بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

(قرآن مجید کی تفسیر ــــ خود ــــ قرآن مجید سے)

جلد اوّل

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب ------------------ مطالب الفرقان (جلد اول)

مصنف ------------------ پرویز

شائع کردہ ------------------ طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

25-B گلبرگ II لاہور- 54660

email: trust@toluislam.com

web: www.toluislam.com

ایڈیشن اول ------------------ اکتوبر 1975ء

ایڈیشن چہارم ------------------ اگست 2000ء (بلا ترمیم)

طابع ------------------ دوست ایسوسی ایٹس

مطبع ------------------ عالمین پریس، لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

آئینۂ مطالب

عنوان	صفحہ
آغازِ سخن	ع
بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم	
۱۔ بسم اللہ وحیِ خداوندی ہے	۱
۲۔ حرف بؔ کے معنی	۱
۳۔ اسم کے معنی	۲
۴۔ بسم اللہ کی غایت	۲
۵۔ قرآنی افہام وتفہیم کا مقصود	۲
(اسکی مزید تشریح ص۲۴ پر ملے گی)	
——— (۰) ———	
سُورۃ فاتحہ ۔ (۱ / ۱—۷)	
حمد	
۱۔ ایک اعتراض کا جواب	۳
۲۔ حمد کا مفہوم	۳
۳۔ حمدِ خداوندی، کارگہ کائنات پر غور وفکر ہی سے کی جاسکتی ہے۔	۴
۴۔ یہ مومنین کا فریضہ ہے۔	۵
۵۔ قرآن کی رو سے علماء کون ہیں؟	۶
یہی مومن، متقی اور اربابِ عقل وبصیرت ہیں۔	۶
۶۔ قرآن میں غور وتدبر بھی وجہِ حمدیت ہے	۷
۷۔ احمدؐ ومحمدؐ ومقامِ محمود	۷
۸۔ ظالم اقوام کی جڑ کٹ جانا وجہ حمدِ خداوندی ہے	۷
۹۔ حمد وملک۔ جمال وجلال کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی	۸
اللہ	
۱۰۔ اللہ ۔ اَلْ + اِلٰہ سے مرکب ہے	۸
۱۱۔ اللہ کے معنی ۔ جس کی اطاعت ومحکومیت اختیار کی جائے۔	۹
۱۲۔ اللہ کا عالمگیر تصوّر	۹

عنوان	صفحہ
۱۳۔ لیکن اللہ کا حقیقی تصور صرف قرآن کریم میں ہے۔	۱۰
اسی لئے ایمان وہی ایمان ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔	۱۰
۱۴۔ تمام اہلِ مذاہب سے ایمان باللہ کا مطالبہ۔	۱۰
۱۵۔ خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔	۱۱
۱۶۔ انسان صرف اسکی طبیعی زندگی سے عبارت نہیں۔	۱۱
اسکے علاوہ اس کی ذات بھی ہے۔	۱۱
۱۷۔ صفاتِ خداوندی، انسانی ذات کی نشوونما ماپنے کا معیار ہیں۔	۱۲
۱۸۔ ذاتِ انسانی کی نشوونما اجتماعی زندگی ہی میں ممکن ہے	۱۲
۱۹۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے آسمانی راہنمائی کی ضرورت	۱۳
۲۰۔ سیکولرازم اس کی قائل نہیں	۱۳
اس انکار کا نتیجہ فسادِ آدمیت ہے	۱۳
۲۱۔ صرف قوانینِ فطرت کے خالق کو ماننا بھی سیکولرازم ہے۔	۱۳
۲۲۔ وہی سما کا اللہ ہے وہی ارض کا اللہ۔ خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کے قوانین کارفرما ہونے چاہئیں	۱۴
۲۳۔ خود اپنے جذبات کو اللہ بنا لینے والے	۱۴
۲۴۔ جذبات اور علم و ہدایت کا باہمی تعلق	۱۴
۲۵۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) کو ضابطۂ اقتدار ماننے والے ہی مومن کہلا سکتے ہیں۔	۱۵

مضمون	صفحہ
ربّ	
۲۶۔ رب کے معنی ــ نشوونما دینے والا	۱۶
۲۷۔ کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔	۱۶
۲۸۔ لیکن وجود میں آنے کے بعد یہ کس طرح نشوونما پا رہی ہے علومِ سائنس اس کی نشاندہی کرتے ہیں	۱۷
۲۹۔ اسے نظریۂ ارتقاء کہا جاتا ہے یہی خدا کا نظامِ ربوبیت ہے	۱۷
۳۰۔ لفظ رب کا ترجمہ بھی کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا	۱۷
عالمین	
۳۱۔ کائنات، ہستی باری تعالیٰ کی علامت (عالَم) ہے۔	۱۸
۳۲۔ تخلیقِ خداوندی میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔	۱۸
۳۳۔ اجرامِ فلکی میں زندگی	۱۹
یہ سب عالمین میں داخل ہیں۔	۱۹
۳۴۔ عالمین کے معنی جملہ نوعِ انسان یا اقوامِ عالم۔	۱۹
قرآن، عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے	۲۰
۳۵۔ رب العالمین کے معنی، عالمگیر ربوبیت کا ضامن۔	۲۰
۳۶۔ اسلامی نظام تمام نوعِ انسان کی پرورش کا ذمہ دار ہوگا۔	۲۰
اس طرح خدا کی صفتِ عالمگیر ربوبیت کا عملی ظہور ہوگا	〃
(۳) الرحمٰن۔ الرحیم	
۳۷۔ رحمت کے معنی سامانِ نشوونما کا بلا مزد و معاوضہ ملنا۔	۲۰

مضمون	صفحہ
۳۸۔ رحیم اور رحمٰن کا ترجمہ صحیح مفہوم سامنے نہیں لاتا۔	۲۱
۳۹۔ نظامِ ربوبیت ارتقائی ہے۔	۲۱
۴۰۔ ارتقاء کی دو شکلیں — عمومی اور فجائی	۲۱
عمومی ارتقا خدا کی صفتِ رحیمیت کی مظہر ہوتی ہے۔	۲۲
اور فجائی ارتقا، رحمانیت کی	
۴۱۔ ابن مسکویہ اور نظریۂ ارتقاء	۲۲
طفرہ کا نظریہ، فجائی ارتقا کا پیش خیمہ تھا۔	۲۲
۴۲۔ تخلیق انسانی کے مراحل	۲۲
۴۳۔ انسانی ذات کی نشوونما، وحی کی راہ نمائی سے ہوتی ہے۔	۲۳
جسے خدا نے رحمت کہہ کر پکارا ہے۔	
۴۴۔ یہ علم (وحی) خدا سے انبیاءؑ کو براہِ راست ملتا تھا	
اس میں خدا کی صفتِ رحمانیت کی نمود ہوتی تھی۔	۲۳
۴۵۔ ختمِ نبوتؐ سے وحی اپنی تکمیل تک پہنچ گئی	۲۴
۴۶۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی مزید تشریح	۲۴
ملوکیت کی تخریب کاریاں	
حکومتِ خداوندی کی تعمیر سامانیاں	
داستانِ ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ	..
۴۷۔ رحم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟	۲۵
۴۸۔ عیسائیت کا (باطل) نظریہ	..
۴۹۔ یہی تصور ہمارے ہاں بھی بار پا گیا۔	۲۶
۵۰۔ دین کی عمارت قانونِ مکافاتِ عمل پر استوار ہے	..
یعنی عدل پر۔	

مضمون	صفحہ
۵۱۔ عدل اور رحم تو دو متضاد عناصر ہیں،	۲۶
۵۲۔ قرآن ان میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔	..
۵۳۔ رحم کا قرآنی مفہوم۔	..
اس سے مراد، تخریب یا نقصان کے ازالہ کی گنجائش ہے	..
۵۴۔ توبہ کا مفہوم — بازآفرینی کا امکان۔	۲۶
۵۵۔ مذاہبِ عالم میں اس کا تصور نہیں۔	۲۷
۵۶۔ بازآفرینی کا یہ امکان خدا کی رحمت ہے	
اور اس سے انکار مایوسی اور کفر۔	
۵۷۔ تلافیٔ مافات کا اصول — ان الحسنات یذھبن	
السیات۔	
(۳) مالک یوم الدین	
۵۸۔ "مالک" کے لغوی معانی	۲۸
۵۹۔ انسانوں کے لئے یہ لفظ استیلاء اور استبداد	..
کا مفہوم لئے ہوگا۔	
خدا کے متعلق اس کا مفہوم اس سے الگ ہوگا۔	..
۶۰۔ یوم — بمعنی زمانہ، مرحلہ، دور، یا وقت۔	۲۹
۶۱۔ الدین — بڑا وسیع المعانی لفظ۔	..
۶۲۔ دینِ خداوندی خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے	۳۰
ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔	
۶۳۔ وہ نظام جسے قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کیا	..
جائے، الدین کہلائے گا۔	
۶۴۔ اسے استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت کہا جاتا ہے	..

مضمون	صفحہ
۶۵۔ دین (اسلامی نظام) کے دو اہم گوشے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اور اطاعتِ رسولؐ	۳۱
۶۶۔ رسول اللہ کے بعد یہ نظام خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کی شکل میں آگے چلا جس میں تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوتے تھے۔	۳۲
۶۷۔ یوم الدین میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پر کوئی زور نہیں ہوگا۔ کوئی جبر و استحصال نہیں ہوگا۔	۳۳
۶۸۔ مفاد پرست گروہوں کی طرف سے اس نظام کی مخالفت۔ ملوکیت، برہمنیت اور نظامِ سرمایہ داری۔	۳۳
۶۹۔ مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک — امورِ دنیا اور امورِ مذہب میں ثنویت۔ اس سے دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نظامِ حکومت سیکولر بن جاتا ہے	..
۷۰۔ اسلام کے ساتھ یہی بیتی۔ اس وقت دنیا میں دین کہیں نہیں۔	۳۴
۷۱۔ دین سے مراد ہے کتاب اللہ کی حکمرانی، قانون کی اطاعت	۳۴
۷۲۔ خدا کے اقتدار (مالک یوم الدین) کا دائرہ یہی دنیا نہیں، آخرت کی زندگی بھی ہے۔	..
(۴) ایاک نعبد	
۷۳۔ دین، مذہب میں تبدیل ہوا، تو عبادت کا ترجمہ "پرستش" کر دیا گیا	۳۵
۷۴۔ عبادت کے معنی محکومیت اختیار کرنا۔	۳۵
اپنی جملہ صلاحیتوں کو قوانین واقدارِ خداوندی کے مطابق تصرف کرنا۔	۳۶
۷۵۔ عبادت اپنی آزاد مملکت (اسلامی نظام) ہی میں ہو سکتی ہے۔	۳۶
۷۶۔ خدا کی عبادت (محکومیت) اختیار کرنے سے انسان ہر نوع غلامی سے آزادی حاصل کر لیتا ہے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔	۳۷
(۵) ایاک نستعین	
۷۷۔ اپنی ذات میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی توفیق طلب کرنا۔	۳۷
۷۸۔ دعا کا مفہوم — شدتِ آرزو کا بیساختہ زبان پر آجانا۔	۳۸
۷۹۔ عبدِ مومن کی آرزوئیں قوانین واقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔	۳۹
۸۰۔ دعا کے ساتھ عمل (کام کرنے) کی ضرورت	..
(۶) اھدنا الصراط المستقیم	۴۰
۸۱۔ ہدایت، واضح اور غیر مبہم راہ نمائی کو کہتے ہیں	۴۱
۸۲۔ تمام اشیائے کائنات کو راہ نمائی	..
اسے ان کی جبلت اور قرآن کی اصطلاح میں وحی کہا جاتا ہے۔	..
۸۳۔ انسانوں کے لئے راہ نمائی۔	..
وحی بذریعہ انبیاء کرامؑ۔	۴۲

مضمون	صفحہ
اسی کو ان کی کتاب کہا جاتا تھا	۴۲
۸۴۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے وہ اس ہدایت کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کے لئے مختار ہے۔	۴۳
۸۵۔ یہ راہ نمائی کتاب اللہ سے ملے گی اور اسے حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی ہوگی۔	۴۳
۸۶۔ منزل پر پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی کو عمل کہتے ہیں۔	۴۴
صراطِ مستقیم	
۸۷۔ ایسا راستہ جس میں نہ پیچ و خم ہو نہ اونچ نیچ۔	۴۴
۸۸۔ الصراط میں ایک عظیم حقیقت مضمر ہے۔	״
۸۹۔ فکرِ انسانی کی بنیادی غلطی۔ زندگی کی حرکتِ دوری سمجھ لی گئی۔	״
اس کے تباہ کن نتائج ــ نظریۂ تناسخ۔	۴۴
عقیدۂ نجات۔	۴۵
۹۰۔ اس سے حرکت اور عمل سب بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔	״
۹۱۔ اہلِ تصوف کا عقیدہ ــ واصل بالحق ہو جانا۔	״
۹۲۔ قرآن نے ان تمام نظریات کو باطل قرار دیا۔ اس نے کہا کہ زندگی کی حرکت دوری نہیں صراطی ہے۔ اس کا مقصد آگے بڑھنا ہے۔	۴۶
۹۳۔ خدا بھی صراطِ مستقیم پر ہے، کا مفہوم	۴۷
۹۴۔ سُبُل السلام (سلامتی کے راستے) کیا ہیں؟	״
(۷) انعمت علیھم	

مضمون	صفحہ
۹۵۔ نعمت کے معنی	۴۸
۹۶۔ منعم علیہ قوموں کے امتیازی نشانات۔	۴۹
۹۷۔ نعماءِ خداوندی کام کرنے سے ملتی ہیں۔	۵۲
۹۸۔ ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔	۵۲
۹۹۔ کفرانِ نعمت سے یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں اور قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔	۵۲
۱۰۰۔ نفسیاتی تبدیلی سے تغیرِ نعمت ہوتا ہے	۵۳
۱۰۱۔ کفرانِ نعمت سے سزا ملتی ہے۔	۵۳
(۸) غیر المغضوب علیھم ولا الضالین	
۱۰۲۔ اس آیت کا غلط ترجمہ	۵۳
۱۰۳۔ قرآن کا اندازِ بیان ــ اضداد سے مفہوم کی وضاحت	۵۴
۱۰۴۔ غضبِ خداوندی کا مفہوم۔ اور اس کا نتیجہ۔	۵۴
۱۰۵۔ ذلت و مسکنت ـ پستی اور جمود	۵۵
۱۰۶۔ باہمی الفت کے بجائے قتال۔ غضبِ خداوندی	۵۶
۱۰۷۔ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے انکار باعثِ غضبِ خداوندی۔	۵۷
۱۰۸۔ یہ ارتداد ہے اور موجبِ غضبِ خداوندی	۵۷
یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ غیر خدائی قوانین کی آمیزش۔ یہ شرک ہے۔	۵۷
۱۰۹۔ اس سے ایک شخص دعوئ ایمان کے باوجود مشرک کا شرک رہتا ہے۔	۵۸

مضمون	صفحہ
۱۱۰۔ معاشی عدم توازن (یعنی غیر متوازن تقسیمِ رزق) وجۂ غضبِ خداوندی۔	۵۸
۱۱۱۔ مغضوب علیہ سے دوستی کے تعلقات بھی جائز نہیں۔	۵۹
(۷) **ولا الضالین**	
۱۱۲۔ ضلالت کے بنیادی معانی	۵۹
۱۱۳۔ ہونیوالے نبی کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی۔	۶۰
۱۱۴۔ تقلید کی تباہ کاریاں۔	۶۰
عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔	۶۰
۱۱۵۔ جذبات سے مغلوب ہوجانے والے بھی ضالین ہوتے ہیں۔	۶۱
۱۱۶۔ جمہوری نظامِ سیاست کی پھیلائی ہوئی گمراہی	۶۲
۱۱۷۔ مذہب کو دین بتاکر بیچنے والے رہزن راہنما	۶۲
۱۱۸۔ یہ کہنا کہ غریبی امیری خدا کے ہاتھ میں ہے، کھلی ہوئی گمراہی ہے۔	۶۳
۱۱۹۔ ضالین کا اتباع مت کرو۔	۶۳
۱۲۰۔ مغضوب علیہ اور ضال کوئی خاص قومیں نہیں۔ یہ تو خصوصیات ہیں — جن قوموں میں بھی پائی جائیں۔	۶۴
خود ہم میں بھی تو یہ علامات موجود ہیں۔	
بسم اللہ اور سورۃ فاتحہ کا خلاصہ	۶۴

—— (۰) ——

مضمون	صفحہ
سُورۃ البقرۃ (۲)	
پہلا باب — متقین	
آیات — ۱ تا ۵	
۱۔ پس منظر — سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط	۶۸
۲۔ (۱/۲) الٓمٓ۔ مقطعات کیا ہیں۔	۷۰
(۲/۲) **ذٰلک الکتاب لاریب فیہ۔**	
۳۔ کتاب کے معنی — ضابطۂ قوانینِ خداوندی	۷۱
حکم اور قانون میں فرق	۷۱
۴۔ قرآن مجید خود رسول اللہ کے زمانے میں، جمع، مرتب، مدون، کتاب کی شکل میں موجود تھا۔	۷۲
۵۔ عربی زبان کی وسعت، مرادفات کی کثرت۔	۷۳
۶۔ ریب کے معنی	۷۳
(۲/۲) **ھدی للمتقین**	۷۴
۷۔ ایک اعتراض۔ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں کو ہوتی ہے۔ جو پہلے ہی متقی ہے، اسے ہدایت کی کیا ضرورت ہے!	۷۵
اس اعتراض کا جواب۔	۷۵
۸۔ تقویٰ (متقی) کا قرآنی مفہوم	۷۵
۹۔ انسانی ذات کا "تقویٰ" — (ایک ضمنی گوشہ)	۷۶
۱۰۔ متقین کی خصوصیات	۷۷
کارگہ کائنات پر غور و فکر اور فطرت کی قوتوں	۷۷

مضمون	صفحہ
کو مسخر کرنے والے۔	۷۷
اس شرط کے ساتھ کہ سرکش جذبات ان پر غالب نہ آجائیں۔	۷۷
(۳/۲) **الذین یومنون بالغیب**	۷۸
۱۱۔ لفظ ایمان کے بنیادی معانی۔	۷۸
۱۲۔ اس کا غلط ترجمہ اور مفہوم بے شمار الجھنوں کا موجب۔	۷۹
ایمان (FAITH) نہیں۔ یہ (CONVICTION) ہے۔	۷۹
۱۳۔ مومن اور تو اور آیاتِ خداوندی کے سامنے بھی اندھا بہرا بن کر سر نہیں جھکاتا۔	۷۹
علم و بصیرت کی اہمیت۔	۸۰
۱۴۔ مسلکِ تقلید کی تباہ کاریاں	۸۰
۱۵۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہے؟	۸۱
قرآنی نقطۂ نگاہ سے مسلمان اور مومن میں فرق	۸۲
من حیث القوم مسلمانوں کا تشخص بھی اپنا مقام رکھتا ہے	۸۲
۱۶۔ اہل کتاب سے ایمان لانے کا مطالبہ	۸۳
۱۷۔ آیت ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصاریٰ.... الخ (۲/۶۲) کا صحیح مفہوم	۸۳
۱۸۔ برہمو سماج کی تحریک۔	۸۳
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی غلط نگہی	۸۴
اس کا ازالہ	..
۱۹۔ کفر بالطاغوت کے بعد ایمان باللہ	۸۶
لا و الا برگ و سازِ امتاں	۸۶
۲۰۔ مومنین کے باہمی روابط۔ اخوت، محبت، اور امن و سلامتی کے ضامن۔	۸۷
۲۱۔ غیر مسلم اقوام کو امن کی ضمانت	۸۷
قرآن کریم کا غیر متبدل ہونا اس کی ضمانت ہے۔	۸۸
۲۲۔ قرآن کریم میں دیا ہوا خدا کا منفرد تصور	۸۸
غیر متبدل قوانین کے مطابق عمل کرنے والا خدا۔	۸۸
ڈکٹیٹر شپ نہیں — قانون کی حکمرانی۔	۸۸
۲۳۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے جزا اور سزا کا مفہوم۔	۸۹
۲۴۔ الغیب کا مفہوم۔	۹۰
۱۔ خارجی کائنات کی مستور قوتیں جو آئندہ جا کر بے نقاب ہو جاتی ہیں۔	۹۰
۲۔ ماورائے سرحد ادراک کے بسیط حقائق	۹۱
لیکن یہ گوشہ بھی غور و فکر کے احاطہ سے باہر نہیں۔	۹۲
۳۔ قوانین پر مبنی پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان — کسان کی مثال	۹۲
خود داعی کی زندگی بھی اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔	۹۳
اور تاریخی شواہد بھی	۹۴
السابقون الاولون کا بلند مقام	۹۴
قانون کی نتیجہ خیزی پر کامل یقین۔	۹۴
۲۵۔ پیش گوئیوں کی حقیقت	۹۵

مضمون	صفحہ
یہ، حوادثِ فطرت کے متعلق تو حتمی طور پر کی جا سکتی ہیں۔	۹۵
لیکن صاحب اختیار و ارادہ انسان کے متعلق نہیں۔	۹۵
یہ علم صرف خدا کو حاصل ہے۔	۹۶
اور حضرات انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی ملتا تھا۔	۹۶
وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا' اب غیب کا علم کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔	۹۶
کشف و الہام کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں	۹۶
(۳) وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ	۹۷
۲۶۔ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنے کا طریق۔ محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔	۹۸
۲۷۔ صلوٰۃ کا لغوی مفہوم	۹۸
ان ربی علی صراط مستقیم کا مفہوم	۹۸
۲۸۔ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی "تسبیح" اور "صلوٰۃ" کا علم رکھتی ہے۔ یعنی اپنے فرائضِ منصبی کا علم۔	۹۹
۲۹۔ ضیاعِ صلوٰۃ کے معنی ہیں اپنے پست جذبات کا اتباع	۹۹
۳۰۔ فریضۂ اقامتِ صلوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔	۱۰۰
محکومیت میں نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں' اقامتِ صلوٰۃ ممکن نہیں۔	۱۰۰
۳۱۔ الصلوٰۃ سے مراد نظامِ مملکتِ اسلامیہ ہے۔	۱۰۰
معاشیات بھی اس کے اندر آجاتے ہیں۔	۱۰۰

مضمون	صفحہ
(حضرت شعیبؑ اور صلوٰۃ)	
۳۲۔ الصلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔	۱۰۱
۳۳۔ اقامتِ صلوٰۃ عظیم انقلابی اقدام ہے۔	۱۰۱
کشمکش صاحبِ ضربِ کلیم و فرعون	۱۰۲
ضمناً۔ انقلاب کس طرح رونما ہوتا ہے۔	۱۰۲
پہلے فضا میں غیر محسوس طور پر تبدیلی آتی ہے پھر محسوس طور پر سامنے آجاتی ہے۔	۱۰۲
۳۴۔ اس انقلاب آفرینی کی شرطِ اولین وحدتِ امت اور وحدتِ نظام و مرکز ہوتی ہے	۱۰۴
(۴) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ	۱۰۵
۳۵۔ رزق کا مفہوم ۔ انسانی جسم کی پرورش اور اس کی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری اسباب و عوامل۔	۱۰۵
۳۶۔ انفاق کے معنی ۔ کھلا رکھنا ۔ باندھ کر نہ رکھنا۔ ضمناً ۔ منافق کی ذہنیت۔	۱۰۵
۳۷۔ ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے۔	۱۰۶
خدا نے' تمام مخلوق کے لئے رزق پیدا کر دیا۔	۱۰۷
اس کے بعد سوال تقسیم رزق کا ہے۔	۱۰۷
اور یہی نوعِ انسان کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا ہے۔	۱۰۷
۳۸۔ نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ	۱۰۸
۳۹۔ بنیادی نکتہ ۔ رزق خدا کا ہے۔ کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔	۱۰۸
اس کی تشریح و توضیح	۱۰۹

مضمون	صفحہ
۴۰۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ (ایک ضمنی گوشہ)	۱۱۰
یہ قرآنی تقسیم نہیں۔	۱۱۱
اللہ کا صرف ایک حق ہے ۔ حقِ ملکیت، نادارُوں کے لئے۔	۱۱۱
۴۱۔ مومنین کا معاملہ خدا کے ساتھ۔	۱۱۱
جان و مال بیچ کر جنّت خرید لی۔	۱۱۱
اس کا عملی مفہوم	
۴۲۔ خدا خیر الرازقین ہے۔ اس کا مفہوم۔	۱۱۳
تقسیمِ رزق میں "خدا کے کارندوں کا کردار"	۱۱۳
۴۳۔ نظامِ سرمایہ داری کی باطل بنیاد ۔ جو جتنا کمالے، وہ اس کا ہے۔	۱۱۳
یہ قارونی ذہنیت ہے۔	۱۱۴
۴۴۔ وحی کی روشنی کے بغیر، اس مسئلہ کے حل کی تلاش میں فکرِ انسانی کی کاوشیں۔	۱۱۵
عقل کا تجرباتی طریق۔	۱۱۵
وحی کا براہِ راست حل عطا کر دینا۔	۱۱۵
حقیقت جہاں بھی منکشف ہوگی وہ رسالتِ محمدیہ ہی کی رہینِ منت ہوگی۔	۱۱۶
۴۵۔ کارل مارکس نے حل تو صحیح پیش کیا ۔ لیکن یہ نہ بتا سکا کہ وہ ممکن العمل کیسے ہوگا۔	۱۱۶
اس نے بر سبیلِ تنزل سوشلزم کا پروگرام پیش کیا لیکن اس سے بات کچھ نہ بنی۔	۱۱۷

مضمون	صفحہ
۴۶۔ سوشلزم کی ناکامی	۱۱۷
۴۷۔ الصلوٰۃ اور انفاق (معاشی نظام) کا تعلق۔	۱۱۸
۴۸۔ صلوٰۃ، فحشآء و منکر سے روکتی ہے	۱۱۸
۴۹۔ تکذیبِ دین کون سے مصلّین کرتے ہیں۔	۱۱۹
ضمناً ۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے ذلیل و خوار کون ہوتا ہے ۔ یتیم کی عزت نہ کرنیوالا، مسکین کی روٹی کا انتظام نہ کرنیوالا۔	۱۱۹
۵۰۔ صلوٰۃ بے روح اور بے غرض و غایت کی مثال۔	۱۲۰
۵۱۔ الصلوٰۃ بمعنی نماز	۱۲۲
انسانی خیالات، اور ظاہری حرکات کا تعلق بڑا گہرا ہے۔	۱۲۲
انہی کو شعائر و مناسک کہا جاتا ہے	۱۲۲
۵۲۔ اگر ان شواہد ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو دین، مذہب بن جاتا ہے۔	۱۲۳
۵۳۔ صلوٰۃ فریضۂ مؤقت ہے۔ یعنی ان اجتماعات میں وقتِ مقررہ پر شریک ہونا چاہیئے۔	۱۲۴
۵۴۔ ان کے لئے آواز دی جائے گی۔	۱۲۴
۵۵۔ ان میں شرکت کے لئے صفائی اور پاکیزگی نہایت ضروری ہے۔	۱۲۴
۵۶۔ ایک اہم بنیادی نکتہ ۔ اصول اور انکی جزئیات	۱۲۵
اصول ہمیشہ ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں۔ جزئیات بدلتی رہتی ہیں۔	۱۲۵

مضمون	صفحہ
۵۷۔ ناسخ و منسوخ کا مفہوم۔	۱۲۵
۵۸۔ انسانیت اس دور تک آپہنچی جس میں علمِ انسانی نے نہایت تیز رفتاری سے ترقی کرنی تھی۔	۱۲۷
۵۹۔ اُس وقت نے اپنا آخری رسول بھیجا۔ اور تمام نوعِ انسان کی راہنمائی کے لئے مکمل ضابطہ ہدایت دے دیا۔	۱۲۷
اس ضابطہ ہدایت کا انداز۔	۱۲۷
غیر متبدل اصول مکمل طور پر، لیکن جزئیات بہت کم۔	۱۲۷
۶۰۔ تعینِ جزئیات، اسلامی نظامِ شورائیت کرے گا۔	۱۲۸
۶۱۔ ثبات و تغیر کا حسین امتزاج	۱۲۹
۶۲۔ بعد میں اسلامی نظامِ مملکت باقی نہ رہا، تو جزئیات کے متعلق فرض کر لیا گیا کہ یہ بھی غیر متغیر رہیں گی۔	۱۳۰
اس سے الدین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔	۱۳۰
۶۳۔ صلوٰۃ کی جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں	۱۳۱
۶۴۔ اوقاتِ صلوٰۃ کے متعلق اشارات	۱۳۱
رکعات کے متعلق۔	۱۳۲
۶۵۔ صلوٰۃ، وحدتِ امت کا ذریعہ تھی۔	۱۳۴
اب نماز، تفرقہ کا مظہر بن گئی ہے۔	۱۳۴
۶۶۔ فرقۂ اہلِ قرآن کی غلط نگہی، گمرہی، اور اس کا اثر قرآن کریم پر۔	۱۳۵
۶۷۔ اب کیا کیا جائے؟	۱۳۶

مضمون	صفحہ
قرآنی نظامِ مملکت کو دوبارہ قائم کیا جائے۔	۱۳۷
۶۸۔ جب تک یہ نظام قائم نہ ہو امت کے مختلف فرقے جس انداز سے ارکانِ اسلام ادا کرتے چلے آرہے ہیں کرتے رہیں۔ ان میں کسی قسم کے تغیر یا حک و اضافہ یا کسی نئے طریق کے وضع کرنے کا حق کسی کو حاصل نہ ہو۔	۱۳۷
۶۹۔ تشکیل و استحکامِ امت کے دو بنیادی گوشے یکہمگی اور باہمگی۔	۱۳۸
یہ مقصد اجتماعاتِ صلوٰۃ میں نکھر کر سامنے آجاتا ہے	۱۳۸
۷۰۔ ارکانِ اسلام کی موجودہ شکلوں کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔	۱۳۹
لیکن ان میں روح پھونکنا بھی ضروری۔	
۷۱۔ یہ چیز پھر سے نصب مرکزیت سے ہوگی۔	۱۴۰
(۴) والذین یؤمنون بما انزل الیک۔	۱۴۰
۷۲۔ وحی کی خصوصیت کہ وہ نازل ہوتی ہے۔	۱۴۰
اس کا مفہوم۔	
۷۳۔ وجدان (INTUTION) بھی فکرِ انسانی ہی کی ایک صنف ہے۔	۱۴۰
۷۴۔ عام عقیدہ کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ وحی جلی (قرآن) اور وحی خفی (احادیث)	۱۴۱
قرآن کریم سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔	۱۴۱
(۵) وما انزل من قبلک	۱۴۲

مضمون	صفحہ
۷۵۔ سابقہ کتب پر ایمان لانے کا مفہوم	۱۴۳
۷۶۔ انبیاءؑ سابقہ پر ایمان	۱۴۴
(۲/۴) **وبالاٰخرۃ ھم یوقنون**	۱۴۴
۷۷۔ آخرت کے معنی ایسی زندگی جو پہلی زندگی سے مختلف اور متغائر ہو۔	۱۴۴
۷۸۔ آخرت بمعنی مستقبل۔	۱۴۵
۷۹۔ دو نظریاتِ حیات ــ (۱) زندگی بس انسان کی طبعی زندگی ہے جس کا موت سے خاتمہ ہو جاتا ہے	۱۴۵
(۲) زندگی مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔	
۸۰۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ــ انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے	۱۴۶
۸۱۔ انسان کا ہر عمل اس کی ذات پر اثر مرتب کرتا ہے۔ یہی اس کا نامۂ اعمال ہے۔	۱۴۷
۸۲۔ جنت و جہنم کا بیان تمثیلی ہے۔	۱۴۸
۸۳۔ ایک اہم نکتہ ــ وہاں سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے۔	۱۴۸
ہر شخص بے نقاب سامنے آجائے گا۔ یہ سب سے زیادہ الم انگیز جہنم ہوگا۔	۱۴۸
۸۴۔ دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج۔	۱۴۹
۸۵۔ تین قسم کے زاویہ ہائے نگاہ ــ (۱) صرف اسی دنیا کے مفاد۔ (سیکولرازم)	۱۴۹
(۲) صرف آخرت میں ثواب۔ (مذہب)	۱۴۹
(۳) دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں (الدین)	۱۵۰
۸۶۔ عمل اور نتیجہ میں ربطِ باہمی	۱۵۱
۸۷۔ ایمان بالآخرت کا نتیجہ ــ اپنے ہر عمل کے لیے جوابدہی کا احساس و یقین۔	۱۵۲
(۲/۵) **اولٰئک علٰی ھدًی من ربھم و اولٰئک ھم المفلحون**	۱۵۲
۸۸۔ مفلحون کے معانی	۱۵۳
کھیتی کی تشبیہ	۱۵۳
۸۹۔ گندم از گندم بروید، جَو ز جَو۔	۱۵۳
۹۰۔ الدین (نظامِ اسلامی) کے نتائج اس دنیا میں۔ استخلاف فی الارض۔	۱۵۴
خلاصہ باب اوّل۔	۱۵۵
دوسرا باب ــ کفّار / آیات ــ ۶ تا ۷	۱۵۷
(۲/۶) **ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون۔**	۱۵۸
(۹۱) اس آیت کے عمومی ترجمہ پر مبنی اعتراض	۱۵۸
۹۲۔ کفر کے معنی ــ یہ کبھی پیدائشی نہیں ہوتا۔ اسے اختیار کیا جاتا ہے۔	۱۵۹
۹۳۔ ان تک ہدایتِ خداوندی کا پہنچنا ضروری ہے۔	۱۶۰

مضمون	صفحہ
۹۴۔ انذار وتنذیر کے معنی۔	۱۶۱
انبیاء اسی اعتبار سے بشیر و نذیر ہوتے تھے۔	۱۶۱
۹۵۔ انسانی زندگی کے متعلق دو نظریات	۱۶۲
(۱) محض طبیعی زندگی۔ (۲) انسانی ذات یا نفس کی پیکر زندگی۔	۱۶۲
۹۶۔ اپنی ذات سے انکار بھی کفر ہے۔	۱۶۲
۹۷۔ عقیدۂ جبر قرآن کریم کے خلاف ہے	
۹۸۔ اپنے اختیار و ارادہ سے کام ہی نہ لینا۔	۱۶۴
ایسے لوگوں کی چند ایک مثالیں۔	
۹۹۔ تقلید کا شیوہ اختیار کرنے والے	۱۶۴
مترفین۔	۱۶۴
۱۰۰۔ جذبات سے مغلوب ہوجانے والے۔	۱۶۵
افراد یا اقوام۔	
یہودیوں کی مثال۔ محض حسد کی بنا پر کفر۔	۱۶۶
۱۰۱۔ پندارِ نفس کی بنا پر انکار۔	۱۶۶
قومِ فرعون کی مثال۔	
۱۰۲۔ نشۂ اقتدار کی سرمستیاں۔	۱۶۷
۱۰۳۔ محفل تمہاری میں بیٹھے ہیں، خیالات کہیں اور ہیں۔	
نظر اور بصر کا لطیف فرق	۱۶۸
۱۰۴۔ یہ تو چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔ ان پر تبلیغ کیا اثر کر سکتی ہے۔	۱۶۸

مضمون	صفحہ
۱۰۵۔ کیا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟	۱۶۹
نہیں! تبلیغ انہیں بھی کرتے رہو۔	
۱۰۶۔ کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے۔	۱۷۰
۱۰۷۔ دین کے نظام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ ثنویت کفر ہے۔	۱۷۱
۱۰۸۔ قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہ کرنے والے کافر ہیں۔	۱۷۲
۱۰۹۔ باہمی اختلاف اور فرقہ بندی شرک اور کفر ہے۔	۱۷۲
مسجدِ ضرار۔	۱۷۳
۱۱۰۔ نظامِ سرمایہ داری۔ ربوٰ۔ کفر ہے۔	۱۷۳
۱۱۱۔ مخالفین کی ٹیکنیک۔ کسی تک قرآن کی آواز مت پہنچنے دو۔ شور مچا دو۔	۱۷۳
۱۱۲۔ کفار مومنین پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے۔	۱۷۴
۱۱۳۔ کفار کے ساتھ مومنین کے دوستداری کے تعلقات نہیں ہوسکتے۔	۱۷۵
۱۱۴۔ اسلام کے اصول بے لچک ہیں۔ اسی لئے ان کیساتھ مفاہمت بھی نہیں ہوسکتی۔	۱۷۸
(۲/۷) ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم	۱۷۹
۱۱۵۔ متداول ترجمہ کی رو سے ایک الجھن	۱۸۰
صحیح مفہوم۔	

مضمون	صفحہ
۱۱۶۔ عمل اور اس کے نتیجہ کا باہمی تعلق۔	۱۸۲
۱۱۷۔ خدا اسے اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے۔	۱۸۲
۱۱۸۔ مسئلہ تقدیر کا لب لباب۔ اقبالؒ کی تشریح کے مطابق۔	۱۸۳
۱۱۹۔ اعمال کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس کی مثالیں۔	۱۸۴
۱۲۰۔ ایسی آیات کا ترجمہ یوں کرو کہ "خدا اپنے قانون کے مطابق یوں کرتا ہے"۔	۱۸۵
۱۲۱۔ دلوں پر مہریں کیسے لگتی ہیں۔	۱۸۶
۱۲۲۔ دل پر خود دل کا تالا۔ ایک عظیم نفسیاتی حقیقت۔	۱۸۷
ولھم عذاب عظیم	۱۸۸
۱۲۳۔ عذاب کے معنی۔	۱۸۸
۱۲۴۔ فطری حوادث۔ زلزلے، سیلاب، وبائی امراض وغیرہ کا تعلق عذاب سے۔	۱۸۹
۱۲۵۔ عذاب کا قرآنی مفہوم۔ زندگی کا کسی مقام پر رک جانا	۱۹۰
۱۲۶۔ ذلت و خواری کا الم انگیز عذاب۔	۱۹۱
محکومی اور غلامی	۱۹۲
استبدال قومی	۱۹۲
تفرقہ انگیزی۔ فرقہ بندی۔	۱۹۳
خوف اور حزن	۱۹۴

مضمون	صفحہ
تنگیٔ رزق۔	۱۹۴
۱۲۷۔ اس جہنم کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے۔	۱۹۵
۱۲۸۔ جسے زندہ رہنا ہے، علیٰ وجہ البصیرت زندہ رہے۔ جسے ہلاک ہونا ہے، دلائل و براہین کی رُو سے ہلاک ہو۔	۱۹۶
۱۲۹۔ قانونِ مہلت۔ سائنٹیفک اصول۔	۱۹۷
۱۳۰۔ عدالتی سزا کو بھی عذاب کہا گیا ہے۔	۱۹۸
خلاصہ باب دوم۔	۲۰۰
تیسرا باب ـــ منافقین	۲۰۱
آیات ـــ ۸ تا ۲۰	
(۸/۲) **ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاٰخر وما ھم بمؤمنین**	۲۰۱
۱۳۱۔ اجزاء ایمان کے تذکرہ کے سلسلہ میں قرآن کریم کا انداز۔	۲۰۲
۱۳۲۔ ایمان لانے کے باوجود مشرک۔	۲۰۳
۱۳۳۔ ایمان بلا عمل	۲۰۳
۱۳۴۔ منافق کسے کہتے ہیں؟	۲۰۴
۱۳۵۔ خدع کے معنی	۲۰۴
۱۳۶۔ کذب کا قرآنی مفہوم۔	۲۰۵
(۹/۲) **یخٰدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔**	۲۰۵

مضمون	صفحہ
۱۳۷۔ منافقت ایک نفسیاتی مرض ہے۔	۲۰۶
۱۳۸۔ ادراک کا مرکز کونسا ہے اور احساسات کا کونسا؟ ایک مشکل مسئلہ جس کا حتمی طور پر فیصلہ نہیں ہو سکا۔	۲۰۶
۱۳۹۔ سائیکلوجی کا (PSYCHE)	۲۰۶
۱۴۰۔ قلب اور فؤاد کی بحث	۲۰۶
شعور کا مفہوم۔	۲۰۷
۱۴۱۔ عالم انفس و آفاق کے بے نقاب ہونے سے قرآنی دعاوی کی تصدیق۔	۲۰۸
۱۴۲۔ منافقین کی علامات — کفر مستور	۲۰۹
ان پر کسی کو بھی اعتماد نہیں ہوتا — خود انکی اپنی پارٹی کو بھی نہیں۔	۲۰۹
۱۴۳۔ تخریبی ذہنیت — نقصان پہنچا کر خوش ہونا۔	۲۱۰
چاہتے ہیں کہ تم بھی انہی جیسے کافر ہو جاؤ۔	۲۱۱
۱۴۴۔ سازشیں اور سرگوشیاں	۲۱۱
حتیٰ کہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف الزام تراشیاں۔	۲۱۲
۱۴۵۔ ریاکاری۔ انفاق و صلوٰۃ و جہاد میں۔	۲۱۳
۱۴۶۔ منافقین کی عبودیت "علیٰ حرف"	۲۱۴
۱۴۷۔ تحاکم الی الطاغوت۔	۲۱۵
۱۴۸۔ تفرقہ انگیزی۔ مسجد ضرار۔	۲۱۶
آج ہماری مساجد!	۲۱۷

مضمون	صفحہ
۱۴۹۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔	۲۱۸
۱۵۰۔ ان سے معاشرتی تعلقات کا انقطاع، جنازہ تک میں شرکت مت کرو۔	۲۱۹
۱۵۱۔ اخروی زندگی میں منافقین کی حالت۔	۲۱۹
۱۵۲۔ درجات و درکات۔ ایک ضمنی گوشہ	۲۲۱
۱۵۳۔ مدینہ کے یہودی اور اعراب	۲۲۲
۱۵۴۔ ایک عظیم حقیقت۔	۲۲۳
حضورؐ کے برپا کردہ انقلاب میں فوق الفطرت عناصر کا دخل نہیں تھا۔	۲۲۴
۱۵۵۔ حضورؐ کی سیرت بطور اسوۂ حسنہ	۲۲۴
۱۵۶۔ منافقین چھٹ کر الگ ہو گئے تھے۔	۲۲۴
۱۵۷۔ باقی صحابہؓ رہ گئے تھے اور سب کے سب پکے اور سچے مخلص مومن تھے۔	۲۲۵
یخدعون اللہ والذین اٰمنوا	۲۲۸
وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون	
۱۵۸۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے	۲۲۸
(۲/۱۰) فی قلوبہم مرض .... یکذبون	۲۲۹
۱۵۹۔ کذب سے نفسیاتی مرض کس طرح بڑھتا ہے۔	۲۲۹
(۲/۱۱-۱۲) واذا قیل لہم لا تفسدوا .... یشعرون۔	۲۲۹
۱۶۰۔ اصلاح اور فساد۔ دو وسیع المعانی اصطلاحات۔	۲۲۹
۱۶۱۔ کیا ہونا چاہیئے، فلسفۂ اخلاق و تمدن کا مشکل ترین مسئلہ	۲۳۰

مضمون	صفحہ
۱۶۲۔ ہونا ویسے چاہیئے جیسے وحی خداوندی کا تقاضا ہو۔	۲۳۱
۱۶۳۔ فساد کے مختلف گوشے۔	۲۳۱
نظامِ حکومت	۲۳۱
۱۶۴۔ ایک ضمنی گوشہ۔ مومنین کو علو فی الارض حاصل ہوگا۔ استکبار بغیر الحق ناجائز ہے	۲۳۴
۱۶۵۔ فسادِ آدمیت کا دوسرا گوشہ۔ مذہبی پیشوائیت	۲۳۵
۱۶۶۔ تیسرا گوشہ۔ معاشی نظام	۲۳۶
۱۶۷۔ نظامِ سرمایہ داری۔ قارون	۲۳۷
۱۶۸۔ چوتھا گوشہ۔ جنسی بدنہادی۔ قومِ لوطؑ	۲۳۸
۱۶۹۔ وحدتِ انسانیت۔ قرآن کا منتہیٰ	۲۳۸
۱۷۰۔ قومیت پرستی۔ فسادِ آدمیت	۲۴۰
۱۷۱۔ خود یہ امت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔	۲۴۱
۱۷۲۔ امت مسلمہ مصلحین کی جماعت تھی۔	۲۴۴
مصلحین اور مفسدین ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔	
(۲/۱۳) واذا قیل لھم ..... لیعلمون	۲۴۴
۱۷۳۔ دولتمند طبقہ اپنے آپ کو عقلِ کل کا مالک سمجھتا ہے اور غریبوں کو بیوقوف۔	۲۴۶
۱۷۴۔ معیارِ فضیلت دولت نہیں، حسنِ کردار ہے	۲۴۶
(۲/۱۴) واذا لقوا الذین ..... مستھزءون	۲۴۶
۱۷۵۔ ہر رسول کے ساتھ استہزاء	۲۴۷
۱۷۶۔ رسول اللہ کو تلقینِ استقامت	۲۴۷
(۲/۱۵) اللہ یستھزئ ..... یعمھون	۲۴۸
۱۷۷۔ طغیان کے معنی۔ حدود و قیود توڑ کر سرکش و بیباک ہو جانا	۲۴۸
۱۷۸۔ میزانِ عدل کو قائم رکھو۔ صحیح توازن ہی میں خیر ہے	۲۴۹
(۲/۱۶) اولٰئک الذین ..... مھتدین	۲۵۰
۱۷۹۔ مسئلہ خیر و شر	۲۵۰
یا نفع اور نقصان کے پیمانے	۲۵۰
۱۸۰۔ مطلق نفع یا نقصان کا علم صرف وحی کی رو سے ہو سکتا ہے۔	۲۵۱
اس کا حقیقی پیمانہ۔ اقدارِ خداوندی	۲۵۱
۱۸۱۔ انسانی ذات کی مزید تشریح	۲۵۳
۱۸۲۔ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا مفہوم	۲۵۳
اس کی مثالیں	۲۵۴
۱۸۳۔ مومنین اور خدا کا بیع و شریٰ کا معاہدہ	۲۵۴
۱۸۴۔ مقتولین فی سبیل اللہ کے بلند مقامات	۲۵۵
مذہبی پیشوائیت۔ دنیاوی مفاد کی خاطر آیات اللہ کے بیچنے والے۔	۲۵۶
۱۸۵۔ دنیا کی ہر متاع آخرت کے مقابلہ میں ثمنِ قلیل ہے	۲۵۷
(۲/۱۷) مثلھم ..... لایبصرون	۲۵۷
۱۸۶۔ زندگی کے اہم مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے عقل کا تجرباتی طریق۔	۲۵۸
۱۸۷۔ غلامی کا مسئلہ	۲۵۹
۱۸۸۔ عقل اور وحی دونوں کی ضرورت ہے۔	۲۶۱

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
۱۸۹۔ ظلمات کے لفظ میں عمیق حقائق پوشیدہ ہیں۔	۲۶۲	انہی پابندیوں کا نام قوانینِ خداوندی ہے	۲۷۵
(۲/۱۸) صمٌّ، بکمٌ، عمیٌ .... لایرجعون	۲۶۲	**چوتھا باب — الناس**	۲۷۹
۱۹۰۔ صمٌّ، بکمٌ، عمیٌ۔ عقل وفکر سے کام نہ لینے	۲۶۳		
۱۹۱۔ لایرجعون کے معنی	۲۶۳	آیات — ۲۱ تا ۲۹	
والے۔		(۲/۲۱) یایھا الناس اعبدو .... تتقون	۲۸۰
(۲/۱۹) اوکصیب ..... بالکفرین	۲۶۴	۲۰۱۔ قرآن کریم کا پیغام عالمگیر انسانیت کے لئے ہے	۲۸۰
۱۹۲۔ طبیعی دنیا کی کوئی شے نہ خیر ہوتی ہے نہ شر	۲۶۴	۲۰۲۔ انسانی تخلیق	۲۸۱
اس کا استعمال اسے ایسا بنادیتا ہے۔	۲۶۵	۲۰۳۔ رزاقیت	۲۸۲
۱۹۳۔ فکرِ انسانی کوئی نظام ایسا نہیں وضع کرسکی	۲۶۵	۲۰۴۔ عالمِ خلق اور عالمِ امر	۲۸۳
جو تمام انسانوں کے لئے خیر ہی خیر ہو۔		۲۰۵۔ بدیع السمٰوٰت والارض	۲۸۴
۱۹۴۔ فطرت کی قوتوں کا غلط استعمال۔	۲۶۸	۲۰۶۔ مغربی سائنس دانوں کا اعترافِ عجز	۲۸۶
اس کا نتیجہ — تباہی	۲۶۸	۲۰۷۔ تخلیقِ کائنات کے متعلق قرآنی تصریحات	۲۸۷
برفو کی شہادت	۲۶۹	۲۰۸۔ احسن الخالقین	۲۸۷
(۲/۲۰) یکادالبرق .... قدیر	۲۶۹	قوتِ تخلیق انسان کو بھی حاصل ہے	۲۸۷
۱۹۵۔ خدا غلط کار لوگوں کی طبیعی قوتیں سلب	۲۷۰	۲۰۹۔ تخلیق و تولید میں فرق	۲۸۷
نہیں کرتا۔		۲۱۰۔ مخلوق میں نت نئے اضافے	۲۸۸
۱۹۶۔ طبیعی مفاد ہر ایک کو بقدر طلب و محنت مل	۲۷۱	۲۱۱۔ کائنات میں زندگی کی نمود	۲۸۹
سکتے ہیں۔		۲۱۲۔ کان عرشہٗ علی الماء کا صحیح مفہوم	۲۹۰
۱۹۷۔ ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر کا مفہوم۔	۲۷۲	۲۱۳۔ انسان کی تخلیق — مختلف مراحل کا بیان	۲۹۱
۱۹۸۔ عالمِ امر۔ یفعل مایرید	۲۷۳	حوادثِ ارضی و سماوی	۲۹۲
۱۹۹۔ عالمِ خلق۔ اقدار و قوانین کی دنیا	۲۷۳	۲۱۴۔ "یوم الست" اور "قالوا بلیٰ" کے افسانے۔	۲۹۳
۲۰۰۔ خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔	۲۷۵	آیت کا مفہوم	۲۹۴

مضمون	صفحہ
(۲/۲۲) الذی جعل لکم ..... تعلمون	۲۹۴
۲۱۵۔ زمین کے "فراشًا" ہونے کا اعجاز	۲۹۴
۲۱۶۔ سماء سقفِ محفوظ ہے۔ اس کا مفہوم	۲۹۵
۲۱۷۔ قرآن کا معاشی نظام ـــ ارض پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔	۲۹۶
۲۱۸۔ انداداً من دون اللہ کی صراحت	۲۹۸
۲۱۹۔ یہی الٰہ الارض ہیں۔	۳۰۰
۲۲۰۔ سیکولرازم میں یا تو سرے سے خدا کا انکار ہوتا ہے، اور یا اسے محض کاغذی خدا مانا جاتا ہے۔	۳۰۱
قرآنِ کریم دونوں کو منکرینِ خدا قرار دیتا ہے۔	۳۰۲
۲۲۱۔ دورِ ملوکیت کے نِد ـــ بادشاہ	۳۰۴
عصرِ حاضر کا نِد ـــ اسٹیٹ	۳۰۴
۲۲۲۔ اسٹیٹ کے پردے کے پیچھے وہی برسرِاقتدار طبقہ۔	۳۰۴
۲۲۳۔ قرآنِ کریم کی تاکید ـــ حلال وطیّب رزق کھاؤ	۳۰۵
۲۲۴۔ ایسا رزق نظامِ خداوندی ہی میں مِل سکتا ہے۔	۳۰۶
۲۲۵۔ قطعاتِ اراضی پر ذاتی ملکیتوں کی تحدید، حضورؐ کے زمانہ ہی میں شروع ہوگئی تھی۔	۳۰۷
۲۲۶۔ یہ نظام، اتباعِ کتاب اللہ سے قائم ہوا تھا۔	۳۰۷

مضمون	صفحہ
(۲/۲۳) وان کنتم فی ریب .... صٰدقین۔	۳۰۸
۲۲۷۔ خدا کا عبد ـــ حقیقی معنوں میں آزاد	۳۰۸
۲۲۸۔ مدعیٔ نبوت کے لئے مشکل ترین مقام	۳۰۹
۲۲۹۔ وہ معجزات کا مطالبہ کرتے تھے	۳۰۹
(اولیاء اللہ کی کرامات)۔ ایک ضمنی گوشہ	۳۱۰
۲۳۰۔ اور خدا کی طرف سے اس کا انکار ہوتا تھا۔	۳۱۰
۲۳۱۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔	۳۱۱
۲۳۲۔ ایمان نہ لانے کی حقیقی وجہ ـــ مفاد پرستیاں	۳۱۲
۲۳۳۔ کیا یہ کتاب کافی نہیں؛	۳۱۳
۲۳۴۔ صحابہؓ کا ایمان ـــ ایک ضمنی گوشہ	۳۱۳
۲۳۵۔ قرآن کا چیلنج ـــ کہ اس جیسی کتاب بنا کر دکھاؤ	۳۱۴
(۲/۲۴) فان لم تفعلوا .... للکفرین۔	۳۱۵
۲۳۶۔ لفظ سورۃ کے معنی۔	۳۱۶
۲۳۷۔ قرآن کریم کی ترتیب ـــ "ترتیب نزولی" کا نظریہ	۳۱۶
۲۳۸۔ عربوں نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔	۳۱۷
اس کے بعد بھی آج تک کسی نے قبول نہیں کیا۔	۳۱۹
۲۳۹۔ عربی زبان کی کتاب	۳۲۰
۲۴۰۔ حضورؐ دعوئے نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔	۳۲۱
۲۴۱۔ حضورؐ کی سیرت کی پاکیزگی ایسا معجزہ تھی جس سے مخالف سے مخالف تک بھی انکار نہیں کرسکا تھا۔	۳۲۲

مضمون	صفحہ
۲۴۲۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔	۳۲۳
۲۴۳۔ النار کے معنی ۔ جہنم کے معنی ۔ (۳۲۷)	۳۲۶
۲۴۴۔ الناس والحجارۃ۔ عوام اور ان کے لیڈر	۳۲۸
(۲/۲۵) وبشر الذین اٰمنو ...... خٰلدون	۳۳۱
۲۴۵۔ اعمال صالحہ کا مفہوم	۳۳۲
۲۴۶۔ جنت کے معنی	۳۳۳
۲۴۷۔ جنت کی کیفیات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔	۳۳۳
۲۴۸۔ جنتِ آدم ۔ یعنی جنتِ ارضی	۳۳۵
۲۴۹۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے	۳۳۷
جانکاہ تصادمات کے بعد حصولِ جنت	۳۳۷
۲۵۰۔ جنت اجتماعی زندگی سے حاصل ہوگی۔ خانقاہیت کے خلوت کدوں میں نہیں۔	۳۳۸
۲۵۱۔ ازواج کے معنی ہم آہنگ رفقاء	۳۳۸
۲۵۲۔ حوروں سے مراد	۳۳۹
۲۵۳۔ سامانِ زیست (رزق) کی کیفیت میں فرق۔	۳۴۰
(۲/۲۶) ان اللہ لا یستحی ..... فاسقین	۳۴۱
۲۵۴۔ مجرد حقائق مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعے سمجھائے جاسکتے ہیں	۳۴۱
۲۵۵۔ قرآنی مثالوں کے کچھ نمونے	۳۴۳
۲۵۶۔ فاسق کا مفہوم۔	۳۴۳
(۲/۲۷) الذین ینقضون .... خاسرون	۳۴۴

مضمون	صفحہ
۲۵۷۔ عہد فراموش اور پیمان شکن کون ہیں۔	۳۴۴
۲۵۸۔ خاسرونا مراد کون ہیں؟	۳۴۵
۲۵۹۔ سورۃ والعصر کا تشریحی مفہوم	۳۴۵
(۲/۲۸) کیف تکفرون باللہ ..... ترجعون	۳۴۶
۲۶۰۔ موت اور حیات کے معنی	۳۴۶
۲۶۱۔ زندگی کیسے پیدا ہوگئی۔ اس کے متعلق عصرِ حاضر کے سائنسدانوں کا عجزِ فہم۔	۳۴۷
۲۶۲۔ نمودِ حیات کی ایک مثال۔	۳۴۸
۲۶۳۔ حیات بعد الممات کی اہمیت۔	۳۴۹
۲۶۴۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کا مفہوم۔	۳۵۰
(۲/۲۹) ھو الذی خلق لکم ..... علیم	۳۵۲
۲۶۵۔ "سبع سمٰوٰت" کا مفہوم۔	۳۵۲
۲۶۶۔ تخلیق ارض وسماء	۳۵۳
۲۶۷۔ رزق اور رزقِ کریم میں فرق۔	۳۵۴
رزقِ کریم مشروط ہے محکومیتِ خداوندی سے۔	-
۲۶۸۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کا باہمی تعلق۔	..
۲۶۹۔ ہر حق مشروط ہوتا ہے ذمہ داری پوری کرنے سے۔	..
خلاصہ باب	۳۵۵-۳۶۰

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بتو صد حساب باقیست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

میں قرآن کریم کا ادنیٰ طالب العلم ہوں میں نے اپنی ساری زندگی اس کتابِ عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے۔ جب میں "ساری عمر" کہتا ہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں کرتا۔ پانچ چھ برس کی عمر سے، کہ جب مجھے مکتب میں بٹھایا گیا، اس وقت تک، کہ میرا رہروِ عمر بہتر سے بھی زیادہ منازل طے کر چکا ہے، بجز اُن دنوں کے جب میں کسی وجہ سے معذور ہو گیا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب قرآنِ مجید میری نگاہوں کے سامنے نہ رہا ہو۔ عمر کے پہلے حصہ میں اس کا مطالعہ مروجہ قدامت پرستانہ طریق سے کیا۔ اس کے بعد جب حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا شعور بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا تھا وہ مجھے حقیقت سے بہت دور لے گیا تھا۔ اس سے خود اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات ابھرنے شروع ہوئے جن کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ برسوں تک میں ریب و تشکیک کی انہی پُرخار وادیوں میں، وقفِ کرب و اضطراب، سرگرداں و حیراں پھرتا رہا۔ اسی دشت نوردی میں مجھے اس کا علم و احساس بھی ہوا کہ ہمارا نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ مذہب گزیدہ کیوں ہو رہا ہے۔ میری قسمت نے یاوری کی، اور، بتائیدِ ایزدی، یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ قرآن مجید کے سمجھنے کا صحیح طریق کیا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو نور (روشنی) کہا ہے۔ اور روشنی اپنے وجود کی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لئے خارجی چراغوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا، قرآن خود قرآن ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن نازل کرنے والے (خدا) نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (75/19) "قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمے ہے" اور اسی بنا پر، قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے (16/89)۔ یعنی "ہر بات کی وضاحت کرنے والا"۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں (18/1) کوئی تضاد نہیں، اختلاف نہیں (4/82)۔ ابہام نہیں، التباس نہیں۔ صاف، نکھری، واضح، روشن کتاب۔

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قرآن مجید، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ نازل کیا گیا ہے۔ (26/195)۔ یعنی واضح عربی

زبان میں۔ علم اللسانیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر واشگاف ہو چکی تھی کہ مرورِ زمانہ سے زبانوں کے الفاظ کے معانی میں کس قدر فرق آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے ضروری ٹھہرا کہ یہ دیکھا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں ان الفاظ کے معانی کیا سمجھے جاتے تھے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کا صرف مفہوم منجانب اللہ نہیں، اس کے الفاظ بھی منجانب اللہ ہیں۔ اسی بنا پر اسے کلام اللہ کہا گیا ہے۔ (۶/۹)

قرآن کریم کا انداز عام کتابوں کا سا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کتاب، مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ اور اس موضوع سے متعلق تمام مضامین اس باب میں مربوط طور پر درج کر دیئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ انداز نہیں۔ اس کے متعلق یوں سمجھئے جیسے یہ تئیس سال کے عرصہ میں ارشاد فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے تو اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر۔ اضافہ کسی اور جگہ، استثناء کسی اور سورۃ میں۔ نیز، مختلف حقائق کے متنوع گوشوں کو، مختلف موضوعات کے ضمن میں، لوٹا لوٹا کر سامنے لایا گیا ہے۔ اس اندازِ بیان کو اس نے "تصریفِ آیات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا۔ (۱۰۵/۶)۔ اسی طریق سے اس نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی متعین اور واضح کیا ہے۔

قرآن کریم کے سمجھنے کی اگلی شرط، تدبر فی القرآن ہے۔ (۸۲/۴)۔ یعنی اسے غور و فکر، عقل و بصیرت اور علم و شعور کی رو سے سمجھنا۔ تدبر فی القرآن کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے ہے، نہ کسی خاص زمانے کے لئے۔ وہ تمام افراد کے لئے ہے، اور ہر زمانے کے لئے۔ اس لئے قرآن مجید کو نہ تو تقلیداً سمجھا جا سکتا ہے، نہ کسی اور کا فکر و تدبر، دوسرے کے لئے سند و حجت ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے تدبر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، کہ علم نوعِ انسان کی وراثت ہے۔ لیکن نہ وہ سند ہو سکتا ہے، نہ حرفِ آخر۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں، خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۵۳/۴۱)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق (خارجی کائنات اور خود نفسِ انسانی) میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآنی دعاوی کی صداقت نکھر کر سامنے آتی جائے گی۔ لہٰذا، قرآن کریم پر غور و تدبر کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں علمِ انسانی جس سطح پر پہنچ چکا ہے، اس پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ قرآن، انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں، اور انسانی فکر کی کاوشیں ان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچی ہیں، تو وہ

قرآن سے راہ نمائی کیا حاصل کر سکے گا!

تدبر فی القرآن کے ضمن میں ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینے کے قابل ہے. قرآن کریم میں کچھ تو احکام و قوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔ احکام و قوانین ایسے الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین ہیں. لیکن حقائق، بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعدالطبیعیات سے ہے. انہیں تشبیہات، تمثیلات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے. مجرد حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو بیان ہی اسی انداز میں کیا جا سکتا ہے. یہ ظاہر ہے کہ تشبیہات و استعارات سے ان حقائق سے متعلق، ہر صاحبِ فکر اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق تصور قائم کر سکتا ہے. بنابریں ان تصورات میں فکری اختلاف قابلِ فہم ہے. لیکن جہاں تک قرآنی احکام یا راہنمائی کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا.

قرآنی راہنمائی کی بھی یہ صورت ہے کہ اس میں بعض احکام متعین ہیں اور بعض اصول و اقدار کی شکل میں. جہاں تک اصول و اقدار کا تعلق ہے، ان کی عملی جزئیات قرآنِ کریم نے خود متعین نہیں کیں. انہیں اسلامی نظامِ مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق وضع کرے۔ اس طرح امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوگی اور برقرار رہے گی. قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط .. ـــ ـــ ـــ ... یہ بھی ہے کہ جب تک آپ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کریں گے قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ (ﭖ). جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے، قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اپنے خیال کی سند اور تائید قرآن سے حاصل ہو جائے۔ اس کی رسائی صداقت تک نہیں ہو سکتی۔

یہ تھا قرآن فہمی کا وہ طریق، جو مجھے خود قرآنِ کریم سے سمجھ میں آیا اور اسی کے مطابق میں نے اسے از سرِ نو سمجھنے کی کوشش کی. ظاہر ہے کہ یہ طریق بڑا صبر آزما، اور یہ مراحل بڑے ہمت طلب تھے. لیکن انہیں طے کئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا. میری عمر کا باقی حصہ اسی کوہ کنی اور جوئے شیر براری میں گزرا ہے۔ اور اس احساس سے میری جبینِ تشکر بارگاہِ ایزدی میں بصد عجز و نیاز جھک جاتی ہے کہ اس کی توفیق و تائید نے مجھے اس میں بڑی کامیابی عطا فرمائی ہے. جہاں تک قرآنی الفاظ (مفردات) کے معانی اور تصورات متعین کرنے کا مرحلہ تھا، میں نے برس ہا برس کی محنت شاقہ کے بعد قرآنی لغت مرتب کیا جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے

اس کے ساتھ ساتھ میں نے تصریفِ آیات کے ضمن میں، تبویب القرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ (اس کا ضخیم مسودہ سالِ گزشتہ کتابت کے لئے دے دیا گیا ہے) ان دونوں بنیادوں پر میں نے پورے کے پورے قرآن کا مفہوم متعین کیا، جو تیس پاروں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی دوران میں، میں نے قرآنی تعلیم اور حقائق کو مختلف تصانیف کی شکل میں بھی شائع کیا جو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ میں بالخصوص بڑی مقبول ہوتی ہیں ۔ من و یزداں، ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، کتاب التقدیر، ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت، شاہکارِ رسالتؐ، اسی سلسلہ زریں کی مختلف کڑیاں ہیں۔

اس کے ساتھ میں نے ہفتہ واری درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ بھی جاری کیا جو بحمداللہ قریب پچیس سال سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ چونکہ درس میں ہر بات بڑی تفصیل سے سامنے آجاتی ہے اس لئے یہ سلسلہ بڑا مؤثر، بلیغ، اور دلکش ثابت ہوا۔ احباب کا شروع ہی سے تقاضا تھا کہ اِن درسوں کی بنیاد پر قرآنِ کریم کی تفسیر مرتب کی جائے۔ میں اس میں بڑی دشواریاں دیکھتا تھا۔ اگرچہ میرے ایک رفیق عزیز (ملک ظہور احمد) کی برسوں کی جانکاہی نے اِن درسوں کو، جو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں، صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا تھا، لیکن درس کا انداز تصنیفی انداز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تفسیر کے لئے اِن درسوں کی تفصیلات کے انبار سے متعلقہ حقائق کو الگ کر کے انہیں از سرِ نو مربوط و مرتب شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے میں اِس سلسلۂ دراز کو شروع کرنے کی اپنے میں ہمت نہیں پاتا تھا۔ لیکن سالِ گزشتہ احباب کے اِس تقاضا نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ مجھے بالآخر سپر انداز ہونا پڑا۔ کچھ وقت تک مسلسل لکھنے سے اب میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اِس مشکل کا حل میرے ایک دوسرے رفیق (اخلاق احمد صاحب) نے پیش کر دیا۔ چنانچہ میں تفسیر کو اِملا کراتا گیا اور وہ لکھتے گئے۔ اور قریب تین ماہ کے نہایت قلیل عرصہ میں اس کی پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا جو پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔ یہ جلد پھیلی ہوئی تو قریب پونے چار سو صفحات پر ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرۃ کی صرف ابتدائی اُنتیس آیات آئی ہیں لیکن تفسیر کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ ابتدائی آیات اسی تفصیل کی متقاضی تھیں۔ ان سے اسلام کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھیں گے، اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور آئندہ ایک ایک جلد قرآنِ کریم کے نسبتاً زیادہ حصہ پر مشتمل ہو گی۔ بہرحال آغازِ سفر میں نے کر دیا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ مزید منازل کتنے عرصہ میں طے ہوں گی اور آخری منزل تک کب

پہنچ جائے گا۔ اِس مقام پر تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ۔ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۔ (۴۰/۴۴)

اِس تفسیر کے ضمن میں حسبِ ذیل نکات پیشِ نظر رکھیے۔

(۱) میں نے اکثر کہا ہے کہ قرآنِ مجید عام تفاسیر سے سمجھ میں نہیں آسکتا، کیونکہ ان میں بیشتر حصّہ خارج از قرآن ہوتا ہے اور مفسّر کے اپنے اعتقادات ونظریات قرآنی راہنمائی پر غالب آجاتے ہیں۔ زیرِ نظر تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں ہر آیت کے مفہوم کو خود قرآنِ کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ نیز، چونکہ میرا تعلّق کسی فرقہ سے نہیں اور میرے اعتقادات ونظریات کی بنیاد قرآنِ کریم پر ہے، اس لئے اِس تفسیر میں آپ فرقہ بندی رنگ کی کوئی آمیزش نہیں پائیں گے۔

(۲) آیات کا لفظی ترجمہ عند الضرورت دیا گیا ہے۔ عام طور پر ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے، کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔

(۳) الفاظ کا لغوی مفہوم اُسی حد تک دیا گیا ہے جس حد تک آیت زیرِ نظر میں اس کی ضرورت ہے۔ باقی مفاہیم لغات القرآن میں ملیں گے۔

(۴) جو آیات کسی آیت کی تشریح میں تائیداً لکھی گئی ہیں، وہاں اُن کا صرف ملخّص بیان کیا گیا ہے۔ انکی توضیح اور تشریح ان کے اپنے مقام پر سامنے آئے گی۔

(۵) چونکہ میں قرآنِ کریم کے متعلق گزشتہ چالیس سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آرہا ہوں، اس لئے اِس تفسیر میں بہت سے ایسے امور سامنے آئیں گے جنہیں میں نے اپنی سابقہ تصانیف میں کہیں نہ کہیں بیان کیا ہوگا۔

(۶) اس تفسیر میں اُن غیر قرآنی معتقدات اور نظریات کی تردید خود بخود ہوتی گئی ہے جو ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کے نام سے مروّج ہیں۔ لیکن اس ضمن میں، میں نے نہ کسی فرقہ کا نام لیا ہے، نہ شخصیتوں کا، بجز چند ایک ایسے مقامات کے جہاں ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اِس سے اُن فرقوں یا شخصیات کی کسی قسم کی تحقیر مقصود نہیں، ان کے خلافِ قرآن نظریات کی تردید مطلوب ہے۔

(۷) تفسیر کے ابواب قرآنی تقسیم کے اعتبار سے نہیں' بلکہ اس تفسیر کے مضامین کی تقسیم کے اعتبار سے ہیں۔

آخر میں' میں اُن تمام احباب کا دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اِس کی ترتیب، تدوین، تحریر، کتابت، طباعت، اشاعت وغیرہ کے سلسلہ میں میری مدد کی۔ اِس ضمن میں رفیقِ عزیز' سراج منیر صاحب کا نام سرِفہرست آتا ہے جن کی دیدہ ریزی نے اس کی کتابت کی تصحیح کا مرحلہ آسان کر دیا۔

اور اس آغازِ سخن کے خاتمہ پر اس امر کا اعتراف واظہار ضروری ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں' بہرحال یہ ایک انسانی کوشش ہے جسے نہ سہو وخطا سے منزہ قرار دیا جاسکتا ہے نہ حرفِ آخر۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ میں نے اپنی کوئی اور حیثیت نہ پہلے سمجھی ہے، نہ اب سمجھتا ہوں۔		والسلام!

۸ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

پرویز

۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ الفاظ قرآن کریم کی ہر سورۃ (بجز سورۃ التوبہ[1]) کے آغاز میں ملتے ہیں۔ بعض حضرات اُسے ایک آیت قرار دیکر متعلقہ سورۃ کا جزو قرار دیتے ہیں۔ اور اس سورۃ کی آیات کے شمار کرنے میں اُسے بھی شامل کر لیتے ہیں۔ بعض اُسے متعلقہ سورۃ کا جزو قرار نہیں دیتے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ الفاظ شروع میں تبرکاً لکھدیے گئے ہیں۔ یہ فنی یا اصطلاحی بحثیں ہیں۔ جو ہمارے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ سورۃ النمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو جو خط لکھا تو اس کا آغاز اس طرح سے کیا: اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (۲۷/۳۰) اس اعتبار سے یہ الفاظ منزل من اللہ، یعنی وحی خداوندی ہیں۔ اور ہمارے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔

عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں:

"شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ کے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔"

"بِسۡمِ اللّٰهِ" میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنے "شروع کرتا ہوں میں" کئے جائیں۔ ان معانی کے لئے اس سے پہلے "اَبۡتَدِءُ" کا لفظ محذوف مانا گیا ہے۔ جس کے معنے ہیں: "میں شروع کرتا ہوں"۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے "اِقۡرَءۡ" کا لفظ محذوف ہے۔ کیونکہ سورۃ العَلَق میں آیا ہے "اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِيۡ خَلَقَ (۹۶/۱)۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ پر وحی کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا۔ جس میں حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ "تو پڑھ ساتھ نام اپنے رب کے جس نے پیدا کیا"۔ (اس آیت کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر آئے گا)۔ بسم اللہ کے شروع میں اس قسم کے الفاظ کو محذوف اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ اس میں (بِ) کے معنے "ساتھ" کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس حرف کے معنے "ساتھ" بھی ہیں۔ لیکن اس کے، اس کے علاوہ، اور معانی بھی ہیں۔ یہ حرف "سبب" بیان کرنے کیلئے بھی آتا ہے۔ یعنی یہ کہنے کے لیے کہ جو کچھ یہاں کہا جا رہا یا کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے، اس کا مقصد یہ ہے، اس کی وجہ یا علت یہ ہے۔

---

[1] کہا یہ جاتا ہے کہ سورۃ التوبہ کے شروع میں "بسم اللہ" اس لئے نہیں لکھی گئی تھی کہ یہ متعین نہیں تھا کہ یہ ایک الگ سورۃ ہے۔ یا سابقہ سورۃ (سورۃ الانفال) ہی کا حصہ ہے۔

اسم کے معنیٰ

لفظ "اِسم" کا ترجمہ عام طور پر "نام" کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ اس کی صفات کے معنوں میں آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ اسم (مادہ۔ س۔م۔و) کے بنیادی معنیٰ کسی ایسی علامت کے ہیں جس سے متعلقہ چیز پہچانی جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس لئے صفاتِ خداوندی کو اسماءِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحشر میں مختلف صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (۵۹/۲۴) "خدا کی تمام صفات حسین ترین اور کامل توازن لئے ہوتے ہیں"۔ اس لئے ہمارے نزدیک "بسم اللہ" میں "اِسم" سے مراد "صفتِ خداوندی" ہے۔

اِس کے بعد "بسم اللہ" میں لفظ "اللہ" آتا ہے جو (یوں کہیئے کہ) خدا کا ذاتی نام ہے۔ اور "رحمٰن" اور "رحیم" اُس کی صفات ہیں۔

بسم اللہ کی غایت

ان معانی کی رُو سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ اس کے بعد کہا جائیگا یا کیا جائے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیّت اور رحیمیّت کا ظہور اور نمود ہو۔ یعنی یہ صفات محسوس طور پر بروئے کار آجائیں۔ جب قرآنِ کریم کی کسی سورۃ کے آغاز میں آنے والے ان الفاظ کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق ایسا فرمایا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "خدا کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن، یا قرآن مجید کی اس آیت کو اس لئے نازل کیا ہے کہ ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کی عام نمود ہو جائے"۔ اور جب ایک عبدِ مومن اپنے کسی کام کی ابتدا ان الفاظ سے کرے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ میں اس کام کو اس لئے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی نمود ہو جائے۔ گویا "بسم اللہ" کی غایت خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کو عملاً بروئے کار لانا ہے۔

اب سوال یہ سامنے آئیگا کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت سے مفہوم و مقصود کیا ہے۔ یوں تو خدا کی تمام صفات اپنے اپنے مقام پر یکساں عظمت اور اہمیت کی حامل ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جن صفات کو خدائی پروگرام اور اس کے اتباع میں انسان کے پروگرام کی غرض و غایت بتایا گیا ہے۔ وہ خاص اہمیت کی حامل ہوں گی۔ فلہذا گہرے غور و تدبّر کی مستحق۔ چونکہ یہ دونوں لفظ (الرّحمٰن ــ الرّحیم) سورۃ فاتحہ کے آغاز میں آ رہے ہیں، اس لیے مناسب یہ سمجھا گیا ہے کہ ان کی تشریح وہاں کی جائے (دیکھئے صفحہ ۲) بنا بریں آپ تھوڑا سا توقف فرمائیں۔ اور سر دست صرف اتنا سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا ہے۔ تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا میں اس کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت عام ہو جائے اور اس کے بندے جس پروگرام کو بھی ہاتھ میں لیں، اس کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیئے۔ بنا بریں اس وقت میں جو (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآنِ کریم کے معانی اور مطالب بیان کر رہا ہوں۔ اور آپ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو اس سے ہمارا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس کی رحمت کا عام ظہور ہو جائے۔ میرے پیشِ نظر بہرحال یہی مقصد ہے اور یہی میری تمام کوششوں کا منتہٰی اور مطلوب ہے۔ وما توفیقی الّا باللہ العظیم۔

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

(۱/۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔

اس آیۂ جلیلہ سے قرآنِ کریم کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آیت کا آغاز لفظ "حمد" سے۔ عام طور پر اس آیت کے معنی یہ کئے جاتے ہیں :

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہانوں کا۔

غیر مسلم بالعموم اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا عجیب ہے جو خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تمام تعریفیں میرے لئے ہیں۔ کسی کا (بقول ان کے) اپنے منہ سے خود اپنے متعلق ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ ان کا یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وحیٔ خداوندی کے ذریعے (جو قرآن کے اندر محفوظ ہے) انسانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ایسا کہیں اور ایسا کریں۔ لہٰذا "الحمد" سے مُراد یہ نہیں کہ خدا اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ اس نے انسانوں سے کہا ہے کہ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو اور اُسے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھو کہ ساری "حمد" خدا کے لئے ہے۔ اگر قرآنِ کریم کے شروع میں لفظ "قُلْ" کو محذوف تصوّر کر لیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔ اس سے مطلب یہ ہوگا کہ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کو یہ سکھایا ہے کہ تم ایسا کہو یا ایسا کرو۔

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے اس آیت میں (اور اسی قسم کے دیگر مقامات میں) لفظ "حمد" کا ترجمہ "تعریف" کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ قرآنی مفہوم کو صحیح طور پر واضح نہیں کرتا۔ "تعریف" کے لئے عربوں کے ہاں اور الفاظ بھی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں وہ الفاظ خدا کیلئے استعمال نہیں ہوتے۔ اس کیلئے "حمد" کا لفظ ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

حمد کا مفہوم | عربوں کے ہاں، کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دِل میں جو جذباتِ تحسین بے ساختہ بیدار ہوں، ان کے والہانہ اظہار کو حمد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں :

ا:۔ جس حسن و رعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہے۔ وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس

شئے ہونی چاہیئے۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذباتِ تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اس کی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف اُن کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں۔

۲:- کسی کی جس بات یا جس کام کی "حمد" کی جا رہی ہو۔ وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیئے۔ اضطراری طور پر یا میکانکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہو جانا، حمد کا مستحق نہیں بناتا۔ حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اس کے لیے بھی "حمد" کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ "مدح" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً "رقصِ طاؤس" میں طاؤس مستحقِ مدح ہوتا ہے۔ اور اس کا خالق (خدا) سزاوارِ حمد۔

۳:- "حمد" کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حمد کرنے والے کے دل کی آواز ہو۔ کسی کے دباؤ سے اس کی تعریف کرنا "حمد" نہیں مدح کہلائے گا۔ نہ ہی "حمد" میں طمع کاری، نمائش، منافقت یا کسی کو بنانے کے لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ "حمد" میں جذباتِ تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

۴:- جس چیز کی حمد کی جا رہی ہو، اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر "حمد" نہیں کی جا سکتی، مبہم تصورات، دھندلے نقوش اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ "حمد" فریبِ تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں اُبھرتی۔ اس کا سرچشمہ وہ یقینِ محکم ہوتا ہے جو علیٰ وجہِ البصیرت حاصل ہو۔

۵:- جن نفع بخش، کشش انگیز رعنائیوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی "حمد" کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ درجۂ کمال تک پہنچ چکے ہوں، اور ان کی نفع بخشیاں محسوس ہوں جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔

"آرٹ برائے آرٹ" موجبِ مدح تو ہو سکتا ہے۔ سزاوارِ حمد نہیں ہو سکتا۔ [۱]

حمد کس طرح کی جا سکتی ہے

یہ ہے لفظِ "حمد" کا مفہوم محاورۂ عرب کی رُو سے۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم نے اِسے استعمال کیا ہے۔ جب اس لفظ پر "ال" (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) آجائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہر قسم کی حمدیت اپنے انتہائی درجہ میں صرف خدا کے لئے ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کے قیاس وخیال وگمان و وہم سے ماوراء ہے۔ اس لئے اس کی ذات کا محض ذہنی تصوّر حمد کے جذبات بیدار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حمد کی شرطِ اولیں یہ ہے کہ وہ شئے محسوس و مرئی ہو۔ لہٰذا جس طرح کسی تصویر کی تحسین سے درحقیقت مصور کی حمد مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی حمد اس کی مخلوق کی رعنائیوں اور نفع بخشیوں کو سامنے لانے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس نے خود کہا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (۱۷/۴۴) کائنات کی ہر شئے اپنے خالق کی "حمد" کی منہ بولتی تصویر ہے۔ (لفظ تسبیح کا مفہوم اپنے مقام پر آئیگا) اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد اس کی پیدا کردہ کائنات پر غور وفکر ہی سے ممکن ہے۔ اس نے مومنین کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ "حَامِدُوْنَ" ہوتے ہیں (۹/۱۱۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب حمدِ خداوندی مظاہرِ فطرت پر غور وتدبر کی رو سے ممکن ہے تو مومنین کا بنیادی فریضہ یہ ہو گا کہ وہ اشیائے کائنات پر غور وفکر کریں۔ کائنات کے مختلف گوشوں میں تحقیقات کریں۔ اور ان کے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوعِ انسانی کے لئے عام کر کے حمدِ خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔ یہی ہیں وہ اربابِ فکر ونظر جن کے لئے خدا نے کہا ہے کہ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹) یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل وبصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ وہ صاحبانِ عقل وبصیرت۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (۳/۱۹۰) جو اٹھتے بیٹھتے، لیٹے ہر آن قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳/۱۹۰) تخلیقِ ارض وسما پر غور وفکر کرتے ہیں۔ اور جب ان میں ریسرچ کرنے کے بعد خالقِ فطرت کی ندرت کاریاں اور نفع بخشیاں ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔ (۳/۱۹۰) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تونے اس سلسلۂ کائنات کو نہ تو بے مقصد پیدا کیا ہے۔ اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لئے۔

یہ ہے خدا کی حمد اور یہ ہیں وہ اربابِ فکر ونظر اور اعیانِ تحقیق وتفحص، جنہیں حَامِدُوْنَ کہا جائے گا۔ اور

[۱] لغات القرآن جلد دوم صفحہ ۵۵۰۔

جب ان کی یہ تمام کد و کاوش خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کے عام کرنے کے لئے ہوگی تاکہ تمام نوعِ انسان اس سے
بہرہ یاب ہوں، تو ان "حَامِدُوْنَ" کو مؤمن کہا جائے گا۔ انہی کو دوسری جگہ خدا نے "علماء"

عُلماء کون ہیں

کہکر پکارا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (۳۵/۲۷)
کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا نظامِ آب رسانی کس قدر تعجب خیز اور حکمت انگیز ہے! (اس نظام کی تشریح مختلف
مقامات پر آئے گی۔ اس جگہ صرف اتنا ہی کہا گیا کہ) وہ فضا کی بلندیوں سے بارش برساتا ہے اور فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ
مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔ (۳۵/۲۷) اور اس ایک ہی پانی سے طرح طرح کی رنگت کی، پھل، پھول، اناج وغیرہ پیدا کرتا ہے۔
وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) اور کیا تم نے کبھی اس
پر بھی غور کیا ہے کہ یہ پہاڑ جو یونہی جامد مادہ کے ساکت و صامت تودے کھڑے نظر آتے ہیں خدا کے نظامِ ارتقا
کی کتنی عظیم نشانیاں اپنے اندر لئے ہیں! ان کی چٹانیں جو کہیں سرخ ہیں، کہیں سفید اور کہیں کالی بھجنگ، ان کی ایک
ایک تہہ کتنے کتنے طویل المیعاد ادوار کی تاریخ اپنے دامن میں سمٹائے ہوئے ہے! وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ
وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ۔ (۳۵/۲۷-۲۸) اور پھر انسانوں پر، مال مویشی پر اور کرۂ ارض پر موجود دیگر
جاندار مخلوق پر غور کرو کہ یہ کس طرح بیشمار انواع میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں کی ہر نوع کس طرح جداگانہ خصوصیات
کی حامل ہے۔ تم ان اشیائے کائنات کو محض سرسری نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہو۔ لیکن خدا کے بندوں میں سے اربابِ
علم و حکمت جب ان پر غور و فکر کرتے ہیں تو وہ اس کی عظمت و جبروت کے احساس سے لرز اٹھتے ہیں: اِنَّمَا يَخْشَى
اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸) اور ان کی زبان پر بے ساختہ حمد و تحسین کے یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ: اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۸) بے شک ان کا خالق، خدائے واحد، بے مثال غلبہ و قوت کا مالک ہے۔ لیکن وہ اس قوت اور
غلبہ کو تخریب کے لئے استعمال نہیں کرتا، کائنات کی حفاظت کے لئے عمل میں لاتا ہے۔ یہی ہیں وہ اربابِ علم و تحقیق جنہیں
قرآن نے علماء کہہ کر پکارا ہے اور جو عملاً خدا کی صفتِ حمدیت کے مظہر ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۵/۳)۔ کائنات کی
پستیوں اور بلندیوں میں مؤمنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خالقِ کائنات اور اس کے محکم قوانین کے متعلق
حتمی یقین رکھتے ہیں۔ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (۴۵/۴) تمہاری اپنی
پیدائش اور دیگر جانداروں کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کائنات کے بالحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں
یہی صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں۔ (۴۵/۴) انہی کو متقی کہا جاتا ہے: اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ٥ (۱۰/۶)۔ نظامِ کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا کہ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ٥ (۴۵/۶) یہ وہ آیاتِ خداوندی ہیں جنہیں تیرے سامنے حق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ ان کے بعد وہ کون سی بات باقی رہ جاتی ہے۔ جس کی رُو سے یہ ایمان لانا چاہتے ہیں؟۔

یہاں تک ہم نے مادی کائنات کے مظاہرِ حمدیّت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انسان کو طبعی سامانِ زیست کے علاوہ سفرِ حیات میں صحیح راہنمائی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ راہنمائی وحی کی رو سے ملتی تھی۔ جس کی آخری کڑی قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بھی مظہرِ حمدیت قرار دیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ٥ (۱۸/۱) یعنی جب تم اس ضابطۂ قوانین پر غور و فکر کرو گے جسے اس نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ تو تمہاری زبان سے بےساختہ اس حقیقت کا اظہار ہو جائے گا کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے اس قسم کا ضابطۂ حیات عطا فرمایا جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ وہ کاروانِ انسانیت کو سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) پر چلا کر اُسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی یہ حمد قرآن کریم پر گہرے غور و تدبّر ہی سے ہو سکتی ہے۔ بنابریں مومن وہ ہیں جو خارجی کائنات میں تحقیق و تفتیش اور قرآن مجید پر فکر و تدبر سے اس حقیقت کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں کہ مستحقِ حمدیت خدا کی ذات ہے۔

قرآن میں غور و تدبّر

جس ذاتِ اقدس و اعظم نے سب سے پہلے اس طرح خدا کی حمد کو عام کیا۔ اسے احمدؐ کہہ کر پکارا گیا (۶۱/۶) یعنی بہت زیادہ حمد کرنے والا اور اسی سے وہ خود محمدؐ قرار پایا (۴۸/۲۹) "جس کی مسلسل و پیہم حمد کی جائے"۔ اسؐ کی حیاتِ طیبہ کے یہی عظیم کارنامے تھے جن کی بنا پر کہا گیا کہ وہ "مقامِ محمود" پر فائز ہے (۱۷/۷۹) اسؐ کے مقدس ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہوا جسے دیکھ کر ساری دنیا پکار اُٹھی کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد و ستائش ہے وہ خدا جس نے ایسا انقلاب آفریں نظام عطا کیا۔ اور اس کے بعد سزاوارِ حمد ہے وہ پیغامبرِ انقلاب جس نے اس نظام کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اس نظام کا اولین نتیجہ یہ تھا کہ ان قوموں کی جڑ کٹ گئی جو کمزور انسانوں پر ظلم و استبداد روا رکھتی۔ اور سلب و نہب سے ان کا استحصال کرتی تھیں۔ اس کا یہ وہ نفع بخش کارنامہ تھا جس سے حمدِ خداوندی اُبھر اور نکھر کر دنیا کے سامنے آ گئی۔ اس کے پیشِ نظر کہا گیا: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶/۴۵) ظلم کرنے والی قوموں کی جڑیں کٹ گئیں۔ اور یوں خدائے رب العٰلمین کی حمد صفحۂ عالم پر منقوش ہو گئی۔

احمدؐ و محمدؐ و مقامِ محمود

جمال وجلال ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلاب کے لیے ذاتِ خداوندی کے جلالی گوشے کی نمود بھی ضروری ہو گی۔ یعنی حسنِ تخلیق کی رعنائیوں کے ساتھ غلبہ اور قوت کا مظاہرہ بھی۔ اسی لئے قرآن کریم نے جلال وجمال دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات کو قرار دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ: لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ (۶۴/۱) حمد و اقتدار دونوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ اگر کائنات میں جمالیات کے ساتھ جلالیات کی نمود نہ ہو تو یہ نظام تباہ ہو کر رہ جائے۔ اقبال کے الفاظ میں:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری،

دوسری طرف، جو قوت واقتدار حمدیت کی مظہر نہ ہو وہ فرعونیت اور چنگیزیت بن کر رہ جاتی ہے۔ یعنی:

— جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی — اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس نے آسمانی راہنمائی کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی ہے۔ (۵۷/۲۵) کہ ان دونوں کے امتزاج سے نظامِ زندگی قائم رہ سکتا ہے۔ "مومناں را تیغ با قرآں بس است"۔ اس لیے کہ "ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند"۔ اگر قوت کا نگران قرآن نہ ہو تو وہ چنگیزیت ہو جاتی ہے۔ اور قرآن کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ محض وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا جماعتِ مومنین ان دونوں صفاتِ خداوندی کے بروئے کار لانے سے "حَامِدُوْنَ" بنتی ہے۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب ایک عبدِ مومن (مسلمان) کہتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اور اس کا مقصود کیا؟ اس سے واضح ہے کہ "حمدیت" زبان سے چند الفاظ دہرانے کا نام نہیں یہ ایک نظام کے بروئے کار لانے سے عبارت ہے جس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں آسمانی راہنمائی کے مطابق نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لیے عام کیا جائے۔ اور جو قوتیں اس کی راہ میں حائل ہوں انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔

تفصیل ان امور کی اگلے الفاظ میں ملے گی۔

اللہ

الحمد کے بعد اگلا لفظ ہے۔ لِلّٰهِ۔ یہ درحقیقت (لِ+اَللہ) ہے (لِ) کے معنی ہیں۔ "کے لئے" لہٰذا "لِلّٰهِ" کے معنے ہوں گے اللہ کے لئے۔ اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کے معنے ہوں گے "حمدیت" اپنی مکمل ترین اور انتہائی شکل میں صرف اللہ کے لئے مختص ہے۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے لفظ اللہ آتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ (اَل+اِلٰہ) سے مرکب

(جاری ہے)

ہے، بنابریں اللہ کے معنے ہوں گے اِلٰہِ حقیقی، اِلٰہِ واحد، جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے یہ (اللہ) اسمِ ذات ہے۔ یعنی یہ لفظ ذاتِ خداوندی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور باقی تمام الفاظ اس ذات کی صفات ہیں۔

(اِلٰہ) کے مادہ (ا۔ل۔ہ) میں حسبِ ذیل معانی مضمر ہوتے ہیں۔

۱:۔ گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا پناہ دینا۔

۲:۔ متحیّر ہونا۔

۳:۔ بلند مرتبہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا

۴:۔ کسی کی غلامی یا محکومیت اختیار کرنا۔ یعنی کسی کا غلبہ و اقتدار تسلیم اور قبول کرنا

ان معانی کی روسے اللہ (یعنی قرآنی اِلٰہ) سے مراد وہ بلند و بالا ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک متحیر رہ جاتے ہیں۔ جس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جس کی اطاعت اور محکومیت ضروری ہے۔ یعنی اُسے اِلٰہ تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی اطاعت و محکومیت اختیار کی جائے۔

جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم نہ کچھ جان سکتے ہیں نہ بتا سکتے۔ وہ انسانی عقل و شعور اور فکر و ادراک کی حد سے ماوراء ہے۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (6/104) اس کا ارشاد ہے۔ البتہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس ذات کی صفات کیا ہیں۔ اور یہ صفات بھی خود اسی کی بتائی ہوئی ہیں۔ جو قرآنِ کریم کے اندر مندرج اور محفوظ ہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ سے مراد ہوگا اس ذات کی حاکمیت و اقتدار تسلیم اور اختیار کرنا جس کی صفات قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔

اِلٰہ کا عالمگیر تصوّر

جیساکہ میں نے اپنی کتاب "من و یزدان" کے شروع میں کہا ہے۔ آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گذر یئے اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو بلالحاظِ زمان و مکان، بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی۔ یعنی بلند و بالا ہستی کا تصور۔ کسی فوق البشر قوت کا احساس جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے۔ جس سے مرادیں مانگی جائیں، جس سے ڈرا جائے، جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں۔ دنیا کے سیاح اور مغربی محققین اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں، جہاں ان سے پہلے کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم تک دکھائی نہیں دئے۔ اور وہاں کے باشندے، تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا، ابتدائی دورِ جہالت کی زندگی بسر کر رہے تھے، تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور اندازِ معیشت و معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی، بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش

کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی ہستی کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا تصور یا تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ اور یہی وہ اختلافات ہیں جہاں ہر قبیلہ کا خدا، دوسرے قبیلہ کے خدا سے مختلف اور ہر مذہب کا معبود دوسرے مذاہب کے معبود سے جداگانہ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رام بھی وہی اور رحیم بھی وہی - یہ حقیقت سے بے خبری کی دلیل، فریب تخیل یا دانستہ تلبیس ہے۔ یہودیوں کا "یہوہ"۔ عیسائیوں کا "فادر"۔ ہندو دھرم کا "ایشور" یا ان کے ویدانت کا "پرماتما"، مجوسیوں کا "یزدان"۔ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ اور قرآن کا اللہ ان سب سے الگ۔ یہ اس لئے کہ ان مذاہب کے بانیوں نے (جنہیں ہم زمرۂ انبیاء کرامؑ میں شمار کرسکتے ہیں، اگرچہ انبیاء کو دین کا بانی نہیں بلکہ دینِ خداوندی کے پہنچانے والے کہا جائے گا۔) خدا کی وہی صفات بیان کی ہوں گی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن بعد میں، اُن میں انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش ہوگئی اور اس طرح مختلف مذاہب کے خدا نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگئے۔ بلکہ خدا کے حقیقی اور منزہ تصور سے بھی جداگانہ تصور کے پیکر بن گئے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۝ (۶/۱۰۱)

خدائے حقیقی

خدائے حقیقی (اللہ) ان صفات سے بلند و بالاتر ہے جنہیں ذہنِ انسانی نے تراش کر اس کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ خدا کا صحیح تصور انہی صفات کی رو سے سامنے آسکتا ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ کیونکہ ان میں انسانی خیالات اور تصورات کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ان لوگوں کے ایمان باللہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا جو اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور واضح طور پر کہتا ہے کہ۔ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوْا (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ جب اس نے کہا ہے کہ:۔ لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ (۴۲/۱۱)۔ تو اس کے یہی معنی نہیں کہ ذاتِ خداوندی کو کسی مثال کے ذریعے بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ مثال، بہرحال کسی محسوس اور محدود شے کی دی جائے گی اور اس کی ذات غیر مرئی اور غیر محدود ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ غیر مذاہب کے لوگ جن جن خداؤں کو مانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس خدا کی مثل نہیں جس کا تصور خود خدا نے دیا ہے۔ اور یہیں سے یہ نکتہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ لفظ "اللہ" کا ترجمہ کسی اور زبان میں

اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا

نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا ترجمہ جس زبان میں بھی کیا جائے گا تو اس سے اس خدا کا تصور ذہن میں آئے گا۔ جسے اس زبان کے بولنے والے خدا مانتے ہیں۔ مثلاً

(GOD) کے لفظ سے عیسائیوں کے خدا کا تصور ذہن میں آئے گا۔ اور "ایشور" کے لفظ سے ہندوؤں کے تصور کا خدا۔

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اور اس کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ میں اسے نہیں مانتا۔ یا ایک شخص اُس خدا کو مانتا ہے جس کا تصور (مثلاً) عیسائیت پیش کرتی ہے۔ اور دوسرا اُس ذات کو جس کا تصور قرآن میں دیا گیا ہے، تو ان کی عملی زندگی پر اس سے کیا اثر پڑے گا؟ اس لئے کہ اگر کسی عقیدہ یا نظریہ کا اثر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا تو اس کا ماننا یا نہ ماننا یکساں ہے۔ اس سوال کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے جسے میں نے اپنی کتاب "من و یزداں" میں بیان کیا ہے، اس مقام پر اس کا ذکر اختصاراً کیا جاتا ہے۔

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے

قرآن کریم پہلے یہ بتاتا ہے (اور اب دنیائے مذاہب کے علاوہ، علمائے نفسیات بھی اس کی شہادت دینے لگ گئے ہیں) کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں جو دیگر حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور بالآخر موت کے ہاتھوں ختم ہو جاتا ہے۔ انسان میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات، نفس یا (SELF) کہا جاتا ہے۔ یہ ذات، ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔ موت کے ہاتھوں انسانی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ بغرضِ تفہیم ہم انسان کی طبیعی زندگی کو "حیوانی سطح کی زندگی" اور اس کی ذات کی حامل زندگی کو "انسانی زندگی" کہہ کر پکاریں گے۔

انسانی ذات

اس غیر نشوونما یافتہ ذات کی نشوونما، انسانی زندگی کا مقصود اور نصب العین ہے۔ نشوونما یافتہ ذات، موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی قرآنی آیات کی رو سے اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گی) یہ حقیقت کہ ایک فرد کی ذات نشوونما پا رہی ہے یا نہیں، اس کا صحیح صحیح طور پر علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان غلط فہمی یا فریبِ نفس میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ (تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں کی رو سے "تزکیۂ نفس" کا تصور اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے) ذات اپنی مکمل ترین شکل میں ذاتِ خداوندی ہے، اور قرآن کریم میں بیان کردہ اس کی صفات، (یوں کہیے کہ) اس سے منعکس ہونے والی شعاعیں یا اس کے مختلف گوشے (FACETS) ہیں۔ ان صفات کو چھوڑ کر جو صرف ذاتِ خداوندی کا خاصہ ہیں۔ (مثلاً ابدیت اور لامتناہیت وغیرہ) باقی صفات، محدود طور پر انسانی ذات کے اندر بھی مضمر طور پر (POTENTIALLY) رکھ دی گئی ہیں۔ جوں جوں انسانی

ذات نشو و نما پاتی جاتی ہے، یہ صفات (بشری حدود کے اندر) منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس فرد کی ذات نشو و نما پا رہی ہو۔ اس کی سیرت و کردار میں (حدِ بشریت کے اندر) "صفاتِ خداوندی" کی نمود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ جاننے کے لئے کہ ہماری ذات نشو و نما پا رہی ہے یا نہیں اور اگر پا رہی ہے تو کس حد تک، یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت و کردار میں "صفاتِ خداوندی" کی جھلک نظر آتی ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو صفاتِ خداوندی، ہماری ذات کی نشو و نما ماپنے کے لئے ایک خارجی معیار یا (OBJECTIVE STANDARD) کا کام دیں گی۔ اس سے انسان کسی غلط فہمی یا خود فریبی میں بتلا نہیں ہو سکے گا۔ یہ ہے اللہ پر ایمان کی اولین ضرورت اور اس کا بنیادی مقصد۔

لیکن انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین و اقدار کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہے جو خدا نے وحی کے ذریعے عطا کی ہیں اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ خدا کے اِلٰہ (صاحبِ اقتدارِ مطلق) ہونے پر ایمان سے یہی مقصود ہے

خارجی کائنات میں ہر شے اُس مقصد کے حصول کے لئے جو اُس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے، قوانینِ خداوندی کے تابع سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ کسی شے کو اس اطاعت سے مجالِ انکار نہیں، یا رائے سرکشی نہیں۔ اس لئے کہ انہیں اختیار و ارادہ کی قوت حاصل نہیں ہے۔ انہیں اُن کی اطاعت کیلئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی پہلی اور بیش پا افتادہ شہادت تو یہ ہے کہ اگرچہ حیوانات کی طرح اس کی طبیعی زندگی کا مدار بھی قوانینِ فطرت کی اطاعت پر ہے۔ لیکن یہ ان کی اطاعت سے سرکشی برت کر، خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ حیوانات خودکشی نہیں کر سکتے۔

جس طرح انسان کی طبیعی (حیوانی سطح کی) زندگی کے لئے قوانین و ضوابط ضروری ہیں، اسی طرح اس کی انسانی زندگی (یعنی وہ زندگی جس میں اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے) کے لئے بھی قوانین و ضوابط لابدی ہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو انسان کے لئے دوہرے ضوابط کی پابندی ضروری ہے ـــــ ایک ضابطہ اس کی طبیعی زندگی (بدن) کے قیام اور نشو و نما کے لئے اور دوسرا ضابطہ اس کی انسانی زندگی (ذات) کے استحکام اور برومندی کے لئے۔

اِجتماعی زندگی اس کی طبیعی (حیوانی) زندگی کا قیام اور نشو و نما تو انفرادی طور پر (اکیلے اور تنہا رہنے سے) بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کی نشو و نما اجتماعی زندگی ہی میں ممکن ہے، جہاں ایک انسان کا واسطہ دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے۔ (یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما ـــــ تزکیۂ نفس ـــــ غاروں، پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں یا مراقبوں اور ریاضتوں کی خلوت گاہوں میں ممکن ہے، فریبِ نفس ہے۔ اور بہرحال قرآنی تعلیم کے خلاف۔) قرآنِ کریم کا تجویز کردہ پروگرام: وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳)

قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکنا۔ اور كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹/۱۱۹) سچوں کی کی معیت میں زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ "جنت" میں داخلہ کی شرط یہ بتاتا ہے کہ۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰) میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا۔ اسے انسان کی تمدنی زندگی کہا جائے گا۔ لہٰذا انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ضابطۂ قوانین کی ضرورت لاینفک ہے۔ اس زندگی کے لئے قوانین وضوابط کی ضرورت دنیا کی ہر قوم تسلیم کرتی ہے۔ انسانوں کے ایک گروہ (جن کی آج کل اکثریت ہے) کا خیال ہے۔ کہ ان قوانین کو انسانی سوسائٹی خود وضع کر سکتی ہے۔ (اس نظریہ کو سیکولرازم کہا جاتا ہے) لیکن قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اس سے انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں فساد برپا ہو جائے گا۔ (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور ہو رہا ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے بھی اسی خدا کی طرف سے قوانین ملنے چاہئیں جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔ اور جن کی رُو سے نظامِ کائنات اس حسن وخوبی سے سرگرم عمل ہے (۴۷/۴-۶) یہ قوانین وحی کی رُو سے ملتے ہیں۔ اور اب اپنی مکمل، غیر متبدل صورت میں قرآن کے اندر محفوظ ہیں (۶/۱۱۴-۱۱۵) سیکولرازم کے حامیوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اتنا تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا۔ اور اس میں اسی کے قوانین کارفرما ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم اسے ایمان باللہ (خدا پر ایمان) تسلیم نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "اگر ان سے پوچھو، کہ اس زمین اور اجرام فلکی کو کس نے پیدا کیا۔ اور شمس وقمر کس کے قوانین کے تابع سرگرم عمل ہیں تو یہ کہیں گے کہ خدا ہی نے انہیں پیدا کیا اور اسی کے قوانین کے یہ تابعِ تسخیر ہیں"۔ پھر وہ کہتا ہے کہ "اگر ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے۔ جس کے قوانین کے مطابق آسمان سے بارش ہوتی ہے جس سے زمینِ مردہ حیاتِ نو حاصل کر لیتی ہے، تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کے قوانین سے ہوتا ہے۔" اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کو تسلیم کرتے ہیں تو انسانی دنیا میں اس کے قوانین کی ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں؟ یہاں پہنچ کر انہیں کونسی بات دھوکہ دیدیتی ہے۔ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۹) ان کی عقل وفکر پر کیوں پردے پڑ جاتے ہیں (۲۹/۶۱-۶۳) وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (۲۹/۶۳)

ارض وسما کا الٰہ

حمدیتِ خداوندی کی آماجگاہ صرف خارجی کائنات نہیں۔ انسانی دنیا کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی مظہر بنے۔ تم انسانی دنیا کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھو اور اس کے بعد دیکھو کہ یہاں کس طرح مسرتوں اور شادکامیوں کے چشمے اُبلتے اور تحسین وآفرین کے غلغلے بلند ہوتے ہیں! وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ إِلٰهٌ وَّفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ (۴۳)

سما میں بھی وہی اِلٰہ ہے۔ اور ارض میں بھی وہی اِلٰہ۔

کائنات کی فضاؤں میں بھی اسی کا اقتدار کار فرما ہے اور زمین پر بھی اسی کا اقتدار۔ اللہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں میں اسی کے قوانین کی کار فرمائی کو تسلیم کیا جائے۔ اگر اللہ کو سموٰت (خارجی کائنات) کا اِلٰہ (صاحبِ اقتدار) تسلیم کر لیا جائے اور انسان اپنی تمدنی زندگی میں اور اِلٰہ تجویز کرلے، تو اس سے فساد برپا ہو جائے گا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۱-۲۲)

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا اور اِلٰہ تسلیم کر لیے جائیں تو ان میں فساد برپا ہو جائیگا۔

اپنے جذبات کو اِلٰہ بنا لینے والے

یہی نہیں کہ قرآن کریم انسانی سوسائٹی کے اپنے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے ہی کو ایمان باللہ کے منافی قرار دیتا ہے۔ وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ:-

"أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ" (۴۵/۲۳)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیا۔

ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ۔ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً (۴۵/۲۳)۔ انسان میں سننے، دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور یوں وہ علم رکھنے کے باوجود تباہیوں اور بربادیوں کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵/۲۳) ایسے شخص کو تباہی سے صرف خدا کی راہنمائی ہی بچا سکتی ہے۔

اس مقام پر ایک ایسا نکتہ سامنے آتا ہے جسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں اجمالاً اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ جب قرآن کا نزول ہوا تو ساری دنیا رہبانیت (خانقاہیت) میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جذبات اور علم و ہدایت

اس مسلک کی رُو سے سمجھا یہ جاتا تھا کہ انسانی جذبات معرفتِ خداوندی کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور قربِ الٰہی اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو جذبات کو فنا کر دے۔ اسی کا نام نفس کشی تھا۔ یہ مسلک انتہائی مہلک تھا۔ اول تو جذبات ہی وہ قوت ہیں جو انسانی عمل کے محرک بنتے ہیں۔ انہیں فنا کر دیا جائے تو انسان پتھر بن کر رہ جائے۔ دوسرے یہ کہ جذبات کو فنا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہے۔ جذبات کو صرف دبایا جا سکتا ہے۔ اور دبائے ہوئے جذبات جب اپنی

تسکین و نمود کے لئے صحیح فطری راستے بند پاتے ہیں تو غیر فطری راستوں سے بہر نکالتے ہیں۔ اسے علم النفس کی اصطلاح میں بدنہادی یا (PERVERSION) کہتے ہیں۔ جس سے انسان قسم قسم کے نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے آ کر اس غلط مسلکِ خانقاہیت کو للکارا اور کہا کہ جذبات کو سرکش اور بیباک بنا دینا، ہلاکت اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ (اس کو وہ جذبات کو اِلٰہ (خدا) بنا لینے سے تعبیر کرتا ہے)۔ انہیں اگر ہدایت خداوندی کے تابع رکھا جائے تو ان سے بڑے تعمیری کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: فَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) گمراہ اور تباہ کار وہ ہے جو ہدایتِ خداوندی کا بغیر جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳۰/۲۹) ظالم وہ ہیں جو بغیر علم اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں۔

مسلکِ خانقاہیت میں علم و جذبات کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔ اسی لئے قربِ خداوندی کا ہر مدعی عقل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ جذبات سے علم کی روشنی میں کام لو۔ فکرِ انسانی کو اس (بظاہر متضاد) حقیقت تک پہنچنے کے لئے صدیاں درکار تھیں۔ چنانچہ اب بیسویں صدی میں علم النفس (PSYCHOLOGY) ایک سائنس کی حیثیت سے سامنے آ رہا ہے (اگرچہ یہ ابھی باقاعدہ سائنس بن نہیں سکا۔) اس علم کے ماہرین نے، بڑی گہری تحقیق کے بعد جذبات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی (RATIONAL PASSIONS) اور (IRRATIONL PASSIONS)۔ یہ وہی تقسیم و تفریق ہے جس کی طرف قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اشارہ کیا تھا۔ اور جسے اس سے پہلے فکرِ انسان اپنا نہیں سکا تھا۔ وہ علم اور جذبات کو نقیضین (متضاد عناصر) قرار دیتا تھا۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں پہنچ کر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قرآن فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں۔

بہرحال قرآن کریم نے خدا کی اُلوہیت (اقتدارِ خداوندی) کو ایسی بلند اور منزہ سطح پر رکھا ہے کہ وہ اور تو اور، انسانی جذبات کو "خدا" بنا لینے کو بھی شرک قرار دیتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی، دونوں کو قوانین خداوندی کے تابع رکھے یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے تھے۔ اور اب اس کی کتاب، قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ اسی کو خدا کی حاکمیت تسلیم کرنا کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام خدا پر ایمان لانا ہے۔ چنانچہ اس نے نہایت جامع الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۵)

جو اپنے تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اُس کی کتاب کے تابع زندگی بسر کریں، وہی خدا کو اللہ ماننے کے مدعی ہو سکتے ہیں۔ اور وہی حقیقی معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۱/۱)

سورۃ فاتحہ میں ان دو لفظوں کے بعد اللہ تعالےٰ کی تین صفتوں کا بیان متعین طور پر کیا گیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی حمدیت کا ظہور اور اس کی نمود بنیادی طور پر ان صفات کی رُو سے ہوگی۔ وہ صفات ہیں: رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اور "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ"۔ سب سے پہلے لفظ ربّ کو لیجئے:

ربّ (ر۔ب۔ب) کے بنیادی معنے ہیں "نشوو نما دینا"۔ یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے اور اس طرح گذارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی، اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ "طریق نشوونما" ربوبیت کہلاتا ہے۔ اور اس طـــرح نشوونما دینے والے کو "رب" کہا جاتا ہے۔ اس طریق میں اصلاح، درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ نشوونما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے "اَلرِّبَّۃ"، ان پودوں کو کہتے ہیں جن کی سرسبزی اور تازگی، سردی اور گرمی ہر موسم میں یکساں رہتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے "ربّ" کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی نشوونما دینے والا۔ پایۂ تکمیل کو پہنچانے والا۔ انتظام کرنیوالا، اصلاح کرنے والا، آگے بڑھانے والا اور استحکام عطا کرنے والا، یعنی ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچانے والا۔

تخلیق کائنات یہ محسوس کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی، اس کا جواب فکرِ انسانی سے ممکن نہیں نظامِ فطرت میں قانونِ علت و معلول (LAWS OF CAUSE AND EFFECT) جاری وساری ہے۔ یعنی یہاں جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طبیعی سائنس، علت اور معلول کی کڑیوں کے دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ محققین ان کڑیوں کو پیچھے لئے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس تحقیق میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو رہے ہیں، لیکن اس میں وہ آخرالامر ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں یہ کائنات تو موجود نظر آتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح وجود میں آگئی۔ یعنی وہاں (EFFECT) تو موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کے (CAUSE) کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اس مقام پر اسی طرح دانتوں میں انگلی دبائے محوِ حیرت کھڑا دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک جاہلِ مطلق۔ ہم نے ("اللہ" کے عنوان میں) دیکھا ہے کہ "اِلٰہ" کے معانی میں متحیّر ہو جانا بھی شامل ہے۔ آغاز

(جاری ہے)

کائنات، وہ مقامِ تحیّر ہے جس کا تعلق خدا کی شانِ ربوبیت سے ہے۔ اسی لئے خدا نے اپنے آپ کو بَدِیعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷) کہا ہے۔ یا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۱۴) یعنی اس مادی کائنات کو بغیر کسی سابقہ مثالہ کے وجود میں لانے والا۔ علت کے بغیر معلول کو ظہور میں لے آنے والا۔ آغاز کائنات سے پہلے کے عالم کو اس نے عالَمِ امر کہہ کر پکارا ہے۔ اور نمودِ کائنات کے بعد کو عالَمِ خلق۔ انسانی علم کا آغاز عالَمِ خلق سے ہوتا ہے۔ اور یہیں سے خدا کی ربوبیت کے سمجھ میں آنے کا بھی آغاز ہوتا ہے۔

نظریۂ ارتقاء

طبعی سائنس کے انکشافات اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ اشیائے کائنات جس شکل میں اس وقت موجود ہیں۔ یہ شروع ہی سے اس شکل میں نہیں تھیں۔ ان میں سے ہر شے کا آغاز (یوں کہیے کہ) ایک نقطہ سے ہوا۔ اس کے بعد یہ شے نشو و نما پاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی (نقطہ لکیر بنتا گیا) اور مختلف مراحل و مدارج سے گزرتی ہوئی اس شکل میں متشکل ہو گئی جسے ہم آج اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اسے ان کی اصطلاح میں نظریۂ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) کہتے ہیں۔ میں نے اس نظریہ کی تفصیل۔ اور قرآنی آیات کی روشنی میں اس کی وضاحت، اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں کی ہے۔ اربابِ ذوق وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ اس مقام پر اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی دیکھئے کہ ان الفاظ (حمد، اللہ اور ربّ) کے جو لغوی معنے ہم نے بتائے ہیں۔ اور پھر جن مفاہیم کے لئے قرآن کریم نے انہیں استعمال کیا ہے، کیا دنیا کی کسی زبان میں ایسے الفاظ ہیں۔ جن میں ان کا ترجمہ کیا جا سکے۔ اسی لفظ "ربّ" کو لیجئے۔ قرآن کریم کے انگریزی تراجم میں (خواہ وہ ترجمے غیر مسلموں نے کئے ہیں یا خود مسلمانوں نے) اس کا ترجمہ (LORD) کیا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس لفظ (LORD) سے کسی طرح بھی وہ مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے جو لفظِ ربّ کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس مفہوم کا سمجھ میں آنا تو ایک طرف، اس سے خدا کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ لفظِ ربّ سے پیدا ہونے والے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ کہاں "اشیائے کائنات کو نشو و نما دیتے ہوئے انہیں ان کے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچانے والا اور اس طرح انہیں ارتقائی مراحل میں سے گزارتے ہوئے ان کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود کرنے والا" اور کہاں (LORD)۔ یہ وجہ ہے جو (GIBB)[1] نے کہا ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اس کا صرف مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ (اور یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی لغات القرآن مرتب کرنے کے بعد قرآن مجید کا ترجمہ نہیں کیا۔ اس کا مفہوم پیش کیا ہے)۔

---

[1] H.A.R. GIBB IN MODERN TRENDS IN ISLAM (1945 EDITION P. 4)

بہر حال ایک محقق جب، نظامِ کائنات پر غور کرتا ہے۔ اور یہ دیکھتا ہے کہ خدا کی ربوبیت کس طرح ایک قطرہ کو گُہر میں تبدیل کرتی ہے اور زندگی کے ایک ناقابلِ ذکر جرثومہ کو کروڑ در کروڑ مراحل سے گزار کر پیکرِ آدمیت تک لے آتی ہے تو وہ بلیساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۱/۱)

لیکن خدا کی اس صفتِ ربوبیت کا ظہور کسی ایک شے یا زندگی کے ایک گوشہ تک محدود نہیں۔ یہ عالمین کو محیط ہے۔ یہاں سے اگلی بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ یعنی یہ کہ عالمین سے کیا مُراد ہے۔

عَالَمِیۡن

اِس کا مادہ (ع۔ل۔م) ہے۔ جس کے معنے ہیں جاننا، پہچاننا۔ چنانچہ عالِم (ل کے زیر کے ساتھ) صاحبِ علم یا کسی بات کے جاننے والے کو کہتے ہیں اور عالَم (ل کے زبر کے ساتھ) اس چیز کو جس کے ذریعے کسی کی پہچان ہو سکے یعنی کسی شے کی علامت یا نشانی۔ جیسے "عَلَم" (جھنڈا) متعلقہ فوج کی نشانی ہوتا ہے۔ آپ رات کے وقت کسی بیابان جنگل سے گزر رہے ہوں جہاں کسی اِنسان کا سراغ تک نہ مل سکتا ہو کہ اتنے میں دور سے آپ کو ایک ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آئے۔ اس سے آپ پہچان جائیں گے کہ وہاں کوئی انسان رہتا ہے۔ وہ دیا کسی انسان کی موجودگی کی علامت یا "عَلَم" بن جائے گا۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ و حقیقت انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتی لیکن اس کائنات کا وجود اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا یہ محسوس کائنات، خدائے غیر مرئی و غیر محسوس کے پہچاننے کی علامت یا ذریعہ کہلائے گی۔ اس سے ایک بلیغ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآنِ مجید نے کائنات کو "عالَم" کہا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ کائنات کا وجود مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ فقط ذریعہ ہے کسی کے پہچاننے کا — خود انسان کے مقام کے پہچاننے کا۔ اور اس سے آگے بڑھ کر اس امر کے جاننے پہچاننے کا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جس کی عظیم القدر اسکیم کے تابع یہ سارا نظام سرگرمِ عمل ہے۔ اس مشہود کائنات کو مقصود بالذات نہیں، بلکہ کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار دینا قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن ✣ نہ سیرِ گل کیلئے ہے نہ آشیاں کیلئے

عالمین جمع ہے عالَم کی۔ لہٰذا اس کے معنے ہوتے "کائناتیں"۔ ہم تو اپنی اسی دنیا کو کائنات سمجھتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم خدا کی پیدا کردہ کتنی کائناتیں ہیں۔ اور پھر اس لفظ کا مفہوم اور بھی واضح ہو جائے گا جب قرآن میں بیان کردہ اس حقیقت کو سامنے لایا جائے۔ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ۔ (۳۵/۱) اللہ تعالیٰ اپنی مشیت

کے پروگرام کے مطابق اپنی مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ کیا معلوم کتنی نئی نئی کائناتیں، نت نئے دن وجود میں آتی رہتی ہیں۔ مخلوقِ خداوندی کی اس تحیر انگیز وسعتوں کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اس نے اپنے آپ کو ”ربّ العٰلمین“ کہا ہے۔ یعنی تمام کائناتوں کی ربوبیت کا ذمہ دار۔

عرب، مٹی اور پتھر (کی سی جامد) چیزوں کے متعلق سمجھتے تھے کہ ان میں نشوونما نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ عالم کا لفظ صرف جاندار یا ذی شعور چیزوں کے لئے بولتے تھے۔ اور اسی نہج سے عالمین سے مراد دنیا کی مختلف قومیں لیتے تھے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات کچھ اور کہتے ہیں جس کی رُو سے جامد اور نامی کی تخصیص ہی مٹتی جارہی ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ خود مادہ (MATTER) کا قدیم تصور ہی بدل چکا ہے۔ اس لئے خدا کی رب العالمینی صرف جاندار چیزوں تک محدود نہیں رہے گی۔ بلکہ کائناتوں میں بکھری ہوئی تمام اشیاء کو محیط ہوگی۔ لیکن اگر ہم عربوں کے قدیم تصور کے مطابق اسے جاندار

اجرامِ فلکی میں زندگی

اشیاء تک ہی محدود سمجھیں تو بھی قرآن کریم کی رو سے جاندار اشیاء اس کرۂ ارض تک محدود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فضائے آسمانی میں پھیلے ہوئے کرّوں میں بھی ایسے ہیں جن میں جاندار مخلوق موجود ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42/29) آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوات کو پیدا کیا۔ اور ان میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ اس کے بعد آیت کے آخری الفاظ بڑے گہرے غور و تدبر کے محتاج ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی وقت مختلف کرّوں میں پھیلی ہوئی جاندار مخلوق کو ایک دوسرے سے ملا دے۔ اس وقت جو دوسرے کرّوں تک پہنچنے کی مہم کا آغاز ہوا ہے، شاید ایک دن انسان کا یہی تجسس اور مہم جوئی قرآن میں بیان کردہ اس حقیقت کا ثبوت بہم پہنچا دے۔ قرآن کریم نے احقاقِ حق کے سلسلہ میں یہ بھی تو کہا ہے کہ: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41/53) ہم لوگوں کو ان کی داخلی دنیا اور خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے، تاآنکہ ہمارا یہ دعویٰ واضح طور پر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مبنی برحقیقت ہے ظن و قیاس نہیں۔ اجرام فلکی میں پھیلی ہوئی زندگی کے اس قرآنی تصور کے پیشِ نظر اقبال نے کہا تھا کہ:

نہیں زندگی سے تہی یہ فضائیں ٭ یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اقوامِ عالم

اگر ہم لفظ ”عالمین“ کے مفہوم کو سمٹا کر اس دنیا کے انسانوں تک محدود کر دیں تو، اس کا مفہوم ”عالمگیر انسانیت“، یا جملہ اقوامِ عالم ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں اس لفظ کو ان معانی میں بھی استعمال کیا گیا

ہے۔ مثلاً اس نے خود قرآن کو "ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ" (۱۲/۱۰۴) کہا ہے اور دیگر مقامات پر اسے۔ بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) یا "هُدًى لِّلنَّاسِ" (۲/۱۸۵) کہکر پکارا ہے۔ اسی طرح اس نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو رحمۃٌ للعٰلمین قرار دیا ہے (۲۱/۱۰۷) اور دیگر مقامات میں ہے کہ حضور کی بعثت کَآفَّةً لِّلنَّاسِ (۳۴/۲۸) کے لئے ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے ربّ العٰلمین کے معنے ہوں گے تمام نوعِ انسان کی نشوو نما کا ذمہ دار (میں عام طور پر اس کے لئے "عالمگیر نظامِ ربوبیت" کی اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں)

اسلامی نظام کی ذمہ داری عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے حقیقی (جس کا تصور قرآن نے دیا ہے) کسی خاص قبیلہ، خاص نسل، خاص قوم بلکہ کسی خاص اہلِ مذہب کا رب نہیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کا رب ہے۔ اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب خدا پر ایمان رکھنے والی امت (امتِ مسلمہ یا جماعتِ مؤمنین) کے ہاتھوں وہ نظام متشکل ہو گا، جس کی رو سے خدا کی صفتِ رب العالمین محسوس و مشہود طور پر سامنے آئے گی تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ نظام تمام نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لے گا۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے۔ "وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا" (۱۱/۶) کرہ ارض پر کوئی جاندار ایسا نہیں جسکے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو۔ رزق کے خزانے تو خدا نے مہیا کر رکھے ہیں لیکن اس کی پیدائش اور تقسیم انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ یہ امت سامانِ زیست (رزق) زیادہ سے زیادہ پیدا کرے گی۔ اور اس کے بعد اس کی تقسیم اس انداز سے کرے گی کہ کوئی انسان اس سے محروم نہ رہنے پائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے مستحقِ حمد و ستائش ہونے کی اولین وجہ اس کی رب العالمینی بتائی گئی ہے۔ بنا بریں دنیا میں وہی نظام مدح و ستائش کا مستحق ہو سکتا ہے جو اس ربوبیتِ عالمینی کی ذمہ داری اپنے سر لے اور اس سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو۔ یہی قرآن کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد اور علت و غایت ہے۔ یہ سامانِ زیست کس کس انداز سے ملے گا یا دیا جائے گا۔ اس کی تشریح ان دو الفاظ سے سامنے آئے گی جو اس کے بعد دیئے گئے ہیں۔ یعنی:

(۱/۲) رَحۡمٰن ــــ رَحِيۡم

ان ہر دو الفاظ کا مادہ (ر - ح - م) ہے۔ یہیں سے لفظ رحمت ہے جس کے معنے ہیں وہ عطیہ جو کسی کے ظاہر و باطن کی کمی کو پیدا کر دے اور جسے ضرورت کے تقاضے کے مطابق دیا جائے۔ اسی سے لفظ "رحِم" ہے۔ رحم مادر میں جس انداز سے جنین کی پرورش ہوتی ہے وہ رحمت کے مفہوم کو وضاحت سے سامنے لے آتا ہے۔ مرد اور عورت کے جرثومات تولید سے رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے۔ اس ممزوج، مخلوط نطفہ کے اندر ایک جیتے جاگتے انسانی بچے کی ممکنات پوشیدہ ہوتی ہیں

وہاں ان مضمرات کو مشہود کرنے کے لئے جس انداز سے سامانِ نشو ونما ملتا ہے وہ اربابِ فکر ونظر کو محوِ حیرت کر دیتا ہے وہاں سب کچھ بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ بچے کے پیدا ہو جانے کے بعد کی حالت سے بالکل مختلف انداز میں ملتا ہے۔ پھر رحمِ مادر میں اتنی لوچ اور لچک، لطافت اور رافت ہوتی ہے کہ وہ جنین کی حرکت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ یہ ہے خدا کی رحمت کی کارفرمائیوں کی ایک مثال۔

سوال یہ ہے کہ خدا کی اس صفت (رحمت) کی نمود وظہور کے لئے رحمٰن اور رحیم کے دو الفاظ کیوں آئے ہیں۔ حالانکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ جیسا کہ ہم "بسم اللہ" کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں یہی الفاظ وہاں بھی آئے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے "رحم کرنے والا بہت مہربان" آپ نے دیکھا کہ اس ترجمہ سے صرف اتنا ہی نہیں کہ حقیقت سامنے نہیں آتی۔ بلکہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ "رحم کرنے والے اور بہت مہربان" کا مطلب کیا ہے۔ قرآن کریم کے انگریزی تراجم میں بھی ان کے لئے (BENFICIENT) اور (MERCIFUL) کے الفاظ آتے ہیں۔ بات ان سے بھی نہیں بنتی، نہ ہی صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ عربی زبان بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ اس میں ہر لفظ کا ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو درخت کے بیج کی طرح اس کے بنیادی مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس زبان میں مختلف ابواب یا اوزان ہوتے ہیں جن کی رو سے ایک ہی مادہ سے مختلف الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہر باب یا وزن کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اس سے، مختلف ابواب میں آنے والے الفاظ کے بنیادی معنے تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیات الگ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ "رَحِیْمٌ" کا لفظ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس صفت کا ظہور التزاماً، بتدریج، مسلسل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور رَحْمٰنٌ کا وزن فَعْلَانٌ ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس صفت کا ظہور شدت کے ساتھ یک لخت ہوتا ہے۔ ان دونوں مفاہیم میں یہ فرق بڑے گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ طبیعیات کے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشیائے کائنات میں نشو ونما ارتقائی طریق سے ہو رہی ہے۔ یعنی وہ اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج نشو ونما پاتے ہوئے آگے بڑھتی چلی آتی ہیں تا آنکہ وہ منزلِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں یہ ارتقائی مراحل کڑی در کڑی مسلسل طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کڑیوں میں کوئی خلا (GAP) نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ شئے ایک ہی جست میں مختلف کڑیاں پھاند کر ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ان کی اصطلاح

فجائی ارتقاء

میں (EMEGRENT EVOLUTION) اور "فجائی ارتقاء" کہا جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہ سائنس دان کچھ نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ اس نظریہ کا (یوں کہیے کہ) امام "لائیڈ مارگن" اپنی کتاب (EMERSENT EVOLUTION) میں لکھتا ہے کہ:

"اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم (EMERGENT) کہتے ہو، وہ بالآخر ہے کیا، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

اسی باب میں وائی کاونٹ سیموئیل کہتا ہے کہ:

علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ہی ظہور میں لا سکتا ہے۔ (BELIEF AND ACTION)[1]

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اشیائے کائنات کو ان کی نشو و نما کے لیئے جو سامانِ رحمت ملتا ہے اس کی عمومی شکل تو یہی ہے کہ وہ التزاماً مسلسل، کڑی در کڑی ملتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے خدا کو "الرَّحِیْم" کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن جب اس کی نمود فجائی ارتقاء کی شکل میں ہو تو اس کے لئے اس نے "الرحمٰن" کہا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ صرف اوزان کے فرق سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اور یہ بات کس طرح سمجھ میں آگئی کہ قرآن نے ایک ہی مادہ کے دو الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔ تخلیقِ انسانی کے سلسلے میں قرآنِ کریم کی ایک ہی آیت میں ان دونوں صفات کی نمود بڑے بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز میں بیان کی گئی ہے۔ سورۂ مومنون میں ہے کہ تخلیقِ انسانی کی ابتداء جامد مادہ سے ہوئی۔ پھر رحمِ مادر میں حمل قرار پایا تو نطفۂ تولید نے نشو و نما پانا شروع کیا۔

تخلیقِ انسانی کے مراحل

پہلے اس نے جونک کی سی شکل اختیار کی۔ پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن گیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھرا۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت کی تہہ چڑھا دی گئی۔ یہاں تک کا طریقِ تولید و نشو و نما عام حیوانوں اور انسانوں کے جنین کی صورت میں یکساں ہوتا ہے اور بتدریج عمل میں آتا ہے۔ یہ خدا کی صفتِ رحیمیت کی رو سے ہوتا

---

[1] نظریۂ ارتقاء اور اس کے تضمنات کی تشریح اور تفصیل کے لیے میری تصانیف "انسان نے کیا سوچا؟" "ابلیس و آدم" اور "سلسبیل" وغیرہ ملاحظہ فرمایئے۔

یہ نظریہ عصرِ حاضر کا اکتشاف نہیں۔ ہمارے متقدمین (مسلمان حکماء) کے ہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ابنِ مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) نے اپنی تصنیف "الفوز الاصغر" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان متقدمین کے ہاں (EMERGENT) کی رو سے پیدا ہونے والے خلا یا جست کو طفرہ کہا جاتا تھا۔

ہے۔ اس کے بعد انسان اور حیوان میں ایک ایسا بنیادی فرق پیدا ہوتا ہے جو سابقہ کڑیوں کے ارتقاء کا طبعی نتیجہ نہیں ہوتا وہاں یک لخت ایک تبدیلی ظہور میں آتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۲-۱۴)۔ یعنی پھر خدا نے اسے ایک نئی قسم کی مخلوق بنا دیا۔ یہ فجائی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ اس "خلقِ جدید" کی رو سے انسان کو اُس کی ذات عطا کر دی جاتی ہے۔ جسکی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے اور جس کی نشوونما سے یہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس فجائی ارتقاء کے لئے "الرحمٰن" کا لفظ آیا ہے۔

وحی کی راہنمائی

اِنسانی ذات کی نشوونما ان اقدار و احکام کی پابندی سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی دئے جاتے ہیں جب خدا نے اپنے متعلق کہا تھا۔ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴) خدا نے سامانِ زیست (رحمت) کا عطا کرنا اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے، تو اس رحمت میں انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے سامان کے علاوہ، اس کی ذات کی نشوونما بھی شامل تھی۔ یہاں ہمارے سامنے ایک اور گوشہ آتا ہے۔ جو اس کی صفتِ رحمانیت کا خصوصی مظہر ہے۔

انسان کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" (۹۶/۵) یعنی خدا نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھدی۔ حیوانات اپنی جبلّت کی رو سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں خارج سے علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے انہیں اس کی صلاحیت عطا ہی نہیں کی جاتی۔ یہ صلاحیت انسان کے لئے مختص ہے۔ انسان اس علم کو مختلف طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ یعنی مشاہدات، تجربات، مطالعہ، تعلیم و تعلم، درس و تدریس وغیرہ کے ذریعے۔ ان طریقوں سے علم بتدریج حاصل کیا جاتا ہے۔ اور جو انسان بھی چاہے اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ اس گوشے میں خدا کی صفتِ رحیمیت کارفرما ہوتی ہے۔

لیکن علم کی ایک اور قسم بھی ہے جو مندرجہ بالا طریقوں میں سے کسی طریق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس میں انسان کی اپنی کوشش یا کسب و ہنر کا کوئی دخل ہوتا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ انسانوں کو براہِ راست ملتا تھا۔ اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے لئے کہا گیا کہ:

وحی خالصۃً وہبی ہوتی تھی

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۱۰۵) اللہ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق جسے چاہتا ہے اس رحمت کے لئے مختص کر لیتا ہے۔ یہ امر کہ حصولِ وحی میں انسان کے اپنے کسب و

ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس حقیقت سے واضح ہے کہ جس برگزیدہ ہستی کو اس کے لئے منتخب اور مختص کیا جاتا تھا۔ اسے وحی ملنے سے ذرا بھی پہلے اس بات کا علم و احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ: مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴۲/۵۲) تو اس سے پہلے جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے" اس سے ظاہر ہے کہ وحی کے عطا ہونے میں خدا کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے متعلق کہہ دیا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۵۵/۱-۲) قرآن کا علم رحمٰن نے عطا کیا۔ اور اسی بنا پر قرآن کو رحمت کہہ کر پکارا گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۷/۸۲) اور ہم نے قرآن میں وہ کچھ عطا کیا جو اس کی صداقت پر ایمان لانے والوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔ خدا کی طرف سے یہ علم (وحی) آخری مرتبہ حضور نبی اکرم صلعم کو عطا کیا گیا۔ اس وحی میں دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور اُسے قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا۔ اسے ختم نبوت کہتے ہیں۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے راہِ راست علم دیئے جانے کی نہ ضرورت باقی رہی نہ امکان اور گنجائش۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سامانِ نشوونما (رحمت) عطا کرنے کا جو ذمہ لیا تھا (۶/۵۴) وہ خارجی کائنات اور انسانی دنیا دونوں کو محیط ہے۔ اسی بنا پر اس نے کہا ہے: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰/۷) "خدا کی رحمت ہر شے کو محیط ہے"۔

بسم اللہ کی مزید تشریح

ہم نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی تفسیر بیان کرتے وقت کہا تھا کہ رحمٰن و رحیم کا مفہوم سورۃ فاتحہ میں سامنے آئے گا۔ ان دو الفاظ کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہم نے یہ پروگرام اس لئے دیا ہے کہ ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو تو اس سے وہ سامانِ نشوونما مراد ہوگا جو طبیعی زندگی اور انسانی ذات کی نشوونما کیلئے ضروری تھا۔ اور جب یہ الفاظ انسان کی زبان سے ادا ہوں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے پیشِ نظر ... پروگرام کو اس لئے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی ان صفات کا ظہورِ عام ہو جائے۔ یعنی وہ نظام قائم ہو جائے جس میں تمام انسانوں کو ان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کا سامان بھی میسر آ جائے۔ اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہوتی جائے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جائے گی کہ جب حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کی طرف اپنے مراسلہ کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷/۳۰) سے کی تھی تو اس سے کس قدر عظیم حقیقت کا انکشاف مقصود تھا۔ تمام بادشاہوں کی لشکرکشی سے مقصود (بانتیجہ) غارت گری اور تباہ کاری ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ملکہ سبا نے مشیروں سے کہا تھا کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۷/۳۴) جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ اُس ملک کے اربابِ عزت و تکریم ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔ اور

یہ چیز کسی خاص بادشاہ تک محدود نہیں۔ ملوکیت کا انداز ہی یہی ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے مراسلہ میں اسی حقیقت کو واضح کیا تھا کہ میرا مسلک دنیاوی بادشاہوں کا سا نہیں۔ میں خدا کا رسول ہوں۔ اور اس کے اقتدار کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ اس لئے میری یہ لشکر کشائی، تباہی و بربادی کے لیے نہیں بلکہ صفتِ رحمانیت و رحیمیت کو عام کرنے کے لئے ہے۔

حضرت سلیمانؑ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث رسول تھے اور ان کا دائرہ اثر و نفوذ، ایک خاص خطۂ زمین تک محدود۔ اس کے برعکس خدا کے آخری رسول نبیٔ اکرم صلعم تمام نوعِ انسان کی طرف بھیجے گئے رسول تھے (اور ہیں) اور آپ کی تعلیم کا دائرۂ اثر و نفوذ زمان و مکان کی حدود سے ناآشنا تھا۔ (اور ہے) اسی لئے حضور صلعم کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہا گیا۔ ($\frac{21}{107}$)

رحم کا صحیح مفہوم

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور بنیادی نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ خدا کی صفتِ رحیمیت کے اندر "رحم" کا مفہوم بھی شامل ہے۔ لیکن رحم کے قرآنی مفہوم اور دنیا میں رائج مفہوم میں بنیادی فرق ہے۔ اس مروجہ مفہوم کو عیسائیت نے عام کیا اور اسی سے وہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کا شکار خود مسلمان بھی ہو گئے۔ ان کے ہاں یہ تصور، تصوف کے ذریعہ پھیلا۔ عیسائیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوّا) کے گناہ کی پاداش میں گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ اسے (ORIGINAL SIN) کہا جاتا ہے۔ انسان کے لئے گناہ کی اس آلائش سے پاک اور صاف ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کا منطقی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ کوئی انسان جنت میں جانے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

عیسائیت کا نظریہ

عیسائیت کا نظریہ یہ ہے کہ جب خدا نے بیچارے انسانوں کی اس حالت پر غور کیا تو اُسے (معاذ اللہ) بڑا افسوس ہوا۔ اُسے ان پر ترس آیا اور اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ مخالفین اُسے صلیب دیدیں۔ اور یوں اس کا خون انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ اس سے عیسائیت کا یہ عقیدہ عام ہوا کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ خدا کے رحم پر ہے جو ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو اس کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کے کفارہ پر ایمان لائیں۔ انجیل کے عہد نامہ جدید میں سینٹ پال کے خطوط پڑھئے۔ ان میں اس عقیدہ کو عام کیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ :-

> "تم کو ایمان کے وسیلہ ہی سے نجات ملتی ہے۔ اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔" (افسیون $\frac{2}{8-9}$)

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ :-

> "ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کی رو سے نہیں۔ ایمان کے

سبب سے راست باز ٹھہرتا ہے۔" (رومیوں کے نام ۳/۲۸)

یہی ہے وہ نظریہ جس کی رو سے خدا کے متعلق عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ (GOD IS MERCY) یا (GOD IS LOVE) خدا محبت اور رحم کا مجسمہ ہے۔ اور یہی ہے وہ تصور جس کی رو سے قرآنِ مجید کے انگریزی تراجم میں رحمٰن اور رحیم کے لئے (MERCIFUL) اور (COMPASSIONATE) رحم کرنے والا، ترس کھانے والا کہا جاتا ہے۔

قرآن کا تصوّرِ رحم

عیسائیت کے اس نظریہ کے خلاف قرآنِ کریم کی تعلیم کی ساری عمارت، قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان کے ہر (انفرادی یا اجتماعی) عمل (کام) کا نتیجہ اِس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ صاف اور مصفّٰی پانی ممدِ حیات ہے۔ یہی قانون طبیعی کائنات میں اور خود انسان کی طبیعی زندگی سے آگے بڑھ کر اس کی انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اسے خدا کے نظامِ عدل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کا یہ نظام غیر متبدل اور اٹل ہے۔

لیکن ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خدا کی صفتِ رحیمیت میں "رحم" کا تصوّر بھی شامل ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عدل اور رحم (بظاہر) دو متضاد تصورات ہیں۔ ان دونوں میں مطابقت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ عدل میں اگر رحم کا جذبہ غالب آجائے تو وہ عدل نہیں رہتا۔ لیکن رحم کے قرآنی مفہوم کی رو سے تضاد باقی نہیں رہتا۔ اس میں عدل بھی رہتا ہے اور رحم بھی۔ اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ ایک آدمی آگ میں اُنگلی ڈالتا ہے۔ اُنگلی جل جاتی ہے۔ اس سے شدت کی تکلیف ہوتی ہے یہ کچھ خدا کے قانونِ عدل کی رو سے ہوتا ہے۔ جس میں رحم کا کوئی شائبہ نہیں۔ لیکن جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ سے انگلی جل جاتی ہے۔ اُس خدا نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں۔ جن کے استعمال سے سوزش کی یہ الم انگیز تکلیف بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور انگلی کی از سرِ نو نشو و نما کا امکان بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کے اسبابِ مدافعت یا علاج کی تخلیق، خُدا کی رحمت یا اس کا رحم ہے۔ آپ نے دیکھا کہ رحم کے اس تصور میں قانون کا تصور کارفرما ہے۔ یعنی جس طرح خدا کا یہ قانون (عدل) ہے کہ آگ میں ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ فلاں قسم کی دوائی لگانے سے اُنگلی اچھی ہو جاتی ہے۔

توبہ کا قرآنی مفہوم

انسانی زندگی میں اسے "توبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ توبہ کا قرآنی مفہوم بھی ایک مثال سے سمجھ میں آ سکے گا۔ آپ نے کسی خاص گاؤں جانا ہے۔ کسی دوراہے پر آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا۔ یہ گمراہی ہے، لغزش ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا یا علاماتِ راہ سے آپ نے محسوس کیا کہ میں غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد آپ اسی راستہ پر آگے قدم نہیں بڑھائیں گے

آپ کو لامحالہ پھر اس دوراہے پر واپس آنا ہوگا جہاں سے آپ اس غلط راستے کی طرف مُڑ گئے تھے۔ لیکن محض اس دوراہے پر واپس پہنچ جانے سے بھی آپ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ جائیں گے۔ یہاں سے آپ کو صحیح راستہ کی طرف قدم اُٹھانا ہوگا۔ غلط راستہ سے دوراہے پر واپس آنے کو عربوں کی زبان اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "توبہ" کہا جاتا ہے۔ اور دوراہے سے صحیح راستہ پر گامزن ہونے کو "عملِ صالح" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح انسانی لغزش سے پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں اس طرح کی تلافئ مافات اور بازآفرینی کے لئے خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ ضابطۂ حیات میں اس قسم کے قوانین کا رکھدینا قرآنی اصطلاح میں خدا کا رحم کہلاتا ہے اور خدا انہی معنوں میں "رحیم" ہے (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں توبہ سے متعلق آیات کی تشریح کی جاتے گی)۔ یہودیوں کے ہاں "توبہ" کا تصور ہی نہیں۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی اعمال کے ذریعہ گناہ کی آلائش کو الگ کر دینے کا امکان نہیں۔ ہندو دھرم کی رو سے انسان اپنے سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کے نتیجہ میں جس "جُون" (چوہا، کُتّا، سوّر، شودر وغیرہ) کی ہیئت میں پیدا ہوگیا ہے، موجودہ جنم میں اس کا بدل سکنا ناممکن ہے۔ یعنی ان اہلِ مذاہب کے ہاں (قرآنی مفہوم کے مطابق) خدا کی رحمت (بازآفرینی کے امکان) سے انکار کیا جاتا ہے۔ اسے قرآن "کفر" سے تعبیر کرتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۱۲/۸۷) اس کے برعکس اس نے کہا ہے۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۳۹/۵۳-۵۵)۔ اے رسول! میرے ان بندوں سے، جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، زندگی کے دوراہے سے غلط راستے کی طرف مڑ گئے ہوں، کہہ دو کہ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔ (ایضاً)۔ وہ خدا کے قانونِ رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اس کے نظامِ عدل میں غلطیوں کے نقصانات کے ازالہ کا امکان بھی موجود ہے۔ تم میں جب بھی یہ احساس پیدا ہو کہ تمہارا قدم غیر خداوندی راستے کی طرف اُٹھ گیا ہے تو اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ (ایضاً) تم اپنے نشو و نما دینے والے کے قوانین کی طرف رجوع کرو۔ اور۔ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ (ایضاً) اس کے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کرو۔ اس سے تم، اپنی لغزش سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچ جاؤ گے۔ لیکن یہ اسی سورۃ میں ممکن ہے کہ تم اس سے پہلے کہ اس لغزش کے تخریبی نتائج تمہارے سامنے آجائیں، قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرلو۔ اگر اس میں تاخیر کر دی تو پھر ان کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا۔ رجوع کرو۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (۳۹/۵۴-۵۵)۔

اس تمام تفصیل کو قرآنِ کریم نے ان چار الفاظ میں سمیٹ کر رکھدیا جب کہا کہ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) غلط اقدامات کے تخریبی نتائج کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام سرانجام دو۔ برائیوں کے نتائج کو بھلائیوں سے دور کر دو۔ یہ ہے خدا کے رحم کے بروئے کار آنے کی صورت۔

آپ نے دیکھا کہ خدا کا رحم بھی کس طرح اس کے قانونِ مکافاتِ عمل ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ فاتحہ کے اگلے الفاظ میں کر دی ہے، جس میں کہا ہے کہ:

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۱/۳)

(۱/۳) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

لفظ مٰلك کا مادہ (م،ل،ک۔ م کی تینوں حرکات زبر، زیر اور پیش کے ساتھ) ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں:

۱:۔ کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا

۲:۔ اختیار و ارادہ یا اتھارٹی

۳:۔ بنیادِ محکم، یعنی وہ سہارا، جس پر کوئی چیز قائم ہو۔

۴:۔ جس ذریعہ سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے۔ اسی لئے "مِلَاکٌ" گارے (یا سیمنٹ) کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے اینٹ اور پتھر آپس میں جڑ کر ایک دوسرے کی قوت کا سہارا بنتے ہیں اور یوں دیوار تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

جب یہ لفظ عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کا مفہوم (بالعموم) اس قسم کی قوت اور اقتدار ہوتا ہے، جس سے دوسرے انسانوں کو مملوک (غلام) بنایا جائے۔ اسے ملوکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اُسے خدا کیلئے بولا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس سے مستبدانہ اقتدار مقصود نہیں ہو گا۔ خدا ہر چیز کا خالق، قادرِ مطلق اور مالک ہونے کے باوجود مستبد نہیں، لہٰذا جب کہا جائے گا کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۰۷) تو ہرچند اس کے معنے یہی ہوں گے کہ ساری کائنات میں اقتدار اور اتھارٹی اسی کی ہے لیکن اس میں یہ بنیادی مفہوم بھی مضمر ہو گا۔ کہ اس کا یہ اقتدار اشیائے کائنات کی زندگی اور نشوونما کا سہارا ہے۔ یہ اقتدار وہ (CEMENTING FORCE) ہے جس سے اجزائے کائنات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ وہ گویا ایک وحدت بن گئے ہیں، اور ان کا یہی وہ باہمی امتزاج ہے جس سے نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے اسے "مودّت"، کہا جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے خدا کی صفت "الودود" بھی ہے (۸۵/۱۴-۱۵) یعنی کائنات کے ذرات میں باہمی کشش و جذب پیدا کر کے سلسلہ ارتقاء کو آگے بڑھانے والا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں خدا کی اس صفت (مالکیت) کا ذکر آئے گا۔ وہاں یہ دیکھنا ہو گا کہ مندرجہ بالا معانی میں سے کون سا معنی اسباق و سباق کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ سورۂ فاتحہ کی اس آیت میں

اس کے معنیٰ اقتدار یا اقتدار کے ہوں گے۔

یوم:

اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر "دن" کیا جاتا ہے، یعنی وہ دن جو چوبیس گھنٹے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں یہ لفظ ان معانی میں بھی آتا ہے، لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جیسے ہم دَور (PERIOD) یا زمانہ (AGE) یا مرحلہ (STAGE) وغیرہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے بھی یہی لفظ (یوم) آتا ہے۔ کائنات جن جن طویل المیعاد مراحل سے گزرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے انہیں بھی "یوم" ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک ایک یوم تمہارے حساب وشمار کی رُو سے ہزار ہزار سال (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں "یوم" کے معنی ہوں گے وقت یا دَور۔

الدّین

قرآن کریم کی یہ ایسی جامع اصطلاح ہے جس کے اندر اس کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجاتا ہے۔ یہ اس کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یہ وہ محور ہے، جس کے گرد اس کے تمام احکام واصول واقدار وقوانین گردش کرتے ہیں اور اپنا مقصود سامنے لاتے ہیں۔ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم سمجھ لینے سے اسلام سمجھ میں آسکتا ہے اور اگر اس کا قرآنی تصور ذہنوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر اسلام کی کوئی بات بھی صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ نہ اس کے نظریات وتصورات، نہ ارکان واحکام، نہ مقصود ومطلوب، نہ غایت ومنتہیٰ۔ اِن تصریحات سے واضح ہے کہ یہ اصطلاح کس قدر جامع، وسیع اور اہم ہے۔ اور اس کا صحیح طور پر سمجھنا کس قدر ضروری بلکہ لاینفک۔

جیسا کہ کہا گیا ہے یہ لفظ بڑا وسیع المعنیٰ ہے۔ ایک طرف اس کے معنے ہوتے ہیں غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، ٹھوس نتیجہ، جزاء وسزا، مکافاتِ عمل۔ لیکن (دوسری طرف) یہی لفظ جب انسانوں کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں: اطاعت، فرماں پذیری، محکومیت۔ اور جب اس کی نسبت، خدا اور انسان دونوں کی طرف جامع طور پر ہوگی تو اس کے معنے ہوں گے، قوانین خداوندی کی اطاعت جس کا نتیجہ خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

اس مادہ کے جو مختلف معانی اوپر بیان ہوئے ہیں، ان کی تائید میں قرآن کریم کی متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جس جس مقام پر وہ آیات سامنے آئیں گی، متعلقہ مفہوم کی خود بخود وضاحت ہو جائے گی۔ اس مقام پر سورۃ آلِ عمران کی ایک جامع آیت کا پیش کر دینا ہوگا۔ فرمایا کہ: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (۳/۸۲)

کیا یہ لوگ دینِ خداوندی کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتے ہیں، کیا انہیں کسی اور دین کی تلاش ہے۔ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ۔ (۳/۸۲) کیا یہ دیکھتے نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو چیز بھی ہے، طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ یہ ہے وہ دین جو پوری خارجی کائنات کو محیط ہے۔ یعنی وہ نظامِ خداوندی جس کے مطابق یہ کارگہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے دین کا مفہوم واضح ہو گیا یعنی وہ نظام جو قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔

اس کے بعد کہا کہ تم بھی اس کا اعلان کر دو کہ ہم خدا ہی کے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔ اور یہ قوانین ہیں جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے نوعِ انسان کو ملتے چلے آئے ہیں۔ اور اب قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳/۸۴) اسی کا نام اسلام ہے۔ لہٰذا اگلی آیت میں کہا گیا "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ" (۳/۸۵) لہٰذا جو شخص "الاسلام" کے سوا (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ آخر الامر دیکھ لیں گے کہ وہ کس قدر خسارے میں رہے۔

اپنی آزاد مملکت کا تصوّر

اس سے واضح ہے کہ دین نام ہے اس نظام کا جسے قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کیا جائے۔ جس میں ہر فرد خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اور جس میں اس کے ہر عمل کا صحیح صحیح نتیجہ (جسے بدلہ یا معاوضہ کہا جاتا ہے) مرتب ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نظام جس میں اطاعت اور محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جائے، اسی صورت میں ممکن ہے کہ امتِ مسلمہ (جماعت مؤمنین) کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں وہ ان قوانین کو نافذ کرنے کا پورا پورا اختیار و اقتدار رکھے۔ بالفاظ دیگر، دین کے تمکن کیلئے مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر "الدّین" یا "الاسلام" کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ مملکت ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اور مقصد اس کا ہوتا ہے دین کا تمکن۔ دیکھئے سورۂ نور کی اس آیت میں اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے۔ "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" (۲۴/۵۵) وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق ایسے کام کریں جو ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور نمود و ظہور کا باعث ہوں، ان سے خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اس دنیا میں حکومت اور مملکت عطا کرے گا۔ جس طرح اس نے ان سے پہلے اسی قسم کی اقوام کو حکومت اور مملکت عطا کی تھی۔ ایسے

"استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہ استخلاف کا ہے کے لئے ہے؟ فرمایا وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (ایضاً) مقصد اس سے یہ ہے کہ وہ دین، وہ نظام زندگی، جسے خدا نے ان کے لئے منتخب کیا ہے، اس کا تمکن ہو جائے۔ وہ عملاً قائم اور نافذ ہو جائے۔ اور اس طرح یہ لوگ، ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ ہو کر امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ امن و اطمینان بھی مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (ایضاً) مقصد یہ ہے کہ وہ صرف خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کر سکیں بایں نمط کہ اس کی حاکمیت میں کوئی اور شریک نہ ہو۔ خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ یہ ہے "الدّین" یا "الاسلام" اس کے بعد کہا ہے کہ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (ایضاً) دین کا مفہوم اس قدر واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد جو اس سے انکار کرے گا یا سرکشی برتے گا تو سمجھ لیجئے کہ وہ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر گامزن ہو گیا۔

جیسا کہ آگے چل کر (اس کے مناسب مقام پر) بتایا جائے گا۔ الدّین کے دو اہم گوشے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے بعد کہا گیا ہے۔ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (۲۴/۵۶) یعنی استخلاف فی الارض سے مقصد یہ ہے کہ "الدّین" کا تمکن ہو جائے اس سے تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کر سکو۔ اور رسول کی اطاعت کر سکو۔ اس طرح کا استخلاف فی الارض حضور نبی اکرم صلعم کے عہدِ ہمایوں میں حاصل ہوا تھا۔ اور اس مملکت کے اولین سربراہ یا مرکزی اتھارٹی خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ لہٰذا اس نظام کے قیام و استحکام کی عملی شکل یہی تھی کہ اس کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت کی جائے۔

اطاعتِ رسول

یہ اطاعت درحقیقت قوانینِ خداوندی ہی کی تھی۔ لیکن چونکہ ان کا نفاذ اس اتھارٹی کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس لئے اس کی اطاعت لازمی قرار دی گئی۔ یہ نظام رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ تک محدود نہیں تھا۔ اُسے آگے بھی چلنا تھا (کہ قرآنِ کریم نوعِ انسان کے لئے آخری اور ابدیت در کنار ضابطۂ حیات ہے) اس لئے اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ :-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن
مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ
عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز ایں نیست، کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں۔ اس سے پہلے بھی اس قسم

کے پیغامبر آتے اور اپنا اپنا فریضہ انجام دے کر چلے گئے۔ لہٰذا اگر کل کو یہ
رسول بھی وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام
انہی کی زندگی تک محدود تھا، تم پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟
جو ایسا کرے گا، وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، اپنا ہی نقصان کرے گا۔
لیکن جو اس روش پر قائم رہیں گے، انہیں ان کی سعی و عمل کے بھرپور ثمرات
ملتے رہیں گے۔

دوسرے مقام پر جماعت مومنین کے متعلق فرمایا کہ " اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ، وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔ ان تمام احکام کو نافذ کریں گے، جنہیں یہ نظام، قوانین خداوندی کی رو سے صحیح تسلیم کرے گا۔ اور ان امور سے قانوناً روکیں گے جو ان احکام کی رو سے قابل تسلیم نہ ہوں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور کے فیصلے آخر الامر قوانین خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اور اس حکومتِ خداوندی کے متعلق یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴) جو لوگ کتاب خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے۔ انہی کو کافر کہا جائے گا۔ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ارشاد فرمادیا، فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) اے رسول تم ان کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو۔

یوم الدین کی خصوصیت

ان امور کی روشنی میں سورۃ فاتحہ کی زیر نظر آیت " مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ " کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ دور جس میں الدین کا نظام قائم ہوگا۔ جس میں اسی کے احکام و قوانین کار فرما ہوں گے۔ اس دور کی خصوصیتِ کبریٰ کیا ہوگی، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ " وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ " (۸۲/۱۷) تمہیں خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین کیا ہے۔ یوم الدین وہ ہے۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (۸۲/۱۹) وہ دور ہوگا جس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار اور اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) اس میں تمام اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہوگا۔ اس میں تمام معاملات خدا کے قانون کے تابع ہوں گے۔ یہ ہے یوم الدین کی بنیادی خصوصیت۔ آپ سوچئے

کہ کسقدر فردوس بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کی جائے اور ہر ایک کی سعی و عمل کے نتائج انہی (قوانین) کے مطابق سامنے آجائیں۔ کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو (۳/۴۴) کسی نوع کا سلب و نہب یا ہضم و استحصال نہ ہو (۲۰/۱۱۲)

اس نظام کی مخالفت

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ دین کے نظام میں کسی انسان کا دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار و اختیار نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام، مفاد پرست گروہوں کے لئے بڑا ناگوار ہوتا ہے۔ اصولی طور پر ان گروہوں کو تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) یعنی اربابِ حکومت (خواہ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو اور اس کا نام کوئی بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے یعنی وہ دورِ قدیم کی بادشاہت یا آمریت ہو یا عصرِ حاضر کی ڈیماکریسی) (۲) سرمایہ دار طبقہ جو دولت کے زور پر محتاجوں اور محنت کشوں کو اپنے زیرِ اقتدار رکھتا ہے۔ اور (۳) مذہبی پیشوائیت، جو خدا کے نام پر اپنی من مانیاں کرتی ہے۔ یہ تینوں گروہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظام قائم نہ ہونے پائے اور اگر قائم ہو جائے تو باقی نہ رہنے پائے۔

حضرات انبیائے کرامؑ اسی دین کو لے کر آتے تھے۔ اور اسی نظام کا قائم کرنا ان کا فریضۂ رسالت ہوتا تھا۔ وہ ان مفاد پرست گروہوں کی انتہائی مخالفت کے علی الرغم اس نظام کو قائم کر دیتے تھے، لیکن، ان کی تشریف براری کے بعد یہ گروہ پھر سے سر نکالتے اور اسے درہم برہم کرنے کی کوشش شروع کر دیتے۔ اس مقصد کے لیے یہ تینوں گروہ آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے تھے، بایں نمط کہ مذہبی پیشوائیت ان میں آگے آگے ہوتی تھی۔ اس کی خاص وجہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جھوٹ اپنی اصلی شکل میں سامنے آکر کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے وہ ہمیشہ سچ کا نقاب اوڑھ کر دھوکہ دیتا ہے۔ اگر یہ لوگ دین کے معتقدین کو، دین چھوڑ دینے کی کھلے الفاظ میں تلقین کرتے تو وہ کبھی ان کی بات نہ سنتے۔ انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کی کہ دین کی اصطلاحات کو بدستور باقی رکھا، لیکن ان کا مفہوم بدل دیا۔ اس کے عملی پروگرام کے اجزاء اور ارکان کی شکلوں کو علیٰ حالہ رہنے دیا لیکن ان کی روح سلب کر کے انہیں بے جان مجسمے بنا دیا (تفصیل اس اجمال کی اس سے اگلی آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے تحت سامنے آئے گی) اس کے بعد انہوں نے دنیاوی امور اور دینی امور کو الگ الگ کر دیا۔ دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں دیدئے اور "دینی امور" کے مالک خود بن بیٹھے۔ ان امور سے مراد، اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین، مثل نکاح، طلاق وغیرہ ہیں دنیاوی امور میں حکومت کے فیصلے نافذ ہونے لگے۔ اور دینی امور میں ان کے فتوے چلنے لگے۔

جو کچھ انبیائے سابقہ کے قائم کردہ دینی نظام کے ساتھ ہوا، وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی بیتی۔ صدرِ اول کے بعد ملوکیت نے سر اُبھارا اور اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ دین دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ جس حصہ

دین مذہب میں تبدیل ہوگیا

کو مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لیا اسے دین کی بجائے مذہب کہکر پکارا جاتا ہے۔ جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ (RELIGION) کیا جاتا ہے۔ مذہب میں نظامِ حکومت لازمی طور پر سیکولر ہو جاتا ہے۔ اسلام کی یہی شکل اس وقت تک قائم ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ اتباعِ شریعت کیلئے اپنی آزاد مملکت کا وجود ضروری نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکانِ اسلام کا اتباع ہر حکومت کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا خدا کا اقتدار، سو اس کا دائرہ آخرت کی زندگی ہے، اس دنیا کی نہیں۔ چنانچہ جب مذہب کی رُو سے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کا ترجمہ (مالک روزِ جزا کا) کیا جاتا ہے تو اس میں "روزِ جزا" سے مقصود قیامت کا دن ہوتا ہے۔ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ فریب ہے جو مذہبی پیشوائیت شروع سے دیتی چلی آرہی ہے۔ اس میں دین مذہب میں تبدیل ہوکر رہ جاتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں صرف مذاہب باقی تھے۔ دین کا نظام کہیں نہیں تھا۔ اور اب بھی (مسلمانوں سمیت) دنیا میں مذاہب ہی موجود ہیں۔ دین کا وجود کہیں نہیں۔ دیگر مذاہب میں مشکل یہ تھی کہ ان کے ہاں خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں تھی۔ اس لئے ان کے مذہب کا پھر سے دین میں بدل جانا ناممکن تھا۔ ہمارے ہاں خدا کی کتاب (قرآن مجید) اپنی اصلی، غیر محرف شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا مسلمانوں میں پھر سے دین کے نظام کا قیام ناممکن نہیں۔ مسلمانوں کی جو آزاد مملکت یہ فیصلہ کرے کہ وہ اپنا نظام قرآن کریم کے تابع رکھے گی وہ دین کے نظام کے قیام کا موجب بن جائے گی۔ میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہیئے، یہ مذہب نہیں دین ہے۔ اس لئے اسے دین کہکر ہی پکارنا چاہیئے۔ یوں اسلام ایک طرف دنیا کے مذاہب سے بھی الگ ہو جائے گا اور دیگر نظامہائے حکومت سے بھی الگ اور ممتاز۔

آخر میں اتنی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ یوم الدین سے مراد صرف اس دنیا میں نظامِ خداوندی کا دور نہیں۔ انسانی زندگی مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور ہر فرد کا مستقبل (اُخروی زندگی کا مقام) اس کے ان اعمال کے اثرات کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ جو اس سے اس دنیا میں سرزد ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے خدا کے قانونِ مکافات کے دوائر یہ دنیا اور آخرت دونوں ہیں۔ اس لئے خدا کے مالکِ یوم الدین ہونے میں یہ دونوں دائرے شامل ہوں گے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ مذہب کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ دین کی اصطلاحات اور ارکان کو علی حالہٖ باقی رکھتا ہے لیکن ان کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ اس کی تفصیل عبادت کے مفہوم میں ملے گی جو ہمارے سامنے اب آرہا ہے۔

(1/4)

(1/4) اِیَّاکَ نَعۡبُدُ :

سورۃ فاتحہ کی اگلی آیت کا پہلا ٹکڑہ " اِیَّاکَ نَعۡبُدُ " ہے، یعنی ایک عبدِ مومن خدا کی حمدیت، ربوبیت رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت کے صحیح تصور کو سامنے لانے کے بعد اختیار پکار اٹھتا ہے کہ " اِیَّاکَ نَعۡبُدُ " اس " نَعۡبُدُ " میں دین کا سارا نظام سمٹ کر آجاتا ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں"۔ اور اگر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" تو اس میں بھی عبادت کے معنے پرستش ہی لئے جاتے ہیں۔ عبادت کو پرستش میں بدل دینے سے، دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر مذہب میں خدا کی پرستش یا پوجا (WORSHIP) ہوتی ہے لیکن دین میں خدا کی "عبادت" ہوتی ہے۔

عبادت

اس کا مادہ (ع۔ب۔د) ہے جس سے لفظ " عَبۡدٌ " آتا ہے اور، جیسا کہ معلوم ہے، عبد کے معنے غلام اور محکوم کے ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ ٹھیک غلامی اور محکومی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ "الشعرآء" میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دیدے تو اس نے ان سے کہا کہ "موسیٰؑ! ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم ہمیں ان احسانات کا بدلہ یوں دے رہے ہو"۔ اس کے جواب میں حضرتِ موسیٰؑ نے کہا کہ تمہارے احسانات یہی ہیں ناں اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26/22) تم نے میری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ (یہاں " عَبَّدۡتَّ " کے معنے واضح ہیں) دوسری جگہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اس کے اکابرین کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا: اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ۚ (23/47) کیا ہم ان کی بات مان لیں، جو ہمارے ہی جیسے دو آدمی ہیں اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان مقامات اور انہی جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ "عبدیت" کے معنے خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ سورۃ کہف میں محکومیت اور عبادت کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ایک جگہ کہا کہ " وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِهٖۤ اَحَدًا " (18/26) خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور دوسری جگہ مستقبل طلب انسان سے کہا کہ۔ وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (110/18) اسے چاہیئے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں سے کہا کہ "اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ" (12/4) یاد رکھو حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ " اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ " (ایضاً) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو۔ یہاں بھی خدا کی محکومیت کو اس کی عبادت کہا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہے " ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ " (12/4) یہ ہے دینِ محکم۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کریم کی رُو سے خدا کی عبادت سے مراد ہے اس کی محکومیت اختیار کرنا۔ اس کے قوانین کی اطاعت کرنا۔ اسی کا نام "الدّین" ہے۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کی محکومیت اختیار

کرنے سے مُراد کسی ڈکٹیٹر کی اطاعت نہیں۔ یہ قانون کی اطاعت ہے کیونکہ دین کے بنیادی معنیٰ قانون کے ہیں۔

خود سپردگی

لیکن اس عبدیّت میں ایک اور نکتہ بھی مضمر ہے۔ عربی زبان میں "تَعْبِیْد" کے معنے ہیں اُونٹ یا گھوڑے کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا۔ یعنی اس وحشی جانور کو اس طرح سدھانا کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خاص قاعدے اور ضابطے کے مطابق صرف کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کی ہیں۔ اگر انسان ان قوتوں کو سرکش اور بیباک رکھتا ہے۔ (یعنی اپنے جذبات کے مطابق صرف کرتا ہے) تو نتیجہ فساد اور تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر انہی صلاحیتوں کو حدود اللہ کے اندر رکھتے ہوئے، اس کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کے مطابق صرف میں لاتا ہے تو اس کا نتیجہ عالمگیر ربوبیت اور اس کی اپنی ذات کی تعمیر ہوتا ہے۔ اس نہج سے، عبادت کے معنے ہوں گے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ آپ سورۃ "النّور" کی آیت نمبر ۵۵ (۲۴/۵۵) کو جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے، ایک بار پھر سامنے لائیے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض (آزاد مملکت) اس لئے ملتی ہے کہ اس سے دین کا تمکن ہو۔ اور تم اس قابل ہو جاؤ کہ "یَعْبُدُوْنَنِیْ" تم صرف میری عبودیّت اختیار کرو۔ یہاں سے بھی یہ حقیقت واضح

اپنی آزاد مملکت

ہو گئی کہ خدا کی عبادت صرف اسی صورت میں اختیار کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کو استخلاف فی الارض حاصل ہو۔ یعنی ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ احکامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ خدا کی "پرستش" کے لئے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ضروری نہیں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) خدا کی پرستش تو کفار کی حکومت میں بھی کی جا سکتی ہے۔

قرآن کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور جیسا کہ، پہلے کہا جا چکا ہے، نزولِ قرآن کے زمانے میں دین کہیں باقی نہیں رہا تھا۔ ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ مذہب میں خدا کی محکومیت نہیں بلکہ اس کی پرستش کا تصور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی بولنے والے اہلِ مذاہب (اور مشرکین عرب) میں اس لفظ (عبادت) کا مفہوم پرستش میں بدل چکا تھا۔ بنا بریں قرآن کریم میں جہاں اس لفظ کی نسبت ان کی طرف کی جائے گی تو ان کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنے پرستش ہوں گے لیکن جب یہ قرآن میں پیش کردہ خدا کے تصور اور اس پر ایمان لانے والی جماعت (مؤمنین) کی طرف منسوب ہوگا تو اس سے مراد خدا کی حاکمیت اور اس جماعت کی طرف سے اس کی محکومیت کا مفہوم سامنے آئے گا۔ اس نہج سے جب خدا کے یہ بندے اس امر کا اعتراف اور اقرار کریں گے کہ:

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ"

صحیح آزادی

تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔ ہم کسی اور کا حق حکومت تسلیم ہی نہیں کرتے۔ سوچئے کہ یہ آزادی اور حریت کا کسقدر بلند اور عظیم دعویٰ اور نعرہ ہے۔ ایسا عظیم، کہ اس سے انسان دنیا کی ہر چوکھٹ سے مستانہ وار، انتہائی سرفرازی سے آزادانہ آگے بڑھ جاتا ہے، اور کسی انسان کے سامنے نہیں جھکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ہے وہ آزادی جو خدا کی عبودیت سے عباد الرحمٰن کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ انسان کا صحیح مقام ہی یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکے۔ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (۵۱/۵۶) انسان خواہ وہ تمدنی زندگی بسر کر رہے ہوں یا صحرائی زندگی، انہیں پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ یہی وہ اعتراف و اعلان ہے جو اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے نعرۂ حریت میں مضمر ہے۔ اور یہی لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم ہے۔ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے اللہ کے۔

؎ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ⁂ حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری

لیکن خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا مقصد، خدا کے کسی کام کا سنوارنا نہیں۔ اس سے مقصد انسان کی خود اپنی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ حقیقت اس سے اگلے دو الفاظ سے ہویدا ہے یعنی:

(۱/۴) وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں"۔ مدد کیلئے عربی زبان اور قرآن کریم میں بہت سے اور الفاظ بھی آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے۔ اس میں ایک ایک چیز کے لئے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے مقاصد اور مطالب کے اظہار کے لئے ان متعدد الفاظ میں سے جن کا انتخاب کیا ہے وہ بجائے خویش قرآن کا اعجاز ہے۔ اس لئے قرآن نے جس مقام پر جس لفظ کو استعمال کیا ہے، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے وہاں اسی لفظ کو منتخب اور استعمال کیوں کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے آجائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہو جائے گا بلکہ اکثر و بیشتر قرآن کریم کی پوری کی پوری تعلیم یا اس کی غرض و غایت و (حکمت) کی ایک جھلک بھی سامنے آجائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ ترجمہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

مُستعان کے معنی

"اِستعانؔ" کا مادہ (ع-و-ن) ہے "عوان" اس جانور یا انسان کو کہتے ہیں جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو۔ اس کی توانائیاں نشو ونما پا چکی ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ لہٰذا "استعان"، کے معنی ہوں گے اپنی ذات کے لئے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا اور اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا۔ اسی نہج سے اللہ تعالیٰ کو "اَلْمُسْتَعَانُ" (۲۱/۱۱۲) کہا گیا ہے۔

زیرِ نظر آیت کے پہلے حصہ میں کہا گیا تھا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" اس میں عبدیت کے معنے تھے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضابطۂ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ لہٰذا اِیَّاکَ نَعبد کے معنے تھے "ہم اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو تیرے ہی احکام و قوانین کے مطابق استعمال کرتے ہیں"۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی صلاحیتیں اور توانائیاں نشوونما پارہی ہوں۔ اور ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ کیونکہ صلاحیتوں اور قوتوں میں اعتدال اور توازن نہ رہے تو وہ ضائع ہو جاتی۔ یا تخریبی نتائج پیدا کرتی ہیں۔ تعمیری نتائج پیدا کرنے کے لئے ان میں اعتدال اور توازن کا ہونا ضروری ہے۔ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے معنے یہ ہیں کہ ہم اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں میں اسی قسم کی نشوونما چاہتے ہیں۔ اور یہ مقصد صرف تیرے (اللہ تعالیٰ کے) بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

دُعا کا مفہوم

"اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" (ہم تجھ سے اس مقصد کے لئے مدد چاہتے یا مانگتے ہیں) میں دُعا کا پہلو سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے دعا کا مفہوم کیا ہے، اسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ جہاں خدا کو "پکارنے" کی آیات سامنے آئیں گی۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ آپ سے کوئی عمل سرزد نہیں ہوسکتا (آپ کوئی کام بالارادہ نہیں کر سکتے) جب تک اس کیلئے پہلے آپ کے دل میں اس کی خواہش یا آرزو پیدا نہ ہو۔ یہ خواہش یا آرزو جس قدر شدید ہو گی اسی قدر اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کا ارادہ مستحکم ہو گا۔ اور جس قدر آپ کا ارادہ مستحکم ہو گا اسی قدر قوت و شدت سے آپ اس مقصد کے حصول کے لئے کوشش کریں گے۔ دل میں موجزن ہونے والی شدید آرزو کا بے محابا زبان پر آجانا "دعا" کہلاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری

بلکہ اکثر اوقات اس آرزو کے، الفاظ کے پیکروں میں، لب پر آنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا دل سے ابھرنا ہی دُعا بن جاتا ہے۔

ہم "بسم اللہ"، کے مفہوم کے سلسلہ میں بتا چکے ہیں کہ عبدِ مومن جس کام کا بھی ارادہ کرتا ہے اس سے اس کی غایت الغایات یعنی منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت مشہود اور کار فرما ہو جائے۔

عبدِ مومن کی آرزوئیں

بالفاظِ دیگر اس سے "ربوبیتِ عالمینی" مقصود ہوتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ عبدِ مومن کی ہر خواہش یا آرزو اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے لئے کہا گیا ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰) "تم وہی چاہو جو اللہ چاہتا ہے"۔ لہٰذا خدا کا بندہ اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل یا مقصدِ پیشِ نظر کے حصول کے لئے قوانین و اقدارِ خداوندی کی توفیق طلب کرے گا۔ یعنی وہ چاہے گا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا ہر قدم انہی قوانین و اقدار کے مطابق اٹھے (اسی کو توفیق طلب کرنا کہتے ہیں یعنی انسانی ارادہ اور عمل کا خدا کی راہنمائی کے مطابق و موافق ہونا) اِسے کہا جائے گا "خدا سے مدد چاہنا"۔

دُعا کے ساتھ عمل

دعا کے مفہوم میں بتایا جائے گا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ خدا سے مانگیں گے وہ ہمیں از خود مل جائے گا۔ اس کے لئے خدا کے بتائے طریقہ کے مطابق پوری پوری کوشش کرنی ہوگی۔ بنا بریں خدا سے "استعانت" کے معنے بھی یہ نہیں کہ ادھر ہم نے دعا مانگی اور اُدھر وہ مقصد حاصل ہوگیا۔ اس کے لئے خدا کے بتائے پروگرام کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ سورۃ بقرہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۲/۱۵۳) اے جماعتِ مومنین! تم صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے خدا سے مدد طلب کرو۔ یاد رکھو خدا کی مدد ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے پیشِ نظر مقصد کے حصول کے لئے استقامت سے کام لیتے ہیں (صلوٰۃ کا مفہوم سورۃ بقرہ میں سامنے آئے گا۔) یہ کہنے کے بعد کہ تم صلوٰۃ اور صبر کے ذریعے خدا سے مدد طلب کرو۔ اگلی آیات میں بتایا گیا کہ اس کے لئے کس قسم کے لرزہ انگیز اور جاں گسل مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ ان مراحل میں خوف و خطر کا سامنا ہوگا۔ بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ جان و مال کا ضیاع بھی ہوگا۔ اس میں جان تک بھی دے دینی ہوگی۔ جو لوگ اس قسم کے صبر آزما مراحل میں ثبات و استقامت کا ثبوت دیں گے، خدا کی مدد انہی کو نصیب ہوگی (۲/۱۵۷-۱۵۴)۔

سورۃ انبیاء میں پہلے اس ابدی اصول کا ذکر کیا گیا ہے کہ وراثتِ ارضی انہی لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں (۲۱/۱۰۵) اس کے بعد اس کشمکش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو رحمتِ خداوندی کے عام کرنے کے سلسلہ میں نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے مخالف مفاد پرست گروہوں کے درمیان برپا تھی ازاں بعد حضور نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! تو مجھ میں اور ان لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ اس کے بعد ہے وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۱۲) قومِ مخالف سے کہا گیا کہ تم جس قسم کی باتیں کرتے ہو ان کے خلاف ہم خدائے رحمٰن سے معاونت کے آرزومند ہیں۔ اسے استعانت کہا گیا ہے اور خدا کو اَلْمُسْتَعَانُ۔ اِس سے بھی واضح ہے کہ خدا سے اِمداد طلبی کا مفہوم کیا ہے۔

آیۂ زیر نظر میں "نَعْبُدُ" اور "نَسْتَعِیْنُ" جمع کے صیغے ہیں ـــــ اور صرف یہی دو مقام نہیں۔ جماعتِ مؤمنین کی تمام دعائیں جمع کے صیغے میں ہیں۔ یعنی یہ مدد طلبی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مؤمنین کے تمام مقاصد اس نظامِ اجتماعیت کی رو سے حاصل ہوتے ہیں، جو قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور اسی باہمی ارتباط و تعاون سے نظام متشکل ہوتا اور مستحکم رہتا ہے۔ یہ نظام قائم بھی افراد ہی کے باہمی تعاون سے ہوتا ہے۔ اور اس کا منتہیٰ و مقصود بھی افراد کی نشوونما ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲) تم بِرّ اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اِثم اور عدوان کے معاملات میں تعاون مت کرو۔ (ان اصطلاحاتِ قرآنیہ کا مفہوم اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گا) اس سے یہ واضح ہے کہ خدا کی استعانت، غاروں، خانقاہوں، حجروں، خلوت کدوں میں حاصل نہیں ہوتی۔ یہ نظامِ خداوندی کے اجتماعی پروگرام میں حاصل ہوتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسان کی ہر کوشش یا عمل کا آغاز اس کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش یا آرزو سے ہوتا ہے یہی آرزو شدید ہو کر ارادہ بنتی ہے اور ارادہ کے مستحکم ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے قدم اٹھتا ہے۔ قدم اٹھانے کا مرحلہ، بڑا اہم ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بڑا نازک بھی۔ آپ گھر سے کسی جگہ جانے کا ارادہ لیکر نکلتے ہیں۔ اس جگہ پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلی اور لا ینفک شرط یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ اگر آپ کا قدم غلط راستہ پر پڑ گیا تو آپ مسافت بھی طے کریں گے، اس میں آپ کا وقت اور توانائی بھی صرف ہو گی، لیکن آخر الامر ہو گا یہ کہ، نہ صرف یہ کہ آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچیں گے بلکہ آپ اس سے بہت دور ہٹ چکے ہوں گے۔ لہٰذا جب آپ نے "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کہہ کر خدا سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی اعانت طلب کی تو اس کا مطلب تھا کہ آپ نے سب سے پہلے یہ چاہا کہ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح یا سیدھا راستہ آپ کے سامنے آجائے۔ اس کے لئے آپ کے دِل کی آرزو یہ دعا بن کر آپ کے لبوں تک آئی کہ: "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" (۱/۵)

(۱/۵) اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

۱/۵ اس میں پہلا لفظ "اِھْدِنَا" ہے۔ جس سے مقصد ہدایت طلبی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے قرآن کریم میں ہدایت کا لفظ (مختلف شکلوں میں) بڑی کثرت اور وسعت سے آیا ہے۔ اس لئے کہ ہدایت و ضلالت، حق و باطل اور کفر و ایمان میں حدِّ فاصل ہے۔ لہٰذا اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا نہایت ضروری۔ "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے

کہ ربوبیت کے معنے ہیں کسی شے کو اس نقطۂ آغاز سے نشو و نما دیتے ہوئے بتدریج تکمیل تک پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام کے مطابق اشیائے کائنات کو ایک سفر اختیار کرنا ہوگا۔ ایک راستہ پر چلنا ہوگا۔ اور یہ راستہ بھی خود خدا ہی کا متعیّن کردہ ہوگا، کیونکہ اس کے متعین کردہ اور بتائے ہوئے راستے کے سوا کسی راستے پر چل کر بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کی راہنمائی کو ہدایت کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ راہنمائی واضح، بیّن، روشن اور نمایاں ہو (یہ خصوصیت خود اس مادہ کے معانی کے اندر مضمر ہے) ظنی، قیاسی، مشکوک، مشتبہ، مبہم راہنمائی کو ہدایتِ خداوندی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ راہنمائی تمام اشیائے کائنات کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ سورۃ "اَلْاَعْلٰی" میں ہے کہ "ربّ" وہ ہے "اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷/۲-۳) جس نے تخلیق کی ابتداء کی، پھر ہر شے کے حشو و زوائد کو الگ کرکے اس میں توازن اور اعتدال پیدا کیا۔ پھر اس کے لئے پیمانے (قوانین) مقرر کئے اور وہ نصب العین متعین کیا جس تک اسے پہنچنا ہے۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے اسے راہنمائی دی۔ دوسرے مقام پر اسی کو سمٹا کر یوں کہا گیا ہے کہ "رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی" (۲۰/۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خِلقت عطا کی اور پھر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اس کی راہنمائی کی۔ یہ راہنمائی ہر شے کے اندر موجود ہے۔ اسے ان اشیاء کی فطرت یا جبلت کہا جاتا ہے، جس پر چلنے کے لیے یہ اشیاء مجبور ہیں۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ مائع شکل میں نشیب کی طرف بہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے، یا دوسری طرف، بھاپ بن کر اُڑ جائے۔ بکری کی جبلت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ شیر کی جبلت ہے کہ وہ خون پیئے اور گوشت کھائے۔ آپ کسی مرغی کے نیچے مرغی اور بطخ کے انڈے سینے کے لئے رکھ دیں۔ جب ان انڈوں سے بچے نکلیں گے تو بط کے بچے پانی کی طرف لپکیں گے اور مرغی کے چوزوں کو آپ پانی کی طرف لے جانا بھی چاہیں تو وہ وہاں سے دور بھاگیں گے۔ یہ راہنمائی ان کے اندر پیدائش کے ساتھ موجود ہوتی ہے، کہیں خارج سے حاصل نہیں کرنی پڑتی۔ اسے قرآنِ کریم نے ان کی طرف وحی، کہہ کر بھی پکارا ہے مثلاً شہد کی مکھی کی طرف وحی (۱۶/۶۸) اجرامِ فلکی کی طرف وحی (۴۱/۱۲)۔ زمین کی طرف وحی (۹۹/۵) وغیرہ۔

انسان بھی مخلوقِ خداوندی میں شامل ہے۔ اسے بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرکے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ اس کے لئے سفر اختیار کرنا اور راستہ طے کرنا ہے۔ اس کے لئے بھی صحیح راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس راہنمائی کا ذمہ بھی اسی خدا نے لے رکھا ہے، جس نے اشیائے کائنات کو راہنمائی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی (۹۲/۱۲)

انسان کیلئے راہنمائی

انسانوں کو راہنمائی دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے یہ کہلایا گیا کہ ربّ العالمین وہ ہے "اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ (۲۶/۷۸) جس نے

مجھے پیدا کیا اور وہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے میری راہ نمائی کرتا ہے۔ قصۂ آدم کے ضمن میں (جسے قرآن کریم نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور جس کی تشریح سورۂ بقرہ میں ہمارے سامنے آئے گی) کہا گیا ہے کہ جب آدم سے جنت چھن گئی اور وہ مایوس سا ہو گیا کہ نہ معلوم میری باز آفرینی کا امکان بھی ہے یا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تم مایوس نہ ہو۔" فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) میری طرف سے تمہاری جانب راہ نمائی آتی رہے گی۔ تم میں سے جو بھی اس کے مطابق راستہ طے کرے گا وہ بلا خوف و خطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

ان آیات (اور اسی قبیل کی کی متعدد دیگر آیات) سے واضح کہ انسان کی راہ نمائی کا ذمہ بھی خدا نے خود لے رکھا ہے لیکن انہیں اس راہ نمائی کے عطا کرنے کی صورت کچھ اور ہے۔ اشیائے کائنات کی صورت میں یہ راہنمائی ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ انسانوں کے سلسلہ میں صورت یہ نہیں۔ ان کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ خدا کی طرف سے یہ راہنمائی (جسے وحی کہا جاتا ہے) اس کے کسی برگزیدہ بندے کو عطا کی جاتی تھی (اسے نبی یا رسول کہہ کہ پکارا جاتا ہے) اور وہ اس راہ نمائی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انہیں اس کا اختیار تھا کہ وہ اس راہنمائی کا اتباع کر کے بلا خوف و خطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں یا اپنے لئے دوسرے (غلط) راستے اختیار کر کے تباہ و برباد ہو جائیں۔ خدا کی طرف سے یہ راہ نمائی سب سے پہلے نبی کو ملتی تھی۔ چنانچہ خود رسول اکرمؐ کے متعلق کہا گیا کہ " وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ "(۹۳/۷) ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو صحیح راستہ کی طرف تیری راہنمائی کر دی۔ نبی کی طرف وحی کردہ راہنمائی کو اس کی کتاب کہا جاتا تھا۔ (یعنی

وحیِ خداوندی

اس کی طرف نازل کردہ کتاب اللہ) لہٰذا ہدایتِ خداوندی کی پیروی سے مقصد اس کتاب کا اتباع تھا۔ نبیِ اکرمؐ کی طرف جو وحی ہوئی وہ قرآنِ کریم کے اندر درج اور محفوظ ہے۔ یہ وحی مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ چنانچہ اس کتاب کے متعلق فرمایا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ وَ
مَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ۝ (۳۹/۴۱) -

ہم نے اس کتاب کو جو مبنی بر حقیقت ہے تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ نوعِ انسانی اس سے ہدایت حاصل کرے۔ ان سے کہہ دو کہ جو یہ ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا۔ جو دوسرے راستے اختیار کر کے گمراہ ہو جائے گا، اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔ تیرا کام اس راہنمائی کو ان لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ انہیں زبردستی اس راستے پر چلانا نہیں کیونکہ تجھے ان پر نگران نہیں بنایا گیا۔

یہاں سے دو باتیں واضح ہوگئیں۔ ایک یہ کہ رسول کا فریضہ ہدایتِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دینا تھا۔ انہیں اس راستہ پر چلانا اس کی ذمہ داری نہیں تھی۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں کہا ہے کہ اگر انسانوں کو بھی اس راستہ پر اشیائے کائنات کی طرح چلانا مقصود ہوتا تو انہیں بھی ان اشیاء کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ اسی اختیار و ارادہ کی جہت سے دوسری جگہ کہا کہ: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳)۔ ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے اسے قبول کرے۔ اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ دوسری جگہ کہا کہ (اے رسولؐ) یہ تیرے اختیار ہی میں نہیں کہ کسی کو صحیح راستہ پر چلا دے خواہ اس کے لئے تیرا کتنا ہی دل کیوں نہ چاہتا ہو۔ صحیح راستہ پر وہی چلے گا جو اپنے منشا و ارادہ سے اس راستہ کو اختیار کرنا چاہے (۲۸/۵۶)۔ اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ راستہ وہی شخص اختیار کرے گا جو کسی منزل تک پہنچنے کے لئے گھر سے نکلے اور پھر دوراہے پر آ کر اس کا متلاشی ہو کہ اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اُٹھے۔ جو شخص سفر ہی اختیار نہ کرنا چاہے اس کے لئے راہنمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یا جو سفر تو اختیار کرے لیکن بلاتعینِ منزل —— اسے سفر نہیں آوارہ گردی کہا جاتا ہے۔ اور قرآنِ کریم اسے حبطِ اعمال کہکر پکارتا ہے (یعنی بلانتیجہ حرکت و عمل) ایسے لوگ کسی راہنمائی کو درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھتے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق رسول اللہ سے کہا ہے کہ: اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۳/۴۰)۔ کیا تو انہیں سنانا چاہتا ہے جو بہرے بن کر بیٹھے رہتے ہیں اور بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ کیا تو انہیں راستہ دکھانا چاہتا ہے جو اپنی آنکھیں ہی کھولنا نہیں چاہتے اور اس طرح کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ صحیح راہنمائی اسی کو مل سکتی ہے جس کے دل میں منزل تک پہنچنے کی تڑپ ہو اور پھر وہ صحیح راستہ کی تلاش میں جدوجہد کرے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ جو لوگ ہماری طرف پہنچنے والے راستے کی تلاش میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں صحیح راستے دکھا دیتے ہیں اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ صحیح راستہ خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے اتباع سے ملتا ہے، اور کسی طریق سے نہیں مل سکتا۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (۲/۱۲۰) (اے رسولؐ) ان لوگوں سے اعلانیہ کہدو کہ حقیقی راہنمائی وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اس کے سوا کوئی راہنمائی کاروانِ انسانیت کو منزلِ مقصود تک نہیں لے جا سکتی۔ یہی ہے وہ راستہ جسے "صراطِ مستقیم" کہکر پکارا گیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ایک شخص لاہور سے راولپنڈی جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ صبح اٹھ کر ریلوے ٹائم ٹیبل کھولتا ہے۔ اس میں دیکھتا ہے کہ راولپنڈی جانے والی گاڑیاں کس وقت چلتی ہیں۔ وہاں کب پہنچتی ہیں۔ کرایہ کیا ہے۔ گاڑی میں سیٹ ریزرو کرانے کا طریق کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ ان امور کے متعلق نہایت احتیاط سے

ٹائم ٹیبل کا مطالعہ کر کے اپنا اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے سنبھال کر رکھ دیتا ہے۔ وہ ہر روز صبح ایسا ہی کرتا ہے۔ اور ایک فریضہ کی طرح ایسا کرتا ہے۔ لیکن وہ راولپنڈی جانے کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ عمر بھر ایسا کرتے رہنے سے راولپنڈی پہنچ جائے گا؟ اور کیا ٹائم ٹیبل کا اسطرح ہر روز مطالعہ کرنا اسے کچھ فائدہ پہنچا سکیگا؟ جواب واضح ہے۔ لہٰذا کتابِ خداوندی کا پڑھنا اور اسے سمجھنا اسے ہی فائدہ پہنچا سکیگا جو اس کی راہنمائی میں سفرِ حیات کیلئے عملی قدم اٹھائے۔ منزل پر وہی پہنچ سکیگا جو اس کتابِ عظیم کی راہنمائی میں سفر اختیار کرے۔ یہ کتاب صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرے گی۔ کسی کو اٹھا کر منزل تک نہیں پہنچائے گی۔

صراطِ مُستقیم

ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ "سیدھا راستہ" کیا جاتا ہے۔ 'سیدھا راستہ' صرف لفظ صراط کا ترجمہ ہے۔ لیکن یہاں الصِّرَاطَ کے ساتھ اَلْمُسْتَقِیْمَ بھی کہا گیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ق۔و۔م) ہے جہاں سے قیام کا لفظ آتا ہے۔ قیام کے معنی کھڑا ہونا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کھڑا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا توازن برقرار رہے۔ ذرا توازن بگڑ جائے تو نہ کوئی انسان کھڑا رہ سکتا ہے نہ کوئی اور چیز۔ اس نہج سے مستقیم کے معنے ہیں توازن بدوش۔ لہٰذا صراطِ مستقیم کے معنے ہوئے سیدھا اور ہموار راستہ۔ ایسا سیدھا کہ اس میں کوئی پیچ وخم نہ ہو۔ اور ایسا ہموار کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔

ایک عظیم حقیقت

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، الفاظ کے انتخاب میں بھی قرآن کریم کا اعجاز مضمر ہوتا ہے۔ صراط کے معنے تو سیدھا راستہ ہی ہیں لیکن اس راستہ کے سیدھا ہونے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ جہاں اپنی طرف سے مثبت نظریات پیش کرتا ہے وہاں، ساتھ کے ساتھ غلط اور باطل نظریات کی تردید بھی کرتا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں الصراط کے اندر پنہاں ہیں۔

زندگی کا دَوری تصوّر

فکرِ انسانی نے زندگی کے متعلق جو تصور وضع کیا اس میں زندگی کی حرکت کو دَوری (CYCLIC) سمجھا گیا۔ یونان کے مفکرین نے جب اجرامِ فلکی پر غور کیا تو انہیں گول پایا۔ اس سے ان کے ذہن میں گولائی یا دائرے کی عظمت قائم ہو گئی۔ اور انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات اور انسان کی زندگی کی حرکت دَوری ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ دائرے کے اندر گردش کر رہی ہے۔ دائرے کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ جس نقطہ سے کوئی شے حرکت کا آغاز کرتی ہے، پورا دائرہ طے کرنے کے بعد وہ پھر اسی مقام پر آپہنچتی ہے۔ وہ آگے نہیں بڑھتی، کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راستہ پر چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اس سے فیثا غورث نے تناسخ (TRANS-MIGRATION OF SOUL) کا نظریہ وضع کیا۔ اس نظریہ کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان ایک جنم لے کر اس دنیا میں آیا تو برائیوں (گناہوں) کی آلائش

سے ملوث ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی روح کو کسی دوسرے پیکر میں پھر سے دنیا میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اس آلائش کو دور کر سکے۔ یہ عمل ایک آدھ پیدائشی چکر میں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے کروڑوں اربوں چکروں (یعنی نئے نئے جنموں) میں سے گزرنا پڑتا ہے تا آنکہ انسان پھر سے اپنی پہلی ہیئت میں آجاتا ہے۔ اس وقت یہ چکر ختم ہو جاتے۔ یعنی ان تمام گردشوں سے مقصد یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا اسی قسم کا پھر سے بن جائے گویا یہ ہے دَوری گردش کا منتہیٰ۔ زندگی کا یہ دَوری تصور نظریۂ تناسخ تک ہی محدود نہیں۔ مذاہبِ عالم میں نجات کا نظریہ اسی تصور کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائیت نے کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ اس آلائش سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان سے انسان پھر سے ویسا ہی پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسا پیدائش سے پہلے تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہی بات جو نظریۂ تناسخ کی بنیاد تھی۔ جن مذاہب نے جہنم کا تصور قائم کیا انہوں نے کہا کہ انسان اس دنیا میں آتا تو پاک صاف ہے لیکن یہاں اس سے ایسے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں جن سے اس کی ذات داغدار ہو جاتی ہے۔ ان داغوں کو دھونے کے لئے اسے اُخروی زندگی میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے ہاں جہنم کی مثال دھوبی کی بھٹی سے دی جاتی ہے۔ اس کے اس طرح پھر سے پاک اور صاف ہو جانے کا نام نجات ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی اسی دَوری حرکت کا تصور کار فرما ہے۔ یعنی اس، اتنے طول طویل سفر کے بعد پھر سے وہیں پہنچ جانا، جہاں سے انسان چلا تھا۔

اہلِ تصوف کا عقیدہ

یہ اہلِ شریعت کا تصور تھا۔ اہلِ طریقت نے اس تصور کو ایک اور رنگ میں پیش کیا۔ ہندوؤں کی ویدانت کی رو سے کہا یہ گیا کہ انسانی روح (آتما) برہما کی روحِ عظیم (پرماتما) کا جزو ہے۔ یہ جزو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے اس آلائش سے پاک اور صاف کر دیا جائے تاکہ یہ پھر سے اپنی اصل میں جا ملے۔ اسے نجات کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے بڑے مشقت طلب مراقبوں کی جانکاہ ریاضتوں، ترکِ آرزو کی مشقوں اور ایذائے خویش کی روح فرسا صعوبتوں کی ضرورت ہوتی ہے (بدھ مت کا نروان بھی کچھ ایسا ہی تصور پیش کرتا ہے) ویدانت کا یہی نظریہ یہودی تصوف اور عیسائیت کی راہبانیت میں سامنے آیا۔ اور وہیں سے مسلمانوں نے مستعار لیکر اسے "اسلامی تصوف" کا نام دیا۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے مولانا روم نے اپنی مثنوی کے پہلے شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ

بشنو از نے چوں حکایت می کند   از جدائی ہا شکایت می کند

یعنی بانسری اس لئے آہ و فغاں کرتی ہے کہ وہ اپنی اصل (نیستان) سے جدا ہو گئی ہے۔ اس کا یہ آہ و نالہ اس وقت ختم ہو گا جب

پھر سے اپنی اصل سے جا ملے گی۔ یہی زندگی کی تمام تگ و تاز کا ماحصل ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی طرح انسانی ذات کے، ذاتِ خداوندی میں پھر سے جذب اور گم ہو جانے کا نام صوفیا کی اصطلاح میں "وصال" کہلاتا ہے۔ یعنی فانی فی اللہ باقی باللہ۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی کے متعلق دَوری حرکت کا نظریہ کس کس قسم کے عقائد اور تصورات کو محیط ہے اور اس سے انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے پیدا کرنے والے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ تخلیق کائنات، انسان کی پیدائش، آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت، حضرات انبیائے کرام کی بعثت، غرضیکہ خدا کی طرف سے اس قدر وسیع و عریض اور رفیع پروگرام کی غایت الغایات صرف یہ ہے کہ جیسا کچھ پہلے تھا پھر سے ویسا (As you were) ہو جائے۔ ایسا بے کار بے مقصد پروگرام کسی صورت میں بھی خدا کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ان تمام باطل تصورات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زندگی کی حرکت دَوری نہیں بلکہ "صراطی" ہے۔ زندگی کا کارواں سیدھے راستے پر گامزن ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس سفر کی غایت پھر سے وہیں پہنچ جانا نہیں جہاں سے آغازِ سفر ہوا تھا۔ اس کا مقصد اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے نقطۂ آغاز سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔

قرآنی نظریۂ حیات زندگی کا سفر دوری نہیں، ارتقائی ہے۔ اس تگ و تاز کا مقصد مصیبتوں سے چھٹکارا پا کر یا آلائشوں سے پاک اور صاف ہو کر پھر سے ویسا بن جانا نہیں، جیسا یہ پہلے تھا۔ اس کا مقصد پہلے سے کہیں زیادہ بہتر بن جانا، بلند مقام حاصل کرنا ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسانی زندگی کا مقصد نجات (یا SALVATION) نہیں بلکہ فوز (ACHIEVEMENT) قرار دیا ہے۔ قرآن کے تصور کی رو سے، انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں —— ذات ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہے وہ اجزاء میں بٹ ہی نہیں سکتی۔ جس شے سے اس کا کوئی جزو الگ ہو جائے وہ شے نامکمل رہ جاتی ہے۔ ناقص ہو جاتی ہے۔ اس سے وہ ذات ذات ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا انسانی ذات خدا کی ذات کا الگ شدہ حصہ نہیں۔ خدا نے انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ذات عطا کی ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اُسے نشوونما دیتے ہوئے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ منزل اُخروی زندگی میں سامنے آتی ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے جو صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا بتائی ہے تو اس سے اس نے انسانی زندگی کے منتہیٰ اور مقصود کے متعلق باطل نظریات کی بھی تردید کر دی ہے۔ اور انسان کے سامنے ایک مثبت تعمیری پروگرام بھی رکھ دیا ہے جو اُسے آگے بڑھاتے ہوئے بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" (۸۴/۱۹) تاکہ انسان درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف اُبھرتا چلا جائے۔ یہ ہے صراطِ مستقیم۔

خدا صراطِ مستقیم پر

سورۂ ہود میں ہے: اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱/۵۶) اس کے عام معانی تو یہی ہیں کہ خدا بھی صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے، لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پورا نظام کائنات قوانینِ خداوندی کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلتا ہوا ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں اس سیدھے اور متوازن راستے پر سب سے پہلے خدا کا رسول گامزن ہوتا ہے۔ اسی لئے حضورؐ کے متعلق فرمایا کہ "اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (۴۳/۴۳) تو بے شک صراط مستقیم پر چل رہا ہے۔ جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ تم یہ مسلک اختیار کرو کہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" ہم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کا آرزو مند بنایا گیا۔ اور ان دونوں کو ملا کر کہا گیا "اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ۔ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ" (۳/۵۰) اے رسولؐ ان سے کہدو کہ میرا اور تمہارا رب اللہ ہے۔ تم سب اسی کی عبدیت (محکومیت) اختیار کرو۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ صراطِ مستقیم خدا کی محکومیت اختیار کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ مجید کس طرح خود آپ اپنی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ صراطِ مستقیم (شاہراہِ اعظم) ایک ہی ہے۔ یہی وہ شاہراہِ عظیم ہے جس کی طرف تمام انبیائے کرام کی وساطت سے راہنمائی ملتی چلی آرہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے متعلق کہا ہے کہ یہ جگمگاتی ہوئی روشنی (نورِ مبین) ہے۔ یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۶)

سُبُل السلام کیا ہیں؟

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کے پروگرام کا اتباع کرتے ہیں، سُبُل السلام (سلامتی کے راستوں) کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ یہاں اس نے "سُبُل" کہا ہے جو سبیل کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں متعدد راستے یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صراطِ مستقیم ایک ہی ہے تو یہاں قرآنِ کریم نے سُبُل کیوں کہا؟ یہ نکتہ غور طلب ہے۔

الدین تو شروع سے ایک ہی چلا آتا ہے۔ لیکن اُسے عملاً متشکل کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں، اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق) طریق اور پروگرام مختلف رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر، خدا کی طرف سے عطا کردہ اصولی قوانین تو شروع سے غیر متبدل رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے زمانے کے تقاضوں (ضروریات) کے اعتبار سے بدلتے رہیں گے۔ انہی کو "سُبُل" کہا جائے گا۔ یعنی وہ پگڈنڈیاں جو آخرالامر شاہراہِ اعظم میں جا کر مل جاتی ہیں۔ اسی لئے اس آیت (۵/۱۶)

ہیں" سُبل السلام" کے بعد کہا: "وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ"۔ اس طرح خدا ان کی راہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کر دیتا ہے۔ یعنی دین کے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لیے جو طریقے بھی اختیار کئے جائیں ان کی غایت یہی ہو کہ وہ انسان کو اصل دین کی طرف لے جائیں۔

یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر چلنے کی آرزو قلبِ مومن میں موجزن ہوتی ہے۔ یہاں تک بات نظری سی تھی۔ اگلی آیت میں قرآن کریم اس کا مقصد اور نتیجہ محسوس شکل میں سامنے لاتا ہے، جب کہتا ہے کہ: "صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ"، یعنی وہ راستہ جس پر اس سے پہلے بھی اسی قسم کے انسان گامزن ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ......

(۱/۶) اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

۱/۶

جس صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کے لئے خدا سے دعا کی گئی تھی اب اس کی وضاحت محسوس انداز میں کی جا رہی ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ ان لوگوں کی راہ ہے جنہیں تو نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی جامع چیز ہے۔ یعنی ایسی چیز جس میں، دین پر عمل پیرا ہونے کے تمام نتائج اور ثمرات آجاتے ہیں، خواہ وہ اس دنیا میں حاصل ہوں اور خواہ اُخروی زندگی میں، لہٰذا نعمت کا صحیح صحیح قرآنی مفہوم سمجھ لینا نہایت ضروری ہے، کیونکہ یہی وہ محسوس معیار ہے جس سے یہ پرکھا جا سکے گا کہ ہمیں نعمائے خداوندی حاصل ہیں یا نہیں۔ اگر حاصل ہیں تو ہمارا ایمان، قرآنی میزان میں ایمان، اور ہمارے اعمال، اعمالِ صالح ہیں۔ اگر یہ حاصل نہیں تو جسے ہم ایمان اور عملِ صالحہ (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے الفاظ میں "خدا پرستی اور نیک عملی") کہہ کر اپنے دل کو جھوٹا اطمینان دلا لیں گے وہ خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں ہو گا۔

عربوں کے ہاں ایک پودا ہوتا ہے جسے وہ "تَنْعِيمَةٌ" کہتے ہیں۔ اس کے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ وہ پانی پر پیدا ہوتا ہے جس سے اس کی تر و تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس مادہ (ن۔ع۔م) میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ "اَلنَّعَمَةُ" اس عمارت کو کہتے ہیں جو پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہو۔ نیز کسی اونچے نشان یا جھنڈے کو بھی، جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے۔ ان معانی سے واضح ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور سرفراز ہونا، نعمت کا مظہر ہے۔ جن لوگوں کی زندگی اس قسم کی ہو گی انہیں "منعم علیہ" کہا جائے گا۔ یعنی وہ جنہیں خدا کی نعمتیں حاصل ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل قرآن کریم کی مختلف آیات میں ملے گی، جن میں چند ایک درج ذیل ہیں۔

منعم علیہ قومیں:

(۱) کسی قوم کا مستبد حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے رستگاری اور آزادی حاصل کر لینا خدا کی نعمت ہے۔ چنانچہ حضرت موسےٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے تمہیں نوزا۔ تم قومِ فرعون کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ تمہیں طرح طرح کے عذاب دیتے تھے۔ خدا نے تمہیں اس سے نجات دلائی۔ یہ اس کا بہت بڑا انعام تھا۔ (۲/۴۹-۴۷)

(۲) لیکن یہ صرف منفی پہلو ہے۔ یعنی کسی عذاب سے نجات حاصل کر لینا۔ اس کے بعد اس کا مثبت پہلو سامنے آتا ہے۔ اسی قومِ بنی اسرائیل کو اس کی ان الفاظ میں یاد دلائی گئی کہ: یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲/۴۷) اے قوم بنی اسرائیل! تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر افضلیت عطا فرمائی۔ بالفاظِ دیگر، منعم علیہ وہ قوم ہے جو اپنی ہم عصر اقوام میں نہایت ممتاز اور بلند و بالا مقام رکھتی ہو۔ یعنی دیگر اقوام کی ہمدوش ہی نہیں، بلکہ ان سے بہت آگے اور سر بلند۔ قرآنِ کریم نے جب اُمّتِ مسلمہ (جماعتِ مؤمنین) کے متعلق کہا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ——— (۳/۱۳۸) تو اس سے یہی مراد ہے یعنی تمام اقوامِ عالم سے بلند و بالا۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:

مومنے بالائے ہر بالا ترے ∴ غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

یہی وہ شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی تھی، جس کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق حضرت سلیمانؑ نے ان الفاظ میں مانگی تھی کہ: رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ (۲۷/۱۹)۔ اے میرے رب! مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جس سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوزا ہے۔

(۳) سورۃ "النحل" میں پہلے زندگی کے مختلف ساز و سامان کی تفصیل بیان کی گئی ہے — رہنے کے لئے مکانات اور خیمے، پہاڑوں میں محفوظ اقامت گاہیں۔ موسم کے اثرات

سے بچنے کے لئے لباس ۔ میدانِ جنگ میں حفاظت کے لئے زرہ بکتر وغیرہ وغیرہ)۔
اور اس کے بعد کہا گیا ہے: كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۱۶/۸۱)
اس طرح خدا نے تم پر اتمامِ نعمت کیا تاکہ تم اس کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہو۔
لہٰذا زندگی کی تمام ضروریات کا میسر آتے رہنا، خدا کی نعمت ہے۔

(۴) سورۃ لقمان میں اس حقیقت کو دو ایسے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کے اندر کائنات کی ہر شے سمٹ کر آجاتی ہے۔ فرمایا: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۱/۲۰) کیا تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں ـــــ ارض و سموات۔ میں جو کچھ ہے، خدا نے اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اس طرح تمہیں اپنی ظاہر و باطن کی نعمتوں کی فراوانیوں سے بہرہ یاب کیا۔

(۵) سورۃ ابراہیم میں تسخیرِ ارض و سما کے تفصیلی بیان کے بعد کہا کہ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴/۳۲-۳۴)
نعمائے خداوندی اس قدر لاتعداد ہیں کہ گنتی و شمار میں نہیں آسکتیں۔ تم دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ زندگی کی برومندی، استحکام اور سرفرازی کے لئے جس جس ساز و براق کی تمہیں ضرورت تھی، خدا نے وہ سب تمہارے لئے مہیا کر دیا۔ یہ سب نعمائے خداوندی ہیں۔

(۶) یہ تو رہا انسان کی طبیعی زندگی کا ساز و سامان ۔ لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) انسان صرف طبیعی زندگی ہی سے عبارت نہیں ۔ اس کی، اس کے علاوہ انسانی زندگی بھی ہے جس کی نشو و نما، ان اقدار کی رُو سے ہوتی ہے جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔ سورۃ مریم میں مختلف انبیائے کرامؑ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ (۱۹/۵۸) یہاں نبوت کو بھی نعمتِ خداوندی قرار دیا گیا ہے، اگرچہ یہ وہ نعمت ہے جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں نہیں ملتی تھی۔ بلکہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ یہ وہ نعمتِ خداوندی ہے جس کا اتمام قرآن کریم میں آکر ہو گیا۔ جہاں کہا کہ: وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (۵/۳)

بنا بریں اب تمام نوعِ انسان قیامت تک وحی کی نعمت سے بذریعہ قرآن کریم بہرہ یاب ہو سکیں گے۔ یہ نعمت (وحی) نہ کسی دوسری جگہ موجود ہے اور نہ ہی رسول اللہؐ کے بعد کسی اور کو مل سکتی ہے۔ غیر متبدل اور محفوظ کتاب اللہ کی موجودگی میں مزید وحی کی ضرورت کیا ہے؟

(۷) جو لوگ اس نعمت (قرآن کریم) سے بہرہ یاب ہوتے ہیں ان کی اوّلین نشانی یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوتا۔ ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ:

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (۳/۱۰۲)

(اے جماعتِ مومنین) تم خدا کی طرف سے عطا کردہ اس محکم سہارے کو، سب مل کر اجتماعی طور پر، ایک جماعت بن کر تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔ تم خدا کی نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے تمہیں سرفراز فرمایا، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے (تمہیں محض ظاہرا طور پر متحد نہیں کیا بلکہ) تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیا۔ اور اس طرح تمہیں آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اس طرح خدا اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم صحیح راستہ پر چلتے رہو۔"

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ خدا نے کس کس چیز کو اپنی نعمت کہا ہے اور وہ منعم علیہ لوگ کونسے

ہیں جو خدا کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم پر رواں رواں، ہم سے آگے گئے ہیں اور جن کے راستہ پر چلنے کی ہمیں دعا سکھائی گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ نعماءِ خداوندی محض دعائیں مانگنے سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایمان و اعمالِ

نعماءِ خداوندی کام کرنے سے ملتی ہیں

صالحہ کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔ (بجز نبوت کے، جو وہبی طور پر ملتی تھی) قرآن کریم کی رو سے سفرِ زندگی میں جنت وہ مقام ہے، جہاں یہ نعماءِ خداوندی اپنی بلند ترین شکل میں متشکل ہو جاتی ہیں۔ اس جنت کے متعلق کہا۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (۳۹/۷۴) کام کرنے والوں کا کس قدر نعمت نشان معاوضہ ہے، جس سے انہیں نوازا گیا ہے۔ سورۃ "النسآء" میں اس کے حصول اور استبقا کے لئے ایک تفصیلی پروگرام دیا گیا ہے جسے ہم اس کے مقام پر سامنے لائیں گے۔ یہاں اتنا کہدینا کافی ہے کہ ان "منعم علیہ" حضرات کی رفاقت "نظامِ خداوندی" کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ (۴/۶۹-۷۰)

اس سلسلہ میں اگلی بات یہ ہے کہ ان نعمائے خداوندی کا حاصل ہو جانا ہی مقصود بالذات نہیں۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان نعماء کا استعمال کس طرح سے کیا جاتا ہے۔ اگر انہیں اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف میں لایا جائے تو اسے "شکرِ نعمت" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر ان کے خلاف استعمال کیا جائے تو قرآن کریم اسے "کفرانِ نعمت" کہکر پکارتا ہے۔

انہیں کس طرح استعمال کیا تھا؟

اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ "ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نعماءِ خداوندی کو کس طرح استعمال کیا تھا" ـــــ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (۱۰۲/۸)

اگر ان نعمائے خداوندی کو غلط (غیر قرآنی) طریقہ پر صرف میں لایا جائے تو یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سورۃ "النحل" میں ہے کہ "خدا اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرنا چاہتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے رہنے والوں کو امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی۔ رزق کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کی طرف چاروں طرف سے کھنچا چلا آتا تھا۔" فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۲) اس قوم نے ان نعمائے خداوندی سے کفر برتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ یہ عذاب کہیں باہر سے نہیں آیا تھا، خود ان کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ تھا یعنی ان کے خود ساختہ نظام کا نتیجہ۔"

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کو کفر سے بدل دیا اور یوں اپنی قوم کے قافلہ کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اِس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہ تھا ـــــ یعنی جہنم میں ـــــ کس قدر تباہ کن تھا وہ مقام، جہاں اس قوم کے لیڈر انہیں لے گئے (۱۴/۲۸-۲۹) لیکن

اس کے ذمہ دار قوم کے لیڈر ہی نہیں ہوتے، ساری کی ساری قوم اس کی ذمہ دار ہوتی ہے. کیونکہ قرآن کریم نے اس باب میں اصول یہ بتایا ہے کہ:

نفسیاتی تبدیلی

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۵۳) ذ (۱۳/۱۱)-

یہ اس لئے کہ جو نعمتیں کسی قوم کو حاصل ہوں، خدا ان میں کبھی تغیر نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر ذہنی اور نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی. یاد رکھو اللہ کے فیصلے یونہی اندھا دھند نہیں ہوتے. وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ نعمتوں کے ملنے اور ان کے چھن جانے کی بنیادی شرط اس قوم کی نفسیاتی تبدیلی ہے۔ اگر یہ تبدیلی، خدا کی راہنمائی کے مطابق صحیح سمت کی طرف ہوئی ہے تو اسے ایمان کہا جائے گا۔ یعنی ایمان کا نتیجہ ہوگی — اور اگر یہ غلط سمت کی طرف ہوئی ہے تو اُسے کفر کہہ کر تعبیر کیا جائے گا۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ خدا کے بندے (گروہِ مومنین) خدا کے حضور اس امر کا اقرار اور اعتراف کرتے ہیں کہ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ. ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں خدا کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے: وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۴) اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ تم خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہو، تو اس کا عملی ثبوت یہ ہوگا کہ تم خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے قوانین کے مطابق صرف کرو۔ اس سے یہ حاصل شدہ نعمتیں بھی برقرار رہیں گی اور ان میں نت نئے اضافے بھی ہوتے چلے جائیں گے۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ (۱۴/۷) جب تیرے رب نے اس امر کا اعلان کیا کہ اگر تم نے شکرِ نعمت کیا تو ہم ان نعماء میں اضافہ کرتے جائیں گے لیکن اگر کفرانِ نعمت کیا تو اس کی سزا بڑی سخت ہوگی۔ یہ سزا کیا ہوگی، اس کی تفصیل اگلی آیت میں دیدی گئی۔

۱/۷

(۷) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ہمارے ہاں سورۃ فاتحہ کی آیات "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ "دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔ نہ ان کی جن پر تیرا غضب ہوا یا جو گمراہ ہوئے"۔ بظاہر اس ترجمہ میں کوئی بات قابلِ اعتراض دکھائی نہیں دیتی، لیکن ذرا بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو اس سے خدا کے متعلق بڑا غلط تصور سامنے آتا ہے۔ جب ہم خدا

غلط ترجمہ

سے عرض کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جن پر تیرا انعام ہوا. یعنی منعم علیہ افراد و اقوام کی راہ. تو یہاں تک بات صاف اور واضح ہوتی ہے. لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں " نہ ان لوگوں کی جن پر تیرا غضب ہوا یا گمراہ ہوئے" تو اس سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ خدا ان لوگوں کی راہ کی طرف بھی راہنمائی کر دیا کرتا ہے جو مغضوب علیہ یا گمراہ ہیں. خدا کے متعلق یہ تصور، کہ وہ ان لوگوں کے راستے کی طرف بھی راہنمائی کر دیتا ہے، بڑا قابلِ اعتراض ہے. خدا اس سے بلند و بالا ہے کہ اپنے بندوں کی راہنمائی مغضوب علیہ اور گمراہ قوموں کے راستے کی طرف کر دے. قرآن کریم کی بعض آیات سے بعض لوگ اس قسم کا مفہوم لے لیتے ہیں کہ " خدا جسے چاہے ہدایت دیدیتا ہے. اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے" ان آیات کا یہ مفہوم صحیح نہیں. ان کا صحیح مفہوم ان مقامات پر سامنے آئے گا جہاں یہ آیات آئی ہیں. یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ انسان ہدایت یا گمراہی خود حاصل کرتا ہے. لیکن چونکہ یہ حاصل ہوتی ہے خدا کے متعین کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق، اس لئے اس کی نسبت خدا کی طرف کر دی جاتی ہے (تفصیل ان امور کی میری تصنیف "کتاب التقدیر" میں ملے گی). مندرجہ بالا آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت کا سامنے رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنے حقائق اور معارف کو اضداد کے ذریعے بھی واضح کرتا ہے اور یہ طریق بڑا دلنشین اور مؤثر ہوتا ہے. مثلاً وہ "ظلمت اور نور"، ظل (سایہ) اور حرور (دھوپ) یا اعمیٰ (نابینا) اور بصیر (بینا) جیسے متضاد الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اپنا مفہوم واضح کرتا ہے. یہی انداز اس نے مندرجہ بالا آیات میں اختیار کیا ہے. ان کے صحیح معانی یہ ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جو منعم علیہ تھے. مغضوب علیہ اور ضالین نہیں تھے. یعنی وہ ایسے تھے، ایسے نہیں تھے. یوں اضداد سے (BY CONTRAST) مفہوم واضح تر ہو گیا.

اضداد سے وضاحت

مَغْضُوْبُ عَلَیْهِ

غضب کا مفہوم

لفظ غضب کے بنیادی معنوں میں شدت، قوت، حرارت، غلبہ، استیلا اور گرفت کی محکمیت پائی جاتی ہے. جب یہ لفظ انسانوں کے لئے بولا جائے گا تو اس میں غصہ اور غضب آلود جذبات کا ہیجان مقصود ہوگا. لیکن اللہ تعالیٰ انسانی جذبات سے بلند اور منزہ ہے. اس لئے جب اس (لفظ) کی نسبت خدا کی طرف کی جائیگی تو اس سے مراد خدا کے قانونِ مکافات کی محکم گرفت ہوگی. وہی مفہوم جو (مثلاً) اس قسم کی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ: اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵/۱۲). خدا کی گرفت بڑی شدید ہوتی ہے یا: فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (۷۳/۱۶). ہم نے اُسے (فرعون کو) بڑی محکم گرفت میں لے لیا. یہی مفہوم خدا کے غضب کا بھی ہے. یعنی وہ تباہی اور بربادی جو اس کے اٹل قانونِ مکافات کی رو سے واقع ہوتی ہے.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے یہاں " اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ " کا مفہوم اس کی ضد کو سامنے لا کر واضح کیا گیا ہے (مثلاً) جب خدا کی ان نعمتوں کا ذکر کیا گیا تھا جن سے قومِ بنی اسرائیل بہرہ یاب ہوئی تھی، تو ان کے متعلق کہا تھا کہ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (۲/۴۷) "ہم نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کی۔ لہٰذا اقوامِ عالم پر فضیلت خدا کی نعمت ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اس راستے کو چھوڑ دیا جس پر چلنے سے یہ سرفرازی حاصل ہوئی تھی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱) ان پر ذلت و مسکنت کا عذاب نازل ہو گیا اور یہ خدا کا غضب تھا۔ دوسری جگہ اسے " ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" (۷/۱۵۲) سے تعبیر کر کے یہ واضح کر دیا کہ ذلت و پستی ان پر اسی دنیا کی زندگی میں طاری ہو گئی تھی۔

ذِلّت و مسکنت

ذِلّت کا لفظ ہر قسم کی محتاجی، کمزوری، محکومی، بے کسی، بے بسی، بیچارگی، درماندگی اور پستی کے معنوں میں آتا ہے۔ وہاں " افضلیت " تھی اور یہاں " ذلت اور پستی "۔ اس سے انعامِ خداوندی اور غضبِ الٰہی کا مفہوم واضح ہو گیا۔

دوسرا لفظ مسکنت ہے۔ زندگی حرکت اور حرارت کا نام ہے۔ یعنی شاہراہِ حیات پر مسلسل، رواں، دواں چلتے رہنے کا نام۔ اسی کو سعیِ پیہم یا جد و جہدِ دوام کہا جاتا ہے۔ جو قوم کسی مقام پر رُک کر کھڑی ہو جائے، وہ زندگی کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ جامد قوم ایک مقام پر کھڑی ہی نہیں ہوتی، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ پیچھے ہٹ رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ چلنے والی قومیں اس سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا مسکنت کسی قوم کی ایسی حالت کا نام ہے، جہاں وہ آگے بڑھنے سے رُک جائے۔ قرآنِ کریم میں جہنم کو جحیم بھی کہا گیا ہے (۵/۱۰) اور جحیم کے معنے ہوتے ہیں، راستے کی روک۔ ہم پہلے، خدا کے اس بیان فرمودہ ابدی اصول کو دیکھ چکے ہیں کہ جو نعمتیں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ ان سے کبھی نہیں چھنتیں جب تک وہ قوم اپنی نفسیاتی (داخلی) دنیا میں تغیر پیدا نہ کرے۔ لہٰذا جو قوم کسی ایک مقام پر رُک جاتی ہے اس سے

فکری جمود

یہی مراد نہیں کہ اس کے پاؤں چلنے سے رُک جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس میں فکری جمود پیدا ہو جاتا ہے، وہ سمجھنا سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ وہ یہ کہہ کہ اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہے کہ زندگی کے حقائق اور مسائل کے متعلق جو کچھ سوچا جانا تھا وہ سوچا جا چکا۔ سفرِ زندگی میں جس قدر مسافت طے کرنی تھی وہ طے کی جا چکی۔ یہی ہماری آخری منزل اور منتہائے مقصود ہے۔ اس کے لئے ان کے پاس سند صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ وہ مسلک ہے جسے ہمارے آباؤ اجداد (اسلاف) نے اختیار کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس عقیدہ کی تردید کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ ایسی قوم موردِ غضبِ الٰہی ہو جاتی ہے، مثلاً سورۃ اعراف میں، قومِ عاد کے متعلق

ہے کہ جب ان کے پیغمبر، حضرت ہودؑ نے، انہیں خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے اسلاف کا مسلک چھوڑ دیں۔ اس کے جواب میں حضرت ہودؑ نے کہا کہ تمہاری یہ روش اور اس پر قائم رہنے کی ضد اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ۔ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ (۷/۷۱) تم پر خدا کا غضب اور رجس نازل ہو چکا ہے (رجس کا مفہوم اپنے مقام پر بتایا جائے گا) جن معبودانِ باطل کا تم ذکر کرتے ہو، جن نظریات و معتقدات کو تم حق وصداقت کی تعلیم کہہ کر پکارتے ہو، اُن کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ۔ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۷/۷۱) یونہی کچھ نام ہیں جو تمہارے اسلاف، یا اب تم نے خود رکھ لئے۔ ان کے حق وصداقت ہونے کی کوئی سند خدا نے نازل نہیں کی۔ اس تنبیہ و تنذیر کے باوجود وہ اپنی ضد پر اڑے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۷/۷۲) اُس قوم کی جڑ کٹ گئی کیونکہ، بجائے اس کے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرتے، انہیں جھٹلاتے رہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مغضوب علیہ قوم زندگی کی تمام شادابیوں اور سرفرازیوں سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کے شجرِ حیات کی جڑ تک کٹ جاتی ہے۔

منعم علیہ قوم کی ایک علامت یہ بھی بتائی گئی تھی کہ۔ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (۳/۱۰۲) اس قوم کے افراد کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان میں باہمی محبت و الفت انتہا تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس،

باہمی قتال غضبِ خداوندی ہے

قرآن کریم نے کہا کہ اگر کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ ایکدوسرے کا گلا کاٹنے لگ جائیں تو ان پر خدا کا غضب نازل ہو جاتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳) یاد رکھو! جو مومن اپنے کسی بھائی کو بالارادہ قتل کر دے تو سمجھ لو کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت وارد ہوگی اور یوں وہ بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔

سخط اللہ

قرآن کریم میں ایک لفظ (سخط) بھی آیا ہے جو قریب قریب غضب کا مرادف ہے۔ جس مقام پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات مکمل ہوتا ہے اور اس کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ اس پورے کے پورے ضابطہ کی اطاعت کی جائے۔ یعنی ایسا نظام متشکل کیا جائے جس میں تمام معاملات اسی ضابطہ کے مطابق طے ہوں۔ اگر ایسا ہو کہ بعض معاملات

کے فیصلے ضابطۂ خداوندی کے مطابق کئے جائیں اور بعض کے اپنے وضع کردہ قوانین یا دوسری قوموں کے ضوابط کے مطابق، تو اس ثنویت کا نتیجہ ذلّت اور خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے (۲/۸۵)) ۔ ایسی قوم کے متعلق کہا کہ وہ مغضوب علیہ ہوتی ہے۔ اسی کی وضاحت دوسری جگہ یہ کہکر کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے واضح ہدایت آجانے کے بعد پھر اپنی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاتے ہیں (اسے ارتداد کہا جاتا ہے) یعنی وہ بعض معاملات میں ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگ جاتے ہیں جن پر ضابطۂ خداوندی گراں گزرتا ہے۔ ان کا انجام بڑا الم انگیز ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۔ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۲۵-۲۸) یہ اس لئے کہ وہ، بجائے اس کے، کہ قوانینِ خداوندی کی کامل ہم آہنگی اختیار کریں، اس روش پر چل نکلتے ہیں جو غضبِ خداوندی کا موجب ہوتی ہے یعنی یہ بعض امور میں ان لوگوں کی اطاعت اختیار کر لیتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس سے ان کے تمام اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کے آخری الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ "بعض امور میں" غیر خداوندی قوانین کا اتباع کرتے ہیں۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جن امور میں وہ ضابطۂ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں ان کا بدلہ تو انہیں ملنا چاہیئے۔ یعنی ان کے تمام اعمال تو ضائع نہیں جانے چاہئیں۔ یہ شبہ سطح بینی پر مبنی ہے۔ اگر آپ بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام کی تمام سعی و عمل رائیگاں چلی جاتی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ اگر آپ کسی طبیب کے علاج کے سلسلہ میں یہ کریں کہ بعض اجزا تو اس کے نسخے کے لے لیں اور بعض اجزا کسی ڈاکٹر کے نسخے کے، تو آپ سوچئے کہ کیا یہ مختلف اجزا اپنا اپنا نتیجہ مرتب کریں گے یا آپ کی ساری کوشش ہی رائیگاں چلی جائے گی ؟ زندگی کا نظام اسی صورت میں صحیح نتائج مرتب کرتا ہے، جب اس کے تمام اجزا، صحیح، خالص، متناسب اور اپنے اپنے مقام پر فٹ ہوں، اور ان میں کسی قسم کی آویزش یا آلائش نہ ہو (اسے توحید کہا جاتا ہے)۔ اگر اس نظام میں کسی دوسرے نظام کے اجزاء کا پیوند لگایا جائے تو اس قسم کا مخلوط نظام کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی پیوند سازی یا آمیزہ کو "شرک" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دین توحید پر مبنی نظام کا نام ہے۔ مذہب میں انسانی نظریات، معتقدات، مشارب و مسالک کی آمیزش کر دی جاتی ہے۔ اس لئے مذہب پرست قوم کے اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ وہ مذہب کی متعین کردہ رسوم و واجبات کی ادائیگی میں بڑی جانگسل مشقتیں اٹھاتی

اور صعوبت انگیز اور صبر آزما محنتیں کرتی ہے۔ لیکن ان کا کوئی تعمیری نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا، بلکہ وہ دن بدن ذلت اور پستی کے گڑھوں میں گرتی چلی جاتی ہے۔ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶ نیز ۳۱/۴۵ ز ۴۰/۱۲ ز ۴۳/۲۶) وہ ایمان لانے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ دینِ خالص میں تو ذرا سی بھی غیر اللہ کی آمیزش ہو جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے۔

دعوائے ایمان کے باوجود شرک

قرآن کریم نے مغضوب علیہ اقوام کی اور بھی علامات بتائی ہیں لیکن اس مقام پر بغرضِ اختصار ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ جب وہ آیات سامنے آئیں گی تو ان کی وضاحت بھی کر دی جائے گی۔ لیکن آخر میں ہم ایک ایسی علامت کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں جس نے ہمارے زمانے میں خاص طور پر اہمیت حاصل کر رکھی ہے، اور وہ ہے معاشی نظام۔ قرآن کریم نے بھوک کو خدا کا عذاب بتایا ہے (۱۶/۱۱۲) لیکن دوسری طرف اس نے یہ بھی کہا ہے کہ۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (۲۸/۵۸) بہت سی ایسی قومیں بھی تباہ ہو گئیں جنہیں بہت زیادہ معاشی فراوانیاں حاصل تھیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب معاشی تنگی خدا کے غضب اور عذاب کی علامت ہے تو معاشی فراوانی کس طرح تباہی کا موجب قرار پا سکتی ہے؟ بات واضح ہے۔ کسی قوم کی خوشحالی کا موجب وہی معاشی نظام ہو سکتا ہے جس میں تقسیمِ رزق میں توازن ہو۔ جس نظام میں یہ توازن بگڑ جائے اس میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ قوم کا ایک طبقہ بھوک اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسرے طبقہ کو سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ تقسیمِ رزق کے اس عدمِ توازن کا لازمی نتیجہ، اس نظام کی تباہی اور اس قوم کی بربادی ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن کریم نے اسے کس طرح خدا کے غضب کا موجب بتایا ہے اس نے کہا ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى (۲۰/۸۱) تم خدا کے عطا کردہ رزق کو حلال اور طیب طریق سے کھاؤ۔ ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے تقسیمِ رزق غیر متوازن ہو جائے [وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ کا یہ مفہوم سورۃ "الرحمٰن" کی اس آیت سے واضح ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (۵۵/۸) تم میزان (ترازو) میں عدمِ توازن نہ پیدا کرو] اگر ایسا کرو گے تو خدا کے غضب میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور اسے اچھی طرح سن لو کہ جو قوم خدا کے غضب میں مبتلا ہو جائے وہ ذلتوں اور پستیوں کے عمیق غاروں میں گر کر تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ (معاشی نظام کے متعلق تفصیلی بحث اپنے مقام پر کی جائے گی)۔

معاشی عدمِ توازن

قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ تم ایسی روش اختیار نہ کرو جس سے تم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے۔ اس نے یہ بھی

کہا ہے کہ مغضوب علیہ لوگوں کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات بھی وابستہ نہ کرو۔ سورۃ مجادلہ میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۔ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ (۵۸/۱۴) کیا تم نے ایسے لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو ان لوگوں سے دوستدارانہ تعلقات وابستہ کرتے ہیں جو خدا کے غضب میں ماخوذ ہیں حالانکہ ان دونوں میں کوئی چیز بھی قدر مشترک نہیں۔ دوسری

مغضوب علیہ سے دوستداری

جگہ جماعت مومنین کو اس سے یہ کہہ کر روک دیا کہ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۶۰/۱۳) اے جماعت مومنین! تم ان لوگوں کو اپنا دوست مت بناؤ جو غضب خداوندی کے مورد ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جب ایک عبد مومن اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے کہ میں کہیں ان لوگوں کے راستے پر گامزن نہ ہو جاؤں جو مغضوب علیہ ہیں تو اس سے اس کا مقصود کیا ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم کا اس باب میں منشا کیا ہے اس کے بعد اس آیت کا اگلا ٹکڑا لیجئے۔ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔

(۱/۷) وَلَا الضَّآلِّيْنَ

قرآن کریم جس طرح منعم علیہ کے مقابلے میں مغضوب علیہ لایا ہے، اسی طرح اس نے ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے معنی حیران و پریشان ہونا، یا سرگرداں پھرنا ہیں۔ نیز کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا، مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے، جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے۔ چونکہ صحرا میں راستہ کھو دینے والا اپنی تمام تگ و تاز کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اس لئے محنت اور کوشش کے ناکام رہ جانے اور رائیگاں چلے جانے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسے سورۃ کہف میں ضَلَّ سَعْيُهُمْ (۱۸/۱۰۴) آیا ہے۔ یعنی ان کی تمام کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ غلط راستے پر چلنے والا اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے، اس لئے سراب کو "اَلْمُضِلُّ" کہا جاتا ہے۔

ایک، ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے، اپنی بصیرت کی بنا پر اسی نتیجہ پر تو پہنچ جاتا ہے کہ اس کا معاشرہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ صحیح نہیں، لیکن صحیح راستہ اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ اس سے اس کے دل میں تلاش حقیقت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ صحیح راستہ کی جستجو میں سرگرداں پھرتا ہے، تا آنکہ اُسے خدا کی طرف سے صحیح راہنمائی مل جاتی ہے۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق جو آیا ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷)۔ ہم نے تجھے تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو تیری راہنمائی صحیح راستہ کی طرف کر دی[1]۔ یہ بات تو ایک نبی کے متعلق کہی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر متلاشی حقیقت کو یہی طریق

[1] واضح رہے کہ نبوت، ہونے والے نبی کی ان فکری کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتی وہ تو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی جس میں انسانی کسب ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ جسے نبوت کے لئے منتخب کیا جاتا تھا وہ کس طرح از خود حاضر و موجود سے غیر مطمئن ہوتا تھا

تلاشِ حقیقت میں سرگردانی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے معاشرہ (یا دنیا) کے مروجہ نظریات و مسالک سے (بلاتحقیق و تفتیش) مطمئن ہو جاتا ہے تو نہ اس کے دل میں صحیح روشِ زندگی کی تلاش کے لئے تڑپ پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی وہ صحیح راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ہر موجود کو غور و فکر سے پرکھنا نہایت ضروری ہے۔ عصرِ حاضر کے مشہور فلاسفر (WHITE-HEAD) نے کہا ہے کہ اپنے دور کے مروجہ معتقدات و نظریات کو علیٰ حالہ تسلیم کر کے ان پر جم کر بیٹھے رہنا بُت پرستی ہے۔[1] یہ عجیب بات ہے کہ خود عربوں کے ہاں بھی بت پرستی میں یہ مفہوم مضمر تھا۔ ان کی زبان میں بُت کے لئے "وثن" کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا اور "وثن" کے معنی ہیں غیر متحرک اور جامد۔ اسی کو تقلیدِ جامد کہا جاتا ہے۔ اس روش کا پیرو کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتا اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے زبندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

تقلید کی تباہ کاریاں قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ کبھی صحیح راستہ پر نہیں چل سکتے ان کا مآل جہنم ہوتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷/۱۷۹) دنیا میں تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جن کی روش یہ بتا رہی ہو گی کہ وہ جہنمی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کونسے لوگ ہیں جن کی روشِ زندگی ان کے جہنمی ہونے کی غماز ہوتی ہے؟ فرمایا۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (ایضاً)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سینے میں دل (سمجھنے سوچنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں لیکن اس سے غور و فکر کا کام نہیں لیتے۔ جن کی آنکھیں ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں جن کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (ایضاً) یہ لوگ انسانی نہیں، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ حیوانوں سے بھی پست سطح پر، کیونکہ حیوان عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (کہ انہیں اس کی صلاحیت ہی نہیں دی گئی) تو کم از کم اپنی جبلت کے مطابق تو زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے برعکس یہ یہ لوگ اپنے مقام سے بھی بے خبر ہوتے ہیں اور منزلِ مقصود کی طرف سے بھی غافل۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے نبی اکرمؐ سے کہا کہ تم نہ مُردوں کو سُنا سکتے ہو اور نہ ایسے لوگوں کو، جن سے تم کچھ بات کرنا چاہو تو وہ منہ پھیر کر چل دیں اور بات سننا ہی نہ چاہیں۔ نہ ہی تم اندھوں کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کر سکتے ہو۔ فَاِنَّكَ

---

[1] ADVENTURES OF IDEAS

لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ (۳۰: ۵۲-۵۳)

عقل و فکر سے کام لینے والوں کو قرآن کریم نے اصولی طور دو شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ، جو زندگی کے دوراہے پر پہنچ کر یہ دیکھنے کی ضرورت سمجھیں کہ انہیں کس راستہ کی طرف مڑنا چاہیئے، نہ کسی سے ایسا پوچھنے کی حاجت جس راستہ پر ہجوم چلا جا رہا ہو، وہ بلا سوچے سمجھے، انہی کے پیچھے ہولیتے ہیں۔ سند اس کی، ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ وہ راستہ ہے جسے ہمارے اسلاف نے اختیار کیا اور وہ ہم تک متواتر چلا آرہا ہے۔ قرآن کریم ان کے متعلق کہتا ہے کہ جب وہ اس راستے پر چلتے چلتے جہنم میں جا پہنچیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا تھا تو وہ کہیں گے۔ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷) اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہمارے ان بڑے بڑے بزرگوں، مذہبی راہنماؤں اور لیڈروں نے گمراہ کیا اور ہمیں صحیح راستہ سے بھٹکا دیا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو صحیح راستہ کو جانتے تو ہیں لیکن ان کی مفاد پرستیاں انہیں اس راستہ پر آنے

جذبات سے مغلوب

نہیں دیتیں۔ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل و فکر اور علم و بصیرت ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے:

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ" (۴۵/۲۳)

کیا تو نے ایسے شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات اور جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی سماعت اور بصیرت پر مہریں لگ گئیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور یوں وہ علم و عقل رکھنے کے باوجود غلط راستہ پر چل نکلا۔ جو شخص اس طرح غلط راستہ پر گامزن ہو جائے اس کے صحیح راستہ کی طرف آ جانے کا طریق اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر خدا کی راہنمائی اختیار کرے۔

واضح رہے کہ [جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے دیکھئے آیت (۴)] انسانی خواہشات اور جذبات، قابلِ نفرت نہیں ان کا غلط استعمال انسان کو تباہ کر دیتا ہے، اگر انہیں خدا کی راہنمائی کے تابع رکھا جائے تو ان سے عظیم تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ

سورۃ قصص میں کہا گیا ہے کہ۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ جو شخص خدا کی راہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے۔

نظامِ جمہوریت کی ضلالت

ہمارے زمانے میں گمراہی کی ایک اور شکل بھی ہے، جو اس وقت ساری دنیا میں عام ہو رہی ہے اور اسے عصرِ حاضر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ روش ہے جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اسی کا اتباع کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم، اس کے برعکس کہتا ہے کہ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۱۶) اگر تو انسانوں کی اکثریت کا اتباع کرے گا تو وہ تجھے خدا کی طرف لے جانے والے راستے سے گمراہ کر دے گی۔ یہ لوگ ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاسات پر چلتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۶/۱۱۸) غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار صرف خدا کی راہنمائی ہے۔ یہی وہ راہنمائی ہے جس کے متعلق نوعِ انسان سے کہا گیا تھا کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) جو میری راہنمائی کا اتباع کرے گا تو نہ وہ صحیح راستہ سے بھٹکے گا اور نہ ہی جگر پاش مشقتوں میں مبتلا ہو کر سعادتوں سے محروم رہ جائے گا۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ جب دو چیزیں اس طرح آپس میں مل جائیں کہ انہیں الگ الگ کرنا ممکن نہ رہے تو اُسے بھی ضلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ دیکھئے آیت (۲/۱)] جب حضرات انبیائے کرامؑ کا پہنچایا ہوا دینِ خداوندی، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں تلبیسِ حق و باطل کی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کا الگ الگ کرنا تو ایک طرف، ان کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر، جس طرح ایک فریب کار گوالا پانی ملے ہوتے دودھ کو خالص دودھ کہہ کر بیچتا ہے، مذہبی کاروبار کرنے والے مذہب کی

مذہب کو دین بتا کر بیچنے والے

خود ساختہ متاعِ کاسد کو دین کا زرِ خالص بتا کر بیچتے اور اس کی بڑی بڑی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۳۱/۶) یہ لوگ اپنے وضع کردہ افسانوں اور خواب آور داستانوں سے لوگوں کو مبتلائے فریب رکھتے ہیں تاکہ انہیں خدا کے راستے سے گمراہ کئے رکھیں۔ یہ ہوتے تو ہیں جاہل لیکن اپنے آپ کو بہت بڑے عالم کہہ کر لوگوں کے مقتدا بن جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ روٹی کی خاطر کرتے ہیں۔ جس خود ساختہ مذہب کو وہ دین کا نقاب اوڑھا کر پیش کرتے ہیں وہ بڑا مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ نتیجہ

بہ کہ دنیا اس حقیقی دین ہی کو، جس کی طرف یہ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں، مذاق سمجھنے لگ جاتی ہے۔ جو قوم دین کے ساتھ اس قسم کا کھیل کھیلے وہ بڑے ہی ذلّت آمیز عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

آپ اقوامِ عالم پر چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس قدر کوئی قوم "مذہب" میں ڈوبی ہوئی ہوگی وہ اسی قدر جاہل اور پسماندہ ہوگی۔ یہی خدا کا عذاب ہے۔ "مذہب" توہّم پرستیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور توہّم پرستی کا لازمی نتیجہ نکبت اور زبوں حالی۔

ہم نے سابقہ صفحات میں "مغضوب علیہ" کی تشریح کو قرآنِ مجید کی اس آیت پر ختم کیا تھا جس میں غیر متوازن معاشی نظام کا نتیجہ جہنم بتایا گیا تھا۔ ضلالت کے سلسلہ میں بھی ہمارے سامنے ایک ایسی ہی آیت آتی ہے، سورۂ یٰسین میں ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (۳۶/۴۷) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ رزق ہوتا ہے جب

رزق خدا کے ہاتھ میں ہے؟

ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس فاضلہ رزق کو ان لوگوں کے لئے کھلا رکھو جنہیں اس کی احتیاج ہے، تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم ہمیں کس قدر غلط راستہ اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہو۔ خدا نے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ جو لوگ مفلس اور نادار ہیں وہ مشیّتِ خداوندی کی رو سے ایسے ہیں۔ خدا چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ ایسے رہیں۔ اب یہ کہنا کہ ان کے افلاس اور ناداری کو ختم کرنے کے لئے ہم انہیں فاضلہ رزق دیدیں، خدا کے خلاف جنگ کرنے کے مرادف ہے۔ اگر خدا چاہتا تو انہیں خود ہی رزق دیدیتا۔ قرآن کے الفاظ میں۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (۳۶/۴۷) خدا کی طرف سے ان کے اس اعتراض کا جواب یہ ملتا ہے۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ایضاً) ان سے کہو کہ تم کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ خدا کسی کو براہِ راست رزق نہیں دیا کرتا۔ رزق کی تقسیم اسلامی نظام کے ہاتھوں سے ہوتی ہے، اور وہ نظام جس میں اس قسم کی طبقاتی تفریق نہیں رہتی، خدا کی راہنمائی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یہ منعم علیہ لوگوں کی راہ ہے۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں قرآن کے معاشی نظام کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے جب جماعتِ مومنین کو یہ دعا سکھائی تھی کہ ہم ان لوگوں کے راستے پر نہ چلیں جو ضآلّین ہیں تو اس سے کیا مقصود تھا۔ اسی بنا پر اس نے تاکید کی۔ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (۵/۷۷)۔ تم ان لوگوں کے جذبات کا اتباع مت کرنا جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور اس طرح یہ تابع اور متبوع، دونوں، خدا کی طرف لے جانے والے سیدھے اور متوازن راستہ سے بھٹک گئے۔

یہ کوئی خاص قومیں نہیں

تصریحاتِ بالا سے یہ بھی واضح ہے کہ مغضوب علیہ اور ضاآلین سے مراد کوئی خاص قومیں نہیں۔ اس کا اطلاق ان تمام قوموں پر ہوگا جو غلط راستوں پر چلنے کی وجہ سے نعمائے خداوندی سے محروم ہوگئیں اور اسطرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جاگریں، خواہ وہ زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے کی قومیں تھیں، خواہ خود اُس زمانہ کی قومیں، اور خواہ قیامت تک آنے والی قومیں۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر سمجھا اور سمجھایا یہ گیا ہے کہ مغضوب علیہ یہودیوں کی قوم ہے اور ضاآلین سے مراد عیسائی ہیں۔ ہم نے اس طرح اپنے آپ کو فریب دے دیا کہ مغضوب علیہم اور ضاآلین اور قومیں ہیں۔ ہمارا شمار ان میں نہیں ہوتا۔ اتنا ہی نہیں ہم نے تو پورے کے پورے قرآن کو اسیطرح مختلف شقوں میں بانٹ رکھا ہے۔ جہاں جہاں تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر آتا ہے ہم یہ کہکر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے، اور مبتلا رہتے ہیں کہ یہ یہود کے متعلق ہے، یہ نصاریٰ کے۔ یہ مشرکینِ مکہ کے متعلق ہے، یہ کفارِ عرب کے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب جہنمی ہیں اور جنت صرف ہمارے لئے تیار کی گئی ہے۔ لیکن خود فریبی سے حقیقتیں تو بدل نہیں جایا کرتیں۔ ہم اس خود فریبی سے اسی صورت میں نکل سکتے کہ ہم خدا کی کتاب کو معیار قرار دے کر یہ دیکھیں، سمجھیں اور پرکھیں کہ ہمارا شمار منعم علیہ کے زمرہ میں ہوتا ہے یا مغضوب علیہ اور ضاآلین کے گروہ میں۔

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز   دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را   قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

خلاصہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر کتاب کے شروع میں مقدمہ یا پیش لفظ لکھا جاتا ہے۔ اس سے اس کتاب کے موضوع یا مندرجات کا تعارف کرانا مقصود ہوتا ہے۔ موزوں ترین مقدمہ یا پیش لفظ اسے سمجھا جاتا ہے جو نہایت مختصر لیکن جامع الفاظ میں اس حقیقت کو سامنے لے آئے کہ کتاب کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کو "فاتحۃ الکتاب" کہا جاتا ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ سورۃ، الکتاب، یعنی قرآنِ کریم کا (یوں سمجھئے کہ) پیش لفظ یا تعارف ہے۔ اختصار کو دیکھئے تو یہ سات آیات پر مشتمل سورۃ ہے اور آیات بھی ایسی مختصر کہ دو دو چار چار الفاظ پر مشتمل۔ لیکن اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم اور دین کے نظام کا ملخص اس کے اندر یوں سمٹ کر آ گیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ یہ قرآنِ کریم کے ایجاز اور اعجاز کی نمایاں شہادت ہے۔

سورۃ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اگر انہیں خدا کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی

اس میں متکلم خود خدا تعالیٰ سمجھا جائے) تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کتاب کو اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ نوعِ انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی تھی وہ پوری ہو جائے یہ نشوونما وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اور اگر اسے انسانوں کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ تعلیم دی ہے) تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہر عبد مؤمن اس کا اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ میں جس پروگرام کو ہاتھ میں لے رہا ہوں اس سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی نمود عام ہو جائے۔

اس کے بعد سورۃ فاتحہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ میں اس کے ملخص کے لئے مناسب الفاظ و بیان کی فکر میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا جو مطلب میں نے "مفہوم القرآن" میں بیان کر دیا ہے وہ اس کا موزوں ترین خلاصہ ہے۔ اس لئے میں اسی کو یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے:

جب انسان اس کارگہِ کائنات کے نظم و نسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آجاتی ہے کہ اس میں، ہر شے کو وہ سامانِ نشوونما کس طرح بلا مزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے جس سے وہ، اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ عام حالات میں تدریجاً اور عندالضرورت فجائی عملِ ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کی رُو سے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر، ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلماتِ تحسین و آفرین آ جاتے ہیں اور وہ بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کائنات کی کسی شے کو نہ بیکار پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج کے لئے" (۳/۱۹۰-۱۸۹)۔ یہی وہ اربابِ علم و ایقان ہیں جو صحیح معنوں میں خُدا کی حمد کرنے والے ہیں۔ (۹/۱۱۲) انہی کو علماء کہا جاتا ہے (۳۵/۲۸-۲۷)۔

خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ جو مستبد قوتیں دوسروں کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوں، انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حمدیت کا قدمِ اول ہے (۶/۴۵)۔

ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ایسا نظام قائم ہو جائیگا جس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ اس میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہوں گے۔ (۸۲/۱۹-۱۸ ؛ ۱۷/۱۱۱ ؛ ۴۳/۸۴)

یہی وہ نظام ہے، جسے آخر الامر انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہنا ہے (۹/۳۳)۔

یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہوگا جو اس حقیقت کبریٰ کا اعلان، اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے، کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی غیر خدائی نظام سے خواستگارِ معاونت ہوتے ہیں (۱۲/۴۰ ؛ ۳/۷۸)۔ اس کا عملی طریق اس کی کتابِ عظیم (قرآنِ مجید) کے احکام و اصول کی اطاعت ہے (۵/۴۴-۴۸)۔

یہ افراد (جماعتِ مومنین) جب سفرِ حیات کے لئے قدم اُٹھاتے ہیں تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں دُعا بن کر ان کے لبوں تک آجاتی ہیں کہ بارِ الٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ اُبھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آجائے جو ہمیں بلا خوف و خطر، ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔

یعنی وہ راستہ جس پر چل کر، سعادتمند اُممِ سابقہ، زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں۔ اس لئے انہوں نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے، اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی (۳۱/۲۰ ز ۲/۴۷)۔

جب تک یہ قومیں، تیرے متعین کردہ راستے پر چلتی رہیں، زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب رہیں۔ جب اُن کے نظریۂ حیات میں تبدیلی آگئی تو یہ نعمتیں ان سے چھن گئیں (۸/۵۳) اور وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئیں (۲/۶۱ ز ۷/۱۵۲) ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھُلس کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں، اور چونکہ صحیح راستہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا اس لئے ان کا کاروانِ حیات اپنی قیاس آرائیوں کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا۔ وہ کبھی آنکھیں بند کر کے، اپنے آباؤ اجداد کی فرسودہ راہوں پر چلتے رہے (۳۷/۶۹-۷۰) اور کبھی انہوں نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا راہ نما بنا لیا (۲۵/۴۳) جب اس سفرِ بے منزل کی بھول بھلیوں میں کھو کر مایوس ہو گئے تو یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ خدا کو منظور ہی نہ تھا کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھاتا (۶/۱۴۹)

بارِ الٰہا! ہم تجھ سے، تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق طلب کرتے ہیں تاکہ ہمارا حشر بھی اُن سوختہ سامانوں کا سا نہ ہو جائے، کہ ہم جانتے ہیں کہ جو قوم تیری راہنمائی سے منہ موڑ لے، اُسے کوئی صحیح راستہ نہیں دِکھا سکتا (۶۱/۵)۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ راستہ انہی کے سامنے آسکتا ہے جو اس کی تلاش کے لئے جد و جہد کریں (۲۹/۶۹) — ہم تجھ سے اس جد و جہد کی بھی توفیق طلب کرتے ہیں۔

بِاسمِہٖ تعالےٰ

پہلا پارہ　　　　دُوسری سورۃ

سُورَۃُ البَقَرَۃِ (٢)

پہلا باب

آیات ــــ ۱ تا ۵

متّقین

۱ ـــ حروفِ مقطعات۔

۲ ـــ قرآن کریم رسول اللہ کے زمانہ ہی میں مرتب کتاب کی شکل میں تھا۔

۳ ـــ متقین کی خصوصیات۔

۴ ـــ ایمان اور (FAITH)

۵ ـــ مؤمن اور مسلم پیدائشی مسلمان۔ برہمو سماجی اسلام۔ مولانا آزاد (مرحوم) کی غلط نگہی۔

۶ ـــ غیب کا علم ــــ پیش گوئیاں۔

۷ ـــ صلوٰۃ اور الصلوٰۃ۔

۸ ـــ نماز اور الصلوٰۃ۔

۹ ـــ قرآن کا معاشی نظام۔

۱۰ ـــ نظامِ سرمایہ داری ــــ قارونی ذہنیت۔

۱۱ ـــ کارل مارکس کا اعترافِ عجز ــــ کمیونزم اور سوشلزم۔

۱۲ ـــ الصلوٰۃ اور معاش کا باہمی تعلق۔

۱۳ ـــ نماز کی جزئیات ــــ اجتماعاتِ صلوٰۃ کی اہمیت۔

۱۴ ـــ مَآ اُنزِلَ پر ایمان۔

۱۵ ـــ آخرت کا مفہوم ــــ قانونِ مکافاتِ عمل

۱۶ ـــ اس ایمان و عمل کا نتیجہ ــــ استخلاف فی الارض۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ البقرۃ (۲)

پس منظر اِسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر، نبی اکرم (صلعم) کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىۡ عَنِّىۡ فَاِنِّىۡ قَرِيۡبٌ ؕ اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ وَلۡيُؤۡمِنُوۡا بِىۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ (۲/۱۸۶)۔ اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہدو کہ میں ان کے بالکل قریب ہوں۔ جب بھی کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ سو انہیں بھی چاہیئے کہ، ان کی پکار کے جواب میں، میں انہیں جو کچھ کہوں، اسے دل کے کانوں سے سنیں، اور اس کی صداقت پر یقین رکھیں تاکہ اُنہیں سفرِ حیات میں صحیح راہنمائی مِل جائے۔

خدا سے "دُعا مانگنے" کے متعلق مختصراً سورۃ فاتحہ، آیت نمبر ۴ (۱/۴) میں لکھا جا چکا ہے۔ تفصیل متعلقہ مقامات پر بعد میں سامنے آتی جائے گی۔ لیکن اتنی بات تو بالکل واضح ہے (اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی) کہ جب ہم اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے خدا سے دُعا مانگتے ہیں تو اس کی طرف سے ہمیں براہ راست جواب نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ جو اس نے کہا ہے کہ، "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں" تو اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اُسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لئے مصروفِ سفر ہے۔ راستہ میں ایک دوراہا آجاتا ہے جہاں اسے پتہ نہیں چلتا کہ ان دو راستوں میں سے کونسا راستہ اس کی منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے۔ وہاں اُسے ضرورت پڑتی ہے کہ کسی جاننے والے سے صحیح راستے کے متعلق دریافت کرلے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اس کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا بلکہ اس کا وقت اور توانائی سب ضائع ہو جائیں گی۔

زندگی کے راستے ہیں، انسان کے سامنے (انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں) قدم قدم پر دوراہے آتے ہیں۔ "دوراہے" سے مفہوم یہ ہے کہ ہر معاملہ کے متعلق اس کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات (POSSIBILITIES) ہوتی ہیں جن میں سے وہ، بیک وقت، صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ ممکنات صرف انسان کے سامنے ہوتی ہیں کیونکہ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ حیوانات کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات ہوتی ہی نہیں کیونکہ انہیں اختیار و ارادہ کی صلاحیت نہیں دی گئی۔ بکری کے سامنے کبھی یہ سوال نہیں آتا کہ وہ گھاس کھائے یا گوشت۔ اس کے لئے ایک ہی راہِ عمل یا فیصلہ ہوتا ہے اور وہ اس کی فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کسی خارجی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ضرورت انسان ہی کو ہوتی ہے۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے لئے سابقہ سورۃ (الفاتحہ) میں اس نے خدا کو پکارا اور کہا تھا کہ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵)۔ "ہمیں سیدھا اور ہموار راستہ بتا دے، دکھا دے"۔ خدا نے کہا کہ ہم نے تمہاری پکار کو سن لیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲/۲)۔ یہ رہنمائی تمہیں ہماری اس کتاب (GUIDE BOOK) میں ملے گی۔ ہم نے اس میں صحیح اور غلط راستوں کی نشاندہی واضح اور بیّن انداز میں کر دی ہے (۲/۲۵۶)۔ یہ ہے تمہاری پکار کا جواب۔ یوں تمہاری دُعا مستجاب ہو گی۔

یہ ہے ربط اس سورۃ کا، سابقہ سورۃ کے ساتھ۔

۲/۱ (۲/۱) الٓمّٓ

اس سورۃ (اور بعض دیگر سورتوں) کے آغاز میں اس قسم کے حروف آتے ہیں، جنہیں الفاظ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے تو ہر لفظ حروف ہی کا مرکب ہوتا ہے، اور عربی زبان میں تو ہر لفظ کا مادہ، حروف میں ہوتا ہے، لیکن حروف مل کر لفظ بنتے ہیں اور لفظ اپنے متعین معانی دیتا ہے۔ لیکن یہ حروف (جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے) الفاظ نہیں بنتے، حروف ہی رہتے ہیں، اور انہیں پڑھا بھی الگ الگ حروف ہی کی طرح جاتا ہے۔ مثلاً الٓمّٓ کو اَلَمْ نہیں پڑھا جائیگا۔ اسے الف۔ لام۔ میم الگ الگ پڑھا جائیگا۔ الگ الگ حروف ہونے کی جہت سے انہیں مقطعات کہتے ہیں۔ یعنی قطع کئے ہوئے حروف۔ ان حروف کے مفہوم کے سلسلہ میں (متقدمین سے لیکر متاخرین تک....) اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ کثرتِ تعبیر سے یہ خواب ہی پریشاں ہو گیا ہے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ہم نے اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھا ہے اسے مختصر الفاظ میں بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

مُقطّعات | انگریزی زبان میں جنہیں مخففات (ABBREVIATIONS) کہا جاتا ہے وہ مختلف الفاظ سے لئے گئے حروف ہوتے ہیں جنہیں الگ الگ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ جیسے (R.S.V.P)؛ (P.S.)؛ (e.g.)

وغیرہ۔ عربوں کے ہاں بھی اس کا رواج تھا۔ عربوں کے ہاں ہی نہیں، بلکہ عبرانی زبان میں بھی یہ چیز ملتی ہے۔ قرآن کریم چونکہ عربوں کی زبان میں نازل ہوا، لہٰذا اس میں اسلوبِ بیان بھی وہی اختیار کیا گیا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ قرآن کا اسلوب بجائے خویش ایک معجزانہ حیثیت رکھتا ہے)۔ ان کے اسلوبِ بیان کے تتبع میں قرآنِ کریم میں بعض حروفِ مقطعات آئے ہیں۔ چونکہ اُن کے ہاں یہ اسلوب عام طور پر رائج تھا اس لئے (قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا کہ) انہوں نے پوچھا ہو کہ ان حروف سے مقصود کیا ہے (اگرچہ ان کی طرف سے پوچھے گئے کئی ایک سوالات کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے)۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔

جہاں تک میری بصیرت، میری راہنمائی کرتی ہے، یہ (باستثنائے چند) خدا کے اسم ذات (اللہ) یا اس کی صفات (الاسماء الحسنیٰ) کے الفاظ سے تراشیدہ حروف ہیں۔ مثلاً الٓمّٓ میں الف، اللہ کے لئے ہے۔ لام، علیم کے لئے اور میم، حکیم کے لئے۔ ان میں یہ ضروری نہیں کہ یہ ان الفاظ کے پہلے حروف ہی ہوں۔ تعینِ مفہوم کے لئے ان الفاظ میں سے کوئی سا حرف بھی لیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے صوتی اعتبار سے بھی انسان کے ذوقِ لطیف کی رعایت رکھی ہے، اور (میرے احساسِ لطیف کا اشارہ ہے کہ) ان حروف کے انتخاب میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ انداز، جسکی رُو سے میں نے (مفہوم القرآن میں) حروفِ مقطعات کا مفہوم متعین کیا ہے۔ اس اعتبار سے الٓمّٓ کا مفہوم ہو گا:

اللہ علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ ....

۲/۲

(۲/۲) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

قرآن کریم نے اپنے آپ کو "الکتاب" کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ک۔ ت۔ ب) ہے، جس کے بنیادی معنے حکم دینے، یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے فرض قرار دیتے گئے ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (۲/۲۱۶)۔ تم پر (عند الضرورت) جنگ کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ جب کوئی فیصلہ یا حکم ابدی اور غیر متبدل ہو تو اُسے قانون کہکر پکارا جاتا ہے[1]۔ قرآنِ مجید میں جو احکام آتے ہیں وہ ابدی بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ اس لئے انہیں، عام اصطلاح کے اعتبار سے، قانون کہا جائے گا۔

---

[1] ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ جب قانون کا لفظ کسی خاص اصول کے لئے آئے تو جہاں اس اصول کی یہ خصوصیت ہو گی کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہے وہاں اس سے یہ مراد بھی ہو گی کہ اس کے مطابق عمل کرنے سے ایک خاص نتیجہ مرتب ہو گا اور ہمیشہ ایسا ہی ہو گا۔ جیسے قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کی صورت میں ظاہر ہے۔ اس اعتبار سے قانون (LAW) کی تعریف یہ بتائی گئی ہے (IF—THEN—ALWAYS) یعنی اگر ایسا کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا، اور ہمیشہ ایسا ہی ہو گا۔ قرآنی قوانین کا بھی یہی خاصہ ہے۔

(اگرچہ خود یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا)۔ قرآن کریم نے لفظِ "کتاب" کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں، اور اس کے بعد کہا گیا ہے۔ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۴/۲۴) یہ تمہارے لئے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے خود، قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳)۔ اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔

عربوں کے ہاں جب منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کرلی جاتی تھی تو اس وقت اُسے کتاب کہکر پکارا جاتا تھا۔ اور چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ہے اس لئے كَتَبَ کے معنے ہیں "اس نے لکھا" لہٰذا "کتاب" ان لکھے ہوئے اوراق کو کہتے تھے جن کی شیرازہ بندی کرلی جاتے۔ قرآن کریم کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

وَالطُّوْرِ۔ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ۔ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۱-۳)

عربوں کے ہاں، ہرن کی کھال کو چھیل کر اُسے (PARCHMENT) کی شکل میں قرطاس بنا لیتے۔ اُسے رقّہ کہا جاتا تھا۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا انہیں ان پر قلمبند کرلیتے اور ان، رقّ منشور، کی جب شیرازہ بندی ہوجاتی تو اسے کتاب کہہ کر پکارا جاتا۔ جہاں تک کاتبینِ وحی کا تعلق ہے، خود قرآن کریم کی شہادت موجود ہے کہ وہ بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد تھے (۸۰/۱۵-۱۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہؐ کے زمانے میں، رقّ کے اوراق پر لکھی ہوئی مرتب اور مدوّن کتاب تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں، قرآن مجید جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں منتشر ٹھیکریوں، ہڈیوں اور پتوں کی مدد سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی تھی، صحیح نہیں۔ اس کے مرتب کتاب ہونے کی شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے (اسے، الفاتحہ کے بعد، شروع ہی میں کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ بلکہ (مفتی محمد عبدہٗ کے قول کے مطابق) کتابٌ بمعنی مکتوبٌ ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے اشارہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف قرآن حکیم کے لکھنے کا حکم فرمایا تھا، قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا[1] بنا بریں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا مفہوم یہ ہوا کہ:

تم نے ہمیں پکارا تھا اور کہا تھا کہ تمہاری راہنمائی اس سیدھے اور
ہموار راستے کی طرف کر دی جائے جو تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔
یہ راہنمائی تمہیں اس کتاب میں ملے گی۔

---

[1] تفسیر المنار۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۲۳۔

الکتاب کہکر اسے دنیا کی باقی تمام کتابوں سے مختص اور متمیز کر دیا۔ اس سے مراد القرآن ہے۔

(۲/۲) لَا رَيْبَ فِيهِ

اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں کسی قسم کا ریب نہیں۔ عام طور پر ریب کے معنے "شک" کئے جاتے ہیں، لیکن شک خود عربی زبان کا لفظ ہے اور اسے قرآن کریم نے بھی استعمال کیا ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو اس نے شَكٍّ مُّرِيبٍ (۳۴/۵۴) بھی کہا ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شک اور ریب میں کیا فرق ہے، اور قرآن کریم نے اس آیت میں ریب کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟

دنیا کی ہر زبان میں مرادفات ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے الفاظ جو ہم معنی ہوں۔ جہاں تک مرادفات کی تعداد کا تعلق ہے دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر (BUCKE) نے مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے، مشہور

مُرادِفات

مستشرق (MAX MULLER) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس زمانے میں سنسکرت زندہ زبان تھی اس میں، اگنی دیوی (آگ) کے لئے پینتیس[۳۵] الفاظ تھے، اور سوریہ دیوتا (سورج) کے لئے سینتیس[۳۷]۔ لیکن عربی زبان میں، مثلاً سانپ کیلئے دو سو، شیر کے لیے پانچ سو، تلوار کے لیے ایک ہزار اور اونٹ سے متعلق ۵۷۴۴ الفاظ ہیں[۱]۔ اس سے آپ، عربی زبان میں مرادفات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن مرادفات کی اس کثرت کے باوجود اس زبان میں کوئی دو لفظ بھی ایسے نہیں جنکے معانی یکسر ایک جیسے ہوں۔ ان مرادفات کے معانی میں لطیف سا فرق ضرور ہوتا ہے، اور یہ لطیف سا فرق، آگے چل کر بعض اوقات بڑی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

ریب اور شک

قرآن کریم نے جو مرادفات استعمال کئے ہیں، ان کا صحیح مفہوم اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہم اُن کے معانی کے اس لطیف سے فرق کو پیش نظر رکھیں۔ ریب اور شک کے اس فرق کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں جگہ... زمین پر ایک لکیر سی دیکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانپ کی لکیر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے اس میں شک ہے، وہاں سانپ ہو نہیں سکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس شک کا تعلق آپ کے ذہن سے ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ دوسری طرف، آپ رات کو اندھیرے میں اپنے کمرے میں سرسراہٹ سی محسوس کرتے ہیں جس سے آپ کو شک گزرتا ہے کہ کہیں یہ سانپ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے آپ کو ایک پریشانی سی لاحق ہو جائے گی۔ اور جب تک آپ اپنے شک کو رفع نہ کر لیں گے، اطمینان سے سو نہیں سکیں گے۔ اس قسم کے شک کے لئے ریب کا

[۱] COSMIC CONSCIOUSNESS, BY- RICHARD MAURICE BUCKE (P.P. 310-31)

لفظ آتا ہے یعنی ایسا شک، جس سے نفسیاتی الجھن اور اضطرابِ نفس لاحق ہو، جس سے آپ کے دل میں بے چینی پیدا ہو۔ بالفاظِ دیگر، لفظ شک کا اثر آپ کے ذہن اور ادراک تک محدود رہتا ہے اور ریب کا نتیجہ، ذہنی شک کے علاوہ قلبی اضطراب بھی ہوتا ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات مترادفات ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں لیکن عام طور پر ان کے بنیادی معنوں میں اس قسم کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے)۔

ریب کا لفظ سورۃ التوبہ میں ایسے انداز میں آیا ہے جس سے اس کا یہ مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ منافقین نے مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کی۔ اس سے ان کا دلی مقصود تو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا تھا۔ لیکن ظاہرا انہوں نے یہی کہا کہ انہوں نے اُسے لِوَجْہِ اللہ تعمیر کیا ہے۔ وحیٔ خداوندی نے ان کی اس منافقت کا پردہ چاک کر دیا اور رسول اللہؐ سے فرمایا کہ تم اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا۔ اس سے ان منافقین کی قلبی کیفیت کیا ہوئی ہوگی، وہ ظاہر ہے۔ اسے بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا ہے لَا یَزَالُ بُنْیَانُھُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ (۹/۱۱۰)۔ یعنی یہ عمارت جو انہوں نے تعمیر کی ہے ان کے لئے (ریب) قلبی اضطراب کا موجب بنی رہے گی تا آنکہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس سے ریب کے معنے واضح ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کتاب اللہ کے متعلق جب کہا گیا کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ، تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس میں کوئی بات مشکوک اور غیر یقینی نہیں۔ اس سے وہ تمام شکوک و شبہات دور ہو جائیں گے جو حقائق کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ذہنِ انسانی میں اُبھرتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی اُن نفسیاتی الجھنوں اور قلبی اضطرابات کا بھی ازالہ ہو جائے گا جو ان شکوک سے پیدا ہوتے ہیں جن سے انسانی قلب متاثر ہوتا ہے۔ اس (کتاب) سے فکری سکون اور قلبی اطمینان دونوں حاصل ہو جائیں گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ (ریب) کے استعمال سے قرآنِ کریم نے ادراک و جذبات دونوں کو کس طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیا!

(۲/۲) ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ

اس کتابِ عظیم کی بنیادی خصوصیت (لا ریب فیہ) بتانے کے بعد، اس کا اساسی مقصد ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ بتایا گیا ہے۔ ہدایت کے معنے سورہ فاتحہ (۱/۵) میں واضح کئے جا چکے ہیں۔ جیسا کہ وہاں بتایا گیا ہے، اس کے معنے ایسی راہنمائی کے ہیں جو ابھر اور نکھر کر سامنے آجائے۔ وہاں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ راہنمائی کی ضرورت اسے ہی لاحق ہوتی ہے، یا اس سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو کہیں جانے کا عزم کرے اور پھر اس کے لئے آمادہ بہ سفر ہو۔ جو شخص کہیں جانا ہی نہیں چاہتا اُسے راہنمائی کیا فائدہ دے سکتی ہے؟ جیسا کہ وہاں تمثیلاً بتایا گیا ہے، آپ گھر میں بیٹھے ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ کرتے رہیں —— صرف مطالعہ ہی نہیں، اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح بھی کرتے رہیں۔ اس سے آپ کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کا

فائدہ اسی کو ہوگا جو عزمِ سفر رکھتا ہو۔ لیکن سفر کے لئے ایک اور احتیاط کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کی وضاحت متقین کہکر کر دی گئی ہے۔

ہمارے ہاں "متقی پرہیزگار" اسے کہتے ہیں جو نہ صرف عام معیار کا مسلمان ہو بلکہ دینداری میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہو۔۔۔ ایسا مقام کہ جسے، یوں کہیئے کہ خداپرست ہونے کی آخری منزل سمجھا جائے۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہدیا جائے کہ وہ بڑا متقی پرہیزگار ہے، تو اس کی بابت کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس مفہوم کے اعتبار سے، عام طور پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ ہدایت (راہنمائی) کی ضرورت تو اس کے لئے ہوگی جو آغازِ سفر کر رہا ہو یا راستہ بھول جائے۔ جو شخص پہلے ہی صحیح راستہ پر چل رہا ہے ۔۔۔ بلکہ یوں کہیئے کہ منزلِ مقصود پر بھی پہنچ چکا ہے ۔۔۔ اُسے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ (بالفاظِ دیگر ہدایت کی ضرورت گمراہوں کو ہوگی۔ متقین کو اس کی کیا ضرورت ہے) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ اعتراض اس لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم سامنے نہ ہونے سے اُبھرتا ہے۔

تقویٰ اور متقین قرآن کریم کی جامع اصطلاحات ہیں۔ ان الفاظ کا مادہ (و۔ ق۔ ی) ہے جس کا بنیادی مفہوم ایک مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ عربوں کا لباس بڑا ڈھیلا ڈھالا اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی نے پوچھا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں تو جواب میں کہا گیا کہ جب تمہیں کسی ایسے راستہ سے گزرنا پڑے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں، تو تم اس میں سے کس طرح گزرو گے؟ اس نے کہا کہ میں کبھی ایک طرف سے اپنا دامن سمیٹوں گا کہ وہ کسی جھاڑی میں نہ الجھ جائے، کبھی دوسری طرف سے۔ اور اسطرح ان جھاڑیوں سے بچتا بچاتا، اس راہ گزر سے محفوظ آگے بڑھ جاؤں گا۔ کہا گیا کہ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

تقویٰ کا بنیادی مفہوم

چنانچہ (و۔ ق۔ ی) کے بنیادی معنے ہوتے ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اسے مضر اور تکلیف دہ چیزوں سے بچانا اور اس مقصد کے لئے صحیح تدابیر کی پوری پوری نگہداشت کرنا۔ بنابریں متقین وہ راہرو ہوں گے جو راستہ کے خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو اور عزم رکھیں۔ لہٰذا اس کتابِ عظیم سے مستفید ہونے کے لئے پہلی بنیادی شرط تو یہ ہوئی کہ انسان، زندگی کے راستوں کو عملاً قطع کرنا چاہے، گھر میں بیٹھے نہ رہنا چاہے۔ اور دوسری شرط یہ کہ وہ محفوظ راستوں سے سفر کرنا چاہے اور اس مقصد کے لئے راستے کے خطرات سے بچنے کے طُرق و اسباب سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ یہ بات بھی ایک مثال سے سمجھ میں آئے گی۔ ایک شخص دریا میں کودنا چاہتا ہے۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ یہاں پانی بہت گہرا ہے، چھلانگ نہ لگاؤ، ڈوب جاؤ گے۔ اگر وہ ڈوبنے کے خطرہ سے بچنا چاہتا ہے، وہ آپ کی اس راہنمائی سے فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن اگر وہ خودکشی کے ارادے سے دریا میں کودنا چاہتا ہے تو آپ کا، اُسے خطرہ سے آگاہ کرنا، نہ کرنا برابر ہے۔ وہ

بلاتامل چھلانگ لگادے گا۔ اس لئے سفرِ حیات کے دونوں قسم کے راہ روؤں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ چند ہی آیات آگے جا کر اس کی قرآنی وضاحت سامنے آ جائے گی۔

لہٰذا متقین وہ ہیں جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہنے کی آرزو رکھیں اور اس کے لئے اس راہنمائی کی نگہداشت کریں جو انہیں اس کتاب سے حاصل ہو۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اگر کسی چیز کو رکھدیا جائے تو وہ بالکل محفوظ رہتی ہے۔ انہیں (PRESERVATIVES) کہا جاتا ہے۔ اس مادہ سے اس کے لئے "وِقَایَة" کا لفظ آتا ہے۔ قرآنی تعلیم وہدایت کا ماحصل انسانی ذات کی اس طرح نشو ونما اور برومندی ہے جس سے یہ اس دنیا میں بھی صحیح، متوازن طریق پر زندگی بسر کر سکے اور اس کے ساتھ ہی ایسی مستحکم ہو جائے کہ یہ، زندگی کی اگلی ارتقائی منازل (حیاتِ اُخروی) طے کرنے کے بھی قابل ہو جائے۔

انسانی ذات کا تقویٰ انسانی ذات کے متعلق قرآن کریم میں ہے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۹۱/۸)۔ اس میں دونوں طرح کے ممکنات رکھ دئیے گئے ہیں۔ فجور یعنی (DISINTEGRATION) کا امکان بھی، اور محفوظ و مستحکم ہونے (INTEGRATION) کا امکان بھی۔ اس کے محفوظ و مستحکم رہنے کے لئے لفظ تقویٰ آیا ہے۔ اس سے بھی اس لفظ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

تقویٰ ——— متقین۔ وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک بکثرت آئے ہیں، اور اس نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے متقین کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ان خصوصیات کے نتائج و ثمار کیا۔ ہم اس مقام پر ان کی صرف دو ایک ایسی خصوصیات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ہمارے نزدیک بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، ہمارے ہاں متقی، پرہیزگار کے الفاظ اکٹھے بولے جاتے ہیں اور متقی کے معنے ہی پرہیزگار کئے جاتے ہیں۔ اس لفظ "پرہیزگاری" کے بطن میں ایک بڑا گہرا تصور پوشیدہ ہے۔ عیسائیت کی رہبانیت ہو یا ہندوؤں کی ویدانت مجوسیوں کی خانقاہیت ہو یا بدھ مت کا نروان۔ ان سب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مادی دنیا (PHYSICAL WORLD) قابلِ نفرت ہے اور دنیاوی جاذبیتوں سے ملوث ہو جانے والا خدا کا مقرب نہیں بن سکتا۔ ان آلائشوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا قربِ خداوندی کے حصول کی بنیادی شرط ہے۔ (دین کے "مذہب" میں تبدیل ہو جانے کے بعد) خانقاہیت کا یہی تصور جب تصوف کی شکل میں مسلمانوں کے ہاں آیا اس کی رو سے انہوں نے بھی دنیا اور اس کی جاذبیتوں کو قابلِ نفرت قرار دیا اور ان کے ترک کرنے کو وجہِ قربِ خداوندی ٹھہرایا۔ یہاں سے "پرہیزگار" کی اصطلاح ہمارے ہاں رائج ہوئی چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ بڑا متقی اور پرہیزگار ہے اس کا تصور کچھ اس طرح سامنے آئے گا

متقین کی خصوصیات

کہ وہ دنیا کی زیب و زینت کی چیزوں سے دور رہتا اور انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ تصور، متقی کے قرآنی مفہوم کی ضد ہے۔ متقیوں کے متعلق سورۃ یونس میں ہے۔ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ (۱۰/۵)۔ خدا وہ ہے جس نے سورج کو روشنی کا سرچشمہ اور چاند کو عکسِ نور بنا دیا، اور اس کے لئے منازل مقرر کر دیں۔ اس کے بعد ہے مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (ایضاً) خدا نے ان عناصر کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا، بالحق پیدا کیا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۱۰/۶)۔ یقیناً رات اور دن کی گردشوں میں، بلکہ جملہ کارگاہِ کائنات میں، خدا نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے ان میں حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں کن لوگوں کے لئے ہیں؟ ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ شعار ہوں۔ یعنی متقیوں کے لئے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جہاں تک اس مادی کائنات کا تعلق ہے اس میں متقین کا مقام کیا ہوگا؟ تمام کائنات پر غور و فکر کرنے اور (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے والے۔

اس سے ایک سوال سامنے آئے گا کہ فطرت کی قوتوں کو تو ہر وہ قوم مسخر کر سکتی ہے جو قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے۔ اس میں مومن اور کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ آج یورپ کی خدا فراموش قومیں اس باب میں بہت آگے بڑھ گئی ہیں، تو کیا انہیں، قرآن کی اصطلاح میں، متقین کہا جائے گا۔ نہیں، ایسا سمجھنا غلط ہے، اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی ایک آیت سے مفہوم اخذ کر کے جھٹ سے نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان نتائج تک پہنچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ان تمام مقامات کو سامنے رکھا جائے جن میں اس موضوع کے متعلق گفتگو کی گئی ہے (اسے تصریفِ آیات کہتے ہیں)

قرآن کریم نے انسانی جذبات کو، جب وہ وحی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں، شیطان کہہ کر پکارا ہے، اور مومن ان لوگوں کو کہا ہے جو وحی کی عائد کردہ پابندیوں کے مطابق زندگی گزاریں۔ اس سلسلہ میں وہ تقویٰ کا مفہوم بھی پیش کرتا ہے، جب کہتا ہے کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱) مومن وہ ہیں جو دانستہ سرکش جذبات (شیطان) کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کا خیال یونہی گھومتے گھماتے ان کے دل میں آ جائے تو وہ فوراً قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یک لخت اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ان کی بصیرت میں جلا پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ پہچان لیتے ہیں کہ یہ ابلیسی فریب ہے۔ اور اسے اپنے دامنِ نگاہ سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں۔ کہا کہ ایسے لوگوں کو متقی کہا جاتا ہے۔

کم از کم ان دو آیات سے یہ مفہوم ہمارے سامنے آ گیا کہ متقی وہ ہیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیِ خداوندی

کے مطابق صرف نہیں لاتے ہیں۔ اور اگر کبھی ان کے دل ہیں، بھولے بھٹکے اس کے خلاف کوئی خیال ابھرتا ہے تو وہ اسے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی وہ خطرناک مقامات تھے جو ان کے راستے ہیں، یہاں وہاں، آنے تھے۔ ان مقامات سے اسطرح احتیاط اور حفاظت سے گزرنے کی آرزو اور عزم رکھنے والوں کو متقین کہا گیا ہے۔ بنا بریں سورۃ بقرۃ کی پہلی آیت کے ان چند الفاظ کا مفہوم یہ ہوا کہ:

> تم نے ہمیں پکارا تھا اور کہا تھا کہ تمہیں زندگی کی مسافت طے کرنے کے لئے صحیح راہنمائی دی جائے۔ یہ راہنمائی تمہیں اس کتاب کے اندر ملے گی جو تمہارے ذہن سے شکوک و شبہات کے کانٹے بھی نکال دی گی اور تمہارے دل سے نفسیاتی الجھنوں اور اضطراب انگیزیوں کی خلشوں کا بھی استیصال کر دے گی۔ لیکن اس راہنمائی سے وہی لوگ استفادہ کر سکیں گے جو عازم سفر ہوں اور یہ چاہیں کہ وہ راستے کی تمام خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔

۲/۳

(۲/۳) اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ

اس مقام پر قرآن کریم نے متقین کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے منفرد اسلوب کے مطابق اس اصطلاح کی وضاحت کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ متقین سے مراد کون لوگ ہیں اور ان کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ، وہ لوگ جو، غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں پہلا لفظ ایمان ہے اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا شاید ہی کوئی ورق ایسا ہو جس میں یہ لفظ (کسی نہ کسی شکل میں نہ آیا ہو) یہ ہو تو اسلام ہے، یہ نہ ہو تو اسلام بھی نہیں۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ جسقدر یہ لفظ یا یہ تصور اہمیت رکھتا ہے، اس کا مروجہ غلط مفہوم اسی قدر ہمیں اسلام سے دور لے گیا ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ پہلے اس لفظ کے لغوی یا بنیادی معانی سمجھ لینے چاہئیں۔

ایمان کے معانی

ایمان کا مادہ (ا۔م۔ن) ہے اور، جیساکہ معلوم ہے، اَمن کے معنے بے خوفی، اطمینان یا خطرات سے محفوظ ہونے کی حالت کے ہیں۔ آمَنَ کے معنے ہیں کسی کو بے فکر اور مطمئن کر دینا۔ دوسرے کو امن دیدینا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لینا۔ عربوں کے ہاں نَاقَۃٌ اَمُوْنٌ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو قویٰ اور عادات کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو۔ جس کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ وہ بہم سفر سے کمزور نہیں ہو جائے گی اور راستہ میں ٹھوکر کھا کر گر نہیں پڑے گی۔ لہٰذا مُؤْمِنٌ کے معنے ہوں گے وہ، جو خود بھی امن و اطمینان

میں ہو اور دوسروں کو بھی امن کی ضمانت دے۔ جس پر بھروسہ کر کے انسان بے فکر اور مطمئن ہو جائے۔ خود اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "اَلْمُؤْمِنُ" ہے (۵۹/۲۳)۔ جس کے معنی ہیں امنِ عالم کا ذمہ دار۔

مؤمن اور عقل و بصیرت

جب آمَنَ کا صلہ (لِ) ہو تو اس کے معنے بات ماننے کے ہوتے ہیں (۲/۵۵)۔ اور جب اس کا صلہ (بِ) ہو تو اس کے معنے ایمان لانے کے ہوتے ہیں۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (۲/۲۸۵) کے معنے ہوتے "سب ایمان لائے اللہ پر"۔ یہی ایمان وہ بنیاد ہے جس پر (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) دین کی پوری عمارت اُستوار ہوتی ہے اور اس کا غلط مفہوم بیشمار اُلجھنیں پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے: (FAITH) اور (FAITH) کے معنے ہوتے ہیں کسی بات کو بلا دلیل و برہان، بلا علم و بصیرت، بلا فکر و تدبر، بلا (REASON) آنکھیں بند کر کے مان لینا۔ اور اس قسم کے ایمان کو بڑا قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ جس قدر کوئی شخص کسی بات کو بلا دلیل و حجت مانے اسی قدر اس کے ایمان کو محکم اور مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عقل اور ایمان کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم خدا کو بلا دلیل مانتے ہیں۔ ایمان کا یہ مفہوم، اس کے قرآنی مفہوم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے ایمان نام ہے حقیقت کو علم و بصیرت، دلائل و براہین، غور و فکر کے بعد، قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ صحیح تسلیم کرنے کا۔ اسے انگریزی زبان میں (CONVICTION) کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے مؤمنین کے متعلق کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) کہ اور تو اور، جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ ان کے سامنے بھی، بہرے اور اندھے بن کر نہیں جھک جاتے۔ وہ انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم نہیں کر لیتے۔ یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے مؤمن کی بنیادی خصوصیت۔ دوسری جگہ ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰) اے اربابِ عقل و بصیرت جو خدا پر ایمان رکھتے ہو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس طرح خطرات سے محفوظ ہو جاؤ۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ایمان وہی لوگ لاتے ہیں جو اربابِ علم و بصیرت ہوں۔ سورۂ حج میں ہے: وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ (۲۲/۵۴)۔ تاکہ وہ لوگ جو اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ یہ قرآن تیرے خدا کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یہاں بھی ایمان کو "علم" کے ساتھ مشروط قرار دیا گیا ہے (اس آیتِ جلیلہ کا اگلا حصہ ایک عظیم حقیقت کا آئینہ دار ہے لیکن اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم اپنے آپ کو موضوعِ زیرِ نظر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں)۔

قرآن کریم کی رُو سے، علم و عقل، کو کس قدر اہمیت حاصل ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جسے ضمناً بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت ہم قرآن کریم کی دو ایک آیات کو سامنے لانے کے بعد آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

علم و بصیرت کی اہمیت

(جیسا کہ سورۃ فاتحہ، آیت نمبر ۷ کے تحت بھی لکھا جا چکا ہے) سورۃ الاعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷/۱۷۹)۔ دنیا میں تم ایسے مہذب اور غیر مہذب انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھو گے جن کا کردار اس حقیقت کا مظہر ہوگا کہ یہ لوگ اہلِ جہنم ہیں۔ یقیناً ہر شخص معلوم کرنا چاہے گا کہ ایسے کون لوگ ہیں جن کا جہنمی ہونا ان کی صورت سے عیاں ہوگا۔ کہا یہ وہ لوگ ہیں: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (ایضاً) جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود، سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے۔ جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ جو کان تو رکھتے ہیں لیکن اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (ایضاً) یہ لوگ انسان نہیں حیوان ہیں۔ بلکہ حیوانوں سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، کہ حیوان اپنی جبلت کے مطابق تو کام کرتے ہیں اور یہ انسان ہونے کے باوجود اپنی انسانی صلاحیتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم کے داروغے، جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھیں گے کہ تم نے کونسا ایسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تم اس عذابِ الیم میں گرفتار ہو گئے ہو۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم، تفصیل میں گئے بغیر، صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ: لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷/۱۰)۔ اگر ہم دعوتِ خداوندی کو گوشِ ہوش سے سنتے اور پھر عقل و فکر سے کام لیتے تو ہم آج جہنم میں نہ ہوتے۔ انہی آیات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے علم و عقل اور غور و فکر کی کسقدر اہمیت ہے۔ کیا اس کے بعد یہ بات حیطۂ تصوّر میں بھی آسکتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ایمان کے معنے ہوں گے بلا علم و عقل اور بلا غور و فکر کسی بات کو مان لینا؟ یہ تصوّر درحقیقت تصوف کا پیدا کردہ ہے۔ جس کی تلقین یہ ہے کہ —— گوش بند و لب ببند و چشم بند —— ان کے ہاں علم و عقل اور دلیل و برہان سے کام لینا ”ابلیسی مسلک“ ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ”اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِيْسُ“ جس نے سب سے پہلے عقل و دلیل سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ (جیسا کہ سورۃ فاتحہ آیت نمبر ۷ کے تحت بتایا گیا ہے) قرآنِ کریم

مسلکِ تقلید کی تباہ کاریاں

تقلید کی سخت مذمت کرتا ہے۔ تقلید کے معنے یہ ہیں کہ جو نظریات و تصورات، اسلاف سے وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم کرنا، اور دلیل و برہان اور عقل و فکر کی رو سے ان کی پرکھ نہ کرنا۔ قرآنِ کریم کفار کے متعلق کہتا ہے: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۲/۱۷۰)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے تم اس کا اتباع کرو۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (ایضاً) تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ ان کی تردید میں قرآنِ کریم نے صرف اتنا ہی کہدینا کافی سمجھا ہے کہ: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ

شَيْـئًـا وَّلَا يَهْتَـدُوْنَ (ایضاً) یہ لوگ اپنے اسلاف کے راستے پر چلتے جائیں گے خواہ ان کے اسلاف نے کبھی عقل و فکر سے کام لیا ہو اور نہ ہی وہ ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں جادہ پیما ہوتے ہوں —— یہ اس کے باوجود انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے تاکہ جس جہنم میں وہ جا کر گرے ہیں اسی میں یہ جا گریں!

یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم لوگ جو پیدائشی مسلمان کہلاتے ہیں، ہماری کیا پوزیشن ہے۔ پیدائشی مسلمانوں کی یہ پوزیشن تو واضح ہے کہ یہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے تو مسلمان کہلائے۔ ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہندو کہلاتے

پیدائشی مسلمانوں کی پوزیشن

نہ اُنہوں نے اپنے انتخاب اور فیصلے سے اسلام قبول کیا، نہ اِنہوں نے اپنے فیصلے سے کفر اختیار کیا۔ آپ قرآنِ کریم کو دیکھئے۔ وہ ہر جگہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یا يُؤْمِنُوْنَ وغیرہ کہتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ جو ایسا کرتے ہیں۔ یہ "فعل" (VERB) کے صیغے ہیں۔ اور فعل کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کا کرنا۔ لہٰذا ایمان اسی کا ایمان ہوگا جو حق و صداقت کو قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ خود تسلیم کرے۔ پیدائشی طور پر مسلمان ہونے میں، اور مسلکِ تقلید میں کچھ فرق نہیں۔ ایک بچہ پیدائشی طور پر اس لئے مسلمان کہلاتا ہے کہ اس کے ماں باپ مسلمان ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ اگر اس کے ماں باپ (مثلاً) سُنّی ہوں تو وہ سُنّی مسلمان ہوتا ہے شیعہ ہوں تو شیعہ مسلمان۔ اس کو مسلکِ تقلید کہتے ہیں۔

یہاں سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح جو مسلمان قوم وجود میں آتی ہے ان کی پوزیشن کیا ہے؟ اسے خود قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے۔ وہ انہیں من حیث القوم مسلمان قرار دیتا ہے —— یعنی امتِ محمدیہ کے افراد —— اور اُن کا غیر مسلموں سے جداگانہ اور الگ تشخص تسلیم کرتا ہے۔ خود رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ابتدائی مسلمان (صحابہ کبارؓ) تو عقل و فکر کی بنا پر سوچ سمجھ کر ایمان لائے تھے اس لئے ان کا شمار صحیح قرآنی مؤمنین کی صف میں ہوتا ہے جب مدینہ میں اسلامی مملکت کی شان و شوکت ابھری تو بہت سے اعرابی قبائل نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر اپنے آپ کو مؤمن سمجھنے اور کہنے لگ گئے۔ قرآنِ کریم نے انہیں تنبیہہ کی کہ تم ایسا مت سمجھو اور مت کہو۔ سورۃ حجرات میں ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (۴۹/۱۴)۔ یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (ایضاً) ان سے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ کیونکہ ایمان تمہارے دل میں داخل نہیں ہوا۔ تم صرف اس مملکت کے سامنے جھک کر اس قوم کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہو۔ لیکن اس سے تمہارے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ ہمارے اسلام لانے سے فائدہ کیا ہوا۔ تم اگر خدا اور رسول کی اطاعت کرو گے تو تمہیں اپنے اعمال کا اسی طرح بدلہ ملے گا جس طرح مؤمنین کو ملتا ہے (ایضاً)۔ تم اسلام کی صداقتوں

کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس طرح جب ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہو جائے تو اس وقت کہو کہ تم مؤمن ہو گئے ہو۔ اس سے ان لوگوں میں جو قلب و دماغ کے اطمینان کے بعد ایمان لائے ہوں اور ان میں جو پیدائشی مسلمان ہوں، یا جو کسی اور وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ہوں، خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا ہے۔ امتِ مسلمہ ہونے کی جہت سے تو مؤمن اور مسلمان ایک ہی قوم کے افراد ہوتے ہیں، لیکن ایمانی مدارج کے اعتبار سے ان میں فرق ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ مجید اکثر و بیشتر، مؤمن اور مسلم کے الفاظ ہم معنیٰ استعمال کرتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات، مسلم کو مؤمن پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی اعتبار سے کہ مؤمن صداقت کا اقرار کرتا ہے اور مسلم اس کے سامنے عملاً سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اس کی اطاعت کرتا ہے ـــ اس اعتبار سے وہ مؤمن اور مسلم کے الفاظ الگ الگ بھی لاتا ہے۔ مثلاً اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ۔ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ..... (۳۳/۳۵) کہیں وہ کہتا ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (۴۳/۶۹)۔ وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور مسلم ہیں یعنی ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ ایسے مقامات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم ہونا مؤمن ہونے ہی کی ایک خصوصیت ہے۔

مؤمن اور مسلم

یعنی قرآنی مفہوم کے مطابق، مؤمن وہ ہے جو آیاتِ خداوندی پر ایمان لاتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے۔ یعنی وہ مؤمن بھی ہوتا ہے اور مسلم بھی۔ یہی کیفیت مسلم کی ہے کہ وہ مسلم بھی ہوتا ہے اور مؤمن بھی ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر (قرآنی مفہوم کی رو سے) مؤمن مسلم بھی ہوتا ہے اور مسلم مؤمن بھی۔ (مسلمان کا لفظ قرآنِ مجید میں نہیں آیا)۔ اس مقام پر ہم جس نکتہ کی وضاحت کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم مسلمانوں کو امتِ محمدیہ کے افراد قرار دیتا ہے۔ یعنی انہیں غیر مسلموں سے الگ اور متمیز قوم تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ قرآنی معیار کے مطابق مؤمن نہیں ہوتے تو انہیں زمرۂ "مومنین" میں شمار نہیں کرتا۔ اگرچہ مخاطب انہیں بھی "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر ہی کرتا ہے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں اس فرق کا سمجھنا اور ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا کہ وہ ان الفاظ سے کہاں "قرآنی مؤمن" مراد لیتا ہے اور کہاں محض اصطلاحی مسلمان۔ "مسلمان قوم" کے افراد کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے جو کچھ کہا ہے، اُن (مسلمانوں) میں سے اگر کوئی شخص، اس میں سے کسی ایک بات کی صداقت سے بھی انکار کرتا ہے، یا قرآنِ مجید کے بعد اور وحی بھی تسلیم کرتا ہے، تو مسلمان قوم (اُمتِ محمدیہ) کا فرد بھی نہیں رہ سکتا۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد آپ اُن آیات پر غور کیجئے جن میں قرآنِ مجید مسلمانوں کو "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ النسآء میں ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴/۱۳۶)۔ اے ایمان والو! (ظاہر ہے

کہ یہاں ان سے مُراد مسلمان قوم کے افراد ہیں) تم ایمان لاؤ، اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر، جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا اور ان کتابوں پر، جنہیں اس نے اس سے پہلے نازل کیا (نیز ۵/۶۸)۔ غور کیجئے! یہاں "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" سے خطاب ہے اور ان سے کہا یہ جا رہا ہے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ۔ تم ایمان لاؤ اللہ پر۔۔۔۔۔۔

"ایمان والو!" سے یہ کہنا کہ تم ایمان لاؤ، بظاہر سمجھ آنے والی بات نہیں لیکن جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے گا جسے ہم نے اُوپر بیان کیا ہے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی۔ اسی ضمن میں اس آیت کو بھی دیکھئے جس میں کہا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲ نیز ۵/۶۹) اس کا صاف اور سلیس ترجمہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی یا نصاریٰ یا صابی ہیں، ان میں سے جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور اس کے ساتھ عملِ صالح کرے گا تو ان لوگوں کا بدلہ ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا اور وہ بدلہ یہ ہوگا کہ ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ یہاں دیکھئے! جس طرح یہود و نصاریٰ و صابئین کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اسی طرح اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کو بھی ایمان لانے کے لئے کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی مراد وہ مسلمان ہیں جو خود ایمان نہیں لائے لیکن جن کا شمار مسلمانوں کی قوم میں ہوتا ہے۔

اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ

ضمناً، یہاں یہود و نصاریٰ، سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں حالانکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن ان کے اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ ایمان کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص یہ کہدے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ ایمان اسی کا ہے جو خدا کو اُس تصوّر کے مطابق مانے، جسے خدا نے (قرآن مجید میں) پیش کیا ہے۔ اور اسی لئے اس نے کہا کہ: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ جو اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں، اس طرح ایمان لائیں جسطرح (اے جماعتِ مومنین!) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ فی الحقیقت خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مغالطہ کو بھی دور کر دیا جائے جو اس سورۃ کے محولہ بالا آیت (۲/۶۲) سے پیدا کیا جاتا ہے۔ گذشتہ (انیسویں) صدی عیسوی میں بنگال (ہندوستان) کے ایک ہندو راہنما، راجہ رام موہن رائے نے ایک تحریک اُٹھائی جو "برہمو سماج" کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس تحریک کی بنیاد اس

برہمو سماجی تحریک

نظریہ پر تھی کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ کہ حقیقت اور صداقت

صرف ان کے پاس ہے، کسی اور مذہب میں نہیں، باطل ہے اور ان کے باہمی اختلافات و نزاعات کا موجب۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ ان سچائیوں کو یکجا کر کے انہیں صحیح تسلیم کر لینے سے تمام مذہبی نزاعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس تحریک کا نام "برہمو سماج" تھا۔

کچھ عرصہ تک اس تحریک کا چرچا رہا لیکن یہ آگے نہ بڑھ سکی۔ ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی مشہور تفسیر، ترجمان القرآن، کی پہلی جلد شائع کی تو اس میں اس نظریہ کو دُہرایا گیا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ:۔

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی غلطی

(۱) اسلام نے نہ صرف یہی بتلایا ہے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہدیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔

(۲) اس نے کہا کہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ایک ہی ہے۔ وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ۔

(۳) اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔

(۴) اس نے کہا کہ اصلِ دین (یعنی ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی) کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جلد اول ۱۹۴۷ء ایڈیشن صفحہ ۲۱۴-۲۱۳ و صفحہ ۱۸۹ و صفحہ ۲۶۶ کا تشریحی نوٹ)

مولانا آزاد (مرحوم) مسلمانوں میں ایک عالمِ دین اور مفسرِ قرآن کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا لوگوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر تھا، اور ان کی اس تفسیر کا مدتوں سے انتظار تھا۔

چنانچہ جب یہ شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا اور مختلف گوشوں سے اس کی تعریف و توصیف میں غلغلے بلند ہوئے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس میں کس قسم کا "برہمو سماجی اسلام" پیش کیا گیا ہے اور اس کے مضرت رساں اثرات کیا نتائج پیدا کر سکتے ہیں تو میں نے اس پر مبسوط تنقید کی جو دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے مشہور مجلہ معارف کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ اس تنقید کو اربابِ نظر کے حلقہ میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور مختلف گوشوں سے مولانا آزاد کی تفسیر کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے اس میں اصولاً دو نکات پیش کئے تھے:۔

(۱) یہ کہنا تو صحیح ہوگا کہ عالمگیر سچائیاں ہر ربانی "مذہب" (نبی یا رسول) کو وحی کی رو سے یکساں

طور پر ملی تھیں لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سچائیاں آج بھی تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں، اس لئے کہ وہ دین جو ان انبیاء کرامؑ کو اپنے اپنے وقت میں ملا تھا کسی اہل مذہب کے ہاں اصلی، حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود نہیں۔ یہ صرف قرآن کریم کے اندر موجود اور محفوظ ہے۔ اور

(۲) یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تمام اہل مذاہب کو رسول اللہؐ کی رسالت اور قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔ [1]

اس کے بعد مسلمانوں میں تو مولانا آزاد (مرحوم) کے اس نظریہ کا اثر کم ہوتا چلا گیا، لیکن ہندوؤں نے اسے بہت اچھالا چنانچہ جون ۱۹۴۱ء میں، شولا پور، کے مقام پر "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی تو اس کے صدر پنڈت سندر لال جی نے مولانا آزاد کی تفسیر کی تائید سے اس نظریہ کو ابھارا۔ اور جب (تحریک پاکستان کے دوران) ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر، مسٹر گاندھی نے تمام ملک کے لئے ایک مشترکہ تعلیمی اسکیم کا منصوبہ تیار کیا تو اس میں اس نظریہ کو خاص اہمیت دی گئی ——— للہ الحمد کہ اس زہر آلود اور اسلام کش اسکیم کے بت کو پاش پاش کرنے کی سعادت بھی اسی ہیچمیرز کے حصہ میں آئی اور اس دور کے مجلہ طلوع اسلام میں شائع شدہ) ایک ہی مقالہ نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ [2]

ان حقائق سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے کس کس قسم کی سازشیں ہوتی تھیں۔ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ یہی تھا کہ اسلام کو اس قسم کی دستبرد سے بچایا جائے اور اسے پھر سے ایک جیتے جاگتے نظام کی شکل میں متمکن کیا جائے جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن تھا۔ اس تحریک کے ساتھ میری وابستگی کی وجہ بھی یہی تھی۔ یہ میرے ایمان کا تقاضا اور دین کا مطالبہ تھا۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹئے۔

تفصیل میں جائیے تو، قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو مبنی بر حق و صداقت سمجھنا ایمان کہلاتا ہے۔ اگر اس میں بیان کردہ کسی ایک بات کے سچا ماننے سے بھی انکار کر دیا جائے، یا اس کے مبنی بر حقیقت ہونے میں شبہ لاحق ہو جائے، تو اس

---

[1] میرا یہ مقالہ، میرے مجموعۂ مضامین، "فردوس گم گشتہ" میں شامل ہے جس کا عنوان ہے "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں"۔

[2] یہ مقالہ "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے عنوان سے چھپا تھا اور اس کے بعد (متعدد زبانوں میں) اس کا پمفلٹ ہزارہا کی تعداد میں سارے ہندوستان میں تقسیم ہوا تھا۔ اس سے یہ فتنہ فرو ہوا تھا۔

شخص کا ایمان، ایمان ہی نہیں رہتا۔ لیکن اجمالاً قرآنِ کریم نے پانچ اجزائے ایمان قرار دیئے ہیں۔ یعنی اللہ — آخرت — ملائکہ — کتب اور انبیاء (۲/۱۷۷) اور ان کے، یا ان میں سے کسی ایک کے انکار کو کفر قرار دیا ہے (۴/۱۳۶)۔ لیکن جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، ان پر ایمان کے معنے ہوں گے ان تفصیلات، امتیازات اور خصوصیات کے مطابق ایمان، جو ان کے متعلق قرآنِ کریم میں بیان کی گئی ہیں۔ اگر وہ ایمان، قرآنی تصورات کے مطابق نہیں تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ ایمان لانے کے لئے، قرآنِ کریم نے طریق یہ بتایا ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جو شخص "طاغوت" سے انکار کرے اور خدا پر ایمان لائے تو اس کے متعلق سمجھو کہ اس نے ایک ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

لَا و اِلَّا

دیکھئے! اس میں ایمان باللہ تک پہنچنے سے پہلے کفر بالطاغوت کی شرط ضروری قرار دی ہے۔ تفصیل میں گئے بغیر، الطاغوت کے متعلق یوں سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد ہر وہ نظریہ، تصور، عقیدہ، منہاج، مسلک ہے جو خلافِ قرآن ہو۔ لہٰذا قرآنی صداقتوں کو تسلیم کرنے کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ ذہن کو تمام غیر قرآنی تصورات و تخیلات سے پاک اور صاف کیا جائے، اس طرح جب ذہنِ انسانی کی لوحِ پاک اور صاف (CLEAN SLATE) ہو جائے گی تو پھر اس پر ایمان کے حروف و نقوش ثبت ہو سکیں گے۔ پہلے سے لکھی ہوئی سلیٹ پر نئی تحریر نہیں لکھی جا سکتی۔ انکار و اقرار کے اس عمل کو اس کلمہ کے دو اجزاء قرار دیا گیا ہے جسے تسلیم کرنے کے بعد انسان ایمان لاتا ہے یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اس کلمہ کے جزوِ اوّل کی رو سے یہ ضروری ہے کہ انسان، ہر غیر خداوندی اِلٰہ سے انکار کرے اور اس کے بعد خدا کے اللہ ہونے کا اقرار کرے۔ اِس حصہ لَآ کے بغیر اِلَّا کی منزل تک پہنچا نہیں جا سکتا۔ جب تک کعبہ سے ان بتانِ آذری کو نکال باہر نہ کیا جائے، اس میں (استعارۃً) "خدا داخل نہیں ہوگا"۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے: لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) تو اس سے یہی مراد تھی کہ جب تک ذہنِ انسانی غیر قرآنی تصورات سے پاک اور صاف نہ ہو اسے قرآن سے مس نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی طریق یہ ہوگا کہ انسان مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، علم، بصیرت، غور و فکر کے بعد اس حقیقت تک پہنچے کہ ذہنِ انسانی کے تراشیدہ نظریات و معتقدات (خواہ وہ غیر مسلموں کے ہوں اور خواہ یہاں خود اپنے ہاں سے وراثتاً ملے ہوں اور ہم نے تقلیداً اختیار کئے ہوں) حق و صداقت کے معیار پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا اس قابل نہیں کہ انہیں ضابطۂ ہدایت تسلیم کیا جائے۔ اس منفی عمل کے بعد اسی طرح غور و فکر کے ساتھ حقائقِ قرآنی کی صداقت پر ایمان لائے — خود بھی اسی طرح ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اسی طرح ایمان لانے کی دعوت دے۔ یہی وہ مسلک ہے جسے اختیار کرنے کے لئے رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ

عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ (۱۲/۱۰۸)۔ میں تمہیں علم و بصیرت کی بنا پر خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں — میں بھی یہی کرتا ہوں اور جو میرے راستے پر چلے گا وہ بھی یہی طریق اختیار کرے گا۔ یہی فرمانِ خداوندی ہے اور اسی کا نام اتباعِ سنتِ رسول اللہ ہے — دعوت اِلی القرآن علیٰ وجہ البصیرت۔

شروع میں بتایا گیا ہے کہ المؤمن کے معنے ہیں امن کی ضمانت دینے والا۔ جہاں تک مومنین کے باہمی روابط کا تعلق ہے ان کے، ایک دوسرے کے، امن و سلامتی کے ضامن ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم نے انہیں بھائی بھائی قرار دیا ہے اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ (۴۹/۱۰) ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ان کی خصوصیت رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (۴۸/۲۹) بتائی گئی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمخوار۔ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡہَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ لَعَنَہٗ وَ اَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا (۴/۹۳)" جس نے کسی مؤمن

مؤمنین کے باہمی تعلقات

کو عمداً قتل کر دیا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہ خدا کے غضب اور لعنت کا مورد ہے۔ اس نے اس کے لئے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ ہمارے معاشرے کا شعار یہ ہے کہ جب ایک مؤمن دوسرے سے ملے تو اُسے کہے" السلام علیکم" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُسے یقین دلائے کہ وہ اس کے امن و سلامتی کا خواہاں اور ضامن ہے۔ اور اس کے جواب میں دوسرا بھی اسے امن و سلامتی کی ضمانت دے۔ لہٰذا افرادِ مؤمنین کا باہمی امن و سلامتی کا ذمہ دار ہونا، ان کے مؤمن ہونے کی بنیادی شرط ہے۔

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، جماعتِ مؤمنین ان کے لئے بھی امن کی ضامن ہوتی ہے۔ اقوامِ عالم کے تعلقات باہمی معاہدات کی رو سے استوار ہوتے ہیں، لیکن پھر عصرِ حاضر کی میکیاولی (سیکولر) سیاست میں معاہدات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اول تو وہی حکومت، جس نے دوسری قوم کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے، اپنے عہد سے پھر جاتی ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرے تو اس کی جانشین حکومت اپنے آئین میں ایسی تبدیلی کر لیتی ہے جس کی رو سے سابقہ معاہدہ خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے بنابریں موجودہ نظامِ سیاست میں کوئی قوم بھی کسی دوسری قوم کی طرف سے امن و سلامتی کے سلسلہ میں مطمئن نہیں ہو سکتی یہی باہمی خدشات بین الاقوامی نزاعات اور بالآخر جنگوں کا موجب بن جاتے ہیں۔

غیر مسلموں کو امن کی ضمانت

لیکن اگر ایک ایسی قوم ہو جس کا آئین اور ضابطۂ قوانین ساری دنیا کے سامنے ہو۔ اس آئین میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ یہ قوم باہمی معاہدات میں کبھی دھوکہ نہیں دے گی، اور یہ ضمانت بھی کہ حکومتیں آئیں اور حکومتیں جائیں، لیکن اس آئین میں کوئی حکومت تبدیلی نہیں کرے گی؛

توسوچئے کہ ایسی قوم کی طرف سے اقوامِ عالم کس قدر مطمئن رہیں گی۔ اس قوم کا نام جماعتِ مومنین ہے۔ یعنی دنیا کو امن کی ضمانت دینے والی قوم۔ قرآنِ مجید کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل ہونا، امنِ عالم کی ایسی قابلِ اعتماد ضمانت ہے کہ دنیا کی کوئی اور قوم اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔

یہاں سے ہمارے سامنے ایک اور عظیم حقیقت آتی ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ خدا کا جس قسم کا تصور قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ "مذاہبِ عالم" میں کسی کے ہاں بھی اس قسم کا تصور نہیں تھا (نہ ہے) ان کے ہاں خدا کا تصور "بادشاہ" کا تصور تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ جس وقت، جس قسم کا جی چاہے حکم دے سکتا ہے۔ کسی کو اس حکم کی خلاف ورزی تو ایک طرف یہ پوچھنے کی بھی مجال نہیں ہو سکتی کہ حضورِ ملکِ معظم نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ اس کے فیصلے، اس کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

جب محدود قوتوں کے مالک بادشاہ کی مطلق العنانی کا یہ عالم ہوتا ہے تو لا منتہٰی قوتوں کا مالک، قادرِ مطلق، خدا کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند کس طرح ہو سکتا ہے؟ وہ جو جی میں آتے کہے، اور جو جی میں آئے کرے، کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور ایسا کیوں کیا ہے!

قانون کی حکمرانی

خدا کا یہ تصور ہر مذہب میں بطور قدرِ مشترک چلا آرہا تھا کہ قرآنِ کریم نے آکر اس کی تردید کی۔ اس نے کہا کہ خدا بیشک قادرِ مطلق ہے، لیکن تخلیقِ کائنات کے بعد اس نے، اپنی اس قدرتِ کاملہ کی رُو سے، ایسے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہِ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے ایسے قوانین مقرر کئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہم لا انتہا قوتوں کے مالک ہونے کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے غیر متبدل قوانین، خارجی کائنات کے لئے مقرر کئے ہیں، اسی قسم کے قوانین انسانی زندگی کے لئے بھی متعین کر دیتے ہیں۔ یہ قوانین قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں، غیر متبدل ہیں اور اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہیں (لا تبدیل لکلمات اللہ) (LAWS IN THEORY) بھی غیر متبدل ہیں (۶/۱۱۴) اور سنت اللہ (LAWS IN PRACTICE) بھی غیر متبدل (۳۳/۶۲)۔ اسی کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہے (سورۃ فاتحہ میں بھی ان امور پر قدرے گفتگو کی جا چکی ہے)۔

خدا کا یہ وہ منفرد تصور ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور جو مذاہبِ عالم میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ یعنی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی بجائے قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا ضامن خدا۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قانون کی تعریف (DEFINITION)

یہ کی جاتی ہے۔ (IF-THEN-ALWAYS) "اگر ایسا کروگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا"۔ آپ قرآنی احکام کے سلسلہ میں دیکھیں گے کہ کہا یہ گیا ہے کہ تم ایسا کرو، تاکہ ایسا ہو جائے۔ اسی کو قانون کی کارفرمائی کہتے ہیں۔ اس خدا پر ایمان رکھنے والا پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ "تم اپنی جگہ کام کرو، مجھے اپنی جگہ کام کرنے دو، نتائج خود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا" (۶/۱۳۶)۔ کہا جاتا ہے کہ نظری دعاوی کے پرکھنے کے لئے، استنتاجی طریق...... (PRAGMATIC TEST) دورِ حاضرہ کی خصوصیت ہے۔ آپ قرآنِ کریم کے قانونِ مکافاتِ عمل پر غور کیجئے اور سوچئے کہ نتائج سے دعاوی پرکھنے کا طریق، دورِ حاضرہ کی تخلیق ہے یا چودہ سو سال پہلے قرآن کریم کا پیش کردہ طریق! کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکے گا کہ قرآن اپنے دعاوی پر بلا علم و دلیل، آنکھیں بند کرکے، ایمان کا مطالبہ کرتا ہے؟ بہرحال، اب آگے بڑھئے:

جزا اور سزا

جزا اور سزا کا فلسفہ ایک مستقل موضوع ہے جو اپنے مقام پر سامنے آئے گا۔ اس جگہ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کسی کام کا جو نتیجہ کسی قانون کے مطابق مرتب ہو، اُسے خارج سے عائد کردہ "سزا" نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً آگ میں انگلی ڈالنے کا لازمی نتیجہ کرب و اذیت ہے۔ یہ اذیت خارج سے عائد شدہ سزا نہیں یہ آگ میں انگلی ڈالنے کا فطری نتیجہ ہے۔ خارج سے عائد کردہ سزا اور عمل کے فطری نتیجہ کے اس فرق کو ایک اور مثال کی رُو سے سمجھئے۔ آقا اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ اگر تم نے پھر برتن توڑا تو تمہیں پیٹوں گا۔ اور ایک ڈاکٹر مریض سے کہتا ہے کہ اگر تم نے پرہیز نہ کیا تو پھر بخار ہو جائے گا۔ دونوں مستقبل کے متعلق کہہ رہے ہیں اور دونوں میں تکلیف کا پہلو مضمر ہے۔ لیکن آقا جو کہہ رہا وہ اس کا حکم ہے اور ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے وہ عمل کے فطری نتیجہ کی پیش گوئی ہے۔ قرآن کریم افراد یا اقوام کی مختلف روشوں کے بعد جہاں کہتا ہے کہ "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (وغیرہ) انہیں الم انگیز عذاب ہوگا۔ تو یہ آقا کا حکم نہیں، غلط عمل کے فطری نتیجہ کی پیش گوئی (PREDICTION) ہے جو مستقبل میں سامنے آئے گا۔ "مستقبل" کی اہمیت آیت کے اگلے حصہ میں سامنے آئے گی، یہ ہے خدا کا وہ تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ (اللہ تعالیٰ نے کہا تھا) تم نے ہمیں پکارا اور کہا کہ سفرِ زندگی طے کرنے کے لئے صحیح راستہ کی طرف تمہاری راہنمائی کی جائے۔ تمہیں یہ راہنمائی اس الکتاب میں ملے گی جو تمہارے شکوک و شبہات اور ظن و تخمین کی پیدا کردہ الجھنوں کو دور کرکے تمہارے قلب میں اطمینان پیدا کر دے گی۔ لیکن اس راہنمائی سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو یہ چاہیں کہ وہ راستہ کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس وضاحت کے بعد بھی سفر کے لئے قدم اُسی کا اُٹھ سکے گا جسے یہ یقین حاصل ہو کہ راستہ کے متعلق جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہے۔ جب تک اسے یہ یقین حاصل نہ ہو وہ

سفر کے لئے قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس راستہ کو کبھی اختیار نہیں کرے گا۔ مستقبل کے متعلق اس طرح یقین حاصل کرنے کا نام ایمان رکھا گیا۔ لیکن اس ایمان کے متعلق کہا گیا کہ

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲/۳)

سوال یہ ہے کہ غیب کیا ہے؟ ایمان کے معنی (FAITH) کرنے سے جس دشواری کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب اس کے ساتھ غیب کا اضافہ کر دیا جائے۔ ایمان بالغیب کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے "ان دیکھے خدا یا ایسے ہی دیگر حقائق پر ایمان"۔ اس کے بعد کہا یہ جاتا ہے کہ جس خدا (یا حقائق) پر ان دیکھے ایمان لایا جائے اُن میں علم و عقل، دلیل و برہان اور غور و فکر کی کہاں گنجائش ہو سکتی ہے؟ لہٰذا سچا اور پکا ایمان وہی ہے جو بلا ثبوت بلا دلیل لایا جائے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ تصور قرآن کریم کے پیش کردہ تصوّر کے خلاف ہے۔ بنابریں ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ ایمان بالغیب کا صحیح قرآنی مفہوم کیا ہے۔

غیب کے بنیادی معنی ہیں، وہ جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ شے یا حقیقت، کہیں موجود ضرور ہو۔ لہٰذا غیب ان اشیاء یا حقائق کے متعلق کہا جائے گا جو کہیں موجود تو ہوں لیکن انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔ قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت، اس کے بالمقابل اس کی ضد لفظِ "شہادت" لا کر خود ہی کر دی ہے۔ اس میں خدا کو عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (۵۹/۲۲) کہا گیا ہے۔ مشہود کے بنیادی معنی تو یہی ہیں کہ وہ شے سامنے موجود ہو، لیکن اس مفہوم میں وسعت پیدا کر کے ان حقائق کو بھی مشہود کہا جاتا ہے جو انسانی حواس کی زد میں آ جائیں۔ اس ذریعۂ علم کو ادراک بالحواس (SENSE PERCEPTION) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو غیب اور شہود کے مختلف مدارج ہوں گے، مثلاً:

خارجی کائنات کی قوتیں

(۱) کائنات میں بے شمار ایسی اشیاء یا قوتیں ہیں جو علم انسانی کی کسی ایک سطح پر مشہود نہیں ہوتیں۔ یعنی ادراک بالحواس کی زد میں نہیں آتیں۔ لیکن جب اس سے اگلے دور میں انسانی معلومات کا دائرہ وسیع اور اس کے علم کی سطح بلند ہو جاتی ہے تو ان میں سے کئی ایسی قوتیں جو پہلے غیب تھیں مشہود ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ مثلاً: ایٹم اور اس کی بے پناہ قوتیں تخلیقِ کائنات کے پہلے دن سے اسی فضا میں موجود تھیں لیکن وہ انسانی حواس سے اوجھل تھیں۔ ہمارے زمانے میں وہ مشہود ہو کر سامنے آ گئی ہیں یا آ رہی ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے دعاوی کے ثبوت کے اثبات کے سلسلہ میں یہ بھی کہا ہے کہ: سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۴۱/۵۳)

ہم، عالمِ انفس و آفاق میں چھپی ہوئی آیات (نشانیوں) کو رفتہ رفتہ سامنے لاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقتِ ثابتہ ہے۔ واضح رہے کہ غیب اور شہادت کے امتیازات انسان کے محدود علم کی بنا پر ہیں۔ ورنہ علمِ خداوندی میں تو کوئی شے غائب ہے ہی نہیں، ہر شے اور حقیقت مشہود ہے — وہ جب کہتا ہے کہ خدا کو غیب کا علم بھی ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے ان اشیا یا حقائق کا علم جو انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس آیت میں کہا ہے کہ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائیگا، کائنات کے بغیاب ایک ایک کر کے مشہود ہوتے جائیں گے اور وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ قرآنِ مجید نے اس باب میں جو دعویٰ کیا تھا وہ مبنی بر حقیقت تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ قرآنِ کریم کے ہر دعوے کا مشہود ثبوت انسانوں کے سامنے آجائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرآنی دعاوی اور حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جا سکتا تھا وہ علمِ انسانی کے کسی ایک دور میں سمجھا جا چکا ہے اور اس کے ماحصل میں نہ کوئی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ، خود انسانی علم اور قرآنی شہادات کے خلاف ہے۔ ایک چیز ہے انسانی زندگی کے لئے راہنمائی اور قرآنی قوانین و اقدار۔ انہیں قرآن نے محکمٰت کہکر پکارا ہے (۳/۷) یہ نہایت واضح اور متعین ہیں۔ اس لئے یہ تو ہر دور میں بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ لیکن دوسری چیز ہے قرآنِ کریم میں پیش کردہ حقائق جنہیں اس نے متشابہات کہا ہے (۳/۷) یعنی وہ مجرد حقائق جنہیں تشبیہات کے ذریعہ ہی سمجھایا جا سکتا ہے[1]۔ ان کے متعلق کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک دور میں یا کسی ایک فرد یا افراد نے ان پر کاملۃً احاطہ کر لیا ہے۔ رموز و اسرارِ فطرت کے متعلق سائنسدانوں کا اعتراف و اعلان ہے کہ اس باب میں "حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے چھوڑ دینا پڑتا ہے"[2]۔ سائنس کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا، لیکن قرآنی حقائق کے متعلق تو اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کا کاملۃً احاطہ نوعِ انسان کے دورِ آخر پر ہی رکھا جا سکتا ہے۔

(۲) بعض ایسے حقائق بھی ہیں جنکا انسانی حواس کی زد میں آنا ممکن ہی نہیں۔ مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت یا مرنے کی بعد کی زندگی کی کیفیات۔ قرآنِ کریم نے جب خدا کے متعلق کہا ہے کہ: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶/۱۰۳) انسانی نگاہیں خدا کا ادراک نہیں کر سکتیں، لیکن علمِ خداوندی، ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے" تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا۔ حتّٰکہ اس نے یہاں تک کہدیا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲/۱۱) تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ذاتِ خداوندی

---

[1] تفصیل ان کی اپنے مقام پر آئے گی۔

[2] THE GREAT DESIGN (P. 52)

کی کنہ دحقیقت کو کسی شئے کی مثال دیکر بھی سمجھایا نہیں جا سکتا، کہ شئے کوئی بھی ہو، بالآخر محسوس ہو گی اور ذاتِ خداوندی محسوسات کی حد سے ماوراء ہے۔ [1]

ماورائے سرحدِ ادراک لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان حقائق نامشہود و نامحسوس کے متعلق غور و فکر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے کارگہِ کائنات اور اس میں کارفرما عناصر و قوٰی کو آیات اللہ کہکر پکارا ہے۔ آیت کے معنے ہوتے ہیں ایسی علامت یا نشانی جس سے کسی شئے کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ لہٰذا اشیاءِ فطرت اور نظامِ کائنات ایسی علامات ہیں جن پر غور و فکر سے ہستیِ باری تعالیٰ کے متعلق فکری طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کائنات میں (بالخصوص مابعدالطبیعات سے متعلق) کتنے بسیط حقائق (ABSTRACT TRUTHS & REALITIES) ہیں جنہیں غور و فکر کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حیاتِ آخرت کا تعلق یکسر مابعدالطبیعاتی حقائق سے ہے۔ اِسی سورۃ بقرۃ کی آیات ($\frac{2}{219-220}$) میں کہا گیا ہے کَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ "ہم اس طرح آیات کو واضح کئے چلے جاتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کر سکو" آپ نے دیکھا کہ یہاں، اِس دنیا اور اِس دنیا کی زندگی کے ساتھ آخرت پر غور و فکر کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ اُس زندگی کی کنہ دحقیقت تو سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن (قرآنی روشنی میں) غور و فکر کے بعد اس کا اثبات اور اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ حقائق محسوس طور پر تو نگاہوں کے سامنے نہیں آسکتے لیکن ایمان بالغیب کا یہ گوشہ بھی علم و بصیرت اور تفکر و تدبر کے احاطہ سے باہر نہیں۔

(۳) ایمان بالغیب کی ایک اور شکل بھی ہے۔ ایک کسان کے پاس تھوڑا سا گندم رکھا ہے جو اس کی اور اس کے بچوں کی پرورش کے کام آسکتا ہے۔ وہ گندم کی بوری کو اٹھاتا ہے اور اسے اپنے کھیت کی مٹی میں ملا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر روز صبح کے وقت اٹھتا ہے۔ سارا دن اس کھیت میں جان مار کر محنت کرتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ واپس آجاتا ہے۔ وہ ایسا ایک دن، دو دن نہیں کرتا، مسلسل اور متواتر مہینوں تک، اسی طرح کرتا رہتا ہے۔ اس کے اس پروگرام اور اس کے نتائج

اَن دیکھے نتائج کو نہ جاننے والے اسے یقیناً پاگل کہیں گے کہ یہ کسی دیوانے ہی کا کام ہو سکتا ہے کہ وہ مہینوں صبح سے شام تک جان مارے اور اس سے اُسے حاصل کچھ نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کے لئے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ اس کا جواب بڑا آسان ہے، اور وہ یہ کہ اگرچہ سرِدست اس کی محنت کے محسوس نتائج

---

[1] یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی کی معرفت (پہچان لینے) کا مطالبہ نہیں کیا۔ اسپر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ معرفتِ ذاتِ خداوندی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔

سامنے نہیں آرہے لیکن اسے یقین ہے کہ یہی چند دانے جنہیں اس نے مٹی میں ملا دیا ہے، ایک دن، پختہ گندم کی شکل میں بوریاں بھر کر اس کے گھر میں آجائیں گے۔ کسی پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر اس طرح یقین کرنا بھی ایمان بالغیب کہلاتا ہے۔

اس کسان کے متعلق تو پھر بھی کہا جائے گا کہ وہ اس پروگرام کے محسوس نتائج کو اس سے پہلے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس سلسلہ میں اسے صرف اس یقین کی ضرورت تھی کہ اگر اس پروگرام پر صحیح طریق سے عمل کیا جائے تو اس کے محسوس نتائج سامنے آکر رہتے ہیں۔ لیکن ایسے پروگرام بھی تو ہوتے ہیں جنہیں پہلی بار شروع کرنا ہوتا ہے۔ اس کے محسوس نتائج کی کوئی نظیر یا مثال اس سے پہلے سامنے نہیں ہوتی۔ اس قسم کے پروگرام کے لئے آمادہ بہ عمل ہونے کے لئے ایک ہی جذبۂ محرکہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اس پروگرام کو پیش کر رہا ہے اس کی باتوں کی صداقت پر کامل یقین ہو۔ اسے ایمان بالرسالت کہا جاتا ہے۔ اس کی صداقت کی شہادت اُس شخص کی سابقہ زندگی ہوتی ہے۔ جب قریش عرب نے رسول اللہ سے کہا کہ جس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے آپ ہم سے کہتے ہیں اور اس کے درخشندہ نتائج کے متعلق اس قدر حزم و اعتماد کے ساتھ یقین دلاتے ہیں، ہم کس طرح مان لیں کہ یہ صحیح اور سچ ہے۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے صرف ایک فقرہ کہا اور وہ یہ کہ:-

خود داعی کی زندگی

فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (۱۰/۱۶)۔

میں تم میں کوئی اجنبی نہیں، نو وارد نہیں کہ تمہیں میرے ماضی کے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس سے پہلے اپنی پوری زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ جس قسم کی زندگی میں نے بسر کی ہے کیا اس سیرت و کردار کے انسان کے متعلق ایسا باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ جائے ــــ کہنے والےؐ نے انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ یہ کہا اور سننے والوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کی بات کو نہ جھٹلایا۔ وحیِ خداوندی نئے پروگرام پیش کرتی ہے اور یہ راستے ہونے بھی بڑے کٹھن ہیں۔ اس وحی کو پیش کرنے والے کی بات کو سچا ماننے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمیں خود اس کے سچا ہونے پر یقین ہو۔ اسے ایمان بالرسالت کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ اپنی بات کو بھی بلا دلیل و حجت نہیں منواتا۔ اپنے پیش کردہ نظام کی نتیجہ خیزی کے ثبوت کے لئے وہ سابقہ اقوام کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ تم تاریخ کے ان شواہد پر غور کرو۔ اِن سے یہ حقیقت واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ وہ نظام جسے میں پیش کر رہا ہوں، پہلی بار دنیا کے سامنے نہیں آیا، اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کیا جا چکا ہے۔ جس قوم نے اس نظام پر عمل کیا اُسے دنیا بھر کی سرفرازیاں اور خوشحالیاں نصیب ہو گئیں۔ جنہوں نے اس کے خلاف

تاریخی شواہد

اپنے خود ساختہ نظاموں پر عمل کیا وہ تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں میں جا گریں۔ تم جاؤ اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھو۔ ان پر ان کے مآل اور نتائج کے نقوش ابھرے ہوئے الفاظ میں مرتسم ملیں گے، اور میرے دعویٰ کا ثبوت بن کر سامنے آجائیں گے۔

دیکھئے یہاں پھر ایمان بالغیب کے لئے غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔ کتابِ خداوندی نے متقین کے اولین گروہ کے لئے جس راستے کی نشاندہی کی تھی وہ ان کے لئے بالکل نیا راستہ تھا۔ اس پر گامزن ہونے کے لئے اسی قسم کے ایمان بالغیب کی ضرورت تھی جس کا تذکرہ ان سطور میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مخالفین اس راستہ میں حائل ہونے والی ہزار قسم کی مشکلات اور خطرات کی نشاندہی کرتے ہوں گے۔ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں باتیں کرتے ہوں گے۔ اس سے ہو سکتا تھا کہ

السابقون الاولون

اُن کے دل میں بھی وساوس ابھریں۔ لہٰذا اس کے لئے بڑے ہی پختہ عزم اور محکم ایمان کی ضرورت تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں قرآنِ کریم نے اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (۹/۱۰۰)۔ کہہ کر پکارا ہے اور ان پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے ہیں (۵۶/۱۰-۲۶)۔ یہ حقیقت ہے کہ (PIONEERS) کا مقام بڑا بلند ہوتا ہے۔ جب ان کا بویا ہوا کھیت، پکی ہوئی فصل سامنے لے آتا ہے تو اسے دیکھ کر دوسرے لوگ فوج فوج اس نظام کی طرف لپک کر آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسے جماعتِ مؤمنین کی از بس جانکاہ کوششوں اور قربانیوں کا فطری نتیجہ بتایا ہے (۱۱۰/۱-۲)۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لئے اس نظام کے محسوس نتائج، اس کی طرف کشاں کشاں چلے آنے کا جذبہ محرکہ بن جاتے ہیں لیکن انہیں بھی ایک اور یقین اور ضمانت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جس قانون کے مطابق اس نظام نے ایک دفعہ یہ نتائج پیدا کر دیئے ہیں وہ قانون اٹل ہے، غیر متبدل ہے۔ اس کی رو سے جو نتائج ایک دفعہ پیدا ہو چکے ہیں، جب بھی اس کے مطابق عمل کیا جائے گا وہی نتائج پیدا ہو جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم بار بار سامنے لاتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۳/۶۲ و ۳۵/۴۳) کائنات میں یہی قانون شروع سے کارفرما چلا آرہا ہے، یہی آج بھی نافذ العمل ہے، اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ سارا قرآن اسی حقیقت کا مظہر ہے کہ قوانینِ خداوندی

قانون کی محکمیت

کی نتیجہ خیزی میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی خواہ وہ خارجی کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت ہوں یا انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانینِ قرآنی۔ یہ تمام نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ جن قوانین پر اس کی بنیادیں استوار ہیں ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انہی قوانین کے غیر متبدل ہونے پر یقینِ محکم تھا جس کی بنا پر (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) نبی اکرم صلعم نے اپنے مخالفین سے کہا

کہ اگر اس قدر نظری دلائل و براہین کے بعد بھی تم اس کی صداقت کے قائل نہیں ہوتے تو اس کے بعد ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (۶/۱۳۶)۔ تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ میں اپنی جگہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل دوں گا نہ تم میرے پروگرام میں رکاوٹ ڈالو۔ اس کے بعد تھوڑا سا انتظار کرو ـــــ اتنا سا انتظار جتنا بیج بونے اور فصل کے پکنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ـــــ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (ایضاً) تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ کامیابی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (ایضاً) ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ تم کہتے ہو کہ یہ غلط ہے۔ دنیا میں قومیں ہر قسم کا ظلم و استبداد کرتی ہیں اور پنپتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہمارا اپنا بھی تجربہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ تھوڑا سا انتظار کرو۔ یہ حقیقت مشہود و محسوس طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہ خدا کا وہ قانون ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔

(۴) غیب و شہادت کی ایک صورت اور بھی ہے۔ علم الافلاک کے ماہرین نہایت حتم و یقین کے ساتھ بتا دیتے ہیں کہ آج سے سو سال کے بعد فلاں دن، فلاں وقت، سورج کو گہن لگے گا۔ اور ٹھیک اس دن، اسی وقت، سورج کو گہن لگ جاتا ہے۔ توہم پرستی کے زمانے میں اس قسم کی پیش گوئیاں کرنے والوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک ہیں۔ اس لئے ان کی پرستش ہوتی تھی۔

پیش گوئیاں

لیکن علمِ انسانی کی وسعت کے بعد آج یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح سامنے آگئی ہے کہ اس میں فوق الفطرت عنصر کوئی نہیں۔ یہ صرف اِس علم کا نتیجہ ہے کہ چاند سورج کی گردشیں کس قانونِ فطرت کے تابع ہیں اور یہ کہ وہ قانون غیر متبدل ہے جو شخص بھی اس قانون کا علم حاصل کر لے، سو کیا، ہزاروں سال پہلے، اس قسم کی پیش گوئیاں کر سکتا ہے۔

لیکن اس قسم کی پیش گوئیاں ان اشیاء کے متعلق تو کی جا سکتی ہیں جو صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں۔ جو قوانینِ فطرت کے تابع چلنے کے لئے مجبور ہیں اور جنہیں اپنی مرضی سے کچھ کرنے کا اختیار ہی حاصل نہیں۔ جو مخلوق اپنے فیصلے آپ کرنے کا اختیار رکھتی ہے اس کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی (انسان تو بہت بڑی صاحبِ اختیار مخلوق ہے۔ آپ ایک چھوٹی سی مخلوق کے ضمن میں مثال کے طور پر اس حقیقت کو سامنے لائیے) دنیا کے دس عظیم القدر سائنسٹ میز کے گرد بیٹھے تحت الثریٰ سے اوجِ ثریا تک اشیائے فطرت کے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کرنے میں مصروف ہیں، اور وہ ایسی پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ اُن کے سامنے میز پر ایک مکھی آکر بیٹھ جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، دس کے دس مل کر بھی یہ نہیں بتا سکیں گے کہ وہ مکھی وہاں سے اُڑ کر اسی میز پر کہاں جا بیٹھے گی! آپ سوچیے کہ جب مکھی جیسی "صاحبِ ارادہ" جاندار کے متعلق اتنا بھی نہیں

بتایا جا سکتا کہ وہ مستقبل میں کیا کرے گی تو انسان جیسے صاحبِ اختیار و ارادہ کے مستقبل کے متعلق کوئی پیش گوئی کیسے کی جا سکتی ہے؟ انسانوں کے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کرنے والے باطل کے دعویدار ہیں۔ کوئی دوسرا تو ایک طرف، قرآن کریم تو یہاں تک کہتا ہے کہ ایک فرد خود اپنے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور اس کی موت کس سرزمین میں واقع ہوگی:

مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (۳۱/۳۴)[1]

یہی وہ غیب ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں (۲۷/۶۵) اس غیب کی چابیاں اسی کے پاس ہیں (۶/۵۹)۔ اور تو اور خدا کے رسول تک کو بھی از خود غیب کا علم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ نے بھی (بزبانِ وحی) اپنے متعلق فرمایا لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۶/۵۰)۔ غیب کا علم میں بھی نہیں جانتا۔ امورِ غیبیہ میں سے رسول کو بھی انہی باتوں کا علم ہو سکتا تھا جو اُسے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی بتائی جاتی تھیں۔ چنانچہ ایسے علم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح کر دی کہ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ (۳/۴۴)۔

اس قسم کے غیب کا علم صرف خدا کو حاصل ہے

یہ وہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں ہم بذریعہ وحی تمہیں بتا رہے ہیں۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ ذاتِ رسالت مآبؐ پر ختم ہو گیا اس لئے اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے غیب کا علم نہیں مل سکتا۔ یہ جو نام نہاد "روحانیت" کے مدعی آئے دن دعوے کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں غیبی امور کا علم خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور اُن کے متعلق ہم پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں، یہ بالفاظِ دیگر، دعویٰ نبوت ہے، کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ اس قسم کا غیب کا علم، وحی کے ذریعے صرف رسولوں کو دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی پیش گوئیاں کرنے والوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان کے یہ دعاوی رَجْمًۢا بِالْغَیْبِ (۱۸/۲۲) سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یعنی اندھیرے میں تیر تکے چلانے والے، یونہی قیاس آرائیاں کرنے والے ہیں۔ اگر اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنے والے خدا کی طرف سے علم پانے کا دعویٰ نہیں کرتے تو ہمیں ان سے کچھ تعرض نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم اتنا ہی کہیں گے کہ یہ غیب کا علم نہیں، محض انسانی قیاسات ہیں۔ لیکن جو یہ کہیگا کہ اُسے یہ علمِ غیب خدا کی طرف سے ملتا ہے (اور اسے کشف و الہام کہا جاتا ہے) تو ہم بلا تامل کہدیں گے کہ وہ اپنے اس دعوے میں سچا نہیں، کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ اس قسم کا علم صرف وحی کی رُو سے حضراتِ انبیاء کرامؑ کو حاصل ہو سکتا تھا اور سلسلۂ وحی ختم ہو چکا ہے۔ قرآن کریم نے صرف وحی کا ذکر کیا ہے۔ کشف و الہام کا اس میں کہیں ذکر نہیں۔

---

[1] اس پوری آیت کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ جو حضرات مسئلۂ تقدیر سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری تصنیف "کتاب التقدیر" کا مطالعہ فرمائیں، جس میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ جو لوگ عزمِ سفر رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں اس راستہ کا پتہ نشان دے دیا جائے جو انہیں بلاخوف و خطر ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے، تو یہ "الکتاب" انہیں اس قسم کی راہنمائی دے سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کتاب کا بتایا ہوا راستہ وہ ہوگا جس پر یہ اس سے پہلے گامزن نہیں ہوتے، اس لئے وہ اسی صورت میں اس راستہ کو عزم اور یقین کے ساتھ اختیار کر سکیں گے جب انہیں اس راستے کے صحیح اور بے خطر ہونے پر پورا پورا یقین ہو۔ لہٰذا متقین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس ان دیکھے راستے کی صحت (یعنی اس نئے نظام کے ان دیکھے نتائج) پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے عازمِ سفر ہوں۔ اس کے بعد انہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا ہوگا، اس کے متعلق کہا:

(۲/۳) وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ

"يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ" کا ترجمہ کیا جاتا ہے "وہ نماز قائم کرتے ہیں" "نماز پڑھتے ہیں" کا تو مطلب سمجھ میں آسکتا ہے لیکن "نماز قائم کرتے ہیں" سے بات واضح نہیں ہوتی۔ یقیمون کا مادہ (ق-و-م) ہے۔ قَامَ، قِیَامًا کے معنے ہوتے ہیں کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا۔ ثابت اور دائم رہنا اَقَامَ کے معنے ہیں اُسے درست اور سیدھا کیا۔ اس کا توازن قائم رکھا۔ ان معانی کو سورۃ فاتحہ میں اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اقامتِ صلوٰۃ کے معنے ہوں گے الصلوٰۃ کو محکم اور استوار کرنا۔ متمکن کرنا۔ (ESTABLISH) کرنا۔ مارماڈیوک پکتھال نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن مجید میں یقیمون کے یہی معنے لکھے ہیں (اگرچہ اس کے ساتھ الصلوٰۃ کا ترجمہ روشِ عامہ کے تتبع میں (WORSHIP) ہی کیا ہے) اس سے واضح ہے کہ "الصَّلٰوۃ" کوئی ایسی چیز ہے جس کا متمکن اور مستحکم کیا جانا مطلوب و مقصود ہے۔ نماز کے متعلق آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ دین کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاحات کو علیٰ حالہٖ رکھا جائے ان کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ ان کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی جگہ کسی دوسری زبان کے الفاظ رکھ دینے سے نہ صرف یہ کہ ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ وہ مفہوم مسخ ہو جاتا ہے۔ الصلوٰۃ کو الصلوٰۃ ہی کہنا چاہئے اور اس کا مفہوم عربی لغت اور قرآن کریم سے متعین کرنا چاہئے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی اصطلاحات دین کے بنیادی ارکان (عمائد اور ستون) کی حیثیت سے بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اس سے ان کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

لغت اور قرآن کریم کی رُو سے مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں اس اہم نقطہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ لغت سے وہ بنیادی تصور (CONCEPT) سامنے آجاتا ہے جو اس لفظ کے مادہ میں مضمر ہوتا ہے اور جس کے لئے اُسے عرب

استعمال کرتے تھے۔ (اسے محاورۂ عرب کہا جاتا ہے) لیکن جب ان الفاظ میں سے کسی لفظ پر (اَل) داخل کر کے، اُسے معرفہ بنا لیا جائے تو وہ قرآنی اصطلاح ہو جاتا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم قرآن کریم سے متعین کیا جائے گا۔ اس کا ذریعہ "تصریفِ آیات" ہے۔ یعنی قرآن کریم

قرآنی اِصطلاحات کامفہوم

جس جس مقام پر اس اِصطلاح کو لایا ہے وہاں سے یہ اخذ کرنا کہ اس کا اس باب میں مقصد و مطلب کیا ہے۔ محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات سے (غور و تدبر کے بعد) قرآنِ مجید کے مفردات و اصطلاحات کا مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے مثلاً لفظ صلوٰۃ کے بنیادی معانی محاورۂ عرب کی رُو سے متعین کئے جائیں گے۔ اور جب الصلوٰۃ کہا جائے گا تو یہ قرآنی اصطلاح ہو گی۔ اس پر دیگر قرآنی اصطلاحات کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہمنے بہرحال یہی طریق اختیار کیا ہے)۔

صلوٰۃ کے لغوی معنی

صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے۔ ویسے اس کا مادہ (ص۔ل۔ی) بھی ہو سکتا ہے (لیکن یہ فنی بحث ہے جسے میں نے "لغات القرآن" میں بیان کیا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ بنیادی طور پر اِس کے معنے ہوتے ہیں، کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا۔ چونکہ عرب، نظری اور تجریدی حقائق کا مفہوم محسوسات کے ذریعہ واضح کیا کرتے تھے اس لئے ان کے ہاں گھُڑدوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر اس طرح مسلسل دوڑتا جائے کہ اُس کی کنوتیاں پہلے نمبر والے گھوڑے کی سُرین سے مِل رہی ہوں تو وہ آگے جانے والے گھوڑے کو "سَابِق" کہتے تھے اور اس دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ۔ اسی بنا پر امام راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (۷۴/۴۳)۔ ہم مصلّین میں سے نہیں تھے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ لغت کی اہم کتاب تاج العروس میں ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں لزوم (وابستگی) یعنی کِسی کے ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس جہت سے قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ صلوٰۃ کے معنے ہوں گے نظامِ خداوندی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا۔ کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ اس بنا پر صلوٰۃ کے معنے خدا کی طرف سے متعین کردہ فرائضِ منصبی کے بھی آتے ہیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ "الصلوٰۃ" سے مفہوم صِرف نماز نہیں۔ اس میں پورے کے پورے قوانین و احکامِ خداوندی اور اس کے عائد کردہ فرائضِ منصبی آجاتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں ہم نے دیکھا ہے کہ مؤمنین کی دعا ہوتی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵)۔ اور سورۂ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶)۔ میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔ نظر بظاہر یوں دِکھائی دے گا گویا خدا صراطِ مستقیم پر آگے آگے جا رہا ہے اور مومنین اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی دعا مانگ رہے ہیں۔

(صلوٰۃ میں یہی مفہوم مضمر ہے) لیکن اسطرح کا تشبیہی مفہوم خدا کے تنزیہی تصور کے خلاف ہے اس لئے اس کا مفہوم یہی ہوسکتا ہے کہ وہ نظامِ کائنات، جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے اپنے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ مفہوم سورۃ "النور" کی اس آیت سے نکھر کر سامنے آجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۔ وَ الطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسۡبِیۡحَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ (۲۴/۴۱) "کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ارض و سمٰوٰت کی ہر شے اور فضائے سماوی میں پرفشاں پرندے خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہے"۔ لفظِ تسبیح کی تشریح تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گی یہاں مجملاً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ اس کے معنے ہوتے ہیں، مقصدِ پیشِ نظر کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اس کے لئے اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر دینا۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ بات واضح ہے کہ کائنات کی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائضِ منصبی کیا ہیں۔ اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے جس کے لئے انہیں مصروفِ جد و جہد رہنا ہے۔ یہاں سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

دوسرے مقام پر قرآنِ کریم نے خود انسانوں کے متعلق وضاحت کر دی ہے کہ الصلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا۔ اس کے قیام سے کیا حاصل ہوتا ہے اور اس کے ضائع کر دینے سے کیا تباہی آتی ہے۔ سورۃ مریم میں پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کا تذکرہ آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ (۱۹/۵۹)۔ ان کے بعد، ان کی امتوں میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے الصلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ انہوں نے کیا کیا جس سے الصلوٰۃ کا ضیاع ہوگیا۔ کہا وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ (۱۹/۵۹)۔ وہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتباعِ جذبات دو متضاد چیزیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے [دیکھئے (۱/۱)] انسانی جذبات کی تسکین بُری چیز نہیں بشرطیکہ ان کا اتباع حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے۔ یہ تباہیاں اس وقت لاتے ہیں جب یہ سرکش اور بیباک ہو جائیں لہٰذا

ضیاعِ صلوٰۃ

الصلوٰۃ کے معنے ہوئے انسانی خواہشات و جذبات کی، قوانینِ خداوندی کے مطابق تسکین و برومندی۔ اُن سے، حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا۔ انہیں قوانینِ الٰہیہ کے پیچھے پیچھے چلانا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اجتماعی نظام کے تابع ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ نظام جس میں مختلف افراد اپنے اپنے مفادات کے پیچھے بھاگنے کی بجائے خدا کے متعین کردہ نصب العین کی طرف بڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کو

ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی بتایا کہ الصلوٰۃ کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے جب جماعتِ مومنین کو تمکن فی الارض حاصل ہو۔ ان کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ہے: اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں

اپنی آزاد مملکت کی ضرورت

کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا، ان کی اپنی مملکت قائم ہوگی (۲۲/۵۵) تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔ بہ ظاہر ہے کہ نماز پڑھنے اور (مروجہ ڈھائی فیصد) زکوٰۃ دینے کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت لاحق نہیں ہوسکتی۔ مروجہ طریق پر یہ فرائض ہر حکومت میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ ہمیں انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں بھی نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حق حاصل تھا۔ اور آج ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا وہ مفہوم نہیں جو آج کل لیا جاتا ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ادا کئے جا سکتے ہیں (زکوٰۃ کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر آئے گی یہاں ہم صرف صلوٰۃ تک محدود رہنا چاہتے ہیں)۔

اسلامی مملکت کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ کہ وَ الَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ۪ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ (۴۲/۳۸) "مومنین وہ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ اور جو رزق خدا نے انہیں دیا ہوتا ہے اسے نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں" (یہی ایتائے زکوٰۃ کا مفہوم ہے) یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ وہ نظامِ مملکت ہے جس میں تمام امور جماعتِ مومنین کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور جس کا بنیادی فریضہ نوعِ انسان کی ربوبیت ہے۔ چونکہ اسلامی نظام کتاب اللہ کے قوانین و اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے اس لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (۷/۱۷۰)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور اس طرح اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ الصلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے، اسے قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں واضح کر دیا ہے۔ سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوتِ خداوندی کو پیش کیا تو حسبِ معمول انہوں

الصلوٰۃ اور معاشیات

نے اس کی مخالفت کی۔ شدید کشمکش کے بعد قوم نے حضرت شعیبؑ سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں؟۔ آپ نے فرمایا کہ میں صلوٰۃ کی آزادی چاہتا

ہوں (کہ اس میں آپ لوگ مخل نہ ہوں) اس مذہب پرست قوم نے اپنے خیال کے مطابق سمجھا کہ یہ اپنے طریق پر خدا کی پرستش کی اجازت چاہتے ہیں اس میں کونسی حرج کی بات ہے۔ یہ جسطرح جی چاہے پوجا پاٹ کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ اس پر رضامند ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صلوٰۃ سے حضرت شعیبؑ کا مطلب وہ نہیں تھا جسے وہ سمجھے بیٹھے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)۔ اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔ اس صلوٰۃ کی تو ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

آپ اس آیۂ جلیلہ کے آخری حصہ پر غور کیجئے، جس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ صرف نماز کا نام نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہوتا ہے۔

ہم نے سورۃ حج کی آیت (۲۲/۴۱) میں دیکھا ہے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جب جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگی تو وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵)۔ یہ حقیقت ہے کہ الصلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ فحشاء کی تفصیلی بحث تو آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو منکر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے، نہی عن المنکر، مملکت کا فریضہ بتایا گیا اور یہاں یہ کہا گیا کہ یہ کام الصلوٰۃ کرے گی۔ یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ اس نظام ہی کا نام ہے جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جہاں تک ہماری نمازوں کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ان سے فحشاء اور منکرات نہیں رُکتے۔ بے نمازوں کو تو چھوڑیئے، کتنے نمازی ہیں جو بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود منکرات کے مرتکب بھی ہوتے ہیں لہٰذا منکرات، نظامِ صلوٰۃ (اسلامی نظامِ مملکت) ہی سے رُک سکتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ کا قیام کسقدر عظیم انقلابی مہم چاہتا ہے، اس کی وضاحت قرآن کریم نے صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کی داستانِ تصادم میں نہایت دلنشین انداز میں بیان کی ہے۔

انقلابِ عظیم

بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ طور کی چوٹیوں پر گئے اور وہاں خدا نے انہیں پکارا تو سب سے پہلے یہ کہا۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۲۰/۱۳)۔ اے موسیٰ! یہ یونہی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں کہ تم یہاں آگئے ہو اور ہم نے تم سے باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ ہم نے تمہیں ایک خاص مقصد اور اپنے ایک عظیم پروگرام کی سرانجام دہی کے لئے منتخب کیا ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ یہ انتخاب بھی یونہی عمل میں نہیں آگیا۔ اس کے لئے تمہیں بڑی جانکاہ کٹھالیوں میں سے گزارا گیا ہے۔ جب تم ان پیمانوں پر پورے اترے تو ہم نے تمہیں اپنے لئے منتخب کیا ہے (۲۰/۴۱)

لہٰذا تم ہماری بات دل کے کانوں سے سنو۔ پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (۲۰/۱۴)
ہمارے سوا، کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اس لئے محکومیت صرف ہماری اختیار کی جا سکتی ہے، کسی اور کی نہیں۔ فرعون
نے تمہاری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس قوم کو اس کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر خدا
کی محکومیت اختیار کرنے کے لئے آزاد کرانا ہے۔ اس کے لئے وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (ایضاً) تمہیں نظامِ صلوٰۃ
قائم کرنا ہے تاکہ ہمارا شرف بلند ہو۔ ہمارے نام کا ڈنکہ بجے۔ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا (۲۰/۱۵)۔ فرعون جیسے
مستبد سرکش حاکم کے نظامِ حکومت کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ صلوٰۃ (نظامِ خداوندی) کا قیام ایک عظیم انقلاب ہے۔ یہ
انقلاب ابھی تک غیر محسوس طور پر پختگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ وہ
غیب سے مشہود ہو جائے۔

یہاں قرآنِ کریم انقلاب آفرینی کے سلسلہ میں ایک عظیم حقیقت کو چلتے چلتے دو لفظوں میں بیان کر گیا ہے۔

اِنقلاب کس طرح آتا ہے

اس نے کہا یہ ہے کہ جسے انقلاب کہا جاتا ہے وہ یونہی شباشب، یک لخت نہیں آ جاتا۔ اس کے لئے ایک عرصۂ دراز درکار ہوتا ہے (فساد تو راتوں رات
برپا کیا جا سکتا ہے انقلاب اس طرح نہیں لایا جا سکتا) زمانے کے تقاضے اس کے لئے فضا ہموار کرتے ہیں۔ انسانی
شعور میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کچھ ایسے غیر محسوس انداز میں ہو رہا ہوتا ہے کہ نگاہیں اُسے بھانپ نہیں سکتیں
غلط نظام کے تخریبی اثرات آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب ان کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو اس نظام کا تختہ اُلٹنے
کا وقت قریب آ جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ہی جھٹکے سے اس نظام کی فلک بوس عمارت دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے اور لوگ
سمجھتے ہیں کہ یہ تبدیلی یک لخت واقعہ ہو گئی۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو سورۂ انبیاء میں نہایت بلیغ انداز میں
بیان کیا ہے۔ آپ اس سورۃ کی آیات نمبر ۱۶ — ۱۱ (۲۱/۱۱-۱۶) کو سامنے لایئے اور ان کے اس مفہوم پر غور کیجئے جسے میں
مفہوم القرآن سے پیش کر رہا ہوں۔ کہا گیا ہے:

> یاد رکھو! اگر تم قوانینِ خداوندی کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ
> گے جس طرح ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ
> رکھی تھی۔ اور پھر اُن کے بعد ان کی جگہ دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔
>
> اُن کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔
>
> اُنہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں لیکن وہ اِس

تنبیہہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آگئے تو وہ لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کونسا موقعہ تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ اب واپس چلو، اپنی ان عیش سامانیوں کی طرف، جن کی سرشاریوں نے تمہیں اس طرح مدہوش کر رکھا تھا۔ تم اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے وہاں چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ تم نے کن لوگوں کی محنتوں کے استحصال سے بنایا تھا اور اس پر تمہارا کیا حق تھا۔

اس وقت انہیں اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔

لیکن اُس وقت اس تاسف سے کیا فائدہ تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں ان پر وہ بیحد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہ رہے، یا بجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔

وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اس کارگہِ کائنات کو محض کھیل تماشہ کے طور پر پیدا کر رکھا ہے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ ہم نے اسے ویسے ہی پیدا نہیں کیا۔ اس کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ افراد ہوں یا اقوام سب کے اعمال صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہیں۔ (۲۱/۱۱-۱۶)

اس وضاحت کے بعد پھر آیئے اصل موضوع کی طرف۔ حضرتِ موسیٰؑ سے کہا یہ گیا کہ وہ انقلاب جو اس وقت تک ضمیرِ کلمات میں پہلو بدل رہا تھا، وقت آگیا ہے کہ اب وہ محسوس طور پر سامنے آجائے تاکہ ——— اور یہ "تاکہ" بڑا اہم ہے۔ اسے غور سے سنئے۔ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی (۲۰/۱۵) تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل سکے۔ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲)۔ کسی کو کسی قسم کے سلب و نہب اور ظلم و استحصال کا خطرہ نہ رہے۔

اس کے بعد کہا :

اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰/۲۴)

جاؤ فرعون کی طرف۔ وہ بڑا سرکش اور حدود فراموش ہوگیا ہے۔

جاؤ اور وہاں وہ انقلاب برپا کرو جس سے ظلم و استبداد مٹ جائے اور بنی اسرائیل ملوکیت کے فولادی شکنجوں سے آزادی حاصل کرلیں ــــ یہ ہے مفہوم اقامتِ صلوٰۃ کا (۲/۳)۔

انقلابِ صلوٰۃ کی بنیادی شرط

لیکن اس قسم کی انقلاب آفرینی کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی شرط وحدتِ امت اور اطاعتِ مرکز ہے۔ اگر امت میں تفرقہ پیدا ہوجائے اور اس کی مرکزیت باقی نہ رہے تو باطل کے نظام کی جگہ حق کے نظام کا قیام تو ایک طرف، قائم شدہ نظام بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے یہ کہہ دیا تھا کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کا پروگرام یہ ہے فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا (۳۰/۳۰) تم اس نظام (دینِ خداوندی) کے قیام کے لئے اپنی تمام توجہات کو ایک مرکز پر مرکوز کردو۔ مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ (۳۰/۳۱) ہر طرف سے کٹ کر اسی کو اپنا نصب العینِ حیات قرار دے لو۔ وَاتَّقُوۡهُ، اس کے لئے راستے کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہو اور اس طرح اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (ایضاً) نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔ یاد رکھو! اس کیلئے وحدتِ امت نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا تم توحید پرست ہوکر پھر سے مشرکین میں سے نہ ہوجانا (وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (۳۰/۳۱)) یعنی مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ (۳۰/۳۲)۔ ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور وہ گروہ گروہ ہوگئے، فرقوں میں بٹ گئے۔ اور اس کے بعد ان میں سے ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہوگیا کہ ہم حق و صداقت پر ہیں اور باقی سب گمراہ ہیں۔ حالانکہ جو امت فرقوں میں بٹ جائے اس میں حق و صداقت کہیں بھی باقی نہیں رہتا۔ حق و صداقت کا امین اجتماعی نظامِ حیات ہوتا ہے جس کی بنیاد وحدتِ امت و مرکزیت پر ہوتی ہے۔ یہ تھی قیامِ نظامِ صلوٰۃ کی اولین شرط۔ (آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ جب ہم نے صلوٰۃ کو نماز میں بدل دیا تو خود نماز ہی ہماری فرقہ بندی کی مظہر اور علامت بن گئی)۔

صلوٰۃ کے متعلق ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے (جیسا کہ ہم داستانِ حضرت شعیبؑ کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں) اس کے ڈانڈے اقتصادی نظام سے جا ملتے ہیں اس لئے نظامِ صلوٰۃ کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس آیت (۲/۳) کے باقی حصہ ــــ یعنی وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ کو ساتھ ہی لیتے ہیں تاکہ صلوٰۃ اور انفاق کے امتزاج

سے پورے نظام کا نقشہ ہمارے سامنے آجائے۔

(۲/۳) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

اسے متقین کی اگلی خصوصیت بتایا گیا ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "جو روزی ہم نے انہیں دی ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے مال و دولت کو خرچ کرتا ہے۔ لہٰذا اس میں متقین کی کیا خصوصیت ہے جو ان کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ متقی وہ ہیں جو اپنے مال و دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ اس کیلئے زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ وہ اپنے روپے پیسے کو احتیاط سے خرچ کرتے ہیں، اور فضول خرچی (اسراف و تبذیر) سے بچتے ہیں۔ اس کا حکم دیگر مقامات میں دیا گیا ہے (۱۷/۲۹؛ ۲۵/۶۷) لہٰذا متقین کی جو خصوصیت بتائی گئی ہے وہ یہی نہیں کہ وہ فضول خرچی سے بچتے ہیں۔ یہ خصوصیت اس سے کہیں بلند اور منفرد ہے۔

رزق کا مفہوم

اس کے لئے پہلے لفظ رزق کو لیجئے۔ ہر وہ شے، جسے زندگی کا دار و مدار ہو اور جو اس کے لئے وجہِ پرورش قرار پائے، رزق کہلاتی ہے۔ اس اعتبار سے آپ رزق کو سامانِ زیست کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ قرآن کریم کی رُو سے انسانی زندگی، اس کے طبعی جسم تک محدود نہیں۔ اس کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے، جس کی نشوونما بہت ضروری ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے رزق میں وہ تمام سامان شامل ہوگا، جو انسانی جسم کی پرورش اور اس کی ذات (انسانی صلاحیتوں کے سرچشمہ) کی نشوونما کیلئے ضروری ہو۔ انسانی ذات کے نشوونما کے لئے رزق کے سلسلہ میں سورۃ الحج میں ہے کہ "جو لوگ خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے عند الضرورت اپنا گھر بار تک چھوڑ جائیں (یعنی ہجرت کریں) اور پھر وہ راستے ہی میں دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہو جائیں یا ویسے ہی کسی حادثہ کی وجہ سے وفات پا جائیں تو لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا (۲۲/۵۸)۔ انہیں خدا رزقِ حسنہ عطا کرے گا۔" ظاہر ہے کہ انسانی موت کے بعد اسے جسم کی پرورش کے لئے غذا اور خوراک کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا اس رزقِ حسنہ سے مراد وہ سامان ...... ہے جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے رزق میں وہ تمام سامانِ زیست شامل ہوگا جس سے اس کے جسم کی پرورش اور اس کی انسانی صلاحیتوں (ذات) کی نشوونما ہو سکے۔

عربوں کے ہاں رزق کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بروقت دیا جائے۔ یعنی جس وقت جس قسم کے سامانِ زیست کی ضرورت ہو، وہ میسر ہو۔

انفاق کے معنی

اب لفظ يُنْفِقُوْنَ کی طرف آئیے۔ جس کا مادہ (ن۔ف۔ق) ہے۔ نَفَقٌ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں۔ جنگلی چوہا اپنے رہنے کے لئے جو بل بناتا ہے اس میں داخل ہونے کے راستے کے علاوہ، اگلی طرف باہر نکلنے کے لئے متعدد راستے بنا چھوڑتا ہے

اور انہیں باریک مٹی سے ڈھانپ دیتا ہے کہ جب کوئی اُسے پکڑنے کی کوشش کرے تو وہ ان راستوں سے باہر نکل جاتے۔ اس قسم کی سرنگ کو "نفق" کہتے ہیں۔ بنابریں منافق، اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام میں داخل ہونے سے پہلے دل میں یہ سوچ لے کہ مجھے اسے نکلنا پڑا تو اس کے لئے کون کون سے راستے اختیار کرنے ہوں گے۔ بہر حال، اس مادہ کے بنیادی معنی خرچ کرنا نہیں کھلا رکھنا ہیں۔ یہ لفظ روک رکھنے کے مقابلہ میں آتا ہے۔ جیسا کہ (۱۷/۱۰۰) سے واضح ہے۔ آج سے ذرا پہلے زمانہ میں، جب نوٹ نہیں چلے تھے اور دولت چاندی اور سونے کے سکوں کی شکل میں ہوتی تھی، تو روپوں کو ایسی تھیلیوں میں رکھا جاتا تھا جن کا اُوپر کا منہ تو کھلا ہوتا تھا لیکن، دوسرا منہ بند ہوتا تھا۔ دولت رکھنے کا یہ انداز بھی "انفاق" کی ضد کہلاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ "معارج" میں ہے کہ جہنم آوازیں دیکر بلائے گا اس شخص کو جو جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸)۔ دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھے رکھتا ہے۔ اسی طرح سورۃ "توبہ" میں انفاق کا لفظ اکتناز کے مقابل آیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ جو لوگ چاندی اور سونے کے سکوں کو روک لیتے ہیں اور اپنی تجوریوں کا منہ کھلا نہیں رکھتے انہیں ایک دردناک عذاب کی "بشارت" دیدو۔ یعنی اس عذاب کی جس میں ان سکوں کو جہنم میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ... کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے صرف اپنے لئے جمع کرکے روک رکھا تھا اور اُسے خدائی پروگرام (ربوبیتِ عالمینی) کے لئے صرف کرنے کی غرض سے کھلا نہیں رکھا تھا (۹/۳۴-۳۵)۔ سورۃ محمد میں ہے کہ اگر تم یہ روش اختیار کروگے تو یاد رکھو، تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی (۴۷/۳۸)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انفاق کے معنے خرچ کرنے کے نہیں بلکہ یہ ایک ایسی روش، نظریہ یا معاشی نظام کی اصطلاح ہے جس میں سامانِ زیست کو روک کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اسے عالمگیر ربوبیت انسانیہ کے لئے کھلا رکھا جاتا ہے۔ (سورۃ فاتحہ میں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور رحمٰن و رحیم کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سے سامنے لائیے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی)۔

رزق خدا کی ذمہ داری ہے

قرآنِ کریم نے کہا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔ صفحۂ ارض پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو۔ اس سے ذہن میں ایک اہم سوال اُبھرتا ہے کہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے (جس پر نوعِ انسان کی تاریخ بھی شاہد ہے) کہ انسان بھوکے مرتے رہتے ہیں۔ زمانۂ قحط ہی میں نہیں بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی قریب آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے۔ ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ جب زمین پر چلنے والے ہر متنفس کے رزق

کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے، تو یہ ذمہ داری کس قسم کی ہے جس میں آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کے لئے اصل حقیقت کا سمجھ لینا ضروری۔

اللہ تعالیٰ نے انسان (بلکہ اپنی دیگر مخلوق) کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی، بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے وہ تمام سامان، جس پر ان کی زندگی کا دارو مدار تھا، پیدا کر دیا —— ہوا، پانی، روشنی، حرارت یہ سب صفحۂ ارض سے باہر موجود ہیں، اور زمین کے اندر خوراک کے ذخائر، جنہیں تھوڑی سی محنت سے، باہر نکالنا ہوتا ہے۔ خدا نے اپنی اس ذمہ داری کو اس طرح پورا کر دیا۔ اسی جہت سے اس نے اپنے آپ کو رازق اور رزّاق کہا ہے۔ اس کے بعد سوال

اصل سوال تقسیمِ رزق کا ہے

اس رزق کی تقسیم کا سامنے آتا ہے۔ سطح بیں لوگوں نے یہ کہا کہ یہ تقسیم بھی خدا کو اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیئے تھی تاکہ وہ ہر ضرورت مند کو براہِ راست رزق پہنچاتا رہتا۔ خدا نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ نظریہ غلط ہے ہم نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے، اس لئے، رزق کی تقسیم کا نظام اس کے ہاتھ میں دیدیا ہے، اور ہم اس میں مداخلت نہیں کرتے۔ تقسیم کے اس نظام کے لئے ہم نے واضح ہدایات دے دی ہیں۔ ان میں سرفہرست ہدایت "انفاق" کی ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی ضرورت سے زائد رزق کو روک کر نہ رکھے۔ اسے دوسروں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے کھلا رکھے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ سامانِ رزق —— خواہ وہ زمین کے باہر ہو یا زمین کے اندر —— کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اس کا حق ملکیت صرف خدا کو حاصل ہے جس نے اسے اپنی مخلوق کی پرورش عامہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ رزق کی غلط تقسیم، اس غلط اور باطل نظریہ پر متفرع ہوتی ہے کہ وسائلِ پیداوار پر انسانوں کو حقِ ملکیت حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ نظریہ نظامِ سرمایہ داری کی اساس و بنیاد ہے اور تمام تباہیوں اور بربادیوں کی جڑ۔ صاحب اقتدار گروہ (خواہ وہ عہدِ قدیم کی ملوکیت کی شکل میں ہو یا عصرِ حاضر کے جمہوری پیکر میں) وسائلِ پیداوار اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے اور پھر دوسرے انسانوں کو روٹی کا محتاج بنا کر ان سے اپنا ہر حکم منواتا ہے۔ جب بھوکے انسان اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو مذہبی پیشوائیت انہیں یہ کہہ کر سلا دیتی ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے غریب رکھتا ہے جسے چاہتا ہے رزق فراواں عطا کر دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے بھوکا رکھتا ہے۔ کوئی انسان اس فرق کو مٹا نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ خدا کا پیدا کردہ ہے۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ تم بھوکے نہ رہو تو وہ تمہیں خود روٹی کیوں نہ دیدیتا۔ قرآنِ کریم نے اس دلیل کو باطل ہی نہیں بلکہ کفر قرار دیا ہے۔ سورۃ "یٰسین" میں ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ (۳۶/۴۷) جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمہیں

جو سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے اسے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھو تو کفر کا شیوہ اختیار کرنے والے، ایمان والوں سے کہتے ہیں (قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (ایضاً) کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (ایضاً) کیا تم چاہتے ہو کہ ہم انہیں روٹی دیں جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے، یہ تو خدا کے خلاف جنگ ہوگی۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں خود روٹی کیوں نہ دیدیتا۔ قرآنِ کریم نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھا ہے کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ایضاً) یہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہے جس کے لئے کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں۔ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ یہ مذہبی پیشوائیت کی فریب کاری ہے جو عوام کو اس غلط عقیدہ کی افیون دے کر نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط کرتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) اور سرمایہ داروں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا ہے (دیکھئے $\frac{9}{34-35}$)۔

نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت

قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد "رَزَقْنٰهُمْ" کے (نَا) میں مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے —— یعنی رزق خدا کی ملکیت ہے۔ اسی نے اسے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ آپ قرآنِ کریم میں یہاں سے وہاں تک دیکھ جائیے رزق کے متعلق، رَزَقْنٰهُمْ، رَزَقْكُمْ وغیرہ الفاظ ملیں گے۔ یعنی رزق خدا کی طرف سے دیا گیا۔ سوال صرف اس کی تقسیم کا ہے۔ زمین، رزق کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس کے متعلق اس نے بار بار کہا ہے کہ یہ خدا کی ملکیت ہے۔ ارض، ارض اللہ ہے ($\frac{7}{73}$) اس میں انسانوں اور ان کے مال مویشی کے لئے سامانِ زیست ہے ($\frac{79}{33}$ و $\frac{80}{32}$)۔ تمام انسانوں کے لئے سامانِ زیست ہے ($\frac{15}{20}$) اسے پیدا ہی مخلوق کے فائدے کے لئے کیا گیا ہے ($\frac{55}{10}$)۔ اسے تمام ضرورتمندوں کیلئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے ($\frac{41}{10}$)۔ سورۂ حدید میں اس حقیقت کو نہایت اختصار لیکن بڑے ہی دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے جب کہا؛ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{57}{10}$)۔ جب حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو جو رزق کے ان ذرائع کو روک رکھو اور انہیں بنی نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کھلا نہ رکھو۔ زمین سے رزق حاصل کرنے کے لئے تم کچھ محنت ضرور کرتے ہو۔ تم زیادہ سے زیادہ ۔۔۔ اپنی اس محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو سکتے ہو نہ کہ ساری کی ساری پیداوار کے۔

رزق خدا کا ہے

تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو۔ باقی، زمین کے مالک (خدا) کو دیدو۔ اس نے سورۂ واقعہ کی آیات ($\frac{56}{63-64}$) میں اس حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ ذیل میں ان آیات کا مفہوم از روئے مفہوم القرآن

بیان کیا جاتا ہے۔ (بہتر ہو کہ آپ قرآن مجید کے کسی نسخہ سے ان آیات کو بھی سامنے رکھ لیں) :

اس مقصد کے لئے، تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ (مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر، اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اُگاتا ہے؟ کیا یہ تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے ؟

اس کے بعد کہا :۔

پھر کھیتی اُگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے ؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے —— اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلّہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیگار میں گئے۔

اس کے بعد ہے :۔

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو، یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے ؟۔
(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آسکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) بھی ویسا کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے ؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج غور کر کے، صحیح نتیجہ تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشو و نما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔

اس کے آگے ہے :۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟

کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا ــــــ رگِ خس میں شعلے کو نہاں کر دینا ــــــ تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

اِن حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ:۔

(رزق پیدا کرنے کی اِس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کسقدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے مالک نہیں بن سکتے)۔ یہ تمام ذرائع پیداوار ازخود موجود رہتے ہیں ــــــ یہ نہ تمہارے بنائے ہوتے ہیں، نہ خریدے ہوتے۔ یہ تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ لہٰذا، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ، اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں، اپنے پاس رکھ لو اور "ہمارا حصہ ہمیں دیدو"۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ۔ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶/۷۳) یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامانِ پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو یہ سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (۶/۱۴۱؛ ۱۴/۳۴؛ ۸۰/۲۴-۳۲) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے الفاظ عام طور پر دہرائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں حقوق کی یہ تقسیم کہیں مذکور نہیں۔ صرف ایک مقام پر "اللہ کے ایک حق" کا ذکر ہے۔ وہ وہی "حقِ مالکانہ" ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے سورۃ انعام میں ہے: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭاِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۶/۱۴۲)۔ "خدا وہ ہے جس نے (تمام انسانوں کی پرورش کیلئے) باغات کا سلسلہ پھیلا دیا ہے۔ بعض بڑے بڑے تناور درخت جو بغیر کسی سہارے

کے کھڑے ہیں۔ بعض نرم ونازک (انگوروں کی سی) بیلیں سہاروں سے کھڑی کی جاتی ہیں۔ نیز سر بفلک کھجوروں کے پیڑ اور مختلف پیداوار والی کھیتیاں۔ اور زیتون اور انار کے پھل — ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی اور الگ تھلگ بھی — جب یہ درخت یا کھیتیاں ثمر بار ہوں تو ان کے پھل اور اناج شوق سے کھاؤ لیکن ان میں سے "خدا کا حق" دیدیا کرو۔ اس باب میں اپنی حد سے تجاوز نہ کرو (کہ "خدا کا حق" بھی خود ہی سنبھال کر بیٹھ جاؤ) تمہاری یہ روش خدا کے ہاں پسندیدہ نہیں قرار پائے گی"۔

"حقوق" کا یہ معاملہ عام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن مؤمنین، خدا کے ساتھ معاملہ میں اور روش اختیار کرتے ہیں۔

مؤمنین کا معاملہ خدا کے ساتھ

ان کا ایمان ہوتا ہے کہ زمین (وسائل پیداوار) ہی نہیں بلکہ خود ان کی (رزق پیدا کرنے کی) صلاحیتیں بھی بنیادی طور پر خدا ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں — وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ..... (۱۶/۵۳)۔ ہمیں یہ نعماء اس لئے دی جاتی ہیں کہ ہم انہیں خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق صرف کریں۔ اس لئے ہم ان کے لئے خدا کے حضور جوابدہ ہوں گے کہ ہم انہیں کس طرح صرف میں لاتے تھے۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۱۰۲/۸)۔ خدا کے ساتھ ان کا معاملہ ایک باہمی معاہدہ کی رو سے طے پاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے،

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔

وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور اس کے عوض خدا انہیں جنت عطا کر دیتا ہے — "جان" میں انسانی زندگی اور اس کی تمام صلاحیتیں آجاتی ہیں۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں اور مال میں وہ سب کچھ شامل ہو جاتا ہے جسے انسان اکتساباً (اپنی محنت سے) حاصل کرتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ "خدا کے ہاتھ" بیچ دیتے ہیں اور خدا انہیں الجنۃ عطا کر دیتا ہے۔ الجنۃ کی تفصیلات تو طول طویل ہیں لیکن (جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے) اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ "جب اور جہاں بھوک لگے پیٹ بھر کھانے کو مل جائے"۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کوئی بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ نہ کسی کو پیاس کا خطرہ ہوگا نہ مکان کا۔ اس الجنۃ میں (کم از کم) زندگی کی ان بنیادی ضروریات کی طرف سے ہر فرد معاشرہ مطمئن ہوگا۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس معاشرہ میں خدا اور مؤمنین کا یہ باہمی معاہدہ یونہی نظری اور عقائدی حد تک نہیں ہوگا۔ عملاً

اس کا عملی مفہوم

ایسا ہوگا — "مذہب" میں چند الفاظ دھرا لینے سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ فریضہ ادا ہو

گیا، لیکن دین میں جو کچھ زبان سے کہا یا مانا جاتا ہے اسے عملاً کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ "مذہب" ہے جس میں مکان کی پیشانی پر یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ:

درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است — ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست

یہ لکھ دیا جاتا ہے اور عملاً اس مکان کے جملہ حقوقِ ملکیت اپنی اور اپنی اولاد کے نام محفوظ کر لئے جاتے ہیں، اور "مالکِ حقیقی" کو اس میں جھانکنے تک بھی نہیں دیا جاتا۔ لیکن دین میں بیع و شریٰ کا وہ معاملہ جس کا اوپر ذکر آیا ہے، عملاً طے پاتا ہے۔ مؤمن اپنی جان اور مال، اس نظام کے سربراہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے۔ بیچا اس کے ہاتھ جاتا ہے اور خدا اس کی تصدیق کر دیتا ہے کہ ہاں، ہم نے خرید لیا۔ اسی کو بیعت (بیع کا معاملہ) کہا جاتا ہے۔ سورۃ الفتح میں ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ (۴۸/۱۰) اے رسول! جو مؤمنین اپنی جان اور مال کو تیرے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خدا کے ہاتھ بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اس معاملہ کی توثیق کے لئے ان کے ہاتھ پر، تیرا ہاتھ نہیں ہوتا، خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ تو خدا کی طرف سے (ON HIS BEHALF) یہ معاملہ طے کر رہا ہوتا ہے۔" مؤمنین اپنی ہر متاعِ حیات کو اس نظام کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں یہ نظام ان کی طبیعی زندگی اور انسانی ذات کی پرورش اور نشوونما کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ یہ ہے وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ کا عملی مفہوم۔

واضح رہے کہ یہ نظام ایک دن میں متشکل نہیں ہو جاتا۔ تقسیمِ رزق کے (انسانوں کے خودساختہ) غلط نظام کی جگہ یہ نظامِ خداوندی آہستہ آہستہ، بتدریج عمل میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں انفرادی صدقہ، خیرات وغیرہ کے ضمن میں جو احکامات نظر آتے ہیں وہ اسی عبوری دور سے متعلق ہیں۔ جب یہ پروگرام اپنی آخری منزل میں پہنچ جاتا ہے تو اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ (۲/۲۱۹) "اے رسول! یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رکھنا (نظام کی تحویل میں دیدینا) ہوگا۔ کہا۔ ان سے کہدو کہ جسقدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب۔" اس میں "دوسروں" سے مراد صرف اپنی جماعت کے افراد نہیں، تمام نوعِ انسان کے ضرورتمند افراد ہیں۔ اس میں ابتدا تو بے شک اپنے معاشرہ ہی سے ہوگی لیکن اس کی وسعتیں پھیلتے پھیلتے عالمگیر انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں گی۔ یہ اس لئے کہ خدا نے تمام دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ (۱۱/۶)، تمام ذی حیات — کی ربوبیت

تدریجاً

کا ذمہ اپنے سر لے رکھا ہے اور اس کی یہ ذمہ داری اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق کہا وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) استحکام اور بقا صرف اس نظامِ تقسیم کے لئے ہو گی جس کے پیشِ نظر کسی خاص فرد، خاص گروہ، خاص ملک یا خاص قوم کا مفاد نہیں، بلکہ تمام نوعِ انسان کی منفعت ہو۔ یہی وہ نظام ہے جسے قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کو متقین کا فریضہ بنایا گیا ہے۔

خیر الرّازقین

آپ نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا کہ خدا نے اپنے آپ کو خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵/۱۱۴؛ ۳۴/۳۹) کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بظاہر تمہیں یہ رزق، ان انسانوں کے ہاتھوں سے مل رہا ہے۔ اس اعتبار سے انہیں رازق کہا جا سکتا ہے لیکن اس رزق کا مالک ہونے کی حیثیت سے، خیر الرّازقین خدا ہی ہے۔ خدا کی طرف سے رزق کی اس طرح تقسیم کرنے والے کارندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنہیں رزق دیتے ہیں انہیں واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (۷۶/۹)۔ اس تقسیمِ رزق میں، ہم صرف منشائے خداوندی کو پورا کر رہے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں دے رہے۔ اور جب ہم اپنی طرف سے کچھ دے ہی نہیں رہے تو اس کے معاوضہ میں کچھ لینا تو ایک طرف، ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ یہ کارندے اس سامانِ زیست میں سے اپنے لئے صرف اتنا لیتے ہیں جتنے کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ باقی سب دوسرے ضرورتمندوں کے لئے دیدیتے ہیں بلکہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی صورت ایسی ہو جائے کہ رزق کم ہو اور حاجتمند زیادہ، تو يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ یہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس معاشی نظام کی عمارت اس ایمان کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔ ہمیں جس قدر نعماء حاصل ہیں خواہ وہ وسائلِ پیداوار کی شکل میں ہوں اور خواہ اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں کی شکل میں وہ سب خدا کی طرف سے عطا شدہ ہیں اس لئے انہیں خدا ہی کے مقرر کردہ اصول اور پروگرام کے مطابق صرف کیا جائے گا۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد یہ (باطل) ذہنیت ہے کہ وسائلِ پیداوار پر بھی افراد کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں بھی اپنی اپنی ہیں۔ ان کی بناء پر جو جتنا کما لے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم نے اس باطل ذہنیت اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو سورۃ نحل ہی کی ایک آیت میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے:

نظامِ سرمایہ داری کی بنیادی ذہنیت

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ

رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۔
اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

مفہوم اس کا یہ ہے:

یہ حقیقت ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ — یہ اس لئے کہ دنیا میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے (۴۳/۳۲)۔ جن لوگوں میں اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنی ساری کمائی اپنے لئے سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ضروریات سے جو کچھ زیادہ ہے وہ ان لوگوں کا حق ہے جن کی ضروریات اُن کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں (۷۰/۲۴)۔ سو یہ لوگ اپنی فاضلہ کمائی ان لوگوں کو واپس کیوں نہیں دیدیتے جو ان کے زیرِ ہدایت کام کرتے ہیں اور جن کا یہ درحقیقت حق ہے، تاکہ اس طرح سب لوگ خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہو جائیں (۳۰/۲۸)

جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ درحقیقت اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں انہیں خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہیں۔

اس سے اگلی آیت میں ہے: اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۱۶/۷۲)
یہ ایمان بالباطل ہے اور نعماءِ خداوندی سے کفر۔ اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ قارون (جسے قرآن کریم نظامِ سرمایہ داری

قارون

کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے) کی بھی یہی ذہنیت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)۔ میری دولت میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے اس لئے اس میں کوئی دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ ذہنیت قارون ہی سے مختص نہیں۔ جو انسان بھی وحی کی اقدار کو چھوڑ دیتا ہے اس کی یہی ذہنیت ہو جاتی ہے (۳۹/۴۹)۔ اسی کا نتیجہ وہ تباہی ہے جس نے دنیائے انسانیت کو جہنم بنا رکھا ہے۔

آپ نوعِ انسان کی تاریخ پر غور کیجئے۔ تقسیمِ رزق کے مسئلہ نے (جسے اب معاشی یا اقتصادی نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے) ہر زمانے میں انسان کو وقفِ اضطراب رکھا ہے۔

اس کی غلط تقسیم سے جو تباہ کن نتائج مرتب ہوتے، بہت سے درد مند قلوب ان سے متاثر ہوئے اور انہوں نے (وحی کی روشنی کے بغیر) اس اہم اور مشکل ترین مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے فکری کاوشیں کیں۔ افلاطون سے لے کر کارل مارکس تک کے مفکرین اور علماء اقتصادیات کے نظریات، انسان کی اسی فکری کاوش اور سعیٔ ناکام کی عبرت آموز داستان کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں (انہیں میں نے اپنی کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے)۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا ہی کافی ہو گا کہ اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی — فکرِ مارکس — نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے۔

کارل مارکس کا نظریہ

لیکن اس سے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔ وحیٔ خداوندی، انسانی زندگی کے اہم مسائل کا حتمی اور یقینی حل پیش کرتی ہے جو خوش بخت اقوام انہیں قبول کر لیتی ہیں وہ راستے کے خطرات سے مامون و مصئون، شاداں و فرحاں، منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہیں۔ جو انہیں اس طرح اختیار نہیں کرتیں وہ فکری طور پر ان کا حل دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ عقل (فکرِ انسان) کا طریق جستجو تجرباتی ہے، جسے (TRIAL AND ERROR) کہا جاتا ہے۔ عقلِ انسانی ایک حل تجویز کرتی ہے اور اس پر گامزن ہو جاتی ہے۔ وہ راستے کے سینکڑوں کٹھن اور پُرخطر منازل طے کرتی، خون کے دریا پیرتی، اور آگ کی خندقیں پھاندتی، ہڈیاں تڑواتی اور صعوبتیں اُٹھاتی آگے بڑھتی ہے تو اُسے نظر آتا ہے کہ اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر دوسرا حل سوچتی ہے اور اس نئے راستے پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے متعدد ناکام اور جانکاہ تجارب کے بعد کہیں جا کر اس کے سامنے وہ حل آتا ہے جسے وحی نے روزِ اول پیش کر دیا تھا۔ اقبال نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں

عقل کا تجرباتی طریق

قرآن کریم نے اس نکتہ کی وضاحت جس انداز سے کی ہے اسے یوں سمجھئے کہ وحی کی پیش کردہ ابدی حقیقتیں زمانے کی لہروں میں لپٹی ہوتی ہیں۔ جب علمِ انسانی ابھر کر ان لہروں کو چھوتا ہے تو اس میں پوشیدہ حقیقت نقاب اُلٹ کر سامنے آ جاتی ہے۔ سورۃ حٰمٓ میں ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳)۔ اس طرح ہم عالمِ انفس و آفاق میں مضمر حقائق کو بے نقاب کرتے جائیں گے تاکہ یہ حقیقت مشہود طور پر سامنے آ جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

نزولِ قرآن کے بعد عقل کے اس تجرباتی طریق کے ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ وسائلِ نشر و اشاعت کی ہمہ گیریت کی وجہ سے، قرآنی حقائق بھی فضائے عالم میں عام ہو چکے، اور ہوتے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی فکر شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے بھی متاثر ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اپنے تجربات سے پہلے، جس مقام

تک صدیوں میں جاکر پہنچتی تھی اب وہ نسبتاً قلیل ترین عرصہ میں پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا (جیسا کہ میں نے حضور نبی اکرمؐ کی سیرۃ طیبہ پر مشتمل اپنی تصنیف ــــ معراجِ انسانیت ــــ میں لکھا ہے) علیٰ رؤس الاشہاد کہا جا سکتا ہے کہ بزمِ ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اُسی آفتاب جہاں تاب کی ضیا باریوں کا تصدق، اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اُسی جانِ بہار کی نکہت بیزیوں کا رہینِ منّت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو ۔۔۔ آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےٰؐ او را بہاست ۔۔۔ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰؐ است

کارل مارکس (۱۸۸۳ ــ ۱۸۱۸) نے اپنی مدت العمر کی فکری کاوشوں کے بعد کہا کہ اس مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جس میں :-

"ہر فرد سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔"

نظری طور پر اس مشکل ترین مسئلہ کا حل بڑا اطمینان بخش تھا لیکن سوال یہ تھا کہ آیا یہ طریق ممکن العمل بھی ہوگا۔ اس کے خلاف اعتراض یہ پیدا ہوتا تھا کہ جو شخص اپنی استعداد کی رو سے کمائی بہت زیادہ کرے لیکن اس کی ضروریات مختصر ہوں، اس لئے اس میں سے اُسے ملے بہت کم، تو اس کے لئے کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا کہ وہ جان مار کر محنت کرے، اور اپنی محنت کا حاصل دوسروں کو دیدے! کارل مارکس، اپنے فلسفہ کی رو سے، خدا ــ وحی ــ رسالت ــ مستقل اقدار ــ حیاتِ آخرت ــ سب کا منکر تھا۔ وہ انسانی زندگی کو اس کی طبیعی زندگی ہی قرار دیتا تھا اور بس ــ اس فلسفۂ زندگی کی رو سے، اسے اس اعتراض کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہہ دیا کہ اس مسئلہ کا حل تو یہی ہے جسے میں نے پیش کیا ہے، لیکن اس پر عمل کیسے ہو سکے گا، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کے جواب کے لئے مصر ہیں وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ سرِدست اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے یہ کہا، اور اس کے جانشین لینن نے یہ کہکر اس کی وضاحت کر دی کہ :-

> نوعِ انسانی کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رُو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے اِن سوالات کا جواب دیا جا سکے۔

(MARX-ENGELS-MARXISM, P.P. 355-358)

مارکس نے کہا کہ جب تک انسان اس، آخری منزل تک نہ پہنچے، عبوری دور میں، بر سبیل تنزل، سوشلزم کا نظام رائج کرلینا چاہیئے۔ یعنی وسائل پیداوار، انفرادی ملکیت سے نکال کر مملکت کی ملکیت میں دیدینے چاہئیں۔ چنانچہ اس وقت سوشلسٹ ممالک میں نظامِ سرمایہ داری کی جگہ سوشلزم کا نظام رائج ہے۔

لیکن یہ نظام اس مشکل کا کچھ بھی حل پیش نہیں کرسکا۔ پردہ اُٹھا کر دیکھیئے تو اس کے پیکر میں سرمایہ دارانہ ہی کی روح کارفرما نظر آئے گی، فرق صرف اصطلاحات کا ہوگا۔ نظامِ سرمایہ داری میں، وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہتے ہیں، سوشلزم میں یہ وسائل، افراد کے اس گروہ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جو مملکت کے اقتدار پر قابض ہوجاتا ہے۔ غریب محنت کش ویسے کا ویسا ہی محتاج و محکوم رہتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

نظامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

پہلے ایک فرعون یہ نعرہ بلند کرتا تھا کہ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ (۴۳/۵۱) کیا یہ ملک اور اس میں بہنے والے دریا اور نہریں میری ملکیت نہیں؟ اب یہ اعلان، "فراعنہ کے گروہ" (اربابِ اقتدار) کی طرف سے ہوتا ہے جنہوں نے ابلہ فریبی کے لئے اپنا نام مملکت (STATE) رکھ لیا ہے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے: اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی۔ (۷۹/۲۴) تمہارا رزق ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم ہی تمہارے پروردگار ہیں۔ اس لئے تم ہماری محکومیت اختیار کرو۔

سوشلزم کی ناکامی

نظامِ سرمایہ داری میں محنت کشوں کی اُجرت (WAGES) زمین یا کارخانہ کا مالک مقرر کرتا تھا۔ اب ان کی اجرت "مملکت" مقرر کرتی ہے۔ اور اجرت مقرر کرنے کا معیار یہ نہیں کہ اس سے کام کرنے والے کی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس کا معیار کام لینے والوں کے مفاد یا مصالح ہوتے ہیں۔ رزق کی ذمہ واری، نہ اُس نظام نے اپنے سر لی تھی، نہ یہ نظام اپنے سر لیتا ہے۔ اس نظام (سوشلزم) میں محنت کش کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوگئی ہے۔ پہلے اگر اس کی کسی ایک مالک سے نہیں بنتی تھی تو وہ اُسے چھوڑ کر کسی اور کی ملازمت اختیار کرلیتا تھا ـــــ اب چونکہ وسائلِ رزق پر، کُلّی اجارہ داری "اسٹیٹ" کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کا دروازہ چھوڑ کر کہیں اور جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ملوکیت کی بدترین شکل ہے۔ یہی وہ جہنم ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْھَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْھَا۔ (۲۲/۲۲) جب وہ غم و اندوہ کے اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں پھر اسی میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ ہے اِس مشکل ترین مسئلہ کا وہ حل جس تک، عقلِ انسانی (وحی کی روشنی کے بغیر) اس وقت پہنچی ہے۔ نظری طور پر تو کارل مارکس اِس کے حل تک پہنچ گیا لیکن چونکہ اس کا فلسفۂ زندگی اسے وہ بنیاد مہیا نہیں کر سکتا تھا جس پر اس نظام کی عظیم عمارت استوار ہو سکے اس لئے عملاً وہ وہیں رہا جہاں نظامِ سرمایہ داری تھا — بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر — اس کا حل صرف ایمان بہم پہنچا سکتا ہے۔ یعنی یہ ایمان کہ:

(۱) وسائلِ رزق ہی نہیں، بلکہ انسانی صلاحیتیں بھی میری مِلک نہیں۔ خدا کی ملک ہیں اور اس کی عطا کردہ۔

(۲) میرا فریضہ یہ ہے کہ میں پوری پوری محنت سے ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر رزق پیدا کروں اور اُسے اس نظام کی تحویل میں دیدوں جو اُسے (مجھ سمیت) تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تقسیم کرے۔ (محنت کا معاوضہ، اُجرت (WAGES) نہیں بلکہ ضروریاتِ زندگی پوری کرنا ہے۔ جو نظام اِس کی ذمہ داری نہیں لیتا اسے وسائلِ رزق کو اپنے قبضے میں لینے کا کوئی حق نہیں)۔

(۳) اگر میں، یا وہ نظام ایسا نہ کرے تو اس کی ہم سے باز پُرس ہو گی۔

اِسے اللہ اور آخرت پر ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور متّقین کا فریضہ بتایا گیا ہے۔

ہم نے بات اقامتِ صلوٰۃ سے شروع کی تھی اور انفاق کو اس لئے درمیان میں لے آئے تھے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ان دونوں کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس ضمن میں چند ایک ایسی آیات سامنے لائی جاتی ہیں جن میں مصلّین کا فریضہ انفاق بتایا گیا ہے اور اس نہج سے انہیں مُنْفِقِیْنَ کہکر پکارا گیا ہے۔ (۳/۱۶)۔

قرآنِ کریم نے "الصلوٰۃ" کا متعین اور محسوس نتیجہ یہ بتایا ہے کہ "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (۲۹/۴۵)۔ الصلوٰۃ، فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ لفظ فحشاء کا مادہ (ف-ح-ش) ہے جس میں ہر امرِ شنیع (قابلِ نفرت) آجاتا ہے۔ لیکن عربوں کے ہاں، جب فحش لفظ بولا جاتا تھا تو اس کے معنے عام طور

صلوٰۃ اور معاشی نظام کا تعلق

پر بے حیائی کے لئے جاتے تھے لیکن فحشاء کے معنے بخل کے تھے، کیونکہ ان کے ہاں بخل انتہائی درجہ کی قابلِ نفرت خصلت تھی۔ جہاں تک منکر کا تعلق ہے اس میں بھی ہر معیوب بات آجاتی ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے معنے ہوتے ہیں عقلِ خودبیں (یعنی صرف اپنا ہی مفاد سوچنے والی عقل) کی حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں۔ عقل کو اگر وحی سے آزاد کر دیا جائے تو اس کا

منصب یہ رہ جاتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے ہر فعل اور فیصلہ کیلئے جواز کی دلیلیں سجھاتی اور سمجھاتی رہے۔ بنا بریں الصلوٰۃ کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ انسان کے دل سے بخل کے جذبات نکال دیتی ہے اور عقل خود بینی کو اس کے جواز کی راہیں سجھانے کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ غایت کے اعتبار سے الصلوٰۃ اور معاشی نظام میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھیے۔

سورۃ الماعون، (۱۰۷) میں کہا گیا ہے: اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (۱۰۷/۱)۔ تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جو دین کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ذکر ان کا ہے جو دین سے متمسک ہونے کے مدعی ہیں (یعنی ہماری طرح اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں) لیکن عملاً دین کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں جس سے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ فرمایا: فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (۱۰۷/۲-۳) یہ وہ ہے کہ جو، اس شخص کو، جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے، دھکے

تکذیبِ دین

دیتا ہے (لفظ یتیم میں وہ بچے بھی آجاتے ہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا — کسی مپرسی کے عالم میں رہ جائیں)۔ ان لوگوں کو دھکے دینے کا مفہوم سورۃ الفجر کی ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کی حالت یہ ہے کہ اگر اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو چلا اٹھتا ہے کہ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ (۸۹/۱۶)۔ دیکھئے! خدا نے مجھے یونہی ذلیل و خوار کر دیا۔ میں نے تو کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس کی مجھے اس طرح سزا ملتی۔ کہا کہ یہ غلط ہے کہ ہمارے ہاں سے کسی پر ذلت و خواری کا عذاب یونہی مسلط کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمہاری ذلت و خواری، تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اعمال یہ تھے: کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ (۸۹/۱۷)۔ تم ان لوگوں کو مستحق تکریم و احترام نہیں سمجھا کرتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے۔ تمہارے نزدیک واجب التکریم وہی لوگ قرار پاتے تھے جن کا جتھہ (پارٹی) بڑا ہو۔ تمہارا دوسرا جرم یہ تھا وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (۸۹/۱۸)۔ جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے (جن کی حرکت رک جاتی تھی)، تم ایسا انتظام نہیں کرتے تھے جس سے انہیں سامانِ زیست میسر آجائے۔ وَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) تم باپ دادا کی میراث ہڑپ کر جاتے تھے۔ وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) اور چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ سمٹا کر تمہارے پاس جمع ہو جائے۔

اس کے بعد آپ پھر سورۃ الماعون کی طرف آجائیے جہاں کہا گیا کہ تکذیب دین وہ کرتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کی عزت و تکریم کرنے کی بجائے انہیں دھکے دیتا ہے اور وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (۱۰۷/۳)

معذور لوگوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (۱۰۷/۴)۔ یہ وہ مصلّین (نمازی) ہیں جن کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۵)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی مرئی اور محسوس حرکات ہی کو صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح اور غرض و غایت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ یعنی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں کو، جنہیں نوعِ انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے رواں دواں بہتے رہنا چاہیئے تھا، ان کے سامنے بند لگا کر انہیں اپنے لئے روک لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مصلّین جن کی نماز ان پر تباہیاں لاتی ہے اور یہی ہیں وہ لوگ جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

سورۃ المدثر میں ہے کہ جہنم کے داروغے مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم کون سے ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جن سے تم داخل جہنم ہو رہے ہو۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۔ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ۔ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۴/۴۳-۴۶)۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم مصلّین میں سے نہیں تھے۔ ہم معذوروں اور مجبوروں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم ان امور کے متعلق باتیں تو بہت بنایا کرتے تھے لیکن عملاً کچھ نہیں کیا کرتے تھے۔ اور یوں ہم دین کی تکذیب کرتے تھے۔

یہ تو دین کی تکذیب کرنے والے مصلّین تھے۔ اس کے مقابلہ میں سورۃ المعارج میں قرآن کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں کہا ہے کہ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۷۰/۱۷) جہنم آوازیں دیدے کر بلائے گی ان لوگوں کو جن کا شیوہ یہ تھا کہ جب انہیں دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بلایا جاتا تو وہ بانو پیٹھ موڑ کر چل دیتے، اور اگر بات سن لیتے تو گریز کی راہیں نکالتے۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (۷۰/۱۸)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دولت جمع کرتے تھے اور اپنی تھیلیوں کا منہ کس کر بند کر لیتے تھے۔ اس کے بعد کہا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا۔ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۱۹-۲۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر وحی کی اقدار سے بے نیاز ہو جائے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ وہ بڑا بے صبرا ہو جاتا ہے۔ ایسا بے صبرا کہ ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے (کسی سودے میں گھاٹا پڑ جاتا) تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب خوشحالی آتی ہے تو مال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد کہا: اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (۷۰/۲۲)۔ لیکن مصلین ایسے نہیں ہوتے یعنی وہ لوگ جو الصّلوٰۃ کی التزاماً پابندی کرتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ فِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۰/۲۳-۲۶) یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حق ہے

جن کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں یا وہ بالکل معذور ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان آیات میں "حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ" کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یعنی سائل و محروم، نہ تو ان سے خیرات مانگتے ہیں نہ یہ انہیں بطورِ خیرات کچھ دیتے ہیں۔ یہ دونوں جانتے ہیں کہ ان کے مال میں ہر ضرورت مند کا حق ہے۔ وہ اُسے بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) طلب کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِس سے مراد یہ ہے کہ یہ نظام انفرادی زکوٰۃ اور خیرات کا نہیں۔ وہ نظام ہے جس کا فریضہ تمام افرادِ انسانیہ کی ربوبیت ہے۔ اس نظام میں ہر ضرورت مند کو سامانِ زیست اس کے حق کے طور پر ملتا ہے۔

ہم اوپر (سورۂ ماعون میں) دیکھ چکے ہیں کہ تکذیبِ دین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو نماز کی محسوس اور مرئی حرکات ہی کو الصلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح، مقصد اور غرض و غایت کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سورۂ نسآء میں ان لوگوں کو منافقین کہا گیا اور ان کی حالت یہ بتائی گئی ہے کہ: وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ (۴/۱۴۲) جب وہ الصلوٰۃ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لئے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں یعنی وہ انہی حرکات و سکنات کی ادائیگی سے سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ پورا ہو گیا۔ وہ حرکات و سکنات، جنہیں لوگ دیکھ سکیں اور اس طرح ان کی تعریف کریں کہ یہ بڑے پکے نمازی ہیں۔ اس آیت میں لفظ کُسَالٰی کے اندر ایک لطیف نکتہ مضمر ہے۔ رُوئی دھننے والے کے پاس دھنک ہوتی ہے جس میں کمان کے ساتھ تانت لگی ہوتی ہے۔ ان دونوں کے یکجا ہونے سے روئی دھننے کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر تانت اور کمان کو الگ الگ کر دیا جائے تو یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا "الکسل" اس تانت کو کہتے ہیں جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو۔ آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ وہ صلوٰۃ جس میں اس کی محسوس حرکات سے اس کے مقصد و غایت کو الگ کر دیا جائے، میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہے۔

سورۃ التوبہ میں منافقین کی یہ کیفیت بتائی گئی ہے: وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹/۵۴)۔ وہ صلوٰۃ کی طرف آتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لئے ہوتے اور اگر دین کی خاطر کچھ دیتے ہیں تو بیگار سمجھتے ہوئے!

اِن آیات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ قرآن کی رو سے صلوٰۃ اور نظامِ انفاق کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اور جس صلوٰۃ سے معاشی نظام کو الگ کر دیا جائے یا جس معاشی نظام کو نظامِ صلوٰۃ سے جدا کر دیا جائے، قرآن کریم کی رو سے ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

نماز

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اگرچہ قرآنِ کریم کی رو سے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم وہ نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں، لیکن قرآنِ کریم میں یہ لفظ (صلوٰۃ) اس شکل کے لئے بھی آیا ہے جسے نماز کہکر پکارا جاتا ہے۔ نماز قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا لفظ ہے۔ ایران کے مجوس (جنہیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریقِ پرستش کو نماز کہا کرتے تھے۔ انہی کے ہاں سے یہ لفظ ہمارے ہاں (ہندوپاک میں) آیا اور ایسا عام ہوا کہ اب صلوٰۃ کی جگہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا[1]۔ بایں ہمہ، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، الصلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں اب نماز کہکر پکارا جاتا ہے۔

خیالات اور جسمانی حرکات کا تعلق

انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس کے دل میں کوئی جذبہ اُبھرتا ہے تو اس کا اظہار زبان کے ذریعے بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے دیگر اعضائے بدن سے خود بخود ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں جو اس جذبہ یا خیال کا مظہر بن جاتی ہیں۔ (مثلاً) جب آپ کے دل میں جذباتِ مسرت موجزن ہوتے ہیں تو اس کی لہریں مسکراہٹ کی شکل میں آپ کے چہرے پر پھیل جاتی ہیں۔ جب آپ کسی کو سلام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ خود بخود ماتھے کیطرف اُٹھ جاتا ہے۔ جب آپ کسی کی تعظیم کرتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے، اور خود سپردگی کے عالم میں یہ جھکاؤ انتہائی شکل اختیار کرلیتا ہے جسے سربسجود ہونا کہتے ہیں۔ اصطلاح میں خیالات اور اعضاء کی اس یکبارگی ہم آہنگی کو متوازیت یا (PARALLELISM) کہکر پکارا جاتا ہے۔ اعضاء کی ان حرکات کا تقاضا ایسا غیر شعوری اور بلاساختہ ہوتا ہے کہ آپ اُسے روک نہیں سکتے۔ اگر آپ کسی مقرر پر پابندی لگا دیں کہ وہ تقریر تو جیسی جی چاہے کرے لیکن دورانِ تقریر وہ ساکن کھڑا رہے۔ اس سے نہ کسی قسم کی حرکت ظہور میں آئے نہ چہرے پر خاص علامات کی نمود ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اوّل تو وہ تقریر ہی نہیں کر سکے گا اور اگر بندھے ٹکے الفاظ بولے گا بھی تو اس کی تقریر بالکل غیر مؤثر اور بے نتیجہ رہ جائے گی۔ اعضائے جسمانی کی ان محسوس اور مرئی حرکات کو (FORMALISM)—شعائر و مناسک—

---

[1] اسی طرح درود کا لفظ بھی قدیم پہلوی زبان کا ہے اور قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ صلوٰۃ بمعنی درود کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔

کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کے اس داخلی تقاضہ کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس کے ظہور و نمود کی اجازت دی ہے صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود، اور مناسک حج میں طواف وغیرہ انسان کے اسی تقاضہ کی تسکین کی شکلیں ہیں۔ اگر ان مرئی شکلوں کو ترک کر دیا جائے تو باقی یا تو فلسفیانہ تخیلات رہ جاتے ہیں۔ یا خانقاہیت کی کیفیات، جن کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ:

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

یہ فلسفہ کے تصورات ہوں یا تصوّف کی کیفیات، بہر حال انفرادی ہوتی ہیں۔ اجتماعیت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ لہٰذا اس میں یہ محسوسات بھی باقی رہتی ہیں اور ان میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی ہم آہنگی اُمّت میں وحدتِ عمل کا مظہر ہوتی ہے۔

ظواہر پرستی

دوسری طرف، جب ان محسوسات سے غرض و غایت مفقود ہو جائے اور ظواہر کی ادائیگی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو اسے پرستش کہا جاتا ہے۔ جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ملتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی چونکہ اسلام "مذہب" بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اس میں بھی الصلوٰۃ کو نماز کے محسوس ارکان تک محدود سمجھ لیا گیا اور عبادت کا مفہوم پرستش قرار دیا گیا ہے۔ اور انہی ظواہر کو اسلام کی غایت سمجھ لیا گیا ہے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اب آئیے قرآنِ کریم کی روشنی میں صلوٰۃ کے اجتماعات کی طرف۔ اسلامی نظام کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو احکامِ خداوندی کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ فریضۂ انفاق کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ صدرِ اول کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب مملکت کے کسی اہم معاملہ کے لئے مشاورت کی ضرورت لاحق ہوتی تو حکومت کی طرف سے ان الفاظ میں منادی کرائی جاتی کہ اَلصَّلٰوةُ الْجَامِعَةُ ۔ اس پر لوگ اس اجتماع میں شرکت کیلئے جمع ہو جاتے تھے[1] چونکہ

[1] میں نے اس تاریخی شہادت کو صحیح سمجھ کر اس لئے یہاں درج کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے، قرآنِ کریم کے اصولی حکم "نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ ــــ صلوٰۃ کے لئے منادی ــــ کی عملی شکل کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ صدرِ اول کی تاریخی شہادت کی صحت و سقم کے متعلق میرا یہی مسلک ہے۔ یعنی جو واقعہ قرآنِ کریم کے خلاف نہیں جاتا میں اسے صحیح تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا جو اس کے خلاف جاتا ہو اسے ناقابلِ تسلیم

مشاورت کی غایت، قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا تھا اس لئے اس کی ابتداء نماز کی شکل میں ہوتی (جس طرح اب ہمارے ہاں رسمی طور پر جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآنِ کریم سے کیا جاتا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ اجتماعات وقتِ مقررہ پر ہوتے تھے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) - یاد رکھو! صلوٰۃ۔ مومنین کے لئے ایک مؤقت فریضہ ہے یعنی ایسا فریضہ جس کی وقتِ معیّن پر ادائیگی کی جائے گی - بالفاظِ دیگر جو وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو اس وقت اس اجتماع میں شرکت لازمی ہو گی۔

اگر ان اوقات کو خود خدا نے مقرر کر دیا ہے تو ان میں رد و بدل نہیں ہو سکے گا۔ البتہ ہنگامی ضرورت کے وقت (مقررہ اجتماعات کے علاوہ) ہنگامی اجتماع منعقد کئے جا سکیں گے۔ اگر ان کے اوقات خدا نے مقرر نہیں کئے، تو انہیں باہمی مشاورت سے مقرر کر لیا جائے گا۔ ان میں (باہمی مشاورت سے) رد و بدل ممکن ہو گا۔ (کیا ان اجتماعات کے لئے اوقات کا تعین خدا نے کر دیا ہوا ہے؟ اس کی بحث ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

اِن اجتماعات کے لئے یہی وہ بلاوا ہے جسے قرآن نے ندائے صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ جمعہ میں ہے:
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (۶۲/۹) اے افرادِ جماعتِ مومنین! جب تمہیں یوم الجمعۃ کو صلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر مقامِ اجتماع کی طرف لپک کر آجایا کرو کیونکہ وہاں "اللہ کی باتیں" ہوں گی (ان آیات کا پورا مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)۔ دوسری جگہ ہے وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا (۵/۵۸) مخالفین کی حالت یہ ہے کہ جب تم الصلوٰۃ جیسے اجتماع کے لئے منادی کرتے ہو تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ صلوٰۃ کے بعد مسجد میں جملہ معاملات طے پاتے تھے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب وصیت کے معاملہ میں کوئی متنازعہ فیہ امر فیصلہ طلب ہو تو صلوٰۃ کے بعد متعلقہ پارٹیوں کو وہاں روک لیا کرو تاکہ اس معاملہ کا قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے (۵/۱۰۶)۔ اِن اجتماعات میں شرکت کے لئے صفائی کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے - اس سلسلہ میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر غسل، وضو، اور تیمم وغیرہ کے احکامات دیئے ہیں (۵/۶ ؛ ۴/۴۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم ان اجتماعات میں پورے ہوش و حواس کے عالم میں شریک ہوا کرو کیونکہ وہاں بڑے اہم امور زیرِ بحث آئیں گے۔ جب تم اتنا بھی نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو تو ان اجتماعات میں شرکت فائدے کے بجائے اُلٹا نقصان کا موجب ہو گی (۴/۴۳)۔

جس شکل میں، ہم نماز ادا کرتے ہیں اس کی جملہ جزئیات اور تفاصیل کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا- ان میں سے صرف چند ایک کا اجمالی طور پر ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان جزئیات کا تعین قرآنِ کریم میں نہیں کیا گیا۔

اور یہاں سے ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال، سامنے آتا ہے جس کا تعلق خود دین کی اصل سے ہے۔

اُصول اور اُن کی جزئیات

ایک چیز ہوتی ہے اصول اور دوسری چیز ہوتی ہے اس اصول کو بروئے کار لانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے۔ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طُرق و اسالیب میں حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ طبیعی زندگی سے متعلق ایک مثال کی رو سے اسے یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کا مدار غذا پر ہے یہ ناقابلِ تغیر اُصول ہے جو شروع سے آج تک یکساں چلا آرہا ہے۔ لیکن غذا کی نوعیت اور کیفیت بدلتی چلی آئی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں غاروں کے رہنے والے انسانوں کی غذا اور تھی اور آج کے انسان کی اور ہے۔ پھر، آج بھی مختلف ممالک کے باشندوں کی غذا میں فرق ہے اور یہ فرق بیشتر آب و ہوا کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ آگے بڑھئے تو ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور حالات ہیں، غذا میں فرق ہوتا ہے۔ بچہ کی غذا اور ہوتی ہے جوانی کے زمانے کی اور، اور بڑھاپے میں اس سے بھی مختلف۔ تندرست کی غذا اور مریض کی غذا میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اگر قاعدہ یہ ٹھہرالیا جائے کہ غذا میں کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی تو زندگی دو قدم بھی نہ چل سکے۔ یہی کیفیت ان اصول و اقدار کی ہے جو خدا کی طرف سے انسانی راہنمائی کے لئے ملے ہیں۔ ان اصولوں کو الدِّین کہا جاتا ہے جو شروع سے آخر تک یکساں چلا آیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲/۱۳)۔ تمہارے لئے بھی دین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا اور جسے اب (اے رسولؐ!) تیری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ ان سب سے یہی کہا گیا تھا کہ اس دین کو ہمیشہ برقرار رکھنا اور اس میں کوئی اختلاف اور تفرقہ پیدا نہ کرنا۔ یہ، الدّین وہ اصول تھے جنہیں شروع سے آخر تک غیر متبدل رکھا گیا تھا لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقوں میں حالات کے مطابق فرق ہوتا رہتا تھا۔ انسانوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے علم کی محدودیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت نوحؑ کو یہ بھی وحی کے ذریعہ سکھایا گیا کہ کشتی کس طرح بنائی جاتی ہے (۱۱/۳۷) اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں دین پر عمل پیرا ہونے کے چھوٹے چھوٹے قواعد و ضوابط بھی وحی کے ذریعے بتائے جاتے تھے۔ جوں جوں علمِ انسانی میں وسعت ہوتی جاتی تھی، ان جزئیات میں کمی اور تبدیلی کردی جاتی تھی۔ سورۃ البقرۃ میں اسی حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ

ناسخ و منسوخ

نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (۲/۱۰۶) وحی کا طریق یہ رہا ہے

ایک رسول کی وساطت سے کچھ قوانین دیئے جاتے۔ اس رسول کے بعد، ان میں سے بعض قوانین کو ان کے نام لیوا بدل دیتے (اسے تحریف کہا جاتا ہے)۔ بعض، انہی کی سازشوں سے، یا حوادثِ ارضی وسماوی کی وجہ سے ضائع اور فراموش ہو جاتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے کہ رہنے تو وہ علیٰ حالہٖ، لیکن تغیرِ حالاتِ زمانہ کی وجہ سے ان میں تبدیلی ضروری سمجھی جاتی۔ اس وقت ایک دوسرا رسول آتا۔ اس کی وساطت سے الدّین کے اصول وہی دیئے جاتے جو سابقہ رسول کی وساطت سے دیئے گئے تھے۔ جہاں تک ان کی جزئیات کا تعلق تھا، ان میں سے جنہیں علیٰ حالہٖ رکھنا مقصود ہوتا، انہیں دُہرا دیا جاتا (انہیں مِثْلِهَا، کہا گیا ہے) اور جنہیں قابلِ تغیر سمجھا جاتا انہیں منسوخ کر کے اس کی جگہ ایسے احکام دے دیئے جاتے جو اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوتے۔ اس لحاظ سے یہ جدید احکام سابقہ احکام سے بہتر ہوتے (بِخَيْرٍ مِّنْهَا) اسے دوسری جگہ تبدیلیٔ آیات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (۱۶/۱۰۱)

سورۃ الحج میں اس حقیقت کو ان جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ ۔ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۲/۵۲)۔ اے رسول! ہمارا اندازیہ رہا ہے کہ ہماری طرف سے انبیاء رُسل کی طرف جو وحی کی جاتی (رسول کے بعد) جب شیطان اس میں کچھ آمیزش کر دیتا تو ہم ایک اور رسول بھیج دیتے اور اس کی طرف نازل کردہ وحی کے ذریعے شیطانی آمیزش کو مٹا کر (منسوخ کر کے) اپنے قوانین کو بارِ دیگر محکم کر دیتے یہ سب کچھ خدا کے علم و حکمت کی بنا پر ہوتا ــــ سابقہ رسول کے نام لیوا اس نئے رسول سے جھگڑتے اور کہتے کہ جو جزئی احکام تم پیش کرتے ہو وہ ہماری شریعت سے مختلف ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تم خدا کے رسول نہیں۔ خود احکام وضع کرتے ہو اور انہیں خدا کی طرف منسوب کر کے وحیٔ الٰہی بتاتے ہو۔ ان کے اس قسم کے اعتراضات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر کسی نئے رسول کی طرف سے ایسے احکامِ شریعت پیش ہوں جو سابقہ رسول کو عطا کردہ احکام سے مختلف ہوں تو یہ بھی خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ منہاج وشرائع (جزئیات) قابلِ تغیر و تبدل ہوتی ہیں اور اصلِ دین غیر متغیر۔ اس لئے منہاج ومناسک کی تبدیلی کی بنا پر اصلِ دین میں جھگڑے نہیں پیدا کرنے چاہئیں۔ لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲/۶۷، ۵/۴۸) ہم نے ہر قوم کے لئے (ان کے حالات کے مطابق) دین کے مختلف طور طریقے دیئے تھے۔ لیکن اصل دین (الامر) ہر جگہ ایک ہی رہا ہے۔ انہیں یہ نہیں چاہیئے کہ ان جزئی احکام کے اختلاف کو بطورِ دلیل پیش کر کے اصل دین کی بابت ہی جھگڑنا شروع

کر دیں۔ (مثلاً) یہودی شریعت میں، ناخن دار جانور (ذی ظفر) اور گائے بکری کی (مخصوص) چربی حرام قرار دیدی گئی تھی (۶/۱۴۷) لیکن قرآنِ کریم نے اسے حرام قرار نہیں دیا۔

آخری ضابطۂ ہدایت

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تاآنکہ انسانیت اس دور تک آپہنچی جس میں انسانی علم کی ترقی اور وسعت کی رفتار بڑی تیز ہو جانی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک آخری رسول کو بھیجا اور انسان کو قیامت تک کے لئے جو راہنمائی دینی تھی اسے اس رسول کی طرف نازل کردہ کتاب میں مکمل اور محفوظ کر دیا۔ اس کتاب کی صورت یہ تھی کہ اس میں:

۱:- دین کے اصول تو وہی تھے جو شروع سے چلے آرہے تھے۔

۲:- جہاں تک احکام کا تعلق ہے ان میں بہت تھوڑے ایسے تھے جن کی تفصیلات بھی خدا نے خود متعین کر دیں۔ یہ وہ تفصیلات تھیں جن کا غیر متبدل رکھا جانا مقصود تھا۔ اور

۳:- دیگر احکام صرف اصولی طور پر دیئے گئے۔ یعنی ان کی جزئیات خدا نے خود متعین نہیں کیں کیونکہ ان (جزئیات) کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہیں تھا۔ ان میں اقتضائے حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہنی تھیں۔

مندرجہ بالا تینوں شقوں کی مثالیں یوں سمجھئے کہ:

۱:- محکومیت (عبودیت) صرف خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔ یہ دین کا ابدی اصول تھا شروع سے غیر متبدل چلا آرہا تھا اور جسے غیر متبدل رہنا تھا۔

۲:- (احکام میں) جن رشتوں کو نکاح کیلئے حرام قرار دیا گیا ہے قرآن نے ان کی جملہ تفاصیل خود بیان کر دی ہیں (دیکھئے ۴/۲۳)۔ اسی طرح وراثت کے حصے بھی خود ہی متعین کر دیئے ہیں (۴/۱۱-۱۲ وغیرہ)

۳:- ا۔ جرائم بیشمار قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی سزائیں تو قرآنِ کریم نے خود متعین کر دی ہیں (سرقہ، زنا، تہمت، بغاوت)۔ اور باقیوں کی سزا خود متعین نہیں کی۔

ب۔ اور بعض احکام ایسے ہیں جنہیں صرف اصولی طور پر دیا گیا ہے مثلاً مشاورت کا حکم (۴۲/۳۸) تو دیا گیا ہے لیکن مشاورت کی مشینری خود تجویز نہیں کی۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم کے اصول و احکام کی کیفیت کیا ہے۔ جہاں تک ان اصول و

تفاصیل کا تعلق ہے جو قرآن کریم میں دے دیئے گئے ہیں ان میں نہ حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ تغیّر و تبدّل۔ باقی رہے وہ احکام جن کی جزئیات خود قرآن نے متعین نہیں کیں ان کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جزئیات کس طرح متعین ہوں گی۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ ان کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ ہم سے بھول ہو گئی ہے کہ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ انہیں دانستہ ایسا چھوڑا گیا ہے۔ فرمایا:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ ۔ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کو ہم نے بتایا نہیں، انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بالفرضِ محال) ان امور کو بھی قرآن میں دیدیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دیدینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکے گی اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادہ ہی کو اُتار پھینکا۔ لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم نے نہیں کیا انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے

تعینِ جزئیات کا طریق

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ رسولوں کے سلسلہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ اس قسم کی نئی جزئیات نئے رسول کی وساطت سے ملتی تھیں۔ اب جب کہ وحی کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا اور حضورؐ کے بعد کسی اور رسول نے آنا ہی نہیں تو جزئیات کے تعین اور ان میں عند الضرورت تغیر و تبدل کے لئے طریق کیا بتایا گیا؟ مندرجہ بالا آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے دوران بھی ان جزئیات کا تعین وحی کی رو سے کیا جانا مقصود نہیں تھا۔ لہٰذا ان جزئیات کے تعین و تبدّل کے لئے جو طریق حضورؐ کے بعد تجویز کیا گیا تھا اُسے خود رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں اختیار کر لیا گیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ:

وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۸)

یہ اُمور اپنے رُفقاء کے مشورہ سے طے کیا کرو۔

یعنی ان جزئیات کا تعین و تغیر و تبدل، باہمی مشاورت سے ہوگا وحی کی رو سے نہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد فرمودہ اِس

طریق (شورائیت) کے مطابق ان جزئیات کا تعین خود رسول اللہؐ کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس کے لئے کیا طریق تجویز کیا گیا۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ جو نظامِ شورائیت (اسلامی نظامِ مملکت) رسول اللہؐ کے زمانے میں قائم ہوا تھا، اسے، حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا۔ اسے آپ کے بعد بھی علیٰ حالہٖ قائم رکھا جانا مطلوب تھا۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ
اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ
يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَسَيَجْزِى
اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۳/۱۴۳)

محمدؐ بجز این نیست، کہ خدا کے ایک رسول ہیں۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول آئے اور (اپنا اپنا مشن پورا کرکے) دنیا سے چلے گئے۔ اگر کل کو یہ رسولؐ بھی وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ بس دین کا نظام ختم ہو گیا، اور اس کے بعد تم پھر اپنی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے! یاد رکھو! جو ایسا کریگا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور جو لوگ اس نظام کو قائم رکھیں گے ان کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں گی۔

یعنی جو نظامِ مملکت حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں قائم ہوا تھا اسے حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اور تعین و تغیرِ جزئیات کے لئے جو حکم حضورؐ کو دیا گیا تھا اس کے مطابق آپ کے بعد بھی عمل ہونا تھا۔ چنانچہ (جس طرح رسول اللہؐ سے کہا گیا تھا کہ ان امور کا تعین باہمی مشاورت سے کیا کرو، اسی طرح) جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔

ان کے معاملات بھی باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ الدّین کے اصول و قوانین، اقدار و احکام، جو قرآنِ کریم کے اندر موجود و محفوظ ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور جو تفاصیل اس میں نہیں دی گئیں ان کا تعین، اور حالات

ثبات و تغیر کا امتزاج

کی تبدیلی کے مطابق ان میں تبدیلی، اسلامی نظامِ مملکت کے ذریعہ ہوگی۔ ثبات (PERMANENCE) اور تغیر (CHANGE) کے اس حسین

اِمتزاج سے کاروانِ انسانیت، شاداں و فرحاں اپنی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی خود انسانی زندگی کا تقاضہ ہے۔ اگر اس میں کوئی اصول ناقابلِ تغیر نہ ہو تو اس کی مثال اس کشتی کی سی ہو جائے گی جسے لنگر کے بغیر حوادثِ زمانہ کی طغیانیوں میں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر اس میں کوئی شے قابلِ تغیر نہ ہو تو وہ جامد اور متحجر بن کر رہ جائے۔ اس کی نمود اور ارتقاء ختم ہو جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور حضورؐ کے بعد جب تک قرآنی نظام قائم رہا (جسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ثبات وتغیر کا یہ امتزاج بھی باقی رہا۔ اس نظام کا یہی وہ زورِ دروں تھا جس کی وجہ سے اِس امت نے چند برسوں میں وہ وسعتیں اور بلندیاں حاصل کرلیں جن کی نظیر تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔ لیکن وائے بدقسمتی، کہ اس کے بعد یہ نظام قائم نہ رہا، اور جب یہ نظام ہی باقی نہ رہا تو اصولی احکام کی جزئیات کے تعین اور تغیر کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اُس وقت دین "مذہب" میں تبدیل ہوگیا (اور جیسا کہ ہر مذہب میں ہوا)

بعد میں کیا ہوا؟

جو جزئیات اس زمانے میں رائج تھیں ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ (دین کے اصولوں کی طرح) ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر رہیں گی۔ اِس سے زندگی ساکت اور جامد ہو کر رہ گئی۔ اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ وہ جزئیات رفتہ رفتہ ناقابلِ عمل ہوتی گئیں بلکہ خود دین کے اصولوں پر بھی عمل کرنا ممکن نہ رہا۔ اس لئے کہ اصولوں پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب ان پر عمل کرنے کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ اگر یہ طریق جامد ہو جائیں تو دین پر عمل کرنا بھی ممکن نہیں رہتا ـــــ جس طرح (مثلاً) اگر یہ فرض کیا جائے کہ سفر کرنے کا ناقابلِ تغیر طریق بیل گاڑی ہے تو چاند تک پہنچنا ناممکن ہو جائے، خواہ اصولی طور پر آپ کو کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو کہ چاند تک پہنچ جانا ممکن ہے۔ ان حالات میں "مذہب" یہ کرتا ہے کہ ان جزئیات کے ظواہر پر عمل پیرا رہنے کو دین کی غایت قرار دیدیتا اور ان پر شدت کے ساتھ پابند رہنے پر زور دیتا رہتا ہے لیکن یہ ٹیکنیک بھی زیادہ عرصہ تک کارفرما نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ انسان اسی عمل پر بطیب خاطر التزاماً کاربند رہ سکتا ہے جس کے نتائج اس کے سامنے آتے جائیں۔ ظواہر پرستی سے کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ اس لئے اعمال کو نتائج کی رُو سے پرکھنے والے لوگ اس ظواہر پرستی پر قائم نہیں رہتے۔ یہ جو ہمارے زمانے میں عام شکایت ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل مذہب سے بے گانہ ہوتی چلی جارہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ یہ نسل (یعنی تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ) نہ تو کسی دعوے کو بلا دلیل و برہان ماننے کے لئے تیار ہے، نہ کسی ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ جس کے واضح نتائج سامنے نہ آئیں۔ اگر دین کا صحیح نظام اور اس کے انسانیت ساز نتائج ان کے سامنے ہوتے تو نہ صرف یہ کہ یہی نوجوان

جانِ مدعا بنا لیتے بلکہ (قرآن کریم کے الفاظ میں) دوسری اقوام بھی فوج در فوج، کشاں کشاں اس کی طرف چلی آتیں (۱۱۰/۲)۔ اور یوں قرآن کریم کا یہ دعویٰ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجاتا کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)۔ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو واضح ہدایت اور مبنی بر حقیقت نظام دیکر بھیجا تاکہ یہ نظام دیگر نظامہائے عالم پر غالب آجائے، خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قرآن مجید نے اپنے جملہ احکام کی تمام تر تفصیلات خود متعین کیوں نہیں کردیں۔ اس کے بعد آپ پلٹئے زیرِ نظر موضوع کی طرف۔ یعنی صلوٰۃ (نماز) کی جزئیات اور تفاصیل کی طرف۔ دین کے نظام میں صلوٰۃ کو جسقدر اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق دو آرا ہو ہی نہیں سکتیں، لیکن اس کے باوجود، آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم نے اس کے اوقات، رکعات، ارکان و اذکار وغیرہ تفاصیل کو متعین طور بیان نہیں کیا۔ ان میں سے بعض کے متعلق اس میں (قرآن مجید میں) کچھ اشارات ملتے ہیں اور باقیوں کے متعلق اتنا بھی نہیں۔ سب سے پہلے صلوٰۃ کے اوقات کو لیجئے۔ ان کے متعلق حسب ذیل مقامات پر اشارے ملتے ہیں۔

صلوٰۃ کے اوقات

(۱) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۱۷/۷۸)۔

اس آیت کا رواں ترجمہ یہ ہے کہ صلوٰۃ قائم کرو "دلوکِ شمس" سے لیکر "غسق لیل" تک اور قرآن الفجر۔ یاد رکھو قرآن الفجر بڑا مشہود ہوتا ہے۔ اس میں "دلوکِ شمس" اور "غسق لیل" کے الفاظ غور طلب ہیں۔ دلک کا لفظ بڑا وسیع المعنیٰ ہے۔ اس کے بنیادی معنے حرکت کرنے کے ہیں۔ جب آفتاب بلندی کی طرف حرکت کرے تو اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے اور جب وہ رو بہ انحطاط ہوکر غروب ہو جائے تو اس کے لئے بھی۔ اور غسق لیل، ابتدائے شب کی تاریکی کو کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے طلوعِ آفتاب سے لیکر غروبِ آفتاب بلکہ غروب کے کچھ عرصہ بعد (غسق) تک کا سارا وقت اس میں آجاتا ہے۔ کتب تفاسیر میں، اس آیت کی تشریح میں اس قدر طول طویل لیکن باہمدگر متضاد باتیں کہی گئی ہیں کہ انہیں اختصاراً پیش کرنے کی بھی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم نے آیت بھی پیش کر دی ہے اور ان الفاظ کے لغوی معانی بھی۔ آیت سے کم از کم اتنا تو واضح ہے کہ اس میں اوقات کا تعین نہیں کیا گیا۔ حالانکہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب اسے کسی بات کو متعین طور پر پیش کرنا مطلوب ہوتا ہے، تو وہ اشارات اور کنایات سے کام نہیں لیتا اسے واضح، غیر مبہم، متعین (SPECIFIC) انداز سے بیان کرتا ہے لیکن

اِس آیت میں وہ متعین انداز اختیار نہیں کیا گیا۔

(۲) سورۃ ہود میں ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (۱۱/۱۱۴)۔ اس کے عام معانی یہ ہیں کہ تم صلوٰۃ قائم کرو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے پہلے حصے میں۔ اسی طرح سورۃ طٰہٰ میں ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (۲۰/۱۳۰) اس میں صلوٰۃ کا لفظ تو نہیں آیا تسبیح کا لفظ آیا ہے۔ لیکن عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی صلوٰۃ ہی مقصود ہے۔ اس میں طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے، دن کے دونوں اطراف اور رات کی گھڑیوں کا ذکر ہے۔ بات یہاں بھی متعین طور پر نہیں کہی گئی۔

یہ اور اس قسم کی چند ایک اور آیات سے عام طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ نماز کے مروجہ پانچ اوقات خود قرآن نے متعین کئے ہیں، لیکن عام دعویٰ یہی ہے کہ یہ اوقات رسول اللہ نے مقرر فرمائے تھے۔

(۳) سورۃ النور میں مجلسی آداب کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھروں میں کام کرنے والے بچے، بے محابا گھر میں گھوم پھر سکتے ہیں، بجز ان تین اوقات کے۔ یعنی مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ۔ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ (۲۴/۵۸) صلوٰۃ الفجر سے پہلے اور صلوٰۃ العشاء کے بعد اور دوپہر کے وقت، کیونکہ ان اوقات میں تم بے تکلف کپڑے وغیرہ اُتار کر بیٹھے یا لیٹے ہوتے ہو۔ اس آیت میں فجر اور عشاء کی نمازوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو نمازیں اسی طرح متعارف تھیں۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں حکم کے طور پر ان کا بھی ذکر نہیں آیا۔

(۴) سورۃ بقرۃ میں، پہلے طلاق وغیرہ کے مسائل کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہے حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (۲/۲۳۸)۔ تم اپنی صلوٰۃ (بصیغہ جمع) کی حفاظت کرو اور "صلوٰۃ الوسطیٰ" کی۔ اس میں "صلوٰۃ الوسطیٰ" کے معنی درمیانی نماز کئے جاتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ وہ ایک طرف فجر اور ظہر اور دوسری طرف مغرب اور عشاء کے درمیان آتی ہے۔ (میرے نزدیک اس آیت کا کیا مفہوم ہے، اسے اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)

رکعات

جہاں تک رکعات کا تعلق ہے انہیں بھی قرآنِ کریم نے متعین طور پر بیان نہیں کیا۔ سورۃ النساء میں اتنا بتایا گیا ہے کہ جنگ کی حالت میں، جب تمہیں دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو نماز کو اس طرح ادا کر لینا چاہئے کہ مجاہدین کا ایک گروہ امام (یعنی رسول اللہ) کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھے۔ جب یہ

سجدہ کرچکیں تو پیچھے ہٹ جائیں اور دوسرا گروہ جس نے ابھی تک صلوٰۃ ادا نہیں کی۔ امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ یہ بھی اسی طرح اپنے ہتھیار سنبھالے رکھیں ــــ (۴/۱۰۱-۱۰۲) سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ہے فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُكۡبَانًا فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ (۲/۲۳۹)۔ یعنی جب تم حالتِ خوف میں ہو تو پھر پاپیادہ یا گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے ذکر کرلیا کرو۔ اور جب تم حالت امن میں ہو تو پھر جس طــرح تمہیں سکھایا گیا ہے اس طرح کرو۔

رکعتوں کے متعلق قرآن کریم کی انہی آیات میں اشارات ملتے ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ ان کے متعلق مختلف فرقوں میں اختلاف ہے ــــ یعنی ہر نماز میں اتنی رکعتیں فرض، اتنی سنت، اتنی نفل وغیرہ میں ان اختلافات کو بھی بڑا دخل حاصل ہے [میں ان آیات کی تشریح (اپنی بصیرت کے مطابق) متعلقہ مقامات پر کردوں گا]

اذکارِ صلوٰۃ جہاں تک نماز میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کی بھی صراحت نہیں. سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۱۷/۱۱۰) میں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا وَابۡتَغِ بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا۔ تم اپنی صلوٰۃ میں نہ تو بلند آواز اختیار کرو اور نہ بالکل خاموشی. بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرو. بعض لوگ یہاں صلوٰۃ سے مراد نماز لیتے ہیں اور بعض عام دُعا۔ (کیونکہ صلوٰۃ کے معنے دُعا بھی ہیں)۔

سورۃ التوبہ میں منافقین کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ (۹/۸۴) تم ان میں سے کسی کی میت پر بھی دعا نہ کرو اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہو۔ اس آیت سے نمازِ جنازہ مُراد لی جاتی ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (۱۷/۷۹)۔ اے رسولؐ! تم رات میں بھی کچھ وقت کے لئے جاگا کرو لیکن یہ حکم صرف تمہارے لئے ہے. اس سے تہجد کی نماز مراد لی جاتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ رسولؐ اللہ کے لئے مخصوص تھی، اور وہ بھی فریضہ کے طور پر نہیں بلکہ نفل کے طور پر۔

میری بصیرت کے مطابق، قرآن کریم میں نماز کی تفاصیل کے متعلق یہی کچھ آیا ہے. میں نے تعیّنِ جزئیات کے جس اصول کا پہلے ذکر کیا ہے اس کی رو سے میرے لئے اس باب میں مزید کاوش کی ضرورت نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ صلوٰۃ کا اصولی حکم وحی کی رو سے حضورؐ کو دیا گیا تو آپؐ نے قرآنی اصول کے مطابق باہمی مشاورت سے اس

کے لئے مکمل پروگرام متعین فرمایا ہوگا۔[1] قرآن کریم کے یہ ارشادات اسی پروگرام کے تضمنات نظر آتے ہیں۔ جس حکم کی جزئیات قرآن کریم خود متعین کرتا ہے اس میں اس کا انداز کیا ہوتا ہے اس کی کچھ مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں (دیکھئے صفحہ ۱۲۰) اس وقت میرے سامنے سورۃ بقرۃ کی آیات ($\frac{۲}{۲۸۲-۲۸۳}$) ہیں (اور آیت ۲۸۲ تو غالباً قرآن کریم کی سب سے لمبی آیت ہے) اس میں کہا گیا ہے کہ جب تم باہمی قرض کا معاملہ کرو تو اس کے لئے کیا طریق اختیار کرو۔ آپ دیکھئے قرآن کریم نے اس پروگرام کو کس وضاحت اور تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب لین دین کے معاملات کی جزئیات میں اس کا یہ انداز ہے تو صلوٰۃ جیسے بنیادی فریضہ کے سلسلہ میں جزئیات کے تعین کے لئے اس نے ایسا ہی انداز کیوں نہ اختیار کیا؟ تعجب ہے کہ اس نے وضو کے متعلق تو ایسا تفصیلی حکم دیا کہ منہ دھوؤ۔ کہنیوں تک ہاتھ دھوؤ۔ سر کا مسح کرو، پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ، جُنبی حالت میں یوں کرو۔ مسافر اور مریض ہونے کی صورت میں ایسا کرو۔ پانی نہ ملے تو کیا کرو۔ ($\frac{۵}{۶}$)۔ تمہیدِ صلوٰۃ کے متعلق تو اس قدر تفصیلی احکام آئے لیکن خود صلوٰۃ کے سلسلہ میں اس طرح متعین طور پر کوئی حکم نہیں دیا اِس سے نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ۔۔۔ ان جزئیات کو (دانستہ) غیر متعین رکھنا چاہتا تھا۔

متقدمین میں سے جن فرقوں نے نماز کی جزئیات کا تعین کیا، انہوں نے ان کی بنیاد احادیث یا فقہ پر رکھی۔ لیکن ان جزئیات میں جسقدر اختلاف ہے وہ مختلف فرقوں کی نماز سے ظاہر ہے۔ اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ قرآن کریم نے الصلوٰۃ کو امت میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس نے سورۃ رُوم میں کہا کہ اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ($\frac{۳۰}{۳۱-۳۲}$) تم صلوٰۃ قائم کرنا اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا، فرقوں میں بٹ گئے اور پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قرآن کریم نے صلوٰۃ کو اُمت میں۔۔۔ وحدت پیدا کرنے اور وحدت برقرار رکھنے کا ذریعہ بتایا تھا لیکن وائے بدنصیبی کہ اب وہی صلوٰۃ (نماز کی شکل میں) امت کے تفرقہ کا مظہر قرار پا گئی ہے۔ کسی جلسہ میں دس ہزار مسلمان بیٹھے ہوں

موجودہ نماز تفرقہ کا مظہر ہے

---

[1] عام عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے ان جزئیات کا تعین وحی خفی کی رُو سے کیا تھا جو قرآن کریم کے اندر نہیں ہے۔ قرآن صرف وحی جلی ہے لیکن قرآن کریم سے وحی کی ان دو قسموں کا ثبوت نہیں ملتا۔ وحی ایک ہی قسم کی تھی جو سب کی سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے وحی کی ان دو قسموں کا عقیدہ یہودیوں کے ہاں تھا۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر ملے گی۔

ان میں فرقہ بندی کی کوئی محسوس علامت سامنے نہیں آئے گی، سب ایک امت کے افراد دکھائی دیں گے لیکن اس دوران میں اگر نماز کی اذان سنائی دے تو ان میں سے ایک ٹولی ایک مسجد کا رُخ کرے گی دوسری ٹولی دوسری مسجد کا۔ اور اس طرح ان کے گروہ منداتہ اختلافات اُبھر کر سامنے آجائیں گے اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ ایک فرقہ سے متعلق مسلمان کو دوسرے فرقہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر وہ بھولے بھٹکے دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے گا تو دہائی مچ جائے گی کہ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

لیکن چونکہ یہ فرقے اس امر کے مدعی ہیں کہ نمازوں کی یہ باہمد گر مختلف جزئیات احادیث یا فقہ کی رو سے متعین ہوئی ہیں اس لئے اس اختلاف کی زد قرآن کریم پر نہیں پڑتی، لیکن ہمارے دور میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا ہے جس نے براہِ راست قرآن کریم کو اس طرح اپنا ہدف بنایا ہے کہ اس کا یہ دعویٰ، کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (معاذ اللہ) باطل ہو کر رہ گیا ہے قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کئی اختلافی باتیں پاتے۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے دعویٰ کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

فرقہ اہل قرآن

اِس فرقہ کا، جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جو (برعکس نہند نام زنگی کافور، اپنے آپ کو اہل قرآن کہکر پکارتا ہے) دعویٰ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے تمام احکام کی جملہ تفصیلات و جزئیات خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے نماز کی جزئیات کو لیا ہے۔ میں کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑے بغیر صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ان کی اس سعی نامشکور کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس فرقہ کے بانی تھے (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم)۔ اور ان کے متبعین کا ایک گروہ لاہور میں مقیم ہے۔ ان دونوں نے نماز کی جزئیات (اپنے دعویٰ کے مطابق) قرآنِ کریم سے متعین کی ہیں اور ان کی دریافت کردہ جزئیات کی کیفیت یہ ہے:-

مولانا چکڑالوی		لاہوری فرقہ	
۱:-	پانچ وقت کی نماز	۱:-	تین وقت کی نماز
۲:-	نماز میں دو تین - چار رکعتیں	۲:-	نماز کی صرف دو رکعتیں
۳:-	ہر رکعت میں دو سجدے	۳:-	ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ

جہاں تک اذکارِ صلوٰۃ کا تعلق ہے وہ بھی بالکل نرالے ہیں، اگرچہ وہ مشتمل ہیں قرآنی آیات ہی پر۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جس قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نماز کی جزئیات تک میں اس قدر اختلاف ہے تو اسے مُنزل مِن اللہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ تو سوچئے کہ اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے؟ اور اگر یہ دونوں گروہ (مقتدی اور مقتدی) آپس میں جھگڑنے لگ جائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھریں کہ اس نے قرآن کو صحیح نہیں سمجھا تو اس سے ایک اور اعتراض وارد ہو گا جو پہلے اعتراض سے زیادہ نہیں تو کم سنگین بھی نہیں ہو گا۔ معترض کہے گا کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ کتاب مبین (روشن کتاب) ہے اور اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ لیکن عملاً اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے حکم میں تعداد تک کو بھی غیر مبہم انداز سے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ جس انداز سے تعداد بتاتا ہے اس سے ایک شخص پانچ وقت سمجھتا ہے تو دوسرا تین وقت۔ کوئی دو — تین — چار رکعتیں سمجھتا ہے، کوئی صرف دو رکعت — کوئی دو سجدے سمجھتا ہے کوئی ایک۔ بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کے متعلق تو انسانوں کا فکری اختلاف قابلِ فہم ہوتا ہے کیونکہ انہیں تشبیہی انداز میں بیان کیا جاتا ہے، لیکن جس کتاب کا متعین احکام و قوانین کے متعلق یہ انداز ہو، اسے خدا کی کتاب کہنا تو درکنار (معاذ اللہ) انسانی تصانیف میں بھی قابلِ قدر مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے قرآن کریم پر کتنی بڑی زد پڑتی ہے۔ انتہائی صدمہ اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے قرآن کا نام لے کر قرآن کے ساتھ کس قدر دشمنی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے خصوصیت سے ان کے نظریہ اور مسلک کی تردید کرنی پڑی۔

لیکن یہ سب کچھ کہہ سن چکنے کے بعد عملی زندگی کی طرف آئیے۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز کی جزئیات میں اختلاف ہے اور یہی اختلاف ان کی فرقہ بندی کا آئینہ دار ہے۔ دوسری طرف قرآنِ کریم نے وحدتِ امت کو دین کی اساس قرار دیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں؟ اور کیا اس امت میں پھر سے وحدت پیدا ہو سکتی ہے؟۔

پس چہ باید کرد

ان اختلافات کی سند یا تائید میں ہر فرقہ اپنے اپنے ہاں کی روایات یا فقہی فیصلے پیش کرتا ہے۔ یہ روایات یا فقہی اجتہادات اس اختلاف کی سند تو قرار پا سکتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اس نظام کا موجود نہ رہنا ہے جس سے دین کا قیام اور امت کی وحدت وابستہ تھی۔ جب ان اختلافات کی بنیادی وجہ یہ ہے تو پھر ان کے رفع ہونے کی بھی اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہو سکتی کہ اس نظام کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ اس مقام پر اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ محض خوابوں کی دنیا میں بسنا ہے۔ وہ نظام دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کہنا، یا تو خود فریبی ہے اور یا فریب دہی۔ خود فریبی ہو یا فریب دہی، قرآن کریم نے بہر حال اس کے متعلق

پہلے ہی وارننگ دیدی تھی کہ اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ یہ نظام رسول اللہ کی زندگی تک قائم رہ سکتا ہے، اس کے بعد نہیں تو اس کا مطلب دین سے ارتداد ہوگا (۱۴۴/۳، تفصیل پہلے گذر چکی ہے) اس نظام کا دوبارہ قائم کیا جانا ممکن بھی ہے اور آسان بھی۔ جو مملکت ایمان کی بنیادوں پر، یہ فیصلہ کرے کہ اس کے جملہ امور (جن میں مذہبی اور غیر مذہبی کی کوئی تمیز و تفریق نہ ہوگی) قرآن مجید کے مطابق سرانجام پائیں گے، اور اس کے بعد وہ اس پر عمل کرنا بھی شروع کردے، تو وہ مملکت علیٰ منہاج رسالت کہلائے گی۔ اس کیلئے شرطِ اولین یہ ہے کہ جن ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہو وہ خود اقدارِ خداوندی کے پابند ہوں اس مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ جو کچھ اس وقت اسلام کے نام سے مروج ہے، وہ اُسے قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھے۔ جو اس پر پورا اُترے اسے اختیار کرے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کردے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی راہنمائی ایسی واضح ہے کہ اس قسم کی پرکھ ناممکن تو ایک طرف، چنداں مشکل بھی نہیں۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اربابِ مذہب کے پاس اس وقت بھی قرآن موجود ہے تو اس کے باوجود ان میں وحدت پیدا کیوں نہیں ہوتی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان امور کی پرکھ کے لئے قرآن کریم کو کسوٹی نہیں بنایا جاتا۔ بہت کچھ خارج از قرآن ہے جسے سند اور معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور یہی ان اختلافات کی وجہ ہے۔ جب قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں تو اسے معیار قرار دینے سے اختلافات کس طرح باقی رہ سکتے ہیں؟

جہاں تک قرآنی اصول و احکام کی جزئیات کا تعلق ہے، وہ نظام، ان کی بھی جانچ پڑتال کرے گا۔ جو جزئیات ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں گی انہیں علیٰ حالہ رہنے دے گا، جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوگی، انہیں تبدیل کریگا اور عندالضرورت ان میں نئی نئی جزئیات کا اضافہ بھی کرنا جائے گا۔ اس طرح ثبات و تغیر کے امتزاج کا قرآنی پروگرام پھر سے بروئے کار آجائے گا۔

جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا، میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے، جس جس انداز سے ان پر کاربند ہیں وہ ان پر اسی طرح کاربند رہیں۔ لیکن ان میں ایسی شدت نہ برتی جائے کہ وہ باہمی نفرت اور عداوت کا موجب بن جائیں نیز کسی فرد یا فرقہ کو اس کا حق نہیں ہونا چاہئے کہ وہ مروجہ ارکان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔ اس سے امت میں مزید تفرقہ اور انتشار پیدا ہوگا، ان جزئیات میں حک و اضافہ یا تغیر و تبدل کا حق صرف اسلامی نظام کو حاصل ہوتا ہے ختم نبوت کے بعد نہ ہی کسی شخص کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ امت سے آکر کہے کہ خدا نے مجھ سے یوں کہا ہے اس لئے تم اب ایسا ہی کرو۔ ایسے شخص کا یہ دعویٰ ہی باطل ہے کہ "خدا نے اس سے یوں کہا ہے"۔ خدا نے انسانوں سے جو کچھ کہنا تھا اسے اس نے آخری بار قرآن کریم میں کہہ دیا اور بس۔

مروجہ عقائد و نظریات میں البتہ جو امور ایسے ہیں جو قرآن کریم کے خلاف ہیں، قرآنی بصیرت رکھنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآنی تعلیم و تصورات کو قوم کے سامنے پیش کریں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس امر کی وضاحت کر دیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ اُن کی اپنی انسانی بصیرت پر مبنی ہے جس میں سہو و خطا کا امکان ہے۔ (میرا اس باب میں یہی مسلک ہے۔ میں موجودہ ارکانِ اسلام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا، نہ ہی کوئی نیا طریقہ وضع یا اختیار کرتا ہوں۔ اور جو قرآنی مفہوم پیش کرتا ہوں اس کے متعلق بھی وضاحت کر دیتا ہوں کہ وہ میری اپنی بصیرت کا نتیجہ ہے جو سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی)۔

آخر میں اس حقیقت کا دھرا دینا ضروری ہے کہ اجتماعاتِ صلوٰۃ کو دین کے نظام میں بڑی اہمیت حاصل ہے قرآن کریم دین کے قیام کے لئے ایک امت (پارٹی۔ حزب اللہ) کی تشکیل کرتا ہے جو باقی دنیا سے بالکل الگ اور منفرد ہوتی ہے، اور چونکہ یہ انقلابی جماعت ہوتی ہے جس کا نصب العین خدا کے تجویز کردہ نظام کو نظامہائے انسانی پر غالب کرنا ہوتا ہے، اس لئے دیگر جماعتوں (اقوام یا پارٹیوں) کے ساتھ اس کا تصادم لازمی ہوتا ہے۔

تشکیل و استحکامِ امت کیلئے صلوٰۃ کے اجتماعات ضروری ہیں

تشکیل و استحکامِ جماعت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں۔ (۱) بے ہمگی (EXCLUSIVENESS) اور باہمدگر پیوستگی (GREGARIOUSNESS) یہ "بے ہمگی" (دوسروں سے علیحدگی) تھی جس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے اعلان کیا تھا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ۔ ہم تم سے، اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کر رکھی ہے ان سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں۔ ان سے بیزار ہیں۔ کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَ بَدَا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَ الۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا۔ ہم تمہارے نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے۔ اس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتے ہیں کہ عداوت اور بغض کھلا ہوا ہے۔ اور یہ کیفیت اس وقت تک رہے گی حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ (۶۰/۴)۔ جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ — انہوں نے اس کا اعلان کیا اور قرآن کریم نے ان کے اس مسلک کو اُمتِ مسلمہ کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا (۶۰/۴)، یہ ہے وہ بے ہمگی، علیحدگی جس کی تلقین و تاکید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس اصول میں کسی مفاہمت یا لچک کی گنجائش نہیں۔ یہی لَاۤ اِلٰہَ کا عملی مفہوم ہے۔

جہاں تک اساسِ اُمت کے دوسرے جزو یعنی باہمدگر پیوستگی (رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (۴۸/۲۹)) کا تعلق ہے اجتماعِ صلوٰۃ اس کا عملی مظاہرہ ہے۔ اس اجتماع کی آواز پر افرادِ اُمت بحکمِ خداوندی فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ (۶۲/۹)۔

اجتماع گاہ کی طرف یہ کہتے ہوئے لپک کر آتے ہیں: اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶/۷۹) - میں ساری دنیا سے منہ موڑ کر اپنی تمام توجہات اس خدا کی طرف مرکوز کرتا ہوں جو کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اور میں اس کی محکومیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا ۔۔۔ اس اعلان میں دوسروں سے علیحدگی اور باخویش پیوستگی کے دونوں اجزا شامل ہیں۔ اس اجتماع میں نظام کے اصولی گوشے سمٹی ہوئی شکل میں (IN MINIATURE FORM) سامنے آجاتے ہیں ۔۔۔ ایک امت۔ اس کے افراد، ہر قسم کا تفرقہ مٹاتے ہوئے، ایک صف میں ایستادہ ۔ ایک امام (مرکزِ ملت) جس کی آواز پر کامل ہم آہنگی اور یک رنگی سے سب جھکتے اور سب اٹھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کس حقیقت کا مظہر؟ اس حقیقت کا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (۱/۴)۔ ہم تیرے سوا کسی کو صاحبِ اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔

نظامِ خداوندی کے اساسی اصولوں کی اس طرح تجدید یاد داشت اور عملی مظاہرہ کے بعد اس معاملہ کی مشاورت کی کارروائی شروع ہوگی جس کے لئے یہ اجتماع منعقد کیا گیا تھا۔

موجودہ بے روح پیکروں کا برقرار رکھنا بھی ضروری ہے

اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے) یہ اجتماعات اب (جبکہ وہ نظام باقی نہیں رہا اور اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے)، ظواہر بن کر رہ گئے ہیں بے مقصد اور پیکر بن چکے ہیں بے روح، بایں ہمہ ان کا برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ شعائر و مناسک "مسلمان قوم" کے جداگانہ تشخص کے برقرار رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ جب کبھی ہم نے اس نظام کے احیا (بارِ دگر قیام) کی کوشش کی، تو ان پیکروں میں روح پھونکنے کا مرحلہ نسبتاً آسان ہوگا۔ اُمت کے دوبارہ قیام کے لئے، نُفِخَ فِى الصُّوْرِ کا (تمثیلی) مفہوم یہ بھی تو ہو سکتا ہے! جیسا کہ کہا گیا ہے وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸/۹۹)۔ ان صُوَر (پیکروں) میں روح پھونک کر ان کی اجتماعیت کا احیاء کر دیا جائے گا۔ لہٰذا نماز کی موجودہ ہیئت کو برقرار رکھنے کے ساتھ اس حقیقت کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ یہ، بہ حالاتِ موجودہ نماز پڑھنا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اسی وقت ممکن ہوگا جب اسلامی نظام قائم ہو (۲۲/۴۱)۔

ضمناً۔ مرکزیت کے نہ رہنے سے امت کی کیا حالت ہو جاتی ہے اس کا نقشہ بھی ہماری موجودہ نمازوں میں سامنے آجاتا ہے۔ فرضوں کی نماز باجماعت میں آپ کو ہم آہنگی اور یک رنگی دکھائی دے گی۔ لیکن اس کے بعد، صلوٰۃِ بے امام (سنتوں وغیرہ) میں، وہی مسجد ہوگی۔ وہی امت۔ وہی نماز۔ لیکن ایک امام کے نہ ہونے سے، ساری جماعت، انتشار اور اختلاف کا مظہر بن جائے گی ۔۔۔ وہ کھڑا ہے۔ یہ جھکا ہوا۔ وہ سجدے میں ہے، یہ بیٹھا ہوا ۔۔۔ غرضیکہ سارا صحنِ مسجد، مسلمانوں

کی موجودہ پریشانیٔ فکر و نظر اور تشتتِ کردار و عمل کی آماجگاہ دکھائی دیگا۔ امامت (مرکزیت) قائم کر دیجئے، پھر سے وہی ہم آہنگی اور یک نگہی عود کر آئے گی۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی —— علاج اس کا؟ وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

اس دشوار گزار وادی کے بعد اب آگے بڑھئے۔ ذکر متقین کی خصوصیات کا ہو رہا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اگلی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

(۲/۴) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ -

یہ وہ لوگ ہیں جو، اے رسولؐ! اس پر ایمان رکھتے ہیں جسے ہم نے تیری طرف نازل کیا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وحی اس مخصوص اور منفرد علم کا نام ہے جو خدا کی طرف سے حضراتِ انبیائے کرام کو براہ راست ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لفظ "نزول" کا انتخاب کر کے بڑے بلیغ انداز سے اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے۔ اس مادہ (ن۔ز۔ل) کے بنیادی معنی ہیں "بلندی سے نیچے کی طرف آنا"۔ اس کے مختلف مشتقات اور ان کے استعمال کے متعلق تو ہم متعلقہ مقامات پر گفتگو کریں گے یہاں ہم اس کے اس مفہوم تک اکتفا کرتے ہیں جس سے مراد وحی ہے۔ جو علم، انسانی فکر کا نتیجہ ہو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہاں سے باہر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ یہ علم نیچے سے اوپر کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس جو علم خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ وہ اُوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس علم کی یہی معروضیت یا خارجیت (OBJECTIVITY) ہے جس کے لئے لفظ انزال یا تنزیل استعمال کیا گیا ہے۔ انسانی علم کی کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو فرد متعلقہ کے "اندر سے باہر" نہ آتی ہو۔ یعنی اس میں اس کے فکر و جذبات کا دخل نہ ہو۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک، وجدان (INTUITION) کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہوتا۔ کہیں، باہر سے ملتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں:

وحی کی خصوصیت

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

وجدان

لیکن یہ محض شاعری ہے۔ عصرِ حاضر کی تحقیق نے بتا دیا ہے کہ اس میں نوائے سروش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خود شاعر کے اپنے تحت الشعور ہی کی آواز ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے برگساں کے حوالہ سے (جسے عصرِ حاضر میں وجدانی تحقیق کا امام سمجھا جاتا ہے) کہا ہے کہ "(INTUITION) انسانی فکر ہی کی ایک بلند شکل کا نام ہے" ؎

RECONSTRUCTION OF RELEGIOUS THOUGHTS IN ISLAM (P.3)

ہم نہیں جان سکتے (اور غیراز نبی کوئی انسان بھی نہیں جان سکتا) کہ وحی ملنے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ ... قرآنِ کریم نے اتنا ہی کہا ہے فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲/۹۷)۔ اے رسولؐ! جبریل اس علمِ خداوندی کو، بحکمِ خداوندی، تیرے قلب پر نازل کرتا ہے۔ یہ علم، قلبِ نبویؐ پر بالفاظہٖ نازل ہوتا تھا۔ اسی لئے اسے کلام اللہ کہا گیا ہے (۹/۶)۔ رسول اللہ پر جو علم اس طرح نازل ہوا اسے خود خدا نے قرآن کہہ کر پکارا ہے، جہاں کہا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا (۷۶/۲۳) ہم نے تیرے اوپر اس قرآن کو تنزیلاً نازل کیا ہے۔ یعنی بتدریج۔ اور رسول اللہ کو حکم دیا گیا تھا کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آپ پر نازل ہوتا ہے اُسے آپ اپنی ذات تک ہی محدود نہ رکھیں، بلکہ دوسرے انسانوں تک بھی پہنچائیں۔ ارشادِ خداوندی تھا يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ (۵/۶۷) اے رسولؐ! جو کچھ منجانب اللہ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو، تو فریضۂ رسالت کی ادائیگی سے قاصر رہیگا۔ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لئے حضورؐ نے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآن) کو جمع، مدوّن اور مرتب شکل میں امت کو دیا جو آج تک ایک لفظ کے تغیر و تبدل کے بغیر امت کے ہاں محفوظ چلا آرہا ہے۔ اس میں نہ کوئی بات منسوخ ہے نہ محرّف۔ اِسی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہ پر ایمان لانا متقی ہونے کی شرط قرار دیا گیا ہے

(ضمناً) ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحیٔ جلی یا متلو اور مکتوب، جو قرآنِ کریم کے اندر درج ہے، اور دوسری قسم وحیٔ خفی یا غیر متلو اور غیر مکتوب، جو قرآنِ مجید میں درج نہیں۔ احادیث اسی وحی پر مبنی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں اس دوسری قسم کی وحی کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں ایک ہی وحی کا ذکر ہے جو قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی اس مقام پر ملے گی جہاں وحی کے متعلق بات سامنے آئے گی)۔

وحیِ خفی

متقی ہونے کے لئے پہلی شرط اللہ پر ایمان لانے کی تھی۔ اس کے بعد مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس میں پہلی بات سمجھنے کے قابل یہ ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارا (یا انسانوں کا) تعلق صرف وحی کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس کے سوا خدا کے ساتھ تعلق کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور چونکہ خدا کی مکمل اور محفوظ وحی اب قرآنِ مجید کے اندر ہے اس لئے خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید ہی ہے۔ جب ہم قرآنِ کریم پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ [کیونکہ یہ خدا کا کلام ہے (۹/۶)] اور جب ہم اس کے احکام پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو ہم خدا کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں کہ اس نے اپنے احکام و قوانین کی اطاعت کا ذریعہ اتباعِ قرآنی قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب متقین کی

خصوصیت یہ بتائی گئی کہ وہ مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس سے عملاً مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کا اتباع کرتے ہیں۔ چنانچہ خود ارشادِ خداوندی ہے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)۔ "جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا کسی اور رفیق یا سرپرست کا اتباع نہ کرو۔ کرنے کا کام تو یہی ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو اس حقیقت کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں"۔ مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ کے متعلق ہم سرِدست اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ پورے کا پورا قرآنِ کریم ہے، اس لیے اس سے متعلق گفتگو اِس (یا کسی ایک) مقام تک محدود نہیں رہ سکتی۔ (میری دیگر تصانیف کی طرح موجودہ کاوش میں بھی، شروع سے آخر تک، آپ جو کچھ دیکھیں گے وہ (بتوفیقِ ایزدی) مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ ہی کی تشریح و توضیح ہوگی۔ کہ یہ میری زندگی کا مشن ہے)۔

متقین کے متعلق یہاں یہ کہا گیا کہ وہ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ :

(۲/۴) وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔

اور جو کچھ اے رسولؐ! تجھ سے پہلے نازل کیا گیا تھا وہ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ رسولؐ اللہ (یا قرآنِ مجید) سے قبل کے مَآ اُنْزِلَ پر ایمان لانے سے مقصود کیا ہے؟ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں رسول آتے رہے۔ رسول یا نبی کے معنے ہی یہ ہیں کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ میں ان سب کی وحی داخل ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو کچھ ان انبیائے کرام کو دیا گیا تھا ان کے نام لیواؤں نے اس میں تحریف کر دی تھی۔ پھر ان میں سے بعض کتب حوادثِ ارضی و سماوی کی وجہ سے ناپید بھی ہو گئیں۔ جو محرف کتب ان انبیاءؑ کے نام لیواؤں کے پاس موجود ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض احکام ایسے ہوں جن میں تحریف نہ ہوئی ہو۔ وہ علیٰ حالہٖ موجود ہوں۔ لیکن، جیسا کہ ہم ناسخ و منسوخ کے نظریہ کے تحت پہلے وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ وحی کا انداز یہ بھی رہا ہے کہ سابقہ انبیاءؑ کی طرف نازل کردہ احکام میں سے جن احکام کا باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا، ان کی جگہ، بعد میں آنے والے نبی کی طرف وحی کی رو سے دوسرے احکام دیدیئے جاتے تھے (خواہ وہ احکام کتبِ سابقہ میں غیر محرف طور پر موجود بھی کیوں نہ ہوں)۔ بنابریں جو کتابیں سابقہ انبیائے کرام کی طرف نازل ہوئی تھیں، نزولِ قرآن کے بعد ان کی صورت یہ ہے کہ

۱:- ان میں سے کوئی کتاب بھی آج اپنی اصلی، غیر محرف شکل میں دنیا کی کسی قوم کے پاس موجود نہیں۔ یہ کوئی بے بنیاد دعویٰ نہیں۔ میں نے ان کتب کی تاریخ مرتب کی ہے اور ان میں خود متعلقہ مذاہب کے اہلِ علم حضرات

کی شہادات سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنی اس شکل میں موجود نہیں، جس میں وہ ان کے نبی کو ملی تھی [۱]۔

۲:- سابقہ انبیائے کرام کی طرف نازل کردہ جس رہنمائی کو علیٰ حالہٖ رکھنا مقصود تھا وہ سب کی سب قرآنِ مجید میں جمع کر دی گئی ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَمُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ ۔ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ ۔ وَلَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ (۵/۴۸) اے رسولؐ! ہم نے اس کتاب کو تیری طرف حق کے ساتھ نازل کیا ہے جو ان تمام دعاوی کو سچ کر کے دکھا دے گی [۲] جو اس سے پہلے مختلف انبیائے کرام کی وساطت سے ان کی امتوں کے ساتھ کئے گئے تھے، اور جو ان انبیاءؑ کی بنیادی تعلیم کو محیط بھی ہے اور اس پر نگران بھی۔ لہٰذا تم اب ان اقوام کے معاملات کا فیصلہ اسی کتاب کے مطابق کرو۔ اور اس الحق کے آجانے کے بعد ان کے خیالات اور خواہشوں کا اتباع مت کرو۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم ان اقوام سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی رسالت اور القرآن پر ایمان لائیں۔

دنیا کی مذہب پرست اقوام کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے ہر قوم، دوسرے مذہب کو جھوٹا کہتی ہے۔ اس جھوٹا کہنے کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب کے بانیوں کو بھی جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ اس سے باہمی نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جو اہلِ مذاہب میں مسلسل نزاع اور فساد چلا آرہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ قرآنِ کریم، کشادِ قلب اور وسعتِ نگاہ کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے یہ کہتا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ ہم جملہ مذاہبِ عالم کے بانیوں [۳] کے متعلق یہ ایمان رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغامبر تھے۔ وہ اپنے اپنے وقت میں، خدا کی طرف سے سچا پیغام لے کر

---

[۱] میری اس کتاب کا نام ——— "مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں" ہے۔

[۲] قرآنِ کریم کو جو کتبِ سابقہ کا مصدق کہا گیا ہے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں، نہ یہ کہ وہ کتابیں جس حالت میں ان اہلِ مذاہب کے ہاں موجود ہیں قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے۔ ایسا کرنا تو کھلا ہوا تضاد ہوگا کہ ایک طرف وہ ان کتابوں کو محرف بھی کہے اور دوسری طرف ان کے سچا ہونے کی تصدیق بھی کرے۔ (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)

[۳] یاد رہے کہ انبیائے کرام دین کے "بانی" نہیں تھے۔ وہ دینِ خداوندی کے مبلغ (دوسروں تک پہنچانے والے) تھے۔ لیکن چونکہ مختلف اہلِ مذاہب کے ہاں دین کا تصور نہیں رہا --- اس لئے وہ ان انبیاءؑ کو اپنے مذہب کا بانی کہتے ہیں۔

آئے تھے۔ اگرچہ وہ پیغام اب اپنی شکل میں (قرآن کے سوا) کہیں اور موجود نہیں۔ ہم ان تمام انبیائے کرام کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جسطرح محمد رسول اللہ کا احترام۔ یہ احترام ہمارے ایمان کا جزو ہے، کیونکہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵) "جہاں تک اُن کے رسول ہونے کا تعلق ہے ہم ان میں سے کسی میں بھی فرق نہیں کرتے۔" آپ نے دیکھا کہ جس "محبت" کو (اقبالؒ کے الفاظ میں) فاتح عالم کہا جاتا ہے وہ جماعتِ مؤمنین کے اس ایمان کا کس طرح فطری اور لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بعض انبیائے کرام کا بصراحت نام لیا ہے اور باقیوں کے متعلق کہا ہے کہ ہم نے ان کا نام نہیں لیا (۴/۷۸ نیز ۴/۱۶۴)۔ لیکن جب ہمارا ایمان یہ ٹھہرا کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف انبیائے کرام آئے تھے تو ان میں سے کسی کا نام قرآنِ کریم میں آیا ہو یا نہ، جنہیں مذہب پرست اقوام اپنے اپنے مذہب کا بانی کہیں گی، ان کا احترام ہم پر لازم آجائے گا، ہم ان میں سے کسی کی شان میں بھی گستاخی نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارے ایمان کے منافی ہوگا۔ البتہ رسول اللہ کے بعد اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرے گا تو ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور اس کا شمار ان انبیاء میں نہیں کریں گے جن پر ایمان لانے کے ہم مکلف قرار دیئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کہا ہے۔ یعنی جو کچھ رسول اللہ پر نازل کیا گیا اور جو حضور سے پہلے (مِنْ قَبْلِكَ) نازل کیا گیا۔ مِنْ بَعْدِكَ۔ یعنی "رسول اللہ کے بعد" نزولِ وحی کا ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا کہ حضور کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

واضح رہے کہ مسلمان، داخل اُمتِ محمدیہ ہی میں ہوں گے اور اتباع بھی قرآنِ کریم ہی کا کریں گے۔ نہ وہ کسی دوسرے نبی کی امت میں داخل ہوں گے اور نہ ہی ان کی طرف منسوب کردہ کتب کا اتباع کریں گے۔

(۲/۴) وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔

متقین کی جن خصوصیات کا ذکر چلا آرہا ہے، یہ ان کی آخری کڑی ہے۔ یعنی ایمان بالآخرۃ۔ یہ خصوصیت، جہاں زیرِ نظر سلسلہ کی آخری کڑی ہے وہاں خود جزئیاتِ ایمان کے سلسلۃ الذہب کی بھی آخری کڑی ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ایمان باللہ اور آخری کڑی ایمان بالآخرۃ۔ ایمان باللہ کا عملی مفہوم ہے خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل، ابدی، غیر متبدل اصول و اقدار و قوانین کی صداقت و محکمیت پر ایمان، اور ایمان بالآخرۃ کا عملی مفہوم ہے ان اصول و احکام پر کاربند ہونے کے حیات بخش ثمرات اور ان کی خلاف ورزی کے انسانیت سوز عواقب پر یقینِ محکم خواہ وہ اس دنیا میں برآمد ہوں اور خواہ اُخروی زندگی میں، ایمان بالآخرۃ دوسرے الفاظ میں خدا کے قانون مکافاتِ عمل پر ایمان کا نام ہے۔

آخرۃ (جس کا مونث آخرۃ ہے) "اوّل" کے مقابلہ میں آتا ہے۔ یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے

آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آئے بلکہ ایک نئے سلسلہ کا آغاز ہو "بعد میں آنے" کے اعتبار سے اس سے مفہوم مستقبل (FUTURE) ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ آخَرُ ہے جس کا مؤنث اُخْرٰی ہے۔ اس کے معنے ہیں ایسی چیز جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہو۔ یہ مفہوم غور طلب ہے۔

تخلیقِ انسانی کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا کہ اس صفحۂ ارض پر زندگی کا آغاز اولین جرثومۂ حیات سے ہوا۔ اس کے بعد زندگی مختلف مراحل میں سے گزرتی، پیکر بدلتی قرنہا قرن کے ادوار پیچھے چھوڑتی، آگے بڑھتی آئی تا آنکہ یہ درجۂ حیوانات میں داخل ہو گئی (تفصیل ان امور کی آگے چل کر بیان کی جائے گی جہاں انسانی پیدائش سے متعلق آیات سامنے آئیں گی) سورۃ المؤمنون میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ رحمِ مادر میں انسانی جنین کس طرح انہی مراحل میں گزرتا ہے جنہیں ہر حیوانی جنین طے کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد انسانی بچے کے ضمن میں کہا: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴)۔ "پھر ہم نے اسے ایک ایسی مخلوق بنا دیا جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف تھی"۔ یہاں سے انسانی زندگی، دیگر حیوانات کی زندگی سے متغائر، مختص اور منفرد ہو گئی۔ حیوانات کی زندگی ان کے طبیعی اجسام کی زندگی سے عبارت ہوتی ہے۔ جب جسم پر موت وارد ہو جائے تو اس حیوان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی ان سے ان معانی میں متغائر اور منفرد ہے کہ فرد اپنے جسم کی موت سے مرتا نہیں، اس کی زندگی آگے بھی چلتی ہے، لیکن زندگی کی اگلی کڑی سابقہ کڑیوں جیسی نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے اسے خلقِ جدید کہکر پکارا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷/۴۹؛ ۳۲/۱۰؛ ۱۷/۹۸) کہ جب ہم مرنے کے بعد گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہم ایک نئی پیدائش لے کر زندہ ہوں گے؟ دیگر مقامات پر قرآنِ کریم نے اسے تَارَةً اُخْرٰی (۲۰/۵۵) اور النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی (۵۳/۴۷) کہکر وضاحت کر دی کہ وہ زندگی، موجودہ حیاتِ ارضی سے متغائر ہوگی۔ مرنے کے بعد کی اس زندگی کو حیاتِ آخرۃ کہا گیا ہے۔ اگر اس پر ایمان نہ ہو تو کوئی شخص نہ مسلمان ہو سکتا ہے، نہ مسلمان کہلا سکتا۔

حیوانی اور انسانی زندگی میں فرق

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ آخرۃ کے معنے مستقبل (FUTURE) کے ہیں ان معانی کے لحاظ سے دیکھئے تو:

(۱) ہر فرد کا آنے والا کل (فردا) اس کا مستقبل ہے۔

(۲) ہر قوم کا اگلا دَور اس کا مستقبل ہے، خواہ وہ عروج ہو یا زوال کا۔

(۳) عالمگیر انسانیت کی ہر موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسل اس کا مستقبل ہے۔ اور

(۴) مرنے کے بعد کی زندگی ان سب کا مستقبل ہے۔

دنیا میں دو قسم کے نظریاتِ زندگی اور ان پر متفرع نظامِ حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریۂ زندگی، نہ خدا کے ابدی، غیر متبدل قوانین (وحی) کا قائل ہے، نہ حیاتِ آخرت کا ماننے والا۔ اس نظریہ کو دہریت یا مادی نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ اور اس پر متفرع نظام کو سیکولر۔ سیکولرازم میں قوانین سازی کا اختیار معاشرہ کو حاصل ہوتا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج بھی معاشرہ کے قائم کردہ نظامِ عدل کی رو سے برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً ملزم کو پولیس گرفتار کرتی ہے، اور اگر عدالت اسے مجرم قرار دیتی ہے تو اسے اس جرم کی سزا ملتی ہے۔ اس نظام کا پہلا بنیادی نقص تو یہ ہے کہ سوسائٹی ہی قوانین بناتی ہے اور جب جی چاہے وہ ان قوانین میں ... ردو بدل بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کا یقین اور اطمینان نہیں ہو سکتا کہ آج کے قوانین کب تک رہیں گے اور کب بدلے جائیں گے۔ اس کا دوسرا بنیادی سقم یہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی جرم پولیس کی گرفت میں نہ آئے، یا وہ ایسا انتظام کر لے کہ عدالت اسے مجرم ثابت نہ کر سکے تو اسے اس جرم کی سزا ہی نہیں مل سکتی۔ اس کے برعکس، خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان بنیادی اسقام سے منزہ اور بلند ہے۔ اس میں انسان کا ہر عمل، خدا کے ابدی قوانین کے مطابق اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے، اور اس کے احاطہ میں محسوس اعمال ہی نہیں آتے، نگاہ کی خیانتیں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی آجاتے ہیں۔ سورۃ مؤمن میں ہے

سیکولر نظریۂ حیات

خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) خدا، نگاہوں کی خیانت اور دلوں میں پوشیدہ رازوں تک سے بھی واقف ہے۔ جہاں تک ان اعمال کے نتائج کا تعلق ہے، سارا قرآن یوں کہیئے کہ اسی نکتہ کی تفصیل ہے کہیں وہ جامع طور پر کہتا ہے وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۔ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱/۱۱۱) "یہ حقیقت ہے کہ تمام افرادِ انسانیہ کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل کر رہے گا، اور یہ اس لئے کہ خدا ہر ایک کے عمل سے اچھی طرح باخبر ہے"۔ کہیں وہ انفرادی طور پر کہتا ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ "ہر فرد کا اچھا کام ہو یا برا، اس کا نتیجہ سامنے آکر رہے گا"۔ یہ اس طرح کہ (قرآنی فلسفۂ حیات کی رو سے) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات (SELF) پر پڑتا ہے اور یہ ذات انہی نقوش کو لئے ہوئے اس زندگی میں بھی قائم رہتی ہے اور اس کے بعد آگے بھی چلتی ہے۔ لہٰذا کسی عمل کے بے نتیجہ رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جماعتِ مؤمنین کی تمدنی زندگی میں نظامِ عدل کا قیام بھی قرآن کریم کی رو سے نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہزار تدابیر و احتیاط کے باوجود اس میں کسی نہ کسی سقم کا رہ جانا خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن خدا کا قانون مکافاتِ عمل ان اسقام سے مبرا ہوتا ہے۔ اس نظام کے متعلق دوسری جگہ ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵)۔ ہر شخص اپنے عمل کا نتیجہ خود بھگتے

گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" دوسری جگہ ہے وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ اس قانون کی رو سے نتیجہ خیزی کے سلسلہ میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ نہ ہی جرم کے بدلہ میں کچھ لے لوا کر مجرم کو چھوڑ دیا جائیگا نہ ہی اس کا کوئی حامی و مددگار ہوگا۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں آور تو اور حضورؐ نبی اکرم کی زبانِ مبارک سے بھی اعلان کرادیا کہ:۔

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)

اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے بچ نہیں سکوں گا۔ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے، انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس کو اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس انفرادیت کو نہایت مختصر، لیکن بڑے جامع انداز میں یہ کہکر بیان کر دیا کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (۶/۹۵)۔ جو کچھ "تمہارا" ہے —— خواہ وہ مال و دولت ہو یا اعزہ و اقارب، دوست اور رفیق ہوں یا عوان و انصار —— تم ان سب کو پیچھے چھوڑ دو گے، اور ہمارے ہاں صرف اپنی انفرادیت (ذات) کو لیکر آؤ گے، اور

انسانی ذات پر کندہ نقوش

اس پر کندہ نقوش خود پکار اٹھیں گے کہ تم نے کیا کچھ کیا تھا۔ آج یہ نقوش نگاہوں سے پنہاں ہیں۔ اس وقت یہ اس طرح نمودار ہو جائیں گے جس طرح لیموں کے عرق سے لکھے ہوئے الفاظ کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خودبخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ انہی نقوش کو انسان کا اعمالنامہ کہا جاتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا (۱۷/۱۳-۱۴) "ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجائے گا اور اس شخص سے کہا جائے گا کہ تم اپنے اعمالنامہ کو خود ہی پڑھ لو اور خود ہی اپنا حساب کر لو۔ تمہاری ذات تمہارا محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے"

حیاتِ اُخروی کی کیفیت، نوعیت اور صورت کس قسم کی ہوگی، اور جنت اور جہنم کی ماہیت کیسی، اسے ہم اپنے شعور کی موجود سطح پر نہیں جان سکتے۔

جنت کے متعلق کہا کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (۳۲/۱۷) "کوئی شخص اس زندگی میں نہیں جان سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا وہ سامان جسے پوشیدہ رکھا گیا ہے کیسا ہے"۔ ہر بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) کی طرح اس نے اسے تمثیلی انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۃ رعد میں ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ

تمثیلی بیان

الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۳/۳۵)۔ "جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے، تمثیلی طور پر اُسے یوں سمجھو۔ ۔ ۔ ۔ (نیز ۴۷/۱۵)۔ اسی طرح جہنم کے متعلق کہا کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴/۶-۷)۔ "اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں"۔

اِن ماوراء الطبیعیاتی حقائق کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ ان کی تفاصیل سارے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں اور اپنے اپنے مقام پر سامنے آتی جائیں گی۔ یہاں اس اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ جنّت، انسانی زندگی کی مزید (اگلی اور بلند و بالا) ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے، اور جہنم اس کے ارتقاء کے رُک جانے کا نام۔ (ان تفاصیل کو میں نے اپنی کتاب — جہانِ فردا — میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے)

البتہ ایک نکتہ ایسا ہے جسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُخروی زندگی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ: یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَھُمْ (۱۰/۴۵)۔ وہاں سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ الم انگیز جہنم کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ ہم دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کہ بظاہر کچھ اور بنے رہتے ہیں اور درحقیقت ہوتے کچھ اور ہیں۔ ہم دوستوں کے بہی خواہ اور غمخوار دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر ہی اندر ان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور ایسا انتظام کر لیتے ہیں کہ ہمارے ان رفقاء اور دوستوں، عزیزوں کو ہمارے ان عزائم اور سازشوں کی خبر نہ ہونے پائے

ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے

اور ہم ان کی نگاہوں میں بڑے معتمد علیہ بنے رہیں۔ ہم لوگوں کی نظروں میں بڑے بڑے مقدس، متقی، پرہیزگار، پکّے اور سچّے مؤمن بن کر دکھائی دیتے ہیں لیکن زیرِ نقاب ہماری زندگی نہایت گھناؤنی ہوتی ہے۔ ہم یہ سب کچھ ایسی کاریگری سے کرتے ہیں کہ عمر بھر ہمارا بھید نہیں کھلتا۔ اسی حالت میں ہم دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ لیکن ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ ہمارے یہ تمام اعزہ و اقارب، دوست احباب، ہمارے معتقد اور متبع، سب موجود ہوں، اور ہماری حقیقی زندگی بے نقاب ہو کر بایں نمط ان کے سامنے آجائے کہ ہمیں کسی بات سے مجالِ انکار نہ ہو، سوچئے کہ اس وقت ہماری حالت کیا ہوگی؟ کیا اس سے بڑی سزا کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ اسی نہج سے اس زندگی کے متعلق کہا ہے یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔ جس دن تمام راز ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ اُف!

لیکن اعمال کے نتائج کے نمودار ہونے کا وقت حیاتِ آخرت ہی نہیں، اس دنیا میں بھی (سب نہیں تو کم از کم بیشتر) نتائج سامنے آجاتے ہیں، بالخصوص قوموں کے اجتماعی نظام کے نتائج — قرآنِ کریم نے آخرۃ کے مقابلہ میں عاجلۃ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے (۱۷/۱۸) اور الدنیا کا بھی (۲/۲۰۰) عاجلۃ کے معنی ہیں، بہت جلد سامنے آجانے والے، اور دنیا کے

معنی ہیں پیش پا افتادہ یا قریبی۔ ہم نے ؔایمان بالغیب کے سلسلہ میں جس کسان کی مثال دی تھی اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ ہم نے کہا تھا کہ اس کے گھر میں بھوک ہے اور اس کے پاس ایک بوری گندم کی ہے جو اس نے اگلی فصل کے بیج کے لئے رکھ چھوڑی ہے۔ اگر وہ

دنیاوی زندگی میں نتائج اعمال

مستقبل کو نظرانداز کرد ے اور مفادِ عاجلہ پر لپک پڑے تو وہ اس گیہوں کو پسوا لے گا۔ اس سے اس کے ہاں تازہ تازہ روٹیاں تو پک جائیں گی لیکن فصل کے کاٹنے کے وقت اس کے حصہ میں ایک دانہ بھی نہیں آئے گا۔ یہ اس لئے کہ اس نے آخرۃ (مستقبل) کے مقابلہ میں عاجلہ (قریبی مفاد کو) ترجیح دی تھی۔ قرآن کریم نے تین قسم کے اندازہائے نگاہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک ان لوگوں کا جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی سمجھتے ہیں۔ جن کے سامنے صرف اسی دنیا کے مفاد ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق کہا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲/۲۰۰) "بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف دنیاوی زندگی کے پیش پا اور قریبی مفاد کا حصول ہی زندگی کا منتہٰی قرار دے لیتے ہیں۔ انہیں یہ مفاد تو مل جاتے ہیں لیکن آخرۃ (مستقبل) میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا"۔ انہی لوگوں کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ انہیں جب جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے اعمال کا کچھ تو خوشگوار نتیجہ یہاں ملنا چاہیئے! ان سے کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۴۶/۲۰) تم نے اپنے حصہ کی تمام خوشگواریاں دنیاوی زندگی ہی میں لے لی تھیں اور انہیں وہیں استعمال کر کے ختم کر لیا تھا۔ لہٰذا اس زندگی کی خوشگواریوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ یہ

صرف دنیاوی مفاد

سیکولرازم کے نظام کے داعیان کی کیفیت ہے، خواہ ان کا نام کچھ ہی ہو۔

دوسرا زاویۂ نگاہ مذہب پرست لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی خوشگواریاں قابلِ نفرت ہیں۔ خدا کے بندوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ آخرت میں جا کر ملے گا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ نظریہ بھی دین کے خلاف ہے۔ اس دنیا میں غربت اور افلاس، ذلت اور خواری، خدا کا عذاب ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور ہم اُسے قیامت کے دن بھی

صرف آخرت

اندھا ہی اٹھائیں گے۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں نہ اس دنیا کے مفادِ عاجلہ نصیب ہوتے ہیں نہ آخرت کی خوشگواریاں۔ وہ ساری زندگی خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کے سحر آگیں خوابوں میں گزار دیتے ہیں۔

اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جن کا نظریۂ حیات یہ ہوتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ. اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا۔ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (۲/۲۰۱-۲۰۲) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا کر اور آخرۃ میں بھی۔

دنیا اور آخرت دونوں

اور اس طرح ہمیں دنیا اور آخرۃ کے مساعی سوز عذاب سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی کوششوں کا نتیجہ اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا تو بہت جلد حساب کرنے والا ہے"۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا آخرۃ پر ایمان ہوتا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ. ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصۡلٰهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا (۱۷/۱۸)۔ "جو شخص صرف دنیا کا مفادِ عاجلہ چاہے گا تو ہم اپنے قانونِ فطرت کے مطابق اُسے یہ مفاد دیدیں گے۔ لیکن آخرت (مستقبل) میں وہ ذلیل وخوار، داخلِ جہنم ہوگا۔ وہاں کی زندگی کی خوشگواریوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا"۔ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا. وَهُوَ مُؤۡمِنٌ۔ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا (۱۷/۱۹)۔ "جو شخص (عاجلہ کے ساتھ) مستقبل کے مفاد بھی چاہے گا اور ان مفادات کے حصول کے لئے قوانینِ خداوندی کے مطابق کوشش کرے گا، تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج مرتب کریں گی"۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا (۱۷/۲۰) قوانینِ خداوندی کے مطابق جو بھی کام کرے گا ہم اس کی مدد کرتے جائیں گے۔ ہم نے اپنی بخششوں کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیئے کہ ایک گروہ کے لئے انہیں کھول دیا جائے اور دوسرے کیلئے بند کر دیا جائے۔ یہ صاحبانِ سعی وعمل ہے اور میدانِ عمل ہر ایک کے لئے یکساں کھلا ہے۔ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ۔ وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ تَفۡضِيۡلًا (۱۷/۲۱)۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمہیں دنیا میں بعض قومیں دوسری قوموں کے مقابلہ میں آگے نظر آئیں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ (عاجلہ کے ساتھ) مستقبل پر بھی ہوتی ہے، ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔

افراد یا اقوام کے اعمال کے نتائج کس طرح مرتب ہوتے ہیں، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن ... قرآنِ کریم اتنا ہی بتاتا ہے کہ یہ تمام کارگہ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ انسان کا کوئی عمل نتیجہ برآمد کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَلِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ. وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ (۴۵/۲۲ ، ۵۳/۳۱)۔ خدا نے ارض وسماء کے سلسلہ کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر

ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے، اور کسی پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو ــــ جہاں تک کائنات میں قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا تعلق ہے، سائنٹیفک تحقیقات کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں کام کا نتیجہ یہ نکلے گا ــــ آگ میں انگلی ڈالیں گے تو وہ جل جائے گی ــــ لیکن جہاں تک ایک فرد کے اخلاقی اعمال یا اقوام کے اجتماعی عمل کا تعلق ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی نتیجہ خیزی میں کارگہ کائنات کیا کرتا ہے؟ سنکھیا کھانے سے انسان پر کس طرح موت وارد ہو جاتی ہے' اُسے تو ہم سنکھیا کے خواص اور انسانی جسم کے نظام سے متعلق سائنٹیفک معلومات کی رو سے بتا سکتے ہیں۔ لیکن مالِ حرام کھانے سے انسانی ذات کس طرح متاثر ہوتی ہے، یا ظلم پر مبنی نظام اپنی صدہا تدابیر کے باوجود آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے تو اس میں نظامِ کائنات کس طرح کارفرما ہوتا ہے، اُسے ہم (کم از کم ابھی تک) نہیں جان سکے۔ شاید علمِ انسان کی مزید وسعتوں کے بعد یہ حقائق بھی بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔

اس مقام پر البتہ ایک اہم نکتہ کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ کوئی مالک اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ اگر تم نے پھر برتن توڑے تو تمہاری بری طرح سے پٹائی کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اس "پٹائی اور برتن توڑنے" میں کوئی باہمی ربط نہیں۔ یہ محض اس شخص کا فیصلہ یا حکم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ اگر تم نے پھر برتن توڑے تو ملازمت سے برطرف کر دئے جاؤ گے۔ اس کے برعکس، ایک ڈاکٹر مریض سے کہتا کہ اگر تم نے

عمل اور نتیجہ کا تعلق

وہ بارہ یہی کھا لیا تو پیٹ میں ایسا درد اٹھے گا جس سے تم جانبر نہیں ہو سکو گے۔ یہ ڈاکٹر کا حکم نہیں۔ قانون شکنی کا فطری نتیجہ ہے اس "غذا کے کھانے" اور "پیٹ کے درد" میں ایک خاص ربط ہے۔ ڈاکٹر کو چونکہ اس ربطِ باہمی کا علم ہے اس لئے وہ (حکم نہیں دے رہا) قانون کی رو سے اس عمل کے نتیجہ کی (یوں کہئے کہ) پیش گوئی کر رہا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ (مثلاً) وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (وغیرہ)۔ "ان کے لئے الم انگیز عذاب" تو یہ "حکم" نہیں۔ ان کی قانون شکنی کے فطری نتیجہ کی "پیش گوئی" ہے ــــ یعنی (IF) اور (THEN) کے غیر متبدل باہمی تعلق کا بیان۔

بہرحال یہ ہے وہ آخرت (قانونِ مکافاتِ عمل) جس پر متقین کا ایمان بلکہ یقین ہوتا ہے۔ یقین کے معنے ہوتے ہیں ہر قسم کے شک و شبہ کے زائل ہو جانے کے بعد علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے آخرۃ پر ایمان بھی کسی اندھی عقیدت کا نام نہیں، اس صداقت کے اعتراف کا نام ہے جو علم و تحقیق کے بعد ـــ پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہو۔ اس لئے اس نے دنیا اور آخرۃ دونوں پر غور و فکر کی تاکید کی ہے (۲/۲۲۰)۔ اس ایمان او یقین کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کبھی اس فریب میں مبتلا نہیں

ہوتا کہ میں جو جی میں آئے کر دوں، مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ سورۃ انبیاء میں ہے کہ (اور تو اور) جنہیں تم دنیا میں صاحب اقتدار (الٰہ) سمجھتے ہو، وہ بھی اپنے اعمال کی جوابدہی سے مستثنیٰ نہیں، ان سے بھی باز پرس ہوگی۔ یہ مقام صرف خدا کا ہے کہ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۲۳)۔ صرف خدا کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ (ضمناً) یہیں سے ایک اور حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ سیاسی لغت میں (SOVEREIGN) کے معنی ہیں (ACCOUNTABLE TO NONE) — جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ اسلامی نظام میں یہ حیثیت (اور تو اور) مملکتِ اسلامیہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی خدا کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ یہ ہے خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے کی وسعتوں کا عالم!

سورۃ فاتحہ میں مؤمنین کی آرزو یہ بتائی گئی تھی کہ ہم ان لوگوں کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں (اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) جنہیں خدا کی نعمتوں سے نوازا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہماری کتاب کے اتباع سے تمہیں یہ تمام نعمتیں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن اس سلسلہ میں تمہیں ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۱۰۲/۸)۔ ان تمام نعمتوں کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں کس طرح حاصل کیا تھا اور کس طرح صرف کیا۔ اپنے ہر عمل کے لئے باز پرس (اور جوابدہی کا احساس اور یقین، ایمان بالآخرۃ کا لازمی نتیجہ، اور مؤمنین و متقین کی بنیادی خصوصیت ہے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ جماعتِ مومنین کی یہ آرزو اُبھر کر ان کے لب پر آگئی تھی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵) ہم چاہتے ہیں کہ ہماری راہنمائی زندگی کے سیدھے اور ہموار راستہ کی طرف ہو جائے۔ ان کی اس دُعا کے جواب میں کہا گیا کہ تمہیں یہ راہنمائی ہماری اس کتاب کی رو سے مل سکے گی۔ لیکن اس کے لئے متقین ہونا قدمِ اول ہے (۲/۲) اس کے بعد بتایا گیا کہ متقیوں کی خصوصیات اور علامات کیا ہیں۔ یہ بتانے کے بعد کہا:-

۲/۵ (۲/۵) اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

یہ لوگ ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن رہتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

مفلحون کا۔۔۔ ترجمہ عام طور "کامیاب" کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا اور وسیع ہے۔ عربی زبان میں "فلاحت" کاشتکاری یا زراعت کو کہتے ہیں اور فَلَّاحٌ کاشتکار کو۔ اس لحاظ سے مفلحون وہ کاشتکار ہوتے

ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔

مفلحون کے معانی

قرآن کریم نے اعمالِ صالحہ کی برومندی اور نتیجہ خیزی کو (عام طور پر) کھیتی سے تشبیہ دیکر سمجھایا ہے۔ غور کیجئے کہ کھیتی کی کامیابی کے لئے کون کون سے اجزائے ترکیبی کی ضرورت ہوتی ہے؟ سب سے پہلے، ایسا بیج جس میں اُگنے کی صلاحیت ہو۔ پھر ایسی زمین جو اس بیج میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو قابلِ نمو بنا دے۔ پھر وہ تمام دیگر طبیعی اسباب ـــــ ہوا، پانی، حرارت، روشنی وغیرہ ـــــ جن سے یہ کھیتی، بڑھتی، پھولتی پھلتی چلی جاتی ہے۔ اور ان سب کے ساتھ زراعت کا وہ قانون اور قاعدہ، جسکی رو سے فطرت کی ان قوتوں اور طبیعی سامان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی رہ جائے تو کھیتی پروان نہیں چڑھے گی۔ اور اگر یہ عمل، ان تمام شرائط کو پورا کرے گا تو پھر (قرآن کے الفاظ میں) ایک ایک دانہ، سات، سات سو دانے بن کر کاشتکار کے گھر آجائے گا۔ لیکن یہ دانے اسی بیج کے مطابق ہوں گے جو بویا گیا تھا اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

"گندم از گندم بروید جوز جو"

جو بوؤگے وہی کاٹوگے"، یعنی وہ قانونِ مکافات، جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مرئی مثال جس سے اعمالِ انسانی کے نتیجہ خیز ہونے ـــــ یعنی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس مثال میں ایک اور عظیم حقیقت بھی پوشیدہ ہے۔ کاشتکاری کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کبھی اس تذبذب میں نہیں رہتا کہ نامعلوم اس کی کوششیں صحیح سمت کی طرف جا رہی ہیں یا نہیں، اور یہ کہ وہ نتیجہ خیز بھی ہوں گی یا ضائع چلی جائیں گی۔ کاشتکار ہر روز اس امر کا اطمینان کر لیتا ہے۔ اس کی محنت کے یہ محسوس نتائج، جو بتدریج سامنے آتے رہتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرتا ہے۔ اگر کسی مقام پر وہ دیکھے کہ اس کی محنت بارآور نہیں ہو رہی، تو وہ اپنی اس سعیٔ لاحاصل کو جاری نہیں رکھتا۔ وہ وہیں رک جاتا ہے اور اس پروگرام کا پورا پورا جائزہ لیتا ہے۔ اگر کہیں سقم دیکھتا ہے تو فوراً اس کی اصلاح کر لیتا ہے (اسے توبہ کہتے ہیں)۔ اور اگر یہ دیکھے کہ وہ سرے سے غلط بنیادوں پر چل رہا ہے۔ تو اس پروگرام کو ترک کر کے کوئی دوسرا نتیجہ خیز قدم اٹھاتا ہے کھیتی کی مثال میں یہ حقیقت بھی مضمر ہے۔ الدین میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس "مذہب" میں انسانی اعمال کے نتائج اس طرح محسوس و مشہود شکل میں سامنے نہیں آتے۔ ان کے متعلق فقط یہ (مبنی بر عقیدت) اطمینان دلا دیا جاتا ہے کہ یہ نتیجہ خیز تو ضرور ہو رہے ہیں لیکن ان کے نتائج آخرت میں جا کر سامنے آئیں گے۔ اس قسم کی اندھی عقیدت ٹھوس حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لئے علم و بصیرت کی روشنی میں آگے نہیں چل سکتی۔ قرآن کریم نے "فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً" کہکر

اور اسے کھیتی کی مثال سے سمجھا کر مذہب کی پیدا کردہ اندھی عقیدت مندی کو دین کی پیش کردہ حقیقت پسندی میں تبدیل کر دیا۔

محسوس نتائج الدین کے پروگرام پر، سب سے پہلے، حضورؐ نبی اکرم اور آپ کے رفقائے کار، صحابہؓ کرام نے عمل کر کے دکھایا۔ ان کے اس عملی پروگرام اور اس کے درخشندہ نتائج کو قرآن کریم نے ایسی مثال اور تشبیہ کی رو سے بیان کیا ہے جہاں کہا: كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸/۲۹)۔ انہوں نے ایک ننھا سا بیج بویا۔ اس سے ایک چھوٹی سی نرم و نازک کونپل ابھری۔ پھر وہ آہستہ آہستہ، تنا، بن کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کے خوشوں میں دانے پڑے اور فصل اس طرح بار آور ہوئی کہ اسے دیکھ کر ان (کاشتکاروں) کا دل وجد و مسرت سے جھوم اٹھا۔ اور جو لوگ انہیں طعنے دیا کرتے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ کس قسم کے بیکار مشغلہ میں اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔ ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔

اس کے بعد کہا کہ یہ بات صرف اسی دور کے مؤمنین اور متقین سے مختص اور انہی تک محدود نہیں وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸/۲۹) خدا کا یہ وعدہ ہے کہ جو لوگ، جب اور جہاں بھی اس قسم کے ایمان اور اسی انداز کے اعمال کا مظاہرہ کریں گے، ان کی کھیتیوں کو تباہیوں سے محفوظ بھی رکھا جائے گا اور وہ پوری طرح ثمر بار بھی ہوں گی۔ اس نتیجہ خیزی اور برومندی کا نام "استخلاف فی الارض" ہے جو ایمان و عمل صالح کا لازمی اور فطری نتیجہ ہے (۲۴/۵۵)۔

جماعتِ مؤمنین نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ جن لوگوں کے راستے پر چلنے کے ہم آرزو مند ہیں وہ، وہ لوگ ہیں جو نعمائے خداوندی سے بہرہ یاب ہوئے تھے، وہ نہیں تھے جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس گئی تھیں اور وہ ان خوشگواریوں سے محروم رہ گئے تھے۔ وہ "مغضوب علیہم" اور "ضالین" تھے۔

یہ ان کا کوئی محض ذہنی تصور یا تخیلاتی آرزو نہیں تھی۔ اُن قوموں کی تاریخ اور مآل زمانہ نزولِ قرآن کے عربوں کے سامنے تھا جو ان نقشوں کے تابع آتی تھیں۔ جیسا کہ خود قرآن کریم متعدد مقامات پر بتایا ہے، وہ ان شاہراہوں پر سے صبح و شام گزرا کرتے تھے جن پر ان تباہ شدہ اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات انہیں دعوتِ عبرت و بصیرت دیتے تھے۔ علاوہ ازیں چلتے پھرتے یہودیوں کا انجام بھی ان کے سامنے تھا جو، کسی زمانے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کے وارث ہونے کے باوجود دنیا کی ذلیل ترین قوم بن کر رہ

گئے تھے۔ یہ تھیں وہ اقوام، ان کا اور ان جیسی دیگر اقوام کا تفصیلی تذکرہ اگلے باب میں سامنے آئے گا۔

خلاصہ

(۱) خدائے علیم و حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ

(۲) تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (۲/۱) وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (۲/۵) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے، اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن۔

یہ ضابطۂ قوانین سفرِ زندگی میں، ان لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔

(۳) یہ وہ لوگ ہیں جو ان حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں، لیکن قرآنِ کریم میں غور و فکر سے ان کا مقصد سمجھ میں آ سکتا ہے، اور صحیح روش کے ان نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن جن کا آخرالامر سامنے آ جانا یقینی ہوتا ہے۔

اس مقصد کے لئے یہ لوگ اُس نظام کو قائم کرتے ہیں جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں اور جو سامانِ نشو و نما انہیں دیا جاتا ہے، اُس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر لے کر (۲/۲۱۹) باقی نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

(۴) یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسولؐ!) تجھ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو ان کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (لیکن جو اُن کے متبعین کے پاس اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں نہیں رہیں، اور اب صرف قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں) — ان صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنے یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اس پروگرام پر اس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لئے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے — وہ اس طرح اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جد و جہد سے انسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے — وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

⑤ یہ وہ سعادت مند لوگ ہیں جو اپنے نشو و نما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کی راہنمائی میں سفرِ زندگی طے کئے جاتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں آخر الامر پروان چڑھتی ہیں (۱۱-۱/۲۳ ؛ ۵-۲/۳۱)۔

یہ گروہ ان لوگوں کا ہے جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہتے ہیں اور ان کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ صحیح راستہ ان کے سامنے آجائے۔

(مفہوم القرآن)

دوسرا باب

آیات ــــ ۶ تا ۷

کُفّار

۱- واضح ہدایت سامنے آجانے کے بعد کفر اختیار کرنا۔
۲- انبیاءؑ بشیر و نذیر ہوتے تھے۔
۳- خود اپنی ذات سے انکار بھی کفر ہے۔
۴- تقلید کی روش اختیار کرنے والے۔
۵- جذبات سے مغلوب
۶- نشۂ اقتدار کی سرمستیاں۔
۷- کائنات کو باطل کہنا کفر ہے۔
۸- کفار کبھی مومنوں پر غالب نہیں آسکیں گے۔
۹- کفار کے ساتھ دوستداری کے تعلقات وابستہ نہیں کیے جا سکتے۔
۱۰- دِلوں پر مہریں لگنے کا مفہوم۔
۱۱- عذاب کا قرآنی مفہوم۔ زندگی کا کسی مقام پر رُک جانا۔
۱۲- تفرقہ انگیزی۔
۱۳- تنگیٔ رزق۔
۱۴- میزانِ عدل۔ قانونِ مہلت۔

دُوسرا باب (آیت ۶ تا ۷)

(کُفّار)

(۲/۶) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

قرآن کریم نے بنیادی طور پر نوعِ انسان کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے ـــــ کافر اور مومن ـــــ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲) ـــــ " خدا وہ ہے جس نے تمہیں (انسانوں کو) پیدا کیا۔ پھر تم میں کچھ کافر ہیں، کچھ مومن" ـــ ان بنیادی انواع کی ذیلی تقسیمات بہت سی ہو سکتی ہیں، لیکن اصولی طور پر انسانوں کی یہی دو قسمیں ہیں ـــــ ایک وہ جو وحی (قرآن کریم) میں دی ہوئی ابدی اقدارِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے وہ، جو ان سے انکار کرتے ہیں ـــ (اسی کو "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی مسلم اور غیر مسلم) اِس آیت (۲/۶) کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے " جو لوگ کافر ہوئے ان کے لئے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لانے کے"۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲/۲) کے سطحی مفہوم کی رو سے اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ جو لوگ پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔ ہدایت تو گمراہوں کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس سے کہیں شدید تر اعتراض آیۂ زیرِ نظر (۲/۶) کے عمومی ترجمہ اور سطحی مفہوم کی رو سے وارد ہوتا

اعتراض

ہے۔ کہا یہ جاتا کہ اگر کفار (غیر مسلموں) کے لئے یکساں ہے خواہ انہیں ہدایت کی تبلیغ کی جائے یا نہ، وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، تو کیا ہدایت کی ضرورت مسلمانوں کو ہے؟ اس پر مزید اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے آغاز میں تو سب کے سب غیر مسلم تھے۔ اگر ان کے لئے یکساں تھا خواہ انہیں تبلیغ کی جائے یا نہ، تو پھر نزولِ قرآن اور تبلیغِ رسالت کا مقصد کیا تھا؟ علاوہ ازیں، آیت کا اگلا ٹکڑہ، (لَا یُؤْمِنُوْنَ) واقعہ کے خلاف ہے۔ وہی لوگ تو ایمان لا کر مومن بنے تھے؛ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس کے صحیح مفہوم کیلئے ان تشریحات کو سامنے لایئے جنہیں ایمان کے ضمن میں پیش کیا جا چکا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ ایمان، دل کے ارادے اور اپنے اختیار کے ساتھ حقائق کی صداقت کے تسلیم کرنے کا نام ہے۔ یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب

تک وہ بلاجبر واکراہ اپنے اختیار و ارادہ سے، ان صداقتوں کو تسلیم نہ کرے۔ اسی اعتبار سے کہا گیا تھا کہ کوئی شخص محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مومن نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن کفر کی ہے۔ اس کے لئے بھی قرآن نے فعل (VERB) کے صیغے استعمال کئے ہیں۔۔۔ کَفَرَ، یَکْفُرُ وغیرہ یعنی "اس نے کفر اختیار کیا" لہٰذا (ایمان کی ضد ہی سہی) کفر بھی ایک نظریۂ زندگی، ایک فلسفۂ حیات، ایک مسلک اور ایک نظام ہے جسے اپنے اختیار و ارادہ سے اختیار کرنے والا کافر کہلاتا ہے۔ یہ بھی پیدائشی نہیں ہوتا۔

یہاں پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ قومی تشخص کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم، پیدائشی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور اس تخصیص و تمیز کا برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن، قرآنی نقطۂ نگاہ سے کافر اور مومن کی بنیادی شرط کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس شرط کی رو سے آیۂ زیرِ نظر (۲-۱) کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اختیار و ارادہ سے کفر کا مسلک اور نظام اختیار کر لیتے، اور پھر اس پر قائم رہنے کے لئے بضد ہوتے ہیں، اور اس کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتے، ان پر اس وقت تک ہدایت کی تبلیغ کچھ اثر نہیں کر سکتی جب تک وہ بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ خودکشی کرنے والے کی مثال کو پھر سامنے لایئے۔ اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس کے لئے یکساں ہے خواہ کوئی اُسے ڈوبنے کے خطرہ سے آگاہ کرے یا نہ کرے، وہ کسی ایسی وارننگ پر دھیان نہیں دے گا۔

دیکھنا یہ ہے کہ (قرآن کریم کی رو سے) کفر کسے کہتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جن پر ہدایت کی تبلیغ کچھ اثر نہیں کر سکتی۔

کفر کے معنی

کُفْرٌ کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے، رات کو، کافِرٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ قبر کو بھی اَلْکَفْرُ کہتے ہیں کیونکہ اس میں لاش کو چھپا دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کسان کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ہے۔ "چھپانے" کے مفہوم کی بنا پر اس کے معنے انکار کرنے کے بھی ہو گئے کیونکہ جو شخص کسی شے کو چھپاتا ہے وہ اس سے انکار کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس ہے۔ چونکہ اِنکار اِقرار کے مقابل میں آتا ہے اس لئے قرآن کریم کی اصطلاح میں کفر، ایمان کی ضد ہے، اور جب یہ انکار، مخالفت تک پہنچ جاتے تو پھر ایسا شخص سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے کَفَرَ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی اختیار کی۔

کُفْرٌ بمقابلہ شُکْرٌ بھی آتا ہے اس لئے شکر کے معنے ہیں کسی چیز کا ابھر کر سامنے آجانا۔ لہٰذا کفرانِ نعمت کے معنے ہیں نعمائے خداوندی کا چھپا لینا۔ انہیں عالمگیر انسانیت کے مفاد کے لئے کھلا نہ رکھنا۔ اس کو کفرِ نعمت کہا گیا ہے۔ (اس مادہ (کفر) کے اور مشتقات بھی ہیں۔ لیکن اس مقام پر ہم اس کے انہی معانی تک محدود رہتے ہیں جو آیۂ زیرِ نظر کے

سمجھنے کے لئے ضروری ہیں)۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ کُفر کے معنے چھپا دینا (انکار کرنا) ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھپایا انہی باتوں کو جاتا ہے جن کا انسان کو علم ہو اور انکار بھی انہی سے کیا جاتا ہے۔ جن امور کا کسی کو علم ہی نہ ہو، ان کے چھپانے یا ان سے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا کفر سے مفہوم یہ ہو گا کہ قرآنی صداقتیں کسی کے علم میں ہوں اور وہ انہیں چھپائے یا ان سے انکار کرے۔

ہدایت کا علم ہونا ضروری ہے

سورۃ محمدؐ میں ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدٰی (۴۷/۳۲)۔ "جو لوگ خود بھی کفر کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی خدا کے راستہ (نظامِ خداوندی) کی طرف جانے سے روکتے (اور اس نظام کے قائم کرنے والے) رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں، بعد اس کے کہ صحیح راہنمائی ان کے سامنے واضح طور پر آچکی ہے........"

سورۃ الانعام میں ہے:

یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ
یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ وَ یُنۡذِرُوۡنَکُمۡ لِقَآءَ یَوۡمِکُمۡ
ہٰذَا ؕ قَالُوۡا شَہِدۡنَا عَلٰۤی اَنۡفُسِنَا وَ غَرَّتۡہُمُ
الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ شَہِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ اَنَّہُمۡ
کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ (۶/۱۳۱)۔

"انسانوں سے پوچھا جائے گا —— خواہ وہ بدوی قبائل ہوں (جن) یا شہروں کی متمدن آبادی (انس) —— کہ کیا تمہاری طرف ایسے پیغامبر نہیں آئے تھے جنہوں نے ہمارے قوانین کو تمہارے سامنے پیش کیا تھا اور تمہیں واضح طور پر بتایا تھا کہ ان قوانین کے خلاف راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہو گا۔ وہ اس کا اقرار کریں گے اور کہیں گے کہ ہاں! ایسا ہوا تھا، لیکن انہیں طبیعی زندگی کے مفادات نے دھوکے میں رکھا، اور انہوں نے اس کے باوجود کفر کا مسلک اختیار کیا۔ یوں وہ اپنے خلاف آپ گواہی دیں گے۔" اور اس کے بعد ہے ذٰلِکَ اَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ رَّبُّکَ مُہۡلِکَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ وَّ اَہۡلُہَا غٰفِلُوۡنَ (۶/۱۳۲)۔ "یہ اس لئے کہ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ کسی قوم کو اس کے غلط نظام کے انجام و عواقب سے آگاہ کئے بغیر تباہ کر دے، ایسا کرنا ظلم ہو گا۔ اور خدا کسی پر ظلم نہیں کیا کرتا۔" اس سے بھی کفر اختیار کرنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کے لئے شرط یہ ہے کہ صداقت کسی کے سامنے آچکی ہو اور پھر وہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

اسی طرح سورۃ مومن میں ہے کہ اہلِ جہنم، دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ ذرا تم ہی خدا سے التجا کرو وہ ہماری اس سزا میں تخفیف کر دے، خواہ ایک ہی دن کے لئے کیوں نہ ہو (۴۰/۴۹)۔ وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ بتاؤ کہ اَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (۴۰/۵۰) کیا تمہارے پاس، خدا کے پیامبر واضح دلائل لے کر نہیں آتے تھے؟ قَالُوْا بَلٰى۔ وہ کہیں گے کہ ہاں! آتے تھے۔ جہنم کے داروغے کہیں گے فَادْعُوْا۔ تو پھر تم خود ہی خدا سے التجا کرتے پھرو۔ ہم تو ایسا نہیں کر سکتے۔ جس نے دیدہ دانستہ تباہی مول لی ہو اس کے لئے ہم کیوں دعائیں کرتے پھریں۔ اور اس کے بعد ہے وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (ایضاً)۔ صداقتوں سے اسطرح انکار کر کے غلط راستوں پر چلنے والوں کی پکار کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے؟

انذار و تنذیر

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انذار کے معنے بھی واضح کر دیئے جائیں جو آیۂ زیرِ نظر (۲/۶) میں آیا ہے — یعنی سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (۲/۶) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عام طور پر اس کے معنے "ڈرانے" کے کئے جاتے ہیں۔ "ڈرانے" سے اس کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا۔ اِنْذَار کے معنی ہوتے ہیں کسی کو کسی ضرر رساں، یا نقصان دہ بات کے انجام سے قبل از وقوع آگاہ کر دینا اور اس طرح اس کے خطرناک نتائج سے ڈرانا۔ لشکر کے آگے آگے جو ہراول دستہ جاتا تھا، تاکہ دشمن کی نقل و حرکت کو بھانپ کر اس سے اپنے لشکر کو آگاہ کرتا رہے اُسے نَذِيْرَةُ الْجَيْشِ کہتے تھے۔ سابقہ صفحات میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ اور ہر نظام کا ایک انجام ہوتا ہے۔ خدا کے پیامبرؑ وحیٔ خداوندی کی رو سے لوگوں کو آگاہ کر دیتے تھے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہ کن ہوگا اور صحیح روش کا نتیجہ خوشگوار۔ اول الذکر کی رو سے انہیں نذیر کہا جاتا تھا — یعنی غلط روش کے مضرت رساں نتائج سے آگاہ کرنے والا — اور ثانی الذکر کی رو سے بشیر — یعنی صحیح روش پر چلنے کے خوشگوار نتائج کی بشارت (خوشخبری) دینے والا۔ بنا بریں، اِنذار کے معنے آگاہ کرنا یا (WARN) کرنا ہوں گے، نہ کہ محض ڈرانا۔ سورۃ یٰسٓ کی ایک آیت (۳۶/۷۰) کے چار الفاظ میں اس حقیقت کو اس اختصار اور ایجاز سے بیان کیا گیا ہے کہ چشمِ بصیرت اس پر غور کر کے وجد میں آجاتی ہے۔ کہا کہ یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶/۷۰) یعنی "(جس شخص یا قوم) میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت ہے، اُسے آگاہ کر دیا جائے کہ جس غلط راستہ پر وہ چل رہا ہے وہ اُسے کس طرح تباہی اور ہلاکت کی جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اور جو، اس کے باوجود، اس غلط راستے کو چھوڑنے سے انکار کر دے، اس پر یہ حقیقت آخرالامر واضح ہو جائے کہ کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا تھا"۔ یعنی تنذیر اسی کے لئے

کارگر ہوسکتی ہے جو زندہ رہنے کا متمنی ہو۔

اب آگے چلئے۔ یہ بھی پہلے بتایا جاچکا ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق بنیادی طور دو نظریات متداول ہیں۔ ایک نظریہ یہ کہ انسان کی زندگی طبیعی قوانین کے تابع مصروف بہ حرکت و عمل رہتی ہے، اور جب یہ مشینری (انہی قوانین کی رو سے) چلنے سے بند ہوجاتی ہے تو اسے موت کہا جاتا ہے جس سے اس فرد کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اسے مغرب کی مادہ پرستی، سیکولرازم، یا کمیونزم کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شئے بھی ہے جسے اس کی ذات، نفس، (SELF) یا (اقبالؒ کی اصطلاح میں) خودی کہا جاتا ہے۔ یہ نہ طبیعی قوانین کی

انسانی ذات

پیداوار ہوتی ہے اور نہ ہی ان قوانین کے تابع۔ یہی انسانی اختیار و ارادے کا سرچشمہ ہوتی ہے اور اسی پر انسان کے ہر عمل کا نتیجہ (یوں کہیئے کہ، منقوش ہوجاتا ہے۔ جسم کی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ اس فرد کے اعمال کے ان نقوش کو ساتھ لئے آگے جاتی ہے اُسے اُخروی زندگی، کہا جاتا ہے جس میں اس کا مقام ان نقوش کے مطابق متعین ہوتا ہے جنکی یہ حامل ہوتی ہے۔ یہ قرآنی نظریہ حیات ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما قرآنی پروگرام کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ الشمس کی ان دو جامع آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱/۹)۔ "جس نے اپنی ذات کی نشوونما کرلی اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی"۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۱۰) "جس نے اسے مادی مفاد کی مٹی کے نیچے دبا دیا اس کی انسانی صلاحیتیں دبی کی دبی (غیر نشوونما یافتہ) رہ گئیں"۔ اس سے واضح ہے کہ کفر، ابدی صداقتوں کو چھپانا اور اپنی ذات سے انکار کرنا یا اسے دبا دینا ہے۔ اسی بنا پر حیوانی سطح زندگی کو کفر کہا گیا ہے۔ یعنی وہ نظریہ حیات جس میں انسانی زندگی کو حیوانوں کی طرح محض طبعی زندگی سمجھا جاتا ہے۔ سورۃ محمد میں ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)۔ "جو لوگ کفر کا مسلک اختیار کرتے ہیں ان کا مقصدِ حیات حیوانات کی طرح کھانا پینا اور طبیعی سامانِ حیات سے متمتع ہونا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کا انجام تباہی کے جہنم کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے"؟ دوسرے مقام پر اس نظریہ زندگی (سیکولرازم) کی وضاحت ان الفاظ سے کی گئی ہے:۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا
وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ
مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم زندہ رہتے ہیں اور پھر زمانے کی گردشیں ہمیں ختم کردیتی ہیں"

—— اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "ان لوگوں کو حقیقت کا کچھ علم نہیں، یہ محض ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں"۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ایمان کی طرح، کفر بھی اپنے ارادے اور فیصلے سے اختیار کیا جاتا ہے، اور اختیار کیا جاتا ہے اُس وقت جب حقیقت کا علم ہو چکا ہو۔ چنانچہ سورۃ کہف میں کہا گیا ہے وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہدو کہ الحق (ابدی صداقت) تمہارے سامنے آچکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے"۔ دوسری جگہ ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶)۔ "الدین کے معاملہ میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صحیح اور غلط راستے دونوں متمیز کر دیئے گئے ہیں۔ جو راستہ جس کا جی چاہے اختیار کرے (نیز دیکھئے ۱۶/۱۰۶)۔

عقیدۂ جبر کے خلاف

جو لوگ ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے عقیدۂ جبر کو بطورِ سپر اختیار کر لیتے ہیں، قرآن کریم نے انہیں بڑی سختی سے ڈانٹا ہے۔ (مثلاً) سورۃ الانعام میں ہے:

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ
اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ۔ كَذٰلِكَ
كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا۔ قُلْ
هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ
اِلَّا الظَّنَّ۔ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (۶/۱۴۹)۔

"جو لوگ شرک کا راستہ اختیار کئے ہوتے ہیں، جب ان سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ غلط روش کیوں اختیار کر رکھی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ اگر خدا کو ایسا منظور نہ ہوتا تو ہم یا ہمارے اسلاف یہ روش کبھی اختیار نہ کرتے"۔ اس پر قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں جسے یہ لوگ بطورِ عذر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جو ایسا ہی کہا کرتے تھے۔ لیکن ایسا کہنے سے وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے تو بچ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ تباہی ان پر آئی اور ان کا عقیدۂ جبر انہیں اس سے بچا نہ سکا۔ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ سراسر جہالت ہے ان سے کہو کہ تم علم کی بارگاہ میں آؤ اور اگر تمہارے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اُسے پیش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ عقیدہ علم و بصیرت پر مبنی نہیں۔ محض ظن و قیاس ہے یا کذب و افترا[1] (نیز دیکھئے ۴۳/۲۰)۔

---

[1] میں نے مسئلہ تقدیر کو اپنی تصنیف —— کتاب التقدیر —— میں شرح و بسط سے بیان کر دیا ہے۔ ارباب ذوق مزید تفصیل اس میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ موضوع زیر نظر کے سلسلہ میں یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایک چیز ہوتی ہے صاحبِ اختیار وارادہ نہ ہونا، اور دوسری چیز ہوتی ہے اس ارادہ کو استعمال نہ کرنا یا ایسی کیفیت پیدا کر لینا جس سے انسان کی یہ بلند ترین صلاحیت کارفرما نہ ہو۔ اول الذکر کے متعلق تو بعد میں بات کی جائے گی۔ ثانی الذکر کے متعلق قرآن کریم بڑی وضاحت سے گفتگو کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ انسان صاحبِ اختیار وارادہ ہونے کے باوجود کس طرح اپنی اس صلاحیت کو خود سلب کر دیتا ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ کس طرح ہوتا ہے اور ایسا کرنے والے کس طرح کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

تقلیداً شیوۂ کفر

(۱) تقلیدِ اسلاف سے انسان خود ہی اپنے اختیار وارادہ کو (SURRENDER) کر دیتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں پہلے کہا وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے (قرآن کریم) اس کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی راستے پر چلتے رہیں گے جس راستہ پر ہم نے اپنے اسلاف کو گامزن پایا ہے۔" اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے"۔

اگلی آیت میں ہے کہ: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲/۱۷۱)۔ تقلید کی یہ راہ، انسان کو حیوانوں کی سطح پر پہنچا دیتی ہے جو عقل و فکر سے کام لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے (۲/۱۷۱)۔ مقلدین اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی مثال یوں سمجھئے کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے جس کے پیچھے چرواہا ہے۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ، اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے اور بھیڑ بکریاں جو ان آوازوں پر لگی ہوتی ہیں، ان کے مطابق اِدھر اُدھر مڑتی رہتی ہیں۔ نہ چرواہے کو اس کا علم ہوتا ہے کہ ان آوازوں اور الفاظ کا مطلب کیا ہے اور نہ ہی وہ بھیڑ بکریاں ان آوازوں کے سوا کچھ سمجھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آباء کی تقلید کرنے والے بہرے، گونگے، اندھے، عقل و فکر سے کچھ کام نہ لینے والے، انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟

مترفین

سورۃ زخرف میں ہے کہ ایسی روش مترفین اختیار کرتے ہیں۔ مترفین انہیں کہتے ہیں جو محنت سے جی چرائیں اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں۔ کسی معاملہ کے متعلق علم و عقل کی رو سے سوچنا اور پھر اپنے اختیار و ارادہ سے فیصلہ کرنا، بڑی کاہش اور کاوش چاہتا، اور اپنی ذمہ داری کو قبول کرنا بڑی جرأت اور ہمت کا متقاضی ہوتا ہے۔ تقلید کا مسلک بڑی تن آسانی کا مسلک ہے۔ اس میں نہ خود کوئی

فیصلہ کرنا پڑتا ہے، نہ ذمہ داری کو قبول کرنا۔ لیکن اس تن آسانی سے انسان اپنے آپ کو خود ہی اس جوہر بے بہا سے محروم کرلیتا ہے جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔ یعنی اختیار و ارادہ کا جوہر۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ کفر کی روش ایسے ہی لوگ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی جو اختیار و ارادہ کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے۔

جذبات سے مغلوب

(۲) اب انسان کے اپنے ارادے کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے کی دوسری مثال لیجئے۔ انسانی ارادے کی صورت یہ ہے کہ اس کے ذرائع علم و خبر ــــ سماعت، بصارت وغیرہ ــــ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان معلومات کی بنیادوں پر اس شخص کی فکر کسی نتیجہ پر پہنچتی ہے۔ اس نتیجہ کی روشنی میں وہ اپنے لئے ایک فیصلہ کرتا ہے۔ اس فیصلہ کو بروئے کار لانے کے عزم کو اس کا ارادہ کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے فیصلہ اور اس پر مبنی ارادے کا دارومدار اس کی سمع و بصر کی صلاحیتوں کے صحیح طور پر کام کرنے پر ہے۔ اگر وہ صلاحیتیں صحیح کام نہ کریں تو پھر نہ وہ صحیح معلومات بہم پہنچاتی ہیں نہ ان پر مبنی فیصلہ کو صحیح فیصلہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ کسی شخص کو نشہ (شراب خواری) کی حالت میں دیکھئے! اس کی سمع و بصر اسے کس کس قسم کی معلومات بہم پہنچاتی ہیں، پھر اس کے، ان معلومات پر مبنی فیصلے کس قسم کے ہوتے ہیں! اور اس کے بعد اس کے ارادے کیا!! اس کے اس قسم کے فیصلوں اور ارادوں کے متعلق کسی غیر کی تنقید کو چھوڑیئے، نشہ اتر جانے کے بعد جب وہ، خود، ان پر نگہ بازگشت ڈالتا ہے تو بے حد پشیمان ہوتا ہے کہ یہ میں نے کیا کہا اور کیا کیا ہے!

نشہ، شراب وغیرہ ہی کا نہیں ہوتا۔ جب، اور جن محرکات کی رو سے بھی انسان کے جذبات اس کی عقل و فکر پر غالب آجائیں وہ نشہ ہی کی کیفیت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس وقت اس کی عقل و فکر ماؤف ہوجاتی ہے۔ سورۃ قصص میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں کو حق و صداقت کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیجئے۔ اس کے بعد ہے فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآءَھُمْ (۲۸/۵۰) "اگر یہ لوگ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ اپنے جذبات کا اتباع کر رہے ہیں"۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰہِ (ایضاً)۔ یاد رکھو! جو شخص بھی اپنے جذبات کو صحیح ضابطۂ حیات کے تابع نہیں رکھتا اور انہیں اپنی مفاد پرستی کے لئے بیباک چھوڑ دیتا ہے، وہ صحیح راستہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اسی کا نام کفر ہے۔

یہ تو افراد کے متعلق ہے۔ قرآن کریم نے اقوام کے متعلق بھی کہا ہے کہ جب کوئی قوم صرف اپنے ہی مفاد کو سامنے رکھے اور اقدارِ خداوندی کو فراموش کردے، تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَحَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶)

"ان کی سماعت اور بصارت اور قوت فیصلہ کچھ کام نہیں دیتیں۔ وہ مسلوب، مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوانینِ خداوندی سے انکار و جحود کا۔ وہ ان قوانین و اقدار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں"۔

یہودیوں کا حسد

جذبات سے مغلوب ہو کر کفر اختیار کرنے والوں کے سلسلہ میں قرآنِ کریم (اپنے اولین مخاطب) اہلِ کتاب کی مثال پیش کرتا ہے، جہاں کہتا ہے کہ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (۲/۹)۔ "یہ اہل کتاب چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کر رکھا ہے، تمہاری بھی وہی کیفیت ہو جائے۔ یہ اس حسد کی بنا پر ہے جس کی آگ ان کے سینے میں بھڑکتی رہتی ہے، حالانکہ حق و صداقت ان کے سامنے واضح انداز میں آچکے ہیں"۔ قرآنِ کریم نے یہودیوں کے اس حسد، بغض اور ضد کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ نبوت حضرت اسحٰقؑ ہی کی۔۔۔ اولاد میں محصور رہے گی۔ لیکن نبی اکرمؐ بنی اسمٰعیلؑ میں سے تھے اس لئے یہود اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ انہیں (اور ان کے ساتھ ساری دنیا کو) معلوم ہونا چاہئے کہ نبوت کا تعلق کسی خاص نسل، قبیلہ یا خاندان سے نہیں۔ یہ اختصاص، مشیتِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے جسے وہ اپنا فضل کہکر پکارتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۲/۹)۔ "یہ لوگ خدا کی نازل کردہ (اس) کتاب سے محض ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں اور یہ بہت ہی برا سودا ہے ـــ یعنی ایسا سودا، جس میں یہ ایسی متاعِ بے بہا کو بیچ کر محض اپنے ایک جذبہ کی تسکین کا سامان خرید رہے ہیں"۔

پندارِ نفس

ضد ہی کی ایک شکل، پندارِ نفس ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ اعراف میں ہے کہ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ (۷/۱۰۱)۔ "خدا کے پیغامبر ان کی طرف واضح حقائق و دلائل لیکر آتے لیکن انہوں محض بر بنائے نخوت و تمرد انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہدیا کہ تم جھوٹے ہو۔ اس کے بعد وہ پیامبر انہیں ہزار سمجھاتے رہے، لیکن چونکہ ایک دفعہ ان کے منہ سے نہ نکل گئی تھی، اس لئے، محض پندارِ نفس کی بنا پر، اپنی ضد پر اڑے رہے اور انکار پر انکار کرتے چلے گئے۔

اس نے پندارِ نفس کی ایک بیّن مثال، آویزشِ صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کی داستان کے ضمن میں بیان کی ہے سورۃ نمل میں ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ نے اہلِ فرعون کے سامنے ایسے واضح دلائل پیش کئے جن کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

لیکن وَجَحَدُوۡا بِہَا وَاسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا (۲۷/۱۴) "وہ انہیں تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے حالانکہ ان کا دل مانتا تھا، انہیں یقین آچکا تھا کہ بات یہ سچی کہتے ہیں۔ لیکن ان کی سرکشی اور تکبر اعترافِ حقیقت کے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔"

نشۂ اقتدار

جب کوئی قوم دھاندلی سے اقتدار حاصل کرے اور پھر اُسے قائم و مستحکم رکھنے کے لئے ہر قسم کے جائز اور ناجائز حربے اختیار کرتی جائے، تو وہ بھی حق و صداقت کی راہ کو اختیار نہیں کرتی، اس سے انکار اور سرکشی برتتی چلی جاتی ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے کہ عرب کے نخوت پرستوں کی یہی کیفیت تھی۔ بعثتِ نبیؐ اکرم سے پہلے وہ قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر ہماری طرف خدا کا کوئی پیامبرؐ آگیا تو تم دیکھو گے کہ ہم کس طرح دنیا کی سب سے بہتر ہدایت یافتہ قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن —— جب وہ پیامبرؐ آیا تو انہوں نے اس کی دعوت سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ سخت نفرت اور عداوت برتنے لگ گئے، محض اس لئے کہ انہیں ملک میں اقتدار حاصل تھا (اِسۡتِکۡبَارًا فِی الۡاَرۡضِ) اور اس صداقت کے ماننے سے وہ جھوٹا اقتدار باقی نہیں رہتا تھا (۳۵/۴۲-۴۳)۔

یہ ہیں وہ لوگ، جن کے متعلق کہا کہ سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (۲/۶)

جو لوگ اس طرح اپنے جذبات سے مغلوب ہوں ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو یا نہ کرو۔ اُن کے جذباتِ حسد و نفرت، بُغض، عداوت، مفاد پرستی، استکبار فی الارض، نشۂ اقتدار ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں چھوڑتے کہ وہ گوشِ ہوش سے کسی بات کو سُنیں اور عقلِ سلیم کی رو سے فیصلہ کریں۔ ذرا تصوّر میں لایئے اس منظر کو کہ راستے جگمگا رہے ہوں، بجلی کے قمقموں سے سڑک بقعۂ نور بن رہی ہو، لیکن ایک راہرو اپنی آنکھیں بند کرلے، تو اسے یہ روشنی کچھ بھی کام دے سکے گی؟ کیا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کے لئے یکساں ہے خواہ راستے روشن ہوں یا تاریکی میں ڈوبے ہوئے! ایسے ہی ہیں وہ لوگ، جن کے متعلق کہا کہ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَلَوۡ کَانُوۡا لَا یَعۡقِلُوۡنَ (۱۰/۴۲) "یہ لوگ تمہاری مجلسوں میں آکر بیٹھتے ہیں بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ بظاہر کان تو ان کے تمہاری طرف لگے ہوتے ہیں لیکن خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ تمہاری آواز ان کے دماغ تک پہنچتی ہے، نہ یہ عقل و فکر کی رو سے اس سے کوئی نتیجہ حاصل کرتے ہیں —— اے رسولؐ! ذرا سوچو کہ جو لوگ کان رکھنے کے باوجود اس طرح بہرے بن جائیں وہ تمہاری اس تبلیغ سے کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں"؟ اگلی آیت میں ہے وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّنۡظُرُ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَہۡدِی الۡعُمۡیَ وَلَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ (۱۰/۴۳)۔ "تم ان سے مصروفِ گفتگو ہوتے ہو۔ یہ

تمہاری طرف تک بھی رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ ان کے خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ اے رسولؐ! کیا تم اس قسم کے آنکھوں والے اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہو! سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۔

نظر اور بصر قرآن کریم نے یہاں نظر اور بصر میں ایسا لطیف فرق بتایا ہے، جس کے لئے ہماری زبان میں موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ ترجمہ ان دونوں کا "دیکھنا" ہی ہے۔ لیکن دیکھنے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے عربی زبان کی یہی وسعت اور قرآن کریم کا انتخابِ الفاظ ہے جس کی رُو سے اس نے، ایک قسم کے دیکھنے کو (جس میں خیالات کہیں اور رہیں) نظر سے تعبیر کیا ہے، اور دوسری قسم کے دیکھنے کو (جس میں سوچنا سمجھنا بھی ساتھ ہو) بصر کہکر پکارا ہے اسے آپ "بصارت" اور "بصیرت" کہکر ان میں تمیز کر سکتے ہیں۔ (نیز دیکھئے ۷/۱۹۸)

سورۃ روم میں ہے:

فَاِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ
اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ۔ وَمَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِ الۡعُمۡىِ عَنۡ
ضَلٰلَتِهِمۡ۔ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (۳۰/۵۲-۵۳)

"اے رسولؐ! جس طرح تم مُردوں کو سُنا نہیں سکتے اسی طرح ان زندہ انسانوں کو بھی نہیں سنا سکتے، کہ جنہیں تم آواز دو تو وہ جان بوجھ کر بہرے بن جائیں اور اس طرح منہ موڑ کر چلدیں گویا انہوں سنا ہی نہیں — اسی طرح تم ان اندھوں کی بھی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی نہیں کر سکتے اور انہیں گمرہی کی تاریکیوں سے نہیں نکال سکتے جو آنکھیں رکھنے کے باوجود دیکھنا ہی نہ چاہیں۔ تمہاری بات پر تو وہی کان دھریں گے جو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس کی صداقت پر ایمان لائے ہوں۔"

سورۃ لقمان میں ہے وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا كَاَنَّ فِىۡۤ اُذُنَيۡهِ وَقۡرًا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ (۳۱/۷)۔ "ذرا اس شخص کی حالت پر غور کرو کہ جب اس کے سامنے ہمارے قوانین پیش کئے جائیں تو وہ انتہائی تکبر و نخوت سے یوں پیٹھ پھیر کر چلدے گویا، اس نے کچھ سنا ہی نہیں گویا اس کے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کیسے بچ سکتا ہے؟" سنکھیا کھا لینے کے بعد، انسان اس تنبیہہ کو ہزار ان سُنی کر دے (کہ سنکھیا سے موت واقع ہو جاتی ہے)۔

سنکھیا اپنا اثر کرکے رہے گا۔

اضداد سے تبیانِ حقیقت

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ اضداد کی رو سے تبیانِ حقیقت کرتا ہے۔ (مثلاً) سورۃ فاطر میں ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۳۵/۱۹)۔ "اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے"۔ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ (۳۵/۲۰)۔ "نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہیں"۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ (۳۵/۲۱)۔ "اسی طرح دھوپ اور سایہ بھی برابر نہیں ہو سکتے"۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ (۳۵/۲۲)۔ "اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں"۔ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ (۳۵/۲۲)۔ "خدا کا قانون یہ ہے کہ سُن وہی سکتا ہے جو سُننا چاہے۔ جو زندہ، کفن پہن کر، قبر میں جا لیٹے اور اس طرح مردہ بن جائے اسے کون سنا سکتا ہے۔ اسے کون کچھ دکھا سکتا ہے؟ یہ ہیں وہ چلتی پھرتی لاشیں کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ جن کے لئے یکساں ہے خواہ تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ جب یہ کچھ دیکھنا سننا ہی نہیں چاہتے تو یہ تمہاری بات کب مانیں گے؟ یہ قرآن تو زندہ انسانوں کے لئے ضابطہ ہدایت ہے (۳۶/۷۰)۔ قبرستانوں میں وعظ کہنے کے لئے نہیں۔ ....

کیا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھ کر حق و صداقت کی بات ان تک پہنچائی نہ جائے کہ ایسا کرنا سعیٔ لاحاصل ہے؟ نہیں! قرآن کا یہ منشا نہیں۔ ان آیات میں تو قرآن کریم ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیت بتاتا ہے۔ ان کے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ رسول اللہؐ (یا دیگر داعیانِ حق) سے یہ نہیں کہتا کہ تم انہیں مرفوع القلم قرار دیکر ان سے منہ موڑ لو۔ رسول اللہؐ کی کیفیت اس طبیبِ مشفق کی سی تھی جس کا دل اس بات سے کُڑھتا ہے کہ مریض دوائی کیوں نہیں پیتا۔ وہ پرہیز کیوں نہیں کرتا۔ حضورؐ کی شدتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ خود خدا کو کہنا پڑا کہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (۱۸/۶)۔ "یہ لوگ جو اس قرآن کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، اے رسولؐ! تو ان کے پیچھے غم و تاسف سے اپنی جان تک گھلا لے گا"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ: وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ "بایں ہمہ، تمہاری غم گساری کا یہی تقاضا ہے کہ تو قرآن کے ذریعہ انہیں فراموش کردہ حقیقتوں کی یاد دہانی کراتے جا تا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اس لئے ہلاک ہو جائے کہ سچی بات اس تک پہنچی نہ تھی۔

ہم ایمان کے متعلق گفتگو کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان کے بنیادی اجزا پانچ ہیں ——— اللہ، ملائکہ، رسل، کتب اور یوم آخرت ——— ان سب کا، یا ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ سورۃ النساءؔ میں ہے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴/۱۳۶) "جو شخص، اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت سے انکار کرتا ہے وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑتا ہے۔" لیکن قرآن کریم نے کفر کے تضمنات ایسے، اور اتنے، بیان کئے ہیں کہ اس کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے اور اس دائرے کے اندر صرف وہی نہیں آتے جنہیں ہم اصطلاح میں کافر یا غیر مسلم کہتے ہیں، اور بھی آجاتے ہیں۔ اس وقت ہم ان میں سے چند ایک گوشوں کو سامنے لاتے ہیں۔ باقی اپنے اپنے مقام پر آتے جائیں گے۔

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے

(۱) کائنات کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض انسان کا اپنا فریب تخیل ہے۔ یونانی فلاسفر افلاطون (PLATO) اس نظریہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جسے اس کی اصطلاح میں "اعیان نامشہود" یا نظریہ "عالم امثال" کہا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ نظریہ اُبھرا اور رفتہ رفتہ ساری دنیا میں پھیل گیا ——— بالخصوص تصوف کی دنیا میں ——— ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت میں اسی لئے کائنات کو مایا یا فریب کہا جاتا ہے۔ یا ایشور کا خواب یا کھیل۔ اہل تصوف کا نظریہ وحدت الوجود بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ ہمارے بیشتر (بالخصوص ایرانی) شعرا اسی افلاطونی نظریہ سے متاثر ہیں۔ (مثلاً) غالبؔ کہتا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مغرب کے مادہ پرست فلاسفروں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات یونہی اتفاقیہ وجود میں آگئی ہے۔ اپنے زورِ دروں سے مصروفِ نقل و حرکت ہے۔ جب یہ زورِ دروں ایک دن ختم ہو جائے گا تو یہ پاش پاش ہو جائے گی اور کارگہِ ہست و بود، نیست و نابود ہو جائے گی۔ نہ اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ یہ کسی متعین پروگرام کے مطابق مصروفِ حرکت ہے نہ ہی اس کا کوئی منتہا اور مقصود ہے۔

قرآن ان نظریات کو باطل کہہ کر پکارتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ صٓ میں ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) "ہم نے ارض و سمٰوات اور جو کچھ ان کے اندر ہے، اسے باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا مبنی بر ظن و قیاس نظریہ ہے جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی کا جہنم ہے۔" (نیز ۲۱/۱۶)۔ اس کے برعکس مومنین کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے،

لیٹے، ہر حالت میں تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار پر غور و فکر کرتے ہیں اور انتہائی کاوش و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۸۹-۱۹۰) "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے سلسلۂ کائنات کو باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے کائنات کو فریبِ تخیل یا بلا غرض و غایت (باطل) سمجھنا کفر ہے۔

ثنویت کفر ہے

(۲۰) قرآنِ کریم میں ہے کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (۲/۲۰۸) "اے وہ لوگو جو ایمان لانے ہو! دین کے نظام میں مکمل طور پر پورے کے پورے، داخل ہو جاؤ"۔ یہ نکتہ بڑا اہم اور غور طلب ہے۔ ایک طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کرنے کے بعد آپ کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے جو مختلف اجزاء پر مشتمل ہے۔ علاج کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس نسخہ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔ اگر آپ ایسا کریں گے کہ اس کے بعض اجزا کو استعمال کریں اور بعض کو چھوڑ دیں تو نہ صرف یہ کہ آپ کے مرض کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس سے الٹا نقصان پہنچ جائے۔ یہی کیفیت اسلامی نظام کی ہے۔ قرآنِ کریم ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس کے مطابق جو نظام قائم کیا جائے گا اس کی بھی یہی کیفیت ہوگی کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے دائرۂ اقتدار اور حیطۂ کار سے باہر نہیں ہوگا، لہٰذا اُسے پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔ اگر صورت یہ پیدا کر لی جائے کہ اس کے بعض حصوں کو اپنے نظام کا جزو بنا لیا جائے اور دوسرے حصوں کو چھوڑ دیا جائے یا چند اجزا اس کے نظام کے لے لئے جائیں اور باقی اجزاء اپنی طرف سے وضع کر لئے جائیں، یا دیگر انسانوں کے وضع کردہ اجزا مستعار لے لئے جائیں، تو نہ صرف یہ کہ یہ نظام اپنے خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا نتیجہ ذلت و خواری، اور اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ قرآنِ کریم ثنویت کے اس مسلک کو بھی کفر قرار دیتا اور مستوجبِ عذاب ٹھہراتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ "کیا تمہاری حالت ہے کہ تم کتابِ خداوندی کے بعض حصوں پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصوں سے انکار کرتے ہو؟ یاد رکھو! تم میں سے جو بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں بھی شدید ترین عذاب میں ماخوذ"۔

دوسری جگہ یہ ہے کہ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ۔ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا۔ فَالْحُكْمُ

لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ (۴۰/۱۲)۔ "جب ان لوگوں کو خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو یہ اس سے کفر برتتے تھے اور جب اس کے ساتھ اور وں کو شریک کر لیا جاتا تھا تو اس پر ایمان لاتے تھے۔ یاد رکھو! یہ روش کفر اور شرک کی ہے ایمان اور توحید کی نہیں۔ ایمان کی روش یہی ہے کہ اقتدار اور حکومت کلّیۃً اور قاطبۃً خدائے واحد کا ہو" اور یہی وہ عظیم حقیقت ہے جسے سورۂ مائدہ میں یہ کہکر کفر اور ایمان میں واضح حدِ فاصل قائم کر دی کہ:

ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہ کرنا۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۳) قرآن کریم کا منتہیٰ و مقصود وحدتِ انسانیہ ہے۔ یعنی اقدارِ خداوندی کے تابع، نوعِ انسان کو ایک مرجع کرنا تاکہ ان فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا خاتمہ ہو جائے جو انسانوں کے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جانے کا فطری نتیجہ ہیں۔ اس کے لئے وہ آغازِ کار کے طور پر، ایک امت کی تشکیل کرتا ہے جسے وہ امتِ مسلمہ کہکر پکارتا ہے۔ اس امت کی وحدت توحید کی مظہر ہے۔ اسی لئے تفرقہ (فرقہ بندی) اس کے نزدیک شرک اور کفر ہے۔ اس نے، سورۂ روم میں، واضح طور پر کہا ہے: وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا۔ کُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ "دیکھنا! تم ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور اس طرح فرقوں میں بٹ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گیا کہ ہم تو حق پر ہیں اور باقی سب فرقے باطل پر" دوسری جگہ اس نے اس فرقہ بندی کو کفر قرار دیا ہے اور بڑی شدت سے، عبرت انگیز انداز میں، اس کی مخالفت کی ہے جب کہا ہے:

فرقہ بندی شرک اور کفر ہے

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ۔ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ
یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ
وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ (۳/۱۰۵-۱۰۶)۔

"اے جماعتِ مومنین! دیکھنا تم بھی کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا، جنہوں نے واضح تعلیم خداوندی کے آ جانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور اس طرح فرقوں میں بٹ گئے۔ اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی ہوگا (یوں سمجھئے کہ ظہورِ نتائج کے وقت)

بعض چہرے روشن اور تابناک ہوں گے اور بعض روسیاہ اور ظلمت آگیں! یہ روسیاہ وہ ہوں گے جنہوں نے (تفرقہ پیدا کرکے) ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا تھا۔ ان سے کہا جائے گا کہ اب تم اپنے اس کفر کا تباہ کن انجام دیکھو"۔

(۴) ہم، آیت (۲/۳) کی تشریح کرتے ہوئے، الصّلوٰۃ کے زیرِ عنوان بتا چکے ہیں کہ صلوٰۃ، وحدتِ اُمّت کی مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ بدقسمتی سے ہماری موجودہ نمازیں ہماری فرقہ بندی کی مظہر ہوتی ہیں اور ہماری مسجدیں اس کی آماجگاہ۔ قرآنِ کریم نے اس قسم کی مساجد کی تعمیر کو، جن سے امت میں تفرقہ پیدا ہو، کفر سے تعبیر کیا ہے، اور یہ بات، اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں کہی ہے جسے تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے خود رسول اللہ کے

مسجدِ ضرار

عہدِ مبارک میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مسجد کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے: مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ (۹/۱۰۷)۔ "یہ مسجد، وحدتِ امت کو نقصان پہنچانے والی ہے، مؤمنین میں تفرقہ کا باعث ہے لہٰذا یہ کفر ہے اور یوں سمجھیے گویا ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے جو خدا اور رسول کے خلاف آمادہ بجنگ تھے"۔

(۵) اسی سورۃ کی آیت ۳ (۲/۳) کی تشریح کرتے ہوئے عنوان "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" کے تابع لکھا گیا تھا کہ قرآنِ کریم ایک جامع معاشی نظام دیتا ہے جو دیگر نظامہائے معیشت سے منفرد اور مختص ہے۔ ـــــ یہ نظام، سرمایہ داری کو جڑ سے اُکھیڑ دیتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ سرمایہ بھی دولت کماتا ہے۔ قرآنِ کریم اس نظام کو ربوٰ سے تعبیر کرتا اور اسے کفر کا مسلک قرار دیتا ہے ـــــ ایسا مسلک، جس کے خلاف اسلامی نظام مستقل اعلانِ جنگ ہے۔ اس نے اس نظام کا ذکر کرتے ہوئے جماعت مؤمنین

نظامِ سرمایہ داری ـــ ربوا ـــ کفر ہے

سے کہا ہے کہ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۳/۱۳۰ ۔ ۲/۲۷۹)۔ "یعنی اس نظام سے بچو، ورنہ تم بھی اسی جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے"۔

(۶) اس قسم کی فرعی خصوصیات کے بعد قرآنِ کریم نے کفار کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ سورۃ حٰمٓ میں ہے وَقَالَ

قرآن مت سننے دو

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ "جن لوگوں نے کفر کا مسلک اختیار کر رکھا ہے وہ خود تو قرآن

کے مخالف ہیں ہی، دوسروں سے بھی یہ کہتے ہیں کہ تم بھی اس قرآن کو نہ سنو اور جہاں کہیں اس کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہو ایسا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ یہی ایک طریقہ ایسا ہے جس سے تم قرآنی مسلک اختیار کرنے والوں پر غالب آسکتے ہو۔ اگر قرآن کی آواز عام ہو گئی تو تم کبھی ان پر غالب نہیں آسکو گے۔"

ان لوگوں نے یہ تدبیر اس وقت سوچی تھی جب قرآن کریم نے کہا تھا کہ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (۸/۵۹) "کفر کا شیوہ اختیار کرنے والے اس زعم باطل میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ قرآن کی پیروی کرنے والوں پر سبقت لے جائیں گے۔ یاد رکھو! یہ لاکھ حربے استعمال کریں، انہیں کبھی عاجز اور مغلوب نہیں کر سکیں گے۔" اس کے بعد قرآن کریم نے مسلمانوں سے تاکید کی کہ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت پوری پوری قوت کے ساتھ کریں (۸/۶۰ ؛ ۳/۲۰۰)۔ اور پھر اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کر دیا:

کفار مومنین پر غالب نہیں آسکیں گے

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)۔ یہ کبھی نہیں ہو سکے گا کہ خدا کفار کو مومنین پر غالب کر دے۔

اللہ تعالیٰ کے اس حتمی وعدہ اور یقینی اعلان کے بعد (موجودہ) مسلمانانِ عالم کو خود فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ کیا وہ مومنین کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟ خدا کا بنایا ہوا معیار تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کوئی غیر مسلم قوم امتِ مسلمہ (جماعت مومنین) پر غالب نہیں آسکے گی۔ اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ روئے زمین پر شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جس میں بسنے والی امتِ مسلمہ ــــ خواہ ان کی مملکتیں کتنی ہی وسیع اور عریض کیوں نہ ہوں ــــ کسی نہ کسی شکل میں، بالواسطہ یا بلاواسطہ، غیر مسلموں کے اثر و تسلط سے آزاد ہوں۔ (بہرحال یہ ضمنی بات تھی)

قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کفر اور اسلام دو جداگانہ فلسفہ ہائے حیات، دو الگ الگ نظامہائے زندگی ہیں اور مومن اور کافر دو جداگانہ قومیں یا پارٹیاں۔ ایک کو اس نے "حزب اللہ" کہا دوسری کو "حزب الشیطان" (۵۸/۱۹، ۲۲)۔ اور حزب الشیطان کے متعلق وضاحت و صراحت سے کہہ دیا کہ یہ تمہارے نظام کے بدترین دشمن ہیں۔ یہ اسے ناکام کرنے اور مٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی یہ کیفیت خود قرآن کریم بیان کرتا ہو، ان سے کسی صورت میں بھی دوستداری کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں۔ قرآن کریم نے اسے بڑی سختی سے روکا ہے۔ اس نے (نبی اکرمؐ کے علاوہ) حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقا کی زندگی کو مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا اور یہ اس مقام پر کہا ہے جہاں ان کے اس اعلان کو سامنے لایا گیا ہے کہ:

کفار مومنوں کے دوست نہیں ہو سکتے

إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا ۔ حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (۶۰/۴)۔

"جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے، اور جن کی تم، خدا کو چھوڑ کر، محکومیت اختیار کرتے ہو، ان سب سے سخت بیزار ہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان بغض اور عداوت ہے۔ اور ہم اسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا ہم ڈنکے کی چوٹ ساری دنیا میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم تمہارے مسلک اور نظام سے اعلانیہ انکار کرتے ہیں۔ تم میں اور ہم میں یہ خلیج اس وقت تک حائل رہے گی جب تک تم بھی ہماری طرح ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ"۔ یہ ہے وہ مقام جہاں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۶۰/۴)۔ "تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کے مسلک، ملت شعار میں زندگی کا بہترین نمونہ ہے"۔ اسی لئے نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ: أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (۱۶/۱۲۳)۔ "تم ہر طرف سے کٹ کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو"۔ اور جماعت مومنین سے کہا: وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (۲/۱۲۵)۔ "تم اس مقام ابراہیمی کو حاصل کرنے کے لئے میدان حیات کو اپنی تگ و تاز کی جولانگاہ بنا دو"۔ اس نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ:

> "اے جماعت مومنین! تم اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا، کسی کو اپنا رازداں نہ بنانا۔ یہ (دوسرے) لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ، جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آ جاتی ہیں، لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم نے یہ باتیں اس لئے واضح طور پر بیان کر دی ہیں کہ تم عقل و ہوش سے کام لے کر، ان کی طرف سے محتاط رہو۔
>
> دیکھو ایسا کبھی نہ کرنا کہ تم انہیں اپنا دوست بنا لو۔ اگر تم ایسا کرو گے بھی، تو وہ کبھی تمہیں اپنا دوست نہیں بنائیں گے، حالانکہ تم ان تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں، اور ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو

ان (تمہارے مخالفین) کے انبیاءؑ کی طرف نازل ہوئیں تھیں۔ تم یہ کچھ خلوصِ قلب سے کرتے ہو لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (قرآن پر) ایمان رکھتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں، تو شدتِ عداوت سے، تمہارے خلاف غصہ میں، اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ اپنے غصے میں مر مٹو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے اور تمہارے سینے میں کیا چھپا ہوا ہے۔ تمہاری نفسیاتی کشمکش اور دو رُخی زندگی تمہارے لئے سامانِ ہلاکت بن جائے گی۔

ان کے خبثِ باطن کا یہ حال ہے کہ، اگر کوئی اچھی بات تمہیں چھُو کر بھی گزر جائے، تو انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے، تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں لیکن تم ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اگر تم اپنے پروگرام میں ثابت قدم رہے اور قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرتے رہے، تو ان کی تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اللہ کا قانونِ مکافات، انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس لئے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوں گے، نہ کہ ان کی خواہشات کے مطابق۔" [1] (۳/۱۱۹-۱۱۷)۔

اِس باب میں اس نے یہاں تک کہدیا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُوٓاْ ءَابَآءَكُمْ وَإِخْوَٰنَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ ٱسْتَحَبُّواْ ٱلْكُفْرَ عَلَى ٱلْإِيمَٰنِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ۔ قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَٰنُكُمْ وَأَزْوَٰجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَٰلٌ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَٰرَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ

---

[1] اِن آیات کا متن اپنے مقام پر درج کر دیا جائے گا۔ سرِدست آپ کسی بھی نسخۂ قرآن کریم سے انہیں ملاحظہ فرمالیجئے۔

اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ
اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ۔ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۹/۲۳-۲۴) ۔

"اے ایمان والو! (اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ آئینِ خداوندی کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کی تفریق، نسلوں اور خونی رشتوں کی بنا پر نہیں ہوگی بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک کی رو سے ہوگی۔ لہٰذا، اور تو اور، اگر) تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کریں تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ۔ یاد رکھو! جو اس تنبیہ کے باوجود ان سے دوستداری کے تعلقات رکھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا، کیونکہ ایسا کرنا، قانونِ خداوندی سے سرکشی کے مترادف ہوگا۔ (اے رسولؐ!) ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، اور دیگر اہلِ خاندان اور مال و دولت، جو تم کماتے ہو۔ اور وہ تجارت، جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ محلات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) سے زیادہ عزیز اور اس کے قیام و بقا کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ محبوب ہوگئی تو پھر تم اپنی اس روش کے نتائج کا انتظار کرو تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رو سے اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو، خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جائے۔"

اس قسم کی تعلیمات، تاکیدات اور تنبیہات کے بعد اللہ تعالیٰ کو پکے اور سچے مومنوں کے ایمان کی پختگی پر اس قدر یقین تھا کہ اس نے پورے اعتماد اور بھروسہ سے کہدیا لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ ۔ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲) ۔ "جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات وابستہ کریں جو خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) کے خلاف آمادہ بجنگ ہوں، خواہ وہ ان کے ماں باپ، اولاد، بہن بھائی یا دیگر افرادِ خاندان ہوں۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ وحیٔ خداوندی زندگی کے ہر گوشے میں ان کے لئے وجۂ تقویت بنتی ہے۔ اس کا نتیجہ جنت کی خزاں ناآشنا بہاریں ہیں، مختصر الفاظ میں یہ کہ خدا ان سے راضی ہوگیا اور یہ اپنے خدا سے۔ یہی لوگ ہیں جنہیں حزب اللہ — خدا کی پارٹی — کہا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی پارٹی ہمیشہ کامیاب و کامران

رہتی ہے۔"

قرآنِ کریم سے یہ بھی واضح ہے کہ جماعتِ مؤمنین میں منافقین بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اس جماعت میں اس قسم کے خیالات پھیلاتے رہتے ہوں گے کہ ساری دنیا ہماری مخالف ہے اگر ہم اپنے قریب ترین کفار، یعنی قریش وغیرہ سے دوستداری کے تعلقات وابستہ کرلیں تو ہمیں اس سے تقویت حاصل ہو جائے گی ـــــ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خفیہ طور پر ان سے اس قسم کے روابط و مراسم بھی قائم کرتے ہوں۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس قسم کی وساوس انگیزیوں کو بے نقاب کر دیا۔ اور جماعتِ مؤمنین سے کہدیا کہ یاد رکھو، یہ منافق وہ ہیں

منافقین کی روش

اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۴/۱۳۹)۔ "جو لوگ جماعتِ مؤمنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ کیا یہ ایسا اس خیال سے کرتے ہیں کہ اس سے انہیں کچھ تقویت حاصل ہو جائے گی۔ ان سے کہدو کہ تقویت پوری کی پوری صرف نظامِ خداوندی سے وابستہ رہنے سے حاصل ہو گی، مخالفین کے ساتھ دوستداری کے تعلقات سے نہیں۔ ان سے ایسے تعلقات قطعاً وابستہ نہیں کئے جا سکتے۔" (واضح رہے کہ "کفار" میں ہر قسم کے غیر مسلم شامل ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب۔ اہل کتاب کے متعلق وضاحت آگے چل کر سامنے آجائے گی جہاں قرآنِ کریم نے ان کے ساتھ بھی دوستداری کے تعلقات سے منع کیا ہے) [دیکھئے (۵/۵۱) حتیٰ کہ اس نے یہاں تک بھی کہدیا کہ جو لوگ تمہارے دین سے استہزا کریں، ان سے بھی دوستداری کے تعلقات وابستہ نہ کرو۔ (۵/۵۷)]

اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاہدات ہو سکتے ہیں اور، عام انسانی سطح پر، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان سے معاشرتی مراسم بھی روا رکھے جا سکتے ہیں لیکن انہیں معتمد علیہ اور راز داں نہیں بنایا جا سکتا۔ اور اسی بنا پر انہیں اسلامی حکومت کے کاروبار میں بھی شریک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مفاہمت نہیں کی جاسکتی

اسلام اپنے اصولوں میں کسی قسم کی لچک نہیں رکھتا۔ اس لئے اس باب میں غیر مسلموں کے ساتھ مفاہمت بھی نہیں کی جا سکتی۔ سورۃ یونس میں ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵)۔ "جب لوگوں کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کیا جاتا ہے تو جو لوگ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے وہ رسول اللہ سے کہتے ہیں کہ قرآن کے ان قوانین و اقدار کو تو ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر تم ہمارے

ساتھ معاملہ کرنا چاہتے ہو تو یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ اور یا کم از کم اس میں ہماری منشا کے مطابق کچھ تبدیلیاں کر دو۔ پھر ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے"۔۔۔۔۔ اس کے جواب میں کہا قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)۔ " اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ یہ میرے اختیار میں ہی نہیں کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی کر دوں۔ میرا منصب تو اس قرآن کا اتباع کرنا ہے۔ اگر میں اس کی خلاف ورزی کر دوں تو اس کے تباہ کن نتائج سے مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ اس سے میں بھی بچ نہیں سکوں گا۔ اس لئے میں ایسا نہیں کر سکتا"۔ دوسری جگہ ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸/۹)۔ "یہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم اپنے مقام سے ہٹو، کچھ یہ اپنے مقام سے ہٹیں اور اس طرح باہمی مفاہمت کر لی جائے"۔ اس سلسلہ میں حضورؐ سے کہا گیا وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱/۱۱۳)۔ " دیکھنا تم ان کی طرف ذرا نہ جھکنا، اگر تم اپنے مقام سے ذرا بھی ہٹ گئے تو اسی جہنم میں جا گرو گے جس میں یہ جانے والے ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ حق اور باطل میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن اگر حق اپنے مقام سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو وہ حق رہتا ہی نہیں۔ حق کے تو بنیادی معانی ہی یہ ہیں کہ وہ اپنے مقام پر اٹل ہو۔ اسے مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ دو۲ اور دو۲ چار ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں دو۲ اور دو۲ تین ہوتے ہیں اور وہ دونوں اس پر جھگڑ رہے ہیں۔ ایک صلح کرانے والا ان سے کہتا ہے کہ میاں! اس قسم کی ضد سے تو معاملہ طے نہیں ہوگا۔ نہ تمہاری بات رہے نہ اس کی۔ تم اس پر صلح کر لو کہ دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص دو۲ اور دو۲ تین کہتا تھا اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ پہلے بھی غلط کہتا تھا، اب بھی غلط کہہ رہا ہے۔ لیکن، جو شخص دو۲ اور دو۲ چار کہتا تھا وہ حق و صداقت کی بات کہتا تھا۔ اگر اس نے " دو اور دو ساڑھے تین"، تسلیم کر لیا تو یہ نہ حق رہا نہ صداقت، یہ تو غلط اور باطل ہو گیا۔ کسی سوال کے غلط جوابات سینکڑوں ہو سکتے ہیں لیکن صحیح جواب ایک اور صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ حق، باطل کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کوئی ضد کی بات نہیں، یہ حق کا فطری تقاضا ہے۔

یہ ہے صورت مسلموں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی۔ اس کے بعد آگے بڑھیے۔ اس سے اگلی آیت ہے:

(۲/۷) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔

اس آیت کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہریں لگادیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے"۔ آپ اس ترجمہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس الجھن پر دوبارہ غور کیجئے جسے ہم نے اس سے پہلی آیت (۲/۶) کے عام ترجمہ کے ضمن میں پیش کیا تھا۔ ان دونوں آیات کے مروجہ ترجمہ سے بات یوں سامنے آتی ہے کہ جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے یکساں ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اللہ نے ان کے کانوں اور دلوں پر مہریں لگا رکھی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں یعنی یہ لوگ کفر اس لئے اختیار کرتے ہیں (اور ایمان اس لئے نہیں لاتے) کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگادی ہیں اور اسی لئے ان کے لئے یکساں ہے کہ خواہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ آپ نے دیکھا کہ جو الجھن پہلے دشوار تھی، اس آیت کے متداول ترجمہ سے وہ دشوار تر ہو گئی۔ اس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا قصور ہی کیا۔ یہ تو اس باب میں بے بس اور مجبور ہیں —— لیکن یہ دشواری ایک معمہ بن جاتی ہے۔ جب اس ترجمہ کے ساتھ اگلے الفاظ بھی ملالئے جائیں کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ "انہیں سخت عذاب ہوگا"۔ اس سے معاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب خود اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی اور اس کی وجہ سے ان میں یہ صلاحیت ہی نہ رہی کہ یہ ایمان لا سکتے، اس لئے یہ کافر رہے، تو پھر انہیں عذاب کیوں دیا جائے؟ —— ہے نا یہ بات ایسی کہ اس پر ناطقہ سر بگریباں اور خامہ انگشت بدنداں، رہ جائے! اس قسم کے مروجہ ترجموں سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں اس کی اس سے بھی واضح تر مثال سورۃ النحل کی آیت (۱۶/۹۳) میں سامنے آتی ہے اس میں کہا گیا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۶/۹۳)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنادیتا (نہ کوئی کافر ہوتا نہ کوئی مومن)۔ وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (ایضاً) لیکن اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے"۔ یہاں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہدایت یا گمراہی اختیار کرنا انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کہا ہے وَلَتُسْــَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳)۔ "لیکن تم سے پوچھا جائیگا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا"۔ دیکھا آپ نے کہ بات کیا ہوئی؟ پہلے کہا کہ خدا جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہے ہدایت دیدیتا۔ اور اس کے بعد کہا کہ "وہ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے گمراہی کا راستہ کیوں اختیار کیا تھا"۔

قرآن کریم کے مروجہ تراجم اور اسے سطحی طور پر سمجھنے کے ان نتائج کے بعد، اب آیئے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف۔

صحیح مفہوم قرآنِ کریم نے (۲/۷) میں کہا یہ ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں ان کے دلوں پر اللہ مہریں لگا دیتا ہے لیکن اللہ نے دوسری جگہ بات ان چار الفاظ واضح کر دی کہ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (۴/۱۵۵)۔ "یہ مہریں ان کے کفر کی وجہ سے لگتی ہیں"۔ یعنی یہ نہیں کہ اللہ ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے، اس لئے وہ کفر کی روش اختیار کرتے ہیں، بلکہ یہ کہ چونکہ وہ کفر کی روش اختیار کرتے ہیں اس لئے ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔

اب آیئے سورۃ النحل کی آیت (۱۶/۹۳) کی طرف جس کا غلط مفہوم، بیسیوں قسم کی الجھنیں پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے[1]۔ یعنی وہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳)۔

دنیا میں فتنہ و فساد، جور و استبداد، ظلم و استحصال، کو عام دیکھ کر حساس، لیکن سطح بین لوگ عام طور پر کہتے سنائی دیں گے کہ خدا نے ایسا کیوں نہ کر دیا کہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ ظلم و استبداد کر ہی نہ سکتے۔ سب انسان نیکی کے راستے پر چلتے رہتے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو بھی دیگر اشیاء کائنات کی طرح ایک ہی راستہ پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کر دیتا۔ ——— وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۶/۹۳) ——— لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسانوں کو مجبور پیدا نہیں کیا، صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا۔ اسی اختیار و ارادہ کا نتیجہ ہے کہ جب وہ زندگی کے دوراہے پر آتا ہے تو اسے (غلط اور صحیح) دونوں رستے نمایاں طور پر دکھا دیئے جاتے ہیں ——— وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰/۱۰) اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ بالفاظِ دیگر، وہ جی چاہے تو غلط راستہ اختیار کر لے اور جی چاہے صحیح راستہ پر گامزن ہو جائے ——— وَيُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۱۶/۹۳)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ غلط راستہ پر چلنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور صحیح راستہ پر چلنے کے ثمرات کیا۔ وہ جونسا راستہ اختیار کرتا ہے اس کے نتائج اسی کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں مواخذہ یا بازپرس کہتے ہیں ——— وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳)۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، انسانی اعمال کے نتائج سزا کے طور پر، اس پر، کہیں خارج سے وارد نہیں کئے جاتے۔ ہر نتیجہ، خود، عمل کے اندر

---

[1] قرآنِ کریم میں اس انداز کی آیات بکثرت آئی ہیں۔ ان کا صحیح مفہوم اپنے اپنے مقام واضح کر دیا جائے گا۔

پوشیدہ ہوتا ہے جس طرح آم کی گٹھلی میں آم کا پیڑ اور ببول کے بیج میں ببول کا درخت۔ ہوتا صرف اتنا ہے کہ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے اور نتیجہ اس کے بعد برآمد ہوتا ہے۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے اسی ربط و ردف کے متعلق فرمایا وَلۡتَنظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ (۵۹/۱۸) "ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ دیکھے کہ اس نے اپنے "کل" کے لئے پہلے سے کیا بھیجا ہے"۔ "کل" کے معنے ہی یہ ہیں کہ عمل کا نتیجہ اس کے ارتکاب کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ دوسری جگہ ہے یَوۡمَ یَنظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدَاهُ (۷۸/۴۰)۔ جب انسان اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے لئے پہلے سے کیا بھیج رکھا ہے"۔

عمل اور اس کے نتیجہ کا باہمی تعلق

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نتائج کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے مثلاً اسی آیت (۲/۲۶) میں کہا گیا ہے کہ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ (۱۶/۹۳)۔ جو شخص صحیح راستہ پر چلنا چاہتا ہے خدا اس کی راہنمائی صحیح راستہ کی طرف کر دیتا ہے۔ جو غلط راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اسے غلط راہ دکھا دیتا ہے۔ یا مثلاً زیرِ نظر آیت (۲/۷) میں کہا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ "اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں"، حالانکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خود خدا نے یہ کہا کہ یہ مہریں خود ان لوگوں کے کفر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بات واضح ہے۔ عمل کا ابتدا انسان کی طرف سے ہوتی اور اس کے نتائج خدا کے مقرر کردہ قانون کی رو سے مرتب ہوتے ہیں۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون (یوں کہیئے کہ) اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اور آخر الامر اسے پکڑ لیتا ہے یعنی اس کے مطابق اس عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ (مثلاً) بنی اسرائیل کی غلط روی کے سلسلہ میں کہا فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ (۶۱/۵) "جب وہ خود ٹیڑھے ہو گئے تو خدا نے اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا"۔ یا دوسری جگہ ہے ثُمَّ انۡصَرَفُوۡا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ (۹/۱۲۷)۔ "جب انہوں نے خدا کے بتائے ہوئے راستہ سے منہ موڑ لیا تو خدا نے ان کے دلوں کو اسی طرف موڑ دیا"۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے جامع طور پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ (۱۳/۱۱)۔ "اللہ کسی قوم کے احوال و کوائف میں تبدیلی نہیں کرتا تا وقتیکہ وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے"۔ یعنی جس قسم کی تبدیلی وہ قوم اپنے اندر پیدا کرے گی خدا کا قانون اُسے ایسا ہی بنا دے گا۔ بالفاظِ دیگر، اس جہانِ سعی و عمل میں، آغازِ کار انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے (INITIATIVE LIES WITH MAN) اور خدا کا قانون اسے (FOLLOW) کرتا ہے۔ انسان جو کچھ بننا چاہتا ہے خدا کا قانون اسے ویسا بنا دیتا ہے، اور جو کچھ وہ اسطرح

مسئلہ تقدیر کا لُبِ لباب

بن جاتا ہے (درخت کے پھل کی طرح) اس کی خصوصیات کی اس سے نمود ہوتی رہتی ہے۔ مسئلہ تقدیر کا یہی لُبِ لباب اور ماحصل ہے جیسے علامہ اقبالؒ نے بڑے دلکش اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ:

رمزِ باریکش بہ حرفے مُضمر است
تو اگر دیگر شوی، اُو دیگر است

یعنی بات تو بڑی دقیق اور لطیف ہے لیکن، یہ راز ایک حرف کے اندر چھپا ہوا ہے اور وہ حرف یہ ہے کہ اگر تو بدل جائے تو تیری تقدیر اسی کے مطابق بدل جاتی ہے۔ یعنی جیسا تو خود ہو جائے ویسی ہی تیری تقدیر بن جاتی ہے۔ خدا کا اسی قسم کا قانون تم پر لاگو ہو جاتا ہے۔

خاک شو، نذرِ ہوا سازد تُرا
سنگ شو، بر شیشہ اندازد تُرا

اگر تو اپنے آپ کو راستے کا گرد و غبار بنالے تو ہوا کا ادنیٰ سا جھونکا بھی تجھے اڑائے اڑائے پھرے گا اور منتشر کر دیگا، لیکن اگر تو اپنے اندر پتھر کی سی صلابت پیدا کرلے تو جس شیشہ سے ٹکرائے وہ چکنا چور ہو جائے گا۔

شبنمی! افتادگی تقدیرِ تُست
قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

اگر تو اپنے آپ کو شبنم بنالے تو فضا کی بلندیوں سے پستیوں کی طرف آگرے اور سورج کی ایک ننھی سی کرن تمہارا تشخص اور وجود ختم کر دے۔ لیکن اگر تو اپنے آپ کو بحرِ زخار بنالے تو تجھے بقائے دوام نصیب ہو جائے۔

بنابریں اگر تو کسی طرح پستی میں گر گیا ہے تو وہاں بیٹھا یونہی تقدیر کو نہ روتا رہ، نہ ہی یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے کہ جب خدا نے میری قسمت میں لکھا ہی ایسا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ غلط ہے۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست

تم اس وقت جس حالت میں ہو اسی کے مطابق خدا کا قانون تم پر وارد ہو رہا ہے، اگر تم چاہتے ہو کہ خدا کا کوئی دوسرا قانون تم پر منطبق ہو، تو اپنے آپ کو بدل لو، خدا کا دوسرا قانون تم پر عائد ہو جائے گا۔ خدا کے ہاں تو لاانتہا قوانین ہیں۔ جس قسم کا انسان خود بننا چاہے اسی قسم کا قانون اس پر وارد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، جب خدا انسان کے کسی عمل کے نتیجہ کو اپنی

طرف منسوب کرتا ہے تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے۔ یعنی "اس نے ایسا کیا تو ہم نے ایسا کر دیا" ایک شخص سنکھیا کھانے سے مر جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سنکھیا نے اُسے ہلاک کر دیا۔ یہ بھی کہ اس نے سنکھیا کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا اور یہ بھی کہ اس نے سنکھیا کھایا اور خدا نے اسے ہلاک کر دیا۔ اور کلیہ کے طور پر یہ بھی کہ جو بھی سنکھیا کھائے گا خدا اُسے ہلاک کر دے گا۔ بالفاظِ دیگر کائنات میں جو کچھ خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے ہوتا ہے اُسے خدا براہِ راست اپنی طرف بھی منسوب کر لیتا ہے (مثلاً) بارش خدا

اعمال کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے

کے متعین کردہ قانونِ فطرت کی رو سے ہوتی ہے اور یہ قوانین ایسے اٹل ہیں کہ جو انسان ان کا صحیح علم حاصل کرے وہ بتا سکتا ہے کہ بارش کب اور کہاں ہو گی۔ اس کے باوجود اللہ اُسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے اِنَّ اللّٰہَ وَ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ (۳۱/۳۴) "خدا بارش برساتا ہے"۔ یا وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ (۲/۱۶۴) "اللہ تعالیٰ آسمان سے مینہ برساتا ہے"۔ حتیٰ کہ وہ بھی یہ کہتا ہے وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا (۱۶/۸۰)۔ "اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے مسکن بنایا۔ اور اس نے مویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لئے گھر بنائے"۔ حالانکہ (ظاہر ہے کہ) خیمے اور مکانات انسان خود بناتے ہیں۔

انسان جو کچھ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ مثلاً (وحی کو چھوڑ کر) انسان ہر قسم کا علم اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرتا ہے لیکن چونکہ حصولِ علم کی بنیادی صلاحیت خدا کی عطا کردہ ہے اس لئے وہ کہتا ہے عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ (۹۶/۵)۔ "خدا نے انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جسے وہ جانتا نہیں تھا"۔ وہ یہاں تک بھی کہتا ہے الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ (۹۶/۴)۔ "خدا نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا"۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ بچہ قلم کے ساتھ لکھنا خود سیکھتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں لین دین کی دستاویزات کے سلسلہ میں کہا کہ وَلَا یَاۡبَ کَاتِبٌ اَنۡ یَّکۡتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ (۲/۲۸۲)۔ "کاتب کو ہرگز نہیں چاہیئے کہ جس طرح خدا نے اسے لکھنا سکھایا ہے، وہ اس دستاویز کو لکھنے سے انکار کر دے"۔ سورۃ مائدہ میں شکاری کتوں کے ذریعہ شکار کرنے کے سلسلہ میں کہا وَمَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ مُکَلِّبِیۡنَ تُعَلِّمُوۡنَہُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ (۵/۴)۔ "جس طرح خدا نے تم کو سکھایا تھا تم نے اسی طرح ان شکاری کتوں کو سدھایا ہے"۔ ظاہر ہے کہ شکاریوں کو خدا یہ نہیں سکھاتا کہ کتوں کو شکار کرنے کے لئے کس طرح سدھایا جاتا ہے۔ اس فن کو وہ خود سیکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ حصولِ علم کی صلاحیت بنیادی طور پر خدا کی عطا فرمودہ ہے، اس لئے خدا ان امور کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے

یہی ہے وہ حقیقت جسے حضرت ابراہیمؑ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ (۲۶/۷۹-۸۰) "خدا وہ ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑجاتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے۔"

ان آیات سے واضح ہے کہ جو نتائج خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے مرتب ہوں (خواہ وہ صحیفۂ فطرت میں بکھرے ہوئے قوانینِ فطرت ہوں یا قرآن کریم کے اندر محفوظ اقدار و قوانینِ خداوندی) خدا انہیں اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ اس نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲/۷) کیوں کہا ہے۔ یعنی یہ کیوں کہا ہے کہ خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ یا جو گمراہ ہونا چاہتا ہے خدا اُسے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے وغیرہ۔

قرآن کریم کی جن آیات میں کسی بات کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہو اگر اس کا ترجمہ یوں کرلیا جائے کہ "خدا اپنے قانون کے مطابق یوں کرتا ہے" یا یہ کہ "قانونِ خداوندی کی رو سے ایسا ہوتا ہے" تو تمام الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ میں نے اس باب میں یہی انداز اختیار کر رکھا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وغیرہ آیات میں خَتَمَ اور طبع کے الفاظ آئے ہیں۔ جب آپ کسی

ختم اور طبع کے معانی

بوتل میں کوئی چیز بھر کر اُسے کارک سے بند کر دیتے اور مزید حفاظت کیلئے اس پر لاکھ کی مہر بھی لگا دیتے ہیں، تو اسے خَتَمَ کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو پورے طور بند کر دینا (یہاں سے ختمِ نبوت کا مفہوم بھی سمجھ میں آجائے گا)۔ بعض اوقات آپ لفافہ وغیرہ بند کرکے اس پر لاکھ لگا دیتے ہیں۔ اور اس لاکھ کے اوپر اپنی مہر کے ذریعہ اپنا نام نقش کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے کو طَبَعَ کہتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یعنی کسی شئ کو اس طرح بند کر دینا کہ اس کے اندر کچھ نہ جا سکے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ انسان کے دل کی یہ حالت کس طرح ہو جاتی ہے۔ یہ حالت کہ علم و بصیرت کی کوئی بات اس میں جا ہی نہ سکے۔

(۱) سورۃ مؤمن میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق کہا کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰/۳۵)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو بلا سند و دلیل، قوانینِ خداوندی کی مخالفت کئے جاتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ روش کس قدر قابلِ مذمت ہے۔ یہ محض نخوت، تکبر اور غرور کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں" اس کے بعد کہا کہ "اس طرح خدا ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔"

مہریں کیسے لگتی ہیں (۲) سورۂ روم میں ہے کہ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَلَئِن جِئْتَهُم بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ (۳۰/۵۸)۔ "ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے قرآن میں مختلف اسالیب و انداز اختیار کئے، لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اس کی آیات پیش کرو تو یہ بلاسوچے سمجھے کہدیں گے کہ تم تو فریب کار ہو، باطل پرست ہو"۔ اس کے بعد ہے۔ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۳۰/۵۹)۔ "اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے جو بلا علم و دلیل دوسرے کو جھوٹا کہنے چلے جاتے ہیں"۔

(۳) سورۃ انعام میں ہے:

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۶/۲۵)۔

"ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو تیری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں تو بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تیری باتوں کو بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں۔ یہ سوچ کچھ اور رہے ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے دلوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں جس سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں۔ لاکھ دلائل ان کے سامنے پیش کر دیں یہ انہیں تسلیم ہی نہیں کرتے۔ تمہارے ہاں آتے ہیں تو محض جھگڑنے کیلئے اور یہ کہہ کر اٹھ جاتے ہیں کہ محض اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جو ہمیں سناتا رہتا ہے"۔ یوں ان کے دلوں پر مہریں لگتی ہیں۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا (۴۷/۱۶)۔ "یہ تمہاری محفل میں بیٹھے ہوئے اپنے ہی خیالات میں غرق رہتے ہیں۔ اور جب اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے، جنہوں نے یہ باتیں دھیان سے سُنی تھیں، پوچھتے ہیں کہ یہ شخص ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا"۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۴۷/۱۶)۔ "یہ ہیں وہ لوگ، جن کے دلوں پر قانونِ خداوندی کے مطابق مہریں لگ جاتی ہیں۔ اور یہ اپنی خواہشات کے پیچھے اندھا دھند چلے جاتے ہیں"۔

ان کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ (۴۱/۵) "اے رسول! تو جو صبح و شام ہمیں تبلیغ کرتا رہتا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دل پردوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے۔ اس لئے تو جو جی میں آئے کرلے، ہم اپنے پروگرام کو چھوڑنے والے نہیں (۴۱/۵)"

(۴) سورۃ جاثیہ کی وہ آیات (۴۵/۲۳) پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ "تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (ایضاً) "خدا نے اسے علم و عقل رکھنے کے باوجود گمراہی میں چھوڑ دیا۔ اس کے قلب اور سماعت پر مہریں لگا دیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ اس سے اس کی دیکھنے، سننے، سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں"۔ اسی کو سورۃ النحل میں یوں کہا گیا ہے کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (۱۶/۱۰۷) "یہ اس لئے کہ انہوں نے دنیاوی مفاد کو مستقبل کے مفاد پر ترجیح دی" اور اس کے بعد ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۶/۱۰۸)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جن کے سمع اور بصر اور قلوب پر خدا نے مہریں لگا دیں۔ یہی وہ ہیں جو اپنے انجام کی طرف سے غافل رہتے ہیں"۔

ان آیات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جب انسان غور و تدبر سے کام نہیں لیتا تو اس میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے[1] اسی کو دلوں پر مہریں لگنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ محمدؐ میں اس عظیم حقیقت کو نہایت مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (۴۷/۲۴) "یہ قرآن کریم پر غور کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟" اس آیت میں

دِل پر خود دل کا تالا

ایک ایسا نکتہ بیان کیا گیا ہے جس پر روشنی ڈالے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کہا گیا ہے کہ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ ان الفاظ کا ترجمہ مشکل ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کے دلوں پر خود ان دلوں کے تالے پڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں پر تالے کہیں خارج

---

[1] علم الارتقاء کے ماہرین بتاتے ہیں کہ جو نوع اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے تو عرصہ کے بعد فطرت اس کے اس عضو کو ناپید ہی کر دیتی ہے۔

سے نہیں پڑتے۔ یہ تالے خود دلوں کی کارگاہ میں ڈھلتے ہیں۔ دل اپنے خودساختہ تالوں کو، خود اپنے اوپر ڈال کر ان کے اندر اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص کمرے کے اندر جا کر، دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دیتا ہے اور پھر چیخنا چلاتا ہے کہ میں باہر کیسے نکلوں۔ مجھے باہر نکالو۔ حالانکہ جو کنڈی اس نے خود لگائی تھی اُسے وہ خود ہی کھول سکتا ہے اور یہی ہے وہ حقیقت، جو دوسرے مقام پر قولِ فیصل بن کر ہمارے سامنے آگئی ہے، جہاں قرآن نے کہا ہے کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳/۱۴)۔ "نہیں بات یہ نہیں جیسے لوگ عام طور پر سمجھے ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ خود ان کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں"۔ اسی کو خدا کی طرف سے لگائی ہوئی مہریں کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲/۷) سے مفہوم کیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں کہا تھا کہ جو لوگ دیدہ دانستہ کفر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی روش کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ ان کے لئے یکساں ہے خواہ ان کی روش کے تباہ کن نتائج سے انہیں آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ وہ صحیح بات ماننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوں گے! ان کی اس کاوش کا نتیجہ یہ بتایا کہ رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ان کے سمجھنے، سوچنے، سننے، دیکھنے کی صلاحیت ہی مفلوج ہو جاتی ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲/۷) چونکہ یہ سب کچھ ان کا اپنا کیا دھرا ہوتا ہے اس لئے اس کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔ اور وہ نتیجہ ہے عذابِ عظیم!

(۲/۷) وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

"عذاب" کا لفظ جس کثرت سے قرآنِ کریم میں آیا ہے اسی کثرت و شدت سے اس کا غلط تصور ہمارے ہاں عام ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہمارے ہاں عذاب شروع ہی مرنے کے بعد قبر میں ہوتا ہے ـــــ قبر کا

عذاب کے معنی

عذاب، حشر کا عذاب ـــــ جہنم کا عذاب ـــــ اور ذہنوں میں اس عذاب کا نقشہ کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے پولیس والے کسی ملزم کو الٹا لٹکا کر، اس کی کھال ادھیڑ رہے ہوں یا لوہے کی گرم سلاخوں سے اس کے جسم کو داغا جا رہا ہو اور وہ اس ناقابلِ برداشت اذیت سے چیخ، چلا رہا اور دہائی دے رہا ہو۔

جہاں تک دنیاوی عذاب کا تعلق ہے اس کی صورت یوں ہے کہ اگر کہیں زلزلہ آئے تو کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہے۔ سیلاب آجائیں تو یہ خدا کا عذاب ہے۔ بارش نہ ہو تو یہ بھی خدا کا عذاب ہے۔ طاعون یا ہیضہ

کی وبا پھوٹ پڑے تو یہ خدا کا عذاب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس عذاب کی شکل عجیب ہوتی ہے۔ فسق و فجور لنڈن میں ہوتا ہے اور زلزلہ میکسیکو میں آجاتا ہے۔ فحاشی اور بے حیائی روس میں ہوتی ہے اور سیلاب پاکستان میں آجاتے ہیں۔ یعنی دنیا کے کسی حصے میں اس قسم کے حوادث نمودار ہوں، کہدیا جاتا ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہے جو فسق فجور کی وجہ سے آیا ہے۔ اور اس کی مدافعت یا ازالہ کے لئے کہا جاتا ہے کہ تم (یعنی مخاطبین) خدا سے معافی مانگو۔ اپنے گناہوں سے توبہ کرو تاکہ خدا کا یہ عذاب ٹل جائے

فطری حوادث

قرآن کریم نے اس قسم کے حوادث کا ذکر اقوامِ سابقہ کے احوال وکوائف کے سلسلہ میں کیا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے اور قوموں کے اعمال اور اس قسم کے طبیعی حادثات میں باہمی ربط و تعلق کیا، اس کی تفصیل اپنے اپنے مقامات پر بیان کی جائے گی۔

جہاں تک دورِ حاضرہ کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے فطری حوادث دنیا کے ہر ملک میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ جو ملک سائنٹیفک تحقیقات کی روشنی میں ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں وہ ان کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ علمِ انسانی رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی رُو سے اس نے اس قسم کے حوادث میں سے اکثر پر قابو پا لیا ہے۔ باقیوں پر بھی وہ اسی طرح قابو پالے گا۔ خدا نے جب انسان سے کہا ہے کہ ہم نے کارگہِ کائنات کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے تو اس سے مراد ہی یہ ہے کہ انسان کو یہ صلاحیت عطا کر دی گئی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے (تفصیل اس کی آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ لہٰذا اس قسم کے کائناتی حوادث کے متعلق کہنا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں مبتلائے عذاب کر دیتا ہے، صحیح نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اقدار و اصولِ خداوندی کی پامالی سے قوم کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔ اس کا اولین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں عدل کا تصور نہیں رہتا۔ وہ اس دھاندلی کی روش کو پہلے غیر قوموں کے خلاف اختیار کرتی ہے اور اسے جذبۂ حُبّ الوطنی (PATRIOTISM) سے تعبیر کر کے اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ جراثیم خود ان کے اپنے اندر بھی سرایت کر جاتے ہیں۔ اور اس طرح اس معاشرہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے جس کا نتیجہ زندگی کے ہر گوشے میں فساد ہوتا ہے [فساد کی تشریح آیت (۲/۱۱) کے تابع ملے گی]۔ اس کا اثر ان کے نظم و نسق پر بھی پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کائناتی حوادث کا مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ یہ تعلق ہے قوموں کے اخلاقی بگاڑ اور کائناتی حوادث کی پیدا کردہ تباہیوں کا۔ بالفاظِ دیگر، کائناتی حوادث — سیلاب، زلزلہ وغیرہ — انسانوں کے "گناہوں" کی وجہ سے نہیں آتے۔ یہ فطرت کے قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔ انسانوں کے "گناہوں" (اخلاقی اقدار سے اعراض برتنے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں نہ ان حوادث کی روک تھام کی صلاحیت رہتی ہے اور نہ ہی

ان کی وجہ سے پیدا شدہ تباہی کے ازالہ کی استعداد۔

جہاں تک اُخروی عذاب کا تعلق ہے یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اس زندگی کے احوال وکوائف ایسے بسیط حقائق ہیں جنہیں ہم محسوس طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ انہیں قرآن کریم میں تشبیہات اور تمثیلات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انہی کی رو سے ہم متعلقہ مقامات میں بتائیں گے کہ ہماری بصیرت کے مطابق ان کا مفہوم کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد دیکھئے کہ "عذاب" کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵) میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے زندگی کا تصور حرکیاتی ہے۔ نہ تو یہ دائرے میں گردش کرتی ہے اور نہ ہی جامد ہے۔ زندگی اپنے نقطۂ آغاز سے مختلف مراحل طے کرتی، ارتقائی منازل میں سے گزرتی، مقامِ آدمیت تک پہنچی ہے۔ یہ مقام انتہائے راہ نہیں اس نے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھنا ہے اور یہ سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ارتقائے آدم کے سلسلۂ دراز کا تو ابھی آغاز ہی ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ زندگی کا آگے بڑھتے چلے جانا اس کی کامیابی ہے اور اس کا کسی مقام پر رُک جانا اس کی انتہائی ناکامی اور نامرادی —— زندگی، جب تک ایک ندی کی طرح رواں دواں رہے، زندگی ہے۔ جب وہ کہیں رک کر جوہڑ بن جائے تو اس کی بنیادی خصوصیت (روانی) پہلے محبوس اور اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے زندگی کے کسی مقام پر رُک جانے کو "عذاب" سے تعبیر کیا ہے۔ عربوں کے ہاں، صحرا کی خشکی اور گرمی کی شدت سے ان کے جانوروں کو پیاسا رہنا پڑھتا تھا اور اکثر اوقات پیاس کی شدت اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ وہ جانور کھانا پینا بھی چھوڑ دیتا تھا اور اس طرح اس میں چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں رہتی تھی۔ اس کی اس کیفیت کو "عذاب" کہا جاتا تھا۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم نے جہنم کو جَحِیم کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً (۵۶/۴۴) جَحِیم کے معنے رکاوٹ یا روک بن جانے کے ہیں۔

زِندگی کا جامد ہو جانا

ہماری قوم میں، جو بدقسمتی سے صدیوں سے ایک ہی مقام پر کھڑی ہے، حرکت کے مبدّل بہ سکون ہو جانے کی روح فرسا اذیت کا احساس ہی مردہ ہو چکا ہے ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ زندگی ہوتی ہی ایسی ہے۔ اس کربِ اذیت کی کیفیت کا اس سے پوچھئے جو کھیل کے میدان میں دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ دوڑ رہا ہو اور اسے نظر آتا ہو کہ وہ ان سب پر سبقت لے جائے گا۔ لیکن راستے میں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے اور اس طرح وہ آگے بڑھنے کی بجائے رک کر کھڑا ہو جائے، اور پھر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ جو کھلاڑی اس سے کہیں پیچھے تھے، وہ کس طرح آگے بڑھ کر منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ

"عذاب" ہے جسے الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں ذلت و پستی، محکومی و محتاجی، ضعف و ناطاقتی، بے کسی و بے بسی، غربت و افلاس، اور اس کے بعد دوں ہمتی اور پست حوصلگی بلکہ بے حمیتی اور بے غیرتی، سب، اس رک جانے کے فطری نتائج ہیں، اور اس لئے "عذاب" کی مختلف شکلیں۔ یہ اس دنیا کا عذاب ہے۔ اس کے بعد اُخروی زندگی میں عذاب کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس متعلق تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی۔ اسوقت اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے اُسے تشبیہی انداز میں بیان کیا ہے اور بنیادی طور پر کہا ہے کہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۵۰/۲۲)۔ وہاں آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اُٹھ جائیں اور نگاہیں اسقدر تیز ہو جائیں گی کہ وہ فولادی تہوں کو بھی چیر کر نکل جائیں گی۔ اس لئے وہاں زندگی کی جولانگاہ میں رک جانے اور پیچھے رہ جانے کے زیاں سے احساس میں اسقدر شدت پیدا ہوگی کہ اسے دیکھ کر انسان چلا اُٹھے گا اور کہیگا کہ يٰلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا (۷۸/۴۰)۔ اے کاش میں ذی احساس انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودہ ہوتا۔

ذیل میں ہم اس عذاب کی چند ایک مثالیں درج کرتے ہیں جس کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے ہے قرآن کریم بیشتر عذاب کی اجتماعی شکل بیان کرتا ہے۔

ذِلّت وخواری

(۱) قرآن کریم نے اگرچہ عذاب کی مختلف نوعیتیں اور خصوصیات بتائی ہیں ــــ کہیں "عذاب عظیم" (بہت بڑا عذاب) کہا ہے اور کہیں "عذاب الیم" (الم انگیز عذاب) ــــ لیکن ہمارے نزدیک، اس کی شدید ترین، اور سنگین ترین صورت وہ ہے جسے اس نے عَذَابٌ مُّهِينٌ ــــ "ذلت آمیز عذاب" سے تعبیر کیا ہے (۲۲/۵ و دیگر مقامات)۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی قوم کی حمیت اور غیرت بالکل ہی مردہ نہ ہو چکی ہو تو ذلت و خواری سے زیادہ کرب انگیز اور عبرت آموز عذاب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نے داستانِ بنی اسرائیل میں کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ان کی مسلسل سرکشی اور معصیت کوشی کا نتیجہ یہ تھا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا (۳/۱۱۱)۔ "جہاں بھی وہ گئے، ذلت کا رسواکن عذاب سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہا"۔ ہم نے اوپر بتایا ہے کہ جب کسی قوم میں حرکت نہیں رہتی اور وہ ایک مقام پر رک جاتی ہے، تو اس کا نتیجہ وہ تباہی اور بربادی ہے، جسے قرآن کریم نے عذاب کہکر پکارا ہے۔ اسی بنا پر اس نے اس عذاب کی وضاحت کرتے ہوئے، جس میں قوم بنی اسرائیل ماخوذ ہوگئی تھی، ذلت کے ساتھ مسکنت بھی کہا ہے (۲/۶۱)۔ یعنی ان کی شوکت و عظمت مبدل بہ ذلت و پستی ہوگئی، اور ان کی حرکت و حرارت

ساکن ومنجمد۔ ان کی اس روش کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے تھے، کہا کہ صرف بنی اسرائیل ہی نہیں بلکہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ جو قوم بھی ایسی روش اختیار کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہوگی اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں ماخوذ۔

محکومی

(۲) ذلت کی پست ترین شکل یہ ہے کہ کوئی قوم، دوسروں کی محکوم اور غلام ہوجائے۔ مصر میں بنی اسرائیل کی حالت یہی ہوچکی تھی۔ قومِ فرعون نے انہیں اپنا محکوم بنا رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف گئے ہیں تو انہوں نے اس سے کہا یہی تھا کہ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰/۴۷) "قومِ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور انہیں عذاب کے شکنجے میں نہ کسے رکھو"۔ اسی (محکومیت ومغلوبیت) کو قرآن کریم نے استبدال واستخلافِ قومی سے تعبیر کیا ہے یعنی کسی قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا۔ اس استبدال کی شاذ صورت تو یہ ہوتی ہے کہ فاتح قوم، مفتوح قوم کو، اس کے مساکن ومواطن سے نکال باہر کرتی ہے اور خود ان کی جگہ آباد اور مسلط ہوجاتی ہے (جیسے بھارت میں آریوں نے وہاں کے اصلی باشندوں، دراوڑوں کے ساتھ کیا) لیکن اس کی عام شکل یہ ہوتی ہے کہ مفتوح قوم سے ثروت وشوکت چھن جاتی ہے اور اس کی مالک فاتح قوم بن جاتی ہے۔ یہ بھی "ایک قوم کا دوسری قوم کی جگہ لے لینا ہے"۔ سورۃ توبہ میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو۔ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹/۳۹)۔ "اگر تم نے اس سے گریز کیا تو یاد رکھو! خدا تمہیں الم انگیز عذاب میں ماخوذ کردے گا۔ اور وہ عذاب یہ ہوگا کہ کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لے لے گی۔ اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔ یہ اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں قانون کی عملداری ہے۔ اور قانون اس قدر محکم قوتوں کا مالک ہوتا ہے کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

دوسری جگہ ہے:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا

غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸)۔

"تم وہ لوگ ہو کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ نظامِ خداوندی کی اقامت و استحکام کیلئے (فی سبیل اللہ) اپنی تجوریوں کے منہ کھلے رکھو، تو تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بخل برتنے لگ جاتے ہیں۔ بخل برتنے والا اس خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے مال و دولت سنبھال کر رکھتا ہے اور دوسروں کو اس سے محروم کرتا ہے لیکن وہ اتنا نہیں سمجھتا کہ اس کی اس روش کا انجام یہ ہوگا کہ وہ خود بھی اس مال و دولت سے محروم رہ جائے گا۔ ان سے کہدو کہ انفاق فی سبیل اللہ کی تاکیدات سے خدا تم سے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں مانگتا۔ اس میں خود تمہارا ہی بھلا ہے۔ وہ ہر احتیاج سے مستغنی ہے۔ محتاج تو تم ہو۔ یاد رکھو! اگر تم نے انفاق کی دعوت پر گریز کی راہیں اختیار کیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی"۔

(۳) خدا نے جماعتِ مؤمنین کو اُمّتِ واحدہ کہکر پکارا ہے اور بار بار کہا ہے کہ تفرقہ انگیزی اور فرقہ بندی کفر اور شرک ہے اور اس کا نتیجہ، تباہی اور بربادی کا رُسوا کن عذاب۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے

فرقہ بندی

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۳/۱۰۴) "دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح ہدایت آجانے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے"۔

باہمی اختلاف کے نتیجہ میں جو عذاب وارد ہوتا ہے اس کے ظہور و نمود کی مختلف شکلیں ہیں جنہیں قرآن کریم نے سورۃ الانعام میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:۔

قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ
اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ۔ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ
بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ
لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ (۶/۶۵)۔

"اس عذاب کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نچلے طبقے میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگ جاتے ہیں اور

یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں"۔ یہ تو باہمی خانہ جنگی ہوتی ہے لیکن کبھی یہ تباہی دوسری قوموں کے ہاتھوں شکست کھا کر بھی وارد ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں جماعتِ مؤمنین سے کہا گیا کہ جو مخالفین اب تمہارے خلاف میدانِ جنگ تک میں اُتر آتے ہیں، قَاتِلُوْهُمْ (۹/۱۴)۔ تم ان سے جنگ کرو۔ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ (۹/۱۴)۔ اللہ چاہتا ہے کہ وہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب میں مبتلا کرے۔ اور یہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائیں (نیز ۹/۵۲)۔

(۴) یہ تو عذاب کی وہ شکل ہے جس میں ایک ہی جھٹکے میں قصہ تمام ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وجہِ سوہانِ روح وہ عذاب ہوتا ہے جس میں قوم کے اعصاب پر خوف کا احساس مسلط رہتا ہے۔ قرآن کریم نے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ یہ بتایا ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ ایسی قوم نہ خوف کے عذاب میں مبتلا ہوگی اور نہ ہی حُزن کی پیدا کردہ افسردگی سے ملول خاطر۔ خوف عام طور پر بیرونی خطرات سے پیدا ہوتا ہے اور حزن اس داخلی کیفیت کو کہتے ہیں۔

خوف اور حزن

جس میں انسان غم و الم کے احساس میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہ وہ جہنم ہے جس کے متعلق کہا کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰی (۸۷/۱۳)۔ جس میں انسان نہ زندہ رہتا ہے نہ مرتا ہی ہے"۔ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷)۔ "نظر آتا ہے کہ موت چاروں طرف سے اس کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے لیکن وہ آتی نہیں"۔ ایمان و اعمالِ صالحہ قوم کو عذاب کی ان دونوں شکلوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس سورۃ النحل میں قرآن نے تمثیلی انداز میں سمجھایا ہے کہ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (۱۶/۱۱۲) "ایک بستی تھی جس کے رہنے والوں کو امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی ——— یعنی نہ انہیں کسی قسم کا خوف تھا نہ حزن ——— ان کی خوشحالیوں کی یہ کیفیت تھی يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (ایضاً) رزق ان کی طرف ہر گوشے سے بافراط کھنچے کھنچے چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (ایضاً) انہوں نے ان نعمائے خداوندی سے کفر برتا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (ایضاً)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مُبتلا ہو گئے۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (ایضاً) اور یہ نتیجہ تھا ان کے اُس خود ساختہ نظام کا جو انہوں نے نظامِ خداوندی کے علی الرغم اختیار کر رکھا تھا ——— یہاں سے واضح ہے کہ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہیں۔ یعنی رزق کی تنگی اور بیرونی خطرات کا دھڑکا۔ تنگیٔ رزق کے متعلق اس نے واضح

بھوک کا عذاب

الفاظ میں کہا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے قانون سے اعراض برتتا ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور جس کی یہاں روزی ہو جائے وہ قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھایا جاتا ہے"۔ دوسری جگہ ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲)۔ "جو اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ (بھوک کے عذاب کے متعلق قرآن کریم کے معاشی پروگرام کے ضمن میں وضاحت سے لکھا جائے گا۔ اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

(۴) سورۃ النحل کی مذکورہ آیت (۱۶/۱۱۲) میں کہا گیا ہے کہ کفرانِ نعمت سے قومیں بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے دوسرے مقام پر بڑے محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴/۲۸) کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جنہوں نے نعمائے خداوندی سے کفر برتا اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا اُتارا جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی پوچھنے والا تک نہ تھا۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۹)۔ یعنی جہنم میں جا اُتارا جو ٹھہرنے کا نہایت ہی بُرا مقام ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جہنم اور جنت کے متعلق تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر ہوگی۔ یہاں اتنا بتا دینا

دنیاوی جہنم

کافی ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹/۵۴) جہنم کہیں دور نہیں۔ وہ تو کفار کو ہر وقت اپنے گھیرے میں لئے رہتی ہے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۸۲/۱۶)۔ "اس کی نگاہوں سے یہ اس وقت بھی اوجھل نہیں، وہ انہیں دیکھ رہی ہے"۔ لیکن چونکہ ان کی آنکھوں پر غفلت اور مفاد پرستیوں کے پردے پڑے ہیں اس لئے وہ انہیں نظر نہیں آتی۔ جسے "یوم الحساب" کہا جاتا ہے اس میں ہوتا یہ ہے کہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۷۹/۳۶)۔ جو جہنم پہلے نگاہوں سے مستور ہوتی ہے اُبھر کر دیدۂ بینا کے سامنے آ جاتی ہے۔

(۵) جیسا کہ پہلے بھی تفصیلی طور پر بتایا جا چکا ہے نہ تو قوموں پر تباہی اور بربادی یونہی دھاندلی سے آتی ہے اور نہ ہی کسی قوم کو سرفرازی اور سربلندی "بخشش" کے طور پر ملتی ہے۔ اس جہانِ سعی و عمل میں، مخالف قوتوں (حق و باطل) کا ہر وقت ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ اس تصادم میں جس قوم میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ جس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ شکست کھا جاتی

اور ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے سورۃ انفال میں چند مختصر الفاظ میں اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں جماعتِ مؤمنین سے کہا ہے کہ ہم تمہیں یونہی میدانِ جنگ تک کھینچ نہیں لائے۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) "جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان ہی کی رُو سے زندہ

زندگی اور ہلاکت علیٰ وجہ البصیرت

رہے"۔ یہی وہ اصول ہے جس کی شہادت کے لئے قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی داستانیں اس شد و مد سے بیان کی ہیں۔ ان داستانوں کے بیان کرنے سے مقصد ہی یہ بتانا ہے کہ حق و صداقت کی حامل قوم کس طرح غالب و کامران رہتی ہے۔ اور باطل نظام کی علمبردار قومیں اس طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں کہ اس کے بعد ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات ان کی نوحہ گری کے لئے باقی رہ جاتے ہیں (۴۰/۸۲-۸۵ وغیرہ)۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ تباہیاں یونہی اندھا دھند نہیں آجاتیں۔ قوموں کو پہلے وارننگ (تنذیر) دی جاتی ہے کہ جس نظام کو تم نے اختیار کر رکھا ہے اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔ انہیں یہ وارننگ بار بار دی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس پر کان نہیں دھرتیں اور اپنی غلط روش میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں تو پھر وہ اس جہنم میں جا گرتی ہیں جس کے متعلق انہیں وارننگ دی گئی تھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۱۷/۱۵)۔ "ہم کسی قوم کو تباہ نہیں کرتے تھے، جب تک ان میں پہلے رسول نہیں بھیج دیتے تھے"۔ دوسری جگہ ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۶/۲۰۸-۲۰۹) "ہم کسی بستی کو تباہ نہیں کرتے جبتک ان میں ان پیامبروں کو نہیں بھیج دیتے جو انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کر دیں اور انہیں یاد دلا دیں کہ وہ غفلت میں پڑے نہ رہ جائیں۔ ہم ظالم نہیں کہ کسی قوم کو یونہی دھاندلی سے تباہ کر دیں"۔

قوموں کے زندہ رہنے اور تباہ ہو جانے کا اصول بھی بڑا واضح اور مبنی بر حقیقت ہے۔ طب کی سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا سہتا اور جس فضا میں سانس لیتا ہے۔ وہ لاکھوں کروڑوں ہلاکت انگیز جراثیم سے مملو ہوتی ہے۔ یہ جراثیم انسان کے اندر جاتے ہیں جہاں اس کی قوتِ مدافعت ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اگر وہ قوت محکم ہے تو وہ ان جراثیم کو تباہ کر دیتی ہے اور وہ شخص تندرست رہتا ہے۔ اگر وہ کچھ کمزور ہو گئی ہے تو یہ ہلاکت آفریں جراثیم اس پر غالب آجاتے ہیں۔ اسے مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علاج کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اس فرد کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جائے تاکہ وہ ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے لیکن

اگر صورت ایسی ہو کہ قوتِ مدافعت گھٹتی چلی جائے اور ہلاکت آفریں عناصر غالب آتے جائیں تو ایک دن ایسا آجاتا ہے جب قوّتِ مدافعت آخری شکست کھا جاتی ہے۔ اسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قانونِ مدافعت و مہلت

افراد کی طرح اقوام کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ جسقدر تعمیری کام کرتی ہیں، ان سے ان کی قوت مدافعت بڑھتی ہے، اور اس طرح تخریبی عناصر اس پر غالب نہیں آتے۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ کسی قوم کے تعمیری کام گھٹتے جائیں اور تخریبی اعمال و عناصر بڑھتے، تو وہ قوم آمادہ بہ زوال ہو جاتی ہے، اور آخر الامر مفتوح و مغلوب اور تباہ و برباد۔ قرآن کریم نے اسے میزان کے پلڑوں کے جھکنے اور اٹھنے کی تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷/۸)۔ جس فرد یا قوم کا حسنات کا پلڑا بھاری ہوتا ہے وہ کامیاب و کامران رہتی ہے۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۷/۹)۔ "جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو تباہ کر لیتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ پلڑوں کے ہلکا اور بھاری ہونے کا یہ طریق کار (PROCESS) ایک دن میں تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا۔ اس کے لئے کافی لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے مہلت کا وقفہ یا اجل (میعاد) کہا جاتا ہے۔ جس کے دوران اُس قوم کے لئے اس کی گنجائش اور امکان ہوتا ہے کہ وہ پھر سے اپنی تعمیری و مدافعانہ قوتوں کو بڑھا لے اور آنے والی تباہی سے بچ جائے۔ لیکن جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کی مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۴۹)۔ "ہر قوم کے لئے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ جب وہ وقفہ اپنے آخری لمحہ تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی تباہی میں نہ ایک ثانیہ کی تاخیر ہوتی ہے نہ تقدیم" (نیز ۱۵/۵)۔ وہ لوگ جو بر بنائے جہالت یہ کہتے ہیں کہ عذاب، خدا کی طرف سے وارد ہوتا ہے۔ یعنی نہ اس کے لئے کوئی قاعدہ قانون مقرر ہے نہ ہی کوئی اصول اور معیار۔ وہ جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے۔ ان کے جواب میں کہا۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴/۱۴۷)۔ اگر تم شکرِ نعمت کرو اور ابدی صداقتوں پر ایمان رکھو تو خدا نے تمہیں عذاب دیکر کیا کرنا ہے۔ وہ تو حسن عمل کے بھرپور ثمرات عطا کرتا ہے۔ اور اس کے علیم ہونے کی یہ کیفیت ہے کہ کسی کا ذرہ برابر عمل بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا (۹۹/۷-۸)۔

ہم نے اوپر یہ تو بتایا ہے کہ زوال آمادہ اور آخر الامر تباہ ہو جانے والی قوموں پر عذاب کس کس شکل میں مسلط ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیز متعین طور پر سامنے نہیں آئی کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر قومیں پہلے زوال پذیر اور اس کے

بعد تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔ منتشر طور پر تو یہ اسباب آپ کو قرآن کریم اور اس کتاب میں بھی جا بجا ملیں گے۔ متعین طور پر ان قوموں کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) وہ قومیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتیں۔ قرآن کریم نے تسخیرِ فطرت کی قوت انسانی ممکنات میں بتائی ہے لہٰذا جو قومیں اس قوت سے کام نہیں لیتیں وہ صفِ آدمیت میں شامل ہونے کے قابل بھی نہیں قرار پاتیں، چہ جائیکہ اُن کا شمار زندہ قوموں میں ہو۔ یہ عام طور پر مذہب گزیدہ قومیں ہوتی ہیں جن کے نزدیک دنیا کی ہر شئے قابل نفرت اور ہر جاذبیت مستحق مذمت ہوتی ہے۔ یہ زندہ حقیقتوں سے گریز کی راہیں اختیار کر کے خود ساختہ مقدس افسانوں کی موہوم دنیا میں مگن رہتی ہیں۔

(۲) وہ قومیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں لیکن ان کا استعمال مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہیں کرتیں بلکہ اپنے مفاد کے مطابق کرتی ہیں جس کا نتیجہ قوموں کا باہمی فساد اور تصادم ہوتا ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ قومیں بڑے عروج کی طرف جا رہی ہیں لیکن ان کا یہ عروج ہنگامی اور وقتی ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار سے بے اعتنائی ان کی تعمیر کی بنیادوں میں ٹائم بم رکھ دیتی ہے۔ اور جب اس کے پھٹنے کا وقت آتا ہے تو ان کی تہذیب و تمدن کی یہ ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ قرآن کریم نے قومِ عاد و ثمود وغیرہ کے متعلق بتایا ہے کہ وہ بڑی قابل رشک قوت و ثروت اور تمکن و تسلّط کی مالک تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیدہ ور اور باشعور اور صاحبِ علم و ہنر بھی تھیں لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کر دیا تو نہ ان کی قوت و سطوت انہیں اِس تباہی سے بچا سکی اور نہ ہی ان کا علم و ہنر ان کے کسی کام آیا۔ اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ($\frac{46}{26}$)۔ مغرب کی موجودہ قومیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ انہوں نے فطرت کی قوتوں کو اس قدر وسعتوں، گہرائیوں اور پہنائیوں سے مسخر کیا جس کی مثال نہیں ملتی اور اس طرح کرۂ ارض کے گوشے گوشے پر چھا گئیں اور چونکہ وہ تسخیرِ کائنات میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں اس لئے دنیا نے یہ تصور کر لیا کہ ان قوموں پر زوال نہیں آ سکتا۔ لیکن انہوں نے جو اقدارِ خداوندی کو اپنی زندگی سے الگ کیا تو اس وقت جس جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اس کا کچھ اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو وہاں کے دیدہ وروں کے سینوں سے بے اختیار اُبھر کر فضائے عالم میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے (اس کی تفصیل میری کتاب ——— انسان نے کیا سوچا ——— میں ملے گی)۔

(۳) تیسری شق میں وہ قومیں آتی ہیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کرتی ہیں۔ یہ قومیں جب تک اس روش پر قائم رہتی ہیں، زوال کا سایہ تک

ان پر نہیں پڑتا۔ اس کی تفصیل آپ کو قرآن کریم کے بیشمار مقامات میں "ایمان اور اعمالِ صالحہ" کے ضمن میں ملے گی۔

ہم نے اس مقام پر اپنے آپ کو، اس عذاب، یعنی غلط کاموں کے تباہ کن نتائج تک محدود رکھا ہے جو اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ اُخروی عذاب کے متعلق، متعلقہ مقامات پر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا اور واضح کر دینا

عدالتی سزا ضروری ہے کہ جرائم کی جو سزا عدالت کی طرف سے دی جاتی ہے اسے بھی قرآن کریم نے عذاب کہکر پکارا ہے (مثلاً ۲۴/۲ و ۲۴/۸)۔

خلاصہ بابِ دوم

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق سورۃ بقرۃ کی آیات چھ اور سات (۲/۶-۷) کا تفصیلی مفہوم۔ میں نے ان کے مختصر مفہوم کو (نظر ثانی شدہ) مفہوم القرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> متقین کے برعکس، دوسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے جو اس دنیا کی طبیعی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اس لئے وہ نہ انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی نشوونما کے لئے اقدارِ خداوندی کی ضرورت کے قائل ہوتے ہیں۔ طبیعی زندگی کے مفاد کا حصول ان کا مقصدِ حیات اور اس کے حصول کیلئے ہر قسم کا حربہ استعمال کر لینا اُن کا مسلک ہوتا ہے۔ وہ جب تک اس بنیادی نظریۂ حیات کو نہ بدلیں انہیں راستہ کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ صحیح راستہ پر کبھی نہیں آسکتے۔ جو شخص خودکشی پر تُلا بیٹھا ہو اس سے یہ کہنا کہ سنکھیا مت کھاؤ، یہ مہلک ہوتا ہے، بے سود ہے۔
>
> ان لوگوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں دیکھنے، بھالنے اور سمجھنے، سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی (جس طرح غصہ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے)۔ ان کی آنکھوں پر جذبات پرستی کے

ایسے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ نشاناتِ راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اِن کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ جاتے ہیں کہ وہ آوازِ جرس سے بھی کارواں کا سراغ نہیں پا سکتے۔ ان کے قلب و دماغ پر اس قسم کے غلاف چڑھ جاتے ہیں کہ وہ گرد و پیش پر غور کرنے سے بھی صحیح سمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ وہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

تیسرا باب

(آیات ـــ ۸ تا ۲۰)

منافقین

۱۔ منافق کسے کہتے ہیں؟ ـ جس کے قلب و زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔

۲۔ منافقت نفسیاتی مرض ہے۔

۳۔ ادراک، احساسات اور نفس کی بحث ـــ قلب اور فواد میں فرق۔

۴۔ منافقین کی علامات ـــ کفرِ مستور۔

۵۔ تخریبی ذہنیت ـ نقصان پہنچا کر خوش ہونا۔

۶۔ سازشیں اور سرگوشیاں ـــ حتیٰ کہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف الزام تراشیاں۔

۷۔ ریاکاری ـــ انفاق و صلوٰۃ و جہاد تک میں۔

۸۔ تفرقہ انگیزی ـــ مسجدِ ضرار ـــ ہماری مساجد!

۹۔ ان سے معاشرتی تعلقات منقطع۔

۱۰۔ اُخروی زندگی میں منافقین کی حالت۔

۱۱۔ صدرِ اول میں منافقین چھٹ کر الگ ہو گئے تھے۔

۱۲۔ صحابہؓ سب کے سب مخلص مومن تھے۔

۱۳۔ فسادِ آدمیت کے مختلف گوشے۔

۱۴۔ نیشنلزم کی تباہ کاریاں۔

۱۵۔ مسئلہ خیر و شر اور نفع نقصان

۱۶۔ زندگی کے مسائل حل کرنے میں عقلِ انسانی کا عجز۔

۱۷۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ کا مفہوم۔

تیسرا باب

(آیات ۸ تا ۲۰)

منافقین

۲/۸

(۲/۸) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

پہلے دیکھا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم نے نوعِ انسان کو اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا ہے — مومن اور کافر۔ مومن وہ جو قرآنِ کریم میں مندرج وحیٔ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ کافر وہ جو اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اب ایک تیسری شق سامنے آتی ہے اور وہ ان لوگوں پر مشتمل ہے "جو کہتے ہیں کہ ہم اس صداقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ مومن نہیں"۔ قرآنِ کریم کے اسی اجمال کی تفصیل اب ہمارے سامنے آئے گی۔

قرآنِ کریم نے ایمان کے پانچ اجزاء بتائے ہیں — اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت — اس آیت (۲/۸) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم "اللہ اور آخرۃ" پر ایمان لائے ہیں۔ بعض سطح بین لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ یہ لوگ پانچ اجزاء میں سے صرف دو اجزاء پر ایمان کے مدعی ہیں، باقی تین اجزاء کو چھوڑ دیتے ہیں اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں۔

ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ یہاں پانچ اجزاء میں سے دو تین کا سوال نہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے بیشک اجزائے ایمان پانچ ہیں (۲/۱۷۷)، لیکن اس کا انداز یہ ہے کہ وہ کہیں ان اجزاء میں سے صرف ایک کو بیان کرتا ہے، کہیں دو کو، کہیں تین کو،

تعداد کا سوال نہیں

اور کہیں پانچوں کو۔ لیکن ہر جگہ اس کا مقصود پانچ اجزاء ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ اس نے کہا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱/۳۰) "جو لوگ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہتے ہیں تو ان پر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے"۔ یہاں صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔ سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲/۶۲) "جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور عمل صالح کرے تو ان کے لئے خدا کے ہاں ان کا اجر ہے"۔ یہاں اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۳/۱۷۸)

"اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ" اور سورۃ تغابن میں ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا (۶۴/۸) "ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اور اُس نور (قرآنِ کریم) پر جسے اللہ نے نازل کیا"

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ آیت (۲/۸) کا یہ مطلب نہیں کہ چونکہ یہ لوگ صرف دو اجزائے ایمان کا اقرار کرتے ہیں باقیوں کا نہیں، اس لئے یہ مومن نہیں ہو سکتے۔ یہاں مذکور صرف دو اجزاء ہیں لیکن مطلوب پانچوں کے پانچوں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآنِ کریم میں بتائے ہوئے اجزائے ایمان کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مومن نہیں ہیں۔

ایمان کے موضوع پر بات کرتے ہوئے یہ پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے ۲/۳) کہ قرآنِ کریم ایسے لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو مسلمانوں کی قوم میں تو داخل ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مومن نہیں۔ اس سے وہ لوگ بھی مراد ہیں جو پیدائشی مسلمان کہلاتے ہیں اور وہ بھی جن کے ایمان میں پختگی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ قرآنِ کریم کی صداقتوں پر ایمان رکھنے کے مدعی تو ہوتے ہیں، لیکن ان کے اعمال خلافِ قرآن ہوتے ہیں۔ مثلاً اس نے سورۃ یوسف میں کہا ہے۔ وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶)۔ "ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ ایمان لانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں"۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی جہاں یہ بتایا جائے گا کہ شرک کسے کہتے ہیں اور مسلمان ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود کس طرح شرک میں ملوث رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں قرآنی معیار کے مطابق مومن نہیں کہا جا سکتا۔ مومنین کے متعلق تو اس نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (۶/۸۳)۔ "وہ ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہیں ہونے دیتے"۔ (اس کی تشریح بھی آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں یہ بتایا جائے گا کہ ظلم کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح ایمان کو ضائع کر دیتا ہے)۔ قرآنِ کریم نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا ہے کہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جائے تو لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْۤ اِیْمَانِهَا خَیْرًا (۶/۱۵۹)۔ "اُس وقت نہ تو اُس شخص کو اُس کا ایمان کچھ فائدہ دے گا جو اُس سے پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا، اور نہ ہی اُس شخص کا ایمان جس نے ایمان کے ساتھ کوئی عملِ خیر نہیں کیا ہوگا"۔ یعنی قرآنِ کریم عمل کے بغیر ایمان کو بھی، ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ مردہ آں ایمان کہ ناید درعمل۔ اس قسم کے لوگوں کے متعلق بھی قرآن یہ کہے گا کہ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (۲/۸)۔ لیکن اس آیت سے یہ لوگ بھی مراد نہیں۔ جن لوگوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان کے متعلق کہا یہ گیا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲/۹) "یہ لوگ خدا کو، اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں"۔ اب بات صاف ہو گئی۔ مومن وہ ہے جس کے دل میں بھی ایمان ہو اور زبان پر بھی ایمان۔ کافر وہ جس کے دل میں بھی کفر ہو اور زبان پر بھی کفر۔ لیکن یہ تیسری شق اُن لوگوں کی ہے جن کے دل میں تو

ایمان نہ ہو لیکن وہ دھوکہ دینے کے لئے کہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ایمان اور کفر دونوں میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایمان میں حق و صداقت کے لئے ہم آہنگی، کفر میں باطل کے لئے ہم آہنگی لیکن جب قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو تو ایسا شخص نہ مومن رہتا ہے نہ کافر۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں منافق کہا جاتا ہے۔ منافق

منافق

کے لغوی معانی کے لئے آپ آیت (۲/۳) میں "یُنْفِقُوْنَ" کی تشریح دیکھئے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نَفَقٌ اُس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دو نوں راستے کھلے ہوں۔ جنگلی چوہا اپنا بل بناتا ہے تو وہ باہر نکلنے کے لئے متعدد سرنگیں کھود کر اُن کے منہ مٹی کی باریک سی تہہ سے بند کر دیتا ہے۔ اور جب اُسے باہر سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ ان پوشیدہ سرنگوں میں سے کسی ایک سے باہر نکل جاتا ہے۔ ان سرنگوں میں سے ہر ایک کو اَلنَّافِقَآءُ کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ منافق اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو کسی نظام یا سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس میں سے نکلنے کے چور دروازے کون کون سے ہیں۔ یعنی وہ سوسائٹی میں داخل ہوتے وقت بھی مخلص نہیں ہوتا، دھوکہ باز ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہہ دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲/۹): "جو خدا کو اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں"۔

دھوکہ کے لئے یہاں لفظ خُدَعٌ آیا ہے۔ اس مادہ (خ۔ د۔ ع) کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر

خدع کے معانی

کرنا کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا۔ عرب اس لفظ کا جس طرح محسوس انداز میں استعمال کرتے تھے اُس سے اس کے معانی اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار مہمان نوازی پر تھا۔ وہ صحراؤں میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں مویشیوں کا دودھ یا گوشت ہی ہر وقت میسر آنے والی چیز ہو سکتا تھا جس سے مہمان کی تواضع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ آنے والے مسافر کے سامنے بالعموم دودھ پیش کرتے تھے۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ مہمان خیمہ میں آجائیں، دودھ دینے والی اونٹنی باہر بندھی ہو، میزبان دودھ دوہنے کے لئے جائے لیکن اونٹنی دودھ چڑھا جائے تو اُس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ اس قسم کی اونٹنی کو خُدُوْعٌ کہتے تھے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ منافق، اُس پارٹی کو جس میں وہ شامل ہو کس طرح دھوکا دیتا ہے۔ یعنی وہ نہایت ناقابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ اُس کے متعلق کہا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ کب دھوکا دے جائے گا۔ اسی طرح وہ اُس راستہ کو خَیْدَعٌ کہتے تھے جو بظاہر معلوم ہو کہ منزل کی طرف لئے جا رہا ہے لیکن درحقیقت اس کے خلاف ہو۔ اسی طرح وہ سراب کو بھی خَیْدَعٌ کہتے تھے۔ نیز اُس دینار کو خَادِعٌ کہتے تھے جو دیکھنے میں کھرا معلوم ہو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ہو۔ سُوْقٌ خَادِعَةٌ اُس بازار کو کہتے تھے جس میں اشیاء کے نرخ ہر آن بدلتے رہیں۔ ابھی کچھ، ابھی کچھ۔

اس لفظ کے اِن معانی سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جن لوگوں (یعنی منافقین) کا ذکر اب آ رہا ہے انکی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کس طرح اُس سوسائٹی اور نظام کے لئے جس میں وہ داخل ہوں، تخریب اور تباہی کا موجب ہو سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے دو ہی آیات آگے چل کر کہا ہے کہ یہ لوگ "کاذب" ہوتے ہیں یعنی جھوٹے۔ لیکن محض جھوٹے کہنے سے کذب کا قرآنی

کذب کا مفہوم

مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔ اسے خود قرآنِ کریم نے ایسے انداز میں واضح کیا ہے کہ اس کے بعد کسی تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایک شخص کو کسی واقعہ کا صحیح علم نہیں، لیکن جیسا کچھ اسے معلوم ہے وہ اُسے اسی طرح بیان کر دیتا ہے۔ اُس کا یہ بیان تو سچا نہیں کہلا یا جا سکتا کیونکہ وہ واقعہ کے خلاف ہے لیکن اُس شخص کو کاذب یا کذاب نہیں کہا جائے گا۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کی رو سے کاذب کسے کہتے ہیں۔ سورۃ منٰفقون میں ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (۶۳/۱) "اے رسولؐ! جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو واقعی اللہ کا رسول ہے"۔ آپ دیکھئے کہ انہوں نے بات بالکل سچی کہی ہے۔ ایسی سچی کہ اس کی صداقت کی شہادت خود خدا یہ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ (ایضاً) "خدا خود جانتا ہے کہ تو واقعی اس کا رسولؐ ہے"۔ لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۔ (ایضاً) لیکن خدا اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ یہاں دیکھئے کہ یہ لوگ بات ایسی کہہ رہے ہیں جو فی الواقعہ مبنی برصداقت ہے۔ خدا خود اس کی تائید کرتا ہے کہ بات سچی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ یہ کہنے والے جھوٹے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے کذب اسے کہیں گے جس میں قلب اور زبان ہم آہنگ نہ ہوں۔ دل میں کچھ اور ہو زبان پر کچھ اور۔ انہی کو قرآنِ کریم منافق کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ لوگ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲/۸) جن کے دل میں ایمان نہیں ہوتا محض دھوکا دینے کے لئے زبان سے ایسا کہتے ہیں۔

۲/۹

(۲/۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۔

یہ لوگ، بزعمِ خویش، خدا کو اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ خود اپنے آپ کو، اپنی ذات کو دھوکہ دیتے ہیں، کسی اور کو نہیں۔ لیکن یہ شعوری طور پر اسے سمجھتے نہیں۔ خدا کو تو اس لئے دھوکہ نہیں دے سکتے کہ وہ ایسا علیم و خبیر ہے کہ دلوں میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتوں تک سے بھی واقف ہوتا ہے (۴۰/۱۹) اس لئے اسے کون دھوکہ دے سکتا ہے۔ اور جماعتِ مومنین کو اس لئے دھوکہ نہیں دے سکتے کہ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر منافقین کی ایسی علامات بیان کی ہیں جن کی روشنی میں کوئی آنکھیں رکھنے والا ان سے دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ وقتی طور

ہر کسی کو دھوکہ دے جائیں لیکن اس کے بعد جب ان کا ملمع اتر جائے تو دوبارہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ مستقل طور پر اصحاب عقل و شعور کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اب رہا یہ کہ یہ اپنے آپ کو کس طرح دھوکہ دیتے ہیں، اس کے لئے قرآن کریم نے ایسی جامع اور عمیق بات کہی ہے جسے دورِ حاضر کے علم النفس (PSYCHOLOGY) کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے قرآن نے کہا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ (۲/۱۰) "ان کے دلوں میں مرض ہے۔"

نفسیاتی مریض

یہ سوال کہ انسان میں سمجھنے سوچنے (ادراک) کا مرکز کون سا ہے اور محسوس کرنے (احساسات) کا مرکز کون سا، قدیم زمانے سے زیرِ بحث چلا آرہا ہے۔ اور (یہی کہا جائے گا کہ) محققین اس باب میں اس وقت تک کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ ادراک (INTELLECT) اور احساسات (FEELINGS) دو الگ الگ گوشے تصور کئے جاتے ہیں، اور یقینی طور پر ان کے مراکز کا تعین نہیں ہوسکا۔ کچھ عرصہ پہلے مفکرین نے (MIND) کی ایک اصطلاح وضع اور اختیار کی تھی جسے ادراک اور احساسات کا سنگم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر یہ معلوم ہوا کہ اس کی یہ حیثیت بھی ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس لفظ سے (MENTAL) اسم صفت (ADJECTIVE) بنایا گیا تو ایک طرف اس کا تعلق خالصتہً دماغ سے جوڑ دیا گیا۔ جیسے (MENTAL HOSPITAL) دماغی امراض کے شفاخانہ کو کہتے ہیں۔ اور دوسری طرف اس کا تعلق جذبات سے قرار دیا گیا ہے۔ جیسے (DISEASED MENTALITY) سے مراد دماغی امراض نہیں، نفسیاتی خلفشار ہے۔ ماہرین علم النفس نے ایک اور اصطلاح وضع کی ہے جسے (PSYCHE) کہہ کر پکارا جاتا اور اس کا ترجمہ انسانی نفس یا ذات (SELF) کہا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا کہ یہ ہے کیا؟

قلب اور فؤاد

عربی زبان (اور قرآن کریم میں) اس مقصد کے لئے قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دو الفاظ آتے ہیں۔ ان دونوں میں ایک سطحی سا امتیازی خط کھینچنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ قَلْبٌ فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ہے، اور فُؤَادٌ جذباتِ سوز و گداز کا منبع۔ (فُؤَادٌ ۔ ف، ا، د، سے ہے۔ جس کے معنی بھوننے کے ہیں۔ یعنی تپش و خلش، سوز و گداز، درد و داغ وغیرہ) لیکن یہ بھی کوئی مستقل خطِ امتیاز نہیں ہے۔ قرآن کریم نے قلب کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ وہ تفکر اور تدبر کا سرچشمہ ہے۔ جیسے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ (۷/۱۷۹) یا۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا (۲۲/۴۶) ۔۔۔ قلوب جن سے وہ عقل و فکر کا کام نہیں لیتے۔ لیکن دوسری طرف قلب کو کہیں محلِ تسکین و اطمینان کہا گیا ہے (۱۳/۲۸)، کہیں رافت و رحمت کا مہبط (۵۷/۲۷)، کہیں اُسے قلبِ سلیم کہہ کر پکارا گیا ہے (۲۶/۸۹)، کہیں قلبِ منیب (۵۰/۳۳)، کہیں شدتِ نفس کی اثر پذیری سے پگھل جانے والا (۸/۲)، اور کہیں شقاوت اور قساوت

سے پتھر کی طرح سخت ہو جانے والا۔ (۲/۷۴ ; ۲۲/۴۶)۔ دوسری طرف اس نے فؤاد کو بھی کہیں مرکزِ عقل و فکر کہہ کر پکارا ہے (۱۷/۳۶) اور کہیں سرچشمۂ جذبات۔ (مثلاً ۱۱/۱۲۰ ; ۲۸/۱۰ ; ۱۴/۴۳)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے قلب یا فؤاد کے متعلق متعین اور متمیز طور پر نہیں کہا کہ ان میں سے کون سا ادراک کا مرکز ہے اور کون سا جذبات کا سرچشمہ۔ لیکن اس نے منافقین کے متعلق یہی کہا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ (۲/۱۰) نیز (۹/۱۲۵) یہ ان کے قلوب میں مرض ہے۔ دوسری طرف اس نے قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ اس میں شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ (۱۰/۵۷) ہے "سینے کے امراض کے لئے شفا"۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ قلب کے مرض سے مراد نفسیاتی خلفشار و انتشار ہے۔

عربی زبان میں مَرَضٌ کے بنیادی معنی ہیں توازن و اعتدال کا اس طرح بگڑ جانا کہ کسی قوت میں اضمحلال، ضعف، یا کمی واقع ہو جائے۔ ان تصریحات کی بنا پر فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کے معنی ہوں گے قلب و نگاہ کے توازن کا بگاڑ یا نفسیاتی کشمکش۔ اسی کو (DISEASED MENTALITY) یا ایسی (UN-BALANCED PERSON ALITY) کہا جائے گا جو مختلف اقسام کے تضادات (CONTRADICTIONS) یا (COMPLEXES) یعنی کشمکش یا الجھاؤ کا شکار ہو۔ آج سے چودہ سو سال پہلے نفاق کو نفسیاتی مرض قرار دینا قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ اور

شعور

اس کے ساتھ جب یہ ٹکڑا ملایا جائے وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۲/۹) تو بات اور بھی لطیف اور عمیق ہو جاتی ہے۔ عرب، حواس کے ذریعہ کسی شے کے ادراک کو شعور کہتے تھے۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ منافقین ایک ایسے نفسیاتی مرض کا شکار ہوتے ہیں جس کی تشخیص ادراک بالحواس (SENSE PERCEPTION) سے نہیں ہو سکتی۔

عصرِ حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) نے انسانی نفس کو دو حصوں (یا سطحوں) میں تقسیم کیا ہے ــ نفسِ شعوری (CONSCIOUS MIND) اور نفسِ غیر شعوری (UN-CONSCIOUS MIND) نفسیاتی امراض کے علل و اسباب نفسِ غیر شعوری کے اُن تہ خانوں میں مدفون و مستور ہوتے ہیں جن تک انسانی شعور (یعنی ادراک بالحواس) کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے کہ منافق ایک ایسے نفسیاتی مرض کا مریض ہوتا ہے جس کے اسباب و علل تک اس کا شعور نہیں پہنچ سکتا۔ یہ مرض بھی نفسیاتی ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی نفسیاتی۔ آپ غور کیجئے کہ جب قرآنِ کریم نے اپنے متعلق کہا کہ اس میں نفسیاتی امراض (لما فی الصدور) کی تشخیص اور علاج کا سامان موجود ہے، تو اس سے وہ

نفس و آفاق کی آیات

حقائق کی کن گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ اور انسانی علم کو کس کس مستور گوشے تک پہنچنے کی دعوت دی اور تاکید کی۔ اس نے خود اپنے مضمر حقائق کے متعلق کہا ہے۔ سَنُرِيْهِمْ

ایٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ۔ (۴۱/۵۳) "ہم اپنی اُن نشانیوں کو، جو عالمِ نفس و آفاق میں مستور ہیں، بے نقاب کرتے چلے جائیں گے تا آنکہ قرآن کا ہر دعوئ حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجائے"۔ عالمِ آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیاں تو وہ ہیں جو ادراک بالحواس (سائنٹیفک تحقیقات و انکشافات) کی رو سے بے نقاب ہوتی جارہی ہیں، عالمِ انفس میں مستور حقائق کے منکشف ہونے کا دور اب شروع ہوا ہے۔ جوں جوں انسان علم النفس میں آگے بڑھتا جائے گا، نہ معلوم قرآن کی کون کون سی مضمر حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آتی جائیں! اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کے حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ علمِ انسانی جس سطح تک پہنچ چکا ہو وہ قرآن پر غور و فکر کرنیوالے کی نگاہ کے سامنے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم پر غور و تدبر کو نہ کسی دور میں محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دور یا فرد اس کا دعویٰ کر سکتا کہ قرآنِ کریم کے متعلق اس کے فکری نتائج حرفِ آخر ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اُوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اُوست

الفاظ کی اس بحث کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم منطق یا فلسفہ کی کتاب نہیں جو وہ ان علوم کی اصطلاحی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں میں اُلجھے۔ اس کی زبان عربی ہے اس لئے اس کے الفاظ کے عام معانی وہی ہوتے ہیں جن معانی میں انہیں عرب استعمال کرتے تھے۔ البتہ جہاں وہ ان الفاظ کو اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتا ہے وہاں ان کے معانی مختص ہوجاتے ہیں۔ قلب یا فواد وغیرہ الفاظ عام معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ "نفس" کا لفظ اس کی خاص اصطلاح ہے جسے وہ اس "قوت" کے لئے استعمال کرتا ہے جو انسانی فیصلوں کا سرچشمہ ہے اور جس کی رُو سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اس نے اپنی اس اصطلاح کو جن مفاہیم کے لئے استعمال کیا ہے' ان کا ذکر آگے چل کر نفس سے متعلق بحث میں آئے گا۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ یہ قرآنِ کریم کی بڑی جامع اور منفرد اصطلاح ہے اور کسی زبان کا کوئی ایک لفظ اس کی صحیح اور کماحقہٗ ترجمانی نہیں کر سکتا۔ حتےٰ کہ دورِ حاضر کے علم النفس کی اصطلاح (PSYCHE) یا (SELF) بھی نہیں۔ ہم بھی محض سمجھانے کی خاطر اس کے لئے ذات، یا خودی یا انا وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح "نفس" کا بدل یا مرادف یہ الفاظ بھی نہیں ہو سکتے۔

منافقین کے متعلق ان بنیادی اور تمہیدی تصریحات کے بعد، ان کی، ان مابہ الامتیاز علامات کا دیکھ لینا ضروری ہے جنہیں قرآنِ کریم خصوصیت سے بیان کرتا ہے۔ ان کی یہ خصوصیات قرآنِ کریم میں اس کثرت سے بیان ہوئی ہیں کہ کسی ایک مقام پر ان سب کا احاطہ مشکل ہے۔ اس جگہ ہم ان میں سے چند ایک نمایاں خصوصیات کو پیش کرتے ہیں۔

منافقین کا کفر

زیرِ نظر آیت (۲/۸) میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں لیکن وہ مومن نہیں یعنی اُن کے دل میں کفر ہے اور زبان پر ایمان کے الفاظ۔ اور یہ کچھ وہ از رہِ فریب ہی کرتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔ (۵/۴۱)۔ "یہ لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم لے آئے لیکن ان کا دل ایمان نہیں لایا"۔ یہی الفاظ (۳/۱۶۶) میں بھی دہرائے گئے ہیں، اور دونوں جگہ کہا یہ ہے کہ وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر سے زیادہ قریب ہیں۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ ہیں تو درحقیقت کافر ہی، لیکن زبان سے مومن بنتے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ۔ (۵/۶۱)۔ "جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم لے آئے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ آتے بھی ہیں تو کفر کو ساتھ لئے ہوئے۔ اور یہاں سے واپس بھی جاتے ہیں تو کفر ہی کے ساتھ۔ لیکن یہ کفر دل میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان سے کہئے کہ خدا تو تمہارے پوشیدہ رازوں تک سے واقف ہے اس لئے تم اس سے کونسی بات چھپا سکتے ہو"۔ ان کے اسی کفرِ مستور کی وجہ سے انہیں "کفار کے بھائی" کہا گیا ہے (۵۹/۱۱) اور حضورؐ سے کہا گیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (۹/۷۳)۔ "اے نبیؐ! جس طرح تمہیں کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے کہا گیا ہے اُسی طرح منافقین کے ساتھ بھی جنگ کرو اور ان سے کسی نرمی کا برتاؤ نہ کرو"۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ (۹/۶۷)

سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۲/۱۴)۔ "جب یہ لوگ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، لیکن جب چوری چھپے اپنے سرغنوں سے ملتے ہیں تو انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم جو ان لوگوں سے ملتے ہیں تو اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ ہم درحقیقت تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں"۔

اس مقام سے یوں ہی آگے نہیں بڑھ جانا چاہیئے۔ قرآنِ کریم نے یہاں ایک بڑی گہری بات کہی ہے۔ سوال یہ

ان پر کسی کو بھی اعتماد نہیں ہوتا

ہے کہ انہیں اس کی ضرورت کیوں پڑتی تھی کہ وہ اپنے لوگوں کو اس کا یقین دلائیں کہ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے اپنے لوگوں کو بھی ان پر کامل اعتماد نہیں تھا۔ اور منافقت میں ہوتا ہی یہ ہے۔ منافقت کی روش کا آغاز تو مصلحتاً ہی ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس سے انسان کا کردار ہی ایسا بن جاتا ہے کہ اس پر بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جو لوگ

ناواقفیت سے ان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو جائیں' وہ تو ان سے دھوکہ کھا جاتے ہیں لیکن جو لوگ جانتے ہوں کہ یہ منافقت برتتے ہیں وہ انہیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے، خواہ وہ خود انہی میں سے کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ان کے ان کے متعلق کہا ہے کہ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ (۴/۱۴۳)۔ "یہ لوگ (منافق) دل سے نہ ان کے ساتھ ہوتے ہیں نہ اُن کے ساتھ۔ یہ ان دونوں کے بین بین، مکھی کی طرح اڑتے رہتے ہیں کہ جدھر شیرینی نظر آئے اُدھر ہی جا بیٹھیں۔ پھر ان کا کسی ایک طرف جا بیٹھنا بھی مستقل نہیں ہوتا، اپنے مفاد ہی کی خاطر ہوتا ہے۔ اگر اس کے بعد مفاد کی کشش دوسری جانب ہو تو یہ اُٹھ کر اُدھر چلے جاتے ہیں"۔ یہ وجہ ہے کہ مومن تو ایک طرف خود کفار بھی انہیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۷۶) "جب یہ لوگ جماعتِ مومنین سے ملتے ہیں تو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن جب اپنے لوگوں سے تنہائی میں ملتے ہیں، تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ اپنی پارٹی کی مصلحت کی خاطر ان لوگوں سے ملنا تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں اس کی سخت احتیاط برتنی چاہیئے کہ ان سے اپنی کتابوں کی وہ باتیں نہ کہہ دی جائیں جنہیں یہ ہمارے خلاف بطور حجت پیش کر کے ہمارا منہ بند کر سکیں۔ تمہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے"۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان پر کامل بھروسہ ان کی اپنی پارٹی کے لوگوں کو بھی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بار بار تاکید کرنی پڑتی ہے کہ میاں! وہاں جاتے ہو تو بڑی احتیاط سے کام لینا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے، منافقت سے انسان کی ایسی نفسیاتی کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کی کوئی بات بھی قابلِ اعتماد نہیں رہتی۔ مخالفین میں تو ان کا اعتماد پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ خود اپنوں کی نگاہوں میں بھی وہ پورے پورے بھروسہ کے قابل نہیں رہتے۔

تخریبی ذہنیت

اپنوں میں ان کی کیفیت کچھ ہی کیوں نہ ہو' حقیقت یہ ہے کہ مخالفین کی جس جماعت میں وہ منافقانہ طور پر شامل ہو جاتے ہیں' ان کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے۔ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ (۳/۱۱۸) "جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ لیکن جب تم سے الگ ہو کر اپنی خلوت گاہوں میں بیٹھتے ہیں تو تمہارے خلاف حسد اور غصہ کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ وہ پاگلوں کی طرح اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں"۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس کیفیت پر صرف اتنا تبصرہ کیا ہے۔ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳/۱۱۸) "ان سے کہہ دو کہ تم اپنے غصہ کی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤ۔ خدا جانتا ہے کہ تمہارے سینے میں کیا ہے"۔ سورۃ نساء

میں ہے:-

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ ۔ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ۔ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۴/۸۱)

"یہ تم سے ملتے ہیں تو تمہیں اپنی بھرپور حمایت اور اطاعت کا یقین دلاتے ہیں لیکن جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو جو کچھ تم نے طے کیا ہوتا ہے، راتوں کی تنہائیوں میں اُس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ سمجھتے یہ ہیں کہ یہاں کون دیکھنے سننے والا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان کی ایک ایک بات کو لکھتا جاتا ہے۔" اس کے بعد اللہ تعالیٰ (جماعتِ مومنین سے) کہتا ہے کہ "تم ان کی اِن سازشوں سے پریشان مت ہو۔ ان سے اعراض برتو اور قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر کامل بھروسہ رکھو۔ یہ اعتماد اور بھروسہ تمہاری کامیابی کے لئے کافی ہوگا۔" سورۂ توبہ میں ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ۔ (۹/۶۵) "اگر کہیں اِن کی منافقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور جماعتِ مومنین کے افراد ان سے پوچھتے ہیں کہ تم یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو تو یہ اُن سے کہتے ہیں کہ ہماری اِن باتوں کو (SERIOUSLY) مت لیا کرو۔ ہم تو یونہی ہنسی مذاق میں اِس قسم کی باتیں کر دیتے ہیں۔" اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (۹/۶۵) "تم ان سے کہو کہ تم ہنسی مذاق کی باتیں کن کے متعلق کرتے ہو؟ خدا اور اُس کے قوانین اور اُس کے رسولؐ کے متعلق؟ تمہیں ایسا کہتے وقت شرم نہیں آتی؟ یہ تو وہ ادب گاہیں ہیں، جہاں ہر قلبِ سلیم رکھنے والے کا سر، انتہائی احترام اور تکریم سے جھک جانا چاہیئے۔ اُس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آنا چاہیئے کہ یہاں کوئی بات مزاحًا کہی جا سکتی ہے۔ تم ان مقامات پر ہنسی اور مذاق کی باتیں کرتے ہو اور اس کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی جھجک و ندامت محسوس نہیں کرتے؟ تم کس قسم کے مدعیٔ ایمان ہو؟"

سازشیں اور سرگوشیاں

سوال یہ ہے کہ لوگ اس قسم کی منافقانہ روش کیوں اختیار کرتے ہیں؟ بنیادی طور پر تو قرآنِ کریم نے ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (۴/۸۹) "یہ چاہتے ہیں کہ جس قسم کے کافر یہ خود ہیں تم بھی اسی طرح کے کافرین بن جاؤ۔ تاکہ یہ اور تم ایک جیسے ہو جاؤ۔" اس کے لئے ان کی سازش یہ ہے کہ اٰمِنُوْا بِالَّذِىْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۳/۷۱) "تم صبح کے وقت اپنے ایمان کا اعلان کر کے اِن لوگوں میں جا ملو۔ دن بھر ان میں گھلا ملا رکھو۔ وہاں ایسی باتیں کرو جن سے ان میں کے سادہ لوح لوگوں کے دل میں

شکوک وشبہات ابھریں۔ شام کو تم اپنے کفر کو ساتھ لئے ہوئے باہر نکلو تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بھی اپنے سابقہ کافرانہ مسلک کی طرف پلٹ آئیں"۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی چالیں کس قدر گہری ہوتی ہیں۔ جہاں تک ان کی باتوں کا تعلق ہے قرآن کہتا ہے کہ وہ بڑی پرکشش اور حیرت افزا ہوتی ہیں۔ پھر وہ بات بات میں، خدا کی قسمیں کھاکر سامعین کے دلوں میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ (۲/۲۰۴)۔ يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ (۹/۸)۔ "جو کچھ تم کہو وہ اس سے متفق ہوتے چلے جائیں گے حالانکہ ان کا دل ان سے اباء کر رہا ہوگا"۔ جماعت کے اندر رہتے ہوئے ان کا مقصد اس قسم کی وسوسہ انگیزی (WHISPERING COMPAIGN) ہوتا ہے جس سے تمہاری پارٹی میں فتنے بیدار ہو جائیں۔ (۹/۴۷)۔ پارٹی کے وہ مخلص افراد جو بطیب خاطر مالی قربانی کرتے ہیں، ان کے متعلق یہ (منافقین) سرگوشیاں کریں گے کہ یہ محض دکھانے کی خاطر اور جماعت میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ باقی رہے جماعت کے وہ غریب افراد جو مالی امداد دینے کی استطاعت نہیں رکھتے، صرف اپنی بدنی خدمات پیش کرتے ہیں، یہ ان کی ہنسی اڑاتے ہیں کہ انہیں دیکھو! یہ سوت کی انٹی لاکر یوسف کے خریداروں میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں (۹/۷۹)۔ اس طرح، یہ جماعت کے اندر انتشار پیدا کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ لوگوں سے یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا (۶۳/۷)۔ "تم اس رسول کو عطیات (چندہ) دینا بند کر دو۔ جب اس کے پاس پیسے نہیں رہیں گے تو جو لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو رہے ہیں، خود بخود اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے"۔

ان منافقین کی خباثت نفس یہیں تک محدود نہیں رہی تھی۔ ان کا دست دنائت اس عتبۂ عالیہ تک پہنچنے سے بھی نہیں شرمایا تھا جس پر دنیا کے عظیم ترین سربلندوں کی گردنیں بصد احترام جھکتی تھیں اور اس میں انتہائی شرف اور فخر محسوس کرتی تھیں۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

ذاتِ رسالتمآب کے خلاف الزام تراشیاں

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ (۹/۵۸)۔ "اے رسول! ان میں ایسے خبیث النفس بھی ہیں جو عطیات کی تقسیم کے بارے میں تمہارے خلاف الزام تراشیوں سے بھی نہیں چوکتے۔ اگر تم انہیں اتنا دیدو جس سے یہ خوش ہو جائیں تو ھوالمراد۔ اگر اتنا نہ دو تو ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ تمہارے خلاف طرح طرح کے الزامات گھڑتے اور پھیلاتے رہتے ہیں"۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے انفاق فی سبیل اللہ بنیادی شرط ہے۔ اور انفاق کو "فی سبیل اللہ" اسی وقت کہا جائے گا جب دینے والا دل کی کامل رضامندی سے دے اور اس کا مقصد

لِوَجْهِ اللّٰهِ کے سوا کچھ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ منافقین کی کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اپنی منافقت کے پردے کو چاک ہونے سے بچانے کی خاطر انہیں کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ تشکیلِ جماعت کے ابتدائی ایام میں جب ہنوز اسلام کا معاشی نظام قائم نہیں ہوا تھا اور انفرادی طور پر ایک دوسرے کی مدد کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ اگر کبھی مارے بندھے، کسی کو کچھ دینا پڑتا تھا تو اس کے بعد احسان جتا جتا کر اُس بیچارے کی جان عذاب میں کر دیتے تھے۔ یہی تھے وہ لوگ جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۔ كَالَّذِیْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ ۔ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ ۔ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۔ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (۲/۲۶۴)

"اے جماعتِ مومنین! تم ایسا کبھی نہ کرنا کہ کسی کی مدد کر کے اسے احسان جتاؤ اور اس طرح اسے قلبی اذیت پہنچاؤ۔

ریاکاری

اس تمہارا کیا کرایا سب رائیگاں چلا جائے گا۔ ایسا کچھ تو وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نہ خدا پر ایمان ہو نہ آخرت پر یقین۔ لیکن اس خیال سے کہ ہمیں نے انہی لوگوں میں رہنا ہے اس لئے اس سے بنا کر رکھنا ضروری ہے، وہ ریاکاری سے کچھ دے دیتا ہے۔ اس قسم کے نفاق کی مثال یوں سمجھو جیسے کسی سخت چٹان پر یونہی ذرا سی مٹی کی تہ جم جائے اور یوں دکھائی دے کہ وہ بڑی عمدہ زمین ہے جس میں اچھی کھیتی اُگے گی۔ لیکن جب اس پر بارش کا ایک تیز سا چھینٹا پڑے تو سب مٹی بہہ جائے اور نیچے چٹان کی چٹان باقی رہ جائے۔ اس طرح ایک دانے سے سینکڑوں دانے حاصل ہونا تو درکنار، فصل کے کاشت کرنے میں جو محنت صرف ہوئی تھی، اور جو بیج ڈالا گیا تھا، وہ بھی اکارت چلا جائیگا۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہ رکھیں اور محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے نیک کام کریں، ان پر فلاح و سعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔"

یہ لوگ انفاق میں ہی ریاکاری سے کام نہیں لیتے تھے، صلوٰۃ کے اجتماعات تک میں بھی اسی مقصد کو لئے ہوئے شریک ہوتے تھے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۔ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۔ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (۴/۱۴۲)۔ "یہ منافقین بزعمِ خویش خدا کو دھوکا دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب وہ صلوٰۃ کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں تو مارے بندھے۔ ریاکاری اس میں زیادہ ہوتی ہے اور ذکرِ خداوندی بہت کم۔ لہٰذا ان کی ان نمازوں سے کچھ حاصل نہیں

ہوتا"۔ [مزید تفصیل کے لئے دیکھئے آیت (۲/۳) میں عنوان صلوٰۃ]

صلوٰۃ کے اجتماعات ہی نہیں، وہ جنگوں تک میں اسلامی لشکر کے ہمراہ شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن وہاں جا کر اس قسم کی سازشیں کرتے، افواہیں پھیلاتے اور وساوس پیدا کرتے کہ لوگ ہمت ہار کر میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھیں (۳/۱۵۳)۔ سورہ توبہ میں ان کی اس قسم کی سازشوں کا تذکرہ بڑی شرح و بسط سے آیا ہے۔ اس کا بڑے گہرے غور و فکر سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بعد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو جس قدر نقصان منافقین نے پہنچایا ہے، کھلے مخالفین کے ہاتھوں اسکا عشرِ عشیر تک بھی نہیں پہنچا۔ قرآنِ کریم نے ان کا اس تفصیل سے ذکر ہی اس لئے کیا ہے کہ ہم اس باب میں محتاط رہیں۔

منافقین کی عبودیّت

ایمان نام ہے عبودیتِ خداوندی کا، یعنی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر معاملہ میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ اس اطاعت میں مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن منافقین اس قسم کی اطاعت کبھی اختیار نہیں کرتے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۔ (۲۲/۱۱)

"تم ایسے لوگوں کو بھی دیکھو گے کہ وہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں تو اس طرح گویا کنارے پر بیٹھے ہیں یعنی کفر اور ایمان کی حدِ فاصل پر۔ اگر وہ دیکھیں کہ قانونِ خداوندی کی اطاعت میں فائدہ ہے تو اُسے اختیار کر لیتے ہیں اور اگر دیکھیں کہ اس میں کچھ نقصان ہوتا ہے تو جھٹ اپنا رخ پلٹ کر دوسری طرف چلے جاتے ہیں"۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ "یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس روش سے انہیں فائدہ ہی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن اگر یہ ذرا بہ نگاہِ تعمق دیکھیں تو انہیں نظر آجائے کہ اس سے دنیا میں بھی نقصان ہوتا ہے اور آخرت میں بھی نقصان۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے واضح تر نقصان اور کونسا ہو سکتا ہے؟"

قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ "جو شخص متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتابِ خداوندی کے مطابق نہیں کرتا یا کراتا تو ایسے ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے؟" اسی کی تشریح کرتے ہوئے اس نے دوسری جگہ ان واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵)۔ "اے رسولؐ! تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ اپنے اختلافی معاملات میں تجھے اپنا حکم تسلیم نہ کریں اور جو فیصلہ تو دیدے

اس سے اعلانیہ سرکشی برتنا تو ایک طرف، اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ کریں اور بطیبِ خاطر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔" یہ ہے مومن ہونے کی بنیادی شرط۔ اس کے برعکس منافقین کے متعلق کہا کہ:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ ۔ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ۔
وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۔ (۴/۶۰)

تحاکم الی الطاغوت

"کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا، جو بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قرآن اور جو کچھ سابقہ انبیاءؑ پر نازل کیا گیا تھا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور عملاً یہ حالت ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی عدالتوں اور ضابطوں کی رُو سے کراتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا تھا کہ ان سے کفر اختیار کریں۔ ہم نے تو انہیں یہ کہا تھا لیکن ابلیسی قوتیں چاہتی ہیں کہ وہ سیدھے راستے سے کہیں دور نکل جائیں۔" اس کے بعد کہا۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (۴/۶۱)۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرانے کے لئے اس رسولؐ کی عدالت کی طرف رجوع کرو تو تم منافقین کو دیکھو گے کہ وہ اس سے دور بھاگیں گے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ منافقت کیا ہے؛ زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ اور عملاً اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی قوانین .... کی رُو سے کرنا۔ اس کی روشنی میں آپ سوچیے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں، یہ تو خیر ایک ضمنی سوال تھا۔ اس سے بھی گہرا غور و تدبر کا مقام اب سامنے آتا ہے۔

تفرقہ انگیزی

اسلام کا، بحیثیت الدین ۔ نظامِ زندگی ۔ قیام اور وحدتِ امت لازم و ملزوم ہیں یعنی اگر امت کی وحدت باقی نہ رہے، وہ فرقوں یا پارٹیوں میں بٹ جائے تو اسلام "الدین" نہیں رہتا، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بنا بریں مخالفین کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں تفرقہ پیدا ہو جائے۔ کافر یعنی کھلے دشمن، تو اس باب میں بمشکل کامیاب ہوتے ہیں لیکن منافقین کی سازشیں اکثر و بیشتر کارگر ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ اس قسم کا تفرقہ، مذہب کا نقاب اوڑھ کر پیدا کرتے ہیں۔ منافقین نے اس قسم کی سازش خود نبی اکرمؐ کی موجودگی میں بھی کی تھی۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی۔ وہ یہ کچھ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے کر رہے تھے لیکن نظر آتا ہے کہ فریب کا پردہ اتنا دبیز تھا کہ کوئی اس سازش کا بھانپ نہ سکا اور انہوں نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ حتیٰ کہ خود خدا کو یہ پردہ اٹھانا پڑا اور اس نے وحی کے ذریعہ بتایا:۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا
لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ - وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى -
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۹/۱۰۷)

"ان منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی چالوں میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی ہے اور اس طرح یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ بڑے پکے مومن اور نظامِ خداوندی کے خدمت گزار ہیں لیکن اس مسجد سے درحقیقت ان کی غرض یہ تھی کہ اس سے اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے' اور اس طرح یہ مسجد ان لوگوں کے لئے کمین گاہ بن جائے جو پہلے سے نظامِ خداوندی کے خلاف مصروفِ کار ہے۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی نیک نیتی سے تعمیر کیا ہے۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں"

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا - لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ
اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ - فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا - وَ اللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُطَّهِّرِيْنَ - (۹/۱۰۸)

"اے رسولؐ! تم اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا۔ جو مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرے، کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ تم اس میں اپنا قدم تک بھی رکھو۔ تمہارا' نہ ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہو سکتا ہے نہ ان کی تعمیر کردہ مسجد سے کوئی تعلق (۶/۱۶۰) اس کی مستحق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد پہلے دن سے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے اصولِ محکم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہی لوگ آتے جاتے ہیں جو فرقہ بندی کے شرک کی آلودگی سے پاک اور صاف رہتے ہیں۔ (۳۰/۳۲)۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی رو سے بنگاہِ پسندیدگی دیکھے جاتے ہیں۔"

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ
اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ - وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ - (۹/۱۰۹)

"ان سے پوچھو کہ کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد' قوانینِ خداوندی کی نگہداشت اور منشائے خداوندی سے ہم آہنگی پر رکھی ہو، بہتر ہے یا وہ شخص جس نے یہ بنیاد ریت کے ایسے تودوں کے کنارے پر رکھی ہو جو کٹ کٹ کر دریا میں گرتے چلے جا رہے ہوں اور اس طرح وہ عمارت اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم کے گڑھے میں جا گرے حقیقت

یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں ان پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کبھی کشادہ نہیں ہو سکتی"۔
اور اس کے بعد قرآنِ کریم نے اس جہنم کی کیفیت جس کے شعلے ان منافقین کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے، ان الفاظ میں بیان کی کہ

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۔ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۹/۱۱۰)

"یاد رکھو! ان کی یہ عمارت جو انہوں نے اس تخریبی مقصد کے لئے بنائی ہے، ان کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ اس سے ان کے دل کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جائے گا۔ ان کے غصہ اور حسد کی آگ میں کمی نہیں ہو گی تاکہ ان کے دل شدتِ اضطراب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی یہ باتیں یونہی دھمکی نہیں، علم و حکمت پر مبنی حقائق ہیں جو واقع ہو کر رہیں گے"۔

ہم نے اس واقعہ کو پوری قرآنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس لئے بھی ضروری سمجھا ہے کہ یہ محض چودہ سو سال پہلے کے واقعہ کا ایک تذکرہ نہیں۔ اس میں خود ہماری اپنی سرگزشت بھی پوشیدہ ہے۔ مساجد کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا، وَ

ہماری مسجدیں!

اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۷۲/۱۸)۔" یہ حقیقت ہے کہ مساجد صرف اللہ کے لئے ہونی چاہئیں۔ اس لئے تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔ نہ انہیں خدا کے سوا کسی اور سے منسوب کرو اور نہ انہیں نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے سوا کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرو"۔ آپ مساجد کے اس بنیادی مقصد اور اللہ تعالیٰ کی اس تاکید کو سامنے رکھیے اور اس کے ساتھ مسجدِ ضرار پر بھی اپنی نگاہ مرکوز کیجئے اور پھر آنکھوں کے سامنے لائیے ساری دنیا میں پھیلی ہوئی مساجد کو۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ مساجد کسی نہ کسی فرقہ کی طرف منسوب ہیں۔ خالص اللہ کے لئے ان میں (شاید) کوئی مسجد بھی نہ ہو۔ اور جو مسجد مسلمانوں میں فرقہ بندی کی مظہر ہو، وہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق، مسجدِ ضرار ہے، کفر کی آماجگاہ ہے، اور خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے کمین گاہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

امت میں تفرقہ پیدا کرنے کے علاوہ قرآنِ کریم نے منافقین کا ایک اور جرم بھی نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ اور اس میں بھی ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں۔ سورۃ احزاب میں پہلے ازواج و بناتِ رسول اللہ اور دیگر مسلمان عورتوں سے کہا کہ وہ باہر نکلا کریں تو اپنے اوپر سے چادر اوڑھ لیا کریں۔ ذٰلِكَ اَدْنٰىٓ اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۳۳/۵۹)۔" اس سے یہ پہچانی جائیں گی کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ اور منافقین کو یہ کہنے کا موقعہ نہیں ملے گا کہ

ہم نے غلط فہمی سے ان سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔" اس کے بعد ہے:-

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا مَّلْعُوْنِيْنَ ۔ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ (۳۳/۶۰-۶۱)

"تم اتنی احتیاط برتو، اگر اس کے بعد بھی منافقین، یعنی وہ لوگ جن کے دل میں خباثتیں بھری ہوئی ہیں اور جن کا کام ہی

شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

معاشرہ میں شرانگیز خبریں پھیلانا ہے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے، تو ان کے خلاف قوت کا استعمال کرنا پڑے گا تا آنکہ یہ یہاں سے دور ہو جائیں۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں ان تمام مراعات سے محروم کر دیا جائے گا جو انہیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ اگر یہ اس پر بھی اپنی سرکشی سے باز نہیں آئیں گے تو یہ جہاں کہیں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے گا اور قتل کی سزا دی جائیگی"۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی رو سے شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور ان کے خلاف افواہیں پھیلا کر، اور اس طرح انہیں اذیت پہنچانا، کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ وہ جرم جس کی آخری سزا قتل بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے اگلی آیت میں کہا گیا سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲)۔ "یہ کوئی وقتی یا ہنگامی حکم نہیں۔ یہ تو خدا کا وہ قانون ہے جو اس سے پہلے بھی الدین کے معاشرہ میں نافذ العمل رہا ہے۔ اس حکم میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی"۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآنِ کریم کی رو سے عورت کا مقام کتنا بلند اور اس کا احترام کس قدر ضروری ہے۔

یہ ہیں منافقین کی سازشوں، فتنہ سامانیوں، شرانگیزیوں اور فرقہ سازیوں کی چند ایک مثالیں جنہیں اس مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیلات، قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر باصرار و تکرار آئی ہیں۔ ان کی تشریح وہاں کی جائے گی۔

(جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنِ کریم نے رسول اللہ سے تاکیداً کہا تھا کہ منافقین کے خلاف بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح کفار کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اس نے اپنے مستمر انداز کے مطابق کہا کہ اگر یہ لوگ اپنی مخالفانہ روش سے باز آ جائیں تو یہ ان کے لئے بہتر ہوگا۔ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (۹/۷۴)"۔ لیکن اگر یہ اس سے پھر جائیں تو پھر اللہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں الم انگیز عذاب دے گا اور ان کا کوئی والی وارث اور حمایتی ایسا نہیں ہوگا جو انہیں اس سزا سے بچا لے"۔ دوسری

جگہ کہا کہ یہ اپنی ان چالوں سے کچھ دنیاوی مفاد تو حاصل کرلیں گے لیکن یہی مال و دولت ان کے لئے عذاب کا موجب بن جائے گا کیونکہ یہ انہیں اس فریب میں مبتلا رکھے گا کہ تمہاری روش بڑی کامیاب ہے، تم اس پر قائم رہو۔ ان کی اسی روش کی بنا پر رسول اللہ سے کہا گیا اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۔ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۹/۸۰)۔ "یہ اس سزا سے بچنے کے لئے ہزار بار بھی تمہارے پاس آئیں تو تم ان کا اعتبار نہ کرو۔ قانونِ خداوندی میں ایسے لوگوں کے لئے سزا سے محفوظ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں"۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۔ (۹/۸۰)۔ "یہ اس لئے کہ ایمان، اطاعت، توبہ اور استغفار کی باتیں محض ان کی زبان پر ہیں۔ ان کے دل میں خدا اور رسولؐ کے خلاف انکار و سرکشی کے جذبات بدستور موجزن رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حفاظت طلبی (استغفار) کیا معنی رکھتی ہے"۔ دوسرے مقام پر حضورؐ کو مخاطب کرکے، جماعت مومنین کو بالواسطہ کہا گیا کہ کفار اور منافقین کی اطاعت مت کرنا۔ اتباع صرف وحیٔ خداوندی کا کرنا اور اس کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھنا (۳۳/۴۸)۔

قطعِ تعلق

ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ ان سے تمام معاشرتی تعلقات منقطع کرلو۔ معاشرتی تعلقات میں جنازہ وغیرہ میں شرکت حرفِ آخر ہوتی ہے۔ انہیں اس سے بھی باز رہنے کی تاکید کی گئی۔ یہاں پھر بوساطتِ نبی اکرمؐ کہا گیا کہ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۔ (۹/۸۴)۔ "تم نہ ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرو اور نہ ہی ان کی موت پر نیک آرزوؤں کا اظہار کرو"۔ اور اس کی وجہ پھر وہی بتائی گئی کہ یہ کفر کو لئے ہوئے دنیا سے گئے ہیں۔ اس لئے جب کفار کے ساتھ اس قسم کے تعلقات روا نہیں رکھے جا سکتے، تو منافقین کے ساتھ کیسے روا رکھے جا سکتے ہیں؟ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کی تاکید کو قرآن اگلی دنیا تک بھی لے گیا ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۚ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۚ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۔ (۵۷/۱۳)

اُخروی زندگی میں

"یہ لوگ جو آج تمہارے ساتھ منافقت برت رہے ہیں۔ یعنی بظاہر تمہارے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں لیکن درحقیقت تم سے الگ ہیں۔ قیامت میں تم سے کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو! ہم بھی تمہاری اس روشنی سے اکتسابِ ضیا کرلیں (یعنی کچھ فائدہ اٹھائیں)۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ (یہ روشنی دوسروں سے مانگے نہیں ملا کرتی! یہ شمع تو اپنے اپنے اعمال کے تیل ہی سے روشن ہوا کرتی ہے، اس لئے تم اگر جا سکتے ہو تو) پچھلی زندگی کی طرف لوٹ جاؤ اور وہیں سے اس روشنی کو تلاش کرو (اس لئے کہ یہ روشنی ان اعمال کا نتیجہ ہے جو دنیاوی زندگی

میں سرزد ہوتے تھے اور چونکہ دنیاوی زندگی کی طرف کوئی لوٹ نہیں سکتا اس لئے انہیں کہیں سے روشنی نہیں مل سکے گی۔ جس کا دیا اس زندگی میں بجھ گیا وہ اُس زندگی میں بھی تاریکیوں ہی میں رہیگا۔ (۵۷/۱۳) ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی طرف (جہاں وہ لوگ ہونگے جن کے دلوں میں ایمان تھا) رحمت ہی رحمت ہوگی اور باہر کی طرف (جہاں ریاکار منافقین ہوں گے) عذاب ہی عذاب ہوگا۔ (ایمان اور منافقت میں ظاہراً بُعد تو ایک اوٹ ہی کا ہوتا ہے، لیکن نتائج کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں)۔ اس سے آگے ہے۔

يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ
وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ۔ (۵۷/۱۴)

"وہ منافقین، اِن مومنین کو آوازیں دے دے کر بلائیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوا کرتے تھے جواب تم ہم سے الگ ہو رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ظاہری طور پر تم ہمارے ساتھ ہوا کرتے تھے، لیکن تم نے اپنے آپ کو دھوکا میں رکھا تھا۔ تم صرف کنارے پر کھڑے اس انتظار میں رہتے تھے کہ دیکھیں پلڑا کس طرف جھکتا ہے تاکہ اسی طرف تم بھی ہو جاؤ۔ تم نظامِ خداوندی کی صداقت کے بارے میں ہمیشہ شکوک اور اضطراب میں رہتے تھے۔ تمہاری انفرادی مفاد پرستیاں تمہیں طرح طرح کے فریب دیا کرتی تھیں۔ تم اسی کشمکش اور دھوکا میں رہے تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے فیصلہ کی گھڑی آپہنچی۔ فریب کے پردے اُٹھ گئے۔ جس کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ تم ہم میں سے نہیں تھے۔"

اِس کے بعد کہا۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ مَأْوَاكُمُ
النَّارُ۔ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (۵۷/۱۵)

"پھر تم نے اپنے آپ کو اس فریب میں بھی رکھا کہ اگر خدا کے ہاں گرفت ہوئی تو ہم کچھ دے دلا کر چھوٹ جائیں گے۔ اب تم دیکھو کہ اس عذاب سے نہ تم ہی فدیہ دے کر چھوٹ سکو گے اور نہ وہ کفار جن میں تم درحقیقت شامل تھے۔ تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہی تمہارا کارساز و کارفرما ہے۔۔۔ اب تم دیکھ لو کہ تمہاری منافقانہ روش کا انجام کس قدر بُرا ہے!"

قرآنِ کریم نے ویسے تو یہ کہا ہے کہ منافقین اور کفار دونوں کو جہنم میں یکجا کر دیا جائے گا (۴/۱۴۰)۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی اس نے اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ (۴/۱۴۵)
"منافق جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے" یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ کفر، کفار اور منافقین۔ کفر دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے۔ لیکن کفار اس کا کھلے بندوں اقرار کرتے ہیں اور منافق جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے انسان کو دس جھوٹ اور بولنے پڑتے ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو شخص زندگی کے ہر قدم پر جھوٹ سے کام لے اس کی زندگی کس قدر عذابِ مسلسل اور الم پیہم میں گزرے گی۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں میرا جھوٹ کھل کر سامنے نہ آجائے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ منافق بڑا بزدل ہوتا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے کہ یہ منافق قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ "تم ہی میں سے ہیں۔ لیکن وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ (۹/۵۶)۔ یہ بے حد بزدل ہیں" اس لئے اپنے دل کی بات دھڑکتے سے زبان پر لاتے سے ڈرتے ہیں" ان کی کیفیت یہ ہے کہ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ۔ (۹/۵۷) "اگر انہیں کہیں پناہ گاہ مل جائے یا کوئی غار۔ یا کسی قسم کا اور چھپنے کا مقام نظر آجائے تو یہ تمہارا ساتھ چھوڑ کر اس کی طرف یوں لپک کر چلے جائیں جیسے کوئی جانور رسہ تڑوا کر بھاگ رہا ہو" قرآنِ کریم نے ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ (۶۳/۴) "تو ان کے قد و قامت، طبیعی پیکر، وضع قطع اور تراش خراش کو دیکھے تو وہ بڑی تعجب انگیز اور خوش آئند نظر آتے" وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ (ایضاً)۔ "جب یہ باتیں کریں تو اس قدر جاذب اور پرکشش، کہ سننے والا مسحور ہو جاتا ہے" لیکن ان ظاہرداری کے پردوں کو ذرا سرکا کر دیکھو تو نظر آجاتا ہے۔ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ۔ (ایضاً) "یہ تنومند و توانا انسان نہیں، گھن کھائی ہوئی کھوکھلی لکڑیاں ہیں۔ جنہیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا ہے" ان کی بزدلی کا یہ عالم ہے يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (ایضاً) "کہیں ذرا سا پتہ بھی کھڑکے تو ان کی جان نکل جاتی ہے کہ آئی کوئی نئی آفت۔ !"

سوچئے کہ جو شخص اس اضطرابِ پیہم کی زندگی بسر کر رہا ہو، اس کا مقام اگر جہنم کے پست ترین درجہ میں نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا؟

درجات و درکات

بات تو ضمنی سی ہے لیکن ہے ایسی کیف انگیز کہ اس کی تشریح کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس سے بھی آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی حقائق کو انسانوں کے سامنے لانے کے لئے عربی کی زبان کا انتخاب کیوں کیا تھا! اوپر کہا گیا ہے کہ منافق جہنم کے "درکِ اسفل" میں ہوں گے۔ سب سے نچلے درک میں۔ آپ سیڑھی کا تصور ذہن میں لائیے۔ اس میں چند ڈنڈے (STEPS) ہی ہوتے

ہیں جب کوئی شخص ان ڈنڈوں کے ذریعہ اوپر چڑھ رہا ہو تو عرب انہیں درجات کہتے تھے اور جب انہی سے نیچے اتر رہا ہو تو انہیں درکات کہہ کر پکارتے۔ سیڑھی کے ڈنڈے وہی ہیں۔ جو شخص اُن کے ذریعے بلندیوں کی طرف جانا چاہے وہ اُسے بلندی تک پہنچا دیتے ہیں، جو پستی کی طرف آنا چاہے وہ اُسے نیچے لے آتے ہیں۔ طبیعی زندگی کے ساز و سامان وہی ہوتے ہیں۔ جو انسان بلند مدارج حاصل کرنا چاہے، وہ ساز و سامان اُسے سرفرازیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جو ذلت اور پستی کی طرف جانا چاہے، وہی ساز و یراق اُسے ذلت کے گڑھوں میں دھکیل دیتا ہے۔ سوال ساز و سامان کا نہیں، اس کے استعمال کا ہے، یا یوں کہیے کہ اُس مقصد کا جس کے حصول کے لئے اُسے استعمال کیا جائے۔

(٠)

نبی اکرمؐ نے اپنے پیشِ نظر پروگرام کی پہلی منزل مکہ میں گزاری۔ وہاں واسطہ قریش سے تھا۔ قریش کے کردار میں منافقت نہیں تھی۔ وہ مخالفت کرتے تھے تو کھلے بندوں اور دوستانہ تعلقات وابستہ کرتے تھے تو بھی علی الاعلان۔ اپنے پروگرام کی اگلی منزل کے لئے حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو اس شہر کی اپنی آبادی بہت کم تھی اور اس میں بھی اکثریت یہودیوں کی تھی جن کی منافقت دنیا میں ضرب المثل ہے۔ یہی تھے وہ اہل کتاب جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ان کی تدبیر یہ تھی کہ صبح، مسلمان بن کر، مسلمانوں میں آملتے۔ ان میں وساوس پھیلاتے، شکوک اُبھارتے، اور شام کو اپنی جماعت کی طرف لوٹ آتے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ اس طرح شاید ناپختہ ایمان والے مسلمان بھی ان کے ساتھ جماعتِ مومنین سے باہر نکل آئیں۔ (۳/۷۲)۔ مدینہ اور اس کے گرد و نواح ان کی بستیاں تھیں۔ اسی ماحول میں اعراب (بدو) بھی بستے تھے۔ نسلی اعتبار سے یہ بھی عرب تھے، اس لئے انہیں بھی قریش کی طرح منافقت سے دور رہنا چاہیئے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ـــــ خراب کرگئی شاہیں بچوں کو صحبتِ زاغ ـــ ایک مدت تک یہودیوں کے ماحول میں رہنے سے ان میں بھی منافقت کے جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے انہیں منافق اہل کتاب کا بھائی بند کہہ کر پکارا (۵۹/۱۱) اور کہا ہے کہ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا۔ (۹/۹۷) یہ بدوؔ کفر اور نفاق میں بہت ہی شدید واقع ہوئے ہیں۔" (نیز ۹/۱۰۱) یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ مل کر منافقانہ طور پر اسلامی نظام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ لیکن جب اس کے علی الرغم، مسلمانوں کی اپنی مملکت قائم ہوگئی تو انہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی اور ایمان لے آئے۔ یہی ہیں وہ، جن کے

یہود اور اعراب

متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہو، یہ ایسا نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ یہ کہیں کہ ہم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ (۴۹/۱۴) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت منافقت کا ملمع ان پر سے اتر چکا تھا اور عربی سرشت پھر سے ابھر کر

اوپر آگئی تھی۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق یہ نہیں کہا کہ یہ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس کہا یہ ہے۔ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا۔ (۴۹/۱۴)۔ "اگر یہ لوگ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے رہے تو ان کے اعمال کے اجر میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی"۔ ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ جہاں تک منافقین کا تعلق ہے، وہ ساری زندگی مسلمانوں کو ستاتے رہے اور انہوں نے ان کی تخریب میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سوال یہ ہے کہ انہیں خدا نے بے نقاب کیوں نہ کر دیا کہ رسول اللہؐ اور جماعتِ مومنین ــــ بالفاظِ دیگر، نظامِ خداوندی ــــ ان کی سازشوں سے محفوظ رہتا اور اس جماعت کی توانائیاں ان کی مدافعت میں صرف ہونے کے بجائے کلیتہً تعمیری پروگرام کے لئے وقف ہوتیں؟ سوال جتنا اہم ہے اس کا جواب اتنا ہی زیادہ غور طلب ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰہُ اَضۡغَانَہُمۡ (۴۷/۲۹)۔ "یہ لوگ جن کے دلوں میں منافقت کا مرض ہے، کیا یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ان کا یہ خبثِ باطن کبھی نکھر سامنے نہیں آسکے گا؟" اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ سے فرمایا۔ وَ لَوۡ نَشَآءُ لَاَرَیۡنٰکَہُمۡ فَلَعَرَفۡتَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ؕ وَ لَتَعۡرِفَنَّہُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اَعۡمَالَکُمۡ۔ (۴۷/۳۰)۔ "خدا ان کی کارستانیوں سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے اگر وہ چاہتا تو تمہیں ان کی ایسی ظاہر اعلامات بذریعہ وحی بتا دیتا جن سے تم انہیں بڑی آسانی سے پہچان لیتے۔ لیکن اے رسولؐ! ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا کرنا ہماری مشیت کے پروگرام کے خلاف ہوتا۔ ہم نے انہیں چھوڑ دیا کہ تم خود انہیں ان کی باتوں سے پہچانو"۔

انہیں خود پہچاننا ہوگا

بات تو یہ چھوٹی سی ہے لیکن اس میں بھی ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ حضورؐ نے جب اپنی انقلاب آفریں دعوت کا آغاز کیا تو چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم امنڈ کر آگیا، اور ان کی یہ مخالفت آخر دم تک جاری رہی۔ ان میں قریشِ مکہ بھی تھے اور مدینہ کے منافقین بھی۔ سطحی نظروں سے دیکھا جائے تو قریشِ مکہ کی مخالفت بڑی شدید اور ہمت آزما تھی، لیکن ذرا بنگاہِ تعمق غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ منافقین کی مخالفت، قریشِ مکہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اذیت رساں، صعوبت انگیز، صبر آزما اور استقامت طلب تھی۔ قریش کھلے ہوئے دشمن تھے وہ للکار کر سامنے آتے اور پکار کر وار کرتے تھے۔ نہ ان کے پہچاننے میں کوئی مشکل تھی اور نہ ہی ان کے عزائم کے بھانپنے میں چنداں دشواری۔ لیکن منافقین کی صورت ان کے یکسر مختلف تھی۔ وہ کھلے چہروں کے ساتھ شمشیر بکف سامنے آنے والے تھے، یہ زیرِ نقاب خنجر در آستیں۔ نہ انہیں آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا، نہ ان کے مکاید کا نظر بظاہر اندازہ

لگایا جا سکتا۔ ان کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ اور اس کا حل کس قدر دقت طلب تھا، اس کا اندازہ سورۃ توبہ میں مذکورہ تفصیلات سے لگ سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت آسان ہو جاتا اگر ان کی پہچان کا کوئی قابل اعتماد طریقہ یا ذریعہ مل جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے وحی سے زیادہ قابلِ اعتماد اور یقینی ذریعہ اور کونسا ہو سکتا تھا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ ہمارے لئے یہ ذرا بھی مشکل نہیں کہ ہم ان کا پتہ نشان بتا دیں، لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ یہ آپؐ کو خود ہی کرنا ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ جہاں تک وحی کا تعلق ہے وہ تو خالصتہً خارقِ فطرت اور فوق البشر ذریعۂ علم تھا۔ اس میں حضورؐ کی اپنی فکر و بصیرت یا محنت اور کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن وحی کی روشنی میں جو محیر العقول کارنامے حضورؐ نے سرانجام دیئے ان میں کسی فوق الفطرت عنصر کا دخل نہیں تھا۔ وہ آپؐ کی اپنی نقید المثال فراست و بصیرت کا نتیجہ اور عدیم النظیر سیرت و کردار کا ثمرہ تھا۔ مخالفین کی تدبیر کا جواب حسنِ تدبیر سے دیا جاتا، اور شمشیر کی کاٹ جوہرِ شمشیر سے کی جاتی تھی۔ یہ فریقین میں برابر کی جنگ تھی، اس فرق کے ساتھ کہ دشمن جو حربہ چاہے استعمال کر سکتا تھا لیکن حضورؐ (اور آپؐ کی جماعت) کو وحی کی عائد کردہ حدود و قیود کا پابند رہنا پڑتا تھا۔ نظر بظاہر اس سے اس کشمکش اور آویزش میں داعیانِ الی الحق کی پوزیشن (DISADVANTAGEOUS) دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت وحی کی متعین کردہ اقدار و اصول کی پابندی تھی جس سے حق آخر الامر غالب آیا۔ اسی کو حضورؐ کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے طور پر

اسوہ حسنہ

دنیا کے سامنے پیش کر کے کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) "رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے"۔ اگر ان کارناموں میں فوق الفطرت عناصر کا عمل دخل ہوتا تو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ نوعِ انسان کے لئے نمونہ نہ بن سکتی۔

یہ وجہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہہ دیا کہ ہم ان منافقین کا پتہ نشان نہیں بتائیں گے۔ تمہیں انہیں ان کے قول و فعل سے خود پہچاننا ہوگا۔ اور قرآنِ کریم اس کی شہادت دیتا ہے کہ حضورؐ نے انہیں پہچانا اور اپنے معاشرہ کو ان سے پاک اور صاف کیا۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ

منافقین الگ کرائے گئے تھے

الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (۳/۱۷۸) "ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا مومنین کے معاشرہ کو ایسی حالت میں چھوڑ دے جس میں یہ اس وقت ہے۔ وہ ایسا کرے گا کہ خبیث اور طیب کو الگ الگ کر دے"۔ جیسا کہ ہم (خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ (۲/۷) کی تشریح کرتے ہوئے بتا چکے ہیں، خدا ان امور کو منسوب تو اپنی طرف کرتا ہے لیکن کئے ہوئے یہ انسانوں ہی کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں

منافقین کا یہ خبث، جماعتِ مومنین کے طیب سے الگ ہو چکا تھا۔ اور وہ معاشرہ ان مخلص مومنین پر مشتمل تھا جنہیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ چونکہ بدوؤں کے ایمان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اس لئے قرآنِ کریم نے ان صحابہؓ کو خصوصیت سے مہاجرین اور انصار کہہ کر پکارا ہے۔ ان کے خلوصِ ایمان کی شہادت قرآنِ کریم کے اوراق میں تابندہ موتیوں کی طرح بکھری پڑی ہے۔ سورۃ انفال میں ہے۔ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا - اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا - لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (۸/۷۴) وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا، اور وہ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومنِ حقا) ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔"

صحابہ سب مخلص مومن تھے

ان میں کچھ وہ تھے جنہوں نے حضورؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا، اور کچھ وہ جو ان میں ذرا بعد میں شامل ہوئے۔ لیکن خدا نے ان سب کے لئے جنت کی بشارت دی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ - وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ - خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا - ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۱۰۰)

"مہاجرین اور انصار جنہوں نے پہل کی، اور وہ جو اس حسین معاشرہ میں اُن کے بعد شامل ہوئے، اللہ اُن سب سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ خدا نے اُن کے لئے ایسے باغات (جنت) تیار کر رکھے ہیں جن کی بہاریں خزاں نا آشنا ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے جسے نصیب ہو جائے۔"

غور فرمایئے۔ خدا نے تمام صحابہؓ کے لئے، خواہ وہ "السابقون الاولون" کے زمرہ میں شامل تھے اور خواہ وہ ان میں بعد میں شامل ہوئے، ابدی جنت کی ضمانت دی ہے اور سب کے لئے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا درخشندہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔ ان میں بعد میں شامل ہونے والوں کے متعلق کہا ہے فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۸/۷۵)۔ "وہ بھی تم ہیں سے ہی ہیں۔ جہاں تک خدا کے وعدے کا تعلق ہے ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں"۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنی معیار کے مطابق مدارج کا تعین اعمال کی رُو سے ہوتا ہے (۴۶/۱۹)۔ لہٰذا السابقون الاولون کے مدارج زیادہ بلند ہوں گے۔ لیکن جہاں تک جنت و مغفرت کے خدائی وعدہ کا تعلق ہے، وہ ان سب کے لئے یکساں ہے۔ چنانچہ سورۃ حدید میں فرمایا۔ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ - اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا - وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى - وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

خَبِیْرٌ (۵۷:۱۰)۔ "وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے، اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ السابقون الاولون کے مدارج نسبتاً بلند ہیں۔ لیکن خدا کے (جنت اور مغفرت کے) حسین اور خوشگوار وعدے ان سب کے لئے ہیں۔ خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دی۔"

یہی ہیں وہ مخلص مومنین جن کے متعلق خدا نے اپنے رسولؐ سے کہا۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۸:۶۲) "خدا وہ ہے جس نے اے رسولؐ! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت کو تمہاری تائید و تقویت کا موجب بنایا"۔ اس کے بعد دوسری آیت میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۸:۶۴) "اے نبیؐ! خدا اور یہ جماعتِ مومنین جو تیرا اتباع کرتی ہے، تیرے لئے کافی ہے۔" آپ نے غور فرمایا کہ مہاجرین اور انصار پر مشتمل صحابہؓ کی جماعت کا مقام کس قدر بلند تھا۔ یہی ہے وہ مقام جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے سورۃ الفتح میں ان وجد آور الفاظ میں کھینچا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸:۲۹)

محمدؐ، اللہ کا رسولؐ اور اس کے رفقاء کار کی جماعت۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد۔ (۴۸:۲۹) تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے ہیں، اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ، اور ان کی سیرت صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے

اس سے انہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے' اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ علامات، سابقہ کتب آسمانی۔ تورات و انجیل۔ میں بھی مذکور تھیں۔

انہوں نے اس نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے' اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نازک و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے۔ اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب کاشتکار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر اس کے بتلائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ انکی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائیگی۔ (۵۵ / ۲۹)۔ لیکن اس کے لئے اسی قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہوگی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے۔ (تخمِ صالح۔ قوانینِ فطرت سے مطابقت۔ مسلسل محنت اور استقلال و استقامت، کھیتی کی برومندی کے لئے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)

قرآن کریم کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا نے جو کہا تھا کہ مؤمنین کے معاشرہ میں سے خبیث کو الگ کر دیا جائے گا وہ وعدہ اس طرح پورا ہوا، اور جو طیب جماعت باقی رہ گئی (یعنی حضورؐ کی دنیا سے تشریف براری کے وقت جملہ صحابہ کرامؓ کی جماعت) وہ کس طرح طیب ہی طیب تھی۔ اُن میں کوئی منافق نہیں تھا۔

اب آگے چلئے۔

(۹/۲) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔

اس آیت کا مفہوم سابقہ آیت کی تشریح میں آچکا ہے۔ صرف ایک نکتہ ہے جو تھوڑی سی مزید وضاحت چاہتا ہے۔

سورۃ النساء میں منافقین کی اِس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ (۴/۱۴۲) اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "منافقین خدا کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور خدا انہیں دھوکہ دیتا ہے۔" اس ترجمہ کی رُو سے خدا کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ واضح ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کے لیے اُس بحث کو سامنے لائیے جو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ (۲/۷) کے ضمن میں سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان الفاظ کو ملائیے کہ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (۲/۹) تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ مفہوم اس آیت کا یہ ہوگا کہ منافق بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن درحقیقت ہوتا یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے وہ خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر منافقت کے نفسیاتی مرض نے ان کے عقل و شعور کی صلاحیتوں پر پردہ نہ ڈال دیا ہوتا تو یہ بات کچھ ایسی عمیق و دقیق نہیں تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آ سکتی۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔ (۲/۹) میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) کہ انسان

اعمال کا اثر انسانی ذات پر

کے ہر عمل کا اثر یا نتیجہ اس کی ذات (نفس) پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ۔ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا۔ (۱۷/۷) "اگر تم سنوارنے والے تعمیری کام کرتے ہو تو اس سے خود تمہاری اپنی ذات سنورتی ہے۔ اور اگر بگاڑ پیدا کرنے والے کام کرتے ہو تو اس سے تمہاری ذات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔" اس نے دوسری جگہ کہا ہے وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱) "جو جرم تم (بظاہر) دوسروں کے خلاف کرتے ہو، وہ درحقیقت خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اُس سے تمہاری ذات مضمحل ہو جاتی ہے۔" (اثم کے یہی معنی ہیں) مشہور جرمن فلاسفر نطشے نے اسی نکتہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "جو جرم تم نے میرے خلاف کیا ہے اُسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُسے کون معاف کرے گا؟" قرآن کریم نے اپنی پیش کردہ حقیقت کو سورۃ حشر میں دو مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں بیان کیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ۔ (۵۹/۱۹) "دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنی ذات ہی کو فراموش کر بیٹھے۔" یعنی خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے۔ اور اسی کو آیہ زیرِ نظر (۲/۹) میں "خود فریبی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے اگلی آیت ہے۔

(۲/۱۰) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔

۲/۱۰ اس آیت کا مفہوم بھی آیہ (۲/۷) میں آ چکا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ قرآن کریم نے منافقت کو نفسیاتی مرض قرار دیا ہے۔ نفسیاتی امراض کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان کی اصلی علت (CAUSE) کی تشخیص نہ ہو جائے نہ صرف

یہ کہ ان کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ ہر غلط علاج سے مرض اور بڑھتا جاتا ہے۔ ہم نے پہلے کہا ہے کہ انسان کو اپنے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دس اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور انہی سے یہ مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ سب نتیجہ ہے بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ کا۔ یعنی اس کذب اور جھوٹ کا جسے انہوں نے اپنی زندگی کا شعار بنا رکھا ہے۔

منافقین کے اس مرض سے پیدا ہونے والے کرب و اضطراب کو قرآنِ کریم نے عَذَابٌ اَلِيْمٌ کہہ کر پکارا ہے یعنی الم انگیز، دردناک عذاب۔ ہم آیہ (۲/۷) کے سلسلہ میں کفر کے متعلق تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ آپ نے وہاں دیکھا ہوگا کہ کفر کا تعلق انسانی فہم و ادراک کی غلطی یا غلط نگہی سے ہے۔ اس بنا پر اُس سے پیدا ہونے والی تباہی کو عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲/۷) کہا یعنی سخت تباہی۔ لیکن منافقت کا تعلق چونکہ انسان کے قلب یا نفسیات سے ہے اس لئے اس سے پیدا ہونیوالی تباہی کو الم انگیز عذاب کہا ہے۔ عام الفاظ میں یوں کہیئے کہ اگر کفر کا نتیجہ دردِ سر ہے تو منافقت کا نتیجہ دردِ جگر۔ آپ نے غور فرمایا کہ الفاظ کے انتخاب میں بھی قرآن کریم کس اعجاز سے کام لیتا ہے (اسی لئے میں تاکید کیا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے کسی لفظ پر بھی غور و فکر کئے بغیر آگے نہیں بڑھ جانا چاہیئے۔)

منافقین کی چند ایک نمایاں خصوصیات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے ان کی ایک ایسی خصوصیت بتائی ہے جو یوں کہیئے کہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا ذکر اس سے اگلی دو آیات میں آیا ہے اور وہ یہ ہیں ۲/۱۱

(۲/۱۱-۱۲) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۔ اَلَآ ۲/۱۲
اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۔

ان آیات کا مفہوم یہ ہے "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ معاشرہ، ملک یا دنیا میں فساد پیدا نہ کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم فساد نہیں پیدا کرتے، ہم تو اصلاح کرتے ہیں" اور قرآن کریم لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ان کی ان باتوں میں نہ آجانا۔ "یہ اصلاح کرنے والے نہیں، فساد پھیلانیوالے ہیں"۔

اصلاح اور فساد

اس آیت میں فساد اور اصلاح کے دو ایسے الفاظ آئے ہیں جو قرآنِ کریم کی بڑی معنی خیز اور غور طلب اصطلاحات ہیں۔ صُلْحٌ کے بنیادی معنے یہ ہیں کہ جس چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اُسی حالت میں ہو۔ اس کا اعتدال۔ توازن، تناسب علیٰ حالہٖ برقرار رہے۔ فَسَادٌ اس کی ضد ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں نہ ہو۔ اس کے اعتدال، توازن اور تناسب، غرضیکہ ہر جوہر اور ہر خاصیت میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہو۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے۔ وہ اُسی حالت میں ہو"۔ ہونا چاہیئے" بظاہر تو دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ دنیائے فکر و نظر کا مشکل ترین مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے انسانی فکر

(وحی کی روشنی کے بغیر) اُس زمانے سے مصروفِ کاہش و کاوش ہے۔ جب انسانی شعور نے پہلے پہل آنکھ کھولی تھی، لیکن آج تک وہ کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ پائی۔ علومِ سائنس کے سامنے جو مسئلہ ہے وہ آسان ہے۔ اس میں سوال صرف "کیا ہے"

کیا ہونا چاہیئے؟ مشکل ترین مسئلہ

(WHAT IS) ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اشیائے کائنات یا فطرت کی قوتوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے اور سائنس کی تحقیقات اس پردہ کو اٹھا دیتی ہیں۔ اور اس کے نیچے چھپی ہوئی حقیقتوں کو (DISCOVER) کر دیتی ہیں۔ اس سے ہر چیز کے متعلق معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہے؛ لیکن انسانی دنیا میں اصل سوال (WHAT IS) کا نہیں ہوتا۔ سوال (WHAT OUGHT TO BE) ہوتا ہے۔ ہم روزمرہ کی بات چیت میں کہتے ہیں کہ اُس نے ایسا کیا حالانکہ اُسے "یوں کرنا چاہیئے تھا"۔ وہ شخص ایسا کہنے والے سے پوچھ سکتا ہے کہ مجھے "ایسا کیوں کرنا چاہیئے تھا۔ جیسا تم کہتے ہو"؟ اور اس کے بعد یہ کہ تم یہ کہنے والے کون ہو کہ مجھے ایسا کرنا چاہیئے تھا۔

قصہ آدم کا تفصیلی بیان چند آیات آگے جا کر ہمارے سامنے آئے گا۔ اُس میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالےٰ نے جب زمین میں ایک صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق (انسان) پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو ملائکہ نے کہا کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) کیا تو دنیا میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو؟ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں فساد پیدا کر دیگا۔ یعنی وہ کسی شے کو اُس حالت پر نہیں رہنے دیگا جس حالت پر اُسے ہونا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ خون ریزیوں کے سوا اور کیا ہوگا!" (علامہ) اقبالؒ نے اس حقیقت کو نہایت حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے:-

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد ماند

گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

خدا نے آدم (انسان) سے کہا کہ دیکھو! تم اپنی تمدنی زندگی کے نظام کو اُسی حالت پر رہنے دینا جس حالت پر ہم اُسے بذریعہ وحی متعین کریں۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کرنا۔ اس سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ لیکن (وحی سے سرکشی برتنے والے) انسان نے کہا کہ نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کروں گا کہ اسے کیسے ہونا چاہیئے۔ "ایسے ہونا چاہیئے اور ویسے نہیں ہونا چاہیئے"۔ کی یہی کشمکش اور آویزش ہے جس کی داستان کو تاریخِ انسانیت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وحیِ خداوندی کہتی ہے کہ تمہاری تمدنی زندگی کے نظام کو ایسا ہونا چاہیئے۔ انسان کی مفاد پرستیاں اسے چیلنج کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ نہیں "یوں ہونا چاہیئے"۔ اسی کو فساد کہتے ہیں۔ اسی کو خیر و شر کی کشمکش یا ابلیس و آدم کی آویزش کہتے ہیں۔ (خیر و شر کی مزید وضاحت ذرا آگے

چل کر سامنے آئے گی)۔ قرآنِ کریم کے متعلق بھی بنیادی طور پر یہی سمجھئے کہ وہ اسی صلح اور فساد کی آویزش کا تذکرہ بلیغ وجمیل ہے۔ مصلحین کی تگ و تاز اس مقصد کے لئے ہوتی ہے کہ انسانی نظام اُس حالت پر رہے جس حالت پر اُسے خدا (یعنی وحی) رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے مومنین کے پیشِ نظر نصب العین کو ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے --- یا یوں کہیئے کہ اس نے مومنین کی تعریف (DEFINITION) یہ کی ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰)۔ "وہ وہی چاہتے ہیں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ ہو"۔ آپ نے دیکھا کہ مومن "کیا ہونا چاہیئے" (OUGHT TO BE) کا

فسادکے مختلف گوشے

مسئلہ کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔ ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر انہیں مصلحین یا صالحین کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس وحی سے برگشتہ ہونے والے، اس نظام کو اپنی مفاد پرستیوں کے مطابق بدل ڈالتے ہیں۔ اسی نہج سے انہیں مفسدین کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے انسانی زندگی کے چند ایک ایسے گوشوں کو سامنے لایا جاتا ہے جن میں قرآنِ کریم کی رُو سے اصلاح کے بجائے فساد برپا ہوتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے نظامِ مملکت کو لیجئے۔ اس میں بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ قانون وضع کرنے کا آخری اختیار کسے حاصل ہو؛ اسی اتھارٹی کو صاحبِ اقتدار (SOVEREIGN AUTHORITY) یا قرآن کی اصطلاح میں اٰلہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت میں اللہ کے متعلق جو بحث سامنے آچکی ہے اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ وہی ایک الٰہ ہے، کوئی اور الٰہ نہیں۔ خارجی کائنات میں اس کے نافذ کردہ قوانین بلا غل و غش کارفرما ہیں۔ سائنس کے محققین اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کارگہِ کائنات کی بنیاد وحدتِ قوانین پر ہے۔ یعنی اس میں ایک ہی اتھارٹی کے وضع کردہ قوانین نافذ العمل ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ محیر العقول مشینری اس حسن و خوبی سے مصروفِ عمل ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے، چاہے وہ (انسانوں کے سوا) عام مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں، سب اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور اس سے کبھی سرکشی نہیں برتتیں"۔

نظامِ حکومت

یہ اس لئے کہ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷) "ساری کائنات میں کبریائی (یعنی اقتدارِ اعلیٰ) صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی کبریائی اندھی قوت پر مبنی نہیں، حکمت پر مبنی ہے"۔ نظامِ کائنات کو مثال کے طور پر سامنے لانے کے بعد اُس نے انسانوں سے کہا کہ جس طرح تم خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہو اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کو الٰہ مانو --- وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (۴۳/۸۴)۔ یاد رکھو! خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ ہے

اور اسی کو انسانی دنیا میں بھی الٰہ ہونا چاہیئے" ایک اور جگہ کہا۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۱/۲۲) یاد رکھو! اگر تم نے ایسی صورت پیدا کرلی کہ خارجی کائنات میں کسی اور کو الٰہ مان لیا اور اپنی داخلی دنیا میں کوئی الٰہ، تو اس کا نتیجہ فساد ہوگا۔ خدا کے متعلق تمہارا یہ تصور کہ اس کا حیطۂ اقتدار صرف خارجی کائنات تک محدود ہے، انسانی زندگی میں انسانوں کو خود مختار ہونا چاہیئے، بڑا غلط ہے اور خدا اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ ساری کائنات کا مرکزی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے" یہ اس لئے کہ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۲۳) "دنیا میں جو بھی صاحب اختیار ہے اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ایسا ہونا چاہیئے، اس کی تمہارے پاس کیا اتھارٹی ہے۔ یہ اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے" اسی نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا کا نظام کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے اس نے دلیل بھی بڑی واضح اور محکم دی ہے۔ اس نے کہا کہ انسان کوئی بھی ہو، اُس کے وضع کردہ قوانین اور فیصلوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے جذبات کی آمیزش ضرور ہوگی۔ اس طرح حق خالصتہً حق نہیں رہیگا۔ اور وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳/۷۱) "اگر الحق لوگوں کے جذبات کے تابع ہو جاتے تو ارض و سماء اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، میں فساد برپا ہو جائے۔ اور اُس فساد کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کی صورت یہی ہے کہ وہ قوانین، جن کے تابع انسانوں نے زندگی بسر کرنی ہے، انسانی جذبات سے ملوث نہ ہوں"۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۳/۷۱) "انسانوں کی غلط نگہی کو دیکھئے۔ ہم انہیں ایسا نظام دینا چاہتے ہیں جس میں ان کے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے لیکن یہ اُس سے اعراض برتتے ہیں" حکومت کی کوئی شکل بھی ہو، اگر اس میں قانون سازی کے اختیارات کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کے ہاتھ میں ہوں تو اس سے لامحالہ دوسرے انسان ان کی مرضی کے تابع چلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور انسان کی یہ انتہائی ذلت ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی مرضی کے تابع چلنے پر مجبور ہو۔ اس سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے شرف و تکریم کا راز اسی میں ہے کہ وہ کسی انسان کا محکوم و محتاج نہ ہو۔

ملوکیت

جس حکومت کا نتیجہ فساد ہے اس کی ایک شکل ملوکیت ہے۔ ملوکیت میں کیا ہوتا ہے! اسے قرآنِ کریم نے ملکہ قومِ سبا کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۷/۳۴) یاد رکھو! جب بادشاہ کسی دوسرے ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو وہاں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہاں فساد کی صورت پیدا ہو جاتی

ہے. وہ سب سے پہلے اُس قوم کے ذی عزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں. اور یہ چیز کسی خاص بادشاہ تک محدود نہیں' یہ خاصۂ ملوکیت ہے. بادشاہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں' وہ یہی کرتے چلے آئے ہیں اور یہی کرتے چلے جائیں گے" دوسری جگہ فساد کی تشریح ان الفاظ میں کر دی کہ وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵) "جب کوئی ایسا شخص ملک میں اقتدار حاصل کر لیتا ہے تو وہاں فساد برپا کر دیا کرتا ہے ۔ وہ فصلوں کو تباہ کر دیتا ہے اور انسانوں کو ہلاک ۔ اس کے برعکس خدا کی فرماں روائی میں ایسا نہیں ہوتا. خدا فساد کو پسند ہی نہیں کرتا"۔

قرآنِ کریم نے مصر کے فراعنہ کو ملوکیت کے نمائندوں کے طور پر پیش کیا ہے ۔ وہ ان کے متعلق کہتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ۪ۙ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ (۸۹/۱۱-۱۲) "وہ بستیوں کو اُس سیلاب کی طرح تباہ کر دیتے ہیں جو اپنے ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جاتا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے ملک میں فساد برپا ہو جاتا ہے ۔ کوئی شے بھی اپنی اصل حالت پر نہیں رہتی" دوسری جگہ ہے ۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۲۸/۴) "فرعون نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی اور دھاندلی مچا رکھی ہے ۔ وہ قومِ بنی اسرائیل کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا ہے کبھی دوسری کو ۔ وہ اِس قوم کے جن افراد میں جوہرِ انسانیت کی نمود دیکھتا ہے انہیں ذلیل و خوار کر دیتا ہے ۔ اور جو اِن جوہروں اور صلاحیتوں سے عاری ہوتے ہیں انہیں آگے بڑھاتا ہے ۔ یہ ہے وہ فسادِ انسانیت' جسے وہ عام کئے جا رہا ہے"۔

ملوکیت کے یہ معنی نہیں کہ اُس میں قوانین سازی کا اختیار کسی ایک فرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ ایک فرد ہو یا افراد کا کوئی گروہ (جسے دورِ حاضر میں مغرب کا جمہوری نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے) قرآنِ کریم کی رو سے اِسے ملوکیت قرار دیا جائیگا

جمہوریت

معلوم ہوتا ہے کہ قومِ ثمودؑ میں کچھ اسی قسم کا 'جمہوری نظام' رائج تھا ۔ چنانچہ جب حضرت صالحؑ نے خدا سے کہا کہ وہ تو ساری کی ساری قوم بگڑی ہوئی ہے ' میں ان کی اصلاح کی کیا شکل اختیار کروں ' تو خدا نے کہا ۔ وَ كَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ (۲۷/۴۸) "تم ساری قوم کی فکر نہ کرو ۔ فساد کی جڑ وہ نو اربابِ اقتدار ہیں جو دار المدینہ میں بیٹھے ہر شے میں بگاڑ پیدا کرتے رہتے ہیں" ان کا پروگرام یہ ہے کہ کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہنے پائے ۔ تم ان (نو) کا علاج کر لو ' تو ساری قوم کا علاج ہو جائے گا ۔ چیچک کا علاج ہر آبلے پر پھایا رکھنا نہیں ہوتا ۔ اس کا علاج یہ ہوتا ہے کہ خون میں جو تخریبی جراثیم داخل ہو گئے ہوں' ان کا ازالہ

کر دیا جائے۔ وہ جراثیم تباہ ہو جائیں گے تو چیچک کے چھالے خود بخود بند ہو جائیں گے۔

اُس نے جنت کے متعلق کہا کہ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا۔ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸/۸۳)۔ "اُخروی زندگی کا یہ مسکن اُن کے لئے ہے جو دنیا میں نہ سرکشی اختیار کرتے ہیں نہ فساد برپا۔ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں اور اسی کا نتیجہ یہ جنت ہے"۔

یہاں ایک اور بنیادی نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ جنت ان کے لئے ہے۔ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ۔ (۲۸/۸۳) جو دنیا میں علوّ نہیں چاہتے۔ علوّ کا عام ترجمہ دوسروں سے بلند ہو جانا لیا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد لی جاتی ہے قوت و اقتدار، سرفرازی و سربلندی۔ تصوف کے مسلک خانقاہیت

مومنین اور علوّ فی الارض

کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ قوت و اقتدار، سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط، فرماں روائی و جہانبانی خدا کے بندوں کا شیوہ نہیں۔ مقربینِ بارگاہِ خداوندی کا مسلک یہ ہے کہ وہ انتہائی عجز و انکسار، ضعف و ناتوانی، بےکسی و بیچارگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی "خودی" کو فنا کر دیتے ہیں تاکہ ان میں نمودِ خویش کی آرزو تک باقی نہ رہے۔ یہ حضرات اپنے اس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی قرآنی آیات اور ان کا خود ساختہ مفہوم پیش کر دیتے ہیں۔ زندگی کا یہ تصور قرآنِ کریم کے خلاف ہے اور عجمی سازشوں کا پیدا کردہ[۱]۔ اس آیت (۲۸/۸۳) میں کہا یہ گیا ہے۔ کہ متقین اور اہلِ جنت وہ ہیں جو دنیا میں علوّ نہیں چاہتے۔ اگر اس کا مفہوم وہ لے لیا جائے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تو اس ارشادِ خداوندی کے متعلق کیا کہا جائے گا جس میں اُس نے مومنین سے کہا ہے کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۳/۱۳۸)۔ "تم مومنین ہو تو تمہیں سب سے بڑا علوّ حاصل ہوگا"۔ ان کے لئے اعلون کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں سب سے بلند، سب سے اعلیٰ، سب پر غالب، سب سے اونچا۔ قرآنِ کریم مومنین کی نشانی یہ بتاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

مومنے بالاتے ہر بالا ترے غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آیت (۲۸/۸۳) میں جس علوّ سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت خود خدا نے کر دی جب کہا کہ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۴۱/۱۵)۔ "قوم عاد نے الحق کے بغیر غلو اور استکبار حاصل کر رکھا تھا"۔ دوسری جگہ اس نے کفار اور اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے۔ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (۴۶/۲۰)۔ "ان سے کہا جائے گا کہ تم نے دنیا میں حق کو

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب۔ شاہکارِ رسالتؐ۔ کا آخری باب

چھوڑ کر، غلبہ و اقتدار حاصل کیا۔ اس سے فساد برپا ہوا، اور اس کا نتیجہ یہ ذلت کا عذاب ہے جس میں تم اس بُری طرح سے گرفتار ہو"۔ (نیز دیکھئے ۸۳/۲۸ ، ۴۲/۴۲)۔ ان آیات میں دیکھئے۔ استکبار فی الارض بغیر الحق کو ناجائز اور وجہِ فساد قرار دیا گیا ہے۔ جب غلبہ و اقتدار کو قوانین خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ علو ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ اور منشاء خداوندی کے مطابق ہوگا۔ وہ نظام اس امر کا اعلان و اعتراف کرے گا کہ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵/۳۷)
"خارجی کائنات میں بھی کبریائی خدا کی ہے اور انسانی زندگی میں بھی اُسی کی"۔ یہ جو ہمارے (مسلمانوں کے) معاشرہ میں پانچ وقت

اللّٰہ اکبر کا اعلان

بلند ترین مقام پر کھڑے ہوکر باآوازِ بلند اعلان کیا جاتا ہے کہ اللّٰہ اکبر! تو یہ اس امر کی شہادت ہوتی ہے (یا ہوتی تھی) کہ کبریائی (اقتدارِ اعلیٰ) صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کا اقتدار اس کا عطا کردہ اور اس کے پروگرام کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ یہ تھا اذان میں "اللّٰہ اکبر" کے اعلان کا قرآنی مفہوم۔ لیکن آج (جب اسلام دین کے بجائے مذہب میں تبدیل ہوچکا ہے) اس کی بھی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ ــــ رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی ــــ

(۲) ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی تائید و حمایت کے بغیر، قائم نہیں رہ سکتی۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر بطیبِ خاطر آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے وہ ملوکیت کی کبریائی کو تسلیم ہی نہیں کرسکتا۔ مذہبی پیشوائیت اسے یہ تعلیم دیتی ہے کہ "جسے تم اپنے سامنے مسندِ اقتدار پر جلوہ فرما دیکھ رہے ہو، یہ "ظل اللّٰہ علی الارض" یعنی زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ ایشور

مذہبی پیشوائیت

کا اوتار ہے۔ خدا نے اپنے سارے اختیارات اسے تفویض کر دیتے ہیں۔ لہذا اس کے سامنے جھکنا کسی انسان کے سامنے جھکنا نہیں، خود خدا کے سامنے جھکنا ہے۔ مذہبی پیشوائیت عوام کے کانوں میں یہ سحر اس اصرار و تکرار سے پھونکتی رہتی ہے کہ انہیں فی الواقعہ انسانی کی شکل میں خدا نظر آنے لگ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ جابر اور سرکش حکمران جس قسم کا فساد جی چاہے مچاتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس فساد انگیزی میں مذہبی پیشوا برابر کے شریک ہیں۔ جب فرعون نے دیکھا کہ اس کے پاس حضرتِ موسیٰؑ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تو اس نے مذہبی پیشواؤں کو بلایا اور کہا کہ وہ عوام پر ثابت کر دیں کہ فرعون برسرِ حق ہے اور (حضرت) موسیٰؑ ملک میں فساد مچانا چاہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس آویزش کا انجام یہ بتایا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ۔ (۱۰/۸۱)۔ "یہ مذہبی پیشوا چاہتے تھے کہ فرعونیت کا فساد برقرار رکھیں لیکن حق کے مقابلہ میں ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے"۔ مذہبی پیشوائیت کی فساد انگیزیوں کے متعلق ہم سردست اسی ایک اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ تفصیلات آگے چل کر سامنے آتی رہیں گی۔

(۳) قوموں کے اجتماعی نظام میں سیاسی اور معاشی گوشوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر ایک گوشے میں بگاڑ ہے

معاشی نظام

تو دوسرے گوشہ میں بھی لازماً بگاڑ ہوگا۔ قرآنِ کریم کے معاشی نظام کے متعلق آیت (۲/۳) کے ذیلی عنوان "مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" کے تحت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ملخصاً اس نظام کی اساس ان مسلمات پر ہے کہ:-

(۱) خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو مخلوق کی زندگی اور پرورش کے سامان کا بھی ساتھ ہی انتظام کر دیا ہے۔ اسے رزق کہا جاتا ہے۔

(۲) اسبابِ رزق یا وسائلِ پیداوار کے متعلق اس نے واضح انداز میں کہہ دیا کہ ان کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیئے کہ کوئی متنفس ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۳) یہ ہے وہ صحیح حالت جس پر وسائلِ رزق کو رہنا چاہیئے اور جس کے مطابق رزق کی تقسیم ہونی چاہیئے۔

(۴) اس میں فساد کی شکل یہ ہے کہ کوئی فرد یا افراد کا گروہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت میں لے لے، اور پھر اس کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ کسی کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ جمع ہو جائے اور دوسرے اپنی ضروریات سے محروم، لہٰذا ان لوگوں کے محکوم و محتاج ہو جائیں جنہوں نے ان ذرائع رزق کو اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔ قرآنِ کریم اس اندازِ معیشت کو فساد کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اختصاراً کہتا ہے کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ (۲/۶۰) "خدا کے عطا کردہ رزق میں سے کھاؤ پیو، لیکن ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو"۔ جہاں تک ذرائع پیداوار کو ذاتی ملکیت میں لے لینے کا تعلق ہے، اس نے اقوامِ سابقہ میں سے قومِ ثمود کی داستان کو خاص طور پر بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ اُس زمانے میں گلہ بانی ذریعۂ معیشت تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے چراگاہیں اور پانی کے چشمے بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ قومِ ثمود کے اربابِ اقتدار

قومِ ثمود کی فساد انگیزی

(سردارانِ قوم) نے انہیں اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ قوم کے نچلے طبقہ کے لوگوں کے مویشیوں پر ان کے دروازے بند رہتے تھے، اور کھلتے تھے تو انہی سردارانِ قوم کی مرضی اور مفاد کے مطابق۔ حضرت صالحؑ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور انہوں نے سردارانِ قوم سے کہا کہ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ (۷/۷۴) "رزق کے یہ سرچشمے خدا کے عطا کردہ ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھو اور ملک میں فساد پیدا نہ کرو"۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے ذہن میں اصلاح کی شکل کیا ہے؟ حضرت صالحؑ نے کہا کہ بات واضح ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۷/۷۳) "یہ زمین بھی خدا کی ہے اور مویشی بھی خدا کے۔ خدا کی اس مخلوق کو خدا کی زمین میں کھلا چھوڑ دو کہ ان میں سے ہر ایک پیٹ بھر کر کھائے پیئے۔ انہوں نے زبانی تو اس کا وعدہ کر لیا لیکن اس پر قائم رہنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ رزق کی ناہمواریوں پر مبنی

نظام نے اس قوم کو تباہ کر دیا۔

جہاں تک اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا تعلق ہے اسے عام طور پر تجارت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ نظامِ تجارت میں ناہمواریوں

تجارت میں فساد

کو بھی قرآن کریم نے فساد کہہ کر پکارا ہے اور اس کے لئے قومِ شعیبؑ کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورۂ ھود میں ہے کہ قومِ شعیب کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ انہوں نے ان سے کہا۔ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ (۱۱/۸۴) "اے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تم بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہو لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس میں اصلاح پیدا کرو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو درست رکھو۔ اور ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تمہاری پوری کی پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔" اس سے اگلی آیت میں اس کی پھر تاکید کر دی کہ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۱۱/۸۵) "اے لوگو! اپنے نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو۔ اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فساد برپا ہو جائے گا اور تمہارا معاشرہ تہس نہس۔"

(ضمناً) آیت (۱۱/۸۷) میں صلوٰۃ اور معاشی نظام کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر نگاہِ بازگشت ڈالئے آپ وہاں دیکھیں گے کہ حضرت شعیبؑ نے جب اُن سے کہا کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ چاہتے ہیں تو وہ یہ سمجھ کر اس پر رضامند ہو گئے۔ کہ (حضرت شعیبؑ کا) اس سے مقصد اپنے طور پر پوجا پاٹ کرنا ہے۔ وہ اس پر رضامند ہو گئے لیکن جب صلوٰۃ کی حقیقت ان کے سامنے آئی تو انہوں نے بڑے تعجب سے کہا کہ اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا (۱۱/۸۷) "کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔"

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، تقسیمِ رزق میں فساد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض افراد کے پاس بےشمار دولت جمع ہو جاتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد (SURPLUS MONEY) یعنی ضرورت سے زائد دولت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو

نظامِ سرمایہ داری

اس نظام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اُس نے بےشمار دولت جمع کر رکھی تھی۔ صحیح نظام کی طرف دعوت دینے والوں نے اُس سے کہا کہ ہم تم سے یہ نہیں کہتے کہ تم اس میں سے اپنے لئے کچھ بھی نہ لو۔ تم اپنی ضروریات کے مطابق لو اور ضرور لو۔ لیکن اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ

فِی الْاَرْضِ . اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ (۷۷/۲۸) "جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو خوشگوار بنا دیا ہے اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ، اور معاشرہ میں فساد پیدا نہ کرو۔ یہ روش خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے بڑی ناپسندیدہ ہے"۔ اس کے جواب میں اس نے وہی کہا جو نظامِ سرمایہ داری کا ہر علمبردار کہتا ہے۔ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ . (۲۸/۷۸) "میں نے یہ دولت اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے۔ اس لئے اسے میں جس طرح میرا جی چاہے صَرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟" اس پر قرآن نے صرف اتنا تبصرہ کیا ہے کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس سے پہلے کتنے افراد اور کتنی اقوام ایسی تھیں جو دولت اور قوت میں اس سے کہیں بڑھ کر تھیں، لیکن ان کے نظام کا فساد، اس کثرتِ دولت و قوت کے باوجود انہیں لے ڈوبا۔

چونکہ آگے چل کر معاشی نظام کے مختلف گوشے جگہ بہ جگہ ہمارے سامنے آئیں گے اس لئے ہم اس وقت انہی تصریحات پر اکتفا کرتے ہیں۔

جنسی بے راہ روی

(۴) قرآن کریم کی رو سے جنسی اختلاط کو حدودِ خداوندی کے تابع رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے جن دو تین جرائم کی سزا خود مقرر کی ہے، ان میں زنا بھی شامل ہے (۲۴/۲) جنسی عصمت کا قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے، اسے ہم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کریں گے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ خود مغرب کے محققین بھی، اپنی مدت العمر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو قوم حفاظتِ عصمت کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتی یا غفلت برتتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندۂ حیات رہ سکتی ہے[1]۔ جنسی بدنہادی (PERVERSION) کی بدترین شکل اختلاطِ ہم جنس (HOMO - SEXUALITY) ہے جس قوم کی طرف حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے تھے اُس میں یہ دبا عام تھی اور اسی بنا پر قرآن کریم میں اُسے بھی مفسدین کی قوم کہا گیا ہے (۲۹/۳۰)۔ جب "فساد" کی بنیادی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کو جس حالت پر ہونا چاہیئے وہ اُس حالت پر نہ رہے یعنی جس مقصد کے لئے اُسے استعمال کرنا چاہیئے وہ اُس کے لئے استعمال نہ کی جائے، تو ہم جنسی اختلاط سے بڑھ کر نمایاں فساد اور کون سا ہو سکتا ہے؟

(۵) اب ہم فساد کی اس شکل کی طرف آتے ہیں جو اس وقت دنیا میں عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی ہے قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا . (۱۰/۱۹) "انسانوں نے جب تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو وہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں وہ خط جس کا عنوان ہے۔ "قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر"

وحدتِ انسانیت ایک ہی گروہ، ایک ہی جماعت، ایک ہی قوم اور ایک ہی امت تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ گئے اور اس طرح نوعِ انسانی کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔" اس خود پیدا کردہ تفرقہ کا دور کرنا، فکر انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ وحی کی راہ نمائی ہی سے دور ہو سکتا تھا۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ اس کے لئے خدا نے انبیاءؑ کا سلسلہ جاری کیا جو لوگوں کو وحدتِ انسانیت کے خوشگوار نتائج کے مژدے سناتے اور تفرقہ کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے تھے۔ اس کے لئے وہ زبانی وعظ ہی نہیں کرتے تھے۔ انہیں خدا کی طرف سے ضابطۂ قوانین بھی دیا جاتا تھا جس کی رُو سے وہ انسانوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، تفرقہ مٹا دیتے تھے"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے آسمانی راہ نمائی کا منتہیٰ وحدتِ انسانیت ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر تشکیل۔ اس کے لئے پہلے ایسے انبیاءؑ کرام آتے رہے جو اپنے حیطۂ کار کے اندر اختلافات مٹا کر وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جب انسانیت اُس دور میں داخل ہوئی، جب ایک عالمگیر وحدت کا امکان ہو گیا تو خدا نے اپنے آخری نبیؐ کو آخری ضابطۂ ہدایت دیکر بھیجا۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھیں گے کہ اس دعوت کو "للنّاس" کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے لئے دعوت۔ سب سے پہلے اُس نے خدا کے قومی یا نسلی تصور کی جگہ اُسے رَبِّ النَّاسِ ، مَلِكِ النَّاسِ ، اِلٰهِ النَّاسِ۔ (۱۱۴/۱-۳) کہا یعنی کسی خاص نسل، گروہ، یا قوم کا رب اور اِلٰہ نہیں، تمام نوعِ انسان کا رب اور اِلٰہ۔ جو رسولؐ اُس خدا نے بھیجا اس کے متعلق بھی یہی کہا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴/۲۸) "اے رسولؐ! ہم نے تجھے تمام عالم انسانیت کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن گروہ بندیوں اور قومیت اور وطنیت کے مدفوں میں گھرا ہوا ذہن انسانی اِس تصور کو جلدی سے نہیں اپنائے گا۔ وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کو سمجھ سکے گا"۔

اس رسولؐ کی وساطت سے اُس نے جو ضابطۂ قوانین (قرآنِ مجید) بھیجا اُس کے متعلق بھی وضاحت سے کہہ دیا کہ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) "یہ کسی خاص نسل یا قوم کے لئے نہیں، تمام نوعِ انسان کے لئے وجہِ بصیرت ہے"۔

وحدتِ انسانیت کے منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے، اس نے، بطورِ آغازِ کار جس قوم کی تشکیل کی (یعنی امتِ محمدیہ) اس کے متعلق بھی وضاحت کر دی کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) "تم بہترین امت ہو، جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے"۔

اس امت کے ہاتھوں جو نظام تشکیل ہونا تھا اس کا مرکز کعبہ قرار دیا گیا، اور کعبہ کے متعلق بھی اس امر کی وضاحت کر دی کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳/۹۵) "دنیا میں وہ پہلا گھر جسے

نسلوں، خاندانوں، وطنوں اور قومیتوں کی انسانیت سوز گروہ بندیوں سے بلند ہو کر تمام عالمِ انسانیت کے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ وہ گھر کعبہ ہے جو مکہ مبارک میں واقع اور جو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہدایت کا مرکز ہے۔" مقصد اس سے قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ (۵/۹۷) ہے۔ یعنی اس نظام کا مرکز جس سے تمام نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔"

"خیر و شر" کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ہم بتا چکے ہیں کہ نفع اور نقصان کے اضافی معیاروں کی رو سے، ہر فرد، یا (زیادہ سے زیادہ) ہر قوم اپنے اپنے نفع کو سامنے رکھتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے مستقل اقدار کے پیمانوں کے مطابق کہا کہ یاد رکھو:۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

"اسی نظریہ، اسی نظام، اسی مسلک کو بقا نصیب ہو سکتی ہے جس کا نصب العین کسی خاص فرد، گروہ یا قوم کا مفاد نہیں، بلکہ تمام نوعِ انسان کی منفعت ہو۔" اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق، بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

ہم نے اس مقام پر قرآنِ کریم کے نصب العین — وحدتِ انسانیت — کے سلسلہ میں ایک ایک، دو دو حوالوں پر اکتفا کیا ہے، ورنہ قرآن مجید میں یہ تصریحات بکثرت بکھری پڑی ہیں۔ وہ اپنے اپنے مقام پر سامنے آئیں گی۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود تھا کہ سلسلۂ رشد و ہدایت کی اس آخری کڑی کا مقصد نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہے جس کی بنیاد ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو نظریہ، جو تصور، جو عقیدہ اور جو نظام اس کے خلاف ہو گا یا اس کے راستے میں روڑے اٹکائے گا، وہ قرآنِ کریم کی رو سے وجۂ فسادِ آدمیت قرار پائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر دوسرے راستوں کی طرف نکل جانے والے لوگ وہ ہیں يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (۲/۲۷)۔ "کہ خدا نے جنہیں ملانے کا حکم دیا تھا وہ ان میں فرقہ پرستیوں، گروہ بندیوں، قومیت سازیوں کی خلیجیں حائل کرنے اور اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت آپس میں ملنے نہ پائے۔"

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ (ایضاً)۔ "یہی لوگ ہیں جو دنیا میں فساد برپا کرتے ہیں۔"

محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ نے وحی کی راہ نمائی میں، اپنے حیطۂ کار کے اندر، ان خلیجوں کو کس طرح پاٹا اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو کس طرح آپس میں جوڑا — ان کے جسموں اور سروں ہی کو نہیں جوڑا بلکہ ان کے دلوں کو جوڑا کہ اصلی جڑنا دلوں کا جڑنا ہے۔ (۳/۱۰۲)، تاریخِ انسانیت اس پر شاہد ہے۔ انہوں نے رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی تفریقات کو مٹا کر

امتِ واحدہ کی تشکیل کی۔ اور اس طرح دنیا کو دکھا دیا کہ وحدتِ انسانیت کا قرآن کا پیش کردہ نظریہ یا تصور ناممکن العمل نہیں۔ لیکن

خود یہ امت ٹکڑوں میں بٹ گئی

اس کے بعد کیا ہوا؛ اس کے تذکرہ سے ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ وہی امت جو عالمگیر انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی تھی، خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پہلے اس نے دین کو مذہب سے بدل کر، مذہب میں مختلف فرقے پیدا کر لئے، اور اس کے بعد نسلوں اور وطنوں کے اختلاف کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹ گئی۔

وطن کے اختلاف کی بنیادوں پر جداگانہ قوموں کی تشکیل، یورپ کی پیدا کردہ لعنت تھی۔ لیکن ہم نے جو اوپر کہا ہے نزولِ قرآن سے اُس دور کا آغاز ہوا جس میں (رفتہ رفتہ) انسان بہرحال یہ سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا کہ کون سا راستہ اُسے آخر الامر کس طرف لے جائے گا۔ یورپ نے باہمی حسد اور نفرت کی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کی تشکیل کر لی لیکن جب شدتِ جذبات میں تھوڑا سا سکون پیدا ہوا (یا یوں کہیے کہ جب اس نظریۂ قومیت کے تباہ کن نتائج سامنے آئے)، تو خود وہیں کے مفکرین چیخ چیخ کر پکار اٹھے کہ یہ نیشنلزم (قومیت پرستی) ہمیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یورپ کے

مفکرینِ مغرب کا واویلا

بہت سے مفکرین اور مدبرین کے اقوال اور آثار پیش کر سکتے ہیں، لیکن بغرضِ اختصار، یہاں دو چار پر اکتفا کیا جاتا ہے[1]۔

(ALDOUS HUXLEY) وہاں کا ایک مشہور مفکر ہے جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE) میں لکھتا ہے:-

> نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے، جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش، جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا، ان پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری، باقی انچاس پجاریوں کو ملیکش تصور کرتا ہے نیشنلزم، اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں، اس کا وجوب ہوتا ہے۔

یاد رکھیے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔

---

[1] جو حضرات تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری تالیف — انسان نے کیا سوچا؟ — میں "سیاست" کا عنوان دیکھیں۔

نیشنلزم سے تنگ آکر وہاں کے مفکرین 'انسانیت' کے جس نقشہ کے دیکھنے کے آرزومند ہیں، ایک ہلکی سی جھلک اس کی بھی دیکھتے جائیے۔ کیتھولک چرچ کا سابقہ اسقف (TEIL ARD-DE-CHARDIN) اپنی کتاب (BUILDING OF THE EARTH) میں لکھتا ہے:۔

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کردیں اور مختلف ملکوں اور خطوں سے آگے بڑھ کر، خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناتوں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسان کو اپنی آغوش میں لے لے۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز امتِ واحدہ کی شکل میں کیا تھا۔ اس کے دکھوں کا علاج یہی ہے کہ یہ پھر سے امتِ واحدہ بن جائے۔ اس باب میں کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں، جس کا نام ہی اس نے (THE COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے، لکھتا ہے:۔

> تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتدا میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جاسکتا ہے جو انسانوں کو باہمدگر جوڑ دے۔ انسانیت کی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

یہ مفکرین، جس عالمگیر برادری کو اس وقت نگہِ تصور سے دیکھ رہے ہیں، اُس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا؟ اس کے متعلق، سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے۔

> یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہوسکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھنچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کی خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کرسکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اور اس کے بعد، یہ مفکر کہتا ہے کہ:-

> ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔
> (BEYOND THE WALFARE STATE)

اُس مذہب کے متعلق جس کا تصور (MYRDAL) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، امریکہ کا بین الاقوامی شہرت کا ماہرِ نفسیات (ERIC FROMM) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:-

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دیگا۔ جو شرق و مغرب کی تمام تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطہ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔
> (THE SANE SOCIETY)

اگر (ERIC FROMM) یا اُس کے ہمنوا، دیگر اربابِ فکر کے سامنے قرآنِ مجید ہوتا تو وہ اس میں دیکھ لیتے کہ جس مذہب کی نمود کے وہ اس شدت سے آرزومند ہیں وہ پہلے سے اِس کتابِ عظیم کے اندر الدّین کی شکل میں موجود ہے لیکن چونکہ وہ محسوس شکل میں، غیر تو غیر، خود اس کتاب پر ایمان رکھنے کے مدعیوں کے ہاں بھی موجود نہیں، اس لئے وہ اس کی نمود کے منتظر ہیں۔ بیشک، بحالاتِ موجودہ اس کی نمود زمانے کے تقاضوں ہی کی رو سے ہوگی، اور اربابِ بصیرت کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کے لئے اب کوئی لمبا عرصہ درکار نہیں ہوگا۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا!

بہرحال، یہ ہے وہ عالمگیر فساد، جس کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ۔ (۳۰/۴۱) "انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کی وجہ سے خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد برپا ہو گیا"۔ اُس دور کی امتِ مسلمہ (یعنی محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ) نے اس فساد کو اصلاح میں بدلا اور اسی جہت سے قرآنِ کریم نے انہیں مصلحین کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مومنین اور کفار کی طرح، مفسدین اور مصلحین ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ (۳۸/۲۸) اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ان دونوں کی زندگی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ اَمْ

نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۔ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸/۲۸)۔ "ایسا ہو نہیں سکتا کہ ہم اُن لوگوں کو جو ایمان اور عملِ صالح کے پیکر ہوں، فساد برپا کرنے والوں کے برابر کر دیں یعنی متقین اور فجار ایک جیسے ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی بیکار پیدا کر رکھا ہے (۳۸/۲۷) مفسدین کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ ان کے برعکس، وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۔ (۱۱/۱۱۷)" ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ خدا اُس بستی یا قوم کو تباہ کر دے جو مصلحین پر مشتمل ہو۔ ایسا کرنا ظلم ہوگا۔ اور خدا کبھی ظلم نہیں کرتا۔" اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۔ (۷/۱۷۰) "ہم مصلحین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔"

مصلحین

آخر میں سوال یہ سامنے آئے گا کہ یہ مصلحین کہا کن لوگوں کو جائے گا؟ ایسا بنا کس طرح جائے گا؟ قرآنِ کریم نے اس کا جواب دو لفظوں میں دے دیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۷/۱۷۰)۔ "مصلحین وہ ہوتے ہیں جو قرآن کریم سے متمسک رہتے ہیں اور اس کی روشنی میں وہ نظام قائم کرتے ہیں جسے اُس نے صلوٰۃ کا نظام کہہ کر پکارا ہے۔

یہ نظام نہ کسی خاص مقام یا زمانہ تک محدود تھا اور نہ ہی ناممکن العمل۔ قرآنِ کریم خدا کی زندہ و پائندہ کتاب ہے اور اس میں قیامت تک یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس کی رو سے ایسا نظام قائم کیا جا سکے جو دنیا کے فساد کو اصلاح میں بدل ڈالے۔

(۲/۱۳) اب قرآنِ کریم میں بیان کردہ مفسدین کی ایک اور ذہنیت ملاحظہ فرمائیے۔

(۲/۱۳) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۔

ایمان کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھیے ۲/۴) کہ قرآنِ کریم نے تمام انسانوں سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خدا کے وجود ہی سے انکار کرتے تھے، اور وہ بھی جو خدا کے ساتھ اور خداؤں (دیوی دیوتاؤں، یا اپنی مقدس ہستیوں، کو بھی صفاتِ الوہیت کا حامل سمجھتے تھے۔ نیز اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی، جو نہ صرف خدا پر ایمان کے مدعی تھے بلکہ قرآنِ کریم نے جو اجزائے ایمان بتائے ہیں (خدا۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ آخرت) ان پر بھی ایمان رکھنے کے دعویدار تھے۔ اُس نے ان سب سے کہا تھا کہ تم ان حقائق پر اپنے اپنے تصور کے مطابق ایمان رکھتے ہو لیکن صحیح ایمان وہی ہے جسے خود خدا نے اپنی غیر آمیزش شدہ وحی (قرآن کریم) میں بیان کیا ہے۔ اسی لئے

ان سے کہا تھا فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) "اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں، جس طرح (اے جماعتِ مومنین!) تم ایمان لائے ہو، تو پھر ان کے ایمان کو ایمان تسلیم کیا جائے گا"۔ حتیٰ کہ اس نے ان مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہا، جن کا ایمان قرآنی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن اس آیت (۲/۱۳) میں جو منافقین سے کہا گیا ہے کہ تم اُس طرح ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں، تو اس میں ایک خاص امر کی طرف اشارہ ہے۔ جن دیگر افراد یا جماعتوں کو ایمان لانے کے لئے کہا گیا تھا ان میں سے کسی کی کیفیت یہ نہیں تھی کہ وہ دل میں کچھ اور رکھتے ہوں اور زبان سے کچھ اور کہتے۔ ان کے تصورات بے شک غلط تھے اور مبنی بر جہالت، لیکن ان کے قلب و آہنگ میں ہم آہنگی ضرور تھی۔ منافقین سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اپنی مصلحت کوشی اور مفاد پرستی کے لئے اختیار کردہ دو رُخی پالیسی کو چھوڑو اور قلب و زبان میں ہم آہنگی پیدا کرو۔ انہوں نے اِس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ تو بیوقوف ہیں جو کھلے بندوں زبان پر وہی کچھ لے آتے ہیں جو ان کے دل میں ہوتا ہے۔ مصلحت بینی اور مفاد کوشی کے تقاضے یہ نہیں ہوتے۔ اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ عقلمند اسے کہا جاتا ہے جو اپنے نفع کی بابت سوچے؛ اور مصلحت بینی اس کی بنیادی شرط ہے۔ جس شخص کو اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہ ہو، اُسے تو پاگل کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم سے جو کہا جا رہا ہے کہ ہم بھی انہی لوگوں کی طرح ہو جائیں تو ہم ایسے بیوقوف نہیں۔

سفاہت کے معنی

"سفاہت" کے معنی ہیں حماقت، بے وقوفی، عقل و فکر کی ناپختگی سب آجاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں جہاں یہ تاکید کی گئی ہے کہ لین دین کے معاملات کو ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر قرض دینے والا، جس نے اس وثیقہ کو املا کرانا تھا، "سفیہا" ہو تو اُسے اس کا کارِ مختار املا کرا دے۔ یہاں سے واضح ہے کہ سفاہت سے مراد عقل کی ناپختگی ہے۔ (نیز دیکھئے (۴/۵)، جس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ عقل میں ناپختہ ہوں ان کے معاملات کی نگہداشت تم خود کیا کرو)۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (۲/۱۳۰) "ملتِ ابراہیمی سے تو وہی شخص پہلو تہی کرسکتا ہے جو اپنے آپ کو بیوقوف بنائے رکھنا چاہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ عقل و فکر رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بیوقوف بنائے رکھنا بھی سفاہت میں داخل ہے۔

جہاں تک منافقین کے اس جواب کا تعلق ہے کہ یہ لوگ جو مخلصانہ ایمان لاتے ہیں، وہ اپنا نفع نقصان بھی نہیں سوچتے اس کے متعلق ہم آیت (۲/۱۴) کے تابع مزید وضاحت کریں گے۔ یہاں ہم ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے غریبوں کے طبقہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس کے بعد جب آپ نے سردارانِ قوم کو خاص طور پر مخاطب کیا اور کہا کہ دیکھو! یہ لوگ خدا پر ایمان لے آئے ہیں،

دولت اور عقل آؤ! تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱/۲۷)۔ "جن لوگوں نے تمہارا دین اختیار کیا ہے۔ یہ تو یونہی سطحی سی عقل و فکر کے مالک ہیں۔ ان لوگوں کا فیصلہ بھی کوئی فیصلہ کہلا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کی مثال پیش کرنے سے کیا حاصل۔ عقل و دانش کے مالک ہم لوگ ہیں۔ ہمارا فیصلہ مبنی بر فہم و فراست قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ ان لوگوں کا جو ہمارے معاشرہ کے نچلے طبقہ سے متعلق ہیں۔"

اِس سے دولت مند طبقہ کی ذہنیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ دولت مند طبقہ اس زعم باطل میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کہ ہمارے پاس دولت ہی بافراط نہیں، عقل و دانش کے اجارہ دار بھی ہم ہی ہیں۔ جن کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ سب احمق اور بیوقوف ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

یہ بات حضرت نوحؑ کے زمانے کے سرداران قوم اور طبقۂ امراء نے کہی تھی، لیکن آپ دیکھئے کہ اِس طبقہ کی آج بھی یہی ذہنیت ہے۔ اور یہ ذہنیت نہ کسی خاص زمانے سے مخصوص ہے، نہ کسی خاص قوم سے۔ جب اور جہاں بھی دولت کو عزت و تکریم کا معیار قرار دیا جائے گا، طبقۂ امراء میں یہ ذہنیت پیدا ہو جائے گی۔ قرآن کریم نے ان معیارات کو بدل دیا۔ اس نے کہا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین سیرت و کردار (اعمال) کی بنا پر ہونا چاہیئے (۴۶/۱۹)۔ اور اس معیار کے مطابق سب سے زیادہ واجب التکریم اُسے

معیارِ فضیلت قرار پانا چاہیئے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے۔ (۴۹/۱۳)

قرآن کریم نے منافقین کے مندرجہ بالا جواب پر صرف اتنا سا تبصرہ کیا ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ عقل و فکر کے مالک ہم ہیں، وہ نہیں جو مخلصانہ انداز سے ایمان لائے ہیں، تو یہ بات ان کی خود فریبی پر مبنی ہے۔ اگر یہ علم و بصیرت کی بارگاہ سے فیصلہ طلب کریں تو وہ انہیں بتا دے کہ احمق اور بیوقوف یہ لوگ نہیں خود تم ہو جو اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ دورخی پالیسی کا انسان کی ذات پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم ان کی اس روش کو سامنے لایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

(۲/۱۴) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ **۲/۱۴**

"جب یہ لوگ جماعتِ مومنین سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب پھر اپنے سرغنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم جو ان لوگوں سے جا کر ملتے ہیں تو آپ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم ان میں شامل ہو گئے

ہیں، قطعاً نہیں۔ ہم تو اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ حضراتِ انبیاء کرام کی دعوت کا جواب مخالفین کی طرف سے کیا اور کیسا ملتا تھا؛ اس مخالفت میں دو اجزاء بطور قدرِ مشترک نظر آتے ہیں۔ یعنی تکذیب اور استہزاء۔ تکذیب، یعنی فریقِ مخالف کو جھوٹا قرار دینے کا تعلق انسانی ذہن سے ہے۔ لیکن استہزاء کا تعلق احساسات اور جذبات سے ہے۔

استہزاء۔ پستی ذہنیت کی انتہا۔

آپ کسی شخص کے سامنے کوئی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ وہ آپ کے دعویٰ کے خلاف دلائل پیش کرتا ہے اور اس طرح اُسے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ طریق فکری ہوگا اور آپ فکر و تدبر ہی کی رو سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اُس کے پاس دلیل کوئی نہ ہو اور وہ آپ کا منہ چڑانے لگ جائے اور ہر بات ہنسی میں اڑا دے تو آپ سوچئے کہ اس کا آپ کے جذبات پر کیا اثر ہوگا؟ اور ایسے شخص کے متعلق کبھی یہ توقع کی جا سکے گی کہ وہ صحیح اور معقول بات کو تسلیم کرے گا؟ قرآنِ کریم نے بعض مقامات پر تکذیب اور استہزاء دونوں کا ذکر یکجا کیا ہے۔ جیسے كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۰/۱۰)۔ "وہ لوگ جنہوں نے قوانینِ خداوندی کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑایا"۔ اور بعض مقامات پر صرف استہزاء کا ذکر کیا ہے؛ اور رسول اللہ سے یہ کہا ہے کہ یہ مخالفین جو تمہارا استہزاء کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۳/۷)۔ "دنیا میں کوئی نبی بھی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ مخالفین استہزاء سے پیش نہ آتے ہوں"۔ (نیز دیکھئے (۶/۱۰)، جس میں کہا گیا ہے کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ یہی ماجرا گزر چکا ہے۔)

استہزاء کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے، یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ کمینہ صفت مخالفین نے ہر داعیٔ الی الحق کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ اور دوسری طرف اس کی تاکید کی کہ تم ان باتوں کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہو جانا۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (۵۰/۳۹)۔ "جو کچھ یہ لوگ یہ کہتے ہیں، تم اس سے افسردہ خاطر مت ہو بلکہ اپنے مقام پر استقلال اور استقامت سے کھڑے رہو"۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (۴۶/۳۵)۔ "تم ان کی اس قسم کی باتوں پر ویسے ہی استقلال و استقامت کا ثبوت دو جیسا اولو العزم رسولوں نے دیا تھا"۔ یاد رکھو! اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۳۰/۶۰): خدا نے تم سے جس قدر وعدے کر رکھے ہیں وہ پورے ہو کر رہیں گے۔ کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس لئے فَاصْبِرْ (۳۰/۶۰)۔ "اپنے پروگرام پر مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہو"۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (۷۳/۱۰)۔ "ان لوگوں کے ساتھ الجھو نہیں۔ یہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہارا وقت اور توانائی ان کی انہی باتوں کی مدافعت میں ضائع

ہوجائے۔ ان خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے نہایت حسن کارانہ انداز سے آگے بڑھ جاؤ۔ ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو، لیکن یہ بھی، اِن جیسی پست سطح پر اتر کر نہیں۔ انہیں چھوڑو بھی تو نہایت حسین و جمیل طریقہ سے چھوڑو۔"

اس کے بعد ہے۔

(۲/۱۵) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔

۲/۱۵ اِس کا لفظی ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "یہ تم سے استہزاء کرتے ہیں تو اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے۔ اور انہیں ان کی سرکشی میں اور آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ یہ عقل کے اندھے ہیں؟ ایسی آیات کا جن میں اس قسم کی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، صحیح مفہوم کیا ہے، اس کے متعلق ہم آیت (۲/۷) کے تحت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲/۷) کے ضمن میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اُسے پھر سے سامنے لائیے، بات صاف ہوجائے گی۔ زیرِ نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ لوگ آیاتِ خداوندی سے استہزاء کرتے اور انہیں پیش کرنے والے داعیان الی الحق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان کی اس قسم کی احمقانہ روش پر ہنستا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود جس اندھے پن کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اس میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ عقل و فکر کی بنیادوں پر کسی صحیح بات کی مخالفت کریں، ان سے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ کسی مقام پر جاکر، بات ان کی سمجھ میں آجائے اور وہ رک جائیں لیکن جو لوگ جذبات کی پست ترین سطح پر اتر کر معقول باتوں کو ہنسی مذاق میں اڑانے کا شیوہ اختیار کریں، اور اس میں انتہائی لذت محسوس کریں، ان کے کسی مقام پر رُک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ (۲/۱۰) میں کہا گیا ہے، منافقین، منافقت سے جس قدر زیادہ کام لیتے ہیں، اسی قدر ان کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کہا کہ جس قدر یہ لوگ استہزاء میں بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر ان کا اندھا پن زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

چلتے چلتے، عربی زبان کے دو مادوں کا لطیف سا فرق بھی دیکھتے جائیے۔ مادہ (ع۔ م۔ ی) کے عمومی معنے ہوتے ہیں آنکھوں کی بینائی کا جاتے رہنا۔ اور مادہ (ع۔ م۔ ہ) بصیرت کے اندھے پن کو کہتے ہیں۔ یہ انسان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ معاملہ پیشِ نظر کے متعلق کیا کیا جائے۔ اور اس وجہ سے وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں حیران و ششدر کھڑا ہو جائے۔ اس آیت میں يَعْمَهُوْنَ (مادہ ع۔ م۔ ہ) کہا گیا ہے۔

یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس روش کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے "طغیان" میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے

طغیان جاتے ہیں۔ اس لفظ (طغیان) کا مادہ (ط، غ، ی) یا (ط، غ، و) ہے۔ اس کے بنیادی معنے ہوتے ہیں حد اور پیمانے سے باہر ہو جانا۔ پانی جب تک دریا کے اندر رہے، دریا ہے اور اس کا نتیجہ منفعت بخش،

لیکن جب اس کے ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو اسے طغیانی یا سیلاب کہا جاتا ہے جو تباہی کا موجب ہوتا ہے اسی طرح انسانی قوتیں اور صلاحیتیں اگر خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال میں لائی جائیں تو ان کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے لیکن اگر وہ ان حدود سے سرکشی اختیار کریں تو ان کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سرکش اور مستبد ارباب اقتدار کے متعلق قرآن نے یہی کہا ہے۔ مثلاً جب حضرت موسیٰؑ کو نبی مہم کے لئے مامور کیا گیا تو ان سے کہا گیا کہ:۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)۔ "فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ بڑا ہی حدود فراموش ہو گیا ہے"۔ قوم ثمود کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ انہوں نے معاشی نظام میں کس قدر بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ ان کے متعلق کہا۔ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ۔ (۶۹/۵ نیز ۹۱/۱۱)۔ "ان کی یہ سرکشیاں انہیں لے ڈوبیں"۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۷/۱۸۶)۔ "جو لوگ خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں پھر کہیں سے بھی راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ راستہ کی تلاش میں اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں"۔

میزانِ عدل قائم رکھو

سورۃ الرحمٰن میں، نوعِ انسان کو چار الفاظ میں ایسی راہ نمائی دی گئی ہے کہ جوں جوں انسان اس کی گہرائی میں جاتا ہے، اس کی بصیرت رقص کرنے لگتی ہے۔ پہلے کہا۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵/۷)۔ "تم خارجی کائنات پر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ یہ محیر العقول کارگاہ اس حسن و خوبی سے اس لئے مصروفِ عمل ہے کہ اس میں جو توازن پیدا کیا گیا ہے اس میں کبھی فرق نہیں آتا"۔ اور اس کے بعد کہا۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (۵۵/۸)۔ "تمہارے سامنے خارجی کائنات کے حسن نظم کی مثال اس لئے پیش کی گئی ہے کہ تم بھی اپنے معاشرے کو حدودِ خداوندی کے تابع رکھو اور اس طرح اس کی میزانِ عدل میں بگاڑ نہ پیدا ہونے دو"۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۔ (۵۵/۹)۔ "اس توازن کو عدل و انصاف کی رو سے قائم کرو اور اس طرح ترازو کے پلڑوں کو بالکل سیدھا رکھو۔ ڈنڈی مت مارو"۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)۔ "اس توازن کو برقرار رکھنے کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ ہم نے جو وسائلِ پیداوار عطا کئے ہیں وہ تمام مخلوق کی منفعت کے لئے ہیں۔ انہیں تمام مخلوق کی منفعت کے لئے کھلا رکھو"۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں فساد پیدا کرتے ہیں۔ انہیں ان کے "طغیان" میں ششدر و حیران چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس سے مفہوم کیا ہے۔

منافقین کی ان علامات و خصوصیات کے بیان کرنے کے بعد اس کا ملخص اگلی آیت میں یوں پیش کر دیا کہ:

(۲/۱۶) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ.

۲/۱۶

لہٰذا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت بیچ کر گمراہی خریدی تو ان کی اس تجارت نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ کیونکہ زندگی کا صحیح راستہ ہی ان کی نگاہوں سے گم ہوگیا۔" اس آیت میں بات تو ایسی کی گئی ہے جیسے ہم روزمرہ بیان کرتے اور ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں، لیکن اس کے اندر بڑے عظیم حقائق اور عمیق معارف پوشیدہ ہیں۔

ہم نے آیت (۲/۱۱) کی تشریح کرتے ہوئے اصلاح اور فساد کے ضمن میں یہ کہا تھا کہ (WHAT IS) کا مسئلہ تو بڑا آسان ہے۔ لیکن (WHAT OUGHT TO BE) کا سوال ایسا ہے جس کے حل کے لئے فکرِ انسانی اپنے اوّلین ایامِ شعور سے لے کر آج تک انتہائی متجسس و مضطرب ہے۔ لیکن وہ کسی حتمی اور اطمینان بخش نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔

خیر و شر کا مسئلہ

اس مسئلہ کو فلسفہ کی اصطلاح میں (GOOD AND EVIL) کا مسئلہ کہا جاتا ہے جس کے لئے عربی زبان اور قرآنِ کریم میں خیر اور شر کی اصطلاحات آتی ہیں۔ عام فہم الفاظ میں اسے نفع اور نقصان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو اس کے لئے نفع بخش ہوں اور ان امور سے محترز رہے جو اس کے لئے نقصان دہ ہوں۔ لیکن یہاں پھر وہی سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ نفع کہتے کسے ہیں، اور نقصان کسے؟ بالفاظِ دیگر، انسانی فکر گھوم گھما کر پھر اسی اوّلین نقطہ پر آکر رک جاتی ہے کہ "کیا ہونا چاہیئے" کا اطمینان بخش حل کیا ہے۔ انسانوں نے نفع اور نقصان کے اپنے اپنے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ مثلاً ایک دکاندار کسی چیز کو لاگت سے دو روپے

نفع اور نقصان کے پیمانے

زیادہ میں فروخت کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ اُسے اس سودے میں نفع ہوا ہے۔ نفع اور نقصان کے ماپنے کا پیمانہ اس کی لاگت ہے۔ اس قسم کے نفع یا نقصان کو اضافی یا (RELATIVE) کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے کاروباری حالات پیدا ہو جائیں جن میں یہ دکاندار اُس چیز کو لاگت سے کم میں بیچنے میں بھی اپنا نفع محسوس کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نفع اور نقصان کے اس قسم کے اضافی معیار بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن فکرِ انسانی ایسے نفع و نقصان میں غلطاں و پیچاں چلی آرہی ہے جو اضافی نہیں بلکہ مطلق ہوں۔ یعنی (ABSOLUTE GOOD) اور (ABSOLUTE EVIL) ۔ مطلق، یعنی جو ہر حالت میں خیر (نفع بخش) یا ہر حالت میں شر (نقصان رساں) ہو۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، فکرِ انسانی اس حل تک پہنچنے میں ابھی تک ناکام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:-

آدمی اندر جہانِ خیر و شر   کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

کس نہ داند زشت و خوب کار چیست — جادۂ ہموار و ناہموار چیست

دوسری جگہ وہ زمانۂ حاضر کے انسان کے متعلق کہتے ہیں :۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ فکرِ انسانی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ خیرِ مطلق اور شرِ مطلق کو متعین کر سکے۔ ایسا صرف وحیٔ الٰہی کر سکتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اپنی فکر و جذبات کی رو سے فیصلہ کرنے والے انسان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (۲/۲۱۶) "بسا اوقات وہ ایسی باتوں کو ناپسند کرتا ہے جو درحقیقت اس کے لئے خیر یعنی منفعت بخش ہوتی ہیں اور ان باتوں کو پسند کرتا اور عزیز رکھتا ہے جو اس کے لئے نقصان رساں ہوتی ہیں" اور اس کے بعد کہا کہ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲/۲۱۶) "کیا چیز تمہارے لئے فی الحقیقت منفعت بخش ہے اور کیا چیز نقصان رساں، یہ تم از خود نہیں جان سکتے۔ اسے صرف اللہ جانتا ہے" دوسری جگہ ہے۔ وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا (۱۷/۱۱) انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دیکر بلاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے" یہ صرف اپنے پیش پا افتادہ (عاجلہ) مفاد کو دیکھتا ہے اور مستقبل تک اس کی نگاہ نہیں جاتی۔

انسان اس معیارِ خیر و شر کو از خود کیوں نہیں دریافت کر سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو اپنی (خواہ وہ انفرادی ہو یا اگر وہ بندانہ) مفاد پرستی کے جذبات سے الگ کر ہی نہیں سکتا اس لئے اس کا وضع یا متعین کردہ معیار اضافی ہوگا مطلق نہیں ہو سکتا۔ خیر و شر کی فلسفیانہ بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم مختصر اور عام فہم الفاظ میں یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل

نفع نقصان کا حقیقی معیار

اقدار اور غیر متغیر اصول متعین کر دیئے ہیں اور انہیں وحی کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا دیا ہے۔ ہر وہ کام جو ان اصول و اقدار کے مطابق ہوگا، خیر یا منفعت بخش ہوگا۔ جو ان کے خلاف ہوگا وہ شر یا نقصان رساں ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک شخص تھوڑا سا جھوٹ بول کر یا فریب دے کر، ہزاروں روپے اکٹھے کر لیتا ہے۔ دوسرا شخص صداقت اور امانت کی اقدار کا پابند رہتے ہوئے اپنے کاروبار میں نقصان اٹھاتا ہے (جیسا کہ غلط معاشرہ میں عام طور پر ہوتا ہے)۔ انسانوں کے خود ساختہ معیار کے مطابق، اول الذکر نے بڑا منفعت بخش سودا کیا ہے۔ اور دوسرے نے بڑا نقصان اٹھایا۔ یہ فیصلہ انسانوں کے خود ساختہ معیار کی رو سے کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس وحیٔ خداوندی کا فیصلہ یہ ہے کہ چونکہ پہلے شخص کا یہ عمل مستقل اقدار کے خلاف ہے اس لئے شر یعنی نقصان رساں۔ اور دوسرے کا عمل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہونے کی وجہ سے خیر، یعنی منفعت بخش ہے۔ اُسے شر اور اِسے خیر قرار دیتے ہیں ان کے مالی نفع اور

نقصان کا سوال نہیں. سوال اُس نفع یا نقصان کا ہے جو اِن افراد کی ذات کو ہوا. اِسی سے نیکی اور بدی، بھلائی اور برائی، ثواب اور عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے. نیکی، بھلائی اور کارِ ثواب وہ کام ہیں جن سے اس کی ذات کی نشو ونما اور استحکام ہو. بدی، برائی اور عذاب کے کام وہ جن سے اس کی ذات کی نشو ونما رک جائے اور وہ کمزور ہو جائے. یہ الگ بات ہے کہ ذات کے استحکام کیساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہو جائیں، اسلامی نظام ہی کا خاصہ ہے.

ہم دیکھ چکے ہیں کہ منافقین نے یہ کہا تھا کہ جو لوگ دیانت اور امانت سے صداقتوں پر ایمان لے آتے اور ان اقدار پر کاربند رہتے ہیں وہ بیوقوف ہیں. عقلمند وہ ہیں جو ان اقدار کی پرواہ کئے بغیر (خواہ زبان سے ان کا اقرار کرتے رہیں) سوچتے یہ ہیں کہ ہمارا نفع یا نقصان کس بات میں ہے. غلط معاشرہ میں ایسا ہی ہوتا اور ایسا ہی کیا جاتا ہے. آج بھی جو شخص یہ کہے کہ میں پوری پوری دیانت داری سے کاروبار کرنا چاہتا ہوں، ہر کاروباری ذہنیت اس پر ہنسے گی اور کہے گی کہ یہ شخص بالکل احمق ہے کاروباری اصولوں کو جانتا ہی نہیں. یہ نقصان اٹھائے گا، تباہ ہو جائیگا.

ان کے برعکس، مومنین ہر حال میں اقدارِ خداوندی پر جمے رہتے اور اس کے متعین فرمودہ غیر متبدل اصولوں کی پیروی کرتے ہیں؛ خواہ اس میں انہیں تکلیفوں پر تکلیفیں اٹھانی، اذیتوں پر اذیتیں برداشت کرنی، اور ہر قسم کے خطرات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے. جب عام مومنین کی یہ روش ہوتی ہے تو آپ سوچئے کہ ان کے امام (خود رسولؐ) کی اس باب میں کیا کیفیت تھی. وہ دنیا کی تمام ترغیبات کو ٹھکراتا، ہر قسم کی اذیتیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا اور ہر طرح کے نقصان کو بطیبِ خاطر قبول کرتا، اپنے پروگرام پر گامزن رہتا تھا. دنیاوی نفع ونقصان کو معیار قرار دینے والوں کے نزدیک اس کی یہ روش "پاگل پن" نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟ اسی لئے وہ کہتے کہ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (۶۸/۵۱). "یہ تو بالکل پاگل اور دیوانہ ہے" یہ ماجرا کسی ایک رسول کے ساتھ نہیں گزرا. وہ ہر رسول کے متعلق یہی کہتے تھے. قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ.

وہ رسول اللہ کو مجنون کہتے

(۵۱/۵۲). "یہ، یا تو (معاذ اللہ) پرلے درجے کا فریب کار ہے اور یہ سب کچھ دکھاوے کی خاطر کرتا ہے، اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کے پاگل ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟" — حالانکہ یہ وہ دیوانگی تھی جس پر ہزار فرزانگی قربان کی جا سکتی ہے!

دنیا کے بازار میں، بیع وشریٰ (خرید وفروخت) میں نفع نقصان کے یہی الگ الگ معیار ہیں. جنہیں قرآن کریم نے زیرِ نظر آیت (۲/۱۶) میں بیان کیا ہے اور جس کے متعلق کہا ہے کہ ان کی تجارت نے انہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا. حالانکہ وہ اپنے معیار کے مطابق سمجھتے تھے کہ ان کا یہ سودا بڑا ہی منفعت بخش رہا. اس بیع وشریٰ کی مثالیں قرآن کریم میں متعدد دیگر مقامات پر بھی آئی ہیں. ان میں سے دو چار ہم یہاں پیش کرتے ہیں.

لیکن ان مثالوں سے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ "نفع اور نقصان" کی اس تعریف (DEFINITION

کو سامنے رکھیں، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی نفع یا نقصان کا حقیقی معیار، انسانی ذات کا نفع یا نقصان ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کفر کی رو سے، انسانی زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے اس میں نفع وہ ہے جس سے دنیاوی مفاد حاصل ہوں۔ اور نقصان وہ جس میں یہ مفاد حاصل نہ ہوں۔ انسانی ذات کا تصور ان کے ہاں ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اس کے نفع و نقصان کا سوال ان کے سامنے آ ہی نہیں سکتا۔

انسانی ذات

(جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا جا چکا ہے) قرآنی نظریۂ حیات کی رو سے انسانی زندگی عبارت ہے' اس کے جسم اور اس کی ذات سے۔ جسم کا تعلق طبیعی یا مادی دنیا سے ہے، اس لئے اس کے طبیعی جسم کی نشو و نما اور استحکام کے لئے وہ مفاد بھی ضروری ہیں جن سے یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ جب قرآنی نظام قائم ہو جائے تو اس میں انسان کو یہ دونوں مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر حق و باطل کی آویزش میں ایسا مقام آ جائے جہاں دنیاوی مفاد اور انسانی ذات کے مفاد میں ٹکراؤ یا تصادم پیدا ہو تو اس وقت دنیاوی مفاد کے مقابلہ میں' انسانی ذات کے مفاد کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اسی کو قرآن کریم کی اصطلاح میں "دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینا" کہا جاتا ہے۔

دنیا کے مقابلہ میں آخرت

دین جب مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں نہ دنیاوی مفاد حاصل ہوتے ہیں نہ انسانی ذات کے مفاد۔ اسے قرآن' دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان سے تعبیر کرتا اور 'خسرانِ مبین' کہہ کر پکارتا ہے۔

نفع و نقصان کے اس قرآنی تصور کے بعد، قرآن کریم کی پیش کردہ مثالیں سامنے لایئے۔

(۱) سورۃ الصف میں ہے۔ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (۶۱/۱۰) - "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو! کیا ہم تمہیں ایک ایسے کاروبار کا پتہ نشان بتائیں، جس میں کبھی نقصان کا احتمال نہ ہو اور اس طرح تمہیں اس الم انگیز عذاب سے بچالے جو کاروبار کے نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے" وہ کاروبار یہ ہے کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۱/۱۱) "تم خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ[1]۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کی صداقت اور محکمیت پر پورا پورا یقین رکھو جو اس کے رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہو رہا ہے۔ اس کے قیام و استحکام کے لئے پوری پوری جد و جہد کرو۔ اس کے لئے اپنا مال اور دولت بھی صرف کر دو اور ضرورت پڑنے پر اپنی جانیں تک بھی لٹا دو۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لے کر غور کرو گے تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ یہ

[1] دیکھئے۔ یہاں مخاطب جماعت مومنین کو کیا گیا ہے۔ اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اس کی وضاحت ۲/۳ میں کی جا چکی ہے۔

کاروبار کس قدر منفعت بخش ہے۔ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۱/۱۲)۔ "یہ نظام تمہارے لئے ایسا سامان مہیا کر دے گا جس سے تم ان تباہیوں سے بچ جاؤ گے جو تمہارے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ اور تمہیں ایسی جنتی زندگی عطا کر دے گا جس کی تر و تازگی میں کبھی کمی واقع نہیں ہو گی۔ (تمثیلاً، سدا بہار باغات کے اندر نہایت پاکیزہ رہنے کے گھر۔ یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے جسے نصیب ہو جائے۔" وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۱/۱۳)۔ "ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی جسے تم بہت پسند کرتے ہو، یعنی دیارِ عرب ہی میں نہیں بلکہ اس سے باہر دیگر مقامات میں بھی تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی" (۶۱/۱۳)۔ اس کے لئے تمہیں قانونِ خداوندی کی پوری پوری تائید و نصرت حاصل ہو گی جس سے کامیابی کی راہیں یکے بعد دیگرے تمہارے سامنے کھلتی جائیں گی۔ اے رسولؐ! تم اپنے رفقاء (جماعتِ مومنین) کو یہ مژدۂ جانفزا سنا دو۔ یہ مژدہ کہ اس سے تمہاری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گے۔ تمہیں دنیاوی مفاد بھی حاصل ہو جائیں گے اور تمہاری ذات سے متعلق مفاد بھی۔" یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (۳۵/۲۹)۔ "یہ وہ تجارت ہے جس میں کبھی خسارہ نہیں ہو سکتا۔"

(۲) کاروبار، خرید و فروخت ہی کا دوسرا نام ہے۔ مومنین کے سلسلہ میں اس خرید و فروخت کی صورت کیا ہوتی ہے اس کے متعلق سورۃ توبہ میں وضاحت کر دی گئی جب کہا۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔ "اس کاروبار کے لئے خدا اور مومنین کے مابین ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے مومنین اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور اس کے عوض خدا انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔" اس کاروباری معاہدہ کے متعلق کہا۔ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۱۱۱)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم اپنے اس سودے پر، جو تم نے خدا سے کیا ہے، جشنِ مسرت مناؤ۔ اس لئے کہ یہ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔"

مومنین اور خدا کا معاہدہ

ایک شخص اجزائے ایمان کے اقرار سے حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے لیکن وہ مومن بنتا ہے خدا کے ساتھ اس معاہدہ کی رُو سے، جسے اُسے زندگی بھر نبھانا ہوتا ہے۔ اسی معاہدہ کی رو سے جماعتِ مومنین کی زندگی کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲/۱۵۵-۱۵۶)۔ "اس میں کہیں جنگ و جدال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہو گا، کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہو گی، کہیں مال اور جان کا نقصان ہو گا، کہیں

کھیتیاں اور باغات اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن آخر الامر فتح و کامرانی کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے۔ اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا

مقتولین فی سبیل اللہ

مقصدِ زندگی نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ اس کے لئے ہم نے اپنا مال اور جان وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ (۹/۵۹)۔ یہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے"۔ اور اس کے بعد ہے۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲/۱۵۷)۔ "یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ خدا اور اس کے ملائکہ ان پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں (ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں)۔ (۳۳/۵۶)۔ انہی کے لئے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور الطاف و کرم کی بارشیں ہیں اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ یہی ہیں وہ خوش نصیب جن کے متعلق کہا۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ۔ (۲/۱۵۴)۔ "جو اس جدوجہد میں جان دے دیتا ہے وہ مرتا نہیں، حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم تو ضرور وفات پا جاتا ہے لیکن اس کی ذات آگے بڑھ جاتی ہے۔ مرنے کے بعد اس کی زندگی کیسی ہوتی ہے، تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے"۔ دوسرے مقام پر کہا۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (۳/۱۶۸)۔ "ان کے متعلق یہ گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مر گئے۔ وہ خدا کے ہاں زندہ ہیں اور اس کے ہاں سے انہیں سامانِ رزق بھی عطا ہوتا ہے"۔ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۳/۱۶۹)۔ "وہ اپنے بلند مقامات کو دیکھ کر، جو انہیں عنایتِ خداوندی سے ملتے ہیں، بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اس احساس سے کہ ان کی قربانی سے ان کے اُن رفقاء کے لئے، جو ان کے بعد دنیا میں موجود ہیں، ایسا معاشرہ قائم ہو گیا ہے جس میں وہ ہر طرح کے خوف و حزن سے مامون ہیں، ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے"۔ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۳/۱۷۰)۔ "وہ ان آسائشوں اور راحتوں سے جو نوازشاتِ خداوندی سے انہیں حاصل ہوتی ہیں، بے حد خوش ہوتے ہیں۔ نیز اس حقیقت سے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کسی ایمان والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتا، اس کا پورا پورا بدلہ دیتا ہے"۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اس کاروبار میں منفعت ہی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ جو کچھ وہ بیچتے ہیں اس کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے جو بہرحال فانی ہے۔ لیکن جو کچھ انہیں اس کے عوض ملتا ہے وہ جاوداں، پیہم رواں ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں

جو تصادمات کے انتہائی شدید مقامات پر بھی اِک تبسم جاں فروز کے ساتھ انتہائی وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں کہ۔

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں!

جان دینے والوں کو اُخروی جنت مل گئی، اور ان کا خون بہا، ان کے رفقاء کے لئے استخلاف فی الارض — اِس دنیا میں اقتدار و حکومت کی شکل میں سامنے آگیا (۲۴/۵۵)۔ اس طرح اس جماعت کے افراد کو ذات کا استحکام اور دنیاوی مفاد دونوں حاصل ہو گئے۔ سوچئے کہ کس قدر منفعت بخش ہے یہ کاروبار جو خدا کے ساتھ کیا جاتا ہے — یہ ہے اسلام، یہ ہے الدین۔ ان کے برعکس،

ان کے برعکس

وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۸۶)۔ "وہ دنیاوی زندگی کے مفاد کی خاطر اپنی آخرت بیچ ڈالتے ہیں۔ یعنی وہ مستقل اقدار کو پامال کر کے دنیاوی مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ہیں جو زندگی بیچ کر موت خریدتے ہیں اور اس طرح مستقل عذاب میں رہتے ہیں۔ اور ان کا کوئی ایسا مددگار نہیں ہوتا جو انہیں اس عذاب سے چھڑا سکے۔" دوسری جگہ کہا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (۳/۷۶)۔ "وہ لوگ جو خدا کے ساتھ باندھے ہوئے اپنے عہد کو اور اس کے استوار رکھنے کے لئے اٹھائی ہوئی قسموں کو دنیاوی زندگی کے مفاد کے عوض بیچ ڈالتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات تباہ ہو جاتی ہے اور آخرت کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔"

اِس قسم کا کاروبار کرنے والوں میں مذہبی پیشوائیت سرفہرست ہوتی ہے۔ یہ ہیں وہ جنہیں مخاطب کر کے کہا گیا کہ۔

مذہبی کاروبار کرنے والے

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (۲/۴۱)۔ "تم ہماری آیات کو، ثمنِ قلیل، حقیر سی قیمت کے عوض مت بیچو۔ اپنے اس سودے کے انجام سے ڈرو۔" ان کا کاروبار یہ ہوتا ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۲/۷۹)۔ "وہ اپنی طرف سے فتوے لکھتے ہیں اور پھر انہیں یہ کہہ کر حقیر سی رقم کے عوض، لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، یہ شریعتِ الٰہیہ ہے۔" اور خدا ان کے متعلق کہتا ہے کہ "جو کچھ یہ لوگوں کو لکھ کر دیتے ہیں وہ بھی تباہ کن ہوتا ہے اور اس طرح یہ جو کمائی کرتے ہیں وہ بھی تباہ کن۔"

اِن آیات (اور انہی جیسی دیگر متعدد آیات) میں خدا نے کہا ہے کہ تم ہماری آیات کو ثمنِ قلیل کے عوض مت بیچو۔ اس

کے یہ معنی نہیں کہ ان کے عوض تھوڑے سے پیسے مت لو، کثیر رقم حاصل کیا کرو۔ یہ غلط ہے۔ قرآنِ کریم متعدد مقامات پر بتاتا ہے کہ

ثمنِ قلیل سے مراد آخرۃ کے عوض دنیاوی مفاد جس قدر بھی حاصل کرلو گے وہ حقیر ہوں گے اور وہ متاع بڑی قلیل۔ مثلاً سورۃ نساء میں ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ (۴/۷۷) "ان سے کہہ دو کہ متاعِ دنیا، وہ کتنی ہی کثیر کیوں نہ ہو، آخرت کے بدلے میں بہرحال قلیل ہے۔ اس لئے کہ حقیقی منفعت آخرت ہی کی منفعت ہے اور وہ اُسے ملتی ہے جو اقدارِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے"۔ سورۃ توبہ میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کر دیا۔ جہاں کہا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۔ (۹/۳۸) اے مدعیانِ ایمان! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو جاتے ہیں! کیا تم آخرت کے مقابلہ میں دنیاوی زندگی کی متاع کو زیادہ پسند کرنے لگ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیاوی زندگی کی متاع، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، آخرت کے مقابلہ میں بہرحال قلیل ہے"۔ یہ اس لئے کہ دنیا اور اس کی متاع، حتیٰ کہ انسان کی (جسمانی) زندگی بہرحال عارضی ہے۔ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (۲۰/۱۳۱) "اور جو سامانِ زیست اقدارِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے وہ منفعت بخش بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی"۔ اور ظاہر ہے کہ بقاء کے مقابلہ میں فنا کو ترجیح دینے والا آخرالامر نقصان میں رہتا ہے کہ حقیقی نقصان انسانی ذات کا نقصان ہے۔ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ ... (۳۹/۱۵)

(۲/۱۷) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۔ (۲/۱۷)

آیت (۲/۱۶) میں نتیجۃً دو اہم نکات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جو لوگ وحی کی صداقتوں پر ایمان لائے بغیر (خواہ وہ کفار ہوں یا منافقین) سفرِ حیات طے کرنا چاہیں، وہ انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ نہیں پا سکتے۔ اور دوسرا یہ کہ جو لوگ مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برت کر دنیاوی مفاد حاصل کرتے ہیں، ان کا یہ کاروبار آخرالامر نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان نکات کو نظری طور پر بیان کرنے کے بعد، اپنے مخصوص انداز کے مطابق، انہیں محسوس مثالوں کی رو سے سمجھایا ہے۔ یہ مثالیں آیات (۲/۱۷-۲۰) میں بیان کی گئی ہیں۔ انہی کی تشریح اب ہمارے سامنے آتی ہے۔ پہلے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ کے سوال کو لیجئے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے (اور جس کی مزید تفصیل "قصۂ آدم" کے عنوان میں ہمارے سامنے آئے گی)، زندگی ارتقائی وادیوں میں سے گزرتی ہوئی انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ اس میں انسان کو جو کچھ فطرت کی طرف سے ازخود ملا ہے وہ، وہی جبلّی تقاضے

(INSTINCTS) ہیں جو دیگر حیوانات کو بھی عطا کیے گئے ہیں۔ انسانی بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو وہ ہر حیوانی بچے کی طرح از خود جانتا ہے کہ اس کی پرورش کا سرچشمہ کہاں ہے اور اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے (یعنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینا)۔ حیوانات کے سامنے زندگی کا صرف ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے — یعنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا — اور اس کے لئے جبلت کی راہ نمائی کافی ہوتی ہے۔ اس لئے نہ انہیں کسی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے نہ تجسس کی حاجت۔ اگر انسان کا مسئلہ بھی اتنا ہی ہوتا تو اسے بھی کسی کاوش کی ضرورت نہ تھی لیکن اس کا مسئلہ اتنا ہی نہیں — اس کے سامنے زندگی کے اور بیسیوں اہم مسائل بھی ہیں — تمدنی اور معاشرتی مسائل — سیاسی اور معاشرتی مسائل، ملی اور بین الاقوامی مسائل — اور خارجی دنیا سے آگے بڑھ کر خود اس کی داخلی دنیا کے گوناگوں مسائل — اس کے شعور اور نفسِ غیر شعوری کے تضادات، اس کی متعدد نفسیاتی الجھنیں، اس کی ذات کی نشوونما اور مستقبل کا سوال وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل کا حل دریافت کر لینا، جبلی راہ نمائی کے بس کی بات نہیں۔

جبلت کے علاوہ، انسان کو عقل و فکر کی صلاحیت بھی عطا ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اس قابل ہے کہ (وحی کی راہنمائی کے بغیر) فکری طریق پر ان مسائل کا حل دریافت کر سکے؟ اس سلسلہ میں ہم، اس سے پہلے، (آیت ۲/۲ کی تشریح کے سلسلہ میں) کچھ گفتگو کر چکے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے چونکہ اس مقام پر مثال کے ذریعہ بات سمجھائی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس کی مزید تشریح کر دی جائے۔ یہ تکرار نہیں، وضاحت ہے۔

زندگی کے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے عقل کا طریق کار تجرباتی (TRIAL AND ERROR کا) ہے۔ وہ جب

عقل کا تجرباتی طریق

کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لئے ابتدا کرتی ہے تو اس کے سامنے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کوئی سابقہ نظیر، نہ کسی نقشہ کی لکیر — وہ اپنے لئے خود ایک راستہ تجویز اور اختیار کرتی ہے اور اس پر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ راستہ میں ہزاروں قسم کے خطرات آتے ہیں لیکن وہ اس یقین کے ماتحت کہ جو راستہ اس نے اختیار کیا ہے، صحیح ہے، ان خطرات کا مقابلہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں انسان کو انواع و اقسام کی تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس میں خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ لاکھوں جانیں تلف ہو جاتی ہیں — لیکن عقل کی اُس یقین دہانی کی بنا پر، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ ایک مقام پر پہنچ کر اُسے پتہ چلتا ہے کہ جو راستہ اُس نے اختیار کیا تھا، وہ غلط تھا۔ وہاں اس کی عقل ایک اور راستہ تجویز کرتی ہے اور اس طرح ایک نئے تجربہ کو سامنے لاتی ہے۔ انسانی فکر کی تاریخ، انہی تجارب کی عبرت آموز داستان ہے۔ (میں نے اس داستان کو اپنی کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اربابِ فکر و تحقیق کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا)۔ عقل کی ان کاوشوں کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مسئلہ زیرِ نظر یہ تھا کہ انسانی معاشرہ میں مختلف افراد کی حیثیت کیا ہے؟ اس مسئلہ کے حل کے لئے عقل نے جو طریق اختیار کیا اس کی تاریخی

ابتداء مفکرین کے ابوالآباء یونانی فلاسفر افلاطون (PLATO) سے ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ پیدائش کی رو سے انسانوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک اہلِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد جنہیں وہ پاسبان (GUARDIAN) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ لوگ معاشرہ کے سب سے اونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں دوسرا طبقہ سپاہیوں کا اور تیسرا طبقہ عوام جو کسانوں، مزدوروں اور غلاموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک، انسانوں کی یہ تقسیم پیدائشی اور فطری ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ غلامی کو تقاضائے فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے لئے وہ (یہ مغالطہ آفریں) دلیل پیش کرتا تھا کہ جس طرح انسانی جسم میں پاؤں کا مقام پست ترین ہے اور ان کا کام سارے جسم کا بوجھ اٹھانا۔ یہی حیثیت معاشرہ میں غلاموں کی ہے۔ انہیں اس مقام سے بہتر مقام عطا کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دینا۔ اس سے چلنے والے کو آسائش کے بجائے جس قدر اذیت پہنچتی ہے، ظاہر ہے۔

غلامی کا مسئلہ

یونانی فلاسفروں میں افلاطون کے بعد اس کے شاگرد ارسطو کا نام سرِفہرست دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی غلامی کو فطرت کا تقاضا قرار دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس انہیں غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز اور ثبوت میں انہیں دلائل پیش کیا کرتا تھا۔

یہ بات آج سے قریب اڑھائی ہزار سال پہلے کی ہے۔ اس اڑھائی ہزار سال کی طویل مدت میں انسانی فکر نے افرادِ انسانیہ کی باہمی پوزیشن کے متعین کرنے میں جو کاوشیں کیں اور جو ٹھوکریں کھائیں، اس کی داستان تاریخ کے اوراق پر خون کے حروف سے لکھی ملے گی۔ ان صبر آزما اور ہمت شکن تجارب کے بعد، وہ صدیوں کے بعد کہیں جا کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ غلامی ایک غیر فطری تصور اور انسانیت کے لئے لعنت ہے، اور اس کے باقی رکھے جانے کا کوئی جواز نہیں۔ چنانچہ چند سال اُدھر اقوامِ متحدہ (U.N.O.) نے اسے اپنے منشور میں بنیادی حقوقِ انسانیت کے منافی قرار دیا۔ اور مختلف ممالک میں اسے ختم کیا گیا۔ لیکن اگر بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو اس سے بھی غلامی کی صرف ایک وحشیانہ اور ناتراشیدہ (CRUDE) سی شکل کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کی روح، دیگر متعدد خبیث روحوں کی طرح، انسانی دنیا میں بدستور گھومتی پھرتی اور مختلف پیکروں اور لباسوں میں سامنے آتی رہتی ہے۔ مثلاً افراد اور اقوام کی سیاسی غلامی، احتیاج کی بنا پر معاشی غلامی، غلط نظامِ تعلیم سے ذہنی غلامی، باطل کے پراپگینڈہ سے نفسیاتی غلامی وغیرہ وغیرہ۔

قرآنِ کریم نے عقلِ انسانی کے اس تجرباتی طریق کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھایا ہے کہ راستہ سے بھٹکا ہوا مسافر، ایک لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا ہے۔ رات کا وقت ہے اور گھپ اندھیرا۔ وہاں نہ کوئی چراغِ راہ ہے نہ سراغِ جادہ۔ نہ جرسِ کارواں ہے نہ نشانِ منزل۔ حتیٰ کہ ستاروں تک کی قندیلوں کو سیاہ بادلوں کے دبیز پردوں نے مکمل طور پر ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ مسافر

اِس مقام پر ششدر و حیران کھڑا ہے۔ اس کے پاس صرف ماچس کی ڈبیا ہے۔ وہ تیلی جلاتا ہے تو چھوٹے سے دائرے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ وہ اس میں دو قدم تک چلنے نہیں پاتا کہ راستہ کو پھر تاریکی ڈھانپ لیتی ہے۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے یوں وہ اس لق و دق صحرا میں، ٹامک ٹوئیاں مارتا آگے بڑھتا ہے کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ ۙ وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا۔ (۲/۲۰) — "ذرا سا راستہ روشن ہوا تو دو قدم چل لیا۔ پھر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا"۔

اس کے برعکس وہ مسافر ہے جو سفر کا آغاز ہی اُس راستہ سے کرتا ہے جس کی نشان دہی وحیٔ خداوندی نے کی ہے۔ وہ راستہ یہاں سے وہاں تک جگمگا رہا ہے۔ وہ راہرو، اس مسافت کو اس حتمی یقین اور اطمینان کے ساتھ طے کئے چلا جاتا ہے کہ اُس کا ہر قدم اُسے منزل سے قریب تر لے جا رہا ہے اور اس کے وہاں تک پہنچ جانے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

قرآن اور غلامی

اسی غلامی (SLAVERY) کی مثال کو لیجئے۔ فکرِ انسانی صدیوں کی جانکاہ کاوشوں کے بعد کہیں جا کر اس نقطہ تک پہنچ سکی ہے۔ کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں حقوق کے مالک ہیں۔ وحیٔ خداوندی نے پہلے ہی دن اعلان کر دیا کہ وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "تمام انسان پیدائش کی رُو سے یکساں احترام و تکریم کے مستحق ہیں"۔ — آدمیت احترامِ آدمی — اور

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اس کا منصب، واضع قوانین کا ہو یا حکمرانی کا — حتےٰ کہ اسے نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو — کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے غلام بن جاؤ۔ ایسا کہنے کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اس کا بھی اعلان کر دیا کہ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو، دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ حق بھی صرف خدا کو حاصل ہے، نہ ہی کسی کو رزق سے محروم کر دینے کا حق اور اختیار۔ ان اعلانات سے اس نے ہر نوعِ غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق جو ہدایات اور احکامات دیئے گئے ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ) سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآنِ کریم کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ انہیں یک لخت آزاد کر دینا نہ مناسب تھا نہ ممکن۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے ایسے احکامات صادر کئے جن میں سے وہ رفتہ رفتہ یا تو آزاد ہوتے گئے یا آزاد خاندانوں کا جزو بنتے گئے۔ اس طرح اس نے اُس وقت کے موجود غلاموں کے مسئلہ کو حل کر دیا۔

اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر اپنے مقام پر ملے گی)

یہ ہے فرق عقل کے فکری طریق، اور وحی کی راہ نمائی کا۔ لیکن — اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کے تجویز کردہ طریق سفر

عقل کی اہمیت

میں عقل کا کوئی منصب و مقام ہی نہیں۔ قرآن کریم نے عقل و فکر انسانی کو بڑی اہمیت دی ہے اس کی رو سے عقل اور وحی کا باہمی تعلق ایسے ہی ہے جیسے سورج کی روشنی اور انسانی آنکھ کا۔ جس طرح سورج کی روشنی کے بغیر، انسانی آنکھ کچھ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح انسان اگر اپنی آنکھیں بند کرلے تو سورج کی روشنی بھی اس کے لئے بیکار ہو جاتی ہے۔ اسی قرآنی حقیقت کو مشہور مغربی مفکر لاک (LOCKE) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> "جو شخص، وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر، عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے"۔[1]

زندگی کے اس روشن راستے میں، جسے وحی نے تجویز کیا ہے، جگہ جگہ دوراہے آتے ہیں جہاں مختلف سمتوں کی طرف جانے والے راستوں کے متعلق نشانات (SIGN - POSTS) نصب ہوتے ہیں۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان نشانات کو پڑھے اور ان کے مطابق صحیح راستہ اختیار کرے یا یوں سمجھئے کہ بچوں کی حساب کی کتاب میں مختلف سوالات دیئے ہوتے ہیں جنہیں وہ ریاضی کے قاعدوں کے مطابق عقل و فکر کی رُو سے حل کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے حل کو اُس جواب سے ملاتے ہیں جو کتاب کے آخری حصہ میں دیا ہوتا ہے۔ اگر اس کا حل جواب کے مطابق ہے تو بچہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے سوال ٹھیک حل کیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر کسی بچے کے پاس ایسی کتاب ہو جس میں سوالات کا حصہ تو ہو لیکن جوابات کا حصہ ضائع ہو چکا ہو تو سوال کے حل کرنے کے بعد وہ اس کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق جس الجھن میں مبتلا ہو جائیگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عقل انسانی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے حل کو وحی کے جواب کے ساتھ ملاتی چلی جائے اور جو اس سے ہم آہنگ ہو اُسے صحیح قرار دے کر آگے بڑھ جائے۔ خود افلاطون نے اس طریق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

> یہ ارباب فکر کچھ بنائیں گے، اُسے پھر مٹائیں گے، یہی کچھ کرتے رہیں گے تاآنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان خدائی راستوں سے ہم آہنگ کریں گے۔ (REPUBLIC)

نور و ظلمت

قرآن کریم نے وحی کو ہر جگہ نور سے تشبیہہ دی ہے اور جہاں وہ روشنی گم ہو، اسے ظلمات کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ (۲/۲۵۷)

[1] (ESSAY — BOOK IV)

"ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے" اس کے برعکس طاغوتی عناصر کفار کو یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷) "نور سے ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں" اسی بنا پر اس نے قرآنِ مجید کو نور کہہ کر پکارا ہے۔ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱) "اللہ نے، اے رسولؐ! تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تو اس کے ذریعے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے" (نیز ۶۵/۱۱) تاریکی کے لئے ظلمات کا لفظ استعمال کرنے میں، دو اہم نکات سامنے لائے گئے ہیں۔ ظلمت کے معنی ہوتے ہیں روشنی کا معدوم ہونا یعنی اس مقام پر روشنی کا نہ ہونا جسے روشن رہنا چاہیے تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس ایک بنیادی معنی کے اندر کتنی بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔

ظلمات کے معنی

اشیائے کائنات اور حیوانات کو خارجی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی راہنمائی انکی جبلت کر دیتی ہے جو پیدائشی طور پر ان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے متعلق نہیں کہا گیا کہ وہ ظلمت میں ہیں۔ حالانکہ وحیٔ منزل من اللہ کی روشنی ان کے پاس نہیں ہوتی۔ وحیٔ منزل من اللہ کی روشنی کا مقام انسانی دنیا ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر ایسی روشنی نہیں رکھی گئی۔ اگر انسانی معاشرہ اپنے آپ کو وحی کی روشنی سے محروم کر لیتا ہے تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ جہاں روشنی ہونی چاہیے تھی وہاں روشنی نہیں ہے۔ اس مقام کے لئے ظلمت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم نے ہر جگہ نور کو واحد کے صیغے میں استعمال کیا ہے لیکن ظلمت کو جمع کے صیغے میں۔ یعنی اس نے ظلمات کہا ہے۔ اس دقیق لیکن نہایت لطیف فرق کو پہلے بتایا جا چکا ہے۔ الحق ہمیشہ ایک ہوتا ہے لیکن باطل ہزاروں اقسام کے بھیس بدل کر سامنے آتا ہے۔ صحیح جواب ایک اور صرف ایک ہوتا ہے لیکن غلط جوابات لاکھوں ہو سکتے ہیں۔ اسی بنا پر اس نے حق یا صحیح جواب کے لئے تو نور کا لفظ استعمال کیا ہے اور باطل یا غلط جوابات کے ظلمات کا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جب روشنی آجاتی ہے تو تاریکیاں خواہ وہ کتنی ہی توبرتو کیوں نہ ہوں، کافور ہو جاتی ہیں۔ وحی کی روشنی، انسانی فکر اور جذبات کی پیدا کردہ غلط نگہی یا فریب کاری کی جملہ اقسام کو مٹا دیتی ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷/۸۱)

اب اگلی آیت کی طرف آئیے۔

۲/۱۸ (۲/۱۸) صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔

پہلے اِن الفاظ کو لیجئے۔ "صُمٌّ" (مادہ ص۔م۔م)۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کے کان بند ہو جائیں، یعنی بہرہ۔ نیز وہ شخص جو کسی کی نہ سنے اور اپنی سی کہے چلا جائے۔ جو عقل و فکر سے کام نہ لے۔ سورۃ یونس میں ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۴۲) "ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بظاہر تمہاری طرف کان لگائے رہتے ہیں لیکن ان کے خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ اے رسولؐ! کیا تو ایسے لوگوں کو سنا سکے گا جو عقل و فکر کے

دروازے بند کر کے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا لیتے ہیں۔"

بُکْمٌ گونگے کو کہتے ہیں یا ایسے شخص کو جو بات واضح طور پر نہ کر سکے۔ مراد ان سے بھی وہ لوگ ہوتے ہیں جو عقل و فکر سے کام نہ لیں۔ سورۃ الانفال میں ہے اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲)۔ "معیارِ خداوندی کی رو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہ لے کر بہرے اور گونگے بن جائیں۔"

عُمْيٌ۔ (مادہ ع۔م۔ی)۔ یہ لفظ عام طور پر تو اندھے کے لئے بولا جاتا ہے۔ لیکن ہے بڑا کثیر المعنی۔ گمراہ ہو جانا، باطل پر مصر ہونا، بلا عقل و فکر، اندھا دھند، آگے بڑھتے چلے جانا، کسی معاملہ میں غیر واضح اور مشتبہ ہو جانا۔ یہ تمام مفاہیم اس کے اندر شامل ہوتے ہیں۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ رسول اللہ سے کہا گیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۶/۵۱)۔ "میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ پھر ان سے پوچھئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان سے پوچھئے کہ تم اس قدر کھلی ہوئی حقیقت پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟" یہاں بھی عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو اندھا کہا گیا ہے۔

لہٰذا صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ سے مراد وہ لوگ نہیں جو طبیعی طور پر بہرے، گونگے یا اندھے ہوں۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ

عقل و فکر سے کام نہ لیں۔ چنانچہ سورۃ بقرہ ہی میں دوسرے مقام پر ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۱۷۱)۔ "بہرے، گونگے، اندھے، یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہ لیں۔"

لہٰذا جب آیتِ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ وحی کے چراغ کو گم کر کے اپنی پیدا کردہ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، تو اس سے مراد یہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ (۷/۱۷۹)۔ "وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود، ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھنے کے باوجود ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔" یعنی خدا نے انہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی تھی وہ اسے استعمال ہی میں نہیں لاتے۔ اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ (۲/۱۸)۔ "وہ غلط راستہ سے صحیح راستہ کی طرف پلٹتے ہی نہیں۔"

يَرْجِعُ کا لفظ بھی بڑا کثیر المعانی ہے اور اس کا غلط مفہوم، جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے، گمراہیاں پیدا کرنے کا

لَا يَرْجِعُوْنَ کا مفہوم

موجب۔ لیکن اس مقام پر ہم اس کی تشریح میں جانا نہیں چاہتے (اس کا مقام آگے چل کر آئے گا)۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اس کے معنی پلٹنے، لوٹنے، واپس ہونے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ اور انہی معانی میں یہ لفظ اس آیت میں آیا ہے۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو آپ کے

مخاطب دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک اہل کتاب جو کسی وقت حق پر تھے لیکن بعد میں اس راستہ سے ہٹ گئے۔ ان سے کہا گیا کہ تم پھر اُسی الحق کی طرف پلٹ کر آجاؤ جو تمہارے انبیاءؑ کی وساطت سے تمہیں دیا گیا تھا لیکن جسے تم نے ضائع کر دیا۔ جب وہ اس سے انکار کرتے تو اُن سے کہا جاتا کہ تم حق کی طرف پلٹ کر کیوں نہیں آتے؛ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا۔ وہ جب حق کی طرف نہیں آتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ ان کے لئے بھی لفظ لَا يَرْجِعُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ بہ ہئیتِ مجموعی یوں سمجھیے کہ مختلف لوگ، مختلف غلط راستے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ایک شخص دوراہے (بلکہ چوراہے) پر کھڑا ہوا آوازیں دے رہا ہے کہ جن راستوں پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں صحیح منزل تک نہیں لے جا سکتے۔ یہاں واپس آؤ۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ اگر وہ واپس نہ آئیں تو اُن کے متعلق بھی لَا يَرْجِعُوْنَ کہا جائے گا۔ بہرحال مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ لوگ غلط راستوں پر چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کریم انہیں آوازوں پر آوازیں دے رہا ہے کہ ادھر آؤ۔ میں تمہاری راہنمائی صحیح راستہ کی طرف کروں گا۔ لیکن یہ اس کی دعوت اور پکار کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ اور اندھوں، بہروں، گونگوں کی طرح اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ (۲/۱۸)

(۲/۱۹) أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ۔ يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ۔ ۲/۵

آیت (۲/۱۷) کی تمہید میں جو دو نکات بیان کئے گئے تھے، اب ان میں کے دوسرے نکتہ کی طرف آئیے یعنی اس نکتہ کی طرف کہ یہ لوگ جو مستقل اقدارِ خداوندی کی قیمت پر زندگی کے طبیعی مفاد حاصل کرتے ہیں تو بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے فائدے میں رہے ہیں لیکن درحقیقت ان کا یہ کاروبار منفعت بخش نہیں، نقصان دہ ہوتا ہے۔ فی الحقیقت منفعت بخش کاروبار وہی ہوتا ہے جو اقدارِ خداوندی کی پابندی کے ساتھ کیا جائے۔ "کاروبار" سے مراد محض معاشی لین دین نہیں، اس سے مراد زندگی کے ہر شعبہ میں نفع یا نقصان کا سوال ہے۔ نفع نقصان، یا خیر و شر کے متعلق پہلے بھی گفتگو کی جا چکی ہے لیکن قرآن کریم نے جو مثال یہاں پیش کی ہے اس کی تشریح کے لئے اس مسئلہ کی مزید وضاحت بھی ضروری ہے۔

خیر و شر کی مزید تشریح

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ طبیعی کائنات میں کوئی شے نہ فی ذاتہٖ خیر ہے نہ شر۔ اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ خدا نے تو ہر شے کو خیر ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان اس کے غلط استعمال سے اسے شر بنا دیتا ہے۔ پانی مدِ حیات ہے۔ اس پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ یہ زمینِ مردہ کو

حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ اس سے لہلہاتی کھیتیاں اُگتی ہیں۔ سرسبز و شاداب، ثمر بار باغات نمود میں آتے ہیں۔ غرضیکہ زندگی اور اس کے لئے جس سامانِ پرورش و استحکام کی ضرورت ہے، پانی اس میں بڑا بنیادی کام دیتا ہے۔ لیکن جس پانی کو پی کر انسان جیتا ہے اسی میں ڈوب کر وہ مر بھی جاتا ہے۔ وہ پانی جو دریاؤں، نہروں، ندی نالوں کے ساحلوں میں گھرا ہوا بہتا ہے، حیاتِ تازہ کی نمود کا موجب بنتا ہے۔ لیکن جب وہی پانی ساحل فراموش ہو کر سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو عالمگیر تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ سنکھیا، کہ جس کا نام ہی ہلاکت کے مرادف ہے، مرنے والوں کی جانیں بچانے کے کام بھی آتا ہے اگر اسے صحیح طریق سے بطور علاج استعمال کیا جائے۔ یہی کیفیت طبیعی کائنات کی ہر شے اور فطرت کی ہر قوت کی ہے۔ خدا نے ان میں سے ہر ایک کو خیر و برکت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ ان کا غلط استعمال ہے جن کی وجہ سے وہ شر کا موجب بن جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر، خیر اور شر ہر شے کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ انسان کے حل کرنے کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کیا طریق ہے جس سے ان کے شر کے پہلو سے محفوظ رہ کر انہیں خیر و برکت کا موجب بنایا جائے۔ ان سے تخریب کی بجائے تعمیری کام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳/۲) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی ہے۔ یعنی یہ آرزو کہ جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے وہ شر نہ بن جائے، خیر رہے۔ اگر بعض چیزیں خیر اور بعض شر ہوتیں تو شر اشیاء سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی جاتی۔ علومِ سائنس یہ تو بتا دیتے ہیں کہ اشیائے کائنات سے خیر کا نتیجہ کس طرح مرتب ہو سکتا ہے، وہ شر کیسے بن سکتی ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ انسان کو اس پر کیسے آمادہ کیا جائے کہ وہ انہیں خیر کے لئے استعمال کرے، شر کے لئے استعمال نہ کرے۔ یہ ان علوم کے حیطۂ کار سے باہر کی چیز ہے۔

طبیعی یا خارجی دنیا سے آگے بڑھ کر انسان کی تمدنی دنیا کی طرف آئیے۔ اور یہاں دیکھئے کہ کیا فکرِ انسانی ایسا نظام تجویز کر سکی ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو ــ یعنی اس کا نتیجہ ہر ایک کے لئے بخیر ہو۔ انسانی فکر نے اپنے تجرباتی طریق کی رو سے اس کی تلاش میں بھی بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ اس کے لئے جو

نظریۂ افادیت

بہترین نظریہ دریافت کر سکی ہے اُسے افادیت یا (UTILITARIANISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے عملِ خیر وہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ مرتب ہو۔ یعنی

THE GREATEST GOOD OF THE GREATEST NUMBER

اس نظریہ کی رو سے مقصود کثیر تعداد کا فائدہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ باقی رہ جائیں گے کیا وہ انسان نہیں؟ انہیں اس مفاد سے کس بنا پر محروم رکھا جائیگا؟ اس اعتراض کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

سیاسی دنیا میں یہی نظریہ جمہوریت کا ہیکل لئے ہوتے ہے۔ جمہوریت کی بنیاد بھی اکثریت کی حکمرانی پر ہے۔ یہاں پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ اقلیت نے کیا جرم کیا ہے کہ انہیں نہ صرف حقِ حکمرانی سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ انہیں، انہی جیسے دوسرے انسانوں کی محکومیت میں دے دیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اکثریت حاصل کر لیتے ہیں۔ فکرِ انسانی ابھی تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکی جس میں شر کا یہ پہلو موجود نہ ہو۔ اس کے ہر نظام میں — خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی — خیر اور شر باہمد گر مخلوط رہتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے زیرِ نظر آیت میں محسوس مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

پہلے ان الفاظ کو لیجئے۔

الفاظ کے معنی

صیّب۔ (مادہ ص۔ و۔ ب) بارش برسانے والا بادل۔ لیکن وہ بارش جو عین وقت اور ٹھیک مقام پر ہو۔

رعد۔ بادل کی گرج۔

برق۔ بجلی کی چمک۔

صواعق۔ (صاعقہ کی جمع) بجلی کی کڑک۔

خطف۔ (۲/۲۰) اچک کر لے جانا۔

عرب، جس جغرافیائی ماحول میں رہتے اور جس آب و ہوا میں زندگی بسر کرتے تھے ان کے لئے بارش فی الواقعہ بارانِ رحمت تھی۔ وہ اس کی بوند بوند کو ترسا اور ہلکی سی بدلی کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر وہاں کبھی ایسی گھٹا اٹھتی جو پانی سے لدی ہوئی ہوتی اور عین وقت اور صحیح مقام پر جھوم کر برستی تو یہ چیز ان کے لئے کس قدر وجہ مسرت ہوتی لیکن اس قسم کی گھٹا میں تاریکی، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک اور کڑک بھی بادلوں کے دامن کے ساتھ لپٹی ہوئی ہوتی۔ وہ بالعموم کھلے آسمان کے نیچے خیموں میں رہتے تھے، اس لئے ان کے ہاں ایسا سامان نہیں ہوتا تھا جس سے وہ بجلی کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکتے۔ لہٰذا جب اس قسم کے بادل آتے تو وہ جہاں بارش کی متوقع حیات آفرینیوں سے پُرمسرت ہوتے، ان کی برق سامانیوں سے انہیں ڈر بھی لگتا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں۔ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲، ۳/۲۴)۔ یعنی "ان برق آمیز گھٹاؤں میں ان کے لئے خوف اور طمع کے دونوں گوشے مضمر ہوتے وہ ڈرتے کہ کہیں بجلی کی چمک ان کی بینائی اچک کر نہ لے جائے (۲/۲۰)۔ اور صاعقہ ان کے کاشانوں پر موت بن کر نہ گر پڑے"۔

واضح رہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے برق، رعد اور صاعقہ کو بنایا ہی تباہی کے لئے ہے۔ انکی تخلیق

کا مقصد بھی خیری ہے۔ چنانچہ سورہ الرعد میں ہے۔ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳) "رعد بھی خدا کے پروگرام کو مستحق حمد و ستائش بنانے کے لئے مصروفِ عمل رہتی ہے۔" ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائنس ابھی تک حتمی طور پر یہ دریافت کر سکی ہے یا نہیں کہ فطرت کی یہ قوتیں، جو فضائے آسمانی میں گرجتی، چمکتی اور تڑپتی نظر آتی ہیں، کون کون سے تعمیری پہلو اپنے اندر لئے ہوتی ہیں۔ جہانتک اس تباہی کا تعلق ہے جو بجلی گرنے سے وقوع پذیر ہوتی ہیں، قرآن کریم نے کنایۃً کہا ہے۔ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ (۱۳/۱۳) "یہ خدا کے قانونِ مشیت (کائناتی قانون) کے مطابق گرتی ہے۔" لہٰذا اگر اس قانون کا علم حاصل کر لیا جائے تو اس کی ہلاکت سامانیوں سے محفوظ رہنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ بڑی بڑی عمارتوں کے اوپر دھات کی ایک سلاخ نصب کر دیتے ہیں جس سے بجلی کی تخریبی لہر غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال، قرآن یہاں کہنا یہ چاہتا ہے کہ فطرت کی ان قوتوں میں تعمیر اور تخریب کے دونوں پہلو مضمر ہوتے ہیں۔ انہیں قانونِ فطرت کے مطابق صرف میں لایا جائے تو نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان کے شر کا پہلو غالب آجاتا ہے۔ جنہیں ان قوانین کا علم نہیں ہوتا وہ اپنے طور پر ان سے محفوظ رہنے کے مختلف طریقے سوچتے ہیں۔ بجلی کڑکتی ہے تو وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم اس کی ہلاکت آفرینی سے محفوظ ہو گئے۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر انہوں نے اس طریق سے اپنی قوتِ سماعت کو محفوظ بھی کر لیا تو اس کا بھی تو امکان ہے کہ بجلی کی چمک ان کی بینائی اچک کر لے جائے۔ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ (۲/۲۰)

اب اس مثال کو آگے بڑھائیے اور خارجی کائنات سے ہٹ کر انسان کی تمدنی دنیا کی طرف آجائیے۔ اس دنیا کے بھی دو گوشے ہیں۔ ایک گوشہ وہ ہے جس میں قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے منفعت بخش کام لیتی ہیں۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ قرآنِ کریم نے کس کس انداز سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے مختلف کام لے سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر لے جن کے مطابق یہ قوتیں روبہ عمل رہتی ہیں۔ جو قوم بھی ان قوتوں کو اس طرح مسخر کر لیتی ہے وہ مادی دنیا میں ترقی کر لیتی ہے۔ اقوامِ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ فطرت کے جو حوادث پسماندہ (جاہل) اقوام میں تباہیاں مچا دیتے ہیں، اقوامِ مغرب نے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں کہ وہ ان قوتوں کے نفع بخش پہلوؤں سے تو متمتع ہو جائیں۔ لیکن ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں۔

انسان کے نظامِ تمدن کا یہ گوشہ تو وہ ہے جہاں اس کا واسطہ فطرت کی (مجبور محض) قوتوں سے پڑتا ہے

فطرت کی قوتوں کا استعمال

اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جہاں انسان کا واسطہ انسان سے پڑتا ہے۔ چونکہ یہ نظام عقل اور فکر کا وضع کردہ ہوتا ہے۔ لوگ کرتے یہ ہیں کہ فطرت کی ان

قوتوں کو اپنے ہاں تو منفعت بخشیوں کے لئے استعمال میں لاتے ہیں لیکن انہی کے بل بوتے پر دوسری قوموں پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے انہیں بظاہر بڑی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ کمزور اقوام پر جس قدر زیادہ غلبہ و استیلا حاصل کر لیتی ہیں اُسی نسبت سے اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کا یہ نظام اس قدر مستحکم ہو گیا ہے کہ ان پر تباہی آہی نہیں سکتی۔ لیکن قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ ان کا ایسا سمجھنا غلط نگہی اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی سے متعلق نظام کے استحکام کا مدار صرف مادی قوتوں کے حصول پر نہیں۔ اس کا گہرا تعلق ان کے مصرف سے بھی ہے! اگر یہ اسباب و وسائل تمام نوعِ انسان کی منفعت اور بہبود کے لئے استعمال کئے جائیں تو وہ نظام مستحکم ہوتا ہے۔ اگر انہیں اپنی منفعت اور دوسروں کی تباہی کے لئے استعمال میں لایا جائے تو یہ نظام (بظاہر کتنا ہی مستحکم کیوں نہ دکھائی دے) آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ تباہی یک لخت نہیں آتی، بتدریج آتی ہے اور آتشِ خاموش کی طرح ان گوشوں سے آتی ہے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ سورۃ

قوموں کی تباہی

اعراف میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۷/۱۸۲)۔ "جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں، ہم انہیں رفتہ رفتہ، بتدریج، اُن راستوں سے تباہی کے جہنم کی طرف لے جاتے ہیں جن کا انہیں علم و ادراک تک نہیں ہوتا"۔ اور ایک دوسری جگہ ہے مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۳۹/۴۷)۔ "جن کا انہیں وہم گمان تک نہیں ہوتا"۔ سورۃ النحل میں ہے۔ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ (۱۶/۲۶)۔ "اے رسولؐ! اِس قسم کی سازشیں تمہاری مخاطب قوم ہی نہیں کر رہی۔ ان سے پہلے بھی انہی جیسی اقوام، اسی قسم کی سازشیں کرتی رہی ہیں۔ لیکن وہ (سازشیں) کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ بلکہ انہیں غیر محسوس طور پر تباہیوں کی طرف لے جاتی رہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مساکن کی بنیادیں تک اکھڑ گئیں۔ ان کی چھتیں ان کے اوپر اس طرح آ گریں کہ وہ ان کے بوجھ تلے دب کر کچلی گئیں۔ اور یہ سب کچھ ایسے غیر محسوس طریق سے ہوا کہ ان کی عقل و شعور کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ یہ تباہی کیسے آئی؟ اور کہاں سے آئی؟"۔

قرآنِ کریم نے اوپر کہا ہے کہ یہ تباہی بتدریج آتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ یہ قومیں سوچیں کہ ہمارے نظام کی وہ کونسی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ تباہیوں کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سمجھتے یہ ہیں کہ اس میں یونہی دراڑیں سی پڑ گئی ہیں جنہیں پُر کیا جا سکتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ ایک دراڑ یا رخنہ کو بند کرتے ہیں تو دوسری طرف سے دیوار میں دو شگاف نمودار ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی بیان کردہ مثال کی رو سے، وہ بجلی کی کڑک سے محفوظ رہنے کے لئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں تو اس کی چمک ان کی بینائی اچک کر لے جاتی ہے۔ تاریخِ تہذیب کا مشہور عالم اور مفکر رابرٹ بریفو (R. BRIFFAULT) اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY

نہیں لکھتا ہے :۔

نظامِ باطل کی تباہی انسانی ہئیتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اُس نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عوام کو لوٹ کھسوٹ کر ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس کاروبار کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن یہ تمام انتظامی خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رُو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے :۔

وہ نظامِ تہذیب، جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہو، آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ کوئی فرد دھاندلی سے کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام، جس کا وہ جزو ہے، اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر جرائم کی اُجرت موت ہے۔

قرآنِ کریم نے زیرِ نظر آیت میں بیان کردہ مثال سے اسی حقیقت کو سمجھایا ہے اور اسے دو لفظوں میں یوں بیان کر دیا ہے۔ کہ وَاللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکٰفِرِیْنَ (۲/۱۹)۔ "خدا کا قانونِ مکافات' حق وصداقت سے انکار کرنے اور سرکشی برتنے والوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوتے ہوتا ہے۔ وہ اس سے نکل کر کہیں جا ہی سکتے"۔ لہٰذا حسنِ تدبر کی جزئی مرمت کاریاں اور پیوند سازیاں انہیں تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔

اور یہیں سے ہم اگلی آیت کی طرف بڑھ جاتے ہیں جہاں کہا ہے۔

(۲/۲۰) یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۔ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْہِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَ اَبْصَارِھِمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے :۔

ہوسکتا ہے کہ بجلی ان کی بینائی اچک کر لے جائے۔ جب وہ چمکتی ہے تو یہ لوگ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں۔ جب اندھیرا ہوجاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت کا بیشتر مفہوم تو سابقہ آیت کی تشریح میں آچکا ہے۔ البتہ دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید وضاحت طلب ہیں۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ۔ اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کے طبیعی ذرائع علم ــ سماعت و بصارت وغیرہ ــ سلب کر لیتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا کرنا اُس کے قانونِ مشیت کے خلاف تھا۔

سوال یہ ہے کہ اُس کا یہ قانونِ مشیت کیا ہے؟ اور وہ ایسا کیوں نہیں کرتا؟

طبیعی قوتیں سلب نہیں ہوتیں

جب کسی معاشرہ میں مظالم عام ہو جاتے ہیں، جور و استبداد، سلب و نہب، بے انصافی اور دھاندلی کی طاغوتی قوتیں بیباک ہوجاتی ہیں کمزوروں اور ناتواں کا، طاقتور لوگوں کے ہاتھوں جینا دشوار ہوجاتا ہے تو سطح بین لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھرتا ہے کہ خدا اُن بازوؤں کو شل کیوں نہیں کر دیتا جو کمزوروں اور ناتوانوں کی ہڈیاں توڑنے کے لئے بروئے کار آتے ہیں۔ جو ہاتھ کسی مظلوم کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لئے اٹھتا ہے، خدا اس ہاتھ کو پتھر کیوں نہیں بنا دیتا کہ وہ حرکت ہی نہ کر سکے؟ ایسا کیوں ہے کہ دھاندلی مچانے والے دن بدن ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی دولت، قوت اور ثروت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ انہیں ہر قسم کے طبیعی مفادات حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر خدا ان کے حصولِ دولت و قوت کے راستے بند کر دے تو یہ اس قابل ہی نہ رہیں کہ غریبوں پر ظلم و ستم ڈھا سکیں۔ خدا کو ایسا کرنا چاہیئے وہ ایسا کیوں نہیں کرتا؟ اس کے جواب میں خدا یہ کہتا ہے کہ ایسا کرنا ہمارے قانونِ مشیت کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے طبیعی دنیا میں طبیعی قوانین (قوانینِ فطرت) نافذ کر دیئے ہیں اور انسانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتے ہیں۔ اس سے انہیں ہر قسم کے مادی مفادات حاصل ہو جائیں گے۔ اس میں سوال کافر اور مومن کا نہیں (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) جو شخص بھی ان قوانین کے مطابق محنت کریگا اسے مادی مفاد حاصل ہو جائیں گے۔ کفر اور ایمان کی تمیز کا سوال اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے جہاں طبیعی قوانین کی رو سے حاصل کردہ مفاد اور قوتوں کے استعمال کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ دیکھئے! سورۃ بنی اسرائیل میں وہ اس حقیقت کو کس قدر بلیغ اور دلآویز انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ۔ (۱۷/۱۸) جو شخص بھی دنیا کے مادی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے، ہم اُسے اس کی سعی و کاوش کے مطابق یہ مفادات دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ

طبیعی مفاد ہر ایک کو حاصل ہو سکتے ہیں

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (ایضاً)۔ "جب وہ ان مفادات کو غلط طور پر استعمال کرتا ہے (اسے کفر کہتے ہیں) تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔" دوسری طرف وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُورًا۔ (۱۷/۱۹) "جو شخص قوانینِ فطرت کے مطابق مادی مفادات حاصل کرتا ہے۔ اور پھر انہیں ہماری متعین کردہ اقدار کے مطابق صرف میں لاتا ہے، تو اس کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرتی ہے۔" جہاں تک طبیعی مفادات کا تعلق ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (۱۷/۲۰)۔
"کافر ہو یا مومن، ہم دونوں کو ان کی سعی و کاوش کے مطابق، آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان دونوں کو ہماری تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ ہم ایسا کبھی نہیں کرتے کہ ایک جماعت کو آگے بڑھ جانے دیں اور دوسری کے راستہ میں پھاٹک لگا دیں کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ ایسا کرنا ہمارے قانونِ مشیت کے خلاف ہے۔ طبیعی مفادات ہماری طرف سے تمام انسانوں کو بطور عطیہ دیئے گئے ہیں اور عطیہ میں ایسی شکل کبھی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ ایک کو دیدیا جائے اور دوسرے کو اس سے محروم رکھا جائے۔ ذرائع رزق ہماری طرف سے تمام نوعِ انسان کو بطور عطیہ دیئے گئے ہیں۔ یہ میدان سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ جو جس قدر محنت کریگا اس کے مطابق اسے پھل مل جائے گا۔"

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازہ جام است ایں جا

دوسری جگہ ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ۔ (۱۱/۱۵) "جو شخص بھی دنیاوی زندگی کے مفادات — اس کی آسائشیں اور آرائشیں — حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے قانونِ فطرت کے مطابق کام کرے تو اس کی ان کوششوں کا، اسے بھرپور نتیجہ مل جائیگا۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔" (نیز دیکھئے ۴۲/۲۰)۔

یہ ہے خدا کا وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق اس نے کہا ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے کہ اخلاقی اقدار کو پامال کرنے والوں کی طبیعی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیں۔ ان کی تباہی، ان کی ان صلاحیتوں کے باوجود، اس لئے واقعہ ہو کر رہے گی کہ انہوں نے اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا۔ یہ وہ تباہی ہو گی جس سے انہیں ان کی طبیعی صلاحیتیں اور مادی قوتیں بچا نہیں سکیں گی۔ یہی ہیں وہ قوتیں جن کے متعلق کہا۔ فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ أَبْصَارُهُمْ وَلَآ أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ۔ (۴۶/۲۶) "جب

انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اُس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور ان کی سماعت، بصارت اور عقل و فکر کی صلاحیتیں انہیں اس سے بچا نہ سکیں۔ وہ ان کے کسی کام نہ آئیں"۔ وہ کہتا ہے کہ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶)۔ "ان لوگوں کی ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، دل کی آنکھیں اندھی ہوا کرتی ہیں"۔ یہ ہے جواب ان لوگوں کے اس اعتراض کا کہ خدا ظالم کے ہاتھ کو شل کیوں نہیں کر دیتا۔ اُس کے بازوؤں کو پتھر کیوں نہیں دیتا؟ کہا کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ۔ (۲/۲۰)۔ "خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ یہ اس کے قانونِ مشیت کے خلاف ہے"۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ (۳۳/۶۲)۔ "اور اس کے قوانین میں تو کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے اس نکتہ کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ لیکن آیت کے اگلے ٹکڑے کا مروجہ غلط مفہوم ایک ایسی الجھن پیدا کر دیتا ہے کہ جس سے نہ صرف قرآنِ کریم کی یہ وضاحت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ اس سے تضاد بھی پیدا ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کے بنیادی دعویٰ کے خلاف ہے۔ وہ ٹکڑہ ہے۔ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یہ الفاظ قرآنِ کریم میں بکثرت آتے ہیں اور ان کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو جی میں آئے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ ہر بات اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جیسا چاہے کرے وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے دیکھا کہ اس مفہوم کی رو سے وہ ساری عمارت کس طرح دھڑام سے نیچے آگرتی ہے جو قانون کی حکمرانی کے قرآنی تصور کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ بنابریں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ میں نے ان امور کو اپنی تصنیف ——— کتاب التقدیر ——— میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہاں اس کا ملخص پیش کر دینا کافی ہوگا۔

خدا اس وقت بھی خدا تھا جب یہ کائنات ظہور میں نہیں آئی تھی۔ اور اس وقت بھی خدا رہے گا جب یہ سلسلہ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا خدا کی دنیا، اس کی پیدا کردہ مادی کائنات ہی نہیں، اس کے ماورا بھی ہے۔ قرآنِ کریم نے مادی کائنات کو عالمِ خلق کہہ کر پکارا ہے اور اُس ماورائی دنیا کو عالمِ امر سے تعبیر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (۷/۵۴)۔ "یاد رکھو! عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں خدا کی دنیا میں ہیں"۔

عالمِ امر

عالمِ امر کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ بس اتنا تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہاں خدا کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس کا تعلق خدا کے پروگرام کے شعبۂ پلاننگ (PLANNING) سے ہے۔ وہیں یہ فیصلے ہوتے ہیں کہ عالمِ خلق کیسا ہونا

چاہیئے۔ وہیں خدا کا تخلیقی پروگرام طے پاتا ہے۔ اور اس کے لئے قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ وہاں کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ۔ (۲۲/۱۴) "خدا اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جو جی میں آئے کرتا ہے"۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ (۱۱/۱۰۷) "یقیناً تیرا رب اپنے ارادوں کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے"۔ سورہ مائدہ میں ہے اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵/۱) "وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے"۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۲۲/۱۸) "وہ جو چاہے کرتا ہے"۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) "اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے سوا ہر ایک سے پوچھا جا سکتا ہے"۔

یہ ہے خدا کا عالمِ امر جب اس کے امر کے مطابق یہ مادی کائنات وجود میں آئی تو یہاں اس کے امر نے ایک اور پوزیشن اختیار کرلی۔ کہا۔ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔ (۳۳/۳۸) "خدا کا امر مقدور ہوگیا"۔ اس لفظ (مقدور) کا مادہ ــــ (ق۔ د۔ ر) ہے جس کے بنیادی معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ۔ قَدَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں، میں نے اس چیز کو ماپا، اس کا اندازہ کیا۔ قَدَرْتُ عَلَیْہِ الثَّوْبَ کے معنی ہیں میں نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ لہٰذا تقدیر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا پیمانہ یا اندازہ کے مطابق فِٹ ہو جانا۔ اور مِقْدَارٌ اس پیمانے یا ماڈل یا (PATTERN) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

قدر کے معنی

چونکہ کسی چیز کو ایک خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری مقدرت حاصل ہو، اس لئے قَدَرْتُ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں، مجھے یہ قدرت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنے پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔

مادہ (ق۔ د۔ ر) کے اِن مفاہیم کی رو سے وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸)۔ کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ، خدا کے مقرر کردہ اندازوں کا پابند ہوگیا۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔ (۶۵/۳) "خدا نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا"۔ مادی کائنات میں، خدا کے مقرر کردہ، یہی وہ پیمانے ہیں جنہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ مثلاً، پانی ایک مقدار تک ممدِ حیات ہے لیکن جب وہ اس پیمانہ سے آگے بڑھ جائے تو انسان کی موت کا باعث بن جاتا ہے (جیسے ڈوب کر مر جانا)۔ اسے پانی کا پیمانہ کہا جائے گا۔ یہی قانونِ فطرت کہلاتا ہے ــــ قرآنِ کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا۔ اس کی جگہ اسی مادہ (ق۔ د۔ ر) کی مختلف شکلیں آتی ہیں۔ ان پیمانوں کے متعلق خدا

تقدیراتِ الٰہیہ

نے یہ واضح کر دیا ہے کہ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ۔ (۷۷/۲۳) "یہ پیمانے یا قوانین ہم نے مقرر کئے ہیں۔ ہم بہترین پیمانے مقرر کرنے والے ہیں"۔ لہٰذا قَادِرٌ کے معنی ہوئے

پیمانے مقرر کرنے والا، یا مادی کائنات کے لئے قوانین متعین کرنے والا۔ پیمانے مقرر کرنے کے اس عمل کو خدا کی تقدیر کہا گیا ہے۔ مثلاً سورہ یٰسین میں ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ (۳۶/۳۸) "سورج (نظامِ شمسی) اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے"۔ اور اس کے بعد ہے۔ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (ایضاً)۔ "یہ اس خدا کا مقرر کردہ قانون (تقدیر) ہے۔ جو ہر بات کا علم رکھتا ہے"۔ یہ تقدیراتِ الٰہیہ (یعنی خدا کے مقرر کردہ قوانینِ فطرت) مقرر تو عالمِ امر میں ہوتے تھے لیکن انسان کو اس کی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔ اسی بنا پر انہیں قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) کہا گیا ہے۔ یعنی "وہ پیمانے جو معلوم ہو سکتے ہیں"۔ نظری طور پر خدا کے ان پیمانوں کو کَلِمٰتُ اللّٰهِ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴) "خدا کے ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی"۔ اور اس کے یہی قوانین جب عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے لئے بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲) "تو خدا کی سنت (روش) میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔

آپ نے دیکھا کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی اس نئی منزل میں کس قدر عظیم انقلاب رونما ہوا ہے۔ یعنی یہ انقلاب کہ خدا کا وہ امر، جو کسی ضابطہ اور قاعدہ کا پابند نہیں ہوتا، عالمِ خلق میں پہنچ کر "مقدور" ہو گیا۔ یعنی وہ "اختیارِ مطلق" کے بجائے قانون بن گیا اور قانون بھی ایسا جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ بالفاظِ دیگر، اس سے خدا نے اپنے اوپر خود ایک پابندی عاید کر لی۔ "خدا پر پابندی" کے تصور سے ہم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جب خدا نے خود کہہ دیا کہ ہم ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں کریں گے تو اس سے کپکپی طاری نہیں ہونی چاہیئے۔ جو قادرِ مطلق اپنی ذاتِ مطلقہ، اپنے کامل اختیار و ارادہ سے خود اپنے اوپر کوئی پابندی عاید کر لے تو اس کا ایسا کرنا اس کے قادرِ مطلق ہونے میں نقص پیدا نہیں کرتا۔ پابندی وہی قابلِ اعتراض ہوتی ہے جو کسی پر دوسرا شخص عائد کرے۔ جو پابندی اپنے اوپر آپ عائد کر لی جائے اُسے اصول پرستی کہتے ہیں، جو نہایت مستحسن امر ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ میں نے اپنے لئے یہ فرض قرار دے لیا ہے کہ میں کسی سائل کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جانے دوں گا تو اس کی یہ خود عائد کردہ پابندی معیوب نہیں، نہایت مستحسن فیصلہ اور مبارک اقدام ہے۔

خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عاید کر رکھی ہیں

خدا نے اپنے اوپر آپ پابندی عائد کرنے کے لئے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جنہیں دیگر مقامات پر انسانوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اس نے کہا ہے۔ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (۶/۱۲)۔

"اُس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے"۔ اور دوسری جگہ انسانوں کے لئے کہا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔ (۲/۱۸۳) "تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے"۔ یعنی یہ فریضہ خدا کی طرف سے انسانوں پر عاید کیا گیا ہے۔ اور كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (۶/۱۲) میں خدا نے یہ فریضہ خود اپنے اوپر عاید کر لیا ہے۔ سورۃ یونس میں ہے۔ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰/۱۰۳) "مومنین کو مصائب و آلام سے محفوظ رکھنا ہم نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے"۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰/۴۷) "مومنین کی مدد کرنا ہمارے اوپر واجب ہے"۔

قرآنِ کریم کے اکثر مقامات میں "وعداللہ" کے الفاظ آتے ہیں یعنی خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ اور انہی وعدوں کے متعلق کہا ہے۔ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔ (۳۰/۶) "خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا"۔ یعنی اس نے وعدہ کا ایفا کرنا اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔

ان' اور ان جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قادرِ مطلق ہونے کے بعد، خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جن کی خلاف ورزی وہ کبھی نہیں کرتا۔ الفاظ ان کے لئے کچھ ہی ہوں، ہم اپنی زبان میں یہی کہیں گے کہ یہ خدا کے قوانین ہیں جنہیں وہ کبھی نہیں توڑتا۔ مثلاً اُس نے کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ۔ (۲۴/۵۵) "خدا نے اُن لوگوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جو اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں تو وہ انہیں دنیا میں ضرور حکومت اور اقتدار عطا کر دے گا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ ان تصریحات

انہی پابندیوں کا نام قوانینِ خداوندی ہے

سے ظاہر ہے کہ جب خدا نے کہا کہ ہم نے اپنے امر و اختیار و ارادہ کو پیمانوں میں مقدور کر دیا ہے اور ہم اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں کریں گے، تو اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے میں کوئی کمی نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا جب کہا جائے گا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انہی قوانین کی رو سے وہ ان پر ایسا کنٹرول رکھتا ہے کہ انہیں ان کی خلاف ورزی نہیں کرنے دیتا۔

ان تصریحات کے بعد آپ آیۂ زیرِ نظر (۲/۲۰) کی طرف پھر آئیے۔ اس میں اُس نے کہا یہ ہے کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ۔ (۲/۲۰) "اگر ہم چاہتے تو ان لوگوں کی طبیعی صلاحیتوں کو سلب کر لیتے"۔ لیکن ہم ایسا کر سکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ایسا نہیں کرتے۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۲۰)۔

"ہم نے تمام امور کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں"؛ اور ہمارا قانون یہ بھی ہے کہ انسانوں کے طبیعی امور کے فیصلے طبیعی قوانینِ فطرت کے مطابق کئے جائیں۔ اس قانون کی رو سے ہم جھوٹ بولنے والے کی زبان گنگ نہیں کر دیتے۔ کسی کی طرف نگاہِ بد سے دیکھنے والے کی آنکھوں کو اندھا نہیں کرتے۔ جھوٹ اور نگاہ کی خیانت اپنے نتائج ضرور پیدا کرتی ہے لیکن اس کے لئے ہمارے دوسرے قوانین مقرر ہیں۔

اس آیت پر ان تینوں گروہوں سے متعلق بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یعنی متقین۔ کفار۔ اور منافقین سے متعلق بحث کا خاتمہ۔ اس کے بعد ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

(۰)

خلاصۂ باب سوم

(آیات: ۸ — ۲۰)

(۸) سابقہ ابواب میں جن دو گروہوں کا ذکر آچکا ہے وہ یا تو وہ ہیں جو کھلے بندوں صداقت کا اقرار کرتے ہیں، یا کھلے بندوں اس سے انکار کرتے۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اِس ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے، لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ (یہ لوگ یا تو سطحی جذبات پرست ہوتے ہیں اور یا ابن الوقت اور موقعہ پرست۔ اس لئے ان لوگوں کی رفاقت پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔)

(۹) یہ لوگ نظامِ خداوندی اور اُس کے قائم کرنے والی جماعتِ مؤمنین سے دو رُخی چالیں چلتے ہیں۔ اور بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں فریب دے رہے ہیں، حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں۔

(۱۰) اس قسم کی جذبات پرستانہ اور فریب کارانہ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا قلب و دماغ صحت مندانہ توازن کھو بیٹھتا ہے اور خدا کا قانون یہ ہے کہ غیر متوازن ذہن جس قدر مصروفِ کار رہیگا اسی قدر اس کا توازن اور بگڑتا جائے گا۔

اس روش کو نبھانے کے لئے انہیں قدم قدم پر جھوٹ بولنا اور ہر موقعہ پر نیا بہروپ بدلنا پڑتا ہے۔ اندازہ لگاؤ کہ اس سے ان کی جان کس قدر اَلم انگیز عذاب میں رہتی ہے۔

(۱۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ناہمواریاں پیدا کر کے معاشرہ کے نظام کو تباہ مت کرو، تو یہ نہایت ڈھٹائی

سے کہتے ہیں کہ ہم معاشرہ کو بگاڑتے کب ہیں، ہم تو اسے سنوارنے والے مصلحین ہیں ــــ یاد رکھو! یہی لوگ تباہ کاریاں اور ناہمواریاں پیدا کرنے والے ہیں، اس لئے کہ جن کی اپنی داخلی زندگی میں ہمواریاں نہ ہوں وہ معاشرہ میں کس طرح ہمواریاں پیدا کر سکتے ہیں!)

حیرت ہے کہ یہ لوگ اس کا بھی احساس نہیں کرتے کہ ان کے قول و فعل کا یہ تضاد، ان کی اصل و حقیقت کو کس طرح بے نقاب کر دیتا ہے!

(۱۳) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اس ضابطۂ زندگی کو اسی طرح مانو اور اختیار کرو جس طرح جماعتِ مومنین کے افراد اسے صحیح تسلیم کرتے اور اس کے مطابق چلتے ہیں، تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو بیوقوف ہیں جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں، اور مفت ہاتھ آجانے والے فائدوں کو چھوڑ کر "اصول پرستی" کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں! کیا ہم بھی انہی جیسے احمق بن جائیں؟

یاد رکھو! نفع نقصان سے بے خبر اور احمق خود یہ لوگ ہیں جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ عارضی مفاد کی خاطر مستقل منافع کو چھوڑ دینا، اچھی تجارت نہیں کہلا سکتی۔

(۱۴) ان کی دو رُخی زندگی کا یہ عالم ہے کہ جب یہ اُن لوگوں کے سامنے آتے ہیں جو اس ضابطۂ خداوندی کو اختیار کئے ہیں، تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن جب یہ اپنی پارٹی کے سرغنوں سے تنہائی میں ملتے ہیں، تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم اندر سے تو تمہارے ہی ساتھ ہیں، صرف ظاہرا طور پر ان لوگوں سے ملتے اور انہیں بے وقوف بنا کر ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

(۱۵) اے کاش! یہ اس کا اندازہ کر سکتے کہ یہ دوسروں کو بیوقوف بنا کر اُن کا مذاق کیا اڑائیں گے، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے (حقائق کی دنیا میں) خود اپنا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی قوت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں اور پھر حیران و سرگرداں مارے مارے پھرتے ہیں، اور جوں جوں آگے بڑھتے ہیں منزل سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

(۱۶) یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو دھوکا دے کر ناجائز فائدے حاصل کر رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہمارا کاروبار بڑا نفع بخش ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا نادان ہی کوئی نہیں کہ انہوں نے زندگی کی صحیح روش کے بدلے میں غلط راستہ خرید لیا ہے۔ انکی یہ تجارت کبھی نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ غلط راستے پر چلکر زندگی کی منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

(۱۷-۱۸) ان عارضی اور عاجلہ مفاد کے پیچھے پھرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جنگل کی تاریک رات میں راستہ معلوم کرنے کے لئے آگ سلگائے جس سے اُس کے اردگرد کی فضا روشن ہو جائے لیکن اس کے فوری بعد آگ بجھ جائے اور اس طرح خدا کا

قانون اُسے تاریکیوں میں اس طرح چھوڑ دے کہ اُسے کچھ دکھائی نہ دے۔ (یعنی مفادِ عاجلہ کی تابناکیاں ایک دفعہ تو نگاہوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی ہیں لیکن اس کے بعد ایسا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اس میں) صرف نگاہیں ہی بیکار نہیں ہوتیں بلکہ سوجھ بوجھ کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اور انسان بہرا، گونگا اور اندھا۔ یعنی عقل و فکر سے عاری (۲۲/۴۴) اور جذبات سے مغلوب ہو کر نفع و نقصان کی تمیز سے محروم ہو جاتا ہے (۲/۱۸) اور اس کے لئے صحیح راستے کی طرف لوٹنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

(۱۹) یا (ان کے تمدنی اور معاشی نظام) کی مثال، جو ان کے خود ساختہ قوانین سے مرتب ہوتا ہے، ایسی ہے جیسے ' وقت پر مینہ برسانے والا بادل، لیکن اُس کے ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیرا، گرج اور بجلی کی چمک بھی۔ (یعنی سامانِ زیست کے ساتھ اسبابِ ہلاکت ملے ہوئے (۲۲/۳۱)) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بارش کی منفعت بخشیوں سے تو فائدہ اٹھالیں لیکن رعد و برق کی تباہ کاریوں سے بچ جائیں۔ اس کا طریقہ ان کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں۔ نہ یہ ہیبت ناک آوازیں سنائی دیں، نہ وہ موت کے منہ میں جائیں۔ ان نادانوں کو اتنا معلوم نہیں کہ بجلی کی تباہ کاریاں کانوں کے راستے ہی اندر نہیں جایا کرتیں۔ وہ تو پوری کی پوری فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ (یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر تدبر کی فسوں سازی سے اُن رخنوں کو بند کر دیا جائے جن کے راستے ان کی دانست میں' تباہیاں آتی ہیں تو غلط نظامِ زندگی کے عواقب سے محفوظ رہا جا سکتا ہے لیکن ان کا خیال خام ہے)۔ خدا کا قانونِ مکافات اُس قوم کو چاروں طرف سے گھیرے رہتا ہے جو حقائق سے انکار کرتی ہے۔ (۲۹/۵۴؛ ۹/۴۹؛ ۸۵/۲۰؛ ۱۷/۹۲)۔

(۲۰) ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کڑک کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں (اور اس طرح بزعمِ خویش اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ خیال کر لیں)، تو بجلی کی چمک ان کی بینائی اچک کر لے جائے یعنی سامانِ زیست کی فراوانی ان کی نگاہوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دے کہ انکی آنکھیں خطرہ کے مقامات کو بھانپنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ یا یہ ایک خطرہ کی روک تھام کا انتظام کریں تو دوسرا خطرہ کسی غیر متوقع مقام سے ابھر کر انہیں تباہ کر دے (۱۸۴/۷)۔

مختصراً یوں سمجھو کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو قوم بھی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لے وہ ان سے نفع یاب ہو جاتی ہے (۱۷/۱۸-۲۱) لیکن صرف طبیعی زندگی کے مفاد پر نگاہ رکھنے والوں کی یہ نفع یابیاں عارضی ہوتی ہیں اور بلند اقدار کو سامنے رکھنے والوں کی مستقل اور پائیدار (۲/۱۸۶؛ ۱۱/۱۵؛ ۴۲/۲۰) اول الذکر کی حالت یوں سمجھو جیسے کوئی شخص بادلوں سے گھری ہوئی تاریک رات میں، صحرا میں راہ گم کردہ کھڑا ہو جب بجلی کی چمک سے ذرا راستہ روشن ہو جائے تو وہ اُس میں چار قدم چل لے لیکن جب پھر اندھیرا چھا جائے تو کھڑے کا کھڑا رہ جائے۔

ہم چاہتے تو ایسا بھی کر سکتے تھے کہ ان لوگوں کے ذرائع علم (سماعت و بصارت) سلب کر لیتے اور اس طرح انہیں قدرتی سامانِ نشو و نما سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہ دیا جاتا، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے ہر بات کیلئے اندازے اور پیمانے مقرر کر دیئے اور قوانین و ضوابط ٹھہرا دیئے ہیں۔ کائنات کی کوئی شے ان پیمانوں سے باہر نہیں جا سکتی۔ ان پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

چوتھا باب

(آیات ـــــ ۲۱ تا ۲۹)

النّاس

۱۔ انسانی تخلیق۔

۲۔ عالمِ خلق و عالمِ امر۔

۳۔ مبدارِ کائنات کے متعلق سائنسدانوں کا عجزِ فہم۔

۴۔ زندگی کی نمود۔

۵۔ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

۶۔ أَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

۷۔ الٰہ الارض اور الٰہ السمآء۔

۸۔ اسٹیٹ کا تصوّر ـــ عصرِ حاضر کا ندّ۔ (معبودِ باطل)

۹۔ رزقِ حلال ـــ رزق اللہ۔

۱۰۔ معجزات کا مطالبہ اور انکار۔

۱۱۔ قرآن کا چیلنج۔

۱۲۔ جہنّم کا مفہوم۔

۱۳۔ جنّت کی حوریں۔

۱۴۔ قرآنی مثالیں۔

۱۵۔ زندگی کیسے ظہور میں آگئی؟

۱۶۔ اُخروی زندگی۔

۱۷۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

۱۸۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا باہمی تعلق۔

۱۹۔ خاتمۃ الکتاب۔

چوتھا باب

(آیات ۲۱ تا ۲۹)

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ

۲/۲۱

(۲/۲۱) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔

گزشتہ باب میں ہمارے سامنے نوعِ انسان کے تین گروہ ۔ متقین، کفار اور منافقین ۔ آئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کا بنیادی مخاطب نوعِ انسان سے ہے۔ وہ انسانوں کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کا ذکر ان کی سیرت و کردار، اعمال و افعال اور اوصاف و خصائص کے امتیازات کی رو سے کرتا ہے؛ ورنہ اس کا پیغام عالمگیر انسانیت ہی کے لئے ہے۔ اس کا خدا رَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (۱۱۴/۱-۳) ہے۔ اس کے رسولؐ کا اعلان ہے کہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸)۔ اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر اور کَآفَّةً لِّلنَّاسِ (۳۴/۲۸) کے لئے بشیر و نذیر ہوں۔ اس کی کتاب نوعِ انسان کے لئے برہان اور نورِ مبین (۴/۱۷۴) اور عالمگیر انسانیت کے نفسیاتی امراض کے لئے شفا، موعظت، ہدایت اور رحمت (۱۰/۵۷) ہے، جس کے عطا ہونے پر انہیں جشنِ مسرت منانا چاہیئے (۱۰/۵۸)۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! بقا اور دوام صرف اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو (۱۳/۱۷)۔ یہی ہیں وہ اعمال جنہیں اعمالِ صالحہ اور حسنات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ انہی کے نتیجہ میں اس دنیا میں اقتدار و استخلاف حاصل ہوتا ہے، اور اُخروی زندگی میں جنت کی بہاریں۔ اس کا مقصود و منتہیٰ تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اپنی تمدنی زندگی کے آغاز میں امت واحدہ کی شکل میں رہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور مختلف قبیلوں، خاندانوں، گروہوں اور قوموں میں بٹ گئے (۱۰/۱۹)۔ ان کے اس تفرقہ اور اختلاف کو مٹانے کے لئے آسمانی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ رسولوں کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا، انہیں ضوابطِ اقدار و قوانین عطا کئے گئے تاکہ ان کے ذریعہ وہ ان منتشر انسانوں کو پھر سے امتِ واحدہ بنا دیں۔ یہ بتائی گئی ہے غایتِ آسمانی ہدایت و سعادت کے سلسلۂ دراز کی۔ آسی

بناپر آیۂ زیرِنظر میں النّاس سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور انہیں وہی بات کہی گئی ہے جو اس سے پہلے مختلف انبیائے گرامی قدر کی وساطت سے بار بار کہی جاتی رہی تھی۔ یعنی اُعْبُدُوا اللّٰہَ۔ تم انسانوں کے وضع کردہ قوانین وضوابط کو چھوڑ کر کہ جنہوں نے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کرکے ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے، صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو (لفظ عبادت کا مفہوم سورۃ فاتحہ کی آیت (۱/۴) میں وضاحت سے بیان کیا جاچکا ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے اُسے ایک مرتبہ پھر دیکھئے لیجئے کیونکہ یہی دین کی اصل واساس ہے اور اسی محور کے گرد قرآنِ کریم کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے)۔ اس نے، واضح طور پر بتادیا کہ انسانی پیدائش کا مقصد اُسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرے۔ سورۃ الذّٰریٰت میں ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (۵۱/۵۶) "انسان، خواہ وہ شہروں کی تمدنی زندگی بسر کر رہے ہوں یا خانہ بدوش صحرانورد قبائل کی منتشر زندگی، وہ اپنی تخلیقی غایت اُسی صورت میں حاصل کرسکتے ہیں جب وہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں"۔

خدا کی صفتِ ربوبیت

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کریم میں خدا کا ذاتی نام اللّٰہ ہے اور باقی اس کی تمام صفات ہیں جنہیں الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات میں خدا کی ان صفات کو بڑی کثرت وتکرار سے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی اعجاز ہے کہ جس مقام پر اللّٰہ تعالیٰ کی جس صفت کو لایا گیا ہے وہ وہاں ٹھیک منطبق ہوتی، اور متعلقہ آیت کے مفہوم کی بڑے دلنشیں انداز سے وضاحت کر دیتی ہے۔ زیرِ تشریح آیت میں کہا گیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ۔ یعنی یہاں خدا کی صفتِ ربوبیت کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ پیشِ نظر آیات کا موضوع ہی خدا کی ربوبیتِ عالمینی ہے (لفظ ربّ کا مفہوم سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت (۱/۱) میں بیان کیا جاچکا ہے۔ اسے وہاں دیکھ لیجئے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کی پرورش کرتے ہوئے اُسے، اُس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج منزلِ تکمیل تک پہنچانے والا۔ یعنی ہر شے کو اس کے حسبِ حال سامانِ نشوونما دینے والا)

لیکن اس آیت میں صفتِ ربوبیت کے بعد خَلَقَكُمْ کہہ کر خدا کی صفتِ خالقیت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور یہ کہہ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (اُس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور اُن انسانوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں) شروع سے آخر تک تمام نوعِ انسان کو، اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ کہا جائے گا۔ وہ کسی خاص دور کے انسانوں تک محدود نہیں ہوگا۔ اس کا اطلاق ابتدائے انسانیت سے لے کر آخر تک تمام نسلِ انسانی پر ہوگا۔ یعنی خدا نے ان سب کو پیدا کیا اور وہی ان کے لئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ تخلیق کے سلسلہ میں اس نے کہا۔ وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ۔ (۲۶/۱۸۴) "اُس خدا کے

خالقیت

قوانین کی نگہداشت کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور سابقہ نسلوں کو بھی"، اور تخلیق کے ساتھ رزاقیت کے متعلق کہا۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ (۳۰/۴۰) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا بھی کیا اور سامانِ رزق بھی عطا کر دیا ہے"۔ دیگر کئی ایک مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ رزاق۔ سورۂ فاطر میں ہے ــــ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؗ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ۔ (۳۵/۳) "اے نوعِ انسان! تم خدا کی اُن نعمت ہائے بے پایاں کو نگاہوں کے سامنے

رزاقیت

لاؤ جن سے اُس نے تمہیں نوازا ہے۔ اور پھر سوچو کہ اُس کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے' اور کوئی ایسا ذی اقتدار بھی جو تمہیں سامانِ نشو و نما عطا کرتا ہے۔ اور جب وہی خالق ہے اور وہی رازق، تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہاں اقتدار و اختیار بھی اُسی کا ہونا چاہیئے۔ جب یہ حقیقت اس قدر واضح ہے تو تم بتاؤ کہ اس سے منہ موڑ کر کس طرف بہکے جاتے ہو"؟ دوسرے مقام پر اسی حقیقت اور دعویٰ کو دہرا کر کہا۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (۲۷/۶۴) "اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ خالق، رازق اور الٰہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے، تو تم اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ بلا دلیل تو کوئی دعوےٰ بھی ہمارے ہاں قابلِ پذیرائی قرار نہیں پا سکتا"۔

تخلیق و رزاقیت کا یہ ربطِ باہمی بڑا گہرا اور غور طلب ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے، یا کسی اور مخلوق نے' خدا سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ وہ انہیں دنیا میں پیدا کرے۔ اس نے اپنے کسی ہمہ گیر اور محیطِ کل پروگرام کے مطابق مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ آپ سوچیئے کہ کیا یہ ظلم و زیادتی نہ ہوتی کہ مخلوق کو پیدا تو کر دیا جاتا لیکن جس سامان و اسباب پر ان کی زندگی اور پرورش کا دار و مدار ہوتا وہ پیدا نہ کیے جاتے! خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے پہلے اس سامان و اسباب کو پیدا کیا اور اُس کے بعد اُس مخلوق کو جن کے لئے اس ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ علم الارض اور علم الحیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ہوا، پانی، روشنی، حرارت، اور زمین میں پیداوار کی صلاحیت پہلے وجود میں آئی اور جاندار مخلوق اس کے بعد پیدا ہوئی۔ یہ ہے تخلیق اور رزاقیت کا بنیادی ربط۔ ضمناً، یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مخلوق کی ایک خاصی تعداد سامانِ رزق سے محروم رہ جاتی ہے، تو یہ، رزق کی غیر خداوندی تقسیم کا نتیجہ ہے جسے انسانوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے ورنہ خدا نے تو اس سامان و اسباب کو تمام نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے یکساں طور پر پیدا کیا تھا۔ تفصیل ان امور کی آیت (۲/۳) کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ اس کی مز تشریح زیرِ نظر آیات میں بھی سامنے آئے گی، اور اس کے بعد بھی، جہاں جہاں معاشی نظام سے متعلق گفتگو ہوگی۔ یہ، بہرحال ایک ضمنی نکتہ تھا۔ یہاں اصل موضوع تخلیق سے متعلق ہے۔

خَلَقَ۔ مادہ (خ۔ ل۔ ق) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو بنانے یا کاٹنے کے لئے اُسے ماپنا۔ اس کا اندازہ لگانا۔

اس کے تناسب وتوازن کو دیکھنا۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانا۔ لہٰذا خَلَقَ کے معنی ہوں گے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اسکے حشو وزوائد کو دور کرنا اور پھر اُسے اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانا اس طرح کہ اس کا توازن وتناسب بالکل درست رہے۔[1] بالفاظِ دیگر، مختلف عناصر کو نئی نئی ترکیبیں دے کر اُن سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ تشریح اس نکتہ کی آگے چل کر سامنے آئے گی۔

خلق و امر

سورۃ الاعراف میں ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷/۵۴) "آگاہ رہو! کہ خلق اور امر دونوں خدا کے لئے ہیں۔ ان میں اس کا کوئی اور شریک نہیں"۔ انہی کو عام طور پر عالمِ امر اور عالمِ خلق کہا جاتا ہے۔ اَمر کے متعلق کچھ ابتدائی گفتگو سابقہ باب کے آخر میں، خدا کے قادرِ مطلق ہونے کے سلسلے میں کی جا چکی ہے وہاں امر اور قدر کا ربطِ باہمی بتایا گیا تھا۔ یہاں امر اور خلق کا ارتباط سامنے آتا ہے۔ اَلْاَمَرَةُ۔ صحرا میں چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ کر جو راستہ کا نشان بنایا جاتا تھا اس کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے اس کے بنیادی معنی نشان، علامت یا سمت (DIRECTION) کے ہیں۔ یہ لفظ اور بھی متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس کے انہی معانی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ہمارے زیرِ نظر موضوع کا تعلق انہی سے ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب بھی کوئی صانع کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کا تصور یا خیال اس کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ پھر وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کرتا ہے۔ اس کی تخلیق کے امکان اور ساخت پرداخت وغیرہ کو ذہن میں لاتا ہے۔ اور جب وہ ان سب امور کا نظری طور پر تعین کر لیتا ہے تو اُس شے کو محسوس طور پر بنانے کے لئے قدم اٹھاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس پہلے گوشہ کو عالمِ امر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں، وجود میں لائی جانے والی شے کے متعلق تمام امور "نظری" طور پر طے پا جاتے ہیں۔ اسے آپ پلاننگ کی (تدبیری) اسٹیج کہہ لیجئے۔ لیکن تخلیقی پروگرام میں یہ اسٹیج اس قدر لاینفک اور اہم ہوتی ہے کہ اس کے بغیر کوئی شے وجود میں نہیں لائی جا سکتی۔ اور اگر یہ مرحلہ یقینی طور پر طے ہو جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ گویا وہ شے وجود میں آگئی۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں۔ (مثلاً) وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (۲/۱۱۷) "جب وہ ایک امر (تدبیر) کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔" خدا کا یہ امر کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمارا علم، عالمِ خلق تک محدود ہے۔ اس سے آگے جا نہیں سکتا۔ مشہور مفکر (PRINGLE PATTISION)

---

[1] اس سے خُلق اور اخلاق کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں جو اسی مادہ سے بنتے ہیں۔

نے کہا ہے کہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے کہ اس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (CREATION) ہے۔ حالانکہ ضروری تھا کہ تخلیق کے ان ہر دو (غیر مرئی اور محسوس) مراحل کے لئے الگ الگ الفاظ ہوتے ۔عربی زبان میں یہ الگ الگ الفاظ (امر اور خلق) موجود ہیں اور قرآن کریم نے انہیں اسی مقصد کے لئے استعمال کیا ہے[1]۔ اگر اس مفکر کی نگاہ میں ذرا اور وسعت ہوتی تو وہ دیکھتا کہ قرآن کریم نے ان مراحل کے لئے دو الگ الگ الفاظ ہی استعمال نہیں کئے، تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور یہ الفاظ تخلیقی پروگرام میں جن تین مراحل کی نشان دہی کرتے ہیں وہ بڑے اہم اور بنیادی ہیں (یہ تیسرا لفظ (یا مرحلہ) آگے چل کر سامنے آئے گا۔

جب امر کا مرحلہ طے ہوجاتا ہے تو اس کے بعد خلق کی منزل سامنے آتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں وہ شے محسوس شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تخلیق کے معنی ہیں مختلف عناصر کو خاص تناسب کے ساتھ ملا کر ان سے ایک نئی چیز پیدا کر دینا۔ انسانی صانع یا کاریگر کے لئے یہ مرحلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ وہ جب کسی شے کی تدبیر کو ذہن میں طے کرلیتا ہے تو اس کے سامنے وہ عناصر پہلے سے موجود ہوتے ہیں جن کے امتزاج سے اُس نے اُس شے کو بنانا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ایک (ARCHITECT) مکان کا نقشہ تیار کرلیتا ہے تو وہ سامان جو اس مکان کی تعمیر کے لئے ضروری ہوتا ہے دنیا میں موجود ہوتا ہے — اینٹ، پتھر، سیمنٹ، لوہا اور لکڑی وغیرہ — اس کے لئے کرنے کا کام اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ ان عناصر (اشیائے ضروریہ) کو خاص تناسب اور توازن کے ساتھ ملا کر نقشے کے مطابق مکان تعمیر کرتا چلا جائے۔ لیکن جب خدا نے اپنے تخلیقی پروگرام کا آغاز کیا تو صورت یہ نہیں تھی۔ اس نے عالمِ امر میں تخلیقِ کائنات کا نقشہ تیار کرلیا۔ تو اُس وقت کوئی شے بھی ایسی موجود نہ تھی جس سے اس پروگرام کے مطابق تخلیقِ کائنات کی جاتی۔ یہاں پہلے خود اُن عناصر کا وجود میں لانا ضروری تھا جن کی ترکیباتِ نَو سے مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ہے خدا کے تخلیقی پروگرام میں وہ تیسرا (یا یوں کہئے کہ درمیانی) مرحلہ جو (PATTISION) کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا۔ یہ مرحلہ ہے محسوس بنیادی عناصر کو عدم سے وجود میں لانے کا۔ اس کے لئے اس نے بَدَعَ اور فَطَرَ کے الفاظ استعمال

بدیع اور فاطر

کئے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پہلے پہل وجود میں لانا۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷) کہا ہے۔ سورۃ یوسف میں فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۲/۱۰۱)۔ سورۃ انعام میں یہی لفظ فعل کے صیغہ میں آیا ہے جہاں کہا ہے۔ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۶/۷۹)۔ یعنی وہ ذات جو عناصرِ کائنات کے پہلے پہل وجود میں لائی۔

---

[1] خطباتِ اقبالؒ۔ (صفحہ ۹۷)

تخلیقِ کائنات کے متعلق تفصیلی گفتگو تو بعد میں، اس کے مناسب مقام پر آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو اس پروگرام کے اساسی خطوط تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ مغرب کے سائنس دان مختلف اشیائے کائنات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان مرکب اشیاء سے پیچھے ہٹتے ہٹتے ہم ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جو مختلف اجزاء سے مرکب نہیں، بلکہ وہ مفرد ہیں۔ ان مفردات کو (ELEMENTS) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان کی تعداد (۹۲) بتائی جاتی تھی۔ اب ان میں ایک آدھ اور کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ مرکب اشیاء کے متعلق تو یہ جان لینا آسان تھا کہ وہ کس طرح وجود میں آتی ہیں، لیکن ان مفردات کے متعلق انسانی علم کچھ نہیں جان سکا کہ وہ کس طرح وجود میں آگئے۔ مثلاً جب انہوں نے پانی کے ایک قطرہ کا تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دو حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے مرکب ہے۔ (اسی لیے پانی کو H_2O سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ لیکن ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں مفردات ہیں۔

ایٹم سے توانائی تک

یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ کس طرح وجود میں آگئیں۔ مادہ (MATTER) کی اس تجزیاتی تحقیق کا ابوالآباء یونانی فلاسفر، دیمقراطیس (DEMOCRITUS - BORN 470 B.C.) کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تحقیق یہ تھی کہ مادہ ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہے جنہیں مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا ان ناقابلِ تقسیم ذرات کو اجزائے لایتجزیٰ یا (ATOMS) کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ رواں دواں آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ ہمارے اس دور میں سائنس دانوں نے مزید انکشاف یہ کیا کہ مادہ کا ہر ذرہ درحقیقت مثبت اور منفی برقیہ (بجلی) کا ہیولیٰ ہوتا ہے اور جب وہ اس سے آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ یہ برقیاتی لہریں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ توانائی محض (PURE ENERGY) ہیں۔ اگر مادہ کے کسی ذرہ کو پھاڑا جائے تو اس سے ایسی بے پناہ توانائی حاصل ہوتی ہے جس سے یہ عظیم کرۂ ارض بھک سے اڑایا جا سکتا ہے۔ یہ جو آجکل اٹامک انرجی (ATOMIC ENERGY) یا (NUCLEAR ENERGY) کا اسقدر شہرہ ہے، وہ یہی توانائی ہے۔

واضح رہے کہ نہ تو قرآنِ کریم کوئی سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اس وقت ہمارا موضوع مادہ کی سائنٹیفک تشریح ہے ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ مفردات اپنی محسوس شکل میں ہوں یا توانائی (ENERGY) کی صورت میں، اصل سوال یہ ہے کہ یہ وجود میں کیسے آگئے۔ قرآنِ کریم نے اسے بَدِیْعٌ اور فَطَرَ سے تعبیر کر دیا۔ یعنی یہ کہہ دیا کہ خدا انہیں عدم سے وجود میں لے آیا۔ اس سے آگے بات ہمارے حیطۂ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہمارا ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔ یہ اشیاء موجود ہیں۔ ان کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ وجود میں کیسے آگئیں۔ آئن سٹائن جیسا عظیم سائنس دان بھی کہہ سکا ہے تو فقط اتنا کہ:۔

طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت میں تبدیل کر دیا ہے...... کائنات جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے، ایک ٹھوس شے نہیں، جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے (THING) ہے ہی نہیں، بلکہ عمل (ACTION) ہے یا حوادث (EVENTS) کی عمارت[1]

آپ نے دیکھا کہ سائنس کی تحقیقات کا رخ کس طرح عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف مڑ رہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ، یہ حقیقت ابھی ایک معمہ ہی ہے کہ اس مادی کائنات کی ابتدا ہو کیسے گئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں (EDDINGTON) بھی اسی طرح نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائے انگشت بدنداں کھڑا ہے جس طرح ایک ہل چلانے والا دہقان (ERNST HAECKEL) نے ایک بڑی دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے معمۂ کائنات (RIDDLE OF THE UNIVERSE). وہ اس میں لکھتا ہے :-

> ہمیں اس کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ نیچر کی کنہ و حقیقت سے ہم آج بھی اسی قدر بے خبر ہیں جس قدر آج سے (2400) سال پیشتر حکمائے یونان، یا دو سو سال پہلے نیوٹن اور اسپنوزا، یا سو سال پہلے کانٹ اور گوئٹے بے خبر تھے۔ ہمیں تو بلکہ اس کا بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم جس قدر اس جوہر کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے یہ کائنات مرکب ہے اور مادہ اور توانائی جس کے خصائص ہیں، وہ اور معمہ بنتا جا رہا ہے۔ ہم اسکی محسوس شکلوں اور ان کی ارتقائی منازل کا علم تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ (ص۳۱)

اور ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر، ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر کہتا ہے کہ :-

> نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے[2]
>
> (THE GREAT DESIGN P.35)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ علوم سائنس کی کتاب

---

[1] خطباتِ اقبالؒ۔ (صفحات ۵۳ تا ۴۰)

[2] اس موضوع پر مزید معلومات کے لئے میری کتاب ــــ انسان نے کیا سوچا؟ ــــ کا باب دوم دیکھئے۔

نہ ہونے کے باوجود جہاں جہاں کسی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کر دیتا ہے تو سائنس کے انکشافات اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس نے مادی کائنات کے اوّلین عناصر کے متعلق تو اتنا ہی کہا کہ خدا انہیں عدم سے وجود میں لایا ہے، لیکن اس کے بعد اس نے بتایا کہ اس ابتدائی مرحلہ کے بعد، خدا کا تخلیقی پروگرام کس طرح مختلف اشیاء کو ارتقائی مراحل میں سے گزارتا ہوا انہیں آخری شکل دے دیتا ہے۔ کئی ایک مقامات پر اس نے کہا ہے کہ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ (۱۰/۴) "وہ کسی شے کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اُسے مختلف گردشیں دیتے ہوئے آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے"۔ ان گردشوں سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے حشو و زوائد کو دور کر کے، اس میں صحیح توازن و تناسب پیدا کر دیا جائے۔ اَلَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۸۷/۲)۔ "وہ ایک چیز کو پیدا کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس میں تسویہ (اعتدال) پیدا کرتا چلا جاتا ہے"۔ اسی بناء پر خدا نے اپنے آپ کو اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹/۲۴) کہا ہے، یعنی تخلیق کی ابتدا کرنے والا، پھر اُس شے کو مختلف گردشیں دے کر اس کے حشو و زوائد کو دور کرنے والا۔ اور اس طرح اُسے آخری شکل دے دینے والا۔ ارسطو نے مختلف اشیاء میں وجہ امتیاز شکل (FORM) کو قرار دیا تھا۔ بلکہ وہ تو شکل ہی کو شے کہہ کر پکارتا تھا۔ قرآنِ کریم نے خدا کو المصوّر کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ وہ کس طرح مختلف اشیائے کائنات کو تخلیقی مراحل سے گزار کر انہیں ایک خاص شکل (FORM) میں لے آتا ہے۔ اشیائے کائنات کی یہ خدا کی کشیدہ و تراشیدہ صورت، حسنِ تناسب و توازن کی بہترین مظہر ہوتی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ اَلَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ۔ (۳۲/۷) "خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو متناسب اور متوازن (حسین ترین) پیکر عطا کیا ہے"۔ اور اسی جہت سے اس نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (۲۳/۱۴) کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خالقوں میں سے بہترین خالق۔

احسن الخالقین

حسنِ تخلیق کے علاوہ، اس میں ایک اور بھی عظیم نکتہ مضمر ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو جو احسن الخالقین کہا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دیگر خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے، اگرچہ ان کے اور خدا کے خالق ہونے میں یہ فرق ہوگا کہ خدا احسن الخالقین ہے اور دوسرے خالق اُس سے کمتر درجے کے۔ ظاہر ہے کہ ہماری معلوم کائنات میں انسان ہی خالق ہو سکتا ہے ــــ یعنی مختلف مادی سامان سے نئی نئی چیزیں بنانے والا۔ علامہ اقبالؒ تو اس قوتِ تخلیق کو نہ صرف وجہِ شرفِ آدمیت قرار دیتے ہیں۔ بلکہ جو انسان اس سے عاری ہو وہ اُسے مومن بھی تصور نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

> ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست — نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

تخلیق و تولید

واضح رہے کہ تخلیق اور تولید میں بنیادی فرق ہے۔ عملِ تولید (یعنی افزائشِ نسل، جو جنسی اختلاط کا نتیجہ ہوتی ہے) میں انسان اور حیوان سب شامل ہیں۔ اگر انسان بھی تولید تک ہی محدود رہے تو وہ

حیوانی سطح سے آگے نہیں بڑھتا۔ اُسے حیوانی سطح سے ممتاز کرنے والا جوہر، عملِ تخلیق ہی ہے۔ بالفاظِ دیگر، حیوانات کا عمل تولید ہے، تخلیق نہیں۔ انسان تولید اور تخلیق دونوں پر حاوی ہے اور خدا کا عمل تولید نہیں، صرف تخلیق ہے۔ اسی لئے اُس نے عیسائیت کے اس باطل عقیدہ کی جگہ جگہ تردید کی ہے کہ حضرت عیسٰیؑ ابن اللہ (خدا کے بیٹے) تھے۔ قرآنِ کریم نے سورۃ اخلاص میں جو اللہ تعالیٰ کی چند نہایت جامع صفات گنائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲/۳) "نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے اور نہ ہی تولید اُس سے عمل میں آتا ہے۔" حتیٰ کہ وہ خود مخلوق بھی نہیں، بلکہ خالق ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر، فاطر ہے۔ انسان خالق ہو سکتا ہے، فاطر نہیں ہو سکتا۔

خدا کے متعلق یہ تصور بھی باطل ہے کہ وہ ایک دفعہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد معطل ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

مخلوق میں اضافے

اس کا عملِ تخلیق برابر جاری ہے۔ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱) "وہ نت نئے تخلیقی اضافے کرتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

غالبؔ اسی حقیقت کو اپنے رنگ میں یوں پیش کرتا ہے کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مشہور مفکر (ERNST CASSIER) اپنی کتاب (AN ESSAY ON MAN) میں لکھتا ہے:-

> سلسلۂ ارتقاء کے باب میں اب یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ ارتقاء کے معنی یہ نہیں کہ اب بنیادی تخلیق (ORIGINAL CREATION) نہیں ہو رہی۔ فجائی ارتقاء درحقیقت بنیادی تخلیق (یا تخلیقِ جدید) ہی ہے۔ اس انکشاف نے ڈارونؔ کے نظریۂ ارتقاء میں اہم تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

اور ہمارے زمانے کا علمِ ارتقاء کا ماہر (SIMPSON) لکھتا ہے کہ

> سلسلۂ ارتقاء میں یہ رجحان نظر آ رہا ہے کہ زندگی کے تمام ممکن گوشوں میں نت نئے اضافے ہو رہے ہیں — اضافے اور پھر ان اضافوں میں مزید کثرت۔
>
> (THE MEANING OF EVOLUTION P. 25)

بے خبر

یہی نہیں کہ خدا اپنی تخلیقی کائنات بلکہ نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق سے غافل اور بے خبر بھی نہیں۔ سورۃ مومنون میں ہے۔ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۲۳/۱۷) "ہم اپنی خلق کی طرف سے

فل اور بے خبر نہیں۔" اس میں اس عقیدہ کی تردید کر دی جس کی رو سے سمجھا یہ جاتا تھا کہ کائنات ایک کلاک ہے جسے خدا نے ایک دفعہ کوک دیا ہے، اور اب وہ اپنے زورِ دروں سے خود بخود مصروفِ حرکت ہے۔ اور خدا یہ فریضہ ادا کر کے آرام سے سو گیا ہے۔ نہیں! خدا مخلوق میں نت نئے اضافے بھی کرتا رہتا ہے اور ان کی ہر حالت اور ہر کیفیت سے باخبر بھی ہے۔ اشیائے کائنات، ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے ہر آن ایک نئی حالت میں ہوتی ہیں۔ انہیں اُس حالت (STAGE) کے مطابق سامانِ نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے جسے خدا برابر پہنچائے چلا جاتا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ۔ (۲۹-۵۵) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مختلف اشیاء کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر آن مختلف حالت میں ہوتی ہیں۔ اور اپنی ہر حالت میں سامانِ نشوونما کے لئے خدا کی محتاج۔" اور چونکہ خدا اپنی تخلیق کی طرف سے غافل نہیں اس لئے وہ ان کی ہر طلب کو بطریقِ احسن پورا کئے جاتا ہے۔

(۲)

زندگی کی نمود

ہم نے اس وقت تک تخلیقِ کائنات کے متعلق گفتگو کی ہے۔ یعنی اس امر کے متعلق کہ یہ مادی یا غیر نامی (IN-ORGANIC) اشیائے کائنات کس طرح وجود میں آئیں۔ اس موضوع کے متعلق بات نہیں کی کہ صفحۂ ارض پر زندگی (LIFE.) کی نمود کیسے ہوئی اور خود انسان کس طرح وجود میں آیا؟ جہاں تک آغازِ حیات کا تعلق ہے سائنٹیفک تحقیقات اس باب میں بھی اسی طرح محوِ حیرت ہیں جس طرح وہ آغازِ کائنات کے متعلق ششدر و حیران۔ البتہ وہ آغازِ حیات کے بعد جاندار اشیاء کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ نظریۂ ارتقاء کی پیداوار ہے۔ اس نظریہ کی ابتداء تو مشہور سائنس دان ڈارون سے ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اس میں اتنے اور ایسے تغیرات ہو چکے ہیں، کہ ڈارون کا نام، یوں کہئے کہ بس تبرکاً ہی لیا جا سکتا ہے۔ صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن و دفائنِ ارضی کے نقوش و آثار کے مطالعہ کے بعد ذہنِ انسانی نمودِ حیات اور تخلیقِ انسانی کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی۔

(۲) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کا اولین جرثومۂ حیات (LIFE-CELL) وجود میں آیا۔

(۳) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے، پھولنے اور مختلف سمتوں میں پھیلنے لگے۔

(۴) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزارہا سال کے مراحل کے بعد مختلف قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

(۵) ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اُس منزل میں پہنچا جب تولید (یعنی تخلیق بذریعہ تناسل) کہا

جاتا ہے۔ اس سے مراد حیوانی زندگی سمجھ لیجئے۔ اور

(۶) حیوانی زندگی اسی قسم کے مزید طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بہ منزل، انسانی پیکر میں جلوہ فرما ہوئی۔ اس طرح نوعِ انسان کی ابتدا ہوئی۔

چونکہ اس بات کا سمجھ لینا کہ زندگی کس طرح وجود میں آگئی، انسانی ادراک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے قرآنِ کریم اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا ہے کہ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ - اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے؟

یعنی زندگی اپنی نمود کے لئے پانی کی محتاج ہے۔ پانی ہی سے اس کی ابتدا ہوئی اور اب بھی جہاں پانی نہیں وہاں زندگی کی نمود ممکن نہیں۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ زندگی کے اس سرچشمہ اولین پر مرکزی کنٹرول خود خدا کا ہے سورۃ ہود میں ہے۔ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (۱۱/۷)[1] یعنی سرچشمہ حیات پر اقتدارِ خداوندی متمکن ہے"۔ اور اسی بنا پر اس نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ (۳/۱۵۵) "قانونِ حیات و ممات خدا ہی کے کنٹرول میں ہے"۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کس طرح وجود میں آگیا۔ اس موضوع کے متعلق تفصیلی گفتگو تو اس مقام پر کی جائے گی جہاں قصۂ آدم سامنے آئے گا۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ جو ہمارے ہاں عام تصور ہے کہ خدا نے پہلے پہل مٹی کا ایک پتلا بنایا اور اس میں روح پھونک کر اسے انسانی شکل عطا کر دی۔ اور پھر اس کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کی بیوی نکالی، اور اس طرح مرد اور عورت کے اس سب سے پہلے جوڑے (آدم اور حوا) سے سلسلۂ افزائشِ نسلِ انسانی کی ابتدا ہو گئی۔ یہ تصور قرآنی نہیں۔ یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ انسانی تخلیق کے متعلق قرآنِ کریم سے جو اشارات ملتے ہیں

انسانی تخلیق

وہ ہماری فکر کا رُخ نظریۂ ارتقاء کی طرف ہی موڑتے ہیں۔ میں نے ان موضوعات پر تفصیلی گفتگو اپنی کتاب — ابلیس و آدم — میں کی ہے۔ اربابِ ذوق و تحقیق اس کا مطالعہ مفید پائیں گے۔ یہاں چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا یہ ہے کہ:-

---

[1] اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے — "خدا کا عرش پانیوں پر ہے"۔ اور پھر اس کی تفسیر میں ایسی ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کی رو سے توہم پرستی ہر سو تیرتی پھرتی نظر آتی ہے۔ لیکن ہمیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲:۷)۔

خدا نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی یعنی غیرنامی مادہ سے کی۔

اس غیرنامی مادہ سے جب پانی کا امتزاج ہوا تو وہ اس سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی تھی۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۳۷:۱۱)

ہم نے انسانوں کو طینِ لازب یعنی چپچپی مٹی سے تخلیق کیا۔

سائنٹیفک تحقیقات ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ طینِ لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے پانی اور مٹی کی آمیزش سے زندگی کا اولین خلیہ (LIFE - CELL) وجود میں آیا۔ یہ خلیہ، زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات، اپنے اندر لئے ہوتا ہے، اُسی طرح جیسے ایک ننھا سا بیج، ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے، نمود و شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ زندگی کا یہ وہ اولین خلیہ ہے جسے قرآن کریم نے "نفسِ واحدہ" کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ۔ (۶:۹۹)۔ "خدا وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے آگے بڑھایا۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقتِ معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی منزل کے سپرد کر دے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے قوانینِ حیات کو اربابِ فکر و نظر کے لئے نکھار اور ابھار کر بیان کر دیا ہے۔" اس انتقالِ مکانی یعنی ایک مستقر سے دوسرے مستقر تک پہنچنے میں ہزار در ہزار سال کا عرصہ لگتا رہا۔ انہی تدریجی منازل کے متعلق کہیں یہ کہا کہ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا۔ (۷۱:۱۴)۔ "اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے۔" کہیں یہ کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴:۱۹)۔ "تم یقیناً بدستور ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے شاہراہِ حیات پر آگے بڑھتے اور بلند بھی ہوتے جاؤ گے۔" انہی سابقہ مراحل میں سے گزرنے کے بعد وہ منزل آگئی جہاں سلسلۂ توالد بذریعہ جنسی اختلاط آگے بڑھا۔ ارشاد ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲:۸)۔ "پھر انسانی نسل کو کمزور سے مائع کے خلاصہ سے بنایا" اور اس طرح:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ڰ نَّبْتَلِيْهِ

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ

اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۔ (۷۶:۲-۳)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جس میں مختلف امکانی صلاحیتیں باہمدگر مخلوط ہوتی ہیں۔ پھر ہم اسے مختلف حالتوں میں گردش دیتے

رہے حتیٰ کہ اسے سننے اور دیکھنے والا اور صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا اور اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اُسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔

یوں صاحبِ اختیار و ارادہ انسان وجود میں آگیا۔ قرآنِ کریم نے اس طویل و عریض داستان کو سورۃ السجدہ کے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جب کہا کہ۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵)۔ "تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین (مادہ) کی پستیوں سے اس کا آغاز کیا جاتا ہے۔ یہاں سے وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں ایک ایک وقفہ تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار (بلکہ پچاس پچاس ہزار (۷۰/۴)) سال کا ہوتا ہے۔" (مثلاً) انسانی تخلیق ہی کو لو۔ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲/۷)۔ "اس کی ابتدار غیر نامی مادہ سے ہوئی۔" ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲/۸)۔ "پھر یہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اس منزل میں جا پہنچا جہاں اس کی تولید کا سلسلہ نطفہ قرار پایا۔" ثُمَّ سَوّٰىهُ (۳۲/۹)۔ "اس کے حشو و زوائد کو دور کر کے اسے ہر طرح سے درست کیا اور اس کے اعضاء و جوارح میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا کیا۔ (۳۲/۹)" وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۳۲/۹)۔ "پھر اُسنے تمہیں علم و عقل اور قوتِ فیصلہ عطا کر دی لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کرتے اور انہیں صحیح مقام پر صرف کرتے ہیں۔"

اس طرح سلسلۂ ارتقاء سے نوعِ انسانی (نہ کہ کوئی خاص فرد انسانیہ) وجود پذیر ہوئی۔ یہ ہے وہ نوعِ انسان، جس سے کہا گیا ہے کہ:۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۲۱)۔ "تم اُس خدا کے قوانین کی اطاعت کرو جس نے تمہیں پیدا بھی کیا اور جو تمہاری نشو و نما کا ذمہ دار بھی ہے۔ اُس کے اور صرف اُسی کے قوانین کی اطاعت کرو تاکہ تم زندگی کے ہلاک کر دینے والے خطرات سے محفوظ رہو۔"

"زندگی کو ہلاک کرنے والے یہ خطرات" دو قسم کے ہیں۔ ایک کائنات کے طبیعی (ارضی اور سماوی) حوادث۔ جہاں تک

ہلاکت انگیز خطرات سے حفاظت

ان حوادث کا تعلق ہے، ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو کس دنیا میں پایا؟ سر پر مسلسل آگ برسانے والا مہیب آتشیں گولہ۔ یعنی آفتاب۔ چاروں طرف بڑے بڑے خوفناک پہاڑ، اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر

اور ان کی تباہ کن تلاطم خیزیاں۔ یہاں وہاں، کف بر دہان دریاؤں کی وحشت سامانیاں، تا بہ حدِ نگاہ ڈراؤنے جنگل، اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے۔ کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی ہلاکت انگیز آندھی، کبھی بلاخیز جھکڑ۔ کہیں آتش فشاں پہاڑوں کی مرگِ سیال، کہیں زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم۔ شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدہام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار، اور بے سر و سامان ابنِ آدم! اس ماحول سے اس نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ کا اعجاز دیکھیے کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود نوعِ انسان کا یہ کارواں بلا انقطاع آگے بڑھتا چلا آیا۔ اس مقام پر سورۃ الاعراف کی ایک نہایت حقیقت کشا آیت بیساختہ سامنے آجاتی ہے۔ وہ آیت جس کے عام مروجہ مفہوم نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ آپ نے خانقاہیت کے آذر کدوں میں بالخصوص "یوم الست" "مستِ الست" یا "قالوا بلیٰ" وغیرہ معانی الفاظ سنے ہوں گے اور پھر ان کی بنیادوں پر اٹھائے ہوئے وہ افسانے جنہیں (اقبالؒ کے الفاظ میں) اندیشۂ عجم نے زیبِ داستاں کے لئے تراش رکھا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:-

یوم الست!

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (۷/۱۷۲)

اس آیت کا پورا پورا مفہوم تو اس کے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے بنی آدم سے کہا یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اور ان خارجی حوادث کے علاوہ خود انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تباہیوں کے علی الرغم، نسلِ انسانی کا اس تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آنا خدا کی ربوبیت کی زندہ شہادت ہے یا نہیں؟ نسلِ انسانی کا وجود، ربوبیتِ خداوندی کی کس طرح منہ بولتی تصویر اور اعلانیہ شہادت ہے، اس کے متعلق کسی سائنس دان سے پوچھیے۔ وہ بتائے گا کہ قرآن کریم اس ایک آیت میں کیسی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔

جہاں تک حوادثِ ارضی و سماوی کا تعلق ہے، ان سے نمٹ لینا پھر بھی آسان تھا، کیونکہ خالقِ کائنات نے انسانوں سے کہہ دیا تھا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵/۱۳)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے اپنے قوانینِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان پر غلبہ پا کر انہیں منفعت بخش کاموں میں صرف میں لاؤ۔ جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے گی، وہ نہ صرف

یہ کہ ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے گی بلکہ ان سے بڑے بڑے کام لے سکے گی؛ یہ وہ "ملائکہ" تھے جو "آدم" کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے تھے۔[1] اس لئے ان کی طرف سے بنی آدم کو کوئی خطرہ نہیں تھا. خطرہ اُس "ابلیس" سے تھا جس نے اُس سے بغاوت اور سرکشی اختیار کی — یہ ابلیس ہے، انسان کے وہ جذبات جو وحی کی قیود سے بیباک ہو جائیں. انہی جذبات کا نتیجہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے وہ باطل نظام ہیں جن میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کا منظر سامنے آتا ہے یعنی جن میں انسان خود نوعِ انسان کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سب سے زیادہ تباہ کن باطل نظام وہ ہے جس کا تعلق معیشت، یعنی سامانِ رزق کی تقسیم اور مصرف سے ہے اور اسی کی طرف قرآن کریم نے اگلی آیت میں اشارہ کیا ہے کہ

(۲/۲۲) الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۚ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ
۲/۲۲ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَ
أَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی رزاقیت کی ذمہ داری کو پورا کرنے کیلئے نظامِ کائنات کو کس انداز سے وضع کیا، اسے سمجھنے کے لئے پہلے اس حقیقت پر غور کرو کہ اس نے زمین کو گول ہونے کے باوجود، کس طرح پھیلا اور بچھا دیا؛ "فَرْش" کے معنی ہیں کسی چیز کو بچھانا اور پھیلانا. گول چیز کی کیفیت کیا ہوتی ہے اسے چھوٹے سے پیمانے پر سمجھنے کے لئے کسی گنبد پر کھڑے ہو جائیے. آپ دیکھیں گے کہ اس کی اتنی بڑی ضخامت کے باوجود بہت تھوڑا سا حصہ ایسا چپٹا ہوتا ہے جس پر بیٹھا یا لیٹا جا سکے. جہاں سے اس کی گولائی شروع ہوتی ہے وہاں کوئی شخص کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، لڑھک کر نیچے گر جاتا ہے. لیکن اس کرۂ ارض کی کیفیت عجیب ہے. یہ نہ صرف گول ہے بلکہ نہایت برق رفتاری سے مصروفِ گردش بھی. اس کی اس گردش کو قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے. اَنْ تَمِيدَ بِكُمْ (۱۶/۱۵). "تم اس پر سکون سے بیٹھے بھی رہو اور وہ گھومتی بھی رہے"؛ اس کے

فرشِ زمین

فِرَاشًا ہونے پر ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی غور کیجئے. گول چیز کی اوپر کی چپٹی سطح کتنی ہی پھیلی ہوئی کیوں نہ ہو، اس پر آپ چلتے جائیں تو ایک مقام ایسا آجائے گا جہاں اس کی گولائی آپ کے سامنے ہوگی اور گولائی کے بعد وہ خلا جس کے اندر وہ چیز ایستادہ یا معلق ہو. لیکن کرۂ ارض کی کیفیت یہ ہے کہ سیاح اس کے ایک مقام سے چلنا شروع کرتے ہیں. پورے کرہ کا چکر کاٹ کر پھر اُسی مقام پر آجاتے ہیں. انہیں نہ کہیں اس کی گولائی دکھائی دیتی ہے اور نہ وہ خلا جس میں یہ معلق ہے. اس خلا کی جگہ مسلسل وہ افق دکھائی دیتی رہتی ہے جہاں (عام الفاظ میں) زمین اور آسمان ملتے نظر

---

[1] تفصیل "قصۂ آدم" میں سامنے آئے گی۔

آتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ فِرَاشًا کی کیسی محیّرالعقول شکل ہے؟ اسے قرآن نے مَھْدًا بھی کہا ہے۔ (۲۰/۵۳؛ ۴۳/۱۰)۔ اَلْمِھَادُ نرم اور ہموار بستر کو کہتے ہیں۔ یعنی ہموار اور پُرآسائش۔ اسی سلسلہ میں خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ۔ (۵۱/۴۸)۔ "ہم نے زمین کو بچھا اور پھیلا دیا۔ دیکھئے ہم کس قدر اچھے آسائشیں بہم پہنچانیوالے ہیں"۔

اس آیت (۲/۲۲) میں آگے ہے۔ وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً۔ سما کے متعلق تفصیلی گفتگو تو وہاں کی جائے گی جہاں "السمٰوٰت والارض" کا ذکر آئے گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہر وہ چیز جو ہمارے اوپر چھائی ہوئی ہو،

بناءِ سماوی

سماء کہلاتی ہے۔ چنانچہ گھر کی چھت بھی سماء کہلاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ "اوپر اور نیچے" تو اضافی سمتیں ہیں، اس اعتبار سے ہر چیز، اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سماء کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے "ارض"۔ اس مفہوم کے پیشِ نظر قرآنِ کریم کی اس آیت کو سامنے لائیے اور جھوم جائیے! ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔ (۶۵/۱۲)۔ "اللہ وہ ہے جس نے متعدد آسمانی کُرّے پیدا کئے اس انداز سے کہ ہر سما کی ایک ارض ہے"۔

سماء کے معنی بادل بھی ہیں۔

زیرِ نظر آیت میں سماء بِنَآءً کہا گیا ہے۔ بِنَآءً کے معنی ہیں عمارت، یعنی جو چیز بھی تعمیر کی جائے اُسے بِنَآءً کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنی چھت کے بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ یہاں ارض کے لئے فِرَاشًا (فرش) آیا ہے اس لئے بِنَآءً کے معنی چھت زیادہ مناسب ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے۔ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا۔ (۲۱/۳۲)۔

سقفِ محفوظ

"ہم نے سماء کو سقفِ محفوظ بنایا ہے"۔ یعنی ایسی چھت جو خود بھی محفوظ ہے اور تمہارے لئے وجہِ حفاظت بھی۔ اور یہ نکتہ پھر بڑا وجد آفریں ہے۔ علم الافلاک کے ماہرین بتاتے ہیں کہ جنہیں شہابِ ثاقب یا ٹوٹنے والے تارے (METEORS) کہا جاتا ہے وہ درحقیقت نظامِ شمسی کے چھوٹے چھوٹے اجرام (ٹکڑے) ہوتے ہیں جو کششِ ثقل کی قوت سے ٹوٹ کر نیچے گرتے اور بارش کی طرح برستے رہتے ہیں۔ بعض اوقات کرۂ ارض بھی اس بارش کے سامنے آجاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ ٹکڑے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ہوتے ہیں اتنے اتنے بڑے، اور برستے ہیں اس قوت کے ساتھ کہ اگر وہ کہیں ایک بار بھی اسی حالت میں زمین پر آگریں تو یہ کرہ تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ جسے ہم فضا یا (ATMOSPHERE) یا سماء کہتے ہیں، وہ میلوں موٹا، تہ در تہ، دبیز گیسوں کا (گویا) لحاف ہے جو پورے کرۂ ارض کو محیط ہے۔ جب یہ شہابِ ثاقب اس فضا میں داخل ہوتے ہیں تو وہ (فضا) ان پتھروں کو پیس کر رکھ دیتی ہے اور جسے ہم ٹوٹا ہوا تارا کہتے ہیں۔ وہ ان کی چمکنے والی راکھ

ہوتی ہے۔ ان میں سے کبھی کبھی پتھر کا کوئی ٹکڑہ پسنے سے رہ جاتا ہے تو وہ زمین پر گرتا ہے۔ لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ فضا میں پس جاتے ہیں۔ اگر فضا ان پتھروں کی بارش کو پیس کر راکھ نہ بنا دے تو زمین پر زندگی محال ہو جائے۔ یوں یہ فضا ہمارے لئے چھت کا کام دیتی ہے اور ہم شہاب ثاقب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (کی یہ (اور اسی قسم کی کئی اور صورتیں) خود نظامِ فطرت کی پیدا کردہ ہیں اور متعدد دوسری صورتیں انسان خود تسخیرِ فطرت سے پیدا کر سکتا ہے۔

خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر اب انسان کی معاشی دنیا کی طرف آیئے اور اس میں دیکھئے کہ انسانوں کا خود ساختہ نظام اسے کس طرح تباہ کر دیتا ہے، اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت اسے کس طرح ان خطرات سے محفوظ و مامون بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس نہایت جامع انداز سے کہا کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو زمین سے فصلیں پیدا ہونے لگتی ہیں (۲/۲۲)۔ ان اجناس اور پھلوں کے متعلق ایک لفظ میں ساری بات سمٹا کر رکھ دی جب کہا کہ رِزْقًا لَّكُمْ۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے (لَكُمْ) متاعِ زیست اور سامانِ پرورش ہے۔ اس میں لکم کا لفظ قرآنِ کریم کے پورے معاشی نظام کو اس طرح سمٹائے ہوئے ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ پہلے نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ (۲/۲۱)۔ اور یہاں کہا۔ رِزْقًا لَّكُمْ۔ جس طرح اس نے پوری کی پوری نوعِ انسان کو پیدا کیا۔ انسانوں کے کسی ایک طبقہ، گروہ، قبیلہ، خاندان، یا قوم کو نہیں۔ پوری کی پوری انسانیت کو۔ اسی طرح خدا کا عطا کردہ رزق، کسی خاص طبقہ، گروہ یا قوم کے لئے نہیں، پوری نوعِ انسان کے لئے ہے۔[1] ارض پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے اور اس کے متعلق قرآنِ کریم نے باصرار و تکرار کہہ دیا ہے کہ اس پر کسی

ارض پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی

کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ نہ کسی فرد کی، نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ سب سے پہلے اس نے بےشمار مقامات پر کہا ہے کہ ارض و سما کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ سو جب وہ خدا کی پیدا کردہ ہیں تو ان پر کسی اور کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس نے متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲/۱۰۷)۔ ارض و سموٰت اسی کی ملکیت ہیں اور اسی کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کا موجب، یا جو ذمہ داریاں اس نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں پورا کرنے کا ذریعہ۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲/۲۸۴) کے یہی معنی ہیں۔ اس کی یہ ذمہ داری کیا ہے جسے پورا کرنے کے لئے اس نے زمین کو پیدا کیا اور اس پر اپنا کنٹرول رکھا؟ اس کے متعلق اس نے سورۃ ھود میں کہا وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔

[1] اس کے متعلق آیت (۲/۳) میں 'ینفقون' کے تحت گفتگو ہو چکی ہے لیکن موضوع کی نسبت کے لحاظ سے یہاں اس کی مزید تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

(۶/۱۱) "سطحِ زمین پر چلنے والا کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر نہ ہو"۔ اس نے تصریفِ آیات سے (مختلف پہلوؤں کو سامنے لاکر) اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ زمین تمام نوعِ انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت یا اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) "خدا نے زمین کو اپنی ساری مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے" سورۃ الاعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ۔ (۷/۱۰) "ہم نے تمہیں زمین میں متمکن کیا اور اس میں تم سب کے لئے سامانِ معیشت رکھ دیا" دوسری جگہ ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ۔ (۱۵/۲۰) "ہم نے زمین میں تمہارے لئے بھی سامانِ معیشت رکھ دیا اور ان کے لئے بھی، جنہیں تم رزق نہیں پہنچاتے" یعنی ایسی مخلوق جس کے رزق کی ذمہ داری انسانوں پر نہیں۔ انسان صرف انہی مال مویشیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو ان کے کنٹرول میں ہوں۔ اسی کے لئے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ رزق کے متعلق کہا۔ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ (۲۰/۵۴) "اس رزق کو تم خود بھی کھاؤ پیو اور اپنے مال مویشی کو بھی کھلاؤ پلاؤ" مال مویشیوں کے سلسلہ میں آپ قومِ ثمود کے اُس واقعہ کو سامنے لائیے جسے آیت (۲/۳) میں بسلسلۂ انفاق بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی جس میں اُس قوم کے اُن سرداروں سے جنہوں نے چشموں اور چراگاہوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر ان میں غریبوں اور کمزوروں کے مویشیوں کا داخلہ بند کر دیا تھا، کہا تھا کہ تم اس سراسر دھاندلی پر مبنی روش سے باز آجاؤ۔ یہ ہے۔ نَاقَةُ اللّٰهِ۔ (اللہ کی اونٹنی) اور یہ ہے اَرْضُ اللّٰهِ۔ (اللہ کی زمین)۔ "اللہ کی اونٹنی" کو کھلا چھوڑ دو کہ وہ "اللہ کی زمین" میں چرے چُگے (۷/۷۳)۔ تم کون ہوتے ہو کہ خدا کی مخلوق کو خدا کی زمین سے متمتع نہ ہونے دو۔ تمہیں اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ تم اس پر بند لگا دو۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰) "جو چیزیں خدا کی طرف سے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بلا مزد و معاوضہ اور بغیر ثمن و صلہ، مفت عطا ہوتی ہیں۔ ان پر پھاٹک لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ انہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیئے۔ (۱۷/۲۰) سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (۴۱/۱۰) "ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے"۔

یہ شرک ہے

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے وسائلِ رزق (ارض یعنی زمین) خدا کے پیدا کردہ ہیں اور خدا ہی ان کا مالک ہے۔ لہٰذا، ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ان کا کوئی اور بھی مالک ہو سکتا ہے، شرک ہوگا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے آیتِ زیرِ نظر میں یہ کہہ دیا کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۲) "تم خدا کے نِدّ نہ بناؤ کیونکہ تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی نِدّ نہیں ہو سکتا" اس جگہ قرآنِ کریم خدا کے شریک و سہیم کے لئے نِدّ کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی قرآنِ کریم کا اعجاز ہے۔ نِدّ کے معنی ہوتے ہیں کسی کا ہم پایہ، ہمسر،

اُس کے برابر۔ لیکن اس میں شرط یہ ہوتی ہے کہ جن دو ہستیوں کو ایک دوسرے کا ہم پایہ تصور کیا جائے' ان کی کیفیت یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنی طرف کھینچے۔ اسی لفظ ندّ کی جمع انداد ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ جب تم زمین پر انسانوں کی ذاتی ملکیت تسلیم کر لو گے تو ایک تو تم انہیں خدا کا ہمسر اور ہم پایہ یعنی شریک تسلیم کر لو گے' اور دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہو گی کہ اس بنیادی وسیلہ رزق اور اس کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف کھینچے' اور دوسروں کو اس سے محروم بھی کر دے۔ آپ سوچئے کہ زمین پر ذاتی ملکیت کے نظام کا، خواہ وہ کسی ایک فرد کی ذاتی ملکیت ہو یا افراد کے مجموعہ، یعنی کسی خاص قبیلہ، خاندان، گروہ، پارٹی یا قوم کی ذاتی ملکیت۔ اس کے سوا کچھ اور نتیجہ ہو نہیں سکتا کہ ان میں کا ہر مالک، زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرے خواہ اس سے مخلوقِ خدا بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کریم نے جہاں جہاں اس قسم کے اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا ذکر کیا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کا تعلق وسائلِ رزق کی ملکیت اور رزق کی تقسیم سے ہے۔ پہلے اس زیرِ نظر آیت ہی کو لیجئے۔ اس میں بھی پیدائش رزق کے بعد کہا گیا ہے کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا۔ (۲۲) ۔ سورۃ حٰمٓ سجدہ میں ہے۔ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا۔ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۱/۹)۔" اے رسول! ان لوگوں سے کہو کہ کیا تم خدا سے کفر برت

اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

رہے ہو؟ اُس خدا سے جس نے ارض کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ مرحلہ اول وہ تھا جس میں یہ ہنوز اس قدر گرم تھی کہ اس پر کسی جاندار مخلوق کے پیدا کرنے اور اس کے زندہ رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں اسے اس قدر ٹھنڈا کر دیا گیا کہ اس پر ذی حیات کا رہنا ممکن ہو گیا اور ان کے لئے سامانِ رزق کا موجود رہنا اور پیدا ہونا بھی"۔ کہا کہ "یہ ہے وہ ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار خدا، جس سے تم کفر برت رہے ہو"۔ یہ کفر کیا ہے؟ یہ کہ "تم اس کے انداد مقرر کر رہے ہو۔ اس کے پیدا کردہ وسائلِ رزق کو انسانوں کی ملکیت میں دے رہے ہو"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (۴۱/۱۰)۔ "خدا نے اس ارض کو اس طرح بنایا کہ پہاڑوں کے ذریعہ آبپاشی کا نظام مقرر کر دیا۔ زمین کی مٹی میں اس کی صلاحیت رکھ دی کہ اس سے بھرپور فصلیں پیدا ہوں۔ پھر اس کی گردش سے موسموں میں ایسے تغیرات متعین کر دیئے کہ ان کی رُو سے سال کے مختلف حصوں میں مختلف اقسام کی فصلیں پیدا ہو جائیں۔ اس سارے انتظام سے مقصود یہ تھا کہ زمین کی یہ پیداوار تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے۔ جب یہ خدا کی ملکیت میں رہے گی تو اس سے یہ مقصد پورا ہو جائیگا۔ لیکن اگر اسے ذاتی ملکیت میں دے دیا گیا تو پھر یہ مقصد پورا نہیں ہو سکے گا"۔

دوسری جگہ ہے کہ جب انسان مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو نہایت تضرع وزاری سے خدا سے دعائیں مانگتا ہے۔ اس وقت وہ ان دعاؤں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لیکن جب اُسے خوشحالی نصیب ہو جاتی ہے تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور خدا کے انداد ___ شریک وسہیم ___ قرار دینے لگ جاتا ہے۔ اس سے وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ کہا کہ یہ کفر ہے۔ اس سے تم کچھ وقت کے لئے تو فائدہ اٹھا لوگے لیکن آخر الامر تم تباہ اور برباد ہو جاؤ گے (۳۹/۸)۔ اسی حقیقت کو سورۂ ابراہیم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ (۱۴/۲۸)۔ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر کبھی غور کیا جنہوں نے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے کفر برتا اور اس طرح اپنی قوم کے قافلہ کو اُس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا سدا کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ ان کا مال ومتاع سب غارت چلا گیا۔ اسی کو جہنم کی تباہی کہا جاتا ہے۔ (۱۴/۲۹)۔ یہ کفرانِ نعمت اس طرح سے ہوا کہ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ۔ (۱۴/۳۰)۔ "انہوں نے خدا کے ند مقرر کر دیئے اور اس طرح لوگ اس کی طرف سے جانے والے راستے کو چھوڑ کر گمراہ ہو گئے تم ان سے کہہ دو کہ تمہاری یہ روش کچھ وقت کے لئے تو تمہیں سامانِ زندگی بہم پہنچا دے گی لیکن تمہارا آخری ٹھکانا تباہی کا جہنم ہو گا۔" سورۂ بقرہ میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہا۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ۔ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ (۲/۱۶۴)۔ "یہ حقیقت ہے کہ ارض وسماوات کی تخلیق، اور لیل ونہار کے اختلاف، اور وہ کشتیاں جو سمندروں میں بط کی طرح تیرتی پھرتی ہیں، اور لوگوں کے لئے ذریعۂ معاش بنتی ہیں" وَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ۔ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ۔ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ۔ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (ایضاً)۔ "اور وہ بارش جسے اللہ بادلوں سے برساتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ اور وہ جاندار مخلوق جو زمین میں چلتی پھرتی ہے اور وہ ہوائیں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں اور وہ بادل جو زمین اور فضا میں معلق، قوانینِ خداوندی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ کائنات کے تمام شواہد ومظاہر، اربابِ عقل وفکر کے لئے اس امر کے دلائل ہیں کہ یہ سب خدا کے پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہیں۔" لیکن اس کے باوجود وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا۔ يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (۲/۱۶۵)۔ "ایسے لوگ بھی جو خدا کے انداد تراش لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک، دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تاکہ اس کا جتھہ زیادہ کثیر التعداد اور طاقتور ہو

جائے۔ لیکن جو لوگ خدا کو خالق اور مالک مانتے ہیں انہیں کوئی اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ وہ کھنچ کر جاتے ہیں تو خدا کی طرف؛

لوگ ان باطل "خداؤں" کی طرف کھنچ کر کیوں جاتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے رکھا ہوتا ہے؛ اور اس طرح محتاجوں اور محروموں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ کشاں کشاں انکی طرف جائیں اور محض روٹی کی خاطر ان کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ یہی وہ مختلف 'خدا' ہیں جن کے متعلق کہا۔ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ۔ (۲۳/۹۱) "یاد رکھو! اگر خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہوتا تو صورت یہ پیدا ہو جاتی کہ ہر الٰہ اپنی اپنی مخلوق کو اپنی طرف کھینچ کر لے جاتا اور اس طرح ان میں سے بعض خدا، دوسرے خداؤں کو مغلوب کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے حقیقی ان تصورات سے بلند و بالا ہے جنہیں یہ لوگ اپنے ذہنوں میں قائم کر لیتے ہیں" اسی لئے ان سے کہا کہ۔ لَّا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا۔ (۱۷/۲۲) "خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ تسلیم نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو آخر الامر ذلیل و خوار ہو کر، این سو ماندہ و آں سو درماندہ، رہ جاؤ گے" اس لئے کہ خدائے حقیقی اور ان باطل خداؤں میں فرق یہ ہے کہ:-

آں خدا نانے دہد جانے دہد   ایں خدا نانے دہد، جانے برد

ان خداؤں کو قرآنِ کریم نے الٰہ الارض کہہ کر پکارا ہے (۲۱/۲۱)۔ اور اس سے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جیسے جوں جوں وا شگاف کرتے جائیں گے، حقائق و معارف کے دفتر آپ کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔ کہا أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ۔ (۲۱/۲۱)

إِلَٰهُ الْأَرْضِ

"کیا انہوں نے اپنی ارضی (معاشی) زندگی کے لئے اور الٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ انہیں سامانِ زیست مہیا کرتے ہیں"؟ ان سے کہو کہ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (۴۳/۸۴) "یاد رکھو! سماء (خارجی کائنات) میں بھی وہی صاحبِ اقتدار ہے اور ارض (انسانوں کی تمدنی، معاشرتی، معاشی) زندگی میں بھی وہی الٰہ۔ اور اس کی یہ الوہیت (اقتدار اور حاکمیت) زمینی خداؤں کی طرح، ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی نہیں، علم و حکمت پر مبنی ہے۔"

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ جیسے تم خارجی کائنات کا خدا تسلیم کرتے ہو اسی کو اپنی ارضی زندگی میں بھی صاحبِ اقتدار تسلیم کرو۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے لوگ معلوم نہیں اس عظیم حقیقت کا کس حد تک ادراک کر سکے تھے لیکن ہمارے دور میں یہ اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آئی ہے کہ اس کے سمجھنے میں اب کچھ بھی دشواری نہیں رہی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، ہمارا

دور مادہ پرستی یا سیکولرازم کا دور ہے۔ سیکولرازم کے معنی خدا سے انکار ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو خدا کا وہ انکار

کائناتی خدا

ہے جس پر کمیونزم اور سوشلزم کے نظریۂ حیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی وہ سرے سے خدا کی ہستی ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی دوسری قسم وہ ہے جو ان ملکوں میں رائج ہے جو اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کائناتی خدا کے تو قائل ہیں لیکن اپنی ارضی زندگی میں اُس سے انکار کرتے ہیں۔ ان سے خدا کے متعلق جب بھی بات کرو تو وہ کہیں گے کہ ہم مانتے ہیں کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا اور یہ سلسلہ اُسی کے متعین کردہ قوانینِ فطرت کی رُو سے برقرار اور سرگرم عمل ہے۔ ان کا خدا پر ایمان یہیں تک ہے۔ جہاں تک ان کی تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں کہ اس میں مذہب یعنی خدا کا کوئی دخل نہیں۔ اسے ہم اپنی مرضی اور منشا کے مطابق چلائیں گے۔ یہ ثنویت — یعنی کائناتی خدا (الٰہ السماء) الگ اور انسانی زندگی کا خدا (الٰہ الارض) الگ، آج دنیا کے تمام "خدا پرستوں" کا شعار بن چکا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اقوام مغرب (یورپ اور امریکہ کی مملکتوں) کو کمیونزم کی یلغار سے خطرہ لاحق ہوا تھا تو انہوں نے یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ "دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور متحد ہو کر ان منکرینِ خدا کا مقابلہ کرو"۔ خدا پرستوں سے ان کی مراد کائناتی خدا کو ماننے والوں سے تھی، کیونکہ الٰہ الارض ان میں سے کوئی بھی خدا کو نہیں مانتا تھا، نہ ہی اب مانتا ہے۔ دیکھئے قرآنِ کریم چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ بعض آیات میں اُس نے اس حقیقت کو مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے اور بعض میں زیادہ تفصیل سے۔ سورۃ لقمٰن میں ہے۔ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۳۱/۲۵)۔ "اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ کہیں گے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تم ان سے کہو کہ اس حد تک تو بات ٹھیک ہے، لیکن تمہیں یہ بھی جاننا اور ماننا چاہیئے کہ خدا کی حمدیت خارجی کائنات تک ہی محدود نہیں یہ کلّی (الحمد) ہے۔ اس لئے کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۳۱/۲۶) ارض ہو یا سماء، اقتدار و اختیار ہر جگہ اسی کا ہے اور اسی جہت سے وہ مستغنی عن الکل اور مستحق حمد و ستائش قرار پاتا ہے"۔ (نیز ۲۹/۶۱)۔ سورۃ زخرف میں پہلے یہ کہا۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۔ (۴۳/۹)۔ "اگر تم ان سے پوچھو کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا تو یہ اس کا اقرار کریں گے کہ اسے خدائے عزیز العلیم نے پیدا کیا ہے"۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے پانچ آیات (۴۳/۱۰-۱۴) میں اس تمام سامانِ زیست کا تفصیلی تذکرہ ہے جسے اُس نے نوعِ انسان کی پرورش اور نشو و نما کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ خدا کو خالق ماننے والے ان "خدا پرستوں" کی کیفیت یہ ہے۔ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ

لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (۴۳/۱۵)"۔ یہ خدا کے بندوں کو اس کا شریک وسہیم بلکہ اس کا جزو قرار دیتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ انسان کیسا کھلا ہوا ناسپاس گزار ہے"۔

سورۂ مومنون میں ہے۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۵)۔ "ان سے کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کا ہے، تو یہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ خدا ہی کا ہے۔ ان کے اس جواب کے بعد ان سے کہو کہ پھر تم اس حقیقت کو اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں اپنے سامنے کیوں نہیں رکھتے"۔ اس کے بعد ہے۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ (۲۳/۸۶-۸۷)۔ "تم ان سے پوچھو کہ فضائے آسمانی میں تیرنے والے ان کُرّوں پر کس کا تصرف ہے اور کون ان کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ وہ کون ہے جس کا اس عظیم، محیر العقول کارگہ کائنات پر مرکزی کنٹرول ہے۔ تو یہ جواب میں کہہ دیں گے کہ ان پر خدا ہی کا کنٹرول ہے"۔ اس کے بعد کہا کہ "ان سے پھر پوچھو کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟" اس کے بعد ہے۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ۔ (۲۳/۸۸-۸۹)۔ "ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے کس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ کون ہے کہ جو اس کی پناہ میں آجائے اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن جو اس کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے اُسے کائنات میں کوئی بھی پناہ نہیں دے سکتا۔ یہ اسے بھی تسلیم کریں گے کہ یہ بھی سب کچھ خدا ہی کے لئے ہے۔ تم اس کے بعد ان سے پوچھو کہ ان حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق نہیں۔ میں اس کے سوا کیا کہتا ہوں کہ انسانوں کی زندگی پر بھی اُسی کے قوانین کا کنٹرول ہونا چاہیئے، جنہیں اُس نے وحی کے ذریعہ عطا کیا ہے؟" اور اس کے بعد کہا بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۳/۹۰)۔ "بات یہ نہیں کہ انہیں اس باب میں کہیں دھوکہ لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کی طرف وہ ضابطۂ قوانین بھیجا ہے جو سرتاسر حق و صداقت پر مبنی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی زد ان کی مفاد پرستیوں پر پڑتی ہے اس لئے یہ اُس سے انکار کرتے ہیں اور خدا پرستی کو صرف اس حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ خارجی کائنات میں اقتدار و اختیار خدا کا ہے کیونکہ اس سے انکی مفاد پرستیوں پر کوئی زد نہیں پڑتی ــــ لیکن اپنی معاشرتی زندگی پر خدا کا کوئی اختیار و اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ یاد رکھو! خدا کا اس قسم کا اقرار کچھ معنی نہیں رکھتا۔ لہذا یہ لوگ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں کہ یہ خدا کو مانتے ہیں"۔

سورۂ عنکبوت میں پہلے اس اصل الاصول کو بیان کیا کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۲۹/۶۰)۔ "ان سے کہو کہ ذرا غور کرو کہ کائنات میں کتنے ذی حیات

ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ ان سب کو خدا کے کائناتی قانونِ ربوبیت کے مطابق سامانِ زیست ملتا ہے۔ لہٰذا اگر تم بھی اپنے ہاں ویسا ہی نظام رائج کر لو تو تم سب کو اسی طرح رزق ملتا جائے گا۔ اس لئے کہ خدا سب کی سنتا اور ہر ایک کی ضروریات سے واقف ہے"۔ اس کے بعد ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۲۹/۶۱)۔ "لیکن ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خارجی کائنات میں تو خدا کے قوانین کی حکمیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن انسان کی دنیا کو اس سے باہر رکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً اگر ان سے پوچھو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج جیسے اجرامِ فلکی کس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، تو یہ اقرار کریں گے کہ اللہ ہی نے ایسا کر رکھا ہے۔ تم ان سے کہو کہ پھر تم اپنے معاشرہ کی تشکیل بھی اُسی کے قوانین کے مطابق کیوں نہیں کرتے، یہاں پہنچ کر تم کیوں الٹے پھر جاتے ہو؟"۔ ایک آیت آگے چل کر کہا۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲۹/۶۳)۔ "اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو بادلوں سے بارش برساتا اور اس سے زمینِ مردہ کو ازسرِ نو زندگی عطا کرتا ہے۔ تو یہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے اور نہایت حسن و خوبی سے کرتا ہے۔ تم ان سے کہو کہ جب تم اس کے معترف ہو کہ جہاں جہاں خدا کا قانونِ ربوبیت کارفرما ہے وہاں ہر طرف سے ستائش و نیایش کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، تو پھر تم اپنے معاشرہ میں وہی قانون کیوں رائج نہیں کرتے؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر غالب آ جائیں گے اور اس طرح یہ عقل و فکر سے کام نہیں لیں گے ورنہ بات تو کچھ ایسی نہیں جو ان کی عقل و فکر میں نہ آ سکے"۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

ہم چاہتے تو اِس مقام پر یورپ کے بڑے بڑے سائنس دانوں، مفکروں اور مدبروں کے اقوال نقل کر دیتے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ کس طرح اس امر کے معترف ہیں کہ خارجی کائنات میں ہر جگہ قانون کی کارفرمائی ہے اور یہ قوانین نہ ان اشیائے کائنات کے وضع کردہ ہیں نہ انسانوں کے مرتب کردہ۔ یہ اُسی خدا کے متعین فرمودہ قوانین ہیں جس نے اِن اشیائے کائنات کو پیدا کیا ہے[1]۔ ان کے اس قسم کے اعترافات کو درج کرنے کے بعد پھر ہم یہ بھی بتاتے کہ

---

[1] میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب ــــ انسان نے کیا سوچا؟ ــــ میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

وہ کس طرح مصر ہیں کہ ان کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہ خود قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ وہ اس میں مذہب کا اتنا ہی دخل تسلیم کر سکتے ہیں کہ لوگ اپنے اپنے طور پر خدا کی پرستش کر لیا کریں۔ اور جو عقائد جی میں آئے رکھیں بشرطیکہ وہ ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اسی کا نام سیکولر نظام ہے۔

حیرت بالائے حیرت یہ کہ ایسا کچھ یورپ کی اقوام ہی نہیں کہتیں یا کرتیں، بلکہ مسلمانوں کی مملکتوں میں بھی یہی نظام رائج ہے۔ ان کے ہاں بھی سیاست اور مذہب دو الگ الگ شعبے ہیں۔ مذہب کا تعلق اعتقادات، عبادات یا زیادہ سے زیادہ نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق پرسنل لاز تک ہے۔ معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی اقوامِ یورپ کی طرح جمہوری نظام کے تابع چلتی ہے جس میں قوانین سازی کے اختیارات بلا حدود و قیود انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی الارض خدا نہیں۔ معاشی زندگی میں اللہ الارض کے معنی یہ تھے کہ وسائلِ رزق پر کسی کی ملکیت جائز نہ قرار پائے۔ وہ اس مقصد کے لئے ملّت (نظامِ مملکتِ اسلامیہ) کے زیر اہتمام رہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ رزق پیدا کرے اور اس کی اس طرح تقسیم کرے کہ کسی کی ضروریاتِ زندگی رُکی نہ رہیں اور کسی کے پاس زائد از ضرورت جمع نہ ہو۔ باطل کے نظام میں یہ وسائلِ رزق انسانوں کی ملکیت میں رہتے ہیں۔ ان کی شکلیں تو بدلتی رہتی ہیں لیکن روح ہر جگہ وہی کارفرما رہتی ہے۔ اَنۡدَادًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ۔ تاریخ کے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔

دورِ ملوکیت کے نِد

اور آج بھی موجود ہیں۔ جسے دورِ جہالت واستبداد کہا جاتا ہے اس میں صرف ایک نِد ہوتا تھا جسے بادشاہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ چنانچہ ملوکیت کے نمائندہ فرعون نے یہی کہا تھا کہ یٰقَوۡمِ اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَ ہٰذِہِ الۡاَنۡہٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (۴۳/۵۱)۔ اے میری قوم کے لوگو! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ملکِ مصر کی زمین اور اس میں بہنے والے دریا اور نہریں میری ملکیت ہیں۔ کیا تم اندھے ہو کہ تمہیں اس قدر محسوس حقیقت بھی نظر نہیں آتی؟ یہ دورِ جہالت تھا جس میں بات، کھردرے پن سے ہی سہی، کھلے کھلے الفاظ میں کی جاتی تھی اب دورِ تہذیب ہے جس میں انداداً من دون اللہ فرعون کی طرح کھلے کھلے بات نہیں کرتے۔ اب وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ ہماری ملکیت ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے ایک بڑا پُرفریب تصور ایجاد کیا ہے جسے (STATE) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

عصرِ حاضر کا نِد، اسٹیٹ

اسٹیٹ کا تصور ایسا مبہم ہے کہ وہ کسی کے سامنے متعین طور پر آتا ہی نہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اسٹیٹ ہوتی کیا ہے؟ وہ رہتی کہاں ہے؟ وہ اپنے احکام کس طرح وضع کرتی ہے اور کس طرح نافذ؟ اس کا کسی کو علم نہیں، لیکن اسٹیٹ ہے کہ فرعون کی طرح وہ اپنے احکام نافذ کئے چلی جاتی ہے اور ان سے سرکشی برتنے والوں کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ جب محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ کیا

تو اُسے بتایا گیا کہ مندر میں رکھی ہوئی مورتی کو بڑی فوق الفطرت قوتیں حاصل ہیں۔ وہ لوگوں کی پکار کا جواب دیتی اور انکی مانگ پوری کرتی ہے۔ محمود کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اُس نے مندر میں جاکر بہ نگاہِ تجسّس دیکھا تو اُسے نظر آیا کہ مورتی کے پیچھے ایک ایسا پردہ لٹک رہا ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا اور لوگ جنہیں مورتی کی آوازیں سمجھتے ہیں وہ اس پردہ کے پیچھے سے ابھرتی ہیں۔ اس نے پجاریوں کی تخویف و ترہیب کے باوجود اس پردہ کو پھاڑ ڈالا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ اسکے پیچھے مندر کے بڑے بڑے پجاری براجمان ہیں اور مورتی کے نام پر پسِ پردہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ دورِ حاضرہ میں (STATE) کی کیفیت بھی اُسی مورتی جیسی ہے۔ اگر آپ اسٹیٹ کے کاروبار کا تجزیہ کریں گے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ جو کچھ اسٹیٹ کے نام سے کہا اور کیا جاتا ہے وہ درحقیقت برسرِ اقتدار طبقہ کے فیصلے اور فرامین ہوتے ہیں جنہیں وہ اسٹیٹ کے نام سے جاری کرتے اور لوگوں سے منواتے ہیں۔ الٰہ الارض کی روح وہی ہے۔ اس نے پیکر دوسرا اختیار کر رکھا ہے ۔۔ اس فرق کے ساتھ کہ مورتی تو پھر بھی مجسم شکل میں سامنے ہوتی تھی، اسٹیٹ کے بت کا محسوس پیکر نہیں ہوتا۔ اُسے کسی مندر میں نصب کرنے کے بجائے پروپیگنڈا کے ذریعہ عوام کے ذہنوں کے بتکدہ میں متمکن کر دیا جاتا ہے۔ وسائلِ رزق پر اسٹیٹ کی ملکیت بتائی جاتی ہے لیکن وہ درحقیقت اُن چند نفوس کے قبضہ میں ہوتے ہیں جو اسٹیٹ کے نام پر حکومت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم ان تمام انسانوں کو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت میں رکھتے ہوں، انداداً من دون اللہ قرار دیتا ہے۔

قرآن کی ان تصریحات کے بعد جب سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۱۶۸) ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖؗ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۔ (۲/۱۶۸)۔ ”اے نوعِ انسان! خدا نے تمہارے لئے جو رزق پیدا کیا ہے، اسے حلال و طیّب طریق سے کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔“

رزقِ حلال و طیّب

یہاں قرآنِ کریم نے زمین میں پھیلے ہوئے رزق کو حلال اور طیّب طریق سے کھانے کے لئے کہا ہے۔ طیّب کے معنی ہوتے ہیں پسندیدہ، خوشگوار، جس کے نتائج عمدہ مرتب ہوں۔ یہاں تک بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن رزق کو بطریقِ حلال کھانے کا سوال غور طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ”مردار، بہتا ہوا خون، لحمِ خنزیر اور ہر وہ شے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کیا جائے“ کو بصراحت حرام قرار دیا ہے (۲/۱۷۳؛ و دیگر مقامات) لیکن ”ما فی الارض“ میں تو کھانے پینے کی تمام چیزیں آجاتی ہیں۔ ان کے بطریقِ حلال کھانے سے کیا مراد ہے؟

ہم، حرام وحلال کی فقہی بحثوں میں الجھے بغیر، اس مقام پر اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے رزقِ حلال کی تشریح "رزقِ کریم" کہہ کر کردی ہے یعنی "عزت کی روٹی"۔ سورۃ الانفال میں "مومنین حقا" (سچے اور سچے مومنوں) کا ذکر دو مقام پر آیا ہے۔ اور دونوں جگہ کہا ہے کہ لَهُمْ دَرَجَٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔ (۸/۴؛ ۸/۷۴)۔ "انہیں رزقِ کریم (باعزت رزق) میسر آئے گا"۔ اقبالؒ نے اس مشکل نکتہ کو یہ کہہ کر حل کر دیا ہے:

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

ظاہر ہے کہ جس رزق کے حصول کے لئے انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کا دست نگر اور محتاج ہو، اس سے "پرواز میں کوتاہی" آنا تو ایک طرف، قوتِ پرواز سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن۔ یہ وہ رزق ہے جو "اندادًا من دون اللہ" کے ہاتھوں ملتا ہے۔ اس کے برعکس وہ رزق ہے جسے خدا نے "رزق اللہ" (۲/۶۰)۔ یا رزق ربک (۲۰/۱۳۱) کہہ کر پکارا اور اسے خَيْرٌ وَّ أَبْقَىٰ کہا ہے (ایضاً) یعنی خیر بھی اور پائندہ بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ رزق ہے جو نظامِ خداوندی کی وساطت سے ملتا ہے اور اس میں کوئی انسان نہ کسی انسان کا دست نگر ہوتا ہے نہ زیر بارِ احسان۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اور یہی دینِ خداوندی کا ماحصل ہے۔ یعنی

کس نباشد درجہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں 'ایں است و بس

قرآنِ کریم نے "مردار، خون، اور لحمِ خنزیر" کو حرام قرار دینے کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ۔ (۲/۱۷۳)۔ یعنی ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے، حرام ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیت نظامِ خداوندی ہی میں ہوتی ہے کہ اس میں رزق "رزق اللہ" ہوتا ہے، "رزق ربک" ہوتا ہے کسی انسان کا نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ رزق 'رزق حلال وطیب' ہوتا ہے۔

اس نظام کا آغاز، حضورؐ نبی اکرم کے مقدس ہاتھوں ہو چکا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس کی رو سے 'قطعاتِ اراضی' کو بڑے بڑے سرداروں کے قبضہ سے نکال کر، مملکت کی تحویل میں لانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ قرآنِ کریم کی بعض آیات اس پر شاہد ہیں۔ سورۃ الرعد میں اسے بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کے دل میں فطرۃً یہ سوال ابھرتا ہو گا کہ جس نظام کے قیام کے لئے میں اس قدر جدوجہد کر رہا ہوں معلوم نہیں وہ کاملۃً میری زندگی میں متشکل ہو سکے گا

یا نہیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ سے کہا گیا کہ وَاِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ۔ (۱۳/۴۰) "تم اس کا خیال مت کرو کہ تمہاری زندگی میں ایسا ہوگا یا نہیں ہوگا یہ ضرور، لیکن اس کے لئے وقت کا تعین تم نہیں کر سکتے۔ تمہارے ذمہ اس پیغام کا لوگوں تک پہنچائے چلے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ اس کے نتائج کب متشکل ہو کر سامنے آتے ہیں۔" اس کے بعد کہا۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ

قطعاتِ اراضی پر تحدید

نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا۔ وَاللّٰهُ یَحْكُمُ۔ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۱۳/۴۱)۔ " اس کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ جن بڑے بڑے قطعاتِ اراضی پر ان سرداروں نے قبضہ کر رکھا تھا وہ کس طرح سمٹ کر چھوٹے ہو رہے ہیں۔ یعنی رفتہ رفتہ ان کی ملکیت سے نکلتے جا رہے ہیں۔ یہ سب خدا کے فیصلوں کے مطابق ہو رہا ہے جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ وہ بڑا سریع الحساب واقع ہوا ہے؟ اب یہ ان پر کبھی مسلط نہیں ہو سکیں گے (۱۳/۴۱)۔ اس سلسلہ کا آغاز رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو چکا تھا اور تکمیل عہدِ فاروقی میں پہنچ کر ہو گئی جب عراق کی زمین افراد کی ملکیت کے بجائے مملکت کی تحویل میں رکھی گئیں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اس دور میں خدا ہی الٰہ السماء تھا اور وہی الٰہ الارض۔ اور "انداداً من دون اللہ" میں سے کسی کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ اُس دور میں رزق "رزق اللہ" تھا اور ہر ایک کو بلا منّتِ غیرے ملتا تھا۔

(۰)

اس کے بعد آپ پھر اس آیت کی طرف آجائیے جس میں رزق کو حلال و طیب طریق سے کھانے کے لئے کہا گیا ہے (یعنی آیت (۲/۱۶۸) کی طرف)۔ اس میں تنبیہ یہ کی گئی ہے کہ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ۔ "تم شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرنا۔ شیطان کے نقوشِ قدم کی تشریح ایک آیت کے بعد یہ کہہ کر کر دی کہ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ۔ (۲/۱۷۰)۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کتاب کا اتباع کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں!

اسلاف کی تقلید

ہم تو اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے رہیں گے!" اس پر قرآنِ کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ "خواہ ان کے اسلاف کے سامنے نہ خدا کا بتایا ہوا صحیح راستہ ہو اور نہ ہی وہ عقل وفکر سے کام لیتے ہوں، یہ بہرصورت انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے رہیں گے!"

رسول اللہؐ کے اولین مخاطب اہلِ کتاب بھی تھے اور وہ عرب بھی، جو کسی آسمانی کتاب کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں

تھے جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے، وہ نظری طور پر تو اس کے مدعی تھے کہ وہ ان کتابوں کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے انبیاءؑ کو ملی تھیں لیکن وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس نہیں تھیں۔ ویسے بھی وہ کتابیں جس شکل میں بھی ان کے پاس تھیں، وہ عملی زندگی میں ان کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ اس شریعت کا اتباع کرتے تھے جو ان کے ہاں اسلاف سے مروج چلی آرہی تھی۔ بعینہٖ جس طرح ہم آج خدا کی کتاب (قرآن کریم) کو اپنے ہاں رکھتے ہوئے بھی عملاً اتباع اس طریق کا کرتے ہیں جو ہمارے ہاں اسلاف سے مروج چلا آرہا ہے۔ لہٰذا، رسول اللہؐ کے اولین مخاطب خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا دوسرے لوگ، اتباع سب اپنے اسلاف ہی کا کرتے تھے۔ یہ تھے وہ لوگ جنہیں کہا جاتا تھا کہ وہ خدا کی کتاب کا اتباع کریں جو ان کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں حضورؐ سے کہتے تھے کہ ایسا کہنے میں تم (معاذ اللہ) جھوٹ بولتے ہو کہ تم جس روش پر چلنے کی ہمیں دعوت دیتے ہو وہ خدا کی متعین کردہ ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے اسلاف کا راستہ چھوڑ کر تمہاری اطاعت کرنے لگ جائیں۔ ہم ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تمہارے اتباع کے مقابلہ میں ہم اپنے اسلاف کے اتباع کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے، یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور یہیں سے ہم اگلی آیت کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

(۲۳) وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ ۖ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ.

۲/۲۳

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے اگر تمہیں اس کے متعلق شک ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں تو تم اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور خدا کو چھوڑ کر جنہیں بھی اپنے ساتھ بلانا چاہو، بلا لو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایسا کر کے دکھاؤ"۔

خدا کا عبد

ضمناً، یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو اپنا عبد کہہ کر پکارا ہے اور صرف حضورؐ ہی کو نہیں، خدا نے اپنے تمام رسولوں کو اپنا عبد کہا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کی عبدیت شرف و مجدِ انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ انسان کے لئے اس سے بڑا مقام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اور یہ اس لئے کہ خدا کی عبدیت کے معنی یہ ہیں کہ ایسا انسان دنیا میں کسی اور کا محکوم، مطیع، فرماں پذیر اور غلام نہیں رہتا۔ اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے — خدا کی عبدیت کا یہ فطری نتیجہ ہے۔ اور آپ سوچئے کہ کس قدر بلند ہے یہ مقام، جسے نصیب ہو جائے۔ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والا، دنیا کی بلند سے بلند چوکھٹ سے مستانہ وار، سر اٹھائے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بقولِ اقبالؒ

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام		نہ غلام او را، نہ او کس را غلام

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں، یہ آپ کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں، خدا کی وحی ہے۔ غور کیجئے تو ایک مدعیٔ نبوت کے لئے یہ مشکل ترین مقام ہوتا تھا۔ اُسے خدا کی طرف سے جو وحی ملتی تھی اُسے غیراز نبی محسوس شکل میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کا تو قلبِ نبوی پر نزول

اس کا ثبوت کیا ہے؟

ہوتا تھا (۲/۹۷) اُس کے بعد وہ وحی کے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا تھا اور لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا تھا کہ یہ میری فکر کا نتیجہ نہیں، خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی ہے ۔۔۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى . اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى . (۵۳/۳-۴) "یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، جسے تم نطقِ نبوی سمجھ رہے ہو، یہ درحقیقت وحیٔ خداوندی ہے۔" اور ان کا سوال یہ تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے ۔۔۔ یہی سوال قرآن کے اولین مخاطب کیا کرتے تھے۔ اور یہی آج بھی کیا جاتا ہے جب پوچھا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ قرآنِ کریم خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے؛ محمدِ عربی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں۔ رسول اللہ اپنے اس دعویٰ کو علم و بصیرت کی بنا پر پیش کرتے اور دلیل و برہان کی رُو سے منوانے کی کوشش فرماتے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں باربار تاکید آئی ہے کہ ان لوگوں سے کہو کہ یہ غور و فکر سے کام لیں، علم و بصیرت کی رو سے سوچیں، گہرے شعور اور تدبر سے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس سے یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے گی کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔

لیکن اتنی محنت و کاوش کون کرتا ہے۔ بالخصوص وہ لوگ جنہیں تقلید کی روش نے نہ صرف سہل انگار اور تن آسان بنا دیا ہو بلکہ اُن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی ماؤف کر رکھا ہو۔ وہ اس کے ثبوت میں کوئی محسوس نشان طلب کرتے تھے۔ ایسا نشان جو خارقِ عادات اور فوق الفطرت ہو اور جسے وہ اپنی طبیعی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیں۔ ایسے نشان کو اصطلاح

معجزاتِ طلبی

میں معجزہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا واقعہ جو انسان کی عقل و فکر کو عاجز کر دے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ ایسا کس طرح واقعہ ہو گیا۔ محسوسات کا خوگر انسان اس قسم کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں مرئی نشانات طلب کرتا اور انہی کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ آج بھی آپ خود اپنے ہاں غور کیجئے۔ جن بزرگوں کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے، اول تو ان میں بہت کم صاحبِ علم و فضل ہوتے ہیں۔ اور جو صاحبِ علم ہوں، اور انہوں نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہوں تو انہیں ان کی علمی قابلیت کی بنا پر اولیاء اللہ نہیں مانا جاتا۔ ان کی طرف کرامات منسوب ہوتی ہیں اور اسی بنا پر انہیں خدا کے مقربین تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ خانقاہی محفلوں میں بیٹھئے۔ ان بزرگوں کی قبروں کے مجاور یا دیگر معتقدین ان حضرات کی کرامات پر کرامات بیان کرتے اور سننے والے سر دھنتے چلے جائیں گے۔ آپ ان کے سوانح حیات کو پڑھیئے، ان میں بھی ان کی علمی یا فکری کاوشوں کا کوئی ذکر نہیں ملے گا۔ اگر ملے گا بھی تو یونہی سرسری سا۔ ساری کتاب ان کی کرامات کے

تذکروں سے بھری ہوگی۔ انہی کرامات کی وجہ سے ان کی شہرت ہوگی اور انہی کے بل بوتے پر وہ مرجع انام بنیں گے۔ یہی کیفیت ایک زندہ پیر کی بھی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی ایک خارقِ عادت کرشمہ یا شعبدہ مشہور ہو جائے، پھر دیکھیئے کہ مخلوق کس طرح اس کی طرف کھینچی چلی آتی ہے۔ اسی قسم کے خارقِ عادات کرشموں کی توقع لوگ انبیاء کرام سے بھی کرتے تھے اور انہی کا ان سے مطالبہ بھی ہوتا تھا۔ ہم معجزات سے متعلق گفتگو آگے چل کر متعلقہ عنوان میں کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

اس سے انکار

کہ رسول اللہ کے مخاطبین یہی مطالبہ حضورؐ سے کرتے تھے اور خدا کی طرف سے (رسول اللہ کی زبانی) اس کا یہ جواب ملتا تھا کہ میرا معجزہ تو یہی کتاب ہے۔ اس کے سوا مجھے کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر مخاطبین کی طرف سے اس مطالبہ اور حضورؐ کی طرف سے اس جواب کو دہرایا گیا ہے۔ دو ایک مقامات ملاحظہ فرمایئے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا۔ (۱۷/۹۰)۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک تیری بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے جب تک تو اس قسم کے معجزات نہ دکھائے۔ مثلاً تو اشارہ کرے اور زمین سے پانی کا چشمہ پھوٹ بہے۔ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۱۷/۹۱)۔ "یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تیرے حکم سے اس میں پانی کی ندیاں جاری ہو جائیں۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۱۷/۹۲)۔ "یا جیسا کہ تو ہمیں اکثر عذابِ خداوندی سے ڈرایا کرتا ہے، ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے گرا دے اور اس طرح ہم پر ناگہانی آفت ٹوٹ پڑے۔ اور یا تو خود خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کر دے۔ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ۔ (۱۷/۹۳)۔ "یا تیرے لئے سونے کا ایک محل خود بخود تیار ہو جائے۔ یا تو ہمارے دیکھتے دیکھتے آسمان پر چڑھ جائے — اور صرف آسمان پر چڑھ ہی نہ جائے کیونکہ محض اتنی بات سے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے بلکہ — وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر اتار دے جسے ہم پڑھ کر دیکھ لیں کہ اُسے واقعی خدا نے لکھا ہے۔ تم ایسا کرکے دکھاؤ گے تو پھر ہم مان لیں گے کہ تم واقعی خدا کے رسول ہو۔" آپ غور کیجئے کہ ان کی طرف سے یہ مطالبات ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان مطالبات میں وہ سب شریک ہوتے تھے — کچھ لوگ مطالبہ کرنے والے، اور دوسرے اس انتظار میں کہ دیکھیں، یہ مدعیٔ نبوت ایسا کرکے دکھا سکتا ہے یا نہیں! اس قسم کا ہوا کرتا تھا مخاطبین کا ہجوم، اور ان کے سامنے یہ مدعیٔ نبوت! اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کی طرف سے (مبنی بر وحی) کیا جواب ملتا تھا۔ یہ جواب کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (۱۷/۹۳) اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اول تو تمہارا خود خدا کے متعلق یہ تصور باطل ہے کہ وہ اپنے قوانینِ فطرت کو توڑ کر، جن کے

متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، اس قسم کے خلافِ فطرت واقعات ظہور میں لے آئے گا، اور وہ بھی اس لئے کہ تم اس کتاب کے متعلق یہ تسلیم کر لو کہ یہ اس رسولؐ کی فکر کا نتیجہ نہیں، خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ہے. یعنی اُس کتاب کے متعلق جو قدم قدم پر دعوت دیتی ہے کہ تم عقل و فکر سے کام لو. یہ اکوئی دعویٰ علم و بصیرت کے خلاف نہیں ــ اے رسولؐ! پہلے تو تم اِن سے یہ کہو کہ تمہارا خدا کے متعلق یہ تصور ہی باطل ہے اور اس کے بعد ان سے کہو کہ تمہارا یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خدا کے رسولوں کو فوق البشر ہونا چاہیئے. هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا (ایضاً) "میں تو صرف ایک انسان ہوں" اور بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ. (۱۸/۱۱۰) "بالکل تمہارے جیسا انسان". اس لئے اس قسم کے خلافِ فطرت واقعات نہ تو خدا ہی ظہور میں لائے گا اور نہ ہی میں انہیں اپنی طرف سے پیش کر سکوں گا کہ میں ایک انسان ہوں، اور کسی انسان کو اس کی قوت اور اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے قوانین کو توڑ سکے.

بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ

آپ سوچیے کہ اس جواب پر وہ کس طرح منہ موڑ کر اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہوئے منتشر نہ ہو جاتے ہوں گے، اور اس سے خود رسول اللہ کے دلِ شفقت آگیں پر کیا نہ گزرتی ہو گی! ایسے ہی تھے وہ مقامات، جہاں حضورؐ کی دلجمعی اور تسکین خاطر کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس قسم کے سکون آفریں پیغامات آتے تھے کہ "وَلَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ. فَصَبَرُوۡا عَلٰى مَا كُذِّبُوۡا. وَاُوۡذُوۡا. حَتّٰۤى اَتٰٮهُمۡ نَصۡرُنَا. وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدۡ جَآءَكَ مِنۡ نَّبَاِى الۡمُرۡسَلِيۡنَ (۶/۳۴) "تم ان لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے کبیدہ خاطر نہ ہو. یہ کوئی انوکھی بات نہیں. تم سے پہلے بھی جو رسول آئے، ان کے ساتھ بھی کچھ ہوتا رہا. ان کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اسی طرح تکذیب ہوتی رہی. لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال و استقامت سے اپنے پروگرام پر جمے رہے اور مخالفین کی طرف سے جس قدر تکالیف پہنچتی رہیں، انہیں ہمت سے برداشت کیا. یہاں تک کہ بالآخر ہمارے قانون کے مطابق ہماری طرف سے نصرت آپہنچی. ہم نے اس کے لئے کوئی خلافِ فطرت طریقہ اختیار نہ کیا. اس لئے کہ خدا کے قوانین اٹل ہیں، ان میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا. یہ بات ان انبیاءؑ کے احوال و کوائف سے واضح ہو جاتی ہے جن کے تذکرے اس قرآن میں تم تک پہنچ چکے ہیں". اس کے بعد ہے. وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ. وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَى الۡهُدٰى فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ. (۶/۳۵) "ان لوگوں کی طرف سے اس قدر مخالفت کے باوجود، تم اس غم سے نڈھال رہتے ہو کہ یہ صحیح راستہ کی طرف کیوں نہیں آتے. تم کیوں اپنے آپ کو خستہ حال کر رہے ہو (۱۸/۶). تم لاکھ غم کھاؤ اور ہزار افسوس کرو، یہ پھر بھی صحیح راستہ کی طرف نہیں آنے کے. اگر تم ایسا کر سکو کہ زمین میں کوئی سرنگ لگا کر پاتال تک جا پہنچو یا آسمان میں

سیڑھی لگا کر عالمِ بالا تک پہنچ جاؤ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے ان کا مطالبہ پورا ہو جائے، تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھو کہ ان لوگوں کے اس قسم کے مطالبات سے مقصد یہی ہے نا کہ تمام لوگ ایک راستہ پر چلنے لگیں۔ اگر انسانوں کا اختیار وارادہ سلب کر کے سب کو ایک طریقہ پر چلانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؛ لیکن خدا کا منشاء یہ ہے نہیں۔ وہ انسان سے اس کا اختیار وارادہ نہیں چھیننا چاہتا۔ لہٰذا وہ چاہتا ہی نہیں کہ خلافِ فطرت حوادث دکھا کر لوگوں کی عقل کو ماؤف کر دیا جائے اور اس طرح وہ ایک راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ یہ ہے اس کی حقیقی وجہ، سو تم بھی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا (ظاہر ہے کہ تم ایسے کبھی نہیں ہو گے) جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو ایسا کیوں نہ بنا دیا کہ سب ایک ہی (صحیح) راستہ پر چلیں۔

مخالفت کی حقیقی وجہ

اوپر کہا گیا ہے کہ اگر ان لوگوں کا اس قسم کا مطالبہ پورا کر بھی دیا جائے تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لانے کے۔ تو اس سے ایک اور لطیف حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ یہ لوگ حضورؐ کی پیش کردہ دعوت سے اس لئے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کے انکار اور مخالفت کی اصلی وجہ یہ تھی کہ جو نظام حضورؐ قائم کرنا چاہتے تھے اس سے ان لوگوں کے تمام ناواجب مفادات ختم ہو جاتے تھے ـــ مساواتِ انسانیہ کی بنا پر وہ تمام فخر ومباہات جسے قریش، محض بربنائے نسل، اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے تھے، وہ شرف و عزت جو کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی اور جس کی بنا پر وہ تمام عرب کی عقیدتمندیوں کا مرکز بنے رہتے تھے، وہ معاشی مفادات جو انہیں نظامِ سرمایہ داری کی رو سے حاصل تھے ـــ حضورؐ کے پیش کردہ نظام کے قیام سے ان سے یہ سب کچھ چھن جاتا تھا۔ لہٰذا یہ تھی اصلی وجہ ان کی مخالفت کی۔ وہ معجزات کا مطالبہ محض اتمامِ حجت کے لئے کرتے تھے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (۶/۷) "اگر ہم تیری طرف ایک ایسی کتاب بھی نازل کر دیں جو قرطاس پر لکھی ہوئی آسمان سے اترے اور جسے یہ چھو کر اچھی طرح اپنا اطمینان بھی کر لیں کہ یہ سچ مچ کی ایک کتاب ہے، تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا (۱۵/۱۵) "اس نے (یوں کہئے کہ) ہپناٹزم (قوتِ متخیلہ) سے ہماری نگاہوں کو مدہوش کر دیا ہے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے خارقِ عادت واقعات سے مفاد پرستوں کا یہ خاص گروہ ایمان نہ لاتا لیکن عوام ان سے ضرور متاثر ہو جاتے اور حضورؐ کے پیروکار بن جاتے۔ لیکن، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ منشائے خداوندی کے خلاف ہوتا۔ منشائے خداوندی

ہے ہی یہ کہ غلط اور صحیح راستے لوگوں کے سامنے واضح طور پر رکھ دیئے جائیں اور پھر اسے ان کے اختیار اور ارادہ پر چھوڑ دیا جائے۔ کہ وہ جو راستہ چاہیں اختیار کرلیں قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (۱۸/۲۹) "ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے خدا کی طرف سے آگیا۔ سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔" اسی سے انسان اپنے فیصلوں اور اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور ان کے نتائج کا مستحق۔ نہ مجبوری سے لایا ہوا ایمان 'ایمان' ہوتا ہے نہ کفر، کفر۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (۱۰/۹۹) "اگر مشیتِ خداوندی میں یہ ہوتا کہ تمام انسان مومن ہوتے تو اس کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسا کرتا۔ لیکن یہ ان کے اپنے فیصلہ سے اختیار کردہ راستہ نہ ہوتا۔ اشیائے فطرت اور حیوانات کی طرح مجبوری کا نتیجہ ہوتا۔ لہٰذا، جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے انہیں مومن بنایا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ چاہتا یہ ہے کہ لوگوں کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ خدا ایسا نہیں چاہتا۔ نہ ہی وہ ایسا کرتا ہے۔"

یہ تھا وہ جواب، جو ان لوگوں کی معجزہ طلبی پر دیا گیا اور کہا گیا کہ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (۲۹/۵۰) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول کو خدا کی طرف سے معجزات کیوں نہیں دیئے جاتے۔ ان سے کہو کہ معجزات کا دینا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن اس سے سلسلۂ رشد و ہدایت کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ میرا منصب معجزات دکھانا نہیں، تمہیں اس سے آگاہ کرنا ہے کہ جس روش پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں۔" اور اس کے بعد ہے۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۲۹/۵۱) "کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ خدا نے اے رسولؐ! تمہاری وساطت سے ان کی طرف اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے کہ جو لوگ بھی اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے، انہیں دنیا میں سامانِ زیست فراوانی سے ملے گا اور وہ عزّ و شرف سے بھی بہرہ یاب اور سرفراز ہوں گے۔ کیا یہ کتاب ان کے لئے کافی معجزہ نہیں جو یہ حسّی معجزات کے مطالبے کرتے رہتے ہیں۔"

صحابہؓ کا ایمان

یہاں چند لمحات کے لئے رُکیے اور نگاہ کا رُخ ایک اور حقیقت کی طرف پھیریئے۔ حضورؐ کی مخاطب قوم کی طرف سے مطالبات کے باوجود کوئی معجزہ ظہور میں نہیں لایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا، اور بار بار فرمایا کہ میرا معجزہ یہی میری کتاب ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو۔ وہ اس پر غور و فکر کرتے تو انہیں وہ تمام مفادات چھنتے نظر آتے جو انہیں اس وقت حاصل تھے۔ ان حالات میں سوچیے کہ جو حضرات، اس کے باوجود حضورؐ کی رسالت پر

ایمان لے آئے تھے، فکر و کردار، دونوں اعتبارات سے ان کا مقام کس قدر بلند تھا! فکری اعتبار سے اس لئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، عرب جیسے توہم پرستانہ ماحول میں، خالص غور و فکر کی رو سے صداقت کا پہچان لینا، کتنی بلند نگہی کی دلیل ہے۔ اور کردار کے اعتبار سے اس لئے کہ انہیں صاف نظر آتا تھا کہ اس صداقت کے قبول کرنے سے ان کے مفادات کس طرح ان سے چھن جائیں گے۔ اور انہیں کس قدر مصائب کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے انہوں نے اس صداقت کو تسلیم کیا اور برملا تسلیم کیا! ان حضرات کے ایمان کی پختگی اور قبولیتِ صداقت کے خلوص میں کسی قسم کا بھی شبہ ہو سکتا ہے؟ یہی تھے وہ پیکرانِ حق و صداقت جنہیں خدا نے "مومن حقا" کہہ کر پکارا (۸/۴)، اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (۹/۱۰۰) کی خلعت سے نوازا تھا۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف لوٹئے۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ان سے کہا گیا کہ میرا معجزہ یہ کتاب ہے۔ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں؟

جب اُن سے یہ کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تم ہمارے سامنے یہ کتاب پیش کرتے ہو، لیکن ہمارا تو اعتراض ہی یہ ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ یہ کتاب میری تصنیف کردہ نہیں، خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے تو ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس قسم کی کتاب ہم خود بھی تصنیف کر سکتے ہیں۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (۸/۳۱) "جب ان کے سامنے اِس قرآن کی آیات کو پیش کیا جاتا ہے تو یہ بڑی بے اعتنائی سے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں سن لیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسی کتاب تصنیف کر سکتے ہیں۔ اس میں اس کے سوا رکھا ہی کیا ہے کہ اقوامِ سابقہ کے قصے کہانیاں ہیں جنہیں یکجا کر دیا گیا ہے"۔ اس جواب پر ان سے کہا گیا کہ بہت اچھا۔ ہمیں یہ منظور ہے۔ چلئے فیصلہ کن بات یہی رہی۔ اگر تم اس کتاب کی مثیل و نظیر کوئی کتاب تصنیف کر دو تو ہمارا یہ دعوےٰ (معاذ اللہ) جھوٹا ہوگا کہ یہ انسانی تصنیف نہیں، خدا کی کتاب ہے۔ خدا نے ان کا چیلنج قبول کیا اور اپنے

قرآن کا چیلنج

رسولؐ سے کہا کہ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱۷/۸۸) "تم تو ایک طرف، اگر ساری دنیا کے انسان ــــ حضری اور بدوی سب کے سب مل کر بھی کوشش کریں کہ اِس قرآن جیسا قرآن بنا لیں تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کے کتنے ہی مددگار کیوں نہ بن جائیں"۔ یہ قرآن جیسا کہ یہ کہتے ہیں، اقوامِ سابقہ کی داستانوں کا مجموعہ نہیں۔ اس میں تو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے متعلق ابدی حقائق اور ازلی راہنمائی دی گئی ہے جسے ہم مختلف اسالیب و انداز سے لوٹا لوٹا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ ہر بات کی وضاحت ہو جائے۔ اس جیسا

مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات کون بنا سکتا ہے؟"

یہاں کہا گیا کہ، جیسا کہ تم نے خود ہی دعویٰ کیا ہے، اس قرآن جیسا، پورا قرآن بنا کر دکھاؤ۔ دوسری جگہ اس مطالبہ میں خود اپنی طرف سے تخفیف کر کے یہ کہہ دیا کہ اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (۱۱/۱۳) "یہ کہتے ہیں کہ اس رسولؐ نے یہ قرآن خود بنا لیا ہے اور اسے خدا کی طرف یونہی منسوب کر رہا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ خدا کی کتاب نہیں، انسان کا کلام ہے، تو تم پورے کا پورا قرآن تو ایک طرف، اس جیسی صرف دس سورتیں بنا کر لے آؤ، اور خدا کو چھوڑ کر جسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہو، کر لو۔ بات صاف ہو جائیگی۔"

یہاں دس سورتیں کہا گیا ہے اور سورۃ یونس میں اس میں مزید تخفیف کر کے کہا اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (۱۰/۳۸) "دس سورتیں بھی نہیں۔ ان سے کہو کہ اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر پیش کر دو۔"

اور اس کے بعد یہ کہہ کر بات کو آخری حد تک پہنچا دیا کہ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (۵۲/۳۴) "ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو ایک سورۃ بھی نہیں، جو حقائق اس میں بیان کئے گئے ہیں، ان جیسی صرف ایک حقیقت، صرف ایک بات ہی وضع کر کے دکھاؤ۔"

کس قدر ہے خود اعتمادی اپنے اس دعویٰ پر کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان وحی کی کسی حقیقت کی مثل و نظیر پیش کر سکے۔ اور یہی تھی وہ انتہا درجہ کی خود اعتمادی، جس کی بنا پر، ان کا چیلنج قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۔ (۲/۲۴)

"اول تو تم ایسا کرنے کی ہمت ہی نہیں کرو گے۔ اور اگر تم نے ہمت کر کے کوشش کر بھی لی تو اس میں یکسر ناکام رہ جاؤ گے۔ تم ایسا کر ہی نہیں سکو گے۔ اور جب صورت یہ ہے تو کیا پھر یہ بات واضح نہیں کہ یہ کتاب واقعی وحی پر مبنی ہے۔ اس رسولؐ کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی تم اسے قبول نہیں کرو گے تو اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم خود ہی تباہیوں کے جہنم میں جا گرو گے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے دو ایک نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ اس میں قرآن کی سورتوں کا ذکر آیا ہے۔ لغوی اعتبار سے اس مادہ (س۔و۔ر) کے معنی ہوتے ہیں جس[illegible] و برتری۔ شرف و فضیلت، سطوت و شوکت، جاہ و جلال،

زور اور دبدبہ۔ ان مفاہیم کے مظاہر، آگے چل کر مختلف مقامات پر، ہمارے سامنے آتے جائیں گے اور ان کی وضاحت متعلقہ مقامات پر کی جائے گی۔ لفظِ سورۃ کا مفہوم سمجھنے کے لئے اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ عربوں کے ہاں یہ لفظ اُس عمارت کے لئے بولا جاتا تھا جو خوبصورتی کے ساتھ منزل بہ منزل آسمان کی طرف بلند ہوتی چلی جائے۔ اِس عمارت کی ہر منزل کو سورۃ کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم بہ ہئیتِ مجموعی ایک عمارت ہے جو انتہائی زیبائی و رعنائی لئے ہوئے، بتدریج بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی ہر منزل کو سورۃ کہا جاتا ہے۔ اس سے ایک عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔

سورۃ کے معنی

آپ نے لوگوں کو عام طور پر یہ کہتے سنا ہوگا کہ قرآنِ کریم نزولی ترتیب کے اعتبار سے کیوں مرتب نہیں کیا گیا؟ یعنی تئیس سال کے عرصہ میں جو آیات وقتاً فوقتاً نازل ہوتی گئیں، انہیں اُسی ترتیب سے لکھتے چلے جانا چاہیئے تھا اور اس طرح یہ کتاب مرتب ہو جانی چاہیئے تھی۔ میں ایسا کہنے والوں سے کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا، صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تو حقیقت ہے کہ رسول اللہ نے قرآن اسی ترتیب کے ساتھ مرتب شکل میں امت کو دیا تھا۔[1] میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں اور گزشتہ قریب چالیس سال سے اس کا مسلسل مطالعہ کرتا چلا آرہا ہوں۔ اور یہ حقیقت علیٰ وجہ البصیرت میرے سامنے آگئی ہے کہ اس کی موجودہ ترتیب بھی ایک معجزہ ہے۔ میں نے اسے ایک نصاب کی کتاب پایا ہے۔ نصاب کی کتاب کی ترتیب اس طرح رکھی جاتی ہے کہ شروع میں اس کے مسلمات اور مبادیات مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، درجہ بدرجہ ان مسلمات کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کا ہر اگلا باب، پچھلے باب یا ابواب کا ماحصل ساتھ لیتے ہوئے آگے بڑھتا اور بلند ہوتا چلا جائے، تاآنکہ جب قاری اس کے آخری حصہ تک پہنچے تو پوری کتاب کے مندرجات نہایت حسنِ ترتیب کے ساتھ اُس کے ذہن میں منقوش ہو جائیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اسی طرح کا پایا اور اسے اسی طرح سمجھا ہے۔ اور میں اپنی بصیرت کے مطابق یہ بھی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی یہ ترتیب بھی اُس اعجاز کا ایک حصہ ہے جس کا چیلنج دنیا کو دیا گیا ہے۔ خدا کی یہ کتابِ عظیم اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے نہ تو "شانِ نزول" کی محتاج ہے اور نہ کسی اور ترتیب کی۔ یہ خود مکتفی ہے اور اپنی وضاحت آپ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو نور (روشنی) کہا ہے اور روشنی اپنی تابندگی کے دعویٰ کے لئے کسی خارجی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔

قرآن کی ترتیب

ویسے بھی اگر مزید غور کیا جائے تو یہ حقیقت کہ اس کی ترتیب بھی منجانب اللہ ہے نمایاں طور پر سامنے آجائے گی۔

---

[1] میں نے اسے اپنی کتاب "مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں" کے آخری باب میں وضاحت سے لکھا ہے۔ مزید تفصیل اسی تفسیر کے متعلقہ مقامات میں سامنے آتی جائے گی۔

خدا نے اِسے اپنی "کتاب" کہا ہے اور کتاب اُسی کو کہا جاتا ہے جو مرتب شکل میں دی جائے۔ غیر مرتب، منتشر فقرات (آیات) اور غیر مربوط ابواب (سورتوں) کو کتاب کہا ہی نہیں جا سکتا۔

دوسرے یہ کہ آج ہمارے پاس اس کا ذریعہ کون سا ہے جس کی رُو سے یقینی طور پر کہا جا سکے کہ قرآنی آیات کے نزول کی ترتیب کیا تھی ـــ یعنی کون سی آیت کب نازل ہوئی تھی۔ اس کا ذریعہ لامحالہ روایات کو قرار دیا جا سکتا (اور قرار دیا جاتا) ہے اور روایات کے غیر یقینی ہونے کی جو صورت ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں (روایات تو یہ بھی کہتی ہیں کہ رسول اللہ نے مرتب شکل میں قرآن مجید امت کو دیا ہی نہیں تھا۔ یہ بعد میں جمع اور مرتب کیا گیا تھا۔ اور جمع اور مرتب بھی اس طریق سے کہ جسے دیکھ کر انسان سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے) اس قسم کے غیر یقینی ذریعہ کی رُو سے مرتب کردہ قرآن کو اُس قرآن کا بدل (بلکہ اس سے بہتر) قرار دینا جسے خود رسول اللہ نے (من جانب اللہ) امت کو دیا تھا، بڑی زیادتی ہے۔ اس قسم کی کوششوں کا ماحصل اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ قرآنِ مجید کے متعلق شکوک پیدا ہوں قرآن اپنی موجودہ شکل و ترتیب کے ساتھ خدا کی وہ کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے رکھا ہے اور یہی قرآن دنیا کے لئے چیلنج ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد پھر اسی چیلنج کی طرف آئیے جس کا ذکر چلا آ رہا تھا۔

قرآن مجید نے یہ چیلنج اپنی قومِ مخاطب کو دیا۔ دوسرے لوگوں کو چھوڑیئے، قریش نے حضورؐ کی دعوت کی مخالفت اس کے یومِ اوّل سے اُس وقت تک مسلسل کی جب تک مکہ فتح نہیں ہو گیا۔ اس مخالفت میں ان کے ساتھ مسلسل تصادمات ہوتے رہے۔ انہوں نے لڑائی پر لڑائی لڑی اور جنگ پر جنگ کی۔ اس میں انہیں جس تکالیف اٹھانی اور نقصانات برداشت کرنے پڑے، وہ ظاہر ہے۔ اس کی آخری حد یہ تھی کہ فتح مکہ کے بعد ان کا وہ سب کچھ جاتا رہا جس کے تحفظ اور بقار کے لئے انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ سوچئے کہ اگر ان کے لئے اس چیلنج کا قبول کرنا ممکن ہوتا جو قرآن نے دیا تھا ـــ کہ اس قرآن جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ ـــ تو وہ کس آسانی سے رسول اللہ کی اس دعوت کو ختم کر سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، وہ اہلِ زبان تھے، انہیں اپنی زبان پر ناز تھا۔ ایسا ناز کہ وہ اس کے مقابلہ میں کسی اور کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے ہاں زبان کی بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ ان کے شعرا محض زبان کے زور پر انقلاب برپا کر دیتے تھے۔ قرآن خود انہی کی زبان میں نازل ہوا۔ ان کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ اس چیلنج کو قبول کر لیتے۔ قرآن نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بدوی قبائل کو بھی ملا لیں۔ اور ان کے علاوہ جن اور لوگوں کو بھی چاہیں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ ان سے اعلانیہ کہہ دیا گیا تھا کہ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۳)۔ "شہید" کے معنی گواہی دینے والا، نگران اور فیصلہ کرنے والا بھی ہوتے ہیں۔ سو، بالفاظِ دیگر ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ "اگر تم اس چیلنج کو قبول کر کے کسی محفل میں اس کا فیصلہ کرانا چاہتے ہو تو تم وہ

محفل خود اپنی نگرانی میں منعقد کرالو۔ خود تمہارے اپنے لوگ اس کی شہادت دیں گے کہ تم نے جو پیش کیا ہے وہ کیسا ہے " سوچئے کہ اگر وہ سمجھتے کہ ایسا کرنا ممکن ہے تو وہ اس چیلنج کی طرف لپک نہ آجاتے؟ انہوں نے ساری عمر جنگیں لڑیں، اپنی جان ومال کا ضیاع برداشت کیا۔ ان کے عزیز واقارب، حتیٰ کہ ان کی بیویاں تک ان کا ساتھ چھوڑ کر مخالف جماعت (مومنین) کے ساتھ مل گئیں۔ بیس سال کے عرصہ تک یہ سب کچھ ہوتا رہا، لیکن وہ اس چیلنج کے قبول کرنے کی طرف نہ آئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے مؤرخین سے کہ وہ تاریخ کی اس شہادت پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ وہ عرب اس کتاب کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچے تھے؟ باقی رہا یہ کہ جب وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ کتاب فکرِ انسانی کا نتیجہ نہیں ہو سکتی تو انہوں نے مخالفتوں اور مقابلوں کو چھوڑ کر اس کتاب کو قبول کیوں نہ کر لیا؟ تو اس کی وجہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس کی وجہ وہی تھی جسے قرآنِ کریم نے قومِ فرعون کی داستان کے ضمن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا۔ (۲۷/۱۴) "وہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا برابر مقابلہ کرتے چلے گئے، حالانکہ ان کا دل مانتا تھا کہ وہ صداقت پر مبنی ہے۔ وہ اس سے اس لئے سرکشی برتتے گئے کہ ان کا پندارِ نفس، ان کا بیجا تکبر، ان کی خو سے استبداد ان کے آڑے آتی تھی۔ وہ اسے اپنی انتہائی ذلت سمجھتے تھے"۔ اور یہ کتنی بڑی نفسیاتی حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم دو لفظوں میں بیان کر گیا ہے۔ کتنی حقیقتیں ہیں جنہیں ہم محض جھوٹی عزت اور شکستِ پندار کی بنا پر جھٹلاتے چلے جاتے ہیں، حالانکہ ان کے سچا ہونے کا ہمیں یقین ہوتا ہے۔

اور قریش تو اس باب میں قومِ فرعون سے آگے تھے۔ ان کے تکبر اور پندار کا تو یہ عالم تھا کہ جب بدر کے میدان میں ابوجہل کے حلق پر تلوار پھرنے لگی تو اس نے اپنے قاتل سے کہا کہ میری گردن ذرا اور نیچے سے کاٹو، خواہ اس میں مجھے کتنی ہی سخت تکلیف کیوں نہ ہو۔ اس نے پوچھا کہ تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ جنگ کے بعد جب مقتولین کے سروں کو نیزوں پر گاڑ کر ان کا جلوس نکالا جائے گا تو میں چاہتا ہوں کہ ابوجہل کا سر باقی سروں کے مقابلہ میں اونچا دکھائی دے۔ سوچئے کہ اس قسم کی قوم، دعوتِ محمدیہ کی صداقت کو ایسے ہی کس طرح قبول کر لیتی! انہوں نے اسے قبول نہ کیا لیکن یہ واقعہ اہلِ دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس امر کی شہادت قرار پا گیا کہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اسے ناممکن سمجھتے تھے۔ کیا یہ واقعہ اس امر کا زندہ ثبوت نہیں کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔ علمِ خداوندی ہے!

اور پھر یہ بات زمانۂ نزولِ قرآن کے مخاطبین تک ہی محدود نہیں۔ یہ چیلنج ساری دنیا کے لئے ہے اور چودہ سو سال

سے برابر دہرایا جارہا ہے۔ اس عرصہ میں (عرب اور غیر عرب) غیر مسلموں میں بھی عربی زبان کے ایسے ایسے عالم گزرے ہیں جن کا ادب میں بڑا بلند مقام ہے۔ کیا اِس چودہ سو سال میں، کسی زمانے میں، دنیا کی کسی قوم نے یا کسی فرد نے اس کا دعویٰ کیا کہ میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں؟ قریشِ مکہ نے تو چھ سات برس ہی لڑائیاں لڑی تھیں۔ دیگر اقوام اور ان کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت سے قطع نظر،

آج بھی یہ چیلنج موجود ہے

اقوامِ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے متحدہ طور پر قریب تین سو سال تک صلیبی لڑائیاں لڑیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں کتنے اور کس قدر نقصانات اٹھائے، اپنی سلطنتیں تباہ کرائیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا، لیکن اس چیلنج کو قبول نہ کر سکیں، حالانکہ اس کی رُو سے مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شکست دے دینا کس قدر آسان تھا! یہ حقیقت، کہ آجتک کسی نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا، کیا اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں؟

اور اگر ماضی کے واقعات کو چھوڑ بھی دیا جائے تو یہ چیلنج آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے۔ دنیا بھر کی غیر مسلم اقوام مسلمانوں کی مخالفت میں جس طرح سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں، اور اس کے لیے جس قدر کاوشیں اور سازشیں کر رہی ہیں — وہ کاوشیں اور سازشیں جنہوں نے ان پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے — کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں سوچ سکتیں کہ اگر اس چیلنج کا مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر لی جائے تو اسلام کو (پناہ بخدا) ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دنیا سے نیست و نابود کیا جاسکتا ہے، اور اس کے بعد مسلمان قوم کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ سکتا! یہ تو ہیں اتنی بیوقوف نہیں، کہ وہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکیں۔ لیکن ان کے اربابِ علم و نظر یہ جانتے ہیں کہ یہ چیلنج قبول نہیں کیا جاسکتا۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے ہیں تو ان کے پادریوں کی ایک فوج ان کے ساتھ آگئی اور انہوں نے جگہ بجگہ مسلمانوں کے ساتھ مناظرے شروع کر دیئے۔ یورپ کی عیسائی سلطنتیں ان کی پشت پر تھیں۔ خود ہندوستان میں انگریزی حکومت کی حمایت اور مدد انہیں حاصل تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہر موضوع پر مناظرے کئے۔ کہیں کامیابی حاصل کی کہیں شکست کھائی۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے اِسے کبھی اور کسی جگہ بھی ...... مناظرہ کا موضوع نہیں بنایا۔

بہرحال، بات اس چیلنج کی تھی جسے قرآن نے اپنی مخاطب قوم، یا دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس چیلنج کا تعلق قرآن کے اسلوبِ بیان سے تھا یا اس میں مندرج حقائق سے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق دونوں سے تھا۔ قرآن اپنے حقائق و معارف کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے اور الفاظ کے انتخاب، اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی معجزہ۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے، خدا کی طرف سے (ہر نبی پر) نازل شدہ وحی معجزہ ہوتی تھی۔ وحی کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ تھی کہ وہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی، خدا کی طرف سے عطا کردہ علم ہوتا تھا جس میں صاحبِ وحی (انسان) کی اپنی

محنت، کسب و ہنر اور کاوش و کاہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ لہذا اس اعتبار سے خدا کی طرف سے نازل شدہ ہر کتاب معجزہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے رسول اللہ سے کہا کہ آپ ان اہل کتاب (یہود) سے کہیئے ۔ قُلْ ۔ فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ ۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (۲۸/۴۹) " تم کوئی ایسی کتاب پیش کرو جو تمہارے پیغمبر پر نازل شدہ کتاب اور اس قرآن سے بہتر ہدایت دینے والی ہو تو میں اس کا اتباع کروں گا"۔ جو کتاب تمہارے پیغمبر کو دی گئی تھی وہ تو اب تمہارے پاس ہے نہیں، یہ کتاب تمہارے سامنے ہے۔ لہذا تم اس سے بہتر کتابِ ہدایت پیش کرو، اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ منجانب اللہ نہیں "۔ لہذا یہ چیلنج قرآنِ کریم کے کتابِ ہدایت ہونے کی جہت سے بھی تھا۔ لیکن اگر یہ چیلنج یہیں تک محدود ہوتا تو اس میں بحث و نزاع کا امکان تھا۔ اس کے برعکس اسلوبِ بیان کے متعلق چیلنج ایسا تھا جس میں بات مجاز اور محسوس انداز سے سامنے آسکتی تھی۔ چیلنج کا یہی وہ گوشہ تھا جس کے متعلق بار بار کہا گیا کہ یہ کتاب عربی زبان میں نازل کی گئی ہے۔ خود لفظ عربی کے معنی فصیح اور واضح کرنیوالے

عربی زبان کی کتاب

کے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربوں کو اپنی زبان کے فصیح و بلیغ ہونے پر اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے سوا ساری دنیا کو عجمی' یعنی گونگا' کہتے تھے۔ لہذا' لفظ 'عربی' کے اس بنیادی معنی کے لحاظ سے قرآن کے اسلوبِ بیان کو نہایت واضح کہا گیا۔ قرآن کی متعدد آیات میں ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۱۲/۲) " ہم نے اس قرآن کو نہایت واضح انداز میں نازل کیا ہے تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ لو "۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے معنی واضح کتاب ہونگے۔ سورۃ زمر میں اس نکتہ کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ ۔ (۳۹/۲۸) " واضح قرآن جس میں کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی ابہام نہیں، التباس نہیں، نہایت صاف و شفاف، اپنے مطالب کو وضاحت اور صراحت سے بیان کرنے والی کتاب "۔ (نیز دیکھئے۔ ۲۰/۱۱۳ ؛ ۴۱/۳ ؛ ۴۲/۷ ؛ ۴۳/۳)۔ ان آیات میں " قرآناً عربیاً "، کے معنی واضح کتاب بھی ہو سکتے ہیں اور عربی زبان کی کتاب بھی۔ ایک جگہ لِسَانًا عَرَبِيًّا (۴۶/۱۲)۔ کہا۔ یعنی عربی زبان کی کتاب۔ اور دوسری جگہ کہا بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۔ (۲۶/۱۹۵) " واضح عربی زبان کی کتاب "۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم نے جو اپنے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس کے اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش کی معجزانہ خصوصیت پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص اردو زبان میں ایک کتاب تصنیف اور شائع کرے اور اس میں بار بار کہے کہ اس کتاب کی زبان اُردو ہے تو اس کا یہ کہنا بے معنی نظر آئے گا۔ اس لئے کہ اس کتاب کی زبان خود کہہ رہی ہوگی کہ وہ اردو میں لکھی گئی ہے۔ بنا بریں' قرآنِ کریم کے اس کہنے سے کہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے۔ اور عربی زبان بھی وہ جو نہایت واضح ہے، یہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

کہ اس کا مقصد وہی چیلنج تھا جو عربوں کو دیا گیا تھا یعنی ان سے کہا یہ گیا کہ یہ خود تمہاری اپنی زبان کی کتاب ہے۔ لہٰذا تمہیں اس چیلنج کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ عربی کے سوا کسی اور زبان کی کتاب ہوتی تو تم اس پر فوراً اعتراض کر دیتے کہ یہ ہماری زبان نہیں۔ ہم اسے سمجھ تک نہیں سکتے اس لئے یہ چیلنج بے معنی ہے۔ خود قرآنِ کریم میں ہے۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ۔ (۴۱/۴۴) "اگر ہم اس قرآن کو عجمی زبان میں نازل کرتے تو یہ فوراً پکار اٹھتے کہ بات واضح طور پر کہو، ہم یہ زبان ہی نہیں سمجھ سکتے۔" دوسرے مقام پر ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس مدعیٔ رسالت کو کوئی دوسرا شخص سکھا پڑھا جاتا ہے اور یہ اسے وحی کہہ کر پیش کر دیتا ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۔ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶/۱۰۳) "ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی دوسرا شخص آ کر سکھا جاتا ہے۔ ایسا کہتے وقت وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ آ کر تمہیں یہ کتاب سکھا پڑھا جاتا ہے اس کی زبان عجمی ہے یا وہ بڑا ہی غیر فصیح ہے۔ اور یہ کتاب عربی مبین کی کتاب ہے۔" نیز دیکھئے۔ (۲۵/۵)

ان تصریحات سے مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ قرآنِ کریم کا یہ چیلنج زبان اور اسلوبِ بیان کی جہت سے بھی تھا۔ اور وہ لوگ، باوجود اس کے کہ خود ان کی زبان عربی تھی اس چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز رہے۔ علاوہ ازیں، قرآنِ کریم میں کئی ایک نکات اور بھی ایسے آئے ہیں جن سے اس چیلنج کے اِس گوشہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اُس زمانہ کے عربوں کی حقائق و معارف سے عدم واقفیت کا یہ عالم تھا کہ قرآن سے پہلے ان کے ہاں سرے سے کوئی آسمانی کتاب ہی نہیں تھی۔ سورۃ سبا میں ہے وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۳۴/۴۴)۔ "اور ہم نے انہیں اس سے پہلے نہ کوئی کتاب دی تھی جسے یہ پڑھتے پڑھاتے اور نہ ہی ان کی طرف کوئی رسول بھیجا تھا۔" اس آیت میں بات تو کسی آسمانی کتاب کی کی گئی ہے لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ عربوں کے ہاں قرآنِ کریم ہی سب سے پہلی کتاب تھی۔ ان کی تعلیمی حالت یہ تھی کہ مکہ، جو ان کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اس کی ساری آبادی میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان سترہ میں رسول اللہ شامل نہیں تھے، جس کی

حضورؐ دعوائے نبوت سے پہلے اَن پڑھ تھے

شہادت خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ سورۃ عنکبوت میں ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۹/۴۸) "اے رسولؐ! اگر تم لکھے پڑھے آدمی ہوتے تو پھر بھی ان لوگوں کے لئے شک و شبہ کی گنجائش ہوتی کہ تم نے یہ کتاب خود تصنیف کر لی ہے۔ لیکن تیری کیفیت تو یہ تھی

کہ دعویٰ نبوت سے پہلے تو نہ پڑھنا جانتا تھا نہ لکھنا۔[1]

یہ تو لکھنے پڑھنے کی بات رہی۔ جہاں تک نبوت و رسالت کا تعلق ہے، قرآنِ کریم میں ہے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ۔ (۴۲/۵۲)۔ "اے رسولؐ! تو دعویٰ نبوت سے پہلے، اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ الکتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔" یہی نہیں بلکہ وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ (۲۸/۸۶)۔ "تو کبھی اس کی توقع تک نہیں کر سکتا تھا کہ تجھے خدا کی طرف سے کتاب ملے گی۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے جو اُس نے تجھے اس سے نوازا۔"

یہ کیفیت تھی اُس شخصؐ کی، جس نے اپنی قوم کو یہ چیلنج دیا کہ آؤ تم سب مل کر اس کتاب کے کسی ایک حصہ کی مثیل و نظیر بنا کر دکھاؤ۔ اور پھر، ایسا بھی نہیں تھا کہ اس چیلنج کا دینے والا کہیں باہر سے آگیا ہو، اور اُن لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ اس کا ماضی کیا ہے؟ اس لئے انہیں شک ہو کہ یہ کہیں سے پڑھ پڑھا کر آگیا ہے اور اپنے آپ کو اَن پڑھ اور سیدھا سادھا ظاہر کر کے ایسا دعویٰ کر رہا ہے۔ حضورؐ نے جب یہ کہا کہ میں تو اس سے پہلے لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتا تھا۔ میرے توحیطۂ گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میں تمہارے سامنے کوئی ایسی کتاب پیش کر سکوں گا، تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

"میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر خود تم میں بسر کی ہے۔ اس لئے تم میرے ماضی سے اچھی طرح باخبر ہو اور جانتے ہو کہ میں کیسا شخص تھا۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ جس شخص کا ماضی یہ ہو وہ اتنا بڑا افترا کیسے کر سکتا ہے؟"

حضورؐ کے اس اعلان میں دو نوں باتیں آجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم خود جانتے ہو کہ میں ایک اَن پڑھ شخص تھا، اور میں نے کبھی خیال تک بھی نہیں کیا تھا کہ میں نبی بنا دیا جاؤں گا۔ لہٰذا یہ بات بھی تم سے پوشیدہ نہیں کہ میں اَن پڑھ ہونے کے باوجود ایسی کتاب پیش کر رہا ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ میں نے جس انداز سے اپنی ساری عمر تم میں بسر کی ہے، تمہارا کیا خیال ہے کہ اس قسم کی زندگی ایک صداقت شعار دیانت دار شخص کی ہوتی ہے، یا ایسے شخص کی جو جھوٹا دعوئے نبوت کرنے کی سوچ

---

[1] یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ ساری عمر ان پڑھ رہے، تو یہ عقیدہ قرآنِ مجید کی اس شہادت کے خلاف ہے۔ اس نے بصراحت کہا ہے کہ دعویٰ نبوت سے پہلے تیرا یہ عالم تھا کہ تو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ دعویٰ نبوت کے بعد حضورؐ کی یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ جس ہستیؐ کا فریضہ تعلیم کتاب و حکمت ہو جو ایک عظیم مدبرؐ اور وسیع و عریض مملکت کا سربراہ ہو، وہ لکھنا پڑھنا بھی نہ سیکھے۔

رہا ہو؟

اور کمال یہ کہ جہاں وہ لوگ — یعنی وہ جو مخالفت میں انتہا تک پہنچے ہوئے تھے — یہ نہ کہہ سکے کہ تم لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے کسی نے حضورؐ کی سابقہ زندگی کے خلاف بھی ایک حرف تک نہ کہا۔ لہٰذا، ہمارے نزدیک، حضورؐ کے دعوٰئ نبوت کی یہ دو نوں معجزانہ شہادات تھیں — ایک حضورؐ کی ایسی پاکیزہ سیرت، جس کے خلاف آپ کے مخالفین ایک حرف تک نہ کہہ سکے، اور دوسرے قرآن کریم، جس کا چیلنج وہ عمر بھر قبول نہ کر سکے۔

دو معجزات

جہاں تک قرآنِ کریم کے اس دعوٰی کا تعلق ہے کہ لفظی طور پر بھی اس کتاب کی مثیل و نظیر لانا انسانی فکر کے لئے ممکن نہیں، اس کا ثبوت بڑا واضح اور بیّن ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اس چودہ سو سال کے عرصہ میں عربی زبان کے بڑے بڑے نامور ادیب اور ممتاز ارباب فصاحت و بلاغت گذرے ہیں جن میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان کی تصنیف کردہ ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو انشاء اور بلاغت کے بلند ترین مقام پر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کو سامنے رکھئے اور پھر قرآن کریم کے کسی حصہ پر غور کیجئے۔ دونوں پر نمایاں فرق نظر آجائے گا۔ اور تو اور احادیث منسوب الی الرسولؐ کے مجموعوں میں بھی جہاں کہیں قرآنِ مجید کی کوئی آیت آجائے، خواہ کسی کو اس کا علم ہو یا نہ کہ وہ قرآن کی آیت ہے، وہ محض زبان کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق محسوس کر لیگا۔ ہماری کئی عربی زبان کی تفاسیر ایسی ہیں جن میں فصاحت و بلاغت پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں بھی جہاں جہاں قرآن کی آیت آتی ہے وہ باقی عبارت میں اس طرح جگمگا رہی ہوتی ہے جیسے پتھروں کے ڈھیر میں چمکتا ہوا ہیرا۔

قرآنِ کریم کے اعجاز کا یہ عالم ہے کہ عربی زبان میں اس کی مثیل و نظیر تصنیف کرنا تو ایک طرف، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کا اعتراف اپنوں کو بھی ہے اور غیروں کو بھی۔ مثال کے طور پر، مشہور مورّخ اور عربی زبان کے ممتاز نحوی اور ادیب، امام ابن قتیبہؒ (متوفی ۲۷۶ھ)، اپنی تصنیف — "کتاب الفرطین" — میں عربوں کے مختلف اسالیبِ بیان کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

> قرآنِ کریم کا نزول، ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنیوالا، قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں (کماحقہٗ) نہیں کر سکتا، جیسا کہ ترجمہ کرنے والوں نے، انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے حبشی یا رومی زبان میں کر لیا تھا، ایسے ہی

زبور اور تورات کے تراجم اور باقی کتب الہٰیہ کے تراجم عربی زبان میں کر لیے گئے تھے کیونکہ عجمی زبانوں میں، مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے[1]۔ مثال کے طور پر دیکھئے اگر آپ قرآنِ کریم کی اس آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (۸/۵۸)

تو آپ قیامت تک ایسے الفاظ مہیا نہیں کر سکتے جو ان معنوں کو ادا کر دیں جو اس آیت میں ودیعت ہیں، بجز اس کے کہ آپ اس نظم و ترتیب کو توڑ کر الگ الگ چیزوں کو ملائیں اور جو چیزیں اس میں ودیعت کی گئی تھیں، انہیں اس طرح ظاہر کر دیں، اور یوں کہیں کہ اگر تمہارے درمیان اور کسی قوم کے درمیان صلح اور معاہدہ ہو، اور تمہیں ان سے خیانت اور نقضِ عہد کا اندیشہ ہو، تو پہلے انہیں بتا دو کہ جو شرائط تم نے ان کے لیے منظور کی تھیں تم نے انہیں توڑ دیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کر دو تاکہ تم اور وہ دونوں نقضِ عہد کو جان لینے میں برابر سرابر ہو جاؤ"

ایسے ہی قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا (۱۸/۱۱)

اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کر دیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جا سکے گا جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے اور اگر آپ یہ کہیں

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ عجمی زبانوں میں عربی زبان جیسی مجاز کی وسعت نہیں۔ لیکن سوال صرف زبان کی وسعت کا نہیں عربی زبان اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس زمانے کے عربوں کے ہاں بھی موجود تھی۔ اور آج تک موجود ہے۔ اگر سوال صرف زبان کی وسعت ہی کا ہوتا تو قرآنی الفاظ کی جگہ ان کے مرادفات، بآسانی رکھ دیئے جا سکتے تھے جن کی اس زبان میں کمی نہ تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوال قرآنی الفاظ کی جگہ ان کے مرادفات کا نہیں، اصل سوال قرآن کے اسلوب بیان کا ہے جس کے متعلق مسلم اور غیر مسلم ماہرینِ لسانیات یہ متعین ہی نہیں کر سکے کہ اس اسلوب کا نام کیا رکھا جائے۔ یہ ہے وہ وجہ کہ کسی اور زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ تو ایک طرف، اس کے الفاظ کی جگہ خود عربی زبان کے مرادفات بھی رکھ دیئے جائیں تو وہ ان کا بدل نہیں ہو سکتے۔

کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے انہیں چند سال تک سلائے رکھا" تو اب بھی آپ نے مضمون کا ترجمہ تو کر دیا، مگر الفاظ کا ترجمہ نہیں کہہ سکے۔

ایسے ہی قرآنِ کریم کی تیسری آیت ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا۔ (۲۵ــــ۷۳)

اگر آپ اس آیت کا ترجمہ اس کے الفاظ کے مطابق کریں گے تو وہ ایک مغلق بات بن جائے گی۔ اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ "وہ لوگ اس سے تغافل نہیں برتتے" تو اس سے آپ نے مضمون کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا ہے، ترجمہ نہیں کیا۔

(قرطین۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۶۳)

یہ تو تھی ایک مسلم صاحب طرز ادیب کی رائے۔ غیروں میں سے بھی جس نے قرآنِ کریم کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ہمارے زمانے میں مشہور مستشرق (H. A. R. GIBB) کا شمار عربی زبان کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MODERN TRENDS IN ISLAM 1945 EDITION) میں لکھتا ہے:-

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے ...... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے، تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو، لیکن 'بایں ہمہ' جو مد و جزر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں' اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش' اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے:-

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ۔ (۵۰ــــ۴۳)

اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھائیے۔ اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ مرتبہ "ہم" (WE) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟

(صفحہ ۴ ترجمہ رواں)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بجز اس کے جو اقبالؒ کہہ گیا ہے کہ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

(۰)

اس کے بعد پھر آیت زیر نظر (۲/۲۴) کی طرف آجایئے جس میں کہا گیا ہے۔ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۔ (۲/۲۴) "ان سے کہا گیا کہ جب تم اس چیلنج کے قبول کرنے سے عاجز آجاؤ گے تو کیا پھر بھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرو گے کہ یہ کتاب کسی انسان کی فکری تخلیق نہیں خدا کی وحی ہے۔ لیکن اگر تم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرو گے تو اس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم تباہی کے النار میں جا گرو گے۔

النّار کے معنی

اس النّار میں جس کا ایندھن النّاس اور الحجارۃ ہیں اور جو ان صداقتوں سے انکار کرنے کا فطری نتیجہ ہے۔" اس میں پہلا وضاحت طلب لفظ النّار ہے۔ اس کے عام معنی آگ ہیں لیکن جس طرح ہمارے ہاں، غصہ کی آگ، انتقام کی آگ، دشمنی کی آگ، آتش حسد اور آتش بغض کے الفاظ عام طور پر استعمال ہوتے ہیں عربوں کے ہاں نار کا لفظ بھی ان معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ نیز عرب "نار الحرب" اس آگ کو کہتے تھے جسے وہ اعلانِ جنگ کے لئے پہاڑیوں کی چوٹی پر جلاتے تھے۔ اور "نار القوم" کے معنی ہیں اُس قوم نے شکست کھائی۔ اس سے اس لفظ النّار کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ خود قرآنِ کریم نے اسے تباہی اور بربادی اور شکست و ہزیمت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم خدا کی اُس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس طرح تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (۳/۱۰۲)۔ "تم تباہی اور بربادی کے جہنم (النار) کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ خدا نے تمہیں اس میں گرتے گرتے بچا لیا۔" ظاہر ہے کہ یہاں النّار سے مراد وہ تباہی ہے جو افرادِ قوم کی باہمی عداوت اور خانہ جنگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ خود قرآن نے اسے "نار الحرب" (۵/۶۴) کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ النّور میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ خدا جماعتِ مومنین کو استخلاف فی الارض عطا کرے گا (۲۴/۵۵-۵۶) لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ

فِی الْاَرْضِ ۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۔ (۲۴/۵۷) "یہ لوگ جو اس نظام کی مخالفت میں اس قدر جدّوجہد کر رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس جماعت کو شکست دے دینگے۔ انہیں شکست نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس' یہ مخالفین خود نذرِ آتش ہو جائینگے۔ اور سوچئے کہ یہ کیسا بُرا انجام ہوگا" ظاہر ہے کہ یہاں النّار سے مراد شکست اور ذلّت کی زندگی ہے۔

قرآنِ کریم میں عام طور پر النّار سے مراد جہنم ہے، اور ہمارے ہاں عام عقیدہ یہی ہے کہ جہنم ایک ایسا مقام ہے جس میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور اس میں کفار کو جھونکا جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہنم' اُخروی زندگی میں معصیت اور سرکشی کا مآل ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جنت اور جہنم ان قلبی کیفیات کا نام ہے جن کا سلسلہ اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر متعلقہ مقامات پر سامنے آتی جائے گی) یہاں ہم مختصر الفاظ میں اتنا بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جہنّم کے معنی کیا ہیں اور اس کا قرآنی مفہوم کیا؟

جہنّم کے معنی

زمانہ قدیم میں یروشلم کے جنوب میں ایک وادی تھی جس میں مولوک دیوتا کا مندر تھا۔ وہاں انسانوں کو زندہ جلا کر اس دیوتا کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی۔ عبرانی زبان میں وادی کو جی کہتے ہیں اور جس شخص کی طرف وہ وادی منسوب تھی اس کا نام ہنوم تھا۔ اس بنا پر اس وادی کو جس میں انسانوں کو جلا کر قربان کیا جاتا تھا، "جی۔ہنوم" (یا جہنم) کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے جہنّم سے مراد "انسانیت کی قربان گاہ" ہوگا' اور عذابِ جہنم کا مفہوم ہوگا، انسانیت سوز عذاب، خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ قرآنِ کریم اپنے بسیط حقائق کو محسوس تشبیہات و تمثیلات کے ذریعہ سمجھاتا ہے۔ اس نے جہنم کی اس کیفیت کو بھی مختلف محسوس تشبیہات کی رُو سے سمجھایا ہے۔ انہی کو' قرآن میں بیان کردہ جہنم کی تفصیلات کہا جائے گا۔ لیکن انہیں' بہرحال' تشبیہات ہی سمجھنا چاہیئے۔

اُخروی زندگی کی ماہیت اور نوعیت کا سمجھ لینا ہمارے شعور کی موجودہ سطح کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اتنی بات بہرحال' واضح ہے کہ جہنم کسی گڑھے کا نام نہیں جس میں آگ جلائی گئی ہو۔ یہ قلبِ سوزاں کی کیفیت کا نام ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۔ (۱۰۴/۶-۷) "خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں" اسی طرح سورۃ توبہ میں بیان کردہ مسجدِ ضرار کے واقعہ کو سامنے لائیے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ منافقین نے اس مسجد کی بنیاد تباہی کے کنارے پر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ۔ (۹/۱۰۹) "وہ عمارت اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم میں جا گری" یہ جہنم کیا تھا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۔ (۹/۱۱۰) "ان کے دل، اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن گئے" اور اس اضطرابی کیفیت نے

ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔" یہ ہے جہنم۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ "تم اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن 'الناس اور الحجارۃ' ہیں"۔ ایندھن کے لئے لفظ وَقُود آیا ہے۔ وَقَدٌ آگ کو کہتے ہیں اور وَقُوْدٌ ان لکڑیوں کو جن سے آگ جلائی جائے۔ حَطَبٌ ایندھن کے لئے رکھی ہوئی لکڑیوں کو کہتے ہیں، اور وُقُوْدٌ اس وقت کہتے ہیں جب ان لکڑیوں کو سلگا دیا جائے۔ لہٰذا "وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ" کے معنی ہوں گے وہ آگ جس کے شعلے الناس اور الحجارۃ کے اپنے پیدا کردہ ہوں گے۔ بانگِ درا میں 'سیرِ فلک' کے عنوان سے، علامہ اقبالؒ کی ایک نظم ہے جو جہنم کی حقیقت کو بڑے معنی خیز اور بصیرت افروز انداز سے سامنے لاتی ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ جب وہ جنت کے "خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش" نظارہ سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے دور ایک یخ بستہ سرد خانہ دیکھا۔ اپنے گائیڈ سے پوچھا کہ یہ خطۂ زمہریر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جہنم ہے۔ اس پر انہوں نے بصد استعجاب کہا کہ ہم نے تو سن رکھا ہے کہ جہنم میں بھڑکتے ہوئے شعلے ہوں گے اور آپ اس یخ بستہ خطہ کو جہنم بتا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ جہنم ہی ہے لیکن اس کے شعلے اپنے نہیں ہوتے۔

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں　　　اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں!

یہ ہے وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ کا مفہوم۔

چند ایک دیگر مقامات پر بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔ مثلاً آیت (۶۶/۶) میں یہی الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ آلِ عمران میں کفار کے متعلق کہا گیا ہے۔ وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ۔ (۳/۹) "یہ لوگ خود ہی جہنم کا ایندھن ہیں"۔ سورۃ انبیاء میں باطل پرستوں سے کہا گیا کہ اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ (۲۱/۹۸) "تم خود اور تمہارے یہ باطل پرست مقتدا جن کی تم عبودیت اختیار کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں"۔ سورۃ الجن میں صحیح راستے سے ہٹ جانے والوں کے متعلق کہا۔ فَکَانُوْا لِجَھَنَّمَ حَطَبًا۔ (۷۲/۱۵) "یہ جہنم کا ایندھن ہیں"۔

النّاس والحجارۃ

آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اس جہنم کا ایندھن الناس اور الحجارۃ ہوں گے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے انسان اور پتھر۔ اور پتھروں سے مراد لی جاتی ہے وہ بت جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ آیت کے اگلے لفظ ہیں اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (۲/۲۴) "یعنی وہ آگ جسے کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ پتھر، خواہ ناتراشیدہ ہو، یا اُسے تراش کر کوئی مورتی بنا دی جائے نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ مومن اور کافر تو انسان ہی ہوتے ہیں، پتھر نہیں ہوتے۔ اس لئے جو آگ کفار کے لئے تیار کی گئی ہو اس میں پتھروں کے جھونک دینے کا کیا مطلب؟

النّاس کے عام معنی نوعِ انسانی ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ تقابلی طور پر آئے گا تو اس کے معنے عوام الناس ہوں گے یعنی عام لوگ۔ مثلاً قرآن کریم مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہتا ہے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲/۴۴)۔ "تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم، لوگوں کو تو یہ وعظ و نصیحت کرتے ہو کہ وہ نیک کام کریں، اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔" حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ الکتاب کے احکام، عوام اور مذہبی پیشواؤں، دونوں کے لئے یکساں طور پر واجب الاتباع ہوتے ہیں۔" دوسری جگہ ان مذہبی پیشواؤں کے متعلق ہے لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۹/۳۴)" یہ، الناس، یعنی اپنے پیچھے چلنے والے عوام کا مال باطل طریق سے کھا جاتے ہیں۔" ان مقامات میں، ظاہر ہے کہ النّاس سے مراد مذہبی پیشواؤں کا اتباع کرنے والے عوام ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴/۳۷)۔ "یہ وہ لوگ ہیں خود بھی بخل کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور الناس کو بھی یہی حکم دیتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔" (نیز ۵۷/۲۴)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں النّاس سے مراد عوام ہیں اور حکم دینے والے ارباب اقتدار یا قوم کے لیڈر۔

ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ النّاس سے مراد عوام ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو مذہبی پیشواؤں، قومی لیڈروں یا حکمرانوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

اب آیئے لفظ حِجَارَۃ کی طرف۔ اس کا مادہ (ح۔ج۔ر) ہے جس کی بنیادی معنی ہیں روکنا۔ منع کرنا۔ اور اس سے مراد ہوتی ہے عقل۔ جو انسان کو یہ بتاتی ہے کہ تمہیں کس مقام پر رُک جانا چاہیئے۔[1] (خود لفظِ عقل کے معنی بھی روکنے اور منع کرنے کے ہیں)۔ اس اعتبار سے حَجِرٌ ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو "ذِی حِجْرٍ" (۸۹/۵) کہا ہے۔ یعنی ارباب دانش و بینش۔ لیکن وہی ارباب دانش و بینش جو بڑے چالاک اور ہوشیار ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو مذہبی پیشوا، قومی لیڈر یا اربابِ اقتدار بن کر خدا کی طرف جانے والے راستوں میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بنا بریں "وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" کے معنے ہوں گے عوام اور ان کے لیڈر۔ قرآن کریم میں، جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں کے باہمی جھگڑوں کو تشبیہی انداز میں بڑے عبرت آموز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ سبا کی آیات (۳۴/۳۱-۳۳) میں کہا گیا ہے۔[2]

---

[1] پتھر کو حجر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔
[2] آیات کسی نسخہ قرآن مجید میں دیکھ لیجئے۔

اگر تو اس منظر کو سامنے لاتے جب یہ لوگ، جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی، خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روی کا ایک دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔

لیڈر کہیں گے، ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو۔ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستہ کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو۔

ان کے متبعین کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچھاتے تھے، جس سے ہم سیدھے راستہ کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا۔

لیکن ان کا یہ عذر قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جائے گا اور ان سب داخلِ جہنم کر دیا جائے گا۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ جہنم میں جانے والے ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کر کے ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کب اختیار و اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستہ پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم غلط راستہ پر چل رہے تھے۔ لیکن ہم نے تو تمہیں اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔ تم خود ہی پیچھے چل پڑے تھے۔ اب ہم سب اس عذاب میں برابر کے شریک ہیں (۳۷/۲۲-۳۴)۔[1]

سورۃ مومن میں ہے:

جہنم میں متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے اور تم ہمیں بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے۔ اب ذرا اس عذاب سے ہمیں چھڑا دو۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہم خود اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ اب تو ہم سب کو یہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ (۴۰/۴۷-۴۸ نیز ۲/۱۶۶-۱۶۷ ؛ ۲۶/۹۵-۱۰۲)[1]

ان تصریحات سے بتانا یہ مقصود ہے کہ آیت (۲/۲۴) میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر ان واضح دلائل کے باوجود تم ان صداقتوں کا انکار کئے چلے جاؤ گے تو تم تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرو گے ــــ تم بھی اور تمہارے پیچھے چلنے والے عوام

---

[1] آیات کسی نسخۂ قرآن مجید میں دیکھ لیجئے۔

بھی ــــ وہ تباہی جو غلط راستے پر چلنے کا فطری انجام ہوتی ہے۔

اس کے برعکس وہ جماعت ہے جو ان صداقتوں کو تسلیم کرکے خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے۔ ان کی زندگی کس قسم کی خوشگواریوں کی آماجگاہ ہوتی ہے اسے اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

۲/۲۵
(۲/۲۵) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا
الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ۔ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ
مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

قرآن کریم نے حضراتِ انبیاءؑ کرام کو نذیر اور بشیر کہکر پکارا ہے یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے والے اور ان کے حسنِ عمل کے خوشگوار اثرات کی خوشخبریاں دینے والے۔ فریضۂ تنذیر کو آیت (۲/۲۴) میں ادا کرنے کے بعد، اب قرآن کریم تبشیر کی طرف آیا ہے۔ آیۂ زیرِ نظر کا عام ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

> اے رسولؐ! تو خوشخبری دے ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، کہ ان کے واسطے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انہیں وہاں جب کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے قبل مل چکا ہے۔ انہیں یہ پھل ملتی جلتی ہوئی شکل میں دیئے جائیں گے اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ ازواج ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایمان کا تفصیلی بیان آیت (۲/۳) میں گزر چکا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک عملِ صالحہ کا تعلق ہے اس کا عمومی تصور لفظ فساد کے ضمن میں، آیت (۲/۱۱) میں دیا جا چکا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ فساد اور اعمالِ صالحہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس تقابل سے اعمالِ صالحہ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ مادہ اس کا (ص-ل-ح)

اعمالِ صالحہ

ہے۔ اَصْلَحَ اِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں اَحْسَنَ اِلَيْهِ، یعنی اس نے ایسا کام کیا جس سے دوسرے آدمی کی خرابی، نقص یا کمی دور ہوگئی۔ لہٰذا اعمالِ صالحہ سے مراد ہیں حسن کارانہ توازن پیدا کرنے والے کام۔ اَلصَّلَاح کے معنی ہوتے ہیں حالات کا عقل و شرع کے تقاضوں کے مطابق معتدل و مستقیم ہو جانا۔ یعنی جس چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے اس کا ٹھیک اسی حالت میں ہونا۔ بالکل مناسب، درست باترتیب، ٹھیک حالت میں رہنا۔ اس مفہوم کی وسعت کے اعتبار سے اعمالِ صالحہ

کے معنی ہوں گے ایسے کام، جن سے انسان کی مضمر صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور ناہمواریاں دُور ہو جائیں۔ جو کام اس دنیا اور آخرت، دونوں کی زندگی کی خوشگواریوں کو اپنے ساتھ لائیں۔ یہ بہرحال وہی کام ہوں گے جو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوں۔ قرآن کریم میں آپ شروع سے آخر تک دیکھیں گے کہ "اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت" لازم و ملزوم طور پر ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اور اس کے ساتھ ہی قرآن میں بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق صلاحیت بخش کام کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ وہ اعمال، جن کا سرچشمہ دل کا یقین (ایمان) نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں جو میکانیکی طور پر سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے اس لئے کہ صحیح اعمال کا اولین نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان کے اندر تبدیلی پیدا ہو۔ اس کی ذات نشو و نما پائے۔ جس سے اس کی سیرت میں پاکیزگی اور کردار میں بلندی پیدا ہو۔ جو کام میکانیکی طور پر کئے جائیں ان سے یہ نتیجہ کبھی مرتب نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف، وہ ایمان جو اعمالِ صالحہ کا محرک نہیں بنتا، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے جو اسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال بلا ایمان بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ نیز اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست و معیار کے مطابق اعمالِ صالحہ سمجھ لیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے بہت سے کاموں کو اعمالِ صالحہ کے طور پر بیان کیا ہے لیکن ان اعمال کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم کا نام ہے جنہیں قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے متعین کیا ہے، اور اعمالِ صالحہ، ان اقدار کے تحفظ (یعنی ان کے مطابق کام کرنے) کو کہتے ہیں، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہو گی۔ اسی کو بالفاظِ دیگر کیریکٹر کہا جائے گا۔ لہٰذا کیریکٹر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو۔ اس کی پہچان ان کاموں کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس شخص سے سرزد ہوں، اور اس کا محسوس نتیجہ یہ ہو کہ نوعِ انسان کے معاملات سنور جائیں اور معاشرہ میں حُسن پیدا ہو جائے۔ قرآن کریم نے ان کا نتیجہ اَلْجَنَّة بتایا ہے۔ بلکہ یہاں جنّت کی بجائے جنّٰت کا لفظ آیا ہے۔ اَلْجَنَّة قرآن کریم کی بڑی بنیادی اور جامع اصطلاح ہے جس کا پورا پورا مفہوم کسی ایک مقام پر سامنے نہیں آ سکتا کیونکہ اسکی تفاصیل یہاں سے وہاں تک قرآن کریم کے صفحات پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔

جنّت کا مفہوم

لغوی طور پر اس مادہ (ج-ن-ن) کے معنے ہیں چھپا لینا۔ اس مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک کا ذکر قرآن کریم میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ لیکن یہاں ہم ان میں سے صرف ایک لفظ (جنّت) ہی کو لیں گے۔ جنّت کے معنی باغ کے ہیں۔ بالخصوص اس باغ کے جس کی

زمین درختوں کی کثرت اور روئیدگی کی بہتات کی وجہ سے چھپی ہوتی ہو، نظر نہ آئے۔ قرآن کریم میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ اس دنیا کی جنت بھی بتایا گیا ہے اور اُخروی زندگی کی جنت بھی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اُخروی زندگی اور اس کی کیفیات کی کُنہ اور حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لئے قرآن کریم نے انہیں تمثیلات اور تشبیہات کے پیکروں میں پیش کیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (۱۳/۳۵) "جس جنّت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے بعد اس کی تفاصیل دی گئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ محمدؐ کی آیت (۴۷/۱۵) میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ جنتِ اُخروی کا بیان تمثیلی اور تشبیہی ہے۔ اس لئے ان الفاظ کے وہ معنے نہیں لینے چاہیئے جن معانی میں ہم انہیں اپنی محسوس دنیا میں استعمال کرتے ہیں۔ اس نے یہ بتانے کے لئے کہ جنت کسی مقام کا نام نہیں، کہا ہے۔ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۲۱ نیز ۳/۱۳۲) "وہ جنت، جس کی وسعتیں ارض و سمٰوٰت، یعنی تمام کائنات کو محیط ہیں"۔ اس کے چشموں کے متعلق کہا۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (۷۶/۶)۔ "خدا کے بندے ان چشموں سے سیراب ہوں گے جنہیں وہ خود اپنے قلب کی گہرائیوں سے بہا کر لائیں گے"۔ قرآنی تمثیلات کے متعلق اس نے کہا۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹/۴۳)۔ "ان مثالوں کی رو سے وہ لوگ حقیقت تک پہنچ سکیں گے جو علم کے ذریعہ ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے"۔ جو لوگ یہ خیال کریں کہ ان سے، اسی دنیا کی محسوس اشیاء جیسی چیزیں مراد ہیں، تو انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۲/۱۷)۔ "کوئی شخص یہ جان نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کے نتیجہ میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان، اُن سے مخفی رکھا ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟" باقی رہا ان کا تشبیہی اور تمثیلی بیان، تو یہ ظاہر ہے کہ یہ مثالیں ایسی ہونی چاہیئے تھیں جنہیں قرآن کی اولیں مخاطب قوم بآسانی سمجھ سکتی۔ عرب جیسے ملک میں، چاروں طرف تپتے ہوئے صحرا پھیلے ہوئے تھے جن میں کہیں کہیں پانی کا کوئی ایک آدھ چشمہ مل جاتا تھا اور اس چشمے کے گرد دو چار درخت اُگ آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس سے زیادہ آرام دِہ، پر آسائش، سکون بخش منظر اور کون سا ہو سکتا تھا کہ گھنے باغات ہوں جن میں صاف شفاف چشمے ہوں۔ ان چشموں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی چاروں طرف بہہ رہا ہو۔ اس باغ میں تپش کا کہیں گزر نہ ہو۔ درخت پھلوں سے لدے ہوتے ہوں۔ دودھ اور شہد کی ایسی افراط ہو گویا ان کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ کھانے کے لئے پرندوں کا لطیف گوشت میسر ہو۔ ان باغات میں نہایت آرام دِہ خیمے نصب ہوں ——— ان کے نزدیک اس سے زیادہ آسائش بخش سامانِ زیست اور کونسا ہو سکتا تھا؟ اس سے

آگے بڑھتے تو ان میں سے جو لوگ ایران اور بازنطینی حکومتوں کے زیرِ سایہ شہروں میں آتے جاتے تھے وہ وہاں کی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ، جس سامانِ آرائش و زیبائش کو دیکھتے تھے وہ ان کے لئے یقیناً جنت نگاہ اور فردوسِ گوش بنا ہوگا۔ قرآن کریم نے جنتی زندگی کے سلسلہ میں اس سامان کا بھی ذکر کیا اور نہایت دلآویز انداز میں کیا۔ اعلیٰ درجے کے قالین اور صوفے بچھے ہوئے، عالیشان محلات، جن میں حریر و اطلس کے پردے آویزاں، بلوریں آفتابے، چاندی سونے کے ظروف، نہایت خوش ذائقہ مشروبات، ایسا دلکش ماحول اور اس میں ہم مزاج، ہم رنگ، ہم آہنگ احباب کی محفلیں ـــــ ان عربوں کو جنتی زندگی اسی قسم کی مثالوں سے سمجھائی جا سکتی تھی۔ اگر قرآن کی اولین مخاطب قوم کے تصوراتِ زندگی کچھ اور ہوتے تو انہیں انہی کے مطابق تمثیلات و تشبیہات کے ذریعہ جنت کی مجرد حقیقتوں کو سمجھایا جاتا۔

ان باغات میں جو پانی کی ندیاں رواں دواں بتائی گئی ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے حسنِ عمل کے نتائج، زمان و مکان کی حدود کے پابند نہیں۔ ان سے پیدا ہونے والے باغات ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں گے یعنی جب تک انسانوں سے یہ اعمال سرزد ہوتے رہیں گے ان سے یہ نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ سورۃ الرعد میں کہا گیا مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۔ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (۱۳/۳۵)۔ "متقیوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک باغ ہے جس کے نیچے پانی کی ندیاں رواں دواں ہیں۔ اس کے درختوں کے پتے خزاں ناآشنا ہیں۔ اس لئے ان کے سائے میں بھی کبھی فرق نہیں آتا اور ان درختوں کے پھل بھی ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی خاص موسم میں پھل لگیں اور دوسرے موسم میں وہ پھلوں کے بغیر رہ جائیں۔ یہ ہے ان لوگوں کی زندگی کی مثال جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔" سورۃ ابراہیم میں اس حقیقت کو اور بھی زیادہ دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے باغات اور ان کے نیچے بہنے والی ندیوں کا ذکر کیا گیا۔ پھر کہا اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۔ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۱۴/۲۴-۲۵)۔ "تم غور کرو کہ اللہ کس طرح مثالوں کے ذریعہ بات سمجھاتا ہے؟ زندگی بخش اور ثمر بار نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں پھل دیتا چلا جائے۔ ہم ایسی مثالیں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ ان کے اندر چھپی حقیقتوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے لا سکیں۔" اقبالؒ

کے الفاظ میں :-

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند ؛ بہار ہو کہ خزاں لاالٰہ الاّ اللہ

لیکن قرآنِ کریم نے ایک ہی جنت کا ذکر نہیں کیا۔ کہا ہے وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (۵۵/۴۶)۔ "جن لوگوں کو عدالتِ خداوندی میں حاضر ہونے کا احساس ہے ـــــ یعنی وہ جانتے ہیں کہ اُن سے ان کے ہر کام کی بازپرس ہوگی تو ان کے لئے دو جنتیں ہوں گی"۔ یعنی ایک جنت اس دنیا میں اور دوسری جنت آخرت میں۔ پھر ان جنتوں کے متعلق کہا ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ (۵۵/۴۸)۔ ان جنتوں میں زندگی (MONOTONOUS) نہیں ہوگی بلکہ ان میں بڑی (VARIETIES) ہوں گی"۔

اُخروی جنت کی طرح قرآنِ کریم نے جنتِ ارضی کے کوائف کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اس کی ابتدا جنتِ آدم سے کی ہے، اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، آدم کی داستان کسی فرد کی داستان نہیں، بلکہ یہ خود آدمی کی کہانی ہے۔ نوعِ انسان کی سرگزشت، جسے بڑے دلنشیں محاکاتی انداز میں تمثیلاً بیان کیا گیا ہے اس

جنتِ ارضی

کا تعلق بہرحال اسی دنیا سے ہے کیونکہ کہا یہ گیا ہے وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً (۲/۳۰)۔ "جب خدا نے ملائکہ سے کہا ہم اب زمین میں سابقہ مخلوق کے جانشین کے طور پر ایک نئی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو"۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے انسان کی اسی زندگی کا بیان مقصود ہے۔ اس کے بعد ہے کہ آدم کو الجنّۃ میں رہنے کے لئے کہا اور اس اَلۡجَنَّةَ کی پہلی خصوصیت یہ تھی وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا (۲/۳۵) "اس میں وسائلِ رزق پر حدبندیاں نہیں کی گئی تھیں۔ اس میں "میری اور تیری" کا سوال نہیں تھا۔ اس میں کیفیت یہ تھی کہ جس کا جہاں سے جی چاہے، پیٹ بھر کر کھالے"۔ دوسری جگہ ہے کہ آدم سے کہا گیا ... کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَلَا تَعۡرٰى ۙ وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ "اس میں تجھے نہ تو روٹی کی محتاجی کا خوف لاحق ہوگا، نہ کپڑے سے محرومی کا خدشہ۔ اس میں تجھے نہ پانی کی کمیابی کا خطرہ ہوگا اور نہ ہی سکونت کے متعلق کسی قسم کا اندیشہ"۔ اس میں: لَا يَمَسُّهُمۡ فِيۡهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمۡ مِّنۡهَا بِمُخۡرَجِيۡنَ (۱۵/۴۸)۔ "سامانِ رزق کے حصول کے لئے نہ تو جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی، نہ کسی قسم کا اضمحلال اور افسردگی ہوگی، اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہاں اس بات کی پوری پوری ضمانت ہوگی کہ وہاں سے انہیں کوئی نکالے گا نہیں" (نیز ۳۵/۳۵)۔ وہاں صرف سامانِ زیست ہی نہیں

ملے گا۔ وہاں معاشرتی زندگی ایسی پاکیزہ ہوگی کہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۵۶/۲۵-۲۶)۔ اس میں کوئی لغو اور بیہودہ بات سننے میں نہیں آئے گی نہ ہی کوئی ایسی بات ہوگی جس سے درماندگی پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس، وہاں چاروں طرف سے امن و سلامتی کی صدائیں اور دعائیں فردوس گوش بنیں گی" (نیز ۱۳/۲۴ و ۱۴/۲۳)۔ اس لئے کہ اُس معاشرہ کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے خلاف کسی قسم کا بغض، کینہ یا حسد نہیں ہوگا۔ یعنی کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جسے دوسروں سے چھپا کر رکھیں (۷/۴۳ و ۱۵/۴۷) سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں کوئی کسی کو ذلیل اور خوار نہیں کر سکے گا۔ وہاں شرفِ آدمیت اور احترامِ انسانیت کا پورا پورا تحفظ ہوگا غرضیکہ وہاں کیفیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۶/۴۸)۔ "نہ کسی قسم کا خارجی خوف ہوگا نہ داخلی حزن و ملال"۔

یہ وہ جنتِ ارضی تھی جو اس دنیا میں ان قوموں کو حاصل ہوئی جنہوں نے ایمان و اعمالِ صالحہ کی زندگی بسر کی۔ اور جو آج سے چودہ سو سال پہلے محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہٗ کے عہدِ ہمایوں میں دنیا کے سامنے آئی۔ قرآن کریم نے قوم فرعون اور بنی اسرائیل کی کشمکش کے سلسلہ میں کہا ہے۔ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ۔ كَذٰلِكَ۔ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۵۷-۵۹)۔ "ہم نے اپنے قانونِ مکافات کے مطابق قوم فرعون کو اس سرزمین سے نکال باہر کیا جس میں ان کے باغات اور چشمے تھے۔ جن میں ان کے خزانے اور انتہائی تکریم و عزت کے مقامات تھے اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا" (نیز ۴۴/۲۵-۲۸) اس نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ اگر تم نے ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کی تو۔ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۱/۱۲)۔ "ہم تمہیں بھرپور آسائشوں کے سرسبز و شاداب باغات میں نہایت پاکیزہ مساکن عطا کریں گے"۔ اور جب آخرالامر انہیں یہ جنتِ ارضی عطا ہوگئی تو وہ بیساختہ پکار اُٹھے۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۳۹/۷۴)۔ "کس قدر مستحقِ ستائش ہے خدا کی ذات جس نے اپنے وعدوں کو اس طرح پورا کر دکھایا اور ہمیں اسی دنیا میں اس جنت کا مالک بنا دیا جہاں ہمیں اس امر کا پورا پورا اقتدار اور اختیار حاصل ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح جی چاہیں رہیں سہیں۔ کس قدر عمدہ اور خوشگوار ہے کام کرنے والوں کی محنت کا یہ صلہ!"۔ قرآن کریم نے صلح حدیبیہ کا، جو فتح مکّہ کی تمہید تھی، مقصد یہ بتایا ہے لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ

سَیِّاٰتِھِمْ ۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴۸/۵) " تاکہ اس سے ہم مومنین اور مومنات کو اس جنت میں بسا سکیں جس کی بہاریں خزاں نا آشنا ہوں۔ اور اس طرح ان کے معاشرے کی ناہمواریوں کو دور کر دیں۔ معیارِ خداوندی کی رو سے بہت بڑی کامیابی ہے جسے حاصل ہو جاتے"۔ یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنت صرف مردوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ مردوں اور عورتوں، مومنین اور مومنات —— دونوں کے لئے ہو گی۔ چنانچہ دوسری جگہ کہا ہے

مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴) "جو کوئی بھی عملِ صالحہ کرے گا، خواہ وہ مرد ہو اور خواہ عورت؛ اور وہ مومن بھی ہو، تو انہیں جنت میں داخل کیا جاتے گا۔ اور ان کے حسنِ عمل کے صلہ میں ذرا برابر بھی کمی نہیں کی جاتے گی"۔

اور دوسری بات یہ سامنے آئی کہ جنتِ ارضی کے متعلق خدا کے یہ وعدے فتح مکہ کے قریب جاکر پورے ہوتے۔ یعنی قریب بیس[*] برسوں پر پھیلی ہوئی زندگی کے ان جانکاہ تصادمات اور صعوبات کے بعد، جن کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

جانکاہ تصامات کے بعد

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا ۔ حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲/۲۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی، مفت میں، جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی ان جانگداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس قسم کے انقلاب آفرینی کے لئے جدوجہد کی۔ کیفیت یہ تھی کہ سختیاں اور مصائب انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارِ الٰہا! ہماری کوششوں کی بارآوری کا وقت کب آئے گا؟ ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جاکر ان کی کوششیں کامیاب ہوتی رہیں اور تائیدِ ایزدی ان کی سعی و عمل کو ثمربار کرتی رہی۔

تمہیں بھی انہی مراحل میں سے گزرنے کے بعد جنّتی زندگی مل سکے گی۔

(نیز دیکھئے ۳/۱۴۱؛ ۹/۱۶؛ ۲۹/۲؛ ۳۳/۱۰)۔

جنّتِ ارضی کے متعلق ہم سر دست انہی کوائف پر اکتفا کرتے ہیں اور ان میں صرف ایک اضافہ ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ جنت، اجتماعی زندگی بسر کرنے سے حاصل ہو سکے گی۔

جنّتِ اجتماعی زندگی سے حاصل ہوگی

خانقاہیت کے خلوت کدوں کی انفرادی زندگی کی رُو سے نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کے لئے شرط ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹/۲۹-۳۰) "تم میرے بندوں کے ساتھ مل جاؤ اور اس طرح میری جنت میں داخل ہو جاؤ" جنت قرآنی معاشرہ کی تشکیل سے حاصل ہوتی ہے۔

جنت کی زندگی میں یہ بھی کہا گیا ہے وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ (۲/۲۵)۔ "اس میں پاکیزہ ازواج ہوں گی" ہمارے ہاں عام تصور یہی ہے کہ جنت، اُخروی زندگی میں جاکر ملے گی اور اس میں جنتی مردوں کو بڑی خوبصورت بیویاں ملیں گی جنہیں حوریں کہکر پکارا گیا ہے۔ چونکہ اس تصور کی رو سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسلام کے مخالفین اس پر بڑے اعتراضات کرتے ہیں، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نکتہ کی وضاحت یہیں کر دی جائے۔

جنّت میں ازواج

ہمارے ہاں ازواج کے معنے بیویاں ہی لئے جاتے ہیں۔ حتیٰکہ زوجہ بیوی کو کہا جاتا ہے اور خاوند کو زوج بھی نہیں کہا جاتا۔ لیکن عربی زبان (اور قرآن کریم) میں جسطرح یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کی رو سے اس کے معنی بڑے وسیع ہیں۔ زبان کے اعتبار سے زوجاً ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔ جب دو چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک کے بغیر دوسری کی تکمیل نہ ہو سکے تو ان میں سے ایک کو دوسری کا زوج کہا جائے گا۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیے ایک دوسرے کے زوج کہلائیں گے، کیونکہ اگر ایک پہیہ نہ ہو تو دوسرا بیکار رہ جاتا ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دونوں پہیے ایک جیسے ہوں۔ اگر ان میں ذراسی بھی عدم مطابقت ہوگی تو گاڑی چل نہیں سکے گی۔ اس اعتبار سے ازواج کے معنی ہوتے ہیں ہم فکر، ہم رنگ، ہم آہنگ رفقاء (COMPANIONS)۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم کے معیار کی رو سے، میاں بیوی کو سب سے زیادہ ہم آہنگ و یکرنگ، ایک دوسرے کا رفیق ہونا چاہیئے، اس لئے میاں بیوی کا زوج ہوتا ہے (۵۵/۱) اور بیوی میاں کی زوج۔ اس نقطۂ نگاہ سے

دیکھئے تو جنتِ ارضی میں ازواج سے مراد ہم فکر و یکرنگ رفقاء بھی ہوں گے اور ہم مزاج و ہم آہنگ میاں بیوی بھی۔ لیکن جنتِ اُخروی کا تصور چونکہ اس قسم کا مادی تصور نہیں، اس لئے اس میں ازواج سے مراد ہم آہنگ رفقاء کے ہوں گے جن میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوں گے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس زندگی میں مرد اور عورت کی موجودہ حیاتیاتی (BIOLOGICAL) یا جنسی (SEXUAL) تمیز علی حالہ رہے گی یا اس کا انداز بھی کچھ اور ہوگا، کیونکہ وہاں کی زندگی کی کیفیت و ماہیت کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ محض لفظ ازواج سے ذہن کو جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہو جانا چاہیئے۔ اس سے رفقاء کا مفہوم ہی لینا چاہیئے۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنت کی زندگی اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ اُس میں خدا کے بندوں کا ایک دوسرے سے مل کر رہنا ضروری ہے (۸۹/۴۹)۔ یہ سب ایک دوسرے کے زوج ہوں گے۔

حوروں سے مراد

جنت کے سلسلہ میں حوروں کا ذکر بھی آتا ہے اور اس کے عام مفہوم کے اعتبار سے بھی ذہن اخروی جنت میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اگر اُخروی جنت میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا سلسلہ بھی باقی رہے گا تو یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں لیکن، جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، وہاں کی زندگی کی تفاصیل کو مادی پیکروں میں سامنے لانا ہی نہیں چاہیئے۔ یہاں ہم اتنا واضح کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ لفظِ حُور بھی صرف مؤنث کے لئے نہیں بولا جاتا، مذکر کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ یہ لفظ جمع ہے اور اس کا واحد اَحْوَرُ بھی ہے جو مذکر ہے، اور حَوْرَآءَ بھی، جو مؤنث ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ایسے لوگ (مرد یا عورتیں) جن کی آنکھ کی سفیدی نہایت صاف اور اس کی سیاہی نہایت گہری ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ان کے ہاں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جن کی سیرت بڑی پاکیزہ اور نگاہ بڑی صاف ہو۔ کیونکہ لفظ اَحْوَرُ (جس کی جمع حُوْرٌ ہے) کے معنی پاکیزہ عقل کے ہیں۔ یعنی چالاک اور مکار عقل نہیں بلکہ پاک اور صاف عقل۔

قرآن کریم میں بعض مقامات پر حُوْرٌ کے ساتھ عِیْنٌ کا لفظ بھی آیا ہے (۴۴/۵۴ ؛ ۵۲/۲۰) معنی اس کے بھی ایسے شخص کے ہیں جس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہوں اور اس کا استعمال بھی مذکر و مؤنث دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُوْرٌ عِیْنٌ) خواہ وہ عام ہم نشین ہوں یا میاں بیوی، کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھوکہ دینے کے کام میں نہیں لائی جائے گی۔ وہ عقل، ادب خوردۂ دِل ہوگی۔ یعنی پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جُو اور فریب کار۔ یہ ہیں آیۃ زیرِ نظر میں وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ (۲/۲۵)

کے معانی۔ یعنی جنتی زندگی (خواہ وہ اس دنیا کی ہو یا آخرت کی) ایسے رفقاء پر مشتمل ہوگی جن کی سیرت نہایت بلند اور فکر نہایت پاکیزہ ہوگی۔

ان تصریحات کے بعد آپ آیئے آیۂ زیرِ نظر کے اس ٹکڑہ کی طرف، جس کا مفہوم ابھی باقی ہے۔ یعنی کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (۲/۲۵) "جب انہیں رزق دیا جائیگا تو کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا تھا۔ ان سے کہا جائیگا، نہیں! یہ بعینہٖ وہی نہیں، اس سے ملتا جلتا ہے"۔ اس میں بھی ایک عمیق حقیقت مضمر ہے۔ لفظِ رزق کے معنی ایسے سامانِ زیست کے ہیں جو ہر وقت ملے یعنی تقاضائے زندگی کے عین مطابق۔ آیت (۱/۱) کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتایا جا چکا ہے کہ کائنات میں سلسلۂ ارتقاء جاری و ساری ہے ملخص اس کا یہ ہے کہ زندگی، اولیں جرثومۂ حیات (LIFE-CELL) سے شروع ہو کر، مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ اس رہِ دور دراز میں، جوہرِ حیات تو ایک ہی رہا لیکن اس کے پیکروں میں بڑا فرق پیدا ہوتا رہا۔ اس کا پیکر جس حالت میں بھی تھا اسے اس کی مناسبت سے سامانِ زیست ملتا رہا۔ اسی سے وہ زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے قابل ہوا۔ یہ رزق مقصد کے اعتبار سے تو ایک ہی تھا لیکن نوعیت کے اعتبار سے اس میں بڑا فرق ہوتا تھا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے کسی سائنسدان کے دماغ کی ضرورت نہیں یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے (مثلاً) آپ ایک انسانی بچہ کو لیجئے۔ اس کا رزق ماں کا دودھ ہوتا ہے۔ بچے کی ابتدائی زندگی میں چونکہ اس کا معدہ کمزور ہوتا ہے اس لئے اس کی ماں کے دودھ میں پانی زیادہ ہوتا ہے اور غذائیت کے اجزا بہت کم۔ جوں جوں اس کا معدہ قوی ہوتا جاتا ہے ماں کے دودھ میں خود بخود مائیت کم اور غذائیت بڑھتی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ دو اڑھائی سال کے بعد دودھ کافی گاڑھا ہو جاتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں وہ کہلائے گا تو دودھ ہی، لیکن پہلے دن کے دودھ اور اس دو اڑھائی سال کے عرصے کے بعد کے دودھ میں نمایاں فرق ہوگا۔ اس مثال سے

غذا کی کیفیت میں فرق

آپ قرآنِ کریم کی اس آیت کو پھر سامنے لایئے جو پہلے بھی لکھی جا چکی ہے۔ یعنی يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹) کائنات کی ہر شے اپنے سامانِ زیست کے لئے ربوبیتِ خداوندی کی محتاج ہے۔ ان اشیائے کائنات کی کیفیت یہ نہیں کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی حالت میں رہتی ہوں۔ ان کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اور حالات کی اسی نسبت سے، ان کے سامانِ زیست کے تقاضوں میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ خدا کی ربوبیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر شے کو، اس کی اُس وقت کی حالت کے تقاضے کے مطابق

سامانِ پرورش عطا کرتا ہے۔

اب اسی حقیقت کو پھیلا کر اعمال کے نتائج کی دنیا کی طرف لیجائیے۔ یہ آخرت میں کس شکل میں نمودار ہوں گے، اُسے بھی چھوڑیئے۔ خود اسی دنیا میں دیکھئے۔ چودہ سو سال پہلے ان اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی نعمائے خداوندی کی جو کیفیت اور نوعیت تھی، آج کی نعماء اُن سے مختلف رنگ میں ہوں گی۔ روح اور جوہر تو ان کا وہی ہوگا لیکن ان کی شکلیں کچھ اور ہوں گی۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآنِ کریم نے اس تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے کہ اہلِ جنت کو جو سامانِ زیست ملے گا۔ وہ ہر دور (بالخصوص دنیا اور آخرت) میں یکساں نہیں ہوگا بلکہ باہم متشابہہ — ملتا جلتا — ہوگا۔ جوہر، غیر متغیر رہے گا، لیکن اس کے پیکر حالات کی مناسبت سے بدلتے چلے جائیں گے۔

اب آگے چلئے:

(۲/۲۶) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۔　۲/۲۶

عام معنی اس آیت کے یہ ہوں گے کہ اللہ کے لئے یہ بات کسی جھجک اور تامل یا حجاب وندامت کی نہیں کہ وہ مجرد حقائق کو، مچھر یا اس سے بھی کسی کمتر درجے کی شے کی مثال سے واضح کرے۔ ان مثالوں کے متعلق، ان لوگوں کا تاثر، جو وحی کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ہوگا کہ بھی ان کے رب کی طرف سے سراسر حق وصداقت پر مبنی ہیں۔ لیکن جو ان صداقتوں سے انکار کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اس قسم کی حقیر سی چیزوں کی مثالیں دینے سے اللہ کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ اس طرح، ایک ہی بات سے کچھ لوگ صحیح راہنمائی حاصل کرلیں گے، دوسرے گمراہ ہوں گے۔ لیکن گمراہ فاسقین ہی ہوں گے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم مجرد (بالخصوص ماوراء الطبیعیاتی) حقائق کو محسوس تمثیلات وتشبیہات کے ذریعہ سمجھاتا ہے یہی ان کے سمجھانے کا بلیغ ترین ذریعہ ہے۔ مثال ہر مناسب شے کی دی جاسکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ ان تمثیلات کا ردِ عمل مومنین اور کفار کی طرف سے مختلف ہوتا ہے تو اس میں ایک نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے۔ خارج میں، شے ایک ہی ہوتی ہے لیکن اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کی رو سے مختلف لوگوں کا تاثر اس متعلق

تاثرات کا فرق

مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص شاخِ گل پر مسکراتے پھول کو دیکھ کر اس کی رعنائیوں اور زیبائیوں، اس کی عطر بیزیوں اور شمیم ریزیوں سے وجد و کیف کے عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص، اس کے کانٹوں سے ہمہ تن شکایت بن جاتا ہے۔ یہ فرق زاویۂ نگاہ کا ہے۔ ہم اس موضوع کو پھیلانا چاہیں تو اس کے متعلق ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب کی جا سکتی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی شے، ایک ہی واقعہ، یا ایک ہی شخص کے متعلق مختلف لوگوں کے تاثرات مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہوتے ہیں۔ یہ فرق زاویۂ نگاہ کے اختلاف کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

ایکہ منزل را نمیدانی ز راہ　　قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود　　ایں زمین و آسماں، دیگر شود

قرآنِ کریم انسان کے زاویۂ نگاہ کو بدل دیتا ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھتا ہے۔ اور اقدارِ خداوندی کے پیمانوں کے مطابق اس کی قیمت متعین کرتا ہے۔ قرآن کا پیدا کردہ یہی وہ تغیرِ نفس ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ کہتا ہے کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود　　جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

بالفاظِ دیگر :

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے　　بدل جانے سے اس کے رنگ ہے اک چیز کا بدلا

قرآنِ کریم کی اصطلاح میں دل کے اِس رنگ بدلنے کو ایمان کہا جاتا ہے۔ یہ بڑی بنیادی تبدیلی ہے جو انسان کی نفسیات میں پیدا ہوتی اور خارجی تبدیلیوں کی بنیاد بنتی ہے۔ اس سے اشیائے کائنات کے پیمانے بدل جاتے ہیں، ان کی قیمتیں بدل جاتی ہیں، اُن کے مقاصد بدل جاتے ہیں، ان کی غایتیں بدل جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے آیۂ زیرِ نظر میں یہ کہہ کر بیان کیا ہے کہ مثال ایک ہی ہوتی ہے، اُسے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے والوں کے تاثرات مختلف ہوتے ہیں۔ آگے چل کر ہم سورۂ آلِ عمران کی آیت (۳/۷) میں، دیکھیں گے کہ اس میں یہی بات "تشبیہات" کے سلسلہ میں کہی گئی ہے۔

قرآن کریم میں مختلف حقائق یا موضوعی کیفیات کو مختلف مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ یہ مثالیں آئندہ آیات میں ہمارے سامنے آتی جائیں گی۔ ہم یہاں ان میں سے چند ایک کو نمونتاً پیش کرتے ہیں۔

قرآن کی مثالیں

(۱) احکامِ سبت کی مخالفت کرنے والوں کی ذہنیت کو قِرَدَةً خَاسِئِينَ سے تشبیہ دی گئی ہے (۲/۶۵)۔

(۲) عقل و فکر سے کام نہ لینے اور تقلید کی روش اختیار کرنے والوں کو بھیڑ بکریوں سے تشبیہ دی گئی ہے (۲/۱۷۱)

(۳) ناقابلِ تسکین حرص و آز کی مثال ہانپنے والے کُتّے کی دی گئی ہے (۷/۱۷۶)۔

(۴) کلمۂ طیّب کی تشبیہ شجرِ طیب سے اور کلمۂ خبیثہ کی شجرِ خبیثہ سے دی گئی (۱۴/۲۴-۲۶)

(۵) شرک سے پیدا ہونے والے خوف و دہراس اور عدمِ حفاظت کو اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ پرندے کا چھوٹا سا بچہ جو اپنے گھونسلے سے نیچے گر پڑے اور اُسے کوئی چیل یا عقاب اچک کر لے جائے۔ یا گھاس کا ایک سوکھا سا تنکا، جسے ہوا کا جھکڑ جدھر جی چاہے، اڑائے اڑائے پھرے (۲۲/۳۱)۔

(۶) جو قومیں اپنی محنت کے ماحصل کو خود اپنے ہاتھوں تباہ کر دیں، ان کی مثال اس بڑھیا سے دی گئی ہے جو دن بھر بڑی محنت سے سوت کاتے لیکن اسے شام کو خود ہی ریزہ ریزہ کر کے رکھ دے (۱۶/۹۲)۔

(۷) معبودانِ باطل سے وابستہ امیدوں کو تارِ عنکبوت کہکر پکارا گیا ہے (۲۹/۴۱)۔

(۸) بے عمل مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی مثال ایک ایسے گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی مقدس کتابیں لاد دی گئی ہوں (۶۲/۵)۔

(۹) پاکیزگیٔ سیرت کو، سیپ کے اندر شفاف موتی سے تشبیہ دی گئی ہے (۵۶/۲۳)۔ اور

(۱۰) قرآن کریم کو جس آسمانی قندیل سے تشبیہ دی گئی ہے اُسے تو اس کے مقام ہی پر وجۂ نورانیتِ قلب و نگاہ بنایا جائے گا کیونکہ ڈر ہے کہ اختصار سے اس تشبیہ کی درخشندگی اور تابندگی ماند نہ پڑھ جائے (۲۴/۳۵)۔

یہ، اور اسی قسم کی متعدد اور، مثالیں ہیں جن سے قرآن کریم نے مختلف حقائق کو سمجھایا ہے۔ اور، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اُخروی زندگی کی تمام کیفیات کا بیان تمثیلی اور تشبیہی ہے۔ یہی وہ تشبیہات و تمثیلات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ قندیلِ راہ بنتی ہیں اور دوسروں کے لئے نکتہ چینی اور عیب جوئی کا موجب۔ ایسے لوگوں کو اس نے "فاسقین" کہکر پکارا ہے۔ ہمارے ہاں

فاسقین کا مفہوم

فسق و فجور اور فاسق و فاجر کے الفاظ عام طور پر بولے جاتے ہیں لیکن ان کا صحیح مفہوم کم لوگوں کے سامنے ہوتا ہے۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ نشوونما پاتی اور پختگی تک پہنچتی ہے (یہی صورت دوسرے پھلوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے) وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (PATTERN) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی اور وہ پختگی تک پہنچتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے۔ ایسا پھل کبھی پختگی تک نہیں پہنچتا بلکہ گل سڑ جاتا ہے۔ عرب اس کے لئے فسق کا لفظ بولتے تھے۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا اجتماعی زندگی کا قالب عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد معاشرہ کی صلاحیتوں کی صحیح صحیح نشوونما ہو جاتی ہے۔ جو فرد یا گروہ اس نظام کے قالب سے باہر نکل جاتے اُسے فاسق کہا جائے گا۔ اس کی نشوونما نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا ہر شخص جو قوانین خداوندی کے دائرے اور اس کے تجویز کردہ قالب سے باہر نکل جائے۔ وہ فاسق ہے۔ قرآن کریم نے اگلی آیت میں اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ

۲/۲۷ (۲/۲۷) اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔

یعنی فاسقین وہ ہیں جو خدا سے باندھے ہوئے پختہ عہد کو توڑ دیتے ہیں اور جنہیں خدا نے باہمی ملانے کا حکم دیا ہے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح ملک میں، یا زمین پر، فساد برپا کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں بیان کردہ، اساسی نکات کی تشریح آیت (۲/۱۱) میں، فساد کے عنوان کے تابع کر دی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ خدا سے باندھا ہوا عہد کون سا ہے — اس کی ایک مثال وہ عہد ہے جس کی رو سے مومن اپنی جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے (۹/۱۱۱) دیگر متعدد مقامات پر اس کی اور تفصیلات بھی بتائی ہیں جن کا ذکر متعلقہ مقامات پر آئے گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ایک شخص جب خدا پر ایمان لاتا ہے تو وہ اُس سے اس امر کا عہد کرتا ہے کہ وہ اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ عہد شکنی ہوگی۔

عہد فراموش

عَہِدَ الشَّیْءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا اس کی پیہم نگہداشت کرنا۔ اس کے اس بنیادی مفہوم کے لحاظ سے بھی خدا سے باندھے ہوئے عہد کے ایفا کے معنے ہوں گے اس کے احکام کی نگہداشت کرنا۔ جب اس لفظ کے بعد اِلیٰ آئے تو اس کے معنے حکم کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی عَہْدُ اللّٰہِ کا ایفا درحقیقت احکام خداوندی کی اطاعت و نگہداشت کا دوسرا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد انہی لوگوں کی طرف سے ہوگا جو خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہوں۔ یہی

وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے متعلق کہا جائے گا کہ انہوں نے خدا سے ایک عہد باندھا تھا۔ ایک وعدہ کیا تھا جسے وہ اب نباہتے نہیں۔ اس شق میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو زبان سے ایمان کے مدعی ہوں لیکن عملاً احکامِ خداوندی کی اطاعت نہ کریں۔ یہ سب فاسق کہلائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کہیں ظالمین کو فاسق کہکر پکارا ہے (۲/۵۹)۔ اور کہیں ان لوگوں کو جو احکامِ خداوندی کی اطاعت سے گریز کی راہیں نکالیں (۳/۸۱) اور، مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں یہ کہ اس نے مؤمن اور فاسق کو ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے۔ (۳۲/۱۹)۔ یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت نہ کرنے والا (اس کے تجویز کردہ قالب سے باہر نکل جانے والا) مومن کہلا ہی نہیں سکتا۔ تفصیل ان امور کی آیت (۲/۲) کی تفسیر میں گذر چکی ہے جہاں مومن اور رسمی اور اسمی مسلمانوں میں فرق بتایا گیا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲/۲۷)۔ خسران کا لفظ بھی بڑے وسیع معانی کا حامل ہے۔ اَلْخَاسِرُ کے معنی ہوتے ہیں راستہ کھو جانے والا، ہلاک ہو جانیوالا۔ یا جو شخص کامیاب نہ ہو سکے۔ جو تجارت میں گھاٹے میں رہے۔ خُسْرٌ میں مادی اشیاء میں کمی اور معنوی اشیاء کا نقصان دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یعنی مال و دولت میں نقصان اور عقل و ایمان اور شرف و عزت میں کمی، دونوں کے لئے خُسْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے قرآن کریم نے اسے سورۃ العصر میں نہایت مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ جب کہا ہے۔ وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۱-۳)۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اگر انسان ہدایتِ خداوندی کی پیروی نہ کرے تو وہ نقصان میں رہتا اور آخرالامر تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ اس تباہی سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اقدارِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھیں اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں۔ اس پروگرام کی رو سے ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جس میں ہر فرد اپنا فریضہ اتنا ہی نہیں سمجھتا کہ جو کام اس کے ذمہ لگا دیا گیا تھا اس نے اُسے پورا کر دیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتا ہے کہ وہ بھی حق کے راستہ پر قائم رہیں اور اس میں جس قدر مشکلات آئیں ان کا مقابلہ ثبات و استقامت سے کریں۔ ان کی ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین، خود ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ (۳/۱۹۹) وہ مسلسل اور متواتر اس روش پر گامزن رہتے ہیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لئے زمانہ کی ریگِ رواں پر اپنے نقوشِ قدم ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ جماعت ہے جو کامیاب و کامران زندگی بسر کرتی ہے۔ ان کے سوا، دیگر انسانوں کی زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں کی حسرت انگیز داستانوں کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ تاریخ کے اوراق اس پر

خاسر و نامراد کون ہیں؟

شاہد ہیں"۔

قرآن کریم انسانیت کی تاریخ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی شہادت کے طور پر پیش کرنے کے بعد یہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ تم اس صداقت سے کس طرح انکار کر سکتے ہو؟

(۲/۲۸) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

۲/۲۸

اس کا عام ترجمہ یہ ہے "تم کس طرح خدا کی ہستی کا انکار کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تم پر موت وارد ہوگی۔ اس کے بعد پھر تم زندہ ہوگے۔ اور اس کی طرف رجوع کروگے"۔

اس آیت میں سب سے پہلے خدا نے اپنی ہستی کے ثبوت کے لئے ایک دلیل یہ دی ہے کہ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ "زندگی" کا پیدا کرنا کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے ان دو الفاظ ——— موت اور حیات ——— کے لغوی معنی دیکھ لیجئے۔

حیات لفظ حیات کا مادہ (ح-ی-ی) ہے۔ علمائے لغت نے اس کے بنیادی مفہوم کے سلسلہ میں لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں جو ہمارے مفیدِ مطلب نہیں۔ اس کے بالمقابل موت کا لفظ آتا ہے۔ استعمال کی رُو سے اس لفظ کے بھی متعدد معانی ہیں۔ بنیادی طور پر:-

موت (۱) حیات اور موت کے الفاظ طبیعی معنوں میں زندگی اور موت کے لئے بھی آتے ہیں۔

(۲) قرآن ان لوگوں کو بھی مردہ کہتا ہے جو طبیعی طور پر تو زندہ ہوتے ہیں لیکن ان کی انسانی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان کے مقابلہ وہ، انہیں زندہ انسان قرار دیتا ہے جو عقل و شعور سے کام لے کر خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوں۔

(۳) وہ ان قوموں کو بھی مردہ کہتا ہے جو زوال پذیر ہو چکی ہوں۔ اگر ان میں عروج حاصل کرنے کی استعداد و صلاحیت باقی ہو تو وہ قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے سے دوبارہ زندگی حاصل کر سکتی ہیں۔ اور

(۴) انسان کی طبیعی موت کے بعد اگلی زندگی کو بھی حیات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہی وہ اُخروی زندگی ہے جو جزوِ ایمان ہے۔

آیۂ زیرِ نظر میں سب سے پہلے انسان کی طبیعی زندگی کا سوال سامنے آتا ہے۔ ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ سائنسدانوں کے لئے یہ سوال کس قدر لاینحل معمہ ہے کہ مادی کائنات کی ابتدا کیسے ہوگئی! اس سلسلہ میں ان کا

سرچشمۂ حیات کے متعلق سائنسدانوں کا عجزِ فہم

اعترافِ عجز بھی ہمارے سامنے آچکا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ "زندگی" (LIFE) کیسی پیدا ہو گئی، ان کے لئے اس سے بھی زیادہ لاینحل ہے اور، اس باب میں بھی، دورِ حاضرہ کا بڑے سے بڑا سائنسدان اور مفکر اسی طرح سرگریباں ہے جس طرح اڑھائی ہزار سال پہلے کے اربابِ فکر و دانش انگشت بدنداں تھے ہم چاہتے تو اس باب میں مفکرین اور محققینِ مغرب کے بیسیوں اعترافات نقل کر دیتے۔ لیکن اس تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ سمجھنے کے لئے دو ایک اقتباسات ہی کافی ہوں گے۔ علمائے حیاتیات میں (J.S. HALDANE) کا شمار ممتاز محققین میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف (THE PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY) میں لکھتا ہے :-

> اب اس حقیقت کے تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں کہ زندگی محض طبیعیاتی اور کیمیادی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ ان مادی کیفیات سے پہلے موجود تھی اور ہمیشہ سے موجود تھی۔ نیز اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جس کی تعبیرات کی روشنی میں ہمارے حیاتیاتی اصولوں کو عملاً منطبق کرنا چاہئے۔ لہٰذا زندگی کے مسئلہ کو طبیعیاتی اور کیمیادی مسئلہ سمجھنا ہی غلط ہے۔ زندگی اور انسانی ذات کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ ہماری کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے اور یہ تعبیر ناممکن ہی رہتی ہے خواہ ہم زمان کے اعتبار سے کتنے ہی پیچھے اور مکان کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ چلے جائیں۔ زندگی کو پیچھے لے جانے سے اس کی مادی تعبیر کبھی نہیں مل سکے گی۔ نہ ہی انسانی ذات کو پیچھے لے جانے سے ہم کسی ایسے مقام تک پہنچ سکیں گے جہاں ہم کہہ سکیں کہ انسانی ذات اس طرح مادہ سے پیدا ہو گئی (صفحہ ۳۸ و ۱۱۱ و ۱۲۲)

نظریۂ ارتقاء کی ابتداء تو ڈاروِن کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کے نظریہ میں بڑی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ جن سائنسدانوں نے یہ تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان میں (SIMPSON) کی حیثیت بڑی نمایاں ہے وہ زندگی کی ابتداء اور سلسلۂ علت و معلول کی اولین کڑی کے متعلق لکھتا ہے :-

> زندگی کی ابتداء کیسے ہو گئی۔ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم

نہیں۔ اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جا رہا ہے لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطۂ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید انسان کے حیطۂ ادراک ہی سے باہر۔ کائنات کے آغاز اور سلسلۂ علت و معلول کی اولین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اولیں کڑی، راز ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ذہن انسانی اس راز کو کبھی نہیں پا سکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علتِ اولیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں، لیکن اسے اپنے ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔

(THE MEANING OF EVOLUTIN ; P.P. 13, 135)

چونکہ یہ مسئلہ سرحدِ ادراکِ انسانی سے ماوراء ہے اس لئے قرآن کریم بھی اس کی تشریح میں نہیں جاتا۔ وہ اس سے گفتگو نہیں کرتا کہ زندگی وجود میں کیسے آگئی، وہ آغازِ سخن اس سے کرتا ہے کہ زندگی کی نمود کس طرح ہوتی۔ اس سلسلہ میں آیات (۲/۲، ۲/۲۰، ۲/۲۱) میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے۔ نمودِ حیات کے سلسلہ میں ہم بھی ایک مثال کے ذریعہ بات سمجھنے اور سمجھانے سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے جو آواز نشر کی جاتی ہے وہ فضا کی کہربائی لہروں میں پھیل جاتی ہے لیکن ہمیں اس کی موجودگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ آواز ہمارے ریڈیو سیٹ کی وساطت سے محسوس طور ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے۔ ہمارے احساس (سماعت) کی گرفت میں آنے سے پہلے یہ آواز معدوم نہیں تھی۔ موجود تھی۔ لیکن ہم اس کی موجودگی کا احساس نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اگر ہمارا ریڈیو سیٹ خراب ہو جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ آواز ختم (یا معدوم) ہو گئی۔ حالانکہ وہ ختم یا معدوم نہیں ہوتی بیسٹ کی خرابی کی وجہ سے ہمارے کانوں میں نہیں آتی۔ ازاں بعد، اگر ہمارا سیٹ پھر درست ہو جاتا ہے یا ہمیں ایک نیا سیٹ مل جاتا ہے، تو اس آواز کا وجود پھر ہمارے احساس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا نے زندگی کو اس کے مادی پیکر (اولیں جرثومۂ حیات) میں آنے سے پہلے پیدا کر رکھا ہو۔ لیکن چونکہ اس وقت وہ ہمارے احساسات کی گرفت میں نہیں آئی تھی اس لئے اس نے ہماری اس حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے (كُنتُمْ اَمْوَاتًا)۔ اس حالت کے متعلق مزید اشارہ اتنا ہی کیا ہے کہ تم کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھے (۷۶/۱)۔ ذکر کے معنی اپنے مقام پر بیان کئے جائیں گے) جب اس کی نمود محسوس پیکر دل میں ہو گئی تو حیاتاً کہہ کر پکارا، کیونکہ وہ ہمارے احساس کی گرفت میں آگئی جب وہ پھر

نمودِ حیات کی ایک مثال

ہمارے احساس کی گرفت سے باہر ہوگئی تو اُسے موت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کے بعد، جب پھر اس کی نمود ہو جائے گی تو اُسے حیات بعد الممات سے تعبیر کیا جائے گا۔ (ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت ہم اس کی نمود کو کس طرح محسوس کریں گے کیونکہ اس وقت ہمارا "ریڈیو سیٹ" موجود سیٹ سے مختلف ہوگا۔ یہ ہے زندگی کے مستتر (مضمر) اور بارز (نمودار) ہونے کا تمثیلی بیان۔

زیرِ نظر آیت میں قرآنِ کریم نے موجودہ حیات سے پہلے کی موت، پھر حیات، اس کے بعد کی موت، اور حیاتِ اُخروی کا ذکر کیا ہے۔ اسی کو اس نے دوسری جگہ دو موتیں اور دو زندگیاں کہکر پکارا ہے (۴۰/۱۱)۔ اور موت کے بعد کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس کے بعد پھر موت وارد نہیں ہوگی (۳۷/۵۹ ؛ ۴۴/۵۶)۔ قرآنِ کریم کی رو سے حقیقی اہمیت، حیات بعد الممات کے سوال ہی کو حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے جو دین کی اصل و اساس ہے۔ اِنسان کی موجودہ زندگی تو طبیعیات کا مسئلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کفر اور ایمان کا تعلق، حیات بعد الممات سے ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا ہے کہ:-

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں، میری انتہا کیا ہے

حیات بعد الممات

بنیادی طور پر، فکر کرنی بھی اسی کی چاہئے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اس کا تعلق کفر و ایمان، اور دین کی اساس سے ہے۔ جو شخص حیاتِ بعد الممات کا قائل نہیں وہ (بزعمِ خویش) یہ سمجھتا ہے کہ اس زندگی میں جو کچھ میرے جی میں آئے، کروں۔ اگر میں ایسا انتظام کرلوں کہ میرے جرائم کسی کی نگاہوں میں نہ آسکیں، اور اگر آ بھی جائیں تو مجھے ان کی سزا نہ بھگتنی پڑے، تو کوئی میرا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد موت ہے اور موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان جسقدر ظلم اور زیادتیاں کرتا ہے اس کا بنیادی سبب یہی زعم باطل (یعنی حیاتِ اُخروی سے انکار) ہوتا ہے۔ اور اگر آج دنیا میں دھاندلی اور بد اخلاقی اسقدر عام ہو رہی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حیاتِ آخرت (یا قانونِ مکافاتِ عمل) سے انکار، گویا ایک عقیدہ کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ قرآنِ کریم حیاتِ اُخروی کے ایمان پر اِسی لئے اس قدر زور دیتا ہے کہ اس سے انسانی معاشرہ بھی صحیح حالت میں رہتا ہے اور افراد کی ذات بھی اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل بحسن و خوبی طے کرسکے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (۶۷/۲)۔ "خدا وہ ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہارے اعمال کی پرکھ ہوسکے۔ وہ

عزیز بھی ہے اور غفور بھی۔" دوسری جگہ ہے۔ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۱۰/۴)۔ یعنی خدا وہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اُسے گردشیں دیتا ہے تاکہ ایمان و عمل صالحہ کا نتیجہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ٹھیک ٹھیک مرتب ہو جائے اور حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے جرائم بلا عقوبت نہ رہنے پائیں۔ بالفاظ دیگر تخلیقِ موت و حیات کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ زندگی عمل کی آماجگاہ بنے اور جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں سامنے نہ آسکیں وہ حیاتِ اُخروی میں سامنے آجائیں۔ حیاتِ اُخروی کے متعلق آیت (۲/۴) کی تفسیر میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کے متعلق مزید تصریحات، قیامت، حشر، نشر، حساب کتاب، جنت، جہنم وغیرہ عنوانات میں کی جائے گی کہ وہی ان کے مناسب مقامات ہیں۔ اس مقام پر اتنا مزید واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم حیاتِ اُخروی پر اسقدر زور اس لئے نہیں دیتا کہ لوگ اُخروی عذاب سے "ڈرکر" اچھے کام کرنے لگ جائیں، قطعاً نہیں حیاتِ بعد الممات ایک حقیقت ہے اور وہ اِسے (دیگر حقائق کی طرح) حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی، زندگی کی آخری کڑی نہیں۔ زندگی کو ابھی مزید ارتقائی مراحل طے کرنا ہیں اور اس کے لئے سلسلۂ حیات، مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اعمال کے نتائج کا ذکر انہی ارتقائی منازل کے سلسلہ میں آتا ہے۔

اس آیت میں تشریح طلب بات ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲/۲۸) کی ہے۔ اس کے متعلق ابتدائی گفتگو آیات (۱/۵ و ۲/۲۸) میں کی جا چکی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مزید وضاحت یہاں بھی ضروری ہے۔

اِلیہ راجعون کا مفہوم

تُرْجَعُوْنَ کا مادہ (ر۔ج۔ع) ہے۔ رُجُوْعٌ کے معنے ہیں پلٹنا، لوٹنا، واپس ہونا۔ رَجَعَ اِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی طرف امداد وغیرہ کیلئے رجوع کرنا۔ اور رَجِيْعٌ کے معنی نتائج مرتب ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ یہ وہ معانی ہیں جو خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں پہلے معانی کی رو سے "رجعت الی اللہ" کے معنے ہوں گے زندگی کے ہر مرحلہ کے حل کے لئے قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ اور دوسرے معانی کی رو سے مفہوم ہو گا انسانی اعمال کا قانون مکافات کے مطابق نتیجہ خیز ہونا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان معانی میں بکثرت آیا ہے۔ متعلقہ آیات میں اس کا یہ مفہوم واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ سرِ دست ہم "اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کے ان دو غلط مفاہیم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی رو سے ذاتِ باری تعالیٰ اور خود انسان کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں حیاتِ اُخروی کے متعلق عام

تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد جب انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو ایک بہت بڑا میدان ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ عدالت کی کرسی پر متمکن ہوں گے۔ ہر شخص ملزم کی حیثیت سے اس کے حضور پیش ہوگا۔ وہاں اس کا حساب کتاب ہوگا اور خدا کی طرف سے فیصلے صادر ہوں گے۔ مجرموں کو داخل جہنم کر دیا جائیگا اور جو مجرم ثابت نہیں ہوں گے انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے بھی قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اعمال کی جزا اور سزا کا کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچا ہے لیکن (جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے) حیاتِ اُخروی کے متعلق قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ تمثیلاً بیان کیا گیا ہے، حقیقتاً نہیں، اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ سچ مُچ کا ایک میدان ہوگا اور اس میں خدا کرسیٔ عدالت پر متمکن ہوگا۔ مجرم اس کے حضور پیش ہوں گے، تو اس سے خدا کا مکان (SPACE) اور زمان (TIME) میں محدود ہو جانا لازمی قرار پائے گا۔ خدا کے متعلق ایسا تصور، قرآنی تصورات کے خلاف ہے (وہ ان حدود سے منزہ اور ان قیود سے ماوراء ہے)۔ لہٰذا خدا کے حضور حاضر ہونے، یا اس کی طرف جانے (الیہ راجعون) کے معنے ہوں گے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق نتائج کا سامنے آنا۔ مرنے کے بعد یہ کیسے ہوگا۔ اس کا عملی طریق کیا ہوگا اور نوعیت کیا، اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس وقت بہر حال اتنا سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ یہ... "کسی خاص" مقام کے اندر نہیں ہوگا۔ (الیہ راجعون (خدا کی طرف لوٹ کر جانے) کے صحیح مفہوم کو ایک مثال کی رو سے یوں سمجھئے کہ ایک مفرور اشتہاری مجرم ہے جو گرفتاری سے بچنے کے لئے بھاگتا اور چھپتا پھرتا ہے۔ اس کے متعلق عدالت کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ اوّل و آخر تمہیں یہاں آنا پڑے گا۔ اس سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ یہ ہے مطلب انسانوں کا آخرالامر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونے (یعنی الیہ راجعون) کا۔

اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ کا دوسرا غلط مفہوم اہل تصوف کا پیدا کردہ ہے جسکی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہے جو اس سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اب مقصودِ حیات یہ ہے کہ یہ جزو، مادہ کی دلدل سے چھٹکارا حاصل کر کے پھر سے ذاتِ خداوندی میں مل جائے۔ تصوف کے اس خلافِ قرآن عقیدہ کے متعلق آیت (۱/۵) میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

اور یہ جو ہم، کسی کے مرنے کی خبر سن کر، کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ (۲/۱۵۶) اور اس سے مراد انتہائی رنج و الم، غم و اندوہ اور صدمہ و مصیبت کا اظہار ہوتا ہے، تو، جیساکہ آیت (۲/۴۶) کے تابع آیات (۲/۱۵۶-۱۵۷) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک، عظیم القدر، حیات بخش، انقلاب آفریں، ولولہ خیز، مسرت اجذبۂ بے پایاں

کا زلزلہ انگیز اعلان ہے، جسے بدقسمتی سے پیامِ مرگ کا نوحۂ ماتم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا ہر حیات بخش تصور، مرگ آفریں عقیدہ بن جاتا ہے۔ مذہب، قبرستانوں میں وعظ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، جب کہ دین، جنگاہِ حیات میں مسلسل جہد کا داعی ہوتا ہے (تفصیل آیت ۲/۱۹ میں بیان کی جا چکی ہے)۔

آیۂ زیرِ نظر کے آخری الفاظ (ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ) ہمیں اگلی آیت کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو، یوں ہے:

(۲/۲۹) هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ‌ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ۔ ۲/۲۹

عام معنی اس کے یہ ہیں کہ "خدا وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے، اسے تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ارض کی طرح سماء پر بھی اسی کا کنٹرول ہے جسے اس نے نہایت اعتدال سے استوار کر رکھا ہے۔ اور اس کا یہ غلبہ اور کنٹرول علم کی بنا پر ہے"۔

اس باب کی ابتداء ہوئی تھی ان الفاظ سے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ (۲/۲۱)۔ اور اگلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ اس نے زمین اور آسمان سے تمہارے لئے سامانِ زیست پیدا کیا ہے۔ اب جو کہا گیا ہے کہ تم اسی بنیادی حقیقت کی طرف رجوع کرو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اِس آیت میں اسی حقیقت کو، دھرایا گیا ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ خَلَقَ لَـكُمۡ جَمِيۡعًا (۲/۲۹)۔ جو کچھ زمین میں ہے وہ تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے ہے کسی خاص خاندان، قبیلہ، گروہ، قوم یا طبقہ کے لئے نہیں — تمام نوعِ انسان کے لئے ہے۔ یہاں ارض کے بعد سماء۔ بلکہ سمٰوٰت کا ذکر ہے۔ سماء کے معنی ہیں بلند فضائے کائنات، اور سمٰوٰت کے معنی وہ مختلف اجرامِ فلکی (کُرّے) جو اس فضا میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھرتے ہیں (۳۶/۴۰)۔ ارض و سمٰوٰت سے متعلق تفصیلی بحث تو اس مقام پر ہوگی جہاں ہم نظامِ کائنات کے متعلق گفتگو کریں گے۔ یہاں دو ایک الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ جو کہ آیۂ زیرِ نظر میں استعمال ہوئے ہیں۔

سبع سمٰوٰت

(۱) ہمارے ہاں "سبع سمٰوٰت" کا عام طور پر ترجمہ "سات آسمان" کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں سَبۡعٌ سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں یہ عدد تامّہ (PERFECT NUMBER) تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے وہ اسے "کئی ایک" یا "متعدد" کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے، جب ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ تمہیں دس بار سمجھایا ہے! یا میں بیسیوں مرتبہ گیا ہوں یا تم ایک بار

چھوڑ، سو بار آؤ۔ اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا۔ اس سے صرف کثرت مراد ہوتی ہے۔ لہٰذا سبع سمٰوٰت کے معنی متعدد اجرام فلکی (آسمانی کرّے) ہوں گے۔

(۲) اِستویٰ کا مادہ (س۔و۔ی) ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی ذات میں پورے پورے اِعتدال پر ہونا۔ ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود اور اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچے ہوئے ہونا۔ استویٰ الی الشئ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا قصد (ارادہ) کرنا، یا اس کی طرف متوجہ ہونا اور استویٰ علیٰ میں غلبہ وتسلط کا مفہوم ہوتا ہے۔ آیۂ زیرِ نظر میں ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹) کے معنی ہوں گے "اور وہ سمٰوٰت کی طرف متوجہ ہوا تو وہاں متعدد کرّے معلق کر دیئے جن میں انتہائی تناسب وتوازن پایا جاتا ہے"۔

(۳) ثُمَّ، حرف ہے اور عام طور پر اس مقام پر آتا ہے جہاں کوئی ترتیب بیان کرنا مقصود ہو، جیسے ہم کہتے ہیں کہ پہلے اس نے کھانا کھایا پھر پانی پیا۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ ہر جگہ ترتیب (پھر) کے معنوں میں ہی استعمال ہو۔ یہ (اور) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنابریں، آیۂ زیرِ نظر میں خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا. ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ (۲/۲۹) کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ اس نے پہلے زمین کو پیدا کیا اور پھر سماء کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں متعدد کروں میں استوار کیا۔ یہاں اس کے معنی یہی ہوں گے کہ اس نے زمین کو پیدا کیا اور وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی تائید سورۃ النّٰزِعٰت کی ایک آیت سے ہوتی ہے جس میں پہلے آسمانی کروں کے متعلق ہے رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا (۷۹/۲۸)۔ "اس نے آسمان کی بلندی کو اونچا کیا اور اُسے ٹھیک ٹھیک بنایا"۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (۷۹/۳۰)۔ "اور اس کے بعد کرۂ ارض کو دور پھینک دیا"۔ اس نے تو بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا .... (۲۱/۳۰)۔ ابتداءً تمام کائناتی کرّوں (ارض و سمٰوٰت) کا ہیولیٰ (NEBULAR MASS) ملا جلا ایک ہی تھا۔ بعد ازاں انہیں الگ الگ کیا گیا"۔

ان آیات کا مفہوم اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آیۂ زیرِ نظر میں (ثُمَّ) کا حرف ترتیب کے لئے نہیں آیا (اور) کے معنوں میں آیا ہے۔

اس حقیقت کو پھر سامنے لائیے کہ اس باب کی ابتداء ہوئی تھی اِعْبُدُوْا سے اور اس کے بعد پیدائش رزق کا ذکر آیا تھا۔ زیرِ نظر آیت میں پیدائش رزق کو پھر دھرایا گیا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتفصیل بیان کیا جا چکا ہے رزق کی پیداوار خدا کے مقرر کردہ قوانین فطرت کی رو سے ہوتی ہے اور جو شخص (یا قوم) بھی ان قوانین کے مطابق محنت کرے، اسے یہ رزق حاصل ہو سکتا ہے ـــــ اس میں "کافر و مومن" کی بھی کوئی تمیز نہیں۔

رزق اور رزقِ کریم

لیکن رزق کی ایک قسم وہ بھی ہے جسے قرآن کریم نے "رزق کریم" (عزت کی روٹی) کہکر پکارا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ یہ حاصل ہوتا ہے اس نظام کے اندر جو ان قوانین کی رُو سے قائم ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) انسانوں کی تمدّنی زندگی کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ رزق اس "اعْبُدُوْا" سے مشروط ہے جسے خدا کی محکومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ سورۃ فاتحہ کی تشریح میں دیکھ آئے ہیں۔ خدا کے محکوم بندے، خدا کے حضور اعتراف اور اعلان کرتے ہیں کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ (۱/۴) ہم تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں اور تجھ سے اور صرف تجھ سے طلبگار اعانت ہیں"۔ اس سے واضح ہے کہ خدا سے اعانت طلب کرنے کا حق اسی کو پہنچتا ہے جو

اعانت طلبی اور اطاعت گزاری کا باہمی تعلق

اس کی محکومیت اختیار کرے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ آج دنیا میں ہر طرف "حقوق ــ حقوق" کا شور سنائی دیتا ہے۔ لیکن ان حقوق طلب کرنے والوں کو کوئی یہ نہیں بتاتا کہ ہر حق مشروط ہوتا ہے ذمہ داری کے پورا کرنے سے۔ حقوق طلب کرنے کا حق اسی کو پہنچتا ہے جو پہلے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے رزقِ کریم۔ رزقِ حسنہ۔ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً، یا اپنی اعانت اور نصرت کے وعدوں کے ایفاء کو ایمان و عمل صالحہ سے مشروط قرار دیا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴۲/۲۶)۔ وہ جواب ہی ان لوگوں کی پکار کا دیتا ہے جو ایمان و اعمالِ صالحہ کی شرط پر پورے اتریں۔ ہم جو اس کی اعانت و نصرت سے محروم اور رزق کریم سے مہجور رہتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اِیَّاكَ نَعْبُدُ کی شرط پوری کئے بغیر اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہتے رہتے ہیں۔

اس وضاحت پر اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔

خلاصہ باب

اے گروہِ نسلِ انسانی! تمہیں ان اقوام کے خودساختہ نظام کی نگاہ فریب جگمگاہٹ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو، اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین کے تابع لے آؤ۔ وہ نشو ونما دینے والا جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کو پیدا کیا، اور کائنات کی اس قدر تخریبی قوتوں کے باوجود، نسلِ انسانی کو مختلف مراحل میں سے گذارتے ہوئے اس مقام تک لے آیا (۲/۲۱-۲۲)۔ بس یہی ایک طریق ہے جس سے تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رو سے مل سکے گی جس کے مطابق اس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کردیا۔ اوپر فضا میں کُرّے بکھیر دیئے تاکہ باہمی کشش و جذب سے یہ اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں۔ پھر ایسا انتظام کردیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامان رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے۔ اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے، تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ، جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ شرک ہوگا۔ ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت (خواہ وہ کسی کی ہو) انسانوں کو خدا بنا دینا ہے۔ انہیں تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (۲/۲۱)

اگر تم اس قدر محکم دلائل و شواہد کے باوجود، اس باب میں کسی شک و شبہ یا نفسیاتی اُلجھن میں مبتلا ہو کہ جو ضابطۂ زندگی ہم نے، اپنے بندے کی وساطت سے، تمہیں دیا ہے، وہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں، تو اس کے دور کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جو نقشہ یہ ضابطہ پیش کرتا ہے، اس کے بجائے کوئی متبادل نقشہ تم مرتب کرکے دکھاؤ ——— پوری کی پوری عمارت کا نہیں تو اس کی ایک منزل ہی کا سہی ——— یعنی اس ضابطہ کی کسی ایک شق جیسی شق بنا کر لاؤ (۲/۲۳، ۱۱/۱۳)۔ اس کے لئے کسی ایک شخص پر ذمہ داری ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جتنے ادیب و مفکر اور تمدنی اور سیاسی مقنّن تمہارے معاشرہ میں پائے جاتے ہوں، ان سب کی ایک کمیٹی بنا لو، بس ایک اللہ کی وحی کو الگ چھوڑ دو، اور ان سے کہو کہ ایسا کرکے دکھائیں۔ اگر تم واقعی اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم اس کا فیصلہ نہیں کرپاتے کہ یہ ضابطہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں، اور محض اپنی مفاد پرستیوں سے چمٹے

رہنے کی خاطر شکوک و شبہات کا ساز نہیں بجا رہے، تو تمہیں اس چیلنج کو قبول کر لینا چاہیئے۔

لیکن اگر تم نے ہمارے چیلنج کو قبول نہ کیا —— اور ہم بتائے دیتے ہیں کہ تم اسے ہرگز قبول نہیں کرو گے —— اور عقل و بصیرت کی رو سے بات سمجھنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنی مخالفت میں اندھا دھند آگے بڑھتے گئے اور حق کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو گئے، تو اس کا نتیجہ وہ تباہی و بربادی کا جہنم ہو گا جس میں تمہارے عوام اور خواص، اور چالاک لیڈر اور ان کے متبعین، سب اپنی دولت و حشمت کے ساتھ، جا گریں گے —— خواہ یہ جنگ کی صورت میں ہو، جس کی آگ انسانوں کے ہاتھوں سے اور معدنی آلات حرب و ضرب کے ذریعے بھڑکائی جاتی ہے۔ اور خواہ غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن انجام کی شکل میں ہو۔ بہرحال یہ وہ جہنم ہے جو صحیح ضابطۂ حیات سے انکار اور سرکشی برتنے والوں کے اعمال نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ (۶۶/۶)

اس ٹکراؤ میں اس جماعت کے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں جو قوانین خداوندی اور زندگی کی بلند اقدار کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے، اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے۔ اے رسول! تو انہیں خوشخبری دیدے کہ ان کے لئے ایک ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس کی شادابیاں سدابہار، اور جس کی آسائشیں زوال نا آشنا ہوں گی (۱۴/۷۵ ؛ ۱۳/۳۵)۔ اِس زندگی میں خزاں نادیدہ بہاریں، اور بعد کی زندگی میں بھی حیاتِ جاوید۔

خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے یہ وعدے تمہاری موجودہ جماعت کے ساتھ مخصوص اور اسی تک محدود نہیں۔ جب اور جہاں بھی کسی جماعت نے ایسی روش اختیار کی، اس کا یہی نتیجہ نکلا (۲۴/۵۵ ؛ ۳۹/۷۴) اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ ان اعمال کے نتائج ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں، البتہ ان کے پیکر زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ملتے جلتے ہیں۔

اس معاشرہ میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے اور ان کے رفیق بنتے جائیں گے۔ یہ بھی ان ہی جیسی پاکیزہ سیرتوں کے حامل ہوں گے۔ جب تک یہ معاشرہ قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار رہے گا، یہ اپنے پھل اسی طرح دیتا جائے گا۔ اس میں فساد اور تغیر واقع نہیں ہو گا۔

ہم نے اس معاشرہ کو ایک سرسبز و شاداب باغ (جنّت) کہہ کر پکارا ہے، اور ان کے اعمال حسنہ کے نتائج کو لذیذ پھلوں سے تشبیہہ دی ہے تو اس لئے کہ بلند حقیقتیں، محسوس تشبیہات سے سمجھائی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا، یہ بات شانِ خداوندی کے منافی نہیں کہ وہ حقائق کو تمثیلات کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اس نے جنتِ اُخروی کو

بھی تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ (۱۳/۳۵) یہ تو خیر پھر بھی باغات اور پھلوں کی مثالیں ہیں، اگر ضرورت پیش آئے تو اُسے اس میں بھی کسی قسم کا باک نہیں ہوگا کہ وہ مچھر جیسی حقیر شئے، یا اس سے بھی کسی کمتر چیز کی مثال دے کر بات واضح کردے۔ جو لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے (وحی کے ذریعے) بیان ہو رہا ہے، وہ ان مثالوں سے سمجھ جائیں گے کہ یہ، اُن کے نشوونما دینے والے کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔

لیکن جو لوگ اس بنیادی حقیقت ہی سے انکار کرتے ہیں وہ ان تمثیلات اور تشبیہات میں بھی ہزار نقص نکالیں گے، اور کہیں گے کہ اس قسم کی مثالوں سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ یوں بھی تشبیہ اگر سچی بات سمجھانے کے لئے ہو تو اس کے نتائج حقیقت کشا اور بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ اور اگر باطل کی نقاب پوشی کے لئے ہو تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی سے فتنے پھیلتے ہیں۔ اس سے تم سمجھ لو کہ ایک ہی بات سے کس طرح دو متضاد نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ فرق زاویۂ نگاہ کا ہوتا ہے۔ ایک اندازِ نگاہ سے دیکھو تو اسی سے گمراہی کے راستوں پر جا پڑو۔ اور دوسری سے دیکھو تو اسی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کشادہ ہو جائیں لیکن غلط راہوں پر صرف وہ لوگ چل نکلتے ہیں جو قوانین خداوندی کے قالب کے اندر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ان سے گریز کی راہیں نکال کر، اپنے لئے الگ راستے اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام ذمہ داریوں کے قبالہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں جو اُن پر خدا کی ربوبیتِ عالمینی کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، نیز اُس عہد کو بھی توڑ ڈالتے ہیں جو انہوں نظامِ خداوندی سے باندھا تھا (۹/۱۱۱) اور اس طرح انسانیت کے تمام رشتوں کو منقطع کر کے (۱۳/۲۱ ; ۱۳/۲۵) اُسے نسلوں، برادریوں، وطنوں، قوموں کے غیر فطری امتیازات سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور انفرادی یا قومی مفاد پرستی کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں، حالانکہ خدا کے قانونِ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ان رشتوں کو جوڑ کر، تمام نوعِ انسان کو ایک برادری کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں سمجھا جاتے (۲/۲۱۳ ; ۱۰/۱۹ ; ۳۱/۲۸)۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور آخر الامر تباہی اور بربادی کے سوا ان کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔

ان لوگوں سے (جن کی روشِ زندگی کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) کہو کہ تم قانونِ خداوندی کا انکار کس دلیل سے کر سکتے ہو، جبکہ خود تمہاری اپنی ہستی اس کی زندہ شہادت ہے۔ تم کسی انداز سے بھی غور کرو، اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ کرۂ ارض پر زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہ پورا کرہ بے جان مادہ کا ڈھیر تھا۔ پھر اس میں زندگی کی نمود ہوئی اور وہ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی پیکر انسانی تک پہنچی۔ (اس سے پہلے تم زندہ انسان تو ایک طرف کوئی قابلِ ذکر شئے تک نہیں تھے (۷۶/۱)۔ اس مقام پر پہنچ کر تم جیتے جاگتے انسان

بن گئے اور اس قابل ہو گئے کہ تمہیں "تُم" کہکر پکارا جاسکے (۳۹/۹)۔ - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - اس سے ظاہر ہے کہ زندگی تمہاری پیدا کردہ نہیں اسے خدا ہی نے عطا کیا ہے۔
اس کے بعد جب تم طبیعی قانونِ خداوندی کے مطابق مرجاؤ گے تو خدا کیلئے کونسی مشکل ہو گی کہ تمہیں پھر زندہ نہ کر سکے (۳۷/۵۸ ؛ ۴۰/۱۱ ؛ ۴۴/۵۶)۔ لہٰذا، موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ زندگی آگے چلتی ہے مکافاتِ عمل کے لئے۔ اس لئے تم اس قانون کی گرفت سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ تم اس سے ہزار بھاگنے کی کوشش کرو، تمہیں آخر الامر اس کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا ——— بلکہ یوں سمجھو کہ اب بھی تمہارا قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

یہ قانون اس خدا کا متعین کردہ ہے جس نے تمہیں اس زمین پر پیدا کیا تو تمہارے لئے سامان نشو ونما بھی ساتھ ہی مہیا کر دیا۔ پھر تم کائنات کی پہنائیوں میں غور کرو کہ اس میں متعدد اجرامِ فلکی کس توازن و اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہیں (۵۷/۱-۲)۔ یہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اُس خدا کے قانون کے مطابق جو ہر شے کی مضمر قوتوں اور تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ارض و سما کا یہ کائناتی نظام اس لئے سرگرم عمل ہے کہ انسانوں کے اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں (۵۳/۳۱ ؛ ۱۱/۷ ؛ ۴۵/۲۲) اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے انسانی خصوصیات اور کائنات میں اس کے مقام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اُسے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جو درحقیقت خود انسان ہی کی سرگذشت ہے۔ (مفہوم القرآن)

اس باب میں نوعِ انسان سے متعلق اصولی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے انسان کی تمدنی زندگی کا ذکر کیا ہے اور اس کا آغاز "قصۂ آدم" کے تمثیلی بیان سے کیا گیا ہے اسے ہم اس کتاب کی دوسری جلد پر اٹھا رکھتے ہیں۔

مے باقی و ماہتاب باقیست ٭ ما را تو صد حساب باقیست

والسلام

———•‡•———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

(قرآن مجید کی تفسیر ــــ خود ــــ قرآن مجید سے)

جلد دوم

سورۃ بقرۃ - آیات ۳۰ تا ۱۱۲

پرویز

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	———	مطالب الفرقان (جلد دوم)
مصنف	———	غلام احمد پرویزؒ
ناشر	———	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	———	25-B گلبرگ II لاہور 54660
	———	فون: 576 4484
طابع	———	دوست ایسوسی ایٹس
	———	الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 54000
	———	فون: 712 2981
مطبع	———	عالمین پریس
چوتھا ایڈیشن	———	دسمبر 1996ء (بلا ترمیم)

طلوع اسلام ٹرسٹ سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

باسمہٖ تعالیٰ

آئینۂ مطالب

صفحہ	عنوان
ا۔ظ	فہرست
ع	انڈکس آیات
ف	حرفِ آغاز
	پہلا باب — تمہید سرگذشتِ آدم
	الانسان
۳	۱۔ غیر جاندار مادہ سے زندگی کی نمود کیسے ہوگئی۔
۶	۲۔ نظریۂ ارتقاء اور قرآنِ مجید۔
۱۰	۳۔ محققینِ مغرب کی غلط نگہی — سیکولرازم کا تصور
۱۲	۴۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق
۱۵	"نفخِ روح" سے مراد
۱۶	۵۔ انسانی ذات یا نفس کے خصائص و وظائف
	حیات بعد الممات
۲۲	انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں

صفحہ	عنوان
۲۳	**نفسِ انسانی**
۲۴	۶۔ انسانی ذات ہر بچہ کو عطا ہوتی ہے لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔
۲۴	۷۔ انسانی زندگی کا مقصد اس (ذات) کی نشوونما ہے۔
۲۵	۸۔ تزکیۂ نفس کا ذریعہ انفاق فی سبیل اللہ۔
۲۵	۹۔ اس کی پہچان کہ ذاتِ انسانی کی نشوونما ہو رہی ہے
۲۶	۱۰۔ ذات کی خصوصیت 'انفرادیت' ہے۔
؍؍	نیز اختیار و ارادہ۔
۲۷	۱۱۔ عملِ خیر سے مراد۔
۲۸	۱۲۔ موت کے بعد انسانی ذات اپنے اعمال کے نقوش لئے آگے بڑھتی ہے۔
۳۰	۱۳۔ سائیکالوجی کی تحقیق
؍؍	نفسِ انسانی کے دو شعبے۔ شعوری اور غیر شعوری ان دونوں کا مجادلہ۔

عنوان	صفحہ
۱۴- اعمال نامہ سے مراد۔	۳۱
۱۵- نفسِ انسانی کا بقا۔	؍؍
انسانی فطرت	؍؍
۱۶- انسان کی کوئی فطرت نہیں	۳۴
۱۷- ہمارے ہاں کا غلط عقیدہ - اسلام دینِ فطرت ہے	۳۵
۱۸- قرآن میں بیان کردہ انسانی خصوصیات۔	۳۶
۱۹- خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔	۳۸
یہ عقیدہ بھی غلط ہے۔	؍؍
۲۰- **حملِ امانت**	۳۹
۲۱- دیگر انسانی خصوصیات	۴۰
۲۲- اشرف المخلوقات ہونے کا غلط نظریہ۔	۴۱
۲۳- انسان اور بشر۔	؍
۲۴- جن و انس	۴۲
۲۵- النّاس	؍؍
ابلیس	؍؍
۲۶- انسانی کردار کے دو گوشے	۴۲
خونخواریت اور گدازیت	
۲۷- عیسائیت کا باطل نظریہ —	۴۳
گناہِ اول	؍
۲۸- اس سے جبریت کا عقیدہ پیدا ہوا۔	۴۳
اس کی تردید۔	۴۴
۲۹- مغربی محققین کی ریسرچ	۴۴
اور اس کی تردید۔	۴۵

عنوان	صفحہ
۳۰- جبلت - نسل - وراثت - ماحول - عادات - عمرانیت	
کے نظریات اور ان کی تردید۔	۴۶
۳۱- ابلیس یا شیطان — قرآن میں۔	۵۰
یہ خود انسان کے اپنے جذبات کا نام ہے۔	۵۱
۳۲- ان بیباک جذبات کے مختلف مظاہر —	
شیاطین الجن والانس۔	۵۲
۳۳- غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھانا — شیطان کا	
سب سے زیادہ کامیاب حربہ	۵۳
مصنوعی نیکیاں — مصنوعی صلوٰۃ	۵۴
۳۴- احکام کے نتائج خود قرآن نے واضح کر دیئے۔	۵۶
اسے کتاب و حکمت کہتے ہیں۔	؍؍
۳۵- نفسِ امّارہ - نفسِ لوّامہ - نفسِ مطمئنہ	۵۷
۳۶- نفسیاتی امراض اور اخلاقیات کا باہمی تعلق	۵۸
۳۷- انسانی جذبات کی گہرائیاں۔	۵۹
۳۸- شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ کیوں؟	۶۰
آدم	
۳۹- آدم سے مراد آدمی ہے،	۶۱
۴۰- قصۂ آدم خود مدنی الطبع انسان کی سرگزشت ہے	۶۲
۴۱- آدم کا لفظ انبیاء کرام کے ساتھ۔	۶۳
خلیفہ	۴
۴۲- خلیفۃ اللہ کا غلط عقیدہ۔	۶۴
۴۳- خلیفہ کے معنی جانشین کے ہیں۔	۶۴

عنوان	صفحہ
۴۴۔ انسان سے پہلی مخلوق۔	۶۵
۴۵۔ استخلاف فی الارض۔	۶۶
ملائکہ	
۴۶۔ مدبرات امورِ الٰہیہ۔ یعنی نظم و نسقِ کائنات کے لئے مامور قوتیں	۶۷
۴۷۔ فطرت کی قوتیں۔	۶۷
ضمناً۔ عرشِ خداوندی سے مراد	״
۴۸۔ تسبیحِ ملائکہ۔	۶۸
۴۹۔ ملائکہ کا سجدہ۔	״
۵۰۔ تسخیرِ فطرت۔	״
۵۱۔ نفسیاتی اثرات پیدا کرنے والے ملائکہ۔	۶۹
ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔	״
دوسرا باب ـــ سرگزشتِ آدم	
آیات ۲/۳۰ تا ۲/۳۹	
۲/۳۰۔ واذقال ربک...... تعلمون	۷۲
۵۲۔ ملائکہ کی تسبیح و تقدیس۔	״
۵۳۔ تسبیح اور ذکر کا قرآنی مفہوم	۷۳
۵۴۔ ورد و وظائف۔ تعویذ گنڈوں کی حقیقت	۷۵
۵۵۔ فساد انگیزیاں اور خونریزیاں۔	۷۶
۵۶۔ نیشنلزم کی خونریزیاں و فساد انگیزیاں	۷۷

عنوان	صفحہ
۵۷۔ عیسائیت اور جنگ	۷۸
۵۸۔ تغلب یعنی قوت کے استعمال کی دو قسمیں (سائیکالوجی کا انکشاف)	۷۹
۵۹۔ قرآن اور قوت کا استعمال	۸۰
۲/۳۱۔ وعلم آدم الاسماء..... صٰدقین	۸۱
۶۰۔ علم الاسماء۔	۸۱
۶۱۔ اشیائے کائنات یا قوانینِ فطرت کا علم	۸۲
۶۲۔ غلط نام رکھنے کی تباہ کاریاں۔ ایک ضمنی گوشہ	״
بڑے بڑے مزار اور خانقاہیں	״
۶۳۔ تسخیرِ فطرت۔	۸۳
۶۴۔ علمِ انسانی کی امکانی وسعتیں	۸۴
۶۵۔ سائنسدانوں کا اعترافِ عجز۔	״
۶۶۔ تسخیرِ فطرت مقامِ آدم ہے جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں۔	۸۶
۶۷۔ یہ مومنین کا فریضہ ہے۔	״
۶۸۔ علماء کون ہیں۔	۸۷
۶۹۔ کائنات کے متعلق سیکولرازم کا باطل نظریہ۔	״
افلاطون کا نظریہ ـ اعیانِ نامشہود۔	۸۸
ہندوں کی ویدانت اور ہمارے صوفیاء کا	״
وحدت الوجود کا عقیدہ۔	۸۸
مغرب کے مادہ پرستوں کا نظریہ۔	״
۷۰۔ قرآنی نظریہ کائنات۔	۸۹

عنوان	صفحہ
اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔	۸۹
اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔	۹۰
۷۱۔ کائنات کو باطل سمجھنے والے دنیا میں ذلیل ہوتے ہیں۔	۹۱
۷۲۔ مادہ پرستی کی تباہ کاریاں — مغربی مفکرین کا واویلا۔	۹۱
۷۳۔ تین گروہ — مومن۔ مغرب کے مادہ پرست۔ مذہب پرست۔	۹۲
۷۴۔ تخلیقِ کائنات کا ایک مقصد — قانونِ مکافاتِ عمل کی کارفرمائی۔	۹۳
مغرب کے مفکرین کا اعتراف۔	
۲/۳۲ - قالوا سبحٰنک .... الحکیم	۹۴
۷۵۔ ملائکہ کا اعترافِ عجز۔	۹۵
۲/۳۳ - قال یآدم .... تکتمون۔	״
۷۶۔ خدا غیب و شہود کا علم رکھتا ہے۔ اس کا مفہوم۔	״
۷۷۔ میلادِ آدم کے مناظر (اقبال کی زبانی)	۹۶
۲/۳۴ - و اذ قلنا للملٰئکۃ .... من الکٰفرین	۹۸
۷۸۔ ملائکہ کا سجدہ۔	۹۸
سجدہ کا مفہوم۔	۹۹
۷۹۔ ابلیس کا انکار۔	״
ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا۔	״

عنوان	صفحہ
۸۰۔ ابلیسی کردار کے دو رُخ۔	۱۰۰
اپنا فیصلہ — اور مجبوری کا عذر۔	
۸۱۔ عقیدۂ جبر، پستی کردار اور دوں ہمتی کا مظہر ہے۔	״
۸۲۔ معصیتِ ابلیس و آدم میں فرق۔	۱۰۱
آدم نے غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس میں اصلاح کا امکان ہو گیا۔	״
ابلیس نے اس کا اعتراف نہ کیا۔ اس میں اصلاح کا امکان نہ رہا۔	״
۸۳۔ ابلیسی کردار اور اقبال۔	״
۸۴۔ پیدائشی امتیاز کا باطل نظریہ	۱۰۲
۸۵۔ آدم مسجودِ ملائک ہے	۱۰۳
خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں	״
یہی مقامِ عبدیت ہے۔	״
۸۶۔ شرک کیوں جرمِ عظیم ہے	۱۰۴
۸۷۔ رسوم و مظاہر کی اہمیت اور انہیں مقصود بالذات سمجھ لینے کی تباہ کاریاں۔	۱۰۵
۸۸۔ سیکولر نظام میں سجدہ کی اجازت!	۱۰۶
تحریکِ پاکستان کے دوران یہی مسئلہ مابہ النزاع تھا	״
۸۹۔ ابلیس کے جرائم کی فہرست۔	۱۰۶
۹۰۔ جذبۂ حسد۔	۱۰۷
۹۱۔ مستبدوں کا دبدبہ اور بزدلی۔	״

عنوان	صفحہ
۹۲۔ فرعون کا ایمان — اس کی پستیٔ کردار کا نتیجہ	۱۰۷
۹۳۔ ابلیس کا جذبۂ انتقام۔	۱۰۸
۹۴۔ قیامت تک مہلت۔	″
۹۵۔ ابلیس اور خدا کے مخلص بندوں کی آویزش میں خدا دخل نہیں دیتا۔	۱۰۹
۹۶۔ احتناک کا رسواکن تغلب۔	″
۹۷۔ مستبد ڈکٹیٹر اپنے مخالفین کو ذلیل کر کے بڑی لذت حاصل کرتے ہیں۔	۱۱۰
۲/۳۵۔ وقلنا یآدم ..... الظّٰلمین	۱۱۱
۹۸۔ جنتِ آدم۔ رزق کی فراوانی لیکن میری اور تیری کی تفریق نہیں۔	۱۱۱
۹۹۔ مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ۔	۱۱۲
۱۰۰۔ جو قوم دنیا میں ذلیل ہے وہ آخرت میں بھی ذلیل ہوگی۔	۱۱۳
۱۰۱۔ شجر سے کیا مراد تھی؟	″
۱۰۲۔ باہمی اختلافات سے قبیلوں۔ گروہوں اور قوموں میں بٹ جانا۔	۱۱۴
۲/۳۶۔ فازلّهما الشیطٰن ... الی حین	۱۱۵
۱۰۳۔ ابلیسی سازش یہ ہے کہ نوعِ انسان، اولاد کی نسبت سے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائے۔	۱۱۶
۱۰۴۔ اہل و عیال وجہ زینت ہیں لیکن اگر یہ بلند انسانی مقاصد کے راستے میں حائل ہوجائیں تو فتنہ بن جاتے ہیں۔	۱۱۷

عنوان	صفحہ
۱۰۵۔ قرآنِ کریم نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں مجرم قرار دیا۔	۱۱۷
عیسائیت نے صرف عورت کو مجرم ٹھہرایا اور اس بنا پر اسے مردود مخلوق قرار دیا۔	″
عیسائیت میں عورت کی حیثیت	۱۱۸
۱۰۶۔ عورت کی حیثیت خود ہمارے ہاں —	″
وضعی روایات پر مبنی تفاسیر	۱۱۹
۱۰۷۔ قرآن کریم میں مرد اور عورت ہمدوش	۱۲۳
۱۰۸۔ ہبوطِ آدم سے مراد تشتت و افتراق کی پست سطح زندگی۔	۱۲۵
۱۰۹۔ عداوت کا مفہوم — الگ الگ ہوجانا۔	۱۲۶
۱۱۰۔ معاشی طبقات میں باہمی عداوت۔	″
۱۱۱۔ قرآن کریم کی وارننگ۔	۱۲۷
۲/۳۷۔ فتلقّٰی آدم ...... التوّاب الرّحیم	۱۲۹
۱۱۲۔ وحی کی راہنمائی کی ضرورت	۱۲۹
کلمات اللہ سے مراد وحیٔ خداوندی ہے۔	۱۳۱
یا وہ نظریۂ حیات یا نظامِ زندگی جو وحی پر مبنی ہو	۱۳۲
۱۱۳۔ آدم کی توبہ — اصلاح کی گنجائش اور اس کا طریق	۱۳۳
۲/۳۸۔ قلنا اھبطوا .... یحزنون۔	″
۱۱۴۔ اتباعِ وحی کا نتیجہ — خوف و حزن سے مامونیت	″
خوف و حزن کا تفصیلی مفہوم۔	۱۳۴
سبّ غالب — جماعت مومنین کی زندگی یہی اولیاء اللہ ہیں۔	۱۳۵

صفحہ	عنوان
	۲/۳۹ - والذین کفروا وکذبوا ......
۱۳۶	...... خلدون۔
	۱۱۵ - اس کے برعکس کفر اور تکذیب کا نتیجہ جہنم
″	کی تباہی ہوگا۔
۱۳۶	تکذیب کا مفہوم۔
۱۳۶	۱۱۶ - سرگزشتِ آدم پر نگہِ بازگشت۔
	انسان نے خارجی کائنات کے حسن کو سنوارا
	ہے۔ لیکن اپنی دنیا کو تباہ برباد کرتا چلا آ
۱۳۷	رہا ہے۔
۱۳۸	۱۱۷ - جنتِ آدم اور جنتِ مومن میں فرق —
	بخشش کی جنت اور اعمال کے بدلے میں
″	حاصل کردہ جنت۔
۱۳۹	۱۱۸ - تورات میں قصہ آدم
۱۴۱	یہ نتیجہ ہے وحیِ خداوندی میں انسانی آمیزش کا
۱۴۲	۱۱۹ - وضعی روایات کی سازش۔
۱۴۳	ان روایات کی رو سے قصہ آدم کو اعجوبہ بنا
۱۴۳	دیا گیا ہے۔
۱۴۴-۱۴۵	خلاصہ آیات ص۳۰ تا ص۳۹
	(مقتبس از مفہوم القرآن)

تیسرا باب — داستانِ بنی اسرائیل — منزلِ اول

آیات ۲/۴۰ تا ۲/۴۶

صفحہ	عنوان
	۱۲۰ - قرآن فہمی کے تین طریقے۔ علم و دانش کی رو سے
۱۴۷	نتائج پرکھنے سے۔ یا تاریخی شہادت کے ذریعے۔
۱۴۹	۱۲۱ - تاریخ کی اہمیت۔
۱۵۰	سائنس یا فلاسفی آف ہسٹری۔
۱۵۱	مارکس کا نظریۂ تاریخ۔
۱۵۲	۱۲۲ - قانونِ مکافاتِ عمل یا سنت اللہ
۱۵۴	۱۲۳ - اثری انکشافات (اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات)
۱۵۵	۱۲۴ - قوموں کے عروج و زوال کے اصول۔
″	۱۲۵ - قوموں کی ہلاکت سے کیا مفہوم ہے۔
۱۵۶	۱۲۶ - داستانِ بنی اسرائیل۔
۱۵۷	ابتدائی تعارف۔
″	فرعونِ مصر۔
۱۵۹	۱۲۷ - بنی اسرائیل کے دس گم شدہ اسباط۔
۱۶۰	۱۲۸ - بخت نصر کا حملہ۔
۱۶۱	اس کا نقشہ حزقی ایل نبی کے خواب کی صورت میں
۱۶۱-۱۶۲	اس کا قرآن کریم میں ذکر۔
	۱۲۹ - حضرتِ عیسیٰ کے زمانے میں یہودیوں کے احبار و
۱۶۴	رہبان کی حالت۔
″	حضرت عیسیٰ کے انقلاب آفرین وعظ۔
″	انجیل برنباس کا بیان۔
۱۶۵	سیکولرازم کے خلاف بغاوت۔
۱۶۵	۱۳۰ - آخری تباہی۔

عنوان	صفحہ
۱۳۱- ان کے جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے ان کی تباہی ہوئی۔	۱۶۶
۱۳۲- ایک غلط فہمی کا ازالہ—	۱۶۸
یہودیوں کی حکومت قائم ہوسکتی ہے۔	۱۶۸
۱۳۳- حضرتِ موسیٰ کی داستانِ حیات۔	۱۷۰
۲/۴۰ - یٰبنی اسرائیل.....فارھبون۔	۱۷۱
۱۳۴- بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی۔	۱۷۱
فرعون کی طرف سے عذاب کی شکلیں۔	〃
محکومی—تفرقہ—ذبح ابناء کا مفہوم۔	۱۷۲-۷۳
۱۳۵- نجات کا قرآنی مفہوم۔	۱۷۴
۱۳۶- تمکن فی الارض خدا کا انعام ہے جس سے بنی اسرائیل بہرہ یاب ہوتے تھے۔	۱۷۶
۱۳۷- کتاب و حکومت و نبوت۔ سرفرازیاں اور سربلندیاں۔	۱۷۷
۱۳۸- میثاقِ بنی اسرائیل کی تفصیلات۔	۱۷۹
۱۳۹- نقضِ عہد کا نتیجہ—احساسِ کمتری۔ منافقت۔	〃
۱۴۰- "صرف مجھ سے ڈرو" کا مفہوم۔	۱۸۰
۱۴۱- "خدا سے ڈرنے" کا مفہوم کیا ہے — ایک اہم ضمنی گوشہ۔	۱۸۰-۸۲
۲/۴۱ - وآمنوا بما انزلتُ.....فاتقون۔	۱۸۲
۱۴۲- اہلِ کتاب سے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟	۱۸۲

عنوان	صفحہ
۱۴۳- ان کی کتابیں محرّف تھیں۔	۱۸۳
۱۴۴- ان میں اختلافات پیدا ہوگئے تھے۔	۱۸۴
۱۴۵- تورات کی تاریخ۔	〃
۱۴۶- وحی کی دو قسمیں— وحی جلی اور وحی خفی	۱۸۶
مثنا۔ جمارا۔ تالمود۔ باطنی علم۔	〃
۱۴۷- قرآن کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم۔	۱۸۷
۲/۴۱ - ولاتکونوا اوّل کافر بہٖ۔	۱۸۸
۱۴۸- دین کی سب سے زیادہ مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔	۱۸۸
ایمان، قرآنِ خالص کی اطاعت کا نام ہے۔	۱۸۹
مذہب، شخصیتوں کو ساتھ ملاتا ہے۔ اور انہی کی وضع کردہ شریعت کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پکارتا ہے۔	۱۹۰
یہ شرک ہے	〃
۱۴۹- حضورؐ پر قریش تو ایمان لے آئے لیکن اہلِ کتاب مخالفت پر اڑے رہے۔	۱۹۰
۱۵۰- اگر تمام معاملات کے فیصلے منزل من اللہ کتاب (قرآن مجید) کے مطابق نہ کئے جائیں تو یہ کفر ہے۔	۱۹۱
۱۵۱- مذہب میں جنت آسانی سے مل جاتی ہے۔	۱۹۱
۱۵۲- یہود و نصاریٰ کا باہمی تفرقہ۔	۱۹۲
۱۵۳- یہ دین میں غلو کرتے تھے۔	۱۹۳

عنوان	صفحہ
رسولوں کو خدا اور علماء و مشائخ کو رسول بنا دینا	۱۹۳
۱۵۴- ہر رسول کا اعلان کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں۔	״
۲/۴۱- وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا	۱۹۴
۱۵۵- مذہب کو کاروبار مت بناؤ	۱۹۴
ہر رسول کا اعلان کہ تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔	״
۲/۴۲- ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون۔	۱۹۵
حق کے معانی و مفہوم	״
خدا الحق ہے۔	۱۹۶
قرآن الحق ہے۔	״
اسلام دین الحق ہے۔	״
اعمال نامہ الحق ہے۔	۱۹۷
۱۵۶- کشمکش حق و باطل۔	۱۹۷
۱۵۷- قوانینِ فطرت بھی حق ہیں	۱۹۸
ان کی خلاف ورزی باطل نتائج پیدا کرتی ہے	۱۹۹
۱۵۸- اسلامی جنگیں بھی اسی مقصد کے لئے تھیں۔	״
۲/۴۳- واقیموا الصلوٰۃ ..... الراکعین۔	۲۰۱
۱۵۹- زکوٰۃ کا مفہوم۔	״
(ضمناً اسلام اور کمیونزم کا بنیادی فرق)۔	۲۰۲
۱۶۰- انبیاء سابقہ کو زکوٰۃ کا حکم۔	۲۰۲
رسول اللہؐ اور جماعت مومنین کو زکوٰۃ کا حکم۔	۲۰۲
۱۶۱- زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم جو قرآن کے مطابق نہیں۔	۲۰۴
۱۶۲- ایتائے زکوٰۃ حکومت کا فریضہ ہے۔	۲۰۵
۱۶۳- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔	۲۰۶
انسانی جسم اور ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا	۲۰۷
۱۶۴- دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت۔	۲۰۸
فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔	۲۰۹
زکوٰۃ کے متعلق ایک وضعی روایت۔	۲۰۹
۱۶۵- رسول اللہؐ نے مروجہ زکوٰۃ دی ہی نہیں۔	۲۱۰
حضورؐ کی مالی حالت۔	۲۱۰
۲/۴۳- وارکعوا مع الراکعین۔	
۱۶۶- رکوع کا مفہوم۔ اطاعتِ خداوندی۔	۲۱۱
رکوع اور سجدہ میں فرق — رکوع عبوری دور کے احکام کی اطاعت ہے۔	۲۱۲
۱۶۷- دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔	۲۱۳
۱۶۸ تشکیل اُمت۔	״
رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک سے نہیں ایمان کے اشتراک کی بنا پر تعمیرِ امت۔	۲۱۵
ضمناً۔ دین اور تصوف میں فرق۔	״
۱۶۹- اُمت کا اجتماعی نظام — خلافت یا اسلامی مملکت	۲۱۶
مرکزِ ملت — قبلہ	״
۱۷۰- ہماری موجودہ حالت — فرقہ بندی کے شرک میں مبتلا۔	۲۱۷

عنوان	صفحہ
(۲/۴۴)- اتامرون الناس..... تعقلون	۲۱۹
۱۷۱- بِرّ کے معنی۔	۲۱۹
۱۷۲- یہودیوں کے علماء و مشائخ کی حالت۔	۲۲۰
(۲/۴۵-۴۶)- واستعینوا بالصبر... راجعون	۲۲۲
۱۷۳- یہودیوں میں استقلال اور استقامت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی	
—— صبر کا مفہوم۔	"
۱۷۴- فیصلے قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہوں گے۔	۲۲۳
خلاصۂ باب	۲۲۴

چوتھا باب

داستانِ بنی اسرائیل- دوسری منزل سینا کی وادیاں

آیات ۲/۴۷ تا ۲/۵۴

عنوان	صفحہ
(۲/۴۷)- یبنی اسرائیل...... علی العلمین	۲۲۸
۱۷۵- نعمائے خداوندی کی یاد دہانی سے مقصد	۲۲۸
(۲/۴۸)- واتقوا یوما..... ینصرون	۲۲۸
۱۷۶- نجات کے متعلق یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد۔	۲۲۹
۱۷۷- قانونِ مکافاتِ عمل کا تشریحی بیان۔	۲۳۰
۱۷۸- جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم	۲۳۱
۱۷۹- شفاعت کا باطل عقیدہ	۲۳۲
۱۸۰- شفاعت کا قرآنی مفہوم۔	۲۳۴
(ضمناً) قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کس طرح متعین کرنا چاہیئے۔	۲۳۵
۱۸۱- دنیاوی زندگی میں شفاعت کے معنی معاونت کے ہیں۔	۲۳۵
۱۸۲- اخروی زندگی میں شفاعت سے مراد شہادت (گواہی) دینے کے ہیں۔	۲۳۶
۱۸۳- خدا خود شفیع ہے۔	۲۳۷
۱۸۴- رسول اللہ کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔ حضورؐ کے لئے شاہد اور شہید کے الفاظ ہی آتے ہیں۔	۲۳۷
۱۸۵- مجرموں کو جرم کے بدلے میں کچھ لے کر بھی چھوڑا نہیں جائے گا۔ اسے عدل یا کفارہ کہتے ہیں۔	۲۳۹
۱۸۶- نصرت کے معنی کسی مجرم کی مدد کر کے اُسے چھڑا لینا	۲۳۹
(۲/۴۹)- واذ نجینکم...... عظیم۔	۲۴۰
۱۸۷- بلاء (ابتلاء) کا قرآنی مفہوم۔	۲۴۱
اللہ اپنے بندوں کی آزمائش نہیں کرتا۔	"
۱۸۸- ابتلاء سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی صلاحیتیں کس حد تک نشو و نما پا رہی ہیں اور وہ کس سیرت و کردار کا مالک ہے۔	۲۴۲
۱۸۹- بلاء عظیم کے معنی احسان عظیم۔	۲۴۳
(۲/۵۰)- واذ فرقنا..... تنظرون	۲۴۴

عنوان	صفحہ
۱۹۰- مصر سے نکل کر سینا کی طرف آنے کا مرحلہ۔	۲۴۴
۱۹۱- ضمناً ـ رسول اللہؐ کی ہجرت کے دوران غار کا واقعہ۔	۲۴۴
۱۹۲- عصا کے معنی۔	۲۴۵
۱۹۳- آل کے معنی	۲۴۵
۱۹۴- سمندر نے کیسے راستہ دیا تھا۔	۲۴۶-۴۸
۱۹۵- فرعون کا ڈوبتے وقت ایمان لانا۔	۲۴۹
(جبریل اس کے منہ میں مٹی ٹھونس رہا تھا!)	۲۴۹
۱۹۶- اس کے بالمقابل ساحرین دربارِ فرعون کا ایمان!	۲۵۰
۱۹۷- فرعون کی لاش کا محفوظ رکھے جانا۔	۲۵۲
(۲/۵۱)- واذ واعدنا ...... ظلمون۔	۲۵۳
۱۹۸- فرمائش کہ ہمارے لئے بھی ایک بت بنوا دیجئے	۲۵۳
۱۹۸- عزیر کون تھا؟	۲۵۴
۱۹۹- سامری کون تھا۔	۲۵۶
داستان گو واعظ۔	۲۵۷
۲۰۰- گوسالہ پرستی کا واقعہ	۲۵۷
۲۰۱- قوم کو تفرقہ سے بچانے کے لئے عارضی شرک گوارا کر لیا۔	۲۵۹
۲۰۲- مسلمان اور فرقہ پرستی کا شرک!	۲۵۹
ابلیس کا افسوس - یہ فرقے نہیں مکاتبِ فکر ہیں۔	۲۵۹
۲۰۳- سامریت کی افسانہ نگاری۔	۲۶۰
۲۰۴- تورات کا بیان۔	۲۶۱

عنوان	صفحہ
۲۰۵- شرک سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے اس لئے یہ ظلم عظیم ہے۔	۲۶۱-۶۲
(۲/۵۲)- ثم عفونا ...... تشکرون۔	۲۶۲
۲۰۶- شکر کا مفہوم۔	۲۶۳
۲۰۷- بازآفرینی کا ایک اور موقعہ	۲۶۴
(۲/۵۳)- واذ اٰتینا ...... تھتدون	۲۶۴
۲۰۸- اس مقصد کے لئے ضابطۂ ہدایت دیا گیا	۲۶۴
۲۰۹- اسے فرقان کہا گیا۔ فرقان کا مفہوم۔	۲۶۴
۲۱۰- ہر نبی اور ہر رسول کو کتاب دی گئی تھی۔	۲۶۵
۲۱۱- حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو کتاب ملی تھی۔	۲۶۵
(۲/۵۴)- واذ قال ...... التواب الرحیم	۲۶۶
۲۱۲- توبہ اور تواب کی مزید تشریح۔	۲۶۶
۲۱۳- خدا کی صفت البارئ کا مفہوم۔	۲۶۷
۲۱۴- فاقتلوا انفسکم کا مفہوم	۲۶۷
خلاصۂ باب	

پانچواں باب ـ آیات ۲/۵۵ تا ۲/۷۱

داستانِ بنی اسرائیل ـ خوئے غلامی کے مظاہرے

عنوان	صفحہ
۲۱۵- خوئے غلامی میں پختگی کے نتائج۔	۲۷۲
۲۱۶- حضرت ابراہیمؑ کا سوال ـ رب ارنی کیف تحی الموتیٰ۔	۲۷۴

عنوان	صفحہ
۲۱۷ - حضرت موسیٰؑ کو ستانے والی قوم۔	۲۷۵
طرح طرح کے مطالبات، شکوے، طعن تشنیع۔	//
(۲/۵۵)- واذ قلتم ...... تنظرون-	۲۷۶
۲۱۸ - مطالبہ کہ ہم خدا کو بے نقاب دیکھیں گے۔	۲۷۶
اور بزدلی کا یہ عالم کہ بجلی کی کڑک سے ہوش و حواس اُڑ گئے۔	۲۷۷
شرک سے انسان ایسا ہی بزدل ہو جاتا ہے۔	//
۲۱۹ - مسلمانوں کو تنبیہ کہ تم ایسا نہ ہو جانا!	۲۷۸
لیکن تصوف ہمیں ان سے بھی آگے لے گیا۔	۲۷۹
(۲/۵۶)- ثمّ بعثنٰکم ..... تشکرون-	۲۷۹
۲۲۰ - لفظ موت کا مجازی مفہوم۔	۲۸۰
۲۲۱ - لفظِ بعث کا مفہوم	۲۸۱
(۲/۵۷)- وظلّلنا علیکم ..... یظلمون	۲۸۲
۲۲۲ - دیگر نعمائے خداوندی — بادلوں کا سایہ۔	
یعنی آسائش و راحت کا سامان۔	۲۸۲
۲۲۳ - لفظِ نزول کے معانی	۲۸۳
۲۲۴ - من و سلویٰ۔	//
۲۲۵ رزق کے ساتھ طیّب کی شرط۔ طیب کا مفہوم	۲۸۳
یہی شرط، کمیونزم اور قرآن کے معاشی نظام میں حدِ فاصل ہے۔	
(۲/۵۸)- واذ قلنا ..... المحسنین	۲۸۵
۲۲۶ - خلافتِ ارضی۔ مملکت و تمکن۔	۲۸۶

عنوان	صفحہ
۲۲۷ - عام فاتحین اور مومن فاتحین میں فرق۔	۲۸۶
عجز و انکساری کے ساتھ مفتوحہ علاقہ میں داخل ہونا	//
اندازِ ملوکیت کی بساط الٹ دی گئی۔	//
۲۲۸ - مغفرت کا مفہوم	۲۸۷
بخشش کا تصور ہی خلافِ قرآن ہے۔	۲۸۸
۲۲۹ - محسنین کے لئے اجر سے بھی کچھ زیادہ۔	۲۸۹
محسنین کے معنے۔ حسن کا مفہوم۔	۲۸۹
الاسماء الحسنیٰ کے معنی۔	۲۹۰
۲۳۰ - عدل و احسان کا حکم۔ اس کے معنے۔	۲۹۱
۲۳۱ - ھل جزاء الاحسان الا الاحسان	
کا مفہوم۔	۲۹۱
(۲/۵۹)- فبدل الذین ..... یفسقون	۲۹۳
۲۳۲ - ہماری تفاسیر کی رُو سے اس کا مفہوم۔	//
اس کا عملی نتیجہ — اہمیت صرف الفاظ کو،	//
معانی کو نہیں۔ فنِ قرأت۔ تبلیغی جماعت۔	//
۲۳۳ - ان سے کہا کہ اٹھو اور ارضِ مقدس پر قبضہ کر لو۔	۲۹۴
کہنے لگے۔ ہم تو نہیں جائیں گے۔ آپ دونوں بھائی جائیے۔	//
وہ زمین چالیس سال تک اُن پر حرام قرار دیدی گئی۔	۲۹۵
۲۳۴ - زمین کے وارث وہی ہو سکتے ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو۔	۲۹۵
۲۳۵ - رجز کے معنی۔	۲۹۵

عنوان	صفحہ
(۲/۶۰)- واذ استسقیٰ ... مفسدین	۲۹۷
۲۳۶- پانی کے چشمے۔	۲۹۷
۲۳۷- چٹپٹی غذاؤں کے تقاضے۔	۲۹۸
(۲/۶۱)- واذ قلتم ...... یعتدون	۲۹۹
۲۳۸- قتلِ انبیاء کا مفہوم۔	۳۰۰
(مرزا غلام احمد کی دلیل کا ابطال)۔	۳۰۱
۲۴۰- اللہ اور اس کے رسول ہی غالب آکر رہیں گے۔	۳۰۲
حزب اللہ اور حزب الشیطان،	۳۰۳
ہوسکتا تھا کہ دین کا غلبہ رسول کی وفات کے بعد ہو	۳۰۴
۲۴۱- قتل بغیر الحق کے معنی۔	۳۰۴
۲۴۲- تورات اور انجیل دونوں میں ہے کہ دین بنی اسرائیل	
کی قوم تک محدود رکھا جائے گا۔ عالمگیر نہیں ہوگا	
قرآن نے اس کی تردید کی۔	۳۰۵
(۲/۶۲)- انّ الذین امنوا .... یحزنون	۳۰۵
۲۴۳- دین عالمگیر انسانیت کے لئے ہے	〃
(۲/۶۳)- واذ اخذنا ..... تتقون۔	۳۰۶
۲۴۴- الطور سے مراد۔	〃
(۲/۶۴)- ثم تولیتم .... الخسرین	۳۰۶
۲۴۵- مہلت کے وقفے میں اضافہ۔	۳۰۷
(۲/۶۵)- ولقد علمتم .... خاسئین	۳۰۷
۲۴۶- سبت کا مفہوم۔	〃
۲۴۷- یہودیوں کے بندر بن جانے کا مفہوم	۳۰۸

عنوان	صفحہ
۲۴۸- مودودی صاحب کی تفسیر	۳۱۰
(۲/۶۶)- فجعلنٰها نکالاً ..... للمتقین۔	〃
۲۴۹- یہ واقعہ ہمارے لئے موجبِ عبرت ہے۔	۳۱۰
(۲/۶۷)- واذ قال موسیٰ .... من الجٰهلین	۳۱۱
۲۵۰- ذبحِ بقر کا واقعہ	〃
۲۵۱- اعوذ باللہ کا مفہوم۔	۳۱۲
(۲/۶۸)- قالوا ادع لنا ..... تؤمرون۔	۳۱۴
۲۵۲- بجائے اس کے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کرتے لگے	
موشگافیاں کرنے ـــ مثلاً اس بیل کی عمر	
کیا ہونی چاہیئے۔	۳۱۴
(۲/۶۹)- قالوا ادع لنا ...... النظرین۔	〃
۲۵۳- اور اس کا رنگ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔	۳۱۴
(۲/۷۰)- قالوا ادع لنا .... لمهتدون۔	〃
۲۵۴- کہا کہ بات اب بھی مشتبہ سی ہے وضاحت کیجئے	۳۱۴
(۲/۷۱)- قال انه ...... یفعلون۔	۳۱۵
۲۵۵- اسقدر کٹ حجتیوں کے بعد جاکر اس سیدھے	
سادے حکم کی تعمیل کی!	〃
۲۵۶- ناپختہ ذہنیتوں کے مسلمان اپنے سابقہ	
عقائد ساتھ لاتے ہیں	۳۱۵
۲۵۷- قرآنِ کریم کے اصولی احکام کی جزئیات کا تعین	۳۱۶
۲۵۸- یہ قوم اس طرح حضرت موسیٰؑ کو تنگ کرتی تھی	۳۱۸
۲۵۹- ہمارے ہاں کی ایک وضعی روایت- پتھر کپڑے لیکر بھاگ گیا	۳۱۹

عنوان	صفحہ
چھٹا باب آیات ۲/۷۲ تا ۲/۱۱۴	۳۲۱
داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل	
(۲/۷۲-۷۳)- واذ قتلتم ..... تعقلون -	۳۲۲
۲۶۰- قرآنی احکام وحقائق کے تین گوشے -	″
۲۶۱- واقعہ قتل کی عام تفسیر- اور اس پر اعتراضات	۳۲۳
۲۶۲- ہمارا قیاس — اس میں تفتیشِ جرم کا نفسیاتی طریقہ بتایا گیا تھا-	۳۲۵-۲۶
۲۶۳- مودودی صاحب کا بیان کہ قرآن میں (معاذ اللہ) ابہام ہے-	۳۲۸
(۲/۷۴)- ثم قست قلوبکم.... تعملون	۳۲۹-۳۰
۲۶۴- یہودیوں کی قساوتِ قلبی-	۳۳۰
۲۶۵- دل کس طرح سخت ہو جاتے ہیں؟	۳۳۱
۲۶۶- یہودیوں کی زر پرستی اور خود غرضی کی انتہا-	۳۳۲
۲۶۷- خشیت کا مفہوم-	۳۳۳
(۲/۷۵)- افتطمعون...... یعلمون-	۳۳۳
۲۶۸- حضور دل سے چاہتے تھے کہ یہ لوگ تباہی سے بچ جائیں۔	۳۳۴
(۲/۷۶)- واذا لقوا الذین.... تعقلون-	۳۳۴-۳۵
۲۶۹- ان کی منافقت -	۳۳۵
۲۷۰- ان کے مذہبی پیشواؤں کی تاکید کہ مسلمانوں سے اپنی صحیح تعلیم کی کوئی بات نہ کہہ دینا۔	۳۳۵
(۲/۷۷)- اولا یعلمون .... یعلنون	۳۳۶
۲۷۱- لیکن وہ خدا سے کیا چھپا سکتے تھے؟ -	۳۳۶
۲۷۲- لفظِ حدیث کے معنی-	″
(۲/۷۸)- ومنھم امیون..... یظنون-	۳۳۷
۲۷۳- لفظِ اُمّی کے معنی (۱) ان پڑھ-(۲) غیر اہل کتاب- اور (۳) مکہ کا باشندہ -	۳۳۷
۲۷۴- رسول اللہ نبوت سے پہلے ان پڑھ تھے- بعد میں ایسے نہیں تھے-	۳۳۸
۲۷۵- لفظِ امانیّ کے معنی آرزو اور (۲) لفظی تلاوت -	۳۳۸-۳۹
۲۷۶- کتاب اللہ کا رسمی احترام- تلاوت مفہوم سمجھے بغیر-	۳۳۹
(۲/۷۹)- فویل للذین.... یکسبون	۳۴۰
۲۷۷- شریعت سازی اور دین فروشی-	۳۴۰
جب مذہب ذریعہ معاش بن جائے تو ہر جگہ یہی کچھ ہوتا ہے -	۳۴۰
(۲/۸۰-۸۲)- وقالوا...... خلدون-	۳۴۱
۲۷۸- خدا کا قانونِ مکافات — جزا اور سزا اعمال کا نتیجہ -	۳۴۱
عمل اور فعل میں فرق-	۳۴۲
عمل کے معنی ہیں ایسا کام جو بالارادہ اور التزاماً کیا جائے-	۳۴۲
(۲/۸۳)- واذ اخذنا.... معرضون	۳۴۲-۴۳

عنوان	صفحہ
۲۷۹- تولید و تخلیق میں فرق	۳۴۳
خدا کا عمل تخلیقی ہے، تولیدی نہیں۔	//
اس کے ہاں بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس کی بیوی نہیں۔	۳۴۴
ایک عظیم دلیل۔ خدا اپنے قوانین کے خلاف نہیں کرتا	//
۲۸۰- والدین سے حسنِ سلوک۔	۳۴۵
۲۸۱- عائلی زندگی (یعنی خاندانی رفاقت) کی ضرورت	۳۴۶
۲۸۲- ماں باپ کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں۔	۳۴۷
اسوۂ ابراہیمی کا اتباع نہ کہ رام کی تقلید۔	۳۴۸
۲۸۳- ذی القربیٰ سے حسنِ سلوک۔	۳۴۹
۲۸۴- یتامیٰ سے حسنِ سلوک۔	//
یتیم کے معنی۔ جو معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔	۳۵۰
۲۸۵- قولوا للناس حسنا۔	//
(۲/۸۴)- واذ اخذنا.... تشہدون۔	۳۵۲
۲۸۶- بنی اسرائیل کے دو عہد — باہمی خونریزی نہیں کرو گے۔	۳۵۲
(۲/۸۵)- ثم انتم ھؤلاء..... تعلمون۔	//
پہلے لوگوں کو بیکس اور محتاج بنا دینا، پھر ان کی مدد کر کے اپنے آپ کو فریب دے لینا کہ ہم ثواب کا کام کر رہے ہیں۔	۳۵۲-۵۳
عصرِ حاضر کے باطل نظام سرمایہ داری، اور فلاحی مملکتوں کا نقشہ۔	۳۵۴-۵۶
۲۸۷- روایات اور پیش گوئیاں — ایک ضمنی گوشہ	۳۵۷
۲۸۸- غلام اور لونڈیاں — قرآنِ کریم کی روشنی میں	۳۵۸
— مودودی صاحب کی تفسیر میں	۳۵۸-۵۹
۲۸۹- کتاب کے ایک حصہ پر ایمان دوسرے سے انکار!	۳۵۹-۶۰
یہ سیکولرازم ہے۔	۳۶۱
۲۹۰- تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء کا یہی مسلک تھا۔	۳۶۱
یہی اب ہماری حالت ہے۔ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز	۳۶۲
۲۹۱- دین کے نظام کی تکمیل تدریجاً ہوگی۔	۳۶۲-۶۳
(۲/۸۶)- اولٰئک .... ینصرون۔	۳۶۳
۲۹۲- اس کی وجہ — دنیاوی مفاد کو مستقل اقدار پر ترجیح دینا ہے۔	۳۶۳
(۲/۸۷)- ولقد اتینا...... تقتلون۔	۳۶۴
۲۹۳- ختمِ نبوت — ایک ضمنی گوشہ۔	۳۶۵
۲۹۴- روح القدس کا ایک مفہوم۔	//
۲۹۵- قرآنِ خالص سے نفرت — اس میں تبدیلی کرنے کا مطالبہ۔	۳۶۶
(۲/۸۸)- وقالوا قلوبنا غلف... یومنون	۳۶۷

عنوان	صفحہ
۲۹۶- حصولِ علم کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔	۳۶۸
انسانی علم ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جارہا ہے۔	؍؍
یہ ذہنیت غلط ہے کہ ہمیں مزید علم کی ضرورت نہیں۔	؍؍
ہمارے علماء کی حالت۔	۳۶۹
امام غزالیؒ۔ مفتی محمد عبدہٗ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ دارالمصنفین کے مجلہ معارف کی آراء۔ اور علامہ اقبال کی تنقیدات۔	۳۷۰-۷۳
۲۹۷- لعنت کے معنی۔	۳۷۴
(۲/۸۹)- ولما جاءھم ۔۔۔۔ علی الکٰفرین	۳۷۵
۲۹۸- تورات میں آنے والے رسول کی پیش گوئی۔	۳۷۶
انجیل میں بھی۔	۳۷۷
۲۹۹- حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی حضورؐ کے متعلق قرآن کریم میں اس کا ذکر	۳۷۸
۳۰۰- تمام اہلِ مذہب آنے والے کے انتظار میں ہیں۔	؍؍
وہ آنے والا آچکا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرمؐ۔	۳۷۸
لیکن ہم بھی آنے والے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔	۳۷۹
مجدد دین۔ مہدی آخر الزمان۔ حضرت عیسیٰ کا نزول	؍؍
۳۰۱- یہ عقائد ختمِ نبوت کے منافی ہیں۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔	۳۸۰
(۲/۹۰-۹۳) بئسما ۔۔۔۔۔ مؤمنین۔	۳۸۱-۸۳

عنوان	صفحہ
۳۰۲- قرآن مجید سننا لیکن عمل اس کے خلاف کرنا۔ یہ ہے ہمارا شیوہ۔	۳۸۳
(۲/۹۴-۹۶)- قل ان کانت ۔۔۔ بما یعملون	۳۸۵-۸۶
۳۰۳- موت محاسبۂ خویش کا ذریعہ ہے۔	۳۸۵
مومن موت کا استقبال کرتا ہے۔	۳۸۶
کافر اس سے بھاگتا پھرتا ہے۔	؍؍
(۲/۹۷-۹۸) قل من ۔۔۔۔۔ للکٰفرین۔	۳۸۶-۸۷
۳۰۴- وحی کس طرح نازل ہوتی تھی، ہم جان نہیں سکتے۔	۳۸۷
ہم اس کے متن کو سمجھ سکتے ہیں۔	؍؍
جبریل۔ میکائیل۔ روح القدس۔	۳۸۸
خدا کفار کا دشمن ہے۔ اس کا مفہوم۔	۳۸۸
خدا کے ولی (دوست) ہونے کا مفہوم۔	۳۸۸
(۲/۹۹) ولقد ۔۔۔۔۔۔۔ الفٰسقون۔	۳۸۹
۳۰۵- جو بھی غیر متبدل اخلاقی پابندیوں سے آزادی چاہتا ہے فاسق ہے۔	۳۸۹
عصرِ حاضر میں سیکولرازم، سوشلزم یا کمیونزم سب اسی جذبہ اباحت کے پیدا کردہ ازم ہیں۔	۳۸۹
(۲/۱۰۰) اوکلما ۔۔۔۔۔ یؤمنون۔	۳۹۰
۳۰۶- معاہدہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پابندی پوری قوم کی طرف سے ہو۔	۳۹۰

عنوان	صفحہ
(۲/۱۰۱) - ولمّا .... یعلمون ۔	۳۹۱
۳۰۷- یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسےٰؑ کی مخالفت ۔	〃
۳۰۸- قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والوں کی مخالفت ۔	〃
(۲/۱۰۲) - واتبعوا .... یعلمون ۔	۳۹۲تا۴۴۳
۳۰۹- ایک حقائق پرور آیت اور اس کا غلط مفہوم	۳۹۲
حضرت سلیمان کے خلاف تورات کی یاوہ گوئی	۳۹۴
جادو اور حضرت سلیمانؑ ـــ اسم اعظم ۔	۳۹۵
ضمناً، حضرت عیسیٰؑ کے حواری	۳۹۶
قرآن کریم نے حضرت سلیمانؑ کا دامن پاک کیا	۳۹۶
لیکن ہماری کتب تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے ؟	۳۹۷
۳۱۰- بابل ـــ سحر کاری کا اولین مرکز ۔	۳۹۹
۳۱۱ - ہاروت و ماروت کا افسانہ اور ہماری کتب تفاسیر ۔	۴۰۰
مودودی کی تفسیر (تفہیم القرآن) میں ۔	۴۰۱
آیت کا صحیح مفہوم ۔	۴۰۲
۳۱۲- سحر یا جادو کی تاریخ اور حقیقت	۴۰۴
یہودی اور باطنیت ـــ یہی ہمارے ہاں کا تصوف ہے ۔	۴۰۸
عیسائیت اور تصوف ۔	۴۱۱
قرآن ـــ باطنیت کے خلاف چیلنج ۔	۴۱۳

عنوان	صفحہ
۳۱۳- مسلمان اور تصوف ۔	۴۱۴
۳۱۴- رسول اللہؐ پر جادو (مودودی صاحب کی تفسیر)	۴۱۷
۳۱۵- تعویذ اور ورد وظیفے اور ہمارے علماء کرام	۴۱۹
۳۱۶- قرآن کی عظمت ۔	۴۲۳
۳۱۷- علامہ اقبالؒ اور تصوف ۔	۴۲۷
(۲/۱۰۴) یاَیّھا الذین اٰمنوا ..... عذاب الیم ۔	۴۲۹
۳۱۸- یہودیوں کی پست ذہنیت ۔ ذو معنی باتیں کرنا ۔ زبان کو توڑ مروڑ کر گفتگو کرنا ۔	۴۲۹
جماعت مومنین سے تاکید کہ بات ہمیشہ دو ٹوک واضح کرو ۔	۴۳۱
(۲/۱۰۵) - مایودّ الذین .... الفضل العظیم	〃
۳۱۹- قریش کی مخالفت کی وجوہات ۔	۴۳۲
۳۲۰- قرآن کریم خیر ہے اس کا مفہوم ۔	۴۳۳
(۲/۱۰۶-۱۰۷) - ما ننسخ من اٰیۃ .... ولی ولانصیر ۔	۴۳۴
۳۲۱- ناسخ و منسوخ سے متعلق آیت ۔	〃
(۲/۱۰۸) - ام تریدون .... سواء السبیل	〃
۳۲۲- دین تمام کا تمام قرآن کے اندر دیدیا گیا ہے ۔	۴۳۵
(۲/۱۰۹) - ودّ کثیر ...... قدیر ۔	〃
۳۲۳- اہل کتاب کی کوشش کہ مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کر دیں ۔	〃

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
ان سے اعراض برتو لیکن حسن کارانہ انداز سے۔	۴۳۵	(۲/۱۱۱)۔ وقالوا۔۔۔۔۔۔ صٰدقین	۴۳۷
نبی کا قلب گداز و پرسوز۔	۴۳۶	۳۲۵۔ ان کا زعم باطل کہ جنت یہود و نصاریٰ	
(۲/۱۱۰)۔ واقیموا الصلوٰۃ۔۔۔۔ بصیر۔	״	کے لئے مختص ہو چکی ہے۔	״
۳۲۴۔ اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کے پروگرام	״	اس کی تردید۔	״
کی اہمیت۔	״	(۲/۱۱۲)۔ بلیٰ من اسلم۔۔۔ یحزنون۔	״
ان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوگا۔	״	۳۲۶۔ خدا کا قانونِ مکافات۔ ایمان و عمل کے نتائج ہر ایک کو ملیں گے	״

خلاصہ باب پنجم و ششم صفحہ ۵۲–۴۳۷
(آیات ۲/۵۵ تا ۲/۱۱۲)

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

انڈکس آیات — جلد اول

یہ انڈکس اُن آیات کا ہے جن کی تفسیر مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد میں مسلسل دی گئی ہے

جلد اول

آیت	سورۃ فاتحہ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ (مسلسل)	صفحہ
۱	....	۳	۵	....	۱۵۲	۱۸	....	۲۶۲
۲	....	۲۰	۶	....	۱۵۸	۱۹	....	۲۶۴
۳	....	۲۸	۷	....	۱۷۹	۲۰	....	۲۶۹
۴	....	۳۵	۸	....	۲۰۲	۲۱	....	۲۸۰
۵	....	۴۰	۹	....	۲۰۵	۲۲	....	۲۹۴
۶	....	۴۸	۱۰	....	۲۲۸	۲۳	....	۳۰۸
۷	....	۵۳	۱۱	....	۲۲۹	۲۴	....	۳۱۵
	سورۃ بقرۃ		۱۲	....	〃	۲۵	....	۳۳۱
۱	....	۷۰	۱۳	....	۲۴۴	۲۶	....	۳۴۱
۲	....	۷۱	۱۴	....	۲۴۶	۲۷	....	۳۴۴
۳	....	۷۸	۱۵	....	۲۴۸	۲۸	....	۳۴۶
۴	....	۱۴۴	۱۶	....	۲۵۰	۲۹	....	۳۵۲
			۱۷	....	۲۵۷			

انڈکس آیات جلد دوم سورۃ بقرۃ

آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ
۳۰	سورۃ بقرۃ	۷۲	۳۴	سورۃ بقرۃ	۹۸	۳۸	سورۃ بقرۃ	۱۳۳
۳۱	....	۸۱	۳۵	....	۱۱۱	۳۹	....	۱۳۶
۳۲	....	۹۴	۳۶	....	۱۱۵	۴۰	....	۱۷۱
۳۳	....	۹۵	۳۷	....	۱۲۹	۴۱	....	۱۸۲

آیت	سورة	صفحه	آیت	سورة	صفحه	آیت	سورة	صفحه
۴۲	سورة بقرة	۱۹۵	۶۵	سورة بقرة	۳۰۷	۹۰	سورة بقرة	۳۸۱
۴۳	....	۲۰۱	۶۶	....	۳۱۰	۹۱	....	۳۸۱
۴۴	....	۲۱۹	۶۷	....	۳۱۱	۹۲	....	۳۸۲
۴۵-۴۶	....	۲۲۲	۶۸	....	۳۱۴	۹۳	....	۳۸۲-۸۳
۴۷	....	۲۲۸	۶۹	....	۳۱۴	۹۴	....	۳۸۵
۴۸	....	۲۲۸	۷۰	....	۳۱۴	۹۵	....	۳۸۵
۴۹	....	۲۳۰	۷۱	....	۳۱۵	۹۶	....	۳۸۶
۵۰	....	۲۴۴	۷۲-۷۳	....	۳۲۲	۹۷-۹۸	....	۳۸۶-۸۷
۵۱	....	۲۵۴	۷۴	....	۳۲۹-۳۰	۹۹	....	۳۸۹
۵۲	....	۲۶۲	۷۵	....	۳۳۳	۱۰۰	....	۳۹۰
۵۳	....	۲۶۴	۷۶	....	۳۳۴-۳۵	۱۰۱	....	۳۹۱
۵۴	....	۲۶۶	۷۷	....	۳۳۶	۱۰۲	....	۳۹۲
۵۵	....	۲۷۶	۷۸	....	۳۳۷	۱۰۳	....	۴۰۴
۵۶	....	۲۷۹	۷۹	....	۳۴۰	۱۰۴	....	۴۲۹
۵۷	....	۲۸۲	۸۰-۸۲	....	۳۴۱	۱۰۵	....	۴۳۱
۵۸	....	۲۸۵	۸۳	....	۳۴۲-۳۴۳	۱۰۶-۷	....	۴۳۴
۵۹	....	۲۹۳	۸۴	....	۳۵۲	۱۰۸	....	۴۳۴
۶۰	....	۲۹۷	۸۵	....	۳۵۴	۱۰۹	....	۴۳۵
۶۱	....	۲۹۹	۸۶	....	۳۶۳	۱۱۰	....	۴۳۶
۶۲	....	۳۰۵	۸۷	....	۳۶۴	۱۱۱	....	۴۳۷
۶۳	....	۳۰۶	۸۸	....	۳۶۷	۱۱۲	....	۴۳۷
۶۴	....	۳۰۶	۸۹	....	۳۶۵		———	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ آغاز

(پہلا ایڈیشن)

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

مطالب الفرقان کی پہلی جلد، اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ آیات کے شمار کے اعتبار سے تو وہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ سورۃ بقرۃ کی صرف (۲۹) آیات پر مشتمل تھی لیکن اس میں اتنے اصولی مباحث آگئے تھے کہ بعض ایسے احباب نے، جنہوں نے اس سے پہلے میری کسی تصنیف کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا اور پہلے پہل اس جلد کو بدقتِ نظر دیکھا تھا۔ مجھ سے کہا کہ اس ایک جلد سے پورے کے پورے اسلام کا صحیح خاکہ ان کے سامنے آگیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد چاروں طرف سے اس کی اگلی جلد کی اشاعت کے تقاضے شروع ہوگئے۔ اس تفسیر کا مسودہ میرے پاس پہلے سے تیار نہیں رکھا تھا۔ میں اسے ساتھ کے ساتھ لکھا کرتا ہوں۔ اس میں جسقدر وقت لگتا ہے وہی کم نہیں۔ لیکن اس کے بعد، کتابت اور طباعت کی جن خاردار وادیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کی آبلہ انگیزی اور دامنگیری کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو ان مراحل سے خود گزرے ہوں۔ للہ الحمد کہ یہ صبر آزما منازل بھی بخیر وخوبی طے ہوگئیں اور میں اس قابل ہوگیا کہ اس کی دوسری جلد، حسبِ وعدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پیشِ خدمتِ احباب کرسکوں۔ (اکتوبر کی تخصیص اس لئے ہے کہ طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن (بالعموم) اسی ماہ میں منعقد ہوتی ہے اور بادہ مستانِ ذوقِ قرآنی کا یہی وہ دلکش و پُرخلوص اجتماع ہے جو میرے اس نذرانۂ محبت و عقیدت کا صحیح محمل ہوسکتا ہے۔ خدا میرے ان رفقائے سفر کو تا دیر سلامت رکھے)۔

۲۔ زیرِ نظر جلد، سورۃ بقرۃ کی (۸۲) آیات — از ۲:۳۰ تا ۲:۱۱۲ کو محیط ہے اور ان کا بنیادی موضوع قصۂ آدم اور داستانِ بنی اسرائیل ہے۔ جیساکہ آپ دیکھیں گے، قرآن مجید میں بیان کردہ قصۂ آدم، کسی فرد کی داستانِ حیات نہیں۔ یہ خود انسان (آدمی) کی کیفیات ونفسیات کا تذکرہ ہے جسے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عمودی طور پر بتایا یہ گیا ہے کہ انسان میں تسخیرِ فطرت کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اگر یہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں

اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرے گا تو عالمِ انسانیت لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) کا فردوس بداماں معاشرہ بن جائے گا۔ اور اگر، افراد یا اقوام انہیں اپنے سرکش جذبات کی تسکین کے لئے صرف میں لائیں گی، تو یہ کرۂ ارض، يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰)۔ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کا جہنم بن جائے گا۔

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک محکم اصولِ حیات یا ابدی قانونِ زندگی پیش کرتا ہے اور نظری دلائل کے ساتھ ساتھ اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد کو اس کی صداقت کی تائید میں سامنے لاتا ہے۔ اپنے اسی انداز کے مطابق اس نے سورۂ بقرۃ کے آغاز میں قصۂ آدم کے فوری بعد، داستانِ بنی اسرائیل کی ابتداء کر دی ہے۔ یہ داستان صرف قومِ بنی اسرائیل کی تاریخ نہیں۔ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے جس تکرار و اصرار سے اس داستان کو دھرایا ہے، کسی اور قوم کے تذکرہ کو اس تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ زیرِ نظر جلد میں مقامِ آدم کی کیفیات اور داستانِ بنی اسرائیل کی تفصیلات (قریب قریب) بتمام و کمال آ گئی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ شمار کے اعتبار سے تو یہ جلد کل (۸۲) آیات پر مشتمل ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے یہ گویا اپنے موضوع کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ اس وضاحت سے یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی ہوگی کہ (جیسا کہ میں نے جلد اول کے آغاز میں کہا تھا) اس تفسیر کی ابتدائی جلدوں میں آیات کی تعداد کم ہوگی لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، آیات کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی کیونکہ جو آیات پہلے آ چکی ہوں گی انہیں دھرایا نہیں جائے گا۔ ان کے حوالہ پر اکتفا کیا جائے گا۔ اگرچہ بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو بات کسی پہلی جلد میں کہی جا چکی ہے، وہ مزید وضاحت کے لئے کسی اگلی جلد میں بھی آ جائے۔ میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتا (کیونکہ اکثر ایسے حالات بھی رونما ہو جاتے ہیں جن کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا)۔ لیکن میرا ارادہ یہی ہے کہ اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دیا جائے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ (۱۱/۸۸)۔ میرا عمر بھر کا ساتھی اگر عمر بھر میرے ساتھ رہے تو اس سے بڑھ کر میری سعادت اور کیا ہوگی؟

۳۔ ان مجلدات کے ترتیبی انداز کے متعلق جلد اول میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ان میں دو ایک نکات کا اضافہ ضروری ہے:-

(۱) آیات کے حوالوں میں اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔ (مثلاً ۲/۱۵ سے مراد ہے سورہ بقرۃ کی... پندرھویں آیت)۔ ان حوالوں کو بڑی احتیاط سے چیک کر لیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ قرآن مجید کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں کا اختلاف ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی حوالہ کے مطابق مطلوبہ آیت نہ ملے تو ایک آدھ

آیت پہلے یا بعد میں دیکھ لیا جائے۔ اگر اس سے بھی وہ آیت نہ ملے تو براہِ کرم مجھے مطلع فرما دیا جائے تاکہ، اگر حوالہ میں غلطی ہو تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لی جائے۔

(۲) جلد اول میں ان (۷ + ۲۹) آیات کا انڈکس نہیں دیا جا سکا تھا جن کی تفسیر اس جلد میں آئی تھی۔ زیرِ نظر جلد میں، فہرست کے بعد، جلد اول و جلد دوم دونوں کی آیات کا انڈکس دیدیا گیا ہے تاکہ مطلوبہ آیت یا آیات کے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

۴۔ آخر میں اس اعتراف کو پھر دہرا دوں جسے میں اپنی ہر کتاب کا جزوِ لازم سمجھا کرتا ہوں کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ، بہر حال ایک انسانی کوشش ہے جسے نہ سہو و خطا سے منزہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ حرفِ آخر۔ میں جو کچھ خدا کی اس کتابِ عظیم سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اُسے میں نے بے کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہوالمراد۔ اگر اس سے اختلاف ہو تو آپ اپنے طور پر غور و تدبر کریں۔ میں اس ضمن میں کسی سے بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا کہ اس کے لئے مجھے فرصت ہی نہیں۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ۔ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ (۴۰/۴۴)۔ والسلام۔

پرویز

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء

دوسرا ایڈیشن

مطالب الفرقان کو بفضلِ ایزدی اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو گیا اور دوسرے ایڈیشن کے تقاضے بہ شدت موصول ہونے لگے۔ للہ الحمد کہ اب یہ ایڈیشن (بلا تغیر و تبدل) پیشِ خدمت ہے۔ اس دوران میں اس کی تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد بھی شائع ہو چکی ہے۔

جنوری ۱۹۸۳ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

مطالب الفرقان

جلد دوم

سورۃ بقرۃ ــــــ آیات ۳۰ تا ۱۱۲

پہلا باب

(تمہید سرگزشتِ آدم)

اِنسان کی پیدائش
نفسِ انسانی (انسانی ذات یا خودی)
انسانی فطرت
حملِ امانت سے مراد
ابلیس — شیطان
نفسِ امّارہ - لوّامہ - مطمئنّہ
آدم
خلیفہ فی الارض
ملائکہ
تسخیرِ فطرت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا باب

تمہیدِ سرگزشتِ آدم

آغاز —— سورۃ بقرۃ —— آیت —— (۲/۳۰)

مطالب الفرقان کی پہلی جلد، سورۃ بقرۃ کی آیت (۲/۲۹) پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ اس کا آغاز ہوا تھا، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۱/۱)۔ یعنی خدا کی ربوبیتِ عالمینی سے۔ اور آیت (۲/۲۹) میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا گیا تھا کہ ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا (۲/۲۹)۔ ”اے نوعِ انسان! ہم نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب تمہارے اجتماعی مفاد کے لئے ہے“۔ یعنی اس سامانِ رزق میں تمام نوعِ انسان برابر کی شریک ہے۔ اسے ان سب کی نشو و نما کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اسے انفرادی ملکیت میں نہ لے لینا۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ تم خدا کے شریک و سہیم پیدا کر لو گے (۲/۲۲)۔ یہ شرک ہوگا۔ اس حقیقت کو ان آیات میں نظری طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ نوعِ انسان کس طرح مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ انہوں نے کس طرح ان ذرائع رزق کو انفرادی ملکیت میں لے لیا اور اس طرح ان میں باہمی عداوت پیدا ہو گئی۔ اسے اس نے ”قصۂ آدم“ کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے جس کا آغاز آیت (۲/۳۰) سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ داستان سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن کریم خود انسان کے متعلق کیا بتاتا ہے۔ اس لئے ہم پہلے اسی موضوع کو لیتے ہیں۔

اَلۡاِنۡسَانُ

میں نے اپنی کتاب — ابلیس و آدم — کے پہلے باب میں کہا ہے کہ انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اس کی نگۂ استعجاب کا اس مقام پر رک جانا فطری امر ہے جسے وہ سلسلۂ تخلیقِ انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیٔ حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود میں آ گیا۔ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اس سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایک فرد کو تراش لیا جائے۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا جائے۔

اس طرح جب مرد اور عورت وجود میں آجاتیں تو پھر افزائشِ نسلِ انسانی کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں "پہلے انسان" کے سلسلہ میں ایسا ہی کچھ بیان کیا گیا ہے ہم اس کی تفصیل قصۂ آدم میں (آگے چل کر) پیش کریں گے۔ یہاں بات انسان سے متعلق ہو رہی ہے۔

ہم مطالب الفرقان۔ جلد اول (صفحہ ۲۸۵-۲۸۶) میں بتا چکے ہیں کہ "انسان" تو ایک طرف، دنیا بھر کے محققین آج تک اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکے کہ خود یہ کائنات کس طرح وجود میں آگئی۔ انہوں نے اس کے متعلق تو بہت کچھ کہا ہے کہ یہ اپنی ابتدا کے بعد مختلف گردشیں کرتی ہوئی، کس کس قسم کی تبدیلی کی وادیوں میں سے گزر کر اس مقام تک آ پہنچی جہاں ہم اسے آج موجود پاتے ہیں، لیکن یہ کہ اس کی پہلی شکل کا آغاز کیسے ہو گیا ـــــ وہ عناصر کہاں سے آگئے جن کی گردشوں سے یہ اس طرح آگے بڑھی ـــــ اس سوال کے جواب میں آج کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی اسی طرح انگشت بدنداں ہے جس طرح آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسان، یا آج کا جاہل دہقان۔

ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء جب غیر جاندار کائنات کے آغاز کے متعلق ہمارے محققین کے عجزِ فہم کی یہ کیفیت ہے تو وہ اس کے متعلق کیا سمجھ سکتے ہیں کہ اس غیر جاندار مادہ (IN-ORGANIC MATTER) میں زندگی (LIFE) کی نمود کیسے ہو گئی۔ یعنی زندگی کا آغاز کیسے ہو گیا۔ (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ) اس کا تصور ڈاروِن نے پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس نظریہ میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ آج اس نظریہ کا سب سے بڑا ماہر (G. G. SIMPSON) کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE MEANING OF EVOLUTION) میں لکھتا ہے:-

> زندگی کی ابتدا کیسے ہو گئی؟ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ...... اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جا رہا ہے ...... لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطۂ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید انسان کے حیطۂ ادراک ہی سے باہر ...... کائنات کے آغاز اور سلسلۂ علّت و معلول کی اولیں کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی .... یہ اولیں کڑی راز ہے، اور میرا خیال ہے کہ ذہنِ انسانی اس راز کو کبھی نہیں پا سکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علّتِ اولیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں،

لیکن اُسے اپنے حیطۂ ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔ (PP. 13، ۱۳۵)

مشہور سائنسدان (J.S. HALDAN) ہمارے دور کا بہت بڑا ماہر علم الحیات (BIOLOGIST) ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY) میں لکھتا ہے:-

اب اس حقیقت کے تسلیم کر لینے میں کوئی دقت نہیں کہ (جیسا کہ نیوٹن کے اصولوں کے ماتحت سمجھا جاتا تھا) زندگی محض طبیعیاتی اور کیمیاوی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں، بلکہ ان مادی کیفیات سے پہلے موجود تھی اور ہمیشہ سے موجود تھی۔ اور اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جس کی تعبیرات کی روشنی میں ہمیں اپنے حیاتیاتی اصولوں کو عملاً منطبق کرنا چاہیئے (P. 38)۔ لہٰذا زندگی کے مسئلہ کو طبیعیاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (P. 111)۔ زندگی اور انسانی ذات (PERSONALITY) کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ ہماری کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے۔ اور یہ تعبیر ناممکن ہی رہتی ہے خواہ ہم زمانہ (TIME) کے اعتبار سے کتنے ہی پیچھے اور مکان (SPACE) کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ چلے جائیں۔ زندگی کو پیچھے لے جانے سے اس کی مادی تعبیر کبھی نہ مل سکے گی، نہ ہی انسانی ذات کو پیچھے لے جانے سے ہم کسی ایسے مقام تک پہنچ سکیں گے جہاں ہم کہہ سکیں کہ انسانی ذات اس طرح مادہ سے پیدا ہوگئی (P. 122)۔

زندگی آ کہاں سے گئی؟ اس سوال کا جواب تو کوئی نہیں دے سکا، البتہ ڈاروِن نے یہ بتایا کہ اس کی اوّلیں نمود کہاں سے ہوئی۔ یعنی ہم زندگی کی نمود کو اس کی اوّلین شکل میں کہاں دیکھتے ہیں۔ اس کی تحقیق ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اوّلین (PROTOPLASM) کی ابتداء سمندر میں ہوئی تھی کیونکہ اس میں اسی نوعیت اور اُسی تناسب کے نمکیات (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ سمندر کا پانی جب اپنے کنارے کی مٹی سے ملا تو اس سے وہ پہلا (CELL) ـــــ خلیہ ـــــ وجود میں آگیا جس میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس خلیہ میں ہنوز نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی، اس لیے اسے سائنس کی اصطلاح میں (UNI-CELLULAR ORGANISM) کہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے "نفسِ واحدہ" کہہ کر پکارتا ہے اسکے بعد سلسلۂ ارتقاء شروع ہوا۔ نفسِ واحدہ، جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا جن میں سے ایک حصہ نے نر کی شکل اختیار

کرلی اور دوسرے نے مادہ کی۔ اور یوں زندگی کے پیکروں کا سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے مختلف شاخوں میں پھیل گیا۔ ان میں سے ایک شاخ نوعِ حیوانات کی ہے۔ اسی سلسلۂ ارتقاء نے ایک قدم آگے بڑھایا تو زندگی نے انسانی پیکر اختیار کرلیا۔ (ان اشارات کو ہم مطالب الفرقان۔ جلد اول (صفحہ ۹۲-۲۸۹) میں بھی بیان کرچکے ہیں، لیکن موضوعِ زیرِ نظر کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کا یہاں دُہرا دینا ضروری ہے۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآن

سلسلۂ کائنات کی ابتداء اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصولی نظام بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ ارشاد ہے:۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ. ذَٰلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۳۲/۵-۶)۔

تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو قانونِ مشیت کے مطابق، زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ (PERIOD) تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو ہر شے کی موجودہ صورت سے بھی واقف ہے۔ اور اس کے مضمر ممکنات سے بھی۔ اس کا قانونِ مشیت اتنی قوت رکھتا ہے کہ وہ ہر شے کو مناسب نشوونما دیکر اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

یہاں اِن مراحل کے متعلق کہا ہے کہ وہ "ہزار ہزار برس" کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ بعض صورتوں میں "پچاس پچاس ہزار سال" کے بھی ہوتے ہیں (۷۰/۴)۔

خدا کے اسی نظامِ ارتقاء کی رو سے (اس نے کہا ہے کہ) زندگی کا آغاز پانی سے ہوا۔ سورۃ الانبیاء میں ہے:۔

"جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۲۱/۳۰)۔" اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے"۔ اور اس کے بعد کہا کہ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۱۱/۷)۔ "زندگی کے اس

سرچشمہ پر پورا پورا کنٹرول خدا کو حاصل ہے"۔ اس کے بعد اس نے ان تخلیقی مراحل کا ذکر کیا ہے جن میں سے گزر کر زندگی، پیکرِ انسانی تک پہنچی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲/۷)۔(نیز ۶/۲، ۳۸/۷۱)۔

اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی۔

دوسری جگہ "طین" کی بجائے "تراب" کا لفظ آیا ہے۔ (۳۰/۲۰ ؛ ۳۵/۱۱) "طین" یا "تراب" غیرجاندار مادہ تھا۔ جب اس کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو وہ "طینِ لازب" یعنی چپچپی مٹی بن گیا۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۳۷/۱۱)۔ قرآن نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مٹی اور پانی کے امتزاج، یعنی اس گارے کی صورت یہ نہیں تھی کہ اس میں "مٹی" زندگی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اس نے کہا یہ کہ اس "مٹی کا خلاصہ" پانی سے ملا تو اس سے زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوئی۔ چنانچہ سورۃ مومنون میں ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳/۱۲)۔ اس آیت میں "مٹی کے خلاصہ" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم جب کوئی بیج زمین میں بوتے ہیں تو وہ ان اجزاء کو، جن پر اس کی نشو و نما کا ـــ مدار ہوتا ہے، زمین سے کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ انہی اجزاء (نمکیات، معدنیات وغیرہ) کو سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳/۱۲) یعنی مٹی کا خلاصہ کہا جائے گا۔ اس قسم کے مٹی کے خلاصہ سے حیات کا پہلا خلیہ (CELL) وجود میں آیا۔

قرآن کریم نے دیگر مقامات میں ایک اور حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس نے اشارۃً یہ بتایا ہے کہ پانی اور مٹی کے اس امتزاج کے ساتھ حرارت کی بھی ضرورت تھی، لیکن ان عناصر ترکیبی میں ایک خاص توازن، یا تناسب نہایت ضروری تھا۔ اگر وہ تناسب قائم نہ رہے تو وہ مٹی سوکھ کر ٹھیکری بن جائے۔ چنانچہ سورۃ الرحمٰن میں ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵/۱۴ ؛ ۱۵/۲۶)۔ "ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا، جس کی کیفیت یہ تھی کہ (اس میں اگر حرارت کی زیادتی ہو جاتی تو) وہ سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بجنے لگ جاتے۔ لیکن ہم نے ان اجزاء میں ایسا تناسب قائم کیا کہ اس سے زندگی کا اولین جرثومہ وجود میں آگیا"۔ اسے قرآن کریم نے "نفسِ واحدۃ" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی ایسا خلیہ جس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ وہ واحد، یعنی ایک (UNIT) تھا۔ سورۃ الانعام میں ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۶/۹۹ ؛ ۴/۱)۔

خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشو و نما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف

منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقتِ معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی منزل کے سپرد کر دے۔ اس طرح، تم ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے پیکرِ انسانی میں پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے قوانینِ حیات کو نکھار اور ابھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن انہیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔

اِنہی مراحل اور منازل کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹)۔ "تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے۔ اور اس کے بعد شاہراہِ حیات پر اسی طرح آگے بڑھتے اور بلند ہوتے جاؤ گے"۔ ارتقائی منازل میں اسی تبدل و تحول کے متعلق دوسری جگہ کہا: وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۷۱/۱۴) "اُس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ تم طور طریقے بدلتے ہوتے یہاں تک پہنچ گئے"۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ سلسلۂ ارتقاء کے متعلق سائنٹیفک تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ سب سے پہلے زندگی کے جس خلیہ کی نمود ہوئی اس میں نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ خلیہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک حصے نے نر کی شکل اختیار کی اور دوسرے نے مادہ کی۔ گویا یہ جوڑا اسی نفسِ واحدہ سے وجود میں آیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ:-

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۷/۱۸۹)۔

تمہارا نشو و نما دینے والا وہی ہے جس نے تمہیں ایک "نفسِ واحدۃ" سے پیدا کیا۔
اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ [1]

ضمناً قرآن کریم نے صرف انسان کے متعلق ہی یہ نہیں کہا کہ نفسِ واحدہ سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس نے کہا ہے کہ: وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱/۴۹؛ ۴۳/۱۲)۔ "اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بناتے ہیں۔ ہم نے ان امور کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ تم قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری کو پیشِ نظر رکھ سکو"۔ آج سائنس کے انکشافات اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ زندگی جہاں بھی ہے (مثلاً نباتات اور حیوانات میں) وہاں "جوڑے" موجود ہوتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کے ابتدائی مراحل میں ایک ہی خلیہ کے اندر افزائشِ نسل کی صلاحیت ملتی ہے لیکن زندگی جب ذرا آگے بڑھتی ہے تو ہر مقام پر نر و مادہ کا سلسلہ دکھائی

---

[1] اس سلسلہ میں مزید حوالوں کے لئے دیکھئے: (۴/۱)؛ (۳۰/۲۱)؛ (۳۹/۶)؛ (۴۲/۱۱)؛ (۴۹/۱۳)۔

دیتا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق ہمارے زیرِ نظر موضوع سے نہیں، اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی کی نمود تو "تراب" (یعنی زمین) سے ہوئی لیکن آگے بڑھ کر وہ مختلف انواع (SPECIES) میں اس طرح پھیل گئی جس طرح درخت کی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیل جاتی ہیں (۱/۱۷)۔ سلسلۂ ارتقاء کے ماہرین جب مختلف انواعِ حیات کو سمجھاتے ہیں تو وہ اسے درخت کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں۔ ان انواع کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہی میں وہ جاندار بھی ہیں جو پیٹ کے بل رینگتے ہیں؛ وہ بھی جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور چوپائے بھی (۲۴/۴۵)۔ نیز اڑنے والے پرندے بھی۔ ان سب کے متعلق کہا کہ یہ تمہاری ہی قسم کی مختلف "امم" ہیں (۶/۳۸)۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اصلِ حیات کی وحدت کو کس کس انداز سے سمجھایا ہے؟

ان تخلیقی مراحل کو طے کرتی ہوئی زندگی اس مرحلہ میں آ پہنچی جہاں افزائشِ نسل بذریعۂ تناسل یعنی نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے درجۂ حیوانات کہا جاتا ہے۔ سورۃ السجدہ میں ہے:

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲/۸)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

اسی کو دوسری جگہ نطفہ کہا گیا ہے (۱۶/۴)۔[1] نطفہ سے جو جرثومہ وجود میں آتا ہے وہ رحمِ مادر میں کن کن مراحل سے گزرتا اور کیا کیا شکلیں اختیار کرتا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً سورۃ مومنون میں کہا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳/۱۲-۱۴)۔[2]

ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ (پھر ہمارا یہ تخلیقی پروگرام اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعۂ تولید ہوتی ہے اس طرح

---

[1] مزید حوالوں کیلئے دیکھئے (۱۹/۲۲)؛ (۲۵/۵تا۴)؛ (۳۶/۷۷)؛ (۶۷/۲)؛ (۲۰/۴۰)؛ (۸۶/۵-۶)۔

[2] اس جگہ آیت (۲۳/۱۱) کے آخری الفاظ دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ ذرا آگے چل کر سامنے لائے جائیں گے

ہم نے اسے نطفہ بنایا جو (رحم کے اندر) ٹھہر گیا اور مادہ کے بیضہ میں قرار گیر ہوگیا۔ پھر اس نطفہ کو علقہ (جونک کی سی شکل) میں تبدیل کیا۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا۔ پھر اس ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔

اسی طرح سورۃ الحج میں ہے ...... فَإِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ...... (۲۲/۵)[۱] "ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے کی (پھر یہ مادہ مختلف منازل طے کرتا اس منزل میں آپہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے) اور نطفہ رحم مادر میں ٹھہر جاتا ہے۔ پھر وہ ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ان مراحل میں سے اس لیے گزرتا ہے کہ نطفہ میں جس قدر امکانات مضمر طور پر موجود تھے وہ بتدریج نشو و نما پاتے ہوئے ظہور میں آجائیں۔ وہ جنین ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق کچھ وقت کے لیے رحمِ مادر میں رہتا ہے۔ پھر تم جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجاتے ہو"۔

مغربی محققین کی غلط نگہی

یہ مراحل وہ ہیں جن سے انسانی بچہ ہی نہیں بلکہ ہر حیوانی بچہ رحم مادر میں گزرتا ہے۔ لہٰذا اس حد تک انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مغربی محققین اپنی ریسرچ میں اس مقام تک آکر رک گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح فطرت کے طبیعی قوانین کے مطابق وجود پذیر ہوتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت یہ زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر انہی کے مطابق اس پر موت وارد ہو جاتی ہے، اور جس طرح دیگر حیوانات کا موت سے خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے انسانی جسم کا تجزیہ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یہ کن کن عناصر سے مرکب ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انسانی جسم میں:-

(۱) دس گیلن پانی ہے۔

---

[۱] مزید حوالوں کے لیے دیکھئے (۳۶/۶۷)؛ (۹۶/۲)؛ (۴۰/۶۷)۔

(۲) اتنی چربی، جس سے صابن کے سات ڈنڈے بن سکیں۔

(۳) اتنا کاربن، جس سے نو ہزار سرمہ کی پنسلیں بن سکیں۔

(۴) اتنی فاسفورس، جس سے دو ہزار دوسو دیا سلائی کی تیلیاں تیار ہو سکیں۔

(۵) اتنا لوہا، جس سے ایک چھوٹی سی کیل بن جائے۔

(۶) اتنا چونا جس سے ایک مرغی کے دڑبے میں سفیدی ہو جائے ——— اور

(۷) ذراسی گندھک اور میگنیشیا ——— اللہ اللہ خیر سلا۔

(THE PROPER STUDY OF MAN; BY B.A. HAWARD)

ضمناً، اگر ان لوگوں کی تحقیق طبیعیات تک ہی محدود رہتی تو بھی خیر تھی، لیکن یہاں ایک اور دشواری نے سر ابھارا جسے مشہور مذہبی مفکر (F.J. SHEEN) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹیفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقعہ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت عالم آفاق کے متعلق نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب نیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس کی رُو سے مطالبہ یہ کیا گیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تاکہ وہ اس سائنٹفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔

(PHILOSOPHY OF RELIGION)

خارجی کائنات کے متعلق نیوٹن کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا۔ اور ڈارون کی تحقیق کی رو سے یہ نتیجہ کہ قوانینِ فطرت کے سوا نہ کوئی اور قوانین ہیں نہ سرچشمۂ علم۔ انسان کی طبیعی زندگی قوانینِ فطرت کے تابع بسر ہوگی اور اس کی تمدنی زندگی ان قوانین کی رو سے، جنہیں انسان خود وضع کرے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس تصور نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جسے (RATIONALIST MOVEMENT) "تحریکِ عقلیت" کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کی ایسوسی ایشن نے ۱۸۹۵ء میں اس کی تعریف ان الفاظ میں پیش کی تھی:۔

عقلیت سے مراد وہ ذہنی رجحان ہے جس کی رو سے عقلِ انسانی کو بلا حدود و قیود بلند ترین مقام پر فائز سمجھا جاتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے فلسفہ اور اخلاقیات کی بنیاد رکھی جائے جس کی صداقت کا معیار خالص عقلِ انسانی ہو اور وہ کسی سند (انحصارٹی) کو تسلیم نہ کرے۔ [1]

اِس "نئے مذہب" کو سیکولرازم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی انتہائی شکل مارکسزم کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں لینن لکھتا ہے:۔

مادہ پرستی (سیکولرازم) کے معنے یہ ہیں کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ خارجی صداقت وہی ہے جسے ہم اپنے حواس کے ذریعہ معلوم کر سکیں۔ عقلِ انسانی اس قابل ہے کہ یہ ہمیں صداقتِ مطلقہ کا علم دیدے، چنانچہ اس نے یہ علم دیدیا ہے۔ [2]

آپ نے غور فرمایا کہ خالص طبیعی تحقیق کے ڈانڈے کہاں جا کر ملائے گئے ہیں؟ یعنی اس تحقیق کی رو سے دعویٰ یہ کر دیا گیا کہ وحی، رسالت، مستقل اقدار، حیاتِ آخرت سب اساطیر الاولین ہیں، ان کا کوئی وجود نہیں۔ انسان ایک حیوان ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ زندگی کے مسائل کے فیصلے اپنی عقل کی رو سے کر سکتا ہے۔

وہیں سے تردید انسان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی ہر تحقیق کو حرفِ آخر سمجھ لیتا ہے، حالانکہ اگر وہ تھوڑا سا انتظار کرے اور اپنی تحقیق کو آگے بڑھنے دے تو اس کی سابقہ تحقیق کی کمزوری اس پر خود واضح ہو جائے۔ چنانچہ ابھی طبیعیاتی نظریہ کی صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اسی مغرب سے ہمارے کانوں میں اس قسم کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جن میں کہا گیا کہ:۔

میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ مسئلۂ حیات۔ موجودہ زمانہ کی طبیعیات اور کیمسٹری سے سمجھایا جا سکتا ہے، خواہ سمجھانے والا کیسا ہی ذی فہم کیوں نہ ہو۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ آیا مستقبل کے علم طبیعیات اور کیمیا کے ذریعہ ایسا ہوگا، اس کے متعلق میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ جب علمِ طبیعیات کے حوادث غیر متعین ہو جائیں، جب کیمیا خود طبیعیات بن جائے اس وقت صورتِ حالات اور ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت تک میں (HALDANE) کی ہمنوائی میں یہی کہتا رہوں گا کہ جب ہم علمِ حیات کو تمام دیکھتے ہیں

[1] "انسان نے کیا سوچا" (ص ۲۷)۔ [2] "انسان نے کیا سوچا" (ص ۳۰)

تو ہمارے سامنے ایک بالکل نئی صورت آجاتی ہے۔ ایسی صورت، جسکی وحدت اور بنیادی فطرت ایسی ہی اہم ہے، جیسی طبیعیات کے کسی اور تصور کی۔ ؎

اور مشہور روسی مفکر اوسپینسکی کے الفاظ ہیں:۔

ہماری سائنس، زندگی اور اس کی ابتدا کے متعلق کچھ نہیں بتلا سکتی۔ یہ معمہ، معمہ ہی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ جسم، زندہ خلیہ (CELL) زندہ مادۂ حیات (PROTOPLASM) میں کچھ ایسی چیز ہے جسے سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہی وہ ناقابلِ فہم شے ہے جو ذی حیات مادہ کو غیر ذی حیات سے متمیز کرتی ہے۔ ہمیں اس شے کا تعارف صرف اس کے عمل (FUNCTION) سے ہوتا ہے۔ اس کے اعمال میں سب سے اہم عمل، تولیدِ خویش (SELF-REPRODUCTION) ہے۔ یہ چیز غیر ذی حیات جسم، مردہ خلیہ اور مردہ مادہ میں نہیں پائی جاتی۔ ایک ذی حیات جسم اپنے آپ کو لامحدود طور پر (MULTIPLY) کرتے چلا جاتا ہے اور اس کے لئے غیر ذی حیات مادہ کو اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ یہی "زندگی" کا وہ عمل ہے جس کی ماہیت سمجھائی نہیں جا سکتی۔ لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ مادیئین کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ زندگی، میکانکی قوتوں کے نتیجہ کا نام ہے۔ (TERTIUM ORGANAM: P. 103)

گلاسگو یونیورسٹی کا وائس چانسلر، (JOHN CAIRD) اپنے ایک لیکچر میں کہتا ہے:۔

آج تک اس امر کی کوئی مثال بھی نہیں پیش... کی جا سکی کہ زندگی محض کیمیائی عناصر (CHEMICAL CONSTITUENTS.) سے پیدا ہو گئی ہو۔ لہٰذا یہ قیاس، کہ زندگی کا ارتقاً کسی اور زندگی کے اثر کے بغیر بھی ممکن ہے، بلا دلیل ہے۔ (PROTOPLASM) کو، جسے مادۂ حیات قرار دیا جاتا ہے، محض کیمیائی مرکبات کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ مادۂ حیات، جس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور جس کے کیمیائی اجزا معلوم ہو سکتے ہیں، زندہ نہیں، بلکہ مردہ مادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مادۂ حیات، جسے زندہ کہا جا سکتا ہے، اگرچہ انہی اجزا کا مجموعہ ہوتا ہے جو مُردہ مادۂ حیات میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس سے ایسے خواص و اعمال

؎ (THE PHYSICAL REASONABLENESS OF LIFE; BY A.V. HILL)

کا مظاہرہ ہوتا ہے جو بالکل جدید ہوتے ہیں اور جنہیں اس کے کیمیائی اور طبیعیاتی اجزاء کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شئے کسی ایک وقت میں ایسے خواص کا مظاہرہ کرتی ہے جو یکسر کیمیائی یا میکانکی ہوں اور دوسرے وقت میں ایسے خواص کا، جن سے وہ اپنے آپ کو ایک جیتے جاگتے، بڑھنے پھولنے والے جسم میں تبدیل کرلے، یا ایسے افعال کا جن سے وہ دوسری چیزوں کو اپنا جزوِ بدن بنا سکے اور پھر اپنے جسم سے کچھ اور پیدا کرسکے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں جو نئی چیزیں اس میں پیدا ہوتی ہیں ان کا سبب کوئی ایسا جدید عنصر ہے جو پہلی صورت میں اسمیں موجود نہ تھا۔ اس سے محض کیمیائی یا میکانکی عمل ظہور میں آتا تھا۔

(INTRODUCTION TO THE PHILOSOPHY OF RELIGION-P. 96)

اس موضوع پر عصرِ حاضر کے محققین کے اسی قسم کے متعدد اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہیں اقوال سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ خود مغرب ہی کی تحقیقِ جدید کا رُخ اس سمت کی طرف مڑ چکا ہے کہ "زندگی" بے جان مادہ کی میکانکی تبدیلیوں سے وجود میں نہیں آجاتی۔ یہ کسی اور "عنصر" کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس طرح "زندگی" مادہ کی سابقہ میکانکی کڑیوں سے بالکل متمیز اور ممتاز کڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب "زندگی" حیوانات سے انسانی پیکر اختیار کرتی ہے تو وہاں بھی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل منفرد ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے قرآنِ کریم کی طرف پھر آئیے۔ سابقہ صفحہ (۹) پر آیت (۲۳/۱۴-۱۲) درج کرنے کے بعد ہم نے (حاشیہ میں) یہ لکھا تھا کہ اس آیت کے آخری الفاظ دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اُس آیت کے الفاظ اور اُس کے ترجمہ کو ایک دفعہ پھر سامنے لایئے اور اس مقام پر پہنچئے جہاں قرآن کریم نے کہا تھا کہ "رحمِ مادر میں جنین کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو گوشت سے ڈھانپ دیا گیا"۔ یہاں تک کے مراحل حیوانی اور انسانی جنین میں مشترک تھے۔ اس کے بعد انسانی جنین کے سلسلہ میں کہا کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳/۱۴)۔ "پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی اور دوسری قسم کی مخلوق کی شکل میں نمودار کردیا۔ سو دیکھو، خدا کا قانونِ تخلیق کتنی بڑی ممکنات کا حامل ہے اور اسی جہت سے وہ احسن الخالقین ہے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہا۔ اور انسان کی اس منفرد ہیئت کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵/۴)۔ "ہم نے انسان کو احسن ہیئت کی ممکنات لئے ہوئے پیدا کیا"۔

یہ خَلْقًا اٰخَرَ — ایک بالکل جداگانہ قسم کی تخلیق — کیا ہے؟ جس میں انسان منفرد ہے! یعنی جو کسی اور مخلوق کو عطا نہیں ہوئی۔ قرآنِ کریم نے اس کیلئے ایک منفرد اصطلاح استعمال کی ہے۔ سورۃ السجدۃ میں پہلے، انسان کے مختلف تخلیقی مراحل کو گنایا گیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے: "اور اس میں ہم نے اپنی روح پھونک دی"۔[1] یہ خصوصیت صرف

[1] مزید حوالوں کیلئے دیکھئے (۱۵/۲۸-۲۹) نیز (۳۸/۷۱-۷۲)۔

انسان کی ہے ۔ کسی دوسری مخلوق کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ " روح " کے معنی توانائی ہیں ۔ لہٰذا " نفخ " سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ایک ایسی توانائی یا قوت عطا کی گئی جو دیگر مخلوقات میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آئی ۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ قوت ، اختیار و ارادہ کی ہے جملہ کائنات میں یہ قوت یا تو خدا کو حاصل ہے اور یا (اس کی عطا کردہ) انسان کو۔ اسی لئے خدا نے اِسے "روحہ" یا "روحنا" (الوہیاتی توانائی - قوتِ خداوندی) کہکر پکارا ہے۔ بالفاظِ دیگر ، انسان کو دیگر مخلوقات کی طرح مجبور پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے سامنے دو راستے (POSSIBILITIES) آئیں تو اسے اختیار دیا گیا ہے کہ یہ ان میں سے جس راستے کو چاہے اپنے لئے منتخب اور اختیار کرلے۔ اس کے سوا کسی مخلوق کو ایسا اختیار نہیں دیا گیا۔ کائنات کی ہر شے (بے جان اور جاندار) اُس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہے جس کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔ صرف انسان اس سے مستثنیٰ ہے۔ انسان میں وہ "شے" جسے یہ قوت عطا کی گئی ہے، قرآن نے اُسے "نفس" کہکر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات، خودی (SELF) یا (PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے ماہرین علم النفس نے اس کے لئے ایک جدید اصطلاح (PSYCHE) وضع کی ہے۔ قرآن کریم نے انسانی نفس کی خصوصیات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کفر اور ایمان یا حق و باطل کا اولین نقطۂ امتیاز یہی ہے۔ یعنی ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے جو طبیعی قوانینِ فطرت کے تابع زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اس تصور کو کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۃ محمدؐ میں ہے: وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)۔ "جو لوگ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور دیگر طبیعی مفادات سے متمتع ہوتے ہیں اور اسی کو منتہائے زندگی سمجھتے ہیں، وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں"۔ دوسری جگہ ہے کہ :-

اِنسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)۔

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں مرنے والے مرجاتے ہیں اور نئے بچے ، نئی زندگی لے کر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ زمانہ کا چکر ہے جو یونہی چلتا رہتا ہے۔ گردشِ زمانہ سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو انسان

کی اصل و حقیقت کا کچھ علم نہیں، یونہی، سطحی سی معلومات ہیں جن کی بنا پر یہ اس قسم کی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

انسانی نفس بالذات

قرآن کریم نے یہ بات اپنے زمانۂ نزول کے مخاطبین کے متعلق کہی تھی لیکن آج خود مغرب کے محققین یہ کہہ رہے ہیں کہ ان سے پہلے جن محققین نے یہ تصورِ حیات پیش کیا تھا، وہ اُن کی قیاس آرائیاں تھیں جنہیں بعد کی تحقیق نے خود ہی غلط ثابت کر دیا۔ یہ محققین اس نتیجہ پر، کہ انسان میں اس کے طبیعی جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، اپنے طور پر عجیب انداز سے پہنچے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی جسم مرکب ہے مختلف خلیات (CELLS) کا۔ ان خلیات کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی کثیر تعداد ہر وقت ضائع ہوتی رہتی ہے اور ان کی جگہ نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ فنا و تجدید مسلسل جاری رہتا ہے تا آنکہ کچھ وقت کے بعد سابقہ جسم سارے کا سارا ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے[1]۔ اگر انسان محض اس کے طبیعیاتی جسم سے عبارت ہوتا تو کچھ عرصہ کے بعد اس سابقہ انسان کا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن تجربہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ آپ نے آج سے بیس تیس برس پہلے جو بات کہی تھی یا جو کام کیا تھا اس کے متعلق آپ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ "میں نے یوں کیا تھا" یا "میں نے یہ بات کہی تھی"۔ جسے آپ "میں" کہتے ہیں طبیعی جسم کے بدل جانے کے ساتھ نہ وہ ختم ہوتی ہے نہ تبدیل۔ وہ بعینہٖ وہی رہتی ہے اور یہی وہ "میں" ہے جس سے انسان فی الحقیقت، انسان کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس مقام پر قرآنِ کریم میں بیان کردہ ایک ایسی عظیم حقیقت سامنے آتی ہے جسے پیش کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سورۃ السجدۃ کی آیت (۳۲/۹) کا ایک حصہ پہلے درج کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے انسانی تخلیق کے ان مراحل کا ذکر ہے جن میں انسان اور حیوانات دونوں شریک ہیں۔ ان میں انسان کے لئے غیب کی ضمیر (THIRD PERSON) لائی گئی ہے — نَسْلَهُ — سَوّٰىهُ — فِيهِ — اس کے بعد ہے: وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ۔ "خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی"۔ اس طرح وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۳۲/۹)۔ "خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے"۔ یہاں ضمیر غائب کی جگہ مخاطب (کُمْ) (SECOND PERSON) لائی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس نفخِ روحِ خداوندی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان تخاطب کے قابل ہو گیا یعنی اب

---

[1] سائنس کی اصطلاح میں اس طریق کو (ANABOLISM: KATBOLISM) اور (METABOLISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
اس کی تفصیل کے لئے میری کتاب — سلیم کے نام خطوط — جلد اول میں ساتواں خط دیکھئے۔

یہ مخلوق انسان کہلانے کی مستحق قرار پا گئی — اور یہ "تم" وہ ہے جو ہر آن بدلنے والے انسانی جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ تم نے دس سال پہلے یہ کہا تھا، تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ تم آج بھی وہی شخص ہو جو دس سال پہلے تھے۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اب مغربی محققین بھی اسے تسلیم کر رہے ہیں کہ انسان کے ہر آن بدلنے والے جسم میں کوئی شے ایسی بھی ہے جو تغیر نا آشنا ہے، جو بدلتی نہیں، جو اپنی ذات میں قائم رہتی ہے۔ اسے انسانی نفس یا ذات کہا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ انسانی جسم کے ہر آن بدلنے کا اس "میں" پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ جب انسانی جسم پر موت وارد ہو جاتی ہے تو اس کی "میں" اس سے بھی متاثر نہیں ہوتی۔ وہ اسی طرح باقی اور غیر متبدل رہتی اور جسم کا لبادہ اتار کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ انسانی نفس کی یہی بنیادی خصوصیت ہے جس کے متعلق مشہور فرانسیسی مفکر برگسان کہتا ہے کہ :-

WE CHANGE WITHOUT CEASING

یعنی "ہم میں تغیر تو واقع ہوتا ہے لیکن ہم کبھی معدوم نہیں ہوتے"۔ اور برگسان کی ہمنوائی میں پولینڈ کا مفکر (NICHOLAS BARDYEAV) کہتا ہے کہ :-

PERSONALITY IS CHANGELSSNESS IN CHANGE

یعنی "انسانی ذات، تغیرات کے ہجوم میں عدمِ تغیر کا نام ہے"۔ [۱]

پروفیسر (ERWIN SCHRODINGER) نے ایک چھوٹی سی، لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے (WHAT IS LIFE)۔ وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے :-

"میں" کسے کہتے ہیں ؟

اگر آپ "میں" کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں، وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے — انسان نے کیا سوچا۔ صفحات ۹۶-۹۴ ۔

اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے .... اگر کوئی ماہرِ عملِ تنویم ایسا بھی کردے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے پھر بھی تم دیکھو گے کہ اِس تمہاری "میں" کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

انسانی ذات اور حافظہ اِس مفکر نے اس مقام پر ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جس کی وضاحت کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انسانی ذات کے منکرین (مادہ پرستوں) کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ جسے تم "میں" کہتے ہو اور اس کے ثبوت میں دلیل یہ پیش کرتے ہو کہ "میں نے دس سال پہلے جو بات کہی تھی، میں آج بھی اس کا احساس اور اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میں نے ہی کہی تھی۔ اگر جسم کے بدلنے سے کچھ بھی باقی نہ رہتا تو مجھے اس کا احساس کیسے ہو سکتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ انسان میں کوئی شے ایسی ہے جو جسم کے تغیرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ اِسی کو انسانی ذات کہتے ہیں"۔ یہ دلیل بڑی کمزور ہے۔ اِن (مادہ پرستوں) کا کہنا یہ ہے کہ یہ انسانی حافظہ ہے جس سے اس قسم کا احساس قائم رہتا ہے۔ جس شخص کا حافظہ خراب یا گم ہو جائے، اُسے اپنے متعلق کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ نہ اپنے ماضی کے کوائف کا کوئی احساس ہوتا ہے۔ اور حافظہ، دماغ کے خلیات کی کارفرمائی ہے۔ یعنی یہ طبیعی نظامِ جسم کا فعل ہے اور چونکہ دماغ کے خلیات موت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مرنے کے بعد انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ پروفیسر (SCHRODINGER) نے یہاں ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی اعمال اور ارادوں کے نقوش انسانی ذات پر مرتسم ہوتے ہیں جو تغیر نا آشنا ہے۔ حافظہ وہ ذریعہ ہے جس سے یہ نقوش مشہود شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس لطیف نکتے کو دو ایک مثالوں سے سمجھئے۔ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے کوئی پروگرام نشر ہو رہا ہے جسے آپ اپنے ریڈیو سیٹ سے سنتے ہیں کہ اس میں سے یکا یک وہ آواز آنی بند ہو جاتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام ختم ہو گیا ہے۔ لیکن تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل آپ کے سیٹ کا ایک تار خراب ہو گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ریڈیو سیٹ سے آواز کے بند ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ ریڈیو اسٹیشن ختم ہو گیا ہے۔ وہ تو بدستور موجود ہے لیکن اس کے پروگرام پکڑنے کا جو ذریعہ (آپ کا سیٹ) تھا، اس میں نقص واقع ہو گیا ہے۔ حافظہ وہ ریڈیو سیٹ ہے جس کے ذریعے آپ کی ذات کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے پروگرام سامنے آتے ہیں۔ حافظہ (ریڈیو سیٹ) کی خرابی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوگا کہ اس کے پیچھے ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں یا وہ منہدم ہو گیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کے حافظہ کے خراب یا گم ہو جانے سے اُسے ماضی کے احساسات یاد نہیں رہتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ احساسات حافظہ پر منقوش تھے۔ اس کے

خراب یا گم ہو جانے سے، وہ نقوش ہی ضائع ہو گئے۔ وہ نقوش انسانی ذات پر مرتسم تھے، جو حافظہ کی خرابی کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ یا مثلاً سینما فلم کا عکس، سکرین (پردہ) پر پڑتا ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ اگر سینما اسٹیج پر سکرین نہ رہے یا خراب ہو جائے تو وہ تصویر ہمیں نظر نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ وہ فلم ہی باقی نہیں رہی۔ فلم تو بدستور موجود ہے صرف وہ ذریعہ باقی نہیں رہا جس سے اس فلم کے نقوش مشہود طور پر ہمارے سامنے آ رہے تھے جب وہ سکرین درست ہو جائے گی (یا سائنس کی تحقیق اس کی جگہ کوئی دوسرا ذریعہ اظہار ایجاد کرے گی) تو فلم پر منقوش تصویر پھر ہمارے سامنے آ جائے گی۔

برگساں اس باب میں اور بھی آگے جاتا ہے۔ وہ اپنی معرکہ آرا تصنیف (MATTER AND MEMORY) میں اس موضوع پر بلند فلسفیانہ سطح پر بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ پیش کرتا ہے کہ حافظہ درحقیقت دماغ کا فعل نہیں۔ وہ محض ذریعہ اظہار ہے ایک غیر مادی فعال عنصر کا۔ اس کے الفاظ ہیں:

> آپ نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ حافظہ کیوں دماغ کا فعل نہیں ہو سکتا۔ دماغ، حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اُسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال (PRESENT) پر اپنا تصرف کر سکے۔ لیکن "خالص حافظہ" مادی شے نہیں۔ یہ روحانیت (غیر مادی عنصر) کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا درحقیقت رُوح کی دنیا ہے۔

ان مفکرین کی تحقیق سے واضح ہے کہ انسانی شعور (یا حافظہ جو تسلسلِ شعور کا دوسرا نام ہے) انسان کے طبیعی نظامِ جسم کا نتیجہ نہیں۔ یہ انسانی ذات کا وظیفہ ہے جو تغیر نا آشنا ہے، اور جو مدت کے بعد بھی بدستور تغیر نا آشنا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے اس عمیق حقیقت کو بڑے بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

> اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا۔ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۹/۴۲)۔
>
> خدا انسانی ذات کو (جو سرچشمۂ شعور ہے) نیند کی حالت میں، اور موت کی حالت میں، اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ (یعنی انسانی ذات کا وظیفہ۔ شعور اور اختیار و ارادہ۔ وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے) نیند کے بعد جب انسان بیدار ہو جاتا ہے تو یہ شعور ایک مدت تک کے لئے واپس آ جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں وہ (انسانی جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتا) روک لیا

جاتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، ایک عظیم حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں مضمر ہیں۔

جسطرح نیند کی حالت میں انسانی ذات فنا نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح، حافظہ کی خرابی یا گم ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ انسانی ذات بھی فنا ہو گئی۔ یا وہ حافظہ سے الگ کوئی شے ہی نہیں۔ نیند کی حالت میں انسانی شعور کارفرما نہیں رہتا حالانکہ اس کا جسم بدستور کام کر رہا ہوتا ہے۔ موت کے بعد بھی انسانی جسم کے ہونے یا نہ ہونے کا اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اپنے نقوش کو لئے بدستور باقی رہتی ہے۔ لیکن جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ موت کے بعد انسانی ذات کے نقوش کے مشہود ہونے کے لئے کس قسم کے ذرائع عطا کئے جائیں گے لیکن ذرائع کوئی بھی ہوں، یہ حقیقت ہے کہ انسانی ذات کے نقوش فناپذیر نہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے ان مغربی مفکرین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

جن مفکرین کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان کا تعلق بھی ہمارے ہی زمانے سے ہے لیکن وہ آج سے چند سال پہلے ہو گزرے ہیں۔ اسوقت دنیائے علم النفس (سائیکالوجی) میں (ERICH FROMM) کا نام سرفہرست ہے۔ وہ عقیدہ کی رو سے (HUMANIST) ہے یعنی وحی کا قائل نہیں، لیکن آپ دیکھئے کہ وہ سائیکالوجی کے عمیق اور طویل مطالعہ اور تجزیہ نفس کے ذاتی تجارب کے بعد نفسِ انسانی کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے:-

> انہی معنوں میں، ہم اپنے آپ پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ہم اپنے جسم میں، اپنی ذات کے وجود سے باخبر ہیں۔ اس کا ہمیں احساس ہے۔ یہ ذات ناقابلِ تغیّر ہے۔ اور تغیر پذیر احوال و کوائف، حتیٰکہ اپنے خیالات اور جذبات تک میں بعض تغیرات کے باوجود، یہ ہماری زندگی میں شروع سے آخر تک اسی طرح قائم و دائم رہتی ہے۔ یہی وہ "شے" وہ معروضیات ہے جو لفظ "میں" کے پیچھے ایک حقیقت ہے اور جس کی بنیاد پر، ہمارے تشخّص کے عقیدہ اور یقین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر ہمیں اپنی ذات پر اعتماد اور یقین نہ ہو تو ہمارے تشخّصِ خویش کا احساس متزلزل ہو جاتا ہے ——— ہم دوسرے لوگوں کے سہارے جینے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (ہماری اپنی کوئی رائے یا فیصلہ نہیں ہوتا) انہی لوگوں کی رائے ہمارے لئے تشخّصِ خویش کا موجب بن جاتی ہے۔

یاد رکھئے! صرف وہ شخص، جسے اعتمادِ خویش حاصل ہو، دوسرے لوگوں سے عہدِ وفا نباہ سکتا ہے کیونکہ اسی صورت میں اسے اس امر کا یقین ہو سکتا ہے کہ وہ آنے والے زمانہ میں بھی وہی ہوگا جو وہ آج ہے۔ اور اسی طرح محسوس اور عمل کرے گا جسطرح وہ آج کرتا ہے۔ یہ اعتمادِ خویش ہی ہے جس سے ہم دوسروں سے کچھ وعدہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں نطشے نے کہا تھا کہ انسان کی تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ "وہ وعدہ کرسکتا ہے" اور یہی وہ خصوصیت ہے جس سے ایک انسان، انسان کہلا سکتا اور انسان رہ سکتا ہے۔ انسانی وجود کی شرطِ اوّلین، اس کا اپنے آپ پر یقین ہے۔ (صفحہ ۲۰۶)

غالباً ایسے ہی ہیں وہ لوگ، جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:-

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو ❊ منکرِ اُو اگر شوی ، منکرِ خویشتن مشو

اِس لئے کہ جو شخص خدا (وحی اور آخرت) کا منکر ہے لیکن انسانی ذات میں عقیدہ رکھتا ہے، اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دن ان صداقتوں کو بھی تسلیم کرے گا۔ لیکن جو شخص انسانی ذات کا منکر ہے (یعنی اپنے آپ کو ایک حیوان سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا) وہ حیوانیت سے بلند و بالا کسی حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کا ذہن اس پست سطح سے بلند ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

با آدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

(ERICH FROMM) نے کہا ہے کہ انسانی ذات کے تغیر نا آشنا ہونے کا نتیجہ ہے کہ انسان کو اس کے سابقہ فیصلوں کا ذمہ دار اور پابند قرار دیا جاتا ہے۔ اس باب میں راشڈل اپنی کتاب (THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ:-

> اخلاقی نظام کا دار و مدار ہی اس مسلمہ پر ہے کہ "میں" اپنے تمام گذشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔ اس لئے اگر کچھ عرصہ کے بعد "میں" وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں، "میں" اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی نہیں قرار پاتا۔ اگر صورتِ حال یہ ہو تو پھر کسی شخص پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام ہی عائد نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہی ہے وہ بنیاد جس پر قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے جس کا سلسلہ دراز موت کے بعد تک چلا جاتا ہے۔

نفسِ انسانی کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اسے ان الفاظ میں سمجھایا ہے: وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ "خدا نے انسان میں اپنی روح پھونک دی" اس کے غلط مفہوم سے ایک ایسا عقیدہ وضع ہوا جس پر تصوف کی ساری عمارت ایستادہ ہے۔ ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ انسانی آتما (روح) پرماتما (سب سے مکمل روح یعنی خدا) کا ایک جزو ہے جو مادی جسم میں محبوس ہے اور انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود یہ ہے کہ مادی آلائشوں کو اس طرح ترک کیا جائے کہ یہ روح، مادہ کی دلدل سے نکل کر پھر اپنی اصل، یعنی روحِ خداوندی سے جا کر مل جائے۔

انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی

یہ عقیدہ پھرتا پھراتا مسلمانوں کے تصوف میں بھی در انداز ہو گیا اور تعلیم دی جانے لگی کہ انسانی ذات، ذاتِ خدا کا جزو ہے۔ اور انسانی زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ یہ جزو، اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ غالبؔ کے الفاظ میں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ اولیاء اللہ کی موت کو موت نہیں کہا جاتا، اُسے "واصل بالحق" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کی رُوح پھر سے الحق کے ساتھ جا کر مل گئی۔ اسے وصال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے۔ ذات جہاں بھی ہو، اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہے۔ وہ اجزاء میں تقسیم ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر، کسی ذات سے اس کا کوئی جزو الگ ہو جائے تو وہ ذات نامکمل یا ناقص ہو جاتی ہے اور نامکمل ذات کو ذات کہا ہی نہیں جا سکتا۔ انگریزی زبان میں انسانی ذات کی انفرادیت کے لئے لفظ (INDIVIDUALITY) آتا ہے (IN-DIVIDUAL) کے معنی ہی (IN-DIVISIBLE) یعنی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ لہٰذا انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں، یہ خدا کی عطا کردہ فضلاً اکتسابیت یا قوت ہے، جس سے انسان کو نوازا گیا ہے۔ پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) نظریۂ فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کا موجد ہے جس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیا ہے۔ وہ ارتقائے نفسِ انسانی کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

> میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ (نفس کے) اس ارتقاء کو ایک "نفسِ اعلیٰ" (SUPREME MIND) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہیئے۔ وہ "نفسِ اعلیٰ" جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم "جدید" سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر ہی دیکھتا ہوں کہ اُوپر سے نیچے اور اوّل سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی، خدائی عاملیت (DIVINE AGENCY) کا ہی مظاہر

ہے۔ اور چونکہ اس سلسلۂ ارتقاء میں، نفسِ انسانی، بلند ترین مقام پر ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقائے نفسِ انسانی اِس "نفسِ اعلیٰ" کی عالیت کا آئینہ ہے۔ لیکن (جیسا کہ میرا عقیدہ ہے) یہ "نفسِ اعلیٰ" لا محدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے۔ اس کی ذات کے لئے "اول" اور "آخر" اور "جدّت" و "اعادہ" کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جاسکتے جن معانی میں یہ نفسِ انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں...... وہ "رُوحِ خالق" جو قدیم اور واجب الوجود ہے ارتقاء کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقاء کی بڑھتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

(THE GREAT DESIGN)

اِس سے بھی اِنسانی ذات اور ذاتِ خداوندی کا بنیادی فرق ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نفسِ انسانی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، اس فرق کا صحیح صحیح تصور انہی سے سامنے آسکتا ہے۔ اس مقام پر ہم، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

نفسِ انسانی

کتبِ لغت کی رُو سے، اس مادہ (ن۔ ف۔ س) کے متعدد معانی ہیں۔ عظمت اور بڑائی، ہمت، عزت، ارادہ اور عقوبت (سزا)، نیز عقل، عِلم، قلب، شعور اور احساس کے معنوں میں بھی۔ لیکن جامع طور پر یہ لفظ، انسانی ذات یا شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے۔ اِن معانی کی رُو سے، اس کے لئے ہمارے ہاں، ذات یا خودی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بندوں کے بھی ہوتے ہیں اور یہ لفظ ان معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جن کے لئے ہم اپنے ہاں "اپنے آپ" کے الفاظ بولتے ہیں۔

ضِمناً نَفَسٌ (ف کے زبر کے ساتھ) کے معنی سانس کے ہوتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْفَاسٌ آتی ہے۔ ——— زیرِ نظر موضوع کی نسبت سے ہم اپنے آپ کو صرف اس دائرہ تک محدود رکھیں گے جس کے اندر یہ لفظ انسانی ذات کے لئے آیا ہے [1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: لغات القرآن جلد (...)

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حیوانات اور انسان میں ما بہ الامتیاز خصوصیت، انسانی ذات ہے۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو بلا تخصیص عطا ہوتی ہے۔ اور یہی وہ امتیاز ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ انسانی ذات کیا ہے؟ یعنی اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے، یہ نہ بتایا جاسکتا ہے نہ سمجھایا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات تو ایک طرف، ہم تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ زندگی (LIFE) جسے عام طور پر "جان" کہتے ہیں، کیا ہے! ہم زندگی کی علامات سے، زندہ اور مردہ میں تمیز کرسکتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ زندگی ہے کیا؟ یہی کیفیت انسانی ذات کی بھی ہے، بلکہ اس سے بھی لطیف تر۔ اس کی ماہیت کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اسے اُن خصوصیات کی بنا پر پہچانا جاسکتا ہے جو اس سے عملاً ظہور میں آتی ہیں۔ انسانی ذات، ہر انسان کو امکانی (POTENTIAL) شکل میں ملتی ہے۔ یعنی غیر نشوونما یافتہ (UN.DEVELOPED)۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس میں نشوونما پاکر مستحکم ہونے کی بھی صلاحیت رکھدی گئی ہے اور اگر اس کی نشوونما نہ کی جائے تو یہ، دبی کی دبی رہ جاتی ہے۔ سورۃ الشمس میں ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۹۱/۷-۱۰)۔ "انسانی ذات، اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے، (اس پر غور کرو)۔ اس میں، اس امر کی صلاحیت رکھدی گئی ہے کہ یہ چاہے تو غلط روش پر چل کر اپنے اندر انتشار پیدا کرلے اور چاہے اس انتشار سے محفوظ رہ کر، مستحکم سے مستحکم ہوتی چلی جائے۔ جس نے اپنی ذات کی نشوونما کرلی وہ کامیاب و کامران ہوگیا، اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ لیکن جس نے اسے اپنے پست جذبات کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا، اس کی کشتِ حیات ویران ہوگئی۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں"۔[1] اس کے نشوونما پانے کی کیفیت کے لئے قرآن کریم نے "تزکیہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کے لغوی معنی نشوونما یا بالیدگی (GROWTH) کے ہیں۔ انسانی زندگی کا فریضہ یہ ہے کہ اس (ذات) کی نشوونما کی جائے۔ اس سے یہ اس قابل ہوجائے گی کہ زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ جائے (اسے حیاتِ اُخروی میں جنت کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ لیکن اگر یہ غیر نشوونما یافتہ رہ جائے تو یہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ رُک کر رہ جاتی ہے (اسے جہنم کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ جہنم کے لئے ایک لفظ "جحیم" بھی آیا ہے جس کے معنی رکاوٹ کے ہیں۔

اِنسانی ذات کی نشوونما

انسانی ذات کی نشوونما ان اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونا، اس

---

[1] ان آیات کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے، لیکن اسے ہم ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس کے مروجہ مفہوم نے کس قدر غلط فہمی پیدا کر رکھی ہے۔

نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جسے "الدین" یا "الاسلام" کہکر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک فریضہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یُزَکِّیۡکُمۡ (۲/۱۵۱)۔ "وہ تمہاری ذات کی نشوونما کرتا ہے"۔[1] اس کے معنی ہیں کہ رسولؐ تعلیم کتاب و حکمت کے مطابق ایسا نظام متشکل کرتا ہے، جس میں اقدارِ خداوندی کے اتباع سے مؤمنین کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں خانقاہوں کی خلوتوں میں چلّوں اور ریاضتوں سے تزکیۂ نفس کیا جاتا ہے، وہ فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے تزکیۂ نفس، قرآنی نظام کے اندر جہدِ مسلسل کی رو سے ہوتا ہے۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونے کے مختلف اور متعدد گوشے ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر گوشہ ان کی آماجگاہ ہے لیکن ان میں نمایاں حیثیت مزد و معاوضہ کے خیال کے بغیر انفاق فی سبیل اللہ کو حاصل ہے۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق پوری پوری محنت کرے اور اس محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی نوعِ انسان کی بہبود کیلئے اس نظام کے حوالے کردے۔ مثلاً سورۃ الّیل میں ہے کہ جہنم سے وہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸)۔ "جو اپنا مال و دولت اس مقصد کے لئے دیدیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے"۔ سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ سے تثبیتِ نفس حاصل ہوجاتی ہے (۲/۲۶۵)۔ تثبیت کے معنی استحکامِ ذات کے ہیں۔ انفاق کے برعکس، بخل یا شحِّ نفس ہے —— یعنی سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ قرآن کریم میں اس سے بچنے کی سخت تاکید آئی ہے (دیکھئے ۵۹/۹ و ۶۴/۱۶)۔ نظامِ خداوندی میں انفاق کی یہ شکل ایک تنظیمی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اس کے لئے دیکھئے (۹/۱۰۳)۔

اس کا معیار

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اس کی پہچان آسان ہے۔ ذاتِ خداوندی مکمل ترین ذات ہے اور اس کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، وہ اس ذات کے مختلف (FACETS) یا شئون ہیں۔ ان میں بعض صفات تو ایسی ہیں جن کا تعلق ذاتِ خداوندی کی لامتناہیت سے ہے —— مثلاً اس کا ازلی اور ابدی ہونا۔ ان میں تو کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن دیگر صفات ایسی ہیں جن کی نمود (علیٰ حدِّ بشریت) انسانی ذات میں بھی ممکن ہے۔ لہٰذا جس انسان سے ان صفات کی نمود ہو، اُس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اسی کو "قربِ خداوندی" کہا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ہے: فَلَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۵۳/۳۲)۔ "تم خود ہی اپنے معیار کے مطابق فیصلے کرنے نہ بیٹھ جاؤ کہ تمہاری ذات نشوونما پا رہی ہے۔ خدا کو اچھی طرح معلوم ہے،

---

[1] مزید حوالوں کے لئے دیکھئے۔ (۲/۱۲۹) و (۳/۱۶۳) و (۶۲/۲)۔

کس کی ذات، کس حد تک، تخریب سے محفوظ ہے۔" (نیز دیکھئے ۴۷/۴۹ ؛ ۲۴/۲۱)۔ سورۃ الحشر میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (۵۹/۱۹)۔ "دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی"۔ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ خدا فراموشی، اور خود فراموشی (منکرِ خویشتن شدن) لازم ملزوم ہیں۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ صفاتِ خداوندی وہ معیار (STANDARD) ہے جس سے یہ ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے کہ انسان کی ذات کس حد تک نشوونما پا چکی، یا پا رہی ہے۔

انفرادیت

ذات کی بنیادی خصوصیت انفرادیت ہے۔ انفرادیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر ذات خود مکتفی ہے، بذاتہٖ قائم ہے کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں۔ یہ اپنے ہر فیصلہ کی آپ ذمہ دار ہے اور اس کے نتائج بھی اسے خود ہی بھگتنے پڑتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ سورۃ اخلاص میں خدا کے متعلق جو کہا گیا ہے، قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (۱۱۲/۱)۔ تو اس میں "احد" کے معنی "ایک" نہیں، بلکہ یہ ذاتِ خداوندی کی انفرادیت یا یگانگت (UNIQUE-NESS) کا مظہر ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کائنات میں مشیتِ خداوندی بتمام و کمال کارفرما ہے، لیکن انسان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰)۔ "تم اپنی مرضی کے مطابق، جو کرنا چاہتے ہو، کرو"۔ انسان کا یہی اختیار و ارادہ ہے جس کی تصریحات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ کہیں کہا گیا ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہہ دو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آ چکا ہے۔ تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول اور اختیار کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ کہیں کہا گیا: مَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۷/۱۵)۔ "جو صحیح راستہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا۔ جو غلط راہ پر چلے گا اس کا نقصان بھی اس کی ذات کو ہو گا"۔[1]

انسان کے اسی اختیار و ارادہ کا فطری نتیجہ ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا

---

[1] مزید حوالوں کے لئے دیکھئے۔ (۲/۱۰۸)؛ (۳۶/۴۴)؛ (۲۷/۹۲)؛ (۱۹/۶)؛ (۳۱/۱۲)؛ (۲۹/۴۱)۔ مطالب الفرقان جلد اول میں زیرِ تشریح آیت (۱/۵) میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ نیز کتاب التقدیر۔

شریک نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل کی جو آیت ابھی ابھی درج کی گئی ہے یعنی (۱۷/۱۵)، اس کا اگلا حصہ یہ ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۱۷/۱۵)۔ "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا" (نیز دیکھئے ۳۹/۸) (۵۳/۳۸)۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کی گئی کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ ....

"انسانی ذات جو صحیح کام کرے گی اس کا فائدہ بھی اسی کو ہوگا، اور جو غلط کام کرے گی، اس کا نقصان بھی اسی کو اٹھانا پڑے گا۔"

.... حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے انسان کے ہر کام کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس کا ہر عمل، اس کی ذات پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں ہے: وَمَنْ يَكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱)۔ "جو شخص اقدارِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔" دوسری جگہ کہا گیا: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا (۷۳/۲۰)۔ "تم جو کچھ اپنی ذات کی بہبود کے لئے عملِ خیر کرتے ہو، خدا کے ہاں سے اس کا 'خیر' نتیجہ ملے گا، اور یہ بہت بڑا معاوضہ ہے۔" اگرچہ لفظ "خیر" کے عام معنی نیک عمل ہیں، لیکن بنیادی طور

عملِ خیر سے مراد

پر اس کے معنی ایسے اعمال ہیں، جن سے انسانی ذات کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے۔ (یعنی خ۔ی۔ر) اس لئے مومنین سے کہا گیا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۲/۱۴۸، ۵/۴۸)۔ "تم ان اعمال میں مسابقت کرو جو تمہاری ذات کے اختیارات میں وسعتیں پیدا کرنے کے موجب ہوں۔" خود مومنین کی اعلیٰ صفت سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ (۳۵/۳۲) بتائی گئی ہے۔ یعنی وہ، جو يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (۳/۱۱۳) (۲۱/۹۰)، (۲۳/۶۱)۔ "اختیارات افزا اعمال میں تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔" دوسری جگہ ان کے اعمال کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ (۹/۸۸)۔ "ان کے لئے اختیارات کی وسعتیں ہیں۔" خود احکامِ خداوندی کو فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (۲۱/۷۳)۔ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بیشتر مقامات میں آتا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ تو اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وحی کی رو سے انسان پر جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں تو ان سے فی الحقیقت مقصود اس کی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے، جس طرح نہر میں مختلف مقامات پر ٹھوکریں (FALLS) بنادی جاتی ہیں کہ ان سے پانی کی رفتار میں تیزی پیدا ہو جائے۔ اس بنا پر جنتی زندگی میں مسابقت چاہنے والوں کو مُتَنَافِسُوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے (۸۳/۲۶)۔ "تنافس" سے مراد، نفس کی وسعتوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی و کاوش ہے۔ قرآن کریم کی ان تصریحات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نیک اعمال، اعمالِ حسنہ یا اعمالِ صالحہ وہ کام ہیں، جن سے انسانی ذات میں وسعت یا استحکام پیدا ہوتا ہے، اور سیئات یا برے کام وہ ہیں، جن سے اس میں ضعف یا اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ان سے انسانی ذات میں انتشار

واقع ہو جاتا ہے۔ سنر کہتے ہی انتشار کو ہیں۔ اسی کو "خسرانِ نفس" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ (DIS-INTEGRATION)
(۶/۹؛ ۳۹/۱۵)۔ یعنی وہ اعمال، جن سے انسانی ذات میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ [1]

ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے عمل سے مراد وہی کام نہیں، جو کسی سے محسوس طور پر سرزد ہوں۔ اس میں وہ امور بھی شامل ہیں، جن کا انسان ارادہ یا نیت کرے، خواہ وہ عملی طور پر اس سے سرزد نہ ہی ہوں۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور میز پر اس کی قیمتی گھڑی پڑی ہے۔ آپ کے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر موقع مل جائے تو میں اس گھڑی کو چُرا لوں لیکن آپ کو اس کا موقع نہیں ملتا۔ دنیاوی قانون کی رو سے آپ نے کسی جُرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے حساب سے آپ کی اس نیت کا اثر بھی آپ کی ذات پر مرتب ہو گیا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے: وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (۵۰/۱۶)۔ "ہم انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہیں"۔ دوسری جگہ ہے: يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) نیز (۲/۲۸۴)۔ "خدا تمہاری نگاہوں کی خیانت اور دل کے پوشیدہ رازوں تک سے بھی واقف ہے"۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی نیت اور ارادہ بھی اس کی ذات پر اثر مرتب کر دیتا ہے۔ انسانی ذات، اعمالِ انسانی کے انہی اثرات و نقوش کو ساتھ لے کر موت کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ [2] اسی کا نام انسان کا اعمال نامہ ہے۔ اگر انسانی ذات کو نشو و نما دینے والے اعمال کا وزن زیادہ ہے تو وہ ارتقائی منزل میں آگے بڑھ جائے گی۔ اور اگر ان کا وزن کم ہے اور انسانی ذات کی کما حقہٗ نشو و نما نہیں ہو سکی تو وہ آگے بڑھنے سے روک دی جائے گی۔ اس لئے جنت کے متعلق کہا کہ وَذٰلِكَ جَزَآءُ مَنْ تَزَكّٰى (۲۰/۷۶)۔ "جنت، انسان کے ان اعمال کا بدلہ ہے جن سے اس کی ذات کی نشو و نما ہو چکی ہو"۔ واضح رہے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہر ذات اپنے اعمال کی آپ ذمہ دار ہوتی ہے۔ نہ کسی دوسرے کے کسی عمل کا اثر اس پر پڑ سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی اس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ اس کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ سورۃ الانعام میں ایک آیت ہے کہ

---

[1] مزید حوالوں کے لئے دیکھئے۔ (۲۱/۱۱؛ ۱۰۳/۲۳؛ ۳۹/۱۵)۔ انسانی ذات کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں، زیرِ تشریح آیات (۱/۱)؛ (۹/۲)؛ (۴/۲) میں بھی ذکر آ چکا ہے۔

[2] اس مقام پر آپ آیت (۳۹/۴۲) کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نیند اور موت کی حالت میں نفسِ انسانی (ذات) کا عمل معطل ہو جاتا ہے۔ نیند کی صورت میں وہ (ذات) بیدار ہونے پر "واپس آ جاتی ہے"۔ لیکن موت کی صورت میں اسے روک لیا جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں واپس نہیں آتی۔ اس کی کارفرمائی کا میدان اگلی دنیا ہوتا ہے۔ اسی کو اُخروی حیات کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح نیند کی حالت میں انسانی ذات مرتی نہیں، اسی طرح موت سے بھی وہ مرتی نہیں۔ مرتا صرف جسم ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

جوں جوں نگہ بصیرت اس کی گہرائیوں میں اترتی ہے ۔ انسان وجد میں آجاتا ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے :

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶/۹۵)۔

اس آیۃ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے کہ "جن جن چیزوں کو تم یہاں "میری" یا "میرا" کہتے ہو، جن اپنوں کو تم اپنے یا میرے کہہ کر پکارتے ہو، ان سب کو یہیں چھوڑ کر، صرف اپنی ذات کو لیکر ہمارے ہاں آؤ گے۔ تمہارے مال و دولت، تمہارے اعزہ و اقربا ء تمہارے رفقاء اور متعلقین، تمہارا جسم، یہ سب پیچھے رہ جائیں گے۔ اور تم صرف اپنی ذات کو لے کر ہماری عدالت میں حاضر ہو گے"۔ لفظ "فرادیٰ" سے انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵)۔ "تم اپنی ذات کی حفاظت کرو۔ اگر تم میرے راستہ پر چلتے رہے تو کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا"۔ یہ آیت بھی ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دنیا میں دوسرے لوگ انسان کو نفع بھی پہنچا سکتے ہیں اور نقصان بھی، لیکن یہ نفع اور نقصان اس کی طبیعی زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، کوئی دوسرا اُسے نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس کو نفع بھی انسان خود آپ پہنچاتا ہے اور اس کا نقصان بھی یہ خود ہی کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس مقام پر ہمیں جرمن فلاسفر نطشے کا وہ قول یاد آجاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے اُسے میں تو معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُسے کون معاف کر سکتا ہے؟ قرآن کریم میں جو بار بار کہا گیا ہے: وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲/۵۷)۔ "ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ انسان، اپنی ذات پر، خود آپ ظلم کرتا ہے"۔ تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ انسان اپنی ذات کو خود آپ نقصان پہنچاتا ہے، کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں ذاتِ انسانی کے وہ خصائص و لزومات، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ اس کی بعض دیگر بنیادی خصوصیات ایسی ہیں جن کا ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں عالم آفاق اور خود ان کی نفسیاتی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے، تا آنکہ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے"۔ عالم آفاق، یعنی خارجی کائنات کے نظم و ضبط کے متعلق، سائنس کی تحقیقات ایک عرصے سے جاری ہیں اور ان میں، ہمارے دور تک، کافی ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن عالم انفس (یعنی انسانی ذات) کے متعلق تحقیق کا دروازہ حال ہی میں کھلا ہے۔ اسے علم النفس یا

سائیکالوجی (PSYCHOLOGY) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اگرچہ اس تحقیق نے ابھی تک، باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار نہیں کی لیکن، بایں ہمہ، اس وقت تک بھی اس کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اس سے قرآنی حقائق پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے

سائیکالوجی کی تحقیق

انسانی نفس کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک نفسِ شعوری (CONSCIOUS MIND) اور دوسرا نفسِ غیر شعوری یا نیم شعوری (SUB, OR UN-CONSCIOUS MIND) ان کا کہنا یہ ہے کہ نفسِ شعوری کا تعلق انسان کے محسوس اعمال سے ہے اور ان اعمال کی بھی صورت یہ ہے کہ عقلِ انسانی غلط اعمال کو بھی مزیّن اور مستحسن بنا کر دکھا دیتی، اور ان کے جواز کے لئے قسم قسم کے دلائل مہیا کر دیتی ہے، جس سے انسان اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلط کام (جرم) سرزد نہیں ہوا۔ لیکن ان جرائم کے اثرات، نیز ان ارادوں، آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں تک کے اثرات جو محسوس شکل اختیار نہیں کر پاتے، ان سب کو نفسِ غیر شعوری، اپنی تہوں میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس دنیا میں ان اثرات کے نتائج نفسیاتی امراض کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور علمِ تجزیۂ نفس کی رو سے ان کا علاج بھی کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک انسانی ذات کے مستقبل کا تعلق ہے، یہ حیاتِ آخرت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہاں کی زندگی کے متعلق قرآن کریم نے ایک مقام پر کہا ہے: يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹) "جب چھپے ہوتے راز بھی اُبھر کر سامنے آجائیں گے۔" دوسری جگہ ہے: لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰/۲۲)۔ "تم اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر تھے۔ آج تمہاری نگاہوں سے پردے اُٹھا دیئے گئے ہیں اور وہ اتنی تیز ہوگئی ہیں کہ کوئی شے بھی ان سے اوجھل نہیں رہ سکتی۔" فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ (۳۰/۵۷)۔ "دنیاوی زندگی میں انسان کی عقلِ بہانہ ساز مختلف قسم کے دلائل سے اس کی غلط کوشیوں کے لئے وجہِ جواز مہیا کر دیا کرتی ہے۔ اس دن اس کی وہ وجوہِ جواز (معذرتیں) اسے کچھ فائدہ نہ دے سکیں گی۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت وہ تمام نقوش و اثرات، جنہیں نفسِ غیر شعوری نے اپنی تہوں میں چھپا رکھا تھا، اُبھر کر سامنے آجائیں گے (۸۶/۹)۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے چار الفاظ میں اس اعجاز و ایجاز کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی کماحقہٗ داد کوئی علم النفس کا ماہر ہی دے سکتا ہے۔ کہا ہے: يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۶/۱۱۱) "جس دن انسان کا ایک نفس اس کے دوسرے نفس سے جھگڑتا ہوا سامنے آئے گا۔ اس دن ہر انسانی ذات کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اور کسی پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔" غور کیجئے! آج سے چودہ سو سال پہلے انسان کے ان "دو" نفسوں کے باہمی مجادلہ کا ذکر کیا کسی مفکر کے بس کی بات تھی؟ ایسا انکشاف وحیٔ خداوندی ہی کر سکتی تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اسی کو قرآن نے انسانی اعمالنامہ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا ہے:

اعمال نامہ وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا۔ اقْرَأْ كِتَابَكَ ۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷/۱۳-۱۴)۔

اس دنیا میں انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے لیکن ایک لپٹی ہوئی شکل میں ظہورِ نتائج کے وقت، یہ لپٹا ہوا اعمال نامہ ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجائے گا۔ اس وقت انسان سے کہا جائے گا کہ تو اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے۔ تمہارا حساب کرنے کے لئے باہر کسی محاسب کے ...... بلانے کی ضرورت نہیں۔ آج تمہارا نفس خود اپنے خلاف محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

اُس وقت نفسِ غیر شعوریہ اپنے تمام پوشیدہ نقوش کو ساتھ لئے، نفسِ شعوریہ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا اور اس سے کہے گا کہ عقلِ فریب کار، جن غلط اعمال کو مزیّن بنا کر تمہیں دکھاتی رہی اور تم اس کے فریب میں آتے رہے، آج وہ اعمال بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم میں جرأت ہے تو ان سے انکار کر دو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے، کہ یہ وہ سلیٹ ہے جس پر لکھا ہوا ہر حرف، حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس پر کوئی خارجی عنصر اثر انداز نہیں ہوا۔ سورۃ القیٰمۃ میں ہے:

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ (۷۵/۱۴-۱۵) عقلِ فریب کار، انسان کے غلط اعمال کو ہزار مزیّن بنا کر اُسے دھوکے میں رکھے، اس کا نفس (غیر شعوریہ) اس پر پوری پوری نگاہ رکھتا ہے اور وہ اس دن اس کا اچھی طرح محاسبہ کرے گا۔

یہ ہیں نفسِ انسانی کے متعلق قرآنی شواہد۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، علم النفس (سائیکالوجی) ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ جب یہ ذرا اور آگے بڑھے گا تو زمانہ دیکھے گا کہ اس کی تحقیقات کس طرح ان حقائق کی بھی تائید کرتی چلی جاتی ہیں، جو ابھی اس کے دائرۂ جستجو اور تفتیش سے باہر ہیں۔ یہ حضرات، انسانی نفس (SELF) کی حیاتِ بعد الممات (SURVIVAL) کے امکان کے تو قائل ہو چکے ہیں۔ وقت آئے گا کہ یہ اس کی بقا (IMMORTALITY) کے بھی انہی معنوں میں معترف ہو جائیں گے، جن معنوں میں قرآن کریم نے اِسے پیش کیا ہے۔ [1] (SURVIVAL) اور (IMMORTALITY) میں کیا فرق

---

[1] اس باب میں ڈاکٹر (C.G.JUNG) کے تجربات بڑے بصیرت افروز ہیں۔ دیکھئے اس کی کتاب (MEMORIES, DREAMS REFLECTIONS) نیز (DEATH AND RE-BIRTH OF PSYCHOLOGY BY IRA PROGOFF)

ہے۔ اس کی وضاحت اس مقام پر کی جائے گی جہاں حیات بعد الممات کا تفصیلی تذکرہ آئے گا۔ سردست اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قرآن کریم نے، اہلِ جنت اور اہلِ جہنم دونوں کے بقائے نفس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اہلِ جہنم کا یہ کہکر کہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (۲۰/۷۴) ”اس میں انہیں نہ زندگی نصیب ہوگی، نہ موت ہی آئے گی۔“ یہ محض (SURVIVAL) ہوگا۔ ان کے برعکس اہلِ جنت کے متعلق کہا کہ: لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی (۴۴/۵۶)۔ ”پہلی موت (جو دنیا میں آ گئی، اس کے بعد) وہاں ان پر موت وارد نہیں ہوگی۔“ اسے (IMMORTALITY) کہا جائے گا۔ یعنی بقائے دوام۔

اس کے ساتھ ہی اتنا اور سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ انسانی ذات کا بقائے دوام، خدا کے ”بقائے دوام“ جیسا نہیں خدا کی بقا فنا آشنا نہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف لامحدود ذات (INFINITE) کی ہوسکتی ہے، جو خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اُسے ہم ابدیت (ETERNITY) سے تعبیر کریں گے۔ انسانی ذات بہرحال محدود (FINITE) ہے۔ اس لئے یہ لاانتہا نہیں ہوسکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جائے گی۔ (جنت بھی اس کا منتہیٰ نہیں۔ راستے کی منزل ہے) لیکن اس کا بہرحال انجام ہوگا۔ وہ انجام کیا ہوگا، ہم اپنے اِدراک کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے۔ شاید وہاں جاکر یہ راز بھی کھل جائے۔

یہ ہیں انسانی ذات (نفس) کے متعلق، قرآنی شواہد کے چند گوشے۔

اِنسانی فطرت

اِنسانی ذات کے تذکرہ کے بعد، ہم ان چند ایک نظریات کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں، جو ہمارے ہاں شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بنے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ ”انسانی فطرت“ (HUMAN NATURE) کا ہے۔ فکرِ انسانی کی بعض غلط اندیشیاں ایسی ہیں جن کے نتائج اس طرح عالمگیر ہوجاتے ہیں کہ وہ زمان اور مکان کی حدود سے بھی غیر متاثر رہتے ہیں۔ انہی میں ایک غلط نگہی انسانی فطرت کا نظریہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے، انسانی فکر کا آغاز یونان کے فلاسفر سے ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نظریہ ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسان کی جو تعریف (DEFINITION) متعین کی تو اس کی بنیاد یہی نظریہ تھا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ ”انسان، صاحبِ شعور حیوان ہے“، کسی نے کہا ”اِنسان، مدنی الطبع حیوان ہے“۔ کسی نے کہا کہ ”انسان وہ حیوان ہے جو اوزار بناتا ہے“۔ وغیرہ وغیرہ۔ اِن (DEFINITIONS) میں تو وقتاً فوقتاً اختلاف ہوتا رہا۔ لیکن فطرتِ انسانی کا بنیادی نظریہ مسلسل آگے چلا آیا۔ ہر مفکر نے انسانی فطرت کا نظریہ پیش کیا لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ انسانی

فطرت بالآخر ہے کیا؟ حیرت ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے مفکر اس دو اڑھائی ہزار سال کے عرصہ میں ان چند مبادیات پر بھی غور نہ کر سکے، جن سے یہ مسئلہ صاف ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ فطرت کسے کہتے ہیں؟ پانی کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے، ہر برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر جا کر منجمد ہو جاتا ہے اور دوسری طرف بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ یہ خصوصیات پانی کی فطرت کہلائیں گی۔ یا مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے، کسی دوسری غذا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسے بکری اور شیر کی فطرت کہا جائے گا۔ ان مثالوں سے ہم نے دیکھا کہ:-

فطرت کا مفہوم

(۱) فطرت اس بنیادی خصوصیت کو کہتے ہیں جو غیر متبدل ہو۔ اور

(۲) یہ فطرت اس نوع کے ہر فرد میں یکساں طور پر پائی جائے گی۔ یعنی بکری دنیا میں کہیں بھی ہو، اور کسی زمانے میں بھی ہو، وہ گھاس کھانے والی ہوگی۔ اسی طرح شیر بھی کسی زمانے میں ہو، اور کسی ملک میں، وہ گوشت خور ہوگا۔ اور یہ خصوصیات ہر بکری اور ہر شیر میں یکساں ہوں گی۔

شق (۱) سے ظاہر ہے کہ فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے جو اسے بدلنے پر قادر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا صاحبِ اختیار و ارادہ کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔

شق (۲) سے یہ واضح ہے کہ ہر نوع کی فطرت، اس نوع کے ہر فرد میں یکساں طور پر پائی جائے گی۔ اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے، مختلف زمانوں کے انسان تو ایک طرف، کسی ایک زمانے میں بھی، نوعِ انسان کا ایک فرد، دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ ان کی شکل و شباہت یا انگلیوں کے نشانات کی بات نہیں، اگرچہ وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے، ان کی سیرت و کردار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان مبادیات سے یہ واضح ہے کہ انسان (MAN) کی کوئی فطرت نہیں (جبلّی طور پر، انسانوں میں جو حیوانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یا وراثت اور ماحول کا جو اثر، انسانی بچوں پر مرتب ہوتا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر ابلیس کے عنوان کے تابع ملے گا) ایسے بچے پائے گئے ہیں جنہیں ان کی پیدائش کے وقت ہی کوئی جنگلی جانور اٹھا کر لے گیا اور انہوں نے، انہی جانوروں میں، جنگل میں پرورش پائی۔ بعد میں دیکھا گیا کہ ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جو انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی خُو بُو انہی حیوانوں جیسی تھی جن میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ اس کے برعکس، جانوروں کو کسی ماحول میں بھی رکھا جائے، وہ اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ بکری اور کتے کی پرورش (ایک ہی گھر میں کیوں نہ ہو۔ بکری، بکری .... رہتی ہے اور کتا، کتا۔ یہ اس لئے کہ ان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے، جو غیر متبدل ہے۔

اِنسان کی کوئی فطرت نہیں

کوئی دو اڑھائی ہزار سال کے عرصہ کے بعد اب کہیں جا کر علم النفس کے ماہرین اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔
(ERICH FROMM) نے اپنے عمر بھر کے تجارب کے بعد اس غلط نظریہ کی بڑے محققانہ انداز سے تردید کی ہے۔ [1] اس نے بڑے نشتر انہ انداز میں کہا ہے کہ یہ باطل نظریہ اس لئے مسلسل اور متواتر چلا نہیں آیا کہ علمی انداز سے اس کی تردید نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ انسان کی بہت سی تخریب کاریوں کے لئے سپر کا کام دیتا تھا۔ مثلاً ارسطو نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ غلامی، انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور یہی دلیل اٹھارویں صدی تک غلامی کے جواز میں دی جاتی رہی۔ یا مثلاً نظامِ سرمایہ داری کے جواز میں یہ کہا جاتا رہا کہ ذاتی ملکیت اور مفادِ خویش یا خودغرضی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اس لئے کوئی ایسا نظام انسانی فطرت کے مطابق نہیں کہلا سکتا جس کی بنیاد ان جذبات پر نہ ہو۔

اِنسانی فکر نے تو یہ ٹھوکریں کھائی ہی تھیں، کہ اس کے پاس ایسا سرچشمۂ علم نہیں تھا جو غلطیوں سے منزہ ہو۔ لیکن حیرت اندر حیرت کہ خود مسلمانوں نے بھی اس نظریہ کو اختیار کر لیا۔ اور یہیں تک اکتفا نہیں کیا؛ اسے بڑھا چڑھا کر یہاں تک لے گئے کہ عقیدہ یہ وضع کر لیا کہ:-

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ [2]

(۲) لہٰذا انسان کی فطرت، عین خدا کی فطرت ہے۔

(۳) اسلام دینِ فطرت ہے، یعنی عین انسانی فطرت کے مطابق۔

(۴) لہٰذا کوئی کام، جو انسانی فطرت کے خلاف ہو، وہ اسلام کے خلاف ہے۔

(۵) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اگر اُسے ماحول کے اثرات سے غیر متاثر رکھا جائے تو اس کی زندگی اِسلام کے مطابق ہو گی۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے اس کی کتاب (THE ANATOMY OF HUMAN DESTRUCTIVENESS. P. ۲۴۶-۲۴۸) آگے چل کر اس کتاب کے حوالے اکثر دیئے جائیں گے۔ ان مقامات پر ہم صرف (ERICH FROMM) لکھیں گے۔ اس سے مراد اسکی یہی کتاب ہو گی۔

[2] (محرف) تورات نے کہا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ ہم نے اس سے یہ تصور لے کر، یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ خُدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔

ہمارے ہاں ان نظریات کو مسلمات کی حیثیت سے مانا جاتا ہے اور اس شدت کے ساتھ مانا جاتا ہے کہ یہ گویا خود اسلام کے بنیادی نظریات ہیں۔ اس کی سند میں قرآن کریم کی ایک آیت پیش کر دی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے:

فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۳۰/۳۰)

اللہ کی وہ فطرت، جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ دینِ قیّم (اسلام) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

اس آیت میں جو لفظ "فطرت" آیا ہے اس کا یہ مفہوم (NATURE) یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں استعمال ہی نہیں کیا جن معانی میں یہ آج مستعمل ہے۔ قرآن کریم تو ایک طرف، زمانۂ نزولِ قرآن کی عربی مبین میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں جب (عباسیوں کے زمانہ میں) یونانی فکر کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو ان کے ہاں کے لفظ (NATURE) کے لئے "فِطرت" کی اصطلاح وضع کی گئی۔ وہاں سے یہ لفظ نیچر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور پھر اسی خود وضع کردہ اصطلاح کے مطابق، قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت کی پہلے تفسیر کی گئی اور پھر دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یوں یہ باطل تصور نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں عام ہوا بلکہ اسلام کا بنیادی نظریہ قرار پا گیا۔

اس لفظ کے مادہ (ف۔ ط۔ ر) کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (زیرِ تشریح آیت ۶/۱۴) میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (۶/۱۴) کہا ہے۔ فَطَرَ کے معنی ہیں کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسے پہلی بار پیدا کرنا۔ لہٰذا "فطرت" کے معنی ہوئے خدا کا وہ طریق (یا قانونِ) تخلیق، جس کی رُو سے وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ "فَطَرَ" کے ان معانی کی روشنی میں آیت (۳۰/۳۰) کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بھی اپنے اسی قانون و طریقِ تخلیق کے مطابق عدم سے وجود میں لایا ہے جس طریق کے مطابق اس نے جملہ کائنات کو پیدا کیا۔ تخلیقِ انسانی کے لئے کوئی دوسرا طریق اختیار نہیں کیا گیا۔ خدا کا یہ تخلیقی نظام بڑا محکم ہے، جس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لہٰذا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کو اس نے کسی دوسرے طریق سے پیدا کیا (یعنی مثلاً اس نے مٹی کا ایک پُتلا بنایا۔ اس کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کی بیوی نکالی اور اس سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا) وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ حقیقت سے واقف نہیں۔ چنانچہ اس نے خود انسانوں کے متعلق کہا ہے: قُلِ الَّذِیۡ فَطَرَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷/۵۱) "اللہ وہ ہے جو تمہیں پہلی بار عدم سے وجود میں لایا" اس کی تشریح میں دوسری جگہ کہا: هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَكُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا (۷۶/۱) کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزرا، جب یہ کوئی قابلِ ذکر

شے نہیں تھا"۔ بلکہ اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًا (۱۹/۶۷)۔ کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے اُسے پیدا کیا درانحالیکہ یہ کوئی شے نہیں تھا"۔ یہ ہے فطرت اللہ کا مفہوم۔ یعنی خدا کا قانونِ تخلیق، جس کی رو سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح انسانوں کو بھی عدم سے وجود میں لایا۔ خود آیت (۳۰/۳۰) لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ میں "خلق اللہ" کے الفاظ "فطرت اللہ" کی تشریح کر رہے ہیں۔ یعنی قانونِ تخلیق۔

ہم ذرا آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا، اور ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ انسان کے متعلق خدا نے یہ کچھ کہا ہے:۔ (۱) وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (۴/۲۸)۔

انسانی خصوصیات

"انسان کو بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔ (۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴/۳۴)۔ "انسان ظالم بھی واقع ہوا ہے اور کفر پسند و ناشکر گزار بھی"۔ (۳) وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) نیز ۲۲/۶۶؛ ۴۲/۴۸؛ ۴۳/۱۵؛ ۸۰/۱۷) یعنی "انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے"۔ (۴) ناشکر گزار بھی بے حد جھگڑالو بھی ـــــ ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۱۶/۴)۔ "واضح طور پر جھگڑالو"۔ (۵) وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴)۔ "انسان اکثر معاملات میں خواہ مخواہ جھگڑے نکالتا رہتا ہے"۔ (نیز دیکھئے ۳۶/۷۷؛ ۲۲/۳)۔ (۶) وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱)۔ "انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے"۔ (نیز ۲۱/۳۷)۔ (۷) وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰)۔ "انسان بڑا خود غرض بخیل اور تنگ نظر واقع ہوا ہے"۔ (۸) کیفیت اس کی یہ ہے کہ یہ بےصبرا بھی ہے اور ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا ـــ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹)۔ (۹) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۱۰۰/۶)۔ "یہ نعمائے خداوندی کی ناقدر شناسی کرتا ہے اور اس کی ہوس کی کوئی حد اور کنارا ہی نہیں"۔ (۱۰) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی (۹۶/۶)۔ "یہ بڑا سرکش واقع ہوا ہے"۔ (۱۱) سرکش بھی اور اس کے ساتھ ظالم اور جاہل بھی ـــ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲)۔

یہ ہیں انسان کی موٹی موٹی خصوصیات، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ یہ تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ ان سے حقیقی مراد کیا ہے۔ اس مقام پر آپ اس پر غور کیجئے کہ اگر عقیدہ یہ ہو کہ خدا نے انسان کو اپنی "فطرت" پر پیدا کیا ہے اور انسانی فطرت کی، قرآن نے یہ خصوصیات بتائی ہوں، تو سوچئے کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوگا؟ کیا خدا کی فطرت (معاذ اللہ) انہی خصوصیات کی حامل ہوگی؟ لہذا یہ نظریہ یا عقیدہ بالبداہت غیر قرآنی اور باطل ہے۔ کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ یا انسان کی کوئی فطرت بھی ہے! علاوہ ازیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ فطرت ان بنیادی خصوصیات کو کہا جاتا ہے جو غیر متبدل ہوں۔ اگر انسانی فطرت کے نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا کی طرف سے سلسلۂ ہدایت اور حضراتِ انبیائے کرام کی بعثت عبث ہو کر رہ جاتی ہے، کیونکہ جب فطری خصوصیات

کو بدلا ہی نہیں جا سکتا تو پھر اس تمام سلسلۂ رشد و ہدایت سے حاصل کیا ہوگا ؟ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے اس لئے حضرات انبیائے کرام مبعوث ہوتے رہے کہ وہ انسان کو اس کی فطرت کے مطابق چلائیں۔ یہ تصور پھر باطل ہے۔ کوئی شے اپنی فطرت کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔ ہر نوع اپنی فطرت پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے اور چونکہ وہ اپنی فطرت کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی، اس لئے ان کے لیے نہ خارجی طور پر ہدایتِ خداوندی کی ضرورت ہے نہ ہادیانِ طریقت (انبیاءؑ و رسلؑ) کی بعثت کی حاجت۔ بکریوں کو کوئی رسول آکر نہیں بتاتا کہ تمہارے لئے گھاس حلال ہے اور گوشت حرام۔ یہ چیز ان کی فطرت میں داخل ہے جس کی وہ خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتیں۔ جس خصوصیت کی خلاف ورزی کی جا سکے اُسے فطرت کہا ہی نہیں جا سکتا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جس نوع کی کوئی فطرت ہو، اس کے تمام افراد اُس فطرت کے مطابق چلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس نوع کے افراد میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو ایسا پیدا کر دیتے کہ ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ہماری مشیت کے خلاف تھا۔ سورۃ ھود میں ہے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (۱۱/۱۱۸) "اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا تو وہ تمام نوعِ انسان کو ایک گروہ کی طرح پیدا کر دیتا اور وہ آپس میں اختلاف نہ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا یہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلافات ہدایتِ خداوندی کی رو سے مٹ سکتے ہیں"۔ دوسری جگہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹)۔ "اگر مشیتِ خداوندی میں ایسا ہوتا تو کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان ایک ہی راستہ پر چلتے لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اے رسول! کیا تو... انسانوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کرلیں"؟ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں، جس پر چلنے کے لئے اُسے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔ ہر انسانی بچہ، ایک صاف اور سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے جس پر وہ جس قسم کے نقوش مرتسم کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ———

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ ؛ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

——— وحیٔ خداوندی کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اُس سلیٹ (اپنی ذات) پر اپنے اختیار و ارادہ سے، وحی کی راہنمائی میں صحیح خطوط و نقوش مرتسم کرلے۔ (ERICH FROMM) اپنی اس کتاب میں، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، لکھتا ہے:-

اب علم الانسان کے ماہرین کی اکثریت نے یہ انکشاف کیا ہے کہ انسان ایک قرطاسِ ابیض

(سفید کاغذ) بلکہ پیدا ہوتا ہے جس پر ہر کلچر اپنا متن تحریر کر دیتا ہے۔ (ص ۲۴۷)

خیر و شر کی تمیز

یہیں سے ہم ایک اور غلط فہمی کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ بھی ہے کہ خیر و شر کی تمیز خود انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ عقیدہ بھی بالبداہت باطل اور قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر ہوتی تو اُسے وحی کی راہنمائی کی قطعاً ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ خیر و شر کی تمیز بکریوں کے اندر ہے، شیروں کے اندر ہے۔ جو چیز ان کے لئے شر (موجبِ نقصان) ہے، وہ کبھی اس کی طرف رخ نہیں کرتے۔ اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اور اس کے لئے انہیں کسی خارجی ہدایت یا تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر اس قسم کی صلاحیت انسان کے اندر ہوتی تو اُسے بھی وحی کی ہدایت کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ اس غلط عقیدہ کے لئے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کا سہارا لیا جاتا ہے، جس کے ایک گوشے کو ہم پہلے بھی سامنے لا چکے ہیں۔ یعنی سورۃ الشمس کی یہ آیت کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۹۱/۸)۔ "خدا نے فسق و فجور اور تقویٰ کو نفس انسانی میں الہام کر دیا"[1] اور مطلب اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ گناہ اور ثواب کے کاموں کی تمیز خود نفسِ انسانی کو الہام کر دی گئی ہے۔ جو کچھ "فطرتِ انسانی" کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں اس عقیدہ کے ابطال کے لئے کسی دلیل اور سند کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ انسانی میں دونوں امکانات (POSSIBILITIES) اور صلاحیتیں رکھدی گئی ہیں۔ یعنی اگر وہ چاہے تو غلط روش اختیار کر کے منتشر (DIS-INTEGRATE) ہو جائے۔ اور چاہے تو صحیح روش اختیار کر کے اس سے بچ جائے (فَجَرَ کے معنی پھٹ جانا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے) اور آیہ زیر نظر میں "فجورہا" اور "تقوٰہا" کی ضمیر (ھا) اس کی طرف واضح اشارہ ہے — یعنی انسانی نفس کا فجور اور تقویٰ اس کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ان دونوں ممکنات کی حامل ہے۔

---

[1] ہمارے ہاں کشف و الہام کے الفاظ بھی عام ہیں جن سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ خدا اپنے برگزیدہ بندوں (اولیاء اللہ یا صوفیاء) کو بذریعہ الہام، براہ راست علم عطا کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی قرآن کے خلاف اور ختمِ نبوت کے منافی ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا ذریعہ فقط ایک تھا جسے وحی کہکر پکارا گیا ہے اور وحی کا سلسلہ حضورؐ رسالتماب پر ختم ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد اول زیر آیت (۵/۱)، (۲/۵) گفتگو ہو چکی ہے۔

اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیت (۷/۱۷۲) پیش کی جاتی ہے، یعنی یہ آیت :-

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (۷/۱۷۲)۔

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ "ہستی باری تعالیٰ کا اقرار ہر انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے"۔ یہ عقیدہ بھی بالبداہت غلط ہے۔ اس آیت کے صحیح مفہوم کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (زیر آیت ۲/۲۹۳ میں) تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیجئے۔

حملِ امانت

ایک اور غلط فہمی سورۃ احزاب کی آیت (۳۳/۷۲) کے غلط مفہوم سے پیدا کی جاتی ہے۔ آیت حسب ذیل ہے :-

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۖ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔ (۳۳/۷۲)۔

اس کا ترجمہ حسب ذیل کیا جاتا ہے :-

ہم نے اپنی امانت زمین اور آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، لیکن انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس ذمہ داری سے ڈر گئے، لیکن انسان نے اُسے اُٹھا لیا۔ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔

"امانت سے کیا مراد ہے"؟ اسے تو ہم ذرا آگے چل کر واضح کریں گے۔ یہاں اتنی بات دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کو اُٹھانے کے لئے زمین، آسمان اور پہاڑوں سے کہا اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آپ غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر باطل ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق تو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح طور پر کہدیا ہے کہ وہ سب احکامِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶/۴۹)۔ ان میں سے کسی میں مجالِ سرکشی نہیں، یارائے انکار نہیں۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) لہٰذا یہ سمجھنا کہ انہوں نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت سے انکار کر دیا، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

اب اس سے آگے بڑھیئے۔ خدا نے اپنی امانت کو زمین، آسمان، پہاڑوں کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی کس قدر سبکی ہوئی ہو گی؟ اسی احساس کے ماتحت انسان آگے بڑھا اور کہا کہ لائیے! اسے میں اٹھائے لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی اس پیشکش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے شاباش ملنی چاہیئے تھی۔ لیکن اس کی بجائے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل تھا۔ آپ دیکھئے کہ اس سے خدا کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے!!

یہ ساری ٹیڑھی دیوار "حمل امانت" کے غلط مفہوم کی بنیاد پر اُٹھائی گئی ہے۔ ان الفاظ کے معنے لئے جاتے ہیں: "امانت کا اٹھانا"۔ حالانکہ عربی لغت کی رُو سے "حمل امانت" کے معنی ہیں "امانت میں خیانت کرنا"۔[1] ان معانی کی رُو سے اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اشیائے کائنات کے ذمے کچھ فرائض عائد کئے تو وہ نہایت دیانتداری سے بے چون و چرا انہیں ادا کرتے گئے۔ انہوں نے اس امانت میں کوئی خیانت نہ کی۔ وہ ایسا کرنے سے خائف رہتے ہیں (۱۶/۵۰)۔ لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ جو فرائض اس کے ذمے عائد کئے گئے ہیں، یہ ان کی بجا آوری میں خیانت کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا کرنے میں کسی اور کا کچھ نہیں بگڑتا، خود اسی کا نقصان ہوتا ہے —— یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر ظلم اور زیادتی کرتا ہے"۔ (اس سلسلہ میں آیات ۲۴/۴۱ و ۴۱/۱۱ و ۱۳/۱۵ بھی ملاحظہ کیجئے)۔

دیگر انسانی خصوصیات

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اختیار و ارادہ کی قوت یا صلاحیت انسان اور دیگر حیوانات میں خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور صلاحیتیں بھی ہیں جو اسے دیگر حیوانات سے متمیز اور ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً قوتِ گویائی (عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵/۴))۔ تحریر کی صلاحیت۔ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴))۔ حصولِ علم کی استعداد۔ (عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶/۵))۔ انسان میں یہ صلاحیتیں مضمر طور پر رکھ دی گئی ہیں۔ جنہیں وہ اپنی محنت اور کاوش سے بروئے کار لائے گا۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ ہی عالم و فاضل اور صاحبِ قلم و لسان ہوتا ہے، وہ تو بالکل کورا ہوتا ہے۔ البتہ اس میں ایسا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے جس کے لئے محنت اور کاوش درکار ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے میری "لغات القرآن"۔

لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ "انسان وہی کچھ حاصل کر سکتا ہے جس کے لئے وہ محنت کرے"۔

اشرف المخلوقات

ہمارے ہاں انسان کو، اشرف المخلوقات بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کرۂ ارض پر جو مخلوق محسوس طور پر نظر آتی ہے، اس کے مقابلہ میں یہ واقعی اشرف ہے لیکن خدا کی مخلوق کرۂ ارض تک ہی تو محدود نہیں، نہ معلوم خدا کی اس ناپیدا کنار کائنات میں اور بھی کس کس قسم کی مخلوق موجود ہے جس کی ہمیں ہنوز کچھ واقفیت نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے انسان کے متعلق کہا ہے: وَ فَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق سے افضل پیدا کیا ہے"۔ خدا نے "اکثر مخلوق سے افضل" کہا ہے۔ "تمام مخلوق سے افضل" نہیں۔ اس لئے یہ ..... اشرف المخلوقات نہیں کہلا سکتا۔ قرآن کریم میں تو یہاں تک بھی آیا ہے: لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۴۰/۵۷)۔ "ارض و سما کی تخلیق انسانی تخلیق کے مقابلہ میں کہیں بڑی تھی۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے"۔ اس حقیقت کی تفسیر کوئی بلند پایہ سائنسدان، یا سائنسدانوں کی جماعت پیش کر سکتی ہے۔ سطحی طور پر تو ہمارا خیال اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسانی تخلیق کے سلسلہ میں قرآن نے کہا ہے کہ وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ (۳۲/۷)۔ "انسان کی پیدائش کا آغاز بے جان مادہ سے ہوا"۔ لیکن بے جان مادہ کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس طرح وجود میں آگیا۔

اِنسان اور بشر دو ایک ضمنی گوشے اور بھی۔ قرآن کریم نے انسان اور بشر کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر میں پہلے کہا: وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ (۱۵/۲۶)۔ اور پھر اسی کو اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا (۱۵/۲۸)؛ (۱۵/۳۳) بھی کہا۔

قرآن کریم میں "جن و انس"، کے الفاظ بھی اکٹھے آتے ہیں۔ (مثلاً ۶/۱۳۱؛ دیگر مقامات) انسانی آبادیاں، قدیم الایام سے دو حصوں میں منقسم چلی آرہی ہیں۔ ایک آبادی وہ جو شہری یا تمدنی زندگی بسر کرتی ہے اور دوسری وہ، جو

جن و انس جنگلوں، صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی طرح رہتی ہے۔ اب تو اس ثانی الذکر آبادی کی تعداد گھٹتی چلی جا رہی ہے اور مواصلات کے عام ہو جانے سے ان میں باہمی میل جول بھی بڑھ رہا ہے۔ لیکن، پہلے

یہ آبادی بڑی کثیر التعداد ہوتی تھی اور رسوم و رواج اور بود و ماند کے طور طریقوں میں شہری آبادی سے بالکل مختلف۔ عربوں کے ہاں یہ دونوں آبادیاں خصوصیت سے ایک دوسرے سے متمیز تھیں اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے، رسوم و عادات، معاشرتی و معاشی انداز بالکل جداگانہ۔ ان کے ہاں اَلْاِنْسُ اس قبیلہ کو کہتے تھے، جو کسی ایک جگہ مقیم ہو یعنی شہری آبادی اور اَلْجِنُّ ان لوگوں کو، جو ان شہریوں کی نگاہوں سے اوجھل (دور) صحرا نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ دونوں گروہ انسانوں ہی پر مشتمل تھے۔ انہی کو قرآن کریم نے "جن و انس" کہکر پکارا ہے۔

النّاس قرآنِ کریم میں 'النّاس' کا لفظ نوعِ انسانی کے لئے آیا ہے۔ جیسے كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳ ؛ ۱۰/۱۹)۔ ان آیات میں قرآن نے نوعِ انسان کو امتِ واحدہ (ایک عالمگیر برادری) کہکر پکارا ہے۔ اور اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا ہے کہ جس طرح تمہارا آغاز ایک وحدت کی شکل میں تھا اسی طرح تمہاری نشاۃ ثانیہ بھی وحدت کا انداز لئے ہوگی۔ سورۃ لقمٰن میں ہے : مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸)۔ "تمہاری تخلیق اور بعثت نفسِ واحدہ کی طرح ہے"۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ کسی انسان کو اس زمین پر دوام اور بقا حاصل نہیں۔ طبیعی موت ہر ایک کے لئے ہے۔ (۲۱/۳۵ ؛ ۲۹/۵۷)۔

ابلیس

اب ہم اپنے اس تحقیقاتی سفر کی مشکل ترین وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ چنگیز اور ہلاکو بھی انسان تھے جن کی وحشت، درندگی، خونخواریت، ظلم اور تشدد کے تصور سے آج بھی روح کانپ اُٹھتی ہے۔ دوسری طرف حاتم طائی بھی انسان تھا جس نے اپنی ساری عمر نوعِ انسان کی بے مزد و معاوضہ خدمت اور غمگساری میں گزار دی۔ سوال یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں یہ "بُعد المشرقین" کیسا ؟ اس سے ظاہر ہے کہ نہ تو ظلم اور تشدد ہی انسان کی فطرت میں داخل ہے —— ایسا ہوتا تو انسان حاتم طائی کیسے بن سکتا تھا! —— اور نہ ہی ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ اس کی فطرت ہے۔ کیونکہ اس صورت میں انسان ہلاکو اور چنگیز کیسے بن سکتا تھا —— یہاں سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر انسان میں اس قسم کی خوں ریزی اور قصابیت کہاں سے آتی ہے، اور دل سوز گدازیت کہاں سے ؟ اس سوال نے صدیوں سے انسان کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے اور "مذہب" اِن الجھنوں میں مزید اضافہ کا موجب

بنتا چلا آرہا ہے۔

(محرف) عیسائیت نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے ساتھ، اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ اور اس آلائش کو دور کر دینا اس کے بس کی بات نہیں۔

عیسائیت کا نظریہ

اس کے معنی یہ ہوئے کہ گناہ یا شر (EVIL) انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ اس باب میں مجبورِ محض ہے۔ اس خود پیدا کردہ مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ صلیب پر اپنی جان دیکر انسانوں کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ (ہم اس وقت عیسائیت کے صرف یہ عقائد بیان کر رہے ہیں۔ ان پر تبصرہ اور تنقید سرِ دست مقصود نہیں اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ان عقائد کا بودا پن ایسا واضح ہے جس کے لئے کسی تبصرہ اور تنقید کی ضرورت ہی نہیں)۔ "گناہِ اول" کے عقیدہ کے بعد خود ان کے ہاں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ تو اپنے اولیں ماں باپ (آدم اور حوّا) کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے، لیکن خود آدم اور حوّا نے یہ گناہ کیسے کیا؟ وہ جب "پیدا ہی نہیں ہوتے تھے" تو وہ اس گناہ کے مرتکب کس طرح ہوئے؟ اس کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے، اور شیطان کا تصور انہوں نے ایسا دیا گویا وہ خارج میں کوئی مستقل بالذات شخصیت ہے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ "گناہِ اول" کے عقیدہ نے جبریت (DETERMINISM) کا نظریہ پیدا کیا۔ مذہب کی گرفت کس قدر محکم اور انسانی قلب کی گہرائیوں تک پہنچی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یورپ میں ایسے ایسے محققین اور سائنسدان پیدا ہوئے جنہوں نے "انسان" کے متعلق بڑی وسیع اور گہری ریسرچ کی۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو عیسائیت تو ایک طرف، خدا تک کے بھی منکر تھے، لیکن عیسائیت کے پیدا کردہ عقیدۂ جبریت کی محکمیت کا یہ عالم تھا، اور وہ اس طرح ان کے تحت الشعور میں داخل ہو چکی تھی کہ وہ اپنی ہر ریسرچ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد نہیں، مجبور ہے۔ لیکن صداقت اپنے آپ کو منوائے بغیر نہیں رہتی۔ ہمارے زمانے میں علم انسانی نے جو محیر العقول ترقی کی ہے، وہ عیسائیت کے اس باطل عقیدہ اور سابقہ محققین کے جبریت کے غلط تصور کی تردید کرتی چلی جا رہی ہے۔ ذیل میں مختصر الفاظ میں، ان دونوں گوشوں کی، سرسری سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک ان غلط نظریات کی تردید کا تعلق ہے، میں نے مناسب سمجھا ہے کہ (ERICH FROMM) کی اس کتاب کے حوالہ سے بات کروں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ وہ اس ریسرچ میں تازہ ترین (LATEST) بھی ہے اور مختلف محققین کی فکر کی مہیمن بھی۔ عیسائیت کے عقیدۂ "اولین گناہ" کے متعلق (ERICH FROMM) لکھتا ہے کہ اس

عقیدہ کو فروغ اس لئے ہوا کہ اس نے انسان کے ہر جرم کے لئے وجہ جواز مہیا کر دی اور مجرمین نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا (یعنی وہ خود فریبی کا شکار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے) کہ ہم تو مجبورِ محض ہیں۔ جرم، انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر ودیعت کر کے رکھدیا گیا۔ اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ ارتکابِ جرم کے خلاف احساسِ ندامت تک ختم ہو گیا بلکہ یہ مایوسانہ تصور بھی عام ہو گیا کہ انسان کی کسی کوشش سے بدکرداری کی اصلاح ممکن ہی نہیں، لیکن:-

اس کی تردید

> اس طرح کی مایوسی کا عام کرنا بھی ایسا ہی ہلاکت انگیز ہے جس طرح کسی اور باطل کا عام کرنا۔ یہ الجھنیں بھی پیدا کرتا ہے اور حوصلہ شکنی بھی۔ اس قسم کے خلافِ عقل عقائد کا پھیلانا اور پھر ان کے پیدا کردہ نقصانات کی تلافی کے لئے "جھوٹے مسیحوں" کی آمد کا عقیدہ وضع کرنا کچھ کم ہلاکت آفریں نہیں۔ یہ عقائد پہلے انسان کو جرم اور گناہ کی ترغیب دلاتے ہیں اور پھر اُسے مفلوج بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ (ص ۴۸۴)

اب آیئے مغربی محققین کی اس ریسرچ کی طرف، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان، حیوان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ طبیعی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا جو خصوصیات، حیوانات میں جبلّی طور پر پائی جاتی ہیں، وہ خود انسان کے اندر موجود ہیں۔ اسے نظریۂ جبلّت (INSTINCTIVENESS) کہا جاتا ہے۔ سابقہ ماہرینِ علم النفس نے پہلے ان جبلتوں کو تین بنیادی شقوں میں تقسیم کیا، یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) — جذبۂ تغلب (SELF-AGGRESSION) اور — جذبۂ افزائشِ نسل (SELF — PROCREATION)۔ فرائڈ نے جذبۂ تحفظِ خویش اور جذبۂ تغلب کو یکجا کر کے ان تین شقوں کو دو میں بدل دیا۔ لیکن جذبۂ تغلب نے اپنی اہمیت برقرار رکھی کیونکہ دنیا میں فسادانگیزیوں اور خونریزیوں کا باعث اکثر و بیشتر یہی جذبہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے یہ شق مغربی محققین کی تحقیق اور بحث و نظر کا موضوع بنتی رہی[1]۔

لیکن حال کی تحقیق نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے۔ چنانچہ (ERICH FROMM) لکھتا ہے کہ جبلی جذبات بیشک انسان کے طبیعی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، لیکن انسان کے تقاضے طبیعی ہی

مغربی محققین کی ریسرچ

---

[1] اس باب میں (K-LORENZ) کی کتاب (ON AGGRESSION—1966) بڑی تفصیل کی حامل ہے۔ اور اس نے اس نظریہ کے عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

تو نہیں، ان سے آگے کچھ اور بھی ہیں، جن کا تعلق اس کی انسانی زندگی سے ہے۔ یہ تقاضے اس وقت پورے ہوتے ہیں، جب اس کے ان جبلی جذبات کو اس کے کیریکٹر کے سانچوں کا پابند کر دیا جائے (ص۲۶)۔ وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:

انسانیت کا جوہر اس کا کیریکٹر ہے، جسے وہ حیوانیت کے جبلی تقاضوں کے نعم البدل کے طور پر اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ (ص۲۸۵)

"حیوانی جبلت" سے ملتا جلتا، نسل کا عقیدہ ہے جس کی رُو سے مغرب کے ماہرین علم الحیات (ANTHROPOLOGISTS) نے کہا... کہ انسانی بچہ کے ذہنی نقوش، معتقدات و تصورات وغیرہ انفرادی نہیں، بلکہ نسلی (RACIAL) ہوتے ہیں۔ ہر فرد، کسی نہ کسی نسل سے متعلق ہوتا ہے۔ نسلی معتقدات و تصورات وراثتاً آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں اور انہی کے مجموعی اثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص و رجحانات ہوتے ہیں۔ نسلی امتیازات کا نظریہ بڑی تباہیوں کا موجب بنا کیونکہ اس سے انسانیت ایسے ٹکڑوں میں بٹ گئی جن کا متحد کرنا ناممکنات میں سے سمجھا گیا۔ غنیمت ہے کہ اب خدا خدا کر کے اس باطل نظریہ کی بھی تردید ہو چکی ہے۔ (مثلاً) پروفیسر (L. HOGBEN) اس باب میں رقمطراز ہے کہ:۔

تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کا بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

(THE NATURE OF LIVING MATTER)

"نسلیت" سے ملتا جلتا عقیدہ "وراثت (HEREDITY)" کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی بچہ کو اس کے ماں باپ کے معتقدات و تصورات بھی پیدائشی طور پر ملتے ہیں۔ اس عقیدہ کا مشہور مؤید، پروفیسر (N.S. JENNINGS) انسانی بچہ کی پیدائش کے مختلف مراحل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ رحم مادر میں جنین کی تشکیل قریب ایک ہزار موالید (GENES) سے ہوتی ہے۔

اور یہ معلوم ہے کہ ان ہزار موالید میں سے ہر ایک اپنی اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور الگ الگ فریضہ۔ چنانچہ اگر ان میں سے ایک بھی تلف یا تبدیل ہو جائے تو جنین کی شکل و صورت میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے اور خود اس انسان میں بھی، جس کی ابتدا اس جنین سے ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تبدیلی اس کی آنکھوں کی رنگت، ناک کی شکل یا قد و قامت پر اثر انداز ہو، اور اس کے ساتھ ہی اس کے

مزاج اور افتادِ طبیعت پر بھی۔ مزاج، ذہنیت، افتادِ طبیعت، شخصیت وغیرہ کا انحصار
مختلف طریقوں سے ان موالید پر ہے جن سے انسانی بچہ متشکل ہوتا ہے۔ ۱

لیکن اب اس نظریہ کی بھی تردید ہوتی جا رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ جو کچھ ہمیں وراثتاً ملتا ہے اُسے ماحول سے بدلا جاسکتا ہے، اور ماحول کو ہم اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں۔ ۲

یہاں سے انسانی فکر کا رخ، نظریۂ وراثت سے نظریۂ ماحول کی طرف مڑ گیا۔ اس نظریہ کی سب سے مشہور شاخ، نظریۂ عادات (BEHAVIOURISM) ہے، جسے ڈاکٹر واٹسن نے پیش کیا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ انسانی بچہ پیدائشی طور پر اپنے اندر کوئی خصوصیات یا تصورات لے کر نہیں آتا۔ اس میں، جس قسم کی عادات پیدا کر دی جائیں، وہی اس کے مختلف اعمال کی محرک بن جاتی ہیں، اور یہ عادات انمٹ ہوتی ہیں۔ اسی کی دوسری شاخ نظریۂ عمرانیت (SOCIOLOGY) ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی بچہ جس قسم کی سوسائٹی میں آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے، وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اٹھارہ ماہ کی عمر سے لے کر تین سال یا زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی عمر تک، انسان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ بن چکتا ہے۔ اور بچپن کے ان نقوش کا مٹانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس نظریہ نے ہمارے دور میں بڑی اہمیت اختیار کر لی، لیکن مزید تحقیق نے اسے بھی باطل قرار دیدیا۔ اس تحقیق کی رو سے یہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ بچہ پر ماحول کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے لیکن اسے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ اس کے یہ نقوش ایسے انمٹ اور محکم ہوتے ہیں کہ انہیں بعد میں بدلا ہی نہیں جاسکتا۔ اس باب میں مشہور محقق (B.F.SKINNER) نے بڑی وسیع تحقیق کی ہے جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بچپن کے بعد اگر مثبت محرکات محکم طور پر پیدا کر دیے جائیں تو ان سے ابتدائی ماحول کا تمام اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔ (ERICH FROMM) اگرچہ پروفیسر (SKINNER) کے بعض نتائج سے اختلاف کرتا ہے لیکن وہ اس باب میں اس سے متفق ہے کہ ماحول کے یہ اثرات مٹائے جاسکتے ہیں اور اس کا طریقہ انسان کے اندر کیریکٹر پیدا کرنا ہے۔ ۳

---

۱ ملاحظہ ہو پروفیسر مذکور کی کتاب (THE BIOLOGICAL BASIS OF HUMAN KNOWLEDGE) ان امور کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب ——— انسان نے کیا سوچا ——— کا باب "میکانیکی تصورِ حیات"۔

۲ دیکھئے (V.H. MOTTRAM) کی مشہور کتاب (THE PHYSICAL BASIS OF PERSONALITY)

۳ آپ نے غور فرمایا کہ محققینِ مغرب کی تحقیق کے نتائج کس طرح، خود بخود، قرآنی دعاوی کی دلیل اور ثبوت بنتے چلے جا رہے ہیں، یعنی انفس و آفاق میں آیاتِ خداوندی کی نقاب کشائی کس طرح حقائق کو سامنے لاتی چلی جا رہی ہے (۴۱/۵۳)۔

آپ نے غور فرمایا کہ نظریۂ جبلّت، نسلیت، وراثت، عادات، عمرانیت کے واضعین کس طرح غیر شعوری طور پر عیسائیت کے وضع کردہ نظریۂ جبریت سے متاثر ہو گئے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان اپنے معتقدات اور اعمال کے لئے آزاد نہیں ہوتا بلکہ وہ مجبور ہے۔ لیکن خود مغرب ہی کے محققین اب اس نظریہ پر پہنچے ہیں کہ جبریت کا عقیدہ اور نظریہ باطل اور ناقابلِ تسلیم ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے نہایت واضح الفاظ میں پیش کر دیا تھا۔ اس نے انسان کے متعلق جو کہا کہ اسے اختیار و ارادہ یا انتخاب کی صلاحیت دی گئی ہے تو اس ایک نکتہ نے ان تمام باطل تصورات کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ مجبور کے سامنے ایک ہی امکان (POSSIBILITY) ہوتی ہے، ایک سے زیادہ نہیں۔ بکری کے سامنے ایک ہی امکان ہے کہ وہ گھاس کھائے، گوشت نہ کھائے۔ اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ان دونوں (گھاس یا گوشت) میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ صاحبِ ارادہ اُسے کہا جاتا ہے جس کے سامنے دو امکانات (POSSIBILITIES) موجود ہوں اور اسے اس کا اختیار حاصل ہو کہ وہ ان میں سے جس امکان کو چاہے، اختیار کر لے۔ اس بنیادی تصور سے لازمی طور پر یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ (۱) پیدائشی طور پر انسان کوئی ایسا نقش لے کر نہیں آتا جو اَنمٹ ہو۔ ہر انسانی بچہ ایک سفید لوح لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور (۲) دنیا میں خیر و شر، غلط اور صحیح، تخریب و تعمیر کے امکانات ہر دوراہے پر موجود ہوتے ہیں اور یہ انسان کے اپنے فیصلے پر موقوف ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے، اختیار کرے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کے سامنے ان دو امکانات، اور ان میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے سے مراد کیا ہے؟ جیسا کہ واضح ہے، انسان کا جسم، حیوانات کی طرح، طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا ہے، لہٰذا اس کے جسمانی یا طبیعی تقاضے وہی ہیں جو دیگر حیوانات کے ہیں۔ انہیں جبلت یا (ANIMAL INSTINCTS) کہا جاتا ہے لیکن اِنسان صرف حیوان ہی نہیں وہ "انسان" بھی ہے۔ اور اس اعتبار سے اس کے انسانی تقاضے بھی ہیں۔ یہ بات ہم محض "عقیدۃً" کی سطح پر نہیں کہتے، عصرِ حاضر کے غیر مسلم محققین بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ مثلاً (ERICH FROMM) اس باب میں لکھتا ہے:-

> اِنسان کے طبیعی تقاضے اور محرکات ضروری ہیں، لیکن وہ مقابلۃً کم اہمیت رکھتے ہیں انسان کے وہ جذبات، جو اس کی توانائیوں کو اس کے نصب العین کی تلاش کے لئے مجتمع کر دیتے ہیں، زیادہ اہم ہیں۔ انہیں ہم عقیدت (DEVOTIONAL) یا مقدس (SACRED) کے نام سے پکار سکتے ہیں۔[1]

[1] یہ مفکر خدا اور وحی کا قائل نہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وہ، انسان کے انسانی (حیوانات سے بلند) تقاضوں کے لئے کس طرح اپنے آپ کو ان اصطلاحات کے اختیار کرنے پر مجبور پاتا ہے، جن کا تعلق وحی کی دنیا سے ہے۔ ان کے لئے اور الفاظ مل ہی نہیں سکتے۔

زندگی کے طبیعی تقاضے تو انسان کو صرف زندہ رکھتے ہیں۔ اس کے وہ جذبات جو عقیدت یا تقدس کے دائرے میں آتے ہیں، ان کا میدان اس کی طبیعی زندگی سے بہت آگے ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں انسان اپنی زندگی، بلکہ اپنی "قسمت" تک کو قربان کر دیتا ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس میں اس کے وہ محرکات پیوست ہوتے ہیں، جو اس کی زندگی کو درحقیقت زندہ رہنے کے قابل بنا دیتے ہیں (صفحہ ۲۹۸)۔

اس سے ذرا پہلے وہ لکھتا ہے کہ "یاد رکھیئے کہ انسان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کی تبدیلی ناممکن ہو، اور نہ ہی یہ حقیقت ہے کہ انسان خارجی اثرات سے محفوظ رہ ہی نہیں سکتا۔ ہمیں بد سے بدتر سوسائٹی میں بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو اپنے آپ کو ان اثرات سے ملوث نہیں ہونے دیتے۔ اور وہ بھی جن سے مناسب تعلیم و تربیت سے، یہ اثرات زائل ہو جاتے ہیں" (صـ ۲۹۷ فٹ نوٹ)۔ وہ اپنی دوسری کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے کہ:-

مریض انسانوں میں صحت یاب ہونے کی آرزو اس امر کی دلیل ہے کہ انسان مرض پر مطمئن نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی بد اندیشی، تساہل، تغافل یا جہالت کی بنا پر مرض میں مبتلا ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اُسے کہیں شفا کی کرن نظر آتی ہو تو وہ اس کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ ہم جو تجزیۂ نفس (PSYCHOANALYSIS) کی رو سے نفسیاتی امراض کا علاج کرتے ہیں تو اس میں کرتے صرف اتنا ہی ہیں کہ پہلے ان اثرات کا کھوج لگاتے ہیں جو اس کے تحت الشعور میں جاگزیں ہوتے ہیں اور جنہیں اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔[1] اس کے بعد ہم اس کے ان محرکات کو تقویت دیتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے علاج یا شفایاب ہونے کی ضرورت یاد دلائی تھی اور اس کے لئے اُسے آمادہ کیا تھا۔ اگر انسان کے اندر یہ جذبہ موجود نہ ہو —— یا مر چکا ہو —— تو ہم اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ اسے بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تنہا عقل انسانی اس مقصد کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ عقل انسانی مرض اور

---

[1] علم تجزیۂ نفس کی رُو سے، انسان کے وہ احساسات، جن کا وہ اظہار تو نہ کرے لیکن ان کی یاد اس کے حافظہ میں موجود رہے، (SUPPRESSED FEELINGS) کہلاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی یاد بھی محو ہو جائے تو وہ اس کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ انہیں (REPRESSED FEELINGS) کہا جاتا ہے۔

اور صحت کو پہچان تو سکتی ہے۔ انسان کے ان محرکاتِ خیر کو بیدار نہیں کر سکتی جو شر کے پیدا کردہ اثرات کا ازالہ کر سکیں (ص ۲۲۴-۲۲۳)۔

اس مفکر کے یہ آخری الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں جن سے وحی کی ضرورت پر بڑی گہری روشنی پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ نکتہ بسردست، ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم فی الحال اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔ یہ مفکر، اس علاج کے لئے ایک ایسے معاشرے کا وجود اور قیام لاینفک سمجھتا ہے جس میں وہ اقدار و نظریات زندہ اور بیدار ہوں جو انسان کے ان محرکات کو تقویت دے سکیں جو شر کے پیدا کردہ اثرات کو مٹا دیں (ANATOMY ص ۱۳)۔ وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ :-

انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی پوری نشوونما اور برومندی حاصل کرے بشرطیکہ جس معاشرہ میں وہ رہتا ہے اس کے حالات اس کیلئے ممد و معاون ہوں۔ (ANATOMY.. ص ۲۹۱)

اس وقت مختلف اقوام اور ممالک میں، جس قسم کے معاشرتی حالات کارفرما ہیں، ان کے پیشِ نظر وہ اس قسم کی تبدیلی کو بڑا دشوار قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے ناممکن نہیں کہتا۔ وہ انسان کے مستقبل سے ناامید نہیں۔ وہ کہتا ہے :-

ایسا تصور کرنا بالکل جائز ہوگا کہ انسان اپنی نشوونما کے امکانی دائرہ کو مکمل کرے گا اور ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے سے خائف نہ ہوگا۔ [1] نہ کوئی بچہ اپنے ماں باپ سے خائف ہو اور نہ کوئی ماں باپ اپنے بالادستوں سے نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقہ سے خائف ہو، نہ کوئی قوم اپنے سے زیادہ زورآور قوم سے خائف۔ اس مقصد کا حصول بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ موجودہ معاشی، سیاسی، ثقافتی اور نفسیاتی عوامل اس کے راستہ میں بہت بڑی رکاوٹیں بن کر کھڑے ہیں۔ علاوہ ازیں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا کی قومیں مختلف قسم کے باطل خداؤں کی پرستش کر رہی ہیں اور چونکہ ہر قوم کا خدا الگ ہے اس لئے وہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے کی زبان ضرور سمجھتے ہیں ..... لیکن اس سے ہمیں مایوس نہیں ہونا

---

[1] قرآن کریم نے اس مثالی معاشرہ کی خصوصیت یہی بتائی ہے تاکہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) "اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن"۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

چاہئے۔ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں، جو ان تمام موانعات پر قابو پا سکتی ہیں (ص ۴۸۵-۴۸۲)۔

ابلیس یا شیطان

اور یہاں سے ہم اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے قرآن کریم نے "ابلیس یا شیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور جو ہمارے اس موضوع کا سرنامہ ہے۔ لفظ ابلیس کا مادہ (ب ل س) ہے جس کے معنی مایوسی اور ناامیدی کے ہیں، اور لفظ شیطان کا مادہ (ش۔ط۔ن) جس کے معنی دور چلے جانے کے ہیں۔ یعنی حدود فراموشی۔ یہ لفظ سرکشی، مخالفت اور بیباکی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نیز اس کے معنی جل جانے اور بھڑک اٹھنے کے بھی ہیں۔ اسی شعلہ مزاجی کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی (۱۲/۷)۔ (شیطان اور ابلیس (جو کچھ بھی اس سے فی الحقیقت مفہوم ہے) کے لئے یہ دو الفاظ کیوں آئے ہیں، اس کی تشریح آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

"مذہب" نے شیطان کو انسان سے الگ، ایک جداگانہ اور خارجی ہستی قرار دیا جو انسان کو برائی پر اکساتا ہے[۱]۔ عیسائیت نے اس تصور کو بڑی شد و مد سے پھیلایا۔ اس لئے کہ یہ اس کے پیش کردہ عقیدۂ جبریت کی تائید کرتا تھا۔ اور عام لوگوں نے اسے اس لئے قبول کر لیا کہ اس سے وہ اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھ سکتے تھے کہ گناہ یا جرم کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ اس کا ذمہ دار شیطان ہے۔ قرآن کریم نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی اور ابلیس یا شیطان کا ایسا تصور پیش کیا جس کی تائید علمی تحقیق سے ہوتی جا رہی ہے۔ قرآن نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بتایا اور اس کی وضاحت کی کہ جب یہ اپنے ارادہ کو غلط طور پر استعمال کرتا ہے تو اسے اس کا شیطانی فعل قرار دیا جاتا ہے اور جب یہ اسے صحیح طور پر استعمال کرتا ہے تو یہ اس کے شرفِ انسانیت کی دلیل ہوتا ہے۔ یعنی اس نے شیطنت کو خود انسان کا اپنا فعل قرار دیا۔ اور اس کے لئے خود اسی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں ہے کہ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (۷/۲۰)۔ یعنی "شیطان نے انہیں بہکایا" اور دوسری جگہ کہا کہ "ہم نے انسان کو پیدا کیا" وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (۵۰/۱۶)۔ "اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کس طرح بہکاتا ہے"۔ آپ دیکھئے کہ یہاں بہکانے کے فعل کو ایک جگہ شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسری جگہ اُسے خود انسان کا اپنا فعل

---

[۱] مجوسیت ایک قدم آگے بڑھی اور اس نے خیر اور شر کے لئے دو الگ الگ خدا تراش لئے۔ خیر کا خدا یزداں، اور شر کا خدا اہرمن۔ ان دونوں میں ابدی طور پر کشمکش جاری ہے۔ اس عقیدہ کو ثنویت (DUALISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

قرار دیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انسان کو کچھ جذبات دیئے گئے ہیں جن کے تقاضوں کے پورا کرنے سے اس کی زندگی برقرار رہتی ہے۔ لہٰذا ان جذبات کی تسکین خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ مادی تصورِ حیات کی رو سے ان تقاضوں کو (حیوانات کی طرح) جس طرح جی چاہے، پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآنی تصورِ حیات کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان تقاضوں کو ان پابندیوں کے دائرے کے اندر رہ کر پورا کیا جائے جنہیں مستقل اقدارِ خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً افزائشِ نسل کے لئے جنسی جذبات کی تسکین ضروری ہے۔ ایک شخص ان کی تسکین اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط سے کرتا ہے، دوسرا ان کی تسکین کسی پاک دامن، شریف النفس لڑکی کی عصمت دری کے ذریعہ۔ جذبات کی تسکین دونوں صورتوں میں ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک طریق اپنے اندر خیر کا پہلو لئے ہوتے ہے اور دوسرا طریق شر کا۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے جذبات کو سرکش اور بیباک نہ رکھو۔ بلکہ ان کی تسکین اقدارِ خداوندی کی راہنمائی میں کرو[1]۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۴۵/۲۳) "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ الٰہ کے معنی ہوتے ہیں وہ قوت جس کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کی جائے۔ اور دوسری جگہ کہا کہ: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) "اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جس نے اپنے جذبات کی تسکین، ہدایتِ خداوندی سے الگ ہٹ کر کی"۔ یعنی قرآن کریم کی رُو سے جذبات کی تسکین کوئی برا فعل نہیں۔ ہدایتِ خداوندی سے سرکشی برت کر ان کا پورا کرنا شر، جرم یا گناہ ہے۔ اسے اس نے شیطانی فعل کہہ کر پکارا ہے اور تاکیداً کہا ہے کہ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۔۔۔۔ اَعْبُدُوْنِىْ (۳۶/۶۰-۶۱) "شیطان کی عبودیت (محکومیت) مت اختیار کرو، خدا کی معبودیت اختیار کرو"۔

ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کی رو سے شیطان یا ابلیس کوئی موجود فی الخارج ہستی یا شخصیت نہیں یہ خود انسان کے اپنے ہی فیصلوں کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ÷ ضمیرش سرد و بے ہنگام دیدند
بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود ÷ ترا از آتشِ ما آفریدند

یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر قصۂ آدم میں دیکھیں گے) انسان اور شیطان بیک وقت زندگی کی اسٹیج پر سامنے آتے ہیں اور شیطان کو انسان کے آخری لمحاتِ زندگی تک مہلت دیدی گئی ہے۔ گویا انسان او شیطان کا چولی دامن کا ساتھ

---

[1] ان امور کی تفصیل ـــــ مطالب الفرقان۔ جلد اول میں آیات (۱/۱ ؛ ۲/۱ ؛ ۲/۴) میں گزر چکی ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لی جائے۔

ہے (ملاحظہ ہوں آیات ۷/۱۴ ؛ ۱۵/۳۶ ؛ ۱۷/۶۲ ؛ ۳۸/۷۹ — تفصیل آدم کے عنوان میں ملے گی۔)

شیطان، چونکہ انسانی ارادوں یا جذبات ہی کا دوسرا نام ہے جو محسوس طور پر نظر نہیں آسکتے، اس لئے شیطان کے متعلق کہا کہ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷/۲۷)۔ "وہ اور اس کے ہم قبیلہ تمہیں ایسے مقامات سے دیکھتے ہیں جہاں تم انہیں نہیں دیکھ سکتے"۔ اور اسی جہت سے دوسری جگہ کہا: كَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰)۔ "وہ ان قوتوں میں سے ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں"۔

چونکہ انسانی ارادے اور ان کے فیصلے کثیر التعداد ہوتے ہیں اور مختلف قسم کے پیکروں میں ان کی نمود ہوتی ہے، اس لئے یہاں، جنہیں شیطان کے ہم قبیلہ کہا ہے، دیگر مقامات پر انہیں "جنود ابلیس"، ابلیس کا لاؤ لشکر یعنی ابلیس کے متبعین کہہ کر پکارا گیا ہے (دیکھئے ۷/۱۸ ؛ ۱۵/۴۲ ؛ ۲۶/۹۵ ؛ ۳۸/۸۵)۔ چونکہ ہر انسان کا اپنا اپنا "شیطان" ہوتا ہے اس لئے جب مختلف انسانوں کے شرانگیز اعمال اور تخریب کاریوں کا ذکر کیا گیا تو اُسے شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۶/۱۱۲) کہہ کر پکارا گیا۔ کہیں انہیں اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷/۲۷) سے تعبیر کیا گیا۔ اور مجموعی طور پر انہیں حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (۵۸/۱۹) یعنی شیطان کی پارٹی قرار دیا گیا، جس کے مقابلہ میں حِزْبُ اللّٰهِ آیا ہے (۵۸/۲۲) جس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے جذبات کی تسکین قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔ حزب الشیطان، یعنی شیطانی پارٹی کے سرغنوں کو بھی شیاطین کہا گیا ہے (دیکھئے ۲/۱۴)۔ حتّٰی کہ ان سرکش قبائل کو بھی جنہیں حضرتِ سلیمانؑ نے اپنے احکام کی زنجیروں کا پابند کر کے انہیں بڑے بڑے کاموں پر لگا یا تھا (۲۱/۸۲)۔ یعنی اگر انہیں ان پابندیوں سے آزاد کر دیا جاتا تو وہ ہر قسم کی سرکشی اور بغاوت پر اُتر آتے۔

حزب الشیطان میں وہ اقوامِ غالب بھی شامل ہیں جو خود بھی اقتدارِ خداوندی سے سرکشی برتتی ہیں اور اپنی مغلوب اقوام کو بھی انہی غلط راہوں پر چلاتی رہتی ہیں۔ اس کے لئے وہ کس قسم کے حربے استعمال کرتی ہیں، انہیں قرآن کریم نے (قصۂ ابلیس و آدم) میں بڑے لطیف اور دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ ابلیس نے خدا سے کہا کہ تو اس آدم (آدمی) کو دنیا میں بھیج۔ اور پھر دیکھ کہ میں اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ اس کے لئے وہ جو طریق اور ذرائع استعمال کرے گا ان کے متعلق کہا گیا: وَاسْتَفْزِزْ ... بِصَوْتِكَ. وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ. وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ (۱۷/۶۴)۔ "کبھی اس پر پروپیگنڈہ کے ذریعے، جسے آلاتِ ابلاغ کی مدد سے عام کیا جائیگا (مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ) کہیں ان کے خلاف "پولیس ایکشن" کیا جائے گا اور قوت کے بل بوتے پر انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلایا جائے گا۔ کہیں اقتصادی امداد سے انہیں سیاسی محکومیت کے شکنجوں میں جکڑا جائے گا۔ اور کہیں ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے گی کہ وہ انہی سرکش جذبات کو لئے ہوئے پروان چڑھے۔ کہیں انہیں دلکش وعدوں سے بہلایا جائے گا"۔ یہ ہیں اقوامِ غالب کے وہ حربے جنہیں ابلیسی ہتھکنڈوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کی اپنی بیباک خواہشاتِ نفس ہوں یا اقوامِ غالب کے اس قسم کے حربے، ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انسان کے غلط اعمال کو نہایت دلکش، جاذب اور مزین بنا کر دکھاتے ہیں (ملاحظہ ہوں آیات 6/43؛ 8/48؛ 16/63)۔ اگر برائی برائی بن کر سامنے آئے تو انسان اس سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اگر جھوٹ بولنے والا اپنے جھوٹ سے فریقِ مقابل کو اپنا ہمنوا بنا لے اور اُسے اپنی مقصد براری کا آلۂ کار بننے کے لئے آمادہ بھی کرلے، لیکن آخر میں کہدے کہ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے، وہ سب جھوٹ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ وہ اس کے لئے اسی صورت میں تیار ہوگا کہ اُسے یقین پر یقین دلاتا چلا جائے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ ہے۔ ابلیسی وساوس کی سب سے بڑی صنعت گری یہ ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ کو سچ بنا کر دکھائے۔ انسان کے برے اعمال کے متعلق اُسے یقین دلادے کہ وہ نیک اعمال ہیں، ان میں کسی قسم کی برائی کی بات نہیں۔ ابلیس کا یہ حربہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ یوں تو اس کی جولانگاہ انسانی زندگی کا ہر گوشہ ہے، لیکن جہاں یہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ وہ "مذہب" کی دنیا ہے۔ "مذہب" میں انسان، سینکڑوں ہزاروں

غلط اعمال کو مزیّن کرکے دکھانا

ایسے کام کرتا ہے جو یا تو تخریب انگیز ہوتے ہیں یا بلانتیجہ رہ جانے والے۔ لیکن ابلیس ان لوگوں کو اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ یہ بڑے "ثواب" کے کام ہیں۔ ان سے احکامِ خداوندی کی تعمیل ہوتی ہے اور منشائے خداوندی کی تکمیل۔ ان سے تمہیں جنت مل جائے گی۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے ایک الگ کتاب کی نہیں، تو کم از کم الگ باب کی ضرورت ہے (اور اسے ہم اس کے مقام پر پیش بھی کریں گے)۔ لیکن یہاں ہم اس کی ایک آدھ مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ کہف میں ہے کہ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال انہیں سب سے زیادہ نقصان میں رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غلط کام کرتے ہیں وَهُمْ يَحْسَبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (18/104)۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی نیکیاں کما رہے ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں مصنوعی ہوتی ہیں، حقیقی نہیں ہوتیں"۔ نتیجہ اس کا یہ کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18/105)۔ "ان کے اعمال بالکل رائیگاں جاتے ہیں —— ایسے رائیگاں کہ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی"۔—— غور کیجئے! یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں، جنہوں نے کوئی کام نہیں کیا، جو بے عمل تھے۔ ذکر ان لوگوں کا ہے جنہوں نے بہت سے کام کئے۔ بڑی جگر پاش مشقتیں اٹھائیں، جانکاہ صعوبات برداشت کیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بڑے ثواب کے کام ہیں۔ لیکن چونکہ وہ فریب میں مبتلا تھے اس لئے ان کی ساری مشقتیں اور محنتیں رائیگاں گئیں۔ یہ ایسی ملمع شدہ نیکیاں تھیں کہ جب انہیں حقیقت کا ایک تاؤ دیا گیا تو ان کا اصلی کھوٹ ابھر کر سامنے آگیا۔ اس قسم کی مصنوعی نیکیوں کی ایک محسوس مثال بھی قرآن کریم نے دی ہے۔ اس نے الصلوٰۃ کے متعلق کہا ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (29/45)۔ "الصلوٰۃ"

مصنوعی صلوٰۃ

کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان اور معاشرہ ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکرداریوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا اور قانونِ خداوندی تمام انسان ساز قوانین پر غالب آجائے گا۔" اگر الصلوٰۃ کا یہ نتیجہ سامنے آتا ہے تو وہ حقیقی صلوٰۃ اور سچی نیکی ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو انسان ہزار نمازیں پڑھتا ہے، اس کا یہ عمل مبنی بر حقیقت قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹/۴۵)۔ "جس قسم کی تم مصنوعی نماز پڑھتے ہو اور اللہ کا ذکر کرتے ہو اس سے ہم خوب واقف ہیں۔ یہ سب اعمال بے نتیجہ ہیں۔ تمہاری صنعت گری ہے۔ میزانِ خداوندی میں ان کا پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں" اسی قسم کے نمازیوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱۰۷/۱)۔ "تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتے ہیں؟" یعنی یہ لوگ دین کے منکر نہیں۔ کافر اور غیر مسلم نہیں۔ یہ دین کا زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ اس کے ارکان کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن محض رسمی۔ یہ نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۴-۷)۔ "تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو نماز کے محسوس ومرئی ارکان کو (جو دوسروں کو نظر آجاتے ہیں) تو بڑے حزم و احتیاط سے ادا کرتے ہیں لیکن صلوٰۃ کے مقصد اور غایت سے بے خبر رہتے ہیں۔ نماز کی اس شدت کے ساتھ پابندی بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ رزق کے ان سرچشموں پر، جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ضرورت مند کیلئے یکساں طور پر کھلا اور رواں دواں رہنا چاہیے، بند باندھ دیتے ہیں کہ وہ انہی کے تصرف اور ملکیت میں رہیں اور دوسرے ضرورت مند ان سے مستفید نہ ہو سکیں۔" یہ ہے وہ صلوٰۃ۔ جسے "مَا تَصْنَعُوْنَ" (مصنوعی) کہہ کر تباہی کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

ضمناً۔ آج کل یہ بحث عام ہو رہی ہے کہ "قرآنی نماز" کون سی ہے اور اس کے لئے کہا یہ جا رہا ہے کہ قرآن کریم میں اتنے وقتوں کی نماز کا حکم ہے۔ ہر نماز میں اتنی رکعتیں اور ہر رکعت میں اتنے سجدے[1] اس نماز کو قرآنی صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور جو نمازیں دوسرے مسلمان پڑھتے ہیں وہ غیر قرآنی صلوٰۃ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ صلوٰۃ کا جو نتیجہ قرآن کریم نے بتایا ہے وہ نہ اس نماز سے حاصل ہوتا ہے نہ اس نماز سے۔ قرآنی صلوٰۃ وہ ہے جس سے معاشرہ سے بے حیائی اور بدکرداری ختم ہو جائے اور قانونِ خداوندی کی بالادستی قائم ہو۔ جس صلوٰۃ سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہو وہ قرآنی صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی۔ قرآن کی رُو سے "مَا تَصْنَعُوْنَ" کے ذیل میں آتی ہے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو ان بصیرت افروز اور عبرت آموز الفاظ میں نمایاں

---

[1] فرقہ اہل قرآن، جس کا ذکر مطالب الفرقان جلد اول میں آچکا ہے، اس نماز کو قرآنی صلوٰۃ کہہ کر پکارتا ہے۔

کیا ہے کہ: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ ...... (۲/۱۷۷)۔
نیکی (اور کشاد کی راہ) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بر و تقوٰی کی راہ یہ ہے کہ تم ایمان کے بعد کس ایثار اور حسنِ کردار کا مظاہرہ کرتے ہو۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے دعوئ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ انہی کو متقی کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اسی مقام پر رسمیات (FORMALISM) اور غرض و غایت کے فرق کو نمایاں کرکے بتا دیا ہے۔ مقصد، احکامِ خداوندی کی غرض و غایت کو پورا کرنا ہے جس کی پرکھ ان نتائج سے ہوتی ہے جن کی خود قرآن نے وضاحت کر دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دین کے عملی نظام میں احکام کے ارکان اور محسوس مظاہر بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں دین کی غایت اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، مقصود بالذات نہیں۔ لیکن "مذہب" میں یہی مظاہر، مقصد بن جاتے ہیں۔ اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ احکام کی غایت اور ان کی محض رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　٭　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　٭　　یہ مذہبِ ملّا و نباتات و جمادات

یہ ہیں وہ بے نتیجہ اعمال، جنہیں شیطان مزین بنا کر دکھاتا رہتا ہے ـــــ علامہ اقبالؒ نے ابلیس کے اس حربے کو اس نظم میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ ابلیس کی مجلس شوریٰ ـــــ اور جو ان کے آخری مجموعۂ کلام ـــــ ارمغانِ حجاز ـــــ کے حصۂ اردو میں شامل ہے۔ اس میں بات یوں چلی آرہی ہے کہ ابلیس کے مشیر اس سے کہتے ہیں کہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ زمانے کے تقاضوں سے یہ امتِ مسلمہ بیدار ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں ڈر یہ ہے کہ کہیں پھر سے نظامِ خداوندی کو قائم نہ کر دے جس سے ہمارا خاتمہ ہو جائے۔ ابلیس اُن سے کہتا ہے کہ تمہارا یہ احساس بالکل بجا ہے لیکن میں تمہیں ایک ایسا گُر بتاتا ہوں جس سے یہ امت کبھی بیدار نہیں ہوگی۔ وہ گُر یہ ہے کہ ان کے غلط اور مصنوعی اعمال کو ان کی نگاہوں میں ایسا حقیقی بنا کر دکھاؤ کہ یہ اس فریب میں گم رہیں اور ان نظریات و رسوم میں درمتشدد ہوتے چلے جائیں۔ تم انہیں ان مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ:-

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے　　٭　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے　　٭　　یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ان نظری مسائل میں اُلجھا کر:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　٭　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ :

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے ؍ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آپ اُمتِ مسلمہ کے احوال و کوائف پر غور فرمائیے اور پھر دیکھئے کہ ابلیس کا یہ حربہ کس قدر کامیاب ثابت ہو رہا ہے جس کی رو سے وہ اپنے غلط اور بے نتیجہ اعمال کو مزین بنا کر دکھاتا چلا آ رہا ہے۔ جب تک ہم اس فریبِ نفس میں مبتلا رہیں گے ہماری حالت کبھی سنور نہیں سکے گی —— یعنی دین کی طرف آنے کے لئے "مذہب" سے نجات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

احکام کے نتائج قرآن کریم نے ابلیس کے اس حربہ کو ناکام بنانے کے لئے کیا یہ کہ جہاں کوئی حکم دیا اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ (اسے کتاب و حکمت کہتے ہیں۔ یعنی احکام اور ان کی غرض و غایت)۔ اگر کسی حکمِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو خدا نے (اپنی کتاب میں) بتایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس حکم پر منشائے خداوندی کے مطابق عمل ہو رہا ہے (اسے دین کہا جائے گا) لیکن اگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو، یا وہ نتیجہ برآمد نہ ہو جو قرآن کریم نے بتایا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس حکم کی تعمیل منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہو رہی۔ اگر ہم اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے جو اس عمل کا قرآنی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا، بلکہ مطمئن ہو کر بیٹھے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ عین منشائے خداوندی کے مطابق ہے اور راسخ طریق پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں تو (قرآنی الفاظ میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمارے غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھا رہا ہے۔ اور ہم اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں (اسے مذہب کہا جاتا ہے) یہی وہ اعمال ہیں جن کا میزانِ خداوندی میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔

اور یہاں سے ہم ایک اہم نکتہ کی طرف آجاتے ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عیسائیت کے پھیلاتے ہوئے عقیدہ کی رُو سے انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ شیطان کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ دورِ حاضر کی علمی تحقیق نے اس عقیدہ اور جبریت کے نظریہ کو باطل قرار دیدیا ہے۔ اور اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسانی ذات میں اس امر کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ حیوانی جذبات کی بیباکیوں پر غالب آجائے۔ یہ وہ حقیقت کتنا اور انقلاب انگیز صداقت ہے جس کا اعلان، قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس پہلے کر دیا۔ اسے اس نے قصۂ ابلیس و آدم میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ابلیس چیلنج پر چیلنج دیتے چلا جاتا ہے کہ میں ابنِ آدم کو اس طرح گمراہ کردوں گا اور اس طرح تباہ کردوں گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب یوں ملتا ہے کہ تیری ان تمام سازشوں کے باوجود اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) "میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ و تسلط نہیں ہو سکے گا۔ جو

ابلیس پر غالب آنے کی صلاحیت میرے قوانین و اقدار کی محکومیت اختیار کریں گے تو اُن پر کبھی غالب نہیں آسکے گا۔"

اِس کا اعادہ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۵/۴۴ ؛ ۱۶/۶۵ ؛ ۳۸/۸۲)۔ ایک مقام پر اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ابلیس کی سازشیں کتنی ہی گہری اور اس کے حربے بظاہر کتنے ہی محکم کیوں نہ ہوں، وہ خدا کے مخلص بندوں کے سامنے "تارِ عنکبوت سے زیادہ مضبوط ثابت نہیں ہوں گے۔ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا (۴/۷۶)" شیطان کے مکر و فریب بڑے کمزور ہوتے ہیں۔"

نفسِ انسانی کی انہی صلاحیتوں کو قرآن کریم نے اس کی تین کیفیات سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ (۱۲/۵۳)۔ "یہ حقیقت ہے کہ انسان کا نفس اُسے بُرائی کے لئے اکساتا رہتا ہے لیکن اس سے وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو خدا کے سحابِ رحمت کے سائے تلے آجاتے ہیں"۔ یہ اگرچہ (قصہ حضرت یوسف ؑ میں) عزیزِ مصر کی بیوی کا قول ہے لیکن قرآن نے اس کی تردید نہیں کی اور جس انداز سے اس نے نفسِ انسانی کی وساوس انگیزیوں کا ذکر کیا ہے" اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خود انسان کے اپنے غلط فیصلے اُسے غلط راہیں اختیار کرنے کے لئے اکساتے رہتے ہیں۔ اسی کو نفسِ اَمّارہ کہا گیا ہے۔ اس کی دوسری حالت کو لَوَّامَۃ (۷۵/۲) کہکر پکارا گیا ہے۔ یہ انسانی ذات کی وہ کیفیت ہے جس میں اس کے اندر خیر و شر کی کشمکش بیدار ہوتی ہے۔ پہلے وہ ایک غلط فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ جب اُسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے ـــــ یاد رکھئے! احساسِ ندامت بھی انسان کی خصوصیت ہے۔ حیوانات میں ندامت کا جذبہ نہیں ہوتا۔ حیوانات کیا، جو بھی کسی روش پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہو، اس میں احساسِ ندامت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنے فیصلے کی غلطی کا احساس ہے جس سے ندامت کا جذبہ بیدار

نفسِ انسانی کی تین۳ کیفیتیں

ہوتا ہے۔ یہ بہرحال نفسِ انسانی کی کشمکش کی کیفیت ہے۔ اور جب اس کی خیر کی قوت، شر کی قوت پر غالب آجاتی ہے تو اُسے اس کشمکش سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اِسے قرآن کریم نے اَلنَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ (۸۹/۲۷) کہکر پکارا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے متوازن ذات (BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ لیکن یہ اطمینان وہ فریبِ نفس نہیں، جس میں شیطان غلط اعمال کو مزیّن بنا کر انسان کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ یہ اطمینان وہ ہے جو کسی مریض کو شفایاب ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تندرستی کا اطمینان اور ہے اور اسپرین کھا کر درد سے (بظاہر) چھٹکارا حاصل کر لینے کا اطمینان اور۔

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے نہ انسانی جذبات کو مذموم اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے۔ نہ ان کے فنا کرنے کا حکم دیا ہے ـــــ یہ جو ہمارے ہاں تصوف میں نفس کشی کو جہادِ اکبر قرار دیا جاتا ہے، یہ تصور خلافِ قرآن بھی ہے اور عملاً ناممکن بھی۔ انسانی جذبات کو فنا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اِنہیں (زیادہ سے زیادہ) دبایا جا سکتا ہے۔ اور ان کے دبانے سے انسان

ایسے نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے جن کے نتائج فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ انہیں دبا یا جائے تو یہ اپنی نمود اور کار فرمائی کے لئے غیر فطری راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے نفسیاتی اصطلاح میں بدنہادی یا (PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس قسم کے نفسیاتی عوارض اور اخلاق کا باہمی تعلق کیا ہے، اس کے متعلق علمائے نفسیات کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے (ERICH FROMM) لکھتا ہے:-

> نفسیاتی صحت اور نفسیاتی عوارض کا مسئلہ اخلاقیات کے ساتھ اسطرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نفسیاتی عارضہ کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کا مظہر (یا نمائندہ) ہوتا ہے۔ "ہیومن ازم" کے ضابطۂ اخلاق کی رو سے انسانی ذات کی تکمیل و محکمیت میں ناکامی، بجائے خویش اخلاقی ناکامی ہے۔ اس سے بھی زیادہ متعین الفاظ میں، نفسیاتی عوارض کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کے مظاہر ہوتے ہیں اور نفسیاتی علامات اخلاقی کشمکش کے حل نہ کرنے کا نتیجہ۔
>
> (MAN FOR HIMSELF P.224)

قرآن کریم نے منافقین کے متعلق جو کہا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲/۱۰)۔ "ان کے دلوں میں مرض ہوتا ہے"۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲/۱۰) "اور اس کی وجہ سے بڑے الم انگیز عذاب میں مبتلا رہتے ہیں" تو اس سے مذکورہ صدر حقیقت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ منافقت اخلاقی کمزوری ہے اور اس سے کئی قسم کے نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن میں ہے: وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹) "منافقین فریب نفس میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ شعوری طور پر انہیں اس کا علم نہیں ہوتا"۔ اس مرض کے حقیقی اسباب و علل ان کے تحت الشعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

آپ دیکھئے کہ "انفس و آفاق کی نشانیاں" کس طرح قرآنی حقائق کی صداقتوں کی شہادت بنتی چلی جا رہی ہیں۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسانی جذبات کی تسکین ضرور کی جانی چاہیئے، لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، جنہیں اقدار خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس باب میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک قول منسوب کیا جاتا ہے جو (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) واقعی حضور کا قول ہو سکتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے صحابہ نے عرض کیا کہ کیا حضورؐ کا بھی ابلیس ہے؟ ارشاد ہوا، ہاں میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر رکھا ہے۔

اِسی بصیرت افروز حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است ❖ زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی

اس مقام پر ہمارے سامنے برٹرینڈ رسّل کا ایک واقعہ آتا ہے۔ رسّل کا شمار عصرِ حاضر کے ممتاز ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بڑا متشدد دھریہ (ATHEIST) تھا۔ اور عیسائیت کے خلاف مجسم بغاوت۔ اس کی کتاب (WHY I AM NOT A CHRISTIAN) نے کلیسا کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بایں ہمہ، اس نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کی تیسری جلد میں (جو اس کی زندگی کے آخری دور ۱۹۴۴ —— ۱۹۶۹ کے حالات پر مشتمل ہے) اپنا ایک واقعہ لکھا ہے جو ہمارے زیرِ نظر موضوع کے اعتبار سے بڑا غور طلب اور عبرت آموز ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

میں اس سے پہلے کبھی یونان نہیں گیا تھا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی دلکش تھا۔ اس خطۂ زمین کی اُن محسوس کامرانیوں کے مظاہر کو دیکھنے کے بعد، جو ہر صاحبِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر لیتی ہیں، میں ایک چھوٹے سے گرجا کی طرف چلا گیا جو اُس زمانہ میں تعمیر ہوا تھا جب یونان (عیسائیت کا مذہب اختیار کرنے کے بعد) بازنطینی حکومت کا حصّہ بن چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس گرجا میں، میں غیر شعوری طور پر اپنے اندر ایک ایسی راحت اور سکون محسوس کر رہا تھا جو اس یونان کی عظیم عمارتوں میں نہیں محسوس ہوئی تھی جو اُن کے عہدِ اصنامیات کی یادگار تھے۔ اس سے مجھے محسوس ہوا کہ عیسائی زاویۂ نگاہ کی میرے قلب پر، میرے اندازہ و تصور سے کہیں زیادہ عمیق گرفت ہے۔ یہ گرفت میرے معتقدات پر نہیں تھی۔ میرے جذبات اور احساسات پر تھی۔ اس سے مجھے یہ دکھائی دیا کہ عہدِ پارینہ کا یونان، عصرِ حاضر سے جس باب میں مختلف (اور ممتاز) تھا وہ یہ تھا کہ انہیں (عیسائیت قبول کرنے سے پہلے) گناہ کا احساس نہیں تھا اور مجھے یہ محسوس کر کے بڑا ہی تعجب ہوا کہ احساسِ گناہ کے عقیدہ کا خود مجھ پر کس قدر گہرا اثر تھا۔ اگرچہ وہ اثر میرے نظریات اور معتقدات پر نہیں، میرے احساسات و جذبات پر تھا۔ (صفحہ ۸۲-۸۳)۔

برٹرینڈ رسّل جیسے انقلابی مفکر کی یہ کیفیت، تھی کہ وہ عمر بھر عیسائیت کے خلاف برہنہ شمشیر رہا۔ لیکن عیسائیت کے بنیادی عقیدہ (اوّلین گناہ) کا اثر کس طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا کہ وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک اس سے نجات حاصل نہ

کرسکا۔ وہ اس کے تحت الشعور میں جاگزیں رہا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابلیس کس طرح اعماقِ قلب میں گم رہتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ "ایمان باللہ" تک آنے کے لئے، پہلے "کفر بالطاغوت" ضروری ہے، (۲/۲۵۶) تو اس سے مراد یہی ہے کہ جب تک باطل عقائد و تصورات کو دل کی گہرائیوں سے دور نہ کیا جائے، انسان صداقت اور حقیقت پر ایمان نہیں لا سکتا۔ رسّل کے اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کے باطل عقائد کی گرفت کس قدر محکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب پرست قوم کا دین کی طرف آنا، ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہوتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اسلام جیسا مجسم صداقت دین اور حضور نبی اکرمؐ جیسے پیکرِ صداقت، اس دین کے پیش کرنے والے، لیکن بایں ہمہ مدینہ کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اسے قبول نہ کیا۔ یہ اس لئے کہ ان پر مذہب کی گرفت بڑی شدید تھی۔ ان کے برعکس، مکہ کے قریش اس کی آغوش میں آتے چلے گئے۔ اس لئے کہ وہ، اگرچہ بُت پرست تھے، لیکن کسی مصطلحہ مذہب کے پیرو نہیں تھے۔

اس سے ہمیں اس حقیقت کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی کہ آج کا مسلمان (بلکہ صدیوں پیشتر تک کا بھی) قرآن کی آواز کی طرف لبیک کیوں نہیں کہتا؟ ان کی "مذہب پرستی" ان کے راستے میں حائل ہے۔

یہ ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جذبات کو فنا نہیں کیا جا سکتا انہیں قرآنی احکام و اقدار کے تابع رکھا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا کہ شیطانی وساوس گھومتے گھماتے مؤمنین کے سامنے بھی آتے ہیں لیکن .... اس "لیکن" کیلئے قرآن کے الفاظ دیکھئے۔ فرمایا:-

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (۷/۲۰۱)۔

قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنیوالوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کہیں شیطان کا کوئی خیال گھومتے گھماتے ان کے دل میں آ جائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یوں ہو جاتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی آ گئی اور انہیں صاف صاف نظر آنے لگ گیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے[1] اس سے وہ ابلیس کی فریب کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی کا نام ابلیس کو مسلمان کرنا یا اُسے "قرآن کی شمشیر سے ذبح کرنا ہے"۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکے گا۔

شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے کہ قرآن کریم نے شیطان کے لئے، شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی وجہ، اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آرہی

---

[1] یہی وہ "برہان رب" تھی جو ایک نہایت نازک مرحلہ پر حضرت یوسفؑ کے سامنے آگئی تھی (۱۲/۲۴)۔

تھی لیکن اب علم النفس کے انکشافات نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔ علمائے علم النفس نے اب ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ جسے (FRUSTRATION—AGGRESSION THEORY) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات کی شدت میں صحیح قوانین سے سرکشی برت کر غلط قدم اٹھا لیتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کے نتائج و عواقب سامنے آتے ہیں تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے سرکشی اور مایوسی انسانی اقدام کے دو گوشے یا رُخ ہوتے ہیں جو باہدگر لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآن کریم نے اس کے لئے شیطان اور ابلیس کے الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ انسان کی کیفیت ہی یہ ہے: وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا (۱۷/۸۳)۔ "جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں تو قوانینِ خداوندی سے اعراض برتتا اور بے رخی اختیار کرتا ہے۔ اور جب اس کے اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں، حالات نامساعد ہو جاتے ہیں تو وہ پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے" ——— یہی شیطنت اور ابلیسیت ہے۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے "ابلیس" مایوسی کا مظہر ہے۔ اور شیطان سرکشی کا شعلۂ بیباک۔

اب ہم قصۂ ابلیس و آدم کی طرف آتے ہیں جس کی تمہید کے لئے اتنی تفصیلی گفتگو کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن اس کے لئے ابھی تھوڑے انتظار کی مزید زحمت برداشت کرنی ہوگی۔ تاکہ ہم پہلے ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لا سکیں جو اس داستان میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے لفظِ آدم کو لیجئے:۔

آدم

لغت کی رُو سے اُدْمَۃ کے معنی ہیں قرابت، موافقت اور مل جل کر رہنے کی صلاحیت۔ یہیں سے لفظِ آدم ہے۔ حکمائے یونان نے جو انسان کو مدنی الطبع حیوان (SOCIAL ANIMAL) قرار دیا تھا، تو آدم کا لفظ اس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسی آدم کی طرف نسبت سے عربی لفظ آدمیؑ ہے۔ عام بول چال میں اسی کو آدمی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں آدم یا بنی آدم کے الفاظ آتے ہیں، ان کی جگہ اگر آدمی کا لفظ رکھ دیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے ہمارے ہاں بھی، (محرف) تورات کے زیرِ اثر، عام مشہور یہی ہے کہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم، ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کی داستان ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ کسی فرد یا ایک جوڑے کی داستان نہیں، بلکہ یہ خود "آدمی" کی سرگزشت ہے جسے قرآنِ کریم نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی۔ یعنی قدیم قبائل کی شکل میں

قرآن کریم کی متعدد آیات ایسی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ آدم سے مُراد، انسان یا بشر ہے۔ اور قصۂ آدم کسی ایک جوڑے کی داستان نہیں بلکہ یہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے قرآن کریم نے بڑے لطیف اور دلکش محاکاتی (ڈرامائی) انداز سے بیان کیا ہے۔

یہ آدمی ہی کی سرگزشت ہے

سورۃ الحجر میں انسان کی تخلیق سے بات شروع کی گئی ہے (۱۵/۲۶) اور اس کے بعد کہا گیا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا (۱۵/۲۸)۔ "جب تیرے ربّ نے ملائکہ سے کہا کہ میں ایک بشر پیدا کر رہا ہوں"۔ اور اس کے بعد قصۂ آدم سامنے لایا گیا ہے، کہ کس طرح اُسے ملائکہ نے سجدہ اور ابلیس نے انکار کیا (۱۵/۲۸-۲۹)۔ اس سے اگلی آیات میں ہے کہ ابلیس نے کہا کہ مجھے اس "آدم" کی وجہ سے راندۂ درگاہ کیا جا رہا ہے لیکن آپ دیکھئے گا کہ میں کس طرح لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۵/۳۹)۔ "ان سب کو غلط راہوں پر ڈالتا ہوں"۔ یہاں هُمْ جمع کی ضمیر ہے جس کے معنی تمام انسان ہیں اور پھر لفظ "اجمعین" نے اس کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ ایک فرد (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کا قصہ نہیں، تمام نوعِ انسان کی داستان ہے۔ (نیز دیکھئے ۳۸/۷۱-۸۲)۔

سورۃ بقرۃ میں اس داستان کی ابتدا "آدم اور اس کی بیوی" سے ہوتی ہے۔ جن کے لئے عربی قاعدے کی رو سے تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا (۲/۳۵)۔ لیکن اس کی اگلی ہی آیت میں ہے: وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲/۳۶)۔ "ہم نے ان سب سے کہا کہ تم زندگی کی بلند سطح سے نیچے گر چکے ہو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں سے ایک، دوسرے کا دشمن ہوگا۔ تمہیں کچھ وقت کے لئے کرۂ ارض پر قیام کرنا ہوگا"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ آدم نے خدا سے کچھ ہدایات پائیں اور توبہ کی (۲/۳۷)۔ لیکن اس کے بعد پھر جمع کا صیغہ ہے اور اس میں "جَمِيْعًا" کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ "تمہاری طرف میری جانب سے ہدایت آتی رہے گی، جو ان ہدایات کا اتباع کریں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن"۔ بعینہٖ یہی اسلوب، آیات (۷/۱۹، ۷/۲۴) میں اختیار کیا گیا ہے اور اسی طرح کے صیغے وہاں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا دو آیات میں تو انسان یا بشر یا آدم کی تخلیق کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ یہ تذکرہ پوری نوعِ انسان کا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۷/۱۱)۔ "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی۔ پھر تمہیں ایک صورت عطا کی"۔ (ان میں "کُم"

جمع کا صیغہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد پوری کی پوری نوعِ انسان ہے)۔ اور اس کے بعد ہے کہ "ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو"۔ اس کے بعد پھر اس داستان کو دہرایا گیا ہے جس میں ابلیس کے انکار اور سرکشی کا ذکر ہے، اور ابلیس کے جواب میں جمع کے صیغے آتے ہیں۔ یعنی (لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ (۷/۱۶))۔ اور لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (۷/۱۷)۔ اِن آیات سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قصۂ آدم، بنی نوعِ انسان ہی کا قصہ ہے۔ بعض آیات میں اس کے لئے "بنی آدم" کے الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے کہ "اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے" (۷/۲۶)۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ (۷/۳۱)۔ "اے بنی آدم! اپنی زیبائش و زینت کا خیال رکھو" اور اس سے ذرا آگے ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵)۔ "اے بنی آدم! (یعنی نوعِ انسان) ہم تمہاری طرف اپنے رسول بھیجیں گے جو تم میں سے ہی ہوں گے۔ وہ تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کریں گے۔ جو لوگ ان قوانین کی نگہداشت کریں گے اور اپنی حالت کو سنوار لیں گے، انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا"۔ اس سے بھی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کے لئے بعض مقامات پر "ذُرِّیتِ آدم" کے الفاظ بھی آتے ہیں، مثلاً (۱۹/۵۸ و ۱۷/۶۲)۔

نبوّتِ آدم کا عقیدہ

قرآن کریم میں ایک مقام پر البتہ لفظ آدم، انبیائے کرام کے ساتھ آیا ہے۔ جہاں کہا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۳/۳۳)۔ "یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی"۔ یہاں آدم کا ذکر حضرت نوحؑ کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے۔ اور اسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ آدم ایک نبی تھے۔ لیکن صرف اتنی بات سے اس نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکتا کہ جس آدم کی داستان قرآن کریم میں آئی ہے، وہ ایک فرد تھا اور فرد بھی نبی۔ پہلی چیز تو یہ کہ آیت (۳/۳۳) میں "اِصْطَفٰی" کا لفظ آیا ہے اور یہ لفظ قرآن کریم میں غیر انبیاء کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرتِ مریم کے متعلق (۳/۴۲) اور خود امتِ محمدیہ کے متعلق (۳۵/۳۲) میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نہ حضرت مریم نبیہ تھیں اور نہ ہی امتِ محمدیہ کے افراد نبی۔ نبوت کا تو سلسلہ ہی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے ہر مقام پر سلسلۂ انبیاء کرام کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے کیا ہے اور دیگر انبیاءؑ کے متعلق کہا ہے کہ وہ ان کے بعد آئے تھے (۴/۱۶۳)۔

اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آدم کو بالتصریح ایک حکم دیا اور آدم نے اس سے معصیت

برتی۔ اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ قصۂ آدم میں ہر مقام پر کہا گیا ہے کہ ابلیس نے انہیں (آدم اور اس کی بیوی کو) بہکایا، اور وہ اس کے بہکاوے میں آگئے۔ حضراتِ انبیائے کرام تو ایک طرف (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ابلیس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) "یقیناً میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔" دیگر مقامات پر عباد کے ساتھ مخلصین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے عام مخلص بندوں پر بھی ابلیس غالب نہیں آسکتا تو ایک نبی پر وہ کس طرح غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔

ان تشریحات سے واضح ہے کہ جس آدم کی داستان قرآن کریم میں آئی ہے وہ کوئی نبی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی قبیلہ کے کسی ممتاز فرد کا نام ہو، کیونکہ عربی زبان میں اِدَامٌ کسی خاندان کے ایسے مثالی فرد کو بھی کہا جاتا ہے جس سے اس کے قبیلہ کو پہچانا جاتے۔

اب رہا یہ کہ قصۂ آدم میں آدم اور اس کی بیوی کا ذکر آیا ہے تو ظاہر ہے کہ جب ہم آدمی کے متعلق گفتگو کریں گے تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے۔ قرآن کریم نے اس قصہ میں عورت کا ذکر خاص طور پر کیوں کیا ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر سامنے آجاتے گی۔

خلیفہ

اس سے اگلی اہم اصطلاح ہے ——— خلیفہ ——— ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ بھی رائج ہے کہ انسان دنیا میں "خدا کا خلیفہ ہے"۔ (خلیفۃ اللہ فی الارض)۔ یہ تصور بھی قرآن کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی انسان کو "اپنا خلیفہ" نہیں کہا۔ آدم کے متعلق اتنا ہی کہا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲/۳۰) ——— اپنا خلیفہ نہیں کہا۔ اس کی تشریح ابھی سامنے آتے گی۔

لفظ خلیفہ کے مادہ (خ۔ ل۔ ف) کے معنی ہیں کسی کے پیچھے، کسی کے بعد۔ مثلاً ایک قرن کے بعد دوسرا قرن یا ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ ایک قوم جو کسی دوسری قوم کے بعد آتے۔ اس کے لئے ہمارے ہاں صحیح لفظ "جانشین" ہے۔ لہٰذا خلیفہ کے معنی ہیں کسی کا جانشین۔ اور یہ مادہ ان معانی میں قرآن کے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں قوم عاد کے متعلق کہا گیا: وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷/۶۹)۔ "تم اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ خدا نے تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔" حضرت نوحؑ نے اس قوم سے کہا کہ اگر تم نے پیغاماتِ خداوندی پر کان نہ دھرا تو یاد رکھو: وَیَسْتَخْلِفُ

رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (۱۱/۵۷)۔" خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ یعنی انہیں تمہارا جانشین بنا دے گا"۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کچھ دنوں کے لئے اپنی قوم سے الگ ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (۷/۱۴۲)۔" میرے بعد تم میرے جانشین بننا"۔ اسی سورۃ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا ہے: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (۷/۱۶۹)۔" ان کے بعد ان کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے . . . . . . "۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کے بعد اس کا جانشین ہونے والا۔ ظاہر ہے کہ یہ جانشین اُسی کا ہو سکتا ہے جو موجود نہ ہو۔ کسی کی موجودگی میں اس کے جانشین ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کو اگر اللہ کا جانشین (خلیفہ) تسلیم کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا خود دنیا میں موجود نہیں۔ انسان اس کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا ہے۔ اور خدا کے متعلق ایسا تصور بالبداہت غلط اور باطل ہے۔ تاریخ میں ہے کہ حضرتِ ابوبکر صدیقؓ کو کسی نے "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں خلیفۃ الرسولؐ ہوں، خلیفۃ اللہ نہیں ہوں[1]۔

انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کے لئے نہیں آیا۔ خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے آیا ہے۔ خود قرآنِ کریم نے، اس کا مقصدِ تخلیق یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶)۔" ہم نے جن و انس کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہمارے قوانین کی اطاعت اختیار کریں"۔

انسان سے پہلی مخلوق

انسان درحقیقت ایک ایسی مخلوق کا جانشین ہے جو اس سے پہلے کرۂ ارض پر موجود تھی لیکن اب ناپید ہو چکی ہے۔ سورۃ الحجر میں ہے: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷)۔" اور انسان سے پہلے ہم نے ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جسے آتشیں مخلوق کہا جائے گا، اور جو اب تمہاری نگاہوں سے اوجھل (ناپید) ہے"۔ ماہرینِ علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ زندگی کے سلسلۂ ارتقاء میں اولیں جرثومۂ حیات سے لیکر بن مانس تک کی کڑیاں تو دائرہ تحقیق میں آگئی ہیں، لیکن بن مانس اور انسان کے درمیان کی ایک کڑی گم ہے۔ اُسے وہ (MISSING LINK) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آیۂ زیرِ نظر میں اسی گم گشتہ کڑی کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ اس کرۂ ارض پر انسان کی نمود سے پہلے زمین بہت زیادہ گرم تھی اس لئے وہ مخلوق ایسی ہوگی جو نسبتاً تیز حرارت میں بھی زندہ رہ سکتی ہو۔ غالباً اسی نسبت سے قرآنِ کریم نے اُسے آتشیں مخلوق کہہ کر پکارا ہے۔

---

[1] کتاب "ابوبکر" مصنفہ محمد حسین ہیکل (اُردو ترجمہ ص ۵۸۳)

اِس آیت سے بہرحال یہ واضح ہے کہ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ: اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲/۳۰) تو اس سے مراد یہی تھی کہ ہم اب ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہے ہیں جو سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔

دنیاوی مملکتوں میں، جانشینی اپنے ساتھ اقتدار لئے ہوئے ہوتی ہے۔ یعنی خلیفہ اس جانشین کو کہیں گے، جسے اقتدارِ مملکت حاصل ہو۔ اسی مفہوم کے پیشِ نظر قرآن کریم نے جماعتِ مؤمنین سے کہا ہے کہ تم سے پہلی قومیں جادۂ ہدایت سے منحرف ہوگئیں تو انہیں تباہ کر دیا گیا۔ ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۱۴) "ان کے بعد ہم نے تمہیں دنیا میں ان کا جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو"۔ ظاہر ہے کہ خلافت یا جانشینی اقتدارِ مملکت ساتھ لئے ہوتے ہے۔

بااقتدار جانشینی

لہٰذا خلیفہ کے معنی ہوں گے کسی کا بااقتدار جانشین۔ اسی نہج سے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ: اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸/۲۶) "اے داؤد! ہم نے تمہیں تمہارے پیشرؤں کا خلیفہ (جانشین) بنایا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں میں الحق کے مطابق فیصلے کرو۔ (حکومت قائم کرو)"۔

اسی قسم کی جانشینی کو قرآن نے استخلاف فی الارض سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں ہے: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (۲۴/۵۵) "تم میں سے جو بھی وحی کی صداقتوں پر ایمان لائے گا اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں استخلاف فی الارض عطا کرے گا۔ جیسا کہ اس نے ان سے پہلی اقوام کو استخلاف عطا کیا تھا"۔

ضمناً چونکہ جماعتِ مؤمنین کی صورت میں اس استخلاف کی غرض و غایت یہ بتائی تھی کہ: وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ (۲۴/۵۵)۔ "تاکہ وہ دین متمکن ہو سکے جسے خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے"؛ اس لئے یہ استخلاف فی الارض عام بادشاہوں کے استخلاف سے مختلف اور متمیز ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں "خلافت" اور "ملوکیت" میں فرق کیا جاتا ہے۔[1]

ملآئکۃ

قصۂ آدم میں ایک اور اہم اصطلاح ملائکہ کی آتی ہے۔ بعض لغویین کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مادہ (اَلْاَکُ) ہے۔ جس کے معنی پیغام رسانی کے ہیں۔ لیکن دوسرے محققین کا قول ہے کہ اس کا مادہ (مَلَکٌ) ہے جس کے معنی قوت کے

---

[1] استخلاف فی الارض کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل، آیات (۲/۱ ؛ ۲/۲) کی تشریحات ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں۔ پیغام رسانی کے سلسلہ میں ملائکہ کا جو ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات پر آیا ہے، اُسے متعلقہ مقامات میں بیان کیا جائے گا۔ سرِدست ہم ان ملائکہ کو لیتے ہیں جو قوت کے مظاہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا تو اس کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن قوتیں، ان قوانین کی رو سے، اس نظم و نسق کائنات کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں، انہیں ملائکہ کہکر پکارا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ حٰمٓ میں سمٰوٰت کے متعلق کہا گیا ہے: وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (۴۱/۱۲)۔ "ہم نے ہر سماء کی طرف اپنا امر وحی کر دیا" اس سے مراد وہ قوانینِ خداوندی ہیں جن کی رو سے اجرام فلکی اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ دوسری جگہ ارض و سمٰوٰت دونوں کے متعلق کہا: یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ (۶۵/۱۲) "ان میں خدا نے اپنا امر نازل کر دیا۔"

مُدبّراتِ اُمورِ الٰہیہ

اور دوسری طرف سورۃ النّٰزِعٰت میں فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹/۵) آیا ہے یعنی "تدبیرِ امور کرنے والے" خارجی کائنات میں ان امورِ الٰہیہ (قوانینِ فطرت) کے مدبّرین سے مراد ملائکہ ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت (۷/۵۴) میں مختلف عناصرِ فطرت (سمٰوٰت، ارض، شمس و قمر اور نجوم وغیرہ) کے متعلق کہا: مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ (۷/۵۴)۔ "خدا نے انہیں اپنے امر کے تابعِ تسخیر کر رکھا ہے"، یعنی یہ سب اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔ اور اس کے ساتھ کہا: ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۷/۵۴)۔ "پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔" لغوی طور پر عرش کے معنی تخت کے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب یہ لفظ خدا کے لئے استعمال ہو گا تو اس سے مراد اُس قسم کا مادی تخت نہیں ہو گا جس پر بادشاہ بیٹھتے ہیں۔ اس سے مراد اقتدار یا مرکزی کنٹرول ہو گا۔ (نیز دیکھئے ۲/۲۵۵)۔ اور دوسری جگہ ملائکہ کے متعلق کہا: وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ (۶۹/۱۷)۔ "وہ تیرے رب کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں" ایک اور مقام پر ان کے متعلق کہا:

عرش

حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹/۷۵)۔ "وہ عرشِ خداوندی کے گرد گردش کرتے ہیں"۔ یعنی یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (۳۹/۷۵)۔ "اپنے نشو و نما دینے والے کے نظامِ ربوبیت کو وجۂ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہتے ہیں"۔ اسی تسبیح کے متعلق سورۃ الرعد میں ہے: وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ (۱۳/۱۳)۔[1] "رعد اور

---

[1] علامہ ابنِ قیم نے کہا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ میں رعد سے مراد "مَلَكٌ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُوَكَّلٌ بِالسَّحَابِ"۔ ملائکہ میں سے ایک مَلَک ہے جسے بادلوں کے نظام پر مقرر کیا گیا ہے۔

(بحوالہ "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" از محمد تقی امینی صاحب ص ۱۲۶)

(دیگر) ملائکہ نظامِ خداوندی کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں" —— تسبیح کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا۔ پوری پوری قوت صرف کر دینا۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر جو آیا ہے کہ: سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۵۷/۱)۔ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جو قوانین خداوندی کی رُو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے، پوری شدت اور بھرپور توانائی سے سرگرم عمل ہیں"۔ اسی کو دوسری جگہ "ملائکہ کی تسبیح" کہکر پکارا گیا ہے[1] (۴۲/۵)۔

کائناتی قوتیں، قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ سورۃ النحل میں ہے: وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ. يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۴۹-۵۰)۔ "ارض و سموات میں جو کچھ ہے —— خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ —— قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ اور ان سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ وہ خدا کے غلبہ و تسلط سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں اور جو کچھ انہیں حکم دیا جاتا ہے، بلاچون وچرا اس کی اطاعت کرتے رہتے ہیں"۔

سجدۂ ملائکہ

فطرت کی انہی قوتوں (ملائکہ) کے متعلق قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ سجدہ ریزی کے معنے ہیں، کسی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینا۔ اس کے تابعِ تسخیر ہو جانا۔ اسی جہت سے قرآن کریم نے بنی آدم یا نوعِ انسان سے کہا ہے کہ کائنات کی جملہ اشیاء قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنے مقصد کے مطابق کام لے سکیں۔ سورۃ حج میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (۲۲/۶۵)۔ "کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اُسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر رکھا ہے"۔ دوسری جگہ (۳۱/۲۰) میں، ارض کے ساتھ سماوات بھی آیا ہے۔ اور سورۃ جاثیہ میں ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵/۱۲)۔ "جو کچھ سماوات اور جو کچھ ارض میں ہے ان سب کو خدا نے اپنی طرف سے، تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں حقیقت تک پہنچنے کی بہت سی نشانیاں ہیں"۔ یہ آدم کے سامنے ملائکہ کا سجدہ ہے[2]۔ یعنی انسان، قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے، اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا ہے۔ ان اشیاء میں بعض ایسی ہیں جو ایک ہی خاصیت کی حامل ہیں اور بعض وہ، جن میں ایک سے زیادہ خاصیتیں ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے

---

[1] مزید تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔ [2] مزید تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔

ملائکہ کے متعلق کہا: اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)۔ عام الفاظ میں اس کا ترجمہ ہے "دو دو، تین تین، چار چار بازوؤں والے ملائکہ" اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ "خدا اپنی مشیت کے مطابق، اپنی خلق میں اضافے بھی کرتا رہتا ہے"۔ سو، کون کہہ سکتا ہے کہ اشیائے کائنات میں کیا کیا اضافے ہوتے رہتے ہیں یا ان میں کتنی ایسی خاصیتیں ہیں جنہیں ابھی تک انسان دریافت نہیں کر سکا۔

قرآن کریم کی بعض آیات سے ایسا بھی مترشح ہوتا ہے کہ ملائکہ، انسانوں میں نفسیاتی اثرات پیدا کرنے کا موجب بھی بنتے ہیں۔ مثلاً بدر کے میدان میں، جماعتِ مجاہدین کو جو اطمینانِ قلب نصیب ہوا تھا ان کا ذریعہ بھی ملائکہ بتائے گئے ہیں (۳/۱۲۵ ; ۸/۱۰)۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم ان مؤثرات کو دیکھ نہیں سکتے۔ ملائکہ کے یہ لشکر، جو جماعتِ مجاہدین کے لئے وجۂ اطمینان و سکینت ہوتے تھے، ان کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ: لَمۡ تَرَوۡهَا (۹/۲۶ ; ۹/۴۰)۔ "تم انہیں دیکھ نہیں سکتے"۔[1]

یہ کچھ اُن ملائکہ کے متعلق ہے جو کارگہِ کائنات میں، امورِ الٰہیہ کی تدابیر کے لئے مامور ہیں، اور جنہیں ہم نے فطرت کی قوتوں سے تعبیر کیا ہے۔ عالمِ امر میں یہ مدبراتِ امورِ الٰہیہ کس طرح کارفرما رہتے ہیں۔ ہم اس کے متعلق نہ کچھ جان سکتے ہیں، نہ کہہ سکتے۔

اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سکیموں کے بروئے کار لانے کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ یہ قوتیں، جنہیں ملائکہ کہکر پکارا گیا ہے خود خدا کی تخلیق کردہ ہیں اور اسی کے حکم کے مطابق اِن امور کو سرانجام دینے پر مامور۔ انسان نے اپنے دورِ جہالت میں، ان قوتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کردی —— ہندوؤں کے ہاں سورج دیوتا۔ چاند دیوتا۔ اندر (بادل) دیوتا۔ اگنی (آگ) دیوی۔ وایو (ہوا) دیوی دھرتی (زمین) ماتا۔ گنگا ماتا وغیرہ۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش اسی توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ عربوں کے ہاں بھی ملائکہ (فرشتوں) کو دیویاں۔ (بلکہ خدا کی بیٹیاں) سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے ان باطل معتقدات کی تردید کی اور ان سب (ملائکہ) کو آدم کے حضور سجدہ ریز بتا کر اس حقیقت کو واضح کیا کہ آدمی ان "دیوی دیوتاؤں" کا ساجد نہیں،

---

[1] یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہو گیا کہ ۱۹۶۵ء کی "پاکستان - بھارت" جنگ میں، فرشتے مدد کے لئے آئے اور لوگوں نے انہیں، کہیں سبز عماموں کے ساتھ اور کہیں سفید گھوڑیوں پر سوار دیکھا، تو یہ سب انسانی ذہن کے تخیلات اور توہمات تھے۔ جب ملائکہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ صحابہؓ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے تو وہ ہم آپ کو کیسے نظر آجائیں گے؟

مسجود ہے۔ اس سے آپ دیکھئے کہ قرآن نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ اور مقام آدمیت کس قدر بلند کر دیا۔

قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان، اسلام لانے کی شرط قرار دیا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ملائکہ کو دیوی دیوتا ماننے کی بجائے، فطرت کی وہ قوتیں تسلیم کیا جائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آدمی کے تابع تسخیر کر دیا ہے۔

اس تمہید کے بعد، اب آیئے قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم کی طرف۔ اس میں آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب تک ان امور اور اصطلاحات کی اس قدر مبسوط تشریح نہ کر دی جاتی، قصۂ آدم سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

دوسرا باب
آیات ۳۰ تا ۳۹

سرگزشتِ آدم

۱ تخلیقِ آدم
۲ ملائکہ کا اعتراض
۳ علم الاسماء ــــــ تسخیرِ کائنات
۴ کائنات کے متعلق قرآنی نظریہ
۵ سجدۂ ملائکہ ــــــ اِستکبارِ ابلیس
۶ مسلکِ ابلیسی کی گمراہیاں
۷ جنتِ آدم کی خصوصیات
۸ آدم کی لغزش ــــــ شجرِ ممنوعہ سے مراد
۹ مردوں اور عورتوں کی حیثیت
۱۰ آدم کی بازآفرینی
۱۱ وحی کی راہنمائی کی ضرورت
۱۲ اتباعِ وحی کا نتیجہ ــــــ خوف و حزن سے مامونیت
۱۳ بائبل میں قصۂ آدم
۱۴ اور ہماری کتبِ تفاسیر میں۔

دوسرا باب

سرگزشتِ آدم

۲/۳۰ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

پہلے باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم، کسی ایک فرد (یا جوڑے) کی داستان نہیں۔ یہ خود آدمی کی سرگزشت ہے جسے قرآن نے تمثیلی طور پر محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ تصور میں یوں لائیے کہ بارگاہِ ایزدی میں تین فریق کھڑے ہیں۔ درمیان میں آدم، یعنی آدمیت کا نمائندہ۔ ایک طرف ملائکہ، یعنی فطرت کی قوتیں، جو خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق اس کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتی ہیں، اور تیسرا فریق، ابلیس یعنی آدمی کے وہ سرکش اور بیباک جذبات جو اقتدارِ خداوندی کے ساحلوں میں پابند نہیں رہنا چاہتے۔ بارگاہِ خداوندی سے ملائکہ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ ——— اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰)۔ "میں کرۂ ارض پر ایک نئی مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو اس سے پہلی مخلوق کی جانشین ہوگی"۔ اس پر ملائکہ کا ردِّعمل مثبت اور منفی، دونوں حیثیتوں میں سامنے آتا ہے۔ مثبت حیثیت سے تو یہ کہ: نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)۔ اس میں انہوں نے اپنی خدمت گزاری کی روئیداد پیش کی ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس طرح سرگرمِ عمل رہتے ہیں (نُسَبِّحُ) اور اس کے لئے جس حد تک بھی جانا پڑے جاتے ہیں (نُقَدِّسُ)۔ بالفاظِ دیگر، وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضور! کیا ہم سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی واقع ہوئی ہے جو کسی اور مخلوق کی تخلیق کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو فرما دیجئے۔ ہم اپنی اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور منفی حیثیت سے یہ کہا کہ اس نئی مخلوق کا جو ہیولیٰ ہمارے سامنے آیا ہے "اس میں ہمیں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دکھائی دے رہے ہیں، تو کیا کرۂ ارض پر ایسی مخلوق پیدا کی جائے گی جو فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں عام کرے! ہماری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔ بارگاہِ خداوندی سے اس کے جواب میں اتنا ہی کہا گیا کہ ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

ملائکہ نے کہا تھا کہ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)۔ اس میں نُسَبِّحُ اور نُقَدِّسُ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ تسبیح کے متعلق سابقہ باب میں مختصر اشارات سامنے آچکے ہیں۔ لیکن یہ تصور مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ اس مادہ (س۔ب۔ح) کے بنیادی معنے تیرنے کے ہیں۔ اَلسَّبَّاحُ ایسے تیراک کو کہتے ہیں جو پورے ہاتھ پھیلا کر تیرے۔ اور اسی نسبت سے اَلسَّوَابِحُ ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو پورے قدم پھیلا کر، انتہائی تیزی سے دوڑیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رُو سے سَبْحٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ و تاز کرنا۔ امکان بھر جدوجہد کرنا۔ ہر وقت سرگرداں اور سرگرم عمل رہنا۔

تسبیح و تقدیس

چنانچہ آسمانی کرّوں کی تیز خرامی کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ یٰسین میں ہے: وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ (۳۶/۴۰) و (۲۱/۳۳)۔ "تمام کُرّے اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھر رہے ہیں"۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے: سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۵۷/۱ ; ۵۹/۱ ; ۶۱/۱)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے انتہائی شدت سے سرگرمِ عمل رہتی ہے"۔ ضمناً، ان ہرسہ آیات کے آخر میں کہا گیا ہے: هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ۔ یعنی اس خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے، جو انتہائی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ اور تسلط مستبدانہ نہیں بلکہ حکمت پر مبنی ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اس کے متعین فرمودہ قوانین کی رو سے ہوتا ہے۔ دھاندلی سے نہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ۔ وَاِنۡ مِّنۡ شَيۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ۔ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا (۱۷/۴۴)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے، خدا کے پروگرام کی تکمیل اور اُسے درخورِ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ لیکن تم ان کی اس سرگرمیٔ عمل (تسبیح) کو سمجھتے نہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ کائنات محفوظ رہے۔ اور اس کی حفاظت کے لئے جو قوتیں سرگرمِ عمل ہوں وہ یونہی بھڑک اٹھنے والی نہ ہوں بلکہ انتہائی دھیمے پن سے اپنے فرائض کو انجام دیتی ہیں"۔

اسی طرح سورۃ النور میں ہے کہ: اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ۔ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ۔ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ (۲۴/۴۱)۔ "کیا تم نظامِ کائنات پر غور نہیں کرتے کہ اس میں کس طرح ہر شے ——— جمادات اور نباتات ہی نہیں بلکہ پرندوں تک ——— اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ سے اچھی طرح واقف ہے۔ یعنی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائضِ منصبی کیا ہیں (صلوٰۃ کے یہی معنی ہیں) اور یہ بھی کہ اس کا دائرہ کار

کونسا ہوتا ہے۔ (تسبیح کا یہ مفہوم ہے)۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ یہ اپنے اپنے فریضہ کو کس طرح سرانجام دیتے ہیں"۔

بعض آیات میں اس لفظ کو "استکبار" کے مقابلہ میں لاکر اس کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا گیا۔ مثلاً سورۃ حٰمٓ میں ہے کہ فَاِنِ اسْتَکْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ یُسَبِّحُوْنَ لَہٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا یَسْئَمُوْنَ (۴۱/۳۸)۔ "اگر یہ لوگ (یعنی حق کو تسلیم نہ کرنے والے) قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے دیجئے۔ اس سے یہ خدائی کائنات کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے دن رات سرگرمِ عمل رہتی ہے اور ان کا اس سے سرکشی برتنا تو ایک طرف، وہ اس عملِ پیہم اور حرکتِ مسلسل سے تھکتی بھی نہیں"۔ سورۃ الاعراف میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا جہاں کہا کہ: اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ (۷/۲۰۶)۔ "خدا کے ہاں، کوئی شے اس کی اطاعت سے کبھی سرکشی نہیں برتتی۔ وہ سب اپنے اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرمِ عمل رہتی ہیں اور خدا کے احکام کے سامنے سجدہ ریز"۔

دنیائے انسانیت میں یہی حکم، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے، جماعتِ مومنین کو دیا گیا جہاں کہا گیا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ (۵۶/۷۴) (۶۹/۵۲)؛ (۵۶/۹۶)۔ یعنی "تم خدا کی عظیم صفتِ ربوبیت کو عملاً مشہود کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہو"۔ سورۃ الحجر میں ہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ (۱۵/۹۸)۔ "اپنے خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہو اور اس طرح ان لوگوں کے زمرہ میں شریک ہو جاؤ جو خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوتے ہیں"۔ یہی جماعتِ مومنین کا شعار بتایا گیا ہے (۴۸/۹)۔ یہ پروگرام اتنا طویل، صبر آزما اور دشوار گزار تھا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا کہ آپ اس (پروگرام) کی تفاصیل اور جزئیات پر غور و فکر کرنے کے لئے راتوں کو زیادہ نہ جاگا کریں۔ اس لئے کہ اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳/۷)۔ "تمہارے سامنے دن بھر کا جو پروگرام ہوتا ہے وہ بڑا فرصت طلب ہوتا ہے"۔ یہاں بھی سَبْحًا کے معنی واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس کے صبر آزما ہونے کے لئے، یہ لفظ جہاں کس کس ن صاحب ضربِ کلیمؑ اور فرعون کے سلسلہ میں آیا ہے وہ بڑا حقیقت کشا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ: اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰/۲۴)۔ "تم فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ بڑا ہی سرکش اور مستبد ہوتا جا رہا ہے۔ اسے اس کی ان بیباکیوں سے روکو"۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس عظیم مہم کی دشوار گزاریوں کے پیشِ نظر چند ایک درخواستیں پیش کیں اور ان کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے ساتھ

میرے بھائی ہارونؑ کو بھی بھیج دیجئے تاکہ وہ اس پروگرام میں میرا مددگار رہے۔ اور اس کے بعد ہے۔ کَیۡ نُسَبِّحَکَ کَثِیۡرًا وَّ نَذۡکُرَکَ کَثِیۡرًا (۲۰/۳۳،۳۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ ہم وہاں تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں"۔ اور تسبیح اور ذکر کا جو عام مفہوم ہمارے لیا جاتا ہے وہ معلوم ہے۔ اس مفہوم کے پیشِ نظر سوچئے کہ کیا اس مہم کے سر کرنے کے لئے یہی کچھ کرنا تھا کہ فرعون کو الٹی میٹم دینے کے بعد، یہ دونوں بھائی اس کے دربار میں پہنچ کر تسبیح پھیرنے لگیں اور "ھُو حق" کی ضربیں لگائیں لیکن تسبیح کا جو قرآنی مفہوم اوپر بیان کیا گیا اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تائید اور امداد اس لئے مانگی تھی کہ وہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہوں اور ایک ایک قدم پر اپنی راہنمائی کے لئے خدا کے قانون کو اپنے سامنے لائیں۔ (ذکر کا یہی مفہوم ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر ملے گی)۔

تسبیح اور ذکر

واضح رہے کہ جن معانی میں تسبیح کا لفظ ہمارے ہاں مروج ہے، یہ شے (یعنی دانے پروئی ہوئی تسبیح) عربوں کے ہاں غیر معروف تھی۔ اس کا عیسائی راہبوں کے ہاں رواج تھا جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا۔ نیز گنتی (یعنی اتنی دفعہ یہ پڑھو، اتنی دفعہ یہ) کا تصور یہودیوں کے ہاں عام تھا۔ جو ہندسوں کے باطنی معانی پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ورد وظائف، گنڈے تعویذ، اسمِ اعظم وغیرہ سب انہی کی اختراعات ہیں۔ یہ بہرحال ایک الگ موضوع ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دین کے تصورات و نظریات "مذہب" میں آکر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔

سُبحان اللہ

قرآن کریم میں "سبحان اللہ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ مثلاً سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ (۳۷/۱۵۹)۔ دوری کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن جو تصورات بھی قائم کرے، وہ (خدا) اس سے بہت دور، بلند و بالا اور "ورا ءالورا" ہے۔ سعدی کے الفاظ میں:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ‏ و ز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ‏ ما ہمچناں بہ اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

ملائکہ نے دوسرا لفظ نُقَدِّسُ کہا تھا۔ اس مادہ (ق۔ د۔ س) کے معنی ہوتے ہیں دور تک چلے جانا۔ اور اسی سے قَدَّسَہٗ کے معنی ہیں "اس نے اس کے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا"۔ اس لحاظ سے خدا کی صفت قُدُّوۡسٌ (۵۹/۲۳، ۶۲/۱) کے معنی ہیں "ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور اور منزّہ"۔

تسبیح و تقدیس کے ان معانی کی رو سے ملائکہ نے کہا یہ کہ ہمارے ذمہ جو فرائض عائد کئے گئے ہیں، ہم ان کی ادائیگی کے

لئے ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور اس کے لئے ہمیں جہاں تک بھی جانا پڑے، جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کائنات میں اس نئی مخلوق کی ضرورت کیا ہے ——— غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟ ———

یہ تو تھا ملائکہ کے ردِ عمل کا مثبت پہلو۔ منفی طور پر انہوں نے کہا کہ جو مخلوق زیرِ تکوین ہے اس کے متعلق تو ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکے کہ: يُفْسِدُ فِيهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰)۔ "وہ (آدم) زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزیاں کرے گا"۔ بارگاہِ خداوندی سے اس کی تردید نہیں کی گئی۔ کہا صرف یہ گیا کہ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰)

فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں

"میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔ آگے بڑھنے سے پہلے، ہم اس ارشادِ خداوندی کے حسنِ لطافت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اللہ تعالیٰ جیسے قادرِ مطلق اور صاحبِ ملکوت و جبروت کے کسی پروگرام پر ملائکہ جیسی مخلوق کی طرف سے اس قسم کا اعتراض یا ردِ عمل کس قسم کی سرزنش (بلکہ سزا) کا مستوجب ہونا چاہیئے تھا؟ کوئی دنیاوی حاکم ہوتا تو اپنے زیرِ دستوں کی اس قسم کی گستاخی کے جواب میں انہیں سُولی پر ٹانگ دیتا یا ان کی کھال کھنچوا دیتا۔ ساحرینِ دربارِ فرعون کا اتنا ہی جرم تھا کہ انہوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی پیش کردہ صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ فرعون کی طرف سے اس کے خلاف کس قسم کے ردِ عمل کا اظہار ہوا تھا۔ اس نے گرج کر کہا تھا کہ ہیں! تم میری اجازت کے بغیر ہی ربِّ موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لے آئے ہو! تم دیکھو! کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں کٹوا کر تمہیں سولی لٹکا دوں گا (۷/۱۲۰-۱۲۳)۔ ایک فرعونِ مصر پر ہی کیا موقوف ہے! ایسے مقام پر دنیا کے ہر فرعون کی طرف سے اسی قسم کے ردِ عمل کا مظاہرہ ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ کسی قسم کے غصہ کا اظہار کیا نہ ملائکہ کی زجر و توبیخ کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ تم نے جو کچھ سمجھا ہے، تمہاری کوتاہیٔ علم کا نتیجہ ہے۔ تمہارا علم محدود ہے۔ تم اپنے علم کی بنا پر یہیں تک دیکھ اور سوچ سکتے ہو۔ تم اس باب میں معذور ہو۔ لیکن ہماری نگاہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ ہم ابھی تمہارے علم میں اضافہ کر دیں گے اور اس کے بعد تم دیکھ لوگے کہ اس نئی مخلوق کی خصوصیات کیا ہیں اور اس کی تخلیق کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے ——— لیکن یہ بات ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ سرِ دست آپ ملائکہ کے پیش کردہ اعتراض کی طرف آئیے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ نئی مخلوق دنیا میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔

لفظِ فساد کی تشریح کے سلسلہ میں، اس کتاب کی جلد اول میں زیرِ آیات (۲/۱۱-۱۲) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے

(دیکھئے جلد اول صفحہ ۲۴۴-۲۲۹)۔ فساد کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس حالت پر نہ رہنے دینا جس حالت پر اُسے ہونا چاہیئے[1] اس میں بگاڑ پیدا کر دینا۔ اس کے عملی مظاہر کے لئے ہم نے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی مثالیں پیش کی تھیں اور ان سے بھی زیادہ نمایاں مثال اس نیشنلزم کی پیش کی تھی جس نے دورِ حاضر میں عالمگیر تباہیاں مچا رکھی ہیں۔ فساد کا یہ مفہوم آیۂ زیرِ نظر (۲/۳۰) سے تین ہی آیات پہلے (۲/۲۷) میں بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (۲/۲۷)۔ یعنی "خدا نے جنہیں آپس میں ملانے کا حکم دیا تھا، یہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد مچا دیتے ہیں"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فساد کی جس شکل کا یہاں ذکر کیا گیا ہے (آیت (۲/۳۰) میں) اوّلاً اسی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ملائکہ نے کہا کہ یہ نئی مخلوق (انسان) اپنی نوع کی وحدت ختم کر کے مختلف گروہوں، قبیلوں اور آخر الامر قوموں میں بٹ جائے گی جس کا نتیجہ باہمی جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور یوں اس سرزمین پر خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۃ یونس میں ان الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے؛ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹)۔ "نوعِ انسان شروع میں ایک عالمگیر برادری تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے اور یوں گروہوں میں بٹ گئے"۔

نیشنلزم کی فساد انگیزیاں

قومیت (نیشنلزم) اور جنگ و جدل کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے، اس کے لئے مغربی مفکرین اور مدبرین کی شہادات سامنے لایئے۔ (مثلاً) مشہور مفکر میسن (J.W.T MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ:

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے، جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اسی بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

ایک اور مفکر (ADAM DE HEGEDUS) نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک اہم کتاب شائع کی تھی۔ اس میں وہ لکھتا ہے:-

> مسئلہ کس قدر پیچیدہ کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں عالمگیر لڑائیاں، نیشنلزم کی پیدا کردہ ہیں۔ اور یہی ہمارے زمانے میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ ان دونوں لڑائیوں کی تہہ

---

[1] اقبال کے الفاظ میں:

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد ماند ٭ گفت آدم کہ چنیں است و چناں خواہد بود

ہیں وہی اصول کارفرما تھا جس کی رو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر کرتی ہیں[۱] اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

اور رونا صرف یہی نہیں کہ یہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہوگئیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی، تو اس وقت بھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

(THE STATE OF THE WORLD- P. 11-12.)

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے کہ "نیشنلزم، انسانی تاریخ میں سب سے بڑا مفسدہ ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کوئی فسادِ انسانیت نہ عالمگیر ہوا کرتا تھا، نہ انسانی زندگی کو کلی طور پر محیط۔[۲]"

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ فساد اور خون ریزی میں باہمی کیا تعلق ہے۔ اور ملائکہ نے انسانی تاریخ کے کس بڑے مفسدہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جہاں تک جنگ (یعنی قوت کے استعمال) کا تعلق ہے۔ عیسائیت نے ایسا نظریہ یا عقیدہ پیش کیا جس کی رو سے قوت کا استعمال کسی حالت میں بھی جائز قرار نہ دیا گیا۔ اس نے اس کی بجائے رحم کا تصور پیش کیا جس کی رو سے یہ کہا گیا کہ اگر کوئی دست دراز تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے، تو بجائے اس کے کہ تم اس کا ہاتھ روکو، اور اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئے تو اس کی کلائی مروڑ کر رکھ دو، تم اپنا دوسرا گال اس کے سامنے کر دو۔ اگر کوئی تمہاری واسکٹ اتارے تو تم اپنا کرتہ خود اتار کر اس کے حوالے کر دو۔ یعنی عیسائیت میں عدل اور نظامِ عدل قائم کرنے کے لئے قوت کے استعمال کا تصور ہی نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے دی گئی تعلیم نہیں۔ ان کی خود ساختہ تعلیم ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق بھی ہم سے نہیں خود مغرب کے دانشوروں سے پوچھئے۔ مشہور مفکر رابرٹ بریفو نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں ہسپانیہ

عیسائیت اور جنگ

---

[۱] قرآنِ کریم نے قوموں کے باہمی فساد کا جذبۂ محرکہ یہی بتایا ہے۔ جہاں کہا ہے: تَتَّخِذُونَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶/۹۲) "تم آپس کے معاہدات کو بھی فریب دہی کا ذریعہ بنا لیتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے آگے بڑھ جائے"۔

[۲] ان امور کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب — انسان نے کیا سوچا — بابِ سیاسیات

کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے:-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم وستم ہوں لیکن خود ظلم وستم سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے۔ اس نے ان لوگوں کو، جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، آئینِ محبت کی تعلیم دی ہے، انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے، انہیں خدا کی ابویت یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب اور اخلاق کے اس ہجوم میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ "مسیح مقدس" جور و استبداد کے ستائے انسانوں کے درمیان آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم وستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظامِ عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومتِ خداوندی کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔

(P.P. 332-333)

اسی بنا پر عصرِ حاضر کا عظیم مفکر (WHITE-HEAD) لکھتا ہے کہ:-

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(ADVENTURES OF IDEAS — P. 18)

عیسائیت کی اسی تعلیم اور اس کے بے پناہ پروپیگنڈہ کا اثر ہے کہ اسلام کے خلاف اس قسم کے اعتراضات عام ہوتے چلے آرہے ہیں کہ یہ خون ریزیوں کا مذہب اور جنگ و قتال کا دین ہے۔ ان اعتراضات اور اسلام کی صحیح تعلیم کے متعلق تو ہم آگے چل کر تفصیل سے لکھیں گے جہاں جہاد کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قوت کا استعمال ہر مقام پر ممنوع قرار نہیں پا سکتا۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف، ہمارے دور کے علم النفس (سائیکالوجی) نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ مثلاً (ERICH FROMM) اپنی کتاب میں جذبۂ تغلب (AGGRESSION) یعنی قوت کے استعمال

تغلب کی دو قسمیں

پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ تغلب ہر قسم کا ناجائز اور خلافِ شرفِ انسانیت ہے۔ تغلب کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی (BENIGN AGGRESSION) جائز،

اور (MALIGNANT AGGRESSION) مذموم۔ شیر اگر فطرت کے تقاضے کے مطابق اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہرن پر حملہ کرتا ہے تو یہ کوئی جرم یا ناجائز فعل نہیں۔ لیکن اگر کوئی شکاری (بھوک کے لئے نہیں بلکہ) محض تفریح کی خاطر ہرن پر گولی چلاتا ہے تو اخلاقی ضابطہ نگاہ سے یہ مذموم تغلب ہوگا۔ اگر کوئی ظالم کسی مظلوم کے سینے میں چھرا گھونپنے کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کا یہ اقدام مجرمانہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس مظلوم کی جان بچانے کے لئے اس ظالم کی کلائی مروڑ دیتا ہے، یا اس کی مزاحمت پر اسے گولی مار دیتا ہے، تو یہ تغلب نہ صرف یہ کرنا جائز نہیں بلکہ انسانیت کی حفاظت کیلئے ضروری بھی ہے۔

قرآن اور قوت کا استعمال:

اور یہی ہے وہ تغلب جس کی قرآن کریم نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ عندالضرورت اس کی تاکید بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک انسانی جان کی قیمت کتنی بڑی ہے، اس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)۔ "یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا (یعنی بجز اس کے کہ اسے جرمِ قتل کی سزا کے لئے ہلاک کیا جائے یا فساد کو روکنے کی خاطر) تو یوں سمجھئے گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو ہلاک کر دیا۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)۔" اور جس نے کسی ایک کی جان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا تو یوں سمجھئے گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی"۔ ایک طرف تو اس کے نزدیک انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہے، لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کوئی سرکش اور مستبد انسان، یا انسانوں کا گروہ مظلوم اور کمزور انسانوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر دے اور ان کی ہلاکت و تباہی پر اتر آئے تو اسے اس ظلم و استبداد سے روکنے کے لئے پہلے سمجھانا چاہیئے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو قوت کے زور سے اسے اس دراز دستی سے روک دینا چاہیئے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی جنگ کو "قتال فی سبیل اللہ" (یعنی نوعِ انسان کی حفاظت کے لئے اللہ کی راہ میں جنگ) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے کہ: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲/۲۵۱)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے (یعنی اس کی اجازت نہ دے) کہ ظلم و ستم کرنے والے افراد کی روک تھام، انصاف پرور گروہ، قوت کے زور سے کریں، تو کرۂ ارض پر فساد برپا ہو جائے۔ لیکن خدا نوعِ انسان کو اپنے سایۂ عاطفت میں رکھنا چاہتا ہے اس لئے اس نے عدل پرور انسانوں کو تاکید کر رکھی ہے کہ وہ ایسے مقام پر پوری پوری قوت سے کام لیں اور ظالموں کے ظلم کو روک دیں"۔ اس نے جماعتِ مومنین کو، جہاں پہلی بار جنگ کی اجازت دی ہے، تو وہ بھی ایسا ہی موقعہ تھا۔ اور اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ

وَصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ۔ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۲/۴۰)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرتا کہ انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے جور و ستم کی روک تھام کر سکے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا اور یہود و نصاریٰ کی خانقاہیں اور یہودیوں کی پرستش گاہیں اور مسلمانوں کی مساجد سب منہدم ہو جاتیں۔ لیکن خدا نے ایسی جماعت (امتِ مسلمہ) اٹھا کھڑی کی ہے جو اس قسم کے سرکش گروہوں کی روک تھام کا انتظام کرے گی۔ اور چونکہ ان کا یہ عمل خدا کے متعین کردہ پروگرام کی خاطر ہو گا اس لئے خدا بھی ان کی مدد کرے گا۔ وہ بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے"۔

اسی سلسلہ میں اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جماعت مؤمنین کا فریضہ ہے کہ کوئی مظلوم اُسے کہیں سے بھی مدد کے لئے پکارے وہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ ظالم کے تیروں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ اپنی جانیں دے دیں تاکہ ان مظلوموں، کمزوروں اور ناتوانوں کی جانیں بچ جائیں (۴/۷۵)۔ اس قسم کی جنگ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوں گی اور سطحی نگاہ سے دیکھنے والے اُسے ان کی باہمی جنگ قرار دیں گے۔ لیکن قرآن کریم نے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی یہ جنگ "قتال فی سبیل اللہ" ہے اور دوسرے گروہ کی جنگ "قتال فی سبیل الطاغوت" (۴/۷۶)۔ اسی کو (ERICH FROMM) نے (BENIGN AGGRESSION) اور (MALIGNANT AGGRESSION) کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ بارگاہ خداوندی سے ملائکہ کو جواب ملا کہ ہمارے مقابلہ میں تمہارا علم محدود ہے اس لئے تم نہیں جانتے کہ اس نئی مخلوق کی کیا خصوصیات ہیں۔ اسے ہم جانتے ہیں۔ اگر بات کو یہیں چھوڑ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی ملائکہ کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن بارگاہِ خداوندی نے مناسب سمجھا کہ ملائکہ پر واضح کر دیا جائے کہ خود ان کے مقابلہ میں اس نئی مخلوق کی قوتوں کی کیا کیفیت ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم میں ہے:-

۲/۳۱ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ ۔ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔

آیت کے پہلے چار الفاظ کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "خدا نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیئے"۔ جہاں تک عَلَّمَ کا تعلق ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا نے آدم کو یہ سب کچھ خود سکھا دیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے انسان میں اس قسم کی صلاحیت رکھ دی جس کی بنا پر اس کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔

علم الاسماء علم کس چیز کا ؟ تمام کی تمام اشیائے کائنات کے اسمآء کا۔ اس میں اسماء کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسماء، اسم کی جمع ہے جس کا مادہ (س۔م۔و) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی شے کی وہ خصوصی علامت، جس سے وہ شے پہچانی جا سکے اور دوسری اشیاء سے متمیز ہو سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی شے کا محض نام جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تاوقتیکہ ہم اُس شے کو پہچان نہ سکیں اور اس کی اُس خصوصیت کا علم نہ ہو جو اسے دوسری چیزوں سے متمیز کرتی ہے۔ اسی لئے صاحبِ مفردات (امام راغب اصفہانی) نے اس لفظ (اسماء) پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک مسمّٰی کا علم نہ ہو اس کے اسمآء کا علم کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یعنی جب ہم پانی کہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کیا شے ہے اور اس کی خصوصیات کیا؟ اس اعتبار سے دیکھئے تو نام (اسماء) بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر مختلف اشیاء کے اپنے اپنے نام نہ ہوں، یا ہمارے سامنے ایسی چیزیں رکھی ہوں جن کے ہم نام نہ جانتے ہوں تو اس سے کتنی دشواری پیدا ہو جاتی ہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسدان جب کوئی نیا انکشاف یا کوئی نئی شے ایجاد کرتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھتے ہیں۔ اس باب میں ایک مغربی ڈاکٹر کہتا ہے کہ :-

> آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں اُن سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں۔ [۱]

لہٰذا علم الاسماء کے معنی ہیں اشیائے کائنات کی ماہیت، کیفیت، خواص اور متمیزات کا علم۔ بالفاظ دیگر علومِ طبیعی کی تحصیل کی صلاحیت جس میں علومِ سائنس کے تمام گوشے آ جاتے ہیں۔

ضمناً۔ ڈاکٹر (TYLER) نے کہا ہے کہ غلط نام رکھنے سے بڑا نقصان پہنچتا ہے طبیعی دنیا میں اس سے کس کس قسم کے نقصانات پہنچتے ہیں، اس سے قطع نظر، معتقدات کی دنیا میں یہ چیز کس قدر گمراہی اور تباہی کا باعث بنتی ہے وہ بھی بالکل

غلط ناموں کی تباہ کاریاں واضح ہے۔ قرآن کریم نے کفار یا مشرکین سے کہا ہے کہ جنہیں تم اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز ایں نیست کہ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ (۱۲/۴۰)۔ "یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، یہ درحقیقت وہ نہیں — تم انہیں خدا کہتے ہو، یہ خدا نہیں۔ تم انہیں معبود سمجھتے ہو یہ معبود نہیں۔ تم نے ان کے یہ غلط نام رکھ چھوڑے ہیں۔ مَآ اَنۡزَلَ

---

[۱] DR. M.L TYLER IN "HOMEO DRUG PICTURES" (PREFACE)

اللّٰہُ بِہَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۱۲/۴۰)۔ "خدا نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ معتقدات کی دنیا میں کسی کا نام رکھنے کے لئے بھی خدائی سند کی ضرورت ہو گی۔ یہ جو ہمارے ہاں بڑے بڑے آستانے، مزارات اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دیئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جاتے اور ان کے لئے ایسا پراپیگنڈا نہ کیا جاتا تو وہ مٹی کے ڈھیر اور پتھر کے تودوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھتے۔ آپ ایسے قبرستانوں سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں جن میں کسی قبر کا بڑا نام نہ رکھا گیا ہو یا اس پر رفیع الشان عمارت نہ تعمیر کی گئی ہو۔ لیکن جہاں کسی قسم کا مقدس نام ہو، یا بلند اور پرشوکت عمارت، تو وہ آپ کے لئے مرکزِ توجہ اور داعیٔ سجدہ بن جاتا ہے۔ انہیں محض قبریں کہیئے (یعنی انہیں ان کے اصلی نام سے پکاریئے)۔ وہ کبھی وجہ جبیں سائیٔ انام نہیں بن سکیں گی۔ یہ بہرحال ضمنی گوشہ تھا۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے۔

کہا یہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اشیائے کائنات کی ماہیت معلوم کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اسے قوانینِ فطرت کا علم کہا جائے گا۔ انسان جن اشیائے فطرت کے خواص و ماہیت کا علم حاصل کر لیتا ہے اور وہ قوانین معلوم کر لیتا ہے جن کے تابع وہ سرگرمِ عمل رہتی ہیں، وہ اشیاء اس کے تابعِ تسخیر ہو جاتی ہیں[1] پھر وہ ان سے جو چاہے کام لے سکتا ہے۔ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ کہا ہے کہ خدا نے اشیائے کائنات کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ یعنی انہیں غیر متبدل قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ جب انسان ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے تو وہ ان اشیاء کی مضمر قوتوں کو مسخر کر لیتا ہے اور اس سے مختلف فائدے اٹھاتا ہے۔

تسخیرِ فطرت

کہیں اس نے کہا ہے کہ اس نے تمہارے لئے چاند اور سورج کو مسخر کر دیا (۱۴/۳۳)۔ کہیں کہا ہے کہ رات اور دن کو مسخر کر دیا۔ (۱۴/۳۳؛ ۱۶/۱۲؛ ۳۱/۲۹؛ ۳۵/۱۳؛ ۳۹/۵)۔ کہیں یہ کہ تمہارے لئے دریاؤں، سمندروں اور ان میں چلنے والی کشتیوں کو مسخر کر دیا۔ (۱۴/۳۲؛ ۱۶/۱۴)۔ اس طرح متفرق اشیاء کا ذکر کرنے کے بعد جامع طور پر کہا کہ: سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (۲۲/۶۵) "جو کچھ زمین میں ہے اس سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا"۔ کہیں کہا کہ: سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (۳۱/۲۰)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں، ارض و سموٰت میں جو کچھ ہے، اُسے تمہارے لئے مسخر کر دیا"۔ اور سورۃ جاثیہ میں اسے جامع حیثیت سے ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ: وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۴۵/۱۳)۔ "ارض و سموٰت میں جو کچھ ہے، اس سب کو من جانب اللہ تمہارے

---

[1] تسخیرِ فطرت کے متعلق پہلے باب میں بھی ضمنی اشارات آ چکے ہیں۔ اس جگہ اُس اجمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔

لئے مسخر کردیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں"۔

اس آیت میں لفظ جَمِیْعًا، اُس لفظِ کُلَّهَا کی تفسیر ہے جو (۲/۱۴) میں اوپر آچکا ہے۔ ذرا اس کی وسعت کو تصوّر میں لائیے۔ کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی جملہ موجودات کی کیفیت و ماہیت اور ان کے خواص و جواہر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان میں رکھدی گئی ہے۔ پہلے تو مجملاً اس کائنات کو لیجئے جس کی وسعتوں اور پہنائیوں کے تصور سے بھی انسانی فکر عاجز آجاتی ہے۔ اور پھر اس میں جس قدر گوناگوں اشیاء ہیں (یعنی فطرت کی قوتیں

علمِ انسانی کی وُسعت

اور ان کے مظاہر) انہیں تصور میں لائیے۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ انسانی علم کے امکانات کس قدر لامحدود اور ناپیدا کنار ہیں۔ ہم اپنے دور کو سائنس کے انکشافات کی گویا معراج کبریٰ سمجھتے ہیں لیکن ہمارے سائنسدانوں کو خود اس کا اعتراف ہے کہ ہم (نیوٹن کے الفاظ میں) "علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپ اور گھونگھے اکٹھے کرنے سے آگے نہیں بڑھ پائے"۔ (HAECKEL) اپنی کتاب (RIDDLES OF THE UNIVERSE) کے آخری باب میں لکھتا ہے کہ:۔

ہمیں اس امر کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ نیچر کی کنہ و حقیقت سے ہم آج بھی اسی قدر بے خبر ہیں جسقدر آج سے دو ہزار چار سو سال پیشتر حکمائے یونان، یا دو سو سال پہلے نیوٹن اور اسپینوزا، یا سو سال پہلے کانٹ اور گوئٹے بے خبر تھے۔ ہمیں تو بلکہ اس امر کا بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم جس قدر اس جوہر کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے کائنات مرکب ہے۔ اور مادہ اور توانائی، جس کے خصائص ہیں، وہ اور معمہ بنتا جا رہا ہے۔ ہم اس کی محسوس شکلوں کا اور ان کی ارتقائی منازل کا علم تو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن ان محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ (PAGE-310)

سر جیمز جینز ہمارے دور کا علم الافلاک کا سب سے بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے وہ اپنی مشہور کتاب (THE MYSTERIOUS UNIVERSE) کے خاتمے پر لکھتا ہے کہ:۔

جو کچھ کہا گیا ہے اور جو نتائج تجربتاً پیش کئے گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ وہ تمام محض قیاسی اور غیر یقینی ہیں۔ ہم نے اس مسئلہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عہدِ حاضر کی سائنس ان مشکل مسائل کے متعلق، جو ہمیشہ کے لئے ماورائے سرحد ادراک رکھے گئے ہیں، کچھ کہہ سکتی ہے؟ ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک مدہم سی کرن دیکھ پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ کرن بھی فریبِ نگاہ ہی ہو۔ اس لئے کہ اس باب میں ہمیں کچھ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر بہت بوجھ ڈالنا پڑتا ہے۔ سو آج

یہ دعویٰ قطعاً نہیں ہو سکتا کہ دورِ حاضرہ کی سائنس کوئی یقینی اعلان کر سکتی ہے۔ بلکہ انسب یہ ہے کہ سائنس کو چاہیئے کہ اس قسم کے اعلان کرنا چھوڑ دے۔ علم کے دریا کا رخ اکثر اوقات پیچھے کی طرف لوٹتے بھی دیکھا گیا ہے۔

سائنسدانوں کے اس قسم کے اعترافات و اعلانات کے پیشِ نظر، شاید کوئی سطح بیں مایوس ہو کر بیٹھ جائے کہ جب اشیاءِ کائنات کی کنہ اور حقیقت اور خواص و متمیزات کے متعلق علم حاصل کرنا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں تو اس کے لئے اس قسم کی جانکاہ کوششوں سے فائدہ کیا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا طالبِ علم تو نہ ایسا کہہ سکتا ہے اور نہ اس طرح مایوس ہو کر بیٹھ سکتا۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا ارشاد ہے کہ: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲/۳۱)۔ "آدمی میں تمام اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ودیعت کر کے رکھدی گئی ہے"۔ لہٰذا اس کا ایمان یہ ہوگا کہ انسان ان کوششوں میں آگے بڑھتا جائیگا اور اشیائے فطرت (كُلُّهُمْ) کا علم حاصل کر کے رہے گا۔ اس ضمن میں (SIR FRANCIS YOUNG HUSBAND) کا ایک اعلان بڑا حقیقت کشا، بصیرت افروز اور امید افزا ہے۔ اس نے (THE MYSTRY OF NATURE) کے عنوان سے ایک حقائق پرور مقالہ لکھا ہے جو مشہور کتاب (THE GREAT DESIGN) میں شامل ہے۔ وہ اپنے مقالہ کے آخر میں لکھتا ہے:۔

> سائنس سے ہم آخرالامر جو سبق سیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ ہمیں سائنس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہم فطرت کے متعلق سب کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔ جو علم ہم حواس کے ذریعے حاصل کرتے ہیں، اس کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ محسوسات تو فطرت کی گہرائیوں کے بیچ ابھرے ہوئے جزیرے یا کنارے ہیں۔ ہم صرف فطرت کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اس چہرے کے بدلے ہوئے آثار کا بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جوں جوں ہم ان گہرائیوں میں جاتے ہیں یہ حقیقت پختہ ہوتی جاتی ہے کہ ان کے پیچھے کوئی ایسی قوت ہے جو ہماری نگاہوں سے پنہاں ہے۔ اس قوت کو جاننے کی آرزو ہمارے دل میں ہمیشہ مچلتی رہے گی۔ لیکن یہ شاید کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔
>
> اس قسم کا احساس ہم پر مایوسی طاری کر دیتا لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جوں جوں ہم اس سمندر کی گہرائیوں میں اترتے ہیں، ہمارے مسرت بڑھتی جاتی ہے۔ رموزِ فطرت ہمیں آوازیں دے دے کر آگے بلاتے ہیں اور ہم طوعاً و کرہاً ان کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں اس تگ و تاز کا صلہ بھی مل جاتا ہے۔ ہم جتنا گہرائیوں میں جاتے ہیں اتنا ہی اپنے آپ کو بلندیوں پر پاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس میدان میں آگے ہی آگے بڑھتے

جانا چاہیے۔ اور ہم آگے بڑھتے جائیں گے، کبھی رک کر کھڑے نہیں ہوں گے۔ بلانے والے کی آواز میں کچھ ایسی دلکشی ہے کہ ہمارے قدم مجبوراً اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اٹھتے چلے جائیں گے۔ (صفحہ ۲۵۴-۲۵۵)

یہ مقامِ آدم ہے

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے تسخیرِ فطرت آدم (آدمی) کا فریضہ بتایا ہے ——— یعنی یہ فقط مقامِ آدم ہے جس میں کافر اور مومن سب شامل ہیں ——— مقامِ مومن اس سے بہت آگے ہے۔ جہاں تک مقامِ آدم کا تعلق ہے اس میں مومن بھی شریک ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہیں یہ کہا ہے کہ: اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۵/۳) "یہ حقیقت ہے کہ ارض و سماوات میں مومنین کے لئے آیات ہیں"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے: اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵/۴)۔ کہیں انہیں لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۱۰/۶) کہا ہے۔ یعنی کائنات میں متقیوں کے لئے آیات ہیں۔ ان، اور اسی قسم کی دیگر آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن اور متقی ہونے کیلئے تسخیرِ فطرت ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جنہیں ہم علومِ سائنس کہتے ہیں، ان کی تحصیل کے بغیر ایمان اور تقویٰ بھی مکمل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے کائنات پر غور و فکر کی تاکید کے بعد کہا ہے کہ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (۴۵/۶) "یہ اللہ کی وہ آیات ہیں جنہیں خدا، حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے"۔ جو لوگ اس کے بعد بھی

یہ مومنین کا فریضہ ہے

حق پر ایمان نہیں لاتے ان سے پوچھو کہ: فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۴۵/۶) "یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے سوا اور کس چیز پر ایمان لائیں گے"۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو گوشے ہیں۔ ایک، اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک علیم و خبیر ہستی اپنے محکم، اٹل اور تعمیری قوانین کی رو سے چلا رہی ہے۔ اور دوسرے، خدا کی کتاب، قرآن کریم میں تفکر و تدبر۔ اسی اعتبار سے صحیفۂ فطرت اور قرآنِ کریم دونوں کو "خدا کی کتابیں" کہا جا سکتا ہے۔ اول الذکر میں انسان کی طبیعی زندگی کے متعلق راہنمائی ہے اور ثانی الذکر میں اس کی انسانی زندگی سے متعلق ہدایات۔ آپ صحیفۂ فطرت کو کتاب اللہ (قرآنِ کریم) کا ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانینِ فطرت بھی اسی خدا کے متعین فرمودہ ہیں جس خدا نے دوسرا مجموعۂ قوانین، قرآن کے اندر عطا کیا ہے۔ بنا بریں، قوانینِ فطرت کی تحقیق و کاوش بھی خدا کی "عبادت" کا ایک گوشہ ہے ——— یعنی اس کے متعین فرمودہ قوانین کی تحقیق اور ان کا اتباع۔ ہمارے ہاں جن لوگوں کو "علماء" کہا جاتا ہے ان کے مبلغِ علم کا ہر ایک کو علم ہے۔ انہیں نہ قوانینِ فطرت کا علم ہوتا ہے نہ قرآنی قوانین کا۔ قوانینِ فطرت کا تو بہر حال کچھ علم نہیں ہوگا۔ یہ ان کے دائرہ تعلیم میں داخل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ قرآن کریم علماء کن لوگوں کو کہتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا ۔ وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) "کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھر تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں ۔ ان میں بعض سرخ ہیں ، بعض گہرے سیاہ رنگ کے اور اسی طرح دیگر مختلف رنگوں کی تہیں"۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (۳۵/۲۸) ۔"اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں"۔

علماء کون ہیں

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے ۔ کائنات کے مختلف گوشوں کا، بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا ، سائنس کے مختلف علوم کا جن میں طبیعیات ، نباتیات ، حیوانیات ، فضائیات ، ارضیات اور انسانیات کے تمام شعبے آ جاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے ۔ کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگاہِ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر اس کی منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے"۔

اور یہاں سے ہماری فکر کا رُخ ایک اور سمت کی طرف مڑ گیا ۔ پہلے کہا گیا کہ علم الاشیاء ۔ مقامِ آدم ہے جس میں کافر اور مومن سب شریک ہیں ۔ جو انسان بھی صحیح خطوط پر محنت اور کوشش کرے گا ، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے گا ۔ سوال یہ ہے کہ پھر کافر اور مومن میں فرق کیا ہے ؟ اور یہ فرق کہاں سے شروع ہوتا ہے ؟ یہ نکتہ غور طلب اور وضاحت کا متقاضی ہے ۔

کائنات کے متعلق سیکولر نظریہ

سیکولرازم کے متعلق اس کتاب کی پہلی جلد میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے ۔ (ملاحظہ ہوں آیات ۱/۱ ، ۲/۳ ، ۲/۴ ، ۲/۲۲ کی تشریحات ، نیز اس جلد کے پہلے باب میں ،، انسانی ذات کے متعلق گفتگو) سیکولرازم سے ہماری مراد ہے ، وحی کی روشنی سے بے نیاز ہو کر تنہا فکرِ انسانی کی راہنمائی ۔ اس فکر کی رو سے کائنات کے متعلق پہلا تصور یونان کے مشہور فلاسفر افلاطون (PLATO) نے پیش کیا ۔ اس نے کہا کہ یہ محسوس کائنات فی الواقعہ موجود نہیں ۔ حقیقی کائنات عالمِ امثال میں واقع ہے ۔ اور یہ محسوس کائنات اس کا صرف سایہ ہے ۔ وجود اصل شے کا ہے ، اس کے سایہ کا نہیں ۔ ہم نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ اگر کسی کا ذہن ہو بلند

اور نگاہ کا زاویہ ہو غلط تو اس سے انسانیت کو جسقدر نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں افلاطون کی نمایاں مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس نے کائنات کے متعلق یہ باطل نظریہ پیش کیا، اور اس اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کی قریب قریب، ہر قوم اس سے متاثر ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ انسان کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کی کوشش کرتا، وہ اسے محض وہم و خیال تصور کر کے اس سے بیگانہ ہو کر بیٹھ گیا۔ ہندوستان کی ویدانت نے اس کا بڑا گہرا اثر لیا اور اسے مذہبی تقدس کا رنگ دیکر یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات اپنا وجود نہیں رکھتی، وجود صرف برہما (خدا) کا ہے

وحدت الوجود کا نظریہ

جس نے اشیائے کائنات کی شکل میں روپ دھار رکھا ہے۔ پراکرتی (مادی دنیا) محض مایا (فریب) کا جال ہے۔ یہ ہندو دھرم کا تصوف تھا۔ اسی نے ہمارے ہاں وحدت الوجود کا لبادہ اوڑھا اور اس تصوف کی بنیاد بنا جس کا بانی شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کو قرار دیا جاتا ہے ——— ابن عربی کی بھی یہی کیفیت تھی، کہ ذہن بڑا رسا تھا اور نگاہ کا زاویہ غلط، وحدت الوجود کے فریب تخیل نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل و حرکت قوم کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بنا پر افلاطون کے متعلق لکھا ہے کہ :-

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
بر تخیل ہائے ما فرماں رواست — جامِ اُو خواب آور و گیتی رُباست
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ اُو بر جانِ صوفی محکم است

قوم ہا از سکرِ اُو مسموم گشت
خفت و، از ذوقِ عمل محروم گشت

مغرب کے مادہ پرست

مغربی محققین و مفکرین نے افلاطون کی اس افیون سے پیچھا چھڑایا تو وہ افراط کی طرف نکل گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کائنات مادی ہے اور مادہ کے سوا کسی شے کا وجود ہی نہیں یہ کائنات کسی نہ کسی طرح محض ہنگامی طور پر وجود میں آ گئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کی رو سے یہ ایک بے روح مشینری کی طرح مصروفِ حرکت ہے۔ اس کی نہ کوئی غرض و غایت ہے نہ منزلِ مقصود۔ نہ اس کے پیچھے کوئی بصیر و خبیر قوت ہے نہ اس کے آگے کوئی دلیلِ راہ۔ کائنات کے متعلق اس قسم کا تصور مغربی محققین کا پیدا کردہ نہیں، یہ تصور بھی قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مغربی محققین نے صرف اسے جلا دی ہے اور (بزعم خویش) اس کی تائید میں دلائل و شواہد پیش کئے ہیں۔

قرآن کریم نے کائنات کے متعلق ان ہر دو تصورات کی شدت سے تردید کی۔ اس نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے کہ :-

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور یہ کہنا بھی باطل ہے کہ نہ اِس کے پیچھے کوئی علیم و خبیر قوت ہے نہ اس کے سامنے کوئی غرض و غایت۔ اس کے برعکس اس نے اعلان کیا کہ:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ۔ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷)۔

قرآنی نظریۂ کائنات

"ارض و سماوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اُسے ہم نے باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا"۔ باطل کے مقابلہ میں لفظ حق آتا ہے۔ حق کے معنی ہیں کسی چیز کا اسطرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے۔ حق، ہر ناقابلِ انکار حقیقت کو کہا جاتا ہے۔ نیز حق، اس نظریہ یا مسلمہ کو کہتے ہیں جو تعمیری نتائج پیدا کرے جو اپنی جگہ پر ثابت، محکم اور اٹل ہو۔ باطل چونکہ حق کی ضد ہوتا ہے اس لئے اس کے معنی ہوں گے ایسی شے جو فی الواقعہ موجود نہ ہو جو ثابت اور محکم نہ ہو۔ جس سے تعمیری نتائج پیدا نہ ہوں۔ جس کی کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ باطل کے ان معانی کے پیشِ نظر آپ مندرجہ بالا آیت کے اُن الفاظ پر غور کیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ ہم نے کائنات کو باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ فی الواقعہ موجود ہے۔ اس کی غرض و غایت ہے[1]۔ یہ تعمیری نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے افلاطون کے نظریہ اور مغرب کے مادہ پرستوں کے تصور، دونوں کی تردید ہو گئی۔ قرآن کریم کے نزدیک کائنات کے متعلق صحیح تصور کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اِس آیت کے اگلے الفاظ سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے "کہ کائنات کو باطل تصور کرنا کفر ہے اور محض ظن و قیاس پر مبنی۔ یعنی نہ یہ علم پر مبنی ہے نہ صداقت پر۔ ایسا سمجھنے والے مومن نہیں، کافر ہیں"۔

کائنات کو باطل تصور کرنے کا جو نتیجہ مندرجہ بالا آیت میں بتایا گیا ہے، وہ بڑا ہی غور طلب ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، کائنات کے متعلق یہ تصور کہ یہ محض فریبِ تخیل ہے، انسانیت کو مفلوج بنا دینے کا موجب بنا۔ اور اب مغربی محققین کا یہ نظریہ، کہ اس کی کوئی

---

[1] چونکہ "کائنات" میں خود انسان بھی شامل ہو جاتا ہے، اس لئے مغرب کے مادی نظریہ کی رد سے انسان کے متعلق بھی یہی کہا گیا کہ اس کی تخلیق کی بھی کوئی غرض و غایت نہیں۔ اسے یونہی بے مقصد پیدا کر دیا گیا ہے —— کاروانِ زندگی بے منزل است۔ قرآن کریم نے اس باطل تصور کی بھی یہ کہکر تردید کر دی کہ: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا (۲۳/۱۱۵)۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت، بے مقصد، پیدا کر دیا ہے"۔ فَتَعٰلَی اللّٰهُ الْمَلِکُ الْحَقُّ (۲۳/۱۱۶)۔ "ایسا کرنا خدا کے شایانِ شان نہیں"۔ (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی)۔

غرض وغایت نہیں، انسان کو حیوان بنا دینے کا باعث۔ اس قسم کی زندگی کو قرآن نے جہنم کا عذاب قرار دیا ہے جس میں اس وقت ساری دنیا ماخوذ ہے۔ اس سے اگلی آیت میں قرآن کریم نے ان دونوں نظریات کے حامل گروہوں میں خطِ امتیاز کھینچ کر رکھ دیا ——— یعنی وہ گروہ، جو تخلیقِ کائنات کو باطل سمجھتا ہے اور وہ گروہ جو اُسے حق تسلیم کرتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے :-

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ (۳۸/۲۸)۔

"ان سے پوچھو کہ کیا ہم ان لوگوں کو، جو کائنات کے بالحق ہونے پر ایمان رکھیں اور پھر ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہوں جو اشیائے کائنات کی مضمر ممکنات کو بیدار کریں اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا موجب بنیں، ان لوگوں کے برابر قرار دیں گے جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، کیا متقین اور فجار ایک جیسے ہو جائیں گے؟" اس میں مفسدین کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسی فساد کی طرف تو ملائکہ نے اشارہ کیا تھا! ان دونوں گروہوں میں فرق کر کے بارگاہِ ایزدی نے ملائکہ کو بتا دیا کہ ان کے سامنے ایک ہی گروہ ہے دوسرا نہیں۔ یہ دوسرا گروہ کس طرح وجود میں آئے گا۔ وہ کہاں سے راہنمائی حاصل کرے گا۔ اس کے متعلق اس سلسلہ کی اگلی آیت میں کہا :-

کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوۡۤا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (۳۸/۲۹)۔

"یہ راہنمائی انہیں اس کتاب میں ملے گی جسے ہم نے اے رسولؐ! تیری طرف نازل کیا ہے۔ یہ راہنمائی یکسر خیر و برکت کا موجب ہے۔ لیکن یہ حاصل اُنہی کو ہو گی جو اس کے قوانین پر غور و فکر سے کام لیں اور عقل و بصیرت کی رو سے انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں"

اس سے سیکولرازم کے حامیوں اور وحی سے اکتسابِ ضیا کرنے والوں میں فرق کر کے بتا دیا۔

مندرجہ بالا آیت (۳۸/۲۷) میں کہا گیا ہے کہ "ہم نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا" یہ منفی پہلو تھا۔ مثبت طور پر کہا کہ :-

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۲۹/۴۴)

"اللہ تعالیٰ نے ارض و سمٰوٰت کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں جو وحی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں"۔ وحی کی صداقت پر یقین رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جن کے متعلق سورۃ آلِ عمران میں کہا گیا ہے کہ: اِنَّ

مقامِ مؤمن

فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (۳/۱۸۹)۔

"یہ حقیقت ہے کہ ارض و سما کی تخلیق.... اور لیل و نہار کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کیلئے عظیم نشانیاں ہیں"۔ یہ صاحبانِ عقل و بصیرت کون ہیں؟ اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۰)۔

"یہ وہ لوگ ہیں، جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور کارگاہِ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمیں نشو و نما دینے والے! تو نے اس محیر العقول کارگاہِ کائنات کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو یونہی باطل تخلیق کرے۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اس طرح کے وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے ہماری سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ ہو جائیں۔" اس سے اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ اس "عذابِ نار" کا محسوس و مشہود نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہ کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۱)۔ "عذابِ جہنم میں مبتلا وہ قوم ہوتی ہے جو دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ ایسی قوم کا دنیا میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔"

دنیا میں ذِلّت کی زندگی

آپ اقوامِ عالم پر ایک اچھلتی ہوئی نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے ان چند الفاظ میں کیسی عظیم الشان حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ دنیا کی جس قوم نے افلاطونی فریب پر مبنی ویدانت یا تصوف کو مسلکِ زندگی بنایا وہ تسخیرِ کائنات کی طرف سے بے بہرہ ہو گئی۔ انہی اقوام کو "مذہب پرست" کہا جاتا ہے جو مادی دنیا اور اس کی خوشنمائیوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر ان سے کنارہ کش رہنے میں قربِ خداوندی کی جھلک دیکھتی ہیں۔ یہ قومیں، ان اقوام کے مقابلہ میں، جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہیں، نہایت ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ اپنی ضروریاتِ زندگی تک کے لئے ان قوموں کی محتاج اور دست نگر ہوتی ہیں، اور وہ قومیں اس امداد کی جو قیمت وصول کرتی ہیں، وہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی ان کی سیاسی غلامی اور محکومی۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اس قسم کی قوموں کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہوتا۔ یہ قومیں، جنہیں اپنا حامی و ناصر سمجھتی ہیں (یعنی جو نظر بظاہر ان کی امداد کرتی ہیں) وہ درحقیقت ان کی ہمدرد اور دوست نہیں ہوتیں۔ وہ ان کی احتیاج کا فائدہ اٹھا کر ان کا پورا پورا استحصال کرتی ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم نے جو کہا تھا کہ کائنات کو باطل نہیں، بالحق پیدا کیا گیا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے، اور مقصود و مطلوب کیا۔ اب رہیں وہ قومیں جو وحی کی راہنمائی سے کام نہ لیتے ہوئے تخلیقِ کائنات کو (جس میں انسان بھی شامل ہیں) بے غرض و غایت سمجھتی ہیں، وہ انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی وحی کی راہنمائی سے کام نہیں لیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرت کی بے پناہ قوتوں کو مسخر کر کے انہیں ایک دوسرے کی ہلاکت اور تباہی کے لئے صرف کرتی ہیں۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

مادہ پرستی کی تباہ کاریاں

انیسویں صدی، سائنس کی ظفر مندی کا زمانہ تھا۔ سائنس نے ہمیں سستا کوئلہ اور کپاس دی اور ذرائع رسل و رسائل

میں انقلاب پیدا کر دیا۔ دیگر سینکڑوں طریق سے انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کر دیں اور آسائش کے سامان مہیا کر دیئے۔ لیکن سائنس ایک دو دھاری تلوار تھی جس نے انسانوں کو وہ قوتیں عطا کر دیں جن کا طریقِ استعمال وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قتل و غارت گری کی استعداد میں اضافہ ہو گیا اور اس طرح اس کی تہذیب، تباہی کے جہنم کے کنارے تک آ پہنچی۔ انیسویں صدی نے صرف سائنس کی ترقی دیکھی اور یہ ہمارے لئے چھوڑ دیا کہ ہم دیکھیں کہ سائنس کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت میں کس طرح تنزّل واقع ہوتا چلا گیا۔

(GOOD AND EVIL — PAGE 119)

آئن سٹائن عصرِ حاضر کا عظیم ترین سائنسدان ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

ہمارے دور کے سائنسدانوں کی قلبی حالت الفرڈ نوبل کی سی ہو گئی ہے۔ الفرڈ نوبل نے ایک ایسا "بھک سے اُڑ جانے والا" مادہ ایجاد کیا تھا جو اس زمانے میں سب سے زیادہ ہلاکت انگیز تھا۔ اس سے اس کے ضمیر پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے نوبل پرائز کا اعلان کیا جو ہر سال اس شخص کو دیا جاتے جو دنیا میں قیام امن کا سب سے بڑا موجب ہو۔ ہمارے سائنس دان، جنہوں نے اس قدر ہلاکت انگیز ایجادات کی ہیں، اپنے آپ کو ضمیر کی اسی جہنمی سوزش میں مبتلا پاتے ہیں۔ یہ اگر جرم کا احساس نہیں تو کم از کم ذمہ داری کے احساس کا نتیجہ ضرور ہے۔

(OUT OF MY LATER DAYS)

ہمارے دور کے سائنسدانوں، مدبّروں، مفکروں، سیاستدانوں کی یہی قلبی کیفیت ہے جسے قرآن کریم نے "عذاب النّار" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ مؤمنین کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ اس سے ہمارے سامنے تین قسم کی قومیں آ گئیں۔

تین گروہ

(۱) وہ قوم، جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اسے جماعت مؤمنین کہا جائے گا۔

(۲) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لیتی ہے لیکن انہیں دوسروں کی ہلاکت اور تباہی اور اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کرتی ہے، یہ مقامِ آدم ہے، جس کا نتیجہ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) ہے ——— اور

(۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ یہ مذہب پرست اور تصوف زدہ قوم ہے جو انتہائی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ جو یہاں ذلت اور خواری کی زندگی بسر کرے اور اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہو گا۔ اِس لئے اس قوم کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور عاقبت بھی خراب۔

تخلیقِ کائنات کی غرض و غایت کیا ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جسے کسی دوسرے مقام پر تفصیل سے بیش کیا جائے گا۔ اس وقت ہم صرف قرآن کریم کی ایک آیت سامنے لانا چاہتے ہیں جس سے اصولی طور پر واضح ہو جائے گا کہ جہاں تک ہمارا

تخلیق کائنات کا مقصد

تعلق ہے، تخلیقِ کائنات سے مقصد کیا ہے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے: وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۴۵/۲۲)۔ "خدا نے ارض و سماوات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ ہو"۔ اس سے ظاہر ہے کہ تخلیقِ کائنات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل بروئے کار آجائے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔ لیکن جو قوم تخلیقِ کائنات کی اس غرض و غایت پر ایمان رکھے وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر پورے پورے حتم و یقین کے ساتھ ایمان رکھے گی۔ اور یہی وہ قوم ہے جو فطرت کی قوتوں کو فساد اور خونریزیوں کا موجب بنانے کے بجائے، انہیں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ذریعہ بنائے گی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یورپ کے انیسویں صدی کے محققین اور مفکرین نے یہ نظریہ وضع کیا کہ کائنات کی کوئی غرض و غایت نہیں۔ یہ یونہی بے مقصد وجود میں آگئی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ کہ اپنی طبیعی زندگی کی پرورش کے سوا، خود انسانی زندگی کی بھی کوئی غرض و غایت نہیں۔ لیکن اب وہاں کے مفکرین نے کروٹ بدلی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ نہ کائنات کی تخلیق بے مقصد ہے اور نہ ہی انسانی زندگی بے غرض و غایت۔ وہاں کا ایک مفکر (F.W. JONES) اپنی کتاب (DESIGN AND PURPOSE) کا اختتام اِن الفاظ پر کرتا ہے:-

> اگر انسان نے اپنی فکر میں تبدیلی پیدا کر لی کہ انسانی زندگی بلا مقصد نہیں تو اس سے نوعِ انسان کو بیحد فائدہ پہنچے گا۔ انسانی زندگی کو با مقصد تسلیم کرنے سے یہ بھی تسلیم کیا جائے گا کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء، غرضیکہ پوری پوری کائنات با مقصد ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک دن، انسان، شاہراہِ حیات پر اس طرح گامزن ہو کہ اسے نظر آجائے کہ اُس کے ساتھ تمام سلسلۂ کائنات اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس کا منتہائے نگاہ ہے اور یہ اس کائنات کا ایک ہمسفر ہے۔ اس شاہراہِ کائنات پر تمام افرادِ کارواں کے حقوق یکساں ہیں۔ اس شاہراہ کے منتہیٰ کا ہمیں علم نہیں، لیکن اس سے ہم اس حقیقت کا احساس تو کر سکتے ہیں کہ یہ بات کائنات کے بس میں نہیں کہ وہ اس راہ اور اس پر چلنے والے افرادِ کارواں کو فنا کر سکے ...... تاریخ کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں یہ احساس بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم القدر سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور ہر انسانی زندگی، خواہ وہ کسی قدر غیر اہم کیوں نہ ہو۔ اس کائناتی مقصد کا جزو ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور ضمنی اشارہ بھی لائقِ توجہ ہے۔ کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ایک جگہ کہا ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۸-۳۹)۔ "ہم نے ارض و سماوات، اور جو کچھ ان کے درمیان ہیں، اسے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اُسے بالحق پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے"۔ ہندوؤں کے ہاں برہما (یعنی ان کے تصور کے خدا) کو نٹ راجن کہکر پکارا جاتا ہے۔ یعنی "کھلاڑیوں کا راجہ"، سب سے بڑا کھلاڑی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ برہما نے اس دنیا کو کھیل اور تفریح کے لئے پیدا کر دیا ہے۔ اسی جہت سے اُسے نٹ راجن کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ اور اس کی وضاحت کر دی کہ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ محض کھیل تفریح کی خاطر اس قسم کے تماشے کرتا رہے۔ وہ خود الحق ہے اور اس کا ہر ارادہ اور ہر کام حق پر مبنی۔

آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ کیسی کیسی عظیم حقیقتوں کو اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔

اب آجائیے پھر اصل موضوع کی طرف۔ آیت (۲/۳۱) میں کہا یہ گیا ہے کہ خدا نے آدم میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرکے، فطرت کی قوتوں کو اپنے مصرف میں لائے۔ اور اس میں (کُلَّهَا) کا اضافہ کرکے یہ بتا دیا کہ فطرت کی کوئی قوت بھی ایسی نہیں جو اس کے دائرۂ تسخیر سے باہر رہ جائے۔ اس کے بعد (اسی تمثیلی یا محاکاتی انداز میں) کہا کہ خدا نے پھر ان اشیائے کائنات کو ملائکہ کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ دنیا میں کسی نئی مخلوق کی ضرورت نہیں، ہم مملکتِ خداوندی کے نظم و نسق کو سرانجام دینے کے لئے کافی ہیں اور ہمارے ہی ہاتھوں خدا کا تخلیقی پروگرام اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا، تو ذرا تم ان اشیاء کے خواص و جواہر اور ان کی مضمرات و ممکنات کے متعلق بتاؤ۔ اس کے بعد ہے:۔

۲/۳۲ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔

ملائکہ نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ "ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا علم آپ نے ہمیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ ہمیں از خود کوئی معلومات حاصل ہیں اور نہ ہی ان کی تحصیل کی صلاحیت ہمارے اندر۔ کہاں آپ کا لامحدود علم اور حکمت اور کہاں ہمارا محدود علم! ان دونوں میں نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے!"

یہاں بھی ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کائنات کی ہر ذی حیات یا غیر ذی حیات شے اپنے قویٰ اور خواص

کا علم تو رکھتی ہے لیکن کوئی شے کسی دوسری شے کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتی۔ سونے کو کچھ علم نہیں کہ لوہا کیا ہوتا ہے۔ بکری کو کچھ علم نہیں کہ مچھلی میں کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں۔ ان کے اس شعور کو عام اصطلاح میں شعورِ سادہ (SIMPLE CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ جب ہم نے کہا ہے کہ انہیں صرف اپنے متعلق "علم" ہوتا ہے تو اسے بھی درحقیقت علم نہیں کہا جائے گا۔ ان میں جبلی طور پر کچھ خاصیتیں ہوتی ہیں جن کا، ان سے، مختلف مواقع پر اظہار ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے نہ ان خاصیتوں کا علم کہیں سے حاصل کیا ہوتا ہے نہ ان میں اس سے زیادہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ملائکہ نے کہا ہے کہ:

لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲/۳۲)۔ اس کے بعد ہے:۔

۲/۳۳ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔

اس پر "خدا نے آدم سے کہا کہ تم انہیں ان کی خاصیتوں، صلاحیتوں، یا کنہ و حقیقت کے متعلق بتاؤ کہ وہ کیا ہیں۔ جب آدم نے انہیں یہ بتا دیا تو خدا نے انہیں (ملائکہ کو) کہا کہ کیا اب تمہاری سمجھ میں یہ بات آئی جو ہم نے کہا تھا کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں، تم نہیں جانتے......"

غیب و شہود "غیب" کا مفہوم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۳) کی تشریح کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے۔ اُسے ایک بار پھر سامنے لے آیئے۔ اس وقت ہم صرف اتنا دُہرا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جب کوئی شے صرف علمِ خداوندی میں ہو اور محسوس طور پر وجود میں نہ لائی گئی ہو اُس کی اِس حالت کو "غیب" کہیں گے۔ اور جب وہ محسوس طور پر سامنے آجائے تو اُسے مشہود کہا جائے گا۔ اسی طرح جس شے کی کوئی مُضمر صلاحیت ہنوز محسوس طور پر سامنے نہ آئی ہو اُسے بھی غیب کہا جائے گا۔ اور جب وہ علمِ انسانی میں آجائے تو اُسے مشہود کہہ کر پکارا جائے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارے سامنے صرف مشہود و محسوس کائنات ہے۔ اور ہم، ان اشیائے کائنات کا بھی علم رکھتے ہیں جو ہنوز ہمارے علم و ارادے میں ہیں اور جو محسوس و مرئی طور پر سامنے نہیں آئیں۔ (وہ جو کہا گیا ہے: يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱)۔ وہ اپنی مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ تو اس سے یہی مُراد ہے)۔ اور دوسرے یہ کہ تم مختلف اشیاء کی مضمر صلاحیتوں سے واقف نہیں۔ بنا بریں تمہارا علم بے حد محدود ہے۔ اس کے برعکس، ہم ارض و سما اور ان میں پھیلی ہوئی جملہ اشیاء کے غیب اور شہود دونوں سے واقف ہیں۔ اور یہی ہمارا وہ علم ہے جس کا ایک گوشہ ہم نے اس نئی مخلوق —— آدم —— میں ودیعت کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا مظاہرہ ابھی ابھی ہو چکا ہے۔

اس آیت کے اگلے الفاظ اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن ان کا غلط مفہوم یا ترجمہ بڑی گمراہی کا موجب

بن جاتا ہے۔ ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ "ہم جانتے ہیں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم ہم سے چھپاتے ہو"۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ملائکہ کو یہ قوت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی بعض باتوں کو خدا سے چھپائے رکھیں۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے ملائکہ اور خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔ اِن الفاظ میں درحقیقت غیب اور شہادت کے تصور کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ آپ اشیائے کائنات پر غور کیجئے۔ یہ تخلیقِ کائنات کے وقت سے دنیا میں موجود ہیں، لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک وقت میں ان کی کوئی ایک مضمر صلاحیت یا خاصیت نمود میں آتی ہے۔ جوں جوں ارتقاء کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، یا انسانی تحقیق آگے بڑھتی جاتی ہے، اِن اشیاء کے مضمر خواص آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی ایٹم (ATOM) کو لیجئے۔ دنیا میں موجود تو یہ پہلے دن سے تھا لیکن اس کی ساری خاصیتیں (POTENTIALITIES) مضمر تھیں، پوشیدہ تھیں، مخفی تھیں، زیرِ نقاب تھیں۔ محسوس طور پر ان کی نمود نہیں ہوئی تھی۔ اور آج اسی ایٹم کی یہ مخفی اور مضمر صلاحیتیں اس طرح نمود میں آرہی ہیں کہ ان سے کام لیتے ہوئے انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اور ابھی تو ان خاصیتوں کے نمود کی شاید پہلی ہی منزل ہے۔ یہ ہے اشیائے کائنات کی وہ حالت، جسے مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۲/۳۳) کہکر پکارا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے اُن کی نمود کے بعد کی کیفیت جسے مَا تُبْدُوْنَ (۲/۳۳) کہا گیا۔ ملائکہ سے کہا یہ گیا کہ ہم نے جو علمِ آدم میں ودیعت کر کے رکھدیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا دستِ تحقیق تمہاری ان خاصیتوں کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دے گا جو آج، اور تو اور خود تمہاری اپنی نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ ہے اس نئی مخلوق کا مقام اور وہ خصوصیت جس سے تم عاری تھے اور جس کا اسے حامل بنایا جا رہا ہے۔ تمہاری مضمر خاصیتوں کی نمود اس کے ہاتھوں سے ہوگی۔ علامہ اقبالؒ نے (بالِ جبریل میں)

میلادِ آدم کا منظر اسی منظر کی اپنے مخصوص اور شگفتہ انداز میں عکاسی کی ہے۔ ایک سین میں یہ دکھایا گیا ہے کہ فرشتے آدم کو جنت سے کس طرح رخصت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اس (آدم) سے کہتے ہیں:-

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر ؛ کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

اس کے بعد اگلا سین وہ ہے جس میں روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔ اس میں ارض آدم سے کہتی ہے کہ:-

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ ۔۔۔ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ۔۔۔ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے ۔۔۔ دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

یہ تھا وہ مقامِ آدم، جسکی ملائکہ کے سامنے، دستِ یزداں نے خود نقاب کشائی کی۔

اقبالؒ نے پیامِ مشرق میں، اس منظر کو فارسی زبان میں پیش کیا ہے، اور اس سے بھی کہیں زیادہ جوش و جلال کے ساتھ۔ جی نہیں چاہتا کہ میں قارئین کو اس سے محروم رکھ کر آگے بڑھ جاؤں۔ میں نے اس منظر کو اپنے مقالہ "آدم کی کہانی" میں (جو اب میری کتاب — اقبال اور قرآن — میں شائع ہو چکا ہے) محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے مرحلۂ اولیں سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے لکھا ہے کہ "ہزارہا سال کی گردشوں کے بعد اس مشتِ خاک نے ایک متعین صورت اختیار کی۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بن گئیں۔ زمین کانپی، آسمان تھرتھرایا، چاند کا ساغرِ زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے ننھے سے دل دہل گئے، فضا میں ایک شور اٹھا اور:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل حذر اے پردگیاں، پردہ درے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر

تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اقبالؒ کی فارسی نظموں کا اُردو میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ میں یوں بھی اصل کی روح مسلی جاتی ہے۔ لیکن اس نظم کا ترجمہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار کو اردو دان طبقہ کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ وہ ترجمہ یہ ہے:-

عشق چیخ اُٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا حُسن کانپ اٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

فطرت آشفتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے ایک خودگر، خودشکن اور خودنگر پیدا ہوا

پہنچی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر پردہ دارو! ہوشیار! اک پردہ در پیدا ہوا

آرزو تھی زندگی کی گود میں سوتی ہوئی آنکھ کھولی، اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ تھی میں آب و گل میں مضطرب

ہائے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

علامہ اسلمؒ نے ان اشعار کے ترجمہ کے بعد، کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:-

مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے — لو! تمہارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا
چرخ سے آئی ندا اے ساکنانِ بحر و بر — اک جہانِ آشوب، ظالم فتنہ گر پیدا ہوا
جس کی خاطر یہ زمین و آسماں چکر میں تھے — مادرِ فطرت کا وہ نورِ نظر پیدا ہوا
تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش
آخر اس سازِ کہن کا زخمہ ور پیدا ہوا

آدم کے اس مقام سے آگاہ ہو جانے کے بعد ملائکہ کا جو ردِعمل ہو سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ قرآن نے اسے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

۲/۳۴ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ۔

ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ تسخیرِ فطرت کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں ملائکہ کا سجدہ کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ ہمارے ہاں تو سجدہ کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا ہے کہ نماز میں اپنی پیشانی کو زمین پر ٹکا دیا جائے لیکن سجدہ کے بنیادی معنی کسی کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا، کسی کی اطاعت اختیار کر لینا ہیں۔ قرآنِ کریم میں بیشمار مقامات پر یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ سورۃ النحل کی ان دو آیات کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ:-

ملائکہ کا سجدہ

وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّةٍ وَّالۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ۔ يَخَافُوۡنَ رَبَّهُمۡ مِّنۡ فَوۡقِهِمۡ وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ (۱۶/۴۹-۵۰)

"کائنات میں جو کچھ ہے، خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔ وہ ہمارے سامنے کی جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، سب قوانینِ خداوندی کے اطاعت گزار ہیں۔ وہ اس سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ وہ سرکشی برتنے کے انجام سے خائف رہتے ہیں۔ جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، وہ بلا چون و چرا اس کے مطابق عمل کرتے ہیں"۔ دوسری جگہ ہے اِنَّ الَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوۡنَهٗ وَلَهٗ يَسۡجُدُوۡنَ۔ (۷/۲۰۶)۔ "تیرے رب کے ہاں جو مخلوق ہے وہ اس کی محکومیت سے سرکشی نہیں برتتی۔ جو فرائض انہیں تفویض کئے گئے ہیں وہ ان کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں"۔ اِن آیات میں سجدہ کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس آیت (۲/۳۴) میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے تو آدم کو سجدہ کر دیا، لیکن ابلیس نے ایسا نہ کیا۔ اس نے اس سے انکار کیا، اور انکار ہی نہیں، اس سے سرکشی برتی، اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی آدم کی سرگزشت کا تذکرہ آیا ہے، وہاں اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے اس سے سرکشی برتی۔ [ملاحظہ ہوں آیات ۷/۱۱؛ ۱۵/۳۱؛ ۱۷/۶۱؛ ۱۸/۵۰؛ ۲۰/۱۱۶؛ ۳۸/۷۱-۷۴]۔ ملائکہ کے سجدہ اور ابلیس کے انکار و سرکشی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اگر قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے تو فطرت کی قوتیں، تمام کی تمام، اس کے سامنے جھک سکتی ہیں کہ وہ ان سے جس طرح جی چاہے کام لے۔ لیکن انسان کے اپنے جذبات، احکامِ خداوندی اور مستقل اقدار کی اطاعت سے سرکشی برتتے ہیں۔ اور یہی وہ گوشہ ہے جہاں ہدایت خداوندی کی ضرورت پڑتی ہے، اور جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام عقیدہ یہ ہے (اور اکثر تفاسیر میں بھی یہی لکھا ملتا ہے) کہ ابلیس ملائکہ ہی میں سے تھا — بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ معلم الملکوت (یعنی فرشتوں کا استاد) تھا۔ لیکن یہ خیال بالبداہت غلط ہے۔ ملائکہ کے متعلق تو قرآن کریم نے ہر مقام پر یہ کہا ہے کہ: هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹)۔ "ملائکہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے"۔ دوسری جگہ ہے: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶/۶)۔ "جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے وہ اس کے مطابق کام کرتے ہیں اور کبھی معصیتِ خداوندی اختیار نہیں کرتے"۔ لہٰذا جب ملائکہ کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہے تو ابلیس کس طرح ملائکہ میں سے ہو سکتا ہے، جس کا پہلی بار تعارف ہی یہ کہہ کر کرایا گیا کہ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ (۲/۳۴)۔ اور ہر جگہ اسے دہرایا گیا ہے۔ یہ غلط فہمی آیت (۲/۳۴) میں لفظ اِلَّا کے غلط مفہوم سے پیدا ہوئی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اور ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے نہ کیا۔ اس مفہوم کی رو سے ابلیس کو ملائکہ کے زمرے میں شمار کر لیا گیا۔ ہم عربی گرامر کی تشریحات میں الجھے بغیر "اِلَّا" کا مفہوم اردو زبان کی عام عبارات کی رو سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ "اور مرد تو آ گئے لیکن زید نہیں آیا"۔ اس سے واضح ہے کہ زید بھی ایک مرد ہے۔ یعنی وہ مردوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ "مرد تو سب آ گئے لیکن زینب نہیں آئی"، تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زینب مردوں میں سے نہیں، وہ کوئی اور جنس (عورت) ہے۔ آیت (۲/۳۴) میں "اِلَّآ اِبْلِيْسَ" کے یہی معنے ہیں۔ یعنی ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے اس سے انکار کر دیا۔ اس سے واضح ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا۔

ابلیس کا انکار

ہم نے یہ وضاحت اس غلط فہمی کے رفع کرنے کی غرض سے ضروری سمجھی ہے جو ہمارے ہاں متداول چلی آ رہی ہے، ورنہ ملائکہ اور ابلیس کا جو مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اس کے پیشِ نظر اس قسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا — ملائکہ فطرت کی قوتیں ہیں، ابلیس خود انسان کے اپنے سرکش جذبات۔

ابلیس کی سرکشی کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ایک ایسا عمیق نکتہ ہے جو ایک عظیم حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یعنی عقیدۃ

جبر و قدر کی، بالفاظِ دیگر، مسئلہ تقدیر کی۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ خدا نے ابلیس سے پوچھا کہ جب میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ کونسی بات تھی جس نے تجھے اس حکم کی تکمیل سے روکا۔ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ۚ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ (۷/۱۲)۔ "اس نے کہا کہ میرا مقام آدم سے بلند ہے۔ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے۔" میں اس "مٹی کے مادھو" کے سامنے کیوں جھکوں، جبکہ میں اس سے افضل ہوں۔ (نیز دیکھئے ۱۵/۳۳؛ ۱۷/۶۱؛ ۳۸/۷۵)۔ آپ

ابلیس اور عقیدۂ جبر و قدر

دیکھئے کہ ابلیس نے اپنے انکار کے جواز میں ایک دلیل پیش کی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے اس کا اعتراف و اقرار و اعلان کیا ہے کہ میں نے ایسا کچھ دیدہ دانستہ، اپنے اختیار و ارادہ سے، اپنے فیصلہ کے مطابق کیا ہے؛ اور وہ اس دلیل پر مبنی ہے کہ میں آدم سے افضل اور بہتر ہوں۔ ابلیس کی یہ دلیل غلط ہو سکتی ہے (اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ دلیل غلط تھی جس کی وجہ سے وہ اس قسم کی خود فریبی میں مبتلا ہو گیا)۔ لیکن اس سے اس نے اپنے آپ کو صاحبِ اختیار و ارادہ بتایا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے اس فیصلے اور اقدام کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ یہ فیصلہ اور اقدام "شیطان" کا تھا ـــــ یعنی انسان کے سرکش جذبات کا۔ لیکن جب اس کے بعد اس کے سامنے اپنے اس غلط فیصلے اور سرکش اقدام کے نتائج آئے تو اس پر مایوسی طاری ہو گئی۔ (یہ ابلیسیت کا مظاہرہ ہے) ــــــ اس مایوسی میں اس نے معذرتیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ لیکن اُسے اس کے سوا کوئی معذرت نہ مل سکی کہ وہ اپنے آپ کو مجبور ثابت کرے۔ قرآن کریم نے جہاں اس کی پہلی دلیل کو پیش کیا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ میں آدم کو کیوں سجدہ کروں، میں اس سے اعلیٰ ہوں۔ اس کے بعد کہا ہے کہ خدا نے اس سے کہا کہ جاؤ! تم راندۂ درگاہ ہو گئے۔ فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ (۱۵/۳۴)۔ "تم زندگی کی تمام شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم کر دیئے گئے ہو"۔ یہ تھے اس کے غلط فیصلے کے نتائج و عواقب۔ جب اس کے سامنے یہ نتائج آئے تھے تو اُسے چاہیئے تھا کہ جس دھڑلّے سے اس نے اپنی سرکشی کا اعلان کیا تھا اسی جرأت سے ان عواقب کا بھی سامنا کرتا۔ یہ اس کے کیریکٹر کی پختگی ہوتی۔ لیکن اس نے اس مقام پر بڑی پستی کا ثبوت دیا۔ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَيۡتَنِىۡ (۱۵/۳۹؛ ۷/۱۶)۔ اس نے کہا کہ "بارِ الٰہا! میں کون ہوں جو تیرے حکم سے سرتابی برتتا۔ مجھ میں اس کی تاب و مجال کہاں ہے۔ میں تو بندۂ مجبور ہوں۔ تیرے حکم کے بغیر تو ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ اس لئے میں خود گمراہ نہیں ہوا، مجھے تو نے گمراہ کیا ہے"۔ یہ تھی مایوس (ابلیس) کی پستی کردار، یعنی اپنے آپ کو مجبور قرار دیکر اپنی غلطی کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لینا۔ یہی پستی کردار اس کے راندۂ درگاہ ہونے کا موجب بنی۔

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی۔ اس نے خدا کے حکم سے معصیت برتی (۲۰/۱۲۱) اور ابلیس سے بھی معصیت ہوئی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے ندامت سے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا: رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ

اَنۡفُسَنَا۔ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (۷/۲۳) "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے خود اپنے خلاف زیادتی کی ہے، ہم سے بھول ہوئی، چوک ہوئی۔ اگر تو ہماری حفاظت کا سامان عطا نہیں فرمائے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

معصیتِ ابلیس و آدم میں فرق

اس کے جواب میں اس سے کہا گیا کہ آدم! تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اور آئندہ کیلئے محتاط رہنے کا وعدہ کر لیا۔ لہٰذا تمہاری اصلاح کا امکان ہے۔ اگر تم اس کے بعد ہماری راہنمائی کی پیروی کرو گے تو تم اس لغزش کے نقصان رساں نتائج سے بھی محفوظ رہو گے، اور آئندہ کے لئے بھی تمہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہوں گی"۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے اصلاح کا امکان اس شخص کے لئے ہے جو اپنے فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس جب ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے اپنے فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں ایسا کرنے والا کون ہوں، تو نے مجھے گمراہ کیا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں میں اصلاح کا امکان ہی نہیں ہوتا۔

اس سے آپ غور فرمایئے کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک ایک سانس میں دُہرایا جاتا ہے کہ ——— وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ——— سب کچھ خدا ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ انسان تقدیر کا پابند ہے۔ اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ قرآن کریم اس عقیدہ اور نظریہ کے متعلق کیا کہتا ہے، اس کے لئے مطالب الفرقان جلد اول میں آیات (۲/۱ تا ۲/۴) کی تشریحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔ نیز میری مستقل تصنیف ——— کتاب التقدیر ——— کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

اقبالؒ اور ابلیسی کردار

علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب "ضربِ کلیم" میں تقدیر کے عنوان سے ایک بڑی بلیغ اور دلکش نظم لکھی ہے جس میں ابلیس کے ان اقدامات اور ان کے نتائج کو بڑے حسین انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ آپ اُسے خود ملاحظہ فرمالیں۔ وہ نظم یہ ہے:-

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود

حرفِ "استکبار" تیرے سامنے ممکن نہ تھا ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد!

ابلیس
بعد ازاے تیری تجلّی سے کمالات وجود!

یزداں		(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے		کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود،
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام		ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!

(ماخوذ از محی الدین ابن عربی) [1]

اِسی سرگزشت سے ایک اور بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ ابلیس کی خطا فکر کی غلط بینی، یا بنائے استدلال کی کجی کا نتیجہ تھی۔ اِنسان میں اس قسم کی غلطیوں کا امکان ہے۔ ان کی تلافی کا طریق یہ ہے کہ جس وقت اس غلطی کا علم ہو جائے، اس سے رجوع کر لیا جائے۔ لیکن جس غلطی کا انسان اپنے آپ کو ذمہ دار ہی تسلیم نہ کرے، وہ اس کی جذباتی کجروی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں۔

پیدائشی امتیاز کا باطل نظریہ

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ابلیس کی پیش کردہ دلیل بڑی گمراہ کن تھی۔ اس نے اپنی برتری اور آدم کی کمتری کے لئے دلیل یہ دی تھی کہ میری پیدائش آگ سے ہوئی اور آدم کی مٹی سے۔ یعنی اس نے پیدائشی امتیاز کے تصور کو اپنے لئے وجۂ فضیلت قرار دیا تھا۔ قرآن کریم کی رُو سے پیدائشی تفریق و امتیاز کا نظریہ باطل ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ یکساں واجب التکریم ہوتا ہے (۱۷/۷۰)۔ برہمن، کشتری، ویش اور شودر کے امتیازات انسانوں کے خود ساختہ ہیں۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ مدارج کا معیار ہر شخص کے اعمال، یعنی اس کا کردار و عمل ہے (۴۶/۱۹)؛ (۴۹/۱۳)۔ لہٰذا یہ کہنا کہ میں پیدائش کی رُو سے کسی دوسرے انسان سے افضل و اعلیٰ ہوں، باطل نظریہ ہے۔

---

[1] حیرت ہے کہ ابن عربی نے ابلیس کے صاحبِ ارادہ اور اس کے بعد جبریت کو کس طرح موضوعِ سخن بنایا۔ وہ تو وحدۃ الوجود کا قائل ہی نہیں، السابق الاول ہے۔ اور وحدت الوجود کے عقیدہ کی رُو سے ابلیس کا الگ وجود تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ابن عربی نے تو فرعون کے متعلق کہا ہے کہ "اُسے ایک طرح سے حق حاصل تھا کہ کہے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی۔ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم۔ کلمۂ موسویہ)۔ بہر حال جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہے بڑا دلچسپ اور معنی خیز۔

آگے بڑھنے سے پہلے سجدہ کے متعلق ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ سجدہ کا مفہوم، کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرنا ہے۔ قرآن کریم نے انسان کے متعلق واضح طور پر کہدیا کہ اُسے صرف احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے،

سجدہ کا مفہوم

کسی اور کی نہیں۔ اسی کا نام عبادتِ خداوندی ہے۔ سورۃ حج میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (۲۲/۷۷) "اے جماعتِ مومنین! تم صرف اپنے رب کا رکوع و سجود و عبودیت اختیار کرو"۔ اس میں رکوع و سجدہ اور عبادت کو مرادف معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان تمام الفاظ سے مراد اطاعتِ خداوندی ہے۔ سورۃ النجم میں ہے: فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳/۶۲) "اللہ کو سجدہ کرو۔ یعنی اس کی محکومیت اختیار کرو"۔ یہاں سے بھی سجدہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد عبودیتِ خداوندی ہے۔ قرآن کریم نے شرفِ انسانیت کا بلند ترین مقام "عبدیت" بتایا ہے، اس نے دیگر انبیائے کرام کو بھی خدا کے عبد کہہ کر پکارا ہے۔ اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی لقب سے نوازا ہے۔ عبدیت کا مفہوم اس کتاب کی جلد اوّل میں آیات (۱/۴ و ۲/۲۳) میں واضح کیا جا چکا ہے۔ اس مقام پر اتنا دُہرا دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ کہا کہ ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے تو اس سے اس نے اس باطل نظریہ کی تردید کردی جس کی رو سے مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا سمجھ کر، انسان ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا۔ جہاں تک خود انسان کا تعلق ہے اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا. اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳/۷۹-۸۰) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ خدا اُسے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ عطا کردے، کہ وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کردے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی

مقامِ عبدیت کی سرفرازیاں

تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر کرتے ہو، ربّانی یعنی خدا کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار بن جاؤ۔ اُسے یہ بھی نہیں کہنا چاہیئے کہ تم ملائکہ کی پرستش شروع کردو یا نبیوں کو خدا بنالو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم تو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے کا عہد کرو اور وہ تمہیں کفر کی تعلیم دے، ایسا کسی کو نہیں کرنا چاہیئے"۔ یہ ہے مقامِ آدمیت یعنی کائنات میں، خدا کے قوانین کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرنا۔

شرک اس لئے جرمِ عظیم نہیں کہ اس سے (معاذ اللہ) خدا کو غصہ آجاتا ہے کہ تم نے اوروں کو میرے جیسا (خدا) کیوں تسلیم کرلیا؟ یہ اس لئے ظلمِ عظیم ہے کہ اس سے انسان شرفِ انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے۔ شرفِ انسانیت کا مقام یہ ہے

کہ انسان ایک خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر کے، ساری کائنات میں سرفرازانہ زندگی بسر کرے۔ یہی وہ توحید ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے۔ ۔ کہ انسان خدا کا عبد بننے کے بعد کس طرح ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس عبدیت کو سجدۂ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے   ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ہے وہ سجدۂ خداوندی، جس کا حکم قرآن کریم میں دیا گیا ہے، لیکن اب جس کا مفہوم، نماز میں اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دینے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نماز کا یہ سجدہ بھی ضروری ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ انسانی ارادہ اور اس کی جسمانی حرکات میں ایک خاص ربطِ باہمی ہے۔ اسے (PARALLELISM) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے[1]۔ جب آپ کسی کو سلام کہتے ہیں تو آپ کا ہاتھ غیر شعوری طور پر ماتھے کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ جب آپ کے دل میں کسی کے احترام کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو آپ کا سر خود بخود جھک جاتا ہے۔ خوشی کی خبر سن کر آپ کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ ندامت میں آپ کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ غصہ میں آپ غیر شعوری طور پر چلا کر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ محبت کا اظہار بڑی لطافت و نزاکت لئے ہوتا ہے۔ انسانی جذبات اور ان کے محسوس مظاہر کا یہ ربط غیر شعوری بھی ہے اور بڑا اہم بھی۔ آپ کسی شعلہ نوا مقرر سے کہیے کہ وہ اپنی تقریر کے دوران کسی قسم کی حرکت نہ کرے ساکت و صامت کھڑا ہوتا چلا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ چند منٹ تک بول کر رُکتا جائے گا۔ اور اس کی ان چند منٹ کی تقریر بھی بڑی غیر مؤثر ہوگی۔

خدا کی اطاعت کے جذبہ کے اظہار کے لئے اس قسم کے جسمانی مظاہر ناگزیر بھی ہیں اور ضروری بھی۔ ان کے بغیر انسان کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی جسمانی حرکات کو (FORMALISM) کہا جاتا ہے۔ یعنی رسوم و مظاہر۔ نماز میں قیام و رکوع و سجود،

رسوم و مظاہر

یا حج میں طوافِ کعبہ، انہی جذباتی تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ دین کے پروگرام میں ان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں یہ رسوم و مظاہر تو باقی رہ جاتے ہیں، اطاعت کی روح گم ہو جاتی ہے۔ اس میں سارا زور ان مظاہر کی باقاعدگی اور پابندی سے ادائیگی پر دیا جاتا ہے۔ اور اطاعتِ خداوندی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص نماز میں اس طرح سجدہ ادا کرے کہ اس کے ساتوں اعضاء ـــــ دونوں پاؤں کے پنجے، دونوں گھٹنے، دونوں ہاتھ اور ماتھا ـــــ زمین کے ساتھ لگ جائیں، اس کے متعلق کہا جاتا ہے

---

[1] ان حقائق کو جلد اول میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات (۱۲۳ - ۱۲۰)۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مقام پر ان کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے ـــــ اور ایسا تو مطالب الفرقان میں اکثر ہوتا رہے گا۔

کہ اس نے صحیح سجدہ ادا کر لیا خواہ اس سجدہ کی ادائیگی کے وقت وہ دل میں طاغوتی فیصلوں کے بروئے کار لانے کے پروگرام کی تفصیلات ہی کیوں نہ طے کر رہا ہو۔ ابلیس ان مظاہر کو کس طرح مزیّن بنا کر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق ہم، باب اول میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اقبالؒ نے اس سجدہ میں، جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶/۱۹)۔ یعنی "سجدہ کر اور خدا کے قریب ہو جا" اور ہمارے رسمی سجدوں میں بڑے دلکش انداز میں فرق کر کے بتایا ہے۔ وہ اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں:۔

مردِ آزادے چو آید در سجود   در طوافش گرم رو چرخِ کبود

وہ خدا سے آرزو کرتے ہیں کہ:۔

نہ خواہم ایں جہان و آں جہاں را   مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوزِ سرورش   بوجد آرم زمین و آسماں را

خدا کے حضور صحیح سجدہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں:۔

مسلمانیم و آزاد از مکانیم   بروں از حلقۂ نُہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے   بہائے ہر خداوندے بدانیم

یعنی وہ سجدہ، جس سے دنیا میں خدائی کے ہر دعویدار کی قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُسے کتنے میں خریدا جا سکتا ہے۔ کتنا بڑا ہے یہ مقام جو انسان کو، خدا کے حضور سجدہ عطا کر دیتا ہے۔ اور اس کے بعد اقبالؒ (ہماری موجودہ حالت پر اشکبار ہوتے ہوئے) بصد حسرت و یاس پکار اٹھتا ہے کہ:۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی ؛ اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

وہ مسلمان سے کہتا ہے کہ یاد رکھ!

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام ؛ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

آستانِ خداوندی پر سر جھکا کر دنیا کے بڑے سے بڑے آستانہ سے مستانہ وار، سرفراز و بے نیاز گذر جانا، یہ ہے اس سجدہ کا نتیجہ جو بارگاہِ خداوندی میں ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا نتیجہ۔

مذہب میں "عبادت" انفرادی ہوتی ہے لیکن دین تو اجتماعیت کا نظام ہے۔ اس میں ہر عمل کا نتیجہ، جہاں انسان کی اپنی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے، وہاں وہ دین کے نظام کے تمکّن کا ذریعہ بھی قرار پاتا ہے۔ اسی کو اجتماعیت کہتے ہیں، اور اسی قسم کا ہے وہ سجدہ، جس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ:۔

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو ؛ وہ سجدہ، جس میں ہے ملّت کی زندگی کا پیام

تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء اور اقبالؒ اور ان کے ہمنواؤں کے درمیان یہی نکتہ باعثِ نزاع تھا۔ ان علماء کا موقف یہ تھا کہ جب۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد اہلِ ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو اس میں مسلمانوں کو اعتقادات اور عبادات کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اس لئے، مسلمانوں کے لئے ان کی الگ آزاد مملکت کا مطالبہ اسلام کا تقاضہ نہیں۔ ان کے برعکس، اقبالؒ کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ اسلام ان انفرادی اعتقادات اور عبادات کا نام نہیں۔ اسلام اس دین کا نام ہے جس میں حکمرانی صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے اور اس کے لئے مسلمانوں کی آزاد مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت، جسے انہوں نے ان چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا تھا کہ:-

سیکولر نظام میں سجدہ کی اجازت

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ؛ نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

بہر حال، یہ گفتگو تھی اس سجدہ کے متعلق جس کا حکم اُمّتِ مسلمہ کو دیا گیا تھا۔ اس لئے ہم پھر اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں —— یعنی ابلیس و آدم کی آویزش کی طرف۔

ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ ابلیس نے سرکشی اختیار کی، اس پر ابلیس سے کہا گیا: قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ (۷/۱۸)۔ "خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ذلیل دھتکارا ہوا ہے۔ ذریتِ آدم میں سے جو تیرا اتباع کرے گا ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ دوسری جگہ ہے: قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (۳۸/۷۷)۔ "خدا نے اس سے کہا کہ تو یہاں سے نکل جا۔ تو قیامت تک (ہمیشہ ہمیشہ کیلئے) زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہے گا" (۳۸/۷۸)۔

ابلیس کے جرائم

واضح رہے کہ خدا نے ابلیس سے یہ کچھ جو کہا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے (خدا کو) (معاذ اللہ) غصہ آگیا کہ ابلیس نے اس کا حکم کیوں نہ مانا۔ غصہ تو انسانی جذبہ اور کمزوری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے منزہ اور بلند ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابلیس کی طرف سے جس پستیٔ کردار کا مظاہرہ ہوا، یہ اس کا فطری نتیجہ تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں سورۃ الفاتحہ کی تشریح کے ضمن میں بتایا گیا ہے، خدا کا غضب درحقیقت انسان کے غلط اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے۔ ہم بابِ اول میں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ سرگزشتِ آدم کا سارا بیان تمثیلی ہے اور اس کا انداز محاکاتی۔ لہٰذا خدا کی طرف سے ابلیس کو یہ حکم بھی تمثیلی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابلیس کی طرف سے کس قسم کی پستیٔ کردار کا مظاہرہ ہوا تھا جس کا فطری نتیجہ زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی اور ذلّت و خواری تھا؟ پہلی چیز تو یہ کہ اس نے

اپنے پیدائشی امتیاز کو وجہ فضیلت بنایا۔ یہ اس کی پست ذہنیت کی دلیل تھی۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے انکار کے لئے پہلے تو دلیل پیش کی جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ انکار اس نے اپنے ارادہ سے کیا ہے جس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اور اس کے بعد، جب اس انکار کے عواقب سامنے آئے تو عقیدۂ جبر میں پناہ لینے لگا اور اپنے اس انکار کا ذمہ دار اپنے بجائے خدا کو قرار دیدیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷/۶۲)۔ ابلیس نے خدا سے کہا کہ یہ مخلوق جسے تو نے میرے مقابلے میں واجب التکریم قرار دیا ہے؛ تو دیکھ کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں"۔ یہ جذبہ حسد ہے جو درحقیقت احساس کمتری کی دلیل ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کے نفسیاتی تجزیہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ سرکش اور مستبد حکمرانوں کا جذبہ رعونت اور انانیت، درحقیقت اُن کے احساس کمتری کی تخلیق ہوتا ہے۔ کمتری کا یہ احساس انہیں ہر وقت ستاتا رہتا ہے اور وہ اس کی تسکین دوسروں کو اذیت دیکر حاصل کرتے ہیں اسے اصطلاح میں (SADISM) کہا جاتا ہے۔ وہ جب تک قوت و اقتدار کے مالک رہتے ہیں، بڑے جری اور دلیر نظر آتے ہیں، لیکن جونہی ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے، وہ انتہائی درجہ کے بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے داستانِ صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کی ایک کڑی میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ فرعون کی فرعونیت تو ضرب المثل ہے۔ لیکن اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے چلا کر کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۰/۹۰)۔ "میں اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ اس خدا کے سوا، جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، کوئی خدا نہیں۔ اور اس طرح میں زمرۂ مسلمین میں شامل ہوتا ہوں"۔ بظاہر چاہیئے تو یہ تھا کہ خدا کی طرف سے اُسے شاباش دی جاتی کہ تو بالآخر ایمان لے آیا۔ تو نے بہت اچھا کیا۔ لیکن خدا کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا آٰلْئٰنَ۔ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ۔ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰/۹۱)۔ "تو ساری عمر حق و صداقت سے سرکشی برتتا رہا۔ ملک میں فساد برپا کرتا رہا۔ تیری سرکشی اور استبداد حد و د ناآشنا تھے۔ لیکن اب جب موت تیرے سامنے آئی ہے تو تو اس سے بچنے کے لئے ایمان کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تیرے کردار کی انتہائی پستی کی دلیل ہے۔ یہ ضعفِ خودی ہے۔ اس لئے تیرے اس اقرار و اعلان کا ہماری میزان میں "پرِکاہ جتنا بھی وزن نہیں"۔

مستبدوں کی بزدلی

یہی وہ کردار ہے جس کا مظاہرہ ابلیس کی طرف سے ہوا۔ اسی لئے خدا نے اس سے کہا تھا: اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (۷/۱۳)۔ "تو بڑا ہی پست فطرت ثابت ہوا ہے"۔ یہ ہیں وہ حقائق، جو ابلیس کو راندۂ درگاہ قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ دنیا کے بڑے بڑے سرکش اور مستبد فراعنہ کا صحیح کردار کس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

ابلیس کا جذبۂ انتقام

بہرحال، ابلیس کو جب اس طرح دھتکارا گیا تو وہ انتقام پر اتر آیا۔ اس نے بدرگاہِ خداوندی عرض کیا کہ آپ مجھے اور آدم کو رزم گاہِ حیات میں آزاد چھوڑ دیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں اُسے کس طرح ننگی کا ناچ نچاتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اس مقابلہ میں ایسا نہ ہو کہ جب میں اُسے پچھاڑ کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھوں تو آپ میرا ٹینٹوا دبا دیں۔ یہ تو منصفانہ کُشتی قرار نہیں پائے گی۔ آپ مجھے اس کا اطمینان دلا دیجئے کہ جب تک کرۂ ارض پر آدم کا وجود باقی رہے گا، مجھے بھی اس وقت تک مہلت دی جائے گی۔ قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی

قیامت تک مہلت

یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ۔ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ (۷/۱۴-۱۵)"۔ ابلیس نے کہا کہ مجھے آخری وقت تک مہلت دیجئے اور خدا نے اس سے کہا کہ ہمیں یہ شرط منظور ہے۔ تمہیں اور آدم کو برابر کی مہلت دی جائے گی"۔ یہی الفاظ دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں (دیکھئے ۱۵/۳۶؛ ۱۷/۶۲؛ ۳۸/۷۹)۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ابلیس کا محلِ انتقام بھی سراسر بے جا تھا۔ آدم نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس سے انتقام کس بات کا؟ اسے (ابلیس کو) شکایت یہ تھی کہ خدا نے آدم کو اس سے افضل کیوں قرار دیا ہے؟ اگر وہ اسے اپنے خلاف زیادتی سمجھتا تھا تو اسے اس کے لئے (معاذ اللہ) خدا سے انتقام لینا چاہیئے تھا۔ لیکن خدا کے سامنے پنجہ کشی کی تو اُسے نہ جرأت تھی، نہ اس کی ہمت۔ وہ اس کی (خدا کی) قوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے آدم (بیچارے) کو کمزور اسامی دیکھ کر اُسے، اپنی آتشِ انتقام کے فرو کرنے کا ذریعہ بنایا۔ یہ بھی اس کی پستیٔ کردار کی علامت تھی۔ دوں ہمت مستبد سرکشوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ طاقتور حریف کو تو کچھ نہیں کہتے۔ اپنا غصہ کمزوروں اور ناتوانوں پر نکالتے ہیں خواہ ان کا کوئی قصور بھی نہ ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید، انسانی کیریکٹر کی کمزوریوں کو کس طرح ابلیس کے روپ میں پیش کئے چلا جاتا ہے!

بہرحال، ابلیس نے خدا سے مہلت مانگی جو اُسے مل گئی۔ جب وہ اس سے مطمئن ہو گیا۔ تو اس نے اپنے چیلنج کو دُھرایا اور کہا کہ اب تو دیکھ کہ میں بنی آدم کو تیرے سیدھے راستہ سے بہکانے کے لئے کس کس قسم کی راہزنی سے کام لیتا ہوں۔ میں ان کے دائیں طرف سے حملہ کروں گا اور بائیں طرف سے۔ ان کے سامنے سے آؤں گا اور ان کے پیچھے سے۔ چاروں طرف سے انہیں گھیر لوں گا اور پھر تو دیکھے گا کہ ان میں اکثریت کس طرح تیری ناشکر گزار ہوتی اور میرے اشاروں پر ناچتی ہے (۷/۱۶-۱۷)۔ دوسرے مقام پر ہے کہ میں ان کے ہر غلط فیصلہ اور اقدام کو ان کی نگاہوں میں بڑا مزیّن بنا کر دکھاؤں گا اور اس طرح انہیں تیرے راستہ سے گمراہ کر دوں گا (۱۵/۳۹)۔ سورۃ صٓ میں ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ تو یہاں سے دور ہو جا! اور اس کے بعد اس کی مہلت طلبی کی درخواست کو منظور کر لیا گیا تو: فَبِعِزَّتِکَ ۔ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (۳۸/۸۲)"۔ اس نے کہا تیری عزت و جبروت کی قسم! تو دیکھ کہ میں انہیں کس طرح گمراہ کرتا ہوں"۔ اس آیت میں فَبِعِزَّتِکَ (۳۸/۸۲) کا لفظ بڑا ہی پُر معنی ہے۔

ابلیس خدا کے جلال و جبروت کا قائل ہے۔ اس کی لامحدود قوتوں کا معترف ہے۔ اس کی عزت و اقتدار کی قسم کھاتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ دیکھ! میں تیری اس چہیتی مخلوق کو کس طرح گمراہ کرتا ہوں؟ ابلیس کو یہ کہنے کی جرات کس وقت ہوئی؟ اس وقت جب خدا کی طرف سے اُسے یہ ضمانت مل گئی کہ اُسے اور آدم کو برابر کی مہلت دی جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی کشمکش اور آویزش میں خدا دخل نہیں دے گا۔ اور اس کے بعد جو خدا کی طرف سے کہا گیا، اور خود ابلیس نے بھی اس کا اقرار کیا کہ "خدا کے مخلص بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چل سکے گا" تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ بندے

خدا دخل نہیں دے گا

اپنے جذبات کو اقدارِ خداوندی کے ساحلوں میں محدود رکھیں گے اور شر کی قوتوں کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیں گے۔ یہ ان کی اس قوت کا نتیجہ ہوگا جو انہیں اقدارِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوگی۔ یہ نہیں کہ شر کی قوتوں کو خدا خود مغلوب کرے گا اور اس کا کریڈٹ (CREDIT) اس کے مخلص بندوں کو ملے گا۔ خیر و شر کی یہ کشمکش نہایت منصفانہ ہوگی۔ اس میں نہ کسی سے رعایت برتی جائے گی نہ کسی کا راستہ روکا جائے گا۔ یہاں، بلا رُو رعایت، قوت کا مقابلہ قوت سے ہوگا۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ ان امور کی تشریح باب اول میں، ابلیس کے عنوان میں ہو چکی ہے۔ اس میں البتہ ایک لفظ ایسا آیا تھا جس کی وضاحت کو ہم نے موجودہ مقام پر اٹھا رکھا تھا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ابلیس نے خدا سے کہا کہ تو مجھے یومِ قیامت تک مہلت دے اور پھر دیکھ کہ میں کس طرح لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷/۶۲)۔ اس میں اَحْتَنِكَنَّ کا لفظ غور طلب ہے۔ ابلیس نے کہا یہ کہ تو دیکھ کہ میں کس طرح اس پر کاٹھی ڈالتا ہوں۔ اسے اپنا مرکب بناتا ہوں۔ اس پر سواری کرتا ہوں۔ کسی کو اپنے

اِحتناک کی رسوائیاں

تابع فرمان بنانے کے لئے عام طور پر یہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن گھوڑے پر سواری کرنے کے بھی مختلف انداز ہوتے ہیں۔ ایک انداز تو یہ کہ گھوڑے پر نہایت خوشنما، قیمتی زین کسی جائے۔ اس کے منہ میں مرصع لگام دی جائے۔ ماتھے پر طاؤسی کلغی لگائی جائے اور اس انداز سے اس پر سواری کی جائے۔ سواری تو اس طرح بھی ہوتی ہے لیکن اس میں پھر بھی گھوڑے کا کچھ وقار قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف آپ اس منظر کو سامنے لائیے کہ گاؤں کے کچھ لڑکے کسی ٹٹو کو گھیر لیں۔ ان کے پاس نہ زین ہو نہ لگام۔ ایسے میں وہ کرتے یہ ہیں کہ کہیں سے کوئی ٹوٹی پھوٹی رسی لیکر اس سے گھوڑے کا منہ اور ٹھوڑی باندھ دیتے ہیں اور اُسے لگام کے طور پر ہاتھ میں تھام کر اس پر سواری کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ اس انداز کی سواری، اس گھوڑے کے لئے اذیت رساں ہی نہیں بلکہ اس کی ذلت و رسوائی کی تصویر بھی سامنے لاتی ہے۔ سواری کے اس انداز کو عربوں کے ہاں "اِحتناک" کہا جاتا تھا۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ ابلیس نے خدا سے جو یہ کہا کہ: اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷/۶۲) "یہ مخلوق جسے تو، اس قدر واجب التکریم بتا رہا ہے،

تو دیکھیگا کہ میں اس سے کس طرح احتناک کا سلوک کرکے اسے ذلیل و خوار کرتا ہوں"؛ تو اس کا عملی مفہوم کیا تھا۔

ضمناً۔ عصرِ حاضر کے ماہرین علم النفس کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ (SADISTIC TENDENCIES) رکھنے والے مستبد ارباب قوت (ڈکٹیٹروں) کا مسلک یہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالفین کو جسمانی اذیت دیکر ہلاک کریں۔ انہیں جتنی لذت اپنے سربفول کو ذلیل و خوار کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اتنی لذت ان کی موت سے نہیں ملتی۔ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رکھنا چاہتے ہیں، لیکن انتہائی ذلت و خواری کی زندگی میں! اس سے انہیں انتہائی سرور و کیف حاصل ہوتا ہے۔ ابلیس کے احتناک سے بھی مقصود ہے۔

بہرحال، ابلیس نے یہ کہا۔ اس پر بارگاہِ ایزدی سے جواب ملا کہ ہم جانتے ہیں کہ تو اس کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرے گا۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ۔ وَرَجِلِكَ۔ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ۔ وَعِدْهُمْ۔ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۷/۶۴)۔" ان میں بعض کو تم اپنے پروپیگنڈے کے زور سے گڑبڑا کر ان کے مقام سے ہٹا دو گے۔ جو اس طرح خائف نہ ہوں گے، ان پر بڑے بڑے لشکرے کر چڑھ دوڑو گے ــــ ایسے لشکر، جن میں سوار اور پیادے سب شامل ہوں گے ــــ بعض مقامات پر تم انہیں مالی امداد دینا شروع کردو گے اور انہیں کاروبار میں اپنا شریک کرلو گے اور اس طرح اقتصادی تغلب سے انہیں اپنا ہمنوا بنالو گے۔ بعض جگہ ایسی تعلیم گاہیں کھول دو گے جن سے ان کی آنے والی نسلیں خودبخود تمہارے رنگ میں رنگی جائیں۔ تم ان سے بڑے بڑے دلکش وعدے کرو گے حالانکہ تمہارے وعدے سب فریب پر مبنی ہوں گے۔ اور یہ تمہارے فریب میں آجائیں گے۔ یہ ہیں وہ طریقے، جنہیں تم بنی آدم کے 'احتناک' کے لئے اختیار کرو گے"! (جیسا کہ ہم پہلے باب میں ابلیس کے زیرِ عنوان لکھ چکے ہیں) یہ وہ ابلیسی حربے ہیں، جنہیں اقوامِ غالب، کمزور قوموں کو مغلوب کرنے کے لئے اختیار کرتی ہیں، اور عصرِ حاضر میں اس کے مظاہرے نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن ابلیس کے اس چیلنج کے جواب میں، ہر مقام پر یہی کہا گیا کہ: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۵)۔" میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا"۔ ــــ اور "عبادی" کی تشریح سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یعنی ایک خدا کی محکومیت اختیار کرکے، ساری کائنات پر حکومت کرنے والے۔

بہرحال، شیطان نے یہ چیلنج دیا، جسے خدا نے قبول کرلیا اور پھر:-

۲/۳۵ وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ۔ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ۔ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔

"اور ہم نے آدم سے کہا کہ تو اور تیری زوج، جنت میں رہو۔ اس میں سے جہاں سے جی چاہے، سیر ہو کر کھاؤ، پیو۔ پابندی صرف اتنی ہے کہ اس شجر کے قریب نہ پھٹکنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ بڑی زیادتی ہو جائے گی"۔ انہی الفاظ کو (۷/۱۹) میں بھی دہرایا گیا ہے۔ اور یہاں سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس "جنت" کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں، جہاں سے جی چاہے کھاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ۔ یعنی یہاں تمہیں، رزق فراوانی اور کشادہ سے ملے گا۔ اور اس میں میری اور تیری، کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ جہاں تمہیں بھوک لگے وہاں یہ رزق موجود ہوگا، اور کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ میری ملکیت ہے تم نے اسے کیسے لے لیا۔

ہم گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں کہ "سرگذشت آدم" میں انسانی زندگی کے اس قدیم دور سے آغازِ سخن کیا گیا ہے جب اس نے پہلے پہل، مل جل کر رہنا شروع کیا۔ یعنی قدیم قبائلی زندگی کا دور۔ ماہرینِ علم الانسان کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم قبائلی زندگی میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان کی زبان میں "ملکیت" کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔ اس میں "استعمال" کا لفظ ملتا ہے، "ملکیت" کا نہیں۔ اس دور میں آبادی ہنوز کم تھی اور زمین بڑی کشادہ۔ اس لئے سامانِ زیست کی بڑی فراوانی تھی۔ اور چونکہ کسی نے زمین پر لکیریں کھینچ کر ان خطوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں نہیں لیا تھا، اس لئے معاش کی کیفیت یہی تھی کہ جہاں سے کسی کا جی چاہے، پیٹ بھر کر کھالے ـــــ پیٹ بھر کر کھالے (رَغَدًا) کے معنی یہ ہیں کہ اس دور میں سامانِ رزق کے جمع کر کے رکھنے (HOARDING) کا تصور بھی نہیں تھا۔ رزق سے مقصود اپنی ضرورت پوری کرنا تھا، نہ کہ خزائن و دفائن کی رو سے دوسروں کو اس سے محروم رکھنا۔ یہ تھی وہ جنتی زندگی جس کا ذکر قصۂ آدم میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس جنت کی مزید تفصیل سورۃ طٰہٰ میں ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی ۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ "اس میں تمہیں نہ تو روٹی کی فکر ستائے گی نہ کپڑے کی، نہ پیاس کا خوف ہوگا نہ سورج کی گرمی کا۔ تمہارے لئے کھانے کو روٹی، پینے کو پانی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان، سب کچھ بلا تردد اور بلا مشقت موجود ہوگا"۔ لیکن ابلیس کی کوشش یہ ہوگی کہ تمہیں اس سے محروم کر دے۔ اس لئے کہیں اس کے پھندے میں نہ پھنس جانا (۲۰/۱۱۷)۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ تم ہماری راہنمائی کی پیروی کرو۔ یاد رکھو! وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، اور جس کی یہاں روزی تنگ

جنتِ آدم

ہو گی وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔" آپ نے غور فرمایا کہ آدم کی جنت کیا تھی اور ابلیس نے اُسے اُس جنت سے نکال دینے کے لئے کیا کیا ترکیبیں سوچی تھیں۔ پھر آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قوانینِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ رزق کی فراوانی بتایا ہے، اور ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ معیشت کی تنگی قرار دیا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے:-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲)

"خدا اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے رہنے والے نہایت امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس میں ہر طرف سے سامانِ رزق بڑی فراوانی سے چلا آتا تھا۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناشکر گزاری کی۔ ان سے کفر برتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اور یہ نتیجہ تھا ان کے اُس معاشی نظام کا، جسے انہوں نے خود وضع کیا تھا۔ خدا کا متعین فرمودہ نظام ایسا نہیں ہوتا۔"

وہ تھی آدم کی جنت، جس میں امن بھی تھا اور اطمینان بھی اور اس کے ساتھ رزق کی فراوانی بھی۔ اس کے بعد، جب انسانوں نے اپنا وضع کردہ معاشی نظام اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے امن بھی چھن گیا اور اطمینان بھی ——— اور بھوک کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔ یہ تھا آدم کا اس جنت سے نکل جانا، جس کا ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ ہم مطالب الفرقان جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۴ ص۲۹۶) وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ نظامِ خداوندی میں ذرائع رزق پر ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ زمین رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس سے مقصود یہ کہ تمام مخلوق کو ان کی ضرورت کے مطابق سامانِ پرورش میسر آتا ہے۔ یہ ہے نظامِ خداوندی۔ اس کے برعکس، انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے جس میں بالادست طبقہ، زمین کے لامحدود رقبوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتا ہے تاکہ زیر دست طبقہ اپنی روٹی تک کے لئے ان کا محتاج اور دست نگر رہے۔ اور پھر یہ (زبردست) لوگ، ان کمزوروں اور ناداروں کی احتیاج کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے رکھیں۔

مرد اور عورتیں دونوں

یہاں ایک اور حقیقت بھی غور طلب ہے۔ قرآن کریم نے جب جنتِ آدم کے متعلق کہا کہ اس میں "آدم اور اس کی زوج" دونوں یکساں طور پر رہیں گے تو اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ سامانِ زیست میں مردوں اور عورتوں، دونوں، کا حصہ ہو گا۔ یہ نہیں کہ مرد سامانِ زیست کا مالک بن بیٹھے اور عورت اس کی محتاج رہے۔

آیت (۲۰/۱۲۴) میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے اعراض برتیں گے ان کی روزی تنگ ہو جائے گی اور

وہ قیامت کے دن بھی اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ، جو قوم یہاں ذلت و خواری اور تنگی اور مفلسی کے عذابِ خداوندی میں مبتلا ہوگی وہ عاقبت میں بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۷۲/۱۷)۔ "یہاں کا اندھا، قیامت میں بھی اندھا ہوگا بلکہ اس سے بھی گیا گزرا"۔ اس سے واضح ہے کہ جو قوم اس دنیا میں ذلیل و خوار اور محتاج ہوگی (اور اس ہیچ زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہے گی) اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا :: جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا :: جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

چونکہ ہم اس موضوع پر جلد اول میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس لئے اس کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ آدم سے کہا گیا کہ تم اس جنت میں خوش و خرم رہو سہو۔ اس میں سے، جہاں سے جی چاہے، کھاؤ پیو۔ لیکن دیکھنا اس "شجر" کے قریب نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جنتی زندگی تم سے چھین لی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ "شجر" کونسا تھا جس کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا تھا؟ اس کی تفسیر میں بہت

شجر سے کیا مراد تھا

کچھ کہا گیا ہے۔ بائبل میں تو اسے "علم کا درخت" (TREE OF KNOWLEDGE) بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ تو بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے تو آدم کی پہلی خصوصیت ہی یہ بتائی ہے کہ اسے خدا نے تحصیلِ علم کی صلاحیت عطا فرمائی (۳۱/۲)۔ اور یہی علم تھا جسکی بنا پر اسے ملائکہ پر فضیلت حاصل ہوئی۔ قرآنِ کریم میں علم کی اس قدر فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس کی روشنی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ خدا نے آدم کو علم کے قریب جانے سے منع کر دیا تھا۔

بائبل میں یہ بھی ہے کہ وہ درخت "خیر و شر کی تمیز" کا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ اگر آدم کو خیر و شر میں تمیز کرنے سے روکا گیا تھا تو یہ مقامِ آدم کیا، حیوانات سے بھی پست سطح زندگی ہوئی۔ قرآنِ کریم کی رو سے تو قصۂ ابلیس و آدم سے بنیادی طور پر مقصود ہی خیر و شر کی تمیز ہے۔

یہ بائبل میں تھا۔ اور ہمارے ہاں یہ کہہ کر قصہ ہی ختم کر دیا گیا کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔[1] یہ مفہوم ایسا سطحی ہے کہ

---

[1] ان حضرات کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ گیہوں کا درخت نہیں ہوتا، پودا ہوتا ہے۔

اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

عربی زبان میں ہر وہ چیز، جو مجتمع ہو کر، کسی وجہ سے متفرق ہو جائے "شَجَرَ" کہلاتی ہے۔ درخت کو بھی شجر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جڑ اور تنے کی حد تک مجتمع ہوتا ہے اور اس کے بعد مختلف شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اسی لئے شَجَرَ بَيْنَهُمْ کے معنی ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا، تفرقہ پیدا کر لینا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)۔ "اے رسول! تیرا خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن قرار نہیں پا سکتے تاوقتیکہ یہ اپنے ان معاملات میں، جن میں یہ باہمی اختلاف کرتے ہوں، تجھے اپنا حَکَم تسلیم نہ کر لیں اور پھر اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے سے سرتابی تو ایک طرف، یہ اس سے اپنے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں۔ ان کا مسلک یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے سامنے، اپنا سر ہی نہیں، دل بھی جھکا دیں۔" اس آیت میں "شَجَرَ بَيْنَهُمْ" کا مفہوم واضح ہے۔ "مُشاجرت" کہتے ہی باہمی منازعت اور مخاصمت کو ہیں۔

"شَجَرُ" کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی کسی شئے کا پہلے مجتمع ہونا اور پھر پھٹ کر الگ الگ ہو جانا۔ باہمی تفرقہ پیدا کر لینا۔ قرآن کریم میں نوعِ انسان کی ابتدائی زندگی اور اس کے بعد اس مشاجرت کے متعلق سورۃ یونس میں کہا ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹)۔ "شروع میں تمام نوعِ انسان، امت واحدہ تھی۔ یعنی ایک عالمگیر برادری۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔" اور دوسری جگہ کہا ہے کہ ان کے اختلافات کو رفع کر کے انہیں پھر سے امتِ واحدہ بنا دینے کے لئے خدا نے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت شروع کیا (۲/۲۱۳)۔ اس سے اُس مشاجرت کا نقشہ سامنے آ گیا جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا۔ اس سے کہا یہ گیا تھا کہ تم ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا۔ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا۔ اگر تم نے ایسی روش اختیار کر لی تو یاد رکھو! اِس جنتی زندگی کا سارا نقشہ بگڑ جائے گا۔ کوئی شئے اپنے مقام پر نہیں رہے گی۔ (ظلم کے بنیادی معنی یہی ہیں) تمہاری معیشت تنگ ہو جائے گی۔ افلاس اور بھوک عام ہو جائے گی۔ تم طبقات میں بٹ جاؤ گے اور تم میں جنگ و جدال شروع ہو جائیں گے، اور ملائکہ نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ یہ نئی مخلوق فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں شروع کر دے گی، وہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔ یاد رکھو! ابلیس کی پوری پوری کوشش یہ ہو گی کہ تم میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے۔ تم خاندانوں، قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں بٹ جاؤ اور پھر ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہو جائے۔ دیکھنا، ایسا نہ کرنا، ورنہ یہ جنت چھن جائے گی

اور دنیا جہنم بن جائے گی۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ابلیسی سازش کی تمام تفاصیل کو کس طرح ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ "مشاجرت" یعنی نوعِ انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اِسی بنا پر اقبالؒ نے (جاوید نامہ میں) ابلیس کو "خواجۂ اہلِ فراق" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ "تفرقہ ڈالنے والوں کا سرخیل"۔

اور اس کے بعد ہے:۔

۲/۳۶ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا۔ فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔

"شیطان نے ان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دی، وہ پھسل گئے"۔ ایک جگہ ہے: وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۲۰/۱۲۱)۔ "اور آدم نے ارشادِ خداوندی سے معصیت کی اور اس طرح صحیح راستہ سے بھٹک گیا"۔ دوسری جگہ ہے: فَنَسِيَ۔ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۲۰/۱۱۵)۔ "آدم نے صحیح راستہ کو ترک کر دیا۔ ہم نے اُسے پختہ ارادے والا نہ پایا"۔

ابلیس نے آدم سے کہا کہ: مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۷/۲۰)۔ "خدا نے جو تمہیں اس شجر کے قریب جانے سے منع کر دیا ہے تو یہ اس لئے کہ تم کہیں ملائکہ نہ بن جاؤ یا تمہیں حیاتِ جاوداں حاصل نہ ہو جائے"۔ دوسری جگہ ہے: قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰/۱۲۰)۔ "شیطان نے آدم سے کہا کہ میں تجھے ایک ایسے درخت کا پتہ نشان بتاتا ہوں جس کا پھل کھانے سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے گا اور ایسی مملکت مل جائے گی جس پر کبھی زوال نہ آئے گا"۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ حیاتِ دوام کی خواہش اس کے دل میں ہمیشہ انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ آبِ حیات کی تلاش اور خضر و سکندر کی ملاقاتوں کے افسانے، اس کی اس خوابیدہ آرزو کی بیدار تعبیریں ہیں۔ لیکن اس کی یہ آرزو، نہ آج تک پوری ہوئی ہے نہ ہوگی۔ جو انسان اس دنیا میں آیا وہ موت کا شکار ہو گیا۔ لہٰذا طبعی طور پر تو کسی فرد کا ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے اس کے خود غرضی کے جذبات نے ایک اور راہ سجھائی اور اس سے کہا کہ تم اپنی اولاد کے ذریعے مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکتے ہو۔ اولاد سے تمہارا نام روشن ہوگا۔ یہ وہ "بُوٹا" ہے جو آگے چلتا ہے۔ اولاد سے خاندان کی طرح پڑتی ہے۔ خاندان پھیل کر قبیلہ بنتا ہے۔ قبیلہ کی وسعتیں، نسل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کے ذریعہ ان کے مورثِ اعلیٰ، ان کے آباؤ اجداد، ان کے اسلاف کا نام روشن رہتا ہے۔ ابلیس نے آدم کے کان میں یہی افسوں پھونکا۔ اس نے کہا کہ عالمگیر برادری کا تصوّر

حیاتِ جاوید بوساطتِ اولاد ایک فریب ہے۔ انسانیت کے ہجوم میں گم ہوکر، ایک فرد اپنا جداگانہ تشخص کھو دیتا ہے۔ اس اژدحام میں تمہیں حیاتِ دوام کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ اس کا ذریعہ تمہاری اولاد ہے اور اس کے بعد اولاد در اولاد کا منفرد اور متمیز سلسلہ۔ یہ ہے وہ ابلیسی وسوسہ، جسے قرآن کریم نے "جنسی اختلاط" کی ایمائیت (SUGGESTIVENESS) سے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (۷/۲۰-۲۱)

"شیطان نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ خدا نے جو تمہیں کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا چاہیئے تو اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ تم کہیں بہت بڑی قوتوں کے مالک نہ بن جاؤ، یا حیاتِ جاوید حاصل نہ کرلو۔ تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں اس کا طریق بتاتا ہوں، تم زندہ رہ سکتے ہو۔ اپنی اولاد کے ذریعہ۔ یوں وہ افزائشِ نسل کو مقصودِ حیات بتاکر، انسان کو حیوان کی سطح پر لے آیا اور زندگی کے بلند مقصد کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کردیا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیرخواہی کیلئے کہہ رہا ہوں"۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۷/۲۲)۔

"چنانچہ اس نے اس قسم کی باتوں سے انسان (مرد اور عورت) کو بہکا دیا اور انہیں ان کے مقامِ بلند سے گرا دیا۔ ان کے ستر کے مقام بے پردہ ہوگئے اور (چونکہ انسانی سطحِ زندگی پر حیا کا جذبہ بھی نمودار ہو جاتا ہے اس لئے (تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ) انہوں نے ستر کے ان مقامات کو پتوں سے چھپانے کی کوشش کی۔ اس پر خدا نے ان سے کہا کہ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ تم انسانی زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر، حیوانی سطحِ زندگی پر نہ آجانا؟ میں نے تمہیں (WARN) کردیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے فریب میں مت آجانا"۔ اسی حقیقت کو آیت (۲۰/۱۲۱) میں بھی دھرایا گیا ہے۔

یہ تھا وہ فریب، جس سے انسان کے پست جذبات نے اسے، بلند انسانی سطح سے گرا کر زندگی کی حیوانی سطح پر پہنچا دیا۔

یاد رہے کہ جنسی جذبات کی تسکین اور افزائش نسل (اولاد پیدا کرنا) معیوب و ممنوع نہیں۔ قرآنِ کریم نے تو انہیں وجۂ زینت قرار دیا ہے (۱۸/۴۶)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہدیا ہے کہ اگر مال اور اولاد تمہارے بلند انسانی مقاصد کے راستے میں حائل ہو جائیں تو یہ بہت بڑا فتنہ بن جاتے ہیں (۸/۲۸)۔ بہر حال، یہ ہے آدم کے "ستر کھل جانے" کا وہ مفہوم، جو ہم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ ابلیس کی افسوں سازی سے آدم کے مقاماتِ ستر برہنہ ہو گئے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ محض افزائش نسل کو مقصودِ حیات سمجھ لینے کے معیوب اور مذموم نتائج جب انسان کے سامنے آئے تو، بجائے اس کے کہ وہ اس روشِ زندگی کو ترک کر دیتا، اس نے ان عیوبِ برہنگی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ذاتوں، برادریوں، نسلوں اور نسل کی بنا پر قومیتوں کے جس قدر فوائد گنائے جاتے ہیں، وہ انہی عیوب کی پردہ پوشی کی ناکام کوششیں ہیں۔

بہر حال، قرآنِ کریم نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ انسان سے کہا یہ گیا کہ تم ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ اس سے تمہاری زندگی جنت کی خوشگواریوں کی حامل رہے گی۔ لیکن اگر تم نسل پرستی کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو اس سے یہ جنت تم سے چھن جائے گی۔ اگر تم نے اس نسل پرستی کو منطقی دلائل کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی تو یہ خود فریبی ہو گی۔ اس سے تم انسانیت کے بلند مقام سے نیچے گر جاؤ گے۔ اسی کو "ہبوطِ آدم" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا ذکر اسی آیت کے اگلے حصّہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔

آیۂ زیرِ نظر میں ایک لفظ ایسا ہے جس میں حقائق کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (۲/۳۶) اس میں "هُمَا" کی ضمیر وہ نقطہ ہے جس میں (جیسا کہ ہم نے کہا ہے) بڑے اہم اور بصیرت افروز حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان نے ان دونوں (مرد اور عورت) کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دی۔[1]

بائبل میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آ گیا۔ اس بنا پر عیسائیت

---

[1] دیگر زبانوں میں واحد اور جمع، دو صیغے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں تین — یعنی واحد (ایک کے لئے)۔ تثنیہ (دو کے لئے) اور جمع (دو سے زیادہ کیلئے)۔ ضمیر (هُوَ) واحد غائب (مذکر) ضمیر ہے جس کے معنی ہیں "وہ ایک"۔ هُمَا ضمیر تثنیہ غائب (مذکر اور مؤنث) ہے جس کے معنے ہیں "وہ دونوں"۔ اور هُمْ ضمیر جمع غائب (مذکر) ہے جس کے معنی ہیں "وہ سب"۔ قرآنِ کریم میں لغزشِ آدم کے سلسلہ میں هُمَا کی ضمیر آئی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ شیطان نے آدم اور اس کی زوج (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا۔

عیسائیت میں عورت کا مقام

گناہِ اوّل کا مجرم عورت کو قرار دیتی ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے۔ اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت دنیا میں تمام مصائب کا سرچشمہ ہے، اس لئے انتہائی قابلِ نفرت مخلوق۔ عیسائیت کا مقدس لٹریچر، عورت کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو ملعون و مردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تجرد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرد کی زندگی کو وجہ تقرب خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں، ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں یعنی "جنسی آلائش" سے دور رہتی ہیں۔ دنیائے عیسائیت میں، صدیوں تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ "جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ، میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی شدہ رہیں"۔ اس کے بعد اُس نے کہا:۔

> آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گرجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے۔ انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رُو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کمتر درجہ پر رہنا چاہیئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جا کر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے۔ (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت، شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے"۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جا سکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ پھر حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کیا جائے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے ساتھ ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی، مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر و تانیث کا امتیاز ہی اٹھ جائے گا۔[1]

عورت کی حیثیت خود ہمارے ہاں

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بدقسمتی کہ خود ہم (مسلمان) بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے ان عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام کا جزو بنا کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب "WOMAN IN ANTIQUITY-BY CHARLES SELTMAN".

تھا کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور، خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ:-

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے اُن سے انس و محبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرتِ حوّا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرتِ آدم علیہ السلام کو جنّت میں جگہ دی گئی لیکن تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوّا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو اور کیوں پیدا کی گئی ہو۔ حضرت حوّا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔ [1]

دوسری جگہ ہے کہ:-

صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تُو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اُٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ [2]

اس تفسیر اور روایات کی رو سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا)۔ ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس کی کجی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہئے۔

---

[1] ترجمہ اُردو مولانا محمد جوناگڑھی پارہ اول ص۸۵۔

[2] " " " " " پارہ چہارم ص۲۶۔

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس "ٹیڑھی پسلی" کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پا گئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ سورۃ النساء میں ایک آیت ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۳۴/۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "مرد عورتوں پر حاکم یا داروغہ ہیں"۔[1] اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (سورۃ النساء پارہ پنجم) میں ہے کہ:

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اُسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری، اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا، جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپ نے فرمایا اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا۔ (ص ۲۰)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی۔ یعنی (اس روایت کی رُو سے)..... حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ:

ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لونڈیوں[2] کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ آئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دیدی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔

---

[1] اس کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

[2] بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔ کیا انہی کو "لونڈیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے؟

حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروقؓ اعظم کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاکی ہوگئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے اشعثؓ: تین باتیں یاد رکھ؛ جو میں نے آنحضرتؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (صـ ۲۰-۲۱)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:۔

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے۔ تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کردے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں (صـ ۲۱)۔

یہ تو (ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب کی رو سے) عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتب روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ:۔

حضرت ابوہریرہ مروی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری۔ کتاب پیدائش انبیاء)

دوسری روایت ہے:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں۔ (بخاری کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا"۔ (بخاری کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔[1] (بخاری۔ کتاب الانبیاء)۔

---

[1] ایک طرف کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"؛ اور دوسری طرف بتایا جاتا ہے (بقیہ بر صفحہ ۱۲۲)

یہ روایات وضعی ہیں

صاف نظر آ رہا ہے کہ اس مقصد کے پیشِ نظر، کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کر سکیں کہ بائبل میں یا عیسائیت کے عقائد کی رُو سے عورت کو کس قدر قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے خاص سازش کے ماتحت اس قسم کی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا کیا ہی تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ان وضعی روایات کو احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قرار دیکر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی روایات کی نسبت، حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف کس طرح صحیح قرار پا سکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو "سوختہ بخت" یہ کہدے کہ ایسی روایات کی نسبت، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اُسے "منکرِ حدیث" قرار دیکر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں!

ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات اور تفاسیر کا اثر آگے بھی بڑھنا تھا۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے "احکامِ شریعت" میں دیکھئے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے۔ شریعت سے آگے بڑھ کر، تصوف کی طرف آیئے تو وہاں عیسائیوں کے (SAINTS) کے خیالات صوفیائے کرام میں عام نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی تجرد کو متاہل زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ عورتوں کے متعلق حضرت علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کا ارشاد ہے کہ:-

> بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا، اس کا اصل سبب عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل و قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں[1]۔

روایات و تفاسیر اور شریعت و طریقت سے جب بات آگے بڑھ کر شاعری تک پہنچی تو پھر ——— اللہ دے اور بندہ لے ——— پوچھئے مت کہ اس مجبور و مقہور مخلوق کے خلاف کیا کیا نہ کہا گیا۔ ارشاد ہوا:-

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن   کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن
اگر نیک بودے سر احوال زن   زناں را مزن نام بودے نہ زن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) کہ حضورؐ نے جہنم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں، دنیا میں "مائیں" نہیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں ——— اگر سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی ——— تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے تو جنت تھی لیکن وہ خود جہنم میں تھیں! صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات کو پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں "بیوی" ہوتی ہے۔ عورت کی کوئی اور پوزیشن نہیں ہوتی ——— اور "بیوی" ہمارے اربابِ شریعت کے نزدیک جنس کا رسد سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

[1] یہ اقتباس غالباً "کشف المحجوب" کا ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہفتہ وار مجلہ "منہاج"، لاہور کی اشاعت بابت ۱۲ ستمبر ۱۹۵۸ء سے لیا ہے۔

مثنوی، ایمن از ان کہ زن پارساست　　　کہ خرسندہ بہ، گرچہ، وزدآشناست[1]

قرآن کریم نے نہ تو کہیں یہ کہا ہے کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اور نہ ہی یہ کہ گناہ اول کا موجب عورت تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (۲/۳۶)۔ شیطان نے عورت کو نہیں بہکایا۔ عورت اور مرد دونوں اس کے فریب میں آگئے۔[2] اس سے آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے مرد اور عورت، دونوں کی حیثیت یکساں قرار دی ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے" تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

مرد اور عورت ہم دوش

قرآن کریم نے ان دونوں کی حیثیت یکساں قرار دی ہے اور انہیں یکساں انسانی صلاحیتوں کا پیکر بنایا ہے۔ اس موضوع پر، ہم تفصیل سے تو اس کے اپنے مقام پر لکھیں گے۔ اس وقت صرف دو ایک آیات ملاحظہ فرمایئے:-

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ۔ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ۔ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ۔ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ۔ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ۔ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ۔ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ۔ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ۔ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۳۳/۳۵)

"اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ)۔ اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ)۔ اگر مرد اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ)۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں

---

[1] میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ اشعار نظامی گنجوی کے ہیں یا فردوسی کے۔ بہرحال یہ ہیں ہمارے ہاں رائج۔

[2] جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے قرآن کریم نے اس کے لئے تثنیہ کا صیغہ (یا ضمیر) استعمال کیا ہے۔ جہاں واحد کا صیغہ ہے وہاں بصراحت آدم کہا گیا ہے۔ (دیکھئے ۲۰/۱۱۵ و ۲۰/۱۲۱)

اُن کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں، تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) - اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے ..... (وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ) - اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ) - اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ) - اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں، دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا) -

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی کی جنت میں (وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴)) - ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں گا۔ (لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳/۱۹۴)) -

اس میں شبہ نہیں کہ تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مختص ہیں۔ (مثلاً جنین کی حفاظت، بچہ کی پرورش اور ابتدائی تربیت وغیرہ) اس کے لئے اس کی جسمانی ساخت کے بعض گوشے بھی مردوں سے مختلف ہیں اور نفسیاتی طور پر بھی بعض ایسی منفرد خصوصیات، جو اس کے ان فرائضِ زندگی کی ادائیگی کے لئے معاون بن سکیں۔ مثلاً بچے کے لئے محبت اور پیار کا جذبہ اور ایثار و شتربانی کی صلاحیت۔ ایثار اس قسم کا کہ جنین ماں کے خون سے مترتب ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کا انحصار ماں ہی کے عطا کردہ رزق (دودھ) پر ہوتا ہے۔ ماں میں سہار اور برداشت کا مادہ اس قدر فراواں ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ہر قسم کے تقاضہ کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے پورا کئے جاتی ہے اور اس کے لئے اس سے کسی صلہ یا معاوضہ کی متمنی نہیں ہوتی۔ یہ، اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات ہیں۔

جن میں عورت منفرد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کارفرمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے امتِ مسلمہ (مملکتِ اسلامیہ) کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ اس میں اس نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹/۷۱)۔ "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے اور زکوٰۃ دہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اللہ اپنی رحمتوں کے سایۂ عاطفت میں رکھے گا اور یہ سب اس کی بے پایاں قوت و حکمت کی رو سے ہوگا۔" آپ سوچئے کہ اس سے بڑھ کر (مردوں اور عورتوں کی) مساوات کی شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے؟

اس ضمنی گوشے کے بعد پھر آیئے اصل موضوع کی طرف۔ آیت (۲/۳۶) پہلے پوری درج کی جا چکی ہے۔ اس میں خدا نے آدم سے کہا تھا کہ تم نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ اس سے تمہاری جنتی زندگی برقرار رہے گی۔ لیکن اس کی خود غرضی کے جذبات نے اُسے بہکا دیا اور اس نے نسلی امتیازات کی رو سے اس برادری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ہبوطِ آدم سے مُراد

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس جنت سے نکال دیا گیا۔ قرآن کریم میں اسے "ہبوط" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اور اس کے بعد (۲/۳۸) اور (۲/۱۲۲) میں بھی "ھبوط" کے معنے ہوتے ہیں کسی بلند سطح سے پست سطح کی طرف آجانا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی، جس میں نوعِ انسانی ٹکڑوں میں نہیں بٹی تھی اور اس طرح ان میں میری اور تیری کی تمیز پیدا نہیں ہوئی تھی، بلند سطح زندگی تھی ——— ایسی زندگی جس میں کسی فرد کو اپنی طبیعی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے کوئی تردد نہیں تھا۔ نہ ہی اُسے کسی قسم کا خوف اور حزن تھا۔ وہ اس بلند مقام سے نیچے گرا۔ اس کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کا ایک گروہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس سے قتل و غارت گری عام ہوئی۔ دوسری طرف "میری اور تیری" کی تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالادست گروہوں نے وسائلِ رزق کو اپنے قبضہ میں لے لیا جس سے زیر دست گروہ نانِ شبینہ تک کے لئے ان کے محتاج ہو گئے۔ قرآن کریم نے اس پست سطحِ زندگی کا نقشہ اِن دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ:۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) "تمہارا ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن اور حریف بن جائے گا"۔ یہی الفاظ

غیر اشتراکی مملکتیں ہیں جن کے قریب ۷۵ کروڑ شہری، دنیا کے ذرائع پیداوار کا بیشتر حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ یہ لوگ باقی دنیا کے لئے سازوسامان تیار کرتے ہیں اور اس سے حاصل کردہ دولت کی بنا پر، ایسے بلند معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے مدمقابل ایک سو ترقی پذیر (UN-DEVELOPED) غریب مملکتوں کی قریب ڈیڑھ ارب آبادی ہے جس میں سے کروڑوں نفوس بھوک اور امراض کی وجہ سے موت کے سائے تلے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس وقت تک یہ تصادم بین الاقوامی مذاکروں میں تقریروں اور قراردادوں، تجویزوں اور معاشی مشوروں تک محدود ہے۔ لیکن ان محروم قوموں کا دباؤ اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ بعض مغربی سیاستدان اسے پوری کی پوری نسلِ انسانی کے لئے "ٹائم بم" قرار دے رہے ہیں۔ ان سیاستدانوں میں مملکت برطانیہ کا وزیر (REG PRENTICE) جیسا مدبر بھی شامل ہے۔ خطرہ کے اس بڑھتے ہوئے احساس کا نتیجہ ہے کہ بعض سیاستدانوں کا خیال ہے کہ ان مفلس اور نادار قوموں کے ہاتھ میں اگر ایٹمی توانائی کے بم آ گئے تو یہ دولتمند قوموں کو چیلنج دیدیں گے کہ یا تو اپنی جمع شدہ دولت ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم پورے کرۂ ارض کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بھی یہ قومیں دنیا کے معاشی نظام کو تو... تہ و بالا کر کے ضرور رکھ دیں گی۔

اوائل فروری ۱۹۷۶ء میں، منیلا کے مقام پر، اقوامِ متحدہ کے زیر اہتمام، ان ۷۷ اقوام کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو معاشی امور میں ترقی پذیر اقوام سے بہت پیچھے (UN-DEVELOPED) ہیں۔ اس کانفرنس کے چیرمین ... دفرڈینینڈ مارکس) نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ دنیا کی آبادی کا ستر فی صد حصہ غریبوں پر مشتمل ہے:-

اگر دنیا کے ذرائع رزق کی منصفانہ تقسیم نہ ہوئی تو سوال یہ نہیں ہوگا کہ "ایسا ہوگا یا نہیں"؛ سوال یہ ہوگا کہ ایسا کس وقت ہوگا کہ دنیا کے غریب اٹھیں گے اور دولتمند کو چیلنج دیں گے کہ ان ذرائع رزق سے ہمارا پورا پورا حصہ ہمارے حوالے کرو۔ یاد رکھو! "جنگ یا موت" کا تباہ کن خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز، ۳ فروری ۱۹۷۶ء)

اقبالؔ نے بہت پہلے، استحصال پسند اقوام سے کہہ دیا تھا کہ یاد رکھو! خدا نے ملائکہ کو حکم دے دیا ہے کہ:-

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

وہ وقت اب آ گیا ہے۔

بہرحال، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کی یہ محسوس و مشہور تفسیر ہم سب کے سامنے ہے، اور یہ پیدا کردہ ہے اس مشاجرت کی، جس کے تباہ کن نتائج سے قرآنِ کریم نے آدم کو آگاہ کیا تھا۔

آدم سے کہا گیا کہ تم نے بہر حال ایک مدت تک کے لئے اس زمین پر زندگی بسر کرنی ہے۔ اس سے تمہیں مفر نہیں۔ لہٰذا تمہارے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ تم اسی قسم کی کرب و اذیت کی جہنمی زندگی بسر کرنا چاہوگے یا ایسی زندگی، جو پھر سے تمہارے فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا موجب بن سکے۔

قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶)۔ "مستقر" کا لفظ کس قدر حقیقت کشا ہے، اسے ہم جلد اول میں (نظریۂ ارتقاء کے تحت) واضح طور پر بیان کر چکے ہیں (ملاحظہ ہوں آیات ۲/۱؛ ۲/۲؛ ۳/۴)۔ اس کے علاوہ اس کا ذکر، اسی جلد کے باب اول میں بھی آچکا ہے۔ اگر کوئی شے ایک ہی مقام پر ٹھہری ہوئی ہو تو اُسے جامد کہا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ایسی شے ہو جو حرکت کرتی چلی آ رہی ہو اور کچھ وقت تک سستانے کے لئے کسی ایک مقام پر ٹھہر جائے، اور اس کے بعد اسے پھر آگے چلنا ہو، تو اس کی اس وقتی آرام گاہ کو اس کا مستقر کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں زندگی کے ارتقائی مراحل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور مغرب کے اُس مادی نظریہ کی تردید بھی کر دی جس کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اس کے سفرِ ارتقاء کی آخری منزل ہے، اس کے بعد اسے آگے نہیں بڑھنا۔ قرآن کریم نے کہا کہ تم نے کرۂ ارض پر کچھ وقت کے لئے زندگی بسر کرنی ہے۔ یہ زندگی اس نہج کی بسر کرو کہ تمہاری موجودہ ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی تم اس قابل بھی بن جاؤ کہ زندگی کی اگلی منزلیں بھی بحسن و خوبی طے کر سکو۔

اس آیت میں دوسرا لفظ "متاع" آیا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں، وہ سامان جو ضروریاتِ سفر کے لئے کافی ہو۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ اس چیز کو کہتے ہیں، جس سے تھوڑے سے وقت کے لئے فائدہ حاصل کیا جائے۔ (تمتّع کے معنی فائدہ حاصل کرنے (UTILITY) کے ہیں، ملکیت کے نہیں) اس سے بھی قرآن کریم نے اپنے پیش کردہ معاشی نظام کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی یہ بتا دیا کہ دنیا میں سامانِ رزق فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہے، ملکیت میں لینے کے لئے نہیں۔ اور اس فائدہ حاصل کرنے میں تمام بنی آدم یکساں طور پر شریک ہیں، کیونکہ اس کا خطاب آدم سے ہے ——— یعنی پوری نوعِ انسان سے۔

سوال یہ ہے کہ اس تنذیر کے بعد آدم کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا یا اسے یہ بھی بتایا گیا کہ جو جنت اس سے چھن چکی ہے اس کی بازیابی کی کوئی صورت بھی ہے؟ اُسے یہ بتایا گیا، کیونکہ ابدی مایوسی تو ابلیس کے لئے تھی جس میں اصلاح کی صلاحیت نہیں تھی۔ آدم میں اصلاح کی گنجائش تھی اس لئے اسے اپنی اس محرومی کو فائز المرامی میں بدلنے کا طریق بتایا گیا۔ اور وہ اگلی آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے:-

۲/۳۷ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ۔ فَتَابَ عَلَیۡہِ۔ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ۔

یہاں سے ایک عظیم انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق قرآن کریم نے بتا دیا کہ جس نہج پر انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے اس کا علم، خود ان کے اندر ودیعت کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ اسے اُن کی جبلّت (INSTINCTS) کہتے ہیں۔ اشیائے کائنات کی تسخیر کے سلسلہ میں کہدیا کہ انسان کو اس امر کی صلاحیت دیدی گئی کہ وہ ان کا علم حاصل کرکے انہیں مسخر کرے۔ لیکن یہ جو انسان نے باہمی مشاجرت سے اپنی زندگی کو جہنم بنا لیا تھا، اس سے نکلنے کے لئے ——— یا یوں کہیئے کہ فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے انسان کو خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی، اسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کے متعلق تفصیلی گفتگو تو اس کے اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وحی وہ راہنمائی ہے جس میں کسی انسان کی ذاتی فکر اور اکتسابی علم کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے خدا کسی برگزیدہ شخصیت کو منتخب کرلیتا تھا۔ اسے یہ راہنمائی خدا کی طرف سے براہِ راست ملتی تھی اور وہ اُسے، کسی قسم کی آمیزش کے بغیر، دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسانوں نے جو باہمی اختلافات پیدا کرلئے تو ان کا مٹانا، ان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی جس کا سلسلہ اس زمانے سے شروع کردیا گیا جب انسانوں میں یہ اختلافات نمودار ہوئے۔ آپ سورۃ یونس اور سورۃ بقرۃ کی اُن دو آیات کو ملا کر پڑھئے جو پہلے بھی گذر چکی ہیں۔ ان سے یہ مفہوم واضح ہو جائے گا۔ سورۃ یونس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً۔ فَاخۡتَلَفُوۡا (۱۰/۱۹)۔ "تمام انسان ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کرلئے"۔ اور سورۃ بقرۃ میں ہے: کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ۔ وَاَنۡزَلَ مَعَھُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ (۲/۲۱۳)۔ "تمام انسان امتِ واحدہ کی شکل میں رہتے تھے (پھر انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کرلئے اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تو ان اختلافات کو مٹانے کیلئے) خدا نے انبیائے کرامؑ کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں آکر بتاتے تھے کہ وحیِ خداوندی کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کس قدر تباہ کن ہوں گے۔ ان (انبیاء) کے ساتھ خدا نے ضوابط و قوانین نازل کئے تاکہ وہ انسانوں کے باہمی اختلافی معاملات کا، حق و صداقت کے ساتھ فیصلہ کریں"۔ یہی ہے وہ حقیقت، جس کے لئے کہا ہے: فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ (۲/۳۷) یعنی "آدم کو خدا کی طرف سے راہنمائی ملی"۔

وحی کی راہنمائی کی ضرورت

تَلَقّٰی (مادہ ل۔ق۔ی) کے بنیادی معنی ہیں کسی کے سامنے آنا۔ یا کسی سے کچھ حاصل کرنا۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو جو راہنمائی بذریعہ وحی ملتی تھی اس کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ سورۃ القصص میں ہے: وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ (۲۸/۸۶)۔ اے رسولؐ! تو اس کی توقع ہی نہیں رکھتا تھا کہ تجھے خدا کی طرف سے ضابطۂ قوانین القاء کیا جائیگا[1] یعنی بذریعہ وحی دیا جائے گا" دوسری جگہ ہے: يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۴۰/۱۵) "خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے امر کے مطابق وحی عطا کر دیتا ہے" علاوہ بریں خود زیر نظر آیت (۲/۳۷) سے اگلی آیت میں یہ کہکر بات بالکل واضح کر دی کہ: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى (۲/۳۸)۔ "جب میری طرف سے تمہیں ہدایت ملے گی" "مِنِّىْ هُدًى" نے بات واضح کر دی کہ اس سے مراد خدا کی طرف سے ملنے والی راہنمائی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا نے آدم (انسان) سے کہدیا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہوگی کہ تم اپنے اختلافات کو خود مٹا سکو۔ یہ اختلافات ہماری وحی کی روشنی ہی میں مٹ سکیں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنے پر خود یورپ کے مفکرین اور مدبرین بھی مجبور ہو رہے ہیں۔ اقوامِ عالم میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں انہوں نے انتہائی کوشش کر دیکھی کہ انہیں وہ خود مٹا سکیں لیکن وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہے۔ انہوں نے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی لیکن وہ بھی اس مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام رہی۔ مسٹر (EMERY REVES) نے (THE ANATOMY OF PEACE) کے نام سے ایک مختصر لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے۔ وہ اس میں کہتا ہے:۔

> لیگ آف نیشنز ناکام رہ گئی۔ اس لئے کہ وہ انٹرنیشنلزم کے غلط عقیدہ پر قائم ہوئی تھی۔ اس عقیدہ پر کہ مختلف قوموں کے درمیان صلح قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ باہمی مذاکرات کے ذریعہ کر لیا کریں۔ (کس قدر غلط تھا یہ تصور)۔ ان تنازعات کا حل ممکن ہی نہیں جب تک قوموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد میں اصلاح نہ ہو جائے (اور وہ بنیاد ہے نیشنلزم)۔ (P.161)

اس کے بعد وہ کہتا ہے:۔

> ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں

---

[1] ہمارے ہاں صوفیاء کے متعلق کشف والہام کے ساتھ اِلقاء۔ کا لفظ بھی بولا جاتا ہے اور جس سے مراد خدا کی طرف سے علم حاصل ہونا جاتی ہے۔ ہم متعدد مقامات پر بتا چکے ہیں کہ ختم نبوت کے بعد، خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا تصور ہی غلط ہے، خواہ اس کے لئے کوئی اصطلاح بھی کیوں نہ استعمال کی جائے۔ نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔

کے حل کرنے ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کرسکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر، خالص انسانی سطح پر، دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (P.164)

"خالص انسانی سطح" پر یہ مقصد کیسے حل ہو سکے گا؟ اس کے متعلق یورپ کا ایک اور مفکر (J.M.MURRAY) کہتا ہے کہ:-

چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے۔

(ADAM AND EVE. P. 66-67)

کلماتُ اللہ قرآن کریم نے اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جو اب اپنی حقیقی، منزہ اور مکمل .... شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ یہی وہ "کلمٰت" ہیں جن کا ذکر آیت (۲/۳۷) میں کیا گیا ہے۔ کلمہ (جس کی جمع کلمات ہے) کے عام معنی بات کے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ وحی خداوندی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے: یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ (۷/۱۵۸)۔ "وہ خدا اور اس کی وحی پر ایمان رکھتا ہے"۔ یہی وہ کلمٰتُ اللہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الانعام میں کہا ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے قوانین، صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اس کے کلمات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ خدا سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ (نیز دیکھئے ۱۰/۶۴ ; ۱۸/۲۷)۔

وہ نظریۂ حیات، یا نظامِ زندگی، جو وحی خداوندی پر مبنی ہو، اسے بھی قرآن کریم نے کلمہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کی محکمیت اور خوشگوار نتائج کو ایک مثال کی رُو سے یوں سمجھایا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۱۴/۲۴-۲۵)۔ "ذرا اس مثال پر غور کرو۔ طیب نظریۂ زندگی کی مثال، ایک ایسے عمدہ پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں، محکم اور استوار ہوں، اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانہ اور ہر موسم میں پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح، مجرد حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعہ واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ سکیں"۔

اس کے برعکس وَ مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیۡثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیۡثَۃِ اجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَہَا مِنۡ قَرَارٍ۔ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ۔ وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیۡنَ۔ وَ یَفۡعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۱۴/۲۶-۲۷)۔ غلط نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی مثال ایک ایسے نکمّے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ زمین کے اوپر ہی ہو جو یونہی ایک جھٹکے سے اُکھڑ جائے"۔

"اس طرح اللہ اس محکم نظریۂ زندگی کی رو سے، جماعتِ مومنین کو ان کی دنیاوی اور اخروی زندگی، دونوں میں ثبات اور تمکّن عطا کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ، اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ان کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے"۔ صحیح اور غلط نظریاتِ زندگی اور نظامِ حیات میں باہمی کشمکش شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس کشمکش میں، بعض اوقات، جماعتِ مومنین کو میدانِ جنگ میں بھی اترنا پڑتا ہے۔ اُن کی اس جنگ کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا السُّفۡلٰی۔ وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ہِیَ الۡعُلۡیَا (۹/۴۰)۔ "تاکہ خدا کفار کے نظریۂ زندگی کو مغلوب کر دے اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات غالب آ جائے"۔ اسی قسم کی جنگ کے متعلق دوسری جگہ ہے: وَ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ۔ وَ یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ۔ لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَ یُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ۔ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ (۸/۷-۸)۔ "اللہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات (قوانین) کے ذریعے حق کو ثابت کر دے اور اس سے سرکشی برتنے والوں کی جڑ تک کاٹ دے۔ یاد رکھو! ان لڑائیوں سے مقصد، حق کو ثابت اور متمکن، اور باطل کو محو کر دینا ہے۔ خواہ یہ بات مجرمین پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرتی ہو"۔ (نیز دیکھئے ۱۰/۸۲ و ۴۲/۲۴)۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلمٰت اللہ سے مراد وہ قوانینِ خداوندی ہیں جو وحی کی رو سے عطا کئے گئے ہوں اور کلمہ سے مراد وہ نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات، جو ان قوانین کی بنیادوں پر استوار ہو۔ اس حکم یا نظریۂ زندگی کا اصل الاصول یہ ہے کہ: لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ "اقتدار کا حق، خدا کے سوا کسی کو نہیں"۔ یہ کلمہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ لیکن جب کسی نظریہ کی روح گم ہو جاتے اور اس کے صرف الفاظ باقی رہ جائیں تو پھر کلمۂ خداوندی، اس کلمہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کے الفاظ ہم دن رات دہراتے رہتے ہیں اور اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ حالانکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ کلمۂ طیبہ کی مثال، اس درخت کی سی ہے جو ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اور یہ پھل، دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں اس کی محسوس اور مرئی شکل جماعتِ مومنین کا ثبات اور استحکام ہے (۱۴/۲۴-۲۷۔ یہ آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں) قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے: اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ (۳۵/۱۰)۔ خدا کے عطا کردہ طیب نظریۂ حیات میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے زور دروں سے بلند ہوتا جائے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کے اعمالِ صالحہ بھی شریک ہو جائیں تو پھر وہ برق رفتاری

سے رفعت اور بلندی حاصل کرلیتا ہے۔" خدا کا متعین فرمودہ نظریۂ حیات ازخود آگے بڑھتا چلا آرہا ہے اور زمانے کے تقاضوں سے انسان اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ اسے اختیار کرے۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک یوم ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار برس (۷۰/۴) کا ہوتا ہے) لیکن جب اس کے ساتھ حق و صداقت پر چلنے والی جماعت کا زورِ بازو شامل ہوجاتا ہے تو یہ اپنے نتائج ہمارے حساب اور شمار کے مطابق مرتب کردیتا ہے۔ جیسا کہ عہدِ محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ میں ہوا۔ (لیکن یہ ایک جداگانہ موضوع ہے جس پر تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی)۔

آدم نے جب خدائی راہنمائی اختیار کرلی تو (یوں سمجھئے کہ) اس کی توبہ قبول ہوگئی۔ یعنی وہ صحیح راستہ پر چل پڑا۔ توبہ کا تفصیلی مفہوم، مطالب الفرقان، جلد اول میں بڑی تفصیل سے آچکا ہے۔ (دیکھئے تشریح زیرِ آیت (۱/۴ صفحہ ۲۶) آیت ۱/۴ میں کہا گیا ہے کہ جب آدم نے اپنا رخ صحیح سمت کی طرف کرلیا تو خدا نے بھی اپنی توجہ اس کی طرف منعطف کردی۔ وہ توّاب اور رحیم ہے۔ ہم جلد اول میں مسئلہ تقدیر پر بحث کرتے ہوئے یہ بتا چکے ہیں کہ انسان، جس قسم کا راستہ اختیار کرتا ہے، اسی قسم کے قوانینِ خداوندی کا اطلاق اس پر ہوجاتا ہے۔ (دیکھئے جلد اول آیات (۱/۲) و (۲/۴) و (۲/۲) صفحات ۵۲، ۶۳ و ۸۰)

اس مقام پر بھی انسان سے یہی کہا گیا ہے کہ جب تمہیں اس امر کا احساس ہوجائے کہ تم سے غلطی سرزد ہوگئی ہے اور تم اپنی اصلاح کرنا چاہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس غلط راستے پر تم چل رہے تھے اس سے منہ موڑ کر پھر اسی دوراہے پر آجاؤ، جہاں سے تمہارا قدم اس غلط راستہ کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس سے تمہاری سابقہ غلطی کا ازالہ ہوجائے گا۔ اور اس کے بعد صحیح راستہ اختیار کرلو۔ اس سے تم منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اسی حقیقت کو اگلی آیت میں دہرایا گیا ہے، جہاں کہا:-

۲/۳۸ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

"ہم نے آدم سے کہا کہ زندگی کے اس بلند مقام سے گر کر تم اس کی پست سطح پر تو آگئے ہو لیکن تمہاری یہ گراوٹ ابدی محرومی نہیں۔ ہماری طرف سے تمہیں (ہمارے رسولوں کی معرفت) راہنمائی ملے گی۔ سو جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا تو وہ لوگ خوف اور حزن سے مامون ہوجائیں گے۔"

خوف اور حزن سے مامونیت

"ھدایت" کی تفصیل تو پہلی جلد میں گذر چکی ہے۔ یہاں اتباعِ ہدایت کا جو نتیجہ بتایا گیا ہے وہ بڑا اہم ہے۔ یعنی خوف اور حزن دونوں سے مامونیت۔ خوف، عام طور پر بیرونی خطرات اور نقصانات کے احساس کو کہا جاتا ہے،

اور حَزَن کے معنی ہوتے ہیں، افسردگی، پژمردگی، پریشانیٔ خاطر، اندوہ و ملال، جسے عام الفاظ میں دل کا ڈوب جانا کہتے ہیں۔ ہر چند یہ لفظ ہر قسم کے حزن ملال کے لئے بولا جاتا ہے لیکن عرب اسے معاشی پریشانی کے لئے خاص طور پر بولتے تھے۔ چنانچہ حَزَانَۃُ الرَّجُلِ انسان کے اُن متعلقین، اہل و عیال کو کہا جاتا ہے جن کی تکلیف سے اُسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے لئے سامانِ رزق کا اہتمام کرے۔

عصرِ حاضر کے علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کی کم و بیش تمام نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض کا بنیادی سبب خوف ہے۔ (یاد رہے کہ انگریزی زبان میں خوف کو (FEAR) اور حزن کو (GRIEF) کہا جاتا ہے)۔ خوف سے انسانی ذات یوں کہیئے کہ گھُٹ کے مرجاتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ حزن ہوتا ہے — قرآنِ کریم نے اس نظام کی بنیادی خصوصیت جو قوانینِ خداوندی پر مبنی ہو، یہ بتائی ہے کہ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲)۔ "جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقتوں کو تسلیم کر کے، اُن کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا تو اُسے نہ کسی قسم کی ناانصافی اور دھاندلی کا خوف ہوگا، نہ استحصال کا ڈر"۔ دوسری جگہ ہے: فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۷۲/۱۳)۔ "جو کوئی خدا پر ایمان لے آتا ہے، اُسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب و نہب کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ذلت و رسوائی کا خوف"۔ اسی کو اس نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۷/۴۹)۔ "تم جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جہاں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن"۔ بارگاہِ ایزدی سے پکار کر کہا جائے گا کہ: يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۳/۶۸)۔ "اے میرے بندو! اب تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن"۔ یہ زندگی حاصل کس طرح سے ہوگی، اس کے متعلق سورۃ حٰمٓ میں کہدیا کہ:-

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ. وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (۴۱/۳۰-۳۱)۔

جو لوگ اِس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر اس طرح جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کرو اور نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے

اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ اُس جنتی زندگی میں ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہو گے۔ اور وہ سب کچھ ملے گا، جسے تم طلب کرو گے۔

اولیاء اللہ

یہی ہیں وہ خوش نصیب، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست (اولیاء اللہ) کہا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے: لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۱۰/۶۲)۔ ضمناً اس نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہیں: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۳)۔ جنہیں مومن اور متقی کہا جاتا ہے اور ان کی پہچان یہ ہے کہ: لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (۱۰/۶۴)۔ "اُن کی اس دنیا کی زندگی بھی ہر قسم کی خوشگواریوں کی حامل ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی۔ اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی ہنگامی یا عارضی بات نہیں کہ کبھی ایسا ہوگا اور کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۰/۶۴)۔ "یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے۔ اور یہ بڑی عظیم کامرانی ہے، جسے حاصل ہو جائے۔" دنیاوی زندگی میں خوشگواریوں کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ کہہ دیا کہ: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸)۔ "تمہیں نہ افسردہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے نہ غمگین۔ اگر تم مومن ہو تو تم سب پر غالب آکر رہو گے۔" یعنی "لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ" کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ قوم تمام مخالفین پر بالادست ہو۔ مغلوب، محکوم ہر قسم کے خوف اور حزن کا شکار ہوتا ہے اور مومن کی زندگی مغلوب محکوم کی نہیں، غالب اور بالادست کی زندگی ہے۔ لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ (۲۱/۱۰۳)۔ "بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے دل میں پریشانی اور افسردگی پیدا نہیں کر سکتا۔" وہ نہایت استقامت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس پر غالب آجانے کے بعد، یہ کہتے ہوئے، بحضور رب العزت سجدہ شکر بجا لاتے ہیں۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴)۔ "کس قدر قابل حمد و ستائش ہے وہ ذات، جس نے ہمارا حزن دور کر دیا۔" لفظ مومن کا تو مادہ ہی، امن (ا۔م۔ن) ہے اور امن اور خوف باہمدگر متضاد ہیں۔ اس لئے مومن، خوف اور حزن سے مامون ہوتا ہے۔ اور جس کی زندگی خوف سے مامون ہو، وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہو سکتا۔ (ERICH FROMM) کی یہ تحقیق پہلے سامنے آچکی ہے کہ مثالی زندگی وہ ہے جس میں کسی کو کسی قسم کا خوف نہ ہو۔ اسی کو قرآن کریم نے "نفس مطمئنہ" سے تعبیر کیا ہے۔ (۸۹/۲۷)۔

یہ ہے وہ زندگی، جس کا وعدہ آدم سے کیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی کا اتباع

کرے۔ جو ایسا نہ کریں، ان کے متعلق وہیں کہدیا :-

۲/۳۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

"جو لوگ، اس حقیقت کی صداقت سے انکار اور ہمارے قوانین کی تکذیب کریں گے، تو ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی اور وہ مستقل عذاب کی زندگی جیئیں گے"۔ یعنی جب تک وہ اس غلط روش کو ترک نہیں کریں گے، ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی زندگی سے نکل نہیں سکیں گے۔

یہاں کفر کے ساتھ تکذیب بھی کہا گیا ہے۔ تکذیب کا مفہوم تو تفصیل طلب ہے جو اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کفر قوانینِ خداوندی (قرآنی صداقتوں) سے یکسر انکار ہے۔ اور اس میں تکذیب خود بخود آ جاتی ہے۔ لیکن جب کفر اور تکذیب کا الگ الگ بیان ہو تو وہاں تکذیب کا مفہوم یہ ہوگا کہ زبان سے تو ان صداقتوں کا اقرار کیا جائے لیکن عمل ان کے خلاف کیا جائے۔ یعنی عملاً اپنے دعوائے ایمان کی تکذیب کی جائے۔ جیسا کہ سورۃ الماعون میں کہا گیا ہے کہ:

"تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو زبان سے تو دین کا اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اسے جھٹلاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ان لوگوں کو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ جائیں، دھتکارتے ہیں اور جو کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے۔ یہ وہ نمازی ہیں جو رسمی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن صلوٰۃ کی غرض و غایت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیئے تھا بند لگا کر روک لیتے ہیں (۱۰۷:۱-۷)"۔ یہ ہے تکذیب کی نمایاں مثال۔

لہٰذا قرآنِ کریم کی رو سے، کفر اور تکذیب دونوں کا نتیجہ عذابِ جہنم ہے۔

نگہ بازگشت

یہ ہے وہ سرگزشتِ آدم، جو قرآنِ کریم میں، انتہائی حسین اور بلیغ، تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہے یہ سرگزشتِ آدم نہیں، انسانیت کی تاریخ ہے۔ آپ اس تاریخ پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کی ایک ایک تفصیل کس طرح قرآنی صداقتوں کی شہادت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جہاں تک اس طبعی کائنات کا تعلق ہے، انسان نے علومِ فطرت کی تحصیل سے اس مٹی کے گھروندے کو کیا سے کیا نہیں بنا دیا۔ ذرا اس دور کو سامنے لائیے جب انسان نے پہلے پہل اس زمین پر تمدنی زندگی شروع کی اور اس کے بعد اس کی آج کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی مشاطگی نے کائنات کے گیسوؤں کو کس طرح سنوارا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص، شوخ انداز

میں ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے " محاورہ مابین خدا اور انسان "۔۔۔ اور وہ یوں ہے :-

خُدا

جہاں را زِ یک آب و گِل آفریدم　　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

من از خاک پولادِ ناب آفریدم　　　تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را

قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

اِنسان

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　　سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(پیام مشرق)

اس حقیقت سے قطع نظر کہ انسان نے اس خارجی کائنات کے حسن میں، کسقدر اضافہ کیا ہے، اس نظم میں ایک بڑا پُر معنی اشارہ ہے۔ انسان نے خدا کے ان اعتراضات کا جواب تو دیدیا جن کا تعلق خارجی کائنات سے تھا، لیکن اس کے عائد کردہ پہلے اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ

جہاں را زِ یک آب و گِل آفریدم　　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

انسان کے پاس اس کا جواب ہے ہی نہیں۔ خدا نے نوعِ انسان کو امت واحدہ کی شکل میں پیدا کیا تھا۔ اس نے اُسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور پھر ان ٹکڑوں کو یکجا کرنے کے لئے اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ انسانی تاریخ کے یہ دونوں گوشے باہمدگر اس قدر متضاد و متخالف ہیں کہ ان پر غور کرنے سے انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ایک گوشے میں اسقدر بلندی اور دوسرے میں اسقدر پستی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تسخیرِ کائنات تو اس علم کی رُو سے کی جاسکتی تھی (اور کرلی گئی) جس کی تحصیل کی صلاحیت اس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ لیکن اس کی ذاتی اور تمدنی زندگی صحیح خطوط پر، وحی کی راہنمائی ہی میں جادہ پیما ہوسکتی تھی جسے اس نے نظرانداز کر دیا۔ اس کا عبرت آموز نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اقبالؒ نے ان دونوں گوشوں کے تقابل کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے :-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار | عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا | زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

زندگی کی شبِ تاریک تو، سائنس کے علوم سے نہیں، وحی کی شمعِ جہانتاب ہی سے روشن ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ :-

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم | پیشِ اُو سجدہ گزاریم و مُرادے طلبیم

اقوامِ مغرب آج اس روشنی کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ اے کاش! کوئی اللہ کا بندہ شمعِ قرآنی ہاتھ میں لے کر اُن کی راہنمائی کرے تو آدم کو پھر سے وہ جنت مل جائے، جس کی بازیابی کے لئے وہ اس قدر وقفِ اضطراب ہے۔

پھر اس طرح خود حاصل کردہ جنت، اور جنتِ آدم میں ایک معیاری فرق بھی ہے۔ وہ جنت آدم کو اُس کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں نہیں ملی تھی؛ "بخشش" کے طور پر عطا ہوگئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ایک لغزش سے چھن گئی۔ لیکن جو جنت انسانی اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، وہ دائمی ہوتی ہے۔ اس جنت کے متعلق بارگاہِ خداوندی سے اعلان ہوگا کہ

جنتِ آدم اور جنتِ مؤمن میں فرق

تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳)۔ "یہ وہ جنت ہے جسکا تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے میں مالک بنایا جارہا ہے"۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا - یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا - یہ اللہ کا وعدہ ہے جو مبنی بر حقیقت ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (۴/۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

یہ ہے دونوں جنتوں میں فرق — ایک بخشش کے طور پر ملی ہوئی، دوسری اپنے حسنِ کردار کے صلہ (نتیجہ) میں حاصل کی ہوئی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ | تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست

یہ جنت وہ ہے جس کے متعلق "روحِ ارضی" نے آدم کے استقبالیہ میں کہا تھا کہ :-

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں | آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں | جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل! کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

لہٰذا یہ جنت چھن کیسے سکتی ہے!

موضوع تو ختم ہوگیا لیکن اس کا ایک ضمیمہ باقی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب مختلف مذاہب کے پاس، ان کی (مبینہ) آسمانی کتابیں موجود ہیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اب حق و صداقت کی راہ، صرف قرآن کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس وہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں موجود نہیں جو ان کے دین کے داعی نے انہیں خدا کی طرف سے دی تھی[1] ان کتابوں کو انسانی تحریف نے کچھ کا کچھ بنا کر رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

تورات میں قصۂ آدم سرگزشتِ آدم، سابقہ انبیائے کرامؑ کی طرف وحی میں بھی بیان کی گئی تھی۔ چنانچہ بائبل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ اس کتاب میں یہ قصہ کس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ:۔

خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (تورات کتاب پیدائش ۱/۲۷)۔

اس کے بعد قصۂ آدم کی بعض تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔ جنتِ آدم کے متعلق ہے:۔

اور خداوند خدا نے عدن میں، پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے میں خوب تھا اور باغ کے بیچوں بیچ حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے اُگایا۔ اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار سرے نہروں کے بنی۔ پہلی کا نام فیسون جو حویلہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ وہاں سونا ہوتا ہے۔ اور اس زمین کا سونا اچھا ہے۔ اور وہاں موتی اور بلور بھی ہیں اور دوسری نہر کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی، اور تیسری کا نام دجلہ ہے جو اسور کے پورب جاتی ہے اور چوتھی نہر کا نام فرات ہے (پیدائش ۲/۱۴)۔

قرآن نے انسانی سرگزشت کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا نام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ تمثیل نہ رہتی، تاریخ کا واقعہ بن جاتی۔

شجرِ ممنوعہ کے متعلق لکھا ہے:۔

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغِ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیکر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس

---

[1] اس کی تفصیل میری اس کتاب میں دیکھئے جس کا عنوان ہے۔ "مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں"۔

دن تو اسے کھائے گا، ضرور مرے گا (پیدائش ۲/۱۷-۱۶)۔

انسان کو نیک و بد کی پہچان وحی کے ذریعہ کرائی جانی مقصود تھی۔ لہٰذا، اس شجر کے قریب آنے سے منع کرنے کے کیا معنی؟

آدم کی بیوی کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے:۔

اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑ دے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ اور وہ دونوں آدم اور اس کی جورو ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے (پیدائش ۲/۲۵-۲۱)۔

اس کے بعد یہ مذکور ہے کہ کس طرح سانپ نے (ابلیس نے نہیں بلکہ سانپ نے) اس عورت کو بہکایا اور اس نے شجرِ ممنوعہ کا پھل خود بھی کھایا اور اپنے خاوند کو بھی کھلایا۔ اس کے بعد:۔

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سُنی۔ اور آدم اور اس کی جورو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا ہوں۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اور اس نے کہا کہ تجھے کس نے جتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ (پیدائش ۳/۱۳-۸)

چنانچہ اس جرم کی پاداش میں:۔

اس نے (یعنی خداوند خدا نے) عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ (پیدائش ۳/۱۶)

اور آدم سے کہا کہ:۔

اس واسطے کہ تو نے اپنی جورو کی بات سنی اور اس درخت سے کھایا، جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور

وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارا اُگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا۔

اِس کے بعد مذکور ہے کہ:۔

اور خداوند خدا نے کہا۔ دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک ہو گیا اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے اور کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ زمین کی، جس میں سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغِ عدن کی پورب کی طرف کروبیوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درختِ حیات کی نگہبانی کریں۔ (پیدائش ۳/۲۲-۲۴)

آپ نے غور فرمایا کہ اس قصہ کی مذکورہ صدر تفاصیل میں کسطرح زمین کی پستی اور خاک کی کثافت جھلک رہی ہے صاف نظر آتا ہے کہ یہ انسانی تخیلات کی عکاسی ہے وحی کا بیان نہیں۔ اتنا ہی نہیں، اس کے بعد، کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی پانچویں سے آٹھویں آیت میں ہے:

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اُسکے دل کے تصور اور خیال روز بروز بد ہی ہوتے جاتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا، روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک، کیونکہ ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔

یہ "حقائق" کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

وحئ خداوندی میں آمیزش

سابقہ آسمانی کتابوں کے ساتھ ایسا کیوں ہوا اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۲۲/۵۲)

اے رسولؐ! ہماری وحی کے ساتھ ہوتا یہ رہا ہے کہ ہمارا ایک فرستادہ نبی آتا، لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا، اس کے بعد شیطان صفت لوگ اس کی وحی میں اپنی طرف سے آمیزش کر کے اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے۔ اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھجدیتا اور سابقہ وحی کو اس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اس لئے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے دینِ خالص، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا کہ اس میں کوئی تحریف یا آمیزش نہ کر سکے۔ اور اس کے بعد وحی کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اسے ختمِ نبوت کہا جاتا ہے۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اس لئے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کتاب میں کسی قسم کا رد و بدل کیا جا سکے لیکن شیطان صفت لوگوں نے اس کیلئے ایک اور تدبیر نکالی۔ اس تدبیر کے متعلق قرآن کریم نے سورۃ الانعام میں کہا ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶/۱۱۲)۔ "جو نبی بھی آیا، شیطان صفت لوگ، خواہ اُن کا تعلق شہری بستیوں سے تھا یا صحرائی آبادیوں سے، اس کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے، اس کیلئے وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے اور عوام کو بہکانے کے لئے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے۔" یہ ملمع سازی کی باتیں وہ ہیں، جو وضعی روایات کی شکل میں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دی گئیں اور پھر انہیں کی بنیادوں پر قرآن کریم کی تفسیریں لکھی گئیں۔ چونکہ ان روایات کو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اس لئے انہیں تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک بگڑ چکی ہے کہ یہی ملمع سازی کی باتیں اصلِ اسلام بن گئی ہیں اور قرآن کا مصرف صرف اشارہ گیا ہے ——— کہ از یاسینش او آساں بمیری ——— انہی ملمع سازوں کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

وضعی روایات

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے ٭ بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

قصۂ آدم میں اس "زیبِ داستاں" کے لئے کیا کچھ بڑھا یا دیا گیا ہے اس کی کچھ مثالیں ہم پہلے دیکھ چکے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حوّا کو کس طرح آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اسی تفسیر (ابن کثیر) میں خود تخلیق آدم کے متعلق، روایات کی سند سے، کہا گیا ہے کہ:-

> پھر آدم علیہ السلام کی مٹی اُٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا کہ وہ بجتی مٹی تھی، جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں اور اگر میں اس پر مسلط ہو گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی

رہی، خون گوشت بنتا گیا، جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جھٹ سے اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لئے اُٹھ نہ سکے۔ اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے: وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا۔ یعنی انسان بے صبرا اور جلد باز ہے۔ نہ تو خوشی میں صبر نہ رنج میں۔ جب روح جسم میں پہنچی اور چھینک آئی تو کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا یَرْحَمُکَ اللّٰہُ۔

(ابن کثیر۔ پارہ اول۔ ص۸۳)

یہ آج سے چھ سات سو سال پہلے کی بات تھی (حافظ عماد الدین ابن کثیر کی وفات ۷۷۴ھ میں ہوئی) عصر حاضر کے "مفسرین" اس سے آگے بڑھے اور ان کی طرح پر یہ مصرعہ لگایا کہ:۔

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق کے بعد حضرت آدم نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا تو انہیں ہر قسم کی مخلوق نظر آئی۔ طرح طرح کے جانور، چرندے و پرندے نظر آئے۔ لیکن ایسی کوئی مخلوق جو ان کی ہم جنس ہو اور جس سے انس و سکون حاصل ہو، نظر نہ آئی۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بڑی وحشت سی ہوئی اور دل ہی دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے کوئی ایسی مخلوق نصیب ہو جائے جس کی رفاقت اور معیت سے مجھے چین اور سکون ملے۔ چنانچہ دوسرے جمعہ کو جب کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام عالمِ خواب میں تھے اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت عورت پیدا کرو جو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے موجب تسکین ہو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرتِ حوّا کو آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا۔ بہرحال آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر پیدا کیا گیا ہو یا بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں حضرت آدم کو کوئی تکلیف اور کوئی درد محسوس نہیں ہوا اور بغیر تکلیف کے اللہ نے حضرت حوّا کو پیدا فرما دیا۔ حضرت آدم جب نیند سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ انہیں کی جنس سے ایک مخلوق عورت کی شکل میں، ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

حضرت آدم نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ غیب سے آواز آئی کہ یہ ہماری کنیز اور بندی ہے۔ اس کا نام حوّا ہے اور اس کو ہم نے تمہاری رفاقت اور تمہارے انس کے لئے پیدا کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے نہیں چھو سکتے جب تک اس کا مہر ادا نہ کردیں۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ اے پروردگار! اس کا مہر کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ محمد اور آلِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر دس بار درود بھیجا جائے۔ حضرت آدم نے دریافت کیا کہ اے اللہ! محمدؐ کون ہیں؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو تمہیں یعنی آدم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دس مرتبہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین عقدِ نکاح قائم ہوا۔ اور اس جمعہ کے آخری حصہ میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباس زینت سے حضرت حوّا کو آراستہ کرکے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔

یہ اقتباس ہے اُس درس قرآن کا جو کراچی کے (مشہور مولانا) احتشام الحق تھانوی صاحب نے ارزاں فرمایا تھا اور جو اخبار "سیرت" (لاہور) کی تیس ۳۰ مئی ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباس ہم نے محض مثالاً پیش کر دیا ہے ورنہ اس میں کسی خاص "مولانا" کی تخصیص نہیں۔ ہمارے ہاں کے دار العلوموں میں یہی کتبِ روایات و تفاسیر پڑھائی جاتی ہیں۔ اور انہی کی بنا پر وہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو "علماء" کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں کے ہر محراب و منبر سے یہی قصے دہرائے جاتے ہیں۔ ان کی انہی افسانہ طرازیوں کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر ✿ تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

غنیمت ہے کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ان کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

خُلاصہ

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں پہنچی، اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آیا کہ انسان، اپنے سے پہلی آبادیوں کی جگہ زمین میں آباد ہو (۲/۱۵)، تو کائناتی قوتوں کو اس پر تعجب ہوا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں تھی جسے قوانینِ خداوندی میں مجال سرتابی ہو (۱۶/۴۹-۵۰)۔ لیکن اس جدید مخلوق کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا جا رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ بار الہا! یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے اب زمین میں بسایا جا رہا ہے؟ یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا جس کا نتیجہ ناہمواریاں اور خونریزیاں ہوگا۔ اس کے برخلاف ہم ہیں کہ جو فرائض ہمارے سپرد کئے گئے ہیں ہم ان کی سرانجام دہی میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں (۱۶/۵۰) اور تیرے پروگراموں کو درجۂ حمد و ستائش بنانے کے لئے جہاں تک جانا پڑے جاتے ہیں۔ اس پر خالقِ کائنات نے کہا کہ تم ہمارے اس جدید پروگرام کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔

انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی تھی کہ یہ ان قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرمِ عمل ہیں۔ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک صرف اپنی خصوصیات سے باخبر ہوتی ہے دیگر خصوصیات کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ لیکن آدم میں جملہ اشیائے کائنات کی خصوصیات کا علم حاصل کرنے کی استعداد رکھ دی گئی جس سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان اشیاء میں ربطِ باہمی کیا ہے۔ اور ان میں اس قسم کے اور روابط پیدا کر کے کیا کچھ ظہور میں لایا جا سکتا ہے۔ اُن کائناتی قوتوں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ یہ جدید مخلوق تمہارے مقابلہ میں فروتر ہے، تو بتاؤ کیا تمہیں بھی یہ استعداد حاصل ہے؟

اس پر انہوں نے عجز سے اپنی گردن جھکا دی اور کہا کہ تیرے پروگرام ہماری حدِ نگاہ سے آگے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف اُتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں علم دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اکتساباً کچھ معلوم کر لینے کی ہم میں استعداد ہی نہیں۔ تجھے کائنات کا کلّی علم ہے اور تو ہی اپنے پروگرام کی غرض و غایت سے باخبر ہے۔

جب اس طرح انسانی ممکنات کی یہ پہلی جھلک ان کے سامنے آگئی تو ان سے کہا گیا کہ ہم کائنات اور اس میں پیدا کی جانے والی مخلوق کے متعلق وہ کچھ جانتے ہیں جو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم سے سرِدست کیا کچھ ظہور میں آرہا ہے اور تمہاری مضمر صلاحیتیں کیا ہیں (جن کی نمود انسان کے ہاتھوں ہوگی)۔

اس پر کائناتی قوتیں سب انسان کے سامنے جھک گئیں، لیکن ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تھے انسان کے خود اپنے جذبات جن کے غالب آجانے سے اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے اور، اتنی بڑی قوتوں کا مالک، خود اپنے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے، اور اس پر چاروں طرف سے مایوسیاں چھا جاتی ہیں۔

ان صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو دنیا میں بسایا گیا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشو و نما کی بڑی فراوانی تھی (۲/۱۱۸) اس نظامِ معیشت کی خصوصیات یہ تھیں کہ:

(۱) اس میں "میری" اور "تیری" کا امتیاز نہیں تھا۔

(۲) "رزق" کھانے پینے کے لئے تھا، ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں

(۳) "رزق" ہر جگہ میسر تھا اور پیٹ بھر کر کھانے کے لئے میسر (۲/۱۱۸)

اس اندازِ معیشت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں نہ باہمی تصادم تھا نہ تزاحم۔ نہ اختلاف تھا، نہ افتراق۔ تمام انسان ایک برادری کی طرح رہتے تھے (۲/۲۱۳ و ۱۰/۱۹)۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا گیا کہ اگر تم نے باہمی اختلاف شروع کر دیئے تو یہ جنتی زندگی تم سے

چھن جائے گی اور تم (زندگی کے بلند مقاصد تو ایک طرف) سامانِ زیست کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں میں مبتلا ہو جاؤ گے (۲۰/۱۱۸) کوئی شے اپنے صحیح مقام پر نہیں رہے گی اور اس طرح تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھو گے۔

لیکن انسان پر اس کی انفرادی مفاد پرستیوں کے جذبات غالب آگئے اور اس نے اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ انسانی برادری نسلوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ جس نے زیادہ قوت فراہم کر لی وہ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو گیا۔ اس سے اس کی وہ جنتی زندگی چھن گئی۔ انسان مختلف گروہوں میں بٹ گیا، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا۔ ان میں مفادِ خویش کی بیچریں حائل ہو گئیں۔

لیکن دنیا میں، انسانی زندگی کوئی ایک آدھ دن کی بات نہ تھی کہ یوں بھی گذر ہو جاتا۔ اس نے یہاں ایک مدت تک رہنا اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اٹھانا تھا۔ تو کیا انسان کے لئے اس کی خود پیدا کردہ مصیبت کا کوئی حل نہیں تھا؟ اس کا حل تو تھا لیکن یہ، اس کے عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ عقلِ انسانی، ہر فرد کو اس کے مفاد کے تحفظ کی راہیں تو بتا سکتی ہے، عالمگیر انسانیت کے امن و سلامتی کا طریق نہیں بتا سکتی۔ یہ اس نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی رُو سے ممکن تھا جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی مل سکتا تھا، اور جسے اختیار کرنے سے اسے پھر سے وہی جنتی زندگی حاصل ہو سکتی تھی۔

چنانچہ جب جنت کی زندگی اس سے چھن گئی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ تمہارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں— خواہ تم سب کے سب غلط راستے پر چل نکلو پھر بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت (۷/۳۵) تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے (۲۰/۱۲۲-۱۲۳)

لیکن جو لوگ اس راہنمائی کے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور اس کی صداقتوں کو جھٹلائیں گے، تو، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق وہ مستقل عذاب کی زندگی جئیں گے —— اس دنیا میں بھی، اور اس کے بعد بھی ——

کائناتی قوتوں کو مسخر کر لینا مقامِ آدم ہے (یعنی کائنات میں انسان کا صحیح مقام) اور ان قوتوں کو وحیٔ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی بہبود کی خاطر استعمال کرنا، مقامِ مومن ہے۔ اگر ان قوتوں کو مختلف قومیں اپنی خواہشات اور ذاتی مفاد کے لئے استعمال کریں تو اس کا نتیجہ عالمگیر فساد ہے۔

یہ ہے سرگزشتِ آدم کا تمثیلی بیان اور اس کا ماحصل۔

تیسرا باب

(داستانِ بنی اسرائیل — منزلِ اوّل)

آیات ۲/۴۰ - ۲/۴۶

۱— تاریخ کی اہمیت

۲— تاریخ اور قرآن کریم

۳— مارکس کا نظریۂ تاریخ

۴— قانونِ مکافاتِ عمل

۵— قوموں کے عروج و زوال کے اصول

۶— بنی اسرائیل کی تاریخ

۷— حضرت موسیٰؑ کی داستانِ حیات

۸— بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی

۹— تورات کی تاریخ

۱۰— دین کا سب سے بڑا مخالف۔ مذہب پرست طبقہ

۱۱— حق و باطل کی کشمکش

۱۲— زکوٰۃ کا مفہوم

۱۳— دین اجتماعی نظام کا نام ہے

۱۴— تشکیلِ اُمّت

۱۵— مرکزِ ملّت۔ قبلہ۔

تیسرا باب

داستانِ بنی اسرائیل ——— منزلِ اوّل

۲/۴۰ یٰبَنِیٓ اِسۡرَآئِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ۔ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ۔ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ۔ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ۔

سابقہ باب کا اختتام اُن دو آیات پر ہوا ہے جن میں نوعِ انسان سے کہا گیا ہے کہ "تمہاری طرف ہدایاتِ خداوندی آتی رہیں گی جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن، اور جو قوم ان کی خلاف ورزی کرے گی اس کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی، وہ تباہی اور بربادی کے جہنم کی زندگی بسر کرے گی" (۲/۳۸-۳۹)۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تمام بنیادی تعلیم اسی قسم کے دعاوی پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں کہا یہ گیا ہے کہ "اگر یوں کروگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، اور یہ بات محض ہنگامی یا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا"۔ قرآن کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا لیکن آج کی اصطلاح میں اسی کو قانون کہا جاتا ہے۔ بنابریں قرآن کریم کی بنیادی تعلیم اسی قسم کے غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل بھی کہا جاتا ہے اور مستقل اقدارِ خداوندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان قوانین کی صداقت پر یقینِ محکم کو ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایمان علیٰ وجہ البصیرت لایا جاتا ہے یہ اندھی عقیدت کا نام نہیں ہوتا (۲۵/۷۳)۔ سوال یہ ہے کہ ان قوانین کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لایا کس طرح جاتا ہے؟ اسے خود قرآن کریم نے آیت (۱۰/۳۹) میں ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ: بَلۡ کَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا یَاۡتِهِمۡ تَاۡوِیۡلُهٗ۔ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ۔ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیۡنَ (۱۰/۳۹)

قرآن فہمی کے طریق

اس آیۂ جلیلہ میں قرآنی دعاوی کے پرکھنے کے تین طریقے بتائے گئے ہیں۔ پہلا طریق یہ ہے کہ انسان کو اسقدر علم حاصل ہو کہ وہ اس کی روشنی میں ان دعاوی پر غور و فکر کرسکے۔ جب انہیں علم و بصیرت کی روشنی میں، خالی الذہن ہو کر، پرکھا جائے گا تو ان کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ یہ وہ طریق ہے جس کی رو سے قرآنی قوانین کو ان دانشوروں کے سامنے پیش کیا جانا چاہیئے جو کسی حقیقت کو معروضی طریق پر (OBJECTIVELY) سمجھنے اور پرکھنے کے مدعی ہوں، یا اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے جب نطشے کے متعلق کہا تھا کہ:-

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں ٭ تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

تو اس سے یہی طریقِ افہام و تفہیم مقصود تھا۔

لیکن مذہب پرست طبقہ اس طریق کی طرف بشکل آسکتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو ان معتقدات سے بآسانی پاک اور صاف نہیں کرسکتا جو اس میں روایتاً اور وراثتاً سما چکے ہوں۔ وہ انہیں ابدی حقائق اور غیر متبدل صداقتیں سمجھتا ہے اور ان پر ذرا سی تنقیدی نگاہ ڈالنے کو بھی کفر اور الحاد قرار دیتا ہے اس طبقہ کو علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے قرآنی حقائق سمجھاتے جا ہی نہیں سکتے۔ انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے　　تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

اس کے لئے قرآن کریم میں بیان کردہ دوسرے طریق کو لیجئے۔ قرآن کا پیش کردہ دین محض ایک نظریہ نہیں، وہ ایک عملی نظام ہے۔ یا بالفاظِ دیگر سائنٹیفک طریقِ کار۔ اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کے دعاوی بنیادی فارمولوں کی حیثیت اختیار کرلیں گے جن کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہوگا کہ ان پر عمل کرکے دکھا دیا جائے کہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں یا نہیں، جن کا اس نے دعویٰ کیا ہے۔ اسے اصطلاح میں استنتاجی طریقِ کار کہتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریق، جس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اعلان کرایا گیا کہ: قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶)۔" اے رسولؐ! اپنی قوم سے کہدو کہ جو دعاوی میں پیش کرتا ہوں ان کے متعلق نظری بحث وجدل کی ضرورت نہیں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ جو پروگرام میں پیش کرتا ہوں اس کا عملی نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں ہوں گی۔ تم کہتے ہو کہ نہیں یہ دعویٰ غلط ہے۔ جو پروگرام ہم پیش کرتے ہیں اس کا نتیجہ فلاح و بہبود ہوگا۔ اس بحث کو فیصلہ تک پہنچانے کا طریق یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو، میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ اور مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو، اور اس میں تم مداخلت نہ کرو۔ نتائج خود بتادیں گے کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے"۔

اس کے بعد کہا کہ اگر تم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے تو پھر تیسرا طریقِ کار یہ ہے کہ تم اقوامِ گزشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ جس قوم نے اس پروگرام کی مخالفت کی، جو میں پیش کر رہا ہوں (کیونکہ ان کی طرف مبعوث انبیائے کرام نے بھی ایسا ہی پروگرام پیش کیا تھا) اس کا انجام کیا ہوا۔ اس کے لئے تمہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اقوام تمہارے گرد و پیش کے علاقوں میں آباد تھیں۔ تمہیں ان کی سرگزشتوں کا بھی علم ہے اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات اُن شاہراہوں پر اب تک موجود ہیں جن پر تم صبح شام سفر کرتے رہتے ہو۔ ان اقوام کا مآل، خود میرے دعاوی

کی صداقت کا ثبوت بن جائے گا۔

قرآنی قوانین کی صداقت کے پرکھنے کے یہ تین طریق خود قرآن مجید نے بتائے ہیں۔ ان میں سے تیسرے طریق کار کو تاریخی شواہد کہا جاتا ہے اور اس سے تاریخ کی اہمیت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک

تاریخ کی اہمیت

اہم امتیازی نشان تاریخ بھی ہے۔ حیوانات کی حالت یہ ہے کہ وہ ہزار ہا سال گزرنے کے بعد بھی اسی مقام پہ ہوتے ہیں جہاں ان کی نوع کا پہلا حیوان تھا (مثلاً جو بکری آج ہمارے سامنے آتی ہے وہ انہیں خاصیتوں اور صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے جو دس ہزار سال پہلے کی بکری میں پائی جاتی تھیں)۔ لیکن، اس کے برعکس، آج کا انسان خاصیتوں اور صلاحیتوں، نیز احوال وظروف کے اعتبار سے دس ہزار سال پہلے کے انسان سے یکسر مختلف ہے۔ وہ انسان کپڑے پہننا اور گھر بنانا تک بھی نہیں جانتا تھا۔ آج کا انسان چاند کی سیر بھی کر آیا ہے۔ انسان کی اس ترقی کا راز اس میں ہے کہ ایک نسل یا ایک زمانہ کا انسان اپنے تجربات و مشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس علمی، تجرباتی، مشاہداتی نتائج کے منتقل کرنے کی روئیداد کو تاریخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کا صدقہ ہے کہ ہر نسل کے انسان کو اپنی زندگی اور اس کی جدوجہد کا آغاز، ابجد سے نہیں کرنا پڑتا۔ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا ماحصل، ہزار ہا سال کی مسلسل تگ و تاز کا نچوڑ، اقوام وملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ، ہر نئی نسل کو وراثتاً مل جاتا ہے اور وہ اپنی جدوجہد کا آغاز وہاں سے کرتی ہے جہاں اُسے سابقہ نسل نے چھوڑا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اپنے تاریخی سرمایہ سے جو اس قدر فیضیاب ہوتا ہے تو اس کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ کائنات میں خدا کے غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں۔ اس لئے جس بات کا جو نتیجہ آج سے ہزار ہا سال پہلے برآمد ہوا تھا وہی بات اگر آج دہرائی جائے گی تو اس کا وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ انسان کی طبیعی زندگی میں یہ حقیقت ایک ایسا مسلّمہ ہے جس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سنکھیا جس طرح آج سے دس ہزار سال پہلے مہلک تھا اسی طرح آج بھی قاطعِ حیات ہے۔ سیلاب جو تباہیاں حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں لایا کرتا تھا وہی تباہیاں ہماری آنکھوں کے سامنے راوی، چناب اور سندھ کی طغیانیوں سے برپا ہو جاتی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح تمہاری طبیعی زندگی میں خدا کے اٹل قوانینِ فطرت کارفرما ہیں، اسی طرح تمہاری اجتماعی زندگی بھی اس کے متعین کردہ قوانین کے تابع رہتی ہے۔ جن قوانین کے اتباع سے آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی قوموں نے سربلندی وسرفرازی حاصل کی تھی ان کے اتباع سے آج بھی وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس، جن قوانین کی خلاف ورزی سے اس زمانہ کی قومیں تباہ ہوئی تھیں ان سے روگردانی کا نتیجہ آج بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ کلیہ، کہ جو عمل ایک دفعہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس سے ہر بار ویسا ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ سائنس یا فلسفہ کہلاتا ہے۔ ہم آج (PHILOSOPHY OF HISTORY) یا (SCIENCE OF HISTORY) کے الفاظ عام طور پر سنتے ہیں اور ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ علوم عصر حاضر کے سائنسدانوں یا فلاسفروں کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ہیگل کی (PHILOSOPHY OF HISTORY) اس باب میں مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تاریخ کو بطور ایک سائنس یا فلسفہ کے، پہلی بار، قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن، تاریخ کے مطالعہ پر اسقدر زور دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ (۲۴/۳۴)۔ "ہم نے تمہاری طرف اپنے واضح قوانین نازل کئے، جن کے تابع تمہاری حیاتِ اجتماعیہ کارفرما رہتی ہے" اور ان قوانین کے ساتھ، وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲۴/۳۴)۔ "اقوام سابقہ کے حالات اور کوائف بھی نازل کئے، جن میں، ان لوگوں کے لئے، جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہیں، سامانِ عبرت و موعظت ہے"۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲۴/۳۴)۔

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ تو اکثر سنے ہوں گے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" (HISTORY REPEATS ITSELF)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخی واقعات اسی شکل و صورت میں بار بار رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ بار بار اس حقیقت کا ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے کہ فلاں اندازِ زندگی کا نتیجہ فلاں قسم کا ہوگا اور فلاں روش کے نتائج فلاں نوعیت کے۔ قرآن کریم نے سورۃ الحجر میں اقوام سابقہ کی سرگزشتیں پیش کرنے کے بعد کہا کہ: وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (۱۵/۸۷)۔ "اے رسولؐ! ہم نے تجھے زندگی کے وہ بنیادی اصول دیئے جن کے مطابق اعمالِ حیات اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور دوسرے وہ متعدد تاریخی واقعات، جو اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ان قوانین کی رو سے فی الواقعہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے"۔ قرآن کریم میں اقوام سابقہ کے احوال و کوائف اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج اس کثرت سے بیان ہوتے ہیں کہ ان کی تفصیل پیش کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔[1] عدمِ گنجائش کی بنا پر، ہم اس مقام پر ان میں سے چند ایک واقعات اور ان کے نتائج پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن، قبل اس کے کہ ہم اس وضاحت کی طرف آئیں، ضمناً

مارکس کا نظریۂ تاریخ

ایک اور نکتہ کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے دور میں ایک اور گوشہ کی طرف سے بھی تاریخ کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی۔ اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ مارکس نے تاریخ کا

---

[1] اقوام سابقہ کے ان کوائف و احوال کے لئے میری تصانیف۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور۔ ملاحظہ فرمایئے۔

ایک خاص نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا بانی تو جرمن فلاسفر ہیگل ہے لیکن اس وقت، چونکہ دنیا میں عام چرچا مارکسی نظریہ کا ہے، اس لئے ہم اسی کے تعارف تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے لیکن جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس سے پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے اور وہ اس پہلے نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے جو اس کے سابق نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلۂ تغیرات واضداد ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری وساری رہے گا۔ کائنات میں نہ کوئی نظریہ، تصور یا عقیدہ غیر متبدل ہے اور نہ ان پر متفرع کوئی نظام تغیر نا آشنا۔ یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ اس نظریہ کو جدلیت یا (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو سلسلۂ تغیرات واضداد کو اس نظم و ضبط کے ساتھ روبہ عمل لاتی چلی جاتی ہے تو اس نے کہا ایسا "تاریخی وجوب" (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ہوتا ہے۔ "تاریخی وجوب" ایک ایسی اصطلاح ہے جو استعمال تو اس کثرت اور شدومد سے کی جاتی ہے لیکن جس کا متعین مفہوم آج تک نہیں بتایا جا سکا۔ (NECESSITY) یا وجوب کے معنی ہوتے ہیں ایسی بات جو بہر حال ہو کر رہے۔ اسے (HISTORICAL DETERMINISM) بھی کہتے ہیں۔ یعنی تاریخی جبریت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، ایسا بہر حال ہو کر رہتا ہے۔ کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ انسان اس کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس نظریہ کی رُو سے، انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی بجائے مجبورِ محض بن کر رہ جاتا ہے۔ اسے تاریخ کی مادی تعبیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصور کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں، ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی تھا۔ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے، اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی اور بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات، سب واہمہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر، اس نظریہ کی رو سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ دونوں کا مسئلہ روٹی کا ہے، اور اس کا حل ہو جانا مقصودِ حیات۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ مارکسی نظریۂ تاریخ، نہ صرف قرآنی نظریہ کی ضد ہے بلکہ یکسر غیر سائنسی (UN-SCIENTIFIC) بھی ہے۔ قرآنی نظریہ کی رو سے، انسان کے ہر عمل کا ایک مخصوص نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مارکسی نظریہ کی رو سے تاریخِ انسانیت میں، انسان کے اختیار و عمل کا کوئی دخل نہیں۔ تاریخی وجوب کی اندھی قوت ایک نظام متشکل کرتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد، اس نظام کی عمارت کو خود ہی مسمار کر کے اس کی جگہ اس کے خلاف دوسرا نظام متشکل کر دیتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو تاریخِ انسانیت، انسانی اعمال و کردار کے نتائج کی تاریخ نہیں، تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی کارفرمائی کی داستان ہے۔ اس نظریہ کی کمزوری بدیہی ہے۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد پھر آجایئے پیشِ نظر موضوع کی طرف، جس میں کہا یہ جا رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشت کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ قوموں کا انجام اس روش کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ اپنی اجتماعی زندگی کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ قانونِ خداوندی کی اس کارفرمائی کو وہ "سنت اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً وہ سورۃ المؤمن میں آغازِ کلام اس طرح کرتا ہے: اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ۔ کَانُوۡۤا اَکۡثَرَ مِنۡہُمۡ وَ اَشَدَّ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ۔ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (۴۰/۸۲)۔ "اے رسولؐ! کیا یہ لوگ، جو قرآنی قوانین کی صداقت کے خلاف اس قدر سرکشی برت رہے ہیں، زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت اور ملکی استحکام میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر۔ لیکن جب اُن کی غلط روش کے نتائج ان کے سامنے آئے تو ان کی یہ قوتیں ان کے کسی کام نہ آسکیں"۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ: فَلَمَّا جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ۔ وَ حَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ (۴۰/۸۳)۔ "جب ان کے رسول، ان کے پاس واضح قوانینِ خداوندی لیکر آئے تو بجائے اس کے کہ یہ اُن پر غور و فکر کرتے، وہ اسی میں مگن ہو کر بیٹھے رہے جو آبا و اجداد سے ان کے ہاں وراثتاً چلا آرہا تھا۔ انہوں نے ان رسولوں کا مذاق اڑایا لیکن اس استہزا نے خود انہی کو چاروں سے گھیر لیا۔ فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗ وَ کَفَرۡنَا بِمَا کُنَّا بِہٖ مُشۡرِکِیۡنَ (۴۰/۸۴)۔ "جب ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئی تو چلانے لگے کہ ہم خدائے یکتا و یگانہ پر ایمان لاتے ہیں اور ان جھوٹے خداؤں کا انکار کرتے ہیں جنہیں ہم خدائی اقتدار میں شریک تصور کیا کرتے تھے"۔ لیکن ان کا یہ ایمان و اقرار مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد تھا، اس لئے یہ انہیں تباہی سے بچا نہ سکا۔ فَلَمۡ یَکُ یَنۡفَعُہُمۡ اِیۡمَانُہُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا۔ سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِہٖ۔ وَ خَسِرَ ہُنَالِکَ الۡکٰفِرُوۡنَ (۴۰/۸۵)۔ "جب تباہی ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی تو ان کا یہ ایمان انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ یہ کوئی ہنگامی حادثہ نہیں تھا۔ یہ سنت اللہ ہے یعنی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل جو اسی انداز سے کارفرما چلا آرہا ہے اور جس سے انکار کرنے والے آخرالامر تباہی کا شکار ہو کر رہتے ہیں"۔

سنت اللہ

یہ سنت اللہ کسی ایک جماعت، ایک زمانہ یا ایک مقام تک محدود نہ تھی۔ یہ عالمگیر قانونِ خداوندی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں بھی انسان تھا، خدا کا یہ قانون کارفرما رہا ـــــ امم گذشتہ میں بھی اور آج بھی ـــــ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ۔ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا (۳۳/۶۲)۔ "خدا کا یہ مقررہ قانون ان لوگوں

میں بھی کارفرما رہا جو پہلے گذر چکے ہیں اور آئندہ بھی تم اس قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ (اس غیر متبدل، سنّت اللہ کی مزید توضاحت کے لئے دیکھئے آیات ۸/۳۸ ; ۱۷/۷۷ ; ۱۸/۵۵ ; ۳۵/۴۳ ; ۴۸/۲۳)۔

اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کا علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تو وہ ہے جسے تاریخی نوشتے —— یعنی تاریخ کے تحریری ریکارڈ —— کہا جاتا ہے، لیکن عصرِ حاضر میں تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کا ایک اور طریق بھی عمل میں لایا جارہا ہے۔ جسے اثری انکشافات (ARCHAEOLOGICAL DISCOVERIES) کہا جاتا ہے دنیا نے یہی سمجھا ہے کہ یہ عظیم المنزلت علمی کارنامہ بھی عصرِ حاضر ہی کی ایجاد ہے لیکن جس کی نگاہیں قرآن مجید پر ہیں وہ جانتا ہے کہ اس کی اولیت کا سہرا بھی اسی سرچشمۂ علمِ خداوندی کے سر ہے۔ قرآن کے اوراق کو الٹیے اور دیکھئے کہ اس نے کس کس انداز سے کہا ہے کہ ان مخالفین سے کہو کہ تم مختلف

اثری انکشافات

ممالک میں چلو پھرو اور جن اقوامِ گذشتہ کے افسانے تمہارے کانوں تک پہنچے ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں جاؤ اور ان کے کھنڈرات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان کی ٹھیکریوں پر عبرت اور موعظت کی کتنی اثر انگیز اور دلدوز داستانیں منقوش ہیں۔ ان نقوش کو دیکھو اور ان کے آئینہ میں ان اقوام کے حالات اور ان کے انجام کا مطالعہ کرو۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۔ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ (۳/۱۳۷-۱۳۸)

"تم سے پہلے بھی دنیا میں قومیں گزر چکی ہیں۔ تم ان کی بستیوں میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے تھے ان کا انجام کیا ہوا اور پاداشِ عمل کے کیسے نتائج پیش آئے۔ اس میں عالم لوگوں کے لئے بھی تبیانِ حقیقت کا سامان موجود ہے اور وہ لوگ جو زندگی کے خطرات سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی ہدایت اور موعظت کا سامان"۔ اور اس کے ایک ہی آیت بعد فرمایا کہ: وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ "یہ تاریخ کی گردشِ دولابی ہے۔ تم اس پر غور کرو اور دیکھو کہ اقوام و ملل کے عروج و زوال کا یہ قانون کس قدر عالمگیر اور اٹل ہے"۔ "سنّت اللہ"، کی طرح "سِيرُوا فِي الْأَرْضِ" کی آیات بھی قرآنِ کریم میں بکثرت آئی ہیں جو متعلقہ مقامات پر سامنے آتی جائیں گی۔ سرِ دست ان کے حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے ۱۲/۱۰۹ ; ۱۶/۳۶ ; ۲۲/۴۵ ; ۲۷/۵۲ ; ۳۷/۱۳۷-۳۸ وغیرہ) اس "سِيرُوا فِي الْأَرْضِ" سے مقصد کیا ہے اسے سورۃ الحج کی اس آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ: أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶)۔ "کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے۔ لیکن محض چلنے پھرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر ان کے سینے میں دلِ زندہ ہوتا تو یہ اس سے سمجھنے سوچنے کا کام لیتے۔ اگر ان کے گوشِ نصیحت نیوش ہوتے تو یہ ان سے سُن بھی سکتے۔

مشکل یہ ہے کہ جب کوئی شخص عقل کا اندھا بن جائے تو اس کی وہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں جو ماتھے میں گڑی ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں مستور ہیں۔"

قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کیا کہ تاریخ کی اہمیت پر زور دیا اور لوگوں کو اقوام گذشتہ کی سرگذشتوں کے مطالعہ کی تاکید کی۔ اس نے ان اصول و قوانین کی بھی وضاحت کر دی جن کے مطابق قوموں کو سرفرازیاں اور خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی سے وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر تو اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں ہم چند ایک کا ذکر مثال کے طور پر کرتے ہیں۔ پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ

قوموں کے عروج و زوال کے اصول

قوموں کی موت و حیات (یعنی عروج و زوال) کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا جو بغیر کسی سبب اور علت کے وجود میں آجائے۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو! لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸/۴۲)۔ "اس کارگہِ سعی و عمل میں جو زندہ رہتا ہے دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے اور جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی قاعدہ اور قانون کے مطابق ہلاک ہوتا ہے۔ یہ اس خدا کا متعین فرمودہ قانون ہے جو سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔" اس قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ "کسی قوم کی جو حالت بھی ہو، خدا اس میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ قوم، خود اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرلے۔" یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ قوموں کا عمل اور کردار ان کی ذہنیت (نفسیات) کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں "ایمان" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصولی نکتہ کے بعد اس نے پھر وہ جرائم بتائے جن کے نتیجہ میں قومیں تباہ ہوتی ہیں، کہیں کہا کہ: وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷)۔ "یاد رکھو! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا نشو و نما دینے والا کسی قوم کو یونہی ناحق ہلاک کر دے درآنحالیکہ اس قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔" دوسری جگہ فرمایا: فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶/۳۵)۔ "وہی قوم ہلاک ہوتی ہے جو حق و صداقت کے راستے چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔" کہیں کہا کہ یہ یاد رکھو! تباہیاں اور بربادیاں یونہی تقدیر کی رو سے نہیں آجاتیں۔ یہ انسانوں کی خود اپنی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹/۷۰)۔ "خدا کسی قوم پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ اپنے اوپر خود ہی زیادتی کرتے ہیں۔" سورۃ الشوریٰ میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کر دیا: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰)۔ "جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔"

قوموں کی ہلاکت کا مفہوم

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم

میں قوموں کی تباہی اور بربادی کے لئے "ہلاکت" اور ان کی سرفرازی و کامرانی کے لئے "حیات" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ قوم طبیعی طور پر (PHYSICALLY) اس دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم پوری کی پوری صفحۂ ارض سے مٹ جائے اور اس کی صرف داستانیں باقی رہ جائیں۔ لیکن ہلاکت کے معنی اس سے وسیع ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے قوموں کی ہلاکت کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ حکومت و سطوت، عزت و اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت و زوال کے جہنم میں جا گریں۔ ایسی قوم کے افراد زندہ رہتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن ان کی حیاتِ اجتماعیہ (ملّی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے، خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے قوموں کی ہلاکت۔ بعض قومیں اس طرح تباہ ہوتی ہیں کہ ان میں حیاتِ نو کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ لیکن جن قوموں میں اس کی صلاحیت موجود ہو، باز آفرینی کے مواقع اُن کے سامنے آتے ہیں اگر وہ ان سے فائدہ اٹھائے تو اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ اور یہی ہے وہ مقصد، جس کے لئے قرآنِ کریم داستانِ بنی اسرائیل کو سامنے لایا ہے، جس کا آغاز آیتِ زیرِ نظر، یعنی (رکوع ۲) سے ہوتا ہے۔

داستانِ بنی اسرائیل

سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس اہم حقیقت کی وضاحت کے لئے آغازِ کلام داستانِ بنی اسرائیل ہی سے کیوں کیا ہے؟ حالانکہ ان سے بھی پہلے کی متعدد اقوام کا ذکر قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ اس کی دو بیّن وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآنِ کریم کی اولین مخاطب قوم (عربوں) کے ہاں قدیم اقوام کی یا تو زبانی داستانیں مشہور تھیں اور یا ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات۔ اُن اقوام کے زندہ افراد ان کے سامنے نہیں تھے۔ اس کے برعکس یہودی ان کے گرد و پیش بڑی تعداد میں آباد تھے اور ان کی اس وقت کی زندگی بھی، قرآنِ کریم کے دعاوی کی متحرک شہادت کی طرح اُن کی نگاہوں کے سامنے تھی —— دوسرے یہ کہ قدیم اقوام کے متعلق قرآنِ کریم نے یہی بتایا ہے کہ جب ان کے جرائم حد سے بڑھ گئے تو ایک رسول ان کی طرف آیا جس نے انہیں، ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا اور صحیح روش اختیار کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس سے سرکشی برتی اور تباہ ہو گئیں۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل وہ قوم ہے جو مصر میں فراعنہ کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے انہیں آزادی ملی۔ فلسطین میں با اختیار زندگی بسر کرنے لگے اور آہستہ آہستہ عروج و اقبال کی ان بلندیوں تک پہنچے جو سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کے پیکروں میں تاریخ کے اوراق پر جلوہ ریز دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر قعرِ مذلت میں گر گئے اور گرتے ہی چلے گئے۔ بالفاظِ دیگر، یہ وہ قوم ہے جس کی تاریخ اس امر کی شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے کس قسم

کی سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور ان کے خلاف ورزی سے قوم پر کس قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے تاریخی شواہد کا آغاز بھی داستانِ بنی اسرائیل سے کیا ہے اور اس کے بعد اس کے اہم ٹکڑے بھی مختلف مقامات پر سامنے لایا ہے۔ ان کی داستانِ زندگی کے یہ گوشے تو اپنے اپنے مقام پر سامنے آتے رہیں گے لیکن ان کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کا اجمالی سا تعارف بھی کرا دیا جائے۔

تعارف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے۔۔۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام، جن کے حصہ میں سرزمینِ فلسطین کی سرداریاں آئیں۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جنہیں دنیا میں "خدا کے اولین گھر" کی تولیت نصیب ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے تھے اور اُن کا لقب اسرائیل تھا۔ اسی نسبت سے اُن کی ذرّیت، دنیا میں، بنی اسرائیل کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (JUDA) تھا۔ ان کی نسل کا قبیلہ جس علاقہ پر حکمران تھا اُسے بھی (JUDA) کہا جاتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں (اور ان کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کے ایک اور بیٹے بن یامین کی نسل کو) یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی اور بنی اسرائیل اور یہودی سے عام طور پر ایک ہی مفہوم لیا جانے لگا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ ہم آگے چل کر (سورۃ یوسف میں) دیکھیں گے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرتِ یوسف علیہ السلام کس طرح غلامی کی حالت میں مصر پہنچے اور پھر اپنے حسن سیرت اور بلند صلاحیتوں کی بنا پر وہاں تمکن حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے والد بزرگوار اور قبیلہ کو مصر بلا لیا۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے پھلے اور جو قبیلہ پہلے چند نفوس پر مشتمل تھا۔ اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ یہ ہے وہ زمانہ، جس سے قرآن کریم میں بیان کردہ داستانِ بنی اسرائیل کی ابتداء ہوتی ہے۔ تاریخی قیاسات بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ قریب (سنہ ۲۱۰۰ ق۔م) تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ قریب (سنہ ۱۷۰۰-۱۶۰۰ ق۔م) ہونا چاہیئے۔

فرعونِ مصر اس داستان میں فرعون کا لفظ بھی بار بار آتا ہے۔ یہ کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں بلکہ شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن راع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ، دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر سکندر کے زمانے تک فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ ان کا آخری خاندان اہلِ فارس کا تھا جسے سکندر نے سنہ ۳۳۲ ق۔م میں شکست

دی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں (عام قیاس کے مطابق) ہیکسوس (HYKSOS) کا خاندان برسرِ حکومت تھا، جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہی خاندان مصر پر حکمران تھا اور یہ کہ ان کے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) ابتدائی زمانہ کے فرعون کا نام ریمیسیس ثانی (RAMESES-II) تھا۔ اور خروج کے وقت کا بادشاہ، اس کا بیٹا منفتاح (MERNE-PTAH)، اگرچہ بعض شواہد اس کی تردید کرتے ہیں۔ بہرحال یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآن کریم بحث نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس کا کام..... اُن حقائق اور نتائج کو پیش کرنا ہے، جو ان داستانوں میں مضمر ہیں۔ اس کا منصب وقائع نگاری نہیں۔

ہم کہہ رہے تھے کہ اس چار سو سال کے عرصہ میں، بنی اسرائیل مصر میں ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور اہلِ مصر سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ جب یہ (حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں) مصر میں آئے تھے تو یہ بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہاں کے بادشاہوں نے انہیں اپنی محکومی اور غلامی کے شکنجہ میں جکڑ لیا۔ ان کی اسی کربِ ظلم کی شدت اور ذلّت وپستی کی انتہا کا زمانہ تھا جب ان میں صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ علیہ السلام، مبعوث ہوئے۔ میں نے اپنی کتاب ——— برقِ طور ——— میں ان کی اس زمانہ کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ اِستبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں۔ برہمنیت کی خواب آور فریب کاریاں اور سرمایہ داری کی پُر سکوت خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر فتنہ بجائے خویش گلا گھونٹنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت اور بربریت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی وبربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی پُرسکون روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ واژدر موجود ہوں، وہاں مخلوقِ خدا پر کیا گزر رہی ہوگی؟ تاریخ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح وبسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر۔ اور قارون سرمایہ داری کی لعنت کا بہت بڑا نمائندہ۔ تینوں یک جا، اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس محکومیت کی زندگی سے نجات دلا کر، سینا کی وادیوں میں آزادی سے ہمکنار کرایا۔ وہاں یہ بڑھے، پھولے، پھلے۔ ایک عظیم مملکت کے مالک ہوئے جو حضرتِ داؤد علیہ السلام اور حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ قوم باہمی تشتت وافتراق کے عذاب میں گرفتار ہوئی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کے دو اسباط (یہودہ اور بن یامین) پر مشتمل ایک سلطنت تھی جس کا مرکز یروشلم تھا۔

اور ان کے باقی دس اسباط (بنی اسرائیل) پر مشتمل دوسری سلطنت، جس کا دارالحکومت سماریہ تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل اسیریا نے سماریہ کی سلطنت کو تباہ کر دیا اور بنی اسرائیل کو گرفتار کرکے نینوا لے گئے۔ قومیں اپنی مرکزیت کو کھو کر، کس طرح ریت کے ذروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے، اس کی عبرت انگیز شہادت ان دس اسباط پر مشتمل قومِ بنی اسرائیل کا انجام ہے۔ آج محققین کی بڑی سے بڑی غور و بین بھی یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ دس اسباط، بالآخر کہاں گم ہو گئے۔ اِدھر اُدھر سے قیاسی سراغ لگائے جاتے ہیں۔

گم گشتہ اسباط

کچھ حصہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ افغانستان اور سرحد کی پہاڑیوں میں افغانوں کی صورت میں متشکل ہے، حال ہی (۱۹۶۷ء) میں پشتو اکاڈمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے —— تواریخ حافظ رحمت خانی —— مع حواشی۔ اس کے حواشی میں بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ جملہ افغان، حضرت یعقوبؑ کی اولاد، بنی اسرائیل سے ہیں۔ اور ایک حصے کے متعلق قیاس ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ یہ بہرحال محض قیاسات ہیں۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی مرکزیت کھو کر یہ عظیم الشان قوم کن کن صحراؤں میں جذب اور کون کون سے بیابانوں میں دفن ہو گئی۔ جو قوم بھی اپنی ملی مرکزیت کی حفاظت نہیں کرتی اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ دوسری قوموں میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہے کہ بعد میں ان کی جداگانہ ہستی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ یہ تھا انجام بنی اسرائیل کے ایک حصہ کا۔ اب اس کے دوسرے حصہ کی طرف آئیے جو یہودہ کے نام سے متعارف تھا۔ ان پر چھوٹی چھوٹی تباہیاں تو آتی رہیں۔ لیکن دو حادثات ایسے گزرے جنکی ہلاکت آفرینی کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کہیں نہ دیکھی ہو گی[1] قرآن کریم نے ان دو حوادث کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۱۷/۴) "ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی اختیار کرو گے"۔ ضمناً یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بات ان کی تباہی کی تھی لیکن ذکر ان کی سرکشی کا کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کی تباہی قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے ہی کا نتیجہ تھی۔ دوسری جگہ کہا ہے: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۵/۷۸)۔ "جب بنی اسرائیل نے

---

[1] ان کے بعد البتہ ہمارے زوال نے انہیں بھی مات کر دیا ہے۔

حق و صداقت سے کفر اختیار کیا تو پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں واشگاف الفاظ میں کہدیا کہ ان کی اس سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں گے"

بخت نصر کا حملہ

ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بنوکدنصر (بخت نصر) کے ہاتھوں رونما ہوئی اس نے ۵۹۹ ق م میں حملہ کیا اور یہودیوں کے دینی اور سیاسی مرکز یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ قتل و غارت گری اور سلب و نہب کا ایسا جانگداز سانحہ تھا جو تاریخ انسانیت میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف یہودیوں کی سلطنت تباہ ہوئی بلکہ اُن کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی۔ اور غلامی اور محکومی کی بڑی سے بڑی اذیتیں اور مصیبتیں جو کسی قوم پر آسکتی ہیں، سب یکجا ہو گئیں یہی وہ قیامت صغریٰ تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ: فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ. فَجَاسُوا خِلَٰلَ الدِّيَارِ. وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (۱۷/۵) "جب ان دو حادثوں میں سے پہلا حادثہ رونما ہوا تو ہم نے بنی اسرائیل پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا جو بڑے ہی خوفناک اور طاقتور تھے۔ وہ ان کی آبادیوں کے اندر گھس گئے اور انہیں تباہ برباد کر کے رکھدیا یہ ان کے انہی جرائم کا نتیجہ تھا جس سے انہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا لیکن وہ ان سے باز نہ آئے تو یہ وارننگ پوری ہو کر رہی"۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ یہودیوں کے لئے پہلی وارننگ تھی۔ ان پر اس کا اچھا اثر ہوا اور ان کے دل، ایک حد تک، اطاعتِ خداوندی کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ایک سو برس کے اندر فارس کے تین شہنشاہ — خورس۔ دارا اور ارتخششتا ان کی امداد پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دیدی۔ چنانچہ ہیکل کی تعمیر ۵۳۷ ق م میں شروع ہو کر ۵۱۵ ق م میں تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد خانماں خراب اور آوارۂ وطن یہودی پھر سے اپنی اجڑی ہوئی بستیوں میں آکر آباد ہونے شروع ہو گئے اور یوں ان کی مردہ جماعت نے قریب ایک صدی کے انقلاب کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کر لی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ. وَأَمْدَدْنَٰكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ. وَجَعَلْنَٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا (۱۷/۶) "پھر ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے حق میں کر دی۔ اور مال و دولت کی فراوانی اور افرادی قوت کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور اس طرح تم پھر ایک بڑی قوم بن گئے"۔

ملتِ یہودیہ کی باز آفرینی کی یہی داستان ہے جسے تورات میں حزقی ایل نبی کے خواب کے استعارہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

حزقی ایل نبی کا خواب

خدا کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے خدا کی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی، مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا۔ اور دیکھ، وہ وادی کے میدان میں بہت تھیں۔ اور دیکھ، وہ نہایت سوکھی تھیں۔ اور اس نے مجھے کہا کہ آدم زاد! کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوواہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیوں تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوواہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں تمہارے اندر روح داخل کروں گا اور تم جیوگے اور تم پر نسیں بٹھلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا۔ اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیوگے اور جانوگے کہ میں خداوند ہوں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبوّت کی اور جب میں نبوّت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہو گئی۔ پھر ان میں روح نہ تھی۔ تب اس نے مجھے کہا کہ نبوّت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد! اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہودا یوں کہتا ہے کہ اے سانس! تو چاروں ہواؤں میں سے آ! اور ان مقتولوں پر پھونک کہ وہ جئیں سو میں نے حکم کے موجب نبوت کی اور ان میں روح آئی اور وہ جی اُٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد! یہ ہڈیاں سارے اہلِ اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی۔ ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اس لئے تو نبوّت کر اور ان سے کہہ کہ خداوند یہودا یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔ اور اے میرے لوگ جب میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا تب جانوگے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم جیوگے اور میں تم کو تمہاری سرزمین میں بساؤں گا۔ تب تم جانوگے کہ مجھ سے خداوند نے کہا اور پورا کیا۔ (حزقی ایل ۳۷/۱-۱۴)

قرآن میں ذکر

اور اس واقعہ کو قرآن کریم نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا۔ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ

بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ۔ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۔ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۔ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ ۔ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۲۵۹) ۔

ایک شخص کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے مکانات مسمار ہو کر کھنڈر بن چکے تھے ۔ اس نے کہا کہ کیا اس قسم کی ویران بستی کو، اس کی موت کے بعد، پھر سے زندگی مل سکتی ہے ؟ اللہ نے اسے ایک سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور اس کے بعد اسے دوبارہ زندگی عطا کر دی اس سے پوچھا گیا کہ تم بھلا کتنی مدت تک اس حالت میں رہے ہو ؟ اس نے کہا بس ایک آدھ دن ۔ اللہ نے کہا تم سو سال تک اس حالت میں رہے ہو تاہم دیکھو، کہ تمہارا کھانا اور پانی تک خراب نہیں ہوا ۔ اسی طرح تمہارا گدھا بھی (ویسے کا ویسا) کھڑا ہے ۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کے لئے اس بات کی نشانی بن جاؤ (کہ قانونِ خداوندی کی رو سے مردہ اقوام کو بھی زندگی مل سکتی ہے) ۔ کیا تم جنین کی حالت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح ، خون کے لوتھڑے سے ہڈیاں ابھارتے ہیں انہیں سخت کرتے ہیں ، اور پھر ان پر گوشت پوست چڑھا کر ، انہیں ایک جیتا جاگتا بچہ بنا دیتے ہیں ۔

جب اس مثال کے ذریعے اس پر بات واضح ہو گئی تو اس نے کہا کہ ہاں ! اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر ، اس کا پورا پورا کنٹرول ہے ۔ موت اور حیات کے فیصلے بھی انہی پیمانوں کے مطابق ہوتے ہیں ۔ جب تک ہم ان پیمانوں کو نہیں سمجھتے ایک بات کو مستبعد خیال کر لیتے ہیں ۔ جب وہ سمجھ میں آ جاتے ہیں ، وہی ناممکن بات ، ممکن نظر آنے لگ جاتی ہے ۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ گئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی ۔ اہلِ فارس کے زیرِ اقتدار انہوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی ، سکندر نے ۳۳۲ ق م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور ان کا شیرازہ پھر منتشر ہونے لگا ۔ پھر ۳۲۰ ق م میں بطلیموس (PTOLEMY) نے مصر کے راستے حملہ کر کے یروشلم پر قبضہ کر لیا ۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آ گیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہو گئے حتّٰی کہ ۶۶ء ق م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جو رومیوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی تھی ۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا

تَتْبِيرًا (۷/۱)۔"پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو پھر تم پر ایک اور قوم مسلط ہو گئی جس نے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ تمہارے ہیکل تک میں داخل ہو گئے۔ جس طرح پہلے حملہ آوروں نے کیا تھا انہوں نے بھی سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا"۔ رومیوں کا گورنر پامپائی اُٹھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ پھر ۷۰ء ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔ مشیت کی طرف سے انہیں ان کی بازآفرینی کا ایک آخری موقعہ دیا گیا اور ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے۔ لیکن انہوں نے آپؑ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔

اقتدار کے زمانہ میں قومیں ظلم و استبداد، دھاندلی اور ناانصافی، سلب و نہب، غصب و استحصال کے انسانیت کش جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں، جن کے نتیجہ میں ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ لیکن محکومیت کے زمانہ میں، ان کی مذہبی پیشوائیت ایسی تباہ کن روش اختیار کرتی ہے جو انہیں ابھرنے ہی نہیں دیتی اور آہستہ آہستہ تباہی کے جہنم میں جا گراتی ہے۔ یہی تھی ان کے احبار و رہبان کی وہ انسانیت کش روش، جس کے خلاف مسیحا نفس حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک صدائے انقلاب بن کر اٹھے۔ انجیل میں اس کا نقشہ بڑے بصیرت افروز انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰؑ کا نعرۂ انقلابؑ

ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بے باک، حق گو، پیامبرِ انقلاب کی طرح ان کے مذہبی پیشواؤں کو مخاطب کر کے کہتے:-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں، لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جسنے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو۔ اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے..... اے اندھے راہ بتانے

والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔
کبھی ان سے کہتے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو ..... اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔ (متی باب ۲۳، آیات ۳۶-۱)

اور کبھی وہ اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:

دیکھو! یہ فقیہہ اور فریسی جو موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو ..... وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربیؔ کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھی بنی اسرائیل کے علماء اور مشائخ کی حالت اور یہ تھا وہ مشن، جسے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا، جو وہاں خدائی کر رہے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس حق گوئی کو کس طرح برداشت کر لیتے انہوں نے ان کے خلاف متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہکر بھڑکاتے کہ یہ شخص تمہارے عقائد خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہو گی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ ..... تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں (برنباس فصل ۱۴۲)

یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتے تھے" تو

سیکولرازم کے خلاف

اس سے ان کی مراد کیا تھی۔ یا یوں کہیئے کہ اس کے خلاف انہیں اعتراض کیا تھا؟ اس کے لئے وہاں کے نظامِ معاشرت و سیاست کو سامنے لانا چاہیئے۔ وہاں

رومیوں کی حکومت تھی لیکن وہ حکومت سیکولر تھی جس کی رو سے انہوں نے امورِ مملکت تو اپنے ہاتھ میں رکھے تھے لیکن مذہبی امور یہودیوں کے احبار و رہبان کے زیر اقتدار تھے۔ یہ (یہودی) حکومت کے دائرہ اختیار میں مداخلت نہیں کرسکتے تھے اور حکومت ان کے حیطۂ حکمرانی میں دخل انداز نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اس کے خلاف، دین کا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں سیاست اور مذہب دونوں حکومتِ خداوندی کے تابع آجاتے تھے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی نہیں رہتا تھا۔ آپؑ کی دعوتِ انقلاب کی طرف سے یہی وہ خطرہ تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہودی آپس میں کہتے تھے کہ:-

> اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر لیں پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جاسکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ص ۱۴۲)

آخری تباہی مختصراً، یہودیوں نے اپنی بازآفرینی کے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا وہ اپنے جرائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے تاآنکہ اُن کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (طیٹس) نے ۷۰ء عیسوی میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس سوختہ بخت قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہر ثبت کردی۔ [1]

اور یہ تھی وہ قوم جس سے (بعثتِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) قرآن کریم نے خطاب کرکے کہا تھا کہ تمہارے لئے حیاتِ نو حاصل کرنے کا ایک اور موقعہ آگیا ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے جرائم سے اجتناب برت کر اس نظام کے تابع آجاؤ جسے یہ نبی آخرالزمان صلے اللہ علیہ وسلم وحیٔ خداوندی کے مطابق قائم کر رہا ہے تو تمہاری ذلت و نکبت پھر سے عظمت و رفعت میں تبدیل ہوجائے گی۔ ان کے یہ جرائم کیا تھے جنکی طرف ان کی بار بار توجہ منعطف کرائی جاتی تھی؛ قرآن کریم نے ان کا بڑی شرح وبسط سے تذکرہ کیا ہے۔ وہ تفاصیل تو اپنے اپنے مقامات پر سامنے آئیں گی لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کی ایک سمٹائی ہوئی فہرست اس جگہ پیش کردی جائے تاکہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے کہ وہ جرائم کیا ہوتے

---

[1] یہاں یہ واقعات اجمالاً بیان کئے گئے ہیں۔ تفصیل ان امور کی، میری کتاب — برقِ طور — میں ملے گی۔

ہیں جو قوموں کے آخری تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ اس فہرست کو ذرا غور سے دیکھئے کیونکہ اس میں ہمارے لئے عبرت اور موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں) قرآن کریم ان تاریخی شواہد کو پیش ہی اس لئے کرتا ہے کہ ہم ان کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہیں ہم میں بھی تو وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو رہیں جن کے نتیجہ میں سابقہ اقوام تباہ ہوگئی تھیں۔ اور یہی ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم ان جرائم کی فہرست کو نمایاں طور پر سامنے لانا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہودیوں کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ:۔

جرائم کی فہرست

(۱) اُن کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۹/۳۴)۔

(۲) نظام سرمایہ داری کی بنیاد، ربٰو پر ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام تھا، حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (۴/۱۶۱)۔

(۳) ربٰو کے علاوہ، وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (۴/۱۶۱ و ۵/۴۲) اس سلسلہ میں، ان کی ہوسِ زرپرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآن کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اور ہے بھی یہ میرا بھائی۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دے دو، تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔ (۳۸/۲۱-۲۴)

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کے سلب و نہب سے، سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ کر مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دلنشین انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے، اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو اور اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ یاد رکھو! تمہارے صدقہ و خیرات کے اس قسم کے کام، اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۷۹) اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے (۵/۶۳) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

(۶) ان کے اکابرین ملت (لیڈرانِ کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں، جو وہ کرکے نہ دکھائیں۔ لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن کر خوش ہوتے تھے (۳/۱۸۷)۔

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ (۹/۳۱)۔ کسی کو ان کے فیصلوں سے مجالِ سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی، اور مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ:-

(ا) وہ غرور، نفرت اور تکبر و تمرّد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم و عقل کی بات کی جاتی تو وہ اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں (۲/۸۸)۔

(ب) مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر، جس قسم کا چاہو، فتویٰ دیدیتے تھے۔ (۷/۱۶۹)۔ اور پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے، لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۷۹)

(ج) اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستہ کی طرف نہ آنے پائیں اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی دعوت دے۔ (۹/۳۴)۔

(د) وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی۔ (۱۵/۱۴)۔ ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (۲/۱۱۳)۔

(س) وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے تھے اس پر خود عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (۶۲/۵)

(ش) وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو۔ جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے۔ (۲/۸۰)۔ تم تو خدا کی چہیتی اولاد ہو۔ وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (۵/۱۸)۔

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں۔ مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے بہانے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون سے گریز کی راہیں

نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (۷/۱۶۴-۱۶۳)۔

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتی۔ اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی۔۔۔ ۔۔۔ پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۲/۹۵ ؛ ۶۲/۸)۔ نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو وہ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مر جاتے۔ (۲/۲۴۳)۔

(۱۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے جوہرِ ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۲/۲۴۷)۔ اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ (۲/۲۴۹)

یہ تھے یہودیوں کے وہ جرائم، جن کی پاداش میں قرآن کریم نے کہا تھا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ۔ (۳/۱۱۱)۔ وہ جہاں بھی گئے ذلت و مسکنت سائے کی طرح ان کے پیچھے رہی اور انہیں خدا کے غضب سے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ اور نبی اکرمؐ کے بعد بھی ان کی یہی حالت رہی۔

کیا یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے یہ، اور قرآن کریم کی اسی قسم کی دیگر آیات کے غلط استنتاج سے ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا، اور وہ متوارث چلا آ رہا ہے، کہ خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ یہودیوں کو کبھی حکومت نہیں مل سکتی — یہ خدا کا فیصلہ نہیں۔ ہمارا اپنا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے) زمانہ نزولِ قرآن کریم سے قریب ایک ہزار سال پہلے سے بنی اسرائیل میں جو اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ان کا فطری نتیجہ محکومی و محتاجی تھا۔ یہ ذلت و خواری انہیں مختلف اقوام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت ان کی یہ خرابیاں اور بھی زیادہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے قرآن کریم نے ان کی ذلت و رسوائی کی زندگی کو اپنے اس دعویٰ کی صداقت میں بطورِ شہادت پیش کر کے کہا کہ دیکھ لو، قوانینِ خداوندی سے انحراف کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب رہا ان کے مستقبل کا سوال، تو (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قوموں کی تباہی دو قسم

کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس تباہی کے بعد اس قوم کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی قوموں کے لئے باز آفرینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری قسم کی قومیں وہ ہیں جو تباہی کے باوجود اپنا قومی تشخص قائم رکھتی ہیں۔ ان قوموں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ان خرابیوں کو دور کر لیں جن کی وجہ سے ان پر ذلت و ادبار کے بادل اُمڈ آئے تھے اور ان کی جگہ وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جن سے (قرآن کے الفاظ میں) "مردہ قومیں زندگی حاصل کر لیتی ہیں" تو انہیں پھر حیاتِ تازہ مل سکتی ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے اسلاف میں کسی زمانہ میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تو ان کی آنے والی نسلوں میں اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کر کے از سرِ نو اپنی صلاحیتیں بیدار کر لیں؛ صدیوں پہلے کی کسی نسل (GENERATION) کی غلطیوں کی پاداش میں اس کی آنے والی تمام نسلوں پر باز آفرینی کے دروازے بند کر دینا، می نہ سود خدلتے را ـــــ بنا بریں جس طرح ہمارے اسلاف کے درخشندہ کارنامے ہمارے لئے شوکت و سطوت کی زندگی کا موجب نہیں بن سکتے، ہمیں شوکت و سطوت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم خود وہ کام کریں جن کا نتیجہ شوکت و سطوت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے اسلاف کے ذلت و خواری کا موجب بننے والے جرائم، ان کے بعد کی نسلوں کے لئے ذلت و خواری کا سبب نہیں بن سکتے۔ اگر وہ اپنے اسلاف کی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کر لیں تو انہیں اپنے کاموں کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس باب میں قرآن کریم کا فیصلہ بڑا واضح ہے۔ جب اس نے کہا کہ: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)۔ "یہ تمہارے اسلاف اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ تھے۔ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ تمہارے متعلق فیصلہ اس سے ہوگا کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

اور یہودیوں کے متعلق تو قرآن نے ایک اور وضاحت بھی کر دی۔ اس آیت میں، جس میں کہا گیا ہے کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا (۳/۱۱۱) "وہ جہاں بھی جائیں گے ذلت و رسوائی کی لعنت ان کا پیچھا کرے گی" کے بعد کہا گیا کہ إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (۳/۱۱۱)۔ "اس ذلت و مسکنت سے نکلنے کی دو صورتیں ہو سکیں گی، ایک تو یہ کہ وہ ضابطۂ خداوندی کو تھام لیں۔ اس سے انہیں باعزت طریق سے حیاتِ نو حاصل ہو جائے گی اور دوسری صورت یہ کہ کوئی قوم اپنی کسی مصلحت کی بنا پر ان کا سہارا بن جائے۔ اس صورت میں بھی ان کی ذلت مبدل بہ قوت ہو جائے گی۔ لیکن اس میں غیروں کی محکومیت کی غیر مرئی رسوائی ضرور باقی رہے گی ـــــ وہ عزت اور وقار، جس میں کوئی قوم، کسی دوسری قوم کی رہینِ منت نہ ہو، صرف ضابطۂ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے"۔

بہرحال ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی خود تصریح کر دی تھی کہ اس، این سو راندہ و آزار سو درماندہ قوم کی نجات کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قوم نے ضابطۂ خداوندی کی اطاعت تو اختیار نہ کی لیکن (بایں قوم را بعض قوتیں) اپنی مصلحتوں کی خاطر ان کا سہارا بن گئیں اور اس طرح فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔

حضرتِ موسیٰ کی داستانِ حیات

اس تمہیدی تعارف کے بعد ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بات پوری طرح واضح نہیں ہو سکے گی جب تک خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستانِ حیات کی نمایاں کڑیاں بھی سامنے نہ لائی جائیں۔ داستانِ بنی اسرائیل اور سرگزشت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور قرآن کریم میں یہ دونوں سرگزشتیں دوش بدوش سامنے آتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب اور کشمکش کی تفاصیل تو اپنے اپنے مقام پر بیان کی جائیں گی، یہاں صرف ان پر طائرانہ نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام مصر میں بنی اسرائیل کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کی وساطت سے ان کی والدہ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اس بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیں۔ ان کی والدہ نے اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں ایسا ہی کیا۔ اس صندوق کو بادشاہ کے کارندوں نے دریا سے باہر نکالا اور اس طرح بنی اسرائیل کی محکوم قوم کا یہ بچہ شاہی محلات میں پہنچ گیا ——— اس میں مصلحت یہ تھی کہ چونکہ آخر الامر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے اربابِ حکومت کے ساتھ ٹکر لینی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ محلاتی سیاست اور امورِ مملکت کے سربستہ رازوں سے واقف ہو جائیں۔ یہ چیز محکوم قوم کے گھرانے میں پرورش پانے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اس بچہ کو خود شاہی محلات میں پہنچا دیا گیا۔ یہ وہیں بڑھے، جوان ہوتے تو وہاں ان کے ہاتھوں ایک (بالادست) قبطی کا قتل ہو گیا۔ اس سے آپ مصر کو چھوڑ کر مدین کی طرف چلے آئے۔ وہاں انہوں نے ایک غریب سے گھرانے میں شادی کی (کہا جاتا ہے کہ ان کے خسر حضرت شعیب علیہ السلام تھے) معاہدہ کی رو سے برسوں ان کی بھیڑیں چرائیں۔ وہاں سے ندائے جمال نے انہیں طور کی چوٹیوں پر بلا کر شرفِ نبوت سے سرفراز فرمایا اور فرعون کے ساتھ .... نبرد آزمائی کا حکم دیا۔ وہ واپس مصر تشریف لائے، قومِ بنی اسرائیل کی تربیت کی۔ فرعون سے ٹکر لی اور آخر الامر بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر سینا کی وادیوں کی طرف دوبارہ آ گئے۔ وہاں اس قوم کی از سرِ نو تعلیم و تربیت کر کے انہیں آزادی اور سرفرازی کی زندگی بسر کرنے کا اہل بنا دیا۔ ان کے بھائی حضرت ہارون

علیہ السلام اس تمام مہم میں ان کے ساتھ تھے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان تو یہیں تک بیان ہوئی ہے لیکن بنی اسرائیل کی طول طویل سرگزشت کا سلسلہ زمانہ نزولِ قرآن تک آیا ہے۔ اور اس کا آغاز اس آیت سے کیا گیا ہے جو ہمارے اس باب کی زیبِ عنوان ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے اسے یہاں دوبارہ درج کیا جاتا ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ وَاِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ (۲/۴۰)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "اے قومِ بنی اسرائیل! تم میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا۔ تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور تم میرے سوا کسی سے مت ڈرو۔"

یہاں بنی اسرائیل کو نعمائے خداوندی کی یاد دلائی گئی ہے۔ انعاماتِ خداوندی کی تشریح و تفصیل مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں زیرِ آیت (۱/۴) بیان کی جا چکی ہے (دیکھئے صفحات ۴۸-۵۰) بنی اسرائیل کو جن نعمائے خداوندی کی خصوصیت سے یاد دلائی گئی ہے۔ ان کی تفصیل قرآن مجید کے متعدد مقامات پر آئی ہے اور ان کا اجمالی تذکرہ چند سطور آگے جا کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ ان نعماء کی ابتداء قرآن کریم نے یہ کہہ کر کرائی ہے۔ وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ (۲/۴۹) "اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عذاب سے نجات دلائی جس میں قومِ فرعون نے تمہیں مبتلا کر رکھا تھا۔" یہ عذاب کیا تھا؟ اس کی تفصیلات بھی متعدد مقامات پر سامنے آئیں گی، لیکن اس کی اصل الاصول، یا علت العلل قرآن کریم نے ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دی ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف گئے تو اس سے کہا: اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (۲۶/۱۷)۔ "میں اس لئے آیا ہوں کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے نکال کرلے جاؤں۔ تم ان کے راستہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ انہیں جانے دو۔" اس کے جواب میں فرعون نے کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم نے تم پر اتنے احسانات کئے اور تم ان احسانات کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو کہ ہماری حکومت کی جڑیں ہی کھوکھلی ہو جائیں۔ سوچو کہ اگر بنی اسرائیل، جو ہماری محکوم قوم ہے، یہاں سے چلی جاتے تو پھر ہم حکومت کس پر کریں گے؟ محکوموں کے بغیر حکومت کا تصور ممکن نہیں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم نے اور تو بہت سے احسانات گنائے جو (بقول تمہارے) تم نے ہمارے حال پہ کئے تھے لیکن وہ احسان تمہیں یاد نہ رہا جو ان میں سب سے زیادہ "گراں بہا" ہے۔

غلامی کا عذاب

اور وہ یہ ہے کہ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (۲۶/۲۲)۔ "تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور محکوم بنا رکھا ہے۔" یہ ہے سب سے بڑا احسان، جو تم نے مجھ پر اور میری قوم

پر کر رکھا ہے۔ اس کی یاد بھی تو دلاؤ؟

آپ نے غور فرمایا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح ایک لفظ میں اس عذاب کی تفصیل کو سمٹا کر رکھ دیا جس میں بنی اسرائیل ماخوذ تھے —— یعنی غلامی اور محکومی کا عذاب! اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ اَلْعَذَابُ الْمُهِيْنُ (۴۴/۳۰) کہا ہے یعنی ذلّت آمیز عذاب۔ ہم اس جلد کے پہلے باب میں بتا چکے ہیں کہ مستبد اربابِ اقتدار کو انتہائی خوشی اس سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل اور خوار کریں۔ حکمران قوم کی مسرّت کا راز اسی میں پنہاں ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کو ذلیل کرتے ہیں۔ جہاں تک ان طبیعی یا محسوس تکالیف کا تعلق ہے جو بنی اسرائیل کو پہنچائی جاتی تھیں، ان کی تفاصیل تورات میں شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے:۔

> لیکن اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور نہایت زور پیدا کیا۔ اور وہ زمین ان سے معمور ہوگئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا، پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھلائے تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے ستائیں۔ اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے۔ پر انہوں نے جتنا انہیں دُکھ دیا وہ زیادہ تر بڑھے اور فراواں ہوئے۔ اور وہ بنی اسرائیل کے سبب ناخوش ہوتے۔ اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں، جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں۔ (خروج ۱/۱۴)

اس میں کہا گیا ہے کہ فرعون کو اس کا خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ اگر بنی اسرائیل قوت پکڑ گئے تو وہ ان کی حکومت کے لئے بہت بڑے خطرے کا موجب بن جائیں گے۔ اسی خطرہ سے بچنے کے لئے انہوں نے وہی تدبیر اختیار کی جو مستبد حکمرانوں کا عام سیاسی حربہ ہے یعنی وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) "وہ بنی اسرائیل میں پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا۔ ایک پارٹی کو معزز اور مکرم بنا کر آگے بڑھاتا اور دوسری کو کمزور کرکے پیچھے ہٹاتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑاتا رہتا۔"

پارٹیوں میں بٹ جانا —— عذاب

اس باہمی اختلاف اور تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے۔ وہ اس محکوم قوم میں سے کس قسم

کے لوگوں کو آگے بڑھاتا اور کن لوگوں کو پیچھے ہٹاتا۔ اسے قرآن نے یہ کہہ کر بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے کہ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸/۴)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "وہ ان کے ابناء کو ذبح کرتا اور ان کی نساء کو زندہ رکھتا اور اس طرح ان میں فساد برپا کرتا رہتا۔" یہ الفاظ دو ایک دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں (مثلاً ۲/۴۹ و ۷/۱۴۱) ہمارے ہاں ان الفاظ کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے

ذبحِ ابناء کا مطلب

بچے پیدا ہوں ان میں سے لڑکوں کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اسے تورات سے لیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے:

> تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو، جن میں سے ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا نام فوعہ تھا، یوں کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی کا کام کرتی ہو اور تم انہیں پتھروں پر دیکھو، اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو۔
>
> (خروج ۱/۱۵-۱۶)

یہودیوں نے تو اس افسانہ کی کمزوری کو خود ہی بھانپ لیا اور یہ لکھ دیا کہ:

> پر، دائی جنائیاں خدا سے ڈریں اور جیسا کہ مصر کے بادشاہ نے انہیں حکم کیا تھا، نہ کیا اور لڑکوں کو جیتا رہنے دیا۔ (خروج ۱/۱۷)

لیکن ہمارے ہاں کے مفسرین اُس بات پر جمے رہے جسے سب سے پہلے مفسر نے لکھ دیا تھا (تقلید میں ہوتا ہی یہ ہے) اور کبھی کھڑے ہو کر یہ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اگر فرعون کے اس حکم پر ایک نسل تک بھی عمل ہوتا تو مصر سے بنی اسرائیل کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ لیکن وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی اتنی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نیز اُن کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام بھی موجود تھے جو ان سے بڑے تھے۔ اگر لڑکے قتل کر دیئے جاتے تو حضرت ہارون علیہ السلام کس طرح زندہ بچ جاتے! پھر قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فرعون نے حکم یہ دیا تھا کہ جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں ان کے ابناء کو ذبح کیا جائے (۴۰/۲۵)۔

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں ذبح اور قتل کے الفاظ جان سے مار دینے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے۔ ان سے مراد ہوتا ہے کسی کو ذلیل و خوار کرنا۔ اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہ دینا۔ اسے جوہرِ انسانیت سے محروم رکھنا۔ اور ابناء قوم کے معنی قوم کے لڑکے ہی نہیں بلکہ مجازی معانی کے اعتبار سے اس سے مراد، قوم کے معزز افراد ہوتے ہیں، بِنا، عمارت یا عمارت کی بنیاد کو کہا جاتا ہے) لہٰذا ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ فرعون کرتا یہ تھا کہ قوم بنی اسرائیل کے جن

افراد میں جوہرِ مردانگی کی نمود دیکھتا انہیں ذلیل و خوار کرتا، پیچھے ہٹاتا، اور آگے ان لوگوں کو بڑھاتا جو ان صلاحیتوں سے عاری ہوتے۔ حکمران طبقہ کی اس قسم کی دسیسہ کاری ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ وہ محکوم قوم میں سے انہی کو اپنا مقرب اور معزز بناتے ہیں جو انسانی صلاحیتوں سے عاری ہوں۔ اور جن کے متعلق ذرا سا احساس بھی ہو کہ وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہیں۔ انہیں ابھرنے نہ دیا جائے۔ یہ تھی فرعون کی وہ چال، جس سے وہ بنی اسرائیل کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ (آیت ۲۸ میں) اَلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا۔ یعنی وہ قوم جسے وہ کمزور سے کمزور تر کئے جاتا تھا۔ لہٰذا بنی اسرائیل پر خدا کا پہلا انعام یہ تھا کہ اس نے انہیں غلامی کے اس ذلت آمیز عذاب سے نجات دلائی۔

لیکن یہ تو صرف منفیانہ پہلو ہے۔ غلامی کے عذاب سے نجات ملنے سے قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب نظر آتا ہے کہ نجات کے اُس مفہوم کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں بات کر لی جائے

نجات کا مفہوم

جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے اگرچہ اس پر تفصیلی بحث اس کے مقام پر آئے گی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، عیسائیوں کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس سے اس آلائش کو دور کر دینا نجات کہلاتا ہے، اور یہ حاصل ہوتی ہے حضرت مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لانے سے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ہمیں ہمارے اسلاف کے بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا تاکہ ان گناہوں کے جراثیم تلف ہو جائیں اور اس کے بعد ہمیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اس کا نام ہے نجات ——— یعنی عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کی پاداش میں مختلف ورنوں (ذاتوں) میں جنم لیتا ہے۔ وہ کروڑہا کروڑ سال تک آواگون (تناسخ) کے ان چکروں میں گردش کرتا رہتا ہے اور آخر الامر اس سے چھٹکارا حاصل کر کے مُکتی (نجات) حاصل کر لیتا ہے۔ ویدانت یا تصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ روحِ خداوندی انسانی پیکر میں پہنچ کر مادہ کی کثافتوں سے ملوث ہو جاتی ہے۔ اس کثافت کو مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں سے دور کیا جاتا ہے تاکہ یہ روح پھر اپنی اصل کے ساتھ مل جانے کے قابل ہو جائے۔ مادہ کی کثافت کے اس طرح دور ہو جانے کا نام نجات ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دنیا کے تمام مذاہب اور مسالک میں "نجات" کا تصور یہ ہے کہ انسان پہلے پاک اور صاف تھا۔ پھر بعض آلائشوں اور کثافتوں سے ملوث ہو گیا۔ (خواہ یہ کثافتیں پیدائشی ہوں یا گناہوں کی پیدا کردہ) انسانی زندگی کا مقصد ہے کہ ان آلائشوں کو دور کر کے پھر ویسا انسان بن جائے جو آلائشوں سے ملوث نہیں تھا ———

خواہ یہ چیز اس دنیا میں ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل ہو جائے اور خواہ آخرت میں کچھ وقت کے لئے جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد —— طریقِ کار اس کا کوئی بھی ہو، مقصد اس سارے پروگرام کا یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر سے ویسا ہی بن جائے۔ مثال کے طور پر آپ یوں سمجھئے کہ صبح کے وقت آپ تندرست اور توانا تھے۔ پھر کسی وجہ سے آپ کو بخار ہو گیا۔ آپ نے اس کی تکلیف برداشت کی، علاج معالجہ کیا۔ شام کو بخار اتر گیا اور آپ پھر ویسے کے ویسے ہو گئے جیسے صبح کے تھے۔ اس تمام پروگرام میں آپ نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ یہ ہے نجات کا وہ عام تصور، جو بدقسمتی سے ہمارے ہاں بھی مروج ہے۔ آپ سوچئے کہ اس نظریہ کی رو سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟

خدا پاک اور صاف روحوں کو، انسانی پیکر میں، دنیا میں بھیجتا ہے کہ وہ یہاں پہنچکر گناہوں کی آلائش میں ملوث ہو جائیں۔ پھر انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کرتا ہے کہ وہ لوگوں اس آلائش کے دور کرنے کے طریقے بتائیں۔ یہ آلائشیں یہاں صاف نہیں ہوتیں تو انہیں مرنے کے بعد داخلِ جہنم کر دیتا ہے تاکہ اُس بھٹی میں یہ آلائشیں صاف ہو جائیں۔ اور اس طول طویل پروگرام کے بعد جب انسان پھر ویسے ہی بن جائیں جیسے وہ دنیا میں آنے سے پہلے تھے تو انہیں جنت میں بھیج دیتا ہے۔ اور اس پر اس پروگرام کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کا پروگرام اس خدا کے شایانِ شان ہو سکتا ہے جو بار بار کہتا ہے کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو عبث اور باطل پیدا نہیں کیا۔ اسے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے بالحق پیدا کیا ہے۔

قرآن کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ انسان دنیا میں کسی قسم کے گناہ کی آلائش کے بغیر سادہ لوح کے ساتھ، کچھ مضمر صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں اس کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما کرے کہ وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس اگلی ارتقائی منزل کا نام جنت ہے۔ اسے اس نے "فوز" کہکر پکارا ہے اور فوز کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے نہیں بلکہ مثبت طور پر کچھ حاصل کرنے (ACHIEVEMENT) کے ہیں۔ ان اشارات سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ قرآنی پروگرام کا مقصد انسان کی "نجات" نہیں، اس کی فوز و فلاح ہے (فلاح کے معنی ہوتے ہیں کھیتی کا بردمند اور ثمربار ہونا)۔ اس اجمال کی تفصیل اس مقام پر آئے گی جہاں اُخروی زندگی سے متعلق گفتگو ہو گی۔ یہاں اتنی مزید وضاحت کافی ہو گی کہ "نجات" کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بھی ہیں اور مصیبت سے دور رکھنے کے بھی۔ اُخروی نجات اس دوسرے معانی میں ہے۔

اس ضمنی گفتگو کے بعد پھر آیئے اصل موضوع کی طرف۔ قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خدا نے تمہیں فرعون

کی غلامی کے عذاب سے نجات دلائی۔ یہ پہلی کڑی تھی اس سلسلۂ انعامات کی جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ غلامی کی زندگی میں تمہیں اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے مواقع حاصل نہیں تھے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے بعد تمہیں اس کے مواقع حاصل ہوں گے۔ جب تم نے ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے معاشرہ کو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کیا تو اس سے زندگی کے مثبت نتائج تمہارے سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا:۔

تمکن فی الارض

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸/۵-۶)

چنانچہ اس مقام پر ہم نے ارادہ کیا کہ وہ قوم جسے فرعون کے استبداد نے کچل کر رکھ دیا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ اُسے نہ صرف یہ کہ دوبارہ زندگی مل جائے۔ اسے سربراہی اور سرداری عطا کی جائے۔ اُسے ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے جس میں وہ اپنی با اختیار مملکت قائم کرے اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار، ہامان اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھا دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور جس سے محفوظ رہنے کے لئے وہ اس قدر فریب کارانہ حربے استعمال کیا کرتے تھے۔

یہاں سے ہم نے دیکھ لیا کہ انعامِ خداوندی یہی نہیں تھا کہ اس قوم کو فرعون کی حکومت سے نجات دلائی گئی۔ یہ تو قدمِ اوّل تھا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد اپنی با اختیار مملکت قائم کریں۔ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو اور تمکن بھی اس سرزمین پر حاصل ہو جس پر پہلے قومِ فرعون قابض تھی۔ چنانچہ سورۃ الشعراء میں ہے فَأَخْرَجْنَاهُم مِّن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ۔ كَذَٰلِكَ۔ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (۲۶/۵۷-۵۹)۔" اور ہم نے قومِ فرعون کو ان کے سرسبز و شاداب باغات، صاف اور شفاف چشموں اور ان کی زمین کے ذخائر و دفائن سے نکال باہر کیا اور ان سے تمام عزت و تکریم کے مقامات چھین لئے اور ان سب کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا" وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ (۱۰/۹۳)۔" ہم نے بنی اسرائیل کو ایسا تمکن عطا کیا جو سراب نہیں تھا، حقیقت پر مبنی تھا۔ اور ہم نے انہیں نہایت خوشگوار اور پاکیزہ سامانِ زیست عطا کیا —— وہ سامانِ زیست، جس سے پرواز میں کوتاہی آنے کے بجائے۔ حدود ناآشنا قوتیں پیدا ہو جائیں۔"

قرآن کریم نے جماعت مومنین کی خصوصیت —— یا ایمان و عملِ صالحہ کا لازمی نتیجہ —— یہ بتایا ہے کہ یہ

اُمّت دنیا کی ہر قوم پر غالب اور ان کے مقابلہ میں سر بلند اور سرفراز ہو گی۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸) اقبالؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

مومنے بالائے ہر بالا ترے   غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

جماعتِ مومنین، دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ میں بلندتر ہوتی ہے کسی کا اس کے آگے نکل جانا تو درکنار، اس کی غیرت اسے بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور قوم اس کی ہمدوش ہو۔ یہی وہ انعامِ خداوندی تھا جس سے بنی اسرائیل کو نوازا گیا تھا، جب اس سے کہا کہ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲/۴۷ ؛ ۲/۱۲۲) "ہم نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر برتری عطا فرمائی"۔ دوسرے مقام پر کہا ہے۔ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰھُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۴۴/۳۲) "یہ قوم دیگر ہم عصر اقوام عالم کے مقابلہ میں منتخب قوم تھی اور ان کا یہ انتخاب یونہی "مرحمتِ خسروانہ" کے طور پر عمل میں نہیں لایا گیا تھا۔ یہ علم و بصیرت پر مبنی تھا"۔

حکومت تو محض قوت کے بل بوتے پر بھی حاصل ہو سکتی ہے، اور اگر اس قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس سے دیگر اقوام پر غلبہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے ——— تاریخِ انسانیت، چنگیز اور ہلاکو قسم کے پیکرانِ غلبہ و تسلط کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن جس حکومت کو قرآنِ کریم نعمتِ خداوندی قرار دیتا ہے اس کی بنیاد محض قوت پر نہیں ہوتی۔ اس کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ قوت کو ان قوانین کے ساحلوں میں محصور رکھا جائے جو وحی کی رُو سے عطا ہوں۔ اس مملکت کو اس نے "ایمان اور اعمالِ صالحہ" کا نتیجہ بتایا ہے (۲۴/۵۵)۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی افضلیت کے سلسلہ میں اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ:-

کتاب و حکومت و نبوّت

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۴۵/۱۶)۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ضابطۂ قوانین عطا کیا۔ انہیں حکومت اور مملکت دی اور ان میں انبیاء کو مبعوث کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں نہایت خوشگوار اور پاکیزہ سامانِ زیست میسر آیا اور اپنی ہم عصر اقوام پر برتری بھی حاصل ہو گئی۔

یہ تھے وہ انعاماتِ خداوندی، جن کی یاد بنی اسرائیل کو دلائی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس یاد دہانی سے مقصود کیا تھا؟ اس سے انہیں یہ بتانا مقصود تھا کہ تم نے جب قوانینِ خداوندی کو پسِ پشت ڈالا تو قومِ فرعون کی ذلّت آمیز،

رسوا کن اور اذیت رساں محکومی کے عذاب میں مبتلا ہوگئے۔ اس کے بعد جب تم نے ان قوانین کا اتباع کیا تو تمہیں مملکت، حکومت، رزقِ طیب، غلبہ و برتری غرضیکہ دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہوگئیں۔ اس کے بعد تم نے پھر قوانینِ خداوندی سے منہ موڑ لیا تو تمہاری یہ حالت ہوگئی جس میں تم اس وقت زندگی گزار رہے ہو۔ حکومت و سطوت تو ایک طرف، تمہیں اس آسمان کے نیچے، اور خدا کی وسیع سرزمین پر، کہیں ٹک کر بیٹھنے کو جگہ نہیں مل رہی۔ تمہیں دنیا نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی اور صحرا نورد، خانماں خراب (WANDERING JEWS) کہہ کر پکارتی ہے لیکن تمہاری یہ محرومی اور نامرادی ابدی نہیں۔ اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے سلسلہ میں تمہارے لئے بازآفرینی کا ایک موقعہ آیا تھا، تم نے اسے ضائع کر دیا۔ اب پھر ایک موقعہ آیا ہے۔ اگر تم اس سے فائدہ اٹھا لو تو تمہیں پھر وہی سرفرازیاں اور سربلندیاں حاصل ہو جائیں گی۔ تمہیں یاد ہوگا (اور اس حقیقت کے بچے کھچے آثار تو تمہاری محرف کتابوں میں آج تک موجود ہیں کہ) جب تمہارے مورثِ اعلیٰ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی کہ دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں تمہارے نام لکھ دی جائیں۔ تو ہم نے کہا تھا کہ یہ خوشگواریاں یونہی ابدی طور پر کسی قوم کے نام نہیں لکھی جایا کرتیں۔ اگر یہ قوم ہماری متعین روش پر چلتی رہی تو ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب رہے گی۔ لیکن اگر اس نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تو پھر مصائب و آلام کے بادل اُمڈ کر آ جائیں گے۔ بایں ہمہ، ان کی یہ محرومی ابدی نہیں ہوگی۔ ان کے لئے آخرالامر بازآفرینی کا ایک موقع آئے گا اور وہ اس طرح کہ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (۷/۱۵۷)۔ "انہیں اس رسول کا اتباع کرنا ہوگا جس کی نشاندہی تورات اور انجیل میں کرا دی گئی ہے۔ یعنی رسولِ آخرالزمان نبیِ اُمّی کا اتباع"۔ اور یہ ان کے لئے آخری موقعہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا۔[1] اسی کے لئے کہا گیا وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (۲/۴۰)۔ "تم نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا، اُسے پورا کرو تو میں نے جو وعدہ تم سے کیا تھا، میں وہ پورا کر دوں گا"۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ "تم یہ کرو تو میں وہ کر دوں گا" اس کی تشریح مطالب الفرقان

---

[1] یہود اور نصاریٰ، دونوں اس آنے والے کا انتظار کر رہے تھے، اور اب تک انتظار کر رہے ہیں، جس کا وعدہ ان کی کتابوں میں موجود تھا (اور موجود ہے)۔ وہ آنے والا (صلی اللہ علیہ وسلم) آ کر چلا بھی گیا اور یہ اب تک اس کا انتظار کر رہے ہیں ——— اور جائے عبرت کہ ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یا للعجب! ۔

جلد اول میں "تقدیر" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی شرح و بسط سے کی گئی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۱۶۲ اور ۱۸۵-۱۸۰)۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرو تو اس کے نتائج خود بخود تمہارے سامنے آجائیں گے۔

میثاقِ بنی اسرائیل

بنی اسرائیل کے اس عہد کو "میثاق" کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ یہ تھا کہ ـــ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (۲/۸۳)۔ یعنی "بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا گیا تھا: انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کی اطاعت نہ کریں"۔ چونکہ وہ قوانین اب نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے عطا کئے گئے ہیں اس لئے ان کی اطاعت اسی رسولؐ کی اتباع کی شکل میں ہو سکتی ہے۔ یہ تو اس میثاق یا عہد کا مرکزی نقطہ تھا۔ اس کی تفاصیل مختلف مقامات پر دی گئی ہیں مثلاً (۲/۸۳؛ ۵/۱۲) میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ وغیرہ کو سامنے لایا گیا ہے۔ (۵/۱۲) میں رسولوں کے اتباع کی تائید کی گئی ہے۔ (۴/۱۵۴) میں سبت کی پابندی کی تاکید ہے۔ (۲/۸۴) میں کہا گیا ہے کہ وہ باہمی خونریزی نہ کریں اور اپنی ہی قوم کے کمزور لوگوں کو ان کے گھر بار سے نہ نکال باہر کریں۔ (۲/۶۳ ؛ ۲/۹۳) میں کہا گیا ہے کہ وہ اس کتابِ خداوندی کو محکم طور پر تھام لیں جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے۔ (۷/۱۶۹) میں کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے خلاف افترا پردازی سے کام نہ لیں۔ یعنی خود ہی مختلف احکامات وضع کر کے انہیں شریعتِ خداوندی کا نام دے کر لوگوں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں۔

یہ تھے وہ عہد جو اُن سے لئے گئے تھے لیکن انہوں نے اِس عہد و میثاق کو اُٹھا کر پھینک دیا (۳/۱۸۶)۔ یہی وہ نقضِ عہد تھا جس کے نتیجہ میں دنیا بھر کی ذلتیں اور رسوائیاں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ گئیں (۴/۱۵۵)۔ اور ان کے دل پتھر ہو گئے (۵/۱۳)۔

محکومی اور غلامی، نکبت و زبوں حالی، ذلّت اور پستی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم احساسِ کمتری کے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس سے جرأت اور بسالت، حق گوئی اور بیباکی کے جوہرِ انسانیت تلف ہو جاتے یا دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے قلوب خوف و حزن کے کاشانے بن جاتے ہیں۔ توہم پرستی کی رسیاں انہیں سانپ بن کر ڈراتی ہیں۔ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳/۴)۔ "کہیں کوئی پتہ کھڑکے تو ان کی جان جاتی ہے کہ آئی کوئی نئی مصیبت!" اسی ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ منافقت کا شیوہ اختیار کر لیتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہودیوں کی یہی حالت ہو چکی تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ تم نے جو عہد میرے ساتھ

کیا تھا اُسے پورا کرو۔ تم کسی سے مت ڈرو۔ وَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ (۲/۴۰) اس کا عام ترجمہ ہے "صرف مجھ سے ڈرو" اور یہ نکتہ تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔

خوف، خشیت، رہب وغیرہ کا ترجمہ خوف یا ڈرہی کیا جاتا ہے لیکن مادہ کے اعتبار سے ان کے معانی میں خفیف اور لطیف سا فرق ہوتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں یہ الفاظ مختلف مواقع پر مختلف مفاہیم کے ساتھ آئے ہیں۔ انسان میں جب کوئی کمزوری پیدا ہو جائے تو اُسے اپنے غیر محفوظ ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور وہ ہر وقت اپنی حفاظت کی تدابیر سوچتا رہتا، اور اس وجہ سے لرزاں و ترساں رہتا ہے اس کی اس کیفیت کو رَهْبٌ کہتے ہیں، اس عدمِ تحفظ کے احساس کا نتیجہ منافقت ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے منافقین کے متعلق کہا ہے کہ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹/۱۳) "ان کے دلوں میں خدا کے مقابلہ میں انسانوں کا خوف زیادہ شدید ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ پیش آئند معاملات پر فہم و فراست سے غور و فکر نہیں کرتے۔ موہوم خطرات کی وجہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔"

خدا سے ڈرنے کا مفہوم

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم آیت (۲/۳۸) میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہدایاتِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم میں دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا، اور اسے بہت بڑا انعامِ خداوندی قرار دیا گیا ہے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ خوف کے احساس سے کس قدر تباہ کن نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب "خوف" اس قدر تباہیوں کا موجب ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا ہے کہ "مجھ سے خوف کھاؤ"۔ خوف بہر حال خوف ہے، خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی کیوں نہ ہو۔ یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کہ ہم "خوف" کے ایک ہی معنی لیتے ہیں، حالانکہ خوف اور خوف میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک خوف وہ ہے جو کسی مستبد حکمران کی دھاندلی اور تشدد کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا خوف وہ ہے جو کسی غلط اقدام کے تباہ کن نتیجہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے۔ ہم بچے کو ڈراتے ہیں کہ آگ کے پاس نہ جانا، تمہاری انگلی جل جائے گی، اسے خوف نہیں کہا جائے گا بلکہ غلط اقدامات سے احتیاط برتنے کا احساس کہا جائے گا۔ اسے اندیشہ یا خدشہ کہہ لیجئے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ عربی زبان میں "خوف" کا یہ مفہوم بھی ہے۔ اس اعتبار سے اَلْخَافَةُ اس چرمی جبّہ کو کہتے ہیں جسے چھتے سے شہد نکالنے والا

اوڑھ لیتا ہے تاکہ وہ مکھیوں کے ڈنگ سے محفوظ رہے۔ نیز اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں کسی شے کو محفوظ رکھنے کے لئے، بند کر دیا جائے۔ اس نہج سے دیکھئے تو خدا سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کا احساس کر کے ان سے اجتناب کیا جائے، بچا جائے۔ قرآن کریم کے متعلقہ مقامات پر غور کرنے سے "خوفِ خدا" کا یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ النّٰزعٰت میں ہے: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۷۹/۴۰)۔ "جو شخص مقامِ خداوندی سے ڈرتا ہے اور اپنے آپ کو پست جذبات سے باز رکھتا ہے"۔ یہاں خوف کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اپنے پست جذبات کے اتباع کے نقصان رساں نتائج کا احساس کرتے ہوئے ان سے احتیاط برتنا۔ سورۃ بقرۃ میں ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ.... (۲/۲۲۹)۔ "اگر تمہیں اس کا ڈر ہو کہ تم حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکو گے تو......." یہاں بھی خوف کے معنی واضح ہیں (نیز دیکھئے ۴/۳ و ۴/۳۵)۔ سورۃ الانعام میں نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ: اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)۔ "اگر میں بھی قوانینِ خداوندی کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی یومِ عظیم کے عذاب سے ڈرنا ہوگا" (نیز دیکھئے ۱۰/۱۵ و ۳۹/۱۳)۔

یہی مفہوم "خشیتِ الٰہی" کا بھی ہے۔ عربوں کے ہاں شَجَرَةٌ خَاشِبَةٌ ایسے درخت کو کہتے تھے جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو جائے، لیکن اس طرح خشک کہ اس کے پھر سے سرسبز ہو جانے کی توقع ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی وہی مُراد ہے۔ یعنی تم اس احساس سے غافل نہ ہو کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے تمہاری کھیتیاں جھلس جائیں گی؛ تمہارا نخلِ تمنّا خشک ہو جائے گا۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کے خوف، خشیت یا رَهْبٌ کا مفہوم اُس خوف اور ڈر سے مختلف ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے لاحق ہوتا ہے۔ یہ خوف اس انسان کی طرف سے لاحق ہوتا ہے جس سے یا تو تمہاری کچھ امیدیں وابستہ ہوں یا جس سے تمہیں کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔ ان وجوہات سے پیدا ہونے والے خوف سے محفوظ اور مامون رہنے والوں کے متعلق کہا کہ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا۔ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۲۱/۹۰)۔ "یہ لوگ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت، دونوں صورتوں میں، ہمارے قوانین کو پکارتے تھے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں انسانوں کا خوف باقی نہیں رہتا تھا"۔ اس نے دوسرے مقام پر کہا کہ انسان انہی لوگوں سے خائف ہوتا ہے جنہیں وہ صاحبِ اقتدار سمجھ لیتا ہے۔ اگر اس کا ایمان ہو کہ اقتدار صرف خدا کو حاصل تو پھر وہ کسی انسان سے خائف نہیں ہوتا۔ سورۃ النّحل میں ہے:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۱۶/۵۱)۔ "خدا کا حکم یہ ہے کہ تم اپنے لئے دو الٰہ تجویز نہ کرو۔ الٰہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ لہٰذا تم صرف اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرو" یہ جو یہاں اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (دو الٰہ) کہا گیا ہے تو اس کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴)۔ "سماء میں بھی وہی الٰہ ہے اور ارض میں بھی وہی الٰہ" اس نکتہ کی وضاحت مطالب الفرقان (جلد اوّل) میں زیرِ آیت (۱/۱) (صفحات ۱۰-۹ پر) کی گئی ہے۔ یہاں اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ مذہب میں یہی ثنویت رائج ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کا حیطۂ اقتدار آسمانوں پر ہے اور دنیاوی معاملات کا تعلق انسانی حکومتوں سے ہے۔ اس میں آسمانی اِلٰہ کا تصور محض نظری حیثیت لئے رہتا ہے۔ لیکن ارضی خداؤں کا خوف ہر وقت اعصاب پر مسلط رہتا ہے۔ اسی کا نام شرک ہے اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف۔ اقبال کے الفاظ میں:-

آنکہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است　　شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(اسرار و رموز ص۱۱۱)

بنا بریں، جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے کہا کہ: وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۲/۴۰) تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تم نے دنیا میں مختلف الٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن سے تم ہر وقت ڈرے اور سہمے رہتے ہو۔ تم اگر قوانینِ خداوندی کی صداقت پر پھر سے ایمان لے آؤ اور ان کے مطابق زندگی بسر کرو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے دل میں کسی انسان کا ڈر اور خوف باقی نہیں رہے گا۔ احساس ہوگا تو فقط اس کا کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے کیونکہ اس کا نتیجہ واقعی ایسا ہوگا جس سے انسان کو ڈرنا چاہیئے۔ اسی کی تاکید کرتے ہوئے ان سے کہا کہ:-

(۲/۴۱) وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۖ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۔

اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم اس قرآن پر ایمان لاؤ جو نُزِّلَ مِنَ اللّٰہ ہے اور جو مصدق ہے، اُس کا جو تمہارے پاس ہے۔ ایسا نہ کرو کہ تم اس سے انکار کرنے والوں میں پیش پیش ہو" ہم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کیساتھ اہلِ کتاب کو بھی دعوت دی تھی کہ وہ رسالتِ محمدیہ پر ایمان لائیں۔

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

(دیکھیے جلد اول ص۸۳) سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ایک ہی دین تھا جو حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر نبی اکرم

(صلی اللہ علیہ وسلم) تک جملہ انبیاء کرام ؑ کو خدا کی طرف سے دیا جاتا رہا تو پھر انبیاء سابقہ کی امتوں (یہود و نصاریٰ وغیرہ) سے یہ کیوں کہا گیا کہ وہ قرآن کریم پر ایمان لائیں۔ ان کے پاس اُن کی کتابیں موجود تھیں جن پر وہ ایمان رکھتے تھے تو اس کے بعد قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے دین ایک ہی تھا جو مختلف انبیائے کرام کی طرف نازل کردہ کتابوں میں دیا گیا تھا لیکن ان انبیاء کے نام لیواؤں میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہی تھی جو ان کے نبی کی وساطت سے انہیں ملی تھی۔ ہمارا یہ دعویٰ یونہی بلا سند اور بلا دلیل (محض قرآن کریم کی عظمت اور افضلیت ثابت کرنے کے لئے) نہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ میں نے اپنی کتاب ——— مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں ——— میں مختلف مذاہب کے مدعیوں کی تصانیف اور تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے رسول نے انہیں دی تھی۔ چونکہ اس مقام پر بات، یہودیوں کے متعلق ہو رہی ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان کی مبینہ آسمانی کتاب، تورات کی مختصر سی تاریخ پیش قارئین کر دی جائے۔ لیکن اس تاریخ کو سامنے لانے سے پہلے قرآن کریم کے اس دعویٰ کو دیکھئے جس میں اس نے کہا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں دیدہ دانستہ تحریف کرتے تھے۔ اس تحریف کی پہلی شکل تو وہ تھی جسے اس نے

تحریف

زیر نظر آیت سے متصل آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۲/۲) "تم نہ تو تلبیس حق و باطل کرو اور نہ ہی دیدہ دانستہ کتمانِ حقیقت"۔ سورۃ آلِ عمران کی آیات (۷۱/۳ : ۱۹۹/۳) نیز سورۃ المائدۃ کی آیت (۱۳/۵) اور سورۃ الانعام کی آیت (۹۲/۶) میں بھی ان کے انہی اقدامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تلبیسِ حق و باطل کے معنے یہ ہیں کہ احکامِ خداوندی اور اپنی خود ساختہ شریعت کو اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان میں امتیاز اور پہچان مشکل ہو جائے۔ اور کتمانِ حقیقت کے معنی ہیں کہ اصل بات کو چھپائے رکھنا۔ یہ مذہبی پیشوائیت کی عام روش ہے، خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ (۷۹/۲) "خود احکام وضع کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے"۔ کبھی وہ یہ کرتے ہیں کہ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ (۴۶/۴) "وہ احکامِ خداوندی کو ان کے صحیح مقامات سے ہٹا کر اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں اور پھر ان کی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے ان کا کچھ سے کچھ مفہوم متعین کر دیتے ہیں"۔ (نیز دیکھئے ۱۳/۵ ؛ ۴۱/۵)۔

اللہ تعالیٰ نے منزل من اللہ کتاب کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا (۴/۸۲)۔ اور اس کا فطری نتیجہ یہ ہونا ہے کہ اس کتاب کی ماننے والی امت میں بھی کوئی اختلاف اور تفرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب کتابِ خداوندی کے ساتھ وہ کچھ کیا جائے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کتاب میں بھی

اختلافات اختلافات پیدا ہو جائیں گے اور اس کی ماننے والی قوم بھی فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہی کچھ کتابِ موسیٰؑ کے ساتھ ہوا تھا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (۴۱/۴۵) "یہ حقیقت ہے کہ دیگر انبیائے کرام کی طرح حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو بھی خدا کی طرف سے کتاب دی گئی تھی لیکن اس کتاب میں اختلافات پیدا کر دیئے گئے" اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور ہر فرقہ کے علماء اور مشائخ خدا بن کر بیٹھ گئے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)۔ "ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا سے ورے ہی اپنا معبود بنا لیا"۔

یہ تھے وہ الزامات، جو قرآنِ کریم نے یہودیوں کے خلاف عائد کئے تھے اور انہی کی بناء پر اُن سے کہا تھا کہ انہیں جو تعلیم سابقہ انبیائے کرام کی وساطت سے ملی تھی، وہ ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں، وہ اب قرآنِ کریم ہی میں ملے گی۔ اس لئے اگر وہ حیاتِ نو کے متمنی ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائیں۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق تاریخی شواہد سے کس طرح ہوتی ہے۔

تورات کی تاریخ سب سے پہلے اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تورات صرف اس کتاب کا نام نہیں جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام صحف کا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے انبیائے بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ یہ مجموعہ (۳۹) کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں علمائے یہود تین سلسلوں میں منقسم کرتے ہیں:۔

(۱) سلسلۂ اوّل۔ تورات (یا قانون)۔ اس میں پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں جنہیں کتبِ موسیٰ کہا جاتا ہے ــ پیدائش ــ خروج ــ احبار ــ گنتی اور استثناء ــ قرآنِ کریم میں تورات (یعنی عہدِ عتیق) کو کہیں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ ان کے صحف ہی کا ذکر آیا ہے (۵۳/۳۶؛ ۸۷/۱۹)۔

(۲) سلسلۂ دوم۔ نبیم۔ اس میں چھوٹی بڑی بائیس کتابیں شامل ہیں ــ اور

(۳) سلسلۂ سوم۔ کیتبیم۔ اس میں بارہ کتابیں شامل ہیں جن میں سے ایک زبور بھی ہے۔

یہ کتابیں (جیسی کچھ بھی ہیں) آج موجود ہیں، لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے جن کا وجود اس مجموعہ میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی کم از کم گیارہ کتابیں گنائی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک ان پانچ کتابوں کا تعلق ہے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور اس کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کا کم از کم کچھ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ عہد نامۂ عتیق کی کتابوں کے متعلق بہ تحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ ابتداءً کس عہد میں مدوّن ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے۔ البتہ اتنا ضرور متحقق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا اور اس کے بعد از سر نو ان کی تدوین عمل میں آئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے الواحِ تورات اور دیگر تبرکات کو (یہودیوں کے قول کے مطابق) ہیکل میں محفوظ رکھا تھا۔ بخت نصر نے ان سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا اور یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ قریب ایک سو سال کے بعد جب یہودیوں نے یروشلم میں دوبارہ بسنا شروع کیا تو انہیں اپنے گم گشتہ مصاحف کی ترتیبِ نو کی فکر ہوئی۔ تورات کے بیان کے مطابق، عذرا فقیہہ نے اپنی یادداشت کے مطابق سلسلۂ اول کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا[1] اس کے بعد نحمیاہ نبی[2] نے سلسلۂ دوم کی کتابوں کو مرتب کیا۔ لیکن، اس کے بعد، جب یونانیوں نے فلسطین کو تباہ کیا تو انہوں نے ان تمام صحیفوں کو جلوا دیا اور تورات کی تلاوت کو حکماً بند کر دیا۔ اس کے بعد یہودیوں کے احبار و رہبان نے ان کتابوں کو از سر نو مرتب کرنا شروع کیا اور اُن انتالیس کتابوں کے سلسلہ کو مکمل کیا جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن جب ۷۰ء میں رومی گورنر ٹائٹس نے بیت المقدس کو تباہ کیا تو پھر یہودی اس میں آ کر آباد نہ ہو سکے۔ ٹائٹس ان مقدس صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر فتح کی یادگار کے طور پر روما کے محلات میں لے گیا۔ یہودیوں کی مرکزیت فنا ہو چکی تھی، ان کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ مختلف مقامات پر ان کے علماء نے انفرادی طور پر پھر ان کتابوں کو مدوّن کیا۔ یہودیوں کی اپنی زبان قدیم عبرانی تھی۔ لیکن بابل سے مراجعت کے بعد ان کی زبان ارامی ہو گئی۔ عذرا فقیہہ نے عہدِ عتیق کی کتابوں کس زبان میں لکھا تھا، یہ بالتحقیق معلوم نہیں۔ اس لئے کہ ان کی مرتب کردہ کتابوں کا بھی دنیا میں کہیں وجود نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو یا تو یہودیوں کی اصل زبان عبرانی قدیم میں لکھا ہوگا یا پھر بعد کی زبان (ارامی)

---

[1] اس کے مرتب کرنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اسے میری کتاب — مذاہبِ عالم کی مبیّنہ آسمانی کتابیں — میں دیکھئے۔

[2] یہودیوں کے ہاں ہیکل کے ایک منصبدار کو بھی نبی کہہ کر پکارتے تھے جس کا منصب پیش گوئیاں کرنا ہوتا تھا۔ یا لوگوں کو ان کی "قسمت" بتانا۔

ہیں۔ لیکن دنیا جن کتابوں سے روشناس ہوئی وہ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ اور انہیں سے پھر ان کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا۔ ان عبرانی نسخوں میں بیحد اختلافات ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی میں ان کے تقابل سے ایک متفق علیہ نسخہ مرتب کیا گیا جو اب تک مروج ہے۔ اس نسخہ میں مذکورہ صدر اختلافات کو حاشیہ پر لکھ دیا گیا۔ ان کا پہلا ایڈیشن ۱۴۸۸ء میں چھپا لیکن جب ۱۵۲۵ء میں دوسرے ایڈیشن کا انتظام کیا گیا تو پہلے ایڈیشن کے نسخہ سے بارہ ہزار جگہ اختلاف کرنا پڑا۔ دوسرے ایڈیشن کا یہی نسخہ اب عام طور پر رائج ہے۔

یہ ہے اس کتاب (یا مجموعہ کتب) کی تاریخی حیثیت، جسے یہودی اپنے انبیاء کی کتابیں کہکر، ان پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان تاریخی شواہد کے علاوہ، اگر عہدِ عتیق کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا ایک ایک ورق پکار پکار کر کہدے گا کہ یہ کسی صورت میں بھی خدا یا انبیائے کرامؑ کی طرف منسوب کی جانے کے قابل نہیں۔

وحی کی دو قسمیں جہاں تک تلبیسِ حق و باطل کا تعلق ہے، یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی دراصل دو اقسام تھیں۔ ایک تورہ شب کتب۔ یعنی وحیٔ مکتوب (یا وحیٔ متلو) اور دوسری تورہ شب علفہ۔ یعنی وحیٔ غیر مکتوب (یا وحیٔ غیر متلو)۔ یہ وحیٔ غیر مکتوب حضرتِ ہارون علیہ السلام اور ان کی اولاد کی وساطت سے بسلسلۂ روایات آگے بڑھتی گئی۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر تک ان روایات کا ایک طومار اکٹھا ہو گیا تھا جسے ربی یہودہ نے ایک جگہ جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام مشنا ہے پھر اس مجموعہ کی تشریحات وتفسیرات یکجا کی گئیں۔ اس کا نام جمارا ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں تالمود بھی یہودیوں کے ہاں تورات کی سی اہمیت رکھتا ہے بلکہ تورات سے بھی زیادہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مجموعہ، تورات کی تفسیر ہے اور وحی کا ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ)۔

یہ تو تھا سلسلۂ روایات۔ اس کے علاوہ ایک اور ذخیرہ بھی تھا جو اس سے زیادہ پر پیچ اور مخفی راستوں سے جمع کیا گیا تھا۔ عذرا فقیہہ کے متعلق مشہور تھا کہ جب انہوں نے تورات کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا تو اس کے

باطنی علم ساتھ ستر مخفی ملفوظات بھی مدون کئے تھے جو باطنی علم پر مبنی تھے اور ان کی تعلیم پوشیدہ طور پر خواص تک محدود تھی۔ عذرا فقیہہ کا اپنا بیان ہے کہ ان دو سو چار کتابوں کے متعلق جو اس نے مرتب کی تھیں، اس بلند و بالا ہستی کا ارشاد ہوا کہ:-

ان کے پہلے حصہ کو عام طور پر شائع کردو تاکہ اہل اور نا اہل سب انہیں پڑھ سکیں۔ لیکن دوسرے حصہ کی ستر کتابوں کو مخفی رکھو اور صرف انہیں کو دو جو لوگوں میں سمجھ بوجھ کے مالک ہوں۔ کیونکہ ہی

لوگ ہیں جن میں فہم و فراست کا چشمہ، عقل کا منبع اور علم کا دریا ہے۔[1] (عزرا حوالہ صفحہ ۲۲۶ پر دیکھئے)

یہ تھی یہودیوں کے ہاں (مبینہ) آسمانی راہنمائی کی حالت، جس کے پیش نظر ان سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ حیاتِ نو کے متمنی ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ خدا کی اس آخری کتاب (قرآنِ عظیم) اور خدا کے اس آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں۔

مُصدّق کے معنی

ضمناً، قرآنِ کریم کے متعلق متعدد مقامات پر کہا گیا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲/۴۱)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "یہ قرآن تصدیق کرتا ہے ان کتابوں کی جو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے پاس ہیں"۔ آپ سوچئے کہ یہود و نصاریٰ[2] کی جن کتابوں کی کیفیت وہ تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے اور جن کے متعلق خود قرآن کریم نے بار بار کہا ہے کہ وہ محرف تھیں، کیا قرآنِ کریم ان کتابوں کے سچا ہونے کی تصدیق کریگا؟ لفظِ 'مصدّق' کے معنی تصدیق کرنے والا نہیں۔ اس کے معنی ہیں سچ کر دکھانے والا۔ یہود و نصاریٰ کی آسمانی کتابوں میں (جس شکل میں بھی وہ نزولِ قرآن کے وقت موجود تھیں) بہت سے قرآنی دعاوی کا ذکر تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا کی حکومت زمین پر اسی طرح قائم ہوگی جس طرح اس کی حکومت آسمان پر قائم ہے۔ دینِ خداوندی کا غلبہ ہوگا، حق کی فتح ہوگی، باطل شکست کھا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک آنے والا آئے گا اور وہ ایسا کرکے دکھائے گا۔ اُن سے کہا گیا کہ جس آنے والے کا تمہیں انتظار تھا، وہ آگیا اور اپنے ساتھ وہ کتاب لایا ہے جو خدا کے ان وعدوں کو عملاً سچ کر دکھائے گی جن کا ذکر تمہاری کتابوں میں آیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت (۹/۱۱۱) کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جو لوگ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیں گے اُنہیں خدا جنت عطا کر دے گا۔ اور اس کے بعد ہے: وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ (۹/۱۱۱)۔ "یہ وہ خدا کا سچا وعدہ ہے جو اس نے توراۃ میں بھی کیا تھا، انجیل میں بھی، اور اب اسی کو قرآن میں دہرا رہا ہے"۔ اس قسم کے تھے خدا کے وہ

---

[1] جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ان تمام امور کی تفصیل، حوالے، سندیں اور شواہد، میری کتاب ——— مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں ——— میں ملے گی۔ وہاں سے یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ پھر یہودیوں کے یہ تمام عقائد اور مسالک کسطرح رفتہ رفتہ خود ہمارے ہاں بھی در آئے اور (وضعی روایات، تفاسیر اور صوفیا کے مکاشفات کے ذریعے) مروجہ مذہبِ اسلام کی بنیادیں بن گئے۔ ہمارے ہاں بھی وحی کی یہی دو قسمیں مانی جاتی ہیں۔

[2] انجیل کے متعلق ہم آگے چل کر اس کے مقام پر، اسی تفصیل سے لکھیں گے جس تفصیل سے تورات کے متعلق لکھا گیا ہے۔

وعدے جنہیں خدا کے اس رسولؐ نے سچ کر دکھایا تھا۔ واضح رہے کہ قرآن کریم جہاں نظری طور پر کہتا ہے کہ اس تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا، وہاں وہ طریق بھی بتاتا ہے جس پر عمل کر کے وہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس طریق کا نام دین کا نظام یا الاسلام ہے۔ مذہب میں نظری تعلیم تو بچی کھچی کسی نہ کسی حالت میں باقی رہ جاتی ہے لیکن وہ عملی طریق نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو جاتا ہے جس کی رو سے ان نظری مواعید نے محسوس نتائج کی شکل اختیار کرنی تھی۔ مذہب میں اس نظری تعلیم کے الفاظ کو دہرا لینے یا رسمی طور پر پرستش کے طور طریقے ادا کر لینے کا نام اطاعتِ خداوندی سمجھ لیا جاتا ہے۔ باقی رہے اس کے نتائج، تو اس کے متعلق یہ کہکر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلا لیا جاتا ہے کہ یہ (نتائج) اگلی دنیا میں جاکر مرتب ہوں گے۔ اس دنیا میں نہیں۔ دین کے نظام میں یہ نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ قرآن کو جب مواعیدِ خداوندی کا مصدق کہا گیا ہے تو اس سے یہ مفہوم ہے کہ اس میں وہ طریق بھی بتا دیا گیا ہے جس کے مطابق عمل کرنے سے خدا کے یہ وعدے اس دنیا میں سچے ثابت ہو کر سامنے آجائیں گے۔

وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ (۲/۴۱)

آیت کے اس ٹکڑے میں ایک اور عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جب بھی کوئی رسول آیا تو عام طور پر اس کے مخاطب دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو کسی پہلے نبی کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خدا، وحی اور آخرت تک کے منکر تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جنہیں مذہب پرست کہا جاتا ہے۔ وہ کسی سابقہ رسول کے متبع ہونے کے دعویدار تھے اور (بزعم خویش) خدا، رسولؐ، کتاب اور آخرت کے قائل اور شریعتِ خداوندی کے ماننے والے۔ چاہیئے یہ تھا کہ یہ گروہ اس نئے رسولؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہتا کیونکہ وہ اُنہی صداقتوں کی طرف دعوت دیتا تھا جنہیں یہ خود تسلیم کرتے تھے۔ وہ ان میں اصلاح ہی چاہتا تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب پرست طبقہ داعیانِ الی اللہ کی مخالفت میں پیش پیش ہوتا تھا اور سب سے زیادہ متشدد۔ اس حد تک کہ ان میں سے

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے دین کی مخالفت

بہت کم ایسے افراد نکلتے جو اس رسول کی دعوت کو قبول کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کا مدار شخصیت پرستی پر ہوتا ہے اور حضرات انبیائے کرامؑ کی طرف سے پیش کردہ دین، خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ شخصیت پرستی کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی بات کو علم و بصیرت یا دلیل و برہان کی رو سے پرکھنے کے بجائے دیکھا یہ جائے کہ وہ ان کے اسلاف کے اقوال یا مسلک کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس کے خلاف ہو تو پھر آپ لاکھ

سر پٹختے وہ اُسے کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے اسلاف پر زد پڑتی ہے، اور اُسے وہ کسی صورت میں بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اس مسلک کو حق و صداقت پر مبنی سمجھتے جس میں نام تو خدا کا ہو لیکن پرستش درحقیقت ان شخصیتوں کی ہو جنکی عقیدت ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکی ہو۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ سورۃ الزمر میں کہتا ہے کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے: وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۳۹/۴۵) "جب ان کے سامنے اکیلے خدا (خدائے واحد) کے احکام پیش کئے جاتے ہیں تو یہ بات ان پر سخت گراں گزرتی ہے۔ اس سے ان کا سینہ بھنچ جاتا ہے۔ وہ منہ بسور لیتے ہیں۔ لیکن جب ماسوا اللہ (دوسری شخصیتوں) کی بات کی جاتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔"

قرآن، اس قسم کے "خدا پر ایمان" کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ ایمان تو، توحید خالص کا نام ہے۔ اگر اس میں کسی شخصیت کی ذراسی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ کفر ہو جاتا ہے، شرک قرار پا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المؤمن میں ہے: ذَٰلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ۖ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا ۚ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۴۰/۱۲) "جب انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اُس سے کفر اختیار

قرآنِ خالص کی اِطاعت

کر لیتے ہیں۔ لیکن جب خدا کے ساتھ اوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ پھر ایمان لے آتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہ خدا پر ایمان نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ خدا کے اقتدار کو اقتدارِ مطلق تسلیم کیا جائے اور اس حقیقت پر یقین رکھا جائے کہ حق حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اطاعت صرف اسی کے احکام کی کی جا سکتی ہے۔" سورۃ بنی اسرائیل میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کہا کہ: وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا (۱۷/۴۵) "جب تو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے تو یہ لوگ، جو دعوئ ایمان کے باوجود، خدا کے قوانین مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت کے منکر ہیں، ان کے اور تمہارے درمیان ایک ایسا پردہ لاحق ہو جاتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔" اس غیر مرئی اور غیر محسوس پردہ سے ہوتا کیا ہے؟ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا (۱۷/۴۶) "ان کے دلوں پر خول چڑھ جاتے ہیں جس سے ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں جس سے صداقت

کی آوازوں کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ تو ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے۔ ان کی پسندیدہ شخصیتوں کو ساتھ نہیں ملاتا۔ اس سے ان کے دلوں میں نفرت کے طوفان اُمڈ آتے ہیں اور یہ منہ موڑ کر چل دیتے ہیں"۔ جسے لوگ "شریعتِ خداوندی" کہکر پکارتے ہیں وہ خدائے واحد کے احکام پر مشتمل نہیں ہوتی۔ یہ ان کے اسلاف کی وضع کردہ شریعت ہوتی ہے جسے یہ خدا کا شریک ٹھہرا دیتے ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے: اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱) "خدا کے یہ شریک وہ ہیں جو ان کے لئے اس قسم کی شریعت وضع کر دیتے ہیں جس کا حکم خدا نے نہیں دیا ہوتا"۔ یہی ہے وہ شریعت، جسے ان کے علماء و مشائخ (احبار و رہبان) شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے اور ان سے اس کی اطاعت کراتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہی کو خدا کے شریک قرار دیا ہے جب کہا ہے اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)۔ "یہ اپنے احبار و رہبان کو خدا کا شریک بنا دیتے ہیں"۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ دینِ خداوندی کی سب سے شدید مخالفت، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی تھی، اس کی شہادت قرآن کریم کے اوراق سے بین طور پر ملتی ہے۔ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب خدائے واحد کی طرف دعوت

زمانۂ نزولِ قرآن کی شہادت

دی تو آپ کے سامنے ایک تو قریشِ مکہ تھے۔ یہ لوگ کسی سابقہ نبی کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ ان میں بت پرستی، اوہام پرستی، رسوم پرستی عام تھی لیکن اصطلاحی طور پر یہ کسی مذہب کے پیرو نہیں تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جسے قرآن کریم اہلِ کتاب کہکر پکارتا ہے۔ یہ وہ گروہ تھا جسے ہم اصطلاحی طور پر مذہب پرست کہہ سکتے ہیں۔ ان میں یہودی اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کے معتدبہ حصہ میں انہی اہلِ کتاب کی مخالفتوں، دسیسہ کاریوں، فریب انگیزیوں، پنہاں سازشوں اور کھلی ہوئی بغاوتوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ مؤمنین کے ساتھ ان سب کا ٹکراؤ مسلسل رہا لیکن آخر الامر ہم دیکھتے ہیں کہ لا مذہب قریش یا دیگر اسی قسم کے عرب قبائل نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن ان اہلِ کتاب میں سے بہت کم مسلمان ہوئے۔ ان (یہودیوں) کو پہلے مدینہ سے نکالنا پڑا اور اس کے بعد ملک بدر کرنا پڑا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس تورات ہے جو ان انبیاء کی تعلیم پر مشتمل ہے جو خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ تمہاری ان موجودہ کتابوں کی نسبت تو بیشک ان انبیاء کی طرف ہے لیکن ان کے مندرجات خدائے واحد کی وحیٔ خالص پر مشتمل نہیں۔ ان میں بہت کچھ انسانوں کا خود ساختہ شامل ہو چکا ہے۔ اسی کو تلبیسِ حق و باطل کہا جاتا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن کیسے بلیغ انداز میں بیان

کرتا ہے جب کہتا ہے: إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ أَسْلَمُوا۟ لِلَّذِينَ هَادُوا۟ وَٱلرَّبَّٰنِيُّونَ وَٱلْأَحْبَارُ بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا۟ مِن كِتَٰبِ ٱللَّهِ وَكَانُوا۟ عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا۟ ٱلنَّاسَ وَٱخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِى ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَٰفِرُونَ (۵/۴۴)۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہماری ہدایت اور روشنی موجود تھی جو انسانوں کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتی تھی۔ انبیاؑ اور ان کے بعد تمہارے بزرگوں میں سے وہ لوگ جن کے ذمہ اس تعلیم کی حفاظت کا فریضہ عائد کیا گیا تھا، اس خدائی تعلیم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے اور اسی کے مطابق تمہارے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرتے اور ان فیصلوں کی نگرانی بھی کرتے۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے اس میں خود اپنی طرف سے بہت کچھ ملا لیا۔ اس سے نہ وہ تورات، تورات رہی نہ شریعت، شریعتِ خداوندی۔ تمہارے مذہبی پیشواؤں نے اسے اپنا کاروبار بنا لیا۔ تم اس حقیقت کو سمجھتے بھی ہو کہ جو کچھ یہ پیش کرتے ہیں وہ صداقت پر مبنی نہیں لیکن تم پر ان کا خوف اس قدر مسلط ہو چکا ہے کہ تم ان کی مخالفت میں زبان پر کچھ نہیں لانا چاہتے۔ لیکن تمہاری یہ روش بالکل غلط ہے۔ ان کے فتووں سے مت ڈرو۔ ڈرو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن عواقب سے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ اس قسم کی مخلوط شریعت کا نام خدا پر ایمان نہیں۔ خدا پر ایمان صرف اس کا ہے جو تمام امور کے فیصلے منزل من اللہ کتاب کے مطابق کرتا ہے۔ جو لوگ بھی ایسا نہیں کرتے وہ کافر ہیں، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مؤمن ہی کیوں نہ کہیں۔" اسی قسم کے ہیں وہ "مؤمن" جن کے متعلق کہا کہ وہ ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِٱللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶)۔ ایمان یہ ہے کہ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی کے مطابق کیا جائے۔ اگر اس وحی کے ساتھ کسی قسم کی بھی آمیزش کر دی جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے، ایمان نہیں رہتا۔ مذہب میں (خواہ اس کا کوئی نام بھی کیوں نہ ہو) اسی قسم کا شرک کارفرما رہتا ہے۔ خدائے واحد پر ایمان نہیں رہتا۔

جنت آسانی سے مل جاتی ہے

مذہب پرست طبقہ، مذہب کو چھوڑ کر دین کی طرف اس لئے نہیں آتا کہ مذہب میں جنت بڑی آسانی سے مل جاتی ہے اور دین میں ضبطِ نفس کے صبر آزما مراحل سے گزرنا اور خارجی قوتوں کے ہمت شکن تصادمات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مذہب اپنے پیروؤں کو اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ تم خدا کی چہیتی قوم ہو۔ وہ تمہیں کبھی جہنم میں نہیں جلائے گا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کا یہی عقیدہ تھا کہ نَحْنُ أَبْنَٰٓؤُا۟ ٱللَّهِ وَأَحِبَّٰٓؤُهُۥ (۵/۱۸) "ہم خدا کی اولاد اور اس کے محبوب بندے ہیں"۔ وہ ہر مذہب پرست کی طرح اس خوش فہمی میں مگن تھے کہ وَقَالُوا۟ لَن يَدْخُلَ ٱلْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ

هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (۲/۱۱۱)۔ "جنت میں صرف یہودی اور عیسائی جائیں گے دوسروں پر اس کے دروازے بند ہوں گے"
(ضمناً) ان کے اس دعوٰی کا جواب بھی سنتے جائیے جو خدا کی طرف سے ملا کہ: تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۵/۱۱۱)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ اگر تم اپنے اس دعوٰی میں سچے
ہو تو اس کی تائید میں کوئی دلیل پیش کرو" اور اس کے بعد پوری تحدّی سے اعلان کر دیا کہ اس قسم کی خوش فہمیاں سب
باطل ہیں۔ فریبِ عقیدت ہیں۔ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۔
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۱۱۲)۔ "حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا جو
انسان بھی خلوصِ قلب سے احکامِ خداوندی کے سامنے جھک جائے اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے تو
خدا کے ہاں سے اسے اس کا صلہ ملے گا۔ اور وہ صلہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگ خوف اور حزن سے مامون ہو جائیں گے"۔ ان
سے کہا کہ اگر تم اس دعوٰی میں سچے ہو کہ جنت میں صرف یہودی اور نصارٰی ہی جا سکیں گے تو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق،
یعقوب، (علیہم السلام) اور ان کے وابستگان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ تو نہ یہودی تھے نہ نصارٰی۔ تمہارے
اصول کے مطابق تو وہ بھی جنت میں نہیں جا سکیں گے (نیز دیکھئے ۲/۴۴)

باہمی فرقہ بندی قرآنِ کریم نے اس ضمن میں ایک اور بھی دلچسپ بات کہی ہے: یہودی اور عیسائی، دونوں اس
کے مدعی تھے کہ وہی جنت میں جائیں گے کوئی دوسرا نہیں جا سکے گا۔ لیکن ان کی باہمی مخاصمت
کی کیفیت یہ تھی کہ: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (۲/۱۱۳)۔
"یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی حق و صداقت پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی حق و صداقت پر نہیں۔ اور تماشہ یہ کہ دونوں
اپنے اپنے دعاوی کی تائید میں وہ کتاب پیش کرتے ہیں جس کے متعلق ان کا دعوٰی ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے"۔ اور اس
کے بعد قرآن کریم نے یہ کہا کہ: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۲/۱۱۳)۔ "یہ بات یہود و
نصارٰی تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کا ہر مذہب پرست یہی کہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقے ایک دوسرے
کے خلاف یہی کچھ کہتے رہتے ہیں۔ اور ہر فرقہ یہی دعوٰی کرتا ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وحیِ خداوندی پر مبنی ہے"۔ ؎

؎ یعنی ہر مذہب پرست پہلے تو یہ کہتا ہے کہ ہمارا مذہب سچا ہے باقی سب مذاہب جھوٹے ہیں۔ اسی لئے جنت میں ہم ہی جائیں گے۔ دیگر اہلِ مذاہب
نہیں جا سکیں گے۔ اور اس کے بعد پھر خود اپنے مذہب کے پیروؤں کے متعلق کہتا ہے کہ جنت میں صرف ہمارا فرقہ جائے گا۔ دوسرے فرقوں
کے متبعین اس میں ——نہیں جا سکیں گے —— مذہب کہیں بھی ہو۔ اس کی خصوصیات ہر جگہ یکساں ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کی شخصیت پرستی کی وجہ کیا ہے؟ قرآن کریم نے ایک لفظ میں اس کی بنیادی وجہ بیان کردی جب کہا کہ :-

غلو فی الدین

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ (۴/۱۷۱ و ۵/۷۷) "اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو مت کرو۔" اس ایک لفظ میں دنیا کے تمام مذاہب کی باطل پرستی کا راز مضمر ہے۔ غلو کے معنی ہیں کسی کو اس کے صحیح مقام سے آگے بڑھا دینا۔ خدا کا مقام تو بلند ترین ہے اس لئے اس کے متعلق (غلط تصورات تو قائم کئے جا سکتے ہیں) غلو نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا دین میں غلو کے معنی ہونگے انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے بلند تر مقام پر بٹھا دینا۔ چنانچہ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بلکہ خود خدا بنا دیا۔ اور یہودیوں نے عزیر[له] کو ابن اللہ قرار دیدیا (۹/۳۰)۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا صراحتاً نام تو اس لئے لیا گیا کہ یہی اس وقت حضورؐ کے اولین مخاطب تھے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب نے اپنے بانیٔ مذہب کو کسی نہ کسی شکل میں فوق البشر قرار دے رکھا ہے۔ مذہب پرست انسان اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جس ہستی کو وہ اپنے مذہب کا بانی یا خدا کا نبی اور رسول مانتا ہے وہ عام انسانوں جیسا ہو۔ چنانچہ جب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے (وحیٔ خداوندی کی رو سے) یہ اعلان کیا کہ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ (۱۸/۱۱۰) "میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے" تو (اقوام سابقہ کی طرح) ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ خدا کا رسول، انسان ہو سکتا ہے۔

انا بشر مثلکم

چنانچہ انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ ایسا شخص رسول کس طرح ہو سکتا ہے يَاۡكُلُ مِمَّا تَاۡكُلُوۡنَ مِنۡهُ وَيَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ (۲۳/۳۳) "جو تمہاری طرح کھاتا پیتا ہے" وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ (۲۵/۷) "اور تمہاری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔"

ہم تورات کی تاریخ کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ یہودیوں نے یہ عقیدہ بھی وضع کر رکھا تھا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو تورات میں لکھی جاتی تھی اور دوسری وہ، جو انبیاء کے اپنے اقوال پر مشتمل ہوتی تھی اور تورات میں داخل نہیں کی جاتی تھی۔ یہ وحی روایتاً آگے چلی اور بعد میں اس کے مجموعے تیار ہوئے۔ ان مجموعوں کو تورات کا ہم پایا (مثلہ معہ) قرار دیدیا گیا۔ یہ بھی غلو فی الدین کی ایک کڑی تھی۔ وہ اس سے آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ ان کے علماء نے جو تفاسیر لکھی ہیں یا فقہی احکام وضع کئے وہ بھی وحی منزل من اللہ کی طرح غیر متبدل ہیں اور ان کی اطاعت، اطاعتِ خداوندی کے مرادف۔

یہ تھا وہ غلو فی الدین، جس سے یہودیوں کو روکا گیا اور کہا گیا کہ دین میں ہر ایک کو اس کے اپنے اپنے مقام پر رکھو۔ کسی کو اس سے آگے نہ بڑھاؤ۔ دین میں خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسانوں کو ان کے مقام سے آگے بڑھا دیا جائے ——— خواہ وہ خدا کے رسول ہوں یا علماء اور مشائخ ——— اور یہی وہ چیز تھی جسے وہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے [٢]۔ مذہبی پیشوائیت اتنا ہی نہیں کرتی کہ وہ اس دعوت

له اس کی تفصیل لغات القرآن میں دیکھئے۔ ٢ اس مقام پر مجھے اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ خود میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں (بقیہ صفحہ ۱۹۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

کے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ آواز بلند نہ ہونے پائے۔ اسے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔
یہی تھی ان اہلِ کتاب کی وہ روش جس کے سلسلہ میں ان سے کہا گیا تھا کہ: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۳/۹۸)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول کرنا چاہتے ہیں، تم ان کا راستہ روک کر تو کھڑے نہ ہو جاؤ۔ تم چاہتے یہ ہو کہ یہ لوگ بھی تمہاری طرح ٹیڑھے راستے اختیار کر لیں۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ سیدھا راستہ وہی ہے جس پر یہ لوگ چلنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تمہاری ہر کرتوت سے واقف ہے اور تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔"

مذہبی پیشوائیت ایسا کیوں کرتی ہے۔ اس کا جواب قرآنِ کریم نے (آیت ۲/۴۱ کے) اگلے ٹکڑے میں دیدیا ہے، جہاں کہا ہے:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲/۴۱)

"تم دین کو کاروبار نہ بناؤ۔ اس سے دنیا مت کماؤ۔"

آپ قرآنِ کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ ہر رسول کی دعوت یہ ہوتی تھی کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (۱۱/۵۰)۔ "اے لوگو! خدا کی محکومیت اختیار کرو" اور اسی سانس میں وہ یہ بھی اعلان کر دیتے تھے کہ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۱۱/۵۱)۔ "میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا"۔ آپ سوچئے کہ یہ کتنی اہم بات ہوگی جسے ہر رسول اپنی دعوت کے ساتھ دہراتا تھا۔ بات ہے ہی بڑی اہم۔ جب دین کو ذریعۂ معاش بنا لیا جائے تو پھر وہ دین رہتا ہی نہیں، مذہب بن جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز تھی جس سے یہودیوں کو اس طرح روکا گیا تھا۔ یہ دین فروشی، مذہب کے پیشوا (علماء و مشائخ) اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت یہ کہکر کر دی کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹/۳۴)۔ "اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا کہ اکثر علماء و مشائخ عوام کے مال و دولت کو باطل طور پر کھا جاتے ہیں اور اپنی اسی کمائی کی خاطر وہ لوگوں کو خدا کے راستہ کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کی راہ میں روک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۳)۔ (قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق) اتنا ہی کہتا ہوں کہ دین میں غلو نہ کیجئے۔ خدا کو خدا، اس کے رسولؐ کو رسولؐ اور علماء و فقہاء کو عالم اور فقیہ ہی سمجھیے۔ انہیں اپنے مقام سے آگے نہ بڑھائیے۔ لیکن مذہب پرست طبقہ کے نزدیک ایسا کہنا کفر ہے۔ قرآنِ کریم نے سچ کہا تھا کہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہمیشہ ایک سا ردِّ عمل ہوگا خواہ وہ کوئی مذہب ہو۔

بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔" دین فروشی کے اس کاروبار کے متعلق، مطالب الفرقان ــــ جلد اول میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۲۵۷-۲۵۶)۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ "ہماری آیات کو "ثمن قلیل" کے عوض مت بیچو" تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ جیسا کہ وہاں بتایا جا چکا ہے، اس سے یہ کہنا مقصود نہیں کہ دین کے عوض تھوڑے پیسے نہ لیا کرو: زیادہ لیا کرو۔ (جب حرام ہی کھانا ہے تو پیٹ بھر کر کیوں نہ کھایا جائے!) ہم نے وہاں بتایا ہے کہ جب مستقل اقدارِ خداوندی اور دنیاوی منفعت میں ٹکراؤ ہو تو اس مستقل قدر کے مقابلہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی متاع بھی جنسِ کاسد اور متاعِ قلیل و حقیر قرار پا جاتی ہے۔ قرآن کہنا ہی یہ چاہتا ہے کہ متاعِ دنیا بیشک حاصل کرو لیکن دین کو بیچ کر نہیں۔ اور یہ چیز اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ:-

وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ (۲/۴۱)

"انسان صرف قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچے"۔ یہی وہ احتیاط ہے جس سے انسان دین فروشی سے بچ سکتا ہے۔

چونکہ دین فروشی التباسِ حق و باطل اور کتمانِ حقیقت ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے اگلی آیت میں ان سے کہا کہ:-

۲/۴۲ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

"حق اور باطل کو آپس میں گڈمڈ نہ کرو، نہ ہی حقائق کو چھپاؤ۔" اگرچہ حق اور باطل کا عام مفہوم واضح ہے اور اس کے ایک گوشہ کو، جو تخلیقِ کائنات سے متعلق ہے، آیت (۲/۲۶) کے ذیل میں بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ دین کا سارا دارومدار حق کو تسلیم کرنے اور باطل کو مسترد کر دینے پر ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی ان دو بنیادی اصطلاحات کو اور وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔

حق کے معانی

عربی زبان میں "حَقٌّ" ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے بنیادی اور اہم مفاہیم حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) کسی شے کا ٹھوس واقعہ یا ایسی حقیقت بن کر سامنے آجانا جس سے کسی کو مجالِ انکار نہ ہو۔ یعنی اس کا محکم طور پر ثابت ہو جانا۔ (۲) ایسا ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو، امٹ اور غیر متبدل

ہو۔ جو اپنی جگہ پر قائم رہے اور کسی کے بدلانے سے بدل نہ سکے۔ (۳) جو اپنی جگہ تو قائم رہے لیکن جو چیز اس کے دائرہ کے اندر کارفرما ہو وہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرتی چلی جائے۔ اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ آج کل تو دروازوں میں قبضے لگے ہوتے ہیں لیکن پرانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر اور نیچے گلی کی طرح لکڑی ہوتی تھی جو (SOCKET) میں بالکل فٹ ہو جاتی تھی۔ (SOCKET) تو اپنی جگہ قائم رہتی تھی لیکن یہ گلی اس کے اندر اس طرح گھومتی رہتی تھی کہ دروازہ حسبِ ضرورت بند بھی کیا جا سکتا تھا اور کھولا بھی۔ "حق" کی یہ خصوصیت اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کی مزید تشریح چند سطور آگے جا کر سامنے آئے گی:

یہ ہے "حق"، اور جو شے یا نظریہ اس کے خلاف ہو اسے باطل کہا جائے گا۔ لہٰذا باطل کے معنے ہوئے جو حقیقت میں واقع نہ ہو اور اسے محض عقیدۃً مان لیا جائے۔ جس کا یا تو کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو اور یا اس سے تخریبی نتائج پیدا ہوں۔ جو محو ہو جانے والا ہو۔ جو ہواؤں کے رُخ کے ساتھ اپنا بھی رُخ بدلتا رہے۔ یا اس طرح جامد ہو کر انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے۔

اب دیکھئے قرآنِ کریم میں یہ لفظ یا اصطلاح کن معانی میں آئی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو الحق کہا ہے۔ سورۃ المومن میں ہے: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (۲۳/۱۱۶) "بلند و بالا، ہر قسم کے غلبہ و تسلط اور اقتدارِ مطلق کا مالک —— الحق۔"

جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے (یعنی وحیِ خداوندی) اسے بھی الحق کہا گیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے: وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (۱۳/۱) "جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے وہ الحق ہے۔" (نیز دیکھئے ۳۴/۶ و ۳۵/۳۱)۔ سورۃ البقرۃ میں ہے: نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۲/۱۷۶) "اللہ نے اِس کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔" بعض مقامات پر اِسے صرف الحق کہہ کر پکارا گیا ہے، جیسے لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۱۰/۹۴)۔ "تیرے رب کی طرف سے تیری طرف الحق آگیا۔" (نیز دیکھئے ۴۷/۲ و ۱۰/۱۰۸)۔ سورۃ الکھف میں ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہدو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے۔ اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔"

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا کہ: اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ (۲/۱۱۹)۔ "ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔" اسی کو متعدد مقامات پر "دین الحق" بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ التوبہ میں ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)۔

"خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت، یعنی دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ تمام نظاموں پر غالب آجائے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر نہیں کرنا چاہتے۔" (نیز دیکھئے ۴۸/۲۸؛ ۶۱/۹)

انسانی اعمال نامہ کے متعلق بھی یہ کہا کہ: وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳/۶۲) "ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو ہر بات حق کے مطابق کہتی ہے۔"

سورۃ النجم میں، حق کے مقابلہ میں ظن کا لفظ لاکر بتایا گیا ہے کہ کوئی ظنی عقیدہ یا نظریہ دین الحق نہیں ہو سکتا۔ آیت کے الفاظ ہیں: وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۔ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (۵۳/۲۸)۔ "ان لوگوں کا عقیدہ، نظریہ یا مسلک علم پر مبنی نہیں ہوتا۔ یہ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ حق کے مقابلہ میں ظن کچھ معنی نہیں رکھتا۔" حق اور ظن کے اسی تقابل کے سلسلہ میں سورۃ الحج میں کہا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (۲۲/۶۲) "یہ اس لئے کہ الحق صرف خدا کی ذات ہے اور جسے یہ لوگ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔" (نیز دیکھئے ۳۱/۳۰) انہی کے متعلق دوسری جگہ کہا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹/۵۲)۔ "جو لوگ اللہ سے انکار کرتے ہیں اور باطل پر ایمان رکھتے ہیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔" دوسری جگہ کہا کہ ان کا کیا کرایا سب باطل ہو جاتا ہے۔ یعنی رائیگاں جاتا ہے (۱۱/۱۶)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قوانینِ خداوندی سب کے سب الحق ہیں اور جو کچھ بھی ان کے خلاف ہے وہ باطل ہے (جیسا کہ پہلے تفصیلاً لکھا جا چکا ہے) قوانینِ خداوندی میں، ایک تو قوانینِ فطرت داخل ہیں اور دوسرے وہ قوانین جن کا تعلق انسان کی انسانی زندگی سے ہے۔ ان دونوں میں تمیز کرنے کی غرض سے ثانی الذکر کو مستقل اقدارِ خداوندی بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ کائنات میں حق و باطل کی کش مکش جاری ہے۔ اس کے لئے کہیں

کشمکشِ حق و باطل

کہا کہ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱۷)۔ "اس طرح خدا حق و باطل میں ٹکراؤ پیدا کرتا رہتا ہے۔" دوسری جگہ کہا کہ: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)۔ "خدا باطل پر حق کی ضربیں لگاتا رہتا ہے۔ تاآنکہ حق، باطل کا مغز توڑ دیتا ہے اور اس طرح وہ محو ہو جاتا ہے۔" سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷/۸۱)۔ "ان سے کہدو کہ الحق آگیا ہے۔ اور اس کے آنے سے باطل محو ہو گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ باطل، حق کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اسے تو مٹ ہی جانا ہے۔ دیر صرف حق کے آنے کی ہوتی

ہے۔" تاریکی اس وقت تک تاریکی رہتی ہے جب تک روشنی نہیں آتی۔ روشنی کی پہلی کرن کے آنے سے تاریکی محو ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ تاریکی، روشنی کے نہ ہونے کا نام تھا۔ جب تک روشنی رہے گی تاریکی آ نہیں سکے گی۔ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴/۴۹)" ان سے کہدو کہ الحق آگیا ہے۔ باطل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔ وہ اس کے پہلے حملے ہی سے شکست کھا جائے گا۔ اور جب تک الحق موجود رہے گا، باطل پلٹ کر نہیں آسکے گا۔"

یہ الحق، قرآن کریم کی شکل میں خدا کی طرف سے نازل کیا گیا اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا اس لئے اس کے متعلق کہدیا کہ: لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۔ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (۴۱/۴۲)" باطل اس کی طرف نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل شدہ ہے۔"

لیکن قرآن کریم میں الحق صرف الفاظ کی شکل میں موجود اور محفوظ ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا میں یہ ٹھوس حقیقت بن کر کس طرح سامنے آتا ہے؟ (اس وقت تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے موجود اور محفوظ ہونے کے باوجود باطل کا دور دورہ ہے)۔ اس سوال کا تعلق مسئلہ خیر و شر سے ہے جس کے متعلق ہم مطالب الفرقان جلد اول ص۲۵۰-۲۵۱ و ۲۶۷-۲۶۲) میں لکھ چکے ہیں۔ نیز کشمکش ابلیس و آدم میں بھی جس کا تفصیلی ذکر سابقہ باب میں آ چکا ہے۔ یہاں اسے ہم، مختصر الفاظ میں دہراتے ہیں۔ پہلے قوانین فطرت کو لیجئے۔ یہ قوانین، تخلیق کائنات کے ساتھ

قوانینِ فطرت حق ہیں

ہی یہاں موجود تھے لیکن نظری حیثیت سے۔ جب تک انسان ان کا علم حاصل نہیں کرسکا، غلط (باطل) راستوں پر چلتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت نقصان اٹھاتا رہا۔ (مثلاً) اس نے سیلاب کے متعلق سمجھا کہ یہ "اندر دیوتا"، کے غصہ میں آجانے (کف بدہاں ہو جانے) کا نتیجہ ہے۔ وہ سیلاب آجانے پر "اندر دیوتا"، کے بت کے حضور چڑھاوے چڑھاتا رہا اور سیلاب اسے بدستور تباہ کرتے رہے۔ چیچک کے متعلق اس نے سمجھا کہ یہ "کالی ماتا" کی ناراضگی سے پھوٹتی ہے تو وہ کالی ماتا کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھاتا رہا لیکن چیچک اسے اور اس کی اولاد کو موت کی بھینٹ چڑھاتی رہی۔ یہ باطل کا غلبہ تھا۔ لیکن جب اس نے صدیوں کی کاوشوں اور کاہشوں کے بعد ان قوانین کو دریافت کر لیا جن کے مطابق سیلاب آتے اور چیچک پھوٹتی ہے۔ تو اس نے ان پر قابو پا لیا اور اس طرح حق، باطل پر غالب آگیا۔

اور اب تو مرض اور شفا کے متعلق ایک اور نظریہ قائم ہوا ہے۔ وہ یہ کہ تخریبی جراثیم، ہوا۔ پانی۔ غذا۔ چھوت چھات

کے ذریعے انسان کے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کی قوتِ مدافعت ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اگر وہ قوت زیادہ قوی ہے تو وہ ان جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہے اور انسان کی صحت برقرار رہتی ہے۔ اگر قوتِ مدافعت کمزور ہے تو وہ جراثیم غالب آجاتے ہیں اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جائے تاکہ وہ ان جراثیم پر غالب آجائے۔ یہ بھی طبیعی سطح پر حق و باطل کی کشمکش ہے۔ انسانی فکر نے اس نظریہ کا انکشاف بھی صدیوں کے تجربات کے بعد کیا ہے۔

یہی کیفیت اس حق اور باطل کی کشمکش کی ہے جو انسانی زندگی میں بھی کارفرما چلی آرہی ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ تمدنی، معاشرتی، سیاسی، معاشی نظاموں نے، جو باطل پر مبنی تھے، اسے جس قدر نقصان پہنچایا ہے، تاریخِ عالم کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ حق پر مبنی نظام، خدا کی طرف سے ملتا رہا، لیکن باطل پرست انسانوں کی مفاد پرستیاں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی رہیں۔ اسے قرآنِ کریم نے حق اور باطل کی کشمکش یا کفر اور ایمان کے مجادلے سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ الکہف میں ہے: وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ ۚ وَیُجَادِلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِہِ الۡحَقَّ وَاتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَمَاۤ اُنۡذِرُوۡا ہُزُوًا (۱۸/۵۶) "ہم اپنے پیغامبروں کو بھیجتے رہے تاکہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ حق کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے اور باطل کی روش اختیار کرنے کے عواقب کسقدر تباہ کن ہوتے ہیں۔ لیکن وحی سے انکار کرنے والے مفاد پرست، باطل کے حربے لیکر حق کے خلاف نبرد آزما ہو گئے تاکہ وہ حق کو غالب نہ آنے دیں۔ اسے کمزور کر دیں۔ ہمارے پیغامبران سے کہتے رہے کہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا لیکن وہ ان تنذیرات کی ہنسی اڑاتے رہے۔" (نیز دیکھئے ۴۰/۵)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کا یہ ٹکراؤ ان دو جماعتوں کے تصادم سے سامنے آتا تھا جن میں سے ایک حق کا علم بلند کرنے کے لئے اٹھتی تھی اور اس کے مدِ مقابل دوسری جماعت، باطل کے حربوں سے اس کا مقابلہ کرتی تھی۔ اس تصادم کی آخری آماجگاہ میدانِ جنگ ہوتا تھا۔

جنگ کا مقصد

صدرِ اول کی جماعتِ مومنین کے یہی وہ جنگ تھے جن کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ: وَیُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۙ لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَیُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ (۸/۷-۸) "خدا چاہتا تھا کہ اپنے قوانین کی رو سے حق کو ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں سامنے لے آئے اور اس سے انکار کرنے والوں کی جڑیں کاٹ کر رکھدے۔ یہ تصادم اس لئے تھا کہ حق ثابت اور محکم ہو جائے اور باطل مٹ جائے، خواہ مجرموں پر یہ بات کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔" اس سے ظاہر ہے کہ الحق بلاشک قرآنِ کریم میں نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن وہ عملاً

ایک ٹھوس حقیقت اسی صورت میں اختیار کر سکتا ہے، جب حق کی علمبردار جماعت باطل کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑی ہو۔ اس جماعت کے ہاتھوں، باطل شکست کھا جاتا ہے اور جب تک یہ جماعت موجود رہتی ہے، باطل پلٹ کر نہیں آسکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر یہ جماعت موجود نہ رہے تو پھر الحق پر مبنی قانونِ خداوندی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ انسان اپنی عقل کے تجرباتی طریق سے ٹھوکریں کھاتا اور ہڈیاں تڑواتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس طرح صدیوں کی جانگسل منازل طے کرنے کے بعد حق تک پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ہم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں واضح طور بیان کر چکے ہیں (دیکھئے صفحات ۱۱۶-۱۱۵)۔

یہ ہے وہ طریق جسے قرآن کریم نے سورۃ الرعد میں برجستہ مثالوں کی رو سے واضح کیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ (۱۳/۱۷)۔

"کائنات میں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے اور اسی کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اسے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ بادلوں سے مینہ برستا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے زمین کا میل کچیل جھاگ بن کر سطح پر آجاتا ہے تو سیلاب کی رَد اُسے بہا کر لیجاتی ہے اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے۔

یا یوں سمجھو کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے کہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ جھاگ بن کر اُوپر آجاتا ہے اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے۔

اس طرح کائنات میں خدا کے قانونِ کشمکش کے مطابق تعمیری قوتیں تخریبی قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں، تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ محو و ثبات (۱۳/۳۹)۔ اس طرح خدا مثالوں کے ذریعے بات واضح کر دیتا ہے۔"

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل کے تجرباتی طریق کے بعد، وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ ضرورت ہر آن رہتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایک تو اس لئے کہ زندگی کے مسائل کسی دور میں ختم نہیں ہو جائیں گے۔ یہ آخری انسان تک سامنے

آتے رہیں گے۔ اور دوسرے اس لئے کہ حق کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے اقدارِ خداوندی کی پابندی ضروری ہوگی۔ اس موضوع پر ہم جلد اول میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ (دیکھئے صفحات ۲۶۶ — ۲۵۷)

یہ تھا وہ الحق، جس کے متعلق بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ نہ تو تم حق کو چھپاؤ اور نہ ہی تلبیسِ حق و باطل کرو۔ اس آیت (۴۲/۲) میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس کے بعد تم کرو کیا؟ اِس "کرنے" کے لئے اصولی طور پر آیت (۴۱/۲) میں کہا تھا کہ تم قرآن مجید اور رسالتِ محمدیہ کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ اس کے بعد ایک عملی پروگرام دیا گیا جس کی ابتداء یہ کہہ کر کی گئی کہ:-

۴۳/۲ وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم صلوٰۃ قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔"
دیکھنے میں تو یہ اس پروگرام کی تین چھوٹی چھوٹی کڑیاں ہیں لیکن درحقیقت ان میں دین کے پورے کا پورا نظام سمٹ کر آگیا ہے۔ قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ص ۱۰۴—۹۷)۔ اس مقام پر یعنی آیت (۳/۲) میں، وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ کے الفاظ آئے تھے۔ ہم نے وہاں صلوٰۃ کے ساتھ انفاق کی بھی تشریح کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے (ملاحظہ ہوں جلد اول کے صفحات ص ۱۴۰—۱۰۵) لیکن چونکہ زکوٰۃ کا لفظ یہاں پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا صحیح تصور واضح طور پر سامنے لے آیا جائے۔ کیونکہ "صلوٰۃ" کی طرح "زکوٰۃ" کا مروجہ مفہوم بھی قرآنی مقصود تک پہنچنے نہیں دیتا۔

زکوٰۃ کا مفہوم

ہم اِس جلد کے پہلے باب میں نفس یا انسانی ذات کے سلسلہ میں یہ بتا چکے ہیں کہ مادہ (ز۔ک۔و) کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، پھلنا، نشوونما پانا۔ یہیں سے لفظ الزکوٰۃ ہے جس کے بنیادی معنی ہیں نشوونما، بالیدگی، پھلنا پھولنا۔ اس جلد کے باب اول میں نظریۂ ارتقاء کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ سطحِ ارض پر انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات اس قدر نشوونما حاصل کرے کہ اس سے یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل، یا یوں کہیے کہ اگلی منزل، طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن زندگی کی

موجودہ منزل میں انسانی ذات کی نشو ونما انسانی جسم کے اندر رہتے ہوئے ہی ممکن ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جسم کی بھی مناسب نشو ونما ہوتی جائے۔ قرآن کریم نے ان تمام ذرائع، اسباب، سامان کے لئے، جس سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو ونما ہوتی جائے، الزکوٰۃ کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتہ کو پھر سے سامنے لے آئیے کہ کمیونزم کا منتہیٰ، انسانی جسم کی پرورش اور نشو ونما ہے اسی لئے ان کے ہاں روٹی کا مسئلہ آخری اور مقصود بالذات مسئلہ ہے۔ یعنی اگر انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں تو پھر اس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ قرآن کریم اسے حیوانی سطح زندگی کہہ کر پکارتا اور کفر سے تعبیر کرتا ہے (۴۷/۱۲)۔ اس کے برعکس قرآن کریم کے نزدیک انسانی جسم کی نشو ونما مقصود بالذات نہیں۔ یہ ذریعہ ہے انسانی ذات کی نشو ونما کا، جو مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ کمیونزم اور اسلام دو معاشی نظام نہیں، بلکہ دو نظریاتِ زندگی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور متناقض ہیں۔

اس تمہید کے بعد آئیے۔ قرآن کی اصطلاح زکوٰۃ کی طرف۔

انبیاء سابقہ کو زکوٰۃ کا حکم

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم سلسلہ وحی میں، قرآن کریم میں پہلی بار نہیں آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ حکم انبیائے سابقہ کو بھی دیا گیا تھا۔ سورۃ انبیاء میں مختلف انبیائے کرامؑ کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ: وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ (۲۱/۷۳) "ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ خیر کے کام کریں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور اس طرح ہماری عبودیت اختیار کریں"۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مخاطبین سے کہا کہ: وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (۱۹/۳۱)۔ "خدا نے مجھے زندگی بھر صلوٰۃ اور زکوٰۃ پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے"۔ ذرا آگے چل کر حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کے تذکرۂ جلیلہ کے ضمن میں کہا: وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ (۱۹/۵۵) "وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے"۔ بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ "ہم نے ان سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا عہد لیا تھا" (۲/۸۳)۔ اور ان سے کہا تھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کی ناہمواریاں دور کر کے انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا (۵/۱۲)۔ یہی حکم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وساطت سے جماعتِ مومنین کو دیا گیا۔ سورۃ المزمل میں خطاب کی ابتداء نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے۔ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (۷۳/۲۰)۔ یہ جمع مخاطب کے صیغے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ مومنین سب کو دیا گیا تھا۔ سورۃ المائدۃ میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵/۵۵)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور جملہ احکامِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں"۔ اسی طرح سورۃ التوبہ میں ہے کہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹/۷۱)۔ "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا اپنی رحمتوں کا سایہ کرے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کے غلبہ اور حکمت کا مالک ہے"۔ اسی طرح سورۃ الاعراف میں ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دنیا اور آخرت کی حسنات کی دعا مانگی تو اُن سے کہا گیا کہ: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۷/۱۵۶)۔ "میں ان حسنات کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ شعار ہوں گے۔ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے اور ہمارے قوانین پر پختہ ایمان رکھیں گے"۔

مشرکینِ مکہ اسلامی نظام کی سخت مخالفت کرتے تھے اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ وہ میدانِ جنگ تک میں اُتر آئے تھے۔ ان حالات میں ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹/۵)۔ "اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں تو پھر ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ یہ اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے"۔ ذرا آگے چل کر کہا گیا کہ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۹/۱۱)۔ "اگر یہ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ دیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے"۔

ان دونوں آیتوں میں مشرکین کے حصارِ دین میں داخل ہو جانے کے لئے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی شرط عائد کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ دین کے بنیادی ستون ہیں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ان دونوں ستونوں کی اس بنیادی حیثیت کو متعین طور پر واضح کر دیا۔ جہاں کہا وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڏ حُنَفَاۗءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸/۵)۔ "اور خدا نے انہیں یہ حکم دیا ہے

دین کے بنیادی ستون

کہ وہ دل کے پورے خلوص کے ساتھ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کریں۔ اسی کو اپنا نصب العین قرار دے کر سیدھے اس کی طرف چلتے جائیں۔ اِدھر اُدھر مت دیکھیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں۔ یہ ہے دینِ قیم جس پر چلنے کا انہیں حکم دیا گیا ہے"۔ سورۃ حٰمٓ میں کہا ہے کہ مشرکین کے لئے تباہی ہے: اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۴۱/۷)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام نہیں دیتے اور آخرۃ کے منکر ہیں"۔ یہاں ایتائے زکوٰۃ اور ایمان بالآخرت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بھی دین کے اس بنیادی ستون کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ جو لوگ ہدایتِ خداوندی کا اتباع کریں گے ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں رہے گا۔ اُسی سورۃ (بقرۃ) میں ذرا آگے چل کر کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۲۷۷)۔ "جو لوگ ایمان لاتے اور اُن سے اعمالِ صالحہ سرزد ہوتے ہیں اور وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں تو اللہ کے ہاں سے انہیں ان کا اجر ملتا ہے۔ اور وہ اجر یہ ہوتا ہے کہ ان پر کسی قسم کا خوف و حزن طاری نہیں ہوتا"۔ دوسری جگہ انہیں کے متعلق کہا کہ: رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (۲۴/۳۷)۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ خرید و فروخت اور دیگر کاروبار انہیں قوانینِ خداوندی سے غافل نہیں کرتے۔ وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ انقلاب آجائے گا جس میں انسانوں کے قلوب بھی اُلٹ کر رہ جائیں گے اور نگاہیں بھی"[1]۔

ان مقامات پر ہم نے ایتائے زکوٰۃ کے قرآنی الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں" یا "زکوٰۃ دو"۔ اور چونکہ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ جس مال پر ایک سال گزر جائے اس میں سے (مجملاً) اڑھائی فیصد کے حساب سے خیرات کے طور پر دیدیا جائے، اس لئے قرآن کی اس اصطلاح سے توجہ اس مفہوم کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی رو سے ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم نہیں۔ یہ تو خیرات ہے جو انفرادی طور پر دیدی جاتی

---

[1] سورۃ الروم میں کہا گیا ہے کہ "ربٰو فی الحقیقت بڑھتا نہیں لیکن زکوٰۃ بڑھتی ہے" (۳۰/۳۹)۔ اس کی تشریح اس مقام پر کی جائے گی جہاں ربٰو کے متعلق گفتگو ہو گی۔

ہے بعض لوگ اس میں اتنی تبدیلی کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا یہ روپیہ انفرادی طور پر خرچ کرنے کے بجائے بیت المال میں جمع ہونا چاہیئے اور حکومت اسے ان مصارف میں خرچ کرے جنہیں قرآن نے متعین کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ یہ کہتے ہیں کہ "بیت المال" حکومت کے خزانہ سے الگ ہوتا ہے اس لئے اس روپے کو حکومت کی آمدنی (GOVERNMENT REVENUES) سے الگ رکھنا چاہیئے، کیونکہ حکومت کی آمدنی دنیاوی ہے اور یہ روپیہ دینی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس اصطلاح میں ثنویت کا وہ تصور کس طرح اُبھر کر سامنے آجاتا ہے جس کی رو سے دین اور دنیا کو دو الگ الگ دائرے قرار دیدیا گیا ہے اور جس پر سیکولرازم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس تصور کی رو سے بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ زکوٰۃ دینا، نماز پڑھنے کی طرح انفرادی فعل ہے جسے ہر حالت میں اور ہر مقام پر عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایتائے زکوٰۃ کا یہ تصور قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔ قرآنِ کریم نے ایتائے زکوٰۃ کو مشروط کر دیا ہے ایک خاص شرط کے ساتھ اور یہ وہ شرط ہے جس سے اس فریضہ کا بنیادی مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ سورۃ الحج میں جماعتِ مومنین کو پہلی بار جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کا پہلا مقصد تو یہ بتایا گیا کہ اس سے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد پیروانِ اسلام کے متعلق کہا کہ:

یہ حکومت کا فریضہ ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)۔

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو جائے گا۔ جب ان کی اپنی آزاد حکومت قائم ہو جائے گی، تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ جسے قرآن جائز تسلیم کرتا ہے، اس کا حکم دیں گے۔ جسے وہ ناجائز قرار دیتا ہے اس سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام معاملات کی آخری اتھارٹی قانونِ خداوندی ہوگا"۔ اس آیت سے یہ بات سورج کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم نے (اقامتِ صلوٰۃ کی طرح) ایتائے زکوٰۃ کے لئے جماعتِ مومنین کی اپنی حکومت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور ایتائے زکوٰۃ (زکوٰۃ دینا) مملکت کا فریضہ بتایا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تصور بھی قرآن کے مطابق نہیں کہ لوگ اپنے طور اڑھائی فیصد خیرات کے طور خرچ کر دیں اور یہ بھی صحیح نہیں کہ حکومت "زکوٰۃ" وصول کرے۔ یہاں تو حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ — یعنی زکوٰۃ دینا قرار دیا گیا ہے، زکوٰۃ لینا یا وصول کرنا نہیں۔ سورۃ المومنون میں، مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ "یہ لوگ زکوٰۃ کے لئے مصروفِ کار رہتے ہیں"۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ایتائے زکوٰۃ ایک پروگرام ہے جس پر جماعت مومنین اپنی مملکت میں نظامِ حکومت کے تابع عمل پیرا رہتی ہے۔ یہ پروگرام، یا مملکت اسلامیہ کا فریضہ، زکوٰۃ کے اُس مفہوم کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے جسے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے وہاں بتایا ہے کہ الزکوٰۃ کے معنی ہیں وہ سامان، اسباب اور ذرائع جن سے

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

افرادِ انسانیہ کی جسمانی نشوونما بھی ہوتی جائے اور ان کی ذات کی نشوونما بھی۔ قرآن کریم کی رو سے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی ذات کی نشوونما بھی۔ یہ اس حکومت کا فریضہ ہی نہیں بلکہ اس کے قیام کا مقصد اور وجہ جواز ہے۔ افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات کے متعلق ہم جلد اول میں معاشی نظام کے تابع گفتگو کر آتے ہیں۔ (دیکھئے صفحات ۱۹۴ تا ۱۰۵) باقی رہی انسانی ذات کی نشوونما، سو اس کے متعلق اسی جلد کے پہلے باب میں بات ہو چکی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کس طرح دینِ قیّم بنتے ہیں۔ دین کا مقصد ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افراد احکام و قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے رہیں اور جس میں ہر فرد کو وہ سامان اور ذرائع میسر آجائیں جن سے اس کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے۔ افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات پوری کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع رزق، مملکتِ اسلامیہ کی تحویل میں رہیں۔ اور ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ مملکت افرادِ معاشرہ کی تعلیم و تربیت اس طرح کرے کہ ذات کی نشوونما کا تقاضا ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اگرچہ انسانی نشوونما کے یہ دونوں گوشے زکوٰۃ کی جامع اصطلاح میں آجاتے ہیں لیکن بعض مقامات پر اس نے ان کا الگ الگ بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں ہے کہ ”کشاد اور نیکی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشاد کی راہ اس کی ہے جو اللہ، آخرت، ملائکہ، انبیاء اور کتب پر ایمان لائے“ اور وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (۲/۱۷۷) ”مال کی کشش کے باوجود اسے ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، ابن السبیل، سائلین اور محکوموں اور غلاموں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے۔ اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرے“۔ یہاں ظاہر ہے کہ ”ایتائے زکوٰۃ“ کے معنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مقصد تو روپیہ صرف کرنے سے حاصل ہو جائے گا جس کے لئے ”اٰتَى الْمَال“ کے الفاظ پہلے آچکے ہیں۔ یہاں ایتائے زکوٰۃ سے مراد اس کا دوسرا گوشہ ہے۔ یعنی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا اور ایسی مساعد فضا پیدا کرنا، جس میں ان افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب کہا گیا ہے کہ: وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۵۱؛ ۲/۱۲۹؛ ۳/۱۶۴؛ ۶۲/۲) ”وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس طرح ان کے تزکیۂ نفس ـــــ ان کی ذات کی نشوونما ـــــ کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی مناسب نشوونما کر سکیں“ تو اس سے بھی یہی مقصد ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی حیثیت

سے حضورؐ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ آپؐ افرادِ معاشرہ کے رزق کا انتظام کریں۔ لیکن اس کے ساتھ، بلکہ اس سے کہیں اہم، یہ فریضہ تھا کہ حضورؐ ان افراد کی ذات کی نشوو نما کا انتظام کریں۔ اور یہ مقصد تعلیمِ کتاب و حکمت کی رُو سے حاصل ہو سکتا تھا۔

ضمناً ہم نے اوپر کہا ہے کہ فریضۂ رسالت یہ بھی تھا کہ لوگوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی ذات کی نشوو نما کر سکیں تو یہ چیز قرآنی رہنمائی کے مطابق ہے۔ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہا ہے کہ وَيُزَكِّيهِمْ اور دوسری جگہ خود افراد کے متعلق کہا کہ: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱/۹)۔ "اسی کی زندگی کی کھیتی پروان چڑھی جس نے اپنی ذات کی نشوو نما کر لی۔" (نیز ۸۷/۱۴ و ۳۵/۱۸) ان آیات سے ظاہر ہے کہ اپنی ذات کی نشوو نما ہر فرد کو خود ہی کرنی ہوگی۔ اسلامی نظام —— باتباعِ رسالتِ محمدیہ —— ایسا انتظام کرے گا جس سے افرادِ معاشرہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی ذات کی نشوو نما کر سکیں۔ اسی کو ہم نے مساعد فضا مہیا کرنا یا مناسب تعلیم و تربیت کے اسباب بہم پہنچانا کہا ہے۔ افراد کی ذات کی نشوو نما کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسے تو فرد کو خود آپ ہی کرنا ہوگا۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کر سکتے ہیں انہیں صحیح راستہ پر چلا نہیں سکتے۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۲۸/۵۶)۔ "اور تو اور، وہ بھی جس سے تو خاص طور پر محبت کرے، تو اُسے بھی صحیح راستہ پر چلا نہیں سکتا۔ اسے راستہ دکھا ہی سکتا ہے راستہ پر چلنا تو قانونِ خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہی جانتا ہے کہ کون صحیح راستہ پر چلتا ہے۔"

اس ضمنی نکتہ کے بعد ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت (اسلامی مملکت) کا فریضہ ہے۔ یہ صدقہ اور خیرات کا انفرادی فعل نہیں —— ضمناً، جنہیں زکوٰۃ کے قرآنی مصارف کہا جاتا ہے وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں، صدقات کے مصارف ہیں (دیکھئے ۹/۶۰)۔ صدقات اور زکوٰۃ میں کیا فرق ہے اس کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی۔

ہم نے کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے۔ مملکتِ اسلامیہ یا قرآنی حکومت پر کسی خاص فرد یا افراد کے کسی گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری امتِ مسلمہ کی مملکت ہوتی ہے اور جسے ہم مملکت کا فریضہ کہتے ہیں وہ درحقیقت پوری امت کا فریضہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ایتائے زکوٰۃ بھی پوری کی پوری ملّتِ اسلامیہ کا فریضہ قرار پائے گا۔ عملی طور پر یوں سمجھئے کہ اس مملکت میں تمام کاسب افراد ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کئے جائیں گے، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری پوری تندہی سے سرانجام دیں گے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر

زکوٰۃ کا عملی نظام

فاضلہ، اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی (مرکزِ ملّت) کی تحویل میں دیدیں گے تاکہ وہ اس سے ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا انتظام بھی کرے جو اپنی ضروریات خود پورا کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ، وہ مملکت افرادِ معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کرے جس سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں۔ اس اعتبار سے آپ آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی جملہ آمدنی (REVENUE) کو کہا جائے گا اور اسے اس لئے زکوٰۃ کہا جائے گا کہ اس آمدنی کا مقصد افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہوگا۔ حکومت کے محاصل کو مقصد کے نام سے تعبیر کرنے میں جو گہری حکمت ہے اس کی تحسین اربابِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔

اس مقام پر قارئین کے دل میں یقیناً یہ سوال ابھرے گا کہ پھر یہ "زکوٰۃ" موجودہ شکل میں کس طرح تبدیل ہوگئی؟ "کس طرح تبدیل ہوگئی" کا جواب دینا مشکل ہے۔ اتنا تو واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں نہ زکوٰۃ کے نصاب کا کوئی ذکر ہے نہ اس کی شرح کا۔ نہ اس کے مصارف کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں خارج از قرآن ہیں۔ نصاب وغیرہ تو اس لئے بھی خارج از قرآن ہے کہ قرآنِ کریم نے مال و دولت جمع کرنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ اتنی مخالفت کہ اس نے ایک مقام پر کہا ہے کہ "جہنم آوازیں دے دے کر بلائے گا اس شخص کو جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸)" جو مال جمع کر کے اسے برتن میں بند کر لیتا ہے اور پھر اس پر ڈھکنا دے کر اسے اپنے لئے مختص کر لیتا ہے" ایسے شخص کو جہنم آوازیں دے دیکر بلائے گا۔ سورۃ الھمزۃ

دولت جمع کرنے کے خلاف

میں ہے کہ سخت تباہی ہے اس کے لئے اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ (۱۰۴/۲) "جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانوے کے پھیر میں پھنس جاتا ہے" قرآن کہتا ہے کہ ایسے شخص کو اس آگ کے حوالے کر دیا جائے گا "جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں" سورۃ التوبہ میں اس اجمال کو مزید تفصیل سے بیان کر دیا جہاں کہا کہ: وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ۔ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ۔ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵)" جو لوگ چاندی اور سونا، یعنی مال اور دولت جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے لئے کھلا نہیں رکھتے، تو اے رسولؐ! تم اعلان کر دو کہ وہ ایک الم انگیز عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔ اس دن ان کے چاندی اور سونے کے ان ٹکڑوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے مختص کر رکھا تھا۔ لو

آج اپنے خزانہ سے پیدا ہونے والے عذاب کا مزہ چکھو۔" ہم نے یہ آیات محض مثال کے طور پر درج کر دی ہیں ورنہ قرآنِ کریم اصولی طور پر زراندوزی کی سخت مخالفت کرتا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ: یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کتنا حصہ دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہدو! کہ تمہاری اپنی ضروریات سے جس قدر بھی زائد ہے وہ سب کا سب۔" قرآن کی اس تعلیم کی روشنی میں ظاہر ہے کہ یہ تصور ہی نہیں پیدا ہوتا کہ مسلمان دولت جمع کرتا رہے اور اس جمع شدہ مال پر ایک سال گزر جانے کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد نکال کر "اللہ واسطے" دیدے۔ یہ تو خالص نظامِ سرمایہ داری ہے۔ نظر آتا ہے کہ جب صدرِ اول کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی تو اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے عناصر بھی اُبھر آئے۔ قرآنی آیات کی رو سے تو اس نظام (سرمایہ داری) کے شائبہ تک کی بھی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کے لئے لامحالہ روایات وضع کرنی پڑیں اور وہ روایات ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دی گئیں (مثلاً) ہم نے اُوپر سورۃ التوبہ کی آیات (۹/۳۴-۳۵) درج کی ہیں جن میں دولت کے اکتناز کو عذابِ جہنم کا موجب بتایا گیا ہے۔ ان کی تفسیر کے سلسلہ میں ذیل کی روایت (مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ میں) درج ہے:۔

زکوٰۃ کے متعلق وضعی روایات

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرتِ عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دونگا اور اس مشکل کو حل کر دونگا پس، عمرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔۔۔۔ (حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا بیان سنکر (حضرت) عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

یہ روایت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے لئے وضع کیا گیا۔ ورنہ آپ سوچئے کہ خدا کی طرف سے حکم نازل ہوتا ہے اور وہ (معاذ اللہ) صحابہ کبارؓ پر معاذ اللہ گراں گزرتا ہے؟ حضرتِ عمرؓ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے اس مشکل کے حل کی تلاش کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے ہیں اور حضورؐ فرما دیتے ہیں کہ تم لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔ جتنا جی چاہے مال جمع کرو۔ بس اس میں سے، سال کے بعد اڑھائی روپیہ سینکڑہ کے حساب سے خدا کی راہ میں دیدیا کرو۔ باقی سارا مال حلال وطیب ہو جائے گا اور (حضرت) عمرؓ اس حل کو سن کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں۔

(معاذاللہ ثم معاذاللہ)۔ یہ وہ مؤمنین ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے اپنا مال اور جان، خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا (9/111) یہ وہ مؤمنین ہیں کہ خدا کا حکم تو ایک طرف، اس کے رسولؐ کے فیصلے کے متعلق خدا کا یہ ارشادِ گرامی ان کے سامنے تھا کہ: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (4/65) "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک ان کی یہ حالت نہ ہو کہ اپنے ہر اختلافی معاملہ میں تجھے اپنا حَکَم بنائیں اور اس کے بعد ہی نہیں کہ تمہارے فیصلہ کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرلیں بلکہ اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی نہ گزرے۔ وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔" کیا آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ تصور کرسکتے ہیں کہ جن لوگوں کے مؤمن ہونے کے لئے یہ شرط تھی، خدا کا حکم ان کے دل میں کسی قسم کی گرانی پیدا کر دے گا اور پھر وہ اس مصیبت کا حل تلاش کرنے کے لئے اپنا نمائندہ رسول اللہؐ کے پاس بھیجیں گے؟ اور نمائندہ بھی حضرت عمرؓ جیسا، جس کے کرتے پر زمانۂ خلافت میں بھی چار چار پیوند لگے ہوتے تھے؟

اس قسم کی ہیں وہ روایات، جن کی رو سے قرآن کریم کے معاشی نظام (الزکوٰۃ) کو مروجہ زکوٰۃ میں بدل دیا گیا اور جس نے نظامِ سرمایہ داری کے لئے سارے راستے کھول دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ خود ان حضرات کی بیان کردہ سیرت کی رُو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زکوٰۃ دی ہی نہیں

رسول اللہ اور جمعِ مال

اس لئے کہ تمام کتبِ سیرت اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے ضروریات سے زائد ایک پیسہ بھی کبھی گھر میں نہیں رکھا تھا۔ ایک روایت میں یہاں تک کہا گیا ہے:-

> مرض الموت کے وقت، حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے، حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کر دو۔ (یعنی بیت المال بھیج دو) تاکہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں، لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپ کی تیمار داری میں مصروف ہوگئے۔ آپ کو ہوش آیا تو فرمایا وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا ـــ خدا کا محمدؐ کے متعلق کیا گمان ہوگا جب وہ اس سے ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں خود بیت المال میں بھجوا دیا۔ (اصح السیر۔ حکیم دانا پوری)

بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرما دیا تھا:-

> میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کے اخراجات کے بعد جو کچھ بھی بچے گا، وہ صدقہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جس ذاتِ اقدس ؐ کی یہ کیفیت ہو اور جس گھرانہ کی مالی حالت ایسی ہو وہ اس زکوٰۃ کو کیسے ادا کریں گے جس کی اولین شرط یہ ہے کہ جمع شدہ مال پر ایک سال بیت چکا ہو۔ کیا اس گھر میں جمع شدہ مال سال بھر کے لئے رکھا رہتا ہوگا؟

اور جب اس گھر کی کیفیت یہ تھی تو اس کے بعد یہ سوچئے کہ اس آیت کا مطلب کیا ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو یہ حکم دیا تھا کہ[1] وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ (۳۳/۳۳)۔ "تم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرو"۔ ظاہر ہے کہ یہ ایتائے زکوٰۃ، ہماری مروجہ زکوٰۃ نہیں تھی۔ یہ وہی زکوٰۃ تھی جس کے متعلق ہم حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ (یُزَکِّیْھِمْ) کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی حضور ؐ کے اہلِ خانہ ؓ سے کہا یہ گیا تھا کہ تم ایسا انتظام کرو جس سے تمہارے دائرۂ اثر میں آنے والے افراد کی ذات کی نشو و نما کا انصرام ہو سکے۔ یعنی ضروری تعلیم و تربیت کی رو سے۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ امتِ مسلمہ کا اجتماعی منصب تھا۔ اس کی تائید زیرِ نظر آیت (۴۳/۲) کا اگلا ٹکڑا کر رہا ہے:۔

وَ ارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (۴۳/۲)۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔ دیکھنے میں تو یہ تین لفظ ہیں لیکن درحقیقت یہ مذہب اور دین کا نقطۂ امتیاز ہیں۔ اس کی وضاحت سے پیشتر آپ پہلے اس لفظ (رکوع) کے معنی اور مفہوم کو دیکھ لیجئے۔

رکوع کے معنی

اس کے مادہ (ر۔ک۔ع) کے معنی جھکنے کے ہیں، جس طرح سجدہ کے معنی بھی جھکنے کے ہیں۔ عام طور پر ان میں فرق یہ کیا جاتا ہے کہ رکوع تھوڑے سے جھکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ پورے اور کامل جھکاؤ کو۔ یہ وہی فرق ہے جو نماز میں رکوع اور سجدہ کی محسوس ہیئت میں نظر آتا ہے۔ ان دونوں کے اس فرق کی تشریح بھی ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ جیسا کہ اسی جلد کے دوسرے باب میں "سجدہ" کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے۔ سجدہ سے مفہوم قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ یہی مفہوم رکوع کا بھی ہے۔ سورۃ الحج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۷۷/۲۲) اے جماعتِ مومنین! تم رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ یعنی اپنے رب کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرو۔ اور خیر کے کام کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں"۔ اس سے اگلی آیت میں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور

[1] خطاب "نساء النبی" سے ہے جن میں حضور ؐ کی ازواج مطہرات اور دیگر محترم خواتین بھی آجاتی ہیں۔ اسی لئے میں نے اس کا ترجمہ اہل بیت کیا ہے۔

اعتصام باللہ وغیرہ، دین کے بنیادی ارکان کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ الفتح میں، مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ کی مختلف خصوصیات اور صفاتِ کبریٰ کے ضمن میں کہا: تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹)۔ "تو انہیں راکعین اور ساجدین دیکھے گا"۔ ظاہر ہے اس کے معنے بھی اطاعت گزار کے ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں مومنین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں وَهُمْ رَاكِعُونَ (۵/۵۵)۔ "وہ خدا کے اطاعت گزار ہوتے ہیں"۔ سورۃ التوبہ میں مومنین کے اوصاف کے سلسلہ میں الرّٰكِعُونَ السّٰجِدُونَ (۹/۱۱۲) کہا گیا ہے۔ خانہ کعبہ کے سلسلہ میں بھی لِلطَّآئِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۲/۱۲۵ ; ۲۲/۲۶) کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک مقام پر اہلِ جہنم کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ خدا کی صداقتوں کی تکذیب کرتے تھے وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ۔ (۷۷/۴۸)۔ "جب ان سے کہا جاتا تھا کہ رکوع کرو تو یہ رکوع نہیں کرتے تھے"۔ اس کے معنی واضح ہیں کہ ان سے کہا جاتا تھا کہ احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو تو یہ ان کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ رکوع کرنے کے معنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے ہیں —— اس کی محکومیت اختیار کرنے کے —— ہم نے اوپر کہا ہے کہ سجدہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ لیکن لغوی طور پر رکوع تھوڑے سے جھکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ پورے کے پورے جھک جانے کو۔ ہرچند یہ دونوں الفاظ اطاعت کے معانی میں مرادف ہیں لیکن قرآن کریم نے جب یہ دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں تو ان کا فرق کچھ یوں سمجھ میں آتا ہے۔ دین کی دعوت کا آغاز اس قوم سے ہوتا ہے جو ان صداقتوں سے یا تو بالکل بیگانہ ہوتی ہے یا ان پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ ان کی روشِ زندگی ان کے یکسر خلاف ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ روش صدیوں سے اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی چلی آ رہی ہوتی ہے، انہیں اس حالت سے نکال کر دین کی غایت تک پہنچانا ایک طویل سفر ہوتا ہے۔ نفسیاتی حکمت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں یہ تبدیلی بتدریج لائی جائے (مثلاً) ہم قرآنِ کریم کے معاشی نظام میں دیکھ چکے ہیں کہ اس کا منتہیٰ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ہے۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ مملکت کے حوالے کر دینا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس غایت تک تو بتدریج پہنچا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں صدقہ اور خیرات اور ضرورتمندوں کے لئے انفرادی امداد وغیرہ کے احکام بھی ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ وراثت کے احکام بھی۔ صاف نظر آتا ہے کہ ان احکام کا تعلق اس عبوری دور سے ہے جس میں سے گذار کر اس جماعت کو آخری نصب العین تک پہنچایا جائے گا[1] جب وہ

رکوع اور سجدہ میں فرق

[1] جیسے ترکِ خمر کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس حکم کو آخری منزل تک پہنچنے کے لئے قریب پندرہ سال کا عرصہ لگ گیا۔

آخری منزل آجائے گی ـــــ یعنی تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہو جائے گی اور افرادِ مملکت کے پاس زائد از ضرورت کچھ نہیں رہے گا ـــ اُس وقت اِس عبوری دور سے متعلق احکام پر عمل پیرا رہنے اور ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دین کے اس طریقِ کار کی روشنی میں، ہم کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ رکوع کا تعلق عبوری دور سے ہے اور سجدہ، انتہائی شکل کا نام ہے۔ اطاعت تو دونوں میں ہی ہوگی لیکن ان کے مدارج میں فرق ہوگا۔ یہ بھی واضح رہے کہ انتہائی شکل میں جب عبوری دور سے متعلق احکام پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے، وہ بدستور اپنی جگہ قائم رہیں گے جب حالات پھر ویسے ہو جائیں تو وہ نافذالعمل ہو جائیں گے ـــ جس طرح پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کا حکم نافذالعمل ہو جاتا ہے اور پانی مل جانے پر یہ حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔ منسوخ نہیں ہو جاتا۔

اب آیئے اس بنیادی نکتہ کی طرف، جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ وہ مذہب اور دین میں حدِ فاصل ہے یعنی یہ کہ وَارْكَعُوْا کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کی شرط کیوں لگائی گئی ہے۔

دین اجتماعی نظام کا نام ہے

مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ، انفرادی تعلق کا نام ہے، جسے ہر شخص اپنے اپنے طور پر، اپنے اپنے طریق سے ہر جگہ، بزعمِ خویش، قائم کر سکتا ہے، اور مقصد اس سے اپنا اطمینان حاصل کرنا، یا اس سے آگے بڑھ کر اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت بھی اجتماعی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے نتائج بھی اجتماعی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اجتماعی معاشرہ یا جماعت بھی افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے ایک صالح نظام، یا طیب جماعت اسی صورت میں متشکل ہو سکتی ہے جب افراد بھی صالح ہوں۔ یہ نکتہ بڑا بنیادی ہے جس کی رو سے دائرہ یوں قائم ہوتا ہے کہ افراد صالح ہوں تو جماعت یا نظام صالح ہوتا ہے اور اجتماعی نظام صالح ہو تو افراد بھی صالح ہوتے ہیں۔ افراد اور جماعت کا یہ تعلق ایک مثال کے ذریعے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ گھڑی، مختلف پرزوں کے ربطِ باہمی کا نام ہے۔ اگر پرزے ٹھیک ٹھیک ہوں تو گھڑی بھی درست ہوگی اور اگر اس کے پرزے درست نہ ہوں تو گھڑی کے درست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا لیکن اگر یہ نہایت عمدہ، پختہ، درست، صحیح و سالم پرزے میز پر بکھرے پڑے ہوں، تو نہ ان کا کوئی فائدہ ہوگا نہ ان سے کوئی نتیجہ مرتب ہو سکے گا۔ انہیں ایک خاص ربط و ضبط کے ساتھ، مشینری کی شکل میں اپنی اپنی جگہ پر فٹ ہونا پڑے گا تب جا کر ان کی افادیت ظہور میں آ سکے گی۔ اسے کہتے ہیں اجتماعی نظام۔

تشکیلِ اُمت

قرآن کریم نے دین کے قیام کے لئے اُمت کا وجود لازمی قرار دیا ہے۔ اسی لئے اس نے مومنین کو اُمت کہہ کر پکارا ہے۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے دنیا میں

خدا کے گھر کی عمارت استوار کی تو اس کی تعمیر کے بعد انہوں نے خدا کے حضور اپنی یہ آرزو پیش کی کہ: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲/۱۲۸) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی ایسا بنا کہ ہم تیرے اطاعت گذار رہیں اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے احکام کے سامنے سربسجود ہو"۔ یعنی تعمیر کعبہ کے بعد پہلی دعا ایک اُمت پیدا کرنے کے لئے کی گئی۔ یہی وہ امت تھی جو اسلام کو بحیثیت دین کے متشکل کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی۔ چنانچہ اسی کعبہ کی مرکزیت کے سلسلہ میں کہا گیا کہ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳) "اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا۔ تمہارا نظام یہ ہوگا کہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کروگے اور یہ رسول تمہارے اعمال و کردار کا نگران ہوگا"۔ اس امت کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح اور بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا فریضہ ہے"۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱) "اور ہم نے اپنی مخلوق میں سے ایک امت پیدا کی جو الحق کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی کرتی اور اسی کی رُو سے دنیا میں نظامِ عدل قائم کرتی ہے"۔[1]

اعتصام بحبل اللہ

یہ اُمت متشکل کیسے ہوگی، اس کے متعلق سورۃ آلِ عمران میں وضاحت سے بتا دیا کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲) "تم تمام کے تمام، اجتماعی حیثیت سے، وحی خداوندی (قرآن مجید) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ فرقے اور پارٹیاں نہ بن جاؤ"۔ یہاں دیکھئے۔ امت کی وحدت کا طریق کار یہ بتایا گیا ہے کہ سب کے سب، کتاب اللہ کے ساتھ متمسک رہیں۔ یہی ان کا نقطہ ماسکہ اور نصب العینِ حیات ہو۔ پھر جَمِيْعًا کے لفظ نے واضح کر دیا کہ یہ "اعتصام بحبل اللہ" اجتماعی حیثیت سے ہوگا۔ فرداً فرداً تو ایک طرف، گروہ در گروہ ہو کر بھی، یہ اعتصام نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد کہا: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۳/۱۰۲) "تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تم اس میں گرنے ہی والے تھے کہ اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ ہم اس طرح تمہیں اپنی باتیں، اپنے احکام، اپنی آیات سمجھاتے رہتے ہیں تاکہ تم صحیح راستہ پر چلتے رہو۔

---

[1] یہاں سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ عدل اسی فیصلہ کو کہا جائے گا جو وحی خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق ہو۔

یہ تھا وہ طریق، جس سے ان افراد کو ایک امت کی شکل میں متشکل کیا گیا، اس میں بنیادی نکتہ تھا، اجتماعی طور اعتصام بحبل اللہ (۴/۱۴۶ ؛ ۳/۱۰۲) - اور نتیجہ تھا دلوں کے باہمی ملنے سے ایک دوسرے کا بھائی بن جانا۔" اس امت کی تشکیل میں وجہِ جامعیت دین کا اشتراک تھا۔ نسل، رنگ، وطن، زبان میں سے کسی کا اشتراک بھی وجہِ جامعیت نہیں تھا۔ قرآن کریم نے مختلف اقوامِ عالم اور مختلف ادوارِ زمانہ میں پیدا ہونے والے انبیائے کرامؑ کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا: اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲)۔ "یہ تمام حضرات ایک امت کے افراد تھے۔ اور ان کے ایک امت بننے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی رب کے بندے تھے اور اسی کے اطاعت گزار تھے۔" یہی وہ اُمت تھی جسے سلسلہ انبیائے کرامؑ کی آخری کڑی، حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کے اشتراک کی بنیادوں پر متشکل فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے تاکیداً کہا کہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۱۹۹) "اے جماعتِ مومنین! اے امتِ مسلمہ! تم میں سے ہر فرد دین کی بنیادوں پر ثابت قدم رہے۔ دوسرے افراد کے ثابت قدم رہنے کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح ربط باہمی سے باہوں میں باہیں ڈال کر ایک جماعت کی حیثیت سے سفرِ حیات طے کرے۔ یوں تم سب قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔" اس کے بعد تاکید کی کہ: كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹/۱۱۹)۔ صادق بننا اور رہنا چاہتے ہو تو گروہِ صادقین کے ساتھ مل کر رہو۔" اور یہی مفہوم ہے: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۲/۴۳) کا۔ قرآن کریم نے تو جنت میں داخل ہونے کی شرط بھی یہ بتائی ہے کہ: فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۙ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰)۔ "میرے بندوں کے ساتھ مل جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا۔" یاد رہے کہ یہاں نفسِ مطمئنہ کو مخاطب کیا گیا (۸۹/۲۷)۔ مذہب اور تصوف میں تصور یہ ہے کہ نفس کا مطمئن ہو جانا مقصودِ حیات ہے، اور نفس چونکہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے اس لئے اطمینانِ قلب یا اطمینانِ نفس انفرادی چیز ہے جو مختلف قسم کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جس فرد کو یہ حاصل ہو جائے وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نفسِ مطمئنہ کے جنت میں داخل ہونے کے لئے بھی یہ شرط بتائی کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۙ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰)۔ "تو میرے بندوں کے گروہ میں شامل ہو جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا۔ اس کے بغیر تُو جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔" آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو ہم نے گھڑی اور اس کے پرزوں کی مثال سے بات واضح کی تھی، قرآن کریم نے اُسے کس طرح ایک حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے۔ یعنی افراد کے نفس (ذات) کا متوازن اور مطمئن ہونا ضروری ہے لیکن یہ نفس الگ الگ مقصدِ حیات حاصل نہیں کر سکتے ان کا جماعت کی مشینری کے اندر فِٹ ہونا نہایت ضروری ہے اس طرح یہ جنتی زندگی حاصل کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت و جہنم، دونوں کے متعلق یہ کہا کہ ان میں جماعتیں داخل ہوں

گی (۳۹/۳ و ۳۹/۴۲)۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام میں اسلام اور جماعتی زندگی کو لازم ملزوم قرار دیا ہے، اور یہ درحقیقت تفسیر ہے اُس قرآنی نکتہ کی، جسے حضرت عمرؓ نے ان تین الفاظ میں سمو کر رکھدیا تھا کہ لَآ اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ۔ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اقبالؒ نے فرد اور جماعت کے باہمی تعلق پر بھی بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ رموزِ بیخودی میں کہتے ہیں:۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است ❊ جوہرِ اُو را کمال از ملت است

فرد می گیرد، ز ملت احترام ❊ ملت از افراد می یابد نظام

مرکزِ ملت

دین کے اسی اجتماعی نظام کو خلافتِ راشدہ، یا مملکتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت مشتمل ہوگی ایک امت پر، جس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوگا نہ سیاسی پارٹی۔ اس امت کا ضابطہ خدا کی کتاب ہوگا اور انہیں اس کتاب کے مطابق چلانے والی اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی، جسے مرکزِ ملت کہکر پکارا جاتا ہے۔ اسی کی تشریح میں اقبالؒ کہتا ہے:۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے ❊ روزگارش را دوام از مرکزے

محسوسات کے خوگر انسان کے لئے ایک محسوس مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام میں یہ محسوس مرکز، کعبہ ہے جسے خدا نے "بَیْتِیَ" (اپنا گھر) کہکر پکارا ہے اور اسے تمام امت کے لئے قبلہ قرار دیا ہے۔ قبلہ کے معنی ہوتے ہیں، وہ نصب العین جو ہر وقت نظروں کے سامنے رہے (مثال کے طور پر جیسے) اگر آج ماسکو کہا جائے تو اِس سے مقصد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کمیونزم کے نظام کے مرکز کی محسوس شکل ہوتا ہے۔ یہی حیثیت دین کے نظام میں کعبہ کی ہے جس کے متعلق کہا کہ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲/۱۴۴)۔ "تم دنیا میں کہیں بھی ہو، تمہاری نگاہیں اسی مرکز کی طرف ہونی چاہئیں"۔

آئین (کتاب اللہ) کی وحدت اور مملکت کی وحدت اور اُن کے ساتھ اس محسوس مرکز کی وحدت سے امت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ:۔

چیست ملت، اے کہ گوئی لا الٰہ ❊ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

مردہ؟ از یک نگاہی زندہ شو ❊ بگذر از بے مرکزی، پائندہ شو

کعبہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ محض مٹی اور پتھر کی عمارت کا نام نہیں۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی یک نگہی کی محسوس علامت ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ہے:۔

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست طوافِ اُو طوافِ بام و در نیست

میانِ ما و بیتُ اللہ رمزیست کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

یہ ہے دین کی رو سے، جماعت، اس کے مرکز اور اس کے نصب العین کی حقیقت —— ایک امت، ایک ضابطۂ حیات، ایک نظامِ زندگی، ایک مملکت اور ایک مرکزِ محسوس۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ان ارکان و عناصر کی شکلیں تو باقی رہ جاتی ہیں، روح اور مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ روزانہ زندگی میں اس اجتماعیت کے مظاہر صلوٰۃ کے اجتماعات تھے لیکن اب اس کا مفہوم "باجماعت نماز" بن کر رہ گیا ہے اگرچہ مروجہ نماز کے لئے جماعت کی شرط بھی لازمی نہیں (نماز انفرادی طور پر بھی ادا کی جا سکتی ہے) لیکن باجماعت نماز کا ثواب زیادہ بتایا جاتا ہے۔ پھر، نماز کی نیت کرتے وقت، "منہ طرف قبلہ شریف کے" بھی کہا جاتا ہے۔ مساجد کا رُخ بھی قبلہ کی سمت رکھا جاتا ہے اور اس کے تعین کے لئے بڑی احتیاط برتی

ہماری موجودہ حالت

جاتی ہے کہ وہ بالکل صحیح ہو۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن محض رسوم، جن کی روح گم ہو چکی ہے۔ نماز میں سارے نمازی "باجماعت" کھڑے ہوتے ہیں لیکن ایک نمازی کا دل، دوسرے نمازی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی تھی وہ جماعت، جس پر طعن کرتے ہوئے، منافقوں کے متعلق کہا تھا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (۵۹/۱۴)۔ "تم گمان کرو گے کہ یہ ایک جماعت ہے حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں"۔ آپ کو یاد ہو گا کہ قرآنِ کریم نے جماعت کی بنیادی شرط فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (۳/۱۰۲) بتائی تھی۔ یعنی جس میں افراد کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ایک اجتماع یہ تھا اور ایک اجتماع ہماری نماز کا ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا تو ملا ہوتا ہے لیکن قلوب الگ الگ ہوتے ہیں۔ پھر اس جماعت کا ایک امام بھی ہوتا ہے جس کی آواز پر سب نمازی اُٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ "اطاعتِ امام" نماز کی حرکات و سکنات تک محدود ہوتی ہے۔ دین میں امام یا امیر کی اطاعت، زندگی کے ہر گوشے میں ہوتی ہے کیونکہ وہ امت سے قرآن کی اطاعت کراتا ہے۔ یہی صورت "منہ طرف قبلہ شریف" کی ہے۔ اس میں قبلہ کی طرف رخ کرنے کی شکل تو باقی ہے، اس کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ مقصد، نصب العین کی وحدت تھا۔ قیامت ہے کہ مختلف فرقوں کے مسلمان الگ الگ مسجدوں میں، الگ الگ فرقہ وارانہ نمازیں پڑھتے ہیں اور ہر ایک اپنی نماز کو باجماعت بھی قرار دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارا رُخ قبلہ کی طرف ہے۔ حج کا اجتماع اس سے بھی زیادہ حسرت آمیز منظر پیش کرتا ہے۔ اس میں ساری امت کے افراد، اس مرکزِ محسوس (کعبہ) کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس کا طواف کرتے ہیں، لیکن ان کے مذہبی اور سیاسی مراکز بھی الگ الگ ہوتے ہیں، اور ان کے دل بھی ایک دوسرے سے الگ۔

یاد رکھئے! اسلام، بحیثیت دین، اس دن ختم ہو گیا تھا، جب امت میں وحدت نہیں رہی تھی۔ یعنی جب امت مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں یا حکومتوں میں بٹ گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس امت سے تاکید کی تھی کہ: وَ لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ "یاد رکھو! تم مومن ہونے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں مذہبی فرقے یا سیاسی پارٹیاں بنا لیں اور اس کے بعد ہر گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کر بیٹھ گیا کہ ہم حق پر ہیں باقی سب باطل پرست ہیں"۔ چونکہ ہمارے ہاں امت کا ہر فرد کسی نہ کسی فرقہ سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم کی اس قسم کی آیات ان پر بڑی گراں گزرتی ہیں۔ ان کے فرقوں کے بندھن، یعنی مذہبی پیشوا، انہیں یہ کہکر مطمئن کرا دیتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام پر کوئی فرقہ بھی قائم نہ ہو؟ ہم اسلام پر قائم ہیں اس لئے ہم پر ان آیتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کریم نے تو کسی فرقہ کی بھی استثنا نہیں کی۔ اور یہ بات بڑی واضح ہے۔ دین، امتِ واحدہ کی شکل میں ہی قائم اور باقی رہ سکتا ہے۔ جب امت فرقوں میں بٹ گئی تو دین باقی نہ رہا، مذہب رہ گیا۔ لہٰذا کوئی فرقہ یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ ہم دین پر قائم ہیں۔ دین پر قائم امت ہوتی ہے۔ افراد یا فرقے مذہب پرست ہو سکتے ہیں، دین پر قائم نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اللہ نے رسول اللہ سے کہہ دیا تھا کہ: إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)۔ "جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا"۔ رسولؐ کا تعلق بواسطہ امت سے ہوتا ہے، فرقوں سے نہیں۔

یہودی مذہب پرست تھے۔ ان کی امت کی وحدت ختم ہو چکی تھی حتیٰ کہ قومی مرکزیت تک بھی تباہ ہو چکی تھی۔ ان کا محسوس مرکز — یروشلم — بھی ان کی تولیت میں نہیں رہا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، ان کا دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لہٰذا جب ان سے کہا گیا کہ: وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ (۲/۴۳) تو وہ جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم تو اپنے طریق پر خدا کی پرستش کرتے ہیں (یہ اقامتِ صلوٰۃ ہے) صدقہ، خیرات بھی دیتے ہیں (یہ ایتائے زکوٰۃ ہے)۔ تو آپ ہم سے اور کیا چاہتے ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ نہ یہ صلوٰۃ، صلوٰۃ ہے۔ نہ یہ زکوٰۃ، زکوٰۃ۔ یہ تو رسمی پرستش، یا انفرادی "نیکی کے کام" ہیں دین نہیں۔ دین کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو لوگ اجتماعی حیثیت سے دین کا نظام قائم کر رہے ہیں (رَاكِعِينَ)۔ تم ان کے ساتھ شامل ہو کر اطاعتِ خداوندی کرو۔

یہ تھی اسلام کی طرف آنے کی وہ دعوت، جو اہلِ کتاب کو دی گئی تھی۔

زیرِ نظر باب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کریم اہلِ کتاب اور بالخصوص ان کے مذہبی پیشواؤں کے غلط معتقدات اور ان کی دسیسہ کاریوں کو نمایاں طور پر سامنے بھی لا... رہا ہے —— دین فروشی، التباسِ حق و باطل، کتمانِ حقیقت، عہد فراموشی، پیمان شکنی وغیرہ —— اور اس کے ساتھ انہیں صحیح دینِ خداوندی کی دعوت بھی دے رہا ہے۔ زیرِ نظر آیت (۲/۴۴) اسی دعوت کی بنیادی شق ہے۔ اس کے بعد پھر ان کی باطل روش کے ایک اور ٹکڑے کو سامنے لایا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

۲/۴۴ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم دوسروں کو تو وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہو۔ بِر و تقویٰ کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلائے رکھتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے"؛

ہمارے ہاں تو، عام طور پر، ہر مقام پر برائی یا گناہ، اور نیکی یا ثواب کے الفاظ ہی بولے جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم میں گناہ کے لئے بھی متعدد الفاظ آئے ہیں اور نیکی کے لئے بھی۔ واضح رہے کہ عربی زبان اور قرآنِ کریم میں کوئی دو لفظ بھی مرادف المعنی نہیں۔ یعنی ایسے نہیں کہ ان کے معانی میں ذرا سا بھی فرق نہ ہو۔ وسعت کے اعتبار سے عربی زبان کا یہ عالم ہے کہ اس میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ موجود ہیں لیکن اُن میں نہایت لطیف اور نازک سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ بنا بریں قرآنِ کریم میں جرائم یا حسنات کے لئے جو متعدد الفاظ آئے ہیں اُن کی معنویت میں بڑا لطیف فرق ہے۔ انہی میں ایک لفظ "بِرّ" بھی ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کشادہ یا وسعت۔

بِرّ کے معنی

تنگ نظری بدترین مذموم خصلت اور انتہائی دنائت اور کمینگی کی مظہر لعنت ہے اس کے مقابلہ میں کشادہ نگہی اور وسعتِ قلب، گراں بہا جوہر اور وجۂ شرفِ انسانیت متاعِ حیات ہے۔ البَرّ کے یہی معنی ہیں اور اسی اعتبار سے خود خدا کی بھی ایک صفت اَلْبَرُّ (۵۲/۲۸) آئی ہے۔ (ب کے زبر کے ساتھ) نیز اس نے اہل جنت کی بھی یہی خصوصیت بتائی ہے جب کہا ہے: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۸۲/۱۳؛ ۳/۱۹۲؛ ۳/۱۹۷؛ ۷۶/۵؛ ۸۳/۱۸؛ ۸۳/۲۲)۔ "ابرار جنت کی آسائشوں کے مالک ہوں گے"۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۱) "تم البِرّ کو حاصل نہیں کر سکتے تاوقتیکہ تم وہ تمام چیزیں، جنہیں تم نہایت عزیز رکھتے ہو، منفعتِ عامہ کے لئے کھلی نہ چھوڑ دو"۔ اس میں آپ دیکھئے کہ بِرّ کے معانی کس قدر واضح ہو جاتے ہیں۔ تنگ نظر انسان، ایک پائی بھی بطیبِ خاطر دوسروں کو نہیں دیتا۔ اپنی عزیز ترین متاع دوسروں کی منفعت کے لئے وہی دے سکتا ہے جس کی نگاہ میں کشادگی اور ظرف میں وسعت ہو۔ دوسری جگہ کہا کہ تم مذہب

کے رسمی ارکان و فرائض کی ادائیگی سے یہ نہ سمجھ لو کہ تمہیں بِرّ حاصل ہو گیا۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (۲/۱۷۷) "بِر یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف"۔ اس کے بعد کہا کہ بِرّ یہ ہے کہ تم خدا کی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اپنا مال و دولت تعمیرِ انسانیت کے لئے عام کر دو"۔ ذرا آگے چل کر کہا کہ: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى (۲/۱۸۹) "بِرّ یہ نہیں کہ تم اپنی رسم کے مطابق مکان کے سامنے کے دروازے سے آتے ہو یا پچھلے دروازے سے۔ بِرّ یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کس قدر کرتے ہو"۔ اسی کی تاکید جماعتِ مومنین سے کی جب کہا کہ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵/۲) "تم بِرّ اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو"۔ یہی وہ بِرّ کے کام ہیں جن کے لئے باہمی مشاورت کی بھی ضرورت بتائی گئی ہے (۵۸/۹)۔ ضمناً، ان دونوں آیتوں میں بِر کے مقابلہ میں لفظ اِثم آیا ہے۔ اِثم کے معنی ہوتے ہیں اضمحلال، افسردگی، تھکان، ضعف اور اس کی وجہ سے صفِ زندگی میں دوسروں سے پیچھے رہ جانا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ بِرّ سے کس طرح جوہرِ انسانیت کی نمود اور زندگی میں کشاد پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال، یہودیوں سے کہا گیا (اور ظاہر ہے کہ یہاں ان کے مذہبی پیشواؤں سے بالخصوص خطاب ہے)، کہ تم دوسروں کو تو بِرّ اور تقویٰ کی تاکید کرتے رہتے ہو، لیکن کبھی نہیں دیکھتے کہ خود تم میں بھی یہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں۔ یہاں

علماء و مشائخ کی حالت

الفاظ ہیں وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (۲/۴۴)۔ تنسون کے مادہ (ن۔س۔ی) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو ناقابلِ التفات سمجھ کر اس کی حفاظت ترک کر دینا۔ اس سے بے اعتنائی برتنا۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ گراں بہا مقام انسان کی ذات (نفس) کا ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے۔ حفاظتِ نفس کے معنے ہوں گے اقدارِ خداوندی کی پابندی سے اپنی ذات کی نشوونما کرنا۔ قرآن کریم ان مذہبی پیشواؤں کو الزام یہ دیتا ہے کہ تم دوسروں کو تو ان اقدار کی پابندی کی اس قدر تاکید کرتے رہتے ہو لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ تم خود ان کی کس قدر پابندی کرتے ہو۔ قرآن کریم نے ان کے علماء کے متعلق کہا ہے کہ: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲/۵)۔ "ان لوگوں کی مثال، جنہیں تورات جیسی کتاب دی گئی تھی، لیکن وہ اس کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، ایسی ہے جیسے کسی گدھے پر مقدس کتابیں لاد دی گئی ہوں"۔ وہ کتابوں کی نمائش کرتا پھرے گا لیکن رہے گا گدھے کا گدھا۔ یہی کیفیت ہوتی ہے ان عالموں اور واعظوں کی، جو ساری عمر دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں اور اپنی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ وہ اس وعظ و نصیحت کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ

وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹/۳۴) "علماء مشائخ کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا جاتے ہیں اور بجائے اس کے، کہ لوگوں کو خدا کی طرف جانے والے راستہ پر چلائیں، اُلٹے ان کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق ایک اور اہم بات بھی کہی ہے اور وہ یہ کہ یہ عام لوگوں کو وعظ و نصیحت تو کرتے ہیں لیکن عملاً انہیں برائیوں سے روکتے نہیں۔ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵/۶۳) "ان کے علماء اور مشائخ لوگوں کو معیوب حرکات سے روکتے نہیں۔ یعنی جو لوگ دوسروں کا مال حرام طریقے سے کھا جاتے ہیں (یعنی دولت مند، سرمایہ دار طبقہ) یہ انہیں اس سے نہیں روکتے۔ یہ اس لئے کہ اس سے خود ان کے اپنے روزگار پر زد پڑتی ہے"۔ قرآن کہتا ہے کہ "یہ ان کی خدا پرستی نہیں، بلکہ مذہب کو انہوں نے ایک انڈسٹری (صنعت) بنا رکھا ہے"۔ (نیز ۵/۷۹)۔

پھر وہ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷)۔ "یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ لوگ ان کی، اُن کے ان کاموں کی وجہ سے تعریف کریں، جنہیں یہ کرتے نہیں"۔ آپ اپنے ہاں کے بزرگوں کے جانشینوں کو دیکھئے خواہ ان کا تعلق علمی مراکز سے ہو اور خواہ تصوف کی خانقاہوں سے۔ یہی نہیں کہ ان میں کوئی محاسن نہیں ہوں گے، ان کے کیرکیٹر میں دنیا بھر کے عیوب نظر آئیں گے لیکن وہ "اعلیٰ حضرت" کی اولاد یا ان کے مزارِ مقدس کے مجاور ہونے کی حیثیت سے انتہائی عزت و تکریم کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ معتقدین آئیں گے، ان کے حضور نذرانے بھی پیش کریں گے اور ان کے پاؤں بھی چومیں گے۔ اور یہ اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ تھی حالت یہودیوں کے احبار و رہبان کی۔ واضح رہے کہ ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور قرآن کریم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ان کے ان اچھے لوگوں کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ (۷/۱۶۸)۔ "ان میں اچھے لوگ بھی ہیں اور بُرے لوگ بھی"۔ "یہ اچھے لوگ الحق کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت بھی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف بھی کرتے ہیں"۔ (۷/۱۵۹ نیز ۳۲/۲۴)۔ یہی اچھے لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (۳/۱۱۳-۱۱۲ نیز ۴/۱۶۲) لیکن یہ اچھے لوگ خال خال تھے۔ ان کی اکثریت کا یہی عالم تھا کہ وہ "دیگراں را نصیحت خود را فضیحت" کے مسلک پر کاربند تھے اور لوگوں کی نظروں میں پارسا بننے کے لئے الکتاب کی تلاوت بھی کرتے رہتے تھے (تلاوت کا وسیع مفہوم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)

قرآن کریم اس منفی پہلو کے بعد پھر مثبت گوشہ کی طرف آیا اور ان سے کہا کہ تم پر جو ذلت و مسکنت اور ادبار و زوال

کا عذاب ملا ہے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمہارے جوہرِ انسانیت بیدار ہوں اور تمہاری صلاحیتیں نشوونما پاجائیں۔ اس کے لئے کہا کہ :۔

۲/۴۶-۴۵ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

اِن آیات کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ خدا سے معاونت طلب کرو۔ لیکن یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ اس لئے یہ عام لوگوں پر بڑی گراں گزرتی ہے اِسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں اور انہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں عدالتِ خداوندی میں اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے"۔

یہاں پہلا لفظ استعانت ہے۔ اور استعانت کے متعلق جلد اول میں آیت (۱/۴) کے تحت بڑی تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول صـ۳۷) وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صبر و صلوٰۃ کی رو سے استعانت کس قدر صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ ہے ـــــ وہ مرحلہ، جس میں ہر قسم کے نقصانات برداشت کرنے اور مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ حتّٰی کہ بعض اوقات جان تک کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ اسی لئے یہاں کہا کہ یہ منزل بڑی کٹھن ہوگی۔

صلوٰۃ کے متعلق بھی جلد اول میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے کہ اس سے مراد اس نظام کی تشکیل ہے جس میں افرادِ معاشرہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ دوسرا لفظ صبر ہے۔ صبر کے معنی ہوتے ہیں ثبات و استقلال کے ساتھ مخالفتوں کا مقابلہ کرنا۔ اسطرح جم کر کھڑے ہو جانا کہ پائے ہمت میں ذرا سی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنی ذات کو ایسا متوازن بنالینا کہ حوادثِ زمانہ کے ہچکولے اُسے ذرا بھی ڈانوا ڈول نہ کرسکیں۔

اِستقامت

صدیوں کی غلامی، محکومی، خانماں خرابی، لامرکزیت سے بنی اسرائیل میں ثبات و استقامت کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ قرآن کریم نے کئی ایک مقامات پر یہ بتایا ہے کہ ان کی کمزوری اور دوں ہمتی کس حد تک پہنچ چکی تھی۔ سورۃ البقرۃ میں، قصۂ آدیزش (حضرت) طالوت اور جالوت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ اُن کا کمانڈر انہیں میدانِ جنگ کی طرف لے چلا تو اُن سے کہا کہ آگے جو ندی آتی ہے اس پر پانی پینے نہ بیٹھ جانا۔ اپنی پیاس کو روکنا۔ لیکن وہ اتنا بھی ضبط نہ کرسکے (۲/۲۴۹-۲۵۲)۔ اس سے ذرا پہلے ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے لیکن موت کے ڈر سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے (۲/۲۴۳)۔ ان کی یہی بزدلی اور دوں ہمتی تھی جس کی وجہ سے ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی تھی (۶۲/۵-۸)۔ بنابریں یہ ضروری تھا کہ ان سے کہا جاتا کہ اگر تم دوبارہ زندگی چاہتے ہو تو اس کے لئے شرطِ اولیں یہ ہے کہ تم احکامِ خداوندی کی اطاعت کرو لیکن اس میں بڑے

استقلال و استقامت کی ضرورت ہوگی۔ قرآن کریم نے دین کے راستہ کو اَلْعَقَبَةُ سے تعبیر کیا ہے (۹۰/۱۱)۔ اس کے معنی ہوتے ہیں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں ان جملہ تفاصیل کو کس اعجاز سے سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہ ہے دین کی وہ گھاٹی جس کے متعلق کہا کہ جب وہ عام لوگوں کے سامنے آتی ہے تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور کہدیتے ہیں کہ اس پر کیسے چڑھا جائے گا لیکن جنہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ زندگی کی رفعت و بلندیاں اس پر چڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، وہ اسے دشوار گزار راستہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس پر چڑھتے ہیں اور قدم قدم ہی سہی، چوٹی پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

ظن کے معنی

آیت (۲/۴۶) میں لفظ یَظُنُّوْنَ آیا ہے۔ عام طور پر ظن کا لفظ حق اور یقین کے مقابلہ میں آتا ہے۔ لیکن علمائے لغت کا کہنا ہے کہ اگر اس کے بعد اَنْ یا اَنَّ کا حرف آئے تو اس کا مفہوم یقین کے قریب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ہم نے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اپنے تمام اقوال و اعمال کا حساب دینا ہے۔ یعنی ان کے نتائج ہمارے سامنے آکر رہیں گے۔ "رب کی ملاقات" اور "الیہ راجعون" کا تفصیلی مفہوم جلد اول (صفحہ ۳۵) پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے دھرانے کی ضرورت نہیں اس کا مفہوم ہوتا ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق اعمال کے نتائج کا سامنے آنا۔ یہودیوں کو یہ بات واضح طور پر اس لئے سمجھائی اور جتائی گئی کہ وہ قانونِ مکافات کے قائل ہی نہیں رہے تھے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ تو یہ کہتے تھے کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں (۵/۱۸) اور جنت ہمارے لئے (RESERVE) ہو چکی ہے (۲/۱۱۱)۔ لہٰذا ان سے یہ کہا گیا کہ اگر حیاتِ نو چاہتے ہو تو تمہیں ان تمام باطل عقائد و نظریات کو ذہن سے نکالنا ہوگا اور اس حقیقت پر ایمان لانا ہوگا کہ حقیقی زندگی اور اس کی خوشگواریاں، قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور مستقل اقدار کی پابندی ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ باطل کی فریب انگیز جھوٹی آرزوؤں اور تمناؤں سے نہیں۔ یہودیوں سے یہ بات براہِ راست کہی اور مسلمانوں سے بالواسطہ کہا کہ تم بھی کان کھول کر سن لو کہ: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ مَنْ

قانونِ مکافات

يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴/۱۲۳)۔ "فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔ فیصلہ ہوگا ہمارے اس قانون کے مطابق کہ جو شخص بھی غلط کام کرے گا، کسے باشد، اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا۔ وہ اپنے دل میں ہزار یہ سمجھے کہ میرے بزرگ میری سفارش کر دیں گے اور عذاب سے بچالیں گے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کوئی ایسی ہستی اور قوت نہیں جو قانونِ خداوندی کے خلاف کسی کی کوئی مدد کر سکے۔" دوسری طرف کہا: بَلٰی

مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۱۱۲)۔ جو شخص بھی احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گا اور خلوصِ قلب سے ان کی اطاعت کریگا تو اللہ کے ہاں سے اُسے اِس کا اجر ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہوگا کہ ایسے لوگ خوف اور حزن سے مامون رکھے جائیں گے۔"

یہاں یہود کو جو وارننگ دی گئی ہے، اس کی مزید تفصیل آئندہ باب میں ہمارے سامنے آئے گی۔

خلاصہ باب سوم

جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ جو قوم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی، وہ سرسبز شاداب رہے گی اور جو ان کے خلاف چلے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی) اس کی زندہ مثال قومِ بنی اسرائیل ہے جو اس وقت (اے رسول) اِن قوانین کی اس شدّت سے مخالفت کر رہی ہے تم ان سے کہدو کہ تم اپنی تاریخ کے اس عہد کو سامنے لاؤ جب تم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ اس دور میں تمہیں کسقدر آسائشیں اور راحتیں، سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب تھیں۔

پھر تم نے اس روش کو چھوڑ دیا، تو اس کا نتیجہ بھی تمہارے سامنے ہے ـــــ یعنی دنیا بھر کی ذِلّت و رسوائی (۲/۶۱)۔

اب پھر ایسا موقع آیا ہے کہ تم چاہو تو اپنی گم گشتہ جنّت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہو۔ تم (میرے قوانین کی اِتباع سے) اپنے عہد کو پورا کرو اور پھر دیکھو کہ میں کس طرح ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہوں جن کا میں نے تم سے، اس کے بدلے میں، وعدہ کیا تھا (۲/۱۱۹)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم تمام غیر خدائی قوتوں کا خوف اپنے دل سے نکال ڈالو، اور صرف میرے قوانین کے سامنے جھکو، اور ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرو، اور محتاط رہو۔ اس ابدی حقیقت کو یاد رکھو کہ خدا کے قوانین اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہوتے ہیں۔ جب اور جہاں بھی کوئی

قوم ان پر عمل پیرا ہوگی، ان کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہو جائے گی جو خلاف ورزی کرے گی، تباہ و برباد ہو جائے گی اسی کو قوموں کی تقدیر اور تاریخ کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہو تو اپنی روش کو بدل لو۔

اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تم اس ضابطۂ قوانین (قرآن) پر ایمان لاؤ جسے ہم نے (اس رسول پر) نازل کیا ہے۔ یہ (علاوہ اور باتوں کے) ان تمام دعاوی کو بھی سچ کر دکھائے گا جو تمہارے ہاں نظری طور پر موجود ہیں۔ چونکہ اس کی تعلیم بنیادی طور پر وہی ہے جو کبھی تمہیں بھی دی گئی تھی (اور جواب اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہیں)، اس لئے تمہیں چاہیئے تھا کہ تم لپک کر اس کی طرف آتے۔ لیکن، اس کے برعکس، تم نے اوروں سے بھی پہلے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ ایسا نہ کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں مذہبی پیشوائیت کی بنا پر کچھ دنیاوی مفاد حاصل ہیں۔ (۲/۴۱-۴۴ ؛ ۵۶/۸۱-۸۲) اور تمہارے خود ساختہ عقائد و رسومات تمہاری قومی گروہ بندی کا موجب بن رہے ہیں جن کا چھوڑنا تم پر گراں گزرتا ہے (۲۹/۲۵) لیکن اس ضابطہ کے اتباع سے جو کلی مفاد حاصل ہوں گے، وہ اِن سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے۔ لہٰذا تم اسی کے مطابق زندگی بسر کرو۔

تمہاری موجودہ روش یہ ہے کہ کہیں تم، حقیقت پر یکسر پردہ پوشی کر کے اُسے لوگوں کے سامنے آنے ہی نہیں دیتے (۲/۱۵۹)، اور کہیں (وحی کے ساتھ اپنی خود ساختہ شریعت کو ملا کر) حق اور باطل کو اس طرح خلط ملط کر دیتے ہو کہ باطل، حق بن کر دکھائی دیتا ہے ـــ اور تم یہ سب کچھ اپنے مفاد کی خاطر دیدہ و دانستہ کرتے ہو۔

تم اپنی اس روش کو چھوڑ دو، اور (قرآن کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنانے کے بعد) نظامِ صلوٰۃ قائم کرو، اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان فراہم کرو، اور اس طرح تم بھی ان کے ساتھی بن جاؤ جو قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (۹/۱۱۹ ؛ ۸۹/۲۹)۔ ایسا صرف اس نظام معاشرہ میں ہو سکے گا جو قرآن پر ایمان رکھنے والی جماعت (مومنین) کے ہاتھوں متشکل ہوگا (۲۲/۴۱)۔

اس کتمانِ حقیقت اور تلبیسِ حق و باطل کی روش کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ تمہاری اپنی زندگی میں عجیب تضاد اور منافقت پیدا ہو چکی ہے۔ تم دوسروں کو تو تاکید کرتے ہو کہ وہ بھلائی اور کشاد کی راہ اختیار کریں (۲/۱۷۷) لیکن جب اپنی باری آتی ہے تو تمہیں یہ سب وعظ نصیحت بھول جاتی ہے اور اس کے ساتھ تم اس کے بھی مدعی ہو کہ تم کتاب اللہ کا اتباع کرتے ہو۔ ذرا عقل و فکر سے کام لے کر سوچو کہ کیا خدا کی کتاب اس قسم کی روش اختیار کرنے کی تعلیم دے گی؟

یاد رکھو! تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما، اور تمہاری زندگی میں صحیح توازن، اُسی صورت میں پیدا ہو سکے گا کہ تم نہایت استقامت اور استقلال سے نظامِ صلوٰۃ پر کاربند رہو (۲/۱۵۳)۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ راستہ تمہیں بڑا دشوار گذار اور یہ منزل بڑی کٹھن نظر آئے گی (اس لئے کہ تم خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ

"مذہب" پر آنکھیں بند کرکے چلنے اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے ہو (۱۴/۲-۱۱؛ ۹۰/۱۲-۱۱)۔ لیکن اگر تمہیں اس کا خیال رہے کہ تم نے خدا (کے قانونِ مکافات) کا سامنا کرنا ہے۔ تم اس قانون کی زد سے باہر نہیں جا سکتے۔ تمہارا ہر قدم اسی کیطرف اُٹھ رہا ہے، تو پھر تمہارے دل میں یقیناً وہ جھکاؤ پیدا ہو جائے گا جس سے انسان، اپنے ذاتی میلانات کو چھوڑ کر۔ قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا کرتا ہے۔

نوٹ: صفحہ ۱۸۷ سطر اول پر عزرا، کتاب دوم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بائبل کے مروجہ نسخوں میں عزرا کی صرف ایک کتاب ہے لیکن لاطینی نسخوں میں عزرا (ESDRAS) کی دو کتابیں ہیں یہ اقتباس وہیں سے لیا گیا ہے۔ (دیکھئے DR. BROWN کی کتاب (RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY P.P 79-82)

چوتھا باب

آیات (۲/۴۷) تا (۲/۵۴)

(داستانِ بنی اسرائیل ــــ سینا کی وادیاں)

۱ - قانونِ مکافاتِ عمل
۲ - جزا اور سزا
۳ - شفاعت کا صحیح مفہوم
۴ - ابتلا و آزمائش کا قرآنی مفہوم
۵ - سمندر کیسے پار کیا تھا ؟
۶ - فرعون کی محفوظ لاش ۔
۷ - فرعون کا ایمان ــــ ضعفِ خودی کا مظاہرہ . . .
۸ - عزیر کون تھا ؟
۹ - سامری کون تھا ؟
۱۰ - گوسالہ پرستی ۔
۱۱ - شکر کا قرآنی مفہوم ۔
۱۲ - حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں کو کتاب دی گئی تھی ۔
۱۳ - خدا کی صفت ــــ البارئ ۔ کا مفہوم ۔
۱۴ - باہمی خوں ریزی کی مذمت ۔

چوتھا باب (آیت ۴۷ تا ۵۴)

داستانِ بنی اسرائیل ـــــ سینا کی وادیاں

۲/۴۷ یٰبَنِیۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ۔

اس آیت میں بھی، آیت (۲/۴۰) کی طرح بنی اسرائیل کو انعاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ ان نعمائے خداوندی کی تفصیل سابقہ باب میں سامنے آچکی ہے۔ اسی قسم کی یاد دہانی آیت (۲/۱۲۲) میں بھی کرائی گئی ہے۔ انعاماتِ خداوندی کی ان یاددہانیوں سے یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے احسانات جتاتے ہیں۔ خدا تو اس قسم کے انسانی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ اس سے مراد ان کی دونوں حالتوں کے تقابل سے انہیں آمادہ بہ اصلاح کرنا ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ ایک تندرست و توانا، خوبرو نوجوان اپنی بد احتیاطیوں کی وجہ سے صحت ضائع کر دیتا ہے اور قسم قسم کے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک ناصح مشفق اس سے کہتا ہے کہ تم اپنی اس حالت کو یاد کرو جب تمہاری صحت قابلِ رشک تھی۔ تمہارے چہرے کی ترو تازگی بڑی پرکشش ہوتی تھی۔ تم ہشاش بشاش زندگی بسر کرتے تھے۔ دن بھر کام کاج کرتے اور کبھی تکان محسوس نہیں کرتے تھے اور آج تمہاری یہ حالت ہو چکی ہے! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر تم اپنی ان بُری عادات کو چھوڑ دو تو پھر سے وہی صحت اور تازگی واپس آسکتی ہے۔ بنی اسرائیل کو جو نعمائے خداوندی کی بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے تو اس سے یہی مقصود تھا۔ انہیں بتایا یہ جا رہا تھا کہ تم نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کی تو تمہیں ایسی سرفرازیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں جن کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ اس کے بعد جب تم نے ان قوانین سے سرکشی اختیار کی تو تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ اگر اب بھی تم اپنی روش بدل لو تو تمہیں وہی سرفرازیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ انعاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کے فوری بعد انہیں یہ بتایا گیا کہ تم نے کونسی غلط روش اختیار کی تھی جس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کی تمہاری موجودہ زندگی ہے۔ اگلی آیت میں ہے:۔

۲/۴۸ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو پیشِ نظر رکھو اور اس امر کی احتیاط برتو کہ تمہارا کوئی قدم اس کے قوانین کے خلاف نہ اٹھے۔ یاد رکھو! قانونِ مکافات کی رو سے ہر شخص کو اپنے اعمال کا خمیازہ، خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکتا۔ نہ ہی کسی کی سفارش، کسی کے کام آ سکتی ہے۔ نہ ہی مجرم کچھ معاوضہ دے کر، سزا سے بچ سکتا ہے۔ نہ ہی کوئی شخص کسی کی کچھ مدد کر سکتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔

یہودیوں کی ذلت و خواری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے قانونِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظرانداز کر دیا تھا اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو چکے تھے کہ جنت ہمارے نام لکھی جا چکی ہے (۲/۱۱۱)۔ ہم خدا کی چہیتی اولاد اور اس کی محبوب قوم ہیں (۵/۱۸) اگر ہمیں، اپنے بعض اسلاف کے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں جانا بھی پڑے گا تو وہ محض چند دنوں کیلئے ہوگا۔ پھر ہمارے سفارشی ہمیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے (۲/۸۰) اس سلسلہ میں انہوں نے عجیب و غریب عقائد وضع کر رکھے تھے۔ ان کی مقدس کتاب تالمود میں ہے:۔

یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد

آخرت میں (حضرت) ابراہیم علیہ السلام جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی، جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے، سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کے ختنہ کی کھال اتار کر، جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے مقامِ ختنہ پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر جہنم میں (چند دنوں کے لئے) بھیج دیں گے۔

(تالمود ص ۴۰۴)

ان اسرائیلیوں کا جہنم میں داخلہ محض ایک رسم پوری کرنے کے لئے ہوگا:۔

جہنم کی آگ کا اسرائیلی گناہگاروں پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ (ایضاً ص ۶۰۵)

اور اس کی وجہ، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ لکھی ہے:۔

اسرائیلی گناہگاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازہ پر گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم ص ۵۸۳)

اُخروی نجات ہی نہیں، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس دنیا کی عزت و فلاح بھی اپنے اعمال کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ:۔

بعض کو عزت ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں

کے اعمال کے صدقہ ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ششم صفحہ ۶۰)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ "یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آباؤ اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہمارے جدِّ امجد ہیں"۔ اسی طرح (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS) میں مذکور ہے کہ:-

> یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد گیارہ صفحہ ۱۴۴)

یہودیوں کے ان عقائد کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآنِ کریم نے مندرجہ بالا آیت (نیز آیت ۲/۱۲۳) میں جو کہا ہے کہ نہ کچھ نہیں ہوسکے گا اور وہ بھی نہیں، تو اس سے ان کے انہی باطل عقائد کی تردید مقصود تھی۔ جیسا کہ ہم مسلسل لکھتے چلے آرہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دین کی اساس و بنیاد خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور سارا قرآن گویا اسی قانون کی تشریح و تفصیل لئے ہوئے ہے۔ اس قانون کا ملخص یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال اور ارادہ بھی) اپنا نتیجہ مرتب کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ عمل، اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے تو اس کا نتیجہ خوشگواریاں ہوتی ہیں اور اگر وہ ان کے خلاف ہو تو اس کا نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں۔ سورۃ البقرۃ میں ہے: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ "جو شخص کوئی اچھا کام کرے گا اس کا اچھا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوگا۔ جو غلط کام کرے گا اس کا تباہ کن نتیجہ بھی خود اسی کو بھگتنا پڑے گا"۔ سورۃ الانعام میں ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵)۔ "جو شخص غلط اقدام کرتا ہے اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا"۔ اس باب میں اور تو اور، کائنات کی عظیم ترین ہستی، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے یہ اعلان کرایا گیا کہ: قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵؛ ۱۰/۱۵؛ ۳۹/۱۳)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو یومِ مکافات کے عذاب سے مجھے بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں"۔ قانون کی اس غیر مرئی حقیقت کو محسوس مثالوں کے ذریعے سے یہ کہہ کر سمجھایا گیا کہ: وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۴۷)۔ "یومِ مکافات کو

ہم عمل کے ترازو کھڑے کردیں گے اور اس طرح کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہو گی۔ اس ترازو کی کیفیت یہ ہو گی فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۷-۸)۔ "غلط اور صحیح اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے آجائے گا۔ اس دن کوئی کسی کو، کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکے گا (۳۴/۴۲)۔ اس دن نہ بیٹا باپ کے کام آسکے گا نہ باپ بیٹے کو بچا سکے گا (۳۱/۳۳)۔ اس دن دوست، اپنے دوست سے بھاگ جائے گا۔ ماں اور باپ اولاد کو چھوڑ دیں گے۔ بیوی اور بچے آنکھیں چرالیں گے۔ اس لئے کہ اس دن سب کو اپنی اپنی پڑی ہو گی (۸۰/۳۴-۳۷ نیز ۷۰/۱۰-۱۴)۔ اس دن نہ کوئی سودے بازی ہو سکے گی نہ کسی کی دوستداری کوئی کام دے سکے گی۔ نہ کسی کی سفارش چلے گی (۲/۲۵۴ نیز ۱۴/۳۱)۔ اس دن ہر فرد، تنہا، صرف اپنی ذات کو لئے ہوئے۔ عدالتِ خداوندی میں حاضر ہو گا (۶/۹۵ نیز ۱۸/۴۸)

یہ ہیں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے چند اشارات۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، سارا قرآن، اساسی اور بنیادی طور پر بہ ہیئت مجموعی اسی قانون کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تفسیر ہے کہ [1]

گندم از گندم بروید، جو ز جو ∴ از مکافاتِ عمل غافل مشو

اِس تمہیدی گفتگو کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۲/۴۸) کے مختلف اجزا کی طرف آیئے۔

پہلا ٹکڑا ہے: يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا (۲/۴۸) اس میں تَجْزِیْ کا لفظ تشریح طلب ہے اس کا مادہ ہے (ج۔ز۔ی) جس کے بنیادی معنے کسی چیز کا بدلہ ہیں۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنے ایک چیز کا دوسری چیز کا قائم مقام ہونا ہے۔ یہ مفہوم ایک اہم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جس چیز کو عام طور پر "عمل کا بدلہ" کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی نتیجہ، عمل کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ یہ آپ کا عمل ہے۔ آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس میں سخت تکلیف ہوتی ہے یہ اس عمل کا نتیجہ ہے۔ عمل تو فوراً ختم ہو گیا لیکن اس کے نتیجے نے اس کی جگہ لے لی۔ اسے عمل کی جزا کہا جائے گا۔ (ہمارے ہاں عام طور پر اچھے نتیجے یا بدلے کے لئے جزا اور برے نتیجے کے لئے سزا کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں، دونوں کے لئے جزا ہی کا لفظ آیا ہے)۔

جزا و سزا

ہاتھ جلنے کی جو مثال ہم نے اوپر دی ہے، اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے نہ سزا خارجی طور پر کہیں باہر سے ملتی ہے نہ جزا ہی کہیں باہر سے انعام ملنے کا نام ہے۔ آپ نے کسی کو گالی دی۔ اس نے آپ کو تھپڑ مارا۔ یہ خارج سے ملی ہوئی سزا ہے۔ اس میں گالی اور تھپڑ میں کوئی ربطِ باہمی نہیں۔ اس کے برعکس، آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالا تو اس کے نتیجے میں آپ شدید درد میں مبتلا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ درد آگ میں ہاتھ ڈالنے کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ سزا کہیں خارج سے نہیں ملی۔ خارج سے ملنے والی سزا میں یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو آپ نے

[1] اس اجمال کی تفصیل کیلئے میری کتاب ــــ جہانِ فردا ــــ اور مطالب الفرقان (جلد اول صـ۱۵۲-۱۴۶) ملاحظہ فرمالیں۔

گالی دی تھی وہ آپ کو معاف کر دے۔ کوئی دوسرا شخص آپ کی طرف داری کر کے، آپ کو اس سزا سے بچالے یا آپ اُسے کچھ دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرالیں۔ لیکن آگ میں ہاتھ ڈالنے کی جو سزا آپ کو ملی ہے اسے نہ کوئی معاف کر سکتا ہے۔ نہ کسی کی سفارش اس کی کوئی تخفیف کر سکتی ہے۔ نہ کسی کو کچھ دے دلا کر آپ درد سے بچ سکتے ہیں۔ اس سزا کو تو آپکو خود ہی بھگتنا ہوگا۔ (اس سے بچا کیسے جائے گا اس کے متعلق "توبہ" کے عنوان میں بتایا جائے گا)۔ بالفاظِ دیگر، قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے عمل خود آپ اپنی جزا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۷/۱۴۷؛ ۵۲/۱۶؛ ۳۴/۳۹؛ ۴۵/۲۸)۔ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ ہر عمل کا نتیجہ، اس عمل کی جگہ آجاتا ہے۔ اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ سورۃ الدھر میں اہلِ جنت کے متعلق کہا: وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا (۷۶/۱۲) "اُن کی استقامت کی جزا جنت کی شکل میں سامنے آجائے گی۔ (نیز ۲۳/۱۱۱)۔ دوسری طرف غلط اعمال کی سزا کے سلسلے میں کہا: ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ (۳۴/۱۷) "ہم نے ان کے کفر کا بدلہ یوں دیا، اور ایسا بدلہ ہم کفر کی روش اختیار کرنے والوں ہی کو دیا کرتے ہیں"۔ ان آیات میں سزا اور جزا دونوں کے لئے جزا کا لفظ آیا ہے۔ دوسری جگہ جامع طور پر کہا: الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۴۰/۱۷) "اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ (نیز ۴۵/۲۲)۔ سورۃ یٰسین میں ہے: فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۶/۵۴)۔ "اس دن کسی شخص پر، کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی اور تمہیں تمہارے اعمال ہی کا بدلہ ملیگا"۔

آیت (۲/۴۸) میں لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ آیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ قانونِ مکافات کی رو سے کوئی شخص، کسی مجرم کا بدل نہیں بن سکے گا۔ یعنی اس کے جرم کی سزا اپنے اوپر نہیں لے سکے گا۔ وہ اس کے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ دوسرے مقام پر ہے: يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۴/۴۱) "جس دن کوئی دوست، کسی دوست کے کام نہیں آسکے گا اور مجرموں کی کوئی شخص مدد نہیں کر سکے گا"۔ قانونِ مکافات کے سلسلے میں جو آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں اُنہیں ایک بار پھر سامنے لائیے۔ زیرِ نظر آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم اور بھی واضح ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اِن چار لفظوں میں کس طرح یہودیوں کے باطل عقائد کی جڑ اکھیڑ کر رکھ دی گئی ہے۔

شفاعت کا مفہوم

آیتِ زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (۲/۴۸)۔ "اس دن کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ اس میں شفاعت کا لفظ غور طلب ہے، اس لئے کہ اس میں یہودیوں کے شفاعت سے متعلق باطل عقیدے کا ابطلان ہی نہیں بلکہ اس کا خود ہمارے ہاں بھی جو غلط

مفہوم لیا جاتا ہے اس کی تردید بھی مقصود ہے۔

"سفارش" کی روش کس قدر قابلِ مذمت فعل اور تباہ کن نتائج کا موجب ہے، اس کا اندازہ آپ اپنے معاشرہ کی موجودہ حالت سے لگا سکتے ہیں۔ آپ ہر روز یہ شکایت کرتے ہیں کہ صاحب! اب تو کوئی کام بھی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتا۔ ہر فیصلہ سفارش کی رو سے ہوتا ہے۔ جس کے پاس کوئی بڑی سفارش ہے اس کا ہر کام بآسانی ہو جاتا ہے۔ جس کے پاس سفارش نہیں، وہ لاکھ حق پر ہو، اس کی کوئی نہیں سنتا۔ آپ جب کسی افسر یا حاکم کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس کے ہاں تو صرف سفارش چلتی ہے تو آپ کے ذہن میں اس کا نہایت نفرت انگیز تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص سفارش کے ذریعے حکام سے لوگوں کے غلط کام کرواتا اور مجرموں کو سزا سے بچا لیتا ہے اُسے بھی بدترین خلائق سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ اگر نقشہ کچھ اِس قسم کا ہو کہ قیامت میں عدالتِ خداوندی میں ملزم پیش ہو۔ قانون کی رُو سے اس کے خلاف جرم ثابت ہو جائے۔ عدل کی رو سے اُسے جہنم کی سزا دی جائے ـــــ بلکہ اسے جہنم میں بھیج بھی دیا جائے۔ اس کے بعد کوئی بزرگ ہستی خدا سے اس کی سفارش کرے اور خدا اس کی سفارش مان کر اس مجرم کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دے تو آپ سوچئے کہ اس سفارش کرنے والے بزرگ اور سفارش ماننے والے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور قائم ہوگا؟ لیکن مذہب کی دنیا میں اس بوالعجبی کا تماشہ دیکھئے کہ مذہب پرست طبقہ دنیاوی کاروبار میں سفارش کے اس عمل دخل کو تو اس قدر مذموم اور معیوب قرار دے گا لیکن قیامت میں سفارش کے اسی کاروبار کو بڑا مستحسن جیا کرے گا۔ چنانچہ شفاعت کا عقیدہ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے شفاعت کے اس باطل عقیدے کی بہ اصرار و تکرار تردید کی ہے۔ کہیں وہ کہتا ہے: يَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ (۱۰/۱۸)۔ "یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں گے"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ: مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ (۴۰/۱۸)۔ "جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہو گی ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا، نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا جس کی اطاعت انہیں کوئی فائدہ دے سکے"۔ دوسری جگہ ہے: وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ (۳۰/۱۳)۔ "جن لوگوں کو یہ اپنے شرکاء سمجھا کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے ان میں سے کوئی بھی ان کا شفیع نہیں ہوگا"۔ (نیز ۶/۹۵)۔ اور فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (۷۴/۴۸)۔ "شفاعت کرنے والوں میں سے کسی کی شفاعت ان کے کام نہ آسکے گی"۔ وہ اس کیفیت کو دیکھ کر پکاریں گے کہ: فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا (۷/۵۳)۔ "کیا آج کوئی شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کر سکیں"۔ اور اس کے بعد مایوس ہو کر خود

ہی ایک آہِ سرد کے ساتھ کہیں گے: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ (۲۶/۱۰۰) "آج ہمارا کوئی بھی شفاعت کرنے والا نہیں"۔

اہلِ مذہب کے عقیدۂ شفاعت کی اس طرح تردید کرنے کے بعد، جماعتِ مومنین سے کہا کہ:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲/۲۵۴)۔

اے جماعتِ مومنین! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے منفعتِ عام کے لئے کھلا رکھو، قبل اس کے کہ وہ دِن آجائے جب نہ تو جنت مال و دولت کے عِوض خریدی جا سکے گی نہ کسی دوست کی دوستی کسی کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی کی سفارش چل سکے گی۔ جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں، وہ اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کرتے ہیں۔

شفاعت کا قرآنی مفہوم

لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں بھی شفاعت کا عقیدہ موجود ہے اور اس کی تائید میں قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے: مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵): وہ کون ہے جو خدا کے پاس کسی کی شفاعت کرے بجز اس کے، جسے خدا اجازت دے"۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکے گی اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت سے کریں گے۔ لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانونِ مکافات کے یکسر خلاف ہے جس کی بنیادوں پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآنِ کریم متضاد عقائد کی تعلیم پیش کرتا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم نے اپنے منزل من اللہ ہونے کی ایک بنیادی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں تضادات اور اختلافات نہیں (۴/۸۲)۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کیلئے ہمیں پہلے لفظِ شفاعت کے معانی پر غور کرنا ہوگا۔

لفظِ شفاعت کے مادہ (ش۔ف۔ع) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو، کسی دوسری چیز کیساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا۔ کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔

اس "ساتھ کھڑے ہو جانے" کی رُو سے اہلِ مذاہب نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ ان کے بزرگ مجرموں کے ساتھ کھڑے ہو کر خدا سے اُن کی سفارش کریں گے۔ اس طرح شفاعت کے معنی سفارش ہو گئے۔ لیکن قرآنِ کریم، اس "ساتھ کھڑے ہونے" کے معنی کچھ اور بتاتا ہے۔

قرآنی اصطلاحات کے معانی

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں بہت سے الفاظ اور اصطلاحات ایسی ہیں جنہیں باطل پرست بھی استعمال کرتے ہیں اور مؤمنین بھی۔ قرآنِ کریم میں جب وہ لفظ باطل پرستوں کی طرف سے آئے گا تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس مفہوم میں اسے باطل پرست استعمال کرتے ہیں۔ اور جب وہ لفظ خود خدا یا جماعتِ مومنین کی طرف سے بولا جائے گا تو اس سے وہ مفہوم لیا جائے گا، جس مفہوم میں اُسے قرآنِ کریم نے استعمال کیا ہے۔ مثلاً اِلٰہ کا لفظ جب کفار یا مشرکین کی طرف سے آئے گا تو اس سے مراد اُن کے بت یا دیگر معبودانِ باطل ہوں گے۔ لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف ہوگا تو اس سے مراد وہ خدائے حقیقی ہوگا جو ہر قسم کے اقتدار کا مالک ہے۔ عبادت کا لفظ جب کفار، مشرکین یا اہلِ کتاب وغیرہ کی طرف سے بولا جائے گا تو اس کے معنی "پرستش" کے ہوں گے اور جب یہ خدا یا جماعتِ مومنین کی طرف سے استعمال ہوگا تو اس کے معنے احکامِ خداوندی کی اطاعت اور اس کی محکومیت ہوگا (وقِس علیٰ ذالک)۔ الفاظ کے ان مفاہیم کے بنیادی فرق کو سامنے رکھنے کے بعد اب لفظ شفاعت کی طرف آئیے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ باطل پرست اہلِ مذاہب، اس سے مراد "سفارش کرنا" لیتے ہیں جس کی تردید قرآنِ کریم نے کی ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم جماعت مومنین کے سلسلے میں اُسے دوسرے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

قرآنِ کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی پیش کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں بِر و تقوٰی کے کاموں میں افرادِ معاشرہ باہمی تعاون کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس تعاون کا حکم خود قرآن میں دیا گیا ہے۔(۵/۲)۔ دنیاوی زندگی میں اس قسم کے تعاون کو شفاعت کہا جائے گا۔ یعنی کسی کی مدد کے لئے دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جانا، اس فرق کے ساتھ کہ تعاون میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور شفاعت میں ایک شخص کسی دوسرے کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ بھی اس کی مدد کرے گا یا نہیں۔ جیسے کسی مظلوم کی جائز مدد کے لئے اس کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔

باہمی تعاون کے سلسلے میں قرآن کریم نے کہا ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲) "بِر اور تقوٰی کے کاموں میں ایک دوسرے کی معاونت کرو۔ اِثم اور عدوان کے کاموں میں معاونت مت کرو"۔ پہلی قسم کی معاونت کو قرآنِ کریم نے مستحسن قرار دیا ہے اور دوسری قسم کے تعاون کو ممنوع۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھایا گیا ہے مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵) "جو شخص کسی اچھے کام میں، دوسرے کے ساتھ

مدد کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اُسے اس میں حصہ مِل جاتا ہے اور جو شخص کسی بُرے کام میں، کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔" یہاں سے اِس دنیا میں ایک دوسرے کی شفاعت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اب آئیے آخرت کی طرف۔ قانونِ مکافات کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے یعنی اس کی ذات اس سے متاثر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی کو اعمالنامہ کہتے ہیں (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن قرآنِ کریم نے جزا اور سزا کی مجرّد حقیقت کو محسوس انداز میں سمجھانے کے لئے ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، مستغیث ہوتا ہے، ملزم ہوتا ہے، گواہ ہوتے ہیں، پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے کہ: وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۵۰/۲۱)۔ "جب ملزم ہماری عدالت میں لایا جائے گا تو اس کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا اور اس کے علاوہ گواہ بھی ہوگا"۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ (جیسا کہ عدالتوں میں قاعدہ ہے) ان میں سے جسے بلایا جائے گا، وہی آئے گا اور وہی اس کی گواہی دے سکے گا جسے گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے لئے کہ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲/۲۵۵)۔ "وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے"۔ سورۃ الزخرف میں وضاحت سے بتایا کہ اس شفاعت (یا کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانے) کے معنے گواہی دینے کے ہیں۔ فرمایا: وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۴۳/۸۶)۔ "یہ باطل پرست جن ہستیوں کو خدا کے سوا پکارتے ہیں، انہیں ان کے ساتھ کھڑے ہونے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ ایسا وہی کر سکے گا (جسے خدا اس کا حکم یا اجازت دے) جو واقعات کا علم رکھتا ہو۔ اور سچی گواہی دے"۔ یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کے ہاں شفاعت کے معنی شہادت یا گواہی دینے کے ہیں۔

شفاعت سے مُراد شہادت دینا

یہ گواہ بہ ہیئتِ مجموعی خدا کے رسول بھی ہوں گے۔ سورۃ المائدۃ میں ہے: يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (۵/۱۰۹)۔ "جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں کی طرف سے تمہاری دعوت کا جواب کس قسم کا ملا تھا"۔ ان رسولوں کا جواب، ان کی طرف سے گواہی (شہادت) ہوگا۔ رسولوں کے علاوہ "ملائکہ"[1] کی شہادت بھی ہوگی۔ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۷۸/۳۸)۔ "جس دن الروح اور ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر

[1] ملائکہ کی تشریح اس کتاب کے بابِ اول میں کی گئی ہے۔ الروح کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔

سکے گا۔ بجز اُس کے، جسے خدائے رحمٰن اجازت دے اور وہ صحیح اور درست بات کہے۔" دوسری جگہ کہا: مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (۱۰/۳)۔ "کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر گواہی کے لئے کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ سورۃ مریم میں ہے: لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹/۸۷)۔ "ان کے سوا، جنہوں نے خدا سے عہد باندھ رکھا ہو (یعنی جو خدا کے مطیع و فرمانبردار رہے ہوں ان کے سوا) کوئی کسی کی تائید اور حمایت میں گواہی کا حق نہیں رکھے گا۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (۲۰/۱۰۹)۔ "اس دن کسی کی شہادت کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گی بجز اُس کے، جسے خدا کا اذن حاصل ہو اور وہ ایسی بات کہے جو خدا کی بات سے ہم آہنگ (قوانینِ خداوندی کے مطابق) ہو۔" (نیز ۳۴/۲۳؛ ۲۱/۲۸؛ ۵۳/۲۶)۔

ان مقامات سے شفاعت کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ مفہوم کہ اس کے معنی سفارش کے نہیں بلکہ صحیح اور سچی شہادت دیکر کسی کی تائید اور حمایت کرنے کے ہیں۔ چونکہ یہ تائید و حمایت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ خدا کے قوانین کے مطابق ہو، اس لئے خدا نے خود اپنے آپ کو "شَفِيْع" کہا ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں ہے: لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (۶/۵۱؛ ۶/۷۰؛ ۳۲/۴)۔ "خدا کے سوا ان کا کوئی دوست اور شفیع نہیں ہوگا۔" اور سورۃ الزمر میں یہ کہکر ساری بات واضح کر دی کہ: قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (۳۹/۴۴)۔ "ان سے کہو کہ شفاعت تمام تر، ساری کی ساری، صرف خدا کے لئے ہے۔" اگر ان آیات میں شفاعت کے معنے سفارش اور شفیع کے معنی سفارش کرنے والا کئے جائیں تو اس سے کوئی بات ہی نہیں بنتی۔ یعنی خدا تو حاکم یا فیصلہ کرنیوالا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حاکم خود ہی سفارش کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا شفاعت سے مراد خدا کی وہ تائید و حمایت ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے خدا کی نصرت بھی کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ہمارے ہاں جو رسول اللہ یا دیگر مقربینِ بارگاہِ خداوندی کی شفاعت بمعنی سفارش کا عقیدہ ہے، وہ صحیح نہیں۔ ویسے بھی، قرآنِ کریم نے، رسول اللہؐ کو کہیں شافع یا شفیع نہیں کہا۔ شہید یا شاہد — گواہی دینے والا یا نگران کہا ہے (دیکھئے ۲/۱۴۳؛ ۴/۴۱؛ ۳۳/۴۵؛ ۴۸/۸؛ ۷۳/۱۵)۔ علاوہ بریں جو رسول خود اپنے متعلق یہ کہے کہ اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں تو اس کی سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا (۶/۱۵) کیا وہ معصیت کاروں کی، سفارش کرکے انہیں ان کے جرائم کی سزا سے بچانے کی کوشش کرے گا؟ قرآنِ کریم نے تو مجرمین کے پُشت پناہ بننے کی سخت ممانعت کی ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا قطعاً یہ شیوہ نہیں

ہوتا (۲۸/۱۲ تا ۲۸/۸۹)۔ ویسے بھی سزا کا جو قرآنی مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو سفارش رشوت وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ آگ میں انگلی ڈالنے سے جو درد ہوتا ہے، کسی کی سفارش، یا رشوت اس کو نہ دور کرسکتی ہے نہ اس میں تخفیف۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو گناہوں (جرائم) کی "بخشش" کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کی وضاحت "مغفرت" کے عنوان میں اپنے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے سفارش کا تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

ان تصریحات سے بات واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کریم نے جب بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ یاد رکھو! خدا کے ہاں کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی تو وہاں شفاعت کے معنی سفارش کے ہیں جس کا عقیدہ یہودی رکھتے تھے۔ اور جس کی تردید قرآن کریم نے کی ہے۔ خواہ وہ عقیدہ کسی کے ہاں بھی ہو۔

آیتِ زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (۲/۴۸) اس میں عدل کے معانی غور طلب ہیں۔ لفظِ عدل کا مفہوم اس سے واضح ہو جائے گا کہ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اس کے لئے ضروری

عدل کا مفہوم

ہے کہ ہر دو اطراف کا وزن ایک دوسرے کے بالکل برابر ہو۔ ان میں سے ہر ایک کو "عِدْلٌ" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ایک چیز کا، کسی دوسری چیز کے برابر ہونا۔ بنا بریں، کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عدل کہلاتا ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے کہ اگر کوئی حالتِ احرام میں کسی جانور کا شکار کرے تو اس کے بدلے میں اسے اس کے برابر کوئی جانور دینا ہوگا: اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ (۵/۹۵)۔ "یا اس کی قیمت کے برابر مساکین کو کھانا کھلانا" اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (۵/۹۵) "یا اس کے بدلے میں روزے رکھنا"۔ اس سے عدل کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی جرم کے معاوضے میں کوئی ایسی شے پیش یا قبول کرنا، جس سے مجرم اس کے مواخذہ سے بچ جائے۔ اس میں رشوت بھی آ جائے گی اور کفارہ بھی۔ کفارہ کا مفہوم بھی وضاحت طلب ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ وہ کتنے ہی اچھے کام کیوں نہ کرے، اس آلائش سے اس کی نجات نہیں ہوسکتی۔ (ان کے عقیدہ کی رو سے) جب اللہ تعالیٰ نے اس صورتِ حالات پر نظر ڈالی تو اس سے اُسے (معاذ اللہ) بڑی پریشانی ہوئی کہ اس سے تمام انسان جہنم رسید ہو جائیں گے! اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو دنیا میں بھیج دے۔ مخالفین اسے صلیب دیدیں، اور اس طرح اس کا خونِ ناحق انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن

کفّارہ کا عقیدہ

بن جائے۔ چنانچہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان لے آئے اس کی نجات ہو جائے گی کیونکہ ان کا خونِ ناحق اس شخص کے گناہوں کا بدلہ بن جائے گا۔ قرآنِ کریم نے جب کہا کہ: وَاِنۡ تَعۡدِلۡ کُلَّ عَدۡلٍ لَّا یُؤۡخَذۡ مِنۡهَا (۶/۷۰) کوئی شخص اپنے گناہوں کا کسی قسم کا بھی بدلہ کیوں نہ دینا چاہے، وہ قبول نہیں کیا جائے گا" تو اس میں رشوت وغیرہ کے علاوہ عیسائیوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی۔ (واضح رہے کہ قسم وغیرہ توڑنے کے جس کفارہ کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے اس کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی۔ اس وقت سمجھنے کے لئے اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ وہ ایسی خفیف سی لغزشیں (لَمَم ۵۳/۳۲) ہیں جن کی، قانون کی رو سے، سزا، جرمانہ ہوتی ہے۔ اس کفارہ کے معنی جرمانہ کی ادائیگی ہوگی۔ لیکن یہ جرمانہ یہیں ادا کیا جاسکے گا۔ آخرت میں اس کی ادائیگی کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا)

یہ ہے وہ عدل، جس کے متعلق یہودیوں سے کہا گیا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں[1]۔ اس قانون کی رو سے ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور کسی قسم کا کفارہ وغیرہ دیکر اس نتیجہ سے بچا نہیں جا سکے گا۔ جو الفاظ زیرِ نظر آیت (۲/۴۸) میں آئے ہیں، انہیں (۲/۱۲۳) میں بھی دہرایا گیا۔

نُصرت کا مفہوم

آیۂ زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (۲/۴۸)۔ نُصرت کے عام معنی، مدد کرنا ہیں لیکن نصرت اور اعانت میں بالعموم یہ فرق کیا جاتا ہے کہ نصرت دفعِ مضرت کے لئے خاص ہوتی ہے۔ یعنی کسی مجرم کی مدد کر کے اسے جرم کی پاداش سے بچا لینا یا کسی مصیبت سے محفوظ رکھنا۔ مثلاً سورۃ الانبیاء میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کو پکارا کہ وہ انہیں آنیوالی مصیبت سے بچائے تو وَنَصَرۡنٰهُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا (۲۱/۷۷) "ہم نے اسے اس قوم کی درازدستیوں سے بچا لیا جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی"۔ سورۃ الزمر میں ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو: مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ (۳۹/۵۴) "قبل اس کے کہ تم اس عذاب میں مبتلا ہو جاؤ جس سے تمہیں کوئی چھڑا نہیں سکے گا"۔ دوسری جگہ اہلِ جہنم کے متعلق کہا کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے: وَلَا یَجِدُوۡنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیۡرًا (۳۳/۶۵) "اور وہ کوئی ایسا مددگار نہیں پائیں گے جو انہیں اس عذاب سے نجات دلا دے"۔ سورۃ المؤمن میں ہے کہ دربارِ فرعون کے مردِ مؤمن نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: فَمَنۡ یَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا (۴۰/۲۹) "ذرا سوچو! کہ جب خدا کا عذاب آ گیا تو اس سے ہمیں کون بچا سکے گا"۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم

---

[1] عدل بمعنی انصاف کے متعلق اس کے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

مجھے بتاؤ: فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ (۱۱/۶۳) "اگر میں قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداش سے مجھے کون بچا سکے گا"۔

اِن آیات سے واضح ہے کہ نصرت کے معنی ہیں کسی کی مدد کرکے اُسے جرم کی پاداش سے بچا لینا خواہ اس مدد کی نوعیت اور کیفیت کچھ بھی ہو۔ یہ تصور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ وہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے کہتا ہے کہ جن معبودانِ باطل، یا اپنے بزرگوں کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ تمہیں جرائم کی سزا سے بچا لیں گے: وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۷/۱۹۲) "تمہیں سزا سے بچا لینا تو ایک طرف، وہ خود اپنے آپ کو بھی پاداشِ جرم سے بچا لینے کی استطاعت نہیں رکھتے"۔ (نیز ۷/۱۹۷؛ ۲۱/۴۳)۔ (جہاں تک خدا کی نصرت کا تعلق ہے اس کی وضاحت اس کے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں ہم نے نصرت کے اسی مفہوم پر اکتفا کیا ہے جس کا تعلق آیت زیرِ نظر سے ہے)۔

جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے اس پر ایک دفعہ پھر نظر ڈالیے... اور دیکھیے کہ ان مختصر سے الفاظ میں، قانونِ مکافات کی کس طرح وضاحت، اور اس کے خلاف اہلِ مذاہب کے ہر باطل عقیدے کی کس طرح ضمنی طور پر تردید کی گئی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ جس قوم کا قرآن کریم کی اس ایک آیت پر بھی ایمان ہو اس میں عدل کا کیا تصور ہوگا، اور وہ احکام و اقدارِ خداوندی کی کس طرح پابند ہوگی اور اس طرح وہ قوم اس زمین پر کس قسم کا جنتی معاشرہ قائم کرے گی!

واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات کا مطلب یہی نہیں کہ ایسا کچھ قیامت (اُخروی زندگی) میں نہیں ہو سکے گا۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کچھ اس دنیا کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیئے۔ خدا کا قانونِ مکافات ہر دو جہان (دنیا اور آخرت دونوں) میں یکساں نافذ العمل ہے۔

قرآنِ کریم، بنی اسرائیل کو ان انعامات کی یاد دہانی کرا رہا ہے جن سے انہیں نوازا گیا تھا۔ اس ضمن میں اُس نے اگلی آیت میں کہا ہے:۔

۲/۴۹ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔

اِس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "تم خدا کی اس نعمت کو بھی یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ فرعون کے استبداد سے نجات دلائی جو تمہیں طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا رکھتی تھی۔ ان میں ایک عذاب یہ بھی تھا کہ وہ تمہارے ابنائے قوم کو ذبح کر دیتے

تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے"۔ "ذبح ابناء" کی تفصیل آیت (۲/۴) کے تحت سابقہ باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں نجات کا مفہوم بھی سامنے آ چکا ہے اس لئے ان تفاصیل کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس آیت کے آخر میں جو آیا ہے کہ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۲/۴۹) تو اس میں لفظ بلآ وضاحت طلب ہے۔

ہمارے ہاں بلآ کے معنے بہت بڑی خوفناک چیز یا (مصیبت) کے ہوتے ہیں۔ یہیں سے لفظ ابتلا ہے جس کے معنے آزمائش کئے جاتے ہیں۔ جب کسی سے کہا جائے کہ خدا کے نیک بندے کیوں مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ خدا انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں اس لفظ کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا ترجمہ آزمائش ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا انہیں آزماتا ہے۔ ان کی آزمائش کرتا ہے۔ اور اس سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ خدا کا ان نیک بندوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ اس کے مقرب بندے ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت کوئی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اس سے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ آپ اپنے کسی محرم راز سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص ہماری دوستی کا دعویٰ تو ہر وقت کرتا رہتا ہے لیکن معلوم نہیں وہ مخلص ہے بھی یا نہیں؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ اُسے آزما کر دیکھ لینا چاہیئے۔ یعنی اس سے کوئی بہت بڑی فرمائش کرنی چاہیئے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ وہ اسے پورا کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ کو اس شخص کی دوستی اور اخلاص کے متعلق یقینی طور پر معلوم نہیں، اور اسے معلوم کرنے کے لئے آپ اُسے آزماتے ہیں۔

آزمائش کا غلط تصور

آپ سوچئے کہ جب ہم یہ کہیں کہ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ اپنے دعویٰ عبدیت میں سچے اور مخلص ہیں یا نہیں، تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ خدا کو اس کا علم نہیں۔ اس آزمائش سے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ لوگ درحقیقت کیسے ہیں! خدا علام الغیوب ہے۔ وہ دلوں میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے لہٰذا اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ فلاں شخص کیسا ہے، خدا کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں یہ لفظ جہاں خدا کی طرف منسوب ہو اس کا ترجمہ آزمائش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

بلا یا ابتلا کا قرآنی مفہوم

بَلَآءٌ ــــ اِبْتِلَآءٌ (مادہ ب۔ل۔و۔یا۔ب۔ل۔ی) اس مادہ کے دو معانی ہوتے ہیں (۱) کسی کے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (۲) کسی چیز کی اصلی حالت کا ظاہر ہونا یا ظاہر کرنا خواہ وہ اچھی ہو یا بُری۔ پہلے مفہوم کی رُو سے اِسے آزمائش کہا جائے گا، اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اس مفہوم کو خدا کی طرف کبھی منسوب نہیں

کرنا چاہیئے۔ دوسرے مفہوم (اصلیت یا حقیقت کے ظاہر ہو جانے) کے نظائر قرآن کریم میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ الطارق میں ہے: یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹) "جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ ہر راز بے نقاب ہو جائے گا"۔ سورۃ آلِ عمران میں منافقین کے سلسلے میں کہا گیا کہ جنگ کا حکم اس لئے بھی دیا جاتا ہے: وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ (۳/۱۵۳)۔ "تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو کر سامنے آ جائے"۔ سورۃ المومنون میں قومِ نوحؑ کی داستان بیان کرنے کے بعد کہا: وَاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ (۲۳/۳۰) "ہم اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو اس طرح ظاہر کرتے رہتے ہیں"۔

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ کشمکش میں زندگی کے مختلف پہلو بدل بدل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ کہیں مشقتوں کے ہمت آزما پہلو اور کہیں خوشگواریوں کے سکون افزا گوشے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان تغیراتِ احوال میں انسان کس قسم کے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے ـــــ وہ نامساعد حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرتا ہے یا راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ مساعد حالات میں وہ خدا فراموش ہو جاتا ہے یا اس کے قوانین کی اور بھی شدت سے اطاعت کرتا ہے۔ ان تغیرِ حالات میں انسانی ردِّ عمل کو ابتلاء سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ یعنی وہ مواقع جن میں انسانی کردار کی نمود ہو جائے۔ سورۃ الفجر میں ہے: فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ (۸۹/۱۵)۔ "جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ انہیں سرسری طور پر لیتا ہے اور تکلفاً کہہ دیتا ہے کہ بس یہ تو خدا کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے اس سے نواز دے"۔ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) "اور جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس کی کس غلط روش کا نتیجہ ہے۔ وہ چیخنے چلّانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ، ناحق، بلاسبب ذلیل و خوار کر دیا"۔ اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ ایسے شخص کا یہ ردِّ عمل غلط ہوتا ہے۔ یہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے، اور یہ تغیراتِ احوال انہی قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

ان نظائر سے واضح ہے کہ ابتلاء کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنا محاسبہ کرے کہ اس کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشو و نما ہو چکی ہے۔ زندگی کے اِس قسم کے (مساعد اور نامساعد) مواقع اس لئے پیش نہیں آتے کہ خدا انسان کو

محاسبۂ خویش

آزماتا ہے ـــــ یہ اس لئے پیش آتے ہیں کہ انسان خود اپنے آپ کو آزمائے۔ اپنی ذات کا ٹسٹ (TEST) کرے کہ وہ کس حد تک مستحکم ہو چکی ہے۔ ان معانی کی وضاحت کے لئے سورۃ الدھر

میں انسانی تخلیق کے سلسلے میں کہا: إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (۷۶/۲)۔ "ہم نے انسان کی پیدائش کی ابتدا ایک ملے جلے نطفہ سے کی اور ایسا انتظام کیا کہ رحمِ مادر میں اس کے مضمر جوہروں کی نمود ہوتی جائے تا آنکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے"۔ یہ ہے.... "اِبْتِلَاءٌ" کا صحیح نقشہ، یعنی مضمر جوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ ان کی نمود ہو جانا ـــ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اس کے لئے انسان کو کبھی نامساعد حالات میں سے گزرنا پڑتا ہے اور کبھی زندگی کی خوشگواریوں سے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۷/۱۶۸)۔ "انہیں زندگی کے مختلف حالات میں سے گزرنا پڑا ـــ یہ حالات کبھی خوشگوار تھے کبھی نامساعد ـــ مقصد اُن سے یہ تھا کہ وہ ہر حالت میں ہمارے قوانین کی طرف رجوع کریں"۔ دوسری جگہ زندگی کے خوشگوار پہلوؤں میں صحیح کردار کی نمود کو بَلَاءً حَسَنًا (۸/۱۷) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"بَلَاءٌ" کے اس مفہوم کی رو سے آیتِ زیرِ نظر میں جو کہا گیا ہے: وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ (۲/۴۹) تو اس میں بلاء کے صحیح معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ فرعون کا عذاب خدا کی طرف سے ایک آزمائش تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خدا کی طرف سے آزمائش کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ عذاب خدا کی طرف سے آزمائش تھی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا ایک طرف تو اس عذاب کی شکل میں انہیں آزما رہا تھا اور دوسری طرف اس نے اپنے ایک جلیل القدر پیغمبر کو بھیجا کہ وہ انہیں اس عذاب سے نجات دلائے۔ یہ تو متضاد باتیں ہوں گی۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے تمہیں فرعون کے عذاب سے جو نجات دلائی تو یہ چیز تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے ایک عظیم نعمت تھی۔ زندگی کا بڑا خوشگوار پہلو تھا کیونکہ اس سے تمہیں اپنی بازآفرینی کے مواقع حاصل ہو گئے (نیز دیکھئے ۷/۱۴۱؛ ۱۴/۶)۔ اصل یہ ہے کہ محکوم قوم کو آزادی مل جانا بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس سے اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم ان مواقع سے فائدہ کس طرح اٹھاتی ہے اور اس آزادی کے محاصل کو استعمال کس طرح کرتی ہے۔ یہ تھی بنی اسرائیل پر خدا کی پہلی نعمت۔

قومِ فرعون کے شکنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے پروگرام کی پہلی کڑی یہ تھی کہ اس قوم کو مصر کی سرزمین سے نکال کر سینا کی آزاد فضا میں بسا دیا جائے۔ یہ ہے وہ واقعہ، جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے

جس میں کہا گیا ہے کہ:

۲/۵۰ وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ۔

بات یوں ہوئی کہ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ (۲۶/۵۲)۔ "اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال کرلے جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ مرحلہ آسانی سے طے نہیں ہوجائے گا۔ فرعون تمہارا تعاقب کرے گا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر نکلے، اور جیسا کہ انہیں پہلے سے (WARN) کر دیا گیا تھا، فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ (۲۶/۶۰) "صبح ہوتے ہی فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔" اب اس منظر کو سامنے لائیے کہ قومِ بنی اسرائیل جب آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ سامنے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم جس کی ہمتوں کو صدیوں کی غلامی نے کچل کر رکھ دیا تھا، گھبرا اٹھی اور کہنے لگی کہ اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ (۲۶/۶۱) "ہم پکڑے گئے، ہم مارے گئے۔" اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے، اُس سکون اور اطمینان کے ساتھ، جو ان حضرات (علیہم السلام) کا خاصہ ہوتا ہے، ان سے کہا کہ كَلَّا ـــــ گھبراؤ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا: اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ (۲۶/۶۲)۔ "ہم تنہا نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً ہماری راہنمائی ایسے راستے کی طرف کر دے گا جس سے ہم صحیح وسلامت اپنے مستقر تک پہنچ جائیں۔"

آگے بڑھنے سے پہلے اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ (۲۶/۶۲) کے روح پرور اور اطمینان افزا ایمان کے اظہار پر غور فرمائیے۔ تاریخ کے اوراق کو، اس واقعہ کے بعد چند صدیاں آگے کی طرف اُلٹیے اور آجائیے اس غار کے دہانے پر، جس میں دو شخصیتیں دشمنوں سے اپنی حفاظت کے لئے چھپی بیٹھی ہیں۔ خدا نے ان دونوں کو ایک دوسرے کا دوست کہہ کر پکارا ہے۔ خطرہ کے احساس سے ایک دوست (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے چہرے پر، پریشانی کے کچھ آثار دیکھ کر ـــــ جو یقیناً اپنی حفاظت کے خیال سے نہیں بلکہ اس ساتھی کی حفاظت کے خیال سے لاحق ہوئی تھی۔ جو ... اپنی

غار کا ساتھی صدیقِ اکبرؓ

جان سے بھی زیادہ عزیز تھا ـــــ اس دوسرے دوست (حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم) نے دل کے پورے سکون اور طمانیت کے ساتھ فرمایا کہ: لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰)۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" یہاں غور کیجئے! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: اِنَّ مَعِىَ رَبِّىۡ (۲۶/۶۲) ـــــ "میرا رب میرے ساتھ ہے۔" انہوں نے اس میں اپنی قوم کو شامل نہیں کیا تھا کیونکہ اس قوم کا ہنوز خدا پر ایمان ایسا پختہ نہیں تھا۔ حضور نبی اکرمؐ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مَعَنَا کہا۔ یعنی اس میں اپنے دوست کو بھی شامل کر لیا کیونکہ اللہ پر اس کے ایمان کی پختگی میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس ضمنی نکتہ کے بعد آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ میرا رب اس راستے کی نشاندہی کر دے گا جہاں سے ہم بخیر و عافیت اپنے مستقر تک جا پہنچیں گے، تو خدا کی وہ رہنمائی کیا تھی اور اس کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح اپنی قوم کو لیکر بحفاظت آگے بڑھ گئے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں چند الفاظ ایسے آتے ہیں، جن کا مفہوم پہلے سمجھ لینا ضروری ہے

(۱) بحر۔ ہمارے ہاں، بحر سمندر کو کہتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں بحر، ہر اس مقام کو کہتے تھے جہاں بہت سا پانی جمع ہو، خواہ وہ نخلستانوں کے تالاب سے ہوں، خواہ دریا اور خواہ سمندر۔ وہ سب کے لئے یہی لفظ بولتے تھے۔ اسی ضمن میں دوسرا لفظ 'یم' بھی آیا ہے۔ (۲۸/۴)۔

(۲) فرق۔ اس کے معنی عام طور پر پھٹ جانا کئے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کے معنی ہوتے ہیں الگ ہو جانا، جدا ہو جانا، فاصلے پر ہو جانا۔

(۳) ضرب۔ یہ لفظ بڑا وسیع المعانی ہے۔ عام طور پر اس کے معنے مارنا کئے جاتے ہیں لیکن یہ لفظ راستہ طے کرنے یا سفر کرنے کے معانی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے: اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (۴/۹۴)۔ "جب تم اللہ کی راہ میں (جہاد کیلئے) نکلو"۔ سورۃ مائدہ میں ہے: اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (۵/۱۰۶)۔ "جب تم حالتِ سفر میں ہو"۔

(۴) عصا۔ (مادہ ع۔ ص۔ و) اس مادہ کے اصلی معنی اجتماع اور ائتلاف کے ہیں۔ یعنی اکٹھا ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا۔ لاٹھی کو اس لئے عصا کہتے ہیں کہ اسے پکڑنے لئے انگلیوں کو اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ العصا جماعت کو کہتے ہیں۔ شق العصا کے معنی ہیں جماعت میں افتراق پیدا کر دینا۔ نیز عصا کے معنی قوت اور ہر اس شے کے ہوتے ہیں جس پر سہارا کیا جائے۔

(۵) آل۔ (مادہ ا۔ و۔ ل) یہ لفظ اولاد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً آلِ یعقوب (۱۹/۶)۔ اور رفقا اور متبعین کے معانی میں بھی۔ جیسے آلِ فرعون (۲/۴۹)

سمندر کیسے پار کیا گیا تھا

ان مبادیات کے بعد آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لیکر سمندر کے کنارے

پہنچے تو آپ نے خدا کے حکم سے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری۔ سمندر کا پانی پھٹ کر الگ الگ شیشے کی دیواروں کی طرح، منجمد ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ ان دونوں دیواروں کے درمیانی راستہ سے سمندر پار کر کے صحرائے سینا میں جا پہنچے۔ تورات میں ایسا ہی آیا ہے، اور ہمارے ہاں یہ تصور وہیں سے لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی متعلقہ آیات پر غور کرنے سے حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (۲۶/۶۲) "میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً میری راہنمائی اس راستہ کی طرف کر دے گا جہاں سے ہم بعافیت سمندر کو عبور کر لیں گے"۔ خدا کی وحی نے اس راستہ کی نشاندہی کی تھی جہاں سے یہ سمندر کو بآسانی پار کر سکتے تھے۔ تورات ہمیں بتاتی ہے —— اور جغرافیہ سے بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ واقعہ بحیرہ قلزم (RED SEA) کا ہے۔ آپ ذرا نقشے پر نگاہ ڈالئے۔ بحیرۂ قلزم، بحر ہند سے الگ ہوکر، عرب اور مصر کو دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا بحر روم کی طرف بڑھتا گیا ہے۔ حتیٰ کہ آخر میں یہ دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ہم بحر روم کی طرف رُخ کئے ہوں تو بائیں طرف کی شاخ ذرا بڑی ہے۔ اب اُسے نہر سویز کے ذریعے بحر روم سے ملا دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نہر سویز موجود نہیں تھی۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان مثلث قطعہ میں سینا کی وادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔ بحیرہ قلزم کا یہ حصہ آج تو کافی گہرا ہے لیکن دنیا میں مرورِ زمانہ سے جو جغرافیائی تغیر و تبدل پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خشکیاں پانی میں اور پانی خشکیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق بحیرۂ قلزم، زمانہ قدیم میں متعدد جزیروں سے پٹا ہوا تھا اور قیاس ہے کہ اس کا آخری حصہ اس زمانے میں اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا آج کل ہے۔ اس لئے مد و جزر یا ہواؤں کے رُخ سے اس حصہ کا پانی پیچھے کی طرف ہٹ کر اسے پایاب بنا دیتا ہوگا۔ اس سلسلے میں دو مزید باتیں قابلِ غور ہیں۔ تورات میں سمندر پھٹ جانے کا بھی ذکر ہے لیکن، اس کے ساتھ ہی وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ :-

> خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک بنا دیا اور پانی دو حصے ہوگیا۔ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ سے خشک زمین پر چل نکلے۔ (خروج باب ۱۴۔ آیات ۲۲ - ۲۱)

—— دوسری بات یہ کہ ۱۹۶۲ء میں یہودیوں کی طرف سے تورات کا جو ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے سمندر کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت

سے اسے (SEA OF REEDS) کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز سے قریب واقع تھا۔ یہ اعلان امریکہ کی (JEWISH PUBLICATION SOCIETY) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر (LISSER ZUSSMAN) کی طرف سے کیا گیا تھا۔

ان تصریحات کے بعد قرآن مجید کی طرف آئیے۔ سورۃ الشعراء میں کہا گیا ہے: فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی اور کہا کہ تو اپنی لاٹھی سمندر پر مار"۔ لیکن، جیسا کہ ہم ان الفاظ کے معانی سے واضح کر چکے ہیں، ضَرَبَ کے معنی راستہ چلنے کے ہیں اور عصا کے معنی جماعت یا قوم کے۔ لہٰذا ان الفاظ کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو اپنی قوم کو لے کر اس سمت سے سمندر کی طرف جا، جس کی بذریعہ وحی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ "اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لو اور اس سمت سے سمندر کی طرف جاؤ جہاں سے پانی خشک ہو چکا ہے"۔ وہاں کا پانی خشک کس طرح ہوا تھا، اس کے متعلق دوسری جگہ کہا۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴/۲۴)۔ "رَهْوًا" کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) سکون، جس میں جوش و خروش نہ ہو۔ اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست۔ سمندر کے پرسکون ہونے کے معنے تو یہ ہیں کہ وہاں اس کا جوش و خروش نہیں ہوگا۔ باقی رہا پانی کے نیچے کی زمین کا کبھی ابھرآنا اور کبھی پست ہو جانا، تو اسے سمجھنے کے لئے آپ سمندر کے کنارے (BEACH) کو سامنے لائیے اور اس کے ساتھ مد و جزر کو۔ مد کے وقت سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ آتا ہے۔ اسے اہل لغت نے زمین کے پست ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور جب اس میں جزر آتا ہے تو پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے اور وہی زمین ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس لفظ (رَهْوًا) کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے دو الفاظ (رَهْوًا اور يَبَسًا) سے کس طرح ساری بات واضح کر دی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی اس مقام کی طرف کی گئی تھی جہاں پانی کی گہرائی بہت کم تھی۔ —— اتنی کم کہ، سمندر کے جزر کے وقت وہ حصہ خشک ہو جاتا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو سمندر میں جزر تھا اس لئے وہ اپنی قوم کو لے کر بحیرۂ قلزم کی اس شاخ کو عبور کر کے سامنے خشکی پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد آلِ فرعون وہاں آئے تو سمندر کو خشک دیکھ کر اس میں اتر گئے۔ لیکن اتنے میں سمندر میں مد شروع ہو گیا اور وہ غرق ہو گئے۔

ان مفاہیم کی روشنی میں اب پوری متعلقہ آیت دیکھئے۔ سورۃ البقرۃ کی زیر نظر آیت میں ہے: وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۲/۵۰)۔ "اور ہم نے

سمندر کے پانی کو فاصلے پر کر دیا اور تمہیں بعافیت پار لگا دیا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو گئے اور تم اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔" آیات (۱۳۹-۱۴۰) (۹/۱۰) میں وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ آیا ہے۔ یعنی "ہم نے اس طرح بنی اسرائیل کو سمندر عبور کرا دیا"۔ یہ منظر کہ (سمندر میں اترنے سے پہلے) اہل فرعون کا گروہ ایک طرف کھڑا تھا اور بنی اسرائیل کا گروہ دوسری طرف کی خشکی پر۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (۲۶/۶۳)۔" اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کو اس راستہ سے سمندر کی طرف لے چلو جسکی ہم نے نشاندہی کی ہے وہ سمندر کے دوسری طرف خشکی پر کھڑے ہو گئے۔ ادھر قوم فرعون کے لوگ آ گئے۔ دونوں کے درمیان سمندر کا وہ حصہ حائل تھا جہاں سے بنی اسرائیل گزرے تھے۔ اس طرح یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے یوں کھڑے تھے جیسے ریت کے تودے ہوں"۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ (۲۰/۷۷)۔" اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لے جا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح تمہیں نہ تو تعاقب کرنے والوں سے کوئی خدشہ ہو گا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا ڈر"۔ اور سلسلے کی آخری آیت ہے: وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ (۴۴/۲۴)۔ "اور ہم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ) تم تو سمندر کو پُر سکون حالت میں چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرعون کا لشکر اس میں غرق ہو جائے گا۔

یہ ہے بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے اور فرعون کے غرق ہو جانے کا واقعہ۔

اس واقعہ کا تذکرہ تو یہاں ختم ہو گیا لیکن اس میں دو امور اور وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ سورۃ یونس میں ہے:-

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُۥ بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ ءَامَنتُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِيٓ ءَامَنَتْ بِهِۦ بَنُوٓا إِسْرَآئِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۹۰/۱۰)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو جا دبوچیں اور انہیں پھر اپنے شکنجۂ استبداد میں جکڑ لیں لیکن اتنے میں پانی چڑھ آیا۔ جب فرعون نے دیکھا کہ وہ غرق ہونے لگا ہے تو پکار اٹھا کہ میں اس خدا پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور اعلان کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار

نہیں اور اس طرح میں بھی اس کے فرمانبردار بندوں میں شامل ہو جاتا ہوں۔[1]

فرعون کا ایمان

فرعون کے اس اعلان پر، عام انسانوں کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا ہوگا کہ اس پر بارگاہِ خداوندی سے تحسین و تبریک کے ڈونگرے برسائے گئے ہوں گے اور ملائکہ نے جوشِ مسرت سے نعرے بلند کئے ہوں گے لیکن قرآن کچھ اور کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرعون کے اس اعلان پر بارگاہِ خداوندی سے جواب ملا کہ:

آٰلْـٰٔنَ۔ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (۱۰/۹۱)

ہاں! تو اب ایمان لایا۔ حالانکہ اس سے پہلے تو نے ساری عمر سرکشی اختیار کئے رکھی اور مسلسل فساد برپا کرتا رہا۔ اب تیرا یہ ایمان ہماری میزان میں پرِ کاہ جتنا وزن بھی نہیں رکھتا۔

آپ اس جواب پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ذہنِ انسانی میں ابھرنے والے خیال اور قانونِ مکافاتِ عمل کے مالک خدا کے جواب میں کس قدر اصولی فرق ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ صداقت کے اقرار او اعلان کا نام ہوتا ہے جس کا محرک جذبہ دفعِ مضرت ہوتا ہے نہ جلبِ منفعت۔ وہ ہر قسم کے خطرات سے بے نیاز ہو کر کیا جاتا ہے۔ اس ایمان کا اعلان، استحکامِ خودی کی دلیل ہوتا ہے۔ لیکن جو ایمان، موت کے ڈر یا کسی اور خوف کی وجہ سے لایا جائے وہ نہ صرف یہ کہ، ایمان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ اس ایمان لانے والے کی بزدلی (ضعفِ خودی) کی دلیل ہوتا ہے۔ ایسا شخص درحقیقت، خطرہ یا موت سے بچنے کے لئے ایمان کو اپنی سپر بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے اعلان کو اس شخص کے منہ پر یہ کہکر مارا جاتا ہے کہ:-

در کفر ہم پختہ نہ زنّار را رسوا مکن

اس ایمان سے تو وہ کفر ہزار درجہ بہتر ہے، جس پر انسان مصائب و خطرات کے باوجود قائم رہے۔ اس سے اس

---

[1] اس واقعہ کے سلسلہ میں ہماری کتبِ روایات کا بیان بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:-

حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی خبر دیتے وقت جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ کاش کہ آپ اس وقت ہوتے اور دیکھتے کہ میں اس کے (فرعون کے) منہ میں کیچڑ ٹھونس رہا تھا اس خیال سے کہ کہیں اس کی بات پوری ہونے پر رحمتِ خدا اس کی دستگیری نہ کرے۔

(ابن کثیر۔ گیارھواں پارہ ص ۵۲)

شخص کی پختگیٔ کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا کفر اس کی فکری غلطی یا تقلید کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:-

وفاداری، بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے ؛ مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

فرعون کے اس ایمان کے مقابلے میں، اسی کے دربار کے ساحرین کے ایمان کو سامنے لائیے، ضعف اور استحکامِ خودی کا تقابل اُبھر کر سامنے آجائے گا۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے مملکت کے بڑے بڑے منتریوں اور پجاریوں کو بلایا تھا۔ اس کے لئے اس نے ایک بہت بڑے دنگل کا سا اہتمام کیا تھا۔ اس مقابلہ کی ہار جیت سے فرعون کا مستقبل وابستہ تھا۔ یہ اس کی "انا" کا بھی سوال تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ مقابلہ کس قدر اہمیت کا حامل تھا۔ مقابلہ ہوا تو ان منتریوں نے حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش کردہ حقائق کو علی وجہ البصیرت دیکھ لیا اور اس کے بعد وہ بے اختیار

ساحرینِ دربارِ فرعون کا ایمان

پکار اُٹھے کہ: اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ (۷/۱۲۱-۱۲۲)۔ "ہم نے خدائے ربّ العالمین، ربّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئے"۔ آپ سوچئے کہ اس سے فرعون کے دل و دماغ کی حالت کیا ہوگی! شکست اور ایسی رسوا کن شکست! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت!! وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا، کف بردہاں سیلاب کی طرح اُمڈا اور کہا اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۷/۱۲۳)۔ "ہیں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھ سے اجازت لئے بغیر خدائے موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کوئی خفیہ سازش ہے جو تم نے مل کر دارالسلطنت میں کی ہے تاکہ تم اس ملک کے باشندوں کو یہاں سے نکال باہر کرو اور اس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کرلو۔ میں تمہیں ابھی اس کا مزہ چکھاؤں گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ فرعون کے خلاف سرکشی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے"۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ (۷/۱۲۴)۔ "میں پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا"۔

جور و استبداد کی ان قہرمانی بجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ساحرین کے کوہ تمثال عزم و ایمان کی تجلیات کا منظر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے نہایت سکون و ثبات سے فرعون کی اس گرج کو سنا۔ ایک تبسم زیرلبی سے اس کی طرف نگہ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس صداقت کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کیا ہم تمہارے ڈر سے یا موت سے بچنے کے لئے اس کی تکذیب کر دیں؟ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ

اَلْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا (۲۰/۷۲)" جس خدا نے ہمیں پیدا کیا اور جو کچھ دلائل وبصیرت کی بنا پر ہمارے سامنے آگیا، ہم اس پر تجھے کبھی ترجیح نہیں دے سکتے۔ تیری دھمکیاں اور تخویف وترہیب کی شعلہ باریاں ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔" فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲)" جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر ڈال، جو تیرے جی میں آئے کر گزر، تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ اسی طبیعی زندگی تک ہمارے گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ تیرے اقتدار کی حدود اسی دنیا تک ہیں اور خدا کی مملکت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔" اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا .... (۲۰/۷۲)" تیرا فیصلہ اسی زندگی تک محدود ہے اور زندگی تو اس سے کہیں آگے جاتی ہے۔ وہاں تیرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔"

یہ تھا وہ ایمان، جو... زمین وآسمان کو وجد میں لے آتا ہے اور اس پر خدا اور اس کے ملائکہ تبریک وتہنیت کے پھول برساتے ہیں۔ (۳۲/۴۴)۔ ایک طرف اس حق گوئی وبیباکی کو دیکھئے اور دوسری طرف فرعون کی پستیٔ کردار کو، جس نے موت سے بچنے کے لئے ایمان کی آڑ لینا چاہی۔[1]

علاوہ بریں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے کہا جا سکتا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اُسے بہرحال قبول کر لینا چاہیئے خواہ اس کا اعلان کسی وقت بھی کیوں نہ ہو۔ ایسا کہنے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ توبہ کسے کہتے ہیں اور اس کی قبولیت کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ توبہ کے دو اجزاء لاینفک یا باہمدگر پیوست ہیں۔ آپ سے کوئی غلطی ہو گئی۔ اس سے کچھ نقصان واقع ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

توبہ کا مفہوم

اس احساس کو توبہ کہتے ہیں۔ لیکن اتنے سے تو اس نقصان کا ازالہ نہیں ہو جاتا جو اُس غلطی کی وجہ سے لاحق ہوا تھا۔ اس کے لئے تو آپ کو ایسے کام کرنے ہوں گے جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔ یہ اس پروگرام کا دوسرا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ تَابَ کے ساتھ اَصْلَحَ کا اضافہ کیا ہے۔[2] اب اگر ایسا ہو کہ آپ کو اپنی خطا کا احساس اس وقت ہو جب آپ کے لئے کچھ کرنے کا وقت ہی نہ رہے تو یہ احساس کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں کر سکے گا۔ بالفاظِ دیگر، یہ کہا جائے گا کہ آپ کی توبہ کی قبولیت کا وقت گزر چکا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ النساء میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے وَلَیْسَتِ

---

[1] اس مقام پر ہم نے ساحرین کے اس واقعہ کو اختصاراً بیان کیا ہے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

[2] اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اول صفحات ۲۷ — ۲۶ پر گزر چکی ہے۔

التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (۴/۱۸) "ان لوگوں کی توبہ، توبہ ہی نہیں جو ساری عمر برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں" قرآن کریم نے اسی لئے ایسے توبہ تسلیم نہیں کیا کہ اس کے بعد عمل کے لئے وقت ہی باقی نہیں رہا تھا جس سے تلافیٔ مافات ہو سکتی۔ یہی الفاظ فرعون کے قصے میں بھی کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ یہ جواب خدا کی طرف سے ملا تھا جو دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہے۔

اس قصہ میں دوسری قابل ذکر بات وہ ہے جس کا تذکرہ، قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے:-

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰/۹۲)

(فرعون کی غرقابی کے وقت ہم نے اس سے کہا کہ) آج ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندر کی موجوں سے بچالیں گے تاکہ، یہ ان لوگوں کے لئے، جو تیرے بعد آنے والے ہیں، حقیقت کی نشانی بن جائے ـــــ اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔

فرعون کی لاش

اس آیت کا صحیح مفہوم، ایک عرصہ تک مرکزِ بحث و نظر بنا رہا۔ اس لئے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فرعون کی لاش کو آنے والوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا گیا تھا۔ چونکہ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی اس لئے اس سلسلہ میں عجیب و غریب افسانے وجود میں آگئے (جو ہماری کتب تفاسیر میں موجود ہیں لیکن جن کا ذکر کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے)۔ تاآنکہ اٹھارویں صدی عیسوی میں، مصر کے تہہ خانوں سے ان کے قدیم بادشاہوں کی ممی شدہ لاشیں برآمد ہونا شروع ہوئیں جن میں سے ایک کے متعلق علمائے مصریات کی تحقیق ہے کہ وہ فرعون موسیٰ (ریمیسس ثانی) کی لاش ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس تحقیق کی روشنی میں قرآن مجید کی اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے آگیا۔ قرآن کریم کے حقائق و غوامض کا وہ حصہ، جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے، علم و تحقیق کی روشنی میں ہی صحیح طور پر سامنے آسکتا ہے۔ زمانہ من حیث الکل علمی تحقیقات کی رو سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ جوں جوں ان تحقیقات میں اضافہ ہوتا جائے گا (

وہ قیاس سے آگے بڑھ کر یقین کے درجہ تک پہنچتی جائیں گی، قرآنِ کریم کے معارف، رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآنِ کریم کے معارف، رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے اور اس طرح وہ آیات، جو پہلے متشابہات میں داخل تھیں — (یعنی انہیں تشبیہاً بیان کیا گیا تھا) — رفتہ رفتہ محکمات کے ذیل میں آتی جائیں گی (۳/۷)۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ "یہاں تک کہ یہ حقیقت مسلمہ طور سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ مبنی بر صداقت ہے"۔

اس طرح، بنی اسرائیل کو، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں اہلِ مصر کے عذاب سے نجات ملی اور فرعون مع اپنے جنود و عساکر کے غرقِ دریا ہوگیا۔ بنی اسرائیل اس کے بعد سینا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہوگئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور اسی زندگی کا ایک واقعہ اس اگلی آیت میں مذکور ہے، جو یوں ہے:

۲/۵۱ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل، مصر میں قریب چار سو سال تک رہے۔ اگرچہ وہ رہے تو محکومیت کی حالت میں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رکھا — یا یوں کہیے کہ حاکم قوم نے انہیں اپنے سے الگ رکھا اور اس طرح ان کا جداگانہ وجود برقرار رہا — ان کا جداگانہ وجود تو برقرار رہا لیکن، جیسا کہ خوئے غلامی کا تقاضہ ہوتا ہے، انہوں نے حاکم قوم کے انداز زیست ہی کو نہیں بلکہ ان کے عقائد و نظریات تک کو غیر شعوری طور پر اپنا لیا اور وہ ان کے قلب کی گہرائیوں تک میں اس طرح پیوست ہوگئے کہ خدا کے دو اولوالعزم پیغمبروں — حضرتِ موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کی تعلیم و تربیت کے باوجود ان کے نقوش نہ مٹ سکے۔

بت سازی کی فرمائش

مصری بت پرست تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی بت پرستی اپنا شعار بنا لیا تھا۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ: وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷/۱۳۸)۔ "اور جب بنی اسرائیل سمندر پار اتر گئے تو وہاں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کی مجاور بنی بیٹھی تھی۔ بنی اسرائیل نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسا ان لوگوں کا معبود ہے"۔ اس فرمائش پر حضرت موسیٰؑ کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ لگایا

جا سکتا ہے لیکن ایسے لوگوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جاتا کہ: قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (۷/۱۳۸)" واقعہ یہ ہے کہ تم بڑی ہی جاہل قوم ہو" کم بختو! تمہیں ابھی تک یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور مآل کیا: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۳۹)" یہ لوگ جس طریق پر چل رہے ہیں وہ تباہ ہو کر رہے گا اور انہوں نے جو عمل اختیار کر رکھا ہے وہ یکسر باطل ہے" اللہ تعالیٰ تمہیں اقوام عالم پر فضیلت عطا فرمانا چاہتا ہے اور تم ہو کہ، انسان تو ایک طرف پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی آرزو دل میں لئے بیٹھے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی: اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۷/۱۴۰)" کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے خدا کے سوا، کوئی اور الٰہ تجویز کر دوں حالانکہ اس نے تمہیں اقوام عالم پر فضیلت عطا فرمائی ہے"۔ تف ہے تم پر اور تمہاری ذہنیت پر — لیکن غلامی سے مسخ شدہ ذہنیت سے اس کے سوا اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی؟

بہ خود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے　　ہزاراں سال منزل در مقام آذری کردہ

بہرحال، حضرت موسیٰ علیہ السلام، انہیں لے کر آگے بڑھ گئے۔ طور کے دامن میں ڈیرے ڈال دیئے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ وقت کے لئے ان سے الگ ہونا پڑا۔ آیت (۲/۵۱) میں اسے چالیس راتوں کی مدت کہا گیا ہے اور آیت (۷/۱۴۲) میں، اس مدت کو، "تیس جمع دس راتیں" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میرے بعد، تم میری جانشینی کرنا اور معاملات کو بالکل ٹھیک ٹھاک رکھنا۔ ان میں کچھ مفسدین بھی ہیں اُن کا خاص خیال رکھنا (۷/۱۴۲)

لیکن ان کی غیر حاضری میں، بنی اسرائیل نے ایک بت کی پرستش شروع کر دی جس کی شباہت گائے کے بچھڑے (عجل — گوسالہ) کی سی تھی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند الفاظ کا تفصیلی مفہوم بیان کر دیا جائے جنہیں اس واقعہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے اس لفظ عِجْلٌ (بچھڑے) کو لیجئے۔

سورۃ التوبہ میں ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ (۹/۳۰)۔ "یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے"۔

عُزَیر کون تھا

ہمارے ہاں عام طور پر عزیر سے مراد، عزرا فقیہہ لئے جاتے ہیں جن کا ذکر تورات کی تدوین کے سلسلے میں تیسرے باب میں آچکا ہے۔ لیکن یہود کا کہنا ہے کہ ہم نہ تو عزرا فقیہہ کو عزیر کہتے ہیں اور نہ ہی ہم انہیں (یا کسی عزیر) کو ابن اللہ مانتے ہیں۔ ہماری بعض روایات میں ہے کہ

نزولِ قرآن کے زمانے میں، مدینہ میں کچھ یہودی تھے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ امام ابنِ حزم نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا صُدوقی فرقہ جو یمن میں رہتا تھا اس کا یہ عقیدہ تھا۔ لیکن یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ روایات ان کے لئے سند قرار ہی نہیں پا سکتیں۔

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآنِ کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ابن اللہ مانتے تھے اس سے مراد عذرا فقیہہ نہیں بلکہ مصر کا "عزیر دیوتا" ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ہیروڈوٹس نے، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام (OSIRIS) یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد "س" زائد ہوتی ہے۔

اس صورت میں، اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام "ایزاری" آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سانڈ بیل پوجا جاتا تھا اس کا نام "ایزار ہاپی"— یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور "فتاح" یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی (اس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ یربعام اول (۹۳۳ ق.م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود ہے لیکن (غلطی سے) لفظِ عزیر کو "اسیر" سمجھ کر اس کا ترجمہ "قیدی" کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔

مصر کے آثارِ قدیمہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ "آمن رع" کی نسل سے، اور خداوندِ ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے اب ایک صحیفہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں۔

---

۵۵ بحوالہ ارض القرآن از سید سلیمان ندوی۔

اِن تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عذرا نبی۔ بہرحال، یہ تاریخی قیاسات ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات، حقیقت کو حتم ویقین کے ساتھ بے نقاب کردیں۔ [1]

قرآن کریم میں ہے کہ سامری نے اِس بت کو ڈھالا تھا اور اسی کی ترغیب وتلقین پر بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔

سامری

اَلسَّامِرَةُ ـــ اَلسَّمَرَةُ ـ یہودیوں کی ایک قوم، جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیز یہ چھوت چھات کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں۔ کوشان اور دوشان۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی۔ صاحب محیط نے کہا ہے۔ کہ اَلسَّامِرَةُ فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی، جو نابلس میں رہتا ہے۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اِن کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھو جانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ آیت (۲۰/۹۵) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا، ایسا ہی کچھ آیا ہے۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رُخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا) حضرت مسیح علیہ السلام سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قوم، جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہوچکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سامری کہہ کر پکارا ہے ۲۰/۸۵) مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معتقد ہوگیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی۔ (۲۰/۹۶)۔

لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ مادہ (س۔م۔ر) سے ہے یا یوں کہیئے کہ عربوں نے سامری سے اس مادہ کے مختلف معانی وضع کئے۔ اَلسَّمَرُ کے معنی ہیں رات میں قصے کہانیاں کہنا۔ اَلسَّامِرُ، شب میں قصہ گوئی کی محفل، نیز قصہ گو۔ اَلسَّمِيْرُ، قصہ گو، داستان زن ـــ کہانیاں کہنے والے۔ جس طرح قوموں کو گمراہ اور

---

[1] بحوالہ لغات القرآن۔ لفظ عزیر۔

برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر قصّوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو دین سے دور ہٹتے گئے۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے

داستان گو۔ واعظ

ہاں دین، نام ہی چند قصّوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے بالکل اجنبی اور نامانوس نظریات قرار پا چکے ہیں۔ ہمارا واعظ داستان گو ہوتا ہے۔ دین کے اس طرح داستانوں میں تبدیل ہو جانے کے سلسلے میں اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستان کیلئے

بہر حال، السّامری، سمیری قوم کا فرد ہو یا خود بنی اسرائیل میں کا کوئی داستان گو، بات وہیں آ جاتی ہے — اس نے دینِ خداوندی کو افسانہ بنا دیا۔

سامری کے قصّے میں ایک لفظ اثر بھی آتا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنے نقش یا نشان کے ہیں اور اسی نہج سے یہ لفظ نقشِ قدم یا کسی کی تعلیم یا مسلک کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت (۲۰/۸۴) میں اس کے یہ معنی واضح ہیں۔ "زیبِ داستان" کے لئے اسے کیا معنٰی پہنائے گئے، اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

اب آیئے قرآن کریم میں بیان کردہ قصّہ "گوسالہ پرستی اور سامری کی طرف۔ اسے سورۃ طٰہٰ اور سورۃ الاعراف میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم سے الگ ہو کر گئے تو اللہ تعالیٰ

گوسالہ پرستی کا واقعہ

نے ان سے کہا کہ: وَمَآ أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَـٰمُوسَىٰ (۲۰/۸۳) "اے موسیٰ! تمہیں کون سی ایسی جلدی پڑی تھی کہ قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر چلا آیا؟"

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اس میں حرج کی کوئی بات نہیں۔ هُمْ أُو۟لَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِى (۲۰/۸۴) "وہ میرے پیچھے، میرے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ میری تعلیم پر عمل پیرا ہیں میرے مسلک کا اتباع کر رہے ہیں" اس لئے میری وقتی عدم موجودگی سے کیا نقصان واقع ہو سکتا ہے؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنۢ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِىُّ (۲۰/۸۵)۔ "تو نے تو اپنی قوم کے متعلق یہ اندازہ کیا لیکن ہوا یہ ہے کہ تیری عدم موجودگی میں وہ ایک عجیب فتنے کا شکار ہو گئی ہے۔ سامری نے اُسے گمراہ کر دیا ہے۔" یہ سن کر فَرَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوْمِهِۦ غَضْبَـٰنَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَـٰقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ ٱلْعَهْدُ أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِى (۲۰/۸۶)۔ "موسیٰؑ غصہ اور تاسف سے ملے جلے جذبات کے ساتھ قوم کی طرف لوٹا اور اُن سے کہا کہ یہ تم نے کیا

گُل کھلایا؟ کیا تمہارے رب نے تم سے زندگی کی خوشگواریوں کے وعدے نہیں کئے تھے؟ یا کیا ان وعدوں کے پورا ہونے میں کوئی لمبا عرصہ لگ گیا تھا جو تم خدا سے نا امید ہوگئے اور اس کی جگہ اور معبود تراش لیا۔ یا کیا تم ادھار کھائے بیٹھے ہو کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کر رہے، اس لئے تم نے یوں عہد شکنی کی ہے"۔ انہوں نے جواب دیا: قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا (۲۰/۸۷)۔ "ہم نے جان بوجھ کر، بطیبِ خاطر، اپنی مرضی سے عہد شکنی نہیں کی بلکہ معاملہ دوسرا پیش آگیا۔ مصری قوم کی دیکھا دیکھی ہم نے زینت و زیبائش کے لئے جو زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرائی زندگی میں، ہم پر مفت کا بوجھ بن رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس بارِ گوش اور وبالِ دوش کو اتار پھینکا۔ یہ خیال سامری نے ہمارے دل میں ڈالا تھا"۔ فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (۲۰/۸۷-۸۸)۔ "سامری نے ان زیورات کو لیا اور انہیں گلا کر ایک بچھڑا سا بنا دیا۔ وہ تھا تو محض ایک بے جان دھڑ، لیکن سامری نے اسے ایسا بنایا (یعنی اس میں کوئی کل رکھدی جس سے) اس میں سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ یہ دیکھ لوگ پکار اٹھے کہ یہ ہمارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی۔ لیکن یہ کچھ کرتے وقت سامری اس بات کو بھول گیا کہ موسیٰ آکر کیا کہے گا"۔ وہ سامری بھولا تھا یا نہیں، لیکن اگر یہ قوم ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتی تو ان پر اس بچھڑے کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (۲۰/۸۹)۔ "کیا انہیں نظر نہیں آتا تھا کہ بچھڑے میں سے ایک آواز تو نکلتی ہے لیکن وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی ان کے لئے کسی نفع یا نقصان کی قدرت رکھتا ہے"۔ علاوہ ازیں۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (۲۰/۹۰)۔ "ہارون نے انہیں پہلے ہی سے کہہ دیا تھا کہ لوگو! یہ شخص تمہیں سخت گمراہی میں مبتلا کر رہا ہے۔ تمہارا رب یہ بچھڑا نہیں، خدائے رحمٰن ہے لہٰذا تم اس گمراہ کرنے والے کی بات مت سنو۔ میری پیروی کرو اور جو کچھ میں تم سے کہوں اس کی اطاعت کرو"۔ لیکن۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (۲۰/۹۱)۔ "انہوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم اس کی پرستش سے باز نہیں آئیں گے۔ جب موسیٰ آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ کیا کہتا ہے"۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے روئے سخن اپنے بھائی کی طرف پھیرا اور ان سے کہا۔ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۔ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۔ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ (۲۰/۹۲-۹۳)۔ "اے میرے بھائی! جب تو نے دیکھا تھا کہ قوم یوں گمراہ ہو رہی ہے تو تو نے انہیں سختی سے روکا کیوں نہیں؟ تو نے وہی کچھ کیوں نہ کیا، جو ایسے وقت میں کیا کرتا ہوں۔ وہ کونسی بات تھی جو تجھے ایسا

کرنے میں مانع ہوتی۔ یا تو نے بھی دیدہ دانستہ مجھ سے سرکشی برتی"۔ اس کے جواب میں حضرت ہارون علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا وہ ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ آپ نے کہا: قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۲۰/۹۴)۔ "اے میرے ماں جائے! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو اور مجھے ہدفِ ملامت نہ بنا (۷/۱۵۰)۔ میں نے انہیں سختی سے اس لئے نہیں روکا کہ مجھے ڈر تھا کہ تو آکر یہ نہ کہے کہ تو نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا۔ میں نے قوم کی اس عارضی جہالت کو گوارا کر لیا لیکن اسے تفرقہ سے بچالیا"۔ اس جواب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہو گئے۔ واضح رہے کہ یہ جواب دینے والا بھی خدا کا ایک رسول تھا اور اس سے مطمئن ہو جانے والا بھی رسول۔

شرک اور تفرقہ

ذرا اس جواب پر غور فرمائیے۔ قوم میں تشتت و افتراق اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے اس سے بچانے کے لئے عارضی شرک تک کو گوارا کر لیا گیا۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے بت پرستی بھی شرک ہے اور تفرقہ بھی شرک۔ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ بنی اسرائیل کی بت پرستی جہالت کا نتیجہ تھی جس کا ازالہ باآسانی ہو سکتا تھا۔ لیکن قوم میں تفرقہ مستقل فساد کا موجب بن جاتا ہے اور اس کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام نے اس بڑے نقصان کے مقابلے میں، کم نقصان والے شرک کو گوارا کر لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مطمئن ہو گئے۔ لیکن ہمارے ہاں، حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مسلمانوں میں مستقل فرقے موجود ہیں۔ اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان فرقوں کے گروہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچا جاتا کہ قرآن کریم بہ نصِ صریح، فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ زمانے کے تقاضوں سے یہ امید بندھ چلی تھی کہ شاید یہ امت فرقہ بندی کے اس شرک سے تائب ہو کر پھر سے اُمتِ واحدہ بن جائے۔ لیکن ابلیس نے ان کے کان میں یہ سحر پھونک دیا کہ تمہارے فرقے، وہ فرقے نہیں، جنہیں قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہ "مکاتبِ فکر" ہیں۔ اس نے الفاظ کے ذرا سے پھیر سے اس شرک کی گرہیں اور مضبوط کر دیں۔

فرقے نہیں مکاتبِ فکر

لیکن الفاظ کے بدل جانے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ سنکھیا تو سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اس کا نام سم الفار کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ ان سے پوچھئے کہ اگر یہ فرقے نہیں مکاتبِ فکر ہیں تو رسول اللہ نے جو فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے (اور اس حدیث کو آپ صحیح مانتے ہیں) تو وہ فرقے کہاں ہیں؟۔

بہر حال، اب پھر قصۂ سامری کی طرف لوٹئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ فَمَا خَطْبُكَ يَسَامِرِيُّ (۲۰/۹۵)

"تم پر کیا بنی تھی جو تم نے یہ کچھ کر دیا۔" اس نے جواب دیا: بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ۔ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ۔ فَنَبَذْتُهَا۔ وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (۲۰/۹۶)۔" میں، جب اِدھر تمہاری قوم کی طرف آیا ہوں تو میں نے وہ کچھ بھانپ لیا تھا جو ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے آپ کے مسلک و مشرب کو پوری طرح اختیار نہیں کیا تھا۔ اس میں سے بس تھوڑا سا حصہ لیا تھا اور محض اپنے مقاصد کی خاطر تمہارے پیروؤں میں شامل ہو گیا تھا۔ تمہاری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے دل نے یہ نقشہ میرے سامنے پیش کر دیا جو مجھے بڑا جاذب نظر آیا۔ چنانچہ میں نے تمہاری تعلیم کا وہ تھوڑا سا حصہ بھی، جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ بیکار سمجھ کر اٹھا کر پھینک دیا اور تمہاری قوم کو پھر بت پرستی کی طرف لے آیا۔ بت پرستی کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں میں مچل رہا تھا۔ میں نے اسے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب میں نے انہیں ذرا سی ترغیب دلائی تو وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے اس کی طرف لپک کر آ گئے۔" آپ نے غور فرمایا کہ عقائد، خواہ وہ کتنے ہی باطل اور مبنی بر جہالت کیوں نہ ہوں، کس طرح انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذروں میں حلول کئے ہوتے ہیں اور انہیں بدلنے کے لئے کس قدر صبر آزما ہمت اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔

سامری نے جو جواب دیا اُسے آپ نے قرآن کریم کے الفاظ میں سن لیا۔ بات کس قدر صاف اور واضح تھی۔ لیکن آپ دیکھئے کہ سامریت (زیب داستاں) کے لئے ہمارے ہاں کے واعظوں نے اس میں کس کس قسم کے افسانوی اضافے کئے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (جس کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا ہے) میں کہا گیا ہے کہ جب فرعون

افسانہ نگاری

اپنے لشکروں سمیت، سمندر کے کنارے آیا تو اس کا گھوڑا پانی میں اترنا نہیں چاہتا تھا۔

> اُسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار آ گئے۔ ان کے جانور کے پیچھے فرعون کا گھوڑا لگ گیا۔ آپ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کا گھوڑا اُسے کچلتا ہوا دریا میں اُتر گیا۔ حضرت میکائیل علیہ السلام اس گروہ کے پیچھے تھے تاکہ ان کے جانوروں کو ہنکائیں۔ [۵۱]

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ یہ تو نے کیا کیا اور اس بے جان جسد سے یہ آواز کیسے آنے لگ گئی تو اس نے کہا کہ:

> جب فرعون کی ہلاکت کے لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے تو میں نے ان کے گھوڑے کے ٹاپ تلے کی تھوڑی سی مٹی اٹھالی تھی (بس یہ اس کا کرشمہ تھا)۔ [۵۲]

---

[۵۱] تفسیر ابن کثیر اردو ترجمہ گیارہواں پارہ صہ ۵۲

[۵۲] ایضاً " " سولہواں پارہ صہ ۲۷

ہے نا یکسر قصہ گوئی!

یہ ہے گوسالہ پرستی کا واقعہ۔ سورۃ طٰہٰ کے علاوہ، یہ سورۃ الاعراف آیات (۷/۱۴۸-۱۵۱) میں بھی آیا ہے۔ ضمناً یہ دیکھئے کہ، اسی واقعہ کو، جسے قرآنِ کریم نے اس طرح بیان کیا ہے، بائبل کس طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

تورات کا بیان

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اُترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا کہ اُٹھ! ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے۔ کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم اسے نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہارے بیٹوں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے زیور جو اُن کے کانوں میں تھے، توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکے ہتھیار سے درست کی اور ان سے کہا کہ اے اسرائیل! یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ اور جب ہارون نے دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی۔ اور ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گزرانیں۔ اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اُٹھے۔

(خروج ۳۲/۱-۶)

آپ نے دیکھا کہ غیر محرف کتابِ خداوندی (قرآنِ کریم) اور محرف کتابوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ بُت حضرتِ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا اور انہوں نے بنی اسرائیل سے اس کی پرستش کرائی تھی۔ خدا کا ایک اولوالعزم پیغمبر اور بت سازی اور بت پرستی! یہ محرف کتابوں ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کے اس شرک کے سلسلے میں کہا ہے کہ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۲/۵۱) ذرا آگے چل کر کہا: اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (۲/۵۴) یعنی "اس سے تم نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا" پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ظلم کے معنی ہیں، جس مقام پر کسی چیز کو ہونا چاہیئے اس کا اس مقام پہ نہ ہونا یا نہ رہنا۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے (۳۱/۱۳)۔

شرک کیوں ظلمِ عظیم ہے

شرک کے سلسلے میں اس جلد کے دوسرے باب (زیر آیت ۲/۳۴) میں بتایا جا چکا ہے کہ شرک اس لئے ظلم عظیم ہے کہ اس سے انسان اپنے مقام سے نیچے گر جاتا

ہے۔شرک میں انسان یا تو خارجی قوتوں کو اپنا معبود تسلیم کرلیتا ہے یا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو۔ کائنات کی قوتیں یا چیزیں (ملائکہ) خود انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے بنائی گئی ہیں اور تسخیرِ فطرت انسانی ممکنات سے ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ بھی ہے۔ اس لئے جن اشیاء کو انسان مسخر کرسکتا ہے انہیں اپنا مسجود بنا لینا، مقامِ آدمیت سے نیچے گر جانا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمام بنی آدم انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ اس لئے کسی انسان کو الوہیت کا درجہ دیدینا بھی شرفِ انسانیت کھو دینے کی دلیل ہے۔ انسان اپنے صحیح مقام پر اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ وہ صرف خالقِ کائنات کے قوانین کے سامنے جھکے۔ اسی کو توحید کہا جاتا ہے۔ کائناتی قوتوں، یا دوسرے انسانوں کو الٰہ تصور کرلینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت ان سے ڈرتا اور کانپتا رہتا ہے۔ اس سے اسے زندگی میں استحکام نصیب ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ الحج میں کہا گیا ہے کہ: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱)۔ "یاد رکھو! جو شخص خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت کرتا اور اس کے سامنے جھکتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا اور ایسا بے کس و بے بس بن کر رہ گیا جیسے چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے زمین پر گر جائے تو اُسے چیل کوّے جھپٹ کرلے جائیں۔ اور ایسا کمزور و ناتواں ہو گیا کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اُسے پرِ کاہ کی طرح اڑائے اڑائے پھرے اور کسی دور دراز گوشے میں پھینک دے۔" یہ ہوتا ہے شرک کا نتیجہ۔ اسی لئے بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ وہ جب اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بت کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے تو ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۷/۱۵۲)۔ "انہوں نے اپنے آپ کو اسی دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کرلیا۔"

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لغزش کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوگئے؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ انہیں اس نقصان کی تلافی کا موقعہ دیا گیا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے:

۲/۵۲ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

عفو کے معنے مٹا دینا یا محو کر دینا ہوتے ہیں۔ یہ لفظ کسی نقصان کی تلافی کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنی ایسا موقعہ بہم پہنچا دینا یا سامان فراہم کر دینا جس سے وہ شخص اپنے نقصان کی تلافی کرسکے۔ قانونی طور پر یہ لفظ سرزنش اور وارننگ کے بعد، سزا دیئے بغیر چھوڑ دینے کے لئے بھی آجاتا ہے اور معمولی سی سزا دینے کے بعد چھوڑ دینے کیلئے بھی

اسی نہج سے ہمارے ہاں اس کے معنے درگزر کر دینا بھی کئے جاتے ہیں۔ حقیقی مفہوم اس کا تلافیٔ مافات کے لئے موقعہ فراہم کر دینا ہو گا اور اسی مفہوم کے لئے یہ لفظ آیۂ زیرِ نظر میں آیا ہے (اس کے دیگر مفاہیم کا ذکر اپنے اپنے مقام پر آئے گا جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس کے معنے آگے بڑھ جانے یا زائد از ضرورت کے بھی ہوتے ہیں۔)

یہاں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو اس معصیت کے بعد ایک موقعہ دیدیا گیا اور یہ اس لئے کہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۵۲) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ تم شکر کرسکو" لیکن اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ للہذا یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شکر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

اس مادہ (ش۔ک۔ر) کے اصلی معنی بھر جانا، ظاہر کرنا یا نمودار ہو جانا ہیں۔ چنانچہ اَلشَّكِرَةُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے تھن دودھ سے بھرے ہوں۔ شَكِرَتِ الشَّجَرَةُ کے معنی ہوتے ہیں درخت کے تنے پر ٹہنیاں نکل آئیں اور اس طرح وہ زندگی جو اس کے اندر پوشیدہ تھی، اس کی نمود ہو گئی۔

شکر کا مفہوم

شُكْرًا کے ان معانی کو پیشِ نظر رکھنے سے "سعیٔ مشکور" کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ یعنی ایسی کوشش اور محنت، جس کے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ چونکہ انسان کی کوششیں اسی صورت میں بھرپور نتائج پیدا کرسکتی ہیں جب وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کی جائیں اس لئے خدا کو شاکر کہا گیا ہے۔ (۲/۱۵۸) یعنی انسانی کوششوں میں بھرپور نتائج پیدا کرنے والا۔ نیز شَاكِرٌ کا لفظ اس شخص کے لئے بھی بولا جائے گا جس کی کوششیں اس طرح... بھرپور نتائج کی حامل ہو جائیں۔

شُكْرًا کے دوسرے معنی ظاہر کرنے یا ظاہر ہونے کے بھی ہیں۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے، انسان کے اندر امکانی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشو و نما پانا اور اس طرح ابھر کر سامنے آجانا، ان کا شکر ہے۔ بنا بریں، اعمالِ صالحہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا موجب بنتے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کو انسانی بہبود کے لئے بے نقاب رکھنا، یعنی انہیں چھپا کر نہ رکھنا، ان نعمتوں کا شکر ہے۔ اس کے مقابل میں کفر کا لفظ آیا ہے۔ (۱۴/۷)۔ جس کے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔ اسی جہت سے کہا گیا: وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲) "تم خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تاکہ دوسرے انسان بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انہیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو"۔

انسانی صلاحیتوں کے نشو و نما پا جانے، اور ان کے صحیح استعمال سے نعمائے خداوندی حاصل ہو جانے سے انسان کے دل میں جذبۂ نشاط کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سرور آفریں کیفیت، قوانینِ خداوندی

کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے جو شخص ان حقائق کو پیشِ نظر رکھتا ہے اس کے دل میں اس سے اطاعتِ خداوندی کا جذبہ اور بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ اسے اللہ کا شکر کرنا یا تشکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اگرچہ تم نے گوسالہ پرستی کے شرک سے اپنے آپ کو مقامِ آدمیت سے گرا لیا تھا اور اس طرح دنیا میں ذلت و خواری کے مستوجب بن گئے تھے لیکن چونکہ ابھی تمہاری تعلیم و تربیت خام تھی اس لئے تمہیں اس جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کر دیا گیا۔ تم سے رعایت برتی گئی اور تمہیں ایک اور موقعہ دیا گیا تاکہ تم اپنے مال و دولت، وقت اور توانائی، قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرو۔ اس تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں گی۔ گوسالہ پرستی میں تم نے اپنی دولت صرف کی، محنت اور مشقت کی، وقت بھی ضائع کیا لیکن اس کا نتیجہ نہ صرف حبطِ اعمال ہوا، بلکہ تمہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر یہی دولت، وقت اور توانائی قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے تو تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتیں۔ تمہیں ایک موقعہ دیا جاتا ہے تاکہ تم اس کے مطابق عمل کرو۔

اس مقصد کے لئے تمہیں ضابطۂ قوانینِ خداوندی دیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں یوں کیا گیا ہے:۔

۲/۵۳ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔

"تمہیں وہ ضابطۂ قوانین، وحی کی رُو سے، موسیٰ علیہ السلام کی معرفت دیا گیا تاکہ تم صحیح راستہ پر چلو۔"

یہاں کتاب کا ذکر آیا ہے۔ ہم تورات کی تاریخ کے ضمن میں، پہلے بتا چکے ہیں کہ تورات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا نام نہیں بلکہ وہ اس مجموعۂ کتب کا نام ہے جو مختلف انبیائے بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں۔ اور جسے بائبل کا عہد نامہ عتیق کہا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں کتابِ موسیٰ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی بنیادی صفت یا خصوصیت "فرقان" بتائی گئی ہے۔ اور یہ خصوصیت اسی کتاب کی نہیں، ہر وحیِ خداوندی کی ہے۔ یہ لفظ بڑا جامع بھی ہے اور واضح بھی۔ اَلْفَرْقُ

فُرقان

کے بنیادی معنی ہیں سر کی مانگ، جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ لہٰذا اَلْفُرْقَان وہ ضابطۂ ہدایت ہے جس سے حق اور باطل، جائز اور ناجائز، غلط اور صحیح اس طرح نکھر کر الگ الگ ہو جائیں کہ ان میں التباس یا ابہام کی بال بھر بھی گنجائش نہ رہے۔ نیز اَلْفَرَقُ ایک پیمانے کو بھی کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا۔ پیمانے سے ہر شے کا تعین ہو جاتا ہے قرآنِ کریم کو بھی اسی جہت سے فرقان کہا گیا ہے۔ (۳/۳)

کتابِ موسیٰؑ کے ضمن میں، ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ مرزا غلام احمد (قادیانی) نے دعویٰ نبوت کیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نبی ہیں تو خدا نے آپ کو کتاب کونسی دی ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، رسول ہونے کا نہیں۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی بلا کتاب۔ ان کا یہ جواب نہ صرف یہ کہ نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے بلکہ خود قرآن کریم کی تعلیم سے لاعلمی کا ثبوت بھی۔

ہر نبی اور رسول کو کتاب

قرآن کریم میں ایک جگہ کہا گیا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۵۷/۲۵)۔ "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی۔" اور دوسری جگہ کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۲/۲۱۳)۔ "اللہ نے انبیاء کو مبشر اور منذر بنا کر بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی۔" ان ہر دو آیات (نیز اسی قسم کے متعدد دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ کتاب دیئے جانے کے اعتبار سے نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نبوت سے مراد ہے خدا سے وحی یا کتاب کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی یا کتاب کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس لئے نہ کوئی رسول بلا نبوت ہو سکتا ہے اور نہ کوئی نبی بلا رسالت[1]۔ مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں کہا کہ دیکھئے حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے لیکن انہیں کتاب نہیں ملی تھی۔ کتاب صرف موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی۔ ان کی یہ دلیل بھی ان کی قرآن کریم سے ناواقفیت کی غماز ہے۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ: وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ (۲/۵۳ و دیگر مقامات) وہاں یہ بھی کہا ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲۱/۴۸)۔ "ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان (یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والی کتاب) دی جس میں وحی الٰہی کی روشنی تھی اور متقیوں کے لئے ضابطۂ ہدایت۔" اس سے بھی واضح تر الفاظ سورۃ الصّٰفّٰت میں آتے ہیں جہاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا نام لیکر کہا ہے: وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (۳۷/۱۱۷)۔ "ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی۔" ان مقامات سے واضح ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ کو خدا کی طرف سے وحی ملی تھی اسی طرح ہارون علیہ السلام کو بھی وحی عطا ہوئی تھی —— اور وحی ہی کو خدا کی کتاب کہا جاتا ہے۔ لٰہذا یہ کہنا کہ میری طرف وحی تو ہوئی ہے لیکن کتاب نہیں ملی۔ وحی اور کتاب کی حقیقت سے بے خبری کا بیّن ثبوت ہے۔

بنا بریں، بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تمہیں مہلت کا وقفہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ تم اس ضابطہ کی اطاعت کرو جو حضرت

[1] تفصیل ان امور کی میری کتاب —— ختم نبوت اور تحریک احمدیت —— میں ملے گی۔

موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے تمہیں دیا گیا ہے۔ اس کے پروگرام کی صراحت اگلی آیت میں کی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ:-

۲/۵۴ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ۔ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ۔ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "تم نے گوسالہ پرستی سے جو اپنا نقصان کیا، یعنی تم مقامِ آدمیت سے گر گئے، تو اس کی تلافی کی یہ صورت ہے کہ تم پھر سے صحیح روش اختیار کر لو"۔ توبہ کے متعلق اس کتاب کی پہلی جلد میں، آیت (۲/۱) کے تحت (صفحہ ۲۲ پر) بتایا جا چکا ہے (اور چند صفحات پہلے اس کا اعادہ بھی کیا جا چکا ہے) کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس مقام سے انسان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا تھا اسی مقام پر واپس آجانا۔ اس کے بعد صحیح راستے کو اختیار کرنے کے لئے لفظ اَصْلَحَ آتا ہے۔ اس طرح توبہ کے پروگرام کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب انسان اپنی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے کی طرف چلنے کے لئے واپس لوٹتا ہے تو قوانینِ خداوندی، نہایت آب و تاب کے ساتھ اس کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ اس کی راہنمائی صحیح راستے کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس نہج سے خدا کو توّاب کہا جاتا ہے —— اور خدا کی یہ صفت اس کا بڑا ہی حسین اور پیارا تصوّر سامنے لاتی ہے یعنی اگر تم اپنی خطا کے احساس سے اپنی آنکھ میں اشکِ ندامت لئے، خدا کی طرف ایک قدم اٹھاؤ تو خدا دو قدم آگے بڑھ کر تمہیں اپنے آغوشِ رحمت میں لے لیگا۔ خدا کی اس صفت کو التوّاب الرحیم سے تعبیر کیا جاتا ہے، بڑی تیزی سے لوٹ کر سامانِ رحمت عطا کرنے والا۔

توبہ اور توّاب

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ (۲/۵۴) ہم نے کسی مقام پر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات (الاسماء الحسنیٰ) قرآنِ کریم میں آئی ہیں لیکن مختلف آیات ہیں، ان صفات میں سے کسی ایک یا دو صفات کا ذکر خاص طور پر آتا ہے اور اس خاص صفت کے اس مقام پر لانے میں بڑی معنوی خصوصیت پنہاں ہوتی ہے۔ اس آیت میں خدا کی صفت اَلْبَارِئُ کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کی کیا خصوصیت ہے؟

الباری

سورۃ الحشر میں خدا کی تین صفات ایک دوسرے سے ملحق بیان ہوئی ہیں۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹/۲۴) —— یعنی الخالق —— الباری اور المصور —— خدا کے عملِ تخلیق کے متعلق پہلی جلد میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی ہیں خدا کے پیدا کردہ مختلف عناصرِ کائنات میں سے بعض کو ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص توازن یا تناسب (PROPORTION) کے ساتھ اس طرح ملانا کہ اس سے ایک نئی چیز وجود میں آجائے۔

اِس عملِ تخلیق کے پروگرام کو سامنے لائیے۔ کائنات میں مختلف عناصر (MATERIAL) ڈھیروں پڑے ہیں۔ عملِ تخلیق کی رو سے ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے غیر ضروری عناصر کو الگ کرکے، ضروری عناصر کو، خاص تناسب کے ساتھ یکجا کیا جاتا ہے۔ غیر ضروری عناصر کو (یعنی وہ عناصر جو اس خاص شے کی تخلیق کے لئے ضروری نہ ہوں) اس طرح الگ کر دینے کی صفت (یعنی الگ کر دینے والے) کو البارِی کہا جاتا ہے۔ جب ان عناصر سے حشو و زوائد کو الگ کر دیا جائے تو پھر وہ نئی شے، خاص صورت (FORM) اختیار کرلیتی ہے۔ خدا کی اس صفت کو (المصوِّر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سمجھنے کے لئے آپ ایک کمہار کو سامنے لائیے۔ وہ اپنے چاک پر گندھی ہوئی مٹی کا تودہ رکھکر چاک کو گردش دیتا ہے۔ اس تودے میں سے زائد مٹی کو الگ کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہی تودہ ایک خاص برتن کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اشیائے کائنات کے ارتقائی عمل کی یہی صورت ہے۔

البارِی کے ان معانی کو سامنے رکھکر آیۂ زیرِ نظر کی طرف آیئے۔ بنی اسرائیل شرک کے مرتکب ہوئے۔ یعنی انہوں نے حق کے ساتھ باطل کو ملوّث کر دیا۔ دونوں مخلوط ہو گئے۔ توبہ کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ باطل کو حق سے الگ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کہا گیا کہ تم اس خدا کی طرف رجوع کرو جو البارِی ہے۔ اس رجوع کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے قلبی اور ذہنی تصورات (معتقدات) سے باطل الگ ہو جائے گا اور تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ خالص خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت کر سکو۔

لیکن اس آیت میں ابھی ایک ٹکڑہ باقی ہے۔ اور وہ ٹکڑہ ایسا ہے جس کے مروجہ (غلط) مفہوم سے بات کہیں سے

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اور فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۵۴/۲)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "تم ایک دوسرے کو قتل کرو"۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں ہے:-

> موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکمِ خداوندی سنایا اور جن جن لوگوں نے بچھڑا پوجا تھا انہیں بٹھا دیا اور دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے اور قتل کرنا شروع کیا۔ قدرتی طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب وہ ہٹا اور انہیں روک دیا گیا تو شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے ہیں اور اس طرح ساری قوم کی توبہ قبول ہوئی۔ (پارہ اول صفحہ ۹۵)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس تفسیر کی تغلیط کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس قوم میں شرک تک کو اس لئے گوارا کر لیا گیا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے۔ تفرقہ باہمی فساد کا موجب ہوتا ہے اور فساد کا آخری نتیجہ قتال۔ ان

میں تفرقہ پیدا ہونے کے امکان کو تو رد کر گیا اور اس تفرقہ کا جو آخری نتیجہ ہو سکتا تھا اس کا حکم دیا گیا! کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی ایک مومن کے ہاتھوں دوسرے مومن کے قتل بالعمد کو خدا کے غضب اور لعنت اور ابدی جہنم کا مستوجب بتایا ہے (۴/۹۳)۔ اس کے بعد آپ سوچ سکتے ہیں کہ خدا، بنی اسرائیل کی اس جماعت مومنین کو یہ حکم دے گا کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو اور پھر اسے اپنی رحمت بھی قرار دیگا، کیونکہ آیت کے آخر میں اس نے اپنے آپ کو التواب الرحیم کہا ہے؟ اس کے برعکس قرآن کریم میں ہے: كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)۔ "ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جس کسی نے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ بجز اس کے کہ ایسا کرنا جرم قتل یا بغاوت کی سزا کے طور پر ہو ——— یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسان کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک متنفس کی جان بچالی، یوں سمجھو، گویا اس نے پوری نوع انسان کی جان بچالی"۔

جس خدا نے انہیں یہ حکم دیا تھا کیا وہ انہیں اس کا حکم دیتا کہ باہمی قتال سے ہزاروں جانیں تلف کردو!! علاوہ ازیں چند ہی آیات بعد ان سے کہا گیا ہے کہ تم سے عہد لیا گیا تھا کہ تم باہمی خون ریزی نہیں کرو گے، لیکن تم نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ یہ بڑا سنگین جرم تھا (۲/۸۴-۸۵)۔ اب ظاہر ہے کہ جس باہمی خونریزی اور قتال کو خدا نے ان کے خلاف "فرد جرم" میں سرفہرست رکھا ہے، خود خدا نے تو اس کا حکم نہیں دیا ہوگا۔ لہٰذا اس آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں۔

بات صاف ہے۔ ہم "ذبح ابناء" کے سلسلے میں بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم میں ذَبْحٌ اور قَتْلٌ کے معنے گلا کاٹ دینا یا مار دینا ہی نہیں۔ اس کے معنے کسی کو پست کرنا بھی ہیں۔ بنی اسرائیل نے حکم خداوندی سے سرکشی اختیار کر کے گوسالہ پرستی کے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ ان سے کہا یہ گیا کہ تم اگر اپنے نقصان کی تلافی چاہتے ہو تو اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ تم دو سرکشی کو چھوڑ کر تم اپنے قلوب کو اطاعت خداوندی کے لئے جھکاؤ ——— بہت زیادہ جھکاؤ۔ اس قدر جھکاؤ کہ ان میں معصیت اور سرکشی کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ ایسا کرنے کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ تم صحیح راستہ اختیار کر لو۔ اس سے تمہارے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ اور تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما بھی۔

خلاصہ

خدا نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہیں تو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ تم اس کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو، جب تمہیں، ان کی بدولت، زندگی

کی ہر قسم کی آسائشیں نصیب ہوگئی تھیں اور تم اپنی ہم عصر اقوام میں، ایسی ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے تھے کہ کوئی اور قوم تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی (۲/۱۲۲)۔

اس نظام کو چھوڑنے کے بعد، تمہاری حالت یہ ہوگئی کہ آئین و قوانین کا احترام اور عدل و انصاف کی پاسداری تمہارے ہاں سے بالکل اٹھ گئی ــــ لیکن اب یہ دھاندلی زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی۔ اب (قرآنی نظام کے قیام سے) وہ دور جلد آنے والا ہے جس میں کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی (۶/۱۶۵) نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی سے، اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ (رشوت) لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی مدد کو پہنچ سکے گا۔

یہ اس دنیا میں بھی ہوگا جب (قرآن کا) نظامِ عدل قائم ہوگا، اور آخرت میں بھی، جب تمام فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوں گے۔

تمہیں یاد ہے کہ جب تم قومِ فرعون کی محکومی میں تھے تو وہ تم پر، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر طرح طرح کے عذاب وارد کیا کرتے تھے۔ ان میں بدترین عذاب یہ تھا کہ وہ تمہارے اندر پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا (۲۸/۴) اور اس طرح کرتا یہ تھا کہ تمہاری قوم کے معزز افراد کو، جن میں اسے جوہرِ مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور جن سے اسے خطرہ کا امکان نظر آتا تھا، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بناتا رہتا تھا (بالخصوص انہیں جو موسیٰؑ پر ایمان لاتے تھے۔ ۴۰/۲۵)، اور جو طبقہ ان جوہرول سے عاری ہوتا، اسے اپنا معزز و مقرب بنا کر آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے تمہاری قوم کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی تھی (۲۸/۵)۔ [سیاستِ ملوکیت کا انداز ہی یہی ہوتا ہے۔ ۲۷/۳۴]۔

تم نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو اس نے تمہیں سب سے پہلے فرعون کے اس عذاب سے نجات دلائی۔ یہ چیز تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تمہارے لئے ایک عظیم نعمت تھی، کیونکہ اس سے تمہیں اپنی بازآفرینی کے مواقع حاصل ہو گئے (۷/۱۴۱)۔

اور پھر (قومِ فرعون کے ساتھ کشمکش کے بعد) وہ وقت آگیا کہ تم مصر کو چھوڑ کر چل نکلے اور فرعون کا لشکر تمہارے تعاقب میں آیا، تا آنکہ تم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سامنے سمندر (یا دریا) کا حصہ تھا اور پیچھے فرعون اور اس کی فوج، تم اس طرح گھر چکے تھے کہ ہماری راہنمائی سے تمہیں سمندر (یا دریا) میں خشک راستہ مل گیا۔ اور اس طرح، ہم نے تمہیں فرعون کے لشکر کی دستبرد سے بچا لیا، اور وہ، اور اس کا لشکر، سب غرق ہو گئے۔ اور یہ کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا (۷/۱۳۸؛ ۱۰/۹۰؛ ۲۰/۷۷؛ ۲۶/۶۳؛ ۴۴/۲۴)۔

اور سینا کی وادی میں پہنچ کر، (جہاں تمہاری تربیت ہو رہی تھی)، موسیٰؑ ہمارے حکم کے مطابق چالیس راتوں کے لئے تم سے الگ ہوا (۷/۱۴۲)، تو تم نے اتنے ہی عرصہ میں، (خدا کو چھوڑ کر مصریوں کے دیوتا) بچھڑے کی پرستش شروع کر دی، اور اس طرح، قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔

لیکن ہم نے اس پر بھی تمہیں راندۂ درگاہ نہیں کر دیا، بلکہ (جیسا کہ آگے چل کر مذکور ہے۔ ۲/۵۴)، تمہاری اس غلط روش کے مضر اثرات کو مٹا دیا، اور تمہیں پھر موقع دیا کہ تم اپنی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کر لو۔

اس مقصد کے لئے، ہم نے موسیٰؑ کو ایک ایسا ضابطۂ قوانین دیا، جو حق و باطل کو نکھار کر الگ الگ کر دینے والا، اور مستقل اقدار کا پیمانہ تھا۔ یہ اس لئے دیا کہ تم، اس کی روشنی میں، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکو۔

جب موسیٰؑ (چالیس راتوں کے بعد) اپنی قوم کی طرف واپس آیا، اور اس نے دیکھا کہ قوم گوسالہ پرستی میں مصروف ہے، تو اس نے ان سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے کو اپنا معبود کر، اپنا ہی نقصان کیا ہے، کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم اس سے انسانی سطح سے بہت نیچے گر گئے ہو (۷/۱۵۲)۔ اب پھر اس مقام کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنی غلطی کا اعتراف کرو، اور نہایت عجز و انکسار سے، قوانینِ خداوندی کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قوانینِ خداوندی کے ان خوشگوار اور زندگی بخش نتائج سے پھر مستفید ہو سکتے ہو، جو اس وقت تم سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ان قوانین میں یہ خصوصیت ہے کہ جب بھی کوئی ان کی طرف رجوع کرتا ہے، تو یہ، ربوبیت کے تمام سامان اپنے ساتھ لئے، اپنا رخ اس کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

پانچواں باب

داستانِ بنی اسرائیل — خوئے غلامی کے مظاہرے

(آیات ۲/۴۸ تا ۲/۷۱)

۱ طرح طرح کے طفلانہ تقاضے۔

۲ ہم خدا کو بے نقاب دیکھیں گے۔

۳ نعمائے خداوندی —— من و سلویٰ۔ رزقِ طیّب کا مفہوم۔

۴ ارضِ مقدس میں تمکن کا وعدہ —— اور قوم کی دوں ہمتی۔

۵ وراثتِ ارضی کا ابدی قانون —— صلاحیّت۔

۶ قتلِ انبیاء و رسل —— خدا اور رسولوں کے غالب رہنے کا مفہوم۔

۷ عالمگیر دین صرف اسلام ہے۔

۸ سبت کا واقعہ۔

۹ بنی اسرائیل کے بندر بن جانے کا مفہوم۔

۱۰ ذبحِ بقر کا واقعہ —— قوم کی کٹ حجتیاں

۱۱ اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم کا مفہوم۔

۱۲ ناتربیت یافتہ اقوام کا اسلام لے آنا۔

۱۳ ہمارا مروجہ اسلام، کس طرح غیر اسلامی عقائد و مسالک کا مجموعہ بن گیا۔

۱۴ حضرت موسےٰؑ کے کپڑے لیکر بھاگ جانے والی وضعی روایت۔

****

پانچواں باب

داستان بنی اسرائیل — خوئے غلامی کے مظاہر

سابقہ باب میں ضمناً، بتایا گیا تھا کہ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل میں جوہر انسانیت مفقود ہو چکے تھے۔ نہ اُن کے سینے میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی، نہ ان کی نگاہوں میں تابندہ مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں، غلامی، ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و ذمائم، جنہیں جسدِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہئے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن جراثیم، کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے تھے۔ خوئے غلامی میں پختہ انسان، زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ، اس سے ذاتی سیرت کی رعنائیاں اور اجتماعی کیریکٹر کی دلربائیاں ایک ایک کر کے چھن جاتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

از غلامی دل بمیرد در بدن ❊ از غلامی روح گردد بارِ تن

یہ تو ہوتی ہے غلامی میں انفرادی کیفیت۔ جہاں تک اجتماعی زندگی کا تعلق ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے:

از غلامی بزمِ ملت فرد فرد ❊ این و آں از این و آں اندر نبرد

یہ لوگ بظاہر ایک قوم نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اجتماعی نہیں، انفرادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس میں ہر فرد کا مفاد اپنا ہوتا ہے اور جب یہ مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ان میں باہمی سر پھٹول شروع ہو جاتی ہے۔ اُن کی اس انفرادی زندگی کو اقبالؒ نے ایک مثال سے نہایت بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

آں یکے اندر سجود ایں در قیام ❊ کاروبارش چوں صلوٰۃِ بے امام

آپ کسی مسجد میں، باجماعت نماز کو دیکھئے، اگرچہ اس جماعت میں بھی اب افراد ہیں . . . روحِ یگانگت نہیں ہوتی، تاہم

خوئے غلامی

اس رسمی جماعت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں افراد، سیدھی صفوں میں، کندھے سے کندھا ملاتے، کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص (امام) کی آواز پر، سب کے سب، اُٹھتے ہیں، جھکتے ہیں سجدے میں جاتے ہیں۔ اس کے بعد، جب یہی نمازی، سنتیں پڑھنے لگتے ہیں تو نماز بھی وہی ہوتی ہے اور نمازی بھی

وہی۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اب ان میں امام نہیں ہوتا۔ اس امام کے نہ ہونے سے ان نمازیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی کھڑا ہے، کوئی رکوع میں جھکا ہوا، کوئی سجدے میں پڑا۔ آپ کہیں دور کھڑے ہو کر اس صحنِ مسجد پر نگاہ ڈالئے جس میں یہ نمازی، نماز ادا کر رہے ہوں۔ تشتّت و افتراق کا بڑا عبرت انگیز منظر سامنے آجائے گا۔ یہی کیفیت ہوتی ہے قوموں کی غلامی کے زمانے میں۔ ان کی مرکزیت فنا ہو جاتی ہے اور وہ قوم ہزار قسم کے اختلافات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے نئے راستوں کی تلاش کا جذبہ:۔

کیشِ اُو تقلید کارش آذری است ندرت اندر مذہبِ اُو کافری است

جب ان میں فہم و بصیرت کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کی صداقتوں کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ اپنی پرستش کے لئے، محسوس خداؤں کو تراش لیتے ہیں —— خواہ یہ خدا مٹی اور پتھر کی مورتیں ہوں اور خواہ زندہ اور مردہ انسان۔ مسلکِ تقلید بذاتِ خویش بت پرستی ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کا ایک بلند پایہ فلاسفر (WHITE=HEAD) کہتا ہے کہ:۔

مروجہ تصورات و نظریات پر بلا تحقیق مطمئن ہو کر بیٹھ جانا بُت پرستی ہے۔[1]

یہی وہ بت پرست ہیں، جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:۔

تازگی ہا وہم و شک افزایدش ∴ کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

وہ اس طرح لکیر کے فقیر ہو جاتے ہیں کہ ہر نئی تحقیق میں انہیں کفر و الحاد کے جراثیم دکھائی دیتے ہیں۔ صدیوں کے اس جمود و تعطّل سے اُن کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ پتھر کی مورتیوں کی طرح ذہنی طور پر خود بھی پتھر بن جاتے ہیں اور ایک مقام پر ساکت و صامت بالکل کھڑے رہتے ہیں۔

کاروانِ شوق بے ذوق و رحیل ∴ بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

اُن میں، سفرِ حیات میں، ایک قدم آگے بڑھانے کا بھی ولولہ نہیں رہتا۔ اس لئے نہ ان کے سامنے کوئی منزل ہوتی ہے، نہ منزل تک پہنچانے کے راستے۔ نہ کوئی راہنما نہ چراغِ راہ۔ مختصراً یہ کہ:

دین و دانش را غلام ارزاں دہد تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

انسانی زندگی میں عقل و دانش، وحی کی عطا کردہ اقدار و اصول، اور ان کی رو سے نشو و نما پانے والی انسانی ذات متاعِ بے بہا ہیں۔ لیکن غلام اور محکوم محض طبیعی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس متاعِ گرانمایہ کو جنس کاسد سمجھتا ہے۔ اور حیوانوں

[1] ADVENTURES OF IDEAS-

کی طرح جیتا اور انہی کی طرح مر جاتا ہے۔

ایسی ہوتی تھی وہ قوم، جسے انسانی سطح پر لانے کے لئے حضرات انبیائے کرام کو مبعوث کیا جاتا تھا۔ آپ غور کیجئے کہ یہ مرحلہ کسقدر ہمت طلب اور اس فریضے کی ادائیگی کس قدر صبر آزما ہوتی تھی۔ یہی تھا وہ مقام، جہاں حضرتِ

حضرت ابراہیمؑ کا سوال

ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے کہا تھا: رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (۲/۲۶۰)۔ "اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے یہ بتا کہ اِس قسم کی مردہ قوم میں زندگی کی روح کس طرح پھونکی جائے؟" اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا تجھے اس پر یقین نہیں کہ ایسے مُردوں کو بھی زندہ کیا جا سکتا ہے؟ عرض کیا کہ جب آپ نے میرے ذمے یہ فریضہ عائد کر دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا ہو جانا ممکن ہے لہٰذا اس میں تو مجھے کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ میں وہ طریقہ پوچھنا چاہتا ہوں جسے اختیار کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ میں چاہتا یہ ہوں کہ مجھے کامل اطمینان ہو کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ مجھے بالیقین منزل تک پہنچا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا۔ کہا کہ جنگل کے وحشی پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانی سائے تک سے بھی ڈر کر اڑ جاتے ہیں لیکن پرندوں کو سدھانے والے جب انہیں سدھا کر اپنے سے مانوس کر لیتے ہیں تو ان کی اس طرح قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے کہ فضا کی پہنائیوں میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ دور دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی کیوں نہ جا بیٹھیں۔ سدھانے والا، جب ایک آواز دیتا ہے تو وہ لبیک کر اس کی طرف آ جاتے ہیں۔ ابراہیمؑ! حقائق سے نامانوس، وحشی انسانوں کو اس طرح سدھا کر اپنے قریب لایا جاتا ہے۔ یہ ہے طریق مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونکنے کا۔ آپ نے غور کیا کہ یہ طریق کس قدر ہمت شکن، صبر آزما اور استقامت طلب ہوتا ہے؟۔

اس قسم کی تھی وہ قوم، جس کی تعلیم و تربیت۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھی۔ وہ مصر سے تو انہیں نکال لائے کہ یہ تبدیلی صرف سرزمین کی تبدیلی تھی۔ اب وہ مرحلہ آیا جس میں ان کے قلب و دماغ کی تبدیلی مقصود تھی۔ اس مرحلہ میں ان کی خوئے غلامی کے مظاہر قدم قدم پر سامنے آتے تھے۔ اس سلسلے میں دو تین واقعات اس سے پہلے ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب وہ مصر سے نکلے تو سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اگرچہ حضرت موسےٰ علیہ السلام ان کی راہنمائی کر رہے تھے اور انہیں یقین دلا رہے تھے کہ تم گھبراؤ نہیں، میں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں تمہیں ایسے مقام کی طرف لے چلوں گا جہاں سے تم بعافیت سمندر پار کر جاؤ گے۔ لیکن اس سے ان کی چیخ و پکار میں کمی نہ ہوئی بائبل میں ہے:۔

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا

تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا، کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا۔ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا۔ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا۔ تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔[1]

(خروج۔ باب ۱۴۔ آیات ۱۲-۱۰)

آگے بڑھے تو ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بت بنا دیجئے۔ انہوں نے وہاں اپنا دامن چھڑایا تو ان کی غیر حاضری میں، انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ یہ سب ان کی خوئے غلامی کے مظاہر تھے۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ تربیت گاہِ سینا میں قدم قدم پر ان کی طرف سے اسی قسم کے تقاضے ہوتے تھے۔ وہ بات بات پر روٹھ کر بیٹھ جاتے اور سرکشی اختیار کر لیتے۔ اسی قسم کے وہ تقاضے تھے جن سے تنگ آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا: يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (۶۱/۵)۔

حضرت موسیٰؑ کو ستانے والی قوم

"اے لوگو! تم مجھے اس طرح کیوں تنگ کرتے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کوئی اپنی بات تم سے نہیں منوانا چاہتا، میں تو خدا کے پیغامات تم تک پہنچاتا اور انہی کی اطاعت کا تم سے مطالبہ کرتا ہوں، پھر اس میں مجھ سے بگڑنے کی کیا بات ہے؟"

قوم بنی اسرائیل کی یہ ذہنیت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ہی محدود نہیں تھی۔ یہ ان کے بعد بھی مسلسل چلی آئی۔ چنانچہ جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے دینِ خداوندی پیش کیا تو وہ آپؐ سے بھی اسی قسم کے سوالات پوچھتے اور تقاضے کرتے تھے۔ سورۃ البقرۃ میں ہے: اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا

---

[1] ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں محض تاریخی حیثیت سے بیان نہیں ہوئیں۔ ان سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ان سے عبرت اور موعظت حاصل کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ بنی اسرائیل کی داستان، ہم اہلِ پاکستان پر کس طرح منطبق ہوتی ہے ہمیں بھی انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات دلا کر اس خطۂ ارض میں بسایا گیا تاکہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لے کر اپنے تصورات کے مطابق، اپنی آزاد مملکت، (اسلامی نظام) قائم کر سکیں۔ لیکن ہماری ناشکر گزاری کا عالم یہ ہے کہ ہمیں ذرا سی بھی کہیں مشکل پیش آتی ہے تو چلا اٹھتے ہیں کہ "قائداعظمؒ ہمیں یہاں کیوں لے آیا۔ اگر پاکستان نہ بنایا جاتا تو ہم ہندوستان میں، یہاں سے اچھے رہتے"۔ کیا ہماری ذہنیت بعینہٖ، بنی اسرائیل کی سی نہیں؟۔

سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ- وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۲/۱۰۸) "کیا تم چاہتے ہو کہ اس رسولؐ سے بھی اسی قسم کی فرمائشیں کرو، جس قسم کی فرمائشیں تم اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی فرمائشوں کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ تم ایمان کے بدلے کفر کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی روش اختیار کرنے والا بڑے غلط راستے پر چلتا ہے۔"

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو تقاضے کئے تھے ان میں سے ایک تقاضہ وہ بھی تھا، جو زیرِ نظر آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی:

۲/۵۵ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ-

"جب تم نے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم تمہاری کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے جب تک ہم خدا کو بے نقاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ ہم ایسے خدا پر ایمان ہی نہیں لا سکتے جسے ہم اپنے سامنے بے نقاب نہ دیکھ لیں" اس تقاضے کے بعد کیا ہوا اسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

خدا کو بے نقاب دیکھیں گے!

آپ نے دیکھا کہ ایک مدّت تک مصر کی بت پرست قوم میں رہنے سے ان کی ذہنیت کیا ہو گئی تھی۔ یہ ان انبیاء کی اولاد میں سے تھے، اور بہرحال اپنے آپ کو انہی کے پیرو کہتے تھے، جو اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن اب یہ ایسے خدا کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ خدا کی ذات ایک ایسی ورآء الورا حقیقت ہے جو انسانی "قیاس و خیال و گمان و وہم" سے برتر اور ہمارے تصورات کی حدود سے بلند و بالا ہے۔ اس کا طبیعی آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف، انسان تو مادہ تک کی ابتدائی شکل —— توانائی محض (PURE ENERGY) کو بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اُسے اس کے مظاہر ہی سے پہچان سکتا ہے۔ ریڈیو سے نشر شدہ لہریں ہر وقت ہمارے ارد گرد فضا میں محوِ حرکت ہوتی ہیں لیکن ہم انہیں اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتے —— آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف رہا، ہم انہیں اپنے حواسِ خمسہ میں سے کسی حس کے ذریعے محسوس نہیں کر سکتے۔ ان کے وجود کا علم ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو ہمارے ریڈیو سیٹ کی وساطت سے محسوس کرائیں۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق قرآن کریم میں ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ- وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶/۱۰۴) "کوئی آنکھ ذاتِ خداوندی

کا ادراک نہیں کر سکتی، حالانکہ خدا ہر مقام پر موجود ہوتا ہے اور وہ ہر آنکھ کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کا یہ احاطہ کرنا بھی کسی محسوس ذریعے سے نہیں ہوتا۔ وہ نہایت غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر خصوصی اعمال انسانی تو ایک طرف، اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی باخبر ہوتا ہے"۔ ایسے خدا کے متعلق یہ تقاضہ کہ جب تک ہم اسے اپنی آنکھوں سے بے نقاب نہ دیکھ لیں، اس پر ایمان نہیں لائیں گے، کتنی بڑی جہالت ہے! ان کی یہی جہالت تھی جس کے متعلق سورۃ النساء میں ہے: يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ۔ فَقَالُوْٓا۔ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (۴/۱۵۳) "اے رسولؐ! تجھ سے یہ اہل کتاب (یہودی) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے دعوئ نبوت کو تب سچا مانیں گے جب تم ایک بنی بنائی کتاب، آسمان سے اتری ہوئی دکھاؤ"۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کا یہ تقاضہ، اس تقاضے کے مقابلے میں جو انہوں نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا، بہرحال ہلکے قسم کا ہے۔ انہوں نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ تم خود خدا کو ہمارے سامنے بے نقاب لاکر دکھاؤ"۔

ان کی اس فرمائش کے بعد کیا واقعہ پیش آیا، اس کی تفصیل تو قرآن کریم نے نہیں دی۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ: فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۲/۵۵) "تمہیں بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا۔ سورۃ الاعراف میں بھی (غالباً) اسی واقعہ کا تذکرہ ہے وہاں کہا گیا اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (۷/۱۵۵) "انہیں زلزلہ نے پکڑ لیا"۔ ہمارے سمجھنے کی بات اتنی ہی ہے کہ مطالبہ تو خدا کو بے نقاب دیکھنے کا تھا اور ان کی دوں ہمتی اور بزدلی کا عالم یہ تھا کہ بجلی کی

بزدلی کا یہ عالم

کڑک اور زلزلے کے ارتعاش سے ان کے ہوش اڑ گئے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں، محسوسات میں سے تھیں۔ محسوسات کو معبود بنالینے والوں کی ہمت اور حوصلے کا یہی عالم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے شرک کرنے والوں کے خوف اور ڈر کو کس طرح واضح الفاظ میں بے نقاب کیا۔ اسی جلد کے شروع میں قصۂ آدم کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت آدمی کے اندر ودیعت کرکے رکھ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ لیکن محسوسات کو معبود بنالینے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فطرت کی انہی قوتوں سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور یہی خوف انہیں، اُن کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں سے اس طرح لرزہ براندام ہو جائے وہ خدا کی عظمت اور اقتدار کا اندازہ کس طرح لگا سکتی ہے؟ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (۶/۹۲) "انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا"۔ ان اور انہی جیسوں کے متعلق کہا گیا تھا۔

یہودیوں کی یہی ذہنیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جماعت مومنین سے کہا گیا تھا کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى (۳۳/۶۹) "اے جماعت مومنین! دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا، جنہوں نے موسیٰؑ کو طرح طرح کی بیہودہ فرمائشوں اور تقاضوں سے تنگ کر مارا تھا" ان میں سے ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ وہ خدا کو محسوس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس جماعتِ مومنین نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے تو اس قسم کی کوئی فرمائش نہ کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خدا کو اس کی ان صفات کی رو سے ہی جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، پہچانا جا سکتا ہے،

مسلمانوں کو تنبیہ

ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا اس حقیقت پر محکم یقین تھا اور کامل اطمینان۔ لیکن اس کے بعد، جب ہمارے ہاں تصوف در آیا تو ہم بھی اسی سطح پر اتر آئے۔ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی پر ایمان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن تصوف نے اس کی جگہ عرفان کا نظریہ وضع کیا۔ یعنی ذاتِ خداوندی کی معرفت۔ اس کی ذات کا پہچاننا۔ چونکہ (صاحب کے الفاظ میں)۔ تصوف برائے شعر گفتن خوب است ـــــ اس لئے تصوف کے ان عقائد و نظریات نے زبانِ شعر میں گل کھلائے۔ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں اپنا جلوہ بے حجاب دکھائے تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا لَنْ تَرٰىنِيْ (۷/۱۴۳) "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔ اس کے بعد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام، جلوۂ خداوندی کی تاب نہ لا کر گر پڑے (ان اشارات کی تفصیل ہم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کریں گے جہاں یہ بھی بتائیں گے کہ بنی اسرائیل کے تقاضہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست میں بنیادی فرق کیا تھا۔ اس جگہ ہم اسی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں جس کے لئے یہ بات ضمناً کہی گئی ہے)۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ خدا نے اپنے متعلق کہا ہے

ہماری حالت

کہ کوئی انسانی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس میں انبیاء اور غیر انبیاء سب شامل ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی تصوف زدہ شاعری انتہائی غلو سے آگے بڑھتی ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہتی ہے کہ:-

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات؛ تو عینِ ذات می نگری، در تبسمی!

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام صفاتِ خداوندی کے ایک جلوہ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ خداوندی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ نعت کی دنیا میں اس، اور اس قسم کے دیگر اشعار کو بڑے فخر سے پیش کیا اور بڑے ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ یہ وہی غلو ہے جس سے قرآن کریم نے سختی سے منع کیا تھا جب کہا تھا کہ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۴/۱۷۱) "اے اہل الکتاب! تم دین میں مبالغہ مت کرو اور خدا کے متعلق وہی بات کہو جو الحق ہے"۔ اور الحق یہی ہے کہ

ذاتِ خداوندی کو آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف، اس کی کنہ و ماہیت و کیفیت بھی انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔

لیکن یہ مثال تو ذرا پہلے زمانے کی تھی۔ اب معاملہ اور آگے بڑھ گیا ہے اور محراب و منبر تک سے اس قسم کی آوازیں بلند کی جاتی ہیں کہ:-

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر   اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفٰےؐ ہو کر

ان کے نزدیک احَد اور احمَد میں، بس ایک میم کا پردہ حائل ہے جسے عاشق کی نگاہ نہایت آسانی سے، درمیان سے الگ کر کے، ان دونوں کی وحدت کا نظارہ کر لیتی ہے[۵] (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اور یہ کہ:-

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں عین رب (ع+رب) ہے (معاذ اللہ)۔

یہ حضرات بزعمِ خویش، ہر رات خدا کی محفل میں شریک ہوتے اور عاشق و معشوق کی طرح محوِ ناز و نیاز رہتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے ہم سے کہا تھا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جانا، ہم کس دھڑلے سے اس فرمانِ خداوندی سے سرتابی برت رہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ اسے عینِ دین ہی نہیں، مغزِ دین قرار دیا جاتا ہے۔

بہرحال، اب آگے بڑھیے۔ بنی اسرائیل کی اس ذہنیت کے بعد، انہیں مرفوع القلم سمجھا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تربیت گاہِ سینا کو ان کے لئے مہلت کا وقفہ قرار دیا۔ اس لئے کہا کہ ان کے اس قسم کے تقاضوں کے بعد، بجائے اس کے کہ انہیں ابدی طور پر راندۂ درگاہ قرار دے دیا جاتا:

۲/۵۶ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

ہماری کتبِ تفاسیر میں، یہ کہا گیا ہے کہ اس بجلی کی کڑک یا زلزلہ سے وہ سب مر گئے، لیکن اللہ نے انہیں پھر زندہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو خدا اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے، جو بے جان مادہ میں سے زندگی نمود کر سکتا ہے، جو ایک جرثومہ کو انسان بنا سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے یہ ناممکن نہیں کہ وہ کسی کو طبعی طور پر مار

---

[۵] نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر، وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر۔ اسے علامہ اقبالؒ کے دورِ اول کا شعر بتایا جا رہا ہے جسے انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں شامل نہیں کیا۔ لیکن اب اسے فخریہ ان کی طرف منسوب کر کے دنیا بھر میں نشر کیا جا رہا ہے۔ اگر انہوں نے یہ شعر کہا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے کلام سے خارج کر دیا تھا۔ تو پھر اسے ان کی طرف منسوب کئے جانا بڑی زیادتی ہے۔

کر پھر زندہ کر دے۔ مرنے کے بعد کی زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اس خدا نے یہ کہیں نہیں کہا وہ اس دنیا میں کسی کو طبعی موت مار کر، پھر یہیں زندہ کر دے گا۔ اس لئے اس آیت میں، موتؔ اور بعثؔ کے الفاظ کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں۔ موت اور حیات کے متعلق مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۲۸) کے تحت (صفحہ ۳۴۶ پر) گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں موتؔ اور بعثتؔ کے قرآنی مفہوم کو ذرا اور واضح طور پر پیش کر دیا جائے تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہاں ان الفاظ سے مراد کیا ہے؟

بنیادی طور پر موتؔ کا لفظ، حیاتؔ کے مقابلہ میں آتا ہے لیکن جس طرح حیات سے مراد محض سانس لینا نہیں، یہ لفظ مجازاً متعدد دیگر مفاہیم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح موت سے مراد بھی صرف سانس کا بند ہو جانا

موت کا مجازی مفہوم

یا طبعی طور پر مرجانا نہیں، یہ مجازاً متعدد معانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً جس چیز کی حرکت بند ہو جائے اور اس طرح اس پر جمود طاری ہو جائے۔ عربوں کے ہاں اس کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے مَاتَتِ الرِّیْحُ۔ یعنی ہوا رک گئی، ساکن ہو گئی۔ یا جس چیز میں قوت اور حرارت نہ رہے اس کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا مَاتَتِ النَّارُ کے معنی تھے آگ بجھ گئی۔ یا جس چیز میں جوش اور ولولہ نہ رہے اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا تھا مَاتَتِ الْخَمْرُ کے معنے تھے شراب میں تیزی اور تندی باقی نہ رہی۔ بنابریں قرآنِ کریم میں بھی یہ لفظ ضعف و ناتوانی، ذلت و مسکنت، اضمحلال اور شکست خوردگی، قوت نمو کے باقی نہ رہنے یا عقل و شعور کے معطل یا مفقود ہو جانے کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے۔
مثلاً سورۃ البقرۃ میں، بنی اسرائیل ہی کے واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا۔ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (۲/۲۴۳) "تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو دشمن کے مقابلہ کے لئے ہزاروں کی تعداد میں گھر سے نکلے لیکن جب وہ دشمن کے سامنے آئے تو ان پر موت کا خوف اس طرح طاری ہو گیا کہ وہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تو اللہ نے ان سے کہا کہ جاؤ، مرجاؤ۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حیاتِ تازہ عطا کر دی"۔ ظاہر ہے کہ یہاں ان کی شکست خوردہ ذہنیت کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوبارہ ہمت اور حوصلہ عطا ہو ہو جانے کو حیات کہکر پکارا گیا۔

قرآنِ کریم میں، زمین مردہ (بنجر زمین) میں حیاتِ تازہ (پیداوار کی صلاحیت) پیدا ہو جانے کے لئے یہ لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً (۲/۱۶۴)۔ سورۃ النمل میں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ

الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (۲۷/۸۰) "اے رسولؐ! تو نہ مُردوں کو سنا سکتا ہے اور نہ ہی ان بہروں کو، جنہیں بلایا جائے تو وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں۔" اس سے اگلی آیت میں ہے کہ "تو اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔ تو انہی کو سنا سکتا ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔" سورۃ یٰسین میں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) "یہ انہی کے لئے تنذیر کا موجب بن سکتا ہے جو زندہ ہیں۔" قرآنی رہنمائی کی روشنی کے متعلق سورہ الانعام میں ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (۶/۱۲۲) "ذرا سوچو، کہ وہ شخص جو مردہ ہو، پھر اُسے زندگی عطا کر دی جائے اور اُسے ایک شمع ہدایت دیدی جائے جس کی روشنی میں وہ دنیا میں چلے پھرے۔ کیا یہ شخص اس کے برابر ہوگا جو ایسے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے، جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو۔"

میدانِ جنگ تو ہوتا ہی طبعی موت کی آماجگاہ ہے۔ لیکن قرآن کریم میں جہاد (جنگ) کے لئے بلانے کو زندگی کی طرف دعوت، کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴) "اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول کی اُس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔"

بعث کا مفہوم

ان، اور انہی جیسے دیگر متعدد مقامات سے واضح ہے کہ موت کے معنے ہر جگہ طبعی موت نہیں۔ اس کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۲/۵۶) میں دوسرا لفظ بعث ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں جو چیز آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں حائل ہو اُسے راہ سے ہٹا دینا۔ مختلف رکاوٹوں کو دور کر کے کسی کی حرکت کو جاری کر دینا۔ اس اعتبار سے اس کے معنے کسی کو اُٹھا کھڑا کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ بعثتِ انبیاء کا یہی مفہوم ہے۔ اور بَعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ کے معنے ہیں، موت کے بعد زندگی عطا کر دینا۔ قرآن کریم میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۱۷/۷۹)۔ "تمہارے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دُور کر کے، تمہیں بہت جلد مقامِ محمود تک پہنچا دیا جائے گا۔"

ان مفاہیم کی رُو سے آیۂ زیرِ نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل نے اپنی عقل و بصیرت کی صلاحیت بھی کھو دی تھی اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو بھی پسِ پشت ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس قسم کے تقاضے کر دیا کرتے تھے کہ ہم خدا کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی فکری اور اعتقادی موت تھی جس سے ان پر جمود طاری ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر ایک موقعہ عطا کیا۔ ان کی اس ذہنی اور اخلاقی موت کے بعد، ان کے موانعات کو دور کر کے اُنہیں

پھر سے حیاتِ تازہ عطا کر دی تاکہ ان کی کوششیں ضائع نہ ہوں بلکہ بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں اس واقعہ کے ضمن میں کہا: اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (۷/۱۵۵)" یہ ایک بھٹی تھی جس میں سے وہ گزرے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں بھسم ہو کر راکھ ہو جاتے یعنی انہیں کبھی سیدھا راستہ دکھائی نہ دیتا لیکن خدا نے اپنے قانونِ مشیت کی رُو سے ان کی پھر سے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر دی" یہ تھی موت کے بعد ان کی دوبارہ زندگی۔

جہاں تک راستے کے موانعات کے دور کر دینے (بعث) کا تعلق ہے، ان کی طبیعی زندگی کی مشکلات اور پریشانیاں بھی دور کر دیں اور انسانی زندگی کی بھی۔ طبیعی زندگی کی سہولتوں کے متعلق فرمایا:-

۲/۵۷ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ۔ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ وَمَا ظَلَمُوْنَا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔

"اے بنی اسرائیل! تم خدا کی ان نعمتوں کو بھی یاد کرو کہ اس نے ان صحراؤں میں، تمہارے سر پر بادلوں کے سائے کر دیئے۔ کھانے کے لئے من و سلویٰ جیسی غذا عطا کر دی جس کے لئے تمہیں کچھ محنت اور مشقت کرنی نہیں پڑتی تھی......"

ظِلّ کے معنی

یہاں بادلوں کے ساتھ ظَلَّلْنَا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے سایہ کے ہوتے ہیں چونکہ عربوں کا ملک نہایت گرم ہے اور وہاں درختوں کی بہت کمی، اس لئے ان کے ہاں سایہ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ راحت و آسائش کی ہر شے کو "ظِلٌّ" سے تعبیر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جنت کو بھی ظِلٌّ کہکر پکارتے تھے۔ اسی نہج سے قرآن کریم نے جنت کے سلسلے میں ظِلٰلٌ کا لفظ متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے (ملاحظہ ہوں ۳۶/۵۶؛ ۷۷/۴۱ وغیرہ)۔ لہٰذا آیۂ زیرِ نظر میں ظَلَّلْنَا کے لفظ میں آسائش و راحت کا مفہوم بھی شامل ہے۔

لفظِ غمام جمع ہے غَمَامَةٌ کی۔ اس کے بنیادی معنے کسی چیز کو ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اور چونکہ بادل، سورج کو ڈھانپ لیتا ہے اس لئے عرب اس لفظ کو بادلوں کے معانی میں بھی استعمال کرتے تھے۔

آیت میں، من و سلویٰ کے ساتھ، اَنْزَلْنَا آیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ سینکڑوں مقامات پر آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے بلندی سے نیچے کی طرف آنے کے ہیں لیکن اس کا مجازی استعمال متعدد انداز میں ہوتا ہے۔ جو چیز خدا کی طرف

نزول کے معنی

سے عطیہ کے طور پر ملے اس کے لئے یہ لفظ عام طور پر آتا ہے۔ اسی لئے بارش اور زمینی پیداوار کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحدید میں ہے وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ (۵۷/۲۵)۔ "اور ہم نے لوہا نازل کیا"۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنے معدنیات کے بلا مزد و معاوضہ عطا ہونے کے ہیں۔ (یہاں ہم اس لفظ کے انہی معانی تک محدود رہتے ہیں۔ نزولِ قرآن کریم کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی)۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا کہ خدا نے تمہیں مَنّ اور سلوٰی بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیا۔ مَنّ، شیرخشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی اور بڑی لذیذ گوند ہوتی ہے جو صحرا کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے۔ لیکن مَنّ کے معنے احسان کے بھی ہیں۔ اس لئے اس لفظ میں کنایۃً یہ مفہوم بھی شامل ہو گا کہ یہ غذا تمہیں خدا کی طرف احساناً عطا ہوئی تھی۔ اسی طرح

منّ و سلوٰی

سلوٰی بٹیر کی قسم کا ایک پرندہ ہوتا ہے لیکن (مادہ کے اعتبار سے) اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو کسی کے لئے وجہ تسلّی ہو۔ بنابریں من و سلوٰی کے الفاظ میں طبعی غذا کے ساتھ معنوی کنایات بھی شامل ہیں۔ (سایہ فگن بادلوں اور من و سلوٰی کا ذکر ۷/۱۶۰ ؛ ۲۰/۸۰-۸۱ میں بھی آیا ہے)۔

رہنے کے لئے کھلی فضا، سایہ کے لئے بادل، کھانے کے لئے من و سلوٰی اور عقب کی طرف سے حفاظت کے لئے طُور جیسا پہاڑ، جس کا ذکر (۲/۶۳ ؛ ۲/۹۳ ؛ ۴/۱۵۴) میں بھی آیا ہے۔

یہ ان کی طبیعی زندگی کے لئے سامانِ نشو و نما تھا۔ سیکولر نظام میں بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم طبیعی سامانِ حیات سے متمتع ہونے کے لئے ایک شرط بھی عائد کرتا ہے اور وہ یہ کہ كُلُوا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ (۲/۵۷)۔ اس نے رزق کے ساتھ "طیّب" کی شرط التزاماً لگائی ہے اور یہی شرط قرآن کے معاشی نظام کو کمیونزم کے نظام سے

رزقِ طیّب کا مفہوم

متمیز اور ممتاز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں طیّب کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ لغت کی رُو سے اس کے بنیادی معنی ہر وہ چیز ہے جو طبیعی طور بھی انسان کے لئے پسندیدہ خوشگوار، خوش ذائقہ اور ممدِ صحت ہو اور وہ انسانی ذات کے لئے بھی نشو و نما اور بالیدگی کا موجب ہو۔ قرآن کریم نے کھانے کی بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور باقی چیزوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ حلال ہیں۔ لیکن حلال کے ساتھ اس نے طیّب کا اضافہ بھی کیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کھانے پینے کی حلال اشیاء میں سے تمہیں جو پسند ہوں، جو تمہارے لئے خوشگوار ہوں، جو ممدِ صحت ہوں، انہیں کھاؤ پیو۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال چیز کے کھانے کا حکم دیدیا گیا۔

قرآن کریم نے انسان کے حسن ذوق کی رعایت بھی رکھی ہے۔ اسی لئے حلال چیزوں میں سے انتخاب انسان کی پسندیدگی پر چھوڑا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی ذات کا تعلق ہے اس کے لئے طیّب وہی رزق ہو گا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق (جائز اور حلال طریق سے) حاصل کیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ فَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۷)۔ "جو مومن بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ شامل کرے گا، خواہ وہ عورت ہو، خواہ مرد، ہم اسے نہایت طیب زندگی عطا کریں گے اور ان کے حسنِ عمل کا نہایت حسین نتیجہ مرتب کریں گے۔ یعنی ان کی حیاتِ طیبہ ان کے ایمان اور حسنِ عمل کا فطری نتیجہ ہوگی"۔ ظاہر ہے کہ اس میں دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں کے علاوہ، انسانی ذات کی نشو و نما بھی شامل ہے اور یہی وہ چیز ہے جو طبعی طور پر خوشگوار رزق کو رزقِ طیب بناتی ہے۔ حلال اور طیب رزق کے ضمن میں تفصیلی گفتگو پہلی جلد میں بھی ہو چکی ہے (ملاحظہ ہوں آیات ۲/۳؛ ۲/۱۱-۱۲؛ ۲/۲۲؛ ۲/۲۹) اور اس جلد میں بھی (زیرِ آیت ۲/۳۰)۔ لہٰذا اس نکتہ کی مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں بجز ایک نکتہ کے۔ اور وہ یہ کہ رزق کے طیّب ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے کوئی شخص اپنے لئے مخصوص کر کے نہ دبا بیٹھے۔ وہ تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا ہو۔ اس میں سب حاجتمند برابر کے شریک ہوں۔ چنانچہ یہ شرط بنی اسرائیل پر بھی عائد کی گئی تھی۔ بائبل میں ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خدا کی طرف سے من و سلویٰ ملا تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ:۔

> یاد رکھو۔ یہ وہ روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ اس میں سے ہر ایک بقدر اپنے کھانے کے لے، اور جس کے خیمے میں جتنے لوگ ہوں، ایک اُدمر فی کس کے حساب سے جمع کرے۔ اس سے زیادہ کوئی شخص جمع نہ کرے جس نے ایسا کیا اس کے رزق میں کیڑے پڑ جائیں گے۔
>
> (خروج - ۱۶/۱۶-۲۰)

اس انداز کو قرآن کریم رزق کے طیب ہونے کی ایک شرط بتاتا ہے۔

قرآن کریم نے یہ کچھ کہنے کے بعد ایک اور عجیب نکتہ کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے لوگوں اور ان کے بعد آنے والوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ تم جو یہودیوں کی اس قدر ذلّت و نکبت کی زندگی دیکھ رہے ہو تو یہ نہ سمجھو کہ ہم نے ان پر خواہ مخواہ ظلم کر رکھا ہے۔ ہم نے تو انہیں اس قدر نعمتوں سے نوازا تھا لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی ناقدر شناسی کی اور اس طرح اپنے آپ پر خود ظلم کیا جس کا نتیجہ ان کی ذلّت و خواری کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ——— ہم کسی پر ظلم کیا ہی نہیں کرتے۔

بنی اسرائیل کو، قومِ فرعون کی غلامی سے نجات دلائی گئی۔ اس کے بعد انہیں صحرائے سینا میں بسایا گیا۔ اگرچہ ان کی زندگی کی اس منزل میں بھی انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا گیا لیکن یہ ان کی زندگی کا منتہیٰ اور مستقل مستقر نہیں تھا۔ یہ تو محض راستے میں ستانے کا مقام تھا۔ ان کا آخری مقام کچھ اور تھا جس کا ذکر سورۃ القصص میں ان الفاظ میں آیا ہے کہ: وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ (۲۸/۵-۶)۔ "ہمارا پروگرام یہ تھا کہ یہ قوم، جسے فرعون کے ظلم و استبداد نے اس قدر کمزور اور ناتواں بنا کر رکھ دیا تھا، ان پر اپنا احسان کریں۔ انہیں مملکتِ فرعون ہی کے ایک علاقہ کا وارث بنائیں، وہاں انہیں تمکن عطا کریں اور اس طرح دیگر اقوام کی امامت ان کے حصے میں آجائے۔" (نیز ۷/۱۳۷؛ ۲۶/۵۷-۵۹؛ ۳۲/۲۴)۔ اس کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں کہا ہے:-

۲/۵۸ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۔

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: "اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اِس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں، جہاں چاہو فراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور حِطَّةٌ کہتے ہوئے۔ بخش دیں گے ہم تمہارے گناہ اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ بھی دیں گے۔"

خلافتِ ارضی

اس آیت میں قریہ سے مراد کوئی خاص بستی نہیں بلکہ فلسطین کی سرزمین ہے جس کا انہیں وارث بنانا مقصود تھا۔ اُس سرزمین کے متعلق چار الفاظ میں یہ بتایا کہ وہاں تمہیں جنتِ ارضی کی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کے الفاظ جنتِ آدم کے سلسلے میں آیت (۲/۳۵) میں آچکے ہیں۔ وہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ اس سے مقصود کیا تھا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھدی گئی ہے۔ اب تم آگے بڑھو اور اس کا قبضہ لے لو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں خاص تنبیہ بھی کر دی اور یہ وہ تنبیہ ہے جو کسی ملک میں عام فاتحین اور مومنین کے لشکر کے داخل ہونے میں بیّن امتیاز پیدا کر دیتی ہے۔ عام فاتحین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوحہ علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو قوت کا نشہ انہیں بدمست کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ مفتوح و مغلوب آبادی کو ایسے ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں جس سے انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ سابقہ اقوام کے سلسلے میں تاریخ کے خونی اوراق، فاتح قوم کی اس وحشت و بربریت

کی داستانوں سے ملوث ہیں اور عصرِ حاضر کی اقوام، مفتوحہ علاقوں کے ساتھ کیا کچھ کرتی ہیں وہ ہمارے آنکھوں دیکھے مناظر ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو ملکۂ سبا کے ان عبرت آموز الفاظ میں تمام دنیا کے لئے باعثِ موعظت بنایا ہے کہ: قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۚ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (۲۷/۳۴)۔ ملکہ سبا نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے پوچھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی چٹھی کا کیا جواب دینا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ان سے کہا کہ اپنا مشورہ دیتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا کہ جب بادشاہ، کسی ملک

مسلم فاتحین کی خصوصیت

میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتے ہیں تو وہاں کیا کچھ کرتے ہیں۔ وہ وہاں کی ہر شے کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ وہاں کے معزز اور سربرآوردہ ابنائے قوم کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں ـــ اور اسے بھی فراموش نہ کرنا کہ کسی خاص بادشاہ کی روش نہیں، یہ ملوکیت کا خاصہ ہے۔ بادشاہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور یہی تھی قوت کے نشہ میں مدہوش ملوکیت کی وہ ذہنیت، جسے بدلنے کے لئے بنی اسرائیل کو تنبیہ کی گئی کہ اس سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہونا تو اس انداز سے کہ تمہاری گردنیں قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہوں (سُجَّدًا)۔ دیکھنا! تمہارے سر میں سرکشی کے جذبات نہ اُبھر آئیں ان بستیوں میں متکبر اور جابر بن کر داخل نہ ہونا۔ اپنے سر کو جھکاتے ہوئے داخل ہونا۔ اس کے ساتھ دوسرا لفظ حِطَّةٌ ہے۔ اور یہ تنبیہ بھی بڑی عبرت آموز ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ و جدال میں سپاہیوں سے کوئی نہ کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے۔ کہا کہ فاتحانہ طور پر داخل ہوتے وقت اپنی ان لغزشوں پر نظر رکھنا جو تم سے سرزد ہو چکی ہوں۔ جب تمہاری نگاہیں اپنی لغزشوں پر مرکوز ہوں گی تو تمہارے دل میں تمرّد اور سرکشی کے جذبات نہیں ابھریں گے۔ فروتنی اور انکسار کے جذبات بیدار ہوں گے۔ اور دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ اس سرزمین کو اب تمہارا مستقر بننا ہے اس لئے اس کا بھی خیال رکھنا کہ اگر تم نے وہاں کسی چیز کو تباہ اور برباد کر دیا تو وہ تباہی اور بربادی خود تمہاری ہو گی کیونکہ وہ چیزیں تو اس کے بعد خود تمہاری اپنی زندگی کا سامانِ زیست بننے والی ہیں۔ انہیں دشمن کی چیزیں نہ سمجھنا، اپنی سمجھنا۔

لغت کی رو سے حِطَّةٌ کے یہ دونوں معانی ہیں ـــ اپنی لغزشوں کی معافی مانگنا اور اس منزل پر سامانِ سفر کو اتار دینا۔ یہی تھی وہ تلقین، جو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی لسانِ مبارک سے خود جماعتِ مومنین سے کی گئی جب کہا کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۱-۳)۔ جب خدا کی نصرت تمہارے شاملِ حال ہو جائے تمہارے سامنے فتوحات کے دروازے کھل جائیں اور تمہارے نظام کے ان خوشگوار نتائج کو دیکھ کر

لوگ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہونے شروع ہو جائیں تو اس وقت یہ نہ سمجھ لینا کہ اب مقصد حاصل ہو گیا۔ اصل پروگرام تو اس وقت شروع ہو گا۔ اس لئے تم خدا کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل کے لئے پہلے سے بھی زیادہ شدت کیساتھ سرگرمِ عمل رہنا اور خدا سے سامانِ حفاظت طلب کرنا۔ وہ تمہاری کوتاہیوں اور لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ رکھے گا۔ یہی تھی وہ تنبیہ جو بنی اسرائیل کو کی گئی اور اس کا نتیجہ بھی انہی الفاظ میں بیان کیا گیا کہ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (۲/۵۸)۔ یہاں مغفرت کا لفظ پہلی بار آیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے صحیح مفہوم کا سامنے آنا نہایت ضروری ہے۔

مغفرت کے معنی

قرآنِ کریم کی رو سے قانونِ مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم آیات (۲/۴۸ ; ۲/۵۲) میں سابقہ صفحات پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے عمومی طور پر مغفرت کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا اور یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ ہمارے ہاں جو کہا جاتا ہے کہ "گناہ بخشے جائیں گے"۔ تو یہ تصور بھی قانونِ مکافات کے خلاف ہے۔ سفارش (شفاعت) کا عملی مقصد بھی تو یہی ہوتا ہے کہ مجرم کو بخش دیا جائے۔ اُسے اس کے جرائم کی سزا نہ دی جائے۔ جب قرآن کریم کی رو سے کسی مجرم کی سفارش نہیں ہو سکتی تو اس کے جرائم یا گناہوں کے بخشے جانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لغت کی رُو سے غَفْرٌ کے معنے ہیں کسی کو ایسی چیز پہنا دینا جس سے وہ نقصان رساں چیزوں سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اَلْمِغْفَرُ زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جالی کو کہتے تھے جو خود کے نیچے پہنی جاتی تھی اور جو گردن اور مونڈھوں کو اس طرح ڈھانپ لیتی تھی کہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہیں ہوتا تھا اور اس طرح اس کا پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہتا تھا۔ اس مادہ کے اس بنیادی مفہوم کی روشنی میں مغفرت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ جسمانی طور پر دیکھئے تو انسان پر ہر آن ایسے جراثیم کا حملہ ہوتا رہتا ہے جو اس کی صحت اور آخرالامر اس کی زندگی کو تباہ کر دیں۔ لیکن فطرت نے انسان کے اندر ایسی قوتِ مدافعت رکھی ہے جو ان تخریبی عناصر کا مقابلہ کرتی ہے اور ان پر غالب آکر انہیں ہلاک کر دیتی ہے۔ یوں انسان ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر کبھی یہ تخریبی عناصر وبائی امراض کی شکل اختیار کر لیں تو لوگوں کو حفاظتی تدابیر (PREVENTIVE MEASURES) اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جائے اور یہ تخریبی عناصر غلبہ پالیں تو معالج اس بیمار کی قوتِ مدافعت بڑھانے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ اگر یہ قوت بڑھ جائے تو یہ ان تخریبی عناصر کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ان تدابیر کو (CURATIVE MEASURES) کہا جاتا ہے۔ حفظِ ماتقدم کی تجاویز ہوں یا علاج کی تدابیر، انہیں بہرحال ہلاکت سے محفوظ رکھنے کی تدابیر کہا جائے گا۔ طبیعی زندگی میں یہ مغفرت ہے اور ایسی تدابیر، طلب اور اختیار کرنے کو

استغفار کہکر پکارا جائے گا — استغفار کے معنی ہیں مغفرت (حفاظت) طلب کرنا۔

طبیعی زندگی کی طرح انسانی ذات کی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کی نشوونما اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان عناصر کے حملوں سے بچنے کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں جو اس کی تخریب کا موجب ہوں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ وہ تخریبی عناصر انسانی ذات پر غالب آجائیں تو پھر ایسی تدابیر کی ضرورت اشد ہو جائے گی جو انسانی ذات کی تقویت کا موجب بنیں۔ یعنی اقدارِ خداوندی پر اور شدت سے عمل کیا جائے۔ اس پروگرام کے مطابق حفاظت مل جانے کو مغفرت کہا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسے میزان کی تشبیہ سے محسوس طور پر سمجھایا ہے اس نے کہا ہے کہ انسانی زندگی کے دو پلڑے ہیں۔ ایک پلڑے میں تعمیری عناصر (نیکیاں) ہوتی ہیں اور دوسرے میں تخریبی عناصر (برائیاں یا گناہ)۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۱۰۱/۶-۷) "جس کا نیکیوں کا پلڑا جھکا رہے گا وہ خوشگوار زندگی بسر کرے گا" وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۸-۹)۔ لیکن جسکا یہ پلڑا ہلکا ہو جائے گا وہ تباہی کے جہنم میں جا گرے گا۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اس وقت تباہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کے تعمیری اعمال کے پلڑے میں اور وزن ڈال دیا جائے یعنی زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کئے جائیں۔ اس طرح تباہی سے حفاظت مل جانے کو مغفرت کہا جاتا ہے اور استغفار کے معنے ہوتے ہیں اس حفاظت کے لئے جد و جہد کرنا۔ قرآن کریم نے دو لفظوں میں بتا دیا ہے کہ تباہی سے یہ حفاظت ملتی کیسے ہے۔ اور یہ وہ بنیادی اصول ہے جو اس تمام مسئلہ کی نہایت عمدگی سے وضاحت کر دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ:-

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴ نیز ۱۳/۲۲ ; ۲۳/۹۶ ; ۲۸/۵۴)۔

یاد رکھو! تباہی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری (نیک کام) کرو۔ سیئات کو حسنات ہی دور کر سکتی ہیں۔

تمہاری حسنات کا وزن تمہارے تعمیری پلڑے کو جھکا دے گا۔ اسے خدا کی مغفرت کہا جاتا ہے۔

بخشش کا غیر قرآنی تصور

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے مغفرت کا تصور۔ لیکن اس کے معنے "بخشش" کر دینے سے قوم پر جو تباہیاں آئیں اور آرہی ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ قوم تباہ کن جرائم پر جرائم کئے چلی جارہی ہے، اخلاقی پستیوں کی آلائش میں ملوث ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کے باوجود مطمئن ہے کہ خدا یہ سب کچھ بخش دے گا۔ اس بخشش کے لئے کرنے کا کام اتنا

ہی ہے کہ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ یا اللہ بخش دے۔ یا۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ کی تسبیحیں پھیرتے رہو۔ یہ ہے وہ فریبِ نفس جس نے ہماری قوم کو جرائم اور بداخلاقیوں پر اسقدر جری کر دیا ہے۔ جب یقین یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سب جرائم بخش دے گا تو پھر وہ کونسا احساس ہے جو انسان کو غلط کوشیوں سے باز رکھ سکے؟ قرآن کریم نے قدم قدم پر کہا کہ جنت صرف تمہارے اعمال کے بدلے میں ملے گی۔ لیکن ہم ہیں کہ جنت بھی خدا سے بخشش کے طور پر مانگتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کسقدر درد و سوز سے (بظاہر طنزیہ انداز میں) کہا ہے کہ:-

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است ✧ بہشتے بہرِ اربابِ ھمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش ✧ بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

(ارمغانِ حجاز)

اور اس "فی سبیل اللہ" عطا شدہ بہشت کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتے ہیں:-

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ   تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

اور یہ کہکر انہوں نے جزائے عمل کے قرآنی مفہوم کو ایک مصرعے میں سمو کر رکھ دیا، کہ:-

جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اس سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو تو خدا کے حضور سر جھکائے ہوئے اور اپنی لغزشوں کے تباہ کن نتائج سے سامانِ حفاظت طلب کرتے ہوئے داخل ہو۔ ایسا کرو گے تو ہم تمہیں ان نقصانات سے بھی محفوظ رکھیں گے اور وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ (۲/۵۸) اس پر کچھ اضافہ بھی کریں گے۔ یہ "اضافہ" مزید حسنات کا متقاضی ہے۔

محسنین کا مادہ (ح۔س۔ن) ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت (قبل از اسلام) کے عرب بالعموم جاہل، گنوار اور وحشی تھے جنہیں نہ ذوقِ سلیم سے کوئی واسطہ تھا، نہ حسِ لطیف سے کوئی بہرہ۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔

حسن کا مفہوم

زیادہ تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں، لیکن ان کے ذوقِ لطیف کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے ہاں حسن کی تعریف تھی "صحیح صحیح توازن اور تناسب" (PROPORTION)

ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کی اس سے بہتر اور جامع تعریف ہو نہیں سکتی۔ اور یہ بات وہی قوم کہہ سکتی ہے جسے ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کا بہرہ وافر عطا ہوا ہو۔ حسن کا نام ہی صحیح تناسب کا ہے۔ کسی حسنِ مجسم، پری پیکر کی ایک آنکھ کی سیاہی بال برابر اپنے مقام سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کی ساری رعنائیاں شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور ذوقِ لطیف اس سے اِبا

کرنے لگ جاتا ہے۔ توازن کا ذرا سا بگاڑ بھی حسن کو ختم کر دیتا ہے۔

اور قرآنِ کریم کو دیکھئے کہ اس نے صحیح اعمال کو حسنِ عمل کہہ کر پکارا ہے۔ اور ان کی جزا یا نتیجہ کو بھی حسن سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ ہم انسان اور نفس کے عنوانات میں بتا چکے ہیں، انسان کو مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں۔ ان متضاد صفات یا صلاحیتوں میں صحیح صحیح توازن برقرار رکھنا، حسنِ عمل کی معراج ہے۔ صفاتِ

الاسماء الحسنٰی

خداوندی کے لئے قرآنِ کریم میں اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی (۵۹/۲۴) کے الفاظ آتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جس میں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کے ساتھ انتہائی حسن کارانہ انداز سے یکجا جمع ہیں یہی انداز جب (علیٰ حدِ بشریت) انسانی ذات میں پیدا ہو جائے تو اُسے "خدا کے رنگ میں رنگے جانے" سے تعبیر کیا جائے گا۔ (۲/۱۳۸)۔ تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے: اَلَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ (۳۲/۷)۔ "خدا نے کائنات کی ہر شے کو بہترین تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" اس نہج سے خدا کو: اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ (۲۳/۱۴) کہا گیا ہے۔ خدا نے جو دین انسانوں کے لئے متعین کیا وہ بھی احسن ہے۔ چنانچہ سورۃ النسآء میں ہے: وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِیۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُحۡسِنٌ (۴/۱۲۵)۔ "اس نظامِ زندگی سے زیادہ حسین نظام اور کونسا ہو سکتا ہے جس میں ہر فرد اپنے جذبات، توجہات، بلکہ پوری کی پوری ذات کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دے اور اس طرح نہایت حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے۔" ایسا دین عطا کرنے والے خدا کے متعلق کہا: وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکۡمًا (۵/۵۰)۔ "خدا سے بڑھ کر احسن احکام دینے والا کون ہو سکتا ہے؟" اسی جہت سے خود قرآنِ کریم کو اَحۡسَنُ الۡحَدِیۡثِ (۳۹/۲۳) کہا گیا۔ سورۃ اللیل میں ہے وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰی وَکَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی (۹۲/۸-۹)۔ "جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیتا ہے اور پھر اس خیال میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج نہیں اور معاشرے کے حسن کو بگاڑ دیتا ہے۔" آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے نظامِ سرمایہ داری کے متعلق کہا ہے کہ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے اس سرمایہ داری کے نمائندہ "قارون" کے بارے میں کہا کہ: وَاَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ (۲۸/۷۷)۔ "جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو دور کر دیا ہے اسی طرح تمہیں بھی چاہیئے کہ تم معاشرے کی ناہمواریاں دور کر دو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ خدا فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" معاشرے میں حسن پیدا کرنے یعنی اس کی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے بنی اسرائیل (اور خود جماعتِ مومنین) سے کہا گیا کہ: وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا (۵/۱۲)۔ عام ترجمہ تو ان الفاظ کا یہ ہے کہ "تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو" لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ جس کے پاس زائد از ضرورت دولت ہو وہ دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے دیدے تاکہ اس طرح معاشرے کا حسن (توازن) برقرار رہے۔ دوسری جگہ یہ کہا کہ: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ (۱۷/۷)۔ "اگر تم اسطرح معاشرے کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود تمہاری ذات

کا توازن برقرار رہے گا"۔ یہاں سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآنِ کریم کی رو سے اعمالِ حسنہ یا حسنات کے معنے کیا ہیں۔ اس سے مراد ہیں ایسے کام، جن سے معاشرے کا بگڑا ہوا توازن درست ہو جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایسے کام کرنے والوں کی اپنی ذات کا بھی توازن برقرار رہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ اس قسم کے کام کرنے والوں کو قرآنِ کریم میں محسنین کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس سلسلے میں کہا ہے کہ حضرات انبیائے کرام سب محسنین تھے (۶/۸۵)۔

عدل و احسان

قرآنِ کریم نے کہا ہے: إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (۱۶/۹۰) "تمہیں اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے"۔ عدل کے معنے تو یہ ہیں کہ جو کچھ کسی کا واجب ہے اسے دیدیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس سے اس کی ضروریات پوری نہ ہو سکتی ہوں تو کیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ یہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ کہا کہ نہیں۔ اس کی کمی کو پورا کیا جائے تاکہ اس سے اس کا بگڑا ہوا توازن برقرار رہے۔ اسے احسان کہتے ہیں جو قرآن کریم کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حکم دیا ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (۶/۱۵۲) اس کے معنے یہ ہیں کہ جب والدین ضعیف ہو جائیں تو ان میں مختلف نوعیتوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اولاد کو چاہیئے کہ ان کی اس کمی کو پورا کرے۔ اِسی کا نام احسان ہے۔

اِحسان کا بدلہ احسان

سورۃ الرحمٰن میں ایک عظیم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور مفہوم اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص تم پر احسان کرے تو تم بھی اس پر احسان کرو اور اس طرح اس کے احسان کا بدلہ چکا دو۔ چنانچہ احسان فراموش کو معاشرے میں بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا یہ قرآنی مفہوم نہیں۔ قرآنِ کریم نے تو مومنین کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ جب کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہیں تو اس سے کہہ دیتے ہیں: لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَلَا شُكُورًا (۷۶/۹)۔ "ہم نے تمہارے لئے جو کچھ کیا ہے۔ تم سے اس کے بدلے میں کچھ لینا تو درکنار، ہم تو اس کے لئے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے یہ کچھ تمہارے لئے نہیں کیا۔ لِوَجْهِ اللّٰهِ کیا ہے۔ جس قرآن کی یہ تعلیم ہو، کیا وہ یہ کہے گا کہ اگر تم کسی پر احسان کرو تو اسے اپنا بے دام غلام بنالو اور جب تک وہ اس کا بدلہ نہ چکادے اس کے سر پر سوار رہو؟ اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم بڑا بلند ہے۔ قرآن کریم کہتا یہ ہے کہ معاشرے یا کسی فرد میں کسی قسم کی کمی آجانے سے اس کا توازن بگڑ جائے، تو تمہارا فریضہ ہے

کہ اس بگڑے ہوئے توازن کو سنوار دو۔ لیکن اس کے لئے کسی معاوضہ یا صلہ کے متمنی مت ہو۔ تم نے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کرنا ہے۔ یہ تمہارا فریضہ ہے۔ وہ برقرار ہو گیا۔ بس یہی تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔

ع صلۂ شہید کیا ہے، تب و تاب جاودانہ

اب آئیے آیۂ پیشِ نظر کی طرف، جس میں کہا گیا ہے: نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۵۸)۔ "اگر تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے رہو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری حفاظت کر دی جائے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تمہارے لئے اس سے بھی زیادہ کیا جائے گا۔ آپ مریض کی مثال کو، جو پہلے بیان کی گئی ہے، ایک بار پھر سامنے لائیے اس میں بتایا گیا ہے کہ جب کسی کی قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے تو مہلک عناصر اس پر غالب آ جاتے ہیں۔ معالج اس مریض کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیتا ہے جس سے وہ ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن علاج کا مرحلہ، یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ معالج اسے مزید مقویات دیتا ہے تاکہ اس کی قوتِ مدافعت بڑھ جائے اور وہ اس طرح تخریبی عناصر کے حملوں سے محفوظ رہے۔ یہ ہے مراد وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۵۸) سے۔ یعنی اگر تم حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرو گے تو تمہیں تمہاری لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ ہی نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ تمہاری صلاحیتوں کو اس قدر مستحکم کر دیا جائے گا کہ تم زندگی کے بقیہ سفر کو بھی بخیر و عافیت طے کر سکو گے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں (ایک اور مقام پر) ایسا عمیق نکتہ بیان کیا گیا ہے جس پر غور کرنے سے نگۂ بصیرت رقص کرنے لگ جاتی ہے۔ اس نے اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے: لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰/۳۵)۔ "اہلِ جنت جو کچھ چاہیں گے، انہیں ملے گا۔۔۔ بلکہ ہماری طرف سے اس سے بھی زیادہ"۔

جو چاہو گے اس سے بھی زیادہ

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جنت میں، اہلِ جنت کی ہر خواہش پوری ہو جائے گی تو پھر اس سے زیادہ کا کیا سوال پیدا ہو گا؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کی خواہشیں اور آرزوئیں اس دائرے تک محدود ہوتی ہیں جس کے اندر وہ زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اس دائرے سے آگے اس کا تصور بھی نہیں جا سکتا لیکن خدا کے پروگرام کی رو سے، انسان نے نہ معلوم زندگی کے کتنے ارتقائی منازل طے کرنے ہیں۔ جنت بھی ان منازل میں سے راستے کا ایک مقام ہے۔ اس سفر کا منتہیٰ نہیں۔ لہٰذا اہلِ جنت کی خواہشات اُس دائرے تک محدود ہوں گی۔ اس سے آگے ان کی نگاہیں جا ہی نہیں سکیں گی۔ لیکن نگۂ خداوندی تو انتہا تک جاتی ہے۔ وہ ان کے حسنِ عمل کے بدلے میں وہ کچھ بھی دے گا جو اُن کی زندگی کی اس وقت کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرے اور اس کے علاوہ وہ انہیں اس قابل بھی بنا دیگا کہ وہ اس سے اگلی منزل کو بھی بحسن و خوبی طے کر سکیں۔ یہ ہے خواہشات سے زیادہ ملنے

کا قرآنی مفہوم۔ یہ ہیں سَنَزِیدُ الْمُحْسِنِینَ کے معنی۔

خدانے تو بنی اسرائیل کے لئے یہ کچھ چاہا تھا لیکن۔

۲/۵۹ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ ۔ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۔(نیز ۷/۱۶۲)

ہمارے ہاں کے مفسرین نے بالعموم کہا ہے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں داخل ہوتے وقت تم حِطَّةٌ کہنا۔ لیکن انہوں نے حِطَّةٌ کی بجائے حِنْطَةٌ کہا (جس کے معنی گندم ہیں) اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہو گیا۔ یعنی ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ کہہ دینے سے ان پر تباہی آگئی۔ یہ مفہوم جس قدر بے معنی ہے اس کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے ہاں مرتب ہوا وہ یقیناً ایسا ہے

الفاظ پر سارا زور

کہ اس پر ٹھہر کر غور کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی آیات کا تلفظ صحیح ہونا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ آیات کا صرف تلفظ صحیح ہونا چاہیئے خواہ ان الفاظ کے معانی سمجھ میں آئیں یا نہ! اس نظریہ کی رو سے ہمارے ہاں صدیوں سے قرآنی الفاظ کے تلفظ کی صحت کو اس قدر اہمیت دی جارہی ہے کہ بس اسی کو دین کا مقصود و مطلوب سمجھ لیا گیا ہے۔ اس نے ایک الگ فن کی حیثیت اختیار کرلی، جسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلم ممالک کے بڑے بڑے جیّد قاری اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے حفاظ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کی صحت پر انتہائی زور دیا جاتا ہے لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو قرآنی الفاظ کے معانی بھی جانتا ہو۔ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک جماعت پیدا ہو گئی

تبلیغی جماعت

ہے جس کا مشن یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا "کلمہ درست" کراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ ساری زندگی اس "جہاد" میں لگے رہتے ہیں کہ لوگ کلمے کے الفاظ صحیح طور پر ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر ان کے نزدیک اس امت پر ساری تباہیاں اس لئے آئی ہیں کہ لوگ کلمے کے الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ اگر امت ان الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنے لگ جائے تو پھر ان کے سب بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔

قرآنی لفظ "قول" کے معنی "بات" ہیں۔ لیکن خود ہمارے ہاں "بات" کا لفظ جن معانی میں بولا جاتا ہے اس سے "قول کے بدل دینے" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ہم ہر روز کہتے ہیں کہ "چلو بھئی! یہاں بات بنتی نظر نہیں آتی"۔ یا یہ کہ "بات بنتے بنتے بگڑ گئی"۔ ظاہر ہے ان فقروں میں بات سے مراد کوئی لفظ نہیں بلکہ معاملہ یا پروگرام

ہے۔ لہٰذا قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے جو پروگرام بنی اسرائیل کے سامنے رکھا تھا، انہوں نے اسے یکسر بدل دیا۔ انہوں نے ہماری بات کو بدل دیا۔ یہ ظلم تھا، فسق تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غضبِ خداوندی کے مستوجب بن گئے۔ یعنی یہاں اللہ تعالیٰ نے خود کہدیا ہے کہ ان پر یہ تباہی اس لئے آئی کہ انہوں نے ظلم اور فسق کی روش اختیار کرلی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ان سے کہا کیا گیا تھا اور انہوں نے کیا کیا؟ سورۃ المائدۃ میں اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۵/۲۱)۔ "دیکھو! یہ ارضِ مقدس تمہارے نام لکھدی گئی ہے۔ اٹھو! اور اس کا قبضہ لے لو۔ دیکھنا دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔" یہ تھی بات جو اُن سے کہی گئی تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰي يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵/۲۲)۔ "اے موسیٰ! اس

ارضِ مقدس پر قبضہ

سرزمین میں تو بڑے بڑے جابر لوگ رہتے ہیں۔ جب تک وہ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے خود ہی نکل جائیں تو پھر ہم ضرور اس میں داخل ہو جائیں گے۔" ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ دشمن خود بخود اپنے ملک کو خالی کر جائے، تو پھر ہم آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کرلیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے ان دو بندوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) نے ان سے کہا کہ تم اس قدر بزدل اور دوں ہمت کیوں ہو رہے ہو؟ ذرا آگے بڑھ کر اس زمین پر قدم رکھو۔ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَي اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵/۲۳)۔ "اگر ایک دفعہ تم نے وہاں قدم رکھ دیا تو پھر غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔ یہ بات تم سے خود خدا نے کہی ہے۔ اگر تمہیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس کی بات پر اعتماد کرو۔" آپ کو معلوم ہے اس کے جواب میں انہوں نے کیا کہا: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵/۲۴)۔ وہ بولے، اے موسیٰ! ہم نے ایک دفعہ جو کہدیا کہ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھائیں گے۔ اگر تم وہاں جانے پر اس قدر ہی تلے بیٹھے ہو تو تم اور تمہارا بھائی دونوں جاؤ۔ ان لوگوں سے جا کر لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے انتظار کریں گے۔ جب تم انہیں وہاں سے نکال دو گے تو ہم آجائیں گے۔" لیجئے جواب مل گیا!!

(ضمناً) اس آیت میں آیا ہے: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ (۵/۲۴)۔ اس کے معنی یہ بھی کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان لوگوں سے لڑو" لیکن عربی زبان میں "رب" بڑے بھائی کو بھی کہتے ہیں۔ میں نے

اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔ بہرحال اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے تو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ سمجھی خدا سے یہ کہا: اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵/۲۵)۔ "بارِ خدایا! میں اپنے آپ یا اپنے بھائی کے سوا کسی پر بھی کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اس قسم کی فاسق قوم میں اور ہم ہیں، تو ہی کوئی فیصلہ کردے"۔ اور خدا کا فیصلہ یہ تھا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵/۲۶)۔ "جب ان کی حالت یہ ہے تو وہ سرزمین، جو ان کے نام لکھدی گئی تھی، چالیس سال تک ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ تم انہیں ان جنگلوں اور صحراؤں میں سرگرداں پھرنے دو۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی اس بدنصیبی پر تمہیں تاسف ضرور ہوگا۔ لیکن جس قوم کی روش یہ ہو اس پر افسوس کرنے سے کیا حاصل"۔ خدا کا یہ فیصلہ اس کے قانونِ وراثتِ ارض کے مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے: اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱/۱۰۵) "زمین کے وارث تو وہی بندے ہو سکتے ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو۔ اس صلاحیت میں صالحیت بھی شامل ہے"۔ چنانچہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس سال تک جنگلوں اور صحراؤں میں لئے لئے پھرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی نوجوان نسل کی تربیت بھی کرتے رہے۔ جب یہ نئی نسل تربیت پاکر جوان ہوئی تو انہوں نے ایک جھپٹا مارا اور فلسطین کی موعودہ سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ قوموں کی بازآفرینی کا طریقہ ہی یہ ہے کہ ان کے قدامت پرست، فرسودہ خیال اور رجعت پسند عنصر کو الگ کر کے نئی نسل کے افراد کی تعلیم و تربیت جدید ماحول میں نئے خطوط پر کی جائے تاکہ وہ تازہ ولولے اور زندہ عزائم لے کر ابھریں اور ہر مخالف قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیں۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے اپنی اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ:

من کہ نومیدم ز پیران کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن
برجواناں سہل کن حرفِ مرا — بہرشاں پایاب کن ژرفِ مرا

اسی لئے ان کی دعا یہ تھی کہ:

جوانوں کو مری آہ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

بہرحال قرآنِ کریم میں ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر رِجْز کی مار ماری گئی۔ یہاں رِجْز کا لفظ بڑا غور طلب ہے۔ (اَلرَّجَزُ) اونٹ کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اس کی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے اور کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین جھٹکوں کے بعد کہیں اٹھنے

کے قابل ہوتا ہے (ہمارے ہاں بیلوں کو بھی یہ مرض عاید ہو جایا کرتا ہے)۔ لہٰذا اس کے معنی ہیں کسی قوم کا اس قدر کمزور ہو جانا کہ وہ بمشکل اُٹھنے کے قابل ہو سکے۔ اسے قرآن کریم نے رِجْزٌ کہکر پکارا ہے۔ جنگِ بدر کے سلسلے میں قرآن کریم میں آیا ہے کہ وہاں خدا نے ایسے سامان پیدا کر دیئے: وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۸/۱۱) "جس سے تمہاری وہ کمزوری رفع ہو گئی جو دشمنوں کے پھیلائے ہوئے وساوس کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ تمہارے دل مربوط ہو گئے۔ تمہیں جمعیتِ خاطر نصیب ہو گئی۔ تمہارے قدم جم گئے۔ اس سے رجز کے معنے واضح ہو جاتے ہیں۔

اس آیت (۲/۵۹) میں رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ کہا ہے۔ قومِ بنی اسرائیل میں ایک ضعف و ناتوانی اور اضمحلال اور کمزوری قومِ فرعون کے استبداد کی پیدا کردہ تھی لیکن یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ان کے حوصلوں کی یہ پستی اسی کا نتیجہ تھی۔ اسے قرآن کریم نے "آسمان سے نازل شدہ رجز" کہا ہے۔ اس کی تائید (۳۴/۵) سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "جو ہمارے قوانین کو غیر مؤثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ الم انگیز رجز کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں"۔ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا کہ آپ اس انقلابِ عظیم کو برپا کرنے کے لئے اٹھیئے۔ (قُمْ فَأَنذِرْ ۷۴/۲) تو اس کے بعد کہا کہ اپنی جماعت کی اس طرح سے تربیت کیجئے: وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴/۵)۔ "ان کا ضعف و ناتوانی مبدل بہ قوت ہو جائے اور ان میں ایک ہی جنبش سے اُٹھ کھڑے ہونے کی طاقت پیدا ہو جائے"۔

آیت زیرِ نظر (۲/۵۹) میں ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ رجز ان کے فسق کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور سورۃ الاعراف میں ہے کہ ایسا کچھ ان کے ظلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ یعنی انہوں نے اپنا صحیح مقام چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فسق کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں آیت (۲/۲۶) کے تحت (صفحہ ۲۲۴ پر) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں اس قالب سے نکل جانا جس میں کسی کی صلاحیتیں پختگی تک پہنچ سکیں۔

اس داستان میں اندازِ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے کسی ایسی نعمت کا ذکر کیا گیا جس سے بنی اسرائیل کو بہرہ یاب کیا تھا۔ اس کے بعد کہا گیا کہ جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ پھر کسی اور نعمت کا تذکرہ کیا گیا۔ آیت (۲/۵۹) میں سایہ فگن بادلوں اور من و سلویٰ کا ذکر تھا۔ اگلی آیت میں کہا گیا ہے:-

۲/۶۰ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۔ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے "جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے ہم سے پینے کا پانی مانگا تو ہم نے اس سے کہا کہ تم اس صحرا سے آگے بڑھ کر اس علاقے کی طرف چلے جاؤ جہاں چٹانیں ہیں۔ وہاں تمہیں پتھروں میں پنہاں پانی کے چشمے مل جائیں گے"۔ اس آیت میں "ضربِ عصا" کا ذکر آیا ہے۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے پہلے بیان کر چکے ہیں جہاں قومِ بنی اسرائیل کا سمندر پار کرنے کا ذکر آیا ہے (دیکھئے ۲/۵)۔

پانی کے چشمے

وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے ایک معنے تو یہ ہوں گے کہ اپنی جماعت کو لے کر پتھریلے علاقے کی طرف نکل جاؤ۔ اور یہ بھی کہ وحیٔ خداوندی نے ان چٹانوں کی نشاندہی کر دی جن پر پڑی ہوئی مٹی ہٹانے سے نیچے سے چشموں کا پانی پھوٹ نکلے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ یہ قوم بات بات پر بگڑ بیٹھتی تھی اور واویلا مچانا شروع کر دیتی تھی کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال کر لے آئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی بائبل میں ہے:-

> تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے ہم سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں لوگوں کے لئے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خدا کا کیوں امتحان کرتے ہو۔ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰؑ پر جھنجھلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مواشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔
>
> (خروج ۱۷/۱-۳)

آیتِ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ وہاں بارہ چشمے نکلے اور انہیں بنی اسرائیل کے بارہ اسباط (قبیلوں) میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اقوامِ سابقہ میں حضراتِ انبیائے کرام اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت بھی قومِ بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔ پھر یہ قوم بھی قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہنوز ان کی تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ ان قبائلی تفریقات کو مٹا کر انہیں ایک امت بنا دیا جائے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار ایسے ہی تھے۔ لہٰذا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے یا خاندان کو الگ الگ چشمہ تفویض کر دیا کہ کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔ اس کے

بعد قرآن کریم نے اپنی اس بنیادی تعلیم کو دھرایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے عطا کردہ رزق کو باہمی فساد کا موجب نہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بڑی شرح وبسط سے لکھا جاچکا ہے۔ (دیکھئے آیات ۲/۳ ؛ ۲/۱۱-۱۲ ؛ ۲/۲۲ ؛ ۲/۲۹ اور اس جلد میں آیت ۲/۳۰)۔ ان آیات میں فساد کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ ان تشریحات کی یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

بنی اسرائیل کو مصر کے علاقے سے باہر نکال لینے کا مقصد تو یہ تھا کہ انہیں قوم فرعون کی غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات مل جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ ان سے شہری زندگی کی سہل انگار عادات چھڑا کر ان کی تربیت صحرائی اور کوہستانی علاقوں میں اسطرح کی جائے کہ وہ محنت اور مشقت کے خوگر اور سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:-

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ❊ یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اسی مقصد کے پیشِ نظر یہاں بنی اسرائیل کو بالکل سیدھی سادی اور فطری غذا دی گئی تھی۔ یعنی من اور سلویٰ۔ لیکن انہیں رہ رہ کر مصری کھانوں کے چٹخارے یاد آتے تھے خواہ وہ حاکم قوم کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں چوسنے ہی سے کیوں نہ حاصل ہوتے ہوں۔ چنانچہ بائبل میں ہے۔

> بنی اسرائیل کی ساری جماعت، زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے۔ پہنچے اور ساری جماعت بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کر کھاتے تھے، مارے جاتے۔ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لاتے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔
> (خروج ۱۶/۱-۳)

قرآنِ کریم نے ان کے اسی تقاضے کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا ہے:-

۲/۶۱ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۔ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ۔ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔

اس آیت کا مفہوم حسب ذیل ہے " (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۲/۵۸) تم نے سپاہیانہ زندگی پر، شہری زندگی کو ترجیح دی۔ اس کے لئے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم (اس صحرائی زندگی میں) صبح و شام ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ اس لئے، تم اپنے نشو و نما دینے والے سے ہمارے لئے زمینی پیداوار طلب کرو ـــــ سبزیاں ترکاریاں، ککڑیاں، لہسن (یا مختلف قسم کے اناج)، مسور، پیاز (وغیرہ) ـــــ حالانکہ صحرائی زندگی تمہاری عسکری تربیت گاہ تھی اور وہاں کی خوراک ایسی تھی جو تم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتی۔

موسیٰؑ نے کہا کہ (کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ) تم اُس بہترین زندگی کی بجائے، جو تمہارے لئے تجویز کی جا رہی تھی، اس قسم کی ادنیٰ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو جاؤ، شہر کی زندگی اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں عسکریت اور کشورکشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور محکومیت اور تساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ اور، اس طرح، ان پر ذلّت و خواری کا عذاب خداوندی مستولی ہو گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے انبیاء کی عزت و توقیر کے بجائے، انہیں ناحق ذلیل کرنے کی تدبیریں کرنے لگے، نیز، بعض کی جان تک کے لاگو ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ تھا۔"

اس آیت میں جو کہا گیا ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ملک مصر کی طرف واپس چلے جاؤ۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اس دشت و صحرا میں تمہیں اس لئے لایا گیا تھا کہ تم شہری تمدن کی تن آسان زندگی کی جگہ سپاہیانہ زندگی کے خوگر بن جاؤ۔ تاکہ تمہیں ایک قومِ غالب کی طرح سرفرازیاں اور کامرانیاں نصیب ہو جائیں۔ لیکن اگر تم ذلیل و خوار ہی رہنا چاہتے ہو تو جاؤ! اِدھر اُدھر کئی بستیاں موجود ہیں ان میں جا بسو۔ وہاں تمہیں وہ کچھ مل جائے گا جس کی تم خواہش کر رہے ہو۔ اس میں "اِهْبِطُوْا" کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ ہم آیات (۲/۳۶ و ۲/۳۸) میں بتا چکے ہیں، ھبوط کے معنی کسی بلند سطح سے پست سطح کی طرف آ جانے کے ہیں۔ لہٰذا انہیں بتا دیا گیا کہ تمہاری اس قسم کی خواہشات تمہیں پھر انہیں پستیوں کی طرف لے جائیں گی جن میں تم اس سے پہلے زندگی بسر

کرتے تھے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ اور وہ غضبِ خداوندی کے مستوجب قرار پا گئے۔ ان الفاظ کا مفہوم آیات (۱/۷ و ۲/۷) پہلی جلد (صفحات ۵۳ - ۵۵) نیز آیات (۲/۳۵ و ۲/۴۴) زیرِ نظر جلد میں شرح و بسط سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت و مسکنت اور غضب و عذابِ خداوندی نازل ہوگیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسا صرف ان کی اس خواہش کی پاداش میں ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کی یہ تاریخ زمانہ نزولِ قرآن میں انکے سامنے پیش کی گئی تھی، اس لئے ان کی یہ حالت کسی ایک واقعہ کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ بہ ہیئتِ مجموعی نتیجہ تھی ان کی تمام سرکشیوں اور بدعنوانیوں کا، جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ان سے سرزد ہوئی تھیں۔ چنانچہ خود زیرِ نظر آیت کے آخری حصے میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ حتیٰکہ انبیاء تک کو قتل کر دیا۔ حدود فراموشی اور کھلی ہوئی بغاوت تک پر اتر آئے — معصیت (ع-ص-ی) قانون شکنی اور نافرمانی کو کہا جاتا ہے اور عدوان کے معنے حد سے تجاوز کرنا ہیں۔ مقصد دونوں کا قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنا اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جانا ہے۔

قتلِ انبیاء اس آیت میں "قتلِ انبیاء" کی حقیقت وضاحت طلب ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک (جھوٹے) مدعیٔ نبوت (مرزا غلام احمد) نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی تھی کہ جھوٹا مدعیٔ نبوت قتل کر دیا جاتا ہے اور میں چونکہ قتل نہیں کیا گیا اس لئے میں جھوٹا مدعی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کہنا، قرآنِ کریم کے حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) عربی زبان میں قتل کے معنی کسی کو غیر موثر بنا دینا بھی ہیں لیکن اس کے معنی سچ مچ قتل کر دینا بھی ہیں اور قرآنِ کریم میں کہیں یہ نہیں آیا کہ جھوٹے مدعیٔ نبوت کو قتل کر دیا جائے گا۔[1] اس کے برعکس قتلِ انبیاء کا ذکر قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً دیکھئے ۲/۹۱ و ۳/۲۰ و ۳/۱۱۱ و ۳/۱۸۰ و ۴/۱۵۵) ان آیات میں قتلِ انبیاء کا ذکر ہے۔ اور آیات (۳/۱۸۲ و ۵/۷۰) میں قتلِ رسل کہا گیا ہے۔ انجیل میں حضرتِ مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب ان کے اسی

---

[1] اس ضمن میں آیات (۶۹/۴۴-۴۷) کو تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں "قطعِ وتین" کے معنے یہ نہیں کہ افترا کرنے کی صورت میں رسول کی رگِ قلب کو (عملِ جراحی کی طرح) کاٹ کر رکھ دیا جاتا۔ مقصد یہ ہے کہ اس صورت میں ان ذرائع و اسباب کو منقطع کر دیا جاتا جن سے اس کے مشن کو استحکام و ثبات حاصل ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

جرم کو قرار دیا ہے چنانچہ متی کی انجیل میں ہے:۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو۔ اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچوگے؟ اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بشہر ستاتے پھروگے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا، تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لیکر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک، جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے، انہیں سنگسار کرتی ہے۔ کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تم نے نہ چاہا۔ (متی ۲۳/۲۹-۳۷)

قتل انبیاء و رسل کی سب سے بڑی شہادت خود، رسول اللہ کے متعلق آیت (۳/۱۴۴) سے ملتی ہے جہاں کہا گیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئْنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴)۔ "محمدؐ بجز این نیست! کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کئی رسول اپنے اپنے فرائض سرانجام دیکر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر کل کو یہ بھی مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے"؟ یہاں خود رسول اللہ کے متعلق قتل کئے جانے کے امکان کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ جھوٹا مدعیٔ نبوت قتل کر دیا جاتا ہے۔ سچے نبی کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم میں ایک جگہ کہا گیا ہے: يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ۔ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۵/۶۷)۔ "اے رسولؐ! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم نے اپنے فریضۂ رسالت کو سرانجام نہیں دیا۔ تمہارا کام تبلیغ

رسالت ہے۔ خدا تمہارے مشن کو لوگوں کی دست برد سے محفوظ رکھیگا۔ یاد رکھو! جو قوم حق و صداقت سے سرکشی برتتی ہے وہ کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کرتی"۔ ظاہر ہے کہ یہاں وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (۵/۶۷) سے مراد حضورؐ کی جسمانی حفاظت نہیں، حضورؐ کے مشن اور ما انزل اللہ کی حفاظت مقصود ہے۔ جہاں تک حضور کی جسمانی حفاظت کا تعلق ہے جنگِ احد میں حضور کو کئی زخم آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ عندالضرورت خود میدانِ جنگ میں جایا کرتے تھے ـــــ بلکہ اپنی فوج کی قیادت کیا کرتے تھے ـــــ میدان جنگ میں قتل ہو جانا، ناممکنات میں سے نہیں۔ روایات میں ہے کہ حضور نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ اس مرض کا بنیادی سبب وہ زہر ہے جو ایک یہودیہ نے حضورؐ کو کھانے میں دیدیا تھا۔ اگرچہ آپ نے وہ لقمہ اُگل دیا تھا لیکن زہر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہو گیا تھا اور اس نے رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی تو قتلِ انبیاء کی شق میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور آیت بھی ہے جس سے بعض اوقات ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ خدا کے رسولوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا[1] وہ آیت یہ ہے: کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ (۵۸/۲۱)۔

رسولوں کا غلبہ

"خدا نے اسے واجب قرار دے رکھا ہے کہ وہ اور اس کے رسول غالب آکر رہیں گے"۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کے رسول قتل نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ اگر انہیں قتل کر دیا جاتا تو وہ غالب کس طرح آتے! لیکن جب اس آیت پر، اسے اس کے سیاق و سباق کے اندر رکھ کر، اور اسی قسم کی دیگر آیات کو ساتھ ملا کر، غور کیا جائے تو اس بات کی تائید ہوتی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی (اوپر) بیان کیا ہے۔ اس آیت سے پہلے ان مخالفین کا ذکر چلا آرہا ہے جن کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ حضورؐ کا پیش فرمودہ نظامِ خداوندی کامیاب نہ ہونے پائے۔ ان کے متعلق کہا کہ: اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰہُمۡ ذِکۡرَ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ الشَّیۡطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (۵۸/۱۹) "ان لوگوں پر شیطان اس بری طرح مسلط ہو چکا ہے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کو یکسر ترک کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) کے افراد ہیں۔ انہیں سن رکھنا چاہیئے کہ حزب الشیطان آخر الامر خاسر و ناکام رہتی ہے"۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ (۵۸/۲۰)۔ "یاد رکھو! جو لوگ بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کریں گے، وہ ذلیل و خوار ہوں گے"۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ (۵۸/۲۱)۔ "اس لئے کہ خدا کا فیصلہ ہے ـــــ اس نے اسے واجب اور لازم قرار دے رکھا ہے ـــــ کہ خدا اور

[1] کبھی خود میرا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا تھا۔

اس کے رسول آخرالامر مظفر و منصور ہوں گے۔ یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جو تمام قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ دنیا کی کوئی قوت اس کے فیصلے کو ناکام کر سکے۔" نظامِ خداوندی کی مخالفت کرنے والے "حزب الشیطان" (شیطان کی پارٹی کے افراد) ہیں۔ اِن کے برعکس ایک پارٹی خدا کی بھی ہے۔ یعنی حزب اللہ۔ اس پارٹی کے افراد کی کیفیت یہ ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ۔ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)۔" یہ لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھیں وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کریں جو اللہ اور اس کے رسول (دینِ خداوندی) کے دشمن ہوں، خواہ وہ ان کے ماں باپ، یا بیٹے بیٹیاں، یا بھائی بند، یا دیگر عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے۔ اور مرضیٔ خداوندی ان کی تائید و نصرت کا موجب بن رہی ہے۔ یہ اس جنت میں داخل ہوں گے جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ رضی اللہ عنہم و

حزب اللہ

رضو عنہ — یہ لوگ حزب الشیطان کے مقابلہ ہیں، حزب اللہ ہیں۔ اور ساری دنیا کو سن رکھنا چاہیئے کہ آخرالامر حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) ہی کامیاب ہوتی ہے۔ حق غالب آکر رہتا ہے۔"

اِن آیات سے ظاہر ہے کہ:-

۱- حزب الشیطان، دینِ خداوندی کی مخالفت کرتی تھی۔ اس سے مراد وہ تمام قوتیں ہیں جو نہیں چاہتی تھیں کہ نظامِ خداوندی قائم ہو۔

۲- ان کے مقابلہ میں حزب اللہ (خدا کی پارٹی) تھی جو ان دشمنوں کی مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھی۔

۳- خدا کا وعدہ یہ تھا کہ حزب الشیطان بالآخر ناکام رہے گی اور حزب اللہ کامیاب ہوگی۔

۴- اسے "خدا اور اس کے رسولوں" کے غالب آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِس سے واضح ہے کہ رسولوں کے غالب آنے سے مراد اس نظامِ خداوندی کا غالب آنا ہے جسے وہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ مشن تنہا رسول کے ہاتھوں تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس میں اس کے رفقاء — جماعتِ مومنین — بھی شامل ہوتے

تھے۔ اسے "محمد رسول اللہ والذین معہٗ" (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں قائم ہونا اور باطل کے ہر نظام پر غالب آنا تھا۔ اس کشمکش میں اس جماعت کے کسی فرد (خواہ وہ خود رسول ہی کیوں نہ ہو) کے وفات پا جانے یا قتل ہو جانے سے، کسی قسم کا فرق نہیں پڑتا تھا۔ حتٰی کہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نظام کو پورا پورا غلبہ رسول کی وفات کے بعد حاصل ہو، جیسا کہ قرآن کریم کی کئی ایک آیات سے واضح ہے (مثلاً) سورۃ الرّعد میں ہے: وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰)۔ "جو کچھ ان مخالفین سے کہا جاتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا، اے رسول! ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ تمہاری زندگی میں سامنے آ جائے اور کچھ حصہ تمہاری وفات کے بعد۔ تمہارا فریضہ اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق اسکی تکمیل کب ہو گی"۔ نظامِ خداوندی کا غلبہ بہر حال ہو کر رہے گا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے: هُوَ الَّذِىْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)۔ "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت یعنی حق پر مبنی نظام، دیکر بھیجا۔ یہ نظام باطل کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا خواہ یہ بات مشرکین پر کیسی ہی گراں کیوں نہ گزرے؟ ظاہر ہے کہ یہ پروگرام (PROCESS) قیامت تک جاری رہے گا۔ کیونکہ ہر زمانے میں کوئی نیا نظامِ باطل ابھر کر سامنے آئے گا۔ جس پر نظامِ خداوندی نے غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (۵۸/۲۱) سے مراد یہ نہیں کہ یہ ناممکن تھا کہ حق و باطل کی آویزش میں رسول قتل ہو جاتا۔ مراد یہ ہے کہ اس کشمکش کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ دینِ خداوندی غالب آئے گا اور باطل کا نظام ناکام رہے گا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح اپنے مقام پر کی جائے گی کہ قرآن کریم میں آمدہ "اللہ و رسول" کی اصطلاح سے مراد نظامِ خداوندی ہے)

آیتِ زیرِ نظر (۲/۹۱) میں قتل انبیاء بغیر الحق کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے "حق کے ساتھ" قتل کئے جانے کی تصریح خود کر دی ہے۔ سورۃ المائدہ میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)۔ "جس نے کسی ایک شخص کو بھی ناحق قتل کر دیا — یعنی بجز اس کے کہ اسے جرمِ قتل کی سزا کے طور پر یا جرمِ بغاوت کی پاداش میں قتل کیا جائے — تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا"۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کو قانونِ خداوندی کے مطابق کسی جرم کی پاداش میں قتل کیا جائے تو وہ قتل بغیر الحق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد قرآنِ کریم یہودیوں کے اس بنیادی عقیدہ کی پھر تردید کرتا ہے جس کا ذکر متعدد بار پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی ان کا یہ عقیدہ کہ دین صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود ہے اور جنت بھی انہی کے لئے مخصوص۔ ان کے اس عقیدے کی تشریح آیت (۲/۴۳) میں شرح و بسط سے کی جا چکی ہے۔

یہ عقیدہ کہ دین صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود رہنا چاہیئے، یہودیوں ہی کا نہیں۔ انجیل میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے۔ مثلاً متی انجیل میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو اُن سے کہا:۔

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوّروں کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں پاؤں کے نیچے روندیں اور پلٹ کر تمہیں پھاڑیں (متی ۶/۷)

اس کی تشریح انہوں نے آگے چل کر ان الفاظ میں کر دی:۔

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۹/۵-۶)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انجیل کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام بھی بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ عیسائیت کو جو عالمگیر مذہب قرار دیا گیا ہے تو یہ عیسائیوں کا بعد کا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ انجیل اسے بنی اسرائیل تک ہی محدود رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے ہاں موجود تھا اور اس کی تردید قرآن کریم نے اگلی آیت میں کر دی۔

۲/۶۲ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ دینِ خداوندی کا پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص خواہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو یا یہودیوں کے گھر، عیسائیوں کے ہاں یا صابئین کے گھر، کسے باشد! جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور عملِ صالحہ کرے گا تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا۔ یہ آیت مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۴) کی تشریح کے سلسلہ میں (صفحات ۸۳-۸۴ پر) آچکی ہے۔ اور وہاں اس کا مفہوم واضح انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اُسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے

یہود و نصاریٰ کے اس عقیدے کی تردید کر دی کہ دین کسی خاص نسل یا قوم کی اجارہ داری ہے۔ بنی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو دین عطا کیا گیا ہے وہ تمام نوعِ انسان کے لئے ہے۔ وہ عالمگیر دین ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم داستانِ بنی اسرائیل کی اگلی کڑی کی طرف آ جاتا ہے اور کہتا ہے :-

۲/۶۳ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ -

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل دامنِ کوہ میں اقامت پذیر ہوئے تھے اور اس طرح ان کی حفاظت کا فطری سامان کر دیا گیا تھا کہ ان پر عقب سے کوئی حملہ آور نہ ہو۔ اس پہاڑ کو الطور کہا گیا ہے۔ طور کے معنی سرسبز پہاڑ کے ہیں لیکن اس لفظ کے ساتھ (ال) لگنے سے اس سے مراد ایک خاص پہاڑ ہو گیا۔ یہ وہ پہاڑ تھا جہاں پہلے پہل حضرت موسیٰ علیہ السلام

الطُّور

کو وحی سے نوازا گیا تھا (دیکھئے آیات ۱۹/۵۲ و ۲۸/۲۹ و ۲۸/۴۶)۔ یہی وہ الطور تھا جس کے دامن میں اقامت پذیر بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا (۲/۹۳ و ۴/۱۵۴ و ۲۰/۸۰)۔ یہی وہ الطور ہے جسے دو ایک اور مقامات پر سلسلۂ رشد و ہدایت کی ایک کڑی کے طور پر شہادت میں ... پیش کیا گیا ہے (دیکھئے ۵۲/۱ و ۹۵/۲) اس الطور کے دامن میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا تھا وہ کیا تھا؟ یہ کہ جو قوانین انہیں وحی کی رو سے دیئے جاتے ہیں انہیں ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ سفرِ حیات میں انہیں محکم طور پر تھامے رہیں تاکہ وہ زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہیں۔ جسے خدا پر ایمان کہا جاتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے عطا کردہ قوانین کی اطاعت اور اس کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کریں گے۔ ہمارے ہاں ایمان کا ترجمہ "مان لینا" کیا جاتا ہے جس کا کوئی عملی مفہوم نہیں ہوتا۔ ماننے کے معنے ہیں اس کی طرف سے بھیجی ہوئی راہنمائی کی پیروی کرنا۔ اسی کو خدا کے ساتھ عہد کہہ کر پکارا گیا ہے۔ جماعتِ مومنین اور اللہ تعالیٰ کے مابین، جو معاہدہ ہوتا ہے اس کے لئے آیت (۹/۱۱۱) ملاحظہ کیجئے۔

بنی اسرائیل نے خدا سے یہ عہد کیا۔ لیکن :-

۲/۶۴ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ - فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ -

وہ اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس کا نتیجہ ان کی تباہی ہونا چاہیئے تھا لیکن چونکہ خدا کے پروگرام میں یہ تھا کہ انہیں

بازآفرینی کے مواقع دیئے جائیں، اس لئے انہیں ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ ان کی مہلت کے وقفے کو بڑھا دیا گیا۔ یہ خدا کا فضل تھا اور اس کی رحمت۔ کسی قوم کو مہلت کا وقفہ مل جانا، واقعی عنایاتِ خداوندی میں سے ہوتا ہے۔ یہ ہوتا تو ہے اس کے قانون کے مطابق ہی، لیکن ضابطۂ قوانین میں اس قسم کی گنجائش کا رکھا جانا، بہرحال عنایتِ خداوندی ہی ہے۔

لیکن اس قوم نے مہلت کے اِس وقفے سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی خوئے سرکشی سے باز نہ آئے۔ اس کی شہادت میں واقعۂ سبت کو پیش کیا گیا ہے:-

۲/۶۵ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ۔ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ۔

اَلسَّبْتُ کے مادہ (س۔ ب۔ ت) کے بنیادی معنے ہوتے ہیں راحت اور سکون۔ اور اس سے مراد ہوتا ہے ترکِ عمل اور قطعِ کاروبار۔ چونکہ یہاں اَلسَّبْت آیا ہے اس لئے اس سے مراد وہ دن ہے جس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے۔ یعنی سنیچر کا دِن۔

سبت کا مفہوم ہفتے میں ایک دن کی چھٹی (یا کاروبار کا ناغہ) آج کل معمول میں داخل ہے۔ یہ پابندی یہودیوں کے ہاں بھی معمول میں داخل تھی۔ (HASTINGS) نے اپنے انسائیکلوپیڈیا میں عہد نامہ عتیق، مشنا اور تالمود کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سبت جمعہ کی شام سے شروع ہو جاتا اور سنیچر کا پورا دن رہتا تھا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ قریب اڑتیس دیگر امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ناغہ کا دن قانونی طور پر متعین نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ لوگ اس میں اختلاف کرتے تھے اور اس کی وجہ سے گریز کی راہیں تراش لیا کرتے تھے۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لئے، اس کے لئے ایک خاص دن متعین کر دیا گیا۔ سورۃ النحل میں ہے: اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۱۶/۱۲۴) "السبت کا دن ان کے اختلافات کی وجہ سے مقرر کیا گیا۔"

ہفتے میں ایک دن کا ناغہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن جب زندگی کسی نظام کے تحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عاید کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندی پر قائم رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کے ڈسپلن سے قوم کی سیرت و کردار کا امتحان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی سی طمع (TEMPTATION) کا مقابلہ بھی نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں، وہ زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اتریں گے؟ قرآن کریم

نے اس واقعہ کا ذکر یہی بتانے کے لئے کیا ہے کہ یہودیوں میں اتنا سا کیریکٹر بھی باقی نہیں رہا تھا۔ محکوم قوم کی کیفیت یہی ہو جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ یہودیوں پر پابندی عاید کی گئی تھی کہ وہ ایک دن (منجملہ دیگر امور) مچھلیاں نہ پکڑیں۔ جانوروں میں یہ جبلّی حس (INSTINCT) ہوتی ہے کہ جب انہیں یقین ہو جائے کہ فلاں مقام پر یا فلاں وقت میں کسی قسم کا خطرہ نہیں تو وہ وہاں آنے جانے میں بیباک ہو جاتے ہیں۔ [اسی مقصد کے لئے جنگلوں میں مقاماتِ امن (SANCTUARIES) کا تعین کر دیا جاتا ہے]۔ وہاں مچھلیوں کی بھی یہی کیفیت ہوگئی تھی۔ کچھ عرصہ کی مداومت کے بعد ان کی حس نے انہیں بتا دیا کہ اس دن ہمیں کوئی نہیں پکڑے گا، اس لئے وہ تیرتی ہوئی سطحِ آب پر آجاتی تھیں۔ اور یہ، کردار کے خام، اتنی سی ترغیب کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ انہیں چوری چھپے پکڑ لیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کا بہت بڑا ٹسٹ (TEST) تھا (۷/۱۶۳ ذیز ۷/۱۶۳)۔ لیکن جب انہوں نے اس پابندی کو توڑا تو عذابِ خداوندی میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے لئے الفاظ ہیں فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۲/۶۵ نیز ۷/۱۶۶) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تم ذلیل بندر بن جاؤ"۔ اور اس کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچ مچ کے بندر بن گئے تھے۔ اگرچہ ہمارے متقدمین

بندر بن جانے کا مفہوم

میں سے بھی بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد مسخِ سیرت ہے، مسخِ صورت نہیں، یعنی ان کی شکلیں بندروں کی سی نہیں ہوگئی تھیں بلکہ ان کی سیرت بندروں کی سی ہوگئی تھی۔

لفظ قِرَدَةً کا مادہ (ق-ر-د) ہے۔ اَلْقَرَدُ اس اون کو کہتے تھے جو خود بخود جھڑ جائے اور کاتی نہ جاسکے۔ اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے یونہی پھینک دیا جاتا تھا۔ اس سے یہ لفظ حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ اَقْرَدَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں افسردگی اور درماندگی کی وجہ سے اس شخص پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو گیا اور یوں سمجھو کہ وہ جھوٹ موٹ کا مردہ بن گیا۔ اس اعتبار سے وہ، ہر قابلِ نفرت اور حقارت انگیز شے کو قِرَادَةٌ کہتے تھے۔ چنانچہ یہ لفظ چیچڑی کے لئے بھی آتا ہے۔ اس سے اَلْقِرْدُ بندر کو کہتے تھے جو ان کے نزدیک بڑا قابلِ نفرت جانور تھا۔ یہی معنی لفظ خاسئین کے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں بار بار کہا گیا ہے کہ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۲/۶۱)۔ اُن پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو گئے۔ اسے خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲/۸۵) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی اسی دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی۔ یہودیوں کی اس ذلت و خواری کی زندگی کے متعلق خود بائبل میں ہے کہ:-

اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اس سرے سے اس سرے تک تتر بتر کرے گا اور

وہاں تو غیر معبودوں کی جو لکڑیاں اور پتھر ہیں جن سے نہ تو نہ تیرے باپ دادے واقف تھے، اُن کی پرستش کرے گا اور ان قوموں میں تجھ کو آرام نہ ملے گا۔ بلکہ تیرے پاؤں کے تلوے کو قرار نہ ہو گا۔ کیونکہ خداوند وہاں تجھ کو دل کا دھڑکا اور آنکھوں کی دھندلاہٹ اور جی کی غمناکی دے گا۔ اور تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانا ہو جائے گی اور تو رات اور دن ڈرتا رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی پر کچھ بھروسہ نہ ہوگا۔ اپنے دل کے خوف سے، جسے تو کھائے گا اور ان چیزوں سے، جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں گی، صبح کو تو کہیگا اے کاش کہ شام ہوتی! اور شام کو کہیگا اے کاش صبح ہوتی۔ اور خداوند تجھ کو اس راہ سے، جس کی بابت میں نے تجھے کہا کہ تو پھر اسے نہ دیکھے گا کشتیوں پر مصر کو پھر سے جائے گا اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لئے اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچے جاؤ گے اور تمہیں کوئی مول نہ لے گا۔ (استثناء ۲۸/۶۴-۶۸)

خود زمانہ نزولِ قرآن میں یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ اب پھر تمہارے سامنے ایک موقعہ آیا ہے کہ تم اپنی ذلت کی زندگی کو عزت اور سرفرازی کی زندگی میں تبدیل کر لو۔ اگر ایسا نہ کروگے تو نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ (۴/۴۷)۔ "تمہیں زندگی کی خوشگواریوں سے اسی طرح محروم کر دیا جائے گا جس طرح تمہارے اسلاف میں اصحاب سبت کو محروم کر دیا گیا تھا"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ان لوگوں کو سچ مچ کا بندر نہیں بنا دیا گیا تھا بلکہ ان کی سیرت بندروں کی سی ہو گئی تھی۔ ان کی (APISH MENTALITY) کی شہادات قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے مسخ شدہ سیرت کو محسوس انداز میں سمجھانے کے لئے اسی قسم کی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ منافقین کے متعلق کہتا ہے: قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ۔ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (۵/۶۰)۔ "اے رسولؐ! تم ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ معیارِ خداوندی کی رُو سے کس کی حالت بدترین ہے؟ ان کی حالت جو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی متاعِ حیات جھلس گئی۔ ان کی سیرت بدترین حیوانات — بندروں اور خنزیروں — جیسی ہو گئی۔ بڑی بڑی مستبد سرکش قوموں نے انہیں اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہی لوگ ہیں جو زندگی کے بدترین درجہ میں ہیں اور سب سے زیادہ راہ بھٹکے ہوئے"۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے، جو اصحاب سبت کے متعلق آئے ہیں

یہ مراد نہیں کہ وہ سچ مچ کے بندر بن گئے تھے۔ اس قسم کی تفسیریں ان روایات پر مبنی ہیں جو یہودیوں نے وضع کر کے ہماری کتب روایات میں داخل کر دیں [1]۔ لیکن قرآنِ کریم نے اپنے مفہوم کو اگلی آیت میں خود ہی واضح کر دیا ہے، جہاں کہا ہے :-

۲/۶۶ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

ہمارے لئے عبرت

"ہم نے ان کی اس حالت کو ان لوگوں کے لئے بھی موجبِ عبرت بنایا جو اس دور میں موجود تھے اور ان کیلئے بھی، جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے باعثِ صد موعظت ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں"؛ اگر وہ لوگ سچ مچ بندر بنا دیئے گئے تھے تو ان کی یہ تبدیلی ان لوگوں کے لئے تو وجۂ عبرت ہو سکتی تھی جنہوں نے انہیں ایسا بنتے دیکھا، لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے یہ کس طرح وجۂ موعظت ہو سکتی تھی۔ آج ہم سینکڑوں بندروں کو دیکھتے ہیں کیا ہم میں سے کسی کا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ انہی بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں؟ یا یہ کہ اگر ہم نے بھی احکامِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ہم بھی انہی جیسے بندر بن جائیں گے؟ سچ مچ کے بندر ہمارے لئے باعثِ عبرت نہیں البتہ قرآنِ کریم نے قدم قدم پر صحرا نورد خانماں خراب، ذلیل و خوار یہودیوں کی مثال دیکر ہمیں سمجھایا ہے کہ جو لوگ احکامِ خداوندی سے سرتابی برتتے ہیں ان کی یہ حالت ہو جایا کرتی ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم ان کی خوئے غلامی کے مظہر ایک اور واقعہ کو سامنے لاتا ہے، جب کہتا ہے کہ :-

---

[1] یہ چیز ہمارے روایت پرست متقدمین تک ہی محدود نہیں۔ خود ہمارے دور کے ایک مفسر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں :-

> بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنے لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیئے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۸۴۔ طبع ۱۹۵۱ء)۔

۲/۶۷ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۔ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۔ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۔

عام ترجمہ اس آیت کا یہ ہے "اور پھر وہ معاملہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے یہ سیدھی سادی سی بات کہی تھی کہ خدا کا حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کردو (بجائے اس کے کہ وہ اس صاف اور سیدھے حکم کی تعمیل کر دیتے، لگے طرح طرح کی کٹ حجتیاں کرنے۔ پہلے) کہا: بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا نے ایسی بات کا حکم دیا ہو۔ تم ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ موسیٰؑ نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں احکامِ الٰہی کی تبلیغ میں تمسخر کردوں اور جاہلوں کا شیوہ اختیار کردوں"۔

ذبحِ بقر کا واقعہ

بَقَرٌ گائے اور بیل دونوں کو کہتے ہیں۔ یہ جمع ہے۔ اس کا واحد، بَقَرَةٌ ہے[1] قصۂ سامری کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے بھی مصریوں کی تقلید میں گوسالہ پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے خودساختہ سانڈ (بقرۃ) کے بت کو جلا کر دریا برد کر دیا تھا لیکن قرآنِ کریم میں ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ (۲/۹۳)" گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں تک میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ ان کے خون کے ذروں تک میں حلول کر گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خدا پر خلوصِ قلب سے ایمان نہیں لائے تھے"۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی گوسالہ پرستی کے مستور جذبات کا مظاہرہ کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہوگا، اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ کوئی ایسا اقدام کیا جائے جس سے یہ عقیدت ان کے دِل سے نکل جائے۔ اس کا آسان طریق یہ تھا کہ کسی گائے یا سانڈ کو خود اُن کے ہاتھوں سے ذبح کرا دیا جائے۔

اس تجویز یا حکم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں گائے کی پرستش ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہندو، مسلمان ہو جائے تو وہ اور تو سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن اگر گائے کا گوشت اس کے سامنے آجائے تو اُسے جھرجھری آجاتی ہے۔ وہ اسے کھانے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ اسے اپنے آپ کو اس پر مائل کرنے کے لئے ایک عرصہ لگ جاتا ہے۔ صدیوں سے متواتر چلے آنے والے معتقدات ایسے ہی گہرے ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی تھی۔ ان کے دل سے اس دیوتا کی عقیدت اور محبت کو زائل کرنے کے لئے مؤثر ترین طریق یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے دیوتا کو خود ان کے ہاتھوں ذبح کرایا جائے۔ وہ اس حکم کی تعمیل سے اعلانیہ انکار تو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس

---

[1] اسی کی نسبت سے قرآنِ کریم کی اس سورۃ کا نام سورۃ بقرۃ رکھا گیا۔

سے ان کا کفر ثابت ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لئے بہانہ سازیاں شروع کیں۔ سب سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ خدا اس قسم کا حکم کیوں دے گا۔

انہوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا باتیں بنائیں۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو "اعوذ باللہ" آیا ہے، اس کے قرآنی مفہوم کی وضاحت کر دی جائے کیونکہ... اسے ہمارے ہاں بڑی

اعوذ باللہ کا مفہوم

اہمیت حاصل ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ع۔و۔ذ) ہے۔ عَاذَتْ بِوَلَدِهَا کے معنے ہیں مادہ کا اپنے نوزائیدہ بچے کے پاس کھڑے رہنا۔ اور اس کی حفاظت کرتے رہنا۔ عَاذَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اُسے مستقل طور پر اختیار کر لینا۔

جو جماعت، قرآنی نظام کے قیام کے لئے اٹھے گی اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ ہر مخالف قوت سے محفوظ رہنے کی تدبیر کرے۔ یہ تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جماعت، قوانین خداوندی کی زیادہ سے زیادہ تعمیل اور پابندی کرے۔ اسے "خدا کی پناہ میں آنے سے" تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی اس آرزو اور روش کو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳/۱) یا اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴/۱) جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ المومن میں ہے کہ جب فرعون اور اس کی کابینہ کے زیر غور یہ سکیم آئی کہ حضرت موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے تو آپ نے کہا: اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ (۴۰/۲۷)۔ "میں ان کی سازشوں کے خلاف، خدا کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں" (نیز ۴۴/۲۰) حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے بچی کی پیدائش کے وقت کہا تھا: وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۳/۳۵)۔ "بارِ الٰہا! میں اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطانی سازشوں سے محفوظ رکھنے کی استدعا کرتی ہوں"۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (۲۳/۹۷-۹۸)۔ "اے رسولؐ! تم کہو کہ شیطان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لئے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر حملہ آور نہ ہوں"۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۷/۲۰۰)۔ "اگر کسی قسم کا کوئی وسوسہ یا ان مخالفین کا کوئی سرغنہ تم میں باہمی فساد ڈالنا چاہے (۱۲/۵۳) تو تم ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اور شدت سے متمسک ہو کر اس کی پناہ میں آ جاؤ۔ یاد رکھو! تمہارا خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ ان تخریبی عناصر یا وساوس سے محفوظ رہنے کے لئے خدا کی حفاظت میں کس طرح آیا جاتا ہے اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی کہ: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا۔

فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (۷/۲۰۱) "متقیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی غلط (شیطانی) خیال، یونہی گھومتے پھرتے بھی ان کے پاس سے گزر جائے تو وہ فوراً قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یوں ہوتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی سامنے آجائے اور صاف طور پر دکھائی دینے لگ جائے کہ انہیں اس حالت میں کیا کرنا چاہیئے"۔ اس مفہوم کی تائید قصّہ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی ہوتی ہے۔ جب عزیز مصر کی بیوی نے کمرے کے دروازے بند کر کے اپنی خواہش نفس کی تسکین کے لئے حضرت یوسفؑ کو آمادہ کرنا چاہا تو آپ نے کہا: مَعَاذَ اللّٰهِ (۱۲/۲۳) "میں تمہارے اس ارادے اور اقدام سے محفوظ رہنے کے لئے خدا کی پناہ طلب کرتا ہوں"۔ اور انہیں یہ پناہ اس طرح سے مل گئی کہ: وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ. كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ. اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ (۱۲/۲۴) "وہ عورت اس کا تہیّہ کر چکی تھی اور اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر یوسفؑ کی جگہ کوئی اور ہوتا جس کے سامنے اپنے پروردگار کی درخشندہ و تابناک اخلاقی قدر نہ ہوتی تو وہ بھی اس پر آمادہ ہو جاتا۔ اس اخلاقی قدر کے پیشِ نظر رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس بے حیائی کے کام سے مجتنب رہا اور یوں اس نے اپنے حسنِ سیرت سے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے"۔ اس سے واضح ہے کہ ایسے مقامات پر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان فوراً اس امر کو سامنے لے آئے کہ اس باب میں خدا کی راہنمائی کیا ہے اور پھر شدت سے اس پر کاربند ہو جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں یہی حقیقت (۱۲/۵۴) میں بھی سامنے لائی گئی ہے۔

سورۃ النحل میں ہے کہ فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. اِنَّهٗ لَيۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ (۱۶/۹۸-۹۹)۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ "جب تم قرآنی پروگرام پر عمل درآمد شروع کرو گے تو مفاد پرست اور سرکش قوتیں اس کی مخالفت کریں گی۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ تم اور زیادہ شدت کے ساتھ قوانینِ خداوندی سے وابستہ رہ کر تخریبی عناصر کی معزت رسانیوں سے، سامانِ حفاظت طلب کرو۔ یاد رکھو! یہ تخریبی قوتیں ان لوگوں پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین اور ان کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھیں"۔ (نیز دیکھئے ۴۰/۵۶)۔

یہ تھا قرآنی مفہوم فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ کا۔ لیکن اب اس کی تعمیل کا طریق صرف یہ رہ گیا ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت کے آغاز میں اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ کے الفاظ دہرا لئے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، اس سے ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا جاتا ہے۔ لفظِ تعویذ کا مادہ بھی یہی ہے۔ اب قرآنی آیات کا

مصرف یہ رہ گیا ہے کہ ان کے تعویذ بنا کر گلے میں ڈال دیئے جائیں یا دروازوں کے ساتھ لٹکا دیئے جائیں، اور اس سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جائے کہ اس سے ہر آفت سے حفاظت مل جائے گی۔ کیونکہ ہم خدا کی پناہ میں آگئے ہیں۔ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتے تو اس میں ہوتا ہی یہی ہے۔ اس میں حصولِ مقاصد کی عملی تدابیر کے بجائے الفاظ کی پرستش شروع ہو جاتی ہے۔

بہرحال، آپ پھر واقعہ ذبحِ گاؤ کی طرف آیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔ میں بالکل (SERIOUS) ہوں اور خدا کا حکم تم تک پہنچا رہا ہوں کہ تم ایک گائے ذبح کر دو۔ ظاہر ہے کہ گائے یا بیل کے لفظ سے ایک بچہ بھی سمجھ لے گا کہ اس سے کیا مراد ہے لیکن چونکہ ان کے دل میں چور تھا اس لئے انہوں نے خواہ مخواہ موشگافیاں شروع کر دیں اور کہنے لگے:۔

۲/۶۸ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ۔

”خدا سے کہیئے کہ وہ ذرا واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے یا بیل کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ جب انہوں نے اس قسم کی جزئیات کا تقاضہ شروع کر دیا تو ان سے کہا گیا کہ وہ سانڈ نہ بوڑھا ہونا چاہیئے نہ بچہ، بلکہ اس کے بین بین، ادھیڑ عمر کا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے۔ اس کی تعمیل کرو۔“

اس پر انہوں نے کہا کہ بات اب بھی کچھ مشتبہ سی ہے:۔

۲/۶۹ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ۔ تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ۔

”انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے پوچھ کر یہ بھی بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ کہا گیا کہ گہرے زرد رنگ کا سانڈ (بیل) جو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اچھا جچے۔“

وہ اس پر بھی آمادہ بہ عمل نہ ہوتے اور مزید حجت بازی کے لئے کہا:۔

۲/۷۰ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۔

” اپنے رب سے کہو کہ ذرا کھول کھول کر بتائے کہ وہ بیل کیسا ہونا چاہیئے۔ ہم پر بات واضح نہیں ہوئی۔ اس کی

مزید وضاحت کر دی جائے تو ہم یقیناً حکم کی تعمیل کریں گے"۔

اس پر ان سے کہا گیا :-

۲/۷ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ - فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ -

"وہ بیل ایسا ہونا چاہیئے جسے نہ ہل میں جوتا گیا ہو اور نہ کنوئیں پر چلایا گیا۔ ہر طرح سے صحیح وسالم اور بے داغ۔ کہا کہ ہاں! اب تم نے ٹھیک ٹھیک بتایا!" اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ انہوں نے ایک معمولی سی بات میں بھی اس قدر موشگافیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے یہ کچھ اس لئے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہیں تھی۔ انہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے ایک بیل ذبح کرانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے دل سے ان کے معبود کی عظمت اور عقیدت نکل جائے۔ لیکن ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُسے ذبح کریں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس کا کھلے بندوں اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے حیلہ سازیاں اور عذر تراشیاں شروع کر دیں اور اس قدر لمبی چوڑی باتوں کے بعد اس حکم کی تعمیل کی۔

اس واقعہ سے دو اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو قوم دین کے حقائق اور نظام کو اچھی طرح سمجھنے اور اس طرح ان کی صداقت پر مطمئن ہوئے بغیر کسی وجہ سے ایمان لے آتی ہے وہ اپنے سابقہ عقائد (خواہ وہ اوہام اور خرافات ہی کیوں نہ ہوں) اپنے دل کی گہرائیوں میں ساتھ لے کر آتی ہے۔ اس کے لئے بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت مسلسل

ناپختہ ذہنیت کے مسلمان

اور التزاماً اس انداز سے کی جائے کہ یہ تمام عقائد ان کے دل سے نکل جائیں اور ان کی جگہ قرآنی عقائد نہایت پختگی سے ان کے قلب و ذہن میں جاگزیں ہو جائیں۔ صدرِ اسلام میں اسی قسم کے تھے وہ نئے نئے ایمان لانے والے (بدوی قبائل) جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے: قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹/۱۴)۔ "یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہو کہ وہ ایسا نہ کہیں بلکہ یہ کہیں کہ ہم نے اس مملکت یا نظام کے سامنے اپنے آپ کو (SURRENDER) کر دیا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا"۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ اس سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ اگر وہ خدا اور رسول کی اطاعت کرتے رہے تو ان کے اعمال کے معاوضہ میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ اللہ غفور اور رحیم واقع ہوا

ہے" میں نے اپنی کتاب ــــ شاہکارِ رسالت ــــ میں اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ جب وہ قومیں، جن کے علاقے مسلمانوں نے فتح کئے تھے، شبا شب، بغیر کسی سابقہ تعلیم و تربیت کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئیں تو وہ اپنے تمام قدیم عقائد کو ساتھ لیے ہوئے آئیں اور چونکہ اس کے بعد بھی ان کے مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہو سکا اس لئے ان کے وہی عقائد اسلامی عقائد کی شکل اختیار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئے اور وہی عقائد و نظریات اس وقت تک مسلسل آگے چلے آ رہے ہیں۔

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ خود (ہندوستان اور) پاکستان میں کثیر التعداد مسلمان ان اسلاف کی اولاد ہیں جو اسلامی تعلیم و تربیت کے بغیر (خارجی محرکات کی بنا پر) مسلمان ہو گئے تھے، وہ ہندوانہ عقائد اور رسوم اپنے ساتھ لائے اور چونکہ ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو سکا، اس لئے وہ عقائد و رسوم بدستور ہم میں چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارا مروجہ اسلام، (خواہ وہ کہیں ہو) انہی عقائد و نظریات اور رسوم و مسالک کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جنہیں ہمارے (غیر مسلم) اپنے ساتھ لئے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ (اور طریقِ عمل) یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۲۹) بتایا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ کتاب و حکمت کی تعلیم سے افرادِ امت کی صحیح تربیت (یُزَكِّيهِمْ) کیا کرتے تھے۔ اگر ارشادِ خداوندی اور سنت نبوی کے اتباع میں تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جاتا تو (نئے نئے مسلمانوں کے اپنے ساتھ لائے ہوئے) عقائد و مسالک، جزوِ اسلام نہ بن سکتے۔ لیکن ہم نے اس طریق نبوی کا اتباع چھوڑ دیا جس سے اسلام کچھ کا کچھ بن کر رہ گیا۔ اب جو تعلیم، مذہب کے نام سے دی جاتی ہے وہ انہی عقائد و مسالک کی تعلیم ہوتی ہے کیونکہ کتاب (قرآن) کا مقصد، ہمارے ہاں، اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا۔ اور دین کی غایت اور مقصد کے نگاہوں سے گم ہو جانے کی وجہ سے حکمت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہی وہ "غارتگری" ہے جس کا ماتم کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی ؛ یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

ذبحِ بقر کے واقعہ کا یہ پہلا نکتہ ہے جو سامانِ عبرت فراہم کرتا ہے۔ اس کا دوسرا نکتہ بھی ایسا ہی اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم نے جو احکام اور قوانین اصولی طور پر دیئے ہیں اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں تو ایسا کچھ دانستہ اور خدا کے پروگرام کے مطابق کیا گیا ہے۔ دین کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے تھے لیکن ان کی جزئیات

قرآنی احکام کی جزئیات

کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا۔ اگر وہ (جزئیات) بھی قرآن کریم کے اندر دیدی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدل قرار پاجاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال وکوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عملدرآمد مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا تو لوگ خود نفس اسلام ہی سے بدظن ہو جاتے اور یہ خیال قائم کر لیتے کہ یہ ضابطۂ قوانین کسی گزرے ہوئے زمانے میں تو ممکن العمل تھا، اب یہ اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے اس اہم گوشے کی وضاحت مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۲) کے تحت صفحات (۱۳۰-۱۲۵ پر) شرح وبسط سے کر دی ہے۔ اس کا دہرانا ضروری نہیں۔ البتہ ان دو آیات کا پھر سے درج کر دینا ضروری نظر آتا ہے جنہیں قرآن کریم نے ہماری ہدایت کے لئے سورۃ المآئدۃ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۔ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ۔ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۔ (۵/۱۰۱-۱۰۲)۔

اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بالفرضِ محال) ان امور کو بھی قرآن میں دیدیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دیدینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تم سمجھ لو کہ انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی موجود ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے چند باتیں فرض قرار دی ہیں۔ پس تم ان کو ضائع نہ کرو۔ چند چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک بھی نہ پھٹکو۔ اس نے چند حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے، تم ان کے متعلق کرید مت کرو۔ کیونکہ خدا

نے ایسا بھول کر نہیں کیا، دانستہ ایسا کیا ہے۔

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ۔ جلد اول صفحہ ۹۲۔ باب اعتصام بہ کتاب و سنت)

ہم نے جلد اول میں، صراحت سے بتایا ہے کہ جزئیات کا تعین اور ان میں تغیر و تبدل صرف اسلامی مملکت کر سکے گی جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔ کسی فرد یا افراد کے گروہ کو ایسا کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

یہ قوم حضرتِ موسیٰؑ کو تنگ کرتی تھی

آپ چند صفحات پیچھے اُلٹیے اور اس مقام پر پہنچیے جہاں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی گئی ہے کہ: وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَد تَّعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ (۶۱/۵)۔ "جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میری قوم کے لوگو! تم مجھے اس طرح کیوں ستاتے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں اور تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ خدا ہی کے ارشادات ہوتے ہیں۔ اس لئے تم مجھے ان کی وجہ سے قدم قدم پر ستانے کیوں بیٹھ جاتے ہو۔ گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے وہ واقعات آگئے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ کس طرح ایک ایک قدم پر روٹھ کر بیٹھ جاتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، کوسنے لگ جاتے تھے۔ اس ضمن میں چند ایک مقامات اور بھی ملاحظہ فرمائیے جو بائبل میں مذکور ہیں۔ مثلاً:

> تب ساری جماعت چلّا کر روئی اور لوگ اس رات بھر رویا کیے۔ پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انہیں کہا کہ اے کاش کہ ہم مصر میں مرجاتے! اور ... کاش کہ ہم مصر میں مرجاتے! اور کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے۔ (گنتی ۱۴/۱-۲)

اس سے آگے ہے:-

> بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے مہینہ میں دشتِ صین کو آئی اور قادس میں رہنے لگی۔ مریم وہاں مری اور وہیں گاڑی گئی۔ وہاں جماعت کے لئے پانی نہ تھا۔ سو وہ جمع ہو کے موسیٰ اور ہارون کے برخلاف ہوئے۔ اور ان لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا اے کاش کہ جب ہمارے بھائی خداوند کے آگے مر گئے، ہم بھی مرجاتے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لائے کہ ہم اور ہمارے جانور یہاں مرجائیں؟ اور تم ہمیں مصر سے اس بُرے مقام پر پہنچانے کے واسطے کیوں نکال لائے؟ یہاں تو بونے کی جگہ نہیں اور نہ انجیروں کی اور نہ انگوروں کی اور نہ اناروں کی۔ یہاں تو پینے کو پانی بھی نہیں۔ (گنتی ۲۰/۱-۵)

اور تیسرے مقام پر :

اور لوگوں نے خدا اور موسیٰ سے بگڑ کر یوں کہا کہ تم ہم کو مصر سے نکال لائے کہ ہم بیابان میں مریں ؟ یہاں تو نہ روٹی ہے نہ پانی ۔ ہمارے جی کو اس ہلکی روٹی سے کراہیت آتی ہے ۔ (گنتی ۲۱/۵)

یہ ٹھوس واقعات تھے ۔لیکن انسانی ذہن کو جو لذت افسانوں سے ملتی ہے وہ حقیقت میں کہاں ؟ اس لئے بائبل میں (جس میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو چکی ہے) اس کھلی ہوئی حقیقت کو چھوڑ کر افسانہ طرازی کی طرف رخ کر لیا گیا ۔ انہوں نے ایسا کیا تو یہ بات کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ خدا کی کتاب اس کی اصلی شکل میں اُن کے پاس موجود نہیں رہی تھی اور ذہن انسانی نے اسے افسانوں کا مجموعہ بنا دیا تھا ۔لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ خود ہمارا لٹریچر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ، حالانکہ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود تھی ۔ اور اس میں یہ تمام واقعات نہایت وضاحت سے مذکور تھے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس "اذیت رسانی" کے سلسلے میں بخاری میں حسب ذیل روایت درج ہے :-

ایک وضعی روایت

حضرت ابوہریرۃؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰؑ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے ۔چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی ان کے حصہ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا ۔لیکن بعض موذی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے یہ اس قدر پردہ صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے ۔ برص ہے یا باد خایہ ہے یا کوئی اور مرض ہے ۔ اس لئے خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی افترا بندی سے بری کرے ۔ چنانچہ ایک روز (حضرت) موسیٰؑ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے ۔ کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے لگے ۔غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے پہننے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا ۔ موسیٰؑ لاٹھی لیکر (برہنہ) پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے ۔ او پتھر ! میرے کپڑے ۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تک پہنچ گئے ۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور معائنہ کر لیا کہ وہ بہت عمدہ ساخت کے آدمی ہیں خدائے تعالیٰ نے (اس ذریعہ سے) بنی اسرائیل کی افترا بندی سے ان کو بری کر دیا ۔ بالآخر پتھر بھی رُک گیا ۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے لئے اور لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے ۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم موسیٰؑ کے مارنے کی وجہ سے پتھر پر تین یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے تھے ۔حضورؐ نے فرمایا خدا تعالیٰ کے مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ...... (۳۳/۶۹) ۔

(بخاری عربی مطبوعہ مصر ، جلد دوم صفحہ ۱۵۳ ۔ اُردو ترجمہ جلد اول صفحہ ۷۶)

آپ خود سوچ لیجئے کہ جو قرآن ان روایات و تفاصیل کی رو سے سمجھا جائے گا اس سے اسلام کا کس قسم کا تصور ذہن میں پیدا ہو گا۔ اسی قسم کا اسلام ہے جس سے ہماری نئی نسل، جس نے سوچنا شروع کیا ہے، مذہب سے برگشتہ ہو رہی ہے۔ اگر اس کے سامنے قرآنِ کریم اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اسے حرزِ جاں نہ بنالے۔ میں یہ کچھ اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں ان نوجوانوں کے سامنے قرآن کریم کو بلا آمیزش پیش کرتا ہوں جس سے بڑے حوصلہ افزا، خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

نوٹ: ترتیب کے اعتبار سے اس جگہ پانچویں باب کا خلاصہ آنا چاہیئے تھا۔ لیکن پانچویں اور چھٹے باب میں اس قدر معنوی تسلسل ہے کہ ان دونوں کا خلاصہ یکجا دیا جانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بنابریں آیات ۵۵ تا ۱۱۲ کا خلاصہ چھٹے باب کے آخر میں دیا جائے گا۔

چھٹا باب

داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل

(آیات ۷۲ تا ۱۱۲)

۱— واقعۂ قتل اور طریقِ تفتیش
۲— یہودیوں کی قساوتِ قلبی۔
۳— قانونِ مکافاتِ عمل
۴— والدین اور اولاد کا تعلق
۵— کتاب کے ایک حصہ پر ایمان دوسرے سے کفر۔ یہ ثنویت باعثِ تذلیل ہے۔
۶— ہمارے علماء کی حالت۔
۷— "آنے والے" کا عقیدہ
۸— سیکولرازم۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ سب خلافِ اسلام ہیں۔
۹— حضرت سلیمانؑ کے خلاف بہتان تراشی۔ ہاروت و ماروت کا افسانہ
۱۰— جادو کی حقیقت۔ باطنیت کا عقیدہ۔ تعویذ۔ درود، وظائف
۱۱— علامہ اقبالؒ اور تصوف
۱۲— قریش کی طرف سے اسلامی نظام کی مخالفت۔
۱۳— مخالفین سے اعراض اور علیحدگی کا حسن کارانہ طریق۔
۱۴— قانونِ مکافاتِ عمل

چھٹا باب

(آیات ۷۲ تا ۱۱۲)

داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل

۲/۷۲-۷۳ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۔ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔

ان آیات کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اُس سے ان کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیداً ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے، اصولی طور پر اُسے مختلف گوشوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ایک، اور بنیادی گوشے کا تعلق انسانی راہنمائی (ہدایت) سے ہے۔ اس میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کے معانی متعین ہیں جنہیں ہر ذہنی سطح کا انسان (بشرطیکہ وہ قرآنِ کریم کی زبان اور اسلوبِ بیان سے واقف ہو) باسانی سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے گوشے کا

قرآنی حقائق کے تین گوشے

تعلق خارجی کائنات میں نافذ قوانین اور نظام سے ہے۔ ان حقائق کے کماحقہٗ سمجھنے کے لئے اشیائے کائنات سے متعلق علوم (قوانینِ فطرت) سے واقفیت ضروری ہے۔ اِن قوانین میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن کا انکشاف علومِ سائنس کی رو سے کر لیا گیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق تحقیق جاری ہے۔ ان (آخرالذکر) کے متعلق جو کچھ سر دست کہا جائے گا وہ قیاس ہوگا۔ لیکن قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بہرحال قطعی اور یقینی ہے۔ اس لئے ان امور کے متعلق ہم یہی کہیں گے کہ جب انسانی علم مزید ترقی کر جائے گا تو ان آیاتِ قرآنیہ کا قطعی مفہوم ہمارے سامنے آ جائے گا۔ ان کے یقینی ہونے پر بہرحال ہمارا ایمان ہے۔ یہی کیفیت اُن تاریخی واقعات کی ہے جنہیں قرآنِ کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ ان میں سے اکثر واقعات کی تصدیق و توثیق تاریخی انکشافات سے ہو چکی ہے اور کچھ ایسے ہیں جن سے یہ تحقیق ہنوز پردہ نہیں اٹھا سکی۔ ان کے متعلق بھی سر دست یہی کہا جائے گا کہ

ان کے سچا ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور جب تاریخی تحقیقات آگے بڑھیں گی تو وہ ان کی تصدیق کر دینگی۔ جس طرح (مثلاً) فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا جو واقعہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے، صدیوں تک تاریخی تحقیق کے اعتبار سے وہ پردۂ اخفا میں رہا تآنکہ اہرامِ مصر کے نیچے ممی شدہ لاشوں کے انکشاف کے بعد قرآنِ کریم کا بیان حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آگیا۔ اس سے اگلا گوشہ ان حقائق پر مشتمل ہے جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ (مثلاً) مرنے کے بعد کی زندگی اور اس کی کیفیات۔ ان حقائق کی کنہ و ماہیت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے، البتہ دلائل و شواہد کی رو سے ان کے متعلق ذہن میں ایک تصور قائم کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ، ان کے حقیقتِ ثابتہ ہونے پر بھی ہمارا ایمان ہے۔

جس واقعہ کا ذکر آیاتِ زیرِ نظر (۲/۶۷-۷۳) میں آیا ہے، تاریخی تحقیق ابھی تک اس پر سے پردہ نہیں اٹھا سکی۔ اس لئے اس کے متعلق سردست جو کچھ کہا جائے گا، بہرحال قیاسی ہوگا۔ لیکن قیاس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ قرآنی اصول و قوانین یا اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، ان آیات کے مفہوم کی طرف آیئے۔ ان سے پہلی آیات میں گائے یا بیل

واقعۂ قتل کی عام تفسیر

(سانڈ) کے ذبح کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ عام طور پر مفسرین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق بھی ذبحِ بقرہ سے ہے یعنی ان آیات میں واقعاتی تسلسل ہے۔ اس اعتبار سے عام طور پر کہا یہ گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک قتل ہوگیا اور قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ چنانچہ وہ باہم جھگڑنے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام دھرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس بات کو یہ لوگ پوشیدہ رکھتے تھے (یعنی یہ کہ قاتل کون ہے) اسے ہم ظاہر کئے دیتے ہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ اس ذبح شدہ گائے کی لاش کا ایک ٹکڑا اس مقتول (مردہ) کی لاش کے ساتھ لگا دو۔ انہوں نے ایسا کیا تو مردہ جی اٹھا اور اس نے بتا دیا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ اس راز کے افشا کرنے کے بعد وہ پھر مرگیا۔ جن لوگوں کو اس مفہوم سے اختلاف ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ شخص درحقیقت مرا نہیں تھا بلکہ بیہوش ہوگیا تھا۔ یا اس میں عملِ تنفس بند ہوگیا تھا اور اس کے جسم کے بعض اعضا کو حرکت دینے سے اس میں عملِ تنفس پھر سے جاری ہوگیا یا وہ ہوش میں آگیا تھا۔ وہ ان آیات کے بعض الفاظ کے مجازی معانی کی تائید

سے اس نتیجہ تک پہنچنے کے مدعی ہیں۔ لیکن (ہمارے نزدیک) کسی شخص کا بیہوش ہو جانا یا اس پر سکتہ طاری ہو جانا تو کوئی ایسا اہم یا غیر معمولی واقعہ نہیں جسے قرآن کریم اتنی اہمیت دیتا۔ ہمارے خیال میں وہ مقتول تھا اور مر چکا تھا۔ اہمیت اس واقعہ کو یوں بھی ہے کہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اُسے ان میں سے کسی ایک شخص نے قتل کیا تھا۔ قَتَلْتُمْ جمع کا صیغہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اجتماعی سازش کا نتیجہ تھا، اور مقتول بھی کوئی اہم شخصیت تھی۔ جہاں تک اس مفہوم کا تعلق ہے کہ خدا نے یہ کہا کہ اُس مذبوحہ گائے یا بیل کی لاش کے کسی ایک ٹکڑے کو مقتول کی لاش کے ساتھ مس کر دو تو اس سے مقتول زندہ ہو جائے گا — اور وہ زندہ ہو گیا — تو اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کس کا تھا؟ معجزہ کے متعلق تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی کے ہاتھوں سرزد ہوتا تھا، اور اس طرح وہ اس نبی کے دعوائے نبوت کی دلیل یا شہادت بن جاتا تھا۔ لیکن یہ معجزہ، حضرت موسےٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سرزد نہیں ہوا۔ لہذا یہ معجزہ اُس گائے کا ہو گیا جسے ذبح کیا گیا تھا۔ اور یہ بات تسلیم کئے جانے کے قابل ہی نہیں۔ اُس گائے کو بنی اسرائیل کے ہاتھوں اس لئے ذبح کرایا گیا تھا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ گائے عام مویشیوں کی طرح ایک مویشی ہے جو خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتی۔ وہ انسان کے قابو اور قبضہ میں ہوتی ہے جسے وہ جس وقت چاہے ذبح کر سکتا ہے۔ لہذا اسے معبود سمجھنا انتہائی حماقت ہے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ اُس ذبح شدہ گائے میں بھی یہ قدرت ہو کہ اُس کے چھونے سے ایک مردہ زندہ ہو جائے تو اس کے معبود ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے؟ یہ تو عجیب سی بات ہوتی کہ بنی اسرائیل کے دل سے گائے کی عظمت و عقیدت زائل کرنے کے لئے اُسے اُن کے ہاتھوں ذبح کرایا گیا، اور پھر اس ذبح شدہ گائے کو ایسی قدرت کا حامل ثابت کر کے دکھا دیا جو خدا ہی کے شایانِ شان ہو سکتی ہے۔ اس سے تو اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔

اب آگے بڑھیے۔ اس تفسیر کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس تصور کو سامنے لائیے کہ مردہ گائے کے ایک ٹکڑے کو لاش کے ساتھ مس کیا گیا تو وہ مردہ زندہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد خدا نے کہا کہ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (۲/۷۳) "اس طرح خدا مردوں کو زندہ کیا کرتا ہے — اور زندہ کرے گا"۔ اس میں كَذٰلِكَ (یعنی اس طرح) کا لفظ

قابلِ غور ہے۔ یعنی خدا نے کہا یہ ہے کہ ہم مردہ انسانوں کے جسموں کے ساتھ مردہ حیوانات کے بعض ٹکڑوں کو مس کریں گے اور اس طرح مردے جی اٹھیں گے! اس تفسیر کے بے معنی (بلکہ قرآنی تصور کے خلاف) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ اگر خدا کو یہی مقصود تھا کہ وہ مقتول زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ نشان بتا دے تو اس کے لئے اس ذبح شدہ گائے کو درمیان میں لانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ اس کے بغیر اپنے حکم سے براہِ راست ایسا نہیں کر سکتے تھے؟

اس کی تفسیر میں قیاس کا رُخ کس سمت کی طرف ہونا چاہیئے، اس کا تعین آیت (۲/۷۳) کے آخری الفاظ نے خود ہی کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۲/۷۳)، "اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی باتیں بتاتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لو"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس واقعہ میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اُسے عقل و فکر کی رو سے سمجھا جانا چاہیئے۔ اگر یہ خارقِ فطرت معجزہ ہوتا تو اسے سمجھنے کے لئے عقل کو اپیل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ معجزہ تو کہتے ہی اُسے ہیں جس کے سمجھنے سے عقل عاجز آجائے۔ بنابریں، اس کے متعلق جو قیاس بھی کیا جائے اس کی بُنیاد عقل و فکر پر ہونی چاہیئے۔ یعنی اُسے عقل و بصیرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ذبح بقر کے واقعہ سے نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی ان اور اسی نہج کی دیگر آیات میں بنی اسرائیل کی تاریخ کو سامنے لایا گیا ہے جو حضرتِ موسےٰ علیہ السلام سے لے کر نزولِ قرآن کریم کے زمانے تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا زیرِ نظر واقعہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے کسی اور دور سے متعلق ہے۔ اس کا تعلق ذبحِ بقر کے زمانے یا واقعہ سے نہیں۔ یہ ایک الگ واقعہ ہے۔

ہمارا قیاس

ہمارے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ اُس قوم کے کسی گروہ نے خفیہ سازش سے کسی نامور ہستی کو قتل کر دیا اور کوشش کی کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے قوم میں کھلبلی مچ گئی ہو گی اور قاتل کے تعین میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے ہوں گے جس سے وہ ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہوں گے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کے پہچاننے کا ایک نفسیاتی طریقہ بتایا جو اس زمانے میں وحی کے ذریعے ہی بتایا جا سکتا تھا۔ آپ پہلے کسی لاش کا تصور ذہن میں لائیے۔ وہ مرنے والا اپنے آخری سانس تک تمام گھر والوں کے لئے عزیز ترین ہستی اور محبت و پیار کا پیکر تھا۔ لیکن سانس بند ہو جانے کے بعد جب وہ زندہ انسان کے بجائے مردہ ہو گیا تو اس کی لاش سے گھر پر ہیبت طاری ہو گئی جس کمرے میں اُس لاش کو رات بھر کے لئے رکھا گیا، کوئی

شخص اس میں تنہا جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ رات بھر مُردے کی چارپائی کے گرد بہت سے لوگ (بالعموم عورتیں) جمع رہتی اور کچھ پڑھتی پڑھاتی رہتی ہیں تاکہ خیال لاش کی طرف نہ جانے پائے۔ یہ کیفیت ہوجاتی ہے لاش کی۔ اور وہ لاش اگر کسی مقتول کی ہو تو اس کی ہیبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ قتل کا جرم ایسا سنگین ہوتا ہے کہ قاتل کسی فوری جذبے کے ماتحت اس کا خفیہ ارتکاب تو کر لیتا ہے لیکن جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس جرم کا احساس اس کے دل میں کرب و اضطراب کی ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خون چھپا نہیں رہتا۔ وہ مجرم کے سر پہ چڑھ جاتا ہے۔ آجکل سنگین خفیہ جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں خاص نفسیاتی طریق عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ان طریقوں کے ماہرین ملزم سے مختلف سوالات کے دوران اُس کے چہرے کی علامات اور آثار سے اکثر اوقات صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب ایسے آلات بھی ایجاد ہو گئے ہیں جو ملزم کے دورانِ خون، دل کی

تفتیش کا نفسیاتی طریق

دھڑکن، نبض کی رفتار کو اس طرح ریکارڈ کرتے جاتے ہیں کہ اُن سے اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ کر لینا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو پھر بھی ماہرینِ علم النفس کے وضع کردہ طریق ہیں، ہمارے ہاں بالکل نچلی سطح پر چور کا پتہ لگانے کا ایک طریقہ تھا، (اور دیہات وغیرہ میں اب بھی ہے) جسے "لوٹا گھمانا" کہتے ہیں۔ ایک "سیانا" لوٹا لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ پڑھتا ہے اور جن لوگوں پر چوری کا شبہ ہوتا ہے اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایک ایک شخص آکر لوٹے پر ہاتھ رکھے۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جو چور ہوگا اُس کے ہاتھ رکھنے سے لوٹا گھوم جائے گا۔ لوٹا گھومتا گھماتا تو کچھ نہیں لیکن جب چور لوٹے پر ہاتھ رکھتا ہے تو اس کا رنگ ضرور فق ہو جاتا ہے اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں (غالباً یہیں سے ہمارے ہاں "چور کی داڑھی میں تنکا" کا محاورہ رائج ہو گیا۔ اگرچہ اب عادی مجرم اپنی داڑھیاں منڈائے رکھتے ہیں تاکہ ان میں تنکا نہ اٹکے)، ہم سمجھتے ہیں کہ قصۂ زیرِ نظر میں اسی قسم کا نفسیاتی طریق تھا۔ جو بذریعہ وحی بتایا گیا تھا ــــ اس پر کچھ تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ وحی اس قسم کی باتیں بھی بتایا کرتی تھی، انسان کے ابتدائی ادوار میں تو کیفیت یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کے ذریعے بتایا گیا تھا۔ (۱۱/۳۷ ؛ ۲۳/۲۷)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کہا یہ گیا ہوگا کہ جن لوگوں پر قتل کا شبہ ہے اُن میں سے ایک ایک شخص لاش کے قریب آئے اور لاش کا ہاتھ اٹھا کر اس کے جسم سے لگا دیا جائے۔ تفتیش کنندہ اس کا گہری نظر سے جائزہ لیتا جائے کہ کس پر کس قسم کی کیفیت

طاری ہوتی ہے۔ یا ان سے پہلے ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ قاتل تنہائی میں سچی سچی بات بتا دے ورنہ اس لاش کے چھونے سے سارا راز کھل کر سامنے آجائے گا۔ تفتیش کے اسی طریق پر غور و فکر کی دعوت قرآنِ کریم نے دی ہے اور اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اب تفتیشِ جرائم کا نفسیاتی طریق عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اِس مفہوم کے سلسلے میں، البتہ ایک بات وضاحت طلب رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (۲/۷۳)۔ لغوی اعتبار سے تو اس کا ترجمہ یہی ہوگا کہ "اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے"۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس سے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲/۷۳) (تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے سکو) کا ربط قائم نہیں رہتا، اس لئے ان الفاظ کے لغوی نہیں بلکہ مجازی معانی لینے ہوں گے۔ امام راغب نے "حیات" کے معنی قوتِ عقل و عمل بھی بتائے ہیں اور کسی بات کے ظاہر یا واضح ہو جانے کے بھی۔ چنانچہ حَيِيَ الطَّرِيْقُ کے معنی ہیں، راستہ ظاہر یا واضح ہو گیا۔ اور طَرِيْقٌ حَيِيٌّ کے معنے ہیں واضح راستہ۔ اور جب موت کا لفظ اس کے مقابل آئے گا تو اس سے مفہوم کسی بات کا پوشیدہ ہو جانا ہوگا۔ چنانچہ عقل و ہوش یا حواس کے گم ہو جانے پر بھی موت کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ آیت (۲/۷۲) میں مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔ (۲/۷۲)۔ (جسے تم چھپاتے ہو) کو آیت (۲/۷۳) میں الْمَوْتٰى (مخفی یا پوشیدہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ۔ (خدا ظاہر کر دے گا) کی يُحْيِ اللّٰهُ سے وضاحت کر دی گئی ہے۔ آیاتِ زیرِ نظر میں نقطۂ ماسکہ "پوشیدہ راز کا ظاہر کرنا تھا" نہ کہ مردہ کو زندہ کر کے دکھانا۔ وہ راز اس طرح سے ظاہر ہو گیا۔ یوں بھی قرآنِ کریم نے مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا دینے کو "حیات" سے تعبیر کیا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۷۹)۔ "اے اربابِ عقل و بصیرت! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا ملنے سے قوم کو زندگی (حیات) عطا ہو جاتی ہے۔

بہرحال، جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے۔ حقیقت اُس وقت سامنے آئے گی جب تاریخی تحقیق اس واقعہ سے پردہ اٹھائے گی۔ اُس وقت تک ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ بحالاتِ موجودہ ہماری فکر کی حد یہی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ امام ابنِ کثیرؒ جیسے مفسرؒ، جو قدامت پرستی اور اعجوبہ پسندی میں عام طور پر بہت شدت اختیار کر جاتے ہیں، اس واقعہ کے ضمن میں، انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی موقف اختیار کیا ہے۔ وہ گائے کے ٹکڑے کو لاش کے ساتھ چھونے کے ضمن میں

لکھتے ہیں کہ :۔

اس کا بیان نہ تو قرآن میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں، اور نہ ہمیں اس کے معلوم ہونے سے کوئی فائدہ ہے، نہ، نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان ہے۔ سلامت روی اسی میں ہے کہ جس چیز کا بیان نہیں، ہم بھی اس کی تلاش و تفتیش میں نہ پڑیں۔

(تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول۔ صفحہ ۱۰۱)

اس کے برعکس ہمارے دور کے مفسر، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے،

مودودی صاحب کا قرآن پر اعتراض

اس سے ہمیں افسوس ہی نہیں، سخت صدمہ ہوا۔ ہمیں ان کے خیالات سے اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ اختلاف کی صورت میں ہمیں کسی قسم کا صدمہ تو ایک طرف، تأسف بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن جب کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس سے (معاذ اللہ) خدا کی اس کتاب عظیم پر حرف آتا ہو تو اُس سے ہمیں واقعی دلی افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔ وہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

اس مقام پر بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لئے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی "لاش کو اسکے ایک حصے سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اُسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انہیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اُسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیئے تھی نہ کہ اُس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہو۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۸۶)

اس "بیک کرشمہ دو کار" کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ جو کچھ ہم نے اس کے معجزہ ہونے اور اس گائے کی عظمت و تقدیس کے مسلّم ہو جانے کے سلسلے میں پہلے لکھا ہے وہ اس کی تردید کے لئے کافی ہے۔ لیکن

جس بات سے ہمیں صدمہ ہوا وہ مودودی صاحب کے یہ الفاظ ہیں کہ "اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی "

اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔

قرآن کے الفاظ میں "ابہام" ۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ۔ غیر مسلم تو اس قسم کے اعتراض کیا کرتے ہیں لیکن کسی مسلمان سے قرآن کریم کے متعلق اس قسم کی جسارت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ (۵/۱۵) کہا ہے یعنی روشن اور نہایت واضح کتاب ؛ ایسی واضح کہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) "ہر شے کو نہایت وضاحت سے بیان کرنے والی" جس کتاب کے متعلق خود اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہوں، اس کے متعلق یہ کہنا کہ اُس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے، بہت بڑی جسارت ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جائے کہ ہماری فکر ہنوز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ ان الفاظ کے حقیقی مفہوم کو سمجھ سکے، کیونکہ تاریخی تحقیق ابھی وہاں تک نہیں پہنچ سکی، یہ کہنا کہ اِس کے الفاظ میں ابہام ہے، ہم تو سمجھ نہیں سکے کہ اسے کیا کہا جائے ؟ یعنی اپنی فکر کی نارسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے خدا کی کتاب کو مبہم قرار دینا۔ استغفر اللہ۔ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ :۔

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ   ترا گناہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

اِن صاحب کا کہنا یہ ہے کہ "یہ میرا گناہ نہیں، نخیلِ بلند کا گناہ ہے۔ کیونکہ میرا ہاتھ کوتاہ نہیں اور میری نگاہ فرومایہ نہیں ہوسکتی"؛ ہم عاجز بندوں کا تو بہرحال ایمان یہ ہے کہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے !

(٭)

خدا کی کتابِ مبین کو مبہم کہنے والوں کی یہی قساوتِ قلبی ہے جس کی طرف (بالواسطہ) اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں کہا ہے :۔

۲/۷۴ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔

(بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ) تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا، تم بگڑتے اور بنتے رہے، لیکن مسلسل تکبر اور رعونت سے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ بعض پتھر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ اُن سے پانی کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اور بعض ایسے کہ وہ پھٹ جاتے ہیں تو ان کے اندر سے پانی کے چشمے اور ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور ایسے پتھر بھی ہوتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کی رو سے اپنی سختی کو چھوڑ کر نرم پڑ جاتے ہیں لیکن تمہارے دل ہیں کہ نہ وہ انسانیت کی غمخواری میں نرم ہوتے ہیں اور نہ اپنی رعونت کو چھوڑ کر صداقت کے سامنے جھکتے ہیں۔

مسلسل سرکشی اور تمرّد، نخوت اور تکبر سے انسان کے دل کی جو حالت ہو جاتی ہے اُسے قرآنِ کریم نے بہ ہیئتِ مجموعی پتھر سے تشبیہ دی ہے۔ (کالحجارۃ — پتھر نہیں بلکہ پتھر کی مانند) یہ وہی تمثیلی انداز ہے جو سورۃ الحشر کی آیت (۵۹/۲۱) میں اختیار کیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۵۹/۲۱) "اس قرآن کی اثر انگیزیوں کا عالم یہ ہے کہ اگر، مثال کے طور پر، ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساس عطا کر دیتے) تو تُو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے احساس سے اُس پر لرزہ طاری ہو جاتا اور ذمہ داریوں کے خیال سے اس کا جگر شق ہو جاتا ہے۔ اِس قسم کی مثالیں ہم اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ یہ قرآن کن عظمتوں کا مالک ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔"

قساوتِ قلبی

آیۂ زیرِ نظر میں ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۷۴)، قساوت کے معنی سخت ہو جانا ہیں۔ حَجَرٌ قَاسٍ، ٹھوس اور سخت پتھر کو کہتے ہیں۔ اَرْضٌ قَاسِيَةٌ سخت چٹیل زمین، جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ اس سے قساوتِ قلبی یا سنگدلی کا تصور سامنے آ جاتا ہے۔ دلوں کی یہ حالت کیسے ہو جاتی ہے اس کے متعلق جماعتِ مومنین سے کہا وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷/۱۶) "دیکھنا! تم کہیں سابقہ اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ (ضد)، تعصب اور تقلید کی

روش اختیار کی، اور پھر جب اس روش پر چلتے ایک عرصہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور وہ راہِ راست سے پھر کر ایک طرف کو ہو گئے۔" اس کے بعد خود ان اہل کتاب (یہودیوں) سے کہا کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ (۵۷/۱۷)۔ "اب بھی مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ مردہ زمین کو کس طرح حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ تم بھی اگر اس کے قوانین سے ہم آہنگی اختیار کر لو تو تمہارے دلوں کی سختی نرمی سے بدل سکتی ہے۔" دوسری جگہ ہے۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (۵/۱۳)۔ "انہوں نے خدا سے جو عہد باندھے تھے انہیں ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ نعماتے خداوندی سے محروم ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کے دل ایسے سخت ہو گئے کہ وہ خدا کی وحی میں تحریف کرنے لگ گئے اور اس کے ایک حصے کو یکسر فراموش کر دیا۔"

دل کس طرح سخت ہو جاتے ہیں

وحیِ خداوندی میں تحریف اور آمیزش کس طرح سے ہوتی ہے اس کے متعلق (۲۲/۵۲) میں کہا کہ رسول اللہ سے پہلے ہر رسول کے ساتھ یہی ہوتا رہا کہ اُس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد شیطانی عناصر اس کی وحی میں آمیزش کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہوتا یا ان کے دل سخت ہو چکے ہوتے، وہ تحریف اور آمیزش ان کے لئے باعثِ فتنہ بن جاتی (۲۲/۵۳) اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶/۴۳)۔ "شیطان ان کے غلط اعمال کو نہایت خوشنما بنا کر دکھاتا۔" سورۃ الزمر میں کہا کہ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۹/۲۲)۔ "کیا وہ شخص جس کے سینے میں کشادہ پیدا ہو چکی ہے، اور وہ سفرِ حیات خدا کی عطا کردہ روشنی کی راہنمائی میں طے کر رہا ہو، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے سخت ہو چکا ہو۔ ایسے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہوتے ہیں۔" اس سے واضح ہو گیا کہ قساوتِ قلبی شرحِ صدر کی ضد ہے۔ اور شرحِ صدر اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور وہ انسان بڑا خوش بخت ہے جسے یہ حاصل ہو جائے۔ کشادِ قلب، وسعتِ ظرف، پہنائیِ نگاہ، حق و صداقت قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادگی، اور بخل اور خود غرضی کے مقابلے میں دوسروں کی ہمدردی کے لئے اپنے سینے کا کھلا رکھنا۔ یہ ہیں شرافتِ انسانیہ کے خصائصِ کبریٰ۔ اور یہود انہی خصائص سے محروم ہو چکے تھے۔ جہاں تک بخل اور خود غرضی کا تعلق ہے، یہودیوں کی دناءت دنیا

میں ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے۔ یہودی ذہنیت (JEWISH MENTALITY) کا مفہوم کسے معلوم نہیں؛ شیکسپیر نے اپنے ڈرامہ (THE MERCHANT OF VENICE) میں (SHYLOCK) کے کردار میں، یہودیوں کی جس ذہنیت کا نقشہ کھینچا ہے وہ ان کی قساوت بلکہ شقاوتِ قلبی کی زندہ شہادت ہے۔

یہودیوں کی خود غرضی

کارل مارکس نے جس کا خاندان نسلاً یہودی تھا (اگرچہ اس کے باپ نے یہودیت کو ترک کرکے عیسائیت کا مذہب اختیار کر لیا تھا) زر پرستی کو "یہودیت" سے تعبیر کیا ہے۔ واضح رہے کہ جرمن زبان میں یہودیت اور کاروبار دونوں کے لئے (JUDENTUM) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہودیت، یعنی کاروبار (تجارت) ایک ایسا مذہب ہے جس میں زر (دولت) کی حیثیت خدا کی ہے۔

یہودی کا دنیاوی مسلک کیا ہے، کاروبار — اس کا دنیاوی خدا کون ہے، روپیہ[1] - یہ زر، اسرائیل کا وہ حاسد خدا ہے جو کسی دوسرے کو خدا برداشت نہیں کر سکتا۔ زر انسان کے تمام خداؤں کو تخت سے اتار دیتا ہے اور ان کو اشیائے بازاری میں بدل دیتا ہے۔ زر تمام چیزوں کی آفاقی قدر ہے۔ لہٰذا اس نے ساری دنیا کو — دنیائے انسانیت اور دنیائے فطرت دونوں کو — ان کی اپنی قدروں سے محروم کر دیا ہے۔ اور انسان، اس کی پرستش کرتا ہے۔ لہٰذا یہودیوں اور غیر یہودیوں کی آزادی اور تجارت کا انحصار، بنی نوعِ انسان کے یہودیت، یعنی تجارتی کاروبار سے نجات حاصل کرنے پر ہے۔

(بحوالہ "موسیٰؑ سے مارکس تک"۔ از سبطِ حسن صفحہ ۲۸۵-۸۶)

یہ تھے یہودی، جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا کہ اُن کے دل پتھروں جیسے ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ پتھروں میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کی دراڑوں میں سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ ایسے بھی کہ جب وہ کہیں سے شق ہو جاتے ہیں تو ان میں سے صاف شفاف قطراتِ آب موتیوں کی طرح ٹپکنے

---

[1] خود پاکستان کے ہمسایہ "یہودی" (ہندوؤں) کے ہاں بھی دولت کی پرستش ہوتی ہے۔ لکشمی، دولت ہی کی دیوی کا نام ہے اور دھن (مال) کا لفظ ان کے ہاں انتہائی خوش نصیبی اور مبارک بادی کے لئے بولا جاتا ہے۔

لگ جاتے ہیں۔ ایسے بھی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں تو ان کی سختی اور صلابت میں نرمی (لچک) پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ شقی القلب ایسے ہیں کہ نہ کسی مظلوم کی مظلومیت پر ان کا دل پگھلتا ہے، نہ کسی رستم رسیدہ انسان سے ہمدردی میں ان کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے۔ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ "نم بہ چشمِ منعماں کم دیدہ ام" تو اس میں انہی جیسے سرمایہ داروں کی طرف اشارہ ہے۔ آج بھی دنیا میں یہودیوں کی سرمایہ داری نے جس طرح جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔، اس کا کسے علم نہیں۔ غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال ان کا شیوہ اور سلب و نہب ان کا شعار ہے۔ یہ سب انکی قساوتِ قلبی کی وجہ سے ہے۔ آیت زیرِ نظر کے آخری الفاظ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲/۷۴) نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اُن کی اس قساوتِ قلبی کا مظاہرہ اُن کی سیرت و کردار کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔

ضمناً، اس آیت میں ایک لفظ خشیت بھی آیا ہے۔ آیت (۲/۴۰) میں "فارھبون" کی تشریح کرتے

خشیت کا مفہوم

ہوئے وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ خوفِ خدا کا مفہوم کیا ہے۔ اس مادہ (خشیت) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی کام کا انجام معلوم ہونے کی وجہ سے اُس سے اندیشہ کرنا اور احتراز برتنا۔ سورۃ طٰهٰ میں قرآنِ کریم کے متعلق ہے اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۲۰/۳)۔ "یہ قرآن اس شخص کے لئے آیۂ عبرت ہے جو جانتا ہے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ کیا ہوگا"۔ اسی کا نام خشیتِ خداوندی ہے۔

——— (٠) ———

یہودیوں کی اس ذہنیت کو سامنے لانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا کہ:۔

۲/۷۵ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا کہ "کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ یہ قوم، تمہاری بات مان کر قرآنِ کریم پر ایمان لے آئے گی؟ ایسا سمجھنا تمہاری خوش فہمی ہوگا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ عوام تو ایک طرف، ان کے مذہبی پیشوا، خود اپنی کتابوں میں تحریف کرتے رہے، اور اب

بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تمہاری محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کا کلام (قرآن مجید) سنتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح سے سمجھتے اور جانتے ہیں کہ وہ واقعی خدا کا کلام ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھتے ہیں تو خدا کی ان آیات کو نہایت مسخ شدہ صورت میں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی بد دیانتی اور جراءتِ دزدیدگی[1] کا یہ عالم ہو' اور وہ دیدہ دانستہ، جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہوں، اُن سے اس کی توقع رکھنا کہ وہ قرآن کی صداقت کو مخلصانہ طور پر قبول کرلیں گے ۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں ؟

ضمناً ہم نے "افتطمعون" کا ترجمہ توقع کرنا کیا ہے۔ لیکن توقع اور طمع میں بڑا باریک فرق ہے۔ توقع کا تعلق ذہن اور خیال سے ہوتا ہے اور طمع کے معنی ہوتے ہیں وہ خواہش اور آرزو جو دل میں پیدا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ نبیِ اکرمؐ اور جماعتِ مومنین دل سے چاہتے تھے کہ یہ راہ گم کردہ قوم کسی طرح صحیح راستے پر آجائے تاکہ ان کی ذلت وخواری کی زندگی، خوشگواریوں اور سرفرازیوں میں بدل جائے ۔ ایک طبیبِ مشفق

حضورؐ کی شفقتِ قلبی

کی طرح جو دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح مریض کا دکھ دور ہو جائے۔ حضور نبیِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق خصوصیت سے کہا گیا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۲۶/۳) "تو تو اس غم سے اپنی جان گھُلائے گا کہ لوگ صداقت کو کیوں نہیں مانتے"۔

قرآنِ کریم نے جو یہ کہا ہے کہ یہ لوگ تمہاری محفلوں میں آکر کلام اللہ سنتے ہیں اور باہر جاکر اُسے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں تو یہ چیز نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے، نہ کسی خاص زمانے میں مقید۔ پروپیگنڈے میں ہوتا ہی یہ ہے کہ کسی شخص کی بات کو صحیح شکل میں پیش نہیں کیا جاتا، اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ ابلیس کا خاص حربہ ہے۔

(۰)

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک اور ذہنیت کو بھی واشگاف کیا ہے جہاں کہا ہے:۔

۲/۷۶ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى

---

[1] چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

"جب یہ لوگ تمہاری محفلوں میں آتے ہیں یا تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں"۔ منافقین کی اس روش کا ذکر آیت (۲/۱۴) (پہلی جلد صفحہ ۲۰۹ تا ۲۴۶) میں آچکا ہے جہاں ان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب یہ لوگ تمہاری محفل سے اٹھ کر اپنے مذہبی پیشواؤں کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم نے کہیں مسلمانوں کو اپنی کتابوں کی وہ باتیں تو نہیں بتا دیں جن سے ثابت ہو کہ اُن کا رسول برحق ہے اور اس طرح وہ ان

ان کی منافقت

حوالوں کو تمہارے خلاف پیش کر کے تمہیں شکست دے دیں؟ وہ (ان کے سرغنے) ان سے کہتے کہ تم وہاں جاتے ہو تو اپنے حواس برقرار رکھا کرو اور اس کی احتیاط برتا کرو کہ تمہاری زبان پر بھولے سے بھی کوئی ایسی بات نہ آنے پائے۔

زمانۂ نزولِ قرآن میں، یہودیوں کی مبیّنہ آسمانی کتابوں کی یہ کیفیت تھی کہ ایک تو وہ عبرانی زبان میں تھیں، جس سے غیر یہودی بالعموم ناواقف تھے۔ اس لئے انہیں معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُن کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ پھر، ان کے مذہبی پیشوا ان کتابوں کو بالعموم دوسروں سے چھپا کر بھی رکھتے تھے۔ ان کتابوں میں بڑی حد تک تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُن میں ایسی چیزیں موجود تھیں جو ایک آنے والے رسول کا ذکر کرتی تھیں اور اس کی جو علامات بتاتی تھیں اُن پر حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پورے اُترتے تھے۔ احبار و رہبان، اپنے اُن لوگوں سے، جو مسلمانوں کی محفلوں میں جاتے، تاکیداً کہتے تھے کہ اُن سے کہیں تم یہ نہ کہہ دینا کہ ہماری کتابوں میں ایک آنے والے رسول کا ذکر ہے اور اس کی یہ علامات بتائی گئی ہیں۔ ایسا کرو گے تو وہ خود تمہاری شہادات کو تمہارے خلاف پیش کر کے ثابت کر دیں گے کہ وہ آنے والے رسولِ آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم یہی ہیں۔ اس کا تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اس لئے اس کی بڑی احتیاط برتنا۔

دنیا کے مذاہب میں ہوتا یہی ہے۔ مذہبی پیشوا اپنی تعلیم کو "گپت ودیا" بنا کر رکھتے ہیں تاکہ اس پر ان کی اجارہ داری قائم رہے اور کسی دوسرے کی اس تک رسائی نہ ہو۔ اور تو اور، وہ خود اپنے عوام سے بھی حقیقی تعلیم کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ خود ہمارے ہاں اس کی کتنی احتیاط برتی جاتی ہے

کہ مسلمانوں کے سامنے قرآنِ خالص نہ آنے پائے۔ کیونکہ اس سے مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے!

(٥)

ان اہلِ کتاب کے علماء اور مشائخ ایسی احتیاط برتتے تھے۔ لیکن ان کی ان چالوں کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ:-

۲/۷۷ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ۔

ان کی حماقت ملاحظہ فرماؤ کہ یہ اپنی کتابوں کی صحیح تعلیم کو اُس خدا سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں جس نے وہ کتابیں نازل کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی ازلی علم کی بنا پر سابقہ کتابوں کی حقیقی تعلیم کو قرآنِ کریم کے اندر شامل کر دیا۔ جہاں تک ان کی اس کوشش کا تعلق تھا کہ مسلمان اُن کی کتابوں کو سمجھنے نہ پائیں تو وہ بھی ناکام نہ رہ گئیں (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کی کتابیں عبرانی زبان میں تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ وہ عبرانی زبان سیکھ لیں، تو انہوں نے ہفتہ عشرہ کے اندر اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی جس سے وہ یہودیوں کی کتابوں کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل و بنیاد کی رُو سے عربی اور عبرانی زبان ایک ہی ہیں۔ بلکہ عبرانی زبان کی اُم (ماں) بھی عربی زبان ہے۔ اس لئے جس شخص کو عربی زبان پر عبور ہو، اُسے عبرانی زبان کے سمجھنے اور سیکھنے میں زیادہ دشواری لاحق نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہی وجہ تھی جو (تاریخ میں ہے کہ) حضرتِ عمرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے، دوسرے ملکوں میں جاتے تو وقت نکال کر یہودیوں کے اہلِ علم لوگوں کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان کی زبان سمجھتے تھے۔ بہر حال، یہودی علماء کی کوششوں کے باوجود اُن کی کتابوں کی کوئی بات مسلمانوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

لفظ حدیث کے معنی

ضمناً آیت (۲/۷۶) میں اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ کا لفظ آیا ہے۔ لفظِ حدیث کے عام معنی بات کے ہیں۔ اس اعتبار سے خود قرآنِ کریم کو بھی حدیث کہا گیا ہے، یعنی خدا کی بات۔ سورۃ النساء میں ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (۴/۸۷) "اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا کون ہے؟" اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی "یہ سچی باتیں" قرآنِ مجید ہی کے اندر ہیں۔ اسی بنا پر مخالفین کو جو چیلنج دیا گیا تھا تو ان سے کہا گیا تھا فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا

صٰدِقِيْنَ۔ (۲/۲۳)۔" اگر یہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کہ قرآن، خدا کا کلام نہیں، انسان کا وضع کردہ ہے تو یہ اس کی مثل کوئی حدیث (بات) لاکر بتائیں"۔

اسی مادہ سے حَدَّثَ کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کا چرچا کرنا یا اُسے عام کرنا۔ سورۃ الضحیٰ میں ہے۔ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (۹۳/۱۱)۔" اے رسولؐ! تم خدا کی نعمتوں کا عام چرچا کرو"۔ اس لفظ کے یہی معنے آیت (۲/۷۶) میں ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں ہم نے لفظ حدیث کے عام معانی سے متعلق گفتگو کی ہے۔ اس کے اصطلاحی مفہوم (احادیثِ رسولؐ اللہ) سے متعلق اپنے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

(۰)

اوپر سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا تھا کہ اہلِ کتاب کے مذہبی پیشوا، اپنی کتابوں کی تعلیم کو، خود اپنے عوام کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور اُن کے لئے ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ ان عوام کی حالت یہ تھی کہ

۲/۷۸ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ

اس کے عام معنی یہ ہیں کہ یہ عوام اُمّی تھے اور کتاب کے متعلق امانی سے زیادہ کچھ علم نہیں رکھتے تھے۔ یہاں اُمّی اور امانی کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔

اُمّی کے معنی لفظِ اُمّی کا مادہ (ا۔م۔م) ہے اور اس کے بنیادی معنے "ماں" کے ہیں۔ اس اعتبار سے کسی شے کی اصل و بنیاد کو اُم کہا جاتا ہے۔ اسی سے لفظ اُمّت ہے جس کے معنی قوم یا جماعت کے ہیں (اس کا تشریحی مفہوم آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گا)

لفظ اُمّی کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو۔ یعنی جس حالت میں اُسے اس کی ماں نے جنا تھا وہ اُسی حالت میں ہو۔ اس سے اس لفظ کے معنی غیر تعلیم یافتہ یا اَن پڑھ ہو گئے۔ اہلِ کتاب اپنے سے غیر عربوں کو اُمّی کہتے تھے اور اس سے مراد تھی ایسی قوم جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ عربی اور اُمّی کو مرادف معانی میں استعمال کیا کرتے تھے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے کہ یہ اہلِ کتاب کہتے ہیں۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ۔ (۳/۷۴)۔ ان عربوں (غیر اہلِ کتاب)

کے ساتھ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا"۔ یہاں اُمّی کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے اور انہی معانی میں دوسری جگہ ہے۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ (۳/۱۹) "اے رسولؐ! تم اہل کتاب سے بھی کہو اور امیین سے بھی کہ کیا تم اسلام لاتے ہو یا نہیں؟" یہاں قرآن کریم نے امیین کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت انہی غیر اہل کتاب عربوں میں ہوئی تھی اس لئے سورۃ الجمعہ میں ہے۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (۶۲/۲) "اللہ وہ ہے جس نے ان امیوں میں، خود انہی سے ایک رسول مبعوث کیا"۔

عرب، مکہ کو امّ القریٰ (۶/۹۳) کہتے تھے۔ اس شہر کی نسبت سے اہل مکہ کو بھی اُمّی کہا جاتا تھا۔

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے لفظ اُمّی کے معنی ہیں (۱) اَن پڑھ۔ (۲) اس قوم کا فرد جس کی طرف قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی یعنی غیر اہل کتاب۔ اور (۳) مکہ کا رہنے والا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو قرآن کریم نے کہا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ (۷/۱۵۷) "یہ لوگ (مومنین) نبیِ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں"؛ تو اس میں لفظِ اُمّی کے تینوں معانی لئے جا سکتے ہیں یعنی مکہ کا باشندہ یا اس قوم کا فرد جس کی طرف پہلے کتاب نہیں آئی تھی۔ اور اَن پڑھ۔

جہاں تک حضورؐ کے ان پڑھ ہونے کا تعلق ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حضورؐ کی یہ کیفیت نبوت سے پہلے کی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد حضورؐ کی یہ حالت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سورۃ عنکبوت میں اس کی وضاحت ان الفاظ

حضورؐ اَن پڑھ نہیں رہے تھے

میں کر دی؛ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (۲۹/۴۸) اے رسولؐ! تو نبوت ملنے سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا، نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔ اس آیت میں مِنْ قَبْلِهٖ نے واضح طور پر بتا دیا کہ حضورؐ نبوت سے پہلے بے شک لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، لیکن نبوت کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تمام عمر اَن پڑھ رہے تھے، قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہے۔

اب لفظ اَمانی کی طرف آیئے۔ اس کا مادہ (م۔ ن۔ ی) ہے۔ بنیادی طور پر اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ (۱) خواہشات۔ آرزوئیں، تمنائیں، جذبات۔ اور (۲) کسی کتاب کی تلاوت، یعنی مفہوم سمجھے بغیر اس کا

لفظ امانی کے معنی

محض پڑھ لینا۔ رسول کی کتاب کے مندرجات کے لئے یہ لفظ (۲/۵۲) میں آیا ہے۔ اس کی تشریح پہلے بھی گذر چکی ہے۔ اور اس کے بعد اپنے مقام پر بھی آئے گی۔ یہاں اتنی تنبیہ کافی ہے کہ عام تراجم میں جو اس کے معنی تمنائیں یا آرزوئیں کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ جہاں تک اس کے دوسرے مفہوم (تمنا، آرزو) کا تعلق ہے، سورۃ البقرہ میں ہے۔ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۔ (۲/۱۱۱)۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی نہیں جا سکے گا۔ یہ محض ان کی خوش فہمیاں ہیں۔ باطل آرزوئیں ہیں۔ خود پیدا کردہ تمنائیں ہیں"۔ دوسری جگہ، ان کے ساتھ مسلمانوں کو بھی شامل کر کے بہ ہیئت مجموعی کہا کہ یاد رکھو! لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۔ (۴/۱۲۳)۔ "جنت میں داخلہ نہ تمہاری آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق ہوگا نہ اہلِ کتاب کی۔ یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں"۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا (۴/۱۲۳) جو بھی غلط کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ اور خدا کے سوا اس کا کوئی ایسا حامی اور مددگار نہیں ہوگا، جو اسے اس کی سزا سے بچا سکے۔ اس کے برعکس وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴)۔ "جو قرآنی معیار کے مطابق اچھے کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ قرآن کی صداقت پر یقین رکھتا ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہو سکیں گے اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی"۔

اِن دو الفاظ (اُمّی اور امانی) کے معانی متعین ہونے کے بعد آیت (۲/۷۸) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ان مذہبی پیشواؤں کی جو سازش ہے کہ کتاب کی تعلیم کو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جائے وہ اس میں اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ عوام اَن پڑھ ہوتے ہیں اور کتاب کے ساتھ محض ان کی

کتابُ اللہ کا رسمی اِحترام

عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر گھر میں کسی اونچی جگہ رکھتے ہیں۔ کھولتے ہیں تو اسے چومتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں، اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ اس کی سطروں اور لفظوں پر انگلی پھیر کر سمجھتے ہیں کہ ہمیں ثواب حاصل ہو گیا ہے۔ اس طرح کتاب اللہ، ان کی اس قسم کی فریب انگیز خوش فہمیوں اور مزین آرزوؤں کا مرجع بننے سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ان میں ایسے ہوتے ہیں جو محض کتاب

کے الفاظ دہراتے رہتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ ان الفاظ کے معانی اور مفہوم کیا ہے، یہ کتاب کو ناظرہ پڑھتے ہیں۔ اس کی محض تلاوت کرتے ہیں، اسے حفظ کر لیتے ہیں، اس سے زیادہ انہیں کتاب کا کچھ علم نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ جب عوام کی یہ حالت ہو تو ان کے مذہبی پیشوا، انہیں جو کچھ بتا دیں وہ اُسی کو کتاب کی تعلیم سمجھ لینگے۔

(۰)

مذہبی پیشوا، اُن کی اس جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور

۲/۷۹ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ۔

"یہ مذہبی پیشوا، خود اپنی طرف سے، جو جی میں آئے لکھتے رہتے ہیں اور عوام کے سامنے اسے شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے مقصد محض روٹی کمانا ہوتا ہے" ارشادِ خداوندی ہے کہ انکے یہ خود وضع کردہ فتاویٰ بھی ان کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں۔ اور جو کچھ یہ ان کے ذریعے کماتے ہیں وہ بھی ان کی بربادی کا باعث۔ شریعت سازی اور دین فروشی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ (ان امور کی تشریح جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۱۶، صفحہ ۲۵) اور زیرِ نظر جلد میں آیات (۲/۴۲-۴۱) کے تحت کی جا چکی ہے)

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی تکذیب کرنے والوں کے متعلق کہا (جس سے ظاہر ہے کہ اس سے خود ہمارے ہاں کے دین فروش علماء مراد ہیں) کہ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُونَ۔ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ۔ (۵۶/۸۲-۸۱) "کیا تم قرآن جیسی عظیم کتاب سے خود بھی پھسلتے ہو اور دوسروں کو بھی پھسلاتے ہو، اور اس کی تکذیب کرتے ہو، تاکہ اس طرح تم روٹی کما سکو۔ تم نے تکذیبِ دین کو ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے" حقیقت یہ ہے کہ جب بھی دین، ذریعۂ معاش بن جائے تو انسان کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کسی مذہب کی پیشوائیت کی بھی تخصیص نہیں۔

دین فروشی

(۰)

پھر ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خود بھی اس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، اور دوسرے لوگوں سے بھی کہتے ہیں کہ

۲/۸۰ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۚ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

"اول تو ہم لوگ جہنم میں جائیں گے ہی نہیں اور جائیں گے بھی تو صرف چند دنوں کے لئے۔ اس کے بعد ہمارے بزرگ ہمیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے"۔ ان کی اس خوش فہمی کی تردید میں کہا کہ "ان سے پوچھو کہ کیا تم نے خدا سے اس قسم کا کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟ اگر ایسا وعدہ لے رکھا ہے، تو پھر تو تمہارا کہنا بالکل بجا اور درست ہے کیونکہ خدا اپنے عہد اور وعدہ کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا"۔

(*)

لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ تم خدا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل نہیں۔ جیسا کہ تمہیں بار بار بتایا جا چکا ہے (اور یہ تفصیل آیت (۲/۴۸) کے تحت سابقہ صفحات میں سامنے آچکی ہے)، خدا کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ:۔

۲/۸۱-۸۲ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔

قانونِ مکافات

"جس قوم نے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اور اس روش کو ایسا عام کیا کہ سارا معاشرہ خطاکاریوں میں گھر گیا اور ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو گیا۔ تو اس قوم کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی اور وہ لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ان کا مقام جہنم ہو گا۔ اِن کے برعکس، جو قوم خدا کے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو گی تو اِن لوگوں کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں، جنتی زندگی نصیب ہو گی اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی"۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔

آیت (۲/۸۲) میں ایمان اور جنت کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا مفہوم جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۲۵)

عمل اور فعل میں فرق

صفحہ ۳۳۳ - اور آیت (۲/۳۱) صفحہ ۸۷ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آیت (۲/۸۲) میں آیت (۲/۲۵) کو سمٹا کر بیان کیا گیا ہے۔ البتہ لفظِ اعمال (واحد ـ عمل) کے مفہوم میں ایک دو نکات وضاحت طلب ہیں۔ عمل اور فعل دونوں کے معنے "کام" کے ہیں۔ لیکن (امام راغب نے کہا ہے کہ) عَمَلٌ ہر وہ کام ہے جو کسی جاندار سے ارادۃً سرزد ہو۔ اس کے برعکس فِعْلٌ کا لفظ حیوانات کی طرف اس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب اُن سے کوئی کام بلا قصد سرزد ہو۔ حتیٰ کہ جمادات کی طرف بھی۔ عَمَلٌ کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے۔ صاحبِ محیط نے تو بعض اہلِ لغت کا یہ قول بھی نقل ہے کہ عَمَلٌ درحقیقت عِلْمٌ کی مقلوب شکل ہے۔ لہٰذا عمل کے لئے علم لاینفک ہے۔ علاوہ ازیں، علمارِ لغت کے نزدیک عمل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (التزامًا) کیا جاتا ہو۔

ان تصریحات کی رو سے عمل اس کام کو کہا جائے گا جو بالارادہ کیا جائے اور التزامًا کیا جائے۔ جو کام محض عادتًا کئے جائیں یا میکانکی طور پر، ان پر عمل کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکے گا، نہ ہی ان کاموں پر جو کبھی کبھار کر دیئے جائیں۔ اس بنا پر آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ قرآنِ کریم نے جن کاموں کو اعمال کہہ پکارا ہے ان سے کس قسم کے کام مراد ہیں۔ یہی ہیں وہ کام جن سے مثبت اور تعمیری نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور یہی نیکی کا ماحول کا نتیجہ ہے اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ "مذہبی اعمال" سے جنت کی عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ یہ کام رسمًا، عادتًا یا تقلیدًا سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے خود لغت کی رُو سے بھی "اعمال" کی شق میں نہیں آتے۔ اور ظاہر ہے کہ جس کام پر "عمل" کے لفظ تک کا اطلاق نہ ہو سکے اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟

——— (٠) ———

دین کے ان اصولوں کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد داستانِ بنی اسرائیل کی اگلی کڑیاں سامنے لائی گئی ہیں۔

(۲/۸۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ. ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو پھر یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ تم سے خدا نے ایک عہد لیا تھا۔ (اس عہد کا اجمالی ذکر (۲/۴۰) میں آچکا ہے) وہاں یہ کہا گیا ہے کہ تم وحیٔ خداوندی کو نہایت محکم طور پر تھامے رہو۔ اب اس اصولی حکم کی جزئیات کا ذکر آتا ہے۔ اصولی حکم تو یہ کہہ کر دہرایا گیا کہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اور عبدیت اختیار مت کرو۔ فرمانبرداری اور اطاعت شعاری اسی کے احکام کی کرو۔ کسی اور کے احکام کی نہیں۔

اِن احکام میں سب سے پہلے کہا کہ والدین، رشتہ داروں، یتامیٰ اور مساکین سے احسان کرو۔ ان میں سب سے پہلے لفظ والدین آتا ہے۔ مادہ (و۔ ل۔ د) کے معنی ہیں طریقِ تولید کی رو سے افزائش نسل۔ خواہ وہ ابتدائی جرثومہ کی سطح پر ہو یا انتہائی حیوانات کی سطح پر، جن میں خود انسان بھی شامل ہے۔

تولید و تخلیق میں فرق

اللہ تعالیٰ کا طریقِ پیدائش تخلیقی (CREATION) ہے۔ تولیدی (PRO CREATION) نہیں۔ اسی لئے اس نے خود اپنے متعلق کہا۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲/۳)۔ "نہ خدا طریقِ تولید کی رو سے وجود میں آیا ہے اور نہ ہی وہ اس طریق سے کسی کو وجود میں لاتا ہے"۔ عیسائیوں نے، جو حضرتِ مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ وضع اور اختیار کیا کہ وہ ابن اللہ — خدا کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید چار الفاظ میں کر دی کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ. وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶/۱۰۲)۔ اس آیۂ جلیلہ میں ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ پہلے تین الفاظ میں تو یہ کہا کہ خدا کی قدرتِ کاملہ کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ اس محیر العقول کارگہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ یعنی کسی ساز و سامان، مسالہ یا اسباب کے بغیر۔ جو خدا یہ کچھ کر سکتا ہے اسکے لئے یہ کون سی مشکل بات ہے کہ اپنا ایک بیٹا بھی پیدا کر لے۔ لیکن (اس نے کہا کہ) ہم نے تخلیقِ کائنات کے بعد کچھ قوانین وضع اور نافذ کئے ہیں جن کے مطابق یہاں کا جملہ کاروبار سر انجام پاتا ہے۔ ان میں

خدا کا بیٹا!

سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ سلسلۂ افزائش نر و مادہ کے اختلاط کے بغیر وجود میں نہیں آئے گا۔ (مثلاً) انسانی بچے کی تولید کے لئے بیوی اور شوہر کے اختلاط کی ضرورت ہے۔

اور اس بات کو تو یہ لوگ (عیسائی بھی) تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کی کوئی بیوی نہیں۔ لہٰذا جب اس کی کوئی بیوی نہیں تو اس کے مقرر کردہ قانونِ تولید کی رو سے اس کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے نافذ کردہ قوانین میں خود اپنے لئے بھی استثنا نہیں کرنا چاہتا حالانکہ اگر وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ لہٰذا خدا کا عملِ افزائش تخلیقی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، حیوانی سطح پر اس کا طریق افزائش بھی تولیدی ہے لیکن انسانی سطح پر اس کے عمل میں عملِ تخلیق کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے اور چونکہ صرف حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا، ایمان نہیں، کفر ہے (۷/۱۲) اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہر کہ اُو را قوتِ تخلیق نیست — نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

(۰)

اب آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں تو والدین سے مراد صرف ماں باپ، اور اولاد سے مراد بیٹے اور بیٹیاں ہوتی ہیں لیکن عربی زبان میں والدین کا سلسلہ ماں باپ سے اوپر تک چلا جاتا ہے یعنی دادا نانی وغیرہ اور اولاد کا سلسلہ بیٹے اور بیٹیوں سے نیچے یعنی پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرہ۔ اس کی اہمیت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ جہاں قرآنی قانونِ وراثت کے سلسلے میں بتایا جائے گا یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے حصہ پانے کا حقدار ہوتا ہے۔ یہاں ہم قرآنِ کریم کے انہی احکام تک محدود رہنا چاہتے ہیں جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت میں کہا تو یہ گیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا۔ لیکن انہی الفاظ میں یہی احکام، متعدد مقامات پر، خود مسلمانوں کو بھی دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو (۴/۳۶)

پہلا حکم یہ ہے کہ والدین سے احسان کرو۔ لفظ احسان کے معنی آیت (۲/۸۳) کی تشریح کے سلسلے میں چند صفحات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی میں جو کمی واقع ہو گئی ہو، اس کی اس کمی کو دور کر کے اس کے توازن کو برقرار کر دینا۔ بڑھاپے کی عمر میں انسان میں کئی لحاظ سے کمی آجاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور کئی اور طبیعی صلاحیتوں میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کا طبیعی توازن بگڑ جاتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ — اب عناصر میں اعتدال کہاں

اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے ایک مقام پر ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۳۶/۶۸) "کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کبرسنی کی وجہ سے انسان کے جسمانی

ڈھانچے اور اس کی طبعی قوتوں اور صلاحیتوں میں کس قدر کمی واقع ہو جاتی ہے، وہ کس قدر نگوں سار ہو جاتا ہے"۔ دوسری جگہ کہا۔ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۔ (۲۲/۵) "تم میں بعض لوگوں میں جن کی عمر لمبی ہوتی ہے، بچپنے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ علم میں اضافہ تو ایک طرف، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ پہلے یاد تھا وہ بھی بھول جاتا ہے"۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ بڑھاپے میں عام طور پر انسان میں اپنی ضروریات آپ پوری کرنے کی قوت بھی نہیں رہتی اور اس کی بعض صلاحیتوں میں بھی بڑی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اولاد کو یہ حکم دیا کہ تم ان کی اس کمی کو پورا کرو۔ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے علاوہ ان کی دل جوئی بھی کرتے رہو۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، بڑھاپے میں انسان بچوں کی سی باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ بچوں کی باتوں میں نہ منطقی ربط ہوتا ہے، نہ ترتیب و تسلسل۔ اس کے باوجود، تم ان کی باتوں سے زچ نہیں پڑ جاتے بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہو۔ لیکن جب یہی کیفیت بوڑھے والدین کی ہو جاتی ہے تو اس سے تم زچ پڑ جاتے اور انہیں ڈانٹنے لگ جاتے ہو۔ دیکھئے قرآنِ کریم نے کیسے بلیغ انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں کہا ہے:۔

والدین سے حسنِ سلوک

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ (۲۴-۲۳/۱۷)

"تیرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان سے پیش آؤ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں عمر رسیدہ ہو جائیں تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ مت کرو۔ ان سے نہایت نرمی سے اس انداز سے بات کرو جس سے ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہونے پائے۔ اپنا شفقت کا ہاتھ ان کے سر پر رکھو اور خدا سے یہ دعا مانگو کہ وہ تمہیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ جس حسنِ لطافت سے انہوں نے تمہاری بچپن میں نشو و نما کی تھی، تم بھی اسی طرح ان کی نشو و نما اور رفاقت کا سامان بہم پہنچاؤ"۔

اس حکم میں دو ایک اور اہم نکات بھی پوشیدہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انسان اپنے طبعی تقاضوں کو

حیوانات کی طرح جبلّی طور پر پورا کرتا ہے ۔ مثلاً بھوک لگنے پر کھانا کھانا ۔ پیاس کے لئے پانی پینا ، افزائشِ نسل کے لئے جنسی اختلاط ۔ ان امور کے لئے انسان کو وحی کی رو سے تاکید کرنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ یہ ہدایت تو اس کی جبلّت میں رکھ دی گئی تھی ۔ البتہ انہی امور میں اس کی انسانی سطح پر جن پابندیوں کی ضرورت تھی ان کی راہ نمائی وحی کی رو سے کر دی گئی ۔ مثلاً کھانے پینے میں حلال و حرام کی تمیز ، جنسی اختلاط کے لئے ازدواجی زندگی سے متعلق حدود و قیود ۔ حیوانی سطح پر ان حدود و قیود کی ضرورت نہیں تھی ۔ انکا ملحوظ رکھنا خاصۂ انسانیت ہے ۔ اس اصول کی روشنی میں اس حقیقت پر نگاہ ڈالئے کہ اپنے بچوں کی پرورش ہر حیوان جبلّی تقاضے کی رُو سے کرتا ہے ۔ اس لئے قرآنِ کریم نے بھی انسان کو کہیں یہ تاکید نہیں کی کہ تم اپنے بچوں کی پرورش کیا کرو ۔ لیکن ماں باپ سے حسنِ سلوک حیوانی جبلّت کا تقاضا نہیں تھا ۔ اس کے لئے وحی کی رو سے انسان کو تاکید کی گئی ۔ اور یہ تاکید والدین تک ہی محدود نہ رکھی گئی بلکہ اس کا سلسلہ آگے بھی بڑھایا گیا ۔

اگرچہ بعض بلند سطح کے حیوانات میں نر اور مادہ کی رفاقتی زندگی کا نقشہ سامنے آتا ہے ۔ لیکن عائلی زندگی (فیملی لائف) کا تصور ان کے ہاں نہیں ملتا ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جس عمر تک بچے کو ماں باپ کی طرف سے پرورش اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے اس حد تک تو ان میں " عائلی زندگی " کا نقشہ نظر آتا ہے ۔ لیکن جب بچہ اس عمر سے آگے بڑھ جاتا ہے تو عائلی زندگی کے روابط تو ایک طرف ، نہ بچہ ماں باپ

فیملی لائف

کو پہچانتا ہے نہ ماں باپ بچے کو جانتے ہیں ۔ ان میں یکسر بیگانگی اور علیحدگی ہوتی ہے ۔ اگر یہی کیفیت انسان کی تمدنی زندگی میں بھی پیدا ہو جائے تو یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی انسانی سطح کی نہیں ۔ یورپ نے عائلی زندگی کو بالعموم حیوانی سطح تک برقرار رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذرا بڑا ہونے پر نہ ماں باپ کو اولاد سے کوئی تعلق رہتا ہے ، نہ اولاد کو ماں باپ سے کوئی واسطہ ۔ اور ان کے ہاں بوڑھے ماں باپ ، جس تنہائی اور بےکسی کی زندگی بسر کرتے ہیں ، وہ عبرت و موعظت کی زندہ شہادت ہوتی ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں کی بعض حکومتیں ان درماندہ ، واماندہ اور دھتکارے ہوئے انسانوں کے لئے روٹی کپڑے اور رہائش کا انتظام کر دیتی ہیں ، لیکن صرف روٹی ، کپڑا تو انسانی زندگی کا سہارا نہیں ہوتے ، انسانی جذبات ، رفاقت ، شفقت ، عطوفت اور محبت کے بھی متقاضی ہوتے ہیں ۔ ان کے پورا کرنے کا وہاں کوئی انتظام نہیں ہوتا ۔ یہ

تو صرف (FAMILY UNIT) ہی میں پورے ہو سکتے ہیں ۔ بچوں کی صحیح تربیت بھی گھر کے ماحول میں ہو سکتی ہے اور بڑھاپے کی یاس انگیز تنہائیوں کا مداوا بھی یہیں ممکن ہے ۔ گھر میں بچے ہوتے ہیں تو وہ بوڑھے دادا، دادی کے دوست اور ہمجولی بن جاتے ہیں کیونکہ ان میں بھی تو بچپنا آچکا ہوتا ہے۔ یہ، اور اس قسم کے دیگر مصالح ہیں، جن کی بنا پر اسلامی معاشرے میں خاندانی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین و تاکید ہے ۔

اب ایک قدم آگے بڑھیئے اور قرآنِ کریم کی ایک اور حقیقت نگہی پر غور کیجئے ۔ دنیا کے ہر مذہب میں، بلکہ ان کے ہاں بھی جو کسی متعین مذہب کے پابند نہیں، اس بات کو ایک مسلّمہ کی سی پوزیشن حاصل ہو چکی ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"۔ اسے ایک ایسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جس پر کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی ۔ بعض مذاہب میں تو اس کے متعلق ایسی شدت اختیار کی جاتی ہے کہ ماں باپ کی پوجا تک کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ جو اس فریضہ کی جس حد تک ادائیگی کرتا ہے اس کا مقام اسی قدر بلند سمجھا جاتا ہے ۔ اس کی مثال ہندو دھرم اور ان کی تاریخ میں ملتی ہے ۔ مہاراجہ رام چندر نے اپنے باپ (مہاراجہ دسرتھ) کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہوئے راج پاٹ تیاگ کر بن باس اختیار کر لیا حالانکہ وہ حکم علم و دلیل پر مبنی نہیں تھا بلکہ خالصتہً جذباتی تھا ۔ بایں ہمہ، نوجوان رام چندر کی اس فرمانبرداری سے اس کا مقام اتنا بلند تصور کیا گیا کہ اسے ایشور کا اوتار قرار دے کر اس کی پرستش شروع ہوگئی ۔ ہندو دھرم اور معاشرت میں ان کا آج تک یہی مقام چلا آرہا ہے ۔ اُن کے ہاں، بیوی کا خاوند کی پوجا کرنا اور اولاد کا ماں باپ کی پرستش کرنا، عظیم ترین نیکی کے کام ہیں۔

ماں باپ کی اطاعت

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس چیز کو دنیا کے ہر مذہب اور ہر قوم میں ایک مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا تھا ۔ قرآنِ کریم نے اس مسلّمہ کو توڑا اور اس کی بجائے ایسی راہ اختیار کی جو مبنی برحقیقت و صداقت ہے ۔ اس نے ماں باپ کی اطاعت کو کہیں فرض قرار نہیں دیا بلکہ کہا یہ کہ ان کے ساتھ احسان کرو ۔ بات بڑی واضح ہے ۔ جہاں تک بچپن کی عمر کا تعلق ہے، بچے کو یقیناً ماں باپ کی ہدایات پر چلنا چاہیئے کیونکہ اس میں ابھی نہ خود اپنے نفع و نقصان میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوتی ہے نہ ہی اس کا تجربہ ہوتا ہے ۔ لیکن جب بچہ جوان ہو جائے ؍ سنِ رشد تک پہنچ جائے، تو اُسے ان انسانوں کی اطاعت کا حکم

دینا، جن کے متعلق خود قرآن یہ کہتا ہے (اور ہماری روزمرّہ کی زندگی اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ ارذل العمر کے درجے میں پہنچ چکے ہوتے ہیں، اس کی زندگی کی گاڑی کو بہت پیچھے دھکیل دینے کے مرادف ہوگا۔ زمانے کے تقاضے بڑی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں اور بڑھاپے میں انسان، ان نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا، وہ معاملاتِ حاضرہ کے فیصلے اپنے سابقہ دور کے تقاضوں کے مطابق ہی کر سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فیصلے ان نئے تقاضوں میں (FIT-IN) نہیں ہو سکتے۔ ایک نوجوان کو اس قسم کے فیصلوں کی اطاعت پر مجبور کرنا ــــ اور وہ بھی یہ کہہ کر یہ خدا کا حکم ہے ــــ اُس کے دل میں جس قسم کی نفسیاتی کشمکش پیدا کر دیگا، اور اُس کے جو پریشان کن، اور بعض حالات میں، فساد انگیز نتائج پیدا ہوں گے، ان کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے حالات اُن نوجوانوں کی زندگی میں زیادہ رونما ہوتے ہیں جو ماں باپ کے ہر حکم کو ارشادِ خداوندی کی طرح واجب التعمیل تصور کرتے ہیں۔ اس سے بالخصوص، ان کی ازدواجی زندگی جس قدر تلخ ہو جاتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ قرآن کریم نے جس "مسلّمہ" کو محض جذباتی قرار دے کر اس کی جگہ ایک حقیقت پسندانہ حکم دیا تھا، ہم نے اُسی "مسلّمہ" کو اپنے ہاں مذہبی فریضہ قرار دیدیا ــــ اور اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔

اسوۂ ابراہیمیؑ

ہندو دھرم نے "رام" کی زندگی کو قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا (۶۰/۴) اور ان کی اس زندگی کا ابتدائی تعارف ہی یہ کہہ کر کرایا کہ یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا (۱۹/۴۲) "اے میرے باپ! تم اُن بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نہ کچھ سُن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے۔ نہ کسی معاملے میں تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔" یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَھْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا (۱۹/۴۳) "اے میرے باپ! مجھے حقائق کا وہ علم دیا گیا ہے جس سے تم محروم ہو۔ لہٰذا تم میرا اتباع کرو۔ میں تمہیں سیدھے راستے کی طرف لے جاؤں گا۔" ساری دنیا میں مسلّمہ یہ تھا کہ بیٹے کو ماں باپ کا اتباع کرنا چاہیئے۔ یہاں بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ سوال باپ اور بیٹے کے رشتے کا نہیں، فیصلہ کن امر تو یہ ہے کہ علم و حقیقت کے راستے پر کون ہے۔ اسوۂ ابراہیمیؑ کا یہی اتباع تھا جس کے لئے خصوصیت سے کہا کہ ماں باپ سے حسنِ سلوک ضرور کرو لیکن اگر وہ تمہیں خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے لئے کہیں، تو ان

کا کہنا قطعاً نہ مانو۔ (۸/۲۹ : ۱۵/۳۱)۔ دینِ خداوندی میں اتباع نہ باپ کا ہے نہ بیٹے کا۔ اتباع حق و صداقت کا ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ انسانی تاریخ میں یہ روش نہیں رہی کہ آنے والی نسل نے ہر حال میں جانے والی نسل کا اتباع کیا ہو۔ اگر یہ صورت رہتی تو انسان آج بھی، ابتدائی زمانے کے انسانوں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا کیونکہ اسلاف کے اتباعِ مسلسل کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس قسم کا اتباع حیوانات میں ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کی بکری بھی ویسی ہے جیسی سب سے پہلے زمانے کی بکری تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکوئے   زبندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب   پیمبرہم رہِ اجداد رفتے   (پیامِ مشرق)

والدین کے بعد قرآنِ کریم نے ذی القربیٰ کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے۔ قربیٰ کا مادہ (ق۔ر۔ب) ہے جس کے معنے قریب ہونے کے ہیں۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ والدین کے بعد جو بھی زیادہ قریبی

ذی القربیٰ

ہوں، ان سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ لیکن ذی القربیٰ کی اصطلاح عام طور پر رشتہ داروں کے لئے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قربیٰ کے معنی رشتہ دار نہیں، رشتہ داری ہیں۔ جب اس کے ساتھ (ذو یا ذی) آئیں گے تو اس کے معنے رشتہ داروں کے ہوں گے۔ اس فرق کی اہمیت آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں مودّت فی القربیٰ (۴۲/۲۳) کی تشریح کی جائے گی۔ بہرحال، ذی القربیٰ کے ساتھ حسنِ سلوک کے حکم نے خوش معاملگی اور تعاون کے لئے، تمدنی زندگی میں اور وسعت پیدا کر دی۔

اس کے بعد کہا کہ یتامیٰ سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ یتیم کے بنیادی معنی ایسے شخص کے ہیں

یتامیٰ سے حسن سلوک

جو تنہا رہ جائے۔ اصطلاحی طور پر یہ لفظ ان لوگوں کیلئے بولا جاتا ہے جن کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اور وہ اس طرح تنہا رہ جائیں۔ لیکن عربوں کے ہاں اس کا یہ محدود مفہوم نہیں تھا۔ وہ ان جوان لڑکیوں کو جنہیں خاوند نہ ملیں یا بیوہ عورتوں کو بھی اس میں شامل کرتے تھے۔ (اس مفہوم کی اہمیت آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں تعددِ ازدواج کا ذکر آئے گا)۔ یتیم کے معانی کی وسعت کے اعتبار سے، اس کے اندر ہر وہ شخص آجائے گا جو معاشرے میں تنہا رہ جائے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ غور سے دیکھئے کہ غیر قرآنی معاشرے میں ہر شخص

اپنے آپ کو یتیم (تنہا) محسوس کرتا ہے۔ ہم تو ایک طرف رہے، ہمارے ذہن میں یورپ اور امریکہ کی معاشرتی زندگی کا کچھ ایسا تصور ہے کہ وہاں کوئی شخص بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا ہوگا۔ لیکن وہاں کی "یتیمی" کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ کچھ عرصہ ہوا امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اس میں اہلِ امریکہ کی معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس کتاب کا نام تھا (THE LONELY CROWD) یہ عنوان خود وہاں کے "یتیم" معاشرے کا غماز ہے۔ افراد کی یہ یتیمی صرف نصب العین کی وحدت اور قلب و نگاہ کی ہم آہنگی سے دور ہو سکتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں قرآن کے الفاظ میں "افراد کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں" (۳/۱۰۲)۔ اور جب معاشرہ کی یہ کیفیت ہو جائے تو پھر اس میں کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ بہر حال، قرآن کریم نے جو یہ حکم دیا تھا کہ یتامیٰ کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ تو اس سے اس کا یہی مطلب نہیں تھا کہ ان کی طبیعی ضروریات ہی کو پورا کرو۔ بلکہ یہ مطلب بھی تھا کہ ان کے ساتھ ایسا رابطہ رکھو کہ انہیں محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہیں۔ (یتامیٰ کے متعلق دیگر احکام اپنے مقام پر آئیں گے)

اس سے آگے ہے کہ مساکین کے ساتھ بھی احسان کرو۔ اور ان کی کمی کو پورا کرو۔ اس لفظ کا مادہ (س۔ک۔ن) ہے۔ جس کے معنی ہیں حرکت کا بند ہو جانا۔ کسی کا ایک مقام پر رک کر رہ جانا۔ چلنے کی سکت نہ رہنا۔ عام طور پر اس سے یہ مفہوم لیا جائے گا کہ جن لوگوں کا کسی وجہ سے چلتا ہوا کاروبار رک جائے ان کی اس کمی کو پورا کر دو تاکہ ان کی کاروباری مشینری پھر سے حرکت میں آ جائے۔ یہ مساکین کے مفہوم کا ایک گوشہ ہے۔ اس اصول کو مدِنظر رکھنے سے اسی قسم کے کئی اور گوشے بھی سامنے آسکتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ان مقامات پر قرآنِ کریم رشتہ داری کے تعلق سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اِن شقوں میں ہر ضرورت مند انسان شامل ہے۔ حتیٰ کہ بعض آیات میں، ان میں "ابن السبیل" کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی کوئی اجنبی مسافر جو تمہارے ملک میں سے گزر رہا ہو، اگر اس کو بھی کوئی ضرورت پیش آگئی ہے تو تم، اُسے بھی پورا کرو۔ اِن احکام میں اپنے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ یہ بات آیت کے اگلے الفاظ سے واضح ہو جاتی ہے جہاں کہا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲/۸۳)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ لوگوں سے اچھی باتیں کیا کرو۔ لیکن حُسْن کا جو مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور لفظ "قول" کی جو تشریح پہلے ہو چکی ہے (ملاحظہ ہو ۲/۵۹)، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے

کہ اس سے مراد اچھی اچھی باتیں کرنا ہی نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات اور روابط میں توازن برقرار رکھنے کی اہمیت بھی شامل ہے۔ ایک حسین اور متوازن معاشرہ میں ہر بات، ہر عمل، ہر حرکت، ہر اقدام حسن کارانہ انداز لئے ہوتا ہے!

اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہے جس کی جامعیت کے متعلق اس سے پہلے (جلد اول اور اسی جلد کے سابقہ ابواب میں) وضاحت سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم امتِ محمدیہ ہی کو نہیں دیا گیا۔ یہ تو دین کی اساس ہے۔ اور چونکہ دین، شروع سے آخر تک اصولی طور پر ایک ہی چلا آ رہا تھا اس لئے ہر رسول کی امت کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ یہاں بنی اسرائیل مخاطب ہیں۔ آگے چل کر دیگر اقوام کا ذکر بھی آئیگا۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم نے عہد کیا تھا کہ ان احکام کی تعمیل کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد تم (باستثنائے چند) اس قول و قرار سے پھر گئے۔ اتنی بات "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ" کے الفاظ سے پوری ہو جاتی تھی لیکن اس کے بعد وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲/۸۳) سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا تھا کہ یہ کسی عہدِ گزشتہ کے ہنگامی واقعہ کا ذکر ہے۔ کسی زمانے میں، یہودیوں کی اُس وقت کی نسل کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہوگا۔ لیکن "وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ" سے اس امر کی وضاحت کر دی کہ تم ہو ہی ایسے۔ تمہاری ہمیشہ یہ روش رہی کہ ایک بات کا عہد کر کے اُس سے پھر گئے۔ تمہاری یہ روش عارضی یا ہنگامی نہیں تھی۔ تمہاری ساری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ تم کرتے ہی یہی کچھ رہے ہو۔ تمہاری ذہنیت ہی ایسی ہو چکی ہے۔ قول و قرار کے بعد اس سے پھر جانا، تمہاری عادتِ مستمرہ اور فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ تم نے پہلے بھی یہی کچھ کیا تھا اور آج بھی یہی کچھ کر رہے ہو۔ اس سے عہد نزولِ قرآن کی اولین جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے قول و قرار اور معاہدات پر یونہی اعتماد نہ کر لینا۔ یہ اُن سے پھر جایا کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے واضح ہے، انہوں نے ایسا ہی کیا۔

(۰)

اس کے بعد بنی اسرائیل کے اسی عہد و میثاق کی ایک اور شق سامنے آتی ہے اور وہ ایک عظیم حقیقت در کنار ہے:۔

۲/۸۴ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا
تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ
اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۔

سابقہ آیات میں کئی ایک مقامات پر بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ خدا نے تم سے یہ عہد بھی لیا تھا۔ وہ عہد بھی۔ تم نے اِس بات کا اقرار و پیمان بھی کیا تھا، اُس بات کا بھی۔ لیکن تم اپنے ہر عہد سے پھر گئے۔ ہر پیمان و اقرار سے روگردانی کی۔ اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ تم سے دو اور باتوں کے عہد بھی لیے گئے تھے۔ ایک یہ کہ تم باہمی خونریزی نہ کرو گے۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے لوگوں کو اُن کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تمہارے مذہبی صحیفوں میں، ایسا کچھ لکھا بھی ملے گا، اس لئے تم آج بھی اس کے گواہ ہو کہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا اور تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا۔

———(۰)———

لیکن

۲/۸۵ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ
مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ
يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ
مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔

تم نے ان ہر دو احکام کی خلاف ورزی کی۔ تم نے باہمی خونریزی بھی کی اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے بھی نکالا۔ یہاں باہمی خون ریزی کی بجائے قتل کا لفظ آیا ہے۔ جیسا کہ آیت (۲/۵۴) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے، قتل کے معنے سچ مچ قتل کر دینا بھی ہیں اور کسی کو پست و ذلیل کر دینا اور غیر مؤثر بنا دینا بھی۔ آیت (۲/۸۴) میں چونکہ خوں ریزی کا ذکر ہے اس لئے یہاں قتل کے لئے خوں ریزی بھی ہو سکتے ہیں لیکن جو کچھ اگلی آیت میں کہا گیا ہے اس کی رو سے غور کیا جائے تو اس کے معنی پست اور ذلیل کر دینا، کمزور

اور ناتوان بنا دینا بھی ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم کئی مقامات پر لکھ چکے ہیں، قرآن کریم میں امم سابقہ کی یہ داستانیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ ان میں جو اصول پوشیدہ ہیں وہ آنے والوں کے لئے بھی راہ نمائی کا موجب بنیں۔ اس آیت میں ایک ایسا اہم اصول بیان کیا گیا ہے جو باطل کے نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اس لئے یہ انتہائی غور و تفکر کا متقاضی ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں سے کہا یہ ہے کہ تم کرتے یہ تھے کہ خود اپنی قوم کے ایک طبقے کو مفلس

ایک عجیب فریب نفس

اور غریب، کمزور اور ناتوان بنا کر انہیں ان کے گھروں تک سے نکال باہر کرتے تھے۔ ان بے گھر، بے در، خانماں خراب، ضعیف و ناتواں لوگوں کو اِدھر اُدھر کے طاقتور قبائل قید کر لیتے تھے۔ اُس کے بعد تمہارے مذہبی پیشوا اس قسم کا وعظ کہتے تھے کہ قیدیوں کو قید سے چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ تم یہ ثواب کمانے کے لئے باہمی چندے اکٹھے کرتے اور ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے چھڑا لیتے۔ ان سے کہا گیا کہ ایسا کرنے سے تم اپنے آپ کو کتنے بڑے فریب میں مبتلا رکھتے ہو۔ قیدیوں کو قید سے آزاد کرانے کا ثواب تو کماتے پھرتے ہو لیکن اتنا کبھی نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کو اس حالت تک پہنچا دینا جس میں دوسرے لوگ انہیں اچک کر لیجائیں، کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ تم ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرتے وقت تو ذرا متأمل نہیں ہوتے۔ اس سے تمہارے دل میں خفیف سی کھٹک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ تم ان لوگوں کو بے دھڑک اس حالت تک پہنچا دیتے ہو اور اس کے بعد انہیں قید سے چھڑانے کی "نیکیاں" کماتے پھرتے ہو۔

اس سے یہ اہم اصول ہمارے سامنے آتا ہے کہ کسی کو ایسی حالت تک پہنچا دینا جس میں وہ خود تمہاری یا دوسروں کی مدد کا محتاج ہو جائے، نظامِ خداوندی میں جرم عظیم ہے۔ اور پھر اس کی مدد کر کے اپنے آپ کو اطمینان دلا لینا اور خوش ہو جانا کہ ہم نے اتنا بڑا ثواب کا کام کیا ہے، فریب نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس قرآنی صداقت میں ہمارے لئے ہی نہیں، ساری دنیا کے لئے کتنا بڑا اصول پوشیدہ ہے۔

آج ساری دنیا کی آبادی بنیادی طور پر، دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طبقہ دولت مندوں کا، دوسرا طبقہ مفلسوں اور غریبوں کا۔ اس کے بعد ساری دنیا اس غم میں گھلی جارہی اور اس

باطل کا اقتصادی نظام اور مذہب

"جہادِ عظیم" میں مصروف نظر آتی ہے کہ ان غریبوں اور مفلسوں کی مدد کس طرح کی جائے۔

لیکن اس بنیادی سوال پر کوئی غور نہیں کرتا کہ امیروں اور غریبوں کے یہ دو متضاد طبقات وجود میں کس طرح آتے ہیں؟ پیدائش کی رو سے کوئی انسانی بچہ نہ غریب ہوتا ہے نہ امیر۔ آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا کہ کوئی بچہ پیدائش کے وقت ہیرے اور جواہرات کے ہار اپنے گلے میں، اور جاگیروں، ملوں و فیکٹریوں کی ملکیت کی دستاویزات ہاتھ میں لے کر پیدا ہوتا ہو۔ اور دوسرا بچہ خالی ہاتھ دنیا میں آتا ہو۔ سب بچے دنیا میں یکساں طور پر خالی ہاتھ آتے ہیں، اور اس کے بعد ہم خود ان میں سے بعض بچوں کو دولتمند بنا دیتے ہیں اور بعض کو غریب۔ طبقۂ امراء کے بچوں کو دولت، جائیدادیں اور جاگیریں میراث میں مل جاتی ہیں اور غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہونے والے بچے ان کے خدمت گزار اور محنت کش بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہزاروں ایکڑ زمین کے رقبہ کا مالک (بچہ یعنی زمیندار) کچھ کام نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اس کے مزارعے سال بھر خون پسینہ ایک کر کے اناج پیدا کرتے ہیں اور اُس میں سے انہیں اتنا بھی نہیں ملتا کہ ان کی اور ان کے بچوں کی طبیعی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہو سکیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں وہ امیر، امیر تر بنتا چلا جاتا ہے اور یہ غریب، غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ دیہات سے نکل کر شہروں کی طرف آجائیے۔ یہاں ملوں اور فیکٹریوں میں محنت کش اور ملازم کام پر لگائے جاتے ہیں۔ ان فیکٹریوں کے مالک ان مزدوروں کی اُجرت (WAGES) مقرر کرتے ہیں۔ (WAGES) کس طرح سے مقرر ہوتی ہیں، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ (غالباً) حکمائے یونان میں سے کسی کا قول ہے کہ تاریخِ انسانیت میں سے وہ دن سیاہ ترین تھا جب کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کما کر دیا جو اس سے زیادہ تھا جتنا وہ آقا اس غلام پر خرچ کرتا تھا۔ اس دور کی بے نقاب غلامی ہو یا عصرِ حاضر کی نقاب پوش غلامی (جسے مزدوری یا محنت کشی کہا جاتا ہے) ہر آقا، اپنے مزدور کو اس سے کم دیگا جتنا وہ مزدور کما کر دیتا ہے۔ (مثلاً) کسی مزدور سے یہ طے پاتا ہے کہ وہ آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرے گا۔ اور اسے دس روپیہ یومیہ اجرت ملے گی۔ وہ مزدور چار گھنٹے میں اتنا کام کر دیتا ہے جس سے مالک کو دس روپے مل جائیں۔ اس کے بعد وہ بقایا چار گھنٹوں میں جس قدر محنت کرتا ہے اسے اس کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا۔ وہ سارے کا سارا کارخانے کے مالک کے پاس چلا جاتا ہے۔ کارخانہ دار اس پر تو

نگاہ رکھتا ہے کہ وہ مزدور ایک منٹ کے لئے بھی بیکار نہ بیٹھے لیکن اس سے اسے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ جو اُجرت اس مزدور کو دی جاتی ہے اس سے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس سے محنت کشوں کے طبقہ کو آہستہ آہستہ ایسے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے جہاں ان پر فاقوں تک کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسے میں مذہب آگے بڑھتا ہے اور ان دولت مندوں سے کہتا ہے کہ ان غریبوں کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صدقات، خیرات، زکوٰۃ اور دیگر بہبود کے کاموں کے لئے سخت تاکیدی احکام نازل کئے ہیں۔ ایسا کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ دولت مندوں کا یہ طبقہ بڑے فخر سے خیرات کے کاموں میں حصہ لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس سے خوشنودیٔ باری تعالیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم ان سے کہتا ہے کہ اے صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ سے، ان مفلس اور محتاجوں کی مدد کر کے ثواب کمانے والو! ذرا یہ بتاؤ کہ انہیں مفلس اور محتاج بنایا کس نے ہے؟ تم پہلے انہیں مفلس اور محتاج بنا دیتے ہو اور پھر ان کی مدد کر کے خوش ہو جاتے ہو کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں حالانکہ انہیں اس حالت تک پہنچانا سنگین ترین جرم تھا۔ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ (۲/۸۵) دولت مند طبقہ، اور ان کی حمایت کرنے والے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ زمیندار نے اپنی ملکیت کی زمین، ان مزارعوں کو دی لہٰذا بٹائی لینا ان کا "شرعی حق" ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ انہیں زمین پر اپنی ملکیت جتانے کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ کرۂ ارض کی ساری زمین خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اور اس نے اسے تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت سمجھ لینا، خود خدا بن جانا ہے۔ (اس نکتہ کی وضاحت اس کتاب کی پہلی جلد میں آیت (۲/۲۲)، صفحہ ۲۹۶) کی تشریح میں کی جا چکی ہے) اسی طرح کارخانے کے مالک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا سرمایہ لگا رکھا ہے اس لئے اسے اِس سرمایے کا نفع لینے کا حق حاصل ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ کارخانے کے موجودہ مالک (یا اس کے باپ دادا) کے پاس یہ سرمایہ آیا کہاں سے؟ یہ انہی مزدوروں کی اُس چار گھنٹے کی محنت کا ماحصل ہے جس کا انہیں کچھ معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔

انفرادی سرمایہ داروں سے آگے بڑھ کر، آجکل فلاحی مملکت (WELFAR STATE) کا نظام سامنے آتا ہے۔ اس میں خود مملکت سرمایہ کار ہوتی ہے اور مزدوروں، مفلسوں کے لئے

فلاح و بہبود کی اسکیمیں، وہی "صدقہ، خیرات" کے ثواب کمانے کے کام! حتیٰ کہ عصرِ حاضر میں جس انقلاب (سوشلزم) کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، اس میں بھی محنت کشوں کو اجرتیں (WAGES) ہی دی جاتی ہیں اور اجرتیں مقرر کرنے کا اصول و معیار، وہی سرمایہ دارانہ ہے۔

قرآن، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، دونوں کے خلاف چیلنج لے کر سامنے آتا ہے اور اعلانیہ کہتا ہے کہ اِن انسانوں کو مفلسی اور محتاجی، غریبی اور ناداری کی اس حالت پر پہنچانے کا ذمہ دار یہ باطل نظام ہے جو سرمایہ دار طبقے کا وضع کردہ اور مذہبی پیشواؤں کی باطل تاویلات کے سہارے قائم ہے۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اُس حالت تک پہنچا دے جس میں وہ، ان کا دست نگر بننے پر مجبور ہو جائے۔ دین کے قائم کردہ نظام میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس نظام کی تفصیلات پہلی جلد میں زیرِ آیت (۱/۲ ; ۲/۳ ; ۳/۲۴، صفحات ۵۸ ; ۱۰۱ ; ۲۹۶) ہیں اور زیرِ نظر جلد میں آیات (۲/۳۶ ; ۲/۳۴) میں گزر چکی ہیں۔ انہیں ایک نظر پھر دیکھئے۔ یہاں اتنا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں مزارعت (بٹائی) یا اجرت کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تصور ہی قرآن کے معاشی نظام کے خلاف ہے۔ اس نظام میں ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور زاید از ضرورت کسی کے پاس نہیں رہتا۔ باقی رہا یہ کہ خود قرآن کریم میں بھی صدقہ اور خیرات وغیرہ کا ذکر آیا ہے تو اس کے متعلق ہم قرآن کے معاشی نظام سے متعلق اُن آیات میں ذکر کر چکے ہیں جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ (مزید تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)

آیۂ زیرِ نظر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بالادست طبقہ درحقیقت ایک برادری ہوتا ہے جو زیردست طبقہ کے مقابل متحدہ محاذ قائم کر لیتا ہے۔ بالادست طبقہ کے لوگ، زیردست طبقہ پر غالب رہنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس مدد کے لئے قرآن نے اثم اور عدوان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اثم سے مراد ہوتی ہے ایسے کام جو اضمحلال پیدا کر دیں اور عدوان ان اُن کاموں کو کہتے ہیں جن سے انسان حد سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ طبقہ ایسی اسکیمیں بناتا رہتا ہے جن سے محنت کشوں اور مزدوروں کی قوتیں مضمحل ہو جائیں اور سرمایہ دار طبقہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے اس نظام کو مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر اسکیم محنت کشوں کے اثم اور سرمایہ داروں کے عدوان کا موجب ہوتی ہے، اور اسے شرعی سند، مذہبی پیشوائیت بہم پہنچاتی

ہے۔ کوئی فرعون، ہامان کے بغیر فرعون نہیں بن سکتا۔ نہ ہی ان میں کوئی قارون جنم لے سکتا ہے۔

(۰)

زیر نظر آیت میں قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ پہلے تم لوگوں کو اس حالت میں پہنچا دیتے ہو کہ انہیں دوسرے لوگ اپنا قیدی یا غلام بنائیں اور پھر ان قیدیوں یا غلاموں کو رہائی دلانے کے لئے فدیہ دیتے ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ :۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر ایک ایسا ہی زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ بالکل درست اور ٹھیک، جیسی کہ دونوں جوتیاں برابر اور ٹھیک ٹھیک ایک جیسی ہوتی ہیں۔

(ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بکتاب وسنت)

جس مقصد کے لئے ہم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اُس تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔ یہ، اور اس قسم کی دیگر روایات کو عام طور پر پیش گوئیاں کہا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ پیش گوئیاں نہیں بلکہ حقائق سے اخذ نتائج ہے۔ (پیش گوئی علم غیب کا دوسرا نام ہے اور علم غیب خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں "آنے والے حالات" سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے کسی انسان کی طرف سے نہیں) احادیث کے معاملے میں ہمارے ہاں دشواری یہ ہے کہ کسی حدیث کا پورا پس منظر بیان نہیں کیا گیا صرف "قولِ رسولؐ" درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے بات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ مندرجہ بالا حدیث کے ضمن میں ہم سمجھتے ہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہوگا کہ اگر مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ان کی حالت بھی بعینہٖ بنی اسرائیل کی سی ہو جائے گی کیونکہ انہوں نے بھی خدا کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ وہ جو قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰)۔ "رسول اللہ، بحضور رب العزت عرض کریں گے کہ اے میرے رب! حقیقت یہ ہے کہ میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ (مہجور بنا دیا تھا)"۔۔۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

روایات میں پیش گوئیاں

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں غلامی کا رواج عام تھا۔ تو میں

بالعموم جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ اس کے بعد ان کی خرید و فروخت کے بازار بھی گرم رہتے تھے۔ قرآن کریم نوعِ انسان کو ہر طرح کی غلامی سے نجات دلانے

غلامی اور قرآن کریم

کے لئے آیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ غلامی جیسی لعنت کو کیسے باقی رہنے دیتا۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴) "ان قیدیوں کو بہر حال رہا کرنا ہوگا۔ اگر ان کی قوم ان کا فدیہ دیدے۔ قیدیوں کے بدلے میں قیدی یا مقرر کردہ فدیہ۔ تو انہیں اس طرح چھوڑ دو۔ اور اگر حالات ایسے ہوں جن میں فدیہ کی شکل پیدا نہ ہو سکے تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ یعنی انہیں ہر حال چھوڑنا ہوگا" جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اور یہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم نے غلام اور لونڈیاں بنانے کے دروازے کو اس طرح ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ باقی رہے وہ غلام اور لونڈیاں جو اس وقت عرب معاشرے میں موجود تھے۔ ان کے متعلق ایسے احکام دیدیئے جن سے وہ یا تو رفتہ رفتہ آزاد خاندانوں کے جزو بن جائیں اور یا آزاد انسانوں کی طرح اپنی الگ زندگی بسر کریں۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں (ماملکت ایمانکم) کے متعلق جتنے احکام ہیں، وہ سب اسی سلسلے میں ہیں۔ اس میں آپ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے "غلاموں کو آزاد کرو، آزاد کرو" کی تاکید جا بجا ملے گی اور کسی ایک جگہ بھی یہ لکھا نہیں ملے گا کہ دوسروں کو غلام بناؤ۔

یہ تو تھے قرآن کریم کے احکام۔ لیکن جب ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ہم نے غلامی کو اسلام کا جزو بنا لیا۔ چنانچہ آپ ایک طرف یہ دیکھیں گے کہ ہمارے سلاطین، وزراء، امراء، حتیٰ کہ علماء کے طبقہ کے محلات میں سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں چلتی پھرتی نظر آئیں گی اور دوسری طرف ان لونڈیوں کی خرید و فروخت کے متعلق "احکامِ شریعت" کی تصریحات دکھائی دیں گی۔ یہ چیز ہمارے متقدمین تک ہی

مودودی صاحب اور غلامی

محدود نہیں، عصر حاضر کے مفسرین اور اسلام کے نام نہاد مفکرین کا بھی یہی مسلک ہے۔ ہمارے دور میں (LATEST) تفسیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی۔ تفہیم القرآن۔ ہے۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں:۔

> حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے لے۔ چاہے ان کا تبادلہ اُن مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں

ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔

(تفہیم القرآن ۔ جلد اول صفحہ ۳۴۰ ۔ اشاعت ۱۹۵۱ء)

انہوں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب ــ تفہیمات ۔ حصہ دوم ــ میں بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ وہ اس میں کہتے ہیں کہ ان لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی بھی ضرورت نہیں (صفحہ ۳۱۵) نیز

اسلامی شریعت میں نکاح کے لئے تو چار کی حد مقرر ہے ...... لیکن لونڈیوں کے لئے سرے سے کوئی حد رکھی ہی نہیں گئی۔ (ایضاً صفحہ ۳۱۹)

جہاں تک لونڈیوں کی خرید و فروخت کا تعلق ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

اِس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اُس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کو منتقل کر دیتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۲۳)

طرفہ تماشہ یہ کہ اس کے ساتھ ہی ہماری تفاسیر میں غلاموں کو آزاد کرنے کو اتنے بڑے ثواب کا کام بتایا گیا ہے جس کا مقابلہ شاید ہی کوئی دوسرا عمل کر سکے۔ یعنی ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ تم ان قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بناؤ اور دوسری طرف یہ کہ خدا نے غلاموں اور لونڈیوں کو رہا کرنا بڑا ثواب کا کام قرار دیا ہے۔ غور کیجئے کہ کیا یہ بعینہٖ وہی شکل نہیں جسے بنی اسرائیل نے اختیار کر رکھا تھا۔ یعنی ایک طرف اپنے لوگوں کو گھروں سے نکالنا اور دوسری طرف انہیں چھڑا کر لانے کا ثواب کمانا۔ کس قدر صحیح فرمایا تھا حضورؐ نے کہ میری امت نے اگر قرآن کو چھوڑ دیا تو یہ نعل بہ نعل بنی اسرائیل کی پیروی کرنے لگ جائے گی!

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے خلاف یہ الزام عاید کرنے کے بعد کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ (۲/۸۵) تمہاری حالت یہ ہے کہ تم کتابِ خداوندی کے ایک حصہ پر تو ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو! یہ نکتہ بھی بڑا غور طلب ہے۔ آیتِ زیرِ نظر کی رو سے ان سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہاری کتاب میں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ اپنے لوگوں کو گھروں سے نہ نکالنا۔ اور یہ حکم بھی کہ قیدیوں کو چھڑانا بڑا نیکی کا کام ہے۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ اس دوسرے حکمِ خداوندی پر تو ایمان رکھتے

ہو لیکن پہلے حکم سے کفر برتتے ہو۔ یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لانے اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرنے کے مرادف ہے۔" اور اس کے بعد کہا کہ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (۲/۸۵)۔ "یاد رکھو! تم میں سے جو لوگ بھی ایسی روش اختیار کریں گے اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ

دین کے حصے بخرے کر دینا

نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے اور اگلی دنیا میں اس سے بھی زیادہ شدید، الم انگیز، اور رسوا کن عذاب میں ماخوذ کئے جائیں گے۔ اور یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔"

دین، ایک نظامِ حیات عطا کرتا ہے۔ اور حیات (زندگی) کی صورت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اور جب دین، نظامِ حیات عطا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے قبول کیا جائے گا تو پورے کا پورا اور مسترد کیا جائے گا تو پورے کا پورا۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ۔ (۲/۲۰۸)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم اس نظام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔" اس کے معنے یہ ہیں کہ دین کے حصے بخرے کر دینا شیطان کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو قبول کر لینا اور بعض سے انکار کر دینا، کفر ہے، کھلا ہوا کفر۔ اور اس کا نتیجہ اِس دنیا میں ذلت و خواری اور اُخروی زندگی میں عذابِ الیم۔

غلط فہمی میں مبتلا ذہن یہ کہے گا کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ جس نے دین کے جس حصے سے انکار کیا اُسے اُس حد تک تو مبتلائے عذاب ہونا چاہیئے۔ لیکن اس نے اس کے جس حصے کو قبول کیا تھا، اُسے اس کا صلہ تو ملنا چاہیئے۔ اس مغالطہ آفریں دلیل کے ابطال کے لئے طبیعی زندگی کی ایک مثال کو سامنے لائیے۔ طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کر کے ایک نسخہ مرتب کرتا ہے جو مختلف اجزاء (ادویات) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ اس نسخے کو پورے کا پورا استعمال کرینگے تو وہ اپنا صحت بخش نتیجہ مرتب کریگا۔ لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ اس نسخے کے دس اجزاء میں سے پانچ کو تو لے لیں اور بقایا پانچ کو چھوڑ دیں تو کیا آپ کو اس سے "پچاس فیصد" شفا حاصل ہو جائے گی؟ پچاس فیصد شفا حاصل ہونا تو

ایک طرف، نہ معلوم اس سے آپ میں اور کتنے عوارض پیدا ہو جائیں۔ نسخہ کے بعض اجزاء کو چھوڑ دینا تو ایک طرف، اگر آپ طبیب کے متعین کردہ اوزان میں بھی کسی قسم کی کمی بیشی کر دیں گے تو اس کا نتیجہ بھی نہ معلوم کیسا ہلاکت انگیز برآمد ہو جائے! یہی کیفیت دین کے نظام کی ہے۔ یہ نظام اسی صورت میں اپنے خوشگوار نتائج پیدا کریگا جب اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے۔ اگر اس کے بعض حصوں کو اختیار کیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور اس کی زندہ شہادت ہماری اپنی حالت ہے۔ ہم نے دین کو پرسنل لاز اور پبلک لاز (مذہب اور سیاست) میں تقسیم کر کے اِسے "مذہب" میں تبدیل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے! ہم صدیوں سے (باوجود سب کچھ ہونے کے) جس ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ہمارے "مذہب" میں کتاب اللہ کے بعض احکام پر تو بہرحال عمل ہو رہا ہے۔ کیا ان اعمال کا کوئی خوشگوار نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟ کیا ان کے باوجود ہماری ذلت و خواری بڑھتی نہیں جا رہی؟ اور یہ پہلے بالوضاحت بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کا واضح فیصلہ ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت و خواری کی ہوگی اس کی آخرت کی زندگی بھی ذلت و خواری ہی کی ہوگی۔ (۱۷/۷۲ ودیگر آیات)

سیکولرازم

عصر حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اس نظام کو، جس میں انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق پوجا پاٹ، بھگتی، پرستش، نماز، روزہ اور دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن "دنیاوی امور" انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی رو سے طے پاتے ہیں۔ یہ "کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر" کی بیّن مثال ہے۔ کتاب اللہ (قرآنِ کریم) نے ان امور کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران 'نیشنلسٹ علماء' اور علامہ اقبالؒ (اور ان کے ہمنواؤں) کے درمیان یہی نکتہ مابہ النزاع تھا۔ نیشنلسٹ علماء کا موقف یہ تھا کہ ہندو ہمیں اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" حاصل ہوگی؛ اور مطالبہ پاکستان کے مدعیوں کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کی رو سے اس آزادی کو آزادی کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں آزادی سے مراد دین کی آزادی ہے۔ نیشنلسٹ علماء کے اسی موقف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہم نے بہر حال' "دین کی آزادی" کیلئے مملکتِ پاکستان کو حاصل کر لیا لیکن وائے بر حالِ ما، کہ ہم نے یہاں بھی سیکولر نظام جاری کر رکھا ہے۔ آئین کی رو سے تو ہماری مملکت" اسلامی جمہوریہ" ہے۔ لیکن عملاً یہاں یہ حالت ہے کہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں میں ایک وزارت "امورِ مذہبیہ" کی بھی ہے۔ گویا 'مذہبی امور' اِن امور سے الگ ہیں جو دیگر وزارتوں سے متعلق ہیں — "امورِ مذہبیہ" میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اوقاف، حتےٰ کہ مزارات پر عرسوں کی تقریبات وغیرہ شامل ہیں۔ کیا یہ وہی سیکولرازم نہیں جسے تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء پیش کرتے تھے۔ اور جسے غیر اسلامی قرار دے کر ہم نے پھٹکار دیا تھا۔ اگر اسلامی نظام اسی کا نام ہے کہ مملکت میں ایک وزارت" امورِ مذہبیہ" سے متعلق بھی ہو تو اس کی ضمانت تو ہندو بھی دیتا تھا۔

اب ہم اس سلسلہ کی آخری کڑی پر پہنچتے ہیں۔ جب پہلی بار دین کا نظام قائم کیا جائے گا، (یعنی مذہب کے نظام کو چھوڑ کر دین کے نظام کی طرف آیا جائے گا، تو دین کا نظام ایک دن میں قائم نہیں ہوگا، یہ بتدریج قائم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اِن تدریجی مراحل میں بعض اجزا دین کے ہوں گے اور بعض چیزیں غیر اسلامی بھی ساتھ چلیں گی۔ یہ صورتِ حال' افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض کے ذیل میں نہیں آئے گی۔

دین کے نظام کی تدریجی تکمیل

قرآنِ کریم کی حکمتِ بالغہ دیکھئے کہ اس نے یہاں تؤمنون — ایمان لانے کا ذکر کیا ہے، دین کی عملی اقامت کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو قوم دین کا نظام قائم کرنے کے لئے اٹھے اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس نظام کی صداقت (کتاب اللہ) پر بالکلیہ ایمان رکھے۔ اس ایمان کے بعد وہ، غلط نظام کی جگہ تدریجاً صحیح نظام کی طرف بڑھتی جائے لیکن ہر مرحلہ میں اِس حقیقت کو پیشِ نظر رکھے کہ یہ زندگی ہنوز اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہم اسلامی زندگی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ اسلامی اس وقت کہلائے گی جب دین کا نظام بالکلیہ قائم ہو جائے گا اور اس میں کسی غیر دینی عنصر کی رمق تک بھی باقی نہیں رہے گی۔ یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے جہاں دین کی آخری شکل کے لئے احکام دیئے ہیں وہاں ان تدریجی مراحل سے گزرنے کے لئے بھی ہدایات اور قوانین عطا کئے ہیں۔ دین کی آخری شکل وہ ہوگی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اُس میں غریب اور امیر کے طبقات باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے امیروں کی طرف سے غریبوں کو صدقہ اور خیرات دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن ان تدریجی مراحل میں تو یہ تفریق موجود ہوگی اگرچہ اس کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جائے گی۔ قرآنِ کریم میں صدقہ اور خیرات کے ذریعے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے یا ترکہ اور وراثت وغیرہ کے سلسلے میں جو احکام آئے ہیں، اُن کا تعلق انہی عبوری ادوار سے ہے۔ مکمل دین میں تو صورت یہ ہوگی کہ نہ کسی کے پاس ضرورت سے زاید (فاضلہ دولت) ہوگی اور نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم، للہذا دوسروں کی امداد کا محتاج ہوگا۔ اسی دور کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ. قُلِ الْعَفْوَ. (۲/۲۱۹) "اے رسولؐ! تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہو سب کا سب"۔ اس وقت (مذہب میں) ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صدقہ اور خیرات کے متعلق آیات پر تو ایمان رکھتے ہیں، لیکن "قُلِ الْعَفْوَ" کے حکم سے کفر برتتے اور فریبِ نفس کے لئے اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے رہتے ہیں جن کے لئے ہمارے ہاں بکثرت وضعی روایات موجود ہیں۔ لیکن اِس فریبِ نفس سے ہم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے تو نہیں بچ سکتے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے ایک حصے پر ایمان رکھیں گے اور دوسرے سے انکار کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اِس دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کریں گے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یہ ہے "تومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض" کی زندہ مثال، جس پر ہم کاربند ہیں اور ذلت وخواری کے اُس عذاب میں ماخوذ جسے قرآنِ کریم نے اس کا فطری نتیجہ بتایا ہے۔

(۰)

یہ اِس لئے کہ

۲/۸۶ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ.

ان لوگوں نے اُخروی زندگی کو دنیاوی مفاد کے بدلے میں بیچ دیا۔ اس لئے ان کا اس عذاب سے بچ جانا تو ایک طرف، اس میں ذراسی تخفیف بھی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس عذاب سے نجات دلائے گی۔ (تفصیل اس کی جلد اول میں، زیرِ آیت (۲/۴۸) گذر چکی ہے)

(۰)

اس کے بعد کہا۔

۲/۸۷ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ۔ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۔ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۔

آسمانی رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام تک ہی محدود نہیں رہا تھا، ان کے بعد بھی، تمہاری طرف خدا کے رسول یکے بعد دیگرے آتے رہے اور اس سلسلے کی آخری کڑی حضرتِ عیسےٰ علیہ السلام تھے۔

یہاں لفظ قَفَّیْنَا آیا ہے جس کے معنی یکے بعد دیگرے، علی التواتر آنے کے ہیں۔ (نیز دیکھئے ۵۷/۲۷)۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا۔ (۲۳/۴۴) علمائے لغت نے کہا ہے کہ تترہ میں، وقفوں کے ساتھ، یکے بعد دیگرے آنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول بھیجے گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ایک قوم یا ایک ملک میں رسولوں کی آمد کا ذکر ہوگا تو اس میں یکے بعد دیگرے کا سلسلہ سامنے آئے گا۔ ایک رسول، اور دوسرے رسول کی آمد کے درمیانی وقفہ کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا۔ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ ۔ (۵/۱۹)۔ "اے اہلِ کتاب! تمہاری طرف ہمارا یہ رسولؐ، رسولوں کی درمیانی مدت میں آیا ہے"۔ دراصل فترہ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی گرم جوشی یا اثر کا ماند پڑ جانا۔ ایک رسول جو دینِ خداوندی دے کر جاتا تھا، اس کے بعد اس کے متبعین اس میں آمیزش کر دیتے تھے جس کی وجہ سے اس دین کی گرم جوشی پہلے کی سی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے اس کے بعد ایک دوسرا رسول بھیجا جاتا تھا جو دین کو پھر سے اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا تھا۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے سورۃ الحج کی آیت (۲۲/۵۲) میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چونکہ جس دینِ خداوندی کو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کیا تھا اسے قرآنِ کریم میں محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آیت (۲۲/۵۲) میں مِنْ قَبْلِكَ کے الفاظ آتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ سے پہلے تو رسولوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن

ختمِ نبوّت

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ وحیٔ خداوندی، قرآن کریم میں محفوظ کر دی گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت نے دین میں آمیزش کر دی جس کی وجہ سے اُس کی حرارت ماند پڑ گئی۔ یعنی دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس میں پھر وہی پہلی سی حرارت پیدا کرنے کے لئے کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فریضہ اس امت کا ہوگا کہ یہ قرآنِ خالص کی رو سے پھر اُسی نظام کو قائم کر دے۔

بہرحال آیۂ زیرِ نظر میں کہا یہ گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی طرف انبیائے کرامؑ کا سلسلہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تک جاری رہا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق تفصیلی گفتگو متعلقہ مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ انہیں روح القدس کے ذریعے تقویت پہنچائی تو لفظِ روح کے بنیادی معنی توانائی کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اسے وحی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لفظ قدس کی تشریح آیت (۳۰/۲) میں گزر چکی ہے۔ وحی کے .... قدس ہونے میں دو نکات مضمر ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول کی طرف نازل کردہ وحی اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی تھی۔ اُس کا فریضہ تھا کہ اُسے اپنی وسعت کے مطابق، دور دور تک پھیلائے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر رسول کی طرف بھیجی ہوئی وحی ان آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک اور صاف ہوتی تھی جو سابقہ رسولوں کی وحی میں ملا دی جاتی تھیں۔ ہم ذرا آگے چل کر بتائیں گے کہ "روح القدس" کی اصطلاح وحی لانے والے (حضرت جبرئیل) کے لئے بھی استعمال کی گئی ہے۔

روح القدس

قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل پر ایک اور الزام عاید کیا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی رسول تمہاری طرف آتا تھا اور وہ دینِ خداوندی پیش کرتا تھا تو تمہاری کیفیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں جتنا حصہ تمہیں پسند آتا، (یعنی جس سے تمہارے مفادات پر زد نہ پڑتی)، تم اُسے تو قبول کر لیتے اور جو تمہارے مفاد اور جذبات کے خلاف جاتا اُس سے سرکشی برت کر انکار کر دیتے۔ اِس سرکشی میں تم دو طریقے اختیار کرتے۔ یا تو تم اُس رسول کی تکذیب کرتے یا اُسے غیر مؤثر بنا دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تم اُسے جان ہی سے مار دیتے۔ (قتلِ انبیاء کی تفصیل آیت (۶۱/۲) کے تابع گذر چکی ہے)۔

قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ وحیٔ خداوندی میں تم اِس کا انتخاب کرتے کہ اس کا کون سا حصہ ماننا چاہیئے اور کون سے حصے سے انکار کر دینا چاہیئے (تفصیل آیت (۸۵/۲) میں گذر چکی ہے) تو یہی روش تم نے نبیٔ اکرم

صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: وَ اِذَا

قرآن خالص سے نفرت

ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۔ (۱۷/۴۶)۔ "اے رسولؐ! جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو ان لوگوں کے دل میں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اور یہ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں"۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس قسم کے تقاضے آتے تھے کہ: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۔ (۱۰/۱۵)۔ "خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو ناپسند کرنے والے لوگ تجھ سے کہتے ہیں کہ تو اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن پیش کر دے یا اس میں اُن کے حسبِ منشا تبدیلی کر دے"۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)۔ "اے رسولؐ! تو ان سے کہہ دے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔ ....

.... میرا فریضہ تو اتنا ہی ہے کہ مجھے جو کچھ خدا کی طرف سے ملے، میں اُسے تم تک پہنچا دوں۔ اتنا ہی نہیں، میں خود اسی قرآن کا اتباع کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اس کی ذرا سی بھی خلاف ورزی کی تو میں بھی خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا۔ لہٰذا، میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا"۔

یہ بات بنی اسرائیل کے متعلق ہو رہی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہم نے بھی وحی خداوندی (قرآن کریم) کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۲۹/۵۱)۔ "کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ کتاب جس میں ان لوگوں کے لئے جو صداقت پر ایمان لائیں، رحمت بھی ہے اور موعظت بھی"۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ مومنین کے لئے قرآن کافی ہے۔ لیکن ہم دھڑلے سے کہتے ہیں کہ نہیں، ہمارے لئے قرآن تنہا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کی مثل (مثلہٗ معہٗ)[1] کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں تھیں ـــــ ایک وحیِ متلو، جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور دوسری وحیِ غیر متلو، جو احادیث کی شکل میں، بعد میں جمع کی

[1] فٹ نوٹ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

گئی۔ یہ احادیث، قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں۔ (اس عقیدے کے متعلق آیات (۲/۲۳) جلد اول ص۱۳۱ (۱) میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہ عقیدہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس قدر پیوست ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے قرآنِ کریم کافی ہے تو اُسے کافر اور ملحد قرار دے دیا جاتا ہے قرآن کریم نے جو کہا تھا وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (۱۷/۴۶)۔ "جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نہایت نفرت کے ساتھ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔" تو یہ منظر ہر روز ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ منظر بھی کہ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۔ (۳۹/۴۵)۔ "جب اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دلوں میں عجیب قسم کی کدورت اور کبیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اُس کے سوا اوروں کا بھی ذکر آ جاتا ہے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔" غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے کس قدر عبرت آموز انداز میں ہمارا نقشہ کھینچا ہے۔ یاد رکھئے! روایات، تاریخ، تفسیر وغیرہ قرآنِ کریم کے سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن کی مثل نہیں ہو سکتی۔ قرآن بے مثل و بے نظیر، خدا کی کتاب واحد ہے۔ قرآن کی مثل تو خود قرآن کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔

(۰)

اس کے بعد قرآنِ کریم نے یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں (علماء) کی ایک اور ذہنیت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ:-

۲/۸۸ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ذرا ٹھہرو اور دیکھو کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ واقعی حق و صداقت پر مبنی ہے؟ اگر

لہ (فٹ نوٹ صفحہ سابقہ) ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور مثلہ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ قرآن ہی جیسا کچھ اور بھی۔ اس روایت کا وضعی ہونا بالکل بدیہی ہے کیونکہ قرآن کریم تو ساری دنیا کو چیلنج کرتا ہے کہ تم سارا قرآن تو ایک طرف، اس کی کسی ایک سورۃ کی مثل ہی لا کر بتا دو۔ (تفصیل آیات ۲/۲۳-۲۴ جلد اول ص۲۲۸) میں گزر چکی ہے

ایسا نہیں تو جو کچھ ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اُسے بھی اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا۔ تم یوں سمجھ لو کہ ہمارے دلوں پر خول چڑھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے باہر کی کوئی بات بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ یا یہ ایسے برتن ہیں جو پہلے ہی لبالب بھرے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک قطرے تک کی مزید گنجائش نہیں۔ ہم نے جس قدر علم حاصل کرنا تھا، کرلیا۔ اب اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔ اِس ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اُسے اس آیت کے آخری الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت ہم ذرا آگے چل کر کریں گے۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ

حصولِ علم کی ضرورت

فرد ہو یا قوم، جو یہ سمجھ لے کہ ہمیں مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں وہ جیتے جاگتے انسان نہیں رہتے، جانوروں کے متحجرا (FOSSIBLIZED) ڈھانچے بن کر رہ جاتے ہیں۔ انسانی زندگی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان علم کے ارتقاء کا ساتھ دے۔ بلکہ مومن کا تو یہ مقام ہے کہ وہ اپنے زمانے کی امامت کرے۔ شاہراہِ حیات پر کسی ایک مقام پر یہ سمجھ کر کھڑے ہو جانا کہ ہم علم کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں، مصافِ زندگی میں شکست خوردگی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکمل راہ نمائی قرآن کریم میں دے دی۔ اس میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافے کی گنجائش۔ لیکن اس اصولی راہنمائی کی روشنی میں سفرِ زندگی طے کرنے کے لئے تو حصولِ علم کی ضرورت ہوگی اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اس ضرورت کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ذاتِ اقدس داعظمؐ جو علم کی بلندیوں پر فائز تھی، اسے بھی یہ دعا سکھائی گئی: وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ (۲۰/۱۱۴) "اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کرتا جا۔" ظاہر ہے کہ اس دعا میں وہ علم بھی شامل تھا جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی مل رہا تھا اور جو ہنوز آخر تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی قرآن کی تنزیل کا سلسلہ جاری تھا اور اس کے ساتھ وہ علمِ انسانی بھی جس کی روشنی میں حضورؐ نے اس آسمانی ہدایت کو ایک محسوس نظام کی شکل میں قائم کر کے دکھانا تھا۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ (حسین ترین نمونہ) قرار دیا گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُس اسوہ کے اتباع میں یہ دعا ایسی ہے جو ہر قلبِ مومن میں زندہ آرزو کی طرح مچلتی رہنی چاہیئے۔ اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کر۔

لیکن وہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میری امت نے قرآن کو چھوڑ دیا تو اس کی حالت

یعنیٰ بنی) اسرائیل کی سی ہو جائیگی تو اس کی زندہ شہادت، ہمارے مذہبی پیشوا ہیں جو اپنے آپ کو علماء کہہ کر پکارتے ہیں ان کے علم کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ دین کے کام کا ہوتا ہے نہ دنیا کے۔ لیکن ان کی نخوت، و تکبر کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے علم سے مستغنی سمجھتے ہیں اور کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان حضرات

ہمارے علماء کی حالت

کی کیفیت کیا ہے اس کے متعلق — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی — اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان کے متعلق، خود انہی میں کچھ نامور شخصیات کی آراء پیش کر دیں جن کے دلوں کے قفل اللہ تعالیٰ نے کھول دیتے تھے اور اسی لئے ان میں حقیقت شناسی کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم متقدین اور متاخرین کی آراء اس قدر کثرت سے پیش کر سکتے تھے کہ اُن سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جاتی۔ لیکن ہم صرف چند ایک پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے حلقہ۔ علماء میں امام غزالیؒ کا مقام بہت بلند سمجھا جاتا اور ان کی کتاب "احیائے علوم الدین" کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس مشہور تصنیف کی جلد اول کا ایک پورا باب (یعنی چھٹا باب)، علماء کے خلاف تنقید کے لئے وقف کر دیا ہے۔ وہ اس باب میں پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اعتراف حقیقت یا علمی انکسار کے بارے میں، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ کی کیفیت کیا تھی وہ لکھتے ہیں کہ:-

> ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ عزیر نبی ہیں یا نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ تبعؔ (یمن کا قدیم بادشاہ) ملعون تھا یا نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

> حضرت ابن عمرؓ سے اگر کوئی دس مسئلے پوچھتا تو آپ ایک کا جواب دیتے اور نو کے جواب میں خاموش رہتے ..... فقہا سلف میں سے کئی ایسے بزرگ ہیں جو "ادری" (میں جانتا ہوں) کے بجائے "لا ادری" (میں نہیں جانتا) زیادہ کہتے تھے۔

ان حضرات کا یہ مسلک بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:-

> حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے پیشتر ایمان نصیب ہوا تھا۔ لیکن عنقریب تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو کہیں گے کہ ہم نے

قرآن مجید پڑھ لیا ہے ۔ ہم سے زیادہ پڑھنے والا کون ہے ۔ ہم نے اس کا علم حاصل کر لیا ہے ہم سے زیادہ علم حاصل کرنے والا کون ہے ..... یہ امت کے بڑے لوگ ہوں گے۔

جامعۂ ازہر (مصر) مذہبی علوم کی قدیم ترین درس گاہ ہے اور ساری دنیا میں مستند سمجھی جاتی ہے ۔ دوسری طرف مفتی محمد عبدہٗ (مرحوم) کا نام اور مقام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ وہ خود بھی جامعۂ ازہر کے استاد رہے ہیں ۔ علمائے ازہر کے متعلق ان کا کیا خیال تھا اس کی بابت ان کے نامور شاگرد علامہ رشید رضا (مرحوم) لکھتے ہیں کہ :۔

ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی ..... جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اُس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے

(تفسیر المنار۔ جلد اوّل ۔صفحہ ۱۸۱)

(مولانا) ابو الکلام آزاد (مرحوم) کو امام الہند کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ سنئے کہ وہ علماء کے متعلق کیا کہہ گئے ہیں ۔ وہ اپنی مشہور تصنیف "تذکرہ" میں لکھتے ہیں :۔

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے ۔ سارے برگ و بار و ثمراتِ فساد کو انہی سے ظہور و نمو ہوا ۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم ، باسمِ اصل و اساسِ علومِ شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں ، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ خالص سے مرکب ہے اور کس قدر اِس فتنۂ عالم آشوب ، یونانیت و عجمیت سے ؟ کوئی شئے اِس سے نہ بچی ۔ حتّے کہ علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم و ہیّیاتِ معاشرت وغیر ذالک ۔ جب یہ حال علومِ شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا ، جن کو بہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے ۔ دانّ من العلم جہلاً ۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

ان کا سرمایۂ ناز علمِ حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی

صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور تیز کرتی رہتی ہے۔

اِن کے علم کے علاوہ، وہ ان کے کردار کے متعلق لکھتے ہیں:-

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یکجا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے۔ لیکن اِدھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال اِن سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے ...... فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دِل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں، مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے احبارِ یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔ (تذکرہ۔ صفحہ ۸۴ - ۸۳)

دار المصنفین (اعظم گڑھ) سے شائع ہونے والا مجلہ "معارف" (جس کے مدیر سید سلیمان ندوی مرحوم تھے) مذہبی دنیا میں بڑے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ستمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں تحریر تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم مولویوں، جن کا خطاب میر باقر داماد کی "الافق المبین" کے الفاظ میں "لم لا یکونیون" اور "لا نسلمیون" بھی ہے یعنی لم یکون کذا (ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) اور لا نسلم (ہم یہ تسلیم نہیں کرتے) یہ دو حربے ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں کہ جب تک جس مسئلے کے متعلق جو جی میں آئے ہم کہتے چلے جا سکتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم مدرسے والوں

کے درمیان کسی بدقسمت آدمی کی کوئی بات جا پڑے۔ جنگلوں کے درخت اور گھاس، جن سے کاغذ تیار کئے جاتے ہیں، شاید کانپ اٹھتے ہوں۔ جب ان کو خبر ملتی ہو کہ مولویوں نے "آستینیں" "لم لا یکون کذا" اور" لا نسلم" کہنے کے لئے چڑھائی ہیں۔ سمندر بھی تھرا اٹھیں کہ ان کا پانی بھی ہم مولویوں کے لم لا یکونیات اور لا نسلمیات کی سیاہی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ (کذا)

یہ مسئلہ کہ مزارعت (یعنی زمینداری، خواہ بٹائی پر ہو یا نقدی پر)۔ ائمہ سلف میں کچھ لوگ اس معاملہ کے عدم جواز کے قائل تھے۔ یا مسلمانوں کی تاریخ و فلسفہ کی کتابوں میں علوم الدوائل کا جس حصہ میں ذکر کیا جاتا ہے اس میں" بوذاسف" کا لفظ عام طور پر جہاں کہیں استعمال ہوا ہے، مراد اس سے "گوتم بدھ" ہے۔ یہ تو خیر غیر معروف مسائل ہیں، نماز میں آمین زور سے کہنا بہتر ہے یا آہستہ۔ رفع الیدین، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا، روزمرہ کے اسلامی عبادات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان عام مسائل کے متعلق بھی جیسا کہ دنیا جانتی ہے لم لا یکون اور لا نسلم کے قصے آج تک ختم نہیں ہوئے ہیں، ہزارہا صفحات فریقین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں اور ہنوز روز اول ہے۔ (کذا)

ان حضرات کی یہی ذہنیت نہیں کہ یہ انفرادی طور پر سمجھتے ہیں کہ انہیں سمجھنے، سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ :-

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ھدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے ...... اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔[1]

ان مختصر سی مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ" قالوا قلوبنا غلف" کس طرح ہمارے علماء کا مسلک بن

---

[1] جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی کا فتویٰ جو ہفت روزہ ایشیا کی ۴ اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

چکا ہے۔ ان کی یہی وہ ذہنیت ہے جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے اِن حضرات کے خلاف اس کثرت سے تنقید کی ہے کہ اُسے یکجا کیا جائے تو ایک صحیفہ مرتب ہو جائے۔ ان کی تنقید میں طنز و تشنیع کا نشتر بھی ہے اور سوز و گداز کا مرہم بھی۔ مثال کے طور پر دو چار قطعات پیشِ خدمت ہیں۔ وہ سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی زبان سے کہتے ہیں :۔

از شگرفی ہائے آں قرآں فروش　　　دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ　　　نزدِ اُو ام الکتاب افسانۂ

اور اُس کے بعد ایک نالۂ زہرہ گداز کے ساتھ کہتے ہیں :۔

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ　　　آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد　　　ملت از قال و اقولش فرد فرد

اور مقطع کا بند یہ کہ :۔

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب　　　کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد　　　دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

اور بالِ جبریل میں ساقی نامہ کے یہ اشعار ان پر مستزاد :۔

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب　　　مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا　　　لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
تمدّن، تصوّف، شریعت کلام　　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

اس کے جواب میں ان میں سے ہر شخص یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ یہ "علمائے سوء" کے متعلق ہے، ہمارے متعلق نہیں ــ اور ان میں سے ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے فرقے کے علماء، علمائے حق ہیں اور باقی فرقوں کے علماء، علمائے سوء۔ اور قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ جب امت فرقوں میں بٹ جائے تو کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۲) "ہر فرقہ یکساں طور پر فریب نفس میں مبتلا رہتا ہے" ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان میں ایسے حضرات بھی ہیں جو طبعاً منکسر المزاج بھی ہیں اور وسیع القلب

بھی۔ لیکن یہ ان کی ذاتی خصوصیات ہیں۔ جو تعلیم ان لوگوں کو دی جاتی ہے اس کا نتیجہ وہی تنگ نظری اور تعصب، رعونت اور نخوت ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

بات چلی تھی اس سے کہ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں؛ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ - (۲/۸۸)۔ قرآن کہتا ہے کہ: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (۲/۸۸) "نہیں، یہ اُن کے کفر کی وجہ سے خدا کی لعنت ہے۔" اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کو کفر سے تعبیر کیا اور یہ بات بڑی واضح ہے۔ وہ کہتا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ - فَوَيْلٌ

تنگ نظری کفر ہے

لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ - اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۹/۲۲)۔ "انسان کی ایک کیفیت تو یہ ہے کہ اس کا سینہ کھلا ہوا ہو، دل میں کشادہ ہو، نگاہ میں وسعت ہو، تلاشِ حقیقت کے لئے سر میں سودا اور دل میں تڑپ ہو، حصولِ علم کے لئے سرگرداں ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ، جنہیں خدا کی طرف سے شمعِ ہدایت مل جاتی ہے۔ اس کے مقابل، وہ لوگ جن کے سینے میں دل نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہو، وہ ساری عمر غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔" دوسری جگہ ہے: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ - وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ (۶/۱۲۶)۔ "ہدایت و سعادت طلب کرنے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قبولیتِ حق کے لئے ان کے سینوں میں کشاد پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں ایسی طلب نہ ہو، ان کا سینہ اس طرح بھنچا ہوا ہوتا ہے گویا وہ ضیق النفس (دمہ) کے مریض ہو۔ سینہ نہایت تنگ، ایسا تنگ کہ کھل کر سانس بھی نہ لے سکیں۔ ہموار زمین پر چل رہے ہوں تو یوں نظر آئے گویا کسی پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ جن کی ذہنیت اس قسم کی ہو، انہیں ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔" اسی لئے قرآن نے اسے کفر سے تعبیر کیا ہے اور اس کا نتیجہ بتایا ہے لعنت۔

ہمارے ہاں تو لعنت کا لفظ گالی بن کر رہ گیا ہے لیکن عربی لغت اور قرآنِ کریم کے استعمال کی

لعنت کے معنی

رو سے یہ لفظ گالی نہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو جانا، سعادات و برکات سے دور رہنا۔ مثلاً قوم عاد کی تباہی کے سلسلے میں کہا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ وَاُتْبِعُوْا

فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (۱۱/۶۰) "اس دنیا میں بھی محرومیاں ان کے پیچھے لگی رہیں اور قیامت میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی۔" اور اس کے بعد ہے اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ۔ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۱۱/۶۰)۔ یہاں لفظ بُعد (دُوری) نے لعنت کے مفہوم کو واضح کر دیا۔ یہی الفاظ قوم فرعون کے ضمن میں بھی آئے ہیں۔ (۱۱/۹۹ ؛ ۲۸/۴۲)۔ اس مقام پر اتنی وضاحت کافی ہے۔ آگے چل کر جہاں جہاں یہ الفاظ (لعنت یا ملعون وغیرہ) آئیں گے، متعلقہ آیات خود ان کی وضاحت کرتی جائینگی۔

زیرِ نظر آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمیں علم حاصل کرنے کی حاجت نہیں۔ ہمیں کسی کی بات تک سننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارا علم مکمل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ ذہنیت کافرانہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم اور حقیقت کی برکات سے محروم رہ جاتا ہے فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ (۲/۸۸) "ان میں سے خال خال لوگ ایسے نکلیں گے جن میں حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔"

(۸)

جب ان کی ذہنیت یہ ہے تو پھر ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ قرآنِ کریم میں پیش کردہ صداقتوں پر غور و فکر کر کے انہیں قبول کریں۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے۔

۲/۸۹ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۔ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا ۔ كَفَرُوْا بِهٖ ۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۔

یہ لوگ اس کتاب کی صداقت سے انکار کر رہے ہیں اور سرکشی برت رہے ہیں جو ان کے انبیاء کی حقیقی تعلیم کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ اس کی تائید کرتی ہے۔ اور اُن دعاوی کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو ان سے کئے گئے تھے۔ یہ ایک سچے نبی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے اور خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ آئے تو یہ اپنے مخالفین پر غلبہ پا سکیں۔ یہ اُس تعلیم کی صداقت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جسے یہ رسولؐ لے کر آیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اس سے سرکشی برت رہے ہیں۔ اس سے نہ تو اس رسول کا کچھ بگڑے گا، نہ خدا کی کتاب کا کچھ نقصان ہوگا۔ ان کا اپنا ہی نقصان ہوگا کیونکہ یہ زندگی

کی اُن خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جائیں گے جو اس کتاب کی اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہیں) ۔

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآنِ کریم مصدق (یعنی سچ کر کے دکھانے والا) ہے اُن دعاوی کا جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ قرآنِ کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم آیت (۴۱) میں بیان کیا جا چکا ہے، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ آنے والے کے انتظار میں تھے اور خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اسے جلدی بھیج تاکہ ہم اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل کریں تو یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام دنیا سے تشریف لے جاتے وقت اپنی امت سے کہہ جاتے تھے کہ اگر اس کتاب میں تحریف ہو گئی یا اس نظام میں بگاڑ پیدا ہو گیا تو پھر ایک اور نبی آئے گا جو تعلیمِ خداوندی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیگا اور نظامِ خداوندی کی گاڑی

تورات میں آنے والے نبی کی پیش گوئی

کو پھر سے صحیح پٹری پر ڈال دے گا۔ قرآنِ کریم کے بعض مقامات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ متعدد بار بتایا جا چکا ہے، انبیائے سابقہ کی طرف نازل شدہ کتابوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں دنیا میں موجود نہیں۔ بائبل، زندہ مذہب کی کتاب ہے لیکن اسکی جو کیفیت ہے وہ اس کی اس تاریخ سے سامنے آ چکی ہے جسے گذشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں بھی بعض آثار ایسے پائے جاتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے انبیاء ایک آنے والے کی بشارت دے کر جایا کرتے تھے۔ مثلاً عہدنامہ عتیق کی کتاب استثناء کے باب اٹھارہ آیت اٹھارہ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ:-

> میں ان کے لئے، ان کے بھائیوں میں سے، تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈال دونگا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو، جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔

ان کی کتابوں کی اسی قسم کی بشارات تھیں جن کی رو سے یہودی ایک آنے والے نجات دہندہ کے

انجیل میں بھی

انتظار میں تھے (اور اب تک انتظار میں ہیں) انجیل میں اس آنے والے کی بشارت، اس سے بھی واضح تر الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ یوحنا کی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے اپنے متبعین سے جو آخری باتیں کیں، ان میں یہ بھی کہا کہ :۔

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روپ جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو۔ (باب ۔ ۱۵ ۔ آیات ۔ ۲۷ ۔ ۲۶)

اس سے اگلے باب نمبر ۱۶ میں ہے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے ان سے کہا۔

میں نے یہ باتیں تم سے کیں، تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دونگا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راست بازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں، مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کا روپ آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کر دے گا۔ (آیات ۱۴ - ۶)

آپ بائبل کے اسلوب بیان یا زبان کا خیال نہ کیجئے۔ اول تو نہ معلوم ان میں کتنی تحریف ہو چکی ہے، اور

حضورؐ کے متعلق پیش گوئی

دوسرے یہ کہ اصلی زبان ترجمہ در ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ کتاب کچھ سے کچھ بن چکی ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ ان تحریف شدہ کتابوں میں بھی ایسے آثار ملتے ہیں جن میں ایک آنے والے کے متعلق بشارات موجود ہیں۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کی طرف سے دی گئی بشارت کا ذکر تو خود قرآنِ کریم میں ان الفاظ میں موجود ہے کہ :۔

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (۶۱/۶)

(حضرت) عیسٰیؑ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں تمہاری طرف خدا کا فرستادہ ہوں اور جو کچھ تمہارے پاس تورات (کتب سابقہ) میں آیا تھا اُسے سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہوں اور میں تمہیں اللہ کے ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئیگا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔

لیکن اب جب وہ آنے والا ان کے پاس واضح دلائل کے ساتھ آگیا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی وحی لے کر نہیں آیا، جو کچھ یہ پیش کر رہا ہے، اس کا خود تراشیدہ "کھلا ہوا جھوٹ ہے۔"

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ انجیل میں اس آنیوالے کے متعلق کیا الفاظ استعمال ہوئے تھے اور قرآنی آیت میں حضورؐ کا اسم مبارک احمدؐ کیوں آیا ہے۔ واضح رہے کہ حضورؐ اپنے دونوں اسمائے گرامی محمدؐ اور احمدؐ سے متعارف اور موصوف ہیں۔ یہاں ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ جس آنے والے کی بشارت حضرت عیسٰی علیہ السلام نے دی تھی وہ زمانہ نزول قرآن میں آچکا تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ (۶۱/۶) "جب وہ آنیوالا آگیا تو یہ کہنے لگے کہ وہ جھوٹا ہے۔" قرآن کے الفاظ فَلَمَّا جَآءَهُمْ واضح طور پر بتلاتے ہیں کہ زمانہ نزول قرآن میں، وہ آنے والا ان کی طرف آچکا تھا۔

آنے والے کی یہ شہادات تو بائبل سے ملتی ہیں۔ ویسے تمام دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے متبعین کے ہاں ایک آنیوالے کا عقیدہ موجود ہے۔ مثلاً ہندو کلنکی اوتار کے انتظار میں ہیں۔ بدھ مت کے پیرو

ہر مذہب میں آنے والے کا عقیدہ

متیا کے انتظار میں، چینی ایک تری تھنکر کے منتظر ہیں، مجوسی میتھرا کے انتظار میں، جو ان کے عقیدے کی رو سے زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اور وہ دوبارہ، اپنی اصلی صورت میں آئینگے اور یا اس کے مثل اور بروز کی شکل میں۔ یہودی اور عیسائی کس طرح ایک آنے والے مسیحا کی انتظار میں ہیں، اس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے۔ اہل مذاہب کے ان عقاید سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے انبیاءؑ نے ایک بعد میں آنے والے کی بشارت دی ہوگی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ بعد میں آنے والا، حضور نبیؐ آخر الزماں

(فٹ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

صلے اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آگیا اور دنیا کو وہ کتاب خداوندی دے گیا جو خدا کی طرف سے آنیوالی آخری کتاب

وہ آنیوالا آچکا ہے

ہے۔ وہ غیر متبدل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ اس لئے آنے والوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسی کو ختمِ نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کے بعد کوئی "مامور من اللہ" نہیں آئیگا۔ "مامور من اللہ" صرف حضرات انبیائے کرام ہوتے تھے اور جب انبیائے کرام کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مامورین من اللہ کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضورؐ کے بعد "مامورین من اللہ" کی آمد کا عقیدہ، ختمِ نبوت کی مُہر کو توڑ دیتا ہے۔

لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو دین کی اساسات ہی بدل جاتی ہیں۔ ختمِ نبوت، یعنی مامورین من اللہ کی آمد کے سلسلے کے ختم ہو جانے کا عقیدہ اسلام کی اصل واساس ہے۔ اگر یہ عقیدہ نہ رہے تو قرآن کریم کے مکمل، غیر متبدل، محفوظ اور آخری کتاب ہونے کا عقیدہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور جب قرآنِ کریم کے متعلق یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اسلام کی اساس ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن جب اسلام، دین کی جگہ مذہب بن گیا تو دیگر اہلِ مذاہب کی طرح ہمارے ہاں بھی آنے والے کا عقیدہ رائج ہو گیا۔ بلکہ اس باب میں ہم، باقی اہل مذاہب سے بھی آگے نکل گئے۔ وہ تو ایک ہی آنے والے کے انتظار میں ہیں اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم ہر صدی پر ایک مامور من اللہ (مجدد) کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور قیامت کے قریب امام مہدی کی آمد اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے کا عقیدہ بھی۔ اور اس کے باوجود ہم ختمِ نبوت پر بھی ایمان رکھنے کے مدعی ہیں اور قرآنِ کریم کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ کتاب ہونے کے عقیدے کے حامل بھی۔ مامورین من اللہ کی آمد کے عقیدہ کے ماننے والے کہہ دیتے

لیکن ہم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں

ہیں کہ یہ حضرات کوئی نئی کتاب لے کر نہیں آئیں گے۔ یہ قرآنِ کریم کو سمجھانے کے لئے ہی آئینگے۔ آپ غور کیجئے کہ جس

لہ (فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) مختلف اہلِ مذاہب اپنے مذہب کے اولین راہنما کو مختلف القاب سے پکارتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں آیا ہے کہ خدا نے ہر قوم کی طرف انبیاء بھیجے۔ اس اعتبار سے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان مذاہب کے اولین راہنما انبیائے کرامؑ ہی تھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم نے ان کے لئے انبیاء کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لوگ انہیں بانیٔ مذہب کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن انبیائے کرامؑ دین کے بانی نہیں ہوتے تھے وہ تو دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے والے ہوتے تھے۔ باقی رہے "بانیانِ مذاہب" تو حضرات انبیائے کرامؑ مذہب لاتے ہی نہیں تھے۔ وہ دینِ خداوندی لاتے تھے۔ اسلئے انہیں بانیانِ مذاہب نہیں کہنا چاہیئے۔

کتاب کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی کسی "آسمان سے آنے والے" کی ضرورت پڑے، اس کا یہ دعوے کہ وہ نہایت واضح اور مبین و منیر کتاب ہے، کیا معنے رکھے گا؟ آنے والے کے عقیدے کے متعلق میں نے اپنی کتاب "شاہکارِ رسالتؐ" اور اس کے بعد دوسری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ لیکن چلتے چلتے ایک منظر کا سامنے لانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ مذاہب عالم میں سے ہر ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ جس آنے والے کا انہیں انتظار ہے وہ قیامت کے قریب آئے گا اور جب تک وہ ان کے مذہب کو باقی مذاہب پر غالب نہیں کر دیگا، قیامت نہیں آئے گی۔ آپ ذرا سامنے لائیے اس منظر کو کہ ہندو دھرم، بدھ مت، جین مت، مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور (اجازت دیجئے کہ ان کے ساتھ خود ہم مسلمانوں کے عقیدے کی رو سے وہ بھی جن کے ہم منتظر ہیں) یہ سب قربِ قیامت کے وقت دنیا میں آجائیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنے مذہب کو دوسرے مذہب پر غالب کرنے کے جہاد میں مصروف ہو تو اس وقت اس کرۂ ارض کا نقشہ کیا ہوگا؟ یہاں تو قیامت سے پہلے ہی قیامت آجائے گی!

بہرحال، اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے اپنا آخری ضابطۂ دین نازل کرکے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے کر آنیوالوں کے عقیدے کو ختم کر دیا۔ اسی لئے رسالتِ محمدیہ ابد در کنار ہے اور اس کے سحابِ کرم کا دامن قیامت تک تمام نوعِ انسان کو محیط۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس مقام پر اُن الفاظ کو مقطع کے طور پر درج کر دوں جن پر میں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف ــ معراجِ انسانیت ــ کے باب بعنوان "صبحِ بہار" کو ختم کیا تھا۔ یعنی

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت رہی، نہ کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔

اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ در پکار اٹھتا ہے کہ:-

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر بحق دل بند و راہِ مصطفٰیؐ رو

(۰)

بہرحال، آیت (۲/۸۹) میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے رسالتِ محمدیہ کے انکار سے اپنی بازآفرینی کے موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا اور یہ ان کی انتہائی حرماں نصیبی تھی اور بڑا ہی گھاٹے کا سودا، یعنی

۲/۹۰ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۔

انہوں نے دنیاوی مفاد کے چند دراہم کاسدہ کے عوض اپنی ذات کی متاعِ بے بہا کو فروخت کر دیا۔ یعنی انہوں نے خدا کی کتاب سے سرکشی برتی۔ اور اس سرکشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ کتاب۔ (معاذ اللہ) ۔حق و صداقت پر مبنی نہیں۔ بالکل نہیں، انہوں نے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ انہوں نے محض اس ضد اور تعصب کی وجہ سے اس سے انکار کر دیا کہ نبوت بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل کے گھرانے میں کیوں آ گئی۔ یعنی وہی قدیمی حسد اور تعصب جو انہیں بنی اسمٰعیل کے ساتھ تھا، ان کے قبولیتِ حق و صداقت کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے سابقہ جرائم کی وجہ سے جس عذاب میں مبتلا تھے، اس انکار و سرکشی سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان خانماں خرابوں کو مدینہ اور اس کے مضافات میں سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ میسر آ گیا تھا لیکن انہوں نے وہاں مسلمانوں کے خلاف ایسی سازشیں کیں کہ وہاں سے بھی انتہائی ذلت کی حالت میں نکلنا پڑا۔ قرآنِ کریم نے اسے عَذَابٌ مُّهِيْنٌ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی نہایت رسوا کن عذاب۔

—— (۰) ——

اسی تسلسل میں قرآنِ کریم نے کہا ہے:۔

۲/۹۱ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۚ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لاؤ تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی پر ایمان رکھیں گے جو ہماری طرف نازل کیا گیا تھا۔ اور اس کے سوا ہر بات

سے انکار کرینگے۔ حالانکہ جس کتاب کی طرف انہیں دعوت دی جارہی ہے وہ ان کی طرف نازل شدہ سچی تعلیم کے خلاف نہیں۔ بلکہ وہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے والی ہے جو خود ان کے ہاں موجود ہیں اور جن کے لیے یہ ایک آنے والے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کہو کہ اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ تم اس قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ یہ ایک غیر اسرائیلی نبی کی طرف نازل ہوا ہے تو یہ بتاؤ اس سے پہلے جو اسرائیلی انبیاء کرامؑ تمہاری طرف آتے تھے، تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے؟ تم ان کی تحقیر و

قتلِ انبیاء کا جرم

تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ تمہاری مخالفت اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ تم انہیں قتل بھی کر دیا کرتے تھے (۲/۹۱ ؛ ۲/۸۷)۔ لہٰذا، تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اسرائیلی انبیاء پر ایمان لایا کرتے تھے خود تمہاری اپنی تاریخ کی رُو سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔ دور کیوں جایئے۔ حضرت عیسٰےؑ علیہ السلام تو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ کیا تم اُنکے دعوائے نبوت پر ایمان لائے تھے؟ اُن پر ایمان لانا تو ایک طرف، تم تو بڑے فخر سے کہتے پھر رہے ہو کہ ہم نے انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ انہیں (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مار دیا!

(۰)

اور آگے بڑھو!

۲/۹۲ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔

حضرت موسٰےؑ علیہ السلام کو تم اپنے مذہب کا مؤسس اور اپنا مورثِ اعلیٰ مانتے ہو، سوچو کہ تم نے خود ان کے ساتھ کیا کیا۔ انہوں نے واضح تعلیم خداوندی پیش کی اور تم نے اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ وہ تم سے چند دن کے لئے الگ ہوئے تو تم نے ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ یہ کچھ کم ظلم نہیں تھا، جو تم نے اُن کی زندگی میں، اُن کے ساتھ، اور خود اپنے ساتھ کیا۔

(۰)

اس سے اگلی آیت میں ہے:۔

۲/۹۳ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا

فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ قُلۡ بِئۡسَمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِهٖۤ اِيۡمَانُكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔

طور کے دامن میں تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم کتابِ خداوندی کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے، اسکی تعلیم کو بگوش ہوش سنو گے اور پھر اس کی اطاعت کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا کہ تم نے اسے اچھی طرح سن اور سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد تم نے کیا کیا؟ بجائے اس کے کہ تم اس کی اطاعت کرتے تم نے اعلانیہ اور کھلے بندوں اُس کی خلاف ورزی کی۔ یہ اس لئے کہ تم نے اِس کتاب کے الفاظ کو تو سنا، لیکن اُسے اپنے دل میں جگہ نہ دی کیونکہ تمہارے مَن میں چور تھا۔ تمہارے دل میں گوسالہ کی محبت اور عقیدت حلول کئے ہوئے تھی۔ اے رسولؐ! ان سے کہو کہ یہ ہے تمہارا سابقہ ریکارڈ اور یہ ہے تمہارے ایمان کی حقیقت۔ لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ ہم اس لئے قرآن پر ایمان نہیں لاتے کہ ہم پہلے ہی وحیٔ منزل من اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، جو ہماری طرف نازل ہوئی تھی، خود فریبی اور فریب دہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تمہارا ایمان، تمہیں یہی کچھ سکھاتا اور اسی قسم کی منافقت کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے تو تُف ہے ایسے ایمان پر!

بنی اسرائیل سے متعلق بات کی تو وضاحت ہو گئی لیکن اس میں جو سبق ہمارے لئے پوشیدہ ہے وہ

قرآن کو سُننا اور عمل اُس کے خلاف کرنا

ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ دین کا عملی مفہوم ہے سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا۔ احکاماتِ خداوندی کو اچھی طرح سے سنو، سمجھو اور ان کے مطابق عمل کرو۔ یعنی ان کا سُننا اور سمجھنا اسلئے ضروری ہے کہ اس کے بعد ان پر عمل کیا جا سکے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ آپ احکامِ خداوندی کے الفاظ سنتے رہیں۔ اور اُس کے بعد عمل اُس کے خلاف کرتے رہیں تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا ہماری یہی حالت نہیں ہو چکی! جس قدر ہم خدا کی کتاب کو پڑھتے یا سنتے ہیں، اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ اور اس کے بعد اپنی عملی زندگی میں، ہم جس طرح اس کے خلاف چلتے ہیں اس کی مثال بھی دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ خدا نے کہا تھا کہو سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا — ہم نے سنا اور ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ہم اس کے برعکس، زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ سَمِعۡنَا وَ عَصَيۡنَا (۲/۹۳) — ہم نے سنا، بہت اچھی طرح سے سنا۔ لیکن ہم عمل اس کے خلاف کریں گے۔ قرآنِ کریم کو روزانہ پڑھنے اور سننے کے علاوہ، ہم رمضان المبارک کے ایک مہینے میں جس التزام سے اسے سُنتے ہیں — اور پورے

مہینے ہیں ہی نہیں اُس کے بعد ایک ایک رات میں جس طرح اُسے ختم کرتے ہیں (اِسے شبینہ کہا جاتاہے)۔ یہ "سننے" کی انتہاہے۔ ہمارے ہر اجتماع کا آغاز قرآنی آیات کے سننے سے ہوتا ہے۔ دور دور سے قاری آتے ہیں۔ اور قرآن سنانے کی محفلیں گرماتے ہیں۔ اب تو ان کی قراتیں گراموفون کے ریکارڈز تک میں بھر دی جاتی ہیں۔ کہ جب جی چاہے قرآن کے الفاظ کو سُن لیا جائے۔ حریم کعبہ کے متعلق بڑے وجد آفریں انداز میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سال بھر، دن اور رات کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں قرآن مجید کے الفاظ فضا میں گونجتے سنائی نہ دیتے ہوں۔ یہ سب سَمِعۡنَا (سننے) کے مظاہر ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ سوچیے کہ کیا آج دنیا کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جہاں سے اَطَعۡنَا (ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں) کی آواز بلند ہوتی ہو؟ اسکے برعکس عَصَيۡنَا (ہم اس کے خلاف کرتے ہیں) کے مظاہر ہر مقام پر نظر آئینگے۔ میکانکی طور پر کتاب اللہ کے الفاظ کو پڑھتے اور سنتے رہنا، لیکن "گوسالوں" کی عقیدت کو دل کی گہرائیوں میں پیوست رکھنا، یہ ہے ہمارا مسلک اور مشرب۔

اس مسلک کو پختہ تر کرنے کے لئے اس قسم کے عقاید وضع کر لئے گئے کہ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے پڑھنے سے دس دس نیکیاں مل جاتی ہیں۔ مثلاً الٓـمّٓ کہنے سے تیس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ مذہب کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ نیکیاں کمانا ہوتا ہے۔ اگر نیکیاں اس قدر آسان طریق سے مل جائیں تو کچھ اور کرنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے "ناظرہ" قرآن شریف پڑھانے (اور پڑھنے) کے اہتمامات کئے جاتے ہیں۔ اسے خود پڑھا جاتا ہے اور اس طرح پڑھنے کا "ثواب" مُردوں کو بخشا جاتا ہے۔ اسے قریب المرگ مریض کو سنایا جاتا ہے کہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔

یہ ہیں (سَمِعۡنَا) کی متعدد شکلوں کی چند ایک مثالیں جو امت میں صدیوں سے رائج چلی آرہی ہیں۔ اس (سَمِعۡنَا) کی جس پر عمل پیرا ہونے سے انقلاب عظیم برپا ہو جاتا!

اِس (اپنی) جگر خراش داستان کے بعد پھر بنی اسرائیل کی طرف آجاتے ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں (۵/۱۸) اور جنت پر ہماری واحد اجارہ داری ہے (۲/۱۱۱) قرآن کریم نے ان سے کہا کہ :-

۲/۹۴ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

تم اس دنیا میں انتہائی ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر تمہیں کہیں ٹھکانہ تک میسر نہیں آسکتا۔ ایں سو راندہ و آں سو درماندہ، مارے مارے پھر رہے ہو۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے تو پھر تم سوچ کیا رہے ہو؟ موت کی تمنا کرو اور اپنی جان دیدو اور سیدھے اس جنت میں چلے جاؤ جس میں ہر قسم کا راحت و آسائش کا سامان موجود ہے۔ جس شخص (یا قوم) کو آنکھ بند کرتے ہی اس قسم کی زندگی میسر آسکتی ہو وہ اس ذلت و خواری میں دن کیوں بسر کرے؟ موت کی تمنا تمہارے اس دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہونی چاہیئے۔

لیکن قرآن کریم نے خود ہی کہدیا کہ :-

۲/۹۵ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۔

یہ کبھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے۔ ان کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب کبھی جان دینے کا موقعہ آیا تو یہ وہاں سے نہایت بزدلی سے بھاگ اٹھے (۲/۲۴۳)۔ یہ اس لئے کہ ان کا یہ دعویٰ بھی محض دکھاوے کا ہے کہ جنت ان کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ جس قسم کی معصیت اور بدعملی کی زندگی بسر کرتے ہیں اس کا انہیں اچھی طرح احساس ہے اور اس وجہ سے یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ یہ جانتے ہیں کہ خدا ہمارے ان جرائم سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے ہمیں ان کی سزا مل کر رہے گی۔

موت محاسبۂ خویش کا ذریعہ ہے

موت، انسان کے لئے بہت بڑا محاسبۂ خویش (TEST) کا مقام ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کہا ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲)۔ "موت اور حیات کا تو سلسلہ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس (TEST) سے تم اپنا محاسبہ کر سکو کہ تمہاری ذات میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے"۔ جس کی ذات میں استحکام

پیدا ہو چکا ہو وہ تو موت کو عروس کی طرح گلے لگا لیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

موت سے مرنا تو ایک طرف، یہ تو اس کے سامنے، ایک جہانِ تازہ کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اس دروازے کے کھلنے سے آئندہ زندگی کے وہ حسین مناظر اس کے سامنے نمودار ہو جاتے ہیں جن کی طرف یہ لپک کر جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ موت کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے کہ یہ یہودی جو اپنی کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہیں، بھلا موت کی تمنا کیا کریں گے؟

۲/۹۶ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۔ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۔ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۔ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۔ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۔

موت کی تمنا کرنا تو ایک طرف، یہ تو زندہ رہنے کے لئے مشرکین سے بھی زیادہ حریص نظر آئیں گے۔ لیکن ان سے پوچھو کہ کیا اس دنیا میں زیادہ عرصہ تک رہنے سے تم اپنے اعمال کی سزا سے بچ جاؤ گے؟ تم یہاں زیادہ سے زیادہ کتنے عرصہ تک زندہ رہ سکتے ہو؟ کہہ لیجئے، سو برس، ڈیڑھ سو برس۔ سو یا ڈیڑھ سو برس تو ایک طرف، تم اگر ہزار برس تک بھی اس دنیا میں رہو تو موت سے پھر بھی رستگاری نہیں ہو سکے گی۔ موت ایک دن آئے گی اور آ کر رہے گی۔ بارگاہِ خداوندی کے مفرور (اشتہاری) مجرم بھاگ کہ کہیں نہیں جا سکتے۔ انہیں اس عدالت میں حاضر ہونا ہو گا۔ جہاں سے انہیں ان کے کئے کی سزا مل کر رہے گی۔ وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتے۔ لہٰذا اس سزا سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں کہ تم بھاگتے پھرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرلو۔

لیکن، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، محض نسلی تعصب کی بنا پر اس رسولؐ کے خلاف، تمہارا جذبۂ بغض و حسد تمہیں اس طرف آنے نہیں دے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ تم یہاں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرو گے اور مرنے کے بعد بھی الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو گے۔ تم کہتے یہ ہو کہ نبوت، بنی اسرائیل کے گھرانے میں ہی رہنی چاہیئے تھی یہ بنی اسماعیل کے گھرانے کی طرف کیوں آ گئی؟

۲/۹۷-۹۸ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ

وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۔

جبریل نہ تو اپنی طرف سے وحی کو وضع کرتا ہے اور نہ ہی اُسے اس کا اختیار حاصل ہے (یا یوں کہیے کہ اسے اس کی کیا مجال ہے) کہ وہ خدا کی وحی جسے چاہے۔ دے آئے۔ جبریل اور دیگر ملائکہ کا تو فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں، اور پوری پوری وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرتے ہیں۔ اس لئے تمہارا یہ کہنا کہ وحی تو درحقیقت بنی اسرائیل کے کسی فرد تک پہنچانی مقصود تھی لیکن جبریل نے اسے بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کو دیدیا۔ جبریل کے تم پہلے ہی دشمن چلے آرہے تھے۔ اب اس کے خلاف ایک اور جرم عائد کرنے کا تمہیں موقعہ ہاتھ آ گیا۔ لیکن تم نے کبھی سوچا بھی کہ تمہارے اس اعتراض کی نشتر کہاں تک پہنچتی ہے، یہ تو خود خدا کے خلاف اعتراض ہے کہ اس نے اس قسم کے کارندے رکھ چھوڑے ہیں؟ خدا کے خلاف اعتراض، اور تمام نظامِ وحی پر اور ان وسائط (ملائکہ) پر، جو اس کے حکم سے تدبیرِ امور کرتے ہیں —— یعنی جبریلؑ میکائیل سمیت تمام ملائکہ پر اعتراض —— اس قسم کا اعتراض درحقیقت خدا اور اس کے نظام سے کھلا ہوا انکار ہے۔ سوچو، کہ جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کئے ہوئے ہوں، انہیں خدا کی تائید و حمایت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

نزولِ وحی وحی کے متعلق اجمالی سی گفتگو، مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیات (۲/۴ ص۲۳؛ ۵/۱ ص۴۲) میں کی جا چکی ہے۔ تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں ہم اتنا دھرا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ:

(۱) خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کو وحی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا علم صرف انبیائے کرام کو ملتا تھا۔ غیر از نبی کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہ مل سکتا تھا، نہ مل سکتا ہے۔ قرآن کریم میں کشف اور الہام وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔

(۲) جہاں تک وحی کے سرچشمہ کا تعلق ہے، وہ تو فوق الفطرت (SUPRA-NATURAL) تھا لیکن جو کچھ وحی کی رو سے دیا جاتا تھا، یعنی وحی کا متن (TEXT)، وہ فوق العقل (SUPRA-RATIONAL) نہیں ہوتا تھا، یعنی اُسے علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے سمجھا جا سکتا تھا۔

(۳) خدا کی یہ وحی، اپنی آخری شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہیں مل سکتا۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں۔

نبی کو وحی کس طرح ملتی تھی، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ خدا نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷)۔ "اسے جبریل، خدا کے حکم کے مطابق، قلب نبویؐ پر نازل کرتا تھا"۔ دوسری جگہ جبریل کو روح الامین کہکر پکارا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ

الْمُنْذِرِيْنَ (۲۶/۱۹۴-۱۹۲) "یہ قرآن خدائے رب العلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ روح الامین نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا ہے"۔ سورۃ النحل میں اسے روح القدس کہا گیا ہے (۱۶/۱۰۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بھی اسے روح القدس ہی کہا گیا ہے (۲/۸۷ ؛ ۲/۲۵۳ ؛ ۵/۱۱۰) ــــ روح کا مفہوم بھی اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ قرآنِ کریم میں صرف ایک اور مقام پر جبریل کا لفظ آیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ رسول کو، اللہ، جبریل، مؤمنین اور ملائکہ کی تائید اور حمایت حاصل ہے (۶۶/۴)۔ ملائکہ کے متعلق اسی جلد کے پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے نیز ان کی تسبیح و تقدیس کا مفہوم بھی سامنے آچکا ہے۔ اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میکائیل کا لفظ صرف (۲/۹۸) میں آیا ہے۔ یہودی میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے اور جبریل کو دشمن۔

آیت (۲/۹۸) کے آخر میں کہا گیا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۲/۹۸) ــــ عام ترجمہ اس کا یہی ہوگا کہ "خدا کفار کا دشمن ہے"ــــ لیکن دشمن کا لفظ جس مفہوم میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے اس کی رو سے خدا کو کسی کا "دشمن" کہنے سے اس کے متعلق بڑا غلط تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ لفظ "عَدُوٌّ" (یا عداوت) کا مفہوم آیت (۲/۳۶) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بنیادی معنی، دو چیزوں میں بُعد یا مغایرت پیدا ہو جانے کے ہیں۔ جو شخص بھی قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی اطاعت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے ہٹ جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر،

خدا کے دشمن ہونے کا مفہوم

وہ زندگی کی ان سعادات و برکات سے محروم رہ جاتا ہے جو اُسے قوانینِ خداوندی سے حاصل ہونی تھیں۔ خدا کی عداوت سے یہی مفہوم ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مؤمنین کا ولی، اور مومنین کو خدا کا ولی کہہ کر پکارا ہے (۳/۶۷)۔ ولی، ولایت، اولیاء اللہ وغیرہ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم۔ آگے چل کر اپنے مقام پر سامنے آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے جو تقویت حاصل ہوتی ہے اُسے اس قسم کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ "خدا مؤمنین کا ولی" ہے۔ ورنہ خدا کے لئے نہ عدوٌّ کا لفظ ہمارے عام مفہوم کی رو سے آیا ہے، نہ ولی (دوست) کا لفظ ہمارے مروجہ مفہوم کے مطابق۔

یہودیوں کے متعلق کہا یہ جا رہا تھا کہ وہ اس وحیِ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو رسول اللہ کی طرف بھیجی جا رہی ہے۔ اس سے وہ کسی دوسرے کا نقصان نہیں کرتے، خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ وہ اتباعِ وحی سے حاصل ہونے والی خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں گے۔ اسی کو کہیں لعنت سے تعبیر کیا گیا ہے، کہیں عداوت سے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ یہودی جبریل کے اس لئے دشمن ہوگئے کہ اس نے اس وحی کو ایک غیر اسرائیلی تک کیوں پہنچا دیا۔ اس کے لئے کہا:۔

۲/۹۹ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۔

"اے رسولؐ! ہم نے اس وحی کو بذاتِ خود تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔ یہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وحی بھیجنے کا طریق کوئی بھی کیوں نہ اختیار کیا گیا ہو، وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتی تھی۔ اس میں نہ تو اس قوت کا کوئی عمل دخل ہوتا تھا، جس کے ذریعے یہ وحی پہنچائی جاتی تھی، اور نہ ہی اس رسول کا کوئی دخل جس کی طرف یہ وحی بھیجی جاتی تھی۔ وحی خالص علمِ خداوندی کا نام ہے جو ان وسائط سے نوعِ انسان تک پہنچائی جاتی تھی —— خدا سے نبی کی طرف، بذریعہ روح الامین اور اس کے بعد اس نبی کے ذریعے دوسرے انسانوں تک۔ اس کے بعد کہا کہ اس سے انکار صرف فاسق کرتے ہیں۔ فاسق کا مفہوم، پہلی جلد میں، زیرِ آیت (۲/۲۶ صفحہ ۲۴۳ پر) بیان کیا جا چکا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وحی ایک قالب (PATTERN) عطا کرتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسانی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ اس قالب کے اطراف و جوانب کو حدود اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ ان حدود کی پابندی نہیں کرتے انہیں فاسقین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

فاسقین کا مفہوم

اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو دین اور لادینی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ دین، خدا کی طرف سے متعین کردہ حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ نہ ان حدود میں تبدیلی کی جا سکتی ہے نہ ان سے تجاوز۔ جو شخص دین سے انکار کرتا ہے اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی غیر متبدل پابندی کے تابع زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کھلی چھٹی چاہتا ہے کہ جس طرح اس کا جی چاہے کرے۔ مشہور روسی قلمکار، دوستوفسکی (DOSTOEVESKY) نے اس حقیقت کو چار الفاظ میں محصور کر دیا ہے جب کہا کہ "تم خدا کا انکار کر دو تو ہر چیز جائز قرار پا جائے گی"۔ اسی کو اباحت یا فسق کہا جاتا ہے۔ سیکولرازم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ میں کشش و جاذبیت ہی یہ ہے کہ اس میں ہر غیر متبدل اخلاقی پابندیوں سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو فسق کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے یہاں کہا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے وحی سے انکار کے لئے جو وجوہات پیش کی جاتی ہیں وہ محض پردہ ساز ہوتا ہے۔ اس انکار کی علت العلل یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی پابندی سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ وحی کی صداقتوں سے صرف فاسقین انکار کرتے ہیں، تو یہ کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی ہے۔

ان پابندیوں سے آزاد رہنے کی ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے اگلی آیت میں ان الفاظ میں بیان کردیا گیا کہ :-

۲/۱۰۰ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

"جب یہ کسی سے عہد و پیمان کرتے ہیں تو اگرچہ وہ عہد و پیمان پوری کی پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے لیکن انہی میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو توڑ دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ مصلحت کوشی ان کا شیوہ اور مفاد پرستی ان کا شعار ہے، وہ خواہ کسی طریق سے حاصل ہو جائیں" قرآن کریم نے جو یہاں کہا ہے کہ معاہدہ تو پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن ان میں سے کچھ لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس میں بھی میکاولی سیاست کے ایک اہم گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ ابتدائی سطح پر محلوں کی زندگی کو لیجئے۔ ان میں ایسے گھرانے بھی ہوتے ہیں جو ایک آدھ آدمی ایسا رکھ چھوڑتے ہیں جو دوسروں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہے۔ جب اہل محلہ اس کی شکایت لے کر آتے ہیں تو نہایت معصومیت سے کہدیا جاتا ہے کہ بھائی کیا کریں! یہ لڑکا اس قسم کا نکل آیا ہے۔ یہ ہمارے قابو میں ہی نہیں۔ اسے ہم بھی برداشت کر رہے ہیں، تم بھی برداشت کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ایسا ہی سرکش ہے تو تم نے اسے ... گھر میں رکھ کیوں چھوڑا ہے کہ اہل محلہ کے لئے فتنہ و فساد کا موجب بنتا رہے؟ اسے نکال باہر کرو۔ لیکن وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ گھرانوں اور خاندانوں سے آگے بڑھیے تو جماعتوں اور پارٹیوں میں بھی اس قسم کے لوگ رکھے جاتے ہیں جو دوسروں کے خار بہلو بنے رہتے ہیں جس سے معاشرے کا امن و چین تباہ ہو جاتا ہے۔ پارٹیوں سے آگے بڑھ کر قوموں کی طرف آیئے تو یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمسایہ قوم کے ساتھ امن و سلامتی کا معاہدہ کر رکھا ہے لیکن آج سرحد کے اس حصے میں فساد مچا دیا جاتا ہے، کل اس حصے میں۔ پھر اس کے لئے تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جاتے ہیں جس کا نتیجہ سوائے لیپا پوچی کے، کچھ نہیں نکلتا۔ ہمسایہ قوم سے امن کا معاہدہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں امن اور چین کی زندگی نصیب ہو۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ معاہدہ برقرار رہتا ہے مگر امن و چین نصیب نہیں ہوتا۔ معاہدہ کے معنے اس امر کا اطمینان ہو جانا ہے کہ فریق مخالف کی طرف سے اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ یہ فریقِ مقابل کی ذمہ داری ہے کہ ان کے کسی فرد یا گروہ کی طرف سے اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اگر وہ اس کا انتظام نہیں کر سکتے یا نہیں کرتے تو ایسے معاہدے کے معنے کچھ نہیں رہتے۔ قرآن کریم نے یہاں اسی حقیقت پر زور دیا ہے۔

معاہدہ کی پابندی

تمدنی زندگی سے آگے بڑھئے تو مذہب کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ یہ یہود جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان کا شروع سے وطیرہ ہی یہی رہا ہے۔ مثلاً ابھی کل کی بات ہے کہ:-

۲/۱۰۱ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

اِن کی طرف خدا کا ایک رسول آیا جو خود انہی میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے) تھا — یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اس نے آ کر کہا کہ میں تمہارے سابقہ انبیاء کی تعلیم کی مخالفت کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے کے لئے آیا ہوں جو تم سے کئے گئے تھے ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اسے تسلیم کیا لیکن باقی قوم نے اس کی تعلیم کو یوں جنس کاسد کی طرح اُٹھا کر پھینک دیا جیسے یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ ان سے کیا کہا گیا تھا اور یہ رسول کیا کرنے کے لئے آیا تھا۔

کتاب اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کی مخالفت

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا طرزِ عمل یہودیوں ہی سے مخصوص نہیں۔ جب اور جہاں بھی دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو شخص بھی انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے اس کی یوں مخالفت کی جاتی ہے جیسے یہ جانتے پہچانتے ہی نہیں کہ وہ کس کتاب کی طرف دعوت دیتا ہے؟ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ یہود اور نصاریٰ، دونوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ اور جب حضور کے بعد اسلام بھی دین کے بجائے مذہب بن گیا تو جس شخص نے بھی مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دی اس کی اسی طرح مخالفت ہوئی جس طرح ہر اہلِ مذہب، ہر منزّل من اللہ کتاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ آج بھی، قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والوں کی، خود مسلمانوں کی طرف سے جس طرح مخالفت ہوتی ہے، وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔

یہ کچھ تو یہودیوں نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا لیکن ان سے بھی پہلے انہوں نے اسی قسم کی سازش ایک اور رسول کے خلاف کی تھی، یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف۔ قرآن کریم نے اس پوری داستان

کو ایک ہی آیت میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

۲/۱۰۲ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِينُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۔ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِينَ كَفَرُوا ۔ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۔ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۔ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ ۔ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۔

یہ آیت، اُن آیات میں سے ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور وضعی روایات پر مبنی تفاسیر نے، نہ صرف یہ کہ بہت سے الجھاؤ پیدا کر دیئے ہیں بلکہ بعض اہم حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق ذرا تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں شاہ عبدالقادر (مرحوم) کا اردو زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ہے جسے بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ چونکہ مرورِ وقت سے اس زمانے کا اسلوب بیان کچھ ژولیدہ سا ہو گیا تھا۔ اس لئے شیخ الہند، مولانا محمود الحسن دیوبندی (مرحوم) نے اس اسلوب کو قدرے مروّجہ قالب میں ڈھالا اور وہ ترجمہ مولانا شبیر احمد عثمانی (مرحوم) کے حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔ اس ترجمے کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس لئے میں وہی ترجمہ پیش کئے دیتا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان اہل کتاب نے، کتاب اللہ کو تو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور:۔

> پیچھے ہو لئے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان، سلیمان کی بادشاہت کے وقت۔ اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو۔ اور اس علم کے پیچھے ہو لئے جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں، جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے۔ اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہم تو آزمائش کے لئے ہیں، سو تو کافر مت ہو۔ پھر ان سے سیکھتے وہ جادو، جس سے جدائی ڈالتے مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے۔ اور سیکھتے ہیں وہ چیز، جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے۔ اور وہ خوب جان

چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو، نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ۔ اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

اس پر حسبِ ذیل حاشیہ درج ہے:-

خلاصہ یہ کہ یہود اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ کر، علمِ سحر کے تابع ہو گئے۔ اور سحر لوگوں میں دو طرف سے پھیلا۔ ایک حضرت سلیمانؑ کے عہد میں، چونکہ جنات اور آدمی ملے جلے رہتے تھے تو آدمیوں نے شیطانوں سے سحر سیکھا اور نسبت کر دیا حضرت سلیمانؑ کی طرف کہ ہم کو انہی سے پہنچا ہے۔ اور ان کو حکم جن و انس پر اسی کے زور سے تھا۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے پھیلا ہاروت ماروت کی طرف سے۔ وہ دو فرشتے تھے شہر بابل میں۔ بصورتِ آدمی رہتے تھے۔ ان کو علمِ سحر معلوم تھا۔ جو کوئی طالب اس کا جاتا، اول اس کو روک دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا اور اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔

اس سے دو تین وضاحت طلب سوال سامنے آتے ہیں:-

(۱) یہودی کفر اور جادو کی نسبت، حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کرتے تھے (قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی ہے)۔

(۲) عام طور پر مشہور ہے کہ بابل میں، دو فرشتے آدمیوں کی شکل میں رہتے تھے، جادو ان کے ذریعے پھیلا ـــــ اور

(۳) یہ سوال، کہ خود، جادو کیا ہے اور قرآنِ کریم کی رو سے اس کی حیثیت کیا؟

آپ نے دیکھا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہیں اور اس قابل کہ ان کی پوری پوری وضاحت سامنے آجائے۔

سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف یہودیوں کی افترا پردازیاں دیکھئے۔ واضح رہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں ـــــ ان کا صحیفہ ـــــ غزل الغزلات ـــــ بائبل میں موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ خود بائبل اور یہودیوں کے دیگر مقدس لٹریچر میں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق کیا کچھ ملتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بیٹا (رجعام) برسرِ اقتدار آیا لیکن یہ بڑا کمزور حکمران تھا۔ اس لئے اس کے زمانے میں بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا۔ ان سرکشی اختیار کرنے والوں میں ایک شخص (یربعام) نامی تھا جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے شمالی حصہ مملکت کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس نے بہت سے اور لوگوں کو ساتھ ملا کر سلطنت کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کی سرکوبی کرنا چاہی لیکن وہ بھاگ کر مصر چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد واپس لوٹا اور دس اسباطِ بنی اسرائیل کو ساتھ ملا کر مملکت کے خلاف

جنگ کی اور اپنی حکومت قائم کرلی۔ نہ صرف حکومت، بلکہ بیت المقدس کے مقابلے میں بت خانے تعمیر کرائے جہاں اعلانیہ بت پرستی ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل، یوں بار دگر، بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوگئے۔ بت پرستی کے ساتھ، وہ سب اوہام و خرافات، جو مندروں میں عام تھے، یعنی جادوگری، کہانت، توہم پرستی، غرضیکہ کفر و شرک کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اُن پر مسلط نہ ہوچکا ہو۔ چنانچہ خود بائبل میں اس کا ذکر موجود ہے۔ کتاب سلاطین نمبر۱، باب (۱۲-۱۱) میں ہے:۔

> حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کاہن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اس وقت تو وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہوسکا، لیکن رجعام کے عہد سے اس نے بڑی قوت حاصل کرلی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ ملا کر رجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل کے مقابلے میں دو بت خانے تعمیر کرائے، جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔

اس سے واضح ہے کہ بت پرستی وغیرہ پھیلائی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں نے، لیکن خود بائبل کی اسی کتاب "سلاطین" میں اسے حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی مملکت کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہوئی تھیں وہ آپ پر (معاذ اللہ) خدا کا عذاب تھا جو بت پرستی کے جرم کی پاداش میں نازل ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

حضرتِ سلیمانؑ اور تورات

> سو از بسکہ اس کا (حضرت سلیمانؑ کا) دل خداوند اسرائیل کے خدا سے، جو اسے دوبارہ دکھائی دیا، برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم کیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔ اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا از بسکہ تجھ سے ایسا ایسا کچھ ہوا اور تو نے میرے عہد کو اور میری شریعتوں کو جو میں نے تجھے فرمائیں، حفظ نہ کیا، اس واسطے میں سلطنت کو تجھ سے پھاڑ لوں گا اور تیرے خادم کو دونگا، لیکن تیرے باپ داؤد کی خاطر سے میں تیرے جیتے جی ایسا نہ کروں گا، پر تیرے بیٹے کے ہاتھ سے پھاڑ لوں گا۔ مگر ساری سلطنت نہ پھاڑ لوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کے لئے، جسے میں نے چن لیا ہے ایک فرقہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔
>
> (۱سلاطین نمبر ۱ ۱۳-۱۱/۹)

اس سے ذرا پہلے ہے:۔

پر سلیمان بادشاہ بہت سی اجنبی عورتوں کو فرعون کی بیٹی کے سوا چاہتا تھا۔ موآبی۔ اور عمونی اور ادومی اور صیدانی اور حتی عورتوں کو۔ ان قوموں کی جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم کیا کہ تم ان کے پاس اندر نہ جاؤ اور وہ تم پاس اندر نہ آئیں کہ وہ یقیناً تمہارے دلوں کو اپنے معبودوں کی طرف مائل کرائیں گی سو سلیمان انہیں سے عاشق ہو کے لپٹا۔ اس کی سات سو جوروان بیگمات تھیں اور تین سو حرمین۔ اور اس کی جوروں نے اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔ جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا، سو سلیمان نے صدانیوں کی دیبی عنارات اور بنی عمون کے نفرتی ملکرم کی کی پیروی کی۔ اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داوا کی طرح نہ کی۔ (سلاطین (۱) ۱۱/۱-۶)

آپ دیکھئے کہ یہودیوں کی کتابِ مقدس میں خود ان کے پیغمبروں کے متعلق کس قسم کے افسانے ملتے ہیں! اس مقام پر تو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے۔ بائبل میں بہت سے دیگر اولوالعزم انبیائے کرام کے متعلق جس قسم کی خرافات ملتی ہیں، انہیں دیکھ کر حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ بہر حال یہ تھی کفر کی وہ روش، جسے یہودیوں نے حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ اب آئیے جادو کی طرف۔ تالمود میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے پاس

جادو اور حضرتِ سلیمان

ایک انگشتری تھی جس پر اسم اعظم[1] کندہ تھا۔ جس کی تاثیر سے انسان، حیوان، چرند، پرند، جنات، بھوت سب آپ کے مسخر تھے۔ جب آپ کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو آپ کو اپنی قوت بڑا ناز ہو گیا۔ یہ بات خداوند یہوا کو ناگوار گذری، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کا بادشاہ اشموڈیس چالاکی سے آپ کی انگشتری چرا کرلے گیا، اور آپ کا ہم شکل بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ حضرت سلیمانؑ کی قوت کا راز تو اسی انگشتری میں تھا، جب وہ چھن گئی تو سب کچھ گیا۔ چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہ رسمون کے ملک میں پہنچ کر آپ نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔ قضا کار بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہو گئی۔ جب بادشاہؑ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر مچھلی لے کر ادھر سے گزر رہا تھا۔ بھکارن شہزادی نے

---

[1] آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں میں اسمِ اعظم کا تصور کہاں سے آیا؟

وہ مچھلی اس سے خرید لی، اور جس وقت اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی (حضرت سلیمانؑ جنہوں نے اپنا نام قہلت رکھ چھوڑا تھا) فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے، اُسے فوراً اٹھا لیا اور آنکھ جھپکنے کے عرصے میں یروشلم پہنچ کر اس غدار کو قتل کیا اور خود تختِ حکومت پر متمکن ہوگئے (یہودی تالمود)۔ یہ ہیں وہ خرافات جو یہودیوں کی مقدس ترین کتابوں میں خدا کے اس برگزیدہ رسول کی طرف منسوب ہیں۔

قرآنِ کریم عظیم کتاب ہے۔ اس کے دشمن (یہود و نصاریٰ وغیرہ) خود اپنے انبیاء اور بزرگوں کے متعلق اس قسم کے خرافاتی افسانے وضع کرتے ہیں اور قرآن اِن حضرات کی مدافعت کرتا ہے۔ مثلاً انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کل بارہ شاگرد تیار کر سکے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو چند پیسوں کے عوض مخبری کر کے آپ کو پولیس کے حوالے کرا دیا اور جب آپ کے خلاف مقدمہ چلا تو باقی گیارہ کے گیارہ ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام مخالفتوں کے ہجوم میں گھر گئے تو آپ نے اپنے رفقاء سے پوچھا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (۳/۵)۔ "تم میں سے کون محض خدا کی خاطر اس مصیبت کے وقت میرا ساتھ دے گا؟" تو ان

حضرت عیسیٰ کے حواری

سب نے بیک زبان پکار کر کہا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (۳/۵)۔ "ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ دیکھ لیجئے گا کہ ہم کس طرح احکامِ خداوندی کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں"۔ اتنا ہی نہیں کہ قرآنِ کریم نے محض تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کا ذکر کر دیا ہو۔ اس نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی سی روش اختیار کرنی چاہیئے (۶۱/۱۴)۔ ظاہر ہے کہ جب قرآنِ کریم سابقہ انبیائے کرام کے رفقاء اور متبعین کے متعلق اس انداز سے مدافعت پیش کرتا ہے تو وہ خود حضرات انبیائے کرام کا دامن اُن آلودگیوں سے کیوں نہ پاک اور صاف کرے گا جن سے خود ان کے نام لیواؤں نے انہیں ملوث کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن ان دونوں تہمتوں سے یہ کہکر پاک کر دیا کہ: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲/۱۰۲)۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ سلیمانؑ نے کفر کی روش اختیار کر لی تھی۔

قرآن کریم اور حضرت سلیمانؑ

اس نے قطعاً ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ تو اس کے دشمن، شیاطین تھے جنہوں نے کفر کی روش بھی اختیار کی اور وہ لوگوں کو جادو بھی سکھاتے تھے"۔ قرآنِ کریم نے یہ کچھ آج سے چودہ سو سال پہلے کہا اور دیکھئے کہ اب خود اہلِ بائبل کی تحقیق نے انہیں کس نتیجے پر پہنچایا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں کہا گیا ہے کہ:۔

اتنا تو غالباً صحیح ہے کہ (حضرت) سلیمانؑ کی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی، متعدد بیویاں تھیں، لیکن آپ نے ان سب کے لئے عبادت خانے نہیں بنوائے تھے، نہ ہی خدائے یہوہ کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش شامل کی تھی۔ انہیں اس سرزمین میں، جو خداوند یہوہ کی وراثت تھی، خدائے واحد کے انکار کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق خدائے یہوہ کا وفادار پرستار تھا۔

اور ڈکشنری آف بائبل میں اس کی تائید ان الفاظ میں آئی ہے:-

ایسا باور کرنا مشکل ہے کہ سلیمان بادشاہ، خدائے یہوہ سے مرتد ہو کر بت پرست ہو گیا تھا۔

یہ تو قرآن کریم نے کہا، لیکن اب یہ دیکھئے کہ ہمارے ہاں کی اسی قرآن کی تفاسیر میں اس سلسلے میں کیا کچھ ملتا ہے۔

ہماری کتب تفاسیر کے سلسلے میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر یہ مفسرین اس قسم کی باتوں کو یہ کہکر پیش کرتے کہ یہ ان کے اپنے خیالات ہیں تو بعد میں آنے والے، ان سے اختلاف بھی کر سکتے تھے اور ان کی تردید بھی۔ لیکن ان تفسیروں کا معاملہ ہی الگ ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی مفصل اور مبسوط تفسیر، ابن جریر طبری نے (تیسری صدی ہجری میں) مرتب کی۔ اس میں آیات کی تفسیر میں کہا یہ گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا ہے۔ یا فلاں صحابیؓ سے یوں مروی ہے۔ یعنی اس تفسیر میں جو کچھ لکھا گیا اسے رسول اللہؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کے بعد جتنی تفسیریں

ہماری تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے

مرتب ہوئیں، وہ سب کم و بیش تفسیر طبری ہی کو بطور سند پیش کرتی ہیں۔ اب آپ غور کیجئے کہ اگر کسی آیت کے متعلق یہ کہا جائے کہ رسول اللہؐ نے اس کی تفسیر یوں بیان فرمائی ہے تو کون مسلمان ہے جو یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ مجھے اس سے اختلاف ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جو کچھ امام طبری نے لکھدیا وہی کچھ آج تک آخری سند بن کر چلا آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں غور طلب سوال یہ ہے کہ امام طبری نے جو کچھ کہا اس کا مدار روایات پر ہے۔ روایت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا۔ اب اگر اس طرح سے شنید کا سلسلہ دو، تین سو سال تک پیچھے لے جایا جائے تو اس کی سند کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ آخری راوی نے بیان کیا وہ بالضرور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ اس پرکھ کے لئے قابلِ اعتماد طریق یہ ہے کہ جس بات کو بھی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جائے اس کے متعلق یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قرآن کریم کے خلاف تو نہیں۔ اگر وہ قرآن کریم کے مطابق ہے تو ایسا باور کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ اُسے حضور کا ارشاد گرامی سمجھا جا سکتا ہے لیکن

اگر وہ قرآن کریم کے خلاف ہو تو ظاہر ہے کہ وہ حضورؐ کا قول نہیں ہو سکتا، لہٰذا اُسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ یہ ہے وہ مسلک جو روایات، تاریخ اور تفاسیر کے سلسلے میں، میں نے اختیار کر رکھا ہے۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے کفر اور سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ ہماری کتب تفاسیر میں اس سلسلے میں کیا لکھا ملتا ہے۔ امام طبری کی تفسیر بڑی ضخیم تھی۔ امام ابن کثیر نے اسے نسبتاً مختصر شکل میں پیش کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تفسیر بڑی مقبول ہے۔ اس تفسیر میں (زیرِ نظر آیت کی تشریح کرتے ہوئے) کہا گیا ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جب آپ پاخانے جاتے تو اپنی بیوی حضرت جادہ کو دے جاتے۔ جب حضرت سلیمانؑ کی آزمائش کا وقت آیا اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی، جو دیدی گئی۔ اُس نے پہن لی اور تخت سلیمانی پر بیٹھ گیا۔ تمام جنات وغیرہ حاضرِ خدمت ہو گئے۔ حکومت کرنے لگا۔ اِدھر جب حضرت سلیمانؑ واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا تو جھوٹا ہے انگوٹھی تو حضرت سلیمانؑ لے گئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ ان دنوں میں شیاطین نے جادو کی اور نجوم کی اور کہانت کی اور شعر اشعار کی اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی تلے دفن کرنی شروع کر دیں۔ آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہو گیا۔ آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ عمرِ طبعی کو پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمانؑ کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعہ سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے اور اُن کی کرسی تلے دفن ہیں۔ چونکہ جنات اُس کرسی کے پاس نہیں جا سکتے تھے اس لیئے انسانوں نے اسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں۔ بس اب ان کا چرچا ہو گیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا رازیہی تھا بلکہ لوگ، حضرت سلیمانؑ کی نبوت سے انکاری ہو گئے اور آپ کو جادوگر کہنے لگے۔

(تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول صفحہ ۱۲۵)

معالم التنزیل، ہمارے ہاں کی ایک اور اہم تفسیر ہے۔ اس میں مندرجہ بالا "افسانے" یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ:۔

جب اس جن (یعنی جعلی سلیمان) کو حکومت کرتے کچھ عرصہ گذر گیا تو حضرت سلیمانؑ کے صحابی آصف نے آپ کی ازواجِ مطہرات سے پوچھا کہ باہر تو اس کا (یعنی جعلی سلیمان کا، جس کے متعلق انہیں علم نہ تھا کہ وہ جعلی ہے)

حال بہت بُرا ہے، تمہارے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے ؟ اس کے جواب میں آپ کی ازواج نے کہا کہ یہاں اس کا حال بدتر ہے۔ یہ تو حیض کی حالت میں بھی اجتناب نہیں کرتا۔ اور غسلِ جنابت بھی نہیں کرتا۔ اِن تفاسیر کے افسانوی اور اُن روایات، جن پر یہ تفاسیر مبنی ہیں، کے وضعی ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے ؟

بابل اور سحر کاری

اب آئیے آیہ زیر نظر کے دوسرے گوشے، یعنی ہاروت و ماروت کی طرف۔ تاریخی انکشافات اس پر شاہد ہیں کہ زمانۂ قدیم میں بابل، سحر و کہانت اور شعبدہ گری و فسوں سازی کا گہوارہ تھا۔ چنانچہ راجزن اپنی مشہور کتاب ــــ بابل اور اشوری مذہب ــــ میں لکھتا ہے:-

اہلِ بابل و نینوا کے مذہب کا معتد بہ حصّہ جھاڑ پھونک کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ (صفحہ ۱۴۵)

انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ "اہلِ بابل کا مذہبی لٹریچر، سحر و کہانت سے بھرا پڑا تھا۔ جب کلدانیوں (اہلِ بابل) کی قومیت کا شیرازہ بکھرا تو وہ تمام دنیا میں پھیل گئے اور جہاں جہاں گئے اُنہوں نے شعبدہ بازی اور افسوں طرازی کی اس نظر فریب تعلیم کو عام کرنا شروع کر دیا" (دیکھئے RAGOZIN کی کتاب کالڈیا) یہودی شعبدہ بازی اور سحر و کہانت کے بہ دل شیدائی تھے۔ اہلِ بابل کے بکھرے ہوئے معلموں کا سب سے زیادہ اثر انہی توہم پرستوں پر ہوا۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا اس پر شاہد ہے کہ یہودیوں میں اہلِ بابل ہر جگہ بہ نگاہِ تقدس دیکھے جانے لگے اور (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رو سے) ان کی تعلیم یہودیوں کے ہاں عام ہو گئی۔ اس پر جیوش انسائیکلو پیڈیا (جلد ہشتم) کی حسب ذیل شہادت قابلِ غور ہے[1]

> قدیم یہودیوں میں جادو کی تعلیم عام تھی۔ حتیٰ کہ صدرِ مجلس یا محکمۂ قضا کی رکنیت کے لئے جادو کا علم لاینفک شرط سمجھا جاتا تھا، خواہ یہ جادو کفار سے ہی کیوں نہ سیکھا جائے۔ ان کے بڑے بڑے علماء اسی علم کے ماہر تھے، اور قانون کی نگاہ میں اس کا اثر مسلم تھا۔ لوگ اہلِ علم کی باتوں کی پرواہ کرتے یا نہ کرتے، لیکن ساحرین کی عقیدت ان کے رگ و ریشے میں سما چکی تھی۔ اسی نے انہیں تباہ کر دیا۔

اس کے بعد آئیے اپنی کتبِ تفاسیر کی طرف۔ تفسیر ابن کثیر میں آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۰۲) کی تفسیر میں لکھا ہے:-

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور ان کی اولاد

---

[1] یہودی (بلکہ سامی اقوام) میں مروجہ جادو کی تفاصیل (G. CAMPBELL THOMPSON) کی کتاب (SEMITIC MAGIC; ITS ORIGIN AND DEVELOPMENT) میں ملاحظہ کیجئے۔

ہاروت وماروت پھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر بد لوگ ہیں، کیسے نافرمان اور سرکش ہیں، ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو پسند کرلو۔ میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں زمین پر بھیجتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت ماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہدیا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں نے نبیوں کی معرفت اپنے حکم احکام پہنچاتا ہوں لیکن تم سے بلاواسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک کرنا، زناکرنا، شراب نہ پینا۔ اب یہ دونوں زمین پر اترے اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لئے حسین وشکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا۔ اوس نے کہا اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہوسکے گا....... وہ چلی گئی۔ پھر آئی اور کہنے لگی اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو، تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہے۔ اونہوں نے اسے بھی نہ مانا۔ وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو۔ اونہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھکر اُسے منظور کرلیا۔ اب نشہ میں مست ہوکر زنا کاری بھی کی اور اوس بچے کو بھی قتل کرڈالا۔ جب ہوش وحواس درست ہوئے تو اوس عورت نے کہا جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے، سب تم نے کر ڈالے۔ یہ نادم ہوئے۔ انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذاب دنیا کو اختیار کرو یا عذاب اُخروی کو۔ اونہوں نے دنیا کے عذاب پسند کئے۔ (ابن کثیر پارہ اول صفحہ ۱۲۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

صحابہ اور تابعین سے بھی اس قسم کی روائتیں بہت کچھ منقول ہیں۔ بعض میں ہے کہ زہرہ ایک عورت تھی اوس نے ان فرشتوں سے یہ شرط کی تھی کہ تم مجھے وہ دعا سکھا دو جسے بڑھ کر تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ اونہوں نے سکھا دی۔ یہ پڑھ کر چڑھ گئی اور وہاں تارے کی شکل میں بنا دی گئی۔ (ابن کثیر پارہ اول صفحہ ۱۲۴)

اس کے بعد ہے:۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔ یہاں بابل سے مراد بابل دنباوند ہے۔ اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نبطی زبان میں اس کا نام بیدخت تھا اور فارسی میں ناہید تھا۔ یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی۔ جب انہوں نے اوس سے برائی کا ارادہ کیا

تو اوس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو مجھے منظور ہے۔ اونہوں نے ایسا ہی کیا پھر اوس نے کہا مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اترتے ہو؟ اونہوں نے یہ بھی بتا دیا۔ چنانچہ پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی لیکن اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب کبھی زہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے۔ اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ پہلے پہل چند دنوں تک تو یہ فرشتے ثابت قدم رہے۔ صبح سے شام تک عدل کے ساتھ حکم کرتے رہتے۔ شام کو آسمان پر چڑھ جاتے پھر زہرہ دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ زہرہ ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔ (ابن کثیر۔ پارہ اول صفحہ ۱۲۸-۱۲۷)

اس قسم کی تفسیروں کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ متقدمین کی تفاسیر ہیں، جنہوں نے روایات کے بارے میں،

مودودی صاحب کی تفسیر

زیادہ چھان پھٹک سے کام نہیں لیا، لیکن اس زمانے میں، جو تفاسیر لکھی جا رہی ہیں ان میں اس قسم کا رطب و یابس شامل نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں (LATEST) تفسیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس بارے میں اس میں کیا لکھا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

اس آیت کی تاویل میں، مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا، جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے[1]، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازار سا حری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام

[1] قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ وہ فرشتے تھے۔

کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکّے اور نوٹ لے جاکر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول صفحہ ۹۸ طبع ۱۹۵۱ء)

ہم اِس تفسیر پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اسے ہم قارئین کی بصیرت پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ :-

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو

قرآنِ کریم میں حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی مختلف جنگوں میں ملائکہ کے نزول اور تائید کا ذکر آیا ہے۔ اور ہر مقام پر یہ کہا گیا ہے لَمْ تَرَوْهَا "تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے" (۹/۲۶؛ ۹/۴۰؛ ۳۳/۹)۔ یعنی قرآنِ کریم بالفاظِ صریح کہہ رہا ہے کہ فرشتے (اور تو اور، حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ تک کو بھی) نظر نہیں آسکتے تھے۔ اور مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ یعنی ان کے نزدیک ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جو انسانی شکل میں، بابل میں لوگوں کو، خلافِ حکمِ خداوندی، جادو کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور اس کے لئے جو "مصلحتِ خداوندی" تھی اُسے آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

یہ ہے نمونہ ان تفاسیر کا، جن کی رو سے قرآنِ کریم کو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی روشنی میں اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ (۲/۱۰۲)۔ ان (یہودیوں) کی کیفیت یہ تھی کہ یہ خدا کی صحیح تعلیم کو چھوڑ کر ان افسانوں کے پیچھے لگے رہتے تھے جو ان کے سرغنوں نے مملکتِ سلیمانؑ کے خلاف تراش رکھے تھے۔ ان میں سے

آیت کا صحیح مفہوم

ایک افسانہ یہ تھا کہ سلیمانؑ جیسا پیغمبر سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔ ایسا کرنا کفر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے رسول، کفر کا شیوہ اختیار نہیں کیا کرتے۔ اس لئے وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲/۱۰۲)۔ سلیمانؑ کفر کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ ایسا کچھ اس کے مخالفین کیا کرتے تھے۔ جو لوگوں کو جادو

سکھایا کرتے تھے۔

(پھر قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ) یہ قصہ بھی، جو ان لوگوں میں مشہور ہے، صحیح نہیں کہ بابل میں کوئی دو فرشتے، ہاروت ماروت، تھے اور ان کی طرف وحی کے ذریعے سحر نازل ہوتا تھا جسے وہ لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اعتراض سے بچنے کے لئے یہ لوگ اس افسانہ میں اتنا اضافہ کر دیتے ہیں کہ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (۲/۱۰۲)۔ "جب لوگ ان کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتے تو وہ ان سے کہتے کہ دیکھو! ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے۔ تم کیوں کفر کی روش اختیار کرتے ہو"؟ لیکن جب اس پر بھی لوگ باز نہ آتے تو وہ انہیں ایسے جادو ٹوٹکے سکھا دیتے جن کے ذریعے وہ میاں اور بیوی میں تفرقہ پیدا کر دیں۔ یہ بھی افسانہ ہی ہے۔ بابل میں نہ ایسے کوئی فرشتے تھے اور نہ ان کی طرف منجانب اللہ کچھ نازل ہوتا تھا۔ نہ وہ لوگوں کو اس قسم کی تنبیہ کرتے تھے۔ یہ سب ان لوگوں کی افسانہ تراشیاں ہیں۔ جہاں تک اس عقیدے کا تعلق ہے کہ جادو ٹوٹکے کسی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں تو یہ عقیدہ بھی سرے سے غلط ہے۔ نفع و نقصان تو قوانینِ خداوندی کی رو ہی سے پہنچا کرتا ہے نہ کہ اس قسم کی توہم پرستیوں سے (فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۲/۱۰۲)

ان کے مذہبی پیشوا، اس قسم کے افسانوں کے سہارے لوگوں کو جادو ٹوٹکے سکھاتے تھے۔ اسے انہوں نے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ یہ ایسے بیوقوف نہیں تھے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ جو شخص اپنا دین و ایمان بیچ کر مکر و فریب کی تجارت کرتا ہے، وہ یہاں تو چار پیسے کما لیتا ہے لیکن اخروی زندگی کی خوشگواریوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۲/۱۰۲) بس افسوس ہے ان کی اس خرید و فروخت پر۔ کیا ہی بری متاع ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کی نجات بیچ ڈالی۔ کاش وہ جانتے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں کس طرح اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں (وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۲/۱۰۲)

یہ ہے اس آیۂ جلیلہ کا صحیح مفہوم۔ اس میں حرفِ مَآ نے سارا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ اس کی رو سے قرآن یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی کوئی بات سرے سے تھی ہی نہیں۔ یہ سب ان کا خود تراشیدہ افسانہ ہے۔ (حرفِ مَآ اس سارے افسانے کی نفی کر رہا ہے)۔

اور اگلی آیت میں ہے کہ:۔

۲/۱۰۳ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

"اگر اس قسم کی روش اختیار کرنے کی بجائے، منزل من اللہ صداقتوں پر ایمان رکھتے اور اس قسم کی تباہ کن روش سے بچتے، تو انہیں خدا کے ہاں سے وہ کچھ ملتا، جو اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتا جو یہ ان فریب کاریوں سے کماتے ہیں۔ اے کاش! ایسی صاف اور سیدھی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ـــــ بات تو صاف اور سیدھی ہے لیکن انسان کی مفاد پرستیاں اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ یہی کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔"

جادو کی حقیقت

اس کے بعد آخری گوشہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ سحر (جادو) کی حقیقت کیا ہے اور قرآن مجید کا اس باب میں موقف کیا؟ اس جلد کے پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کارگہ کائنات کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی وہ قوانین بھی نافذ کر دیئے جن کے مطابق اسے سرگرم عمل رہنا تھا۔ ان قوانین کی اصل و بنیاد، قانونِ علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ یہاں جو واقعہ بھی ظہور میں آتا ہے اس کا ایک سبب ہوتا ہے یا یہ کہ ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھدی گئی ہے۔ یہ جس قدر ان قوانین کا علم حاصل کرتا جائے گا، ہر واقعہ کا سبب اس کی سمجھ میں آتا جائے گا۔ نوعِ انسان کی ابتدائی زندگی میں اس نے ہنوز یہ علم حاصل نہیں کیا تھا اس لئے اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا، کہ واقعات کا ظہور کس طرح سے ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ ایک اچھے بھلے آدمی کو بخار ہو گیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ بخار کیوں ہوا؟ اس کا سبب کیا ہے؟ اور جب اس کا سبب ہی اس کو سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا تو اسے یہ بھی کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ اس کا ازالہ کس طرح کیا جائے؟ یہی کیفیت، نت نئے دن، خارجی کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی تھی۔ واقعات اس کے سامنے آتے تھے لیکن ان کے اسباب کا اسے کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات میں وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ اپنے ذہن میں کچھ غیر مرئی قوتوں کا خیال پیدا کرے اور یہ سمجھ لے کہ ان واقعات کی خالق وہ قوتیں ہیں۔ انہیں آپ دیوی دیوتا کہہ لیجئے۔ سیلاب آتا تو اس کا یہ خیال اس سے کہتا کہ پانی کے دیوتا کو غصہ آگیا ہے جس کا نتیجہ یہ سیلاب ہے۔ ان میں سے کچھ زیرک لوگ ان رسوم کو سرانجام دیتے تھے۔ ان رسومات کا نام پوجا پاٹ، پرستش یا (WORSHIP.) تھا۔ ماہرینِ علم الانسان

(ANTHROPOLOGISTS) اسے "عہدِ پرستش" یا (AGE OF WORSHIP) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان رسومات کو ادا کرتے تھے لیکن ان کے اپنے ہاتھ میں اقتدار کوئی نہیں تھا۔ جب ان کا ذہن آگے بڑھا تو انہوں نے ایک ایسا عقیدہ وضع کیا جس کی رو سے یہ قوت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گئے۔ وہ عقیدہ یہ تھا (مثلاً) کسی شخص کو بخار آتا تو وہ کہتے کہ کسی دشمن نے کوئی ٹونا ٹوٹکا کیا ہے۔ ہم ایسا منتر جانتے ہیں جس سے اس شخص کا بخار بھی اتر جائے اور ٹونا کرنے والے کا بھی ستیاناس ہو جائے اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے کہ ہمارے پاس ایسا علم بھی ہے جس سے ہم دیوتاؤں کو بھی مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری مرضی کے تابع چلیں۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ زیرک لوگ رفتہ رفتہ بہت سی غیر مرئی قوتوں کے مالک بن گئے۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت یا (PRIEST-CRAFT) کا آغاز ہوا ماہرین علم الانسان اس دور کو، "دورِ سحر" (AGE OF MAGIC) کہکر پکارتے ہیں۔

انسان کی طبیعت عجوبہ پسند واقع ہوئی ہے۔ جو واقعات التزاماً اور معمولاً اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اس کا ذہن ان سے مانوس ہو جاتا ہے اس لئے ان میں نہ کچھ اجنبیت محسوس کرتا ہے نہ ہی وہ اس کے لئے وجہ حیرت بنتے ہیں۔ لیکن جن واقعات کے اسباب اس کی سمجھ میں نہیں آتے وہ اس کے لئے بڑے تحیر انگیز اور تعجب خیز قرار پاتے ہیں اور وہ (بچوں کی طرح) ان میں بڑی کشش اور جاذبیت، بلکہ لذت و انبساط محسوس کرتا ہے۔ تاریخ انسانی کے اولین ادراق میں انسان کی یہ عجوبہ پسندی ہر مقام پر ابھری ابھری نظر آئے گی وہ دور تو بعد میں ختم ہو گیا لیکن انسانی عجوبہ پسندی کا جذبہ اس کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ علم انسانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ اس میں کمی ضرور واقع ہو گئی لیکن یہ یکسر معدوم نہیں ہو سکا۔ اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ جادو یا (MAGIC) کا لفظ آج بھی بڑے بڑے دانشوروں تک کے لئے کشش اور لذت اندوزی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

یوں تو (MAGIC) کا لفظ اشارہ کناں ہے کہ اس کی ابتدا، مجوس (MAGIS) کے ہاں سے ہوئی۔ لیکن عصرِ حاضر کی تحقیق کا رخ اس طرف ہے کہ اسے سب سے پہلے ایک باضابطہ علم یا فن کی صورت قدیم مصری مذہب نے عطا کی۔ وہاں سے یہ یونان کی طرف گیا اور اس کے بعد بابل میں (رجو بعد میں) اس کا مشہور مرکز قرار پاگیا۔ یونان میں اس کی نسبت ایک افسانوی نام (HERMES TRISMAGISTUS) کی طرف کی گئی ہے۔ جہاں سے اسے (HERIMETIC SCIENCE) کا نام ملا ہے۔ یہ فن مشرق کے ظلمت کدوں میں ابھی تک اسی قدیم نقاب میں لپٹا چلا آتا ہے۔ لیکن ممالک یورپ میں سحر و نیرنجات (OCCUL-TISM) نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور اس کی سوسائٹیاں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

علمائے سحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء، ایک عالمِ مثال (ASTRAL WORLD) ہے جس میں تمام موجوداتِ عالم (افراد و حوادث) کے عکس موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تخصیص نہیں۔ ماضی اور حال کے افراد و حوادث کی طرح مستقبل کے افراد و حوادث بھی اپنی عکسی صورت میں اس عالمِ مثال میں موجود رہتے ہیں اور وہاں سے اس کائنات کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ عالمِ مثال اور ہمارے اس حواس کی دنیا میں باہمی تعلق ایک آفاقی عامل (UNIVERSAL AGENT) کے ذریعے قائم ہے۔ (اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ہمارے کرۂ ارض کے گرد ریڈیائی لہریں موجزن ہیں اور وہ ہر کہربائی حرکت کو ایک ثانیہ میں ہر مقام پر پہنچا دیتی ہیں) یہی وہ عامل ہے جو ایک شخص کے خیالات کی دنیا کو دوسرے شخص کے "عالمِ تخیل" سے مربوط کئے ہوئے ہے خواہ ان میں کتنا ہی بُعدِ مکانی کیوں نہ ہو۔ اب صرف کرنا یہ ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے۔ جو ایسا کرے، ماضی، حال اور مستقبل کی تمام قوتیں اس کے اشاروں پر ناچیں گی۔ اور وہ باتیں ظہور میں آئیں گی جو کسی کی عقل و فکر میں نہ آسکیں۔ اسی کا نام سحر، افسوں، طلسم، نیرنجات ہے۔ اس عامل سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنی داخلی قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ان ریاضتوں اور مشقتوں سے ہوتا ہے جو اس "سائنس" میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ یہ ہیں مختصر بنیادیں جن پر اس فن کی ساری عمارت قائم ہے۔ عام طور پر سمجھا یہی جاتا ہے کہ اس فن سے مقصود فقط شعبدہ بازی ہے لیکن اس کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ شعبدہ بازی تو فقط راستے کے مناظر ہیں۔ یہ دراصل ادراکِ حقیقت کا ذریعہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت، وہی عالمِ مثال ہے اور اس کا ادراک اسی طریق سے ہوسکتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانہ میں فنِ سحر نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ اور اب بھی مشرق میں اسے عام طور پر یہی حیثیت حاصل ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اس فن کی تمام تر بنیاد اس پر ہے کہ انسان اپنی داخلی قوتوں کو اس قدر نظم و ضبط میں لے آئے کہ اس سے اس قسم کی خلافِ معمول (خارقِ عادات) باتیں ظہور میں آنے لگ جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ "داخلی قوتیں" کیا ہیں جنہیں ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ان کا مطمعِ نگاہ ہوتا ہے۔

علمائے نفسیات (PCYCHOLOGISTS) کی تحقیق ہے کہ انسان کی قوتِ متخیلہ یا قوتِ ارادی (WILL POWER) کو مختلف طریقوں سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ غالب قوتِ ارادی والا انسان، اپنے سے کمزور قوتِ ارادی والے انسان کو اپنی قوت سے متاثر کر سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حواس اُس کی مرضی کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یعنی اس کی آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو یہ دکھانا چاہے۔ اس کے

کان وہی کچھ سنتے ہیں جو یہ سنانا چاہے وقس علیٰ ہذا۔ انسان کے حواس اس کے ذہن کے تابع ہوتے ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کسی گہری فکر میں مستغرق ہوں تو آپ کے سامنے سے کوئی گزر جاتے، آپ کو خبر تک نہیں ہوتی حالانکہ آپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اس لئے قوتِ غالب والا انسان دراصل کمزور قوت والے انسان کی دماغی قوت کو مغلوب کرلیتا ہے اور اس طرح اس کے حواس خود بخود اس کی قوت کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب اگر یہ چاہے کہ ایک پتھر کا ٹکڑا اُسے سونا بن کر دکھائی دے تو وہ اسے سونا ہی دیکھے گا اور سونا ہی سمجھے گا۔ یا یہ کہ اس کا دماغ درد کا احساس نہ کرے تو وہ اس کا احساس چھوڑ دے گا، جیسے کلوروفارم کے اثر کے ماتحت دماغ سے قوتِ احساس معطل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیاد، جس پر سحر و افسوں کی تمام محیرالعقول اور نگاہ فریب عمارت استوار ہے (STEINER) اپنی کتاب (THE WAY OF INITIATION) میں لکھتا ہے:۔

> ہر انسان میں ایسی مخفی قوتیں موجود ہیں جن کی رو سے وہ عالمِ بالا کا علم حاصل کرسکتا ہے۔۔۔۔۔۔ جب سے نوعِ انسانی کی ابتداء ہوئی ہے ایسے اسکول موجود رہے ہیں جن میں وہ لوگ، جن کی یہ قوتیں بلند سطح پر موجود تھیں، ان لوگوں کو یہ کچھ سکھاتے تھے جو اس کی تلاش میں تھے۔

فنِ سحر کا بہت بڑا محقق (ELIPHAS LEVI) لکھتا ہے:۔

> جس طرح جسمانی ورزشوں کے ذریعہ سے انسان اپنی جسمانی قوتوں کو محیّرالعقول درجہ تک لے جا سکتا ہے اور قائم رکھ سکتا ہے اسی طرح ''روحانی'' قوتوں کا حال ہے کیا آپ اپنے آپ پر اور دوسروں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر کرنا چاہتے ہیں تو یہ سیکھئے کہ اپنی قوتِ ارادی کو کس طرح استعمال میں لایا جاتا ہے۔ فنِ سحر کا سب سے پہلا راز یہی ہے اور اس راز کی بنیادوں کو محکم بنانے کے لئے قدیم استادانِ فن نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا کہ اپنی خانقاہوں کے اردگرد ایسی ایسی نگاہ فریب اور بھیانک صورتیں پیدا کر چھوڑتے تھے کہ جو شخص اس فن کے سیکھنے کے لئے اس حلقہ میں داخل ہونا چاہتا، اس کی قوتِ ارادی کا پہلے ہی امتحان ہو جاتا اور اس کے بعد اسے ایسی ایسی مشقت آمیز ریاضتوں سے گزارا جاتا جن سے اس کی قوت محکم سے محکم تر ہوتی جاتی۔

ان بیانات کے پیشِ نظر (EVELYN UNDERHILL) نے اپنی کتاب (MYSTICISM) میں لکھا ہے "فنِ سحر کے دورِ حاضرہ کے استادوں کے نظریہ کی رو سے یہ فن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ قوتِ ارادی کو اس

کی عام حدود سے آگے بڑھا دیا جائے۔ لہٰذا سحرکاری یہی ہے کہ ذہن کو خاص نظم و ضبط کے ماتحت لاکر قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جائے۔" جب قوتِ ارادی میں اس قسم کا نظم و ضبط پیدا کر دیا جائے تو یہ کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے، اس کے متعلق (E. TOWENE) اپنی کتاب (JOY-PHILOSOPHY) میں لکھتا ہے:-

> ذرا تصور میں لایئے کہ یہ تمام کائنات اور ستاروں کا ہجوم سب کے سب چشم براہ ہیں کہ آپ انہیں کیا حکم دیتے ہیں۔ پھر تصور میں لایئے کہ آپ کو فقط ایک بٹن دبانا ہے اور اس کے بعد جو کچھ آپ کہیں گے یہ کریں گے۔ جونہی آپ نے کہا کہ میں یہ کچھ کر سکتا ہوں اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا" کائنات کی تمام قوتیں آپ کے اشارے پر ناچنے کے لئے تیار ہوں گی۔

قوتِ ارادی کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اسے ایک نقطہ پر مرکوز کرنا (CONCENTRATION) ہے۔ اس کے لئے مراقبے کرائے جاتے ہیں۔ مختلف الفاظ اور فقرات کو خاص طریقوں سے دہرایا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مشقتیں اور ریاضتیں اٹھانی پڑتی ہیں (LEVI) لکھتا ہے:-

> یہ تمام شکلیں اور ان کی مثل حرکات و سکنات۔ یہ تمام اعداد و شمار اور حروف، والفاظ، مقدس فقرے، منتر، تعویذ سب قوتِ ارادی کی تربیت کے ذرائع ہیں جن سے یہ قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس طرح متخیلہ کی تخلیقی قوتوں کو محکم بنا دیتی ہیں۔ ایک عمل، خواہ وہ کتنا ہی توہم انگیز اور جہالت آمیز کیوں نہ نظر آتا ہو، مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عملیات کے ذریعے مریضوں کا علاج کرنے کے متعلق یہی محقق لکھتا ہے:۔

> عامل کی تمام قوت کا راز یہی قوتِ ارادی ہے اور اس کا کمال فقط یہ ہے کہ وہ مریض کے دل میں اپنی عقیدت پیدا کر دے۔

یہ ہے فنِ سحر کی بنیاد۔ یعنی قوتِ ارادی اور متخیلہ کے کرشمے۔ جس شخص پر اس قوت کو اثر انداز کیا جاتا ہے وہ، وہی کچھ دیکھنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے جو کچھ اسے دکھایا اور سمجھایا جائے۔ یعنی جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے وہ فی الواقعہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ محض فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔

یہودی اور باطنیت

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں "سحرِ بابل" کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، ان توہم پرستیوں کا آغاز تو بابل اور اس کے گرد و پیش کی سرزمین سے ہوا لیکن یہودی

اس سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ شروع شروع میں انہوں نے اسے اس کے اصلی نام — سحر — (جادو) ہی سے پکارا لیکن جب یہ نام بدنام ہوگیا اور یہ شعبدہ بازی سمجھا جانے لگا تو ان کے احبار و رہبان نے ضروری سمجھا کہ اسے کوئی مقدس لبادہ اوڑھا دیا جائے۔ انہوں نے اسے باطنیت کہکر پکارا۔ انگریزی زبان میں اسے ——— (MYSTICISM) کہا جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ "تصوّف"[1] کے نام سے مشہور ہے۔ آئندہ سطور میں، ہم باطنیت اور تصوّف کو مرادف معنوں میں استعمال کریں گے۔ اس وضاحت کے ساتھ آگے بڑھیے۔

یہودیت ظواہر پرستی کا مذہب ہے۔ اس لئے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت مشکل تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانے میں، جب یہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی، ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے "نبیوں" (PROPHETS) کے احوال و ظروف کچھ ایسے ہیں جیسے باطنی خلوت گاہوں میں ارباب تصوّف کے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا اسلوبِ زندگی، وہی اندازِ گفتگو۔ اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات۔ اسی نوع کی پیش گوئیاں۔ لیکن حقیقی تصوف ان میں اس کے بعد جاکر آیا جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (PHILO) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوف کا ابوالاباء درحقیقت افلاطون (PLATO) کو سمجھنا چاہیئے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ علم السحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء ایک عالم امثال ہے۔ یہ تصور درحقیقت سب سے پہلے افلاطون نے پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالمِ امثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم محض اس کا پرتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس حقیقی عالم کے متعلق علم، حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا، باطنی طریق سے حاصل ہوسکتا ہے۔ افلاطون کے اس فلسفہ کی نشاۃِ ثانیہ، بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلوطینس (PLOTINUS) تھا۔ ان فلاسفرز میں ایک (APOLLONIOUS OF TYANA) نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے برہمنوں سے ویدانت (ہندی تصوف) سیکھا۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینوس کی زیر سرکردگی افلاطون کے فلسفہ قدیم

[1] تصوف کے متعلق ضمناً، جلد اول (آیات ۱/۱۵ ص۴۵ ؛ ۲/۱۱-۱۲ ص۲۳۴ ؛ ۲/۲۸ ص۳۵۱) اور جلد دوم (آیات ۲/۴۴ ؛ ۲/۵۵) میں ذکر آچکا ہے۔ یہاں ایک اور زاویۂ نگاہ سے اس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

کو، ان ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر، ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نوفلاطونی فلسفہ .... (NEO-PLATONISM) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، باطنیت میں بدل گئی۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ:۔

تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے باطنی معانی کا راز پا جائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے۔

تورات کی شریعت، ہر بنی اسرائیل کے لئے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے چنانچہ مثنا (کتاب "حقیقت") میں لکھا ہے کہ:۔

کتابِ پیدائش کے باطنی معنی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہیئے، اس کی سخت ممانعت ہے۔ اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقامِ ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصلی معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروفِ ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انہیں خاص طریقوں سے اکٹھا کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی یہی خواص و تاثرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے کہ:۔

خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا اور ان کے پر اسرار مجموعوں سے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا، وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علمِ حقیقی ہے اور اس سے انسان پر، اسرار و رموزِ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ جس پر یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں چنانچہ ان کے

"ربانی صوفیوں" (RABBANIC MYSTICS) کی شعبدہ بازیوں کے عجیب و غریب قصے مشہور رہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام، رموز کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے۔ بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہو جاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے یہ ارباب تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوابوں کی تعبیرات سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ آپ نے دیکھا کہ عہدِ قدیم کا وہی سحر، کس طرح نئے روپ میں نمودار ہو گیا۔

جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم (خدا کے سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوا ان کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ لیکن ان کی تشریف برادری کے بعد خود عیسائیت یہی کچھ بن کر رہ گئی۔ ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوئے تھے وہ پہلے یہودی ہی تھے اور دوسرے اس لئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہو گئی، اس لئے اسے بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر، تصوف کی قرارگاہ میں پناہ لینی پڑی۔ بہرحال، اب ہم عیسائیت کی طرف آتے ہیں۔

عیسائیت اور تصوّف

عیسائیت میں پہنچ کر باطنیت نے ایک منظم مسلک (ORGANISED SYSTEM) کی شکل اختیار کر لی۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہو گئیں۔ ان کے قواعد و ضوابط وضع ہوئے۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرر ہوئیں۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور و طریق متعین ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی۔ اس "روحانی ترقی" کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے زینے تجویز ہوئے۔ جگہ جگہ مختلف اولیاء (SAINTS) نے اپنے حلقے اور مراکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب باطنیت کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ:-

> اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ جب آدم اور حوّا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہو گئی تھیں لیکن اس کے بعد یسوع مسیح آیا کہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ بس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے سے خدا اور اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آ سکے گا۔
>
> (ST. ORIGEN)

اس مقصد کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ علائق، ترکِ خیالات، ترکِ آرزو، غرضیکہ "روحانیت" کے علاوہ ہر شے کا ترک، ضروری قرار پا گیا اور حقیقی زندگی اسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت —— گوش بند و چشم بند و لب بہ بند —— کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا رموز و اسرارِ کائنات کے جلوے دیکھتا رہے۔

دہ عالمِ غیب، وہ دنیائے نور، وہ بلند سے بلند تر مقام، جہاں سادہ، غیر متبدل اور مطلق حقیقتیں، باطنیت کی مضمر خاموشیوں کی نورانی قباؤں میں لپٹی ہوتی ہیں۔ ان کے جلوے، دیدۂ ظاہر بیں سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑ دو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی۔ یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ سب کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ یاد رکھو! اگر تم میں ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماوراء ہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اس کے نور کی شعاع، کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے، کامل تاریکی میں۔ (DONYSIUS)

اس کے لئے ترکِ دنیا، مرشد کی اطاعت، خاموشی اور انکساری اولین شرائط ہیں۔ (ST. BEDICT)۔ ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا زاہد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ :-

اسے ایک نور کی چادر اوڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کرتی ہے تا آنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے لیکن درحقیقت وہ تکمیلِ نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے۔ اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں اور آخر الامر وہ خود حقیقتِ مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔ (ST-MACARIUS)

خدا اور انسانی روح کے باہمی تعلق کو (ORIGEN) "عروسی تعلق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی (SAINTS) بھی اسے "آسمانی دلہن" (HEAVENLY SPOUSE) کہہ کر پکارتے ہیں۔ چونکہ اس طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے، لوگوں کی نگاہوں میں بے حد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشرقی خانقاہیت کے مراکز تھے۔

ہم نے یہاں، ایران اور ہندوستان کی باطنیت کا ذکر قصداً نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم "تصوف کی تاریخ نہیں لکھ رہے ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ سحر (جادو) کی توہم پرستیوں نے پہلے یہود و نصاریٰ کو اور اس کے بعد مسلمانوں کو کس طرح متاثر کیا، اور کس طرح، یہ چیزیں مذہب کی روح (دین کا مغز) بن کر ان تمام اہلِ مذاہب کے اعصاب پر مسلط ہو گئیں۔

قرآن اور باطنیت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن آیا اور اس نے آ کر دو انشگاف الفاظ میں بتایا کہ کائنات میں کوئی سرِ مستور نہیں، کوئی راز خفی نہیں، کوئی باطنی علم نہیں خالقِ کائنات کے مقرر کردہ قوانین ہیں جن کی رو سے ہر معلول (EFFECT) ظہور میں آتا ہے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنا انسان کا فریضہ ہے۔ وحیٔ خداوندی نے اس حقیقت کا چھٹی صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ اعلان نہیں کیا۔ اس نے سلسلۂ رشد و ہدایت کی داستان کا آغاز جس نبی کے تذکرہ سے کیا ہے اس کے ضمن میں اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ ابتدائے انسانیت کا دور تھا۔ اُسے آپ دورِ پرستش میں شمار کر لیجئے۔ یا عہدِ سحر میں، بہرحال تھا وہ انسانی جہالت کا دور، جس میں وہ ہنوز قانون کے تصور سے نا آشنا تھا۔ وہاں سیلاب آیا تو حضرت نوحؑ نے یہ نہیں کہا کہ کسی دیوی دیوتا کی کف د ہانیاں ہیں۔ نہ ہی یہ کہا کہ میں اسے اپنی کسی مخفی قوت کے ذریعے روک دیتا ہوں۔ انہوں نے وحی کے زیرِ ہدایت کشتی بنائی۔ کشتی اس قانونِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے کہ مساوی الحجم پانی کے نیچے، پانی پر تیرتی رہتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس قانونِ خداوندی کی رو سے سیلاب کی تباہیوں سے بچاؤ کی صورت اختیار کی۔ وحی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور قرآنِ کریم میں آ کر تکمیل کو پہنچا جہاں اس نے قدم قدم پر بتایا کہ یہاں خدا کے غیر متبدل قوانین کی کارفرمائی ہے۔ کارگاہِ کائنات میں اعجوبہ پسندی اور شعبدہ بازی کو کوئی دخل نہیں۔ جہاں تک، انسان کی اپنی زندگی کا تعلق ہے اس کے لئے بھی اس کتابِ عظیم میں، واضح الفاظ میں راہنمائی کے لئے اصول و قوانین عطا کر دیتے ہیں ان میں بھی کوئی سرِ مستور نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی راز پسِ پردہ نہیں۔ قرآن کریم، عربی زبان کی ایک واضح کتاب ہے جس کا مفہوم علم و بصیرت اور فکر و تدبر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کتابِ عظیم کی ماننے والی قوم میں باطنیت کا تصور تک بھی بار نہیں پا سکتا تھا لیکن، آپ ہی نہیں، دنیا اس حیرت انگیز "حادثہ" پر انگشت بدنداں ہے کہ یہ قوم بھی باطنیت کا شکار ہوئی اور دیگر اہلِ مذاہب سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ شکار۔ ہمارے ہاں اس باطنیت کو تصوف کہہ کر پکارا گیا۔ [1]

---

[1] میں نے جادو۔ باطنیت۔ تصوف کے موضوعات پر اپنی مختلف تصانیف میں لکھا ہے۔ اس باب میں ان کا ملخص ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

مسلمان اور تصوف جہاں تک اس لفظ تصوف کا تعلق ہے اور تو اور خود صوفیاء بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بنیادی معانی کیا ہیں اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں۔ بعض اس لفظ کو اصحاب صفّہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں یعنی (روایات کے مطابق) وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں پناہ گزینوں کی طرح بے سروسامانی کی حالت میں، مسجد نبویؐ کے ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیا (SOPHIE) سے ماخوذ سمجھتے ہیں جس کے معنے عقل و دانش کے ہیں اور جو فلسفہ (PHILOSOPHY) کی ترکیب میں شامل ہے لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ لفظ اُون کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ اُون کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص، جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا، ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابو ہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آگیا۔ یہاں ۱۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلکِ خانقاہیت کا مرکز تھا۔ لیکن تصوف کے بنیادی تصور کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں تہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آ گئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی معتقدات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے اس لئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان کو قرآن سے بیگانہ نہ بنایا جائے اس کی قوت میں ضعف نہیں آسکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اور اس کا انتظام بڑا پختہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم بدل جائے[1] اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ تھا جسے (مثلاً جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) مفسر طبری نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رو سے یہ کہہ کر کر دیئے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ تو وہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں اس وقت سے آج تک متوارث چلا آ رہا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی روح ہے۔ وضعی روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں

---

[1] تفصیل اس اجمال کی میری کتاب —— شاہکارِ رسالتؐ —— میں ملے گی۔

چل سکتا تھا، کیونکہ روایات جس قدر بنانی ممکن تھیں، اس زمانہ میں بن گئیں لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آج تک جاری ہے[1] اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :-

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۳۵)

اس مقام پر شاید بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قرآن کریم جیسی واضح، بیّن کتاب منیر کی موجودگی میں مسلمانوں میں اس قسم کے عقائد راسخ کیسے ہو گئے۔ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت اور "مقدس" طریقہ اختیار کیا گیا۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ کہا گیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی یا وحی غیر متلو کا نام دیا گیا (واضح رہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مسلمان، ان اصطلاحات سے آشنا تک نہ تھے) اس عقیدہ نے دو کام کئے۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجہ حاصل ہو گیا جو قرآن کی تفسیر یا "اسلام کی تکمیل" کے لئے وضع کی جا رہی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ہاتھ آ گئی۔ اس کے علاوہ انہیں اس سے ایک اور بڑا فائدہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو خدشہ یہ تھا کہ اربابِ شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ہو گی، لیکن جب اربابِ شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختمِ نبوت کے معنی سلسلۂ وحی کا ختم ہو جانا ہے، نہ کہ سلسلۂ الہام کا۔ تو وہ اصولاً اہلِ باطن کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی روایات خود ہماری کتبِ احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مجھے دو برتن

---

[1] باطنی معانی کی رُو سے قرآنِ کریم کی متعدد تفاسیر لکھی گئیں۔ اس مسلک کے سرخیل "شیخ اکبر" محی الدین ابن عربی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے باطنی معانی پر مشتمل سَتّر جلدوں میں تفسیر لکھی تھی۔

عطا فرمائے تھے۔ ایک کو تو میں نے کھول کر عام کر دیا ہے (یہ شریعت کا علم ہوا) لیکن اگر دوسرے کو کھول دیتا تو میری شاہ رگ کاٹ دی جائے (یہ ہوا باطن کا علم جو سینہ بسینہ آگے چلتا ہے) باقی رہیں خانقاہوں کی ریاضتیں، سو ان کے لئے اس قسم کی وضعی روایات موجود ہیں کہ رسول اللہؐ نبوت سے پہلے، پانی اور ستو لیکر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کئی کئی روز تک مصروفِ مراقبہ رہتے تھے۔ انہیں ریاضتوں کا نتیجہ خدا کی طرف سے وحی کا ملنا تھا۔ یہ تھے وہ حربے، جن سے، قرآن کے علی الرغم، باطنیت جیسا قرآن دشمن عقیدہ عام ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف یہودیت اور نصرانیت کے تصوف نے پہلے ہی سے فضا کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا۔ جو یہودی یا نصرانی مسلمان ہوئے انہوں نے اس کو اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا اس لئے انہوں نے اسے لپک کر گلے سے لگا لیا۔ نتیجہ یہ کہ تیسری ہجری میں خود مسلمانوں میں اسی زور شور سے خانقاہیں کھلنی شروع ہو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ہاں ہوا تھا۔

اگر تصوف کے سلسلہ کی ابتداء ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنہوں نے فی الحقیقت اس کی ابتدا کی تھی تو ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ خیال گذرتا　کہ یہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ اس کیلئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان حضرات نے باطنی طور پر سلسلہ بسلسلہ رسول اللہؐ سے فیض حاصل کیا تھا اور چونکہ یہ تصور ایرانیوں کا پیدا کردہ تھا اس لئے اس میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا اور انہیں "شاہِ ولایت" کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اب صوفیوں کے مختلف "شجروں" کا منتہیٰ حضرت علیؓ ہی قرار پاتے ہیں۔ مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے۔ سری سقطیؒ مرید تھے خواجہ حسن بصریؒ کے اور خواجہ حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؓ کے، جنہوں نے یہ باطنی علم رسول اللہؐ سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں اتنی شہادت بھی نہیں ملتی جس سے یہ مترشح ہو کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؓ سے ہوئی تھی۔ لیکن یہ باتیں تو اہلِ ظواہر کی ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک زمان و مکاں کا بعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھلاتے، ایک لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنیدؒ کے ایک مرید نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کو خرقۂ تصوف حضرت انس بن مالکؓ سے ملا تھا جو رسول اللہؐ کے صحابی تھے، حالانکہ حضرت جنیدؒ تیسری صدی کے ہیں۔ ان کی وفات (۲۹۸ھ) میں ہوئی تھی۔

آپ نے دیکھا کہ وہی عہدِ قدیم کا سحر (MAGIC)، مسلمانوں سمیت، تمام دنیا کے اہل مذاہب پر کس طرح اکاس بیل کی طرح مسلط ہو گیا، اور مسلط چلا آ رہا ہے۔ اس کے صرف چولے بدلے گئے ہیں، حقیقت ہر مقام پر وہی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ∴ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

قرآن کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا۔ یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز ہے کہ اگرچہ دنیا کی دیگر توہم پرست قوموں کی طرح عربوں میں بھی سحر (جادو) کا عقیدہ عام تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسے سمجھتے تھے جھوٹ اور فریب ہی۔ چنانچہ اربابِ لغت نے کہا ہے کہ اس مادہ (س۔ ح۔ ر) کے بنیادی معنے موڑنے توڑنے کے ہوتے ہیں اور اس سے مطلب ہوتا ہے باطل کو حق کی صورت میں پیش کرنا۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اس کے اصلی معانی کسی چیز کو اصل حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف پھیر دینے کے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا دھوکہ ہے جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکہ کس طرح دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ لفظ عام دھوکے کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا۔[1] سَحَرَہٗ وَ سَحَّرَہٗ کے معنی ہیں اس کو دھوکہ دیدیا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے، اور جادو کے معانی میں ان مقامات پر آیا ہے جہاں دوسروں نے اسے ان معانی میں استعمال کیا ــــ داستانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ لفظ تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس مقام پر ہم بتائیں گے کہ وہاں نہ ساحرین کے معنے جادوگر کے ہیں اور نہ ہی وہ معرکہ جادو کی شعبدہ بازیاں دکھانے کا تھا۔ وہ دین حقہ اور باطل پر مبنی مذہب کے درمیان دلائل و براہین، پر مبنی ایک مناظرہ تھا۔ بہرحال اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

زیرِ نظر آیت (۲/۱۰۲) میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے: وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲/۱۰۲) "شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور یہ کفر تھا" لیکن ہمارے ہاں ایسی روایات وضع ہوئیں جن سے یہ ثابت کیا گیا کہ جادو ایک حقیقت ہے اور اپنا اثر رکھتا ہے اور اس کے لئے

رسول اللہ پر جادو

(یہ لکھتے ہوئے ہماری روح کانپتی ہے کہ) اس کا ہدف خود حضور نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو بتایا گیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن، کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ اس میں قرآن کریم کی آخری دو آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> صلح حدیبیہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر سے ملا اور اس سے کہا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی

---

[1] حوالوں کے لیے دیکھئے میری لغات القرآن مادہ (س۔ ح۔ ر)۔

نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں انہیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضور کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گذار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ آپ پر اس جادو کا یہ اثر ہوا کہ آپؐ گھلتے چلے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ ان کے پاس گئے ہیں، مگر آپ نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے، مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔

(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۵۵۴)

یہ افسانہ کھلے بندوں پکار رہا ہے کہ یہ یہودیوں کا وضع کردہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ:
إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (۱۷/۴۷) "ان ظالموں کی طرف دیکھو کہ یہ جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے"۔ اس کے بعد خدا کا ارشاد ہے:
انظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا (۱۷/۴۸) "اے رسولؐ! دیکھو کہ یہ بدبخت تمہارے خلاف کس کس قسم کی بہتان تراشیاں کرتے ہیں۔ یہ ایسے گمراہ ہیں کہ صحیح راستے کی طرف آنے کی استعداد ہی کھو بیٹھے ہیں"۔ آپ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ ان مخالفین کی بہتان تراشیاں تھیں جو کہتے تھے کہ حضورؐ پر جادو کیا گیا ہے اور ہماری تفاسیر یہ کہہ رہی ہیں کہ مخالفین کا الزام بالکل صحیح تھا۔ رسول اللہؐ پر واقعی (معاذ اللہ) جادو کیا گیا تھا اور اس کا اثر بھی آپ پر ہو گیا تھا۔ اثر بھی اس حد تک کہ آپ اندر ہی اندر گھلتے چلے جا رہے تھے اور حافظہ اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ وہ خیال فرماتے کہ ایک کام کر دیا گیا حالانکہ وہ نہیں کیا ہوتا تھا (مثلاً) حضورؐ نے نماز نہیں پڑھی ہوتی تھی لیکن اپنے دل میں خیال کر لیتے تھے کہ میں نماز پڑھ چکا ہوں حتیٰ کہ آپ کو ایسی چیزیں نظر آنے لگ گئی تھیں جو فی الواقعہ موجود نہیں ہوتی تھیں۔ آپ سوچئے کہ یہ کتنی بڑی سازش تھی جو اس قسم کی روایات وضع کرنے کی شکل میں کی گئی۔ افسوس ان دشمنوں پر نہیں، ان کا تو زندگی کا مشن ہی یہ تھا، افسوس تو اس پر ہے کہ ہم روایات کو مقدس غلافوں میں لپیٹے، ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور آج بھی انہیں دنیا کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر کی شکل میں پیش کرتے ہیں!

یہی نہیں کہ اس قسم کی وضعی روایات ہماری کتب احادیث و تفاسیر میں داخل ہو چکی ہیں۔ ہم جادو کو مانتے

ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ہم اسے جادو نہیں کہتے۔ ہم نے اس کے بڑے مقدس نام رکھ لئے ہیں۔ یہ درود و وظائف، یہ گنڈے تعویذ، یہ مراقبے اور ریاضتیں اسی حقیقت کے مظاہر نہیں تو اور کیا ہیں!

تعویذ اور وِرد وظیفے

اور پھر ان کی تقدیس، گوسالۂ سامری کی طرح اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں حلول کر چکی ہے کہ ہم اسے سننا تک بھی گوارا نہیں کرتے کہ انہیں سحر (جادو) کہدیا جائے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ ایسا کچھ تو کفار اور مشرکین بھی کرتے رہتے ہیں، وہ بھی گنڈے تعویذ دیتے ہیں، دم کرتے ہیں۔ شعبدے دکھاتے ہیں، پھر ان میں اور ان میں فرق کیا ہے، تو اس کے جواب میں یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا اور دوسروں کو فریب دے دیا جاتا ہے کہ وہ "کالا علم" ہے اور یہ "نوری علم"۔ حالانکہ اس میں کالے اور نوری کا سوال ہی نہیں۔ اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ الفاظ یا اعداد میں خاص قوت ہوتی ہے۔ انہیں خاص طریقے سے دہرایا یا لکھا جائے تو وہ اپنا اثر پیدا کر دیتے ہیں خواہ الفاظ کچھ بھی ہوں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایک فن ہے جسے ہر انسان بلا لحاظ عقیدہ و مسلک حاصل کر سکتا ہے۔ مختلف اقوام میں اس کے حصول کے مختلف طریقے ہیں چونکہ جن لوگوں سے اس قسم کی محیر العقول باتیں سرزد ہوتی تھیں انہیں بڑی بڑی فوق الفطرت قوتوں کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ان قوتوں کی تقدیس و عظمت دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔ لہٰذا ازمنۂ قدیم سے اس قسم کی قوتیں اور مذہبی تقدیس لازم ملزوم چلی آتی ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی، بدھوں کے لاما، یہود و نصاریٰ کے رہبان اور دوسرے مذاہب کے فقیر منش لوگ، جو ان قوتوں کو حاصل کرتے ہیں ہمیشہ مذہبی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ ان باتوں کو مذہب کا انتہائی مقام قرار دیدیا گیا۔ اس لئے اس قسم کے لوگ انتہائی عزت و تکریم کے مستحق قرار پا گئے اور شرف انسانیت کے تمام شعبے اس سے ادنیٰ درجے پر رہ گئے۔ اسی وجہ سے یہ چیزیں زیادہ عام ہو گئیں اور عظمت و عقیدت کے حصول کا آسان ذریعہ قرار پا گئیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان تمام لوگوں نے اسے دیدہ دانستہ، دنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر، بطور مکر و فریب اختیار کیا تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فی الواقعہ مذہب کا انتہائی مقام سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر انہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا۔ لیکن اس سے بھی اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ ایک فن ہے اور ہر شخص بطور فن اس کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان، تا بہ کمر پانی میں کھڑا ہو کر، سورۃ یٰسں کی بعض آیات کا ورد کر کے کچھ خاص قسم کی قوت حاصل کر سکتا ہے تو ایک ہندو جوگی، اپنے طریق پر، وید کے کسی منتر سے ویسی ہی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ آپ ان کا نام مختلف

رکھ لیجئے۔ اسے کالا علم اور اُسے نوری علم کہہ دیجئے لیکن جہاں تک اس فن کا تعلق ہے حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ یہ سب قوتِ ارادی کی تنظیم وانضباط کے ذرائع ہیں۔ بقول (UNDERHILL) "اس باب میں ذرائع کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز تو قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ہے" (MYSTICISM P-158)۔[1] وظیفہ، گنڈہ تعویذ یا قرآنی آیات کے عملیات کو دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سب قوتِ ارادی کو مجتمع کرنے کے لئے مختلف ذرائع ہیں اور ان کے نتائج (مثلاً امراض کا علاج وغیرہ) اسی قوت کے کرشمے۔ مشرق میں یہ طریقے بڑے مخفی رکھے جاتے تھے (اور ابھی تک رکھے جاتے ہیں) لیکن مغرب نے اسے ایک سائنس کی حیثیت سے عام کر دیا ہے۔ امریکہ میں ——— (MENI—CULTURE ; NEW THOUGHT اور NEW CONSCIOUSNESS) کے سکول اور یورپ میں مختلف سوسائٹیاں اپنے اپنے طریقوں پر یہ سب کچھ سکھاتی پڑھاتی ہیں۔ لہٰذا اسے قرآنی آیات کے "عمل" سے حاصل کیجئے یا یوگ کے ذریعے۔ یورپ کی سوسائٹیوں سے سیکھئے یا امریکہ کی تنظیموں سے۔ نتیجہ ہر صورت میں وہی برآمد ہوگا۔ لیکن جب آپ اسے دین، اور دین کا بھی[2] نچوڑ قرار دیں گے، اور وجہ افضلیت خارق عادات باتیں تسلیم کریں گے۔ تو مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم (مثلاً ہندوؤں کے جوگی، سنیاسی) ایسے ایسے محیر العقول شعبدے دکھائیں گے جن کا جواب نہیں بن پڑے گا۔ آئے دن آپ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں جوگی نے اس قسم کی محیر العقول بات دکھائی اور فلاں مقام پر اس قسم کی۔ لہٰذا اگر کسی مذہب کی حقانیت کی دلیل اس کے پیروؤں کے خارق عادات شعبدے ہیں تو دنیا میں اسلام کی برتری کا ثبوت مشکل ہو جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ آپ کے ہاں کے شعبدے کرامات ہیں اور دوسروں کے شعبدے محض سحر کاری کی "شیطنت"۔ تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ دوسرے لوگ یہی کچھ آپ کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم، اس اسلام کو، جس میں زندگی اور حرارت پائی جائے، صحیح اسلام قرار نہیں دیتے بلکہ صحیح اسلام اسے قرار دیتے ہیں جس میں اس قسم کی "روحانیت" کے کرشمے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے پیروں اور فقیروں یعنی "روحانی

---

[1] (WHITE) اپنی کتاب (THE OCCULT SCIENCE) میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف ریاضتیں، مراقبے اور وظائف کس طرح ایک ہی قسم کے نفسیاتی اثرات پیدا کرتے ہیں۔

[2] شریعت اور طریقت کی باہمی آویزش کے مباحث پر نگاہ ڈالئے، ہر مقام پر طریقت کا پلڑا جھکا ہوا دکھائی دے گا۔ اہل طریقت و معرفت کا بالعموم دعویٰ یہ ہے کہ شریعت محض ظاہری اعمال کا نام ہے "روحانیت" جو مذہب کی غایت ہے، انہی کے ہاں ہے اور اس کا ثبوت اسی قسم کی خارق عادات باتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ جنہیں کرامات کہکر پکارا جاتا ہے۔

بزرگوں" کی عام طور پر تعریفیں کی جاتی ہیں اور بہت سے غیر مسلم ان کے معتقدین کے حلقہ میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے ان جلیل القدر مشاہیر کو کبھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھیں گے جنہوں نے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے نافذ کیا تھا۔ اس لئے کہ "روحانی بزرگوں" کو اسلام کا سچا پیرو قرار دیکر وہ غیر اسلامی مذہب کو اسلام سے برتر نہیں تو کم از کم اس کے برابر ثابت کر سکتے ہیں اور اس طرح اس دعوٰی کا بلند آہنگی سے اعلان کر سکتے ہیں کہ "تمام مذاہب اپنی بنیادی صداقتوں کی رُو سے یکساں ہیں"۔ لیکن دین کو ایک نظامِ زندگی قرار دیکر ایسا دعوٰی اور اس کا ثبوت ممکن نہیں۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں زیادہ طول طویل بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے بھی اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ میری فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اتنی مرتبہ دہرا لینے سے فلاں نتیجہ برآمد ہو جائے گا؟ جب قرآنِ کریم نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا تو قرآن کا یہ مصرف انسانی دماغ کے اختراع کے سوا اور کیا ہوگا؟ باقی رہا یہ کہ "صاحب! جب ایسا کرنے سے یہ نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو قرآنی آیات و الفاظ میں ان قوتوں کی موجودگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی"؟ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ فرض کر لینا حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ یہ نتائج محض قرآنی آیات و الفاظ کے اوراد و وظائف سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ غیر قرآنی (اور بعض اوقات بالکل مہمل) الفاظ و کلمات سے، ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ محیر العقول نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے نتائج، خواہ قرآنی الفاظ سے مرتب ہوں یا غیر قرآنی سے۔ بہر حال قوتِ ارادی کی کرشمہ سازیوں کا ہی نتیجہ ہیں جو اکتسابی طور پر ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ اور قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔

اس مقام پر ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمارے ہاں اہل سنت والجماعت کے تین فرقے مشہور ہیں۔ اہل حدیث، اور اس کے مقابلے میں اہل فقہ۔ پھر اہل فقہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں دیوبندی اور بریلوی۔ اہل حدیث، کہتے ہیں کہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو بدعت قرار دیتے ہیں اور سخت گمرہی۔ بریلوی حضرات (اہل حدیث کی رو سے) بدعتی کہلاتے ہیں کیونکہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو مانتے ہیں۔ دیوبندی حضرات کا دعوٰی ہے کہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں پر عقیدہ نہیں رکھتے۔ لیکن ورد و وظائف، گنڈے، تعویذ ان کے ہاں بھی عام ہیں۔ دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ "خالد" میں ان کے کسی بزرگ کی کتاب۔ عطاء المنان۔ کا ترجمہ

مسلسل شائع ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے جلیل القدر بزرگانِ دین کے "عملیات" درج تھے۔ مثلاً ایک عمل یہ تھا :-

"الٰہی بحرمۃ یملیخا ۔ کملیخا ۔ کشفوطا ۔ کشا فطیونس ۔ تبونس ۔ اذر فطیرنی ۔ یوانس بوش وکلبہم قطمیر وعلی اللہ قصد السبیل ومنہا جائر ولو شاء لہدٰکم اجمعین ۔ ایک تعویذ یہ تھا: ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی (بچوں کے گلے میں ڈال دیا جائے) ایک اور عمل تھا : بسم اللہ علیقہ لیقہ ثلیقہ ۔ تلیقہ ۔ بحق لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ وعلی ولی اللہ (فائدہ) بغرض اجرائے حاضرات ایک چلتا ہوا عمل ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ جب اس قسم کے مہمل الفاظ و کلمات سے بھی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں تو پھر کالے علم اور نوری علم میں فرق کیا ہے! جہاں تک "نوری علم" کا تعلق ہے، ان حضرات (دیو بندی) کے ہاں سے "عملیاتِ قرآنی" پر اکثر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کا ورد کرنے سے یہ اثر ہوتا ہے اور فلاں تعویذ لکھنے سے یہ اثر۔

قرآنِ کریم نے عمل پر بڑا زور دیا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ـــــ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی لیکن اب "عامل" سے مراد قرآنِ کریم کے مطابق اعمالِ صالحہ کرنے والا نہیں لیا جاتا۔ اس سے مطلب ہوتا ہے تعویذ، گنڈے، ورد وظیفے کرنے والا۔ "اعمالِ قرآنی" کے موضوع پر کتابوں میں قرآنی آیات کے وظیفے اور تعویذ لکھے ہوتے ہیں اور ان کتابوں کے مصنف بڑے بڑے عالم اور بزرگ ہوتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے "عمل" بالعموم تکیوں، دائروں میں کئے جاتے ہیں جہاں "عالم لاہوت کی سیر کرنے کے لئے" نشے میں مدہوش ہوا جاتا ہے۔ اس لئے نشہ کے لئے بھی "عمل" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً جب پوچھا جائے کہ وہ کونسا "عمل کرتا ہے" تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ کون کون سے نشہ کا عادی ہے۔ یہ وہ مقام، جہاں ہمیں "باطنیت" نے پہنچا دیا ہے۔ انہیں جہلا کی باتیں کہہ کر مسترد کر دیا جائے گا۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے) "اعمالِ قرآنی" پر مشتمل کتابیں تو بڑے بڑے جید علماء کی تصنیف کردہ ہیں اور تعویذ گنڈے ہمارے ہاں کے چوٹی کے عالموں کے ہاں سے ملتے ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قرآنی آیات پر مبنی ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اقبال نے کہا تھا کہ :-

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

تو اس سے انہوں نے اس بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت اس کا احساس ہی نہیں کر سکتی کہ قرآن کا مقام کیا ہے۔

قرآن کی عظمت

جس شخص کے قلبِ سلیم کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ ایمان سے بہرہ یاب اور اس کی نگاہوں کو نورِ بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو، وہ جب خدائے حی و قیوم کی اس زندہ و پایندہ کتاب کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے جبروت و جلال کے سامنے تھرتھرا اٹھتا ہے۔ اس عظیم المرتبت ضابطۂ خداوندی کی شوکت و سطوت کے پیشِ نظر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس سراجِ منیر کی درخشندگی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب تدبر و تفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو حقائق و معارف کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے جلوہ بار ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے "مصنف" سے لگایا جا سکتا ہے تو اس کتابِ حکیم کی بلندیٔ منزلت کا کیا پوچھنا جس کا "مصنف" خود خدائے علیم و بصیر ہو۔ اگر اس کی تقدیس کا جائزہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا محمل کون ہے تو اس کتابِ مقدس و مبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذاتِ اقدس و اعظم کا قلبِ منور تھا جو معارجِ انسانیت کی مظہرِ اتم تھی۔ اگر اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس کے مشمولات سے کیا جا سکتا ہے تو اس زندہ و پایندہ کتاب کے علوِ مرتبت کا کیا ٹھکانہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظامِ کائنات سرگرمِ عمل ہو اور جس کے قوانین، اقوام و مللِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے کر رہے ہوں۔ اور پھر اگر اس نسخۂ تکوینِ حیات کی ارجمندی کی قدر و قیمت اس کی تعلیم کے نتائج سے پہچاننی ہو تو اس کے متعلق پوچھئے سرزمینِ عرب کے ان ذرات سے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم، دیکھتے ہی دیکھتے، قیصر و کسریٰ کی دولت و ثروت کی وارث بن گئی اور مکارمِ اخلاق کے اس بلند مقام پر فائز ہو گئی جو آج تک چشمِ عالم کو دیدۂ حیراں بنا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک برقِ خاطف تھی جو فاران کی بدلیوں سے چمکی اور ہر طاغوتی قوت کو خاکستر بنا گئی۔ ایک شمشیرِ برہنہ تھی جو فضائے عالم میں کوندی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ کر گئی جس نے انسانیت کو غیر خداوندی بندشوں میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ تھی وہ کتابِ حکیم جو مسلمانوں کو اس لئے دی گئی تھی کہ وہ اسے قیامت تک کے لئے اپنا نصابِ زندگی بنائیں اور اس کے قوانین کے تابع چلیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ کوئی مریض کسی طبیب سے دردِ سر کا نسخہ لے تو اس کا فائدہ اسی صورت میں ہوگا کہ اس نسخہ کے مطابق دوائیاں خرید کر انہیں حسبِ ہدایت استعمال کرے۔ لیکن اگر وہ اس کاغذ کو جس پر وہ نسخہ لکھا ہے، سبز کپڑے میں، سی کر سر پر باندھ

لے تو اس کی اس حرکت پر عقل ہنسے گی اور علم روئے گا۔ پھر سوچئے کہ اگر کوئی شخص تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے الفاظ کو جس میں (مثلاً) لکھا ہے کہ چوری کی سزا تین سال کی قید ہے، دس ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونکے کہ اس سے چور کا سراغ مل جائے گا تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ قرآن کریم قوموں کے امراضِ کہن کا نسخہ کیمیا ہے، ایک ضابطۂ قوانین ہے، جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی شرف و مجد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نسخۂ کیمیا کو کاغذ پر زعفران سے لکھ کر گھول گھول کر پیا جائے یا اس ضابطۂ قوانین کی مختلف دفعات کے چلّے کاٹے جائیں تو اس سے بڑھ کر اس کتابِ حکیم کا غلط مصرف اور کیا ہوگا؟۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی کرامات پسندی سے انسانی فضیلت کا معیار کس طرح بدل جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے انسان کی فضیلت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ ہے یعنی یہ کہ اس کی زندگی کس قدر، قوانین خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص نہایت بلند سیرت و بلند کردار ہو، وہ گمنامی کی زندگی جیئے گا۔ کوئی اس کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس، ایک شخص کسی خانقاہ میں بیٹھا بھنگ کی لہروں اور چنڈو کی موجوں میں مستغرق ہو۔ لیکن اگر وہ سٹہ کا نمبر صحیح بتا دے تو جیتے جی مرجع انام رہے گا اور مرنے کے بعد اس کی قبر کی پرستش ہوگی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ معیارِ فضیلت، سیرت و کردار کی بلندی نہیں بلکہ شعبدہ بازی قرار پا چکا ہے۔ اب اگر کسی ایسے شخص سے اس قسم کے شعبدات ظہور میں آتے ہیں جو بیباکانہ لغو زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی لغویت پر طرح طرح کے پردے ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس کی "بزرگی" کی شان میں فرق نہ آنے پائے۔ اس قسم کے لوگوں کی عقیدت و عظمت، کچھ اس طرح غیر شعوری طور پر قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم و فضل، ان کی شان میں گستاخی کا حکم زبان پر لاتے خوف کھاتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کو محکمہ قضا و قدر میں ایسا دخل حاصل ہے کہ نہ معلوم ان کی سوء ادبی سے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس غلط معیارِ فضیلت سے قوانینِ الٰہیہ اور اقدارِ خداوندی کی جو قدر و قیمت دلوں میں رہ سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

ایسے حضرات بھی ہیں جو اگرچہ شریعت کے پابند ہیں لیکن معیارِ فضیلت اسی قسم کی چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی "پرستش" میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ اگرچہ زبان سے سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کبھی لوگوں کو اس قسم کی باتوں کی جرأت نہیں دلاتے لیکن وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے

ہیں کہ لوگ کس طرح انہیں اور ان کے بزرگوں کو قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود سمجھتے ہیں لیکن باں ہمہ وہ ایک لفظ اس کے خلاف نہیں کہتے۔ اور اگر وہ بفرضِ محال، زبان سے اس کی مخالفت بھی کریں تو بھی اس کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عمل سے لوگوں کو خود انسان پرستی کی طرف دھکیل کر لاتے ہیں۔ ان کے ماننے والوں کے دلوں میں یقیناً خدا کی ایسی عظمت و عقیدت نہیں ہوتی جتنی خود ان حضرات کی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی ہر مشکل میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گو کہتے یہی ہیں کہ ہم ان کے "واسطہ" سے اپنی درخواست خدا تک پہنچاتے ہیں (جو خود ایک غیر قرآنی عقیدہ ہے) لیکن فی الحقیقت اپنی مرادوں کا منبع انہیں کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا خدا کے ساتھ وہ تعلق کبھی نہیں رہ سکتا جو قرآن کریم قائم کرنا چاہتا ہے۔ سنئے کہ اس باب میں غیر مسلموں کی شہادت کیا ہے۔

> اگر گہرائیوں میں اتر کر دیکھئے تو عملیات کا ہر طالب اس مقام کی طرف جد و جہد کرتا دکھائی دے گا جہاں وہ صرف بٹن دبا دے اور باقی سب کچھ آفاقی قوتیں خود بخود کر دیں۔ وہ جب بہ ہزار مشقت اس قسم کی قوت حاصل کر لیتا ہے جس سے وہ بہت سوں پر غالب آجائے تو اس سے اُس "ایک" کو بھول جانے کی طرف میلان ہو ہی جاتا ہے (LEVI) کے الفاظ میں فطرت کے امور کا بہت گہرا مطالعہ، اس قسم کے غیر محتاط متجسس کو خدا سے بیگانہ بنا دیتا ہے کیونکہ اس کی دماغی تکان اس کے ارتعاش قلب کو مفلوج کر دیتی ہے۔
>
> (MYSTICSM: BY UNDERHILL)

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس خانقاہ نشینی کے طلسم نے جس طرح مسلمانوں جیسی یکسر برق تپاں قوم کو جمود و تعطل کے بیکار مجسمے بنا کر رکھ دیا ہے وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ عمل بالقرآن نے وہ قوم پیدا کی تھی جس کے ہاتھ میں اقوامِ عالم کی "تقدیریں" تھیں۔ جن کی نگاہوں سے موت کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جن کی ہیبت سے مصائب و مشکلات کی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا۔ وہ جس طرف باگیں اٹھاتے، فتح و ظفر ان کی رکاب تھامتی۔ وہ جدھر رخ کر لیتے، کامرانی و کامیابی ان کا بڑھ کر استقبال کرتی۔ وہ قوم جو "اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی دوسری طاقت کو حائل نہ ہونے دیتی"۔ وہ جو اپنے تمام عزائم و مراحل میں، اپنی قوتِ بازو اور قوانینِ خداوندی کی تائید کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ کرتی۔ یہ تھی وہ قوم جسے قرآن کریم نے دنیا میں قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ و ترویج کے لئے پیدا کیا تھا۔ لیکن (UNDERHILL کے الفاظ میں) اس منزل کی تلاش نے "جہاں انہیں صرف

بٹن دبانا پڑے اور باقی سب کچھ غیر معلوم آفاقی قوتیں ان کے لئے خود بخود کر دیں"۔ اس قوم کو رفتہ رفتہ ایسی حالت میں پہنچا دیا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی دوسروں کے آسرے ڈھونڈنے لگ گئی۔ اور قدم قدم پر اس طرح غیروں کی محتاج ہو گئی کہ ہر شخص انہیں ذلیل و خوار سمجھنے لگا۔ یہ سب اس لئے کہ وہ کشمکش حیات میں مردانہ وار حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے، کامیابی و کامرانی کے لئے کشف و کرامات کے "سم سم" کے پیچھے پڑ گئے اور اس طرح وہ تمام زندہ کرامتیں جو خود ان کے دست و بازو سے ظہور میں آنی تھیں افسانے بن کر رہ گئیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا :: ہے بندۂ آزاد خود اِک زندہ کرامات (ضرب کلیم ص ۷۷)

اس کا نتیجہ یہ کہ آج دنیا میں مسلمان سے زیادہ نکمی اور اپاہج قوم شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہ ہے مآل اس "اعجوبہ پسندی" کا جسے ان کے فریبِ نگاہ نے بڑے بڑے مقدس غلافوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اسلام جیسا زندہ اور زندگی بخش نظام حیات دھرم بن کر رہ گیا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ عظیم المرتبت مجاہدینِ اسلام، جن کے ایمان کی حرارت نے فضائے کائنات میں تموّج پیدا کر دیا مسلمانوں کے ذہن سے عام طور پر اتر چکے ہیں، لیکن وہ بزرگ جن کی طرف اس قسم کی حسی کرامات منسوب ہیں، ہر وقت ان کے قلب و نگاہ کے سامنے رہتے ہیں۔ یقین مانیئے! یہ سب کشمکشِ حیات میں اعترافِ شکست ہے، کشاکشِ زندگی سے سپر اندازی ہے، دنیائے عمل و حقیقت سے فرار کی راہ ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی کرامت وہ ہے جو جماعتِ مؤمنین کی قوتِ بازو سے ظہور پذیر ہو اور جس کا عملی نتیجہ اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ اس کرامت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کرامت نہیں۔ وہ کرامت جس سے جہانِ انسانیت میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے۔ اور اس طرح یہ زمین "اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے"۔

بعض حضرات، حقائق سے آنکھیں چرانے کی خاطر، تصوّف کی دو قسمیں بیان کر دیتے ہیں۔ یعنی اسلامی تصوف اور غیر اسلامی (عجمی) تصوف۔ لیکن جب تصوف (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) اپنی اصل کے اعتبار سے "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" تو اسے اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اسلام اسلام ہے اور بس! یہ ایک نظامِ مملکت ہے، نظام معاشرہ ہے، ضابطۂ زندگی ہے، جسے اس قسم کی باطنیت اور کشف و کرامات کی بھول بھلیوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن کریم سے ان امور کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم۔ بلکہ احادیث تک میں بھی تصوف کا لفظ تک نہیں ملتا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے تصوف کو، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا کہکر پکارا ہے۔ مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ ان گے اس اجمال کی تفصیل بھی خود انہی کے الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ انہوں نے لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار "نیو ایرا" (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں، تصوف کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اور تصوّف

"آج کل کا مسلمان یونانی و ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیے مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گرد و پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سرخ روشنی پر جما دی جائے، جسے "اشراق" کا نام دیدیا گیا ہے۔ یہ دراصل دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ "فنائیت" یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے رو بہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تاریخ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خود ساختہ تصوف اور فنائیت میں پناہ لی ہے۔ جب روح حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیانِ انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لبھا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں، جس کے فریب میں مبتلا ہو کر صحتمند اور قوی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و وساوس کے ان ماتوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بحیثیت ایک معاشرہ کے ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خطِ نسخ کھینچ دیا جائے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظامِ شریعت کے تابع رکھیں جو اصلاً مبنی بر وحی ہے۔ لیکن قدیم صوفیاء کا عقیدہ یہ تھا کہ شریعت کی حیثیت تو محض ایک مظہر کی تھی۔ اور وہ خفیہ خفیہ اس کی تلقین بھی کرتے رہے کہ یہ حقیقت کا ایک قشر اور ایک پردہ ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔ اکثر حالتوں میں شریعت کی پابندی قائم رکھی گئی تھی کہ اجتماعی مخالفت سے بچے رہیں، اگرچہ اس کی حیثیت ایک پردے ہی کی رہی۔ اسلامی فکر و ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی فرد اس اعتراف میں متامل نہ ہوگا کہ شریعت سے اعراض کا رجحان اسی خود ساختہ تصوف کا براہ راست

نتیجہ ہے جو عجمی دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم و مرتبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یوں اسلامی جمہوریت رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام سے ہٹتی گئی اور اُسے ایک نوع کی روحانی امرائیت کا غلام بنا دیا گیا۔ یہ امرائیت ایسے علم و قوت کی مدعی تھی جس کے دروازے عام مسلمانوں پر بند تھے۔ مسلمانانِ اندلس ارسطاطالیسی روحیت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیا کے ضعف انگیز اثرات فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیا کی مسلم قوموں کے مقابلے میں روحِ اسلام سے قریب تر تھے۔ آخر الذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخیلات میں ڈھلنے دیا یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصلی حیثیت سے بالکل محروم ہو گیا۔ تسخیرِ ایران کا نتیجہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے کیجیے۔ جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق مل جائے گی۔ انحطاط کے سحر کی کیفیت یہی ہے کہ جن ہاتھوں سے ہم زہر کا پیالہ پیتے ہیں، انہی کو چومتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روزِ روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظمؐ نے عاقل و دانش مند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحاب نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا[1] حضور کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآنِ مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوف کے لئے وجہِ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے۔ جنہوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔

پھر آئیے! دنیا کے حقائق کو خوشی خوشی قبول کیجیے۔ خدا اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال و عظمت کی خاطر ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و کوشش میں مصروف ہو جائیے۔ اس شخص کی بات پر کان نہ دھریئے جو کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی مخفی اصول بھی ہے جسے ناشناساؤں پر منکشف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی پر جھوٹے مدعیوں کے اقتدار اور آپ کی غلامی کا انحصار ہے۔

دیکھیے کس طرح رومی مسیحیت کی روح نے اپنے گرد و پیش مستحکم حصار تعمیر کر لئے تاکہ اس کی تاریک مملکتیں تاریخ نگاروں

---

[1] یعنی قرآنِ کریم جو تھا تو کلامِ خداوندی لیکن دنیا کو لسانِ نبویؐ کی وساطت سے ملا تھا۔

کے ممکن حملوں سے محفوظ رہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے تاریخ اسلام سے آپ کی ناواقفیت کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی کبھی نہ کبھی اس کی تعلیمات کے دھندلکے کو آپ کی ذہنی فضا سے زائل کر دے گی۔ لہٰذا وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسّی ادراک حجاب اکبر ہے (العلم حجاب الاکبر)۔ حسی ادراک کے یہ دشمن آپ کے احساس حقائق کو کند کرتے ہیں اور علم تاریخ کی بنیاد کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے اس توحید کو اپنا لیا جائے جو مصلحت کوشیوں اور مفاہمت اندوزیوں کو جانتی نہ تھی اور جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ۔"

یہ ہے وہ سحر، جس سے یہ امت ہزار برس سے مسحور چلی آرہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہی ہے۔ اس سلسلے میں انسب یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کی اس آیت کو پیش کر دیں جس میں اس نے "سحر بابل" کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والوں کے متعلق کہا تھا:۔

۲/۱۰۳ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔

اگر یہ لوگ اس قسم کی روش اختیار کرنے کی بجائے منزل من اللہ صداقتوں پر ایمان رکھتے اور ایسے تباہ کن اسلوب سے بچتے تو انہیں خدا کے ہاں سے وہ کچھ ملتا جو اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتا۔ اے کاش! یہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے۔"

۲/۱۰۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

بات چلی تھی یہودیوں کی ذہنیت سے۔ اور درمیان میں وہ اہم موضوع آگیا جسے آپ نے ابھی ابھی ختم کیا ہے اس کے بعد ہم اسی داستان کا سررشتہ پھر تھامتے ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ صدیوں کی محکومی، غلامی، خانماں خرابی

یہودیوں کی پست ذہنیت

کی وجہ سے یہ لوگ اس قدر دنی الطبع ہو چکے تھے کہ عام آداب معاشرت تک سے بھی عاری ہو گئے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلوں

میں آکر بیٹھتے تو وہاں بھی اس ذہنیت کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ بات کرتے تو ذومعنی، اور پھر الفاظ ادا کرتے تو اس طرح زبان کو توڑ مروڑ کر، کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۔ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّاۢ بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۔ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴/۴۶) "یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ وحی کے الفاظ تک کو ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر ان میں ردو بدل کر دیتے ہیں اور عام گفتگو میں بھی عجیب انداز سے ذومعنے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ "سمعنا و اطعنا" کہیں (یعنی ہم نے آپ کی بات سن لی ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے) یہ "سمعنا و عصینا" کہیں گے یعنی (ہم نے اسے سنا ہے اور ہم اس کی نافرمانی کریں گے)۔ یا کہیں گے "اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" (تو ہماری بات سن! اگرچہ تیری بات نہیں سنی جائے گی یا طنزاً کہیں گے کہ تو بہرہ ہو جائے) غرضیکہ یہ عجیب انداز سے زبان کو توڑ مروڑ کر باتیں کریں گے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ دینِ خداوندی کو ہدفِ طعن وتشنیع بنا دیا جائے۔ اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اگر ان کی نیت نیک ہوتی اور یہ سیدھی طرح کہتے کہ "سمعنا و اطعنا"، "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے" یا "اسمع و انظرنا" ہماری بات سنیئے اور ہم پر نگہ التفات رکھیے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات صاف اور سیدھی ہو جاتی۔ لیکن انکار و سرکشی، اور حسد و تعصب کی بنا پر ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہ عام معاشرتی حسنِ آداب سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو ایمان لائیں گے —— جن لوگوں کی ذہنیت اس حد تک پست ہو چکی ہو وہ ایسی بلند تعلیم کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں"۔

اس سے واضح ہے کہ یہودی، حضور کی مجلس میں آکر بیٹھتے تو یا تو ذومعنی الفاظ استعمال کرتے اور یا تلفظ ہی توڑ مروڑ کر ادا کرتے جس سے معنے کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ اس کی مثال میں لفظ رَاعِنَا پیش کیا گیا ہے۔ یہ لفظ اگر مادہ (ر-ع-ن) سے ہو تو اس کے معنے حماقت اور رعونت کے ہوتے ہیں۔ اور اگر مادہ (ر-ع-ی) سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی رعایت کرنا۔ ان معانی کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ وہ رسول اللہ سے کہتے کہ "تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہمارا خیال رکھو تو ہم تمہارا خیال رکھیں گے"۔ یعنی وہ سودے بازی کرنا چاہتے تھے اور قرآنِ کریم واضح طور پر بتا چکا ہے کہ ایک داعیٔ انقلاب (رسول) کسی سے سودے بازی نہیں کرتا۔ حق باطل کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ تفصیل اس اجمال کی، جلد اول میں، آیت (۲/۴۲)

کے تحت صفحہ ۱۷۸ پر گزر چکی ہے۔ اور اگر وہ اس لفظ کو ذرا زبان دبا کر بولتے تو حضورؐ کو (معاذاللہ) احمق اور نحوست پرست قرار دیتے۔

قرآن کریم نے یہود کی اس قسم کی نازیبا حرکات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، جماعتِ مؤمنین سے دو باتیں کہیں۔ پہلی تو یہ کہ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (۳۳/۷۰) "ہمیشہ، بات واضح، صاف، دوٹوک اور نپی تلی کہو جس میں کوئی ابہام نہ ہو" (نیز ۴/۹)۔ خاص طور پر شہادت میں تاکیداً کہا کہ کبھی توڑ مروڑ کر کوئی لفظ نہ کہو (۴/۱۳۵)۔ اور دوسری بات یہ کہی کہ حضورؐ کو مخاطب کرتے وقت ایسا لفظ بھی استعمال نہ کرو جس کے معنے یہ ہو جائیں کہ آپ ہماری رعایت کیجئے تو ہم آپ کی رعایت کریں گے۔ مومنین کا یہ شعار نہیں ہوتا۔ وہ رسول کی زبانِ مبارک سے احکامِ خداوندی سنتے ہیں تو بے چون وچرا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اور جب رسول کسی اختلافی معاملے میں فیصلہ دیتا ہے تو فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی یا گرانی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ بطیبِ خاطر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا کہ تم حضورؐ کو مخاطب کرو تو یوں کہو کہ اُنْظُرْنَا "آپ ہم پر نگاہِ التفات رکھئے۔ آپ ہماری طرف دیکھتے رہیے کہ ہمارا قدم جادۂ حق وصداقت سے ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ آپ ہماری نگرانی کیجئے"۔ اسی حقیقت کو ذرا آگے چل کر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرو وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳) "اور خدا کا رسولؐ تمہارے اعمال کی نگرانی کرے"۔ تم حضورؐ سے یوں خطاب کیا کرو اور اس کے بعد حضورؐ کے فرمان کو دل کے کانوں سے سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم کفر کی روش اختیار کرلو گے اور الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد کہا کہ یہ سب ان کی کٹ حجتیاں ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت چاہتے ہی نہیں تھے کہ تمہیں نبوت ملتی، خدا کی کتاب تم پر نازل کی جاتی:۔

۲/۱۰۵ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

اہل کتاب کیوں نہیں چاہتے تھے کہ حضورؐ کو نبوت ملے۔ اس کی وجوہات پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ

یہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ تمہیں نبوّت ملتی

چونکہ ہر مذہب کے پیرو اس فریبِ نفس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کا مذہب سچا ہے اور تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ۔ اس لئے وہ کسی دوسرے کی آواز تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہود و نصاریٰ پر تو یہ بات بھی گراں گزرتی تھی کہ حضورؐ انہیں دین کی دعوت کیوں دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ، عرب میں وہ لوگ بستے تھے جو کسی خاص مذہب کے پیرو نہ تھے (یعنی قریش اور دیگر عربی قبائل) قرآن کریم نے انہیں مشرکین کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے اور اس میں جہاں بھی اس زمانے کے ان "مشرکین" کا ذکر آئے گا اس سے مراد یہی لوگ ہوں گے۔

قریش اس دعوت کی کیوں مخالفت کرتے تھے اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ قریش کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ بڑی سرمایہ دار قوم تھی۔ اس کے تجارتی قافلے یمن سے شام تک رواں دواں رہتے تھے۔ مکہ، سارے عرب اور ارد گرد کے علاقوں کی مرکزی منڈی تھا جو ان کی تحویل میں تھا۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس سارے علاقے کی تجارت کا مرکزی کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔

کعبہ اہلِ عرب کی مرکزی پرستش گاہ تھا اور قریش اس کے متولی یا مہاجن تھے۔ اس سے انہیں ایسا مقدس اور بلند مقام حاصل ہو گیا تھا کہ اس زمانے میں، جبکہ رہزنی اور قذاقی عام تھی، ان کے تجارتی قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ (۱۰۶/۱-۲) علاوہ بریں، خود کعبہ کی آمدنی بھی کچھ کم نہ تھی۔ وہ تو ایک ریاست تھی۔

پھر، انہوں نے انسانوں کو اس طرح نسلی طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا کہ کوئی ان پیدائشی حدود کو توڑ ہی نہیں سکتا تھا، ان طبقات میں قریش کو بلند ترین مقام حاصل تھا ـــــ جیسے ہندوؤں کے ہاں برہمنوں کو۔

غلامی ان کے معاشرے کا معمول تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے سارے کام کاج غلام کرتے تھے جن کی حالت مویشیوں سے بھی بدتر تھی۔ اور ان کے گھروں میں لونڈیاں تھیں جن کی عام خرید و فروخت ہوتی تھی۔

قریش کیوں مخالف تھے

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، اگرچہ ان کی اپنی کوئی منظم حکومت نہیں تھی لیکن وہ کسی خارجی قانون اور ضابطہ کے بھی پابند نہیں تھے۔ وہ پنچائتی طور اپنے معاملات طے کرتے تھے۔ اس نظام میں سردارانِ قوم کو بہت بڑی سیادت اور قیادت حاصل تھی۔

یہ تھے وہ مفادات، جن کے حامل قریش تھے۔ جب مکہ میں قرآنی تعلیم عام ہوئی تو انہوں نے بھانپ لیا کہ اس کی رو سے ان سے وہ سب کچھ چھن جائے گا جس کے وہ اس طرح غاصب بنے بیٹھے تھے۔ اس سے ان کی نہ مذہبی سیادت باقی رہے گی، نہ اقتصادی قیادت نہ نسلی تفوق باقی رہے گا۔ نہ سیاسی امارت۔ جب تک یہ تعلیم نظری حیثیت لئے رہی تو اگرچہ وہ اس

تعلیم پر لبیک کہنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہے لیکن انہوں نے ان کے خلاف اجتماعی طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ یہ نظری تعلیم ان کے لئے سچ مچ کا خطرہ بن جائے گی۔ لیکن جب یہ تعلیم مدینہ میں ایک مملکت کی شکل اختیار کرنے لگی تو انہوں نے ان خطرات کو بے نقاب دیکھ لیا۔ انہیں صاف نظر آگیا کہ اگر مسلمانوں کا معاشرہ قرآنی خطوط پہ متشکل ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز، حیات بخش نتائج کو دیکھ کر ساری دنیا ان کی طرف کشاں کشاں چلی آئے گی اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے نہ قرلیش باقی رہیں گے نہ ان کے امتیازات و مفادات۔ یہ وجہ تھی کہ وہ اس کے خلاف تھے کہ اس قسم کا نظام قائم ہو جائے۔ وہ تو ایک طرف، قیصر و کسریٰ تک کی سلطنتیں بھی اس سے خائف تھیں۔ حضورؐ نے جب قیصر اور کسریٰ کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ اگر تم نے اپنی موجودہ استبداد و استحصال کی روش نہ چھوڑی تو روما کے محنت کشوں اور ایران کے دہقانوں پر ہونے والے مظالم کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا تو انہوں نے بھی اس ابھرنے والی تحریک کے ہاتھوں اپنے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہٰذا اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب تو ایک طرف، دنیا کی کوئی قوت بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ نظام قائم ہو جائے۔

مندرجہ بالا آیت (۲/۱۰۵) میں قرآن کریم کو "خیر" کہکر پکارا گیا ہے۔ اور خیر کی وضاحت سورۃ النحل میں، ان الفاظ سے کر دی گئی ہے: وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (۱۶/۳۰) "جماعت مومنین (متقیوں) سے پوچھا جا رہا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے وہ ہے کیا؟ تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ وہ خیر ہے

قرآن کریم خیر ہے

یعنی جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے انہیں اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں گی اور ان کی اُخروی زندگی بھی انہی حسنات کو لئے ہوئے ہو گی۔ متقیوں کے لئے یہ ٹھکانا کس قدر خوشگوار (پر نعائم) ہو گا!۔ اس کے بعد اگلی آیات میں ان نعماء کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ ہے اس "خیر" پر عمل کرنے کا نتیجہ، جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے — دنیا اور آخرت — دونوں کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا ضامن۔"

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ نبوت کسی کو کسب و ہنر سے نہیں مل سکتی۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور ملتی ہے اور جس ہستی کو اس کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

وحی کے متعلق ہم اس سے پہلے بڑی تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں (ملاحظہ فرمایئے آیات (۲/۱) جلد اول صفحہ ۲۲ نیز (۲/۵) جلد اول صفحہ ۴۲؛ (۲/۴) جلد اول صفحہ ۱۴۰ نیز (۲/۲۳) جلد اول صفحہ ۲۰۸ نیز (۲/۴۷) جلد دوم سابقہ صفحات)۔ یہاں ہم اتنا کہکر

آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ نبوت، خالصتاً وہبی (عطیہ خداوندی) ہوتی تھی اور چونکہ حضورؐ کے ساتھ سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو نبوت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اہل کتاب کی طرف سے پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ نبوت کے لئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں منتخب کیا گیا اور دوسرا اعتراض یہ کہ اگر یہ وحی خدا کی طرف سے ہے تو ایسا کیوں ہے کہ اس کے بعض احکام ان احکامات سے مختلف ہیں جو ہماری شریعت میں موجود ہیں حالانکہ وہ بھی وحی پر مبنی ہے۔ اس کا جواب اگلی دو آیات میں دیا گیا، جہاں کہا کہ:-

۲/۱۰۶-۱۰۷ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۔

یہ آیات "ناسخ اور منسوخ" سے متعلق ہیں۔ اس اہم مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو، جلد اول میں، زیر آیت (۲/۱۰۶) صفحہ ۱۲۵ پر کی جا چکی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا تعلق قرآن مجید کی آیات سے نہیں، کتب سابقہ کے احکام سے ہے۔ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ وہ سب کا سب مکمل اور غیر متبدل احکام و اقدارِ خداوندی کا مجموعہ ہے۔

ناسخ و منسوخ

اس کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ تم اس بنیادی حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ جس قدر احکام و قوانین کا دیا جانا خدا کو مقصود ہے وہ سب از خود قرآن مجید میں دیدیئے جائیں گے اور جن امور کے متعلق کچھ نہیں کہا جائیگا ان کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ خدا سے بھول نہیں ہو گئی۔ لہٰذا ان امور کے متعلق تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات نہ شروع کر دینا جس قسم کے سوالات اس سے پہلے بنی اسرائیل، اپنے رسول، موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔

چنانچہ اگلی آیت میں ہے کہ:-

۲/۱۰۸ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۔ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۔

ہم اس موضوع کے متعلق جلد اول، آیت (۲/۱۰۸) صفحہ ۱۲۸۔ نیز زیر نظر جلد میں آیت (۲/۱) کے تحت (سابقہ صفحات میں) گفتگو کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لیجئے۔ اس مقام پر اتنا کہدینا کافی ہے کہ اس قسم کی روش اختیار کر لینے کو قرآن کریم نے "ایمان کو کفر سے تبدیل کر لینے" کے مرادف قرار دیا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔

دین کی جزئیات کا تعین

ہم اسے دہرا دیں کہ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ ہمایوں میں اسلامی مملکت قائم ہو چکی تھی اسلئے قرآنی احکام و اقدار کی جو تفاصیل اور جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں تھیں، انہیں یہ نظامِ مملکت باہمی مشاورت سے طے کرتا تھا۔ اس لئے یہ صورت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی کہ امت رسول سے کہے کہ وہ ان جزئیات کو بھی بذریعہ وحی حاصل کرے۔ لیکن بعد میں، جب وہ اسلامی نظام باقی نہ رہا تو، ان جزئیات کو احادیث کی رو سے متعین کرنے کی کوشش کی گئی اور عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ یہ احادیث بھی وحی پر مبنی ہیں —— وحی کا ایک حصہ (جسے وحیِ جلی کہا جاتا ہے) قرآن مجید کے اندر ہے اور اس کا دوسرا حصہ (جسے وحیِ خفی کہا جاتا ہے) احادیث میں — گویا اس طرح ہم نے اس سوال کو دہرا دیا کہ جو کچھ قرآن کریم میں نہیں آیا اُسے بھی خدا کو بذریعہ وحی دینا چاہئے تھا اور اس نے اسے وحی کی دوسری قسم کے ذریعے دیدیا۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، وحی کی ان دو قسموں کا عقیدہ بھی غیر قرآنی ہے۔ وحی کی ایک ہی قسم ہے اور وہ سب کی سب قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے، خارج از قرآن کہیں نہیں۔

آیت (۲/۱۰۵) میں کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ وحی رسول اللہؐ کی طرف نازل ہوتی۔ لیکن جب یہ نازل ہو گئی اور لوگوں نے اسے قبول کرنا شروع دیا تو اس کے بعد ان کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح، ان لوگوں کو اس دین سے برگشتہ کر دیں۔ چنانچہ آگے ہے:۔

۲/۱۰۹ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔

آیت کے آخری حصے میں آسمانی انقلابی پروگرام کی ایک اہم کڑی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس انقلاب کی بنیاد نفسیاتی تغیر پر ہے۔ اس کے لئے طریق کار یہ تھا کہ رسولؐ، وحی کی تعلیم کو عام کرتا جائے اور لوگوں کو اس پر غور و فکر کی دعوت دے۔ معترضین کے اعتراضات کا بہ دلائل و براہین جواب دے۔ ان کے شکوک و شبہات کو رفع کرے اور جو لوگ اس طرح، اس دعوت کو قبول کر لیں، انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتا جائے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا کافی حصہ اِس تبلیغ و تنظیم میں گذرا۔ اس کے بعد جب ایسا مقام آگیا جہاں دیکھا گیا کہ باقی لوگ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور محض ضد اور تعصب کی بناء پر اس کی مخالفت کئے جا رہے ہیں تو حضورؐ سے کہا گیا کہ اب تم اپنی ساری توجہ اس جماعت کی تعلیم و تربیت و تنظیم پر مرکوز کر دو اور ان مخالفین سے اعراض برتو۔ اس

مخالفین سے اعراض

کے بعد اگر انہوں نے اپنی مخالفت میں آخری فیصلہ چاہا تو وہ بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو جائے گا۔ لیکن ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے سلسلے

میں کہا کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۷۳/۱۰) یا فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵/۸۵) ان سے الگ بھی ہو تو حسن کارانہ انداز سے۔ دنیا میں دوسروں سے تعلقات وابستہ کرنے کیلئے تو کہا جاتا ہے کہ ایسا حسن کارانہ انداز سے کرنا چاہیئے لیکن یہاں یہ تاکید ہو رہی ہے کہ مخالفین سے بھی اعراض برتنے کی نوبت آ جائے تو ان سے حسن کارانہ انداز سے علیحدگی اختیار کرو۔ ان سے درگذر کرو، اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے آگے قدم بڑھاتے جاؤ (۵/۱۳)۔

نبی کا قلب بھی بڑا ہی گداز اور پُرسوز ہوتا تھا۔ مخالفین اپنی دشمنی میں انتہا تک پہنچ جاتے تھے لیکن اُسے یہ غم کھائے جاتا تھا کہ یہ اس طرح تباہ ہو جائیں گے۔ اے کاش! یہ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ یہ احساسِ غم اتنی شدت اختیار کر جاتا تھا کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۲۶/۳) "ایسا نظر آتا ہے کہ تم تو اس غم میں، کہ یہ لوگ امن و سلامتی کا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنی جان گھلا لو گے۔"

نبی کا قلبِ گداز

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵/۸) "اے رسولؐ! تو ان کی غم خواری میں اس طرح اپنی جان نہ گھلا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے"۔ لیکن اس چھوڑ دینے کے باوجود یہ تاکید بھی کر دی کہ وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰) "تو انہیں قرآن کے ذریعے نصیحت بہرحال کرتا رہ، تاکہ کوئی شخص، حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر تباہ نہ ہو جائے"۔ یعنی، پہلے، رسولؐ ان لوگوں کو بھی اپنی خاص توجہ کا مرکز قرار دیتا تھا۔ اب یہ کہا گیا کہ اس اختصاص سے تو قطع نظر کر لو لیکن اپنی عمومی دعوت جاری رکھو۔ یہ تھی فریضۂ تبلیغ کی اہمیت!

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا کہ اب تم جماعتِ مومنین کی تربیت و تنظیم کے لئے اپنی کوششوں کو مرتکز کر دو۔ اس کے لئے پروگرام وہی دیا گیا جو دین کی اساس ہے۔ کہا یہ گیا کہ :-

۲/۱۱۰ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ۔ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۔

یعنی "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا پروگرام۔ اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق جلد اول میں آیت (۲/۳) کے تحت (صفحات ۹۷-۱۴۰) پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اور زکوٰۃ کے متعلق آیت (۲/۴۳) کے تحت سابقہ صفحات میں ــــ اُسے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کہا یہ گیا کہ اپنی جماعت پر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دو کہ اس انقلابی پروگرام کے ابتدائی دور میں تمہاری سعی و عمل کا محسوس نتیجہ جلدی سامنے نہیں آئے گا لیکن تم اس یقین پر استقامت سے آگے بڑھتے چلے جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں ہو رہا۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے اعمال، وہ پیش رو کارندے ہیں جو کارواں کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ان کے لئے سب انتظام کر رکھتے ہیں۔ یہی کچھ تمہارے اعمالِ حسنہ کریں گے۔ تم اس پروگرام

پر عمل کرتے جاؤ اس سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد اگلی دنیا میں بھی۔

یہ ان (اہل کتاب) کا زعم باطل اور فریب نفس ہے جو کہتے ہیں:۔

۲/۱۱۱ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

یعنی یہ کہ جنت، یہود و نصاریٰ کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ اس آیت کا بنیادی تعلق، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے جس کی تشریح گذشتہ صفحات (بالخصوص زیر آیت ۲/۴۸ ؛ ۲/۹۴) پر کی جا چکی ہے۔

اہل کتاب کے اس زعم باطل کے بعد کہا کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ:۔

۲/۱۱۲ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

جو بھی اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا کر، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے گا اس کا اجر اُسے خدا کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس اجر کو ان چار الفاظ میں دہرا دیا کہ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔

قصہ آدم کے آخر میں یہی کہا گیا تھا کہ جو لوگ ہمارے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں گے ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا (۲/۳۸)، اسی کو یہاں دہرایا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی داستان تو آگے بھی چلتی ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ قارئین اس منزل پر تھوڑی دیر کے لئے ستالیں اور داستان کے اگلے حصے کے لئے تیسری جلد کا انتظار فرمائیں۔

والسلام۔ وللہ الحمد۔

خلاصہ باب پنجم و ششم

(آیات ۵۵ تا ۱۱۲)

(۵۵)۔ ہم نے تمہیں ایک واضح ضابطہ قانون دیا تھا جس کے نتائج نے نہیں، خود بخود بتا دینا تھا کہ وہ (واقعی) خدا کا قانون ہے، کسی انسان کا خود ساختہ نہیں۔ لیکن، بجائے اس کے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کر اس کے نتائج سے خدا کو

پہچانتے، تمہاری ذہنی سطح اسقدر پست، اور تم محسوسات کے اس درجہ خوگر ہو چکے تھے، کہ تم موسیٰ سے یہ کہنے لگے کہ ہم تیری کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک ہم اس خدا کو (جس کی طرف سے، تم کہتے ہو کہ یہ قانون نازل ہوا ہے) خود اپنی آنکھوں سے بے نقاب نہ دیکھ لیں۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ خدا کوئی مادی پیکر نہیں جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ اس کا تو، اس کی خدائی اور اس کے قوانین کے نتائج سے، بہ چشمِ بصیرت ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے)۔

تقاضا تمہارا خدا کو بے نقاب دیکھنے کا تھا، اور ہمت کا یہ عالم کہ زلزلہ کی گرج دار آواز، اور ارتعاش سے ($\frac{7}{155}$) تمہارے ہوش اُڑ گئے، حالانکہ تم دیکھ رہے تھے کہ وہ زلزلہ ہی ہے۔ (یہ اس لئے کہ تمہاری توہم پرستیوں نے، جن کی وجہ سے تم نے بچھڑے تک کو دیوتا بنا لیا تھا، اِن مظاہرِ فطرت کا خوف تمہارے دل میں پیدا کر رکھا تھا۔ شرک کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے)۔

(۵۶) ہم نے اس کے بعد بھی تمہیں اُٹھا کھڑا کیا اور اس کا موقعہ دیا کہ تمہاری صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو سکے تاکہ تم غلامی کے مرگ آفریں اثرات سے آزاد ہو کر انسانی سطح کی حیاتِ نو سے سرفراز ہو سکو، اور اس طرح تمہاری کوششیں ثمربار ہو سکیں۔

(۵۷) اس کے لئے تمہیں بلا مزد و معاوضہ، سامانِ معیشت کی فراوانیاں عطا کی گئیں۔ اُس بیابان میں، پانی سے بھرے ہوئے بادل تمہارے سروں پر سایہ فگن تھے، اور کھانے کے لئے نہایت خوشگوار غذا ——— پرندوں کا گوشت اور خود رُو نباتاتی شیرینی ——— تمہارے لئے وجہِ سکون و اطمینان بنتی تھی۔

لیکن تم اس پر بھی ہمارے قوانین کے اتباع پر قائم نہ رہے! اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا، تم نے اپنا ہی نقصان کیا، اور خود اپنے ہاتھوں سے ایسا کیا۔

(۵۸) ہماری تجویز یہ تھی کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے رہو ($\frac{5}{21}$) اور اس طرح، اپنے اختیار و ارادہ سے، جیسے اور جب جی چاہے، سامانِ رزق سے فائدہ اٹھاؤ، فقط اس ایک شرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو۔ اِس طرح، تمہاری صحرانوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بھی ختم ہو جاتی، اور تم سے جو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں ان کے مضر اثرات سے تمہیں سامانِ حفاظت بھی مل جاتا۔ اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے، تو ان فتوحات کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا چلا جاتا۔

(۵۹) لیکن تم نے سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کے مقابلہ میں آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی کو پسند کیا ($\frac{5}{24}$) اور اس طرح ہمارے تجویز کردہ راستے کو چھوڑ کر، ایک الگ راہ اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے سماوی قانونِ مکافات کے مطابق تم

میں کمزوری آتی چلی گئی اور تمہاری ٹانگیں بری طرح لڑکھڑانے لگ گئیں۔ تم میں جرأت و ہمت باقی نہ رہی (۵/۲۴-۲۲)۔ [اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی سرزمین، جس کی ملکیت کا قبالہ تمہارے نام لکھا جا چکا تھا، (۳/۲۱)، چالیس سال تک تمہارے قبضہ میں نہ آسکی۔ (۵/۲۶)]۔

(۶۰) تم اپنی تاریخ کے اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب تمہیں پانی کی دقت ہوتی۔ اور موسیٰؑ نے اس کے لئے ہم سے درخواست کی تو ہم نے ان کی راہنمائی اس مقام کی طرف کر دی جہاں پانی کے چشمے مستور تھے۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر وہاں پہنچا۔ چٹان پر سے مٹی ہٹائی، تو اس میں سے، ایک دو نہیں اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اس نے ان چشموں کو نامزد کر دیا اور ہر قبیلہ کو بتا دیا کہ ان کا چشمہ کونسا ہے اس طرح ہم نے تمہیں سامانِ معیشت کی فکر سے نجات دلا دی۔ اور کہہ دیا کہ دیکھو! اب جب کہ تمہاری معاشی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، تم۔۔۔ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر کے اس کا شیرازہ منتشر نہ کر دینا

(۶۱)۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۲/۵۹) تم نے بیابانہ زندگی پر، شہری زندگی کو ترجیح دی۔ اس کے لئے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم (اس صحرائی زندگی میں) صبح و شام ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ اس لئے، تم اپنے نشو و نما دینے والے سے ہمارے لئے زرعی پیداوار طلب کرو ـــــ سبزیاں ترکاریاں، ککڑیاں، لہسن (یا مختلف قسم کے اناج) مسور پیاز (وغیرہ) ـــــ حالانکہ صحرائی زندگی تمہاری عسکری تربیت گاہ تھی اور وہاں کی خوراک ایسی تھی جو تم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتی۔

موسیٰؑ نے کہا کہ (کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ) تم اس بہترین زندگی کی بجائے۔ جو تمہارے لئے تجویز کی جا رہی تھی اس قسم کی ادنیٰ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو جاؤ شہر کی زندگی اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں عسکریت اور کشور کشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور محکومیت اور تساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اس طرح، ان پر ذلت و خواری کا عذابِ خداوندی مستولی ہو گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے انبیاء کی عزت و توقیر کے بجائے، انہیں ناحق ذلیل کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ نیز بعض کی جان تک کے لاگو ہو گئے (۲/۸۷؛ ۳/۱۸۲)۔ یہ سب کچھ ان کی سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ تھا۔

(۶۲)۔ یہ تو تمہاری روش رہی ہے، اور اس کے باوجود تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (۵/۱۸) اور جنت تمہاری

نسل کے لئے مخصوص ہے (۲/۱۱۱) ــــ یہ تمہاری خام خیالی ہے ــــ جنت کسی نسل کے لئے مخصوص نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ صابی ہوں یا وہ لوگ جو کسی مذہب میں رسمی طور پر داخل ہوئے بغیر ویسے ہی خدا کو مانتے ہیں ــــ یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے ــــ غرضیکہ کوئی بھی ہو، جو بھی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ، زندگی کے تسلسل، اور اس کے قانونِ مکافات پر اس طرح ایمان رکھے جس طرح اس قرآن میں بتایا گیا ہے (۲/۱۷۷)، اور اس کے دیتے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے، تو ان کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق، ان کا اجر ملے گا، (جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ) نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامن گیر ہوگا، نہ حزن، وجۂ افسردگی بنے گا۔ (۴/۱۳۶ ; ۵۷/۲۸ ، ۶۱/۱۰-۱۱ ; ۹/۲۹ ; ۴۷/۲)۔

(۶۳)۔(اس ضمنی گوشہ کے بعد تم پھر اپنی تاریخ کی طرف پلٹو) اور اس حقیقت کو سامنے لاؤ کہ تمہاری طبیعی حفاظت کا سامان اس طرح کر دیا گیا تھا کہ تمہاری پشت پر پہاڑ کھڑا تھا اور تم اس کے دامن میں تھے ــــ اور تمہاری انسانیت کی حفاظت کے لئے تمہیں ضابطۂ قوانین دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تم سے کہا تھا کہ تم اس ضابطۂ ہدایت کو نہایت مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ یعنی جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھنا، تاکہ تم زندگی کے ہر خطرے سے محفوظ رہ سکو۔ تم نے اس کا محکم عہد کیا تھا۔

(۶۴)۔ لیکن، اس محکم عہد و پیمان کے بعد، تم اس سے پھر گئے۔ یہ تو ہمارا قانونِ مہلت تھا جس کی وجہ سے تم پر فوراً گرفت نہ کی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم سے زندگی کی خوشگواریاں اور سامانِ نشوونما کی فراوانیاں، جو تمہیں حاصل تھیں، فوراً چھن جاتیں اور تم بالکل تباہ و برباد ہو جاتے۔

(۶۵)۔ضابطۂ خداوندی کو مضبوطی سے تھامنا تو بہت بڑی چیز تھی، تمہاری ناپختگیٔ سیرت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ تم سے کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن اپنا کاروبار بند رکھو، اور مچھلیاں نہ پکڑو (۷/۱۶۳)۔ لیکن تمہاری حرص و ہوس اتنی سی پابندی کی بھی متحمل نہ ہو سکی (۴/۱۵۴ ; ۱۶/۱۲۴)۔ اور تم نے اس نظم و ضبط کو توڑ ڈالا۔ (اس سے ہمارا تو کچھ نہ بگڑا) تم خود ہی ذلت و مسکنت کے چلتے پھرتے پیکر بن گئے۔ سرکش قوتوں کی محکومی کے شکنجے میں جکڑے گئے (۵/۶۰ ; ۷/۱۶۷)۔ اور زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ گئے (۴/۴۷)

(۶۶)۔تمہاری یہ ذلت و خواری، ہر اس قوم کے لئے جو تباہیوں سے بچنا چاہے، عبرت و موعظت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ ان کیلئے بھی جو اس وقت تمہارے ہم عصر تھے، اور ان کے لئے بھی جو ان کے بعد آئے، اور انہوں نے تاریخی نوشتوں سے تمہارے حالات کو پڑھا۔

(۶۷)۔ پھر تمہاری خوئے بہانہ سازی کا یہ عالم ہو چکا تھا، کہ جب تمہیں خدا نے حکم دیا کہ ایک سانڈ ذبح کر ڈالو تاکہ تمہارے دل سے گوسالہ پرستی کا وہ جذبۂ عقیدت نکل جائے جو تم نے قبطیوں کی دیکھا دیکھی اپنے اندر پیدا کر لیا تھا (۲/۹۳؛ ۷/۱۵۲)۔ تو پہلے تو تم نے اس حکم ہی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، حالانکہ تمہیں معلوم تھا کہ تمہیں وہ حکمِ خداوندی؛ ایک پیغمبر کی وساطت سے ملا ہے، اور یہ بات ایک پیغمبر کے شایانِ شان نہیں ہوتی کہ وہ جہالت آمیز باتیں کرے۔

(۶۸)۔ جب تمہیں بتایا گیا کہ یہ خدا کا حکم ہے اور اس کی تعمیل ضروری، تو تم نے خواہ مخواہ موشگافیاں شروع کر دیں، اور کہنے لگے کہ خدا سے کہو کہ وہ ذرا واضح طور پر بتائے کہ وہ سانڈ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔

جب تم نے خود ان جزئیات کا تعین چاہا تو تم سے کہا گیا کہ وہ سانڈ نہ بوڑھا ہونا چاہیئے نہ بچہ، بلکہ اس کے بین بین ادھیڑ عمر کا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اب تم اس حکم کی تکمیل میں لیت و لعل مت کرو۔

(۶۹)۔ تم نے کہا کہ نہیں، بات اب بھی واضح نہیں ہوئی۔ اپنے رب سے پوچھ کر یہ بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا گیا کہ گہرے زرد رنگ کا سانڈ، جو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اچھا جچے۔

(۷۰)۔ اس پر بھی تم آمادۂ عمل نہ ہوئے، اور مزید حجت بازی کے لئے کہا کہ بات اب بھی کچھ مشتبہ سی رہی۔ ذرا اور وضاحت سے بیان کیجئے تاکہ ہم صحیح بات تک پہنچ جائیں اور جو کچھ خدا کا منشا ہے ٹھیک اسی کے مطابق کریں۔

(۷۱)۔ کہا گیا کہ ایسا سانڈ جسے نہ ہل میں جوتا گیا ہو اور نہ کنوئیں پر چلایا گیا۔ ہر طرح سے صحیح و سالم اور بے داغ ——— کہا کہ ہاں! اب تم نے ٹھیک ٹھیک پتہ بتایا۔

سو تم نے ایک معمولی سی بات میں بھی اس قدر موشگافیاں شروع کر دیں۔ یہ کچھ تم نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہ تھی۔ تمہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ ہم تمہارے ہاتھوں سے سانڈ (دیوتا) اس لئے ذبح کرانا چاہتے تھے کہ تم نے اسے معبود بنا رکھا تھا، اور ہم چاہتے تھے کہ تمہارے دل سے یہ جذبۂ عقیدت نکل جائے۔ لیکن تمہارا جی نہیں چاہتا تھا کہ تم اُسے ذبح کرو۔ اس کی محبت تمہارے دل کی گہرائیوں تک اُتر چکی تھی (۲/۹۳)۔ لیکن تم اس کا اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، اسلئے تم نے حیلہ سازیاں کرنی شروع کر دیں، اور اس قدر لمبی چوڑی باتوں کے بعد اس حکم کی تعمیل کی۔

یاد رکھو! تعمیلِ احکام میں وہ باتیں کرید کرید کر نہیں پوچھنی چاہئیں جو خدا نے خود نہ کہی ہوں (۵/۱۰۱)۔

(۷۲)۔ ایک طرف تو تمہاری یہ حالت کہ ایک جانور کے ذبح کرنے میں اس قدر حیل و حجت، اور دوسری طرف یہ عالم کہ ایک انسانی جان ناحق لے لی۔ اُسے (خفیہ طور پر) مار دیا، اور جب تفتیش شروع ہوئی تو لگے ایک دوسرے کے سر الزام دھرنے۔ یعنی تم میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہ تھی کہ جرم ہو گیا ہے تو کھلے بندوں اس کا اقرار کر لو۔ لیکن جس بات

کو تم چھپانا چاہتے تھے خدا اسے ظاہر کر دینا چاہتا تھا، تاکہ جرم بلا قصاص نہ رہ جائے۔
(۷۳)۔ مشرکانہ توہم پرستیوں سے، جن میں تم مبتلا ہو چکے تھے، انسان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے کسی ذرا سی خلاف معمول بات کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے (۲۲/۳۱)۔ چونکہ خدا تمہاری اس نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا، اس لئے اس نے قاتل کا سراغ نکالنے کے لئے ایک نفسیاتی ترکیب بتائی (جو انسان کی اس زمانے کی ذہنی سطح کے اعتبار سے، بڑی خلاف معمول تھی) اس نے کہا کہ تمہیں جن لوگوں پر شبہ ہے انہیں ایک ایک کر کے بلاؤ اور ان سے کہو کہ وہ لاش کے کسی حصے کو چھوئیں۔ (چنانچہ جو مجرم تھا جب وہ لاش کے قریب پہنچا تو خوف کی وجہ سے اس سے ایسے آثار نمایاں ہو گئے جو اس کے جرم کی غمازی کرنے کے لئے کافی تھے)۔ اس طرح اللہ نے اس قتل کے راز کو بے نقاب کر دیا اور، مجرم سے قصاص لے کر ان مرگ آفریں تاثرات کو جو قوم پر چھا رہے تھے، مبدل بہ حیات کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قصاص میں قوم کی حیات کا راز پوشیدہ ہوتا ہے (۲/۱۷۹)۔
اللہ اس طرح تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے تاکہ تم، عقل و شعور سے کام لے کر، ایسے معاملات کو سلجھا لیا کرو، اور اس حقیقت کو سمجھ لو کہ نفسیاتی تغیر سے (افراد سے آگے بڑھ کر) کس طرح خود قوموں کی حالت بدل جاتی ہے (۱۳/۱۱)۔
(۷۴)۔ غرضیکہ، تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا۔ تم بگڑتے اور بنتے رہے۔ آخر الامر تم نے ضابطۂ خداوندی سے یکسر منہ موڑ لیا۔ اس سے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ، بعض پتھر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ندیاں پھوٹ نکلتی ہیں، اور بعض ایسے کہ وہ پھٹ جاتے ہیں تو ان کے اندر سے (ندیاں نہ سہی) پانی کے چشمے ضرور بہ نکلتے ہیں۔ اور ایسے پتھر بھی ہوتے کہ وہ قانونِ خداوندی کے سامنے، سختی کو چھوڑ کر، اپنے مقام سے نیچے اتر آتے ہیں یعنی نرم پڑ جاتے ہیں ـــ ایسے نرم کہ انہیں آسانی سے پیسا جا سکتا ہے اور بعض کو پگھلایا بھی۔ لیکن تمہارے دل ہیں کہ نہ وہ انسانیت کی غمخواری میں نرم ہوتے اور نہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں، اور نہ آنسو بن کر تمہاری آنکھ سے ٹپکتے ہیں۔
لیکن اس سے خود تمہارا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ تمہاری کوئی حرکت ہمارے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ان میں سے ایک ایک کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔
(اے جماعتِ مؤمنین، دیکھنا! تم بھی کہیں ان جیسا نہ ہو جانا۔ (۵۷/۱۶)۔
(۷۵)۔ اے قرآنی انقلاب کی طرف دعوت دینے والی جماعت! ہم جانتے ہیں کہ تم دل سے چاہتے ہو کہ یہود بھی اس انقلاب

میں تمہارا ساتھ دیں، اور اس طرح، وہ خود بھی اس ذلّت و خواری کی زندگی سے نجات حاصل کرلیں اور انسانیت بھی ان کی دسیسہ کاریوں سے مخلصی پائے۔ لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی قوم، جس کی قلبی کیفیت وہ ہو چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کبھی تمہارا ساتھ دے سکتی ہے؟ بالخصوص، جب ان کی حالت یہ ہے کہ وہ یہ کچھ لاعلمی سے نہیں کرتے۔ ان میں (مذہبی پیشواؤں کا) گروہ موجود ہے جو قوانینِ خداوندی کو سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، اور پھر جان بوجھ کر اس میں تغیر و تبدل کر دیتے ہیں، اور اس کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جن سے بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے ——— باقی لوگ انہی کا اتباع کرتے رہتے ہیں۔

جو لوگ دیدہ دانستہ یہ کچھ کریں، ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ حق کو قبول کرلیں گے؟

(۷۶) تم انہیں ایماندار سمجھتے ہو، حالانکہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرتے ہیں اور جب آپس میں، ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس جماعت سے خلا ملا رکھنا تو اچھا ہے، لیکن ہمیں اس کی احتیاط برتنی چاہیے کہ ان سے اپنی کتابوں کی وہ باتیں نہ کہہ دی جائیں جنہیں یہ ہمارے خلاف بطور دلیلِ خداوندی لاکر، ہمارا منہ بند کر دیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

(۷۷) لیکن یہ اتنا نہیں سوچتے کہ جس خدا کی طرف سے انہیں وہ باتیں ملی تھیں، یہ، اُسی خدا سے ان باتوں کو چھپانا چاہتے ہیں! ان سے پوچھئے کہ کیا خدا سے یہ باتیں چھپی رہ سکتی ہیں؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ لوگ ظاہر کیا کرتے ہیں اور چھپا کر کیا رکھتے ہیں۔

(۷۸) یہ لوگ دوسروں کے ساتھ ہی اس قسم کی فریب کاری نہیں کرتے، خود اپنوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتے رہتے ہیں (مثلاً) ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو پڑھے لکھے نہیں۔ وہ خوش عقیدگی کی پیدا کردہ جھوٹی آرزوؤں کو پلّے باندھے رکھتے ہیں۔ اور توہم پرستیوں اور قیاس آرائیوں میں مست رہتے ہیں۔ اور شریعت کے متعلق جو کچھ انہوں نے پوچھنا ہو، اس کے لئے اپنے احبار و رہبان (علماء مشائخ) کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۷۹) ان کے علماء کرتے یہ ہیں کہ شریعت کے احکام خود اپنے ذہن سے، اپنی مرضی کے مطابق، وضع کر لیتے ہیں، اور ان اَن پڑھ لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب ارشاداتِ خداوندی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ خود ساختہ شریعت، اور اس کے ذریعے کمائی ہوئی دولت، سراسر تباہی اور بربادی کا موجب ہے۔ ($\frac{56}{82}$)

(۸۰) ان کی یہ خوئے فریب دہی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ، اور تو اور، یہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے

نہیں چوکتے۔ چنانچہ، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔ ہم، زیادہ سے زیادہ، چند دنوں تک جہنم میں رہیں گے (یعنی صرف اُتنے وقت کے لئے جب تک ہمارے شفاعت کرنیوالے ہمیں خدا سے بخشوا نہیں لیں گے)۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اس کے متعلق خدا سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس لئے کہ خدا اپنے عہد سے پھرا نہیں کرتا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ تم خدا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی علم و دلیل نہیں۔

(۸۱)۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خدا کے ہاں سفارشیں چلتی ہیں؟ وہاں کسی کی سفارش نہیں چل سکتی، نہ ہی اس کی کوئی چہیتی قوم ہے)۔ اس کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ جس قوم نے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاشرہ خطا کاریوں سے بھر گیا اور ہر سمت فساد ہی فساد رونما ہو گیا، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی، اور وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(۸۲)۔ ان کے برعکس، جو قوم خدا کے قانون پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو گی، تو ان لوگوں کو جنتی زندگی نصیب ہو گی۔ اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی۔ ($\frac{۲}{۱۱۲}$)۔

(۸۳)۔ تمہارا خدا سے یہ عہد نہیں تھا کہ تم جو کچھ بھی کرتے رہو گے، تم سے اس کی باز پرس نہیں ہو گی)۔ تمہارا عہد یہ تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کے قوانین و احکام کی اطاعت نہیں کرو گے۔ (ضعیف) ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے۔ نیز اپنے رشتہ داروں سے، اور ان لوگوں سے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے اور ان کی زندگی کی گاڑی کھڑی ہو جائے۔ ان سب سے ایسا برتاؤ کرو گے کہ ان کی کمیاں پوری ہو جائیں اور اس طرح معاشرہ کا توازن بگڑنے نہ پائے۔

تم نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ تم لوگوں سے ہمیشہ خوش معاملگی سے پیش آؤ گے، اور انہیں اچھی باتوں کی تلقین کرو گے۔ نیز یہ کہ تم ایسا نظام قائم کرو گے جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع کریں۔ اور ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے ـــــ لیکن تم نے، اس عہد کے بعد، گریز کی راہیں نکالنی شروع کر دیں اور معدودے چند کے سوا، سب کے سب، سیدھا راستہ چھوڑ کر دوسری طرف چل نکلے ـــــ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ تمہاری نفسیاتی کیفیت ہی ایسی ہو چکی تھی کہ تم قانون خداوندی کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل نکلتے!

(۸۴)۔ تم نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ تم باہمی خونریزی نہیں کرو گے، اور اپنے میں سے کمزوروں اور غریبوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر نہیں کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ اور سب کچھ دیکھتے بھالتے، سوچتے سمجھتے اقرار کیا تھا ـــ تم اب بھی اسے تسلیم کرتے ہو۔

(۸۵)۔لیکن تم ہو کہ ایسے محکم قول و اقرار کے بعد، باہمی خونریزیاں کرتے ہو اور، اپنے غریب بھائیوں کو اُن کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو۔ اور بجائے اس کے کہ تمہاری سوسائٹی، ان مجرمین کے خلاف، کوئی کارروائی کرے، تم اُلٹے ان غریبوں کے خلاف ظلم و استبداد میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ——— کہیں کمزور کو کمزور تر بنانے سے اور کہیں ان سرکشوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے ——— اور ستم ظریفی یہ کہ جب، ان گھروں سے نکالے ہوئے غریبوں کو دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم بڑے خدا ترس بنتے ہو اور ان کا زرِ فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے ہو، اور اس سے سمجھتے یہ ہو کہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا! حالانکہ خود ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا وہ سنگین جرم تھا جس سے تمہیں منع کیا گیا تھا۔ سو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ (حالانکہ جس طرح انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے اسی طرح اس ضابطۂ خداوندی کے بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا۔ اور انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے سے انکار کیا جائے گا۔ جس طرح جسم کے دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح جو قوم ضابطۂ خداوندی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے، اور جو حصہ مفید مطلب ہو اس پر عمل کرتی ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیتی ہے، تو) اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسی قوم کے حال کی زندگی بھی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہو، اور مستقبل کی زندگی بھی اندوہناک تباہیوں سے لبریز۔ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی۔

ضابطۂ خداوندی سے اس قسم کا برتاؤ کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

(۸۶)۔یہ لوگ محض، ذاتی مفاد کی خاطر، ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں، اور طبیعی زندگی کی آسائشوں کے لئے مستقبل کی سرفرازیوں کو بیچ ڈالتے ہیں (لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی یہ زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے، اور آخرت کی زندگی بھی خراب) اور یہ تباہی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور کوئی ایسا نہیں ہوتا جو اس حال سے نکلنے میں ان کی مدد کر سکے۔ یہ درحقیقت نتیجہ ہوتا ہے اس غلط نظام کا جس میں صاحبِ اقتدار اور سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال کر کے انہیں مفلس سے مفلس تر بناتے جائیں اور پھر صدقہ و خیرات سے ان کی جھولی میں بھیک کے چند ٹکڑے ڈال کر اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! غلط نظام سے پیدا ہونے والی تباہیاں اس قسم کے فریب نفس سے رک نہیں سکتیں وہ آ کر رہتی ہیں۔

(۸۷)۔تمہاری طرف قوانینِ خداوندی بھیجنے کا سلسلہ موسیٰ تک ہی نہیں رہا، بلکہ، اس کے بعد بھی۔ تمہارے پاس، مختلف رسول، یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ آخر میں عیسیٰؑ ابن مریم آیا۔ اسے بھی ہم نے واضح دلائل و براہین دیئے تھے۔ یعنی ہم نے اُسے اس وحی کی رُو سے تائید و تقویت عطا کی تھی جو ہماری طرف سے بلاآمیزش اس تک پہنچی تھی۔ اور تمہارے پاس انبیائے سابقہ کی جو وحی رہ گئی تھی اس میں تم نے اپنی طرف سے ہزار ملاوٹیں کر رکھی تھیں۔

لیکن تمہاری روش ہمیشہ یہ رہی کہ جب کبھی کسی رسول نے ایسی بات کہی جو تمہارے مفاد و رجحان کے خلاف جاتی تھی اور اس لئے تمہارا دل اُسے پسند نہیں کرتا تھا، تو تم وہیں اکڑ گئے۔ پھر ان رسولوں میں سے بعض کی تم نے تکذیب کی اور بعض کے قتل کے درپے ہو گئے۔

یہی کچھ اب تم اس کتاب کے متعلق کر رہے ہو، تاکہ اس میں تمہاری منشاء کے مطابق تبدیلی کر دی جائے۔

(۱۰/۱۵ ؛ ۱۱/۱۱۳ ؛ ۱۷/۲۴ ؛ ۶۸/۹ ؛ ۳۹/۴۵)۔

(۸۸)۔قرآنی تعلیم سے ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ اس پر غور کرنا تو ایک طرف۔ یہ اسے سننا تک بھی نہیں چاہتے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ (ان سے کہو کہ یہ کوئی خوبی اور فخر کی بات نہیں کہ تمہارے دل اس کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دل کا فریضہ تو ہر بات پر غور و فکر کر کے سچی بات کو قبول کرنا ہے۔ جو دل ایسا نہیں کرتے، سمجھ لو کہ) وہ اپنی اس استعداد اور صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں ایسے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جو بات بھی ان کے سامنے پیش کی جائے اس پر غور و فکر کرنے کے بجائے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم نے اسے ماننا ہی نہیں (۲/۶)۔

اس قسم کی ذہنیت والوں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ صحیح بات کو سمجھ سوچ کر اسے تسلیم کر لیں۔

(۸۹)۔ان کی یہ حالت اس وقت ہو رہی ہے جب انکے پاس اللہ کی طرف سے وہ ضابطۂ قوانین آ چکا ہے جو ان اخلاقی اقدار اور دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے ہاں موجود ہیں، اور جس کے لئے یہ خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ آئے تو یہ کفار پر غلبہ پا سکیں۔ یہ خوب پہچانتے ہیں کہ یہ ضابطۂ قوانین خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ اس سے انکار کر رہے ہیں۔ لیکن اس انکار سے انہوں نے اس ضابطۂ خداوندی کا کیا بگاڑا؟ اس سے ہوا یہ کہ یہ خود اس کی برکات سے محروم رہ گئے۔

(۹۰)۔تمہیں معلوم ہے کہ ان کے انکار کی اصلی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ حسد کہ یہ رسول غیر اسرائیلی کیوں ہے! (انہوں نے از خود یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ دنیا بھر کی برکات و سعادات بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں، حتیٰ کہ نبوت بھی انہی کی قومیت کے دائرے میں محدود رہے) حالانکہ نبوت ایک ایسی موہبت ہے جو خدا کے قانونِ مشیت

کے مطابق اسے دی جاتی ہے جسے اس کا اہل سمجھا جائے۔ (اس میں، قوم اور وطن اور زبان اور رنگ کی کوئی خصوصیت نہیں)۔

بہرحال، ان کی اس ضد سے اس کے سوا اور کیا ہوا کہ یہ زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم رہ گئے۔ ان کی امیدوں کی کھیتی جل کر راکھ ہوگئی اور ان کا انکار اور سرکشی ان کے لئے ایسی ذلت آمیز تباہی کا موجب بن گئی جس نے ان کی ساری اجتماعی قوت کو توڑ کر رکھ دیا۔ کتنا بُرا ہے یہ سودا جو انہوں نے اپنی زندگی کے عوض کیا ہے!!

اور یہ انجام ہر اس قوم کا ہوتا ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرے۔

(۹۱)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ! اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لاؤ، تو اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو صرف اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا تھا۔ اس کے سوا ہم کسی اور تعلیم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ یہ قرآن (ان کی طرف بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ) ان اقدار اور دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے پاس موجود ہیں۔

ان سے کہو کہ (اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ ہم اس قرآن کو اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ایک غیر اسرائیلی کی طرف نازل ہوا ہے تو) بتاؤ کہ، اس سے قبل، جو اسرائیلی انبیاء تمہاری طرف آتے رہے تھے، تم ان کی تذلیل و تحقیر پر کیوں اُتر آیا کرتے تھے۔ ان کی تعلیم کو غیر مؤثر کیوں بنا دیا کرتے تھے۔ اور ان کی جان تک کے دشمن کیوں بن جایا کرتے تھے؟

تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اسرائیلی انبیاء پر ایمان لایا کرتے تھے، خود تمہاری اپنی تاریخ کی رُو سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔

(۹۲)۔ دیگر انبیاء بنی اسرائیل کو تو چھوڑو، تم نے خود موسیٰؑ کے ساتھ کیا کیا؟ وہ تمہارے پاس ایک واضح ضابطۂ قوانین لایا تھا (جس کی بنیادی تعلیم توحید تھی)۔ لیکن تم نے اُسے چھوڑ کر، گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ کہو! یہ ایمان تھا یا کفر؟ یہ اطاعت تھی یا سرکشی؟۔

(۹۳)۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ($\frac{2}{63}$) جب ہم نے تم سے، دامن کوہ میں، اس بات کا پختہ عہد لیا تھا کہ تم اس ضابطۂ خداوندی کو پوری قوت سے تھامے رہو گے، تو تم سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس بات کو دل کے کانوں سے سن لو! اور اچھی طرح سمجھ لو۔ تم نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اسے اچھی طرح سن اور سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ تم نے ان قوانین کی اطاعت کے بجائے ان سے سرکشی اختیار کر لی۔ یہ اسلئے کہ گوسالہ کی عقیدت تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ تمہارے خون میں حلول کر چکی تھی۔

ان سے کہو کہ یہ ہے تمہارا سابقہ ریکارڈ! لہٰذا، تمہارا یہ کہنا کہ ہم اس لئے قرآن پر ایمان نہیں لاتے کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا تھا، خود فریبی اور فریب دہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تمہارا ایمان تمہیں یہی کچھ سکھاتا ہے، اور اس قسم کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے تو ہزار افسوس ہے ایسے ایمان پر۔

(۹۴)- ان سے کہو کہ تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (۵/۱۸) - اور آخرت کا گھر، یعنی جنت، تمہارے لئے مخصوص ہے (۲/۸۰)، اور غیر اسرائیلیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں (۲/۱۱۱) - اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو تمہیں موت سے کبھی نہیں ڈرنا چاہیئے، بلکہ اس کی تمنا کرنی چاہیئے (تمہیں نکھر کر میدانِ جنگ میں سامنے آنا چاہیئے۔ چھپ چھپ کر سازشیں نہیں کرنی چاہئیں۔ موت تو حسنِ عمل کا پہلا امتحان ہے، (۶۷/۲ ؛ ۶۲/۶)-

(۹۵)- لیکن تم دیکھو گے کہ یہ لوگ مرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے، اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی مستقبل کی زندگی کیلئے کیا کمائی کر کے آگے بھیجی ہوئی ہے - اللہ، اس قسم کے فریب کار سرکشوں کی ابلہ فریبیوں سے خوب واقف ہے۔

(۹۶)- مرنے کی تمنا تو ایک طرف! تم دیکھو گے کہ یہ لوگ، زندہ رہنے کے لئے، مشرکین عرب سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کی تمنا یہ ہے کہ اُسے ہزار سال کی عمر مل جائے۔ لیکن، یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ اس درازیٔ عمر سے کیا ہوگا؟ کیا اس سے یہ اپنے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بچ جائیں گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے ایک ایک کام پر نگاہ رکھتا ہے۔ اسلئے ان کے ہر عمل کا نتیجہ ان کے سامنے آکر رہے گا۔

(۹۷)- یہ لوگ جبریل سے ناراض ہو رہے ہیں کہ اس نے ایک غیر اسرائیلی کو وحی کیوں دیدی (۲/۹) - ان سے کہو کہ اس میں جبریل سے ناراض ہونے کی کونسی بات ہے؟ وہ از خود تو کسی کی طرف وحی نہیں لے جاتا - اس نے اس قرآن کو قلبِ محمدی پر خدا کے حکم کے مطابق نازل کیا ہے اور جو کچھ نازل کیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو خود تمہارے ہاں موجود ہیں - اور تیسرے یہ کہ یہ وحی، ہدایت و سعادت کو بنی اسمٰعیل میں محدود نہیں کرتی (کہ تمہیں شکایت ہو کہ تم اس سے محروم کر دیئے گئے ہو) یہ تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے، اور ان لوگوں کی جو اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں، زندگی کی صحیح منزل کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور حال و مستقبل کی خوشگواریوں کی خوشخبری دیتی ہے (خواہ وہ کسی نسل سے کیوں نہ ہوں) -

(۹۸)- (ان سے کہو کہ) تمہارے اس اعتراض کی نشتر، صرف جبریل تک ہی نہیں پہنچتی - یہ تو خود خدا پہ اعتراض ہے اور اس کے تمام نظامِ وحی پر، اور ان وسائط پر جو اس کے حکم سے تدبیرِ امور کرتے ہیں ـــــ یعنی جبریل و میکائیل سمیت تمام ملائکہ پر اعتراض ـــــ اس قسم کا اعتراض، درحقیقت، خدا اور اس کے نظام سے کھلا ہوا انکار ہے۔ سوچو، کہ جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کئے ہوں، خدا ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے!

(۹۹)- (ان سے کہدو کہ تمہاری تمام مخالفت، اور حسد و عناد کے علی الرغم) خدا نے یہ واضح تعلیم تیری طرف نازل کی ہے۔ اس سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو زندگی کے صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے ہوں۔

(۱۰۰)۔ (یہ تو ہے ان کی اعتقادی زندگی کا عالم۔ باقی رہی ان کی عملی زندگی، سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ) جب یہ کسی سے عہد و پیمان کرتے ہیں تو (اگرچہ وہ عہد و پیمان پوری کی پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے لیکن) ان میں سے ایک جماعت اس معاہدہ کو، ردی کاغذ کا ٹکڑا سمجھ کر پھینک دیتی ہے اور اس کا کوئی احترام نہیں کرتی ــــ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کسی مستقل قدر اور غیر متبدل اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتے، (مصلحت کوشی ان کا شیوہ اور مفاد پرستی اس کا شعار ہے۔ وہ کسی طریق سے بھی حاصل ہو)۔

(۱۰۱)۔ (اے رسول! یہ جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہمیشہ یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔ مثلاً تم سے پہلے) جب ان کی طرف ایک رسول (عیسےٰؑ) آیا ــــ وہ رسول جو (تمہاری طرح) ان اقدار و دعاوی کو سچ کر دکھانے والا تھا جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے پاس موجود تھے۔ (اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھا، اور ان کی کتابوں میں اس کا صریح ذکر بھی موجود تھا) لیکن اس کے باوجود، ان لوگوں کے ایک گروہ نے، جو کتاب الٰہی اپنے پاس رکھتے تھے، اس کتاب کو یوں پس پشت ڈال دیا، گویا وہ اُسے جانتے تک نہ تھے (اور اس رسول کے قتل تک کے درپے ہوگئے)۔

(۱۰۲)۔ (ان لوگوں کا شیوہ ہی یہ رہا ہے کہ یہ خدا کی سچی تعلیم کو ٹھکراتے رہے) اور اپنے خود ساختہ افسانوں کے پیچھے لگے رہے۔ اُن افسانوں میں ایک یہ بھی تھا کہ (انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر) سلیمانؑ حقائق خداوندی کو چھوڑ کر، سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔

سلیمانؑ خدا کا پیامبر، اور اس قسم کی کافرانہ روش کا حامل! یہ یکسر افترا پردازی تھی، جو اس کی نبوت کے خلاف ان شیاطین نے تراش رکھی تھی۔ اس باطل روش کا اتباع سلیمانؑ نے نہیں کیا تھا، خود ان کے فتنہ پرداز سرغنوں نے کیا تھا۔ وہ لوگوں کو جادو، ٹونے سکھاتے تھے (اور اسے منسوب کرتے تھے سلیمانؑ کی طرف)۔

پھر ایک افسانہ یہ بھی تھا (جو انہوں نے مشہور کر رکھا تھا) کہ بابل میں دو فرشتے تھے ــــ ہاروت و ماروت ــــ ان پر خدا نے اس علم (جادو) کو نازل کیا تھا۔ لوگ ان کے پاس جا کر اس قسم کے تعویذ گنڈے سیکھتے جن سے میاں بیوی میں افتراق پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ (فرشتے) یہ کچھ سکھانے سے پہلے لوگوں سے کہہ دیتے کہ بھائی! ہم تو ایک فتنہ ہیں۔ تم یہ کچھ سیکھ کر کیوں کافر بنتے ہو۔ (لیکن اس کے باوجود، لوگ ان سے یہ باتیں سیکھتے ــــ ان باتوں میں لذت ہی ایسی ہوتی ہے)۔

لیکن یہ سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ نہ بابل میں اس قسم کے کوئی فرشتے تھے۔ اور نہ ہی خدا نے انہیں کوئی باطنی علم سکھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی خود ساختہ کہانیاں ہیں۔

باقی رہے گنڈے، تعویذ- سو یہ، ان کے ذریعے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے. نفع و نقصان، سب قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے. تعویذ گنڈے سیکھنے (اور کرنے) والوں کو اس سے کچھ دنیاوی مفاد ضرور حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن (ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ) اس میں ان کا نقصان ہی ہے، نفع نہیں- اس لئے کہ اس سے انہیں دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا- (اور یہ حقیقت ہے کہ مستقبل کی خوشگواریوں کے مقابلہ میں، عاجلہ مفاد کچھ وزن نہیں رکھتے) ـــــ جو شخص جان دے کر، جسم کی لذتیں خریدتا ہے، اس کی تجارت نفع کا سودا کس طرح قرار پا سکتی ہے؟ اے کاش! یہ اس قدر کھلی ہوئی بات کو سمجھ سکتے-

(۱۰۳) اگر یہ لوگ ان افسانوں کے پیچھے لگنے کے بجائے، قرآنی حقائق پر ایمان لے آتے، اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے تو خدا کے ہاں سے انہیں اس کا بہت اچھا بدلہ (نتیجہ) ملتا ـــــ کاش، یہ عقل و فکر سے کام لیتے!

(۱۰۴) اے جماعتِ مؤمنین! اس مقام پر ایک اہم حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے- تم نے دیکھا ہے کہ یہودیوں کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ موسیٰؑ سے بار بار اس قسم کے مطالبے کرتے تھے کہ ہمارے لئے یہ مہیا کر دو تو ہم تمہاری بات مانیں گے- یہ روش زندگی غلط ہے تم یہ نہ کرنا کہ اپنے نظام سے اس قسم کی سودے بازی شروع کر دو- اور اس سے کہہ دو کہ اگر تم ہماری رعایت کرو گے تو ہم تمہاری رعایت کریں گے..... تمہارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ تم اپنے رسول (نظامِ خداوندی کے مرکز) سے یہ کہو کہ آپ ہم پر نگاہ رکھیں کہ ہم بے راہ نہ ہونے پائیں، اور ہم آپ کی اطاعت کرتے جائیں گے-

نیز باہمی گفتگو میں، ذو معنی الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں- نہ ہی بات توڑ مروڑ کر کرنا چاہئے یہودیوں کی یہ بھی عادت ہے (۴/۴۶)-

یاد رکھو! یہ باتیں یوں تو بڑی عام سی دکھائی دیتی ہیں، لیکن ان کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں- جو لوگ ان حقیقتوں سے انکار کرتے ہیں وہ الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں-

(۱۰۵)- ان اہلِ کتاب، اور مشرکینِ عرب میں سے جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے کہ تمہاری طرف خدا کی وحی آئے (۳/۷۲ ; ۱۶/۳۴) اور اس کی بناء پر تمہیں زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں- لیکن اس میں ان کے چاہنے یا نہ چاہنے کا کیا سوال ہے؟ یہ سب کچھ خدا کے قانون کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے- وہ جس فرد کو چاہتا ہے وحی کے لئے چن لیتا ہے، اور پھر جو چاہے اس وحی کی خیر و برکت سے مستفید ہو سکتا ہے- اس کی نعمتوں کا دستر خوان ہر شخص کیلئے کھلا ہے- جو ہاتھ بڑھا کر کچھ لینا چاہے لے لے-

(۱۰۶) ان (اہلِ کتاب) کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں، تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی- نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں

ان سے کہدو کہ ہماری طرف سے وحی کا انداز یہ ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام، جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے، انہیں، بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا ہے، اور یہ نئے احکام پہلے احکام سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن سابقہ احکام کے متعلق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے، یا جنہیں سابقہ رسولوں کی قومیں ترک یا فراموش کر دیتی ہیں، یا ان میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتی ہیں (۲۲/۵۲)۔ ان کی جگہ، انہی جیسے احکام، جدید وحی میں دیدیئے جاتے ہیں (۱۶/۱۰۱)۔ اور یہ سب کچھ ہمارے مقرر کردہ اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

انہی اندازوں کے مطابق اب یہ آخری ضابطۂ حیات دیا گیا ہے، جس میں تمام سابقہ سچائیاں آگئی ہیں (۵/۴۸)۔ جو ہر طرح مکمل ہے (۶/۱۱۶)، اور جو ہمیشہ محفوظ رہے گا (۱۵/۹)۔ اس لئے یہ ضابطہ، اب تمام سابقہ ضوابط کی جگہ لے گا، اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا۔

(۱۰۷)۔ ان سے کہو کہ اس بارے میں کوئی شخص خدا پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے وحی کا انتظام ایسا کیوں رکھا ہے؟ کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب اقتدار اسی کا ہے۔ اس لئے وہی جانتا ہے کہ کونسا قانون کب نافذ کرنا چاہیئے۔ (ان سے کہہ دو کہ)، اس کے باوجود، اگر تم اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت سے انکار کرتے رہو گے تو تم خود دیکھ لوگے کہ کوئی دوسرا ضابطہ، زندگی کی مشکلات دور کرنے میں تمہارا کارساز اور مددگار نہیں ہو سکے گا۔

(۱۰۸)۔ اس سلسلہ میں (اے جماعتِ مومنین!) تم بھی ایک بنیادی حقیقت کو سمجھ لو۔ اور وہ یہ کہ جس قدر احکام و قوانین کا دیا جانا خدا کو مقصود ہے، وہ سب، از خود، قرآن میں دیدیئے جائیں گے، اور جن امور کے متعلق کچھ نہیں کہا جائے گا، ان کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے، خدا سے بھول نہیں ہو گئی۔ لہٰذا ان امور کے متعلق تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات نہ شروع کر دینا جس قسم کے سوالات، اس سے پہلے، بنی اسرائیل اپنے رسول (موسیٰؑ)، سے کیا کرتے تھے۔ (اس کرید کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایسی باتوں کو اپنے لئے غیر متبدل شریعت بنا لیا جن کا ہمیشہ کے لئے نباہنا مشکل تھا۔ آخر الامر انہیں ان سے انکار کرنا پڑا۔ سو تم بھی ایسا نہ کرنا (۵/۱۰۱)۔ جو قوم بھی ایمان سے بہرہ یاب ہو کر پھر کفر کی روش اختیار کرے، فلاح و بہبود کی راہ اس سے گم ہو جاتی ہے۔

(۱۰۹)۔ ان اہلِ کتاب میں سے اکثر چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہارے اس ایمان کے بعد، تمہیں پھر کفر کی طرف لوٹا دیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ حقیقت ان پر واضح نہیں ہوئی۔ حقیقت تو ان کے سامنے نکھر کر آ چکی ہے، لیکن یہ اپنے قومی تعصب کی بنا پر اس دین کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں، اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ زندگی کی برکات سے تم فیض یاب ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ تم ابھی اپنے نظام کے ابتدائی دور سے گذر رہے ہو۔ اس لئے ان سے اُلجھ کر اپنا وقت اور توانائی ضائع مت کرو۔ اس وقت تک کہ فیصلہ کن انقلاب کا مرحلہ سامنے نہ آجائے، تم ان سے اعراض برتو، اور ان کا خیال کئے بغیر، اپنے پروگرام کی تکمیل میں آگے بڑھتے جاؤ، اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے درگزر کرو (۵/۱۳؛ ۱۵/۸۵؛ ۴۳/۸۹؛ ۱۱/۱۰)۔ خدا ہر بات کے انداز سے واقف ہے اور حالات پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ کس موقعہ پر کونسی روش اختیار کرنی چاہیئے۔

(۱۱۰)۔ اس پروگرام کی تکمیل، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ہوگی۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنے سے جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کے پیچھے چلتے ہوئے، ان کی رُو سے عائدشدہ فرائض کو ادا کرتا جائے، اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا رہے (۲/۳)۔ اس ابتدائی مرحلہ میں ایسا محسوس ہوگا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ لیکن، یقین رکھو کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ تم اپنی محنتوں کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، وقتِ مقررہ پر، اپنے سامنے دیکھ لوگے (۲/۱۱۰)۔ کسی کا کوئی عمل، اس کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔

(۱۱۱)۔ ان (اہل کتاب) کا دعوٰے ہے کہ جنت بس انہی (یہود و نصاری) کے لئے مخصوص ہو چکی ہے، ان کے علاوہ اس میں کسی اور کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ (۲/۱۳۵)۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے جو ان کے فریبِ نفس اور جہالت نے پیدا کر رکھی ہے۔ ان سے کہو کہ، ذرا جذبات سے الگ ہٹ کر، علم و بصیرت کی رو سے بات کریں، اور اگر یہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں، تو اس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کریں — حقائق کے فیصلے خوش آیند جذبات کی رُو سے نہیں ہوا کرتے، علم و برہان سے ہوتے ہیں۔

(۱۱۲)۔ اور علم و برہان کا فیصلہ یہ ہے کہ زندگی کی خوشگواریاں اور کامرانیاں، قومی گروہ بندیوں اور دل خوش کن آرزوؤں سے وابستہ نہیں۔ ان کے لئے ایک ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جس کسی نے بھی اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دیا۔ جس نے اپنا رخ اس منزل کی طرف کر لیا جو اللہ نے انسانوں کے لئے مقرر کی ہے — اور اس کے بعد (افراط و تفریط کو چھوڑ کر ۲/۱۴۳؛ ۴۱/۳۰)، حسن کارانہ انداز سے (قرآن کے مطابق) زندگی بسر کی، تو اس کے اس ایمان و عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، اسے مل جائے گا۔ ایسے لوگوں کی نشانی یہ ہوگی کہ نہ ان کے لئے کسی قسم کا خوف و خطر ہوگا، اور نہ ہی افسردگی اور غمگینی۔

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب ــــــــــــ مطالب الفرقان (جلد سوم)

مصنف ــــــــــــ غلام احمد پرویزؒ

پبلشرز ــــــــــــ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور۔

پرنٹر ــــــــــــ خالد منصور نسیم

پریس ــــــــــــ النور پرنٹرز و پبلشرز

۲/۳ فیصل نگر ملتان روڈ۔ لاہور

ایڈیشن ــــــــــــ اوّل (نومبر ۱۹۷۹ء)

دوم (نومبر ۱۹۸۸ء)

سوم (مارچ ۱۹۹۳ء)

ضخامت ــــــــــــ ۱۶ + ۵۳۲ = ۵۴۸ صفحات

باسمہ تعالیٰ

آئینہ مطالب

جلد سوم

مضمون	صفحہ
فہرست	و
حرفِ آغاز	س
پہلا باب۔ الدّین کے بنیادی اصول	۲
آیات ۲/۱۱۳ تا ۲/۱۲۳	۳
۲/۱۱۳ وقالت الیہود ...... یختلفون	
الدّین شروع سے ایک ہی چلا آتا تھا۔	۴
رسول کے بعد اس میں آمیزش ہوجاتی۔	۵
اور مذہبی فرقے پیدا ہو جاتے۔	۶
اسلام میں اس کا امکان نہیں تھا	۶
لیکن اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔	۶

مضمون	صفحہ
ختمِ نبوت	۶
اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔	
اس کا صحیح مفہوم	۸
کتاب اللہ کی حکمرانی۔ حکومتِ خداوندی	۹
۲/۱۱۴ ومن اظلم ..... خرابھا	
مساجد کا صحیح مفہوم۔ اطاعتِ خداوندی کا نظام	۱۰
دعا کا ضمنی مفہوم۔ رہبانیت کے خلاف	۱۱ - ۱۲
ذرائع اور مقصد میں فرق	
ذکر کا مفہوم	۱۳
اسم اللہ کا مفہوم۔ صفاتِ خداوندی کی جلوہ باریاں	۱۴
۲/۱۱۴ اولٓئک ..... عظیم	

مضمون	صفحہ
ہماری مساجد کی حالت	۱۶
۲/۱۱۵ وللہ المشرق ..... علیم	
خدا زمان و مکان کی نسبتوں سے بلند ہے	۱۷
۲/۱۱۶ وقالوا ..... قانتون	
عیسائیوں کا ابن اللہ کا عقیدہ	۱۸
۲/۱۱۷-۱۱۸ بدیع السمٰوٰت .... یوقنون	
کلام اللہ وحی کو کہتے ہیں جس کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہوگیا۔	۱۹
حضرت موسیٰؑ سے کلام کرنے کا مفہوم	۲۰
خدا کے لئے الفاظ کا مجازی مفہوم	۲۱
حضرت موسیٰؑ کی، خدا کو بے حجاب دیکھنے کی درخواست	۲۲
خدا کے انسانوں کے ساتھ کلام کرنے کے تین طریقے	۲۲
معجزات طلبی	۲۳
کرامات کا عقیدہ	۲۵
۲/۱۱۹ انا ارسلنٰک ..... اصحاب الجحیم	
رسول کا فریضہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا تھا۔	۲۶
اس راستے پر زبردستی چلانا نہیں تھا۔	۲۷
۲/۱۲۰ ولن ترضٰی ..... نصیر	
اہل کتاب حضورؐ پر بہت کم ایمان لاتے۔	۲۸
صرف اسلام ہی سچا دین کیوں ہے؟	۲۸
ملت کا مفہوم	۲۹
مومنین اور اہل کتاب	۳۱
۲/۱۲۱ الذین ..... خسرون۔	
تلاوت کے معنے قرآن مجید کا اتباع کرنا ہیں۔	۳۲
۲/۱۲۲-۱۲۳ یٰبنی اسرائیل ..... ینصرون۔	
بنی اسرائیل اور قانونِ مکافاتِ عمل۔	۳۳
دوسرا باب ــــ معمارِ حرم	
آیات ۲/۱۲۴ تا ۲/۱۴۱	
۲/۱۲۴ واذ ابتلٰی ..... فاتمھن۔	
تمام رسولوں پر ایمان ضروری ہے۔	۳۶
تفریق بین الرسل جائز نہیں۔	۳۶
حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کا آغاز	۳۷
ابتلائے ابراہیمیؑ	۴۰
۲/۱۲۴ قال انی جاعلک للناس اماما ..... ظلمین۔	
نوعِ انسانی کی امامت	۴۱
امام کے معانی	۴۱
تفسیر ابن کثیر کی رُو سے ان ..... احکامات کی تفصیل	۴۲
نسلی امتیاز کا باطل نظریہ	۴۳
وراثت کا باطل نظریہ	۴۴
نظام کن بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے	۴۴
کعبہ۔ مرکز نظامِ خداوندی	۴۴

مضمون	صفحہ
ہجرت کا مفہوم اور اہمیت	۴۵
حضرت اسماعیلؑ کی وادیٔ حجاز کی طرف نقل مکانی	۵۳
تورات کا افسانہ	۵۳
بخاری کی روایت	۵۴
۲/۱۲۵ واذجعلنا ...... السجود۔	۵۵
کعبہ مرکزِ اجتماعِ امت ہے۔	۵۵
حج۔ عالمگیر انسانیت کا نقطۂ اجتماع	۵۶
طواف کا مفہوم	۵۷
عاکفین کا مفہوم	۵۸
بَیتی۔ خدا کا گھر ہونے کا مطلب	۵۸
مذہب میں کعبہ کی حیثیت	۶۰
رسمی اعمال کا رائیگاں جانا	۶۰
۲/۱۲۶ واذقال ابراهیم .... بئس المصیر۔	۶۰
رزق کے لئے دعائیں	۶۱
رزق کے دروازے، مومن و کافر سب کے لئے کھلے ہیں۔	۶۳
۲/۱۲۷-۱۲۸ واذیرفع ...... الرحیم	۶۴
وادیٔ حجاز کو مرکزیت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا تھا۔	۶۵
۲/۱۲۹ ربنا .... الحکیم۔	۶۵
انسانی ذات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنے والے۔	۶۵
۲/۱۳۰ ومن یرغب .... صالحین	۶۵

مضمون	صفحہ
اسلاف کے اعمال اگلی نسل کے کام نہیں آتے	۶۸
۲/۱۳۱-۱۳۲ اذ قال له ..... مسلمون	۶۸
اسلام عمر بھر کا مسلسل پروگرام ہے	۶۸
قوموں کے عروج و زوال کا ابدی اصول	۶۹
۲/۱۳۳-۱۳۴ ام کنتم ..... یعملون	۶۹
اسلاف کی بابت مت بحثوں میں پڑو	۶۹
قرآنِ کریم نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا تھا	۷۰
دین، اللہ کا عطا کردہ ہوتا ہے	۷۰
اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں کرنی چاہئے	۷۱
مذہب کی نسبت اسکے بانی کی طرف ہوتی ہے	۷۱
۲/۱۳۵ وقالوا ...... مشرکین۔	۷۱
حنیف کا مفہوم	″
ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے	۷۲
۲/۱۳۶-۱۳۷ قولوا آمنا ..... علیم۔	
اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ	۷۳
جس طرح تم ایمان لائے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں۔	۷۳
۲/۱۳۸ صبغة الله .... عابدون	۷۴
صبغۃ اللہ کا مفہوم	۷۴
عیسائیوں کا بپتسمہ یا اصطباغ	۷۵
۲/۱۳۹ قل اتحاجوننا .... مخلصون	۷۶
دین کی صداقت کا استنتاجی طریق	۷۶

مضمون	صفحہ
۲/۱۴۰-۱۴۱ ام تقولون ..... یعملون.	
ماضی پرستی کی تباہ کاریاں	۷۸
(پہلا پارہ ختم)	
تیسرا باب ___ مرکزِ ملت۔ کعبہ	۸۰
آیات ۲/۱۴۲ تا ۲/۱۵۲	
کعبہ کی مرکزیت	۸۰
قریشِ مکہ اور یہودیوں کی مخالفت	۸۰
۲/۱۴۲ سیقول ...... مستقیم.	۸۲
تحویلِ قبلہ کی روایات	۸۳
معراج سے متعلق روایات	۸۴
نمازیں کیسے فرض ہوئیں	۸۶
ایسی تفسیریں کس طرح لکھی گئیں اور قرآنِ کریم کے	۸۸
اس قسم کے ترجمے کس طرح ہو گئے	
وحی کی دو قسمیں !	"
کعبہ، امت میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے	۸۹
۲/۱۴۳ وکذالک ..... رحیم.	
امتِ مسلمہ کی تشکیل اور اس کا فریضہ	۹۰-۹۲
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	"
ولتکم منکم امة .... کا غلط مفہوم	۹۳
جماعت مومنین کی اہمیت	۹۴

مضمون	صفحہ
اس امت کا موسس (حضرت ابراہیمؑ)	۹۴
تعینِ قبلہ کا مقصد	۹۵
۲/۱۴۴-۱۴۶ قد نریٰ ..... یعلمون.	
تربیتی مرکز	۹۷
اب منقولات کے بجائے استدلالی دور آچکا ہے	۹۹
۲/۱۴۷-۱۴۸ الحق .... قدیر.	
محسوس علامات کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا	۱۰۱
۲/۱۴۹-۱۵۱ ومن حیث .... تعلمون.	
کعبہ، مرکزِ قلب و نظر	۱۰۳
۲/۱۵۲ فاذکرونی ..... تکفرون	
ذکر کے معنی شرف و عظمت۔ عمرہ	۱۰۴
تقدیر۔ آغازِ کار انسان کے ہاتھ میں ہے۔	۱۰۵
حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق	۱۰۵
چوتھا باب ___ رزمگاہِ حیات	۱۰۷
آیات ۲/۱۵۳ تا ۲/۱۷۶	
استعانت بالصبر والصلوٰة	۱۰۹
۲/۱۵۳ یا یھا الذین .... صابرین.	
مقتولین فی سبیل اللہ	۱۱۰
(شہداء)	
۲/۱۵۴ ولا تقولوا ..... تشعرون.	

مضمون	صفحہ
شہداءِ جنگِ پاکستان کے متعلق افسانے	۱۱۱
[۲/۱۵۵] ولنبلونکم ..... صابرین۔	
ابتلاء کا مفہوم	۱۱۲
[۲/۱۵۶] الذین اذا ..... راجعون	
انا للہ وانا الیہ راجعون کا صحیح مفہوم	۱۱۲
[۲/۱۵۷] اولئک ..... مھتدون	
درود کا مفہوم	۱۱۳
قرآنی اصطلاحات	۱۱۴
اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت	۱۱۴
صلّٰی علیہ کے معنی	۱۱۵
[۲/۱۵۸] ان الصّفا .... علیم	
حج اور عمرہ کا مفہوم	۱۲۰
جُناح کا مفہوم	۱۲۰
صفا اور مروہ	۱۲۱
شعائر اللہ کا مفہوم۔ شعائر بھی ضروری ہیں۔	۱۲۲
[۲/۱۵۹] ان الّذین ..... لاعنون	
قرآن بالکل واضح کتاب ہے۔	۱۲۴
قرآنی تعلیم کو چھپانے کے طریق	۱۲۵
فقہ	۱۲۵
قرآن کے باطنی معانی	۱۲۶
لعنت ہر طرف سے	۱۲۶
[۲/۱۶۰-۱۶۲] الا الذین ..... ینظرون۔	
توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ لیکن کس کے لئے؟	۱۲۷
اور کس کے لئے بند ہو جاتا ہے؟	۱۲۷
ہماری حالت	۱۲۸
[۲/۱۶۳] والٰھکم .... الرحیم	
جملہ کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے	۱۲۹
[۲/۱۶۴] انّ ..... یعقلون۔	
اس کی شہادت خود کارگہِ کائنات ہے	۱۲۹
[۲/۱۶۵] ومن النّاس .... العذاب	
محبت (عشق) خدا کے ساتھ؟	۱۳۰
عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی!	۱۳۰
وصال اور عرس!	۱۳۰
حب اللہ کا قرآنی مفہوم	۱۳۱
[۲/۱۶۶-۱۶۷] اذ تبرّا الذین .... النّار	
تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔	۱۳۳
دنیا میں لوٹ کر نہیں آیا جا سکتا	۱۳۴
[۲/۱۶۸-۱۶۹] یایھا النّاس ..... تعلمون	
حلال اور طیب رزق	۱۳۵
فحشاء کے معنی	۱۳۶
سیّئات کے معنے	۱۳۷
حسنات کے معنی	۱۳۷
[۲/۱۷۰] واذا ..... یھتدون	

مضمون	صفحہ
مسلکِ تقلید	۱۳۸
وثن کے معنی	۱۳۸
وہائٹ ہیڈ کی وضاحت	۱۳۹
۲/۱۷۱ ومثل الذین .... یعقلون	
حیوانی روش	۱۴۰
۲/۱۷۲ یایھا الذین ..... تعبدون	
حرام اور حلال کا نظریہ	۱۴۰
۲/۱۷۳ انما حرم ..... رحیم	
حرام چیزوں کی فہرست	۱۴۳
غیر اللہ کی طرف منسوب	۱۴۴
اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا	۱۴۵
خنزیر کے گوشت سے متعلق بحث	۱۴۶
۲/۱۷۴ ان الذین ..... الیم	
حرام چیزوں کی فقہی فہرستیں	۱۴۸
۲/۱۷۵-۱۷۶ اولٰئک ...... بعید	
مذہبی پیشواؤں کا کاروبار	۱۴۹
پانچواں باب — بیّنات اور کتاب	
آیات ۲/۱۷۷ تا ۲/۱۸۸	
دلائل۔ قوانین اور شمشیر۔ تشکیلِ نظامِ خداوندی کی تین کڑیاں	۱۵۳

مضمون	صفحہ
۲/۱۷۷ لیس البر..... المتقون	
بِر کی راہ کونسی ہے؟	۱۵۴
ذرائع اور مقصد کا باہمی تعلق	۱۵۴
پانچ اجزائے ایمان	۱۵۵
قبلہ کی طرف رُخ کر لینا مقصود بالذات نہیں	۱۵۵
اعمالِ صالح کی تفصیل	۱۵۵
ان اجزاء کی تشریح	۱۵۷
ذوی القربٰی۔ یتامٰی۔ مساکین۔ ابن السبیل۔	۱۵۷
سائلین، فی الرقاب، العقبۃ۔ دین کی گھاٹی کیا ہے	۱۵۸-۱۵۹
ذلّت کے اسباب	۱۶۱
یتامٰی کی عزت نہ کرنا	۱۶۱
نظامِ ربوبیت کی خصوصیات	۱۶۱
غلامی کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کی امداد	۱۶۱
جمہوریت کا بنیادی نقص	۱۶۱
نظامِ خداوندی کی عملی شکل	۱۶۲
زکوٰۃ کی مزید تشریح	//
رزق کے لئے انتظامات	۱۶۳
ایفائے عہد کا مفہوم	۱۶۳
نظریۂ میثاق	۱۶۴
امانات کا مفہوم	۱۶۴
میثاقِ خداوندی کی عملی شکل	۱۶۵
حقوق و فرائض	۱۶۵

مضمون	صفحہ
میدانِ جنگ میں، مادی اسباب کی اہمیت	۱۶۸
انسانی جان کی قدر و قیمت	۱۶۸
شہید کا مفہوم دین میں	۱۶۸
۲/۱۷۵-۱۷۹ یاایھا الذین ..... تتقون	
قصاص کا حکم	۱۶۹
کُتِبَ کے معنی	۱۶۹
جرم و سزا کا فلسفہ	۱۷۱
۲/۱۸۰ کتب علیکم ..... متقین	
مال کی اہمیت	۱۷۶
وصیت کا حکم	۱۷۷
۲/۱۸۱-۱۸۲ فمن ..... رحیم	
موجودہ قانونِ شریعت اس کے خلاف ہے	۱۷۹
حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟	۱۷۹
ایسا عقیدہ ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف گستاخی ہے	۱۸۰
روح فرسا واقعات	۱۸۱
ائمہ کا فیصلہ	″
وصیت کے متعلق ایسا قانون بن ہی نہیں سکتا جو کتاب و سنت کے مطابق ہو۔	۱۸۲
حق تلفی	۱۸۲
۲/۱۸۳ یاایھا الذین ..... تتقون۔	۱۸۲
حکم اور قانون میں فرق	۱۸۲
صوم (روزوں) کے احکام	۱۸۴

مضمون	صفحہ
کتاب و حکمت۔ قانون اور اسکی غایت کا باہمی تعلق	۱۸۶
ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟	۱۸۶
روزوں کے احکام کی تفصیل	۱۸۷
۲/۱۸۴ ایاما ..... تعلمون	
الذین یطیقونہ کی قدامت پرستانہ تفسیر	۱۸۸
نزولِ قرآن۔ کائناتِ انسانیہ کا عظیم ترین انقلابی واقعہ	۱۹۰
غیر مسلموں کی شہادت	۱۹۱
واقعہ نزولِ قرآن پر جشنِ مسرت منانا	۱۹۲
۲/۱۸۵-۱۸۸ شھر ..... تعلمون	
روزوں کے مزید احکام	۱۹۳
اعتکاف کا مفہوم	۱۹۴
لیلۃ القدر	۱۹۵
شبِ برات کا تیوہار	۱۹۵
روزوں کی غایت ۔ ان سے مقصد	۱۹۷
خدا کی کبریائی کا عملی مفہوم۔ نظامِ خداوندی کا غلبہ	۱۹۷
اللہ اکبر کا مفہوم	۲۰۱
حزب اللہ کا غلبہ	۲۰۱
جانور ذبح کرتے وقت تکبیر کا مقصد	۲۰۲
مالِ حرام سے اجتناب	۲۰۳
رشوت کی ممانعت	۲۰۳
دعا کا تفصیلی بیان	۲۰۴

مضمون	صفحہ
اس کے غلط مفہوم سے پیدا ہونے والے شکوک اور اعتراضات	۲۰۴
السلطان ظل اللہ علی الارض کا عقیدہ	۲۰۷
دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں۔	۲۰۸
حضرات انبیاء کرامؑ کی دعائیں	۲۱۱
مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں	۲۱۳
مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں۔	۲۱۵
دعا سے ہوتا کیا ہے؟ نفسیاتی تبدیلی۔	۲۱۷
ایک دوسرے کے لئے دعائیں۔	۲۲۱
معراجِ نبویؐ کا مفہوم	۲۲۲
مقربینِ بارگاہِ خداوندی	۲۲۳
قرآن سے جواب ملتا ہے	۲۲۴
مرشد صرف خدا ہے۔	۲۲۵
کفارہ کے روزے	۲۲۶
چھٹا باب —— آل ورلڈ مسلم کانفرنس	
حج کا اجتماع	
آیات ۲/۱۸۹ تا ۲/۲۱۸	
حج اور عمرہ کے اجتماعات عہد جاہلیہ میں	۲۲۸
شھر الحرام	″
۲/۱۸۹ یسئلونك .... تفلحون	

مضمون	صفحہ
قمری اور شمسی کیلنڈر	۲۳۰
نسیٔ کا عملی مفہوم	۲۳۱
سال کے بارہ مہینے لیکن کیلنڈر قمری	۲۳۲
اس سے پیدا ہونے والی الجھنیں	۲۳۳
اسلام توہم پرستی کو مٹانے کے لئے آیا تھا	۲۳۴
مذہب میں دین کے ارکان توہم پرستی بن جاتے ہیں	۲۳۴
حج کے اجتماع پر غیر مسلموں کو دعوتِ مشاہدہ	۲۳۵
آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵ کی تشریح صفحہ ۲۶۶ - ۲۸۱ پر دیکھئے	
۲/۱۹۶ واتموا الحج .... شدید العقاب	۲۳۸
حج کے مزید احکام	
۲/۱۹۷ الحج .... الباب	
عقل کی اہمیت	۲۳۹
۲/۱۹۸ لیس .... الضالین	
احرام	″
۲/۱۹۹ ثم افیضوا .... رحیم	
قربانی، نسك، نحر	۲۴۴
سنتِ ابراہیمیؑ (ذبح عظیم)	۲۵۰
حجرِ اسود	۲۵۲
رمی الجمارۃ تین شیطانوں کو پتھر مارنا	۲۵۲
اصحاب الفیل (ہاتھیوں والے کا لشکر)	۲۵۳
۲/۲۰۰-۲۰۴ فاذا .... الد الخصام	

مضمون	صفحہ
دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں	۲۵۵
دنیا کے مقابلے میں آخرت کا مفہوم	״
مذہب میں اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں	۲۵۵
نظامِ خداوندی کے دشمن لیکن ایمان کے مدعی	۲۵۵
سیکولرازم مذہب کے نقاب میں۔	۲۵۶
۲/۲۰۵-۲۰۶ واذا تولیٰ ..... المھاد	
مستبد حکمران	۲۵۷
تکذیب دین کرنے والے	״
اثم و عدوان	۲۵۸
یہ تباہی ساری قوم کی ہوتی ہے	۲۵۸
۲/۲۰۷ ومن الناس ..... العباد	
مرضات اللہ کا مفہوم	۲۵۹
خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا تصور	۲۵۹
رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ	۲۶۰
قتال کے مقاصد اور ہدایات	۲۶۴
آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵	
۲/۱۹۰-۱۹۳ وقاتلوا ..... الظلمین۔	
"اسلام بالتلوار" کا گمراہ کن پراپیگنڈہ	۲۶۶
جنگ کے متعلق تفصیلی بحث	
اسلام کی وحشت انگیز تصویر	۲۶۶
مودودی مرحوم کی تفسیر	۲۶۷

مضمون	صفحہ
مرتد کی سزا۔ قتل	۲۷۰
فی سبیل اللہ کا مفہوم	۲۷۴
طاغوت سے مراد	۲۷۴
فتنہ سے مراد	۲۷۵
۲/۱۹۴ الشھر الحرام ..... المتقین	
مذہبی آزادی کی خاطر جنگ	۲۷۷
انسان کا اختیار سلب کر لینا بدترین استبداد ہے	
حرمات کے مہینوں کی پابندی	۲۸۱
۲/۱۹۵ وانفقوا فی ..... المحسنین	
جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے	۲۸۱
———(۰)———	
۲/۲۰۸ یاایھا الذین ..... مبین۔	
اسلام کی تشریح و توضیح	۲۸۲
اسلام کلی تغیر چاہتا ہے اور محیط کل نظام ہے	۲۸۳
کافۃ اسلام کا مطالبہ	
۲/۲۰۹ فان زللتم ..... حکیم۔	
قوت اور حکمت کا امتزاج	۲۸۳
اسلامی نظام کو مسلسل قائم رکھنا ہوگا	۲۸۴
قانون استبدال و استخلاف قومی	۲۸۵
قوموں کی باز آفرینی کا امکان	۲۸۷
سیکولرازم کے تحت حکومت کا انجام	״
۲/۲۱۰-۲۱۲ ھل ینظرون ..... حساب	

مضمون	صفحہ
اس کے لئے خدا خود نہیں آیا کرتا۔ اس کا قانونِ مکافات یہ نتائج پیدا کر دیتا ہے۔	۲۸۸
۲/۲۱۳ کان الناس ...... مستقیم	
وحدت انسانیت۔ وحی کا منتہیٰ	۲۹۰
ہمارے اختلافات کس طرح مٹ سکتے ہیں؟	۲۹۲
نوعِ انسان کے اختلافات کی تاریخ	۲۹۳
امتِ مسلمہ کی تشکیل۔ ایک ملت۔	۲۹۵
اس کی مخالفت	۲۹۵
۲/۲۱۴ ام حسبتم ...... قریب۔	
جنت یونہی نہیں مل جائے گی	۲۹۶
جنگِ احزاب کا ہولناک نقشہ	۲۹۷
حصولِ جنت کے آسان طریقے	۲۹۸
جنت بطور "بخشش"	۳۰۱
یہ نظام قائم ہو کر رہیگا خواہ کسی قوم کے ہاتھوں ہو۔	۳۰۲
۲/۲۱۵-۲۱۶ یسئلونک ..... تعلمون	
انفاق کی اہمیت	۳۰۲
روزوں کی فرضیت پر اتنا زور، لیکن قتال کی فرضیت کا ذکر تک نہیں کیا جاتا	۳۰۴
میرزا غلام احمد نے جہاد کو منسوخ قرار دیدیا۔	۳۰۵
۲/۲۱۷-۲۱۸ یسئلونک .... رحیم	
ارتداد — قومی و انفرادی	۳۰۷
ہجرت کا قرآنی مفہوم اور مقام	۳۰۸

ساتواں باب — درونِ خانہ

آیات ۲/۲۱۹ تا ۲/۲۵۷

مضمون	صفحہ
۲/۲۱۹ یسئلونک ..... تتفکرون۔	
اثم و عدوان	۳۱۷
خمر کا مفہوم	۳۱۷
امتناعِ خمر کے تدریجی احکام	۳۱۷
جنت کی شراب	۳۲۱
بلا سمجھے نماز یا تلاوتِ قرآنِ مجید	۳۲۲
جُوا (میسرہ)	۳۲۲
نظامِ سرمایہ داری بھی میسرہ ہے	۳۲۳
انصاب۔ چڑھاوے	۳۲۴
ازلام۔ قرعہ اندازی، فالیں لینا، لاٹری	۳۲۴
قسمت کا حال پوچھنا	۳۲۴
عقیدۂ تقدیر	۳۲۴
قل العفو کی بحث۔ العفو کا مفہوم	۳۲۶
غور و فکر — اخروی زندگی تک میں بھی	۳۲۷
۲/۲۲۰-۲۲۲ فی الدنیا .... متطہرین	
رسول اللہ کی یتیمی کی حالت	۳۲۹
یتیموں کے متعلق احکام	۳۲۹
یتیموں کی دوسری قسم۔ بے یار و مددگار لوگ	۳۳۲

مضمون	صفحہ
العقبہ کا مفہوم	۳۳۲
قرآن کا معاشی نظام اور اس کی غایت	۳۳۳
تکذیب دین کرنے والے ــ سرمایہ دار	۳۳۴
عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات	۳۳۶
نکاح کی تفاصیل و شرائط	۳۳۶
(حضرت) عائشہؓ کی عمر بوقت شادی	۳۳۸
مودودی مرحوم اور نابالغ لڑکیوں کی شادی	۳۳۸
محرمات	۳۴۲
رضاعی ماں اور بہن	۳۴۳
تعدد ازواج	۳۴۵
رسولؐ اللہ کی ازواجِ مطہراتؓ	۳۴۸
مجرد، ضبطِ (عفت) نفس سے کام لیں۔	۳۵۲
مہر	۳۵۴
اجورھن سے مراد	۳۵۴
ایک ضمنی نکتہ۔ عربوں کے ہاں کی مروجہ اصطلاحات اور قرآنی اصطلاحات میں فرق۔	۳۵۵
(ضمناً) طلاق کے متعلق ایک نکتہ	۳۵۷
جہیز محض رسم ہے	۳۵۸
الرجال قوامون علی النساء کا مفہوم	۳۵۹
نسبی اور سسرالی رشتے	۳۷۰
جنسی اختلاط کے متعلق بحث	۳۷۰
اس کا مقصد۔ خاندانی منصوبہ بندی	۳۷۳

مضمون	صفحہ
عزل۔ استمناء بالید	۳۷۴
۲/۲۲۳ نساءکم .... مومنین	
نساءکم حرث لکم کی تفسیر روایات کی رُو سے	۳۷۷
۲/۲۲۴-۲۲۵ ولا تجعلوا .... حلیم	
ظہار	۳۸۱
۲/۲۲۶-۲۲۷ للذین .... علیم	
ایلاء	۳۸۳
طلاق سے متعلق احکام	۳۸۵
۲/۲۲۸-۲۳۷ والمطلقت .... بصیر	
حلالہ	۳۹۴
مُتعہ	۳۹۵
جنسی تعلقات کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق	۴۰۴
عدّت	۴۰۵
رضاعت (دودھ پلانا)	۴۱۰
حضانت (بچہ کس کی تحویل میں رہے)	۴۱۲
فلسفۂ موت وحیات	۴۱۳
۲/۲۳۸-۲۳۹ حافظوا .... تعلمون	
صلوٰۃ الوسطیٰ	۴۱۳
۲/۲۴۰-۲۴۲ صفحہ ۴۰۸، ۴۰۹ پر آ چکی ہیں۔	
۲/۲۴۳-۲۴۴ الم تر .... علیم	
فلسفۂ موت وحیات۔	۴۱۴
زندہ وہ رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا	

مضمون	صفحہ
قرض حسنہ۔ خدا کو قرض دینا	۴۱۶
[۲/۲۴۵] من ذالذی ..... ترجعون۔	
بنی اسرائیل کا ایک واقعہ	۴۱۹
[۲/۲۴۶-۲۴۸] الم تر...... مومنین۔	
کمانڈر کے انتخاب کا معیار۔ دولت نہیں۔	۴۲۰
اہلیت اور صلاحیت ہے۔	
تقدیراتِ الٰہیہ ہی قوانینِ خداوندی ہیں۔	۴۲۱
(حضرت) طالوت کا انتخاب	۴۲۱
علم اور قوت کا امتزاج	۴۲۱
تابوتِ سکینہ سے مراد	۴۲۲
کثرت و قلت کا باطل اصول	۴۲۴
[۲/۲۴۹-۲۵۲] فلما فصل ..... المرسلین۔	
کامیابی کا راز تعداد کی کثرت نہیں،	"
ایمان اور صلاحیت ہے۔	
مغربی جمہوریت۔	"
اذن اللہ کے معنی	۴۲۵
[۲/۲۵۳] تلک الرسل .... یرید	۴۲۸
تفریق بین الرسل جائز نہیں	۴۲۹
کلام اللہ سے مراد	۴۲۹
[۲/۲۵۴] یایھا الذین .... ظالمون	
انفاق کی اہمیت	۴۳۱

مضمون	صفحہ
[۲/۲۵۵] اللہ لا الٰہ .... عظیم	
اصل سوال صفاتِ خداوندی کا ہے۔	۴۳۱
(آیت الکرسی)	
سب سے پہلے ایمان کا مطالبہ	۴۳۲
وحدت الوجود کا نظریہ	۴۳۴
نمایاں صفاتِ خداوندی۔ الاسماء الحسنیٰ	۴۳۳
کرسئ خداوندی	۴۳۷
الاعلیٰ	۴۳۸
[۲/۲۵۶] لا اکراہ فی الدین .... علیم	
لا اکراہ فی الدین	۴۳۹
رشد و ہدایت۔	۴۴۰
ایمان باللہ کے لئے کفر بالطاغوت ضروری ہے	۴۴۱
کمیونزم کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری	۴۴۲
[۲/۲۵۷] اللہ ولی ..... خالدون۔	
ولی کے معنی	۴۴۴
اولیاء اللہ	۴۴۵
آٹھواں باب — قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل	۴۵۲
آیات ۲/۲۵۸ تا ۲/۲۸۶ — ختم سورۂ بقرہ	
[۲/۲۵۸-۲۵۹] الم تر .... قدیر	
اسوۂ ابراہیمیؑ	۴۵۵

مضمون	صفحہ
بادشاہِ وقت سے مناظرہ	۴۵۶
۲/۲۶۰ واذ قال ...... حکیم	
مردوں کے زندہ کرنے کے متعلق روایاتی تفسیر	۴۵۷
(حضرت) ابراہیمؑ کو معاذاللہ شک۔	۴۵۹
۲/۲۶۱ مثل الذین .... علیم	
انفاق فی سبیل اللہ	۴۶۳
لفظ سبع (سات) کا مفہوم	۴۶۴
۲/۲۶۲-۲۶۵ الذین ..... بصیر	
انفاق فی سبیل اللہ کے اثرات	۴۶۵
تثبیتِ نفس	۴۶۶
۲/۲۶۶ اَیَوَدُّ ..... تتفکرون۔	
انشورنس	۴۶۸
نذر کے معنی۔ خدمات جو اپنے ذمے لے لی جائیں۔	۴۷۰
۲/۲۶۷-۲۸۱ یا یہا الذین .... یظلمون	
معاشی نظام کی بنیاد	۴۷۲
صدقات کا مفہوم	۴۷۲
دل کی رضامندی۔ مؤمنین کا استغناء	۴۷۳
ربٰو کی بحث	۴۷۴
نظامِ سرمایہ داری اور مودودی مرحوم	۴۷۶
تجارت اور ربٰو میں فرق	۴۷۹
قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔	۴۷۹
اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت	۴۸۲
۲/۲۸۲-۲۸۳ یا یہا الذین ..... علیم	
لین دین کے متعلق ہدایات	۴۸۴
دو عورتوں کی گواہی	۴۸۵
رہن یا قبضہ	۴۸۹
۲/۲۸۴ لِلّٰہ ما فی السمٰوٰت ..... قدیر	
قانونِ مکافاتِ عمل	۴۹۰
۲/۲۸۵ اٰمن الرسول ...... مصیر	
رسول کو بھی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا	۴۹۰
ایمان کے بعد سوچ سمجھ کر اطاعت	۴۹۱
۲/۲۸۶ لا یکلف اللہ ..... کافرین	
لا یکلف اللہ نفساً الّا وسعہا	۴۹۲
کسب اور اکتساب میں فرق	۴۹۳
نسیان، عزم کی کمزوری ہے	۴۹۳
مومنین کی دعائیں	۴۹۴
مولانا ۔ صرف خدا کی ذات ہے۔	۴۹۶
انڈکس	۴۹۷

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ کلام

مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۷ء میں۔ پروگرام یہ تھا کہ اس کی آئندہ جلدیں بھی اسی رفتار سے شائع ہوتی رہیں۔ چنانچہ میں نے جلد سوم کا مسودہ جولائی ۱۹۷۷ء میں مکمل کر لیا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے نظامِ کتابت و طباعت کی منزل ایسی صبر آزما ہے کہ اس میں تمام عزائم فسخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کتاب، اس کے قریب اڑھائی سال بعد تک زمین کے سامنے آ رہی ہے۔ اس دوران میں، اربابِ ذوقِ قرآنی کے پیہم تقاضے ان کی جس بیتابیٔ تمنا کے آئینہ دار رہتے اس کا مجھے بخوبی احساس ہے لیکن اس بے بسی کے عالم میں خود مصنف کے دل پر جو گزرتی ہے اس کا شاید کوئی اور اندازہ نہ لگا سکے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بالآخر یہ جلد شائع ہو گئی اور سابقہ جلدوں کے سے معیار کے مطابق شائع ہو گئی۔ ورنہ اس زمانے میں ایسا معیار قائم رکھنا بڑا مشکل ہے۔

۲۔ جلد اول، سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی ۲۹ آیات پر مشتمل تھی اور ضخامت ۳۸۸ صفحات۔ جلد دوم سورۂ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۱۱۲ کو محیط تھی اور ضخامت ۴۷۶ صفحات۔ زیرِ نظر جلد اسی سورۃ کی آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ پر مشتمل ہے جس پر سورۂ بقرہ اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ ضخامت اس کی ۵۴۸ صفحات ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں، چھتیس صفحات پر مشتمل، تینوں جلدوں کے جامع انڈکس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ انڈکس یوں تو سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے مضامین کا آئینہ دار ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ جائے گی کہ اسلام سے متعلق شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس سے متعلق مجمل یا مفصل اشارہ اس میں نہ آ گیا ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو مطالب الفرقان کی یہ تین جلدیں پورے کے پورے قرآن مجید کی گویا طائرانہ پیش رس ہیں۔ جو تفسیر، تصریفِ آیات کے انداز سے مرتب کی جائے اس کی جامعیت کا یہی عالم ہوتا ہے۔

۳۔ سلسلۂ مطالب الفرقان کا تفصیلی تعارف اس کی پہلی دو جلدوں میں کرایا جا چکا ہے۔ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آیات کا حوالہ اس جلد میں بھی حسبِ سابق ہے۔ یعنی (۲/۱۱۳) سے مراد ہے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۳، انڈکس میں البتہ انہیں یوں لکھا گیا ہے (۲:۱۱۳)۔ اسے ذہن میں رکھیے۔

۴۔ آخر میں، بدرگاہِ رب العزت عرض گذار ہوں کہ جس طرح اس کے فیضِ بے پایاں نے مجھے اپنی کتابِ عظیم کے ساتھ والہانہ طور پر متمسک رہنے کی اب تک توفیق ارزانی فرمائی ہے، یہ سلسلہ زندگی کے آخری سانس تک قائم رہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ اور مانگنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے!

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر — اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مِرے اس دعا کے بعد

۱۲ نومبر ۱۹۷۹ء

پرویز

(۰۰۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مطالب الفرقان

جلد سوم

☆

سورہ بقرہ ــــ آیات ــــ نمبر ۱۱۳ تا نمبر ۲۸۶

ختم سورہ بقرہ

پہلا باب

الدّین کے بنیادی اصول

(۱) الدّین شروع سے ایک ہی چلا آرہا تھا۔
(۲) اس کی تکمیل بعثتِ رسول اللہ سے ہوئی۔
(۳) جب دین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔
(۴) مذہب میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔
(۵) فرقوں کے اختلافات صرف اس نظام میں مٹ سکتے ہیں جس میں تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔
(۶) لیکن اہل کتاب نہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ نہ اس نظام کو تسلیم کریں گے۔
(۷) اس نظام کا مرکز کعبہ ہے جس کا تفصیلی تذکرہ دوسرے باب میں سامنے آئے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

الدّین کے بنیادی اصول

آغاز ـــــ سورۃ بقرہ ـــــ آیت نمبر ۱۱۳

مطالب الفرقان کی دوسری جلد کا اختتام سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۱۲ پر ہوا تھا۔ اُس (جلد) کا آخری حصہ بہ حیثیت مجموعی داستانِ بنی اسرائیل پر مشتمل تھا۔ زیرِ نظر جلد کے ابتدا میں بھی انہی کا تذکرہ آئے گا، لیکن جستہ جستہ مقامات پر۔ آغاز کلام آیت نمبر ۱۱۳ سے کیا جاتا ہے جو یُوں ہے :-

۲/۱۱۳ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ - كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ - فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ - (۲/۱۱۳)

مفہوم اس آیۂ جلیلہ کا یہ ہے :

حق کی مخالفت کرنے والوں کی حالت بھی عجیب ہوتی ہے۔ ان کے باہمی اختلافات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، دینِ خداوندی کی مخالفت میں یہ سب متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔ یہی کیفیت ان یہود و نصاریٰ کی ہے۔ تمہاری مخالفت میں یہ سب ایک ہو جاتے ہیں، لیکن باہمی اختلافات کا یہ عالم ہے کہ یہودی، عیسائیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کا مذہب کچھ نہیں۔

عیسائی، یہودیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ سچائی پر نہیں۔ اور لطف یہ کہ دونوں اِس کے مدّعی ہیں کہ وہ اُس کتاب کی پیروی کرتے ہیں جس کا سرچشمہ ایک ہے (یعنی عہد نامہ عتیق وجدید کی)۔ یہی حالت ان (مشرکینِ عرب) کی ہے جنہیں کتاب (وغیرہ) کا کوئی علم نہیں۔ وہ بھی اپنے معتقدات کو حق پر مبنی قرار دیتے ہیں اور دوسروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ پارٹی بازی کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ اختلافات (جو خدا کا عذاب ہیں ۳/۱۴) اُس وقت تک نہیں مٹ سکتے جب تک قرآن کی رُو سے انسانی معاشرہ میں انقلابِ عظیم واقع نہیں ہو جاتا۔ (۱۱/۱۱۸-۱۱۹)۔ اُس وقت عالمگیر انسانیت اور وحدتِ اقتدار وقانون کا تصور غالب آجائے گا۔ اور یوں اختلافات مٹ جائیں گے ــــ یا پھر مرنے کے بعد ہر ایک کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ حق پر تھا یا باطل پر۔

اس آیت کی مختصر سی تشریح؛ مطالب الفرقان، جلد دوم (صفحہ ۱۹۲) میں، زیرِ آیت (۲/۱۴) گزر چکی ہے۔ مزید وضاحت کے سلسلہ میں سمجھ لینا چاہیئے کہ:۔

الدّین کی وحدت

(۱) اصولی اور اساسی طور پر دین شروع سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ... ... (۴۲/۱۳)۔ "(اے مخاطبینِ قرآن) تمہارے لئے بھی الدّین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم (حضرات) نوحؑ، ابراہیمؑ، موسےٰؑ اور عیسےٰؑ (جملہ انبیاء کرامؑ) کو دیا گیا تھا، اور جس کا حکم (اے رسولؐ!) اب تمہیں دیا جا رہا ہے۔" چونکہ الدّین کا سرچشمہ ایک ہی تھا ـــــ یعنی وحیٔ خداوندی ــــ اس لئے اس میں اختلاف اور تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر جملہ انبیاء کرامؑ سے کہہ دیا گیا تھا: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (۴۲/۱۳)۔ "وہ اس دین (نظامِ خداوندی) کو متمکن کریں اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ کریں۔"

لیکن ہوتا یہ رہا کہ جب تک رسولؐ زندہ رہتا وہ اپنے متبعین کو وحیٔ خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق چلاتا اور اس طرح انہیں ایک مرکز پر قائم رکھتا ــــ الدّین کی عملی شکل، ضابطۂ قوانین کی وحدت کی رُو سے امتِ واحدہ کی تشکیل ہے ــــ لیکن اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد، اُس وحیٔ خداوندی میں آمیزشیں شروع ہو جاتیں۔ یہ ماجرا ہر رسول کی وحی کے ساتھ گزرا۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (۲۲/۵۲)۔ (نیز ۱۳/۱۴، ۲۵/۳۱)۔ "اے رسولؐ! تم سے پہلے جتنے ہمارے فرستادہ نبی آئے اُن کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ وہ جب، ہمارا پیغام پہنچا کر، دنیا سے رخصت ہو جاتے تو ان قوانین سے سرکشی برتنے والے، ان کی وحی میں آمیزش کرکے اسے کچھ کا کچھ بنا دیتے۔" فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِی الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۲۲/۵۲)۔ "اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی سے)

انسانی آمیزش کو دور کر کے، اپنے قوانین کو پھر منزہ حالت میں محکم کر دیتا۔ اس لئے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے، اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔" (اسے ناسخ و منسوخ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا تفصیلی ذکر جلد اوّل صفحہ ۱۲۵ زیر آیت ۲/۳؛ جلد دوم صفحہ ۳۴۴ زیر آیت ۲/۱۰۶-۱۰۷، آچکا ہے)۔ جب الدّین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتے تو اسے مذہب کہا جاتا ہے۔ جب سابقہ رسول کی وحی سے انسانی آمیزش دور کرنے کے لئے نیا رسول آتا، تو مذہب پرست طبقہ اپنے مذہب پر بضد قائم رہتا اور اس رسول کی طرف سے پیش کردہ الدّین کی سخت مخالفت کرتا۔ یہ مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی جو مذہب کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیتے تھے۔ (تفصیل اس کی جلد اوّل صفحہ ۲۵۶ زیر آیت (۲/۱۴)؛ اور جلد دوم صفحہ ۳۰۴ زیر آیت (۲/۷۹) دیکھئے)۔ اس طرح دنیا میں دینِ واحد کی جگہ، مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ پھر جس طرح ہر پیشہ میں ہوتا ہے، ان مختلف مذاہب کے پیشواؤں کی باہمی رقابت، انہیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رکھتی۔ کاروبار چلتا ہی اس طرح سے ہے — اس پیشہ ورانہ رقابت کو قرآنِ کریم نے "بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (دیکھئے آیات ۲/۹۰؛ ۲/۲۱۳؛ ۳/۱۸؛ ۴۲/۱۴؛ ۴۵/۱۷)

اس کے بعد آپ پھر آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۱۳) کی طرف آجائیے۔ اس میں بالتصریح تو نام یہود اور نصاریٰ کا لیا گیا ہے لیکن درحقیقت اشارہ جملہ اہلِ مذاہب کی طرف ہے۔ اس کی وضاحت میں کہا گیا کہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ - (۲/۱۱۳) "تمام اہلِ مذاہب کی یہی روش ہوتی ہے کیونکہ وہ الدّین کی حقیقت کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔"

نبی اکرمؐ کی طرف جو کتاب بھیجی گئی اس کے متعلق وضاحت کر دی کہ وہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی (۶/۱۱۶) اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ - (۱۵/۹) "ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ الدّین کے متعلق جو روش پہلے چلی آرہی تھی، اس کے جاری رکھنے کی اب ضرورت نہیں تھی — یعنی یہ روش کہ سابقہ رسول کی وحی میں داخل کردہ آمیزش دور کرنے کے لئے ایک نئے رسول کی بعثت — یہ اس لئے کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے اپنے اوپر لے لی، اس لئے نہ اس میں انسانی آمیزش کا امکان تھا اور نہ اس آمیزش کو دور کرنے کیلئے حضورؐ کے بعد

ختمِ نبوّت

کسی صاحبِ وحی کے آنے کی ضرورت تھی۔ اس کو ختمِ نبوت کہا جاتا ہے جو، قرآن مجید کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطہ ہونے کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے (اس کے متعلق اشارات جلد اوّل صفحہ ۲۴

زیرِ آیت ۲/۲، اور جلد دوم صفحہ ۳۶۴، آیت ۲/۵ میں گزر چکے ہیں)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو الدّین رسول اللہؐ کی وساطت سے دنیا کو دیا گیا تھا، قرآن کریم کے مکمل اور محفوظ ہو جانے کے بعد، (اس کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کا امکان نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی مذہب میں تبدیل ہو گیا اور امت، امتِ واحدہ رہنے کے بجائے فرقوں میں بٹ گئی۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھیئے کہ جس طرح یہود، نصاریٰ، مجوس وغیرہ الدّین کے باقی نہ رہنے سے مختلف فرقے بن گئے، اسی طرح اسلام کے بہ حیثیت دین باقی نہ رہنے سے، امتِ مسلمہ مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور جس

فرقہ بندی

طرح قَالَتِ الْیَھُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ (۲/۱۱۳) "یہودی کہتے ہیں کہ حق پر ہم ہیں، نصاریٰ باطل پر... اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ حق پر ہم ہیں اور یہودی باطل پر ہیں" اسی طرح ہمارا بھی ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ حق پر ہم ہیں۔ باقی فرقے باطل پر ہیں اور تماشا یہ ہے کہ ھُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ۔ (۲/۱۱۳)۔ سب فرقے قرآن کو خدا کی کتاب اور اپنے آپ کو اس کتاب کا متبع کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ (۴/۸۲)۔ "کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے" یعنی قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی ایک بین دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مختلف فرقے (باہمی اختلافات کے باوجود) اس کے مدّعی ہوں کہ وہ قرآن کریم کا اتباع کرتے ہیں، تو اس سے یہ ثابت ہو جاتے گا کہ قرآن کریم میں اختلافات ہیں۔ یعنی ہمارے فرقوں کا اختلاف، قرآن کے اس دعویٰ کا بطلان کرتا ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ (فرقہ بندی کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۱۰۱، زیرِ آیت ۲/۴؛ صفحہ ۱۹۳، زیرِ آیت ۲/۷؛ صفحہ ۲۱۵، زیرِ آیت ۲/۹ گفتگو کی جا چکی ہے)۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب وحیِ خداوندی میں انسانی آمیزش کر دی جاتی تھی تو دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس طرح دنیا کے مختلف مذاہب وجود میں آگئے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے ہاں بھی وحیِ خداوندی (قرآن مجید) میں انسانی آمیزش ہو گئی جو دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آگئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ تو پھر ہوا کیا؟ — ہوا یہ کہ قرآن تو غیر محرف رہا لیکن مذہبی پیشوائیت نے خارج از قرآن عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا۔ اس کے بعد، غیر محرف قرآن تو محض تلاوت کے لئے باقی رہ گیا اور عمل، ان خارج از قرآن عناصر کے

مطابق ہونے لگا۔ لہٰذا، دیگر مذاہب میں وحیِ خداوندی کے غیر محرّف شکل میں باقی نہ رہنے اور ہمارے ہاں اسکے غیر محرّف شکل میں باقی رہنے، میں عملاً کوئی فرق نہ رہا۔ کتاب اللہ تو اسی صورت میں مؤثر رہتی اور وحدتِ امت کا ذریعہ بنتی ہے جب اسے، اور صرف اسے، دین میں سند اور آخری حجت تسلیم کیا جاتے۔

مختلف مذاہب کے باہمی اختلافات کے سلسلے میں آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۱۳) میں کہا گیا ہے: فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (۲/۲۱۳)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ ان کے اختلافی امور کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا۔"

قیامت کا عام مفہوم "آخرت کی زندگی" لیا جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت پر ایمان، مسلمان ہونے کی لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ (اس پر تفصیلی بحث جلد اول صفحہ ۱۵۲-۱۴۴، زیرِ آیت (۲/۴) ہو چکی ہے۔ مختلف مذاہب یا فرقوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ "قیامت کے دن" (یعنی مرنے کے بعد کی زندگی میں) ہوگا — لاریب اور برحق — لیکن یہ واضح ہے کہ "قیامت کا دن" دنیاوی زندگی میں کئے گئے اعمال کے نتائج کے سامنے آنے کا دن ہے۔ لہٰذا، ان اختلافات میں قیامت کے دن فیصلہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں، ہر مذہب کے پیروں اور ہر فرقہ والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا۔ اور اسی کے مطابق ان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ لیکن اس سے یہ فائدہ نہیں ہوگا کہ غلط روش پر چلنے والے کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے تو وہ اس روش کو چھوڑ کر، صحیح روش اختیار کرلے۔ جو اس دنیا میں غلط روش پر چلتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور جہنم دارالعمل نہیں، دارالجزاء ہے۔ یعنی اُس میں، اپنی اصلاح کرکے صحیح راستے پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ (جنت اور جہنم، اور جزا و سزا کے متعلق جلد اول اور دوم — بالخصوص جلد اوّل — میں بڑی تفصیلی بحث آچکی ہے۔ متعلقہ جلد کی فہرستِ مضامین کے حوالے سے اس بحث پر ایک نظر ڈال لیجئے)۔ اصلاح کا امکان تو اسی صورت میں ہوگا کہ اختلافی امور کی حقیقت اسی دنیا میں سامنے آجائے۔ قرآنِ کریم میں قیامت کا لفظ ان معانی میں بھی آیا ہے۔

قیامت کا لفظ "قِیَامٌ" سے ہے جس کے معنی کھڑے ہو جانے کے ہیں۔ اس لفظ (قِیَامٌ) کے ساتھ (ۃ) کے اضافہ سے قیامۃ بنا ہے جس کے معنی ہیں، ایک لخت کھڑے ہو جانا۔ میری کتاب — جہانِ فردا —

قیامت کا مفہوم

کے ایک پورے باب میں اس کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس تفصیل کے اس جگہ دہرانے کا نتیجہ تحصیلِ حاصل ہوگا۔ موضوعِ زیرِ نظر کی مناسبت سے اس کے

وہ ایک متعلقہ اقتباسات کا پیش کیا جانا کافی ہوگا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "انسان کے اٹھ کھڑے ہونے" کا مقام یہ دنیا بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔ اس دنیا میں مستبد قوتیں، کمزوروں اور ناتوانوں کو اس طرح دبائے رکھتی ہیں کہ ان میں اٹھنے کی سکت تو ایک طرف، اس کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک ہنگامہ خیز انقلاب آتا ہے اور یہی دبی ہوئی انسانیت، یکبارگی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ اس دنیا میں قیامۃ ہے۔ یہ انقلاب اگر اس جماعت کے ہاتھوں رونما ہو جو مستقل اقدارِ خداوندی کی حامل ہے، تو معاشرہ میں، ظلم و استبداد کی جگہ عدل و احسان کا دور دورہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے گا، کوئی اسے غصب نہیں کر سکے گا۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ حق، باطل پر غالب آجائے گا۔ اس قسم کا انقلاب، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاءؓ کے ہاتھوں اس قدر نمایاں طور پر رونما ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے اسے بھی القیامۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل بتائی ہیں ـــــ

رسول اللہ کی بعثت کے وقت دنیا میں، دینِ خداوندی اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ہر جگہ مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تمام اہلِ مذاہب کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خدائی تعلیم اپنی حقیقی شکل میں موجود ہے۔ لیکن ایک کی تعلیم دوسرے سے ملتی نہیں تھی۔ ان میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں تھا جو حق و باطل میں امتیاز کر کے، ان نزاعات کو مٹا سکے، اس لئے ان میں باہمی جنگ و جدل جاری رہتی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ اس انقلاب سے ایک معیار سامنے آجائے گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کون سی تعلیم فی الواقعہ خدا کی دی ہوئی ہے اور کون سی انسانوں کی خود ساختہ۔ اس طرح ان کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں گے۔ چنانچہ مختلف مذاہبِ عالم کے پیروؤں (یہود، نصاریٰ، مجوس وغیرہ) نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے اختلافات مٹ گئے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ "یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" میں ان کے اختلافات مٹ جائیں گے تو اس سے یہی مراد ہے۔ (عربی زبان اور قرآن کریم کی رُو سے، یَوْم کے معنی دن ہی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد زمانہ، دَور، عہد بھی ہوتے ہیں۔ اس نسبت سے "یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" سے مراد ہوگا وہ انقلابی دور جو قرآن کی رُو سے سامنے آیا تھا۔ اس انقلابی دور میں، ان اہلِ مذاہب کے اختلافات رفع ہوئے تھے ـــــ لہٰذا آیت (۲:۱۱۳) میں جو کہا گیا ہے کہ ان کے اختلافات کا فیصلہ "یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" میں ہو جائے گا تو اس سے مراد یہ ہے کہ اب خدا کا دین پھر اپنی اصل شکل میں آگیا ہے۔ جب اس کے مطابق معاشرہ کا نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت واضح ہو جائے گا کہ کون سی روش صحیح ہے اور کونسی غلط۔

آیت (۲۲/۵۲) میں کہا گیا ہے کہ جب سابقہ دین میں آمیزش ہو جاتی تو ایک نئے رسول کی وساطت سے اس آمیزش کو دور کر دیا جاتا۔ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ۔ (۲۲/۵۲)۔ "اور اس کے بعد اللہ اپنے قوانین کو محکم کر دیتا ہے" خود آیت (۲۲/۵۲) میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ فَاللّٰهُ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ۔

کتاب اللہ کی حکمرانی

(حکم) کے معنی "فیصلہ کرنے" کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اختلافی اور نزاعی امور میں فیصلے وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتے۔ (یہی وجہ ہے کہ مذہب میں اختلافی امور کے فیصلے — مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے — نہ کبھی ہوتے ہیں نہ ہو سکتے ہیں)۔ فیصلہ تو وہی اتھارٹی دے سکے گی جو صاحب اقتدار ہو۔ اسے "استخلاف فی الارض" (۲۴/۵۵) یا نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ وہ نظام جس میں تمام امور کے فیصلے قانونِ خداوندی کی رو سے ہوں۔ مثلاً:-

(۱) سورۂ بقرہ میں جہاں انبیائے کرامؑ کی بعثت کا ذکر آیا ہے وہاں کہا کہ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ۔ (۲/۲۱۳)۔ "ان انبیاء کے ساتھ خدا نے ضابطۂ قوانین (الکتاب) بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کیا کریں۔"

(۲) خود حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸)۔ "اے رسول! تو لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کر۔"

(۳) حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ: اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۵)۔ "کیا (تم چاہتے ہو کہ) میں اللہ کے سوا کسی اور کو صاحبِ اقتدار (فیصلہ کن اتھارٹی) تسلیم کر لوں جس نے تمہاری طرف یہ نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔"

(۴) اس کتاب کے ساتھ کوئی اور ضابطۂ قوانین شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) "اللہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

(۵) خود رسول اللہؐ بھی اسی کا اتباع کرتے تھے (۶/۵۷؛ ۷/۲۰۳)

(۶) اس کی خلاف ورزی معصیتِ خداوندی تھی اور مستوجب عذاب۔ (۶/۱۵)

(۷) ہر اختلاف اسی کی رو سے مٹے گا۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ۔ (۴۲/۱۰)۔ "جن معاملات میں تم اختلاف کرتے ہو، ان کے فیصلے کے لئے خدا (کی اس کتاب) کی طرف رجوع کیا کرو۔"

(۸) یہی کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز ہے وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

"جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہی کو تو کافر کہا جاتا ہے"۔

ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے، مملکت کے اقتدار کی رُو سے کئے جا سکیں گے۔ اسے قرآن نے حکومتِ خداوندی کہہ کر پکارا ہے۔ لہٰذا، دنیاوی زندگی میں یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (جس میں لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب کے مطابق ہوں گے) وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا کہ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ (۲۲/۵۶)۔ "جس دور میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہوگا اور تمام امُور کے فیصلے وہی کریگا"۔ (یعنی فیصلے اس کی کتاب کی رُو سے ہوں گے) جب یہ نظام حضور نبی اکرمؐ کے ہاتھوں قائم ہوا، تو اس میں مختلف مذاہب کے اختلافی امور کے فیصلے ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ہمارے فرقوں کے اختلافات بھی اسی صورت میں مٹ سکیں گے جب کتاب اللہ کو حَکَم (فیصلہ کُن اتھارٹی) تسلیم کر لیا جائے۔ عملاً یہ شکل اسلامی نظام یا قرآنی مملکت ہی میں سامنے آسکے گی۔

اس کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی ـــــ خواہ وہ یہود و نصاریٰ (دیگر مذاہب) کی پیشوائیت ہو، اور خواہ مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی جہاں کہا گیا،

۲/۱۱۴ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ...... (۲/۱۱۴)

آیت کے اتنے حصّے کا عام الفاظ میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ کی مساجد میں اس کے ذکر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دے اور اس طرح ان کی تخریب کا باعث بنے"۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے لفظ "مسجد" اور "ذکر" کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا ضروری ہوگا۔ سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ خدا "اپنی آیات کو محکم کر دیگا"؛ اور اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایک ایسا نظام قائم ہوگا جس میں احکامِ خداوندی (آیات اللہ) مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ العمل ہوں۔ اس مفہوم کی روشنی میں "مساجد" اور "ذکر" کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائے گا۔

مسجد کا مفہوم

لُغت کی رُو سے مسجد کے معنی ہیں سجدہ گاہ۔ یا سجدہ کرنا۔ سجدہ کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۱۰۴-۱۰۳، زیرِ آیت (۲/۳۴) بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے مراد ہے احکام و قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرنا۔ خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ (یہی معنی "عبادت" کے ہیں جس کی تشریح جلد اوّل صفحہ ۳۵ آیت ۱/۴ میں گزر چکی ہے) لہٰذا، مساجد کے معنی ہیں اطاعتِ خداوندی کے مراکز۔ وہ مقامات جہاں یہ امور طے ہوں کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور ان کے نفاذ کے طور طریق کیا ہوں گے۔ اسی لئے کہا گیا کہ: وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (۷/۲۹)۔ "تم اپنی توجہات تمام تر قوانینِ خداوندی پر مرکوز رکھو۔ ہر معاملہ میں انہی کی طرف رجوع کرو۔

ان کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دو اور اطاعت اسی کے لئے مخصوص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔" اس کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے مقام پر کہا: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (۷۲/۱۸)۔ "اطاعت و فرماں پذیری صرف احکامِ خداوندی کی ہوسکتی ہے، کسی اور کی نہیں، اس لئے کسی اور کی اطاعت کو اس میں شریک نہ کرو۔" یعنی لَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۔ (۱۸/۱۱۰)۔ "اطاعتِ خداوندی میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔"

ضمناً۔ آیات (۷۲/۱۸) اور (۷۲/۱۸) میں دَعَا کا لفظ آیا ہے جس کے عام معانی "پکارنے" کے کئے جاتے ہیں۔ یعنی خدا کے سوا (یا اس کے ساتھ) کسی اور کو "نہ پکارو"۔ اور اس سے یہ نظری مسائل پیدا ہوکر باعثِ بحث و جدل بن گئے کہ یا اللہ کی طرح کسی اور کو بھی یا کہہ کر پکارنا جائز ہے یا نہیں۔ جیسے یا رسول اللہ۔ یا علیؓ۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ۔ دعا کے معنی محض پکارنے کے نہیں۔ اس کے معنی ہیں اپنے ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ کتاب اللہ کو "دعوت دینا" کہ وہ بتلائے کہ ہمیں اس باب میں کیا کرنا چاہیئے۔ اگرچہ دعا کے متعلق مختصر طور پر جلد اول صفحہ ۳۸، زیرِ آیت ۱/۴ میں لکھا جا چکا ہے لیکن اس کی تفصیلی بحث کا مقام آیت (۲/۱۸۶) ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ یہ تفصیل وہیں بیان کی جائیگی۔ یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ مسجد کے معنی یا تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا ہیں اور یا وہ مراکز جہاں ان قوانین کے نفاذ اور ان کی عملی اطاعت کے متعلق غور و تدبر اور بحث و مشاورت ہو۔ یہ اطاعت خالصتاً قوانینِ خداوندی کی ہوگی اس میں کسی اور کی اطاعت کو شامل کرنا شرک ہے۔ اسی لئے کہا کہ مَا کَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ۔ (۹/۱۷) "مشرکین کے لئے جائز ہی نہیں — انہیں اس کی اجازت ہی نہیں دی جاسکتی کہ وہ مساجد کی تعمیر (آبادکاری) میں حصہ لیں۔" جو لوگ خالصتہً قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں (BELIEVE) ہی نہ کریں، اُن کے ہاتھوں اُس نظام کی برومندی اور فروغ کیسے ہوسکتا ہے جو خالصتہً اطاعتِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔ (۹/۱۸) اس نظام کی تشکیل، استحکام اور فروغ صرف اُن لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پاسکتا ہے جو ارشاداتِ خداوندی کی صداقت اور اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی محکمیت پر یقین رکھتے ہوں۔

رہبانیت کے خلاف

مذہب کی دنیا میں "خدا پرستی" سے ذہن فوراً رہبانیت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ یعنی "اللہ والوں" کی نشانی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ دنیا سے دُور بھاگیں۔ ترکِ لذات، ترکِ حظائظ، ترکِ خواہشات، ترکِ زیب و زینت، ان کا مسلک۔ اور خاک نشینی اور سر بزیری ان کا مشرب ہو۔ اطاعتِ خداوندی کے اس باطل تصور کی تردید کے طور پر واضح طور پر کہہ دیا: يٰبَنِىْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ

مَسٰجِدٍ ۔۔۔۔ (۷/۳۱)۔ "اے نوعِ انسان! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیاوی زیب وزینت، اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی"۔ اس لئے جس نظامِ خداوندی کے قیام کی تمہیں دعوت دی جاتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ دنیا کی خوشگواریاں بھی ہیں۔

ایک طرف یہ کہا اور دوسری طرف اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اگر تم نے احکامِ خداوندی کی اطاعت محض رسمی (میکانکی) طور پر کی تو اس سے بھی اطاعت کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ ان کی اطاعت کا تقاضا تمہارے دل کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے۔ (اس کو خشوع وخضوع کہتے ہیں)۔ خود لفظ اطاعت کے لُغوی معنوں کے اندر بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے۔ اس کے معنی 'بطیبِ خاطر فرماں پذیری' ہیں۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ذرائع اور مقصد کے فرق کو بھی نمایاں طور پر واضح کر دیا ہے۔ گھر سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہونا، ٹکٹ خریدنا، ریل میں بیٹھنا، یہ سب ذرائع ہیں منزل تک پہنچنے کے۔ مقصد منزل تک پہنچنا ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے ذرائع اختیار کرنا بھی نہایت ضروری، بلکہ لاینفک اور ناگزیر ہے۔ لیکن اگر ذرائع ہی مقصود بالذات بن جائیں، اور مقصد یا نصب العین فراموش ہو جائے، تو محض ذرائع اختیار کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ ٹکٹ خرید کر گھر بیٹھے رہنے سے آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ دین میں شعائر اور مناسک، یعنی احکام کی مرئی اور محسوس شکلیں اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ مذہب میں یہی محسوس ومرئی شکلیں، مقصود بالذات بن جاتی ہیں اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

نظامِ خداوندی میں کعبہ کو اساسی مرکز کی حیثیت حاصل ہے (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) اسی لئے اسے

مسجد الحرام کی دیکھ بھال

مسجد الحرام کہہ کر پکارا، اور پوری کی پوری امتِ مسلمہ کا مطمحِ نگاہ قرار دیا گیا ہے۔ دیگر مساجد اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس اساسی مرکز (کعبہ) کی دیکھ بھال ضروری ہے لیکن کعبہ بھی حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے، خود مقصود نہیں۔ اس لئے اس کی دیکھ بھال بھی ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں یہ کہا کہ مساجد (مراکزِ نظامِ خداوندی) کی تعمیر وفروغ، جماعتِ مومنین (امّتِ مسلمہ) کا فریضہ ہیں، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ: اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۹/۱۹)

"تم کہیں ایسا نہ سمجھ لینا کہ مسجدِ حرام کی آبادکاری، اور اس مرکز میں جمع ہونے والوں کی دیکھ بھال، مقصود بالذات ہے بالکل نہیں۔ اصل مقصد، خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہنا ہے۔ جو اس لِم کو نہیں سمجھتا وہ

حقیقت فراموش ہے اور کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔"

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ زیرِ نظر آیت (۲/۱۱۴) میں "مساجد اللہ" سے مفہوم کیا ہے۔ ان سے مفہوم ہے نظامِ خداوندی کے مراکز۔ ایواناتِ مملکتِ اسلامیہ۔ اس کے بعد لفظ ذکر کی طرف آئیے۔

ذکر اللہ کا مفہوم

برسبیلِ تذکرہ تو اس کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۷۶-۷۵۔ زیرِ آیت (۲/۱۵۲) بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس مقام پر یہ لفظ مزید وضاحت طلب ہے۔

ذکر کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی بات کو ہر وقت ذہن میں رکھنا۔ اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا — اسے نصب العین حیات قرار دے لینا۔ اس مقصد کے لئے کہ وہ کہیں فراموش نہ ہو جائے، اسے بار بار نگاہوں کے سامنے لانا، اور اس کی یاد تازہ کرنا — یہ سب ذکر کے مفہوم میں شامل ہوتا ہے۔

نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد، احکام و قوانین و اصول و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنا ہے۔ ان قوانین و اقدار (وغیرہ) کا ضابطہ قرآن مجید ہے۔ یہی اس نظام (اسلامی مملکت) کا آئین و دستور ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ ضابطۂ خداوندی ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کو الذکر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۶۹؛ ۷/۶۳)، نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ (۱۵/۶)۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (۱۵/۹)۔ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الذِّكْرَ (۱۶/۴۴)۔ و دیگر مقامات۔ یعنی اس نظام کا نصب العین، قرآن مجید ہے۔ چونکہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے نصب العین حیات ہے، اس لئے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۲/۱۰۴) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (نیز ۳۸/۸۷؛ ۶۸/۵۲؛ ۸۱/۲۷)۔ قرآنی نظام ہر قسم کے سلب و نہب اور غصب و استحصال کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے مفاد پرست گروہوں کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس نظام کے ضابطۂ آئین (قرآن مجید) کو نگاہوں سے اوجھل کر دیں۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ (۵۸/۱۹)۔ "مفاد پرستانہ جذبات ان پر غالب آجاتے ہیں اور اس طرح وہ اس ضابطۂ خداوندی کو فراموش کر دیتے ہیں"۔ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا طریقہ یہ ہے کہ... قرآن کی رُو سے انہیں ان کے صحیح نصب العین حیات کی یاد تازہ کرائی جائے۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ (۵۰/۴۵)۔ یہی فریضۂ رسالت تھا (۸۸/۲۱)۔ یعنی فراموش کردہ حقیقتوں کی یاددہانی۔ رسول، ان لوگوں کو ان حقیقتوں کی یاددہانی کراتا تھا لیکن یہ ان سے اعراض برتتے تھے۔ (۲۱/۲؛ ۲۱/۴۲)

اس ذکر سے اعراض برتنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ فرمایا وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے ذکر سے اعراض برتتا ہے اس کی، اس دنیا

میں معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔"

یہ ہے حق و باطل کی وہ کشمکش اور خیر و شر کی وہ آویزش جو شروع سے چلی آرہی ہے۔ یعنی ایک طرف ظلم و استبداد اور سلب و نہب کی قوتیں، اور ان کے مقابلہ میں، ضابطۂ خداوندی (ذکر اللہ) کی حامل جماعتیں جو باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ حق کے نظام کو قائم کرنے کے لئے مصروفِ جدوجہد ہوتی ہیں۔ ان کی اس جدوجہد کو "اللہ کا ذکر کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ جلد دوم، صفحہ ۷۵-۷۴، زیرِ آیت ۲/۳ میں بتایا گیا ہے)۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ تم فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ بڑا سرکش اور حدود فراموش ہوتا جا رہا ہے (۲۰/۲۴)، تو حضرت موسیٰؑ نے، اس مہم کی ہمت طلبیوں اور دشوار گزاریوں کے پیشِ نظر، علاوہ دیگر درخواستوں کے، خدا سے یہ بھی کہا کہ میرے بھائی ہارونؑ کو بھی میرے ہمراہ بھیج دیجئے۔ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۔ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا (۲۰/۳۴-۳۳) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے — "تاکہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں"۔ (تسبیح کا مفہوم جلد دوم۔ صفحہ ۴۳۔ زیرِ آیت ۲/۳ بتایا جا چکا ہے)۔ ذکر کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے اس آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا کہ ہم دو ہوں گے تو تیرے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل اور تیرے مقرر کردہ نصب العین کے حصول کے لئے زیادہ گرمجوشی سے جدوجہد کر سکیں گے۔ بارگاہِ خداوندی سے ان کی اس درخواست کو شرفِ قبولیت عطا ہوا تو ساتھ ہی اس کی بھی تاکید کر دی کہ وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي۔ (۲۰/۴۲)۔ "ہم نے تمہاری مانگ پوری کر دی ہے۔ اب دیکھنا! تم میرے ذکر میں تساہل نہ برتنا۔" یہاں سے بھی ذکر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہی ہے وہ ذکر اللہ جس کے متعلق فرمایا کہ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۔ (۱۳/۲۸)۔ "یاد رکھو! صحیح اطمینانِ قلب اسی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ تم قرآن کے بتائے ہوئے نصب العین کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھو اور اس کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرو۔"

آیت زیرِ نظر (۲/۱۱۴) میں تیسرا تشریح طلب لفظ اِسْمُهٗ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "خدا کا نام" لیکن (جیسا کہ جلد اوّل صفحہ ۲ پر بتایا گیا ہے)۔

اسم اللہ کا مفہوم

اسمائے خداوندی کے معنی صفاتِ خداوندی ہیں اور اس سے ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ احکام و اقدارِ خداوندی کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس حقیقت کو اگر اور سمٹا کر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ افراد اور معاشرہ میں (تا بحدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی نمود و ظہور ہو۔ اسلامی معاشرہ، صفاتِ خداوندی کو (محدود پیمانے پر) عملی شکل میں منعکس کرتا ہے اس طرح جلال و جمالِ خداوندی، انسانی دنیا میں "جلوہ بار" ہوتے ہیں۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ۔ (۳۹/۶۹)۔ "اور یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا

اٹھتی ہے:

ان تصریحات کی روشنی میں آیت (۲/۱۱۴) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جماعتِ مومنین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام قائم ہو جائے جس میں صفاتِ خداوندی کی نمود، نصب العین اور مقصود ہو۔ لیکن مفاد پرست قوتیں اس نظام کے قیام کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ اس نظام کے مراکز، آباد اور فروغ یافتہ ہونے کے بجائے ویران اور برباد ہو جائیں۔ ذرا سوچو کہ ان لوگوں سے بڑھ کر انسانیت کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔ اگر کسی گاؤں میں ہسپتال کھولنے کے لئے عمارت تعمیر کی جا رہی ہو اور کچھ بدقماش اس عمارت کو مسمار اور ویران کر دیں، تو ان سے بڑھ کر گاؤں والوں کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے؟

آیت کا باقی حصہ یہ ہے:۔

أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَن يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲/۱۱۴)

ان لوگوں کو چاہیئے یہ تھا کہ ان انسانیت ساز مراکزِ نظامِ خداوندی کی طرف آتے تو سرکشی کے جذبات لئے ہوئے نہیں بلکہ اپنی تخریبی کارروائیوں کے تباہ کن نتائج سے ڈرتے ہوئے آتے۔ بہرحال، ان کی اس مخالفت اور سرکشی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انہیں دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی نصیب ہو گی اور آخرت کی زندگی میں تباہی اور بربادی۔

دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں، جلد اول، صفحہ ۱۴۹ پر، زیرِ آیت (۲/۸۵) تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ قریشِ مکہ جو اس نظام کے قیام کی راہ میں مسلسل رکاوٹیں ڈالتے رہے، ان کا انجام کیا ہوا، اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔

(۰)

صدرِ اوّل میں جب تک قرآنی نظام قائم رہا، مسجد کی یہی پوزیشن رہی۔ یعنی وہ امورِ مملکت طے کرنے کا مرکز تھی۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق، جلد اول صفحہ ۹۷-۱۰۱ زیرِ آیت (۲/۳) تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مراد ان تمام فرائضِ منصبی کا ادا کرنا ہے جو خدا کی طرف سے امت پر عاید کئے گئے ہیں۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ (جنھیں بعد میں نماز کہا گیا) بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ ہیں، اس لئے صدرِ اول میں ان کا انعقاد بھی بہرحال مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اُس دور میں، نہ صلوٰۃ سے مراد محض نماز تھی، نہ مسجد کا مصرف صرف ادائیگیٔ نماز۔ اُس زمانے میں قرآنی نظام کے دارالخلافہ (مدینہ طیبہ) کی مسجد (مسجدِ نبویؐ) امت کی تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ حکومت کا جملہ کاروبار اسی میں سرانجام پاتا تھا۔ مختلف مملکتوں

کے سفراء سے اسی میں ملاقات ہوتی تھی جنگی تیاریوں کے منصوبے اسی میں طے پاتے تھے حتیٰ کہ (ایک روایت کی رُو سے) حبشی طائفہ کا تماشا بھی مسجد ہی میں ہوتا تھا جسے خود حضورؐ شرفِ نظر عطا فرماتے تھے۔ یہ تھی مسجد کی پوزیشن اور اس میں ذکر اللہ کی حقیقت صدرِ اول میں جب قرآنی نظام نافذ تھا۔

اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور قرآنی نظام باقی نہ رہا، تو دین اور سیاست الگ الگ ہو گئے۔ دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں چلے گئے اور دین (جو اب مذہب بن گیا تھا) مذہبی پیشواؤں کو تفویض ہو گیا۔ اس ثنویت کی رُو سے، کاروبارِ مملکت ایوانات حکومت میں سرانجام پانے لگے اور مساجد صرف "نماز پڑھنے" کے لئے رہ گئیں اور ذکر اللہ کا مفہوم رہ گیا "تلاوتِ قرآنِ مجید"۔ کچھ عرصہ بعد جب اُمت میں تصوف در آیا، تو اس نے ذکر اللہ کے لئے اپنے طریقے وضع کئے۔ اب اس سے مراد ہو گئی "ورد و وظائف"، ذکر خفی اور جلی ــ ھُو حق سے قلب پر ضربیں لگانا چونکہ وہ اس ذکر کو اخفا میں رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اس کے لئے خانقاہیں تعمیر کر لیں اس طرح ذکر اللہ مخصوص ہو گیا اربابِ طریقت کے لئے اور نمازیں رہ گئیں اربابِ شریعت کی تحویل میں۔ یہی شکلیں اب تک رائج چلی آ رہی ہیں۔ ہماری مساجد کی حالت کیا ہے، اس کی تفصیل جلد اول صفحہ ۲۱۷-۲۱۵ زیر آیت (۲/۹) میں دی جا چکی ہے اور اب تو حالت اور بھی دگرگوں ہو گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہیں کہہ دیا کہ ــ

ہماری مسجدیں

ــ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی ــــ مذہبی پیشوائیت کو اس قسم کا بہانہ اللہ دے، انہوں نے مساجد کو اپنی سیاسی رسّہ کشی کے مراکز بنا لیا۔ مخالفین پر کیچڑ اُچھالی جاتی ہے۔ انہیں ہدفِ سبّ و شتم بنایا جاتا ہے۔ اس سے مسجدوں میں آئے دن دنگا فساد ہوتا ہے خون خرابے ہوتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مساجد کو سیاسی اکھاڑے تو نہ بنایئے، تو جواب ملتا ہے کہ اسلام میں سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا ــــ حقیقت یہ ہے کہ مذہب نام ہی دین سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ہے۔ اقبالؒ بیچارے کو کیا علم تھا کہ اس کے پیش کردہ (قرآنی) تصور کو کن کن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ (ذکر کا ایک مفہوم اور بھی ہے جسے صفحہ ۱۳ پر بیان کیا گیا ہے)۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ "مساجد میں ذکر اللہ" کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا مطلب کیا تھا؟ حضور نبی اکرمؐ اور اُمتِ مسلمہ، قرآنی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس کا اساسی مرکز کعبہ تھا۔ کعبہ کی تولیت قریش کے قبضہ میں تھی اور اس سے وہ ہزار ہا قسم کے فائدے اٹھاتے تھے۔ نظامِ خداوندی کے قیام سے وہ سب مفادات ختم ہو جانے تھے اس لئے وہ اس نظام کے قیام کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس کی راہ

میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے۔ بالفاظِ دیگر، جماعتِ مومنین مسجد (مسجدِ حرام۔ کعبہ) کی تعمیر چاہتی تھی اور فریقِ مخالف اس کی تخریب کے درپے تھا۔ آپ نے دیکھا کہ سوال کسی عمارت کی تعمیر اور تخریب کا نہیں تھا؛ نظامِ خداوندی کے قیام اور انہدام کا تھا۔ یہی وہ کشمکش تھی جس کے متعلق کہا کہ یہ لوگ جس قدر جی چاہے، مزاحمت کر کے دیکھ لیں یہ نظام قائم ہو کر رہے گا اور اس کے مخالفین ذلیل و رسوا ہوں گے۔ قرآنی نظام میں کعبہ (قبلہ) کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اس کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۷-۲۱۶ زیرِ آیت (۲/۱۴۴) لکھا جا چکا ہے۔ اسے خدا نے بَيْتِيَ (میرا گھر) کہہ کر پکارا ہے اور ملّتِ مسلمہ سے کہا ہے کہ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ (۲/۱۴۴)۔ "تم دنیا کے کسی گوشے میں ہو، تمہاری نگاہوں کا رُخ اسی مرکز کی طرف ہونا چاہیئے"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ اس گھر میں رہائش پذیر ہے۔ بالکل نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی تو کیفیت یہ ہے کہ :-

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲/۱۱۵) ۲/۱۱۵

وہ جہت و سمت کی قیود سے بالا اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ وہ کائنات کی تمام پہنائیوں پر چھایا ہوا ہے۔ تم جس طرف بھی رُخ کرو گے، خدا کی جلوہ باریاں تمہارے سامنے ہوں گی۔ کسی سمت کو رُخ کرنا تو ایک طرف،

خدا کا آفاقی تصوّر

هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ (۵۷/۴)۔ "تم جہاں کہیں بھی ہو، خدا تمہارے پاس اور ساتھ ہوتا ہے حتیٰ کہ: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶) "وہ تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے"۔ کعبہ کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ تمہاری ہئیتِ اجتماعیہ کا مرکز ہے۔ وہ ذکر اللہ (قرآنی تصورات) کو دنیا میں عام کرنے کا سرچشمہ ہے۔

اسی سے اس نے قریش کو بھی متنبہ کر دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ اگر کعبہ کی عمارت پر تم نے اپنا قبضہ نہ چھوڑا تو یہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا۔ اس نظام میں کعبہ کی اہمیت اپنے مقام پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ نہیں (حضور نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق) سارا کرۂ ارض، جماعتِ مومنین کے لئے "مسجد" ہے۔ جہاں بھی فضا سازگار ہوتی، یہ اس نظام کو قائم کر لیں گے۔ بنا بریں، صرف اس بنا پر کہ اس وقت تم اس عمارت پر قابض ہو، تم اس نظام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

اس نظام کے قیام کی راہ میں ایک قریش ہی حائل نہیں تھے، جملہ اہلِ مذاہب بھی اس کے خلاف تھے کیونکہ اس کے قیام سے ان کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ ان اہلِ مذاہب میں سے یہودی اور عیسائی، اس تحریک کے مراکز (مکّہ اور مدینہ)

اور ان کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اس نظام کے کس قدر مخالف تھے' اس کا ذکر چار آیات آگے (۲/۱۲۰) میں آئے گا۔ یہاں ان دونوں میں سے نصاریٰ (عیسائیوں) کی پستیٔ فکر کو پہلے سامنے لایا گیا۔ کہا کہ:۔

۲/۱۱۶ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۔ (۲/۱۱۶)

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کو انسانوں کی سطح پر لا کر رکھ دیا ہے۔ وہ

ابن اللہ کا عقیدہ

اس سطح سے بہت بلند اور اس تصوّر سے بہت دور' پاک اور منزہ ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے' اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس لئے وہ انسانوں کی طرح بیٹوں کی مدد کا محتاج نہیں۔

۲/۱۱۷ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ (۲/۱۱۷)

ان کا محدود ذہن انہیں یہی بتا سکا ہے کہ خدا کا طریقِ آفرینش بھی تولید (PROCREATION) ہے۔ یعنی وہ طریق جس سے انسانی دنیا میں باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ہے جو جملہ کائنات کو کسی ساز و سامان (MATERIAL) کے بغیر عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اس کا اندازِ تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر وہ بتدریج اپنی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے لا انتہا قوتوں کے مالک خدا کو بیٹوں کی کیا حاجت؟ تخلیقِ کائنات' عالمِ امر و خلق اور تخلیق و تولید کے متعلق تفصیلی بحث پہلی دو جلدوں میں آ چکی ہے' اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ (دیکھئے جلد اوّل صفحہ ۲۲-۱۶۔ زیر آیت (۱/۱)؛ صفحہ ۲۹۲-۲۸۳ ۔ زیر آیت (۲/۱۴)؛ جلد دوم۔ صفحہ ۳۴۳۔ زیر آیت (۲/۳۸)۔ حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی ضمناً تردید جلد دوم۔ صفحہ ۲۴۳۔ زیر آیت (۲/۸۳) کی جا چکی ہے۔ اس کی مزید تشریح' پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں اپنے مقام پر آئے گی۔ آیاتِ زیر نظر (۲/۱۱۶-۱۱۷) میں قرآنِ کریم نے عیسائیوں کے اس باطل عقیدہ کی اصولی تردید پر اکتفا کیا ہے۔ مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ جو قوم اس قدر توہمات میں گھری ہوئی ہو' وہ دین کے نظام کے بلند تصوّر کو بآسانی کس طرح سمجھ سکتی ہے۔ لہٰذا' ان کی طرف سے اس کی مخالفت قابلِ فہم ہے۔

(۰)

نبی اکرمؐ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد وحیٔ خداوندی پر استوار کرتے تھے' اور مخالفین وحی کے متعلق طرح طرح کے

سوالات کرتے تھے۔ ان کا مقصد تو اس نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا تھا لیکن وہ کھلے بندوں اس کا اظہار کرنے کے بجائے) وحی، نبوت، رسالت کے متعلق اعتراضات کرتے تھے:۔

۲/۱۱۸ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ (۲/۱۱۸)

ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا کو ہماری راہ نمائی مقصود ہے تو وہ ہم سے براہِ راست باتیں کیوں نہیں کرتا۔ یا کوئی ایسی محیر العقول، خارقِ عادت نشانی ہمارے سامنے کیوں نہیں لے آتا جس سے ہم پہچان لیں کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے وحی ہے۔ ان کی یہ باتیں وحی کی کنہ وحقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہیں اور پہلی مرتبہ نہیں کہی گئیں ان سے پہلے بھی، اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے، یہی کچھ کہا کرتے تھے۔ انہیں کون بتائے کہ ہماری کتنی نشانیاں صفحۂ کائنات پر بکھری پڑی ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں انہی کو نظر آسکتی ہیں جو علم و بصیرت سے کام لے کر اعترافِ حقیقت پر آمادہ ہوں۔

یہاں ان کی طرف سے پیش کردہ دو مطالبات کا ذکر ہے۔ (۱) یہ کہ وحی ان کی طرف براہِ راست آئے اور (۲) یہ رسول کوئی خارقِ عادت (معجزہ) دکھائے۔ پہلے شقِ اول کو لیجئے۔

وحی کے متعلق سابقہ دو جلدوں میں تفصیلاً لکھا جاچکا ہے۔ ملخصاً یہ کہ:۔

(۱) خارجی کائنات کی ہر شے، اور جانداروں میں ہر نوع کے ہر فرد کے اندر، از خود وہ رہنمائی ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے جس کے مطابق اسے زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ اشیاء یا انواع و افراد، اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اسے (ANIMAL INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (جلد اول صفحہ ۱۷۔ آیت ۱/۵)

(۲) انسانوں کی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت (جلد اول صفحہ ۱۲۔ آیت ۱/۱) (جلد دوم صفحہ ۱۲۹۔ آیت ۲/۴)۔

(۳) یہ وحی کسی منتخب ہستی کی طرف نازل..... کی جاتی تھی اور اس سے کہا جاتا تھا کہ اسے دوسرے انسانوں تک بھی پہنچا دے۔ یہ علم، خدا سے براہِ راست حاصل ہوتا تھا اور اس میں اس ہستی کی اپنی فکر یا کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۳۔ آیت ۲/۴؛ صفحہ ۱۴۰۔ آیت ۲/۴)

(۴) کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی تھی۔ وہ نبی کو کس طرح ملتی تھی؟ (جلد دوم صفحہ ۳۸۷۔ آیت ۲/۹۷)

(۵) نبی کی طرف وحی، اس کی کتاب میں محفوظ ہوتی تھی۔ اس کے باہر (خارج از قرآن) وحی کا وجود نہیں ہوتا تھا۔ (جلد اوّل صفحہ ۱۸۱۔ آیت ۲/۴؛ جلد دوم صفحہ ۱۸۶۔ آیت ۲/۱۴)۔

(۶) وحی کے سوا، خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وجدان انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح "کشف والہام" بھی۔ یہ اصطلاحات بھی انسانوں کی خود وضع کردہ ہیں۔ قرآن کریم میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ فنّی چیزیں ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ (ان پر تفصیلی بحث جلد اوّل اور دوم میں تصوّف کے عنوان میں گزر چکی ہے)۔

(۷) وحی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوگئی۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل نہیں ہوسکتا خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

زیرِ نظر آیت (۲/۱۱۸) میں، ان لوگوں کی طرف سے مطالبہ یہ کیا تھا کہ خدا ان سے براہِ راست کلام کرے۔ (لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ)۔ مقصد اس سے وحی ہی تھا۔ وحی کو اللہ تعالیٰ نے خود کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲/۷۵ ؛ ۹/۶ ؛ ۴۸/۱۵)۔ اسی جہت سے وحی کی رُو سے عطا شدہ قوانین و احکامِ خداوندی کو کلماتُ اللہ کہا گیا ہے۔ (۶/۱۱۶ ؛ ۷/۱۵۸ ؛ ۱۰/۶۴ ؛ ۱۸/۲۷)

وحی کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے جبریل۔ یا روح الامین یا روح القدس (جو ایک ہی بات ہے) باذنِ خداوندی قلبِ نبویؐ پر نازل کرتا تھا (۲/۹۷ ؛ ۱۶/۱۰۲ ؛ ۲۶/۱۹۲-۹۴)۔ اسی کو ایک مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ۔ (۲۷/۶)۔ خدا کی طرف سے قرآن، نبی اکرمؐ کی طرف اِلقا کیا گیا تھا۔ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو وحی اسی نہج سے ملتی تھی۔ لیکن حضرت موسےٰؑ کے سلسلے میں اسے خاص طور پر کلام کہہ کر پکارا گیا ہے۔

حضرت موسےٰؑ سے کلام

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (۴/۱۶۴)۔ "خدا نے موسےٰؑ کے ساتھ کلام کیا"۔ اس کلام کو بھی وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسےٰؑ سے کہا گیا — فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى۔ (۲۰/۱۳) — "جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے کان لگا کر سن لے"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی اگر وحی ہی تھی (جس کا قلبِ نبوی پر اِلقا ہوتا ہے تو حضرت موسےٰؑ کے ضمن میں) اسے خاص طور پر کلام کیوں کہا گیا اور اس کی تخصیص کیوں کی گئی کہ: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (۴/۱۶۴)۔ "موسیٰؑ کے ساتھ خدا نے باتیں کیں"۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو وحی ملنے کا جہاں ذکر آیا ہے اس واقعہ کا اندازِ بیان ایسا ہے گویا کسی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ (مثلاً) سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ آگ کے نشان پر طورؔ پر گئے تو نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى (۲۰/۱۱)۔ "اسے پکارا گیا۔ اسے یہ کہہ کر آواز دی گئی کہ اے موسےٰؑ! اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ۔ (۲۰/۱۲)

"میں تیرا رب ہوں" وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ۔ (۲۰/۱۳)۔ "ہم نے تجھے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا جو کچھ تیری طرف وحی کی جاتی ہے اُسے اچھی طرح سے سن لو"۔

اسی طرح سورۂ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسےٰ "وہاں پہنچے تو نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ۔ (۲۸/۳۰)۔ "وادی کی دائیں جانب سے اسے پکارا گیا" .... اسی طرح سورۂ نمل میں بھی نُوْدِيَ آیا ہے (۲۷/۸ نیز ۲۶/۱۰-۱۱ ، ۷۹/۱۵-۱۶) یعنی اسے آواز دی۔ ان تمام مقامات میں آواز دے کر بلانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے۔ ایسے عام الفاظ میں سوال، جواب یا عرض معروض کہہ لیجیے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں انداز ہمکلامی کا سا ہے ۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے کا ۔ لہٰذا، اسے کلام کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مقصد اس سے ... وحی ہی ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں جان سکتے (اور کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا) کہ نبی کے قلب پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا تھا، اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہمکلامی کی نوعیت کیا تھی۔ واضح رہے کہ نَادَيْنٰهُ کی تخصیص حضرت موسیٰؑ کیساتھ نہیں تھی (۵۲/۱۹)۔ دیگر انبیاء کرامؑ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔ (مثلاً) وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ (۳۷/۱۰۴)۔ "اور ہم نے ابراہیمؑ کو آواز دے کر کہا ...." جہاں نَدٰی کے لفظ کے بغیر يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ (۸/۶۴)، يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ ۔ (۵/۶۷)۔ کہا گیا ہے ، وہاں بھی آواز دینا ، پکار کر کہنا یا مخاطب کرنا مراد ہے۔ حتیٰ کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲/۱۰۴) بلکہ يٰاَيُّهَا النَّاسُ (۲/۱۶۸)۔ میں غیر از انبیاء انسانوں کو مخاطب کر کے احکام دیئے گئے ہیں۔ اس طرح خدا ان سب سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتی ہے۔

الفاظ کا مجازی مفہوم

واضح رہے کہ خدا کے لئے جہاں کلام کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے مراد، انسانوں کی طرح زبان سے الفاظ ادا کر کے باتیں کرنا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے محسوس ذرائع سے بلند اور ماوراء ہے۔ ایسے مقامات پر اس قسم کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی میں نہیں بلکہ مجازی معانی میں لینا چاہیئے۔ (مثلاً) جہاں اللہ تعالیٰ نے يَدُ اللّٰهِ کہا ہے (اللہ کا ہاتھ۔ ۴۸/۱۰) تو اس سے مراد، انسانوں کا سا ہاتھ نہیں۔ اس کا مطلب خدا کی قدرت اور اختیار ہے۔ اسی طرح جب کہا جائے گا کہ خدا دیکھتا ہے۔ خدا سنتا ہے تو اس سے مراد اس کا (انسانوں کی طرح) آنکھوں سے دیکھنا یا کانوں سے سننا نہیں ہوگا۔ اس سے مراد علم خداوندی ہوگا۔

بات حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہمکلامی کی ہو رہی تھی۔ اسے ایک مقام پر مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ (۴۲/۵۱)۔ "پردے کے پیچھے سے بات کرنا" بھی کہا گیا ہے۔ یہ اس نسبت سے کہ سورۂ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے درخواست کی کہ: رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۔ (۷/۱۴۳)۔ "اے میرے پروردگار! تو میرے سامنے بے حجابانہ آ تاکہ تیرے دیدار سے میری

نگاہ بھی کامیاب ہو"۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (۷/۱۴۳) "نہیں موسیٰ! تو مجھے دیکھ نہیں سکتا"۔ تو یہ 'کلام مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ' ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم اُس آیت کی مزید تشریح کر دیں جس میں مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ خدا کے کلام کرنے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے: مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ۔ (۴۲/۵۱) "کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ (بجز اُن طریقوں کے جن کا ذکر آگے آتا ہے)"۔ یہاں دیکھئے! یہ نہیں کہا کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے (بجز ان طریقوں کے)۔ کہا یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ بجز ان طریقوں کے۔ یعنی انسان خدا سے کلام نہیں کر سکتا۔ خدا انسان سے کلام کرتا تھا یا کلام کرتا ہے۔ کس طرح؟ اِلَّا وَحْیًا۔ وحی کے ذریعے۔ جس کا القاء انبیاء کے دل میں کرایا جاتا تھا۔ (۲/۹۷) اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ "یا پردے کے پیچھے سے" (جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا)۔ یہ دونوں طریقے حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص تھے۔ باقی رہے 'دوسرے لوگ (یعنی غیر از نبی)' سو ان کے ساتھ خدا کے کلام کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ۔ (۴۲/۵۱) ان کی طرف خدا کا رسول بھیجا جاتا تھا جو اُن تک خدا کے وہ احکام پہنچاتا تھا جنہیں خدا اپنے 'قانونِ مشیت کی رُو سے' اس رسول کو دیتا تھا۔ یعنی غیر از نبی انسانوں سے خدا براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ اس کا کلام، انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ واضح رہے کہ وحی کے معنی، کسی کے حکم کو کسی کی طرف پہنچانے کے بھی ہیں۔

ہم نے ان تصریحات کو قرآنِ کریم کے متعلقہ مقامات کی وضاحت کے لئے پیش کیا ہے ورنہ جہاں تک اصل سوال کا تعلق ہے، یہ تمام بحثیں اب محض نظری ہیں۔ سلسلۂ وحی، حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا اور خدا کی طرف سے آخری وحی قرآنِ کریم میں محفوظ ہو گئی۔ اب کسی کو خدا کی طرف سے وحی نہیں مل سکتی۔ یعنی کسی کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ خدا کسی انسان سے براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ لہٰذا، اب ان بحثوں کا عملی مفہوم کچھ نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا تھا۔ جسے وحی کہا جاتا تھا۔ یہ وحی آخری مرتبہ حضور نبی اکرمؐ کو عطا کی گئی جو قرآنِ کریم کی دفتین میں موجود ہے۔ اس قرآن پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ بحثیں کہ وحی کی کنہ و ماہیت کیا تھی، وہ انبیاء کرامؑ پر کس طرح نازل ہوتی تھی، بے مقصد ہیں اور خواہ مخواہ الجھنیں پیدا کرنے کا موجب۔ نہ ہی یہ بحثیں کہ خدا کی طرف سے وحی تو نہیں ملتی البتہ کشف و الہام ہوتا ہے۔ یہ تمام تصورات، تصوّف کے پیدا کردہ ہیں۔ جو (بقول علامہ اقبالؒ) اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے اور بڑی خطرناک گمراہیاں پیدا کرنے کا موجب۔ جعلی نبی انہی سیڑھیوں سے "دعویٰ نبوت کے مقام پر پہنچتے ہیں۔

اس کے بعد آیۂ زیرِ نظر (2/118) کی طرف پھر آجاتیے۔ رسول اللہ کے مخالفین کا مطالبہ یہ تھا کہ وحی ان کی طرف براہِ راست آنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ایک تو انہیں یہ بتایا گیا کہ جو وحی انسانی راہ نمائی کے لئے دی جاتی ہے، اس کا طریق ہی یہ ہے کہ ایک منتخب شخصیت کی طرف وحی کی جاتی ہے جسے وہ دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے (42/51)۔ دوسرے ان سے یہ کہا گیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ یہ تعلیم تمہیں کس کی وساطت سے دی جارہی ہے۔ تم یہ دیکھو کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے، وہ کیا ہے؟ اگر تم علم و بصیرت اور عقل و شعور کی رُو سے اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ تعلیم صداقت پر مبنی ہے تو اسے قبول کر لو اور اگر تمہارا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے مسترد کر دو۔ یہ تو کوئی معقول انداز نہ ہوا کہ ایک بات کسی اور کی طرف سے ملے تو اسے مسترد کر دیا جاتے اور وہی بات اگر براہِ راست تم سے کہہ دی جائے تو تم اسے قبول کر لو۔ تم اپنی نگاہ اس پر رکھو کہ تم سے کہا کیا جا رہا ہے۔ نہ اس پر کہ وہ بات تم تک پہنچی کس طریق سے ہے۔ اگر تم اس بنیادی نقطہ کو سمجھ لو تو سارا جھگڑا ختم ہو جاتے۔ لیکن جیسا کہ ایک ہی آیت آگے چل کر بتایا گیا، ان کا مقصد افہام و تفہیم تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی بات پر جمے رہنا چاہتے تھے اور اس قسم کے مطالبات اور اعتراضات، سب کٹ حجتیاں تھیں۔ دنیا میں انسانوں کی عام روش یہی ہے اور اسی سے تمام جھگڑے اٹھتے اور فسادات برپا ہوتے ہیں۔

ان کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ یہ رسول انہیں کوئی حسّی معجزہ دکھاتے۔ وحی کے مخالفین کی طرف سے معجزات طلبی کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۳۱-۲۰۹۔ زیرِ آیت (2/23) تفصیلی بحث آچکی ہے۔ نسلِ انسانی میں بعض جذبات، خواہشات، تصورات معتقدات انسان کے ابتدائی دور سے متوارث چلے آرہے ہیں۔ انہی میں اعجوبہ پسندی بھی ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کا شعور نیم بیدار یا نیم پختہ تھا۔ اس لئے فطرت کا قانونِ علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسی بنا پر وہ فطرت کے ہر مظہر اور کائنات کے ہر حادثہ کو خارقِ عادت خیال ... کرتا تھا۔ ان کے مذہبی پیشوا ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے اور انہیں طرح طرح کے شعبدوں میں الجھائے رکھتے تھے۔ اس سے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ دعوائے "روحانیت" کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا مدعی کرئی شعبدہ دکھاتے۔ انسانی شعور کہیں سے کہیں پہنچ گیا لیکن انسان کی یہ خواہش غیر شعوری طور پر متوارث چلی آرہی ہے اس لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ ان لوگوں کا یہ مطالبہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ جذبہ انسانوں میں متوارث چلا آرہا ہے (كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ. تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (2/118)۔ "تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ" سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ جذبہ یا خواہش نوعِ انسان میں غیر شعوری طور پر متوارث چلی آرہی ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے: اَتَوَاصَوْا بِهٖ۔ (51/53)۔ یوں نظر

معجزات طلبی

آئے گا جیسے ہر جانے والی قوم آنے والی قوم کو وصیت کرجاتی ہے کہ تمہاری طرف سے اس قسم کا ردِّ عمل ہونا چاہیئے اور تم اس قسم کے مطالبات پیش کرنا، اس قسم کے اعتراضات کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ، خواہ متواتر ہی کیوں نہ چلا آرہا ہو، بہر حال مبنی بر جہالت ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہر مقام پر سختی سے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ تم عقل و فکر کو سلب کرنے والی فرمائشوں کے بجائے، غور و تدبّر سے کام لو اور سوچو کہ تم سے کہا کیا جا رہا ہے؟ جب تم معجزہ طلب کرتے ہو تو اس کی دو صورتیں ہی ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ رسول تمہیں اپنی طرف سے کوئی معجزہ دکھائے۔ اس سلسلہ میں یہ رسول تم سے بار بار کہہ رہا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں"۔ (جلد اوّل صفحہ ۳۱۔ آیت ۱۸/۱۱۰)۔ لہٰذا، اس کے اس اعتراف اور اعلان کے بعد اس سے کسی فوق البشر یا خارق عادت واقعہ کے ظہور میں لانے کا مطالبہ ہی غیر معقول ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا انہیں کوئی معجزہ دکھائے۔ معجزہ کے معنی ہیں ایسی بات جس کے کرنے سے تمہاری عقل عاجز ہو۔ سو اس قسم کے (من جانب اللہ) معجزات تو خطۂ ہستی پر ایک ایک قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ زیادہ دور نہ جاؤ۔ تم بتاؤ کہ تم ایک مکھی بھی بنا سکتے ہو؟ تو کیا مکھی کی تخلیق اور اس کا وجود (خود تمہارے معیار کے مطابق) معجزہ نہیں؟ اب آؤ اس قرآن کی طرف جسے یہ رسول پیش کرتا ہے۔ سو اس کے متعلق تمہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ تم اس کی ایک سورۃ جیسی سورۃ تصنیف کرکے پیش کرو..... (جلد اوّل آیات ۲/۲۳-۲۴ صفحہ ۳۰۸-۳۱۶) تم نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ تم اس کی مثل بنانے سے عاجز ہو۔ تو کیا یہ (قرآن) معجزہ نہیں؟

کیسی واضح اور بیّن ہے یہ بات، لیکن یہ تو اسی کی سمجھ میں آسکتی ہے جو عقل و فکر سے کام لے۔

(۰)

قرآن کریم نے ان ہر دو مطالبات کو مبنی بر جہالت قرار دیا اور ان کے وقوع پذیر ہونے سے انکار کر دیا لیکن وائے بر حالِ ما کہ ہم نے انہیں خود اپنے معتقدات میں شامل کرلیا۔ اُن کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ خدا براہِ راست ہم سے ہمکلام ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہمکلامی تو صرف نبی سے ہوسکتی ہے، غیر از نبی سے نہیں۔ اور نبوت کا خاتمہ، نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ہوگیا۔ لہٰذا، رسول اللہ کے بعد، خدا کا کسی انسان سے براہِ راست ہمکلام ہونے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کی طرف سے یہ سلسلۂ ہمکلامی بدستور جاری ہے۔ وہ اولیاء اللہ یا صوفیاء کرام سے براہِ راست باتیں کرتا ہے — بلکہ یہ حضرات خود خدا سے براہِ راست باتیں کرتے ہیں۔ آپ غور فرمائیے کہ ایک طرف ہم ختمِ نبوت پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور اسے دین

خدا سے ہمکلامی کا عقیدہ

کی اصل و بنیاد قرار دیتے ہیں (اور یہ حقیقت بھی ہے) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ کلام بدستور جاری ہے۔ البتہ اس کا نام وحی کے بجائے کشف والہام رکھ لیا گیا ہے[1] یعنی محض نام بدل دینے سے ہم مطمئن ہو گئے کہ اس سے عقیدۂ ختمِ نبوتؐ پر حرف نہیں آتا۔

کرامات

باقی رہے معجزات۔ سو اس کے لئے بزرگوں کی کرامات کا عقیدہ وضع کر لیا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو اپنے رسول کے متعلق کہتا ہے کہ وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہے۔ اس لئے اس سے فوق البشر (یا خارق عادت) واقعات کے ظہور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کی طرف سے ایسے واقعات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں بھی، نام کے فرق سے اپنے آپ کو (جھوٹا) اطمینان دلایا جاتا ہے کہ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے — اور یہ عقیدہ "بھنگڑ خانے کے ملنگوں" کا نہیں، بڑے بڑے علمائے دین کا ہے۔ مفتی محمد شفیع مرحوم (جن کا حال ہی میں ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا ہے) دارالعلوم دیوبند کے مفتیٔ اعظم تھے جس کے بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے۔ وہ اپنی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ — اسی طرح کرامت میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے — معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں نہیں ہوتے — ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارقِ عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے۔ غیر نبی سے اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔
>
> (ماہنامہ البلاغ۔ کراچی بابت مارچ ۱۹۷۷ء۔
>
> بحوالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۵۶-۵۵)

مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ - (۸/۱۷)۔ کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ ان حضرات کے نزدیک معجزہ اور کرامت، حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ فرق صرف ان کے ناموں کا ہے۔ یہ ہیں ہمارے عقاید! واضح رہے کہ ہم نے مفتی محمد شفیع مرحوم، کا قول محض مثال کے طور پر درج کیا ہے' ورنہ ہمارے ہاں کے

---

[1] بعض تو اسے پکارتے بھی وحی کہہ کر ہی ہیں۔

بڑے بڑے نامور اربابِ شریعت کی کتابیں کرامات کے امکان کی بحثوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور خود ان حضرات کی کرامات کے تذکرے ان کی تصانیف میں عام ملتے ہیں اور ان کے متبعین کی زبانوں پر رواں رہتے ہیں۔

(۰)

بہرحال، یہ تھا جو مخالفین کی معجزہ طلبی کے جواب میں کہا گیا۔۔ اس کے بعد خود نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے، ان لوگوں کو بتایا گیا کہ نبوت سے مقصود اور نبی کا مشن کیا ہوتا ہے۔ فرمایا:

۲/۱۱۹ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔ (۲/۱۱۹)

اے رسول! ہم نے تجھے الحق (قرآن مجید) کے ساتھ انسانوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو لوگوں کو بتا دے کہ خدا کی وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی سے کس طرح تباہی آجائے گی۔ تو ان تک یہ پیغام پہنچا دے اور پھر یہ ان پر چھوڑ دے کہ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ جو انکار کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا اور اس کی تباہی کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوگی۔

کہا یہ گیا ہے کہ:۔

(۱) رسول کو بالحق بھیجا گیا ہے۔ الحق کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۸۹ ۔ زیر آیت ۲/۱۳ بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی رسول زندگی کی

رسول بالحق بھیجا گیا

حقیقتیں (REALITIES) پیش کرتا ہے جو مبنی بر صداقت ہوتی ہیں۔ حقائق اور اعجوبات دو متضاد باتیں ہیں۔

(۲) ان حقائق کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتا ہے، اور (ان حقائق پر مبنی) صحیح روش کا مآل، خوشگواریاں اور سرفرازیاں۔ نذیر کے معنی ہوتے ہیں خطرات سے آگاہ کرنے والا، اور بشیر اسے کہتے ہیں جو خوشگواریوں کی بشارت دے۔ (تفصیل جلد اوّل صفحہ ۱۶۱ زیر آیت ۲/۴ گزر چکی ہے)۔

اس کے بعد، رسول اللہ سے کہا کہ تمہارا کام ان حقائق کو ان لوگوں تک پہنچا دینا اور اس طرح انہیں صحیح راستہ دکھا دینا ہے۔ تمہارا فریضہ انہیں اس صحیح راستے پر زبردستی چلانا نہیں۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ صحیح اور غلط راستے سامنے آجانے کے بعد، وہ خود طے کرے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ (انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق، جلد اوّل صفحہ ۴۱ زیر آیت ۱/۵ ۔ اور جلد دوم۔ باب تمہید و سرگزشتِ آدم میں

بڑی تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے)۔ بنابریں، حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ آپ نے ان حقائق کو ان لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس سے آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اگر یہ لوگ، غلط راستے پر چل کر جہنم کے گڑھے میں جا گریں گے۔ تو اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوگی۔ بایں ہمہ، حضورؐ کی شفقتِ قلبی، ان کی اس تباہی پر خون کے آنسو روتی تھی۔ آپؐ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ وہ لوگ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۳۴۔ آیت ۲/۷۵)

یہاں ان تباہ ہونے والوں کو اصحاب الجحیم کہا گیا ہے۔ جحیم، جہنم ہی کا دوسرا نام ہے اور جہنم کے معانی جلد اوّل صفحہ ۳۲۷ زیر آیت ۲/۲۴ بیان کئے جا چکے ہیں۔ جحیم کے معنی ہیں رکاوٹ۔ یعنی جس مقام پر انسانی زندگی کا ارتقاء رک جاتا ہے وہ جحیم ہے۔ اس سلسلہ میں، جلد اوّل صفحہ ۱۴۰، آیت (۲/۲۴) میں جنّت اور انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل سے متعلق بحث بھی دیکھئے۔

(۰)

یہ کچھ واضح کر دینے کے بعد، حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ لوگ جو اس قسم کے اعتراضات اٹھاتے اور مطالبات پیش کرتے ہیں، تو یہ ان کی کٹ حجتیاں ہیں۔ ان کا مقصد حقائق کو سمجھنا نہیں۔ یہ اپنے مسلک و مشرب ہی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ تمہارے پیش کردہ مسلک (کو اختیار کرنا تو ایک طرف، اس) پر غور و فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے یہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہیں کہ صداقت اور حقیقت ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے انہیں اسے کسی اور جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے حضورؐ سے کہا گیا کہ:۔

۲/۱۲۰ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۔ (۲/۱۲۰)

یہ یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہو سکیں گے جب تک تو (اپنا مسلک چھوڑ کر) ان کا مسلک اختیار نہ کر لے۔

"مذہب" کی دنیا میں بالعموم یہی ہوتا ہے۔ کوئی اہلِ مذہب اپنا مذہب چھوڑ کر، دوسروں کا مذہب اختیار کر لینے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ "دوسرا مذہب اختیار کر لینا" تو ایک طرف، وہ کبھی اس کا تصور کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوتا کہ دیکھ تو لوں کہیں میرا مذہب غلط ہی نہ ہو۔ یہی کیفیت فرقوں میں ہوتی ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۲)۔ "ہر فرقے کے متبعین اس خیال میں مگن ہوتے ہیں کہ صحیح راستے پر وہی ہیں"۔ باقی

سب غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضور نبی اکرمؐ پر یہود و نصاریٰ میں سے خال خال ایمان لاتے۔

اس مقام پر یہ سوال دل میں پیدا ہوتا تھا (اور آج بھی پیدا ہوتا ہے) کہ جو بات دیگر اہلِ مذاہب کہتے ہیں، وہی بات اسلام بھی کہتا ہے۔ اس کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ حقیقت اور صداقت اس کے ہاں ہے، کسی اور کے ہاں نہیں۔ پھر، یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ دیگر اہلِ مذاہب کا یہ دعویٰ تو باطل ہے اور اسلام کا وہی دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے؟ سوال اہم ہے اور اس کا جواب اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں یہ کہہ کر دے دیا گیا کہ:۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۔ (۲/۱۲۰)

۲/۱۲۰ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ سوال میرے راستے اور تمہارے راستے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کا بتایا ہوا راستہ کون سا ہے اور اس راستے کی طرف راہنمائی کرنے والی تعلیم کہاں سے ملے گی؟

یہ ہے حق اور باطل۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا معیار! نظری طور پر اس کا بھی یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب اس کا مدعی ہے کہ وہ تعلیم اس کے پاس موجود ہے۔ پھر، اس کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس باب میں کس کا دعویٰ صحیح ہے اور کس کا غلط ـــ

صرف اسلام ہی کیوں سچا دین ہے

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے اور، اپنے مخصوص انداز کے مطابق، ٹھوس حقیقت پر مبنی جواب دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دین بے شک ایک ہی تھا جو مختلف انبیاء کرامؑ کی طرف نازل کردہ کتابوں میں دیا گیا تھا۔ اگر ان انبیاءؑ کے نام لیواؤں کے پاس وہ کتابیں ہوتیں تو بیشک ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا کہ صداقت اس کے پاس ہے اور چونکہ وہ صداقت ایک ہی تھی اس لئے ان میں نہ تفرقہ ہوتا نہ باہمی جنگ و پیکار۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبیؑ کو دی گئی تھی۔ لہٰذا، ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ ان کے پاس ہدایتِ خداوندی موجود ہے۔ رسول اللہؐ نے یہ جواب (وحی کی رُو سے) اپنے زمانے کے اہلِ کتاب کو دیا، اور ان میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی۔

اور آج یہی جواب ہم اپنے زمانے کے جملہ اہلِ مذاہب کو بھی دے سکتے ہیں۔ اور ہمارا یہ جواب بلا سند اور بلا دلیل نہیں۔ میں نے اپنی کتاب ـــ "مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں" ـــ میں، خود مختلف اہلِ مذاہب کی تصانیف کی اسناد سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبیؑ کو دی گئی تھی اور اس کا خود ان کو بھی اعتراف ہے۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۸۸-۱۹۲۔ زیر آیت (۲/۷۹) میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے اور وہاں تورات کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ دے دی گئی ہے۔ (دیگر کتب کی تاریخ،

میری مذکورہ بالا کتاب میں موجود ہے)

ان سے کہا گیا کہ :-

(۱) تم بھی مانتے ہو کہ سچی راہ نمائی وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ (۲/۱۲۰)۔ اور

(۲) اس کا تمہیں خود اعتراف ہے کہ یہ هُدَى اللّٰه (خدا کی طرف سے دی گئی ہدایت)، اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہیں ہے۔

(۳) میں اس ہدایت کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تم علم و بصیرت کی بنا پر، کامل غور و تدبر کے بعد، خود فیصلہ کرو کہ یہ راہ نمائی، خدائی ہدایت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ تم میرے دعویٰ پر نہ جاؤ۔ غور و فکر کے بعد خود اس کا فیصلہ کرو۔ تمہارے پاس خدائی راہنمائی ہے نہیں۔ تمہارا یہ دعویٰ کہ تمہارا مسلک صحیح ہے اور من جانب اللہ، محض تمہاری اندھی عقیدت پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے مقابلہ میں خالی عقیدت کبھی مبنی بر صداقت نہیں سمجھی جا سکتی۔ میں العلم پیش کرتا ہوں اور تم محض خوش عقیدگی کے جذبات۔ تم علم و عقل کی بارگاہ سے پوچھو کہ ان دونوں میں سے کون سا مسلک حق و صداقت کا مسلک کہلا سکتا ہے۔ بنا بریں، اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس ہدایتِ خداوندی کو چھوڑ کر، تمہارے جذبات کا اتباع کر لوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو غلط راستے پر چلنے کے جو تباہ کن نتائج ہوں گے، اُن سے مجھے کون بچا سکے گا؟ یہ حقیقت، آیۂ زیرِ نظر کے باقی ماندہ حصے میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ :-

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (۲/۱۲۰) ۲/۱۲۰

اے رسول! اگر اس کے بعد، تم نے، اس الْعِلْم کو چھوڑ کر ان کے تباہ فریب جذبات کی پیروی اختیار کر لی تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

(٥)

اس آیت میں ملت کا لفظ آیا ہے۔ ملت (مادہ م-ل-ل) کے بنیادی معنی ہیں ایسی دستاویز جسے املا کرا کر لکھایا گیا ہو۔ اس اعتبار سے ملت کے معنی ہوں گے تحریری ضابطہ قانون۔ چونکہ تحریر سے ایک چیز واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے اس لئے طَرِيْقٌ مَلِيْلٌ۔ اس راستے کو کہتے ہیں جو واضح اور

مِلّت کا مفہوم

نمایاں ہو اور اس پر بکثرت آمد و رفت ہوتی ہو۔ اس اعتبار سے مِلَّةٌ کے معنی طریقہ اور راستہ (مسلک و مشرب) کے ہوں گے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے ـــــ یعنی مسلک و مشرب۔ طریقِ راہ۔ (مثلاً) حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں سے (اپنا تعارف کراتے ہوئے) کہا کہ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ۔ (۱۲/۳۷)۔ "میں نے اس قوم کے مسلک کو ترک کر دیا جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی تھی"۔ اور اس کے برعکس وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ...... (۱۲/۳۸) "اپنے آباء ـــــ ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کا مسلک اختیار کر لیا"۔ یا (مثلاً) جب نبی اکرمؐ نے توحید کی دعوت پیش کی تو مخالفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ: مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔ (۳۸/۷) "جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے اس میں ہم نے نہ ایسی بات دیکھی نہ سنی۔ یہ تو ایک انوکھا سا مسلک ہے جسے یہ شخص (رسولؐ اکرم) پیش کر رہا ہے"۔

قرآنِ کریم نے (متعدد مقامات پر) اسلام کو ملتِ ابراہیمی کہہ کر پکارا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۳۰ ; ۲/۱۳۵ ; ۳/۹۵ ; ۴/۱۲۵ ; ۶/۱۶۱ ; ۱۶/۱۲۳ ; ۲۲/۷۸)۔ اسے مسلک ابراہیمی کیوں کہا گیا ہے، اس کی وضاحت حضرتِ ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ میں کی جائے گی۔

بہرحال، زیرِ نظر آیت میں، یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا گیا کہ وہ رسول اللہؐ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپؐ ان کے مسلک کو اختیار نہ کر لیں۔ ان کے برعکس :-

۲/۱۲۱

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ۔ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (۲/۱۲۱)

اس کا عام ترجمہ ہوگا کہ "ان (یہود و نصاریٰ) کے برعکس، جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے، وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے، یہ لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس، جو لوگ اس کے ماننے سے انکار کریں گے اور اس کے خلاف سرکشی برتیں گے، وہ آخر الامر نقصان میں رہیں گے"۔

قرآنِ کریم نے، ان اہلِ مذاہب کو جو اُس زمانے میں اس کے مدعی تھے کہ وہ اُس کتاب کے پیرو ہیں جو ان کے نبی کو خدا کی طرف سے ملی تھی، "اہلِ کتاب" کہہ کر پکارا ہے اور ان میں یہود اور نصاریٰ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا ہے۔ بعض مقامات پر انہیں اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ـ بھی کہا گیا ہے۔ (۲/۱۴۵ ; ۵/۵)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ لیکن انہیں اہلِ کتاب کہنے کے باوجود ان سے کتاب اللہ (قرآنِ کریم اور نبی اکرمؐ کی نبوت) پر ایمان

لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ (تفصیل جلد اوّل۔ صفحہ ۸۳۔ آیت (۲/۴) اور جلد دوم۔ صفحہ ۱۸۲۔ آیت (۲/۱۳۶) میں پیش کی جاچکی ہے)۔

اس نے جماعتِ مومنین کو "اہلِ کتاب" کہہ کر تو نہیں پکارا، لیکن بعض مقامات پر انہیں بھی "اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ"۔۔۔۔ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۴۴) یا اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتَابَ (۶/۱۱۵) یعنی وہ لوگ جنہیں الکتاب دی گئی ہے۔ ایک جگہ انہیں وارثینِ کتاب بھی کہا گیا ہے (۳۵/۳۲)۔ اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ نبی اکرمؐ کی طرف کتاب نازل کیے جانے کے لئے عام طور پر اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ۔ کے الفاظ آتے ہیں (۳/۳)۔ "تجھ پر (عَلَیْکَ) کتاب نازل کی ہے"۔ لیکن بعض جگہ (اِلَیْکَ) کا لفظ بھی آیا ہے (مثلاً ۴/۱۰۵ میں) یعنی "تیری طرف" کتاب نازل کی گئی ہے۔

مومنین اور اہلِ کتاب

جماعتِ مومنین کے ضمن میں بالعموم اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ (۶/۱۱۵) کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی تمہاری طرف کتاب نازل کی گئی ہے۔ لیکن بعض جگہ (اِلَیْکُمْ) ۔ تمہاری طرف ۔۔۔ کے بجائے (عَلَیْکُمْ) کا لفظ بھی آیا ہے (۲/۲۳۱) "تم پر کتاب نازل کی ہے"۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس طرح نبی پر کتاب نازل کی گئی ہے اسی طرح تم پر بھی کتاب نازل کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ اس کتاب کو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اگرچہ ذرا گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح یہ کتاب، قلبِ نبویؐ کے اندر اتاری گئی ہے اسی طرح تم بھی اس پر غور و فکر کے بعد اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں نقش کرو۔ قرآن اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جو دل کی گہرائیوں میں نہ اتر چکا ہو۔ (۴۹/۱۴) اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

اس کے بعد آپ پھر آیۂ زیرِ نظر کی طرف آجائیے (۲/۱۲۱)۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ۔ "وہ لوگ جنہیں یہ کتاب دی گئی ہے"۔ اس سے مراد جماعتِ مومنین ہے نہ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ)۔ ایک تو اس لئے کہ آیت (۲/۱۲۰) میں یہود و نصاریٰ کا بالتصریح ذکر آیا ہے اور اس آیت میں اس جماعت کا ذکر ہے جس کا مسلک ان کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت میں ان کے متعلق کہا گیا ہے "اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (۲/۱۲۱)۔ یہ لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس جماعت (مومنین) کے متعلق کہا گیا ہے کہ۔۔۔ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ (۲/۱۲۱)۔ "یہ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے"۔ تلاوت

کا لفظ تشریح طلب ہے۔ ہمارے ہاں تو تلاوتِ قرآنِ مجید سے مراد، قرآن کا پڑھنا ہے خواہ وہ معنی اور مفہوم سمجھے بغیر ہی کیوں نہ ہو۔ (اس کے متعلق جلد دوم، صفحہ ۳۳۹۔ زیر آیت (۲/۷۸) لکھا جا چکا ہے)۔ لیکن تلاوت کا مفہوم اس سے وسیع اور عمیق ہے۔

تلاوت کا مفہوم

لفظ تلاوت کا مادہ (ت۔ ل۔ و) ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ کسی کے "پیچھے پیچھے چلنا" جسمانی طور پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ (۹۱/۲)۔ "چاند جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے چلتا ہے"۔ اور احکام کے اتباع کے لئے بھی۔ امام راغبؒ نے کہا ہے کہ تلاوت سے مقصود تو اتباعِ کتاب ہے لیکن اتباع کے لئے ضروری ہے کہ اسے پڑھا جائے (یعنی سمجھ کر پڑھا جائے)، اس لئے تلاوت کا لفظ قرآن مجید کے پڑھنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ 'قرأت' سے مختص ہے۔ یعنی قرأت' محض پڑھنے کو کہتے ہیں اور تلاوت میں قرأت اور اتباع دونوں آجاتے ہیں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن مجید کا پڑھنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھا جائے، اور سمجھنا اس لئے ضروری کہ اس کا اتباع کیا جائے۔ اگر قرآن کو سمجھا نہ جائے تو اس کا پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا اور اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا سمجھنا بھی بیکار ہے۔

آیۂ زیرِ نظر میں جو کہا گیا ہے کہ: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (۲/۱۲۱)۔ تو اس سے مراد فقط پڑھنا نہیں بلکہ اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کہا کہ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔ (۲/۱۲۱)۔ "یہ لوگ درحقیقت اس پر ایمان لاتے ہیں"۔ اگر تلاوت کے معنی صرف پڑھنا لیا جائے تو یہ جماعتِ مومنین کی خصوصیت نہیں۔ قرآن کو پڑھتے تو غیر مسلم بھی ہیں لیکن وہ اس کا اتباع نہیں کرتے۔ جماعتِ مومنین کی تلاوت یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں۔ اسے سمجھتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کا فریضۂ رسالت ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۱۵۱)

اس میں پہلا فریضہ، کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچانا۔ اسے ان کے سامنے پیش کرنا۔ اسے پڑھ کر سنانا ہے۔ دوسرا فریضہ اس کتاب کا سمجھانا ہے (یُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) اور تیسرا فریضہ، ان کی ذات کی نشوونما کرنا ہے جو احکامِ قرآنیہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، تلاوت میں تینوں باتیں آگئیں۔

کتاب اللہ کا پڑھنا پڑھانا۔ اس کا سمجھنا سمجھانا اور اس کا اتباع کرنا۔
رسول اللہ کو جس انداز سے الکتاب دی گئی تھی، اس کے لئے بھی تلاوت کا لفظ آیا ہے۔ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (۳/۵۷)۔ "اس طرح ہم نے، اے رسول! اس کتاب کو تمہارے سامنے پیش کیا، تمہیں عطا کیا"۔ جیسا کہ وحی کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے، ہم نہیں جان سکتے (اور کوئی بھی غیراز نبی نہیں جان سکتا) کہ نزولِ وحی کی کیفیت کیا تھی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے حضورؐ سے جو کہا ہے کہ: "نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ" تو اس کی کیفیت اور ماہیت کیا تھی۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب حضورؐ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی تھی، لیکن رسول اللہ جس طرح اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے، اس کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس میں تعلیمِ کتاب بھی شامل تھی اور اس کے اتباع سے تزکیۂ ذات بھی۔

(۰)

مطالب الفرقان جلد دوم کا بیشتر حصہ، داستانِ بنی اسرائیل پر مشتمل تھا۔ اس داستان کا آغاز یہ کہہ کر کرایا گیا تھا کہ، يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ..... (۲/۴۰) "تم خدا کی ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے اس نے تمہیں نوازا تھا" (جلد دوم صفحہ ۱۷)۔ اس کے بعد ان نعماء کی یاد دہانی آیت (۲/۴۷) میں کرائی گئی جس کی تفصیل جلد دوم صفحہ ۲۲۰ میں سامنے آچکی ہے۔ اس سے ملحقہ آیت میں ان کے باطل عقائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو محض ان کی خوش عقیدگی پر مبنی تھے اور جو دین کے بنیادی اصول ـــ قانونِ مکافاتِ عمل ـــ کے خلاف تھے۔ اس کی تشریح جلد دوم صفحہ ۲۲۸ میں بیان کی جا چکی ہے۔ اب اس داستان کا اختتام بھی اسی انداز سے کیا گیا ہے جس انداز سے اس کا آغاز کیا گیا تھا۔ یعنی کہا یہ گیا کہ:۔

۲
۱۲۳-۱۲۲

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۱۲۳-۱۲۲)

یہ آیات لفظاً لفظاً آیات (۲/۴۸-۴۷) جیسی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ انہی آیات کو یہاں دہرایا گیا ہے۔ اگر آپ جلد دوم صفحات ۲۲۸-۲۴۰ پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان آیات کو آخر میں کیوں دہرایا گیا ہے۔ جیسا کہ وہاں تفصیلاً بتایا گیا ہے، بنی اسرائیل کی تمام تباہیوں اور بربادیوں کا بنیادی سبب

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی چہیتی قوم ہے۔ اس لئے، خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، انہیں اس دنیا میں بھی نعماے خداوندی سے نوازا جائے گا۔ یعنی انہیں وہ بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) حاصل ہوں گی، اور آخرت میں جنت بھی اسی طرح مل جائے گی۔ یہ باطل عقیدہ ان کے رگ و پے میں سرایت، اور ان کے دل کی گہرائیوں تک میں اُتر چکا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس کی بار بار تردید کی جاتی — جس قدر مرض مُزمن ہوگا، اسی قدر ضرورت ہوگی کہ اس کا علاج پیہم اور متواتر کیا جائے۔ قرآنِ کریم میں تصریفِ آیات (آیات کو پھیر پھیر کر بار بار سامنے لانے۔ ان کا اعادہ کرنے) سے یہی مقصود ہے۔ لہٰذا، اس مقام پر ان کے اس بنیادی عقیدہ کی ایک بار پھر تردید کر کے، اس داستان کو سرِدست تہ کر کے رکھ دیا۔

دُوسرا بابؓ

معمارِ حرم

آیات ـــــــ ($\frac{۲}{۱۲۴}$) تا ($\frac{۲}{۱۴۱}$)

(۱) تعمیرِ حرم سے پہلے تخریبِ دَیر، لازمی مرحلہ ہے۔
(۲) نوعِ انسان کی امامت (لیڈر شپ کا استحقاق)
(۳) تخریب سے تعمیر کی طرف نقلِ مکانی ـــــ ہجرت۔
(۴) نوعِ انسانی کے عالمگیر مرکز کی تاسیس و تعمیر۔
(۵) حج ـــ عالمگیر انسانیت کا نقطۂ اجتماع۔
(۶) اس کی وجۂ جامعیت ـ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت ـ قوانینِ خداوندی کی۔
(۷) اس نصب العین پر یقین کا مطالبہ تمام نوعِ انسان سے ـــ خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا غیر اہلِ کتاب۔
(۸) اسی سے وحدتِ انسانیہ کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔
(۹) یہی وہ صبغۃ اللہ ہے جس میں ڈوب جانے سے تمام تضادات ختم ہو جاتے ہیں اور نوعِ انسان امتِ واحدہ بن جاتی ہے۔

دوسرا باب

معمارِ حرم

قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام کی طرف آتے اور خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ ان تمام انبیاءؑ کو من جانب اللہ ماننا، جزوِ ایمان ہے ۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ... (۲/۱۷۷) "جو ایمان لایا اللہ پر۔ آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتابوں پر اور انبیاءؑ پر"۔ ان میں بعض کا ذکر تصریحی طور پر قرآن مجید میں آیا ہے اور بعض کا اس طرح ذکر نہیں آیا۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ .... (۴۰/۷۸ نیز ۴/۱۶۴) "اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ ہم تجھ سے پہلے بھی اپنے رسول بھیجتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا ذکر تصریحاً کر دیا گیا ہے اور بعض وہ جن کا یوں ذکر نہیں کیا گیا"۔ ان میں سے بعض پر ایمان لاکر اور بعض سے انکار کرکے، انسان مومن نہیں ہوسکتا۔ یہ کفار کا شیوہ ہے جو کہتے ہیں کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (۴/۱۵۰)۔ "ہم بعض انبیاء پر ایمان

تفریق بین الرسل

لاتے ہیں اور بعض پر ایمان نہیں لاتے"۔ ان کے متعلق کہا کہ: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ (۴/۱۵۱)۔ "یہ پکے کافر ہیں"۔ یعنی بعض انبیاءؑ کا ماننا، انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ اسی طرح کافر کے کافر رہتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے تمام انبیاء کو ماننا ہوگا، اور ماننا بھی اس طرح کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (۲/۲۸۵) "ان کے نبی ہونے میں کسی قسم کا فرق نہ کیا جائے"۔ (۳/۸۴)۔ یہ مانا جائے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے یہ سب یکساں تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان حضرات کے دوائر تبلیغ و تعلیم میں فرق تھا۔ ایک رسول صرف ایک بستی کے لوگوں کی اصلاح کے لئے آتا۔ دوسرا کسی عظیم قوم کی ہدایت کے لئے۔ ایک کا مقابلہ اپنے قریہ کے چند شریر نفوس سے ہوتا اور دوسرے کا تصادم بڑی بڑی مستبد قوتوں کے ساتھ۔ اس اعتبار سے ان کے مدارج و مناصب میں فرق ہوتا۔ اور اسی نہج سے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲/۲۵۳ ؛ ۱۴/۵۵)۔ اس اختلافِ مدارج اور مراتب کے باوجود یہ سب حضرات ایک ہی برادری کے افراد، ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی سلکِ مروارید کے گہرِ تابدار تھے۔

قرآن کریم نے سلسلۂ انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکار سے کیا ہے۔ ان کے بعد (قومِ عاد کی طرف) حضرت ہودؑ

حضرت ابراہیمؑ

اور پھر (قومِ ثمود کی طرف) حضرت صالحؑ کا تذکرہ۔ ان کی دعوتِ رشد و ہدایت کا دائرہ ان کی اپنی اپنی قوم تک محدود تھا۔ لیکن اسلام تو تمام بنی نوعِ انسان کا دین ہے اس لئے اس کا پیغام عالمگیر ہے۔ ان تین انبیاء کرامؑ کے بعد، قرآن کریم نے اُس رسولؑ کا ذکر کیا ہے جس کے ہاتھوں اسلام کی اس آفاقیت اور عالمگیریت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ذاتِ گرامی، پیکرِ خُلّت و صداقت، حضرت ابراہیمؑ کی ہے جنھیں مشیّتِ ایزدی نے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا اور سامی اقوام میں نبوت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ آپ کی ذریت سے باہر نہ گئی۔ اس شجرِ مقدس کی ایک شاخِ طوبیٰ، حضرت عیسیٰؑ تک منتج رہی تو دوسری شاخ سے وہ گلِ سرسبد تبسم فشاں اور عطر بیز ہوا جس پر نور و نکہت کی تمام رعنائیاں معراج تک پہنچ گئیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی سلسلۂ نبوت کی کڑی تھے جس کے تذکرہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی گئی ہے۔ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (۳۷/۸۳)۔ "اور یقیناً ابراہیمؑ، نوحؑ کے گروہ (زمرۂ انبیاء) میں سے تھا"۔ دوسری طرف جملہ انبیاء بنی اسرائیل اور حضور خاتم النبیینؐ ان کی ذریت میں سے تھے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (۶/۸۵)

اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور (اسحٰقؑ کا بیٹا) یعقوبؑ عطا کیا۔ ہم نے ان سب کو زندگی کا صحیح راستہ دکھایا۔ وہی راستہ جو اس سے پہلے نوحؑ کو دکھایا گیا تھا اور اس کی نسل میں سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی وہی راہ دکھائی۔ ہم اس طرح حسنِ عمل کرنے والوں کو ان کے اعمالِ حسنہ کا بدلہ دیتے ہیں۔

تعارفِ ابراہیمی

تورات میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی آٹھویں پشت میں نحور پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیمؑ کے دادا تھے۔ وہ آٹھ پشتیں یہ ہیں۔ نوحؑ، سام، ارفکسد، سلح، عبر، فلج، رعو، سروج، نحور، تارح، ابراہیمؑ۔

نحور سے یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھا۔

- **نحور**
  - **تارح (آذر)**
    - **حضرت ابراہیمؑ**
      - (حضرت سارہ کے بطن سے) حضرت اسحٰقؑ۔ انہوں نے کنعان (یعنی فلسطین اور شام) میں حکومت قائم کی۔ جملہ انبیاءؑ بنی اسرائیل انہی کی ذریت میں سے تھے۔
      - مدیان (حضرت قطورا کے بطن سے) یہ حجاز کے قریب بحرِ احمر کے ساحل کے پاس متمکن ہوئے۔
      - (حضرت ہاجرہ کے بطن سے) حضرت اسمٰعیلؑ جو وادیٔ فاران (مکہ) میں جلوہ افروز ہوئے۔ حضورؐ نبی اکرم انہی کی ذریت میں سے تھے۔
    - **حاران**
      - (حضرت لوطؑ)

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا خاندان، کلدانیوں کے شہر 'اُور' میں آباد تھا۔ خود 'اُور' کے معنی شہر یا بستی کے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد 'بابل' وغیرہ کوئی بڑا شہر ہو۔ تورات (کتاب پیدائش) میں ہے:۔

> اور تارح نے اپنے بیٹے ابرام اور اپنے پوتے لوط۔ یعنی اپنے بیٹے حاران کے بیٹے۔ کو' اور اپنی بہو' سری' اپنے بیٹے ابرام کی جورو کو لیا اور ان کے ساتھ کسدیوں کے اُور سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہاں رہے۔ (پیدائش - ۱۱/۳۱)

کلدانیوں کا تمدن، ازمنۂ قدیم کی تاریخ کے اوراق پر نمایاں حروف میں منقوش ہے۔ تورات میں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں، عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے۔ جس میں شنعار (بابل) کے بادشاہ کا نام 'امرافیل' بتایا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین مینارِ بابل پر کندہ ہیں۔ اس قیاس کی رُو سے، حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م قرار دیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ تورات کا بیان ہو، یا عام تاریخ کا، یہ سب قیاسات ہیں۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تفصیلات سے بحث نہیں کرتا۔

جس قوم میں حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے وہ بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود حضرت ابراہیمؑ کے والد، مملکت کے بلند مرتبہ پجاری (آوار) تھے۔ واضح رہے کہ اُس زمانے کے پجاری، آجکل کے پنڈتوں، گرجا کے پادریوں، مساجد کے اماموں یا درگاہوں کے مجاوروں جیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ (بادشاہ کے بعد) مملکت کے بلند ترین منصب پر فائز اور وسیع اختیارات کے مالک ہوتے تھے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہ بادشاہ گر ہوتے تھے اور مملکت کا سارا کاروبار انہی کی منشاء کے مطابق سرانجام پاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد (آذر) کا بھی یہی مقام تھا اور اُس کے بعد اس مقام و منصب کے وارث (حضرت) ابراہیمؑ قرار پانے والے تھے۔ اس قسم کے ماحول اور اس قسم کے گھرانے میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے بچے کو انہی معتقدات کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن مشیت خداوندی نے جس بچے کو (آگے چل کر) نبوت جیسے منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کرنا ہوتا تھا، وہ شروع ہی سے اس قسم کے خارجی اثرات سے غیر متاثر رہتا تھا۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ زندگی کا صحیح راستہ کون سا ہے (اس کی نشاندہی تو وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی) لیکن غلط راستوں سے اس کی طبیعت شروع ہی سے اِبا کرتی تھی۔ (تفصیل اس اجمال کی حضورؐ نبی اکرمؐ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں اپنے مقام پر سامنے آئے گی۔ علم النفس (PSYCHOLOGY) اس حقیقت پر انگشت بدنداں اور عمرانیات (SOCIOLOGY) سرگرداں ہے کہ اس قسم کی بت پرستی کی فضا میں پرورش پانے والا بچہ، آگے چل کر دنیا کا سب سے بڑا بُت شکن کس طرح بنا۔ اس کی یہ بت شکنیؑ مٹی اور پتھر کی محسوس اور مرئی مورتیوں تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے زمانے میں جب انسانی نگاہ محسوسات کی چار دیواری کے باہر بمشکل جاتی تھی، تیشۂ براہیمی نے دلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے، غیر محسوس بتوں تک کو پاش پاش کر ڈالا اور یوں، دنیا میں توحیدِ خالص کے انقلاب آفریں پیامبر کی حیثیت سے، ملتِ موحدہ کے مورثِ اعلیٰ قرار پاتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی فضا میں، اصنام پرستی اور بت گری کی جگہ بت شکنی کی دعوت اور اس کی عملی نمود کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس کے لئے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر کھڑے ہو جانے کی ہمت اور پہاڑوں کے ساتھ ٹکرا جانے والی استقامت کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے خدائی کے دعویدار بادشاہ (جسے نمرود کہہ کر پکارا جاتا ہے) کی قہرمانیت، آذر جیسے بُت گر باپ کی "ہامانیت" اور شعلہ صفت، آتش بہ پیرہن قوم کی مذہبی دیوانگی کا تنہا مقابلہ کرنے کی بسالت درکار تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے مخالفتوں کے ان تمام ہجوموں کا مقابلہ کیا اور ان صبر آزما، جان گداز مراحل کو اس کامیابی اور کامرانی سے طے کیا کہ تاریخ کے شواہد اس پر آج تک تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے چلے آرہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس بطلِ جلیل کی داستانِ حیات کا آغاز اسی مقام

سے، یہ کہہ کر کیا ہے کہ:-

۱۲۴/۲ وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۔ (۱۲۴)

اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "جب ابراہیمؑ کو اس کے ربّ نے چند احکام میں آزمایا تو اس نے انہیں پورا کیا"۔ اس میں "آزمایا" ترجمہ ہے ابتلیٰ کا۔ ہمارے ہاں ابتلا کا لفظ آزمائش کے لئے بولا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو مختلف مصائب میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کرتا ہے، ان کا امتحان لیتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے ابتلاء کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس کے صحیح مفہوم کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۴۱۔ زیر آیت (۲/۹) تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کا ملخص یہ ہے کہ انسان کے سامنے بہت سے صبر آزما اور ہمت طلب مراحل آتے ہیں۔

ابتلاء کا مفہوم

ان میں اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس میں ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی کس قدر صلاحیت ہے۔ اس قسم کے مقامات درحقیقت انسان کے حقیقی کردار کی نمود کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس سے وہ اپنی ذات کی صلاحیتوں کا محاسبہ (TEST) کرتا ہے۔ لہٰذا ابتلاء درحقیقت محاسبۂ خویش کا دوسرا نام ہے۔ بنابریں، آیۂ زیر نظر کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ (حضرت) ابراہیمؑ کو حق و باطل کی کشمکش میں بڑے سخت جانگسل مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ انہوں نے ان تمام صبر آزما مراحل کا نہایت ثبات و استقلال سے مقابلہ کیا اور کامیاب و کامران آگے بڑھ گئے! اور اس طرح انہوں نے خود بھی دیکھ لیا اور دنیا کو بھی بتا دیا کہ ان کی صلاحیتیں کس قدر نشوونما پا چکی ہیں۔ قرآن کریم نے ان مراحل، اور ان میں سے حضرت ابراہیمؑ کے حسن و خوبی کے ساتھ گزر جانے کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں مختصراً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انہیں مملکت کی بلند ترین پیشوائیت کا منصب اور اس سے وابستہ دولت، ثروت، عزت، شہرت، عظمت، اختیارات، سب بلا محنت و کاوش وراثت میں مل سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ان سب کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اس قسم کی جاذبیتوں اور کششوں سے، دامن جھٹک کر الگ ہو جانا، بڑی ہمت کا کام ہوتا ہے۔ اس کے بعد، بادشاہ کے ساتھ مقابلہ کا مرحلہ آجاتا ہے — اُس زمانے کے مستبد، اختیاراتِ مطلقہ کے مالک، بادشاہ — اور بادشاہ بھی نمرود جیسا جس کا استبداد دنیا میں ضرب المثل ہے — اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانا اور اس طرح مقابلہ کرنا کہ (قرآن کے الفاظ میں) اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ (فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ – ۲/۲۵۸) جس کو آسا ہمت اور جرأت کا متقاضی تھا، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ پھر، اس قسم کی مذہب پرست قوم کے معبودوں کی نہ صرف نظری طور پر تنقیص و تنکیر، بلکہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دینا، جس آتش فشاں

کا سامنا کرنا تھا، اس کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس عزیمت اور خلت کے مجسمہ نے ان تمام تلاطم خیزیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا تو اس کے بعد وہ مرحلہ آگیا جہاں قوم، وطن، سب کو چھوڑ کر اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹/۲۶)۔ اور اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ (۳۷/۹۹)۔ کا عملی ثبوت پیش کر کے، ایک اجنبی سرزمین کی طرف ہجرت کر جانا اور اسی پر اکتفا نہیں، اپنی اولاد (کے ایک حصہ) کو ایک بے برگ و گیاہ وادی (۱۴/۳۷-۳۵) میں جا بسانا۔ اور اس طرح اپنے گھر کو اجاڑ کر، خدا کے گھر کو آباد کرنا — سوچیئے کہ اس قدر جانگداز مراحل کو انتہائی خندہ پیشانی سے طے کر جانا، کس عظمتِ کردار کا آئینہ دار ہے :-

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت ابراہیمؑ نے اس قدر بلندئ کردار کا ثبوت دیا تو بارگاہِ خداوندی کی طرف سے انہیں یہ کہہ کر نوازا گیا کہ ابراہیمؑ! تو واقعی اس کا اہل ہے کہ تجھے عالمِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر سرفراز کیا جائے :-

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (۲/۱۲۴)

۲/۱۲۴　عالمِ انسانیت کا وہ بلند ترین مقام تھا جس کا اہل حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا گیا؟ — نوعِ انسانی کی امامتِ کبریٰ — کسی ایک قبیلہ، ایک خاندان، ایک قوم کی امامت نہیں — پوری کی پوری نوعِ انسانی کی امامت۔

امامت کا مفہوم

امامت کا عام ترجمہ تو (LEADERSHIP) کیا جاتا ہے لیکن عربی زبان (اور قرآنی لسان) کی رُو سے اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا اور بلند ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس لفظ سے درحقیقت بتایا یہ گیا ہے کہ امام (لیڈر) کا منصب کیا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ معماروں کے پاس ایک چھوٹا سا آلہ ہوتا ہے — یعنی لمبے سے دھاگے کے ساتھ ایک لٹو سا بندھا ہوتا ہے۔ اس سے وہ دیکھتے جاتے ہیں کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے؟ چنائی ہموار ہو رہی ہے؟ دیوار میں کہیں خم تو نہیں آ رہا؟ اس میں کجی تو نہیں پیدا ہو رہی؟ اس آلہ کو اَمام کہا جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کو اِمَامًا لِّلنَّاسِ قرار دینے سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کی کسی قوم نے اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس کے عمل و کردار کی دیوار صحیح استوار ہو رہی ہے تو اس کے پرکھنے کے لئے اسے سیرتِ ابراہیمیؑ کو بطور معیار اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سیرتِ ابراہیمیؑ کو نوعِ انسان کے لئے بہترین ماڈل (اسوۂ حسنہ ۶۰/۴) کہہ کر پکارا ہے — یعنی انسانی معاشرہ کی سیدھ اور ٹیڑھ ماپنے کا پیمانہ۔

آیت کے اگلے حصہ میں ایک اور عظیم حقیقت کو وا شگاف کیا گیا ہے۔ لیکن اس مقام پر میں تھوڑے سے توقف کے لئے معذرت چاہوں گا۔ میں نے اس کتاب (مطالب الفرقان) میں، قرآنی حقائق کو براہِ راست پیش کئے جانے کا انداز اختیار کیا ہے اور اس کے تقابلی مطالعہ سے عام طور پر اعراض برتا ہے۔ لیکن بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں اس قسم کا تقابل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن مجید کو اسلاف کی تفسیروں کی رُو سے سمجھنا چاہیئے۔

روایات کی رُو سے تفسیر

چنانچہ جہاں کوئی شخص قرآن مجید کا کوئی مفہوم پیش کرتا ہے اس سے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا اسلاف میں سے بھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ اگر ان میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا تو پھر اس کا پیش کردہ مفہوم بلا سوچے سمجھے مسترد کر دینے کے قابل قرار دے دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں بڑی مستند تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو آزمانے کے لئے کچھ احکام دیئے تھے جن کی انہوں نے تعمیل کی اور اس طرح اس آزمائش میں پورے اتر آئے۔ وہ احکام کیا تھے؟ غور سے دیکھیے۔ وہ احکام یہ تھے:-

> مونچھوں کو کم کرنا۔ کلی کرنا۔ ناک صاف کرنا۔ مسواک کرنا۔ سر کے بال منڈوانا یا رکھنا تو مانگ نکالنا۔ ناخن لینا۔ زیرِ ناف بال لینا۔ ختنہ کرانا۔ بغل کے بال لینا۔ پیشاب پاخانے کے بعد استنجا کرنا۔ جمعہ کے دن غسل کرنا وغیرہ۔
>
> (تفسیر ابنِ کثیر۔ اردو ترجمہ۔ پہلا پارہ صفحہ ۱۴۴)

اس کے بعد لکھا ہے:-

> صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے: دس باتیں فطرت کی اور اصل دین کی ہیں۔ مونچھیں کم کرنا۔ ڈاڑھی بڑھانا۔ مسواک کرنا۔ ناک میں پانی لینا۔ ناخن لینا۔ پوریاں دھونا۔ بغل کے بال لینا۔ زیرِ ناف بال لینا۔ استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ میں دسویں بات بھول گیا شاید کلی کرنا تھی۔ صحیحین میں ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں۔ پانچ باتیں فطرت کی ہیں۔ ختنہ کرانا۔ موئے زہار لینا۔ مونچھیں کم کرنا۔ ناخن لینا۔ بغل کے بال لینا۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۵)

یہ تھے وہ احکام جن کی تعمیل کرنے سے حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا۔ ان میں ختنے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ بخاریؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اسّی سال کی عمر میں بسولے سے اپنا ختنہ آپ کیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۵۱)

بہرحال، یہ ہے ہماری مستند تفاسیر اور روایات کی رُو سے تفسیر اس آیت کی۔

(۰)

اب آگے بڑھیئے۔ قدیم زمانے میں، انسانی معاشرہ کی بنیاد نسلی امتیاز پر تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے اور ایک خاندان دوسرے خاندان سے الگ، نسلی بنیاد پر ہی ہوتا تھا۔ ہندو دھرم (یا ہندو معاشرہ) میں ورنوں (ذاتوں۔ گوتوں) کی تقسیم بھی پیدائش کی رُو سے ہوتی تھی۔ جو بچہ جس گھرانے میں پیدا ہو گیا، اس گھرانے کا ورن (برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ شودر) اس کی زندگی کا جزوِ لاینفک قرار پا گیا۔ یعنی اس ورن کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

ابلیس وآدم کی تمثیلی آویزش کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے (جلد دوم صفحہ ۱۱۴۔ آیت ۲/۳۴) کہ ابلیس نے آدم کو اسی نسلی امتیاز کا چکمہ دے کر بہکایا تھا۔ اسی تصور کی رُو سے موروثی بادشاہت کا نظام وجود میں آیا۔ یعنی بادشاہ کا بیٹا محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے تخت وتاج کا وارث قرار پا گیا۔ یہی "اصول" دیگر مناصب ومدارج کے سلسلہ میں تسلیم کر لیا گیا۔ ... نسلی تفریق کا یہ باطل نظریہ،

نسلی امتیاز کا باطل نظریہ

عالمِ انسانیت میں کس قدر تباہیوں کا موجب چلا آرہا ہے، اس کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۳۹ آیت ۲/۱۱-۱۲ کے تحت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دین کا مقصد ان غیر فطری تفریقات کو مٹا کر، نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کر دینا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے، موروثیت کے تصور کا ابطال ضروری تھا چنانچہ حضرات انبیاء کرامؑ نے اس کی عملی مثالیں قائم کیں۔ داستانِ حضرت نوحؑ کے ضمن میں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جب انہوں نے 'موروثیت' کے اس قدیم نظریہ کی رُو سے سمجھا کہ ان کا بیٹا محض اس لئے تباہی سے بچا لیا جائے گا کہ وہ ان کا بیٹا ہے' تو ان کی اس غلط فہمی کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ دین میں "فلاں ابنِ فلاں" چیزے نیست۔ "تیرا" وہی ہے جو دین میں تجھ سے ہم آہنگ ہے۔ (آیت ۱۱/۴۶۔ تفصیل کے لئے میری کتاب ــ جوئے نور ــ میں داستانِ حضرت نوحؑ ملاحظہ کیجئے)۔ وہاں' باپ سے کہا گیا تھا کہ جب تک تیرا بیٹا ایمان میں تجھ سے ہم آہنگ نہ ہو' وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہو سکتا۔ داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں پہلے' بیٹے (حضرت ابراہیمؑ) سے کہا گیا کہ تیرا اُس باپ سے کوئی رشتہ نہیں جو تیرا ہم مسلک نہیں (جلد دوم صفحہ ۳۲۸۔ زیرِ آیت ۹/۱۱۴) اور آخر میں انہوں نے اس کلی اصول کا اعلان کر دیا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ۔ (۱۴/۳۶)۔ "جو میرا اتباع کریگا وہ میرا ہوگا" جو اس راستے سے الگ راستہ اختیار کرے گا، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد' آیۂ زیرِ نظر کے اگلے ٹکڑے کی طرف آیئے۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ نوعِ انسانی کی امامت' حضرت ابراہیمؑ کے حصے میں آئے گی۔ یہ بڑا جلیل القدر منصب تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کی وضاحت چاہی کہ کیا

وراثت کا باطل نظریہ

عام دنیاوی دستور کے مطابق یہ منصب میری اولاد کو وراثت میں ملے گا؟ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۔ (۲/۱۲۴)۔ جواب ملا۔ نہیں! ابراہیمؑ تجھے یہ منصب تیرے جوہرِ ذاتی کی بنا پر ملا ہے. تیری اولاد میں اگر یہ جوہر پائے گئے تو وہ بھی اس منصب پر سرفراز رہے گی۔ لیکن اگر ان میں یہ جوہر نہ رہے تو وہ اس منصب کے مستحق نہیں رہیں گے :۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ۔ (۲/۱۲۴)

۲/۱۲۴ کہا کہ نہیں! جو اس راستے سے سرکشی اختیار کرے گا، اسے یہ منصب نہیں ملے گا۔ ہمارا وعدہ مشروط ہے جوہرِ ذاتی کے ساتھ۔

اس ایک اساسی اصول سے، اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ :۔

(۱) وراثت کا نظریہ باطل ہے خواہ وہ ملوکیت کے سلسلہ میں ہو اور خواہ دیگر امتیازات اور مقامات کے ضمن میں۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی ذریت (نسل) میں جو انبیاء کرامؑ پیدا ہوتے تو اس بنا پر نہیں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں ان کے جوہرِ ذاتی کی بنا پر اس منصب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اس سے یہ دوسرا کلیہ مستنبط ہوا کہ اگر کسی شخص کا بیٹا اپنے جوہرِ ذاتی کی بنا پر، باپ کے منصب کا مستحق قرار پاتا ہے تو اُسے، محض اُس شخص کا بیٹا ہونے کی بنا پر اس سے محروم نہیں کر دیا جائے گا۔ اور

(۳) اس سے یہودیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ اولادِ ابراہیمؑ ہونے کی بنا پر جنت کے مستحق قرار دیئے جا چکے ہیں۔

مساواتِ انسانیہ کے اس آفاقی اصول کے بعد، اس عمارت کی طرف آئیے جو اس سنگِ بنیاد پر استوار ہوتی ہے یعنی

نظام کی تشکیل

نوعِ انسانی کو امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھالنے کا نظام — نظام کے تصور سے ایک بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ نظام متشکل ہوتا ہے ان اصولوں کی بنا پر جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتّص اور منفرد کرتے ہیں۔ یہ اصول اس نظام کا فکری مرکز قرار پاتے ہیں۔ وحدتِ افکار کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نظام کا ایک محسوس یا مشہود مرکز بھی ہوتا ہے۔ (اس کی وضاحت

کعبہ مرکزِ نظامِ خداوندی

جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۶، زیرِ آیت (۲/۴۴) کی جا چکی ہے)۔ نظامِ خداوندی (الدّین) کا فکری مرکز تو وحی تھی (جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے) لیکن اس کا ایک محسوس مرکز بھی ضروری

تھا۔ یہ مرکز کعبہ ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں سے عمل پذیر ہوئی تھی۔ ان کا یہ کارنامہ، ان کے منصب — امامتِ نوعِ انسان — کی اولین ذمہ داری تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن، بابل کا علاقہ تھا اور کعبہ سرزمینِ حجاز میں واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ بابل سے حجاز کیسے تشریف لائے۔ اگر یہ معاملہ محض نقلِ مکانی کا ہوتا تو ہم اسے اہمیت نہ دیتے۔ لیکن یہ تبدیلی محض جائے رہائش کی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ دین کے نظام کے قیام کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس لئے ہم نے اسے درخورِ اہمیت قرار دیا ہے — اور ہم کیا! خود اللہ تعالیٰ نے اسے ایک اہم انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔ دین کی اصطلاح میں اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب — معراجِ انسانیت — میں بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی ہے لیکن مطالب الفرقان کی جامعیت کا تقاضا ہے کہ اسے یہاں دہرا دیا جائے۔

ہجرت

آپ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوتِ انقلاب کی تاریخ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آجائے گا کہ ہر تحریک تین مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ پہلا مرحلہ دعوت و تلقین اور تبلیغ و تبیین کا ہوتا ہے جس میں اس پیغام کی عام نشر و اشاعت کی جاتی ہے اور افہام و تفہیم کے ذریعے سعید روحوں کو اس کی طرف بلایا جاتا ہے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ اس جماعت (مومنین) کے حلقہ میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایسا وقت آجاتا ہے جب نظر آتا ہے کہ ان بقایا لوگوں میں حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں اور ان کی طرف سے سوائے مخالفت کے اور کسی سلوک کا امکان نہیں۔ اس وقت برأت و ہجرت کا مرحلہ آتا ہے جس میں ان متمرد و سرکش انسانوں سے قطعِ علائق کر لیا جاتا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ فتح و کامرانی کا ہوتا ہے جس میں حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ اپنی نزاکت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ :-

مرحلۂ برأت و ہجرت

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ (۷۱/۲۶)

اور نوحؑ نے کہا: "اے میرے پروردگار! انکارِ حق کرنے والوں میں سے روئے زمین پر کسی سرکشی اختیار کرنے والے (متنفس) کو (زندہ) نہ چھوڑ۔"

اور اس کے بعد اس متمرد قوم کا جو کچھ انجام ہوا اس پر بھنور کی آنکھ آج تک روتی ہے۔ یہی حضرت ھودؑ نے قومِ عادؔ سے کہا :-

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۔ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّىْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۔ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ۔ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ حَفِيْظٌ ۔ (۱۱/۵۷)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی۔ (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں) اور (مجھے تو نظر آرہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔

اور اس کے بعد :-

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (۷/۷۲)

"پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہودؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں، ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔"

اور حضرت صالحؑ نے بھی اس مقام پر پہنچ کر اسی طرح اعراض برتا۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّىْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۔ (۷/۷۹)

پھر صالحؑ ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

اور اس کے بعد :

وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰى ۔ (۵۳/۵۲)

ثمود کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

ملّتِ حنفیہ کے مؤسّس اوّل حضرت ابراہیمؑ کی تحریک میں یہ مقام برأت و ہجرت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے :-

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ۔ (۶۰/۴)

جب انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ "ہم" (حضرات ابراہیمؑ اور ان کی جماعت) ان سے جنہیں تم اللہ کے

سوا معبود بناتے ہوئے ہو۔ بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت و نفرت آشکارا ہو گئی۔ یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔

اور اس کے بعد ان سے کہہ دیا کہ :-

اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۹/۲۶)

"میں اس وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو غالب اور حکمت والا ہے۔"

اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس ملک کو چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تاکہ کسی بار آور زمین میں حکومتِ خداوندی کے شجرِ مقدس کی تخم ریزی کی جائے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر نبی اکرمؐ نے دینِ خداوندی کے مخالفین کو مخاطب کر کے یہ زلزلہ انگیز اعلان کیا تھا کہ :-

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ ۔ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۔ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۔ (۱۰۹/۱-۶)

(اے رسول!) تم کہہ دو: "اے منکرینِ دعوتِ حق! میں ان کی عبودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہیں کروں گا جن کی عبودیت تم اختیار کئے ہوئے ہو اور (حالات اس پر شاہد ہیں کہ) نہ تم ہی اُس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرو گے جس کی عبودیت میں اختیار کر رہا ہوں (لہٰذا میری اور تمہاری راہ الگ الگ ہے) اور نہ میں ان کی عبودیت (اطاعت) اختیار کر سکتا ہوں جن کی عبودیت تم نے اختیار کر رکھی ہے اور (بظاہر حالات) تم بھی اس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرنے والے نہیں ہو جس کی عبودیت میں نے اختیار کر لی ہے۔ تمہارے لئے تمہارے اعمال کی جزا ہے اور میرے لئے میرے اعمال کی جزا۔" (مکافاتِ عمل کے دن حقیقت واضح ہو جائے گی۔)۔

اس اعلانِ برأت و علیحدگی کی شدت، تاکید اور وضاحت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ چند جملوں کے تکرار سے حق و باطل کو کس طرح الگ الگ کر کے رکھ دیا ہے کہ ان میں مفاہمت و مصالحت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ وہ 'رسول' ان سے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اس کے جواب میں کہتے ہو کہ نہیں! "جس راستے پر ہم چل رہے ہیں وہ تو کامیابیوں کا راستہ ہے، لیکن جس راستے کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو، وہ تباہیوں کی طرف لے جانے والا ہے۔" اب اس کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوئی اور صورت ۔ بجز

اس لئے کہ تم اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے میرے راستے پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتادیں گے کہ کس کا راستہ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۔ وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۔ (۱۱/۱۲۲-۱۲۱)

اور (اے رسول!) تم ان لوگوں سے کہہ دو "تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ۔ ہم بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہیں۔ تم بھی (نتیجہ کے) منتظر رہو۔ ہم بھی منتظر ہیں"۔

(۰)

اب اسی موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آئیے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے۔ رسول کا مقصد خالی وعظ و نصیحت نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے نظامِ حکومت کا قیام ہوتا ہے، جس میں احکامات خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظامِ حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظامِ زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جد و جہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن سرکش قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں، اس کی سر توڑ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعیٔ انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فریضہ عاید ہوتا تھا، میں نے اسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد ان پیش نظر لوگوں تک دعوتِ حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچانا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ممکن نہیں تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لئے مساعد ہو۔ وطن کی حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں، اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک "وطن" وہ ہے جس کی زمین اس نظامِ خداوندی کے لئے سازگار اور بارآور ہو۔ لہٰذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رُخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام رسول

وطن کا مفہوم رسُول کی نگاہوں میں

کی زبان میں "ذھاب الی اللہ" یا "ھجرت الی اللہ" ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ہجرت" کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر وہ تعلق جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، وہ اسے بلا تأمل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام۔ مال کی محبت۔ اولاد سے وابستگی۔ رشتہ داروں سے تعلقات۔ دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے جو "کانٹا" بھی دامن گیر ہو، اسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے اس لئے انسان وطن کی زمین میں بُری طرح پا بگل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں کے لئے وجہ جامعیت اور باعثِ اتحاد و اتفاق بنی اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کر لی۔ کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر قرار پا گیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے، اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رُخ اسی بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے، تو آپ ہر کشش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار وہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپ کے راستہ میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عناں گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاع گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے لیکن جنکی نگاہیں طبعی زندگی کی چار دیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جوہرِ خودی۔ شرفِ انسانیت۔ کلمۃ الحق یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلابِ بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آ رہا ہے اور اس میں اس کی اس متاعِ نایاب کی خیر نہیں تو کہئے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردد و تأمل وطن کی خار دار جھاڑی کو اپنے راستے سے الگ پھینک دے گا اور کسی ایسے مقام کی طرف رُخ کر لے گا جہاں اس کی یہ متاعِ بے بہا محفوظ ہو جائے۔ (اور اس کی حفاظت صرف اسی نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اس کا نام **ھجرت** ہے۔ حتیٰ کہ اس کی حفاظت

ہجرت سے مفہوم میں اسے اپنی جان تک بھی دینی پڑجاتی ہے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہٰذا، ھجرت ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است — ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآنِ کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و اسالیب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۔ (۲۹/۵۶)

اے میرے بندو جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطۂ زمین میں ممکن نہیں تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اُس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو ھوالمراد۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ ۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا، اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا، یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھئے! سورۂ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۔ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۔ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۔ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۔ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۔ (۴/۹۷)

جو لوگ (غیر خداوندی ماحول میں رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، ان کی روح قبض کرتے وقت فرشتے ان سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے"؟ (یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟) وہ جواب میں کہتے ہیں۔ "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے" (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے

تھے)۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟" یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور (جس کا ٹھکانا جہنم ہوا تو) کیا ہی بُری جگہ ہے!

معذورین معذرت صرف ان لوگوں کی قابلِ قبول ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں[1]۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا۔ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔ (۴/۹۸-۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ چارۂ کار نہ رکھتے ہوں، اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے، اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو:۔

وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً۔ وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (۴/۱۰۰)

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کریگا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی، اور (ہر طرح کی) کشائش پائے گا (کہ معیشت کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی)۔ اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سرزمین نظامِ خداوندی کے لئے زیادہ سازگار ہو، اور پھر اسے (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی نیت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا) اور اللہ تو (ہر حال میں) حفاظت اور سامانِ نشو و نما دینے والا ہے۔

---

[1] ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جد و جہد کریں۔ نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

مہاجرین کے مدائح

خدا کی راہ، یعنی قیامِ نظامِ حکومتِ الٰہیہ کے لئے ہجرت کرنے والوں کے فضائل و مناقب، قرآن کے مختلف مقامات پر ابھرے ہوتے حروف میں ملتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ (۲/۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے (اور راہِ ایمان میں ثابت قدم رہے) اور جن لوگوں نے ہجرت کی سختیاں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی (سچی) امیدواری کرنے والے ہیں، اور (جو کوئی اللہ کی رحمت کا سچے طریقہ پر امیدوار ہو، تو) اللہ سامانِ حفاظت اور پرورش عطا کرنے والا ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

(٥)

دین (نظامِ خداوندی) کے اس پروگرام کے مطابق، حضرت ابراہیمؑ اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے کنعان اور شام کے علاقوں میں آبسے۔ چونکہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا نظام متشکل نہیں ہو سکتا، اس لئے وہاں آپ نے ایک مملکت قائم کی جو آلِ ابراہیمؑ کے ہاتھوں بڑی مستحکم ہوتی چلی گئی۔ قرآن کریم میں ہے: فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ۔ (۴/۵۴) ہم نے خاندانِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی عطا کی تھی اور ان کے ساتھ ایک عظیم الشان سلطنت بھی۔ آپ کے دو بیٹے ـــ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ بھی منصب نبوت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ بڑے تھے اور حضرت اسحٰقؑ چھوٹے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے تو اُس نظام کی بنیاد رکھی تھی جو عالمگیر انسانیت کو محیط ہو۔ مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ اس نظام کا مرکزِ محسوس سرزمین حجاز میں مکہ کے قریب کعبہ قرار پائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، آپ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کے قریب آن بسایا۔ (اس عالمگیر آفاقی مقصد کے لئے سرزمینِ حجاز کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا، اس کے متعلق، ہم بعثتِ نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم اپنے آپ کو واقعات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں)۔

لیکن اس مقام پر ایک اہم نکتہ ہمارا دامن گیر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم تو یہ بتاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو مشیت کے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اس جگہ بسایا گیا تھا۔ لیکن تورات جس طرح اس واقعہ کو بیان کرتی ہے اس

ہجرتِ اسمٰعیلؑ

سے انسانی آمیزش سے منزہ وحی، اور محرف کتاب اللہ کا فرق ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں۔ سرّی (سارہ) اور ہاجرہ ـــ بلکہ یوں کہیے کہ سارہ بیوی .... تھی اور ہاجرہ لونڈی۔ سارہ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ اس کے برعکس ہاجرہ بار آور ہوگئی تو یہ بات سارہ کو سخت ناگوار گزری اور وہ اسے تنگ کرنے لگ گئی۔ چنانچہ ہاجرہ ایک مرتبہ تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی لیکن

تورات کا فسانہ

فرشتے نے اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ "تو حاملہ ہے، ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سُن لیا ہے۔" (پیدائش - ۱۶ / ۷-۱۱)۔ آگے چل کر کہا گیا ہے کہ (حضرت) اسمٰعیلؑ کی پیدائش سے سارہ کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور اس کے بعد جب سارہ کے ہاں (حضرت) اسحٰقؑ پیدا ہوئے تو حسد کی آگ ناقابلِ برداشت ہوگئی کیونکہ پہلوٹا بیٹا ہونے کی جہت سے باپ کے وارث (حضرت) اسمٰعیلؑ قرار پاتے تھے، (حضرت) اسحٰقؑ نہیں۔ چنانچہ سارہ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔

> چنانچہ ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کے کاندھے پر دھر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اُسے رخصت کیا۔ وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے میدان میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ (پیدائش ۲۱ / ۱۴)

اس کے بعد :۔

> اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلّا چلّا کے روئی ـــ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سُنی۔ اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی ـــ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اُس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ـــ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اس مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیرانداز ہوگیا۔ (پیدائش - ۲۱ / ۱۵ - ۲۰)

آپ نے غور فرمایا کہ مشیت کے پروگرام کی اس عظیم کڑی کو محرف کتاب میں کس رنگ میں پیش کیا گیا ہے؟ لیکن تورات پر کیا گلہ کہ وہ تو محرف کتاب ہے۔ آپ دیکھیے کہ خود ہماری کتبِ احادیث میں اس واقعہ کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔

زگلفروشش نالم کز اہلِ بازار است	تپاکِ گرمیٔ رفتارِ باغبانم سوخت

بخاری کی روایت

بخاری میں، جسے حدیث کی مستند ترین کتاب قرار دیا جاتا ہے، لکھا ہے :-

ابن عباس کہتے ہیں کہ اوّل اوّل جس عورت نے گھاگرہ پہنا وہ والدہ اسمٰعیلؑ ہیں انہوں نے گھاگرہ اس لئے پہنا کہ ان کے نشانِ پا کا سارہ کو پتہ نہ چلے۔ پھر ابراہیمؑ علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو لے نکلے اور وہ اس کو دودھ پلاتی تھیں حتیٰ کہ ان دونوں (ماں بیٹے) کو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک بڑے درخت کے پاس زمزم (کی جگہ) کے بالائی طرف موقع مسجد کے اوپر کی جانب چھوڑ گئے۔ اور اس وقت مقامِ مکہ میں کوئی شخص نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔ پس وہ وہاں ان دونوں کو چھوڑ گئے اور ان کو ایک ایک تھیلی کھجوروں اور ایک مشک پانی کی دے گئے۔ پھر ابراہیمؑ پیچھے کو چل پڑے اور والدہ اسمٰعیلؑ ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیمؑ! آپ ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جاتے ہیں جس میں نہ کوئی غمخوار انسان ہے اور نہ کوئی چیز۔ اس نے بار بار ان کو یہ کہا لیکن وہ کچھ التفات نہ کرتے تھے۔ آخرکار انہوں نے کہا کہ کیا وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ہاں۔ اس پر انہوں نے کہا تو اللہ ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

اس کے بعد اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ہاجرہ کس طرح پانی کی تلاش میں مضطرب و بیقرار، کبھی صحرا میں، کبھی پہاڑ پر سرگرداں پھرتی رہیں تا آنکہ خدا نے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ یعنی بعینہٖ وہی کچھ جو تورات جیسی محرف افسانوی کتاب میں لکھا ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ وہ بلند اور عظیم مقصد تو ایک طرف، اس سے حضرت ابراہیمؑ کا کس قسم کا کردار سامنے آتا ہے جو شخص اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو، ایک لق و دق صحرا میں، پانی کا ایک مشکیزہ دے کر تنہا چھوڑ جاتے، اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اور جب اس پر یہ اضافہ کیا جائے کہ ایسا کچھ خدا کے حکم سے کیا گیا تھا، تو اس قسم کے خدا کے متعلق آپ (معاذ اللہ) کیا تصور قائم کریں گے؟ —— بہرحال، تورات محرف ہے اور ہماری روایات وضعی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودی اس قسم کی افسانوی کتاب کو وحیٔ خداوندی کہہ کر سر پر اٹھائے پھرتے ہیں اور ہم اس قسم کی وضعی روایات کو سینے سے لگائے پھرتے —— مذہب میں ایسا ہی ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی مذہب ہو —— قرآنِ کریم میں اس قسم کے کسی واقعہ کا اشارہ تک نہیں۔

—— (٥) ——

قرآنِ مجید نے تعمیرِ کعبہ کا آغازِ سخن تو آیت (۲/۱۲۷) سے کیا ہے لیکن اس سے پہلے اس کی غایت ان الفاظ میں بیان کر دی ہے :-

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا .... (۲/۱۲۵)

۲/۱۲۵ ابراہیمؑ کا قائم کردہ یہی وہ نظام تھا جس کا مرکز، کعبہ قرار دیا گیا تھا تاکہ تمام نوعِ انسان، اپنے اختلافات دور کرکے، ایک نقطہ پر جمع ہو جائے۔ اور اس طرح ہر قسم کے خطرات سے (جو گروہ بندیوں اور قومیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں) محفوظ و مامون ہو جائے ـــــ یہی وہ مرکز ہے جس پر نوعِ انسان نے آخر الامر جمع ہونا ہے اسی سے انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے گی۔ (۳/۹۶ ؛ ۵/۹۷ ؛ ۱۴/۳۵ ؛ ۲۲/۲۵)

کعبہ کی غایت بتائی گئی ہے ـــــ مثابۃ للنّاس اور امنًا ـ مثاب (مادہ ث - و - ب) کے معنی ہیں جمع ہونا۔ اور مثابۃ کے معنی ہیں وہ مقام جہاں ہر جگہ سے لوٹ کر، جمع ہوا جائے۔ یعنی مرجع، منزل، نقطۂ اجتماع ، مرکزِ اجتماعیت ـ لہٰذا 'مثابۃ للنّاس' کے معنی ہوئے، نوعِ انسان کے ایک نقطہ، ایک مشترکہ مقصد پر جمع ہونے کا مرکز ـ اور غایت اس کی بتائی امنًا ـ تاکہ وہ ہر قسم کے خطرات سے (جو گروہ بندیوں اور قومیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہیں) محفوظ اور مامون ہو جائے۔

یہ نقطہ بڑے گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی کعبہ یا حج کا ذکر آیا ہے اسے للنّاس کہا گیا ہے۔ یعنی کسی خاص قوم، خاص گروہ، خاص فرقہ کے لئے نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے ـــــ

کعبہ ـ عالمگیر انسانیت کے لئے

(۱) اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ـ (۳/۹۶)

وہ پہلا گھر جسے تمام نوعِ انسان کے لئے بنایا گیا، مکہ مبارک میں ہے۔ اور وہ تمام اقوامِ عالم کے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ـ (۳/۹۶-۹۷) جو اس نظام میں داخل ہو جائے گا اسے امن مل جائے گا۔

(۲) وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ـ (۲/۱۲۵)

جب ہم نے اس گھر کو نوعِ انسان کے لئے ایک مرکز پر جمع ہونے کا مقام اور جائے امن بنایا ـ

سورۃ مائدہ میں ہے :-

(۳) جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ـ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا جس کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔

تعمیرِ کعبہ کے بعد، حضرت ابراہیمؑ نے دعا یہ مانگی کہ میں نے اپنی اولاد کو یہاں بسا دیا ہے۔

(۴) فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ ...... (۱۴/۳۷)

بارالٰہا! تو ایسا کر دے کہ لوگوں (الناس) کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔

اس شہر پر یہاں کے رہنے والوں کی اجارہ داری نہیں۔

(۵) جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، اس کے دروازے تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں کھلے رہیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں بھی کعبہ کا ذکر ہے، اسے الناس (نوعِ انسان) کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہاں ہونے والے

حج۔ تمام نوعِ انسانی کا نقطۂ اجتماع

اجتماع (حج) کے سلسلہ میں بھی، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (۲۲/۲۷) تو تمام نوعِ انسان کو دعوت دے کہ وہ یہاں آئیں لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸)۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (۳/۹۶)۔ جو لوگ (الناس) بھی اس تک پہنچنے کی راہ پائیں ان سے کہو کہ وہ یہاں آئیں۔ بشرطیکہ ان کا اس طرح جمع مقصدِ خداوندی کے حصول کے لئے ہو۔ اپنے اپنے گروہی یا قومی مفاد کی خاطر نہ ہو کہ اس سے فساد پھیلتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ الدّین (اسلامی نظام) کا عالمگیر انسانیت کو امتِ واحدہ بنانے کا جو پروگرام ہے، کعبہ کس طرح اس کا مرکز قرار دیا گیا ہے اور حج کا اجتماع اس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ جسے امتِ مسلمہ کہا جاتا ہے، اس کے ذمہ اس مرکز کی نگہداشت اور اس اجتماع کا اہتمام کرنا ہے اس لئے اس امت کے متعلق بھی کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹)۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو اِمَامًا لِلنَّاسِ کہا گیا تھا تو اس سے مقصد کیا تھا؟ وہ اس نظام کے داعیٔ اوّل تھے جس کا منتہیٰ تمام عالمِ انسانیت کو ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا تھا اور یہی

تھا وہ ابراہیمی مسلک (ملّۃ ابراھیمی) جس کے اتباع کا تمام اہل مذاہب کو حکم دیا گیا تھا (۲/۱۳۵) حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہا گیا کہ — ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا۔ (۱۶/۱۲۳) ہم نے تیری طرف بھی یہی وحی بھیجی ہے۔ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر، ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔ اور امت مسلمہ (جماعت مومنین) سے کہا کہ

۲/۱۲۵ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی۔ (۲/۱۲۵)

تم مقام ابراہیمی کے حصول کو اپنی تگ و تاز حیات کی جولانگاہ بناؤ۔

تمہاری سعی و کاوش کی غایت، جدوجہد حیات کا مقصد، مقام ابراہیمی کا حصول ہونا چاہیئے۔ یعنی نوع انسان کی امامت۔

مقامِ ابراہیمی

اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اُسی کے مسلک و مشرب (ملت) کا اتباع کرو۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔ (مصلّی کے معنی جلد اول صفحہ ۹۸ بسلسلہ صلوٰۃ۔ زیر آیت (۲/۳) واضح کئے گئے ہیں)۔

آیت زیر نظر (۲/۱۲۵) کا باقیماندہ حصہ یہ ہے۔

۲/۱۲۵ وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ۔ (۲/۱۲۵)

ہم نے (معماران حرم) ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے تاکید کی تھی کہ وہ اس مقام کو عالمگیر انسانیت کا مرکز بنائیں۔ اور اسے انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے پاک اور صاف رکھ کر اس جماعت کے لئے مخصوص کر دیں جس کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے یعنی ان کی پوری پوری اطاعت کر کے، ایسی پوزیشن اختیار کرے کہ وہ تمام نوع انسان کی پاسبان اور نگران ہو۔ ان کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سنوارے اور ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرے۔

رکوع اور سجود کا مفہوم، جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۲۔ آیت (۲/۴۳)۔ اور سجدہ کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۹۵۔ زیر آیت (۲/۳۴) بیان کیا جا چکا ہے۔

طَوْفٌ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہوتے ہیں۔ اَلطَّآئِفُ، چوکیدار یا کوتوال کو کہتے ہیں جو رات

طواف کا مفہوم

کو حفاظت کے لئے پہرے اور چکر لگائے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس نظام کی حامل امت کو، جس کا مرکز کعبہ ہے، خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۰۹) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ قوم

جسے نوعِ انسان کی فلاح وبہبود کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳) یہ آیت، ان آیات کے درمیان آئی ہے جن میں کعبہ کی اہمیت کا ذکر ہے۔ اس امت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُمَّةً وسطًا ہے۔ وسطاً اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں میں سے ہر ایک سے یکساں فاصلے پر ہو، جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطہ سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ وہ قوم (امت) ہوگی جو تمام نوعِ انسان سے یکساں فاصلے پر ہو۔ جو نہ کسی کی طرف یونہی جھکے، نہ کسی سے یونہی کھنچ کر رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عدل کرنے والی قوم کا اس سے زیادہ جامع تصور کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

اس کے بعد دیکھئے کہ اس امت کا فریضہ کیا بتایا گیا ہے۔ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ تمام اقوامِ عالم کے اعمال وکردار کی نگران، یعنی یہ دیکھنے والی کہ کوئی قوم جادۂ عدل وانصاف سے اِدھر اُدھر تو نہیں ہوئی۔ اور ان کا رسول (نظامِ خداوندی کی آخری اتھارٹی) ان کے اعمال وکردار کا نگران۔ اقوامِ عالم کی اس نگرانی اور نگہبانی کی جہت سے انہیں طَائِفِیْن کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی ان کی حفاظت اور نگرانی کرنے والی قوم۔

ان کی دوسری خصوصیت عَاكِفِیْن بتائی گئی ہے۔ عَكَفَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کیلئے

عاکف کا مفہوم

اسے لڑی میں پرو دینا جس طرح موتیوں کو دھاگے میں پرو کر انہیں سلک گہر بنا دیا اور اس طرح بکھرنے سے بچا لیا جاتا ہے۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں میں کنگھی کرکے انہیں بنا اور سنوار دینا۔ ان کی مشاطگی کر دینا۔ لہٰذا، عاکفین کے معنی ہوں گے وہ امت جو اقوامِ عالم کے منتشر شیرازہ کو منظم کرے اور ان کے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھا دے۔ چونکہ اس مقصد کے لئے بڑے گہرے غور وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے کسی پُرسکون ماحول میں رُک کر، ٹھہر کر، بیٹھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلئے ثانوی طور پر اس کے معنی کسی جگہ رک کر بیٹھنے والے ... بھی آتے ہیں۔

یہ ہوا قرآنی مفہوم، طائفین، عاکفین اور رکع السجود کا۔ یعنی ان خصوصیات کی حامل ہوگی وہ قوم جس کے ہاتھوں وہ

بیتی کا مفہوم

نظام متشکل ہوگا جس کا مرکز کعبہ ہے۔ یہاں قرآن نے کعبہ کو بَیْتِی کہا ہے ــ یعنی میرا گھر ــ اس کائنات میں ہر شے خدا کی ہے لیکن وہ بعض چیزوں کو خصوصیات سے "میری" کہہ کر پکارتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص قوم، خاص گروہ، خاص جماعت، یا خاص افراد کی ملک نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوعِ انسان کے مشترکہ مفاد کے لئے کھلی رہیں گی۔ اس کی بیّن مثال قومِ ثمود اور حضرت صالحؑ کی کشمکش کی داستان ہیں

ملتی ہے۔ اس قوم کی حالت یہ تھی کہ وہاں کی چراگاہیں اور چشمے بڑے بڑے سرداروں کی اونٹنیوں کے لئے مخصوص تھے اور غریبوں کے مویشیوں کی ان تک رسائی مشکل تھی۔ حضرت صالحؑ نے اس سلب ونہب اور جور واستبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ (المختصر) طے یہ پایا کہ تمام مویشیوں کی باریاں مقرر کر دی جائیں اور ہر ایک جانور اپنی باری پر ان سے متمتع ہو۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا کوئی بیّن ثبوت ہونا چاہیئے کہ تم اپنے اس عہد کی پابندی کرتے ہو یا نہیں۔ اور ثبوت کی عملی شکل یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی سردار کی ملکیت ہے نہ کسی غریب کی۔ بلکہ یہ سب کی مشترکہ اونٹنی ہے۔ اگر تم نے اسے اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تم اپنے عہد پر پابند رہے ہو۔ اس اونٹنی کو نَاقَةَ اللّٰہ کہہ کر پکارا گیا (۷/۷۳) یعنی نہ میری نہ تیری۔ بلکہ سب کی مشترکہ۔

اسی طرح اس نے کہا ہے کہ اگر کسی خاص خطۂ زمین کو مستبد قوتیں، اپنی ملکیت تصور کر کے تم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں تو تمہیں چاہیئے کہ وہاں سے کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جس پر کوئی قابض نہ ہو۔ اسے بھی خدا نے "ارضی" کہہ کر پکارا ہے (۲۹/۵۶) یعنی "میری زمین"، حالانکہ ساری زمین خدا ہی کی ہے۔

ان مثالوں کی روشنی میں بیتی کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ گھر جو دنیا میں کسی فرد یا کسی قوم کا نہیں بلکہ وہ تمام نوعِ انسان کا مشترکہ گھر ہے کیونکہ ان کے اللہ کا گھر ہے۔

یہ تھا وہ "اللہ کا گھر" جسے پاک اور صاف رکھنے کے لئے معمارانِ حرم کو تاکید کی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ طہارت

تطہیر کعبہ

کا لفظ جسمانی پاکیزگی کے لئے بھی آتا ہے لیکن یہ قلب ونگاہ، خیالات، نظریات، معتقدات کی پاکیزگی کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں منافقین کے متعلق ہے۔ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ۔ (۵/۴۱)۔ ان کے قلوب پاکیزہ ہو ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا "خدا کے گھر" کو پاکیزہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے جس نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے اس میں انسانی خیالات اور نظریات کی آمیزش نہیں ہونی چاہیئے۔ اسے خالصۃً اقدارِ خداوندی کے لئے وقف رہنا چاہیئے۔

یہ تھی کعبہ کی حقیقت اور کیفیت دینِ خداوندی میں۔ لیکن بعد میں جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ آپ مطالب الفرقان جلد اوّل صـ۱۲۲ کو سامنے لائیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی جذبات اور قلبی کیفیات کا اظہار، محسوس حرکات کی رُو سے ہوتا ہے۔ دین کے نظام کی غایت تو انسانی قلب ونگاہ میں منشار ایزدی (قرآنِ کریم) کے مطابق تبدیلی پیدا کرنا ہے جس کے لئے اس نے کچھ اصول، اقدار اور احکام دیئے ہیں۔ لیکن ان اقدار واحکام کی تعمیل کے مظاہر، خارجی حرکات ہوتی ہیں۔ نماز میں رکوع وسجود اس کی بیّن مثال ہے۔

مذہب میں کعبہ کی حیثیت

اسی طرح کعبہ بھی، امّت کی مرکزیت کی محسوس علامت؛ اور حج ان کی ہئیت اجتماعیہ کی محسوس شکل ہے۔ لیکن مذہب میں ہوتا یہ ہے کہ ان احکام کی غرض و غایت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی محسوس شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اب کعبہ کی حیثیت محض ایک "مقدس مقام" کی رہ گئی ہے اور حج، ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی۔ اب تطہیرِ کعبہ کے لئے اس مکان کو گلاب اور کیوڑہ سے غسل دیا جاتا، اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے اس کے گرد طواف کر لیا جاتا ہے۔ مذہب میں یہی مظاہر مقصود بالذات بن جاتے ہیں اور ان کی ادائیگی سے انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے فریضۂ خداوندی ادا کر دیا۔ یہی وہ "اعمال" ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ: اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔ (۱۸/۱۰۵)۔ وہ بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو کچھ کرتے ہی نہیں۔ لیکن یہ لوگ ہیں کہ اس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھاتے اور صبر آزما تکالیف برداشت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں۔ ایسے رائیگاں کہ لَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ (۱۸/۱۰۵)۔ اعمال کا بدلہ (نتیجہ) متعین کرنے کے وقت، ان کے لئے میزان (ترازو) کھڑے کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ انہیں اَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۔ (۱۸/۱۰۳)۔ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں ان کے اعمال کی وجہ سے شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یعنی بے عملی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن اعمال کی وجہ سے جو محض رسمی طور پر ادا کئے گئے تھے۔

بات تعمیرِ کعبہ کی ہو رہی تھی۔ اس کی تفصیل اگلی چار آیات میں دی گئی ہے۔ آیت (۲/۱۲۷) میں کہا گیا ہے کہ وہ دونوں، باپ بیٹا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کعبہ کی بنیادوں کو استوار کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ خدا سے دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ ان دعاؤں میں پہلی دعا یہ تھی کہ:

۲/۱۲۶ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (۲/۱۲۶)

ابراہیمؑ نے اس مرکزیت کی بنیاد رکھ دی اور خدا سے التجا کی کہ اے وہ جو تمام کائنات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا ہے! تو ایسا کر دے کہ یہ مقام ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے، امن اور پناہ کی جگہ بن جائے۔ (۳/۹۶) اور ان میں سے جو لوگ تیرے قوانین کی صداقتوں پر یقین، اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھیں، خواہ وہ

کہیں کے رہنے والے بھی کیوں نہ ہوں (۲۲/۲۵)۔ انہیں زندگی کی آسائشیں اور سامانِ زیست کی فراوانیاں عطا کردے (۲/۱۲۶)۔

خدا نے کہا کہ بے شک ان لوگوں کو یہ کچھ ملے گا۔ باقی رہے وہ جو اس سے انکار کریں گے، تو ہمارے طبعی قوانین کے مطابق، انہیں بھی زندگی کے عاجلہ مفاد ضرور حاصل ہوں گے (۱۷/۱۸-۲۰)۔ لیکن انجام کار وہ نہایت بے بسی کی حالت میں مصیبت کی زندگی کی طرف کھنچے چلے جائیں گے ۔۔ کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جس کا مآل یہ ہو!

رزق کی دُعا

دیکھئے! تعمیرِ کعبہ جیسے عظیم اور مقدس فریضہ سے سبکدوش ہونے کے بعد، سب سے پہلی دعا جو ان کے لبوں کو چومتی ہے، یہ ہے کہ انہیں رزق اور امن عطا فرما۔ اس سے رزق اور امن کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ نظامِ خداوندی کی تشکیل اور استحکام کا فریضہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ یہ قوم ہر قسم کے خطرات سے مامون اور معاش کی طرف سے مطمئن ہو۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے سورۂ نحل کی آیت (۱۶/۱۱۲) میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھو۔ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ .... (۱۶/۱۱۲)۔ ایک بستی تھی جسے خطرات کی طرف سے مامونیت اور معاش کی طرف سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف چاروں سمت سے سامانِ رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ۔ (۱۶/۱۱۲) یہ انعاماتِ خداوندی تھے لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ جس مقصد کے لئے انہیں ان بخشائشوں سے نوازا گیا تھا، انہوں نے انہیں اس کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے خدا کے مقرر کردہ معاشی نظام کے خلاف اپنا نظام قائم کر لیا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۲) ان کے خود ساختہ نظامِ معیشت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ فارغ البالی کی جگہ انہیں فلقے آنے شروع ہو گئے اور اُن کا امن خطرات میں گھر گیا۔ یہ سب اُن کے اپنے وضع کردہ غلط نظام کا نتیجہ تھا۔ قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنے کا لازمی نتیجہ رزق کی تنگی ہوتا ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا .... (۲۰/۱۲۴) جو قوانینِ خداوندی سے اعراض برتتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور اس طرح (یوں سمجھو کہ) وہ دنیا میں اندھا ہو جاتا ہے اور ۔۔ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ (۲۰/۱۲۴) اور جو شخص دنیا میں اندھا ہو جاتا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہتا ہے۔ بلکہ وہاں یہ تاریکیاں زیادہ شدید ہو جاتی ہیں (۱۷/۷۲)۔ کعبہ اس نظام کا مرکز ہے جس میں رزق کی فراوانیاں بھی ہوتی ہیں اور ہر طرح کا امن و اطمینان بھی۔ چنانچہ قریش سے جو اس نظام کے قیام کی مخالفت کرتے تھے، یہی کہا گیا تھا:-

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ - اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ - فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ - الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ - (۱۰۶/۱-۴)

قریش کعبے کے متولی ہیں، اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت وعظمت ہے۔ اسی عزت و احترام کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ قبائل اور ممالک نے ان سے عہد وپیمان کر رکھے ہیں کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹے گا۔ چنانچہ یہ سردی اور گرمی، سال بھر، اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔

کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے قریش کو اس قدر فوائد حاصل ہیں، لیکن جس مقصد کے لئے انہیں اس کا متولی بنایا گیا تھا، انہوں نے اسے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ انہیں خدا نے بھوک اور خوف سے نجات دلائی تھی، تاکہ یہ اس طرح مامون ومطمئن ہو کر، کعبے کو نظامِ خداوندی کا مرکز بنائیں۔ (لیکن انہوں نے اسے یاترا کا تیرتھ بنا کر رکھ دیا اور خود اس کے مہنت بن گئے۔)

یہ غلط ہے۔ انہیں چاہیئے کہ یہ اُس گھر کے مالک (یعنی خدا) کے قوانین کی اطاعت کریں، جس گھر کے ساتھ نسبت نے انہیں یہ مقام عطا کر رکھا ہے۔ (یہ کام اب اس جماعت کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو اس مقصد کے لئے متشکل کی جارہی ہے)۔

رزق کے متعلق دعائے ابراہیمی دوسرے مقام پر ان الفاظ میں مذکور ہے:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ - (۱۴/۳۷)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصدِ عظیم کے لئے) اپنی کچھ اولاد کو، تیرے واجب الاحترام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے (اسے "تیرا گھر" اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کی مشترکہ جائے امن ہے)۔ یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کھیتی کا نام ونشان تک نہیں۔

میں نے یہ سب اہتمام اس لئے کیا ہے کہ میری اولاد نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرے — یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں — سو، اے ہمارے نشوونما دینے والے! ایسا کر دے کہ (ان تمام، بظاہر، نامساعد حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز تو، ان کے لئے، زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق فراہم کر دے۔ (۲/۱۲۶) تاکہ (یہ معیشت کی طرف سے مطمئن ہو کر، اس مقصد کے حصول کے لئے،

ایسے جذب و انہاک سے کام کریں کہ) ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔

(قرآن کے معاشی نظام کے متعلق دیکھئے جلد اوّل صفحہ ۱۰۱۔ آیت ۲/۳ ؛ صفحہ ۲۹۴۔ آیت ۲/۲۲)

(۰)

یہاں ایک لمحہ کے لئے رُک جائیے۔ دعائے ابراہیمی میں کہا گیا ہے۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا۔ (۱۴/۳۵) "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو اس شہر (بلد) کو امن کی جگہ بنا دے" (۲/۱۲۶) اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد (حضرت اسمٰعیلؑ) کو جس جگہ بسایا تھا، وہ وادی تو ایسی تھی جہاں زراعت نہیں ہوتی تھی لیکن جہاں انہیں بسایا تھا وہ ایک شہر (مکہ) تھا۔ اس سے بھی اس روایت (اور تورات کے بیان) کی تردید ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے (اور جو پہلے گزر چکی ہے) کہ آپ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو کسی ویرانے میں چھوڑ گئے تھے۔ بہرحال اس ضمنی نکتہ کے بعد آگے بڑھئے۔

ربوبیتِ عالمینی

دعائے ابراہیمی میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ: وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (۲/۱۲۶) "یہاں کے رہنے والوں میں سے، جو اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے، اسے رزق عطا فرما"۔ یعنی انہوں نے رزقِ خداوندی کو جماعتِ مومنین تک محدود اور مختص کر دیا تھا۔ لیکن خدا تو ربّ العالمین ہے اس نے فوراً یہ کہہ کر اس کی تصحیح کر دی کہ:۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۔ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ (۲/۱۲۶)

خدا نے کہا کہ بے شک جماعتِ مومنین کو وہ کچھ ملے گا جس کے متعلق تم نے دعا مانگی ہے۔ لیکن جو اس سے انکار کریں گے ان پر بھی رزق کے دروازے بند نہیں ہوں گے۔ انہیں ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق مفادِ عاجلہ ضرور حاصل ہوں گے۔ فرق یہ ہوگا کہ یہ لوگ آخر کار نہایت بے بسی کی حالت میں مصیبت کی زندگی کی طرف کھنچے چلے جائیں گے کہ غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل جلد اوّل صفحہ ۱۴۹-۱۵۰ زیرِ آیت (۲/۴) ؛ صفحہ ۲۵۳۔ زیرِ آیت (۲/۱۲) ؛ صفحہ ۲۷۱۔ زیرِ آیت (۲/۱۲) میں ملے گی۔

(۰)

اس کے بعد آیات (۲/ ۱۲۷-۱۲۸) کو سامنے لائیے:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِـمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ . رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا . إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ . رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا . إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۔ (۲/ ۱۲۷-۱۲۸) ۲/ ۱۲۷-۱۲۸

ان حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے اس مرکزِ نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے ہاتھ اس کی تعمیر میں مصروف تھے اور لب پر یہ وجد انگیز دعائیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما دے کہ تو، دل میں مچلنے والی آرزوؤں کو جانتا اور لب تک آنے والی تمناؤں کو سنتا ہے، اس لئے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت اس مرکز کی تعمیر کے لئے کوشاں ہیں۔ اور وہ ارادے اس کے سوا کیا ہیں کہ اس مرکز کے ساتھ وابستہ رہ کر، ہم تیرے ضابطۂ قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور ہمارے سر اس کے سامنے جھکے رہیں ـــــ نہ صرف ہم ہی، بلکہ ہماری آنے والی نسلوں میں بھی وہ لوگ پیدا ہوں جو، اسی طرح تیرے قوانین کی اطاعت کرنے والے ہوں۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمیں وہ طور طریق بتا دے جن سے ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں، اور تیری عنایات و انعامات کا رُخ ہماری طرف رہے۔ اس لئے کہ تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جونہی کسی نے اُس کی طرف رُخ کیا، وہ اپنے سامانِ رحمت و ربوبیت کو لئے، خود اُس کی طرف بڑھ آیا۔ (۲/ ۱۲۸)

اس کے بعد ان حسین آرزوؤں کے مقطع کا بند جس میں بتایا گیا ہے کہ وحدتِ انسانیہ کے اس مرکز (کعبہ) کے لئے وادیٔ حجاز کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے نگہِ انتخاب حضرت اسمٰعیلؑ پر کیوں پڑی تھی۔ دعا مانگی کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ . إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ (۲/ ۱۲۹) ۲/ ۱۲۹

اے ہمارے پروردگار! ہماری اولاد میں یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے، تاآنکہ اُن میں سے، اس دعوتِ انقلاب

کو ہے کر، وہ رسول اٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو اُس کی آخری اور مکمل شکل میں اُن کے سامنے پیش کر دے (۵/۱۱۹)۔ انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے، اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (۲/۱۲۹؛ ۶/۹۳؛ ۳۳/۳۴) اور (صرف نظری طور پر ہی تعلیم نہ دے، بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کر دے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور اُن کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے۔

اس قسم کی نشو و نما، قوت اور حکمت، دونوں کے امتزاج سے ہو سکتی ہے، اور ان دونوں کا امتزاج تیرے متعین کردہ نظام ہی کے اندر ممکن ہے۔ (۵۷/۲۵)

حضور نبی اکرمؐ کی ان خصوصیات یا مناصبِ رسالت کا ذکر (۲/۱۵۱)؛ (۳/۱۶۴)؛ (۶۲/۲) میں بھی آیا ہے حضورؐ کے فریضۂ تزکیہ کی تشریح، جلد دوم، صفحہ ۲۵ زیرِ آیت (۲/۲۰) بیان کی جا چکی ہے۔

یہ تھا وہ نظام جس کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ نے کی اور حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں تکمیل تک پہنچا۔ اسی کو مسلکِ ابراہیمی (ملّتِ ابراہیمی) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس مسلک کے متعلق کہا کہ :۔

۲/۱۳۰ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۔ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۔ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔(۲/۱۳۰)

عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مسلک سے اعراض وہی برت سکتا ہے جو اپنے آپ کو بیوقوف بنائے۔ سفاہت کے معنی حماقت بھی ہیں لیکن یہاں جو مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ کہا تو اس سے فکر کا رُخ کسی اور سمت کو مُڑ جاتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ انسانی ذات کی نشو و نما تاکہ یہ اس دنیا میں بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی بسر کر سکے اور اس کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔ آسمانی رشد و ہدایت، اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے نظامِ خداوندی (الدین) کی غرض و غایت یہی ہے۔ اسی کے لئے حضور نبی اکرمؐ کا فریضہ (يُزَكِّيْهِمْ) بتایا گیا ہے۔ مسلکِ ابراہیمیؑ کے اتباع سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مسلک کو وہی اختیار کریگا جو اپنی ذات کی قدر و قیمت جانتا ہو۔ جو اس کی نشو و نما کی اہمیت کا پورا

انسانی ذات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنا

پورا احساس رکھتا ہو۔ جو اس کی اہمیت کا احساس نہ کرے، اس کی وقعت نہ پہچانے، اس کی صحیح قدر و قیمت نہ جانے، اس لئے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھے جس توجہ کی یہ مستحق ہے، اسے وہ توجہ نہ دے، تو وہ اس مسلک سے برگشتگی اختیار کریگا۔ مَنْ

سَفِهَ نَفْسَهٗ کے یہی معنی ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ان دو لفظوں میں قرآنِ کریم انسانی زندگی کے متعلق دو زاویۂ نگاہ کو کس قدر بلیغ انداز سے سامنے لایا ہے۔ انسانی ذات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سیکولر نظریۂ حیات کے قائل جن کے نزدیک انسان عبارت ہے اس کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے، اور بس۔ جب وہ انسانی ذات کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کے درخورِ توجہ قرار دینے کا سوال کہاں پیدا ہوگا؟

(۲) مذہبی پیشوائیت کے سامنے بھی انسانی ذات کا سوال نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک چند احکام کی میکانکی اطاعت سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کو عذابِ جہنم سے نجات مل جاتی ہے۔ اگر اس میں کچھ کسر رہ جاتی ہے تو اسے خدا کی بخشش یا شفاعت پورا کر دیتی ہے۔

(۳) اربابِ طریقت کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ ان کی نگاہ تزکیۂ نفس پر ہوتی ہے۔ لیکن تزکیۂ نفس سے ان کی مراد انسانی ذات کی نشوونما نہیں، بلکہ اسے فنا کر دینا ہے ـــ اس دنیا میں ترکِ علائق سے اور آخرت میں ذاتِ خداوندی میں جذب ہو جانے سے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صفحہ ۴۵ آیت ۱/۵؛ صفحہ ۳۵۱ آیت ۲/۲۸؛ جلد دوم صفحہ ۲۰۵ آیت ۲/۱۰۲ میں ملے گی)۔

لٰہذا، ان میں سے کوئی بھی مسلکِ ابراہیمی کا متبع نہیں ہو سکتا۔ اس کا اتباع وہی کرے گا جو نظامِ خداوندی کے تحت زندگی بسر کرنے سے اپنی ذات کی نشوونما کی کوشش کرے۔ اس مسلک کی بنیاد رکھنے والے (حضرت ابراہیمؑ) کی خصوصیت یہی کہ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (۲/۱۳۰) اس کی اس دنیا کی زندگی بھی برگزیدہ تھی اور آخرت میں بھی اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے ہوں گے۔ (نیز دیکھئے ۱۶/۱۲۰-۱۲۲)۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً۔ (دنیاوی خوشگواریوں اور سرفرازیوں) کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کے ماحصل کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۔ (۴/۵۴)۔ انہیں ایک عظیم مملکت عطا کی تھی۔ دوسری جگہ ہے کہ وہ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ تھے (۳۸/۴۵)۔ یعنی انہیں قوت اور بصیرت دونوں حاصل تھیں۔

یہ برگزیدگی اور مقامِ بلند کس طرح حاصل ہوا، اسے بھی قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص و منفرد انداز کے مطابق نہایت مختصر لیکن جامع شکل میں بیان کر دیا جب کہا کہ:-

۲/۱۳۱ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۲/۱۳۱)

جب اُس کے نشو ونما دینے والے نے اس سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جاؤ (ان کی اطاعت اختیار کرو) تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے لبّیك! اللّٰھم لبّیك! کہتے ہوئے ان کے سامنے جھک گیا۔ ان احکام کی غرض و غایت کیا تھی؟ ربوبیتِ عالمینی — عالمگیر انسانیت کی نشو ونما۔ (ربوبیتِ عالمینی کی تفصیل، جلد اول صفحہ ۱۶-۱۸ آیت (۱/۱) میں گزر چکی ہے۔)

یہاں تک بات حضرت ابراہیمؑ کی ذات تک محدود تھی۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان کے بعد اس نظام کے جاری رہنے کی کیا صورت تھی۔ ہم سابقہ صفحات میں آیت (۲/۱۲۴) کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ پر اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ نظام اور اس کی رُو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں اور سرفرازیاں وراثتاً منتقل نہیں ہو جائیں گی۔ ہر نسل کو اپنی سعی و کاوش سے انہیں حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے:

۲/۱۳۲ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ . يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (۲/۱۳۲)

ابراہیمؑ خود بھی اس مسلک پر کاربند رہا اور اپنے بیٹوں کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تلقین و تاکید کی۔ اسی طرح (ان یہودیوں کے جدِ امجد۔ اسرائیل یعنی) یعقوبؑ نے بھی اسی مسلک کی تاکید کی اور اپنی اولاد سے کہا کہ یہی وہ نظام ہے جسے خدا نے تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔ لیکن اس مسلک کی پابندی کوئی ہنگامی یا وقتی بات نہیں۔ یہ تو تمہاری ساری زندگی کا شعار ہونا چاہیئے۔ تمہیں آخری سانس تک ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی کا انحصار سانس لینے پر ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم نے ایک بار سانس ... لیا یا کبھی کبھی سانس لے لیا تو اس سے زندگی برقرار رہے گی۔ یہ تو زندگی بھر کا عمل پیہم اور شعارِ مسلسل ہے۔ جونہی اس سے انقطاع ہوا، زندگی ختم ہو گئی۔ طبیعی زندگی کی طرح انسان کی "انسانی زندگی" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ حیات آور شعار ایسا نہیں کہ اسے جب جی چاہا اختیار کر لیا اور جب جی چاہا چھوڑ دیا۔ اسے تو مسلسل اختیار کئے رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے استقامت شرط ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ .... (۴۱/۳۰)۔ "جن لوگوں نے اس حقیقت کا اقرار اعلان کر دیا کہ ہمارا رب صرف اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار و اعلان پر جم کر کھڑے ہو گئے، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے"۔

اسلام، عمر بھر کا پروگرام ہے

یعنی دعوائے ایمان کے بعد استقامت بنیادی شرط ہے۔ یہ ہے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ — ساری عمر مسلم رہنے سے مراد۔

اس کے بعد قرآنِ کریم بالواسطہ یہودیوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تھا تمہارے اسلاف کا مسلک۔ اس کے برعکس، تم اس عقیدہ پر جمے بیٹھے ہو کہ تمہیں دنیا کی تمام خوشگواریاں' اور عاقبت کی شادابیاں محض اس لئے مل جائیں گی کہ تم اُن برگزیدہ ہستیوں کی اولاد ہو! یہ عقیدہ یکسر باطل ہے جس کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہو سکتی۔ وہ اُن سے کہتا ہے کہ :-

۱۳۳/۲ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي. قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرٰهِمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ. (۱۳۳/۲)

کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے مورثِ اعلیٰ' (حضرت) یعقوبؑ نے (جن کے لقب، اسرائیل کی نسبت سے تم اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہو) مرتے وقت اپنی اولاد کو کیا وصیت کی تھی؟ تمہیں معلوم نہ ہو تو آؤ ہم تمہیں بتائیں۔ اس نے ان سے پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کی محکومیت (عبدیت) اختیار کرو گے؟ انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم اسی خدا کے قوانین کی اطاعت کریں گے جس کی اطاعت ہمارے آبا و اجداد ـــ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ ـــ کرتے رہے ہیں، اور جس کی محکومیت خود آپ نے اختیار کی تھی۔ وہی ایک صاحبِ اقتدار ایسا ہے جس کی محکومیت اختیار کرنا وجہِ شرفِ انسانیت ہے۔ ہم اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے' اور اسی طرح اس نظام کو مسلسل مستحکم بنائیں گے جسے انہوں نے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد کہا :-

۱۳۴/۲ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ. لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ. وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ. (۱۳۴/۲)

یہودیوں سے کہا کہ یہ ہیں تمہارے اسلاف جن میں سے ہر ایک نے قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کی اور اس طرح وہ نوازشاتِ خداوندی کے سزاوار قرار پائے۔ لیکن تم ہو جو یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ محض ان کی نسل میں ہونے کی بنا پر تم ان تمام خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو جاؤ گے جو تمہارے اجداد و اسلاف کو ان کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں ملی تھیں، یاد رکھو! ہر فرد کے لئے اس کے اپنے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ باپ کے حسنِ عمل کے نتائج بیٹے کو وراثتاً مل جائیں، چہ جائیکہ کسی قوم کے صدیوں پہلے گزرے ہوئے اسلاف کے اعمال کے نتائج ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتے جائیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے۔ قطعاً نہیں۔ یہ محض خوش فہمی اور فریبِ نفس ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے ثمرات ان کے لئے تھے، جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ ظہورِ نتائج کے وقت تم سے پوچھا جائے کہ تمہارے اسلاف

ہر ایک کے اپنے اعمال

کے اعمال کس قسم کے تھے، اور جب تم ان کے اعمالِ حسنہ کی تفصیل بتاؤ تو کہا جاتے کہ جاؤ۔ ان کے حسنِ عمل کے ثمرات و برکات کے تم حقدار ہو۔ ان سے بہرہ یاب ہو جاؤ۔ ایسا سمجھنا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے یکسر خلاف ہے۔ وہ لوگ اپنے اعمال اپنے ساتھ لے کر دنیا سے گزر گئے۔ ان کا بدلہ انہیں ملے گا۔ تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آئینگے۔ تم سے پوچھا تک نہیں جائے گا کہ تم کس کی اولاد ہو اور تمہارے اسلاف نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے تھے۔

اس آیۂ جلیلہ میں، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ایک عظیم بنیادی اصول بتایا گیا ہے۔ زندہ قوموں کی ہر

قوموں کے عروج وزوال کا قانون

نئی نسل اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کو لے کر، اپنی سعی و کاوش سے ان کے قائم کردہ نظام کو آگے بڑھاتی ہے اور یوں، اس تسلسلِ سعی و کاوش سے، وہ ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن جب کسی قوم کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے تو وہ خود کچھ نہیں کرتی اور اپنے اسلاف کے درخشندہ کارناموں کو گِنا گِنا، اور اچھال اچھال کر، اپنے آپ کو اطمینان (یعنی فریب) دے لیتی ہے کہ وہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں۔ وہ فخریہ کہتی ہے کہ یہ قومیں جو آج آگے بڑھ رہی ہیں، انہوں نے یہ سب کچھ ہمارے ہی اسلاف سے لیا ہے۔

آج ہماری حالت ایسی ہی ہو چکی ہے جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو! اقوامِ مغرب نے علم و ہنر اور تسخیرِ فطرت میں کس قدر ترقی کی ہے اور وہ کس طرح مصافِ زندگی میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں، تو بجائے اس کے ہم اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنی پستی سے نکلنے کی کوشش کریں، ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے آج اس قدر ترقی کر لی ہے تو پھر کیا ہوا؟ ہمارے اسلاف نے ان سے بھی کہیں بڑھ کر تحقیقات کی تھیں۔ ان کی ترقی اُنہی کی تحقیقات کی رہینِ منت ہے اور اس جواب سے ہم اپنے اَنا (EGO) کی تسکین کر لیتے ہیں حالانکہ اس کی حقیقت فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

اس آیت میں دوسرا اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم اس جھگڑے میں مت پڑو کہ تمہارے اسلاف میں سے کون بڑا

اسلاف کی بابت مت جھگڑو

تھا اور کون چھوٹا۔ کون حق پر تھا اور کون ناحق۔ ہم تم سے یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ ہم یہ پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا؟ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ ان کے اعمال ان کے لئے تمہارے اعمال تمہارے لئے۔

لیکن مذہب کا تو دار و مدار ہی شخصیتوں پہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں ساری بحثیں اسلاف کے متعلق ہوتی

رہتی ہیں۔ ہر فرقہ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرقہ کے بانی اور اس کے وارثین کو افضل اور اشرف ترین ثابت کردے۔ ہم ہزار برس سے اسی قسم کی بحثوں میں الجھے چلے آرہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم بڑا معرکہ مار رہے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم اسے، جس خدا کے "دین" کی بہت بڑی خدمت قرار دیتے ہیں، اس خدا کا ارشاد اور اعلان یہ ہے کہ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ "ہم تم سے ان بزرگوں کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے۔" اگر خدا کا یہ ارشاد ہمارے سامنے ہو تو یہ سارے فرقہ وارانہ نزاعات بحث و تمحیص، مناظرے اور مجادلے، جنگ و جدل سب ختم ہو جائیں۔ ان جھگڑوں سے تو مترشح ہوتا ہے گویا ہم کہہ رہے ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے ایسا کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے تمہارے بزرگوں کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے لیکن یہ (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ) ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لئے ہے۔ وہاں سب سے پہلا سوال یہی ہوگا کہ فلاں بزرگ کے متعلق تمہارا عقیدہ کیا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سوال کے جواب کے لئے پوری طرح تیاری کر کے خدا کے سامنے جانا چاہیئے۔

یاد رکھیئے۔ اس قسم کے خیالات اور معتقدات، قوم کو عالم کردار سے بیگانہ رکھنے کی سازشیں ہیں۔ قرآن کریم

شخصیت پرستی

نوعِ انسان کو شخصیت پرستی کے طوق و سلاسل سے آزاد کرانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے وہ ہر شخص سے اس کے جوہرِ ذاتی کے متعلق پوچھتا ہے، اضافی نسبتوں کے متعلق نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایک اصول کی رُو سے، وہ انسان کو کس کس قسم کی غلامیوں کے پھندے سے آزادی دلا دیتا ہے؛ اس نے شخصیت پرستی کی غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن ہم نے بعد میں زنجیروں کے انہی ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں جکڑ لیا۔

خدا ایں سخت جان را یار بادا   کہ افتاد است از بام بلندے

―――― (۰) ――――

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، خدا کی طرف سے تمام انبیاء کو دین ایک ہی ملا تھا۔ وہ دین اللہ تھا۔ یعنی

دین اللہ

خدا کا عطا کردہ الدین۔ اسے پھر سن رکھیئے کہ قرآن کریم نے الدین (الاسلام) کو دین اللہ (۸۳/۳، و دیگر مقامات) ــــ اللہ کا دین ــــ کہا ہے۔ اس کی نسبت (اور تو اور) کسی رسول کی طرف بھی نہیں کی۔ رسول، خدا کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے آتے تھے۔ وہ کوئی اپنا دین نہیں لاتے تھے لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ہر مذہب کی نسبت اُس کے بانی کی طرف ہو جاتی ہے ــــ مذہب سنت یہ طبقہ

اس کی اولین نسبت' اس شخصیت کی طرف کر دیتا ہے جسے وہ بزعمِ خویش اس کا بانی قرار دیتا ہے حالانکہ رسول کسی مذہب کے بانی نہیں ہوتے تھے (وہ مذہب لاتے ہی نہیں تھے اس لئے اس کے بانی کیسے ہو سکتے تھے۔ وہ دین لاتے تھے اور چونکہ دین خدا کا عطا کردہ ہوتا تھا اس لئے وہ اس دین کے بھی بانی نہیں ہوتے تھے۔) اس طرح مختلف مذاہب آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد' ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر فرقہ کی نسبت اس کے بانی (حقیقی یا مزعومہ) کی طرف کی جاتی ہے اور یوں ان فرقوں میں سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ یہودی مذہب ' اور عیسائی مذہب ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے لائے ہوئے دینِ خداوندی کی محرّف شکلیں تھیں۔ یہ دونوں حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے تھے (حضرت عیسیٰؑ بھی بنی اسرائیل ہی سے متعلق تھے)۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ دینِ خداوندی کی دعوت دیتے تھے اور ان کی اسی دعوت (ملّتِ ابراہیمیؑ) کی طرف، رسول اللہ (قرآن کریم کے ذریعے) یہود و نصاریٰ کو بلا رہے تھے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ :-

۲/۱۳۵ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا ۚ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (۲/۱۳۵)

یہ کہتے ہیں کہ تم مذہب یہودیت یا مذہب عیسائیت اختیار کر و تو سمجھا جائے گا کہ تم سیدھے راستے پر چل رہے ہو۔ ان سے کہا کہ یہ تمہاری خود ساختہ گروہ بندیاں ہیں جو تمہارے اپنے وضع کردہ مذہب کی پیدا کردہ ہیں۔ ہدایت' ملّتِ ابراہیمی (دینِ خداوندی) اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (یہودیت اور عیسائیت کی گروہ بندیوں کی تفصیل' جلد دوم صفحہ ۳۰۵۔ زیرِ آیات ۲/۶۱-۶۲ دی جا چکی ہے)

اس آیت میں' حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت حنیف بتائی گئی ہے اور یہ دین کی اصل و اساس ہے حنیف کے معنی ہوتے ہیں اپنی توجہات کو تمام اطراف سے ہٹا کر، ایک نقطہ، ایک نصب العین، ایک مرکز پر مرکوز کر دینا۔ اپنی

حنیف کا مفہوم

توجہ کو ہر دوسری سمت ہٹانا، لَآ اِلٰہَ ہے' اور ایک مرکز (دینِ خداوندی) پر مرکوز کرنا' اِلَّا اللّٰہ۔ اسی کو دوسری جگہ کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲/۲۵۶)۔ ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے۔ یعنی پہلے ہر غیر خداوندی تصور، نظریہ، عقیدہ، مسلک سے منہ موڑنا، اور جب اس طرح انسانی فکر و نظر کی لوح صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایمان باللہ کا نقش ثبت کرنا۔ اگر غیر خداوندی تصورات و نظریات کا ذرا سا شائبہ بھی باقی رہ جائے تو یہ شرک ہوگا۔ دین میں شرک کا سایہ تک نہیں رہتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کفر بالطاغوت کی یہ تمام منازل ایک ایک کر کے طے کیں۔ (دیکھئے ۶/۷۵-۷۹) اور جب اس طرح ان تمام اطراف

سے منہ موڑلیا تو پھر اعلان کیا کہ:-

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔ (۶/۷۹)

میں ہر غیر خداوندی تصور اور عقیدہ سے بیزار ہو کر، اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو جملہ کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے۔ میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ ہے میرا مسلک۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ دینُ اللہ میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اور جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں توحید باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا، ہر مذہب شرک پر مبنی ہوتا ہے۔ مذہب میں فرقے ہوتے ہیں، اور فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔ (تفصیل جلد اوّل صفحہ ۱۷۲، زیرِ آیت ۲/۲ گزر چکی ہے)۔ لہٰذا، دین میں نہ مختلف مذاہب ہوتے ہیں، نہ فرقے۔ جہاں فرقے ہوں سمجھ لیجئے کہ وہاں نہ دین ہے نہ توحید۔

یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مذہبی گروہ بندیوں سے ہٹ کر، تمام نوعِ انسان کو دین کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کا فطری نتیجہ (یا تقاضا) اس حقیقت پر ایمان لانا اور اس کا اعلان کرنا تھا کہ تمام انبیاءِ کرام خدا کی طرف سے ہی (اور واحد) دین لے کر آئے تھے۔ اور ان کی اس حیثیت (یعنی نبوت و رسالت) میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ امتِ مسلمہ سے کہا کہ یہودی اور عیسائی تو اپنے اپنے گروہ بندانہ مسلک کی طرف دعوت دیتے ہیں، تم اس مسلک کی دعوت دو کہ:-

۲/۱۳۶ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَعِیْسٰى وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ (۲/۱۳۶)

تم ان سے کہو کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون سا مسلک ہے جسے اختیار کر کے ہم تمہاری خود ساختہ گروہ بندی اور نسل پرستی سے بلند ہو چکے ہیں۔ وہ مسلک یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے ہیں جو اس نے اِس رسول کی وساطت سے، ہماری طرف بھیجا ہے۔ (یہ اپنی اصل و اساس کی رُو سے اسی قسم کا ضابطۂ زندگی ہے جس قسم کا ضابطہ .... اس سے پہلے) حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ نیز حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل بلکہ تمام انبیاءؑ کی طرف نازل ہوا تھا۔ ہم ان تمام حضرات انبیاء کرامؑ

کو ایک ہی سلسلہ کی کڑی سمجھتے ہیں اور منصبِ نبوّت کے حامل ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کرتے، اگرچہ مدارج کے اعتبار سے ان میں فرق ضرور ہے (۳/۸۴)۔ یہ ہے وہ مسلک جس کی رُو سے ہم خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ یعنی ان قوانین کی جن میں انسانی آمیزش کا شائبہ تک نہیں۔

اس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ سابقہ کتابوں پر ایمان کا مطلب کیا ہے۔ اس کی بابت جلد اول صفحہ ۱۴۳ زیرِ آیت (۲/۴) وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ جلد دوم صفحہ ۲۶۵۔ آیت (۲/۲۱۳) میں بتایا گیا ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف

ہر نبی کو کتاب ملی تھی

سے کتاب ملی تھی۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ رسول کتاب کے ساتھ آتا تھا اور نبی بلاکتاب۔ اس آیت میں جن انبیاء کرامؑ کا نام لیا گیا ہے ان میں صحفِ ابراہیمؑ اور کتابِ موسیٰؑ اور کتابِ عیسیٰؑ کا ذکر تو قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ باقی انبیاء کی کتابوں کا کوئی ذکر نہیں آیا، لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کی طرف بھی کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ اور "وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّوْنَ" میں جامع طور پر کہہ دیا کہ تمام انبیاء کو کتابیں ملی تھیں۔

اس وضاحت کے بعد کہا کہ :-

۲/۱۳۷ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لاتے ہو تو اس وقت یہ خدا کے متعین کردہ راستے پر گامزن ہونگے۔

اہلِ کتاب سے ایمان لانے کا مطالبہ

اور اگر یہ اس سے اعراض برتیں گے تو ان کا یہ اعراض اس راستے سے الگ ہو جانے کے مرادف ہوگا جس پر حضرات انبیاء کرامؑ چلتے آئے ہیں۔ اگر انہوں نے اس راستے سے اعراض برتا تو یہ تمہاری مخالفت مسلسل کرتے رہیں گے۔ لیکن تمہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمارے نظام میں جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضررسانیوں سے محفوظ رکھے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کا نظام ہے جو سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

"فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا" ایک عظیم حقیقت کی کشاف ہے۔ دنیا میں (کم و بیش) تمام اہلِ مذاہب خدا کو بھی مانتے ہیں اور حیاتِ آخرت کو بھی۔ لیکن قرآن، ان کے اس ایمان کو ایمان

ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور آخرت کا جو تصور خود خدا نے (قرآن میں) پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق ایمان درحقیقت ایمان کہلا سکتا ہے۔ (ایمان کا مفہوم جلد اول صفحہ ۲۲ - آیت (۲/۴) میں واضح کیا جا چکا ہے) یہی وجہ ہے کہ وہ جنہیں اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے، ان سے بھی اسی انداز کے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی وضاحت جلد اول صفحہ ۱ - آیت (۱/۲) اور صفحہ ۳۳ - آیت (۲/۴) میں آچکی ہے جہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ "برہمو سماجی اسلام" جسے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے خاص مصلحتوں کے تحت پیش کیا تھا، قرآنی اسلام کے یکسر خلاف تھا۔

اسلام کا یہ ہمہ گیر تصور تھا جس کے متعلق کہا کہ :-

۲/۱۳۸ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۔ (۲/۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔

صبغۃ کے معنی "رنگنے کا طریق" ہوتے ہیں۔ پھر اسے خود "رنگ" کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے ۔۔ دینِ

صبغۃ اللہ

خداوندی کو صبغۃ ۔۔ رنگنے کا طریق یا خدا کا رنگ ۔۔ کہہ کر، دین کی غرض و غایت اور منتہیٰ و مقصود کے طول طویل مباحث کو جس حسنِ ایجاز کے ساتھ ایک لفظ میں سمٹا دیا گیا ہے، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ دین کی غایت اور انسانی زندگی کا منتہائے مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی جائے، یا یوں کہیئے کہ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس میں کس حد تک صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی ہیں (اس کی تفصیل جلد دوم صفحہ ۲۵ زیر آیت (۲/۳۰) عنوان نفسِ انسانی میں سامنے آچکی ہے)۔ اسے خدا سے یک رنگی اور ہم آہنگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ نیا رنگ کیا کرتا ہے؟ کپڑے پر کتنے ہی داغ دھبے یا مختلف رنگوں کے نقوش و آثار ہوں، نیا رنگ، اگر وہ گہرا ہے تو ان تمام نقوش و اثرات پر غالب آکر کپڑے کو "یک رنگ" (یعنی ہموار اور یکساں) کر دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، جب ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو انسانی کردار میں عجیب قسم کی یکسانیت اور ہمواریت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس یکسانیت یا متوازنیت کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے کو پورے کا پورا اسی رنگ میں ڈبو دیا جائے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ (۲/۲۰۸) اے مدعیانِ ایمان! تم دینِ خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اسی کو توحید کہا جائے گا۔ یعنی کپڑے کا یک رنگ ہو جانا اور اس

میں کسی دوسرے رنگ کا شائبہ تک باقی نہ رہنا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ رنگ گہرا بھی ہو اور پکا بھی۔ اگر یہ رنگ پھیکا ہے تو اس سے سابقہ نقوش و آثار صرف دھیمے پڑ جائیں گے، مٹیں گے نہیں اور اگر کچا ہو تو کچھ عرصہ کے بعد، یہ نیا رنگ اُڑ جائے گا اور سابقہ داغ دھبے پھر سے اُبھر کر سامنے آجائیں گے۔ (صدرِ اوّل کے بعد) ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ ہم نے اپنے اوپر جو دین کا رنگ چڑھایا، تو وہ پھیکا بھی تھا اور کچا بھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑے سے عرصہ کے بعد، خارجی اثرات سے (جو خاص سازش کے ماتحت پھیلائے گئے تھے) وہ رنگ اڑ گیا اور قبل از اسلام کے داغ دھبے، سب اُبھر کر اوپر آگئے۔ اگر ہماری آنکھیں کھلی ہوتیں (یعنی ہم عقل و بصیرت سے کام لیتے) اور قرآنِ کریم کی روشنی ہمارے سامنے ہوتی، تو ہمیں نظر آجاتا کہ صِبْغَةَ اللہ باقی نہیں رہا۔ لیکن ہوا وہ جسے قرآنِ کریم نے اِن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ۔۔۔ (۱۶/۶۳)۔ ہمارے پست جذبات نے ان باطل نقوش کو اس قدر مزیّن اور پُرکشش بنا دیا کہ ہم نے اسی فریبِ نگاہ کو حقیقت سمجھ لیا۔ یہی ہیں وہ نقوش جنہیں ہم صِبْغَةَ اللہ سمجھ کر سینے سے لگائے پھر رہے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ یہ سب غیر اللہ کے رنگ ہیں۔

عیسائیوں کا بپتسمہ

عیسائیوں کے ہاں ایک رسم ہے جسے اصطباغ (یا بپتسمہ) کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے بھی وحیِ خداوندی کی رُو سے صِبْغَةَ اللہ کا استعارہ پیش کیا تھا۔ اس سے انکی مراد انسانی سیرت کو خدائی رنگ۔۔۔ رنگنا تھا۔ لیکن بعد میں، جب وہ رنگ اُڑ گیا تو اس اصطباغ۔ (اصطباغ۔ صبغہ) نے بپتسمہ کی رسم اختیار کر لی۔ اس رسم کی رُو سے، عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے پر رنگ (یا بعض اوقات) "مقدس پانی" چھڑک دیتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس سے اس بچے سے وہ آلائش دُھل جاتی ہے جو اُس کے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کی لغزش کا نتیجہ تھی اور جسے ہر انسانی بچہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان چھینٹوں سے (عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے) وہ آلائش دور ہو جاتی ہے اور بچہ "خدا کی بادشاہت" میں داخل ہونے کا مستحق بن جاتا ہے۔ ہم ان کی اس رسم پر ہنستے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم خود کس طرح اسی قسم کے فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ ہم نے بھی تو مذہبی رسوم کے نقوش کو صِبْغَةَ اللہ سمجھ رکھا ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ:۔

چہ گرتمت ز مسلمانِ نا مسلمانے جز ایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند

(اقبالؒ)

(۰)

اس کے بعد یہود و نصاریٰ سے کہا کہ یہ ہے خدا کا صحیح تصور جسے ہم پیش کرتے ہیں:۔

۲/۱۳۹ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ۔ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ۔ (۲/۱۳۹)

کہاکہ ان سے کہوکہ کیا اس وضاحت کے بعد بھی تم ہم سے جھگڑتے ہو اور کہتے ہو کہ جب ہم پہلے ہی خدا کو مانتے ہیں تو پھر ہم سے خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ کہاکہ آؤ! ہم تمھیں بتائیں کہ تمہارے خدا کے ماننے اور ہمارے ماننے میں کیا فرق ہے۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ تم اس خدا کو مانتے ہو جس کی ربوبیت، رحمت، ہدایت حتیٰ کہ جنت، قومِ بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۵۔ آیت ۲/۶۲-۶۱)۔ لیکن ہم جس خدا کو مانتے ہیں وہ رَبُّنَا (ہمارا بھی رب) ہے اور رَبُّکُمْ (تمھارا بھی رب)۔ یعنی ہم خدا کی عالمگیر ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ (جلد اوّل۔ صفحہ ۱۶۔ آیت ۱/۱)

دوسرا فرق یہ ہے کہ تم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کریں، جنت ان کے لئے ریزرو (مختص) ہو چکی ہے۔ (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۹۔ آیت ۲/۸۰)۔ اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے اپنی جان دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۳۹ آیت ۲/۸۱)۔ لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اس کے نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے۔

قطع نظر دیگر امور، تم دیکھو کہ دین کے ان دو بنیادی ستونوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) کے تمہارے تصوّر اور ہمارے تصوّر میں کس قدر فرق ہے۔

(۰)

"وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ" کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۴۸۔ زیر آیت (۲/۷۸) میں قرآن فہمی کے تین طریقوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں پہلا طریقہ تو علم و بصیرت کی رُو سے افہام و تفہیم کا ہے۔

استنتاجی طریق

دوسرا طریقہ استنتاجی ہے۔ یعنی قرآنی نظام کو عملاً متشکل کر کے اس کے نتائج کو اس کے دعوے کی صداقت کے لئے بطورِ شہادت اور ثبوت پیش کرنا۔ اسی سلسلہ میں نبی اکرمؐ نے اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ اگر تم دلائل و براہین ... سے میرے دعوٰی کی صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سا نظام مبنی بر صداقت ہے (۶/۱۳۶)۔ اس مقام پر بھی اسی طریق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جب

کہا گیا کہ اگر تم اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہو تو پھر جاؤ۔ تو اپنے پروگرام پر عمل کرو ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ ہم خالصتہً اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہیں گے۔

(۰)

اس کے بعد ان کے اس دعوٰی کو پھر دہرایا جیسے آیت (۲/۱۳۵) میں پیش کیا گیا تھا۔ یعنی :-

۲/۱۴۰ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۔ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ (۲/۱۴۰)

کیا اس کے بعد بھی یہ لوگ یہی کہے جاتے ہیں کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل یہودی تھے یا نصرانی؟ ان سے کہو کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، خدا کی طرف سے عطا شدہ علم (وحی) کی بنا پر کہتے ہیں۔ اور تم یا تو محض قیاسی باتیں کرتے ہو، اور یا حقیقت کو چھپاتے ہو۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ جو شخص اس بات کو چھپائے جس کا علم اُسے خدا کی طرف سے ملا ہو، اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے؟ لیکن تم ہم سے تو یہ باتیں چھپا سکتے ہو، خدا سے کس طرح چھپا سکتے ہو؟ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور ایسا کیوں کرتے ہو!

انبیاء بنی اسرائیل یہودی و نصرانی نہیں تھے

جہاں تک حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کتمانِ حقیقت کا تعلق ہے، دوسرے مقام پر اسے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ تورات اور انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ لہٰذا وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہو سکتے ہیں (۳/۶۵) یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جو لاکھ پردوں میں چھپائے بھی چھپ نہیں سکتی۔ لہٰذا اس قسم کے کتمانِ حقیقت سے کیا حاصل؟ (یہودیوں کی کتمانِ حق کی مذموم عادت کے متعلق جلد دوم۔ صفحہ ۲۰۰۔ آیت ۲/۴۲ میں بھی ذکر آچکا ہے)۔

(۰)

اس کے بعد پھر آیت (۲/۱۳۴) کو دہرایا گیا :-

۲/۱۴۱ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ وَلَا

تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۴۱/۲)

اس آیت میں جو بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے اس کا قوموں کی موت وحیات سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ اسے جتنی بار بھی سامنے لایا جائے کم ہے۔ اسلاف پرست یا ماضی پرست قوم، شاہراہِ حیات پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک زندہ قوم کی زندگی میں تسلسل ہوتا ہے اور اسی تسلسل کا نام تاریخ ہے۔ اس لئے اس قوم کا اپنی تاریخ سے منقطع ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (تاریخ کی اہمیت کے متعلق جلد دوم، صفحہ ۱۵۰۔ زیرِ آیت ۲/۱۴۴ تفصیل سے لکھا جا چکا ہے) لیکن تاریخ کے ساتھ رابطہ اور چیز ہے اور ماضی پرستی اور شے۔ ماضی پرستی، تقلید کا دوسرا نام ہے۔ تقلید کی تباہیوں کے متعلق، جلد اوّل، صفحات ۶۰ و ۱۴۴ تا ۱۶۴ و ۳۰۷۔ زیرِ آیات (۲/۱)؛ (۲/۴)؛ (۲/۴۴) لکھا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی آیات کو اس لئے بار بار سامنے لاتا ہے

ماضی پرستی

کہ قوم، ماضی پرستی کے فریب میں کھو کر، کشمکشِ حیات سے گریز کی راہیں نہ تراش لے۔

زمانۂ نزولِ قرآنِ کریم میں تو یہودیوں کو ماضی پرستی کی تباہ کاریوں کی یاد دلانے کی ضرورت تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات کا اطلاق — بلکہ زیادہ شدت سے اطلاق — خود ہم پر ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ان آیات پر غور کر کے سوچیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

اس آیت پر قرآنِ کریم کا پہلا پارہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں پاروں کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں۔ یہ تقسیم حفظ میں آسانی یا حوالوں کے لئے بعد میں اختیار کی گئی تھی۔ چونکہ ہمارے ہاں بالعموم پاروں کے شمار کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لئے میں نے اس کا ذکر کر دیا ہے کہ اس آیت پر پہلا پارہ ختم ہو جاتا ہے۔

پہلا پارہ ختم

تیسرا باب

مرکزِ ملّت ـــــ کعبہ

آیات ـــــ ۲/۱۴۲ تا ۲/۱۵۲

۱ - کعبہ کے مرکز قرار دینے کے خلاف یہودیوں کے اعتراضات ۔

۲ - وضعی روایات جو بالبداہت یہودیوں کی تراشیدہ نظر آتی ہیں ۔

۳ - امتِ مسلمہ کی تشکیل اور اس کی خصوصیاتِ کبریٰ ۔

۴ - نسل ۔ رنگ ۔ زبان ۔ وطن کی نسبتوں کے بجائے خالص نظریہ کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ ۔

۵ - اس امت کا مرکز محسوس کعبہ ہے ۔

۶ - یہی ان کا قبلہ ہے ۔ یعنی اس مقصدِ حیات کی محسوس علامت جسے زندگی کے ہر شعبے میں نگاہوں کے سامنے رہنا چاہیئے ۔

۷ - مقصود بالذات اس محسوس مرکز کی معنویت ہے نہ کہ عمارتی خوبصورتی ۔

شروع دوسرا پارہ

تیسرا باب

مرکزِ ملت ـــــ کعبہ

سابقہ باب میں، معمارِ کعبہ، حضرت ابراہیمؑ کا تذکرۂ جلیلہ وجہِ فروغِ دیدہ ہوا تھا۔ اب خود کعبہ کی داستان ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام ایک نظامِ حیات کا نام ہے۔ جس کے لاینفک عناصرِ ترکیبی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وحیِ خداوندی پر مشتمل ایک مکمل، غیر متبدل، محفوظ ضابطۂ حیات (قرآنِ کریم) جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، تمام نوعِ انسان کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔

(۲) اس ضابطۂ زندگی کی صداقت پر ایمان رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک 'امت' جو نسلی، قومی، وطنی امتیازات سے بلند ہے۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں۔ کوئی پارٹی نہیں۔

(۳) اس امت کی ایک مملکت جس میں یہ ضابطۂ حیات عملی نظام کی شکل اختیار کرے۔

(۴) اس مملکت کی ایک مرکزی اتھارٹی جو اس نظام کو قرآنی خطوط پر قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ اور

(۵) اس مملکت کا ایک محسوس مرکز جسے کعبہ کہا جاتا ہے اور جس کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔

قریشِ مکہ

نبی اکرمؐ کی حیاتِ نبویؐ کا پہلا دور (جسے مکی دور کہا جاتا ہے) اس امت کے ابتدائی ہیولیٰ کی تشکیل کا دور تھا۔ اس زمانہ میں (یوں کہیئے کہ) اس نظام کا خمیر تیار ہو رہا تھا۔

کعبہ ایک بُت کدہ تھا جس کے متولی قریش تھے۔ کعبہ کی اس تولیت سے انہیں بڑی امتیازی زندگی حاصل تھی۔ یوں کہئے کہ پورے عرب کی امامت (لیڈرشپ) انہیں میسر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جس نظام کا تصور رسول اللہ پیش فرما رہے ہیں، اگر وہ قائم ہو گیا تو کعبہ کی تولیت ان کے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ اس لئے وہ اس دعوت کے سخت مخالف اور شدید دشمن تھے۔ تیرہ سالہ مکی دور کے بعد، آپؐ (اور آپؐ کی جماعت) نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی کیونکہ وہاں کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار تھی۔ قریش کو اس کا احساس تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک جگہ بھی قائم ہو گیا تو کعبہ کی تولیت اور اس سے وابستہ مفادات ان کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی سرگرمیاں تیز تر کر دیں اور ان کی جولانیاں میدانِ جنگ تک پہنچ گئیں۔ سات سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد، آخر الامر مکہ فتح ہوا اور کعبہ (جو پہلے نظری طور پر اس نظام کا مرکز تھا) عملاً اس کی تحویل میں آگیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس مملکت کا دارالخلافہ تو مدینہ ہی رہا لیکن اس نظام کا مرکز کعبہ قرار پایا۔ یہ اس لئے کہ مملکت کے دارالخلافہ کے محلاتِ وقوع (مقامات) تو مختلف مصالح کے تحت بدلے جا سکتے ہیں، لیکن اس نظام کی حامل امت کے فکر و نظر کے مرکز کا اپنے مقام پر محکم رہنا ضروری تھا۔ اگر اس کا محلِ وقوع بھی دارالخلافوں کے ساتھ بدلتا رہتا تو یہ مرکز مقامی بن کر رہ جاتا۔ سابقہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے (زیرِ آیت ۲/۱۲۵) کہ کعبہ کو عالمگیر انسانیت (الناس) کا مرکز قرار دیا گیا تھا۔ اس کی عالمگیریت کا بھی تقاضا تھا کہ یہ نت نئے دن اپنے محلاتِ وقوع بدلتا نہ رہے۔

مدینے کے یہودی

عرب میں اہلِ کتاب میں سے یہودیوں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں کی معیشت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور مدینہ میں بالخصوص انہیں بڑی قوت حاصل تھی۔ قریش کے علاوہ، یہ بھی اسلامی نظام کے سخت مخالف تھے۔ اس سے ان کا نظامِ سرمایہ داری درہم برہم ہو جاتا تھا۔ ان کے زمانۂ عروج میں، یروشلم (بیت المقدس) ان کا دارالسلطنت تھا۔ ظہورِ اسلام کے وقت ان کی سلطنت تو باقی نہیں رہی تھی لیکن یروشلم بدستور ان کی عقیدتمندیوں کا مرکز تھا۔ عیسائیوں کو یہودیوں کے ساتھ سخت عداوت تھی۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کی رُو سے) یہودیوں نے ان کے نبی (بلکہ خدا کے بیٹے) کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ جب یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے اس میں یہودیوں کے مقدس مقامات (بالخصوص ہیکلِ سلیمانی) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور ان کے کھنڈرات ان کے دورِ عروج کی مرثیہ خوانی کے لئے باقی رہ گئے، اور وہ بھی اس شکل میں کہ عیسائی وہاں کوڑا کرکٹ پھینکا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بیت المقدس بدستور یہودیوں کی عقیدت کا مقدس (نظری) مرکز تھا۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ ایک آنے والا آئے گا اور عیسائیوں کو وہاں

سے نکال کر، بیت المقدس کو پھر سے اس کا حقیقی (بلند) مقام عطا کر دیگا۔ اس لئے وہ ہر طریقہ سے اس مقام کی تقدیس، عظمت اور اہمیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

اسلام نے جب انبیائے بنی اسرائیل کی نبوت کی تصدیق اور احترام کو جزوِ ایمان قرار دیا تو یہودیوں کو خیال ہوا کہ مسلمان بیت المقدس کو اپنی عقیدت کا مرکز (قبلہ) قرار دیں گے، بالخصوص اس لئے کہ کعبہ بت کدہ بن چکا تھا اور توحید پرست، ایک بتکدہ کو اپنی عقیدت کا مرکز کبھی نہیں بنا سکتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں نے کعبہ ہی کو اپنا قبلہ قرار دیا (حالانکہ وہ اس وقت قریش کے قبضہ میں تھا) تو ان کا یہ فیصلہ اُن پر سخت شاق گزرا۔ چنانچہ انہوں نے جھٹ سے اعتراض کر دیا کہ (یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ) انہوں نے بیت المقدس جیسے مقدس اور متبرک مقام کو چھوڑ کر، کعبہ کو قبلہ کیسے قرار دے لیا؟ (قبلہ، یعنی مرکزِ ملت کی اہمیت کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۶۔ زیر آیت (۲/۱۴۳) گفتگو ہو چکی ہے۔ نیز میری کتاب معراجِ انسانیت میں قبلہ سے متعلق باب میں) اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ (جیسا کہ جلد دوم صفحہ ۲۰۵ آیات (۲/۶۱-۶۲) میں بتایا جا چکا ہے) یہودیوں نے دین کو نسلی بنا دیا تھا اس لئے بیت المقدس ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ اور اسلام، عالمگیر انسانیت کا دین تھا اس لئے اس کے مرکز کو نسلی، قومی جغرافیائی نسبتوں سے ماوراء ہونا چاہیئے تھا۔ یہی کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حقیقی وجہ۔ لیکن یہ بات نسل پرست یہودیوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ اعتراض کر دیا۔ اور ان کے اسی اعتراض سے اس داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

۲/۱۴۲ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۔ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۔ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (۲/۱۴۲)

یہ سمجھ بوجھ سے کام نہ لینے والے (یہودی) اعتراض کرتے ہیں کہ جب اہلِ کتاب کا قبلہ (مرکز) بیت المقدس موجود تھا، تو مسلمانوں نے اس سے روگردانی کر کے، کعبہ کو اپنا مرکز (قبلہ) کیوں قرار دے لیا؟

آگے بڑھنے سے پہلے، یہاں ایک ضمنی نکتہ غور طلب ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کو سفہا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس دین (قرآنی نظام) کی دعوت کیا تھی اور یہودی اس کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ دعوت تھی اُس کعبہ کو مرکز قرار دینے کی جسے ملتِ حنیفہ کے موسسِ اول، حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر، یہ دعوت تھی ملتِ ابراہیمؑ کے احیاء کی۔ یہودی اپنی نسبت تو حضرت ابراہیمؑ کی طرف ضرور کرتے تھے لیکن وہ تمسک اپنے قومی مرکز ہی سے رکھنا چاہتے تھے۔ بالفاظِ دیگر، وہ ملتِ ابراہیمی

سے اعراض برتتے تھے۔ قرآن کریم نے ملت ابراہیمی سے اعراض برتنے کو سفاہت سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آیت (۱۳۰) میں دیکھا جا چکا ہے۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ...... یہ وجہ ہے جو یہاں یہودیوں کو سفہا کہا گیا ہے۔

اس کے بعد آیئے اس اعتراض کی طرف جو یہودیوں کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس اعتراض میں بیت المقدس

یہودیوں کا اعتراض

کی عظمت و اہمیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ یہودی بنی اسرائیل (یعنی حضرت اسحٰق کے بیٹے حضرت یعقوب) کی اولاد تھے اور عرب (قریش) حضرت اسمٰعیل کی اولاد۔ بنی اسرائیل کو بنی اسمٰعیل کے ساتھ مخاصمت بلکہ عداوت شروع سے چلی آرہی تھی۔ اس حسد تک عداوت کہ (اگرچہ وہ ایک آنے والے کے نہایت شدت سے منتظر تھے) انہوں نے نبی اکرمؐ کی دعوت نبوت سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ آپؐ کا نسبی تعلق بنی اسمٰعیل سے تھا۔ داعیٔ اسلام (حضور نبی اکرمؐ) تو ایک طرف، وہ جبرئیل کے بھی اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ وہ بنی اسمٰعیل کی طرف وحی کیوں لے گیا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۳۸۶۔ آیت ۲/۹۸-۹۷)۔ کعبہ کو مرکز قرار دینے سے (ان کے خیال میں) بنی اسمٰعیل کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ وہ اس لئے بھی مسلمانوں کے اس فیصلہ کے خلاف تھے (حالانکہ یہ فیصلہ تو خود خدا کا تھا مسلمانوں کا اپنا نہیں تھا)۔

ان کے اس اعتراض کا جواب، اصولی طور پر، یہ کہہ کر دے دیا کہ بیت المقدس، بنی اسرائیل کا قومی مرکز ہے۔ اور اسلام، تمام بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اس عالمگیر دعوت کا مرکز وہی ہونا چاہیئے جو مشرق و مغرب (ساری دنیا) کو محیط ہو، نہ وہ جو کسی خاص نسل یا قوم کا منتہائے نگاہ ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر، خدا نے اپنے قانون مشیت کے مطابق، اس امت کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کر دی ہے (اس امت کی یہ خصوصیت اگلی آیت میں سامنے آجائے گی)

قرآن کریم نے تو کعبہ کو تمام نوع انسان کے قلب و نگاہ کا نصب العین، اور ان کی ہیئت اجتماعیہ کا مرکز قرار دے کر، قومی مراکز کی اہمیت کو ختم کر دیا، لیکن یہودیوں نے بیت المقدس کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے جو

تحویل قبلہ کی روایات

سازش کی وہ بڑی کامیاب رہی۔ یہ سازش تھی جھوٹی روایات وضع کر کے انہیں مسلمانوں کا جزو ایمان بنا دینا۔ چنانچہ تحویل قبلہ (بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ بنانے) کے سلسلہ میں، ہمارے ہاں کی معتبر ترین حدیث کی کتابوں میں جو روایات درج ہیں، ان کا ملخص یہ ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ (نبوت کی) زندگی میں حضورؐ، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ چاہتے یہی تھے

کہ رُخ کعبہ کی طرف کیا جائے۔ اس کے لئے آپؐ نے شکل یہ اختیار کی کہ حرمِ کعبہ میں نماز کے لئے اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی۔ (کعبہ اور بیت المقدس سیدھ میں پڑتے تھے) جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہ شکل نباہنا مشکل ہو گیا اس لئے کہ اب بیت المقدس (یروشلم) اور مکہ دو مخالف سمتوں میں پڑتے تھے۔ اگر منہ بیت المقدس کی طرف کرتے تو کعبہ کی طرف پشت ہو جاتی اور اگر منہ کعبہ کی طرف کرتے تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہو جاتی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، اگرچہ آپؐ اسے دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔ قریب سترہ ماہ، اور بعض روایات کی رُو سے، قریب دو سال تک آپؐ اسی نہج سے نماز ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے حکم آیا کہ آپؐ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ یہ حکم اُس وقت آیا جب آپؐ، نماز (ظہر یا عصر) کی امامت فرما رہے تھے اور دو رکعتیں پڑھ چکے تھے۔ حکم آنے پر آپؐ نے اپنا رُخ بدلا اور اس کے ساتھ ہی مقتدیوں نے بھی رُخ بدلا۔ رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لائیے کہ اگر پہلے منہ، شمال کی طرف تھا تو اب منہ جنوب کی طرف کرنا پڑا۔ مقتدیوں نے اپنا رُخ تو کھڑے کھڑے بدل لیا ہو گا لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضورؐ) کو مسجد کا نصف چکر کاٹ کر، دوسری جانب امامت کے لئے جانا پڑا ہو گا۔ (ضمناً) مدینہ میں ایک مسجد ہے جسے "مسجد ذو قبلتین" کہا جاتا ہے۔ (یعنی دو قبلوں والی مسجد)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ مسجد تھی جس میں یہ واقعہ پیش آیا۔ بہرحال، اس طرح، بیت المقدس کی جگہ، کعبہ، مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ (احادیث کے حوالوں ساتھ یہ تمام تفصیل، تفسیر ابنِ کثیر، شروع پارہ دوم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ابنِ کثیر نے (یہ تفصیل دینے کے بعد) لکھا ہے:-

> مرفوع حدیث میں ہے کہ یہودیوں کو ہم سے اس بات پر بڑا حسد ہے کہ خدا نے ہم کو جمعہ کے دن کی توفیق دی اور یہ اس سے بھٹک گئے۔ اور اس پر کہ ہمارا قبلہ یہ ہے اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے۔ اور بڑا حسد ان کو ہماری آمین کہنے پر بھی ہے جو ہم امام کے پیچھے کہتے ہیں۔
>
> (تفسیر ابنِ کثیر۔ پارہ دوم۔ اردو ترجمہ۔ صفحہ ۳)

یعنی ان احادیث کی رو سے (جو خود ہماری کتب روایات موجود ہیں) حضورؐ، قریب پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اسی وجہ سے بیت المقدس کو (ہمارے ہاں) قبلۂ اوّل کہا جاتا ہے۔

معراج سے متعلق روایت

آپ نے دیکھا کہ یہودیوں نے کس طرح بیت المقدس کی اہمیت کو ہمارے ایمان کا جزو بنا دیا؟ اس سلسلہ میں معراج کے واقعہ سے متعلق روایات بھی قابلِ غور ہیں۔

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے :-

رسول اللہ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے تقریباً بارہ سال گزر چکے تھے۔ ۵۲ سال کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریل فرشتے نے آکر آپ کو جگا دیا۔ نیم خفتہ اور نیم بیداری کی حالت میں آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور ایمان اور یقین سے بھر دیا۔

(مودودی صاحب کا ماہنامہ ترجمان القرآن ۔ بابت نومبر ۱۹۷۶ء)[1]

سب سے پہلے، آپ اس ٹکڑے پر غور فرمایئے کہ بارہ سال کی مدت نبوت کے بعد، آپ کا سینہ صاف کیا گیا۔ اور اسے علم۔ بردباری۔ دانائی اور ایمان و ایقان سے بھرا گیا۔ گویا زمانۂ نبوت کے پہلے بارہ سال تک حضورؐ کا سینہ نہ تو (معاذ اللہ) صاف تھا اور نہ ہی اس میں علم، بردباری، دانائی حتیٰ کہ ایمان و ایقان تھا (استغفر اللہ)۔ آگے بڑھیئے۔

اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا گیا جس کا رنگ سفید اور قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ براق کی رفتار سے چلتا تھا۔ . . . (یہ مختلف منازل طے کرتا ہوا) چوتھی منزل پر پہنچا۔ جہاں بیت المقدس تھا وہاں براق کا سفر ختم ہوا . . . . وہاں آپؐ نے ان تمام انبیاء کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپؐ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کیلئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپؐ نے سب کو نماز پڑھائی۔ (ایضاً)

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جملہ انبیاء کرامؑ کا یہ اجتماع، کعبہ میں نہیں ہوا۔ بیت المقدس میں ہوا جہاں حضورؐ کو کعبہ سے اٹھا کر لے جایا گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس روایت کی رو سے نہایت لطیف پیرایہ میں کس طرح کعبہ پر بیت المقدس کی افضلیت ثابت کر دی گئی ہے؟

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے تمام انبیاء کی امامت کرائی۔ ظاہر ہے کہ ان میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل تھے۔ لیکن یہودی سازش آگے بڑھی اور (حضورؐ نبی اکرم کی زبانِ مبارک سے) روایت کا باقی حصہ یوں بیان کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ شبِ معراج میں ——

نمازیں کیسے فرض ہوئیں

[1] واقعہ معراج کی تفاصیل احادیث کے تمام مجموعوں میں درج ہیں۔ لیکن ہم نے انہیں مودودی صاحب کے حوالے سے لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف ایسی روایات درج کرتے ہیں جنہیں ان کی نگہ بصیرت صحیح قرار دیتی ہے۔ ویسے بھی انہیں عام طور پر دورِ جدید کا "بلند پایہ مفسّر" سمجھا جاتا ہے۔

بارگاہِ خداوندی سے ۔

مجھ پر نماز فرض کی گئی۔ یعنی دن اور رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر میں واپس ہوا اور موسیٰؑ کے پاس آیا۔ موسیٰؑ نے پوچھا کہ تم کو کیا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو رات دن میں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ تمہاری امت رات دن میں پچاس نمازیں ادا کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ خدا کی قسم! میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کی اصلاح اور معالجہ میں کافی کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ اصلاح پذیر نہ ہوئے۔ تم اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور امت کے لئے تخفیف چاہو۔ چنانچہ میں پھر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں پھر دربارِ الٰہی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں پھر بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوا اور دس نمازیں اور کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر بھی یہی کہا۔ میں پھر دربارِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں رات دن میں باقی رہ گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر بھی یہی کہا۔ میں واپس ہوا اور بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوا اور رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ میں موسیٰؑ کے پاس واپس ہوا تو انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا، تمہاری امت رات دن میں پانچ نمازیں بھی ادا نہ کر سکے گی .... تم اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور مزید تخفیف چاہو۔ میں نے کہا، میں نے بار بار اپنے پروردگار سے تخفیف کا سوال کیا ہے۔ اب مجھ کو شرم آتی ہے۔ میں اس پر راضی ہوں اور خدا کے اس حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۷۶ء۔ نیز مشکوٰۃ۔ اردو ترجمہ صفحہ ۲۷۶-۲۷۵ جلد دوم)

آپ اس روایت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے، حضورؐ نبی اکرمؐ کس طرح (معاذ اللہ) طفلِ مکتب دکھائی دیتے ہیں! اور اس کے ساتھ ہی آپ اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اس سے خود خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے جو پہلے اس قسم کے ناممکن العمل احکام دے دیتا ہے اور پھر ان میں بار بار تخفیف کرتا جاتا ہے! (معاذ اللہ) صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایات یہودیوں کی وضع کردہ ہیں۔ ان کی رو سے انہوں نے کعبہ کے مقابلہ میں (اپنے قبلہ) بیت المقدس کی افضلیت ثابت کر دی اور حضور نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں (اپنے پیغمبر) حضرت موسیٰؑ کی عظمت! اور ہم ہیں کہ ان روایات کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔

———— (٠) ————

بات ہو رہی تھی تحویلِ قبلہ کی، اور اس ضمن میں ان روایات کو سامنے لایا گیا تھا جن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ قریب پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس کے بعد کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ اگر تھوڑا سا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ روایات بالبداہت وضعی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ آپؐ مکے میں پیدا ہوئے۔ کعبہ وہاں موجود تھا۔ وہ توحید کا مرکز بیشک نہیں تھا لیکن عربوں کا مرکز تھا، بنی اسمٰعیل کا مرکز تھا۔ قریش اس کے متولی تھے۔ خود حضورؐ بھی قریشی تھے۔ تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ کبھی کسی عرب (قریش) نے کعبہ کو چھوڑ کر، بیت المقدس کی طرف رُخ کیا ہو! وہ تو ساری دنیا کو کعبہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کیسے کر سکتے تھے! کعبہ کو اس زمانے میں اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ یمن کے عیسائی گورنر نے یہ دیکھ کر کہ کعبہ، اس کے تعمیر کردہ معبد کے مرکز بننے کے راستے میں حائل ہے، اسے مسمار کرنے کی غرض سے مکہ پر فوج کشی کر دی۔ قرآنِ کریم میں سورۃ الفیل اس کی شاہد ہے۔ یہ اس سال کا واقعہ ہے جب حضورؐ پیدا ہوئے تھے۔ (قبل از نبوت) چالیس سال حضورؐ نے اسی فضا میں بسر کئے جو کعبہ کی اہمیت سے اس قدر معمور تھی — اور وہ بھی ایک عام عرب کی طرح نہیں۔ قریش کے ممتاز ترین قبیلہ، بنی ہاشم کے نہایت معزز اور واجب التکریم فرد کی حیثیت سے۔ آپ سوچئے کہ اس زمانے میں بھی کعبہ کی کس قدر اہمیت آپؐ کے دل میں جاگزین ہوگی۔ پھر عربوں کو اس کا بھی علم تھا (اور وہ اس پر فخر کرتے تھے) کہ کعبہ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے جدِ امجد حضرت اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا۔

آگے بڑھیے۔ زمانہ قبل از اسلام میں بھی وہاں ایسے افراد موجود تھے جو اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کے متبع قرار دیتے تھے اور اسی نسبت سے حنیف کہلاتے تھے۔ یہ خدائے واحد کے پرستار تھے۔ جب حضورؐ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے تو آپ کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم ہوا۔ (دیکھئے۔ آیت ۲/۱۲۵۔ صفحہ ——) کیا اس کے بعد آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کر سکتے ہیں کہ حضورؐ پندرہ سال تک، کعبہ کو چھوڑ کر، بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے ہوں گے؟ روایات یہ بھی کہتی ہیں کہ آپؐ بیت المقدس کی طرف رُخ تو کر لیتے تھے لیکن آپؐ کی دلی خواہش یہی تھی کہ اپنا رُخ کعبہ کی طرف ہی کریں۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو آپؐ نے اس مسلک (یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے) کو خود اپنے فیصلہ سے اختیار کیا تھا۔ اگر اپنے فیصلے سے اختیار کیا تھا تو پھر کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی دل میں خواہش کے کیا معنی؟ اگر آپ کا جی کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو چاہتا تھا تو آپؐ کو اپنا فیصلہ بدلنے میں کیا امر مانع تھا؟ دوسری صورت یہ تھی کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم خدا کی

طرف سے دیا گیا تھا۔ سو اوّل تو قرآن میں کہیں ایسا حکم نہیں۔ .... دوسرے یہ کہ اگر یہ ارشادِ خداوندی کی تعمیل بھی تو کیا اسے ایک لمحہ کے لئے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ اس حکم کی تعمیل (معاذاللہ) طوعاً و کرہاً کرتے تھے۔ دلی خواہش اس کے خلاف تھی (استغفراللہ!) کیا خدا کے رسولؐ، ارشادِ خداوندی کی تعمیل اس طرح کیا کرتے تھے؟ اور اس کے بعد اس قیامت بالائے قیامت کو دیکھئے کہ حضورؐ، حکمِ خداوندی کی (طوعاً و کرہاً) تعمیل اور اپنی دلی خواہش میں مفاہمت (COMPROMISE) کی صورت یہ پیدا کر لیتے تھے کہ نماز میں ایسے مقام پر کھڑے ہو جاتے جہاں کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی سامنے۔ چلئے! خدا بھی راضی ہو گیا اور اپنے دل کی تسکین بھی ہو گئی۔ (معاذاللہ!)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

لیکن مدینہ میں آکر مشکل پڑی۔ آپ غور کیجئے کہ یہ سترہ ماہ یا دو سال کا عرصہ، حضورؐ نے (معاذاللہ) کس کرب اور ضیق میں گزارا ہو گا۔ جی چاہتا تھا کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو اور حکمِ خداوندی کی تعمیل میں رُخ بیت المقدس کی طرف کرنا پڑتا تھا! (ان روایات کی رُو سے) یہ کہنا پڑے گا کہ بالآخر، خدا نے رحیم کو آپؐ کی اس حالت پر ترس آگیا اور اس نے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دے کے آپؐ کو اس کشمکش سے نجات دلائی! (میرے اللہ! تیری پناہ)

عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیریں لکھنے والے ایسے ایسے جید امام تھے انہوں نے اس قسم کی تفسیریں کیسے لکھ دیں۔ اور اگلا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنے والے اتنے اتنے بڑے عالم تھے، انہوں نے ایسے ترجمے کس طرح کر دیئے اور ان سوالات کا جواب دو لفظوں میں دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس سب کی ذمہ دار یہ وضعی روایات ہیں۔ جب ان روایات کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ یہ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی ہیں تو قرآن کا مفہوم ان سے ہٹ کر یا ان کے خلاف کس طرح لیا جا سکتا تھا۔ روایات میں ہے کہ حضورؐ پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا۔ جب مفسرین نے قرآنِ کریم کی تفسیریں لکھیں تو وہ قرآنِ مجید کی کسی آیت کا مفہوم اس کے خلاف لے ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہی کے مطابق تفاسیر مرتب کر دیں۔ اس طرح ہماری تفاسیر، قرآن سے دور چلی گئیں۔ ان تفاسیر کی رُو سے قرآنِ کریم جس طرح سمجھا گیا، ترجمہ کرنے والوں نے اس کے مطابق آیات کا ترجمہ کر دیا۔ اس کی بیّن مثال ہمارے سامنے ہے۔ قرآنِ کریم کی آیت ہے:-

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ (۱۴۲/۲)

روایات اور تفاسیر میں لکھا تھا کہ پندرہ سال تک بیت المقدس قبلہ رہا۔ اس کے بعد اسے تبدیل کرنے کا حکم آیا۔ اس کی رُو سے آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا۔

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اگر ذہن، روایات (اور ان پر مبنی تفاسیر) سے متاثر نہ ہوتا تو اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں کیا جاتا کہ:-

یہ بے وقوف لوگ (یہود) کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے پھیر دیا اُس قبلہ سے جس پر وہ (یہود) ہیں — یعنی یہود کے قبلے سے۔

میں اس مقام پر گرامر کی ان بحثوں میں نہیں الجھنا چاہتا کہ "قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" کا یہ ترجمہ کس طرح صحیح ہے۔ (کوئی سمجھنا چاہے گا تو انفرادی طور پر اُسے سمجھا بھی دوں گا)۔

مشہور ہے کہ ایک غلطی کے جواز کے لئے کئی مزید غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جب یہ سمجھا گیا کہ پندرہ سال تک رسول اللہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے، تو اس سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوا کہ حضورؐ نے ایسا خدا کے حکم ہی سے کیا ہوگا۔ لیکن قرآنِ کریم میں تو ایسا حکم کہیں نہیں! اس پر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ وحیِ جلی اور وحیِ خفی۔ وحیِ جلی تو قرآن کے اندر درج ہے اور وحیِ خفی احادیث میں ہے۔ یہ وحی بھی، وحیِ قرآنی کی مثل ہے (مثلہٗ معہٗ قرآن کی مثل، قرآن کے ساتھ)۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم وحیِ خفی کی رُو سے ملا ہوگا۔ (وحی کی ان اقسام کے متعلق دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد اوّل ص ۱۴۱۔ آیت ۲/۴)

لیکن یہاں مشکل آن پڑی کہ احادیث میں اس چیز کو بطور واقعہ تو بیان کیا گیا ہے (کہ حضورؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے) لیکن اس کا حکم وہاں بھی نہیں ملتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وحیِ خفی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالفاظہٖ کتبِ احادیث میں درج ہو۔ حضورؐ نے اس پر جو عمل کر کے دکھایا اسے وحی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس لئے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم اگر بہ نصِ صریح کہیں نہیں ملتا تو اس سے کچھ ہرج واقعہ نہیں ہوتا۔ حضورؐ کا اُس طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اس کے وحی ہونے کی سند ہے۔ غرض، ایک غلط (وضعی) روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے، اس قدر الجھنیں پیدا کرنی پڑیں۔ سچ ہے۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج	تا ثریا می رود دیوار کج

قرآن کو روایات کے تابع رکھنے کے بجائے، اگر روایات کو قرآن کے تابع رکھا جاتا، تو نہ، معاندینِ اسلام کی

اس قسم کی روایات کو جزوِ دین بنانے کی سازش کامیاب ہو سکتی، نہ ہی امت اس قدر الجھنوں اور تفرقہ کا شکار ہوتی۔ (امت نے جب بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا، قرآنِ کریم بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا اور یہ ہر قسم کے انتشار و تشتت، تفرقہ اور اختلاف سے محفوظ ہو جائے گی)۔

ان روایات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں وضع ہوئی تھیں جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تھا اور قبلہ سے مقصود وہ مکان یا مقام رہ گیا تھا جس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاتے۔ دین میں، قبلہ سے مقصود نظامِ خداوندی (یا قرآنی مملکت)، کا مرکزِ محسوس تھا جو محور تھا امت کی تمام سرگرمیوں کا۔ اگر قبلہ کا یہ مفہوم سامنے ہوتا تو اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ حضورؐ نماز میں اپنا رُخ کس طرف کرتے تھے۔ کعبہ تو وہ نقطہ باسکہ تھا جس سے متمسک ہو کر مسلم افراد نے ایک امت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ اس کی تصریح اگلی آیت میں یوں کر دی کہ :۔

۲/۱۴۳ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ..... (۲/۱۴۳)

اس آیۂ جلیلہ میں كَذٰلِكَ کا لفظ بڑا پُر معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت بنا دیا۔

تشکیلِ اُمّتِ واحدہ

یعنی تعینِ قبلہ وہ عملی طریق (PROCESS) تھا جس سے تمہارے بکھرے ہوئے ذرّے ایک چٹان بن گئے۔ یہ اس مرکز کی کشش ثقل تھی جس سے تم سب ایک نقطہ سے وابستہ اور باہمدگر پیوست ہو گئے۔ یہاں کعبہ کو اس امت کی وجہِ جامعیت بتایا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر اس امت کا ذکر کرتے ہوئے، حبل اللہ کو وجہِ جامعیت قرار دیا گیا ہے۔ حبل اللہ کی اصطلاح (جس کے لفظی معنی اللہ کی رسّی یا بندھن ہیں) بڑی جامع ہے۔ اس میں پورے کا پورا نظام آجاتا ہے۔ وہاں کہا یہ گیا ہے کہ :۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳/۱۰۲)

تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، سب کے سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر، اس نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور اپنے اندر فرقے یا پارٹیاں مت پیدا ہونے دو، کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۰/۳۱) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (۶/۶۵)۔ تم ذرا اپنی قبل از اسلام کی حالت کو سامنے لاؤ جب تم ایک امت کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم

ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے تمہاری اس حالت میں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا جس سے تم میں ظاہرداری کا میکانکی طور پر اتحاد ہی نہیں ہوا بلکہ تمہارے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے تمہارا اس طرح ایک نظام کے تابع ایک برادری بن جانا کتنا بڑا انعامِ خداوندی تھا تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظامِ خداوندی نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ (۳/۱۰۳؛ ۸/۶۳؛ ۴۹/۱۰) اس طرح اللہ اپنے قوانین و ضوابط اور ان کے نتائج و ثمرات واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔

(اس کے بعد اس امت کا ذکر ہے۔ لیکن وہ آیت (۲/۱۲۸) ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳)۔ "اس طرح (یعنی کعبہ کی مرکزیت سے) ہم نے تمہیں ایک ایسی امت (قوم) بنا دیا جو عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے"۔۔۔ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں، تم سے

امت کی خصوصیات

یکساں فاصلے پر (EQUI-DISTANT) ہیں۔ نہ تم کسی کی طرف یونہی جھکے ہوئے ہو، نہ کسی کی طرف سے یونہی کشیدہ۔ تمہارے نزدیک، عدل و انصاف کے نقطۂ نگاہ سے تمام اقوام یکساں ہیں۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال و کردار کا محاسبہ کرتے رہو کیونکہ تمہارا منتہائے مقصود، تمام نوعِ انسان میں وحدت پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ خود تمہارے اعمال و کردار پر نگاہ رکھنے والا بھی کوئی ہو جو دیکھتا رہے کہ تمہارا قدم، خدا کے مقرر کردہ راستے سے اِدھر اُدھر نہیں اٹھ رہا۔ یہ ہے اس نظام کا خاکہ ۔۔۔ قرآن کریم تمہاری وحدت کا نظریاتی (IDEOLOGICAL) مرکز۔ کعبہ اس کا محسوس مرکز۔ اور اس نظام کی مرکزی اتھارٹی، اس کا اقتداری مرکز۔ اور فریضہ اس امت کا اقوامِ عالم کے کردار پر محاسبانہ نگاہ رکھنا۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ...... (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود اور بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان تمام امور کو جنہیں کتاب اللہ صحیح تسلیم (RECOGNISE) کرتی ہے، قانوناً نافذ کرو اور جنہیں وہ غلط قرار دیتی ہے، ان سے لوگوں کو قانوناً روکو[1]"۔

---

[1] معروف و منکر کا تشریحی بیان اپنے مقام پر آئے گا۔

یہاں اس آیت کا سامنے لانا ضروری ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (۳/۱۰۳)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ:۔

اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا۔ اور منع کرے برائی سے۔ وہی پہنچے اپنی مراد کو۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس سے مراد علماء کی جماعت ہے جس کا امت میں موجود رہنا ضروری ہے تاکہ

آیت کا غلط مفہوم

وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی رہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس مفہوم کی رو سے، اسلام میں اس مذہبی پیشوائیت کے وجود کو سندِ دوام عطا کر دی گئی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ مفہوم قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور بوجوہ غلط۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ اس آیت سے ذرا ہی آگے وہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس آیت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

ساری کی ساری امت کا بتایا گیا ہے نہ کہ اُمت کے کسی خاص گروہ کا۔ اگر آیت (۳/۱۰۳) کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، امت کے ایک گروہ کا فریضہ ہے، پوری کی پوری امّت کا نہیں۔ تو یہ دونوں آیتیں (۳/۱۰۳ اور ۳/۱۰۹) ایک دوسرے سے متضاد ہو جائیں گی، اور قرآنِ کریم کے اس دعویٰ کے خلاف کہ اس میں کہیں تضاد نہیں (۴/۸۲)۔

دوم۔ قرآنِ کریم نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے نہ کہ علماء کے گروہ کا۔ اس کا ارشاد ہے:۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ۔ (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے اور ان کے تمام معاملات قوانینِ خداوندی

کے مطابق طے پائیں گے۔

اس آیت کی تشریح جلد اول صفحہ ۱ زیر آیت (۲/۱۱۰) کی جاچکی ہے جہاں واضح کیا گیا ہے کہ یہ فرائض اپنی آزاد مملکت ہی میں ادا کئے جاسکتے ہیں۔ اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ اور چونکہ یہ حکومت پوری کی پوری امت پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے درحقیقت امت ہی اس فریضہ کو ادا کرتی ہے۔

جب تک دین کا یہ نظام قائم رہا، یہ فریضہ اس نظام (مملکت یا حکومت) کی طرف سے ادا ہوتا رہا جب دین مذہب میں تبدیل ہوگیا اور اسلامی نظام باقی نہ رہا تو بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت میں بٹوارے کی رو سے نمازیں پڑھانے، زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ علماء کے حصے میں آگیا جسے وہ وعظ و نصیحت کے ذریعے سرانجام دینے لگے۔ اس آیت کا یہ مفہوم اُس وقت وضع کیا گیا۔ غور کیجئے کہ جس فریضہ کی ادائیگی کے لئے قرآن، اپنی مملکت کا قیام شرط قرار دے، وہ وعظ ونصیحت کے ذریعے کس طرح ادا ہوسکتا ہے؟ اس میں تو آمر اور نہی کے الفاظ آتے ہیں۔ آمر کے معنی حکم دینے اور نہی کے معنی حکماً روکنے کے ہیں۔ وعظ ونصیحت سے جس طرح لوگ معروف کو اختیار کرتے اور منکر سے باز رہتے ہیں اس کا مشاہدہ ہم ہر روز کرتے ہیں!

سوم۔ اس آیت (۳/۱۰۳) کے آخر میں کہا گیا ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "یہی لوگ کامیاب ہوں گے اور فلاح پائیں گے"۔ اگر آیت کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ایک خاص گروہ (مذہبی پیشوا) ادا کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مفلحون بھی یہی گروہ ہوگا۔ باقی امت نہیں۔ یہ مفہوم قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ جماعتِ مومنین کو مفلحون قرار دیتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۲۳/۱؛ اور اسی قسم کی دیگر بے شمار آیات)۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری امت کا ہے، نہ کہ امت کے کسی خاص گروہ کا۔

آیت (۳/۱۰۳) کا ترجمہ یہ نہیں کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "تم ہی وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے"۔ کیونکہ "معروف ومنکر" کا ضابطہ (قرآنِ مجید) تمہارے ہی سپرد کیا گیا ہے۔ لغوی تفصیل میں اُلجھے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس آیت میں، مِنْ کا حرف تبعیض کے لئے نہیں آیا۔ تبیین کے لئے آیا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تبعیض کا مفہوم لینے سے قرآن مجید میں تضاد لازم آجاتا ہے اور تبیین کے مفہوم کی رو سے، قرآن کے دیگر مقامات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات میں ہمیشہ وہ مفہوم لینا چاہیئے جس سے قرآن میں تضاد

واقع نہ ہو۔ میرا مسلک بہرحال یہی ہے۔

اسلام میں جماعتی زندگی کس طرح اساسی حیثیت رکھتی ہے، اس کے متعلق جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۱-۲۱۶۔ زیر آیت (۲/۱۴۳) وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس جماعت (جماعتِ مومنین) کی اہمیت کو قرآنِ کریم نے باصرار و تکرار

جماعتِ مومنین کی اہمیت

نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ: هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۲)۔ یعنی "خدا وہ ہے جس نے، اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تیری تائید و تقویت کا موجب بنایا۔" آپ دیکھئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تنہا اپنی نصرت کو، حضورؐ کی قوت و تائید کا ذریعہ نہیں قرار دیا۔ اس کے ساتھ جماعتِ مومنین کی رفاقت کو بھی اس کا موجب بتایا ہے۔ ذرا آگے چل کر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۴)۔ یعنی "اے رسولؐ! خدا، اور یہ جماعتِ مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے، تیرے لئے کافی ہے۔" یہاں بھی یہ نہیں کہا کہ اس مشن کی کامیابی کے لئے، رسول کے ساتھ صرف خدا کافی ہے۔ کہا کہ اس مقصد کے لئے خدا اور جماعتِ مومنین کافی ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ اس نظام میں جماعت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے؟ انہی حضرات کو قرآنِ کریم نے "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ" کہہ کر پکارا ہے (۴۸/۲۹)۔ یعنی حضورؐ کے رفقاء۔ انہی کو صحابہ کرامؓ کے لقبِ گرامی سے پکارا جاتا ہے۔ (قرآنِ کریم کی رُو سے صحابہ کبارؓ کا مقام کیا ہے، اس کی بابت متعلقہ مقام پر گفتگو کی جائے گی۔ جو حضرات اسے بلاتوقف دیکھنا چاہیں، وہ میری کتاب — شاہکارِ رسالتؐ— میں پہلا باب (گزرگاہِ خیال): ملاحظہ فرمالیں۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ کعبہ، اس امت کا قبلہ، نصب العینِ حیات ہے (یعنی وہ نقطہ جسے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے)۔ چونکہ اس کعبہ کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اس لئے قرآنِ کریم نے انہیں

اس امت کا موسّس

اس امت کا اوّلین ہیولیٰ (FIRST CRYSTAL) یا تخمِ صالح قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے ایسے معجزانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ فرمایا کہ:-

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا۔ (۱۶/۱۲۰)

ابراہیمؑ دیکھنے میں تو ایک فرد تھا لیکن درحقیقت اس کی ذات میں ایک ایسی امت سموئی ہوئی تھی جو اپنی تمام توانائیوں کو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف کئے ہوئے تھی۔ جس طرح بیج میں پورا درخت سمویا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح (حضرت) ابراہیمؑ کی ذات میں یہ امتِ مسلمہ سموئی ہوئی تھی۔ اس نظام کی ابتداء ابراہیمؑ تھا اور اس کا مقصد: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً

وَّاحِدَةً ..... (۲:۲۱۳)، تمام نوعِ انسان کا ایک امت بن جانا۔ کعبہ اس امتِ واحدہ اور اس عالمگیر برادری کا مرکز و ثقل ہوگا۔

کعبہ (قبلہ) کی اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے آیۂ زیرِ نظر کے باقیماندہ حصہ کی طرف آیئے۔ فرمایا:۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ. وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ. وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ. اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (۲:۱۴۳)

مفہوم اس کا یہ ہے:۔

تعیینِ قبلہ (مرکز) کا سوال بڑا اہم تھا۔ یہ سوال، درحقیقت، قومی مرکز کی جگہ، انسانیت کے عالمگیر مرکز کے اختیار کرنے کا سوال تھا۔ اس لئے جس قبلہ کو (اے رسولؐ!) تو نے اختیار کیا ہے، اُسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا ہے، تاکہ دونوں قسم کی ذہنیتیں الگ الگ ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ کون ہے جو، رسول کے اتباع میں، اپنا رُخ پھیر کر، ہر قسم کی قومی نسبتوں کو چھوڑ کر، خالص انسانیت کی نسبت اختیار کرتا ہے۔ اور وہ کون ہے جو قومی نسبت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

یہ تبدیلی، فی الواقعہ، ان لوگوں پر گراں گزرتی تھی جن کے دل ابھی تک قومیتوں کے تنگ دائرے میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان تنگناؤں سے نکلنا اُسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے ذاتی رجحانات کے بجائے قانونِ خداوندی کو اپنا راہ نما بنالے۔

قومیت کے تنگ دائرے میں رہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ انسانیت کی وسعتوں میں پھیل جانے سے اس کا جتھہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے (۲۹/۲۵)۔ لیکن تم ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود پر تمہارا ایمان کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ خدا کے قانون کے مطابق چلنے سے انسان، تخریبی قوتوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور اسے سامانِ نشو و نما بھی بافراط ملتا ہے۔

تعیینِ قبلہ کا مقصد

اگر قبلہ سے مقصد صرف اتنا ہی ہوتا کہ نماز میں رخ کس طرف کیا جائے، تو یہ کون سی ایسی بات تھی جو لوگوں پر اس قدر گراں گزرتی اور جسے اتباعِ رسول کے ماپنے کا پیمانہ یا معیار قرار دیا جاتا؟ یہ درحقیقت قومیت کی تشکیل کا ایک نیا معیار تھا۔ یہ ایک نیا نظریۂ زندگی (IDEOLOGY) تھا جس سے تمام سابقہ نظریات منسوخ ہو جاتے تھے۔ نوعِ انسانی، نسل، رنگ، زبان، وطن اور مذہبی فرقہ بندیوں

کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں کا ہر گروہ دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار چلا آرہا تھا۔ قرآن کریم نے انسانی تفریق و تقسیم کے ان تمام معیاروں کو ختم کر کے نظریۂ حیات کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کا تصور پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہونی لازمی تھی جن کے مفادات اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ وابستہ تھے۔ اس سے تعیین قبلہ کی حقیقت اور اہمیت سامنے آجاتی ہے۔ یہی تھی اس کی وہ اہمیت جس نے قلب نبویؐ کو وقفِ اضطراب کر رکھا تھا۔ مدینہ میں وہ مملکت قائم ہوگئی تھی جس میں نظامِ خداوندی کو مشہود انداز سے دنیا کے سامنے آنا تھا۔ اس نظام کا مرکز کعبہ تھا، اور وہ قریش کے قبضہ میں تھا۔ اس تصور سے حضورؐ کے قلبِ مطہر کی کیا کیفیت تھی، اسے قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ :۔

۲/۱۴۴ قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰىهَا ۔ (۲/۱۴۴)

"ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ تمہارے دل میں کس طرح بار بار یہ آرزو اُبھر رہی ہے کہ جس مقام (کعبہ) کو اس نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے، اسے ہماری ہی تحویل میں ہونا چاہیئے۔" نظام ہمارا اور اس کا مرکز اس نظام کے دشمنوں کے قبضہ میں، یہ کوئی جچتی ہوئی بات نہیں۔" ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس شدتِ آرزو، اور اضطرابِ قلبی کی وجہ سے، تیری نگاہیں کس طرح بار بار ہماری طرف اٹھتی ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ بارالہا! اس مرکز کو ہماری تولیت میں دلا دے! یہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے اور ایسا ہو کر رہے گا لیکن ہمارے قانونِ مشیت کی رُو سے اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ لیکن کعبہ کو قبلہ قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس نظریۂ حیات کی علامت (SYMBOL) ہے، وہ (نظریہ) ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتے اور اس طرح اس کی اہمیت اور عظمت دلوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو جاتے۔ اس مقصد کے لئے ضروری نہیں کہ کعبہ طبیعی طور پر بھی تمہاری تحویل میں ہو۔ سو، اس دوران میں تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ :۔

فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَیۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ...... (۲/۱۴۴)

تم اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز کر دو۔ یعنی اس نظریہ کی اہمیت جس کی علامت کعبہ ہے اور کعبہ کو غیر خداوندی قوتوں سے آزاد کرانے کی ضرورت پر مرکوز۔ تم اپنی جماعت کے افراد سے کہہ دو کہ تم خواہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اور زندگی کے کسی شعبہ میں مصروفِ تگ و تاز ہو، تمہاری نگاہوں سے یہ مقصد اوجھل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے تمہاری جماعت میں یک نگہی اور ہم آہنگی پختہ سے پختہ تر ہوتی جائے گی اور حصولِ مقصد کی خواہش تیز سے

تیز تر۔ تاآنکہ وہ وقت آجائے جب کعبہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے تمہیں سر بکف میدان میں اتر نا پڑے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں؛ ؎

بانشہ درویشی در ساز و دمادم زن   چوں پختہ شوی خود را، بر سلطنتِ جم زن

تربیتی مرکز مصر میں جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کے پنجہ میں جکڑے ہوتے تھے اور حضرت موسیٰؑ، اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے، ان کی تعلیم و تربیت کر رہے تھے، تو اس وقت اسی قسم کا پروگرام ان کے لئے بھی تجویز کیا گیا تھا جب کہا کہ:۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (۱۰/۸۷)

اس لئے ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی (ہارونؑ) کو حکم دیا کہ سر دست مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے، وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کر دو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ تم اپنی جماعت کے لئے کوئی تربیتی مرکز قائم کرو جہاں ان کے اجتماعات ہوا کریں۔ اس لئے تم فی الحال اپنی جماعت کے افراد کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کر دو۔ انہی کو قبلہ بنا کر نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کر دو۔ اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج و ثمرات کی خوشخبری دیتے رہو (تاکہ ان کے حوصلے بلند اور ہمتیں جوان رہیں)۔

اس سے (ضمناً) یہ بھی واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے طریقِ نبوی کیا ہوتا ہے۔ افراد کی تعلیم و تربیت جس سے وہ نفسیاتی تغیر پیدا ہو جائے جس کے بغیر کوئی خارجی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو قبلہ، اس جماعت کی تربیت گاہ بھی ہوتا ہے۔ نیز اس آیت میں جہاں "اقیموا الصلوٰۃ" آیا ہے، اس سے نظامِ صلوٰۃ کا تصور بھی سامنے آجاتا ہے۔ (وہ تصور جس کی تشریح، جلد اول صفحہ ۱۴-۹۷۔ زیر آیت (۲/۳) کی جا چکی ہے)۔ اس کے بعد کہا کہ:۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۔ (۲/۱۴۴)

۲/۱۴۴

اصل یہ ہے کہ یہ اہلِ کتاب بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہاری یہ دعوت ان کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایک حقیقت ہے (اس لئے کہ خود ان کے ہاں اس کا ذکر موجود ہے)۔ لیکن اس کے باوجود، یہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کئے جا رہے ہیں۔ ہم ان کی ایک ایک

حرکت سے باخبر ہیں.

اس سے ایک ہی آیت بعد کہا گیا ہے کہ یہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔ لہٰذا ان کی مخالفت برنائے جہالت یا ناواقفیت نہیں، تعصب اور عداوت کی بنا پر ہے۔

(۰)

اس سے واضح ہو گیا کہ تعینِ قبلہ کا صحیح مفہوم کیا تھا اور یہودیوں کو اس پر اس قدر شدید اعتراض کیوں تھا کہ مسلمانوں نے، بنی اسرائیل کے قبلہ کی جگہ کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے۔ یہ درحقیقت دین کا اختلاف تھا۔ نظامِ زندگی کا اختلاف تھا۔ نظریۂ حیات کا اختلاف تھا۔ مقصود و منتہیٰ کا اختلاف تھا۔ قبلہ تو محض اس کی محسوس علامت تھا۔ اس لئے فرمایا کہ :-

۲/۱۴۵ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۲/۱۴۵)

یہ ظاہر ہے کہ جہاں ضد اور تعصب کارفرما ہو، وہاں دلیل و برہان کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے، اگر تو ان کے سامنے دنیا جہان کی دلیلیں بھی پیش کر دے، یہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی تم (علم و بصیرت کے خلاف) ان کے قبلہ کی پیروی کر سکتے ہو۔ ان کی تو خود اپنی حالت یہ ہے کہ (تمہاری مخالفت میں تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن) اپنے اپنے قبلے الگ رکھتے ہیں اور ایک مرکز پر جمع ہی نہیں۔

بہرحال، ایک عالمگیر انسانیت کی طرف دعوت دینے والا، ان لوگوں سے مفاہمت کر ہی نہیں سکتا جو قومیتوں کے تنگ دائرے میں مقید ہوں۔ اگر (بفرضِ محال) وحی کی رُو سے حقیقتِ حال کا علم ہو جانے کے بعد بھی، تو ان کی خواہشات کا اتباع کرنے پر آمادہ ہو جائے، تو تیرا شمار انہی میں سے ہو گا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔

تصریحی طور پر، اس مقام پر ذکر یہودیوں اور عیسائیوں کا چلا آ رہا ہے۔ ان کی باہمی دشمنی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یروشلم ان دونوں کا مقدس شہر تھا۔ اسی میں یہودیوں کا قبلہ تھا اور اسی میں عیسائیوں کا۔ لیکن عیسائیوں نے

مخالفت کا متحدہ محاذ

یہودیوں کے قبلہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور وہاں، ان کے ہیکل (معبد) کے کھنڈرات کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ یہ (عیسائی) یہودیوں کو اس شہر میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ باہمی عداوت کا تو یہ عالم۔ لیکن اسلام کی دعوت کی مخالفت میں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی! تاریخ کی یہ حقیقت بڑی تعجب انگیز ہے کہ باطل پرست گروہ، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھی کیوں نہ ہوں، حق کی مخالفت میں سب متحد ہو جاتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں کے مختلف مذہبی فرقوں کو دیکھئے۔ ان میں مسلسل سرپھٹول ہوتی رہتی ہے لیکن قرآنی دعوت کی مخالفت کے لئے سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت کی مزید وضاحت کر دی جس کی طرف اجمالاً آیت (۲/۱۴۴) میں اشارہ کیا گیا تھا کہ:۔

۲/۱۴۶ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۱۴۶)

یہ لوگ ان حقائق سے اچھی طرح باخبر ہیں اور تمہاری دعوت کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح انسان اپنے بیٹوں کو پہچان لیتا ہے۔ (اس لئے کہ تمہاری آمد کی پیش گوئیاں ان کی مبینہ آسمانی کتابوں تک میں موجود ہیں) لیکن ان کے علماء و مشائخ کا گروہ دیدہ دانستہ انہیں چھپاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نبی اکرمؐ کے ظہور کے متعلق یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں پیش گوئیاں موجود تھیں۔ اور وہ (مسخ اور تحریف شدہ حالت ہی میں سہی) موجودہ تورات (عہدنامہ عتیق) اور انجیل (عہدنامہ جدید) میں بھی پائی جاتی ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں، اہلِ کتاب کے دعاوی کی تردید کے لئے ان کی کتابوں سے اسناد و دلائل پیش کرنا ضروری تھا کیونکہ وہ اسی کو فیصلہ کن معیار قرار دیتے تھے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک، عیسائیوں کے ساتھ مناظروں میں یہ انداز بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب اس کی چنداں اہمیت نہیں رہی۔ اب دنیا منقولات (کتابی

استدلالی دور

اسناد) کے بجائے، معقولات (علمی اور عقلی دلائل) کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس لئے اب، دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے استدلالی (RATIONAL) طریق کی ضرورت ہے۔ "دیگر مذاہب کے مقابلہ" میں ہی نہیں؛ (کیونکہ اب نفسِ مذہب کی اہمیت ہی کم ہوتی جارہی ہے)، بلکہ دنیا کے اربابِ علم و بصیرت کو اس کا قائل کرنے کے لئے کہ اقوامِ عالم اس وقت جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں، اس سے نکلنے کے لئے، قرآنی نظام کے سوا کوئی چارۂ کار

ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے سامنے حق و صداقت کو پیش کرنے کا وہ دَور ابھر کر مشہود ہو رہا ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ :-

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ . . . (۴۱/۵۳)

جوں جوں انسانی علم بڑھتا جائیگا اور نئے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے — وہ خارجی کائنات سے متعلق ہوں یا انسان کی داخلی دنیا سے متعلق — وہ سب قرآن کے دعاوی کی زندہ شہادتیں بنتے جائیں گے اور یوں دنیا دیکھ لے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔

میں بھی اثباتِ حق و صداقت کے لئے اس علمی اور فکری طریق کو ترجیح دیتا ہوں اور قرآنی حقائق کو اپنی بصیرت کے مطابق، علمی اور عقلی دلائل کی رُو سے پیش کرتا ہوں۔ یہ وجہ ہے کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ بعثت نبی اکرمؐ کے متعلق جو کچھ کتبِ سابقہ میں آیا ہے اسے یہاں درج کیا جائے۔ دنیا نظامِ محمدی کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اس لئے اسے اب (کتبِ سماوی کی پیش گوئیوں کی رُو سے) ظہورِ محمدیؐ کے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دلائل مانگتے ہیں۔ اُن کتابوں کے حوالے نہیں۔ بہرحال، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ :-

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ - (۲/۱۴۷)

۲/۱۴۷ حقیقت تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تم تک پہنچ چکی ہے۔ تم اس سے متمسک رہو۔ ان کٹ حجتیاں کرنے والوں سے بحث و جدل کی ضرورت نہیں۔

تمہارا فریضہ، حقیقت کو ان تک پہنچا دینا تھا سو اس سے تم سبکدوش ہو گئے۔ اب ان سے بحث وجدل بے کار ہے۔ جو جان بوجھ کر، حقیقت کی مخالفت کرتا جائے، بحث و نظر اُسے کیا فائدہ دے گی ؟

(٠)

مطالب الفرقان، جلد اول میں، صلوٰۃ کے سلسلہ میں بتایا جاچکا ہے کہ غیر مرئی اور غیر محسوس نظریات جب عملی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کے لئے جسمانی حرکات یا محسوس علامات ناگزیر ہوتی ہیں۔ (دیکھئے جلد اول صفحہ ۱۲۲ زیرِ آیت ۲/۳)۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو وہ نظریات نگاہوں سے گم ہو جاتے ہیں اور ان کی محسوس علامات ان کی جگہ مقصود بالذات

مقصد اور محسوس علامات

بن جاتی ہیں۔ یوں مذہب ہیں، دین، بے جان پیکر، بے روح جسد، یا ممی شدہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ گزشتہ آیات میں، کعبہ کی اہمیت کا ذکر مسلسل ہو رہا تھا، اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔ لیکن قرآن کریم نے اس مسلسل داستان کے عین درمیان، ذرا رک کر، اور یوں کہیے کہ موضوع سے ذرا ہٹ کر، اس خطرہ کا ازالہ کر دیا جو محسوس علامات کے مقصود بن جانے سے لاحق ہوتا تھا اور جس کا شکار جملہ اہلِ مذاہب ہو چکے تھے۔ اس نے رک کر کہا کہ کعبہ کی معنوی عظمت بجا اور درست، لیکن دیکھنا ایسا نہ ہو کہ تم اس عمارت کی خصوصیات بیان کر کے، دیگر اہلِ مذاہب کے مذہبی مراکز پر اس کی افضلیت ثابت کرنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۔ (۱۴۸:۲)

۱۴۸/۲ ہر قوم نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی مذہبی مرکز تجویز کر رکھا ہے۔ محسوس طور پر کعبہ کی عمارت کی بھی اتنی ہی حیثیت ہے۔ دیکھنا! تم اسی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ تم ایسے کتنے کام سرانجام دیتے ہو جو نوعِ انسانی کی منفعت کا باعث بطورِ تمہاری ذات میں وسعت پیدا کرنے کا موجب ہوں۔ اسے شرف و افضلیت کا پیمانہ قرار دے کر دیکھو کہ تم دیگر اقوام سے کس قدر آگے ہو۔ نہ اس بنا پر کہ تمہارا کعبہ کس قدر خوشنما، مزین، آراستہ پیراستہ شاندار اور خوبصورت ہے۔

چند آیات آگے جا کر، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ۔ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۔ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا۔ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۔ (۱۷۷:۲)۔

یہ لوگ، دین کے مقصد سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور چند رسوم و مناسک کو اصل دین سمجھ کر ان کی پابندی کو اس کی غایت سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن، تم کہیں اس فریب میں نہ آ جانا۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ قانونِ خداوندی کی رو سے، وسعت و کشاد کی راہ (جس سے انسان معیارِ خداوندی پر پورا اترتا ہے) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف [اگرچہ امت میں وحدت اور یکجہتی پیدا کرنے کیلئے

اس قسم کے محسوس شعائر کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہوتے) مقصود اُس نظام کا قیام ہے جس کے اصولِ اساسی یہ ہیں:۔

اللہ پر ایمان، قانونِ مکافات اور حیاتِ آخروی پر ایمان، ان کائناتی قوتوں پر ایمان جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں واسطہ بنتی ہیں۔ انبیاء کرام پر ایمان جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے اور اُن کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر ایمان۔ (۲/۴)

اِس ایمان (آئیڈیالوجی) کے بعد عملی دنیا میں یہ روش کہ مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینا (۲/۱۹) ـــــ وہ رشتہ دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں لاوارث اور تنہا رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے، یا ان میں کام کاج کی استعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو کسی وجہ سے زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی، ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ اِن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی دولت کو وقف کر دینا۔ مختصر الفاظ میں، نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنا تاکہ تمام ضرورت مندوں کو سامانِ نشو ونما مہیا ہوتا رہے۔ اپنے عہد و پیمان کا احترام کرنا اور قول و قرار کا پکا ہونا۔ لیکن اگر مخالف قوتیں آمادۂ پیکار ہو جائیں تو پھر مصائب و مشکلات کا نہایت ثابت قدمی اور استقامت سے مقابلہ کرنا، اور خوف و ہراس کو پاس نہ پھٹکنے دینا۔

جو لوگ اِس روش پر استقامت سے گامزن رہتے ہیں، وہ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہوتے ہیں اور انہی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے خطرات کی گھاٹیوں سے بچتے ہیں (نہ وہ جو چند رسومات کے مجموعہ کا نام دین رکھ کر، ان کی ادائیگی سے جنت کا وارث بننے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔)

دین میں، ظواہر، محسوس علامات، جہت اور مکان مقصود بالذات نہیں ہوتے لیکن (جیسا کہ اوپر کہا، اور سابقہ صفحات میں آیت ۲/۱۱۵ کے تابع بھی لکھا جا چکا ہے) مذہب میں یہی ظواہر عین مقصد قرار پا جاتے ہیں جب اسلام دین تھا تو اس میں کعبہ کی عمارت اور دیگر ملحقات اور متعلقات کی حیثیت اتنی ہی تھی۔ لیکن اب ہمارے ہاں بھی ظواہر، عینِ دین بن چکے ہیں۔ کعبہ کی (پتھروں اور چونے گچ کی) عمارت کی تقدیس ہمارا جزوِ ایمان بن چکی ہے۔ (عقیدہ یہ بھی ہے کہ حجرِ اسود کو حضرت آدم جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے) اور اس

عمارت کی تزئین و آرائش، اور مناسکِ حج کی میکانکی ادائیگی، مقصودِ شریعت۔ مسابقت فی الخیرات کا تصور جو نظامِ خداوندی ہی میں ممکن تھا، نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ کعبہ کی عمارت تمہاری تحویل میں نہ بھی ہو، تو بھی اس کی غرض و غایت اگر تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے تو اس سے تمہاری ہئیتِ اجتماعیہ قائم رہے گی۔

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۸﴾ (۲/۱۴۸)

تم کہیں بھی ہوگے، اس طرح تم میں حقیقی اجتماعیت پیدا ہو جائے گی کیونکہ حقیقی اجتماعیت کا مدار نکرد نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی پر ہے۔ کعبہ تو اس کی محسوس علامت ہے۔ یہ معیار خدا کا مقرر کردہ ہے — اس نے ہر مقصد کے لئے معیار اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

اس کے بعد قرآن پھر اس نکتہ کی طرف آگیا جس کی توضیح سابقہ آیات میں، کئے چلا آرہا تھا۔ یعنی یہ کہ:-

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ اِنَّہٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾ (۲/۱۴۹)

مرکزِ قلب و نگاہ

کعبہ تمہاری تحویل میں ہو یا نہ ہو، تم اس کی غایت اپنے سامنے رکھو۔ تم دنیا میں کہیں بھی ہو، اپنی تمام توجہات کو اسی مقصد اور غایت پر مرکوز رکھو۔ یہ تمہارے خدا کا مبنی برحقیقت پیغام ہے۔ اس کے مطابق عمل کئے جاؤ۔ اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ برحق کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا۔ اس سے تم میں وہ نفسیاتی تبدیلی واقع ہو جائے گی جو خارجی تبدیلی کی شرطِ اوّلین یا اس تبدیلی کی علت (CAUSE) ہے۔

اس نکتہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بار بار دہرایا گیا اور کہا کہ:-

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ شَطۡرَہٗ ۙ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡکُمۡ حُجَّۃٌ ٭ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ ٭ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَ اخۡشَوۡنِیۡ ٭ وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ (۲/۱۵۰)

تم کہیں بھی ہو، اور وہاں سے کہیں بھی جانے کا ارادہ کرو، اپنے قلب و نگاہ کا مرکز کعبہ ہی کو رکھو۔ اسے ذہنی طور پر اپنا قبلہ بناتے رکھو۔ اے رسول! تم بھی ایسا ہی کرو اور تمہاری جماعت کے افراد بھی ایسا ہی کریں۔ یہ تم سب کا اجتماعی پروگرام ہو۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو تمہاری سعی و عمل کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آ جائیں گے جو تمہارے نظام کی صداقت کا زندہ ثبوت بن جائیں گے اور کسی کو اس سے مجالِ انکار نہیں ہوگی بجز ان کے جو اس کی مخالفت میں ظلم و استبداد پر اتر آئیں۔ لیکن تمہیں ان سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ڈرنا صرف اس سے چاہیئے کہ کہیں قانونِ خداوندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ ہم نے تو یہ ضابطہ قوانین دیا ہی اس لئے ہے کہ انہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں حاصل ہوں اور تمہارا ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اٹھتا جائے۔

۲/۱۵۱ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۱۵۱)

اور اس مقصد کے لئے ہم نے تمہاری طرف اس رسول کو بھیجا ہے کہ یہ ہمارا پیغام تم تک پہنچائے۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ یعنی یہ بتائے کہ خدا کا قانون (کتاب) کیا ہے اور اس کی غرض و غایت (حکمت) کیا۔ یعنی وہ کچھ بتائے جسے تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ اگر تم اس سے واقف ہوتے تو وحی کے بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہاری تربیت اس طرح کرے کہ تمہاری ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ تم اس پروگرام پر عمل پیرا رہو اور پھر دیکھو کہ منزل کس طرح خود کھنچ کر تمہاری طرف نہیں آجاتی۔

المختصر:-

۲/۱۵۲ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲)

تم اس طرح، ہمارے مقرر کردہ نصب العینِ حیات کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اَذْكُرْكُمْ ـــ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔

ذِکر کا وسیع تر مفہوم

لفظ ذکر کا ایک مفہوم سابقہ صفحات میں آیت (۲/۱۱۴) کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے دوسرے معنی ہیں کسی کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ شرف و عظمت عطا کرنا۔ سورۃ مومنون میں ہے کہ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (۲۳/۷۱) ذرا ان عقل کے اندھوں کو دیکھو۔ ہم ان کے ہاں ان کی بڑائی اور عظمت، شرف و مجد، سرفرازی اور سربلندی کا سامان

لے کر آتے ہیں (یعنی وہ ضابطۂ ہدایت جو انہیں یہ سب کچھ عطا کرے گا) اور ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اس عظمت اور سرفرازی سے منہ موڑے ہوئے ہیں اس سے اعراض برت رہے ہیں" (نیز ۴۳/۵)۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (۲۱/۱۰)۔ "ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں، اگر تم ذرا عقل و فکر سے کام لو، تو تمہیں نظر آئے گا کہ خود تمہارا ہی ذکر ہے"۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قرآن، جو کچھ بیان کرتا ہے وہ انسانی زندگی ہی سے متعلق ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس میں خود تمہاری عزت و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ ذرا آگے چل کر، حضور نبی اکرمؐ کی لسانِ مبارک سے کہلوایا: هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (۲۱/۲۴)۔ جو مسلکِ حق و صداقت میری جماعت اختیار کر رہی ہے اور جسے انبیاءؑ سابقہ کے متبعین نے اختیار کیا تھا، اس کے نتیجہ میں جو شرف و مجد انہیں حاصل ہوا وہی انہیں بھی حاصل ہوگا۔ سورۃ زخرف میں ہے: اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (۴۳/۴۴)۔ اس قرآن میں، اے رسولؐ! تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے شرف و عظمت کا سامان مضمر ہے"۔

ذکر کے اس مفہوم کی روشنی میں زیرِ نظر آیت کی طرف آیئے جس میں کہا گیا ہے کہ: فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ (۲/۱۵۲)۔ اس کے معنی صاف ہیں کہ "تم میرے مقرر کردہ پروگرام کو اپنے سامنے رکھو۔ اسے اپنا نصب العین حیات قرار دے لو۔ میں اس کے بدلے (نتیجہ) میں تمہیں شرف اور عظمت عطا کر دوں گا"۔

تقدیر کے متعلق، جلد اول میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۵۴۔ آیت ۱/۱؛ صفحہ ۱۶۳ آیت ۲/۴؛ صفحہ ۱۸۱۔ آیت ۲/۷؛ صفحہ ۲۷۴۔ آیت ۲/۲۶)۔ اس مقام پر صرف اتنا دہرا دینا کافی ہوگا کہ آغازِ کار (INITIATIVE)

آغازِ کار انسان کے ہاتھ میں ہے

انسان کی طرف سے ہوتا ہے، اور خدا کا قانون اس کا اتباع کرتا (اس کے پیچھے پیچھے چلتا) ہے۔ یہاں یہ کہا کہ فَاذْكُرُوْنِیْ ۔ تم میرے مقرر کردہ پروگرام کو اپنے سامنے رکھو ——— اَذْكُرْكُمْ ——— اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں شرف و عظمت عطا کر دوں گا ——— تم یہ کر دو گے تو میں یہ کر دوں گا۔ تقدیر ——— یعنی قانون اور اس کے نتیجے کا ربطِ باہمی ان دو لفظوں میں واضح ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے حقوق (RIGHTS) اور ذمہ داریوں (RESPONSIBILITIES)

حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق باہمی

کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ حقوق، ذمہ داریوں کے پورا کرنے سے ثبت ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا، اس کا کوئی حق ثبت نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس پر کوئی ذمہ داری عائد کی جائے، اسے

اس امر کا یقینِ محکم ہو کہ اگر میں نے اس ذمہ داری کو پورا کر دیا تو میرا یہ حق ثبت ہو جائے گا۔ مجھے یہ کچھ مل کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوگا۔ اس اعتماد اور یقین دہی کے لئے قرآنِ کریم میں بار بار کہا گیا ہے کہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آپ نے دیکھا کہ اس ایک نکتہ سے وہ تمام الجھنیں کس طرح دور ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس وقت دنیا میں اس قدر انتشار اور فساد پھیلا رکھا ہے۔

فَاذْكُرُونِيْ کا عملی پروگرام یہ ہے کہ :-

وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۔ (۲/۱۵۲)

۲/۱۵۲ تمہیں جو ایسی عظیم نعمت دی گئی ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اس ضابطہ کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

شکر کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۶۳ زیر آیت (۲/۵) بتایا جا چکا ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ہم نے کہا ہے کہ اگر تم ہمارے مقرر کردہ پروگرام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لوگے تو ہم تمہیں زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں عطا کر دینگے۔ لیکن اسے یاد رکھو کہ تمہیں ان نعماتِ خداوندی کا شکر ادا کرنا ہوگا یعنی انہیں، خدائی راہنمائی کے مطابق، منفعتِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہوگا۔ دبا کر بیٹھ نہیں جانا ہوگا۔ حج کے سلسلہ میں جو کہا تھا کہ تم اقوامِ عالم کو دعوت دو کہ آکر دیکھیں کہ ہمارا نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے — لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ ۔ (۲۲/۲۸) ۔ تو اسی کا نام "شکر" ہے جس کی ضد "کفر" ہے۔ کفر کے معنی چھپانا اور دبانا ہیں۔

چوتھا باب

رزمگاہِ حیات

آیات ــــ ۲/۱۵۳ تا ۲/۱۷۶

(۱) نظامِ خداوندی کی راہ میں پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ۔
(۲) درود کا مفہوم۔
(۳) شعائر اللہ صفا و مروہ
(۴) قرآن مجید واضح کتاب ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔
(۵) قرآنی حقائق کو چھپانے کی کوششیں۔
(۱) ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔
(۲) وحی خفی اور جلی کا عقیدہ۔
(۳) فقہ۔
(۴) باطنی معانی۔
(۶) لعنت، ہر طرف سے۔
(۷) باز آفرینی کے مواقع۔
(۸) خدا کے ساتھ محبت کا غلط مفہوم۔
وصال اور عرس کی تقریبات۔
حب اللہ کا قرآنی مفہوم۔
(۹) تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔
(۱۰) فحشاء اور سیآت کا مفہوم۔
(۱۱) مسلکِ تقلید کی تباہ کاریاں۔
(۱۲) حرام اور حلال کا نظریہ۔ حرام اشیاء کی فہرست۔
(۱۳) مذہبی پیشوائیت کا کاروبار۔

چوتھا باب

رزمگاہِ حیات

سابقہ باب میں یہ حقیقت سامنے آگئی ہے کہ :-

(۱) اسلامی نظام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کا مرکز محسوس (کعبہ) اس جماعت کی تحویل میں رہے جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے۔

(۲) مخالف قوّتوں کی انتہائی کوشش ہوگی کہ یہ مرکز اس جماعت کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اس لئے ان قوتوں سے تصادم ناگزیر ہوگا۔

(۳) اس تصادم سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری پوری تیاری کی ضرورت ہوگی اور اس تیاری کے سلسلہ میں قدمِ اوّل، اپنے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کرنا ہوگا۔

(۴) نفسیاتی تغیّر کے ضمن میں یہ سمجھ رکھنا ضروری ہے کہ وہ تغیر، خود بخود مقصد حاصل کر کے نہیں دے دیتا۔ اس سے وہ صلاحیتیں بیدار اور وہ توانائیاں متحرک ہو جاتی ہیں جو حصولِ مقصد کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس تصادم کا مقابلہ ان صلاحیتوں اور توانائیوں کے بل بوتے پر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں، اس نفسیاتی تغیّر کا نام ایمان ہے تو حصولِ مقصد کے لئے ان صلاحیتوں کی نمود اور اس توانائی کا شہود اعمالِ صالحہ کہلائے گا۔

آئندہ آیات میں اس تصادم اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس اصول کو نمایاں کیا گیا ہے کہ :-

۲/۱۵۳ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۲/۱۵۳)

اس نظام کی اقامت کی راہ میں (جو محدود گروہوں اور قوموں کے مفاد کے خلاف عالمگیر انسانیت کے مفاد کا علمبردار ہے) بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں گی اور سخت مشکلات کا سامنا ہوگا (مفاد پرست گروہ اسے آسانی سے قائم نہیں ہونے دیں گے)۔ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتوں کو یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ، کچھ بھی ہو۔ استقامت اور ثبات کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو اور دوسرے یہ کہ مخالفین خواہ کوئی راہ اختیار کریں، تم اُسی راستے پر چلو جو تمہارے خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے ـــــ اس سے تمہیں، قانونِ خداوندی کی رُو سے، بڑی تقویت حاصل ہوگی۔ جماعتِ مومنین سے کہا یہ گیا ہے کہ ان مشکلات پر قابو پانے اور ان تصادمات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ خطرات کتنے ہی حوصلہ شکن اور مشکلات کیسی ہی ہوش رُبا کیوں نہ ہوں، استقامت اور ثبات کا دامن تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ تمہارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے اور دوسرے یہ کہ مخالفین خواہ کوئی راہ اختیار کریں، تم اسی راستے پر چلتے جانا جسے تمہارے خدا نے تمہارے لئے متعین کیا ہے کوئی غلط راہ اختیار نہ کرنا۔ اس سے تمہیں بھرپور توانائیاں حاصل ہو جائیں گی۔

استعانت بالصّبر والصّلوٰۃ

اس آیت میں تین الفاظ آئے ہیں۔ استعانت۔ صبر اور صلوٰۃ۔ استعانت کا مفہوم، جلد اول صفحہ ۳۷، زیرِ آیت (۱/۴) بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانینِ خداوندی کے اتباع سے انسانی صلاحیتوں اور توانائیوں کا نشوونما پانا اور ان میں کامل اعتدال اور توازن پیدا ہو جانا۔

صبر کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۲۲، زیرِ آیت (۲/۴۵) سامنے آچکا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں خطرات کے مقابلہ میں اس طرح جم کر کھڑے ہو جانا کہ پائے استقامت میں ذرا سی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنی ذات کو ایسا متوازن بنا لینا کہ حوادثِ زمانہ کے ہچکولے اسے ذرا بھی ڈانواں ڈول نہ کر سکیں اور صلوٰۃ کی پوری تشریح جلد اول صفحہ ۹۸، زیرِ آیت (۲/۳) سامنے آچکی ہے۔ اصولی طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کا مسلسل اتباع کئے جانا۔ کسی کے ساتھ بالالتزام وابستہ اور پیوستہ رہنا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے الفاظ آیت (۲/۴۵) میں بھی آچکے ہیں۔ (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۲) وہاں ان (الفاظ) کے بعد کہا گیا تھا کہ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔ (۲/۴۵)۔ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے اعانت طلبی بڑا ہمت آزما مرحلہ اور بڑی کٹھن منزل ہے اس لئے عام لوگوں پر یہ مہم بڑی گراں گزرتی ہے۔

اسے وہی لوگ سر کر سکتے ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور جو ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کے احساس سے خائف رہتے ہیں۔ یہاں پھر ان الفاظ (صبر اور صلوٰۃ) کو دہرایا گیا اور ان کے بعد کہا گیا کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (۱۵۳/۲)۔ خدا کی رفاقت، اس کے قوانین کی رُو سے حاصل ہونے والی تائید و تقویت صرف انہی کو ملتی ہے جو خطرات کا مقابلہ استقامت اور استقلال سے کریں۔ اس اصولی وضاحت کے بعد کہا کہ یہ خطرات بڑے لرزہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے مصائب جھیلنے اور ہر طرح کے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں بعض اوقات جان تک کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا — لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ :۔

۱۵۴/۲ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ (۱۵۴/۲)

یاد رکھو! دنیا میں نظامِ خداوندی کو متشکل کرنا پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی راہ ہوتی ہے۔ اس میں، اور تو اور، جان تک بھی دے دینی پڑتی ہے۔ لیکن جو اس جدوجہد میں جان دیتا ہے، وہ مرتا نہیں — اُسے مردہ سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (۱۶۸/۳)۔ وہ حیاتِ جاوداں سے بہریاب ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح تم اس طبیعی زندگی کا ادراک، حواس کے ذریعے کر سکتے ہو — یعنی تم دیکھ سکتے ہو کہ فلاں شخص زندہ ہے یا نہیں — اُس زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ وہ محسوسات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے۔ (البتہ اس کے امکان کو سمجھ سکتے ہو)۔

جو ان خطرات کا سامنا اور ان تصادمات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں، وہ مرتے نہیں۔ انہیں مردہ

مقتولین فی سبیل اللہ

سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (۱۶۸/۳)۔ وہ حیاتِ جاوداں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح تم انسان کی طبیعی زندگی اور موت کا ادراک حواس کے ذریعے کر سکتے ہو — یعنی تم دیکھ سکتے ہو کہ فلاں شخص زندہ ہے یا مردہ — راہِ حق میں جان دینے والوں کی زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ ان کی وہ زندگی محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے۔ تم عقل کی رُو سے اس کے امکان کو تو سمجھ سکتے ہو، اس کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ یعنی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ زندگی کس قسم کی ہے۔ "شعور" کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۰ زیر آیت (۹/۲) بتایا جا چکا ہے کہ اس سے بالعموم مراد، ادراک بالحواس ہوتا ہے۔ یعنی (SENSE-PERCEPTION) — اس ذریعۂ علم سے تم ان کی اُخروی زندگی کی کنہ و حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو ہمارے ہاں شہید (جمع شہداء) کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ان کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔ اس میں ان کے لئے "مقتولین فی سبیل اللہ" کی اصطلاح آئی ہے جس کی تشریح جلد اول صفحہ ۲۵۵ آیت (۲/۱۵۴) پر کی جا چکی ہے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں مُردہ مت کہو۔ آیت (۳/۱۶۹) میں ہے کہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا۔ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (۳/۱۶۸) "ان لوگوں کے متعلق گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مر گئے۔ وہ خدا کے ہاں زندہ ہیں اور وہاں انہیں رزق بھی عطا ہوتا ہے۔" مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات کے متعلق اپنے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ اُس دُنیا میں زندہ ہوتے ہیں جسے آخرت کہہ کر پکارا گیا ہے اور جسے یہاں عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (اپنے خدا کے ہاں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اُن کی اُس زندگی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ۔ وَ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ (۲/۱۵۵)۔ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے متعلق بحثیں اور

شہداء کے متعلق افسانے

مناظرے ہوتے رہتے ہیں اور دعوے کئے جاتے ہیں کہ ہم نے انہیں یہاں دیکھا اور وہاں دیکھا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ (مابین پاکستان اور بھارت) کے زمانے میں تو ان سبز عماموں اور سفید گھوڑیوں والوں "کے شریک جہاد ہونے" اور انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے افسانے عام زبان زدِ خلائق تھے لیکن یہ سب "افسانے" تھے جن کے خلاف میں نے اُسی زمانے میں لکھا تھا۔ (ضمناً) اُس جنگ میں چونکہ ہماری فتح ہوئی تھی اس لئے اس میں تو انہیں شریک ہوتے اور "راوی کے پُل پر بم پھینکتے" سب نے دیکھا لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمیں شکست ہوئی تو یہ کسی کو نظر نہ آئے!! بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کی زندگی کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجود سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ نہ ہی ان کا کوئی تعلق ہماری دُنیا سے ہوتا ہے۔ وہ "عِنْدَ رَبِّهِمْ۔" (اپنے رب کے ہاں) زندہ ہوتے اور سامانِ نشوونما (رزق) پاتے ہیں۔ اگلی آیت میں کہا کہ :-

۲/۱۵۵ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ (۲/۱۵۵)

ان تصادمات میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا۔ کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہوگی کہیں مال و

ابتلاء کا مفہوم

جان کا نقصان ہوگا۔ کہیں باغ اور کھیت اجڑیں گے۔ یہ تمام خطرات اور نقصانات درحقیقت تمہارے لئے یہ دیکھنے کے مواقع بہم پہنچائیں گے کہ تمہاری ذات کی کس قدر نشوونما ہو چکی

ہے اور تم میں مقابلہ کی کس قدر صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ جو لوگ ان دشوار گذار مراحل میں ثابت قدم رہیں گے ان کے لئے کامیابی اور کامرانی کی خوشخبریاں ہوں گی۔

(ابتلاء کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۲۴۱ زیرِ آیت (۲/۱۲۴) اور زیرِ نظر جلد میں زیرِ آیت (۲/۱۵۵) پیش کیا جا چکا ہے۔)

۲/۱۵۶ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ (۲/۱۵۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ہجومِ مصائب اور انبوہِ نوائب میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصدِ زندگی، نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے (۶/۱۶۲) کیا مال اور کیا جان، ہم نے اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہوا ہے (۹/۱۱۱)۔ یہ ہمارا اپنا ہے ہی نہیں۔ اس لئے اسے اس کے اصلی مالک (خدا) کے حوالے کر دینے میں ہمیں تامل کیا ہو سکتا ہے؟ مشکلات آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اُٹھے گا (۹/۵۹)۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ مصیبتوں سے ڈر کر کسی اور طرف رُخ نہیں کریں گے۔

"اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کا صحیح مفہوم بڑا اہم اور گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس کی تفصیلی تشریح جلد اول میں کی جا چکی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۴۴۔ آیت (۱/۵)، صفحہ ۲۶۳۔ آیت (۲/۱۸)۔ بالخصوص صفحہ ۳۲۵۔ آیت (۲/۲۸)۔ جہاں مذکورہ بالا مفہوم کی وضاحت ملے گی۔

اس کے بعد ہے:۔

۲/۱۵۷ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۔ (۲/۱۵۷)

یہی وہ جماعت ہے جو اپنے رب کے نزدیک مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ انہی کے لئے سامانِ نشو و نما کی فراوانیاں اور سحابِ کرم کی گہر باریاں ہیں اور ان کا منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (نیز دیکھئے جلد اول صفحہ ۲۵۵۔ آیت (۲/۱۱)

آیت کا مطلب واضح ہے لیکن اس میں "صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ۔" سے نگاہ کا رُخ ایک اور گوشے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو بڑا اہم ہے اور خصوصی غور و فکر کا مستحق۔

سورۃ احزاب کی حسب ذیل آیت آپ نے ہزاروں مرتبہ سنی ہوگی۔ اسے وعظ کی ہر مجلس میں، میلاد کی ہر محفل میں، نعت خوانی کے ہر اجتماع میں دہرایا جاتا اور انتہائی خلوص اور عقیدت سے پڑھا اور سنایا جاتا ہے یعنی:۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ (۳۳/۵۶)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:۔

تحقیق اللہ اور فرشتے اس کے، درود بھیجتے ہیں اوپر نبی کے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، درود بھیجو اوپر اس کے اور سلام بھیجو سلام بھیجنا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

آیت کے الفاظ ہیں "یُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ" سوال یہ ہے کہ اس کا ترجمہ "درود بھیجنا" کیسے کیا گیا۔ درود کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ لفظ نماز کی طرح یہ بھی قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا ہے۔ ایران کے مجوس

درود کا مفہوم

(جنھیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریق پرستش کو نماز کہتے تھے اور دعا پڑھنے کو درود۔ وہیں سے یہ دونوں لفظ ہمارے ہاں آگئے اور ان کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ قرآن کریم کی دونوں اصطلاحات، صلوٰۃ اور صلوات نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں ـــ ایسی اوجھل کہ اب ان کا تصور تک ذہن میں نہیں آتا۔ (نماز کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۱۲۲ آیت (۲/۳) میں گفتگو ہو چکی ہے) نتیجہ یہ کہ وہ انقلابی پروگرام جو ان اصطلاحات میں مضمر تھا، گم ہوگیا۔ صلوٰۃ کا مفہوم، خاص طریق پرستش میں محدود ہوگیا اور صلوات اللہ علیھم۔ کا مقصود، درود پڑھنے میں تبدیل ہوگیا۔ بیسیوں قسم کے درود تصنیف ہوئے اور ہر درود کے وظیفے کے مختلف طریق وجود میں آگئے ـــ کچھ جلی، کچھ خفی ـــ کچھ کتابوں میں، کچھ سینہ بسینہ۔ کچھ روایات کے ذریعے، کچھ علم لدنی (باطنی علم) کی رُو سے۔ درود شریف کی فضیلت میں کتابوں پر کتابیں لکھی گئیں چنانچہ اب کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ درود شریف اور اس کی برکات ایسا مسلّمہ بن چکے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس کے حقیقی (قرآنی) مفہوم کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرے تو دُہائی مچا دی جاتی ہے کہ اس کے ایمان میں خلل واقع ہوگیا ہے۔ اسے ان شیطانی وساوس سے فوراً توبہ کرنی چاہیئے ـــ آپ نے غور فرمایا کہ یہ مقام کس قدر نازک اور یہ مرحلہ کیسا دشوار گزار ہے۔ لیکن قرآن کریم کے طالب العلم ہونے اور اس کے مفہوم کو واضح طور پر بیان کرنے کی وجہ سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان تمام مقامات کا مفہوم قرآن کی روشنی میں سامنے لاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ قرآن سے بددیانتی کے مرادف ہوگا جو بارگاہِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے محفوظ رکھے۔

میں شروع سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ قرآن کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ اپنی اپنی استعداد

اور بصیرت کے مطابق، اور چند شرائط کے تحت، اس کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ صورت عام قرآنی مفردات (الفاظ) کی ہے تو اس کی اصطلاحات کا معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم اور مشکل ہے۔ قرآنی اصطلاحات بڑی جامع اور خاص تصورات کی حامل ہیں اس لئے ان کی جگہ کوئی اور اصطلاح استعمال نہیں کی جا سکتی۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہم قرآن سے دُور ہٹ جائیں گے۔ مثلاً ہم نے قرآنی اصطلاح صلوٰۃ کی جگہ نماز کی اصطلاح وضع اور اختیار کی تو ارباب

قرآنی اصطلاحات

فکر و بصیرت جانتے ہیں کہ) ہم قرآنی تصورِ صلوٰۃ سے کس قدر دور چلے گئے۔ یہ وجہ ہے جو میں تاکیداً کہا کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنی اصطلاحات کی جگہ دوسری اصطلاحات کبھی اختیار نہیں کرنی چاہئیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، نماز اور درود (وغیرہ) قدیم پہلوی زبان کے الفاظ ہیں جو مجوسیوں کے مذہب میں عام مستعمل تھے۔ ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی (عربی زبان کی) اصطلاحات کی جگہ یہ اصطلاحات اُس وقت رائج ہوئیں جب اسلام، ایران میں پہنچا۔ اس امر کی تحقیق کرنا اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) مرتب کرنے والے کی ذمہ داری ہوگی کہ قرآنی اصطلاحات کی جگہ یہ مجوسی اصطلاحات کن عوامل و عناصر کے ذریعے اسلام میں در آئیں، انہیں رائج کرنے کے لئے کیا کیا کوششیں کی گئیں اور اس سے مقصد کیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب۔ شاہکارِ رسالت ۔۔۔ کے آخری باب میں مختصراً اس پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ موضوع اس سے زیادہ تفصیلی تحقیق کا متقاضی ہے۔ اس قسم کی (اسلام کی) تاریخ مرتب کرنے کا خیال ایک عرصہ سے میرے ذہن میں ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ جو پروگرام اس وقت میرے زیرِ نظر و ترتیب ہے، وہ مجھے اس کی فرصت دے گا یا نہیں۔ اس ضمن میں، میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ :-

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

میں نے یہ الفاظ اس لئے صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی صاحبِ ہمت، الدّین کے صحیح تصور کو امت کے سامنے لانے کا ارادہ کرے، تو اسے معلوم ہو کہ اس تحقیق میں اسے قدمِ اوّل کس سمت کو اٹھانا ہوگا۔

(٠)

اس تمہید کے بعد آیئے آیت اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ ...... (۳۳/۵۶) کے قرآنی مفہوم کی طرف۔ اس آیت کو تو آپ نے (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے) ہر منبر و محراب اور ہر مذہبی محفل و مجلس سے ہزاروں مرتبہ سُنا ہوگا۔ لیکن اس آیت سے چند ہی آیات پہلے، ایک اور آیت ہے جسے آپ نے بہت کم سُنا ہوگا۔

وہ آیت یہ ہے:۔

هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۔ (۳۳/۴۳)

اس کا ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ یوں کرتے ہیں۔

(اے جماعت مومنین۔ اللہ) وہ ہے جو رحمت بھیجتا ہے اوپر تمہارے اور فرشتے اس کے تو کہ نکالے تم کو اندھیروں سے طرف روشنی کے۔ اور ہے ساتھ ایمان والوں کے مہربان۔

آپ سردست، اس آیت کے صرف پہلے حصے کو لیجئے۔ یعنی هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ۔ کو۔ آیت (۳۳/۵۶) میں کہا گیا تھا کہ "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ ....." اور آیت (۳۳/۴۳) میں ہے هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ۔ یعنی اللہ اور اس کے ملائکہ جو عمل نبی کے ساتھ کرتے ہیں، وہی عمل وہ جماعتِ مومنین کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں تو وہ اسی طرح مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ (الفاظ دونوں آیتوں میں ایک ہی ہیں)۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کریم کی ان دو آیتوں میں جو ایک ہی سورۃ میں، تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہوئی ہیں) اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے جو بات نبیؐ کے لئے کہی گئی ہے وہی بات مومنین کے لئے بھی کہی گئی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں، نبی اکرمؐ پر درود بھیجنے کا ذکر تو اس کثرت سے ہوتا ہے لیکن مومنین پر درود بھیجنے کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا۔ ہم پہلے آیت ــــ هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ (۳۳/۴۳) کو لیتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مفہوم واضح ہو جانے سے آیت (۳۳/۵۶) کا مفہوم خود بخود سامنے آجائے گا۔

مفرداتِ امام راغب میں صَلّٰى عَلَيْهِ کے معنی لکھے ہیں، تعظیم کرنا، دعا دینا، حوصلہ افزائی کرنا۔

صلّٰی علیہ کے معنی

پروان چڑھانا، نشوونما کرنا۔ کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا (لغات القرآن ص ۱۰۴۵)

آیاتِ قرآنی میں جہاں "صَلّٰى عَلٰى" آئے گا، وہاں دیکھا جائے گا کہ ان معانی میں سے کون سا معنی زیادہ موزوں ہے۔ آیت (۳۳/۴۳) میں کہا گیا ہے کہ: هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ...... اللہ اور اس کے ملائکہ، مومنین کے ساتھ "صلّٰی علیٰ" کا عمل کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا اور ملائکہ کی طرف سے "صلّٰی علیٰ" کا عمل ایسا ہے جس سے جماعتِ مومنین تاریکیوں سے روشنی کی طرف آجاتی ہے۔

ظلمات (تاریکیوں) سے نور کی طرف آنے کا مطلب کیا ہے۔ اسے سورۃ ابراہیم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔۔۔۔ (۱۴/۵) "ہم نے موسیٰؑ کو اپنا ضابطہ قوانین دے کر اس مقصد کے لئے (مصر واپس) بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال لائے" قوم بنی اسرائیل مصر میں فرعونی محکومیت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ان کی اس حالت کو قرآن کریم نے ظلمات کہہ کر پکارا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو وہاں بھیجا گیا کہ وہ اس مظلوم و مقہور قوم کو فرعون کی غلامی کے شکنجے سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط کی طرف لے آئے۔ اسی سورۃ میں چار آیتیں پہلے کہا گیا ہے کہ: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (۱۴/۱) "اے رسول! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ اس کے ذریعے تو نوع انسان کو ظلمات سے نور کی طرف لے آئے" سورۃ بقرہ میں ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔۔۔ (۲/۲۵۷) "اس جماعت (مومنین) کو اللہ کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہے جو انہیں ظلمات سے نور کی طرف لے جائیگی"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (۳۳/۴۳)۔ اللہ اور اس کے ملائکہ کا ایسا عمل ہے جس سے یہ جماعت ہر نوع غلامی سے رستگاری حاصل کر کے، صحیح آزادی اور حریت کی فضا میں بال کشا ہو جائے گی۔ ایسا نظام قائم کرلے گی جس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہو نہ محکوم۔ اس نظام کا قیام خود منشاء خداوندی ہے لیکن یہ قائم ہوتا ہے ایک جماعت کے ہاتھوں۔ جو جماعت اس مقصد کو لے کر اٹھتی ہے اسے خدا کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔ "اے جماعتِ مومنین! اگر تم خدا کی مدد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوگے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور وہ مدد کیا ہوگی ــــ وہ تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا۔ تمہارے پاؤں میں لغزش نہیں آنے دے گا"۔ کہا کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰/۴۷)۔ "جماعتِ مومنین کی مدد کرنا، ہم پر واجب ہو جاتا ہے"۔ خدا کی یہ مدد، جس سے اس جماعت کو ثبات و استقامت حاصل ہو جاتی ہے، ملائکہ کی وساطت سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جنگِ بدر جیسے زلزلہ انگیز معرکہ کے سلسلہ میں، کہا کہ خدا نے ملائکہ کو حکم دیا کہ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔۔۔۔ (۸/۱۲)۔ جماعتِ مومنین (مجاہدین) کو ثبات و استقامت عطا کر دو۔ اسی کو نصرتِ خداوندی کہا گیا ہے۔ (۲۶ ــــ ۹/۲۵ ؛ ۱۲۴ ــــ ۳/۱۲۲)۔ (ملائکہ کے متعلق جلد دوم، باب اول صفحہ ۶۶ پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے)۔

تصریحاتِ بالا کی روشنی میں آیت (۳۳/۴۱) کا مفہوم واضح ہوگیا۔ اس میں سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا۔ (۳۳/۴۱)۔ اے جماعتِ مومنین! تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اس ضابطۂ قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے بھی رکھو اور دنیا میں اس کا زیادہ سے زیادہ چرچا بھی کرو۔ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۔ (۳۳/۴۲)۔ اور اس کی عملی تنفیذ کے لئے دن رات سرگرمِ عمل رہو۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ (۳۳/۴۳)۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت تمھیں حاصل رہے گی۔ تمھاری سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی۔ تمھارے نظام میں کسی قسم کا خلل اور فساد واقع نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم زندگی کی ہر قسم کی تاریکیوں سے نکل کر جگمگاتی روشنی میں آجاؤ گے اور تمھاری صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جائیں گی۔

یہاں سے ہم آیت (۳۳/۵۶) کی طرف آجاتے ہیں جس میں کہا کہ: اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ۔ اس نبی کو خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہے جیسا کہ فرمایا۔ وَّیَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا۔ (۴۸/۳)۔ اے رسول! اللہ تمھیں ایسی نصرت عطا کرے گا جس سے تمھیں غلبہ اور تمکن حاصل ہو جائے۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا..... (۴۰/۵۱)۔ ہم اپنے رسولوں اور جماعتِ مومنین کی اسی دنیاوی زندگی میں مدد کیا کرتے ہیں۔

آیت کے پہلے حصہ میں کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ۔ اس نبی کو اللہ اور اس کے ملائکہ کی نصرت حاصل ہوگی۔ لیکن دوسری جگہ رسول اللہ سے کہہ دیا کہ: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۴)۔ اے رسول! تمہارے لئے صرف اللہ کی مدد کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس جماعت کی مدد بھی ضروری ہے جو تمھارا اتباع کرتی ہے۔ یعنی رسول اللہ کے مشن کے کامیاب ہونے کے لئے اللہ، اس کے ملائکہ اور جماعتِ مومنین کی تائید و نصرت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کہا کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ۔ (۳۳/۵۶) اے جماعتِ مومنین! خدا کے اس پروگرام کو پروان چڑھانے کے لئے تم بھی اس رسول کی مدد کرو۔ دوسری جگہ ہے۔ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ..... (۴۸/۹)۔ اس کی مدد کرو۔ اس کی عظمت کو قائم رکھو۔

مومنین رسول اللہ کی مدد کیسے کریں گے؟ فرمایا۔ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۳۳/۵۶) تم اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ تم اس کی اطاعت کرو جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ عَزَّرُوْهُ

وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (۷/۱۵۷) "تم اسے تقویت پہنچاؤ۔ اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ تم اس کتابِ روشن کا اتباع کرو جسے اس کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس طرح تمہارا مشن کامیاب ہو جائے گا۔"

اب پوری آیت کو سامنے لائیے :۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۳۳/۵۶)

یہ حقیقت ہے کہ خدا اور اس کے ملائکہ اس نبی (کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے اس) کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کی مدد کرتے ہیں۔ اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔

یہ ہے وہ آیت جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ :۔

اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر۔ اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو۔

اور درود اور سلام بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ ...... الخ کے الفاظ دہراتے رہو۔ دن رات اس میں مشغول رہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ کا ترجمہ "درود بھیجنا" کر کے، کس طرح ایک عظیم علمی انقلاب آفریں پروگرام کو چند الفاظ دہراتے رہنے میں تبدیل کر دیا؟ ـــــ تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات ـــــ وہ قوم جس نے دنیا کے ہر باطل نظام کی بساط الٹ کر، ان کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا تھا، کس طرح چند الفاظ کو دہرا کر نجات حاصل کرنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا کر بیٹھ گئی!۔

اس تبدیلی کے لئے کچھ زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ "تلاوتِ قرآن مجید" کا ترجمہ کر دیا "قرآن پڑھا کرو"۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ کا ترجمہ کر دیا "نماز پڑھا کرو"۔ اور صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ کا ترجمہ کر دیا "رسول پر درود و سلام بھیجا کرو۔ یعنی چند الفاظ پڑھا کرو۔ یوں یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ "کیا کرو" کو "پڑھا کرو" میں تبدیل کر دیا۔ وہی آیت جو شعلۂ جوالہ تھی، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے ـــ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

جہاں تک محض پڑھنے، یعنی الفاظ دہراتے رہنے کا تعلق ہے، اس کا سلسلہ بہت پیچھے جاتا ہے۔ علم الانسان کے

کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کا پہلا دور، عہدِ پرستش (AGE OF WORSHIP) تھا۔ اس سے اگلا دور، عہدِ سحر (AGE OF MAGIC)۔ اس دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بعض الفاظ میں (ان کے معانی میں نہیں بلکہ ان الفاظ میں) خاص تاثیر ہوتی ہے۔ اگر ان الفاظ کو خاص طریقہ سے دہرایا جائے تو وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے دورِ جہالت کے ان باطل تصورات کو ختم کر دیا لیکن ہم (قرآن کو چھوڑنے کے بعد) پھر اُس عہدِ سحر کی طرف لوٹ گئے۔ قرآنی آیات کے ورد وظیفے اور ان کے الفاظ کو دہراتے رہنے کا مسلک، سب اُسی دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں، جلد دوم، صفحہ ۱۴۱۔ آیت (۲/۱۰۲) دیکھئے۔ "درود پڑھنا" بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہ کچھ کرنے کا کام تھا۔ محض پڑھنے کا نہیں۔

(۰)

ہم نے دیکھا ہے کہ "صَلّٰی عَلٰی" کے معنی حوصلہ افزائی کرنا اور دعا دینا بھی ہیں۔ سورۃ التوبہ میں ہے کہ ان اعراب میں ایسے لوگ ہیں جو اس نظام کے قیام کے لئے 'بطیبِ خاطر' مالی امداد دیتے ہیں۔ ان کا اس سے مقصد ہوتا ہے قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ۔ (۹/۹۹)۔ خدا کے ہاں بلند درجات اور رسول کی طرف سے حوصلہ افزائی۔ یہ کس طرح سے ہوتی ہے، اس کے لئے رسول اللہ سے کہا کہ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ۔ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ۔ (۹/۱۰۳) تم ان کے عطیات قبول کر لیا کرو، مناسب تعلیم و ترتیب سے ان کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرو۔ اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین و ستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کیا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری تحسین (شاباش۔ یعنی شاد باش) ان کے لئے بڑی تسکینِ خاطر کا موجب ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد آیئے آیۂ زیرِ نظر کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ۔ (۲/۱۵۷) یہ وہ سرفروش ہیں، جن پر خود خدا تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتا اور ان کی ذات کی مزید نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

(۰)

کعبہ سے متعلق آیات کے درمیان، محافظینِ کعبہ (نظامِ اسلامی کے خدام) کی صفات بیان کرنے کے بعد، پھر ایک آیت حج کے ضمن میں سامنے لائی گئی۔ کہا۔

۲/۱۵۸ اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَيۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۱۵۸)

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے :-

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں ۔ سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کا، تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ۔ ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدردان ہے سب کچھ جاننے والا ۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

اس آیت میں حج ، عمرہ ، صفا ، مروہ ، جناح کے الفاظ محتاجِ تشریح ہیں ۔ حج کے متعلق، کعبہ کے سلسلہ میں سابقہ صفحات (دوسرا باب ۔ صفحہ ۵۶) میں ضمناً بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ اسلامی نظام میں امت کی "سالانہ کانفرنس" ہے ۔ (اس کی تفصیل حج سے متعلق آیات کے ضمن میں متعلقہ مقام پر پیش کی جائے گی ۔)

حج کا مفہوم

لفظ الحج کا مادہ (ح ۔ ج ۔ ج) ہے جس کے بنیادی معانی (۱) ارادہ کرنا ۔ (۲) روکنا ۔ (۳) جھگڑا کرنا ۔ اور (۴) دلائل پیش کرنا ہیں ۔ آخری معانی نے اعتبار سے قرآنی دلائل کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَة "حقیقت رس دلیل" (۶/۱۵۰) کہا گیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان معانی کی رو سے، حج، امت کے اس اجتماع کو کہا جائے گا جہاں نظامِ خداوندی سے متعلق جملہ اہم معاملات کا فیصلہ دلائل وحجت کی رو سے کیا جائے ۔ مشاورتی نظام میں اس قسم کے اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں ۔ میری بصیرت کے مطابق، اس نظام نے ایک عالمگیر سالانہ اجتماع ضروری قرار دیا تھا، اور سال بھر میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات عندالضرورت اس پر مستزاد ۔

عمرہ

ان اجتماعات کو عمرہ کہا جاتا ہے ۔ عمرہ (مادہ ع ۔ م ۔ ر) کے بنیادی معانی آباد کرنا ۔ باقی رکھنا، خرابی سے محفوظ رکھنا ہیں ۔ ان معانی سے عمرہ کے اجتماعات کا مقصد خود بخود واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی ان اجتماعات میں اس بات پر غور وفکر کیا جائے گا کہ یہ نظام کس طرح ہر قسم کی خرابی اور کمزوری سے محفوظ رہ کر مستحکم تر ہوتا جائے ۔

جناح کا مفہوم

لفظ جُناح کے متعدد معانی ہیں جن کی تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی ۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان میں گناہ بن گیا، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ لفظ گناہ، عربی میں آکر جُناح بن گیا ۔ حقیقت کچھ بھی ہو، ہمارے ہاں اس کے معنی گناہ کئے جاتے ہیں ۔ ہمارے موجودہ مذہب (اسلام) میں گناہ کا لفظ بھی، اس کی ضد ثواب کی طرح، ایسا مبہم سا ہے جس کا کوئی متعین

مفہوم سامنے نہیں آتا۔ دراصل یہ لفظ (جناح) ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، چنداں مضائقہ نہیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے آپ دیکھیں گے کہ وہاں اس کا یہی مفہوم موزوں ہے۔

صفا اور مروہ

صفا اور مروہ مکہ سے ملحق دو پہاڑیاں ہیں۔ حج کے سلسلہ میں ان پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگانا (جسے سعی بین الصفا والمروہ کہا جاتا ہے) حج کے ارکان میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی ایسا کرنا ضروری ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تورات کے بیان کردہ قصہ کی رُو سے (جس کا اتباع ہماری کتب روایات میں بھی کیا گیا ہے) جب اس مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا جسے حضرت ابراہیمؑ، اپنی بیوی (حضرت ہاجرہؓ) اور شیرخوار بچے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو لق و دق صحرا میں چھوڑ کر چلے گئے تھے، تو مامتا کی ماری ماں (حضرت ہاجرہؓ) پانی کی تلاش میں ان وادیوں میں سرگرداں پھرتی تھیں۔ کبھی ایک پہاڑی پر چڑھتیں، کبھی دوسری پر۔ سعی بین الصفا والمروۃ کو سنتِ حضرت ہاجرہ کے اتباع میں' ارکانِ حج میں واجب سمجھا جاتا ہے۔

لیکن زیرِ نظر آیت میں تو یہ نہیں کہا گیا کہ ان پہاڑیوں (کی وادیوں) میں طواف کرنا لازمی ہے۔ اس میں تو کہا یہ گیا ہے کہ ان میں طواف (گھومنے پھرنے) میں کوئی حرج نہیں (یا گناہ) کی بات نہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عرب جاہلیہ میں عام عقیدہ یہ تھا کہ یہ ایسے مقدس مقامات ہیں جن میں گھومنا پھرنا منع ہے۔ قرآنِ کریم نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی۔ اور کہا کہ ان میں گھومنے پھرنے میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کا مروجہ عقیدہ (کہ ان پہاڑیوں میں طواف ارکانِ حج میں سے ہے۔ یعنی لازمی ہے) قرآنی آیت کے خلاف ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ان میں چلنے پھرنے میں کوئی گناہ (یا حرج) کی بات نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جس طرح قریش نے خانہ کعبہ کو بتوں سے بھر رکھا تھا، اسی طرح انہوں نے ان پہاڑیوں پر بھی دو بُت نصب کر رکھے تھے اور ان کی تعظیم کے لئے وہ ان کا طواف کیا کرتے تھے۔ اسلام نے جب وہ بُت اٹھوائے تو مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح بُت پرستی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح اب ان پہاڑیوں کا طواف بھی ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی تردید کے لئے کہا کہ ایسا نہیں۔ ان کا "طواف" ممنوع نہیں۔

لیکن یہ توجیہہ کچھ جچتی نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا کہ ان کا طواف ممنوع نہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی حرج یا مضائقہ نہیں، لیکن ہمارے ہاں اسے ارکانِ حج کے زمرہ میں شامل کر کے، لازم قرار دے دیا گیا۔ یعنی کہا یہ گیا کہ جس طرح تم حالتِ کفر میں ان کا طواف ضروری سمجھتے تھے، اسی طرح اسے اب بھی ضروری سمجھو۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم کی آیت کی روشنی میں، ہمارا خیال اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ (زمانۂ کفر میں) قریش، ان وادیوں کو (بتوں کا مسکن ہونے کی وجہ سے) مقدس خیال کرتے تھے اور ان میں گھومنا پھرنا ممنوع سمجھتے تھے۔ قرآن کریم نے اس غلط عقیدہ کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ بھی باقی پہاڑیوں اور وادیوں کی مانند ہیں۔ ان میں تقدیس کی کوئی بات نہیں۔ تم ان میں بلا تأمل چلو پھرو۔ ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

البتہ قرآن کریم نے صفا اور مروہ کو (کاروانِ حجاج کے ہمراہ جانے والے جانوروں کی طرح ۲۲/۳۶) شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲/۱۵۸) اور ان شعائر کا ادب ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے (۵/۲ ; ۲۲/۳۲)۔ شعائر کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۲۲ آیت (۲/۱) میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی مجرد (ABSTRACT) حقیقت یا نظریہ کی محسوس علامات (SYMBOLS) ہوتے ہیں۔ مثلاً مملکت کا جھنڈا۔ شعائر کی حیثیت سے وہ بڑا واجب الاحترام ہوتا ہے لیکن اس کے کپڑے یا بانس کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جھنڈا بوسیدہ ہو جائے اور اس کے کپڑے کو اتار پھینکا جائے، تو اس کپڑے کی حیثیت دوسرے کپڑوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ وہ کپڑا واجب التکریم نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن کریم نے کہا کہ یہ پہاڑیاں منجملہ شعائر اللہ ہیں۔ لیکن اس سے ان کے اردگرد کی زمین یا ان کے پتھر ایسے مقدس نہیں ہو جاتے کہ ان میں چلنا پھرنا ممنوع ہو۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) حج میں ساتھ لے جانے والے مویشیوں کو بھی شعائر اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں مقدس نہ سمجھ لیا جائے۔ ان سے دوسرے جانوروں کی طرح کام لو اور پھر انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت کھاؤ۔ (۲۲/۳۲ — ۳۷)

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان پہاڑیوں کو شعائر اللہ کیوں قرار دیا گیا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ خانہ کعبہ کی طرح ان کی تعظیم بھی حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی، اگرچہ زمانۂ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے مقاصد مسخ ہو چکے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے مقاصد کا صحیح تعین کر دیا لیکن ان کے محسوس علامات ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا اور اسلامی نظام باقی نہ رہا، تو مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور ان علامات کی تعظیم مقصود بالذات بن گئی۔ اس لئے قرآن کریم نے انہیں شعائر اللہ قرار دینے کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ تم اپنے دل کی کامل رضامندی سے خیر کے کاموں میں کس قدر حصہ لیتے ہو۔ یہی وہ کام ہیں جن کے بھرپور نتائج خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے حاصل ہوں گے۔ اس خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے جو جانتا ہے کہ تم کارِ خیر میں کس قدر حصہ لیتے ہو اور ان رسوم (مناسک) کی میکانکی تعظیم کس قدر کرتے ہو۔

یہ ہے وہ حقیقت (یعنی مقصود اور رسوم کا بنیادی فرق) جسے مذہب میں نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔

یہ (کتمانِ حقیقت) کس قدر جرمِ عظیم ہے، اس کے متعلق فرمایا کہ:-

۲/۱۵۹ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ - (۲/۱۵۹)

خدا نے بیّنات اور ہدایت کو اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ جو لوگ ان پر پردے ڈال دیں گے وہ زندگی کی شیرینیوں سے محروم ہو جائیں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ خدا نے بیّنات اور ہدایت کو اپنی کتاب میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ ہدایت کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۷ آیت (۲/۵) میں شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ دوسری چیز ہے بیّنات۔

بیّنات

بَيِّنَاتٌ - واحد بَيِّنَةٌ کا مادہ (ب۔ی۔ن) ہے جس کے معنی ہیں (۱) الگ الگ کر دینا۔ (۲) ابھارنا نمایاں کرنا۔ اَلْبَيَانُ کے معنی ہیں کسی بات کا کھل کر، واضح طور پر سامنے آجانا۔ بَيِّنَةٌ کے معنی ہیں واضح دلیل۔ مُبِينٌ کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا۔ واضح کرنے والا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو کِتَابٌ مُّبِينٌ بھی کہا ہے (۵/۱۵)۔ یعنی نہایت واضح ضابطۂ حیات، اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ بھی (۱۶/۸۹)۔ ہر بات کو واضح کر دینے والی کتاب۔ یعنی اپنے مطالب میں بھی واضح اور جملہ حقائق کو واضح کرنے والی بھی۔ سورۃ النحل میں ہے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ - (۱۶/۴۴) "ہم نے اس ضابطۂ حیات کو تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لئے نازل کیا گیا ہے، تو اُسے ان پر ظاہر کر دے۔ اور تاکہ وہ اس میں غور و فکر سے کام لیں۔ (نیز ۱۶/۶۴) اس سے ظاہر ہے کہ:-

(۱) خدا نے اپنے رسول کی طرف کتاب نازل کی (انزلنا الیک)

(۲) لیکن یہ کتاب درحقیقت تمام نوعِ انسان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ (مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ) اس لئے:-

(۳) رسول اللہ کا فریضہ تھا کہ اسے اپنے تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ اسے لوگوں پر ظاہر کر دے۔ (لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ)۔ اسے ان تک پہنچا دے: بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ .... (۵/۶۷)

خود اس کتاب کے متعلق بتا دیا کہ:-

(۱) یہ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ہے (۱۶/۸۹)۔ یعنی جن امور کا بذریعہ وحی بتانا ضروری تھا، انہیں اس میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کتاب خود مکتفی اور مکمل ہے، اور اپنے مطالب کو واضح کر دینے کے لئے کسی اور بذریعہ کی محتاج نہیں۔

قرآن واضح کتاب ہے،

(۲) یہ کتاب تمام نوعِ انسان کے لئے اظہارِ حقیقت ہے۔ بَيَانٌ لِّلنَّاسِ۔ (۳/۱۳۷)

(۳) اس میں صحیح اور غلط راستے بالکل واضح اور الگ الگ ہو گئے ہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲/۲۵۶)

(۴) یہ کتاب مبین ہے۔ یعنی بالکل واضح۔ (۵/۱۵)

(۵) یہ روشنی ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔ (۵/۱۵)۔ روشنی' اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ خود روشنی ہوتی ہے اور ہر اس شخص پر جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے، دوسروں چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس سے ہر شے اپنی اصلی شکل میں نکھر اور اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اسی لئے اسے تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (۱۲/۱۱۱) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھا دینے والی۔ (فَصَّلَ کے معنی الگ الگ کر دینا ہوتے ہیں)۔

(۶) اس کی وضاحت خود خدا نے اپنے ذمہ لی تھی۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ (۷۵/۱۹)۔ اس کے مطالب کو خدا نے کس طرح واضح کیا ہے اسے بھی خود ہی بتا دیا جب کہا کہ: وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۶/۱۰۶)۔ ہم اس طرح قرآن کی آیات کو پھیر پھیر کر، بار بار، سامنے لاتے ہیں تاکہ یہ کہیں کہ تو نے واقعی بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا ہے۔ اس طرح ہم اس کے مطالب کو ان لوگوں پر واضح کر دیتے ہیں۔ جو علم وبصیرت سے کام لیں۔ بیّنات (دلائل) انہی لوگوں کے لئے مفید ہو سکتے ہیں جو غور و تدبر اور علم و دانش سے کام لیں۔

یہ تھی اس علم کی حقیقت جسے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے، نبی اکرمؐ کی وساطت سے' تمام نوعِ انسان کی راہنمائی (ہدایت) کے لئے عطا کیا۔ اس میں کوئی سِرّ مستور نہیں۔ کوئی پوشیدہ راز نہیں۔ صاف، واضح، ظاہر، بیّن، کتاب — خود بھی روشن اور ہر دیدۂ بینا کے لئے روشنی۔ اس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی التباس نہیں، کوئی مشکوک بات نہیں۔ یہ اپنے مطالب آپ واضح کرتی ہے اور اس کے لئے کسی خارجی سہارے کی محتاج نہیں۔ (جہاں تک اس کے اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام متعین کرنے کا سوال ہے، اس کی بابت جلد اوّل صـ۱۲۵۔ آیت (۲/۴) میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے)۔ اس سلسلہ میں ضمناً جلد اوّل صـ۲۶۱۔ آیت (۲/۱۲)؛ جلد دوم صـ۲۲۸۔ آیت (۲/۲)

اور صد ۳۶۶۔ آیت (۲/۸۷) میں بھی ذکر آچکا ہے۔

یہ ہے وہ کتابِ مبین، جس کے متعلق کہا کہ جو لوگ اس کے حقائق کو چھپاتے ہیں، وہ خدا کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کتاب اللہ (وحیٔ خداوندی) کو چھپانے کا ایک طریق وہ تھا جسے سابقہ اہلِ کتاب نے اختیار کیا تھا۔ یعنی خود کتاب میں تحریف کر دینا۔ قرآن کریم کے سلسلہ میں یہ طریق تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اس کے حقائق اور تعلیم کو چھپانے کے لئے اور طریقے اختیار کئے گئے۔ مثلاً:-

قرآنی تعلیم کو چھپانے کے طریق

(۱) یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآنِ مجید کی بہت سی آیات منسوخ ہیں۔ یعنی انہیں صرف پڑھا جائے گا، حکم ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ تحریف فی الکتاب کا بالکل انوکھا لیکن بڑا کامیاب طریق ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صد ۱۲۵-۱۲۶۔ زیر آیت (۲/۱۰۶) گزر چکی ہے)۔

(۲) پھر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحیٔ جلی یا متلو اور دوسری وحی خفی یا غیر متلو۔ وحی جلی تو قرآنِ مجید میں درج ہے اور وحی خفی کتب روایات میں ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اوّل صد ۱۴۱۔ آیت (۲/۱۵۱)۔ اور جلد دوم صد ۱۸۶۔ آیت (۲/۱۲۹) میں آچکی ہے)۔

وحیٔ خفی کے متعلق کہا گیا کہ یہ قرآنِ مجید کے ساتھ، قرآنِ مجید کی مثل ہے۔ اس کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتی ہے اور ان پر قاضی بھی ہے۔ قاضی کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی احکام کے متعلق جو فیصلہ روایات دیں گی، اُسے شریعتِ خداوندی کہا جائے گا۔

فقہ

(۳) روایات (یا احادیث) کے بعد فقہ سامنے آتی ہے۔ فقہ ان احکام کو کہتے ہیں جو مختلف ائمۂ فقہ (امام ابوحنیفہؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگردوں) نے مدون کئے۔ فقہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس کے احکام، قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے مسلّم امام، ابوالحسن عبیدہ الکرخی نے کہا ہے کہ "ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ ہے۔" (تاریخ فقہ اسلامی، علامہ خضری اُردو ترجمہ شائع کردہ۔ دار المصنّفین اعظم گڑھ۔ صد ۲۴۱)۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کی جن آیتوں کو منسوخ سمجھا جائے یا جنہیں احادیث یا فقہ منسوخ ٹھہرا دے، وہ نہ صرف

مکتوم (چھپائی ہوئی) ہوں گی، بلکہ وہ تو سرے سے معدوم ہی ہو جائیں گی۔ موجود تو وہی آیات سمجھی جاسکتی ہیں جن کا حکم زندہ اور واجب العمل ہو۔

(۴) جب دینؔ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو وحی کی زندہ حقیقتیں، رسمی نقل و حرکت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس میں رسوم باقی رہ جاتی ہیں اور مقاصد معدوم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ انہی رسوم کی ادائیگی جو دین میں حصولِ مقاصد کا ذریعہ تھیں، مقصود بالذات بن جاتی ہے اور اس پر قوم مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کتمانِ کتاب اللہ کا سب سے بڑا اور مؤثر ترین ذریعہ مذہب کا وجود ہے جو مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم رہتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کے متعلق جو کہا ہے کہ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - (۹/۳۴) یہ لوگ، خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں، تو اس سے یہی مراد ہے۔ یہ کتاب اللہ کو سامنے آنے ہی نہیں دیتے۔

(۵) کتمانِ کتاب اللہ کے یہ طریق تو اربابِ شریعت نے وضع اور اختیار کئے۔ اصحابِ طریقت ایک قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا کہ قرآنِ مجید کے وہ معانی ہیں ہی نہیں جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

باطنی معانی

ان الفاظ کے باطنی معانی ہیں جو ہم پر، خدا کی طرف سے، کشف و الہام کے ذریعے وانشگاف کئے جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے الفاظ اور ان کے باطنی معانی کا یہی فرق ہے جسے (مولانا) رومؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

ما ز قرآں مغز را برداشتیم ۔۔۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم (معاذ اللہ)

باطنیت کے متعلق جلد دوم۔ آیت (۳/۲) صفحہ ۱۳۳ پر بحث کی جاچکی ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ کتمانِ کتاب اللہ کے لئے کس کس قسم کے نگاہ فریب پردے وضع کئے گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم محض تلاوت (اس کے الفاظ کو دہرا کر) "ثواب" حاصل کرنے کے لئے رہ گئی ہے اور یہ نگاہ فریب پردے اس قدر مقدس بن چکے ہیں کہ اگر ان کی طرف انگلی بھی اٹھائیے تو قیامت برپا کر دی جاتی ہے۔

قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ جو لوگ کتمانِ کتاب اللہ کرتے ہیں، وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ وہ خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (لعنت کے معنی جلد دوم صفحہ ۳۷ زیرِ آیت (۲/۸۸)

لعنت ہر طرف سے

بیان کئے جاچکے ہیں)۔ یہاں کہا کہ: أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ - (۲/۱۵۹) زندگی کی خوشگواریاں دو طریق سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ایک کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے براہِ راست۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں، ان کے ساتھ روابط قائم رکھنے سے۔

کتمانِ کتاب اللہ کے مرتکب، خود تو اس کے متعلق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کرتے، یا کرنا چاہتے ہیں، یہ ان کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں کسی گوشے سے بھی ثمراتِ حیات نصیب نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا انسان کی یہ محرومی ابدی ہوتی ہے۔ کہا کہ ایسے لوگوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ:-

۲/۱۶۰ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ (۲/۱۶۰)۔

اگر تم کسی وقت ایسا کر بیٹھو، تو یہ نہ سمجھ لینا کہ بس، اب یہ محرومی ابدی ہے۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں۔ تم جب بھی اُس مقام پر واپس آجاؤ جہاں سے تمہارا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا تھا، اور صحیح راستے پر چل پڑو، اور اس طرح، اس نظام کو پھر سے عملاً متشکل کر کے نمایاں طور پر دنیا کے سامنے لے آؤ تو اس کی برکات پھر تمہاری طرف لوٹ آئیں گی۔ اس لئے کہ خدا کا قانون، اپنی برکات و ثمرات کو لئے، اُس قوم کی طرف تیزی سے بڑھ آتا ہے جو اُس کی طرف رُخ کرتی ہے، اور اس کے لئے بر و مندی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

جو لوگ یہ محسوس کر کے کہ ہمارا قدم غلط راستے کی طرف اُٹھ گیا تھا، اس سے لوٹ جائیں اور صحیح راستہ اختیار کر لیں، انہیں یہ ثمرات حاصل ہو سکتے ہیں۔ خدا (معاذ اللہ) منتقم مزاج نہیں کہ وہ چڑ جائے کہ انہوں نے غلط راستہ کیوں اختیار کر لیا تھا، اس لئے ان کے لئے بازیابی کی کوئی صورت نہیں۔ وہ تو اپنی مخلوق کی نشو و نما چاہتا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی قوم اس کی کتاب (ضابطہ قوانین) کی طرف لوٹتی ہے، اس کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہو جاتی ہے۔ (توبہ اور رحمت کا مفہوم جلد اول صفحہ ۲۶۔ آیت (۲/۱)۔ اور جلد دوم صفحہ ۲۶۶۔ آیت (۵/۴) میں بیان کیا جا چکا ہے)۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو:-

۲/۱۶۱ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔ (۲/۱۶۱)

لیکن جو قوم ایسا نہیں کرتی، اور عمر بھر غلط روش پر ہی چلے جاتی ہے، تو وہ یقیناً اس ضابطہ قانون کی برکات سے، فطرت کی قوتوں کی تائید سے، اور اُن تمام انسانوں کے تعاون سے محروم رہ جاتی ہے، جنھوں نے اس باب میں اُن کا ساتھ دینا تھا۔

یہ لوگ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ (ملائکہ کے متعلق دیکھئے جلد دوم صـ ۶۶)

۲/۱۶۲ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (۲/۱۶۲)

اس قوم کی یہی حالت رہتی ہے۔ اس کی تباہیوں اور بربادیوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی حتیٰ کہ ان پر موت وارد ہوجاتی ہے، اور چونکہ موت سے باز آفرینی کا امکان ختم ہوجاتا ہے، اس لئے انہیں زندگی میں جو مہلت کا وقفہ حاصل تھا، وہ بھی باقی نہیں رہتا۔

ہم یہاں دہرا دیں کہ یہ سب کچھ کہا گیا ہے اس قوم کے متعلق جو کتمانِ کتاب اللہ جیسے سنگین جرم کی مرتکب ہو۔ اقوامِ سابقہ نے اس باب میں جو کچھ کیا، اور اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اسے چھوڑیئے۔ آپ یہ دیکھئے کہ ہم نے جس طرح کتاب اللہ کو

ہماری حالت

مختلف رنگین پردوں کے پیچھے چھپایا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم صدیوں سے غلامی و محکومی اور محتاجی و محرومی کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ نظامِ خداوندی کے قیام سے ہمیں جو نعمائے حیات میسر آتی تھیں، اُن کا تو ذکر ہی کیا، مذہب میں چونکہ عقل و فکر سے کام لینا جرمِ عظیم اور مادی دنیا سے نفرت، تقویٰ شعاری قرار پاتا ہے اس لئے ہم فطرت کی قوتوں سے بھی متمتع نہیں ہوسکے۔ اب رہی انسانوں کی طرف سے مدد تو محتاج اور محروم قوم کا دنیا میں کوئی حامی و ناصر اور یار و مددگار نہیں ہوتا۔ طاقتور قومیں انہیں اپنے مطلب کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کرتی ہیں اور اس کے عوض اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں ان کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ یہ ہے وہ الم انگیز عذاب جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آرہے ہیں؛ اور چونکہ مذہب (شریعت اور طریقت دونوں) ہمیں تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ خدا کے مقرب بندوں کی یہی نشانیاں ہیں، اس لئے ہم اپنی غلط روش کو چھوڑنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لاتے۔

قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنے والی قوموں کی یہ حالت یونہی اتفاقیہ نہیں ہوجاتی۔ یہ خدا کے اس قانونِ مکافاتِ عمل کا حتمی، لازمی نتیجہ ہوتی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ کائنات میں اس کے قانون کے سوا کسی کا قانون نافذ العمل نہیں۔

۲/۱۶۳ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲/۱۶۳)

کائنات میں قانون صرف ایک ہی کا جاری و ساری ہے۔ یعنی خدا کا قانون جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ کائنات نشو و نما حاصل کرتے ہوئے، ارتقائی منازل طے کرتی جائے۔

یہ ہے خدا کی رحمت کا مفہوم۔ (جلد اوّل ص۲۔ آیت (۱/۲)۔ جو قومیں اس کے قوانین پر پردے ڈال کر، اپنے خود ساختہ قوانین وضوابط کی پیروی کریں گی، وہ آخرالامر تباہ اور برباد ہو کر رہیں گی۔ اس کا ثبوت؟ اس کا ثبوت خود یہ کارگۂ کائنات ہے۔

۲/۱۶۴ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔ (۲/۱۶۴)

تم نے یہ دیکھنا ہو کہ کائنات میں کس طرح خدائے واحد کا قانون کارفرما ہے، اور وہ قانون کس طرح تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے، تو، اس کے لئے کائنات کی حیرت انگیز مشینری پر غور کرو اور دیکھو کہ اس کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔ دن اور رات کی گردش مدام کس نظم وضبط سے جاری ہے۔ اتنے اتنے بڑے جہاز، منفعت بخش سامان سے لدے ہوئے، کس طرح سینۂ بحر پر تیرتے پھرتے ہیں (اور وہ کون سا قانون ہے جو انہیں اس طرح تھامے ہوئے ہے)۔ اُس صاف اور شفاف پانی کو دیکھو جو بادلوں سے برستا ہے اور زمین مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ نیز، اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ صفحۂ ارض پر، انواع واقسام کے چلنے پھرنے والے ذی حیات کس طرح پھیل رہے ہیں۔ ہوائیں کس طرح، خاص خاص موسموں میں، اپنی سمت بدلتی ہیں۔ بادل کس طرح زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں، قانونِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑے، اِدھر سے اُدھر کھنچے چلے جاتے ہیں۔

ان تمام مظاہرِ فطرت پر غور کرنے سے انسان ایک ہی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کائنات کا نظم وضبط ایک ہی ذی اقتدار ہستی کے کنٹرول میں ہے لیکن اس نتیجہ پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو عقل وفکر سے کام لیں۔

اشیائے کائنات چونکہ مجبور پیدا کی گئی ہیں اس لئے وہ قوانینِ خداوندی کی بے چون وچرا اطاعت کئے جاتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کائنات کی یہ محیر العقول مشینری اس حسن وخوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل چلی جا رہی ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے، اور وہ اس مرحمتِ خداوندی کا بڑا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس کی حالت

یہ ہے کہ:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (۲/۱۶۵)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو۔ ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی۔ اور اللہ والوں کو اس سے زیادہ تر محبت ہے اللہ کی۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

خدا کے ساتھ محبت

"محبت" کا جو تصور ہمارے ہاں ہے، اس کی رُو سے سوچئے کہ اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ آپ کسی اَن دیکھی، غیر مرئی، غیر محسوس چیز کے ساتھ محبت نہیں کر سکتے۔ بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) یا مجرّد نظریات کی عظمت کا احساس آپ کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے لیکن اسے بھی "محبت" سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ذاتِ خداوندی وہ ہے کہ اسے دیکھنا تو ایک طرف، وہ — برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — ہے۔ (۶/۱۰۳)۔ اسے کسی محسوس شے کے ساتھ تشبیہ بھی نہیں دی جا سکتی۔ اسے مثال کے ذریعے بھی سمجھایا نہیں جا سکتا۔ (۴۲/۱۱)۔ لہٰذا اس کے ساتھ اس قسم کی محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ لیکن ہمارے ہاں اہلِ تصوّف نے اللہ کے ساتھ محبت کو اصلِ دین قرار دیا اور پھر اس بنیاد پر ایسی ایسی تصوراتی عمارتیں استوار کیں جو طلسمِ ہوش رُبا کو بھی شرمائیں۔ اللہ کو محبوب بلکہ معشوق قرار دیا اور اسے بالکل انسانی معشوق کی شکل میں پیش کیا۔ اسے عشقِ حقیقی کہہ کر پکارا گیا اور اس کا اوّلین زینہ عشقِ مجازی بنایا گیا۔ عشقِ مجازی" کیا ہے؟ امرد پرستی! آپ فارسی شعرا کا صوفیانہ کلام دیکھئے۔ وہ "مغبچوں" کی محبت سے پٹا پڑا ہے۔ ساری شاعری اُنکے خط و خال۔ لب و رخسار۔ زلف و کاکل کے گرد گھومتی ہے۔ وہیں سے یہ انداز اُردو شاعری میں در آیا۔ جب ان حضرات سے پوچھئے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب مجازات ہیں جو خدا کے ساتھ عشق و محبت کا زینۂ اوّلیں ہے۔ اس زینۂ اوّلین کو تو سب سمجھتے اور دیکھتے ہیں، لیکن، زینۂ آخریں کو آج تک نہ کسی نے دیکھا ہے، نہ سمجھا۔ زیادہ کریدیئے تو کہا جاتا ہے کہ یہ رموز و اسرار الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے — ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی — جو تن لاگے سو تن جانے۔ — اس کی منزلِ آخریں فنا فی اللہ بتائی جاتی ہے۔ یعنی — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — اسی کا نام وصال ہے۔

وصال اور عُرس

آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی وفات کو وفات نہیں کہا جاتا، وصال کہا جاتا ہے اور پھر اُن کا "عُرس" منایا جاتا ہے۔ "عُرس" کے معنی شادی ہیں۔ (تقریبِ عروسی

کے الفاظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتے ہیں) اسی قسم کی ہیں وہ تصوّراتی عمارتیں جو "حبّ اللہ" کی بنیاد پر استوار کی جاتی ہیں۔ تصوّف پر تفصیلی بحث جلد دوم صفحہ ۴۰ زیرِ آیت (۲/۱۰۲) گزر چکی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عیسائیت میں (GOD IS LOVE) کا عقیدہ تھا۔ (یعنی خدا محبت ہے)۔ اسی نے ہمارے ہاں "حبّ اللہ" کا لبادہ اوڑھ لیا اور عینِ دین بن گیا۔ اس قسم کے تمام تصوّرات دُوسروں سے مُستعار لئے ہوئے ہیں۔

اب آیئے قرآنِ کریم کی طرف۔ اَلْحُبُّ (مادہ ح۔ ب۔ ب) کے متعدد معانی ہیں جن میں سے تین چار زیادہ اہم ہیں۔ یعنی (۱) کسی چیز کو لازم پکڑنا۔ اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا۔ (۲) کسی کام کے نتائج کا اُبھر کر سامنے آ جانا، جیسے کہا جاتا ہے۔ اَحَبَّ الزَّرْعُ۔ کھیتی کے خوشوں میں دانے پڑ گئے۔ (۳) چاہنا یا پسند کرنا۔ اور (۴) کسی کی حفاظت کرنا۔ اسے تھامے رکھنا۔

ان معانی کی رُو سے ظاہر ہے کہ انسان کے خدا سے "محبت کرنے" سے مراد ہوگی، کتاب اللہ یا قوانینِ خداوندی کو

حُبّ اللہ کا قرآنی مفہوم

محکم طور پر پکڑنا یعنی ان کی لزوم و استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ قرآنِ کریم نے اسی کو "اعتصام بحبل اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (۳/۱۰۲)۔ اور خدا کے انسان سے "محبت کرنے" کے معنی ہوں گے انسان کی حفاظت کرنا۔ اسے تھامے رکھنا۔ اس کے حسنِ عمل کو نتیجہ خیز بنانا۔ اسی کو خدا کی پسندیدگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ۔ (۳/۳۰)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ خدا کے ساتھ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (۴/۸۰)۔ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی"۔ اس سے واضح ہے کہ آیت (۳/۳۰) میں جو کہا گیا ہے: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ، تو اس کے معنی اللہ کی اطاعت کرنا ہیں یعنی آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر تم اللہ کی اطاعت کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے رسول کا اتباع کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا: يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۳/۳۰) "اللہ تم سے محبت کرے گا"، یعنی تمہاری لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ وہ حفاظت اور رحمت کرنے والا ہے۔ اس آیت میں دیکھئے۔ بندوں کی طرف سے خدا کے ساتھ محبت کے معنی اس کی اطاعت کرنا ہیں، اور خدا کی طرف سے بندوں کے ساتھ محبت کے معنی، بندوں کی حفاظت کرنا، انہیں سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا۔ ان کے حسنِ عمل کی "کھیتیوں میں دانے پیدا کرنا" ہیں۔ "محبت" کے یہ تمام معانی اُوپر دیئے جا چکے ہیں۔

سورۃ المائدہ میں ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ۔ (۵/۵۴) اے جماعت مومنین! جو کوئی تم میں سے دینِ خداوندی سے پھر جائے تو (وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔) فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ۔ (۵/۵۴)۔ خدا ان کی جگہ ایسی قوم کو لے آئے گا جو خدا کی اطاعت کریں گے۔ اور خدا ان کی حفاظت کریگا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے بریشم کی طرح نرم اور شاخِ ثمر بار کی طرح خمیدہ ہوں گے لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (۴۸/۲۹) وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی (مخالف) کی طعن وتشنیع سے اثر پذیر نہیں ہوں گے۔ یہاں سے یحبونہٗ (ان کا خدا سے محبت کرنا) کا مفہوم واضح ہے۔ باقی رہا "یُحِبُّھُمْ" (یعنی خدا کا ان سے محبت کرنا) تو اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ: ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (۵/۵۴) وہ نوازشاتِ خداوندی کے مستحق قرار پائیں گے۔ ان کی سعی وعمل ثمر بار ہوگی۔ "محبت" کا مزید مفہوم ایک آیت بعد ان الفاظ سے واضح کر دیا کہ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ (۵/۵۶)۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) سے روگردانی کریگا تو...... یعنی یہاں "خدا کے ساتھ محبت" کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے جس کے معنی روگردانی کرنا۔ اعراض برتنا۔ نافرمانی کرنا ہیں۔

اِنْ اور اِن جیسی دیگر آیات سے واضح ہے کہ بندوں کی خدا کے ساتھ محبت کے معنی ہیں۔ احکامِ خداوندی کی ثبات واستقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ اور خدا کی بندوں کے ساتھ محبت کے معنی ہیں، خدا کی طرف سے ان کی حفاظت اور نشوونما کا سامان بہم پہنچنا۔ ان اطاعت کرنے والوں کی مختلف مقامات پر خصوصیات بتائی گئی ہیں (مثلاً) اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (۲/۱۹۵) اللہ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔ دیگر مقامات پر انہیں تَوَّابِیْنَ (۲/۲۲۲) مُتَطَھِّرِیْنَ (۲/۲۲۲) مُتَّقِیْنَ۔ (۳/۷۶) صَابِرِیْنَ۔ (۳/۱۴۶) وغیرہ کہہ کر پکارا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیۂ زیر نظر (۲/۱۶۵) کا جتنا حصہ پہلے درج کیا گیا ہے۔ یعنی وَمِنَ النَّاسِ ...... حُبًّا لِّلّٰہِ۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور ہستیوں کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ انہی اختیارات واقتدارات کے مالک ہیں جو خدا کو حاصل ہیں۔ وہ ان کے احکام وارشادات کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح خدا کے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ لیکن جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں وہ نہایت شدت سے ان

قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی انسان کو خدائی اختیارات میں شریک نہیں کرتے۔ وہ ان قوانین کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے۔

" اَنْدَادًا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ " کا مفہوم جلد اوّل صفحہ ۲۹۸ ۔ زیر آیت (۲/۲۲) دیا جا چکا ہے۔ آیت کا باقی حصّہ یہ ہے:۔

۲/۱۶۵ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۔ (۲/۱۶۵)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، وہ ان لوگوں کی سمجھ میں اس وقت نہیں آسکتا۔ جب ان کی اس غلط روش کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے تو اس وقت یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ فی الواقعہ کائنات میں اقتدار و اختیار خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اس کے قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے وضع کردہ احکام پر عمل پیرا ہونے اور اس طرح انسانوں کو خدا کا درجہ دیدینے کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد کہا:۔

۲/۱۶۶ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۔ (۲/۱۶۶)

اس وقت یہ دیکھیں گے کہ جن (حکمرانوں، لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں) کی یہ پیروی کیا کرتے تھے وہ کس طرح ان سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ وہ سہارے کس طرح ٹوٹ رہے ہیں جو انہوں نے اُن سے وابستہ کر رکھے تھے اور ان کے باہمی رشتے کس طرح منقطع ہو رہے ہیں۔

جب ان لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی تو اس وقت ان کے معتقدین اور متبعین (FOLLOWERS) کی کیفیت کیا ہوگی، فرمایا:۔

۲/۱۶۷ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۔ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۔ (۲/۱۶۷)

اُس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ اگر وقت کا دھارا ایک بار پیچھے کی طرف مڑ جائے تو ہم بھی ان لیڈروں اور پیشواؤں سے اسی طرح آنکھیں پھیر لیں جس طرح انہوں نے آج ہم سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔

یوں ان کی غلط روش کے نتائج بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آ جائیں گے اور یہ دیکھ لیں گے کہ جن ہستیوں

کو وہ اپنے لئے اس قدر محکم سہارے سمجھتے تھے، انہوں نے انہیں کس قدر عاجز و ناتواں بنا ڈالا ہے۔ ایسا عاجز و ناتواں اور افسردہ و واماندہ کہ ان میں اس تباہی سے نکلنے کی سکت ہی نہیں رہی۔

کس قدر حسرتناک ہے ان کا یہ انجام! پُر فریب سہاروں پر تکیہ کرنے والوں کا ایسا ہی انجام ہوا کرتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جب ان کے لیڈروں کی فریب دہی کا پردہ چاک ہوگا تو یہ کہیں گے کہ اگر ایک بار گزرا ہوا وقت واپس آجائے تو ہم انہیں اس کا مزہ چکھائیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہوسکے گی۔

وقت کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا

اس میں ایک عظیم نکتہ بیان کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں — ماضی کبھی مستقبل نہیں بن سکتی۔ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا۔ زمان (TIME) آگے کی طرف جاتا ہے، پیچھے کی طرف نہیں۔

یونانیوں کے ہاں زندگی کا تصور دائری (CYCLIC) تھا، اس لئے ان (کے ہاں کے بعض فلاسفرز) کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان باربار اس دنیا میں آتا ہے۔ اسے تناسخ کا عقیدہ کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے ان کے ہاں سے یہ نظریہ مستعار لیا اور "آواگون" کے نام سے اسے اپنے مذہب کا جزو بنا لیا۔ اس نظریہ کا ابطال جلد اوّل ۴۴ آیت (۵/۱) میں کیا جا چکا ہے۔ قرآن کریم بالتصریح کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتا۔ سورۃ مومنون میں ہے۔

تناسخ کا عقیدہ باطل ہے

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ـ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ـ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ـ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۲۳/۹۹-۱۰۰)

تا آنکہ جب ان لوگوں کے سرہانے (جو غلط راستے پر چلتے تھے) موت آکھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دے تو میں بہت اچھے اچھے کام کروں۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیری آرزوئے خام ہے۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ ان مرنے والوں کے پیچھے قیامت تک پردہ حائل ہے۔ اب یہ پیچھے نہیں جاسکتے۔

سورۃ شعراء میں ہے کہ اہل جہنم قیامت میں کہیں گے کہ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۲۶/۱۰۲) ہم کہیں ایک بار پھر دنیا کی طرف لوٹ سکیں تو ہم بھی ایمان لانے والوں سے ہو کر بتائیں۔ (نیز ۳۹/۵۸ ؛ ۵۳/۶)

وقت کا دھارا پیچھے کی طرف مڑا ہی نہیں کرتا۔ یہ یا تو ایک مقام پر رک جاتا ہے (جیسے جسم کی موت کے سلسلہ

ہیں) اور یا آگے بڑھتا ہے (انسانی ذات کے اس دنیاوی زندگی سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں)۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود — ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تشریح جہنم سے متعلق مقام میں سامنے آئے گی۔ آیہ زیر نظر (۲/۱۶۷) میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوا عوام کو سبز باغ دکھا کر اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور عوام کے سامنے یہ حقیقت اس وقت آتی ہے جب اُن کی اِن فریب کاریوں کا پردہ چاک ہوتا ہے لیکن اس وقت ان کی غلط روش کے نتائج ان کی تباہی کا موجب بن چکے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے واویلا مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (اس میں خود عوام کی کس حد تک ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے اس مقام پر بیان کیا جائے گا جہاں جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں کے مکالمات کا ذکر آئے گا۔ جو حضرات اسے بلا تاخیر دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب "جہانِ فردا" میں جہنم کا عنوان ملاحظہ فرمالیں۔

(۰)

اس کے بعد بتایا کہ یہ اپنے آپ حاکم بن بیٹھنے والے اور خدائی فوجدار (مذہبی پیشوا) کرتے کیا ہیں:۔

۲/۱۶۹-۱۶۸

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۔ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۲/۱۶۹-۱۶۸)

یہ لوگوں کو سبق پڑھاتے رہتے ہیں کہ تم معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرو اور صرف اپنے مفاد کا خیال رکھو اور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹتے جاؤ۔ اور ستم ظریفی یہ کہ یہ اپنے اس خود ساختہ مسلک کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ فرمودۂ خداوندی ہے۔ یہ شریعتِ حقہ ہے۔

اے نوعِ انسان! دیکھنا تم کہیں ان قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں، مفاد پرستوں کے پیچھے نہ لگ جانا۔ ان کی بات نہ ماننا۔ یہ تمہارے بھلے کی نہیں کہتے۔ یہ تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ خدا کا فرمان یہ نہیں کہ تم سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لو اور اس طرح معاشرہ میں ایسی شکل پیدا کر دو کہ کسی کے ہاں دولت کے انبار لگے ہوتے ہیں اور کسی کو ایک وقت کی روٹی تک میسر نہیں۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ تم خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھو اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لو۔ یہ رزق خداوندی کے حلال اور طیب طریق

حلال اور طیّب رزق

سے کھانے کا طریق ہے۔

حلال اور طیّب رزق کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ اسے ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ [حوالوں کے لئے دیکھیے۔ جلد اوّل صفحہ ۱۰۵ آیت (۲/۳)، صفحہ ۲۳۶ آیات (۲/۱۱-۱۲)، صفحہ ۳۰۵-۲۹۴ آیت (۲/۲۲)، صفحہ ۳۵۴ آیت (۲/۲۹)۔ جلد دوم صفحہ ۲۸۳ آیت (۲/۵۷)]

طیّب کا لفظ پہلے آچکا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۲۸۳ آیت (۲/۵۷)۔ اور شیطان کے متعلق تفصیلی بحث جلد دوم۔ باب اوّل صفحہ ۵ میں گزر چکی ہے۔ حلال کا لفظ تشریح طلب ہے لیکن ذرا آگے چل کر [آیت (۲/۱۷۳) میں] حرام کا لفظ آتا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ حلال و حرام دونوں کی وضاحت وہاں کی جائے اس کے لئے تھوڑا سا توقف فرمائیے۔ سوء اور فحشا کے الفاظ پہلی بار آئے ہیں اور وضاحت طلب ہیں۔

فحشاء کے معنی

پہلے فَحۡشَآءُ کو لیجئے۔ اَلۡفُحۡشُ (مادہ ف۔ح۔ش) کے بنیادی معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ زیادتی کر بیٹھنا۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر معیوب، قابلِ مذمت اور بے حیائی کے کاموں کے لئے استعمال ہونے لگا۔

لیکن فَحۡشَآء کے معنی بخل کے ہیں۔ (شاید اس لئے کہ عربوں کے نزدیک بخل سب سے زیادہ امرِ شنیع تھا)۔ اس کی وضاحت آیت (۲/۲۶۸) سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا کہ اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ "شیطان تمہیں ڈراتا ہے کہ اگر تم نے فاضلہ دولت کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیا، تو تم غریب اور محتاج ہو جاؤ گے۔ اس لئے وہ تمہیں بخل کی تلقین و تاکید کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ خداوندی تمہیں اس کی ضمانت دیتا ہے کہ تم ہر قسم کی احتیاج سے محفوظ رہو گے اور تمہیں رزق فراواں ملتا رہے گا۔ یہ اس خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے جس کے اسباب و ذرائع رزق بڑے وسیع ہیں اور وہ ہر ایک کی ضروریات کا علم بھی رکھتا ہے"۔

قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں بھی اسے دہرایا گیا ہے کہ فَاِنَّہٗ یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ..... (۲۴/۲۱) اس کے برعکس، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ..... (۷/۲۸)۔ خدا بخل کا حکم نہیں دیتا بلکہ یَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ ..... (۱۶/۹۰) اس سے روکتا ہے۔ وہ نظامِ خداوندی کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ..... (۲۹/۴۵)۔ نظامِ صلوٰۃ بخل (خود غرضی۔ مفاد پرستی) اور قابلِ نفرت امور کو روک دیتا ہے۔ (واضح رہے کہ فَحۡشَآء کا لفظ۔ بخل کے علاوہ دیگر قابلِ مذمت امور کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی

مثالیں متعلقہ مقامات پر سامنے آئیں گی)۔

آیت (۱۶۹ ۲) میں دوسرا تشریح طلب لفظ السُّوْءِ ہے جس کی جمع اَلسَّیِّئَاتُ ہے۔ سُوْءٌ کی ضد حَسَنَۃٌ ہے۔

سیّئات کے معنی

اور سیئاتُ کی ضد حَسَنَاتٌ ۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں بکثرت آتے ہیں۔ ہمارے ہاں حسنات کے معنی نیکیاں اور سیّئات کے معنی برائیاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن نیکی اور بدی کا جو محدود مفہوم ہمارے ہاں رائج ہے، قرآن کی ان اصطلاحات کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ علماء لغت نے کہا ہے کہ حُسْن سے مراد ہوتی ہے کسی چیز کے تناسب و توازن (PROPORTION) کا صحیح صحیح ہونا۔ اس کے مقابل لفظ فَسَادٌ آتا ہے جس کے معنی ہیں معاشرہ کا غیر متوازن ہوجانا۔ قرآن کریم میں، قارون کے قصہ کے سلسلہ میں، نظام سرمایہ داری کو الفساد کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس کے مقابل میں حسن کا لفظ آیا ہے (۲۸ ۷۷) اس مقام

حسنات کے معنی

پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ حَسَنَۃٌ اور حَسَنَاتٌ کے معنی ہوں گے ایسے کام جن سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ کا حسن ۔ یعنی توازن و تناسب ۔ برقرار رہے، اور (اس کے مقابلہ میں) سَیِّئَۃٌ اور سَیِّئَاتٌ کے معنی ہوں گے ایسے کام جن سے انسان کی ذات اور معاشرہ کا حسن (توازن) بگڑ جائے۔ اس سے واضح ہے کہ حسنۃ اور سیّئۃ کا حقیقی مفہوم، ان کے مروجہ معانی (نیکی۔ بدی) کے مقابلہ میں کس قدر وسیع اور جامع ہے۔ جب انسانی ذات میں توازن پیدا ہو جائے (جسے BALANCED PERSONALITY کہتے ہیں) تو اس سے اس کی سیرت و کردار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کوئی معاشرہ متوازن ہو جائے تو اسے زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، جس کسی فرد کی ذات کا توازن بگڑ جائے تو نفسیاتی مریض ہو جاتا ہے اور اس کی سیرت اور کردار غیر صحت مندانہ ہو جاتے ہیں اور جب کسی معاشرہ کا توازن بگڑ جاتے تو اس سے زندگی کے ہر گوشے میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ (میں نے مفہوم القرآن میں صحیح توازن کے لئے "ہمواریاں" اور بگڑے ہوئے توازن کے لئے "ناہمواریاں" کی اصطلاحات استعمال کی ہیں)۔

حسنات اور سیّئات کے سلسلہ میں اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی متعلقہ مقامات پر سامنے آتی جائے گی۔

السُّوْءِ اور الفحشاء کے ان معانی سے، آیت (۱۶۹ ۲) کا وہ مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا جسے اوپر لکھا گیا ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ رزقِ حلال وطیب سے کیا مراد ہے۔ منشاء خداوندی یہ ہے کہ اس نے جو سامانِ زیست بلامزد و معاوضہ عطا کیا ہے (مِمَّا فِی الْاَرْضِ) اس کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ وہ ہر شخص

کو اس کی ضروریات کے مطابق، بلا منتِ غیرے، ملتا جائے اور یوں معاشرہ کا توازن نہ بگڑے۔ اس میں ناہمواریاں نہ پیدا ہوں۔ لیکن مفاد پرست، خود غرض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیں، اور اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیں۔ یہ لوگ نوعِ انسان کے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ یہ اس قسم کا (ناہمواریاں پیدا کرنے والا) نظام قائم کرتے ہیں، اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھ کر اسے سندِ الوہیت عطا کر دیتی ہے۔ یعنی وہ یہ فتویٰ دیدیتے ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری منشاءِ خداوندی کے عین مطابق ہے۔ نزولِ قرآن مجید سے پہلے تو اس کی وجہ جہالت ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے پاس منشاءِ خداوندی معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے پاس خدا کی کوئی کتاب اصلی، حقیقی، (غیر محرف) شکل میں موجود نہیں تھی۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد تو یہ صورت نہیں رہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد، ان کے پاس، اس غلط اور باطل نظام کی تائید کے لئے دلیل یا سند کیا ہے؟ وہی دلیل اور سند جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شروع سے پیش کی جاتی رہی ہے اور آج بھی پیش کی جاتی ہے۔ یعنی

۲/۱۷۰ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ۔ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔـا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ۔ (۲/۱۷۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے، اس کا اتباع کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی راستے پر چلتے جائیں گے جس راستے پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے ۔۔۔ یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے! یا للعجب۔

مسلکِ اسلاف کی کورانہ تقلید کے متعلق، مطالب الفرقان، جلد اول میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے

مسلکِ تقلید

ایک نظر دیکھ لیا جائے (حوالوں کے لئے دیکھئے صفحہ ۶۔ آیت ۱/۲؛ صفحہ ۱۶۴۔ آیت (۲/۴) صفحہ ۳۰۷ آیت (۲/۴))۔ زندگی کی علامت 'حرکت' ہے، اور 'موت' جمود سے پہچانی جاتی ہے۔ اسلام میں بت پرستی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے۔

وثن کے معنی

(۲۲/۳۰) جو وثن کی جمع ہے۔ وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت۔ جامد و غیر متحرک ہو جانا۔ بُت کو وثن اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ جامد ہوتا ہے۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نہجِ زندگی جس میں حرکت نہ رہے، وہ جامد ہو جائے، وثن ہے۔ جب قرآنی

ضابطۂ حیات کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانے کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی مقام پر رُک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا جائے حیرت ہے کہ ہم نے تو قرآنِ کریم کے اس عظیم نکتہ کو پسِ پشت ڈال دیا لیکن مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ چنانچہ (ہمارے دور کا نامور فلاسفر) وائیٹ ہیڈ لکھتا ہے:-

بت پرستی مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کا نام ہے[1]

اس قسم کی بت پرستی میں ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے نظریات اور مناسک کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں اور ان کے معانی، مفہوم اور مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے جس کے محافظ مذہبی پیشوا ہوتے ہیں۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق یہی مفکر لکھتا ہے:-

> زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رو زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرائے چلے جاتے ہیں۔ . . . . . . اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً ص۳۵)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے، بلا اختیار و ارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت نہیں رہتی (ان میں اس کی صلاحیت ہوتی نہیں کیونکہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہوتے)۔ بھیڑ، جو کچھ آج سے پانچ لاکھ سال پہلے تھی، وہی کچھ آج ہے۔ بھیڑ کا بچہ بھیڑ ہی بن سکتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اسلاف کے مسلک و منہاج کی کورانہ پیروی کا نتیجہ خواہ وہ حیوانات میں ہو، اور خواہ اسے انسان نما حیوان اختیار کریں۔ قرآنِ کریم نے اس مسلک کے سمجھانے کے لئے یہی مثال دی ہے جب کہا ہے کہ:-

---

[1] A.N. WHITE HEAD — ADVENTURE OF IDEAS P. 12

۲/۱۷۱ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (۲/۱۷۱)

مذہبی پیشواؤں اور ان کے پیچھے چلنے والے (مقلدین) کی مثال یوں سمجھئے کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے جس کے پیچھے چرواہا ہے۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں۔ بلا الفاظ، اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے، اور بھیڑ بکریاں جو ان آوازوں پہ لگی ہوتی ہیں، ان کے مطابق ادھر ادھر مڑتی رہتی ہیں۔ نہ چرواہے کو اس کا علم ہوتا ہے کہ ان آوازوں کا منطوق اور ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے، اور نہ ہی وہ بھیڑ بکریاں ان آوازوں کا مطلب سمجھنے کی اہل ہوتی ہیں۔ یہ ہیں تقلید آبا کرنے والے

حیوانی روش

بہرے، گونگے، اندھے، عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ (۷/۱۷۹) بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، کہ حیوان تو معذور ہوتے ہیں کیونکہ انہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی حاصل نہیں ہوتی، اور یہ انسان نما حیوان، ان صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہوئے، حیوانوں کی روش اختیار کئے رہتے ہیں۔

اس کے بعد کہا:-

۲/۱۷۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (۲/۱۷۲)

اے جماعت مومنین! دیکھنا تم کہیں ایسی روش اختیار نہ کر لینا اور ان کی اس قسم کی باتوں پہ کان نہ دھرنا کہ ہمارے اسلاف نے اسے حلال قرار دیا ہے اور اسے حرام۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو رزق خدا نے عطا کیا ہے، اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق۔ حلال و طیب طریق سے کھاؤ پیو، اور اس کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق صرف میں لاؤ۔ یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ تم خدا کی اطاعت کرتے ہو، ان کے اسلاف کی نہیں۔

مسلک اسلاف کو دین خداوندی سمجھنے والے مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ بیٹھے حرام اور حلال کی فہرستیں مرتب کرتے رہتے، اور انسانی آزادی کو اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑتے رہتے ہیں۔ تم اُسے حلال سمجھو جسے خدا نے حلال قرار دیا ہے اور اُسی کو حرام جسے اس نے اپنی کتاب میں حرام ٹھہرایا ہے۔ اور یہ فہرست بڑی مختصر ہے۔

حرام اور حلال کا نظریہ

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس فہرست کی طرف آئیں، حرام اور حلال کا نظریہ قرآنی روشنی میں سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ دین میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم۔ ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے۔ ۱۷/۷۰) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنلئے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔ اسے اپنے احکام کے تابع رکھے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اُسے ضابطۂ قوانین، یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو، کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو"۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً:-

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم نے اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیبِ خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلسِ قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون پر پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی امتِ مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (AUTHORITY) ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

قرآنِ کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں گتھیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لئے حرام کے معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا، منع کر دینا، اس پر پابندی لگا دینا۔

قرآنِ کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۃ بقرہ میں ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۔۔۔۔ (۲ / ۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مُردار اور (بہتا ہوا ۱۴۵/۶) خون اور سؤر کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں اُن کے ساتھ اشیاءِ مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔۔۔۔ (۷ / ۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے:۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۔۔۔۔ (۷ / ۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ[1]

ان آیات سے ظاہر ہے کہ:۔

(۱) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(۲) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(۳) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(۴) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے اُن کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

---

[1] لفظ حرام کے دیگر استعمالات اپنے اپنے مقام پر آئینگے۔

ان تصریحات کے بعد اب آیۂ زیر نظر کیطرف آیئے جس میں کہا گیا ہے:۔

۲/۱۷۳ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - (۲/۱۷۳)۔ نیز (۱۶/۱۱۵)

خدا نے تم پر صرف یہ چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ مردار۔ خون۔ خنزیر کا گوشت۔ اور ہر وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

پھر اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے پینے کے لئے کچھ اور نہ ملے اور تم جان بچانے کے لئے مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی یا لذت یابی کی نہ ہو، تو اس صورت میں، ان چیزوں کو بقدر ضرورت کھا لینے میں مضائقہ نہیں۔ چونکہ اس میں تمہاری نیت قانون شکنی کی نہیں، اس لئے اس سے تمہاری ذات پر جو اضمحلال واقع ہونا تھا، قانونِ خداوندی یہ حکم یقین تمہیں اس سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری ذات کی نشوونما پر مضر اثر نہیں پڑے گا۔

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں بھی کھانے پینے کی حرام چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہی چار چیزیں گنائی گئی ہیں۔ البتہ بعض آیات میں ان کی مزید تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں مَيْتَةً (مردار) کی تصریح کرتے ہوئے کہا۔ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ...... (۵/۳) یعنی جو جانور طبعی موت مر جائے (ميتة) اس کے علاوہ۔ جو گلا گھونٹ کر مر جائے۔ چوٹ کھا کر مر جائے جو اوپر سے گر کر مر جائے، کسی جانور کا سینگ لگنے سے مر جائے یا جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو۔ یہ بھی حرام ہیں۔ ہاں اگر ان جانوروں کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو پھر ان کا کھانا جائز ہے۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔ (۵/۳)۔ نیز جن جانوروں کو استھانوں پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کیا جائے، وہ بھی حرام ہیں۔ یعنی ان مقامات پر جو لوگوں نے نذر نیاز کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ یا جن کا گوشت پانسوں کے ذریعے تقسیم کیا جائے (عہد جاہلیہ میں یہ بھی جوئے کی ایک قسم تھی۔ تفصیل اس کی میسرہ کے ضمن میں آئے گی جہاں بتایا جائے گا کہ قرعہ اندازی یا فالیں لینا بھی از روئے قرآن ممنوع ہے)۔ آیت (۵/۴) میں کہا گیا ہے کہ جو شکار، شکاری جانور تمہارے لئے پکڑیں، وہ بھی حلال ہے۔

آیت (۵/۳) میں دَمٌ کہا گیا ہے۔ (یعنی خون)۔ آیت (۶/۱۴۵) میں دَمًا مَّسْفُوْحًا کہہ کر اس کی وضاحت

کر دی۔ یعنی بہتا ہوا لہو۔

آیت (۵/۳) میں "فَمَنِ اضْطُرَّ" کہا تھا۔ یعنی جو مجبور ہو جائے۔ آیت (۵/۳) میں "فَمَنِ اضْطُرَّ فِی مَخْمَصَۃٍ" کہہ کر اس کی وضاحت کر دی۔ یعنی جو بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے۔ آیت (۲/۱۷۳) میں اضطراری حالت کے بعد کہا۔ "غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ"۔ بَاغٍ کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانے والا۔ قانون شکنی کرنے والا۔ بغاوت کرنے والا۔ عَادٍ کے معنی بھی حد سے تجاوز کرنا ہیں۔ آیت (۵/۳) میں "غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ" کہا۔ یعنی اثم (قانون شکنی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے نہیں۔ معنی واضح ہیں۔ یعنی اضطراری حالت کے معنی ہیں، بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جانا۔ لہٰذا، ایسی حالت میں حرام چیز کو اتنا ہی کھانا جائز ہو گا جس سے بھوک رفع ہو جائے۔ اس سے زیادہ کھانا۔ یا محض لذت کے لئے کھانا، حد سے تجاوز ہو جائے گا۔

کھانے پینے کی جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے، ان میں تین چیزیں تو مادی ہیں۔ یعنی مُردار، خون اور خنزیر کا گوشت اور چوتھی چیز اعتقادی۔ یعنی ہر وہ حلال شے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، حرام ہو جائے گی۔

غیر اللہ کی طرف منسوب

اس سلسلہ میں فرمایا۔ فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ بِاٰیٰتِہٖ مُؤْمِنِیْنَ۔ (۶/۱۱۹)۔ جس چیز پر خدا کا نام لیا جائے اسے ہی کھاؤ۔ یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ قوانینِ خداوندی پر تمہارا ایمان ہے۔ ذرا آگے جا کر کہا: وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (۶/۱۲۲)۔ جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے، اسے مت کھاؤ۔ ان آیات میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں کی گئی لیکن جس سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کا تعلق حلال جانوروں کے ذبح کرنے سے ہے۔ آیت (۵/۴) سے اس مفہوم کی تائید ہو جاتی ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ:۔

(۱) کھانے پینے کی چیز جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ حرام ہو جاتی ہے۔

(۲) حلال جانوروں کو ذبح کرتے وقت اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو ان کا گوشت کھانا جائز نہیں۔ وہ اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ یعنی خدا کا نام لینا لازمی ہے۔

ان امور کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ لیکن آپ اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ہاں مُردار اور سؤر کا کھانا تو ایک طرف، ان کا نام تک لینا بھی قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے لیکن پیروں، فقیروں کے نام کی نذر نیاز اور مزاروں مقبروں پر چڑھائے ہوئے چڑھاوے، نہ صرف یہ کہ انہیں شیرِ مادر کی طرح حلال اور طیب سمجھا جاتا ہے بلکہ انہیں متبرک

قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے بہ نصِ صریح حرام ہوتے ہیں۔ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (۲/۱۷۳)۔ ہیں، اُهِلَّ کا مادہ (ھ۔ل۔ل) ہے جس کے بنیادی معنی آواز بلند کرنا یا پکارنا ہیں۔ [ابتدائی تاریخوں کے چاند کو هِلَال[۱] اس لئے کہتے ہیں کہ جو اسے دیکھ لے وہ بآوازِ بلند اس کا اعلان کرتا ہے۔ ہمارے ہاں هَلَّلَ کے معنی تہلیل یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ کہنے کے ہیں] پکارنے کا عملی مفہوم، غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا ہے۔

سورۃ انعام میں ہے۔ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (۶/۱۲۰)۔ خدا نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کیا کیا چیزیں حرام ہیں۔ ان کے سوا سب چیزیں حلال ہیں۔ سو جب کسی جانور کو خدا کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے تو اس کا کھانا از روئے دینِ خداوندی حلال ہو جائے گا۔ اسے کسی کے فتوے کی رُو سے حرام سمجھنا، قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تمہارے مرغوبِ خاطر نہ ہو یا طبّی طور پر مضرِ صحت ہو۔ (یعنی تمہارے لئے طیّب نہ ہو)۔ اس سے واضح ہے کہ (بجز اضطراری حالت کے) حرام چیزوں کو تو کھایا ہی نہیں جا سکتا، لیکن ہر حلال شئے کا کھانا لازمی اور فرض نہیں۔

حالتِ احرام میں صَيْدُ الْبَرِّ۔ بھی حرام ہے۔ (۵/۱)؛ (۵/۹۵-۹۶)۔ اس کی تفصیل حج کے ضمن میں سامنے آئے گی۔

سورۃ المائدہ میں ہے۔ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ...... (۵/۵)۔ "اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔" اس کے یہ معنی نہیں کہ اہلِ کتاب کے ہاں کا ہر کھانا حلال ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں کا وہی کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہوگا جسے قرآن نے حرام قرار نہیں دیا، ورنہ یہ بات تو عجیب ہوگی کہ (مثلاً) اپنے ہاں سؤر کا گوشت پکاؤ تو وہ حرام ہو، اور وہی گوشت کسی عیسائی کے ہاں پکا ہو تو وہ حلال قرار پا جائے۔ کسی چیز کے حلال ہونے کی جو شرائط قرآنِ مجید نے عائد کی ہیں، اگر کسی اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا ان شرائط پر پورا اترتا ہو تو اس کا کھانا حلال ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی جانوروں کو اُسی

اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا

[۱] اسے کہتے ہی تبرک ہیں۔

طرح ذبح کرتے ہیں جس طرح مسلمان ذبح کرتے ہیں، اور وہ اس پر خدا کا نام بھی لیتے ہیں۔ (اسے ان کی اصطلاح میں کوشر کہا جاتا ہے)۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس حلال جانور کے گوشت کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہوگا۔ لیکن اس میں دوسری شرط یہ بھی ہے کہ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ۔ (۵/۵)۔ وہ بھی تمہارے ہاں کے کھانے کو حلال سمجھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کے ہاں کے حلال کھانے کی جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ ان کے ساتھ تمدنی روابط ہیں۔

قرآنِ کریم نے اہلِ کتاب کے ہاں کے کھانے کی تخصیص کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں، خواہ وہ حلال ہونے کی شرائط کو پورا بھی کیوں نہ کرتا ہو۔

(۰)

قرآنِ کریم نے جن تین مادی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں مُردار اور خون کے متعلق کوئی بات نہیں کی جاتی۔

لحمِ خنزیر

البتہ لحمِ خنزیر (سؤر کے گوشت) کے متعلق اکثر بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ (ان کے ایک آدھ فرقہ کے سوا) عیسائی اس کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی طرف سے اکثر اعتراض ہوتا ہے کہ مسلمان اسے کیوں حرام سمجھتے ہیں۔ انگلستان میں رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے اس ضمن میں مجھے اکثر استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے اہلِ قلم کی طرف سے لکھا تو بہت کچھ گیا ہے لیکن اس کے خلاف بنیادی دلائل دو ہی دیئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جانور (خنزیر) بڑا بے حیا ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے گوشت میں ایسے جراثیم ہوتے ہیں جو انسان کے لئے مضرِ صحت ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں ان دلائل سے مطمئن نہیں۔ جہاں تک اس کے بے حیا ہونے کا سوال ہے، تو یہ دلیل بڑی بودی ہے، حیا اور بے حیائی تو انسانی خصوصیات ہیں۔ حیوانات میں نہ اس کا احساس ہوتا ہے، نہ تمیز۔ باقی رہا اس کے گوشت کا مضرِ صحت ہونا، سو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اہل (COMPETENT) نہیں۔ یہ الگ سائنس ہے جو میرا میدان نہیں۔ لیکن جو کچھ مسلمان محقق اس کے متعلق لکھتے ہیں، عیسائی ریسرچ کرنے والے اس کی شدت سے تردید کرتے ہیں۔ میں اس دلیل سے اس لئے بھی مطمئن نہیں کہ کئی جانور ایسے ہوں گے جن کا گوشت انسانی صحت کے لئے لحمِ خنزیر سے بھی زیادہ مضر ہوگا۔ اگر علتِ حرمت یہی تھی تو قرآنِ کریم میں بہت سے ایسے اور جانوروں کو بھی حرام قرار دینا چاہیئے تھا، اس میں خنزیر کی تخصیص کیا تھی؟

جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، اس کی علتِ حرمت، طبعی (PHYSICAL) نہیں، جذباتی اور نظریاتی ہے۔
آپ دنیا کی کسی قوم، اور کسی زمانے کے لٹریچر کو دیکھئے (خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی) اس میں سوٴر کو انتہائی قابلِ نفرت جانور قرار دیا گیا ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ لفظ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس جانور کے خلاف اس قسم کی عالمگیر نفرت کی وجہ کیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نفرت، زمانہ قدیم سے، ہر قوم میں چلی آ رہی ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو خیر یہ حرام ہی ہے، لیکن عیسائی، جو اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں وہ بھی (You SWINE) گالی کے طور پر بولتے ہیں۔ اور (PIG - HEADED) بھی۔ انجیل میں، حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہا گیا ہے کہ "اپنے موتی سوٴروں کے آگے نہ ڈالو" (متی - ۶/۷)۔ ابتداءً عیسائی بھی سوٴر کے گوشت کو حرام سمجھتے (اور ختنہ کراتے) تھے کیونکہ وہ شریعتِ موسوی کے پابند تھے۔ لیکن بعد میں جب یہودیوں کے خلاف ان کی نفرت شدت اختیار کر گئی تو انہوں نے، اُن کے علی الرغم، سوٴر کا گوشت کھانا شروع کر دیا اور ختنہ کرانا بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود، سوٴر کے خلاف ان کا جذبۂ نفرت بدستور رہا۔ یوں نظر آتا ہے جیسے اس جانور کے خلاف یہ جذبہ، (بجز وحشی قبائل کے) نوعِ انسان کے تحت الشعور میں چلا آ رہا ہے۔ (جیسے مردار خوار ــــ اور خونخوار، قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں)۔ میرا خیال ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں کے اس جذبہ کا احترام کرتے ہوئے اسے حرام قرار دیا ہے۔ (حرام اور احترام کا مادہ بھی ایک ہی ہے)۔
ایک دفعہ ایک انگریز (عیسائی) مفکر مجھے ملنے کے لئے آیا، اور منجملہ دیگر امور، اس نے خنزیر کے گوشت کی حرمت کے متعلق بھی بات چھیڑ دی۔ حسبِ معمول اس نے کہا کہ ہمارے ہاں خنزیروں کی اس طرح پرورش کی جاتی ہے کہ ان کے گوشت میں کوئی چیز مضرتِ رساں نہیں ہوتی۔ کیا آپ اس قسم کے گوشت کو بھی حرام قرار دیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے نزدیک اس کے حرام ہونے کی علت، مادی نہیں، جذباتی ہے۔ اس نے کچھ خندۂ استہزا سے کہا کہ مادی چیزوں میں جذباتی علت کا کیا سوال؟ میں نے نہایت متانت سے کہا کہ کیا آپ اپنی حقیقی بہن سے شادی کریں گے؟ اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا سوال کر دیا؟ اپنی بہن سے شادی کون کر سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ معاف فرمایئے! اپنی بہن اور کسی اور لڑکی میں جس کے ساتھ آپ بلا تکلف شادی کر سکتے ہیں، عورت ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سو جب دونوں کا جسم ایک جیسا ہوتا ہے، تو بہن کے ساتھ شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ خاموش ہو گیا اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ حلت و حرمت کی وجوہ، مادی سے کہیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔
سو میرے نزدیک، قرآنِ کریم نے کھانے پینے کی جن چیزوں، اور جن رشتوں کو حرام قرار دیا ہے، اس کی وجہ

یہ ہے کہ اس نے انسان کے ان جذبات کا احترام کیا ہے جو نوعِ انسان کے تحت الشعور میں عام طور پر، بطور قدرِ مشترک متوارث چلے آرہے تھے۔ لیکن یہ بہرحال میری توجیہہ ہے جس کے ساتھ ضروری نہیں کہ آپ بھی متفق ہوں، لیکن جس بات کے متعلق نہ کسی مسلمان کو اختلاف کی اجازت ہے، نہ شک و شبہ کی گنجائش، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے یہ حرام ہیں۔ اگر ان کی علتِ حرمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے تو صوالمراد۔ اس سے ہماری ذہنی تسکین ہوجاتی گی۔ لیکن اگر یہ اطمینان بخش طور پر سمجھ میں نہیں بھی آتی، تو بھی یہ حرام ضرور رہیں گی — ہر سوسائٹی اور تنظیم کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر رہنا چاہتا ہے، اسے ان اصولوں کو ماننا ہوگا۔ اگر ان پر اس کا دل نہیں ٹھکتا، تو اسے اس سوسائٹی سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ حرام اور حلال، اسلامی سوسائٹی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ جو شخص اس سوسائٹی میں رہنا چاہتا ہے اسے قرآن کے حرام کردہ کو حرام سمجھنا ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ اس کے حرام کو حرام نہ سمجھیں اور اس کے باوجود اس کی قائم کردہ سوسائٹی (امتِ مسلمہ) کے رکن بھی رہیں۔ یہ ہے حرام اور حلال کی بنیادی اہمیت۔

(۰)

حرام کی فقہی فہرستیں

آپ نے غور فرمایا کہ دین میں حلال و حرام کا مسئلہ کس قدر بنیادی اور اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے اس قدر وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے بہ شد و مد، پکار پکار کر کہا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار خدا، اور صرف خدا کو ہے۔ الدین میں یہ اختیار کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں کتاب اللہ کے حرام کردہ کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے، اس خدائی اختیار پر چھاپہ مارتی ہے، وہ خدا کی متعین کردہ فہرست کو تو پسِ پشت ڈال دیتی ہے اور اپنی الگ فہرستیں مرتب کرکے، انہیں شریعت خداوندی کے نام سے مشہور کر دیتی ہے اور انہی کی پابندی لوگوں سے کراتی ہے۔ اسی کو تھیاکریسی کہتے ہیں — یعنی خدا کے نام پر مذہبی پیشواؤں کی حکومت۔ اسے قرآن کریم نے جرمِ عظیم قرار دیا ہے جب فرمایا۔

۲/۱۷۴ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۔ (۲/۱۷۴)

جو لوگ خدا کے حرام کردہ کو پسِ پردہ ڈال کر، حرام وحلال کی اپنی فہرستیں مرتب کرنے لگ جائیں اور اس طرح خدائی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر، انہیں دنیاوی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیں، تو وہ بظاہر کتنے ہی مرفہ الحال اور مقدس کیوں نہ دکھائی دیں، یوں سمجھو کہ وہ سامانِ زیست حاصل نہیں کر رہے، انگاروں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ آج تو یہ بڑے فرحاں وناز اں پھر رہے ہیں، لیکن ظہورِ نتائج کے وقت تم دیکھو گے کہ خدا ان سے بات تک نہیں کرے گا۔ یعنی اس کے قانون کی رو سے ملنے والی سعادتیں اور خوشگواریاں ان سے آنکھ تک نہیں ملائیں گی اور ان کی انسانی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں گی۔ یہ بڑا ہی الم انگیز عذاب ہوگا۔ اس وقت انہیں اس کا احساس اور اندازہ ہوگا کہ انہوں نے شرفِ انسانیت کو جن داموں بیچا تھا وہ کس قدر حقیر اور کم مایہ تھے۔

یہ اس لئے کہ :۔

۱۷۵/۲ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۔ (۱۷۵/۲)

یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کی متعین کردہ سیدھی راہ کو بیچ کر غلط راستوں کو خریدا۔ خدا کی حفاظت کے بدلے میں تباہیاں مول لیں ۔۔۔ ذرا سوچو کہ سب کچھ دیکھتے بھالتے، تباہیوں کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے جانا، کتنی بڑی دیدہ دلیری کا کام ہے۔ یہ اپنی قوتِ برداشت کے متعلق کس قدر غلط فہمی میں ہیں۔ اس کا کس قدر غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ یہ اس تباہی کا مقابلہ کر ہی نہیں سکیں گے۔

مذہبی پیشوائیت اور ان کے کاروبار کے متعلق سابقہ دو جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ دیکھئے بالخصوص جلد اوّل صفحہ ۳۳۔ آیت (۳/۱) ؛ صفحہ ۶۲۔ آیت (۲/۱) ؛ صفحہ ۲۳۵۔ آیات (۱۲-۱۱/۲) ؛ صفحہ ۲۵۶۔ آیت (۱۹/۲) اور جلد دوم صفحہ ۱۹۴۔ آیت (۴۱/۲) ؛ صفحہ ۳۴۰۔ آیت (۷۹/۲)

ان کا ایسا انجام کیوں ہوگا ؟

۱۷۶/۲ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۔ (۱۷۶/۲)

اس لئے کہ خدا نے جو کتاب نازل کی ہے وہ اٹل حقیقت ہے جس میں اختلاف کا شائبہ تک نہیں۔ (۸۲/۴) لیکن جب انسان اپنے ذہن سے شریعتیں وضع کر کے اس کتاب میں اختلاف پیدا کرنے لگ جائیں، تو پھر وہ صحیح

راستے سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

اگر ہر معاملہ میں غلط اور صحیح کا معیار، خدا کی کتاب کو قرار دیا جائے، تو فیصلوں میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کتاب کی جگہ، ذہنِ انسانی کے وضع کردہ معیار لے لیں تو پھر بات بات پر اختلاف ہو گا۔ یہ وجہ ہے کہ الدّین میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا، اور مذہب، فرقوں کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ خدا نے مذہبی پیشوائیت کو جو "کاروبار" قرار دیا ہے تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار ہے۔ کاروباری حلقے ہمیشہ ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہوتے ہیں۔ یہ کاروبار کا تقاضا ہوتا ہے۔ الدّین میں ساری کی ساری امت کا نصب العین ایک ہوتا ہے۔ مذہب میں ہر فرقہ کے پیشِ نظر اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے۔

اس مفاد طلبی کے لئے مذہبی پیشوائیت کیا کرتی ہے، اسے اگلے باب میں بیان کیا جائے گا۔

پانچواں باب

بیّنات اور کتاب

دلائل اور قوانین

آیات — ۲/۱۷۷ تا ۲/۱۸۸

۱- دلائل۔ قوانین اور شمشیر کا باہمی تعلق
۲- اعمالِ صالحہ کی تفصیل
۳- اسبابِ ذلت
۴- زکوٰۃ کی مزید تشریح
۵- انسانی جان کی قدر و قیمت
۶- قصاص کا حکم
۷- قرآن اور حدیث
۸- صیام (روزوں) کے احکام اور غایت
۹- نزولِ قرآن
۱۰- خدا کی کبریائی کا قیام
۱۱- دعا کا تفصیلی مفہوم
۱۲- قربِ خداوندی کا مفہوم
۱۳- معراجِ نبویؐ کا مفہوم
۱۴- مرشد خدا کی ذات ہے۔

پانچواں باب

بیّنات اور کتاب

دلائل اور قوانین

سورۃ الحدید میں ہے :-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ (۵۷/۲۵)

اس مقصد کے لئے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ مختلف اقوام کی طرف اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجتا ہے اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی لاتا ہے۔ وہ (رسول) اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرہ کے استحکام کے لئے خدا نے ضابطۂ قوانین کے ساتھ، شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے جس میں بڑی سختی ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ سختی عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لئے یہ نوعِ انسان کے لئے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے وفا شعار بندے ہیں جو اس نظامِ خداوندی کی مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز، مرئی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئے ہوتے اور وہ اپنے یقینِ محکم کی بنا پر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یوں خدا کا وہ نظام جو اپنے اندر غلبہ اور قوت رکھتا ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

اس آیت میں تین چیزوں کو منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ البیّنات۔ اَلْکِتٰب اور اَلْحَدِیْد۔ ان کے منزّل من اللہ ہونے کی تشریح تو آگے چل کر آئے گی، یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس ترتیب سے ان تینوں چیزوں کا ذکر آیا ہے وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے پروگرام کی ترتیب وار کڑیاں یا مدارج (STAGES) ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بیّنات (دلائل) اور کتاب (قوانین) دونوں قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک حکم دیتا... یا قانون سامنے لاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے اور اس کی تعمیل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے اس نے حکمت کہہ کر بھی پکارا ہے۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۴/۱۱۳) ودیگر متعدد آیات)۔ نظامِ خداوندی کی دعوت میں پہلا مرحلہ بیّنات (دلائل) کا ہوتا ہے۔ رسول اپنے مخالفین کو دلائل و براہین کی رو سے سمجھاتا تھا کہ ان کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر نقصان دِہ اور تباہ کن ہوگا، اور صحیح راستہ اختیار کرنے کے ثمرات کس قدر خوشگوار ہوں گے۔

دلیل، قانون اور شمشیر

جو لوگ عقل و بصیرت کی رو سے ان دلائل سے مطمئن ہو کر اس (رسول) کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیتے وہ اس رسول کی جماعت (امت) میں شامل ہو جاتے۔ ان افراد کو وہ قوانین اور ان کی غرض و غایت بتائی جاتی جن کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی تھی۔ اس طرح انہیں اس نظام کی عملی تشکیل کے لئے تیار کیا جاتا۔ لیکن مفاد پرست گروہ اس نظام کی تشکیل کی مخالفت کرتے اور اسے ختم کرنے کے لئے قوت کے استعمال پر اتر آتے۔ اس وقت ضروری ہو جاتا کہ ان کی مدافعت قوت کے ذریعے کی جائی۔ یہ تیسری سٹیج اَلْحَدِیْد یعنی شمشیر کے استعمال کی ہوتی۔ علامہ اقبالؒ نے کتاب اور حدید (قرآن اور شمشیر) کے باہمی تعلق کو اپنے مخصوص، بلیغ اور نہایت دلآویز انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ — مومناں را تیغ با قرآں بس است!

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند

ایک قوت قانون کی ہے اور ایک قوت شمشیر کی۔ نظامِ خداوندی میں یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہوتی ہیں۔ شمشیر، قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ حق کی مخالف قوتیں اسے بے بس نہ بنا دیں۔ اور قرآن، شمشیر کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کا بے جا کا نہ استعمال نہ ہونے پائے۔ اس کی قوت قانونِ خداوندی کے تابع رہے۔ اس وقت تک ہمارے سامنے بیّنات آئے ہیں۔ اب قانون اور شمشیر کا مرحلہ آتا ہے۔ مطالب الفرقان، جلد اول صـ۱۲۲۔ زیرِ آیت (۲/۲) میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کے لئے انسان کے دل سے ایک جذبہ اُبھرتا ہے لیکن اس جذبہ کا اظہار محسوسات کے ذریعے ہوتا ہے — انسانی جسم کی حرکات و سکنات یا شعائر (SYMBOLS)

قوانینِ خداوندی کے احترام کی شکلیں ہیں۔ یہ حرکات وسکنات یا شعائر مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ (مثلاً) آپ نے ریل کے ذریعے کہیں جانا ہو تو اس کے لئے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ ٹکٹ خرید کر آپ عازمِ سفر ہو جاتے ہیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ٹکٹ خرید کر آرام سے گھر بیٹھے رہیں تو آپ قیامت تک اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتے خواہ ٹکٹ کو کتنا ہی حفاظت سے کیوں نہ رکھیں۔ الدّین میں نگاہ مقصود (منزل) پر ہوتی ہے

ذریعہ اور مقصد کا باہمی تعلق

اور شعائر اس تک پہنچنے کی محسوس علامات ہوتی ہیں۔ لیکن مذہب میں یہی شعائر مقصود بالذات بن جاتے ہیں۔ اور مذہبی پیشوا ان محسوس علامات کو عین دین کہہ کر ان کی اہمیت کو دلوں میں جاگزین کرتے رہتے ہیں۔ یعنی وہ اس ٹکٹ کو نہایت مقدس قرار دیکر اس کی حفاظت کی سخت تاکید کرتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر جلد کے دوسرے اور تیسرے ابواب میں کعبہ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کعبہ کو نظامِ خداوندی کا مرکزِ محسوس قرار دیا گیا اور جماعتِ مؤمنین کو تاکید کی گئی کہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں اس مرکز کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں تاکہ اس نظام کے ساتھ ان کی وابستگی قائم رہے۔ اس کی محسوس شکل کے پیشِ نظر یہ انداز اختیار کیا گیا کہ صلوٰۃ کے اجتماعات میں ہر ایک کا رُخ کعبہ کی طرف رہے اور یوں کعبہ، قبلہ کی حیثیت اختیار کر لے۔ الدّین میں نظامِ خداوندی کے ساتھ وابستگی نصب العین حیات

اور رُخ جانبِ کعبہ اس کی محسوس علامات

تھی اور رُخ جانبِ کعبہ اس کی محسوس علامت۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو کعبہ کی حیثیت نماز میں "منہ طرف قبلہ شریف" کی رہ گئی اور اس کی اہمیت کا یہ عالم کہ کسی نمازی کا رُخ ذرا ادھر ادھر ہو جائے تو دُہائی مچا دی جائے کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ رُخ سیدھا کر کے نماز پھر پڑھو۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی سامنے نہیں لایا جاتا کہ اس سلسلے پروگرام سے مقصد کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے بار بار متنبہ کیا ہے کہ دیکھنا کہیں ان محسوس شعائر کو مقصود بالذات نہ بنا لینا۔ چنانچہ سابقہ صفحات میں زیرِ آیت (۲/۱۱۵) کہا گیا کہ تم کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ خدا مغرب کی سمت (کعبہ میں) رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اُسے اپنا گھر (بیتی) کہہ کر پکارا ہے۔ خدا نہ مشرق میں رہتا ہے نہ مغرب میں۔ مشرق و مغرب جملہ کائنات اس کی مملکت ہے اور وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا کہ:-

(۲/۱۷۷) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ - (۲/۱۷۷)

برّ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔

لفظ برّ کا ترجمہ نیکی کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ جلد دوم صفحہ ۲۱۹ زیرِ آیت (۲/۴۴) بتایا جا چکا ہے، اس کا مفہوم اس سے

وسیع تر ہے۔ اسے آپ کشاد اور کامیابی کی راہ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ کشاد، کامیابی اور فائز المرامی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف — غور کیجئے کہ یہ بھی حکم ہے کہ: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ: (۲/۱۴۴ : ۲/۱۴۹)۔ "تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنا رخ اس کی طرف رکھو" اور یہ بھی کہ کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ پہلا حکم، ایک بلند مقصد کے حصول کے ذریعے (MEANS) کے طور پر ہے اور دوسرا اس تنبیہ کے لئے کہ تم اس ذریعہ کو مقصدِ زندگی (END) نہ سمجھ لینا۔ پہلا حکم (مثال کے طور پر) یہ ہے کہ ٹکٹ ضرور خریدو، اور دوسرا حکم یہ کہ ٹکٹ کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ مقصود و مطلوب تو منزل تک پہنچنا ہے ٹکٹ صرف اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے دین اور مذہب کے فرق کو کس طرح چار لفظوں میں واشگاف کر کے رکھ دیا اور مذہبی پیشوائیت کی غلط نگہی کا پردہ چاک کر دیا۔

جب یہ کہا کہ کشاد کی راہ یہ نہیں تو اس سے فطری طور پر دل میں یہ خیال ابھرا کہ اگر کشاد کی راہ یہ نہیں تو پھر کشاد کی راہ کون سی ہے؟ قرآنِ مجید نے فوراً اس سوال کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ — کشاد کی راہ یہ ہے کہ ......

اور اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ جو کچھ اگلے الفاظ میں کہا گیا ..... کس قدر اہم ہے۔ یوں کہیئے کہ وہ دین کا ملخّص ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں سامنے لایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ:-

۲/۱۷۷ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔ (۲/۱۷۷)

کشاد کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر۔ قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی پر، ملائکہ پر۔ انبیاء کرام پر جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے۔ اور ان کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر۔

اجزائے ایمان

ایمان کا مفہوم کیا ہے، اسے جلد اوّل ص۲۷ زیرِ آیت (۲/۳) بیان کیا جا چکا ہے۔ اللہ پر ایمان کا مفہوم ص۱۱ زیرِ آیت (۱/۱)۔ انبیاء کرامؑ، کتبِ سابقہ اور آخرت پر ایمان کا مطلب ص۱۴۳-۱۴۴ زیرِ آیت (۲/۴) ہیں۔ ملائکہ کے متعلق جلد دوم ص۶۶ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اجزائے ایمان یہی پانچ ہیں[1]۔ اور دوسری بات یہ کہ ایمان جذبۂ محرکہ ہوتا ہے عملِ صالح کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر جگہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ کو لازم و ملزوم کر دیا ہے۔

(1 فٹ نوٹ ص۱۵۶ پر ملاحظہ کریں)

نہ ایمان، بلا عمل کچھ قیمت رکھتا ہے نہ اعمال بلا ایمان منتیجہ خیز ہو سکتے ہیں۔ جب تک آپ کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ ٹکٹ خرید کر ریل میں سوار ہو جانے سے آپ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے، آپ نہ ٹکٹ خریدیں گے نہ ریل پر سوار ہوں گے۔

یوں ایمان، انسان کے لئے جذبۂ محرکہ بنتا، یا اسے آمادہ بہ عمل کرتا ہے۔ اور اگر آپ اس یقین کے ہوتے ہوئے بھی نہ ٹکٹ خریدیں اور نہ ریل پر سوار ہوں، تو بھی آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یوں ایمان بلا عمل کچھ قیمت نہیں رکھتا ــــ مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل۔

اس ایمان کے بعد عمل کے مختلف اجزا سامنے لائے گئے ہیں۔ فرمایا۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ (۲/۱۷۷)

جو شخص مال و دولت کی کشش کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے ــــ وہ ان کے رشتہ دار ہوں یا قرب و جوار میں بسنے والے دیگر افراد۔ یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا یا لا وارث رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ یا ان میں کام کرنے کی صلاحیت یا استعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں۔ انہیں آزادی دلانے کے لئے کشادگی راہ ان کی ہے جو اس قسم کے مقاصد کے لئے اپنی زائد از ضرورت دولت کو وقف کر دیں۔

ان اجزاء کا مفہوم تو واضح ہے لیکن چونکہ قرآنِ کریم انہیں البِرّ (کشادگی راہ) کے بنیادی اور لازمی ارکان کی حیثیت سے بیان کیا ہے اس لئے ان کی تھوڑی سی مزید وضاحت غیر از محل نہ ہوگی۔ اس لئے بھی کہ آئندہ چل کر یہ اصطلاحات بار بار سامنے آئیں گی۔

ایتائے مال علیٰ حبّہٖ۔ یعنی مال و دولت کی کشش کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دینا۔

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۵) یہ جو ہمارے ہاں ایمان کی تفصیل یوں بتائی جاتی ہے کہ "اٰمنت باللہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت۔ تو اس میں" والقدر خیرہٖ وشرہٖ"... کا اضافہ خارج از قرآن ہے اور مسئلہ تقدیر کو جزوِ ایمان قرار دینے کی عجمی سازش ــ تفصیل اس کی میری تصنیف ــ کتاب التقدیر ــ میں ملے گی۔

ان اجزا کی تشریح

اسے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (۳/۹۱)۔ "تم کامیابی (بِرّ) سے ہمکنار ہو نہیں سکتے جب تک تم اپنی پرکشش متاع کو (دوسروں کی ضروریات کے لئے) کھلا نہ رکھو"۔ انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۱۰۵ زیر آیت (۲/۳)، شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیا جائے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ جب نظامِ اسلامی قائم ہو جاتے تو پھر ہر شخص کی زائد از ضرورت کمائی اس نظام کی تحویل میں چلی جائے گی جو اسے ان مقاصد (یا ان جیسے دیگر مقاصد) کے لئے اجتماعی طور پر صَرف کریگا۔ لیکن جب وہ نظام ہنوز قائم نہ ہو تو انفاق انفرادی طور پر ہوگا۔ قرآنِ کریم میں انفرادی انفاق (جسے صدقہ اور خیرات کہہ لیجئے) سے متعلق احکام اس عبوری دور کے لئے ہیں جب وہ نظام زیرِ تشکیل ہو۔

ذوی القربیٰ

انفاق کے لئے ابتدا ذوی القربیٰ سے کی گئی ہے۔ اس کے عمومی معنے ہوں گے "تمہارے قرب و جوار میں بسنے والے ضرورت مند لوگ"۔ لیکن اصطلاحی طور پر القُربیٰ کے معنے ہوتے ہیں رشتہ داری۔ اس لئے ذَوِی القُربیٰ کے معنی ہوں گے رشتہ دار۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اصلاح کا آغاز ہر فرد کے قریبی دائرے سے کرتا ہے اور پھر اسے وسعت دے کر پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے انفرادی انفاق کے لئے بھی ابتدا اس سے کی کہ تم اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاؤ اور ان میں جو صاحبِ احتیاج ہوں ان کی امداد کرو۔ اور پھر اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے جاؤ۔

یتامیٰ

ہمارے ہاں یتیم سے مراد صرف وہ بچے لئے جاتے ہیں جن کے ماں باپ مرجائیں۔ لیکن عربی زبان (اور قرآنِ کریم) میں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بھی آتا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ جائیں۔ آپ غور کیجئے۔ قرآنِ کریم نے اس ایک لفظ سے کتنی وسیع حقیقت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس کی تشریح جلد دوم صفحہ ۳۴۹۔ آیت (۲/۸۳) میں کی جا چکی ہے۔ اس نے بھرے معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنیوالوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ دیا کہ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ (۹۰/۱۵)۔ "اس قدر قربا کی موجودگی میں یتیم"۔ بھری دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے والا! اُف! کس قدر حزن انگیز ہے تنہائی کا یہ احساس! فانی کے الفاظ میں :-

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنا سے — بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

لہٰذا، کشادگی راہ اُسی پر کھلے گی جو ہر اس شخص کا ساتھی بن جائے جو اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس کرے۔

مساکین ہمارے ہاں مسکین کا تصور عجیب و غریب قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مادہ (س۔ک۔ن) ہے جس کے معنی ہیں ساکن ہو جانا۔ حرکت کا باقی نہ رہنا۔ اس لئے انفرادی طور پر مسکین وہ شخص ہوگا جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی وجہ سے رُک جائے یا جس میں کام کاج کرنے کی سکت نہ رہے اور یوں وہ محتاج ہو جائے۔ اور اجتماعی طور پر مسکین وہ قوم ہوگی جس پر مسکنت کا عذاب طاری ہو جائے۔ یعنی جس میں قوتِ عمل نہ رہے۔ جس پر جمود و تعطل طاری ہو جائے۔ یہاں ان لوگوں کی مالی امداد کرنے کے لئے کہا گیا ہے جن کا کاروبار رُک جائے۔ یا جو محنت کرنے سے طبعی طور پر معذور ہو جائیں۔ (تفصیل اس کی جلد دوم صفحہ ۳۵ آیت (۲/۸۳) میں گزر چکی ہے۔)

ابن السبیل سبیل کے معنی راستہ ہیں اور ابن السبیل کے عمومی معنی مسافر کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن عربوں کے ہاں یہ اصطلاح بالخصوص اس مسافر کے لئے استعمال کی جاتی تھی جس کا زادِ سفر ختم ہو جائے۔ اور اس طرح وہ اس ملک کے باشندوں کی مدد کا محتاج ہو جائے جس میں وہ سفر کر رہا ہو۔ آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے کہ قرآنِ کریم نے جن لوگوں کی مالی امداد کی تاکید کی ہے ان میں مسلمان و غیر مسلم کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ مدد کا محتاج کوئی بھی ہو، اہلِ ایمان پر اس کی امداد ضروری ہو جاتی ہے۔ اگلی شق ہے:۔

سائلین ہمارے ہاں سائل (سوالی) سے مراد مانگنے والے ہوتے ہیں جنہیں فقیر بھی کہا جاتا ہے۔ عربی لغت میں لفظ سوال کے معنی احتیاج کے ہوتے ہیں۔ اس لئے سائل کے معنی ضرورت مند یا صاحبِ احتیاج کے ہیں۔ مسکین اور سائل میں یہ عمومی فرق سمجھئے کہ مسکین تو وہ ہے جو کام کاج سے معذور ہو جائے لیکن سائل وہ ہے جو کام تو کرے لیکن اس کی کمائی اس کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔

یہاں پھر اس کی وضاحت کر دی جائے کہ احتیاج کی یہ شکلیں غیر قرآنی نظام میں پیدا ہوں گی۔ قرآنی نظام میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ پر ہوگی۔ تفصیل جلد اول صفحہ ۱۰۵۔ زیر آیت (۲/۳) میں گزر چکی ہے۔ اگلی شق ہے:۔

فی الرّقاب اَلرَّقَبَةُ گردن کو کہتے ہیں۔ اور رَقَبَہٗ کے معنی ہیں اس نے اس کی گردن میں رسّی ڈال کر اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اس لئے فی الرّقاب کے معنی ہیں غلام۔ ہمارے دور میں غلامی (SLAVERY) کی وہ شکل اب کم و بیش ختم ہو گئی ہے جسے عہدِ جاہلیت کی لعنت کہا جاتا تھا۔ لیکن اس نے اب جو مہذب شکل اختیار کی ہے (یعنی کسی قوم کو اپنا محکوم بنا لینا) وہ اس سے بھی زیادہ اذیت رساں اور وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس لئے اب فی الرقاب میں وہ قومیں بھی آ جائیں گی جن کی آزادی سلب کر لی گئی ہو اور

وہ اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ ان کی مدد کرنا جماعت مؤمنین (اسلامی مملکت) کا فریضہ ہوگا۔ جہاں تک زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں میں رائج غلامی کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے اسے کس طرح ابدی طور پر ختم کرایا اسکی بابت جلد اوّل صفحہ ۲۶ آیت (۲/۱۷۷) اور جلد دوم صفحہ ۳۵۸ آیت (۲/۸۵) میں لکھا جا چکا ہے۔ جو غلام اور لونڈیاں

تحریر رقبۃ

عربی معاشرے میں پہلے سے موجود تھے قرآنِ کریم نے ہر موقع پر انہیں آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لئے اس نے تحریر رقبۃ کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی غلام اور محکوم کو آزاد کرنا (مثلاً) قتلِ خطاء کے کفارہ کے طور پر تحریر رقبۃ (۴/۹۲)۔ لغو قسموں کے توڑنے کا کفارہ تحریر رقبۃ۔ (۵/۸۹)۔ ظہار (بیبیوں کو ماں وغیرہ کہہ دینے کی لغویت) کا کفارہ تحریر رقبۃ (۵۸/۳) اسی طرح قرآنِ کریم نے صدقات کے مصارف میں بھی فی الرّقاب۔ کو مستحق امداد قرار دیا ہے۔ سوچئے کہ جو قرآن قدم قدم پر غلاموں کو آزاد کرنے کی تاکید کرتا ہو' وہ دوسروں کو غلام بنا لینے کی اجازت دے گا؟ لیکن ان لوگوں کا کیا علاج جو آج بھی جنگ میں قید شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کو شریعت کا حکم قرار دیتے ہیں؟ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۵۶۔ آیت (۲/۸۵)۔ یہ ہیں وہ امداد کے مستحق جن کی مالی امداد کو قرآن کریم نے بِرّ کی راہ قرار دیا ہے۔ ان شقوں کا دیگر متعدد مقامات پر بھی ذکر آیا ہے۔ ان میں سے دو ایک مقامات کا یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سورۃ البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو حیوانات کے مقابلہ میں صاحب ارادہ کیا بنایا کہ اس نے سمجھ لیا کہ مجھے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو گیا ہے۔ میں جس طرح جی چاہے زندگی بسر کروں۔ مجھے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ وہ تن آسانی کی زندگی گزارنے اور مفاد پرستی کی آسان راہ اختیار کرنے کو پسند کرتا ہے۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ

دین کی گھاٹی

(۹۰/۱۱) اور ہمت طلب اور صبر آزما راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتا۔ اس راستے کے لئے العقبۃ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ یہ "دین کی راہ" کی بڑی برجستہ اور جامع تشبیہ ہے۔ پہاڑ پر ایک تو بھاگ کر نہیں چڑھا جاتا، قدم قدم، آہستہ آہستہ بتدریج چڑھا جاتا ہے۔ پھر اس میں سانس پھول جاتی ہے تکان بھی ہو جاتی ہے لیکن یہ راستہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی دین کی راہ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ: وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ (۹۰/۱۲)۔ تو خود نہیں جان سکتا کہ العقبۃ کیا ہے۔ اسے تمہیں ہم بتاتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ دین کی اس دشوار گزار، ہمت طلب راہ کی تفصیل کیا ہے۔ فرمایا فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳)۔ یہ کہ انسان صرف اپنی فکر نہ کرے۔ بلکہ یہ دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی مستبد قوت کی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں تو

نہیں جکڑی ہوتی۔ لہٰذا کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اطاعت اور محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جائے جس میں ہر انسان گردن اُٹھا کر چلے۔ جس میں ہر ایک کو حریت اور آزادی حاصل ہو۔

اس گھاٹی کا اگلا قدم کیا ہے۔ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ۔ (۹۰/۱۴)۔ جب اور جہاں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر کمزور انسانوں کے لئے بھوک اور واماندگی کو عام کر دیں۔ یعنی سامانِ زیست ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص ہو جائے تو وہ نظام ان لوگوں کے رزق کا اہتمام کرے جنھیں محتاج بنا دیا گیا ہو۔

تیسرا قدم یہ کہ جب اور جہاں ایسا باطل معاشرہ قائم ہو جس میں کمزور انسان ہزارہا انسانوں کے درمیان رہتے ہوتے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائے ۔ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ۔ (۹۰/۱۵)۔ تو یہ نظام ان بے یار و مددگار انسانوں کا رفیق و یاور بنے اور انہیں تنہا محسوس نہ ہونے دے۔

اور چوتھا قدم ۔ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَۃٍ۔ (۹۰/۱۶)۔ جس معاشرہ میں یہ حالت ہو کہ ایک معذور انسان بھی اپنی روٹی کمانے کے لئے دن بھر مٹی میں لتھڑا رہے۔ یعنی محنت کش طبقہ کی یہ حالت ہو، اس معاشرہ کو بدل کر ایسا نظام قائم کرے جس میں ہر فرد اپنی معاش کی طرف سے بےفکر ہو جائے۔ یہ ہے اَلْعَقَبَۃُ کی تشریح۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ راستہ بڑا ہمت طلب ہے اور تنہا نہیں کاٹا جا سکتا۔ یہ اجتماعی سفر ہوتا ہے۔ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَۃِ۔ (۹۰/۱۷) ایسا شخص اس کارواں میں شامل ہو جاتا ہے جس کے افراد خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تاکید و تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ اس راہ میں ثابت قدم رہیں اور خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃِ۔ (۹۰/۱۸) یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو صاحب یمن و سعادت ہیں جنہیں زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔

سورۃ الفجر میں ہے کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ دے تو وہ بڑا تلوّن مزاج اور عجلت پسند ہو جاتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَ نَعَّمَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ۔ (۸۹/۱۵)۔ جب ایسے شخص کو خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اس مرفہ الحالی میں کتنے اور عوامل شریک ہیں۔ اور یہ ان سب کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں کسی اور کا کیا عمل دخل ہے؟ یہ خدا کا فضل ہے جس سے اس نے مجھے نوازا ہے۔ یعنی اس کے لئے نہ کوئی قاعدہ مقرر ہے نہ قانون۔ وہ جسے چاہے، عزت اور آسائش

عطا کر دے۔ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ۔ (۸۹/۱۶)۔ لیکن جب اس کی زندگی دوسرا رُخ بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ چیخنے چلّانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق بلاسبب ذلیل و خوار کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے یونہی بلاسبب اور بلا قاعدہ ہو جاتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خدا نے تمہیں ناحق یونہی ذلیل کر دیا۔ ناحق ذلیل نہیں کر دیا۔

یتامیٰ کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ۔ (۸۹/۱۷)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے معاشرہ ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں عزت کا معیار دیانت و شرافت نہیں، بلکہ جتھہ اور پارٹی تھا۔ جس کی پارٹی زیادہ قوت والی تھی اس کی عزت و توقیر ہوتی تھی۔ جو تنہا رہ جاتا تھا (یتیم)، اس کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا۔ تکریم اور عزت کے معیار بدلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تم ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ جتھہ کی مضبوطی اور اکثریت کا معیارِ عزت و اقتدار ہونا عہدِ جاہلیت ہی کی روش نہیں۔ اس دورِ تہذیب و تمدّن میں بھی حکومت و سطوت اور قوت اور عزت کا یہی معیار ہے۔ آج جمہوریت (ڈیموکریسی) کو، ساری "مہذب" دنیا میں، بہترین اور مسلّمہ اندازِ تمدّن سمجھا جاتا ہے۔ جمہوریت اس کے سوا کیا ہے کہ جس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو، زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قوت، جاہ و حشمت، عزت اور

جمہوریت کا بنیادی نقص

دولت سب زمامِ اقتدار کے ساتھ بندھے چلے آتے ہیں۔ جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کو کوئی پوچھتا نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، جمہوریت وہ نظام ہے جس میں :-

بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ جو تنہا رہ جائے اس کی خبر گیری کیا کرو۔ کہا یہ ہے کہ جو تنہا رہ جائے اسے ذلیل مت سمجھو۔ اس کی عزت کرو۔ یعنی معیارِ تکریم، پارٹی یا جتھہ یا قبیلہ یا خاندان قرار نہ دو۔ جوہرِ ذاتی وجہِ توقیر سمجھو۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (۴۹/۱۳)۔ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ جس کا کردار سب سے بلند ہو۔ دوسری جگہ کہا (اَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ۔ (۹۳/۹) جو تنہا رہ جائے۔ اسے دھتکارا نہ کرو۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ قرآنی نظام میں تنہا رہ جانے والوں کے محض روٹی کپڑا کا انتظام نہیں کیا جائے گا۔ انسان ہونے کی جہت سے ان کی عزت بھی کی جائے گی۔ بالفاظِ دیگر انہیں اس معاشرہ میں رزقِ کریم حاصل ہوگا — باعزت سامانِ زیست۔

بتایا جا رہا تھا کہ خدا کسی قوم کو یونہی ذلیل وخوار نہیں کر دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قوم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں (۱) یتیم کی عزت نہیں ہوتی تھی اور (۲) لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔ (۸۹/۱۸)۔ جس کی چلتی گاڑی کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتی تھی، صاحبِ استطاعت لوگ نہ اس کی خود مدد کرتے تھے نہ دوسروں کو اس کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ یہاں پھر اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنی نظام میں سائل ومحتاج کے رزق ہی کا انتظام نہیں کیا جاتا، ان کی عزت اور خودداری پر بھی حرف نہیں آنے دیا جاتا۔ اس میں وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (۹۳/۱۰)۔ سائل اور محتاج کو قابلِ نفرت نہیں سمجھا جاتا۔

(۰)

بات یہ چلی آرہی تھی کہ کامیابیوں کے راستے اس طرح کشادہ نہیں ہوتے کہ تم پرستش کی چند رسوم کو میکانکی طور پر ادا کر لو اور سمجھ لو کہ ہم فریضۂ خداوندی کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گئے۔ کامیابیوں کے راستے ان پر وا ہوتے ہیں جو ہر صاحبِ احتیاج کی مدد کرتے اور محکوموں اور غلاموں کی آزادی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے بعد کہا:۔

۲/۱۷۷ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ (۲/۱۷۷)

اور اس کے ساتھ وہ لوگ ہی ایسا نظام قائم کرتے ہیں جن میں تمام افرادِ معاشرہ احکام وقوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق جلد اول صفحہ ۹۷-۱۴۲۔ زیر آیت (۲/۳) تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کے بعد کہا:۔

۲/۱۷۷ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ۔ (۲/۱۷۷)

وہ ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں۔ اس کی تشریح جلد اول صفحہ ۱۰۵۔ زیر آیت (۲/۳) اور جلد دوم صفحہ ۲۰۔ زیر آیت (۲/۴۳) کی جا چکی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ نظامِ خداوندی کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے اور ان کی انسانی صلاحیتیں پروان چڑھتی جائیں۔

زکوٰۃ کی مزید تشریح

یہاں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مفہوم فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جمع شدہ دولت کا ایک خفیف سا حصہ سال کے بعد بطورِ خیرات دے دیا جائے۔ لیکن اس آیت میں کہا گیا ہے کہ کامیابیوں کی راہ ان پر کھلتی ہے جو اٰتَى الْمَالَ .... دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد کہا۔ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ..... جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ سے مراد مال دینا ہی ہوتا تو یہ بات "اٰتَى الْمَالَ" سے پوری ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد اٰتَى الزَّكٰوةَ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ، ایتائے مال سے کچھ الگ چیز ہے۔ یا یوں کہیے کہ فقط اٰتی المال

سے ایتائے زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) ایتائے زکوٰۃ سے مراد ہے انسانی ذات یا صلاحیتوں کی نشوونما کا اہتمام کرنا۔ اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہو گی لیکن یہ چیز اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہو گی۔ خود مقصد نہیں ہو گی۔

—— (۱) ——

اب آگے بڑھیئے۔ کہا کہ کامیابیوں کی راہ اُن پر وا ہو گی۔

۲/۱۷۷ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ...... (۲/۱۷۷)

اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن وعدہ اور عہد میں ایک اہم فرق ہے۔ وعدہ تو ہر (PROMISE) کو کہتے ہیں۔ یہ عام طور پر انفرادی ہوتا ہے۔ لیکن عہد کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا۔ اسکی پیہم نگہداشت کرنا۔ اور (۲) ذمہ داری۔ لہٰذا، عہد کے معنی ہوں گے اپنی ذمہ داریوں کی پیہم نگہداشت کرنا۔ اس سے ایفائے عہد کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

ایفائے عہد

سورۃ المؤمنون میں، مومنوں کی چند ایک بنیادی خصوصیات کا ذکر ہے۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (۲۳/۸)۔ "وہ اپنی امانات اور عہد کی نگہداشت کرتے ہیں"۔ اس میں دو چیزیں، امانات اور عہد، الگ الگ آئی ہیں۔ اس میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔

جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی وہ ایک مثالی نظام حکومت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس نے عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے مختلف نظام وضع اور اختیار کئے اور جب وہ ناکام ثابت ہوئے تو ان کی جگہ دوسرے نظام اپنائے۔ اس کی یہ مسلسل ناکام کوششیں بالآخر اس نظام پر منتج ہوئیں جسے جمہوری نظام کہا جاتا ہے اور جو آج کل ساری (مہذب) دنیا میں رائج ہے اور جسے فکر انسانی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے جمہوری نظام کی بنیاد نظریہ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) پر استوار.... ہے جس کا بانی رُوسو (ROUSSEAU. 1712 - 1778 A.D) کو قرار دیا جاتا ہے: اگرچہ اس سے پہلے ہابز اور لاک جیسے مفکرین نے بھی اس کا تصور پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مملکت اور افرادِ مملکت میں ایک میثاق (معاہدہ) ہوتا ہے جس کی رُو سے افراد اپنے ذمہ کچھ فرائض لے لیتے ہیں اور ان کے عوض مملکت ان افراد کے حقوق ادا کرتی ہے لیکن اس نظریہ کا بنیادی سقم یہ ہے کہ اس میں افراد

نظریہ میثاق

اور مملکت کو دو الگ الگ فریق تصور کر لیا جاتا ہے۔ جبھی تو ان میں میثاق قرار پاتا ہے۔ میثاق ہمیشہ دو فریقوں کے مابین ہوتا ہے۔ لیکن مملکت یا حکومت تو افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے وہ افراد سے الگ، ایک فریق (فریقِ مقابل) کس طرح بن سکتی ہے؟

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، نظریۂ میثاق کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کا بانی روسو ہے لیکن جن کی نگاہیں تاریخ کے وسیع افق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ نظریہ روسو سے صدیوں پہلے قرآن مجید نے پیش کیا تھا اور وہ اس سقم سے منزّہ تھا جو روسو کے نظریہ میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے نظامِ مملکت کے بنیادی تصور کے متعلق کہا ہے کہ۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)۔ "اللہ مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور ان کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے"۔ یہ ہے وہ میثاق جو خدا اور مومنین کے مابین طے پاتا ہے۔ اس کی رُو سے خدا اور مومنین دو الگ الگ فریقوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ایک فریق (مومنین) کچھ فرائض (OBLIGATIONS) اپنے ذمہ لے لیتا ہے — یعنی عند الطلب مال اور جان حاضر کر دینا — اور دوسرا فریق (خدا) انہیں کچھ حقوق (RIGHTS) عطا کر دیتا ہے۔ یعنی الجنّة۔ آیت (۲۳/۸) میں مومنین کے ان فرائض کو "امانات" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ فرائض جن کی ادائیگی کے بعد ان افراد کو ہر طرح کے امن کی ضمانت مل جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم میں الجنّة سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ..... (۷/۴۹)۔ "تم جنت میں داخل ہو جاؤ جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن"۔ (اس کی تشریح جلد دوم صفحہ ۱۳۳۔ آیت (۲/۳۸) میں کی جا چکی ہے) آپ نے دیکھا کہ اس نظریۂ میثاق میں دو فریق موجود ہیں جن میں ایک کے ذمے امانات ہوتی ہیں (یعنی فریقِ مقابل کے سپرد کچھ کر دینا) اور دوسرے کے ذمہ عہد (یعنی اس کے بدلے میں کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینا)۔ فریقِ اوّل (خدا) فریقِ ثانی (مومنین) کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اس کی طرف سے اس عہد کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہو گی۔ فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ۔ (۲/۸۰)۔ لیکن اس عہد کے پورا کرنے کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ فریقِ مقابل بھی اپنے عہد (ذمہ داریوں) کو پورا کرے۔ فرمایا۔ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ۔ (۲/۴۰) "تم اپنا عہد پورا کرو، میں اپنا عہد پورا کروں گا"۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ خدا تو ایک بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) ہے۔ وہ اس میثاق میں عملاً فریق کس طرح بن سکے گا؟ یہ تو محض ذہنی نظریہ یا عقائد کا میثاق ہوگا جو محسوس شکل (CONCRETE FORM) میں استوار نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اللہ نے خود ہی یہ واضح کر دیا کہ یہ محض نظری میثاق نہیں ہوگا۔ عملی

امانات کا مفہوم

اور محسوس میثاق ہوگا۔ اور وہ اس طرح کہ نظامِ خداوندی کا سربراہ (یا اربابِ حل و عقد) جو خدا کی جانب سے (ON BEHALF OF ALLAH) یہ عہد کریگا، وہ اس کے پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ سورۃ الفتح میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۔ (۴۸/۱۰) "اے رسول! (آیت ۹/۱۱۱ میں بیان کردہ میثاق کی رُو سے) جو مومن اپنی جان اور مال کو تیرے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خدا کے ہاتھ بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اس معاہدہ کی توثیق کے لئے ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں ہوتا درحقیقت خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔" اب ظاہر ہے کہ جو سربراہِ نظامِ خداوندی، خدا کی جانب سے یہ معاہدہ کرتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرتا ہے جو انسانوں کے سلسلہ میں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ (تفصیل ان امور کی جلد اول صفحہ ۱۱۲ آیت (۲/۴) میں گزر چکی ہے)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ آیت (۲/۱۷۷) میں جو کہا گیا ہے کہ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتے ہیں انہیں پورا کرتے ہیں۔ یہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اس نظام میں اسلامی حکومت اس طرح قائم ہوتی ہے۔ اس میں ذمہ دار ارکان سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے عہد کو پورا کرو اور دیگر افرادِ مملکت سے تاکید کی جاتی ہے کہ تم اپنی امانت میں خیانت نہ کرو۔ (۸/۲۷)۔

حقوق و فرائض

——— (○) ———

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، بینات اور کتاب (دلائل اور قوانین و احکام) کے بعد اگلا مرحلہ شمشیر کا آتا ہے۔ یعنی مفاد پرست گروہ اس نظام کی مخالفت میں میدانِ جنگ تک میں اُتر آئیں گے اور اس نظام کے حامیوں پر یہ فریضہ عائد ہو جائے گا کہ وہ ان کی مدافعت بزورِ شمشیر کریں۔ یہ مرحلہ بڑا جانگداز اور مشقت طلب ہوگا۔ اس لئے کشاد کی راہ طلب کرنے والوں کی اگلی خصوصیت یہ بتائی :-

۲
۱۷۷

وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ۔ (۲/۱۷۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو مصائب و مشکلات کا مقابلہ نہایت استقامت سے کرتے ہیں اور تزاحم و تصادم کے وقت جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میدانِ جنگ میں

اَلۡبَاۡسُ۔ سخت مصیبت، بالخصوص میدانِ جنگ میں پیش آنے والی مشکلات کو کہتے ہیں۔ اربابِ لغت نے کہا ہے کہ اَلۡبَاۡسُ۔ مال و دولت کے نقصان کو کہتے ہیں اور اَلضَّرَّآءُ جسمانی نقصان کو۔

ان تصادمات میں مصائب اور نقصانات کی تفصیل آیت (۲/۱۵۵) میں سامنے آچکی ہے۔ یہاں بھی اسی قسم کے مصائب اور ضیاع و زیاں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہاں بھی بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ کہا گیا تھا، یعنی خوشگواریوں کی نوید جانفزا ہے ان کے لئے جو ..... ایسے صبر آزما مراحل میں ثبات و استقامت کا ثبوت دیتے اور اس طرح خدا کی تبریک و تہنیت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ (۲/۱۵۵)۔ یہاں کہا کہ :-

۲/۱۷۷ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (۲/۱۷۷)

یہ ہیں وہ جو اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں اور انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو متقی کہہ کر پکاریں۔ یعنی یہ کہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوتے راہِ حیات میں آنے والے خطرات سے محفوظ رہتے ہیں۔

آپ "اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا" پر غور کیجئے اور جھوم جھوم جائیے۔ بات یوں شروع کی گئی تھی کہ کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم احکامِ خداوندی کے ظواہر کی کس قدر پابندی کرتے ہو۔ ظواہر (رسوم و مناسک) کی ادائیگی تو نہایت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ ان کی ادائیگی دعویٰ ایمان کا ثبوت نہیں۔ اس کا ثبوت وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو دین کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی جان اور مال کو قربان کر دیتے ہیں۔ انہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مومن اور متقی کہیں۔ یہ ہے دین اور مذہب میں فرق!

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور (اقبالؒ)

مذہب میں ساری نیکیاں "منہ طرف قبلہ شریف" میں سمٹ آتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا جہادِ عظیم، نمازیوں کا رُخ سیدھا کرنا قرار پاجاتا ہے ـــ ان نمازیوں کا جن میں سے (امام سمیت) ہر ایک کا قبلۂ مقصود الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ وہ "باجماعت نماز" ہوتی ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰی (۵۹/۱۴) تم خیال کروگے کہ یہ سب ایک جماعت ہیں۔ یہ ایک جماعت نہیں۔ ان کے صرف جسم ایک قطار میں نظر آتے ہیں، دل ان کے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

خدا کا اعلان ہے کہ اس قسم کی ظواہر پرستی (لَیْسَ الْبِرَّ) کوئی نیکی نہیں۔ لیکن جنت کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہی اصل نیکی ہے۔ تم (معاذ اللہ) خدا کی باتوں پر نہ جاؤ۔ تم وہی کیے جاؤ جو ہم کہتے ہیں۔ ہم تمہیں جنت میں داخل ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دینگے!

(۰)

بیّنات کے بعد اب کتاب کی طرف آئیے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔
پیچھے سے بات ذرائع اور مقاصد کی چلی آ رہی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اگر ذرائع کو مقصد سمجھ لیا جاتے تو ایسے لوگوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ ان کی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ذرائع بیکار ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ اور جب اس خیال کو تقویت پہنچانے' بلکہ مقدس بنانے کے لئے تصوّف آگے بڑھے' تو ذرائع (مادی اسباب) سے نفرت برتنا اور انہیں ترک کر دینا، دین کا منشاء و مقصود قرار پا جاتا ہے۔ قرآن کریم بڑی پُر حکمت کتاب ہے۔ اور اس قسم کے وساوس پہلے سے اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (۵۰/۱۶)۔ خدا کا ارشاد ہے۔ (یعنی ہم انسان کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو بھی جانتے ہیں)۔ چنانچہ وہ ایسے مواقع پر اس قسم کے وساوس کے ازالہ کا ساتھ ہی انتظام کر دیتا ہے۔ سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ حق کی مدافعت میں مصائب و مشکلات کا استقامت سے مقابلہ کرنے والے سچے مومن ہیں۔ اور اگر وہ اس مقابلہ میں جان دے دیں تو وہ حیاتِ جاوید کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کے نزدیک انسانی جان کی چنداں اہمیت یا قدر و قیمت نہیں۔ اگلی آیت میں (جو اب ہمارے زیر نظر آئے گی) اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

ہم نے ذریعہ اور مقصد کے تعلق کو سمجھانے کے لئے ریلوے ٹکٹ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی مثال دی تھی۔

مقصد اور ذرائع

اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ آپ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے گھوڑے پر سفر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں مقصد منزل تک پہنچنا ہے اور گھوڑا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ تصوّف نے کہا کہ گھوڑا بے کار شے ہے بلکہ حصولِ مقصد کے راستے میں رکاوٹ۔ اس لئے اسے ہلاک کر دینا چاہیئے۔ ترکِ دنیا اور نفس کُشی کا یہی مفہوم ہے۔ سیکولر تصوّر نے کہا کہ گھوڑا ہی مقصدِ حیات ہے۔ ساری توجہ اسی پر مرکوز کر دینی چاہیئے۔ یعنی زندگی اسی دنیا کی زندگی' اور اس کا مقصد انسانی جسم کی آسائش و زیبائش ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں نظریات کی تردید کی اور کہا کہ گھوڑا اگرچہ منزلِ مقصود نہیں لیکن منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے اس کی نگہ پرداخت، پرورش اور حفاظت بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے موجودہ زندگی میں انسان کا مقصد اس کی ذات کی نشو و نما ہے۔ لیکن یہ نشو و نما (زندگی کی موجودہ سطح پر) مادی اسباب و علائق اور انسانی جسم و جان کے ارتباط ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے تسخیرِ مادہ اور جسم و جان کی پرورش و حفاظت بھی نہایت ضروری ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات کا باہمی تعلق کیا ہے' اس کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۱-۱۲۔ آیت (۲/۲) وصفحہ ۱۶۲،

مادی اسباب کی اہمیت

آیت (۲/۹) وصفحہ ۲۰۶ آیت (۲/۹) وصفحہ ۲۵۰ آیت (۲/۱۹)۔ نیز جلد دوم باب اول میں نفس کے عنوان میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور دنیا اور آخرت کے باہمی تعلق کے متعلق جلد اول ص۲۵۳ آیت (۲/۱۴) کے تحت۔ یہاں پیشِ نظر یہ نکتہ ہے کہ قرآنِ کریم انسان کی طبیعی زندگی .... کو مقصود بالذات تو قرار نہیں دیتا لیکن وہ اس کی حفاظت کو ضروری ٹھہراتا ہے ...... اس کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کس قدر ہے، اس کا اندازہ اس ایک آیت سے لگائیے جس میں اس نے کہا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲) "جس نے کسی ایک جان کو بھی ہلاک کر دیا بجز اس کے کہ وہ جرمِ قتل یا فساد برپا کرنے کے جرم کی سزا کے طور پر ہو۔ تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی تلف ہونے سے بچایا، یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی"۔ دوسری

انسانی جان کی قدر وقیمت

جگہ ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۶/۱۵۲)۔ "انسانی جان کو خدا نے قابلِ احترام قرار دیا ہے (اس کا ناحق ضائع کرنا حرام قرار دیا ہے) اس لئے کسی کو ناحق قتل مت کرو (ناحق کے معنی ہیں خلافِ قانونِ خداوندی)۔ انسانی جان کی حفاظت اور قتل و جرائم کی روک تھام کے سلسلہ میں کہا:

۲/۱۷۸ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (۲/۱۷۸)

اے جماعتِ مومنین! تم پر قصاص لازم قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی کی جان محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ جرمِ قتل کے مرتکب کو معاشرہ کی طرف سے سزا ملے۔ سزا کے سلسلہ میں عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی اس میں چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسان کی جان یکساں واجب الاحترام اور قیمتی ہے۔

قصاص کا حکم

(مثلاً) قاتل اگر آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اس کا عورت ہونا اسے سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ اسے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔ جرمِ قتل کی دو صورتیں ہیں۔ قتلِ عمد (بالارادہ) اور قتلِ سہو (نادانستہ)۔ بالارادہ اول الذکر کی صورت میں جرم کی سزا موت ہے یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے موت سے کم کوئی سزا (۴/۹۲-۹۳)۔ خون بہا لے کر اسے چھوڑ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اگر قتل عمداً نہیں کیا۔ یونہی سہواً ہو گیا ہے، تو اس صورت میں (۴/۹۲) کے مطابق دیت — خون بہا — ادا کرنا ہوگا۔ اس دیت کی رقم سے اگر مقتول کا وارث برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے تو اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے (۴/۹۲)۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ جو کچھ طے ہو جائے مجرم اس کی پابندی کرے اور حُسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ قتلِ سہو کے لئے دیت مقرر کرنے میں تمہارے رب کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تمہاری صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ لیکن جو شخص اس طرح معاملہ طے ہو جانے کے بعد زیادتی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

اس آیت میں پہلا لفظ کُتِبَ ہے۔ لفظ کتاب کے متعلق جلد اول صفحہ ۲ آیت (۲/۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی

کُتِبَ کے معنی

ضابطۂ احکام و قوانین کے ہیں۔ اس آیت میں لفظ کُتِبَ سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے معنی ہیں "تم پر لازم قرار دیا گیا ہے، تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمہارے لئے یہ قانون مقرر کیا جاتا ہے"۔ قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی احکام کے سلسلہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

اس میں دوسرا غور طلب لفظ قصاص ہے۔ عام طور پر اس کے معنی سزا کئے جاتے ہیں لیکن اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ اس مادہ (ق۔ ص۔ ص) کے معنی ہیں۔ کسی کا پیچھا کرنا۔ کسی کا تعاقب کرنا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ کوئی جرم (UNTRACED) نہ رہ جائے، کوئی مجرم قانون کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ملزم کا تعاقب کیا جائے تاآنکہ وہ گرفتار ہو جائے۔ اس کے بعد اس پر مقدمہ چلے گا۔ اس کا فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ عدالت میں ملزم، مجرم نہ ثابت ہو، اس لئے اسے کوئی سزا نہ ملے۔ لیکن اس سے قصاص کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔

اس حکم کی رُو سے قصاص کو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ کا فریضہ۔ لہٰذا، اس میں جرائم کا بدلہ لینے کو متعلقہ افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ اسے معاشرہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ جس معاشرہ میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) ہو، اس میں جرم اور اُس کے مواخذہ کی یہی صورت ہونی چاہیئے۔ اس میں

جُرم، متعلقہ افراد کے خلاف نہیں ہوتا، خود حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ اس میں مستغیث افراد نہیں ہوتے خود حکومت ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے (..... CROWN ... VS) کہا جائے گا۔ لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کرے۔ اسے سزا دے۔

اس سے آگے ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، عدل کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے، اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مردِ آزاد کی ہو یا غلام کی، عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصولِ مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مردِ آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مردِ آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل مردِ آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے یہاں عام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ "جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے معافی دے دی جائے تو اُسے چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے"۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ "کچھ معاف کر دینا" (شیءٌ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے "کچھ معاف کر دینے" (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ "کچھ معاف کر دینے" کی شکل اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خون بہا کہا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ القصاص جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ :-

۲/۱۷۹ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (۲/۱۷۹)

اے ارباب عقل و بصیرت اگر تم غور سے دیکھو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ القصاص کے نظام عدل میں تمہاری قوم کی اجتماعی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہو۔

قرآن کریم مناسب تعلیم و تربیت سے قلوب و اذہان میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے افراد معاشرہ خود بخود قانون کی خلاف ورزی (ارتکاب جرم) سے محترز رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جن کے قلب و دماغ میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو اور وہ جرائم کے مرتکب ہوں۔ ان کی اصلاح اور معاشرہ کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے سزا ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قرآن کریم کی روشنی میں مختصر الفاظ میں جرم اور سزا کا فلسفہ سامنے لایا جائے۔

جرم و سزا کا فلسفہ

قرآن کریم میں دو قسم کے احکام ملیں گے — ایک اخلاقی اور دوسرے تعزیری۔ تعزیری سے مراد ہیں ایسے احکام جسے سوسائٹی کا جرم قرار دیا جائے اور اخلاقی احکام سے ایسے احکام مراد ہیں جن کی خلاف ورزی معاشرتی جرم قرار نہ پائے۔ مثلاً: لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا۔ (۱۷/۳۷)۔ (زمین میں اکڑ کر نہ چلو) قرآن کا حکم ہے۔ لیکن یہ ایسا حکم نہیں جس کی خلاف ورزی معاشرہ کا جرم قرار دیا جائے۔ اسی سورت میں دوسرا حکم ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى۔ (۱۷/۳۲) "زنا کے قریب مت جاؤ" ظاہر ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی معاشرتی جرم ہوگی۔ واضح رہے کہ احکام کی اخلاقی اور تعزیری تقسیم محض زیر نظر سوال کے سمجھنے کے لئے کی گئی ہے ورنہ قرآن کریم کے ہر حکم کی بنیاد اصلاح اخلاق پر ہے۔ اور اخلاق سے مراد ہے انسانی ذات کی نشوونما کے ذرائع۔

تعزیری احکام بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن نے خود ہی تجویز کر دی ہے (مثلاً زنا) اور دوسرے وہ جن کی سزا اس نے خود تجویز نہیں کی بلکہ اسے اسلامی نظام پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق ان کی سزا خود متعین کرے۔ مثلاً، اس نے 'الخمر' (عرف عام میں شراب) کے استعمال سے منع کیا ہے لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا مقرر نہیں کی۔

یہ مسئلہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے جن احکام کی سزا خود مقرر نہیں کی، ان میں سے کون کون سے ایسے ہیں

جنہیں تعزیری احکام کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کوئی ایک فرد نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کسی فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی حکم کی خلاف ورزی کو معاشرتی جرم قرار دے کر اسے مستوجب سزا ٹھہرائے۔ یہ فیصلہ اسلامی نظام کے کرنے کا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو فیصلے اسلامی نظام کریگا ان میں وقتاً فوقتاً د بہ تقاضائے حکمت) تبدیلیاں کی جاسکیں گی۔ احکام ہی نہیں، قرآن کریم نے جن امور کو بطورِ اصول بیان کیا ہے، یا جو حدود مقرر کی ہیں، ان کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کو جرم قرار دینا بھی اسلامی نظام کا فریضہ ہے۔ حدود سے مراد ہے اعمال کا وہ دائرہ جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا منع ہے۔ حدود اور اصول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اسلامی نظام کا فریضہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرے جس میں ہر فرد اپنے بنیادی حق، اپنی ہر متاعِ زیست کو اس طرح محفوظ سمجھے کہ اسے اس باب میں ذرا سا تردد، فکر یا تشویش لاحق نہ ہو۔ اسے اس کے متعلق پورا پورا اطمینان اور یقین حاصل ہو۔ قرآنی نظام کا لازمی نتیجہ اس قسم کی فضا کا وجود میں لانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہو گی کہ: لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (۲/۳۸)۔ اس میں انہیں نہ خوف ہو گا نہ حزن۔ وہ اس فضا کو قرآنی اقدار کے مطابق تعلیم و تربیت، اور افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینے سے پیدا کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو "نفسیاتی مریض" ہوں اور ان کا "پاگل پن" افرادِ معاشرہ سے امن و اطمینان کا احساس چھین لے۔ ایسے مریضوں کا علاج ضروری ہے اور جب تک وہ پورے طور پر شفایاب نہ ہوں افرادِ معاشرہ کو ان کے جنون کے پیدا کردہ خطرات سے محفوظ رکھنا از بس لازمی۔ یہ علاج اکثر و بیشتر ان مریضوں (مجرموں) کی قلبی اور ذہنی اصلاح سے ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے لئے بطورِ آخری اقدام تخویف و ترہیب کی بھی ضرورت پیش آتی ہے ___ کئی نفسیاتی امراض ایسے ہیں جن کا علاج خوف کی احساس دہی سے کیا جاتا ہے ___ اس طریقِ علاج کو سزا کہا جائے گا۔ اس سے مقصد اوّلاً حتی الامکان خود اس مجرم کی اصلاح ہوتی ہے اور ثانیاً ان کی اصلاح جن کے تحت الشعور میں ارتکابِ جرم کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں۔ سزا بطورِ انتقام کا تصوّر غیر قرآنی ہے۔

یہ تو رہا سزا کا ایک مقصد۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم نے جس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کے ہاں چوری کی ہے۔ اگر عدالت نے اس مجرم کو دس سال قید کی بھی سزا دے

دی تو اس سے اس مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کا نقصان پورا کیا جائے۔ اگر مال مسروقہ برآمد ہو گیا ہے تو اُسے واپس دلایا جائے۔ اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو مملکت اُسے خود مہیا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ قرآنی تصورِ "جرم وسزا" کی رُو سے مستغیث مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا۔ وہ نظامِ معاشرہ (حکومت) کے خلاف مدعی ہوتا ہے۔ مملکت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کریگی۔ اگر اس متاع پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ مملکت نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک 'مجرم' نظامِ مملکت ہے نہ کہ وہ خاص فرد جس نے ارتکابِ جرم کیا ہے۔ یہ نظامِ مملکت کے دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کراتا ہے یا خود پورا کرتا ہے۔ مظلوموں کو اس سے واسطہ نہیں ــــ نظامِ مملکت کا فریضہ مظلوم یا اس کے وارثوں کا پشت پناہ بننا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا۔ (۱۷/۳۳)۔ اگر نظامِ معاشرہ مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتا تو وہ اس کا پشت پناہ کیسے بن سکتا ہے، اور حامی و ناصر ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر نقصان کی تلافی روپے سے نہیں ہوسکتی۔ لیکن نظامِ مملکت کو بہر حال اس کی تلافی کی شکل پیدا کرنی ہوگی، بشرطیکہ وہ نقصان اس شخص کی غفلت یا تساہل کی وجہ سے نہ ہوا ہو ــــ اس کی تلافی بھی کرنی ہوگی، اور اس کے ساتھ اس کا انتظام بھی کہ آئندہ معاشرہ میں ایسا نہ ہو۔

اوپر کہا گیا ہے کہ تعزیری سزاؤں سے مقصود یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے نفسیاتی مریضوں کا علاج ہو جائے۔ نفسیاتی علاج کی کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ مریض کو مرض کا احساس ہو جائے۔ یعنی مجرم دل سے اعتراف کرے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجرم کے دل میں فی الواقعہ یہ احساسِ ندامت بیدار ہو جائے تو اس کی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ "سزا دینے" کے بجائے معاف کر دیتا ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ وہ شخص اپنی اصلاح کرے اور ایسا کرنے میں معاشرہ اس کی ہر ممکن مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا سے پہلے عفو (درگزر کر کے اصلاح کرنے) کی گنجائش رکھی ہے۔ وہ 'سزا' اُس صورت میں تجویز کرتا ہے جب مجرم میں اس کے سوا اصلاح کا امکان نہ ہو۔

قرآنِ کریم بدنی سزائیں (CORPORAL PUNISHMENT) تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ چور کو جیل خانے بھیج دے جہاں اسے روٹی کپڑا ملتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھوکے مر جائیں۔ یعنی جرم وہ کرے اور سزا یہ بےگناہ بھگتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خوف جس سے عادی مجرموں کی اصلاح کا امکان ہو سکتا ہے،

یا جس سے امکانی مجرموں کو ارتکاب جرم سے باز رکھا جا سکتا ہے، بدنی سزا ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اب ان اصولوں کو دیکھئے جنہیں قرآنِ کریم اس باب میں بنیادی قرار دیتا ہے۔

(۱) **قصاص**۔ اس کے معنی جرم کی سزا دینا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے۔ یعنی قرآنی نظام میں کسی جرم کو (UNTRACED) نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ اس قسم کے محکم نظامِ تفتیش میں حیاتِ اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (۲/۱۷۹)

(۲) **عدل**۔ یعنی فیصلہ کرتے وقت مجرم کی پوزیشن، عدل کے تقاضے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے پائے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ۔ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ (۲/۱۷۸) کا اصول ہمیشہ کارفرما رہے۔

(۳) جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰) یہ بھی اس صورت میں جب اس کے بغیر اصلاح کا امکان نظر نہ آئے۔

(۴) جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، ملزم کو بے گناہ سمجھنا اور معاشرہ کو اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے۔ سورۃ نور میں ہے کہ مدینہ میں بعض لوگوں نے کسی عورت کے خلاف تہمت تراشی کی اور لوگ اسے لے اڑے۔ اس پر قرآنِ کریم نے یہ ہدایت دی کہ تم نے جب یہ افواہ سنی تھی تو تمہارا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ: هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۔۔۔ بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (۲۴/۱۲-۱۶) یہ ایک مستقل راہنمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ جب ملزم کے متعلق (اثباتِ جرم سے پہلے) سوءِ ظن کی بھی ممانعت ہے تو دورانِ تفتیش اسے کسی قسم کی اذیت دینا کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے۔ ایسا کرنا بجائے خویش جرم ہے۔

کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو، جو اس قانون کے خلاف ہو تو اسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر کسی قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے ہوگا۔ قرآنِ کریم میں کئی ایک احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ (۴/۲۳)۔ جو اس سے پہلے ہو گیا، اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو (یعنی عمداً نہ کیا گیا ہو) اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ (۳۳/۵)۔ جو کچھ تم سے سہواً ہو جائے اس پر مؤاخذہ نہیں۔ مؤاخذہ اس پر ہے جس میں تمہارے دل

کا ارادہ شامل ہو۔

لیکن لاپرواہی بھی ایک جرم ہے اور قابلِ سرزنش۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں قتلِ خطا (سہواً) کی سزا بھی تجویز کی ہے۔ اگرچہ وہ سزا جرمِ قتل کی نہیں۔ بطور کفارہ کے ہے۔ (۴/۹۲)

بڑے بڑے جرائم سے بچنے والوں سے اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے تو وہ قابلِ معافی ہوتی ہے۔ سورۃ النجم میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ (۵۳/۳۲)۔

جو لوگ بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں، ان سے کبھی کوئی معمولی سی لغزش ہو جاتے تو وہ قابلِ عفو ہے۔

سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح، تعلیم و تربیت اور معاشرتی احوال و کوائف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے (اُس زمانے کی) لونڈیوں کی جرمِ زنا کی سزا شریف عورتوں سے نصف قرار دی تھی۔ (۴/۲۵) کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتی تھیں اس کے پیشِ نظر ان سے بلند اخلاق کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس رسول اللہ کے گھرانے کی خواتین سے کہا گیا کہ اگر اُن سے کوئی جرم سرزد ہوا تو اس کی سزا دُگنی ہوگی۔ (۳۳/۳۰)

قرآنِ کریم جس قسم کا معاشرہ قائم کرنا اور اس میں افرادِ معاشرہ کی تربیت جس انداز سے کرتا ہے اس سے وہ توقع رکھتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے گی تو وہ خود اس کا اعتراف کرلے گا اور صحیح صحیح بات کہدے گا، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جاتے (۴/۱۳۵)۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے شہادت کے سلسلہ میں ایسا بلند اصول پیش کیا ہے جس کی موجودگی میں عدل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)۔

قرآنِ مجید کے پیشِ نظر مجرم کی اصلاح ہے، اس لئے وہ اس کے دل میں جرم کے مذموم ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک عجیب و غریب اصول پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَکْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ۔ (۴/۱۱۱)۔ جو کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرتا ہے۔ وہ بزعمِ خویش سمجھتا ہے کہ اس نے اس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے اور اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جرم سے خود مجرم کی اپنی ذات پر ایسا نقصان رساں اثر پڑتا ہے جس کی تلافی کسی خارجی سزا سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر مجرم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچالے تو بھی اس سے جو نقصان اس کی ذات کو ہوا ہے وہ اس سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات: یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔ (۴۰/۱۹) وہ نگاہ کی خیانتوں اور

دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے"۔ یہ ہے وہ تعلیم جس سے وہ مجرم کے دل میں احساسِ ندامت بیدار کرتا ہے۔ اور اگر ایسا ہوجائے تو اسے سزا دینے کے بجائے اصلاح کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک محاورہ ہے "مال صدقہ جان۔ جان صدقہ آبرو" یعنی مال و دولت بھی اپنی قیمت رکھتے ہیں لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ مال اور جان میں (TIE) پڑجائے۔ یعنی ان میں سے ایک ہی محفوظ رہ سکے تو اس وقت جان بچانے کے لئے مال صرف کر دینا چاہیئے۔ اور اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑجائے تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان تک بھی قربان کر دینی چاہیئے۔

مال کی اہمیت

قرآنِ کریم بھی مال و دولت کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے۔ اس نے مال کے متعلق کہا ہے کہ: جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (۴/۵)۔ مال سے انسان (اقوام) اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجانے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ لیکن مال کی غلط تقسیم سے جو بھی خرابیاں پیدا ہوتی اور تباہیاں آتی ہیں ان کی روک تھام اور ازالہ کے لئے قرآنِ کریم نے پورا معاشی نظام متعین کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل جلد اول ص ۱۰۵۔ آیت (۲/۳) اور ص ۲۹۴۔ آیت (۲/۴۳) میں گزر چکی ہے۔ جب وہ نظام قائم ہوجاتا ہے تو نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے نہ جائیداد۔ یہ سب اس نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے اور وہ نظام تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ لیکن جب تک وہ نظام قائم نہ ہو، وہ اس عبوری دور میں مال و دولت کے صرف اس کی ملکیت، اور تقسیم کے متعلق ضروری احکام بھی دیتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم حکم وصیت کا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲/۱۸۰) ۲/۱۸۰

تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمہارے لئے یہ قانون مقرر کیا جاتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے، اور تم اپنے پیچھے کچھ مال و دولت چھوڑ رہے ہو تو تم اپنے والدین اور دیگر اقرباء کے لئے (یعنی جنہیں بھی تم اپنا قریبی سمجھو خواہ وہ تمہارے رشتہ دار ہوں یا نہ) قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین (مسلمانوں) پر فریضۂ خداوندی ہے۔

اس آیت سے وصیت کے حکم کی اہمیت واضح ہے۔ اس میں پہلے كُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا گیا ہے۔ یعنی تمہیں اس کا

وصیّت کا حکم

حکم دیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر میں دہرایا گیا ہے۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ ایسا کرنا متقین پر (یعنی جو بھی کتاب اللہ کو اپنا راہ نما سمجھتے ہیں۔ (۲/۲)۔ ان پر لازم ہے۔ یہ فریضۂ خداوندی ہے جس کا ادا کرنا ان پر واجب ہے۔ اس سے اس حکم کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کا عمومی انداز یہ ہے کہ وہ احکام اور قوانین اصولی شکل میں دیتا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ (اس کی حکمت جلد اول ص۱۴۰-۱۴۷۔ زیر آیت (۲/۲) بیان کی جا چکی ہے)۔ لیکن بعض احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی اس نے خود متعین کر دی ہیں۔ وصیّت سے متعلق حکم میں جس "معروف" (قاعدہ) کا ذکر ہے اس کا تعین بھی قرآن نے خود ہی کر دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ۔ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِن شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ (۵/۱۰۶-۱۰۷)

پہلے کہا گیا ہے کہ ہم نے بالعموم دین کے اصول دیتے ہیں، ان جزئیات متعین کر کے نہیں دیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے کسی قانون کی جزئیات بھی متعین نہیں کیں۔ بعض اہم قوانین کی جزئیات اور عملی طریق ہم نے متعین کر دیئے ہیں۔ ان میں قانونِ وصیّت وشہادت بھی ہے۔ اس باب میں یاد رکھو کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ وصیّت کر رہا ہو (کیونکہ وصیّت کرنا فرض ہے، ۲/۱۸۰)۔ تو اس کے لئے گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سو تم اپنے لوگوں میں سے دو ایسے گواہ مقرر کر لو جو انصاف پسند ہوں۔ لیکن اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور ایسی جگہ پر جہاں تمہارے اپنے آدمی موجود نہیں اور وہاں موت کا سامنا ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ ہی گواہ بنا لو۔ پھر جب ان کی شہادت کی ضرورت پڑے تو تمہارے جج انہیں صلوٰۃ کے بعد ٹھہرا لیں۔ اگر تمہیں شبہ ہو کہ وہ ویسے سچ سچ نہیں کہیں گے تو وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اس گواہی کے عوض کسی سے کچھ نہیں لیا خواہ وہ ہمارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی ہم سچی شہادت کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو مجرم ہوں گے۔

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے سچی گواہی نہیں دی تو جس پارٹی کے خلاف انہوں نے غلط گواہی دی تھی۔

اس پارٹی کے دو گواہ سامنے آئیں اور خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی سابقہ گواہوں کے مقابلہ میں زیادہ سچی ہے۔ ہم حق سے ذرا بھی تجاوز نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم مجرم قرار دیئے جائیں۔

اس ضمن میں مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا:۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۲/۱۸۲-۱۸۱)

وصیت دو عادل گواہوں کے سامنے ہونی چاہیئے (۵/۱۰۶) اگر کوئی شخص وصیت سننے کے بعد اس میں ردّ و بدل کر دے تو ایسے لوگ (قانون کی نگاہ میں) مجرم ہوں گے۔ (انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بات زبانی ہوئی تھی اس لئے کسے معلوم کہ متوفی نے کیا کہا تھا اور ہم نے کیا بیان دیا ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ) اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ کسی طرف بیجا طور پر جھک گیا ہے تو اُسے چاہیئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ یہ وصیت بدل دینے کے جرم کے مرادف نہیں ہوگا۔ قانون میں اس قسم کی گنجائش رکھ دینا مغفرت و رحمتِ خداوندی کا تقاضا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف مصالحانہ کوشش ہوگی اور کوشش بھی وصیت کرنے والے کی زندگی میں۔ اس میں قولِ فیصل وصیت کرنے والے ہی کا ہوگا۔

وصیت کے متعلق قانون واضح ہے۔ لیکن ایسے واقعات بھی ہو سکتے ہیں جن میں کسی کو وصیت کرنے کا وقت نہ ملا ہو۔ یا وصیت کرنے کے بعد ترکہ میں کچھ اضافہ ہوا ہو جسے اس کی وصیت (COVER) کرتی ہو تو ایسی صورتوں میں بجائے اس کے کہ ورثاء خود اپنے طور پر فیصلہ کریں کہ ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے اور یوں باہمی جھگڑوں کا دروازہ نہ کھل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حصے خود ہی مقرر کر دیئے۔ وراثت کے متعلق یہ احکام سورۃ نساء کی آیات ۱۲، ۱۱ میں صراحت سے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہر حصہ کے بعد کہا گیا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔ (۴/۱۲ ؛ ۴/۱۱) یعنی یہ تقسیم اس صورت میں ہوگی جب متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ بچے۔ اگر اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط ہے تو تقسیم وصیت کے مطابق ہوگی نہ کہ قانونِ وراثت کے مطابق۔ یہاں بھی دیکھیے۔ وصیت کو تبدیل کرنے کی اجازت خدا نے بھی نہیں دی۔

———— (۰) ————

تصریحاتِ بالا کی رُو سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وصیت کرنے کا حکم کس قدر تاکیدی ہے۔

(۱) اس نے اس حکم کے سلسلہ میں پہلے کُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا، یعنی تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور آخر میں کہا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ متقیوں پر ایسا کرنا واجب ہے۔ یہ فریضۂ خداوندی ہے۔

(۲) وصیت کے متعلق کہا کہ یہ پورے کے پورے ترکہ کے لئے کی جائے گی، ہاں اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ کوئی شخص وصیت نہ کر پایا ہو یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو، تو پھر اس کی تقسیم قرآنی قانونِ وراثت کی رُو سے ہوگی۔

(۳) وصیت کرنے والے کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں یا غیر رشتہ داروں میں سے جس کے حق میں چاہے، اور جس قدر مال کی چاہے، وصیت کر دے۔

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ قرآنِ کریم کے اس قدر واضح حکم اور اس کی تشریحات کے علی الرغم ہمارے

قانونِ شریعت

ہاں "قانونِ شریعت" یہ ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (⅓) ترکہ کے لئے کی جا سکتی ہے اور وہ بھی ان رشتہ داروں کے حق میں نہیں جو وراثت میں حصہ پا سکتے ہیں۔ اور اس حکم کی بنیاد ایک روایت پر رکھی جاتی ہے۔ جب کہا جائے کہ اس باب میں اللہ کا حکم اس قدر واضح ہے اور اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۶/۱۱۶) احکامِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تو خدا کے حکم میں یہ تبدیلی کس طرح جائز قرار پا سکے گی تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس روایت نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ "فتنۂ انکارِ حدیث" میں لکھتے ہیں:۔

> نبیؐ کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے۔۔۔۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ۔ (۲/۱۸۰) تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اُسے موت آئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔
>
> (ص۸۵ بحوالہ مقامِ حدیث ص۵)

حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے

آپ غور فرمائیے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ایک طرف خدا کا نہایت واضح، محکم اور غیر متبدل حکم ہے۔ دوسری طرف

ایک روایت ہے جسے رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقعہ رسولؐ اللہ نے ایسا فرمایا تھا۔ اس کی صرف نسبت حضورؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ وہ روایت آپ کی وفات کے قریب دو اڑھائی سو سال بعد لوگوں کی زبانی حدیثوں کے مجموعوں میں درج ہو جاتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے اور اسی بنا پر یہ عقیدہ وضع کر لیا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ حدیث رسولؐ اللہ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا عمل قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ہو سکتا تو اسے منکرِ حدیث قرار دے کر ملحد اور بے دین ٹھہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد ایوب (مرحوم) نے اپنے کتابچہ کا نام ہی "فتنۂ انکارِ حدیث" رکھا تھا۔

یہ عقیدہ کہ رسولؐ اللہ خدا کے حکم کو منسوخ کر دیا کرتے تھے، اس قدر زلزلہ انگیز ہے کہ اس سے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ (۱۹/۹۰)۔ "آسمان پھٹ پڑیں۔ زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔" قرآنِ کریم میں ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ۔ "جب ان مخالفینِ اسلام کے سامنے احکامِ خداوندی پیش کیے جاتے

ایسا عقیدہ ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف اتہام ہے

ہیں تو یہ لوگ جو خدا کے سامنے جانے کی امید نہیں رکھتے، رسولؐ اللہ سے کہتے ہیں کہ (ہم اس صورت میں تمہارے ہمنوا ہوں گے کہ) یا تو اس قرآن کے بدلے کوئی اور قرآن پیش کرے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس میں کوئی تبدیلی کر دے۔" آپ نے غور فرمایا کہ معاندینِ اسلام کا حضورؐ سے مطالبہ کیا تھا! یہ کہ آپ قرآن کے احکام کو منسوخ کر کے ان کی جگہ اور احکام دے دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں کیا کہا گیا۔ قُلْ — خدا نے رسولؐ اللہ سے کہا کہ تو اس کے جواب میں ان سے کہہ دے کہ: مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ "یہ میرے حیطۂ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں کوئی تبدیلی کروں۔" اگر یہ کتاب میری تصنیف ہوتی تو میں اس میں ردّ و بدل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ تو خدا کی کتاب ہے۔ میں خدا کی کتاب میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کیسے کر سکتا ہوں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ "میں تو خود اس کتاب کا اتباع کرتا ہوں"۔ میرا فریضہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا ہے۔ اس لئے میں ان میں ... ردّ و بدل کیسے کر سکتا ہوں۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۰/۱۵)۔ اگر میں اس میں کوئی ردّ و بدل کروں تو یہ حکمِ خداوندی کی معصیت ہو گی جس کی پاداش میں مجھے ایسی سخت سزا ملے گی جس کے تصور سے بھی میں کانپ اٹھتا ہوں۔

یہ تھا احکامِ قرآن کے سلسلہ میں حضورؐ کا عقیدہ اور مسلک اور اب اُسی رسولؐ کے نام لیوا بڑے فخر سے کہتے ہیں

کہ حضورؐ احکامِ خداوندی کو منسوخ کر دیا کرتے تھے اور ایسا کہتے وقت انہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ انہوں نے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے اور وہاں رسول اللہؐ بھی موجود ہوں گے۔ جب حضورؐ پوچھیں گے کہ تم نے میرے خلاف اس قسم کی گستاخی کی جرأت کس طرح کی تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ اس قسم کی جرأت کی شعوری یا غیر شعوری طور پر) وہی وجہ ہو سکتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا۔ ایسا کہنے کی وہی لوگ جرأت کر سکتے ہیں جنہیں اس کا خیال ہی نہ ہو کہ انہوں نے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے۔ ایسا کہنے میں حافظ محمد ایوب (مرحوم) منفرد نہیں۔ یہ ہمارے ہاں کی مروجہ شریعت کا مسلمہ فیصلہ ہے جو صدیوں سے نافذ العمل چلا آ رہا ہے اور آج بھی فیصلے اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی ہے وہ قوم (یعنی ہم مسلمان) جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰)۔ حضور رسالتمآبؐ خدا سے فریاد اور شکایت کریں گے کہ بار الٰہا! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ اسے چھوڑ دیا تھا۔

اس قسم کے خلافِ قرآن عقائد وضع کرنے اور ان کی بنا پر قرآن کو چھوڑ دینے سے ہمارا جو حشر آخرت میں جا کر ہوگا، وہ تو ایک طرف رہا۔ اس سے جو الجھنیں اس زندگی میں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی کچھ کم الم انگیز نہیں۔ میرے سامنے اس قسم کے واقعات اکثر آتے رہتے ہیں۔ ایک میاں بیوی اچھے خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے اولاد کوئی نہیں تھی۔ ایک وسیع مکان تھا جس کے ایک حصے میں وہ خود رہتے تھے اور باقی حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا۔ خاوند کی

روح فرسا واقعات

موت کے بعد اس کی لاوارث بیوہ کا اس مکان کے سوا (معاش کا) کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ خاوند کے بھائی برادر جنہیں عرفِ عام میں شریک کہا جاتا ہے اور جو لفظ دشمن کے مرادف ہے، ان کے سخت دشمن تھے۔ خاوند نے مرتے وقت وصیت کر دی کہ مکان کی واحد مالک اس کی بیوہ ہوگی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی برادر "شریعت" کا فتویٰ لے آئے کہ یہ وصیت ناجائز ہے۔ (بیوہ صرف (¼) حصہ کی مالک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے نکال باہر کیا۔ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ کیا خدا کا یہی انصاف ہے؟ میں اس مظلوم کو کس طرح سمجھاتا کہ یہ خدا کا انصاف "نہیں"۔ ان اربابِ شریعت کا انصاف ہے جن کا شعار یہ ہے کہ يَكْتُبُوْنَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ وہ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ حکم خداوندی ہے اور یہ دھندا اس لئے کرتے ہیں کہ: لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ (۲/۷۹)۔ تاکہ اس سے کچھ پیسے کما لیں۔ انہوں نے اسے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارا فتویٰ نہیں۔ یہ رسولؐ اللہ کا فیصلہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ رسولؐ اللہ ایسا فیصلہ کبھی نہیں دے سکتے تھے۔ وہ تو (قرآنِ کریم کی سند کی رُو سے) خدا سے پناہ مانگتے تھے کہ وہ خدا کے کسی حکم کو تبدیل کرنے کی جرأت کریں۔ یہ روایات یقیناً وضعی ہیں۔

ائمہ کا فیصلہ

پھر یہ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ائمہ کرام کا فیصلہ ہے۔ اس کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دل میں ان ائمہ حضرات کا اس قدر احترام ہے کہ ہم اس قسم کے خلافِ حکمِ خداوندی فیصلوں کو ان کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر اس پر بھی ان کا اصرار ہے کہ یہ انہی حضرات کا فیصلہ ہے تو ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کا اور ان کے خدا کا معاملہ ہے۔ ہم تو احکامِ خداوندی کے خلاف کسی کے قول کو بھی سند اور حجت نہیں مان سکتے۔

سند سے آگے بڑھ کر یہ حضرات اس صریحی خلافِ قرآنِ حکیم کی تائید میں دلائل پر اُتر آتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنے سے دوسرے رشتہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سوچئے کہ اس اعتراض کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ۔ (۱۸۰/۲) والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے وصیت فرض قرار دی جاتی ہے، تو اُسے (معاذ اللہ) اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ اس سے دوسرے رشتہ داروں کی حق تلفی ہو جائے گی۔ اس ترمیم نے (پناہ بخدا) خدا کی اس چوک کی تلافی کر دی۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

حق تلفی

جہاں تک رشتہ داروں کے حق کا تعلق ہے، تو یہ واضح ہے کہ کسی شخص کی ملکیت میں کسی اور کا حق ہوتا ہی نہیں۔ صاحبِ ملکیت کو اس کے تصرف کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ سو جب اس کی ملکیت میں کسی اور کا حق ہی مسلّم نہیں تو حق تلفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے ترکہ کی تقسیم کے جو حصے مقرر کر دیئے ہیں تو اس لئے کہ اگر ترکہ بلا وصیت رہ جائے تو یہ تنازعات کا موجب نہ بن جائے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآن کریم (۱۱-۱۲/۴) میں جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر ہے تو ہر حکم کے ساتھ اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ ... یہ تقسیم، وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ اگر وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو ورثاء کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ متوفی کو اپنی ملکیت پر پورا پورا حق حاصل تھا۔ اگر وہ کسی وجہ سے اپنے اس حق کو کماحقہٗ استعمال نہیں کر سکا تو پھر اس کے ترکہ کی تقسیم قرآنی احکام کے مطابق ہوگی۔

یہ حضرات اسے تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شخص اپنی زندگی میں اپنی پوری جائیداد جس کے نام چاہے ہبہ کر سکتا ہے اس

ہبہ کر سکتا ہے

سے بھی انہوں نے تسلیم کر لیا کہ اُسے اپنی جائیداد کے تصرّف میں پورا پورا حق حاصل ہے۔ اس میں اس کے کسی رشتہ دار کا حق مسلّم نہیں. لیکن ہبہ کرنے میں ایک اُلجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس سے یہ شخص اپنی جائیداد سے اپنی زندگی میں محروم ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنا عرصہ اور زندہ رہنا ہے اور جس کے حق میں جائیداد ہبہ کرا دی گئی ہے اس کا اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوگا. چنانچہ ایسے واقعات بھی سامنے آتے رہتے ہیں کہ اچھا بھلا خوشحال آدمی اپنی جائیداد ہبہ کر دینے کے بعد زندگی کے آخری ایام میں نانِ شبینہ تک کا محتاج ہو گیا۔

اللہ (خبیر و علیم) نے ان تمام مصالح کو سامنے رکھ کر وصیّت کا حکم دیا تھا جسے ہمارے اربابِ شریعت نے منسوخ قرار دے کر یہ تمام اُلجھنیں پیدا کر دیں. میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ مروّجہ قانونِ وصیت میں تبدیلی کر کے اسے قرآنِ کریم کے مطابق بنا دیا جائے. لیکن مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہو سکی. اب پاکستان میں ایک عجیب صورت سامنے آ رہی ہے. دستورِ پاکستان میں یہ بنیادی شق رکھی گئی ہے کہ مملکت کا کوئی قانون، کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا' اور جو مروّجہ قوانین کتاب و سنت کے خلاف ہیں انہیں ان کے مطابق مرتب کر دیا جائے گا. دیکھنا چاہیئے کہ وصیت کے متعلق ایسا قانون کس طرح مرتب ہوگا جو کتاب کے بھی مطابق ہو اور سنت کے بھی. کتاب (قرآنِ مجید) کا فیصلہ ہے کہ وصیت پورے کے پورے ترکہ میں کی جا سکتی ہے' اور ورثا کے حق میں بھی. اس کے برعکس سنت (روایات کا فیصلہ) ہے کہ وصیت صرف (⅓) حصہ میں کی جا سکتی ہے اور وہ بھی غیر ورثاء کے حق میں. ورثا کے حق میں نہیں کی جا سکتی۔ آپ سوچئے کہ کیا کوئی ایسا قانون بن سکتا ہے جو کتاب کی شرط کو بھی پورا کرے اور سنت کی شرط کو بھی؟۔ ان سطور کی تسوید[1] کے وقت تک تو حکومت کی طرف سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوا. معلوم نہیں کہ جب یہ کتاب شائع ہو کر قارئین تک پہنچے اس وقت صورت حال کیا ہو؟ میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ آپ اُس وقت قانون سازی کے فرائض انجام دینے والے حضرات سے دریافت کیجئے گا کہ وصیّت کے متعلق ایسا قانون کس طرح مرتب ہوگا جو کتاب اور سنّت دونوں کی شرائط پر پورا اترے؛

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ وصیّت، ہبہ، ترکہ، وراثت وغیرہ سے متعلق تمام بحثیں اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں، جب ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج نہ ہو. قرآن کے معاشی نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ مال و دولت

---

[1] اکتوبر ۱۹۷۸ء

یا جائیدادیں ہوں گی، نہ ان کی (DISPOSAL) کے متعلق سوالات پیدا ہوں گے۔ اگر کسی کا کوئی ترکہ ہوگا تو وہ ان اشیائے مستعملہ تک محدود ہوگا جنہیں حکومت نے ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی۔

(٥)

اس کے بعد قرآنِ کریم کے اگلے حکم کو لیجئے:۔

ہمارے زمانے میں ہر سلطنت میں اپنی اپنی مستقل فوج (STANDING ARMY) ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی نسبتاً متمدن ممالک میں یہی کیفیت ہوتی تھی۔ لیکن قرآنِ کریم نے یہ تصور دیا کہ اُمت کا ہر فرد قابلِ مجاہد (سپاہی) ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام افرادِ امت مستقل فوج کی طرح چھاؤنیوں میں تو نہیں رہیں گے۔ یہ اپنے اپنے گھروں میں رہیں گے۔ اور مختلف کام کاج کرتے رہیں گے اور جب جنگ کے لئے آواز دی جائے گی تو یہ فوج کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اس شکل میں اس کی البتہ ضرورت ہوگی کہ سال میں کچھ عرصہ ایسا رکھا جائے جس میں انہیں سپاہیانہ زندگی ...... کا خوگر بنایا جائے۔ عسکری پابندیوں کی مشق کرائی جائے۔ (جس طرح آجکل ریزرو فوج کے سپاہیوں کو سال میں کچھ وقت کے لئے ٹریننگ کیمپس میں جاکر تربیت حاصل کرنی ہوتی ہے)۔ اس کے لئے ماہِ صیام تجویز کیا گیا۔ فرمایا:۔

۲/۱۸۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۔ (۲/۱۸۳)

اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی اقوام کے لئے فرض قرار دیئے گئے تھے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہوسکو اور سفرِ زندگی میں خطرات سے محفوظ رہ سکو۔

صوم صِیَام (مادہ ص۔ و۔ م) کے معنی ہیں رک جانا۔ باز رہنا۔ ٹھہر جانا۔ قرآنِ کریم نے کھانے پینے کی چند چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی چیزوں کو حلال و طیب کہا (۲/۱۷۳)۔ حرام اشیاء پر تو (بجز اضطراری حالت کے) مطلق پابندی ہے لیکن سپاہیانہ زندگی ایسی ہے جس میں ایسے حالات پیدا ہوسکتے ہیں (اور بالعموم ہوتے ہیں) جن میں حلال و طیب چیزوں کے استعمال سے بھی رکنا پڑتا ہے ـــ حالتِ جنگ میں یا تو وہ ملتی ہی نہیں، یا کھانے پینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ سپاہیانہ زندگی کا خوگر ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ حالتِ امن میں ان چیزوں کے استعمال پر کچھ وقت کے لئے خود پابندی عائد کرلی جائے تاکہ قوتِ برداشت بڑھے۔ اس کا نام ہے صوم (جمع صیام)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ "روزہ" کرنے کے بجائے ضبطِ نفس (ڈسپلن) کیا جائے تو وہ قرآنی مفہوم سے زیادہ

قریب ہوگا۔ سورۃ احزاب میں مومن مردوں اور عورتوں کی جن نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے' ان میں اَلصَّآئِمِیْنَ وَ الصَّآئِمٰتِ بھی ہے (۳۳/۳۵) اس کا ترجمہ" روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں" قرآنی مفہوم کو واضح نہیں کریگا۔ اس کا مفہوم ہوگا" ہر اس بات سے رُک جانے والے جس سے رُکنے کے لئے کہا جائے۔" یعنی اپنے آپ پر ضبط رکھنے والے۔ ڈسپلن کے پابند۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دین شروع سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ اس لئے جہاں تک ابدی احکام کا تعلق ہے وہ بھی ہر رسول کی وساطت سے یکساں دیئے گئے تھے۔ مجاہدانہ زندگی ہر زمانے میں دینِ خداوندی کا تقاضا تھی اس لئے ان رسولوں کی امتوں پر بھی اسی طرح صیام فرض قرار دیئے گئے تھے جس طرح امتِ مسلمہ پر (کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ۔)۔ بنی اسرائیل میں صوم میں کھانے پینے کے علاوہ بات چیت کی بھی ممانعت تھی۔ (دیکھئے ۱۹/۲۶)۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ پابندی خدا کی عائد کردہ تھی یا ان کے اربابِ شریعت نے خود اس کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہودی شریعت کے احکام جس قدر سخت تھے ان سے نظر آتا ہے کہ وہ ان کے احبار فقہا کے جذبۂ آمریت کے وضع کردہ تھے۔ بہرحال اس باب میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد کردہ تھی یا ان کی فقہ کا حکم تھا۔ قرآن کریم میں تذکرۂ حضرت زکریا کے متعلق جو کچھ آیا ہے (۳/۴۱) اس سے البتہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد کردہ تھی۔ قرآن کریم نے بہرحال بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں کی۔

صیام سے متعلق آیت (۲/۱۸۳) کے اخیر میں کہا گیا ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اور دو اَیتیں آگے چل کر: لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ اور لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (۲/۱۸۵)۔ ہم ان تینوں غایات کی تشریح آیت (۲/۱۸۵) میں کریں گے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآنی احکام کے ساتھ جو (لِ) یا (لَعَلَّکُمْ۔ تاکہ) کے الفاظ آتے ہیں تو یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسی اہمیت کا کہ اس سے دین اور مذہب کا فرق نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ مذہب میں صرف حکم دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس سے ہوگا کیا؟ اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے تو اربابِ شریعت کی آنکھوں میں خون اتر آئے گا۔ دہن کف آلود ہو جائے گا۔ غصے سے کانپنے لگ جائیں گے اور چیخ کر کہیں گے کہ نکل جا یہاں سے۔ خدا کے حکم کے بارے میں پوچھتے ہو کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے؟ ایسا پوچھنے والا مرتد ہو جاتا ہے۔ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ان کے اس قسم کے ردِ عمل کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کیوں کا جواب ان کے پاس ہوتا نہیں اور وہ بجائے اس کے کہ اپنی کوتاہیٔ فہم کا اعتراف کریں' اسے غصے کے پردے میں چھپاتا اور "حمیت دینی" سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسکے

برعکس دین میں خدا اپنے ہر حکم کے ساتھ خود یہ بتاتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس کا فائدہ

کتاب و حکمت

کیا ہوگا ـــ دین میں درحقیقت "حکم" نہیں دیا جاتا۔ قانون دیا جاتا ہے اور قانون کہتے ہی اسے ہیں کہ "اگر یہ کروگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا"۔ اس (تو) کو قانون دینے والے خدا نے خود ہی واضح کر دیا تاکہ انسان کسی غلط فہمی یا خود فریبی میں نہ رہے۔ اگر (تو) نہ بتایا جائے تو انسان کبھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی تعمیل صحیح طور پر نہ ہو رہی ہو، لیکن اس کے پرکھنے (ٹسٹ کرنے) کے معیار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسی طور پر کرتا چلا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ کوئی منفعت بخش نتیجہ برآمد نہ ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ الٹا نقصان ہو (انسان کی سعی و عمل کا رائیگاں چلے جانا بھی تو کچھ کم نقصان دہ نہیں ہوتا)۔ خدا نے احکام (قوانین) دیتے تو ساتھ ہی خود بتا دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا تاکہ انسان ساتھ کے ساتھ ٹسٹ کرتا جائے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے۔ (اس سلسلہ میں جلد اوّل صفحہ۔ آیت (۲/۳) خدا کے صحیح تصور کا عنوان اور متعدد مقامات پر قانونِ مکافاتِ عمل بھی دیکھئے)۔ یہ ہے کتاب و حکمت کا باہمی تعلق ـــ کتاب کے معنیٰ قانون اور حکمت سے مراد یہ ہے کہ اس قانون کی غرض و غایت کیا ہے۔ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ مفہوم ہے احکام کے ساتھ (لِ) یا (لَعَلَّكُمْ) کا۔

۲/۱۸۴ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ. (۲/۱۸۴)

یہ صیام (روزے) گنتی کے دنوں کے ہیں۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کرے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں لیکن طبعی طور پر اس کی مستقلاً حالت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اس کے لئے دوسرے دنوں میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہیئے کہ روزے کے عوض کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کر دے ......

یہاں کہا کہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں۔ یعنی یہ (REFRESHER COURSE) ایک مدتِ معینہ کے لئے

احکام کی تفصیل

ہوگا۔ اس مدت کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ: فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ (۲/۱۸۵)۔ جو کوئی تم میں سے اپنے گھر پر ہو تو وہ مہینے بھر کے روزے رکھے۔ یعنی

اس کی مدت ایک ماہ ہے۔

ان دو آیتوں کے ملا لینے سے صیام کے متعلق احکام کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی :-

(۱) یہ مدت ایک ماہ کی ہے۔

(۲) اس مدت میں جو شخص اپنے گھر پر ہو ـــــ فَمَنْ شَهِدَ کے یہی معنیٰ ہوتے ہیں۔ وہ مہینہ بھر کے روزے رکھے۔

(۳) اگر وہ بیمار ہے یا حالت سفر میں تو وہ صحت یاب ہونے یا سفر سے واپس آجانے کے بعد یہ مدت پوری کرے۔

اب ایک اور (CATEGORY) باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی ایک شخص گھر پر بھی ہے، بیمار بھی نہیں (سفر میں بھی نہیں)، لیکن وہ خلقی طور پر (CONSTITUTIONALLY) اتنا کمزور ہے کہ وہ بھوک پیاس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس سے شفایاب ہونے کی امید نہیں۔ یا کبر سنی کی وجہ سے نحیف ہوتا چلا جا رہا ہے، یا کوئی اور ایسی معذوری ہے جس کی وجہ سے وہ اس ماہ کے بعد بھی روزے نہیں رکھ سکتا۔ تو وہ کیا کرے؟ اسکے متعلق کہا کہ وہ اس کا فدیہ ادا کر دے تاکہ وہ طبیعی طور پر نہیں تو کم از کم ذہنی طور پر امت کے اس اجتماعی پروگرام میں شریک ہو جائے (واضح رہے کہ ہم نے یہاں روزے رکھنے کے الفاظ مروجہ مفہوم کی رُو سے لکھ دیئے ہیں ورنہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، یہ سب اس ٹریننگ کورس کا پروگرام ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ مریض صحت یاب ہونے اور مسافر سفر سے واپسی کے بعد یہ گنتی پوری کرے، تو مملکت کا عسکری نظام ایسے لوگوں کے لئے خصوصی کورس کا انتظام کرے گا۔

یہ جو ایک استثنائی صورت بتائی گئی ہے ـــ یعنی وہ لوگ جو بمشقت روزہ رکھ سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ ایسا شخص خود ہی کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے کہا کہ اگر کوئی کیس بَین بَین (BORDER - LINE) کا ہے۔ یعنی وہ کر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ تو اس کے لئے کہا کہ وہ قانون کی طرف نہ جائے بلکہ اپنے لئے آپ ہی فیصلہ کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ مشقت تو ضرور ہو گی لیکن بایں ہمہ وہ روزہ نباہ لے گا، تو بہتر یہی ہو گا کہ وہ روزہ رکھ لے کیونکہ جو مقصد روزہ سے حاصل ہو سکتا ہے وہ فدیہ سے نہیں ہو سکتا بشرطیکہ تم روزہ کی حکمت سے واقف ہو۔

بات بالکل واضح ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (۲/۱۸۴) عربی زبان کے ہر مشہور اور مستند کتب لغت مثل، تاج العروس، محیط، مفردات امام راغب، اقرب الموارد وغیرہ اس

پر متفق ہیں کہ الطّاقَ اس قوت کو کہتے ہیں جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جا سکے۔ اس سے انہوں نے لکھا ہے کہ

اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ کی تفسیر

قرآن کریم میں جہاں آیا ہے لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا (۲/۲۸۶) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو۔ اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کر سکیں۔ اس آیت (۲/۱۸۴) کی تفسیر میں مصر کی شہرۂ آفاق تفسیر المنار میں (جسے مفتی عبدہٗ اور ان کے شاگرد مفتی السید رضا نے مرتب کیا تھا) لکھا ہے:۔

> عرب اطاق الشئی اس وقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے۔ اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ۔ سے مراد ہیں ضعیف۔ بوڑھے۔ اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کا پیشہ مشقت انگیز کاموں میں ہو نیز وہ مجرم جنھیں مشقت کے کاموں پر لگایا گیا ہو۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں۔
>
> (المنار۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۶۔ بحوالہ لغات القرآن ص ۱۱)

بات بالکل واضح ہے۔ لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کی تفسیر میں کیا کہتا ہے، اسے بھی دیکھتے جائیے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

> اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ مگر یہ روزے فرض نہیں تھے۔ پھر ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لئے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔[1]

ان حضرات کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جو حکم پہلے نازل کیا تھا اس میں کہا کہ:۔

> جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں تو وہ فدیہ دے دیں،

یعنی جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود روزہ نہ رکھیں وہ فدیہ دے دیں۔ بالفاظ دیگر جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت

---

[1] تفہیم القرآن۔ از ابو الاعلیٰ مودودی صاحب۔ جلد اوّل۔ ص ۱۴۱۔ طبع اوّل۔

کے باوجود روزہ نہ رکھیں، وہ تو فدیہ دیں اور جو لوگ اس کی برداشت کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ نہیں دے سکتے" انہیں روزہ رکھنا ہوگا۔ اس کے بعد (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ) اللہ میاں کو خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا کہ جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہوں وہ بے شک روزہ نہ رکھیں، فدیہ دے دیں۔ لیکن جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ بالضرور رکھیں انہیں فدیہ دینے کی اجازت نہیں۔ اسے محسوس کرنے کے بعد اس نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا اور دوسرا حکم یہ دیا کہ وہ پہلی عام رعایت منسوخ سمجھی جائے۔ فدیہ کی اجازت مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لئے ہے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو۔

ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ:۔

(۱) قرآن کریم میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ پہلی رعایت والی آیت منسوخ کر دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں تو اس کی کسی آیت کے منسوخ کئے جانے کا ذکر یا اشارہ تک نہیں[1]

(۲) مسافر اور مریض کے لئے فدیہ کی آیت کا ذکر کہاں ہے؟ قرآن مجید نے انہیں یہی کہا ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کریں۔

اسی ضمن میں ایک اور مثال بھی دیکھئے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵) "یعنی اس مہینہ میں جو شخص اپنے گھر پر ہو وہ انہی دنوں میں روزے رکھے اور جو سفر پر ہو وہ گھر واپس آ کر گنتی پوری کرے عربی لغت میں شَهِدَ کے معنی گھر پر موجود ہونا اور غَابَ کے معنی سفر پر چلے جانا ہیں۔ دیکھئے لغات القرآن ص۹۸۱۔ لیکن اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے[2]

جو شخص اس مہینے کو پائے۔ یعنی جو شخص اس مہینے میں زندہ ہو وہ روزے رکھے جو اس سے پہلے مر جائے وہ بے شک روزے نہ رکھے!

آپ غور کیجئے کہ یہ حضرات خدا کی اس کتاب عظیم کے ساتھ کیا کچھ کرتے ہیں؟ ان ہی جیسوں کے متعلق اقبالؒ نے با صد سوز و گداز کہا تھا:۔

---

[1] ناسخ و منسوخ کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ ص۱۲۶۔ آیت (۲/۳) دیکھئے۔

[2] تفہیم القرآن۔ جلد اول ص۱۴۲۔ طبع اول۔

زمن بر صوفی و ملا سلامے	کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت	خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(۰)

اگر کوئی مؤرخ ہر قسم کے اثرات سے الگ ہو کر، یکسر غیر جانبدارانہ طور پر تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سا واقعہ ہے جسے اس پوری تاریخ میں سب سے بڑا عظیم انقلاب انگیز قرار دیا جا سکتا ہے، تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ واقعہ نزولِ قرآن کا ہے۔ میں یہ بات محض بربنائے عقیدت نہیں کہہ رہا۔ جن (غیر مسلم) مؤرخوں اور مفکروں نے تعصب اور جانبداری سے الگ ہٹ کر، تاریخِ انسانیت پر غور کیا ہے وہ از خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ میں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب — معراجِ انسانیت — میں دی ہے۔ یہاں دو ایک شہادات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نزولِ قرآن عظیم ترین انقلابی واقعہ

کارلائل اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ' میں لکھتا ہے:-

اوّلین دورِ جہالت سے گزر کر اب ہم ایک مختلف قسم کے انسانوں اور مذہب کی ایک نرالی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ یعنی عرب میں دینِ محمدیؐ کی اشاعت کی طرف۔ ایک بہت بڑا انقلاب! ایسا انقلاب جس نے نوعِ انسانی کی عام حالت اور ان کے تصورات کی زندگی میں عجیب تبدیلی اور محیر العقول تبدیلی پیدا کر دی۔

تاریخِ تہذیب کا مشہور مؤرخ (DORSY) اپنی تصنیف (CIVILISATION) میں لکھتا ہے کہ:-

عربوں کا ظہور ایک عظیم داستان ہے اور دنیا کی تاریخ میں یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ ..... یہ حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو دورِ حاضرہ کی تہذیب بھی کہیں نہ ہوتی۔ (ص ۲۳۴ ، ص ۲۳۹)

گبن جیسا مؤرخ جب ظہورِ اسلام کے مرحلہ پر پہنچتا ہے تو کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ:-

اب ہماری نگاہ اس ناقابلِ فراموش انقلاب پر مرکوز ہے جس نے اقوامِ عالم پر ایک نرالا لیکن دائمی نقش چھوڑا۔

اور (THE MAKING OF HUMANITY) کا نامور مصنف (BRIFFAULT) کہتا ہے:-

وہ روشنی جس سے تہذیب کی شمع دوبارہ جلائی گئی، یونانی اور رومی ثقافت کی ان چنگاریوں سے نہیں لی گئی جو یورپ کے کھنڈرات میں سُلگ رہی تھیں۔ نہ ہی باسفورس کے کنارے "زندہ موت" سے۔ یہ روشنی شمال

کی طرف سے نہیں بلکہ جنوب کے حملہ آوروں سے لی گئی۔ یہ روشنی عرب سے اٹھی۔ (P. ۱۸۳)

تاریخ عالم کا مصنف (W. N. WEECH) اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے :-

مغرب میں پاپائے روم کلیسا پر اپنے اقتدار کا مدعی تھا۔ مشرق میں قیصر کا یہی دعویٰ تھا جس کا بطلان مصر اور شام کر رہے تھے۔ اس طرح عیسائیت کی صفوں میں مہلک انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن وقت آچکا تھا کہ ان صفوں کو یکسر معدوم کر دیا جائے کیونکہ اب ایک عظیم روحانی قوت عرب سے نمودار ہونے والی تھی۔ (P. 250)

اور مشہور مفکر (PRINGLE KENNEDY) ان الفاظ میں کہ :-

چند ہی سال کے عرصے میں (فتنہ و فساد کا) یہ نقشہ کس طرح بدل گیا ؟ کس طرح ۶۵۰ء تک یہ دنیا اُس دنیا سے مختلف ہو گئی جو اس سے پہلے تھی ؟ نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MOHAMMAD. P. 18)

قرآنِ کریم یہ انقلاب، اینٹوں اور پتھروں کی دنیا میں نہیں لایا۔ دلوں کی دنیا میں لایا۔ اس نے انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ اس نے اس کا نصب العین حیات بدل دیا۔ اس نے اس کے مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دی۔ اس نے اس کی زندگی کے معیار بدل دیئے۔ خیر و شر کے پرکھنے اور نفع و نقصان کے ماپنے کے نئے پیمانے عطا کر دیئے۔ اس نے انسانوں کی خود ساختہ پرانی اقدار کو جنسِ کاسد اور زرِ کم عیار قرار دے کر نئی اقدار کے سکے رائج کر دیئے۔ اسی لئے اس کے خدا نے کہا کہ اس زمانے میں جب تمام کائنات تاریکیوں میں ڈوب رہی تھی اس تابندہ سحر کو نئی اقدار کے ساتھ بھیجا۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ[1] (۹۷)۔ دنیا کی تمام قومیں کوئی نہ کوئی تیوہار مناتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ سے بھی ایک تیوہار منانے کے لئے کہا۔ آپ جانتے ہیں وہ تیوہار جس عظیم واقعہ کی یاد منانے کے لئے تجویز کیا تھا۔ کون سا تھا ؟ نزولِ قرآن کا عدیم النظیر واقعہ۔ فرمایا :-

جشنِ مسرت

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۔ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَ بِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ۔ (۱۰ / ۵۷ - ۵۸)

اے نوعِ انسان ! تمہاری طرف تمہارے نشو و نما دینے والے کی جانب سے وہ ضابطۂ حیات آگیا جس میں ہر اُس کشمکش

---

[1] یہاں محض اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ تفصیل اُس وقت سامنے آئے گی جب ہم قرآن کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

کا علاج موجود ہے جو تمہارے دلوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے؛ اور جو ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطۂ زندگی قرار دیتی ہے، کامیابیوں کی راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا اور انہیں سامانِ نشو ونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

اے رسول! ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ حیات کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ اس کے ملنے پر تم جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس متاعِ حیات سے زیادہ گراں بہا ہے جسے تم اپنے لئے جمع کرتے رہتے ہو۔ یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ قیمتی۔ (۱۰/۵۸)

پھر جس طرح وہ واقعہ جس کی یاد میں یہ جشنِ مسرت تجویز کیا گیا، دنیا جہان سے نرالا تھا؛ اس جشن کے منانے کا طریق بھی منفرد تھا۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں صرف اقدارِ خداوندی کا پابند بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے اُس نے ایک قوم (اُمت) تیار کی جو ہر اُس قوت کا مقابلہ کرے جو انسانیت کو محکوم و مغلوب رکھنا چاہیے۔ مجاہدین کی اس جماعت کے تربیتی کورس کے لئے صیام کا پروگرام تجویز کیا گیا اور کہا کہ یہ پروگرام اُن دنوں رُوبعمل لایا جائے جب نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ فرمایا۔

۲/۱۸۵ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ...... (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ وہ قرآن جو نوعِ انسان کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو علم و بصیرت پر مبنی ہے اور جو مستقل اقدار کے ایسے پیمانے پیش کرتا ہے جو حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتے ہیں۔

(الفرقان اور الفدر کی تفصیل اپنے مقام پر بیان کی جائے گی)

اس سے واضح ہے کہ اس پروگرام کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا۔ اس لئے کہ اس میں اس ضابطۂ حیات کے نزول کی ابتدا ہوئی تھی جسے نظامِ زندگی بنانے کے لئے صیام کا تربیتی کورس تجویز کیا گیا تھا۔ اس لئے کہا:۔

۲/۱۸۵ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ...... (۲/۱۸۵)

سو جو شخص اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے چاہیئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو گھر پر تو ہو لیکن

مریض ہو۔ یا جو سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ خدا تمہارے لئے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ سختی اور تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔

(اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو)۔

اس آیت میں صیام کی غرض و غایت یہ بتائی گئی ہے:۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (۲/۱۸۵)

اور اس سے پہلے ـــ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (۲/۱۸۳)

ان اصطلاحات کی تشریح کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روزوں سے متعلق بقایا احکام کو بھی اسی جگہ بیان کر دیا جائے۔ یہ احکام (۲/۱۸۷) میں یوں دیئے گئے ہیں۔ (درمیان میں جو آیت (۲/۱۸۶) لائی گئی ہے، اسے بھی بعد میں پیش کیا جائے گا)۔

۲/۱۸۷ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔ (۲/۱۸۷)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی۔ ـــ بیویوں سے جنسی اختلاط "قربِ خداوندی" کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصور ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (۵۷/۲۷)۔ لہٰذا، خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہوتے تھے ان سے درگذر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت منشائے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی

بیویوں کے پاس بھی جا سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہو جائے۔ اس کے بعد رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم اس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت و اطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو تاکہ تم الجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سلجھا سکو تو پھر تم ان راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یکسوئی سے معاملات پیشِ نظر پر مرکوز رکھو) بس یہ ہیں وہ حدود جو اس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کر دی ہیں۔ ان کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام و قوانین کو نمایاں طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ لوگ ان کی پوری پوری نگہداشت کر سکیں۔

اعتکاف کا مفہوم

اس میں وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ۔ کے الفاظ مزید غور کے متقاضی ہیں۔ مساجد کے متعلق آیت (۲/۱۱۴) میں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ان سے مراد وہ مراکز ہیں جن میں اسلامی نظام کے متعلق جملہ امور طے پائے جاتے ہیں اور عٰكِفُوْنَ کے متعلق کہا جا چکا ہے (زیرِ آیت ۲/۱۲۵) کہ اس کا مطلب ہوتا ہے وہ لوگ جو مملکت کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سنوارنے کے لئے یکسوئی کے ساتھ مصروفِ غور و فکر ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صِیَام کے پروگرام میں عام شرکت کرنے والوں کو اس کی اجازت ہوگی کہ وہ (چاہیں تو) رات کو اپنے اپنے گھر چلے جایا کریں لیکن ایسے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ حل و عقد جن سے خصوصی مشاورت کی ضرورت ہوگی، انہیں عند الضرورت راتوں کو بھی روک لیا جائے گا۔ اسے اعتکاف سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں حدود اللہ کی اصطلاح بھی سامنے آئی ہے۔ یعنی پابندیوں کی لائنیں ـــ مقصود تو یہی ہے کہ ان لائنوں (حدود) سے تجاوز نہ کیا جائے لیکن بربنائے احتیاط کہا یہ گیا۔ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ـــ ان سے ذرا فاصلے پر ہی رہو تو اچھا ہے تاکہ تھوڑی سی لغزش سے پاؤں ان کے باہر نہ جا پڑے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم تعمیلِ احکام کے لئے کس قدر حکیمانہ انداز اختیار کرتا ہے!

اس آیت سے صِیَام سے متعلق احکام مکمل ہو گئے۔ انہیں بغرضِ تجدیدِ یادداشت مختصر الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔

(۱) ماہِ رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں۔ آیت (۲/۱۸۵) میں فلیصمہ کی (کا) اس کا تعین کر دیتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ روزے تین دن کے یا نو دن کے ہیں وہ از روئے قرآن صحیح نہیں۔

(۲) ہر وہ شخص جو گھر پر موجود ہو اور تندرست و توانا ہو۔ اس پر روزہ فرض ہے۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو بہ مشقت روزہ نباہ سکیں۔ اس کا فیصلہ خود ان ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ ایسا شخص روزے کا فدیہ دے جو ایک محتاج کا کھانا ہے۔

(۳) مریض تندرست ہونے کے بعد اور مسافر گھر پر واپسی کے بعد باقی گنتی پوری کرے۔ یعنی اس مہینے میں سے جتنے روزے رہ گئے ہوں۔ ان کی گنتی پوری کرے۔

(۴) جب رات کی تاریکی اور صبح کی روشنی متمیز ہوجائے اس وقت سے لے کر رات تک روزہ دار کے لئے کھانے پینے اور جنسی اختلاط کی ممانعت ہے۔

(۵) یاد رہے کہ دین کے نظام میں ماہِ صیام جہاد کی تیاری کے لئے تربیتی کورس اور ایک اجتماعی پروگرام ہے۔ اس میں عام مجاہدین کی دِن کے وقت کی حاضری ضروری ہوگی لیکن اہل الشوریٰ کو رانوں کو بھی اپنے مراکز میں روک لیا جائے گا۔ اس پروگرام کی بہ حسن تمام تکمیل کے بعد وہ جشنِ مسرت منایا جائے گا جسے عید الفطر کہا جاتا ہے۔

(۰)

اس سلسلہ میں بقیہ تفصیلات سے پہلے ایک ضمنی نکتہ کا سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی صراحت

لَيْلَةُ الْقَدْرِ

کردی ہے کہ اس کے نزول کا آغاز ماہِ رمضان کی ایک رات میں ہوا ہے جسے لیلۃ القدر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہ رات رمضان کے مہینے کی ایک رات ہے۔ قرآنِ مجید نے متعین طور پر نہیں بتایا کہ یہ رات کونسی ہے۔

شب بارات

ہم میں آجکل جو تیوہار رائج ہیں ان میں ایک تیوہار شبِ بارات کا بھی ہے۔ باقی تیوہاروں کے متعلق تو پھر بھی کچھ نہ کچھ بتایا جاتا ہے کہ وہ کس واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں لیکن شبِ بارات (برات) کے متعلق کچھ نہیں بتایا جاتا، بجز اس کے کہ یہ بڑی بابرکت رات ہے اور اس میں آنے والے سال کے انسانی مقدرات کے فیصلے ہوتے ہیں ___ اور اسی سے اس تیوہار کی لِم کا سراغ مل جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ___ شاہکارِ رسالت ___ کے آخری باب میں شرح و بسط سے لکھا ہے، جب اصل ایرانی مسلمان ہوئے تو وہ اپنے سابقہ مذہب، مجوسیت کے عقائد، نظریات حتیٰ کہ رسوم و مناسک تک کو ساتھ لائے۔ اس طرح قرآنی اسلام کی جگہ عجمی اسلام وجود میں آگیا جو اب تک مروج ہے۔ تقدیر کا عقیدہ اور آتش پرستی مجوسی مذہب کے بنیادی ارکان تھے۔ برامکہ اہلِ مجوس کا ایک ممتاز خاندان تھا۔ مسلمان ہونے پر انہوں نے ایسی عظمت حاصل کی کہ عہدِ عباسیہ میں منصبِ وزارت تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے قدیم مسلک ___ عقیدہ تقدیر اور آتش پرستی کے اظہار کے لئے شبِ بارات کے جشن کی طرح ڈالی (لفظ برات یا بارات کے معنی قسمت کے ہیں۔ ہم اپنے ہاں کہتے کہ ___ یہ میری بارات میں ہی نہ تھا)۔ یہ تھی اس تقریب کی اوریجنل حیثیت۔ لیکن اب یہ مسلمانوں کا ایک اہم تیوہار بن چکی ہے، اور اس رات کی تقدیس

کے لئے کئی ایک روایات وضع کرلی گئی ہیں۔ روایات کی حد تک تو پھر بھی بات قابلِ فہم تھی، لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اس کی تائید میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی پیش کر دی جاتی ہے۔ یعنی:-

حٰمٓ ۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۔ (۴۴/۱-۴)

خدائے حمید و مجید کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطۂ ہدایت اپنی صداقت پر آپ شاہد ہے۔ اس کا آغاز ایک ایسی رات میں ہوا جو بڑی ہی مبارک ہے۔ یہ کتاب ہمارے اسی پروگرام کے مطابق نازل ہوئی جس کی رُو سے ہم شروع ہی سے انسانوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اسی میں ان تمام امور کو جو آسمانی حکمت پر مبنی ہیں۔ غلط امور سے الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

ان آیات کو شبِ برات کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں جو کہا گیا ہے کہ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس رات ہر ایک کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

جب کہا جائے کہ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ نزولِ قرآن کی ابتدا رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی تو وہ رات جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا کوئی سی بھی ہو، اسے بہرحال رمضان کے مہینے کی ایک رات ہونا چاہیئے۔ اور شبِ برات شعبان کے مہینے میں آتی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ شعبان کے مہینے کی اس رات کو قرآنِ کریم لوحِ محفوظ سے آسمانِ اوّل پر نازل ہوا اور پھر رمضان میں یہ آسمانِ اول سے دنیا میں نازل کیا گیا۔

یہ ہے نمونہ ان تفسیروں کا جو ہمارے ہاں زیبِ داستاں کے لئے[1] وضع کی گئی ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ:-

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند[2]

اس ضمنی نکتہ کے بعد آیئے صیام کی غرض و غایت کی طرف۔

(٠)

قرآنِ کریم نے صیام کی تین غایات بتائی ہیں۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ اس پروگرام کا مقصد کیا ہے۔ اس سے ہوگا کیا۔

[1] ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے ٭ بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

[2] پاژند: مجوسیوں کی ایک مقدس کتاب۔

صیام کی غایت

اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس سلسلہ میں اُس نے تین باتیں کہی ہیں: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ - (۲/۱۸۳)
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۱۸۵) اور لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵)۔ تقویٰ کا مفہوم جلد اول صـ۵۲ آیت (۲/۲) میں بتایا جا چکا ہے۔ یعنی راستے کے خطرات سے بچ کر چلنا۔ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ لہٰذا، صیام کے پروگرام کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم خطرات کا مقابلہ کرنے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تمہاری قوتِ برداشت بڑھ جائے گی اور تمہارے اندر ڈسپلن پیدا ہو جائے گا۔

اس کا دوسرا نتیجہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ہے۔ شکر کا مفہوم جلد دوم صـ۲۶۳ زیرِ آیت (۲/۵۲) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے انسانی کوششوں کا بھرپور نتیجہ برآمد ہونا۔ لہٰذا، کہا یہ گیا ہے کہ صیام کے پروگرام سے تم میں جو برداشت کی قوت اور ڈسپلن کی صلاحیت پیدا ہو گی، اس سے تمہاری کوششیں پوری طرح ثمربار ہو جائیں گی۔

اس سے سوال یہ اُبھرا کہ کوششیں تو کسی مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے یہ جانکاہ کوششیں کی جائیں گی اور وہ بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔ اس مقصد کو "تُكَبِّرُوا اللّٰهَ" کی نہایت جامع اصطلاح میں سمٹا کر بیان کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ "تکبروا اللہ" دین کی غایت اور جماعت مؤمنین (امتِ مسلمہ) کا منتہائے مقصود ہے۔ یہ امت جیتی ہے تو اس کے لئے، اس کی تمام جدوجہد ہوتی ہے تو اسی کے لئے اور مرتی ہے تو اسی کی خاطر۔

خدا کی کبریائی

تکبروا اللہ سے مراد ہے خدا کی کبریائی قائم کرنا۔ کبریائی سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق جلد اول صـ۲۳ آیات (۲/۱۱-۱۲) میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے لیکن چونکہ زیرِ نظر آیت میں یہ بات پہلی دفعہ سامنے آئی ہے اس لئے مختصر الفاظ میں اس کا دہرا دینا غیر از محل نہ ہو گا۔

کبریائی کے معنیٰ ہیں انتہائی بلندی۔ ایسا غلبہ اور تسلط جس کے اوپر کسی کا غلبہ اور تسلط نہ ہو۔ کلی اختیارات کا مالک۔ آخری اتھارٹی۔ صاحبِ اقتدارِ مطلق (ABSOLUTE POWER) کا مالک۔ آجکل کی سیاسی اصطلاح میں اسے (SOVEREIGN POWER) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سورۃ جاثیہ میں ہے:-

وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ - (۴۵/۳۷)

خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کی ہے۔ وہ انتہائی غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ حکمت پہ

مبنی ہے۔

خارجی کائنات میں خدا کے غلبہ اور اقتدار کے متعلق کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس میں ہر جگہ اس کے مقرر کردہ قوانین کی حکومت ہے، اور ایسی حکومت کہ اس سے بالا کسی کا اقتدار نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے ہم ہی نہیں مغرب کے وہ سائنسدان بھی معترف ہیں جو خدا کو بھی نہیں مانتے۔ وہ بھی اس کے معترف ہیں کہ کائنات میں جن قوانین کی کارفرمائی ہے ان سے بالا کوئی قوانین نہیں۔ وہ ان قوانین کو قوانینِ فطرت کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم انہیں خدا کے مقرر کردہ قوانین فطرت کہتے ہیں۔ ان قوانین کی کبریائی سے انہیں بھی انکار نہیں۔ سو خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی مسلّم ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس کے لئے بھی خدا نے قوانین متعین کر دیئے ہیں لیکن یہاں یہ قوانین از خود نافذ العمل نہیں۔ یہ انسانی ہاتھوں سے نافذ ہوں گے۔ ان قوانین کو انسانی دنیا میں نافذ کرنا خدا کی کبریائی کو ثبت (ESTABLISH) کرنا کہلائے گا۔ یہ جماعتِ مومنین، امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس کو خدا کی حکومت یا دین کا نظام کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کو منصبِ نبوت پر سرفراز کرنے کے بعد (میرے اندازے کے مطابق) پہلا حکم یہ دیا گیا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ اُٹھ اور لوگوں کو غیر اللہ کے قوانین کی عملداری کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۲-۳) اور اپنے نشوونما دینے والے کی کبریائی کو مسلط اور ثبت کر۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (۱۷/۱۱۱) "اس کی کبریائی کما حقہٗ ثبت کر" اور اس کا مطلب یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (۱۷/۱۱۱) "غلبہ اور اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہ ہو" خدا کی یہی کبریائی ہے جس کی بنا پر اُس نے اپنے آپ کو المتکبر (۵۹/۲۳) کہا ہے۔

نظامِ خداوندی کا غلبہ

اور کسی جگہ اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹)۔ متعال کے معنی بھی انتہائی غلبہ اور اقتدار کا مالک ہیں۔ دیگر مقامات میں اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ بھی کہا ہے۔ (۲۲/۶۲؛ ۳۱/۳۰؛ ۳۴/۲۳)

سوال یہ سامنے آیا کہ خدا کے اس غلبہ و اقتدار کے ثبت ہونے کا عملاً مفہوم کیا ہے۔ فرمایا کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲)۔ حکومت صرف خدا کی ہو۔ کیونکہ العلی الکبیر وہی ہے۔ اس لئے احکم الحاکمین وہی ہوگا۔ (۹۵/۸)۔

بات یہاں تک بھی نظری اور اعتقادی سی دکھائی دیتی ہے۔ یعنی کیا خدا کو العلی الکبیر یا احکم الحاکمین مان لینے اور کہہ دینے سے مقصد پورا ہو جاتا ہے؟ کہا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹/۴۰) بالادستی خدا کے قوانین کو حاصل ہو۔ غلبہ و تسلط ان ہی کا ہو۔ حکومت انہی کی ہو۔ اس طرح کی حکومت

کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳)۔ دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن خدا سے ایسا نہیں پوچھا جا سکتا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے چار لفظوں میں کیسی عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ سیاسی اصطلاح میں .... (SOVEREIGNTY) کی تعریف یہ ہے :-

(ACCOUNTABILITY TO NONE)

جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کا اقتدارِ مطلق صرف خدا کو حاصل ہو سکتا ہے اور کسی کو نہیں۔

کلمۃ اللہ کے متعلق کہا کہ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ - (۶/۱۱۶) یہ قوانینِ خداوندی مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ ان کے مجموعہ کا نام کتاب اللہ ہے (یعنی قرآن مجید) لہٰذا خدا کی حکومت، اس کے غلبہ و تسلط، اس کے اقتدارِ مطلق، اس کی کبریائی سے مراد ہو گا اس کی کتاب کی حکومت۔ لیکن ظاہر ہے کہ انسانی دنیا میں قوانین کی حکومت ازخود تو قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ بہرحال انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو گی۔ جو جماعت اس کتاب کی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری لے گی اسے جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ اس لئے فرمایا کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ - (۵/۴۴) (جو کتاب اللہ کی حکومت قائم کرتے ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے)۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر کہلاتے ہیں۔ جب حکومت اس کتاب کے مطابق قائم ہو گی تو اسے الدّین — یعنی نظامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے گا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اسی دین کا قیام، اور دیگر ادیان (نظامہائے زندگی) پر اس کا غلبہ و استیلا تھا :-

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو حق پر مبنی نظامِ حیات اور ضابطۂ ہدایت دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام دنیا کے ہر باطل نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ امر ان لوگوں پر کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی محکومیت پسند نہیں کرتے۔

چونکہ یہی نظام ہے جو منشائے تخلیقِ انسانی کو پورا کر سکتا ہے۔ یعنی اس کے تابع انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننے کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے، آخرالامر اسے دیگر نظامہائے حیات پر غالب آکر رہنا ہے۔ اس لئے فرمایا :-

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۔ (۵۸/۲۱) خدا نے اس کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ اسے واجب قرار دے رکھا ہے کہ آخر الامر ایسا ہو کر رہے گا۔ خدا غالب آکر رہے گا۔ خدا کے غالب آنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ وہ رسول غالب آکر رہیں گے جن کا مقصدِ حیات نظامِ خداوندی کو قائم کرنا ہے۔ (تفصیل جلد دوم ص ۳۰۲۔ آیت (۲/۲) میں گزر چکی ہے)۔

لیکن رسول اکیلا تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اس پروگرام کی تکمیل رسول اور اس کے رفقاء کی اجتماعی کوششوں سے ہوگی۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ۔ (۴۸/۲۹)۔ یہ سب مل کر اس فریضہ کو سرانجام دیں گے۔ چنانچہ جس آیت میں کہا: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۔ (۵۸/۲۱) اس سے اگلی آیت میں یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ رسول اور جماعتِ مومنین حزب اللہ (خدا کی پارٹی) ہے اور یاد رکھو: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۔ (۵/۵۶)۔ "آخر الامر غلبہ حزب اللہ ہی کو ہوگا"۔ یہی وہ جماعت ہے جس کے متعلق کہا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸) چونکہ تم مومن ہو۔

حزب اللہ کا غلبہ

یعنی خدا کی کبریائی کو ثبت کرنے کے ذمہ دار ـــ اس لئے تم سب پر غالب رہو گے۔ جب قانونِ خداوندی کی حکمرانی ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی کبریائی (اپنی حکومت) قائم کرنے کا داعیہ لے کر اٹھیں گے' وہ راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِىَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ (۷/۱۴۶) "جو لوگ الحق کے بغیر دنیا میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہیں گے انہیں نظامِ خداوندی جھاڑ جھنکار کی طرح راستے سے ہٹا دیگا"۔ یہ ہے ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ کا عملی مفہوم۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی کبریائی نے سمٹ سمٹا کر عملی شکل کیا اختیار کی؟ وہ حکومت جس میں اقتدارِ مطلق کتاب اللہ کو حاصل ہو، جن لوگوں کے ہاتھوں یہ حکومت قائم ہو' اس احتیاط کی بنا پر کہ کہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ انہیں حقِ کبریائی (حقِ حکومت) حاصل ہو گیا ہے انہیں تاکید کر دی کہ تم ساری دنیا سے پکار کر کہہ دو۔ اعلان کر دو۔ (PROCLAIMATION) کے طور پر براڈ کاسٹ کر دو اور دن رات براڈ کاسٹ کرتے رہو کہ

اَللّٰهُ اَكْبَرُ!

اللہ اکبر کا مفہوم

دنیا میں کسی انسان کو کبریائی حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں بھی نہیں۔ کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آذری

آپ نے غور فرمایا کہ "اللہ اکبر" کس قدر انقلاب آفریں نعرہ ہے۔ کیسی فلک شگاف حقیقت ہے کس قدر "باغیانہ" اعلان ہے۔ — یعنی ہر انسان کے حقِ حکومت کے خلاف نعرۂ بغاوت — وہ جو رسولؐ اللہ کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی ہے (۷/۱۵۷) تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی وسیع اور طویل کیوں نہ ہو، وہ سمٹ کر ان دو لفظوں میں آجاتی ہے کہ — اللہ اکبر!

اور یہ تھا صیام کے پروگرام کا مقصد۔ یعنی لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ تاکہ تم اس قابل ہو سکو کہ خدا کے عطا کردہ (DIRECTIVES) کے مطابق وہ نظام قائم کر دو جس میں تم ساری دنیا میں اعلان کر سکو کہ کبریائی (حقِ حکومت) صرف خدا کو حاصل ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ دین میں صیام سے مفہوم و مقصود کیا تھا؟

اور پھر اس پر بھی غور فرمایا کہ مذہب میں آکر صیام کا مفہوم کیا رہ گیا؟ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ:-

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　　وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　　یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے　　　(اقبالؔ)

(ضمناً) مروجہ روزوں میں کھانے پینے وغیرہ کی پابندی سے تو حکم خداوندی کی تعمیل یہ ہی تھی۔ وہ کر لی گئی۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ کا مقصد اپنے آپ کو متقی پرہیزگار کہہ لینے سے حاصل کر لیا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ کے متعلق کہہ لیا کہ جمعۃ الوداع درحقیقت بارگاہِ خداوندی میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے لئے ہے کہ اس نے ہمیں روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ ذرا مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے متعلق یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا کہ یہ جو نمازِ عید میں چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں اس سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے! اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد کفار کی حکومت میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی یہی کہا تھا اور پھر تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کا بھی یہی موقف تھا۔

صیام کے پروگرام کے علاوہ، قرآن کریم نے حج کے پروگرام کے متعلق بھی فرمایا کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲۲/۳۷)۔ یعنی اس کی غایت بھی خدا کی کبریائی ثبت کرنے کا عملاً پروگرام ہے۔ اس کی تفصیل حج سے متعلق احکام کے ضمن میں سامنے لائی جائے گی۔ اس وقت ذہن ایک اور نکتہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ وہاں یہ آیت حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کے ضمن میں آئی ہے۔ اور اس سے پہلے کہا ہے۔ سَخَّرَهَا لَكُمْ۔ (۲۲/۳۷)۔ خدا نے ان جانوروں کو تمہارے زیرِ تسخیر کر دیا ہے۔ ذرا اپنے تصور کے سامنے لائیے اس نقشہ کو کہ ایک جانور کو آپ نے لٹایا ہوا ہے۔ اس کی گردن کو

ذبح کے وقت اللہ اکبر

پاؤں سے دبا رکھا ہے۔ وہ بالکل بے بس، ہر طرح سے آپ کے قابو میں ہے۔ چھری آپ کے ہاتھ میں ہے جو ابھی اس کی گردن پر چلا دی جائے گی۔ ذرا سوچئے کہ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جن سے انسان کے دل میں اپنے بڑا ہونے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ عین اُس وقت کہا کہ چھری چلاتے وقت کہو :۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ!

بڑا میں نہیں، بڑی خدا کی ذات ہے۔ کبریائی اسی کے لئے ہے۔ اسی لئے وضاحت سے کہہ دیا کہ حلال جانور کا گوشت بھی تمہارے لئے حلال اسی صورت میں ہو گا کہ تم چھری چلاتے وقت اس کا اعلان کرو کہ کبریائی میرے لئے نہیں، خدا کے لئے ہے۔

یہ تھا دین کا عطا کردہ تصور۔ اور اب جس طرح جانور ہمارے عام "مذبح خانوں" میں اور خود حج کی تقریب پر ذبح کئے جاتے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔

(۰)

صیام (روزوں کے احکام) کے بعد بات وہیں نہیں چھوڑ دی۔ اس کے بعد بھی کچھ کہا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے اس سے صیام کی پابندی کا مقصد اور بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ کہا کہ تم نے کھانے پینے کے معاملہ میں ہمارے حکم کے مطابق کچھ پابندیاں اپنے اوپر عائد کی تھیں۔ جب تم اس طرح پابندیوں کے خوگر ہو گئے ہو تو ایک پابندی کا حکم اور بھی سنو! اور وہ یہ ہے کہ :۔

۲/۱۸۸ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۱۸۸)

روزے کا مقصد یہ تھا کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہو جائے کہ تم زندگی میں ہر جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکو۔ اور تمہاری خواہشِ نفس یا مفاد پرستی کا تقاضا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرا لو جس سے دوسروں کا مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس طرح حاصل کردہ مال و دولت کا انجام کیا ہوتا ہے؟

روزے میں کیا ہوا تھا؟ دن بھر روٹی اور پانی تمہارے سامنے پڑے تھے۔ تم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ وہی روٹی اور پانی جب افطار کے بعد تمہارے سامنے آئے تو تم نے انہیں بلا تکلف کھا پی لیا۔ روٹی پانی تو وہی تھے۔ ان میں یہ فرق کیسے پیدا ہو گیا! اس طرح کہ دن میں انہیں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ رات کو یہ پابندی اٹھا دی تھی۔

مالِ حرام

مال و دولت شکل و صورت کے اعتبار سے ہر جگہ اور ہر ایک کے پاس ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ ناجائز مال (رزقِ حرام) پر خدا کی طرف سے پابندی عائد ہوتی ہے اور جائز مال (رزقِ حلال) پر وہ پابندی نہیں ہوتی۔ تو کیا یہ بات تاسف انگیز نہ ہوگی کہ جس روٹی پر (روزے میں) پابندی ہو، تم اُسے تو نہ کھاؤ لیکن جس مال پر پابندی عائد ہو اسے ہڑپ کر جاؤ۔ مؤمن کا یہ شعار نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہر پابندی کی یکساں نگہداشت کرتا ہے۔ صیام کے پروگرام کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

(۰)

احکامِ صیام کے درمیان ایک آیت اور تھی جسے ہم نے التوا میں رکھا تھا۔ اُسے اب سامنے لایا جاتا ہے۔ فرمایا:-

۲/۱۸۶ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۔ (۲/۱۸۶)

جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو۔ سو میں تو قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے۔ تو چاہیئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے اس آیت کا تعلق "دعا مانگنے" سے نہیں لیکن چونکہ آیت کے عام ترجمہ کی رُو سے اسے "دعا مانگنے" کے لئے قرآنی سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے دعا کا مفہوم اسی مقام پر ذرا وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ میں نے اسے اپنی کتاب "کتاب التقدیر" میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہیں سے اسے ملخصاً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ بعد میں اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لایا جائے گا۔ (دعا کے متعلق ضمناً جلد اول صـ۳۹ـ۳۸ پر بھی لکھا جا چکا ہے)۔

ہمارے ہاں "دعا مانگنے" سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے بارگاہِ خداوندی

دعا کا مفہوم

میں التجا کرے۔ اسی کو خدا سے مراد یں مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے اور اعتراضات ابھرتے ہیں، ہم پہلے انہیں سامنے لاتے ہیں۔

اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہے، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے، اور (قسمت کا لکھا) اٹل ہوتا ہے، تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مرجانا ہے۔ اب اس کے لئے، وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنے دن بیمار رہے گا اور اس کے بعد مرجائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے ـــ جو فیصلہ بدل سکتا ہے ـــ خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے ـــ وہ

اس سے پیدا ہونے والے شکوک

اٹل نہیں کہلا سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی، اس عقیدہ کی رُو سے، خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے (یا اس کے متعلقین نے) ہم سے درخواست کی تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے، اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچئے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کیسے اشکال لاحق ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہو گی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہو گی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ بکر زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر نہیں اور مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہو گا جو حق پر ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے (یعنی زید کی)، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا؟ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی؟

اور اگر کہا جائے خدا بہرحال، حقدار کا ساتھ دیگا، تو اوّل یہ چیز واقعہ کیخلاف ہے۔ ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ـــ ہیں ـــ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے

پر چڑھا دیئے جاتے ہیں ــ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہ رہا۔ حقدار، دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہرحال اس کا ساتھ دے گا۔ اور جو حق پر نہیں، وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی نہیں سنے گا۔

اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔ دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ تو اس سے پھر وہی دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں لیکن بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا۔ تو کیا، اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی (حالانکہ وہ حق پر تھا)۔

یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروّجہ عقائد کی رُو سے، دعا کے سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے سورۃ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ..... (۲/۱۸۶)

اور اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

(اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار (کو سنتا اور اسے) قبول کرتا ہوں۔

اس ترجمہ کی رُو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بیکس و بےبس مصیبت زدہ لوگ گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا، اس امر واقعہ کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب (قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِ حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا) بڑے دور رس (تخریبی) نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو (مذکورہ بالا جواب کی رُو سے)

اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے۔ اس لئے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیئے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد، ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف، مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو اُبھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دستِ تظلم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے۔ لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لئے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے! یا للعجب! آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں اور زیر دستوں کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ ان کے شکر گزار ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا۔ وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر "حضرت صاحب" کے آستانِ عالیہ پر مصیبت زدہ

خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا ہے

اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا، گڑگڑا کر، ہاتھ باندھے، اور اکثر، ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لئے دعا کیجئے' ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا اور یہ سلسلہ، "حضرت صاحب" کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد (جسے وفات نہیں بلکہ وصال کہا جاتا ہے، یعنی ان کا اپنے محبوب — خدا — سے جا کر مل جانا) ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے سجدوں میں گر گر کر التجائیں کی جاتیں، اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں اس لئے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرات مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ (یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے یعنی وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ .... "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔

السُلطان ظلّ اللّٰہ علی الارض کا عقیدہ

ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ ہمارے

دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی "اصل" آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس سایہ کی رُو سے، خدا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کی طرح وہ (شاہنشاہِ حقیقی) بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے ــــ نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا ــــ جسے چاہا پکڑ لیا جسے چاہا نواز دیا۔ جسے چاہا بخش دیا جسے چاہا باندھ لیا۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب و دربان کھڑے ملتے تھے۔ پھر اہلِ دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء۔ اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لئے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی نقشہ ہم نے دربارِ خداوندی کا متعین کر لیا۔ اس کی رُو سے، خدا تک بات پہنچانے کے لئے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر، خدا تک دعا پہنچانے کے لئے کسی "حضرت صاحب" کے وسیلہ کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہماری درخواست (دعا) منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعینہٖ جس طرح بادشاہوں کے حضور نذرانہ گزارنا پڑتا ہے یا ان کے مقربین کی "خدمت" کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو شہنشاہیت نے ہمارے ذہنوں پر مرتسم کیا اور جس نے رفتہ رفتہ مقدس عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ سے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر و الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں، اور دامانِ طریقت سے وابستگان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ معلوم "حضرت صاحب" کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا۔ حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (۷/۱۹۴)، وہ تمہارے ہی جیسے انسان (خدا کے بندے) ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں، یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے، ان کے متعلق کہا ہے کہ تم انہیں لاکھ پکارو، وہ تمہاری بات ہی نہیں سن سکتے۔ اور اگر (بالفرضِ محال) وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (۳۵/۱۴)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو، وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں۔ (۴۶/۵) انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔ (۱۶/۲۱) وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں وہ تمہاری کیا سنیں گے اور کیا مدد کریں گے؟

(۰)

اب آئیے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجئے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ یعنی "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے

دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں

قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔ اس کے بعد ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔ (۲/۱۸۶) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی (قوانین) کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو، اور میری اطاعت کرو (میری باتوں کا جواب دو) اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔ يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۴۲/۲۶)۔ "دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں"۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔

سورۂ مومن میں ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ لیکن اتنی بات سن رکھو۔ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (۴۰/۶۰)۔ جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے (ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی) وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ سورۂ اعراف میں خدا کو پکارنے کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ (۷/۵۵)۔ وہ انہیں پسند نہیں کرتا جو حدود سے تجاوز کر جائیں۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں، ان کی دعائیں بے کار ہو جاتی ہیں (۱۳/۱۴)۔ دعاؤں کی مقبولیت کے لئے ایمان شرطِ اوّل ہے اور ایمان کے متعلق بھی سُن رکھو کہ "انہی لوگوں کے متعلق سمجھا جائے گا کہ وہ فی الواقعہ ایمان لائے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کئے جائیں تو وہ سرِ تسلیم خم کر دیں اور پھر خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری جد و جہد کریں اور کسی حالت میں بھی اطاعتِ خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کریں۔ وہ لوگ اس جد و جہد میں راتوں کی نیند تک بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۳۲/۱۵-۱۶) وہ اس طرح بیم و رجا دونوں حالتوں میں خدا کو پکارتے ہیں اور جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے، اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں اسی حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم متعلقہ آیات کا مفہوم مفہوم القرآن

سے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا:-

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش ہیں، قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں۔

ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور ارباب فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد، علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا کر دے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم، علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں ــــ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ بلکہ نوعِ انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقینِ محکم رکھے۔

لہٰذا، ان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار یہ بھی ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور خدا پر ایمان لے آئے۔

اس کے بعد ان اربابِ علم و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں (وہ دعائیں مانگتے ہیں) کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری غلطیوں کے اثرات مٹاتے رہنا اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے، اپنے رسولوں کے ذریعے (وحی کی رو سے) جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ (۱۹۳-۱۸۹/۳)

دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیے۔ ارشاد ہوا:-

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى .... (۱۹۴/۳)

خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ (ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے۔ لیکن تم یاد رکھو کہ) ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔

یہ ہوتا ہے خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

(۰)

یہ تو تھی عام مومنین کی کیفیت۔ اب ذرا حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ کر لیجیے تاکہ بات اور بھی واضح ہو جائے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق کہا کہ جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو نَادٰىنَا اس نے ہمیں پکارا۔ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ۔ (۷۵/۳۷)۔ تو ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی دعا کا کیا جواب دیا گیا تھا غور سے سنیے۔ فَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا۔ (۲۷/۲۳) ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تم ہماری زیرِ نگرانی، ہماری ہدایات کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ یعنی حضرت نوحؑ کی دعا کے جواب میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ ہم تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ انہیں وہ تدبیر بتا دی جس سے وہ اور ان کی جماعت آنے والے سیلاب سے محفوظ رہ سکیں۔

جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ فرعون کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں، تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے، متعدد تائیدی اسباب و ذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ اس کے جواب میں کہا۔ قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰى (۳۶/۲۰) اے موسیٰؑ! جو کچھ تو نے مانگا ہے ہم نے تجھے عطا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی اور تیری مانگ پوری کر دی ہے تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ ۔ (۲۰/۴۲)۔ "تم دونوں حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی (حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو! جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے۔ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (۱۰/۸۹)۔ " خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے۔ اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو، تم کبھی اُن لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ نے یہ دعا کی کہ ان کی امت کو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں عطا کر دی جائیں تو جواب میں کہا گیا کہ ایسا ہو جائے گا بشرطیکہ" یہ لوگ نبی آخرالزمان کا اتباع کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری رحمت ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسانوں میں سے وہ انہی کو ملتی ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کریں اور دوسروں کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کریں۔ (۷/۱۵۶-۱۵۷)

حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے لئے دعا کی تو انہیں اس کی خوشخبری اسی وقت دے دی گئی۔ لیکن یہ دعا پوری اس طرح ہوئی کہ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۔ (۲۱/۸۹-۹۰) ان کی بیوی میں جو نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، اس کی اصلاح ہو گئی۔[1]

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا، ان کے سلسلہ میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لئے جن طبیعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں بہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ دعا مانگ لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اسی قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۃ رعد میں ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ

لب دریا پیاسا

پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا ایسے شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ پیاس اس کی بجھے گی جو آگے بڑھ کر پانی سے چلّو بھرے اور اسے پی لے۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی۔ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۔ (۱۳/۱۴)۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' ان کی دعائیں رائیگاں جاتی ہیں۔

(○)

[1] حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کے سلسلہ میں مزید تصریحات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گی۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی داد فریاد نہیں! ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں۔ ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سنی بھی جاتی ہیں اور قبول بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا طریق کچھ اور ہے۔ وہ طریق کیا ہے، اسے غور سے سنیئے:۔

مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں

برسہا برس کی محنت شاقہ اور تگ و تازِ پیہم کے بعد مدینہ میں جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکہ میں محصور تھے، قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ "بار الٰہا! ہماری مدد کر اور ہمارے لئے ان ظالمین کے جور و ستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔" انہوں نے خدا سے دعا کی، اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے مدینہ کی جماعتِ مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اے جماعتِ مومنین! انہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ کیا تم سنتے نہیں کہ مکہ کے مظلوم و مقہور، بے کس و بے بس، کمزور و ناتواں، مرد، عورتیں، بچے کس طرح گڑ گڑا گڑ گڑا کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں کہ بار الٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکت اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو نہیں سن رہے؟ اور اگر سن رہے ہو تو پھر کس بات کے انتظار میں ہو۔ تم ان کی امداد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں۔ تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس الحاح وزاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ (۴/۷۵) وہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی یار و مددگار پیدا کر۔ کوئی حامی و ناصر بھیج۔

غور کیجئے، مکہ کے مظلوم خدا سے فریاد کرتے ہیں۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت، اس حکومت، اس نظام سے کہا جو اس کے نام پر، اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا تھا، کہ تم ان کی پکار کا جواب دو۔ تم ان کی مدد کے لئے اٹھو۔

یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعت مومنین جو اب مدینہ میں تھی، تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں مانگی ہوں گی! لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی داد رسی کے لئے وجود میں آیا ہو' اس لئے ان کی مدد کا

مظلوموں کی دعائیں اسلامی مملکت سنتی ہے

کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ تم ہمت و استقلال سے کام لے کر' اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا اور اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی، تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے (خدا سے) نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآن کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ "کہو! کہ وہ کون ہے جو قلب مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے"! وہ اس کے لئے کیا کرتا ہے۔ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (۲۷/۶۲)۔ "وہ تمہیں حکومت و مملکت عطا کر دیتا ہے"۔ یہ ہے طریق خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے عطا نہیں ہو جاتی۔ یہ ان کے ایمان و اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲۴/۵۵)

دوسرے مقام پر اسی جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ انہی کی روشنی میں اپنے امور مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامان زیست انہیں خدا نے دے رکھا ہو' اسے رفاہ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں"۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی (مشاورت باہمی) سے اشارہ اسی نظام مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لئے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو' قوم فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی تھی۔ سورۂ قصص میں ہے کہ۔

> فرعون اپنی مملکت میں دھاندلی کی انتہا کر رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس طرح ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کئے چلا جاتا تھا (کہ وہ ابھرنے نہ پائیں) اس کے لئے وہ کرتا یہ تھا کہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہر مردانگی دکھائی دیتے ذلیل و خوار کر کے غیر موثر بنا دیتا' اور جو ان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ ان میں

ناہمواریاں پیدا کئے چلا جاتا۔

اس سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک میں سرداری اور سروری عطا کر دی جائے اور انہیں ایک ایسے خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ (۲۸ / ۴-۶)

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے۔ اس کی ضرورت پیش آتی ہے اس غلط معاشرہ میں جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو۔ ہر جگہ

دعا مانگنے کی ضرورت کب پڑتی ہے؟

دھاندلی ہو رہی ہو۔ کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے۔ جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں اس شخص کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے۔ جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے۔ جہاں افراتفری اور نفسانفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اُسے روندتے چلے جائیں، کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے۔ جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں۔ جہاں مفلس مریض اس لئے بن آئی موت مر جائے کہ اس کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں تھا، اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اسے گور و کفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کہنے والے نے کہا ہے کہ :؎

جو نہیں آشنا مصیبت کا — درد و غم کا نہ جو شکار ہوا

جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا — جو نہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو رویا

وہ نہیں جانتا دُعا کیا ہے؟

اسے معلوم کیا خُدا کیا ہے؟

جب معاشرہ صحیح خطوط پر (مستقل اقدارِ خداوندی پر) متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردّد کے ملتا ہے۔ نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لئے اس میں نہ کوئی محتاج

ہوتا ہے نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرہ میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لئے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو حضرت عمر فاروق رضؓ نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جب بھی اس پر غور کیا جائے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا تھا کہ لوگو! سُن رکھو:۔

مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب کیفیت یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لئے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں، اور وہ شخص میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً احتسابِ خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ ضرورتمند کی ضرورت اس سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی راہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لئے خدا سے کچھ مانگنا ہی نہیں پڑتا جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی کیا ضرورت ہوگی! یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں سب اجتماعی ہیں، انفرادی نہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ خود ان دعاؤں سے لگ سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے مومنین کی چند ایک دعائیں:۔

مومنین کی سب دُعائیں اجتماعی ہوتی ہیں

(۱) اے رب العالمین! ہمیں زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ دکھا دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرے سحابِ کرم کی بارش ہوئی تھی۔ (۱/۵–۷)

(۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی حسنات عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنات (۲/۲۰۱)

(۳) مجاہدین کی دعائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ثبات و استقامت عطا فرما تاکہ ہمارے قدموں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اگر ہم سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت فرما دے۔ اور ہمیں مخالفین پر کامیابی عطا فرما۔ (۲/۲۵۰)؛ (۳/۱۴۶–۱۴۷)

(۴) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سہو و نسیان سے درگزر فرما۔ ہم جہالت اور غفلت کے اس بوجھ تلے نہ دب جائیں جن کے نیچے اقوامِ سابقہ دب گئی تھیں۔ ہمیں اتنی قوت عطا فرما دے جس سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ہمیں ان لوگوں پر غلبہ و نصرت عطا کر دے جو تیرے نظام کے مخالف ہیں۔ (۲/۲۸۶) نیز (۳/۱۵)۔

(۵) اے ہمارے رب! ایسا نہ ہو کہ صحیح راستہ مل جانے کے بعد ہمارے قدم پھر غلط راستے کی طرف اُٹھ جائیں۔ تو ہمیں سامانِ نشوونما عطا فرماتا رہ۔ (۳/۷)۔

(۶) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی وساطت سے ہم سے کیے ہیں انہیں پورا کر دے۔ (۳/۱۹۲ - ۱۹۳)

(۷) ہمارا شمار صالحین کے زمرے میں ہو۔ (۵/۸۳)۔ ظالمین کے زمرے میں نہ ہو۔ (۷/۴۷)۔

(۸) ہمارے اور ہمارے مخالفین کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ (۷/۸۹)۔ [یہ حضرت شعیبؑ اور ان کے متبعین کی دعا تھی۔ انبیائے اور ان کی جماعتیں، مخالفین کے ساتھ تصادمات میں اسی قسم کی دعائیں مانگا کرتی تھیں]۔

(۹) متبعینِ حضرت موسیٰؑ کی دعا کہ بارالہا! ہمیں ظالمین کا تختۂ مشق نہ بننا پڑے۔ (۱۰/۸۵)۔ یہی دعا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھیوں کی تھی۔ (۶۰/۵) ۔ (۱۰) عذاب جہنم سے محفوظ رہنے کی دعائیں۔ (۲۵/۶۵)

(۱۱) بیوی بچے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنیں (گھر کی زندگی سکون و اطمینان کی ہو) اور ہم متقین کے امام قرار پائیں۔ (۲۵/۷۴)

(۱۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ایسا کر دے کہ ہمارے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لئے کدورت نہ رہے۔ (۵۹/۱۰)

(۱۳) جنت میں مومنین کی دعائیں کہ ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ (۶۶/۸)

یہ ہوتا ہے انداز مومنین کی دعاؤں کا۔ ان کی ساری دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں جن سے پورے معاشرہ، جماعت، نظام کی خیرسگالی کے جذبات جھلک کر باہر آتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں اجتماعی ہی سہی، ان سے ہوتا کیا ہے؟ ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہ سوال

اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل، اس لئے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔

(۰)

کوئی کام کرنا ہو، اس کے لئے سب سے پہلے، ہمارے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے جس

دُعا سے کیا ہوتا ہے؟

قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا۔ اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں گے۔ علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لئے ایک نظم لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدرسہ کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ یعنی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

اس شعر کے مصرعہ اوّل میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ دیوں تو بچوں کے لئے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ بڑی عمیق ہے۔ یعنی جب انسان کی دلی تمنا، حروف و الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے، تو اُسے دعا کہا جاتا ہے۔ جتنی گہری تمنا اتنی ہی مخلص دعا۔ جتنی شدید آرزو، اتنی ہی پُرکیف پکار۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوں کی بیداری سے انسان کے اندر کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پھر جس قسم کی وہ آرزو، اسی قسم کی نفسیاتی

نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے

تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے، خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

اَیکہ منزل رانمی دانی ز راہ — قیمتِ ہر شے زاندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

بہرحال، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدتِ آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے، اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو عشق کی اِک جست قصہ تمام کر دیتی ہے[1]، وہ شدتِ آرزو ہی کی پیدا کردہ توانائی کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس باب میں جب ہم "زمانہ جاہلیت" کے عربوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے

---

[1] عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (اقبالؒ)

کہ تمدن وتہذیب سے اس قدر عاری اور فلسفہ ومنطق سے اس قدر نابلد ہونے کے باوجود ان کی نگاہ کس قدر بلند اور ان کی فکر کس قدر عمیق تھی۔ اور اس کے مظاہرہ کا ان کے ہاں ایک ہی ذریعہ تھا۔ یعنی ان کی زبان۔ لسان عربی مبین ___ وہ (بادیہ نشین) جب اپنے مویشیوں کا دودھ دوہتے تو تھوڑا سا دودھ تھنوں میں باقی چھوڑ دیتے۔ یہ دودھ، اس دودھ کے نیچے اتارنے کا موجب بن جاتا جسے اس مویشی نے اوپر چڑھا لیا تھا۔ اس طرح چھوڑے ہوئے دودھ کو وہ اَلدَّاعِیَۃ کہتے۔ اس سے دُعا کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو انسانی جذبات کو اُبھارنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنے، جس سے اس کی مضمر توانائیاں (چھپا یا ہوا دُودھ)، مشہود ہو کر باہر نکل آئیں ___ شدتِ آرزو سے، جس کا دوسرا نام دعا ہے، یہ ہوتا ہے۔

آرزو کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو ہے کس قسم کی۔ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے، مومن کے سامنے "صحیح آرزو" کا جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ (۷۶/۲۹)۔ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ تم اپنی آرزوؤں کو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھو جس بات کو خدا بُرا سمجھتا ہے، تم بھی اُسے بُرا سمجھو۔ جسے وہ اچھا سمجھتا ہے تم بھی اُسے اچھا سمجھو، تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ ___ قرآنِ کریم کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ___ آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا ___ یہ تمھیں وہ کچھ بنا دے گا جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تم بنو۔ لہٰذا، سب سے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ ویسی نہ ہو تو اُسے تبدیل کر کے مستقل قدر سے ہم آہنگ کر لینا چاہیئے۔

اگلا قدم یہ ہے کہ اس آرزو، اس مقصد، اس معیار کو ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ قرآنِ کریم نے مومنین کا جو شعار بتایا ہے وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں:___ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (۳/۱۹۱)۔ "جو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں"۔ اس سے ان کی آرزوئیں پختگی بھی پیدا ہوتی جاتی ہے اور اس کی پاکیزگی بھی ملوث نہیں ہونے پاتی۔ قرآنِ کریم نے سورہ حٰمٓ میں اس حقیقت کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ "وہ لوگ جو دل کے کامل یقین واطمینان سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر اس دعویٰ پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہیں"۔ اس میں ذرا سا بھی تزلزل نہیں آنے دیتے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ۔

ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو ان سے کہتے ہیں کہ تم مت خوف کھاؤ۔ مت غمگین ہو۔ اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور مددگار ہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی ـــ اس کے بعد ہے: وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ: (۴۱/۳۰-۳۱)۔ اس میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ اس میں تمہاری ہر آرزو پوری ہوگی۔ ہر دعا قبول ہوگی۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ۔ بہت بڑا وعدہ ہے ـــ جو کچھ تم چاہو گے وہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان تصریحات کے مطابق جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، مومن، چاہے گا ہی وہی جو مستقل اقدارِ خداوندی (مشیت ایزدی) کے مطابق ہوگا، اس لئے وہ کسی غلط بات کو چاہے گا ہی نہیں۔ اور وہ مانگے گا ہی وہی جس کے دینے کا خدا نے مومنین سے وعدہ کر رکھا ہے۔ یعنی ہر قسم کی خوشگواریاں، سرفرازیاں، رزقِ کریم، غلبہ و تسلط، قوت و اقتدار، یعنی قرآنی معاشرہ کی تمام برکات۔

آپ نے غور فرمایا کہ مومنین کی دعائیں کیسی ہوتی ہیں اور وہ پوری کس طرح سے ہوتی ہیں۔ یہ دعائیں اس جماعت کی ہوتی ہیں جو دنیا میں خدا کے نظام کی تشکیل و استحکام کے لئے اٹھے اور سفرِ حیات، وحی خداوندی کی روشنی میں طے کرتی جائے۔ سینے میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ دل میں حصولِ مقصد کی تڑپ: نگاہوں کے سامنے واضح نصب العین۔ بازوؤں میں قوت اور قدموں میں استقامت۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی ذات، (علیٰ حدِ البشریت) صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مومن کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کے خیالات، ارادے، مقاصد، مطامح، زاویہ ہائے نگاہ اور منتہائے نظر، سب مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی حقیقت کو میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں ان الفاظ کے پیرہن میں پیش کیا تھا:۔

> دعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمہ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا۔ عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دلکش رعنائیوں سے یکرنگی کی مچلتی ہوئی آرزو۔ چکور کے سینے میں چاند کو اپنے اندر سمو لینے کی کہکشاں گیر و فلک پیما والہانہ امنگ۔ قلبِ پروانہ میں شمع فروزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کا وجد انگیز و رقص آفریں جوش و خروش، یعنی انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لامتناہیت (حیاتِ جاوداں) میں بدل لینے کا بیتابانہ ولولہ اور اسی ولولہ کی تسکین کے لئے قطرۂ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے بازوئے شاہیں کی طلب۔
>
> بغور دیکھئے تو ایمان، دعا، اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس

حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا، اس ہم آہنگی و یک رنگی کی شدید تڑپ ہے اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے کوشش پیہم۔

یہی ہیں مومنین کی وہ دعائیں جو مستجاب ہوتی ہیں۔ انہی کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے ـــ وہ نظام، جس میں کسی کو اپنی انفرادی ضرورت اور حاجت کے لئے، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ نظام "ان کی دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتا ہے"۔ وہ اس کا انتظام کرتا ہے کہ ہر صاحبِ احتیاج کی دعا (مانگ) بابِ خداوندی سے ٹکرانے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

باقی رہی ملائکہ کی تائید، سو اس کے لئے قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ۔ (۸/۱۰) اس سے انسان کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اس کے قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ۔ (۸/۱۱)۔ اور سکونِ قلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قدموں میں ثبات و استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے جو کچھ دُعا سے ہوتا ہے یعنی اس سے انسان کے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کس قدر قابلِ رشک ہے وہ انداز جس میں اقبالؒ نے، اتنی بڑی رفیع و منیع اور عمیق و دقیق حقیقت کو، دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے کہ جس سے بلیغ اور دلکش انداز، تصور میں نہیں آسکتا ـــ آپ بھی سنیے اور وجد میں آ جائیے۔ کہا ہے کہ ؎

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ (قضا سے یہاں مراد قانونِ خداوندی ہے)۔

(۰)

باقی رہا ہمارا ایک دوسرے کے لئے دعا کرنا، تو یہ درحقیقت ان کے حق میں ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے جس سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں، اسے اخلاقی تائید (MORAL - SUPPORT) کہا جاتا ہے۔

ایک دوسرے کیلئے دعائیں کرنا

اس سے خود اس شخص کے اندر ایک قسم کی نفسیاتی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس کے اثرات نہایت خوشگوار ہوتے ہیں۔ جس محبوبِ جاں نواز کے دیکھنے سے (غالبؔ کے الفاظ میں) مریض کے منہ پر رونق آجائے، اس سے چار کلماتِ تسلی یا دو الفاظِ تحسین

سننے سے جو قلبی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی حیثیت، مردہ کے لئے دعائے خیر کی ہے۔ اس سے مردہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کے پسماندگان کے غم واندوہ میں کمی واقعہ ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے معاشرتی روابط کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس نہیں کرتا اور سخت سے سخت جانکاہ مصیبت میں بھی اس کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ اسی لئے حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جب اپنے عطیات تیرے پاس لائیں تو انہیں قبول کرنے کے بعد صَلِّ عَلَيْهِمْ۔ "انہیں شاباش دیا کر"۔ ان کے اس عمل کو (APPRECIATE) کیا کر۔ انہیں دعا دیا کر۔ اس لئے کہ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۹/۱۰۳)۔ "تیری دعا ان کے لئے بڑی موجب تسکین ہوتی ہے"۔

(۰)

قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کی بعض انفرادی دعاؤں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً حضرت ایوبؑ نے اپنی انتہائی تکلیف میں خدا کو پکارا، اور خدا نے ان کی مصیبت کو رفع کر دیا (۲۱/۸۳-۸۴)۔ حضرت یونسؑ نے اپنے غم والم کی اندوہناکیوں میں خدا کو پکارا اور انہیں مصیبت سے نجات مل گئی (۲۱/۸۷-۸۸)۔ سو اوّل تو قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ ان کے مصائب و آلام دور کرنے کے لئے کس قسم کے اسباب پیدا کئے گئے تھے۔ دوسرے (اور یہ بات بنیادی ہے) کہ نبوت ایک ایسا مقام ہے جس کی کنہ و ماہیت کا سمجھنا کسی غیر از نبی کے لئے ممکن نہیں۔ ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا اور نبی کا باہمی تعلق کس قسم کا ہوتا تھا۔ خدا نبی سے کس طرح ہمکلام ہوتا تھا۔ نبی خدا سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ لہٰذا، جس حقیقت کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے، اس کے متعلق بحث و گفتگو سے کیا حاصل!

(۰)

اس کے بعد آیئے آیۂ زیر نظر (۲/۱۸۶) کی طرف۔ روزہ میں کھانے پینے اور جنسی اختلاط سے احتراز کیا جاتا ہے۔ تصوف کے پیدا کردہ نظریہ کی رو سے ذہن اس طرف منتقل ہوسکتا تھا کہ ترکِ لذائذ اور مادی اشیاء کے پرہیز سے انسان خدا کا مقرب بن جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ ہمارے ہاں متقی کا ترجمہ کیا جاتا ہے "پرہیزگار"۔ یہ اسی (تصوف کے پیدا کردہ) تصور کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ ان لذائذ و حظائظ سے مجتنب رہنے اور مشقتیں برداشت کرنے سے خدا کا قرب حاصل نہیں ہو جاتا۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ۔ (۲/۱۸۶)۔ "اے رسول! جب میرے بندے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ کہ میں ہر وقت

ان کے قریب ہوں"۔

قرب (نزدیکی) ایک تو فاصلہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ دو مادی چیزوں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے خدا کے قرب سے مراد فاصلہ کے اعتبار سے نزدیکی نہیں۔ وہ کسی مقام میں متمکن نہیں کہ انسان آگے بڑھ کر اس کے قریب ہو جاتا ہے۔

معراجِ نبویؐ

ضمناً معراجِ نبویؐ کا عام تصور یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ مکہ سے سفر کر کے آسمانوں کو طے کرتے ہوئے عرشِ الٰہی تک پہنچے اور وہاں خدا سے ملاقی ہوئے۔ اس نظریہ کے خلاف بنیادی اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا کسی خاص مقام پر متمکن ہے جہاں جا کر اس سے ملا جاتا ہے۔ یہ نظریہ خدا کے اس تصور کے خلاف ہے جو قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ میں (IMMINANCE) اور (TRANSCENDANCE OF GOD) کی فلسفیانہ بحثوں میں الجھے بغیر اتنی وضاحت پر اکتفا کروں گا کہ قرآنِ کریم نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ (۵۷/۴)۔ تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ (۵۰/۱۶)۔ ہم انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۔ (۵۶/۸۵) لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لہٰذا آیت (۲/۱۸۶) میں "اِنِّىْ قَرِيْبٌ" سے مراد خدا کا مکان (SPACE) کے اعتبار سے نزدیک ہونا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ہمارے ہاں خدا کا تصور بادشاہوں کو سامنے رکھ کر تراشا گیا ہے۔ بادشاہوں کے مقربین فاصلہ کے اعتبار سے بھی اس کے نزدیک بیٹھتے تھے جو سب سے زیادہ مقرب ہوتا تھا اس کی نشست بادشاہ کے قریب تر ہوتی تھی۔ اب بھی حکومتوں میں (بادشاہ نہ ہونے کے باوجود) سفراء۔ وزراء۔ حکام۔ عمال وغیرہ کے لئے (WARRANT OF PRECEDENCE) (یعنی نشستوں کی ترتیب) مقرر ہوتی ہے اور اسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

مقربینِ بارگہِ خداوندی

دربارِ خداوندی کا کچھ اس قسم کا تصور ہمارے ذہنوں میں بھی منقوش ہے اور اولیاء اللہ (یعنی مقربینِ بارگاہِ خداوندی) اپنے معتقدین سے بیان کرتے ہیں کہ رات محفلِ خداوندی میں کون کس جگہ تشریف فرما تھا۔ اس قسم کے تمام تصورات غیر قرآنی اور دوسروں کے

لہ قرآنِ کریم میں حضورؐ کے عرشِ معلیٰ پر جانے کا ذکر نہیں۔ معراجِ نبویؐ حضورؐ کے کمالاتِ نبوتؐ کی معراج ہے تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

ہاں سے مستعار لئے ہوتے ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالیٰ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۔"ذاتِ خداوندی انسانوں کے پیدا کردہ اس قسم کے تصورات سے بلند و بالا ہے"۔ خدا کا وہی تصور صحیح ہے جسے خود خدا نے اپنے متعلق قرآنِ کریم میں دیا ہے۔ اس تصور کی رُو سے قربِ خداوندی سے مراد ہوگی "اطاعتِ خداوندی کی رُو سے حاصل شدہ مدارج۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶/۱۹) "خدا کی اطاعت کر اور اس طرح اس کا قرب (مدارجِ عالیہ) حاصل کرے"۔ لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶/۱۹) خدا کے ہاں ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کی رُو سے متعین ہوتے ہیں۔ جو اعمالِ حسنہ میں سب سے آگے ہوں وہی سب سے زیادہ مقرب۔ اَلسّٰبِقُوْنَ۔ السّٰبِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (۵۶/۱۰-۱۲)؛ (۸۳/۲۸ ۵۶) دوسری جگہ انہیں اَلْمُتَنَافِسُوْنَ۔ کہا ہے یعنی دوسروں سے سبقت لے جانے والے، جو حیاتِ جاوید کے سرچشمہ سے سیراب ہوں گے۔ (۸۳/۲۶-۲۸) سورۃ توبہ میں ہے کہ نظامِ خداوندی کے استحکام کے سلسلہ میں مالی امداد رسول اللہ کی طرف سے تحسین و آفرین (صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ۔) اور قُرُبٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ ـــ (۹/۹۹) کا موجب ہوتی ہے۔ یہاں قربت کے ساتھ عِنْدَ اللّٰہِ (خدا کے ہاں) نے بات واضح کر دی کہ اس سے مراد خدا کے ہاں بلند مدارج ہیں۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ وہی مال وجہِ تقربِ خداوندی ہے جسے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ محض مالدار ہونے سے انسان خدا کا مقرب نہیں بن سکتا۔ اعمالِ صالح کی رُو سے مقرب بن سکتا ہے۔ (۳۴/۳۷)۔ نہ ہی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو خدا کا مقرب بنا سکتا ہے۔ یہ تو خدا کی اطاعت ہے جس سے یہ تقرب حاصل ہوتا ہے[1]۔ (۳۹/۲-۳)

(٠)

لیکن آیت زیرِ نظر (۱۸۶/۲) میں "قربِ خداوندی" کا مفہوم کچھ اور ہے۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ وہ اس طرح کہ جب بھی کوئی اپنی راہنمائی کے لئے مجھے آواز دیتا ہے تو میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کی پکار کا جواب دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔

متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ کتاب اللہ کا مقصد اور منصب یہ ہے کہ جب انسان نے زندگی میں

---

[1] تصوف کے متعلق تفصیلی بحث جلد دوم صفحہ ۸۶ آیت (۲/۱۰۲) کے تحت ہو چکی ہے۔

کسی دوراہے پر پہنچے اور اسے یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے جس سے وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو قرآنِ کریم اس کی راہنمائی اس راستے کی طرف کر دیتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کو محاکاتی انداز میں بڑے دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک مسافر دوراہے پر کھڑا ہے اور اسے صحیح راستے کا یقینی طور پر علم نہیں۔ اسے دُور کوئی شخص دکھائی دیتا ہے۔ وہ اسے پکار کر آواز دیتا ہے اور راستے کے متعلق دریافت کرتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسافر دوراہے پر کھڑا ہو اور وہاں کوئی آدمی ایسا نہ ہو جس سے وہ راستے کی بابت دریافت کر سکے، یا جس سے وہ پوچھے وہ اس کی آواز کا جواب ہی نہ دے۔ یا جواب دے تو یہ کہ مجھے راستے کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ سفرِ زندگی میں ہم انسان کی یہ حالت نہیں ہونے دیں گے۔ وہ کسی دوراہے پر راستے کے متعلق پوچھے، ہم اُسے جواب دینے کے لئے وہاں موجود ملیں گے اور اس سے کہہ دیں گے کہ یہ (GUIDE BOOK) ہے اس میں فلاں صفحہ الٹو، تمہیں راستے کا پتہ نشان مل جائے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ کسی مسافر کے سوال کا جواب اس کتاب سے نہ ملے۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸)۔ کوئی جواب طلب بات ایسی نہیں جسے اس کتاب میں بغیر جواب کے چھوڑ دیا گیا ہو۔

یہ جواب قرآن سے ملتا ہے

آیت (۲/۱۸۵) میں کہا گیا تھا کہ رمضان کے مہینے میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی۔ یعنی اس کتاب کی ابتدا جو غلط اور صحیح راستوں کو الگ الگ کر کے بتا دیتی ہے۔ اور اس سے اگلی آیت (۲/۱۸۶) میں کہا کہ پوچھنے والوں سے کہو کہ تم اس کتاب سے اپنے سوال کا جواب مانگو۔ پھر دیکھو کہ اس سے کس طرح اس کا واضح جواب ملتا ہے کہ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ۔ (۱۱/۶۱)۔ اس سے تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ تمہارا خدا کس طرح تم سے قریب بھی ہے اور تمہارے ہر سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت قرآنِ کریم کی اس خصوصیت کی وضاحت کرتی ہے۔

(ضمناً، یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کا ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ ہمیں جو کچھ خدا سے پوچھنا ہو اس کی کتاب سے پوچھنا چاہیئے۔ یہ کتاب ہمارے ہر سوال کا جواب دیگی۔ خود ستائی کے طور پر نہیں بلکہ حقیقتِ نفس الامری بلکہ بطور تحدیثِ نعمت عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ خدا کے اس حقیر بندے نے جو سوال بھی اس کتاب سے پوچھا اس کا اسے کافی اور وافی جواب اس سے مل گیا۔ یہ سائل اس کی بارگاہ سے کبھی محروم نہیں لوٹا۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ (ہم ہر سائل کے سوال کا جواب

دیتے ہیں) اس ہیمپیرز کا ذاتی تجربہ ہے ـــ ہم تو دیتے ہیں کوئی مانگنے والا ہی نہیں۔ ایک عظیم حقیقت ہے۔ اس سے مانگو تو سہی۔ پھر دیکھو کہ وہ کس طرح ـــ شعلہ شعلہ بہ بخشد، شرر شرر نہ دہد ـــ اس کے بعد ایک ایسی بات کہی گئی ہے جس سے نگہ تصور میں پھول کھلنے اور بہاریں مسکرانے لگ جاتی ہیں۔ انداز وہی محاکاتی ہے۔ کہا کہ تم نے ہم سے کچھ مانگا اور ہم نے جھولیاں بھر بھر کر دیا۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي (۲/۱۸۶) ہم بھی تم سے کچھ مانگتے ہیں۔ سوال کرتے ہیں۔ کیا تم ہمارے سوال کا جواب نہیں دو گے؟ ہماری مانگ پوری نہیں کرو گے؟

خدا کی مانگ پوری کرو

سبحان اللہ! یہ انداز جس قدر شانِ محبوبیت لئے ہے اُسے بس محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کے پیکر میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔

خدا کی وہ مانگ کیا ہے؟ وَلْيُؤْمِنُوا بِي - (۲/۱۸۶) یہ کہ تمھیں جو جواب ہمارے ہاں سے (یعنی کتاب سے) ملا ہے اس کی صداقت پر یقین کرو۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے خدا کا کچھ سنور جائے گا۔ اس کا کوئی بگڑا ہوا کام بن جائے گا۔ کیا اس نے یہ سوال کسی اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کیا تھا۔ کہا کہ نہیں! اس سے تمہیں کچھ اور بتانا مقصود تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ ہم نے اس کا پتہ نشان بتا دیا۔ تمہیں اس کا علم ہو گیا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ صحیح راستہ معلوم ہو جانے کے بعد ضروری نہیں ہوتا کہ وہ شخص اس راستے کو اختیار بھی کر لے اور اس پر چل بھی پڑے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز مجھے نقصان پہنچاتی ہے اور فلاں فائدہ دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہ نقصان رساں چیز کو چھوڑتے ہیں نہ نفع بخش کو اختیار کرتے ہیں۔ سقراط کا یہ قول عملی تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے کہ (KNOWLEDGE IS VIRTUE) "علم ہی اصل نیکی ہے۔" اس کے برعکس غالبؔ نے جو بات کہی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد ـــ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

قرآن کہتا ہے کہ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تم صرف جانتے ہو کہ فلاں چیز مضرت رساں ہے۔ تمھیں اس کا یقین نہیں کہ اس سے تمہارا واقعی نقصان ہو جائے گا۔ کسی بات کا محض علم ہونے اور اس کی مضرت رسانی پر یقین ہونے میں بڑا فرق ہے۔

قرآنِ کریم نے کہا کہ تمہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ صحیح راستہ کون سا ہے لیکن تم اس راستے پر گامزن اسی صورت میں ہو گے جب تمہیں اس امر کا یقین ہو کہ صرف وہی راستہ ایسا ہے جس سے تم بخیر و عافیت منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اس کے سوا کوئی راستہ ایسا نہیں۔ وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ - (۲/۱۸۶) اے رسول!

ان سے کہو کہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے راستے کے صحیح ہونے پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھیں۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ تاکہ یہ اس راستے کو محکم طور پر اختیار کر سکیں۔ اس پر جم کر گامزن ہو سکیں۔ رُشْد کے معنی ہیں صحیح بات کے معلوم ہو جانے پر اسے جم کر، محکم طور پر اختیار کر لینا۔ قرآن کریم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح راستے کو نمایاں طور پر واضح کر دیتا ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲۵۶/۲)۔ اور پھر ایسا تغیرِ نفس پیدا کر دیتا ہے جس سے انسان اس راستے کو محکم طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ "پھر طبیعت اُدھر آجاتی ہے۔" چونکہ یہ راستہ قرآن اور صرف قرآن سے ملتا ہے اس لئے مُرشِد خدا کی ذات ہے۔ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا۔ (۱۷/۱۸)۔ جو اس کے راستے کو چھوڑ دیتا ہے اس کا کوئی حامی و مددگار اور مرشد نہیں ہو سکتا۔

رُشد کے معنی

(۰)

جن روزوں (صیام) کو فرض قرار دیا گیا ہے ان کا ذکر تو انہی آیات میں ہے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید میں بعض روزوں کا بطور کفارہ بھی ذکر آیا ہے اور وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مناسکِ حج میں کچھ کمی رہ جانے کے سلسلہ میں (۳ + ۷) دس روزوں کا حکم (۱۹۶/۲)

(۲) قتلِ خطا میں دو ماہ کے روزوں کا حکم۔ (۹۲/۴)

(۳) قسم توڑنے کے کفارہ کے طور پر تین دن کے روزوں کا حکم۔ (۸۹/۵)

(۴) "ظہار" کے کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزوں کا حکم۔ (۴/۵۸)

(۵) حالتِ احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کے طور پر روزوں کا حکم (۹۵/۵)

(۰)

واضح رہے کہ یہودی شریعت میں روزے میں بات چیت کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ (۲۶/۱۹)

چھٹا باب

حجّ - جہاد - ہجرت

آیات ۲/۱۸۹ تا ۲/۲۱۸

(۱) حج کا اجتماع ـــــ آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔
(۲) مرضات اللہ کا مفہوم۔
(۳) قتال (جنگ) کے مقاصد اور ہدایات۔
(۴) قرآن اور مذہبی آزادی۔
(۵) ارتداد کا غلط تصور۔
(۶) قوّت اور حکمت کا امتزاج۔
(۷) اسلام کا منتہیٰ ـــــ وحدتِ انسانیت
(۸) حصولِ جنّت کی آسان راہیں۔
(۹) جہاد کی اہمیت۔
(۱۰) ہجرت کا مفہوم۔
(۱۱) جہاد کے خلاف سازش۔
(۱۲) انسانیت کی نجات صرف قرآنی نظام میں ہے۔

چھٹا باب

حج کا عالمگیر اجتماع اور اُس کی غایت

حضورؐ نبی اکرم سے دریافت کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ جب جہاد (بمعنی قتال فی سبیل اللہ ـــ خدا کی راہ میں جنگ) ہو رہا ہو تو اس میں شامل ہو، اور جب وہ نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ مسلمان کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین ہوتا ہے ـــ یعنی دینِ (نظام) خداوندی کو تمام باطل نظاموں پر غالب کرنا ـــ اور اس کی ساری زندگی اس نصب العین کے حصول (یعنی اس نظام کے قیام اور اس کے بعد اس کے تحفظ، استحکام اور بقا) کے لئے وقفِ جد و جہد ہوتی ہے جنہیں عام الفاظ میں "عبادات" کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اسی پروگرام کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں۔ صیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں آچکا ہے۔ مہینہ بھر کے اس تربیتی کورس کی تکمیل کے بعد جشنِ مسرت (عید الفطر) منایا تو پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا آغاز ہو گیا۔ یہ کڑی ہے۔

حج کا اجتماع

حج کا اجتماع۔ کعبہ کی اہمیت درحج کا عمومی تعارف، دوسرے باب میں کرایا جا چکا ہے۔ وہاں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ حج درحقیقت نمائندگانِ امت کی سالانہ عالمگیر کانفرنس ہے جس میں اسلامی نظام سے متعلق مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، دلائل و براہین کی رُو سے تمام امورِ مملکت پر بحث و تمحیص ہوتی ہے اور آئندہ سال کے لئے پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ نمائندگانِ امت کے علاوہ، دوسرے لوگوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ آکر دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں حج کا اجتماع ہوتا تھا۔ قریش، جو کعبہ کے متولی تھے۔ وہ اس کا اہتمام کرتے تھے اور دور و نزدیک کے لوگ جوق در جوق اس میں شریک ہوتے تھے۔ کعبہ، بتکدہ تھا جس میں مختلف قبیلوں کے بُت نصب تھے۔ یہ قبائل اپنے اپنے بتوں کی پوجا کرتے۔ ان کے استھانوں (آستانوں) پر جانور ذبح کرتے

اوہام پرستی کے عجیب وغریب مظاہرے ہوتے اور اس طرح یہ سب اس میلے میں شریک ہو جاتے۔ میلہ، تجارتی مرکز کا بھی کام دیتا۔ عرب، حج کے بین القبائل اجتماع کا اہتمام تو ذی الحجہ کے مہینے میں کرتے لیکن رجب کے مہینے میں چھوٹے پیمانے پر بھی ایک اجتماع ہوتا جسے وہ عُمرہ سے تعبیر کرتے۔

عُمرہ

عرب کا علاقہ بالعموم بے برگ وگیاہ ریگستان پر مشتمل تھا (اور اب بھی ویسا ہی ہے) اس لئے وہاں کے رہنے والوں کی معیشت کا دارومدار، زیادہ تر لوٹ مار پر تھا۔ یہ لوٹ مار، رہزنی اور قزاقی (قافلے لوٹنے) کی شکل میں بھی ہوتی اور جنگ میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کی صورت میں بھی۔ اس لئے اس ملک میں سفر کرنا بڑے خطرات کا سامنا کرنا تھا۔ لیکن حج کے اجتماع کی اہمیت کے پیشِ نظر انہوں نے ایک بین القبائلی معاہدہ کر رکھا تھا (جسے آج کی اصطلاح میں CONVENTION کہہ لیجئے) یہ اس معاہدہ کی رُو سے حج سے پہلے (ذی قعدہ)، حج کی تقریب پر (ذی الحجہ) اور حج کے بعد (محرم) کے تین مہینے، اور اُدھر عمرہ کے سلسلہ میں رجب کا مہینہ، شہر الحرام تسلیم کئے جاتے تھے۔ یعنی ایسے مہینے جن میں ہر قسم کی لوٹ مار اور جنگ وجدال حرام ہوگی۔ کعبہ کے متولیوں (مذہبی پیشواؤں) نے اسے بھی کس طرح کاروبار کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ان کی اس روشِ کہن یا عادتِ مستمرہ کے مطابق، اسلام میں بھی حج کے اجتماع کے لئے ذی الحجہ کا مہینہ رہنے دیا گیا اور حرمات کے چار مہینوں[1] میں جنگ پر پابندی کو بھی قائم رکھا لیکن اس اجتماع کے مقصد اور اس کی روح کو یکسر بدل دیا۔

نظامِ خداوندی کے مخالفین، اس نظام کی راہ میں شروع سے روڑے اٹکاتے چلے آرہے تھے۔ لیکن حج کے اجتماع کے ضمن میں ان کی یہ مخالفت شدید ترین شکل اختیار کر لیتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بین القبائلی معاہدہ کو بھی بالائے طاق رکھ کر، ان مہینوں میں بھی جنگ پر اُتر آتے تھے۔ زیرِ نظر باب کا مرکزی موضوع تو حج کے متعلق تفاصیل ہے لیکن مخالفین کی اس روش کے پیشِ نظر جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے، اس میں جنگ کے متعلق بھی چند ایک ہدایات آگئی ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان دونوں عنوانات کو الگ الگ کر لیا جاتے۔ کیونکہ دونوں یکساں اہم بھی ہیں اور تفصیل طلب بھی۔ ہم پہلے حج کو لیتے ہیں۔ فرمایا:۔

۲/۱۸۹ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۔ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ۔
وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

---

[1] قرآنِ کریم میں ان مہینوں کے نام نہیں دیئے گئے۔ یعنی انہیں متعین طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ صرف تعداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۹/۳۶)

مَنِ اتَّقٰى ۔ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۱۸۹)

مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ ہم نے شہرِ رمضان (رمضان کے مہینے) کے متعلق کہا ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی اور اس لئے اسے صیام کے پروگرام کے لئے متعین کیا گیا۔ اس سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض نحس۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ماہ و سال، زمان کی گردشِ دولابی کے مظہر ہیں۔ ان میں سعد و نحس کا کوئی سوال نہیں۔ ان کا مقصد تو محض مختلف کاموں، بالخصوص حج کے لئے وقت کا تعین ہے اور بس۔ (آیت کے باقیماندہ حصہ کا مفہوم آگے چل کر بیان ہوگا)۔

اِھلال کے معنی ہیں آواز بلند کرنا۔ چونکہ عربوں کے ہاں مہینے کی ابتدا، چاند کی پہلی تاریخ سے ہوتی تھی، اس لئے جو شخص سب سے پہلے چاند دیکھ لیتا وہ اونچی اونچی آواز سے لوگوں کو اس سے مطلع کرتا۔ (عید کے چاند کے سلسلہ میں ہمارے ہاں اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے)۔ اس سے نئے چاند کو ھلال کہنے لگے۔ عربوں جیسی صحرانشین قوم میں جہاں حساب کتاب رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، مہینوں اور دنوں کا حساب چاند ہی کی رُو سے ہوسکتا تھا اس لئے ان کے ہاں قمری مہینے اور قمری سال کا رواج تھا۔ لیکن قرآنِ کریم نے کہا کہ ماہ و سال کے حساب کے لئے چاند کی کوئی تخصیص نہیں۔ شمسی اور قمری دونوں قسم کے سال رکھے جاسکتے ہیں۔ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ۔ (۶/۹۶) "سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جاسکتا ہے"۔ دوسری جگہ ہے۔ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ

قمری اور شمسی کیلنڈر

بِحُسْبَانٍ (۵۵/۵)۔ سورج اور چاند دونوں، مقررہ حساب اور قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں اس لئے دونوں سے گنتی شمار کا کام لیا جاسکتا ہے۔ حساب رکھنے کا کوئی خاص اہتمام نہ ہو (مثلاً کیلنڈر اور جنتریاں) تو چاند کی رو سے حساب رکھنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وَ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ۔ (۱۰/۵) اس کی مقررمنازل (اس کے بڑھنے گھٹنے کی شکلیں) حساب میں آسانی پیدا کرسکتی ہیں۔ دوسری طرف کہا کہ رات اور دن کی گردش سے بھی حساب رکھا جاسکتا ہے۔ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ۔ (۱۷/۱۲)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رات اور دن کا اختلاف، سورج کی رُو سے رونما ہوتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، تقویم (کیلنڈر) شمسی بھی ہوسکتی ہے، قمری بھی۔ (جیسا کہ کہا جاچکا ہے، عربوں جیسی بادیہ نشین قوم کے لئے قمری تقویم زیادہ آسان تھی (ہمارے ہاں اب بھی دیہات میں چاند کے مطابق تاریخوں کا حساب رکھنے میں آسانی سمجھی جاتی ہے)، لیکن زرعی نظام میں اس میں ایک دقت پیش آجاتی ہے۔ زراعت کا پروگرام موسموں کے دامن سے وابستہ ہوتا ہے اور موسموں کا تغیر سورج کے حساب سے ہوتا ہے نہ کہ چاند کے

حساب سے۔ رمضان کا مہینہ کبھی سردی میں آجاتا ہے کبھی گرمی میں۔ لیکن گندم کی کٹائی کے لئے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی سردی کے مہینے میں ہو کبھی گرمی کے۔ اس لئے زرعی نظام، سورج ہی سے وابستہ رہ سکتا ہے۔ ویسے بھی سورج کی رُو سے۔ زمین، سورج کے گرد (تقریباً) ۳۶۵ دنوں میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے (جسے سال کہا جاتا ہے) اور اس طرح ہر مہینہ ہمیشہ اسی موسم میں آتا ہے۔ زمین کے اس چکر کو پورا کرنے میں جو تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے، اسے ہر چار سال کے بعد، فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر کے پورا کر لیا جاتا ہے۔ اسے (LEAP YEAR) کہا جاتا ہے۔ لیکن قمری سال تو شمسی سال سے دس دن کم ہوتا ہے جس کے معنی، ہر تین سال کے بعد ایک مہینے کا فرق، اور ہر چھتیس سال کے بعد ایک سال کے فرق کے ہیں۔ زرعی معیشت میں اگر قمری سال رائج ہو تو انہیں ہر تین سال کے بعد، ایک ماہ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ قمری سال موسموں کے لحاظ سے شمسی کے برابر ہو جائے۔ یہودیوں کے ہاں ایسا ہی ہوتا تھا اور عرب جاہلیہ میں بھی ایسا ہی۔ (ہندوؤں کے ہاں ابھی تک یہی سسٹم جاری ہے۔ ان کے ہاں ہر تین سال کے بعد، قمری سال بارہ کی بجائے تیرہ ماہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اسے لوند کا سال کہا جاتا ہے)۔

لیکن عربوں کے ہاں (زراعت کے علاوہ) مہینوں کا تعین ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی اہم، بلکہ اہم ترین تھا۔ وہ یہ کہ ان کے ہاں سال میں چار مہینے حرام (واجب الاحترام) تھے جن میں جنگ وجدل بھی بند تھی اور لوٹ مار بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مہینے متعین بھی ہونے چاہئیں اور ہر ایک کو معلوم بھی۔ دو سال تک تو یہ مہینے متعین اور معلوم تھے لیکن تیسرے سال جب ایک مہینے کا اضافہ ہوتا (جس کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا) تو مذہبی پیشواؤں کے لئے "کاروبار" کا بڑا عمدہ موقعہ ہاتھ آجاتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان تیرہ مہینوں میں کون کون سے چار مہینے حرام سمجھے جائیں۔ یہ انتظام ہو کہنا نہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں نَسَاۃٌ کہتے تھے۔ نساءٌ یا نَسِیٓءٌ کے

نسیٓ کا عملی مفہوم

معنی ہیں کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا، مؤخر کر دینا۔ چونکہ ان مہینوں میں تغیر وتبدل کا اثر بڑے بڑے سرداروں اور تاجروں پر پڑتا تھا اس لئے ان کے مفاد کی خاطر نساءٌ کرتے یہ کہ کسی سال کسی مہینے کو حرام قرار دے دیتے، کسی سال کسی مہینے کو۔ اس سے معاشرہ میں بڑی گڑبڑ مچتی۔ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ لوگ کرتے یہ کہ یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ (۹/۳۷)۔ یعنی یہ لوگ ایک ہی مہینے کو ایک سال جنگ کے لئے جائز قرار دے دیتے اور دوسرے سال اسے ناجائز ٹھہرا دیتے۔ اس طرح ان چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر دیتے جن میں جنگ کو حرام قرار دیا گیا تھا لیکن مہینوں کو ادھر اُدھر کر دیتے۔ یعنی

عملاً خدا کے حرام کئے ہوئے کو حلال ٹھہرا دیتے اور سمجھتے یہ کہ ہم کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ جب اسلامی نظام قائم ہوا تو اس نے مذہبی پیشواؤں کی دیگر چالبازیوں اور دسیسہ کاریوں کے ساتھ اس تغیر و تبدل کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔۔۔۔ (۹/۳۷)۔ یاد رکھو! مہینوں میں اس طرح تقدم و تاخر کر دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ تو ان معاہدات کا عملی انکار ہے جو تم نے باہمی کر رکھے ہیں۔

بارہ مہینے کا سال

اس سے قانون شکن لوگ بڑی غلط راہوں پر چل نکلتے ہیں۔ لہٰذا، اعلان یہ کیا جاتا ہے کہ:-

اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْھَآ اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۔۔۔۔ (۹/۳۶)

نظامِ خداوندی کی رُو سے، سال کے بارہ مہینے ہوں گے۔ تیرہ کبھی نہیں ہوں گے۔ یہ گنتی خدا کے اس قانونِ فطرت کے مطابق ہے جو اس نے تخلیقِ ارض و سما کے وقت مقرر کیا تھا۔ ان میں چار مہینے حرام (واجب الاحترام) ہیں۔ یاد رکھو! اب سے یہی محکم قانون رائج رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان، حج کے عظیم اجتماع میں، نظامِ خداوندی کے نمائندہ، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی طرف سے کیا گیا۔ اور اس نے نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر رکھ دی۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قانونِ فطرت کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہی ہونے چاہئیں۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ زمین، سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے۔ اسی مدت کو بارہ پر تقسیم کر دینے سے کیلنڈر فطرت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد شمسی کیلنڈر کی رُو سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے شمسی کیلنڈر تجویز کیا تھا جس سے موسموں کا تعین بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور حرمات کے مہینوں کا بھی۔

لیکن ہمارے ہاں ہوا یہ کہ سال کے مہینے تو بارہ مقرر کر لئے گئے لیکن کیلنڈر قمری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سابقہ قمری کیلنڈر میں ہر تیسرے سال ایک ماہ کے اضافہ سے، شمسی اور قمری سالوں میں جو ہم آہنگی ہو جاتی تھی، وہ بھی باقی نہ رہی اور شمسی حساب سے بارہ مہینوں کے سال سے جو فوائد حاصل ہونے تھے وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ ہمارے ہاں یہ سلسلہ اب تک رائج ہے۔ میں نے یہ تحقیق کرنے کی بڑی کوشش کی کہ یہ معلوم ہو سکے کہ قرآنِ کریم کے اس اعلان کے بعد، جس سے (میری بصیرت کے مطابق) شمسی تقویم ہی ثابت ہوتی ہے، بارہ مہینوں والا قمری سال کس طرح رائج رہا یا رائج ہو گیا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ سنِ ہجری، حضرت عمرؓ کے زمانہ

ہیں اختیار کیا گیا تھا، لیکن یہ کہیں سے معلوم نہیں ہو سکا کہ بارہ مہینوں والا قمری سال کیسے رائج ہوا۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جو روش جتنی پرانی ہو جائے وہ اتنی ہی مقدس ہو جاتی ہے اور اسے کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ اس بنا پر ہمارے ہاں قمری کیلنڈر کے متعلق یہ عقیدہ قائم ہو گیا ہے کہ یہ اسلامی کیلنڈر ہے اور شمسی کیلنڈر غیر اسلامی ہے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ وجہ ہے جو ہمارے ہاں مذہبی تقاریب کے لئے قمری کیلنڈر رائج ہے اور "دنیاوی امور" کے لئے شمسی کیلنڈر۔ ظاہر ہے کہ یہ تضاد دور ہونا چاہیئے۔ لیکن مجھے یا کسی فرد یا کسی فرقہ کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس قسم کے اجتماعی معاملات میں کوئی تغیر و تبدل کر سکے۔ اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہو گیا تو اسے اِس کا حق حاصل ہو گا کہ وہ ایسے معاملات پر نظر ثانی کرے اور قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے قوانین وضع اور اختیار کرے جو زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

(۰)

اب آیئے آیہ زیر نظر کے بقایا حصہ کی طرف۔ پوری آیت یوں ہے۔

۱۸۹/۲ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۔ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۱۸۹/۲)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض منحوس۔ اس لئے انہوں نے، اے رسول! تم سے اِس کی بابت دریافت کیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ مہینوں (یا دنوں) میں سعد و نحس کا خیال توہم پرستی ہے۔ ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان سے اوقات کا تعین ہو جاتا ہے ـــ اور اس کے فوائد ظاہر ہیں ـــ اسی طرح یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حج کب ہو گا۔

ان سے واضح طور پر کہہ دو کہ دین میں توہم پرستی کو کوئی دخل نہیں۔ مثلاً یہ جو تم سمجھتے ہو کہ حج کے دوران، مکانوں میں سامنے کے دروازے سے نہیں آنا چاہیئے، پچھواڑے سے آنا چاہیئے (تو یہ محض توہم پرستی ہے) سعادت اور کشادگی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ کشادگی راہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ تم کس حد تک قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو، اور تم میں کیرکٹر کی کتنی

بلندی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا، تم اِن جہالت آمیز باتوں کو چھوڑ دو، اور جس طرح، اور دنوں گھروں میں دروازوں کے راستے آتے ہو اسی طرح حج کے دنوں میں بھی آؤ جاؤ۔

قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور معمول کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یہی کامیابی کا طریقہ ہے۔

توہم پرستی کیخلاف

اوہام پرستی جہالت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں بھی ہوتی ہے جو اپنی نسبت کسی معروف مذہب کیطرف نہ کرتے ہوں۔ مثلاً افریقہ کے وحشی اور جنگلی قبائل ۔۔۔ اور ان لوگوں میں بھی جو کسی مذہب کی طرف منسوب ہوں، جیسے (مثلاً) ہم آجکل کے مسلمان۔ اسلام، علم و بصیرت پر مبنی دین ہے۔ وہ اپنے ہر حکم کے متعلق بتاتا ہے کہ ایسا کیوں کہا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اس لئے وہ ہر قسم کی جہالت کو دور کرتا اور توہم پرستی کو مٹا دیتا ہے۔ یاد رکھئیے! جہالت اور دین، یکجا نہیں رہ سکتے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ حج کے دوران اگر انہیں کسی ضرورت کے لئے گھر آنا پڑتا تو باہر کے دروازے سے گھر میں داخل نہ ہوتے، گھر کے پیچھے... کوئی دروازہ ہوتا تو اس سے اندر آتے اور یا پھر دیوار پھاند کر۔ یہی عرب جب اسلام لے آئے تو ان سے کہا کہ اب پرانی اوہام پرستی کو چھوڑ دو۔ کشاد کی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں۔ کشاد کی راہ یہ ہے کہ تم کس قدر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو۔ اور یہی وہ طریق ہے جس سے انسان کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔

اس سے پہلے یہی الفاظ (لیس البر) اس نظریہ کی تردید میں کہے گئے تھے کہ دین کے احکام، میکانکی طور پر بجا لانے سے ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ (۲/۱۷۷) قرآنِ کریم کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح زمانہ جاہلیت کی رسمیں توہم پرستی ہیں، اسی طرح دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے ارکان واحکام بھی توہم پرستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ قرآنِ کریم اپنے ہر حکم کے ساتھ (لعلکم) کہتا ہے۔ یعنی ایسا کرنے سے یہ ہوگا۔ جہالت کی توہم پرستی یا مذہبی رسوم واعمال، اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟ یعنی اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، دین کے احکام پر بھی محسوس شکلوں میں عمل پیرا ہوا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر بھی ہوتے ہیں جنھیں شعائر اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دین کے شعائر کی نگہداشت، اور مذہب کے اوہام کی میکانکی طور پر ادائیگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دین کے شعائر در رسوم، اس کے نظام کی مختلف کڑیاں اور اس کے بلند و بالا نصب العین کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں مذہب میں یہ ارکان مقصود بالذات سمجھے جاتے ہیں۔ اسی کو "توہم پرستی" کہتے ہیں۔ یعنی ان کی اہمیت انسان کے ذہن اور قیاس (یا اندھے عقائد) پر مبنی ہوتی ہے۔ علم و بصیرت اور دلائل وبراہین پر نہیں۔ یاد رکھئے! ہر وہ عمل جو "کیوں" کا معقول

جواب نہ دے سکے، تو ہم پرستی کے زمرے میں آجاتا ہے۔

اس کے بعد حج کی جزئیات کی طرف آیئے۔

حج کا اجتماع اسلامی نظام کا رکن رکین ہے اس لئے اس کا انتظام و انصرام امتِ مسلمہ کے ذمہ ہوگا اور یہ اساسی طور پر مختص ہوگا اس امت کے نمائندگان کے لئے، لیکن قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ سے جو کہا تھا کہ عالمِ انسانیت کو اس کی دعوت دو، تو اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دی جاسکے گی کہ وہ مبصرین کی حیثیت سے اس میں شریک ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ سورۃ حج میں ہے:-

حج اور غیر مسلم

وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ...... (۲۲/۲۷-۲۸)

(ہم نے ابراہیمؑ سے کہا کہ) وہ لوگوں میں اعلان کردے کہ وہ حج کی تقریب پر یہاں آئیں۔ دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔ وہ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوعِ انسان) کی منفعت عامہ کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

دوسری جگہ ہے:-

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۳/۹۶)

سو جو لوگ بھی اس مقام تک پہنچنے کی راہ پائیں، وہ یہاں جمع ہوں بشرطیکہ ان کا یہاں جمع ہونا خالص خدا کے لئے ہو، گروہ بندانہ مصلحتوں کے لئے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے نظام اور اس کے اس قسم کے اجتماعات کی افادیت سے انکار کریں، وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ خدا تو تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اس اجتماع میں شرکت کے لئے شرطِ اوّلین یہ ہے کہ اس سے مقصد پیشِ نظر انسانیت کی بہبود ہو۔ کسی کی مخالفت اور تخریب نہ ہو۔ (للّٰہ سے یہی مراد ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے)۔ دوسری جگہ اس کی تصریح اس طرح کر دی کہ

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ

مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۔ (۲۲/۲۵)

ہم نے اس مقام اور اس اجتماع کو، یہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ لیکن جو شخص، گروہ یا قوم یہاں یہ ارادہ لئے ہوئے آئے کہ ایسا جتھہ قائم کیا جائے جس میں کمزور اقوام پر ظلم اور زیادتی کی جائے، تو وہ اس اجتماع کے مقصدِ عظیم سے دور ہٹ جائے گا۔ اور اسے اس کی سخت سزا دی جائے گی۔

یہ شرائط، اس اجتماعِ عظیم کے سلسلہ میں بھی نافذ ہوں گی اور ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات کے لئے بھی جو عند الضرورت منعقد کئے جائیں۔ انہیں عمرہ کہا جاتا ہے، خواہ وہ اسی اجتماع کی ذیلی کمیٹیاں ہوں یا دوسرے اوقات میں منعقد ہونے والی کمیٹیاں۔ (۲/۱۹۶)

یہاں شرطِ اولین یہ عائد کی گئی ہے کہ اس میں شامل ہونے والے اس کے مقصد پر متفق ہوں اور کسی پر ظلم و زیادتی کے لئے جمع نہ ہوں۔ چونکہ قریشِ مکہ (جنھیں مشرکین کہہ کر پکارا گیا ہے) اس نظام اور اس کے مقاصد کی شروع سے مخالفت کرتے چلے آ رہے تھے، اس لئے اعلان کر دیا گیا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہو سکیں گے (۹/۳ ؛ ۹/۲۸)۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعلان اُسی وقت کیا جا سکتا تھا جب مکہ، اسلامی نظام کی تحویل میں آ گیا ہو۔ اس سے پہلے تو حالت یہ تھی کہ یہی مشرکین (قریشِ مکہ) خود مسلمانوں کو کعبہ کے قریب نہیں آنے دیتے تھے (۲۲/۲۵)۔ چنانچہ یہ اعلان فتح مکہ کے بعد، پہلے اجتماعِ عظیم میں کیا گیا۔ اسی لئے اسے قرآنِ کریم میں یَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ (۹/۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حج کا مقصد

آپ نے غور فرمایا کہ اس اجتماع (حج) کا حقیقی مفہوم کیا تھا۔ آج اقوامِ عالم جن مقاصد کی تلاش، لیگ آف نیشنز (آنجہانی) اور اقوامِ متحدہ (U.N.O.) جیسے اداروں میں کر رہی ہیں، قرآنِ کریم نے اس کا تصور آج سے چودہ سو سال پہلے پیش کر دیا تھا، اس فرق کے ساتھ کہ اس نے (اقبالؒ کے الفاظ میں) جمعیتِ اقوام کی جگہ "جمعیتِ آدم" کا تصور دیا تھا۔ جمعیتِ اقوام، کمزور قوموں کے خلاف ظلم اور زیادتی کے لئے وجود میں لائی جاتی ہے۔ حج نوعِ انسان کی منفعت کے لئے۔ اسی لئے یہ واضح کر دیا کہ اس میں جو قوم، ظلم اور زیادتی کی نیت سے شامل ہو گی، نہ صرف یہ کہ اسے اس سے نکال دیا جائے گا بلکہ اس کی المناک سزا بھی دی جائے گی۔

یہ ہے نوعِ انسان کے عالمگیر اجتماع کا وہ نقشہ جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔

آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے خور و نوش کا (اُس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر) کیا انتظام تجویز کیا گیا تھا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس میں شامل ہونے والوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ فالتو جانور لائیں جو ان کے کھانے پینے کے کام آئیں۔ اور جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں، وہ اپنے تحائف، ان لوگوں کے ہاتھ بھیج دیں۔

اب آیئے ان رسوم اور شعائر کی طرف جن کا اس اجتماع کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ چونکہ آیات ۱۹۰/۲ تا ۱۹۵/۲ کا تعلق حج سے نہیں اس لئے انہیں یہاں پیش نہیں کیا جا رہا۔ انہیں بعد میں سامنے لایا جائے گا۔ فرمایا:-

۱۹۶/۲ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۔ (۱۹۶/۲)

تم نے دیکھا کہ نظامِ عدل و مساوات کے قیام اور استحکام کے لئے کس قدر جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً تمہارے اجتماعات ہوتے رہیں جن میں باہمی مشاورت سے اس عظیم پروگرام کی تکمیل کے طریقے سوچے جائیں۔ انہی اجتماعات کا نام حج اور عمرہ ہے۔

ان اجتماعات کا مقام، تمہارے نظام کا مرکز، یعنی کعبہ ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ تم وہاں پہنچنے سے روک دیئے جاؤ، تو تم سے جو کچھ آسانی سے ہو سکے، تحفتہً وہاں بھیج دو (تاکہ وہ ان لوگوں کے کام آئے جو اس مقصد کے لئے وہاں جمع ہوئے ہیں)۔ جب تک یہ تحائف اپنی منزل تک نہ پہنچ جائیں، تم بھی (اُن لوگوں کے ساتھ قلبی ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے) حجامت نہ بنواؤ۔ جب وہ وہاں پہنچ جائیں تو پھر تم (اُن لوگوں کی مطابقت کرتے ہوئے) اپنے سر کے بال منڈواؤ۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی مریض ہو، یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، تو وہ اس کے بدلے میں روزے رکھ لے یا کوئی عطیہ دیدے یا کوئی اور عملِ خیر کرے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے پھر جب تم حالتِ امن میں ہو (اور ان اجتماعات میں خود شریک ہو سکو)، تو تم میں سے جو شخص حج اور عمرہ دونوں سے

مستفید ہونا چاہیے، لو جو تحفہ میسر آئے ساتھ لے جائے۔ جسے کوئی تحفہ نہ مل سکے تو وہ، حج کے دوران میں تین دن کے اور واپسی پر سات دن کے، روزے رکھ لے، اور یوں دس دن کے روزے پورے کر لے۔ یہ اس کے لئے ہے جس کے اہل و عیال اس کے ساتھ کعبہ میں موجود نہ ہوں۔

یاد رکھو! ان اجتماعات سے اصل مقصد تو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہے۔ لیکن ان تقریبات پر بعض رسوم بطور ملی شعائر اختیار کر لی جاتی ہیں۔ ان سے مقصود، باہمی یک رنگی اور ہم آہنگی ہوتا ہے جس کا مظاہرہ محسوس شکلوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ سو تم اپنی نگاہ اصل مقصود پر رکھو۔ یعنی قوانین خداوندی کی نگہداشت پر۔ اگر ایسا نہ کرو گے (اور محض رسومات ہی کو اصل مقصود سمجھنے لگ جاؤ گے) تو اس کا نتیجہ سخت تباہی ہوگا۔

اس سے پہلے (۲/۱۸۹ میں) بتایا جا چکا ہے کہ تقویم (کیلنڈر) کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس سے اجتماع حج کی تاریخوں کا تعین ہو سکے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حج کا اجتماع تو ذی الحجہ کے مہینے میں مقرر ہوا تھا لیکن اس سے ایک ماہ قبل اور ایک ماہ بعد بھی حرمات کے مہینے مقرر کر دیئے گئے تھے تاکہ لوگ امن و عافیت سے آنے جانے کا سفر کر سکیں۔ اور نسیئ کی رسم قدیم کو ختم کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ ان مہینوں میں تغیر و تبدل نہ کیا جا سکے۔ اسی لئے اگلی آیت میں کہا:

۲/۱۹۷ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (۲/۱۹۷)

حج کے اجتماعات کے مہینے معلوم و متعین ہونے چاہئیں۔ پھر جو شخص اس فریضہ کو اپنے ذمے لے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام شرائط پوری کرے۔ ازاں جملہ، یہ بھی کہ اس اجتماع میں کوئی بات پایۂ ثقاہت سے گری ہوتی نہیں ہونی چاہیئے۔ نہ فحش کلامی یا دیگر جنسی میلانات کی باتیں۔ نہ درشت کلامی یا کوئی اور معیوب حرکت۔ نہ باہمی مشاورت میں، دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے یوں ہی باتیں بڑھاتے جانا اور مناظرانہ جنگ و جدل پر اتر آنا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ مختصراً یوں سمجھو کہ یہ اجتماعات نوع انسان کی منفعت بخشیوں کی تجاویز سوچنے کے لئے ہیں (۲۲/۲۸)۔ سو ان میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو تمہیں اس مقصد سے دور لے جائے۔ یاد رکھو! تمہارا ہر عمل خدا کے قانون مکافات کی نگاہ میں ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اس سفر کے لئے تمہارے پاس زادِ راہ بھی ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں

بھیک مانگنے کی ذلت سے محفوظ رہو گے۔

نیز ان اجتماعات میں شریک انہی کو ہونا چاہیئے جو عقل و بصیرت کی رُو سے سوچ سکیں کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کس طرح کی جا سکتی ہے' (اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی صورتیں کیا ہیں)۔

یہ مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک نکتہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (۲/۱۹۷) یہاں تقوٰے کے لئے صاحب عقل و بصیرت ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

عربی لغت میں' اَللُّبُّ۔ ایسی تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کی جمع

عقلِ جہاں بیں

الباب ہے۔ لہٰذا' اولی الالباب ان صاحبانِ عقل و بصیرت کو کہیں گے جو جذبات سے الگ ہٹ کر، معاملات پر عقلِ خالص کی رُو سے غور و فکر کریں۔ علامہ اقبالؒ نے عقل کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں۔ عقلِ خود بیں وہ جو انسان کو صرف اس کے ذاتی اور انفرادی مفاد کے حصول کی تدابیر بتاتی ہے' اور عقلِ جہاں بیں وہ جو اسے نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ پر آمادہ کرتی ہے۔ جب انسانی عقل، قرآنِ کریم کی روشنی میں روبعمل ہو تو وہ عقلِ جہاں بیں بن جاتی ہے۔ قرآنِ کریم مومنین کو اولی الالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ مثلاً سورۃ الطلاق میں ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۔ (۶۵/۱۰) "اے اربابِ عقل و بصیرت! یعنی وہ گروہ جو ایمان لائے ہو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس مقصد کے لئے خدا نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ ھدایت بھیجا ہے۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' ایمان کے لئے عقل و بصیرت کی ضرورت ہے۔ لیکن اسی عقل کی جو وحیِ خداوندی کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرے۔ انسانی عقل اور وحی کی روشنی کی مثال' انسان کی آنکھ اور سورج کی سی ہے۔ سورج کی روشنی نوعِ عالمگیر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو بینا ہو اور اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ دوسری طرف' انسانی آنکھ روشنی کے بغیر بے کار ہے۔ وہ کبھی صحیح راستہ متعین نہیں کر سکتی۔ [اس ضمن میں جلد اول میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ دیکھئے صـ۵۵ آیت (۲/۲)؛ صـ۱۱۵ آیت (۲/۴۴)؛ صـ ۲۵۸-۲۶۱ ۔ آیت (۲/۱۷)]

(۰)

تقریبِ حج کے سلسلہ میں ضروری ھدایات دیتے ہوئے۔ درمیان میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرا دی جب کہا کہ

۲/۱۹۸ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ..... (۲/۱۹۸)

اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ یہ اجتماعات کوئی "یاترا" کی قسم کی چیز نہیں کہ وہاں دنیاوی معاملات کی کوئی بات نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ان اجتماعات میں، ملت کے لئے سامانِ نشو ونما اور معاشی وسائل کے طلب و اخذ کے لئے جد وجہد کرو۔

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ان اجتماعات کا مقصد محض اعتقاداً اور رسماً ایک فریضہ ادا کرنا، یا "گناہ بخشوانا" نہیں۔ یہ تو (اقبالؒ کے الفاظ میں) از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ـــــ دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولنے کا نظام ہے۔ اس لئے اس اجتماع میں اپنے اقتصادی اور معاشی مسائل کو بھی پیش نظر رکھو۔ (مثلاً) اپنی مصنوعات کی نمائش لگاؤ۔ دوسری قوموں کے نمائندوں کے ساتھ معاشی اور تجارتی معاہدات کرو۔ چنانچہ (۲۲/۳۳) میں کہا گیا ہے کہ جو زاید از ضرورت جانور اپنے ساتھ لاؤ، ان سے سفر میں بھی فائدے اٹھاؤ۔ یعنی ان پر مالِ تجارت اور مصنوعات وغیرہ لاد کر لاؤ۔ (اس اہم نکتہ کو وہی آیات آگے چل کر (۵/۲) میں نہایت حسن وخوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے لئے آپ تھوڑا سا توقف فرمائیں)۔

آیت (۲/۱۹۸) کا باقی حصہ یہ ہے:-

۲/۱۹۸ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۔ (۲/۱۹۸)

جب تم ان مسائل کے طے کر لینے کے بعد عرفات کے میدان سے واپس آجاؤ تو مشعر الحرام کے قریب آکر پھر جمع ہو اور جو ہدایات تمہیں وہاں دی گئی ہیں، عقل و شعور کی روشنی میں ان پر غور وفکر کرو۔ تم اس سے پہلے خیال کرتے تھے کہ حج محض ایک یاترا ہے۔ یہ تمہاری غلط نگہی تھی۔ یہ نظام خداوندی کا اہم گوشہ ہے جس کا بنیادی تعلق تمہاری تمدنی، معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے۔

حج کی پوری غرض وغایت اس آیت کے اندر مرکوز ہے، باقی تمام رسوم ومناسک اس کے لوازمات ہیں۔ اس میں عرفات اور مشعر الحرام کی اصطلاحات انتہائی غور وفکر کی متقاضی ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لئے بات ذرا پیچھے سے شروع کی جائے گی۔

رمضان کے مہینے میں، اسلامی نظام کے قیام واستحکام کے لئے تربیتی کورس کا اہتمام ہوا۔ اس میں سپاہیانہ زندگی کے خوگر ہونے کے علاوہ، خصوصی نشستوں میں (جنہیں اعتکاف فی المساجد کہا گیا ہے (۲/۱۸۷)) اپنے اپنے مقامی

مسائل پر غور و فکر کیا گیا۔ جشنِ نزولِ قرآن (عید الفطر) کے اجتماع میں ان نمائندگان کو چنا گیا جو ملت کے آئندہ اجتماعِ عظیم (حج) میں شرکت کریں گے۔ یہ نمائندگان (اور ان کے علاوہ اپنے طور پر مبصرین) عازمِ حج ہوئے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد کانفرنس کا اصلی سیشن ایک وسیع و عریض میدان میں ہونا طے پایا۔ وہاں سب سے پہلے مختلف ممالک (کرۂ ارض) کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے نمائندگان کا باہمی تعارف ہوا۔ اسی باہمی تعارف کی نسبت سے

عرفات

اسے عرفات کا میدان کہہ کر پکارا گیا۔ (عرفات۔ عرف۔ تعارف)۔ اس تعارف کے بعد سیشن کے صدر نے، جو مرکزی مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ یا اس کا نمائندہ ہوگا، خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس میں اس نے مملکت کی سالِ گزشتہ کی کارروائی پر روشنی ڈالی اور آئندہ سال کے پروگرام کے بنیادی خط و خال کی وضاحت کی۔ اس پروگرام کو اپنے ساتھ لیکر، یہ نمائندگان، "مشعر الحرام" میں جمع ہوئے۔ مشعر کے معنی ہیں وہ مقام جہاں عقل و

مشعر الحرام

شعور کی رُو سے معاملات پر بحث و تمحیص کی جائے۔ اور چونکہ ان معاملات کا تعلق نظامِ خداوندی سے ہوگا، اس لئے اسے حرام — یعنی واجب الاحترام بھی قرار دیا — یہاں یہ نمائندگان حسبِ ضرورت دو یا تین دن تک قیام کریں گے۔ اس پروگرام کی عملی جزئیات اور ان کے سلسلہ میں باہمی تعاون و تناصر کے سلسلے میں بحث و تمحیص بھی ہوگی، اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی — آج دوپہر کا کھانا، نمائندگانِ پاکستان کی طرف سے رات کا کھانا اہلِ افغانستان کی طرف سے (وقس علیٰ ذالک)۔ ان ضیافتوں کے لئے وہ جانور ذبح ہوں گے جنہیں یہ لوگ اس مقصد کے لئے ساتھ لائے تھے یا جو دوسرے لوگوں نے تحفۃً بھیجے تھے — (جانور ہی نہیں، کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی بطور ہدیہ — تحفہ)۔ اس قسم کے تفصیلی تبادلۂ خیالات کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں کی طرف واپس چلے جائیں گے اور یوں حج کے اجتماع کی تکمیل ہوجائے گی۔

مشعر الحرام (منیٰ) میں چند دنوں تک قیام رہے گا۔ فرمایا:-

۲/۲۰۳ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۖ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۔ (۲/۲۰۳)

اس مقام پر گنتی کے دنوں تک قیام رہنا چاہیئے۔ جن لوگوں کو واپسی کی عجلت ہو وہ دو دن کے بعد وہاں سے رخصت ہو جائیں۔ جو زیادہ دیر ٹھہر سکیں وہ واپسی میں تاخیر کر دیں۔ نہ ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات ہے نہ ویسا کرنے میں۔ مقصد تو پروگرام کی تکمیل ہے جتنے وقت میں ہو جائے۔ اس تمام دوران میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ تمہارا

ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو جس کے حصول کے لئے تم یہاں اکٹھے ہوئے ہو۔

سورۃ حج میں ہے کہ مشعر الحرام کے قیام کے دوران، یہ لوگ کھائیں پئیں بھی۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (۲۲/۲۹)

اور باہمی مشاورت سے ایسی تدابیر بھی سوچیں جن سے ان کی ملی زندگی کی کثافتیں دور ہو جائیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں جنہیں انہوں نے نوعِ انسان کی بہبود کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھا ہے، اور اس طرح یہ ملت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدارِ خداوندی کا نشان ہے اور جسے اس باب میں شرفِ اوّلیت اور سبقت حاصل ہے۔

ملی کثافت کو دور کریں

اس میں ایک لفظ تفث آیا ہے۔ اس کے معنی میل کچیل (کثافت) دور کرنے کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے، کہا یہ جاتا ہے کہ اس کا مطلب ناخن کتروانا، بغل اور زیرِ ناف کے بال صاف کرنا، سر کے بالوں کی میل کچیل دور کرنا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حج کے سلسلہ میں اتنے دنوں تک دن رات کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اس میں نہانے دھونے کا مفہوم بھی ہو، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مشعر الحرام میں خطبہ عرفات میں دیئے گئے پروگرام کی جزئیات پر جو بحث و تمحیص ہو گی تو اس ضمن میں تفث کے معنی ملت کی کثافتیں دور کرنے کی تدابیر سوچنا ہوں گے۔ حج کا اجتماع ہی ملی مسائل کا حل سوچنے کے لئے ہوتا ہے۔

بیت العتیق

اس آیت (نیز ۲۲/۳۳) میں کعبہ کو بیت العتیق کہا گیا ہے۔ العتیق عربی لغت میں بڑا جامع لفظ ہے۔ جس کے معنی حریت۔ آزادی۔ شرافت۔ نجابت۔ عزت۔ حسن و جمال کے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے کعبہ کے بیت العتیق ہونے کے معنی ہوں گے اُس نظام کا مرکز جو نوعِ انسان کے لئے ان خصوصیات کا حامل ہو۔ وہ نظام جو عالمگیر انسانیت کو ان خصائص کبریٰ کی ضمانت دے۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں ایسی ذات جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہ ہو۔ اس کے معنی خود قوت بھی آتے ہیں۔ چونکہ سبقت، یعنی سب سے آگے ہونا، بجائے خویش ایک اعلیٰ خصوصیت ہے، اس لئے اس کے معنی سبقت، یا قدیم ہونے کے بھی آتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم نے اس ایک لفظ میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کا ضامن نظامِ خداوندی ہے۔

بیت المعمور

کعبہ کو بیت المعمور بھی کہا گیا ہے (۵۲/۴)۔ یعنی خدا کا آباد گھر۔ یا برکات و سعادات سے معمور گھر۔ بیت الحرام بھی (۵/۹۷) یعنی واجب الاحترام گھر ۔۔ اسی کو متعدد مقامات پر مسجد الحرام کہہ

بھی پکارا گیا ہے۔ (مثلاً ۱۴:۳۷۔ و دیگر مقامات)۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیتی (میرا گھر) کہا ہے۔ اسی نسبت سے اس نے اپنے آپ کو رب البیت کہا ہے (۱۰۶:۳)۔ یعنی اس گھر کا مالک۔ (کعبہ کے متعلق دیگر تصریحات پہلے گزر چکی ہیں)۔

(۰)

شعائر اللہ

حج کے ضمن میں، بعض چیزوں کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شعائر کی معنوی بحث جلد اول ص۱۲۲ زیر آیت (۲:۲) میں گزر چکی ہے۔ اور صفا اور مروہ کے شعائر اللہ ہونے کا ذکر اسی جلد میں آیت (۲:۱۵۸) کے تحت آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ، سورۃ مائدہ میں ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ ...... (۵:۲)

اے جماعتِ مومنین! جن چیزوں کو اس نظام کی محسوس علامات قرار دیا جائے، ان کی بے حرمتی مت کرو۔ اس لئے کہ ان کی بے حرمتی اس امر کی دلیل ہوگی کہ تمہارے دل میں نظامِ خداوندی کا احترام نہیں۔ نیز جن مہینوں میں جنگ کا سلسلہ ملتوی کیا جاتا ہے، ان کی بھی بے حرمتی مت کرو۔ ان کا احترام ملحوظ رکھو۔ جو جانور یا تحائف حج کی تقریب کے سلسلہ میں بھیجے جائیں، وہ بھی شعائر.... میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔ یا جو لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جائیں تاکہ وہاں ملت کے معاشی مفاد اور زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کرنے کی تدابیر پر غور و فکر کریں، ان کا بھی احترام کرو۔

بیت الحرام، شہر الحرام اور ان تحفوں اور جانوروں کے احترام کا ذکر (۵:۹۷) میں بھی آیا ہے۔ ان جانوروں کے شعائر اللہ ہونے کے متعلق (۲۲:۳۶) میں بھی کہا گیا ہے۔ آیت (۲۲:۳۲) میں کہا گیا ہے کہ جو شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کے دل میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ) کا جذبہ ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ شعائر اللہ اپنی ذات میں مقدس یا محترم نہیں ہوتے۔ ان کا احترام اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں قوانینِ خداوندی کے احترام کا جذبہ موجزن ہے۔ ان شعائر کی تعظیم اسی جذبہ کا مظہر ہوتی ہے۔ (۲۲:۳۲)

(۰)

احرام

حج کے اجتماع میں احرام باندھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ البتہ سورہ مائدہ میں ہے کہ شکار کرنے کی ممانعت ہے وَأَنتُمْ حُرُمٌ (۵:۹۵) جب تک تم حالتِ احرام میں ہو۔ یعنی اس اجتماع

ہیں شریک ہو۔ ضمناً حالتِ احرام میں شکار کرنے پر یہ پابندی خشکی کے جانوروں تک محدود ہے (۵/۹۶)۔ اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں خشکی کے جانور کا شکار بالارادہ کرے تو اسے اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا جس کی تفصیل (۵/۹۵) میں دی گئی ہے۔

(۰)

حج کی تقریبات ختم ہو جانے کے بعد کہا کہ

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۲/۱۹۹) ۲/۱۹۹

ان تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد، تم عام لوگوں کی طرح اپنے اپنے ہاں واپس آجاؤ (یہ نہ سمجھو کہ تم ان سے الگ کچھ اور بن گئے ہو) اور جو پروگرام وہاں طے ہوا ہے، اُس کے مطابق، اپنی حفاظت کے سامان کی طلب و جستجو میں سرگرمِ عمل رہو۔ یقیناً اس طرح اللہ کا قانون تمہاری حفاظت کا سامان بھی کرے گا اور پوری پوری نشوونما کا بھی۔

(۰)

قربانی

حج کے احکام تو مکمل ہو گئے لیکن ابھی ایک ایسی چیز کا تذکرہ باقی ہے جسے اس ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جس کے متعلق قرآنی احکام معلوم کرنے کے آپ بھی منتظر ہوں گے۔ یعنی قربانی۔

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے کچھ نذرانہ پیش کرنے کی رسم زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ چنانچہ اس نے سورہ مائدہ میں تمثیلاً ایک قصہ یوں بیان کیا ہے:۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۔ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۔ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۔ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ (۵/۲۷)

اے رسول! ان سے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک بیان کرو (قصہ تو یہ تورات میں بھی مذکور ہے لیکن اس میں بہت سی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں اس لئے اسے ٹھیک ٹھیک بیان کیا جاتا ہے)۔ ان دونوں بھائیوں نے (اپنے خیال اور عقیدہ کے مطابق) خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے (ان کے عقیدہ کے مطابق) ایک کی "قربانی" قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔ اس پر اسے غصہ آگیا اور وہ اپنے

بھائی سے کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا کہ اللہ متقیوں کی پیش کش قبول کیا کرتا ہے۔

اس میں لفظ قُرْبَانًا آیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے مراد کسی جانور کا ذبح کرنا ہو۔ اس کا ترجمہ "پیش کش" زیادہ موزوں ہوگا۔ جس طرح بتوں کے استھانوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، اسی قسم کی کوئی یہ چیز بھی ہوسکتی ہے۔ بہرحال، قُرْبَانًا کا لفظ یہاں آیا ہے۔

یہودیوں کے ہاں البتہ "سوختنی قربانی" کا رواج تھا۔ معتقدین اپنی اپنی پیش کش ہیکل میں لاتے تھے۔ یہ مختلف قسموں کے پکوان بھی ہوتے تھے۔ پھل پھلواڑی اور سبزی ترکاری بھی۔ اور بعض اوقات ذبیحہ کے لئے جانور بھی۔ انہیں نذر یا قربانی کہا جاتا تھا۔ کاہن اس میں سے کچھ حصہ آگ میں جلاتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ اس کی خوشبو سے خدا خوش ہوتا ہے۔ (دیکھئے عہدنامہ عتیق۔ کتاب احبار۔ باب ۲/۳)۔ اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں تھا۔ یہودیوں کا اسلام کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر یہ وہی دین ہے جسے حضرت موسےٰؑ نے پیش کیا تھا تو اس میں سوختنی قربانیوں کا حکم کیوں نہیں؟ سورۂ آلِ عمران میں ہے، اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۔۔۔۔ (۳/۱۸۲)۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم اس رسول پر ایمان نہ لاؤ جب تک یہ ایسی قربانی (کا حکم) نہ لاتے جسے آگ کھا جائے۔" قرآنِ کریم میں قُرْبَانًا کا لفظ انہی دو مقامات پر آیا ہے۔ مسلمانوں کے سلسلہ میں قربانی کا لفظ کہیں نہیں آیا۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ کعبہ وادیٔ حجاز میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (وادی غیر ذی زرع۔ ۱۴/۳۷)۔ اسی مقام پر ہزاروں، لاکھوں افراد پر مشتمل حج کا اجتماع ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ، جنہیں خود بھی کھانے کو بمشکل ملتا تھا، اتنے کثیر اجتماع کے خورد و نوش کا انتظام کیا کر سکتے تھے؟ اس کے لئے، ان آنے والوں کو اپنا انتظام آپ ہی کرنا تھا۔ اُس زمانے میں کھانے پینے کا بہترین اور ممکن العمل انتظام یہی ہوسکتا تھا کہ یہ لوگ فالتو جانور (یعنی اپنی سواریوں سے زائد جانور) ساتھ لائیں۔ انہیں عندالضرورت یہاں ذبح کریں۔ خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ قرآنِ کریم میں بتقریبِ حج جانور ذبح کرنے کا یہی مقصد بتایا گیا ہے۔ ان فالتو جانوروں کو ساتھ لانے کے سلسلہ میں کہا:-

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (۲۲/۳۳)۔

ان جانوروں کے متعلق یہ تصور نہ کر لینا کہ یہ (ان سانڈوں کی طرح ہیں جنہیں یہ لوگ اپنے بتوں کے لئے وقف کر دیتے ہیں) مقدس بن گئے ہیں، بالکل نہیں۔ یہ عام جانوروں کی طرح ہیں جن سے تم دورانِ سفر، سواری یا باربرداری کے سلسلہ میں مختلف کام لیتے ہو۔ ان سے بھی اسی قسم کے کام لو تا آنکہ یہ تمہاری منزلِ مقصود، کعبہ تک پہنچ جائیں۔

اس کے بعد،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ۔ (۲۸/۲۲)

انہیں، حج کے دنوں میں، اللہ کا نام لے کر ذبح کرو۔ ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور اگر وہاں کوئی مصیبت زدہ محتاج ہو، تو اسے بھی کھلاؤ۔

ذرا آگے چل کر کہا:۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَاۗىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ڰ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَاۗفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (۳۶/۲۲)

وہ اونٹ (جنہیں تم ساتھ لاتے ہو) شعائر اللہ میں تو شامل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح یہ تمہارے لئے مقدس بن جاتے ہیں۔ یہ تمہارے فائدے کے لئے ہیں۔ انہیں اللہ کا نام لے کر قطار در قطار ذبح کرو اور جب وہ ذبح ہو کر کسی پہلو پر گر پڑیں تو ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور دوسرے مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلاؤ ہم نے ان مویشیوں کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے تاکہ تم (کھانے پینے کی طرف سے بے فکر ہو کر، اپنے بلند مقصد کے حصول کے لئے) ایسی کوشش کر سکو جو بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

ان اونٹوں اور دیگر مویشیوں کو شعائر اللہ (واجب الاحترام) اس لئے قرار دیا گیا کہ اس زمانے میں مویشیوں کی لوٹ مار عام تھی۔ (غنیمت کے لفظ کا مادہ ہی غنم ہے جس کے معنی بھیڑ بکریاں ہیں)۔ حجاج کے ان قافلوں میں یہ مویشی کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ انہیں لوٹ مار کرنے والوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ شعائر اللہ ہیں، کوئی ان کی طرف نگہ بد سے نہ دیکھے۔ انہیں بخیر و عافیت ان کی منزل گاہ — کعبہ — تک پہنچنے دیں۔ اسی لئے ان کے گلے میں نشان کے طور پر پٹہ (قلادہ) بھی ڈال دیتے تھے کہ یہ پہچانے جا سکیں۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) جو لوگ خود حج کے لئے نہیں جاتے تھے وہ اپنی طرف سے کچھ تحائف حاجیوں کے ساتھ کر دیتے تھے۔ ان تحائف میں جانور بھی ہوتے تھے، اور کھانے پینے کی بعض دوسری اشیاء بھی۔ انہیں ھدیۃ (تحفہ) کہا جاتا تھا۔ ان ھدایا کو بھی کعبہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ یعنی یہ وہیں پر کام آنے کے لئے ہوتے تھے۔ آیات (۱۹۶/۲) اور (۹۵/۵ ; ۹۷/۵) میں بھی انہی ھدایا اور قلائد کا ذکر ہے۔ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی کہ حج کے لئے جانے والوں کا کوئی قافلہ کعبہ تک نہ پہنچ سکے، تو ان ھدایا کو وہاں

بھیج دیا جائے (۲۲/۴۵)۔ کیونکہ یہ حجاج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا مقصد خورد و نوش کی ضروریات پورا کرنا ہے۔ چونکہ "قربانیوں" کے متعلق زمانہ قدیم سے یہ خیال ذہنوں میں راسخ چلا آرہا تھا کہ ان کا خون، گوشت پوست معبودوں تک پہنچتا ہے۔ اس لئے، اس خیال سے کہ مسلمانوں کے تحت الشعور میں بھی اسی قسم کا کوئی عقیدہ کروٹیں نہ لے رہا ہو، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (۲۲/۳۷)

(اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ جانور تمہاری ضروریات پورا کرنے کے لئے ہیں۔ یہی ان کے اس موقعہ پر ذبح کرنے سے مقصود ہے)۔ اللہ تک ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اُس کے ہاں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے، کہ تم اس کے قوانین کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو۔ اس نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم (اپنی طبیعی ضروریات کی طرف سے بےفکر ہو کر) خدا کے اس ضابطۂ قوانین کو، جس سے اس نے تمہاری راہنمائی کی ہے، دنیا کے تمام قوانین و ضوابط پر غالب کر سکو (۲/۱۸۵)۔ جو لوگ اس طرح، قوانینِ خداوندی کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں گے، ان کے لئے نہایت خوشگوار نتائج کی بشارتیں ہیں۔

حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا ذکر انہی آیات میں آیا ہے۔ اس سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ جس طرح آج کل حج کے موقعہ پر لاکھوں کی تعداد میں جانور ذبح کر کے پھینکتے چلے جاتے ہیں اور اسے حکمِ خداوندی کی تعمیل تصور کیا جاتا ہے، یا عیدالاضحٰی کی تقریب پر جس طرح قربانیاں دی جاتی ہیں، ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ مروجہ مذہب میں ان قربانیوں کی سند میں کچھ روایات پیش کی جاتی ہیں۔ چونکہ میرے پیشِ نظر صرف قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہے اس لئے ان روایات کے متعلق بحث کرنا میرے مقصد سے خارج ہے۔ ویسے بھی روایات کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآنِ کریم ہے۔ ان قربانیوں کی تائید میں البتہ قرآن مجید کی دو آیات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ان میں پہلی آیت، سورۃ الانعام کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۶/۱۶۳)

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ

ان سے کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

اس میں لفظ نسك کے معنی قربانی کئے جاتے ہیں۔ لغت میں اس مادہ (ن۔س۔ك) کے معنی پاک اور صاف کرنا ہیں۔ نَسَكَ الثَّوْبَ۔ اس نے کپڑے کو دھوکر پاک اور صاف کرلیا۔ اَرْضٌ نَاسِكَةٌ۔ سرسبز و شاداب زمین جس پر حال ہی میں بارش ہوئی ہو۔ ان بنیادی معانی کی رُو سے اس سے مفہوم کسی معاملہ کی درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے۔ نَسَكَ السَّبَخَةَ کے معنی ہیں اس نے زمین شور کو درست کیا۔ اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا۔ نَسَكَ اِلٰی طَرِیْقَةٍ جَمِیْلَةٍ اس نے اچھا طریقہ اختیار کرلیا اور پھر اس پر مداومت کی۔ راستہ اختیار کرلینے کی جہت سے کلامِ عرب میں مَنْسَكٌ۔ ہر اُس مقام کو کہتے ہیں جس پر عام طور پر آمدورفت جاری ہو۔ یہیں سے اس کے معنی روش اور رسم کے ہوگئے۔ اور امور و مراسمِ حج کو بھی مناسکِ حج کہنے لگے۔

نُسُك

شاہ عبدالقادرؒ اس کے معنی "عبادات" کرتے ہیں۔ اور (مولانا) ابوالکلام آزاد "عبادت کے سچے طور طریقے"۔ "خالص اور سچے طور طریقے" اس کا صحیح مفہوم ہے۔ ان معانی کی رُو سے آیۂ زیرِ نظر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی:۔

> اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرے تمام فرائضِ زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریق، مختصراً میری ساری زندگی حتیٰ کہ میری موت بھی خدا کے تجویز کردہ پروگرام کے لئے وقف ہے۔

مروجہ قربانی کی تائید میں سورۃ الکوثر کی آیت — فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ — بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — "نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر"۔ "قربانی کر" ترجمہ کیا جاتا ہے وَانْحَرْ کا۔

وَانْحَرْ

لُغت کی رو سے نَحْر سینے کے اوپر کے حصے کو کہا جاتا ہے۔ صاحب تاج العروس نے مختلف تفاسیر کی سند سے وَانْحَرْ کے متعدد معانی لکھے ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا ہوکر سینے کو باہر کی طرف نکالنا۔ (۲) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا۔ (۳) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا۔ (۴) نماز میں نَحْر تک ہاتھ اٹھانا۔ (۵) اپنے سینے کو قبلہ رُخ کرکے کھڑے ہونا۔ (۶) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔

اونٹ کے ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے کھڑے، اس کے نَحْر (سینے کے اوپر کے حصے) کے قریب، حلق کی رگ پر نیزہ مارتے ہیں۔ اس سے نَحَرَ الْبَعِیْرَ۔ کے معنی آتے ہیں، اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا۔

لیکن لغت میں اَلنَّحْرُ و اَلنِّحْرِیْرُ کے معنی ہیں ماہر، عقل مند، تجربہ کار، ہر بات کو سمجھ کر سوچ کر اختیار کرنے والا، اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَرْتُ الشَّیْءَ عِلْمًا۔ میں علم کی رُو سے اس معاملہ

پر حاوی ہو گیا۔

ان معانی کی رُو سے، سورۃ الکوثر کا مفہوم یہ ہو گا کہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ اے رسول! ہم نے تجھے قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے جو سرچشمہ ہے دنیا بھر کی برکات و سعادات کا۔ اس میں حکمت اور بھلائی کی لامنتاہی باتیں ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ابھرتی اور سامنے آتی چلی جائیں گی۔ اس خیر کثیر میں کبھی کمی واقع نہیں ہو گی۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اب تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اپنے ربّ کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہے۔ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اپنے فرائضِ منصبی کو بطریقِ احسن ادا کرے۔ جملہ معاملات پر علم و عقل اور تجربہ و مشاہدہ سے پوری طرح حاوی ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنی جماعت کے لوگوں کے کھانے پینے کا بھی انتظام کرے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ (۱۰۸:۱) اس وقت تو حالت یہ ہے کہ تیری جماعت کمزور سی ہے اور مخالفین بڑی قوت اور کثرت کے مالک ہیں لیکن آخرالامر تو دیکھے گا کہ جو لوگ تیرے نظام کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور یہی نظام جو نوعِ انسان کے لئے خیر کثیر کا سرچشمہ ہے، آگے چلے گا۔

یہ ہے ہماری بصیرت کی رُو سے' اس سورۃ میں وَانْحَرْ کا مفہوم۔ اس سے مروجہ قربانی کی سند لینا بعید از کار سی بات ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں وانحر سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈتی ہیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے۔ قرآنِ کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں "اونٹ ذبح کرو" یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو۔ چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کر لی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ہے کہ عبرانی زبان میں "کوشر" حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ اَلْکَوْثَرَ (۱۰۸:۱) اسی سے معرب ہے۔ اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (۱۰۸:۱) کے معنی ہوں گے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا"۔ لیکن ہم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی]۔

اور اگر وانحر سے مراد بالضرور "قربانی" لینا ہے تو قرآنِ کریم کی رُو سے اِن شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہو گا۔

ایک تو یہ کہ نحر صرف اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، کسی اور جانور کے ذبح کرنے کو نہیں۔ اس لئے "قربانی" صرف اونٹوں کی دی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ آیات میں بتایا جاچکا ہے) قرآن کریم نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام کعبہ قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ "قربانی" صرف حج کے مقام پر کی جائے گی اور تیسرے یہ کہ قرآن کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور وہاں کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ لہٰذا صرف اتنے اونٹ ذبح کئے جائیں گے جن کا گوشت کھانے کے کام آسکے۔ بنا بریں جس طرح آجکل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی ہیں اور تمام دنیا میں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں قرآن کریم سے اس کی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔

(٠)

سنّتِ ابراہیمیؑ

قربانی کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ سنّتِ ابراہیمیؑ کا اتباع ہے اور "ذبحِ عظیم" کے واقعہ سے اس کی سند لائی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ یوں مذکور ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں کبر سنی میں ایک لڑکا (حضرت اسمٰعیلؑ) پیدا ہوا۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ۔ (۳۷/۱۰۲)۔ جب وہ بیٹا باپ کے ساتھ کام کاج (کھاگنے دوڑنے) کے قابل ہوا تو آپ نے اپنے ایک خواب کی رُو سے سمجھا کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ اس بیٹے کو (اللہ کی راہ میں) قربان کر دیا جائے۔ آپ نے بیٹے سے کہا کہ

يٰبُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۔ (۳۷/۱۰۲)

اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے۔

بیٹے نے جواب میں عرض کیا :۔

يٰأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصّٰبِرِينَ ۔ (۳۷/۱۰۲)

ابا جان! جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے، آپ (اسے اگر حکمِ خداوندی سمجھتے ہیں تو) بلا تامل کر گزریئے۔ انشاءاللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا چھری ہاتھ میں لی ــــ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۔ (۳۷/۱۰۳) تو نَادَيْنٰهُ ہم نے اسے آواز دی اور کہا۔ يٰإِبْرٰهِيمُ اے ابراہیمؑ! (۳۷/۱۰۴)

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۔ إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۔ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِينُ ۔ (۳۷/۱۰۵-۱۰۶)

تو نے اپنے خواب کو حقیقت سمجھ کر اپنے بیٹے کو سچ مچ ذبح کرنے کے لئے لٹا دیا۔ (یہ ہمارا حکم نہیں تھا۔ یونہی تمہارا خواب تھا اس لئے ہم نے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اس نقصان سے بچالیا) اس لئے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں ہم انہیں اس قسم کے نقصانات سے بچالیا کرتے ہیں۔

یہ خدا کی طرف سے ایک واضح انعام تھا جو ابراہیمؑ پر کیا گیا۔

باقی رہا وہ بیٹا جو پیکرِ تسلیم و رضا تھا۔

ذبحِ عظیم

وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۔ (۳۷/۱۰۷)

ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچالیا۔

اس طرح جان دے دینے کی قربانی تو ایک ثانیہ سے ختم ہو جاتی تھی۔ ہم نے اس سے ایک بہت بڑی قربانی لی۔ وہ قربانی یہ تھی کہ ملک شام کی سرداری کے بجائے ہم اپنے اس گھر کی پاسبانی کی خدمت اس کے سپرد کرنے والے تھے جو عرب کی بے برگ و گیاہ وادی میں واقع تھا اور جسے قیامت تک دنیا بھر کے توحید پرستوں کا مرکز بننا تھا۔ (۱۴/۳۷)

پھر جو قربانی (حضرت) ابراہیمؑ دینا چاہتا تھا وہ اس کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ تک محدود رہتی۔ لیکن جس قربانی کے لئے ہم نے اسے زندہ رکھا اس کا سلسلہ اس کی نسل میں بھی جاری رہنا تھا جسے (حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد) اس گھر کا پاسبان بننا تھا۔ وَ تَرَکْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ (۳۷/۱۰۸) ذریتِ حضرت اسحٰقؑ اور اولادِ حضرت اسمٰعیلؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اول الذکر کے مقابلہ میں، حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کی یہ قربانی کس قدر عظیم تھی۔

قرآنِ مجید میں تو یہ واقعہ اسی طرح مذکور ہے لیکن تورات میں ہے کہ

> ابرہام نے اپنا ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔ اس وقت خدا کے فرشتے نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام! اے ابرہام! وہ بولا میں حاضر ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر مت بڑھا اور اسے کچھ مت کر کہ اب میں نے جانا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے۔ ہاں! اپنے اکلوتے کو مجھ سے دریغ نہ کیا۔ تب ابرہام نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختنی قربانی کے لئے چڑھایا۔
>
> (کتاب پیدائش۔ ۲۲/۱۰-۱۳)

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو قربانیاں حج اور عید الاضحیٰ کی تقریب پر دی جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے انہیں کس طرح سنّتِ ابراہیمیؑ کا اتباع کہا جا سکتا ہے؟

حج کے سلسلہ میں حجرِ اسود کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے لیکن قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اکثر واعظ کہا کرتے ہیں کہ اس مقدس پتھر کو حضرت حوّا اپنے ساتھ جنت سے لائی تھیں۔ یہ (اقبال کے الفاظ میں) محض "زیبِ داستان" ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک (دوسرے رنگ کا) پتھر دیوارِ کعبہ کے ایک کونے میں اس لئے لگا دیا تھا کہ اس سے طواف کے وقت، چکر وں کے شمار میں آسانی رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال اس طرف گیا ہے کہ سامی اقوام میں رواج تھا کہ جب کسی معاہدہ کو محکم طور پر استوار کرنا ہوتا تو فریقین ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ حج کی تقریب پر، حاجی خدا سے اپنا عہد استوار کرنے کے لئے قدیمی رواج کے مطابق، اپنا ہاتھ اس پتھر پر مار کر، اطمینان کر لیتے کہ ہم نے خدا سے اپنا عہد استوار کر لیا ہے۔ یہ ہر دو توجیہات قرینِ قیاس ہیں۔ ایک تحقیق یہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں ایک عرب تاجر، بسلسلۂ تجارت فلسطین گیا اور وہاں، حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب قبر سے ایک پتھر تبرکاً اٹھا لایا اور اسے دیوارِ کعبہ میں نصب کر دیا۔ پہلے تو اس کی صرف تعظیم ہوتی رہی اور پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ پتھر کی پرستش شروع ہوئی تھی کہ مختلف قبائل نے اپنے اپنے بت کعبہ اور اس کے حطیم میں نصب کر دیئے۔ اور یوں خدا کا گھر بُت کدہ بن گیا۔

حجرِ اسود

ان میں سے کوئی توجیہہ بھی صحیح ہو، قرآنِ کریم میں بہرحال حجرِ اسود کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی اس نے اسے شعائر اللہ میں شمار کیا ہے۔

تین شیطانوں کو پتھر مارنا

اور سب سے آخر میں وہ رسم جس کے بغیر کہا جاتا ہے کہ فریضۂ حج کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یعنی رمی الجمار "یعنی تین شیطانوں کو پتھر مارنا"۔ جو لوگ حج کے لئے نہیں جاتے تھے، وہ پہلے تو اس "فریضہ کی ادائیگی" کی بابت سنا ہی کرتے تھے لیکن اب ٹی۔ وی (ٹیلی وژن) کی بدولت اسے ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے اور . . . . .

اس رسم کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں کہیں نہیں۔ واعظوں کی زبانی یہ روایت سنائی دیتی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے لے کر چلے تو راستے میں شیطان نے انہیں ورغلانا چاہا۔ وہ اس مقصد کے لئے قریب آتا تھا، اور حضرت ابراہیمؑ اسے پتھر مار کر بھگا دیتے تھے۔ سات مرتبہ ایسا ہوا تا آنکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس سنّتِ ابراہیمیؑ کے اتباع میں ہر حاجی، ان شیاطین کو (جو پتھروں کی شکل میں وہاں نصب ہیں) سات سات کنکریاں مارتے ہیں ـــــ اس روایت کا وضعی ہونا بدیہی ہے۔

قرآنِ کریم میں سورۃ الفیل دیکھئے۔ یمن کے عیسائی گورنر، ابرہہ، نے ارادہ کیا کہ کعبہ کو مسمار کر دیا جائے۔ اس مقصد

کے لئے وہ ایک لشکرِ جرار لے کر، جس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے [جن کی نسبت سے اس لشکر کو اصحاب الفیل کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۰۵/۱)] جانبِ مکہ روانہ ہوا۔ بجائے اس کے کہ وہ یمن سے مکہ کا کھلا راستہ (امامِ مبین) اختیار کرتا، اس نے خفیہ راستہ اختیار کیا جو پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے مکہ تک پہنچ جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ مکہ کے تین غداروں نے اسے اس راستہ کا پتہ نشان بتایا تھا۔ اس نے یہ خفیہ تدبیر تو اختیار کر لی لیکن فطرت کے غمازوں نے اس کی پردہ دری کر دی۔ چیلوں اور کرگسوں (گدھوں) کے جھنڈ، فضائے آسماوی میں اس لشکر کے اوپر اڑتے چلے آتے۔ اس قسم کے جانوروں کی فطری ذکاوت انہیں بتا دیتی ہے کہ آگے چل کر میدانِ جنگ میں انہیں بافراط سامانِ خورد ونوش میسر آئے گا۔ اس لئے وہ لشکروں کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں۔ اہلِ مکہ نے ان پرندوں کے ہجوم سے بھانپ لیا کہ پہاڑیوں کے پیچھے کوئی جمعیت آرہی ہے۔ وہ پہاڑیوں کے اوپر چڑھ گئے اور وہاں سے اس لشکر پر اس شدت سے پتھراؤ کیا کہ لشکر اور اس کے ہاتھیوں کا بھرکس نکل گیا۔ یہ واقعہ نبی اکرمؐ کے سنِ پیدائش کا ہے (یعنی نبوت سے چالیس سال پہلے کا)۔ عربوں کی تاریخ میں یہ واقعہ ایسی اہمیت کا حامل تھا کہ انہوں نے اس کی یادگار قائم کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے لئے انہوں نے کیا یہ کہ ان پہاڑیوں کے دامن میں جہاں سے انہوں نے پتھراؤ کیا تھا، مناسب مقامات پر نشانات نصب کر دیئے۔ حج کے موقع پر لوگ جمع ہوتے تو اس اہم قومی پتھراؤ کی یاد میں، ان نشانات کو کنکریوں کا ہدف بناتے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان نشانات سے مطلوب وہ تین غدار تھے جنہوں نے ابرہہ کو اس خفیہ راستے کا پتہ نشان بتایا تھا اور قوم نے انہیں اس سازش کی پاداش میں سنگسار کر دیا تھا۔ انہوں نے بعد میں آنے والی نسلوں کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ غداروں کا حشر کیا ہوتا ہے، ان نشانات پر پتھراؤ کی رسم جاری کی۔ علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمتہ) نے اپنے سفرنامہ حج میں لکھا ہے کہ ابرہہ کے رہبر ابو رغال ثقفی کی قبر مکہ اور طائف کے درمیان، مقام مغمس پر واقع ہے۔ ہر عرب جو وہاں سے گزرتا ہے، اس پر رجم کرتا ہے[1]۔ ہو سکتا ہے کہ رغال ثقفی ان تین غداروں کا سرغنہ ہو جن کے نشانات پر حج میں رجم کیا جاتا تھا۔

یہ توجیہہ جی کو لگتی ہے اور عرب جاہلیہ کی حمیتِ قومی کی آئینہ دار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس رجم نے بعد میں موجودہ شکل اختیار کر لی ہو۔ عرب جاہلیہ کے رجم میں "کیوں" کا جواب بہرحال موجود تھا لیکن اب جو اس نے مذہبی رسم کی شکل اختیار کر رکھی ہے، اس میں "کیوں" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال، قرآنِ کریم میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

(٠)

---

[1] نوادرات۔ صفحہ ۳۴۱

ہاتھیوں والے کا لشکر

یہ ہیں حج سے متعلق احکام جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ جس مقصد کے لئے انہیں مقرر کیا گیا تھا، یعنی حج کی غرض و غایت کو سامنے رکھیے، اور اس کے بعد موجودہ حج کی تقریب اور اس سے متعلقہ رسوم و مناسک کو، اور پھر سوچئے کہ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے ارکان کیا انداز اختیار کر لیتے ہیں؟ اقبالؒ نے انہی اجتماعات کے متعلق آہِ سرد کھینچ کر کہا تھا کہ

عیدِ آزاداں، شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنین

اور اس "شکوہِ ملک و دیں" کی طرف قرآنِ کریم نے اگلی متعلقہ آیت میں اس طرح اشارہ کیا ہے۔ پہلے کہا:-

۲/۲۰۰ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ...... (۲/۲۰۰)

حج سے واپسی کے بعد تم یہ نہ سمجھ لو کہ جو فریضہ تم پر واجب تھا وہ ادا ہو گیا۔ اب تم پر کوئی مزید ذمہ داری باقی نہیں رہی! وہاں سے واپسی پر بھی تم قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھو۔ اسی طرح جیسے تم اس سے پہلے اپنے اسلاف کے مسلک کو اپنے سامنے رکھا کرتے تھے — بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت اور گہرائی کے ساتھ۔

اس سے یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے تم اپنے نسلی امتیازات کو فخریہ بیان کیا کرتے تھے۔ اب اس کی جگہ اس کا ذکر کرو کہ تم قوانینِ خداوندی کی کس حد تک پابندی کرتے ہو کہ وجہِ عزت و تکریم یہی ہے۔ (۴۹/۱۳)

تقاریب، اجتماعات، کانفرنسیں، مختلف قوموں (اور ان کی مملکتوں کی طرف سے) منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں اکثر سیکولر سٹیٹ ہوتی ہیں جن کے پیشِ نظر صرف اپنے دنیاوی مفادات ہوتے ہیں۔

۲/۲۰۰ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ (۲/۲۰۰)

وہ لوگ بھی ہیں جن کے پیشِ نظر صرف دنیاوی مفاد ہوتے ہیں۔ انہیں یہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

ان کے برعکس

۲/۲۰۱ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (۲/۲۰۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی طلب و آرزو یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور

اُخروی زندگی کی مسرتیں بھی اور وہ ہر قسم کی تباہیوں سے محفوظ رہیں۔

دُنیا اور آخرت کی خوشگواریاں یہ ہیں نظامِ خداوندی پر ایمان رکھنے والے جس کے استحکام کی خاطر یہ اس قسم کے اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ (۲/۲۰۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے اعمال کے مطابق دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریوں میں حصہ مل جاتا ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ وہ ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب کرتا جاتا ہے۔ البتہ ان کے نتائج کی نمود اور اظہار اپنے موقعہ پر ہوتا ہے۔

ان ہر دو گروہوں کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۱۴۹-۱۵۰۔ آیت (۲/۴)، ص ۲۵۳۔ آیت (۲/۱۴) اور ص ۲۷۔ آیت (۲/۸) میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

یہاں قرآنِ کریم نے ان دو گروہوں کا ذکر کیا ہے جن کے اعمال (کاموں) کے نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ سیکولر نظریہ حیات کے حامل، اور دینِ خداوندی پر ایمان رکھنے والے۔ دیگر مقامات پر اس نے ایک تیسرے گروہ کا ذکر بھی کیا ہے جن کے متعلق کہا ہے کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۔ (۱۸/۱۰۵) ان کے تمام اعمال رائیگاں جاتے ہیں حتیٰ کہ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔ بے نتیجہ اعمال کے وزن کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر اس گروہ کی مختلف خصوصیات اور علامات بیان کی گئی ہیں۔ لیکن جس ضمن (CONTEXT) میں ہم اس آیت کو یہاں لائے ہیں، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں خود ہمارا ہی ذکر ہے۔ آپ سوچئے کہ ایک سال کے حج کے اجتماع میں دنیا بھر کے مسلمان کس قدر صعوبات اور تکالیف برداشت کر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس پر کس قدر روپیہ اور وقت صرف ہوتا ہے، کتنی اموات بھی ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد حاصل کیا ہوتا ہے؟ نہ دنیاوی مفاد نہ دینی (نظامِ خداوندی کی) کامیابیاں:
اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔ یہ سب کیا کرایا رائیگاں جاتا ہے۔ لیکن وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ اس اجتماعِ عظیم میں شرکت کرنے والے اپنے جی میں سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ خوش عقیدگی ہے جو ہر سال لوگوں کو کشاں کشاں وہاں لے جاتی ہے۔ اگر ہمارے سامنے قرآنی معیار ہوتا تو یہی حج ساری دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کا موجب بن جاتا اور اس طرح ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں نصیب ہو جاتیں۔

———— (٠) ————

بات ہو رہی تھی ان دو گروہوں کی۔ ان میں سے ایک گروہ سیکولرز کا ہوتا ہے۔ یعنی وہ جو کھلے بندوں خدا۔ وحی، مستقل اقدار اور حیاتِ آخرت کا انکار کرتا ہے۔ وہ نہ خود دھوکے میں رہتا ہے، نہ دوسروں کو دھوکا دیتا ہے لیکن سیکولرازم کے حامیوں کا ایک اور گروہ ہوتا ہے جو (مسلمان کہلاتا ہے)۔ خدا۔ وحی اور آخرت پر ایمان کا مدعی ہوتا ہے۔ لیکن دل سے ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کے پیشِ نظر مقصد دنیاوی مفاد ہی ہوتا ہے۔ اس غرض سے کہ کہیں عوام بدک نہ جائیں، وہ مذہب کے ظاہر کا شدت سے پرچار کرتا رہتا اور اس سلسلہ میں اپنی "اسلامی خدمات" کا ڈھول بجاتا رہتا ہے لیکن دین کی اصل دغایت کی صداقت اس کے قلب میں قطعاً نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ گروہ جس کے متعلق فرمایا:۔

۲/۲۰۴ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ‏. (۲/۲۰۴)

جب یہ لوگ دنیاوی معاملات، اور امورِ مملکت کے متعلق گفتگو کریں گے تو وہ اپنی ملمع ساز باتوں سے تمہیں

ملمع ساز مسلمان

ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے۔ وہ اپنے دعاوی میں سچا ہونے کے ثبوت میں قدم قدم پر خدا کو گواہ ٹھہرائیں گے۔ حالانکہ ان کے دل (نظامِ خداوندی کی طرف سے) دشمنی اور خصومت کے جذبات سے لبریز ہوں گے (کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے قیام میں ان کی فنا ہے)۔

یہ اپنے آپ کو پکے اور سچے مسلمان ظاہر کرنے والے۔ یہ بات بات پر خدا کی قسمیں کھانے والے، ایسا کیوں کرتے ہیں؟ محض اس لئے کہ لوگ اقتدار کی چابیاں ان کے ہاتھ میں دے دیں۔ یہ لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو یہ عوام کی بہبود کے لئے یہ کریں گے۔ اسلام کی خدمت کے لئے وہ کریں گے۔ وہ اس طرح عوام کو دھوکا دیکر اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں۔ اور

۲/۲۰۵ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ الۡحَـرۡثَ وَ النَّسۡلَ‌ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ ۔ (۲/۲۰۵)

جب حکومت ان کے ہاتھ آجاتی ہے تو ان کی ساری کوشش اس لئے ہوتی ہے کہ ملک کا امن و نظام درہم برہم ہو جائے۔ فصلیں تباہ ہو جائیں۔ نسلِ انسانی ہلاک ہو جائے۔ نہ معاشی نظام مستحکم رہے نہ عمرانی۔ انہیں صرف اپنے مفادات کا خیال ہوتا ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ ملک اور قوم کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ حالانکہ جس خدا کی یہ بار بار قسمیں کھاتے اور اسے گواہ بنا کر پیش کرتے تھے، انہیں علم ہے کہ وہ کبھی اسے پسند نہیں کرتا کہ ملک میں

تباہی اور ویرانی پھیل جاتے۔

فساد اور اصلاح کا قرآنی مفہوم، جلد اول صـ۲۲۹ - آیت (۲/۱۱-۱۲) میں واضح طور پر پیش کیا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے دعاوی کی تائید میں خدا کو بطور گواہ پیش کیا کرتے تھے، لوگ، ان کی فساد انگیزیوں سے تنگ آکر، اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ انہیں خدا کی یاد دلائیں۔

۲/۲۰۶ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ - (۲/۲۰۶)

جب ان سے کہا جائے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں تو نشۂ حکومت کی بدمستیاں اور جھوٹی عزت کا خیال، اصلاح کے بجائے، انہیں اور خرابیوں کے لئے اُکساتا ہے۔ ان کا مقام تباہی اور بربادی کا جہنم ہے جہاں انسانیت ذبح ہوتی ہے — اُف! کتنا بُرا ہے یہ انجام۔

اس آیت میں قرآنِ کریم نے، آئین و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر، حکومت کرنے والے مستبد، سرکش، عناں تاب، اربابِ قوت کی سائیکالوجی کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کے ذہن میں قوت کے سوا کسی تدبیر کا تصور تک نہیں ہوتا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کی اندھا دھند بدعنوانیوں سے ملک تباہ ہو رہا ہے، تو ان کے

مستبد حکمران

دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ہم سے قوت کے استعمال میں کچھ کمی رہ گئی ہے اس لئے یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کی اصلاح یا ازالہ کے لئے وہ اور سختی برتتے ہیں۔ زیادہ شدت سے قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ خرابیاں اور بڑھتی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ یہ اپنی قوم کو اپنے ساتھ لے کر تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتے ہیں۔ یہ بھی تباہ ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی قوم بھی۔ اسی لئے تو قرآنِ کریم، قوم کو متنبہ کر دیتا ہے کہ اگر ملک میں خرابیاں عام ہو رہی ہیں تو تم اس خیال سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھے رہو کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار ہم تھوڑے ہیں۔ جب تباہ ہوں گے تو وہی لوگ ہوں گے جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہیں۔ (قرآن نے کہا کہ) اس خود فریبی میں مبتلا مت رہو۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً - (۸/۲۵)۔ اس تباہی سے بچنے کا اجتماعی طور پر انتظام کرو۔ کیونکہ جب وہ آتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ یہ ابتلا ساری قوم کے لئے ہوتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ - (۲/۲۰۶) جلد دوم صـ۲۵۶ - آیت (۲/۵) میں بتایا جا چکا ہے کہ اثم کے معنی ایسے کام ہیں جو انسان میں اضمحلال پیدا کر دیں، جن سے قوتوں میں کمی واقع ہو جائے۔

اِثْم کا مفہوم جن سے افسردگی اور واماندگی پیدا ہو جاتے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ مستبد اور سرکش حکام، قوت کے غلط استعمال سے معاشرہ میں خرابیاں پیدا کر دیتے ہیں تو اس سے معاشرتی ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کا ازالہ اصلاحِ احوال سے نہیں کرتے، اور زیادہ قوت کے استعمال سے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں اور زیادہ اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ (جب ہم خمر، شراب کی ممانعت سے متعلق آیت پر آئیں گے تو وہاں اثم کا مفہوم نکھر کر سامنے آجائے گا)۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ شراب پینے سے (بظاہر) انسان کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد، خمار یہ بتاتا ہے کہ اس کی قوت کس قدر کم ہو گئی ہے۔ اسے اثم کہا جاتا ہے۔ شراب کا عادی، اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے شراب کا اور زیادہ استعمال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کا اثم (کمزوری، ضعف۔ اضمحلال) اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ وہ اسے ایک دن ہلاکت کے جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔
مستبد نظامِ حکومت کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کے "ازالہ" کے لئے اور زیادہ شدت سے قوت کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے مملکت میں مسزید اضمحلال (اثم) پیدا ہو جاتا ہے۔ غلط کوشی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تا آنکہ وہ حکومت اور اس کے ساتھ وہ قوم، تباہی کے جہنم تک جا پہنچتی ہے۔ اس میں اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ (ہر قوت، اضمحلال بڑھاتی ہے۔

یہ تو ہے غلط بین و غلط کوش مستبد حکمران۔ ان کے برعکس:-

۲/۲۰۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۔ (۲/۲۰۷)

آیات (۲/۲۰۱ - ۲۰۲) میں جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک گروہ کا تفصیلی تعارف سابقہ صفحات میں کرایا جا چکا ہے۔ مذکورہ صدر آیت میں دوسرے گروہ کا ذکر آتا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ "ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو رضا جوئی باری تعالیٰ یا خدا کی خوشنودی کی خاطر بیچ دیتے ہیں۔ اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بہت مہربان ہے"۔ قبل اس کے کہ ہم "مرضات" کا صحیح مفہوم پیش کریں، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے آیت (۲/۲۰۷) کے تحت بتایا تھا کہ قرآنی نظام میں مملکت کا نظریہ میثاق کا ہے۔ یعنی اس میں خدا اور انسان کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی رو سے انسان اپنی جان اور مال "خدا کے ہاتھ" بیچ دیتا ہے، اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ آیۃ زیرِ نظر میں بھی اسی بیع و شریٰ کا ذکر ہے۔ (ضمناً لفظ شریٰ کے معنی بیچنے اور خریدنے، دونوں کے آتے ہیں۔ آیت (۹/۱۱۱) ہیں اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ...... تھا۔ یعنی خدا

مومنین سے خرید لیتا ہے۔ اور آیۃ زیر نظر میں " مَن یَّشرِی " آیا ہے۔ یعنی جو شخص اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد آیت کے مفہوم کی طرف آیئے۔ اس میں تشریح طلب لفظ مرضات ہے جس کا عمومی ترجمہ رضاجوئی یا خوشنودیِ باری تعالیٰ کیا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے آپ نے "متقی پرہیزگار" لوگوں کی زبان سے اکثر اس قسم کے الفاظ سنے ہوں گے کہ "اللہ اس سے خوش ہوتا ہے" یا "عبادت سے مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے"۔ دوسری طرف ایسے الفاظ کہ "اس قسم کی باتوں سے خدا ناراض ہو جاتا ہے"۔ "اللہ کی ناراضگی سے ڈرو" وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ سے خدا کے متعلق بڑا غلط.... تصور پیدا ہوتا ہے۔ خوشی یا ناراضگی وغیرہ انسانی جذبات ہیں، اور ذاتِ خداوندی اس قسم کے جذبات سے منزہ اور ماوراء ہے۔ خدا کے صحیح تصور کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۔ آیت (۱/۱) نیز صفحہ ۵۴۔ آیت (۱/۲) نیز صفحہ ۵۳ آیت (۲/۲) میں مختصر الفاظ میں بات ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں جلد اول میں تقدیر کا عنوان بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۶۳ تا صفحہ ۱۸۱ تا صفحہ ۲۷۲)۔ نیز جلد دوم میں نفس سے متعلق بحث بھی۔ اور جلد اول میں قانونِ مکافاتِ عمل صفحہ ۱۴۶-۱۵۲ بھی۔ بایں ہمہ، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اہم نکتہ مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔

مرضاتِ اللہ

جب ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا، یا خدا کا تصور ایسا ہی قائم کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لئے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کر قوت اور اقتدار کا مالک کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی، بادشاہ کی طرح، ایک تخت پر بٹھایا۔ اس کے اردگرد، مقربین کو جمع کیا۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے حاجب و دربان بھی مقرر کئے۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اس کے حضور پیش کرنی ہو تو ضروری ہوگا کہ اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرے اور پھر اس درخواست کو اس کے مقربین کی وساطت سے اس تک پہنچائے تاکہ وہ درخواست دہندہ کی سفارش بھی کریں۔ ان درخواستوں کے فیصلے، یا خدا کے دیگر احکام، کسی قاعدے یا قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار "بادشاہ" کے مزاج پر ہوتا ہے۔ وہ خوش ہو گیا تو جاگیر کے طور پر گاؤں بخش دیا۔ ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ سعدی کے الفاظ میں،

خوشنودیِ باریتعالیٰ

مزاجِ شاہاں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ "گاہے بسلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند"۔ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام و اکرام کی بارش کر دیتے ہیں۔ لہٰذا، بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کو راضی کر لیں۔ اسے خوش رکھیں۔ ایشور کی بھگتی، ڈنڈوت، پوجا پاٹ، اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں

دینا۔ سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور، پرماتما یا دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھگتوں سے راضی رہیں۔

قرآنِ کریم نے خدا کے متعلق یہ باطل تصور مٹایا اور اس کی جگہ یہ تصور پیش کیا کہ اس نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات اس نظم و ضبط کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انہیں تقدیراتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد میں اس موضوع پر، مختلف مقامات میں، بڑی شرح و بسط سے بحث کی جا چکی ہے۔ ان مجلدات کی فہرست سے ان مقامات کو دیکھ لیا جائے۔

رَضِیَ - یَرْضٰی - رِضْوَانًا و رِضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی کے ساتھ دل کی پوری رضامندی سے متفق ہو جانا۔ ہم آہنگ ہو جانا۔ مطابقت پیدا کر لینا۔ بیع و شریٰ کے معاملہ میں یہ ہم آہنگی یا باہم متفق ہو جانا، مشہود طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ معاملہ طے ہی اس وقت ہوتا ہے جب فریقین باہمدگر متفق ہو جائیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآنی تصور کی رُو سے، خدا اور مومنین کا معاملہ، بیع و شرای کا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں باہمدگر متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ (۹/۱۰۰ - و دیگر مقامات) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر متبدل قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ یہ اس لئے اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے کہ اشیائے کائنات کو ان قوانین کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی زندگی کے لئے بھی مقرر کئے ہیں۔ لیکن انسان کو اس نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلے۔ جب انسان ان قوانین کی متابعت یا مطابقت (ہم آہنگی) کی زندگی بسر کرتا ہے تو اسے اِتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰہِ۔ (۳/۱۶۱)۔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس نے قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کر لی اور جب وہ ان قوانین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو ان کی رُو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ

یہی معنی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ کے ہیں۔ یہ قوانین، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں، اس لئے اتباعِ رضوان اللہ کے معنی اتباعِ قرآنِ کریم کے ہوں گے۔ سورۃ محمدؐ میں اس نکتہ کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کفار کے متعلق پہلے کہا۔ کَرِھُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۴۷/۹) وہ ما انزل اللہ (قرآنِ مجید) سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ (۴۷/۲۸)۔ وہ "رضوان اللہ" سے نفرت کرتے ہیں۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ تخلیقِ کائنات (جس میں انسان بھی شامل ہے)، خدا کے ایک عظیم پروگرام کی

کرلی ہے۔ انسان کے سوا، دیگر اشیائے کائنات مناسب پرورش سے خودبخود وہ کچھ بن جاتی ہیں جو کچھ انہیں بنانا مقصود ہے۔ مثال کے طور پر، بکری کے بچہ کی مناسب پرورش کی جائے تو وہ خودبخود بکری بن جاتا ہے۔ اسے کچھ اور بننے کا اختیار ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یوں کہیں گے کہ کائنات کی ہر شے خودبخود منشائے خداوندی کے مطابق بن جاتی ہے۔ جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کا تعلق ہے، انسانی بچہ بھی (بکری کے بچہ کی طرح) مناسب پرورش سے، انسانی پیکر اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن صرف یہ پیکرؐ انسانؑ کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ حیوان، صرف اتنے سے انسان نہیں بن جاتا، اسے اپنی کوشش سے انسان بننا ہوتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں، "آدمی کو انسان" بننا پڑتا ہے۔ اور وہ انسان بن سکتا ہے ان قوانین کے اتباع سے جنہیں خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو آدمی سے انسان بن جائے اور جی چاہے تو آدمی کا آدمی رہتے ہوئے، دیگر حیوانات کی سی زندگی جئے اور حیوانات کی سی موت مر جائے۔ خدا کے پروگرام میں وہ اسی صورت میں فِٹ آسکے گا جب وہ آدمی سے انسان بن جائے۔ قرآنِ کریم اسے ایسا بنا دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن کرتا یہ ہے کہ:

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

جب آدمی انسان بن جاتا ہے تو اس وقت کہا جاسکتا ہے کہ وہ منشاءِ خداوندی کے مطابق بن گیا۔ اسی منزل میں پہنچنے والوں کے متعلق کہا جائے گا کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

اس مقام پر پہنچکر کہا جاسکتا ہے کہ اگر قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا منتہیٰ ومقصود یہی ہے کہ ہم ایسی مخلوق بن جائیں جو منشاءِ خداوندی کو پوری کرے جو اس کے معیار پر پوری اترے، تو یہ وہی بات ہوگئی کہ اس تمام تگ وتاز کا منتہیٰ، خدا کے کسی مقصد کی تکمیل ہے۔ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اس کے کسی مقصد کے لئے اس قدر جانکاہ مشقتیں برداشت کریں۔ ہم کیوں آدمی سے انسان بنیں؟ ہم آدمی پیدا ہوئے آدمی کی زندگی بسر کرکے، آدمی ہی مرجانا چاہتے ہیں۔ انسان بننے میں ہمارا فائدہ کیا ہے؟

انسان بننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ خدا کا نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آدمی سے انسان بن جانے والا خدا کی ایک اسکیم میں بھی فِٹ بیٹھ جاتا ہے اس لئے خدا اسے اس کے لئے منتخب کرلیتا ہے۔ سمجھنے کے لئے اس کی مثال لیوں۔ سمجھئے کہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر آپ سے کہتا ہے کہ اگر آپ فلاں بیرونی ڈگری (FOREIGN DEGREE) حاصل کر آئیں تو آپ کو یونیورسٹی کے فلاں شعبہ کا سربراہ مقرر کردیا جائے گا۔ آپ دن رات کی محنتِ شاقہ سے وہ ڈگری حاصل کرلیتے ہیں اور آپ کو حسبِ وعدہ، اس شعبہ کا سربراہ مقرر کردیا جاتا ہے۔ آپنے اس ڈگری کے حاصل کرنے سے اس یونیورسٹی

پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اس کا کوئی بگڑا ہوا کام نہیں سنوارا۔ آپ نے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا اور اس معیار پر پورے اترے جو اس شعبہ کی سربراہی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح اس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ یوں آپ اس یونیورسٹی کے پروگرام میں بھی فٹ بیٹھ گئے۔

یہی مثال قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے آپ کے، آدمی سے انسان بن جانے کی ہے۔ اس سے آپ ہی کا کچھ سنورتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے قدم قدم پر کہہ دیا کہ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ. وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا۔ (۱۰/۱۰۸) جو شخص صحیح راستہ اختیار کرتا ہے وہ خود اپنے فائدے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ جو غلط راستے پر چلتا ہے وہ اس سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹/۶)۔ خدا جملہ کائنات سے مستغنی ہے۔ نہ تمہارے انسان بننے سے اس کا کچھ سنورتا ہے، نہ تمہارے حیوان رہنے سے اس کا کچھ بگڑتا۔ بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا. قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَىَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۴۹/۱۷) "اے رسول! یہ لوگ

اس سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے

تجھ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت دھرو۔ یہ تو بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ دکھا دی۔ لہٰذا اگر تم واقعی اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے ممنونِ احسان ہو، نہ یہ کہ اپنے اسلام لانے کا احسان دھرو"

مرضات کا لفظ دو تین اور مقامات پر بھی آیا ہے۔ سورۃ بقرہ ہی میں ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ . . . . (۲/۲۶۵)۔ "جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اُسے قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جاتے"۔ یہ تو مرضاتَ اللہ کا مفہوم ہو گیا۔ اگلے دو لفظوں نے بات بالکل واضح کر دی کہ قوانینِ خداوندی سے مطابقت (مرضات اللہ) کا نتیجہ کیا ہو گا۔ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔" اس سے تمہاری ذات کو استحکام حاصل ہو جائے گا"۔ آپ نے دیکھ لیا کہ جو کچھ "لِمَرْضَاتِ اللّٰهِ" کیا جاتا ہے اس سے انسان کا اپنا ہی کچھ سنورتا ہے۔

سورۃ النساء میں ہے کہ منافقین تخریب کے لئے خفیہ مشورے کرتے ہیں۔ ان کے برعکس مومنین، نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں کے لئے باہمی مشورے کرتے ہیں۔ ان مشوروں کے متعلق کہا کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۴/۱۱۴)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے مطابقت کی خاطر ایسا

کریں گے انہیں اس کا بہت بڑا اجر ملیگا۔

سورۃ الممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ نظامِ خداوندی کے دشمن ہیں ان سے دوستداری کے تعلقات وابستہ نہ کرو۔ اس کے بعد ہے کہ ذرا سوچو کہ اس قسم کی متضاد باتیں کبھی یکجا ہو سکتی ہیں؟ اس قسم کی باتیں کہ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ ..... (۶۰/۱) تم ہماری راہ میں ہمارے قوانین کا اتباع کرتے ہوئے، جہاد کے لئے نکلو، اور اس کے ساتھ خفیہ طور پر ان دشمنانِ دینِ خداوندی سے دوستی کے تعلقات بھی وابستہ کر لو؟ یہ ناممکن ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان مقامات سے "مرضات اللہ" کا مفہوم کس طرح واضح ہو جاتا ہے؟ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق۔ ان قوانین کی اطاعت کرتے ہوئے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "رضائے باریتعالیٰ" کا مفہوم کیا ہے۔ اور اسی سے زیرِ نظر آیت کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ۔ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ۔ (۲/۲۰۷)

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ اپنے معاملہ کو پورا کرنے کے لئے، اپنے آپ کو (یعنی اپنی جانوں تک کو) اس کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کی ذات کی، نہایت لطیف انداز سے نشو و نما ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

"اپنی جانوں کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دینے" کے مرحلہ پر ہم ان آیات کی طرف آجاتے ہیں جن میں قتال کا حکم آیا ہے اور جن کی تشریح کو ہم نے ملتوی کر دیا تھا۔ یعنی آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵۔

(جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کی رو سے نظامِ حیات یہ ہے کہ

(۱) ہر فرد، اپنی خداداد صلاحیت و قابلیت، اور اپنی محنت و کاوش سے پیدا کردہ متاعِ زندگی کو حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، صرف کرے۔ اس سے اس کی سیرت میں پاکیزگی اور کیریکٹر میں بلندی پیدا ہو جائے گی۔

(۲) اس قسم کے افراد جب ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کا ارادہ کریں گے تو اس سے ایک ایسی امت (قوم) وجود میں آجائے گی جو اس نظامِ خداوندی کو عملاً قائم کریگی جو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔

(۳) مفاد پرست قوتیں اس نظام کے قیام کے راستے میں ہر قسم کی مزاحمت کریں گی۔ ان کی اس مزاحمت کا مقابلہ

کرنا اس امت کا فریضہ ہوگا۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جہدِ مسلسل، سعی پیہم۔ مومن کی ساری زندگی اسی (جہاد) کی عملی تعبیر ہے۔

(۴) اس جہدِ مسلسل میں ایک مرحلہ وہ بھی آجاتا ہے جہاں ان مخالف قوتوں کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں اترنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسے قتال (یعنی جنگ) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قتال، جہاد کی آخری منزل ہے لیکن ہر مقام پر جہاد کے معنی قتال نہیں۔ یعنی بعض مقامات پر جہاد اور قتال مرادف معانی کے لئے آئیں گے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مقام پر جہاد سے مراد قتال ہو۔

قتال کے مقاصد اور ہدایات

(۵) چونکہ اسلام نام ہی جہاد (اور اس کی آخری منزل) قتال کا ہے — یعنی قرآنِ کریم کے مقرر کردہ مقاصد کے حصول کے لئے جہدِ مسلسل، اور عندالضرورت، جان تک دیدینے کا — اس لئے سارا قرآن، ان سے متعلق ہدایات و تصریحات سے بھرا پڑا ہے۔ بنا بریں، ان تمام مقامات کا ایک جگہ احصار مشکل ہے۔ یہاں ہم قرآنِ کریم کی رُو سے جنگ کے مقاصد، شرائط اور اصولی ہدایات پر اکتفا کرتے ہوئے ان آیات کی طرف آجائیں گے جو سورۃ بقرہ کے متعلقہ حصہ میں آئی ہیں۔

اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان آیات میں جہاں مشرکین، کفار، منافقین، اہلِ کتاب کا ذکر ہے، اس سے اوّلاً مراد زمانہ نزولِ قرآن کے مخالفین ہیں جن کے ساتھ صدرِ اول کے مسلمانوں کو جنگ کرنی پڑی تھی۔ ہر زمانہ کے غیر مسلم مراد نہیں۔ ان آیات سے البتہ وہ اصول مستنبط کئے جائیں گے جن کے مطابق، ہمارے زمانے (اور ہر زمانے) کے، نظامِ خداوندی کے مخالفین کے خلاف، عندالضرورت جنگ کرنی پڑے گی۔ سورۃ بقرہ میں ہے :-

۲/۱۹۰ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ - (۲/۱۹۰)

جنگ کے سلسلہ میں اس، سب سے پہلے اصول کو یاد رکھو کہ تم انہی سے جنگ کرو جو تمہارے خلاف جنگ پر اتر آئیں اور اس طرح تمہارے لئے لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے (۲۲/۳۹)۔ یہ جنگ "خدا کی راہ" میں ہوگی۔ یعنی نظامِ خداوندی کے تحفّظ کی خاطر۔ اس میں بھی قانون کی حدود سے آگے نہیں بڑھا جائے گا۔ (اور اس قانون کی وضاحت قرآنِ کریم میں دیگر مقامات پر کر دی گئی ہے)۔ قانون سے تجاوز کرنا، خدا کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ بات ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

۲/۱۹۱ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۔ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ (۲/۱۹۱)

جب تم ان حالات میں جنگ کے لئے مجبور کر دیئے جاؤ تو پھر پوری قوت کے ساتھ جنگ کرو اور دشمن کو جہاں پاؤ، اس کا مقابلہ کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے، تم بھی انہیں وہاں سے نکال دو۔ جنگ فی ذاتہٖ کوئی قابلِ ستائش چیز نہیں لیکن ظلم اور فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہیوں اور خرابیوں کا موجب ہے، اس لئے ظلم اور فساد کی روک تھام کے لئے جنگ جیسے حربہ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جنگ میں اس بات کا خیال رکھو کہ ہم نے کعبہ کو امن کا مقام قرار دیا ہے (۲/۱۲۵) اس لئے تم دشمن کے ساتھ کعبہ کے قرب وجوار میں جنگ نہ کرو۔ لیکن اگر دشمن وہاں بھی جنگ سے باز نہ آئے تو پھر تم بھی ان سے جنگ کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ اس قسم کے بین الاقوامی معاہدات کا احترام نہ کریں تو ان کا علاج اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے حملے کا جواب دیا جائے۔

لیکن :۔

۲/۱۹۲ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۲/۱۹۲)

اگر وہ وہاں جنگ سے رُک جائیں تو تم بھی رُک جاؤ۔ (دونوں کی ٹریننگ سے مقصود ہی یہ تھا کہ تم میں ایسا ڈسپلن پیدا ہو جائے کہ جہاں بڑھنے کا حکم دیا جائے، بڑھ جاؤ۔ جہاں رُکنے کا حکم دیا جائے، رُک جاؤ۔ خواہ آگے بڑھنے میں کتنا ہی فائدہ کیوں نہ دکھائی دے۔ اگر تم اس طرح قوانینِ خداوندی کی متابعت کرتے گئے تو) وہ تمہاری حفاظت کے اسباب بھی پیدا کر دیگا اور سامانِ نشو ونما بھی بے حد وشمار بہم پہنچائے گا۔

اس کے بعد ہے :۔

۲/۱۹۳ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔۔۔۔ (۲/۱۹۳)

ان حدود وشرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے تم ان کے خلاف جنگ کرو۔ تا آنکہ جو فتنہ انہوں نے ابھار رکھا ہے وہ فرو ہو جائے اور ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ دین کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر واکراہ نہ ہو (۲/۲۵۶؛ ۲۲/۴۰)۔ جو چاہے اسے خالصۃً للہ اختیار کر سکے۔

ہم نے اس آیت کا صرف اتنا حصہ دانستہ درج کیا اور بقایا کو ملتوی رکھا ہے۔ اس لئے کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس کے غلط مفہوم نے اسلام کے متعلق بڑی سنگین قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

ان سے جنگ کرو۔ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ۔ اس آیت کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرتے رہیں۔ تا آنکہ وہ اسلام قبول کر لیں اور اس طرح خدا کا دین ساری دنیا میں پھیل جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مسلمان جہاں جاتے تھے، غیر مسلموں سے کہتے تھے کہ "اسلام یا تلوار"۔ اگر وہ چپکے سے اسلام قبول کر لیتے تو فبہا، ورنہ ان سے بزورِ شمشیر اسلام منوایا جاتا۔ اس غلط (اور یکسر خلافِ اسلام) نظریہ کے عام کئے جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے۔ قتل و غارت گری، بربادی اور تباہی، ہلاکت و خون ریزی، جور و ستم۔ ظلم و استبداد کے خونین مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ بے پناہ کی طرح بڑھتے چلے آرہے ہیں، جن کے جلو میں، سبعیت و بربریت کے مجسمے، ہولناک جنات و عفاریت کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ امنڈے چلے آرہے ہیں۔ اور اس قہرِ خداوندی، اس سیلابِ بلا کے سامنے تہذیب و تمدن۔ علم و عمرانیت۔ عدل و انصاف۔ عفت و عصمت۔ مذاہب و مسالک کے پھولوں اور پھلوں کے درخت ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کی ہزارہا سال کی محنت و کاوش نے جو متاعِ علم و دانش جمع کی تھی، وہ سب راکھ کا ڈھیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا۔ بیواؤں کا نالہ و فغاں آسمان تک جاتا اور ناکام نامراد واپس آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ سب قتل و غارت گری تو اسی خدا کا بول بالا کرنے کے لئے کی جاتی تھی۔ جہاں جہاں سے یہ قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں، ان کی للکار ایک ہی ہے — یعنی اسلام یا تلوار — اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں اور کسی جگہ زنار کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امان ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے کوئی گوشہ عافیت۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے مامون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے۔ جو باقی بچے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے، وحشی سرداروں کے کوڑے کھاتے، نخاس (منڈیوں) کی طرف گھسٹتے چلے جاتے ہیں کہ وہاں احترامِ انسانیت کو دو ٹکوں کے عوض نیلام کر دیا جائے اور یہ عفت مآب خواتین لونڈیاں بن کر ان کی ہوسِ جنس پرستی کی تسکین کا سامان مہیا کریں۔

یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کا نام آتے ہی آنکھوں کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ حقارت و نفرت کے بخارات، قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں، اور اس ننگِ انسانیت

بہیمانہ مذہب کو دنیا سے مٹانے کی مختلف تدابیر کو ذہن کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یہ ساری بھیانک تصویر، پیدا کردہ ہے قرآنِ کریم کی اس آیت کی غلط تفسیر و تعبیر کی کہ تم کافروں کے ساتھ جنگ کرو تا آنکہ اسلام ساری دنیا میں پھیل جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تصویر کو بھیانک سے بھیانک تر بنانے اور اس کو دنیا میں عام کرنے میں، یورپ کے متعصب مورخین، مفکرین اور اربابِ کلیسا کے پراپیگنڈے کا بڑا دخل ہے لیکن اس کا رنگ و روغن تو خود ہمارے ہاں کی تفاسیر اور تاریخ کا مہیا کردہ ہے اور اس کی بنیاد ہے اس (اور اسی قسم کی دیگر) آیات کی غلط تفسیروں، اور ہماری افسانوی تاریخ پر جو اسلام کا نقاب اوڑھے معاندینِ اسلام کی وضع کردہ ہے۔ اس سلسلہ میں، ہم متقدمین کی تفاسیر و کتبِ تاریخ سے بکثرت مثالیں پیش کر سکتے تھے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ زیادہ مناسب اور مفید ہوگا کہ اس ضمن میں عصرِ حاضر کے ایک ایسے مفسر کی "تحقیقات" پیش کر دی جائیں جو ماڈرن کہلانے اور بڑے روشن خیال سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری مراد، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے ہے جن کے قلم کا شہرہ عام ہے۔ وہ پہلے سورۃ انفال کی حسبِ ذیل آیت مع ترجمہ نقل کرتے ہیں:۔

مودودی صاحب کی تفسیر

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۔ (۸/۳۹)

اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> اس آیت میں دینِ اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک کہ فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے نہ مٹ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے۔ اور پورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص نہ ہو جائے۔
>
> (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ پہلا ایڈیشن ص ۹۶-۹۵)

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک "پورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص" صرف اسلام کی رُو سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے مودودی صاحب کی اس تشریح کا مطلب واضح ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ساری دنیا (تمام غیر مسلموں) سے لڑتے جائیں تا آنکہ اسلام کا غلبہ ہو جائے۔

انہوں نے اپنی کتاب تفہیمات (حصہ اول) میں "جہاد فی سبیل اللہ" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ اس میں وہ پہلے اصولاً لکھتے ہیں:۔

اس بحث سے یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلامی جہاد کا مقصود، غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ (محرم ۱۳۵۹ھ ایڈیشن ص ۷۹)

پھر اس اجمال کی تفصیل میں لکھتے ہیں :-

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوتی تھی، سب سے پہلے اس کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرت ؐ کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور پھر حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔ (ص ۸۱-۸۲) - (نیز رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ پہلا ایڈیشن۔ ص ۱۹۰)

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ کی جنگوں کی غرض و غایت کیا تھی میں نے ان کے متعلق اپنی کتاب "معراجِ انسانیت" (یعنی سیرتِ حضور نبی اکرم ؐ) اور "شاہکارِ رسالت" ۔ عمر فاروق ؓ میں شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ خود ہمارے مفسرین اور مؤرخین، اسلام کا کس قسم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق، حضور نبی اکرم ؐ کو جونہی قوت حاصل ہوئی، آپ نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ آپ کی طرف سے بھیجی ہوئی دعوتِ اسلام قبول کی جاتی ہے یا نہیں) رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا اور حضورؐ کے بعد، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ نے گردوپیش کی غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ ان جنگوں میں گرفتار شدہ قیدی عورتوں کو کس طرح لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا کہ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا قیدِ تعداد "اپنے استعمال میں لائیں" اور جب جی چاہے انہیں فروخت کر دیں، اس کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات مطالب الفرقان، جلد دوم ص ۲۵۸-۵۹۔ زیرِ آیت (۲۵/۴) پیش کی جا چکی ہیں۔

مودودی صاحب نے، اپنی کتاب "خطبات" میں بھی جہاد کے موضوع پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ اسلام پہلے اپنی ایک پارٹی تیار کرتا ہے۔

اور جب وہ اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا، آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی

کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات ۔ ۱۳۵۹ھ ۔ ایڈیشن ص ۲۳۵)

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ "کیا اسلام بزورِ شمشیر پھیلا؟" مودودی صاحب نے اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں (جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا ان کی جماعت کی طرف سے بڑا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے) لکھتے ہیں۔

رسول اللہؐ تیرہ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہو سکتا تھا، اسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے۔ واضح حجتیں پیش کیں۔ فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھلائے۔ اپنے اخلاق اور پاکیزہ زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق ان کے سامنے خود ظاہر ہو چکا تھا۔ انہوں نے برای العین دیکھ لیا تھا کہ جس راہ کی طرف ان کا ہادی انہیں بلا رہا ہے وہ سیدھی راہ ہے۔ اس کے باوجود صرف یہ چیز انہیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کا چھوڑنا انہیں گوارا نہ تھا جو کافرانہ بے قیدی کی زندگی میں انہیں حاصل تھیں۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیِ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی اور آلا۔ کل ماثرۃ او دم او مال یدعیٰ فھو تحت قدمی ھاتین۔ کا اعلان کر کے تمام موروثی امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔ عزت و افتخار کے تمام رسمی بتوں کو توڑ دیا۔ ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی۔ اخلاقی قوانین کو بزور نافذ کر کے اس بدکاری اور گناہگاری کی آزادی کو سلب کر لیا جس کی لذتیں ان کو مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور وہ پرامن فضا پیدا کر دی جو اخلاقی فضائل اور انسانی محاسن کے نشوونما کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتی ہے، تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی اور شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دور ہو گئیں اور یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردے ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت باقی نہ رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت کے ساتھ قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہو گئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے ..... پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے۔ (الجہاد فی الاسلام ۔ ۱۹۲۷ء ۔ ایڈیشن ص ۱۳۔۱۷۵)

اس اقتباس کے آخر میں کہا گیا ہے کہ "اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے۔" ظاہر ہے کہ اس میں "تبلیغ" کا لفظ محض برائے وزنِ بیت شامل کر دیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے، مودودی صاحب لکھ چکے ہیں کہ تبلیغ اسلام کے لئے حضور نبی اکرمؐ تیرہ سال تک مسلسل کوششیں فرماتے رہے (یعنی اپنی عمرِ نبوت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ اس میں صرف کر دیا)۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مؤثر سے مؤثر طریق استعمال کر دیکھے۔ حتیٰ کہ خدائے معجزات تک دکھلا دیئے لیکن وعظ و تلقین کی یہ تمام کوششیں (معاذ اللہ) ناکام رہ گئیں۔ اس کے بعد آپ تلوار لے کر اٹھے تو چند دنوں میں اسلام سارے ملک میں پھیل گیا۔

یہ ہے اسلام کا وہ نقشہ جو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

(۰)

یہ تو رہا غیر مسلموں کو مسلمان کرنے کا سوال۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی مسلمان، اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہئے تو کیا اُسے اس کی اجازت ہوگی؟ مودودی صاحب کا اس باب میں ارشاد یہ ہے کہ اسے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ وہ مرتد کہلائے گا اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ یعنی ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "مرتد کی سزا ــــ اسلامی قانون میں"۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

مرتد کی سزا قتل

> یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقفِ کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ (اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن ص ۷)

وہ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں، تاریخ سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ (مثلاً) وہ لکھتے ہیں :۔

> حضرت علیؓ کو اطلاع دی گئی کہ ایک گروہ عیسائی سے مسلمان ہوا پھر عیسائی ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے سامنے بلوایا اور حقیقتِ حال دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم عیسائی تھے۔ پھر ہمیں اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں۔ ہم نے اسلام اختیار کر لیا۔ مگر اب ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے سابق دین سے افضل کوئی دین نہیں۔ لہٰذا اب ہم عیسائی ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیئے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنا لئے گئے۔ (ص ۲۱-۲۰)

ایک اور مثال!

> حضرت علیؓ رحبہ کے مقام پر بیٹھے کہ آپ کو ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ یہاں ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں

ایک بت رکھ چھوڑا ہے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بت نکل آیا۔ حضرت علیؓ نے اس گھر میں آگ لگا دی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا۔ (ص ۳۲)

یہ ہے خدا کے ارشاد' لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں) پر زبان سے ایمان رکھنے والوں کا "عملی اسلام"! ظاہر ہے کہ یہ تمام روایات اور واقعات جنہیں مودودی صاحب اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کر رہے ہیں، وضعی ہیں۔ لیکن ان کا ارشاد ہے کہ:-

اس باب میں پہلا شک جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی کے دورِ آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا[1] (ص...)

واضح رہے کہ ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے مرتد وہی نہیں جو اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ ان کے فیصلہ کی رُو سے جس شخص کے متعلق یہ حضرات فتویٰ دے دیں کہ اس کے عقائد "اسلام" کے مطابق نہیں (یعنی ان کے تصور کے اسلام کے مطابق نہیں) اسے بھی مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتے گا۔ اس تکفیر سازی اور ارتداد بازی نے بے گناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق کی کس طرح ندیاں بہا دیں، اس کے تذکرہ سے ہماری تاریخ کے صفحات لالہ زار ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عقیدہ" خلق قرآن" کو لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس عقیدہ کے حامیوں اور مخالفوں کا کس قدر خون بے محابا بہایا گیا حالانکہ دونوں مسلمان تھے اور ان میں بعض بڑی بڑی ممتاز ہستیاں بھی تھیں۔

بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل ہے) جو اسلام کے قرآنی تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے، ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے۔ بادشاہ اپنے جس مخالف کو ختم کرنا چاہتا، بجائے اس کے کہ اسے اپنے حکم سے قتل کر کے کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاتا، وہ "علماء حضرات" کو اشارہ کر دیتا کہ اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیں۔ اس فتویٰ کی رُو سے وہ مرتد قرار پا جاتا اور پھر "شریعت حقہ" کی رُو سے اسے قتل کر کے حکومت محافظِ دینِ متین قرار پا جاتی۔ بادشاہوں سے نیچے اتر کر، خود علماء حضرات بھی باہمی آتشِ حسد و رقابت کو فرو کرنے کے لئے یہی "مقدس حربہ" استعمال کرتے۔

آپ کہیں گے کہ یہ ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کی باتیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ عہدِ کہن کی داستانیں بن چکی ہیں۔ اب انہیں کوئی نہیں مانتا لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ یہ تاریک دور کی باتیں نہیں، آپ کے اس روشن ترین دور میں بھی اسی شریعت کے احیاء کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنے مذکورہ صدر کتابچہ (مرتد کی سزا — اسلامی قانون میں) کے آخر میں، موجودہ مسلمانوں کے متعلق بھی بحث کی ہے جنہیں وہ پیدائشی مسلمان کہہ کر پکارتے

---

[1] سرسید کی تحریک کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اس خلافِ اسلام نظریہ کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :-

اس سلسلے میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو "قتلِ مرتد" کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا، پھر اس نے باختیارِ خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا، اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی۔ کیوں نہ وہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی منافقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔ (ص ۷۲)

یہ تو رہا مسئلہ، اب اس مسئلہ (PROBLEM) کا حل ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں :-

پس جہاں تک نفسِ مسئلہ کا تعلق ہے، وہ بہر حال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانونِ اسلام کی طرف سے ان کے لئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہو گا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آ کر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرینِ علمِ شریعت کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں[1]۔ البتہ اس معاملے کا ایک پہلو ایسا ہے جس میں مجھے کچھ پیچیدگی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مدتِ دراز سے ہمارا اجتماعی نظام نہایت ڈھیلا اور سست رہا۔ ہمارے ہاں کئی نسلیں ایسی گزر چکی ہیں کہ ہر نسل نے بعد کی نسل کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ خصوصاً پچھلے دورِ غلامی میں تو ہماری قومی بے شعوری اس حد کو پہنچ گئی کہ ہمارے لاکھوں افراد نے بے پرواہی کے ساتھ، اور ہزاروں نے جان بوجھ کر اپنی اولاد کو کافرانہ تعلیم و تربیت کے حوالے کر دیا[2]۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں اسلام سے بغاوت و انحراف کے میلانات رکھنے والوں کا تناسب خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اگر آگے چل کر

---

[1] فقہا اور ماہرینِ علمِ شریعت کو بطور سند پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کو نہیں۔

[2] خود مودودی صاحب نے بھی اپنی اولاد کو یہی تعلیم دلوائی ہے۔

کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہوا اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے اُن سب کو بزورِ اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا۔ جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں، تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے واللہ الموفق للصواب، کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ "جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں"۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے، فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا' اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں، انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔　　　(صفحہ ۷۴-۷۶)

"جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا" سے مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں گے کہ اس کے عقائد اسلام کے مطابق نہیں رہے، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔[1]

—— (۰) ——

بات یہاں سے چلی تھی کہ قرآنِ کریم نے کن حالات میں، اور کن مقاصد کے لئے جنگ کرنے کی اجازت یا حکم دیا ہے۔ اس طویل تمہیدی سفر کے بعد آپ متعلقہ آیات کی طرف آیئے۔ یعنی آیات $\frac{۲}{۱۹۰-۱۹۳}$ کی طرف۔ ان میں دو تین بنیادی نکات سامنے آتے ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ یعنی

(۱) قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ـ (۲/۱۹۰)

---

[1] اس مسئلہ پر، ادارہ، طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ "قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۲) اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ - (۲/۱۹۱)

(۳) وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ - (۲/۱۹۳)

۲/۱۹۳ سورۂ انفال میں ہے۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸/۳۹)

"فی سبیل اللہ" قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور بیشمار مقامات میں آتی ہے جن کا یہاں استقصا ضروری نہیں مختصر

فی سبیل اللہ کا مفہوم

الفاظ میں اس کے معنی ہیں "خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی خاطر" یا "نظامِ خداوندی کے قیام اور استحکام کی خاطر"۔ "ان مقاصد کے حصول کی خاطر جو جماعتِ مومنین کے لئے خدا کی طرف سے متعین کئے گئے ہیں"۔ آپ نے دیکھا کہ ان مفاہیم میں الفاظ اگرچہ کچھ مختلف ہیں لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ اس کے برعکس "طاغوت" کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں حد سے تجاوز کر جانے والا۔ سرکشی اختیار کرنے والا۔ "طغیانی" اسی سے ہے۔ اصطلاحی طور پر اس سے مراد ہر وہ نظریہ، نظام یا قوت ہے جو حدود و قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتے۔ قرآن کریم نے جنگ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ .... (۴/۷۶)۔ "مومن" فی سبیل اللہ" جنگ کرتے ہیں، اور کفار "فی سبیل الطاغوت"۔ یہاں سے ہر دو جماعتوں کے جنگ کے مقاصد کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ ان دونوں میں کشمکش شروع سے چلی آرہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کشمکش کیا ہے اور کیوں ہے؟

طاغوت سے مراد

اللہ پر ایمان لانے والے اپنے ہاں ایسا معاشرہ (یا نظام) قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ آزادانہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ غیر مسلموں (کفار) کے مسلک و مشرب سے کوئی تعرض نہیں کرتے صرف اپنے ہاں اپنے مسلک کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن طاغوتی قوتیں ان کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ وہ انہیں اس کی اجازت نہیں دیتیں اور وہ یہ کام نہ چلنے، تو قوت کے بل بوتے پر ان کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ نے جب مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قریش اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص دھاندلی ہے۔ جب میں تمہارے منہاج و مسلک میں دخل نہیں دیتا تو تم میرے راستے میں کیوں کھڑے ہوتے ہو۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ - (۶/۱۳۶)۔ "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور دنیا دیکھ لے گی کہ ظلم اور دھاندلی پر مبنی نظام کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن یہ جو آخر میں کہا گیا تھا کہ "نتائج خود

بتادیں گے کہ کون سا نظام کیسا ہے۔" یہی خدشہ تو انہیں کھائے جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر رسول اللہ کا پروگرام کامیاب ہو گیا تو اس کے درخشندہ، انسانیت ساز نتائج دیکھ کر، ساری دنیا لپک کر ان کے نظام کی طرف آجائے گی۔ یہ وجہ تھی جو وہ اس کے راستے میں آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو رہے تھے۔ حضورؐ ان سے کہتے کہ اس باب میں دھونس اور دھاندلی کا سوال ہی نہیں۔ میں بھی عقل و بصیرت، دلائل و براہین کی رُو سے بات کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح دلائل و بصیرت کی رُو سے بات کرو۔ (REASONABLE) بنو۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (۲/۱۱۱)۔ لیکن وہ جواب میں کہتے کہ کہاں کی دلیل اور کیسی برہان۔ یہاں فیصلہ قوت سے ہوگا اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ قوت کس کے پاس زیادہ ہے۔ اس کے جواب میں ان سے فقط اتنا کہا جاتا کہ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ عقل و بصیرت کے بجائے، دھونس اور دھاندلی (قوت) کے زور سے بات منوانے والوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔ وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۔ (۳۵/۴۴) وہ قومیں قوت اور زور میں ان سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ لیکن وہ قوت کے نشے میں بدمست تھے۔ انہوں نے کوئی معقول بات نہ سنی اور ان لوگوں کا بدستور راستہ روکتے رہے جو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق، قوانینِ خداوندی کے تابع نہج زندگی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ قرآن کریم میں دیکھئے۔ اس نے ان کے خلاف یہ فردِ جرم عاید نہیں کی کہ انہوں نے اس نئی دعوت (دینِ خداوندی) کو قبول کیوں نہیں کیا۔ جرم یہ عاید کیا ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کی مزاحمت کرتے تھے۔ انہیں اپنے لئے آزادانہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسے قرآنِ کریم نے "يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا۔ لوگوں کو اُدھر جانے سے روکنا۔

ان کی (اور دنیا میں ہر دھاندلی کرنے والے کی) اس ذہنیت اور روش کو قرآنِ کریم نے "فتنہ" کہہ کر پکارا ہے۔

فتنہ کے معنی

اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں، آگ میں تپانا۔ اذیت پہنچانا۔ لیکن استعمال کے لحاظ سے یہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کسی پر زبردستی کی جائے۔ جب کوئی دوسرے کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ اسے اس کے راستے سے ہٹا دے خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ..... (۵/۴۹)۔ "اس بات سے محتاط رہنا کہ یہ لوگ کہیں تمہیں وحی کے بتلائے ہوئے راستے سے نہ ہٹا دیں۔" دوسری جگہ ہے۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ..... (۱۷/۷۳)۔ "انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ یہ تمہیں وحی کے راستے سے ہٹا دیں۔" ایک اور مقام پر ان مخالفین سے کہا گیا کہ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۔ (۳۷/۱۶۲)۔ "تم کسی کو خدا کی طرف سے بہکا، ہٹا کر نہیں لے جا سکتے۔"

ان آیات میں دیکھئے، فتنہ کا لفظ، کسی کو خدا کی راہ سے بہکا... ہٹا کرلے جانے کے لئے بولا گیا ہے۔ یہی "صَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ" ہے۔ خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا ہے۔

قریش نے اپنی مزاحمت جاری رکھی تا آنکہ نبی اکرمؐ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں منتقل ہو جانے کے بعد، قریش سے کسی قسم کا تعلق واسطہ نہ رہا، اس لئے انہیں اپنی مزاحمت ختم کر دینی چاہیئے تھی لیکن وہ اس میں اور بھی زیادہ متشدد ہو گئے۔ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سورۂ انفال میں ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۸/۳۶)۔ "یہ مخالفین خدا کا راستہ روکنے کے لئے مال و دولت خرچ کر رہے ہیں"۔ اور جب ان کی یہ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو انہوں نے ۲ھ میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو پہلی بار جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۔ نِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ (۲۲/۳۹-۴۰)

ان لوگوں کو جن پر مسلسل مظالم کئے گئے جنہیں ان کے گھر بار سے نکال دیا گیا۔ اور جو وہاں سے نکل کر، اتنی دور، آکر بسے، تو ان کے خلاف لشکر جرار لے کر، حملہ کرنے کو آگئے۔ انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کریں۔ ان لوگوں کا، جن کے خلاف دشمن یہ کچھ کر رہے ہیں، بالآخر جرم کیا تھا؟ — جرم بس یہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور یہ مخالفین کہتے تھے کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ تم اللہ کو اپنا رب تسلیم کر لو۔

دوسری جگہ ہے۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۔ (۸۵/۸)۔ "یہ ان سے بس اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ یہ خدا پر ایمان کیوں لے آتے ہیں"۔ اسے قرآن نے کبھی "فتنہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (۸۵/۱۰) اور "صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔ یعنی خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا۔ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۸/۴۷) یہ لوگ اس طمطراق سے حملہ کرنے کے لئے گھروں سے نکلے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو! ہم نے کس مقصد کے لئے یہ لشکر کشی کی ہے۔ "يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے لئے۔ خدا کا راستہ روکنے کے لئے۔ اس مقام پر اِن بے گھر، بے در قلیل التعداد مہاجرین کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ :-

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ .... (۸/۳۹)

ہاں! اب تم ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ ان سے جنگ کرو حتیٰ کہ وہ فتنہ مٹ جائے جس کے لئے یہ ان اقدامات تک اتر آتے ہیں۔ یعنی دین کے معاملہ میں کوئی کسی پر کسی قسم کی زبردستی نہ کر سکے۔ دین کا معاملہ خالصتہً اللہ کیلئے ہوجائے جس کا جی چاہے، برضا و رغبت 'لوجہ اللہ' دین اختیار کرے۔

دوسری جگہ اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ۔ اے رسولؐ! یہ، تمہارے رفقا، تم سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں جواب جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو یہ بھی بتا دیجئے کہ جن مہینوں میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے، اس کی بابت ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ ان مہینوں میں جنگ کرنا سنگین جرم ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۔ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکنا۔ اس کے نظام کے خلاف سرکشی برتنا مسجد حرام تک میں جنگ سے باز نہ رہنا اور لوگوں کو اس امن سے بھی نکال باہر کرنا۔ یہ جرائم بہت زیادہ سنگین ہیں۔ یہ تو کھلی ہوئی دھاندلی ہے۔ یہ فتنہ ہے۔ اور فتنہ، جنگ سے بھی زیادہ تباہی اور فساد کا موجب ہوتا ہے اس لئے فتنہ کو مٹانے کے لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے — تم حیران ہو گے کہ جب تم ان کا کچھ بگاڑتے نہیں۔ ان کی کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ ان کے مسلک و منہاج میں دخل تک نہیں دیتے۔ ان کا ملک چھوڑ کر، وہاں سے دور، اس دیس میں آ بسے ہو۔ تو پھر یہ تمہاری جان کے لاگو کیوں ہو رہے ہیں؟ یہ اس لئے کہ یہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ تم یہ نیا دین اختیار کرلو۔ اس لئے یاد رکھو: لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا۔ (۲/۲۱۷)۔ جب تک ان میں قوت و استطاعت رہے گی، یہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے تا آنکہ تمہیں اس دین سے ہٹا کر، پھر اپنے مسلک کی طرف نہ لوٹا لیں۔

مذہبی آزادی کی خاطر جنگ

اور اس کے بعد، اس سلسلہ میں وہ بلند و بالا اور غیر متبدل اصول بیان کیا جسے، ہمارے خیال میں، دنیا کی ہر مملکت کے ایوان حکومت کی پیشانی پر سنہری حروف میں کندہ کرا دینا چاہیئے۔ فرمایا کہ اگر دھاندلی کے مسلک کو بلا روک ٹوک رواں دواں چلنے دیا جائے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جائے۔

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ (۲۲/۴۰)۔

اگر اس قسم کا انتظام نہ کیا جائے کہ بدلگام اور سرکش لوگوں کی مدافعت کے لئے امن پسند لوگ اٹھیں، تو کسی قوم کی عبادت گاہ تک دنیا میں محفوظ نہ رہے۔ زاویہ نشین راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے ہیکل، مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، سب ڈھا دی جائیں۔ ان پرستش گاہوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ سرکش قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی جماعت موجود رہے۔

معابد (پرستش گاہیں) علامات ہوتی ہیں متعلقہ مذاہب کی۔ لہٰذا، معابد کی حفاظت سے مراد خود ان مذاہب کی حفاظت ہے غور کیجئے۔ اسلام، ان تمام مذاہب و مسالک کو باطل قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود کہتا یہ ہے کہ اگر کوئی قوت کسی مذہب کو زبردستی مٹانا چاہے تو امتِ مسلمہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس مستبد قوت کا مقابلہ کرکے اس مذہب کی مدافعت اور محافظت کرے۔ سوچئے کہ کیا ایسا دین جو دوسروں کے مذہب کی حفاظت کے لئے اپنے پیروؤں کو سینہ سپر میدانِ جنگ میں نکل آنے کا حکم دے، اس کی تلقین کریگا (یا اسے روا رکھے گا) کہ غیر مسلموں کو بزورِ شمشیر مسلمان بنایا جائے۔؟ آیاتِ بالا کے تسلسل میں اس نے کہا ہے کہ جو قوم، ان مذاہب کی مدافعت کے لئے اٹھے گی، اللہ کی نصرت اسکے شاملِ حال ہوگی۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔ جو لوگ اس مقصد کے لئے سینہ سپر، میدانِ جنگ میں نکلیں گے، یوں کہیئے کہ وہ خدا کی مدد کرنے کے لئے اٹھیں گے۔ اور جب وہ خدا کی مدد کرنے کے لئے باہر نکلیں گے تو خدا پر بھی لازم ہوگا کہ وہ ان کی مدد کرے۔ اللہ ان کی مدد ضرور کریگا۔ وہ بہ نصرتِ خداوندی، ان سرکش قوتوں کو مغلوب کریں اور اس طرح اس قانونِ خداوندی کو دنیا میں ثبت کردیں کہ۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ۔ (۲/۲۵۶) دین کے

دین میں کوئی اکراہ نہیں

معاملے میں کوئی کسی پر جبر نہیں کرسکتا۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح راستہ نکھر اور اُبھر کر لوگوں کے سامنے آچکا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ..... (۱۸/۲۹)۔ جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲/۲۵۶)۔ جس نے طاغوت کی راہ اختیار کرنے سے انکار کردیا اور اللہ کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرلیا، تو اس نے ایک ایسا سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے کا نہیں۔

حضور نبی اکرمؐ کا قلبِ دردآگیں اس احساس سے مضطرب و بیقرار رہتا تھا کہ یہ لوگ اپنی غلط روش پر اڑے رہ کر تباہی کیوں مول لے رہے ہیں۔ یہ اسلام کیوں نہیں قبول کرلیتے۔ اس پر ارشادِ باریتعالیٰ ہوا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰/۹۹) کیا تو انہیں جبراً مومن بنانا چاہتا ہے؟ اگر انسانوں کو جبراً مومن بنانا

مقصود مشیت ہوتا تو خدا انہیں پیدا ہی اس طرح کرتا کہ یہ سب مومن ہوتے۔ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ۔ (۱۰/۹۹)۔ تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے حیوانات کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ایک نوع کے حیوان، ایک ہی روش پر چلنے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو انسانوں کو بھی ایسا ہی پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اسے، اُس نے دونوں راستے دکھا دیتے ہیں اور پھر اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ (۷۶/۳) "ہم نے اسے صحیح راستہ دکھا دیا ہے۔ اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کرلے۔ جی چاہے اُس سے منہ موڑ لے"۔ وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ۔ (۹۰/۱۰)۔ ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیتے ہیں جو بڑے واضح ہیں اور اس کا اختیار دیا ہے کہ یہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ مذہب کے معاملہ میں جور و اکراہ، زبردستی سے کام لینے کے معنی ہیں، انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کرلینا۔ یہ تو خدا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ یعنی خدا اسے اختیار و ارادہ کا مالک بناتا ہے اور تم اس کا اختیار و ارادہ سلب کر لینا چاہتے ہو۔ یہ بدترین قسم کا استبداد ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اس نے فرعون کو استبداد اور فتنہ و فساد کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا ہے کہ وہ خود اپنی قوم کو بھی مذہبی آزادی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ جب اس کے دربار کے ساحرین (مذہبی پیشواؤں) نے حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، ربِ موسیٰؑ پر ایمان لانے کا اعلان کیا تو وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کہا کہ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۲۰/۷۱) ہیں! تم نے میری اجازت کے بغیر اس کا دین قبول کر لیا ہے؟ تم دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میں تمہارے الٹے

دربارِ فرعون کے ساحرین

ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا۔ تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہیں اس سے بھی زیادہ شدید عذاب دوں گا۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ جہاں ایک طرف ایمان کی حقیقت کو سورج کی طرح روشن کر دیتا ہے۔ دوسری طرف اس جرأت و بسالت کی بھی زندہ شہادت بن جاتا ہے جو قلبِ مومن میں ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ ...... ایک طرف تمہارا یہ دبدبہ و طنطنہ ہے جو سراسر استبداد اور دھاندلی پر مبنی ہے۔ دوسری طرف وہ صداقت ہے جو دلائل و براہین کی روشنی میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ ہم تمہاری دھاندلی کو اس بصیرت افروز حقیقت پر کیسے ترجیح دے دیں؟ تمہاری عقوبت کے ڈر سے ایسا کرنا انتہائی بزدلی ہوگا۔ فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ۔ تو جو کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ (۲۰/۷۲)۔ تیرا دائرۂ اختیار ہے ہی کتنا؟ وہ صرف اس دنیا کی زندگانی تک محدود ہے، اور زندگی کے میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ ان تک تیری دسترس ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے مذہبی آزادی کے بارے میں قرآنِ کریم کا مؤقف اور اس کی تعلیم۔ اس کی رُو سے ایمان نام ہے دل و دماغ کی کامل رضامندی اور اطمینان سے صداقت قبول کر لینے کا۔ جو شخص اسلام کی پیش کردہ صداقت کو اس طرح قبول کر لے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کسی وقت، کسی وجہ سے، اس کا یہ اطمینان باقی نہیں رہتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ایمان ہی باقی نہیں رہا۔ جس کا ایمان باقی نہ رہے، اس کے دائرۂ اسلام کے اندر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، وہ بلاخوف و خطر اسلام کو چھوڑ سکتا ہے۔ اگر اس کے بعد وہ اسلامی مملکت میں رہنا چاہتا ہے تو دوسرے غیر مسلموں (ذمیوں) کی طرح وہیں رہے۔ اگر کسی اور جگہ چلا جانا چاہتا ہے تو بخوشی چلا جائے۔ یہ کہنا کہ غیر مسلم، اسلام کے دروازے میں داخل تو اپنی مرضی سے ہو سکتا ہے لیکن اس سے باہر اپنی مرضی سے نہیں نکل سکتا، اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس کا بنیادی اصول، حق و صداقت کے رد و قبول کے معاملہ میں انسان کو کامل آزادی عطا کرنا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کی رُو سے جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ لوگوں سے بہ جبر اسلام منوایا جائے، یا اس لئے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی کسی پر کسی قسم کا جبر نہ کر سکے، اور جونسا مذہب جس کا جی چاہے، اختیار کرے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اور اس کی تشریح جلد اول ص۴۷ زیر آیت (۲/۴) میں بھی کی جا چکی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان کے معنی ہیں کسی صداقت کو دل و دماغ کے پورے اطمینان اور رضامندی سے صحیح تسلیم کرنا۔ قرآن، اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جس میں کسی قسم کی زبردستی کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ بزورِ شمشیر تو ایک طرف، اگر کسی کی عقل و فکر کو معطل یا مفلوج کر کے، اس سے اسلام کا اقرار لے لیا جائے تو دینِ خداوندی اسے بھی ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ مومن انہیں کہا جاتا ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳) "اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات پیش کی جائیں تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھکتے۔" اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ قرآن کسی کو، اس کی مرضی کے خلاف، زبردستی، اسلام کے دائرے کے اندر باندھ کر رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ "مرتد کی سزا قتل" دینِ خداوندی کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ مذہب کی کامل آزادی منشورِ خداوندی کا اولین اعلامیہ ہے۔

ان تشریحات کے بعد، ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھ لینا آسان ہوگا جن کے سلسلہ میں ان وضاحتوں کو ضروری سمجھا گیا تھا۔ یعنی آیات (۲/۱۹۰-۱۹۳) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن جنگ کے سلسلہ میں ایک پابندی کا ذکر آگے

آیت میں آتا ہے۔ فرمایا:۔

۲/۱۹۴ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (۲/۱۹۴)

یہ پہلے (اسی باب کے شروع میں) بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، سال میں چار مہینے ایسے رکھے گئے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار پاتی ہے۔ انہیں حرمات کے مہینے کہا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جنگ دو فریقوں کے درمیان ہوتی ہے اس لئے اس قسم کی شرائط یا پابندیاں یک طرفہ نہیں ہوسکتیں۔ یہ فریقین میں معاہدہ کی رُو سے طے پاتی ہیں۔

حرمات کے مہینے

اور اس وقت تک قائم رہ سکتی ہیں جب تک فریقین ان پر کاربند رہیں۔ اگر ایک فریق ان کی خلاف ورزی کرے تو فریقِ ثانی ان سے خود بخود آزاد ہوجاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ:۔

حرمات کے مہینوں کی پابندی تو ادلے بدلے کے طریق پر ہی ممکن ہے۔ اگر فریقِ ثانی اس کا احترام نہ کرے اور زیادتی پر اُتر آئے تو تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرو جیسا وہ تمہارے ساتھ کرتا ہے۔ (یعنی اس کا مقابلہ کرو اور حرمت کے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہو) مختصراً یہ کہ ان تمام امور میں تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ان حدود کی نگہداشت کرتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کی کس قدر تاکید کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس قسم کے احکام نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہوں۔

اس کے بعد آگے بڑھیے۔ جنگ کی صورت میں، غیر متوقع اخراجات کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ جنہیں بہرحال اس امت (قوم) ہی کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرمایا:۔

۲/۱۹۵ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۲/۱۹۵)

نظامِ خداوندی کے استحکام کی خاطر اپنی فاضلہ دولت کو بند کر کے نہ رکھو۔ کھلا رکھو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہاری پوری کی پوری قوم تباہ ہوجائے گی اور جب قوم تباہ ہوجائے تو تمہارا مال و دولت کہاں باقی رہے گا؟ اصل یہ ہے کہ

جنگ میں معاشرہ کی اقتصادیات کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس توازن کو قائم رکھنا ازبس ضروری ہے۔
واضح رہے کہ یہ حکم اُس زمانے سے متعلق معلوم ہوتا ہے جب ہنوز قرآن کا معاشی نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد، فاضلہ دولت، انفرادی طور پر، کسی کے پاس نہیں رہی تھی۔ وہ مملکت کی تحویل میں آگئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عام حالات میں جس قدر کوئی فرد اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لئے اپنے پاس رکھے، جنگ کی حالت (EMERGENCY) میں، اس میں بھی کچھ کم کرنا پڑے۔ زیرِ نظر اس قسم کے احکام ایسی صورتوں سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔

(۰)

حج کے احکامات کے ضمن میں دو گروہوں کا ذکر ہمارے سامنے آیا تھا۔ ایک وہ جن کے پیشِ نظر صرف اس دنیا کے مفاد ہوتے ہیں اور دوسرا وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کے مفادات اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو خدا کے ساتھ جان و مال کی فروخت کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قتال سے متعلق آیات کی وضاحت ضروری سمجھی گئی۔ اس طرح جب نظامِ خداوندی کا ایک خاکہ سامنے آگیا تو فرمایا کہ :۔

۲/۲۰۸ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (۲/۲۰۸)

اے جماعتِ مومنین! تم اس نظامِ خداوندی میں، جو امن و سلامتی کا ضامن ہے، اجتماعی طور پر، پورے کے پورے، داخل ہو جاؤ اور چند قدم چل کر رک نہ جاؤ۔ اسے تکمیل تک پہنچاؤ۔ نیز اس میں کسی قسم کی پیوندسازی نہ کرو اور اپنے پست جذبات کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ یہ روش شرفِ انسانیت کی کھلی ہوئی حریف ہے۔

اس آیت میں سِلْم اور کافۃ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ سِلْم تو اسلام ہی ہے لیکن چونکہ یہ لفظ ہمارے سامنے پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے اس کی اور اس کے ساتھ "کافۃ" کی وضاحت ضروری ہے۔

کافۃ، جس کا مادہ (ک۔ف۔ف) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ (۱) کسی معاملہ کی آخری حد تک پہنچ جانا۔ تھوڑا سا چل کر رک نہ جانا۔ اسے تکمیل تک پہنچانا اور (۲) تمام کا تمام۔ جمیع۔ اجتماع۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ

(۱) اسلام ایک کلی نظام کا نام ہے جو پوری کی پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ گزشتہ صفحات میں صبغۃ اللہ کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے [دیکھیے دوسرا باب۔ آیت (۲/۱۳۸)] کہ انسان کو پوری کی پوری سیرت یا شخصیت کا اس

رنگ میں رنگے جانا ضروری ہے۔ ایمان کی بنیاد، انسان کے نفسیاتی تغیر پر ہے، اور نفسیاتی تغیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ فرد

کلی تغیر

میں قلبِ ماہیت ہو جائے۔ وہ خَلْقًا اٰخَرَ (ایک نئی مخلوق) بن جائے (۲۳/۱۴) وہ غالبؔ کے الفاظ میں آدمی سے انسان بن جائے۔ یہ تبدیلی جزئی نہیں ہوتی، کلی ہوتی ہے۔ وہ سیرت اور کردار کے اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ کیریکٹر جزئیات میں نہیں دیکھا جاتا، بہ ہیئت مجموعی (MAN AS A WHOLE) میں نمودار ہوتا ہے۔ اسی کو کافّۃ کہا جائے گا۔

کافّۃ کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام، انفرادی مذہب نہیں، اجتماعی دین، یعنی نظامِ زندگی ہے۔ اس کی وضاحت جلد دوم، ص ۲۱۱-۱۹ زیرِ آیت (۲/۱۴۳) کی جا چکی ہے۔ اس نظام کی رُو سے امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

اور کافّۃ کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اسے قبول اور اختیار کیا جائے گا تو بالکلیہ اور رد کیا جائے گا تو بالکلیہ۔ پیوندسازی سے اسلام باقی ہی نہیں رہتا۔ اسلام میں جب پیوندسازی شروع ہوئی تو رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو گئی کہ اصلی (ORIGINAL) اسلام کا اس میں کوئی ٹکڑا تک نہ رہا۔ سارا اسلام انہی پیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس لئے اگر اب اس (موجودہ) اسلام کو حقیقی اسلام میں تبدیل کرنا ہو گا، تو اس پیوندوں پر مشتمل گدڑی کو یکسر اتار پھینکنا ہو گا۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کو لازمی شرط قرار دیا ہے (۲/۲۵۶) اس میں شبہ نہیں کہ یہ تبدیلی ہو گی تدریجاً۔ لیکن ہو گی بالکلیہ۔ اس سلسلہ میں جلد دوم۔ زیرِ آیت (۲/۸۵) صفحہ ۳۶۰ ملاحظہ فرمائیے۔

اور اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ انسان اپنے جذبات کو حدود اللہ کے ساحلوں کے اندر محصور رکھے۔ ان سے اقدارِ خداوندی کے تابع کام لے۔ اس سے وہ تغیر پیدا ہو گا جو اس میں قلبِ ماہیت پیدا کر دیگا۔

۲/۲۰۹ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲/۲۰۹)

ان واضح دلائل آجانے کے بعد اگر تمہارے پاؤں میں لغزش آگئی، تو تم بھی تباہیوں کے جہنم میں جا گرو گے۔ یاد رکھو! ہمارا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اس کی گرفت بڑی شدید ہے۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔

اس آیت میں دو ایک نکات بڑے اہم ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ خدا کے ہاں "قوت اور حکمت" دونوں کا امتزاج ہے۔

حکمت اور قوت

(وہ عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے) جب قوت اور حکمت دونوں یکجا ہوں تو اسے قانون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قوت کے ساتھ اگر حکمت (REASON) نہ ہو، تو وہ دھاندلی بن

جاتی ہے. اور اگر حکمت کے ساتھ قوت نہ ہو تو وہ وعظ یا فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے.

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں　　　　قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

(اقبالؒ ۔ پس چہ باید کرد)

دوسرے یہ کہ اگر ایک قوم ایک دفعہ صحیح نظام کی پابند ہو جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے بعد وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، اس نظام کے خوشگوار نتائج سے وہ متمتع ہوتی چلی جائے گی. بالکل نہیں۔ اسے نظام کے استحکام کے لئے مسلسل جدّوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۔ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ۔ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ۔ (۴۱/۳۰-۳۲)

جو لوگ اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی. تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں۔ (۳/۱۲۴)). اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو نہ ہی افسردہ خاطر ہو. تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (۳/۱۲۴-۱۲۵ ؛ ۸/۱۰-۱۲ ؛ ۴۶/۱۳)۔

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے. (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی). اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا، اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے. جو چاہو گے، ہوگا. جو مانگو گے، ملے گا. یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)۔

اور یہ سب کچھ ایسی عزت و توقیر کے ساتھ ملے گا جیسے میزبان، اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے. اس میں، خدا کی طرف سے، زندگی کے خطرات سے حفاظت کا سامان بھی ہوگا اور سامانِ نشو و نما بھی.

اس میں "قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ" کے ساتھ "استقامت" شرط رکھی گئی ہے. استقامت، اس جدوجہد کے تسلسل (CONTINUITY) کا نام ہے جہاں اس تسلسل میں انقطاع آیا، اس نظام کا نقشہ بگڑ گیا اور وہ قوم اس کے انسانیت ساز ثمرات سے

محروم ہوگئی۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا۔ (۱۳/۳۵)۔ "اس (جنتی معاشرہ) کے ثمرات اور سائے دائم رہیں گے۔" کے یہ معنیٰ نہیں کہ قوم جو جی میں آئے کرتی رہے، وہ باغات انہیں بدستور پھل دیتے چلے جائیں گے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب تک وہ قوم اپنی جدوجہد جاری رکھے گی، ان ثمرات سے متمتع ہوتی رہے گی۔ جب اس کے پاؤں میں لغزش آجائے گی، وہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ سورۃ ابراہیم میں اسی حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

استقامت

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (۱۴/۲۴-۲۵)

غور کرو کہ خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے بات واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریۂ حیات کی مثال ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے سماوی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں (مسلسل و متواتر) پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ بسیط حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں سمجھ سکیں۔

یعنی وہ درخت تو ایسا ہے جس میں ہر زمانے میں بار آوری کی صلاحیت ہے لیکن لوگوں کو اس کا پھل قانونِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے۔ اور قانونِ خداوندی ہے: "قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا"۔ اس نظریۂ زندگی کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے مطابق جدوجہد میں استقامت۔ آیت (۲/۲۰۹) "زَلَلْتُمْ" استقامت کی ضد ہے۔ جب کوئی قوم اس جدوجہد کو ترک کر دیتی ہے، تو وہ اس شجرِ طیب کے خوشگوار پھلوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس درخت میں پھل لانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دوسری قوم اس مسلک کو اختیار کر لیتی ہے، تو وہ اس کے ثمرات سے متمتع ہو جاتی ہے۔ اسے قانونِ استبدال و استخلافِ قومی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسے جلد اول صفحہ ۱۹۲ زیر آیت (۲/۴) بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں جو آیات درج کی گئی ہیں۔ (یعنی ۹/۳۹ ؛ ۴۷/۳۸) ان میں استبدالِ قومی کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں اسے "ارتدادِ قومی" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فرمایا:۔

استبدال و استخلافِ قومی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ

لَوۡمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۔ (۵۴)۔

اے ایمان والو! جو تم میں سے، نظامِ خداوندی سے پھر جائے (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا) اللہ ان کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کے افراد دنیا کی ہر شے کے مقابلہ میں، نظامِ خداوندی کو زیادہ عزیز رکھیں گے، اور ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا بھی انہیں عزیز رکھے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے ریشم کی طرح نرم، اور شاخِ ثمردار کی طرح خمیدہ ہوں گے، لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (۴۸/۲۹)۔ وہ اس کے نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی کی طعن و تشنیع سے نہیں ڈریں گے۔ یہ نوازشاتِ خداوندی کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو قوم بھی انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنا چاہے اسے حاصل ہوسکتی ہیں۔ خدا کے ہاں نہ تو گروہ بندانہ تنگ نظری ہے اور نہ ہی انعامات کی اندھا دھند تقسیم۔

واضح رہے کہ اس استبدال و استخلاف سے مراد یہ نہیں کہ جونہی کوئی قوم نظامِ خداوندی سے منہ موڑ لے گی، وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی اور اس کی جگہ دوسری قوم آن کھڑی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ "منہ موڑنے والی" قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے محروم ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دوسری قوم اس نظام کے استوار کرنے کے لئے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ ان نعماء سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سابقہ (زوال آشنا لیکن ہنوز زندہ) قوم اپنی غلطیوں کا احساس کر کے صحیح راستے پر واپس آجائے اور اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالے۔ سورۃ آلِ عمران میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ۔ ذرا سوچو کہ جو بدنصیب قوم صحیح راستہ اختیار کر لینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ۔ درآنحالیکہ اس نظام کے درخشندہ نتائج نے یہ حقیقت مشہود کر دی تھی کہ جو کچھ ان کے رسول نے کہا تھا وہ مبنی برحقیقت تھا۔ اس قوم پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کس طرح کشادہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۔ (۳/۸۵) ایسے ظالمین پر سعادت و کامرانی کی راہیں کبھی وا نہیں ہوسکتیں: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ۔ (۳/۸۶)۔ اس قسم کی قوم کا حشر اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کے خوشگوار ثمرات سے بھی محروم رہے۔ کائناتی قوتوں کی برکات بھی اس کے حصے میں نہ آئیں اور اقوامِ عالم بھی اسے ذلیل و خوار سمجھ کر دھتکار دیں۔ یوں ان پر ہر طرف سے محرومی اور نامرادی کی پھٹکار

پڑے۔

قبل اس کے کہ ہم اگلی آیات کی طرف بڑھیں، ذرا رُک کر دیکھ تو لیں کہ یہ کونسی بدنصیب، سوختہ بخت قوم کا ذکر ہو رہا ہے؟ کیا یہ ہمارا ہی ذکر تو نہیں؟

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!

اس کے بعد آگے بڑھیئے: خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (۳/۸۷)۔ ذلت وخواری کا یہ عذاب ان پر مسلط رہیگا اور (خدا و رسول کا زبانی اقرار) ان کی سزا میں ذرا سی تخفیف بھی نہیں کر سکے گا۔ اور نہ ہی ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور میں تھوڑی سی بھی تاخیر کی جائے گی۔ وہ اسی دنیا میں ان کے سامنے آجائیں گے (اور وہ قوم اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرے گی)۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے لئے اس ذلت وخواری کے عذاب سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہوگی یا وہ ابدی

بازآفرینی کا امکان

طور پر محروم و مردود ہو جائے گی! کیا کہ ان کے بچ نکلنے کا امکان ہوگا؟ فرمایا:۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳/۸۸)۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ جس دوراہے پر ان کے قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گئے تھے، یہ پلٹ کر وہیں جائیں۔ وہاں سے سیدھا راستہ اختیار کریں اور خدا کے عطا کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر پھر سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اس طرح یہ ابدی ہلاکت سے محفوظ بھی ہو جائیں گے اور انہیں سامانِ نشوونما بھی میسر آجائے گا۔ یعنی انہوں نے دینِ خداوندی (قرآنی تعلیم) میں جو آمیزشیں کر رکھی تھیں انہیں یکسر علیحدہ کر کے، پھر سے خالصتًہ قرآنی نظامِ زندگی اختیار کرلیں، تو ان کے بچاؤ کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مُشتِ پرے داری
بیا، من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

لیکن — اور یہ "لیکن" بڑا کپکپا دینے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ (۳/۸۹)۔ لیکن یہ اگر ایسا نہ کریں، اور زبان سے "یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ" کہتے اور عملاً اُسی غلط راستے پر چلتے رہیں، اور اس میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں، تو پھر یہ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔" یہ جو کہا گیا ہے کہ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا۔ تو مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔ مذہب میں ہر عقیدے اور مسلک کی سند یہ ہوتی ہے کہ یہ اسلاف سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ اب

ظاہر ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا "اسلاف" کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے اس "تواتر" کی سند مزید مستحکم ہوتی جائے گی۔ اسی روش پر چلتے رہنے سے باز آفرینی کی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ ایسی قوم کا انجام ابدی ہلاکت ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۔ (۳/۹۰)۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس باز آفرینی کا امکان اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد اگر یہ چاہیں کہ (حیاتِ اُخروی میں) زندگی کی سرفرازیاں نصیب ہو جائیں تو ایسا ہونا ناممکن ہوگا" خواہ یہ اس کے بدلے میں دنیا بھر کی دولت بھی کیوں نہ دینا چاہیں۔ ان کے لئے الم انگیز عذاب کی زندگی ہو گی اور کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس حالت میں ان کی مدد کر سکے۔"

ان تصریحات کی روشنی میں، آیت (۲/۲۰۹) کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ یعنی اگر واضح دلائل سامنے آجانے اور صحیح راستہ اختیار کر لینے کے بعد تمہارے پاؤں میں لغزش آگئی تو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے تم بچ نہیں سکو گے۔ (قوموں کے عروج و زوال کے متعلق۔ جلد دوم صـ ۱۵۵۔ زیرِ آیت (۲/۲۰۹) میں بھی بحث ہو چکی ہے)۔

یہ تنبیہ تو ان لوگوں کو کی گئی جو اسلام کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ باقی رہے وہ جو اس دعوت کی مسلسل مخالفت کئے جا رہے تھے تو ان کے متعلق کہا کہ:-

۲/۲۱۰ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۔ (۲/۲۱۰)

یہ لوگ ابھی تک انہی خیالات میں مگن ہیں جو ان کی توہم پرستیوں نے پیدا کر دیئے ہیں (مثلاً یہ کہ) قوموں کی تباہی کے لئے خدا خود بادلوں کے رتھ میں بیٹھ کر فرشتوں کے جلو میں آیا کرتا ہے اور یوں آخری فیصلہ ہوا کرتا ہے)۔

اے رسول! ان سے کہو کہ قوموں کی تباہی اس طرح نہیں ہوا کرتی۔ وہ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کی رو سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا تمہاری طرف نہیں آیا کرتا بلکہ تمہارا ہر عمل تمہیں اس کی عدالت کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ تم اس کے اس قانون کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ تباہی اور بربادی اس طرح آیا کرتی ہے۔

ان سے کہو کہ اس کی شہادت چاہتے ہو تو:-

۲/۲۱۱ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۗ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ (۲/۲۱۱)

ان یہودیوں (بنی اسرائیل) سے پوچھو جو تمہارے گرد و پیش بھی رہتے ہیں۔ انہیں، قوموں کی موت اور حیات سے متعلق واضح قوانین دیئے گئے تھے۔ انہوں نے ان قوانین کا اتباع کیا تو ان پر خدا کی نعمتوں کے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ان سے اعراض برتا تو وہ نعمتیں، ذلتوں اور خواریوں میں بدل گئیں۔ اور یہ سب کچھ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوا جس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

زندگی کی نعمتیں کیا ہوتی ہیں اور وہ چھنتی کس طرح سے ہیں، ان کے متعلق جلد اول صفحہ ۔ زیر آیت (۱/۵) گفتگو ہو چکی ہے۔ ان نعمتوں کے چھن جانے میں قوم کے لیڈر کیا کیا کرتے ہیں اس کی بابت (۲/۴۸) دیکھئے۔

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال دل میں ابھرتا ہے کہ جب کوئی قوم، زندگی کی اس قدر سرفرازیوں اور خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو، تو پھر وہ کیا کرتی ہے جس سے یہ تمام نعمتیں اُس سے چھن جاتی ہیں؟ فرمایا:۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (۲/۲۱۲)

۲/۲۱۲

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ زندگی کی بلند انسانی سطح سے انکار کر کے، حیوانی زندگی کو اصلِ حیات سمجھ لیتے ہیں اور اسی زندگی کی عیش سامانیاں ان کا مقصدِ حیات بن جاتی ہیں۔ اور یہ چیزیں انہیں بڑی جاذب، پُرکشش اور حسین بن کر دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیوانی سطحِ زندگی پر اقدار کا سوال پیدا نہیں ہوتا ــ اقدار تو انسانی سطحِ زندگی پر سامنے آتی ہیں ــ یہ لوگ بلند اقدارِ حیات فراموش کر دیتے ہیں اور جو لوگ ان اقدار پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں (کہ ان کی مت ماری گئی ہے جو زندگی کے سہل الحصول عیش و طرب کے مقابلہ میں محض نظری اقدار کو ترجیح دیتے ہیں) یہ لوگ ان اقدار پرست مومنین کی ہنسی اس لئے بھی اڑاتے ہیں کہ اس پروگرام کے ابتدائی دور میں یہ اُن کے مقابلہ میں، کمزور و ناتواں سے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ یہ حصولِ قوت و جاہ کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن جب آخر الامر معاشرہ میں آسمانی انقلاب نمودار ہو جاتا ہے تو ساری دنیا دیکھ لیتی ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار کی نگہداشت کرتے تھے وہ ان لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں جو محض دنیاوی مفاد کو مقصدِ حیات سمجھتے تھے اور اس کے حصول میں کسی اصول و اقدار کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو قوم قانونِ خداوندی

کے مطابق سامانِ زیست حاصل کرنا چاہتی ہے اُسے کس طرح خود اس کے اپنے اندازوں سے بھی زیادہ، بلا حد وحساب رزق کی فراخیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

یہ حقائق قوم بنی اسرائیل ہی سے مخصوص نہیں، نوعِ انسان کی ساری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔ انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جب وہ، بعد میں پیدا ہونے والی تمدنی زندگی سے ناآشنا تھا۔ قدرتی پیداوار پر اس کا گزارہ تھا اور وہ ہر ایک کو با فراط مل جاتی تھی کیونکہ ہنوز "میری اور تیری" کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔

وحدتِ انسانیت

یہ تھی "آدم" کی وہ جنتی زندگی جس کی تفصیل جلد دوم کے دوسرے باب (زیرعنوان سرگزشتِ آدم) میں گزر چکی ہے۔ اس کے بعد "میری اور تیری" کا سوال پیدا ہو گیا تو ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اس طرح ان میں اختلافات پیدا ہو گئے (۱۰/۱۹)۔ ان اختلافات کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ہر فرد، ہر گروہ، ہر قوم کی عقل اس کے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔ دوسروں کا مفاد اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ وحی شروع کیا۔ اس نے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجا کہ وہ انسانوں کو ان کی اختلافی زندگی کے تباہ کن نتائج وعواقب سے متنبہ کریں اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی نوید جانفزا سنائیں۔ ہر نبی اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا مبنی برحقیقت ضابطہ (الکتاب) لاتا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ
۲/۲۱۳ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ - (۲/۲۱۳)

تمام انسان ایک امتِ واحدہ کی طرح رہتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے (۱۰/۱۹) تو خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا جو انہیں اختلافات کی ہلاکت آفرینیوں اور وحدتِ امت کی نشاط انگیزیوں سے مطلع کرتے۔ ان انبیاء کے ساتھ ضابطۂ حیات بھی نازل ہوتا جس کے مطابق وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، ان میں وحدت پیدا کرتے۔

اس آیۂ جلیلہ میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) نوعِ انسان، شروع میں امتِ واحدہ تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ آتے۔ وہ ان کے اختلافات کو اس کتاب کے ذریعے مٹاتے تھے جو انہیں خدا کی طرف سے ملتی

تھی۔ اس سلسلۂ رشد وہدایتِ خداوندی کا منتہی یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ یہ شکل قرآنِ کریم کے اتباع سے پیدا ہوسکے گی۔

(۲) ہر نبی اور ہر رسول کو خدا کی طرف سے کتاب ملی تھی۔ تفصیل اس کی جلد دوم صفحہ ۲۶۵۔ زیرِ آیت (۲/۵۵) گزر چکی ہے۔ اس لئے نبی یا رسول بلا کتاب کا عقیدہ قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔

(۳) اختلافات اور تفرقہ کفر اور شرک ہے۔ قرآنِ کریم کے اس بنیادی نکتہ کے متعلق پہلی اور دوسری جلد دونوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (مثلاً جلد اول صفحہ ۱۶۷ آیت (۶/۱)؛ صفحہ ۱۹۳۔ آیت (۶/۲)؛ صفحہ ۲۱۵۔ آیت (۶/۹)۔ جلد دوم صفحہ ۲۵۹۔ آیت (۲/۵۲)؛ و دیگر مقامات جنہیں ان جلدوں کی فہرست میں دیکھ لینا چاہیئے۔

(۴) جس قوم میں اختلافات اور فرقے ہوں، وہ وحیٔ خداوندی کی متبع نہیں ہوسکتی۔ وحیٔ خداوندی کی پیرو قوم کی پہلی اور بنیادی نشانی، اس میں وحدت ہے۔

(۵) مسلمانوں میں یہ وحدت پیدا ہو نہیں سکتی جب تک وہ ہر اختلافی معاملہ میں قرآن کو اپنا حکم تسلیم نہ کریں۔ (۴۲/۱۰؛ ۱۶/۶۴)۔

آیت (۲/۲۱۳) کا بقایا حصہ حسب ذیل ہے:-

۲/۲۱۳ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲/۲۱۳)

ہر نبی اس کتاب کی رو سے جو اُسے دی جاتی، وحدت پیدا کر کے چلا جاتا، لیکن اس کے بعد وہ لوگ جنہیں وہ کتاب دے جاتا کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں، ایسی تعلیم کے باوجود، باہمی ضد اور رقابت۔ یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ سے۔ پھر اختلافات شروع کر دیتے (۱۶/۹۲؛ ۵۷/۲۰؛ ۳/۱۰۱) لیکن ان میں سے جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے، انہیں خدا اپنے قانون کے مطابق، اختلافات سے بچنے کی راہ دکھا دیتا۔ یہی وہ طریق ہے جس سے اللہ ہر اُس قوم کی، جو اختلافات سے بچنا چاہتی ہے، زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے۔

یہ طریق شروع سے چلا آرہا ہے۔ نبی آتا۔ کتابِ خداوندی کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا۔ جو لوگ اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آتے، ان کے سابقہ اختلافات مٹ جاتے۔ وہ امتِ واحدہ بن جاتی۔ وہ رسول چلا جاتا تو اس کے نام لیوا

اس کی کتاب میں تحریف کر کے امت میں تفرقہ پیدا کر دیتے۔ یہ تفرقہ، مذہبی پیشواؤں کی باہمی رقابت اور جتھہ بازیوں کی بنا پر پیدا ہوتا۔ اس کے بعد پھر ایک اور رسول آجاتا۔ وہ خدا کی طرف سے غیر محرف ضابطۂ ہدایت لے کر آتا اور اس کی رُو سے پھر ایک امتِ واحدہ پیدا کر جاتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ خدا نے اس سلسلہ کے آخر میں ایک ایسی کتاب نازل کر دی جس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کی رُو سے، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک امتِ واحدہ متشکل فرمائی۔ وہ اس امت کو اس کتاب کا وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد مذہبی پیشواؤں نے پھر

ہمارے اختلافات

سر ابھارا۔ وہ اس کتاب میں توڑ دو بدل کر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایک نیا عقیدہ وضع کر دیا کہ خدا کی وحی تمام تر اس کتاب (قرآنِ مجید) کے اندر نہیں۔ وحی کا بہت بڑا حصہ اس کے باہر بھی ہے۔ انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالا اور اس خارج از کتاب حصہ کو وحی کا درجہ دے کر، امت میں فرقے پیدا کر دیئے۔ ان فرقوں کو مٹانے کے لئے اب کوئی مامور من اللہ تو آئے گا نہیں کیونکہ مامورین من اللہ (انبیاء کرامؑ) کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور کسی مامور من اللہ کے آنے کی اب ضرورت بھی نہیں کہ مامور من اللہ خدا کی کتاب لے کر ہی آیا کرتے تھے۔ کتاب اللہ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جب بھی ہم نے اپنے اختلافی معاملات کے صحیح اور غلط ہونے کے لئے اس کتاب کو حکم مان لیا، ہمارے اختلافات مٹ جائیں گے۔ اور ہم پھر سے امتِ واحدہ بن جائیں گے۔ اور جب ہم خود امتِ واحدہ بن جائیں گے تو باقی دنیا کو امتِ واحدہ بنانے کا پروگرام مرتب کر کے اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہو جائیں گے۔

ہم نے سابقہ صفحات میں "اختلافات" کا ذکر کیا ہے تو اس سے لمحۂ اولین میں نگاہ، شیعہ سُنّی اور حنفی وہابی (وغیرہ) کے اختلافات کی طرف اٹھتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امتِ واحدہ میں اس قسم کے اختلافات بھی راہ نہیں پا سکتے لیکن قرآنِ کریم کے پیشِ نظر اختلافات کا دائرہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ آپ ایک بار پھر آیت (۲/۲۱۳) مع آیت (۱۰/۱۹) پر نگاہ ڈالئے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا۔ نوعِ انسان امتِ واحدہ تھی۔ اس کے بعد اس میں اختلافات پیدا ہو گئے جنہیں مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ وہ اختلافات تھے (اور ہیں) جن سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اختلافات کیا تھے اور کس طرح رونما ہوئے تھے۔

علمائے علم الانسان والسنہ کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی آبادی کا اولین سرچشمہ جھیل کیسپین (CASPIAN SEA) کے اطراف و جوانب کا علاقہ ہے۔ وہاں کی آبادی ایک نوع کی شکل میں تھی جس میں کسی قسم کی تفریق نہیں

تھی۔ اس کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ نوع مختلف قبائل میں بٹ گئی۔ یہ تفریق کیسے اور کن تقاضوں کے ماتحت رونما ہوئی، کہا

نوعِ انسان کے اختلافات

نہیں جا سکتا۔ ہم جلد دوم، سرگذشتِ آدم کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ سحر پھونکا تھا کہ تم حیاتِ جاوید اپنی اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اپنی اولاد کے ذریعے جداگانہ تشخص نے آگے چل کر مختلف قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ یہ وحدتِ انسانی میں پہلی تفریق تھی۔ اسی سے آگے چل کر نسلوں کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم عمل میں آگئی۔ اس معیار کی رُو سے نوعِ انسان کو تین شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) آریائی (ایرین)۔ مثلاً ہندی۔ ایرانی۔ فرنگستانی اقوام

(۲) تورانی (منگولین)۔ مثلاً ترکستانی۔ چینی اقوام

اور (۳) اسامی (سیمٹیک)، مثلاً عرب۔ آرامی۔ عبرانی۔ سریانی۔ کلدانی وغیرہ اقوام۔

بعض علمائے انساب، نوعِ انسانی کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بنا پر کرتے ہیں۔ مثلاً سفید فام۔ سیاہ فام یا سُرخ فام۔ اور زرد فام۔ ان کے برعکس، تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی، حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث۔ حام اور سام سے آگے چلی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ نوعِ انسانی کی پہلی تفریق، قبیلوں کی شکل میں رونما ہوئی جن کی بنیاد نسل پر تھی۔ لہٰذا، نسلی امتیاز وحدتِ انسانیت کے راستے میں پہلی روک ہے۔

جب آبادی بڑھی تو مختلف قبیلوں نے نقلِ مکانی کر کے کسی دوسری سرزمین کو اپنا مستقر یا وطن قرار دے لیا۔ اس طرح جغرافیائی حدود یا وطنی امتیازات وحدتِ انسانی میں تفریق کا باعث قرار پائے۔ (اسی (وطنی) تفریق سے زبانوں کا اختلاف بھی رونما ہوا۔

ایک قبیلہ (یا آگے بڑھ کر ایک قوم) میں تقسیمِ کار کے تقاضوں کی رُو سے مختلف گروہوں نے مختلف کام اپنے ذمے لئے۔ اس سے پیشے' وجہِ اختلاف بن گئے۔ یعنی جو تفریق معاشرہ میں تقسیمِ عمل کی ضرورت کے ماتحت وجود میں آئی تھی، اس نے آگے چل کر ذاتوں اور برادریوں کی شکل اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ ہندو دھرم نے انسانوں کو پیدائشی طور پر چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم کر دیا، اور اس تفریق کو' برہما (خدا) کی متعین کردہ کہہ کر اٹمٹ قرار دے دیا۔

پیشوں کی تفریق، یا مختلف افراد میں کمانے کی صلاحیت کے اختلاف سے، کمائی میں فرق پیدا ہوا تو اس

سے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات وجود میں آگئے۔ اور جب زیادہ طاقتور یا دولتمند طبقہ نے ذرائع پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیا تو اس طبقاتی تفریق کی گرہیں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

یہ تھیں وہ تفریقات جنھوں نے وحدتِ انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ حضرات انبیاء کرامؑ **اس تفریق و تقسیم** کو مٹا کر پھر سے وحدتِ انسانیہ کا پیغام لے کر آتے اور اپنے دائرہ کار کے اندر اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے۔ انبیاء کرامؑ کے اس مقصد کی وحدت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ یہ حضرات ایک ہی دین لے کر آتے تھے۔ . . . .

. . . — اور اس دین کا منتہیٰ و مقصود وحدتِ انسانیت تھا — لیکن فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہی دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو انہی انبیاءؑ کے نام لیوا باہمدگر ایسی تفریق اور عداوت پیدا کر لیتے تھے کہ وہ باقی تمام تفریقات سے زیادہ شدید اور محکم ہو جاتی تھی — اس کے بعد، ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے تھے، اور ان کی بین الفرق جنگ وجدل مستقل عداوت پر منتج ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، حضرات انبیاء کرامؑ، انسانوں کے اس تفرقہ کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کے لئے آتے تھے — اور تاریخ عالم اور قرآنِ کریم اس پر شاہد ہیں کہ ان کے اس انسانیت سازمشن کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ یہ مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ اس لئے کہ مفاد پرست اور استحصال پسند گروہوں کا مفاد اسی میں تھا کہ انسانوں میں یہ تفریق باقی رہے۔ یہ ہے دینِ خداوندی اور دنیاوی مفاد پرست گروہوں میں کشمکش کی اصل و بنیاد، جسے اقبالؒ نے ان دو جامع ابیات میں محصور کر دیا ہے۔ وہ دینِ خداوندی (یا وحی) کو عقلِ جہاں بیں، اور گروہ بندانہ مفاد پرستیوں کو عقلِ خود بیں سے تعبیر کرتے ہیں[1] اور کہتے ہیں۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

قرآنِ کریم اس دینِ خداوندی (عقلِ جہاں بیں) کو اپنی مکمل شکل میں آخری بار لے کر آیا اور حضور نبی اکرمؐ نے اس کی روشنی میں ایک ایسی امت کی تشکیل فرما دی جو نسل، رنگ، زبان، وطن، قومیت، مذہب کے تمام اختلافات و تفریقات کو مٹا کر وحدتِ انسانیت کا ماڈل بنی۔ اس طرح حضورؐ نے اقوامِ عالم کو سمجھا اور دکھا دیا کہ یہ ہے دنیا سے اس فساد کو مٹانے کا طریق جس نے

امتِ مسلمہ کی تشکیل

---

[1] عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است (پیامِ مشرق۔ باب نقشِ فرنگ)

انسان کی اس جنتِ ارضی کو جہنم بنا رکھا ہے۔

حضورؐ نے اس دعوت کو پیش کیا، اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا تھا، مفاد پرست گروہ ہجوم کر کے اس دعوت کی مخالفت

اس کی مخالفت

کے لئے اُمنڈ آئے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک خطۂ ارض میں بھی قائم ہو گیا تو ان کے سلب و نہب کے دمدموں (TANKS) سے لپسی اور کچلی ہوئی انسانیت جوق در جوق اس کی طرف آجائے گی اور انہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

اور یہ تھا وہ مقام جہاں اس امت سے — جو اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اٹھی تھی — کہا گیا کہ تم سوچ لو کہ تمہاری منزل کس قدر کٹھن اور تمہارے راستے کس قدر دشوار گزار ہیں۔ ان راستوں کا منتہیٰ تو بیشک زندگی کی بہار آفریں جنت ہے، لیکن یہ جن صبر آزما تزاحمات اور ہمت شکن تصادمات سے پٹے پڑے ہیں انہیں سامنے رکھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ جب انصارِ مدینہ کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں یہ دعوت لے کر آیا کہ آپ مدینہ تشریف لے چلیئے اور وہاں سے اس دعوت کا عملی آغاز کیجیے، تو حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ تم اس کا عہد دو کہ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ وہ اس عہد کے لئے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے کہ ان کے سربراہ نے ان سے کہا کہ تم نے سوچ سمجھ لیا ہے کہ اس عہد اور اس بیعت کا عملی مفہوم کیا ہے؟ سن رکھو کہ

یہ عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ کے مرادف ہے۔

اور عرب و عجم کے خلاف اسی اعلانِ جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت سے کہا تھا کہ۔

۲/۲۱۴ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (۲/۲۱۴)

تم یہ سمجھ بیٹھے کہ تم اس نظام کو آسانی سے قائم کر لو گے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں

جنت ویسے ہی نہیں مل جائے گی

بھی ان جاں گداز مراحل سے گزرنا ہوگا جن سے وہ لوگ گزر رہے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ صعوبات اور مشکلات کا ہجوم انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کا قائد (رسول)

پکار اٹھتے کہ بارالٰہا! ہماری کوششوں کے بارآور ہونے کا وقت کب آئے گا!

ایسے ایسے ہمت شکن اور روح فرسا مراحل کے بعد کہیں جاکر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور نصرتِ خداوندی ان کی سعی وعمل کو بارآور کرتی۔

تمہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا ہوگا۔

حصولِ جنت کی راہ میں ان تصادمات کے متعلق جلد اول صفحہ ۳۳۵-۳۳۶ ۔ زیر آیت (۲/۲۵) میں لکھا جاچکا ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ آلِ عمران میں ہے:-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۱)

کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ جنت یونہی بیٹھے بٹھائے مل جائے گی۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ اس حقیقت کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہوگا کہ تم میں سے کون مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور باطل کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتا ہے۔

سورۃ التوبہ میں ہے:-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (۹/۱۶)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا تو اس کے بعد کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال خام ہے۔ دعوائے ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام واستحکام کیلئے مصروف جدوجہد رہتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعتِ مومنین کے سوا کسی کو اپنا دوست اور رازدار نہیں بناتا — یعنی زمانہ قبل از ایمان کے اس قسم کے روابط کو منقطع کر لیتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کی نگاہ تمہارے کاموں پر ہوتی ہے۔ دعویٰ ایمان کے الفاظ پر نہیں ہوتی۔

ایمان کیساتھ عمل

اسی تنبیہ کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا گیا.... کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ (۲۹/۲) ۔ "کیا یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ اب جو جی میں آئے کرو۔ تم نے مطالبہ پورا کر دیا ہے اور اب تم سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے! ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔ ابھی تو تمہیں صعوبات ومشکلات کی جانگسل بھٹیوں میں سے گزرنا ہوگا۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کو جن جانگداز مراحل سے گزرنا پڑا تھا ان میں سے ایک (جنگِ احزاب) کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان ہولناک الفاظ میں کھینچا ہے:-

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ (۳۳/۱۰-۱۱)

وہ ایسا سختی کا وقت تھا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امنڈ کر آگئے تھے۔ مقابلہ کی شدت کے تصور سے

جنگِ احزاب میں ہولناک نقشہ

تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور دہشت سے تمہارے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آ پہنچیں گے۔ جو ذرا کمزور دل واقعہ ہوتے تھے ان کے دل میں خدا کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایسے لرزا دینے والے تصادم کے وقت مومنین کا جذبۂ صادقہ ابھر کر سامنے آگیا اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ وہ کس پامردی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ تھا حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد۔ یہ تھی دین کی غرض و غایت۔ یہ تھا اس نظام کی مخالف قوتوں کی مزاحمت کی شدت کا عالم اور یہ تھا دین کی حامی جماعتوں کا فریضۂ حیات۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

چو می گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لَآ اِلٰہ را

رسول اللہ نے وحدتِ انسانیہ کو ایک امت کی شکل میں زندہ حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد اس امت کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو سابقہ امتوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے بھی دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا اور وحدتِ انسانیہ کے فریضہ کو پورا کرنا تو ایک طرف، خود رنگ، نسل، زبان، وطن، قومیت کے دورِ جاہلیت کے بتوں کی پرستار بن کر، قوموں، پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ گئے۔ آپ سوچئے کہ کہاں امت کا یہ مقصد کہ تمام اقوامِ عالم کے اختلافات مٹا کر، انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے اور کہاں اسی امت کی اپنی یہ حالت کہ دو مسلمان خانۂ خدا میں رُو بہ قبلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے! کیا یہ قوم دین کی اس غایت کو پورا کر سکتی ہے؟ اور اس کی واحد ذمہ دار ہے مذہبی پیشوائیت جو مروجہ مذہب کو دینِ خداوندی بتا کر امت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھتی ہے۔

مسلمان کا منتہیٰ حصولِ جنت ہے ناں؟ دین نے حصولِ جنت کے لئے جو کچھ کہا تھا وہ آپ کے سامنے آچکا لیکن

حصولِ جنت کے آسان طریقے

مذہبی پیشوائیت نے حصولِ جنت کو کس قدر آسان بنا رکھا ہے اس کا اندازہ ان (وضعی) روایات سے لگ سکتا ہے جنہیں یہ حضرات بہ اصرار و تکرار، جھوم جھوم کر، محراب و منبر سے سناتے رہتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

ابو داؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپکتا ہے۔ مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ جو شخص پورا پورا وضو کرتا ہے تو نماز کے بعد بالکل ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد یہ کلمات کہتا ہے "اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ واشہد ان محمد عبدہٗ ورسولہٗ" تو ایسے شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں؛ (مسلم)

ابن خزیمہ کی روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ تم کیا عمل کرتے ہو؟ میں نے تمہاری جوتیوں کی آواز جنت میں سنی کہ تم مجھ سے بھی آگے چل رہے ہو۔ بلالؓ نے عرض کیا کہ دو کام میرے معمول بہا ہیں۔ ایک ہمیشہ باوضو رہتا ہوں۔ جب وضو ٹوٹ جاتا ہے تو فوراً دوسرا وضو کر لیتا ہوں اور جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ادا کر لیا کرتا ہوں۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کس قدر آسانی سے مل جاتی ہے۔ یعنی وضو کیا تو تمام گناہ پانی میں بہہ گئے اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل پڑھ لئے تو خود رسول اللہ سے بھی آگے آگے جنت میں پہنچ گئے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص مؤذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے۔ لیکن حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے جواب میں لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۔ کہتا ہے تو یہ شخص جنت میں جائیگا۔

طبرانی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو۔ لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے یعنی دوزخ سے دور کر دیتی ہے۔ پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب تم سو رہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ

نہیں لکھا جاتا۔ یہاں تک کہ نیند سے جاگو (اور اگر رات کو دوزخ کے کام کرتے رہو تو صبح کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دیگی)۔

ترمذی کی حدیث ہے کہ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرتا ہے اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ مقتدیوں میں سے جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ ادا ہوئی، اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

بخاری اور امام مالکؒ کی ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائے تو تم رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہا کرو۔ جو بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تو صرف گناہ بخشنے کا ذکر تھا، مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھ لے' اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ترمذی کی روایت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعت نفل پڑھنے والے کے لئے جنت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ابو داؤد میں ہے کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے جو شخص چار رکعتیں پڑھتا ہے، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ کے لئے آیا اور خاموش بیٹھ کر خطبہ سنا تو اس کے گناہ نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے اور زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔

"وظائف" عجمی اسلام کا امتیازِ خصوصی ہیں۔ دین اور دنیا کا کوئی معاملہ پیش آجائے، اس کے لئے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی حاجت۔ بس ایک وظیفہ پڑھ لیجیے' مطلب حل ہو جائے گا۔ انہی وظائف سے جنت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً نسائی کی .... حدیث ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کی نماز کے بعد سات مرتبہ اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ۔ (یا اللہ مجھے دوزخ سے نجات دیدے) پڑھ لیا تو دن اور رات میں کسی وقت بھی مر جائے، وہ جنت میں جائے گا۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے بستر پر لیٹتے وقت کہا: اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، وہ گناہ خواہ دریاؤں کے جھاگ کے برابر ہوں یا درختوں کے پتوں کے برابر، ریگ کے ذروں کے برابر ہوں یا ان کی تعداد ایامِ دنیا کی مثل ہو یعنی ابتدائے آفرینش

سے قیامت تک جتنے دن ہوں، ان کی مثل بھی گناہ ہوں تو سب بخش دیئے جائینگے۔

مسلم میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَر۔ کہہ لیا کرو جس نے یہ وظیفہ پڑھا اُس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے ہر دن میں سو بار قُلْ ھُوَ اللّٰہ۔ پڑھنے کا ورد کر لیا تو اس کے پچاس سالہ گناہ مٹ گئے۔

مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت امام ہانیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ہلکا سا وظیفہ بتا دیجئے کیونکہ میں بہت بڑھیا ہو گئی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ سو بار پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو غلام آزاد کر دیئے، اور وہ بھی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے۔ سو بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو گھوڑے زین اور لگام سمیت مجاہدین کو دے دیئے۔ سو بار اَللّٰہُ اَکْبَر۔ کہا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو اونٹ مع نکیل وغیرہ اللہ کے راستے میں دیئے۔ اور سو بار لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ کہا کرو۔ یہ کلمہ زمین و آسمان کو ثواب سے بھر دیتا ہے۔ جس دن یہ وظیفہ پڑھے گی اس دن کسی کے اعمال بھی تیرے اعمال کے برابر آسمان پر نہ جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی یہ وظیفہ پڑھے تو اس کے اعمال بیشک تیرے اعمال کے برابر ہوں گے۔

حاکم کی روایت ہے کہ جس نے اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

شہادت

پڑھا اور پھر اسی بیماری میں مرگیا تو اس کو ایک شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور اگر اس بیماری سے اچھا ہو گیا تو تمام گناہوں سے پاک ہو کر اچھا ہوتا ہے۔

قرآنی نظام کے قیام کی جد و جہد میں ہر قربانی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ گراں بہا قربانی انسان کی جان کی قربانی ہے۔ قرآن نے ان سعادت مند نفوس کو "مقتولین فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے) کہہ کر پکارا ہے۔ انہیں عام طور پر شہید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اعمال میں شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور مخالفین کے ساتھ "اللہ کی راہ میں لڑنے والوں" سے بڑھ کر سخت مقابلہ (جہاد) کرنے والا اور کوئی نہیں۔ یہی مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ تھے جنھوں نے باطل کی قوتوں کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اس لئے ان قوتوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دینے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ سے بیگانہ کر دیا جائے۔ اب دیکھیے کہ اس کے لئے ہماری کتب احادیث میں کس قسم کی روایات داخل کر دی گئیں۔

مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو! حاضرین نے عرض کیا کہ خدا کی راہ

میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہدا کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید، جو طاعون سے مرگیا وہ شہید، جو اسہال (دستوں کی بیماری) سے مرگیا وہ شہید، جو پانی میں ڈوب کر مرگیا وہ شہید، جو مکان گرنے سے دب کر مرجائے وہ شہید' (اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ) جو نمونیہ سے مرجائے وہ شہید، جو آگ میں جل کر مرجائے وہ شہید۔ جو عورت وضع حمل سے مرجائے وہ بھی شہید۔

اس کے بعد یہ دیکھیے کہ ان "شہدا" کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے لیکن روایات کی رُو سے وہ اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا بلکہ اپنے ساتھ بہت سے اقربا کو جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

ان (اور ان جیسی دیگر روایات) میں آپ کو قدم قدم پر یہ الفاظ ملیں گے کہ "خدا گناہ بخش دیتا ہے" اور اس طرح گنہگار جنت میں چلا جاتا ہے۔ "خدا کی بخشش" کا عقیدہ اس قدر عام اور ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے کہ ہم ہر آن خدا سے "بخشش" کی دعا مانگتے رہتے ہیں حتیٰ کہ مرنے والے کے متعلق بھی ہماری یہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ اسے بخش دے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے "مغفرت[1]" کا ترجمہ ہی "بخشش" کر رکھا ہے۔ یہیں سے ہمارے ہاں "بخشش" کا لفظ رائج ہوا۔ اور "بخشش" کے معنی تو آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اب مسلمان خدا سے جنت بھی "بخشش" کے طور پر مانگتا ہے — وہی جنت، جس کے حصول کے متعلق چند ایک ارشادات خداوندی آپ کی نظروں سے ابھی ابھی گزرے ہیں۔ یہی تھی ہماری وہ عبرت آموز اور تاسف انگیز ذہنیت جس پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے، اقبالؒ نے اپنے مخصوص نشترانہ انداز میں کہا تھا کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است | بہشتے بہرِ اربابِ کرم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش! | بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است

(ارمغانِ حجاز)

آپ اپنی (یعنی ہم مسلمانوں کی) موجودہ حالت پر غور کیجیے اور پھر سوچئے کہ کیا دین کی غایت — وحدتِ انسانیہ — اس قوم کے ہاتھوں وجود میں آسکتی ہے؟

---

[1] مغفرت کا قرآنی مفہوم جلد دوم صفحہ ۲۸۷ زیرِ آیت (۲/۱۸۵) بیان کیا جا چکا ہے۔

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ آپ ان آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو پہلے گذر چکی ہیں اور جن

مایوسی کی کوئی بات نہیں

میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اس دین سے اعراض برتو گے تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی جو اس کے مقصد کو پورا کرے گی۔ اور قرآن کریم کی اس "پیشگوئی" کے کچھ کچھ آثار ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ آپ جلد اول صفحہ ۲۳۹۔ آیت (۲/ ۱۱) میں پیش کردہ حقائق کو ایک بار پھر سامنے لائیں اور دیکھیں کہ یورپ کے مفکر کس طرح اپنے (یعنی اقوامِ عالم) موجودہ نظریاتِ زندگی سے تنگ آکر ایک ایسی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو وحدتِ انسانیت کے زریں اصول کے مطابق بسائی جائے۔ ان کی یہ تڑپ، ہنوز، جنین کی شکل میں، ان کے سینوں میں پرورش پا رہی ہے۔ انہیں ایسی دنیا کی تلاش تو ہے لیکن انہیں وہ بنیاد نہیں مل رہی جس پر ایسی آسماں بوس عمارت استوار کی جا سکے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد قرآنی اقدار کے سوا کہیں سے نہیں

یہ نظام ضرور قائم ہوگا

مل سکے گا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو، جاوید نامہ میں" قوسِ قزح کے رنگ میں بیان کیا ہے ۔۔۔ "قوس و قزح" کے رنگ میں اس طرح کہ اس میں اس نے اپنی ملت کی حالت پر جو آنسو بہائے ہیں وہ امید کی قرآنی کرنوں میں سے گزر کر، افقِ عالم پر حسین اور رنگین دھنک کی صورت میں نمودار ہو رہے ہیں[1]۔ کہتے ہیں۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است	سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر	آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی	از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است	احتیاجِ روم و شام اورا کجا است
حق اگر از پیشِ ما بر داردش	پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن	ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(۰)

---

[1] جب سورج کی کرنیں بادلوں میں سے گزرتی ہیں تو ان سے قوس و قزح وجود میں آتی ہے۔ اس استعارہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ آیت (۲/۲۱۳) میں کہا گیا تھا کہ دین کا مقصد وحدتِ انسانیہ کی عملی تشکیل ہے۔ اور مفاد پرست

پہلا مرحلہ۔ انفاق

قومیں اس وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ پھر ایک امت اٹھتی ہے اور اسی وحدت کے احیاء کے لئے سرگرمِ عمل ہوتی ہے۔ اس امت کا ان مفاد پرست گروہوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ (۲/۲۱۴)۔ اس کے بعد بتایا کہ اس ٹکراؤ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ امت کیا کیا تقاضے پورے کرتی ہے۔ آیت (۲/۱۱۱) میں ان تقاضوں کو دو شقوں میں پیش کیا گیا ہے یعنی مال کا انفاق اور جان کی قربانی۔ یہی دو تقاضے یا مطالبے اگلی آیتوں میں سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان آیات کا تعلق اُس دور سے ہے جب قرآنی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی جا رہی تھی اور وہ ہنوز متشکل نہیں ہوا تھا۔ اُس دور میں انفاقِ مال کے متعلق فرمایا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۱۵) ۲/۲۱۵

اس کے لئے، سب سے پہلا مرحلہ، مالی قربانی کا ہے۔ اے رسول! تمہارے ساتھی تم سے پوچھتے ہیں کہ اس کے لئے کس قدر مال کی ضرورت ہوگی اور اُسے کہاں خرچ کرنا ہوگا۔ ان سے کہو کہ اس پروگرام کی ابتداء معاشرہ کے محدود دائروں سے کی جائے گی۔ اس لئے، سردست تم یہ دیکھو کہ ان دائروں میں وہ کون کون سے افراد ہیں جو دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ مثلاً، سب سے پہلے، اپنے گھروں میں اپنے والدین کو دیکھو۔ پھر اور آگے بڑھو تو انہیں دیکھو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ نیز انہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے۔ پھر اس سلسلہ کو اپنی بستی سے آگے بڑھاؤ، اور باہر سے آنے والوں کے متعلق دیکھو کہ انہیں تمہاری مدد کی کس قدر ضرورت ہے۔ (اس کی آخری حد وہ ہے جسے (۲/۲۱۹) میں بیان کیا گیا ہے)

تم ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کرو، اور اس پر یقین رکھو کہ جو کچھ بھی تم دوسروں کی بھلائی کے لئے کرو گے، وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا۔ اس میں سے ایک ذرہ برابر بھی بے نتیجہ نہیں رہنے پائے گا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انفاق کی یہ شکل، اسلامی نظام کے عبوری دور سے متعلق ہے۔ اس کے آخری مرحلہ میں اسکی کیا شکل ہوگی، اسے جلد اول صفحہ ۱۰۵، آیت (۲/۳)۔ اور صفحہ ۲۹۴ آیت (۲/۱۴۳) میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کی بنیادی آیت (۲/۲۱۹) چار آیات کے بعد سامنے آئے گی۔

اب آئیے دوسرے مطالبہ (یعنی جان کی قربانی) کی طرف۔ فرمایا:۔

۲/۲۱۶ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ (۲/۲۱۶)

مال کے بعد، جانوں کی قربانی کا مرحلہ آئے گا۔ یعنی تمہیں مخالفین سے جنگ بھی کرنی پڑے گی۔ یہ مرحلہ تم پر گراں گزرے گا۔

جان کی قربانی

کیونکہ تم لوٹ مار کی خاطر جنگ کرنے کے عادی ہو۔ انسانیت کی بہبود کے لئے، جس میں ایثار ہی ایثار ہو، ذاتی منفعت کوئی نہ ہو، جنگ کرنا، کارے دارد۔ لیکن ان معاملات میں تم اپنی انفرادی عقل اور جذبات سے فیصلہ نہ کراؤ۔ اس لئے کہ یہ عین ممکن ہے کہ عقل خود بین تمہیں ایک بات کو سخت ناپسندیدہ بنا کر دکھائے لیکن وہ (تمہاری ذات کی بہبود کے نقطۂ نگاہ سے) تمہارے لئے بڑی خیر و برکت کی موجب ہو۔ اس کے برعکس، عقل و جذبات کے سطحی تقاضے کسی چیز کو بڑا خوش آیند بنا کر دکھائیں لیکن وہ درحقیقت (تمہاری ذات کی نشوونما کے لئے) بڑی مضرت رساں ہو۔ اس لئے ان امور کا فیصلہ وحی کی روشنی میں کرو، کیونکہ وحی کی نگہ دوررس، حقیقت کو دیکھتی ہے، اور تمہاری جذبات کے تابع چلنے والی عقل کی نگاہ محدود ہوتی ہے۔ وہ حقیقت کو نہیں جان سکتی۔

جنگ کے متعلق آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں اس لئے یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مذہب میں آکر، قرآنی احکام کی اہمیت کیا شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اسی (سورۂ بقرہ کی) آیت (۲/۱۸۳) میں کہا گیا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ "تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں" اور اس سے ذرا آگے (زیر نظر آیت میں) کہا گیا ہے، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ تم پر جنگ (قتال) فرض کیا گیا ہے۔ دونوں آیتوں کے مخاطب مؤمنین (مسلمان) ہیں۔ اور دونوں کے الفاظ بھی ایک جیسے (كُتِبَ عَلَيْكُمْ)۔ صیام (روزوں) کی فرضیت کا ذکر تو قرآن مجید میں اسی ایک مقام پر آیا ہے لیکن جہاد یا قتال کی فرضیت اور اہمیت سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں روزوں کی فرضیت اور اہمیت کے متعلق اس قدر تاکید اور تلقین کی جاتی ہے۔ ان کے "ثواب" کے متعلق اتنے دلکش وعظ کہے جاتے ہیں۔ ان سے متعلق مسائل پر اس قدر

قتال کی فرضیت

کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ افطار اور سحری کے اوقات کے تعین اور ان کے اعلانات کے سلسلہ میں اتنے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن آپ نے کبھی کسی محراب اور منبر سے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ (جنگ کی فرضیت) کے متعلق کچھ سنا ہے؟ اپنی تقریروں

زورِ خطابت پیدا کرنے کے لئے تو جہاد کے متعلق آیات اور اشعار خوب چسپاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ محض "شاعری" ہوتی ہے۔ اس کی فرضیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آجکل جنگ نے انتہائی ٹیکنیکل سائنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے لئے قائمہ فوج (STANDING ARMY) ناگزیر ہو گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم تو تمام مومنین (مسلمانوں) کو مجاہد (سپاہی) بنانا چاہتا ہے۔ انہی میں سے مستقل قائمہ فوج بھی ترتیب کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے یہ فریضہ (نماز جنازہ کی طرح) فرضِ کفایہ[1] تو نہیں بن جاتا؟ اس فریضہ کی اہمیت کو اس لئے اجاگر نہیں کیا جاتا کہ اگر "علماء" حضرات اسے تمام امت کے لئے فرضِ عین کی حیثیت سے پیش کریں اور روزوں کی طرح اس کی اہمیت پر زور دیں تو انہیں خود بھی (اور سب سے پہلے) میدانِ جنگ میں جانا پڑے گا۔ لہذا وہ روزوں کی فضیلت پر زور دیتے رہیں گے اور فریضۂ قتال کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت دشمن کے خلاف جنگ چھڑ جائے تو وہ حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھے اپنی فوج کی فتح کے لئے دعائیں مانگنے پر زور دیں گے۔ خود میدانِ جنگ کی طرف رُخ تک نہیں کریں گے۔

امت کے لئے فریضۂ قتال کی اہمیت پہلے ہی کم ہو رہی تھی کہ (وہ جو کہتے ہیں "مرے کو مارے شاہ مدار"۔) اس تصور کو مسلمانوں کے دل و دماغ سے ہمیشہ کے لئے محو کر دینے کے لئے ایک "مامور من اللہ" تشریف لے آئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ :-

مرزا غلام احمد اور جہاد

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے فرما دیا کہ مسیحِ موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند لیا گیا۔　(اربعین ۴ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی ص۱۵)

اور اس کے بعد "مسیح موعود" صاحب نے اس نثر کی مزید وضاحت نظم میں یوں فرما دی کہ ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال　　دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

---

[1] فقہ کی رُو سے فرضِ کفایہ، ایسے فریضہ کو کہتے ہیں کہ اگر معاشرہ میں سے کچھ لوگ بھی اسے ادا کر دیں تو اسے پورے معاشرہ کی طرف سے ادا کردہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی۔
مندرجہ تبلیغ رسالت جلد پنجم۔ ص ۴۹)

میں نے اس تمام تفصیل کو اپنی کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "مسیح موعود" صاحب پر وحی کون سے "آسمان" سے نازل ہوا کرتی تھی اور وہ اس قسم کے اعلانات کے لئے کس کی طرف سے "مامور" تھے۔

اب ضمنی نکتہ کے بعد پھر آیۂ زیرِ نظر (۲/۲۱۶) کی طرف آجائیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک کام تمہیں ناگوار گزرے لیکن وہ درحقیقت تمہارے لئے موجبِ خیر ہو۔ اور ایک بات تمہیں بہت مرغوب ہو اور وہ درحقیقت تمہارے لیے شر کا موجب ہو۔ خیر و شر کی تفصیلی بحث جلد اول صفحات ۲۵۰ ؛ ۲۶۵ میں زیرِ آیت (۲/۱۹ از ۱۶) نیز جلد دوم میں (ص ۳۸ ؛ ۲۷ پر) بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" بنیادی حقیقت ہے۔ انسانی ذات کے لئے کون سے امور موجبِ خیر اور کون سے باعثِ شر ہیں، یہ وحیٔ خداوندی ہی بتا سکتی ہے؛ "عقلِ خود بیں" اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی لئے عقل کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے۔

اس آیت (۲/۲۱۶) میں کہا گیا ہے کہ جنگ کی وجہ سے بیشک تمہیں انفرادی طور پر تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مصائب برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر دشمن تم پر غالب آجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ان دشمنوں کے عزائم کے متعلق اگلی آیت میں کہا۔

۲/۲۱۷ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ - (۲/۲۱۷)

لیکن صلح ہو یا جنگ، قانونِ خداوندی کی پاسداری ہر حالت میں لازمی ہے۔ مثلاً جس مہینے میں تمہیں جنگ سے روکا گیا ہے، اس میں جنگ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ دوسری طرف، اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھو کہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکنا۔ اس کے قوانین کی صداقت سے انکار و سرکشی برتنا مسجد حرام تک میں جنگ کرنے سے باز نہ رہنا اور جو لوگ اس میں پناہ لے چکے ہوں انہیں وہاں سے نکال باہر کرنا۔ یہ جرائم بہت زیادہ سنگین ہیں۔ یہ فتنہ پردازی ہے اور فتنہ پردازی قتل سے بھی زیادہ ہلاکت انگیز نتائج کا موجب ہوتی ہے۔

اسے بھی یاد رکھو کہ یہ لوگ جو تم سے برسرِ پیکار ہیں، کبھی جنگ سے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے جب تک — اگر ان میں اس کی استطاعت ہو — تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کر دیں۔ (جنگ سے ان کا مقصد ہی یہ ہے)۔ لیکن اسے سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور حالتِ کفر میں اس کی موت واقع ہو جائے تو یہ وہ لوگ ہوں گے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ (۲/۲۶۵)۔ یہ بات کہ یہ کسی وقت دین کے صحیح راستے پر تھے، انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکے گی۔

جنگ کے سلسلہ میں مقاصد، شرائط اور ہدایات، آیات (۲/۱۹۴-۱۹۳) میں گزر چکی ہیں۔ ان میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حرمات کے مہینے کون کون سے تھے اور ان مہینوں میں حرمِ کعبہ کے گرد و پیش جنگ کی کیا صورت تھی۔ ان امور کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے

ارتداد۔ انفرادی اور قومی

علاوہ یہاں دو قسم کے ارتداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ارتداد قومی یعنی پوری کی پوری قوم کا دینِ (نظامِ خداوندی) سے برگشتہ ہو جانا، خواہ وہ دشمن کی طرف سے جبریہ ہو اور خواہ اسے وہ قوم از خود چھوڑ دے۔ اس کا انجام کیا ہوگا، اس کے متعلق سابقہ صفحات میں، استبدال و استخلافِ قومی، کے موضوع کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ ایسی قوم انعاماتِ خداوندی سے محروم رہ جاتی ہے۔

آیت (۲/۲۱۷) کے دوسرے حصے میں، انفرادی ارتداد کا ذکر ہے یعنی کوئی ایک فرد اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے۔ اس کے متعلق بھی گزشتہ صفحات میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر آیت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اگر وہ شخص دوبارہ اسلام کی طرف نہ آجائے اور حالتِ کفر ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے تمام اعمال غارت ہو جائیں گے۔ یعنی اس نے جو اعمالِ حسنہ اس زمانے میں کئے تھے جب وہ اسلام کا پابند تھا، تو ارتداد کی صورت میں وہ ان کے ثمرات سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ

اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ - (۲/۱۳۲ ، ۳/۱۰۱)۔ اس کی تشریح سابقہ صفحات میں زیرِ آیت (۲/۱۳۲) گزر چکی ہے۔ اگر ارتداد کی سزا قتل کر دینا ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ ۔ فَیَمُتۡ وَہُوَ کَافِرٌ ۔ بہرحال جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اس موضوع پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

——— (۰) ———

جنگ کے متعلق ضروری ہدایات کے بعد کہا۔

۲/۲۱۸ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَجٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ - (۲/۲۱۸)

جو لوگ نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے قیام کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہو اس سے اپنا دامن چھڑا کر آگے بڑھ جائیں۔ حتیٰ کہ اس کے لئے اگر وطن تک بھی چھوڑنا پڑے تو اُسے بھی چھوڑ دیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں اور مرتے دم تک اسی روش پر قائم رہیں (۳/۱۰۱) تو یہی لوگ ہیں جو رحمتِ خداوندی کے صحیح معنوں میں امیدوار اور مستحق ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے مضرت رساں اثرات سے ان کی حفاظت کر دیتا ہے۔ اور ان کی نشوونما کا پورا پورا سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اس آیت میں "اَلَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَجٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ" کہا گیا ہے۔ جہاد کے متعلق گزشتہ صفحات میں قتال (جنگ) کے سلسلہ میں ذکر آ چکا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ مؤمن کی زندگی، قیام و استحکام نظامِ خداوندی کے لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہنا ہے۔ اس جدوجہد میں آخری مقام وہ آجاتا ہے جہاں اسے نظامِ خداوندی کی حفاظت کے لئے سربکف اور شمشیر بدست میدانِ جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔ لیکن اس جدوجہد کا ایک گوشہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کی خاطر اُسے جو کچھ چھوڑنا پڑے، بلا تأمل و توقف اسے چھوڑنا چلا جاتا ہے۔ اسے ہجرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا آخری مقام وہ ہے جہاں اسے وطن تک بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ چونکہ (قتال کی طرح) ہجرت کے متعلق بھی بڑے غلط تأثرات قائم کئے گئے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔

ہجرت

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ (معاذ اللہ) مکہ سے جان بچا کر مدینہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اس لئے اسے (ESCAPISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہجرت کی یہ تعبیر غلط تأثرات کا نتیجہ ہے۔ یہ درحقیقت نظامِ خداوندی کے قیام کے پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کا وقوع نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں نہیں ہوا۔ قریب قریب ہر رسول کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا تھا۔

جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے، رسول کا مقصد خالی وعظ و نصیحت نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ایسے نظامِ حکومت کا قیام ہوتا ہے جس میں احکاماتِ خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظامِ حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظامِ زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جدوجہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے لیکن سرکش قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں اس کی سرتوڑ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعئ انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فریضہ عائد ہوتا تھا میں نے اُسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد، ان پیشِ نظر لوگوں تک دعوتِ حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچاتا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ممکن نہیں تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لئے مساعد ہو۔ وطن کی حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں،

وطن کا مفہوم رسولؐ کی نگاہوں میں

اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک وطن وہ ہے جس کی زمین اس ... نظامِ خداوندی کے لئے سازگار اور بارآور ہو۔ لہٰذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رُخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام، رسول کی زبان میں، "ذھاب اِلی اللّٰہ" یا "ھجرت اِلی اللّٰہ" ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ہجرت" کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ ہر اس تعلق کو جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، بلا تامل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام، مال کی محبت، اولاد سے وابستگی، رشتہ داروں سے تعلقات، دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے جو "کانٹا" بھی دامنگیر ہو، اسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے۔ اس لئے انسان وطن کی زمین میں بُری طرح پابگِل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں

کے لئے وجہِ جامعیت اور باعثِ اتحاد و اتفاق بنی۔ اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کرلی کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر قرار پاگیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے۔ جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رُخ اس بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے، تو آپ کس طرح ہر کشش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار یہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپ کے راستے میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عناں گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردّد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاعِ گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے۔ لیکن جن کی نگاہیں طبعی زندگی کی چار دیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جوہرِ خودی، شرفِ انسانیت، کلمۃ الحق، یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلاب بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آرہا ہے اور اس میں اس کی اس متاعِ نایاب کی خیر نہیں تو کہیے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردّد و تأمل، وطن کی خاردار جھاڑی کو اپنے راستہ سے الگ پھینک دے گا، اور کسی ایسے مقام کی طرف رُخ کر لے گا جہاں اس کی یہ متاعِ بے بہا محفوظ ہو جائے۔ (اور اس کی حفاظت صرف اس نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اس کا نام **ھجرت** ہے۔ حتیٰ کہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک بھی دینی پڑ جائے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہٰذا، ہجرت ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ھجرت سے مفہوم

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنئ او از تنک آبی رم است — ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآن کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و اسالیب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ سورۃ عنکبوت میں ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ۔

(۲۹/۵۶)

اے میرے بندو جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطۂ زمین میں ممکن نہیں تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجیے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو ھُوَ الْمُرَاد۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ — اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا؛ یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھیے! سورۃ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (۴/۹۷)

جو لوگ غیر خداوندی ماحول میں رہ کر اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے؟" یعنی دین کے

اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟)۔ وہ جواب میں کہتے ہیں "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے"؟ (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے) اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟" غرضیکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور (جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو) کیا ہی بری جگہ ہے!

معذورین معذرت صرف ان لوگوں کی قابلِ قبول ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں[1]۔

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَّلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۔ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۔ (۴/۹۸-۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں، اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری کو دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے، اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو:۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَّسَعَةً وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۔ (۴/۱۰۰)۔

---

[1] ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جدوجہد کریں نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کرے گا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی، اور وہ وہاں (ہر طرح کی) کشائش پائے گا (کہ معیشت کی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی) اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سرزمین نظامِ خداوندی کے لئے زیادہ سازگار ہو، اور پھر اُسے (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی موت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا)۔ اور اللہ تو (ہر حال میں) حفاظت اور سامانِ نشو ونما دینے والا ہے۔

قرآنِ کریم نے صدرِ اوّل کے مومنین کا دو زمروں میں تعارف کرایا ہے۔ مہاجرین اور انصار۔ مہاجرین وہ جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اور انصارؓ مدینہ کے وہ مومن جنھوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔ جہاں تک مجاہدین کا تعلق ہے ان میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل ہیں۔ مہاجرین میں ایک تو وہ تھے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی اور دوسرے وہ جنھوں نے اس کے بعد ہجرت کی۔ قرآنِ کریم نے ان سب کو مومنِ حقاً قرار دیا اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے بلند ترین اعزاز سے مشرف فرمایا ہے۔ تفصیل ان امور کی جلد اول صفحہ ۲۲۵ زیرِ آیت (۹/۲) اور صفحہ ۳۱۳۔ آیت (۳/۲) میں گذر چکی ہے۔ (صحابہ کبارؓ کے متعلق مزید تفصیل کے لئے میری کتاب "شاہکارِ رسالت" دیکھیئے)۔

اس مقام پر اتنا مزید سمجھ لینا ضروری ہے کہ مہاجرین اور انصار دو الگ الگ "پارٹیاں" نہیں تھیں۔ وہ ایک ہی امت کے افراد اور ایک ہی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے لئے یہ دو اصطلاحیں ان کی منفرد خصوصیات کی بنا پر استعمال کی گئی تھیں جس طرح امتِ مسلمہ کے افراد کے لئے مسلمین، مومنین، متقین وغیرہ اصطلاحات، قرآن میں آئی ہیں۔ اُمّت میں الگ الگ پارٹیوں کا تصور خلافِ اسلام اور شرک ہے۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

(۰)

اس آیت (۲۱۸/۲) میں (۱) ایمان (۲) ہجرت (۳) جہاد کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان کے

لئے ضروری ہے کہ انسان کے ہوش وحواس قائم ہوں اور وہ عقل و فکر سے پوری طرح کام لے سکے۔ اور ہجرت اور جہاد کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ محنت کا عادی اور مشقتیں برداشت کرنے کا خوگر ہو۔ اور ان سب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے گھر کی زندگی امن و سکون کی ہو۔ کیونکہ جس شخص کی گھر کی زندگی (HOME LIFE) خوشگوار نہ ہو، وہ باہر کی زندگی میں دلجمعی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم نے اگلی آیات میں انہی موضوعات سے بحث کی ہے جنہیں ہم آئندہ باب میں سامنے لائیں گے۔

ساتواں باب

درونِ خانہ

عائلی قوانین

آیات ـــــ ۲۱۹ تا ۲۵۷

۱۔ شراب۔ میسرہ۔ ازلام۔ انصاب۔ ممانعت

۲۔ قل العفو کی بحث۔
(قرآن کے معاشی نظام کی اساس)

۳۔ یتیموں کی پرورش۔ حفاظت۔ عزت

۴۔ عائلی زندگی سے متعلق قوانین

۵۔ نکاح۔ نکاح کے لئے عمر

۶۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح

۷۔ تعدد ازواج ـــ رسول اللہ کی ازواج مطہراتؓ

۸۔ طلاق۔ حلالہ

۹۔ مہر۔ جہیز

۱۰۔ عورتوں اور مردوں میں مساوات

۱۱۔ جنسی اختلاط سے مقصد۔ متعہ کی بحث

۱۲۔ النّساء حرث لکم کی بحث۔

۱۳۔ عدت۔ رضاعت۔ حضانت

۱۴۔ کمانڈر کے انتخاب کا معیار

۱۵۔ وحی۔ خدا سے ہمکلامی

۱۶۔ صفاتِ خداوندی۔ آیۃ الکرسی

۱۷۔ اولیاء اللہ

ساتواں باب

درونِ خانہ

عائلی قوانین

سابقہ باب کے آخر میں کہا گیا ہے کہ دین کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان عقل و ہوش سے کام لے۔ آیت زیرِ نظر میں ان چیزوں سے اجتناب کا ذکر ہے جس سے عقل و ہوش ماؤف ہو جاتے ہیں۔ فرمایا:-

۲/۲۱۹ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (۲/۲۱۹)

اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا:-

اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے خمر اور میسرہ کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ ان دونوں میں بہت زیادہ اثم بھی ہے اور نفع بھی۔ لیکن ان کا اثم ان کے نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ (آیت کا باقی حصہ آگے چل کر لکھا جائے گا)۔

اس میں خمر، میسرہ اور اثم کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ اثم کے متعلق جلد دوم صفحہ ۳۵۶ زیرِ آیت (۲/۸۵) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی اضمحلال، افسردگی اور تکان کے ہوتے ہیں۔ عرب، اَلْاٰثِمَۃُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تکان کی وجہ سے ایسی مضمحل ہو جائے کہ قطار میں دوسرے اونٹوں کے ساتھ قدم بقدم چلنے کے قابل نہ رہے۔ ان سے پیچھے رہ جائے۔ خود یہ لفظ بتا رہا ہے کہ خمر اور میسرہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ یعنی جو فرد ان کا عادی ہو جائے وہ دیگر افرادِ معاشرہ کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اور جو قوم ان کی عادی ہو جائے وہ سفرِ حیات میں دیگر اقوامِ عالم کے ہمدوش چلنے کی صلاحیت کو بیٹھتی ہے۔ وہ اپنی توانائیاں کھو کر مضمحل، فلہٰذا آمادہ بہ زوال ہو جاتی ہے۔ پہلے خمر کو لیجئے۔ خمر کے بنیادی

خمر معنیٰ ہیں کسی چیز کو ڈھانپ دینا۔ چھپا دینا۔ خمار ان اوڑھنیوں کو کہتے ہیں جن سے عورتیں اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیتی ہیں (اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔ دیکھئے ۲۴/۳۱) ان بنیادی معانی کی جہت سے اَلْخَمْرُ ہر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ۔ (لغات القرآن) یعنی خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ عرب عام طور پر فشردہ انگور سے شراب بناتے تھے اور اسے خمر کہتے تھے۔ اسے ہمارے ہاں شراب کہا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ خمر کے لئے شراب کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ہر اس شے کو جو پی جاتے شراب کہا جاتا ہے۔ (یعنی مشروب)

خمر (الکحل) کے متعلق دورِ حاضرہ میں اس قدر ریسرچ ہو چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ محققین متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عارضی طور پر شراب دورانِ خون میں تیزی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے ایسی بیماریوں میں جن کے علاج کے لئے دورانِ خون میں تیزی پیدا کرنا مقصود ہو، دوائی کے طور پر اسکا استعمال فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے عادۃً استعمال سے دورانِ خون کی رفتار میں جو تیزی اور اس کے بعد سستی واقعہ ہوتی ہے اس کا بہ حیثیتِ مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے قوائے عملیہ مضمحل اور آخر الامر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ شرابی کی عقل و ہوش کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا مشاہدہ ہر روز کیا جا سکتا ہے۔

قبل از اسلام عربوں کی حالت یہ تھی کہ (بقول مولانا حالیؒ) — شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی — جو قوم صدیوں سے اس کی عادی چلی آ رہی ہو، اس سے یہ دفعتہً چھڑائی نہیں جا سکتی۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اس سے

تدریجی احکام متعلق احکام تدریجاً آئے ہیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی قطعی ممانعت کے احکام قریب چار پانچ سن ہجری میں نازل ہوئے۔ یعنی مکی زندگی کے تیرہ سال اور مدنی زندگی میں سے چار یا پانچ سال (مجموعی طور پر) سترہ اٹھارہ سال میں جا کر کہیں اسے کلیتہً بند کیا گیا۔ اس ضمن میں پہلا حکم وہی نظر آتا ہے[1] جس میں کہا گیا ہے کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ دوسرا حکم وہ معلوم[1] ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

---

[1] ہم نے "نظر آتا ہے" اور "معلوم ہوتا ہے" اس لئے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم میں مختلف آیات کے زمانۂ نزول کا ذکر نہیں آیا اور روایات میں جس انداز سے اس کا ذکر آتا ہے اس سے بات واضح ہونے کے بجائے اُلٹی الجھ جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں قرآنی احکام کے تقدم و تاخر کا تعین ان کے مفہوم کی رُو سے کرنا چاہئیے۔ جیسا کہ خمر کے معاملہ میں کیا گیا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (۴۳/۴)

اے جماعتِ مومنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب بھی نہ جاؤ۔ تاآنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کہہ کیا رہے ہو؟

(حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ کی تشریحی بحث تو آگے چل کر آئے گی، یہاں صرف اتنا دیکھیئے کہ) قرآن نے کہا ہے کہ تم حالتِ سُکر میں صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ۔ اَلسُّکْرُ کے بنیادی معنی کسی چیز کو روک دینے یا بند کر دینے کے ہیں۔ اس سے یہ لفظ ہر اس کیفیت کے لئے بولا جانے لگا جس میں انسان کی عقل و ہوش کے دروازے بند ہو جائیں۔ لیکن عام طور پر اس سے مراد نشہ کی حالت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر نشہ آور چیز آجائے گی۔ اب دیکھیئے کہ مندرجہ بالا آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک ہونا تو ایک طرف ان کے قریب بھی نہ آؤ۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ تو دین (اسلامی نظام) کے پروگرام کی بنیاد ہے۔ ستون ہے۔ انہیں جب (حالتِ نشہ میں) ان میں شرکت سے روکا گیا تو اس کا عملی نتیجہ یہ ہؤا ہوگا کہ جن لوگوں کی ضبطِ خویش کی صلاحیت قوی ہوگی انہوں نے از خود خمر یا دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال سے اجتناب کر لیا ہوگا۔ صلوٰۃ جیسے اہم اجتماعات میں شرکت سے محرومی کو کون بآسانی برداشت کر سکتا تھا؟ اس سے ایسا نفسیاتی تغیر رونما ہؤا ہوگا جس سے اس قسم کی دیرینہ طبعی عادات کے چھوڑنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہوگی۔ اس قسم کے تدریجی مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر ان سے کہا گیا کہ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ (۹۰-۹۱/۵)

(سابقہ آیت میں قسموں پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قسموں پر قائم رہنا اس امر کی شہادت ہے کہ تمہارا عزم و ارادہ محکم ہے۔ تمہاری قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ بہت مضبوط ہے۔ اس سے سیرت میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ کام جس سے عقل و فکر ماؤف، حوصلہ اور ہمت پست، اور عزم و ارادہ کمزور ہو جائے اس قابل ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے) مثلاً، خمر۔ میسرہ۔ انصاب۔ ازلام (جن کا ذکر ۲/۲۱۹ میں آچکا ہے) ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ

کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں (۵/۹۱)۔ للہٰذا تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روڑا بن کر نہ اٹک جائیں۔

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اُتر آئے تو یہ چیزیں (انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گی اور قوانینِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے اور نظامِ صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔ کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہو گے۔

(انصاب اور ازلام کے متعلق گفتگو بعد میں کی جائے گی۔ یہاں اتنا دیکھئے کہ) خمر اور میسرہ کو رجس کہا ہے اور عَمَلِ الشَّیْطٰن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رِجْسٌ کے معنی ہوتے ہیں شک، تردد، التباس اور معاملات کا اس طرح گڈمڈ ہو جانا کہ صحیح بات سامنے نہ آسکے۔ الجھاؤ (CONFUSION) پیدا ہو جانا۔ اس قسم کے شکوک و التباس کا فطری نتیجہ اضطرابِ قلب ہوتا ہے۔ اس لئے رجسٌ میں یہ سب کچھ آجاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے معانی خود واضح کر دیئے ہیں جہاں کہا ہے کہ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰/۱۰۰) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر (CONFUSION) طاری رہتی ہے۔ ان کے سامنے معاملات گڈمڈ رہتے ہیں۔ کوئی بات صاف اور نکھری ہوئی نہیں ہوتی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے خمر کے استعمال کا نتیجہ جو رجس بتایا ہے تو اس سے کیسی عمیق حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

پھر اسے "عمل الشیطان" بتایا ہے۔ اس سے تو قرآن نے شرابی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ شیطنت کے معنی شعلوں کا بھڑک اٹھنا۔ شدت پیدا ہو جانا۔ سرکش ہو جانا۔ انانیت کا مجسمہ بن جانا وغیرہ ہوتے ہیں۔ شراب کے نشہ کا فطری نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ شراب کے نشہ میں دُھت انسان اپنے آپ کو "میں" نہیں کہتا۔ "ہم" کہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس حالت میں اس کا (EGO) کس قدر دیو ہیکل اور جناتی ہو جاتا ہے۔ وہ شخص ہمہ تن الیغو بن جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ انانیت اور سرکشی ہوتا ہے۔ یعنی وہ عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے اور ہمہ تن شعلہ صفت انانیت کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ باہمی بغض و عداوت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ پھر کہاں کا ذکر اللہ اور کہاں کی صلوٰۃ۔

یہ سب کچھ گنانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا کہ بتاؤ کیا تم اس کے بعد بھی اس بدعادت کو نہیں چھوڑو گے؟ ان میں سے کون ہو گا جو اس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کرے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جماعتِ مومنین سے اس

کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا!

ہمارے ہاں کے بعض کٹ حجتیے (یعنی جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور وہ دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔) اکثر کہا کرتے ہیں کہ شراب کو خدا نے "حرام" قرار نہیں دیا اس لئے اس کا پینا کچھ ایسا سنگین جرم نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے حلال اور حرام کو (علاوہ اخلاقی خبائث کے) کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رکھا ہے (لحم خنزیر۔ مردار۔ دم مسفوح۔ غیر اللہ کی طرف منسوب اشیاء)۔ شراب (خمر) چونکہ کھانے پینے کی اشیاء (غذا یا خوراک) میں داخل نہیں اسی لئے اسے اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ باقی رہی اس کی ممانعت تو جس چیز کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہو کہ وہ

(۱) رجس ہے۔

(۲) شیطانی فعل (عمل الشیطان) ہے۔

(۳) اس سے باہمی بغض اور عداوت پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) یہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔

(۵) اس سے قوائے عملیہ اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مضمحل ہو جاتی ہیں۔

اور اس کے بعد کہا کہ اس سے اجتناب کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم فلاح نہیں پا سکو گے۔ اور آخر میں کہا کہ بتاؤ! تم اسے چھوڑنے ہو یا نہیں ـــ ھل انتم منتھون؟

فرمائیے کہ اس کے خلافِ اسلام قرار دیئے جانے کے لئے اور کون سے الفاظ کی ضرورت تھی؟ لفظ حرام میں کون سا بم پوشیدہ ہے جس سے ڈر کر شراب کے رسیا اسے چھوڑ دیتے۔ قرآنِ کریم نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے۔ (۳۳/۷)، ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کے بعد' بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں؟ سو سوال الفاظ کا نہیں سوال ایمان کا ہے۔ جس شخص کا اس پر ایمان ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے۔ وہ انہیں چھوڑ دے گا، خواہ اس کے الفاظ کوئی سے بھی کیوں نہ آئے ہوں۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم نے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں ہر نشہ آور شے آجاتی ہے۔ اسلامی مملکت جب اسے قانوناً ممنوع اور اس کے استعمال کو جرم قرار دے گی تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔ اسے (DEFINE) کرے کہ خمر سے مراد کیا ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔ اصولاً جب بھی کسی شے یا عمل کو قانونی حیثیت دی جائے تو اس کا (DEFINE) کرنا قانونی تقاضا ہوتا ہے۔ مجھے

اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ حال ہی (۱۹۷۷ء) میں حکومتِ پاکستان نے شراب کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور اس کے استعمال کو مستوجب سزا و جرم ٹھہرایا ہے لیکن انہوں نے اسے (DEFINE) نہیں کیا کہ شراب سے مراد کون سی شے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اس قانون کی خلاف ورزی کے احکامات عدالت کے سامنے آئیں گے تو وہاں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ ہے کیا؟ محض شراب کہہ دینے سے تو قانونی تقاضا پورا نہیں ہوسکے گا۔ قرآنِ کریم نے جن امور کی تفصیل خود بیان نہیں کی، ان کی تفاصیل کا تعین اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

یہ تو رہی اس کی قانونی حیثیت۔ جہاں تک اس کی معنویت کا تعلق ہے اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ خمر وہ ہے جس سے انسان کی عقل و فکر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مسلوب یا مضمحل ہو جائے۔ آپ سوچئے کہ اس میں کیا کیا باتیں نہیں آجاتیں۔ سب سے پہلے تو "مذہب" ہے جس میں سوچنے سمجھنے کو گناہ اور ابلیس کی روش قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں ہر عقیدہ کو بلا سوچے سمجھے ماننا اور اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہوتا ہے۔ کیا یہ چیز خمر کی معنویت میں شامل نہیں ہو جاتی؟ ـــــ بلکہ اس سے بھی شدید تر شکل میں! نشہ کی حالت میں عقل و فکر عارضی طور پر معطل ہوتی ہے لیکن "مذہبیت" میں یہ صلاحیتیں مستقلاً مفلوج ہو جاتی ہیں۔

مذہب سے آگے بڑھیئے تو کیا دولت کا نشہ، حکومت اور اقتدار کا نشہ، لیڈر شپ کا نشہ ـــ انسانوں کو بدمست اور مدہوش نہیں کر دیتا؟

قرآنِ کریم نے ان تمام نشوں کو خلافِ شرفِ انسانیت فلہٰذا عمل الشیطان قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم میں

جنت کی شراب

نعمائے جنت کے ضمن میں شراب کا لفظ بھی آیا ہے اور ایک جگہ خمر کا بھی۔ عربی زبان میں شراب ہر پینے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔ یعنی مشروب۔ قرآنِ مجید نے اس کے لئے طہور کے لفظ کا اضافہ کر کے بتا دیا کہ یہ مشروبات بھی پاکیزہ ہوں گے (۲۱/۷۶ ؛ ۵۱/۳۸)۔ سورہ محمد میں : اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ آیا ہے۔ (۱۵/۴۷)۔ لیکن وہاں بات ہی یوں شروع کی گئی ہے: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ.... (۱۵/۴۷)۔ "جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو....." اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب بیان تمثیلی ہے۔ حقیقی نہیں۔ اس لئے ان الفاظ کے معنی مجازی لینے چاہئیں نہ کہ حقیقی۔ اس تمثیلی بیان کی وضاحت بھی یہ کہہ کر کر دی کہ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ۔ (۲۳/۵۲)۔ ان مشروبات سے نہ تو کوئی لغویات ظہور میں آئے گی اور نہ ہی اضمحلال پیدا ہوگا۔ دنیاوی شراب (خمر) کا نتیجہ تو اثم بتایا تھا (۲/۲۱۹)؛

جنت کے مشروبات کے متعلق یہ کہہ کر کہ ان کا نتیجہ اثم نہیں ہوگا انہیں دنیاوی مشروبات سے متمیز کر دیا۔ (جنت کے تمثیلی بیان کے متعلق جلد اول صفحہ ۳۳۲ زیر آیت (۲/۲۵) بحث ہو چکی ہے)

(۰)

اور آخر میں وہ نکتہ جسے ہم نے شروع میں منتظر وضاحت رکھا تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقۡرَبُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمۡ سُكَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَعۡلَمُواْ مَا تَقُولُونَ۔ (۴/۴۳)

اے جماعتِ مومنین! تم حالتِ نشہ میں صلوٰۃ کے قریب تک نہ جاؤ۔ تاآنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

اس کے اولین مخاطب عرب تھے۔ اس لئے وہ نشہ کی حالت میں اذکارِ صلوٰۃ کے الفاظ تو (اپنی زبان میں) بولتے تھے لیکن (نشہ کی وجہ سے) ان الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا، اس حکم کا مفہوم یہ ہوا کہ جس شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ نماز میں جو الفاظ بول رہا ہے ان کا مفہوم کیا ہے، اس کا نماز پڑھنا بے معنی ہے۔ اسے اس سے روک دیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ہمارے ہاں جو نمازیں (عام طور پر) پڑھی جاتی ہیں ان میں نمازی کو معلوم ہی نہیں ہوتا جو الفاظ وہ بول رہا ہے ان کا مفہوم کیا ہے۔ کیا وہ بھی اس ذیل میں نہیں آتیں؟ ان الفاظ کا دہراتے رہنا جن کا مفہوم اور مطلب انسان نہیں سمجھتا، کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اس کا اطلاق بلا سمجھے قرآن مجید کی تلاوت پر بھی ہوگا۔ اس کے متعلق جلد دوم صفحہ ۳۳۹ زیر آیت (۲/۷۸) بات ہو چکی ہے۔ محض الفاظ کے (بلا سمجھے) دہرانے میں کوئی تاثیر مضمر سمجھنا (خواہ اس کا نام ثواب ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) سحر کی بنیاد ہے۔ اس کے متعلق جلد دوم زیر آیت (۲/۱۰۲) صفحہ ۴۰۳ پر بڑی تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

بلا سمجھے نماز

مقصود اس تنبیہ سے یہ ہے کہ قرآن کریم اُسی فریضہ کی ادائیگی کو قابلِ قبول اور نتائج خیز قرار دیتا ہے جس میں "تَعۡلَمُواْ مَا تَقُولُونَ" کی شرط پوری ہوتی ہو۔ یعنی جو کیا جائے اس کا مطلب سمجھ میں آرہا ہو۔

(۰)

آیت زیر نظر (۲/۲۱۹) میں کہا گیا تھا کہ يَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡخَمۡرِ وَٱلۡمَيۡسِرِ۔ خمر کی بات ہو چکی۔ اب میسرہ کی طرف آئیے۔ اس کا مادہ (ی۔ س۔ ر) ہے جس کے معنیٰ سہولت یا آسانی کے ہیں۔ یہیں سے لفظ یَسَار ہے جس کے معنیٰ بائیں ہاتھ کے ہیں۔ ہمارے ہاں جو کہتے ہیں کہ"

مَیسرہ

یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔ اس سے میسرہ کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی وہ دولت جو محنت و مشقت کے بغیر آسانی سے ہاتھ آجائے۔ اس میں سارا نظامِ سرمایہ داری آجاتا ہے جس میں محنت اور مشقت کوئی اور کرتا ہے، اور سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ کے بل پر بلا محنت و مشقت اس کے ماحصل کو سمیٹ کر لے جاتا ہے۔ اس قسم کی تمام دولت" میسرہ" کے ضمن میں آجاتی ہے۔ قرآن اُس یُسر کو جائز قرار دیتا ہے جو عُسر (محنت مشقت) کے بعد حاصل ہو۔ (۹۴/۵-۶) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۵۳/۳۹) کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل ہی کا حقدار ہے۔

لیکن عرب اس لفظ (میسرہ) کو جوئے (قمار بازی) کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں یعنی عقل و فکر کا ماؤف ہوجانا اور بلا محنت و مشقت دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ جوئے میں عقل و فکر کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسے (GAME OF CHANCE) کہتے ہیں۔ (CHANCE) کے معنی ہوتے ہیں وہ جس میں انسانی تدبیر یا عقل و فکر کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ محض اتفاقیہ ہاتھ آجائے۔ اس سے خمر کا تعلق واضح ہے۔ یہ تو خمر کے نشہ سے کہیں بڑھ کر مدہوش کن ہوجاتا ہے۔ یہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے عرب اسے قمار[1] کہتے تھے۔ یعنی جنون۔ قمار باز کا جنون دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے — اور اس کا جذبہ؟ بلا محنت و مشقت دوسرے کی دولت حاصل کرلینا — قرآن کریم نے سود خوار کے متعلق کہا ہے کہ اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ مخبوط الحواسی کے عالم میں مضطرب و بیقرار ہو (کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ ۲/۲۷۵) یہی حالت جواریئے کی ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کا مال چھیننے کی ہوس میں پاگل ہو رہا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے خمر اور میسرہ دونوں کو ایک زمرہ (CATEGORY) میں رکھا ہے۔ اس ضمن میں آیات (۵/۹۰-۹۱) دیکھیے جو خمر کے ضمن میں پہلے درج کی جاچکی ہیں۔ ان سے انسان حواس باختہ ہوجاتا ہے۔ یہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ہیں۔ ان سے باہمی بغض و عداوت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ کے راستے میں روک بن کر حائل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔

آیات (۵/۹۰-۹۱) میں خمر اور میسرہ کے علاوہ انصاب اور ازلام کا بھی ذکر آیا ہے۔ انصاب کی تو قرآن کریم

انصاب

نے یہ کہہ کر وضاحت کردی مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ۔ (۵/۳) جو کچھ غیر اللہ کے استھانوں پر

---

[1] قمار قمر سے ہے جس کے معنی چاند کے ہیں۔ قمر (چاند) کے ساتھ جنون کا تعلق بڑا قدیمی ہے۔ انگریزی زبان میں LUNATIC کا لفظ اسی پر شاہد ہے۔

چڑھاوا چڑھانے کے لئے ذبح کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر اللہ کی طرف نسبت سے یہ شرک ہوگا۔ لیکن آپ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس میں بھی خمر اور میسرہ کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ چڑھاوے چڑھانے میں عقل و فکر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اندھی عقیدت کارفرما ہوتی ہے اور چڑھاوے بیشتر اس مقصد کے لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ آپ کی مراد محنت و مشقت کے بغیر پوری ہو جائے۔ چڑھاوا بھی قمار باز کا پھینکا ہوا پانسہ ہوتا ہے کہ یا تو جو کچھ ہاتھ سے دیا ہے وہ بھی جاتا رہا اور یا وہ گوہرِ مراد ساتھ لے کر واپس آیا۔ قرآن کریم نے اسے بھی ممنوع قرار دیا ہے۔

ازلام وہ تیر تھے جن سے عرب قرعے ڈالتے، فالیں لیتے اور چڑھاوے کا گوشت تقسیم کرتے تھے۔ فالیں لینے اور قرعے ڈالنے میں بھی خمر اور میسرہ کا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ یعنی عقل و فکر سے کام نہ لینا، اور محض اتفاقات (CHANCES) کی رُو سے فیصلے کرنا۔ قرآن کریم کا پیش کردہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ جو معاملہ درپیش ہو انسان اس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے۔ عقل و فکر کی رُو سے اس کے ہر پہلو پر غور کرے اور اس کے بعد قرآن کریم کی روشنی میں اس کے متعلق فیصلہ کرے۔ قرآن کریم نے عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنم کے کندے اور حیوانات سے بدتر قرار دیا ہے (۱۷۹/۷)۔ لیکن قرآن کو سر آنکھوں پر رکھنے اور ایک ایک رات میں اسے دہرانے والی قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے فیصلوں کے لئے قرعے ڈالتی، لاٹریاں نکالتی، فالیں لیتی اور استخارے کرتی ہے۔ خمر اور میسرہ کو تو سخت معیوب اور مذموم سمجھا جاتا ہے لیکن فالیں لینے اور استخارے کرنے کو نہایت مقدس قرار دیا جاتا اور جن کی طرف ان مقاصد کے لئے رجوع کیا جاتا ہے، انہیں روحانیت کے مقامِ بلند پر فائز خیال کیا جاتا ہے — اس کے بعد کمیشن بٹھائے جاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ کیا قرآن مجید نے ان تمام امور کا نتیجہ اثم قرار دے کر قوموں کے زوال کے بنیادی سبب کی پردہ کشائی نہیں کر دی؟ یعنی یہ تمام امور ایسے ہیں جن سے قوائے فکریہ اور عملیہ مفلوج اور مسلوب ہو جاتے ہیں۔

میسرہ، ازلام، قرعے، فالیں اور استخارے تو پھر بھی کبھی کبھی کرائے جاتے ہیں۔ عقل و فکر کو ماؤف کرنے کا ان سب سے بڑھ کر ایک اور عقیدہ ہے اور وہ ہے عقیدۂ تقدیر جس کی رو سے نہ انسان کی عقل و فکر کچھ کام دے سکتی ہے نہ محنت و مشقت کچھ فائدہ۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے از خود مل جائے گا اور جو کچھ تقدیر میں ہے خود بخود ہوتا جائیگا۔ ہمارا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

کیا اس عقیدہ کا فطری نتیجہ شدید ترین قسم کا اثم (اضمحلال) نہیں ـــ عقل و فکر کے لئے بھی اثم اور سعی و عمل کے لیے بھی اثم۔

لیکن خمر اور میسرہ گناہِ عظیم اور قابلِ تعزیر جرم ، اور تقدیر کا عقیدہ جزوِ ایمان[1]۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادہ   کہ افتاد است از بامِ بلند ے

(۰)

اس کے بعد آیت (۲/۲۱۹) کا باقی حصہ لیجیے۔ پوری آیت یوں ہے۔

۲/۲۱۹ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ (۲/۲۱۹)

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام کی راہ میں کون کون سی چیزیں حائل ہوتی ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی اصولی بات یہ ہے کہ جو چیز بھی انسان کی عقل و خرد کو ماؤف کرکے اس کے قوائے عملیہ کو مضمحل کر دے، وہ اس نظام کی راہ میں موانعات میں سے ہے ـــ ہر نشہ آور چیز اور وہ دولت جو بلا محنت و مشقت مل جائے (جس میں قمار بازی بھی شامل ہے) اس کی تین مثالیں ہیں۔ ان میں اضافی طور پر منافع بھی ہے۔ لیکن ان سے انسانی ذات میں ایسی افسردگی، سہل انگاری، سستی اور اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے جو اُسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتا۔ یہ نقصان ان چیزوں کے عارضی نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہلاکت انگیز ہے۔

لہٰذا، مفت میں ہاتھ آجانے والی دولت کے پیچھے نہ پڑو۔ اپنی محنت سے کماؤ (۵۳/۳۹)۔ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے اپنے لئے رکھو، اور جس قدر ان سے زائد ہو، سب کا سب، نوعِ انسان کی پرورش کے لئے، کھلا رکھو (تاکہ نظامِ خداوندی اُسے ضروری مصرف میں لا سکے)

---

[1] عقیدہ تقدیر کے متعلق جلد اول میں بڑی تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۵۴ ; ۱۸۰-۱۸۴ ; ۲۷۴۔ میری کتاب "کتاب التقدیر" تو ہے ہی اس موضوع پر۔

اس طرح خدا اپنے احکام و قوانین کو تمہارے لئے واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو، اور سوچو کہ تمہارا حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) دونوں کس طرح روشن ہو سکتے ہیں۔

سطح بین نگاہوں کو اس آیت کے مختلف احکام میں کوئی ربط دکھائی نہیں دے گا۔ یہی نہیں کہ انہیں کوئی ربط دکھائی نہیں دے گا، وہ یہ بھی کہہ دیں گے کہ اس میں بڑی اَن جوڑ باتیں ہیں۔ خمر اور میسرہ اور ان کے ساتھ العفو (انفاق) ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے اس قسم کے اعتراضات سطح بینی پر مبنی ہیں۔ سطح سے ذرا نیچے اتر دیکھا جائے تو سارا قرآن مربوط نظر آئے گا۔ اس کی محسوس شہادت خود مطالب الفرقان آپ کے سامنے ہے۔ جلد اول میں قرآن کا معاشی نظام بڑی وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھیے۔ ۲/۱ صفحہ ۱۰۵ نیز ۲/۲۲ صفحہ ۲۹۲) اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظام کی آخری شکل یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ (جماعتِ مومنین کے افراد) پوری پوری تندہی سے محنت کرتے اور اس کے ماحصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی سب بطیبِ خاطر دوسرے ضرورت مندوں کے لئے نظامِ معاشرہ کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔

العفو کا مفہوم

العفو کے یہی معنیٰ ہیں۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد جتنا ہے وہ سب کا سب۔ زیرِ نظر آیت کے پہلے حصہ میں خمر اور میسرہ سے روکا گیا ہے۔ خمر کا نتیجہ عقل و ہوش کا سلب کر لینا ہے اور میسرہ اس ہوسِ زر کا مظہر جس کی رُو سے انسان چاہتا ہے کہ محنت مشقت کیے بغیر دوسروں کی دولت کو ہتھیا لیا جائے۔ قرآنِ کریم اس کے برعکس انسان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔ اور ایسا کچھ پاگلوں کی طرح نہیں، بلکہ بقائمی ہوش و حواس، عقل و بصیرت کی رُو سے دل و دماغ کی کامل رضامندی کے ساتھ کرے۔ آپ نے دیکھا کہ العفو کی نفسیات کس طرح خمر اور میسرہ کی کیفیت کی ضد ہے۔ خمر اور میسرہ سے اجتناب، انسانی کردار کا منفیانہ پہلو ہے۔ یعنی اس قسم کی ذہنیت پیدا نہ ہونے دینا اور العفو اس کا مثبت پہلو ہے یعنی ایسی ذہنیت پیدا کرنا۔ پہلا گوشہ حصّہ لا ہے اور دوسرا گوشہ حصّہ اِلّا۔ جب تک اوّل الذکر ذہنیت کو چھوڑا نہیں جائے گا ثانی الذکر (مثبت) ذہنیت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ یہ کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ (۲/۲۵۶) کے عملی مظاہرے ہیں۔ جب تک مفت دولت ہاتھ آجانے کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں آئے گی، اپنی محنت کی کمائی کو بطیبِ خاطر دوسروں کو دے دینے کی ذہنیت پیدا نہیں ہوگی۔ یہ وجہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اور اسلام یک جا نہیں رہ سکتے۔

(۰)

دوسروں کے مال و دولت کو بلا کھٹکے ہضم کر لینے کی آسان ترین شکل ان یتیموں کا سرپرست بن جانا ہے جو

صاحبِ جائیداد یا مال دار ہوں۔ ان کا سرپرست بننے میں دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ معاشرہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ شخص یتیموں، لاوارثوں کی پرورش کرتا ہے اس لئے مستحق تعریف و توصیف ہے اور وہ ان لاوارثوں کا مال اس طرح خورد برد کرتا رہتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ قرآنِ کریم نے اگلی آیت میں اسی سوال کو لیا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال تک آئیں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے عقل و فکر پر جس قدر زور دیا ہے اور غور و تدبر کی جس قدر تاکید کی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غور و فکر کا دائرہ دنیاوی امور تک محدود ہے۔ مابعد الطبیعاتی مسائل (MATAPHYSICS) اس کی حدود سے ماوراء ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مابعد الطبیعاتی امور محسوسات کے دائرے میں نہیں آتے، اس لئے مادی اشیاء کی طرح ان کا حواس (SENSES) کے ذریعے احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان کے متعلق بھی غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ آیت (۲۱۹ ۲) میں خمر، میسر، انفاق جیسے امور زیرِ بحث آتے ہیں جن کا

امورِ آخرت میں غور و فکر

تعلق (نظر بظاہر) صرف مادی دنیا سے ہے۔ اس لئے ان کے متعلق مادی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان کا تعلق انسان کی اُخروی زندگی سے بھی ہے۔ اس لئے کہ ان سے مقصد انسانی ذات کی نشو و نما سے ہے اور انسانی ذات کا دائرہ اسی دنیا تک محدود نہیں۔ اس سے آگے بھی جاتا ہے جسے حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں۔ آیت (۲۱۹ ۲) کے آخری الفاظ اور آیت (۲۲۰ ۲) کے ابتدائی الفاظ کو ملا کر پڑھیئے تو بات یوں سامنے آئے گی کہ۔۔۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

اس طرح اللہ اپنے احکام کو نہایت وضاحت سے نکھار کر اور ابھار کر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کر سکو۔

مذہب، بنیادی امور میں بھی غور و فکر کو ممنوع قرار دیتا ہے اور دین (قرآنِ کریم) دنیاوی امور ہی میں نہیں، اُخروی امور تک میں غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔

(۰)

اس کے بعد آیئے اگلی آیت کی طرف۔

۲/۲۲۰ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۚ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۚ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲/۲۲۰)

یہ نظام ہر ضرورتمند کی دستگیری کرے گا۔ ان میں خصوصیت سے وہ لوگ سامنے آتے ہیں جو دنیا میں بے یار و مددگار رہ جائیں ـــ ان میں وہ بچے بھی شامل ہیں جن کے ماں باپ مرجائیں ـــ ان کے معاملات کو سلجھانا موجبِ خیر ہے۔ اگر تم ان سے مل جل کر رہتے ہو یا ان کے معاملات میں شرکت کرتے ہو تو ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ یاد رکھو! ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے کون اصلاح چاہتا ہے اور کس کی نیت میں فتور ہے۔ تمہیں یہ واضح ہدایات اس لئے دی گئی ہیں کہ تمہارے لئے اصلاح کا راستہ آسان ہو جائے۔ اگر اس کا قانونِ مشیت ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہیں اس قسم کی ہدایات نہ دیتا اور اس سے تم مشکل میں پھنس جاتے۔ لیکن خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے۔ (۲/۱۸۵)

لیکن آسانیوں کے یہ معنی نہیں کہ تم جو چاہو کرو۔ تم پر کسی کا کنٹرول ہی نہ ہو۔ خدا کا قانونِ مکافات، ہر بات پر پورا غلبہ رکھتا ہے اگرچہ اس کا یہ غلبہ عین حکمت پر مبنی ہے۔

یتیموں کے متعلق احکام

لفظ یتیم کے متعلق جلد دوم صـ۳۴۹ زیر آیت (۲/۸۳) میں بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے ہاں یتیم صرف ان بچوں کو کہتے ہیں جن کے ماں باپ مرچکے ہوں لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ اس میں یتیم ہر اس فرد کو کہتے ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ اس تنہائی کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی لق و دق صحرا میں اکیلا ہو۔ قرآنِ کریم کی رو سے وہ یتیم ہے جو بھرے معاشرہ میں، سینکڑوں، ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں، اپنے آپ کو تنہا پائے۔ نہ کوئی اس کا پرسانِ حال ہو نہ یار و مددگار۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے بڑی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵) یعنی وہ جو اتنے لوگوں سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو یتیم (تنہا) پائے۔ آپ قرآن کریم کی اس نادر اصطلاح پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہمارے (اور دنیا بھر کے) موجود (غلط) معاشرے میں کس طرح ہر شخص اپنے آپ کو بھرے معاشرہ میں یتیم محسوس کرتا ہے!

یتیمی کا درد وہی محسوس کرسکتا ہے جس پر خود یہ بیتی ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ کے متعلق ہدایات اور احکام دینے سے پہلے حضور نبی اکرمؐ سے کہا کہ آپ تو جانتے ہیں کہ یتیم کیا ہوتا ہے اور یتیمی کا درد کسے کہتے ہیں کیونکہ

آپ پر خود یہ دور گزر چکا ہے۔ فرمایا: اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَـاٰوٰی۔ (۹۳/۶) "کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے تجھے یتیم پایا، توحفاظت اور پناہ کا سامان مہیا کر دیا؟" اس میں دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ (تاریخ کی رو سے) حضورؐ کے والدین ابتدائی عمر میں فوت ہو گئے تھے۔ اس لئے

رسولؐ اللہ کی یتیمی

آپؐ عرفِ عام میں یتیم ہو گئے تھے۔ دوسرے اس میں حضورؐ کے زمانہ قبل از ہجرت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جب آپ کے لئے مکہ میں پناہ کی کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ "فَاٰوٰی" (خدا نے تمہارے لئے حفاظت اور پناہ کا سامان فراہم کر دیا) سے مدینہ کی "پناہ گاہ" کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کے لئے جو کچھ کیا تھا اُسے اٰوَوْا وَّ نَصَرُوۡۤا (۸/۷۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرحال، صورت کوئی بھی ہو، حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ آپؐ تو خود یتیمی کی منزل سے گزر چکے ہیں اس لئے: فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ (۹۳/۹)۔ یتیموں پر کسی قسم کی سختی نہیں کرنی چاہیئے۔

زیرِ نظر موضوع میں دونوں قسموں کے یتیموں کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ یعنی ان بچوں کے متعلق بھی جن کے ماں باپ مر چکے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بھی جو (بلا لحاظِ عمر) اپنے آپ کو معاشرے میں بے یار و مددگار تنہا پائیں۔ پہلے اول الذکر کو لیجیے۔

سورۃ انعام میں ہے:-

وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ۔

(۶/۱۵۲ نیز ۱۷/۳۴)

یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، اِلّا یہ کہ خود ان کے فائدے، اور نگہداشت کے لئے عمدہ طریق سے کچھ خرچ کرنا پڑے۔ یہ بھی اس وقت تک کہ وہ جوانی کی عمر کو نہ پہنچیں۔ (۶/۱۵۲؛ ۱۷/۳۴)

یہاں "اَشُدَّهٗ" کہا (یعنی جوانی کی عمر)۔ دوسری جگہ اسے "نکاح کی عمر — بلوغت" سے تعبیر کیا ہے۔

وَابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ وَلَا تَاۡكُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ یَّكۡبَرُوۡا وَمَنۡ كَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ وَمَنۡ كَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیۡبًا۔[1] (۴/۶)

(۱ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳۰ پر)

اور یتیموں کی بھی صحیح تربیت کرو۔ اور ان کی جانچ پڑتال کرتے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشو و نما ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سن بلوغت ۶/۱۵۲؛ ۱۷/۳۴؛ ۴۶/۱۵) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں عقل کی پختگی نظر آئے تو ان کا مال انہیں واپس دے دو (اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر ۵/۴ کے مطابق کرو) اور اس خیال سے کہ وہ اب سنِ بلوغت کو جلد پہنچ جائیں گے اور ان کا مال انہیں واپس دینا ہوگا۔ فضول خرچی کر کے ان کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے مال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا معاوضہ، سو تم میں سے جو ضرورتمند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہیئے لیکن جو ضرورتمند ہو (یعنی ان کی جائیداد کے انتظام کے لئے اسے جو وقت صرف کرنا پڑے، اس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگ دست ہو جاتے) تو وہ قاعدے اور قانون کیمطابق حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو تو اس پر گواہ لے لیا کرو۔ اور حساب فہمی کے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لینے والا ہے۔

اس سے ذرا پہلے ہے:۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۔ (۴/۲)

یتیموں کا مال و اسباب بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں اپنی نکمّی چیزوں سے بدل لو۔ ان کا مال الگ رکھو، اپنا مال الگ۔ ان کے مال میں خُرد بُرد کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے (اور جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے) ان کا مال انہیں بحفاظت لوٹا دو۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل احکام کی شدت ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے کہا کہ تقسیم وراثت کے وقت اگر کوئی ایسے یتیم بچے سامنے آجائیں جن کا ترکہ میں کوئی حصہ نہ ہو تو ازرہِ تلطف انہیں بھی کچھ دے دو اور نرمی سے سمجھا دو کہ اصل پوزیشن کیا ہے:۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ

لہ (فٹ نوٹ ۳۲۹) ان آیات میں "بلغوا النکاح" اور "اشدّہ" کے الفاظ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کیونکہ (آگے چل کر) عائلی قوانین کے سلسلہ میں ان سے بڑا اہم نکتہ مستنبط ہوگا۔

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔ (۴/۸)

اگر تقسیم وراثت کے وقت ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصہ نہ ہو یا دوسرے یتیم اور مساکین، تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور مناسب طور پر سمجھا دو کہ ترکہ کی تقسیم قانون اور قاعدے کے مطابق ہو گی جس کی رُو سے انہیں بطور حق کچھ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ انہیں دیا گیا ہے، محض ان کی دلجوئی کی خاطر ہے۔

اس کے بعد ہے:-

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا۔ (۴/۹)

ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیئے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جاؤ تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ ان سے بے انصافی ہو۔ لہٰذا تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف، سیدھی اور محکم ہو۔

اور پھر وہ وعید جس کی رُو سے کہا کہ

اِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔ (۴/۱۰)

یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذباتِ حرص و ہوس اور بھڑک اُٹھتے ہیں۔ ان کی نیت نہیں بھرتی اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی انسانی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم نے جہاں احسان کا حکم دیا ہے ـــ یعنی دوسروں کی کمی پوری کرنے کا۔ اس میں یتیموں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (۲/۸۳؛ ۴/۳۶)"، والدین، ذی القربیٰ۔ یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔" دوسری جگہ کہا کہ اصل کشاد کی راہ یہ ہے کہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى (۲/۱۷۷؛ ۲/۲۱۵) "مال کی محبت کے علی الرغم اسے یتامیٰ وغیرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیا جائے۔" حتیٰ کہ مالِ غنیمت[۱] کے خمس (پانچویں حصہ) کے متعلق کہا کہ

[۱] ان امور کی تفصیل متعلقہ مقامات پر آئے گی۔

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۔ (۸/۴۱ ; ۵۹/۷)

یاد رکھو! میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ "خدا اور رسول" — یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لئے رکھ کر باقی ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا — مثلاً (میدانِ جنگ میں جانے والوں، اور کام آجانے والوں کے) اقرباء کے لئے یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے۔ ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔ نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔

(۰)

بے یار و مددگار

اب یتیمی کی دوسری صورت کی طرف آئیے۔ یعنی معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے۔ اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کرنے والے۔ دیکھیے، اس باب میں قرآنِ مجید کن کن گوشوں سے حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ سورۃ الفجر میں ہے کہ انسان بڑا عجلت پسند اور تلوّن مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَكْرَمَنِ ۔ (۸۹/۱۵) جب اس کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی دین ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت و آسائش عطا کر دیتا ہے "۔ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ ۔ (۸۹/۱۶) جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق، بلاوجہ، ذلیل و خوار کر دیا" یعنی بلا استحقاق آسائشیں حاصل ہو جائیں تو اسے قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا لیکن اگر (بزعمِ خویش) بلا سبب تنگی آجائے تو اس پر چیخنے لگ جاتا ہے۔ اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ خدا کے متعلق تمہارا یہ تصور غلط ہے۔ اس کے ہاں تمام فیصلے قاعدے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہاں سے نہ کسی کو بلا استحقاق کچھ ملتا ہے[1]، نہ بلا سبب چھینا جاتا ہے۔ لہٰذا، تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے

[1] نبوت اس سے مستثنیٰ تھی۔ یعنی وہ کسی کو حق کے طور پر نہیں ملتی تھی۔ وہ خدا کی موہبت ہوتی تھی۔ لیکن اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

کہ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا، جس میں ان لوگوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا، ان کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا، جو تنہا رہ جائیں۔ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ - (۸۹/۱۷)

غور کیجیے کہ یہاں قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں کس قدر عظیم حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔ عہدِ قدیم کا وحشی ابنِ آدم ہو یا دورِ حاضرہ کا مہذب انسان۔ اس کے ہاں معیار یہ چلا آرہا ہے کہ عزت اس کی ہوتی ہے جس کا جتھہ بڑا ہو۔ جس کی پارٹی مضبوط ہو۔ عزت تو ایک طرف۔ عہدِ حاضر کے نظامِ جمہوریت میں حق و باطل تک کا معیار اکثریت اور اقلیت قرار پاتا ہے جس پارٹی کی اکثریت ہو اقتدار بھی اس کا حق اور فیصلے بھی اس کے مبنی بر عدل و صداقت۔ اقلیت کو اس کے تابع فرمان رہنا پڑتا ہے۔ جب معاشرہ میں اقلیت کی یہ کیفیت ہو تو ظاہر ہے کہ جو شخص تنہا رہ جائے، جس کے دست و بازو نہ رہیں۔ اسے کون پوچھے گا؟ ایسے شخص کو قرآن نے "یتیم" کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ جس معاشرہ میں یتیم کی عزت نہ ہوتی ہو وہ آخر الامر تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سورۃ البلد میں اس نے اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دین کے نظام میں

قرآن کا معاشی نظام

بے شک قوم کو سرفرازیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان سرفرازیوں کے لئے ایک تو بڑی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے ان تک بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ اس نے اسی لئے اُسے العقبة کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ اس کے بعد کہا کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ (۹۰/۱۲) تم خود نہیں سمجھ سکتے کہ "العقبة" کیا ہے۔ آؤ تمہیں ہم سمجھائیں کہ العَقَبَةُ کیا ہے۔ فَكُّ رَقَبَةٍ - (۹۰/۱۳) دنیا سے غلامی اور محکومی کی لعنت کو ختم کرنا۔ ہر محکوم اور غلام کی گردن میں پڑی ہوئی زنجیر کو کاٹ پھینکنا۔ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ - (۹۰/۱۴)۔ جس زمانے میں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور اس طرح غریبوں اور محتاجوں پر رزق کے دروازے بند ہو جائیں۔ ایسی حالت میں سامان زیست مہیا کرنا۔ کس کے لئے مہیا کرنا؟ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ - (۹۰/۱۵) ان کے لئے جو ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو "یتیم" محسوس کریں اَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۹۰/۱۶) یا ان محنت کشوں کے لئے جو محض روٹی کے ٹکڑے کی خاطر مٹی میں رُلتے رہیں۔ یہ ہے "العقبة" دین کی گھاٹی پر چڑھنا۔!

تکذیب دین کرنیوالے

یہ ہے الدین ـــ دوسری طرف وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو دین کا انکار تو نہیں کرتے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی زبان سے اپنے

مؤمن اور مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن عملاً اس انداز کی زندگی بسر کرتے ہیں جو ان کے اس دعویٰ ایمان کی قدم قدم پر تکذیب کرتی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو سورۃ الماعون میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے ضروری سمجھا ... کہ اسے پورے کا پورا درج کر دیا جائے۔ جہاں تک یتامیٰ کا تعلق ہے اس میں کہا گیا ہے:۔

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ - فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ - وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ - فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ - الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ - الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ - وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ - (۱۰۷/۱-۷)

کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرز عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دین داری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔

(دین کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ میں جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے اسے محسوس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا اور بے کس ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے کسی کی کوئی ضرورت رُک جائے تو اُسے فوراً پورا کر دیا جائے۔ لیکن) اس دیندار کی حالت یہ ہے کہ جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے، یہ اُسے دھکے دیتا ہے اور محتاجوں کی مدد نہ خود کرتا ہے۔ نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ (۶۹/۳۴)

کام تو ایسے کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو "دیندار" ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی، پرہیزگار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کا اتباع کریں۔ اور عالمگیر انسانیت کو سامان نشو و نما بہم پہنچایا جائے۔ یہ صلوٰۃ کی اس غرض و غایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام، رکوع، سجود وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضۂ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے۔ (۹/۵۴)

ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسری طرف رزق کے ان سرچشموں پر جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہیئے، بند لگا کر، ان پر اپنا

قبضہ جما لیتے ہیں اور اس طرح ضرورتمندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ (یوں یہ تکذیبِ دین کرتے اور ننگِ اسلام بنتے ہیں)۔

ان کے برعکس، ان لوگوں کی زندگی ہے جو جنت کے مستحق ہیں۔ ان کی روش یہ ہے کہ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔ (۷۶/۸) جو لوگ حرکت سے معذور ہو جائیں، یا جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ جائیں، وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ وہ سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائیں۔

(٠)

یہ ہیں وہ احکام و ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ کے متعلق نازل فرمائی ہیں۔ ان سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم ان کے لئے اسبابِ حفاظت اور سامانِ رزق ہی کی تاکید نہیں کرتا بلکہ ایسا معاشرہ متشکل کرنے کی تاکید کرتا ہے جس میں ان کی برابر کی عزت و تکریم ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے آیۂ زیرِ نظر (۲:۲۲۰) کے ایک گوشہ پر دوبارہ نگاہ ڈالئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ، عام طور پر اس کا مفہوم "کاروبار میں شرکت" لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ یتیم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ کہا کہ اسے اپنے ساتھ ملا لو۔ اسے معاشرہ کا جزو بنا لو۔ وہ تمہارے اندر گھُل مِل جائے۔ اس انداز سے گھُل مِل جائے کہ اس کی حیثیت تمہارے بھائیوں کی سی ہو جائے۔ تم اسے اپنا بھائی سمجھو وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھے۔ اس طرح اس کی تنہائی کا احساس مٹ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا تھا تو یہ معاشرہ میں فساد کی حالت تھی۔ جب وہ تم میں سے ہو جائے گا تو یہ معاشرہ کی اصلاح یافتہ شکل ہو جائے گی۔

یہ تھی اصلاح کی وہ شکل جو قرآنِ کریم نے تجویز کی تھی۔ لیکن اس کے برعکس ہماری کیا حالت ہے، اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ ہمارے ہاں جو سوختہ بخت تنہا اور کمزور رہ جائے اسے کس بُری طرح کچلا جاتا ہے، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ باقی رہے یتیم بچے، سو انہیں یتیم خانوں میں داخل کر کے ان کے جوہرِ انسانیت کی جس طرح تذلیل کی جاتی ہے، وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ انہیں مستقلاً احتیاج، گداگری اور نفرت و حقارت کے ماحول میں رکھ کر بیسیوں قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کی آماجگاہ بنا دیا جاتا ہے وہ جن کی عزت کرنے کا قرآن نے حکم دیا تھا، معاشرہ کی ذلیل ترین مخلوق بن جاتی ہے۔

یاد رکھئے! جس معاشرہ میں کسی ایک فرد کی بھی عزتِ نفس پر حرف آجائے وہ معاشرہ اسلامی نہیں رہتا۔ اس کا دعویٰ اسلام، دین کی تکذیب ہوتا ہے۔

(٠)

اور یہاں سے ہم اس معاشرتی (عائلی) زندگی کی طرف آتے ہیں جسے اگر قرآنی خطوط پر متشکل کیا جائے تو قرآن کے

عائلی زندگی

الفاظ میں وہ جنت بداماں بن جاتی ہے۔ عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ انہیں اسی مقام پر یکجا سامنے لے آیا جائے ان میں نکاح، مہر، طلاق، عدت، تعدد ازواج وغیرہ سب آجائیں گے۔ اس کی ابتدا تو آیت (۲/۲۲۱) سے ہوگی لیکن ظاہر ہے کہ باقی آیات تسلسل کے ساتھ درج نہیں ہوں گی۔ موضوع کے اعتبار سے درج کی جائیں گی۔

——— (٠) ———

گھر کی زندگی (HOME LIFE) کی ابتدا "میاں بیوی" سے ہوتی ہے جو نکاح کے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔

نِکاح

(۱) نکاح کو قرآنِ مجید نے میاں بیوی کا باہمی معاہدہ قرار دیا ہے۔ آیت (۲/۲۳۷) میں اس کے لئے عقد کا لفظ آیا ہے اور سورۃ النساء میں میثاق کا لفظ (۴/۲۱) دونوں کے معنی معاہدہ کے ہیں۔

(۲) نکاح کے لئے قرآنِ مجید نے عمر کا تعین خود نہیں کیا، لیکن اس نے اس باب میں جو کچھ ضمناً کہا ہے اس میں نکاح کے لئے بلوغت کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ..... (۴/۶) تم یتیم بچوں کی جانچ پڑتال کرتے رہو تاآنکہ وہ "نکاح کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ دوسری جگہ ہے۔ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔ (۶/۱۵۳) "تاآنکہ وہ اپنی اشد تک پہنچ جائیں" اشد بھرپور جوانی کو کہتے ہیں۔ اس نے اس کی خود وضاحت کر دی ہے جب کہا: ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ، ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ، ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا۔ (۴۰/۶۷) "تم پیدا ہوتے ہو تو بچے ہوتے ہو، پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو، پھر تم بوڑھے ہو جاتے ہو" اس سے ظاہر ہے کہ اشد بچپن اور بڑھاپے کا درمیانی عرصہ ہے۔ اور وہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ لہٰذا نکاح کی عمر بلوغت یا جوانی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم نے بلوغت کی عمر کا خود تعین نہیں کیا کیونکہ یہ آب و ہوا (اور دیگر عناصر) کی رو سے مختلف ملکوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اس عمر کا تعین اسلامی مملکت کرے گی۔ لیکن یہ تو واضح ہے کہ نابالغ لڑکے یا لڑکی کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی جب قرآن مجید نے اسے باہمی معاہدہ قرار دیا ہے تو معاہدہ کے لئے فریقین کا عاقل، بالغ، اور با اختیار ہونا ضروری ہے۔ قرآنِ مجید نے عورت کی مرضی کے خلاف اس کا مالک بن بیٹھنے کو حلال ہی

قرار نہیں دیا۔ سورۃ النساء میں ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا۔ (۴/۱۹)۔ اے جماعتِ مومنین! یہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے خلاف ان کے مالک بن جاؤ" اور ظاہر ہے کہ رضامندی کا سوال بالغ کی صورت ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی طرف سے ولی یا ولی کی اجازت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بالغ لڑکی بطیبِ خاطر خود کسی کو اپنا مختار مقرر کر دے لیکن قانون کی رُو سے اس قسم کا مختار نامہ بھی تحریری ہونا چاہیئے۔

ساردا ابل

لیکن ہماری مروجہ شریعت میں نکاح کے لئے بلوغت کی شرط ہی نہیں، یہاں چھ چھ مہینے کی لڑکیوں کا نکاح ان کا ولی کر دیتا ہے۔ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی مجلسِ قانون ساز کے ایک ہندو ممبر (مسٹر ساردا) نے ایک بل پیش کیا جس کی رُو سے نابالغ لڑکے لڑکی کی شادی کو ممنوع قرار دیئے جانے کی تجویز تھی۔ اس کے خلاف ہندوؤں کے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ لیکن سب سے شدید مخالفت ہمارے "علمائے کرام" کی طرف سے ہوئی ۔۔ اس درجہ شدید کہ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک کا مرکز دہلی میں قرول باغ کا علاقہ تھا۔ وہاں طے یہ ہوا کہ علماء کا ایک وفد وائسرائے کے حضور پیش ہو اور اسے بتائے کہ اگر اس قانون کا اطلاق مسلمانوں پر کیا گیا تو یہ ان کے نزدیک مداخلت فی الدین ہوگا اور اس کے خلاف ملک میں کہرام مچ جائے گا۔ مجھے وہ واقعہ کبھی نہیں بھولتا جب یہ حضرات ایک وفد کی شکل میں وائسریگل لاج جا رہے تھے۔ اس میں قریب قریب تمام فرقوں کے علماء حضرات شامل تھے۔ میں استاذ المکرم علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمتہ) کے پاس بیٹھا تھا۔ جب یہ وفد ان کے مکان کے سامنے سے گزرا، انہوں نے فرمایا کہ یہ ہماری تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے نمائندوں کا جب بھی اتفاق ہوا ہے باطل پر ہوا ہے۔ وائسرائے نے (غالباً) ان کی درخواست کو مسترد کر دیا تو اس کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ چنانچہ لوگ چھ چھ ماہ کے بچوں کو گود میں اٹھائے لئے آتے تھے اور مولوی صاحبان ان کے نکاح پڑھاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تحریک کی مرکزی شخصیت کون سی تھی؟ کامریڈ کے مدیر، آکسفورڈ کے تعلیمیافتہ (مولانا) محمد علی جوہر (مرحوم)!

یہ تو پرانی بات ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان میں نکاح کے لئے بلوغت کی عمر شرط قرار دی گئی تھی۔ اس کے خلاف بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ ان قوانین کے منسوخ کرنے کا مطالبہ اب تک جاری ہے۔ اور اس میں پیش پیش جماعتِ اسلامی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے بانی، ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا فتوٰے

ہے کہ:-

نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

(تفسیر تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۵۷۱۔ طبع اوّل
نیز ماہنامہ ترجمان القرآن۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء)

وہ جنت کی حوروں کے متعلق کہتے ہیں کہ:

کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پا گئی ہوں گی انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذّت کا سامان فراہم کریں گی۔

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۲۸۷۔ جلد پنجم صفحہ ۲۷۱
نیز ہفتہ وار ایشیا۔ مورخہ ۱۴؍جون ۱۹۶۹ء)

اور آپ کو معلوم ہے کہ (نابالغ لڑکیوں کے ساتھ نکاح اور خلوت کی) سند کیا ہے؟ سند ہیں وہ (وضعی) روایات جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور نو سال کی

حضرت عائشہؓ کی عمر

عمر میں رخصتی ہو گئی تھی۔ ان روایات نے معاندینِ اسلام کو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف ایسے اعتراضات کا موقع بہم پہنچایا ہے جن کا ہم سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ مجھے یہ روایات شروع ہی سے کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر تحقیق کی تو یہ عجیب حقیقت منکشف ہوئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ (میں نے اس پوری تفصیل کو اپنی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" کے آخری باب میں درج کر دیا ہے)۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس تحقیق پر ہماری مذہبی پیشوائیت خدا کے حضور سجدۂ شکرانہ بجا لاتی کہ اس سے معاندینِ اسلام کے وہ اعتراضات باطل قرار پا گئے جن کا کوئی جواب ہم سے بن نہیں پڑتا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے الٹا مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ یہ کس جرم کی پاداش میں؟ اس جرم کی ...... کہ میری اس تحقیق کی رو سے بخاری کی حدیث غلط قرار پا جاتی ہے۔ یعنی ان حضرات کی حمیّتِ دینی اور جذبۂ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کی یہ کیفیت ہے کہ اگر حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدسؐ پر اس قسم کا جگر فگار طعن پڑتا ہے تو پڑے، لیکن بخاری کی ایک روایت غلط قرار نہ پائے! امام بخاریؒ نے خود بیان کیا ہے کہ انہیں قریب چھ لاکھ احادیث ملیں جن میں سے انہوں نے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو مسترد

کر دیا اور صرف تین ہزار کو اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ اب روایت پسند حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تین ہزار میں سے کسی ایک روایت کا انکار بھی مسلمان کو کافر بنا دیتا ہے۔ یعنی وہ روایات جنھیں امام بخاری نے اپنی بصیرت کی رو سے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا، وحی منزل من اللہ کی حیثیت اختیار کر گئیں کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ دین میں یہی غلو ہے جس سے انسانوں کو خدا بنا لیا جاتا ہے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے ان کے بالغ ہونے کے بعد (سترہ یا انیس سال کی عمر میں) شادی کی تھی اور یہ قرآن مجید کے ارشاد کے عین مطابق تھا۔ قرآن کریم کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی۔

(۰)

(۲) ازدواجی رشتہ سے میاں بیوی کی زندگی کی ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے جس کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ جس جوڑے نے مدت العمر تک اس طرح زندگی بسر کرنی ہو ان میں باہمی پسندیدگی لاینفک شرط ہوگی۔

انتخاب

عورت کی پسندیدگی کے متعلق تو اوپر آیت گذر چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس کی رضامندی کے بغیر تم اس کے مالک بن ہی نہیں سکتے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق ہے اس نے کہا ہے فانکحوا ماطاب لکم من النساء۔ (۳/۴) تم ان عورتوں سے شادی کرو جو تمھیں پسند ہوں۔

قرآن کریم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا زوج قرار دیا ہے (ہمارے ہاں تو زوج یا زوجہ بیوی کو کہتے ہیں لیکن عربی زبان میں میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے)۔ یعنی بیوی میاں کی زوج۔ میاں بیوی کا زوج۔ (خود قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ دیکھیے (۵۸/۱) جہاں خاوند کو عورت کا زوج کہا گیا ہے)۔ لغت کی رُو سے زوج ایسی دو چیزوں کو کہتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔ جیسے گاڑی کے دو پہیئے کہ اگر ان میں سے ایک دوسرے سے ذرا بھی مختلف ہو تو گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۳۰/۲۱)

جامد مٹی سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جرثومہ (LIFE CELL) کی شکل میں تھی وہ جوش نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ تو اس کا ایک حصہ نر بن گیا دوسرا مادہ — اس طرح تم — مرد اور عورت

۔ ایک دوسرے کے زوج (جوڑے) بن گئے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کی رفاقت سے سکونِ قلب حاصل کرو۔ اس نے تم میں ایک ایسا گہرا رشتہ پیدا کر دیا جو تمہاری (مرد اور عورت دونوں کی) صلاحیتوں کی نشو ونما کا موجب بن گیا۔

زندگی کے اس نقشے میں بھی ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، قانونِ خداوندی کی حکمیت اور حیات بخشی کی نشانیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی میں یہ نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گے جب شریفین میں کامل ہم آہنگی ہو۔ ہم آہنگی

ہم آہنگی

طبیعت اور مزاج کی، فکر و نظر کی، ذوق وجذبات کی، نظریات اور تصورات کی، مقاصدِ حیات کی، نصب العین زندگی کی، مسلک ومشرب کی، اور سب سے مقدم ہم آہنگی عقائد کی۔ قرآنِ کریم نے اس کو بنیاد قرار دے کر ایک (EXTREME) مثال سے اس کی وضاحت کی ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۲۱ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۗ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (۲/۲۲۱)

تم جس جنتی معاشرہ کے قیام کی فکر میں ہو، اس کی ابتدا، تمہاری گھر کی زندگی سے ہوتی ہے۔ للہذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ تم اپنے گھر کو جنت بناؤ۔ اس کے لئے بنیادی سوال یہ ہے کہ میاں بیوی کا انتخاب کس معیار کے مطابق ہونا چاہیئے؟ اسی معیار کے مطابق جس کی رُو سے تمہاری امت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر۔ تمہاری آئیڈیالوجی یہ ہے کہ اطاعت صرف ایک خدا کے قوانین کی ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا میاں بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی میں متفق ہوں۔

بنا بریں، تم کسی مشرک عورت سے شادی نہ کرو تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لے آئے۔ مشرک آزاد عورت سے مومن لونڈی[1] بہتر ہوتی ہے خواہ اول الذکر تمہیں کتنی ہی جاذبِ نگاہ کیوں نہ دکھائی دے۔ اسی طرح مومن عورتیں مشرک مردوں سے شادی نہ کریں تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مشرک آزاد مرد سے مومن غلام بہتر ہے خواہ

[1] (دیکھئے نوٹ صفحہ ۳۴۳ پر ملاحظہ ہو)

اولی الذکر کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔ یہ اس لئے کہ متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں کا یک جا جمع کر دینا جہنم پیدا کر دے گا۔ اس لئے خدا کا قانون تمہیں اس سے روکتا ہے۔ وہ تمہارے گھر کی زندگی کو جنت کی آسودگیاں عطا کرنا اور تمہیں ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

خدا اس طرح اپنے احکام کو لوگوں کے لئے واضح کر دیتا ہے تاکہ وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں۔

آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے ایک ہی آیت میں کتنے اہم امور کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم آہنگیٔ فکر و نظر کو لیتے ہیں۔ مسلمان مرد کے مشرکہ عورت اور مسلمان عورت کے مشرک مرد سے نکاح کو حرام قرار دینا محض ایک قانونی (فقہی) مسئلہ نہیں۔ یہ ازدواجی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا بنیادی سوال ہے۔ قلب و نگاہ میں عدمِ موافقت سے ازدواجی زندگی جہنم بن جاتی ہے اور ان کی ہم آہنگی سے جنت۔

پھر قرآن نے لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اور لَوْ اَعْجَبَكُمْ کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ بنیادی معیارِ انتخاب حسن و جمال کی فریفتگی اور کشش نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ثانوی چیز ہے۔ اس کے بعد عَبْد اور اَمَة کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ مال و دولت اور حسب و نسب بھی معیارِ انتخاب نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تمام چیزیں اضافی ہیں۔ حقیقی معیارِ انتخاب قلب و دماغ کی ہم آہنگی اور فکر و نگاہ کی یک رنگی ہے۔ اس قسم کی مطابقت سے ازدواجی زندگی جنت بداماں بن جائے گی۔ اور اگر اس قسم کی ہم آہنگی نہیں ہو گی تو حسن و جمال، مال و دولت، خاندان اور قبیلہ، حسب و نسب کے باوجود گھر، جہنم بنا رہیگا۔

(۳) بعض رشتے ابدی طور پر حرام ہیں۔ یعنی پسندیدگی وغیرہ کے باوجود، ان سے کسی مسلمان (مرد یا عورت) کا نکاح جائز ہی نہیں۔

(ا) مشرک مرد اور عورت کے متعلق اوپر یہ آیت آ چکی ہے (۲۲۱/۲)۔ دوسری جگہ اَلْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کہہ کر واضح کر دیا کہ عورتوں کا مومن ہونا ضروری ہے۔ اس کی استثناء ذیلی شق (ب) میں دی گئی ہے۔

لہ (فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۰)۔ یہ اسلام کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے جس میں ہنوز زمانہ جاہلیت کی لونڈیاں اور غلام مسلمانوں کے ہاں موجود تھے۔ اسلام نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو آہستہ آہستہ اپنے معاشرہ کا جزو بنا لیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (تفصیل غلام اور لونڈیوں کے عنوان میں ملے گی)

(ب) مسلمان مرد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن مسلمان عورتیں اہل کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کر سکتیں۔ سورہ المائدہ میں ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (۵/۵)

تم نے غور کیا کہ حلت و حرمت کے قرآنی احکام نے انسانی زندگی میں کیا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ اس سے پہلے انسانوں کی خود ساختہ شریعتوں نے اس باب میں ہزار قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس سے انسانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ قرآنی دور میں چند چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی تمام خوشگوار چیزیں حلال قرار دے دی گئیں۔ اس سے کس قدر میدان وسیع ہو گیا؛ نیز اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ (اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو تمہارے ہاں حرام ہے اور)

وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے جائز سمجھیں۔

کھانے پینے سے آگے بڑھ کر ازدواجی زندگی کی طرف آؤ تو تمہارے لئے مومن پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی عقدِ نکاح میں لانے کے لئے جائز ہیں۔

واضح رہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی صرف اجازت ہے حکم نہیں۔ اسلامی مملکت بعض مصالح کی بنا پر اس اجازت پر پابندی عائد کر سکتی ہے۔ جیسا کہ (تاریخ بتاتی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر ان سے شادی پر پابندی لگا دی تھی۔ اس مقام پر اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت قرآن کے حلال کردہ پر وقتی پابندی لگا سکتی ہے۔ اسے ابدی طور پر حرام قرار نہیں دے سکتی۔ نہ ہی اس کے حرام کردہ کو حلال قرار دے سکتی ہے۔

محرمات

(ج) قرآن کریم نے محرمات کی تفصیل خود بیان کر دی ہے۔ آیت (۲۲/۴) میں ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے شادی کی ہو ان سے نکاح مت کرو۔ اس سے پہلے تم جو کچھ کر چکے ہو کر چکے۔ اب ایسا نہ کرنا۔ یعنی سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہے۔ اسی کے بعد ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ
مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (۴/۲۳)

علاوہ ازیں تم پر حسب ذیل رشتوں کی عورتیں بھی نکاح کے لئے حرام قرار دی گئی ہیں۔ تمہاری ــــ (۱) مائیں (۲) بیٹیاں۔ (۳) بہنیں۔ (۴) پھوپھیاں، (۵) خالائیں، (۶) بھتیجیاں۔ (۷) بھانجیاں۔ (۸) وہ عورتیں جن کا تم نے دودھ پیا ہو۔ وہ بمنزلہ ماؤں کے ہیں۔ (۹) تمہاری دودھ شریک بہنیں۔ (۱۰) تمہاری بیویوں کی مائیں (۱۱) تمہاری بیویوں کی (سابقہ شوہر سے) لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں پرورش پاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہیں۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تم ان بیویوں سے خلوت کر چکے ہو۔ اگر خلوت نہ کی ہو تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (۱۲) تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں۔ (منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔ ۳۳/۳۷)۔

(۱۳) نیز یہ بھی حرام ہے کہ (جب ۴/۳ کے مطابق تعدد ازدواج کی ضرورت پڑ جائے تو) تم بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں لے آؤ۔

ان احکام سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب ان کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ یاد رکھو! تمہاری ذات کی حفاظت اور نشوونما صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد ہے: وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ (۴/۲۴) ان عورتوں سے بھی نکاح حرام ہے جو دوسروں کے نکاح میں ہوں۔ بجز ان کے جن کے ساتھ تم پہلے نکاح کر چکے ہو ــــ یا لونڈیوں سے۔

ان احکام میں دو تین نکات وضاحت طلب ہیں۔

رضاعت

(۱) رضاعی ماؤں اور رضاعی بہنوں سے نکاح حرام ہے۔ قرآنِ کریم نے رضاعت کی تشریح خود نہیں کی۔ یعنی کتنے عرصہ کے لئے دودھ پلایا ہو۔ نہ ہی رضاعی بہن کے متعلق متعین طور پر کہا ہے کہ ان دونوں بچوں نے کتنے عرصہ تک اکٹھے دودھ پیا ہو۔ اسلامی مملکت اس ضمن میں جزئی قوانین خود وضع کرے گی۔ ویسے بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے رضاعی ماں وہ ہو گی جو بچے کو اس کی دو سال

کی عمر کے اندر دودھ پلائے اور رضاعی بہن وہ جو اس بچے کیساتھ ماں کا دودھ پیئے۔ یہ بہرحال ہمارا استنباط ہے۔ اس کی قانونی حیثیت اسلامی مملکت ہی متعین کر سکتی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح حرام ہے۔

(ii) صلبی بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے۔ منہ بولے بیٹوں کے متعلق دوسرے مقام پر ہے۔ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳/۴) وہ حقیقی بیٹے نہیں بن جاتے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے متبنیٰ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔

(iii) "محصنٰت" سے نکاح حرام ہے۔ محصنٰت کے معنی پاکدامن عورتیں بھی ہیں اور شادی شدہ عورتیں بھی۔ آیت (۴/۲۴) میں محصنٰت سے مراد وہ عورتیں ہو سکتی ہیں جو کسی اور کے نکاح میں ہوں۔ ان سے نکاح حرام ہوگا۔ صدر اول میں البتہ ایک واقعہ سامنے آگیا تھا جس میں اس حکم میں استثناء کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ ابتدائی ہجرت کے بعد مکہ میں ایسی عورتیں رہ گئیں جو خود تو اسلام لے آئی تھیں لیکن ان کے خاوند مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں وہ عورتیں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ چلی آئیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے: فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ .... (۶۰/۱۰) انہیں ان کے غیر مسلم خاوندوں کی طرف مت لوٹاؤ۔ نہ یہ اُن کے لئے حلال ہیں، نہ وہ ان کے لئے حلال۔ انہیں یہیں رکھو۔ البتہ اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا۔ جو کچھ (ان کے ساتھ نکاح کے سلسلہ میں) ان کے خاوندوں کا خرچ آیا ہو وہ انہیں ادا کردو۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ .... (۶۰/۱۰) اس کے بعد ان سے نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے کہ اسلام چھوڑ دینے سے نکاح باقی نہیں رہتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت کو جزئی قوانین وضع کرنے ہوں گے۔

(iv) قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ آیا ہے جس کے عمومی معنی غلام اور لونڈیاں لئے جاتے ہیں۔ غلامی کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول صفحہ ۲۶ آیت (۲/۱۷) اور جلد دوم صفحہ ۳۵۵ آیت (۲/۱۷۵) میں گذر چکی ہے۔ یہ زمانہ نزولِ قرآن کا ذکر ہے۔ اب غلاموں اور لونڈیوں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(v) نکاح سے متعلق آیات میں عورت کو کچھ دینے کی شرط بھی آتی ہے۔ اسے مَہر کہا جاتا ہے جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

(۴) نکاح کے لئے قرآنِ کریم نے کوئی رسم تجویز نہیں کی حتیٰ کہ اس میں "نکاح پڑھانے" کا بھی ذکر نہیں۔ لیکن چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسلامی حکومت معاہدات کی توثیق کے لئے جو ضابطہ مقرر کرے اس کا اطلاق اس معاہدہ پر بھی ہوگا۔ قانونی ضرورت کے علاوہ، معاشرتی طور پر بھی ضروری ہے کہ اس امر کا اعلان ہو کہ فلاں مرد اور عورت نے باہمی نکاح کیا ہے۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے۔ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ۔ (۵/۵) "نکاح سے مقصد ازدواجی زندگی کی پابندیاں پوری کرنا ہیں۔ نہ محض جنسی خواہش کی تسکین، اور نہ ہی پوشیدہ تعلقات"۔ نکاح کا اعلان پوشیدہ تعلقات کے امکان کو ختم کر دے گا۔ اس لئے یہ ازدواجی زندگی کی لازمی شرط ہوگی۔ جو نکاح پوشیدہ رکھا جائے، قرآنِ کریم کی رُو سے جائز نہیں ہوگا۔

(۵) سورۃ النور میں ایک آیت ہے۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲۴/۳)

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:۔

زانی مرد صرف زانیہ (عورت) یا مشرکہ سے نکاح کرتا ہے اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک سے نکاح کرتی ہے۔ مومنوں پر یہ حرام ہے۔

اس ترجمہ کی رُو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زانی مرد کا نکاح کسی پاکدامن عورت سے اور اسی طرح زانیہ عورت کا نکاح کسی پاکباز مرد سے جائز نہیں۔ زانی اور زانیہ یا تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں یا مشرکوں سے۔ لیکن یہ مفہوم ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں نکاح کا لفظ اپنے بنیادی معانی (مجامعت) کے لئے آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مومن مرد یا مومن عورت میں سے ایک بھی پاکباز رہنا چاہے تو فعل زنا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے (زنا بالجبر کا سوال الگ ہے)۔ بلا اس فعل کا ارتکاب وہ کرتے ہیں جو قوانینِ خداوندی پر ایمان ہی نہیں رکھتے (یعنی مشرک)، مومن ایسا نہیں کر سکتے۔ اس سے فعل زنا کی شناعت کی وضاحت مقصود ہے۔

———(۰)———

تعددِ ازدواج

ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) ایک سے زیادہ بیویوں کا سوال بڑی اہمیت

رکھنا ہے۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم نے وحدتِ زوج یعنی ایک وقت میں ایک بیوی (MONOGAMY) کا اصول مقرر کیا ہے ۔ (فَوَاحِدَةً - ۴/۳ ۔ اس کی سند ہے ۔ پوری آیت آگے چل کر سامنے آئے گی) اگر کسی وقت بیوی سے نباہ کی صورت نہ رہے تو اس اصول کی رو سے اس کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں ۔ اس کی جگہ دوسری بیوی لائی جاسکے گی۔ سورۃ النساء کی آیت (۴/۲۰) میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۔ " اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو اس کے لئے پہلی بیوی سے معاہدۂ نکاح فسخ کرو " (اسے طلاق کہتے ہیں ، اس مقام پر ہم نے ان آیات کے حوالے صرف یہ بتانے کے لئے دیئے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اصول وحدتِ زوج کا ہے (ان آیات کی تشریح و تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی) ۔ لیکن بعض ہنگامی حالات میں قرآن مجید نے اس اصول میں استثناء (RELAXATION) بھی کی ہے ۔ یہ ہنگامی حالات کس قسم کے ہوسکتے ہیں ' اس کے لئے صدرِ اول کے اسلامی معاشرہ کو سامنے لانا چاہیئے۔

مدنی زندگی میں مخالفین کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ مسلمانوں کی مقدار پہلے ہی (مقابلتہً) بہت کم تھی ۔ ان جنگوں میں شہادات کی وجہ سے ان میں اور بھی کمی واقع ہوگئی ـــ اور کمی بھی نوجوانوں میں کیونکہ جنگوں میں اکثر و بیشتر نوجوان ہی شریک ہوتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی مقدار زیادہ ہوگئی ۔ اس پر مستزاد یہ کہ مکہ سے بہت سی مسلمان عورتیں اپنے سابقہ (غیر مسلم) شوہروں کو چھوڑ کر (ہجرت کرکے) مدینہ آگئیں ۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ انہیں ان کے شوہروں کی طرف لوٹایا نہ جائے ۔ ان سے یہیں شادی کر لی جائے ۔ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کرسکتی (حتیٰ کہ اہلِ کتاب سے بھی نہیں) ۔ اس سے معاشرہ میں عجیب سی صورت پیدا ہوگئی ۔ بیوہ عورتیں (اور ان کے یتیم بچے) نیز شادی کی عمر تک پہنچی ہوئی (جوان ناکتخدا) لڑکیاں ' کثیر تعداد میں ' اور اصول وحدتِ زوج کا ۔ اس نے ایک تمدنی مشکل پیدا کردی ۔ ان عورتوں کو باعزت مقامِ حفاظت دینا نہایت ضروری تھا ۔ اس مشکل کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء پیدا کر کے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیجائے تاکہ یہ مشکل مسئلہ حل ہوجائے ۔ یہ تھا وہ استثنائی حل جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا :-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ

اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (۴/۳)

اگر تم دیکھو کہ بیوہ عورتوں، یتیم بچوں، ناکتخدا جوان لڑکیوں کے مسئلہ کا اور کوئی خاطر خواہ منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو اس مشکل کے حل کے لئے تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان بے شوہر عورتوں میں سے جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں (۴/۱۹) نکاح کر لو۔ اور جیسا بھی حالات کا تقاضا ہو دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح میں لے آؤ۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ تم اس طرح مختلف افرادِ خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک بیوی کے اصول پر کاربند رہو ــــ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم اس سے پہلے اپنے نکاح میں لا چکے ہو۔ بے انصافی یا کثرتِ اولاد کے بوجھ سے بچنے کے لئے وحدتِ زوج کا اصول زیادہ مناسب رہے گا۔

اس آیت میں پہلا (غور طلب) لفظ یتامٰی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربی زبان میں یتیم کا لفظ ان بچوں تک محدود نہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں۔ اس میں ایسی عورتیں بھی شامل ہیں جن کا شوہر نہ ہو، خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ ناکتخدا جوان لڑکیاں۔ خود قرآنِ کریم نے "یتٰمَی النساء" (۴/۱۲۷) کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ "یتیم عورتیں" یعنی وہ عورتیں جو تنہا یعنی بلا شوہر کے ہوں۔

دوسرا لفظ تَعُوْلُوْا ہے (مادہ ع۔ و۔ ل) ہے جس کے معنی ہر وہ شے ہیں جس کے بوجھ تلے انسان دب جائے۔ اہل و عیال میں عیال کے معنی بال بچوں کا بوجھ ہیں۔ اسی سے "عالَ المیزان" ہے جس کے معنی ہیں ترازو کے ایک پلڑے کا جھک جانا۔ اس کے دونوں پلڑوں کا وزن برابر نہ رہنا۔ یہاں سے اس کے معنی ناانصافی کے آتے ہیں۔

اب آئیے آیۂ زیرِ نظر (۴/۳) کی طرف۔ اس میں تعددِ ازدواج دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

(۱) اگر معاشرہ میں بے شوہر عورتوں کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے اور اس کا کوئی مناسب حل نہ مل سکے تو وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء کر کے ان عورتوں سے شادی کی اجازت ہے۔

(۲) یہ اجازت پھر اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ افرادِ خاندان میں عدل قائم رکھا جا سکے اور (اگر بال بچوں کی پرورش انفرادی ذمہ داری ہے تو) تمام اہل و عیال کی مناسب پرورش ہو سکے۔ یہ مسئلہ بوجھ نہ بن جائے جہاں تک عدل کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے خود ہی بتا دیا کہ اس سے مراد مساویانہ سلوک اور برتاؤ ہے نہ کہ جذبات کا عدل۔ اسی لئے جذبات میں مساوات اور یکسانیت رکھنا نفسیاتی محال ہے جس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر کہا گیا :۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (۴/۱۲۹)

تم ہزار چاہو۔ جذباتی عدل تم قائم رکھ ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے اس عدل کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو عدل مقصود اور ممکن ہے وہ یہ ہے کہ تم کسی ایک بیوی کی طرف اس قدر نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی اُدھر لٹکی رہ جائے۔ یہی وہ اصلاحی شکل ہے جس سے قانونِ خداوندی کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔ اس سے تم گھر میں ناہمواریوں کے مضرات سے محفوظ رہ سکو گے اور راحت اور سکون کی زندگی گزار سکو گے۔

قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کے متعلق صرف یہی ایک آیت (۴/۳) ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ یہ اجازت کتنی شرطوں سے مشروط ہے۔ یعنی

(۱) معاشرہ میں ایسے ہنگامی حالات کا پیدا ہو جانا جس میں بے شوہر عورتوں اور یتیم بچوں کی کثرت ایک مسئلہ (PROBLEM) بن جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ اسلامی مملکت ہی کرے گی کہ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں یا نہیں۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ گھر میں عدل (مساویانہ سلوک اور برتاؤ) کو قائم رکھ سکو۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہو گی۔ اس کے بغیر مساویانہ سلوک کی صورت کبھی ممکن نہیں ہو گی۔ اور

(۳) تیسری شرط یہ کہ تم اس قدر عیال داری کا بوجھ برداشت کر سکو۔

اگر ایسے ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوتے تو ایک سے زیادہ بیویوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اجازت بے سہارا عورتوں کے لئے ہے، باعزت مقامِ حفاظت مہیا کرنے کے لئے ہے۔ آپ سوچئے کہ جس اجازت کی ابتداہی "وَاِنْ خِفْتُمْ" سے ہوئی ہے (اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو) تو اس شرط کے بغیر ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت قرآن سے تو نہیں مل سکتی!

(۰)

ازواج مطہرات

قرآنِ کریم نے حضورؐ نبی اکرم کی ایک سے زیادہ ازواج (مطہرات) کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ ایک وقت میں حضورؐ کے حرم میں کتنی بیویاں تھیں۔ نہ ہی ان کی کل تعداد بتائی ہے لیکن ایک سے زیادہ ازواج کا ذکر ضرور آیا ہے۔ قرآنی تحدید (چار کی حدبندی) کی روشنی میں

بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی تعداد ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی کتاب "معراج انسانیت" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کا جواز وہی ہنگامی حالات تھے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بعد میں یہ ہنگامی حالات ختم ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ خوش حال اور مرفہ الحال بھی ہو گیا۔ لیکن اس مرفہ الحالی میں سب سے غریب گھرانہ سربراہِ مملکت حضورؐ نبی اکرم کا تھا۔ اس تبدیلیٔ احوال وظروف پر حضورؐ کی ازواج مطہرات کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو کاشانۂ نبوی کو چھوڑ کر اور جگہ چلی جائیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۔ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۔ (۳۳/۲۹-۲۸)

اے رسول! تم اپنی بیویوں پر اس حقیقت کو واضح کر دو کہ (اگر تمہیں میری رفاقت میں رہنا ہے تو تمہاری زندگی کا مقصد اس مشن کی تکمیل ہوگا جسے میں لے کر اٹھا ہوں لیکن) اگر تمہارے پیش نظر محض طبیعی زندگی کے مفاد اور دنیاوی زیب وزینت کی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر ہماری زندگی باہمی رفاقت کی نہیں ہو سکتی۔ (رفاقت، مقصد کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اگر مقصد میں اشتراک نہیں تو پھر رفاقت کیسی؟ یہ لڑائیوں کی وجہ سے پیدا شدہ ہنگامی حالات میں تیرے ہاں آئی تھیں۔ اُس وقت اولین مقصد ان کی حفاظت اور پناہ دہی تھا۔ اب جبکہ حالات اعتدال پر آچکے ہیں انہیں اپنے سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی کی اجازت ہونی چاہیئے۔ بنا بریں، تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا کہ تم طوعاً و کرہاً میرے ساتھ رہو۔ اگر تمہاری منشا الگ ہو جانے کی ہو تو) میں تمہیں ضروری سامان دیئے دیتا ہوں اور نہایت عمدگی سے رخصت کر دیتا ہوں (۳۳/۵۱)۔ (تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اب ایک مملکت حاصل ہو گئی ہے اس لئے تمہاری زندگی شاہانہ ٹھاٹھ کی ہو گی۔ مملکت کے ساتھ جو ذمہ داریاں آتی ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس گھر کا معیار مملکت کے غریب ترین فرد کی زندگی کا معیار ہو۔ اس لئے مجھے اور میرے ساتھ میرے متعلقین کو غریبوں کی سی زندگی بسر کرنی ہو گی)۔

اگر تم نظامِ خداوندی کے لئے زندگی وقف کر دینا چاہو اور طبیعی زندگی کے قریبی مفاد پر مستقبل کی خوشگواریوں کو ترجیح دو تو تم میں سے جو بھی اس طرح حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے گی خدا کا قانونِ مکافات اسے اجرِ عظیم عطا کرے گا۔

یہ اذنِ خداوندی ازواجِ مطہرات تک پہنچا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس آستانہ عالیہ کو چھوڑنے کا خیال تک نہ کیا۔ اس کے بعد حضورؐ نبی اکرم سے بھی کہہ دیا گیا کہ چونکہ وہ ہنگامی حالات ختم ہو چکے ہیں جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی تھی اس لئے آپ بھی اب نہ کوئی نئی شادی کر سکتے ہیں نہ ان بیویوں کی جگہ اور بیویاں لا سکتے ہیں۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا. (۳۳/۵۲)

اس کے بعد تمہارے لئے کسی نئی عورت سے شادی کرنا جائز نہیں ہوگا۔ نہ ہی یہ کہ ان بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کسی اور عورت سے نکاح کر لو خواہ اس کی خوبیاں تمہیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگیں۔ اب تیری بیویاں وہی رہیں گی جو تیری بیویاں بن چکیں۔

یاد رکھو! خدا کا قانون تمام امور کی نگہداشت کرتا ہے۔

(۰)

(یہاں ان آیات کو ضمناً درج کیا گیا ہے۔ ان کی تشریح اور دیگر متعلقہ آیات کا اضافہ مناسب مقام پر کیا جائیگا)

یہاں پر آپ کے دل میں یہ سوال ابھرے گا کہ قرآنِ کریم کے اس قدر واضح احکام و ہدایات کے علی الرغم یہ جو ہمارے ہاں بلا مشروط چار چار تک شادیوں کا معمول چلا آ رہا ہے تو یہ سلسلہ کیسے شروع ہو گیا اور اس کی سندِ جواز کیا ہے؟ اس کا جواب اس دورِ ملوکیت سے پوچھئے جب قرآنِ مجید کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور نفسانی خواہشات کا اتباع زندگی کا شعار بن گیا۔ اور سند اس کی وہ وضعی روایات قرار پا گئیں جو اس مقصد کے لئے جعلی سکوں کی طرح "خفیہ ٹکسالوں" میں ڈھلنی شروع ہو گئیں۔ اس طرح یہ اجازت بلا مشروط ہو گئی۔ آپ کو نکاح کی کسی مجلس میں شرکت کا موقع ملے تو نکاح خواں (مولوی صاحب) جو کچھ پڑھتے ہوں اسے کان لگا کر سنیئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت (۴/۳) کی ابتدا ہی "فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ" سے کریں گے یعنی "وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامٰى" —— (شرط) کے الفاظ غائب کر جائیں گے اور اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے مطمئن ہو جائیں گے کہ بلا مشروط تعدد ازواج کی قرآنی سند حاصل ہو گئی —— میں نے ایسے مطبوعہ نکاح نامہ کے فارم بھی دیکھے ہیں جن پر یہ آیت "فانکحوا ماطاب لکم" سے شروع کی گئی تھی —— ان حضرات کو اس کا بھی علم نہیں کہ قرآنِ کریم میں ان کی اس تحریف کے باوجود "فانکحوا" کا (ف) کس طرح ان کی اس فریب دہی کا پردہ چاک کر رہا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، جملہ شرطیہ میں، پہلے "اگر" ہوتا ہے اور اس کے بعد "تو"۔ (مثلاً اگر تم آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا) اگر کوئی شخص، "اگر" والی شرط کو حذف کر کے بات یوں شروع کرے ۔ تو میں جاؤں گا۔ تو یہ بے معنی جملہ اس کی جہالت (بلکہ حماقت) کی دلیل ہوگا۔ اس سے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ "ان خفتم" کے بغیر "فانکحو" سے بات شروع کرنا کس قدر جہالت یا فریب دہی ہے!

ایک لطیفہ اور بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی صاحب لڑکی والوں کے گھر میں بیٹھے نکاح پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ اور دولہا کے کان میں کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تم دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔ یہ تو غنیمت ہے کہ لڑکی والے (قرآن کریم کے) عربی زبان کے ان الفاظ کے معنی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ سمجھتے ہوں کہ مولوی صاحب ان کے ہونے والے داماد کو کیا پٹی پڑھا رہے ہیں تو وہ انہیں کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔ اس مقام پر ہندوؤں کی مقدس کتاب (وید) کے اشلوکوں کے متعلق ایک بات یاد آ گئی۔ ہندوؤں کے ہاں بھی شادی کی تقریب پر کچھ مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور ان میں ویدوں کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ ان اشلوکوں کے متعلق ہندوؤں کے ایک ممتاز ودوان (عالم) پنڈت گنگا پرشاد آپادھیائے (ایم۔اے) پردھان آریہ سماج الہ آباد نے اخبار آریہ متر بابت ۷ر جون ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا۔

> وہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵۔ منتر ۳۶ منتر اتنا اشلیل (گندہ) ہے کہ سادھارن (معمولی) سنسکرت جاننے والا ور (دولہا) بھی اسے پڑھنے کا ساہس (حوصلہ) نہ کریگا۔ ابھی تو لوگ اس لئے پڑھ دیتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ پرنتو (مگر) کیا آریہ سماج سرودا (ہمیشہ) یہی اوستھا (حالت) رکھنی چاہتا ہے؟ یدی (اگر) اس منتر کو نہ نکالا گیا تو اس کے وردھ (خلاف) یا تو بھیانک وردھ (خوفناک مخالفت) ہوگی یا لوگ اسے اپیکشا کی درشٹی سے (بنظرِ حقارت) چھوڑ دیا کریں گے۔ دونوں ہی باتیں انشٹ (بری) ہیں۔

(دیکھیے میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں ص۱۳۷۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۷۷ء)

"مذہب" خواہ کوئی بھی ہو، گپت ودیا (یعنی جسے عوام نہ سمجھ سکتے ہوں) بڑا پردہ پوش اور بھرم قائم رکھنے کا موجب ہوتا ہے!

(۰)

قرآنِ کریم نے اسلامی معاشرے سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں لوگوں کے لئے نکاح

میں آسانیاں ہوں۔ فرمایا:

وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَ اِمَآئِکُمْ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ (۲۴/۳۲)

تمہارے معاشرہ کا یہ بھی فریضہ ہے کہ جن لوگوں — مردوں یا عورتوں — کی شادی نہ ہوئی ہو (خواہ وہ کنوارے ہوں، یا رنڈوے مرد اور بیوہ عورتیں) ان کے نکاح کا مناسب انتظام کرے نیز تمہارے غلاموں اور لونڈیوں[1] میں سے جو شادی کی صلاحیت رکھتے ہوں، ان کے نکاح کا بھی بندوبست کیا جائے۔ (یعنی معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ لوگوں کو مناسب رشتہ تلاش کرنے میں آسانیاں ہوں۔ اور) جسے متاہل زندگی بسر کرنے کے لئے معاشی امداد کی ضرورت ہو اس کا بھی مناسب انتظام کیا جائے۔

یہ سب اس خدا کے مقرر کردہ نظام کی طرف سے ہونا چاہیئے جو بڑی وسعتوں کا مالک اور ہر ایک کے حالات سے باخبر ہے۔ (قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم شدہ نظامِ مملکت کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔)

لیکن قرآنِ کریم کی رو سے نکاح کرنا کوئی حکم یا فریضہ نہیں۔ جو لوگ کسی وجہ سے بطیبِ خاطر مجرد رہنا چاہیں یا جن کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے، ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہیں ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیئے:۔

وَ لْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغْنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (۲۴/۳۳)

جن لوگوں کے لئے رشتے کا انتظام نہ ہو سکے انہیں ضبطِ نفس سے کام لے کر اپنی عفت کو محفوظ رکھنا چاہیئے تاآنکہ نظامِ خداوندی ان کے لئے ضروری سہولتیں بہم پہنچا دے۔

یہاں سے ایک اور اہم سوال کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) قرآنِ کریم نے کھانے پینے کی چیزوں کی حرمت کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اگر کسی وقت اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو بقدرِ ضرورت حرام چیزوں کے کھا لینے کی اجازت ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس نے نہ اضطراری کیفیت کا ذکر کیا ہے، نہ ایسی صورت میں کسی ناجائز طریق کے اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس نے (قرآنی حدود و شرائط کے مطابق) نکاح کی شکل کو جائز طریق قرار دینے کے بعد واضح طور پر کہہ دیا کہ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ

---

[1] جیسا کہ متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم میں جہاں جہاں غلام اور لونڈیوں کا ذکر آیا ہے اس سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو زمانۂ نزولِ قرآن میں عربی معاشرہ میں موجود تھیں۔

الْعٰدُوْنَ ۔ (۲۳:۷) ۔جو کوئی جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس کے سوا کوئی اور شکل اختیار کرے تو وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی ہوگی۔

انسانی جسم کی پرورش کے طبیعی تقاضوں (بھوک ۔پیاس ،نیند وغیرہ) اور جنسی جذبہ میں بنیادی فرق ہے۔جسم کی پرورش کے طبیعی تقاضے از خود بیدار ہوتے ہیں ۔ اگر انہیں پورا نہ کیا جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد نوبت موت تک آ سکتی ہے۔ (مثلاً آپ کسی کام میں اس طرح منہمک ہوں کہ آپ کو دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ ہو۔اس دوران میں آپ کو پیاس لگے تو اس کی تسکین (پانی) کا تقاضا بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کی تسکین (پانی پینے) کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ پانی نہیں پیتے تو بیمار ہو جاتے ہیں ۔ اور چند دنوں تک اس حالت کو جاری رکھیں تو آپ پر موت وارد ہو سکتی ہے ۔لیکن جنسی جذبہ کی یہ صورت نہیں ۔جب تک آپ اس کا خیال نہ کریں یہ بیدار ہوتا ہی نہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آپ اس کی تسکین کی صورت پیدا نہ کریں تو آپ بیمار پڑ جائیں یا آپ کی موت واقع ہو جائے۔ جنسی خواہش کو بار بار بیدا کرنے کے بعد اس کی تسکین نہ کی جائے ، یا غلط طریقوں سے تسکین کی جائے تو اس سے البتہ بعض اعصابی بیماریاں اور نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اسے اصطلاح میں جنسی بدنہادی (SEX - PERVERSION) کہتے ہیں ۔لیکن اگر اسے بیدار نہ کیا جائے تو اس سے عوارض کا پیدا ہونا تو ایک طرف، انسان کے مضمر جوہر اس قدر توانائی حاصل کر لیتے ہیں کہ عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔اس قسم کے ضبطِ خویش کو قرآن "عفت" کہہ کر پکارتا ہے ۔میں اس موضوع پر تفصیل سے دیگر مقامات پر لکھ چکا ہوں جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم ۔میں "جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر" اور "ضبطِ ولادت" سے متعلق خطوط ملاحظہ فرمائیں ۔بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے منکوحہ بیوی سے مباشرت کے سوا ، جنسی جذبہ کی تسکین کی کوئی شکل جائز نہیں !

—— (٠) ——

مہر

قرآنِ کریم نے نکاح کے سلسلہ میں ایک اور شرط کا بھی ذکر کیا ہے ۔سورۃ النساء میں محرمات کی تفصیل دینے

کے بعد کہا ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ۔ (۴/۲۴) "ان عورتوں کے سوا باقی عورتوں سے نکاح حلال ہے بشرطیکہ تم انہیں نکاح کے لئے چاہو کچھ مال دے کر"۔ اس "مال دینے" کو اصطلاح میں مہر کہتے ہیں۔ (مہر اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ مہارت، ماہر، مُہر وغیرہ الفاظ اسی مادہ سے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے صَدُقٰتِهِنَّ کی اصطلاح آئی ہے۔ (۴/۴) یا اُجُوْرَهُنَّ کی (۴/۲۴؛ ۵/۵؛ ۳۳/۵۰؛ ۶۰/۱۰؛ ۶۵/۶)۔ اجُور، اجر کی جمع ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ یہ عورت کے ساتھ تعلقات کا "معاوضہ" ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ کسی چیز کا معاوضہ (اُجرت) نہیں۔ یہ، کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مرد کی طرف سے اپنی ہونے والی بیوی کے لئے تحفہ ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے نِحْلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۔ ۴/۴)۔ جو بڑا ہی بلیغ اور (SUGGESTIVE) ہے۔ نحل، شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ نحلة کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح شہد کی مکھی سینکڑوں میل کی مسافت کر کے پھولوں کے رس کا ایک قطرہ لاتی ہے اور اسے بغیر کسی معاوضہ کے چھتہ میں جمع کر دیتی ہے، مرد کی طرف سے مہر اسی طرح تحفةً بیوی کو دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحفہ کا مفہوم اس سے بھی زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ جیسا کہ جلد دوم ص۱۲۵-۱۱۸، زیر آیت (۲/۳۰) میں بتایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم مرد اور عورت کو مساوات کا درجہ دیتا ہے لیکن ازدواجی رشتہ استوار ہونے کی صورت میں قرآن کہتا ہے کہ عورت کا وزن مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ نکاح کے ترازو میں عورت کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے، اور دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کے لئے مرد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی رکھے۔ اس طرح مرد + تحفہ = عورت، کی مساوات (EQUATION) صحیح بیٹھتی ہے۔ یہ ہے مہر کی صحیح پوزیشن۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے مہر کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں صَدُقٰتِهِنَّ تو قابلِ فہم ہے۔ یعنی مرد اپنی ہونے والی بیوی کے لئے محبت اور لطافت کے جو جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے، ان کی صداقت کے ثبوت (یا دلیل) میں کچھ تحفہ دیتا ہے۔ لیکن قرآن عیاں بیوی کا جو مقدس رشتہ استوار کرتا ہے اس کی روشنی میں "اُجُوْرَهُنَّ" کی اصطلاح کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا اس لئے اس

اُجُوْرَهُنَّ سے مراد

نے اپنے ہاں وہی الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ ان کے مفہوم کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عرب انہیں کن معانی

ہیں استعمال کرتے تھے۔ اگر ان معانی میں اور ان میں جن میں انہیں قرآن استعمال کرتا ہے، کچھ فرق ہے تو قرآن اپنے معانی کی وضاحت کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی صراحت کر دیتا ہے کہ اس لفظ یا اس اصطلاح کا قرآنی مفہوم کس طرح عربوں کے ہاں مروج یا قدیم سے مختلف ہے۔ (مثلاً) عربوں کے ہاں خاوند کو بعل کہتے تھے۔ بعل زمانہ قدیم میں ایک بُت کا نام تھا (۳۷/۱۲۵) اور خود عرب بھی اپنے بتوں کو بعل کہتے تھے۔ ان کے ہاں چونکہ خاوند کی حیثیت "خدا" (ہماری زبان میں "مجازی خدا") کی ہوتی تھی اس لئے انہوں نے خاوند کے لئے یہ لفظ وضع کر لیا تھا۔ ان کے لغت کی رُو سے قرآنِ کریم نے بھی خاوند کے لئے یہی لفظ (بعل۔ جمع بعول) استعمال کیا ہے۔ (۲/۲۲۸؛ ۴/۱۲۸؛ ۱۱/۷۲؛ ۲۴/۳۱)۔ لیکن اُس نے نکاح کے معاملہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام میں خاوند کی حیثیت بعل (خدا) کی نہیں، برابر کے رفیقِ حیات کی ہے۔ لہٰذا، ہم قرآن کے استعمال کردہ لفظ (بعل) کو اس کے لغوی معنوں میں نہیں لیں گے۔ اس سے مراد قرآنی حیثیت ومقام کا خاوند لیں گے۔

اس مثال سے لفظ اُجُوْرَهُنَّ کا استعمال اور اس کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اس نے نحلۃ کے الفاظ سے اجر (معاوضہ) کے تصور کی جڑ کاٹ دی۔ عورت کے ساتھ خلوت کے معاوضہ کا تصوّر تو پاکیزہ ذہنوں کو اُن متعفن اور تاریک گوشوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں بوئے فحش کے بھبکے ابھرتے ہیں۔ قرآن کا عطا کردہ میاں بیوی کا تعلق پاکیزگی اور نظافت کی حسین وجمیل جنت اپنے آغوش میں رکھتا ہے۔ اس میں معاوضہ کا کیا سوال؟ وہاں تو 'من تو شدم تو من شدی' کی کیفیت ہوتی ہے۔

یہ ہے مہر کی قرآنی پوزیشن۔ چونکہ اس کا پیش (یا ادا) کرنا، حکم خداوندی ہے، اس لئے اس کے لئے فریضہ کا لفظ بھی آیا ہے۔ (۲/۲۳۶-۲۳۷)

مہر تحفہ ہے اور تحفہ کی کوئی مقدار یا تعداد متعین نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ اس کا ادا کرنا فرض ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اسے خاوند کی حیثیت (استطاعت) کے مطابق ہونا چاہیئے۔ استطاعت کی نسبت سے یہ "سونے کا ڈھیر" بھی ہو سکتا ہے۔ (۴/۲۰)

مہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہو جانی چاہیئے لیکن سورۃ بقرہ کی آیت ۲۳۶ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ نکاح ہو جائے لیکن مہر مقرر نہ کیا گیا ہو۔ ارشاد ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً (۲/۲۳۶) "اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ تم ایسی عورتوں کو طلاق دے دو جنہیں تم نے چھوا نہیں یا جن کا مہر مقرر نہیں کیا جا سکا۔" اس آیت کا بنیادی تعلق تو طلاق سے

ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ یہاں ہم نے اسے صرف یہ بتانے کے لئے درج کیا ہے کہ ایسی صورت ہوسکتی ہے کہ نکاح ہوجائے لیکن مہر مقرر نہ کیا جاسکا ہو۔ لیکن ایسی صورت شاذ ہوگی ..... معمول یہی ہے کہ مہر نکاح کے وقت مقرر اور ادا کیا جائے۔

(۱) اگر مہر نکاح کے ساتھ ادا نہ کیا گیا ہو تو میاں بیوی کی رضامندی سے اس میں بعد میں کمی بیشی بھی کی جا سکتی ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ۔ (۲۴/۴)۔ "اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ مہر مقرر ہوجانے کے بعد تم باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی کرلو"۔ دوسری جگہ ہے:۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا۔ (۴/۴)

تم اپنی بیویوں کا مہر کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر اس طرح ادا کر دیا کرو جس طرح شہد کی مکھی شہد دے دیتی ہے۔ ہاں! اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے بلا تأمل اپنے صرف میں لا سکتے ہو۔

(۲) نکاح کے بعد قبل از خلوت طلاق ہوجائے تو:۔

(i) اگر مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو خاوند کی استطاعت کے مطابق اسے کچھ دے دینا چاہیئے:۔

لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۔ (۲۳۶/۲)

اور اگر ایسی صورت ہو کہ تم نے ابھی اپنی منکوحہ بیوی کو چھوا نہیں۔ اور نہ ہی اس کا مہر مقرر ہوا تھا اور طلاق کی نوبت آجائے، تو، اس صورت میں بھی قانون کے مطابق طلاق دیدینے میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن چاہیئے کہ اس مطلقہ کو کچھ ساز و سامان دیدیا جائے۔ صاحب وسعت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی بساط کے مطابق ـــ تاکہ مطلقہ ہونے کی وجہ سے اس عورت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی کچھ تلافی ہوجائے۔ اس قسم کا حسن کارانہ سلوک تم پر واجب ہے۔

(ii) اگر مہر مقرر ہوچکا تھا تو اس کا نصف ادا کرنا ہوگا:۔

وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَن

تَعْفُوٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (۲ / ۲۳۷)

اور اگر ایسا ہو کہ تم نے اپنی منکوحہ سے مقاربت نہیں کی، لیکن اس کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور طلاق کی نوبت آجائے، تو اس صورت میں اس کے مہر کا نصف ادا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اگر صورت وہ ہو جسے (۲ / ۲۲۹) میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مرد کو کچھ معاوضہ دلایا جانا مقصود ہو، تو عورت اپنا حق چھوڑ سکتی ہے۔ اور اگر شکل یہ ہو کہ نکاح کی گرہ کو مرد کھولنا چاہتا ہے (یعنی طلاق کا مطالبہ اس کی طرف سے ہے) تو وہ نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس قسم کا باہمی مراعات کا برتاؤ قانونِ خداوندی کے منشار سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے تم آپس میں حسنِ سلوک کو کبھی نہ بھولو۔ الگ بھی ہو تو فراخ دلی کا ثبوت دے کر الگ ہو۔ اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ عورت بذاتِ خود اپنا حق چھوڑ دے یا "جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے" وہ چھوڑ دے۔ ان الفاظ (بیدہٖ عقدۃ النکاح) سے ہمارے ہاں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ "نکاح کی گرہ" خاوند کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو اسے باندھے رکھے اور جس وقت چاہے اسے کھول دے عورت (بیوی) کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ طلاق کا کلی اختیار مرد کو حاصل ہوتا ہے

طلاق کا حق

طلاق کے متعلق تفصیلی گفتگو تو آگے چل کر کی جائے گی، یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ کہنا کہ طلاق کا کلی اختیار مرد کو حاصل ہے، بیوی اس کے قبضہ میں ہوتی ہے، قرآن کی تعلیم، ہدایات، قوانین اور منشار کے خلاف ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے اور جس طرح اس کے باندھنے کے لئے فریقین کو کلی اختیار ہوتا ہے، اسی طرح اسکے کھولنے (ختم کرنے) کا اختیار بھی فریقین کو یکساں حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے (نکاح کے عنوان میں) بتایا جا چکا ہے۔ نکاح کے معاملہ میں عورت خود مختار ہوتی ہے لیکن اگر وہ چاہے تو کسی کو اپنی طرف سے "مختار نامہ" دے سکتی ہے۔ بیدہٖ عقدۃ النکاح سے مراد وہ شخص ہے جسے عورت نے اپنا مختار مقرر کیا ہو یا خود عدالت جس نے طلاق کے تضمنات کا فیصلہ کرنا ہو۔ بہر حال اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عورت چاہے تو اپنا حقِ مہر چھوڑ سکتی ہے۔ (اسی طرح مرد بھی اپنا حق چھوڑ سکتا ہے یعنی وہ چاہے تو عورت کو نصف مہر کے بجائے پورا مہر ادا کر دے) لیکن یہ باہمی رضامندی کی صورت ہے۔ قانونی پوزیشن یہی ہے کہ عورت کو نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

طلاق کی صورت میں مہر کی کچھ اور شرائط بھی ہیں لیکن اسے ہم طلاق کے عنوان میں بیان کریں گے۔

واضح رہے کہ لڑکی کو جہیز دینا محض ایک رسم ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ اگر لڑکی کے ماں باپ

جہیز ایک رسم ہے

یا دیگر اعزہ اور احباب اسے کچھ تحفتہً دینا چاہیں تو اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن لڑکے کی طرف سے جہیز کا مطالبہ ایسی پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، قرآنِ کریم نے تو مرد پر فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ عورت کو کچھ تحفہ دے، نہ یہ کہ الٹا اس سے کچھ طلب کرے۔ چونکہ ہمارے معاشرہ میں اچھے رشتوں کی کمی ہے اور لڑکی کے والدین اس باب میں پریشان رہتے ہیں، اس لئے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو جہیز کا مطالبہ ان کی اس پریشانی کو (EXPLOIT) کرنا ہوتا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جس رشتہ کا آغاز ہی استحصال کی نیت سے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ آغاز کیا، یہاں تو کبھی تک (ایامِ جاہلیہ کی طرح) خاوند ساری عمر یہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے شادی کر کے اسکے والدین پر احسانِ عظیم کیا ہے اور وہ عمر بھر کے لئے اس کے ذیل ہو گئے ہیں اور انہیں ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ اگر اس کے سسرال والے اس کے کسی مطالبہ کو نہیں مانتے (خواہ وہ کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ہو) تو وہ اپنی بیوی کو تنگ کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ماں باپ کو مجبور کر کے اس کے "بعل" کے نہایت نامعقول مطالبہ کو پورا کرا لے۔ اور وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اسے اس کے میکے بھیج دے گا۔ یہ اُس دَور کی ذہنیت کا مظاہرہ ہے جب آدمی ہنوز انسانیت کی سطح پر نہیں پہنچا تھا۔ شریف انسان کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم نے تو نسبی اور سسرالی رشتوں کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے۔ (۲۵/۵۴)۔ تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے۔

(۰)

اس طرح نکاح کی تکمیل سے ایک مرد اور عورت، قرآنی قانون کی رُو سے، میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ نکاح سے مقصد سکینت، رحمت، مودّت۔ یعنی مرد اور عورت کی جنت بداماں ازدواجی زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے میاں بیوی کی باہمدگر پیوستگی اور جذبیت کو ایک نہایت خوبصورت استعارہ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ - (۲/۱۸۷) "تمہارا باہمی رشتہ جسم اور لباس کا سا ہے۔ وہ تمہارے لئے بمثل لباس کے ہیں۔ تم ان کے لئے مانند لباس کے ہو" تم دونوں کے درمیان کوئی اور حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انتہائی قرب، راز داری اور اعتماد کی صورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے باہمی رشتے کا تعلق تو جذبات سے ہے لیکن بایں ہمہ، قرآنِ کریم زندگی کے اس نہایت اہم مسئلہ کے قانونی پہلو کو بھی نظر انداز

نہیں کرتا اور بتاتا ہے کہ اس رشتہ میں حقوق اور ذمہ داریوں کی شکل کیا ہوگی، اسے اس نے چار لفظوں میں ایسی جامعیت سے سمو دیا ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ[1] (۲۲۸)۔ "قانونِ خداوندی کی رُو سے عورتوں کی جس قدر ذمہ داریاں ہیں، اتنے ہی ان کے حقوق ہیں"۔ یعنی ہر ذمہ داری کے مقابلہ میں ایک حق۔

اس مقام پر ایک آیت کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے جلد دوم صفحہ ۱۱۷-۱۲۵، زیر آیت (۲۲۸) میں بتایا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے مردوں اور عورتوں کی حیثیت مساوی ہے اور کسی ایک جنس کو دوسری جنس پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اس کے خلاف ہمارے قدامت پرست طبقہ کا عورت کے متعلق جو پست نظریہ ہے اس کی وضاحت بھی وہاں کر دی گئی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے اپنے نظریہ کی تائید میں جو آیت پیش کی جاتی ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ۔ (۴/۳۴) اس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اس کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے مناسب مقام یہی ہے۔ پوری آیت یہ ہے:-

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۔ (۴/۳۴)۔

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے۔ پس نیک بخت عورتیں فرماں بردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑو ان کو بیچ خواب گاہ کے۔ اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

[1] اس آیت میں وللرجال علیھن درجۃ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان کی تشریح عدت کے ضمن میں کی جائے گی۔

یعنی چونکہ مرد کماتے ہیں اور عورتوں پر اپنا روپیہ صرف کرتے ہیں اس لئے وہ عورتوں پر حاکم ہیں۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ مرد کی فرمانبردار رہے اور اگر اس کی فرماں برداری میں کوئی فرق آجائے تو مرد کو یہ بھی حق حاصل کہ اسے مارے پیٹے۔

یہ ہے عورت کی پوزیشن اس قرآن کی رُو سے جو ہمارے مروجہ ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچوں، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے .... جب میں کہتا ہوں کہ ہمارے مروجہ ترجمے قرآن کا صحیح مفہوم پیش نہیں کرتے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگ جنھوں نے یہ ترجمے کئے تھے عربی کے بڑے بڑے عالم تھے۔ پھر کیا ہوا کہ یہ صحیح ترجمہ نہ کر سکے. اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے وہ ممالک بھی موجود ہیں جن کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے۔ اگر وہ بھی قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تو پھر اور کون صحیح مفہوم سمجھے گا۔

ترجمے صحیح کیوں نہیں ہوتے

یہ اعتراضات بظاہر بڑے وزنی ہیں اس لئے ان کے جواب کے لئے اصل حقیقت کا سمجھنا ... ضروری ہے۔ جن بزرگوں نے یہ ترجمے کئے ہیں ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ یہ کیسے متعین کیا جائے کہ قرآن کے فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہیں لامحالہ اہل زبان ہی کی طرف رجوع کرنا تھا۔ ہمارے ہاں تیسری صدی ہجری سے لے کر ان بزرگوں تک سینکڑوں تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئی تھیں. ان میں سے بعض مفسرین، تفسیر کے علاوہ، عربی ادب کے بھی امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تفسیر کشاف کے مصنف علامہ زمخشری یا تفسیر جلالین، جس میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مرادف عربی الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ ہمارے مترجمین کے لئے عربی کی ان تفسیروں میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی طرح عربی ممالک کے باشندوں کے لئے بھی ان عربی تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی جو کچھ ان عربی کی تفسیروں میں لکھا گیا ہے، اسے قرآن کا صحیح مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہمارے ترجموں میں قرآن کریم کا جو مفہوم دیا گیا ہے (یا جو مفہوم خود عربی بولنے والے سمجھتے ہیں) وہ دراصل قرآن کا وہ مفہوم ہے جو ہمارے اسلاف کی تفاسیر میں درج ہو چکا تھا مثال کے لئے یہی (زیرِ نظر) آیت دیکھئے۔ اس میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ہیں قَوّٰمُوْنَ کا ترجمہ کیا گیا ہے حاکم۔ ہمارے بزرگوں نے قوّامون کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان عربی تفاسیر کو دیکھا تو کشاف میں اس کا مفہوم لکھا تھا مسیطرین۔ یعنی داروغے۔ اور جلالین میں لکھا تھا۔ متسلطین یعنی عورتوں پر مسلّط۔ اب ظاہر ہے کہ جب ہمارے مترجمین نے دیکھا کہ یہ ائمہ تفسیر و ادب، قوّامون کا مفہوم مسیطرین اور متسلطین

بتاتے ہیں تو انہوں نے اس کا ترجمہ حاکم کر دیا۔ یہ ان الفاظ کا صحیح ترجمہ ہے لیکن یہ ترجمہ قرآن کے لفظ قوامون کا نہیں بلکہ قوامون کے اس مفہوم کا ترجمہ ہے جو کشاف اور جلالین میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا' ہمیں (ان ترجموں کے بجائے) یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان تفاسیر میں یہ مفہوم کس طرح آ گیا۔

یہ تفاسیر اس دور میں لکھی گئی تھیں جب ہمارے معاشرے پر ملوکیت کا استبداد غالب آ چکا تھا اور ہماری "شریعت" اور "طریقت" مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصورات سے متاثر ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جس میں عورت کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر قرار پا چکی تھی۔ ان تفاسیر میں سب سے پہلے طبری کی تفسیر لکھی گئی۔ (باقی تفسیریں درحقیقت اسی تفسیر پر لکھی ہوئی "طرحی غزلیں" ہیں) طبری کا انداز یہ ہے کہ اس میں قرآن کا مفہوم روایات کی رُو سے متعین کیا گیا ہے۔ یہ روایات کس طرح وضع ہوئیں اور انہیں کیسے مرتب اور جمع کیا گیا اس کے لئے کتاب "مقامِ حدیث" ملاحظہ کیجیے۔ روایات کی تاریخ سے اس حقیقت کا سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ روایات کے وضع کرنے میں کوئی دشواری ہی نہ تھی۔ یہ روایات عکس ہیں اس معاشرے کا جس میں یہ وضع کی گئی تھیں (نہ کہ رسول اللہ کے عہدِ مبارک کا) اب ظاہر ہے کہ قرآن کا جو مفہوم ان روایات کی رُو سے متعین کیا گیا تھا وہ کس قسم کا ہو گا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پھر اسی آیت کی مثال سامنے لائیے جو اس وقت زیرِ نظر ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ کشاف وغیرہ نے قَوَّامُوْنَ کا مفہوم منسلطین اور مسیطرین بیان کیا ہے۔ اور

روایات

اسی آیت سے عورتوں کو مارنے پیٹنے کا جواز نکالا ہے۔ اس آیت کی "شانِ نزول" میں جو روایات ہماری کتابوں میں لکھی ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرمؐ سے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہو گئی اور حضورؐ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپؐ کے حکم کو سن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر آپؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہو گئی اور بہت سی عورتیں شکایت لے کر آپؐ کے پاس آئیں۔ اس پر آپؐ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے لیکن جب آپؐ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ لہٰذا حکم یہی رہا کہ چونکہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے انہیں مار پیٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعثؓ تین باتیں یاد

دیکھو جو میں نے رسول اللہ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے بیوی کو کس بنا پر مارا۔ .... دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی [1]

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کرسکتا کہ وہ ماسوائے اللہ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

یہ ہیں وہ روایات جو زیر نظر آیت کی تفسیر میں ہماری سب سے قدیم کتب تفاسیر میں مذکور ہیں۔ انہی روایات کی بنا پر قوامون کا مفہوم متسلطین (غلبہ و تسلط کے مالک) اور مسیطرین (داروغہ) لیا گیا اور اسی مفہوم کا ترجمہ ہمارے ہاں حاکم کیا گیا۔ پھر انہی کے مطابق ہماری فقہ کے احکام مدون ہوئے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے امام جصاص نے احکام القرآن میں انہی روایات و تفاسیر کی بنا پر عورتوں کو مارنے پیٹنے اور بند رکھنے کے تمام فقہی قوانین بیان کر دیئے ہیں۔

ان روایات کی وجہ سے ایک بڑی مشکل اور بھی واقع ہو گئی۔ اگر ہمارے یہ مفسرین حضرات قرآنی آیات کا مفہوم اپنی طرف سے متعین کرتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے اتنی گنجائش رہ سکتی تھی کہ ان کے بیان کردہ مفہوم سے اختلاف کر سکتے۔ لیکن جب انہوں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کی تائید میں رسول اللہ کی طرف منسوب کردہ احادیث درج

ایک اور دشواری

کر دیں تو ان کا متعین کردہ مفہوم رسول اللہ کا بیان فرمودہ مفہوم قرار پا گیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ وہ اس مفہوم سے اختلاف کا خیال تک بھی ذہن میں لا سکتا۔ چنانچہ جس کسی نے اس مفہوم سے اختلاف کا خیال ظاہر کیا اسے فوراً کہہ دیا گیا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہ زیادہ بہتر سمجھتے تھے؟ اب کون سا ایسا سوختہ بخت مسلمان ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں رسول اللہ سے بھی بہتر قرآن سمجھتا ہوں۔ اس طرح ان تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم ابدی طور پر مستند قرار پا گئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم رسول اللہ کے متعین فرمودہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ ان روایات کی رو سے متعین کئے گئے تھے جو رسول اللہ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد وضع کی گئیں۔ رسول اللہ کا متعین فرمودہ مفہوم وہ ہو سکتا تھا جسے رسول اللہ قرآن کے ساتھ خود ایک کتاب میں لکھ کر یا لکھوا کر مستند طور پر امت کو دے کر جاتے۔ رسول اللہ نے کوئی ایسی تفسیر امت کو نہیں دی۔ اس لئے ان کتب تفسیر میں بیان کردہ مفہوم رسول اللہ کا نہیں، خود ہمارے مفسرین کا مفہوم ہے جو اس دور میں متعین کیا گیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن جس کی تائید میں وہ روایات درج کر دی گئیں جو رسول اللہ

---

[1] یہ روایات تفسیر ابن کثیر۔ پارہ پنجم میں درج ہیں۔

کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔

اس سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ " اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ " میں قَوَّامُوْنَ کا ترجمہ حاکم، متسلط، اور داروغہ کس طرح کیا گیا۔ اس مقام پر ایک لطیف بات کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہوا کہ ان روایات کی رُو سے ممکن ہے کوئی غیر مسلم یہ اعتراض کر دے کہ رسول اللہ نے عورتوں کے ساتھ اس قسم کے سخت سلوک کی اجازت کیسے دے دی، اب دیکھئے کہ اس اعتراض سے بچنے کی صورت کیا پیدا کی گئی! ایک روایت میں ہے کہ جب آپؐ نے اس عورت کو جس نے اپنے خاوند کی شکایت کی تھی، بدلہ لینے کی اجازت دی تو خدا کی طرف سے (اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ والی) آیت نازل ہو گئی۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا اَرَدْنَا اَمْرًا اَوَاَرَادَ اللّٰهُ غَيْرَهٗ۔ یعنی ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔ آپ سمجھے کہ یہ بات کیا ہوئی! اس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ رسول اللہ تو چاہتے تھے کہ عورتوں سے عدل و انصاف کیا جائے۔ لیکن جب خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا تو رسول اللہ مجبور ہو گئے۔ لہٰذا آپ کو بھی اسی کے مطابق تعلیم دینی پڑی۔

اس روایت کے وضع کرنے والے نے بزعم خویش، رسول اللہ کو تو اس اعتراض سے بچا لیا، لیکن اتنا نہ سوچا کہ وہی اعتراض اب خود خدا پر بھی عاید ہو گیا۔ بلکہ اعتراض کی شدت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ گئی کہ خود رسول اللہ نے خدا کے حکم کی سختی کو محسوس کیا، جبھی تو کہا کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور ہی حکم دے دیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ جو اپنی مرضی کو پورے پورے طور پر خدا کی مرضی (یعنی قانونِ خداوندی) سے ہم آہنگ رکھتے (اور ہم آہنگ رکھنے کی تمنا کرتے) تھے، کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور حکم دیدیا۔[1]

(۰)

اب آیت " اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ " کے صحیح مفہوم کی طرف آئیے۔

آیت کا صحیح مفہوم

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ اَلرِّجَالُ۔ (عام مردوں) اور النِّسَآءُ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی

[1] جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا وہ خدا کی طرف سے وحی (غیر متلو) کی رُو سے ہوتا تھا، وہ غور کریں کہ رسول اللہ نے یہ کیوں فرمایا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور حکم دے دیا۔

ہے، اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے خصوصی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا، قرآن نے تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ہیں۔ لغت میں قَامَ الرَّجُلُ عَلَى الْمَرْأَةِ۔ کے معنے دیئے ہیں مأنها۔ یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قوام علیها کے معنی ہیں مائن لها۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہوگیا۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں۔ اس لئے کہ (بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) تقسیمِ کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتسابِ رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے معذور ہو جاتی ہیں، اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق، عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ (بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ) اس سے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی (فَالصّٰلِحٰتُ) اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ خاص صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قٰنِتٰتٌ کے۔ سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد، اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتسابِ رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ صلاحیتیں غیر محل میں صرف ہو جائیں گی۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کرسکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے (یعنی جنین کی حفاظت)

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ نہایت سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رُو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویوں (فَالصّٰلِحٰتُ) کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرماں بردار (قٰنِتٰتٌ) ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری

ہیں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری کریں اور عصمت کی حفاظت۔ گویا صٰلِحٰتٌ اور قٰنِتٰتٌ اور حٰفِظٰتٌ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے سورہ احزاب (۳۳/۳۵) میں یہ سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر "فرماں بردار" ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہٰذا، یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں' اور عورتیں، مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے۔

عورتوں کو مارنا

اب آگے بڑھیئے۔ آیت کا باقیماندہ حصہ یہ ہے۔ (وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۔) چونکہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرماں برداری کرنا ہے، اس لئے باقیماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں لیا گیا کہ اگر بیوی' مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کر لے۔ اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اُسے مارے۔

لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی، عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی فرائض کو بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رُو سے وہ اکتسابِ رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیمِ کار کے اصول سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آجکل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت[1] (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں، بلا عذر، اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسلِ انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں

---

[1] یعنی ایسا طریق جس میں قاعدے اور قانون کی کوئی پابندی نہ کی جائے۔

کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خواب گاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISH-MENT) بھی دی جا سکتی ہے۔

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رُو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند عورتوں پر حاکم اور داروغے ہیں۔ اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم رکھیں۔ کیونکہ بیوی مرد کی کمائی کھاتی ہے۔ بیوی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خاوند کی تابعدار رہے۔ اور اگر وہ اس کی فرماں برداری نہ کرے تو میاں کو حق حاصل ہے کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنا حکم منوائے۔

(۰)

مردوں اور عورتوں کی مساوات کے خلاف دو اعتراضات اور بھی کئے جاتے ہیں۔ یعنی

(۱) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا کیوں ہے؟ اور

(۲) شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر کیوں قرار دیا گیا ہے؟

وراثت میں لڑکی کا حصہ

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو ۴/۱۱)۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں، عورت کو اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اس کے برعکس، لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔ جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶)۔ یا کلالہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶)۔ (تفصیل قانونِ وراثت کے ضمن میں اپنے مقام پر ملے گی۔)

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ لڑکی کا حصہ کم مقرر کرنے سے نہ تو اس کے حقوق میں کمی آجاتی ہے اور نہ ہی معاشرہ میں اس کا مقام مرد سے نیچے رہ جاتا ہے۔

(۰)

عورتوں کی گواہی

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے۔ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ۔ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں، اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی بیان کر دی ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ" ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ لیکن قرآن نے تَضِلَّ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی نسیان (بھول جانے) سے مختلف ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہوجانا۔ ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہوجانا۔ واضح تر الفاظ میں (TO GET CONFUSED OR BECOME PERPLEXED)۔ اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آیئے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ

(i) ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور

(ii) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ یہ اس لئے ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور اُن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابلِ اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن مردوں کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتے اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابلِ قبول قرار دیا ہے جیسا ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو ۲۴/۶-۹)

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات صاف کر دے۔

وہ تو زمانۂ نزولِ قرآن کی بات ہے۔ آپ آج بیسویں صدی میں، ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جا کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجئے جہاں گرد و پیش اجنبی مرد ہوں۔ وہاں دیکھئے کہ اس بیچاری کی حالت کیا ہوتی ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔ وہ کانپنے لگ جائے گی۔ اس کی گھگھی بندھ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ اس کی کوئی جان پہچان والی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہو جائے گی۔ اس دوسری عورت کا سامنے ہونا اس کے لئے باعثِ تقویت ہوگا۔ اگر اسے کہیں ہچکچاہٹ ہوگی تو اس کی ساتھی اس کی بات صاف یا پوری کر دیگی۔ قرآن کریم نے اسی قسم کی عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ اَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ۔ (۴۳/۱۸) "یہ، زیورات میں پلی ہوئی جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کرسکتی۔" اس قسم کی ہیں وہ عورتیں جن کے متعلق کہا کہ انہیں عدالت میں جانا پڑے

تو ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی کھڑی کر دو تاکہ اس کا حوصلہ بندھا رہے۔ لیکن قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ مناسب تعلیم وتربیت سے انسان (مرد ہو یا عورت) کی اس قسم کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے جنتی معاشرہ کی عورت کے متعلق کہا ہے کہ وہ فصیح البیان (عُرُبًا) ہوگی۔ (۵۶/۳۷)

(۰)

ان تصریحات کے علاوہ، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ اُن دونوں کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادات مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ط (۲/۲۸۲)۔ اگر ایسا ہو کہ اُن میں سے گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی دوسری اس کی بہن اسے یاد دلا دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کی دخل اندازی کا موقعہ ہی نہیں آئیگا۔ اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پا جائے گی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر لڑکیوں کی پرورش "زیورات" میں نہ کی جائے جس سے وہ معاملاتِ زندگی میں حصّہ لینے کے قابل ہی نہ بن سکیں اور یوں "غیر مبین" (گونگی) بن کر رہ جائیں۔ بلکہ انہیں زیورِ تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا جائے تو پھر وہ غیر مبین نہیں رہیں گی۔ اس صورت میں دوسری عورت کی مداخلت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

(۰)

ہم نے پہلے نسبی اور سسرالی رشتوں کے متعلق اشارہ کیا تھا۔ اب اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ عام دستور کے

نسبی اور سُسرالی رشتے

مطابق لڑکا (خاوند) شادی کے بعد بھی اپنے ماں باپ اور دیگر اعزہ واقربا کے ساتھ یا قریب رہتا ہے۔ لیکن لڑکی (بیوی) اپنے تمام اعزہ واقرباء (اہلِ خاندان) کو چھوڑ کر اس نئے خاندان میں آکر بستی ہے۔ اس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ لڑکے (خاوند) کے تمام سابقہ رشتے تو برقرار رہتے ہیں لیکن لڑکی کے رشتے دار ان دونوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے کہا کہ نہیں! اس رشتے سے ان دونوں خاندانوں میں قرب پیدا ہونا چاہیئے (جیسا کہ اشارۃً پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے اس نے کہا کہ سُسرالی رشتہ بھی ایسا ہی اہم ہے جیسا نسبی رشتہ۔ ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَّكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا۔

خدا وہ ہے جس نے انسان کی پیدائش ایک قطرۂ آب سے کی، اس کے بعد تمدنی اور معاشرتی تقاضوں کی رُو سے انسانوں میں باہمی رشتے استوار ہوجاتے ہیں ــ نسبی (ددھیالی رشتے اور سسرالی (ننھیالی) رشتے۔ یہ اسی خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کی رُو سے ہوتا ہے۔

اس طرح مرد اور عورت کے خاندان ایک رشتے میں منسلک ہوجاتے ہیں اور ان کے معاشرتی دوائر میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔

اس ضمن میں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ لڑکے کی شادی اس وقت کرنی چاہیئے جب وہ معاشی طور پر خود کفیل ہو۔ اور اپنے گھر کا بوجھ خود اٹھا سکے۔ شادی کے بعد انہیں اپنے الگ گھر میں رہنا چاہیئے نہ کہ لڑکے کے ماں باپ کیساتھ۔ سینکڑوں گھرانوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ازدواجی زندگی کی خوشگواری کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کا گھر الگ ہو جس میں وہ آزادانہ زندگی بسر کرسکیں۔ سورۃ النور کی آیت (۲۴/۶۱) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "اس میں کچھ حرج نہیں کہ تم اپنے گھر سے کھاؤ یا اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے ۔ ۔ ۔ ۔" اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم ماں باپ کے گھر کو الگ قرار دیتا ہے۔ مشترکہ گھرانے (JOINT FAMILY) کا دستور تو ہندوؤں میں تھا۔ وہیں سے ہمارے ہاں بار پا گیا۔ اس کے نتائج بڑے تلخ ہوتے ہیں۔

(۰)

جنسی اختلاط

ازدواجی زندگی افزائش نسل کا ذریعہ ہوتی ہے جو نتیجہ ہوتی ہے میاں بیوی کے جنسی اختلاط کا۔ قرآن کریم نے اس باب میں بھی ہدایات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے :-

۲/۲۲۲ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۔ (۲/۲۲۲)

نکاح کے بعد مقاربت کا سوال آتا ہے۔ سو ایام حیض میں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے اس لئے کہ حیض، عورت کے لئے ایک قسم کی واماندگی کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مجامعت نقصان کا باعث۔ لہٰذا ان ایام میں عورتوں

سے الگ رہنا چاہیئے تاوقتیکہ وہ اس سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہ عرصہ ختم ہو جائے، تو جس طرح خدا کے طبیعی قانونِ تولید کا اشارہ[1] ہے۔ تم اس طرح ان سے مقاربت کر سکتے ہو۔

اگر تم اس سے پہلے ایسا نہیں کرتے تھے تو اب صحیح راستے کی طرف لوٹ آؤ۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ لوگ وہی ہیں جو غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں اور ناخوش آیند امور سے دُور رہیں۔

ایامِ حیض کے علاوہ (طُہر کی حالت میں بھی) روزے کے دنوں میں مباشرت ممنوع ہے۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے، رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی ـــــ بیویوں سے جنسی اختلاط قربِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصور ہے) میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیال پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے۔ (۵۷/۲۷)۔ لہذا، خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وسوسہ پیدا ہو رہے تھے، ان سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت منشائے خداوندی کے مطابق اپنی بیویوں کے پاس بھی جا سکتے ہو۔

اس کے بعد کہا: وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (۲/۱۸۷) اعتکاف کی حالت میں بھی مباشرت ممنوع ہے۔ (روزے اور اعتکاف کے متعلق پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ دیکھئے عنوان صیام اور حج)۔

ــــــــــ (۰) ــــــــــ

آیت (۲/۲۲۲) میں ایک اہم نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اس میں کہا ہے کہ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ

---

[1] قرآن کریم نے طبیعی قوانین کے فطری طریق کو بھی ہدایتِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے (۲/۲۸۲؛ ۲۰/۵۰؛ ۸۷/۳)

حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ لیکن قرآن کریم ـــ میں اس قسم کا حکم کہیں نہیں دیا گیا (کہ مباشرت کیسے کرنی چاہیئے) اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر "مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" کا مطلب کیا ہے؟ امر کے متعلق جلد اول ص۲۸۳ زیر آیت (۲/۱۰۹) بتایا جا چکا ہے کہ اس کے بنیادی معنی راستے کی نشاندہی کرنے (DIRECTIVE) یا ہدایات کے ہیں۔ حکم کے معنوں میں یہ ثانیاً استعمال ہوتا ہے۔ طبعی افعال کے متعلق خدا کی طرف سے رہنمائی جبلّی طور پر حیوانات کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ یہی خدا کا امر ہے جو خود انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ یہ تو وحی کی رُو سے ہدایت ہے جو خارج سے ملتی ہے۔ طبعی افعال کے متعلق جبلّت یا فطری صلاحیت "امر اللہ" کا حکم رکھتی ہے۔ اس آیت میں دیکھئے حالت حیض میں مباشرت سے احتراز کے لئے وحی کے ذریعے حکم دیا گیا کیونکہ یہ چیز حیوانی جبلّت میں نہیں اور اس کے بعد معاشرتی طریق کے متعلق اتنا کہہ دیا کہ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ جبلّی ہدایت کے مطابق۔

فطری تقاضا

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی ہیں جب انسان انہیں استعمال میں لاتا ہے تو اس کے ان افعال کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی جلد اول ص۱۸۴ ۔ زیر آیت (۲/۷) گزر چکی ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں "من حیث امرکم اللہ" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی فطری تقاضا کے مطابق۔

یہ فطری تقاضا کیا ہے، اسے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ فطرت افزائش نسل چاہتی ہے اور اس کا ذریعہ نر اور مادہ کا جنسی اختلاط ہے۔ قرآن کریم ہمارے ذوق سلیم کی رعایت سے جنسیات (SEX) سے متعلق امور پر گفتگو، ایمائی (SUGGESTIVE) انداز سے کرتا ہے۔ اسی انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے فطرت کے اس منشاء کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

۲/۲۲۳ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲/۲۲۳)

جنسی اختلاط کا مقصد

میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے معاملہ میں اس اصول کو یاد رکھو کہ اس سے مقصود افزائش نسل (اولاد پیدا کرنا) ہے۔ اس اعتبار سے تمہاری بیویوں کی مثال کھیتی کی سی ہے۔ جس طرح کسان اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل اُگانا مقصود ہو اسی

طرح تم بھی اس وقت اپنی "کھیتی" میں جاؤ جب تم (اولاد پیدا کرنا) چاہو۔

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ، اولاد پیدا کرنا ہی نہیں، اصل مقصود اپنی ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ حیاتِ جاوید، بقائے ذات سے حاصل ہوتی ہے اولاد کے ذریعے نہیں۔ اس لئے تم یہ بھی دیکھو کہ تم نے بقائے ذات کے لئے کیا کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ہمیشہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ تم خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔ زندگی کی خوشگواریاں انہی کے لئے ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے ایسے اہم اور نازک مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعے کس قدر لطیف انداز میں واضح کر دیا ہے۔ کسان اپنے کھیت میں کلبہ رانی (ہل چلانا) اس وقت کرتا ہے جب تخم ریزی مقصود ہو۔ اور تخم ریزی سے مقصود کھیت میں فصل اگانا ہوتا ہے۔ لہٰذا میاں بیوی میں جنسی اختلاط اس وقت ہونا چاہیئے جب بچہ پیدا کرنا مطلوب ہو۔ چونکہ افزائش نسل کا مقصد پورا کرنے کے لئے کچھ مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں (مثلاً استقرارِ حمل، وضع حمل، بچوں کی پرورش اور انسان کی صورت میں، ان کی پرورش، تربیت اور تعلیم وغیرہ) اس لئے فطرت نے اس عمل (اختلاط) میں حظ (PLEASURE) کا عنصر رکھ دیا تاکہ وہ اس مشقت طلب معاملہ میں ترغیب کا کام دے۔ اس سے واضح ہے کہ جنسی اختلاط کا حقیقی مقصد افزائش نسل ہے۔ حظ و کیف محض ترغیب کی خاطر ہے۔

افزائش نسل کا فطری مقصد حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے لیکن اس سلسلہ میں فطرت نے ان دونوں میں ایک اہم فرق رکھا ہے۔ حیوانات کی صورت میں اسے (REGULATE) کرنا، فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ایک سانڈ (بیل) سال بھر گایوں کے گلہ میں چرتا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ کسی گائے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن جب فطرت کے پروگرام کے مطابق ان کے استقرارِ حمل کا زمانہ (MATING SEASON) آتا ہے، وہی بیل جنسی اختلاط کے لئے دیوانہ ہو جاتا ہے اور گائے بھی اس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔ اس اختلاط کے بعد ان میں پھر وہی بے رغبتی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر حیوانات کے جنسی جذبہ پر فطرت نے خود (SAFETY VALVE) لگا رکھا ہے۔ وہ اسے اس وقت کھولتی ہے جب ان سے اولاد پیدا کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اس میں حیوانات کا اپنا اختیار کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے موجبِ اختیار پیدا کیا ہے اس لئے یہ (دیگر امور کی طرح) اولاد پیدا کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں بھی فطرت کے پروگرام کی پابندی پر مجبور نہیں۔ مشیتِ خداوندی یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنے

حالات کے مطابق اولاد پیدا کرنے کا (PLAN) خود بنائے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اسی طرح جیسے کسان اپنے پروگرام کے مطابق کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے۔ اسی لئے حیوانات کی صورت میں اولاد کی پرورش کا مسئلہ ایسا دِقت طلب نہیں ہوتا۔

اولاد ایک پروگرام کے مطابق

لیکن انسان کی صورت میں مسئلہ صرف اولاد کی پرورش کا نہیں ہوتا، ان کی تعلیم اور تربیت کا بھی ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری بڑی محنت طلب بھی ہوتی ہے اور مناسب ذرائع اور اسباب کے میسر آنے کی متقاضی بھی۔ اس لئے انسان کی صورت میں نہایت ضروری ہے کہ اس کی اولاد اس کی (PLANNING) کے مطابق وجود میں آئے۔

لیکن جس طرح انسان اپنی ہر قوت اور صلاحیت کے استعمال کے معاملہ میں اپنے اختیار و ارادہ کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے (MIS-USE) ہی نہیں (ABUSE) کرتا ہے، اس نے جنسی اختلاط کے معاملہ میں بھی یہی کچھ کیا۔ اس نے افزائشِ نسل کے فطری مقصد کو تو رکھا بالائے طاق اور حصولِ لذّات کو مقصود بالذات قرار دے کر اس میں ایسا غرق ہوا کہ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہی نہیں، مدہوش ہو گیا اور اس طرح اس کرۂ ارضی کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ بے محابا جنسی اختلاط سے کثرتِ اولاد کا خطرہ تھا۔ اس خطرہ کو مانعِ حمل ادویات اور تدابیر سے دور کر لیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوشش (بلکہ روش) کہ جنسی اختلاط کی لذت تو حاصل ہو جائے لیکن اس سے حمل قرار نہ پائے، دورِ جدید کی اختراع ہے، یہ صحیح نہیں۔ انسان کی دیگر بدنہادیوں (PERVERSIONS) کی طرح یہ بھی قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے اور قوموں کو تو چھوڑیئے خود ہمارے ہاں کی کتبِ روایات میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اُس زمانے میں اس کا طریق عَزل تھا۔ یعنی جنسی اختلاط میں مادۂ تولید رحم کے اندر خارج نہ ہو، باہر خارج ہو۔ اسے آج کی اصطلاح میں (EXTRAXIT) کہا جاتا ہے۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

عزل

> حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو، تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو۔ اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہو گی۔ (بخاری جلد اول۔ ترجمہ اردو شائع کردہ نور محمد۔ کراچی صفحہ ۹۲)

ایک اور روایت میں ہے :-

ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبی (ص) کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ پالیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسول خدا (ص) سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی۔

(بخاری۔ جلد اول صـ۵۷۳ ترجمہ اردو۔ شائع کردہ نور محمد۔ کراچی)

ہمارے ہاں (پاکستان میں) جب ضبط ولادت (FAMILY PLANNING) کی اسکیم جاری ہوئی تو عزل کے جواز اور عدم جواز کے متعلق مذہبی پیشوائیت میں بحث چل نکلی۔ دونوں نے اپنی اپنی تائید میں روایات اور ائمہ سلف کے فتاوی پیش کئے۔ اس کی مخالفت کرنے والے ان روایات کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے جو فریق ثانی نے ان کے حق میں پیش کی تھیں لیکن ان کا مسلک عجیب معذرت خواہانہ تھا۔ مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس باب میں لکھا تھا:۔

عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں، ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرت ؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دیدیا۔ اس طرح کے جوابات نبی (ص) سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

ہم مودودی صاحب کے اس جواب پر کسی قسم کا تبصرہ لاحاصل سمجھتے ہیں۔ اس سے تو بہرحال انہیں بھی انکار نہیں کہ روایات کی رُو سے صحابہ رضؓ میں سے بعض نے عزل کی بابت دریافت کیا اور حضور ؐ نے اس کی اجازت دی!

لیکن حیرت ہے کہ مودودی صاحب ضبطِ ولادت کے لئے عزل کو تو خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ قرار دیتے ہیں لیکن استمنا بالید (مشت زنی۔ MASTURBATION) کو کچھ ایسا جرم نہیں سمجھتے۔ اسی باب میں کسی نوجوان نے ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ:۔

مشت زنی

ان دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ لیکن عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور

عملِ قومِ لوط اور وطیٔ بہائم کی بہ نسبت کمتر ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کرلے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ستمبر ۱۹۶۴ء۔ ایڈیشن صفحہ ۲۰۲)

یہ اُس خدا کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا حکم یہ ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳) جنہیں جنسی خواہش کی تسکین کا جائز ذریعہ (نکاح) میسر نہ آئے، وہ ضبطِ نفس سے کام لیں"۔ لیکن اس ساری بحث میں قولِ فیصل قرآنِ کریم کا وہ ارشاد ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ۔

(۱) جنسی اختلاط کا ایک ہی ذریعہ جائز ہے اور وہ ہے نکاح۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ (۲۳/۷) "جو اس کے سوا کوئی اور طریق اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے"۔

(۲) اور نکاح کے ساتھ جنسی اختلاط کا مقصد اس نے بتایا ہے: مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ۔ (۴/۲۴-۲۵؛ ۵/۵)۔ محصنین کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور مسافحین کے معنی ہوتے ہیں بہا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جائز جنسی اختلاط کا مقصد مادہ تولید کو بیوی کے رحم میں محفوظ رکھنا ہے نہ کہ اسے بہا دینا۔ اس سے فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ۔ (۲/۲۲۳) تم بیوی سے مقاربت اس وقت کرو جب تمہارا مقصد یہ ہو کہ مادہ تولید اس کے رحم میں محفوظ رہے۔ یعنی استقرارِ حمل کے لئے۔ اس مادہ کو بہا دینے کے لئے نہیں۔ کسان اپنے کھیت میں کبھی اس لئے تخم ریزی نہیں کرتا کہ پانی کی لہر آئے اور اسے بہا کر لے جائے۔

(۰)

لیکن اس آیت میں" أَنَّىٰ شِئْتُمْ " کے ایک اور مفہوم نے تو قیامت ہی ڈھا دی۔" أَنَّىٰ "کے معنی "جب" بھی ہیں اور" جہاں سے بھی"۔" جب" کے لحاظ سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ" عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں جب جی چاہے آؤ"۔ اور جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ" جب جی چاہے" سے مراد ہے "جب افزائشِ نسل مطلوب ہو"۔ لیکن ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تم اپنی کھیتی میں" جہاں سے" جی چاہے آؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے مطلب کیا لیا گیا؟

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ جو کچھ لکھنا پڑ گیا۔ کیا اس سے قرآن پاک کی اس تفسیر (مطالب الفرقان) کے ان اوراق کو آلودہ کروں؟ یہ احساس میرے دامنگیر تھا لیکن دوسری طرف یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی!

"تفسیر القرآن بالقرآن" کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر (وضعی) روایات کی رُو سے کی جاتی ہے، اس کی کچھ مثالیں بھی سامنے آتی رہیں۔ اُس احساس اور اِس اہمیت کے تقابل اور موازنہ کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ دل پر پتھر رکھ کر ہی سہی، اس کی مثال پیش کر دینی چاہیئے۔ سو اسے (بصد معذرت) درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری کتب احادیث میں سب سے بلند مقام بخاری کو حاصل ہے۔ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں آیت نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

> نافع مولیٰ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمر قرآن پڑھتے میں کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ ایک روز قرآن پڑھنے میں میں ان کے پاس چلا گیا۔ جب وہ سورۃ بقرہ پڑھتے ہوئے اس آیت (نساء کم) پر پہنچے تو مجھ سے کہا کہ تجھے معلوم ہے یہ آیت کب نازل ہوئی۔ میں نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے اس کا شانِ نزول بیان کیا اور پھر آگے پڑھنے لگے۔ عبدالصمد کہتے ہیں ابن عمر سے یہ بھی روایت پہنچی ہے کہ بعض آدمی عورتوں سے اغلام کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی عورت سے الٹا لٹا کر جماع کرے اس کی اولاد بھینگی ہوگی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ قول غلط ہے۔ عورتوں سے جس ہیئت سے چاہو جماع کرو۔

بخاری کی دو شرحیں بڑی مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔ ایک حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری اور دوسری علامہ بدر الدین عینی کی عمدۃ القاری۔ علامہ عینی نے پہلے بخاری کی حدیث نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:۔

> ہم سے اسحاق نے بیان کیا کہ ہمیں نضر بن شمیل نے خبر دی کہ ہمیں ابن عون نے نافع سے خبر دی کہ ابن عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے تو فارغ ہونے تک بولتے نہیں تھے۔ میں ایک روز قرآن کریم لے کر ان کے پاس بیٹھا اور انہوں نے سورۃ بقرہ پڑھی۔ حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے۔ جانتے بھی ہو کس بارے میں نازل

ہوئی تھی؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تو ابن عمرؓ نے فرمایا۔ فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیتے۔ اور عبدالصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (السختیانی) نے بیان کیا نافع سے۔ انہوں نے ابن عمر سے کہ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحییٰ ابن سعید نے بھی بیان کیا ہے اپنے باپ سے۔ انہوں نے عبیداللہ سے۔ انہوں نے نافع سے۔ انہوں نے ابن عمرؓ سے۔

اس کے بعد علامہ مذکور لکھتے ہیں :-

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے[1]۔ یعنی لفظ فی کے بعد ــــ حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قبلہا۔ یعنی اپنی بیوی کی شرمگاہ میں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابوقلابۃ الرقاشی سے انہوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انہوں نے یاتیہا فی الدبر (اپنی بیوی سے دبر میں جماع کرے) لفظ سے بیان کیا ہے۔　　　　(عمدۃ القاری)

یہ رہی علامہ عینی کی شرح۔ اب حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :-

ابن العربی نے سراج المرید میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا ہے اور کہا ہے۔ یاتیہا فی ۔ ۔ ۔ ۔ اور خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث، عورت سے دبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارے میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے۔ جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جو جابر کی حدیث میں آرہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر رد کرنے کے لئے۔ جیسا

---

[1] ان حضرات کی دیانت ملاحظہ فرمایئے۔ بخاری کے متن (عربی) میں قال یاتیہا فی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے الفاظ موجود ہیں اور فی کے بعد جگہ خالی ہے۔ لیکن بخاری کا اردو ترجمہ جسے نور محمد ـــ کارخانہ تجارت کتب (کراچی) نے شائع کیا ہے اس میں یہ فقرہ ہی غائب کر دیا گیا ہے۔　　　(اردو ترجمہ بخاری، جلد دوم۔ ص۴۳۳)

کہ دوسری حدیث میں آرہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عموم جب کسی خاص سبب پر وارد ہوتا ہے تو بعض اصولیوں کے نزدیک وہ اسی پر محصور رہتا ہے۔ اگرچہ اکثر اصولیوں کے نزدیک عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوصی سبب کا۔ یہ اصول اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ آیت جواز میں حجت ہو۔ لیکن بہت سی حدیثیں اس کی ممانعت کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا وہ حدیثیں آیت کے عموم کے لئے مخصص ہو جائیں گی۔ اگرچہ عموم آیت کی کسی خبر واحد سے تخصیص کرنے کے بارہ میں بھی علماء کے اندر اختلاف ہے۔ اور ائمہ حدیث میں سے ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے جیسے امام بخاری۔ ذہلی، بزار، نسائیؒ اور ابو علی نیشاپوری وغیرہ کہ اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ (فتح الباری)

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ حافظ ابن حجر کے نزدیک اس مسئلہ میں (کہ عورت سے دبر میں جماع جائز ہے یا نہیں) اختلاف ہے۔ بعض اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ بعض اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اب علامہ عینی کی مزید تصریح ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

امام مالکؒ کا مسلک

ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے کہ اس کو بہت بڑی جماعت نے کہا ہے۔ ان سب اقوال کو ابن شعبان نے اپنی کتاب "جماع النسواں" میں جمع کر دیا ہے اور اس کے جواز کو صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور بہت سی روایتوں سے امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی ہے اور ابوبکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ امام مالکؒ سے اس کی اباحت مشہور ہے اور امام مالکؒ کے اصحاب اس کا انکار محض اس کی شناعت اور قبح کی وجہ سے کر دیتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ کی یہ بات اس قدر مشہور ہے کہ ان لوگوں کے انکار سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔

محمد بن سعد نے ابو سلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالک بن انسؒ کی خدمت میں حاضر تھا ان سے مجامعت فی الدبر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا اور فرمایا۔ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے ہی ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے تھے میں نے کسی ایسے آدمی کو نہیں پایا جس کی میں دین کے بارے میں پیروی اور اقتدار کر سکوں اور وہ اس کے حلال ہونے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت سے اس کے دبر میں جماع کرنے کے بارے میں۔ اس کے بعد امام مالکؒ نے یہ آیت پڑھی نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ

اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز واضح ہوگی اور میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب اس کے بارے میں تو امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو کہتے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ (عینی)

یعنی امام مالکؒ تو یقینی طور پر اس کے جواز کے قائل تھے اور خود اس پر عمل پیرا اور امام شافعیؒ کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے امام اعظمؒ کے ایک شاگرد امام محمدؒ سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :-

امام حاکم نے مناقب شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارے میں امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسن کے درمیان ہوا۔ ابن الحسن نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر میں استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام ابن الحسن نے اس کو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا۔ مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہوگی۔ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا پھر تم جس بات کے خود بھی قائل نہیں، اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حاکم نے کہا کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قولِ قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں کیونکہ اپنے قولِ جدید میں اس کے حرام ہونے کی انہوں نے تصریح کی ہے۔ (فتح الباری)

بخاری میں ایک اور روایت بھی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ عطاء کہتے ہیں کہ :-

کچھ حرج نہیں اگر کوئی شخص اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے سوا (اور جگہ) مباشرت کرے۔

(اردو ترجمہ۔ جلد اول صفحہ ۴۹۲۔ کتاب البیوع)

آپ نے غور فرمایا کہ ہماری کتب احادیث و تفاسیر کی رُو سے اس آیت کی کس قسم کی تفسیر سامنے آتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے "اَنّٰی شِئْتُمْ" کا ترجمہ تو "جہاں سے چاہو" ہی کیا ہے لیکن حاشیہ میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ :-

یہود، عورت کی پشت کی طرف ہو کر وطی کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ احول پیدا

پیدا ہوتا ہے۔ آپؐ سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری۔ یعنی تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ یعنی اس سے مقصد اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے۔ سو تم کو اختیار ہے کہ آگے سے یا کروٹ سے یا اس کی پشت سے پڑ کر یا بیٹھ کر جس طرح چاہو مجامعت کرو۔ مگر یہ ضروری ہے کہ تخم ریزی اس خاص موقع میں ہو جہاں پیداوار کی امید ہو۔ یعنی مجامعت خاص فرج میں ہو۔ لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو۔ یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم اس نتیجہ پر تو صحیح پہنچ گئے کہ قرآنِ کریم کی رو سے میاں بیوی کے اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے لیکن چونکہ " اَنّٰی شِئْتُمْ " سے متعلق روایات میں یہودیوں کا ذکر آیا ہے، اس لئے انہیں ان روایات کے حوالے سے یہ وضاحت کرنا پڑی۔ لیکن اگر قرآن کو قرآن ہی سے سمجھا جائے تو نہ اس قسم کی دوراز کار تاویلات کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی کثافتوں سے اس کتاب مطہر کے معانی کو آلودہ کرنے کی جرأت پیدا ہو سکتی ہے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں متصل آیات میں سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ آیت (۲۲۲/۲) میں مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ سے فطری طریق کی طرف اشارہ کر دیا۔ حیض کے دنوں میں مجامعت سے منع کر کے اس کی وضاحت کر دی۔ اور آیت (۲۲۳/۲) میں عورتوں کو حَرْثٌ (کھیتی) سے تشبیہ دے کر اختلاطِ جنسی کا مقصد صراحت سے بیان کر دیا۔ لیکن قرآنِ کریم کو چھوڑ کر جب آپ نے روایات اور ان پر مبنی تفاسیر کی طرف رخ کیا؛ تو اس متعفن دلدل میں پھنس کر رہ گئے جسے ہم بادلِ ناخواستہ سامنے لاتے ہیں۔

(۰)

تعلقات میں کشیدگی

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے زوجین کے انتخاب میں ہم آہنگی اور یک جہتی پر بڑا زور دیا ہے۔ اور ازدواجی رشتہ کا مقصد باہمی مودت، سکینت اور رحمت سے، گھر کو جنت بنانا بتایا ہے۔ لیکن ان تمام احتیاطوں کے باوجود ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اس سلسلہ میں بعض کشیدگی محض عارضی رنجش کی وجہ سے ہو گی جس کی عام وجہ سریع الغضب ہونا ہے۔ یعنی یونہی (TEMPER-LOOSE) کر جانا۔ (مثلاً) انسان غصے میں آ کر بیہودہ بکواس شروع کر دیتا ہے اور جہالت کی وجہ سے بیوی

ظہار کو "ماں" کہہ دینا ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور لغو بات۔ (عربوں کے ہاں اسے ظہار کہتے تھے) اور غصہ ٹھنڈا ہو جانے پر اپنے کئے پر خود ہی نادم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ غصّے کی حالت میں بیوی کو "ماں" کہہ دینے سے وہ سچ مچ "ماں" نہیں بن جاتی۔ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (۳۳/۴) "ظہار سے تمہاری بیویاں تمہاری مائیں نہیں بن جاتیں"۔ اسی لئے اس قسم کی لغو باتوں کو حقیقت پر محمول نہیں کر لینا چاہیئے۔ سورہ البقرہ میں پہلے کہا:۔

۲/۲۲۴ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ (۲/۲۲۴)

عائلی زندگی کے سلسلہ میں دوسری بات یہ یاد رکھو کہ بعض لوگ، یونہی کوئی لغو سی قسم کھا لیتے ہیں (کہ میں فلاں کام نہیں کروں گا)۔ پھر جب ان سے بھلائی اور تقویٰ اور لوگوں میں اصلاح کے کاموں کے لئے کہا جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ایک قسم کھا رکھی ہے' اس لئے ہم ان کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اور پھر فرمایا:

۲/۲۲۵ لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ (۲/۲۲۵)

یاد رکھو! خدا اس قسم کی لغو باتوں پر گرفت نہیں کرتا جو تم، یونہی بلا سوچے سمجھے کھا لو۔ وہ ان قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے کھاؤ (۵/۸۹)۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ نیز اس کا قانون ایسا نہیں جو یونہی ذرا ذرا سی باتوں پر بھڑک اُٹھے۔ اس میں بڑی سہار ہے اور مقصد تمہاری حفاظت ہے نہ کہ تباہی۔

لیکن چونکہ اس قسم کی بیہودہ حرکات سے گھر کی فضا مسموم ہو جاتی ہے اس لئے قرآن کریم ان کی روک تھام کے لئے ان پر تھوڑا سا تاوان ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلے کہتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ - (۵۸/۴)

(لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ معاشرہ میں اس قسم کی لغویتوں کو عام ہونے دیا جاتے۔ سنجیدہ لوگوں کا معاشرہ ایسا نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا) جو لوگ اپنی بیوی کو ماں (یا ایسے ہی کوئی اور الفاظ) کہہ بیٹھیں اور اس کے بعد پشیمان ہو کر اپنی اس بیہودہ بات کو واپس ... لینا چاہیں (تو انہیں کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنا سیکھیں اور یونہی جو جی میں آتے منہ سے نہ نکال دیا کریں۔ وہ جرمانہ یہ ہے کہ) قبل اس کے کہ وہ بہ حیثیت میاں بیوی ایک دوسرے کے پاس جائیں، ایک غلام آزاد کریں۔ یہ اس لئے ہے کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو اور اللہ تمہارے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

جس کے پاس غلام نہ ہو یا غلام آزاد کرانے کی استطاعت (یا اُس زمانے کے غلاموں کے ختم ہو جانے کے بعد جب غلام باقی ہی نہ رہیں تو) اس صورت میں وہ تعلقات زناشوئی سے پہلے دو ماہ کے متواتر روزے رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لئے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھو جو اس کے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔

یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں جن کے اندر رہنا ضروری ہے (اگر اس باب میں سہواً غلطی ہو جائے تو اس کے ازالہ کی شکل وہ کفارہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے ان حدود ہی کا انکار کریں تو وہ کافر ہیں) اور کافروں کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

یہ تو رہا غصہ کی حالت میں ظہار سے متعلق۔ لیکن کوئی شخص عمداً بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے۔ (اسے ایلا

ایلاء

کہا جاتا ہے)۔ تو ظاہر ہے ایسی شکل کو دائماً یا غیر متعین عرصہ کے لئے قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے کہا کہ

۲/۲۲۶-۲۲۷

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَآءُو فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ. (۲/۲۲۶-۲۲۷)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں، تو عورت کو اس معلق حالت میں غیر متعین عرصہ کے لئے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس عرصہ میں باہمی تعلقات کی طرف رجوع کرلیں تو انہیں اس کی اجازت ہے۔ کیونکہ قانونِ خداوندی میں اس قسم کی لغزشوں سے حفاظت

اور رحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ (۵/۸۹ ؛ ۳۳/۴ ؛ ۸۵/۳)

لیکن اگر وہ معاہدۂ نکاح سے آزاد ہو جانے کا فیصلہ کر لیں (جسے طلاق کہتے ہیں) تو انہیں ایسا کر لینا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو ہر بات کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (اسے معلوم ہے کہ جب نباہ کی شکل باقی نہ رہے تو پھر الگ ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے)۔

اس مقام پر قرآنِ کریم نے اس قسم کے توڑنے کے کفارہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن دوسرے مقام پر ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ
الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ
اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ
اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۵/۸۹)

اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے فلاں فلاں حلال چیزوں کے نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس لئے اب اس قسم کو کس طرح توڑیں؟ تو یاد رکھو۔ لغو اور مہمل قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا (۲/۲۲۵) باقی رہیں وہ (غلط) قسمیں جو تم نے قصد و ارادہ سے نہایت محکم طور پر کھائی ہوں تو انہیں بھی توڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں کچھ کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ کھانا ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو کپڑا دینا یا کسی غلام (گردن) کا آزاد کرانا[1]۔ لیکن جسے یہ کچھ میسر نہ ہو (یا حالات ایسے ہوں جن میں یہ کچھ ممکن نہ ہو۔ مثلاً کوئی محتاج یا غلام موجود نہ ہو) تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری اُن (غلط) قسموں کا جو تم نے بالارادہ کھائی ہوں۔ لیکن جو قسمیں قوانینِ خداوندی کے خلاف نہ ہوں، ان کی پاسداری نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ قسمیں درحقیقت عہد و پیمان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور عہد کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے (خواہ وہ عہد دوسروں کے ساتھ کیا گیا ہو یا خود اپنے ساتھ)۔

اس طرح اللہ اپنے احکام و قوانین کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

---

[1] محکوموں اور مظلوموں کی آزادی اسی زمرہ میں آجائے گی۔

چونکہ ایلا میں بھی قسم دل کے ارادے سے کھائی جاتی ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کیلئے بھی یہی کفارہ ہوگا۔
لیکن اگر یہ شخص چار ماہ کے عرصہ میں رجوع نہیں کرتا تو پھر، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے (۲/۲۲۶-۲۲۷)، نوبت طلاق تک پہنچ جائے گی۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔
ظہار اور ایلاء سے متعلق احکام کی روشنی میں اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو بساتے نہیں اور ادھر لٹکی ہوئی چھوڑے رکھتے ہیں، یا مفقود الخبر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے ضروری قوانین وضع کرے۔

(۰)

طلاق

میاں بیوی کی کشیدگی کی انتہائی شکل وہ ہے جس میں معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ طلاق کے لغوی معنیٰ آزاد ہو جانے یا آزاد کرانے کے ہیں۔ نکاح کے معاملہ کو تو قرآنِ کریم نے فریقین کی رضامندی پر چھوڑا تھا اس لئے کہ وہ ان کا انفرادی مسئلہ تھا لیکن فسخ نکاح کا معاملہ انفرادی نہیں رہتا۔ اس میں فریقِ مقابل اور اکثر اوقات اولاد کے مفاد پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے اس نے اسے معاشرہ کا مسئلہ قرار دیا ہے اور اسلامی مملکت کو ہدایات دی ہیں کہ اسے اس باب میں کیا کرنا چاہیئے؟ یہ بات یہیں سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام روش ہے کہ مرد کا جس وقت جی چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر بیوی کو (اکثر اوقات مع بچوں کے) گھر سے نکال باہر کرے یہ قطعاً خلافِ قرآن ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں میاں بیوی برابر کے فریق ہوتے ہیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کے فسخ کرنے میں بھی وہ برابر کے فریق ہوں گے۔ یہ تو معاہدہ کے بنیادی نصوص کے خلاف ہے کہ اس کے استوار کرنے میں تو زوجین برابر کے فریق ہوں لیکن اس کے فسخ کرنے کا کلی اختیار ایک فریق (خاوند) کو حاصل ہو اور فریقِ ثانی (بیوی) مجبور و مقہور ہو۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اس میں نہ خاوند کو (UNILATERALLY) کوئی اختیار ہوتا ہے نہ بیوی کو۔ یہ معاملہ معاشرہ (مملکت) کے طے کرنے کا ہے۔
اب آپ دیکھیئے کہ قرآنِ کریم اس باب میں معاشرہ کو کیا ہدایات دیتا ہے۔ وہ اسے کہتا ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا - (۴/۳۵)

اگر تمہیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کرو۔ اس طرح اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کرلیں (یا دونوں ثالث ان میں اصلاح کی نیت سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں) تو قانونِ خداوندی ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اس لئے کہ اس کا قانون علم و آگہی پر مبنی ہے۔

آپ دیکھیے اس میں "اِنْ خِفْتُمْ" (اگر تمہیں اس کا..... اندیشہ ہو) کا مخاطب معاشرہ (مملکت) ہے۔ لہٰذا میاں بیوی کی باہمی کشیدگی کے دور کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ مملکت ایک مصالحتی بورڈ کی تشکیل کرے۔

دوسرے "شِقَاقَ بَيْنِهِمَا" میں میاں اور بیوی دونوں شامل ہیں اس لئے جس طرح خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ باہمی کشیدگی کی صورت میں تشکیلِ مصالحتی بورڈ مقرر کرنے کے لئے مملکت کی طرف رجوع کرے، اسی طرح بیوی کو بھی حق حاصل ہے۔ بیوی کے متعلق دوسری جگہ ہے:۔

وَاِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۔ (۴/۱۲۸)

(جو عورتیں سرکشی پر اتر آئیں ان کے متعلق (۴/۳۴) میں حکم دیا جاچکا ہے)۔ اس کے برعکس اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی محسوس کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ وہ جن شرائط پر بھی چاہیں آپس میں مصالحت کرلیں۔ اس لئے کہ مصالحت بہرحال جھگڑے سے بہتر ہوتی ہے۔ (مصالحت کیلئے ثالثوں کے تقرر کے متعلق پہلے بتایا جاچکا ہے۔ ۴/۳۵)۔ مصالحت کے معاملہ میں بالعموم روپے پیسے کا سوال سدِّ راہ ہو جایا کرتا ہے اور معاملات سلجھنے نہیں پاتے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعت میں بخل ہوتا ہے۔ اگر تم اس جذبہ پر قابو پا کر حسنِ سلوک سے کام لو اور اس طرح قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل سے باخبر ہوتا ہے۔

اس طرح باہمی مصالحت ہو جائے تو ہوالمراد۔ ورنہ بیوی کو بھی عدالت میں سلسلہ جنبانی کرنی ہوگی۔ عدالت میں عورت کے اپنے معاملہ کے متعلق بحث کرنے کا ذکر خود قرآنِ کریم میں آیا ہے جہاں فرمایا:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۔ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ

تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۵۸/۱)

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو تجھ سے (اے رسول) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اپنی مظلومیت کے متعلق خدا سے فریاد کر رہی تھی (اس نے عدالتِ خداوندی میں استغاثہ دائر کیا تھا)۔ اللہ تم دونوں کے سوال جواب سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اگر مصالحتی بورڈ کی مصالحت کی کوششیں ناکام رہ جائیں تو عدالتِ مجاز فسخ نکاح کا فیصلہ سنا دے گی۔ یہ بات کہ یہ فیصلہ عدالت کے ذریعے ہوگا، قرآنِ کریم سے واضح ہے۔ سورہ الطلاق میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۔ (۶۵/۱)

اے رسولؐ! جب تم طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرو تو لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے بعد عدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے[1]۔ اسے ضروری پورا کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اس کا حساب رکھو اور اس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ ($\frac{۲}{۲۲۸-۲۳۲}$; $\frac{۳۳}{۴۹}$)

دیکھئے! یہاں خطاب تو النبی (بصیغۂ واحد) سے ہے لیکن اس کے بعد طلّقتم (تم طلاق دو) میں جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ عام دستور کے مطابق عدالت کے لئے جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے۔ دوسرے طلقتم سے پہلے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ طلاق کا فیصلہ لوگ از خود نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ نبی (یعنی اسلامی مملکت یا عدالت) کی وساطت سے کیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں طلاق کے متعلق ہدایات دی ہیں اس سے مراد عدالت کے ذریعے فسخ معاہدہ کا فیصلہ ہے جس کا اولین قدم مصالحتی بورڈ کی طرف رجوع کرنا ہے۔

بادی النظر میں ذہن اس طرف جاتا ہے کہ جب مصالحتی بورڈ اپنی کوشش میں ناکام رہ جائے تو عقدِ نکاح از خود فسخ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اس میں بعض دیگر امور فیصلہ طلب ہوتے ہیں جن کے لئے عدالت کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

(۲) اگر عدالت مجاز دیکھے کہ عورت بے قصور ہے اور مرد ہی نباہ نہیں کرنا چاہتا تو وہ عورت سے کچھ دلائے بغیر طلاق کا فیصلہ کر دے گی۔ سورۃ النسآء میں ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا

---

[1] عدت کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی۔

فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ (۴/۲۰-۲۱)

اگر تم یہ فیصلہ کرلو کہ موجودہ بیوی کو طلاق دے کر کسی اور جگہ نکاح کرنا ہے ۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض نئی عورت سے شادی کرنے کا شوق طلاق کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شرائط کے مطابق جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا طلاق تک کی نوبت پہنچ جائے ۔۔ اور تم اپنی بیوی کو سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو (البتہ اگر طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہو تو پھر اس میں سے کچھ لیا جا سکتا ہے (۲/۲۲۹) یا اگر اس سے بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو تو۔ ۴/۱۹) لیکن جب ایسی صورت نہ ہو اور تم اس (بیچاری) کے خلاف ناحق تہمتیں لگا کر کچھ وصول کرنا چاہو تو یہ ایک کھلا ہوا گناہ ہے ۔۔ یعنی ایسی معیوب حرکت جس کے مذموم ہونے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

جو کچھ تم نے اسے دیا تھا وہ کیسے واپس لے سکتے ہو۔ درآں حالیکہ تم میں زناشوئی کے تعلقات رہ چکے ہیں اور تمہاری بیویاں نکاح کے وقت تم سے اپنے حقوق کے تحفظ کا پختہ عہد بھی لے چکی ہیں لہٰذا تمہارے لئے اس معاہدہ کا احترام ضروری ہے۔

(ضمناً) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مرد اگر کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ پہلی بیوی کو (قاعدے قانون کے مطابق) طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اصول وحدتِ زوج (ایک وقت میں ایک بیوی) کا ہے۔

(۳) لیکن عورت اگر فحش کی مرتکب ہو تو عدالت اس سے کچھ ہرجانہ دلا سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ (۴/۱۹)

(جیسا کہ مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بیوی کا انتخاب اپنی مرضی سے کریں (۴/۳) اسی طرح نکاح کے لئے عورتوں کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ تمہارے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ (ایسا کرنا حلال ہی نہیں) اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اگر وہ تمہارے نکاح میں نہ رہنا چاہیں تو انہیں اس نیت سے روک رکھو کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ ہتھیا لو۔ ایسا قطعاً جائز نہیں۔

بجز اس کے کہ ان سے کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو۔ (اس صورت میں عدالت تمہیں اس میں سے کچھ دلا سکتی ہے)۔

(ضمناً) آیت کے پہلے الفاظ سے واضح ہے کہ عورت کی رضامندی کے بغیر (اکراھًا) نہ اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نکاح کے بعد اسے باندھ کر رکھا جاسکتا۔ یعنی نہ اسے نکاح کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی (نکاح کے بعد) اسے اس کی رضامندی کے خلاف بیوی بنا کر رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنا "حلال ہی نہیں"؛ حرام ہے۔ یہ آیت عورت کے حقِ طلاق کی موثق سند ہے۔

(۴) اسی طرح اگر عدالت دیکھے کہ مرد بے قصور ہے اور عورت نباہ نہیں کرنا چاہتی تو وہ مرد کو کچھ ہرجانہ دلا سکتی ہے۔

۲/۲۲۹ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۲/۲۲۹)

طلاق کی صورت میں اس کی اجازت نہیں کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لے لو۔ ہاں اگر کسی وقت ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایک طرف یہی چیز ان کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہو رہی ہو اور دوسری طرف میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں انہیں خدشہ ہو کہ (تعلقات کی کشیدگی کی بنا پر) وہ حقوق و واجبات ادا نہیں کر سکیں گے جو قانونِ خداوندی نے ان پر عائد کر رکھے ہیں — اور معاشرہ کا نظامِ عدالت بھی اسی نتیجہ پر پہنچے اور سمجھے کہ خاوند کو واقعی کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور معاہدۂ نکاح سے آزادی حاصل کر لے۔

یہ قانونِ خداوندی کی حدود ہیں جن کی نگہداشت ضروری ہے۔ جو کوئی ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہوگا۔

(نوٹ) اس آیت کے پہلے چند الفاظ " اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ " اس مقام پر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ انہیں ان کے مناسب مقام پر سامنے لایا جائے گا۔

(۵) عدالت کے اس فیصلہ (طلاق) کے بعد عورت کی عدت شروع ہو جائے گی۔ عدت کے متعلق تفصیلی احکام تو آگے چل کر درج کئے جائینگے۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ

(۱) عدت اس عرصہ کو کہتے ہیں جس میں مطلقہ یا بیوہ عورت کسی دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی۔

(۲) عدت کے عرصہ میں اس امر کی گنجائش ہوتی ہے کہ سابقہ میاں بیوی پھر سے ازدواجی رشتہ استوار کر لیں۔ اس کی شرائط آگے چل کر بیان کی جائینگی۔

اسی سلسلہ میں حسب ذیل ہدایات غور طلب ہیں :۔

(i) سورۃ الطلاق میں ہے :۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۔ (۶۵/۲)

جب وہ مدت (عدت) ختم ہونے کو ہو تو انہیں (عورتوں کو) یا تو "معروف" طور پر رکھ لو۔ یا معروف طور پر الگ کر دو۔

"معروف" کے معنیٰ ہیں مملکت کے وضع کردہ قاعدے اور قانون کے مطابق۔

(ii) سورۃ بقرہ میں ہے :۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۔ (۲/۲۲۹)

یا انہیں معروف طور پر روک لو اور یا حسن سلوک کے ساتھ الگ کر دو۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ عدت کے دوران ان (سابقہ میاں بیوی) کو رشتۂ ازدواج کی استواری کا موقع دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں واضح ہیں۔

(۱) اگر طلاق بیوی نے حاصل کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس خاوند کے ہاں بسنا نہیں چاہتی اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ (اس کا سابقہ) خاوند اسے زبردستی دوبارہ اپنے ہاں لے جائے۔ ہاں اگر وہ عورت اپنا ارادہ بدل لے تو اور بات ہے۔

(ب) اگر خاوند نے طلاق حاصل کی ہے حالانکہ بیوی اس کے ہاں بسنا چاہتی تھی اور مرد اپنی اصلاح کا ارادہ کر لیتا ہے تو یہ رشتہ دوبارہ استوار ہو سکتا ہے۔ بُعُوْلَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۔ (۲/۲۲۸)۔ "اگر وہ اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو وہ اس سابقہ بیوی کو واپس لے لینے کا زیادہ حقدار ہے"۔

"حقدار" کے معنیٰ یہ نہیں کہ وہ بطور استحقاق اس عورت کو دوبارہ بیوی بنا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنی اصلاح کرے تو وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عورت کی رضامندی بہرحال ضروری ہوگی۔ لیکن عورت کو تنگ کرنے کی نیت سے ایسا نہ کیا جائے۔ ارشاد ہے:-

۲/۲۳۱ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ (۲/۲۳۱)

جب مطلقہ عورت کی عدت کا زمانہ ختم ہونے کو آئے تو (جیسا کہ ۲/۲۲۸ میں کہا گیا ہے) یا اُسے نکاح میں لے آؤ یا قاعدے کے مطابق رخصت کر دو۔ [اور یہ فیصلہ دو معتبر گواہوں کے روبرو کرو تاکہ بات واضح ہو جائے۔ (۶۵/۲)]

اور یاد رکھو! ان عورتوں سے دوبارہ نکاح اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کر کے انہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ جو ایسا کرے گا وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا۔ لہٰذا، قانونِ خداوندی کو یونہی مذاق نہ سمجھو۔ اس کے نتائج و عواقب بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ یہ تو اللہ کی نوازشات میں سے ہے کہ اس نے تمہیں ایسا واضح ضابطۂ قوانین عطا کر دیا ہے۔ اور صرف قانون ہی نہیں بتایا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ قانون کی غرض و غایت کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے نتائج کیا نکلیں گے۔!

لہٰذا، تم ان قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔

(ضمناً) آیت کے ان الفاظ پر دوبارہ نگاہ ڈالیے۔ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا — احکامِ خداوندی کا مذاق نہ اڑاؤ۔ ذرا سوچیے کہ کیا اس وعیدِ خداوندی کے مورد ہم ہی نہیں؟ ہم نے جس طرح طلاق کے مسئلہ کو اضحوکہ اور تماشا بنا رکھا ہے اس سے توصاف ظاہر ہے کہ یہ وعید ہمارے ہی لئے ہے۔

(۲) اگر انہوں نے ازدواجی رشتہ کو استوار کر لیا ہے تو ہوالمراد — لیکن اگر الگ ہو جانے کا فیصلہ

کیا ہے تو اس کے لئے دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سورہ الطلاق میں ہے :-

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۔ (۶۵/۲)

جب ان عورتوں کی عدت کی مدت قریب الاختتام ہو تو خواہ انہیں معروف طور پر روک لو اور خواہ معروف طور پر الگ کر دو۔ اس کے لئے دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوگی جنہیں چاہیے کہ وہ (فریقین کی خاطر نہیں بلکہ) خدا کی خاطر شہادت کو قائم رکھیں۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ غور طلب ہے۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ طلاق کے عدالتی فیصلہ کے بعد عدت کے دوران معروف طریق سے رشتۂ ازدواج استوار ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لئے نکاح کی تجدید کی ضرورت ہوگی یا صرف باہمی رضامندی کافی ہوگی۔ فرق ان میں یہ ہوگا کہ تجدید نکاح کی صورت میں مہر دوبارہ دینا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں ایک مقام پر نکاح کا لفظ بھی آیا ہے جہاں کہا ہے۔

۲/۲۳۲ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ..... (۲/۲۳۲)

جب مطلقہ عورتیں اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں اور سابقہ میاں بیوی قاعدے اور قانون کے مطابق پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے (نکاح) کا ارادہ کریں تو تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو۔

یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس صورت میں تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ "بالمعروف" ہوگا۔ یعنی ان قواعد و ضوابط کی رُو سے جنہیں اسلامی مملکت قرآنی حدود کے اندر وضع کرے۔ لہٰذا وہ مملکت اس باب میں جو فیصلہ بھی کرے وہ "معروف" کی شرط کو پورا کر دیگا۔

(۷)

تین مرتبہ کی طلاق

طلاق کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات واضح ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جو احکام شریعت رائج ہیں ان کی رُو سے خاوند کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے (ARBITERARILY) بیٹھے بٹھائے بیوی کو طلاق دے دے لیکن اگر بیوی اس کے مظالم سے رستگاری حاصل کرنا چاہے تو اسے عدالتوں

کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں۔ اس کے لئے اصطلاح بھی الگ ہے۔ یعنی "خُلع" جس کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ مروجہ قانونِ شریعت کی رُو سے زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی جاتی ہے کہ خاوند اگر چاہے تو اپنا "حق طلاق" مشروط یا غیر مشروط طور پر بیوی کو تفویض کر سکتا ہے۔ یعنی طلاق کا حق مرد ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ بیوی کو نہیں۔ وہ اس کے رحم و کرم پر ہی رہتی ہے۔ یعنی اس بات کا تو عورت کو پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس مرد کے حبالۂ نکاح میں آنا چاہتی ہے یا نہیں۔ لیکن جب وہ ایک دفعہ اس جبل (پھندے) میں پھنس جائے تو اس سے چھٹکارا پانے کا اسے کوئی اختیار نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام ہمارے دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں جب مرد عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ شریعتِ خداوندی کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

عورتوں کو لونڈیاں بنا رکھنے کے سلسلہ میں ایک اور اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔ جب عدالت نے طلاق کا فیصلہ کر دیا تو یہ ایک طلاق ہوگئی۔ (یاد رکھئے! قرآنِ کریم کی رُو سے طلاق کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب عقدِ نکاح فسخ ہو جاتے)۔ اگر یہ میاں بیوی عدت کے دوران پھر سے ازدواجی رشتہ استوار نہ کریں اور علیحدہ ہو جائیں، تو اگر یہ چاہیں تو اس کے بعد بھی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اگر یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) ازدواجی رشتہ استوار کرلیں لیکن اس کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے (یعنی اُسی طریق کے مطابق جس کا پہلے ذکر آچکا ہے، عقدِ نکاح فسخ ہو جائے) تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہو گی۔ اس طلاق کے بعد بھی اس کی گنجائش ہو گی کہ یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) پھر سے میاں بیوی بن جائیں۔ لیکن اگر اس کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے جو اس میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تیسری مرتبہ کی طلاق ہو گی تو پھر انہیں اس کی اجازت نہیں ہو گی کہ یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں نکاح کرلیں۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کر لے اور اس سے طلاق ہو جائے (یا یہ بیوہ ہو جائے)، تو اس صورت میں یہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ البقرہ (۲۲۹/۲) میں ہے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ کی طلاق کی صورت میں اس کی اجازت ہے کہ وہ پھر سے ازدواجی رشتہ استوار کرلیں تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

۲/۲۳۰ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۲۳۰/۲)

اگر کسی میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق (اور تین مرتبہ کے نکاح کے بعد تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے تو اس کے بعد یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ ہاں! البتہ اگر وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور اس سے بھی طلاق ہو جائے تو پھر اس میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرے۔

یہ ہیں عائلی زندگی سے متعلق وہ قوانین جنہیں اللہ ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو معاشرتی زندگی کی مصلحتوں کا علم رکھتے ہیں۔

آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم کے یہ احکام کس قدر واضح ہیں۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ (۲/۲۳۱)۔ "ہمارے احکام کا مذاق مت اڑاؤ"۔ تو اس کی بین مثال ہمارے ہاں کے "شرعی احکام" ہیں۔ ان احکام کی رُو سے، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین مرتبہ "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ دے (یعنی طلاق کا لفظ تین مرتبہ کہہ دے) تو یہ تین مرتبہ کی طلاق (طلاق ثلاثہ یا طلاق بائن) قرار پا جاتی ہے جس کے بعد نہ یہ جوڑا میاں بیوی رہنا ہے نہ ہی یہ آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ البتہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ عورت "ایک رات کے لئے" کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ وہ اس کے ساتھ شب بسری کرنے کے بعد دوسری صبح اسے طلاق دیدے، تو پھر یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اسے **حلالہ** کہا جاتا ہے۔ یہ صورت جس قدر حیات سوز اور غیرت کش ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ شرمناک اور الم انگیز پہلو یہ ہے کہ غصہ میں آکر "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" تو مرد کہتا ہے اور اس کے بعد یہ اپنی اس حرکت پر نادم بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کی سزا اس بے گناہ بیوی کو بھگتنی پڑتی ہے — اور سزا بھی ایسی جس کے مقابلہ میں وہ عفت مآب موت کو ترجیح دے یعنی ایک رات کے لئے کسی غیر مرد سے ہم بستری! اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اسے "شریعتِ خداوندی" کہہ کر پکارا جاتا ہے (معاذ اللہ۔ استغفر اللہ)۔ میرے پاس اکثر اس قسم کے استفسارات آتے رہتے ہیں کہ مرد نے غصہ میں آکر طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیا۔ مولوی صاحب نے فرما دیا کہ اب تو حلالہ کرنا ہوگا۔ بال بچوں والی عصمت مآب' (اور اکثر حالات میں) معمر بیوی سر پیٹ رہی ہے۔ اس کی غیرت اسے اس کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ لیکن مولوی صاحب اس پر مُصر ہیں کہ حلالہ کرنا ہی ہوگا۔ اکثر و بیشتر اس "کارِ خیر" کے لئے خود اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی میرے سامنے پیش کئے گئے جن میں حلالہ کرنے والا اس عورت کو طلاق

نہیں دیتا۔ یا اس کے لئے بھاری رقم مانگتا ہے۔ یہ سب کچھ شریعتِ حقّہ کے نام پر ہوتا ہے اور "اربابِ شریعت" کے دل میں خوفِ خدا کا ذرا سا احساس بھی بیدار نہیں ہوتا کہ اس یکسر خلافِ اسلام ہی نہیں خلافِ انسانیت شرمناک فعل کو ختم کریں۔ ختم کرنا تو ایک طرف، حکومت کی طرف سے نافذ کردہ عائلی قوانین (FAMILY - LAWS -1961.) میں تھوڑی سی اصلاح کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے خلاف ہماری مذہبی پیشوائیت نے قیامت برپا کر دی۔ اب بھی جس وقت ان کی "اسلامی حمیت" جوش میں آتی ہے تو ان کی طرف سے سب سے پہلا مطالبہ ان قوانین کو منسوخ کرنے کا پیش ہوتا ہے[1] ــــ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

(۰)

مُتعہ

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے نکاح، مرد اور عورت کے مابین ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ، طلاق، یا زوجین میں سے کسی ایک کی وفات سے منقطع ہوتا ہے۔ طلاق نہ ہو تو یہ عمر بھر تک قائم رہتا ہے۔ اس میں مدّت کا سوال ہی نہیں۔

لیکن عربِ جاہلیہ میں جنسی اختلاط کی ایک اور شکل بھی رائج تھی جس میں یہ اختلاط ایک معینہ مدّت کیلئے معینہ معاوضہ کے عوض روا رکھا جاتا تھا۔ اسے وہ متعہ سے تعبیر کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اسے ختم کر دیا لیکن شیعہ حضرات کے ہاں اسے جائز سمجھا جاتا ہے۔ میرا منصب چونکہ قرآنی احکام و ہدایات کی تبیین ہے اس لئے میں فرقہ وارانہ بحث میں نہیں الجھا کرتا۔ بنابریں، میں شیعہ حضرات کے اس مسلک کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سُنّی حضرات جو اس قسم کے جنسی تعلقات (مُتعہ کو زنا قرار دیتے ہیں، ان کی کتب روایات میں اس کے متعلق کیا کچھ مذکور ہے۔

سُنّیوں کی سب سے معتبر کتاب بخاری شریف ہے۔ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں (جلد دوم صفحہ ۵۹ ۷ مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی، و جلد سوم صفحہ ۱۴۶ مطبوعہ مصر) حسب ذیل حدیث آئی ہے۔

---

[1] مسودہ کی نظر ثانی کے وقت (جنوری ۱۹۷۹ء میں) ملک میں شرعی قوانین کے ملکی قوانین کی حیثیت میں نفاذ کا چرچا عام ہو رہا ہے۔ اس میں بھی عائلی قوانین (۱۹۶۱ء) کی تنسیخ کا مطالبہ پیش پیش۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب کی اشاعت تک صورتِ حالات کیا ہو!

عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور ہمارے پاس کوئی سامان (اپنے مقتضائے فطرت کے پورا کرنے کا) نہ ہوتا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ ہم اپنے اعضائے شہوانی کو قطع نہ کرا دیں؟ حضورؐ نے ہمیں اس سے منع فرمایا۔ پھر ہمیں اجازت دی کہ عورتوں سے کسی کپڑا وغیرہ کے عوض میں "نکاح" کر لیا کریں۔

بخاری کے بعد صحیح مسلم کا مرتبہ ہے۔ اس میں یہ روایت تین طریقوں سے آئی ہے۔ اس میں ایک جگہ "اِلٰی اَجَلٍ" کا اضافہ ہے۔ "یعنی رسول اللہ نے ہمیں اجازت دی کہ ہم ایک میعاد مقررہ کے لئے عورتوں سے کپڑے وغیرہ کے عوض نکاح کر لیا کریں۔" دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس میں لڑائیوں کے زمانے کی تخصیص نہ تھی۔

(صحیح مسلم مطبوعہ مجتبائی۔ دہلی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۵۰)

جمع الفوائد (شیخ محمد بن محمد سلیمان سوسی مالکی مطبوعہ میرٹھ ج ۱۔ ص ۲۲۲) میں اس روایت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ لڑائیوں پر جاتے تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے مذکورہ بالا اجازت دی تھی (یعنی ایک وقتِ معین کے لئے نکاح کی اجازت)

یہی روایت مسند امام ابی عبداللہ محمد بن ادریس شافعی مطبوعہ مصر ص ۱۴۵ میں بھی ہے۔ نیز شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے منتقی الاخبار میں اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا ہے اور صاحب کنز الاعمال (ص ۲۹۵ ج ۸) نے لکھا ہے کہ امام طبری نے تہذیب الآثار میں اس کی تخریج کی ہے۔

دوسری حدیث صحیح بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۲ صفحہ ۷۶۷۔ و مصر جلد ۳ ص ۱۵۰) میں یوں درج ہے۔

جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ حضورؐ کا فرستادہ شخص ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ تم متعہ کرو۔ اب تم متعہ کر سکتے ہو۔

صحیح مسلم (ص ۴۵۰) میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ کے منادی کرنے والے نے آکر اعلان کیا کہ تم لوگوں کو متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دوسری روایت (مسلم ص ۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے خود تشریف لا کر متعہ کی اجازت کا اعلان فرمایا۔

تیسری حدیث بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۱ ص ۷۶۷ و مصر ص ۱۵۰) میں یوں ہے۔

سلمہ بن اکوع کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو مرد و عورت آپس میں قرار داد کریں تو تین راتوں تک ان کی مباشرت کی میعاد ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو اس مدت میں اضافہ کریں اور اگر چاہیں

توجدائی اختیار کرلیں۔

صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی ص۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے جنگ اوطاس والے سال تین دن کے میعادی متعہ کی اجازت دی۔ یہی روایت جمع الفوائد، سنن، دارقطنی اور کنز العمال میں بھی ہے۔

اب ذرا اس کی تفصیل سنیئے۔ صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی صفحہ نمبر ۱۵۱) میں ہے۔

سبرۃ جہنی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس اکٹھے گئے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی اجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ اپنی چادر دے گا۔ اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی لیکن میں اس کی نسبت جوان تھا۔ وہ عورت جب اس کی چادر کی طرف دیکھتی تھی تو اس کی طرف مائل ہو جاتی تھی اور جب میری طرف دیکھتی تو مجھے پسند کرتی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تم اور تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے۔ چنانچہ تین روز تک میں اس کے پاس رہا۔

غور فرمایا آپ نے کہ جناب امام مسلم نیشاپوری صحابہ کبارؓ کا کیا نقشہ کھینچ رہے ہیں! (استغفراللہ! استغفراللہ!)

کنز العمال (جلد ۸ ص۲۹۴) میں سبرہ کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ حجۃ الوداع میں:-

جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر حضورؐ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے آکر عرض کیا کہ عورتیں متعہ کے لئے راضی نہیں ہوتیں جب تک کوئی میعاد مقرر نہ کی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میعاد مقرر کرکے متعہ کرلو۔

آپ نے دیکھا کہ ہمارے راویوں کے بیان کے مطابق نبی اکرمؐ اپنے آخری حج میں صحابہؓ کو کیا تعلیم دے رہے ہیں! (اللّٰھم اغفرلنا۔ اللّٰھم اغفرلنا)۔

اہل سنت والجماعت حضرات کی مدافعت (DEFENCE) یہ ہوتی ہے کہ حضورؐ نے بیشک متعہ کی اجازت دی تھی لیکن بعد میں اس کی ممانعت فرما دی تھی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے جی میں خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ماتھے سے ایک بہت بڑے کلنک کے ٹیکے کو دھو دیا۔ لیکن یہ سادہ لوح اتنا نہیں سمجھتے کہ جو رسول (ان راویوں کے بیان کے مطابق) اپنی نبوت کے آخری سالوں تک متعہ جیسے فعل کی اجازت دیتے رہے، اس رسول کے متعلق (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) دنیا کیا رائے قائم کرے گی؟

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ متعہ کی ممانعت کی جس قدر روایات ہیں ان میں ایسا تضاد رکھ دیا گیا ہے

کہ سوچنے والا ان مخمصے میں پھنس جاتے کہ یہ کیا پریشان کن روایات ہیں۔ مثلاً کنزالعمال (جلد ۸ صفحہ ۲۹۵) میں ایک ہی راوی (سبرہ جہنی) سے (جن کی روایات اوپر گزر چکی ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت حجۃ الوداع میں دی تھی، تین مختلف روایات ہیں جن میں سے

ایک میں ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے دن متعہ سے ممانعت فرمائی۔ دوسری میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے دن ممانعت فرمائی اور تیسری میں ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں ممانعت فرمائی۔

لیکن شرح مسلم نووی (مطبوعہ دہلی جلد ۱ صفحہ ۴۵۰) میں اسحٰق بن راشد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے جنگِ تبوک میں متعہ سے منع فرمایا۔

اندازہ فرمایا آپ نے کہ کس طرح کثرتِ تعبیر سے خواب کو پریشان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ متعہ ایک سے زیادہ مرتبہ جائز قرار دیا گیا اور ایک سے زاید مرتبہ اس کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ امام مسلمؒ نے اس باب کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے۔

باب نکاح المتعہ وبیان انہ ابیح ثم نسخ واستقر تحریمہ الی یوم القیٰمۃ۔

باب نکاح متعہ اس امر کے بیان میں کہ وہ مباح تھا پھر منسوخ ہوا۔ پھر مباح ہوا اور اس کے بعد پھر منسوخ ہوا اور پھر قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم رہی۔

چلئے! ایک بات طے تو ہوئی کہ حضورؐ نے جب آخری بار متعہ کی ممانعت فرمادی تو پھر وہ قیامت تک کے لئے حرام ہوگیا۔

لیکن ٹھہریئے! اسی صحیح مسلم کے (جس نے اوپر لکھا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعہ قیامت تک کے لئے حرام ہوگیا) کچھ ورق آگے الٹیے اور دیکھئے کہ ان میں کیا نظر آتا ہے۔ جلد ۱ صفحہ ۴۵۱ پر درج ہے۔

عطا کی روایت ہے کہ جابر بن عبداللہؓ عمرہ کے ارادے سے مکہ معظمہ آئے تو ہم ان کی ملاقات کو گئے اور مختلف لوگوں نے ان سے سوالات دریافت کئے۔ پھر متعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم لوگوں نے عہدِ رسول اللہ اور عہد ابوبکرؓ اور عہد عمرؓ میں برابر متعہ کیا ہے۔

لیجئے! رسول اللہ اسے قیامت تک کے لئے حرام قرار دے چکے ہیں لیکن صحابہ کبارؓ حضرت عمرؓ کے زمانے تک متعہ کئے جارہے ہیں (معاذ اللہ!)۔ اسی مسلم میں دوسری روایت یوں آئی ہے۔

ابوالزبیر کا بیان ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم لوگ برابر ایک مٹھی بھر جو یا آٹے کے

عوض میں متعہ کرتے رہے ہیں۔جناب رسالتمآبؐ کے زمانے میں اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن حریث والے واقعے میں اس کی ممانعت کی۔

کنز العمال میں اس کی اجرت "ایک پیالہ بھر ستو" لکھی ہے۔ اس کی تائید فتح الباری (شرح بخاری) جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ نے بھی کی ہے۔

کنز العمال (صفحہ ۲۹۴) میں اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے:۔

ام عبداللہ بنت ابی فتیحہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی شام سے آیا اور ان کے مکان میں قیام کیا۔ اس نے کہا کہ بغیر عورت کے مجھے تکلیف ہے تم میرے لئے کوئی عورت تلاش کرو جس سے میں متمتع ہو سکوں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے اسے ایک عورت کا پتہ دیا اور اس نے اس سے متعہ کیا اور اس پر کچھ عدل لوگوں کی گواہیاں قرار دیں۔ پھر ایک طویل زمانے تک وہ اس کے ساتھ رہا اور اس کے بعد شام واپس چلا گیا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں! انہوں نے فرمایا کہ جب وہ پھر آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ جب وہ آیا تو میں نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انہوں نے اُسے بلوا بھیجا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ایسا رسولؐ اللہ کے سامنے کیا۔ انہوں نے منع نہیں کیا یہاں تک کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایسا ہوا۔ انہوں نے بھی منع نہیں کیا۔ پھر خود آپ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ آپ نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں پہلے ممانعت کر چکا ہوتا تو تمہیں سنگسار کر دیتا۔ اچھا جدائی اختیار کر لو تاکہ نکاح اور مسافحت (زنا) میں تمیز ہو سکے۔

ابھی تک تو صرف صحابہؓ (مردوں) ہی کا ذکر تھا۔ مندرجہ بالا روایت میں ایک صحابیہؓ کا ذکر بھی آگیا کہ انہوں نے اس "کارِ خیر" میں کس قدر مدد کی۔ (یا اللہ! توبہ!) لیکن اسی پر اکتفا کھوڑا ہے۔ ذرا آگے بھی بڑھیئے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے حیاء سے کہیئے کہ وہ آنکھیں بند کرلے۔ غیرت سے کہیئے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ شرم سے کہیئے کہ وہ اپنا منہ چھپا لے کہ اب ذکر آرہا ہے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ الصدیقہؓ کی بہن حضرت زبیرؓ کی رفیقۂ حیات حضرت اسماء ذات النطاقین رضی اللہ عنہا کا۔ یہ ذکر ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (صفحہ ۲۷۵) میں۔ وہاں لکھا ہے۔ (توبہ! توبہ! نقلِ کفر، کفر نباشد)

روی النسائی والطحاوی عن اسماء بنت ابی بکر قالت فعلناها علی

عَهدِ رسولؐ اللہ۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہمارے ساتھ متعہ ہوا۔

اسی بنا پر جب حضرت اسماء کے بیٹے (عروہ) نے حضرت ابن عباس رضؓ سے کہا کہ "تم کو خدا کا خوف نہیں کہ تم متعہ کی اجازت دیتے ہو" تو حضرت ابن عباس رضؓ نے کہا کہ "اسئل امك یا عروہ" ذرا جا کر اپنی والدہ سے پوچھو۔ (زاد المعاد ابن قیم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۱۹)

یٰلیتنی مت قبل هذا وکنت نسیًا منسیًا۔

بہرحال، یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ رسولؐ اللہ نے متعہ کی ممانعت کی تھی یا نہیں کی تھی، لیکن حضرت عمر رضؓ نے اسے ضرور بند کر دیا چنانچہ زاد المعاد (ابن قیم) جلد ۱ صفحہ ۲۴۳ میں ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ "دو متعہ تھے جو رسولؐ اللہ کے زمانے میں رائج تھے۔ لیکن میں انہیں بند کرتا ہوں۔ ایک متعۂ حجؐ اور دوسرا عورتوں کے ساتھ"۔ آپ کو اطمینان ہو گیا ہو گا کہ چلئے! حضرت عمر رضؓ کے زمانے ہی میں سہی، یہ لغویت تو ختم ہوئی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سازش ہی کیا جو اس طرح ختم ہو جائے! ابھی سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ فتح الباری (شرح صحیح بخاری) جلد ۹ صفحہ ۱۳۸ پر ہے:۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ابن عباس رضؓ کے تمام اصحاب جو اہل مکہ اور یمن سے تھے جوازِ متعہ کے قائل تھے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ تابعین میں سے طاؤس اور سعید بن جبیر اور عطا اور تمام فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے تھے۔

یہ ہیں وہ احادیث مقدسہ اور ہمارے ائمہ کے اقوال اُس متعہ کے متعلق جسے (اس روایت کی رُو سے جو درج کی جا چکی ہے) خود حضرت عمر رضؓ نے مسافحت (زنا) قرار دیا تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سنی حضرات مناظروں اور مباحثوں میں ان اعتراضات کا کیا جواب دیتے ہیں[۲]، ہمیں تو صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ یہ تمام روایات اور ان کی شرحیں سنیوں کی اپنی کتابوں کے اندر موجود ہیں۔ اور کتابیں وہ ہیں جنہیں رسولؐ اللہ کی غیر متلو وحی کہا جاتا ہے۔ جنہیں قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہٗ معہٗ) ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کی تعلیم سے ہمارے "علمائے کرام" کو سندِ فضیلت

---

۱ متعۂ حج (حج اور عمرہ کے تمتع (۲/۱۹۶)) کے بند کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

۲ شیعہ حضرات کے ممتاز مجتہد سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ "متعہ اور اسلام" میں ان تمام روایات کو نقل کیا ہے اور سنیوں میں سے کسی نے ان سے انکار نہیں کیا۔

ملتی ہے۔ جن کے درس نمازوں کے بعد مسجدوں میں باعثِ سعادتِ کونین تصور کئے جاتے ہیں۔ جنھیں مسلمان اس لئے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سنتِ رسول اللہ اور سنتِ صحابہ کبار رضی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کتابوں میں ہے۔

لیکن ٹھہریئے! ابھی تک معاملہ صرف روایات تک محدود تھا، قرآن سامنے نہیں آیا تھا۔ اب دیکھیئے کہ اس سلسلہ میں کس طرح قرآن کو بھی ساتھ ہی لپیٹنے کی کوشش کی۔

امام طبری کی تفسیر اہل سنت والجماعت کے ہاں ام التفاسیر کہلاتی ہے۔ یہ سب سے پہلی مدون تفسیر ہے۔ بعد کی تمام تفسیریں قریب قریب اسی کے تتبع میں لکھی گئیں۔ دیکھیئے کہ حضرت امام طبری متعہ کی سند کس طرح لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ابوثابت کا بیان ہے کہ ابن عباس رضی نے مجھے ایک مصحف دیا اور کہا کہ یہ ابی بن کعب کی قرأت کے مطابق ہے۔ یحییٰ بن عیسےٰ جو اس روایت کے ناقل ہیں، نصیر بن ابی الاشعث سے ان کا بیان ہے کہ اس مصحف کو نصیر کے پاس دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ فما استمتعتم به منهن الی اجلٍ مسمّی (یعنی تم عورتوں سے متعہ کرو ایک میعادِ مقررہ کے لئے۔

ابونضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ نساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں؟ کہا پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم به منهن الی اجلٍ مسمّی۔ میں نے کہا۔ نہیں! میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباس رضی کے سامنے یہ آیت پڑھی فما استمتعتم به منهن۔ ابن عباس رضی نے کہا۔ الی اجلٍ مسمّی۔ میں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا خدا کی قسم خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے[1]۔

ابو اسحٰق کی روایت ہے کہ ابن عباس رضی نے پڑھا۔ فما استمتعتم به منهن الی اجلٍ مسمّی۔ پانچویں روایت شعبہ کی ہے۔ اس میں بھی ابو اسحٰق سے ایسی ہی روایت ہے۔ قتادہ

---

[1] اسے اختلافِ قرآت کہتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھیئے کتاب "مقامِ حدیث" شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام۔

کا بیان ہے کہ ابی بن کعب کی قرأت میں یوں ہے۔ فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی ۔ عمرو بن مرہ کی روایت ہے کہ میں نے سعید بن جبیر کو پڑھتے سنا۔ فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی ۔

یہ اقتباس کسی شیعہ بزرگ کی کتاب کا نہیں۔ بلکہ سنیوں کے جلیل القدر امام طبری کی تفسیر کا ہے۔ اور جن حضرات کی طرف یہ روایات منسوب ہیں وہ بلند پایہ صحابی رض ہیں جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آیت اس طرح نازل نہیں ہوئی تھی جس طرح قرآن میں درج ہے بلکہ اس اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی جس سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ غور کیا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔

تصریحات بالا سے آپ دیکھئے کہ سنیوں کی نہایت معتبر کتب روایات اور مستند تفاسیر میں خدا، رسول، صحابہ رض، تابعین وغیرہ کی کس قسم کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ان روایات اور تفاسیر کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ

(i) جو آیات قرآن میں درج ہیں وہ اسی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختلف صحابہ رض کی قرأتوں کی رو سے ان کی تنزیلی شکلیں کچھ اور تھیں۔

(ii) خود رسول اللہ نے صحابہ رض کو مٹھی بھر جو یا آٹے کے عوض میں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اور یہ اجازت نبوت کے آخری دور تک جاری رہی۔

(iii) عہد رسالتمآب اور عہد صحابہ رض کے اسلامی معاشرہ میں متعہ عام تھا اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، نہ مردوں کو نہ عورتوں کو۔

(iv) رسول اللہ نے اپنے آخری زمانہ میں متعہ کو حرام قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عہد حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کے ابتدائی زمانہ تک متعہ برابر جاری رہا۔

(v) حضرت عمر رض نے متعہ کو بند کر دیا لیکن اس کے باوجود صحابہ رض، تابعین اور فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے رہے۔

(vi) اور جنہوں نے اسے طوعاً وکرہاً ناجائز سمجھا وہ بھی یہ کہتے رہے کہ عمر رض نے خدا کی ایک بہت بڑی رحمت کو روک دیا۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری (ص ۷۲) میں لکھتے ہیں:-

محدث عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں ابن جریج سے اور انہوں نے عطا سے روایت کی ہے کہ ابن عباس رض کہا کرتے تھے کہ متعہ کو جائز ہونا خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عمر رض نے

اس کی ممانعت نہ کر دی ہوتی تو کبھی کسی کو زنا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

کیا آپ کسی طرح بھی باور کرنے کو تیار ہیں کہ یہ احادیث واقعی رسول اللہ کی ہو سکتی ہیں۔ پھر سن رکھیے کہ یہ احادیث شیعہ حضرات کی احادیث کی کتابوں سے نہیں لی گئیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کی حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں درج ہیں۔ اور ان کے انکار کرنے والے کو "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

(۰)

شاید آپ کہہ دیں کہ یہ عہد کہن (اسلاف) کی باتیں ہیں۔ انہیں چھوڑیئے۔ سنیوں کے ہاں اب تو متعہ کو حرام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہریئے اور خود اپنے زمانے کے ایک مفسر کی بات سنیئے جو اپنے آپ کو شیعہ نہیں کہتے — یعنی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ وہ اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اگست ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:-

فرض کیجیے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور ایک عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں[۱]۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں[۲] جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔

یعنی یہ صاحب جنسی جذبہ میں "اضطراری حالت" کے قائل ہیں اور اس کا علاج متعہ بتاتے ہیں! یہ وہ بات ہے جو (معاذ اللہ۔ صد ہزار بار معاذ اللہ) خدا کو بھی نہیں سوجھی تھی کیونکہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس نے جنسی خواہشات کے ضمن میں اضطراری حالت کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس کہا یہ کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳)۔ "جنھیں نکاح میسر نہ آسکے وہ ضبطِ نفس سے کام لیں"۔

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں (من حیث القوم) جنسی خواہش (SEXUAL URGE) کی اس قدر شدت کیوں ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جس قوم کو "از روئے شریعت" حسبِ ذیل قسم کے احکام بتائے جائیں، ان میں جنسی

---

[۱] وہ کون سی شرعی شرائط ہیں جن کے مطابق وہاں نکاح ممکن نہیں؟

[۲] عارضی کیوں۔ مستقل کیوں نہیں؟

جذبات کی شدت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ (مثلاً) :-

(۱) ایک وقت میں چار چار عورتوں سے شادی۔ اور وہ بھی اس چھوٹ کے ساتھ کہ جب جی چاہے ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ نئی بیوی لے آئیں۔ اس سے آپ ایک شخص کی عمر بھر میں بیویوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مشہور مغربی مفکر اور مؤرخ برِفا (BRIFFAULT) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE MOTHER)۔ اس میں وہ ایک کُرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا۔

(۲) بیویوں کے علاوہ لونڈیاں جن پر نہ تعداد کی پابندی ہے نہ ہی نکاح کی ضرورت، ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے سلاطین اور امراء کے محلات میں لونڈیوں کی کس قدر بھرمار ہوتی تھی۔

(۳) نابالغ لڑکیوں سے نکاح اور مباشرت کی شرعاً اجازت۔

(۴) نکاح کے علاوہ اضطراری حالت میں متعہ کی اجازت۔ بلکہ استمنا بالید (MASTORBATION) کی بھی۔ اور عزل کی بھی۔

(۵) یہ تو اس زندگی میں — مرنے کے بعد جنت میں کفار کی کمسن لڑکیوں کو نوخیز جوان لڑکیوں میں تبدیل کر کے "مومنین" کے سپرد کر دیا جائے گا۔ ان کی بیویاں محلات میں ساتھ رہیں گی اور یہ لڑکیاں (حوریں) سیرگاہوں میں دادِ عیش دیں گی۔

جس قوم کو یہ کچھ "شرعاً جائز" بتایا جائے وہ جنسی خواہشات پر کنٹرول کیسے رکھ سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے بھی سُن لیجیے۔ قرآنِ کریم نے جنسی بدنہادی یا بے راہ روی کا نتیجہ اثم بتایا تھا جس کے معنی اضمحلال ہیں۔ اس اضمحلال کی تشریح ایک مغربی محقق کی زبانی سنیئے جس نے عمر بھر جنسیات کے مسئلہ پر تحقیقِ عمیق کے بعد

ڈاکٹر انون کی تحقیق

اس کے نتائج کو ایک ضخیم کتاب میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ محقق ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J. D. UNWIN)۔ اور ان کی کتاب کا نام ہے۔ (SEX AND CULTURE)۔ اس میں وہ ان قوموں کے متعلق جنھوں نے جنسی جذبہ کی تسکین کے زیادہ مواقع مہیا کر رکھے ہوں، لکھتا ہے :-

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے

اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب وغریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں۔ اور کبھی دیگر ایسی اشیا کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات، اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو نسیاً منسیا ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے، بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ (ص ۳۲۵-۳۲۶)

اس کے برعکس وہ لکھتا ہے کہ

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسانی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ (ص ۴۳۲)

قرآن ایسا ہی معاشرہ تخلیق کرنا چاہتا تھا۔

(۰)

عدّت ہم طلاق سے متعلق موضوع میں دیکھ چکے ہیں کہ مطلقہ عورت ایک معین عرصہ تک کسی

دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتی۔ اس مدتِ انتظار کو عدّت کہا جاتا ہے۔ یہ عدت صرف عورت کے لئے ہے مرد کے لئے نہیں۔ سورہ بقرہ میں جو کہا گیا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (۲/۲۲۸)۔ عورت کی جس قدر ذمہ داریاں ہیں اسی قدر اس کے حقوق ہیں۔ البتہ ایک بات میں مرد کو اس پر فوقیت حاصل ہے (درجہ۔ ایک درجہ ہیں)۔ اور وہ فوقیت یہ ہے کہ طلاق (یا بیوگی) کے بعد عورت ایک مدت تک دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتی اور مرد پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ عدت سے مقصد یہ ہے کہ اس دوران میں یہ متعین ہو جائے گا کہ اگر عورت حمل سے ہے تو اس کا ہونے والا بچہ اس کے سابقہ شوہر کی اولاد ہے۔ اس کا تعین اس مولود کے لئے نہایت ضروری تھا اس لئے یہ حکم دیا گیا۔ جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے' قرآن کریم نے خود اس حکمت کی وضاحت کردی ہے:۔

(۲) مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔

۲ / ۲۲۸	وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ...... (آیت کا باقی حصہ پہلے گزر چکا ہے)

طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاح ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں جتنے میں ان کے تین حیض پورے ہوں۔ [جنھیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو' ان کی عدت تین ماہ کی ہے (۶۵/۴)۔ اور جس عورت کی طلاق مقاربت سے پہلے ہو جائے' اس کی کوئی عدت نہیں۔ (۳۳/۴۹)] اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں اس امر کا اظہار کر دینا چاہیئے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد اس قسم کی جزئیات تک کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ [حمل کی صورت میں ان کی عدت وضع حمل تک ہوگی۔ (۶۵/۴)]

وہ جو کہا گیا ہے کہ "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ (۶۵/۱)۔ جب عورتوں کو طلاق دو تو اس طرح دو کہ ان کی عدت کا شمار ہو سکے" تو اس سے یہی مراد ہے۔ یعنی حیض کی رو سے شمار کرنے کی سہولت۔

(۳) جو عورتیں ایسی سن رسیدہ ہوں کہ وہ حیض آنے کی طرف سے ناامید ہو چکی ہوں' یا جنھیں کسی طبیعی نقص کی وجہ سے حیض نہ آسکتا ہو' ان کی عدت تین مہینے ہوگی۔ اور حاملہ عورتوں کی مدت وضع حمل تک۔

وَالّٰٓـئِىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ

تَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔىْ لَمْ يَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۔ (۶۵/۴)

[جیسا کہ (۲/۲۲۸) میں بتایا جا چکا ہے، عدت کی مدت عام حالات میں تین حیض کا زمانہ ہے لیکن] جن عورتوں کو حیض آنا بند ہو چکا ہو اور اس وجہ سے یہ دشواری لاحق ہو کہ ان کی عدت کا شمار کس طرح کیا جائے تو ان کے لئے تین حیض کے بجائے تین مہینے عدت کے شمار کرو۔ یہی عدت ان عورتوں کے ضمن میں شمار کرو جنھیں کسی عارضہ کی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔ (بعض طبائع کو شاید عدت کی یہ مدت لمبی معلوم ہو کیونکہ اس مدت میں انہیں مطلقہ بیوی کے اخراجات کا متحمل ہونا پڑے گا۔ لیکن اس میں ملول خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں) جو شخص بھی قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا، نظامِ خداوندی اس کے لئے آسانیاں پیدا کر دیگا۔ (متعلقہ عدالت کو ایسی شکلیں بھی سامنے رکھنی چاہئیں اور ان کا حل تجویز کرنا چاہئیے)۔

(۴) جس عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل طلاق دی گئی ہو اس کے لئے کوئی عدت نہیں۔ اس لئے کہ اس کی صورت میں "حمل" معلوم کرنے کا سوال ہی نہیں ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۔ (۳۳/۴۹)

اے جماعتِ مومنین! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں (قانون کے مطابق) طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو تو تمہارے لئے ضروری نہیں کہ تم ان کی عدت کا شمار کرو (جس میں ان کا نان نفقہ تمہارے ذمہ ہوتا ہے اور جس میں وہ دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتیں)۔ تم انہیں مناسب سامان دے کر نہایت خوشگوار انداز سے رخصت کر دو۔ (نکاح ایک معاہدہ ہے۔ جب دیکھا جائے کہ وہ معاہدہ نبھ نہیں سکتا تو قاعدے اور قانون کے مطابق اسے فسخ کر دیا جائے۔ اس میں تلخی پیدا ہونے کی کون سی بات ہے۔ (۲/۲۲۸-۲۳۲؛ ۶۵/۱-۴)

(ضمناً) آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم جنسی تعلقات کو کس طرح ایمائیت کے انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ مباشرت کے لئے بھی "قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ" کے الفاظ لایا ہے۔ یعنی قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو۔

(۵) بیوہ عورتوں کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔

(۲/۲۴۱-۲۴۲) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۔ كَذٰلِكَ

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۲۴۲-۲۴۱/۲)

مطلقہ عورتوں کو قاعدے قانون کے مطابق عدّت کے دوران سامانِ زندگی مہیّا کرو (۶۵/۷) یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمھارے لئے واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے کر انہیں سمجھ سکو۔

انہیں گھر سے نکالا نہیں جائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ کسی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ نہ وہ خود ہی وہاں سے نکلیں۔ سورۃ الطلاق میں ہے۔ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (۶۵/۱) "نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو نہ وہ خود ہی وہاں سے نکلیں۔ بجز اس کے کہ وہ کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوں"۔ اس صورت میں مرد پر اس کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہے گی۔ ذرا آگے چل کر ہے۔ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ۔ (۶۵/۶) "تم اپنی حیثیت کے مطابق انہیں وہیں (یا ویسے ہی) رکھو جہاں (یا جیسے) تم خود رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لئے کسی قسم کی اذیت مت دو"۔ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا۔ (۶۵/۷)

مطلقہ کا خرچ، یا دودھ پلانے کی اُجرت کا معاملہ طے کرنے کے سلسلہ میں اس بات کو مدِّنظر رکھو کہ صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے اور جس کا ہاتھ تنگ ہو تو جو کچھ اللہ نے اُسے دے رکھا ہے وہ اس کے مطابق دے۔ یاد رکھو! خدا کا قانون کسی پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اگر اس فالتو خرچ سے اس پر کچھ تنگی آجائے تو قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کی تنگی کو آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ مطلقہ عورت اپنے گھر میں رہے۔ کسی دوسری جگہ نہ چلی جائے۔ لیکن قرآن کریم کے اس حکم سے کہ مرد اُسے تنگ نہ کرے (۶۵/۶) یہ مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ اگر مرد اُسے تنگ کرے تو وہ (عدالت کی اجازت یا اطلاع کے بعد) کسی اور جگہ سکونت اختیار کر سکتی ہے۔

(۷) بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خور و نوش کا انتظام ضروری ہے جس کے لئے چاہیئے

کہ مرد وصیت کر جائے۔ اگر وہ خود کسی اور جگہ چلی جائے تو یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

۲/۲۴۰ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۔ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ
مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۔ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲/۲۴۰)

تم میں سے جو لوگ بیوہ عورتیں چھوڑ کر مر جائیں انہیں چاہیئے کہ اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور انہیں سامانِ زندگی دیا جائے۔ لیکن اگر وہ از خود چلی جائیں اور قاعدے اور قانون کے مطابق اپنے لئے کچھ اور فیصلہ کر لیں تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آتا۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون بڑی قوت والا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حکمت پر مبنی ہے۔

(۸) عدت کے دوران عورت دوسری جگہ شادی تو نہیں کر سکتی لیکن نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کی ممانعت نہیں۔

۲/۲۳۵ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ
اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا
تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ
النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۳۵)

ان عورتوں کی عدت کے دوران میں اگر تم اِن سے نکاح کی بابت کچھ اشارۃً کنایۃً کہہ دو یا اپنے دل میں اس کا ارادہ پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ــــ خدا کو اس کا علم ہے کہ تمھیں ان سے نکاح کرنے کا خیال آئے گا ــــ لیکن ان سے خفیہ خفیہ نکاح کا وعدہ مت لے لو۔ ہاں! (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) قاعدے قانون کے مطابق ان سے بات چیت کر و۔ لیکن عدت کے دوران نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ (ظاہری اعمال تو ایک طرف) خدا تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے ــــ اور یہ بھی سمجھ لو کہ ان حدود و قیود سے خدا تم پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تمہارا معاشرہ غلط روی کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ خدا ایسا نہیں کہ وہ تمہاری غلط روی پر یونہی بھڑک اٹھے اور تمہیں سخت قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دے ــــ یہ کچھ، مستبد حکمران کیا کرتے ہیں۔ خدا ایسا نہیں کرتا۔

اگر وہ اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ شادی کرنا چاہے (عدت کے دوران یا اس کے بعد) تو اس کے راستے ہیں

روڑے نہیں اٹکانے چاہئیں:-

۲/۲۳۲ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ - (۲/۲۳۲)

جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، اور یہ سابقہ میاں بیوی پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں اور آپس میں قانون کے مطابق نکاح کرنا چاہیں، تو (اے افراد معاشرہ!) تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو۔ یہ تلقین ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ ان قوانین کی اطاعت میں تمہاری ذات کی نشوونما کا سامان اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ یاد رکھو! یہ قوانین اس خدا کے عطا کردہ ہیں جو ان باتوں کو جانتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے (اس لئے تم ان کی اطاعت کرو۔ ان کے نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ یہ کس قدر حقیقت اور حکمت پر مبنی ہیں)۔

(۰)

رضاعت

قرآن کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ ماں اپنے بچے کو اتنی مدت تک ضرور دودھ پلائے۔ اس کا فیصلہ بچے کی حالت کے مطابق ماں باپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ویسے قرآن کریم نے عمومی طور پر کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے جنین کو اپنے بطن میں رکھتی ہے اور پھر اُسے دودھ پلاتی ہے تو اس میں اس کے اڑھائی برس صرف ہو جاتے ہیں۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ (۴۶/۱۵) "ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں اسے اپنے بطن میں رکھتی ہے پھر دردِ زہ کا کرب اٹھاتی ہے اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے تک تیس ماہ کی مدت لگ جاتی ہے"۔ دوسری جگہ (قانونی مقاصد کے لئے) دودھ چھڑانے کا وقت دو سال بتایا ہے۔ وَفِصٰلُهٗ فِىْ عَامَيْنِ۔ (۳۱/۱۴)۔

(۲) لیکن جب معاملہ قانونی حیثیت اختیار کر لے تو بات متعین ہونی چاہیئے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ عورت کو:-

(۱) بچے کا باپ رضاعت کی اُجرت دے۔ اس صورت میں رضاعت کی مدّت دو سال ہوگی۔ لیکن اگر وہ باہمی رضامندی سے اس سے کم مدّت میں دودھ چھڑانا چاہیں یا کوئی دوسرا انتظام مناسب خیال کریں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

۲/۲۳۳ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۔ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۔ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (۲/۲۳۳)

اگر طلاق کی صورت میں ماں کی آغوش میں دودھ پیتا بچہ ہو اور باپ چاہے کہ وہ اس بچے کو پوری مدت تک دودھ پلائے تو ماں کو چاہیئے کہ وہ پورے دو سال تک بچے کو دودھ پلائے (۳۱/۱۴ ؛ ۴۶/۱۵)۔ اس صورت میں قاعدے اور قانون کے مطابق اس عورت کی روٹی کپڑے کا انتظام اُس مرد کے ذمے ہوگا۔ یہ انتظام اس مرد کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے اس باب میں اصول یہ ہے کہ کسی شخص پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ (فیصلہ کرنے والی عدالت کو چاہیئے کہ اس چیز کو پیش نظر رکھے کہ) نہ تو اس بچے کی وجہ سے ماں کو ناحق تکلیف پہنچے اور نہ ہی اس کے باپ کو۔ اگر اس بچہ کا باپ (اس اثنا میں) فوت ہو جائے تو اس کی ذمہ داری اس کے وارث کے سر پر ہوگی۔

اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے (قبل از وقت) دودھ چھڑا کر (کوئی اور انتظام کرلینا چاہیں) تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تم بچہ کے لئے کسی اور دودھ پلانے والی کا انتظام کرنا چاہو تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ جو کچھ تم نے بچے کی ماں سے طے کیا تھا وہ اسے پورا پورا دے دو۔

بہرحال تم ہمیشہ قانون خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل اور نیت پر نگاہ رکھتا ہے (اس لئے نہ تو قانون کی محض رسمی پابندی کرو اور نہ ہی اس سے گریز کی راہیں تلاش کرو)۔

دوسری جگہ ہے :-

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى - (۶۵/۶)

اور اگر وہ حمل سے ہیں تو وضع حمل تک تو تمھیں ان کا خرچ بہر حال برداشت کرنا ہے اور اگر وضع حمل کے بعد وہ تمہاری خاطر بچے کو دودھ پلائیں (یعنی تم کوئی اور انتظام نہ کرو اور باہمی رضامندی سے یہ طے پاجائے کہ وہی بچے کو دودھ پلائیں۔ تو) انہیں ان کی دودھ پلائی کی اُجرت دو۔ ان امور کی تفاصیل کو باہمی مشورے سے قاعدے قانون کے مطابق طے کر لیا کرو اور اگر تم میں سے کسی پر یہ انتظام گراں گزرے تو تم کسی دوسری عورت کا انتظام کر لو جو بچے کو دودھ پلائے۔

حضانت

ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں نابالغ بچے کس کی تحویل میں رہیں، اس کی بابت قرآن مجید نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ عدالتِ مجاز متعلقہ حالات کے پیشِ نظر کرے گی۔ اس باب میں اصول یہ پیشِ نظر ہونا چاہیئے کہ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ (۲/۲۳۳)۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے جس سے ماں یا باپ کو کسی قسم کی مشقت یا مضرت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان امور کے متعلق اسلامی حکومت خود قوانین وضع کریگی۔

(٠)

زیرِ نظر باب میں عائلی زندگی سے متعلق قرآنِ کریم کے احکام اور ہدایات فی الجملہ آگئے ہیں۔ اور آیات (۲/۲۴۰) آیات (۲/۲۴۲) کی تفسیر بھی سامنے آگئی ہے۔ ان کے درمیان آیات (۲/۲۳۸-۲۳۹) کی تشریح رہ گئی ہے اسے پیش کر کے اس موضوع کو ختم کیا جائے گا۔ آیات یہ ہیں :-

۲/۲۳۸-۲۳۹

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى - وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ. فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا. فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. (۲/۲۳۸-۲۳۹)

ان کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:-

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔ پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار۔ پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

ان آیات میں مفسرین اور مترجمین نے صلوٰت سے مراد نمازیں لیا ہے۔ ان میں اختلاف ہے تو "صلوٰۃ الوسطیٰ" (درمیانی نماز) کے مفہوم میں ہے لیکن عام طور پر اس سے مراد عصر کی نماز لی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ پانچ نمازوں (فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء) کے درمیان پڑتی ہے۔

یہ آیات عائلی قوانین کے درمیان آئی ہیں جن کا سلسلہ آیت (۲/۲۲۱) سے شروع ہوا ہے۔ ان سے پہلے بھی طلاق، مہر، عدت وغیرہ سے متعلق احکام ہیں اور ان کے بعد بھی۔ اس لئے ربط کے لحاظ سے یہاں نماز سے متعلق احکام کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہوسکتا ہے اس میں میری کوتاہیٔ فہم کا قصور ہو (خوف کی حالت میں صلوٰۃ نماز کے متعلق احکام (۴/۱۰۳-۱۰۱) میں آئے ہیں۔ ان کی تفسیر متعلقہ مقام پر کی جائے گی)۔

صلوٰۃ کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول، صفحات ۹۷-۱۴۰ زیر آیت (۲/۳) میں کی جاچکی ہے۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ صلوٰۃ کے بنیادی معنی قوانینِ خداوندی سے وابستگی اور ان کی رُو سے عائد کردہ فرائضِ منصبی کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات میں صلوٰۃ سے مراد وہ فرائض ہیں جو سیاق و سباق کی آیات میں عائلی زندگی کے ضمن میں عائد کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے میں نے ان آیات کا حسبِ ذیل مفہوم لیا ہے۔

یہ ہیں (عائلی زندگی کے سلسلہ میں) تمہارے فرائضِ منصبی جن کی محافظت ضروری ہے۔ لیکن تمہارا مرکزی فریضہ جس کی محافظت اشد ضروری ہے، یہ ہے کہ تم زندگی کے ہر گوشے میں ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں کمربستہ کھڑے رہو۔ خوف کی حالت میں پیادہ چل رہے ہو یا سواری پر اور حالتِ امن میں اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے (۳/۱۹۰؛ ۴/۱۰۳)۔ ہر حال میں قوانینِ خداوندی کو اس طرح سامنے رکھو جس طرح اس نے تمہیں بتایا ہے — تم اس سے پہلے ان امور سے واقف نہیں تھے۔

———(۰)———

فلسفۂ موت و حیات

تجدیدِ یادداشت کے لئے اسے دہرا دینا غیر محل نہ ہوگا کہ سابقہ (چھٹا) باب (آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۲۱۸) میں قتال (جنگ) کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی ضمن میں

قرآن کریم نے بتایا کہ جہادِ زندگی میں کامیابی کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنے ہوش و حواس نہ کھوئے اور اپنی اسکیموں کو اتفاقات (CHANCES) پر نہ چھوڑے بلکہ حسنِ تدبیر سے انہیں کامیاب بنانے کی کوشش کرے" اور دوسرے یہ کہ باہر کی دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کی گھر کی زندگی بڑی پُرسکون اور اطمینان بخش ہونی چاہیئے۔ اس کے متعلق ضروری ہدایات سابقہ صفحات میں (آیات ۲/۲۱۹ تا ۲/۲۴۲) سامنے لائی گئیں۔ ان اہم متعلقہ مباحث کے بعد قتال (جنگ) سے متعلق سلسلۂ کلام کو پھر جاری کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں بنی اسرائیل کی داستان کے دو مزید اوراق سامنے لائے گئے ہیں۔

مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحات ۳۸۶-۳۸۵ پر مذکور آیات (۲/۹۴-۹۶) کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ ان میں یہ کہا گیا ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ جنت کا گھر ان کے لئے ریزرو (مخصوص) ہے۔ ان سے کہا گیا کہ جب واقعہ یہ ہے (جیسا تم کہتے ہو) تو تم دنیا میں اس قدر ذلت و خواری کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہو۔ تم اس دنیا کو خیرباد کہو اور مرجاؤ۔ مرنے کے بعد جنت کی خوشگواریوں کے مزے لوٹو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم دیکھو گے کہ یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کے کرتوت کیا ہیں۔ اس لئے موت کے نام سے ان کی جان جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم ایک واقعہ بیان کرتا ہے جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں موت انہیں جا دبوچتی ہے۔ لیکن جو اس کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت تو نہیں کی کہ یہ واقعہ کس قوم یا جماعت سے متعلق ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق بھی بنی اسرائیل ہی سے ہے۔ ارشاد ہے:-

۲/۲۴۳ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۔ (۲/۲۴۳)

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جو قوتیں تمہارے نظام کی راہ میں حائل ہوں گی تمہیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ (۲/۲۱۸-۲۱۹)۔ لیکن خارجی قوتوں کا مقابلہ وہی قوم کر سکتی ہے جس کا داخلی نظام پُرسکون اور اطمینان بخش ہو۔ اس کے لئے تمہیں عائلی زندگی کے متعلق قوانین دیئے گئے (۲/۲۲۱-۲۴۲)۔ اب تم پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔ یعنی اس موضوع کی طرف کہ تمہاری اجتماعی زندگی میں استحکام کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے تم قوم بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ پر غور کرو۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب دشمن کا سامنا ہوا تو وہ اپنا گھر بار

سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوتے ـــــ انہوں نے اس قدر بزدلی کا ثبوت کیوں دیا ؟ محض اس لئے کہ وہ موت سے ڈرتے تھے۔ لیکن وہ زندگی کے اس اصول کو بھول گئے کہ زندہ وہی رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔ (۹۴/۲)۔ جو موت سے بھاگتا ہے اسے موت آگے بڑھ کر دبوچ لیتی ہے ـــــ جب انہوں نے اس راز کو پا لیا تو انہیں حیاتِ نَو عطا کر دی گئی۔ وہ دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹ گئے اور آخر الامر فتحمند ہوئے۔

یہی وہ قانونِ حیات ہے جس سے اقوامِ عالم کو افضلیت و فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس قانون کی قدر دانی نہیں کرتے۔

خطرات کا مقابلہ انسان کے اندر وہ فولادیت پیدا کرتا ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ۔ (۱۰۳/۲۱) کائنات کا عظیم ترین حادثہ بھی انہیں مغموم و محزون نہیں کر سکتا۔ بقولِ اقبالؒ ؎

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی ــــ وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی ــــ یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اور اس قسم کی فولادیت پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا ــــ نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز ــــ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقی زندگی خطرات کا مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ "پل صراط" پر سے گزرے بغیر انسان جنت میں داخل نہیں ہو سکتا !

مذکورہ صدر آیات میں کہا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (۲۴۳/۲)۔ انسانوں کے ساتھ خدا کا برتاؤ فضل و عنایات کا ہے۔ اس سے نگاہ کا رُخ ایک اور سمت کو مڑ جاتا ہے۔ خدا نے انسان کو جان عطیۃً (وہبی طور پر) دی ہے اور یہ بات بذل و سخا اور جود و عطا کے خلاف ہے کہ جو چیز کسی کو عطیۃً دے دی جائے اسے اس سے واپس لے لیا جائے۔ اس لئے خدا انسان سے جان واپس نہیں لیتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ لیکن یہ "ناشکرا" اس عطیۂ عظمیٰ کی قدر نہیں کرتا اور اسے مفت میں ضائع کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ

جانے کہ دادند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

ـــــ (۰) ـــــ

اگلی دو آیات میں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ یہ حیاتِ جاوداں کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اس قوم سے جو موت کے ڈر سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی کہا کہ بھاگو نہیں۔ جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور

۲/۲۴۴ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۔ (۲/۲۴۴)

ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم موت سے ڈر کر بھاگنے کے بجائے حق و انصاف کی راہِ خداوندی میں دشمنوں کا جم کر مقابلہ کرو۔ ان سے ڈٹ کر لڑو۔ یاد رکھو! تمہاری کوئی قربانی ضائع نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اللہ ہر ایک بات کو سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

(۰)

قرآنِ کریم نے نظامِ اسلامی کے قیام اور استحکام کے سلسلہ میں کہا ہے کہ إِنَّ اللهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱) "اللہ مومنین سے ان کا مال اور ان کی جان خرید لیتا ہے اور ان کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے"۔ قتال فی سبیل اللہ میں تو جان حاضر کر دی جاتی ہے۔ لیکن اس قتال (اور ہر قسم کے جہاد فی سبیل اللہ) کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آیت (۲/۲۴۴) کے تسلسل میں کہا۔

۲/۲۴۵ مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۔ (۲/۲۴۵)

تمہاری اجتماعی قوت کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے نہایت حسن کارانہ انداز سے "قرض" دو۔ اسے "قرض" اس لئے کہا جاتا ہے کہ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دولت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے پاس چلی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ روپیہ کسی اور کے پاس نہیں جاتا یہ چند درچند (کئی گنا ہو کر) تمہارے پاس واپس آ رہا ہوتا ہے۔

یاد رکھو! دولت کا بڑھنا اور گھٹنا خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ تم اپنے لئے جس قسم کے قوانین جی چاہے بنا لو، آخرالامر نتیجہ خدا کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوگا۔ تم اس سے ہٹ کر کہیں اور جا نہیں سکتے۔ تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

اور وہ قانون یہ ہے کہ دولت جس قدر نظامِ حق و انصاف کے قیام اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جائے وہ اسی قدر بڑھتی ہے۔

قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کی طرف سے ایثارِ مال کو ہر جگہ قرض کہہ کر پکارا ہے۔ بلکہ قرضِ حسنہ کہہ کر۔ اس

اصطلاح میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ نظام خداوندی اپنے ابتدائی مراحل میں، جب وہ ہنوز زیر تشکیل ہوتا ہے۔ افراد جماعت سے ہر قسم کی قربانی کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہ ہنوز اس قابل نہیں ہوتا کہ انہیں اس کے بدلے میں کچھ دے سکے۔ لیکن جب وہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو وہ انہیں ایک ایک کے بدلے میں سو سو دیتا ہے۔ اس لئے اس نے افراد کے ان مالی ایثار (عطیات) کو قرض کہہ کر پکارا ہے جو دگنا چوگنا واپس دے دیا جاتا ہے۔

نظام سرمایہ داری میں قرض اور ربٰو کی بحث ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس مقام پر صرف ایک نکتہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ربٰو کے ضمن میں کہا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (۳/۱۲۹)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ "دگنا چوگنا" کیا جاتا ہے اور اسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن جو قرض خدا واپس کرتا ہے اس میں "فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً" کو خدا کی طرف سے فضل و رحمت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ بات واضح ہے۔ سودی کاروبار میں مقروض جو کچھ اصل زر سے زائد دیتا ہے، بامر مجبوری، دل پر پتھر رکھ کر دیتا ہے۔ لیکن نظام خداوندی، افراد قوم کو جو کچھ دیتا ہے بطیب خاطر دیتا ہے، جبر و اکراہ سے نہیں دیتا۔ اس لئے افراد کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ قرض حسنہ بن جاتا ہے۔

اس آیت میں قبض اور بسط کے الفاظ بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئے ہیں۔ قبض کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنی گرفت میں لے کر ہاتھ سکیڑ یا کھینچ لینا۔ اور بسط کے معنی ہوتے ہیں دست کرم کو دراز کرنا، وسیع کرنا، کشادہ کرنا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرض کے معاملہ میں بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ خدا (یا نظام خداوندی) نے جو کچھ لیا ہے وہ اس کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ اس نے اسے اپنی گرفت میں لے کر مٹھی میٹ لی ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ اس نے اسے دگن چوگنا کر کے واپس دینے کے لئے لیا ہے۔ خدا کے قابض اور باسط ہونے کے یہی معنی ہیں۔ چونکہ اللہ کو دیئے ہوئے قرض کی واپسی کے متعلق آگے چل کر تفصیلی آیات ہمارے سامنے آئیں گی اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں خود لفظ "قرض" کے متعلق تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے کیونکہ اس تشریح سے اللہ کو دیئے ہوئے "قرض" کا مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

لفظ قرض کا مفہوم

قرض کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کاٹنا۔ چبانا۔ آپ نے جگالی کرنے والے مویشیوں (گائے بیل وغیرہ) کو دیکھا ہوگا۔ وہ چلتے چلاتے ادھر اُدھر منہ مارتے ہیں اور جو کچھ میسر آتا ہے اُسے اسی طرح نگلتے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب انہیں فرصت ملتی ہے تو وہ آرام سے بیٹھ کر اس نگلے ہوئے چارہ کو منہ میں لوٹاتے ہیں اور آہستہ آہستہ چبا کر اسے معدہ میں واپس بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح وہ چارہ ہضم

ہو کر جزوِ بدن بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جگالی کے اس عمل کو عرب القرّیض کہتے تھے۔ اس سے قرضِ حسنہ کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ یعنی تمہارا مال اگر تمہارے پاس رہے تو وہ ایسا چارہ ہوتا ہے جو ہضم ہو کر جزوِ بدن بننے کے قابل نہیں ہوتا لیکن جب تم اسے نظامِ خداوندی کو دیدیتے ہو تو وہ تمہیں اس شکل میں واپس کرتا ہے جس سے وہ جزوِ بدن بن کر ممدِ حیات ہو جائے۔ نظامِ خداوندی جو کچھ افرادِ معاشرہ سے لیتا ہے وہ اسے، انہیں حیاتِ تازہ عطا کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ یہ ہے قرآن کے معاشی نظام کی لِم اور غایت۔ یعنی جان و مال کے عوض جنّت۔!

———— (۰) ————

قتال کی رو سے حیاتِ نو عطا ہونے کے قانونِ خداوندی کے بعد ایک اور واقعہ کی طرف آیئے جس میں بنی اسرائیل کا نام لیا گیا ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۴۶ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى‌ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ قَالَ هَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا‌ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِيَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا‌ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ۔ (۲/۲۴۶)

اس ضمن میں وہ واقعہ بھی غور طلب ہے جو موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے سردارانِ قوم کو پیش آیا۔ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کے زیرِ کمان اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس وقت تو تم جنگ کے لئے اس قدر شوق اور آمادگی کا اظہار کر رہے ہو لیکن (تمہاری جو نفسیاتی کیفیت ہو چکی ہے اس سے) کچھ بعید نہیں کہ جب تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم اس سے گریز کرو۔ انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں، درآنحالیکہ ہم اپنے گھروں سے نکال باہر کئے اور اپنے بچوں تک سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔

لیکن ہوا وہی جو ان کے نبی نے کہا تھا۔ جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے بجز معدودے چند، سب گریز کی راہیں نکالنے لگے۔ لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ جو لوگ قانون شکنی اور نافرمانی

کے عادی ہو چکے ہوں ان میں نظم وضبط کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت کہاں رہ سکتی ہے؟ اللہ ان کی اس نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا، اور اسی لئے ان کے نبی نے ان سے کہا تھا کہ جب جنگ سامنے آئے گی تو تم بھاگ کھڑے ہو گے۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد (حضرت) یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے۔ قرآنِ کریم میں حضرت الیسع کا نام زمرۂ انبیاء میں آیا ہے (۶/۸۶ و ۳۸/۴۸) یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے (حضرت) یوشع بن نون مراد ہیں یا تورات کے لیسعیاہ نبی۔ ان کے زمانے میں فلسطین کا کچھ علاقہ بنی اسرائیل کے زیر نگین آگیا لیکن از اں بعد ۱۰۰۰ ق.م کے قریب حضرت داؤد اور (حضرت) طالوت کی زیرسرکردگی سارے کے سارے فلسطین پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ زیرِ نظر واقعہ کا تعلق اسی زمانہ سے ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں تَوَلَّوْا (وہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے) سے ان کی اسی دوں ہمتی اور پست حوصلگی کی وضاحت کی گئی ہے جس کی طرف آیت (۲/۲۴۳) میں اشارہ کیا گیا تھا۔ بہرحال قوم نے اپنے نبی سے کمانڈر مقرر کرنے کے لئے کہا جس مقصد کے لئے قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے وہ اگلی آیت میں سامنے آتا ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۴۷ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ. (۲/۲۴۷)

بہرحال جب انہوں نے کمانڈر مقرر کرنے کی درخواست کی تو ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا ہے۔ انہوں نے چھٹتے ہی اس پر اعتراض کر دیا کہ وہ ہم پر کیسے کمان کر سکتا ہے؟ اُس کے مقابلہ میں اس منصب اور اقتدار کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔ وہ غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس مال و دولت کہاں ہے؟ ان کے نبی نے ان سے کہا جنگ کی کمان کے لئے مال و دولت معیار نہیں ہوا کرتا۔ اس کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا علم کس قدر ہے اور جسمانی توانائی کا کیا حال ہے۔ طالوت کو یہ کچھ فراوانی سے میسر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں اور قوتوں کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے ہی صرف نہیں کرتا دوسرے لوگ بھی ان سے نفع اندوز ہوتے ہیں۔ اللہ کا یہی قانون ہے جس کے مطابق

کسی کو منصب و اقتدار کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اور اس کا یہ قانون کشادہ نگہی اور علم وحقیقت پر مبنی ہے وہ تمہارے خود ساختہ معیاروں کا پابند نہیں۔

کمانڈر کا انتخاب غور کیجئے۔ بنی اسرائیل ہدایات خداوندی کو فراموش کر کے اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں مال و دولت ہی معیارِ عزو جاہ رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک ایک فوج کے کمانڈر کا تقرر بھی اسی معیار کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی اسے کسی دولت مند گھرانے کا فرد اور کسی امیر کبیر باپ کا بیٹا ہونا چاہیئے تھا۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس غلط نگہی کی تردید کی اور کہا کہ معیارِ انتخاب اہلیت ہونی چاہیئے نہ کہ دولت۔ فوج کے کمانڈر کے لئے ضروری ہے کہ اُسے عسکری نظام کا پورا پورا علم حاصل ہو اور اس کے ساتھ جسمانی قوت بھی۔ (حضرت) طالوت کا انتخاب اسی معیار کے مطابق روبعمل لایا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم ایک تاریخی واقعہ کے ضمن میں بھی کس قدر محکم اصولِ حیات سامنے لے آتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات بیان ہی اس مقصد کے لئے کرتا ہے۔

اس مقام پر ذرا رُکیئے اور اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ پر غور کیجئے۔ آیت کے آخری حصہ میں کہا گیا ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ جسے چاہتا ہے اپنی حکومت عطا کر دیتا ہے" مَنْ يَّشَآءُ" کا ترجمہ "جسے چاہتا ہے" اسی مقام پر نہیں کیا جاتا۔ قرآنِ کریم کی تمام آیات میں ان (اور ان جیسے دیگر) الفاظ کا ایسا ہی ترجمہ کیا جاتا ہے اور پھر اسے عقیدہ جبر کے لئے بطور سند پیش کر دیا جاتا ہے۔ یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ انسان اس باب میں مجبور واقعہ ہوا ہے۔ اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے مسئلہ تقدیر کہا جاتا ہے[1]۔ جس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ (بالخصوص صفحات ۱۶۳؛ ۱۸۴ـ۱۸۰؛ ۲۷۴ پر)۔ وہاں یہ بتایا جا چکا ہے کہ "من یشاء" کے معنیٰ ہوتے ہیں" خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا کرتا ہے۔ اس کی تائید زیر نظر آیت سے نہایت وضاحت سے ہو گئی۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا کہ طالوت کا انتخاب کس معیار کے مطابق کیا گیا تھا اور اس کے بعد کہا کہ " وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ" اگر "مَنْ يَّشَآءُ" کا ترجمہ "جسے چاہتا ہے" کیا جائے تو آیت کا مفہوم یوں ہو گا کہ "طالوت کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کا علم بھی وسیع ہے اور جسمانی قوت بھی اور اللہ جسے چاہتا ہے اقتدار سونپ دیتا ہے۔" آپ دیکھتے ہیں کہ اس طرح ان دونوں ٹکڑوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی ربط نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہو جاتے ہیں۔

"من یشاء" کے صحیح ترجمہ کی رو سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ منصب و اقتدار تمہارے خود ساختہ معیاروں کی

---

[1] تقدیر کے متعلق تفصیلی بحث میری تصنیف "کتاب التقدیر" میں ملے گی۔

رو سے نہیں عطا ہوتا۔ وہ خدا کے قانونِ مشیت کی رُو سے عطا ہوتا ہے اور خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ منصب و اقتدار اس کو ملتا ہے جو اس کے لئے ضروری صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سے "مَنْ يَّشَآءُ" کا مفہوم کیسے واضح ہو گیا۔

مناصب اقتدار کے لئے علم اور قوت دونوں کو معیار قرار دے کر قرآنِ کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب علم کے ساتھ قوت اور قوت کے ساتھ علم وابستہ ہو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

قوت اور رائے

اہلِ حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں — قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی ضوابطِ قانون (الکتاب) کے ساتھ الحدید (شمشیر خارہ شگاف) بھی نازل فرمائی ہے (۵۷/۲۵)۔ زندگی ان دونوں کے امتزاج سے باقی رہ سکتی ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ ذرا آگے چلو گے تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ طالوت کے انتخاب میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ اس کے ہاتھوں جو کارنامے سرزد ہوں گے وہ اس انتخاب کے معیار کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔ فرمایا:۔

۲/۲۴۸ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۲/۲۴۸)

اُن کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا کہ خدا نے جو اقتدار و اختیار طالوت کو سونپا ہے اس کا (پہلا) نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں تمہارے موجودہ قلوب کی جگہ (جو خوف و اضطراب کے نشیمن ہیں) ایسا قلب عطا ہوگا جو سکون و اطمینان سے لبریز ہوگا۔ نیز وہ تمہیں ان تمام بہترین اور باقی رہنے والی خصوصیات اور تعلیمات کا وارث بنا دے گا۔ جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کے متبعین نے چھوڑی ہیں اور جن کی حفاظت خدا کی کائناتی قوتیں کرتی چلی آ رہی ہیں۔

اگر تم خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو تو تمہارے لئے یہ بات اس امر کا پختہ نشان بن جائے گی کہ طالوت کا انتخاب فی الواقعہ صحیح تھا۔

"تابوت سکینت" کے متعلق تورات (کتاب خروج اور سموئیل) میں لکھا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا لکڑی کا

صندوق تھا جسے سونے سے مڑھا گیا تھا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے تبرکات تھے جب فلسطینیوں نے بنی اسرائیل کو شکست دی تو وہ اس مقدس صندوق کو لوٹ کر لے گئے۔ لیکن اس کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے تو انہوں نے اسے ایک گاڑی پر رکھا۔ گاڑی کے آگے دو گائیں جوتیں اور انہیں بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دیا۔ اس طرح یہ تابوت (صندوق) انہیں واپس مل گیا۔ ہمارے اکثر مفسرین نے بھی تورات کی اس تفصیل کو اپنے ہاں درج کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم پر غور کرنے سے بات کچھ اور سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں ذکر ان خصوصیات کا ہو رہا ہے جن کی بنا پر طالوت کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کی پہلی دو خصوصیات کا تعلق دماغ (فکر) اور جسمانی صحت اور توانائی سے تھا۔ اس کے بعد کہا کہ اتنا ہی نہیں کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس کا اہل ہے، وہ اس قلب سلیم کا بھی حامل ہے جو پیروانِ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی ابدیت درکنار (صحیح آسمانی) تعلیم کا خزینہ اور سکون و اطمینان کا پیکر ہے۔ عربی لغت کی رُو سے تابوت کے معنی قلب اور سینے کے بھی ہیں۔

تابوتِ سکینہ

جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے، قرآن کریم میں میدانِ جنگ میں مجاہدین (صحابہ کبارؓ) کی مدد کے لئے ملائکہ کے نزول کا ذکر آیا ہے۔ ان کی طرف سے اس تائید و امداد سے مقصود یہ تھا۔ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔ (۸/۱۰) اور فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (۸/۱۲) تاکہ مجاہدین کو اطمینانِ قلب اور ثبات قدم نصیب ہو۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۴۸/۴) "اللہ وہ ہے جس نے مومنین کے دلوں کو سکینت (سکون) عطا فرمایا" (ملائکہ کے متعلق تفصیلی ذکر جلد دوم۔ باب اول میں آچکا ہے)۔

بہرحال (حضرت) طالوت کے انتخاب کے خلاف اعتراض کرنے والوں کو بتایا گیا کہ انہیں کس قدر صحت اور توانائی، فکری اور علمی صلاحیت اور قلبی پاکیزگی کا بہرہ وافر عطا ہوا ہے۔ اور وہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے متبعین کی صحیح تعلیم کے بھی حامل ہیں۔ تم آگے بڑھو گے تو قدم قدم پر ان کی ان خصوصیات کے مظاہر دیکھو گے ؎

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز　　　یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

اس کے بعد یہ لشکر جالوت (دشمن) کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے پہلے کہا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔ (۲/۱۸۳) "تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں"۔ اور اس کے بعد کہا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (۲/۲۱۶) "تم پر جنگ کو فرض قرار دیا گیا ہے"۔ صیام اور قتال میں کیا تعلق ہے اور قتال میں کامیابی کے لئے صیام کی رو سے

عائد کردہ پابندیوں کی مشق کس قدر ضروری ہے، اس کا عملی ثبوت زیرِ نظر واقعہ کی اگلی کڑی سے لگ سکے گا جس میں کہا کہ:-

۲/۲۴۹ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ (۲/۲۴۹)

بہرحال طالوت کمانڈر مقرر ہوگیا۔ جب وہ لشکر کے ساتھ دشمن کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا تو اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں کس قدر ڈسپلن پیدا ہوچکا ہے، ان سے کہا کہ دیکھو! راستے میں ایک ندی آئے گی۔ اس سے پانی نہ پینا۔ جو اس سے پانی پئے گا وہ سمجھے کہ وہ ہمارے لشکر میں رہنے کے قابل نہیں۔ جو اس سے پانی نہ پئے گا، بجز اس کے کہ یونہی حلق تر کرنے کے لئے چلو بھر پانی پی لے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ ہمارا ساتھی ہوگا۔ (لیکن کمانڈر کے اس حکم کے علی الرغم) انہوں نے بجز معدودے چند، اس ندی سے پانی پی لیا۔

آپ نے دیکھا کہ جنھوں نے صیام کی پابندیوں سے ضبطِ خویش کی مشق نہیں کی تھی وہ کس طرح راہِ کارزار میں پہلے ہی مرحلہ پر فیل ہوگئے۔ اب آگے بڑھیے:-

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ (۲/۲۴۹)

(اس کے بعد انہوں نے یقین دلایا کہ وہ آیندہ ایسا نہیں کریں گے) چنانچہ جب طالوت انہیں اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان پر پکے رہے تھے ساتھ لے کر پار ہوا تو ان بزدلوں نے (جنھوں نے پہلے معافی مانگی تھی) کہہ دیا کہ ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی ہمت نہیں۔

بات صاف ہے۔ جن سپاہیوں میں کچھ وقت کے لئے پیاس پر غلبہ پانے کی بھی سکت نہیں تھی ان میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت کہاں سے آجاتی؟ اس کا حقیقی سبب آیت کے اگلے حصہ میں آتا ہے جہاں کہا۔

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (۲/۲۴۹)

اس پر ان لوگوں نے جنھیں خدا کے سامنے جانے کا خیال (فلہذا، اس کے قانون مکافاتِ عمل پر پورا پورا

یقین) تھا۔ ان سے کہا کہ دشمن کی تعداد کی کثرت سے مت گھبراؤ۔ خدا کے قانون میں یہ بھی ہے کہ تعداد کی کمی سیرت و کردار کی قوت سے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق (تاریخ میں) کئی واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جن میں کم تعداد کے لوگ گروہ کثیر پر غالب آ گئے تھے۔ اصل چیز استقلال و استقامت ہے۔ جو حق پر ثابت قدم رہے، خدا کے قانون کی تائید اس کے شاملِ حال رہتی ہے۔

دیکھئے۔ یہاں ان دو گروہوں کے بنیادی فرقوں کو کس وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ ایک گروہ وہ تھا جسے حیاتِ

کثرت و قلت

آخرت پر ایمان تھا۔ اس لئے وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ موت سے خوف کھاتا تھا۔ (آیت (۲۴۳) میں اسی فرق کو سامنے لا کر اس داستان کی تمہید بیان کی گئی تھی۔)

اس آیت میں قرآنِ کریم نے فتح و ظفر کے ایک اور عظیم راز کا افشا کیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ دنیا میں افراد کی کثرت و قلت معیارِ فتح و شکست نہیں۔ معیار ان افراد کا جوہرِ ذاتی ہے۔ چھوٹی سی جماعت جو ایمانِ محکم اور عملِ پیہم کی قوتوں سے مسلح ہو، بہت بڑی بھیڑ (CROWD) پر نہایت آسانی سے غالب آ سکتی ہے۔ تاریخِ عالم پر تیرتی ہوئی نگاہ ڈالیئے۔ ہر مبارزت میں آپ کو اس اصول کے خط و خال ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ نگاہوں کے سامنے واضح مقصد — اور وہ مقصد بھی عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخشیوں کا حصول — دل میں اس مقصد کی صداقت پر یقین اور اس کے حصول کی تڑپ۔ پاؤں میں استقامت، بازوؤں میں قوت، بڑھتی ہوئی ہمتیں، اٹھتے ہوئے قدم اور حیاتِ جاوداں منزلِ مقصود ہے

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

اسی حقیقت کی طرف بدر کے میدان میں مجاہدین کی توجہ ان الفاظ میں مبذول کرائی گئی تھی کہ اِنْ يَكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸/۶۶) "اگر تم میں ایک سو ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے"۔ کہ اصلی مقابلہ تعداد کا نہیں ہوتا، افراد کے جوہروں کا ہوتا ہے۔ مغربی جمہوریت کا سنیاناس کہ اس نے

مغربی جمہوریت کا باطل نظریہ

انسان کے جوہرِ ذاتی کو یکسر نظر انداز کر کے تعداد کی کثرت و قلت کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا — یعنی جس جھوٹ کی تعداد میں اکیاون ہاتھ اٹھ جائیں وہ سچ قرار پا جائے، اور جس سچ کی تائید میں اُنچاس ہاتھ کھڑے ہوں اُسے جھوٹ سمجھا جائے۔ سوچئے کہ دنیا میں اس سے بڑا عالمگیر فریب کوئی اور بھی ہو سکتا ہے اور قیامت بالائے قیامت کہ آج قریب قریب ساری دنیا اس

فریب کو "منزل من اللہ صداقت" کا درجہ دیتے ہوئے ہیے۔ قرآن کی رُو سے حق، حق ہے اگر اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھے۔ اور باطل باطل ہے خواہ اس کی تائید میں اکیاون چھوڑ سو فیصد ہاتھ بھی کھڑے ہو جائیں۔ جب تک دنیا اِس ابدی صداقت کو تسلیم نہیں کرے گی، فسادِ آدمیت مٹ نہیں سکے گا۔ اور حق کتاب اللہ کے اندر ہے۔

آیت کے آخر میں ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ (۲/۲۴۹)۔

اذن اللہ کے معنی

اس میں باذن اللہ کے معنیٰ کئے جاتے ہیں خدا کے حکم یا اس کی اجازت سے۔ اس سے پھر جبر کا عقیدہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اگر خدا کا حکم ہو تو ایسا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے لغات القرآن میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے مراد اس کا قانون ہے۔ اس آیت میں بِإِذْنِ اللّٰهِ کے بعد وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ کے ٹکڑے نے بات واضح کر دی ہے۔ یعنی خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر مستقل مزاج اور ثابت قدم افراد کم مقدار میں بھی ہوں تو وہ دوں ہمت اور پست حوصلہ افراد پر غالب آجائیں گے۔ خواہ مؤخر الذکر تعداد کے لحاظ سے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ قرآن کریم نے کم تعداد افراد کے غلبہ و نصرت کو ہر مقام پر اسی شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ وہ صابرین یعنی ثابت قدم ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اِذنِ اللہ کے معنیٰ قانونِ خداوندی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ خدا ہر موقع پر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس کیلئے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ صابرین کی کم تعداد بھی غیر صابرین کی زیادہ تعداد پر غلبہ حاصل کر لے گی۔

(۰)

اس کے بعد اس داستان کا اگلا ٹکڑا دیکھیے۔ فرمایا:۔

۲/۲۵۰ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (۲/۲۵۰)

چنانچہ جب یہ باہمت لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے صف آراء ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو دیکھتا ہے کہ ہم تھوڑے ہیں اور دشمن جمِ غفیر لے کر ہمارے سامنے کھڑا ہے، سو، تو ہمارے دلوں کو ہمت اور استقلال سے لبریز کر دے اور ہمارے قدموں کو ثبات عطا فرما دے اور ہمیں ان لوگوں پر غلبہ عنایت کر دے جو تیرے قوانین سے انکار کرتے اور ان سے سرکشی برتتے ہیں۔

دیکھئے! یہ دعائیں (آرزوئیں) کس طرح اس تابوتِ سکینت (قلبِ سلیم) کی پکار پکار کر شہادت دیتی ہیں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور آیت میں جمع کا صیغہ اس حقیقت کی دلالت کرتا ہے کہ جس قسم کا میر کارواں (سربراہ) ہوگا، اسی قسم کے اس کے رفقائے سفر ہو جائیں گے۔ سربراہ کی سیرت کا اس کے متبعین کی ذہنیت اور کردار پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا ہے۔

۲/۲۵۱ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۲/۲۵۱)

چنانچہ انہوں نے خدا کے اس قانون کے مطابق (کہ فتح و ظفرمندی حق پر جم کر کھڑے ہو جانے سے وابستہ ہوتی ہے) اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے دی اور داؤد کے ہاتھوں (جو ان کے لشکر میں تھا) جالوت مارا گیا اور خدا نے (اس کے بعد) اسے حکومت و اقتدار اور فہم و فراست عطا فرمایا اور اسے اپنے قانون مشیت کے مطابق (وحی کا) علم بھی دیا۔

یہ ہے طالوت کا واقعہ۔ مقصد اس کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اگر اللہ مستبد اور سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرے تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ اس نے یہ انتظام اس لئے کر رکھا ہے کہ وہ انسانیت کی تباہی اور بربادی نہیں چاہتا، اس کی تعمیر اور ترقی چاہتا ہے۔ (۲۲/۴۰-۳۹)

لیکن یاد رہے کہ مستبد قوتوں کی روک تھام انسانی جماعتوں کے ہاتھوں ہی سے ہوتی ہے۔ خدا براہ راست ایسا نہیں کیا کرتا۔ اس لئے دنیا میں ایسی جماعت کا رہنا بڑا ضروری ہے۔

یہاں فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ کہا گیا ہے۔ ان شرائط نے جنھیں ان مجاہدین نے پورا کیا اور ان آرزوں نے جو شدتِ طلب سے عین میدانِ جنگ میں ان کے لبوں پر دعائیں بن کر آئیں اور جن کا عکس ہم سابقہ آیت میں دیکھ چکے ہیں، اذن اللہ کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق انہیں غلبہ نصیب ہوا۔ اور آیت کے آخری الفاظ سے جہاد فی سبیل اللہ کی علت غائی اور منتہیٰ و مقصود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جماعت مومنین صرف اس لئے شمشیر بکف میدانِ جنگ میں اترتی ہے کہ دنیا سے فساد مٹ جائے۔ اس نکتہ کی وضاحت

سابقہ باب میں قتال کے سلسلہ میں بڑی شرح وبسط سے کی جا چکی ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

حضرت داؤد کے متعلق گفتگو متعلقہ مقام پر کی جائے گی۔

―― (٠) ――

اور ان تشریحات کے بعد فرمایا:-

۲/۲۵۲ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲/۲)

یہ ہیں وہ قوانین جنہیں ہم، اے رسول! حق وصداقت کے ساتھ تمہیں دے رہے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم اس قسم کے قوانین اپنے تمام پیغمبروں کو دیتے چلے آئے ہیں اور تو بھی انہی میں سے ہے۔

یہ احکام، قوانین اور حقائق، اسی طرح بذریعہ وحی انبیاء سابقہ کو بھی دیئے گئے تھے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں نے ان میں تحریف کر دی اور وہ حقیقت کے بجائے افسانے بن کر رہ گئے۔ انہی حقائق کو اب ہم (اے رسولؐ!) تیری طرف منزہ شکل میں نازل کر رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے گی اس لئے اس میں یہ حقائق افسانے نہیں بن سکیں گے۔ دنیا میں ہر متلاشیٔ حقیقت کو اسی کتاب کی طرف آنا پڑے گا۔

تیسرا پارہ شروع

سابقہ آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲/۲) تو منجملہ مرسلین من اللہ ہے اس کے بعد کہا۔

۲/۲۵۳ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ

مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۔ (۲/۲۵۳)

یہ تمام رسول، منصب رسالت کے اعتبار سے تو ایک جیسے تھے (۲/۲۸۵)۔ لیکن ان کی تعلیم کے دائرہ اثر و نفوذ کے لحاظ سے ان میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل رہی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے خدا نے (جبریل کے واسطے کے بغیر) براہِ راست باتیں کیں [مثلاً موسیٰؑ۔ (۴/۱۶۴)]۔ بعض کے درجے (دیگر امور میں) بلند کئے۔ انہی میں عیسیٰؑ ابن مریم بھی ہے جسے ہم نے واضح دلائل دیئے اور مقدس وحی سے اس کے لئے سامان تقویت بہم پہنچایا۔

اگر ہمارا قانونِ مشیت یہ ہوتا کہ انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور زندگی بسر کرے تو ان رسولوں کی اس قدر واضح تعلیم کے بعد ان کے متبعین آپس میں جنگ و جدال اور اختلافات نہ کرتے۔ لیکن چونکہ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے (۱۸/۲۹)۔ اس لئے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا ۔۔۔ بعض نے ایمان کی راہ پسند کی۔ بعض نے کفر کا راستہ اختیار کرلیا ۔۔۔ پھر سن لو کہ اگر مشیت کا قانون یہ ہوتا کہ انسان کو جبراً ایک ہی راہ پر چلایا جائے تو یہ کبھی آپس میں جنگ و قتال نہ کرتے۔

(ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار بنایا ہی کیوں؟ نہ اسے اختیار دیا جاتا نہ دنیا میں جنگ و قتال ہوتے۔ لیکن ان امور کے فیصلے تمہاری منشاء کے مطابق نہیں ہو سکتے)۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جو تمام نظام کائنات کو اپنے محیطِ کل ارادے (پروگرام) کے مطابق چلا رہا ہے۔ انسان کا صاحبِ اختیار ہونا بھی اسی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔

اس آیت میں دو ایک نکات غور طلب ہیں:۔

(۱) حضرات انبیاء کرام پر ایمان لانے کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (۲/۲۸۵ نیز ۳/۸۴ نیز ۴/۱۵۲)۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ وَ رَفَعَ دَرَجٰتٍ۔ (۲/۲۵۳ نیز ۱۷/۵۵)۔ اس کے متعلق زیرِ آیت (۲/۱۳۶) باب دوم میں بتایا جا چکا ہے کہ جہاں تک ان حضرات کے رسولؑ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغامبر) ہونے کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان کی تعلیم کے دائرہ اثر و نفوذ اور جو پروگرام ان کے سپرد کیا گیا تھا اس کے بروئے کار لانے کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشکلات اور تصادمات کے اعتبار سے ان میں اختلافِ مدارج ہے۔ بایں ہمہ بحیثیتِ رسالت یہ حضرات یکساں واجب التکریم اور مستحقِ احترام

ہیں۔ اس باب میں اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دنیا میں ہر ملک اور ہر قوم میں مرسلین من اللہ آتے رہے۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ (۷۸/۴۰ ; ۱۶۴/۴)
ان میں کچھ وہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا (متعینہ طور پر) ذکر نہیں کیا گیا۔ اہل مذاہب جن ہستیوں کو اپنے مذہب کا "بانی" کہتے ہیں ہم ان میں سے کسی کے خلاف بھی گستاخی کا کلمہ زبان پر نہیں لا سکتے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان انبیاء میں سے ہوں جن کا متعین طور پر ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔

سوچئے کہ کیا اس قسم کی کشادہ نگہی کی تعلیم کہیں اور بھی ملتی ہے؟

(۲) دوسری بات یہ کہی گئی ہے مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ۔ (۲۵۳/۲)۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے خدا نے "کلام" کیا۔ قرآن کریم میں صرف ایک نبی (حضرت موسیٰؑ) کے متعلق "كَلَّمَ اللّٰهُ" کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ النساء میں ہے: كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۱۶۴/۴)

کلام اللہ سے مراد

سورۂ اعراف میں ہے۔ وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ۔ (۱۴۳-۱۴۴/۷) یہ وہ مقام ہے جب طور پر حضرت موسیٰؑ کو شرفِ ہمکلامی سے نوازا گیا تھا۔

حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف وحی ملتی تھی، وحی کے متعلق حسب ذیل مقامات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ جلد اول، آیت (۲/۲)۔ صفحہ ۱۴۰-۱۴۱ ; آیت (۲/۲۳)۔ صفحہ ۳۰۸-۳۰۹ — جلد دوم آیت (۲/۳۷)۔ صفحہ ۱۲۹ ; آیت (۲/۸۱) صفحہ ۱۸۶ ; آیت (۲/۹۷-۹۸) صفحہ ۳۸۷۔

ان مقامات میں بتایا جا چکا ہے کہ کوئی غیر از نبی یہ جان ہی نہیں سکتا کہ خدا کی طرف سے وحی کیسے ملتی تھی۔ اور اب جبکہ وحی کا سلسلہ (حضور رسالتمآب کی ذاتِ اقدس پر) ختم ہو گیا اس لئے کوئی بھی اس راز کو نہیں پا سکتا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی ہے۔ قرآن کریم میں تمام انبیاء کرام کے سلسلہ میں وحی (أوحينا) کا لفظ آیا ہے حتیٰ کہ طور کے ایک مقام کو چھوڑ کر خود حضرت موسیٰؑ کے لئے بھی اوحینا ہی کا لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے ۷/۱۶۰ ; ۱۱۷ ; ۱۰/۸۷ ; ۲۰/۷۷ ; ۲۶/۶۳ ; ۵۲) ۔ دوسری طرف وحی کے ذریعے عطا کردہ قرآن کریم کو خدا نے کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲/۷۵ ; ۹/۶ ; ۴۸/۱۵) اور قرآنی قوانین و حقائق کو "کلمات اللہ" سے تعبیر کیا ہے (۶/۱۱۶)۔ لہٰذا وحی اور کلام اللہ ایک ہی بات ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (۴۲/۵۱)۔ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ بجز ان دو طریقوں کے۔ یعنی جبریل کی وساطت سے قلبِ نبوی میں خدا

کی وحی کا القاء۔ یا پس پردہ خدا کی بات اس تک پہنچ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلوہ گاہِ طور پر یہ دوسرا طریق اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت جو بھی تھی، وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا۔ وحی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس لئے اب خدا کسی انسان سے براہِ راست بات نہیں کرتا۔ نہ کریگا۔[له] اب انسانوں کے ساتھ خدا اپنی کتاب کے ذریعے ہی باتیں کرتا ہے۔ یعنی جب کوئی شخص قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہا ہے تو خدا اس سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اسے کلام اللہ کہا ہے۔ یہ وہ تیسرا طریق ہے جسے سورۂ شوریٰ کی مندرجہ بالا آیت کے آخری حصہ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ (۵۱/۴۲)۔ غیر از نبی انسانوں تک خدا کا کلام رسولوں کی وساطت سے پہنچتا تھا۔ اس کا یہ کلام اب ہم تک اس کی کتاب کے توسط سے پہنچتا ہے۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا ہے۔ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (۲۵۳/۲)۔ اس سلسلہ میں جلد اول زیرِ آیت (۸۷/۲)۔ صفحہ ۲۷۶-۲۷۷ پر وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی آیات کا تعلق عالمِ امر میں قوانینِ خداوندی سے ہے۔

(۴) انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول اور جلد دوم میں انسان اور تقدیر سے متعلق عنوانات دیکھئے۔ (نیز کتاب التقدیر)

(۵) اس آیت میں کہا ہے کہ انبیاءِ سابقہ کی امتوں نے اختلاف افتراق سے کام لیا جس کا آخری نتیجہ باہمی جنگ و قتال تھا۔ اس کے بعد امتِ مسلمہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دیکھنا کہیں تم بھی ایسا نہ کرنا۔ اس کے لئے جلد اول و دوم میں فرقہ سازی، تفرقہ انگیزی، اختلافات وغیرہ سے متعلق عنوانات دیکھیے۔

(۶) اس میں نوعِ انسان کے دو گروہوں میں بٹ جانے کا ذکر ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ (۲۵۳/۲)۔ ایمان میں مشترک انسان اور کفر میں مشترک انسان۔ یہی قرآنِ کریم کی رُو سے قومیت کا معیار ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رُو سے دنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ جماعتِ مومنین ایک قوم اور جو ان میں سے نہیں وہ دوسری قوم۔ اسی کو (موجودہ اصطلاح میں) "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔

———— (۰) ————

قوموں کے عروج و زوال کی ان داستانوں کے بعد فرمایا:-

له اولیاء اللہ کے کشف و الہام کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ اس موضوع پر الگ گفتگو کی گئی ہے۔

۲/۲۵۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۲/۲۵۴)

اے جماعت مومنین! انبیائے سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے یہ تمام احوال و کوائف اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ زندگی کی خوشگواریاں حاصل کرنے کا راز نظامِ خداوندی قائم کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تمہیں جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے' اسے اس مقصد کے لئے کھلا رکھو۔ اس وقت تم ایسا کرنے پر قادر ہو لیکن اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ان خوشگواریوں کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ وہ جنس نہیں جسے تم جس وقت چاہو بازار سے خرید لو۔ نہ ہی یہ کسی دوست سے احساناً مل سکتی ہے اور نہ ہی کسی کی سفارش سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو اس حقیقت سے انکار کرتا ہے وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے۔

اس میں جس قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے وہ اپنی پوری تشریح و توضیح کے ساتھ جلد دوم۔ آیت (۲/۴۸) صفحہ ۲۴۰۔۲۲۸ میں سامنے آچکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔ جس خدا کا یہ قانون ہے اس کی چند اہم صفات کا تعارف اگلی آیت میں کرایا گیا ہے۔

۲/۲۵۵ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۗ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۗ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۔ (۲/۲۵۵)

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس کے الفاظ کا تشریحی مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے پہلے ان الفاظ کو سامنے لایا جاتا ہے۔

آیۃ الکرسی

اَللّٰہُ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول آیت (۱/۱) صفحہ ۸۰۔۱۰ میں بحث ہو چکی ہے۔ لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کی کچھ مزید وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

دین (یا مذہب) کا بنیادی نقطہ خدا پر ایمان ہے۔ دہریوں کو چھوڑ کر (جو خدا کی ہستی سے انکار کرتے ہیں)

دنیا کا ہر شخص کہے گا کہ وہ خدا کو مانتا ہے ' خواہ خدا کے لئے اس کے ہاں الفاظ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن (یہ چیز بظاہر ناقابلِ فہم یا کم از کم تعجب انگیز دکھائی دے گی کہ) قرآن کریم ان کے اس ملنے (ایمان) کو ماننا (ایمان) تسلیم ہی نہیں کرتا۔ نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے میں ایک گروہ ایسا تھا جو کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان رکھنے کا مدعی نہیں تھا (جیسے کفار یا مشرکین عرب) اور ایک گروہ جو کسی نہ کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان رکھتا تھا۔ (جیسے یہودی اور عیسائی جنھیں قرآن اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے) ان اہل کتاب کے خدا پر ایمان کے دعوے سے تو انکار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ خدا تو ایک طرف وہ وحی، ملائکہ، رُسل، حیات بعد الممات پر بھی ایمان کے مدعی تھے۔ جہاں تک اول الذکر گروہ کا تعلق ہے خدا کو وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں مانتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ - سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ($\frac{۲۳}{۸۴-۸۵}$)۔ "ان سے کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ ارض اور جو کچھ اس میں ہے، کس کی ملکیت ہے تو یہ فوراً کہہ دیں گے کہ اللہ کی"۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ - سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ - ($\frac{۲۳}{۸۶-۸۷}$) "ان سے پوچھو کہ اس وسیع کائنات اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے۔ یہ فوراً جواب دیں گے کہ اللہ"۔ اس کے بعد ہے: قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ "ان سے پوچھو کہ اشیائے عالم پر اقتدار کس کا ہے۔ یہ بلا تامل کہیں گے کہ اللہ کا"۔

سب سے پہلے ایمان کا مطالبہ

($\frac{۲۳}{۸۸-۸۹}$) لیکن اس کے باوجود وہ نہ صرف ان کفار و مشرکین کو بلکہ اہل کتاب کو بھی اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ قرآنِ کریم ان کے ایمان باللہ کو ایمان باللہ کیوں تسلیم نہیں کرتا؟ بات واضح ہے۔

خدا (اللہ) ایک مجرد حقیقت ہے۔ انسانی خیال و قیاس و گمان و وہم سے بالا۔ غیر محسوس اور غیر مرئی۔ لہٰذا، جب کوئی کہتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے تو وہ اسی خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے جس کا تصور اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا تصور ہر فرد کا الگ الگ ہو سکتا (بلکہ ہوتا) ہے۔ جب قرآن کریم بھی خدا (اللہ) پر ایمان کی دعوت دیتا ہے تو وہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت و ماہیت کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کو انسان سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کوئی محدود (FINITE)، لامحدود (IN-FINITE) کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے قرآن ذاتِ باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ وہ اس کی صفات (ATTRIBUTES) کا ذکر کرتا ہے اور نہایت وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ ان صفات سے خدا کا جو تصور (CONCEPT) ذہن انسانی میں آتا ہے، قرآنِ کریم اس تصور کے مطابق خدا (اللہ)

پر ایمان کو صحیح ایمان قرار دیتا اور تسلیم کرتا ہے۔ خدا کی ان صفات کے متعلق کبھی کوئی انسان صحیح طور پر نہیں بتا سکتا تھا۔ انہیں خدا نے خود بتایا۔ خدا نے جو وحی انبیاء سابقہ کی طرف بھیجی تھی اس میں بھی اس نے اپنی صفات کو بتایا ہوگا۔ لیکن وہ وحی اپنی منزہ شکل میں کہیں موجود نہیں۔ اس لئے اب خدا کی صفات اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں اور انہی صفات کے مطابق خدا پر ایمان، معیارِ خداوندی کے مطابق سچا ایمان قرار پاسکتا ہے۔ ان صفات کے سوا جو صفات بھی اس کی طرف منسوب کی جائیں گی وہ انسانی ذہن کی وضع کردہ (یا محرف) ہوں گی۔ اس لئے وہ ناقابلِ قبول قرار پائیں گی۔ یہ وجہ ہے جو ان کے متعلق کہا گیا کہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ (۲۳/۹۱) ذہنِ انسانی خدا کی جو صفات بھی وضع کریگا، خدائے حقیقی

صفاتِ خداوندی

ان سے منزہ اور بلند و بالا ہوگا۔ لہٰذا، معیارِ خداوندی کے مطابق مومن (خدا پر ایمان رکھنے والا) اس کو کہا جائے گا جو ان صفات کے مطابق خدا کو مانے جو قرآن کریم میں خود خدا نے بیان کی ہیں۔ یہی وجہ ہے جو اس نے دنیا بھر کے "خدا کو ماننے" کے مدعیوں کے متعلق کہہ دیا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ لوگ راہِ راست پر ہیں۔ (یہ آیت اور اس کی تشریح سابقہ صفحات میں آچکی ہے) ان صفات کو قرآنِ کریم میں الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۵۹/۲۴) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ قرآن کریم کے اوراق میں درخشندہ موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں اور اپنے اپنے مقام پر ہمارے لئے وجہِ فروغِ دیدہ ہوتی جائیں گی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے' دین (اسلام) کا بنیادی نقطہ خدا کا صحیح تصور ہے اور وہ تصور ان صفات کے صحیح طور پر سمجھنے ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ان صفات اور ان کے صحیح طور پر سمجھنے کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ زیرِ نظر آیت میں ان میں سے کچھ صفات ہمارے لئے وجہِ تابندگیٔ قلب و نظر بنتی ہیں۔ فرمایا۔

اَللّٰهُ — اللہ وہ ہے :-

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ — جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

جب اسلام بطورِ دین (نظامِ حیات) سامنے آئیگا تو اس میں اس صفتِ خداوندی کو اساسی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کا مفہوم جلد اول آیت (۲/۱) ص۱۴۰-۱۲۱ میں گزر چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس صفتِ خداوندی پر ایمان سے خدا کا تصور محض نظری یا اعتقادی نہیں رہ جاتا عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی اس ایمان کے بعد، انسان دنیا کے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت یا محکومیت قبول

اور اختیار نہیں کر سکتا۔ آپ نے غور فرمایا! اس ایک صفتِ خداوندی پر ایمان، جہانِ انسانیت میں کیسا عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے! اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم　　　که دانم مشکلاتِ لَآ اِلٰہ را

لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو وہ ان تمام "مشکلات کو آسان کر دیتا ہے"۔ مذہب میں آکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے معنی ہو جاتے ہیں: خدا کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ یعنی اگر تم خدا کی پرستش، بندگی (پوجا پاٹ) کرتے رہو تو تم مومن ہو، خواہ اطاعت اور محکومیت کسی کی اختیار کر لو۔ دیکھا آپ نے کہ مذہب کے فریب نے لَآ اِلٰہ کی مشکلات کو کس طرح آسان کر دیا؟

وحدت الوجود کا نظریہ اور اربابِ شریعت کے بعد جب اہلِ طریقت آگے بڑھے تو انہوں نے سارا جھگڑا ہی چکا دیا۔ تصوف کا بنیادی عقیدہ وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے، خدا ہی ہے: ؎

خود کوزه و خود کوزه گر و خود گلِ کوزه　　　خود رِند و سبوکش

خود برسرِ آں کوزه خریدار بر آمد　　　بشکست و رواں شد

اور اس عقیدہ کے ماتحت انہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مفہوم یہ متعین کیا کہ دنیا میں جن معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے وہ سب اللہ ہی ہیں۔ ہر پتھر کی مورتی جس کی پوجا کی جاتی ہے، اللہ ہے۔ ہر انسان جس کی لوگ پرستش کرتے ہیں، ہر حیوان جسے دیوتا مانا جاتا ہے۔ اللہ ہی ہے۔ یہ بھی اللہ وہ بھی اللہ۔ (معاذ اللہ۔ صد ہزار بار معاذ اللہ)۔ اور اسے نہ صرف عینِ دین بلکہ مغزِ دین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے اس قسم کے عقائد وضع کئے اور جو ان کا اتباع کرتے ہیں، انہیں مقربینِ بارگاہِ خداوندی اور اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ سچ ہے۔ حق کا تو ایک متعین مقام ہوتا ہے۔ باطل کی پستی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ (وحدت الوجود کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم۔ آیت $\frac{2}{131}$۔ صفحہ ۸۸ دیکھئے۔

(۲) **اَلْحَیّ**۔ زندہ اور زندگی عطا کرنے والا۔

اَلْحَیّ وہ اپنی ذات میں زندہ ہے۔ اسے کسی اور نے حیات (زندگی) عطا نہیں کی۔ وہ اپنی مخلوق کو زندگی عطا کرتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ۔ ($\frac{21}{30}$)" اس نے ہر شے کو پانی کے ذریعے زندگی عطا کی"۔ خود انسانوں کے متعلق ہے۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔ ($\frac{2}{28}$)۔

"تم بے جان تھے۔ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ اس طرح مخلوق بھی حَيٌّ (زندہ) ہوگئی۔ لیکن خدا کے الحی (زندہ) اور مخلوق کے زندہ ہونے میں ایک فرق تو یہ ہے کہ خدا از خود زندہ ہے۔ اُسے کسی نے زندگی عطا نہیں کی۔ اور مخلوق کو خدا نے زندگی عطا کی ہے۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ اَللّٰه — الحي لا يموت ہے (۲۵/۵۸)۔ ایسا زندہ جسے موت نہیں آئے گی۔ لیکن مخلوق کے متعلق ہے۔ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيْتُ (۱۰/۵۶) "جس خدا نے تمہیں زندگی عطا کی ہے وہی تم پر موت بھی طاری کرتا ہے"۔ لہٰذا 'لَا يَمُوْتُ' صرف خدا کی ذات ہے۔ اہلِ جنت کیلئے حیاتِ ابدی کا ذکر آیا ہے لیکن خدا کی ابدیت اور انسانوں کی ابدیت میں بڑا فرق ہے۔ اس کی تشریح جنت کی زندگی سے متعلق عنوان میں اپنے مقام پر کی جائے گی۔

(۳) اَلْقَيُّوْمُ — اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) جو اپنے قائم، محکم اور استوار رہنے میں کسی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ جو قائم بالذات ہو (SELF-SUBSISTING)۔ اور (۲) اپنی مخلوق کے معاملات کی اس طرح تدبیر کرنے والا کہ ان کی پیدائش اور سامانِ زیست بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور ان کے مقاماتِ حیات کا علم رکھے۔ جو ہر شے پر نگران ہو۔ جس کے بغیر کوئی شے قائم نہ رہ سکے۔

اَلْقَيُّوْمُ

(۴) لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ — سنة (مادہ و-س-ن)۔ نیند کی ابتدائی کیفیت یا اونگھ کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی کسی چیز سے غافل ہو جانے کے بھی ہیں۔ اور نَوْمٌ نیند کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ (خدا) مخلوق کو زندگی اور سامانِ پرورش عطا کرنے کے بعد ان کی طرف سے غافل اور بیخبر نہیں ہو گیا۔ وہ ان کی ہر حالت سے باخبر اور ان کا ہر مقام میں نگران ہے۔

نہ نیند نہ اُونگھ

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اپنا نظریہ پیش کرتا ہے تو اس سے بالواسطہ کسی نہ کسی باطل عقیدہ کی تردید بھی کر دیتا ہے۔ ہندو دھرم میں عقیدہ ہے کہ ایشور پرماتما سو رہا ہے اور یہ کائنات اس کا خواب ہے۔ جب وہ نیند سے بیدار ہو جائے گا تو کائنات خود بخود معدوم ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم میں لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کہہ کر اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ کائنات کے بالحق پیدا کئے جانے کے متعلق جلد دوم آیت (۳/۱۱) ص۸۹ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔

مغربی مادیئین کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کر دیا۔ لیکن اب اسے اس کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں۔ جس طرح ایک کلاک کو کوک (چابی) دے دی جاتی ہے تو وہ مدتِ معینہ تک خود بخود چلتا رہتا ہے اسی طرح نظمِ کائنات بھی ایک خودکار مشین کی طرح سرگرمِ عمل ہے۔ نہ خدا اس میں اب کوئی دخل دیتا ہے نہ کائنات

کو اس کی ضرورت ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ خدا اس کی نگرانی کی طرف سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں، اس نظریہ کی بھی تردید کر دی۔ اس نے دوسری جگہ کہا ہے۔ يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۵۵/۲۹)۔ کائنات کی ہر شے اپنی حیات، قیام اور نشوونما کے لئے خدا کی محتاج ہے۔ پھر ان اشیائے کائنات کی یہ کیفیت نہیں کہ ان کی ضروریات کے تقاضے غیر متبدل ہیں۔ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی شے کا کوئی تقاضا ایک دفعہ پورا کر دیا جائے تو پھر اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایسا نہیں۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ (۵۵/۲۹)۔ ان کے تقاضے ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور خدا کی ربوبیت ہر نئے تقاضے کے مطابق سامانِ نشوونما بہم پہنچاتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کی مستقل اور مسلسل نگرانی کی ضرورت ہے اور ایسا کچھ وہی خدا کر سکتا ہے جسے نیند تو ایک طرف اونگھ تک بھی نہ آئے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس نگرانی کی طرف سے غافل نہ ہو۔ وہ اپنی مخلوق کے احوال و ظروف سے ہر آن واقف اور باخبر ہو۔

(۵) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ کائنات کے کسی ایک گوشے سے نہیں۔ پوری کی پوری کائنات سے۔ آیت کے اس ٹکڑے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب اس خدا کی ملک ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جملہ کارگہ کائنات اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ وہ اس کے لئے سرگرمِ عمل ہے اور یہ (خدا) ہر قدم پر اس کی نگرانی بھی کرتا ہے اور ضروری سامانِ قیام و نشوونما بھی مہیا کرتا ہے۔

(۶) مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ اشیائے کائنات اس کے پروگرام کی تکمیل میں بلاچون وچرا سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ ان میں سے کسی کو یارائے سرتابی نہیں، مجالِ سرکشی نہیں۔ (تفصیل اس اجمال کی جلد دوم، باب اول صفحہ ۹۹ میں ملائکہ کے عنوان میں گزر چکی ہے۔ نیز زیرِ آیت ۲/۳۴ صفحہ ۹۸ میں۔) لیکن انسان اس میں کوتاہی بھی کرتا ہے اور اس سے سرتابی بھی برتتا۔ لیکن جب وہ ایسا کرتا ہے تو اسے اس غفلت اور سرتابی (قانون شکنی) کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں اور اس کے متعلق خدا کا نظامِ عدل ایسا ہے کہ اس میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، بجز اس کے کہ وہ اس کے قانون کے مطابق ہو۔ شفاعت کے متعلق بحث جلد دوم۔ زیرِ آیت ۲/۴۸ صفحہ ۲۳۲ پر ہو چکی ہے۔

(۷) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ۔ اس باب میں کسی کی مداخلت کی اس لئے بھی گنجائش نہیں کہ حاکم (اللہ تعالیٰ یا اس کا قانونِ مکافات) ہر ملزم کے ماضی اور حال سے پوری طرح واقف

ہوتا ہے۔ (قانونِ مکافات کے متعلق جلد اول زیر آیت (۲/۴) صفحہ ۱۵۲-۱۴۶ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ مزید تفصیل وہاں دیکھ لی جائے)۔

(۸) وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ۔ خدا کے علم کی تو یہ کیفیت ہے کہ زمان و مکان کے حدود بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن انسان کو تو اسی قدر علم حاصل ہو سکتا ہے جس قدر اس کے حصول کی استعداد اسے خدا نے عطا کر رکھی ہے۔ حصولِ علم کے ذرائع سماعت و بصارت اور قلب و فہم اور ادراک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دسترس یا وسعت کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا اس کا علم بہر حال محدود ہے۔ دوسرا ذریعۂ علم، وحیِ خداوندی کے ذریعے عطا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم اتنا ہی ہے جتنا خدا نے دینا چاہا۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کی رو سے انسان کا اکتسابی علم یا وحی کی رو سے عطا شدہ علم، علمِ خداوندی کے مقابلہ میں بہر حال محدود ہے۔

(۹) وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ۔ اس کا علم ساری کائنات کو محیط ہے۔ کرسی کے معنی علم اور اقتدار دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ سابقہ ٹکڑے میں علم کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اس لئے اس ٹکڑے میں علم کے مفہوم کو ترجیح دی جائے گی۔ (لفظ کرسی کی نسبت سے اس آیت کو عام طور پر آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔

(۱۰) وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا۔ اتنی وسیع و عریض کائنات (عصرِ حاضر کے ماہرینِ علم الافلاک تو اسے ناپیدا کنار بھی کہتے ہیں اور وسعت گیر (EXPANDING) بھی۔ اس قسم کی کائنات کے ذرہ ذرہ کے متعلق علم۔ اس کی نگرانی، اس کے ہر تقاضا کا پورا کرنا، انسانی اعمال کے نتائج و عواقب کا مرتب کرنا۔ عقلِ انسانی اپنے اندازہ کے مطابق یہی تاثر لے سکتی ہے کہ ایسا پروگرام تھکا دینے والا ہے۔ لیکن تھک جانا تو محدود توانائی کا نتیجہ ہے۔ جو ذات لامتناہی توانائیوں کی مالک اور سرچشمہ ہو اس کے لئے تھک جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ذہنِ انسانی کی افسانہ طرازی تھی جو اس نے (محرف تورات میں) کہا کہ خدا نے چھ دن لگاتار محنت کر کے کائنات کو پیدا کیا اور ساتویں دن (تھک کر) آرام کرنے لگا۔ (سبت۔ ہفتہ کی تعطیل اسی "سنتِ خداوندی" کے اتباع میں ہے)۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ اس قدر لامتناہی توانائیوں کا مالک کبھی تھکا نہیں کرتا۔

(۱۱) وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔

عُلُوٌّ کے معنی بلندی یا کسی کے اوپر ہونے کے ہیں۔ بلندی کے اعتبار سے اس میں شرف و عظمت یعنی

بلندی مدارج سب آجاتے ہیں۔ اور اوپر ہونے کے اعتبار سے اس کے معنیٰ غلبہ اور تسلّط کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم میں ذاتِ باری تعالیٰ کی یہ صفت مختلف شکلوں میں آئی ہے۔ مثلاً سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ (۶/۱۰۰)۔ ذہنِ انسانی خدا کے متعلق جو تصور پیدا کرے گا وہ (خدا) اس سے بلند و بالا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (۲۰/۱۱۴)۔ اس میں ملك (اقتدار) کی نسبت سے تعالیٰ کے معنیٰ صاحبِ غلبہ و اقتدار ہوں گے۔ دیگر مقامات پر عُلُوًّا كَبِيْرًا (۱۷/۴۳) اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۲/۶۲) یا اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) بھی آئے ہیں۔ ان مقامات میں کبریائی کی جہت سے غلبہ و اقتدار، بلندی و برتری مقصود ہوگا

الاعلیٰ

ان جہات کی رو سے خدا کی جامع صفت اَلْاَعْلٰى (۸۷/۱) آتی ہے۔ اول تو لفظ اَعْلٰى کے معنیٰ ہی سب سے بلند و برتر ہیں۔ پھر اس کے ساتھ (اَلْ) نے اس تخصیص کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ کائنات میں خدا کا غلبہ و تسلط تو ظاہر و باہر ہے۔ انسانی دنیا میں اس کی اس بلندی و کبریائی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اس کے قوانین کو انسانی معاشرہ میں غلبہ و تمکن حاصل ہو۔ اور یہ غلبہ و تمکن ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے جو اس مقصد کے لئے جان تک کی بازی لگا دیں۔ چنانچہ اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت ہی یہ بتائی ہے کہ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰) تاکہ انسانوں کا خود ساختہ نظام پست (مغلوب) ہو جائے اور خدا کا نظام غالب آجائے۔ جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں یہ نظام غالب آتا ہے ان کے متعلق بھی کہا کہ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸) "عارضی تغیرات اور زمانے کی گردشوں سے مت گھبراؤ۔ مت ملولِ خاطر ہو۔ چونکہ تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہو اس لئے آخرالامر غالب تم ہی آؤ گے"۔ آیت (۸۷/۱) میں خدا نے اپنے آپ کو الاعلیٰ کہا تھا۔ یہاں اس کے قوانین کو غالب کرنے والی جماعت کو الاعلون کہا ہے۔ یوں صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت عبدِ مومن کی سیرت و کردار میں منعکس ہوتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

مومنے بالاتے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

عَظِیْم

عظم کے معنیٰ ہڈی کے ہیں۔ چونکہ انسانی پیکر میں ہڈیاں اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے عظمت کا لفظ انتہائی اہمیت کے لئے بولا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ "بہت بڑا" کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ عذاب کے لئے بھی آیا ہے۔ (عَذَابٌ عَظِيْمٌ) اور اجر اور فوز کے لئے بھی۔ (اَجْرٌ عَظِيْمٌ، فَوْزٌ عَظِيْمٌ وغیرہ)

ان معانی کی رُو سے اَلۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ عام الفاظ میں تو یہ کہ ذاتِ خداوندی انتہائی بلندیوں اور عظمتوں کی مالک ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی اساس و بنیاد (عظم) سے لے کر اس کی انتہائی بلندیوں (علو) تک میں ذاتِ خداوندی کو غلبہ و تسلط حاصل ہے۔

یہ ہیں ذاتِ خداوندی کے اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی میں سے چند ایک۔ یہ اور ان کے علاوہ دیگر صفاتِ خداوندی کی رُو سے ذاتِ خداوندی کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس کے مطابق خدا کی ہستی پر ایمان لانا، ایمان باللہ کہلائیگا۔ (میں نے جملہ صفاتِ خداوندی کی تفصیل اپنی کتاب "من و یزداں" میں بیان کی ہے)۔

اس مقام پر اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جائے کہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کا ادراک ذہنِ انسانی کے لئے ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ اسے کسی مثال سے بھی سمجھایا نہیں جاسکتا کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (۴۲/۱۱) "اس کی مثل کوئی شے نہیں"۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت (پہچاننے) کا مطالبہ نہیں کیا "اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی صفات سے (جو اس نے خود قرآنِ کریم میں) بیان کی ہیں، اس کا تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہی خدا پر صحیح ایمان اور دین کی بنیاد ہے۔

——— (۰) ———

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ دین کی اس بنیاد کو سامنے لانے کے بعد کہا:-

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲/۲۵۶﴾

۲/۲۵۶

اس قدر عظیم قوتوں کا مالک خدا اگر چاہتا تو جس طرح خارجی کائنات میں اس کا نظام از خود قائم ہے انسانی دنیا میں بھی از خود قائم ہو جاتا اور انسان اس کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا۔ لیکن ہم اس باب میں زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ اسے انسانوں کو اپنے دل کی رضامندی سے قائم اور اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ہم نے کیا یہ ہے کہ (وحی کے ذریعے) صحیح اور غلط راستے واضح کر دیئے ہیں اور انسان سے کہہ دیا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔

سو جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی

کا نصب العین بنالے گی تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ نظام اس خدا کا تجویز کردہ ہے جو ہر بات کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یہ آیۂ جلیلہ دنیائے "مذاہب" میں انقلابِ عظیم کا اعلامیہ ہے۔ دنیا میں جس قدر کشت و خون مذہب کے نام پر ہوا ہے دیگر وجوہات یا محرکات کے حصہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں آیا۔ ان سب کے خلاف قرآنِ کریم نے اعلان کر دیا کہ دین (عرفِ عام میں مذہب) کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔ وحی نے غلط اور صحیح راستوں کو واضح کر دیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے جونسا راستہ اختیار کرے۔ اس میں کسی قسم کی زبردستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں اس اصلِ عظیم کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانیت کو بالغ تصور کر کے اپنی ہدایات دی ہیں۔ اس لئے کسی بات کے منوانے کے لئے جو طریقے اس کے عہدِ طفولیت (بچپن کے زمانے) میں کارفرما یا مؤثر تھے ان کا دور ختم ہو گیا۔ اب یہ ہر بات اپنی عقل و بصیرت کی رُو سے، اپنے فیصلہ سے مانے گا۔ انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق حسبِ ذیل مقامات دیکھئے:۔

(۱) جلد اول۔ آیت (۱/۵) صفحہ ۴۲؛ آیت (۲/۹) صفحہ ۱۶۳؛ آیت (۲/۷) صفحہ ۱۸۸-۱۸۰؛ آیت (۲/۲۴) صفحہ ۳۱۴-۳۰۹

جلد دوم۔ آیت (۲/۳) صفحہ ۱۵؛ آیت (۲/۴) صفحہ ۱۰۰؛ آیت (۲/۴) صفحہ ۲۳۰۔

"دین میں جبر" کے موضوع پر اس جلد کے چھٹے باب میں (زیرِ آیت ۲/۱۹۴-۱۹۰) بڑی تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ملخص اس تمام بحث کا یہ ہے کہ نہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اس میں باندھ کر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر آنے کے دروازے بھی ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلے ہیں اور باہر نکلنے کے دروازے بھی۔ اس لئے کہ ایمان تو نام ہی ابدی صداقتوں کو دل و دماغ کی پوری رضامندی سے ماننے اور ان پر قائم رہنے کا ہے۔ جہاں یہ رضامندی ختم ہوئی، ایمان بھی ختم ہو گیا۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ دین کے معاملہ میں اکراہ کی اس لئے ضرورت نہیں (یا وہ جائز نہیں) کہ رشد اور غوایت کے (یعنی صحیح اور غلط) راستے واضح طور پر سامنے آ چکے ہیں۔ جب قرآنِ کریم نے کہا کہ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط اور صحیح میں یہ امتیاز قرآنِ مجید میں کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ غلط اور صحیح کے تعین کے لئے قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

رُشد

ہر وہ عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک جو قرآن کے مطابق ہے، رُشد ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غوایت ہے۔

رشد کا مفہوم پانچویں باب میں (زیر آیت ۲/۱۸۶) بیان کیا جا چکا ہے۔

غوایت

غَوِيَ - (مادہ غ - و - ی) کے بنیادی معنی بھٹک جانا، گمراہ ہو جانا، دھوکا کھا جانا ہیں (اس کے مزید معانی متعلقہ مقامات میں سامنے آتے جائیں گے) زیر نظر آیت میں یہ لفظ رشد کے مدمقابل آیا ہے۔ اس لئے جب رشد کے معنی صحیح راستہ ہوں گے تو غوایت کے معنی غلط راستہ ہوں گے۔ اس حقیقت کو یاد رکھیے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ (MEANS ARE JUSTI-FIED BY THE ENDS ACHIEVED) "جس ذریعہ سے بھی مقصد حاصل ہو جائے اسے جائز سمجھا جائے گا"، بڑا گمراہ کن نظریہ ہے۔ جائز نصب العین تک جانے کے ذرائع بھی جائز ہونے چاہئیں۔ ذرائع کو نصب العین سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اس آیت میں اگلی بات یہ کہی گئی ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ ... یعنی ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے جب تک طاغوت سے انکار نہ کیا جائے، اللہ پر ایمان لایا نہیں جا سکتا۔

طاغوت

طاغوت کا مادہ (ط - غ - ی) ہے جس کے معنی حدود شکنی یا سرکشی اختیار کرنا ہیں۔ ان معانی میں وسعت کے لحاظ سے ہر اس قوت کو طاغوت کہا جاتا ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتے۔ (دیکھئے لغات القرآن)۔ زیر نظر آیت میں یہ لفظ (طاغوت) اللہ کے بالمقابل آیا ہے، اس لئے اس کے معنی "خدا کے مدمقابل کھڑا ہو جانے والے" ہوں گے۔ اس کے متعلق جلد اول، آیت (۲/۹) صفحہ ۲۱۵ پر بحث ہو چکی ہے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ جب تک پہلے ہر غیر قرآنی نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک، مشرب کو ذہن سے نکالا نہ جائے، اللہ پر ایمان لایا نہیں جا سکتا۔ بات بالکل واضح ہے۔ دو متضاد چیزیں یک جا ہو نہیں سکتیں۔ اسے جمع بین النقیضین کہتے ہیں جو ناممکنات میں سے ہے۔ جو کچھ تختی پر پہلے لکھا ہے، جب تک اسے مٹایا نہ جائے، نئے نقوش اس پر ثبت نہیں ہو سکتے۔ خود قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ (۵۶/۷۹)۔ تطہیر قلب و دماغ کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ مثبت (POSITIVE) تک آنے کے لئے منفی (NEGATIVE) عمل "لاینفک" ہے۔ یہی وہ ابدی طریق ہے جسے لَاۤ اِلٰهَ - اِلَّا اللّٰهُ - کے نہایت مختصر جملہ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ لَا منزل اول ہے جس کے بعد اِلَّا کی منزل آتی ہے۔ جب روس میں کمیونزم کے انقلابی نعرہ کا آغاز ہوا تو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔

روسی کمیونزم

علامہ اقبالؒ نے اس کے فلسفہ پر قرآنی روشنی میں نگاہ ڈالی تو انہیں اس میں بڑا بنیادی سقم دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　　لا سلاطیں، لا کلیسا، لا اِلٰہ
فکرِ او در تُندِ بادِ لا بماند　　　مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

لیکن

در مقامِ لا نیاساید حیات　　　سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا برگ و سازِ امتاں　　　نفی بے اثبات مرگِ امتاں

(مثنوی۔ پس چہ باید کرد)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

کردۂ کارِ خداونداں تمام　　　بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
درگذر از لا اگر جوئندۂ　　　تارہِ اثبات گیری زندۂ
ایکہ می خواہی نظامِ عالمے　　　جستۂ اورا اساسِ محکمے؟

نظامِ عالم کے لئے اساسِ محکم اِلّا ہے۔ اور یہ اِلّا قرآن کے سوا کہیں نہیں مِل سکتا۔ اسی لئے انہوں نے روس سے کہا کہ

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　　فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب　　(جاویدنامہ)

یہ تمام تنقید و تلقین درحقیقت تفسیر ہے "کفر بالطاغوت و ایمان باللہ" کی۔ روس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ لا کی منزل (کفر بالطاغوت) طے کرنے کے بعد اِلّا کی طرف نہ بڑھا۔ لیکن ہماری شوریدہ بختی کی وجہ یہ ہے کہ ہم لا کی منزل (کفر بالطاغوت) طے کئے بغیر، اِلّا (ایمان باللہ) کے مدعی بن گئے۔ نتیجہ اس کا ہمارا مروجہ مذہب ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ:۔

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود　　　حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنّار دار است　　　حرم چوں دیر بود، او برہمن بود　　(ارمغانِ حجاز)

جب تک ذہنوں سے "رام" نہ نکلے "رحیم" ان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کعبہ کبھی بیت اللہ نہیں بن سکتا جب تک اسے تمام بتوں سے پاک نہ کر دیا جائے۔ ہمارے حقیقی اسلام پر آنے کا طریق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ "مروجہ مذہبِ اسلام" کے ایک ایک عنصر کو قرآنِ کریم کے معیار پر پرکھا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر کے اس کی جگہ قرآنی عنصر کو اختیار کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا۔ (۲/۲۵۶)

زندگی کے لئے ایسا محکم سہارا ہاتھ آجائے گا جو کبھی ٹوٹنے کا نہیں۔ (مادہ کے لحاظ سے) عُروۃ ایسے درختوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں پائیدار ہوں اور ان کے پتے سردی میں بھی نہ جھڑیں۔ چنانچہ جب مویشیوں کے لئے کہیں اور چارہ نہ ملے تو یہ درخت ان کی زندگی کا سہارا بن جاتے ہیں۔ ایسے درختوں پر ہر موسم میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس نہج سے ہر وہ شے جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے، عُروۃ کہلاتی ہے۔

اول تو عُروۃ ہی ایسا محکم اور قابلِ اعتماد سہارا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وثقیٰ کہہ کر اس کی محکمیت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ وثاق ایسی مضبوط رسّی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے اور وہ کبھی نہ ٹوٹے۔

اور ان دونوں (عروۃ اور وثقیٰ) کی تفسیر لَا انْفِصَامَ لَهَا سے کر دی۔ اِنْفِصَامٌ کسی چیز کے تڑخ جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی اس کا ٹوٹ جانا تو کجا وہ تڑخ تک بھی نہ سکے۔

اس قسم کا ہے وہ محکم سہارا جو کفر بالطاغوت کے بعد ایمان باللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ حبل اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ (۳/۱۰۲) "تم اللہ کی رسی کو اجتماعی طور پر نہایت مضبوطی سے تھامے رکھو" ظاہر ہے کہ حبل اللہ سے مراد کتاب اللہ ہے۔ یہی وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جو کبھی دغا نہیں دیتا۔ لیکن اس حبل اللہ کے محکم سہارا بننے کی شرط کیا ہے؟ وَلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۲)۔ تم میں اختلاف اور افتراق پیدا نہ ہو جائے۔ جونہی امت فرقوں میں بٹی، نہ عروۃ الوثقیٰ باقی رہا نہ حبل اللہ۔ اس کے بعد خوش فہمی یا خود فریبی باقی رہ گئی کہ ہم نے حبل اللہ کو تھام رکھا ہے۔ اسے تھاما ہوتا تو ذلت اور پستیوں کے گڑھوں میں کیوں گرتے۔

چہ گویم زاں فقیرے درد مندے	مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادہ	کہ افتاد است از بام بلندے (ارمغانِ حجاز)

(۰)

اس تمسک بالعروۃ الوثقیٰ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اسے اگلی آیت میں بیان کر دیا جہاں کہا:-

۲/۲۵۷ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (۲/۲۵۷)

اس نظام کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ اللہ کا قانون اس جماعت کا نگران و محافظ اور یار و مددگار ہوگا۔ جو اس کی صداقت پر یقین رکھ کر اسے قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ انہیں غلط راستوں کی تاریکیوں سے نکال کر صحیح راہ کی روشنی میں لے آئے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اس نظام کی صداقت سے انکار کرتے ہیں، ان کے معاملات دنیا کی سرکش (غیر خداوندی) قوتوں کے سپرد ہو جاتے ہیں جو انہیں صحیح راستے کی روشنی سے ہٹا کر غلط راہوں کی تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ اُن تاریکیوں میں جہاں انسانیت کی کھیتی جھلس کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے اور اس تباہی سے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اس آیت کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اللہ مومنین کا ولی بن جاتا ہے۔ چونکہ ولی اللہ، اولیاء اللہ، ولایت وغیرہ تصورات نے ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس لئے یہ نقطہ وضاحت چاہتا ہے۔

ولی کے معنی

وَلِیٌّ کا مادہ (و۔ل۔ی) متعدد معانی کے لئے آتا ہے۔ ان میں سے ہمارے زیر نظر موضوع سے متعلق حسب ذیل معانی ہیں:۔

(۱) اَلْوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قُرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔

(۲) اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے لینا۔ اسی سے اَلْوِلَایَۃُ سلطنت اور حکومت کو کہتے ہیں اور وَالٍ نگران اور حاکم کو۔ اَلْوَلِیُّ بھی نگران، ناظم، اور حاکم کو کہتے ہیں۔

(۳) ولی کے معنی کسی کی طرف رجوع کرنا۔ یا کسی کی اطاعت کرنا بھی ہیں۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت گزار یا کسی کی پیروی کرنے والے کو کہیں گے۔

ان تصریحات سے الولی کے دونوں معانی واضح ہوگئے۔ جب اللہ کو ولی کہا جائے گا تو اس کے معنی نگران، حاکم اور مطاع کے ہوں گے۔ یعنی جس کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ سورۂ کہف میں اس حقیقت کی ان الفاظ سے وضاحت کر دی۔ فرمایا۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) "خدا کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں۔ اس لئے کہ خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" یہاں ولی کے معنی "حاکم" (مطاع) کے واضح ہیں۔ اسی سے لفظ مولا ہے۔ یعنی جس کی اطاعت کی جائے۔ جسے حاکم تسلیم کیا جائے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۹-۱۵۰)

اے جماعتِ مومنین! تم اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ نظام کسی شخص کی موت سے درہم برہم نہیں ہو سکے گا (۳/۱۴۴)۔ اس میں خرابی واقع ہو گی تو اس طرح کہ تم ان لوگوں کی بات نہ ماننے لگ جاؤ (اور ان جیسے کام کرنے لگ جاؤ) جو اس نظام کے مخالف ہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ لوگ تمہیں پھر اسی راستے کی طرف لے جائیں گے جس پر تم اس سے پہلے چلتے تھے۔ اس سے تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

تمہیں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کرنی چاہیئے۔ وہی تمہارا مربی اور دمساز ہے، اور وہی حامی و ناصر۔

یہاں دیکھیے۔ پہلی آیت میں غیر خدا کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے: هُوَ مَوْلٰىكُمْ یعنی اطاعت صرف خدا کی کی جائے گی۔ وہی مطاع اور حاکم ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

جیسا کہ واضح ہے، خدا کی یہ اطاعت اس کی کتاب کی رُو سے کی ہوتی ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی اطاعت خود اللہ کی اطاعت ہے۔ فرمایا:۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (۷/۳)

اے جماعتِ مومنین! تم اسی ضابطۂ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشو و نما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اور اس کے سوا کسی کارساز و رفیقِ کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح روشِ زندگی یہی ہے۔ لیکن) بہت تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ (وہ ہدایتِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے فیصلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے)

اولیاء اللہ

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ لہٰذا، اولیاء اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا (کی کتاب) کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں ان کی خصوصیات کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا:۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (۱۰/۶۲)

یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اللہ کے رفیق (اولیاء اللہ) بن جاتے ہیں۔ انہیں نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے، نہ داخلی کشمکش سے اندوہناکی یہاں اولیاء اللہ کی خصوصیت یہ بتائی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اور دوسری جگہ کہا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸)

آدم سے کہا گیا کہ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت (۵/۳۵) تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف وہراس سے محفوظ رہیں گے۔ (۲۰/۱۲۳-۱۲۴)

یہاں یہ بتا دیا کہ "لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ۔" نتیجہ ہوتا ہے ہدایاتِ خداوندی کے اتباع کا۔ لہٰذا آیت (۱۰/۶۲) اور (۲/۳۸) کے ارتباط سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ ہدایاتِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں انہیں اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ ان کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ مومنین اور متقین ہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ آیت (۱۰/۶۲) آپ کے سامنے آچکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کو خوف وحزن نہیں ہوتا۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ (۱۰/۶۳)۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (۱۰/۶۴)۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی ہر قسم کی خوشگواریوں کی حامل ہوگی۔ اور آخرت کی زندگی بھی۔ یہی وہ مومن اور متقی ہیں جن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (۴۱/۳۰)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں۔ (۳/۱۲۴-۱۲۵؛ ۸/۹-۱۲؛ ۴۶/۱۳)

اور وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وہ ان سے کہتے ہیں

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ (۴۱/۳۱)

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی) اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا

جسے تمہارا جی چاہے گا۔ اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے، ہوگا۔ جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ یہ جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے۔ انہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کا عقیدہ دنیا کے ہر مذہب میں چلا آرہا ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جس جس قسم کے غلط عقائد وضع اور اختیار کر رکھے تھے، قرآن کریم نے ان کی ایک ایک کر کے تردید کر دی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ بزرگ دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں اس لئے لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ قرآن کریم نے کہا دوسروں کو نفع پہنچانا تو ایک طرف یہ اپنی ذات کو بھی (قوانینِ خداوندی سے ہٹ کر) کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ (۱۳/۱۶) ”ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو اور عقیدہ یہ رکھتے ہو کہ وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان سے کہو کہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانا تو ایک طرف، یہ تو خود اپنی ذات کے لئے بھی اس قسم کا اختیار نہیں رکھتے“۔ مسلمانوں کے نزدیک حضورؐ نبی اکرم سے بڑھ کر ”ولی اللہ“ کون ہو سکتا تھا۔ خود حضورؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ (۹/۱۰) ”ان سے کہو کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے“۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے یہ ہمیں بھی خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ ہم ان کی اطاعت قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ سُوْرَۃُ الزُّمَر، آیت ۲-۳ میں ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم اس کتاب کے مطابق خدا کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو۔ اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ پھر سن رکھو کہ اطاعت خالصۃً احکام و قوانینِ خداوندی کی ہو گی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کر لیتے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت

اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ فِیۡ مَا ہُمۡ فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ. اللہ ان کی ان باتوں کا ابھی فیصلہ کرتا ہے۔ جن میں یہ (دین کی اصل وحقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ۔ (۳۹/۳)۔ جو جھوٹا اور ناشکر گزار ہے، خدا اسے کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یاد رکھو! مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَہُوَ الۡمُہۡتَدِ۔ صحیح راستے پر وہی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرۡشِدًا (۱۸/۱۷) اور جو کوئی اس کی راہنمائی کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کرلے تو اس کا نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے نہ مُرشد۔ مُرشد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعہ کی جاتی ہے جسے اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے نازل کیا ہے:

یہ وسیلہ ہیں

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اولیاء اللہ" خدا تک پہنچنے (یا اپنی دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ (ذریعہ) ہیں اور ہم اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت پیش کردی جاتی ہے۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ وَجَاہِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِہٖ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (۵/۳۵)۔ اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔ اس لفظ "وسیلہ" سے پیر پرستی کی دلیل لائی جاتی ہے اور پھر اس پر اشخاص پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کر دی جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جو نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد تھا۔ وَیَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ۔ (۷/۱۵۷)۔ قرآنی آیات کا اسی قسم کا غیر قرآنی مفہوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا وَّیَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا۔ (۲/۱۹)۔ بہت سے لوگ اس قرآن (کا غلط مفہوم لے کر) گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اس سے صحیح راہنمائی حاصل کر لیتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ "وسیلہ" کے معنی ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جد و جہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصدِ زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ مفہوم کہ تقویٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کے متعدد مقامات سے

واضح ہے۔ مثلاً اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ (۴۹: ۱۳)۔ خدا کے ہاں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ اور اگر "وسیلہ" کے معنی "ذریعہ" کئے جائیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدر و منزلت طلب کرو۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق قائم

خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق

کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی کتاب کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ جب (اے رسول) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ میں ہر اس شخص کی پکار کا، جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ (۲: ۱۸۶) انہیں چاہیئے کہ میری فرماں برداری کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ "مرشد" تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا ـــ نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو، نہ رزق کے معاملہ میں سرمایہ دار کی طاقت کو، نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو۔ (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ "خدا اور بندے کے تعلق" کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کی کتاب کے ذریعہ ہر شخص کا خدا سے براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکل کیا جاتا ہے۔

"اولیاء اللہ" کے غلط تصور کی رُو سے خدا اور انسانوں کے درمیان اس کے "خاص بندوں" کی کڑی کو کس قدر لابنفک سمجھا جاتا ہے اس کا اندازہ اس حکایت سے لگایئے جو خانقاہیت کی تعلیم گاہوں میں سب سے

یا فرید۔ یا فرید

پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ دریا کے اِس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اُس پار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلتے۔ آگے آگے آپ۔ پیچھے پیچھے آپ کا ایک مقرب مرید۔ دریا کے کنارے پہنچتے تو کسی پُل یا کشتی کے بغیر، پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اُس پار پہنچ جاتے۔ اسی طرح شام کو واپس آجاتے۔ مرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فریدؒ یا فریدؒ پکارتے

رہا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن پانی پر چلتے، مرید نے سنا کہ خود باباؒ صاحب بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی "یا فرید" کے بجائے "یا اللہ" ہی کیوں نہ کہوں۔ اس نے جونہی "یا اللہ" کہا دھڑام سے پانی میں گر گیا اور لگا غوطے کھانے۔ باباصاحبؒ نے اسے سنبھالا اور کنارے پر آکر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا! اس نے ڈرتے کانپتے بات سنائی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ اس سے براہِ راست کوئی راہ و رسم ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری جان نہ پہچان۔ اُسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فریدؒ کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمہاری فرید سے راہ و رسم ہے، تم اسے پکارو۔ جس دن تمہاری راہ و رسم خدا سے براہِ راست ہو جائے گی تم بھی اسے پکار لینا!

یہ اور اسی قسم کی دیگر حکایات سے شروع ہی سے یہ چیز ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ خدا کے مقرب بندے۔ اولیاء اللہ۔ خدا اور دوسرے انسانوں کے درمیان لاینفک کڑی ہوتے ہیں۔ تم خدا سے براہِ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے۔ اور ان سے یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا.... ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح زندگی میں، وہ سب کی سنتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ (جواب دینا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے یکسر بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ۔ (۴۶/۵-۶) اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ (اپنے ان پکارنے والوں کے) دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے یکسر انکار کر دیں گے۔

مُردے ہماری نہیں سُن سکتے

یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں کا یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں۔ ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کا ان عقیدت مندوں کی اس قسم کی حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار، ان کے خدا کے مخلص بندے ہونے کی شہادت ہے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مرنے والوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ان کا تعلق اُس دنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا

دُعَآءَكُمْ ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سنتے ہی نہیں: وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۔ اور اگر بفرضِ محال وہ تمہاری پکار کو سُن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے ۔ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۔ (۱۴-۱۵/۳۵) اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت اور بیزاری کریں گے ۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں ۔ وہ اس دنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے ۔ یہاں بھی آمریت کے دوسرے حصے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفر ہوں گے ۔ سوچئے کہ جنھیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں اور یہ ان کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں ۔ ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ غیب کی

غیب کا علم کوئی نہیں جانتا

باتیں جانتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ ان سے کہدو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو ۔ اور مُردوں کی تو حالت یہ ہے کہ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے [1] کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیات عام مُردوں سے متعلق ہیں، شہیدوں سے متعلق نہیں، شہید زندہ ہوتے ہیں ۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زمرے میں شامل کر دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے ۔ بلکہ ان کا رتبہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے ۔ جب کہا جاتا ہے کہ

اوکشتۂ دشمن است ، ایں کشتۂ دوست

شہداء یعنی مقتولین فی سبیل اللہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول زیر آیت (۱۵۴/۲) ص۲۵۵ اور زیر نظر جلد آیت (۱۵۴/۲) ص۱۱۰ پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے ۔

اولیاء اللہ کی طرف منسوب کردہ کرامات کے متعلق (معجزات کے ضمن میں) جلد اول آیت (۲۵/۲) ص۳۱۰ دیکھیے ۔

---

[1] علم غیب کے متعلق اور تو اور خود رسول اللہ سے ارشاد ہے: قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰) ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دوسرے رسولوں کو) جن امورِ غیب کا علم دینا چاہتا تھا وہ وحی کے ذریعے دے دیتا تھا ۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (۳/۴۴) یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے ۔ چونکہ وحی نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے اس کے بعد کسی کو غیب کا علم ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا ۔ جو غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے ۔

علاوہ ازیں خود نفسِ تصوف کے متعلق جلد اول اور جلد دوم میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ حوالوں کے لئے دیکھئے انڈکس جسے اسی جلد کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ تصوف کے موضوع پر... ایک مبسوط کتاب بھی میرے زیرِ ترتیب ہے۔ اس کے شائع ہونے پر اس کی پوری تاریخ اور حقیقت سامنے آجائے گی۔

ظلمات سے نور کی طرف

اولیاء اللہ کے متعلق اس تفصیلی گفتگو کے بعد آیئے آیۂ زیرِ نظر (۲۵۷) کی طرف۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اللہ جماعتِ مومنین کا ولی ہے۔ اس کی اس ولایت کا مقصد کیا ہے۔ وہ کرتا کیا ہے؟ فرمایا۔ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ "وہ انہیں ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے"۔ ظلمت کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اول زیرِ آیت (۶/۱) صفحہ ۲۶۲ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا بتایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ظلمات (تاریکیوں) سے نور (روشنی) کی طرف لاتا کیسے ہے۔ اس کے لئے سورۂ ابراہیم کی پہلی آیت دیکھئے جس میں کہا گیا ہے:۔

الٓرٰ ۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۔ (۱۴/۱)

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطۂ قوانین ہم نے تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تو اس کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (۵/۱۶ ؛ ۳۳/۴۳) اور ان کے نشو و نما دینے والے کے قانون کے مطابق، انہیں اس کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ (۱۴/۱)

یعنی خدا کی کتاب نوعِ انسان کو زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کتاب کی صداقت سے انکار کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کو روشنی سے تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ وہ اس دنیا میں بھی جہنم کی زندگی گزارتے ہیں اور اگلی دنیا میں بھی۔

نور و ظلمات کی اس کشمکش کی وضاحت کے لئے داستانِ حضرت ابراہیمؑ کا ایک نیا گوشہ سامنے لایا گیا ہے اس کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔

آٹھواں باب

قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آیات ۲/۲۵۸ تا ۲/۲۸۶ ختم سورۂ بقرہ

۱۔ اسوۂ ابراہیمیؑ — ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں۔

۲۔ مُردوں کو زندہ کرنے کا طریق۔

۳۔ انفاق فی سبیل اللہ کی تفصیلات، تضمنات، مقاصد اور منتہیٰ۔

۴۔ معاشی نظام کی بنیاد — دل کی رضامندی۔

۵۔ ربوٰ کی بحث — یہ نظامِ سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔

۶۔ تجارت اور ربوٰ میں فرق۔

۷۔ ربوٰ کا نظام، اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔

۸۔ کاروباری معاملات کے لئے تفصیلی ہدایات

۹۔ ایمان — خود رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا۔

۱۰۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ کا مفہوم

۱۱۔ مومنین کی حسین دعائیں۔

اپنے مولا کے حضور

(ختم سورۂ بقرہ)

آٹھواں باب

قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آیات ۲/۲۵۸ — ۲/۲۸۶

قرآنِ کریم نے دو عظیم الشان ہستیوں کی سیرتِ طیبہ کو جماعتِ مومنین (بلکہ پوری نوعِ انسان) کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہے۔ ایک نبی اکرمؐ (۳۳/۲۱) اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ کے ضمن میں صرف انہی کی زندگی کو (اسوہ) قرار نہیں دیا گیا، ان کے ساتھ ان کے متبعین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ جس آیت میں اس اسوہ کا ذکر آیا ہے وہ یوں ہے:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ...... (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے رفقاء کے طرزِ عمل میں نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے ان سے سخت بیزار ہیں (۳۷/۸۵-۸۶) ہم تمہارے غلط مسلک کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ کے لئے دشمنی اور عداوت رہے گی، تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔ ۳/۱۱۷؛ ۵۸/۲۲)

اسوۂ حسنہ

آپ دیکھئے۔ اس میں اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کی زندگی کو ہمارے لئے اسوہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت (۶۰/۶) میں اس حقیقت کو یہ کہہ کر دہرایا گیا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ یعنی ان سب (حضرت ابراہیمؑ

مع ان کے رفقاء) کی زندگی کو ہمارے لئے اسوۃ کہا گیا ہے۔ اسوۃ کے معنیٰ ماڈل کے ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس زندگی کو اللہ تعالیٰ دوسروں کے لئے ماڈل قرار دیئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس زندگی کے ضروری خط وخال خود ہی بیان کر دے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی دوسروں کے لئے ماڈل نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو اپنی کتاب (قرآنِ مجید) میں واضح طور پر بیان کر دیا۔ اسی طرح نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو جو ہمارے لئے ماڈل (اسوہ حسنہ) قرار دیا گیا ہے تو وہ ماڈل بھی قرآن مجید کے البم کے اندر محفوظ ہے۔ (تشریح اس نکتہ کی اپنے مقام پر کی جائے گی)۔ یہاں صرف حضرت ابراہیمؑ کی انقلاب انگیز زندگی کے نمایاں خطوط سے بحث کی جائے گی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ حیات کے اس مقام پر ان کے طرزِ عمل کو اسوہ کہا گیا ہے: اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (۶۰/۴) جب انہوں نے اپنی پوری کی پوری قوم کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ

اسوۂ ابراہیمی

ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے، ان سے سخت بیزار ہیں۔ ہم تمہارے غلط مسلک کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بناء پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغض و عداوت رہے گی تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہ اس قوم کے ساتھ تصادم کی آخری منزل تھی۔ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں اس سے پہلے بھی اس انقلاب آفریں زندگی کی دو چار اہم کڑیاں بیان کی ہیں۔ ان میں سے پہلی کڑی وہ ہے جہاں انہوں نے خود اپنے والد سے برملا کہدیا کہ آپ کس باطل مسلک کی پیروی کر رہے ہیں۔ اسے چھوڑ دیجئے اور حق کے اس مسلک کا اتباع کیجئے جسے خدا نے متعین کیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم، زیر آیت (۲/۴۳) صفحہ ۳۴۸-۳۴۷ پر بیان کی جا چکی ہے۔ اس اعلان کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ذہن میں رکھیئے کہ یہ کسی عام باپ کو سرزنش کرنے کا واقعہ نہیں تھا۔ آج ہم اس امر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے کہ قدیم زمانے میں سلطنتوں میں پروہتوں (PRIESTS) کا مقام کیا ہوتا تھا۔ اس کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مملکت کا عملاً اقتدار انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور ان کے سامنے خود بادشاہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد مملکت کے اسقفِ اعظم (مہامنتری) تھے اور ان کے بیٹے (حضرت ابراہیمؑ) کو یہ منصب بلند ورثہ میں ملنے والا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر آپ اندازہ لگا لیجئے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنے باپ کو اس تنبیہہ کا نتیجہ کیا ہو سکتا تھا؟ انہوں نے اس نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر انتہائی جرأت اور بیباکی سے باپ کو تنبیہہ کر دی اور خندہ پیشانی سے اس کا نتیجہ بھگت لیا — یعنی نہ صرف اس جاہ و منزلت

اور شان و شوکت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، بلکہ گھر بار تک کو چھوڑنا پڑا۔

یہ تو پھر اپنے گھر میں اپنے باپ سے تصادم تھا، اگلا قدم خود بادشاہ کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔ اور بادشاہ بھی وہ جسے تاریخ نمرود کہہ کر پکارتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

۲/۲۵۸ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (۲/۲۵۸)

"کیا تم نے اس شخص کی سرگزشت پر بھی غور کیا جس نے ابراہیمؑ سے" اور تو اور خود خدا کے بارے میں بھی حجت بازی شروع کر دی تھی۔ ایسے کرنے کی اُسے جرأت کیسے ہوئی؟ محض اس لئے

بادشاہ سے مناظرہ

کہ وہ اس ملک کا بادشاہ تھا۔ اس نے نشۂ حکومت کی بدمستی میں اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھ لیا اور اس زعم باطل میں مبتلا ہو گیا کہ اسے حق حاصل ہے کہ جس کے خلاف جی چاہے زبان درازی کرے۔ حضرت ابراہیمؑ خدا کی طرف سے دعوت دیتے تھے۔ اس نے کہا کہ کون ہے تمہارا رب؟ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۔ (۲/۲۵۸) حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت ہے۔ بات بالکل صاف اور واضح تھی لیکن وہ تو کٹ حجتیاں کر رہا تھا۔ کہنے لگا: اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ ۔ (۲/۲۵۸)۔ یعنی اگر اس بات سے کوئی خدا بن سکتا ہے تو مجھے خود مقامِ الوہیت حاصل ہے۔ میں خود خدا ہوں کیونکہ میں روز لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہوں۔ جس کی چاہتا ہوں گردن اڑا دیتا ہوں۔ جسے چاہتا ہوں بخش دیتا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو جواب دیا تھا، اس سے مراد یہ ہو کہ میں جس نظامِ خداوندی کے قیام کی دعوت دیتا ہوں، اس کی ایک اہم خصوصیت انسانی جان کا احترام ہوگا۔ اس میں موت اور حیات کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے، کسی فرد کی مرضی کے مطابق نہیں ہوں گے۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ میں کسی ایسے نظام کو نہیں جانتا۔ میری مملکت میں میرا حکم ہی نظام اور قانون ہے۔ وہ اس زعم باطل میں کیوں مبتلا ہو گیا؟ اس لئے کہ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اسے حکمرانی کا اقتدار حاصل تھا۔ وہ قوت کے نشہ میں مدہوش تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ شخص حقائق کی طرف سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنی سطح بین رعایا کو محسوسات کی نگاہ فریبیوں میں الجھانا چاہتا ہے۔ اگر کوئی عام مناظر ہوتا تو اپنی بات کی پچ میں نظری بحث میں الجھ جاتا اور بادشاہ کے جواب کی تردید میں دلائل پر دلائل دیئے چلا جاتا تاآنکہ مناظرہ جھگڑے کی نذر ہو کر ختم ہو جاتا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کا مقصد مناظرہ بازی نہیں تھا۔ ان کا مقصد احقاقِ حق تھا۔ اس کے لئے انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کی طرف

خدا کی وحی یہ کہہ کر راہنمائی کرتی ہے کہ: اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ۔ (۱۶/۱۲۵) "تم لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بطریقِ حکمت وموعظت دعوت دو، اور ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے گفتگو کرو"۔ لہٰذا وہ (بادشاہ) اگر محسوسات کی طرف آگیا تھا تو حکمت کا تقاضا تھا کہ اس کے سامنے محسوس دلیل پیش کی جاتی۔ اس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ ۔ (۲/۲۵۸) "میرے خدا کے قانون کے مطابق سورج مشرق کی جانب سے طلوع ہوتا ہے۔ اگر تمہاری مملکت میں تمہارا قانون (یا حکم) چلتا ہے تو سورج کو حکم دو کہ وہ مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو"۔ بات واضح ہو جائے گی کہ خود تمہاری مملکت میں بھی کس کا قانون کارفرما ہے۔ تمہارا یا میرے خدا کا! فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ۔ (۲/۲۵۸) یہ دلیل ایسی مسکت اور بدیہی تھی کہ وہ لاجواب ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس نے اعترافِ حقیقت نہ کیا۔ نشۂ حکومت کا پیدا کردہ پندارِ نفس اعترافِ حقیقت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جایا کرتا ہے فرعون اور اس کے مصاحبوں کے سلسلہ میں قرآن کریم نے یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ: وَ جَحَدُوۡا بِہَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا (۲۷/۱۴)۔ "وہ دل میں تو دعوتِ حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے لیکن ان کا پندارِ نفس اور نشۂ حکومت کی بدمستی انہیں اعترافِ حقیقت کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لئے وہ بلادلیل و برہان اس سے انکار کئے چلے جاتے تھے"۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے مندرجہ بالا واقعہ کے آخر میں کہا: وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۔ (۲/۲۵۸)۔ ظالمین راہِ ہدایت کی طرف نہیں آیا کرتے۔

(۰)

اس کے بعد قرآنِ کریم سرگزشتِ خلیلی کی اس کڑی کو سامنے لایا ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کے استفسار پر سمجھایا گیا ہے کہ اقوامِ مردہ کو دوبارہ زندہ کرنے کا طریق کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کو پیش کیا ہے جس میں انہیں بخت نصر کے ہاتھوں تباہی اور قریب سو سالہ غلامانہ زندگی کے بعد حیاتِ تازہ عطا ہوئی تھی۔ اسے مطالب الفرقان کی دوسری جلد میں زیر آیت (۲/۴) ص۱۶۲-۱۶۰ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

۲/۲۵۹ چونکہ آیت (۲/۲۵۹) بھی وہاں (مع مفہوم) درج کی جا چکی ہے اسلئے اسے یہاں دوبارہ درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۰)

اس کے بعد وہ آیت سامنے آتی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کو بتایا گیا ہے کہ مردہ اقوام کو از سرِ نو زندہ کرنے

کا طریق کیا ہے۔ یہ آیت مع اس کے مفہوم اور تشریح کے جلد دوم زیر آیت (۵/۵۵) صفحہ ۲۷۴ پر درج کی جا چکی ہے۔ لیکن اس میں دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید تشریح طلب ہیں، اس لئے اسے یہاں دوبارہ درج کیا جاتا ہے:۔

۲/۲۶۰ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ . قَالَ بَلٰى . وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ . قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا . وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ . (۲/۲۶۰)

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

اور یاد کر وجب کہا ابراہیمؑ نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کہ کیونکر زندہ کرے گا تو مُردے۔ فرمایا۔ کیا تو نے یقین نہیں کیا۔ کہا کیوں نہیں۔ لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔ فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے۔ پھر ان کو ہلا لے اپنے ساتھ۔ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑہ۔ پھر ان کو بلا۔ چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

اس ترجمہ کی رُو سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے پوچھا یہ تھا کہ "تو کیونکر مردے زندہ کرے گا"؟ ظاہر ہے کہ (زندہ کرے گا) سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ تو مردوں کو قیامت کے دن کیونکر دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس پر خدا نے پوچھا کہ کیا اس پر تمہارا ایمان نہیں "تمہیں اس کا یقین نہیں کہ ہم مردے زندہ کریں گے"؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ایمان تو ہے، لیکن میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ دل کی تسکین چاہتا ہوں۔

آپ اس جواب کے ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ "مجھے اس پر ایمان تو ہے لیکن میرا دل اس سے مطمئن نہیں"۔ آپ سوچئے کہ جس بات پر دل مطمئن نہ ہو اسے ایمان کہا جا سکتا ہے؟ ایمان تو کہا ہی اسے جاتا ہے جو دل اور دماغ کے پورے اطمینان اور سکون کے بعد لایا جائے۔ اگر کسی شخص (اور شخص بھی عام نہیں۔ خدا کے ایک جلیل القدر نبی) کی یہ کیفیت ہو کہ وہ خدا سے کہے کہ میرا ایمان تو ہے لیکن مجھے یقین یا اطمینان اسی صورت میں میسر آ سکے گا جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ تو واقعی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے، تو کیا اس کے ایمان کو (معاذ اللہ) ایمان کہا جائے گا؟ اور اگر ایمان حاصل ہونے کی شرط یہ ہے کہ خدا سچ مچ مردوں کو زندہ کر کے دکھا دے تو پھر اس قسم کا ایمان تو صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے حصہ میں آیا۔ باقی دنیا کا ایمان بغیر اطمینان اور تسکین قلب کے رہ گیا۔

ہمارے مفسرین اور ان کے تتبع میں مترجمین کی دشواری یہ ہے کہ یہ حضرات قرآنِ کریم کو روایات کے تابع رکھتے

ہیں۔ انہی کی رُو سے قرآن کی تفسیر ہوتی ہے اور اسی تفسیر پر مبنی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ آیۂ زیرِ نظر کی تفسیر میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت درج ہے:۔

حضرت ابراہیم کو شک

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہم شک کرنے میں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ اردو ترجمہ جلد سوم ص۶۸)

بخاری کی شرح فتح الباری میں اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) وسوسۂ شیطانی سے ایسا کہا تھا!

آپ سوچئے کہ ان روایات کی رُو سے بات کہاں تک پہنچتی ہے؟ ان کی رُو سے خدا کے ایک جلیل القدر نبی کو اس باب میں شک گزرتا ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور اس کا ایک اور عظیم المرتبت نبی یہ کہتا ہے کہ نحن احق بالشك من ابراهيم۔ "ہم (حضرت) ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرنے کے حقدار ہیں"۔ آپ غور کیجئے کہ جس ایمان کے بارے میں ایسے ایسے جلیل القدر انبیاء کے ریب و تشکیک کا یہ عالم ہو، تو دوسروں کے ایمان کی کیا کیفیت ہو گی! اور انبیاء بھی وہ جن کی زندگی کو خود خدا نے دنیا بھر کے لئے ماڈل قرار دیا ہے! حضرات انبیاء کرام کا ایمان تو شک و ارتیاب کی طوفانی دنیا میں روشنی کے بلند مینار کی طرح روشن اور مستحکم ہوتا ہے جو ہر ڈگمگانے والی کشتی کے مسافروں کے لئے دلیلِ راہ اور وجۂ استقامت بنتا ہے۔ اگر ان کے ایمان کی بھی (معاذ اللہ) یہ کیفیت ہو تو پھر دنیا میں ایمان کہاں تلاش کیا جائے گا؟ اور پھر یہ کچھ اس حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس نے ابھی ابھی بادشاہِ وقت کے سامنے کہا تھا کہ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ۔ (۲۵۸) "میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے"۔ اگر انہیں خدا کے زندہ کرنے کی قدرت پر ایمان نہ ہوتا تو وہ فریقِ مقابل کے سامنے یہ دلیل کس طرح پیش کر سکتے تھے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اطمینان کی خاطر جس طرح مردوں کو زندہ کر کے دکھایا، اس کی تفصیل بھی روایات کی زبانی سُن لیجئے۔ مولانا محمود الحسن (مرحوم) کے (مذکورہ صدر) ترجمہ کی تشریح میں حاشیہ پر لکھا ہے:۔

حضرت ابراہیمؑ حسبِ ارشادِ الٰہی چار جانور لائے۔ ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا، ایک کبوتر۔ اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا تاکہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں۔ پھر چاروں کو ذبح کیا پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے۔ پہلے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا۔ اس کا سر اٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا۔ پھر دھڑ ملا۔ پھر پر لگے۔ پھر پاؤں اور دوڑتا چلا آیا۔ پھر اسی طرح چاروں آ گئے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، چونکہ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن نے جو کچھ سمجھانا تھا سمجھا جا چکا ہے اور وہ ہماری کتب روایات اور تفاسیر میں درج ہو چکا ہے' اس لئے ہمارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ ہم از خود اس پر غور و فکر کریں۔ ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ فلاں روایت میں یہ آیا ہے اور فلاں تفسیر میں یہ لکھا ہے۔ اگر یہ حضرات خود قرآن مجید پر غور کرتے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی کہ قرآن کریم میں حیات اور ممات کے الفاظ' افراد کی طبیعی موت اور زندگی کے لئے ہی نہیں آئے، یہ الفاظ قوموں کی موت اور زندگی کے لئے بھی آئے ہیں۔ (مثلاً، سورۂ انفال میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ۔ (۸/۲۴) "اے جماعت مومنین! تم اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جس سے تمہیں زندگی حاصل ہو۔" غور کیجئے۔ یہاں خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے ہے۔ یعنی ان لوگوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے جو طبیعی طور پر زندہ ہیں اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلاتی ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں زندگی سے مراد طبیعی زندگی نہیں بلکہ عزّ و شرف کی حیاتِ ملّی ہے۔ دوسرے مقام پر... رسول اللہ سے کہا گیا: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ...... اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا ...... (۲۷/۸۰-۸۱)۔ "تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ نہ ہی ان بہروں کو سنا سکتا ہے کہ جب تو ان سے بات کرے تو وہ منہ موڑ کر چل دیں۔ تُو تو انہیں ہی سنا سکتا ہے جو (حق و صداقت پر مبنی بات) مان لینے پر آمادہ ہوں۔"

اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ لِیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا۔ (۳۶/۷۰)۔ "تو قرآن کے ذریعے انہی لوگوں کو آگاہ کر سکتا ہے جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے قوموں کی "زندگی" اور "موت" سے کیا مراد ہے! یہی مفہوم زیر نظر آیت میں "مردوں" سے ہے۔ یعنی "مردہ قوم"۔ اس قسم کے الفاظ ہم ہر روز اپنے ہاں استعمال کرتے ہیں — "عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا" وغیرہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے سامنے بھی یہی مرحلہ تھا کہ جس مردہ قوم کی طرف وہ مبعوث ہوتے تھے اُسے کس طرح دوبارہ زندہ کیا جائے؟ انہیں اس کا تو یقین تھا کہ مردہ قومیں دوبارہ زندہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس طریق سے وہ زندہ ہوتی ہیں وہ اس کے متعلق اپنا اطمینان چاہتے تھے۔ انہوں نے خدا سے کہا تھا کہ مجھے بتا کہ اس قسم کی مردہ قوم کو میں کس طریق سے (کَیْفَ) زندہ کروں! اور خدا نے ایک مثال کے ذریعے وہ طریق بتا دیا تھا یعنی عملِ "تزمیل"۔ ان سے کہا گیا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کر دو کہ یہ وحشی انسان جماعتی زندگی کے خوگر ہو جائیں جو مرکز کی

آواز پر لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے اُڑکر آجاتے ہیں۔ ان کی وحشت کا تو یہ عالم تھا کہ خود حضورؐ نبی اکرم کے زمانے میں جب اعراب نئے نئے زیر تربیت آتے تھے تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ جمعہ کے اجتماع میں بیٹھے ہیں حضورؐ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ یعنی انہیں مخاطب کر کے کچھ حقائق سمجھا رہے ہیں۔ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَھْوَاۨ انْفَضُّوْٓا اِلَیْھَا وَ تَرَکُوْکَ قَآئِمًا۔ (۶۲/۱۱) "اُدھر سے مالِ تجارت لئے کوئی قافلہ آنکلتا ہے، یا کسی تماشا گر کی ڈگڈگی کی آواز کان میں پڑتی ہے تو یہ حضورؐ کو وہیں برسرِ منبر چھوڑ کر بھاگ اُٹھتے تھے۔ لیکن جب ان نامانوس وحشی پرندوں کی تربیت ہوگئی تو ان میں ایسی قلب ماہیت ہوگئی کہ لَا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ۔ (۲۴/۳۷) "بیع و تجارت کی کوئی کشش انہیں ذکر اللہ سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تھا وہ طریق تربیت جو حضرت ابراہیمؑ کی درخواست پر انہیں بتایا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم نے دیکھا نہیں کہ وحشی پرندوں کو سدھانے والے کیا کرتے ہیں؟ جب ان پرندوں کو پکڑا جاتا ہے تو وہ اڑ جانے کے لئے بے حد مضطرب و بیتاب ہوتے ہیں۔ وہ پھڑپھڑاتے ہیں۔ قفس کی تیلیاں توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن سدھانے والا انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کرتا ہے کہ وہ انہیں جنگل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کی آواز پر پھڑپھڑاتے ہوئے اس کے پاس آجاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ حق و صداقت سے دور بھاگنے والی (مردہ) قوموں کو اس طرح اپنے ساتھ مانوس کیا جاتا ہے، تب جا کر انہیں حیاتِ تازہ عطا ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور حوصلہ طلب ہوتا ہے۔ اس قسم کا منصب ہوتا ہے ایک رسولؑ اور اس کے اتباع میں ایک مصلح کا۔ وحشی جانوروں کو سدھانا آسان کام نہیں ہوتا۔

یہ تھا کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کا جواب۔

———(۰)———

اس آیۂ جلیلہ میں دو نکات اور بھی غور طلب ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ مجھے ایمان تو ہے لیکن میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ان کا ایمان کس بات پر تھا اور وہ اطمینان کس بات کا چاہتے تھے؟ انہیں ایمان خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا تھا۔ یعنی انہیں اس پر یقین کامل تھا کہ جب خدا نے کہا ہے کہ یہ مردہ قوم زندہ ہوسکتی ہے تو یہ یقینی بات ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں۔ لیکن وہ سوچتے تھے کہ جب مجھ سے کہا گیا ہے کہ ان میں زندگی پیدا کروں تو مجھے یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ میں کون سا طریقہ اختیار کروں جس سے یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غلط طریق اختیار کر لوں جس کی وجہ سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے اور اس طرح (میں نہیں لیکن)

دنیا اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ خدا کا وعدہ ہی غلط تھا۔ وہ اس لئے اپنا اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا جائے وہ بالکل صحیح ہونا چاہیئے۔

اس سے یہ اہم نکتہ سامنے آجاتا ہے کہ خدا کے قوانین (مواعید) تو سب برحق ہیں لیکن ان کا صحیح نتیجہ اسی صورت میں سامنے آسکتا ہے جب اس منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو پہلی دعا سکھائی ہے — اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ (۱/۵)۔ تو اس سے مراد صحیح طریقِ عمل کا اختیار کرنا ہے۔ اس کے متعلق اطمینان ہونا ایسا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے نبی نے خدا کے وعدہ (قانون) پر یقینِ کامل کے ساتھ صحیح طریق کی طرف راہنمائی کے لئے خدا سے درخواست کی۔ قرآنِ کریم کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے جہاں زندگی کے بلند مقاصد کا تعین کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس نے ان مقاصد کے حصول کے طریق بھی خود ہی واضح کر دیئے ہیں۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کو ضابطۂ حیات تسلیم کرنے والوں کے لئے، نہ مقاصدِ حیات کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے، نہ ان مقاصد کے حصول کے طریقوں کے متعلق ریب وتشکیک کا امکان۔ اس کتاب عظیم کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ (۲/۲)

دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے اپنا اطمینان چاہا تو خدا نے ایک آمرِ مطلق کی طرح یہ کہہ نہیں ڈانٹ دیا کہ "جو کچھ ہم نے کہا ہے کیا اس میں تمہیں کوئی شک ہے جو اپنا اطمینان چاہتے ہو؟ ہم نے جو کچھ کہہ دیا ہے تمہیں اسے آنکھیں بند کر کے مان لینا چاہیئے"۔ خدا نے ایسا نہیں کہا بلکہ ان کا اطمینان کرا دیا۔ قرآنِ کریم میں جو ہے کہ خدا نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے جو احکام اور قوانین دیئے ہیں، ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کرانے کے لئے دلائل وبراہین کی رُو سے ان کی غرض وغایت بھی واضح کر دی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ زیرِ نظر آیت (۲/۲۶۰) کے آخر میں کہا گیا ہے: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ عزیز کے معنی غلبہ اور اقتدار کے مالک کے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ "حکیم" کے اضافے سے یہ واضح کر دیا ہے کہ خدا کا غلبہ واقتدار دھاندلی پر مبنی نہیں، حکمت (REASON) پر مبنی ہے۔ اس لئے اسے دلائل وبراہین کی رُو سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے انسان کو خدا کے "عزیز" ہونے پر اطمینان ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ اس کے اقتدار کو ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں تسلیم کرتا بلکہ قلب ودماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ تسلیم کرتا ہے

اور اسوۂ ابراہیمیؑ یہ ہے کہ انسان اپنے ایمان کے متعلق دلائل وشواہد کی بناء پر اطمینان حاصل کرتا چلا جائے۔

(۰)

ان تاریخی شواہد کو پیش کرنے کے بعد جماعتِ مومنین کے سامنے وہ پروگرام لایا گیا جس کی رُو سے خود انہیں زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہونی تھیں۔ اس پروگرام کی آخری کڑی تو وہ ہے جب اس جماعت کو نظامِ خداوندی کی مدافعت کے لئے سربکف میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔ لیکن اس منزل سے پہلے یا اس تک پہنچنے کے لئے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت بتائی گئی اور انہیں سمجھایا گیا کہ اس نظام کے قیام کے لئے جو کچھ وہ آج دیں گے، وہ ان کے ہاتھ سے جاتا نہیں رہے گا۔ نظام قائم ہو جانے کے بعد وہ سو سو گنا زیادہ ہو کر واپس مل جائے گا۔ اسی حقیقت کو کھیتی کی مثال سے سمجھایا گیا کہ یہ مثال نہایت برجستہ اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے۔ فرمایا:-

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲/۲۶۱) ۲/۲۶۱

انفاق فی سبیل اللہ

ان تاریخی شہادات کے بعد پھر اُسی مقام کی طرف لوٹ آؤ جہاں سے نظامِ خداوندی کی تشکیل کی بات شروع ہوئی تھی (یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی طرف ۲/۲۵۴)۔ اس نظام کے قیام کے لئے اپنی محنت کی کمائی کو کُھلا رکھنا درحقیقت بیج ڈال کر کھیتی اگانا ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ بیج کا دانہ مٹی میں مل کر ضائع ہو گیا لیکن کسان کی دُور رس نگاہوں کو نظر آتا ہے کہ اس ایک دانہ سے کس قدر بالیں پیدا ہوں گی اور ہر بال میں کس طرح سینکڑوں دانے ہوں گے۔ اس طرح اللہ کا قانونِ مشیت، ہر اس قوم کو جو اس پر عمل پیرا ہو ایک ایک کے سو سو کر کے دیتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون بڑی فراخیاں اپنے اندر رکھتا ہے اور یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی طرف اجمالی اشارہ آیت (۲/۲۵۴) میں کیا گیا تھا۔ اب اس اجمال کی تفصیل سامنے آئی ہے۔ انفاق کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول زیرِ آیت (۲/۳)۔ صفحہ ۱۰۵ پر آچکی ہے۔ اس میں انفاق ہی نہیں بلکہ ..... قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا بھی ذکر آگیا ہے۔ نیز (جلد اول) زیرِ آیت (۲/۴۳)۔ صفحہ ۲۹۴ اور اسی جلد سوم میں زیرِ آیت (۲/۲۱۹) بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں انفاق سے متعلق آیات جو اب زیرِ نظر آرہی ہیں، محتاجِ وضاحت نہیں۔ ان میں البتہ اگر کوئی نیا نکتہ سامنے آئے گا تو اس کی تشریح کر دی جائے گی۔

سَبْعَ کا مفہوم

اس آیت میں لفظ سَبْعَ آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے سات (۷) ہیں لیکن اس کا عام طور پر استعمال "متعدد" یا "اکثر" کے مفہوم کے لئے ہوتا ہے۔ (مثلاً) جس طرح ہم اپنے

ہاں کہتے ہیں کہ "تمہیں سو بار منع کیا ہے"۔ "تمہیں ہزار بار سمجھایا گیا ہے"۔ "وہاں لاکھوں آدمی تھے"۔ تو ایسے مقامات پر سو یا ہزار یا لاکھ کی متعینہ تعداد مقصود نہیں ہوتی۔ مفہوم ان سے متعدد بار یا بکثرت ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں جب سَبْعَ (سات) یا سَبْعُوْنَ (ستر) یا سَبْعُمِائَۃٍ (سات سو) بولا جائے گا تو اس سے بھی مراد متعدد یا بکثرت ہوگی۔ ان کی گنتی مقصود نہیں ہوگی۔ ان الفاظ کے سلسلہ میں اس مفہوم کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ قرآنِ کریم میں سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، کے الفاظ متعدد بار آئے ہیں اور ہمارے ہاں ان کا ترجمہ "سات آسمان" کیا جاتا ہے۔ جس سے کئی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے مراد "متعدد فضائی کرے" ہے۔ (یہ بحث جلد اول۔ زیر آیت (۲/۲۹) صفحہ ۳۵۲ میں بھی آچکی ہے)۔

جب اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو اس وقت افرادِ معاشرہ نہ کسی کو انفرادی طور پر کچھ دیتے ہیں نہ کسی سے انفرادی طور پر کچھ لیتے۔ اُس وقت سارا معاملہ نظامِ مملکت سے متعلق ہوتا ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام تک کے عبوری دور میں محتاج افراد کی امداد ذی استطاعت لوگوں کی طرف سے انفرادی طور پر ہوتی ہے۔ اس میں "خیرات" کا شائبہ پایا جاتا ہے جس کا اثر دینے اور لینے والے ہر دو افراد پر پڑ سکتا ہے۔ دینے والے میں احسان کرنے کا جذبہ جس کا نفسیاتی نتیجہ تکبر یا احساسِ برتری ہوتا ہے اور لینے والے میں ممنونِ احسان ہونے کا جذبہ جس سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم اِس دور کے لئے بھی ایسی ہدایات دیتا ہے جن سے اس قسم کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

۲/۲۶۲ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۲۶۲)

جو لوگ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے — جو نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے — اپنی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں اور اس کے بعد انہیں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا کہ اس سے انہوں نے کسی پر احسان کیا ہے۔ اور نہ ہی وہ اس سے دوسروں کے لئے خواہ مخواہ کی مصیبت بن جاتے ہیں (وہ شکریہ تک کے متمنی نہیں ہوتے (۷۶/۹)) تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتوں کا معاوضہ اور قربانیوں کا صلہ اس نظام کے قیام کی شکل میں بایں نمط ملتا ہے کہ انہیں نہ کسی خارجی خطرہ کا خوف ہوتا ہے اور نہ داخلی کشمکش یا احتیاج کے خیال سے غمگینی اور افسردگی۔ نہ خوف، نہ حزن۔

کہا یہ گیا ہے کہ اس وقت داد و ستد کا یہ معاملہ انفرادی ہے لیکن اس سے صحیح قرآنی معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس سے تم سب ہر قسم کے خطرات و خدشات سے محفوظ و مامون ہو جاؤ گے اور یہ تمہارے موجودہ ایثار کا بہت بڑا صلہ ہوگا۔ اس ضمن میں کہا:۔

۲/۲۶۳ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۶۳)

جس مالی امداد کے بعد انسان احسان جتا جتا کر دوسروں کے لئے مصیبت بن جائے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ صاحبِ احتیاج کو عمدہ طریق سے جواب دے دیا جائے اور اس طرح اسے اذیت رسی سے محفوظ رکھا جائے۔ یاد رکھو! خدا کا نظام نہ تمہارا محتاج ہے اور نہ ہی ایسا کمزور کہ ذرا ذرا سے دھچکوں سے اس کی بنیادوں میں تزلزل آجائے۔ تم اس کے لئے خوش دلی سے دینا نہیں چاہتے تو نہ دو۔ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن کچھ دے کر احترامِ انسانیت کو تو فراموش نہ کر دو۔

انفاق کا ایک نتیجہ تو تمدنی ہوتا ہے۔ یعنی اس سے ذی احتیاج افراد کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں اور اس لئے معاشرہ کا توازن برقرار رہتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا (اور نہایت اہم) نتیجہ دینے والے کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یعنی اس سے اس کی ذات (نفس) کی نشوونما ہوتی ہے۔ (دیکھئے آیت ۲/۲۶۵)۔ لیکن اگر اس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش (تو ایک طرف ذرا سی آلائش بھی) ہو جائے تو پھر یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس سے انفاق کا عمل رائیگاں چلا جاتا ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۶۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (۲/۲۶۴)

اے جماعتِ مومنین! اگر تم نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے کچھ دے کر احسان جتاتے پھرو اور دوسروں کے لئے مصیبت بن جاؤ تو اس سے تمہارا انفاق تعمیری نتائج کے بجائے تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بن جائے گا۔ دیکھنا! تم ایسا نہ کرنا۔ یہ کچھ تو وہی کر سکتا ہے جسے قوانینِ خداوندی کی صداقت اور مستقبل کی زندگی پر تو یقین نہ ہو لیکن اس خیال سے کہ میں نے انہی لوگوں میں رہنا ہے اس لئے ان سے بنا کر رکھنا ضروری ہے، اس مد

میں کچھ دیدے۔ اس انفاق کی مثال یوں سمجھو جیسے کسی چٹان پر ذرا سی مٹی جم جائے (اور یوں دکھائی دے کہ وہ بڑی عمدہ زمین ہے جس میں اچھی کھیتی اُگے گی۔ لیکن) جب اس پر بارش کا ایک تیز چھینٹا پڑے تو سب مٹی بہہ جائے اور نیچے چٹان کی چٹان رہ جائے۔ اس طرح (ایک ایک دانہ کا سینکڑوں دانے بننا تو ایک طرف) فصل کاشت کرنے میں جس قدر محنت صرف ہوئی تھی وہ بھی اکارت چلی جاتی ہے۔

یاد رکھو جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہ رکھیں اور (محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے "نیک کام" کریں تو) ان پر فلاح و سعادت کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ (اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے ایمان — صحیح مقصد — کا ہونا اشد ضروری ہے)۔

ان کے برعکس۔

۲
۲۶۵

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲/۲۶۵)

ان کے برعکس جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اُسے قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے اور اس سے (نوعِ انسانی کی پرورش اور) ان کی اپنی ذات کا استحکام و ثبات ہو جائے، ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی اونچی زمین پر (جس تک سیلاب نہ پہنچ سکے) ایک باغ اُگایا جائے۔ اس پر اگر زور کی بارش ہو تو دُگنا پھل دے اور اگر یوں ہی ہلکی سی پھوار بھی پڑ جائے تو وہ بھی اس کی شادابی کے لئے کافی ہو۔

خدا کا قانونِ مکافات جو علم و بصیرت پر مبنی ہے' ایسے لوگوں کے اعمال کے خوشگوار نتائج مرتب کرتا ہے۔

"مَرْضَاتِ اللّٰهِ" کا مفہوم (اسی جلد میں) زیر آیت (۲/۲۰۷) تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ دوسری بات اس

تثبیتِ نفس

آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ انفاق سے "تثبیتِ نفس" ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی مقصد یا نتیجہ جس کی طرف آیت (۲/۲۶۳) میں ضمناً ارشاد کیا گیا ہے۔ نفس کی بحث جلد دوم۔ زیر آیت (۲/۲۳) صفحہ ۲۳ پر بڑی شرح و بسط سے آچکی ہے۔ اس میں منجملہ دیگر امور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان "لیتا" (یعنی اپنے استعمال میں لاتا) ہے۔ اسی طرح اس کی ذات (نفس) کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کو دیتا ہے۔ اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۔ (۹۲/۱۸) اسی کو یہاں تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی انفاق سے انسانی ذات میں ثبات و استحکام پیدا ہو جاتا ہے

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس سے مومن، جان مار کر محنت کرتا اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لئے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جو مارکس کو نہیں مل رہی تھی۔ (دیکھئے جلد اول ص۱۱۶) وہ انسانی نفس ہی کا قائل نہیں تھا تو اسے یہ بنیاد کہاں سے مل سکتی تھی؟ اسی لئے اقبال نے روس کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ :-

جستۂ اور ا اساسِ محکمے ایکہ می خواہی نظامِ عالمے ؟

یہ اساسِ محکم صرف قرآن کریم سے مل سکتی تھی جو اشتراکی نظام کے مدعیوں کے سامنے نہیں۔ اس لئے وہ نظام ناکام رہ گیا۔ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۔ (۲/۲۶۴)

جس نظام کی بنیاد مستحکم نہ ہو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس سے اگلی آیت میں بیان کر دیا۔ فرمایا :-

۲/۲۶۶ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (۲/۲۶۶)

ذرا سوچو کہ تم میں سے کوئی شخص بھی اسے پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں پانی کی ندیاں رواں ہوں (تاکہ وہ سرسبز و شاداب رہے)، اس میں کثرت سے پھل آئے (اور یوں اس شخص کی اپنی اور اس کی اولاد کی زندگی خوشحالی میں گزرے) لیکن اس کے بعد جب وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے چھوٹے چھوٹے ہوں عین اس وقت جھلسا دینے والی آندھی کا بگولا اٹھے اور سارے باغ کو تباہ کر کے رکھ دے۔ سوچو کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا کیا حشر ہوگا؟

(بعینہٖ یہی حالت ہے ان لوگوں کی جو صرف انفرادی مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہیں اور مستقبل کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔ خدا کا نظامِ ربوبیت قائم ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ معاشرہ میں ایسی حالت کبھی نہ پیدا ہونے پائے اور کوئی خاندان کسی وقت بھی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے)۔

یوں اللہ تعالیٰ مختلف مثالوں سے اپنے قوانین کو وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو اور سوچو کہ کیا نوعِ انسان کو محتاجی اور مفلسی اور تباہی و بربادی سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی اور نظام بھی ہو سکتا ہے؟

(ضمناً) اس آیت پر غور و فکر سے ایک اور نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے۔ آج جبکہ قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں، اس قسم کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ایک شخص کے ذرائع آمدنی (جائیداد، مکان، کارخانہ وغیرہ) کسی حادثہ کی وجہ سے تباہ ہو گئے اور اس طرح یہ مرفہ الحال خاندان نانِ شبینہ تک کا محتاج ہو گیا۔ یا خاندان کا فردِ کاسب وفات پا گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے دربدر بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس قسم کی تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے، انشورنس کی اسکیمیں رائج کی گئی ہیں۔ یہ اسکیمیں قرآن کے معاشی نظام کا بدل تو نہیں ہو سکتیں لیکن موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں یہ بہرحال غنیمت ہیں اور ان سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ـــ شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی! اسے کون بتائے کہ جن اصولوں کی رو سے آپ اسے حرام قرار دے رہے ہیں وہ قرآن کے معاشی نظام کے اصول ہیں اور جب اور جہاں وہ معاشی نظام ہی قائم نہ ہو وہاں اس کے اصول کس طرح کارفرما ہو سکیں گے! یہ وہ بنیادی غلط نگہی ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں بے شمار الجھنیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ باطل کے نظام میں حق کی پیوندکاری ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں جلد دوم میں زیر آیت (۲/۵) صفحہ ۲۵۳ کی بحث پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔

انشورنس

ـــــــ (۰) ـــــــ

اس کے بعد پھر انفاق فی سبیل اللہ کے موضوع کی طرف آجاتے ہیں، فرمایا۔

۲/۲۶۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۔ (۲/۲۶۷)

لہٰذا اے جماعتِ مومنین! تم زمین کی پیداوار میں سے بھی، اور اپنی صنعت و حرفت سے بھی جو کچھ کماؤ اس میں سے بھی بہترین حصہ کو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کھلا رکھو۔ اس قسم کا بھولے سے بھی ارادہ نہ کرو کہ اس میں ایسی نکمی چیزیں دے دی جائیں جنہیں تم ان کی اصلی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار نہ ہو بلکہ ان میں نقص کی وجہ سے ان کی قیمت کم کراؤ۔ یاد رکھو! خدا کا نظام ایسا نہیں کہ وہ بھیک مانگتا پھرے اور تم اسکی جھولی میں بچے کھچے ٹکڑے ڈال دو۔ وہ اس قسم کی خیرات سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کا سزاوار ہے۔

(وہ تم سے جو کچھ مانگتا ہے تمہارے فائدے کے لئے مانگتا ہے۔ اپنے لئے نہیں مانگتا۔)

اس آیت میں دو مقامات غور طلب ہیں۔ جیسا کہ آیت (۲/۲۶۲) کے تحت بتایا گیا ہے۔ قرآن کے معاشی نظام کی بحث

اس سے پہلے نہایت تفصیل سے کی جاچکی ہے۔ اس نظام کی رُو سے (۱) زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور خلافِ قرآن ہے۔ اور (۲) انسان جو کچھ اپنی محنت سے کماتے، اس میں سے وہ بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر، باقی دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ یہاں ان ہر دو ذرائع کی وضاحت مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ سے کر دی۔ یعنی جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اور جو کچھ زمین سے برآمد ہو۔ زمین سے برآمد ہونے والی اشیاء میں زراعت بھی شامل ہے اور معدنیات وغیرہ (ذخائرِ ارضی) بھی۔

پھر، طَيِّبٰتِ اور لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ کہہ کر اس کی بھی تاکید کر دی کہ یہ نہ ہو کہ تم اچھی اچھی چیزیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے ضمن میں خود رکھ لو اور ناکارہ اور ناقص چیزیں "فی سبیل اللہ" دیدو۔ جیسا خیرات کے ٹکڑے گداگروں کی جھولی میں ڈالنے سے کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (۳/۹۱) "تم کبھی کشادگی کی راہ نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین متاع دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلی نہ رکھو"۔۔۔ جان مار کر محنت کرنا اور اس کے ماحصل میں سے بہترین چیزیں بطیبِ خاطر دوسروں کے لئے دے دینا، یہ ہے کشاد (عرفِ عام میں، نیکی) کی راہ!

اس کے بعد قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اس راستے میں کون سی چیز روک بن کر کھڑی ہو گی۔ اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ فرمایا۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲/۲۶۸) ۲/۲۶۸

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارے انفرادی مفاد کے خیالات تمہیں یہ کہہ کر ڈرائیں گے کہ اگر تم نے سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا تو تم مفلس اور نادار ہو جاؤ گے۔ کل کو تم پہ بُرا وقت آ گیا تو کیا کرو گے؟ اس لئے تم اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔

"شیطان" کے متعلق جلد دوم باب اول میں بحث ہو چکی ہے۔ ملخصاً اس سے مراد ہر وہ جذبہ ہے جو انسان کو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے روکے۔ "انفاق فی سبیل اللہ" (قرآن کے معاشی نظام کی تشکیل و قیام کی راہ) میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کے ذاتی مفاد پرستی کے جذبات ہوتے ہیں۔ یہاں ان سے محتاط رہنے کی تاکید کی گئی ہے لیکن خالی تاکید ہی نہیں۔ ان سے بچنے کا طریق بھی بتایا گیا ہے۔ اور طریق وہ بتایا گیا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ علم النفس (سائیکالوجی) کی رُو سے، ایک قسم کے جذبات کی روک تھام ان سے متضاد جذبات کی رُو

سے کی جاتی ہے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ جذباتی روک مستحکم اور پائیدار نہیں ہو سکتی۔ محکم اور پائیدار روک وہی ہو سکتی ہے جسے انسان عقل و فکر (REASONS) کی رو سے سمجھے اور دلائل و براہین کی رو سے اختیار کرے۔

لیکن خود عقل کی بھی تو دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسانی جذبات کے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے (خواہ وہ مقاصد کیسے بھی کیوں نہ ہوں) اور دوسری عقل وہ ہے جو قرآنی روشنی میں منزلِ مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اول الذکر کو اقبالؔ "دانشِ برہانی یا عقلِ خود بیں" اور ثانی الذکر کو "دانشِ نورانی یا عقلِ جہاں بیں" سے تعبیر کرتا ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول۔ آیت (۲/۱۲) صفحہ ۲۵۷ پر گزر چکی ہے)۔ اسی عقل کو قرآن "خیرِ کثیر" عطا کرنے والی حکمت کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ وہ عقل ہے جو انسان کے انفرادی مفاد پرستی کے جذبات کا رُخ کلی مفادِ انسانیت کی طرف موڑ دیتی ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۷۰ وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۔ (۲/۲۷۰)

جو کچھ تم خرچ کرنے کی چیزوں سے خرچ کرتے ہو۔ یا جو کچھ تم (مالی امداد کے علاوہ دیگر امور میں) اپنے اوپر واجب قرار دے لیتے ہو، تو ان میں سے ہر بات خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں میں ہوتی ہے اور وہی تمہارا مؤیّد و مددگار ہوتا ہے۔ وہ ان کا حامی و ناصر نہیں ہوتا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں۔

نذر کے معنی

ہمارے ہاں نذر کا لفظ منت ماننے کے معنوں میں آتا ہے (نذر نیاز)۔ اور منت بھی وہ جو اولیاء اللہ کے مزاروں یا بزرگوں کے آستانوں پر مانی جاتے۔ لیکن قرآن کریم نے مؤمنین کی نذر کا مفہوم کچھ اور بتایا ہے۔ نذر کے لغوی معنی ہیں ہر وہ بات جسے انسان اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔ اس آیت میں نذر کا لفظ انفاق کے مقابل آیا ہے۔ انفاق، مال و دولت کے کھلا رکھنے کا نام ہے۔ لیکن معاشرہ میں ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جن کے پاس مال و دولت نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بجائے دیگر خدمات اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ انہیں ان کی نذر کہا جائے گا۔ مثلاً سورۂ توبہ میں منافقین کے متعلق کہا۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (۹/۷۹)۔ "ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جماعتِ مومنین میں سے جو صاحبِ استطاعت، اپنے دل کی رضامندی سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مال و دولت صرف کرتے ہیں یہ انہیں ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں۔ اور جو ان (مومنین) میں ایسے ہیں جن کے پاس دینے کے لئے روپیہ پیسہ نہیں ہوتا لیکن وہ اس مقصد کے لئے اپنی محنت پیش کر دیتے ہیں، یعنی مختلف خدمات

سرانجام دیتے ہیں، تو یہ منافقین ان کی مفلسی پر ان کی ہنسی اڑاتے ہیں"۔

یہ خدمات ان کی نذریں ہوتی ہیں۔ قبروں اور آستانوں پر نذریں پیش کرنا قرآن کی رُو سے حرام ہے کیونکہ یہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ (۵/۳) کے تحت آجاتا ہے۔ (تفصیل اس کی آیت (۲/۱۷۳) کے تحت گزر چکی ہے)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے قرآنی نظام کی تشکیل تک کے عبوری زمانے میں انفاق کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو اس نظام کی اجتماعی ضروریات کے لئے دینا اور دوسرے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انفرادی طور پر دینا۔ اجتماعی ضروریات کے لئے انفاق اگر کھلے بندوں بھی ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں کیونکہ اس سے کسی فرد کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کسی محتاج کو کھلے بندوں کچھ دیا جائے تو اس سے اس کے پندار کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس لئے اُسے ایسے انداز سے دینا چاہیئے کہ "دایاں ہاتھ دے تو بائیں ۔۔۔ کو خبر نہ ہو" اس کے لئے فرمایا:۔

۲/۲۷۱ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲/۲۷۱)

جو کچھ تم اجتماعی ضروریات کے لئے دیتے ہو اُسے کھلے بندوں دو تو بھی اچھا ہے۔ اور (اگر نظام کے ابتدائی مراحل میں اُسے) اہلِ حاجت تک چپکے سے پہنچا دو تو بھی ٹھیک ہے۔ یہ چیزیں ہر صورت میں تمہاری ناہمواریوں اور کمزوریوں کو دور کر دیں گی ـــــ اور ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ کیونکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

(ضمناً) مندرجہ بالا آیات میں صدقات کا لفظ بار بار آیا ہے۔ اس کی تشریح ہم آیت (۹/۶۰) کے ضمن میں کرینگے جس میں صدقات صرف کرنے کی مدّات کی تفصیل دی گئی ہے اور جنہیں ہمارے ہاں غلطی سے مصارفِ زکوٰۃ کی مدّات سمجھا جاتا ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ صدقات ان عطیات کو کہا جائے گا جو ہنگامی ضروریات پوری

صدقات

کرنے کے لئے پیش کئے جائیں۔ عطیہ کے لفظ سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں احسان مندی کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اگلی آیت میں اس نکتہ کی وضاحت ایک اور انداز میں کر دی گئی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ انفاق (یا قرآنِ کریم کے معاشی نظام) کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ سب بطیبِ خاطر کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا جبر یا زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ محض قانون کے زور پر بھی یہ نظام نہ متشکل کیا جاسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا۔ اسی لئے حضورؐ نبی اکرم سے کہا گیا کہ آپ کا فریضہ ان حقائق کو ان لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے، ان کا زبردستی منوانا نہیں۔ آپ کا فریضہ صحیح راستہ دکھا دینا ہے، اس راستے پر چلانا نہیں۔ جسے اس راستے پر چلنا ہوگا وہ اپنی خوشی سے اس پر چلے گا۔ فرمایا:۔

۲/۲۷۲ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۲)

اے رسولؐ! تم ان لوگوں کو نظامِ خداوندی کی راہ دکھا دو۔ تمہارے ذمے اتنا ہی ہے۔ انہیں اس راستے پر چلا دینا تمہارے ذمے نہیں (۵/۹۹ ؛ ۲۸/۵۶)۔ کسی کا صحیح راستے پر چلنا خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی رو سے اس نے انسان کو اپنے لئے آپ راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ تم ان لوگوں کو اتنا بتا دو کہ تم جو کچھ بھی اس ضمن میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود تمہاری اپنی ذات کو ہوگا، بشرطیکہ یہ کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے خرچ کیا جائے۔ اس کا جذبۂ محرکہ کچھ اور نہ ہو۔ یوں، جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی۔

اس میں دین (نظامِ خداوندی) کی ایک عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یہ نظام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے جو دل و دماغ کی پوری رضامندی سے اس کی صداقت کے قائل ہوں اور اس پر عمل پیرا ہونا خود اپنے لئے مفید سمجھتے ہوں۔ اس انفاق کے سلسلہ میں جو کہا گیا ہے کہ یہ مرضات اللہ یا لوجہ اللہ ہوگا تو اس سے یہی بتانا مقصود ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کا جبر ہے اور نہ ہی اس میں کوئی اور جذبہ کارفرما ہونا چاہیئے۔

معاشی نظام کی بنیاد

جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ اس انفاق سے خود اس کا اپنا بھلا ہوگا۔ اس سے اس کی ذات کا استحکام ہوگا۔ وہی اس پروگرام پر عمل پیرا ہو سکے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے دل کی رضامندی سے اسے اختیار نہ کرنا چاہے تو، اور تو اور، خود رسول اللہؐ بھی اُسے اس پر کاربند نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (۲۸/۵۶) "تو، (اور تو اور) انہیں بھی زبردستی اس راستے پر نہیں چلا سکے گا جن سے تجھے محبت ہے"۔ اس لئے مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ (۵/۹۹)۔ اور یہ ہے عالمگیر معاشی نظام کی وہ بنیاد جو مارکس کو نہیں مل سکی تھی اور جس کے موجود نہ ہونے سے کمیونزم تو ایک طرف، اس کی ابتدائی شکل سوشلزم بھی کہیں عملاً کامیاب نہیں ہو سکی۔ ایسے نظام، قانون کے زور یا حکومت کے ڈنڈے سے نہیں چلا کرتے۔ یہ صرف دلوں کی رضامندی سے چلا کرتے ہیں۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے۔

(۰)

جہاں تک انفاق میں حصہ لینے والوں کا تعلق ہے انہیں کہہ دیا کہ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (۲/۲۷۲)

"جو کچھ تم دو گے وہ تمہارے اپنے ہی فائدہ کے لئے ہے"! جو کچھ وہ دیتے ہیں اس کے مصرف کے متعلق کہا کہ :-

۲/۲۷۳ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ۔ (۲/۲۷۳)

یہ بھی یاد رکھو کہ اس روپیہ کو پیشہ ور بھیک منگوں پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ یہ ان حقیقی ضرورت مندوں کے لئے ہوگا جو اس نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں کہیں اس طرح محصور ہو جائیں کہ وہ نہ وہاں سے کسی اور جگہ جاسکیں اور نہ ہی وہاں رہتے ہوئے اپنی ضروریات پوری کرسکیں۔ ان میں (سیرت کی پختگی کی وجہ سے استغناء کا یہ عالم ہو کہ) ناواقف یہی سمجھے کہ ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ البتہ جاننے والے انہیں ان کے چہروں پر نمودار ہو جانے والے اثرات سے پہچان لیں۔ یہ لوگ لپٹ لپٹ کر مانگنے والے گداگر نہیں ہوتے۔

ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تم جو کچھ دو گے اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہوگا۔ یعنی اُسے دینے والوں کی نیت کا بھی علم ہوتا ہے اور لینے والوں کی ضروریات کا بھی۔

ایمان، انسان کی سیرت میں کیسا عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس آیت میں سامنے آسکتی ہے۔ مجبوری کا یہ عالم کہ ناسازگار حالات کے نرغے اور دشمنوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہیں۔ لیکن استغناء کی یہ کیفیت کہ اس کا اظہار تک کسی سے نہیں کرتے، کہ یہ بھی عزتِ نفس کے منافی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اکثر اوقات انسان کے چہرے کی طبیعی علامات اندرونی تقاضوں کی غماز ہو جاتی ہیں۔

مومنین کا استغناء

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو!

ضرورت مندوں کا یہ استغناء، اور دینے والوں کا یہ عالم کہ :-

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو — یوں بھیک دے کہ دستِ دعا کو خبر نہ ہو

اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد بتا دیا کہ یہ عبوری دور چند دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد جب یہ نظام قائم ہو جائیگا، تو سب خطرات اور حزن و ملال ختم ہو جائیں گے۔

۲/۲۷۴ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ

أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (۲/۲۷۴)

اس انداز سے دینے والے وہ لوگ ہیں جو اپنا مال دن رات کھلے بندوں اور خاموشی سے اس مقصد کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ انہی کی قربانیوں سے وہ نظام قائم ہوتا ہے جس میں نہ کسی کو کسی قسم کا خوف وخطرہ رہتا ہے نہ افسردگی اور غمگینی۔

(۰)

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اضداد سے اپنے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ اور یہ انداز بڑا بلیغ اور موثر ہوتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس نے مندرجہ بالا آیات میں اُس نظام کا نقشہ سامنے رکھ دیا جس کی بنیاد انفاق پر ہے۔ یعنی انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے۔ اس کے ماحصل میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھے اور باقی سب بطیبِ خاطر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ اس کے بعد وہ اس نظام کو سامنے لاتا ہے جو اس نظام کی ضد ہے یعنی اس میں (اپنی کمائی کو دوسروں کو دے دینا تو کجا) انسان خود محنت نہیں کرتا اور دوسروں کی محنت کے ماحصل کو ان سے چھین لیتا ہے۔ اسے رِبٰو کہا جاتا ہے۔

رِبٰو کی بحث

ہمارے ہاں رِبٰو کا ترجمہ سود (بیاج) کر دیا گیا اور پھر یہ بحثیں چل پڑیں کہ کس کس قسم کا سود حرام ہے، اور کس کس قسم کا حلال؟ کسی نے اس نکتہ پر غور کرنے کی زحمت نہ کی کہ قرآن کہتا ہے کہ: فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۔ (۲/۲۷۹)۔ اگر یہ لوگ اسے (رِبٰو کو) ترک کر دینے کے لئے تیار نہیں تو ان سے کہہ دو کہ اسے خدا اور رسول (نظامِ خداوندی) کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھو۔ اس سے ظاہر ہے کہ رِبٰو ایک ایسا جرم ہے جسے نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت کے مرادف اور اعلانِ جنگ کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی مملکت میں معاشی نظام بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور رِبٰو ایک ایسا نظام ہے جو اس نظام کی ضد ہے۔ رِبٰو درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔

ربا۔ یربُو (مادہ۔ ر۔ ب۔ و) کے معنٰی زیادہ ہونا، بڑھنا، پھولنا ہیں۔ یہیں سے لفظ رِبٰو ہے جس کے بنیادی معنٰی اصل سے زائد لینا ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں رِبٰو کی انفرادی شکل رائج تھی۔ یعنی ایک شخص کسی کو روپیہ بطور قرض دیتا تھا اور جب وہ قرض واپس کرتا تھا تو اُسے اصل سے کچھ زائد ادا کرنا پڑتا تھا۔ قرآنِ کریم نے

جب رِبوٰا کو حرام قرار دیا تو اُس کی (اس زمانے کی) مروجہ شکل کی یہ کہہ کر جڑ کاٹ دی کہ :

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۔ (۲/۲۷۹)

اگر تم اس سے باز آجاؤ تو تم صرف اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے نہ تم پر کوئی زیادتی ہوگی نہ مقروض پر۔

یعنی اصل زر سے کچھ بھی زاید لینا رِبوٰا تھا۔

اس کے بعد رِبوٰا نے ایک معاشی نظام کی شکل اختیار کر لی جس میں ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے زاید وصول کرنے کے علاوہ رِبوٰا (زاید) کی بیسیوں شکلیں وضع ہو گئیں۔ ان تمام شکلوں پر مشتمل وہ نظام ہے جسے نظامِ سرمایہ داری کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، قرآنِ کریم نے جو کچھ رِبوٰا کے متعلق کہا ہے اس کا اب اطلاق نظامِ سرمایہ داری پر ہوگا۔

قرآن کے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ جلد اول (صفحہ ۱۰۵ و صفحہ ۲۹۴) اور سابقہ صفحات میں زیر آیت (۲/۲۱۹) کہا گیا ہے اس پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ وہ معاشی نظام اِن ستونوں پر استوار ہوتا ہے :۔

۱۔ ذرائع پیداوار، نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہیں۔ لوگوں کی انفرادی ملکیت میں نہ ہوں۔ اسلامی نظام زراعت کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کی غذائی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

۲۔ بجز ان کے جو معذور ہوں، ہر فردِ معاشرہ محنت سے کمائے۔ اور

۳۔ اس کمائی میں سے بقدرِ اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب ذی احتیاج لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ اسلامی کے حوالے کر دے۔

اس سے واضح ہے کہ اس نظام میں فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہتی اور جب فاضلہ دولت ہی نہیں رہتی تو اس دولت (سرمایہ) کے معاوضہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، سرمایہ داری کا نظام ہے جس میں ہر فرد کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت حاصل اور جمع کرلے اس میں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جس قدر دولت بچے وہ اس کا مالک ہے۔ اسے جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ یہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی جڑ ہے۔

اگر ایک شخص اپنی فاضلہ دولت (مثلاً ایک ہزار روپے) کو بکس میں بند کر کے رکھ چھوڑے تو اس کے بعد بھی وہ ہزار کا ہزار ہی رہے گا۔ اس میں ایک روپیہ کا بھی اضافہ نہیں ہوگا۔ لیکن نظامِ سرمایہ داری میں ایسی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں جن سے یہ فاضلہ دولت بڑھتی رہے۔ مثلاً :۔

۱۔ عمومی سطح پر لوگوں کو سودی قرضے دینا۔
۲۔ اس روپے سے زمین خرید کر اُسے مزارعوں کو کاشت کے لئے دے دینا اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بلا محنت و مشقت ہتھیا لینا۔
۳۔ اس سرمایہ سے صنعت (کارخانے) قائم کرلینا۔ ان میں کام کرنے والوں کی محنت سے جو کچھ حاصل ہو۔ اس میں سے کم از کم محنت کشوں کو دینا اور باقی سب خود رکھ لینا۔
۴۔ کسی کے کاروبار میں روپیہ (INVEST) کرکے، منافع کا حصہ دار بن جانا۔
۵۔ ایسا کچھ براہِ راست کرنا یا ایسا کرنے والے (بنکوں یا دیگر اقتصادی) اداروں میں سرمایہ لگا کر بالواسطہ، روپیہ کماتے چلے جانا۔

آپ نے دیکھا کہ ان (یا ان جیسی دیگر) شکلوں میں معاوضہ محنت کا نہیں ہوتا، سرمایہ کا ہوتا ہے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری یا ربٰوا کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں — دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد — محنت کوئی کرتا ہے، اور اس محنت کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ اور اس طرح حاصل کردہ دولت سے وہ مزید ذرائع پیداوار کا مالک بنتا چلا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے ان معاشی اصولوں کو جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ابدی قوانین قرار دے کر، نظام (سرمایہ داری) کو جو اس کے نظام کی ضد تھا، حرام قرار دے دیا اور اُسے اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کہہ کر پکارا۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہا تو جس طرح مسلمانوں نے باطل کے دیگر نظام اپنے ہاں رائج کر لئے اسی طرح نظامِ سرمایہ داری کو بھی اپنا لیا، اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے عین اسلام قرار دے لیا۔ (مثلاً) مودودی صاحب فرماتے ہیں :۔

ہمارا موجودہ شرعی نظام

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں[1] بلاحد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا

[1] یعنی زکوٰۃ۔ صدقات وغیرہ

میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو عملاً بے کار کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین سنہ ۱۹۵۰ء ایڈیشن۔ صفحہ ۵۳-۵۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اُسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اُس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو[1]۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں[2] کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً صفحہ ۴۳)

آپ نے دیکھا کہ نظامِ سرمایہ داری کس انتہائی شکل میں ہمارے ہاں رائج ہے اور اسے کس طرح عین اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ اب سود کی صرف ایک ہی شکل حرام سمجھی جاتی ہے۔ یعنی انفرادی قرضہ پر اصل زر سے کچھ زائد لینا۔ یہ سوال بڑی شد و مد سے زیرِ بحث ہے کہ بنک کا سود حلال ہے یا حرام!

آپ نے دیکھا کہ اسلام کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ربوٰا سے قرآنِ کریم کا مفہوم کیا ہے۔ اس مفہوم کی روشنی میں ربوٰا سے متعلق آیات کو دیکھیے۔ سابقہ آیات میں انفاق اور صدقات کی برکات کو سامنے لایا گیا تھا۔ ان کے برعکس ربوٰا ہے جس میں ہوسِ زر کی وجہ سے انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ :-

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

---

[1] اسے "شرعی" اصلاح میں مضاربت کہتے ہیں۔ یعنی (SLEEPING PARTNERSHIP)

[2] اسے "شرعی" اصطلاح میں مزارعت کہتے ہیں۔ یعنی نقد ٹھیکہ یا بٹائی پر زمین کاشت کرانا۔

۲/۲۷۵ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (۲/۲۷۵)

ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو اپنا پیٹ کاٹ کر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں (۹/۵۹) اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو قرض دیتے ہیں تو ان کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر جتنا دیتے ہیں اُس سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی حالت یوں سمجھو جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگتا پھرے (یعنی ہوسِ زر ان کے سینے میں آگ لگا دیتی ہے جس سے وہ ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے ہیں)۔ یہ لوگ اس روش کے جواز میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ربٰو (روپے پر زیادہ وصول کرنا) تجارت کی مثل ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں (جس طرح تجارت میں دوکاندار گاہک سے اپنے اصل زر سے زائد لیتا ہے اسی طرح ربٰو میں روپیہ دینے والا اپنے اصل سے زیادہ وصول کرتا ہے) یہ ان کی کٹ حجتی ہے۔ تجارت میں انسان روپیہ بھی لگاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ محنت بھی کرتا ہے۔ جو کچھ وہ زائد لیتا ہے وہ اس کے روپے کا منافع نہیں ہوتا اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اور یہ جائز ہے۔ اس کے برعکس ربٰو میں محنت کچھ نہیں کی جاتی۔ محض روپے پر منافع لیا جاتا ہے۔ یہ ناجائز ہے (اس ضمن میں اس اصول کو یاد رکھو کہ جائز صرف محنت کا معاوضہ ہے (۵۳/۳۹) خالی سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کا ماحصل خود لے لینا جائز نہیں ہے۔ اس کو ربٰو کہتے ہیں)۔

سو جس شخص تک خدا کا یہ قانون پہنچ جائے اور وہ اپنی سابقہ روش سے رُک جائے تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے، لے چکا۔ نظامِ خداوندی کی رُو سے اس سے گزشتہ کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن جو اُس سے مڑ کے یا دوبارہ یہی روش اختیار کرلے تو یہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں جُھلس جائیں گی اور ان کے لئے اس عذاب سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اس آیت میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ نظامِ سرمایہ داری میں انسان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے گویا اُسے "شیطان" نے ڈس لیا ہو۔ عربی محاورہ میں شیطان سانپ کو بھی کہتے ہیں جس شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہو، کرب و اضطراب کے علاوہ اس کی پیاس کی شدت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کتنا ہی پانی پیا جائے وہ بجھتی ہی نہیں۔ یہی کیفیت ہوسِ زر کے ڈسے ہوئے انسان کی ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی دولت جمع کر لے اس کی ہوس مٹتی

ہی نہیں بلکہ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ (۱۰۲/۱-۲)۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دولت نہیں کماتا۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس میں دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے۔ اور بھاگتا چلا جاتا ہے۔ تاآنکہ وہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کے مؤیدین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح تجارت میں اصل زر سے زائد لینا جائز ہے۔

تجارت اور ربٰو

وہی صورت ربٰو کی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تجارت اور ربٰو میں بنیادی فرق ہے۔ تجارت میں تاجر سرمایہ بھی لگاتا ہے اور محنت بھی کرتا ہے۔ وہ جو کچھ اپنی لاگت سے زیادہ وصول کرتا ہے وہ اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے نہ کہ سرمایہ کا معاوضہ۔ اس کے برعکس، ربٰو میں بغیر محنت کئے سرمایہ پر بڑھوتی لی جاتی ہے۔ لہٰذا، بیع (یعنی محنت کا معاوضہ) حلال ہے اور ربٰو (صرف سرمایہ پر زیادتی) حرام ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر تاجر اپنی محنت سے زیادہ نفع لیتا ہے تو وہ ربٰو کے زمرہ میں آجائے گا اور حرام

قانون کا اطلاق

ہوگا۔ اسلامی مملکت میں اگر کاروبار انفرادی شکل میں رائج ہوگا تو مملکت طے کرے گی کہ کاروباری انسان کی محنت کا معاوضہ کیا ہوگا۔ وہ اس سے زیادہ منافع نہیں لے سکیگا۔

اس آیت میں " فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ " سے ایک اہم قانونی نقطہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔ اس سے پہلے کے واقعات یا معاملات اس کی زد میں نہیں آئیں گے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے ربٰوا اور صدقات میں فرق کر کے بتایا۔ فرمایا:-

۲/۲۷۶ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۔ (۲/۲۷۶)

یاد رکھو! ربٰو جس کے متعلق انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس سے سرمایہ بڑھتا ہے درحقیقت خود بھی مٹتا ہے اور اس قوم کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیا جاتا ہے اور جس کے متعلق بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے سرمایہ میں کمی آجاتی ہے، خود بھی بڑھتا ہے اور اس قوم کے بڑھنے، پھولنے، پھلنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

ربٰو سے یہ ذہنیت عام ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے سامانِ زیست کو لوگوں سے چھپا کر رکھا جائے تاکہ وہ اس کے لئے محتاج ہوں اور قرض لینے پر مجبور۔ اور قرض دینے والا ان کی محنت کی کمائی پر عیش اڑائے۔ اس سے انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ سفرِ زندگی میں آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری

کی حامل قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری میں انسان اپنی دولت کو چھپا کر رکھتا ہے۔ آج کل کی اصلاح میں اسے کالا دھن (BLACK MONEY) کہہ کر پکارتے ہیں۔ عربی لغت میں ایسا کرنے والے کو کفار کہا جائے گا۔ یعنی دولت کو چھپا کر رکھنے والا۔

اس نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب انسان محنت کئے بغیر دولت حاصل کرنے کا عادی ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی قوتِ عمل (پہلے کمزور اور پھر) زائل ہو جاتی ہے۔ جس شخص کے قویٰ مضمحل ہو جائیں، اسے عربی زبان میں اَثِیم کہا جاتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں پوری کی پوری قوم کی تخلیقی قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہودیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب ربٰو ان کے معاشرہ کا عام چلن ہو گیا تو وہ دنیا میں کوئی اور کام کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اسی بنا پر کہا کہ ان کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ: وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (۴/۱۶۱)۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام ہو گیا تھا حالانکہ (شریعتِ موسوی میں) انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں کو دوسروں کی محنت کی کمائی باطل طریقوں سے غصب کر لینے کی چاٹ لگ جائے، وہ اس سے کب باز آتے ہیں؟

یہاں کہا گیا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری (ربٰو) میں قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی اور رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی ایک آیت میں کہا گیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (۳/۱۲۹)

ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دونے پر دونا اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو۔

اور پھر اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ سود مرکب (COMPOUND INTEREST) حرام ہے، مفرد سود (SIMPLE INTEREST) حرام نہیں ہے۔ امام راغبؒ نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضْعَفَةً دراصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی کم کرنے کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا، آیت کے یہ معنی ہیں کہ تم جو سمجھ رہے ہو کہ ربٰو سے سرمایہ بڑھتا ہے، وہ بڑھتا نہیں، درحقیقت گھٹتا ہے۔ اس سے قومی دولت گھٹ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی شہادت یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ عہدِ حاضر کے اقتصادیات کے

ماہرین اس باب میں تحقیق و تفتیش کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں۔ یہ آیت (۳/۱۲۹) گویا یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا۔ (۲/۲۷۶) کی تفسیر ہے۔ اس نکتہ کی مزید تشریح سورۂ روم کی آیت ۳۹ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰/۳۹)

یاد رکھو! جو کچھ تم دوسروں کو اس لئے دو کہ اس کے بدلے میں تمہیں ان کے مال و دولت میں سے اس سے زیادہ ملے جو تم نے انہیں دیا ہے، (تو ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہیں تمہارے حساب کے مطابق کچھ زیادہ مل جائے لیکن) قانونِ خداوندی کی رو سے اس سے تمہارے مال و دولت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ (یہ تمہیں اس لئے اضافہ نظر آتا ہے کہ تم انفرادی طور پر حساب کرتے ہو۔ اگر تم پوری انسانیت کو سامنے رکھ کر غور کرو تو تم دیکھ لوگے کہ یہ اضافہ نہیں)۔ اس کے برعکس جو کچھ تم اس لئے دو کہ اس سے دوسروں کی نشوونما ہو جائے، اور اس میں تمہیں کسی قسم ذاتی معاوضہ کا خیال نہ ہو، بلکہ یہ تم اس لئے کرو کہ اس سے تمہاری زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیگی، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دیئے ہوئے مال میں فی الحقیقت اضافے ہوتے ہیں۔ (۲/۲۷۵-۲۷۶؛ ۳/۱۲۹؛ ۴/۶۲)

اُس دور میں تو معلوم نہیں اس کی شکل کیا ہو گی لیکن ہمارے زمانے میں مضاربت (یعنی کسی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار ہو جانا) یا بینک میں روپیہ جمع کر کے اس کا منافع لینا، اسی زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیے اس سے کاروباری مشارکت اور کمرشل انٹرسٹ سے متعلق مسائل جن کے سلسلہ میں اس قدر بحثیں چلی ہوئی ہیں، قرآن کے معاشی نظام میں کس طرح حل ہو جاتے ہیں۔

ضمناً، آیت (۳/۱۲۹) سے اگلی آیت میں ہے:۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ (۳/۱۳۰)

"محتاط رہو اس جہنم کی آگ سے جو کفّار کے لئے تیار کی گئی ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری، کفر کے مرادف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام، نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت ہو (۲/۲۷۹)، وہ کفر نہیں تو کیا اسلام ہوگا؟

اس کے بعد وضاحت کر دی کہ اس قسم کا نظام، جماعتِ مومنین کا مسلک نہیں ہو سکتا۔

۲/۲۷۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۲۷۷)

خدا پر ایمان رکھنے، اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہنے والے، بھلا ایسا انسانیت سوز نظام کس طرح قائم کر سکتے ہیں؟ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ اور

اس طرح نوعِ انسان کی نشو و نما کا سامان فراہم کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے حسنِ عمل کا صلہ، نظامِ ربوبیت کی شکل میں سامنے آتا ہے اور اس طرح انہیں نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے، نہ غمگینی ستاتی ہے۔

ان تشریحات اور تصریحات کے بعد وہ قولِ فیصل سامنے لایا گیا جس میں کہا گیا ہے:۔

۲/۲۷۹-۲۷۸ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ـ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ـ (۲/۲۷۹-۲۷۸)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں میں انفرادی سود کا کاروبار عام تھا اور معاشرہ میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان آیات کی رُو سے قرآنِ کریم نے اِسے، (اور اس کے ساتھ پورے نظامِ سرمایہ داری کو) حرام قرار دے دیا اور ان سے کہہ دیا کہ جو کچھ تم پہلے لے چکے ہو، لے چکے، لیکن جو کچھ مقروض کے ذمے، سود میں سے بقایا ہے، تمہیں وہ بھی چھوڑنا ہوگا۔ تمہارے مؤمن ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ تم صرف اصل زر (رأس المال) واپس لے سکتے ہو۔ اس سے نہ تم پر کچھ زیادتی ہوگی نہ مقروض پر۔

اور اس کے بعد کہا کہ اگر تم اس کاروبار (اور نظام) کو نہیں چھوڑو گے، تو پھر تمہیں اسلامی مملکت کا باغی سمجھا

اسلامی نظام کے خلاف بغاوت

جائے گا اور یہ نظام تمہارے خلاف اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح مملکت کے باغیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔

اس مقام پر ایک ثانیہ کے لئے رُکئے اور غور کیجئے کہ اس میں خطاب يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوٓا سے ہے۔ یعنی جماعتِ مومنین سے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نظامِ سرمایہ داری سے باز نہ آئے تو تمہارے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اس سے آپ اس جرم کی سنگینی اور اس نظام کے حرام ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ہمارے ہاں جو صدیوں سے نظامِ سرمایہ داری رائج چلا آرہا ہے تو قرآنِ کریم کی رو سے ہماری پوزیشن کیا ہے۔ ہم میں یہ نظام (سرمایہ داری) اس لئے رائج رہا کہ ہمارے ہاں "مسلمانوں کی سلطنتیں" قائم رہیں۔ اسلامی حکومت کہیں کبھی قائم نہ ہوئی۔

(۰)

اوپر کہا گیا ہے کہ جس مقروض کے ذمے تمہارا قرضہ ہے تم اس سے سود کا بقایا نہیں لے سکتے، صرف اصل زر

لے سکتے ہو. اس کے بعد دیکھیے کہ قرآن کریم کہاں تک آگے چلا جاتا ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۸۰ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ (۲/۲۸۰)

اگر مقروض تنگدست ہے تو اُسے اتنی مہلت دو کہ وہ قرض بسہولت ادا کر سکے۔ اور اگر تم اُسے بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے بشرطیکہ تم دوررس نگاہ سے دیکھ سکو کہ اس میں کس قدر اجتماعی مفاد مضمر ہیں۔

سود تو ایک طرف، اصل زر کو بھی چھوڑ دینا بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا. بالخصوص اُس قوم کے لئے جو صدیوں سے ربٰو کی عادی چلی آرہی تھی۔ اس قسم کی ہمت صرف ایمان کی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ:-

۲/۲۸۱ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۔ (۲/۲۸۱)

تم اس دور کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو جب تمہارے معاملات کے فیصلے قانون خداوندی کی رو سے ہونگے وہ قانون یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی محنت کا معاوضہ ملیگا۔ اور پورا پورا معاوضہ۔ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ کوئی کسی دوسرے کی محنت کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ یہ وہ دور ہوگا جب قرآن کا معاشی نظام قائم ہوگا۔

تم سوچو کہ اس وقت تمہاری حالت کیا ہو گی! تم نے جو کچھ دوسروں کی محنت کے استحصال سے غصب کیا ہوگا، اُسے ظلم قرار دیا جائے گا اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ عدالتِ خداوندی میں ظلم کی سزا کیا ہوتی ہے! ابھی وقت ہے کہ تم اپنے آپ کو اس سزا سے بچا لو۔

(۰)

اسلامی نظام کے قیام تک کے عبوری دور میں انفرادی قرضوں کی ضرورت پڑے گی۔ قرآنِ کریم نے سودی قرضوں کی ممانعت کر دی۔ اگلی آیت میں قرضہ بلا سود کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم نے بجز مستثنیات، اصولی ہدایات ہی دی ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات

لین دین کے متعلق ہدایات

خود متعین نہیں کیں۔ انہیں اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق یہ جزئیات خود متعین کرے لین دین

کے معاملات کی قرآن کے نزدیک کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے ان کی جزئیات تک کا تعین خود کر دیا ہے اور وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ کہ جس آیت میں ان معاملات سے متعلق احکام دیئے گئے ہیں، وہ اس کتاب ہدایت کی سب سے لمبی آیت ہے۔ اور (جیسا کہ آپ ابھی ابھی دیکھیں گے) اس میں چھوٹی سے چھوٹی فروعی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ صلوٰۃ (نماز) جیسے فریضہ کی جزئیات تو اس نے خود متعین نہیں کیں؛ اور لین دین سے متعلق معاملہ کی اس قدر تفصیلی جزئیات خود متعین کر دی ہیں. چونکہ یہ آیت بڑی لمبی ہے اس لئے ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو الگ الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا:-

۲/۲۸۲ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲)

اے جماعتِ مومنین! جب تم ایک مدتِ معینہ کے لئے کسی سے قرضہ کا معاملہ کرو تو اُسے ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔

اس میں اَجَلٍ مُّسَمًّى (ایک مدت تک) کی تخصیص اس لئے کر دی کہ ذرا آگے چل کر دست بدست تجارتی معاملہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ دیکھئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ لین دین کے معاملہ کو ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔ یعنی ایسا کرنا فریضۂ خداوندی ہے۔ لیکن آپ دیکھیئے کہ ہم نے کبھی اس کا احساس تک بھی کیا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے اور ایسا نہ کرنا اس کی معصیت! ہم اجنبی لوگوں سے معاملہ کرتے وقت تو اسے تحریر میں لے آتے ہیں لیکن جہاں "باہمی تعلقات" ہوں وہاں تحریر کی بات کرنا، دوسرے کے منہ پر طمانچہ مار دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ان سے تحریری معاملہ نہیں کرتے اور پھر اس کے نتائج بھی بھگتتے ہیں! بلا تحریر لین دین کے معاملات میں آخر الامر جس قدر تنازعات پیدا ہوتے ہیں اور ان سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ (۲/۲۸۲) "چاہیئے کہ کوئی کاتب اس معاملہ کو دیانتداری کے ساتھ لکھ دے"۔ غور فرمائیے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ فریقین میں سے کوئی اسے لکھ لے۔ کہا یہ کہ کوئی تیسرا شخص اسے ضبط تحریر میں لائے۔ اس سے اس تحریر کا موثق ہونا واضح ہے۔

ضمناً۔ قرآن کریم کے خلاف سازش کرنے والوں نے یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ قرآن رسول اللہ کی زندگی میں ایک کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوا تھا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں عربوں میں لکھے پڑھے اشخاص بہت کم تھے۔ آپ سوچیئے کہ جس معاشرہ میں عام لین دین کے معاملات کو تحریر میں لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیا وہاں

قرآنِ کریم جیسی اہم دستاویز کو تحریری شکل دینے کے لئے کاتب نہیں مل سکتے تھے ؟

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ۔ (۲/۲۸۲)۔ جب کسی کاتب کو اس کے لکھنے کے لئے کہا جاتے تو اُسے چاہیئے کہ اس سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُسے لکھنے پڑھنے کی استعداد عطا فرمائی ہے تو اسے چاہیئے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔

یہاں اس نکتہ پر بھی غور کیجیے کہ کاتب نے لکھنا پڑھنا خود سیکھا ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُسے سکھایا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جن باتوں کو انسان خود اپنی سعی و کاوش سے سیکھتا ہے۔ اُسے بھی خدا کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے کیونکہ انسان کو اس کی بنیادی صلاحیت خدا ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا۔ (۲/۲۸۲) جس نے قرض لیا ہے وہ اس تحریر کو املا کرائے، اور کاتب کو چاہیئے کہ وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر، ٹھیک ٹھیک لکھے۔ اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کرے۔

اس احتیاط پر غور کیجیے کہ یہ تحریر قرض لینے والا لکھوائے! قرض دینے والا نہیں۔ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ۔ (۲/۲۸۲) اگر قرض لینے والا کم عقل سا ہو، یا ضعیف ہو۔ یا ایسی تحریر لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کی طرف سے اس کا کوئی کارمختار (دوست یا سرپرست) عدل و انصاف کے مطابق یہ تحریر لکھوا دے۔ یہاں بھی دیکھئے۔ ایسی صورت میں بھی قرض دینے والے سے نہیں کہا کہ وہ تحریر لکھوا دے۔ قرض لینے والے کے کسی نمائندہ کو اس کی اجازت دی ہے۔ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ۔ (۲/۲۸۲)۔ اور ایسے معاملات کے وقت اپنے میں سے دو مردوں کو بطور گواہ بلالیا کرو۔

فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ۔ (۲/۲۸۲)۔ اگر کسی وقت دو مرد موجود نہ ہوں تو فریقین کی رضامندی سے، ایک

دو عورتوں کی گواہی

مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلالو۔ دو عورتیں اس لئے کہ اگر ایک عورت کو گھبراہٹ وغیرہ کی وجہ سے کہیں مغالطہ ہو جائے۔ یا وہ (CONFUSED) ہو جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

یہ وہ آیت ہے جس سے ہمارے ہاں بات کا بتنگڑ بنا لیا گیا ہے۔ مطالب الفرقان جلد دوم، زیر آیت (۲/۲۸۲)

صفحات ۸-۲۵ پر بتایا جاچکا ہے کہ ہمارے ہاں کس طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں، ناقص العقل، فروتر جنس کا سد، تمام برائیوں کی جڑ اور خرابیوں کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس قوم میں جنسیات (SEX) کا غلبہ ہو، اس کے نزدیک عورت کی حیثیت مردوں کے جنسی جذبہ کی تسکین کے ذریعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ عورت کو مقام انسانیت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ اسے ایک جنس (COMMODITY) تصور کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہمارے ہاں ایک طرف تو عورت کو تمام برائیوں کی جڑ اور جہنم کا کندہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ماں کی طرف چونکہ جنسی جذبہ کی نسبت نہیں کی جاسکتی اس لئے اسے "عورت" کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ عورت سے ان کی مراد، جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے مقام انسانیت نہیں دیا جاتا۔

عورت کے ناقص العقل ہونے کے ثبوت میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ عورت میں مرد کے مقابلہ میں، آدھی عقل ہوتی ہے۔ اس موضوع پر سیر حاصل بحث، سابقہ (ساتویں) باب میں آیت (۲/۲۲۱) کے تحت آچکی ہے۔ اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

———— (٠) ————

اب آگے چلئے۔ فرمایا:۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا۔ (۲/۲۸۲) "جب گواہوں کو شہادت کے لئے طلب کیا جائے تو انہیں چاہیئے کہ اس سے انکار نہ کریں"۔

اس قدر تفصیلات کے بعد پھر اس کی تاکید کی کہ ان معاملات کو ضرور تحریر میں لے آیا کرو

وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ۔ (۲/۲۸۲)۔ قرض تھوڑا ہو یا بہت، اس کی میعاد کے اندر اسے ضبط تحریر میں لانے میں کوتاہی مت کرو۔

اور اس کے بعد اس کی بھی وضاحت کردی کہ اس کے لئے اس قدر تاکید کیوں کی جارہی ہے۔ فرمایا:۔

ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا۔ (۲/۲۸۲) یہ چیز قانون عدل کے تقاضا کو پورا کرنے کے زیادہ قریب ہے۔ اس سے شہادت محکم ہوجاتی ہے اور شکوک و شبہات کا بہت کم امکان رہتا ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۔ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۔ (۲/۲۸۲)۔ لیکن اگر تم آپس میں کوئی دست بدست معاملہ کرو۔ جیسے دکاندار آپس میں کرتے رہتے ہیں اور اسے ضبطِ تحریر میں نہ لاؤ تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ البتہ ایسی خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ ضرور رکھ لیا کرو۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (۲/۲۸۲)۔ اسے بھی اچھی طرح یاد رکھو کہ کاتب یا گواہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔ وہ اسی صورت میں دیانتداری سے یہ فرائض سرانجام دے سکیں گے کہ انہیں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور وہ بلا خوف وخطر سچی بات کہہ سکیں۔

وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۸۲)۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ تم ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان معاملات سے پوری پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ بتا دیا ہے۔ سمجھا دیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ انسانی معاملات کو صحیح خطوط پر رکھنے کے لئے کس قسم کی ہدایات کی ضرورت ہے۔

اگلی آیت میں ان ہدایات کی تکمیل کر دی جہاں کہا کہ:-

(۲/۲۸۳) وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۸۳)

اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور تمہیں کاتب نہ مل سکے تو قرض لینے والے کی کوئی چیز بطور ضمانت اپنے پاس رکھ لو۔ اور اگر تم ایک دوسرے پر اعتماد کرو تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے اُسے چاہیئے کہ اس امانت کو (پوری پوری دیانت سے) واپس کر دے اور اس طرح اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرے۔

اور تم شہادت کو کبھی نہ چھپاؤ۔ جو ایسا کرتا ہے (تو اگر لوگوں کو اس کا پتہ نہ بھی چلے اور وہ ان میں معتبر بنا رہے پھر بھی) اس کا دل مجرم ہوتا ہے اور اس کی ذات کی نشو و نما کی قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ خدا کے قانونِ مکافات سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اسے ہر بات کا علم ہوتا ہے۔

آپ نے "رہن باقبضہ" کے الفاظ اکثر سنے ہوں گے۔ آپ نے کسی شخص کو ایک ہزار روپیہ بطور قرض دیا۔ اس قرض پر

رہن باقبضہ (از روئے شریعت) سود لینا تو حرام ہے۔ آپ اس مقروض کی زمین رہن رکھ لیتے ہیں اور اس کی آمدنی شیرِ مادر کی طرح ہضم کرتے رہتے ہیں، کیونکہ شریعت نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ مرہونہ جائیداد یا زمین کی آمدنی لے لینا حلال وطیب ہے۔ اگر آپ اس مقروض سے سود لیتے تو وہ پچاس، سو روپے سالانہ سے زیادہ نہ ہوتا۔ اسے تو حرام قرار دیا جاتا ہے لیکن آپ اس کی مرہونہ اراضی سے ہزار، پانسو روپے سالانہ تک کی آمدنی ہڑپ کر جاتے ہیں اور کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یا للعجب! آیت میں مقروض کی کسی شے کو "بطور امانت" اپنے پاس رکھ لینے کی اجازت دی گئی ہے اور وہ بھی اس صورت میں اور اس وقت تک کہ معاملہ کو تحریر میں نہ لایا جاسکے۔

(۰)

اس آیت میں کتمانِ شہادت (شہادت چھپانے) کا نتیجہ یہ بتایا کہ فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ اثم کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی صلاحیتوں یا قوتوں کا مضمحل ہو جانا ہوتے ہیں۔ شہادت چھپانے والے کے دل میں جو کھٹک رہتی ہے کہ اگر راز افشا ہو گیا تو کس قدر رسوائی (اور بعض حالات میں عقوبت) ہو گی اس سے اس کی جرأتیں مفلوج اور بیباکیاں مغلوب ہو جاتی ہیں، اور یہی اثم قلب ہے۔

(۰)

ہدایات کی تکمیل ہو گئی اور سورہ بقرہ بھی اپنے اختتام تک پہنچنے کے قریب آگئی۔ جس طرح قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ ہر آیت کے آخر میں ایسے الفاظ (بالعموم صفاتِ خداوندی) لاتا ہے جن سے اس آیت کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے، اسی طرح وہ ہر سورۃ کے آخر میں ایسی آیات لاتا ہے جن میں اس سورۃ کے مقاصد سمٹ کر آجاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری تین آیات میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۸۴ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ (۲/۲۸۴) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) میں جو کچھ ہے خدا کے مقرر کردہ مقاصد کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے"۔ کائنات اور اس میں کارفرما قوتوں (ملائکہ) کے متعلق جلد دوم، آیات (۲/۳۰-۳۱) صفحہ ۶۶ میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ ان مقاصد میں جن کی تکمیل کے لئے کائناتی قوتیں مصروفِ کار رہتی ہیں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۴۵/۲۲)۔ "خدا نے ارض و سماء کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی

نہ ہو" اس سے ظاہر ہے کہ کارگہ کائنات کے سرگرم عمل رہنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات نتیجہ خیز

قانونِ مکافات

ہو۔ یہ کس طرح سے ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی علم مزید ترقی کرے تو رموزِ فطرت کا یہ گوشہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ لیکن اتنا تو ہمارا مشاہدہ (اور تاریخ کی مسلّم شہادت) ہے کہ ظالم اور مستبد فراعنۂ دہر کو ان کے اعمال کی سزا ایسی راہوں سے ملتی ہے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ فَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ (۳۹/۲۵) "ان پر تباہی ان مقامات سے آئی جو ان کے حیطۂ شعور میں بھی نہیں تھے۔" اسی (قانونِ مکافات) کی طرف توجہ منعطف کرانے کے لئے کہا: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ (۲/۲۸۴) "جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ عملی شکل اختیار کر کے محسوس طور پر سامنے آ جائے یا وہ تمہارے ارادے اور آرزو ہی کی منزل میں رہے۔ ان سب کا شمار تمہارے اعمال میں ہوتا ہے جن کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا" (قانونِ مکافاتِ عمل کے متعلق مختلف مقامات پر بحث ہو چکی ہے۔ بالخصوص دیکھئے جلد دوم آیت (۲/۴۸) صفحہ ۲۳۰)۔

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (۲/۲۸۴)۔ غلط اور صحیح راستے متمیز ہو کر تمہارے سامنے آ چکے ہیں اور ان پر چلنے کے نتائج کی بھی وضاحت ہو چکی ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے وہ راستہ اختیار کر لے جو اُسے تباہیوں کی طرف لے جائے جس کا جی چاہے تباہیوں سے محفوظ رہنے والی راہ اختیار کر لے۔ خدا نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔ ان ہی پیمانوں کو قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ انہی پیمانوں کی رُو سے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک فرد سے جو عمل سرزد ہوا ہے اس میں وہ کس حد تک صاحبِ اختیار تھا، اور کس حد تک (شعوری یا غیر شعوری طور پر) مجبور۔ اعمال کے نتائج اسکے اختیار و ارادے کی نسبت سے مرتب ہوتے ہیں۔

خدا نے اپنے ان قوانین کا علم اس وحی کی رُو سے دے دیا ہے جو اس رسولؐ پر نازل ہوتی ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۲/۲۸۵)۔ "رسول اور جماعتِ مومنین ان صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسول پر نازل ہوتی ہیں۔"

۲/۲۸۵

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے۔ کہا کہ رسولؐ پر جو وحی نازل ہوتی ہے پہلے وہ خود اس کی صداقت پر ایمان لاتا ہے۔ اس سے ایک بات یہ واضح ہو جاتی ہے کہ وہ وحی، رسول کی اپنی فکری تخلیق نہیں ہوتی۔ کسی مفکر کے لئے اس کی اپنی فکری تخلیق پر ایمان لانے کا

خود رسول کا ایمان لانا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اُسے بالکل سچی اور صحیح سمجھتا ہے۔ ایمان لانے (یا نہ لانے) کا سوال ان امور کے متعلق پیدا ہوتا ہے جو کسی کو خارج سے ملیں۔ رسول کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ اس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اس وحی کی صداقت پر اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح دوسرے انسان۔ کیونکہ وہ حقیقت (وحی) ان کی بھی فکری تخلیق نہیں ہوتی۔ اسی لئے کہا کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ رسول اور باقی مومن سب اس منزل من اللہ وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ رسول سے تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اس ایمان کا اعلان بھی کرے۔ قُلْ "اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ۔ (۴۲/۱۵)"۔ اے رسول! تم کہو کہ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب پر ایمان لایا ہوں"۔ ایمان کے متعلق قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ وہ صداقت اور حقیقت کو غور و فکر کے بعد تسلیم کرنے کا نام ہے۔ (۲۵/۷۳)۔ اس سے واضح ہے کہ رسول بھی خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی پر غور و فکر کرتا تھا اور یہی مسلک مومنین کا بھی تھا۔ اس سے آپ سوچ لیجئے کہ ہمارے "ایمان" کی حقیقت کیا ہے؟

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵)

یہ سب ایمان لاتے ہیں اللہ پر، ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور ان رسولوں میں بحیثیت رسالت کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (اس کے متعلق اسی جلد میں آیت (۲/۱۳۶) کے تحت گفتگو کی جا چکی ہے)۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ (۲/۲۸۵)۔ وحی کی صداقتوں پر ایمان لانے سے معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ ایمان لانے والے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہی راستہ صحیح ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اس راستے پر چلنا بھی ہوتا ہے۔ جو چلتا ہے وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ جو چلتا ہی نہیں اس کا اس راستے کو صحیح سمجھنا اُسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

اطاعت

قرآن کریم میں سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ سَمِعْنَا کے معنیٰ ہیں احکامِ خداوندی کا دل کے کانوں سے سُن کر انہیں اچھی طرح سمجھ لینا۔ اور اَطَعْنَا کے معنی یہ ہیں کہ سمجھنے کے بعد ان کے مطابق عمل کرنا۔ گویا انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تین شرائط لاینفک ہیں۔ وحی کی رُو سے عطا شدہ رہنمائی کی صداقت پر غور و فکر کے بعد یقین کرنا (ایمان)۔ پھر ان صداقتوں پر مبنی احکام کا اچھی طرح سمجھ لینا۔ اور سمجھنے کے بعد ان کے مطابق عمل کرنا۔ اس سے انسان منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ ان احکام کی اطاعت سے مقصد کیا ہے! فرمایا:-

۲/۲۸۶

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲/۲۸۶)

یہ الفاظ اس مقام پر بھی آتے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر چند ایک مقامات پر بھی (مثلاً ۲/۲۳۳ ؛ ۶/۱۵۳ ؛ ۷/۴۲ ؛ ۲۳/۶۲)۔ اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ خدا کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلّف (ذمہ دار) نہیں ٹھہراتا۔ بات بڑی واضح ہے لیکن بہانہ جو اس سے بڑا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسی لاکھوں پتی کے پاس آپ ایک فلاحی کام کیلئے عطیہ لینے جاتے ہیں۔ وہ آپ کو دس روپے دے دیتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمیں تو آپ سے بہت زیادہ کی توقع تھی اس پر وہ کہتا ہے کہ میری وسعت اتنی ہی ہے اور خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلّف نہیں ٹھہراتا، اسلئے آپ زیادہ کے لئے اصرار نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روش منشائے خداوندی کے خلاف خود فریبی یا ابلہ فریبی ہے۔

ذمہ داری بقدر وسعت

اللہ تعالیٰ نے یا تو مختلف وسعتوں کیمطابق خود ہی احکام دے دیئے ہیں۔ مثلاً روزوں کے احکام کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حکم یہ تھا کہ مہینہ بھر کے روزے پورے کئے جائیں۔ مریض اور مسافر بعد میں گنتی پوری کریں۔ اور اس کے بعد فرمایا:۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔ (۲/۱۸۴)۔ "جو لوگ بمشقت روزہ نباہ سکتے ہوں وہ روزے کے بجائے کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔" یہ ہے علیٰ قدر وسعت مکلّف ٹھہرانے کی ایک مثال۔ یا (مثلاً) مناسکِ حج کے سلسلہ میں حجامت نہ بنوانے کا حکم دیا۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی مریض ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلے میں روزے رکھ لے، یا کوئی عطیہ دیدے، یا کوئی اور عملِ خیر کرے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے (۲/۱۹۶)۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تمام رعایتیں اس اصول کی تفسیر ہیں کہ ذمہ داری بقدر وسعت ہوتی ہے۔ اسی طرح قتلِ مومن بالخطاء کے فدیہ کے طور پر ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد کہا جسے اس کی توفیق نہ ہو وہ دو ماہ کے روزے رکھے (۴/۹۲)۔ یہ متبادل فدیہ بھی وسعت کے پیش نظر تجویز کیا گیا ہے۔ اس قسم کی مزید مثالوں کے لئے (۵/۸۹ ؛ ۵۸/۳-۴) دیکھئے۔ ان مقامات میں اللہ تعالیٰ نے علیٰ قدر وسعت خود ہی متبادل احکام دے دیئے ہیں۔ یا مثلاً معاملہ عدالت میں جائے تو اُسے اس کا اختیار دے دینا کہ وہ فریقِ متعلقہ کی وسعت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرے۔ آیت (۲/۲۳۳) سے یہی متبادر ہوتا ہے۔

لیکن ان الفاظ (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو اس سے وسیع تر اور عمیق تر ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا

دنیاوی حکومتوں میں قانون کے نفاذ سے مقصد افرادِ معاشرہ کی آزادی پر پابندی عائد کرنا ہوتا ہے۔ جو احکام خدا نے صادر کئے ہیں وہ بھی پابندیاں عائد کرتے ہیں لیکن (قرآن کہتا ہے کہ) ان پابندیوں سے مقصد تمہاری آزادی کو سلب کرنا نہیں بلکہ اس میں اور وسعت پیدا کرنا

ہے۔ "خدا کی طرف سے صادر کردہ احکام سے مقصد نفسِ انسانی کے اختیار میں اور وسعتیں پیدا کرنا ہیں"! آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہروں میں مختلف مقامات پر ٹھوکریں (FALLS) بنادی جاتی ہیں۔ سطح بین نگاہیں یہ سمجھیں گی کہ ان رکاوٹوں سے مقصد نہر کی روانی کو روکنا ہے۔ لیکن دیدہ ور یہ جانتے ہیں کہ ان رکاوٹوں سے مقصد نہر کی روانی کی رفتار کو اور تیز کرنا ہوتا ہے (DISCIPLINED LIFE) سے انسانی صلاحیتوں میں وسعت اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے فرد کی ذات بھی متوازی (BALANCED) ہو جاتی ہے اور معاشرہ بھی متوازن۔ اور اس کا، بہ حیثیتِ مجموعی نتیجہ، کاروانِ انسانیت کی ترقی کی راہوں میں کشاد پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہے مفہوم لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

می شود از جبر پیدا اختیار!

اور اسکی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے نے کر دی جہاں کہا کہ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) اس کا عمومی مفہوم تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ جو جیسا کریگا ویسا بھریگا۔ لیکن یہ قرآن ہے۔ اس کا

قانون مکافات

ایک ایک لفظ غور و فکر کا متقاضی ہوتا ہے۔ لَهَا میں (ل) سے مفہوم فائدہ یا نفع ہے اور علیھا میں (علی) کے معنیٰ نقصان یا تخریب ہیں۔ اتنے سے فرق سے معانی یہ ہو گئے کہ صحیح کام کا فائدہ بھی کام کرنے والے کو ہوگا اور غلط کام کا نقصان بھی اسی کو۔ یہ قانون مکافاتِ عمل کا بنیادی اصول ہے۔

لیکن بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ کَسَبَ (مادہ ک۔ س۔ ب) کے بنیادی معنیٰ جمع کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ کمائی کرنے، کچھ حاصل کرنے، یا محض کچھ کرنے کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا لیکن عربی زبان میں مختلف ابواب ہوتے ہیں اور ایک ہی مادہ کے باب بدلنے سے معانی میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ اس آیت میں دیکھئے۔

کسب اور اکتساب میں فرق

لَهَا کے ساتھ کَسَبَتْ آیا ہے اور عَلَيْهَا کے ساتھ اِكْتَسَبَ۔ کَسَبَ اور اِكْتَسَبَ میں باب کا فرق ہے اور اسی فرق سے انکے معانی میں بھی فرق آ گیا ہے۔ کَسَبَ کے معنیٰ ہوتے ہیں ایسا کام کرنا جس میں اپنا بھی فائدہ ہو اور اس کیساتھ دوسروں کا بھی فائدہ۔ اور اِكْتَسَبَ کے معنیٰ ہوتے ہیں ایسا کام جو محض اپنے فائدے کے لئے کیا جائے۔ اب آیت کے معنیٰ یہ ہو گئے کہ جو شخص اس لئے کمائی کرتا ہے کہ اس سے اُسے بھی فائدہ پہنچے اور دوسرے لوگوں کو بھی تو یہ وہ کارِ خیر ہے جس کا اُسے نہایت منفعت بخش صلہ ملیگا اور جو شخص محض اپنے فائدے کیلئے کچھ کرتا ہے دوسروں کا کوئی خیال نہیں کرتا تو ایسی روش زندگی کا انجام نقصان رساں یا تباہ کن ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کے اندر کیسے کیسے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسلئے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ سے اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ بقائے دوام اسی عمل کے لئے ہے

جو عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس کے بعد کہا کہ جماعتِ مومنین ان اصولوں کو سامنے رکھ کر آمادہ بہ عمل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے آدم (آدمی) کا سب سے پہلا تعارف یہ

نسیان عزم کی کمزوری ہے

کہہ کر کرایا تھا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (۲۰/۱۱۵) "ہم نے آدم کو ایک حکم دیا تھا لیکن وہ اسے بھول گیا۔ اس سے بھول ہوگئی" (ضمناً) انسان میں نسیان کی جو وجہ قرآن نے بتائی ہے وہ ایک عظیم نفسیاتی حقیقت کا بیان ہے۔ کہا کہ یہ اسکے عزم کی ناپختگی کا نتیجہ تھا۔ اگر عزم پختہ ہو تو انسان اپنے مقصد یا منزل کو بھولتا نہیں۔ یہ عزم کی ناپختگی ہے جس سے خیال کسی دوسری طرف ہٹ جاتا ہے اور انسان اصل مقصد بھول جاتا ہے۔ (بہرحال) آدم سے بھول ہوگئی لیکن جب اُسے اس کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اپنی غلطی پر اظہارِ ندامت کیا اور آئندہ سے محتاط رہنے کا اقرار۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (۷/۲۳)۔ "انہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اس عہد فراموشی سے ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اگر تو ہمیں اسکے تخریبی نتائج سے محفوظ رکھ کر ہماری نشوونما کا سامان بہم نہیں پہنچائیگا تو ہم تباہ ہو جائینگے"۔ اسکے جواب میں کہا گیا کہ اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور تم نے اس کی ذمہ داری قبول کرلی ہے تو تمہاری بازآفرینی کا امکان ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸) "تم میرے ضابطہ ہدایت کا اتباع کرو۔ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو جائیگا جو تمہارے سہو و خطا سے تمہیں پہنچ سکتا تھا" تفصیل جلد دوم۔ زیرِ آیت (۲/۳۸) صـ۱۳۳ پر گذر چکی ہے)۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے زیرِ نظر آیت میں مومنین کے دل سے ابھر کر لب پر آنے والی آرزوؤں اور التجاؤں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

مومنین کی دعائیں

کہ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ (۲/۲۸۶)۔ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس پر ہماری فوری گرفت نہ ہو جائے۔ ہمیں مہلت دی جائے کہ ہم اس غلطی کا ازالہ کرلیں"۔ (اسی کو توبہ کہتے ہیں جس کے متعلق جلد اول۔ زیرِ آیت (۱/۵) صـ۲۶ ؛ جلد دوم زیرِ آیت (۲/۳۷) صـ۲۶۶ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے)۔ اگر ہمیں اسکے ازالہ کیلئے مہلت نہ ملی تو ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو ہم سے پہلے تباہ ہونے والی قوموں کا ہوا تھا! ہمیں اس سے بچا لے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ (۲/۲۸۶)۔ وہ قومیں اپنے جرائم کی وجہ سے ایسے بوجھ کے نیچے دب گئی تھیں جس نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۹۱/۱۴) "خدا کے قانونِ مکافات نے انکے جرائم کی وجہ سے ان پر اس طرح روڈ رولر پھیر دیا کہ وہ زمین کیساتھ بالکل ہموار ہوگئے"۔ بارالٰہا! ہماری یہ حالت نہ ہو۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (۲/۲۸۶) اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "اے ہمارے پروردگار! ہم پر اتنا بوجھ نہ لاد دینا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو"۔ یہ ترجمہ خدا کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا کرتا ہے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے بندوں پر اتنا بوجھ بھی لاد دیا کرتا ہے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ یہ تو (معاذ اللہ) ظلم ہے۔ استبداد ہے۔ بڑی زیادتی ہے۔ اسی قسم کا تصور سورۂ فاتحہ کی آیت (۱/۶) کے غلط ترجمہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس مقام پر (غلط ترجمہ

کی رُو سے) یہ کہا جاتا ہے کہ "اے ہمارے پروردگار! دکھا ہمیں سیدھی راہ۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا نہ کہ اُن لوگوں کی راہ جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہو گئے"۔ اس سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے گویا خدا لوگوں کو ان راہوں پر بھی ڈال دیا کرتا ہے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائیں اور مومن اس کی دعائیں مانگتے ہیں کہ کہیں ہمارے ساتھ ایسا نہ کر دینا۔ (تفصیل جلد اول ص۵۲ پر گزر چکی ہے) آپ نے غور کیا کہ اس قسم کی آیات کے غلط ترجمہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

زیر نظر آیت کا مروجہ ترجمہ (ہم پر اتنا بوجھ نہ لاد دینا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو) ایک تو اس لئے غلط ہے کہ ابھی ابھی خدا کا یہ ارشاد ہماری نظروں سے گزر چکا ہے کہ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ خدا کسی کی وسعت سے زیادہ اسے مکلف ہی نہیں ٹھیراتا"۔ ایسے خدا کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ کسی پر اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا کرتا ہے، قرآن میں تضاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔" وہ نوعِ انسان کو ان بوجھوں سے آزاد کر دیگا جن کے نیچے وہ دبی چلی آ رہی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ پھینکے گا جن میں وہ جکڑی ہوتی ہے"۔ اس خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ انسانوں پر ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال دیا کرتا ہے، غلط ہے لیکن جن لوگوں کے نزدیک خدا کی ایک صفت اَلْمُضِلُّ بھی ہے (یعنی (معاذ اللہ) گمراہ کرنیوالا) وہ اگر ان آیات کے اس قسم کے ترجمے کر دیں تو ہمیں تعجب کی کونسی بات ہے؟

آیت کا یہ ٹکڑا درحقیقت اسکے اس حصہ کا ضمیمہ ہے جس میں کہا گیا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) خدا انسان پر جو ذمہ داری ڈالتا ہے اس سے اس کی وسعتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ میں کہا یہ گیا ہے کہ ہم پر جس قدر ذمہ داری عائد کی جائے اسی نسبت سے ہماری قوتِ برداشت میں اضافہ ہو جائے یعنی ذمہ داری کے عائد ہونے کے ساتھ ہی وُسْعَهَا کا عمل شروع ہو جائے۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کا اپنی قوم سے خطاب ہے کہ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ۔ میرا ارادہ اور مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق تم میں اصلاح کرتا رہوں۔ اس کے بعد ہے وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۱/۸۸)۔" لیکن میری استطاعت (قوتِ عمل) (اور تمہاری اصلاح کے لئے جو کچھ اور جس قدر چاہیئے) ان میں مطابقت قانونِ خداوندی کی رو سے پیدا ہوگی"۔ توفیق کے معنے دو چیزوں میں مطابقت پیدا ہو جانا ہے۔ اسی بناء پر ہم اپنے ارادوں اور کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا کرتے ہیں کہ وَبِيَدِهِ التَّوْفِيْقُ۔ یعنی ہمارے ارادوں اور مطلوبہ نتائج میں مطابقت خدا کے قوانین کی رُو ہی سے ممکن ہے۔ یعنی ان ارادوں کو کامیاب کرنے کیلئے جس قدر استطاعت درکار ہے وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہی سے حاصل ہو گی۔ یہ معنی ہیں رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے۔ اگر یہ توفیق (مطابقت) نہ ہو تو پھر (حسرت کے الفاظ میں) کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں میری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

مومنین کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں ہمارا شوق بلند ہو اسی نسبت سے ہماری ہمتوں میں بلندی پیدا ہوتی جائے۔ اس لئے کہ ۔۔۔ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر۔

اس کے بعد مومنین کی اگلی آرزوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا (۲/۲۸۶) اگر ہم

لہ تفصیل کے لئے دیکھئے میری تصنیف "کتاب التقدیر"۔

سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہمیں اس کی بھی توفیق ہو کہ ہم اپنے حسنِ عمل سے اس کے غلط نقوش اور مضر اثرات کو مٹا سکیں۔ عفو کے معنی مٹا دینا ہے۔ غلط نقوش مٹتے کس طرح ہیں، اس کے متعلق یہ اصول بتا دیا کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ "اعمالِ حسنہ غلط اعمال کے تخریبی نتائج کا ازالہ کر دیتے ہیں"۔ وَاعْفُ عَنَّا کے یہی معنی ہیں۔ یعنی ہمیں اس کا موقع عطا کر دے کہ ہم ایسا کر سکیں اور اس طرح وَاغْفِرْلَنَا۔ ہم ان کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہ سکیں۔ وَارْحَمْنَا اور ہماری ذات کی نشوونما کئے جا۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام دعاؤں میں مخاطب اللہ کو کیا گیا ہے۔ اگلے دو لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے (محاکاتی انداز میں) یوں سمجھئے کہ ان دعاؤں کے سننے کے بعد خدا کی طرف سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم ہم سے یہ کچھ کیوں مانگ رہے ہو؟ اس کا جواب دو لفظوں میں یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ، اسلئے کہ

اَنْتَ مَوْلٰنَا۔ (۲/۲۸۶)

تو ہی تو ہمارا آقا، ہمارا کارساز، ہمارا سرپرست، ہمارا حامی وناصر، ہمارا آخری سہارا ہے۔ تجھ سے نہ مانگیں تو اور کس سے مانگیں۔

تیرے سوا کوئی شائستہ وفا بھی تو ہو		ہیں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

لفظ "مولٰنا" کے معانی، سابقہ صفحات میں ولی یا اولیاء اللہ کے ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مؤمن کا

اَنْتَ مَوْلٰنَا

ایمان اور اس کی پکار اَنْتَ مَوْلٰنَا ہے۔ یعنی مولا صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی کو مولا سمجھنا کھلا ہوا شرک اور ایسا کہنا، اس شرک کا اعلان ہے۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ یہ جو ہم قدم قدم پر انسانوں کو "مولٰنا" یا مرشدی و مولائی کہتے ہیں تو قرآنِ کریم کی رُو سے اسے کیا کہا جائیگا!

ان تمام آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد آخر میں بتایا گیا کہ ان سے ہمارا مقصود ومنتہیٰ کیا ہے! ہم ایسی قوتیں اور صلاحیتیں کیوں چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (۲/۲۸۶)۔ دنیا میں جتنی قوتیں حق کی مخالف اور دینِ خداوندی کی راہ میں حائل ہوں، ہمیں ان پر غلبہ وتسلط حاصل ہو جائے اور اس طرح لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (نظامِ خداوندی آخر الامر تمام انسان ساز نظاموں پر غالب آجائے) کی حقیقت منتظر لباسِ مجاز میں ہمارے (اور ساری دنیا کے) سامنے آجائے۔

بارالٰہا! ہماری ان آرزوؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرما!

——— (۰) ———

ان حسین آرزوؤں اور درخشندہ امیدوں کے ساتھ سورۂ بقرہ اور اس کے ساتھ مطالب الفرقان کی تیسری جلد

اختتام تک پہنچ گئی۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

قرآن کریم کی ایک سورۃ (بقرہ) کی تفسیر مطالب الفرقان کی تین جلدوں کو محیط ہوئی ہے اور اس کے باوجود میری تسکین اور تسلّی نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ

حسن این قصّہ عشق است، در دفتر نمی گنجد

اس کے بعد بیدہ التوفیق۔

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انڈکس

مطالب الفرقان جلد اول، دوم وسوم مشتمل بر سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ

جلد اوّل ——— سورہ فاتحہ ——— (۱:۱-۷)
جلد اول ——— سورہ بقرہ ——— (۲:۱-۲۹)
جلد دوم ——— سورہ بقرہ ——— (۲:۳۰-۱۱۲)
جلد سوم ——— سورہ بقرہ ——— (۲:۱۱۳-۲۸۶)

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدیں یوں تو سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل ہیں، لیکن چونکہ یہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق مرتب کی گئی ہیں اس لئے ان جلدوں میں قرآن کریم کے بیشتر اہم حقائق و احکام آگئے ہیں۔ اس بنا پر مناسب معلوم ہوا کہ ان تین جلدوں کا جامع انڈکس شائع کر دیا جائے تاکہ زیرِ نظر موضوع کی تلاش میں آسانی رہے۔ اس انڈکس کے مرتب کرنے میں بڑی کاوش اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا امکان رہتا ہے۔ اسی امکان کے پیشِ نظر متعلقہ جلد کے صفحہ نمبر کے ساتھ آیت کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے کہ اگر صفحہ نمبر میں غلطی ہو گئی ہو تو متعلقہ آیت کو دیکھ لیا جائے۔ اگر اس کے باوجود حوالہ صحیح نہ ملے تو براہِ کرم ہمیں مطلع فرما دیا جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ!

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
الف			
ابتلاء کے معنی	دوم	۲۴۱	(۲:۴۹)
ابتلاء کا مفہوم	سوم	۴۰، ۱۱۱	(۲:۱۲۴؛ ۱۵۵)
(حضرت) ابراہیمؑ کا خدا سے	دوم	۲۷۴	(۲:۵۵)
درخواست کرنا کہ مجھے بتا تو مردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے			
حضرت ابراہیم۔ امت مسلمہ کا مؤسس			
〃 〃 بادشاہ سے مناظرہ			
حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ جلیلہ ز ابتلاء۔ امامت	سوم	۳۷-۴۰	(۲:۱۲۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ابلیس	دوم	۴۲	تمہید برگذشت آدم
ابلیس اور آدم کی معصیت میں فرق	دوم	۱۰۱	(۲:۳۴)
ابن السبیل کی امداد	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
ابن اللہ کے باطل عقیدہ کی تردید	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)
ابن مسکویہ اور نظریہ ارتقاء	اول	۲۲	(۱:۲)
اثری انکشافات کی اہمیت	دوم	۱۵۴	(۲:۴۰)
اثم و عدوان	دوم	۳۵۶	(۲:۸۵)
" "	سوم	۲۱۷;۲۵۸	(۲:۲۱۹)(۲:۲۰۶)
اجتماعی نظام کا نام اسلام ہے	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
اجرتوں کا نظام باطل ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
احبار و رہبان کے خلاف حضرت عیسیٰؑ کے وعظ	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)
احسان۔ جنگ کے قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دو	دوم	۳۵۳	(۲:۸۵)
احسن الخالقین	اول	۲۸۷	(۲:۲۱)
احمدؐ	اول	۷	(۱:۱)
اختلافات۔ ہمارے اختلافات کیسے مٹ سکتے ہیں؟	سوم	۷	(۲:۱۱۳)
اختلافات کتاب اللہ کی حکمرانی سے مٹ سکتے ہیں	سوم	۹	(۲:۱۱۳)
اختیار و ارادہ۔ انسان کی خصوصیت	اول	۴۲	(۱:۵)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
آخرت پر ایمان	اول	۱۴۴	(۲:۴)
اخروی زندگی کی اہمیت	اول	۳۴۹	(۲:۲۸)
اخروی زندگی پر غور و فکر	سوم	۳۲۷	(۲:۲۱۹)
آدم۔ (آدمی ہی مراد ہے)	دوم	۶۱	(۲:۳۰)
آدم کی توبہ اور اصلاح کی گنجائش	دوم	۱۳۳	(۲:۳۷)
اذان	اول	۱۲۴	(۲:۳)
اذن اللہ کا مفہوم	سوم	۴۲۵	(۲:۲۵۰)
ارتداد کا قرآنی مفہوم (نیز دیکھئے مرتد)	اول	۵۷	(۱:۷)
ارتقاء کا نظریہ	اول	۱۷	(۱:۱)
ارتقاء۔ عمومی اور فجائی	اول	۲۱	(۱:۲)
" " "	اول	۲۹۰	(۲:۲۱)
ارض کے فراش ہونے کا مطلب	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
ارض (زمین) پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)
ارض پر ذاتی ملکیت رسول اللہؐ کے زمانے ہی میں کم ہو گئی تھی	اول	۳۰۷	(۲:۲۲)
ارض و سما کی تخلیق	اول	۳۵۲	(۲:۲۹)
ارض مقدس پر بنی اسرائیل کے قبضے کا واقعہ۔ دوں ہمتی کی انتہاء	دوم	۲۹۴	(۲:۵۹)
(موجودہ) ارکانِ اسلامی کا برقرار	اول	۱۳۷	(۲:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رکھنا ضروری ہے			
آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد کی غلط نگہی)	اول	۸۴	(۲:۳)
آزمائش ۔ خدا بندوں کی آزمائش نہیں کرتا	دوم	۲۴۱	(۲:۴۹)
ازواج کے معنی ۔ ہم آہنگ رفقاء	اول	۳۳۸	(۲:۲۵)
استبدال و استخلافِ قومی	اول	۱۹۳	(۲:۷)
"	سوم	۲۸۵	(۲:۲۰۹)
استہزا ۔ دنائیت کی آخری حد	اول	۲۴۷	(۲:۱۴)
استخلاف فی الارض	اول	۳۰	(۱:۳)
استخارہ	سوم	۳۱۶	(۲:۲۱۹)
استکبار فی الارض بغیر الحق منع ہے	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
استعانت	اول	۳۷	(۱:۴)
استعانت بالصبر والصلوٰۃ	اول	۳۹	(۱:۴)
" " "	دوم	۲۲۲	(۲:۴۵)
" " "	سوم	۱۰۹	(۲:۱۵۳)
استغناء کی کیفیت	سوم	۴۷۴	(۲:۲۷۳)
استنتاجی طریق ۔ نتائج خود بتا دینگے کہ کونسا نظام سچا ہے	سوم	۷۶	(۲:۱۳۹)
اسٹیٹ ۔ دورِ حاضر کا بُت	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
اسلاف کے متعلق بحثوں میں مت پڑو۔	سوم	۶۹	(۲:۱۳۴)
اسلام اجتماعی نظام کا نام ہے	دوم	۲۱۱-۲۱۶	(۲:۴۳)
(ہمارا مروجہ) اسلام کس طرح غیر اسلامی عقائد و مسالک کا مجموعہ بن گیا ہے	اول	۱۲۳	(۲:۳)
" " "	دوم	۳۱۵	(۲:۷۱)
(صرف) اسلام ہی کیوں سچا دین ہے	سوم	۲۸	(۲:۱۲۰)
اسلام عمر بھر کا مسلسل پروگرام ہے	سوم	۶۸	(۲:۱۳۲)
"اسلام یا تلوار" کا گمراہ کن پراپیگنڈہ	سوم	۲۶۶	(۲:۱۹۳)
اسلام کی تشریح و توضیح	سوم	۲۸۲	(۲:۲۰۸)
اسلام کے اصولوں میں لچک نہیں۔	اول	۱۷۸	(۲:۶)
اسلامی نظام نوعِ انسان کی ربوبیت کا ذمہ دار	اول	۲۰	(۱:۱)
" رسول اللہ کے بعد	اول	۳۱	(۱:۳)
" اس کے بنیادی مقاصد	سوم	۱۵۶-۱۵۷	(۲:۱۷۷)
اسم سے مراد صفتِ خداوندی ہے (بسم اللہ)	اول	۲	بسم اللہ
اسم اعظم	دوم	۳۹۲	(۲:۱۰۲)
اسماء سے مراد ۔ اشیائے فطرت کا علم	دوم	۸۲	(۲:۳۱)
اسمائے خداوندی سے مراد	سوم	۱۴	(۲:۱۱۴)
(حضرت) اسمٰعیل کی حجاز کی طرف نقلِ مکانی	سوم	۵۳	(۲:۱۲۴)
تورات کا افسانہ	سوم	۵۳	(۲:۱۲۴)
اسوۂ ابراہیمی کے اتباع کا حکم	دوم	۳۴۸	(۲:۸۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
اسوۂ ابراہیمی کے اتباع کا حکم	سوم	۴۵۵	(۲:۲۵۸)
اسوۂ حسنہ	اول	۲۲۳	(۲:۹)
" "	سوم	۴۵۶	(۲:۲۵۸)
اشتراکیت اور اسلام کا فرق	دوم	۲۰۲	(۲:۴۳)
"اشرف المخلوقات" کا تصور صحیح نہیں	دوم	۴۱	سرگزشت آدم
اصحاب الفیل	سوم	۲۵۳	(۲:۱۹۹)
اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنے کا طریق	دوم	۲۳۵	(۲:۴۸)
اصلاح اور فساد کا مفہوم	اول	۲۳۱	(۲:۱۱-۱۲)
(دین کے) اصول و جزئیات کا باہمی تعلق	اول	۱۲۵	(۲:۳)
اصول ناقابل تغیر، جزئیات قابل تغیر	دوم	۳۱۷	(۲:۷۱)
اضداد (کے تقابل سے وضاحت)	اول	۵۴	(۱:۷)
اطاعت — ایمان کے بعد سمجھ سوچ کر اطاعت	سوم	۴۹۱	(۲:۲۸۵)
اعراب نے یہودیوں کے زیر اثر منافقت اختیار کر لی تھی	اول	۲۰۹، ۲۰۲	(۲:۸، ۹)
اعمال نامہ الحق ہے	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)
"اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم" کا مفہوم	دوم	۳۱۲	(۲:۶۷)
افتراق وہ ملعونہ شجر ہے جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)
افلاطون کا نظریۂ کائنات	دوم	۸۷	(۲:۳۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(لشکر) اقتدار کی بدمستیاں	اول	۱۶۷	(۲:۶)
آل کے معنی	دوم	۲۴۵	(۲:۵۰)
الاعلیٰ	سوم	۴۳۸	(۲:۲۵۵)
الٰہ — صاحب اقتدار (اللہ کے سلسلے میں عنوان خدا بھی دیکھیے)	اول	۹-۸	(۱:۱)
الٰہ الارض بھی خدا ہے اور الٰہ السماء بھی	اول	۳۰۰	(۲:۲۲)
الہام کا ذکر قرآن میں نہیں	اول	۹۶	(۲:۳)
الفاظ پر زور — معانی سے روگردانی	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
(باہمی) الفت (کے بجائے جنگ و جدال غضب خداوندی ہے)	اول	۵۴	(۱:۷)
اللہ کا صحیح تصور	اول	۱۰	(۱:۱)
" "	اول	۸۸	(۲:۳)
اللہ اکبر کا مفہوم	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
اللہ اور اس کے رسول غالب آکر رہیں گے	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
اس کا مفہوم			
اللہ اکبر کا مفہوم	سوم	۲۰۰	(۲:۱۸۷)
(حمل) امانات کا مفہوم	سوم	۱۶۴	(۲:۱۷۷)
امانت — حمل امانت کا مفہوم	دوم	۳۹	سرگزشت آدم
امانی کے معنی	دوم	۳۳۹	(۲:۷۸)
(تشکیل) امت کے دو اساسی عنصر	اول	۱۳۸	(۲:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
امت کی تشکیل	دوم	۲۱۱ تا ۲۱۹	(۲:۴۳)
امتِ مسلمہ کی خصوصیات	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
امتِ مسلمہ کی تشکیل۔ امتِ واحدہ	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
امر۔ عالمِ امر	اول	۲۸۳	(۲:۲۰-۲۱)
امر۔ عالمِ امر و عالمِ خلق	اول	۲۸۳	(۲:۲۱)
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ساری امت کا ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کا۔	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
امنِ عالم کے ذمہ دار	اول	۸۷	(۲:۳)
آمروں کا بظاہر دبدبہ لیکن درحقیقت بزدلی	دوم	۱۰۷	(۲:۳۴)
امی کے معنی	دوم	۳۳۷	(۲:۷۸)
آمروں کا مسلک ـ اپنے حریفوں کو ذلیل کرکے خوش ہونا	دوم	۱۰۷	(۲:۳۴)

ب

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
بابل سحرکاری کا اولین مرکز	دوم	۳۹۹	(۲:۱۰۲)
(ال) باری کا مفہوم	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)
باطل پر مبنی نظام پنپ نہیں سکتا	اول	۲۶۹	(۲:۱۹)
باطل کا مفہوم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
باطل کے معنی	دوم	۱۹۶	(۲:۴۲)
باطل اور حق کی کشمکش	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)
باطنی علم کا عقیدہ ـ یہودیوں میں	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)
باطنیت ـــ سحر کی	دوم	۴۱۳	(۲:۱۰۳)
پیداوار اور تصوف کی بنیاد	سوم	۱۲۶	(۲:۱۵۹)
باطنیت ـ یہودیوں کے ہاں	دوم	۳۹۲؛۴۰۸	(۲:۱۰۲-۳)
عیسائیوں کے ہاں	دوم	۴۱۱	″
خود مسلمانوں کے ہاں	دوم	۴۱۴	″
بپتسمہ (یا اصطباغ) کا عقیدہ اور رسم	سوم	۷۵	(۲:۱۳۸)
بخت نصر کا حملہ	دوم	۱۹۰	(۲:۴۰)
حزقیل نبی کا خواب	دوم	۱۹۱	″
بخشش کا تصور غیر قرآنی ہے	دوم	۲۸۸	(۲:۵۸)
بدیع السمٰوٰت والارض	اول	۲۸۳-۹۲	(۲:۲۱)
بِر کے معنی	دوم	۲۱۹	(۲:۴۴)
بِر کی راہ کون سی ہے	سوم	۱۵۷	(۲:۱۷۷)
برہمو سماج کی تحریک	اول	۸۳	(۲:۳)
برہمو سماجی اسلام	اول	۸۳	(۲:۳)
برفو (BRIFFAULT) کی شہادت	اول	۲۶۹	(۲:۱۹)
برق	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
برنباس کی انجیل کی شہادت	دوم	۱۶۵	(۲:۴۰)
"بسم اللہ" وحی ہے (بسم اللہ)	اول	۲۴	(۱:۲)
بسم اللہ کی مزید تشریح	..	..	..

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(خلاصہ بسم اللہ۔ سورہ فاتحہ کے آخر میں)	اول	۶۴	(۱:۲)
بشرٌ مثلکم	اول	۳۱۱	(۲:۲۳)
بصر اور نظر کا فرق	اول	۱۶۸	(۲:۶)
بعثت کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۸۱	(۲:۵۶)
بقر (گائے) ذبح کرنے کا واقعہ بنی اسرائیل کا	دوم	۳۱۱	(۲:۶۷)
بلاء کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۴۱	(۲:۴۹)
بناء ــ سماء کو بناء بنایا	اول	۲۹۵	(۲:۲۲)
بندر بن جانا ــ اصحاب سبت کا	دوم	۳۰۷	(۲:۶۵)
بنی اسرائیل کی داستان ــ ابتداء سے آخری تباہی تک	دوم	۱۷۱	(۲:۴۰)
بنی اسرائیل کے دس گم گشتہ اسباط (قبائل)	دوم	۱۵۹	(۲:۴۰)
بنی اسرائیل کو نعماتے خداوندی کی یاددہانی	دوم	۲۲۸	(۲:۴۷)
بنی اسرائیل کے عجیب وغریب	دوم	۲۲۹	(۲:۴۸)
عقائد۔ نجات کے متعلق	سوم	۳۳	(۲:۱۲۲-۲۳)
بنی اسرائیل نے سمندر کیسے پار کیا تھا؟	دوم	۲۴۵	(۲:۵۰)
بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کو کس طرح ستایا؟	دوم	۲۷۵	(۲:۵۵)
بنی اسرائیل کے قتل کا واقعہ	دوم	۳۲۳	(۲:۷۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
بنی اسرائیل نے دین کو اپنی نسل تک محدود کر دیا	دوم	۳۰۵	(۲:۶۱-۶۲)
بھوک (اور خوف) عذابِ خداوندی ہیں	اول	۵۲	(۱:۶)
پ			
پارٹیوں میں بٹ جانا عذاب ہے۔	دوم	۱۷۲	(۲:۴۰)
پاکستان کی تحریک کے دوران، نیشنلسٹ علماء اور اقبالؒ میں وجۂ نزاع	دوم	۱۰۶	(۲:۳۴)
پاکستان کی تحریک کے دوران، نیشنلسٹ علماء کا مسلک	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
پاکستان میں سیکولرازم	دوم	۳۶۲	(۲:۸۵)
پانی کے چشمے ـ بنی اسرائیل کے	دوم	۲۹۷	(۲:۶۰)
پرستش ــ مذہب میں عبادت، پرستش میں تبدیل ہو جاتی ہے	اول	۳۶	۱:۴)
پلڑوں کا جھکنا اور اٹھنا ــ قانونِ مکافات و مہلت	اول	۱۹۷	(۲:۷)
پندارِ نفس کی بنا پر انکار	اول	۱۶۶	(۲:۶)
پیش گوئیاں اور روایات	دوم	۳۵۷	(۲:۸۵)
پیش گوئیوں کی حقیقت	اول	۹۵	(۲:۳)
پیمان شکن	اول	۳۴۴	۲:۲۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ت			
تابوتِ سکینہ (بنی اسرائیل کا)	سوم	۴۲۲	(۲:۲۴۷)
تاریخ سے مفہوم	دوم	۱۵۰	(۲:۴۰)
تاریخ کی اہمیت ۔ قرآن کی رو سے	؍؍	؍؍	؍؍
تاریخ کی مادی تعبیر ۔ مارکسی نظریہ	؍؍	۱۵۱	؍؍
تاریخی شواہد ۔ قرآنی دعاوی کی	اول	۹۴	(۲:۳)
صداقت کی دلیل			
تالمود (یہودیوں کی فقہ اور روایات	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
کی کتاب			
تبلیغ بہرحال کئے جاؤ	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۹)
تبلیغی جماعت	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
تثبیتِ نفس	سوم	۴۶۶	(۲:۲۶۵)
تجارت کا غلط نظام	اول	۲۳۷	(۲:۱۱-۱۲)
وجہ فسادِ آدمیت			
تجارت اور ربو میں فرق	سوم	۴۸۲	(۲:۲۷۹)
تجرباتی طریق ۔ عقل کا	اول	۲۵۸	(۲:۱۷)
تحاکم الی الطاغوت ۔ شیوۂ منافقین	اول	۲۱۵	(۲:۹)
تحریف ۔ سابقہ کتب میں	دوم	۱۸۳	(۲:۴۱)
تخلیقِ خداوندی میں اضافے	اول	۱۶-۲۲	(۱:۱)
	اول	۲۸۸	(۲:۲۱)
تخلیقی قوت انسان میں	اول	۲۹۰	(۲:۲۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
تخلیقی قوت انسان میں	دوم	۲۴۳	(۲:۸۳)
(خدا کا عمل) تخلیقی ہے ۔ تولیدی نہیں	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)
ترتیبِ قرآن	اول	۳۱۶	(۲:۲۴)
تزکیۂ نفس	دوم	۲۵	(۲:۳۰)
تسبیح سے مراد	دوم	۷۳	(۲:۳۰)
تسخیرِ فطرت	دوم	۶۸	سرگزشت
؍؍ ؍؍	؍؍	۸۳	(۲:۳۱)
؍؍ (مقامِ آدم اور مقامِ مومن)	دوم	۸۶	(۲:۳۱)
تصوف کی غلط نگہی	اول	۴۵	(۱:۵)
(الیہ راجعون کا غلط مفہوم)	اول	۳۵۰	(۲:۲۸)
تصوف پر تفصیلی بحث	دوم	۴۰۸	(۲:۱۰۳)
تصوف اور علامہ اقبالؒ	دوم	۴۲۷	(۲:۱۰۳)
	سوم	۴۴۶	(۲:۲۵۷)
تصوف کا غلط نظریہ ۔ علو اور کبریائی	اول	۲۳۴	(۲:۱۱-۱۲)
مومن کا حق ہے			
تصوف اور دین میں فرق	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
تصوف، خدا کی ذات بے نقاب	دوم	۲۷۸	(۲:۵۵)
دیکھنے کا مدعی ہوتا ہے			
تعاون کے لئے شفاعت کا لفظ	دوم	۲۳۵	(۲:۴۸)
تعدد ازواج	سوم	۳۴۵	(۲:۲۲۱)
تعویذ ۔ گنڈے	دوم	۴۱۹	(۲:۱۰۲)
تغیر و ثبات کا امتزاج	اول	۱۲۹	(۲:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(ہماری کتب) تفاسیر میں قصۂ آدم	دوم	۱۴۲	(۲:۳۹)
تفرقہ انگیزی خدا کا عذاب ہے	اول	۱۹۳	(۲:۷)
	سوم	۲۹۰	(۲:۲۱۳)
تفرقہ انگیزی ۔ منافقین کا شعار	اول	۱۴۵	(۲:۹)
(مسجد ضرار کی تعمیر)	״	״	״
تفرقہ عذاب ہے	دوم	۱۷۲	(۲:۴۰)
تفرقہ یہودیوں میں	اول	۱۹۱	(۲:۴)
تفرقہ ۔ قوم کو تفرقہ سے بچانے کے لئے عارضی شرک تک برداشت کیا گیا	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
تفریق بین الرسل	سوم	۳۶	(۲:۱۲۴)
	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
(ہماری کتب) تفسیر کی حقیقت	دوم	۳۹۷	(۲:۱۰۲)
تقدیر ۔ آغاز کار انسان کے	سوم	۱۰۵	(۲:۱۵۲)
ہاتھ میں ہے	سوم	۳۲۵	(۲:۲۱۹)
تقدیر ۔ (عقیدۂ جبر گمراہی ہے)	اول	۶۳	(۱:۷)
״ ״	״	۱۶۳	(۲:۶)
״ ״	״	۱۸۳-۸۴	(۲:۷)
تقدیراتِ الٰہیہ ہی قوانینِ خداوندی	اول	۲۷۴	(۲:۲۰)
ہیں۔	سوم	۴۲۰	(۲:۲۴۷)
تقدیس کا مفہوم	دوم	۷۵	(۲:۳۰)
تقلید (کی تباہ کاریاں)	اول	۶۰	(۱:۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
تقلید (کی تباہ کاریاں)	اول	۱۶۴	(۲:۶)
	״	۳۰۷	(۲:۲۲)
	سوم	۱۳۸	(۲:۱۷۰)
تقویٰ کا مفہوم	اول	۷۵	(۲:۲)
تکذیبِ دین کا مفہوم	دوم	۱۳۶	(۲:۳۹)
״ ״ کرنے والے	سوم	۴۵۴	(۲:۲۰۲)
تلاوتِ قرآن پاک ۔ مفہوم سمجھے بغیر	دوم	۳۳۹	(۲:۷۸)
تلاوت کے معنی قرآن مجید کا اتباع کرنا ہے	سوم	۳۲	(۲:۱۲۱)
تلاوت بغیر سمجھے	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
تمکن فی الارض ۔ خدا کا انعام ہے	دوم	۱۷۶	(۲:۴۰)
״ ״ بنی اسرائیل کے لئے	دوم	۲۸۵	(۲:۵۸)
تناسخ کا باطل نظریہ	اول	۴۴	(۱:۵)
	سوم	۱۳۴	(۲:۱۴۷)
تنذیر کا مفہوم	اول	۱۶۱	(۲:۶)
توّاب	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)
توبہ کا مفہوم	اول	۲۶	(۱:۲)
	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)
تورات کی تاریخ	دوم	۱۸۴	(۲:۴۱)
تورات میں قصۂ آدم	دوم	۱۳۹	(۲:۳۹)
تولید اور تخلیق میں فرق	اول	۲۸۳،۹۲	(۲:۲۱)
״ ״ ״	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
توہم پرستی کے خلاف	سوم	۲۳۴	(۲:۱۸۹)
(مذہبی رسوم ومناسک توہم پرستی			
پر مبنی ہوتے ہیں)			
ث			
ثبات وتغیر کا حسین امتزاج	اول	۱۲۹	(۲:۳)
ثمن قلیل — دنیا کی ہر متاع آخرت	اول	۲۵۷	(۲:۱۶)
کے مقابلے میں ثمن قلیل ہے			
ثنویت (دو خداؤں کا عقیدہ)	دوم	۱۸۳	(۲:۴۰)
	اول	۱۳،۱۴	(۱:۱)
ثنویت (شرک ہے)	اول	۵۷	(۱:۷)
ر (غضب خداوندی اور	ر	۵۷	(۱:۷)
ارتداد ہے)			
ر کفر ہے	ر	۱۷۱	(۲:۶)
ج			
جادو — رسول اللہ پر	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۲)
جادو کی حقیقت	دوم	۴۰۴	(۲:۱۰۲)
جبر کا عقیدہ پستی کردار کی علامت ہے	دوم	۱۰۰	(۲:۱۳۴)
جبریل	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)
جبلت اور انسان	دوم	۳۲،۴۴	سرگزشت آدم
جہاد (دیکھو جنگ)			

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جہیز	سوم	۳۵۸	(۲:۲۲۱)
جدلیت (ہیگل اور مارکس کا نظریہ)	دوم	۱۵۱	(۲:۴۰)
جذبات اور علم وہدایت کا تعلق	اول	۱۴	(۱:۱)
جذبات سے مغلوب ہوجانے والے	ر	۱۴	(۱:۱)
اپنے جذبات کو آلہ بنا لینے والے	ر	۱۴	(۱:۱)
(سرکش) جذبات، شیطان کہلاتے ہیں	دوم	۵۰	سرگزشت آدم
جرائم جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کی	دوم	۱۶۶	(۲:۴۰)
تباہی واقع ہوئی			
جرم وسزا کا فلسفہ	سوم	۱۷۱	(۲:۱۷۹)
جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم	اول	۸۹	(۲:۳)
	دوم	۲۳۲	(۲:۴۸)
جزئیات صلوٰۃ اور قرآن	اول	۱۲۵	(۲:۳)
(احکام کی) جزئیات کا تعین	اول	۱۲۵	(۲:۳)
اسلامی نظام مملکت کریگا			
جمارا (یہودیوں کا مجموعہ روایات)	دوم	۱۸۴	(۲:۴۱)
جماعت کی اہمیت	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
جمال وجلال کا سرچشمہ	اوّل	۸	(۱:۱)
جماعت مومنین کی اہمیت	دوم	۲۰۱	(۲:۴۳)
جمہوریت (کی غلط فہمی)	اول	۶۲	(۱:۷)
	سوم	۱۶۱	(۲:۱۷۷)
جمہوریت کا باطل نظریہ	ر	۴۲۴	(۲:۲۴۷)
جُناح کا مفہوم	ر	۱۲۰	(۲:۱۵۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جنّت اور جہنّم کا تمثیلی بیان	اول	۱۴۸	(۲:۴)
	″	۳۳۴	(۲:۲۵)
جنّت کے معنی	اول	۳۳۲	(۲:۲۵)
جنّتِ آدم	″	۳۳۵	(۲:۲۵)
	دوم	۱۱۱	(۲:۳۵)
جنّت، اجتماعی زندگی میں ملتی ہے	اول	۳۳۸	(۲:۲۵)
جنّت جانکاہ مشقتوں کے بعد ملتی ہے	اول	۳۳۷	(۲:۲۵)
″ ″ ″	سوم	۲۹۶	(۲:۲۱۴)
جنت کسی کی اجارہ داری نہیں۔ اسکے دروازے ہر ایک کیلئے کھلے ہیں۔	دوم	۴۳۷	(۲:۱۱۱-۱۲)
جنت آدم اور جنت مومن میں فرق	دوم	۱۳۸	(۲:۳۹)
حصولِ جنت کے آسان طریقے	سوم	۲۹۸	(۲:۲۱۴)
جنّت کی شراب	″	۳۲۱	(۲:۲۱۹)
جنسی بدنہادی وجہ فسادِ آدمیت۔	اول	۲۳۸	(۲:۱۱-۱۲)
جنسی اختلاط کے متعلق بحث			
جنگ اور عیسائیت	دوم	۷۸	(۲:۳۰)
جنگ اور قرآن	دوم	۸۰	(۲:۳۰)
جنگ کا مقصد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہے	دوم	۱۹۹	(۲:۴۲)
جنگ کے متعلق تفصیلی بحث	سوم	۲۶۴-۸۰	(۲:۱۹۰-۹۵)
جان کی قربانی	سوم	۲۹۶	(۲:۲۱۶)
جنگِ احزاب کا ہولناک نقشہ	سوم	۲۹۷	(۲:۲۱۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جنّ و انس	دوم	۵۲	سرگزشتِ آدم
جوّا (میسرہ)	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
جہنّم کے معنی	اول	۳۲۷	(۲:۲۴)
جہنّم کا آغاز یہیں سے ہوجاتا ہے	اول	۱۹۴	(۲:۷)
چ			
چٹپٹی غذاؤں کا مطالبہ۔ بنی اسرائیل کی طرف سے	دوم	۲۹۸	(۲:۶۰)
ح			
حامدون کون ہیں؟	اول	۵	(۱:۱)
حبطِ اعمال۔ اعمال کا بے نتیجہ رہ جانا	سوم	۲۸۸	(۲:۲۱۰)
الحجارۃ کے معنی	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
حجرِ اسود۔ دیکھئے حج	سوم	۲۵۲	(۲:۱۹۹)
حج سے متعلق احکام	سوم	۲۳۵	(۲:۱۸۹)
حج۔ عالمگیر انسانیت کا نقطۂ اجتماع	سوم	۲۳۵	(۲:۱۸۹)
	سوم	۱۲۰	(۲:۱۵۸)
	سوم	۲۳۳	(۲:۱۸۹)
	سوم	۲۳۸	(۲:۱۹۷)
حج کی تقریب پر جانوروں کو ذبح کرنا۔	سوم	۲۴۴	(۲:۱۹۹)
حج کے اجتماع میں غیر مسلموں کو دعوتِ مشاہدہ	سوم	۲۳۵	(۲:۱۸۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حدیث کے لفظی معنی	دوم	۴۳۶	(۲:۷۷)
حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟	سوم	۱۷۹	(۲:۱۸۰)
حرام اور حلال کا نظریہ	سوم	۱۴۰	(۲:۱۷۲)
حرام چیزوں کی فقہی فہرستیں	سوم	۱۴۸	(۲:۱۷۳)
حرام چیزوں کی قرآنی فہرست	سوم	۱۴۳	(۲:۱۷۳)
حرام مال سے اجتناب	سوم	۲۰۳	(۲:۱۸۶)
حرث و نسل کی ہلاکت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵)
حرکت۔ زندگی کا غیر متحرک ہو جانا، عذاب ہے۔	اول	۱۹۰	(۲:۷)
حرمت کے مہینوں کی پابندی	سوم	۲۸۱	(۲:۱۹۴)
حزب اللہ غالب آکر رہیں گے۔	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
حزب اللہ و حزب الشیطان	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
حزقی ایل۔ نبی کا خواب	دوم	۱۶۱	(۲:۴۰)
حسد و انتقام کا جذبہ	دوم	۱۰۹	(۲:۳۴)
حسن، حسنات۔ اعمال حسنہ	دوم	۲۸۹	(۲:۵۸)
الاسماء الحسنیٰ	سوم	۱۳۷	(۲:۱۶۸)
حسن کارانہ انداز سے بات چیت	دوم	۳۵۰	(۲:۸۳)
حضانت (بچہ کس کی تحویل میں رہے)	سوم	۴۱۲	(۲:۲۳۷)
حق۔ خدا حق ہے۔ قرآن حق ہے۔ اسلام دین الحق ہے۔ اعمال الحق ہے	دوم	۱۹۵	(۲:۴۲)
حق کا مفہوم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
حق کے معنے	دوم	۱۹۵	(۲:۴۲)
(کتمانِ حق)	دوم	۲۰۱	٫٫
حق و باطل کی کشمکش	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)
حقوق اللہ اور حقوق العباد	اول	۱۱۰	(۲:۳)
حقوق اور ذمہ داریاں	اول	۳۵۴	(۲:۲۹)
حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق	اول	۳۵۴، ۳۵۵	(۲:۲۹)
حقوق و فرائض	سوم	۱۶۵	(۲:۱۷۷)
حکم اور قانون میں فرق	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۳)
حکمت اور کتاب۔ قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
حکمت اور قوت کا امتزاج	سوم	۲۸۳	(۲:۲۰۹)
حکومت (اور کتاب و نبوت) انعاماتِ خداوندی سے ہیں	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
حکومت جب منافقین کے ہاتھ میں آجائے۔	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴-۲۰۵)
حکومتِ خداوندی سے مراد کتاب اللہ کی حکمرانی ہے	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
حکومت کا غلط نظام فساد ہے	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵)
حلالہ	سوم	۳۹۴	(۲:۲۳۰)
حلال اور طیب رزق	اول	۲۹۴، ۳۰۵	(۲:۲۲)
(نیز دیکھئے عنوان رزق)			

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حملِ امانت کا مفہوم	دوم	۳۹	سرگزشتِ آدم
حمد اور علوم کائنات	اول	۵	(۱:۱)
حمد کا تفصیلی مفہوم	اول	۳	(۱:۱)
حنیف کا مفہوم	سوم	۷۱	(۲:۱۳۵)
حوادث ارضی وسماوی اور ان سے حفاظت	اول	۲۹۲	(۲:۲۱)
حواریانِ حضرت عیسیٰؑ کی مدافعت	دوم	۳۹۶	(۲:۱۰۲)
حوروں کا مفہوم	اول	۳۳۹	(۲:۲۵)
حیاتِ آخرت	اول	۱۴۹	(۲:۴)
حیات بعد الممات کی اہمیت	اول	۳۴۹	(۲:۲۸)
حیات وممات کا مفہوم	اول	۳۵۰	(۲:۲۸)
خ			
خاسرونامراد کون ہیں؟	اول	۳۴۵	(۲:۲۷)
ختم اللہ علیٰ قلوبھم کا مفہوم	اول	۱۸۵	(۲:۷)
ختمِ نبوت سے تکمیلِ وحی	اول	۲۴	(۱:۲)
	دوم	۳۶۴	(۲:۸۷)
	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
خدا۔ دیکھئے عنوان "اللہ"			
خدا، انسانی اعمال کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے؟	اول	۱۸۴	(۲:۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
خدا زمان ومکان کی نسبتوں سے بلند ہے	سوم	۱۷	(۲:۱۱۵)
خدا کا غلط تصور ۔ بادشاہ کا سا	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ	دوم	۲۷۶	(۲:۵۵)
	سوم	۲۲	(۲:۱۱۸)
خدا کے ہاں بیٹا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کی بیوی نہیں	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)
خدع کا مفہوم	اول	۲۰۴	(۲:۹)
خشیت کے معنے	دوم	۳۳۳	(۲:۷۴)
خلافت (دیکھئے "استخلاف فی الارض")			
خلافتِ آدم کا مفہوم	دوم	۶۴	(بابِ اول)
خلافتِ ارضی ۔ بنی اسرائیل کے لئے	دوم	۲۸۵	(۲:۵۸)
خلق ۔ عالمِ خلق	اول	۲۷۲	(۲:۲۰)
	"	۲۸۳	(۲:۲۱)
خلیفۃ اللہ کا غلط عقیدہ	دوم	۶۴	(۲:۳۰)
خمر	سوم	۳۱۷	(۲:۲۱۹)
(لحم) خنزیر سے متعلق بحث	سوم	۱۴۶	(۲:۱۷۳)
خودی (انسانی ذات)	اول	۱۱	(۱:۱)
خوشنودیٔ باریتعالیٰ کا غلط تصور	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
خوف وحزن خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۴	(۲:۷)
خوف وحزن سے مامونیت	دوم	۱۳۳	(۲:۳۸)
خوفِ خدا کا صحیح مفہوم	دوم	۱۸۰	(۲:۴۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
خیر و شر کا مسئلہ	اول	۲۵۰	(۲:۱۶)
	,,	۲۹۵	(۲:۱۹)
خیر و شر — ان کا مفہوم	دوم	۲۷	(۲:۳۰)
خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر نہیں	دوم	۳۸	تمہید سرگزشت آدم (۲۱۳۰)
د			
درجات و درکات کا معنوی فرق	اول	۲۰۲	(۲:۸)
درود کا مفہوم	سوم	۱۱۳	(۲:۱۵۷)
دعا کا مفہوم	اول	۳۸	(۱:۴)
دعا کا تفصیلی مفہوم	سوم	۲۰۴	(۲:۱۸۶)
دعا کا ضمنی مفہوم	سوم	۱۱	(۲:۱۱۴)
دعائیں — مومنین کی	سوم	۴۹۴	(۲:۲۸۶)
دلائل — قانون اور شمشیر کا باہمی تعلق	سوم	۱۵۳	(۲:۱۷۶)
دنیا اور آخرت دونوں میں حصہ	اول	۱۵۰	(۲:۴)
	سوم	۲۵۵	(۲:۲۰۰)
"دنیا کے مقابلے میں آخرت" کا مفہوم	اول	۲۵۳	(۲:۱۶)
	سوم	۲۵۵	(۲:۲۰۰-۲۰۱)
دنیا میں ذلیل قوم آخرت میں بھی ذلیل ہوگی	دوم	۱۱۱	(۲:۳۵)
دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج	اول	۱۴۹	(۲:۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
دنیاوی مفادات کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں	اول	۲۷۱	(۲:۲۰)
دو ٹوک بات کرو	دوم	۴۳۰	(۲:۱۰۴)
(زندگی کا) دَوری تصور	اول	۴۴	(۱:۵)
دوستداری کے تعلقات (مغضوب علیہ سے)	اول	۵۹	(۱:۷)
دولت جمع کرنے کی ممانعت	دوم	۲۰۸	(۲:۷۳)
دولت مند طبقہ اپنے آپ کو عقلِ کل کا مالک سمجھتا ہے	اول	۲۴۶	(۲:۱۳)
الدین — خارجی کائنات میں	اول	۲۹	(۱:۳)
,, — انسانی دنیا میں	,,	,,	,,
(یوم) الدین کی خصوصیات	اول	۳۲	,,
دین — کتاب اللہ کی حکمرانی کا نام ہے	اول	۳۰	,,
دین میں اکراہ نہیں	اول	۴۲	(۱:۵)
	سوم	۲۷۸	(۲:۱۹۰-۹۴)
	,,	۴۳۹	(۲:۲۵۶)
الدین، مذہب میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے — ظواہر کو مقصود بالذات سمجھ لینے سے — تغیر پذیر جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے سے	اول	۳۴	(۲:۳)
دین کی سب سے زیادہ مخالفت	دوم	۱۸۸	(۲:۴۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے			
دین، قرآنِ خالص کی اطاعت کا نام ہے	دوم	۱۸۹	(۲:۴۱)
دین - اجتماعی نظام کا نام ہے	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
دین کا آخرالامر غلبہ	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
دین - یہودیت اور عیسائیت میں قومی تھا۔ قرآن نے اسے عالمگیر قرار دیا۔	دوم	۳۰۵	(۲:۶۱)
دین فروشی	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
دین کے نظام کی تکمیل تدریجاً ہوتی ہے	دوم	۳۶۲	(۲:۸۵)
دین تمام کا تمام قرآن مجید کے اندر ہے	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۸)
دین کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے	دوم	۳۶۰	(۲:۸۵)
الدین، شروع سے اخیر تک ایک ہی تھا	سوم	۴	(۲:۱۱۳)
دین میں آمیزش	"	۵	(")
دین اللہ کا ہوتا ہے۔ اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں کرنی چاہیئے	سوم	۷۰	(۲:۱۳۳)
دین کے بنیادی مقاصد	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)
دین میں کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں۔	سوم	۲۶۵	(۲:۱۹۳)
ذ			
(انسانی) ذات	اول	۱۱-۱۲	(۱:۱)
	"	۱۶۲	(۲:۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ذاتِ انسانی، نفع نقصان کا حقیقی معیار ہے۔	اول	۲۵۳	(۲:۱۶)
(انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی) ذات پر مرتب ہوتا ہے	دوم	۲۲۸	(۲:۴۷)
ذات کی نشوونما، وحی کی رو سے	اول	۲۳	(۱:۲)
	"	۲۵۳	(۲:۱۶)
(صفاتِ خداوندی، انسانی) ذات کی نشوونما کا معیار ہیں	اول	۱۱-۱۲	(۱:۱)
ذات میں اعتدال و توازن	اول	۳۸	(۱:۴)
(انسانی) ذات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنے والے	سوم	۶۵	(۲:۱۲۹)
ذبح ابناء کا مفہوم	دوم	۱۲۳	(۲:۴۰)
ذبح بقر کا واقعہ	دوم	۳۱۱	(۲:۶۷)
ذبح کرتے وقت تکبیر کا مفہوم	سوم	۲۰۲	(۲:۱۸۸)
ذرائع اور مقصد میں فرق	سوم	۱۱	(۲:۱۱۴)
ذکر کا مفہوم	دوم	۴۵-۴۷	(۲:۳۰)
	سوم	۱۰	(۲:۱۱۴)
	سوم	۱۰۶	(۲:۱۵۲)
ذلت کی زندگی، آخرت میں بھی عذاب کا موجب ہوگی	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)
ذلت کے اسباب	سوم	۱۹۱	(۲:۱۷۷)
ذلت و پستی (غضبِ خداوندی)	اول	۵۵	(۱:۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ذلت وپستی (غضب خداوندی)	اول	۱۹۱	(۲:۷)
ذمہ داریوں اور حقوق کا باہمی تعلق	سوم	۱۰۵	(۲:۱۵۲)
ذی القربیٰ سے حسنِ سلوک	دوم	۳۴۹	(۲:۸۳)

ر

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
راجعون (الیہ) کا مفہوم	اول	۲۶۳	(۲:۱۸)
	؍؍	۴۰	(۱:۵)
	اول	۳۵۰	(۲:۲۸)
رام چندرجی کا اتباع نہیں۔	دوم	۳۴۸	(۲:۸۳)
اسوۂ ابراہیمؑ کا اتباع			
رب اور ربوبیت کا مفہوم	اول	۱۶	(۱:۱)
(نظام) ربوبیت کی خصوصیات	سوم	۱۵۴	(۲:۱۷۷)
ربوٰ (سرمایہ داری) کا نظام کفر ہے	اول	۱۷۳	(۲:۶)
ربوٰ کی تفصیلی بحث	سوم	۴۷۴	(۲:۲۷۴)
الرّجال قوّامون علی النساء کی تشریح	سوم	۳۶۳	(۲:۲۲۱)
رجز کے معنی ضعف یا اضمحلال	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
رحمٰن اور رحیم میں فرق	اول	۲۰	(۱:۲)
رحمت کے معنی	اول	۲۰	(۱:۲)
رحم کا صحیح مفہوم۔ عیسائیت کی غلط نگہی	اول	۲۵	(۱:۲)
رزاقیت	اول	۲۸۲	(۲:۲۱)
رزق اللہ ہی رزق کریم اور رزقِ حلال ہو سکتا ہے۔	اول	۲۹۶	(۲:۲۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
	اول	۳۵۴	(۲:۲۹)
رزق اور اس کی تقسیم	اول	۱۰۵	(۲:۳)
	؍؍	۳۳۶	(۲:۱۱-۱۲)
رزقِ حلال وطیب	اول	۳۰۵	(۲:۲۲)
رزق کا قرآنی مفہوم	اول	۱۰۵	(۲:۳)
رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۴	(۲:۷)
رزق کی فراوانیاں — جنتِ آدم کی خصوصیات	دوم	۱۱۱	(۲:۳۵)
رزق کی اہمیت	سوم	۶۱	(۲:۱۲۶)
رزق کے ساتھ طیب کی شرط	اول	۲۸۳	(۲:۵۷)
رزق کے لئے دعائے ابراہیمؑ	سوم	۶۱	(۲:۱۲۶)
رزقِ کریم کا انتظام	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)
رسمی عبادات بے معنی اور بے نتیجہ ہوتی ہیں	دوم	۵۴	باب اول
رسول — ہر رسول کا اعلان کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں	دوم	۱۹۳	(۲:۱۴۱)
(ہر) رسول کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
رسول غالب آکر رہیں گے۔ اس کا مفہوم	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
رسول کی وفات کے بعد غلبۂ دین	دوم	۳۰۶	(۲:۶۱)
(خود) رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا۔	سوم	۴۹۰	(۲:۲۸۵)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رسول اللہ کی حیات طیبہ بطور اسوۂ حسنہ	اول	۲۰۲	(۲:۸)
رسول اللہ نے جو معجزانہ کارنامے سرانجام دیئے ان میں فوق الفطرت عناصر کا دخل نہیں تھا	اول	۲۰۲	(۲:۸)
رسول اللہ کی دو ـــ نبوت اور بشریت	اول	۲۰۲	(۲:۸)
رسول اللہ کے خلاف (معاذ اللہ) الزام تراشیاں	اول	۲۱۲	(۲:۹)
رسول اللہ خدا کے عبد تھے	اول	۳۰۸	(۲:۲۳)
رسول اللہ دعوئے نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے	اول	۳۲۱	(۲:۲۴)
رسول اللہ کی سیرت حضور کا معجزہ تھی	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
رسول اللہ پر قریش تو ایمان لے آئے اہل کتاب نہ لاتے	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
رسول اللہ کی مالی حالت	دوم	۲۱۰	(۲:۴۳)
رسول اللہ کے لئے شافع یا شفیع کے الفاظ نہیں آئے۔ شاہد یا شہید کے الفاظ آئے ہیں	دوم	۲۳۷	(۲:۴۸)
رسول اللہ دل سے چاہتے تھے کہ لوگ ایمان لے آئیں	دوم	۳۳۴	(۲:۷۵ از ۱۱۹)
رسول اللہ نبوت سے پہلے اَن پڑھ تھے بعد میں ایسے نہیں رہے تھے	دوم	۳۳۸	(۲:۷۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رسول اللہ کی دعا ـ رب زدنی علما	دوم	۳۶۸	(۲:۸۸)
رسول اللہ کی بعثت کے متعلق کتب سابقہ میں ذکر	دوم	۳۷۹	(۲:۸۹)
رسول اللہ پر (معاذ اللہ) جادو	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۳)
رسول اللہ کی یتیمی کی حالت	سوم	۳۲۹	(۲:۲۲۰)
رسول اللہ کی ازواجِ مطہرات	سوم	۳۴۸	(۳:۳۲۱)
رسولوں کا قتل	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)
رسولوں کے متعلق لانفرق اور فضلنا بعضھم علی بعض کا مفہوم	سوم	۳۶	(۲:۱۲۴)
	سوم	۷۳	(۲:۱۳۶)
	سوم	۴۳۷	(۲:۲۵۳)
رشد	سوم	۲۰۸	(۲:۱۸۶)
	"	۴۴۰	(۲:۲۵۶)
رشوت کی ممانعت	سوم	۲۰۲	(۲:۱۸۸)
رضاجوئی باریتعالیٰ سے کیا مراد ہے	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
رضاعت	سوم	۴۱۰	(۲:۲۳۳)
رضاعی ماں ـ بہن سے نکاح حرام ہے	"	۳۴۳	(۲:۲۲۱)
رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا مفہوم	سوم	۲۶۰	(۲:۲۰۷)
رعد	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
رقبۃ (فی الرقاب) غلامی کے خلاف جدوجہد۔ تحریر رقبۃ	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رکوع کا مفہوم	دوم	۲۱۱	(۲:۴۳)
رمی الجمار (حج میں تین شیطانوں کو پتھر مارنا)			دیکھو حج
روایات اور پیش گوئیاں	دوم	۳۵۷	(۲:۸۵)
روایات کی رو سے قصہ آدم		۳۹-۴۴	(۲:۳۹) کے بعد
روح القدس	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷-۹۸)
روح القدس کا ایک مفہوم	دوم	۳۶۵	(۲:۸۷)
روزوں (صیام) کے احکام	سوم	۱۸۴ ۲۲۶	(۲:۱۸۳)
رہن باقبضہ	سوم	۴۸۸	(۲:۲۸۳)
ریب اور شک میں فرق	اول	۷۳	(۲:۲)
ریاکاری	اول	۲۱۳	(۲:۹)
ز			
زاویہ نگاہ کا فرق	اول	۳۴۲	(۲:۲۶)
(ایتائے) زکوٰۃ ۔ دین کا اہم ستون	اول	۱۰۵	(۲:۳)
(ایتائے) زکوٰۃ ۔ صرف اپنا مال نہیں	سوم	۱۶۲	(۲:۱۷۷)
،، کی تاکید	دوم	۴۳۶	(۲:۱۱۰)
زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم اور قرآنی مفہوم	دوم	۲۰۶	(۲:۴۳)
زکوٰۃ کے متعلق ایک وضعی روایت	،،	۲۰۹	،،
زکوٰۃ ۔ رسول اللہ نے مروجہ زکوٰۃ نہیں دی	،،	۲۱۰	،،
زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
زمین پر ذاتی ملکیت ۔ رسول اللہ کے زمانے ہی میں کم ہو گئی تھی	اول	۳۰۶	(۲:۲۲)
زمین کے فراش ہونے کا اعجاز	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
زمین کے وارث صالحین ہوں گے ۔ ابدی قانون	دوم	۲۹۴	(۲:۵۹)
زندگی اور ہلاکت، دلائل و براہین کی رو سے	اول	۱۹۶	(۲:۷)
زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ سائنسدانوں کا اعترافِ عجز	اول	۲۸۵	(۲:۲۱)
زندگی کی نمود کے متعلق قرآنی اشارات	اول	۲۸۹	(۲:۲۱)
س			
(اول) سابقون الاولون کا مقام بلند	اول	۹۴	(۲:۳)
ساحرین دربارِ فرعون کا ایمان	دوم	۲۵۰	(۲:۵۰)
سازشیں اور سرگرمیاں ۔ منافقین کی	اول	۲۱۱	(۲:۹)
ساکن و منجمد (ہونا زندگی کا) ۔ عذاب ہے	اول	۱۹۰	(۲:۷)
سامری کون تھا؟	دوم	۲۵۶	(۲:۵۱)
سائل سے مراد	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
سائیکولوجی کی تحقیق ۔ سائنس آف ہسٹری ۔ نفس انسانی کے متعلق	دوم	۱۵۰	(۲:۴۰)
	دوم	۳۰	باب اول
سبا اور حضرت سلیمانؑ	اول	۲۴	(۱:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سبت کا واقعہ	دوم	۳۰۷	(۲:۶۵)
سبح (تسبیح)	دوم	۷۳	(۲:۳)
سبع سموٰت کے معنی	اول	۳۵۲	(۲:۲۹)
	سوم	۴۶۳	(۲:۲۶۱)
سبل السلام کے معنی	اول	۷۴	(۱:۵)
سبیل (ابن السبیل)	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
(فی) سبیل اللہ کا مفہوم	سوم	۲۷۴	(۲:۱۹۳)
سٹیٹ — دورِ حاضر کا بت — باطل خدا	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
سجدہ کا قرآنی مفہوم۔ اور ہمارے رسمی سجدے	دوم	۹۸	(۲:۳۴)
سجدۂ ملائکہ	دوم	باب اول	ص ۹۸، ۶۸
سحر — (جادو) کی حقیقت	دوم	۴۰۴	(۲:۱۰۲)
سرمایہ دارانہ نظام — پہلے لوگوں کو محتاج بنا دینا پھر ان کی امداد کے لئے خیراتی کام کرنا — یہ فریبِ نفس ہے۔	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
سرمایہ داری کا نظام اور قرآن	اول	۱۰۸	(۲:۲)
	اول	۱۷۳	(۲:۶)
	اول	۲۳۷	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۳۲۵	(۲:۲۱۹)
	سوم	۴۷۸	(۲:۲۷۵)
سزا اور جزا کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۳۱	(۲:۴۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سسرالی رشتے	سوم	۳۶۹	(۲:۲۲۱)
سفاہت کے معنی	اول	۲۴۵	(۲:۱۳)
سقف محفوظ — سماء	اول	۲۹۵	(۲:۲۲)
سلوٰی	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)
(حضرت) سلیمانؑ کے خلاف تورات کی یاوہ گوئی اور قرآن کی مدافعت	دوم	۳۹۵	(۲:۱۰۲)
— لیکن ہماری کتب تفاسیر میں	″	۳۹۷	(۲:۱۰۲)
سماء کو بناء اور سقفِ محفوظ بنایا	اول	۲۹۵	(۲:۲۲)
سمندر پار کرنا — بنی اسرائیل کا	دوم	۲۴۵	(۲:۵۰)
سنتِ ابراہیمیؑ (قربانی)	سوم	۲۵۰	(۲:۱۹۹)
سنت اللہ — قانونِ مکافاتِ عمل	دوم	۱۵۳	(۲:۴۰)
سوٗد (دیکھیے ربوٰ)			
سوٗر (دیکھیے خنزیر)			
سورۃ کے معنی	اول	۳۱۶	(۲:۲۴)
سوشلزم	اول	۱۱۷	(۲:۳)
″ — فسق ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)
سیرت — نبی کی سیرت اس کے دعوٰی کی صداقت کی دلیل۔	اول	۹۲	(۲:۳)
سیکولرازم اور اسلام	اول	۱۳	(۱:۱)
(مذہب سیکولرازم ہوتا ہے)	اول	۳۴	(۱:۳)
سیکولرازم میں آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔	اول	۱۴۶	(۲:۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سیکولرازم ۔ خدا کا انکار یا اُسے محض کائناتی خدا ماننا	اول	۳۰۱	(۲:۲۲)
سیکولرازم ۔ انسانی ذات سے انکار	دوم	۳۱	باب اول
〃 ۔ دو خداؤں کا عقیدہ	دوم	۱۶۵	(۲:۴۰)
سیکولرازم کے خلاف ۔ حضرت عیسیٰؑ کا جہاد	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)
سیکولرازم فسق ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)
سیکولرازم ۔ پاکستان میں	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
〃 ۔ مذہب کے نقاب میں	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴)
〃 ۔ کے تحت حکومت کا انجام	〃	۲۸۷	(۲:۲۰۹)
سیکولرازم کا نظریہ کائنات	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
سیآت کے معنی	سوم	۱۳۷	(۲:۱۶۸-۶۹)
ش			
(رسول اللہ کے لئے) شاہد یا شہید کا لفظ آیا ہے	دوم	۲۳۶	(۲:۴۸)
شب بارات	سوم	۱۹۵	(۲:۱۸۵-۸۸)
شجر ۔ جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا ۔ سے کیا مراد تھی؟	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)
شخصیت پرستی کی زنجیروں کو توڑ دیا گیا۔	دوم	۹۸	(۲:۳۴)
شراب (دیکھئے خمر)			

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
شرک (ثنویت شرک ہے)	اول	۵۷	(۱:۷)
شرک کیوں ظلم عظیم ہے	دوم	۱۰۳	(۲:۳۴)
شرک ۔ قرآنِ خالص کے ساتھ شخصیتوں کو ملا دینا	دوم	۱۹۰	(۲:۴۱)
شرک، تفرقہ سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
شرک سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے یہ ظلم عظیم ہے۔	دوم	۲۶۲	(۲:۵۱)
شرک سے بزدلی	دوم	۲۷۷	(۲:۵۵)
شریعت سازی اور دین فروشی	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
شعائر (محسوس مراسم) بھی ضروری ہیں	اول	۱۳۹	(۲:۳)
	سوم	۱۲۲	(۲:۱۵۸)
شعائر کا مفہوم	سوم	۱۰	(۲:۱۱۴)
شعور کا قرآنی مفہوم	اول	۲۰۷	(۲:۹)
شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ	دوم	۲۳۵	(۲:۴۸)
شفاعت کا باطل عقیدہ	دوم	۲۳۳	〃
شفاعت کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۳۴	〃
شفیع یا شافع کا لفظ رسول اللہ کے لئے نہیں آیا، شاہد یا شہید کا لفظ آیا ہے	دوم	۲۳۷	〃
شک اور ریب میں فرق	اول	۷۳	(۲:۲)
شکر کا مفہوم	دوم	۲۶۳	(۲:۵۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
شمسی کیلنڈر	سوم	۲۳۰	(۲:۱۸۹)
شمشیر کا مقام دین میں	سوم	۱۵۳	(۲:۱۷۷)
	،،	۲۷۷	(۲:۱۹۳)
شہادت کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۳	(۲:۲۸۲)
شہداء	اول	۲۵۵	(۲:۱۶)
،، (مقتولین فی سبیل اللہ)	سوم	۱۱۰	(۲:۱۵۴)
،، کے متعلق افسانے	سوم	۱۱۱	(۲:۱۵۴)
شہر الحرام	سوم	۲۲۹	(۲:۱۸۹)
شیطان	دوم	۵۰	(۲:۳۰)
ص			
صاعقہ	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
صبر	دوم	۲۲۲	(۲:۴۵)
صبغۃ اللہ کا مفہوم	سوم	۷۴	(۲:۱۳۸)
صحابہ کا ایمان اور مقام	اول	۳۱۳	(۲:۲۳)
،، سب مومن تھے		۲۲۵	(۲:۹)
صدقات کا مفہوم	سوم	۴۷۲	(۲:۲۷۲)
صدفات کی تفہیم میں منافقین کی الزام تراشیاں	اول	۲۱۲	(۲:۹)
صراطِ مستقیم ـ ایک عظیم حقیقت	اول	۴۴	(۱:۵)
(زندگی کا سفر دَوری نہیں صراطی ہے	،،	۴۴	(،،)
(خدا خود) صراطِ مستقیم پر ہے	،،	۴۷	(،،)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
صفا اور مروہ	سوم	۱۲۱	(۲:۱۵۸)
صفاتِ خداوندی ـ اصل سوال انہی کا ہے	سوم	۴۳۳	(۲:۲۵۵)
صلوٰۃ	اول	۲۵۵	(۲:۱۶)
صلوٰۃ ـ اقامتِ صلوٰۃ دین کا بنیادی گوشہ	اول	۹۷-۱۰۴	(۲:۳)
صلوٰۃ کے عمومی معانی	،،	،،	(،،)
الصلوٰۃ ـ اسلامی نظامِ مملکت	،،	،،	(،،)
(نماز اور صلوٰۃ میں فرق)	،،	۱۲۲	(،،)
الصلوٰۃ اور معاشیات	،،	۱۱۸	(،،)
صلوٰۃ فریضۂ موقت ہے	اول	۱۲۴	(۲:۳)
صلوٰۃ کی جزئیات قرآن میں نہیں دی گئیں	،،	۱۲۵	(۲:۳)
(بلا سمجھے) صلوٰۃ یا تلاوتِ قرآن مجید	سوم	۳۴۲	(۲:۲۱۹)
(اقامتِ) صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کی تاکید	دوم	۴۳۶	(۲:۱۱۰)
صلوٰۃ الوسطیٰ	سوم	۴۱۲	(۲:۲۳۸)
صمٌ بکمٌ عمیٌ	اول	۲۶۳	(۲:۱۸)
صوم (صیام) کے احکام	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۳)
صوم کی غایت	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۷)
صیام ـ بطور کفارہ	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ض			
ضبطِ ولادت	سوم	۳۷۰-۷۷	(۲:۲۲۳)
ضرار (مسجد) ــ تفرقہ کی بنیاد	اول	۱۷۳	(۹ : ۲)
	"	۲۱۷	(۹ : ۲)
ضلالت کا مفہوم	"	۵۹	(۷ : ۱)
ضالین کا اتباع مت کرو	"	۶۰	(۷ : ۱)
ط			
طاغوت سے فیصلے کرانا شیوہ منافقین	اول	۲۱۵	(۹ : ۲)
(کفر) بالطاغوت، ایمان باللہ کی اولین منزل ہے	سوم	۷۲	(۲:۱۳۵)
طاغوت کی راہ میں جنگ	سوم	۲۷۴	(۲:۱۹۳)
طاغوت سے کفر	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
(حضرت) طالوت کا انتخاب	سوم	۴۱۹	(۲:۲۴۶)
طبقاتی تقسیم خلافِ قرآن ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
طبقاتی کشمکش ــ خطرناک حد تک	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
طغیان کا مفہوم	اول	۲۴۸	(۲:۱۵)
طلاق سے متعلق احکام	سوم	۳۸۵	(۲:۲۲۵)
طواف کا مفہوم	سوم	۳۰۳	(۲:۲۱۵)
طور سے مراد	دوم	۳۰۶	(۲:۶۳)
طیب رزق کا مفہوم	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
طیب رزق کا مفہوم (نیز دیکھئے عنوان "رزق")	اول	۳۰۵	(۲/۲۲)
ظ			
ظہار ــ بیویوں کو ماں کہہ دینا	سوم	۳۸۲	(۲:۲۲۴)
ظلمات کے معنی	اول	۲۶۱	(۲:۱۷)
ظلمِ عظیم ــ شرک کیوں ظلمِ عظیم ہے	دوم	۲۶۱	(۲:۵۱)
ظواہر اور غایت کا تعلق	"	۱۲۳	(۲ : ۳)
ظواہر کو ترک کر دینے کا نتیجہ	"	۱۲۳	(۲ : ۳)
ظواہر کو مقصود و منتہٰی سمجھ لینے کا نتیجہ	"	۱۲۳	(۲ : ۳)
ــ اس سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے	"	۱۲۴	(۲ : ۳)
ع			
عاجلہ مفادات سب کے لئے کھلے ہیں	اول	۲۷۱	(۲:۲۰)
عادات و عمرانیات کے اثرات کا غلط عقیدہ	دوم	۴۶	(۲:۳۰)
عاکفین کا مفہوم	سوم	۵۸	(۲:۱۲۵)
	سوم	۱۹۴	(۲:۱۸۷)
عالمِ خلق و امر	اول	۲۸۳	(۲ : ۲۱)
عالمین کا مفہوم	"	۱۸	(۱ : ۱)
(حضرت) عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
عائلی قوانین	سوم	۳۹۴	(۲:۲۳۰)
عبادت کا صحیح مفہوم	اول	۳۵	(۱:۴)
عبادت اپنی آزاد مملکت میں ہی ہوسکتی ہے	"	۳۶	(۱:۴)
عبد۔ رسول اللہ خدا کے عبد تھے	"	۳۰۸	(۲:۲۳)
عبدیت کا مقام ۔ شرفِ انسانیت	دوم	۱۰۳	(۲:۳۴)
عبوری دور سے متعلق احکام	دوم	۳۵۲	(۲:۸۵)
عہد اللہ سے مراد	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)
عہد فراموشی	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)
(ایفائے) عہد کا مفہوم	سوم	۱۹۳	(۲:۱۷۷)
عدالتی سزا کو بھی عذاب کہا گیا ہے	اول	۱۹۹	(۲:۷)
عداوت کی لعنت	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
عدت	سوم	۴۰۶	(۲:۲۲۸)
عدل اور رحم میں تطابق	اول	۲۶	(۱:۲)
عدل و احسان کا حکم	دوم	۲۹۱	(۲:۵۸)
عدل کے ایک معنی ۔ کچھ دے دلا کر سزا سے بچ جانا	دوم	۲۳۸	(۲:۴۸)
عذاب کے معنی	اول	۱۸۸	(۲:۷)
عذاب کی شکلیں ۔ بنی اسرائیل پر	دوم	۲۹۹	(۲:۶۱)
عربی زبان کی وسعت	اول	۷۳	(۲:۲)
عربی زبان کی کتاب	اول	۴۲۰	(۲:۴۴)
عرس	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
عرشِ خداوندی	دوم	۶۷	باب اوّل
عزل (اس کی تفسیر از روئے روایات)	سوم	۳۷۴	(۲:۲۲۳)
عزم کی کمزوری (آدم میں)	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)
عزیر کون تھا؟	دوم	۲۵۴	(۲:۵۱)
عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)
عصا کے معنی	دوم	۲۴۷	(۲:۵۰)
عفو	دوم	۲۶۲	(۲:۵۲)
العفو کا مفہوم	سوم	۳۳۶	(۲:۲۱۹)
عقبہ ۔ دین، العقبہ ہے	دوم	۲۲۳	(۲:۴۵)
العقبہ کا مفہوم (العقبہ کے معنی)	سوم	۳۳۳	(۲:۲۲۰)
والعقبۃ ۔ دین کی گھاٹی کیا ہے؟	سوم	۱۵۹	(۲:۱۷۷)
عقل و فکر سے کام نہ لینے والے	اول	۵۵	(۱:۷)
(امور آخرت میں بھی) عقل و فکر	سوم	۳۲۷	(۲:۲۱۹)
عقل کا تجرباتی طریق	اول	۱۱۵	(۲:۳)
" " "	"	۲۵۸	(۲:۱۷)
عقل تنہا زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی	"	۲۶۰	(۲:۱۷)
علماء ۔ اسلام میں علماء کا کوئی الگ گروہ نہیں	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
علماء کون ہیں؟	اول	۶	(۱:۱)
	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
(ہمارے) علماء کے علم اور کردار کے متعلق	دوم	۳۶۹	(۲:۸۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مشہور علماء کی شہادت۔ امام غزالی، مفتی محمد عبدہ۔ مولانا آزاد۔ اور علامہ اقبالؒ وغیرہ کی تنقیدات۔	دوم	۳۶۹	(۲: ۸۸)
علم حاصل کرنے اور اسے بڑھاتے رہنے کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔	دوم	۳۶۸	(۲: ۸۸)
علو فی الارض، بغیر الحق منع ہے	اول	۲۳۴	(۲: ۱۱-۱۲)
علیحدگی۔ مخالفین سے علیحدگی بھی حسن کارانہ انداز سے اختیار کرو	دوم	۴۳۵	(۲: ۱۰۹)
عمرہ	سوم	۱۰۴	(۲: ۱۵۲)
"	"	۲۲۸	(۲: ۱۸۹)
عمل اور فعل میں فرق	دوم	۳۴۲	(۲: ۸۰-۸۲)
عورت کی حیثیت۔ عیسائیت میں	دوم	۱۱۴-۱۱۵	(۲: ۳۶)
" " ۔ ہماری وضعی روایات اور تفاسیر کی رو سے	"	"	(")
" " ۔ قرآن کی رو سے	"	"	(")
(شریف) عورتوں سے چھیڑ چھاڑ۔ سنگین ترین جرم ہے	اول	۲۱۸	(۲: ۹)
(ایک مرد کے عوض دو عورتوں کی گواہی	سوم	۴۸۵	(۲: ۲۸۲)
"عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں" کا مفہوم	سوم	۳۷۷	(۲: ۲۲۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(حضرت) عیسیٰؑ اور یہودی پیشوائیت	دوم	۲۹۷	(۲: ۶۰)
" کے انقلاب آفریں وعظ	دوم	۱۹۳	(۲: ۴۰)
" کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی تردید	دوم	۳۴۳	(۲: ۸۳)
عیسائیت اور جنگ	دوم	۷۸	(۲: ۳۰)
عیسائیت میں کفارہ حضرت مسیحؑ کا عقیدہ	دوم	۲۳۹	(۲: ۴۸)
غ			
غار کا واقعہ۔ رسول اللہ کی ہجرت کے دوران	دوم	۲۴۴	(۲: ۵۰)
غضب خداوندی سے کیا مراد ہے	اول	۵۴	(۱: ۷)
غلاموں کو آزاد کرنا یا کرانا دین کی غایت ہے	سوم	۳۲۸	(۲: ۲۲۰)
غلامی کا مسئلہ	اول	۲۶۰	(۲: ۱۷)
"	دوم	۳۵۸	(۲: ۸۵)
غلامی عذاب ہے	دوم	۱۹۰	(۲: ۴۰)
غلامی میں پختگی۔ بنی اسرائیل کی	دوم	۲۶۲	(۲: ۵۵)
غلامی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی امداد	سوم	۱۵۸	(۲: ۱۷۷)
غلبہ۔ خدا اور رسول کا۔ دین حقہ کا	دوم	۳۰۲	(۲: ۶۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
غلطی کا اعتراف، اصلاح کے امکانات روشن کر دیتا ہے	دوم	۱۰۱	(۲:۳۴)
ــــ اس کی ذمہ داری قبول نہ کرنا ابلیسیت ہے	"	"	"
غلو ــ رسولوں کو خدا اور علماء و مشائخ کو رسول بنا دینا	دوم	۱۹۳	(۲:۴۱)
غلو فی الدین کفر ہے	دوم	۱۹۳	(۲:۴۱)
غوایت ــ گمراہی	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
غیب کا مفہوم ــ ایمان بالغیب	اول	۹۰	(۲:۳)
غیب و شہود کائنات	دوم	۹۵	(۲:۳۱)

ف

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(سورۃ) فاتحہ کا خلاصہ	اول	۶۴	(۱:۱-۷)
فاتحین کا مفتوحہ علاقوں میں داخلہ	دوم	۲۸۶	(۲:۵۸)
فاسق کسے کہتے ہیں	اول	۳۴۳	(۲:۲۶)
فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے	دوم	۲۰۸	(۲:۴۳)
فاطر السموٰت والارض	اول	۲۸۳،۹۲	(۲:۲۱)
فالیں لینا	سوم	۳۲۴	(۲:۲۱۹)
فتنہ کے معنی	سوم	۲۷۵	(۲:۱۹۳)
فحشاء کے معنی	سوم	۱۳۶	(۲:۱۶۸-۶۹)
فراشاً ــ زمین کو فراش پیدا کیا گیا۔	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
فرعون ــ دورِ جاہلیت کا نِد	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
فرعونِ مصر	دوم	۱۵۷	(۲:۴۰)
فرعون کا ڈوبتے وقت ایمان	دوم	۲۴۹	(۲:۵۰)
فرعون کے منہ میں جبریل مٹی ٹھونس رہا تھا۔	دوم	فٹ نوٹ	"
فرعون کی لاش کا محفوظ رکھے جانا	دوم	۲۵۲	"
فرقان کے معنی	دوم	۲۶۴	(۲:۵۲)
فرقہ اہلِ قرآن کی گمراہی	اول	۱۳۵	(۲:۳)
فرقہ بندی شرک اور کفر ہے۔ خدا کا عذاب ہے	اول	۱۷۲	(۲:۶)
	اول	۱۹۳	(۲:۷)
فرقہ بندی ــ منافقین کی سازش	اول	۲۱۵	(۲:۹)
فرقہ سازی کے لئے مسجد ضرار کی تعمیر	"	"	"
فرقہ بندی ــ یہود و نصاریٰ کی باہمی فرقہ بندی اور ہم	دوم	۱۹۲	(۲:۴۱)
	دوم	۲۱۳،۲۱۸	(۲:۴۳)
	سوم	۶	(۲:۱۱۳)
فساد اور اصلاح کا مفہوم	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
فسادِ آدمیت کے اہم گوشے	اول	۲۳۱	(۲:۱۱-۱۲)
فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں	دوم	۷۶	(۲:۳۰)
فسق ــ اخلاقی پابندیوں سے دور بھاگنے کا نام ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(سیکولرازم۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ اسی جذبہ کی پیداوار ہیں)			
فضیلت کا قرآنی معیار	اول	۲۴۶	(۲:۱۴)
فطرت ۔ فطرت اللہ اور انسانی	دوم	۳۲	باب اول
فطرت کا غلط عقیدہ ۔			
فطرت کی قوتیں (ملائکہ	دوم	۶۶	باب اول
فطرت کی تسخیر	دوم	۶۸	باب اول
فطرت کے قوانین اور اشیاء کا علم	دوم	۸۲	(۲:۳۱)
فطرت کے قوانین بالحق ہیں	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
فطری حوادث اور انسانی اعمال	اول	۱۸۹	(۲:۷)
فعل اور عمل میں فرق	دوم	۳۴۲	(۲۱۸۲)
فقہ اور قرآن	سوم	۱۲۳	(۲:۱۵۹)
فلاحی مملکت بھی نظامِ سرمایہ داری کا فریب ہے	دوم	۳۵۵	(۲۱۸۵)
فؤاد اور قلب	اول	۲۰۶	(۲:۹)
(اصحاب) الفیل	سوم	۲۵۳	(۲:۱۹۹)
فیملی لائف کی اہمیت	دوم	۳۴۶	(۲۱۸۳)
ق			
قارون	اول	۱۱۴	(۲:۳)
'قالو بلیٰ' اور یوم الست کے افسانے	اول	۲۹۳	(۲:۲۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
قانونِ مکافاتِ عمل	دوم	۱۵۵	(۲:۴۰)
	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۴)
(نیز دیکھئے مکافاتِ عمل)			
قانون کی حکمرانی	اول	۷۱	(۲:۲)
قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
قانون اور حکم میں فرق	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۶)
قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔ سابقہ تاریخ سے نہیں	سوم	۴۷۹	(۲:۲۷۵)
قبلہ ۔ مرکزِ ملت ہے	دوم	۲۱۹	(۲:۴۳)
قبلہ کی تحویل کی روایات	سوم	۸۴	(۲:۱۴۲)
(تعیین) قبلہ کا مقصد	سوم	۹۰	(۲:۱۴۴)
قبلہ کی طرف رخ کر لینا مقصود بالذات نہیں۔	سوم	۱۵۵	(۲:۱۷۷)
قتال۔ (دیکھو "جنگ")			
قتلِ انبیاء و رسل	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)
قتل بغیر الحق کا مفہوم	دوم	۳۰۴	(؍؍)
قتل کا واقعہ ۔ بنی اسرائیل کا	دوم	۳۳۳	(۲:۷۳)
قدس۔ قدوس	دوم	۷۳	(۲:۳۰)
قدیر کے معنی	اول	۲۷۳	(۲:۲۰)
قادرِ مطلق کا مفہوم	اول	۲۷۴	(۲:۲۰)
قرأت کا فن	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
قرآنِ کریم حضورؐ کے زمانے ہی میں	اول	۷۲	(۲:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مرتب و مدوّن شکل میں موجود تھا			
(فرقہ اہلِ قرآن کی گمراہی	اول	۱۳۵	(۲:۳)
قرآنِ کریم ہی منزل من اللہ ہے	ر	۱۴۱	(۲:۴)
قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم نہ کرنے والے کافر ہیں	ر	۱۷۲	(۲:۶)
قرآن کی آواز کسی تک نہ پہنچنے دو. کفار کی ٹیکنیک	ر	۱۷۳	(۲:۶)
قرآن نور ہے	اول	۲۶۲	(۲:۱۷)
قرآن عالمگیر انسانیت کے لئے ہے	اول	۲۸۰	(۲:۲۱)
قرآن کافی ہے	اول	۳۱۵،۳۰۹	(۲:۲۳)
	دوم	۳۶۶	(۲:۸۷)
قرآن کا چیلنج، کہ اس جیسی کتاب لاؤ۔	اول	۳۰۸-۱۶	(ر)
قرآن — عربی زبان کی کتاب	ر	۳۲۰	(۲:۲۴)
قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
قرآن فہمی کے تین طریقے	دوم	۱۴۸	(۲:۴۰)
قرآن کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم	ر	۱۸۷	(۲:۴۱)
قرآن کی ترتیب بھی معجزہ ہے	اول	۳۱۶	(۲:۲۴)
قرآن مجید میں (معاذ اللہ) ابہام ہے (مودودی مرحوم کا عقیدہ)	دوم	۳۲۸	(۲:۷۳)
قرآن مجید کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر	دوم	۳۳۹	(۲:۷۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
قرآن مجید کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
قرآنِ خالص سے نفرت	دوم	۳۶۶	(۲:۸۷)
قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ	دوم	۳۶۶	(۲:۸۷)
قرآنِ مجید کو پڑھنا اور سننا اور اس پر عمل نہ کرنا ہمارا شیوہ ہے	دوم	۳۸۳	(۲:۹۳)
قرآنِ کریم خیر ہے — اس کا مطلب	دوم	۴۳۳	(۲:۱۰۵)
قرآن کی حکمرانی	سوم	۱۰-۹	(۲:۱۱۳)
قرآن کو حدیث منسوخ کر سکتی ہے؟	سوم	۱۷۹	(۲:۱۸۲)
قرآنِ کریم کی تفسیریں اور اس کے ترجمے کس طرح کئے گئے۔	سوم	۸۸	(۲:۱۴۲)
قرآنِ کریم بالکل واضح کتاب ہے	سوم	۱۲۴	(۲:۱۵۹)
قرآن کے باطنی معانی	سوم	۱۲۶	(۲:۱۵۹)
قرآن کا نزول — تاریخ انسانیت کا عظیم ترین انقلابی واقعہ	سوم	۱۹۰	(۲:۱۸۴)
قرآن ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ	سوم	۱۹۱	(۲:۱۸۴)
قرآن ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے.	سوم	۲۲۴	(۲:۱۸۶)
قرآن کی تلاوت سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
قرآنی اصطلاحات کا مفہوم	اول	۹۸	(۲:۳)
قرآنی تعلیم کو مسخ کرنے اور چھپانے کے طریق	سوم	۱۲۵	(۲:۱۵۹)
قربِ خداوندی	سوم	۲۲۳	(۲:۱۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(ذوی) القربیٰ کے لئے انفاق	سوم	۱۵۷	(۲: ۱۷۷)
قربانی	سوم	۲۴۴	(۲: ۱۹۹)
قربانی سے متعلق بحث	سوم	۳۳۵	(۲: ۱۸۹)
قرض حسنہ ۔ خدا کو قرض دینا	سوم	۴۱۶	(۲: ۲۴۵)
قرعہ اندازی	سوم	۳۲۴	(۲: ۲۱۹)
قریش کی مخالفت کی وجوہات	دوم	۴۳۲	(۲: ۲۰۵)
قساوت قلبی ۔ یہودیوں کی	دوم	۳۳۰	(۲: ۷۴)
قصاص کا حکم ۔ جرم قتل کی سزا	سوم	۱۷۹	(۲: ۱۷۸)
قلب اور فواد	اول	۲۰۶	(۲: ۹)
قلت وکثرت معیار نہیں ۔ صلاحیت معیار ہے ۔	سوم	۴۲۴	(۲: ۲۴۷)
قمری کیلنڈر	سوم	۲۳۰	(۲: ۱۸۹)
قوانینِ فطرت اور قرآنی قوانین	اول	۱۱-۱۹	(۱: ۱)
قوانینِ فطرت خارجی کائنات کا دین ہیں ۔	اول	۲۹-۳۰	(۱: ۳)
قوانینِ خداوندی ہی تقدیراتِ الٰہیہ ہیں	اول	۲۷۳	(۲: ۲۰)
اپنے قوانین کی خلاف ورزی خود خدا بھی نہیں کرتا	دوم	۴۴۳-۴۴۴	(۲: ۸۳)
قوانین اور حکمت کا امتزاج	سوم	۲۸۳	(۲: ۲۰۹)
قوت اور علم کا امتزاج	سوم	۴۲۱	(۲: ۲۴۷)
قوت کا استعمال ۔ جائز اور ناجائز	دوم	۸۰	(۲: ۳۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(مسلمانوں کی) قوم کا جداگانہ تشخص	اول	۷۷	(۲: ۲)
قوموں کا استبدال ۔ عذابِ خداوندی ہے	اول	۱۹۲	(۲: ۷)
قوموں کے عروج وزوال کے قوانین	دوم	۱۵۵	(۲: ۴۰)
قوموں کی ہلاکت سے مراد	دوم	۱۵۵	(۲: ۴۰)
قوموں کے عروج وزوال کا ابدی اصول	سوم	۶۹	(۲: ۱۴۴)
قومیت پرستی وجۂ فسادِ آدمیت	اول	۲۳۹	(۲: ۱۱-۱۲)
" " کے خلاف مفکرینِ مغرب کی چیخ وپکار	اول	۲۴۱	(۲: ۱۱-۱۲)
قیامت کے دن کا صحیح مفہوم	سوم	۷	(۲: ۱۱۳)
ک/گ			
(دستاویزات کے) کاتب کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۴	(۲: ۲۸۲)
کارل مارکس کا اعترافِ عجز	اول	۱۱۶	(۲: ۳)
کافۃ ۔ اسلام کا مطالبہ	سوم	۲۸۳	(۲: ۲۰۸)
کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی	اول	۱۶	(۱: ۱)
	اول	۲۸۵-۸۶	(۲: ۲۱)
کائنات میں دینِ خداوندی	اول	۳۰-۳۱	(۱: ۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے	اول	۱۷۰	(۲:۶)
(آغاز) کائنات کے متعلق سائنسدانوں کا عجز فہم	اول	۲۸۵	(۲:۲۱)
کائنات کی تسخیر	دوم	۶۸	باب اول
	دوم	۸۳	(۲:۳۱)
کائنات کے متعلق افلاطون کا نظریہ۔ وحدت الوجود	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
مادہ پرستوں کا نظریہ	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
(تخلیق) کائنات اور قانونِ مکافاتِ عمل کا باہمی تعلق	دوم	۹۳	(۲:۳۱)
(اشیاء) کائنات کا محدود علم	دوم	۹۴	(۲:۳۲)
کائنات کا غیب و شہود — مضمر و محسوس	دوم	۹۵	(۲:۳۳)
کائناتی حوادث اور انسانی اعمال	اول	۱۸۹	(۲:۷)
کائناتی خدا اور، ارضی خدا اور یہ سیکولرازم یا کفر ہے۔	اول	۳۰۱	(۲:۲۲)
کائناتی قوتیں — ملائکہ	دوم	۶۷	باب اول
کبریائی شانِ خداوندی ہے	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
کتاب اللہ (کی حکمرانی کا نام الدین ہے)	اول	۲۹،۳۰	(۱:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کتاب کے ایک حصے پر ایمان، دوسرے سے انکار	اول	۵۷	(۱:۷)
	دوم	۳۵۹	(۲:۸۵)
کتاب کے معنی	اول	۷۱	(۲:۲)
(اہلِ) کتاب سے ایمان کا مطالبہ	اول	۷۳	(۲:۳)
(اہلِ) کتاب میں سے حضورؐ پر بہت کم ایمان لاتے۔	سوم	۲۸	(۲:۱۲۰)
کتاب و حکمت و نبوت — بنی اسرائیل کو ملی تھی۔	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
کتاب — ہر رسول اور ہر نبی کو دی گئی تھی۔	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
کتاب ہر نبی کو ملی تھی	سوم	۷۲	(۲:۱۳۶)
(اہلِ) کتاب کے ہاں کا کھانا	سوم	۱۴۵	(۲:۱۷۳)
کتاب و حکمت — قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
کتبِ سابقہ پر ایمان کے معنی	اول	۱۴۲	(۲:۴)
	سوم	۷۳	(۲:۱۳۶)
(مومنین کو بھی اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ) الکتٰب کہا گیا ہے	سوم	۳۰	(۲:۱۲۱)
کتمانِ حق	دوم	۲۰۱	(۲:۴۲)
کثرت و قلت کا مسئلہ — معیارِ کامیابی تعداد کی کثرت نہیں۔	سوم	۴۲۴	(۲:۲۴۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کذب کا قرآنی مفہوم	اول	۲۰۵	(۲:۸)
کراماتِ اولیاء	اول	۳۱۰	(۲:۲۳)
	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
کرسی خداوندی	سوم	۴۳۷	(۲:۲۵۵)
کسب اور اکتساب میں فرق	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)
کشف و الہام کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
کعبہ (مسجد الحرام) کی دیکھ بھال	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
کعبہ ۔ نظامِ خداوندی کا مرکزِ محسوس	سوم	۴۴	(۲:۱۲۴)
،، مرکز اجتماع انسانیت	سوم	۵۵-۵۶	(۲:۱۲۵)
،، امت میں وحدت پیدا کرنیکا ذریعہ	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
کعبہ کی محسوس علامات کو مقصود بالذات	سوم	۱۰۱	(۲:۱۴۸)
نہ سمجھ لینا			
کفار مومنوں پر غالب نہیں آسکتے	اول	۱۷۴	(۲:۹)
کفار کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات	اول	۱۷۵	(۲:۶)
قائم نہیں کئے جاسکتے			
کفارہ کا مفہوم	دوم	۲۳۹	(۲:۴۸)
کفر بالطاغوت ۔ ایمان باللہ سے پہلے	سوم	۴۴۰	(۲:۲۵۶)
کفر بھی (ایمان کی طرح) خود اختیار کیا جاتا ہے	اول	۱۵۹	(۲:۶)
کفرانِ نعمت (دیکھئے "نعمت")			
کلام اللہ	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
،،	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)
(خدا سے) ہمکلامی کا عقیدہ	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کلم اللہ موسیٰ تکلیما کا مفہوم	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)
کلمات اللہ سے مراد وحیِ خداوندی	دوم	۱۳۱	(۲:۳۷)
اور اس پر مبنی نظریۂ حیات			
کمانڈر کے انتخاب کا معیار ۔	سوم	۴۲۰	(۲:۲۴۷)
دولت نہیں، صلاحیت			
کمیونزم اور اسلام کا فرق	دوم	۲۰۸	(۲:۴۳)
کمیونزم اور قرآنی نظام کے رزق میں فرق	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)
کمیونزم ۔ فسق ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)
،، ۔ ممکن العمل نہیں	اول	۱۱۵	(۲:۳)
،، کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
گوسالہ پرستی کا واقعہ (بنی اسرائیل کا)	دوم	۲۵۳	(۲:۵۱)
،، ،، کا بیان (تورات میں)	دوم	۲۶۱	(،،)
،، ،، کے سلسلے میں ہمارے	دوم	۲۶۰	(،،)
تفسیری افسانے			
کیلنڈر ۔ شمسی یا قمری	سوم	۲۳۰	(۲:۱۸۹)

ل

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
لاٹری	سوم	۳۳۵	(۲:۲۱۹)
لعنت کے معنی	دوم	۳۷۴	(۲:۸۸)
	سوم	۱۲۹	(۲:۱۵۹)
لونڈیاں (دیکھو "غلامی")			
لین دین کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۳	(۲:۲۸۲)

م

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ماحول کے اثرات کا غلط عقیدہ	دوم	۳۳	باب اوّل
مارکس کا نظریۂ تاریخ	دوم	۱۵۱	(۲:۴۰)
ماضی پرستی کی تباہ کاریاں	سوم	۷۸	(۲:۱۴۱)
مال و دولت کی اہمیت	سوم	۱۷۶	(۲:۱۸۰)
مالک کے معنی	اول	۲۸	(۱:۳)
متبنّٰی کی قانونی حیثیت کچھ نہیں	سوم	۳۵۹	(۲:۲۲۱)
متعہ	سوم	۳۹۵	(۲:۲۳۲)
متقین کی خصوصیات	اول	۷۵	(۲:۲)
مثالوں کے ذریعے تبیانِ حقیقت	اول	۳۴۱	(۲:۲۶)
(قرآنی) مثالوں کے چند نمونے	اول	۳۴۳	(۲:۲۶)
محبت — خدا کے ساتھ	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)
محسوس حرکات و خیالات کا تعلق	اول	۱۲۲	(۲:۳)
محکومی، خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۲	(۲:۷)
(حضرت) محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم)	اول	۷	(۱:۱)
محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہٗ	اول	۱۵۴	(۲:۵)
مخالفین سے اعراض۔ لیکن حسن کارانہ انداز سے	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۹)
مذاہب کیسے پیدا ہو گئے	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
(دین کی) مذہب میں تبدیلی	اول	۳۴	(۱:۳)
مذہب پرست طبقہ (مذہبی پیشوائیت)	دوم	۱۹۴	(۲:۴۱)
دین کا سب سے شدید مخالف ہوتا ہے			
اشخاص پرستی اس کا مسلک ہوتا ہے۔	دوم	۱۹۴	(۲:۴۱)
خود ساختہ شریعت کو شریعتِ خداوندی			
بناتا ہے۔			
دین میں غلو کرتا ہے۔			
مذہب کو کاروبار بنا لیتا ہے۔			
بآسانی جنت دلانے کا وعدہ کرتا ہے			
مذہب جب ذریعۂ معاش بن جائے۔	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
مذہبی آزادی (دیکھئے "جنگ")			
مذہبی پیشوا — یہود کے	دوم	۲۲۰	(۲:۴۴)
مذہبی پیشواؤں کی دین فروشی	اول	۶۲	(۱:۷)
	سوم	۱۴۳	(۲:۱۷۴)
مذہبی پیشوائیت اور دین کا نظام	اول	۳۳	(۱:۳)
؍؍ ؍؍ فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
؍؍ ؍؍ کا کاروبار	اول	۲۵۶	(۲:۱۶)
؍؍ ؍؍ یہودیوں کی	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)
مذہبی رسوم و مناسک توہم پرستی پر مبنی ہوتے ہیں	سوم	۲۲۸	(۲:۱۸۹)
مرتد کی سزا (دیکھئے "جنگ")			
(نیز دیکھئے "ارتداد")			
مرشد صرف خدا ہے	سوم	۲۲۵	(۲:۱۸۶)
مرضات اللہ سے مراد	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
مرکزِ ملت — قبلہ	دوم	۲۱۶	(۲:۴۳)
مزارات اور خانقاہیں	دوم	۸۳	(۲:۳۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مزارعت ! نظامِ سرمایہ داری ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
مساکین کے لئے انفاق	دوم	۳۵۰	(۲:۸۳)
	سوم	۱۵۷	(۲:۱۷۷)
مستبد حکمران اوران کی فساد انگیزی کا نتیجہ	سوم	۲۵۷	(۲:۲۰۶)
مسجد کا مفہوم	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
مسجد الحرام کی دیکھ بھال	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
مسجد ضرار کی تعمیر اور ہماری مسجدیں	اول	۲۱۶-۱۷	(۲:۹)
مسکنت ـ خدا کا عذاب ہے۔	دوم	۲۹۹	(۲:۶۱)
(پیدائشی) مسلمانوں کی پوزیشن	اول	۸۱	(۲:۳)
مشت زنی	سوم	۳۷۵	(۲:۲۲۲)
مشنا (یہودیوں کی روایات کا مجموعہ)	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
مصدق لما معکم کے معنی	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
مصلحین اور مفسدین ایک جیسے نہیں ہو سکتے	اول	۲۴۴	(۲:۱۱-۱۲)
معاہدات کی پابندی ساری قوم کی طرف سے ہونی چاہیئے۔	دوم	۳۹۰	(۲:۱۰۰)
معاشی عدمِ توازن باعثِ غضبِ خداوندی ہے	اول	۵۸	(۱:۷)
(قرآن کا) معاشی نظام	اول	۱۰۵	(۲:۳)
	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
	سوم	۳۲۶	(۲:۲۱۹)
	سوم	۴۶۳	(۲:۲۶۱-۷۴)
" " " العفو	سوم	۳۲۶	(۲:۲۱۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(غلط) معاشی نظام وجہِ فسادِ آدمیت ہے	اول	۲۳۶	(۲:۱۱-۱۲)
معاشی نظام ـ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)
معاشی طبقات کی کشمکش ـ خطرناک حد تک	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
معجزات کا مطالبہ اور انکار	اول	۳۰۹	(۲:۲۳)
	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
معجزہ ! ـ رسول اللہ کی سیرت تھی !	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
معراج سے متعلق روایات	سوم	۸۴	(۲:۱۴۲)
معراج نبویؐ (ضمنی تذکرہ)	سوم	۲۲۲	(۲:۱۸۶)
مغضوب علیہ	اول	۵۴	(۱:۷)
مغضوب علیہ اور ضالین کوئی خاص قومیں نہیں۔	اول	۵۵	(۱:۷)
مغفرت کا مفہوم	دوم	۲۸۷	(۲:۵۸)
مفاہمت ـ اصولوں میں نہیں ہو سکتی	اول	۱۷۸	(۲:۶)
مفلحون ـ کون ہیں ؟	اول	۱۵۳	(۲:۵)
مقامِ محمود	اول	۷	(۱:۱)
مقتولین فی سبیل اللہ	اول	۲۵۵	(۲:۱۲)
	سوم	۱۱۰	(۲:۱۵۴)
مقربین بارگہ خداوندی	سوم	۲۲۳	(۲:۱۸۶)
مقطعات (حروف)	اول	۷۰	(۱:۲)
مکاتبِ فکر ـ ایک ابلیسی سازش	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
(قانونِ) مکافاتِ عمل ـ دین کی بنیاد	اول	۲۵	(۱:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مکافاتِ عمل (کا قانون)	اول	۱۴۴،۵۲	(۲:۴)
	سوم	۴۹۲	(۲:۲۸۴-۸۶)
(نیز دیکھیے "قانونِ مکافات")			
	دوم	۱۴۸	(۲:۴۰)
مکافاتِ عمل کے قانون کے مطابق فیصلے	دوم	۲۲۴	(۲:۴۶)
" " کا تشریحی بیان	دوم	۲۳۰	(۲:۴۸)
	سوم	۲۳	(۲:۱۲۲-۲۳)
مکافاتِ عمل۔ جنت کسی کی اجارہ داری نہیں اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں	دوم	۴۳۷	(۲:۱۱۱-۱۲)
مکافاتِ عمل۔ اسلاف کے اعمال، ان کی نسلوں کے کام نہیں آتے۔	سوم	۶۸	(۲:۱۳۰)
ملائکہ	دوم	۶۶	باب اول
ملائکہ کی تسبیح و تقدیس	دوم	۷۳	(۲:۳۰)
ملائکہ کا محدود علم	دوم	۹۴	(۲:۳۲)
ملائکہ کا سجدہ	دوم	۹۸	(۲:۳۴)
ملت کا مفہوم	سوم	۲۹	(۲:۱۲۰)
ملکہ سبا	اول	۲۴	(۱:۲)
ملوکیت۔ دورِ جاہلیت "دیکھئے" انداداً من دون اللہ"	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
ملوکیت کی تخریب کاریاں	اول	۲۴	(۱:۲)
ملوکیت وجہ فسادِ آدمیت ہے۔	اول	۲۳۳	(۲:۱۱-۱۲)
ملوکیت کی بساط اُلٹ دی گئی ہے	دوم	۲۸۵	(۲:۵۸)
من و سلویٰ	دوم	۲۸۳	(۲:۵۹)
مناسک کا مفہوم	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
منافقت احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے۔ جس سے خوف پیدا ہوتا ہے۔	دوم	۱۷۹	(۲:۴۰)
منافقین	اول	۲۰۲	(۲:۸)
	اول	۲۷۹، ۲۱۴، ۲۲۴	(۲:۹)
منافقین سے معاشرتی تعلقات کا انقطاع	اول	۲۱۹	(۲:۹)
منافقین۔ اُخروی زندگی کا عذاب	اول	۲۱۹	(۲:۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
منافقین حضورؐ کی زندگی ہی میں چھٹ کر الگ ہو چکے تھے	اول	۲۲۴	(۲:۸)
منافقین کے ہاتھ میں حکومت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴-۵)
منعم علیہ کون ہیں؟	اول	۴۹	(۱:۶)
موت اور حیات کا مفہوم	اول	۳۴۶	(۲:۲۸)
موت کا مجازی مفہوم	دوم	۲۸۰	(۲:۵۶)
موت محاسبۂ خویش کا ذریعہ ہے۔ مومن اس کا استقبال کرتا ہے۔ کافر اس سے بھاگتا ہے۔	دوم	۳۸۵	(۲:۹۴)
موت و حیات کا فلسفہ۔ زندہ وہ رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔	سوم	۴۱۳	(۲:۲۳۸)
مودودی مرحوم کی تفسیر۔ یہودیوں کے بندر بن جانے کے سلسلے میں۔	دوم	۳۱۰ فٹ نوٹ	(۲:۶۵)
مودودی مرحوم کا مسلک۔ کہ قرآن کریم میں معاذ اللہ ابہام ہے۔	دوم	۳۲۸	(۲:۷۳)
مودودی مرحوم اور غلامی کی تائید	دوم	۳۵۸	(۲:۸۵)
مودودی مرحوم کی تفسیر میں ہاروت و ماروت کا قصہ	دوم	۴۰۱	(۲:۱۰۲)
" " " رسول اللہ پر جادو	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۲)
مودودی مرحوم مذہبی آزادی کے خلاف	--	--	دیکھیے "جنگ"
مودودی مرحوم کی تفسیر، اسلام بزورِ شمشیر پھیلا تھا	سوم	۲۶۵	(۲:۱۹۳)
مودودی مرحوم اور نابالغ لڑکیوں کی شادی	سوم	۳۴۰	(۲:۲۲۱)
مودودی مرحوم کا مسلک عزل اور استمناد بالید (مشت زنی) کے متعلق	سوم	۳۷۵	(۲:۲۲۲)
مودودی مرحوم اور متعہ	سوم	۲۹۵	(۲:۲۳۲)
" اور نظامِ سرمایہ داری	سوم	۴۷۶	(۲:۲۷۵)
(حضرت) موسیٰؑ کی داستانِ حیات کے اشاراتی کوائف	دوم	۱۷۰	(۲:۴۰)
(حضرت) موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو کتاب دی گئی تھی۔	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
(حضرت) موسیٰؑ کو ستانے کے سلسلے میں ایک وضعی روایت۔ پتھر کپڑے لے کر بھاگ اٹھا۔	دوم	۳۱۹	(۲:۷۱)
(حضرت) موسیٰؑ کا خدا سے ہمکلام ہونا۔	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
(حضرت) موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی درخواست اور انکار۔	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
"مولانا" صرف خدا کی ذات ہے۔	سوم	۴۹۶	(۲:۲۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مومن، مشرک کیسے ہوجاتا ہے	اول	۵۸	(۱:۷)
مومن کسے کہتے ہیں ؟	اول	۷۷	(۲:۲)
مومن اور مسلمان میں فرق	اول	۸۲	(۲:۲)
مومن ۔ خوف و حزن سے مامون ۔ سب پر غالب	دوم	۱۳۵	(۲:۳۸)
مؤمنین اور خدا کا باہمی معاہدہ	اول	۱۱۱	(۲:۳)
	اول	۲۵۴	(۲:۱۶)
(جماعت) مومنین میں باہمی محبت اور الفت	اول	۵۶	(۱:۷)
	اول	۸۷	(۲:۳)
مومنین کو علوّ فی الارض حاصل ہوگا	اول	۲۳۴	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
مومنین اور تسخیرِ کائنات	دوم	۸۶	(۲:۳۱)
مومنین کو بھی الّذین اوتوا الکتٰب کہا گیا ہے۔	سوم	۳۱	(۲:۱۲۱)
مومنین کی جماعت کی اہمیت	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
مہر	سوم	۳۵۳	(۲:۲۲۱)
مہلت کا قانون	اول	۱۹۷	(۲:۷)
میثاق بنی اسرائیل	دوم	۱۷۹	(۲:۴۰)
میثاق کا نظریہ اور اس کی عملی تشکل	سوم	۱۶۳	(۲:۱۷۷)
میرزا غلام احمد کی دلیل کہ مفتری علی اللہ قتل کر دیا جاتا ہے ۔ اسکی تردید	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)
میرزا غلام احمد نے جہاد منسوخ کر دیا۔	سوم	۳۰۵	(۲:۲۱۶)
میزانِ عدل کو قائم رکھو	اول	۲۴۹	(۲:۱۵)
میسرہ	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
میکائیل	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)

ن

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نابالغ لڑکی کی شادی	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)
ناپختہ ذہنوں کے ساتھ ایمان لانے والے	دوم	۳۱۵	(۲:۷۱)
النّار کے معنیٰ	اول	۳۲۶	(۲:۲۴)
النّاس والحجارۃ کا مفہوم	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
ناسخ ومنسوخ کا قرآنی مفہوم (حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟ ناسخ ومنسوخ کی آیت)	دوم	۴۴۴	(۲:۱۰۶)
نبوت ۔ ہونے والے نبی کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی	اول	۵۹	(۱:۷)
نبوت (اور کتاب وحکمت) انعاماتِ خداوندی ہیں۔	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
نبی کی طرف نازل ہونیوالا علم وحی کہلاتا تھا	اول	۲۳ز۴۱	(۱:۲ز۵)
نبی ۔ ہر نبی کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۹۵	(۲:۵۳)
نبی کا قلب پرسوز وغمخوار	دوم	۴۳۶	(۲:۱۰۹)
نجات کا غلط اور قرآنی مفہوم	دوم	۱۴۴	(۲:۴۰)
نجات کے متعلق یہودیوں کے عجیب وغریب عقائد	دوم	۲۲۹	(۲:۴۸)
نِدّ ۔ خدا کے ہمسر	اول	۲۹۷	(۲:۲۲)
نذر کا مفہوم	سوم	۴۷۰	(۲:۲۶۶)
نزول کے معنیٰ	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)
نزولی ترتیبِ قرآن کا شبہات خیز نظریہ	اول	۳۱۶	(۲:۲۳)
نسک کے معنی	سوم	۲۴۴	(۲:۱۹۹)
نسل کا باطل عقیدہ ۔ تمہید سرگزشت آدم	دوم	۱۱۶	(۲:۳۹)
نسل وحرث کی ہلاکت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴ز۵)
نسلی امتیاز کا باطل نظریہ	سوم	۴۳	(۲:۱۲۴)
نسخ کا عملی مفہوم	سوم	۲۳۱	(۲:۱۸۹)
نسیان عزم کی کمزوری ہے ۔	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نصاریٰ کہتے ہیں یہودی باطل پر ہیں	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
نصرت کے ایک معنی مجرم کی ناجائز مدد کرکے اسے سزا سے بچا لینا۔	دوم	۲۳۹	(۲:۴۸)
نظام کن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے	سوم	۴۴	(۲:۱۲۴)
نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل	سوم	۱۶۵	(۲:۱۷۷)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
نظامِ خداوندی کے دشمن لیکن ایمان کے دعویدار	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴)
نظامِ خداوندی قائم ہوکر رہے گا خواہ کسی قوم کے ہاتھوں ہو۔	سوم	۳۰۲	(۲:۲۱۴)
نظر و بصر کا فرق۔	اول	۱۶۸	(۲:۶)
نعمت کا مفہوم	اول	۴۸	(۱:۶)
نکاح کی تفاصیل وشرائط	سوم	۳۳۶	(۲:۲۲۱)
(کفران) نعمت کا نتیجہ	اول	۴۸	(۱:۶)
(بقائے) نفس	دوم	بائبل	ص ۳۱
نفس (انسانی ذات یا خودی)	اول	۱۲-۱۱	(۱:۱)
	اول	۱۶۲	(۲:۶)
انفاق سے تثبیتِ نفس	سوم	۴۶۶	(۲:۲۶۵)
نفس۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کے نفس پر مرتب ہوتا ہے۔	اول	۲۰۶	(۲:۹)
نفس امّارہ۔ نفس لوّامہ۔ نفسِ مطمئنہ	دوم	۵۷	باب اول
نفس شعوری وغیر شعوری کا مجادلہ	دوم	۳۰	باب اول

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نفسیاتی (تبدیلی سے تغیرِ نعماء)	اول	۵۳	(۱:۶)
نفسیاتی امراض	اول	۲۰۶	(۲:۹)
نفسیاتی طریقِ تفتیش	دوم	۳۲۶	(۲:۷۳)
تزکیۂ نفس	دوم	۲۵	(۲:۳۰)
نماز اور الصلوٰۃ۔ محسوس حرکات اور خیالات کا باہمی تعلق	اول	۱۲۲	(۲:۳)
نفع نقصان کا مفہوم اور حقیقی معیار	اول	۲۵۰	(۲:۱۶)
نماز کے اوقات و رکعات کے متعلق اشارات	اول	۱۳۱	(۲:۳)
نماز کی جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں	اول	۱۲۸	(۲:۳)
نماز۔ ارکانِ اسلامی کی موجودہ شکلوں کا برقرار رکھنا ضروری ہے	اول	۱۳۹	(۲:۳)
نماز۔ الفاظ کا مفہوم سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
نمازیں کیسے فرض ہوئیں	سوم	۸۵	(۲:۱۴۲)
نور۔ قرآن کریم نور ہے	اول	۲۶۲	(۲:۱۷)
نوعِ انسانی کے اختلافات کی تاریخ	سوم	۲۹۳	(۲:۲۱۳)
نیشنلزم کی تباہ کاریاں	اول	۲۴۱	(۳:۱۱-۱۲)
نیشنلسٹ علماء کا مسلک تحریکِ پاکستان کے دوران	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
و			
واعظ — داستان گو	دوم	۲۵۷	(۲:۵۱)
والدین سے حسنِ سلوک	دوم	۲۴۵	(۲:۸۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
والدین کی اطاعت کا عقیدہ صحیح نہیں۔ قرآن نے ایسا حکم نہیں دیا۔	دوم	۳۴۷	(۲:۸۳)
وثن کے معنی	سوم	۱۳۹	(۳:۱۷۰)
وجدان، وحی نہیں	اول	۱۴۰	(۲:۴)
وحدتِ انسانیت — قرآنی تعلیم کا منتہیٰ	اول	۲۳۹	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۲۹۰	(۲:۲۱۳)
وحدت الوجود کا نظریہ	سوم	۴۳۴	(۲:۲۵۶)
	دوم	۲۷۹	(۲:۵۵)
وحی کی ضرورت	اول	۱۲	(۱:۱)
وحی، خدا سے براہِ راست ملنے والا علم ہے۔	اول	۲۳	(۱:۲)
	اول	۴۲	(۱:۵)
وحی، سب کی سب قرآن کریم میں درج ہے۔ وحی خفی (غیر متلو، غیر مکتوب) کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے۔	اول	۱۴۰-۱۴۱	(۲:۴)
	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)
وحی کا ثبوت	اول	۳۰۸-۹	(۲:۲۳)
وحی کی راہنمائی کی ضرورت	دوم	۱۲۹	(۲:۳۷)
وحی کی دو قسمیں — یہودیوں کا عقیدہ (اور مسلمانوں کا بھی)	اول	۱۴۱	(۲:۴)
،،	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
	سوم	۸۸	(۲:۱۴۲)
	سوم	۱۲۵	(۲:۱۵۹)
وحی کیسے نازل ہوتی تھی ہم جان نہیں سکتے	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)
وحی ہی کلام اللہ ہے	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
وحی پر ایمان — خود رسول اللہ کو بھی لانا ہوتا تھا	سوم	۴۹۰	(۲:۲۸۵)
	سوم	۴۰	(۲:۱۲۴)
وراثت کا باطل نظریہ			
وراثت نسل کا غلط عقیدہ	دوم	۴۶	بابِ اول
ورد۔ وظائف۔ تعویذ گنڈے۔ اسم اعظم	دوم	۷۵	(۲:۳۰)
سب یہودی تصورات ہیں		۴۱۹	(۲:۱۰۲)
	سوم	۱۱۲	(۲:۱۵۷)
وسعت کے مطابق ذمہ داری۔	سوم	۴۹۲	(۲:۲۸۶)
"لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا" کا مفہوم			
وصیت کا حکم	سوم	۱۷۷	(۲:۱۸۰)
وضعی روایات اور قصۂ آدم	دوم	۱۴۲	(۲:۳۹)
وقودِ جہنم (جہنم کا ایندھن)	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
ویدانت اور وحدت الوجود کا نظریۂ کائنات	دوم	۸۷-۸۸	(۲:۳۱)
ولی کے معنی	سوم	۴۴۴	(۲:۲۵۷)
ھ			
ہاروت وماروت کے افسانے (مودودی مرحوم کی تفسیر میں)	دوم	۴۰۰	(۲:۱۰۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(حضرت) ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
ہبہ (اور وصیت)	سوم	۱۷۶	(۲:۱۸۰)
ہبوطِ آدم سے مراد	دوم	۱۲۵	(۲:۳۶)
ہجرت کا مفہوم اور اہمیت	سوم	۸۰	(۲:۱۲۴)
	سوم	۳۰۸	(۲:۲۱۸)
ہدایت کا مفہوم	اول	۴۱	(۱:۵)
(اشیائے کائنات کی) ہدایت	اول	۴۱	(۱:۵)
(رسول) ہدایت (صحیح راستہ) دکھانا تھا اس راستے پر چلانا اسکے ذمہ نہیں تھا	سوم	۲۶	(۲:۱۱۹)
ہلاکت حرث ونسل سیکولر نظامِ حکومت کا نتیجہ	سوم	۲۵۷	(۲:۲۰۵)
ہیگل کی جدلیت	دوم	۱۵۲	(۲:۴۰)

ی

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
یتامیٰ سے حسنِ سلوک (یتیم کا وسیع مفہوم)	دوم	۳۴۹	(۲:۸۳)
	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)
	سوم	۲۳۳	(۲:۲۲۰)
یتامیٰ کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ ذلت	سوم	۱۶۱	(۲:۱۷۷)
یتیموں کے متعلق احکامات۔ دونوں قسم کے یتیم یعنی وہ جن کے ماں باپ ہوں اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں	سوم	۲۳۲	(۲:۲۲۰)
یہودی پکے منافق تھے	اول	۲۰۴	(۲:۸)
(کیا) یہودیوں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے؟	دوم	۱۶۸	(۲:۴۰)
یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں کی حالت	دوم	۱۸۸-۹۵	(۲:۴۱)
	دوم	۲۲۰	(۲:۴۴)
یہودیوں میں ہمت و استقلال باقی نہیں رہا تھا	دوم	۲۲۲	(۲:۴۴)
یہودیوں کی قساوتِ قلبی	دوم	۳۳۰	(۲:۷۴)
یہودیوں کی ہوسِ زر	دوم	۳۳۲	(۲:۷۴)
یہودیوں کی پست ذہنیت۔ آدابِ معاشرت تک سے عاری ہو چکے تھے	دوم	۴۲۹	(۲:۱۰۴)
یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ باطل پر ہیں	سوم	۷	(۲:۱۱۳)
الیسع یا یوشع	سوم	۴۱۸	(۲:۲۴۶)
یوم - یوم الدین	اول	۲۲-۲۹	(۱:۳)
"یومِ الست	اول	۲۹۳	(۲:۲۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

جلد چہارم

☆

آغاز سورۂ آلِ عمران (سورۃ ۳)

پہلا باب

محکمات و متشابہات

۱ ——— الحی القیوم کی حکمرانی کا اثر انسانی حکومتوں پہ
۲ ——— خدائے زندہ، زندہ انسانوں کو خطاب کے قابل سمجھتا ہے
۳ ——— خدا کے ذو انتقام ہونے کا مطلب
۴ ——— انجیل کی تاریخ
۵ ——— آیات محکمات و متشابہات
۶ ——— عرشِ خداوندی کا تصور
۷ ——— ذنب اور ذنوب کا مفہوم
۸ ——— عصمت انبیاء کی بحث
۹ ——— مال اور اولاد فتنہ کس طرح بنتے ہیں
۱۰ ——— خدا کے بندوں کی صفات
۱۱ ——— توحید پہ خدا، ملائکہ اور اربابِ علم کی شہادت
۱۲ ——— الدین اور الاسلام
۱۳ ——— نبوت اور رسالت
۱۴ ——— حبط اعمال کس طرح ہوتا ہے
۱۵ ——— شفاعت کے متعلق مروّجہ عقائد
۱۶ ——— عزّت و ذلّت، محکومی اور حکمرانی "خدا کے ہاتھ میں ہے"؛
۱۷ ——— کفار کے ساتھ تعلقات
۱۸ ——— تقیہ کی بحث

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا باب

محکمٰت و متشابہات

آغاز سورۂ آلِ عمران

(آیات ۱ تا ۳۱)

مطالب الفرقان کی تیسری جلد کا اختتام سورۂ بقرہ کی آخری آیت پر ہوا تھا۔ زیرِ نظر جلد کی ابتداء سورۂ آلِ عمران سے کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے :-

[۳/۱-۲] الٓمّٓ ۚ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ (۳/۱-۲)

خدائے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جسے یہ حق حاصل ہو کہ وہ کسی سے اپنے قوانین و احکام کی اطاعت کرائے۔ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ اسی کا ہے۔ وہ خود زندہ ہے اور ہر ایک کو زندگی عطا کرتا ہے۔ وہ بغیر کسی سہارے کے قائم بالذات ہے اور ہر ایک کو قیام عطاء کرتا ہے۔

الٓمّٓ : یہ حروفِ مقطعات میں سے ہے جن کی تشریح مطالب الفرقان کی پہلی جلد ص۲۰ زیرِ آیت (۲/۱) کی جا چکی ہے۔ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

دوسری آیت کے الفاظ وہی ہیں جو سورۂ بقرہ۔ آیت (۲/۲۵۵) کے ابتداء میں آئے تھے۔ ان کا مفہوم مطالب الفرقان کی تیسری جلد (ص۴۳۵-۴۳۱) میں سامنے لایا جا چکا ہے۔ اس میں ایک اضافہ ضروری ہے۔ یہاں پہلے کہا گیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے، کسی انسان کو نہیں، اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ جس خدا کو حقِ حکومت حاصل ہے وہ اَلۡحَیُّ۔

الحی والقیوم کی حکومت

یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ دوسری جگہ ہے : وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡحَیِّ الَّذِیۡ لَا یَمُوۡتُ (۲۵/۵۸)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قابلِ اعتماد صرف اس کے قوانین ہو سکتے ہیں جو زندہ ہو۔ جسے کبھی موت نہ آئے۔ اسی کے قوانین غیر متبدل قرار پا سکتے ہیں (۶/۱۱۵)۔ یہ ظاہر ہے کہ کامل اطمینانِ قلب اور

سکون کے ساتھ اطاعت انہی قوانین کی کی جاسکتی ہے جن کے متعلق یقینِ محکم ہو کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اسی لئے کہا: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ (۲۰/۱۱۱)۔ "خدائے حی و قیوم کے قوانین کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ کرو"۔ اس اَلْحَیُّ کے متعلق کہا کہ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۴۰/۶۵)۔ یعنی پورے خلوص قلب کے ساتھ اطاعت انہی قوانین کی کی جاسکتی ہے جس کے متعلق یقین و ایمان ہو کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ دل کے کامل سکون کے ساتھ اطاعت انہی قوانین کی کی جاسکتی ہے جن کے متعلق یقین ہو کہ ان میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ اور ایسے قوانین اس ہستی کے نافذ کردہ ہوسکتے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہے۔ اس ایک شرط (یا خصوصیت) سے انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ حکومتیں شخصی ہوں یا جمہوری، اربابِ اقتدار کی (موت ہی نہیں محض) تبدیلی سے معاشرہ میں جس قدر تہلکہ مچ جاتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عصرِ رفتہ میں بادشاہ کی موت سے معاشرہ میں انقلاب برپا ہو جاتا تھا اور (ملکۂ سبا کے الفاظ میں) "بلندیاں پستیوں میں اور پستیاں بلندیوں میں بدل جاتی تھیں" (۲۷/۳۴)۔ آج بھی (مثال کے طور پر) امریکہ کے صدر کے انتخابات سے کئی ماہ پہلے، دنیا بھر کی مملکتوں (بالخصوص کمزور اقوام) کے دل دھڑکنے لگ جاتے ہیں کہ نہ معلوم نیا صدر، مملکت کی خارجی پالیسی میں کس قسم کی تبدیلیاں لے آئے۔ کم و بیش یہی صورت پارلیمانی نظام میں ہوتی ہے کہ نہ جانیں انتخاب سے کون سی پارٹی برسرِ اقتدار آئے اور وہ معاشرہ کے نظم و نسق اور دیگر اقوام کے ساتھ تعلقات میں کس قسم کا تغیر و تبدل کر دے؟ لہٰذا، انسانی حکومتوں کے قوانین اور فیصلے نہ قابلِ اعتماد ہوسکتے ہیں نہ موجبِ سکون و اطمینان۔ قابلِ اعتماد اور اطمینان بخش وہی قوانین ہوسکتے ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہو۔ اور ایسے قوانین وہی صاحبِ اقتدار (اللہ) نافذ کرسکتا ہے جو اَلْحَیُّ (ہمیشہ زندہ رہنے والا) اور اس کے ساتھ القیوم بھی ہو۔ یعنی جس کا اقتدار دوسروں کے سہاروں کا محتاج نہ ہو۔ انسانی اقتدار، خواہ وہ شخصی ہو اور خواہ جمہوری، دوسروں کے سہاروں کا محتاج ہوتا ہے۔ جونہی وہ سہارے کمزور پڑے، اقتدار متزلزل ہوگیا۔ جمہوری نظام میں تو بعض اوقات ایک ووٹ کا رد و بدل، حکومت کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ اس لئے کوئی انسانی نظام القیوم نہیں ہوسکتا۔ یہ خصوصیت بھی اسی خدا کے نظام کو حاصل ہے جو الحی اور القیوم ہے۔

دوسری طرف خدائے زندہ کے قوانین کی اطاعت بھی وہی کرسکتا ہے جو خود زندہ ہو یا جس کے دل میں زندہ رہنے کی تمنا ہو۔

زندہ انسانوں کے لئے قانون

حضور نبی اکرمؐ سے ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ تمہیں یہ قرآن اس لئے دیا گیا ہے: لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ "تاکہ اس کے ذریعے اس شخص اور اس قوم کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہو اور وہ زندہ رہنا چاہے" غلط روش کے مرگ آفریں خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۲۷:۸۰، ۳۰:۵۲)۔ "تو مردوں کو نہیں سنا سکتا"۔

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے — شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں (اقبالؒ)

قرآن کریم زندگی بخش نظام عطا کرتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا

زندگی بخش نظام

یُحْیِیْكُمْ (۸:۲۴) "اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو جو اس پروگرام کی دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا"۔ لہٰذا، خدائے زندہ کا نظامِ اطاعت اس قوم کو حقیقی زندگی کی توانائیاں عطا کرتا ہے جو زندہ ہو یا اس کے دل میں زندہ رہنے کی تڑپ اور خلش ہو۔ مارٹن بوبر (MARTIN BUBAR) نے ایک عمیق نکتہ بیان کیا ہے کہ "تو" وہی کہہ سکتا ہے جو "میں" کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو"۔ خدائے زندہ کو وہی پکار سکتا ہے جو خود زندہ ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ (۲:۱۸۶)۔ "میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں جو میری پکار کا جواب دے"۔ لہٰذا، اگر ہمیں خدا کی طرف سے پکار کا جواب نہیں ملتا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم زندہ نہیں۔

نہیں اعتبارِ الفت جو نہ ہو سکا ابھی تک — میں سمجھ گیا یقیناً ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے

خدا سے اپنی پکار کا جواب لینے کے لئے ہمیں اپنے اندر زندگی پیدا کرنی چاہیئے یہی وہ زندگیؔ جو آخر کار "مرگ ناآشنا" ہو جاتی ہے: لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (۴۴:۵۶)۔ "اس میں پھر موت نہیں آئے گی"۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خودگر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے مر نہ سکے (اقبالؒ)

مردِ مومن جب خدائے الحی القیوم کی صفات (بحدِ بشریت) اپنے اندر منعکس کر لیتا ہے تو یہ بھی حی و قیوم ہو جاتا ہے۔ انسان کی طبعی زندگی سہاروں کی محتاج ہوتی ہے لیکن اُسے وہ حیاتِ جاوید عطا ہو جاتی ہے جو سہاروں کی محتاج نہیں رہتی۔ اور یہ زندگی اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ اُس کا "لا الٰہ الا ھو" پر ایمان اور اس کے مطابق عمل ہو۔ یعنی یہ ایمان کہ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

اور اس قسم کا ایمان اور اس کے مطابق عمل صرف اس کتاب کی رُو سے ممکن ہے جس کے متعلق فرمایا: —

۳:۴ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ۝ (۳:۴)۔

اس نے (اے رسول) تجھ پر وہ ضابطہ حیات نازل کیا ہے جو سرتاسر حق ہے اور ان تمام حقائق و دعاوی کو سچ کر دکھانے والا جو اس سے پہلے آ چکے ہیں (مثلاً) حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف نازل کردہ مجموعہ کتب جسے تورات کہہ کر پکارا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف نازل کردہ کتاب جسے انجیل کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ کتابیں اس سے پہلے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے بھیجی تھیں۔ ان کے بعد یہ ضابطہ ہدایت آیا ہے جو حق اور باطل، غلط اور صحیح کو الگ الگ کر دکھائے گا۔ (۳/۲۵)

جو لوگ ایسے کھلے ہوئے قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں گے اور ان سے سرکش رہیں گے، تو (قانونِ خداوندی کے مطابق) اس روش کا نتیجہ سخت تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ خالی دھمکی نہیں۔ یہ اس خدا کا قانونِ مکافات ہے جو ایسی قوت رکھتا ہے کہ ہر عمل کو اس کے آخری نتیجہ تک پہنچا دے۔

"الحق" کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم۔ آیت (۲/۳۱)۔ صفحہ ۸۹ اور آیت (۲/۴۲)۔ صفحہ ۱۹۵ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ مصدقاً لما معکم کی تشریح مطالب جلد دوم۔ آیت (۲/۴۱)۔ صفحہ ۱۸۲ پر کی جا چکی ہے۔ اور فرقان کا مفہوم مطالب جلد دوم۔ آیت (۲/۵۳)۔ صفحہ ۲۶۴ میں پیش کیا جا چکا ہے۔

تورات کی تاریخ جلد دوم۔ زیر آیت (۲/۴۱) بر صفحہ ۱۸۴ دی جا چکی ہے۔ اب انجیل کی تاریخ پیش کی جانی باقی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع کی طرف آئیں لفظ انتقام کا مفہوم بیان کرنا ضروری ہے جو آیۂ زیرِ نظر کے آخر میں آیا ہے۔ ہمارے

انتقام کا مفہوم

ہاں انتقام کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس میں نفرت۔ عداوت اور کینہ توزی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے جو پسندیدہ خصائص نہیں سمجھے جاتے۔ اللہ تعالےٰ ان جذبات (بلکہ ہر قسم کے انسانی جذبات) سے مبرّا ہے اس لئے اس لفظ (انتقام) کو ان معانی میں اس کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی، اگر کوئی شخص کسی کو اذیت پہنچائے تو اس اذیت کا بدلہ لینے کو انتقام کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالےٰ کو کوئی اذیت ہی نہیں پہنچا سکتا تو اس کی طرف سے "بدلہ لینے" کا کیا سوال؟ انسان اگر قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے اس کا اپنا نقصان ہوتا ہے۔ خدا کا کچھ نہیں بگڑتا: وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (۲۷/۴۰)۔ "جو سپاس گذاری کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے اور جو خلاف ورزی کرتا ہے (تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اعمال و افعال سے مستغنی ہے"۔ اس لئے: اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۱۴/۸)" اگر تم اور کرۂ ارض کے تمام انسان بھی قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی پر اتر آئیں تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑیگا وہ جملہ کائنات سے مستغنی ہے (۳/۹۶) اور ہر حال میں مستحق حمد و ستائش۔ بنابریں خدا کے لئے یہ

لفظ ان معانی میں بھی استعمال نہیں ہو سکتا جن معانی میں یہ ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ عربی زبان میں بھی اس کے بنیادی معنے یہ نہیں۔ اس لفظ کا مادہ (ن۔ ق۔ م) ہے۔ النَّقَمُ راستے کے درمیانی حصے یا وسط طریق کو کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو سامنے لائیے۔ وہ وسطِ طریق سے ہٹ کر اِدھر اُدھر منتشر ہو جائیں تو گڈریا انہیں ہانک کر درمیانی راستے کی طرف لاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے اسے کبھی کبھی "ڈنڈا" بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس سے انتقام کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی غلط روش اختیار کرنیوالوں کو صحیح راستے کی طرف لانا۔ جو صحیح راستے کی طرف نہ آئیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، جب یہ لفظ خدا کے لئے استعمال کیا جائے گا تو اس سے مراد خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہوگا۔ آیت زیرِ نظر میں اس کے ساتھ "عزیز" کا لفظ خود اس کی وضاحت کرتا ہے۔ عزیز کے معنی ہیں وہ صاحبِ اقتدار جسے اپنے قوانین کے نفاذ کا اختیار اور قانون شکنی کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی قوت حاصل ہو۔ (مثلاً) فرعون اور اس کی قوم کے جرائم گنانے کے بعد کہا: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ .... (۷/۱۳۶) یعنی جب وہ اس طرح مسلسل اور پیہم ہمارے قوانین کو جھٹلاتے رہے اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کی طرف سے لاپرواہی برتتے رہے تو ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا اور وہ غرقِ دریا ہو گئے۔ یوں ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اسی طرح قوم مدین (اصحاب الایکہ) کے متعلق ہے کہ وہ بڑے مظالم کرتے تھے: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۱۵/۷۹) تو ہم نے انہیں ان جرائم کی بنا پر ہلاک کر دیا۔ سورۂ سجدہ میں ہے: اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲/۲۲) "ہم مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا دیتے ہیں" دوسری جگہ ہے: فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا (۳۰/۴۷)۔ سورۂ زخرف میں مترفین کے متعلق ہے: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ - فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۴۳/۲۵)۔ "ہم نے انہیں ان کے جرائم کی سزا دی۔ سو دیکھو کہ جن لوگوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی ہے ان کا انجام کیا ہوا" سورۂ دخان میں خدا کی گرفت (مجرمین کے مؤاخذہ) کو اس کا انتقام کہا گیا ہے (۴۴/۱۶)۔

خود سورۂ آل عمران کی اگلی آیت میں قانونِ مکافات کے سلسلہ میں واضح کر دیا کہ

۳/۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۝ (۳/۴)۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جب اس کے علم کی وسعت کا یہ عالم ہے تو مجرمین کا کون سا جرم ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ سکے۔ یہاں سے بھی خدا کے ذوانتقام ہونے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اب ہم انجیل کی تاریخ کی طرف آتے ہیں ہیں نے اسے اپنی کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" میں تفصیل سے ساتھ

انجیل کی تاریخ

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جو کتاب حضرت عیسیٰؑ کی طرف نازل کی گئی تھی اس کا نام انجیل تھا (۳/۴۸) لیکن لکھا ہے لیکن موضوع زیرِ نظر کے تسلسل کے لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ اسے یہاں بھی درج کر دیا جائے۔ تاریخ اس کتاب کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ یعنی نہ وہ دُنیا میں کہیں موجود ہے' نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا بیتی؟ آپ کی تشریف براری کے بعد' چونکہ عام عقیدہ کے مطابق' عیسائی آپ کی واپسی کے منتظر تھے۔ (اور اصل بات یہ تھی کہ حواریوں کی انقلاب پسند جماعت پر بڑی پریشانی کا زمانہ گزر رہا تھا) اس لئے انجیل کی ترتیب و تدوین کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سکی۔

اناجیل

بعد میں جب عیسائی کلیسا، یہودی اور غیر یہودی عناصر کی کشمکش کی رزم گاہ بن گیا تو ان مختلف خیال فرقوں نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی رُو سے اس زمانہ میں قریب (۳۴) اناجیل کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اناجیل درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات تھیں جنہیں ان روایات کی رُو سے مرتب کیا گیا تھا جو اُس زمانے میں عام طور پر رائج تھیں۔ سپنگلر لکھتا ہے :-

> جب (حضرت مسیحؑ) کے دوست اور شاگرد بوڑھے ہو گئے اور یروشلم میں اس جماعت کا صدر آپ کا بھائی تھا تو انہوں نے ان قصص و روایات کو جو عام طور پر زبان زد خلائق تھیں' یکجا مرتب کر کے آپ کی سوانح عمری تصنیف کی ــــ یہی انجیل ہے۔ (زوالِ مغرب جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۲)

حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے حواریوں کی زبان ارامی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ ان (۳۴) اناجیل میں سے (سوائے ایک کے جو اب مفقود ہے) کوئی بھی ارامی زبان میں نہ تھی۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ اُن کے علاوہ ایک بڑی تعداد اُن خطوط کی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ ان کی تعداد قریب (۱۱۳) تک شمار ہوتی تھی۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (منعقدہ ۳۲۵ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار اناجیل (متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا) رسولوں کے اعمال' پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہودا کے خطوط اور مکاشفاتِ یوحنا منتخب کر لئے گئے اور باقی اناجیل اور خطوط کو وضعی (اپوکریفہ) قرار دے دیا گیا۔ جو کچھ منتخب کیا گیا اسے عہد نامۂ جدید کہا جاتا ہے۔ دنیائے عیسائیت میں یہ مقدس آسمانی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ چاروں اناجیل' حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات ہیں جنہیں آپ کے حواریوں نے مرتب کیا۔ (اس کا تفصیلی تذکرہ آگے چل کر آئے گا)۔ "رسولوں[1] کے اعمال" آپ کے حواریوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ خطوط وہ ہیں جو مختلف کلیساؤں اور دوسرے لوگوں کے نام تبلیغی طور پر لکھے گئے اور مکاشفات' یوحنا حواری کے مکاشفہ پر مشتمل ہے۔

---

[1] انجیل میں حواریوں کو رسول اور نبی کہا گیا۔ (دیکھئے اعمال ۱۴/۲۰۶ ; ۱۵/۳۲)

انتخاب نیقیہ کی کونسل میں ان کتابوں کا انتخاب بھی عجیب و غریب طریق سے عمل میں آیا۔ یہ کونسل شاہنشاہ قسطنطین کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سلطنت روما کے اطراف و جوانب سے دو ہزار اڑتالیس مندوبین شامل ہوئے۔ قسطنطین نے خود اس کی صدارت کی۔ اس کونسل کے انعقاد سے مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان میں باہمی تطبیق و توفیق کی صورت پیدا کر کے ایک متفقہ علیہ مذہب کی تشکیل کی جائے۔ کونسل کی بحث و جدل نے ایسی شدت اختیار کی کہ (۱۷۳۰) مندوبین کو باہر نکال دینا پڑا۔ بقایا (۳۱۸) بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے کہ مختلف فرقوں کی اناجیل میں سے کسے باقی رکھا جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے۔ بالآخر انہوں نے ایک رات تمام کتابوں کو فرش پر بکھیر کر رکھ دیا۔ صبح آکر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ ان صحیفوں کو مقدس سمجھ کر منتخب کر لیا گیا اور باقی کتابیں مسترد قرار پاگئیں۔ چنانچہ اس کونسل کی روئداد میں مذکور ہے کہ

> جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا اسے خداوند کی خوشنودی سمجھ لینا چاہیئے۔ بالخصوص اس لئے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سما رہا تھا جس نے انہیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔

(HISTORICAL VIEW OF THE COLINCIL OF NICAEA. BYREV. ISSAC BOYLE.)

یہ ہے عہد نامۂ جدید کی مقدس آسمانی کتابوں کے انتخاب کی داستان۔ ان کتابوں میں عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق، متی کی انجیل سب سے قدیم ہے۔ لیکن اس کے متعلق نہ تو یہی متعین ہو سکا ہے کہ اس کا مؤلف کون ہے اور نہ ہی یہ کہ یہ کس سن میں مرتب ہوئی۔

متی کی انجیل دورِ حاضرہ کی تحقیق کا رجحان اس طرف ہے کہ جس حصہ کا مؤلف حواری متی تھا وہ حصہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ باقی ہے اس کے مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عہدِ تالیف کے متعلق عام طور پر خیال ہے کہ یہ ۶۰ء اور ۶۵ء کے درمیان مرتب ہوئی لیکن پروفیسر ہارنک کے نزدیک اس کا زمانۂ تالیف ۷۰ء اور ۷۵ء کے درمیان ہے۔ بہرحال، زمانۂ تالیف ۶۰ء ہو یا ۷۰ء تاریخ کے صفحات میں اس انجیل کا نشان ۱۷۳ء سے قبل نہیں ملتا۔ یہ انجیل، یونانی زبان میں لکھی گئی تھی اور محققین کا خیال ہے کہ اس کا عبرانی ترجمہ، جیروم نے ۳۹۰ء میں کیا تھا۔ (اگرچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اسے کہیں سے خود عبرانی نسخہ مل گیا تھا)۔

مرقس بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سب سے قدیمی انجیل، متی کی نہیں بلکہ مرقس کی ہے۔ جس کا ذکر سب سے پہلے یوسی بی نے اپنی تاریخی کلیسا میں، جو چوتھی صدی میں لکھی گئی، کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مرقس نے (جو یہودی الاصل تھا) ۱۹۶۷ء میں اسے لکھا تھا۔

لوقا تیسری انجیل لوقا کی ہے۔ یہ غیر یہودی مؤرخ تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں

اس انجیل کو مرتب کیا۔

یوحنا چوتھی انجیل یوحنا کی ہے۔ اگرچہ اسے حضرت مسیحؑ کے حواری یوحنا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن تحقیق جدید یہ ہے کہ اس کا مؤلف ایک اور یوحنا تھا۔ جو ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں اس انجیل کو مرتب کیا۔ اس انجیل میں فلسفۂ یونان کی پوری پوری چاشنی موجود ہے۔

ان اناجیل کے متعلق موسیو رینان کی تحقیق اور رائے ہر صاحب نظر کے لئے قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

چونکہ (حضرت مسیح کی تشریف برادری کے بعد) لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس لئے انہوں نے مستقبل کے لئے کتابیں تصنیف کرنے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ان کے لئے فقط اتنا ہی کافی تھا کہ جس (شخصیت) کے متعلق انہیں انتظار تھا کہ وہ اسے بادلوں کے اندر دوبارہ دیکھیں گے۔ اس تصور کو اپنے آئینہ قلب میں آویزاں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی۔ ان میں اضافے کرنے یا مختلف انداز سے ترتیب دینے یا ایک کی تکمیل دوسرے سے کرنے میں کوئی باک اور تامل نہ تھا۔ (حیات مسیح۔ صد ۱۲)

دوسری جگہ مذکور ہے :۔

ابتداءً اناجیل کی حیثیت بالکل انفرادی تھی۔ اور سند کے اعتبار سے ان کا درجہ روایت سے بھی بہت کم تھا۔ (صد ۲۱۴)

یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مؤرخ رقمطراز ہے :۔

میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے ..... حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے بعد کے ہیں۔ (صد ۱۷ و ۱۸)

سینٹ پال کا سابقہ ڈین ڈاکٹر (W.R. INGE.) اپنی کتاب (THE FALL OF THE IDOLS.) میں لکھتا ہے :۔

بہت کم علماء ایسے ہوں گے جو اس باب میں اختلاف کرتے ہوں کہ انجیل چہارم (یوحنا) ایشیائے کوچک کے کسی گمنام تصوف پسند نے ۹۵ء اور ۱۲۵ء کے درمیان لکھی تھی۔ (صد ۲۶)

متی اور یوحنا کے بیانات کا ذکر کرنے کے بعد موسیو رینان لکھتا ہے :۔

اگر مسیح نے ویسے ہی باتیں کی تھیں جیسے متی نے لکھا ہے تو یقیناً وہ (مسیح) یوحنا کے مطابق باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ (یعنی متی اور یوحنا کے اسلوب و انداز میں اس قدر بین فرق ہے کہ ایک ہی شخص ایسے متضاد انداز میں باتیں کبھی نہیں کر سکتا۔ صد ۱۶)

لوقا کے متعلق رینان کا بیان ہے :۔

اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے۔ یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے ..... اس میں کئی فقرے مڑے

توڑے موڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں . . . . اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں۔

سر چپار اناجیل کے متعلق لکھتا ہے :-

یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ (صـ۲۹)

پھر جیسی کچھ یہ کتابیں ہیں ان میں بھی پند و نصائح کے اقوال ہیں۔ شریعت اور ضابطہ کے قوانین کوئی نہیں۔ موسیو رینان لکھتا ہے :-

(حضرت) مسیح کی تعلیم میں عملی اخلاقیات یا شرعی قوانین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف ایک مرتبہ شادی کے بارے میں آپ نے حتمی طور پر کچھ فرمایا۔ اور طلاق کی ممانعت کی۔ (صـ۲۱۳)

اسی طرح پروفیسر (JOAD) اپنی کتاب (GOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ "اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے" (صـ۳۱۸) میں انکے متعلق بہت کچھ پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسٹر (BEVAN) کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ

ہماری قدیمی اناجیل، سینٹ مرقس، اور سینٹ پطرس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی (حضرت) عیسٰیؑ نے پطرس کی وفات سے اڑتالیس سال قبل جو کچھ کہا اس میں سے جو کچھ پطرس کو یاد رہ سکا وہ بھی ارامی زبان سے یونانی میں ترجمہ شدہ۔ اس لئے (کلیسا کے فیصلہ سے قطع نظر) یہ سمجھنا بالکل حماقت ہے کہ آج جو کچھ (حضرت) عیسٰیؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس طرح لفظاً لفظاً انہی کا ہے۔ گویا کسی مختصر نویس (شارٹ ہینڈ رائٹر) نے اسے لکھ لیا ہو، یا فوٹو گراف سے محفوظ کر لیا ہو۔ (صـ۳۲۳)

اناجیل کی تعلیم کے متعلق جوڈ لکھتا ہے :-

سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق (حضرت) عیسٰیؑ کی تعلیم افسوس ناک حد تک مبہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء، سرمایہ داری۔ استعماریت۔ غلامی۔ جنگ۔ قید و بند (دشمنوں کو) زندہ جلانا یا اذیتیں دینا، غرضیکہ جس چیز کو چاہیں بلا دقت مسیح کی تعلیم سے ثابت کر سکتے ہیں۔ (صـ۳۳۱)

یہ ہے ان اناجیل اربعہ کی تاریخ تدوین۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جو نسخے پہلی صدی عیسوی کے اخیر تک مرتب ہوئے یا جنہیں چوتھی صدی میں نیقیہ کی کونسل نے منتخب کیا تھا وہ اب تک موجود چلے آرہے ہیں۔ دنیا میں اناجیل کے صرف تین

قدیمی نسخے

قدیمی نسخے ہیں۔ ایک وٹیکن میں، جس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ غالباً پانچویں یا چھٹی صدی کا ہے۔ اس نسخہ میں عہد نامہ عتیق و جدید کی کتابیں یونانی زبان میں ہیں، لیکن مکمل نہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بائبل میں ہوں گی ہی اتنی کتابیں جتنی اس نسخہ میں موجود ہیں۔ باقی کتابیں بعد کا اضافہ ہیں۔

دوسرا نسخہ اسکندریہ کا ہے جو آج کل برٹش میوزیم میں ہے۔ اس کے متعلق بھی خیال ہے کہ یہ پانچویں صدی سے پہلے کا نہیں۔ یہ بھی یونانی زبان میں ہے اور ناقص۔

تیسرا نسخہ سیناہے جو روس کے (سابقہ) پایۂ تخت پٹروگریڈ میں تھا اور جسے روسیوں نے انگلستان کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ یہ نسخہ چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انجیل مرقس کا آخری باب جس میں حضرت مسیحؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کا ذکر ہے موجود نہیں۔ اس لئے اب رفتہ رفتہ یہ خیال پختہ ہو رہا ہے کہ یہ قصہ بعد کا اور الحاقی ہے۔

تراجم چوتھی صدی میں جیروم نے ان اناجیل کا ترجمہ یونانی زبان سے لاطینی میں کیا۔ یہی ترجمہ اس انگریزی ترجمہ کا ماخذ ہے جو شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں) شائع کیا گیا اور جو "مستند ترجمہ" کہلاتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں کنٹربری میں ۲۷ علمائے عیسائیت کی ایک مجلس بدیں غرض منعقد ہوئی کہ چونکہ ۱۶۱۱ء والا ترجمہ ناقص ہے اس لئے ایک اور مستند ترجمہ شائع کیا جائے۔ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ کے ناقص رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں اناجیل کے دو قدیمی نسخے (اسکندریہ اور سینا) دریافت نہیں ہوئے تھے۔ نیز اس لئے کہ اثری تحقیقات نے دنیائے تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس نے ۱۸۸۱ء میں ایک اور ترجمہ شائع کیا جسے (REVISED EDITION) کہا جاتا ہے۔ اس کانفرنس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ میں متعدد مقامات الحاقی ہیں۔ یہ تو ہے ان دو "مستند" ترجموں کے باہمی موازنہ کا نتیجہ۔ لیکن انجیل کے جو نسخے بائبل سوسائٹیز کی طرف سے شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کی کیفیت بھی یہ ہے کہ ہر نیا ایڈیشن، سابقہ ایڈیشن سے، اور ہر نئی زبان میں ترجمہ، کسی دوسری زبان میں ترجمہ سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جرمن ڈاکٹر میل نے جب عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کر کے ان کا موازنہ کیا تو تیس ہزار اختلافات شمار کئے۔ اور جان جیمس نے اس سے ذرا زیادہ تحقیق کی تو دس لاکھ اختلافات ابھر کر سامنے آ گئے۔ (مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون (GOSPEL) اور انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون (BIBLE) دیکھئے۔

بائبل کا مفسر، پادری ڈملو جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، لکھتا ہے:۔

> اناجیل کے لکھنے والوں نے یسوع مسیحؑ کے اقوال کو یونانی زبان میں لکھا ہے۔ حالانکہ وہ (حضرت مسیحؑ) اغلباً ارامی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کو کبھی یہ خیال آیا ہو تا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے بھی جائیں گی۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط، جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے، اصل میں صرف ان ہی کلیساؤں کے لئے مخصوص تھے جن کے نام وہ لکھے گئے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں ان معنوں میں مقدس نوشتے

نہیں سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔

آگے چل کر یہی مفسر رقمطراز ہے :-

ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض اوقات وہ الفاظ درج نہیں کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ الفاظ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہوتے چاہیئے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض اوقات اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس سے وہ خود متعلق ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالجات کے علاوہ، عہد نامہ جدید کے قریب چار ہزار (مختلف) نسخے یونانی زبان میں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہیں۔

جس طرح چوتھی صدی عیسوی میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تھی اسی طرح سولہویں صدی (۱۵۴۵ء تا غایت ۱۵۶۳ء) میں ٹرنٹ (TRENT) کے مقام پر ایک اور عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کونسل میں جو اہم مباحث فیصل ہوئے تھے ان کا اجمالی ذکر اس مقام پر کر دیا جائے۔ یہ بیان اس رودادسے ماخذ ہے جسے ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی (لندن) نے شائع کیا تھا۔ اس کونسل میں منجملہ دیگر امور ذیل کی تین اہم باتیں زیر بحث آئی تھیں۔

ٹرنٹ کی کونسل

۱ــــ اپوکریفہ کی حیثیت کیا ہے ؟

۲ــــ کیا روایات اور اناجیل ہم پلہ ہیں ؟

۳ــــ اناجیل کے مختلف نسخوں میں جو اختلافات ہیں انہیں کس طرح رفع کیا جائے ؟

شق اول کے متعلق اس روئیداد میں مذکور ہے :-

اگرچہ اپوکریفہ کتابوں کو جیروم نے بائبل کے ولگیٹ ایڈیشن میں شامل کر دیا تھا لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ انہیں مستند نہیں سمجھتا تھا . . . . لیکن کونسل میں بحث و تمحیص کے بعد) سینٹا کروس کی رائے سب پر غالب آگئی، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ولگیٹ ایڈیشن میں جس قدر کتابیں بھی شامل ہیں انہیں آسمانی کتابیں تصور کیا جائے۔ (ص ۲۷-۲۸)

اسی طرح اپوکریفہ کی جعلی کتابیں آسمانی قرار پاگئیں۔

شق دوم کے متعلق کونسل کے اراکین میں بہت اختلاف تھا۔ چنانچہ جب یہ مسئلہ بحث کے لئے پیش ہوا، اور وہ حصہ پڑھا گیا جس میں درج تھا کہ اناجیل اور روایات کو یکساں تقدس اور عظمت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو برٹنی نے اس کی

مخالفت کی اور کہا کہ اگرچہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ان دونوں کا مصنف خدا ہی ہے۔ کیونکہ سچائی جو بھی ہو اس کا سرچشمہ وہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ بھی سچ ہے وہ سب الہامی ہے (مزید برآں) یہ حقیقت کہ بہت سی روایات اب استعمال میں نہیں رہیں اس امر پر دال ہے کہ خدا کا یہ قطعاً منشاء نہ تھا کہ انہیں تقدس و عظمت میں اناجیل کا ہم پلہ سمجھا جائے۔ (ص۲۹)

لیکن اس کے خلاف مخالفت کا ایسا سیلاب امڈا کہ اس بیچارے کو معافی مانگنی پڑی اور یہ وعدہ کرنا پڑا کہ جو کچھ بھی فیصلہ ہوگا وہ اسے تسلیم کرے گا۔ چنانچہ یہی قرار پایا کہ روایات کو وحی کا ہم پلہ سمجھا جائے۔

شق سوم کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ "اس قدر مختلف نسخوں کا وجود اناجیل کے معانی کو غیر متیقن کر دیتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ایک متفق علیہ نسخہ شائع کر دیا جائے جسے مستند سمجھا جائے"۔ (ص۲۹) چنانچہ یہ طے ہوا کہ چھ ارکان پر مشتمل ایک اور کمیٹی متعین کی جائے جو ولگیٹ کے مختلف نسخوں سے ایک متفقہ علیہ نسخہ مرتب کرے۔ (ص۳۰) PALLYICINT کا بیان ہے کہ اس کمیٹی نے ایک طویل رپورٹ پیش کی جس میں اغلاط و اختلافات کی لمبی چوڑی فہرست درج تھی۔ "اس کثافت کے ڈھیر کو کوئی سیلاب ہی صاف کر سکتا تھا"۔ (ص۳۰) اس کمیٹی نے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد ایک نسخہ مرتب کیا لیکن وہ پوپ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس نے یہ کام علماء کی ایک مجلس کے سپرد کیا۔ اس کے جانشین (PIOUS - V) نے بھی اس مہم کو جاری رکھا اور بالآخر ۱۵۹۰ء میں ایک نسخہ شائع ہوا۔

> اس مستقل مزاج پوپ نے نہ صرف اپنے گرد وپیش بڑے بڑے علماء اور نقاد کی جماعت جمع کی۔ بلکہ خود بھی بڑے جذب و شوق سے اس کام میں منہمک ہو گیا۔ اس نے پریس میں بھیجنے سے پہلے اس نسخہ کو حرف بحرف خود پڑھا۔ دوران طباعت میں اسے دوبارہ پڑھا۔ جب چھپ کر آیا تو اسے پھر پڑھا اور اس کی تصحیح کی۔ اس کے بعد اسے مستند قرار دے کر شائع کیا گیا۔ لیکن ابھی یہ نسخہ شائع ہوا ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں اس سے زیادہ صحیح ایک اور نسخہ شائع کیا گیا۔ ان دونوں نسخوں میں نمایاں اختلاف ہے۔ اس کے بعد ۱۵۹۳ء میں ایک اور نسخہ شائع ہوا جو ۱۵۹۲ء والے نسخہ سے بھی مختلف تھا۔ ڈاکٹر جیمس نے ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو ان میں قریب دو ہزار اختلاف نظر پڑے جن میں بعض آیات پوری کی پوری ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اور بہت سی آیات ایک دوسرے سے متضاد تھیں۔ بایں ہمہ ان دونوں نسخوں کو یکساں طور پر مستند تصور کیا گیا۔ (ص۳۳-۳۴)

غور فرمایا آپ نے کہ اناجیل کے "مستند" نسخے کس طرح وجود میں آتے رہے۔ یہی مستند نسخے تھے جن کا انگریزی شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء) میں ہوا۔ اور جسے پھر ۱۸۸۱ء میں ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا گیا۔ سوچئے کہ اس آخری نسخہ کو (جو پھر ہر نئے ایڈیشن کے وقت بدلا جاتا ہے) جناب حضرت مسیحؑ کی انجیل سے کیا نسبت باقی رہ جاتی ہے؟ حال ہی میں (غالباً ۱۹۶۱ء میں)

بائبل کا ایک جدید انگریزی ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ یہ ماڈرن انگلش (جدید انگریزی زبان) میں ہے۔ سابقہ انگریزی ایڈیشنوں کی خاص زبان تھی — جسے "بائبل زبان" کہا جاتا تھا۔

ان اختلافات یا اغلاط کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ دورِ حاضرہ کی پیداوار ہیں؟ یہ تو اناجیل کی تالیف کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے۔ مشہور نقاد (CELSOS) قریب ۲۰۰ء میں لکھتا ہے کہ

دانستہ تحریف عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں میں دیدہ و دانستہ فریب کارانہ انداز سے ردوبدل کر ڈالا ہے۔

اس تحریف و الحاق کے انداز کیا تھے؟ سب سے پہلے تو یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ عام طور پر ناخواندہ تھے۔ چنانچہ مشہور عیسائی مؤرخ (MOSH EIM) اپنی تاریخ کے حصہ اوّل (پہلی صدی) باب ۳ میں لکھتا ہے:۔

> یہ تمام شاگرد تعلیم سے بے بہرہ اور فلسفہ اور دیگر علوم سے ناآشنا تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اناجیل کے اصل نسخے ان کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ (اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ موجودہ نسخے جو ان حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں دراصل ان کی تالیف نہیں ہیں (کیونکہ وہ تو تعلیم سے بے بہرہ تھے) لیکن اس تحریف اور تغیر و تبدل کی اس سے کہیں گہری وجہ ایک اور تھی۔ یہ وجہ کیا تھی؟ اسے غور سے سُنیئے! سینٹ پال (موجودہ عیسائیت کا بانی) انجیل (خطوط پال) میں لکھتا ہے:۔

> اگر میرے جھوٹ کے سبب سے، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا۔ (رومیوں کے نام ۳/۷)

جھوٹ کی "عظمت" غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا عقیدہ ہے؟ اگر جھوٹ بولنے سے "خدا کی بڑائی" ظاہر ہوتی ہو تو بلا تکلف جھوٹ بولئے۔ جب جھوٹ کا دروازہ اس طرح چوپٹ کھول دیا جائے تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے ظاہر ہیں۔ (MOSHEIM) چوتھی صدی کے متعلق لکھتا ہے:۔

> مذہبی صداقت اور پاکبازی کو ان دو خطرناک حماقتوں سے سخت ٹھیس لگی جو اس صدی میں عام طور پر مروّج ہو چکی تھیں۔ اوّل یہ عقیدہ کہ اگر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے کلیسا کے مفاد کو تقویت پہنچتی ہو تو یہ کذب و فریب بڑے ثواب کا درجہ رکھتا ہے۔
>
> . . . یہ عقیدہ ایک عرصہ سے مروّج چلا آتا تھا اور اس نے اس اثناء میں بے شمار مضحکہ انگیز روایات، افسانہ طرازیاں اور مقدس فریب (عیسائیت میں داخل کر کے) رکھ دیئے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کھلے بندوں کر لینا ہوگا کہ اس صدی (چوتھی صدی) میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں اور بڑے بڑے مقدس ولی بھی اس دروغ بافی اور کذب نوازی سے بری نہ تھے۔

اور اس کا ثبوت ان کی تحریروں سے اور ان کے کارناموں سے بآسانی مل سکتا ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ اس الزام سے کم از کم بڑی بڑی مقدس ہستیوں (مثل فلاں اور فلاں) کو تو مستثنیٰ قرار دے دیں۔ لیکن کیا کیا جائے! سچائی ان بزرگوں کی عقیدت سے کہیں زیادہ قابلِ احترام ہے اور سچائی کا تقاضا ہے کہ انہیں بھی اس الزام کا مورد قرار دیا جائے۔

(چوتھی صدی۔ حصہ دوم۔ باب ۳/۱۴)

یہی مؤرخ تیسری صدی کے متعلق لکھتا ہے:۔

جو لوگ یہ چاہتے تھے کہ نیکیوں میں دوسروں سے سبقت لے جائیں وہ اس چیز کو نہ صرف جائز ہی سمجھتے تھے بلکہ قابلِ تحسین بھی کہ نیکی کے مشن کو تصنع اور فریب سے تقویت دی جائے۔ (حصہ دوم۔ باب ۳/۱۱)

اسے نظر انداز نہ کیجئے کہ لکھنے والا کوئی غیر عیسائی نہیں بلکہ عیسائیوں کی دنیا کا ایک بہت بڑا مؤرخ ہے جس کی تاریخ کلیسا ایک مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ اوپر چوتھی اور تیسری صدی کا ذکر آچکا ہے۔ اب دوسری صدی کو لیجئے:۔

افلاطونی اور فیثاغورثی مسلک کے پیرو، صداقت اور نیکی کے مشن کو، جھوٹ اور فریب سے فروغ دینے کو نہ صرف جائز، بلکہ قابلِ ستائش خیال کرتے تھے۔ جو یہودی مصر میں رہتے تھے انہوں نے (حضرت) مسیحؑ سے پیشتر ان لوگوں سے یہ اصول مستعار لے رکھے تھے۔ جیسا کہ ازمنۂ قدیمہ کی بے شمار دستاویزات سے صاف طور پر ثابت ہے۔ عیسائیوں نے اس اصول کو ان دونوں سرچشموں سے حاصل کیا جیسا کہ ان کثیر التعداد کتابوں سے ظاہر ہے جنہیں تصنیف کسی نے کیا اور منسوب کسی اور کی طرف ہیں۔ (حصہ دوم۔ باب ۳/۱۵)

اس سے بھی پیچھے چلئے اور پہلی صدی کی حالت دیکھئے:۔

(حضرت) مسیحؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے تھوڑا عرصہ بعد آپ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق بہت سی سیرت کی کتابیں لکھی گئیں جو مقدس فریبوں اور اعجوبہ نگاریوں سے بھرپور تھیں۔ یہ کتابیں ان لوگوں نے تصنیف کیں جن کی شاید نیت تو خراب نہ تھی لیکن ان کی تحریروں سے سخت اوہام پرستی اور جہالت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہیں پر بس نہیں۔ بہت سے فریب کاروں نے خود کتابیں لکھیں اور انہیں مقدس حواریوں کی طرف منسوب کر کے دنیا کے حوالے کر دیا[1]۔ (پہلی صدی حصہ دوم۔ باب ۲/۱۷)

اندازہ فرمایئے کہ اس "مقدس جھوٹ" نے جسے سینٹ پال نے بہت بڑا کارِ ثواب قرار دیا تھا، کیا کیا گل کھلائے۔ اور یہ سلسلہ پہلی صدی

---

[1] کم و بیش پچاس انجیلیں آج بھی ایسی موجود ہیں جنہیں اپوکریفہ کی فہرست میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اصل سمجھ کر مقدس آسمانی خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی اصلیت کے متعلق بھی آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

ہی سے شروع ہوگیا۔ مندرجہ صدر اقتباسات صرف پہلی چار صدیوں کے متعلق ہیں اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے۔ ان ہی حقائق کے پیشِ نظر خود عیسائیوں کے علماء اب اس امر کا اعلانیہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اناجیل ناقابلِ اعتبار ہیں۔ انگلیکن چرچ کا بشپ (CHARLES GORE) لکھتا ہے :-

سینٹ کرڈسٹم کی طرح میرے لئے بھی اس امر کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اناجیل غلطی سے مبّرا ہیں

(THE HOLY SPIRIT AND THE CHURCH)

یہ ہے انجیل کی داستان، خود عیسائی مؤرخین، مفکرین اور پادریوں کی زبانی۔ اس سلسلہ میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم میں کتبِ سابقہ (توریت۔ انجیل وغیرہ) کے سلسلہ میں کئی مقامات پر کہا گیا ہے: "مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ" (جیسا کہ آیت ۳/۳ میں بھی آیا ہے)۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ـــــ قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ

مصدقا لما معکم

غور کیجئے کہ اس سے کتنی بڑی گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جو آیت (۳/۳) میں پیش کیا گیا ہے اور جس کی تفصیل مطالب جلد دوم زیر آیت (۲/۴۱)۔ صفحہ ۱۸۲ پہ دی گئی ہے۔ قرآن مجید محرف کتابوں کی تصدیق نہیں کرسکتا۔ انبیاءِ سابقہ کو جو تعلیم دی گئی تھی وہ اُسے سچ کر دکھاتا ہے۔

آیات (۳/۳-۴) میں قانونِ مکافاتِ عمل کا ذکر تھا۔ اگلی آیت میں ایک مثال سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں کیا تعلق ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے ہر عمل کا نتیجہ اس عمل کے سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہوجاتا

عمل اور اس کی نتیجہ خیزی

ہے لیکن وہ بڑا غیر محسوس ہوتا ہے اس لئے اس کے مآل (انجام کار ـــ نتیجہ) کا دیکھنا تو ایک طرف، وہ قبل از وقت ان کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ نتیجہ آہستہ آہستہ نشو و نما پاتا ہوا آگے بڑھتا ہے تاآنکہ ایک دن وہ محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ انسان کو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس غیر محسوس آغاز کا انجام کیا تھا۔[1] یوں سمجھئے کہ اس تمام دوران میں وہ نتیجہ مضمر (LATENT OR POTENTIAL) ہوتا ہے اور آخرالامر (ACTUALISE) ہو کر محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ فرمایا :-

۳/۵ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳/۵)

---

[1] قانونِ مکافاتِ عمل کی توضیح و تشریح کے لئے انڈکس دیکھئے (جو جلد سوم کے آخر میں ملحق ہے)۔

خدا وہ ہے جو جرثومہ تولید کو رحمِ مادر میں آہستہ آہستہ نشوونما دیتا ہوا محسوس پیکر عطا کر دیتا ہے۔ اس طریق کار کے لئے قوت اور حکمت دونوں درکار ہوتی ہیں جو خدا کو بدرجۂ اتم حاصل ہیں۔

اس مثال کی جامعیت پر غور فرمائیے۔ مادۂ تولید کو یوں تو ایک قطرہ کہا جاتا ہے لیکن وہ درحقیقت قطرہ بھی نہیں بلکہ ایسا جرثومہ (CELL) ہوتا ہے جسے برہنہ آنکھ (NAKED EYE) دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اسے خوردبین کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔ کیا اُس وقت کوئی اس کا تصور تک بھی کر سکتا ہے کہ اس جرثومہ کے اندر، پورے کا پورا انسان، اپنی جملہ صلاحیتوں کو لئے چھپا بیٹھا ہے[1]؟ جس طرح انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ اسے بھی اپنے حیطۂ خیال میں نہیں لا سکتا کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال بھی ایک دن تباہی و بربادی کا جہنم بن کر اس کے سامنے آجائے گا۔

قرآن کریم نے اپنے اس اسلوبِ بیان اور اندازِ تفہیم و افہام کو اگلی آیت میں بڑی جامعیت سے بیان کیا ہے۔ یہ آیت بڑی اہم ہے لیکن ہمارے ہاں کے (اکثر) مفسرین اور مترجموں نے اسے غلط معنے پہنا کر ایسی الجھنیں پیدا کر دی ہیں جن سے خدا کی اس کتابِ عظیم کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ آیت یہ ہے:-

۳/۷ هُوَ الَّذِىٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ‏ ۝ (۳/۷)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:-

وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنے پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں"۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۳۴۔ از ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم)) ۱۹۵۱ء ایڈیشن

---

[1] انسانی تخلیق۔ اس کی صورت پذیری اور نظریہ ارتقاء کے لئے جلد سوم کے آخر میں انڈکس دیکھئے۔ صَوَّرَکُمْ کی مزید تشریح متعلقہ مقامات میں سامنے آئے گی۔

اس ترجمہ کے نیچے یہ تشریح دی گئی ہے :-

آیات کا غلط مفہوم | متشابہات۔ یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ (ایضاً)

اس تشریح کی رو سے کہا یہ گیا ہے کہ قرآن مجید میں (معاذ اللہ) ایسی آیات بھی ہیں جن کے مفہوم میں "اشتباہ" (شک وشبہ) ہے۔ یہ اس کتاب کے متعلق کہا جارہا ہے جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (۲/۲)۔ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں ریب وتشکیک (شک وشبہ۔ اشتباہ) کی کوئی گنجائش نہیں۔ مودودی مرحوم نے سورۂ بقرہ کی آیت (۲/۲) متعلقہ ذبح بقر کی تشریح کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اس آیت کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے"۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اوّل صـ۸۶)۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے (قرآن کریم کو) کتابِ مبین (نہایت واضح کتاب) کہہ کر پکارا ہے اور یہاں تک فرمادیا کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۞ (۷۵/۱۹)۔ "اس کی وضاحت ہم نے خود کی ہے کیونکہ ایسا کرنا ہمارے ذمہ تھا"۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین کی اس قسم کی غلط نگہی تھی جس نے قرآن کریم کے متعلق غیر مسلموں کے لئے اعتراضات کے دروازے کھول دیئے۔ دورِ حاضر کے مستشرقین میں (ARTHUR J. ARBERRY) کو عام طور پر کشادہ نگاہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے بھی آیت (۳/۷) کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے :-

THE BOOK WHEREIN ARE VERSES CLEAR .... AND OTHERS <u>AMBIGUOUS</u>

(THE KORAN INTERPRETED VOL : 1 . P. 73)

لیکن جب ہم خود کہیں کہ قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں اشتباہ کی گنجائش اور ابہام ہے، تو آربری وغیرہ کو کس طرح موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ قرآن مجید کی جن آیات کا مفہوم ہماری سمجھ میں نہ آئے، بجائے اس کے کہ انہیں مشتبہ یا مبہم قرار دیا جائے، اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہمارے علم کی سطح ہنوز اتنی بلند نہیں کہ ہم اس کے مفہوم کی رفعت تک پہنچ سکیں۔ یہ قرآن کا "نقص" نہیں کہ اس کے حقائق اتنے بلند اور اس کے اسرار ایسے عمیق ہیں۔ یہ ہنوز ہمارے علم وادراک کی کوتاہی ہے جو ہم ان تک پہنچ نہیں پاتے۔ ؎

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ ؟

اب ہم آیت (۳/۷) کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے حسب ذیل الفاظ (بلکہ اصطلاحات) کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔

۱۔ محکمٰت ۲۔ متشابہات ۳۔ ام الکتاب اور ۴۔ تاویل

محکمٰت | (۱) محکمٰت۔ اس کا مادہ (ح۔ک۔م) ہے۔ اَلْحَكَمَةُ گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں۔ بلکہ گھوڑے کو لگام

دے کر اس کے دونوں جبڑوں کو اس طرح کس کر باندھنے کو کہ وہ ادھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ اس حکمَ سے مراد ہوتی ہے کسی شے کی حدود اس طرح متعین کر دینا کہ اس کا اٹل مقام نمایاں طور پر سامنے آجائے۔ ایسی شے کو مُحْکَمٌ کہیں گے۔ لہٰذا، محکمات وہ آیات ہوں گی جن کے الفاظ کے معانی متعین ہوں۔ مثلاً نکاح کے ضمن میں ارشاد ہے: حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ (۴/۲۳)۔ "تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں"۔ اس میں لفظ اُم (جمع اُمّہات) کے معنے ماں کے ہیں جو بالکل واضح اور متعین ہیں۔ اسی مادہ سے حکمت، حُکم، حکومت، وغیرہ الفاظ بھی آتے ہیں۔ ان کے مفہوم کے لئے تیسری جلد کے آخر میں انڈکس دیکھئے۔ یہاں ہم صرف محکمات کے لفظ تک محدود رہنا چاہتے ہیں)۔

(۲) تَشَابُہ کے معنے ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور مانند اور مشابہ ہونا۔ اَلشِّبْہُ۔ وَالشَّبَہُ۔ وَالشَّبِیْہُ کے معنے ہیں مثل اور مانند۔ تشبیہ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز سے مثال دے کر بیان کرنا۔ مُشَابَھَتٌ کے معنے ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا۔ تشبیہات، تمثیلات (PARABLES) استعارات کے الفاظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتے ہیں۔

لہٰذا، محکمات وہ آیات ہوں گی جن میں الفاظ کے (LITERAL) معانی لئے جائیں۔ اور متشابہات وہ آیات جن میں (SYMBOLICAL ; FIGURATIVE ; ALLEGORICAL ; METAPHORICAL) انداز میں آئے ہوں۔ انہیں مجازی معانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ابھی سامنے آتی ہیں۔

اُمُّ الکتاب

(۳) ام الکتاب۔ امّ (ا۔م۔م) کے حقیقی (محکم) معنی ماں کے ہیں۔ یعنی جس کے بطن سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مجازی طور پر اس کے متعدد معانی ہیں۔ ان میں سے ایک معنے کسی شے کی اصل۔ بنیاد۔ جڑ کے ہیں۔ سورۃ النساء کی آیت: حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ (۴/۲۳)۔ "تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں" میں اُمّ کا لفظ اپنے حقیقی معانی میں آیا ہے لیکن اُمّ الکتٰب میں اس کا مفہوم مجازی ہے۔ یعنی کتاب کی اصل، اساس۔ بنیاد۔ جڑ۔ یہاں 'کتاب کی ان آیات کو جن سے اس کی غرض و غایت، مقصود و منتہیٰ، اصل و اساس کے سامنے آتی ہے' ماں کے تشبیہ دے کر 'ام الکتاب' کہا گیا ہے۔ یعنی (۳/۷) میں لفظ اُم کے حقیقی اور مجازی معانی کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ عربی زبان بڑی وسیع ہے اور اس میں مرادفات بڑی کثرت سے ہیں۔ اس لئے اس میں مجازی معانی کا انداز عام ہے۔ تفصیل اس کی "مفہوم القرآن" کے ابتدائیہ میں ملے گی۔

تاویل

(۴) تاویل کا لفظ ہمارے ہاں اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے۔ قرآنی آیات کو کھینچ تان کر ان کے اپنے مفید مطلب معانی متعین کرنا۔ ایسا کرنا معیوب و مذموم ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک شرک ہے۔ قرآنی آیات کا مفہوم وہی لینا چاہیئے جسے خود قرآن نے متعین کیا ہے خواہ وہ آپ کے مفاد (حتٰکہ آپ کے عقیدہ، مسلک، نظریہ)

کے مطابق ہو یا اس کے مخالف۔ پہلے سے کوئی عقیدہ یا خیال قائم کر کے، قرآن کی طرف اس مقصد کے لئے رجوع کرنا کہ اس سے آپ کے عقیدہ یا خیال کی تائید ہو جائے (خواہ وہ عقیدہ یا خیال باطل ہی کیوں نہ ہو) شرک ہے۔ اس لئے تاویل کا یہ مفہوم فی الواقعہ معیوب

تأویل کا مفہوم

اور مذموم ہے۔ لیکن عربی زبان اور قرآنِ کریم میں اس کا یہ مفہوم نہیں۔ ان میں اس کا مفہوم ہے کسی بات کا مآل۔ انجام۔ آخری نتیجہ۔ مثلاً سورۃ النساء میں اسلامی نظام کے بنیادی عناصر (اللہ۔ رسول اور اولی الامر کی اطاعت) کی وضاحت کرنے کے بعد کہا: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴/۵۹) "یہ روش سب سے بہتر ہے اور تم دیکھو گے کہ آخر الامر اس کا نتیجہ کیسا اچھا برآمد ہوتا ہے"۔ دوسری طرف، دین کو کھیل تماشے سمجھنے والوں کے متعلق کہا کہ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ (۷/۵۳)۔ انہیں بہت کچھ سمجھایا گیا ہے لیکن یہ اپنی روش سے باز نہیں آتے۔ یہ درحقیقت اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی اس روش کا مآل اور آخری نتیجہ ان کے سامنے آ جائے۔ لہٰذا، آیۂ زیرِ نظر میں تاویل کے معنے (ULTIMATE REALITY) ہوں گے، کنہ وحقیقت۔ ماہیت وکیفیت۔

ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب آیئے آیۂ زیرِ نظر (۳/۷) کی طرف جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ آیت بڑی اہم ہے لیکن اس کے غلط مفہوم نے بڑی پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کی تشریح پوری وضاحت سے کی جائے۔ حسنِ اتفاق سے یہ وضاحت (میری تصنیف) لغات القرآن میں (مادہ ح۔ک۔م کے تحت) شرح و بسط سے کی گئی ہے۔ اس جگہ اس کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔ آپ اسے پورے غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔

قرآن کریم میں انسانی راہنمائی کے لئے قوانین و ضوابط دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان احکام و قوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ سے محکم طور پر متعین ہو جاتا ہو۔ جیسا کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے۔

محکمات و متشابہات کا مفہوم

اس قسم کی آیات مُحْكَمٰتٌ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اس عالم سے ہے جو ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات اور اس کی صفات۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور اس میں اعمال کے نتائج۔ وہاں کی جنت اور جہنم۔ یا انسانی زندگی کا منتہیٰ اور مآل۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد حقائق (ABSTRACT TRUTHS) کو جب بھی بیان کیا جائے گا تشبیہ و استعارہ اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائے گا۔ یعنی ان کا بیان (SYMBOLICALLY) ممکن ہوگا۔ مثلاً اللہ کے متعلق

عرش کی مثال

کہا گیا ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۷/۵۴)۔ وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ اور وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (۱۱/۷)۔ اس کا عرش پانی پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں عَرْشٌ سے مراد لکڑی (یا کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں۔ نہ ہی مَآءٌ سے مراد پانی ہے۔ یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے۔ یعنی ان حقائق کو تشبیہ اور

مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا، یہ آیات مُتَشَابِہَاتٌ ہیں۔ یعنی ایسی آیات جن میں حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالمِ محسوسات سے باہر کے ہیں ان کی حقیقت، کنہ، ماہیت، یعنی ان کی تَاْوِیْلٌ (WHAT THEY ACTUALLY ARE) کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غور و فکر سے ہم ان کے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے۔ مثلاً لفظ عَرْشٌ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا مفہوم قوت و اقتدار (AUTHORITY OR CONTROL) ہے۔ یا کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ میں مَآءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱/۳۰)۔ ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔ لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کس طرح عمل میں لاتا (EXERCISE کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (LIFE) کو کس طرح پیدا کیا۔ ان باتوں کی کنہ و حقیقت کو ہم نہیں پا سکتے۔ ان حقائق کی اصل و حقیقت کے متعلق ہمیں علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷/۸۵)۔ ان کی اصل و حقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ البتہ جہاں تک ان کا تعلق ہماری ذات اور انسان کی تمدنی زندگی سے ہے ہم عقل و فکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے، وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳/۷)۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور ہٹا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جانا۔ یہ لوگ ان ماوراء العقل حقائق کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کے لئے نظری موشگافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں اور اسے بلند ذہن سطح کا علم قرار دیتے ہیں۔ یہ زمین کے ہنگاموں کو پست قرار دے کر آسمان کی باتوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم اسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآنِ کریم "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" اور "اُولِي الْاَلْبَابِ" کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ جو عقل و فکر سے کام لے کر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم رکھتا ہے اس لئے ان کے حقائق (TRUTH) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ لیکن ہم ان کی کنہ و حقیقت کو پا نہیں سکتے۔ البتہ ان سے جو انسانی راہنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل و فکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے۔ یعنی ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ"

بھی۔ لیکن خدا ان کی کنہ وحقیقت تک کا علم رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راہنمائی (ذکر) ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اس صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے ۲۶/۲ یا ۲۳/۵)۔

بعض الفاظ کے حقیقی معانی کس طرح فتنہ کا موجب بن جاتے ہیں اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن کریم میں ہے:

خدا کے لئے اعضاءِ انسانی کے الفاظ

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا (۳۶/۷۱) "کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے مویشیں کو کس طرح اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا؟" یہاں خدا کے لئے یَدٌ (ہاتھ) کا لفظ آیا ہے۔ سورۂ مومنون میں حضرت نوحؑ کی کشتی سازی کے سلسلہ میں ہے: فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا (۲۳/۲۷) "ہم نے نوحؑ کی طرف وحی کی کہ وہ ہماری آنکھوں کے تحت کشتی بنائے"۔ یہاں خدا کے لئے عین (آنکھ) کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ الطور میں حضور نبی اکرمؐ سے ارشاد ہوا: وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (۵۲/۴۸) "تم احکامِ خداوندی پر جم کر کھڑے رہو۔ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو"۔ یہاں بھی خدا کے لئے عین کا لفظ آیا ہے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں (ید) یا (عین) کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں گے۔ یعنی دستِ قدرت اور زیرِ نگرانی۔ سچ مچ کے ہاتھ اور آنکھیں مراد نہیں لی جائیں گی۔ لیکن ابتغاء فتنہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ہاں دو فرقے وجود میں آگئے۔ ایک تجسیمیہ اور دوسرا تنزیہیہ۔ تجسیمیہ خدا کو مجسم قرار دیتا ہے اور تنزیہیہ اسے جسم وتشکل وصورت سے منزہ تسلیم کرتا ہے۔ ان دونوں میں جس انداز کی سرپھٹول ہوتی رہی ہے تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں حالانکہ اس تمام بحث کا فیصلہ قرآن مجید کی ایک آیت کی رو سے ہو سکتا تھا جس میں کہا گیا ہے:

وہ مثالوں سے بھی بلند ہے

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲/۱۱)۔ "اس کی مثل کوئی شئے نہیں"۔ یعنی اس کے متعلق کوئی مثال بھی دی جائے گی تو اس (مثال) کے الفاظ کے بھی حقیقی معنے نہیں لئے جائیں گے۔ مجازی مفہوم ہی لیا جائے گا۔ ذاتِ خداوندی تو ایک طرف اس کی توصفات کا بھی یہ عالم ہے کہ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۞ (۶/۱۰۱)۔ "یہ لوگ خدا کی صفات بھی جن الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ ان سے منزہ ومبرا اور بلند وبالا ہے"۔ لہٰذا، ان الفاظ کو بھی حقیقی معانی میں نہیں لینا چاہیئے۔ مجازی معانی میں لینا چاہیئے۔ وہ سمیع وبصیر ہے لیکن اس کا سُننا اور دیکھنا انسانوں جیسا نہیں۔ سعدیؒ کے الفاظ میں:

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم وز ہرچہ گفتہ ایم وشنیدیم وخواندہ ایم

قرآن کریم نے اس کی اس طرح وضاحت کر دی لیکن ابتغاء فتنہ (فتنہ جوئی) ہے کہ تجسیمیہ اور تنزیہیہ فرقے پیدا کر رہی ہے!

تجسیمیہ، قرآنِ کریم کے ان الفاظ کے حقیقی معنی لے کر خدا کو ایک مجسمہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ اس باب میں وہ کس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ ہم نے اوپر عرش کے متعلق بات کی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے :-

عرشِ خداوندی آسمانوں پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک (۱،۷) : (۷۲) یا (۷۳) سال کی راہ ہے۔ اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اس قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

یہ نتیجہ ہوتا ہے آیات متشابہات کے الفاظ کے حقیقی معانی لینے کا۔ انہیں تشبیہات کے رنگ میں لیجئے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

مُتَشَابِہَاتٌ میں ایسے حقائق (احکام نہیں حقائق) بھی شامل ہیں جنہیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے؛ جن کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی علمی اور عقلی سطح کے مطابق یا ہر زمانہ کا انسان اپنے اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ یہ

قرآنی حقائق کے سمجھنے کا طریق ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم ہر سطح کے انسانوں کے لئے راہنمائی کا ضابطہ ہے اور زمانہ کے انسانوں کے لئے بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف انسان مختلف علمی اور عقلی سطح رکھتے ہیں۔ اگر قرآنِ کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنے حقائق بیان کرتا تو نہ وہ عالمگیر ہو سکتا تھا نہ ابدی۔ وہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کے لئے یا ایک سطح کے انسانوں کے لئے ہی مفید ہو سکتا تھا۔ باقی انسانوں کے لئے بیکار ہوتا۔ اس قسم کی کتاب کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت ہو تاکہ ہر سطح کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآنِ کریم کا وہ خاصہ ہے جو اعجاز کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ یہ حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے اندر ایسی وسعت رکھتے ہیں کہ اس سے ہر انسان اپنی اپنی سطحِ علم و عقل کے مطابق مستفید ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے : سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ "ہم انہیں عالمِ انفس و آفاق میں اپنی آیات (نشانیاں) دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ سچا ہے"۔ ہم عالمِ انفس میں آیاتِ خداوندی کی بات اپنے مقام پر کریں گے۔

سردست عالمِ آفاق (خارجی کائنات) کو لیجئے۔ اس میں کتنے حقائق ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں تو ایک طرف ابھی کل تک انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ عصرِ حاضر کے سائنسدانوں نے ان میں سے کئی ایک کو منکشف کر لیا ہے۔ واضح رہے کہ

خارجی کائنات کے حقائق

سائنسدان، حقائق کائنات کو وضع یا ایجاد نہیں کرتے۔ وہ انہیں صرف منکشف (DIS - COVER) کرتے ہیں. یعنی ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھادیتے ہیں. قرآن کا اعلان ہے کہ رموز کائنات میں سے جو راز بھی بے نقاب ہو کر سامنے آئے گا وہ اس کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت ہوگا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لئے ایک الگ مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس مقام پر ہم ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں. سورۃ الشوریٰ میں ہے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ؏ (۴۲/۲۹)۔ "آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموات (زمین اور دیگر اجرامِ فلکی) کو پیدا کیا اور ان دونوں میں ذی حیات مخلوق کو پھیلا دیا۔ پھر وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی وقت اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ان دونوں (زمین اور اجرامِ فلکی) کو ملا دے" آپ سوچئے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں تو ایک طرف، آج سے چند سال پہلے تک، انسان اس کا تصوّر بھی کر سکتا تھا کہ زمین اور اجرامِ فلکی میں اس طرح رابطہ پیدا ہو جائے گا کہ چاند کی سطح انسانوں کی سیرگاہ بن جائے گی! فضانوردوں (SPACE CONQUERERS) نے آج اسے حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ باقی رہا قرآن کا یہ دعویٰ کہ اجرامِ فلکی میں بھی ایسے ہیں جن میں جاندار مخلوق ہے، سو سائنسدان اس کے امکانات کے بھی قائل ہو رہے ہیں اور اس کے لئے ان کی تلاش جاری ہے۔

ان انکشافات سے پہلے، قرآنِ کریم کی اس آیت (۴۲/۲۹) کا شمار متشابہات میں ہوتا تھا۔ اب یہ محکمت کے زمرہ میں آگئی۔ لیکن اسی حد تک کہ زمین اور اجرامِ فلکی میں باہمی رابطہ پیدا ہو سکتا ہے اور ان میں ذی حیات مخلوق کے امکانات ہیں۔ یہ رابطے جن قوانینِ فطرت کی رُو سے پیدا ہوتے ہیں، وہ وجود میں کس طرح آئے تھے اور اب کس قوت کے زور پر کارفرما ہیں، اس کا حقیقی علم خدا ہی کو ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ قرآنِ کریم میں اجرامِ فلکی کے متعلق ہے کہ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰)۔ "ہر ایک اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رہا ہے"۔ اور سورج کے متعلق ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ (۳۶/۳۸)۔ "سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک فلکیات کے متعلق (قدیم بطلیموسی نظریہ رائج تھا، اجرامِ فلکی کی گردش سے متعلق صحیح تصور ذہنِ انسانی میں آ نہیں سکتا تھا۔ جب بعد میں کوپرنیکس کا نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرامِ سماوی کس طرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرمِ گردش ہیں۔ اسی طرح جب تک ہرشل کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کس مستقر کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ جب تک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآنِ کریم کی یہ آیات مُتَشٰبِهٰتٌ کی فہرست میں شامل تھیں۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو یہ آیات محکمٰتٌ کے زمرے میں

داخل ہوگئیں۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کے لئے محکمٰتٌ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کے لئے یہ متشٰبھاتٌ ہی میں داخل ہیں۔ جب تک یہ آیات متشابہات کے زمرے میں تھیں ان کی حقیقت (تأویلٌ) کا علم خدا کو تھا جب یہ محکمٰتٌ کے ذیل میں آگئیں تو ان کی حقیقت "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" پر بھی منکشف ہوگئی۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (۲۵/۶)۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو: فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا (۲۵/۵۹)۔ "اس سے پوچھو جو ان اسرار سے واقف ہے"۔ جب تک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جس نے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کر دیا ہے۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائے گا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خبیر ہو جائیں گے۔

لہٰذا، محکمٰت و متشابہات کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔

یہ ہیں قرآنی آیات کے محکمٰتٌ و متشابھاتٌ ہونے کے مختلف مفاہیم۔ لیکن محکمٰتٌ ہوں یا متشابھاتٌ تمام

قرآن کی تمام آیات محکم ہیں

آیات اپنی اپنی جگہ پر محکم ہیں۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ اسی لئے سورۂ ہود میں ہے: کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (۱۱/۱)۔ "یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا ہے"۔ یہ کتاب مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کی حامل ہے۔ اس کے حقائق غیر متبدل اور اس کے اصول تغیر ناآشنا ہیں۔ جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے ان کی حقیقت بھی غیر متبدل (مُحْكَمٌ) ہے۔ لہٰذا، اس نقطۂ نگاہ سے قرآنِ کریم کی تمام آیات محکمٰت ہیں۔ جو آیات ہمارے لئے ہنوز متشابہ ہیں، خدا کے نزدیک وہ بھی محکم ہیں۔

اس کے برعکس سورۂ زمر میں پوری کتاب کو "مُتَشَابِهًا" کہا گیا ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (۳۹/۲۳)۔ لیکن یہاں متشابھًا کا لفظ مُحْكَمًا کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے نہیں ہوا بلکہ مَثَانِيَ کے مقابلہ میں استعمال

متشابہا مثانی کا مفہوم

"مَثَانِيَ" ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی کر دی جائیں۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ قرآنِ کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی وضاحت اس کی ضد کو سامنے لا کر کرتا ہے۔ مثلاً نور (روشنی) کے مقابلہ میں ظلمت (تاریکی) کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں (نور و ظلمت) باہمدگر مَثَانِيَ ہیں۔ اس طریق بیان سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے (چنانچہ بعض فلاسفر کا خیال ہے کہ اشیاء پہچانی ہی اپنی اضداد سے جاتی ہیں)۔ لیکن اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآنِ کریم میں متضاد باتوں

کا بیان ہے۔ اس کے متعلق اللہ نے کہدیا کہ نہیں۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں (۴/۸۲)۔ اس کی تمام آیات باہمدگر ملتی جلتی (مُتَشَابِهًا) ہیں۔ مَثَانِیَ (متضاد اشیاء کو آمنے سامنے لانے) سے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کی آیات مَثَانِیَ ہونے کے باوجود مُتَشَابِهٌ ہیں۔ اس طرح قرآنِ کریم کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِیَ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ مُتَشَابِهٌ وہ اسلوبِ بیان ہے جس میں حقائق کو ملتے جلتے انداز میں بیان کیا گیا ہے (مثلاً نُورٌ وَهُدًى) اور مثانی وہ اسلوب ہے جس میں ایک چیز کے سامنے اس کی ضد لا کر بات واضح کی گئی ہے۔ میں نے تبویب القرآن میں اضداد کا فلسفہ اور قرآنی اضداد کی فہرست پیش کی ہے۔

ان تصریحات کے بعد اس آیت (۳/۷) کا وہ مفہوم دیکھئے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا ہے۔ اس میں وہ حقیقت سمٹ کر آجاتی ہے جسے گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے:۔

آیت ۳/۷ کا مفہوم اس خدا نے، جس کا قانون، کائنات میں اس طرح کارفرما ہے، انسانوں کی راہنمائی کے لئے یہ ضابطۂ حیات بھیجا ہے۔ اس میں ایک حصّہ تو وہ ہے جو مستقل اقدار، قوانین اور احکام پر مشتمل ہے۔ یہ حصّہ اس ضابطہ کی اصل و بنیاد ہے۔ ان امور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر لفظ اپنے متعیں معانی سامنے لے آتا ہے۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جو ان حقائق پر مشتمل ہے جو مادی کائنات سے ماوراء ہیں (مثلاً خدا کی ذات یا حیاتِ اخروی وغیرہ)۔ ان حقائق کو سمجھانے کے لئے، انہیں تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سو جن لوگوں کے دل، حق کی راہ چھوڑ کر، دوسری طرف جھک جاتے ہیں۔ جو کجروی اختیار کرتے ہیں۔ وہ محض فتنہ پیدا کرنے کے لئے ان الفاظ کو پکڑ لیتے ہیں جن سے ان حقائق کو تشبیہ دی گئی ہے (مثلاً خدا کے اقتدار اور کنٹرول کے لئے عرش کا لفظ، اس کے علم کی وسعت کے لئے کُرسی کا لفظ)۔ وہ یا تو ان الفاظ ہی کو اصل و حقیقت قرار دیتے ہیں (مثلاً یہ کہ خدا سچ مچ ایک تخت کے اوپر بیٹھا ہے)۔ اور یا، یونہی، قیاسات کی رُو سے، ان کی کنہ و حقیقت متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں (مثلاً یہ کہ خدا کی ذات کی اصل و حقیقت کیا ہے) اور ایسا کرنے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یاد رکھیئے! ان میں بعض حقائق تو ایسے ہیں جن کی ماہیت اور حقیقت صرف خدا ہی جانتا ہے۔ البتہ یہ بات، عقل و بصیرت کی رو سے سمجھ آسکتی ہے کہ ان کے بیان کرنے سے مقصود کیا ہے۔ اور بعض حقائق ایسے ہیں، جن کی حقیقت انسانی علم کی سطح کے بلند ہونے سے سامنے آسکتی ہے (۴/۵۳) —— لیکن انہی لوگوں کے سامنے جو مسلسل غور و تدبر اور محنت شاقہ سے علم میں پختگی حاصل کرتے جائیں۔

ان لوگوں کی بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان تشبیہی امور کے متعلق ایمان رکھتے ہیں کہ یہ سب خدا کی طرف سے حقیقت کا بیان ہے، اور، اس کے بعد، غور و فکر سے، علیٰ حدّ بشریت، ان حقائق کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں (۳/۷)۔

اگلی آیت میں مغرب کے (مادہ پرست) سائنسدانوں اور قرآنی راسخون فی العلم (علم میں پختگی حاصل کرنے والوں) میں بنیادی فرق بتایا گیا ہے۔ مغرب کے (مادہ پرست) سائنسدانوں کا مسلک یہ ہے کہ حقائق کائنات کو منکشف کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے اور پھر ان قوتوں کو اپنے گروہ یا اپنی قوم کے مفاد اور تعمیر و استحکام، اور دوسری قوموں کی تخریب و تضعیف کے لئے صرف میں لایا جائے۔ ان کے برعکس قرآنی سائنس دانوں (الراسخون فی العلم) کا مسلک یہ ہے کہ ان قوتوں کو ہدایت خداوندی (وحی کی راہنمائی) کے مطابق عالمگیر انسانیت کی تعمیر و ربوبیت کے لئے استعمال کیا جائے۔ ان کی دعائیں (آرزوئیں) یہ ہوتی ہیں کہ

۳/۷ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۳/۷)

بارالہا! ہمارے قلوب (جذبات و رجحانات) قرآنی راہنمائی کے بعد کسی اور طرف نہ جھک جائیں اور ہماری صلاحیتیں اسی کی روشنی میں بارومند ہوں۔ یہ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اس کی صحیح منزل کی طرف راہنمائی تنہا عقل کی رو سے نہیں مل سکتی۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی عقل، وحیٔ خداوندی کی روشنی میں کارفرما ہو۔ وہ وحی جو حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی۔

یہ وہی اولی الالباب (ارباب علم و بصیرت) ہیں جن کے متعلق اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے:۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۸۹-۱۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں، ان کے لئے کائنات کی پیدائش اور دن رات کی گردش میں، قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی عظیم نشانیاں ہیں۔

ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے، جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں، اور کائنات کی تخلیق و ترکیب (اندازِ پیدائش) پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔ تیری ذات، اس سے بہت بلند ہے اور یہ بات تجھ سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض و غایت، یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب

کی زندگی بسر کرتے ہیں)۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم (علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد) اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح) تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

ان ارباب علم وبصیرت کی مزید دعائیں، آیات (۳/ ۱۹۳ - ۱۹۱) کے ضمن میں سامنے آئیں گی ۔

آیت (۳/ ۷) میں جن الرّاسخون فی العلم کا ذکر آیا ہے ان کا اعلان یہ ہے کہ

۳/ ۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوۡمٍ لَّا رَیۡبَ فِیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ۟ (۳/ ۸)

یہی وہ خدا کی راہنمائی ہے جس کی رو سے انسان، اپنے اختلافات چھوڑ کر ایک نقطہ پر جمع ہو سکیں گے۔ یہ اس انقلابی دور میں ہو گا جس کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو گا، اور خدا کے قوانین اٹل ہیں۔

اس دنیا کے علاوہ، انسانوں کا اجتماع، اخروی دنیا میں بھی ہو گا، جس کا تشبیہی بیان قرآن میں آیا ہے، لیکن انسان اپنے شعور کی موجودہ سطح پر، اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتا —— لیکن اس کی کیفیت اور حقیقت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کے واقع ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اس اجتماع کے معنے یہ ہیں کہ جن لوگوں کے مابین اس دنیا میں نزاعی معاملات ہوں گے وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے اور ان کے دلوں کے اندر چھپے ہوئے خیالات اور نیتیں تک بے نقاب ہو جائیں گی ۔

(اخروی زندگی اور یوم قیامت کے لئے جلد سوم کے آخر میں انڈکس دیکھئے)

ان کے برعکس :-

۳/ ۹ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَیۡـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ۙ (۳/ ۹)۔

جو لوگ، اس راہنمائی کی صداقت سے انکار کر کے، اپنے لئے دوسری روش اختیار کر لیں، تو اس سے انہیں کتنے ہی مفادِ عاجلہ (مال اور اولاد وغیرہ کی کثرت) کیوں نہ حاصل ہو جائیں، غلط روش کے تباہ کن نتائج سے وہ کبھی نہیں بچ سکیں گے۔ ان کی یہ روش فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کا موجب بنتی ہے، جس میں وہ خود بھی جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھی بھی۔ نیز نفسیاتی اضطراب کی وہ آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ (۱۰۴/ ۶-۷)۔

"وقود النار" کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول صہ ۳۲۸۔ آیت (۲/ ۲۴)۔

آیات (۳/ ۸-۹) میں لوگوں کے جس اجتماع اور جہنم کی آگ کا ذکر ہے اس سے مراد حق وباطل کے وہ تصادمات بھی ہیں

جن کی آخری رزمگاہ، جنگ کے میدان ہوتے ہیں۔ یا مخالفین کی وہ تباہی جو دیگر طریقوں سے اس دنیا میں واقع ہو جاتی ہے۔
اسے (تاریخی مثال کے ذریعے) اگلی آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

۳/۱۰ كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۳/۱۰)

اس حقیقت پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں (مثلاً) تم قوم فرعون، اور اس سے پہلی قوموں کے طور طریق پر غور کرو، اور ان لوگوں کے انجام کو دیکھو۔ انہوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا اور اپنے لئے دوسری راہیں اختیار کر لیں تو ان غلط راہوں کے عواقب نے انہیں آن پکڑا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خدا کا قانونِ مکافات، مجرمین کا پیچھا کس شدت سے کیا کرتا ہے۔

ذنب کے معنے

اس آیت میں ذنوب (واحد ذنب) کا لفظ تشریح طلب ہے۔ اس کے عام معنے تو جرائم ہیں لیکن بعض مقامات پر یہ اس سے مختلف معانی میں بھی آیا ہے چونکہ اس کے غلط مفہوم سے بہت سی غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے اس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

"اَلذَّنَبُ" جانور کی دم کو کہتے ہیں۔ اس سے اس کے معنے ہر شے کے آخری حصہ یا انجام اور نتیجہ کے بھی لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کا سب سے اہم مفہوم جس کے لئے یہ عام طور پر قرآنِ کریم میں آیا ہے، جرم (جمع جرائم) ہے۔ اس لفظ (ذنب) کو جرم کے معنوں میں استعمال کرنے سے اہلِ عرب کی ذہانت اور باریک بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ان پڑھ قوم زبان کے معاملہ میں اس قدر صاحب فراست کس طرح ہو گئی؟ قانون مکافاتِ عمل کی رُو سے کوئی مجرم کہیں چلا جائے، وہ اپنے جرم کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس کا جرم اسی طرح اس کے پیچھے لگا (بلکہ چپکا) رہتا ہے جس طرح جانور کی دم۔ جانور کہیں چلا جائے اس کی دم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس سے اس زبان میں ذنبٌ کا لفظ جرم (ذنوب۔ جرائم) کے لئے آتا ہے۔ آیۂ زیرِ نظر (۳/۱۰) میں ذنوب کا لفظ انہی معانی میں آیا ہے اور شدید العقاب نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ عقاب کے معنے کسی چیز کے پچھلے حصے یا کسی کا پیچھا کرنے کے ہیں۔ اسی سے عاقبت، عقبیٰ وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں۔

اس اعتبار سے ذنب اور عقاب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی جرائم اور ان کا نتیجہ۔

چونکہ دُم (ذنب) ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اس لئے ان اتہامات کو بھی ذنوب کہا جاتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے لگا دیئے جائیں جس طرح اَلعُفْوَةُ دم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔

لہٰذا، قرآن کریم میں ذنب (جمع ذنوب) کا لفظ جہاں گناہ یا جرم کے لئے آیا ہے وہاں (بعض مقامات پر) تہمت اور

الزام تراشی کے لئے بھی آیا ہے جو کسی کے خلاف یونہی عائد کر دیئے جائیں۔ یا (بالفاظ صحیح) اس کے پیچھے چپکا دیئے جائیں۔ بنا بریں قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے گا، سیاق و سباق اور قرآن کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں متعین کیا جائے گا کہ اس کے معنے جرائم کے ہیں یا جھوٹی تہمت اور الزامات کے۔

(مثلاً) سورۂ الفتح میں حضور نبی اکرمؐ کے متعلق ہے :۔

سورۂ الفتح کی تشریح

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸/۱-۲)

اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے :۔

ہم نے تمہیں یہ فتح مبین اسی لئے عطا کی ہے تاکہ اللہ تیرے وہ گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں یا جو اس کے بعد سرزد ہوں معاف کر دے۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ و دیگر مترجمین)

اس ترجمہ کی رو سے یہ بحثیں چل نکلیں کہ کیا حضرات انبیاءِ کرامؑ سے بھی گناہ سرزد ہوتے تھے، بالخصوص حضور نبی اکرمؐ سے! اسے عصمتِ انبیاء کا عقیدہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذنب کے اس مفہوم کی رو سے خود حضور نبی اکرمؐ کے گناہوں کو (معاذ اللہ) ثابت

انبیاء کرام کی لغزشیں!

کیا جاتا اور پھر خدا کی اس نوازش بے پایاں کا (فخر و مباہات کے ساتھ) تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے اس نے حضورؐ کے سب (اگلے پچھلے گناہ) معاف کر دیئے تھے۔ اس سے جب دل میں خلش پیدا ہوئی کہ حضرات انبیاء کرامؑ سے معصیتِ خداوندی (گناہ) کس طرح ممکن تھی، تو اس کے جواز میں عجیب و غریب دلائل پیش کئے گئے (مثلاً) ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے کہا :۔

مودودی مرحوم کی توجیہہ

میرا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالےٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں اس لئے ان سے لغزش کا صدور اس بناء پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا بلکہ اس بناء پر ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں ـــــ خدائی صفات کے حامل نہیں۔

رسائل و مسائل حصہ چہارم ـ سستا ایڈیشن صفحہ ۳۲۵ اشاعت اول)

جو کچھ مودودی مرحوم نے کہا ہے غور فرمایئے کہ اس سے انسان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے؟ اول تو یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ سے اگر لغزشیں صادر نہیں ہوتی تھیں تو اس میں ان کی سیرت و کردار کا کوئی کمال نہیں تھا۔ اللہ تعالےٰ ان سے لغزشیں صادر ہونے نہیں دیتا تھا۔ سوچئے کہ اگر صورت یہی تھی تو پھر رسولؐ اللہ کی زندگی کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ جس ہستی سے خود خدا لغزش نہ ہونے دے، اس کی زندگی ان انسانوں کے لئے کس طرح نمونہ بن سکتی ہے جن کی لغزشوں

سے حفاظت خدا نہ کرتا ہو۔

دوسرے یہ کہ مودودی (مرحوم) کے الفاظ میں کبھی کبھی اللہ تعالےٰ ان سے لغزشیں سرزد کرادیتا تھا! (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ)۔ سو چئے کہ اس سے حضرات انبیاء کرامؑ کو کس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان لغزشوں کے ذمہ دار وہ خود نہیں ہوئے تھے۔ اللہ تعالےٰ ان سے یہ لغزشیں سرزد کرادیتا تھا۔ لوگ ان لغزشوں کو دیکھتے تھے اور انہیں بہر حال انہی کی لغزشیں قرار دیتے تھے۔ لیکن ان کے پاس اس بات کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ان لغزشوں کے ذمہ دار وہ نہیں خدا ہے۔ حتیٰکہ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے! کس قدر (معاذ اللہ) مجبوری تھی خدا کے ان برگزیدہ بندوں کی!

نیز یہ کہ اللہ تعالےٰ پہلے تو ان سے لغزشیں سرزد کرادیتا تھا اور پھر ان کی مغفرت کا سامان کرتا تھا!

باقی رہی وہ مصلحت جس کے لئے انبیاء کرامؑ سے یہ لغزشیں صادر کرائی جاتی تھیں۔ یعنی یہ کہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ وہ انسان ہیں خدائی صفات کے حامل نہیں۔ سو اوّل تو حضور نبی اکرمؐ بار بار اعلان فرماتے تھے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۔ میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ دوسرے یہ کہ مخالفین اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ بشر ہی ہیں۔ جانتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کی بشریت کے خلاف اعتراض بھی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (۲۵/۷)۔ "یہ کس قسم کا رسول ہے؟ کہ عام انسانوں کی طرح کھانا پیتا بھی ہے اور بازاروں میں گھومتا پھرتا بھی"۔ ان واضح حقائق کی موجودگی میں لغزشیں صادر کرا کر یہ ثابت کرانے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ بشر ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ ذنبؔ کے غلط مفہوم نے کس قدر الجھنیں پیدا کر دیں! اصل یہ ہے کہ گناہ یا جرم احکام خداوندی کی دانستہ خلاف ورزی (معصیت) کا نام ہے۔ اور اس قسم کی معصیت حضرات انبیاء کرامؑ سے سرزد نہیں ہوتی تھی۔ تدبیری امور میں بعض اوقات کسی سقم کا رہ جانا اور بات ہے۔ اسے نہ لغزش کہا جا سکتا ہے نہ معصیت یا ذنب (جرم)

ان تصریحات کے بعد آیۂ زیر نظر (۴۸/۲) کی طرف آئیے۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کی نبوت کے آخری

سورۂ الفتح کی تشریح

زمانے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے اسے فتح مبین قرار دے کر کہا کہ یہ عظیم فتح اس لئے دی جا رہی ہے کہ تم ان تمام اتہامات سے بری الذمہ ہو جاؤ جو تمہارے مخالفین تمہارے خلاف عائد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور آئندہ عائد کریں۔ مخالفین شروع سے کہتے چلے آرہے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں۔ دیوانے ہیں۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ نبی نہیں کاہن ہیں۔ شاعر ہیں جو لوگوں کو سبز باغ دکھا کر انہیں ورغلاتے رہتے ہیں۔ یہ جس قسم کی مملکت اور حکومت کے وعدے کرتے ہیں وہ ایک بھی پورا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ

نے کہا کہ یہ عظیم فتح جس سے مخالفین کی کمر ٹوٹ گئی ہے' ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو۔ آخرالامر کون سچا ثابت ہوا۔ اب انہیں آئندہ بھی ایسے الزامات عائد کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ یہ ہیں اس آیت میں ذنبٌ کے معنے۔ باقی رہی مغفرت سو اس کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم صفحہ ۲۸۶۔ زیر آیت (۱/۵۸) دیکھئے۔

اس کے بعد آجائیے پھر سورۂ آل عمران کی طرف۔ آیات (۳/۸-۹) کی تشریح میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں

لشکروں کا اجتماع

"لوگوں کو جمع" کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد اخروی زندگی بھی ہے اور اس دنیا میں حق و باطل کے تصادمات کی آخری منزل بھی جہاں لشکروں کا آمنا سامنا ہوتا ہے' یا دیگر طریقوں سے حق کے مخالفین کی تباہی ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے قوم فرعون کی تباہی کا ذکر کیا گیا اور اس کے بعد اس ٹکراؤ کا جو بدر کے میدان میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلے کہا۔

۳/۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳/۱۱)

جو لوگ اس نظام خداوندی کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں' اے رسول! تم ان کے سامنے یہ تاریخی شواہد پیش کرو اور اس کے بعد انہیں متنبہ کرو کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تباہی و بربادی کے جہنم کی طرف ہنکائے جاؤ گے۔ (اے کاش یہ جانتے کہ) وہ زندگی کتنی بُری ہوگی!

ہم نے جو کہا تھا کہ "جامع الناس" سے مراد اسی دنیا میں تصادمات بھی ہیں' تو اس کی وضاحت "ستغلبون" نے کر دی۔ یعنی عنقریب تم مغلوب و مفتوح ہو گے۔ آیت (۳/۱۲) میں (جو آگے آئی ہے) اس کی شہادت پیش کر دی۔ لیکن اس آیت تک

حشر کے معنی

آنے سے پہلے لفظ "تحشرون" کی تشریح ضروری ہے کیونکہ اسی سے حشر کا لفظ آتا ہے۔ اس کے بنیادی معنے "لوگوں کو جمع کر کے' ہانک کر کسی طرف لے جانے" کے ہیں۔ اس میں جمع کرنے' اٹھانے' ہانکنے اور کسی طرف لے جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں حشر (محشر) سے مراد یوم قیامت لیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اُخروی زندگی کے علاوہ اسی دنیا میں لشکر کشی اور نبرد آزمائی کے لئے بھی آیا ہے۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ نے جب وادیٔ نمل کی طرف لشکر کشی کی ہے تو فرمایا: وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ (۲۷/۱۷)۔ سلیمانؑ کے لشکر میں' شہروں کے مہذب باشندے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی اور قبیلہ طیر کے شاہسوار سب اکٹھے ہو گئے اور انہیں ٹریننگ کے لئے روک کر رکھا گیا'۔ یہاں حشر کا لفظ عسکری اجتماع کے لئے آیا ہے۔ جب یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا ہے تو اس سلسلہ میں سورۂ حشر میں ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ

دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (۵۹/۲) ". اللہ وہ ہے جس نے اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے سرکشی اختیار کی' پہلے حشر کے لئے ان کے گھروں سے نکال باہر کیا" یہ ان کی پہلی دفعہ کی اجتماعی جلاوطنی تھی۔ (ان کی دوسری جلاوطنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی تھی)۔ ان مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ لفظ حشر اُخروی زندگی کے اجتماع کے لئے ہی نہیں آتا۔ اس دنیا میں اجتماع کے لئے بھی آتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے حجتہ اللہ البالغہ۔ کتاب الفتن میں یہ دونوں مفاہیم بیان کئے ہیں۔ دیکھئے لغات القرآن۔ مادہ (ح۔ش۔ر) ص۵۱۵۔ آیت (۳/۱۲) میں تحشرون کا لفظ انہی معانی میں آیا ہے اور اس کی شہادت اگلی آیت میں سامنے آتی ہے جہاں کہا:۔

۳/۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ (۳/۱۲)

اس کی ہلکی سی جھلک، تم اس تصادم میں دیکھ چکے ہو جو (ابھی ابھی) بدر کے میدان میں، تم، دونوں جماعتوں کے درمیان ہو چکا ہے ـــــ ایک گروہ، نظامِ خداوندی کی اقامت کے لئے شمشیر بکف تھا، اور دوسرا گروہ مخالفین کا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے مخالفین کی جماعت بہت زیادہ تھی؛ لیکن چونکہ جماعت مومنین ایک عظیم مقصد کے لئے میدانِ جنگ میں آئی تھی' اس لئے اس کے حوصلے بڑے بلند تھے۔ وہ دشمن کے اس گروہ کثیر کو زیادہ سے زیادہ اپنے سے دگنا محسوس کرتے تھے (اس لئے کہ اپنے سے دگنی تعداد پر کامیابی کا انہیں بہرحال یقین تھا (۸/۴۴ ؛ ۸/۶۶)۔

جنگ بدر کی طرف اشارہ

چنانچہ انہیں فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح، قانونِ خداوندی کی تائید ان لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے جو صحیح روش پر چل کر اس کی تائید کو حاصل کر لینا چاہیں۔ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں انہیں اسی ایک واقعہ سے سبق حاصل کر لینا چاہیئے کہ اُن کی مخالفت کا انجام کیا ہو گا (۸/۴۲-۴۶-۵۰)۔

جنگِ بدر کی تفصیلات سورۃ انفال میں دی گئی ہیں اور جو کچھ آیت (۳/۱۲) میں کہا گیا ہے وہ انہی تفاصیل کے پس منظر میں سمجھ میں آسکتا ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ جب ہم ان آیات پر پہنچیں تو اس آیت (۳/۱۲) کو بھی ان کے ساتھ ملا لیا جائے اور اس طرح اس جنگ کا پورا نقشہ سامنے آجائے۔ یہاں یہ اصولی بات بتائی گئی ہے کہ حق کی علمبردار جماعتوں کو فتح و نصرت کیوں حاصل ہوتی ہے اور جو حق پر نہ ہوں وہ خاسر و نامراد کیوں رہتے ہیں۔ فرمایا:۔

۳/۱۳ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ

عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ ○ (۳/۱۴)

ان دونوں جماعتوں میں جو بنیادی فرق ہے، اس کے لئے ایک اصولی بات کا سمجھ لینا ضروری ہے ــــ انسانی زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں بے شمار پسندیدہ اور خوشنما چیزیں ہیں جو انسان کے لئے وجۂ جاذبیت ہیں۔ مثلاً بیوی بچوں کی محبت۔ چاندی سونے (مال و دولت) کے ذخیرے۔ چُنے ہوئے عمدہ گھوڑے۔ مال، مویشی، کھیتی باڑی وغیرہ۔ انسان ان کی طرف کھنچتا

دنیاوی جاذبیتوں اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ

ہے۔ یہ بُری بات نہیں۔ خدا نے انہیں حرام قرار نہیں دیا (۷/۳۲)۔ لیکن ان ہی چیزوں کو مقصودِ حیات اور منتہائے زندگی سمجھ لینا غلط ہے۔ یہ صرف انسان کی طبیعی زندگی کا ساز و سامان ہیں (جو لوگ انہی کو مقصودِ حیات سمجھ لیتے ہیں، وہ کسی بڑی قدر اور اصول کی خاطر جان دینا تو ایک طرف، ذرا سی تکلیف گوارا کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جماعت مؤمنین ہے، جس کا ایمان یہ ہے کہ دنیاوی زندگی اور اس کا ساز و سامان مقصودِ حیات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ بلند مقصد ہے، انسانی ذات کی نشو و نما جو مستقل اقدار کے تحفظ سے ہوتی ہے۔ اس لئے، جب بنیادی مفاد اور بلند اقدار میں تصادم ہوتا ہے (۹/۲۴) تو وہ بلند اقدار کی حفاظت کے لئے دنیاوی مفاد کو بطیب خاطر قربان کر دیتے ہیں، اور (یوں) اس بلند مقام کو پا لیتے ہیں جو حقیقی زندگی کے لئے بڑا ہی خوشگوار اور حسین ہے۔

قرآن کریم نے دُنیاوی زندگی کے ساز و براق۔ مال و منال۔ متاع و اسباب خشکہ اشیائے زیب و زینت کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ تحدی سے کہدیا کہ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ‌ؕ قُلۡ هِىَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا خَالِصَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ‌ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ○ (۷/۳۲) "(اے رسول! تم ان مسلک خانقاہیت کے پیروکاروں سے پوچھو کہ) وہ کون ہے جو ان زیب و زینت کی چیزوں کو اور خوشگوار اشیائے خورد و نوش کو حرام قرار دینے کا اختیار رکھتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ چیزیں اس دنیا کی زندگی میں مؤمنین اور دوسروں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں (اور ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق جس کا جی چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے۔ ۱۷/۲۰، ۱۸) اس وقت ان کے حاصل کرنے کے لئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں (۲۰/۱۱۷-۱۲۳)۔ لیکن زندگی کے نئے انقلابی دور میں یہ بلا حزن و مشقت حاصل ہوں گی۔ جہاں تک اخروی زندگی کا تعلق ہے وہاں یہ اہلِ جنت کے لئے مختص ہوں گی۔ صرف اس دنیا کی زندگی کو منتہیٰ سمجھنے والے اپنا حصہ یہیں حاصل کر لیتے اور ختم کر دیتے ہیں (۴۶/۲۰)"۔ بایں ہمہ جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی سامانِ کشش و جاذبیت اور مستقل قدر (حق) میں ٹکراؤ واقع ہو جائے تو اس وقت مستقل قدر کی حفاظت کے لئے دنیاوی علائق کو قربان کر دینا ایمان ہوگا (اس میں جان تک بھی آجاتی ہے)۔ اس اصول کے لئے، انڈکس (ملحقہ جلد سوم) میں "دنیا اور آخرت" کا عنوان

دیکھئے۔ اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی آیت (۹/۲۴) پر بھی غور کیجئے اور سوچئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ فرمایا:۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۹/۲۴)۔

اے رسول! ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہلِ خاندان۔ اور مال و دولت جو تم کماتے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس (کے قیام و بقاء) کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ عزیز ہو گئی، تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تاآنکہ قانونِ خداوندی کی رو سے، اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر، ادھر اُدھر نکل جائے۔

یہی وہ مقامات ہیں جہاں مال اور اولاد، انسان کے لئے فتنہ (سنار کی بھٹی یا دعویٰ ایمان کے پرکھنے کی کسوٹی) بن جاتے ہیں:

مال اور اولاد فتنہ

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸ ؛ ۶۴/۱۵) تم اسے بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ (انفرادی مفاد کے مقابلہ میں انسانیت کے مفادِ کلی کو اپنا نصب العین قرار دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، مال اور اولاد کی کشش ہوتی ہے۔ اگر ان کی کشش تم پر غالب آگئی تو یہ چیز تمہاری تباہی کا موجب بن جائے گی۔ لیکن اگر تم نے، ان کی کشش و جاذبیت کے باوجود، انسانیت کے مفادِ کلی کو ترجیح دی، تو تم اس کٹھالی میں سے کندن بن کر نکلو گے اور دیکھو گے کہ نظامِ خداوندی کی طرف سے اس کا کس قدر عظیم بدلہ ملتا ہے۔ بیوی بچے بیشک اپنے اندر کشش و جاذبیت کے باوجود اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ لیکن جب کبھی اس کشش، اور محبت، اور بلند اقدارِ خداوندی میں تصادم ہو تو اس وقت اس کشش کو ان اقدار کے راستے میں روک نہیں بن جانا چاہیئے (۲۵/۷۴ ؛ ۶۴/۱۴-۱۵ ؛ ۹/۲۳-۲۴)۔ ایسی صورت میں یہ بیوی بچے فتنہ ہی نہیں بلکہ تمہارے دشمن بن جاتے ہیں۔ فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ (۶۴/۱۴)۔ اسی لئے وارننگ دے دی کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۶۳/۹)

"اے جماعتِ مؤمنین! دیکھنا، تمہاری کیفیت یہ نہ ہو جائے کہ مال اور دولت اور اولاد کی محبت تمہیں قوانینِ خداوندی کے اتباع سے غافل کر دے۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اس سے انہیں سخت نقصان پہنچے گا۔"

جو لوگ دنیاوی سامانِ زیست کو اصل و مقصود سمجھ لیتے ہیں، ان کے متعلق کہا:۔

۳/۱۴ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۳/۱۴)۔

اے رسول! ان سے کہو کہ آؤ ــــ میں تمہیں ایک ایسی چیز کا نشان بتاؤں جو اس تمام ساز و متاع سے کہیں بہتر ہے ــــ یعنی شگفتگی اور شادابی کی ایسی زندگی جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آسکتی۔ جس میں تمام رفقاء (ذہنی کی طرح) پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں ہر قدم، قانونِ خداوندی کی ہم آہنگی میں اٹھتا ہے یعنی کتاب اللہ کے مطابق (۵/۱۶-۱۵ ، ۴۷/۲۸)۔ یہ زندگی ان سعادت مند لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت رکھتے ہیں۔ اور ملتی ہے ان کے اعمال کے بدلے میں جو خدا کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔

جنّت اور اس کی تفاصیل۔ نیز ازواج (واحد زوج) کے مفہوم کے لئے جلد سوم کے آخر میں انڈکس دیکھئے۔ اور رضوانٌ من اللہ کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۶ زیرِ آیت (۲/۲۰۷) دیکھئے۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ "رضوان من اللہ" قرآن مجید کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ (۴۷/۲۸-۲۲) سے ظاہر ہے۔ نیز (۵/۱۶-۱۵) سے۔

مندرجہ بالا آیت میں بصیرٌ بالعباد کہا گیا ہے۔ یعنی "خدا کے بندے"۔ اب ان عباد کی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں :۔

۳/۱۵ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۵)۔

عباد اللہ کی خصوصیات

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کے ضابطہ قوانین کو اپنا نصب العین حیات قرار دے لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی کوشش اور آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تمام غلط باتوں کے اثرات سے محفوظ رہیں جو مخالفین ان کے پیچھے چپکا دیتے ہیں تاکہ اُن کا دامن ان خاردار جھاڑیوں میں اُلجھ کر نہ رہ جائے اور وہ اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو تعمیری مقاصد میں صرف کرکے، زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہیں نیز ان معمولی لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے بھی جو یونہی اتفاقیہ یا سہواً سرزد ہو جاتی ہیں۔ (۲/۲۸۶ ؛ ۵۳/۳۲)۔

اس آیت میں ذنوب کا لفظ پھر آیا ہے اس کا مفہوم آیت (۳/۱۱) کے تحت واضح کیا جا چکا ہے۔ الزامات اور اتہامات کے علاوہ اس میں وہ معمولی لغزشیں بھی آجاتی ہیں جو مؤمنین سے سہو و خطا کی بنا پر سرزد ہوں (۲/۲۸۶)۔ جیسا کہ سورۂ النجم میں کہا گیا ہے:
اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ (۵۳/۳۲) "مومن تمام بڑے بڑے جرائم سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ان سے کبھی نادانستہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو قابلِ ملامت ہو (۵۳/۳۲ ؛ ۳/۱۳۴)۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ اس کی خود اصلاح کر لیتے ہیں (۴/۱۷)۔ اور ان کے اعمالِ حسنہ کے تعمیری نتائج ان کی اس قسم کی معمولی لغزشوں سے پیدا ہونیوالے

نقصانات کی تلافی کر دیتے ہیں (۱۱/۱۱۴)۔ یہی مغفرت سے مراد ہے (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۸۶ آیت ۲/۵۸) اور النّار کے لئے جلد اوّل۔ صفحہ ۳۲۶ آیت (۲/۴۸)۔

اگلی آیت میں ان عباد اللہ (مومنین) کی مزید صفات کا بیان ہے۔ فرمایا:-

۳/۱۶ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (۳/۱۶)

یہ لوگ، اپنے نصب العین پہ ثبات و استقامت سے جمے رہتے ہیں اور ہر مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

اپنے دعوائے ایمان کو عملاً سچ کر کے دکھاتے ہیں۔

ہر وقت، قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں، اور اپنی صلاحیتوں کو انہی کے مطابق صرف کرتے ہیں۔

اپنی محنت کے ماحصل کو، نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اور اپنے ہر پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے پاس پورا پورا سامانِ حفاظت موجود ہے ــــ دشمن سے بچاؤ کے لئے بھی، اور خود اپنے دل میں پیدا ہونے والے خدشات کی مدافعت کے لئے بھی۔

اس آیت میں صبر (الصابرین) کے لئے دیکھئے (مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۲ آیت (۲/۴۵)۔ انفاق (منفقین) کے لئے۔ جلد اوّل صفحہ ۵۰ آیت (۲/۳)۔ اور مغفرت (مستغفرین) کے لئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۸۶ آیت (۲/۵۸)۔

صدق (مادہ ص۔ د۔ ق) کا لفظ بڑا وسیع المعنیٰ ہے۔ ایسا وسیع المعنیٰ کہ اس کی وسعت، لغات القرآن کے قریب چھ صفحات میں بھی بمشکل سما سکی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ لفظ کذب (جھوٹ) کی ضد ہے اور جب انسان کا دل اور زبان ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے کذب کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے صدق کے معنے ہوں گے قلب اور زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ بات کا نفسِ واقعہ کے مطابق ہونا۔ اس کے عام معنے سچ کئے جاتے ہیں لیکن عربی زبان تو بڑی وسیع اور عمیق ہے۔ ان کے ہاں صدق کے بنیادی معنے قوت کے ہیں اور یہ لفظ سچ کے لئے اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ سچ میں قوت ہوتی ہے اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس لئے آپ دیکھ لیجئے کہ صادق اور صدیق کا مفہوم کیا ہوگا۔ صَدَقَ اور صدَّقَ کے معنے ہیں جو کچھ زبان سے کہا جائے اسے سچ کر دکھایا جائے۔ ان ہی کو صادقین کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے جلد سوم صفحہ ۱۶۶-۱۵۴ زیرِ آیت (۲/۱۷۷) دیکھئے اور جھوم جھوم جائیے۔

صدق کا مفہوم

قانتین

قانتین (مادہ ق۔ ن۔ ت) کے بنیادی معنے ہیں کسی دعوے کو لے کر کھڑے ہو جانا۔ اُسے قائم کر دینا اور گرنے سے روک دینا۔ القنوت کے معنے ہوتے ہیں کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا۔

لیکن ان مفاہیم کے لئے تو دوسرے الفاظ بھی (عربی زبان اور قرآن مجید میں) آتے ہیں۔ پھر قانتین کی خصوصیت کیا ہے؟ یہ نکتہ غور طلب

ہے۔ آپ نے میونسپل کمیٹی کی ان گاڑیوں کو دیکھا ہوگا جو سڑکوں پر چھڑکاؤ کرتی ہیں۔ ان میں پانی بھرا رہتا ہے اور ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں چھڑکاؤ کرنا مطلوب ہوتا ہے، ان کا کارک کھول دیا جاتا ہے اور ان میں سے بقدرِ ضرورت پانی نکلتا چلا جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں سَقَاءٌ قَنِيْتٌ اس مشکیزے کو کہتے تھے جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ جہاں ضرورت ہو صرف وہیں اس کا منہ کھلے۔ لہٰذا، اس کا جامع مفہوم ہے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور انہیں صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس قسم کی اطاعت کو اَلْقُنُوْتُ کہتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ مردِ مؤمن یا جماعت مؤمنین کی یہ کیسی منفرد اور منفعت بخش خصوصیّت ہے۔

مستغفرین بالاسحار

اب آئیے مستغفرین بالاسحار کی طرف۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "صبح کے وقت اٹھ کر استغفار کرنا۔ استغفر اللہ ربی کی تسبیح پڑھنا"۔ مغفرت کے معنے آپ دیکھ چکے ہیں۔ اِسْتِغْفَار کے معنے ہیں مغفرت طلب کرنا، حفاظت چاہنا، سامانِ حفاظت طلب اور مہیا کرنا۔

اَلسَّحَرُ کے معنے ہیں ہر چیز کا کنارہ۔ اس اعتبار سے رات کے آخری حصّہ کو سَحَرٌ کہتے ہیں۔ یا صبح سے ذرا پہلے کا وقت۔ چونکہ اس سے دن کا آغاز ہوتا ہے اس لئے ابتدائے کاروبار کے وقت کو بھی سَحَرٌ کہتے ہیں۔ جس کی جمع اسحار ہے۔ زیرِ نظر آیت میں یہی مفہوم زیادہ موزوں ہے۔ یعنی یہ لوگ (مؤمن) اپنے پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے اس کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے سامنے پورا پورا سامانِ حفاظت موجود ہے۔ اگر اسحار سے مراد صبح کا وقت بھی لے لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ، ہر صبح، آغازِ کار سے پہلے اس امر کا جائزہ لے لیتے ہیں کہ اس دن کے پروگرام کے سلسلہ میں پورا پورا سامانِ حفاظت موجود ہے۔ الفاظ کے ان معانی کی رُو سے، مؤمنین کی خصوصیت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یوں تو مؤمنین کی خصوصیات قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے آئی ہیں لیکن سورۂ احزاب کی آیت ۳۵ (۳۵/۳۳) میں (مؤمنین اور مؤمنات) کی خصوصیات بڑی جامعیت سے یک جا بیان ہوئی ہیں۔ اس آیۂ جلیلہ کو بھی ایک نظر دیکھ لیجئے اور مفہوم القرآن میں بھی اس کا مفہوم بھی۔ (نیز ۲۳/۱-۱۱)

اس سورۃ کا آغاز اس دعوے کے ساتھ ہوا تھا کہ لا الٰہ الا ھو (۲/۳) جملہ اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کو نہیں۔ اس دعوے کی شہادت میں کہا:۔

۳/۱۷ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ (۱۷/۳)

اس کا مفہوم بعد میں لکھا جائے گا۔ سرِ دست اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ کہا یہ گیا ہے کہ اس دعوے کی شہادت خود خدا دیتا ہے۔ ملائکہ

دیتے ہیں اور ارباب علم دیتے ہیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی شہادت کا تعلق ہے، گواہ کی شہادت اس کے زبانی یا تحریری بیان کی رُو سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ

خدا کی شہادت

کا "بیان" اس کی کتاب ہے اور اس کتاب کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ توحید ہے۔ یعنی لا الٰہ الا ھو۔ آپ قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے، یہی نقطہ ہے جس کی توضیح و تشریح قدم قدم پر ملتی ہے۔ کہیں دلائل و براہین کی رُو سے۔ کہیں تاریخی شواہد کی بناء پر۔ کہیں تعلیم و تلقین کے ذریعے۔ اسلام تمام کا تمام اس محور کے گرد گردش کرتا ہے۔

ملائکہ کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد دوم (صـ ۹۸ تا ۶۶) میں کی جا چکی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جہاں تک عالم خلق (ہماری محسوس کائنات) کا تعلق ہے ملائکہ سے مراد فطرت کی قوتیں اور ان کے بروئے کار لانے کے عناصر ہیں۔ قرآن کریم نے دعوئے توحید کے اثبات کے لئے جو فطرت کی شہادت پیش کی ہے تو یہ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ سائنس کا مسلّمہ یہ ہے کہ قوانینِ فطرت کے دو اساسی اصول (FUNDAMENTALS) ہیں۔ ایک قانون علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) اور دوسرے وحدتِ فطرت (UNIFORMITY OF NATURE)

ملائکہ کی شہادت

وحدتِ فطرت سے مراد یہ ہے کہ قوانینِ فطرت، ساری کائنات پر یکساں طور پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں یہاں سے وہاں تک وحدت ہے۔ اس سے پہلے تو اس وحدت کی شہادت کرۂ ارض تک محدود تھی۔ اب جو خلانوردی کی مہم شروع ہوئی ہے تو دیکھا یہ گیا کہ جن قوانین کے مطابق انسان کرۂ ارض پر زندہ رہتا اور نقل و حرکت کرتا ہے وہی قوانین چاند پر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ وہاں بھی زندگی ان ہی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ اس لئے اس نے کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳/۸۴)۔ کرۂ ارض پر بھی وہی اللہ ہے ـــــ اسی کے قوانین کارفرما ـــــ اور سماء میں بھی وہی اللہ۔ (نیز ۳/۱۲) سورۃ النحل میں ہے: وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (۱۶/۵۱) ارشادِ خداوندی ہے کہ تم ایسا نہ سمجھ لینا کہ انسانی زندگی میں اور خدا کا اقتدار کارفرما ہے اور خارجی کائنات میں اور خدا کا۔ یہ قطعاً غلط تصوّر ہے۔ اللہ دو نہیں۔ صرف ایک ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲) اگر کائنات میں خدا کے سوا اور بھی اللہ (اربابِ اقتدار) ہوتے تو اس میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس محیر العقول کارگہ کا نظم و نسق اس حُسن و خوبی سے کبھی نہ چل سکتا۔ اس میں کوئی شے بھی اپنے ٹھکانے پر نہ

وحدتِ کائنات

رہتی۔ سب کچھ درہم برہم ہو جاتا۔ یہ قانون کی وحدت ہے جس سے یہ سلسلہ اس محکمیت سے قائم اور کارفرما ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہماری نگاہ کی محدودیت ہے جس سے ہمیں کائنات الگ الگ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ ورنہ حقیقت تمام کائنات ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ ـــــ لہو خورشید کا ٹپکے

اگر ذرے کا دل چیریں ___ لہٰذا، اگر کائنات ناقابلِ تقسیم وحدت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ وحدتِ قانون یا وحدتِ اللہ ہے۔ بنابریں ساری کائنات، فطرت کی قوتیں اور اس میں نافذ العمل قوانین اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ لا الٰہ الا ھو۔ یہ ہے ملائکہ کی شہادت۔

اربابِ علم کی شہادت

اور یہی شہادت اربابِ علم پیش کرتے ہیں۔ آج علومِ سائنس کے محققین اپنی مدت العمر کی تحقیق و تدقیق کے بعد اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ساری کائنات وحدتِ قانون کی مظہر ہے۔ قرآنِ کریم نے علماء کہا ہی سائنیسدانوں کو ہے (۳۵/۲۸-۲۷) لیکن آیت ۳/۱۸ میں) اس نے اولوالعلم کے ساتھ "قائماً بالقسط" کی بھی شرط عائد کی ہے۔ یوں تو قسط کا لفظ عدل کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بنیادی معنے ہوتے ہیں، افراط و تفریط سے بچ کر، درمیانی راہ اختیار کرنا۔ یہاں یہی مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ کائنات کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل و دوم میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ انڈکس سے متعلقہ مقامات دیکھئے۔ وہاں کائنات کے متعلق افراط و تفریط کا نظریہ بھی آپ کے سامنے

قسط کا مفہوم

آجائے گا ___ ایک نظریہ اس کے وجود کا انکار کر کے اسے انسانی تخیل کی تخلیق کہنے والوں کا ہے۔ دوسرا نظریہ مادی کائنات اور انسان کی مادی زندگی کو حدِ آخر قرار دینے والوں کا۔ بالقسط، نظریہ ہے کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے اور انسان کی مادی زندگی اسی سلسلہ کی آخری کڑی نہیں۔ علاوہ ازیں، خارجی کائنات اور قانونِ مکافاتِ عمل میں ایک گہرا تعلق ہے۔

"قسط" کے معنی اگر عدل و مساوات لئے جائیں تو اولوا العلم قائماً بالقسط کا مفہوم ہوگا، وہ اربابِ علم و بصیرت، جو قوانینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرتے ہیں اور وہ نظام، اقتدارِ خداوندی کی زندہ شہادت بن جاتا ہے۔

ان تشریحات کی روشنی میں اس آیت کے اس مفہوم کو دیکھئے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا ہے:-

> بات یہاں سے شروع ہوئی تھی (۳/۲) کہ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ، خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کی شہادت ایک تو، خود ذاتِ خداوندی کا تصور دیتا کرتا ہے (کہ اگر کائنات میں ایک سے زیادہ، صاحبِ اقتدار قوتیں ہوتیں تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جاتا (۲۱/۲۲)۔ یہ تصور کتاب اللہ پر غور و فکر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے خدا کی شہادت کا ذریعہ اس کی کتاب بن جاتی ہے۔
>
> اس کے بعد، اس کی شہادت، کائناتی قوتیں بہم پہنچاتی ہیں جن کے مطالعہ اور مشاہدہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات ایک "وحدت" ہے اور اس میں ایک عالمگیر قانون کارفرما ہے۔
>
> پھر، اس کی شہادت وہ صاحبانِ علم و بصیرت بہم پہنچاتے ہیں جو عدل و مساوات کی بنیادوں پر معاشرہ کا نظام قائم

کرتے ہیں۔ اس نظام کے زندہ نتائج، ان کی شہادت کی دلیل بنتے ہیں۔

یہ تمام شہادات، انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہیں کہ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف ذاتِ خداوندی کو حاصل ہے۔ اور یہ تمام سلسلہ، اس کے بے مثال غلبہ و قوت، اور بے نظیر حکمت کے مطابق سرگرم عمل ہے۔

یہی الاسلام ہے

اور جملہ کائنات کا، ایک اللہ کے قوانین کے تابع سرگرم عمل رہنا، الاسلام ہے۔
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف (۳/۱۸)

الدّین ـــــ یعنی خدا کا مقرر کردہ نظامِ حیات، دین الاسلام ہے جسے تم کائنات میں کارفرما دیکھ رہے ہو اور جس کی شہادت تمہیں ارض و سما کے گوشے گوشے میں مل رہی ہے۔

ارض و سما سے کسی امر کی شہادت مل رہی ہے اس امر کی کہ ہر شے قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے (۳/۸۲) اسی نظام کا نام الاسلام ہے۔ (اسلام اور دین کے متعلق انڈکس میں متعلقہ مقامات دیکھئے)۔ یہی الدّین حضرات انبیاء کرام انسانوں کے لئے لے کر آتے رہے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں نے اس میں اختلافات پیدا کر دیئے۔ آیت کا باقی ماندہ حصہ یوں ہے)۔

۳/۱۸ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ط وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۳/۱۸)

اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنی صرف اقتدارِ خداوندی کی محکومیت جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے (۳/۸۳-۸۴)۔ اور یہی وہ نظامِ حیات ہے جو تمام کائنات اور نوعِ انسان کے لئے قانونِ خداوندی کے مطابق تجویز ہوا ہے۔ یہ کوئی نیا نظام نہیں۔ تمام انبیاء سابقہ اسی نظام کو لے کر آتے رہے لیکن ان کے بعد، ان کے متبعین، باہمی عناد و سرکشی کی بنا پر، اس میں اختلافات کرنے لگ جاتے۔ اس طرح یہ نظام، اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس نہ رہتا، اور وہ دوسری راہوں پر چل نکلتے ـــــ اور اس کا نتیجہ بھی بھگتتے۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات نتائج مرتب کرنے میں دیر نہیں لگایا کرتا۔

اس کے بعد ہے :۔

۳/۱۹ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ط وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ط فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ع (۳/۱۹)

یہی حالت اس وقت ان لوگوں کی ہے جو اس نظامِ خداوندی کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ سو اگر یہ تم سے، اس باب میں جھگڑا تنازعہ کریں، تو ان سے کہہ دو کہ (تم اپنے لئے جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو کر لو) جہاں تک میرا اپنا، اور اس جماعت کا تعلق ہے جو

میرے پیچھے چلتی ہے' ہم نے اپنی تمام توجہات اسی نظام کی تشکیل پر مرکوز کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد تم ان لوگوں سے' جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں' اور ان سے بھی جو کسی آسمانی کتاب کے مدعی نہیں' پوچھو کہ وہ اس نظام کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ اس کی اطاعت کریں گے تو زندگی کی کامرانیوں کی راہیں ان پر کھل جائیں گی۔ لیکن اگر یہ اس سے رُو گردانی کریں گے تو تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔ تمہارا فریضہ ان تک پیغام پہنچا دینا ہے۔ (ماننا نہ ماننا ان کے اپنے اختیار کی بات ہے)

اس کے بعد' جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ خدا کا قانونِ مکافات' تمام انسانوں کے اعمال پر نگاہ رکھتا ہے۔

لفظ اُمّی کے معنے مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صـ۳۳۔ آیت (۷/۱۵۸) میں دیئے گئے ہیں۔

تمام نوعِ انسان کو دعوت

یہاں اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب سب سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یعنی ساری نوعِ انسان سے۔ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے (یعنی ہر زمانہ کے تمام انسانوں کے لئے) مکمل۔ آخری۔ ابدی واحد' ضابطۂ حیات ہے۔ اس سے اس کی دعوت ہر زمانہ میں تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اہلِ کتاب سے مطالبہ کے متعلق۔ مطالب الفرقان جلد اوّل صـ۸۳۔ آیت (۲/۴۱)۔ جلد دوم صـ۱۸۲۔ آیت (۴/۱۳۶)۔ جلد سوم۔ صـ۳۔ آیت (۵/۱۳۴)۔ آیت (۳/۱۳۶) کے الفاظ بھی کم و بیش آیت (۳/۱۹) جیسے ہیں۔ نزولِ قرآن کے بعد' راہ ہدایت پر وہی سمجھا جائے گا جو قرآن کا اتباع کرے گا۔ یہ دینِ خداوندی کا (LATEST EDITION) ہے اور ابدی ہے۔ یعنی ہمیشہ کیلئے۔ اسی کے معنے ختمِ نبوت ہیں۔

وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ ط کے معنے تو واضح ہیں لیکن اس کا مفہوم ذرا وضاحت طلب ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی تو یہ ان کا منصبِ نبوت تھا۔ لیکن یہ وحی ان کی ذات تک محدود رہنے کے لئے نہیں ملتی تھی۔ ان کا فریضہ تھا کہ وہ اسے دوسرے انسانوں تک بھی پہنچائیں۔ یہ ان کا منصبِ رسالت تھا۔ اس اعتبار سے نبی اور رسول ایک

نبوّت اور رسالت کا مفہوم

ہی شخصیت کو کہا جاتا تھا۔ نبوّت کے ساتھ اگر رسالت نہیں تھی تو نبوّت بلا مقصد تھی۔ اور اگر رسالت کے ساتھ نبوّت نہیں تھی تو رسالت بے معنی تھی۔ اگر پیغام ہی نہیں تھا تو پیغام رسانی کیسی؟ بہر حال' رسالت' وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا فریضہ تھا۔ اس وحی کو دوسروں تک اس لئے پہنچایا جاتا تھا کہ وہ اپنی غلط روش سے احتراز برت کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرلیں۔ اسے ہدایت کہا جاتا ہے ایک طبیبِ مشفق کی طرح' نبی کے قلب پرسوز کی انتہائی آرزو ہوتی تھی کہ اس کے مخاطب راہِ ہدایت پر آجائیں تاکہ وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچ جائیں۔ وہ انسانی فکر میں اپنی جان تک گھلا لیتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کو اس سے کہنا پڑا تاکہ تیرا فریضہ اس پیغام کو ان

لوگوں تک پہنچا دینا اور اس طرح صحیح راستے کی نشاندہی کر دینا ہے۔ انہیں صحیح راستے پر چلا دینا تیری ذمہ داری نہیں۔ اس کا ماننا نہ ماننا ان کی اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ اس میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا۔ (اس سلسلہ میں انڈکس میں متعلقہ مقامات دیکھئے)۔ حضورؐ کو یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اِنَّكَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ ..... (۲۸/۵۶) "جن سے تمہیں محبت ہے تم انہیں بھی راستے

رسول کا فریضہ صحیح راستے پر چلا دینا نہیں

پر چلا نہیں سکتے۔" انہیں صرف راستہ دکھا سکتے ہو۔ اس لئے بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ (۵/۶۷) جو کچھ خدا کی طرف سے تم پر نازل کیا جاتا ہے تم اسے دوسروں تک پہنچا دو۔ یہی تمہارا فریضہ ہے۔ اور اس کا اعلان بار بار کر دو کہ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ (۵/۹۹)۔ اس رسول کے ذریعے اس پیغام کو تم تک پہنچا دینا ہے۔ (۵/۹۲؛ ۱۶/۸۲ وغیرہ)۔

اس سلسلہ میں ایک مقام بڑا اہم سامنے آتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضورؐ کے دل میں کبھی یہ خیال گذرا ہو گا کہ جس مقصد کے لئے میں اتنے عرصہ سے مصروفِ تگ و تاز ہوں، کیا وہ میری زندگی میں برومند ہو کر سامنے آ جائے گا یا میری ساری عمر تکلیفیں برداشت کرتے اور صعوبات جھیلتے ہی گذر جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیال کا دل میں آنا فطری امر تھا اور یہ آرزو بڑی معصوم تھی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے اس کا کیا جواب ملا؟ جواب یہ ملا کہ وَاِنۡ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیۡكَ الۡبَلٰغُ

تیری زندگی میں یا تیرے بعد

وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (۱۳/۴۰)۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نظام تمہاری زندگی میں قائم ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری وفات کے بعد ایسا ہو۔ تمہیں اس کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ تمہارے ذمے اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ کب برومند ہو گا، اس کا فیصلہ ہمارا قانون کرے گا۔ اور ہمارے قانون میں کسی کی خاطر بھی رعایت نہیں برتی جاتی۔ وہ اٹل اور بے لچک ہے۔ وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ کسی کی رو رعایت نہیں کرتا۔

اس میں ہمارے لئے بڑا سبق آموز نکتہ پوشیدہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہاری مایوسی کی بیشتر وجہ یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی ذمہ داریاں از خود اپنے سر لے لیتے ہو جو درحقیقت تمہاری ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ اور پھر تم ان میں کامیابی بھی اپنے حسابی قاعدے کی رُو سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اور جب نتیجہ اس کے مطابق برآمد نہیں ہوتا تو تم مایوس ہو جاتے ہو۔ مقصد کوئی بھی ہو، تمہاری ذمہ داری اس کے حصول کے لئے اپنی حدِّ استطاعت تک کوشش کرنا ہوتی ہے۔ اپنی منشاء کے مطابق نتیجہ برآمد کرنا نہیں۔ کوشش اور اس کے نتیجے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جس کے متعین کرنے میں کئی ایسے عناصر کارفرما ہوتے ہیں جو تمہاری حدِ استطاعت سے باہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا، تم اس مقصد کے حصول کے لئے امکان بھر کوشش کئے جاؤ۔ یہی تمہاری ذمہ داری ہے اور چونکہ تم اس سے اپنی استطاعت کے مطابق عہدہ برآ ہوتے چلے جا رہے ہو، اس لئے تمہارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اب آگے بڑھیے، سابقہ آیت میں حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ ان مخالفین سے کہہ دو کہ اگر تم میری تنذیر کے باوجود اپنی غلط روش سے باز نہیں آؤ گے تو اس کا تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کے بعد کہا:-

۳/۲۰ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۰)۔

جو لوگ اس ضابطۂ حیات کی صداقت سے انکار کرتے ہیں؛ اور اس کی طرف دعوت دینے والے انبیاء کی تخریب کے ناحق درپے ہو جاتے ہیں؛ اور انہیں قتل کرنے پر اتر آتے ہیں؛ اور ان کے ساتھ، ان لوگوں کو قتل کرنے پر بھی جو قوانینِ خداوندی کے مطابق عدل و مساوات کا نظام قائم کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ تو ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ ان سب کی کوششیں رائگاں جائیں گی اور آخرالامر ان پر سخت تباہی آئے گی۔

قتلِ انبیاء ورسل اور قتل بغیر الحق کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم۔ صـ۳۰۲-۳۰۱۔ آیت (۲/۶۱) میں گزر چکی ہے[1]۔ کسی قوم کی مجرمانہ

قتلِ انبیاء

ذہنیت کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ جو شخص انہیں غلط کاموں کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرے؛ یا جو لوگ معاملات کے فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہ لیں اور عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں؛ وہ ان کے درپے آزار ہو جائیں اور انہیں جان تک سے مار دیں۔ جو قوم اس درجہ حدود فراموش ہو جائے اس کے راہِ راست پر آنے کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ یہودیوں کی ایسی ہی حالت ہو چکی تھی (تفصیل انڈکس میں بنی اسرائیل کے عنوان کے تحت دیکھئے) ان کی الم انگیز تباہی کے متعلق کہا:-

۳/۲۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۱)

یہ لوگ ہیں کہ جو کچھ یہ کرتے ہیں؛ نہ دنیا میں ان کے کسی کام آسکے گا، نہ آخرت میں اور نہ ہی کوئی ایسا ہوگا جو ان کی کسی قسم کی مدد کر سکے۔

"حبطِ اعمال" کے الفاظ آیت (۲/۲۱۷) میں بھی آئے تھے۔ (جلد سوم۔ صـ۳۶) لیکن وہاں اس کی تشریح نہیں کی گئی تھی کہ اعمال رائیگاں کیے

---

[1] حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں سے کہا تھا کہ "تم پر افسوس ہے کہ تم تو نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور تمہارے باپ دادوں نے ان کو قتل کیا تھا (لوقا۔ ۴۷:۱۱) کم از کم پانچ نامور انبیاء کے قتل کا ذکر تو یہودی بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔

(JESUS: AN HISTORIAN'S REVIEW OF THE GOSPELS, BY MICHAEL GRANT (1977) P. 139.)

چلے جاتے ہیں۔ اس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اس کا پورا پورا اطلاق ہم پر ہو رہا ہے۔

حبط اعمال کا مطلب

حَبِطَتِ الدَّابَّةُ حَبَطًا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کسی اچھی چراگاہ میں پہنچ کر بہت زیادہ کھا جائے جسے وہ ہضم نہ کر سکے۔ اس سے اس کا پیٹ پھول جائے اور وہ مر جائے۔ لغت کے اعتبار سے اس میں درد و الم کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔

حبط اعمال کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے سورۂ کہف کی حسب ذیل آیات پر غور کیجئے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸ / ۱۰۵-۱۰۳)۔

اے رسول! ان سے کہو کہ کیا ہم بتائیں کہ وہ کون ہیں جو اپنی سعی و عمل میں سخت نقصان میں رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں طبیعی زندگی کی مفاد کوشیوں میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور اس کے قانون مکافات اور اخروی زندگی کے قائل ہی نہیں۔ اس لئے ان کے وہ کام جنہیں وہ بہت اچھا سمجھ رہے ہیں، رائیگاں چلے جائیں گے۔ اس حد تک رائیگاں کہ ان کا وزن معلوم کرنے کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔

یہاں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ کہا یہ نہیں گیا کہ سب سے زیادہ نقصان میں وہ لوگ رہیں گے جو کچھ کریں گے نہیں۔ کہا یہ گیا ہے (اَلْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا) کہ وہ کام تو بہت کریں گے اور کام بھی ایسے جنہیں وہ بہت اچھا سمجھتے ہوں گے۔ بڑے نیک کام سمجھ کر سرانجام دیں گے (يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا)۔ لیکن وہ سب رائیگاں چلے جائیں گے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کے لئے حَبَطَ کے ان معانی کو سامنے لائیے جنہیں اوپر بیان کیا گیا ہے۔ جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہو کر اس کا جزو بدن بن جائے تو اس سے اس کی صحت قائم رہتی ہے اور وہ فربہ و توانا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کا چارہ ہضم نہ ہو تو پیٹ پھول جاتا ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت فربہ ہے لیکن یہ درحقیقت فربہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان بہت سے کام ایسے کرتا ہے جو اُسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع وابستہ رکھتا ہے لیکن وہ درحقیقت اس کی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔ اسے قرآن "حبط اعمال" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جن اچھے نتائج کی توقع ان سے وابستہ کی گئی ہو ان نتائج کا مرتب نہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کر سکتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی ساری محنت اکارت

چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴿۲۲﴾ انہی کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا، اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصوّر یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں۔ اچھے اور بُرے اعمال کا معیار اللہ کی کتاب ہے۔ جو اعمال اس کی رُو سے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیّت سے انہیں کیوں نہ سرانجام دیں۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلے گا تاکہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو ویسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائیگاں جائیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے؟ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس نظام کے ظاہری ارکان و شعائر تو باقی رہ جاتے ہیں لیکن ان کی روح (غرض و غایت) باقی نہیں رہتی۔ مذہب پرست قوم ان ظواہر (FORMS) کو اصل دین سمجھ کر بڑی شدت (اور نہایت نیک نیتی) سے ان پر کاربند رہتی ہے۔ ان کے لئے بڑی مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ صعوبات جھیلتی ہے۔ ایثار اور قربانی کرتی ہے۔ وقت، توانائی، مال و دولت صرف کرتی ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ وہ بڑے ثواب کا کام کر رہی ہے۔ مذہبی پیشوائیت ان کی خوش فہمی کو پختہ سے پختہ تر کرتی رہتی ہے لیکن ان کے یہ کام کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتے۔ یہ سب رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ ایسے کام کرنے والوں کو 'بے عملوں کے مقابلہ میں زیادہ نقصان اٹھانے والے (اخسرین اعمالا)۔ اس لئے کہا کہ جو لوگ کچھ نہیں کرتے ان کا وقت، توانائی، مال و دولت تو ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن ان (کام کرنے والوں) کا یہ سب کچھ ضائع جاتا ہے۔ آپ سوچیئے کہ کیا ہماری یہی حالت نہیں۔ ہم میں سے ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جو (مذہبی پیشوائیت کی اصطلاح میں) اسلامی شعائر کے پابند یا دیندار نہیں۔ انہیں لیجئے جو بڑے دیندار، متقی، پرہیزگار ہیں۔ نماز روزے کی شدت سے پابندی کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان کاموں کے لئے وہ کس قدر مشقتیں برداشت کرتے اور مال و دولت صرف کرتے ہیں لیکن ان کے ان کاموں سے کیا وہ نتائج برآمد ہوتے ہیں جو اس زمانے میں ہوتے تھے جب یہی کام دین (نظامِ خداوندی) کے پروگرام کے عناصر تھے؟ اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۵۶۔۵۳۔ آیت (۲/۴۳)۔ ظاہر ہے کہ جب "مذہبی اعمال" اس دنیا میں وہ خوشگوار نتائج برآمد نہیں کرتے تو وہ آخرت میں کس طرح فوز و فلاح کا موجب ہو سکیں گے؟ یہ ہے "حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ" کا مفہوم۔ (دیکھئے انڈکس میں عنوان "دنیا"۔ اور سوچیئے کہ جس قوم کے اعمال اس طرح رائیگاں جائیں وہ کس قدر گھاٹے میں رہتی ہے!

آیت (۳/۲۱) میں کہا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے کفر برتتے ہیں۔ ذیل کی آیت میں اس کی وضاحت کر دی کہ آیاتِ خداوندی سے کفر برتنے کا مفہوم کیا ہے" فرمایا:۔

۳/۲۲ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ وَ ہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۳/۲۲﴾۔

یہ "اہلِ کتاب" وہ ہیں جنہیں اس ضابطۂ خداوندی کا (جواب مکمل شکل میں قرآن میں آیا ہے) ایک حصّہ دیا گیا تھا۔ انہیں چاہیئے تھا کہ وہ اس مکمل ضابطہ کی طرف لبیک کر آتے (۲/۴۱)۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں اس ضابطہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان کے باہمی معاملات کا فیصلہ کرے، تو ان میں کا ایک گروہ (بالخصوص ان کے مذہبی پیشوا) اس سے روگردانی کرتا ہے ——— ان لوگوں کی مفاد پرستیوں نے ان کی ذہنیت ہی ایسی بنا دی ہے کہ انہیں جب بھی حق کی طرف دعوت دی جائے یہ اس سے روگردانی کریں۔ کتاب اللہ کو ماننے کے معنے یہ ہیں کہ جملہ اختلافی امور کا فیصلہ اس کی رو سے کیا جائے۔ یہی کفر و اسلام کا خطِ امتیاز ہے۔ (۵/۴۴) و (۴/۱۶۵) و (۴۲/۱۰)۔

اس میں پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے کہ سابقہ اہلِ کتاب کو "کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا تھا"۔ یعنی ان کی طرف جو کتابیں بھیجی گئی تھیں ان میں ایسا ضابطۂ حیات نہیں تھا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک مکمل ہو۔ مکمل ضابطۂ حیات اب آیا ہے: تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ؕ (۶/۱۱۶)۔ علاوہ اس کے کہ کتبِ سابقہ اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہی تھیں وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ حیات بننے کے لئے دی ہی نہیں گئی تھیں۔ یہ وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد اہلِ کتاب کو بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی تھی۔

کتبِ سابقہ کی حیثیت

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ کتاب اللہ پر ایمان لانے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کئے جائیں۔ یہی کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہے؛ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (۵/۴۴)۔ "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے"۔ اور اسی سے اختلافات دور کئے جائیں (۴/۱۶۵؛ ۴۲/۱۰)۔ ان ارشاداتِ خداوندی کی روشنی میں سوچیئے کہ ہم مسلمانوں کا شمار کس زمرے میں ہو رہا ہے؟

ایمان کا مفہوم

سوال یہ ہے کہ وہ لوگ (اہلِ کتاب۔ بالخصوص یہود) کتاب اللہ کی طرف کیوں نہیں آتے تھے؟ اس کا نہایت جامع جواب مختصر الفاظ میں دے دیا کہ وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کے شفعاء انہیں جہنم کے

عذاب سے چھڑالیں گے:۔

۳/۲۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۳/۲۳)۔

یہ اس لئے کہ خدا کے قانونِ مکافات پر ان کا ایمان ہی نہیں۔ یہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ ہمیں جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ اور اگر ہمیں وہاں جانا بھی پڑے گا تو محض چند دنوں کے لئے (۲/۸۰)۔ اس کے بعد جنّت کے وارث ہم ہی ہوں گے۔ یہ عقیدہ ان کا خود ساختہ ہے اور اس نے انہیں دین کے بارے میں سخت فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

نجات کے متعلق بنی اسرائیل کے عقائد کی تفصیل۔ مطالب الفرقان۔ جلد دوم ص۲۲۷-۲۲۹۔ آیت (۲/۸۰)۔ میں گذر چکی ہے۔ وہیں شفاعت کا مفہوم بھی دیا گیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہودیوں نے عذابِ جہنم سے نجات حاصل کرنے کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کر رکھے تھے، لیکن ٹھہیئے! آپ یہ کہہ کر آگے نہ بڑھ جائیے کہ یہ یہودیوں کے عقائد تھے۔ ہمارا ان سے کیا تعلق؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے بھی اس باب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ جہاں تک حصولِ جنت کے آسان طریقوں کا تعلق ہے اس کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص۲۹۸۔ آیت (۲/۲۱۴) میں آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ عذابِ جہنم سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہمارے

نجات بذریعہ شفاعت

ہاں کس قسم کے عقائد مروّج ہیں؟ اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس مقام پر صرف دو ایک احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں (بخاری اور مسلم کے حوالے سے) یہ روایت درج ہے کہ قیامت میں جب گنہگار تمام انبیاء کرام سے (شفاعت کرانے کے معاملہ میں) مایوس ہو جائیں گے تو وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ حضورؐ ان سے فرمائیں گے کہ

میں شفاعت کا اہل ہوں (اور تمہاری سفارش کروں گا)۔ پھر میں خداوند تعالےٰ کے حضور میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا خداوند تعالےٰ مجھ کو اجازت مرحمت فرمائے گا۔ اور میرے دل میں اپنی حمد و ثناء کے الفاظ ڈالے گا کہ میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثنا کروں گا (وہ الفاظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہیں) میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثنا کروں گا۔ اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائیگا۔ محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ اور کہو جو کچھ کہنا چاہتا ہے میں سنوں گا۔ مانگ جو کچھ مانگنا چاہتا ہے دیا جائیگا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا اے پروردگار! میری امت کو بخش دے۔ پروردگار! میری امت کو بخش دے۔ خداوند تعالیٰ فرمائیگا جاؤ اور دوزخ سے ان لوگوں کو نکال لو جن کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤنگا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کرونگا۔ اور اسکے بعد ربّ العزت میں دوبارہ حاضر ہونگا اور خدا کی حمد و ثناء ان ہی الفاظ میں کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا۔ اے محمدؐ! اپنا سر اٹھا۔ کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔

مانگ جو مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا پروردگار میں اپنی امت کی شفاعت کرتا ہوں۔ میں اپنی امت کی شفاعت کرتا ہوں۔ کہا جائے گا جاؤ اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر یا رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ چنانچہ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا اس کے بعد پھر حضور رب العزت میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا اور خدا کے حضور میں حاضر ہو کر انہیں الفاظ میں خدا کی حمد وثنا کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ جو مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا پروردگار میری امت میری امت (یعنی میری امت کو بخش دے) کہا جائے گا جاؤ۔ اور جس شخص کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ پھر درگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں حمد وثناء کروں گا پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ دیا جائے گا۔ شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا۔ اے پروردگار! ان لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کی اجازت مرحمت فرما جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو (اور کوئی عمل نہ کیا ہو) خداوند تعالےٰ فرمائے گا ان لوگوں کی سفارش تیرا حق نہیں ہے۔ قسم ہے اپنی عزت کی۔ اپنے جلال کی اور اپنی ذاتی اور صفاتی عظمت اور بزرگی کی میں ہی ان لوگوں کو دوزخ سے باہر نکالوں گا جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ۔ کہا ہوگا۔ (بخاری ومسلم)

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ ــــــ جلد دوم۔ صفحہ ۳۱۶-۳۱۵)

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے ہاں بھی جہنم سے نجات حاصل کرنے کے عقائد یہودیوں کے عقائد سے کم نہیں! یہودی شفاعت کو انبیاءؑ تک ہی محدود نہیں رکھتے تھے۔ اس میں اپنے مرشدانِ طریقت (رہبان اور اولیاء) کو بھی شامل کرتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے عقائد ہیں۔ اس کی تفصیل تصوف پر میری زیر کتابت تصنیف میں ملے گی (جو امید ہے اس جلد کی اشاعت سے پہلے شائع ہو جائے)۔ نمونے کے طور پر آپ صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے چشتیہ خاندان کے خواجگان میں خواجہ معین الدین اجمیری کا نام سر فہرست آتا ہے ان کے ملفوظات (دلیل العارفین) میں مرقوم ہے کہ ایک مجلس میں انہوں نے فرمایا:-

پیرانِ طریقت کے ذریعے نجات

بروز قیامت انبیاء، اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہوں گے۔ ہر ایک کمبل میں کم وبیش ایک لاکھ تانے کے تاگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے۔ ان کے مرید اور پیچھے ان کے ان تاگوں کو پکڑیں گے اور

اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامۂ محشر سے فارغ نہ ہو۔ پھر حق تعالیٰ انہیں پل صراط پہ پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پیروں کے اس بتیس ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں بہ برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے اور دروازۂ بہشت پہ پہنچ کر دارالنعیم میں داخل ہوں گے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہودی کتاب اللہ کی طرف اس لئے نہیں آتے تھے کہ وہاں قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ہر جرم کی پاداش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اس قسم کے عقائد وضع کر رکھے تھے۔ سو جب عقیدہ یہ ہو کہ ہم جو جی میں آئے کریں ہمارے شفعاء ہمیں عذابِ جہنم سے بچا لیں گے تو پھر جرائم سے مجتنب کیوں رہا جائے! اس میں ایک بڑا اہم نکتہ مضمر ہے۔ ہم اپنے ہاں بڑھتے ہوئے جرائم کا رونا روتے رہتے ہیں اور ہزار کوششوں کے باوجود ان میں اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جسے قرآنِ کریم نے یہودیوں کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی بنیادی عقیدہ یہی ہے کہ گنہگار رسول اللہ کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔ سو جب گناہوں (جرائم) کی سزا ہی نہیں ملے گی تو ان سے مجتنب کیوں رہا جائے۔ اس قسم کے عقائد قوم کو ارتکابِ جرائم پہ جرأت دلاتے ہیں۔ یاد رکھیئے! یہ صرف خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقینِ محکم ہے جس سے انسان جرائم سے مجتنب رہ سکتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ (انڈکس۔ سے آپ کو اس کی تفصیل مل سکے گی)۔ اس مقام پر بھی، یہودیوں کے اس غلط عقیدہ کو بیان کرنے کے بعد کہا کہ

۳/۲۴ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۖ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۳/۲۴)

لیکن ان کی یہ خود فریبی، انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ اس قانون کی رُو سے، ہر ایک کو، اس کے عمل کا پورا پورا بدل مل جاتا ہے اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔

اس کا مظاہرہ ایک تو ابھی ہو جائے گا، جب یہ میدانِ جنگ میں سامنے آئیں گے اور ذلّت و خواری سے، یہاں سے نکالے جائیں گے (۵۹/۲)۔ اور پھر حیاتِ اخروی میں بھی، اسی قسم کی رسوائیاں ان کے حصّے میں آئیں گی۔ کسی کی سفارش مکافاتِ عمل سے بچا نہیں سکے گی۔

اس بنیادی قانونِ مکافات کی تشریح ——— کہ ہر ایک کو اس کی سعی و عمل اور صلاحیت و استعداد کے مطابق پھل ملتا ہے اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ

۳/۲۵ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِكَ الْخَیْرُ ط اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (۳/۲۵)

حکومت اور عزّت مشیت خداوندی سے

لیکن جس عظیم مقصد کے لئے قرآن کریم نے اس اصول کو بیان کیا تھا ہمارے ہاں کے ترجموں نے اس سے بالکل برعکس نتیجہ پیدا کر دیا۔

اس آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے۔

تو کہہ ! یا اللہ ۔ مالک سلطنت کے ۔ تو سلطنت دیوے جس کو چاہے ۔ اور سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے ۔ اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے ۔ تیرے ہاتھ ہے سب خوبی ۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے ۔ (ترجمہ مولانا محمود حسن)

اس قسم کے ترجموں سے انسان مجبور محض ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن کریم کی تعلیم کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے ۔ اس کا تعلق مسئلۂ تقدیر سے ہے جس کی بابت پچھلی تینوں جلدوں میں بڑی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے ۔ آپ انڈکس میں عنوانات "خدا کا تصور"۔ "خدا انسانی اعمال کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے"۔ "تقدیر"۔ "مکافاتِ عمل"۔ "اختیار و ارادہ"۔ وغیرہ دیکھئے ۔ یہ بات واضح ہو جائے گی کہ "من یشاءُ" اور "مَن تشاء" جیسی اصطلاحات سے مراد ہوتی ہے "خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ۔ اور قانونِ مشیت کے متعلق اس نے واضح کر دیا ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اور کائنات میں ہر بات قانون علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ہوتی ہے ۔ یہی خدا کا قانونِ مشیت ہے ۔ خود آیۂ زیر نظر میں خدا کے متعلق کہا ہے کہ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ۔ یعنی خدا کی طرف سے ہمیشہ "خیر" سرزد ہوتی ہے ۔ شر کی تو اس کی طرف نسبت بھی نہیں کی جا سکتی ۔ اب کسی قوم سے بغیر کسی وجہ کے سلطنت چھین لینا یا کسی کو یونہی بلا سبب ذلیل کر دینا، خیر نہیں کہلا سکتا ۔ یہ تو یکسر شر ہے ۔ خدا نے استخلاف فی الارض ۔ استبدال و استحلال قومی ۔ اور ذلت و پستی کے متعلق غیر متبدل قوانین متعین کر رکھے ہیں (دیکھئے انڈکس) اور یہ سب کچھ اُن قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے ۔ غیر متبدل قوانین و اقدار کے مطابق اختیار کا استعمال سب سے بڑا خیر ہے ۔ شر آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کا خاصہ ہوتا ہے ۔ (دیکھئے عنوان آمر) اس لئے خدا کی حکومت کسی ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں قانون کی حکمرانی ہے ۔ اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔

مالک اور ملک کے الفاظ تو پہلے آ چکے ہیں (جلد اوّل ۔ صـ ۲۸ ۔ آیت ۱/۳) اس میں ہر قسم کا اقتدار شامل ہے ۔ عزت کے

عزّت کے معنی

معنے، غلبہ، تسلط، قوت کے ہوتے ہیں اور ذلت کے معنے ذلت، کمزوری اور پستی کے ۔ یہاں عزت اور ذلت ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں ۔ قرآن کریم نے کسی کو "یونہی ذلیل کرنے" کی تردید

بڑے واضح انداز میں کی ہے۔ کہا کہ انسان کی کیفیت عجیب ہے کہ جب اسے کشائش حاصل ہوتی ہے تو پھولا نہیں سماتا، لیکن جب اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا: فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ (۸۹/۱۶)۔ فرمایا کہ اس سے کہو کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ یہ ذلت تمہاری اپنی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ معاشرہ میں جو بے سہارا جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے جن پر کوئی افتاد پڑ جاتی تھی ان کے سامانِ زیست کی فکر نہیں کرتے تھے۔ چاہتے تھے کہ دنیا بھر کا مال تمہارے پاس آجائے۔ یہ تھے تمہارے وہ اعمال جن کی وجہ سے تمہیں اس ذلت کا سامنا کرنا پڑا (۸۹/۱۶-۲۰)۔ یاد رکھو! خدا کسی کو یونہی بلا وجہ ذلیل نہیں کیا کرتا۔ عزت و ذلت انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خدا نے ہر عمل کے نتیجہ کے لئے قوانین مرتب کر رکھے ہیں۔ (إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ)۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیت (۳/۲۵) کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے:-

> ان سے کہہ دو کہ دُنیا میں کوئی قوم بھی خدا کی چہیتی اولاد نہیں۔ ہر قوم کے ساتھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق برتاؤ ہوتا ہے ——— اور وہ قانون یہ ہے کہ ہر ایک کو، اس کی سعی و عمل کا پھل ملتا ہے۔ (۵۳/۳۹)۔ ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں (۶/۱۳۲) ——— اس قانون کے مطابق، عزت و عظمت اور غلبہ و اقتدار اُسے ملتا ہے جس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے (۲۴/۵۵ و ۲۱/۱۰۵) اور جب وہ اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرے جس سے یہ صلاحیت باقی نہ رہے، تو اس سے عزت و اقتدار چھین جاتا ہے (۸/۵۳ و ۱۳/۱۱)۔ اس قانون کا سررشتہ خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے، اس لئے اسے اس پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے کہ اس کے خلاف کچھ نہ ہونے پائے۔

اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ یہاں ہر بات (خدا کے مقرر کردہ) قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے (اپنے مخصوص انداز میں) نظامِ کائنات کی شہادت پیش کی ہے۔ فرمایا:-

۳/۲۶ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳/۲۶)

اختلافِ لیل و نہار

قرآن کریم نے قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول متعدد مقامات پہ بیان کئے ہیں (دیکھئے انڈکس بلحاظ جلد سوم) اور اس سلسلہ میں اس نے کہا ہے کہ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ قوموں میں یہ گردش دولابی جاری رہتی ہے۔ جو قوم اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے اسے عروج نصیب ہو جاتا ہے۔ جو ان صلاحیتوں کو کھو دیتی ہے وہ قعرِ مذلت میں گر جاتی ہے۔ وہ اس کی وضاحت، کہیں اختلافِ لیل و نہار سے کرتا ہے کہیں تغیراتِ موت و حیات سے۔ (۲/۱۶۴) گردشِ لیل و نہار کے لئے اس

نے عام طور پر "تولج" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (دیکھئے ۲۲/۶۱؛ ۳۱/۲۹؛ ۳۵/۱۳؛ ۵۷/۶) ۔ اس کے مادہ (و۔ل۔ج) کا مفہوم ہوتا ہے کسی شے کا کسی دوسری شے کے اندر آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر داخل ہونا۔ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کی مثال میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ جس طرح دن اور رات کا تغیر آہستہ آہستہ، غیر محسوس طور پر ہوتا ہے اسی طرح قوموں میں تغیر بھی بڑا غیر محسوس اور بتدریج ہوتا ہے۔ دوسری مثال تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ کی دی گئی ہے۔ موت اور حیات کے وسیع مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے (بالخصوص جلد اول۔ صفحہ ۳۴۶ زیر آیت ۲/۲۸)۔ طبعی موت اور حیات کے متعلق بھی قرآن کا بیان (اور سائنس کی تحقیق) یہی ہے کہ بے جان مادہ سے کس طرح زندگی کی نمود ہوتی ہے، اور زندہ اجسام کس طرح بے جان مادہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ (۶/۹۵؛ ۱۰/۳۱؛ ۳۰/۱۹) لیکن اس نے زمین مردہ کو حیات تازہ ملنے کی تشبیہ زیادہ نمایاں طور پر دی ہے کیونکہ اس کا مشاہدہ آسانی سے ہو سکتا ہے اور ہر کس و ناکس کر سکتا ہے۔ (۳۰/۱۹؛ ۴۱/۳۹) ۔ اور اسے اس نے منجملہ آیات خداوندی کہہ کر پکارا ہے (۳۰/۲۴)۔ "آیت" کے معنی ہوتے ہیں ایسی علامت جس سے کسی حقیقت کی نشاندہی ہو سکے۔ یہ تشبیہات و تمثیلات کس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں؟ اس حقیقت کی کہ

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۲۳)

(ذرا اس مثال پر غور کرو کہ) ایک شخص (یا قوم) مُردہ ہے۔ اسے زندگی عطا ہوتی ہے اور اسے ایسی قندیل دی جاتی ہے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے۔ اس کے برعکس دوسرا شخص (یا قوم) ہے جو گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا۔ سوچو کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں! (کبھی نہیں)۔ یہی حالت ان حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کی ہے۔ انہیں (چمگادڑ کی طرح)، اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے اور روشنی ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ اس لئے یہ وحی خداوندی کی جگہ اپنے خودساختہ معتقدات و رسومات میں بہت خوش رہتے ہیں۔

یہ ہے انسانوں کی وہ موت و حیات، جس کی وضاحت کے لئے مختلف مثالیں دی گئی ہیں۔

رزق بغیر حساب

آیت (۳/۲۶) کا آخری ٹکڑہ ہے (تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ)۔ "رزق" کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلد (دوم) میں گزر چکی ہے (دیکھئے انڈکس)۔ بالخصوص جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۵-۱۰۶ زیر آیت (۲/۳) ۔ یہاں اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ "بِغَيْرِ حِسَابٍ" کے معنے یہ نہیں کہ خدا رزق کو یونہی لُٹا دیتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو قوم قرآن کے معاشی نظام کے تحت حصولِ رزق کے لئے جدوجہد کرتی ہے، اسے اس کے اپنے اندازوں

سے بھی کہیں زیادہ رزق ملتا ہے۔ قرآن کا معاشی نظام تو ہم نے دیکھا نہیں (اگرچہ اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ دیکھئے انڈکس) لیکن خدا کے طبیعی قوانین کے مطابق جدوجہد سے جس قدر "بغیر حساب" رزق ملتا ہے اس کا مشاہدہ تو ہم نے خود کر لیا ہے۔ ہمارے ہاں کا کاشتکار اپنے قدیم طریقوں کے مطابق کھیتی باڑی کرتا چلا آرہا تھا، اس سے (خطۂ پنجاب کی اچھی سے اچھی زمینوں سے بھی) بیس پچیس من فی ایکڑ سے زیادہ گیہوں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قوانینِ زراعت کی جدید تحقیقات کی رو سے جب بیج، آلات اور کھاد وغیرہ میں تبدیلی کی، تو اسی زمین سے سو سو من گیہوں پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر خود کاشتکار حیران تھا۔ یہ ہے "بغیر حساب" رزق ملنے کی ایک پیش پا افتادہ سی مثال۔ اگر ان طبیعی قوانین کے ساتھ اقدارِ خداوندی بھی شامل ہو جائے تو پھر کس طرح "بغیر حساب" رزق ملے گا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

گزشتہ آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں انسانوں کے دو گروہ ہمارے سامنے آجاتے ہیں ــــ ایک وہ جو قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کریں، دوسرا گروہ وہ جو ان قوانین سے اعراض برتے اور اپنے خود ساختہ آئین وضوابط کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔ اوّل الذکر گروہ کو جماعتِ مؤمنین کہہ کر پکارا جائے گا اور آخر الذکر کو کفار کا گروہ جس میں جماعتِ مؤمنین سے باہر کے سب لوگ شامل ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے انسانوں کی بنیادی تقسیم اسی طرح کی ہے جب کہا

دو قومی نظریہ

ہے کہ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)۔ اللہ وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہو گیا اور دوسرا مؤمنین کا۔ اسلام مذہب نہیں کہ ان دونوں گروہوں میں محض نظری عقائد کا فرق ہو۔ یہ تو الدّین ہے جس کی رو سے کفر اور اسلام دو جداگانہ فلسفہ ہائے حیات - دو الگ الگ نظامہائے زندگی ہیں اور مؤمن اور کافر (یعنی حزب اللہ اور حزب الشیطان) دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اس نے جماعتِ مؤمنین کو واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ کفار تمہارے نظام کے بدترین دشمن ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہو گی کہ وہ اوّل تو تمہارے نظام کو قائم ہی نہ ہونے دیں۔ اور اگر قائم ہو جائے تو اسے مٹا کر چھوڑیں۔ سو ظاہر ہے کہ

کفار کے ساتھ تعلقات

جن دو گروہوں کے مقاصدِ زندگی ایک دوسرے کے اس قدر مخالف ہوں ان میں باہمی دوستداری اور رازداری کے تعلقات کس طرح قائم ہو سکتے ہیں؟ قرآنِ کریم کفار (یعنی غیر مسلموں) کے ساتھ "انسانیت" کے سلوک کی تاکید کرتا ہے لیکن ان کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات اور رازدارانہ روابط سے بڑی سختی سے روکتا ہے۔ (اس سلسلہ میں جلد اوّل - صفحہ ۵۹ - آیت ۲/۱؛ صفحہ ۷۵-۷۹، آیت ۲/۱۰ دیکھئے۔

اسی ضمن میں فرمایا :-

۳/۲۷ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۳/۲۸)۔

ظاہر ہے کہ اس نظام کی رو سے دنیا کے انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے —— ایک وہ جو اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں گے۔ انہیں مؤمنین کہا جائے گا۔ دوسرے وہ جو اس کی مخالفت کریں گے —— یہ کفار یعنی نہ ماننے والے کہلائیں گے —— ان دونوں گروہوں میں اصولی اختلاف اور مخالفت ہوگی۔

اب ظاہر ہے کہ جماعت مؤمنین کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں ہوگا کہ وہ جماعت کفار کو اپنا دوست اور رفیق بنائے۔ انہیں یہ تعلقات، صرف مؤمنین کے ساتھ وابستہ رکھنے ہوں گے۔ جو ان (مخالفین کو اپنا) دوست بنائے گا، اس کا نظام خداوندی سے کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہے گا (۳/۱۱۷-۱۱۹ ؛ ۵۸/۲۲ ؛ ۶۰/۴)۔ (لہٰذا اے جماعت مؤمنین!) اتنا ہی نہیں کہ تم ان سے دوستدارانہ تعلقات نہ رکھو بلکہ[1] تمہیں (ان سے) بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیئے اور اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان تیار رکھنا چاہیئے۔ تمہیں بڑی شدت سے خدا کے قانونِ مکافات کی احتیاط اور نگہداشت کرنی چاہیئے۔ وہی تمہارا آخری مقام اور پناہ گاہ ہے۔

چونکہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی بحث جلد اوّل میں تفصیل سے کی جاچکی ہے اس لئے اس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ زیرِ نظر آیت میں ایک ٹکڑہ ایسا ہے جس کی وضاحت نہایت ضروری ہے اور وہ ہے: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔ ان الفاظ کے غلط مفہوم کی رو سے اس آیت (۳/۲۸) کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے

مؤمنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہمساز ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

(تفہیم القرآن۔ مودودی (مرحوم) جلد اوّل۔ صفحہ ۲۴۴۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نقطہ کی وضاحت ضروری ہے۔ آپ نے سابقہ جلدوں میں بھی دیکھا ہوگا اور اس جلد میں بھی اس سے پہلے کہ بعض مقامات پر مودودی مرحوم کی تحریروں کے حوالے دیئے گئے ہیں اور زیرِ نظر آیت کا ترجمہ بھی انہی کی تفہیم القرآن

---

[1] اِلَّا بمعنی بلکہ (اتقان۔ سیوطی)

سے پیش کیا گیا ہے۔ ایسے مقامات پر مودودی مرحوم کی تحریروں کو خاص طور پہ پیش کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین کی تفاسیر میں بھی بہت کچھ ایسا ہے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے لیکن ہمارے ہاں کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل پہ ان کا کوئی

مودودی مرحوم کے حوالے کیوں!

اثر نہیں۔ وہ ان سے بالعموم برگشتہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مودودی مرحوم سے بہت متاثر ہیں اور انہیں اسلام کا صحیح ترجمان سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مودودی مرحوم نے جو کچھ قرآنی تعلیم کے خلاف لکھا ہے یہ نوجوان طبقہ اسے بھی عین اسلام سمجھ چکا ہے۔ بیحد ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں سے اس قسم کی (غیر اسلامی) تعلیم کے اثرات محو کر کے اس کی جگہ صحیح اسلام ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مودودی مرحوم کی تحریروں کے حوالوں سے میرا پیش نظر یہی مقصد ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیئے۔

مودودی مرحوم نے اس آیت کا جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی رو سے بات یوں ہوئی کہ عام حالات میں کفار کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر "ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیا جائے" تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ معاف ہے۔ یعنی ایسے حالات میں دل میں تو ان کے خلاف عداوت اور نفرت کے جذبات رکھے جائیں لیکن بظاہر ان سے دوستداری کے تعلقات کا مظاہرہ کیا جائے! آپ سوچیئے کہ ظاہر اور باطن میں اس قسم کے تضاد کو منافقت نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا! قرآنِ کریم نے منافقین کی جس شدت سے مخالفت کی ہے اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔

منافقت

اس شدت کا یہ عالم ہے کہ اس نے جہنم کے درکِ اسفل (سب سے نچلے درجہ) میں کفار کو نہیں بلکہ منافقین کو بتایا ہے۔ بالفاظ دیگر، اس کے نزدیک منافقت، کفر سے بھی بدتر ہے۔ کفر میں مخالف کھلے بندوں سامنے آتا ہے لیکن منافقت میں وہ دوستداری کے فریب انگیز نقاب میں بیٹھ میں چھرا گھونپتا ہے۔ کہا جائے گا کہ مودودی مرحوم اس قسم کی منافقت کو مخالفین کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن منافقت دوسروں کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہی تو اختیار کی جاتی ہے۔ اس لئے غیر مسلموں کی منافقت اور (مودودی مرحوم) جس قسم کی منافقت کو مسلمانوں کے لئے جائز قرار دیتے ہیں ان میں فرق کیا ہے؟ اگر فریق مخالف سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو منافقت اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ صداقت ظاہر و باطن میں ہم آہنگی کا نام ہے اور اس کا صحیح ٹسٹ (TEST) خوف کی حالت میں ہوتا ہے۔ اگر خوف کی حالت میں حق چھپانے کی اجازت ہو تو پھر منافقت قابلِ مذمت کیسے قرار پا سکتی ہے۔ مؤمن کا تو شعار یہ ہے کہ ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق　　یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

مودودی مرحوم نے اپنے اس نظریہ کے تحت کہ بحالتِ خوف منافقت اور ریاکاری کی اجازت ہے ہماری نوجوان نسل کو

مودودی مرحوم کی تعلیم

" اسلام " کی کس قسم کی تعلیم دی ہے اسکا اندازہ دو ایک مثالوں سے لگائیے۔ کوئی بیس پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے کہ، ان کی جماعت کے بعض ممتاز حضرات نے ان پہ الزام لگایا کہ انہوں نے جماعت سازی کے وقت جن بلند آہنگ اصولوں کو پیش کیا تھا اب سیاست کے میدان میں پہنچ کر ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

اصول شکنی

اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کر رہا ہوں تو کون سے جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں (معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے الفاظ میں :-

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اسے نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ " الائمۃ من قریش " " امام قریش میں سے ہوں "؟ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل حصہ چہارم بستا ایڈیشن۔ صد ۳۳۰-۳۲۹)

انہوں نے مودودی مرحوم پہ یہ الزام بھی لگایا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا :-

دروغ گوئی

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین بُرائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (حوالہ نیچے دیکھئے)

اور اپنے اس مسلک کی تائید میں یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ (بقول ان کے)

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں ؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صد ۵۵-۵۴)

آپ سوچئے کہ جن نوجوانوں کے قلب و دماغ میں اسلام کی یہ تعلیم راسخ کر دی جائے، ان پر مشتمل کس قسم کی قوم وجود میں آئے گی۔

مودودی مرحوم کا (آیت ۳/۲۷ کا) جو ترجمہ اوپر نقل کیا گیا، اس کے نیچے انہوں نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے :-

اگر کوئی مؤمن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اسے ان کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انہیں میں کا ایک آدمی ہے۔

(تفہیم القرآن۔ ایضاً۔ صد ۲۴۴)

مودودی مرحوم اگر اس قسم کی تعلیم کو اپنے خیالات کے طور پر پیش کرتے تو اور بات تھی۔ لیکن (قیامت تو یہ ہے کہ) وہ اس تعلیم کو ارشاداتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ان خیالات کا ماخذ کیا ہے اس کی نشاندہی ان کا اگلا فٹ نوٹ کرتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

اپنے بچاؤ کے لئے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ ...... (ایضاً)

"تقیہ" شیعہ حضرات کی ایک مشہور مسلمہ اصطلاح ہے۔

تقیہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے مطالب الفرقان میں کسی مقام پہ کوئی فرقہ وارانہ بحث نہیں چھیڑی۔ یہاں بھی میں نے شیعہ حضرات کا جو نام لیا ہے تو کسی فرقہ وارانہ نظریہ کی رو سے نہیں لیا۔ ایسا صرف یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ مودودی مرحوم نے جو تقیہ کی تلقین کی ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ تقیہ، شیعہ حضرات کی ایک اصطلاح ہی نہیں۔ ان کے ہاں یہ دین کے مسلمات بلکہ اساسات میں سے ہے۔ ان کے نزدیک تقیہ کیا ہے اور دین میں اس کا مقام کیا ہے اسے ہم ان کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب "اصولِ کافی"[ل] سے نقل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں تقیہ کے عنوان سے ایک الگ باب ہے۔ اس میں لکھا ہے :-

(۱) فرمایا حضرت ابوجعفر علیہ السلام نے کہ مخالفین سے بظاہر میل ملت رکھو اور باطن میں مخالفت رکھو جب کہ حکومت بازیچۂ اطفال ہو۔ (کتاب الشافی - جلد دوم - صـ۲۴۴)

(۲) حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے امرِ امامت کو اختیار کرنے کے یہ معنے نہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے اور فقط قبول کر لیا جائے بلکہ چاہیئے یہ کہ نااہلوں (مخالفوں) سے ہمارے معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ہماری احادیث ان سے بیان نہ کی جائیں ہمارے دوستوں سے ہمارا سلام کہو اور کہو کہ رحم کرے اللہ اس بندہ پر جو کہ بات تقیہ ہمارے مخالفوں سے اپنی دوستی ظاہر کرے (صـ۲۴۵)

(۳) آپ نے فرمایا اے سلیمان تم اس دین پر ہو۔ کہ جس نے اسے چھپایا خدا نے اسے عزت دی اور جس نے ظاہر کیا خدا نے اسے ذلیل کیا (صـ۲۴۵)

(۴) فرمایا امام محمد باقر علیہ السلام نے کہ تقیہ میرا دین ہے اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ جس کے لئے تقیہ نہیں اس کے لئے دین نہیں۔ (صـ۲۴۳)۔

کتاب الشافی جلد اوّل میں ہے :-

(۱) میں نے ابوعبداللہ کو فرماتے سُنا جو شخص یہ جانتا ہے کہ ہم نہیں کہتے مگر حق تو اس کو چاہیئے کہ اکتفا کرے اس پر جو ہم سے

[ل] کتاب "اصول کافی" عربی زبان میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ایک ممتاز شیعی عالم سید ظفر حسن امروہوی نے کیا ہے اور ادارہ شمیم بکڈپو۔ ناظم آباد مـ۲ کراچی نے کتاب الشافی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مندرجہ بالا اردو ترجمہ اسی کتاب سے مقتبس ہے۔

جاتا ہے۔ اور اگر ہم سے کوئی بات ایسی سُنی جو حکمِ خدا کے خلاف ہو تو سمجھ لے کہ ہم نے تم سے دشمنوں کے ضرر کا دفع چاہا ہے۔
یعنی بصورت تقیہ اس کو بیان کیا ہے۔ (ص ۲۰۷)

یہ ہے وہ تقیہ جس کی تلقین مودودی مرحوم نے فرمائی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیت (۳/۲۸) کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس آیت کا پہلا حصہ منفی حکم پر مشتمل ہے۔ یعنی کہا یہ گیا ہے کہ تم کفار سے دوستداری کے تعلقات مت رکھو۔ اس کے دوسرے حصے میں مثبت حکم ہے جس کے لئے کہا ہے کہ اتنا ہی کافی نہیں کہ تم ان سے قطع علائق کر لو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تم ان سے محتاط رہو اور اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرو۔ یہاں اِلَّا کے معنے "بلکہ" ہیں (حوالہ کے لئے دیکھئے الاتقان۔ سیوطی)۔ اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ ان سے دوستداری کے تعلقات نہ رکھو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سے اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر لو۔

جہاں تک ان سے ڈر کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے کا تعلق ہے اس کی نفی تو خود اس سے اگلے ٹکڑے نے کر دی جہاں کہا کہ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ یعنی ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ڈر تو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے ہونا چاہیئے۔ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ تمہاری آخری پناہ گاہ وہی ہے۔ جسے ایسی محکم پناہ گاہ میسر ہو اسے انسانوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ (خدا سے ڈرنے کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد دوم، ص ۱۸۱۔ آیت (۲/۴۰) میں گزر چکا ہے)۔

اگلی آیت میں اس مفہوم کی تشریح اور بھی وضاحت سے کر دی جہاں کہا کہ اگر تم میں کوئی ایسا ہے جو ان مخالفین سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کرنا چاہتا (واضح رہے کہ یہ مخالفین ___ قریش، اپنی مسلمانوں کے بھائی بند تھے) تو بجائے اس کے کہ وہ دل میں کچھ اور رکھے اور ظاہر کچھ اور کرے، مناسب یہ ہے کہ وہ کھلے بندوں ان سے جا ملے۔ اس کا یہ فیصلہ اور طرزِ عمل اس کے لئے بھی بہتر ہوگا (کہ وہ منافقت کے نفسیاتی مرض سے بچ جائے گا) اور جماعت مومنین کے لئے بھی بہتر کہ انہیں ناقابلِ اعتماد "رفقاء" سے نجات مل جائے گی۔ فرمایا:-

۳/۲۸	قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳/۲۹)

ہم نے بات بالکل واضح کر دی ہے۔ اس کے بعد جو تم میں سے سمجھتا ہے کہ وہ ان (مخالفین) سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کر سکتا (یا کرنا نہیں چاہتا) تو وہ ادھر سے ہٹ کر کھلے بندوں ان کے ساتھ جا ملے۔ یہ غلط ہے کہ تمہارے دل میں کچھ اور ہو اور ظاہراً روش کچھ اور ___ اس روش سے، بالآخر حاصل کیا ہوگا، جب کہ حالت یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، وہ خدا کے قانونِ مکافات سے کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ تمہارے دل کے پردے کیا شے

ہیں، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، وہ ان سب سے باخبر ہے۔ اور صرف باخبر ہی نہیں، سب پر کنٹرول بھی اسی کا ہے۔ کیونکہ یہ سب اس کے مقرر کردہ قوانین کے تحت رو بعمل ہیں۔

میزانِ خداوندی میں تمہارا فیصلہ تمہاری ظاہر روش کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ ان کے اعمال کی رو سے ہوگا جن میں نگاہ کی خیانتیں اور دل کے ارادے بھی شامل ہوتے ہیں:-

۳/۲۹ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳/۲۹﴾

اس قانونِ مکافات کے مطابق، ہر شخص، ظہور نتائج کے وقت، اپنے اپنے کام کے نتیجہ کو ـــــ خواہ وہ خوش آئند ہو یا ناپسند ـــــ اپنے سامنے موجود پائے گا، اگرچہ وہ ہزار جان سے چاہے گا کہ اس کے اعمال کا ناپسندیدہ نتیجہ اس سے کوسوں دور رہے۔ (لیکن ایسا نہیں ہو سکے گا)۔ اس لئے خدا کے قانونِ مکافات سے ہر وقت محتاط رہنا چاہیئے۔

انفرادی طور پر، تمہیں اس قانون کی سخت گیری شاید خوش آئند نہ ہو، لیکن اگر تم، انسانیت کے مفادِ کل کو سامنے رکھو، تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قانونِ مکافات کی سخت گیری نوعِ انسان کے لئے باعثِ رافت و رحمت ہے۔ اس لئے کہ اگر قانونِ عدل کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے، یا وہ رعایتیں برتنے لگ جائے، تو انسانوں کے لئے جینا محال ہو جائے۔

سابقہ آیات میں مؤمنین، کفار اور منافقین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مقصود نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے راستہ صاف کرنا تھا۔ اس کے لئے فرمایا:-

۳/۳۰ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳/۳۰﴾

اب اس نظام کی عملی تشکیل کی طرف آؤ۔ اس کے لئے ان (مؤمنین) سے کہہ دو کہ اگر تم اس نظامِ خداوندی کو واقعی دل سے پسند کرتے ہو، تو تم اس کی پوری پوری اطاعت کرو اور میرے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔ خدا کا نظام تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما کرے گا۔ اور تمہاری کوششوں کو ثمر بار۔ تمہاری کوتاہیوں اور نادانستہ لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہیں محفوظ رکھے گا۔ اس لئے کہ اس کا قانون، تخریبی قوتوں کے خلاف سپر کا کام بھی دیتا ہے اور انسانوں کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے۔

"خدا کے ساتھ محبت" کی تشریح مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۳۰۔ زیر آیت (۲/۱۶۵) کی جاچکی ہے۔ اس سے مراد احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ اور اس کا عملی طریق :-

۳/۳۱ قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿ (۳/۳۱)

پس، یہ ہے، نظامِ خداوندی کی تشکیل و استحکام کا عملی طریقہ یعنی قانونِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت۔ لیکن اپنے اپنے طور پر نہیں، بلکہ اجتماعی حیثیت سے (اس نظام کے مرکز، یعنی) رسول کے فیصلوں کے مطابق، قانونِ خداوندی کی اطاعت۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد بھی یہی سلسلہ قائم رہے گا اور نظامِ اسلامی کی اطاعت، بمنزلہ "خدا و رسول" کی اطاعت کے ہو جائے گی (۳/۱۴۴)۔

"اللہ اور رسول" کی اطاعت سے مقصود ہے اس نظامِ خداوندی کی اطاعت جو سب سے پہلے نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں تشکیل پذیر ہوا تھا۔ اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ (انڈکس میں اسلام۔ اسلامی نظام۔ الٰہ۔ اللہ۔ حکومتِ خداوندی۔ نظامِ خداوندی کے تابع دیکھئے)۔

اس آیت کے بعد ایک نیا موضوع شروع ہوتا ہے اس لئے ہم اس باب کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

دوسرا باب

داستان حضرت مریمؑ و حضرت عیسیٰؑ

(ماں اور بیٹا دونوں انقلابی)

(۱) ـــــ تذکرہ حضرت زکریاؑ

(۲) ـــــ پیدائش حضرت یحییٰؑ

(۳) ـــــ حضرت مریم کے کوائف حیات

(۴) ـــــ معبدوں اور ہیکلوں کی حیا سوز حالت

(۵) ـــــ حضرت مریمؑ کا انقلابی اقدام

(۶) ـــــ داستانِ حضرت عیسیٰؑ

(۷) ـــــ پیدائش

(۸) ـــــ آپ کی طرف منسوب کردہ معجزات

(۹) ـــــ انقلابی دعوت،

(۱۰) ـــــ ہیکل کے احبار و رہبان اور رومن حکومت سب کے خلاف

(۱۱) ـــــ واقعہ تصلیب کی اصلیت

(۱۲) ـــــ مباہلہ کے معنی

(۱۳) ـــــ ہماری گروہ بندیاں

(۱۴) ـــــ نوعِ انسان کی آزادی کا عظیم منشور

(۱۵) ـــــ بعثتِ سیّدنا رسولؐ اللہ

(۱۶) ـــــ اُمّت کا فریضہ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

دُوسرا باب

حضرت عیسےٰؑ کی داستانِ حیات

(ماں اور بیٹا دونوں داعی انقلاب)

(آیت ۳/۳۲ تا ۳/۱۱۹)

۳/۳۲-۳۴　إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۳/۳۲-۳۳)

ان آیات کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ نے پسند کیا ۔منتخب کیا ۔چُن لیا ۔آدم اور نوحؑ کو ۔اور ابراہیمؑ کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان سے ۔جو اولاد تھے ایک دوسرے کی ۔اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے" اصطفیٰ (مادہ ص۔ف۔و) کے معنی ہیں ۔خالص کرنا ۔(مصطفیٰ) کسی بلند مقصد کے لئے منتخب کرنا ۔فضیلت دینا ۔یہاں آدمؑ کا لفظ حضرت نوحؑ کے ساتھ آیا ہے ۔اس سے (بالعموم) آدم کے نبی ہونے کی دلیل لائی جاتی ہے ۔لیکن جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم ۔ صـ۶۳ ۔آیت (۲/۳۰) میں لکھا جا چکا ہے اس سے یہ استدلال صحیح نہیں ۔اوّل تو اس لئے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ (اصطفیٰ) غیر انبیاء کے لئے بھی آیا ہے ۔اور دوسرے یہاں آلِ ابراہیم ۔اور آلِ عمران کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آلِ

عمران　ابراہیمؑ میں ہر ایک نبی تو نہیں تھا ۔اور عمران کا نام زمرۂ انبیاء میں نہیں آیا ، چہ جائیکہ آلِ عمران میں سے بھی ہر فرد نبی ہو ۔عمران کا لفظ ایک تو اسی آیت میں آیا ہے اور اس کے علاوہ دو جگہ اور ۔ایک اس آیت سے اگلی آیت میں جہاں (حضرت) مریمؑ کی والدہ کو : اِمْرَأَتُ عِمْرَانَ (۳/۳۴) کہہ کر پکارا گیا ہے اور دوسرے (۶۶/۱۲) میں جہاں پھر (حضرت) مریمؑ کو "عمران کی بیٹی" کہا گیا ہے ۔کہا یہ جاتا ہے کہ عمران حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام تھا لیکن ایسا بالتحقیق نہیں کہا جا سکتا ۔قرآن کریم سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ لفظ خود بنی اسرائیل ۔یا ان کے کسی خاص قبیلے کے لئے بولا جاتا تھا ۔آیت (۱۹/۲۸) میں (حضرت) مریمؑ کو اُخْتَ هَارُونَ کہا گیا ہے ۔اس سے بھی ان کا بنی اسرائیل سے متعلق ہونا ظاہر ہے ۔اور (۳/۳۴) میں : اِمْرَأَتُ کے معنے

ہوتی کئے جائیں تو عمران حضرت مریمؑ کے والد کا نام قرار پائے گا اور انہیں اسی نسبت سے "عمران کی بیٹی" (۶۶/۱۲) کہا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب آلِ عمران کو آلِ ابراہیم سے الگ کہہ کر پکارا گیا ہے تو اس سے مُراد بنی اسرائیل ہوں گے کیونکہ وہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ کی ذریت ہی سے تھے لیکن وہ اپنی نسبت (حضرت) ابراہیمؑ کے بجائے، حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کی طرف کرتے تھے۔ اصل میں شاخِ اسرائیل ہو یا شاخِ اسماعیل؛ ان سب کا سلسلہ (تورات کے بیان کی رو سے) حضرت نوحؑ ہی سے شروع ہوتا ہے۔

میرے خیال میں آیت (۳/۳۳) میں مختلف انبیاء کرامؑ کے بجائے" مختلف ادوار کا ذکر ہے۔ اسی لئے میں نے ان آیات (۳/۳۲-۳۳-۳۴) کا مفہوم یوں پیش کیا ہے:۔

جیساکہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے (۲/۲)، یہ نظام پہلی بار نہیں بھیجا گیا۔ اس مقصد کے لئے، مختلف زمانوں میں، مختلف حضرات اور اقوام کو منتخب کیا جاتا رہا ہے ___ مثلاً، انسان کی تمدنی زندگی کا ابتدائی دور جسے" داستانِ آدم" کے تمثیلی انداز میں بیان کیا جا چکا ہے (۲/۳۰-۳۸)۔ پھر دعوتِ نوحؑ کا دور۔ آلِ ابراہیمؑ کا دور۔ اسی کی ایک شاخ، آلِ عمران (یعنی سلسلۂ موسیٰؑ و ہارونؑ) کا دور اور اب آلِ ابراہیمؑ کی دوسری شاخ، آلِ اسماعیلؑ کا دور آیا ہے۔

یہ سب ایک دوسرے کی نسل سے تھے۔ ان کا یہ انتخاب یونہی عمل میں نہیں آگیا تھا۔ نہ ہی اس بناء پر کہ ان کا تعلق کسی خاص نسل سے تھا۔ یہ اس خدا کی طے کردہ اسکیم کے مطابق ہوا تھا جو سب کچھ سُننے والا، اور تمام حالات کا جاننے والا ہے۔

سورۂ آلِ عمران کا عمودی موضوع حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات ہے۔ اگرچہ ان کی داستان کے مختلف گوشے، قرآن مجید کے متعدد مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں لیکن چونکہ اس کی ابتداء سورۂ آلِ عمران سے ہوتی ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان سے متعلق واقعات ایک ہی مقام پر درج کر دیئے جائیں تاکہ یہ تمام منتشر گوشے یک جا سامنے آجائیں۔ لیکن اس سے پہلے حضرت ذکریاؑ اور ان کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ خود حضرت مریمؑ کی ہیکل کی زندگی کی داستان کا آغاز: وکفلھا زکریا (۳/۳۶) سے ہوتی ہے۔ یعنی" خدا نے اسے ذکریا کی کفالت میں دے دیا۔"

حضرت زکریا (علیہ السلام)

قرآن مجید میں حضرت زکریاؑ کی داستانِ حیات اس نقطہ کے گرد گردش کرتی ہے کہ وہ سِن رسیدہ ہو چکے تھے لیکن ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں (حضرت) یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ حضرت زکریاؑ کے دل میں اولاد کی خواہش تو (تقاضائے بشریت کے تحت) غالباً اکثر رہتی ہوگی لیکن اس نے جن حالات میں ایسی شدت اختیار کی، کہ وہ دعا بن کر ان کے لبوں

پر آگئی، قرآن کریم نے اسے بڑے حسین اور بلیغ نفسیاتی انداز سے بیان کیا ہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) حضرت مریمؑ کو ان کی ماں نے بچپن ہی میں ہیکل کی نذر کر دیا تھا اور وہاں اسے حضرت زکریاؑ کی کفالت میں دے دیا گیا تھا۔ وہ بچی ان کے لئے بمنزلہ بیٹی کے تھی اس لئے وہ اس سے بزرگانہ پیار اور پدرانہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دن اس قسم کی باتیں کرتے کرتے، ان کے دل میں اپنی اولاد کی آرزو نے جوش مارا تو:-

۳/۳۷ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ○ (۳/۳۸)

اسی وقت انہوں نے خدا سے دعا کی کہ، اے میرے نشو و نما دینے والے! مجھے بھی اپنے ہاں سے اچھی (طیب) اولاد عطا فرما۔ بیشک تو دعاؤں کا سننے والا ہے۔

ان کی دعا ابھی لبوں پہ تھی کہ

۳/۳۸ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ (۳/۳۹)

وہ ابھی قربانگاہ میں کھڑا محو دعا تھا کہ ملائکہ نے آواز دی اور کہا کہ اللہ تمہیں ایک بیٹے (یحییٰ) کی بشارت دیتا ہے۔ وہ قوانین خداوندی کو سچ کر دکھانے والا ہوگا۔ ایک بڑی جماعت کا لیڈر۔ صاحب نظم و ضبط۔ اور بلند صلاحیتوں کا مالک نبی۔

یہاں محراب کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے ہاں مساجد میں محراب وہ ہوتا ہے جہاں امام کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا ہے۔ لیکن یہودیوں کے ہاں

محراب

یہ ہیکل یا معبد میں ایک خاص مقام ہوتا تھا۔ اس لفظ کا مادہ (ح-ر-ب) ہے جس کے معنے جنگ کرنے یا خون بہانے کے ہیں۔ یہودیوں کے مراسم عبادت میں قربانی (بلکہ سوختنی قربانی) کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کے لئے ان کے معبد میں ایک مخصوص مقام ہوتا تھا جہاں جانوروں کی قربانی دی جاتی تھی (ان کا خون بہایا جاتا تھا)۔ اس مقام کو محراب کہتے تھے۔ حضرت زکریا اس مقام پہ کھڑے محو دعا تھے کہ ملائکہ نے بیٹے کی بشارت دی۔ محراب یہودیوں کے معبد میں قربانگاہ تھی لیکن ہم نے اپنی مساجد میں امام کے کھڑے ہونے کے لئے جو جگہ مخصوص کی تو اسے محراب کہہ کر پکارنے لگ گئے۔[1]

حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف من جانب اللہ، ملائکہ کی وساطت سے کس طرح وحی آتی تھی، اس کی حقیقت کے متعلق ہم نہ کچھ جان سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے۔ وحی خاصہ نبوت تھی اور کوئی غیر نبی اس کی کنہ و ماہیت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس موضوع پہ

---

[1] اب جس طرح امامت کے لئے باہمی جھگڑے ہوتے ہیں اور نوبت سر پھٹول تک پہنچ جاتی ہے تو اس سے "محراب" پھر سے اپنے حقیقی معانی (جنگاہ) کا مظہر بن گیا ہے۔

سابقہ جلدوں میں شرح وبسط کے ساتھ بحث ہو چکی ہے (انڈکس میں متعلقہ مقامات وحی ۔ نبوت ۔ رسالت وغیرہ دیکھئے)۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ملائکہ نے کس طرح حضرت زکریاؑ سے کلام کیا۔ قرآنِ کریم وحی کو کلام اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔

حضرت زکریاؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹے کی جو بشارت ملی تو اس میں ایک نکتہ بڑا لطیف ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اِنَّ اللہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی۔ ہماری نگاہ تو یہیں تک جاتی ہے کہ حضرت زکریاؑ کے بیٹے کا نام یحییٰ تھا اور ان کا شمار زمرۂ انبیاء میں ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تمہیں یحییٰ کی بشارت دی جاتی ہے۔ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش سے پہلے تو ان کا نام یحییٰ نہیں تھا۔ بچے کا نام تو اس کی پیدائش کے بعد رکھا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یحییٰؑ کیوں کہا؟

بڑھاپے کی اولاد۔ اور وہ بھی اکلوتا بیٹا جو دعائیں مانگ مانگ کر ملا ہو، وہ ایسا پیارا اور گوہرِ نایاب اور بے بہا متاع ہوتی ہے کہ ماں باپ ہر وقت اس کی خیریت کے لئے متفکر رہتے ہیں۔ وہ خدا سے دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ مولا تعالیٰ! تو نے

یحییٰ کے معنی

یہ بیٹا عطا کیا ہے تو اسے زندگی عطا کرتا۔ یہ جیتا رہے۔ خیر خیریت سے رہے۔ ماں باپ کا یہی نفسیاتی خدشہ ہوتا ہے جس سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہم غیر شعوری طور پر اپنے بچوں کا نام "جیونا"۔ اللہ رکھا۔ اللہ دتہ۔ وغیرہ رکھتے ہیں۔

یحییٰ، حیات ہی سے ہے۔ اس کے معنے ہیں جیتا رہنے والا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لفظ میں کس طرح ایک بیٹے کی بشارت کے ساتھ حضرت زکریاؑ کے بڑھاپے کے وساوس کی بھی تسکین کا سامان فراہم کر دیا!

حضرت زکریاؑ نے "طیب اولاد" کے لئے دعا مانگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ہی اس ہونے والے بچے کی ان خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جن سے اس کے "طیب" ہونے میں کوئی کلام نہیں رہتا۔

حضرت یحییٰ کی خصوصیات

پہلی خصوصیت سیداً (مادہ ۔ س ۔ و ۔ د) سواد، قوم کے بہت بڑے حصے یا کثیر تعداد کو کہتے ہیں اور سید، صاحبِ سواد کو۔ یعنی وہ سردار جس کے ساتھ بہت سی جماعت ہو۔

دوسری خصوصیت حصور (مادہ ح ۔ ص ۔ ر) ہے۔ اس کے بنیادی معنے "روک دینے" کے ہوتے ہیں۔ یہیں سے محصور حصار وغیرہ کے معنے سمجھ میں آجائیں گے۔ حصور کے معنے اپنے آپ پر ضبط رکھنے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن سید (قوم کا سربراہ) ہونے کی جہت سے، اس کا مفہوم "نظم وضبط رکھنے والا" زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جو اپنے آپ پر بھی کنٹرول رکھے اور اپنی جماعت پر بھی۔ ضبطِ خویش، نظم وضبطِ جماعت کی اوّلین شرط ہے۔

اس کے ساتھ ہی صالح۔ یعنی جس کی انسانی صلاحیتیں بر ومند ہو جائیں۔ اور سب سے آخر (بلکہ اوّل) نبوت۔

ان خصوصیات کا حامل، جیتا رہنے والا بیٹا، (حضرت یحییٰ علیہ السلام)

حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی خوشخبری تو سن لی لیکن بشریت کے تقاضوں سے جو خیالات ان کے دل میں ابھرے قرآن کریم
۳/۳۹ نے ان کا ذکر نہایت بلیغ انداز سے کیا ہے۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ (۳/۳۹)۔ یہاں اَنّٰی کا لفظ بڑا معنی خیز
ہے۔ کہا کہ بار الہا! میرے ہاں اولاد ہونے کا یہ کون سا وقت ہے؟ وَقَدۡ بَلَغَنِیَ الۡکِبَرُ۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اتنا
ہی نہیں۔ وَامۡرَاَتِیۡ عَاقِرٌ۔ اور میری بیوی بانجھ ہے؟ تو ان موانعات کے باوجود، کیا مجھے سچ مچ کا بیٹا عطا ہو گا یا جس
طرح یہ بیٹی مریم مجھے ملی ہے، اسی طرح کا بیٹا ملے گا؛ جواب ملاکہ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ (۳/۳۹)۔ نہیں۔ تمہارے
ہاں وہ بیٹا اسی طرح پیدا ہو گا جس طرح ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سابقہ جلدوں میں بتا چکے ہیں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین کے سامنے جب ایسی آیات آتی ہیں جن میں مایشاءُ یا مانشاء کے الفاظ آئیں تو ان الفاظ کا ترجمہ "جسے چاہتا ہے"۔ اور "جیسے چاہتا ہے" کر کے، یہ لکھ دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن ہم (سابقہ جلدوں میں) وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ ان الفاظ کے معنے یہ ہیں کہ خدا ایسا کچھ اپنے قانونِ مشیت کی رو سے کرتا ہے۔ خارجی کائنات میں اس قانون سے مراد قوانینِ فطرت یا طبعی قوانین ہیں اور انسانی زندگی میں اس سے مطلب قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ مخلوقِ خداوندی میں خدا کا ہر فیصلہ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔

زیر نظر آیت میں: کَذٰلِکَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ کے متعلق بھی ہمارے مفسرین اور مترجمین نے یہی کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کہا کہ "ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں"۔ اور اس کے بعد کہا کہ خدا نے انہیں اپنی مشیت سے بیٹا عطا کر دیا۔

لیکن اگر (اور تو اور، صرف) اولاد کے معاملہ میں ہی مایشاء کا قرآنی مفہوم سامنے رکھ لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

سورۂ الشوریٰ میں ہے:-

یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّکُوۡرَ ۙ اَوۡ یُزَوِّجُهُمۡ ذُکۡرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ یَجۡعَلُ
مَنۡ یَّشَآءُ عَقِیۡمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ ○ (۴۲/۴۹-۵۰)

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے:-

وہ بخشتا ہے جس کو چاہے بیٹیاں اور بخشتا ہے جس کو چاہے بیٹے۔ یا انہیں دیتا ہے بیٹے اور بیٹیاں اور کر دیتا ہے جس کو چاہے بانجھ۔

اب میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ انہوں نے تحقیق کر لیا ہے کہ لڑکی کیوں پیدا ہوتی ہے اور لڑکا کیوں۔ جوڑے کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور عورت یا مرد بانجھ کس طرح ہوتے ہیں اور ان کا علاج کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے مایشاء کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

قصۂ حضرت زکریا میں تو خود قرآن کریم نے "کَذٰلِکَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ" کی تفسیر بیان کر دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰)۔ زکریا میں تو کوئی نقص نہیں تھا۔ اس کی بیوی میں نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اصلاح ہوگئی۔ یعنی مناسب علاج کرنے سے وہ نقص دور ہوگیا اور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگیا۔ اَصْلَحْنَا لَهٗ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ حضرت زکریا میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان کی بیوی میں نقص تھا۔ سو اس کی اصلاح ہوگئی اور وہ بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوگئی۔ یہ ہے مایشاء کی تفسیر۔ یعنی خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق[1] اس پر حضرت زکریا نے خدا سے عرض کی۔

۳/۴۰ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ ۠ (۳/۴۰)

زکریا نے کہا کہ اس باب میں میرے لئے کوئی خاص حکم ہو تو فرما دیجئے۔ خدا نے کہا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم تین دن تک اچھے بھلے ہونے کے باوجود، لوگوں سے اشاروں سے بات کرو (۱۹/۱۰)۔ قانونِ خداوندی کو شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو۔ اور باقی (جس طرح تمہارا معمول ہے) اپنے فرائض کی تکمیل میں صبح و شام مصروف رہو۔

یہودیوں میں روزہ کی حالت میں بات کرنا بھی ممنوع تھا (۱۹/۲۶) حضرت زکریا کو جو کہا گیا کہ تین دن تک لوگوں سے بات نہ کرو۔ تو غالباً انہیں روزہ رکھنے کے لئے کہا گیا ہوگا۔ (ذکر۔ اور تسبیح کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آچکا ہے۔ انڈکس کی مدد سے وہاں دیکھ لیا جائے)۔

انجیل میں حضرت زکریا کا ذکر

اس مقام کے علاوہ حضرت زکریا کا ذکر آیات (۱۹/۲-۹ ؛ ۲۱/۸۹-۹۰) میں بھی آیا ہے۔ ان آیات میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کا ذکر یہاں ضروری ہو۔ حضرت یحییٰ کا ذکر (۱۹/۷ ، ۱۹/۱۲ ؛ ۲۱/۹۰) میں آیا ہے۔ یہاں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ انجیل میں حضرت زکریا کو کاہن کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مثلاً لوقا کی انجیل میں ہے :-

> یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں ابیاہ کے فریق سب سے زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کی اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے .... (لوقا ۱/۵-۷)

یہودیوں کے ہیکل میں کہانت بہت بڑا منصب تھا۔ کاہن پیش گوئیاں کرنے والے کو کہتے تھے اس لئے ان کے ہاں نبی کی اصطلاح رائج

---

[1] قانونِ طبیعی کے مطابق اولاد پیدا ہونے کی ایک نہایت بلیغ دلیل عیسائیوں کے عقیدۂ ابن اللہ کی تردید میں آگے چل کر سامنے آئے گی۔

تھی جس کا ترجمہ کاہن کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بہت سے نامور بزرگوں کے لئے نبی کا لفظ آتا ہے لیکن قرآن کریم میں نبی کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے نبوت پانے والا۔ بنا بریں بعض وقت یہودیوں کے کسی "نبی" اور قرآنی نبی میں التباس ہو جاتا ہے۔ ہمیں اُنہی حضرات کو نبی کہنا چاہیئے جنہیں قرآن مجید میں زمرۂ انبیاء کرام میں بتصریح شامل کیا گیا ہے۔ ان کے سوا، یہودیوں کے "نبی" کاہن تھے۔

یوحنا

حضرت یحیٰؑ کو انجیل میں یوحنا بپتسمہ دینے والا (JOHN, THE BAPTIST) کہہ کر پکارا گیا ہے اور انہیں ایک فقیر بادیہ نشین کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے حضرات انبیاء کرامؑ، راہب اور درویش نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو بڑی عظیم انقلاب آور شخصیتیں ہوتے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن نے حضرت یحیٰؑ کو سیّد او رحصور کہا ہے۔ یعنی ایک کثیر جماعت کا سربراہ جوان کا نظم و ضبط قائم رکھتا تھا۔ اس جماعت کے متعلق تو ذرا آگے چل کر ذکر آئے گا، جسے تاریخ نے الیسینی (ESSENEES) سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت یحیٰؑ اس جماعت کے سربراہ تھے اور ان کا مقصد رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنا تھا۔ چند سال اُدھر اٹلی کے ایک نامور مؤرخ (MARCELLO CRAVERI) نے حضرت مسیحؑ کی سوانح عمری (LIFE OF JESUS) کے نام سے شائع کی تھی جو بعض اہم حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتی ہے وہ اس میں حضرت یحیٰؑ کے متعلق رقمطراز ہے:-

(حضرت یحییٰ) نظم و نسق حکومت کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گناتے اور لوگوں سے کہتے کہ اب یوم مکافات قریب ہے۔ ظالموں کی حکومت کا شجر خبیثہ جڑ سے کٹ جائے گا (اس جہاد میں) بنی اسرائیل سب کے سب ختم ہو جائیں تو بھی اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ خدا کوئی اور قوم پیدا کر دے گا جس کے ہاتھوں باطل کا تختہ الٹ جائے گا (P. 83) -

ظاہر ہے کہ اس قسم کے "وعظ" ایک فقیر بادیہ نشین کے نہیں ہو سکتے۔ ایک عظیم مصلح (خدا کے رسول) کے انقلاب آفریں اعلانات جنگ قرار پا سکتے ہیں۔ اور یہی رسول کا منصب ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلابی زعیم کو حکومت کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے (معلوم ہوتا ہے کہ) اس نے انہیں قتل کرا دیا۔ لیکن انجیل نے اسے بھی (حسبِ معمول) افسانوی رنگ دے دیا ہے۔ متی کی انجیل میں ہے:-

اس وقت چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودس نے یسوع کی شہرت سنی اور اپنے خادموں سے کہا کہ یہ یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے۔ وہ مُردوں میں سے جی اٹھا ہے اس لئے اس سے یہ معجزے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہیرودس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب یوحنا کو پکڑ کر باندھا اور قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے کہ یوحنا نے اس سے کہا تھا کہ اس کا رکھنا تجھے روا نہیں۔ اور وہ ہر چند اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر عام لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ اسے نبی جانتے تھے۔ لیکن جب ہیرودس کی

سالگرہ ہوئی تو ہیرودیاس کی بیٹی نے محفل میں ناچ کر ہیرودیس کو خوش کیا۔ اس پر اس نے قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا کہ جو کچھ تو مانگے گی، تجھے دوں گا۔ وہ اپنی ماں کے سکھانے سے بولی کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر تھال میں یہیں مجھے منگوا دے۔ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے۔ اور آدمی بھیج کر قید خانے میں یوحنا کا سر کٹوا دیا اور اس کا سر تھال میں لایا گیا اور لڑکی کو دیا گیا۔ اور وہ اسے اپنی ماں کے پاس لے گئی۔ اور اس کے شاگرد دوں نے اس کی لاش اٹھالی اور اسے دفن کر دیا۔ اور جا کر یسوع کو خبر دی۔ (متی کی انجیل باب ۱۴ - آیات ۱-۱۲)

یہ قصہ پھر شاعروں اور ادیبوں کے ہتھے چڑھا اور "رقص سلومی" کے نام سے وجۂ رنگینیٔ مجالس بنتا چلا گیا۔ لیکن قرآن کریم میں اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔

حضرت مریم (علیہا السلام)

زیر نظر سورۃ (آل عمران) میں حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے اس داستان کو خاص اہمیت دی ہے (جس کی وجہ آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ اس لئے اس نے اسے (زیر نظر سورۃ کے علاوہ) دیگر متعدد مقامات پر بھی جستہ جستہ بیان کیا ہے۔ لیکن (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کی اہمیت، نیز حصولِ تعریف آیات کے پیشِ نظر، اس مکمل داستان کو اسی مقام پر سامنے لے آیا جائے۔ اس میں ذرا سی دشواری یہ ہے کہ بعض مقامات پر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر الگ الگ آیا ہے اور بعض مقامات میں ان دونوں کے کوائف یک جا ہیں۔ اس کا حل یہ نظر آتا ہے کہ پہلے حضرت مریمؑ کے سوانح حیات پیش کر دیئے جائیں اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے احوال و کوائف کے ضمن میں جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے وہ مقامات (داستان حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ) سامنے لے آئے جائیں۔ اس سے یہ منتشر موتی، سلکِ گہر کی طرح زینتِ دہ اوراق اور فروغ دہ اذہان ہو جائیں گے۔

حضرت مریمؑ کا ذکر قرآن مجید میں

(۱) ـــــ پیدائش، نام، اور ہیکل کی نذر۔ (۳/۳۶-۳۴)

(۲) ـــــ ہیکل کی زندگی میں رزق۔ (۳/۳۶)

(۲) ـــــ اصطفیٰ (فضیلت)۔ (۳/۴۱)

(۴) ـــــ ہیکل کے پجاریوں کی قرعہ اندازی۔ (۳/۴۳)

(۵) ـــــــ ملائکہ کی طرف سے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری (۳/۴۶-۴۴)۔

(۶) ـــــــ یہودیوں کی طرف سے بہتان (۴/۱۵۶) و (۱۹/۲۷)۔

(۷) ـــــــ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش (۱۹/۲۹-۱۶)۔

(۸) ـــــــ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ، آیات ہیں (۲۱/۹۱) و (۲۳/۵۰)۔

(۹) ـــــــ بنت عمران (۶۶/۱۲)۔

(۱۰) ـــــــ حفاظتِ عصمت (۲۱/۹۱) و (۶۶/۱۲)۔

داستانِ حضرت مریمؑ کے سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے انہیں اس قدر اہمیت کیوں دی ہے ـــــ ایسی اہمیت کو فرمایا" اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ؀ (۳/۴۱)"۔ انہیں اس (۳/۴۱)

اس قدر برگزیدگی کی وجہ

دور کی (یا اقوامِ عالم کی) دوسری عورتوں پر فضیلت اور برگزیدگی عطا فرمائی"۔ یہ بہت بڑا امتیاز ہے جو انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کی کون سی خوبی تھی جس کی بناء پر انہیں اس قدر عظیم فضیلت کا اہل قرار دیا گیا"۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اولوالعزم نبی کی والدہ تھیں اس لئے انہیں مستحقِ فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ توجیہہ تو قابلِ تسلیم قرار نہیں پا سکتی۔ والدہ تو ہر نبی کی تھی۔ سو اگر نبی کی والدہ ہونا مستحقِ فضیلت قرار پاتا ہے تو ہر نبی کی والدہ کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ قرآنِ کریم نے (حضرت مریمؑ کے علاوہ) حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا ذکر کیا ہے، اس ضمن میں کہ انہوں نے حکمِ خداوندی کی اطاعت میں، اپنے نوزائیدہ بچے کو دریا میں بہا دیا، (۲۸/۷)۔ ایک اولوالعزم نبی کی والدہ ہونے کے علاوہ ان کا یہ عمل کہ انہوں نے حکمِ خداوندی کی اطاعت میں اپنی ماں مامتا کو قربان کر دیا، وجہِ تحسین تھا۔ لیکن اللہ تعالٰے نے اصطفیٰ کا مستحق انہیں بھی قرار نہیں دیا۔ والدہ ہونا تو ایک طرف نبی کے ساتھ کوئی رشتہ بھی قرآنِ کریم کی رو سے، معیارِ تکریم اور وجہِ فضیلت قرار نہیں پاتا۔ اس کی رُو سے، وجہِ تکریم جوہرِ ذاتی ہے نہ کہ محض رشتہ داری۔ جہاں تک رشتہ داری کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے باپ اور حضرت لوطؑ کی بیوی کا، ان کے کفر اور معصیت کی وجہ سے مجرمین کی صف میں شمار کیا ہے (۶۶/۱۰) اور ان انبیاءِ کرامؑ کے ساتھ ان کی رشتہ داری نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اس کے برعکس اس نے فرعون جیسے" انا ربکم الاعلیٰ" کے مدعی کی بیوی کا تذکرہ اس کے ایمان کی وجہ سے تحسین و ستائش کے ساتھ کیا ہے (۶۶/۱۱)۔ لہٰذا، معیارِ خداوندی کی رُو سے کسی نبی کا رشتہ دار ہونا وجہِ فضیلت قرار نہیں پا سکتا۔ (مولانا) جامیؒ کے الفاظ میں ؎

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامیؔ! 　　　 کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لہٰذا، حضرت مریمؑ کی فضیلت اس بنا پر نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں۔

اس سے بڑھ کر وجۂ فضیلت یہ "معجزہ" یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں بن باپ کے بچہ پیدا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے کے عقیدہ کے متعلق تو بعد میں بات کی جائے گی، اس مقام پر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر حضرت مریمؑ کے ہاں بن باپ بیٹا پیدا ہوا تھا تو یہ معجزہ کس کا تھا؟ ظاہر ہے کہ یہ حضرت مریمؑ کا معجزہ نہیں تھا کیونکہ مرد کے اختلاط کے بغیر استقرارِ حمل اور بچے کی پیدائش میں ان کا (حضرت مریم کا) کا تو کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس لئے یہ ان کا معجزہ کیسے قرار پا سکتا ہے؟ اگر یہ واقعہ کسی (CREDIT) کا مستحق تھا تو حضرت مریمؑ کو اس کا (CREDIT) کس طرح پہنچ سکتا تھا؟ حضرت مریمؑ تو ایک طرف اسے تو حضرت عیسیٰؑ کا بھی معجزہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ (مروجہ عقیدہ کے مطابق) ان کے بن باپ پیدا ہونے میں ان کا بھی کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

اگر یہ معجزہ تھا تو اسے بہرحال اللہ تعالیٰ کا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کچھ وقت کے لئے اپنے جذبات کو الگ رکھ کر سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس معجزہ کے دکھانے کے لئے جو طریق اختیار فرمایا اس نے اس معصوم بچی (مریم) کو کن مشکلات میں

بن باپ پیدائش کے عقیدہ کا اثر

پھنسا دیا! آپ سوچئے کہ اگر ایک جوان، ناکتخدا (غیر شادی شدہ) لڑکی کو حمل قرار پا جائے اور اس طرح اس کے ہاں لڑکا بھی پیدا ہو جائے، تو معاشرہ میں اس کی حالت کیا ہوگی؟ کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہے گی! کیا وہ اپنے گھر والوں کے ہاں جا سکے گی! کیا وہ اس معاشرہ کا سامنا کر سکے گی۔ سوچئے کہ اس کی زندگی کس قدر اجیرن ہو جائے گی۔ کہا جائے گا کہ اس میں حضرت مریمؑ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایسا اللہ تعالیٰ نے کر دیا تھا۔ لیکن ایسا کہتے وقت اس پر غور کیجئے کہ کیا حضرت مریمؑ کے پاس اس کا کوئی ثبوت تھا کہ اس حمل میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ ایسا خدا نے کر دیا ہے۔ کیا وہ اسے کسی صورت میں بھی ثابت کر سکتی تھیں؟ وہ تو ایک طرف رہیں، کیا حضرت عیسیٰؑ بھی کسی طرح یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ان کی والدہ اس باب میں بے گناہ ہیں اور ان کا حمل خدا کی طرف سے تھا۔ اگر انہوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا تھا —— جو نہیں کیا تھا —— تو سوال دعوے کرنے کا نہیں۔ سوال تو اس دعوے کی صداقت کے لئے ثبوت بہم پہنچانے کا تھا۔ ایسا ثبوت جس سے معاشرہ مطمئن ہو جائے کہ حضرت مریمؑ واقعی بے گناہ تھیں۔ ان کا حمل خدا کی طرف سے تھا۔

آپ سوچئے کہ اگر اسے خدا کا معجزہ سمجھا جائے تو اس معجزہ کے مضمرات کیا تھے؟ پھر ایسا معجزہ جسے کوئی معجزہ مانتے ہی نہیں اور اسے معجزہ ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل اور ثبوت نہ ہو، اس معجزہ کا مقصد کیا تھا؟ اب بھی جو لوگ (خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان) حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اسے عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ اسے کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے۔

لہٰذا، یہ بات بھی حضرت مریمؑ کے لئے وجۂ فضیلت قرار نہیں پا سکتی۔

قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا (۲۱/۹۱ ؛ ۶۶/۱۲) اور اسی کو ان کے لئے وجۂ فضیلت قرار دیا ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حفاظتِ عصمت بیشک پاکیزہ کردار کے لئے ضروری ہے لیکن اس میں حضرت مریمؑ کی کون سی انفرادیت تھی؟ دنیا میں، بدکار لوگوں کو چھوڑ کر، اکثریت ان کی ہے جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں مرد بھی شامل ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ تو یہ بھی کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس میں حضرت مریمؑ کی پوزیشن منفرد ہو۔

اور یہی وہ نکتہ ہے جسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم نے حفاظتِ عصمت کے سلسلہ میں دو نمایاں کردار پیش کئے ہیں۔ مردوں میں سے حضرت یوسفؑ اور عورتوں میں سے عورتوں میں سے حضرت مریمؑ۔ داستان حضرت یوسفؑ میں آپ ان حالات پر نگاہ ڈالئے جن میں انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ وہ مصر کے گورنر (عزیزِ مصر) کے گھر میں ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اس کی بیوی نے ان پر ڈورے ڈالنے

حضرت مریمؑ کی خصوصیت

شروع کئے۔ لیکن وہ اس کی طرف ذرا بھی مائل نہ ہوئے۔ اس نے اپنی اس مذموم کوشش میں ہر قسم کا حربہ آزما کر دیکھ لیا حتیٰ کہ معاشرہ کے ممتاز گھرانوں کی اور عورتیں بھی اس کی دم ساز ہوگئیں۔ اس نے انہیں کمرے کے اندر گھیر کر اس کے دروازے بند کر دیئے۔ وہ اس پر پلّا چھڑا کر بھاگ نکلے۔ جب ترغیب سے کام نہ نکلا تو وہ ترہیب پر اتر آئی۔ اس نے انہیں قید تک کی دھمکی دے دی۔ لیکن ان کے پائے استقامت میں اس سے بھی ذرا لغزش نہ آئی۔ حتیٰ کہ اس نے انہیں قید کرا دیا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت یوسفؑ نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ لہٰذا، محض حفاظتِ عصمت کوئی ایسی امتیازی خصوصیت نہیں جسے وجۂ فضیلت قرار دیا جائے۔ اس قسم کے حالات میں — ترغیبات کی ہر کشش کو ٹھکراتے اور ترہیبات کے ہر خطرہ کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے حفاظتِ عصمت، فی الواقعہ مستحقِ تحسین و تبریک ہوتی ہے۔ اور اسی خصوصیت کی بناء پر قرآن کریم نے اس پاکیزہ داستان کو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے تاکہ وہ نوعِ انسان کے لئے نمونہ کا کام دے۔

حضرت مریمؑ کے ضمن میں معاملہ اس سے بھی سخت تھا۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے اس پس منظر کا سامنے لانا بےحد ضروری ہے جس میں یہ واقعہ سرزد ہوا تھا۔ اور یہ قصہ تفصیل طلب ہے۔

یہودی معاشرہ میں فحاشی

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی معاشرہ میں فحاشی اور اخلاق باختگی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ ان میں عصمت کی اہمیت کا احساس تک باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اس معاملہ میں اس

قدر حدود فراموش ہو چکے تھے کہ اپنی فحاشیوں کو "شرعاً جائز" قرار دینے کے لئے اپنے اسلاف کے مذہبی پیشواؤں کی نجی زندگی کی نہایت شرمناک تصاویر پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ قطع نظر ان حیا سوز افسانوں کے جو خود تورات میں بعض انبیاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، ہم ان کوائف و احوال میں سے دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں جو انسائیکلو پیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھیکس (جلد سوم) میں عصمت (CHASTITY) کے زیرِ عنوان درج ہیں۔ آپ نے ہندوؤں کے مندروں میں "دیوداسیوں" کا نام تو سُنا ہوگا۔ یہ جوان لڑکیاں اپنی زندگی دیوتاؤں کی "خدمت" کے لئے وقف کر دیتی ہیں اور مندر کے پجاریوں اور یاتریوں (زائرین) کی جنسی ہوس کی تسکین کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ جس طرح ہندوؤں کے ہاں اس مذہبی قحبہ گری

مذہبی قحبہ گری

(RELIGIOUS PROSTITUTION) کا رواج تھا (اور ہے) اسی طرح یہودیوں کے ہاں بھی یہ قبیح رسم عام تھی۔ ان کے معابد (TEMPELS) میں اس قسم کی عورتیں یہی "فرائض" سرانجام دیتی تھیں۔ مستزاد یہ کہ ان کے ہاں اس قسم کے مرد بھی ہوتے تھے (اس سے قومِ لوطؑ کی جو حیا سوز داستان قرآن کریم میں مذکور ہے وہ بآسانی سمجھ میں آجائے گی)۔ ان عورتوں کو (QEDESHAH) اور ان مردوں کو (QADESHOTH) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ عورتیں (اور غالباً مرد بھی) اپنی آمدنی یہوواہ (یہودیوں کے خدا) کی نذر کر دیتی۔ عام طور پر ان عورتوں کی شادی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اگرچہ بعض اوقات ایسا کر بھی لیا جاتا تھا (انسائیکلو پیڈیا مذکورہ۔ جلد سوم۔ ص۴۹۷)۔ یہودیوں کے ہاں ایک قصہ مشہور تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ تمر (TAMAR) نامی ایک فاحشہ عورت کس طرح (QADESHAH) کا بھیس بدل کر (ENAIM۔ غالباً کسی معبد کا نام ہے) کے دروازے پر بیٹھ گئی اور اس طرح اس نے یہودہ (JUDAH) کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا لیا۔ (ایضاً۔ ص۴۹۷)۔ واضح رہے کہ (JUDAH) حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام تھا جس کی طرف نسبت کر کے بنی اسرائیل اپنے آپ کو یہودی کہتے تھے۔ گویا مذکورہ بالا واقعہ ان کے اس مقدس مورثِ اعلیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔

مذکورہ صدر انسائیکلو پیڈیا میں مشہور یونانی مؤرخ (HERODOTUS) کے حوالے سے 'فلسطینیوں کے عام معاشرہ کے متعلق لکھا ہے:-

> اس ملک کی ہر عورت کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ کسی معبد میں اجنبی مرد سے جنسی اختلاط کرے۔ اس "فریضہ" کی ادائیگی ہر طبقہ کی عورتوں کے لئے لازمی تھی، حتیٰ کہ ان عورتوں کے لئے بھی جو امراء کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ بڑے شاہانہ انداز سے وہاں جاتی تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ یہ سب عورتیں اپنے سر پہ ایک تاگہ لپیٹ کر، دو قطاروں میں ایک

لہ دیکھئے میری کتاب۔ جوئے نور۔

دوسرے کے آمنے سامنے جاتیں اور درمیان میں راستہ چھوڑ دیتیں۔ اجنبی یاتریوں میں سے جس کی پسند میں جو عورت آجاتی وہ اس کی طرف چاندی کا سکہ پھینک دیتا اور اس سے (معبد کی) دیوی کے نام پر خودسپردگی کا مطالبہ کرتا۔ اس پر وہ اس کے ساتھ ہولیتی اور اس کی جنسی ہوس کا تقاضا پورا کرتی۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۴۹۸)۔

مذہبی پیشواؤں کی حالت یہ تو تھا عام پبلک کا حال۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت ان سے بھی گئی گزری تھی۔ یہودیوں کے ہاں مذہبی پیشواؤں میں ربّی (RABBI) کا مقام خاصا بلند تھا۔ مذکورہ صدر انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:۔

کہا جاتا ہے کہ ربّی (ABBAR ARIKA) جب بھی (DARDAESHIR) کو ملنے جاتا تو عام منادی کرادی جاتی کہ کیا کوئی عورت اس کے قیام کے دوران اس کی بیوی بننے کے لئے تیار ہے؟ اسی طرح کا اعلان ربّی (NACHMAN) کے لئے بھی کیا جاتا جب وہ (SHECHANZIB) کی ملاقات کے لئے جاتا۔ جب ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ حالت تھی، تو ان کے عوام کی بے راہ روی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں زناکاری روزمرہ کا معمول بن چکی تھی۔ یروشلم کی تباہی کے زمانے میں زانیوں کی اس قدر کثرت ہوگئی تھی کہ ربّی (JOHANAN) نے اس کی سزا کا خیال ہی ترک کردیا تھا (ایضاً صفحہ ۴۹۸)۔

ان دو چار مثالوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہودیوں کی عبادت گاہوں میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ ان میں مرکزی حیثیت یروشلم کے ہیکل کو حاصل تھی۔ یہودیوں کے ہاں شروع میں خانقاہیت (MYSTICISM) کا رواج نہیں تھا اس لئے ہیکل شرعی رسوم ومناسک ہی کا مرکز تھا۔ اس کی حیثیت خانقاہ (MONASTERY) کی نہیں تھی۔ یہ بعد کی اختراع تھی۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے ہاں یہ رواج حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کچھ ہی عرصہ پہلے شروع ہوا تھا۔ ابتداءً ہیکل میں صرف (مرد) راہب ہوتے تھے

ہیکل کی راہبات جو عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے۔ (قرآنِ کریم نے ان کے احبار۔ علماء۔ کے ساتھ رہبان۔ مشائخ۔ کا ذکر بھی کیا ہے۔ ۹/۳۴)۔ اس کے بعد وہاں راہبات کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا (جیسے عیسائی خانقاہوں میں (NUNS ہوتی ہیں)۔ شروع میں ہیکل کا ضابطہ یہ تھا کہ راہبات زمانہ قبل از بلوغ تک ہیکل میں رہتی تھیں۔ پھر اس میں یہ ترمیم کی گئی کہ انہیں ساری عمر راہبہ کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ عام حالات میں انہیں تجرد کی زندگی بسر کرنی ہوتی تھی لیکن بعض خاص حالات میں ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ ان کی شادی بھی ہوسکتی تھی۔ وہ نہ تو ان پجاریوں کی جماعت سے باہر کسی سے شادی کرسکتی تھیں اور نہ ہی ہیکل کو چھوڑ کر جاسکتیں۔ اس ضابطہ کی خلاف ورزی شرعی جرم کا ارتکاب قرار پاتا تھا ان کی شریعت کسی راہبہ کی، پجاریوں کے باہر کسی مرد سے شادی کو جائز نکاح قرار نہیں دیتی تھی۔ اسے وہ زنا تصور کرتے تھے اور اس کی اولاد کو ولدالزنا۔

اس پس منظر میں داستانِ حضرت مریمؑ کی طرف لوٹیئے۔

یہودیوں کے ہاں ایک طبقہ تھا جسے نذریین یا منذورین کہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ یا تو خود اپنے آپ کو خدا کی نذر

نذریین کا طبقہ

کر دیتے تھے یا ان کے اہلِ خاندان ایسا کر دیتے تھے۔ بعض اوقات والدین بچے کی ولادت سے پہلے ہی اسے نذری بنا دیتے تھے اور وہ ساری عمر نذری رہتا تھا۔ نذریوں کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ عہدِ شباب ہی میں ان کا مرتبہ انبیاء کے برابر ہو جاتا ہے۔ ولادت حضرت مسیحؑ کے زمانے میں نذریوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ لوگ ہیکل میں یا دیگر معابد اور خانقاہوں میں راہبوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، پہلے تو صرف مرد راہب ہوتے تھے لیکن بعد میں لڑکیاں بھی راہبہ بن جاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والدین کا تعلق اسی فرقہ سے تھا۔ یہیں سے قرآن کریم داستانِ حضرت مریم کا آغاز کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

۳/۳۴ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳/۳۴﴾

جب آلِ عمران کی ایک عورت نے اپنے رب کی منت مانی کہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے کو تمام دنیوی علائق سے آزاد کر کے

والدۂ حضرت مریمؑ کی منت

تیرے لئے وقف کرتی ہوں (کہ وہ تیرے مقدس گھر، ہیکل کی خدمت کرے)۔ اے میرے پروردگار! تو میری اس نذر کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ تو سب کچھ جاننے والا ہے اس لئے تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس حسنِ نیت اور خلوص سے یہ منت مانی ہے۔

قرآنِ کریم نے ایک لفظ (مُحَرَّرًا) سے دنیاداری کی زندگی اور راہبوں کی زندگی میں واضح فرق کر کے بتا دیا۔ راہب دنیاوی علائق سے آزاد ہو کر، (یعنی دنیا ترک کر کے) گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اس کے بعد ہے:۔

۳/۳۵ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳/۳۵﴾۔

اس نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ، لڑکا ہو گا، جو ہیکل کا راہب بن جائے گا۔ اور اپنی پوری عمر اس خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔ لیکن اس کے ہاں پیدا ہوئی لڑکی! اس سے اس کے دل میں خیال گزرا کہ لڑکا پیدا ہوتا

تو زیادہ اچھا تھا۔

لیکن خدا کو خوب معلوم تھا کہ اس کے ہاں جو لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ کن خوبیوں کی مالک تھی، اور اس نے، آگے چل کر، خانقاہیت کی غیر خداوندی قیود کو توڑنے میں، کتنے بڑے انقلاب کا موجب بننا تھا۔ لہٰذا، اگر وہ لڑکا ہوتا تو، اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر حال اس کی ماں نے کہا کہ میں اس کا نام مریم رکھتی ہوں۔ اور اسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کرتی ہوں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے اور (جب یہ بعد میں شادی کرے تو) اس کی اولاد کو، شیطان مردود کے وساوس سے محفوظ رکھے۔

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اگرچہ راہبات (لڑکیاں) بھی ہیکل کی خدمت کرتی تھیں لیکن راہب (مرد) بہر حال ان سے بہتر خدمات سرانجام دے سکتے تھے۔ اس اعتبار سے حضرت مریمؑ کی والدہ نے دل میں کہا کہ اگر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہوتا تو زیادہ مناسب[1] ہوتا۔ لیکن اس لڑکی نے جس طرح لڑکے سے بہتر ثابت ہونا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسی مقام پر اس کا بالتصریح ذکر نہیں کیا۔ ایمائی انداز میں کہا کہ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ۔ اس کی والدہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی جو خدا جانتا تھا۔ یہ ویسا ہی انداز تھا جیسا تخلیقِ آدم کے ضمن میں ملائکہ کے اعتراض کے جواب میں کہا گیا تھا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰)۔ "میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" (تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد دوم میں گزر چکی ہے)۔

دوسری بات یہ کہ اس زمانے میں ہیکل کا قانون یہ تھا کہ راہبات سنِ بلوغ تک ہیکل میں رہتی تھیں۔ اس کے بعد وہ عام نبیادی زندگی بسر کر سکتی تھیں۔ اس لئے حضرت مریمؑ کی والدہ نے (حضرت مریمؑ اور اس کی اولاد کو وساوسِ شیطانی سے محفوظ رہنے کی دُعا مانگی تھی۔

(حضرت) مریمؑ کی والدہ نے بچی کا نام مریم رکھا۔ مریم سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے بلند مرتبہ یا عابدہ اور خادمہ کے ہیں۔

مریم کے معنی

لیکن حضرت مریمؑ کے کوائفِ حیات کو سامنے رکھ کر، عربوں کی نگاہ ایک اور طرف بھی گئی۔ وہ: اَلْمَرْيَمُ مِنَ النِّسَاءِ اس عورت کو کہتے تھے جو نہایت پاکباز زندگی بسر کرے لیکن مردوں کے ساتھ (جرأت اور بیباکی سے) باتیں کر سکے۔ حضرت مریمؑ کی یہی خصوصیت تھی جس کی بناء پر انہوں نے تحیر انگیز انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

حضرت مریمؑ کی والدہ نے خدا کے حضور یہ نذرانہ پیش کیا اور:-

---

[1] ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ عام خیال بھی کار فرما ہو جس کی رو سے لڑکے کو بہر حال لڑکی سے بہتر سمجھا جاتا ہے "حوا کی بیٹیاں" بیچاری شروع سے معتوب چلی آ رہی ہیں۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (۳/۳۶)۔

اس کے رب نے اس کی منت کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور مریم کی پرورش اور نگہ پرداخت کا نہایت عمدہ انتظام کر دیا۔ یعنی اسے زکریا جیسے نیک اور پاکباز انسان کی کفالت میں دے دیا۔

اس طرح (حضرت) مریمؑ، ہیکل میں پرورش پاکر جوان ہوئی اور اپنی پاکیزہ زندگی کی بنا پر معتقدین اور ہیکل کے زائرین کا مرجع بن گئی۔ لیکن اس مقام پر قرآن کریم ایمائی انداز میں ایک ایسی بات کہہ گیا ہے جس سے نگاہ کا رُخ اور سمت مڑ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہیکل کے پجاریوں نے راہبات سے متعلق ضابطہ میں یہ ترمیم کرلی تھی کہ راہبہ کو ان پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کرنی ہوگی۔ جب شادی کا "شرعی جواز" موجود ہو تو پھر (ان پجاریوں کی) نگاہوں کا آلودہ ہو جانا چنداں مستبعد نہیں ہو سکتا۔ اس وقت انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس راہبہ (مریم) کو حضرت زکریاؑ کی کفالت سے نکال کر اپنی کفالت میں لے لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس "کفالت" کے پردہ میں ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اس "مقصد" کی طرف بھی قرآن مجید نے نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس باب میں ان میں باہمی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی اور جب تصفیہ کی کوئی اور صورت باقی نہ رہی تو انہوں نے طے کیا کہ

قرعہ اندازی

قرعہ ڈال لیا جائے جس سے نام کا قرعہ نکل آئے اسی کی تحویل میں اس لڑکی کو دے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس داستان کے ضمن میں رسول اللہ سے فرمایا کہ یہ تمام باتیں آپ کو وحی کے ذریعہ بتائی جارہی ہیں۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ۔ ورنہ:۔

۳/۴۴ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (۳/۴۴)

اے رسول! تو ان پجاریوں کے پاس نہیں تھا جب وہ (مریم کی کفالت کے لئے) قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ نہ ہی تو اس وقت ان کے پاس تھا جب وہ اس معاملہ میں باہمی جھگڑا کر رہے تھے۔

آپ ہیکل یا خانقاہ کے اس ماحول پر نگاہ ڈالیئے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ یہودیوں کے پیشواؤں کی جنسی ہوسناکیوں کو بھی سامنے رکھیئے۔ مندرجہ بالا جھگڑوں اور قرعہ اندازیوں کی لم سمجھ میں آجائے گی اور حضرت زکریاؑ (جن کی کفالت میں لڑکی اب تک تھی) کے ان خدشات کا بھی اندازہ ہو جائے گا جسے قرآن مجید میں اشارتاً یوں بیان کیا ہے کہ

۳/۳۶ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۳/۳۶)۔

جب کبھی زکریا کا گذر عبادت گاہ کے اس گوشے کی طرف ہوتا جہاں مریم مقیم تھیں، اور وہ اس کے پاس کھانے پینے کی

ہیکل میں رزق

چیزوں کو دیکھتا تو اس سے پوچھتا کہ (بیٹی!) تجھے یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں؟ اس کے جواب میں وہ کہتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں۔ اللہ اپنی مشیت کے پیمانوں کے مطابق اس طرح سامانِ رزق مہیا کر دیتا ہے جو عام طور پر لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

حضرت زکریاؑ کے اس قسم کے سوالات سے مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہیکل کے پجاریوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں جو اس طرح مریمؑ کے زیادہ قریب آنا چاہتا ہو؟ حضرت مریمؑ بھی ان کے سوال کی لِم کو پالیتیں اور انہیں مطمئن کر دیتیں کہ اس قسم کے شبہات اور خدشات کی کوئی بات نہیں۔ معتقدین اور زائرین انہیں برنائے عقیدت یہ چیزیں "فی سبیل اللہ" دے جاتے ہیں اس لئے آپ کسی قسم کا وسوسہ دل میں نہ لائیے۔ ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ میری طرف اس قسم کی پیش رفت کر سکے۔ میں انہیں خوب پہچانتی ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے اپنی حفاظت کر سکوں۔ آپ بے فکر رہیئے۔

مندرجہ بالا آیت میں جو حضرت مریمؑ نے کہا ہے کہ ھو من عند اللہ (یہ چیزیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں) تو ہمارے مفسرین

عند اللہ رزق

نے، حسبِ عادت، اسے بھی عجیب و غریب معانی پہنائے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا (حضرت) مریم کی کوٹھڑی پر سات سات تالے ڈال دیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، جبریل ان چیزوں کو حضرت مریمؑ کو دے جاتے تھے (اس طرح کہ خدا کے نبی حضرت زکریا تک کو بھی اس کا علم نہیں ہونے پاتا تھا! بالعجب!) ایسے افسانوں سے ان (مفسرین) حضرات کے ذوقِ اعجوبہ پسندی کی تسکین تو بیشک ہو جاتی ہے لیکن وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اس سے (یعنی اس بات سے کہ حضرت زکریاؑ ان کی کوٹھڑی باہر سات سات تالے لگا دیا کرتے تھے) حضرت مریمؑ کے متعلق (معاذ اللہ) کس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے! ــــ اس مریم کے متعلق جس کی حفاظتِ عصمت کو خدا وجہِ اصطفیٰ قرار دیتا ہے! "ھو من عند اللہ" تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ آپ آج بھی کسی خانقاہ کے درویش سے پوچھیئے کہ آپ کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہے، تو وہ بلا تامل جواب دے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہو جاتا ہے۔ وہ ہر ایک کا رزاق ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جسے وہ صاحب، اللہ کی طرف سے (من جانب اللہ) کہتے ہیں وہ ان کے معتقدین کے پیش کردہ نذرانے ہوتے ہیں۔ یہی بات راہبہ مریم نے کہی تھی۔

اس مقام پر ایک ثانیہ کے لئے رُکیئے اور (حضرت) مریم کی قلبی کیفیت کو سامنے لائیے۔ وہ اب جوان ہو چکی تھیں۔ خانقاہیت کی زندگی میں کنواری راہبات کی طرف پجاریوں کی للچائی ہوئی نظریں جس بری طرح اٹھتی تھیں، وہ انہیں اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ ان (بظاہر) مقدس پجاریوں کی زیرِ نقاب اور پسِ پردہ زندگی کا ہر روز مشاہدہ کرتی تھیں کہ وہاں "ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش"۔ وہ یہ بھی دیکھتی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کس طرح اسے اپنی تحویل میں لینے کے لئے کوشاں ہے۔ ان حالات میں اس پاکباز، معصوم لڑکی کے احساسات کو سامنے لائیے۔ وہ ان ہوس پرستوں کے خود ساختہ "قوانینِ شریعت" کی رو سے ہیکل کو چھوڑ

نہیں سکتی تھی۔ وہ ہیکل سے باہر کسی مرد سے حسبِ منشاء شادی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہیکل کے پجاریوں کی سیرت و کردار کے پیشِ نظر

مجبورِ کشاکش

وہ ان میں سے کسی کے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ سوچئے کہ وہ کس قدر بے بس تھی۔ کس قدر پابہ زنجیر تھی۔ وہ دن رات اسی کشمکش میں مبتلا رہتی تھی۔ جب اس کے قلبی اضطراب نے انتہائی شدت اختیار کر لی تو سنت اللہ کے مطابق، اس کے دل میں خدا کی طرف سے یہ اطمینان پیدا کر دیا گیا کہ وہ گھبرائے نہیں۔ ایسے سامان پیدا کر دیئے جائیں گے کہ وہ ہیکل کی ہوس کارانہ فضا سے نکل کر اپنی مرضی کے مطابق، گھر کی پاک اور صاف زندگی بسر کرے اور اس طرح راہ و رسم خانقاہیت کے خلاف جہاد کر کے اپنے دور کی تمام عورتوں (بالخصوص راہبات) سے ممتاز ہو جائے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ میں :-

۳/۴۱ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳/۴۱)

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا :-

اور جب ملائکہ نے۔ مریم سے کہا کہ اللہ تعالےٰ نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ وہ تمہیں نہایت پاکیزہ زندگی عطا کرے گا اور تم اپنے زمانے کی تمام عورتوں سے ممتاز ہو جاؤ گی۔

یہاں ہم نے طَهَّرَكِ کا مفہوم، پاکیزہ زندگی عطا ہونا لیا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ مذہبی پیشوا اور یہودیوں کا معاشرہ تیرے خلاف جو الزامات تراشے گا اور بہتان لگائے گا، وہ بھی سب دور ہو جائیں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے حضرت مریم کو پیغام دیا۔ ملائکہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم میں تفصیل سے لکھا گیا ہے

اطمینانِ قلبی

(اند کس مدد سے حوالے دیکھ لئے جائیں) وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ملائکہ، مومنین کے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کرنے کا بھی موجب بنتے ہیں۔ مثلاً جنگِ بدر کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جب معرکہ شدت اختیار کر گیا تو خدا نے ملائکہ سے کہا کہ مجاہدین کو تائیدِ خداوندی کی بشارت دو لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ (۸/۱۰) کہ اس سے ان کے دلوں کو اطمینان سکون حاصل ہو جائے : فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۸/۱۲ ؛ ۳/۱۲۵) اور ان کے پاؤں جم جائیں۔ انہیں استقامت حاصل ہو جائے جو میدانِ جنگ میں کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ سورۂ توبہ میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے (۹/۴۰ ؛ ۹/۲۶)۔ سورۂ حٰم سجدہ میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ اس طرح کا نزولِ ملائکہ خاص خاص شخصیتوں تک محدود نہیں۔ ایسا نزول عام مومنین پر بھی ہوتا ہے۔ فرمایا :-

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا

وَابْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰-۳۱)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دُنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔ تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں (۳/۱۲۴)) اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (۳/۱۲۴-۱۲۵؛ ۸/۱۰-۱۲؛ ۴۶/۱۳)۔

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی)۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے ہوگا جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)۔

اسی انداز کا نزولِ ملائکہ حضرت مریم کی طرف بھی ہوا تھا (ملائکہ کا ایک اور مفہوم ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا)۔

واضح رہے کہ ملائکہ کا ایک فریضہ وحیٔ خداوندی کو حضرات انبیاء کی طرف پہنچانا بھی تھا۔ لیکن یہ صرف انبیاء تک محدود تھا۔

نبوّت مردوں تک محدود تھی

غیر از انبیاء کی طرف وحی نہیں آتی تھی۔ (اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں "وحی ــــ نبوت ــــ رسالت" کے عنوان کے تحت دیکھئے)۔ حضرت مریمؑ نبی نہیں تھیں (ویسے بھی نبوت مردوں تک محدود تھی۔ (۱۲/۱۰۹؛ ۱۶/۴۳؛ ۲۱/۷)۔ ملائکہ کی طرف سے اس قسم کی بشارتیں کس طرح ملتی ہیں ہم اسے نہیں جان سکتے۔ لیکن قرآنِ کریم سے اتنا واضح ہے کہ مقصد ان سے قلوب میں نفسیاتی تغیر (اطمینان وسکون) پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی قسم کا اطمینان حضرت مریمؑ کے دل میں بھی پیدا کر دیا گیا جو کشمکشِ پیہم سے طلسمِ پیچ وتاب نہیں رہا تھا۔ انہیں اس کا اطمینان ہو گیا کہ انہیں ہیکل کی رہبانیت کی زندگی چھوڑ کر، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں کہا گیا ہے:-

۳/۴۲ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝ (۳/۴۲)۔

اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرے اور خانقاہیت کی غیر خداوندی پابندیوں کو توڑ کر، اپنی فطری صلاحیتوں کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا تہیّہ کر لے۔ اور یوں، اس تجرد اور علیحدگی کی زندگی کو چھوڑ کر اسی طرح قوانینِ خداوندی کی پابندی کرے جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ باقی دنیا سے کٹ کر خانقاہیت کی زندگی بسر کرنا، اطاعتِ خداوندی نہیں۔

ہیکل کو چھوڑنے کا فیصلہ اور اقدام کس قدر حوصلہ طلب اور صبر آزما تھا اور یہ مرحلہ کس قدر جانکاہ اور کٹھن تھا، اس کا ہم آج صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس میں حضرت مریمؑ کے لئے سب سے پہلے خود اپنے خلاف جنگ لڑنے کا مرحلہ تھا۔ وہ ایک

مستقبل کے خطرات

انتہائی مذہب پرست گھرانے کی بچی تھی۔ اس لئے "شریعت کے احکام" کی پابندی کا احساس بچپن ہی سے اس کے رگ و پے میں حلول کر چکا تھا۔ پھر وہ منذورہ (ہیکل کی نذر کردہ) تھی اس لئے راہبہ کی زندگی اس کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ بنا بریں یہ معتقدات اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ ان اعتقادات کے خلاف قدم اٹھانا کوئی آسان بات نہ تھی ——— اور پھر وہ بھی ایک عورت، بلکہ یوں کہئے کہ ایک راہبہ کے لئے!

ہیکل کی ان پابندیوں کو توڑ کر، (حضرت) مریم نے اسی معاشرہ میں رہنا تھا۔ سب سے پہلے خود اپنے والدین کے ہاں جنہوں نے اسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا سوال یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو، جو راہ و رسم خانقاہیت کو توڑ کر آئی ہے، کس طرح قبول بلکہ برداشت کر سکیں گے؟ پھر عام معاشرہ میں بھی وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔

سب سے سخت مخالفت کا اندیشہ مذہبی پیشواؤں (بالخصوص ہیکل کے پجاریوں) کی طرف سے تھا۔ ان کا "شرعی اقتدار" بڑا سخت گیر تھا۔ اول تو ایک راہبہ کا ہیکل کو چھوڑ جانا ہی کچھ کم خلافِ شریعت نہ تھا۔ پھر اس کا کسی عام آدمی سے شادی کرنا تو ناقابلِ معافی جرم تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، وہ اس قسم کے نکاح کو شرعاً جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا، ان کی طرف سے جو کہرام مچنا اور مچایا جانا تھا، اس کا تصور بھی بڑا ڈراؤنا تھا۔ علاوہ ازیں، ان کا سیاسی اقتدار بھی کچھ کم نہ تھا۔ انہیں ہر قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے اختیارات حاصل تھے اور صرف سزائے موت کے لئے رومی گورنر کی توثیق کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس سے کم، ہر قسم کی سزا وہ خود دے سکتے تھے۔ اور موت کی سزا کی صورت میں گورنر کی تصویب محض رسمی سی ہوتی تھی۔

یہ تھے مستقبل کے متعلق اس فیصلے کے عواقب جو حضرت مریمؑ کے پیشِ نظر تھا۔ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا ابتلا تھا ——— اور وہ بھی ایک معصوم لڑکی کے لئے!

لیکن وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کی تعلیم و تربیت نے اس کے اندر انقلابی روح پھونک دی تھی۔ اس نے آنے والے ان تمام خطرات اور خدشات کا اچھی طرح اندازہ لگایا، اور اس کے بعد خدا کی مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے، بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىہَا وَ مُرۡسٰىہَا کہہ کر، اپنے آپ کو ان طوفانوں کے حوالے کر دیا، اور اس طرح اس انقلاب کی بنیاد رکھ دی جس نے انسانوں کی خود ساختہ رسمِ خانقاہیت کی زنجیروں کو توڑنا تھا۔ ماں (حضرت مریمؑ) نے اس انقلاب کی ابتداء کی اور (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) نے اس کی تکمیل کر دی۔ یہی وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ماں بیٹے دونوں کو آیات اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۲۳/۵۰)

اب یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت مریمؑ کو اس قدر بلند مقام کیوں عطا فرمایا تھا۔ وہ فی الحقیقت اس کی مستحق تھیں۔

حضرت مریمؑ کے بقایا کوائفِ حیات، حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ جلیلہ کے ضمن میں آئیں گے جو اب زینت دہ قرطاس ہیں۔

(ضمناً) آیت (۳/۴۴) کا وہ حصہ تو پہلے آچکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہیکل کے پجاری حضرت مریمؑ کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے کس قدر ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے۔ اسی آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ (۳/۴۴) "اے رسول! ان واقعات کا علم ہم تمہیں بذریعہ وحی دے رہے ہیں"۔ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ (بلکہ دیگر انبیاء کرام) کے سلسلہ میں جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے اکثر و بیشتر مقامات پہ وہ تورات اور انجیل میں بیان کردہ واقعات سے مختلف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ تورات اور انجیل وغیرہ کتب سابقہ میں تحریف ہو چکی ہے اس لئے ان میں بیان کردہ واقعات صحت پر مبنی نہیں۔ صحیح واقعات وہ ہیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہودی اور عیسائی قرآن کریم کے اس دعویٰ کو چیلنج کرتے رہے اور تحدی کے ساتھ کہتے رہے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا

قرآن میں بیان کردہ واقعات کی صداقت

ہے کہ جو واقعات اس میں مذکور ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کے بالمقابل تورات اور انجیل میں بیان کردہ واقعات محرف ہیں۔ اس سے پہلے تو اس قسم کا ثبوت پیش کرنا مشکل تھا لیکن اب جو جدید ریسرچ (تحقیق) کا دروازہ کھلا ہے تو خود یہودی اور عیسائی محققین نے جو انکشافات کئے ہیں وہ تورات اور انجیل میں بیان کردہ واقعات کی تغلیط کرتے ہیں اور قرآن کریم میں بیان کردہ واقعات کی تائید۔ اس قسم کی تحقیقاتی کتابیں اب بکثرت شائع ہو رہی ہیں۔ اور یہودی اور عیسائی خود ہی اپنے سابقہ دعاوی سے دست بردار ہوتے جارہے ہیں۔ یوں قرآنی دعاوی کی تصدیق خود اس کے مخالفین کی تحقیقات کی رو سے ہوتی جارہی ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)

حضرت عیسیٰؑ نبی تھے۔ قرآن مجید میں ان کا شمار زمرۂ انبیاء کرامؑ میں کیا گیا ہے (۶/۸۶؛ ۳۳/۷؛ ۴۲/۱۳)۔ ہم ان کی نبوت پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ یعنی کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول اللہؐ کے ساتھ تمام انبیاءؑ کی نبوت پر بھی ایمان نہ لائے۔ یہی حضرت عیسیٰؑ کا صحیح مقام ہے، اور نبوت و رسالت سے بلند تر مقام اور کونسا ہو سکتا ہے؟

لیکن ہمارے ہاں انہیں ایسی خصوصیات کا حامل قرار دیا جاتا ہے جس میں کوئی اور رسول شریک نہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ (۱) وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ (۲) وہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ اور (۳) وہ قیامت کے قریب آسمان

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق خصوصی عقائد

سے نازل ہوں گے اور (۴) امام مہدی کی معیت میں اسلام کا غلبہ ان کے ہاتھوں ظہور میں آئے گا۔ ان عقائد کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے جزوِ ایمان بن گئے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک بات سے بھی انکار کرے تو اس پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا، اور اسے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کسی عقیدہ کی اس سے بڑھ کر اہمیت کیا ہوگی کہ اسے مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کی شرط قرار دے دیا جائے؟ یہ عجیب ماجرا ہے کہ عیسائیوں میں ایسے ایسے مؤرخ محقق اور مصنف گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں، جو ان میں سے کسی بات کے بھی قائل نہیں —— نہ صرف یہ کہ وہ ان کے قائل نہیں بلکہ وہ اپنی تحقیقات کی رو سے ان کی کھلے بندوں تردید کرتے ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ اس کے باوجود عیسائی انہیں دائرۂ عیسائیت سے خارج نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ان سے انکار کرتا ہے، اور قرآن کی سند کے ساتھ انکار کرتا ہے، تو اسے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں ان عقائد نے اس قدر اہمیت اور شدت کیوں اختیار کر لی، یہ نکتہ گہرے غور و خوض سے سمجھنے کے قابل ہے۔

نبی اکرمؐ نے جب قرآنِ مجید دنیا کے سامنے پیش کیا تو یہودیوں اور عیسائیوں پر اس کی براہِ راست زد پڑتی تھی۔ وہ اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیم کو اس کے مقابل لا ہی نہیں سکتے تھے (وہ کتابیں محرف تھیں اس لئے ان کی تعلیم، خدا کی خالص وحی کی حریف ہو

ان کی اس قدر اہمیت کی وجہ

نہیں سکتی تھی) قرآن مجید نے جو چیلنج دیا تھا کہ اس کی یا کم از کم اس کے کسی حصہ کی) مثل اور نظیر لاکر دکھاؤ، تو اس چیلنج کو انہوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کو قرآنِ کریم سے افضل کیا، اس کا ہم پایہ بھی ثابت نہیں کر سکتے، تو انہوں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ اور وہ ترکیب یہ تھی کہ اپنے نبیوں (حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ) کو، مسلمانوں کے نبی (رسول اللہ) سے افضل ثابت کر دو۔ اس سے مسلمان مات کھا جائیں گے۔

لیکن قرآن کریم کی رو سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہی حربہ استعمال کیا جس سے اسلام کی صحیح تعلیم

وضعی روایات کے ذریعے

اور گوشوں میں بھی مسخ کی گئی تھی۔ یعنی انہوں نے جھوٹی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتبِ روایات میں اس طرح داخل کر دیا کہ انہوں نے احادیثِ رسول اللہ کی شکل اختیار کر لی۔ اب ان کے لئے میدان صاف تھا۔ مسلمان جب بھی ان کے مقابلہ میں آتے۔ وہ اپنی کتابوں سے ایسی احادیث پیش کر دیتے

جن سے ان کے رسول، حضور نبی اکرمؐ سے افضل ثابت ہوں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مناظروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان مناظروں میں وہ ہماری کتب روایات سے ان احادیث کو پیش کرتے تھے اور مسلمان مناظران کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ان وضعی روایات کے اس شدت اور کثرت سے پیش کئے جانے کا نتیجہ تھا کہ یہ عقائد مسلمانوں کا جزو ایمان قرار پا گئے۔

یہودیوں کی سازش — یہودیوں نے اس باب میں کیا کیا، اس کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۸۹-۸۲ زیر آیت ۲/۱۴۲ دی جا چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ

۱۔ انہوں نے مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام کیا کہ حضور نبی اکرمؐ (نبوت ملنے کے بعد) قریب پندرہ برس تک کعبہ کے بجائے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے بیت المقدس کا مقام (کعبہ کے مقابلہ میں) کس قدر بلند ہو جاتا ہے؟ چنانچہ ہمارے ہاں اب تک بیت المقدس کو قبلہ اوّل کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

۲۔ شب معراج میں حضورؐ کعبہ سے براہ راست آسمانوں کی طرف تشریف نہیں لے گئے۔ پہلے بیت المقدس گئے۔ وہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کا اجتماع ہوا۔ وہیں سے حضورؐ معراج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور پھر وہیں واپس آئے۔ اس سے بھی کعبہ کے مقابلہ میں، بیت المقدس کی عظمت واضح ہے۔

۳۔ شب معراج، اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پچاس نمازیں فرض کیں اور حضورؐ اس تحفہ خداوندی کو لے کر واپس تشریف لے آئے۔ راستے میں حضرت موسیٰؑ ملے اور انہوں نے کہا کہ اتنی نمازیں آپ کی اُمت سے نہیں پڑھی جائیں گی۔ خدا کے حضور جایئے اور انہیں کم کرائیے۔ اس پر حضورؐ حضرت موسیٰؑ کے کہنے پر کس طرح بار بار بارگاہِ خداوندی میں تشریف لے گئے، اس کی تفصیل جلد سوم (حوالہ مذکور میں) گزر چکی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ کی پوزیشن حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں کیا نظر آتی ہے!

۴۔ انہوں نے اس قسم کی روایات وضع کر کے ہماری کتابوں میں شامل کر دیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان ان روایات کی سند سے انکار کر دیں گے کیونکہ ان کے نزدیک سند اور حجت قرآن مجید تھا اور قرآن مجید میں اس قسم کی کوئی بات مذکور نہیں اس کے لئے انہوں نے یہ پیش بندی کی کہ اپنے اس عقیدہ کو کہ وحی خداوندی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وحی کتاب اللہ میں درج ہوتی ہے اور دوسری وحی کتب روایات میں، مسلمانوں میں بھی عام کر دیا۔ (اس کی تفصیل انڈکس میں وحی کے زیر عنوان دیکھئے)۔ اس طرح انہوں نے ان روایات کو وحی خداوندی کا درجہ دے دیا کہ مسلمان ان سے انکار ہی نہ کر سکیں۔ حتیٰ کہ ان (مسلمانوں) کے ہاں یہ عقیدہ بھی رائج ہو گیا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۷۹۔ آیت ۲/۱۸۲)۔

عیسائیوں کی سازش

یہ کچھ یہودیوں نے کیا۔ عیسائیوں کے ہاں عقیدہ تھا کہ (۱) حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ (۲) وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ اور (۳) قیامت کے قریب دوبارہ نازل ہوں گے۔ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی قرآن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے بھی روایات وضع کیں جن میں ان عقائد کو حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا اور پھر ان روایات نے ہماری کتب احادیث میں جا پائی۔ اس طرح یہ عیسائیوں کے عقائد ہی نہ رہے۔ خود مسلمانوں کے عقائد بھی بن گئے۔ اب عیسائی مناظروں کے لئے مقابلہ کی بڑی گنجائش نکل آئی۔ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے رسول کا (معاذ اللہ) ہمارے رسول سے مقابلہ کرو۔

۱۔ ہمارے رسول کی پیدائش معجزہ۔ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ تمہارے رسول عام انسانوں کی طرح، سلسلہ توالد کے ذریعے پیدا ہوئے۔ کہو! کون بڑا ہوا؟

۲۔ ہمارا رسول زندہ آسمان پر موجود ہے اور تمہارا رسول زیر زمین مدفون۔ کہئے کون بڑا ہوا؟

۳۔ تمہارے رسول کا دعوٰے تھا کہ ان کا لایا ہوا دین، تمام ادیان پر غالب آئے گا۔ یہ دعوٰے نہ تمہارے رسول کے ہاتھوں پورا ہوا، نہ ان کی امت کے ہاتھوں۔ یہ ہمارے رسول کے ہاتھوں پورا ہوگا۔ کہئے کس کا مقام زیادہ بلند ٹھہرا؟

حواری اور صحابہؓ

۴۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے صحابی (حواری) ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مسلمان عیسائی مناظروں پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ تھا تمہارے رسول کی تعلیم کا نتیجہ! ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ یہ بات انجیل میں موجود تھی۔ اس کا جواب ایک وضعی روایت کی رو سے بخاری میں داخل کر دیا۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

حضرت ابن عباسؓ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ کئے حشر میں اٹھائے جاؤ گے۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیم ہیں۔ اس دن میرے کچھ صحابہؓ بائیں جانب (جہنم کی جانب) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ اس پر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے (یعنی مرتد ہو گئے تھے) جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا، جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا کہ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ——— الیٰ قولہ العزیز الحکیم۔ (بخاری۔ اردو ترجمہ۔ جلد دوم ص۱۴۹)

اس سے وہ مسلمان مناظروں کا منہ بند کر دیتے تھے۔ (اس روایت کے وضع کرنے میں اور کیا مقصد پوشیدہ تھا اس کی بابت آگے چل کر بات کی جائے گی)۔

وہ یہ دعوٰی کرتے تھے (اور کرتے ہیں) اور مسلمان ان کی تردید نہیں کر سکتے تھے (نہ کر سکتے ہیں) کیونکہ یہ ان کی کتب روایات

میں موجود ہیں اور ان کی اہمیت اس قدر ہے کہ ان سے انکار کرنیوالا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ جواب ان کا قرآنِ کریم سے دیا جا سکتا تھا لیکن قرآن تو ہمارے ہاں غلافوں میں لپیٹ کر زینت دہ طاقِ نسیاں بنا دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور بات بھی غور طلب اور تأسف انگیز ہے۔ اس دورِ علم و بصیرت میں، عیسائیت ان عقائد کی بنا پر مات کھا رہی ہے۔ اسلام کو اس کے مقابلہ میں نکھر اور ابھر کر بلند ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن جب ہم ان عقائد کو اسلام کا جزو قرار دے دیتے ہیں تو ہم بھی مفت میں مات کھا جاتے ہیں۔ اس طرح اسلام، عیسائیت کی سطح پہ آجاتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس قسم کی وضعی روایات عیسائیت کو کس قدر فائدہ اور اسلام کو کس قدر نقصان پہنچانے کا موجب بن رہی ہیں؟ میرے ہاں مغربی ممالک کے عیسائی مفکر، مؤرخ اور سائنسدان آتے ہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اُن کے ان عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کس قسم کے دلائل دیتے ہیں۔ میں جب ان سے کہتا ہوں کہ قرآن مجید اس قسم کے عقائد کی تائید نہیں کرتا تو انہیں حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ جب اسلام کو قرآن خالص کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ لیکن وائے افسوس کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت اسے کفر سے تعبیر کرتی ہے!

میں نے حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات، قرآنِ کریم، کتب اناجیل اور عیسائی مؤرخوں کی تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں بڑی شرح و بسط سے مرتب کر کے، اپنی کتاب "شعلۂ مستور" میں شائع کئے ہیں۔ اس کتاب سے، اس پیامبرِ انقلاب کی منزہ زندگی نکھر کر سامنے آجاتی، اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں پھیلے ہوئے غلط (خلافِ قرآن) عقائد کی تردید ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب (مطالب الفرقان) میں، ان موضوعات کے متعلق قرآنی آیات کی روشنی میں بحث تو کی جائے گی لیکن وہ بہرحال مختصر ہوگی، کیونکہ تفصیل میں جانے سے تو (مطالب الفرقان کی) زیرِ نظر پوری کی پوری جلد اس ایک موضوع کی نذر ہو جائے گی۔ جو حضرات زیادہ تفصیل سے رکھتے ہوں وہ "شعلۂ مستور" کا مطالعہ فرمالیں۔

پیدائش (عیسائیت کے نقطۂ نظر سے)

حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال ان کی پیدائش سے متعلق ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) عیسائیوں کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ آپ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی تھی۔ اور یہی عقیدہ مسلمانوں میں بھی رائج چلا آرہا ہے۔ لیکن عیسائیوں کے ہاں شروع میں یہ عقیدہ نہیں تھا۔ یہ بعد کی اختراع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیکل کو چھوڑنے کے بعد حضرت مریم نے اپنے ہاں کے ایک شخص سے شادی کی تھی جس کا نام یُوسف تھا اور وہ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ چنانچہ اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ

گویا بالتصریح یوسف نجار کا بیٹا کہا گیا ہے ۔

متی کی انجیل میں ہے :-

یوسف کا بیٹا

جب یسوع یہ تمثیلیں ختم کر چکا تو ایسا ہوا کہ وہاں سے روانہ ہو گیا اور اپنے وطن میں آکر ان کے عبادت خانے میں انہیں ایسی تعلیم دینے لگا کہ وہ حیران ہو کر بولے کہ اس کو یہ حکمت اور معجزے کہاں سے مل گئے ۔ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں ؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہودا نہیں ؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں ؟ (متی ۔ باب ۱۳ ۔ آیات ۵۵-۵۳)

یوحنا کی انجیل میں ہے :-

فلپس نے نتن ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے تورات میں اور نبیوں نے کیا ہے، وہ ہمیں مل گیا ہے ۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے ۔ (یوحنا ۔ باب ۱ ۔ آیت ۴۵)

دوسری جگہ ہے :-

اور انہوں نے کہا ۔ کیا یوسف کا بیٹا یسوع نہیں ہے جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے ہیں ۔ اب کیوں کر کہتا ہے کہ میں آسمان سے اترا ہوں ۔ (یوحنا ۔ باب ۶ ۔ آیت ۴۲)

لوقا کی انجیل میں ہے کہ ایک دفعہ بچپن میں مسیح بھیڑ میں کھو گیا ۔ اور اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈتے رہے جب وہ مل گیا تو

وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اس سے کہا ۔ بیٹا ! تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا ؟ دیکھ ۔ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے ۔ (لوقا ۔ باب ۲ ۔ آیت ۴۸)

دوسری جگہ ہے :-

اور اس کا باپ اور اس کی ماں ان باتوں پر جو اس کے حق میں کہی جاتی تھیں تعجب کرتے تھے ۔ (لوقا ۔ باب ۲ ۔ آیت ۳۳)

مشہور عیسائی مؤرخ رینان (RENAN) نے حیات مسیح (LIFE OF JESUS) کے نام سے ایک بڑی محققانہ کتاب لکھی ہے ۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

آپ (حضرت عیسیٰؑ) طبقہ عوام سے متعلق تھے ۔ آپ کے والد یوسف اور آپ کی والدہ مریم دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے ۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا ۔ . . . . (حضرت) مسیح کے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے بڑے آپ ہی تھے . . . . . مادری زبان آپ کی آرامی تھی . . . . آپ کے والد کا انتقال جلد ہو گیا اور اس کے بعد حضرت مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں ۔ یہ وجہ ہے کہ (حضرت) مسیح عام طور پر "ابن مریم" کے نام سے مشہور ہوئے . . .

آپ نے اپنے والد کے اتباع میں نجاری کا پیشہ اختیار کیا (ص۲۶ لغایت ص۹)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں کسی کو اس کا خیال تک بھی نہیں تھا کہ ان کی پیدائش بن باپ کے ہوئی تھی[1]۔ لیکن یہ بات (کہ وہ یوسف نجار کے بیٹے تھے) ان کے متبعین کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھی۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہودیوں کی مذہبی پیشوائیت نے فتویٰ صادر کر رکھا تھا کہ (حضرت) مریم کا یوسف سے نکاح شریعت موسوی کی رو سے ناجائز تھا۔ چنانچہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو (معاذ اللہ) ولد الحرام قرار دیتے تھے۔ عیسائی اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین تھے لیکن وہ بھی شریعت موسوی کے پابند تھے، اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے۔ وہ شریعت موسوی کی پابندی کرانے کے لئے آئے ہیں۔ اس شریعت کی رُو سے ان سے یہودی پیشواؤں کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اعتراضات اور ان کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشے۔ انہوں نے پہلے یہ عقیدہ وضع کیا کہ حضرت مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان میں زن و شوئی کے تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ انجیل متی میں ہے:۔

> اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں (مریم) کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہوگئی۔ (متی۔ باب ۱۔ آیات ۱۸-۲۳)

اٹلی کے ایک نامور مصنف (MARCELLO CRAVERI) نے (LIFE OF JESUS) "حیاۃ مسیح" کے نام سے ایک بڑی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب شائع کی ہے جس میں اثری اور تاریخی تحقیقات کی روشنی میں عجیب و غریب انکشافات کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عیسائی پیشوائیت نے یوسف اور مریم کے تعلقات کی گتھی کو سلجھانے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ان کی باہمی شادی تو ہوگئی تھی لیکن:۔

> مریم یوسف سے بالکل اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتی تھی —— فرشتوں کی سی محبت —— اور یوسف بھی مریم کو باعصمت نگاہوں سے دیکھتا تھا —— یہ جوڑا کیسا تھا؟ ایک کنواری بیوی کا کنوارہ خاوند۔ (ص۳۸)

لیکن اس سلسلہ میں ابھی ایک اور دشوار گذار مرحلہ باقی تھا۔ اناجیل میں یہ بھی مذکور تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بہن بھائی بھی تھے۔ اس سے (حضرت) مریم اور یوسف کے زناشوئی کے تعلقات کا ثبوت ملتا تھا اور عیسائیت اس تصور کو برداشت نہیں کر

---

[1] (MICHAEL GRANT) نے لکھا ہے کہ حضرت مریم کے لئے "جو کنواری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ عیسائیت میں بعد کی اختراع ہے۔ اصل عبرانی زبان میں اس کے لئے جو لفظ آیا ہے اس کا صحیح ترجمہ "جوان لڑکی" ہے۔ "کنواری" کے لئے دوسرا لفظ ہے۔ (ص۷)

سکتی تھی کہ وہ اپنے "خدا" کی والدہ کو جنسی کثافتوں میں ملوث دیکھے۔ اسی مشکل کے حل کے لئے (بقول کرادیزی) کبھی یہ سوچا گیا کہ وہ بچے یوسف کی پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اور کبھی یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی بہن تھے۔ (طلوعِ اسلام)

ہم اناجیل کی تاریخ کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں کہ موجودہ عیسائیت، سینٹ پال کی اختراع ہے۔ چنانچہ اس نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے "ابن اللہ" کے عقیدے کی طرح ڈالی۔ رومیوں کے نام اس کے ایک خط میں مذکور ہے:۔

مسیح جسم کے اعتبار سے تو داؤد کی نسل سے پیدا ہوا لیکن پاکیزگی روح کے اعتبار سے اور مُردوں میں سے جی اٹھنے کے سبب، قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا۔ (رومیوں کے نام۔ باب ۱۔ پیرا ۴)

ایک مشہور مسیحی عالمِ دینیات، ریوانڈ چارلس اینڈرسن سکاٹ نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے جس کے دوران وہ کہتا ہے:۔

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا .... یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔

مقام الوہیت

اس بظاہر ننھے سے بیج سے جو شگوفہ پھوٹا اور جس نے پھر رفتہ رفتہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی، اس کی رو سے کبھی حضرت عیسیٰؑ کو خدا اور کبھی اقنوم ثلاثہ (باپ۔ بیٹا۔ روح القدس) کا ایک جزو قرار دیا گیا اور کفارہ کا عقیدہ وضع کر کے اعمال سے نجات پائی۔ سینٹ پال کے بعد جب ۳۲۵ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تو اس میں اس بحث نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ

جو شخص یہ دعوے کرے کہ کسی وقت میں خدا کے بیٹے کا وجود نہیں تھا۔ یا پیدا ہونے سے پہلے وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے ہست کیا گیا۔ یا کسی ایسے جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں۔ یا وہ مخلوق یا متغیر ہے۔ ایسے شخص کو کلیسائے مقدس ملعون قرار دیتا ہے

اس فتوے کو شاہنشاہ قسطنطین نے بزور نافذ کر دیا۔ (ملاحظہ ہو، معرکہ مذہب و سائنس۔ از ڈریپر)۔ ازاں بعد ٹرنٹ کی کونسل میں اس عقیدہ نے اس ایمان کی شکل اختیار کر لی کہ

ہم ایمان لائے رب یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ الہ۔ اِلہ اور نور، نور ہے۔ عین خدا ہے۔ موجود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔

جب حضرت مسیحؑ کو یہ مقام دیا گیا تو حضرت مریمؑ کا مقام تصور میں آسکتا ہے۔ چنانچہ ان کے متعلق مقدس کلیسا کا فیصلہ ہے کہ

حضرت مریمؑ کا مقام

وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالک ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے مجسمۂ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے لئے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کر سکتی . . . . ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔

(CATHOLIC SCHOOL BOOK - P. 158)

۱۹۵۰ء میں پوپ (PIOUS, XII) نے اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ حضرت مریمؑ بھی اپنی وفات کے بعد بہ جسد عنصری آسمان پر اٹھا لی گئی تھیں۔ ۱۹۵۴ء کی رسومات میں "ملکۂ مریم" کے عنوان سے ایک جدید تقریب کا اضافہ کیا گیا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی معبود قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۶۴ء میں حضرت مریمؑ کو "مادرِ کلیسا" کے ممتاز ترین لقب سے نوازا گیا۔

(CRAVERI - PP. 41-42)

یہ ہے (مختصر الفاظ میں) عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ کی تاریخ۔ ہم نے اس سلسلہ میں بعض دیگر عقائد کا ذکر بھی اس لئے کر دیا ہے کہ جب آگے چل کر قرآنی آیات (۵/۷۵-۷۲) ہمارے سامنے آئیں گی تو بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کریم کس عقیدہ کی تردید کر رہا ہے۔ اس کے بعد آئیے قرآن کریم کی طرف۔

پیدائش (قرآنی نقطۂ نگاہ سے)

قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے برعکس اس نے اس عقیدہ کی تردید ایسے جامع انداز سے کی ہے جس کی روشنی میں اس کے متعلق کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس نے ابن اللہ کے عقیدہ کی متعدد مقامات میں یہ کہہ کر تردید کی ہے کہ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ (۴/۱۷۱) "وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ اس کے ہاں بیٹا ہو"۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ ان کا یہ عقیدہ، اقوامِ سابقہ کے اسی قسم کے کافرانہ عقیدہ کی تقلید ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹/۳۰) "خدا انہیں غارت کرے۔ یہ صحیح راستہ چھوڑ کر کس طرف بہکے چلے جاتے ہیں"۔ سورۂ مریم میں ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ (۱۹/۳۵) "یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ اس قسم کے باطل تصورات سے ارفع و اعلیٰ ہے"۔ (نیز ۲۳/۹۱)

لیکن جس دلیل محکم کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ سورہ انعام میں ہے۔ سابقہ جلدوں میں عالم امر اور عالم خلق کے

متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک نظر دوبارہ دیکھ لیجئے (انڈکس کی روشنی میں، امر، خلق اور تقدیر کے عنوانات میں تفصیل مل جائے گی) - اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی پروگرام کے دو گوشے ہیں۔ گوشۂ اوّل، عالم امر ہے جس میں تخلیق کے متعلق پروگرام طے پاتا ہے اور پھر جس شے کی تخلیق مقصود ہوتی اسے پہلی بار وجود میں لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلی بار کی تخلیق، علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے قانون کے تابع نہیں ہوتی۔ اسے تو نیست یا عدم (NOTHINGNESS) سے ہست یا وجود (EXISTENCE) میں لایا جاتا ہے لیکن جب کوئی شے وجود میں آجاتی ہے تو پھر وہ خدا کے قانون علت و معلول کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ کوئی استثناء نہیں ہوتی۔ یہ خدا کی اٹل روش (سُنت اللہ) ہے جس میں وہ کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ (۳۳/۶۲ ؛ ۳۵/۴۳)۔

اس پس منظر میں سورۂ انعام کی اس آیت کو سامنے لایئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کی جہالت دیکھئے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کی اولاد بھی ہے۔ جب ان سے یہ کہا جائے کہ اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو جی میں آئے کر سکتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ کہا ان کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ

بن باپ کے پیدا ہونے کی تردید

وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جس طرح جی چاہے کر سکتا ہے۔ اس کی یہی قدرت مطلقہ ہے جس کی رو سے وہ اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے — بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۱۰۲) لیکن یہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ اس کے عالم امر سے متعلق ہے۔ عالمِ خلق سے بات اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ تولید (اولاد پیدا ہونے) کے متعلق اس کا قانون یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کا نتیجہ ہوتی ہے: اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى (۴۹/۱۳) یہ ہے قانونِ خداوندی جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لہٰذا، بیٹا پیدا ہونے کے لئے خاوند اور بیوی دونوں کا ہونا لازمی ہے: اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (۶/۱۰۲)۔ اور جب خدا کی بیوی نہیں تو اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے؟ اب ظاہر ہے کہ جب خدا کے قانون کے مطابق:-

۱۔ اولاد کے لئے مرد اور عورت، خاوند اور بیوی دونوں کا وجود لازمی ہے۔

۲۔ خدا کی بیوی نہیں اس لئے اس کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

۳۔ اسی قانون کی رو سے، کسی عورت کے ہاں مرد کے اختلاط کے بغیر اولاد پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ اولاد کے لئے مرد اور عورت دونوں کا وجود اور اختلاط لازمی ہے۔ جب خدا کے ہاں بیوی کے بغیر بیٹا پیدا نہیں ہو سکتا تو (حضرت) مریمؑ کے ہاں خاوند کے بغیر بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس طرح ایک واضح اور محکم دلیل کی رُو سے بن باپ کے بیٹے کے باطل عقیدہ کی تردید کر دی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ کی اسی ایک آیت سے نفی ہو جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۳۴۳۔ آیت ۲/۸۳)۔

اب آپ قرآن مجید کی دیگر متعلقہ آیات کا مفہوم، مذکورہ بالا حقیقت کی روشنی میں دیکھئے۔ تو بات بالکل صاف ہو جائے گی۔

❀

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے متعلق واقعات کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

۳/۴۵-۴۴ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ (۳/۴۵-۴۴)

اسی سلسلہ میں، ملائکہ نے مریمؑ سے کہا تھا کہ خدا تمہیں، اپنی طرف سے 'ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے۔ یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیحؑ (اور) عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا (یعنی صفاتی نام المسیح۔ ذاتی نام عیسیٰ۔ اور کنیت ابن مریم) دنیا میں صاحب وجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔

تندرست و توانا۔ چھوٹی سی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا (۵/۱۱۰) نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاکباز انسان۔ (اس سے ان کی توہمات کا دُور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے تھے کہ وہ، خانقاہیت کی شریعت کے علی الرغم، متاہل زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ خود یا اس کا بچہ، کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ سچ مچ ایسا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، اس کے دل سے ان خیالات کا دور کرنا ضروری تھا)۔

حضرت مریمؑ اور ملائکہ

ہم نے آیت (۳/۴۲) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت مریمؑ کی طرف ملائکہ کا نزول ایسے ہی تھا جیسے (قرآن کریم کی رو سے) ان کا نزول مومنین کی طرف ہوتا ہے لیکن زیر نظر آیات میں حضرت مریمؑ کو ملائکہ کی طرف سے ہونے والے بیٹے کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ سوال و جواب

لہ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس امر کی تبلیغ کرے گا کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کس طرح کی جائے اور اس کی تبلیغ کا سلسلہ بڑی عمر تک جاری رہے گا۔ (مولانا عنایت اللہ گجراتی نے ایسا ہی مفہوم لیا ہے)

کا سلسلہ بھی مذکور ہے۔ اس اعتبار سے یہاں ملائکہ کا ایک اور مفہوم سامنے آتا ہے۔ مَلَكٌ (جمع ملائکہ) کے ایک معنے پیغام رساں کے بھی ہیں اور یہاں یہ مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت زکریاؑ کی تعلیم کا نتیجہ تھا (جو خدا کے رسول تھے) کہ حضرت مریمؑ کے دل میں رسمِ خانقاہیت کے توڑنے کا انقلاب آفریں خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ہیکل چھوڑ آنے کا اقدام کیا۔ اس پر وہاں کے معاشرہ کے ردِ عمل کی بات پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان حالات میں کسی شخص کا حضرت مریمؑ کے ساتھ شادی کرنے کا مسئلہ بھی کچھ آسان نہیں تھا۔ اسے بھی معاشرہ اور مذہبی پیشوائیت کے طعن و تشنیع کا ہدف بننا پڑتا۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ مشکل مرحلہ بھی حضرت زکریاؑ کی کوششوں

حضرت زکریاؑ کا پیغام رساں

سے طے ہوا۔ انہوں نے یوسف نجار کو اس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا اور یہ سلسلہ جنبانی انہی کی طرف سے ہوئی۔ یہ پیغام رساں ان ہی کی طرف سے بھیجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پروگرام حضرت زکریاؑ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہوگا اور انہوں نے اس کے مطابق یہ اقدامات کئے ہوں گے۔ اس مفہوم کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دوسرے مقام پر (حضرت مریمؑ کی طرف آنے والے کو) رسول کہہ کر پکارا گیا ہے جس کے معنے قاصد یا پیغامبر کے ہیں (۱۹/۱۹)۔ آیت (۴۴/۳) میں ملائکہ کہا ہے تو اس سے سلسلہ جنبانی کا ابتدائی دور سامنے آتا ہے اور آیت (۱۹/۱۹) میں جہاں رسول (واحد) کہا ہے تو اس سے اس کا آخری مرحلہ معلوم ہوتا ہے جہاں یوسف کے ساتھ یہ معاملہ طے پا گیا تھا۔

آیت (۴۴/۳) میں "يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ" آیا ہے۔ اس میں کلمہ کے عام معنی (ایک بات) بھی ہو سکتے ہیں لیکن قرآن کریم میں کلمہ کا لفظ قانونِ خداوندی کے معنوں میں بھی آیا ہے (مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۳۱) اس لئے یہاں وہ معنی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ خانقاہ کی رہبانیت اور تجرد کی زندگی خلافِ قانونِ خداوندی تھی اور متاہل اور ازدواجی زندگی قانونِ خداوندی

کلمہ کا مفہوم

کے مطابق۔ حضرت مریمؑ کے سامنے یہی قانونِ خداوندی پیش کیا گیا تھا۔ دوسرے مقام پر اس مفہوم کی وضاحت اور تائید ہو جاتی ہے جہاں کہا کہ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ (۶۶/۱۲) "(حضرت) مریم نے قوانین و احکامِ خداوندی کو سچ کر دکھایا"۔ سورۃ النسآء میں ہے: كَلِمَتُهُۥٓ أَلْقَاهَآ إِلَىٰ مَرْيَمَ (۴/۱۷۱)۔ "خدا کا حکم یا قانون جسے مریم کی طرف (بوساطت حضرت زکریاؑ) بھیجا گیا تھا۔ اس سے درحقیقت یہودیوں کے اس اعتراض کی تردید مقصود تھی جس کی رُو سے وہ کہتے تھے کہ (حضرت) مریم کا نکاح بھی خلافِ شریعتِ خداوندی تھا اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کی پیدائش بھی خلافِ شریعت۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خود ساختہ عقیدہ کی تردید یہ کہہ کر کر دی کہ حضرت مریمؑ کا نکاح اور اس کے بیٹے کی پیدائش قانونِ خداوندی کے عین مطابق تھی۔

عیسیٰؑ اور مسیح کے معنے

آیت (۴۴) میں اس مولود کا نام عیسیٰؑ، لقب مسیح اور کنیت ابنِ مریم بتائی گئی ہے۔ عیسیٰؑ، عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے مبارک یا سیّد (سردار) کے ہیں۔ انجیل میں لفظ یسوع آیا ہے جسے انگریزی زبان میں (JESUS) لکھا جاتا ہے۔

مسیح کا لفظ مسح سے ماخوذ ہے جس کے معنے جسم پر کسی چیز کے ملنے کے ہیں۔ زیتون کا تیل ملنا، یہودیوں کے ہاں ایک مبارک مذہبی رسم تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کے لئے اس لقب میں ایک گہرا مفہوم بھی پوشیدہ تھا۔ اُس زمانے میں بادشاہوں کی تاجپوشی کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی تھیں ان میں اوّلیں رسم زیتون کے تیل کا مسح بھی تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ حضرت عیسیٰؑ ایسا انقلاب لانا چاہتے تھے جس سے بنی اسرائیل، رومیوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے ایک آزاد حکمران قوم بن جائیں۔ اس نہج سے انہیں یہودیوں کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔ (یہ وہ فردِ جرم تھی جو رومی حکومت نے ان کے خلاف عائد کی تھی)۔ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح کہہ کر پکارنے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی تھا۔

ابنِ مریم کیوں؟

اس کے بعد آئیے ابنِ مریم کی طرف۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر حضرت عیسیٰؑ کو ابنِ مریم کہہ کر پکارا گیا ہے (مثلاً ۲/۲۵۳؛ ۴/۱۵۷؛ ۵/۱۱۲؛ ۱۱۶؛ ۱۱۲) حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ کے پیدائش کے قائل اپنے عقیدہ کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی لایا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابنِ مریم کہہ کر پکارا ہے (ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت نہیں کی) جس سے ظاہر ہے کہ ان کا باپ کوئی نہیں تھا۔ یہ دلیل جس قدر کمزور ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سامی اقوام کے ہاں یہ رواج تھا کہ ماں اور باپ میں سے جو زیادہ مشہور ہو ان کی اولاد کی نسبت اس کی طرف کرتے تھے۔ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰؑ (اور حضرت ہارونؑ) کے والد کا نام کہیں نہیں آیا۔ جہاں ضرورت پیش آئی ہے" ام موسیٰ " کہا گیا ہے۔ (مثلاً ۲۸/۷) حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی، حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کو "ابنِ ام"۔ میری ماں کے بیٹے"، کہہ کر خطاب کرتے ہیں (۷/۱۵۰؛ ۲۰/۹۴) تو کیا اس سے بھی یہ سمجھا جائے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ تاریخ میں دیکھئے۔ سادات کی جو پہلی سلطنت قائم ہوئی تھی، اُسے "بنی فاطمہ" کی سلطنت کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کی جو اولاد حضرت فاطمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی وہ بنی فاطمہ کہلائی۔ ان کی جو اولاد دوسری بیویوں کے بطن سے پیدا ہوئی انہیں علوی کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کے ایک بیٹے کا نام محمد تھا لیکن وہ ابن الحنفیہ کی کنیت سے مشہور ہیں (حنفیہ ان کی والدہ کا نام تھا)۔ نبی اکرمؐ کی صاحبزادی زینبؓ کی بیٹی (امامہ) بنتِ زینت کی کنیت سے متعارف ہیں۔ اپنے والد، ابوالعاص کی نسبت سے نہیں۔ اس قسم کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ خود ہمارے ہاں (بالخصوص دیہات میں) ابھی تک یہ رواج ہے کہ خاوند اور بیوی میں سے جو زیادہ مشہور ہو، ان کی اولاد کو اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ——— "غلام رسول" ——— کیٹرا غلام رسول۔

(کون سا غلام رسول) - "ادہ عیشاں دا پتر" (وہ عائشہ کا بیٹا) -

حضرت عیسیٰؑ کے ماں باپ میں سے، ان کے والد، یُوسف نجار کا نام صرف اناجیل میں ملتا ہے - اس سے زیادہ ان کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا - ان کے برعکس (حضرت) مریم کی شہرت (اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد آج تک) ساری دنیا میں ہے - اور ہیکل کے پیشواؤں کا ٹکراؤ ہی حضرت مریمؑ کے ساتھ تھا - بنا بریں حضرت عیسیٰؑ کو ابنِ مریم کہہ کر ہی پکارا جا سکتا تھا - وہ ابنِ یوسف کی کنیت سے پہچانے ہی نہ جاتے -

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب (حضرت) مریم کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو اُسی وقت اس مولود کی خصوصیات اور منفرد صفات کا ذکر کیوں ضروری سمجھا گیا ——— وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (۳/۴۵-۴۶) - اس کی لِم مختصر الفاظ میں، آیات کے مفہوم میں بتائی گئی ہے - راہبہ کی زندگی ترک کر دینے سے حضرت مریم کا دل جن وساوس کی آماجگاہ بن رہا تھا اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے - انہوں نے اس بندھن کو توڑنے کی ہمت تو کر لی لیکن جب ان کے سامنے بیٹے کا ذکر آیا تو وہ وساوس ہجوم کر کے ابھر آئے - عقیدہ یہ تھا کہ خلافِ شریعت اولاد، خدا کے غضب کی مورد ہوتی ہے - یہ غضبِ خداوندی، بچے پر کس شکل میں اثر انداز ہو سکتا ہے اس کے متعلق بڑی بڑی توہم پرستانہ حکایتیں مشہور ہوتی ہیں - فلاں کے ہاں ناجائز بچہ پیدا ہوا تو گونگا تھا، بہرہ تھا، اندھا تھا، مفلوج تھا، بدشکل تھا، اس کا چہرہ حیوانوں جیسا تھا - وغیرہ وغیرہ - اس قسم کے قصے ہمارے ہاں اب بھی مشہور ہیں - اصل یہ ہے کہ اس قسم کی توہم پرستی کا عورت پر اس قدر گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس کا ہونے والا بچہ سچ مچ خارق عادت (ABNORMAL) پیدا ہوتا ہے - (اس قسم کی مثالیں خود میرے مشاہدہ میں بھی آئی ہیں) - حضرت مریمؑ کے دل میں اس قسم کے وساوس بھی پیدا ہوتے تھے اور انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ جب مذہبی پیشوا اس بچے کی پیدائش کو خلافِ شریعت قرار دیں گے تو وہ معاشرہ میں کس قدر بدنام ہو گا! حضرت مریمؑ کے دل سے اس قسم کے وساوس کو دور کرنے کے لئے انہیں تسلی دی گئی کہ تم کوئی خدشہ نہ کرو، تمہارا بچہ (بفضل ایزدی) تندرست و توانا، چھوٹی عمر میں اچھی اچھی باتیں کرنے والا - بڑی عمر تک پہنچنے والا - عمدہ صلاحیتوں کا مالک - دُنیا میں صاحبِ وجاہت ہو گا حتّٰی کہ، ان کے مذہبی پیشواؤں کے فتووں کے علی الرغم خدا کے ہاں بھی مقرب -

توہم پرستیوں کا ازالہ

اس انداز کے اطمینانِ قلب اور تسکینِ خاطر سے حضرت مریمؑ کو ازدواجی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا گیا! اُف! مذہب کی پیدا کردہ توہم پرستانہ رسوم کو توڑنے کے لئے کتنے بڑے جہاد کی ضرورت ہوتی ہے!

اس کے باوجود، عمر بھر تجرد کی زندگی گزارنے والی راہبہ کا زناشوئی کے تعلقات کے احساس سے گھبرا اٹھنا بعید از قیاس

نہ تھا۔ حضرت مریمؑ نے کہا کہ پروردگار! تیرا حکم تو مجھ تک پہنچ گیا، لیکن :-

۳/۴۶ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (۳/۴۶)۔

اس پر مریم نے (زکریا کی طرح ۳/۳۹) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں ــــ راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟ ــــ اس کے جواب میں اس سے وہی کچھ کہا گیا جو زکریا سے کہا تھا (۳/۳۹) کہ یہ خدا کے اس قانونِ مشیت کے مطابق ہوگا جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے ــــ خدا کے قانونِ مشیت کی رو سے تخلیق کے دو مراحل ہیں۔ ایک عالمِ امر جسے سمجھنے کی خاطر، پلاننگ کا مرحلہ کہہ لیجئے۔ اور اس کے بعد دوسرا مرحلہ وہ جب وہ شے مخصوص شکل اختیار کرنے لگ جائے اس پوری اسکیم کا آغاز ارادہ (مشیت) خداوندی کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے (۲/۱۱۷؛ ۳۲/۵)

"انّی یکون لہ ولد" یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت زکریاؑ نے اس وقت کہے تھے جب انہیں بھی بیٹے کی پیدائش کی بشارت دی گئی تھی۔ (اس کی تفصیل آیت ۳/۳۹ کے تحت گزر چکی ہے)۔ یعنی ان کے سامنے، اپنی اور اپنی بیوی کے اس وقت کے حالات تھے جن کی رو سے وہ سمجھتے تھے کہ ایسے میں ان کے ہاں اولاد کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد جب وہ موانعات دور ہو گئے جو اولاد کی پیدائش کے راستے میں حائل تھے، تو خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ ایسی ہی صورت حضرت مریم کو درپیش تھی۔ وہ راہبہ کی حیثیت سے تجرد کی زندگی بسر کر رہی تھیں اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شدید مخالفت کے پیشِ نظر ہیکل چھوڑنے کے بعد انہیں ازدواجی زندگی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس لئے ان (حضرت مریم) کے لئے بھی بیٹے کی پیدائش کی بشارت وجہ تعجب تھی۔

قرآن کا اندازِ بیان اس مقام پر ایک ضمنی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں جس میں تمام واقعات زمان و مکان کے تعین کے ساتھ مسلسل بیان کئے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس میں واقعات کا زمانی تسلسل نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر ان میں کچھ (GAPS) بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں تدبر و تفکر سے، اس پیش کردہ واقعات میں تسلسل بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور خلا (GAPS) بھی پُر ہو جاتے ہیں۔ اس نکتہ کو زیرِ نظر واقعہ میں بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

بہر حال، حضرت مریم کو (حضرت زکریاؑ کی وساطت سے موصول ہونے والی اس) بشارت پر تعجب ہوا جو ان حالات میں بالکل فطری تھا۔ اس مقام پر تو انہوں نے لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ کہا ہے۔ سورۂ مریم میں ہے : لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا ۝ (۱۹/۲۰)۔ یہاں "مسّ بشر" بغیا کے مقابلہ میں آیا ہے۔ بغیا سے مراد ناجائز اختلاط ہے۔ اس تشریح

کی رُو سے آیت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی حضرت مریمؑ نے کہا کہ میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ صورت یہ ہے کہ میرا نکاح بھی نہیں ہوا اور میں (معاذاللہ) حرام کاری کی مرتکب بھی نہیں ہوتی۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ کَذٰلِكِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ۔ کہ یہ خدا کے اس قانونِ مشیت کی رو سے ہو گا جس کے مطابق عام تخلیق ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ تمہارے لئے (یعنی حضرت مریمؑ کے لئے) کوئی الگ طریق یا عمل اختیار کیا جائے گا۔ حضرت زکریاؑ کے استعجاب کے جواب میں بھی ایسا ہی کہا گیا تھا۔ یعنی کَذٰلِكَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۳/۴۰)۔ اور اس "یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ" کے بعد کہا تھا کہ حضرت زکریاؑ کے ہاں اولاد ہونے کے راستہ میں جو رکاوٹ تھی اسے دور کر دیا گیا۔ یعنی ان کی بیوی کا طبعی نقص (علاج معالجہ سے) دور ہو گیا اور اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے "یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ" کی تفسیر۔ ایسا ہی حضرت مریمؑ کے سلسلہ میں ہوا۔

اس کے بعد ہے "اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "جب وہ (خدا) کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا۔ اور وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ (کُنْ فَیَکُوْنُ) کے غلط مفہوم سے، اسی مقام پر ہی نہیں، بلکہ قرآن کریم کے دیگر مقامات پر بھی عجیب و غریب الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔ (دیکھئے جلد اوّل۔ ص۲۲-۱۶۔ آیت ۲/۱۱۷۔ ص۹۲-۲۸۳۔ آیت ۶/۷۳؛ جلد دوم ص۲۴۳۔ آیت ۳۶/۸۲؛ جلد سوم ص۱۸۔ آیت ۲/۱۱۷)۔ یہاں اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ

کُن فیکون

جب کسی شے کی تخلیق کے متعلق خدا کے عالمِ امر میں فیصلہ ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس تخلیقی اسکیم کے عمل پیرا ہونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تمام مراحل طے کرنے کے بعد، نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ (مثلاً) انسانی بچہ کی تخلیق کے متعلق فرمایا: ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا (۴۰/۶۷)۔ یعنی خدا وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتداء بے جان مادہ سے کی۔ پھر وہ "زندگی" کو مختلف مراحل میں سے گزارتے ہوئے اس منزل میں لے آیا جہاں پیدائش نطفہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ پھر اسی نطفہ کو رحمِ مادر میں جونک کی قسم کا لوتھڑا بنایا۔ پھر وہ تمہیں انسانی بچہ کی شکل میں دنیا میں لے آیا۔ اس کے بعد: ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّکُمْ ثُمَّ لِتَکُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۴۰/۶۷)۔ پھر تم اپنی جوانی کی عمر تک پہنچتے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔ تم میں سے بعض بچپن ہی میں وفات پا جاتے ہیں اور بعض عمر (سنِ شعور) تک پہنچتے ہیں جہاں انسان عقل و فکر سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے: ھُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ (۴۰/۶۸)۔ اس طرح خدا کے قانون کے مطابق زندگی بھی ملتی ہے اور موت بھی وارد ہوتی ہے۔ تخلیقی اسکیم کے ان تمام مراحل کو سامنے لانے کے بعد کہا: فَاِذَا قَضٰٓی

اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۳/۴۷﴾ "جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے "کُنۡ فَیَکُوۡنُ" تو اس کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب خدا کسی اسکیم کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کا تخلیقی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تمام مراحل طے کرتی، رفتہ رفتہ اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ ہے مفہوم کُنۡ فَیَکُوۡنُ کا۔

اس کا غلط مفہوم لینے والے سمجھتے ہیں کہ جونہی خدا کہتا ہے کُنۡ ہو جا تو وہ شے فی الفور اپنی مکمل شکل میں وجود میں آجاتی ہے۔ اس مفہوم کی رو سے وہ ان الفاظ (کُنۡ فَیَکُوۡنُ) کو حضرت عیسیٰؑ کی (بن باپ) پیدائش کے لئے بھی سند اور دلیل کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا فیصلہ کیا تو کہا کہ کُنۡ (ہو جا) اور حضرت عیسیٰؑ پیدا ہو گئے۔

لیکن قرآنِ کریم میں ہے کہ فَحَمَلَتۡہُ ﴿۱۹/۲۲﴾۔ حضرت مریمؑ کو حمل قرار پایا۔ فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ ﴿۱۹/۲۳﴾۔ اور وہ دردِ زہ میں مبتلا ہوئی۔ یعنی وہ ان تمام مراحل میں سے گزری جن سے (بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں) عام عورتیں گزرتی ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنے متعلق فرمایا کہ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ ﴿۱۹/۳۳﴾ "میں سلامتی کا مظہر ہوں اس دن سے جب میری ولادت ہوئی۔ یعنی جس طرح عام بچے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح وہ بھی پیدا ہوئے۔ لہٰذا، یہ تصور ہی غلط ہے کہ ادھر خدا نے کہا کُنۡ۔ اور ادھر حضرت عیسیٰؑ وجود میں آگئے۔ اس کے بعد ہے: ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ ﴿۱۹/۳۴﴾۔ یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریم کی مبنی برحقیقت سرگزشت جس کے بارے میں یہ لوگ اس قدر اختلاف رکھتے ہیں اور باہمی جھگڑتے ہیں۔ یعنی ایک گروہ یہود کا ہے جو اس کی پیدائش کو (معاذاللہ) ناجائز قرار دے رہا ہے۔ اور دوسری طرف عیسائی ہیں جو انہیں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۱۹/۳۵﴾۔ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ خدا کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ وہ اس قسم کے تصورات سے بہت بلند ہے۔ وہ ایک اسکیم کا ارادہ کرتا ہے اور پھر وہ اپنے ضروری مراحل طے کرتی ہوئی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت مریمؑ کی تسکین خاطر کے لئے ان کے بچے (حضرت عیسیٰؑ) کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا تھا۔ اگلی آیت میں بات بالکل واضح کر دی کہ

۳
۴۸-۴۷

وَیُعَلِّمُہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَالتَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ﴿ۚ﴾ وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۙ (۳/۴۸-۴۷)

(مریم کو یہ بھی بتایا گیا کہ تیرا بچہ عام لڑکوں جیسا نہیں ہوگا) خدا کی اسکیم یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا اور

اس حیثیت سے انہیں کتاب وحکمت ــــ یعنی توراۃ اور انجیل ــــ کی تعلیم دے گا۔ (آیت ۴۸ کا باقی حصہ بعد میں آئیگا)۔
رسولاً الی بنی اسرائیل سے ایک بار پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ سے پہلے' انبیاء کرام خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے۔ عالمگیر رسالت حضورؐ ہی کا خاصہ تھا۔

یہ ہے جو کچھ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق سورۃ آلِ عمران کی ان آیات میں آیا ہے۔ ان کے بن باپ کے پیدا ہونے کے عقیدے کے قائل اسی سورۃ کی آیت ۵۸ کو بھی بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ (۳/۵۸)۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ عیسیٰؑ کی مثال آدم کی سی ہے۔ اور چونکہ (ان کے تصور کے حضرت) آدم "بن باپ" پیدا ہوئے تھے اس لئے (وہ کہتے ہیں کہ) حضرت عیسیٰؑ بھی ان کی مثل بن باپ ہوئے۔

مثلِ آدم

پہلی بات تو یہ دیکھئے کہ (ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے) "بن باپ" کے پیدا ہونے والے حضرت عیسیٰؑ کسی طور پر بھی (حضرت) آدم کے مثیل قرار نہیں پا سکتے۔ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ماں کے بغیر پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن حضرت آدم، باپ اور ماں دونوں کے بغیر وجود میں لائے گئے تھے۔ پھر یہ دونوں ایک دوسرے کی مثل کیسے ہوئے؟ علاوہ ازیں، حضرت عیسیٰؑ (جیسا کہ خود ان کی زبانی اوپر درج کیا جا چکا ہے) باقاعدہ پیدا ہوئے تھے (یَوْمَ وُلِدْتُّ) لیکن حضرت آدم تو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ انہیں تو (ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے) مٹی کا ایک پُتلا بنا دیا گیا تھا! پھر دونوں ایک دوسرے کے مثیل کیسے ہوئے؟

نیز حضرت آدمؑ کی پسلی کو چیر کر اس میں سے ان کی بیوی کو نکالا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ تو ایسا ماجرا نہیں گزرا تھا۔ پھر یہ مثیل کیسے ہوئے؟

آپ سوچئے کہ اس قسم کے خود تراشیدہ عقائد کی رُو سے' خدا اور اس کی کتاب کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ یعنی خدا دو شخصیتوں کو ایک دوسرے کا مثیل قرار دیتا ہے حالانکہ مثیل ہونے کی کوئی شرط بھی ان میں موجود نہیں۔

آدم کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۱۰۱۔ آیت ۲/۳۰) میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد "آدمی" ہے، نہ کہ کوئی خاص فرد۔ اور آدمی (انسان) کی تخلیق کے متعلق اُسی جلد میں (صفحہ ۳۱۔ آیت ۲/۳۰) تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ وہ کس طرح، عملِ ارتقا کے مطابق، غیر جاندار مادہ (طین یا تراب) سے شروع ہو کر، پیکرِ انسانی تک پہنچا۔ قرآنِ کریم نے یہاں کہا ہے کہ تم اپنے باطل عقائد کی رُو سے حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ قرار دیتے ہو اور ان کی پیدائش بن باپ کے بتاتے ہو حالانکہ :-

۳/۵۸ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (۳/۵۸)

خدا کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بھی وہی کیفیت ہے جو ہر آدمی کی پیدائش کی ہوتی ہے — انسان کی تخلیق کی ابتدا غیر ذی حیات مادہ (مٹی) سے ہوتی ہے۔ پھر وہ خدا کی مقررہ اسکیم کے مطابق مختلف مراحل طے کرتا ہوا پیکر بشریت میں آجاتا ہے۔ اسی طرح عیسےٰؑ کی پیدائش ہوئی تھی — (وہ نہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ نہ ہی وہ خدا کے بیٹے ہیں)

اس کے بعد ہے :-

۳/۵۹ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ (۳/۵۹)

یہ ہے اس معاملہ کی اصل وحقیقت جسے تیرے رب نے بیان کر دیا ہے۔ سو اس باب میں کسی بحث و جدل کی گنجائش نہیں۔

اس مقام پر اتنا اضافہ غیر محل نہ ہوگا کہ (اناجیل کے بیان کی رُو سے) حضرت عیسیٰؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہا کرتے تھے۔ مثلاً متی کی انجیل میں ہے :-

تب اس نے (مسیح نے) شاگردوں کے پاس آکر کہا کہ اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے اور ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالے کیا جاتا ہے۔ (متی باب ۲۶۔ آیت ۴۵)

نفخ روح حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ مکرمہ حضرت مریمؑ کے متعلق فرمایا :-

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱/۹۱)

اور اس عفت مآب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے یہودیوں کی خود ساختہ شریعت کے علی الرغم عیسیٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا اسی طرح جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمہ ڈال کر اسے صاحب اختیار و ارادہ انسان بنایا جاتا ہے۔

یہاں **فِيهَا** مؤنث کا صیغہ ہے۔ دوسرے مقام پر فَنَفَخْنَا فِيهِ (۶۶/۱۲) میں مذکر کا صیغہ ہے۔ مقصود دونوں جگہ رحم حضرت مریم میں جنین (حضرت عیسیٰؑ) ہے۔ یہ نفخ روح حضرت عیسیٰؑ کی منفرد خصوصیت نہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے ہر انسان کے سلسلہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ (تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۱۵-۱۴۔ آیت ۳۲/۹ میں گزر چکی ہے)۔ یعنی انسان کو حیوانات سے متمیز کرنے کے لئے "نفخ روحنا" کے الفاظ آتے ہیں (دیکھئے ۱۵/۲۹ ؛ ۳۲/۹ ؛ ۳۸/۷۲)۔ اگر "نفخ روح" سے بن باپ

پیدائش ثابت ہوتی ہے تو پھر ہر انسان کی پیدائش کو بن باپ ماننا پڑے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر سورۂ مریم میں بھی آیا ہے۔ موضوع کے تسلسل کی جہت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کو بھی اسی مقام پر سامنے لے آیا جائے۔

سورۂ مریم میں آیت ۱ سے لے کر آیت ۱۵ تک حضرت زکریاؑ اور پیدائش حضرت یحییٰؑ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان آیات کو درج کریں، اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آنا چاہیئے کہ (جیسا کہ آیت ($\frac{3}{44-45}$) کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے) حضرت زکریاؑ نے حضرت مریمؑ کی پرورش کی تھی اور ان ہی کے زیرِ تربیت وہ پروان چڑھی تھیں۔ ان ہی کی تعلیم کا اثر تھا جس سے وہ راہ و رسم خانقاہیت کے توڑنے کا انقلابی قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو گئیں تھیں۔ اس کے بعد حضرت زکریاؑ نے ہی ان کے نکاح وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔

پیدائش حضرت عیسیٰؑ کی مزید تفصیلات

حضرت زکریاؑ خدا کے رسول تھے۔ حضرت مریمؑ اور پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے متعلق حضرت زکریاؑ پر خدا کی طرف سے جو وحی نازل ہوتی تھی وہ اس کے مطابق ان اقدامات کی تدبیر کرتے تھے اور وحی کے ذریعے حاصل شدہ ہدایات کو حضرت مریمؑ تک پہنچاتے تھے۔ اس داستان کی ان کڑیوں کو پیشِ نظر رکھنے سے، قرآنِ مجید کے وہ مقامات بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں جو (ان کڑیوں کو پیشِ نظر نہ رکھنے سے) بہت سی الجھنوں کا باعث بنتے ہیں۔ سورۂ مریم میں آغازِ داستان یوں ہوتا ہے:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ ($\frac{19}{16}$)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآنِ مجید) میں، لوگوں سے مریم کی داستان بیان کر . . . . اس کا آغاز اس وقت سے کر جب وہ ہیکل کو چھوڑ کر (اپنے گاؤں ـــ ناصرہ چلی گئی تھی جو) وہاں سے جانب شرق واقعہ تھا۔

خانقاہ کی زندگی کو ترک کرنے اور اس پر لوگوں کی طعن تشنیع سے اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ معاشرہ سے الگ تھلگ رہنے لگی ـــ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۪ ($\frac{19}{17}$)۔ اس کے بعد ہے: فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ ($\frac{19}{17}$) عام طور پر ان الفاظ کے معنیٰ کئے جاتے ہیں "پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اس کے آگے آدمی پورا"۔ یہ ترجمہ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمۃ القرآن میں ہے۔ اور اسی ترجمہ سے وہ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کی وضاحت کے سلسلہ میں، حاشیہ میں لکھا گیا ہے:۔

یعنی حضرت جبریل نوجوان خوبصورت مرد کی شکل میں پہنچے جیسا کہ فرشتوں کی عادت ہے کہ عموماً خوش منظر صورتوں میں متمثل ہوتے ہیں۔

لیکن جیساکہ ہم نے آیات (۳/۴۴-۴۵) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے قرآن کریم کی رُو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ ملائکہ انسانی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ قرآن کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آسکتے۔ لہٰذا، قرآن میں بیان کردہ اس حقیقت کے پیشِ نظر، یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضرت جبریلؑ بشکل انسانی حضرت مریمؑ کے پاس آئے تھے۔ ہماری تفاسیر میں اس ضمن میں کیا کچھ لکھا گیا ہے میں اسے یہاں درج نہیں کرنا چاہتا تھا (یا یوں کہئے کہ اس کی ہمت نہیں پاتا تھا) لیکن قارئین کو یہ بتانے کے لئے کہ ان تفاسیر میں کس قسم کی افسانہ طرازیاں ہوتی ہیں، دو ایک تفسیری تشریحات نموتاً پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اور وہ بھی سینے پر پتھر رکھ کر (اور قارئین کے ذوقِ سلیم سے بصد معذرت)۔

شیخ اکبرؒ ابنِ عربیؒ، سربرآوردہ صوفیا کے سرخیل ہیں۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

جبریلؑ کس انداز سے حضرت مریمؑ کے پاس آئے تھے! (معاذاللہ)

فرشتہ بشری صورت میں خوبصورت نوجوان بن کر اس لئے آیا تھا کہ وہ (حضرت مریمؑ) اسے دیکھ کر خیال دوڑائے اور اس کا اثر قبول کرے جیساکہ ایسے موقع پر طبیعی طور پہ دل میں خیال پیدا ہو جایا کرتا ہے، اور اس کی (حضرت مریمؑ کی) شہوت بھڑک اٹھے اور اسے انزال ہو جائے جیساکہ خواب میں احتلام ہو جاتا ہے تو وہ اس کے رحم میں ٹپک جائے اور اس طرح حمل ٹھہر جائے اور اس سے بچہ پیدا ہو جائے۔ (استغفراللہ)

(بحوالہ بحرِ قلزم۔ مولنا عنایت اللہ اثری۔ ص۱۱۵)

شیخ اکبر (ابن عربی) صوفیاء کے امام ہیں۔ اہلِ شریعت انہیں سند تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن حضرت مریمؑ اور جبریلؑ کے "افسانے" میں اہلِ شریعت حضرات بھی ان سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ علماء اہلسنت کے مستند امام نسفیؒ، اپنی تفسیر مدارک میں، اور علامہ ابن السعود اپنی تفسیر میں، جو تفسیر کبیر کے حاشیہ پہ درج ہے، فرماتے ہیں :۔

جبریلؑ ایک روشن چہرے۔ گھنگریالے بالوں والے، بے ریش تندرست جوان آدمی کی صورت میں مریم کے سامنے ظاہر ہوا۔

اہلِ سنت ہی کے ایک اور معتبر مفسر قاضی بیضاویؒ نے فرمایا ہے :۔

جبریلؑ ایک بے ریش تندرست خوبصورت نوجوان کی صورت میں متمثل ہو کر مریمؑ کے پاس اس لئے آیا تاکہ مریمؑ اس کے کلام سے مانوس ہو جائے اور اس سے مریم کی شہوت بھڑک اٹھے اور ہیجان سے نطفہ مریم کے رحم میں پہنچ کر حمل ٹھہر جائے۔

اہلِ حدیث کے مایہ ناز مفسر علامہ ابن کثیرؒ نے اسے جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان کے تو تصور سے بھی حیا مانع ہے۔ لیکن (بہ امر مجبوری) انہیں بھی دیکھ لیجئے۔ فرماتے ہیں :۔

جبریلؑ نے مریمؑ کے گریبان میں پھونک ماری تھی۔ وہ نیچے اتری حتیٰ کہ اس کے فرج میں اس طرح داخل ہو گئی جس طرح

ماں باپ (میاں بیوی) باہمی اختلاط کرتے ہیں[1]۔

ہمارے متاخرین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نسبتاً اعتدال پسند اور معقول قرار دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس باب میں وہ بھی دوسروں سے پیچھے نہیں۔ وہ فرماتے ہیں :۔

پھر حضرت مریمؑ کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساری و جاری ہونے کے زمانے میں ماہواری کے دن آئے ۔ جب ان سے پاک ہوئیں تو لوگوں سے ایک الگ مکان میں غسل کرنے کے لئے گئیں ۔ اور پردہ ڈال کر کپڑے اتارے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک کامل خلقت جوان کی صورت میں جبریل کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا ۔ حضرت مریمؑ نے ان کو دیکھا ۔ اور وہ خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں ۔ ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا اور دل سے اللہ کے حضور دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے ۔ پھر اس کو ایک عجیب حالت پیش آئی ۔ طبیعت میں قوائے نسلیہ کا ہیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت کی) کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے ۔ جیسے کسی کو نظر کرنے سے انزال ہو جاتا ہے .... حضرت جبریل نے جب ان کے حال کو دیکھا تو ان کے ستر میں پھونک لگا دی ۔ اس پھونک سے اس میں تأثر پیدا ہوا اور وہ منزل ہو گئیں ۔ حضرت مریمؑ کے نطفہ میں مرد کے نطفہ جیسی قوت تھی اس لئے وہ حاملہ ہو گئیں ۔

(بحوالہ مولانا عنایت اللہ اثری کا کتابچہ "بہتان الصریح علی الروح و مریم والمسیح ۔ ص۲۰۵ مرقومہ طلوعِ اسلام ۔ فروری ۵۶ء)

اور اہلِ حدیث کے ممتاز عالم، نواب صدیق حسن خاں (مرحوم) نے تو حد ہی کر دی ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت مریمؑ کے پاس آنے والا

جبریل نہیں تھا بلکہ عیسیٰ علیہ السلام خود ایک کامل انسان کی شکل بن کر حضرت مریمؑ کے سامنے آ کھڑا ہوا اور باتیں کرتے کرتے اس کے اندر داخل ہو کر خارج ہوا تو اس کا بیٹا کہلایا[2]۔ (بحوالہ ایضاً ص۱۱)

آپ نے غور فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدے سے کس کس قسم کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور انہیں کس کس طرح حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں (معاذ اللہ) ۔

---

[1] یہ تینوں اقتباسات سید عبدالقیوم صاحب کی کتاب حقیقت المسیح (ص۹۰-۹۷) سے ماخوذ ہیں ۔

[2] مرزا غلام احمد قادیانی اپنے متعلق کہتے ہیں :۔

مریم کی طرح عیسیٰؑ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا، اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس سے زیادہ نہیں، بذریعہ اسی الہام کے مجھے مریمؑ سے عیسیٰ بنایا گیا ۔ اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا ۔ (کشتی نوح ۔ ص۴۷)
بحوالہ مولانا اثری

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ حضرت مریمؑ کے خواب کا ہے۔ میں بھی کبھی اسی خیال کا تھا لیکن قرآن کریم میں مزید غور اور تحقیق سے کچھ اور بات سمجھ میں آئی۔

روح کے معنے وحی کے بھی ہیں (دیکھئے لغات القرآن) اور جب خدا کا رسول، وحی خداوندی کی رو سے حاصل شدہ کسی حکم کو دوسروں تک پہنچاتا ہے تو اسے بھی، ان لوگوں کی طرف وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے خدا نے اپنے کسی رسول کی وساطت سے حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف حکم بھیجا کہ بچے کو دریا میں بہادے تو اُسے اَوْحَيْنَا اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰی (۲۰/۳۸) کہا گیا۔ ان تصریحات کی روشنی میں: وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا کے معنے ہوں گے ـــــ خدا نے حضرت زکریاؑ کی وساطت سے حضرت مریمؑ کی طرف پیغام بھیجا ـــــ حضرت زکریاؑ نے یہ پیغام اس شخص کی معرفت بھیجا جسے انہوں نے حضرت مریم کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے منتخب اور آمادہ کیا تھا۔ (یعنی اناجیل کے بیان کی رو سے یوسف نجار) بَشَرًا سَوِيًّا سے یہی نوجوان مراد ہے۔ اب رہا لفظ تَمَثَّلَ۔ سو لغت کی رو سے اس کے معنے "داستان زدن" یعنی بات کرنے کے بھی آتے ہیں۔

روح کے معنے

لہٰذا، آیت (۱۹/۱۷) کے معنے یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ ان پریشانیوں میں افسردہ خاطر رہتی تھیں کہ حضرت زکریاؑ نے ان کی طرف خدا کا پیغام دے کر ایک نوجوان کو بھیجا۔ اس اجنبی جوان کو دیکھ کر حضرت مریم نے کہا: قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا (۱۹/۱۸)۔ "اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے تو میں تجھ سے، خدائے رحمٰن کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں"۔ اس نوجوان نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں: قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹/۱۹)۔ "میں تیرے رب، کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں"۔ یہاں لفظ "رب" سے مراد اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس کے لغوی معنوں میں "پرورش کرنے والا" (مربی) لیا جائے، تو اس سے مراد حضرت زکریاؑ ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے ـــــ اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ (خدا) تجھے ایک عمدہ نشوونما پانے والا بچہ عطا کرنا چاہتا ہے۔

ان الفاظ سے نظر بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا اس نوجوان نے کھٹ سے یہ الفاظ کہہ ڈالے لیکن ـــــ ایک تو اس لئے کہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے، قرآن کریم کسی واقعہ کی تمام کڑیاں بالترتیب خود ہی بیان نہیں کر دیتا۔ ان کے درمیان (GAPS) چھوڑ دیتا ہے کہ ہم اپنے فہم و بصیرت سے انہیں پُر کر لیں۔ اسے (FILL IN THE BLANKS) کا طریق کہتے ہیں جو ادبی نقطۂ نگاہ سے بڑا لطیف انداز بیان ہوتا ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے پہلے فَتَمَثَّلَ کے لفظ نے اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ اس نوجوان نے ساری بات بڑی تفصیل سے بیان کر دی تھی اور اس کا ملخص یہ تھا کہ مشیت خداوندی یہ چاہتی ہے: قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (۱۹/۲۰) جیسا کہ آیت (۳/۴۶) کے تحت بیان

کیا جاچکا ہے، حضرت مریمؑ نے کہا کہ میں نے نہ شادی کی ہے اور نہ ہی میں (معاذاللہ) حرامکاری کی مرتکب ہوئی ہوں، تو میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا؟ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ (۱۹/۲۱) اس نے کہا کہ ایسا کچھ خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق ہوگا ـــ یہی الفاظ آیت (۳/۴۷) میں آئے ہیں۔ نیز حضرت یحییٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں بھی (آیت ۳/۴۰ میں) آئے ہیں۔ اور یہ بات بھی (خدا کے ہاں) طے شدہ ہے کہ وہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ خدا کا رسول ہوگا۔ اس طرح وہ لوگوں کے لئے رحمتِ خداوندی کا موجب اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا ذریعہ بنے گا: وَلِنَجْعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ (۱۹/۲۱)۔

چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع دور ہوتے گئے۔ (حضرت) مریم کے دل سے ضوابط خانقاہیت سے سرکشی برتنے کے عواقب کا خیال دور ہوگیا، ان کی شادی اس شخص سے ہوگئی: فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِۦ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹/۲۲)۔ مریم کو ہونے والے بچہ کا حمل قرار پاگیا۔ لیکن چونکہ اس معاشرہ میں طعن و تشنیع نے ابھی تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا، انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ اس گاؤں سے کہیں دور چلے جائیں تاکہ بچے کی ولادت کسی ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو۔

اس داستان کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات اس مقام پہ بیان ہوں گے جہاں سورۂ مریم ہمارے سامنے آئے گی۔ اس سورۃ میں اس تمام سرگزشت کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ .... (۱۹/۳۴) یہ ہے عیسیٰ ابنِ مریم کی صحیح صحیح سرگزشت جس کے بارے میں لوگ اس قدر اختلاف کرتے ہیں سچی بات خدا ہی بیان کرسکتا تھا۔ سو اس نے بیان کردی۔

اور اسی ارشادِ خداوندی کے تتبع میں، میں بھی عرض کروں گا کہ یہ ہے پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں وہ حقیقت جسے میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھا ہوں۔ اس کے باوجود جو حضرات یہی سمجھیں کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے، انہیں ان کا عقیدہ مبارک۔ میں ان سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر کفر و ایمان کا مدار ہو۔

اس کے بعد آجائیے پھر سورۂ آلِ عمران کی طرف جس کی آیت (۳/۴۸) کے یہ الفاظ سامنے آچکے تھے کہ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَاءِيلَ۔ حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے رسول تھے۔ پوری آیت اس طرح ہے:-

۳/۴۸ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَاءِيلَ ۥ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِـَٔايَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّيٓ أَخْلُقُ
لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ

اَلۡاَکۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۚ (۳/۴۸)۔

اس آیت میں پھر ایک (بظاہر) مشکل مقام آجاتا ہے جس کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کے "معجزات" سے ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے، کچھ تمہیدی گفتگو ضروری ہے۔ اس آیت کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

معجزات

اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشان لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۲۵۲-۲۵۳)

انہیں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات قرار دیا جاتا ہے اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن میں اور لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے تو مٹی کی چڑیاں بنا کر ان میں پھونک مارتے تھے تو وہ اڑنے لگ جاتی تھیں۔ باقی معجزات بعد کی عمر کے بتائے جاتے ہیں[1]۔

مذاہب کی دنیا میں معجزات کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اس کے برعکس دین کی عمارت علم و بصیرت پر استوار ہوتی ہے۔ معجزہ کے معنی ہوتے ہیں ایسا واقعہ جو فطرت کے قوانین کے خلاف ظہور میں آئے اور اس کے سمجھنے سے عقل عاجز آجائے۔

معجزات کی اصولی بحث

اس نہج سے دین میں صرف وحی معجزہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی کنہ اور ماہیت غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کی کنہ اور ماہیت تو سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن جو کچھ وحی میں کہا جاتا ہے (یعنی وحی کا متن) وہ علم و بصیرت اور فہم و تدبر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم نے مطالب الفرقان (جلد اوّل صفحہ ۳۹ زیر آیت (۲/۲۲)) میں بتایا تھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ اپنی دعوت، دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتے لیکن محسوسات کا خوگر انسان ان کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں محسوس نشانات، یعنی معجزات طلب کرتا۔ کتب سابقہ تو محرف ہیں اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے مطالبات کے جواب میں انبیاء کرامؑ کیا ارشاد فرماتے تھے۔ لیکن نبی اکرمؐ کے سلسلے میں قرآن نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ حضورؐ کی طرف سے اس قسم کے مطالبات کا جواب انکار میں دیا جاتا رہا (تفصیل مذکورہ بالا

---

[1] یہی الفاظ آگے چل کر اس مقام پر بھی آئے ہیں جہاں حضرت عیسیٰؑ نے اپنا دعوئے نبوت پیش کیا تھا۔

حوالہ میں دی جا چکی ہے)۔

قرآن مجید میں انبیاءؑ سابقہ کے سلسلہ میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جن سے نظر بظاہر دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے "معجزات" دکھائے تھے۔ انہی مقامات میں ایک مقام حضرت عیسیٰؑ سے بھی متعلق ہے جس کا ذکر آئیہ زیر نظر (۴۸) میں آیا ہے اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب ہم اُس خدا پہ ایمان لاتے ہیں جو اس حیرت انگیز کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ تو اس بات کے تسلیم کرنے میں ہمیں کیا تأمل یا توقف ہو سکتا ہے کہ خدا اس قسم کے واقعات ظہور میں لایا تھا جو خارقِ عادت یا فوق الفطرت تھے اور جن کی کنہ و حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ خدا قادرِ مطلق ہے اور وہ ہر آن ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن "کر سکتا ہے" اور "کرتا نہیں" میں بڑا فرق ہے۔ ہم مطالب الفرقان کی سابقہ جلد میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ اب یہ سلسلہ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلتا رہے گا اور وہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں کرے گا۔ ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ابن اللہ کے عقیدہ کی تردید بھی اسی دلیل کی رو سے کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ قادرِ مطلق تو ایسا ہے کہ وہ اس عظیم کارگہ کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے لیکن اب اس نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ کائنات میں سب کچھ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوگا۔ اس لئے وہ اب ایسا نہیں کرے گا کہ عورت اور مرد کے اختلاط کے بغیر بچہ پیدا ہو جائے۔ یہ خود خدا کا فیصلہ ہے (کہ وہ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا)۔ لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ اب کوئی واقعہ خلافِ قانونِ فطرت ظہور میں نہیں آسکتا وہ اللہ تعالےٰ کے اسی غیر متبدل فیصلہ کی رُو سے ایسا کہتا ہے۔

"معجزات" سے حاصل کیا ہُوا؟

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ اگر معجزات سے مراد خلافِ فطرت واقعات کا ظہور میں لانا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے (ظہورِ معجزات سے) اپنے عظیم اصولوں کو توڑا بھی (یعنی اسی اصول کو کہ وہ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا) تو اس سے حاصل کیا ہوا؟ (مثلاً اگر) حضرت عیسیٰؑ نے سچ مچ مٹی کی چڑیوں کو اڑا کر دکھا دیا۔ اندھوں کو بینائی عطا کر دی۔ جذامیوں کو ہاتھ پھیر کر اچھا کر دیا۔ حتیٰ کہ لوگوں کے سامنے مُردوں کو زندہ کر دیا، تو اس سے ہوا کیا؟ ان لوگوں میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لایا، نہ ہی ان کی مخالفت میں کوئی فرق آیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے (یہودیوں کے اعتراف اور اعلان کے مطابق) حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا! اگر حضرت عیسیٰؑ نے ایسا کچھ، سچ مچ کر کے دکھایا ہوتا تو کیا اس کا نتیجہ یہی نکلتا؟ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی ملنگ، یونہی اپنے بالوں سے دودھ کے قطرے نکال کر دکھاتا ہے، یا اس کی پھونک سے مریضوں کو شفا ہو جاتی ہے تو ایک دنیا اس کی گرویدہ اور معتقد ہو جاتی ہے۔ اور اسی کی نہیں بلکہ اس کے مرنے کے بعد، اس کی قبر تک کی پرستش کرنے لگ جاتی

ہے ۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ایسے ایسے محیر العقول معجزات دکھائیں اور یہودی ویسے کے ویسے ان کے دشمن اور جان کے لاگو رہیں ۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ "معجزات" ویسے نہیں تھے جیسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر ان واقعات کے متعلق کیا کہا جائے گا جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے اور جنہیں معجزات کہا جاتا ہے ۔اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے کہ وحی کا یہ انداز چلا آیا ہے کہ اس میں اکثر امور کو مثالوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے ۔ میں نے تبویب القرآن میں قرآنی مثالوں کی ایک مبسوط فہرست دی ہے ۔ انجیل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا خاص طور پر یہی اسلوب بیان تھا ۔آپ زیادہ نہیں، صرف متی کی انجیل کو دیکھئے ۔ اس میں قدم قدم پر مثالوں کے ذریعے سمجھائی گئی ہیں ۔ (مثلاً حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا :-

تمثیلات

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو (۷) ۔ تنگ دروازے سے داخل ہو کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے ... . (۷) اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس آدمی کی مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا .... پھر اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش پیش (اس کے بعد کئی تمثیلات درج ہیں ۔ مثلاً) انگوری باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل ۔ شہزادے کی شادی کی تمثیل وغیرہ ۔

(۱-متی - باب ۱۳)

متی کی انجیل باب ۱۳ میں لکھا ہے :-

اس نے ایک اور تمثیل انہیں سنائی کہ آسمان کی بادشاہت اس خمیر کی مانند ہے جسے کسی عورت نے لے کر تین پیمانے آٹے میں ملا دیا اور ہوتے ہوتے سب خمیر ہو گیا ۔ یہ سب باتیں یسوع نے بھیڑ سے تمثیلوں میں کہیں اور بغیر تمثیل کے وہ ان سے کچھ نہ کہتا تھا ۔ تاکہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ

میں تمثیلیں کہنے کو اپنا منہ کھولوں گا ۔ (زبور) (متی - ۱۳ ۳۵-۳۳)

متی باب ۱۳ آیت دس میں ہے :-

شاگردوں نے پاس آ کر اس سے کہا تو ان سے تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے ؟ اس نے جواب میں ان سے کہا اس لئے کہ تم کو آسمان کی بادشاہت کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے مگر انہیں نہیں دی گئی .... میں ان سے تمثیلوں میں اس لئے باتیں کرتا ہوں کہ دیکھتے اور پھر نہیں دیکھتے اور سنتے ہیں اور پھر نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا اندازِ بیان یہی تھا کہ وہ بلند حقائق کو تمثیلات کی رو سے واضح کیا کرتے تھے ۔ اس سے

یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ زیر نظر آیت (۳/۴۹) میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ تمثیلات ہیں۔ تمثیلات میں استعمال کردہ الفاظ کے معانی لغوی نہیں لئے جاتے بلکہ مجازی لئے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ اسلوب عام تھا اور چونکہ قرآنِ کریم اسی زبان کے اسلوب کے مطابق نازل ہوا ہے اس لئے ایسے مقامات پر اس قسم کے الفاظ کے معانی لغوی نہیں بلکہ مجازی لئے جائیں گے۔ امام ابن قتیبہ نے لکھا ہے :-

مجازی معانی

عرب کے لوگ کلام میں مجازی معانی بھی لیتے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں بات کرنے کے کئی طریقے اور کئی ہوتے ہیں۔ چنانچہ استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، حذف، تکرار، خفاء، اظہار، تعریض، افصاح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا، اور جمع کو واحد کے صیغے سے۔ خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص۔ غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں جو آپ کو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں . . . .
قرآن کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کر سکتا۔ (قرطبین۔ جلد دوم۔ صـ ۱۶۳ بحوالہ لغات القرآن۔ جلد اوّل)

اور یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم پیش کیا ہے۔ اگر آپ زیر نظر آیت کے الفاظ کے مجازی معانی لے کر اس کا مفہوم سامنے لے آئیں تو جو کچھ حضرت عیسےٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ وحی کے بسیط حقائق کو سمجھانے کے لئے خود قرآن کریم نے اسی قسم کی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۷/۱۷۶) "ہم چاہتے تھے کہ اس خاک افتادہ قوم کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیں لیکن یہ (بد نصیب قوم) زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹے رہی اور اس نے اوپر اُٹھنے کا نام ہی نہ لیا"۔

تشبیہات

یہ تشبیہ خود ہمارے ہاں بھی عام ہے۔ کمزور و ناتواں قوم کو پابندِ قفس، بے بال و پر پرندے سے تشبیہ دی جاتی ہے اور قوی اور توانا قوم کو فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے شاہین سے۔ اقبالؒ نے (زندہ) اُمّتِ مسلمہ کے متعلق کہا ہے کہ

پَرد در وسعتِ گردوں یگانہ   نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

اور ہم خاک آلودہ بے بال و پر، قوم سے کہا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری   بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را

یہی (پرندے) کی تشبیہ حضرت عیسےٰؑ نے دی تھی۔

جہاں تک مُردوں کو زندہ کرنے کی تشبیہ کا تعلق ہے یہ بھی قرآنِ کریم میں عام استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں ہے،،

اَوَ مَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ‌ؕ (۶/۱۲۲) "ذرا سوچو کہ کیا وہ قوم جو پہلے مردہ تھی۔ اسے ہم نے زندگی عطا کی۔ اور اسے ایسی نورانی شمع دی جس کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ وہ خود صحیح راستے پر چلے بلکہ نوعِ انسان کو بھی صحیح راستہ دکھائے، ان لوگوں کی مانند ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہوں اور ان سے نکلنا ہی نہ چاہیں؟" سورۂ انفال میں مؤمنین کو خطاب کر کے کہا ہے کہ اِسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ‌ۚ (۸/۲۴) "تم اللہ اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں حیاتِ تازہ عطا کر دے گی"۔ ایسا ہی حضرت عیسٰیؑ نے کہا تھا۔

اکمہ (مادہ ک۔م۔ہ) اندھے کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی جو صحیح راستے پر نہ چلے بلکہ جو نہی جدھر چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ نیز کَمِہَ فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں اس کی عقل جاتی رہی۔ (لغات القرآن)

اسی طرح برص، جذام (کوڑھ یا پھلبہری) کو بھی کہتے ہیں اور اس زمین کو بھی جس پر سرسبزی اور نمود تازگی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ہو۔ بالکل ویران اور بنجر ہو چکی ہو۔ (لغات القرآن)

آپ بنی اسرائیل (یہودیوں) کی اُس زمانے کی زبوں حالی کو نگاہ میں لائیے اور پھر ان تشبیہات پر غور کیجئے جن کی رو سے حضرت عیسٰیؑ نے انہیں بتایا تھا کہ ان کا علاج کس طرح ہو سکتا ہے ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔ میں نے اپنی تمثیلات اور تشبیہات کی روشنی میں (مفہوم القرآن میں) زیرِ نظر آیت (۳/۴۸) کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:۔

(۳/۴۸) کا مفہوم

> اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ سے یہ بھی کہا کہ تمہارا بیٹا عام لڑکوں جیسا نہیں ہوگا۔ خدا اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا اور یوں اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ (۳/۴۸)
>
> وہ اس قوم سے جس کے عروق مردہ میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی، کہے گا کہ میں تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں۔
>
> میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیاتِ نو عطا کر دوں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی (۳/۴۹)۔
>
> یہ آسمانی روشنی تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی جس پر تر و تازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے ایک نئی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔

میں تمہارے موجودہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لاتے ہو اور کس قدر ذخیرہ (HOARDING) کرتے ہو کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے۔

اس قانون اور نظام میں تمہارے لئے باز آفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کرو۔

(یہی الفاظ (۵/۱۱۰) میں بھی آئے ہیں)

یہ تھے انقلاب آفرینی کے وہ "معجزات" جنہیں حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آسمانی پیغام کی رو سے قوم بنی اسرائیل کے سامنے پیش کئے۔

معاشی انقلاب

ان انقلابات کی نوعیت کیا تھی اسے تو آگے چل کر بیان کیا جائے گا لیکن جس معاشی نظام کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کی ایک جھلک ہمیں انجیل متی کے چھٹے باب میں ملتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے متبعین سے کہا:۔

اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا..... یاد رکھو! کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے .... فضا فضا میں اڑنے والے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔ (آیات ۱۹-۲۶)

انجیل متی باب ۱۱۔ آیت ۲۸ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اعلان کیا:۔

اے محنت کشو! اے بوجھ سے دبے ہوئے مزدورو سب میرے پاس آؤ میں تمہیں آرام دوں گا۔

انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا اس کا نقشہ کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال ۲/۴۴-۴۵)

دوسری جگہ ہے:۔

اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا مال نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں

مشترک تھیں . . . . اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک چیز کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال ۔ ۴/۳۵-۳۲)

اس نظامِ ربوبیت کی مزید تفصیل اس مقام پر ملے گی جہاں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں انسانوں کی محتاجی سے چھڑا کر اپنے ہاں سے رزق عطا کرے ۔ (۵/۱۱۵-۱۱۴)

یہ تھا وہ نظام جسے حضرت عیسیٰؑ نے اس تمثیلی انداز میں بیان کیا تھا کہ میں جانتا ہوں جو کچھ تم صرف میں لاتے ہو اور جو کچھ چھپا کر رکھتے ہو۔

یہ حقیقت کہ کتب اناجیل میں جو "واقعات" بطور معجزات بیان ہوئے ہیں، وہ فی الحقیقت واقعہ شدہ امور نہیں تھے بلکہ

معجزات تمثیلی تھے

حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ تمثیلات کی زبان اور استعارات کے رنگ میں سمجھایا تھا، انہیں بعد کے سوانح نگاروں (متبعین اناجیل) نے سچ مچ کے واقعات کی شکل میں پیش کر دیا، اب خود دنیائے عیسائیت میں مرکز تحقیق و توجہ بن رہی ہے۔ حال ہی (۱۹۷۷ء میں) کو الف حضرت مسیح سے متعلق ایک اہم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے JESUS: AN HISTORIANS REVIEW OF THE GOSPELS.

اور اس کے مصنف ہیں تاریخ عیسائیت کے بڑے نامور عالم، (MICHAEL GRANT) انہوں نے اپنی کتاب میں حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کردہ معجزات کی حقیقت پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ خود حضرت عیسیٰؑ ان "معجزات" کو محض تمثیلات سمجھتے تھے۔ (ص ۳۷)۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے :-

خالص تاریخی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ معجزات فی الواقعہ ظہور میں نہیں آئے تھے۔ (مؤرخ تو ایک طرف) انجیل کا نامور مرتب، سینٹ جون (یوحنا) بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا۔ مثلاً جب وہ 'مردے کے جی اٹھنے" جیسا سب سے زیادہ ناممکن الوقوع معجزہ بیان کرتا ہے تو وہ اسے استعارہ ہی قرار دیتا ہے' (ص ۳۹)۔ انجیر کے درخت والے معجزہ کو لوقاؔ محض تمثیلی بیان قرار دیتا ہے۔ (ص ۴۲)

بحث کے آخر میں پروفیسر گرانٹ نے لکھا ہے کہ اور تو اور، خود حضرت مسیح بھی "معجزات" کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے شاگردوں نے کہا کہ معجزات ان سے بھی ظہور میں آتے ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ "یہ امر قابلِ مسرت نہیں ہے کہ فطرت کی قوتیں تمہارے سامنے جھک جاتی ہیں، قابلِ مسرت یہ بات ہے کہ تمہارے نام آسمانی تختی پر نقوش ہو جائیں"۔ (ص ۴۴)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ معجزات کے متعلق جو ہم نے کہا ہے کہ یہ "واقعات" کا بیان نہیں بلکہ بلند اور بسیط حقائق کو سمجھانے کا تمثیلی انداز ہے، تو خود دنیائے عیسائیت کے ارباب علم و تحقیق اب اسی نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔

ہم بات کر رہے تھے حضرت عیسیٰؑ کی انقلابی دعوت کی جسے وہ تمثیلات اور استعارات کے رنگ میں پیش فرماتے تھے اس دعوت کی تفصیلات سے پہلے آپ ان دو آیات کو دیکھ لیجئے جو آیت (۳/۴۸) کے تسلسل میں آتی ہیں۔ یعنی

۳/ ۵۰-۴۹ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (۳/ ۵۰-۴۹)

وہ بنی اسرائیل سے یہ بھی کہے گا کہ یہ قانون، جو مجھے وحی کے ذریعے ملا ہے، کوئی نیا قانون نہیں۔ یہ ان باتوں کو سچا کر دکھائے گا جو، اس سے پہلے، تورات میں آچکی ہیں۔ اور جو خود ساختہ پابندیاں تم نے (شریعت کے نام سے) خواہ مخواہ اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں، ان سے تمہیں آزاد کر دے گا۔ نیز (حلال و حرام کی) ان پابندیوں سے بھی جو تم پر تمہارے جرم بغاوت کی سزا کے طور پر عائد کی گئی تھیں۔ (۴/۱۶۰؛ ۶/۱۴۷؛ ۱۶/۱۱۸)۔

غرضیکہ وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارے نشو و نما دینے والے کا قانونِ حیات لایا ہوں۔ تم اس قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تم اس طرح کرو جس طرح میں کہتا ہوں۔ (اس سے تم میں وہ اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جو دین کا مقصود ہے)۔

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ تمہاری اور میری، سب انسانوں کی، نشو و نما کا ذمہ دار خدا ہے۔ اس لئے، حکومیت صرف اسی کی اختیار کی جا سکتی ہے۔

یہ ہے وہ سیدھی اور متوازن راہ جو تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریم اور ان کے شوہر کس طرح اپنے وطن سے دور چلے گئے تاکہ بچے کی پیدائش ان لوگوں کے سامنے نہ ہو جو ان کے اس قدر مخالف تھے۔ سورۂ مریم میں بتایا گیا ہے کہ راستے میں کس طرح اس بچے کی پیدائش ہوئی اور اس وقت حضرت مریم کے اضطراب کا کیا عالم تھا —— اسی طرح جیسے وضع حمل کے وقت عورتوں کی حالت ہوتی ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ پریشانی (دیکھئے آیات ۱۹/ ۲۶-۲۲)۔

پیدائش کے بعد اور وطن کی طرف واپسی کے زمانے کے دوران حضرت عیسیٰؑ (بلکہ یوں کہئے کہ اس خاندان) نے کہاں اور

وطن کی طرف مراجعت

کیسے زندگی بسر کی اس کے متعلق اناجیل سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم سے فقط ایک اشارہ ملتا ہے جس میں کہا گیا ہے: وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (۲۳/۵۰)۔ "ہم نے انہیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی"۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مصر کا کوئی علاقہ تھا لیکن رینان کہتا ہے کہ یہ کنبہ قانا کے علاقہ کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ یہ اس اجنبی دیار میں کتنے عرصے تک رہے اس کے متعلق اناجیل میں متضاد بیانات ملتے ہیں۔ عام طور پر کہا گیا ہے کہ مراجعت وطن کے وقت حضرت عیسیٰؑ کی عمر سات برس کی تھی یا زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی۔ جب آپ نے تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو، انجیل لوقا کے مطابق، آپ کی عمر اکتیس برس کی تھی۔ رینان نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس وقت آپ کی عمر تیس برس تھی اور اس کے قریب اٹھارہ ماہ بعد واقعۂ تصلیب ظہور میں آگیا تھا۔ گویا اس اعتبار سے آپ کی مدتِ نبوت قریب ڈیڑھ سال تھی، اور بعض بیانات کے مطابق زیادہ سے زیادہ تین برس۔

قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں اس لئے وہ اس قسم کی بحثوں میں نہیں پڑتا۔ اسے حضرات انبیاء کرام کی تعلیم اور ان کے پیدا کردہ انقلاب سے واسطہ ہوتا ہے اور وہ اسی کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ جب حضرت مریمؑ وطن واپس آئیں (یا جب حضرت عیسیٰؑ نے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کا آغاز فرمایا) تو حضرت عیسیٰؑ سواری پر آئے تھے (۱۹/۲۷)۔ اور انہوں نے اعلان فرمایا کہ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا (۱۹/۳۰): "میں خدا کا عبد ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب حضرت عیسیٰؑ کو نبوت مل چکی تھی۔

ان امور کی تفصیل سورۂ مریمؑ کی آیات (۱۹/۲۷-۳۴) میں پیش کی جائے گی لیکن ان میں ایک نکتہ ایسا ہے جس کی وضاحت اس مقام پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ آیات (۱۹/۲۷-۲۹) میں ہے:-

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَـيْـــــًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (۱۹/۲۷-۲۹)

ہیکل کے پجاریوں کی الزام تراشی

(اسی طرح عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ میاں بیوی، اس بچے کو لے کر، کسی دور مقام میں جا بسے وہ بڑا ہوا۔ شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا تو اس کی والدہ اسے سواری پر ساتھ لے کر اپنے وطن میں واپس آئیں۔ (ایک تو لوگوں کے نزدیک، مریم کی یہ حرکت ہی

کچھ کم قابلِ اعتراض نہ تھی کہ اس نے راہبہ بن جانے کے بعد، ہیکل کے ضابطہ کے خلاف اس طرح متاہل زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے احبار و رہبان کی خود ساختہ شریعت اور ان کی سیرت و کردار کے خلاف سختی سے نکتہ چینی ہوتی تھی) چنانچہ وہ لوگ مریم سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب و غریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا انوکھا بیٹا لے کر آگئی!

وہ (حضرت مریمؑ) سے کہتے کہ اے اُختِ ہارون! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا۔ نہ ہی تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین وضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ (تم تو ایک شریف، مذہب پرست، پابند شریعت گھرانے کی لڑکی تھی۔ تم نے یہ کیا کیا، اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی؟)۔

اس کے جواب میں وہ خود کچھ نہ کہتی بلکہ عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کر دیتی کہ اپنی بات کا جواب اس سے لو۔ (بوڑھے احبارؔ و رہبان، اپنی پیشوائیت کے گھمنڈ میں، نہایت نخوت و تکبر سے کہتے کہ) کیا ہم اس سے بات کریں جو ابھی کل تک جھولا جھولتا تھا!

ان آیات کا مطلب، مذکورہ بالا مفہوم سے واضح ہے لیکن اعجوبہ پسند طبائع کو ان میں بھی ایک معجزہ نظر آتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو تسلی دینے کے لئے ان کی طرف یہ پیغام پہنچایا تھا کہ تمہارا بیٹا تندرست و توانا اور نہایت اعلیٰ خصائل کا حامل ہوگا: وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (۳/۴۵) "وہ بچپن میں بھی تندرست بچوں کی طرح باتیں کرے گا اور عمر بھی بڑی پائے گا۔" اس آیت سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ معجزانہ طور پر جھولے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اس کی تائید میں سورۂ مریم کی آیت (۱۹/۲۹) یہ کہہ کر پیش کر دی جاتی ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ ابھی جھولے میں تھے جب حضرت مریمؑ نے اس بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ مجھ سے نہ پوچھو۔ اس بچے سے پوچھو۔ اور ہیکل کے مقدسین نے جواب میں کہا تھا کہ ہم اس بچے سے کیا پوچھیں جو جھولے میں لیٹے ہوئے ہے؟ یہ سن کر اس بچے (حضرت عیسیٰؑ) نے جھولے سے جواب دیا کہ "میں خدا کا عبد ہوں۔ اس نے مجھے نبوت اور کتاب عطا کی ہے۔" (۱۹/۳۰)۔ اس سے حضرت عیسیٰؑ کا یہ معجزہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جھولے ہی میں اپنی نبوت کا اعلان کر دیا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آیات (۳/۴۵) اور (۱۹/۲۹-۲۷) کا جو مفہوم ہم نے پیش کر دیا ہے اس کی روشنی میں اس باب میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ جھولے میں لیٹا ہوا طفل شیر خوار یہ نہیں کہے گا کہ خدا نے مجھے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور مجھے کتاب دی ہے۔

اس زمانے میں بنی اسرائیل کی کیا حالت تھی اسے مطالب الفرقان کی دوسری جلد میں بڑی تفصیل سے پیش کیا جاچکا ہے (ان مقامات کو "بنی اسرائیل" کے تحت انڈکس کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے)۔ مختصراً یہ کہ ذلت اور دنائت کی کوئی ایسی

بنی اسرائیل کی حالت

خرابی نہیں تھی جو ان میں پیدا نہ ہو چکی ہو اور محتاجی و محکومی کی کوئی زنجیر ایسی نہیں تھی جس میں وہ جکڑے ہوئے نہ ہوں۔ ان کی حالت اُس زمانے سے بھی ابتر تھی جب حضرت موسیٰؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ اُن رومیوں کا استبداد (جن کی محکومی کے شکنجے میں یہ جکڑے ہوئے تھے) فرعون کے استبداد سے بھی زیادہ استخوان شکن تھا اور ان کے احبار و رہبان کی ابلہ فریبیاں اور مکاریاں، ہامان اور اس کے جنود سے بھی زیادہ موجب سلب و نہب۔ یہ تھی وہ قوم جسے حیاتِ نو عطا کرنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے۔ عیسائیت کی مروّجہ تعلیمات کی رُو سے حضرت مسیحؑ کی شخصیت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کچھ اس انداز کا ہے کہ ان کی زندگی ایک تارک الدنیا اور عاجز و ناتواں زاہد گوشہ نشیں کی سی تھی۔ ان کی تعلیم کچھ اس قسم کی سی تھی کہ ایک گال پر تھپیڑ کھا کر دوسرا گال آگے بڑھا دو۔

حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا غلط نقشہ

جو شخص تمہارا کرتہ لینا چاہے اسے اپنا چغہ بھی اتار کر دے دو۔ جو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس تک چلے جاؤ۔ دشمن سے بھی محبت کرو۔ شر کا مقابلہ نہ کرو۔ ظالم سے ظلم کا انتقام نہ لو۔ مظلومی، عاجزی اور انکساری کی زندگی بسر کرو وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ بظاہر بڑے خوش آئند اور دلآویز نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ حضرات انبیاء کرامؑ انقلابِ عظیم کی دعوت لے کر آتے تھے۔ ان کی بعثت کا مقصد ظلم و جبر کی قوتوں کے شکنجے توڑ کر مظلوم و مقہور انسانوں کو آزادی اور سربلندی عطا کرنا تھا۔ ان کی دعوتِ انقلاب اس نصب العین کی نقیب تھی کہ خدا کے آزاد پیدا کردہ انسانوں کو ملوکیت، سرمایہ داری، مذہبی پیشوائیت اور اس قسم کی دوسری زنجیروں میں مقید نہیں رکھا جاسکتا۔ حضرت عیسیٰؑ یقیناً اسی انقلاب آفرین اور جہاد انگیز پیغام کے داعی تھے۔ ان کے سامنے دو محاذ تھے جن سے انہوں نے ٹکر لینی تھی۔ مذہبی پیشوائیت (یعنی ہیکل کے پجاریوں) کا محاذ اور رومن حکومت (یعنی قیصر) کا محاذ۔ بظاہر یہ دو محاذ الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا باہمی گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ نہ ملوکیت

حضرت عیسیٰؑ کے انقلاب آفریں وعظ

مذہبی پیشواؤں کی تائید کے بغیر قائم رہ سکتی ہے اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت حکومت کی عطا کردہ قوت کے بغیر زندہ۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے جہاد کا آغاز مذہبی پیشوائیت کی مخالفت سے کیا۔ وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک حق گو

پیغامبر انقلاب کی طرح ان سے پوری جرأت کے ساتھ کہتے[1] :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنّم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مُقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مَقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کون سا بڑا ہے۔ سونا یا مُقدس جس نے سونے کو مُقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دھمکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے . . . . اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اُونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو — جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو . . . . اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنّم کی سزا سے کیونکر بچو گے ؟ (متی باب ۲۳ - آیات ۳۶-۱)

اور وہ کبھی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ

دیکھو! یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو . . . وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور وہ اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تو تھے مذہبی پیشوائیت کے خلاف حضرت عیسیٰؑ کے نعرہ ہائے انقلاب۔ جہاں تک رومیوں کی حکومت کی جگہ حکومتِ خداوندی کے قیام کا تعلق ہے۔ اناجیل میں اس کی تفصیل تو نہیں ملتی لیکن کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آجاتی ہے، اور دورِ حاضرہ کی تحقیقات سے اس کی تائید بھی ہو رہی ہے۔ انجیل متی میں ہے کہ آپ نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا :- ،

---

[1] حضرت عیسیٰؑ کے یہ انقلاب آفریں وعظ، مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صـ۱۶۳ پر دیئے جا چکے ہیں لیکن موضوع کے تسلسل کے لئے انہیں یہاں درج کرنا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ بیٹے کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ (متی ۱۰ : ۳۴-۳۸)

انجیل برنباس کی فصل ایک سو اڑتیس میں ہے :۔

حکومت خداوندی کے قیام کے داعی

تب ملک کے لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنانا چاہیے

اس کے بعد فصل ایک سو انتالیس میں ہے کہ انہوں نے فرمایا :۔

عنقریب کاہنوں کے سردار اور قوم کے شیوخ مجھ پر اٹھ کھڑے ہوں گے اور رومی حاکم میرے قتل کا حکم طلب کریں گے کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کا ملک غصب کر لوں گا۔

رومی حاکموں کا اندیشہ تو قابلِ فہم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کاہنوں کے سردار اور مشائخ حضرت عیسیٰؑ کی کیوں مخالفت کرتے تھے حالانکہ وہ تو ان ہی کی آزادی اور سربلندی کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے؟ ان کے اس خوف اور ہراس کی وجہ انجیل برنباس میں برملا انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے :۔

مذہبی پیشوائیت کے خطرات

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

آپ نے غور کیا، کہ مسئلہ سارا معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھائے تھے! اسکے بعد انہوں نے جو کہا وہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکولر نظامِ حکومت خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق سیاسی امور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دین کے نظام میں مذہبی اور سیاسی دونوں دوائر، حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا :۔

سیکولر حکومت کی تنویت

اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا خدا رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس صفحہ ۱۴۲)

انجیل برنباس میں ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ "ان لوگوں کو یہی خیال دامنگیر تھا کہ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا اور اس نے اپنے آپ کو بادشاہ بنا لیا تو پھر کیا نتیجہ ہوگا"۔ جیسا کہ مذہبی پیشوائیت کا شیوہ ہے، انہوں نے حکومت سے ساز باز کی کہ اس فتنے کو (جو مذہبی پیشوائیت اور حکومت دونوں کے لئے خطرۂ جان تھا) جڑ سے اکھیڑ دیا جائے۔ انجیل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلے انہوں نے کوشش کی کہ حضرت عیسیٰؑ سے حکومت کے خلاف کچھ کہلوا کر انہیں پکڑوا دیا جائے۔ چنانچہ متّی کی انجیل میں ہے کہ

یہودیوں کی سازش

اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باطل میں پھنسائیں؟ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں (یعنی حکومت کے جاسوسوں) کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے کہا اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا کیونکہ تو کسی کا طرفدار نہیں۔ پس ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا۔ اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو۔ متی (۲۲-۱۵)[1]

جب آپ ان کے دامِ تزویر میں گرفتار نہ ہوئے تو انہوں نے وہ حربہ استعمال کیا جو مذہبی پیشوائیت کے ترکش کا آخری تیر ہوتا ہے۔ انہوں نے آپ کے خلاف یہ جرم عائد کر کے کہ یہ مسیحِ موعود ہونے کا جھوٹا دعوےٰ کرتا ہے، انہیں مفتری علی اللہ قرار دے دیا۔ اور اس طرح انہیں صلیب دینے کے لئے "شرعی جواز" پیدا کر لیا۔ لیکن وہ کسی کو سزائے موت اپنے اختیار سے نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے لئے انہیں رومی گورنر سے توثیق کرانے کی ضرورت تھی۔ اس طرح وہ انہیں ایک مجرم کی حیثیت سے کشاں کشاں گورنر کی عدالت میں لے گئے (MARCELLO CRAVERI) جس کی کتاب (THE LIFE OF JESUS) کا ذکر پہلے آ چکا ہے، نے لکھا ہے کہ جب رومی گورنر نے یہودیوں کے جرگہ سے پوچھا کہ مسیح کا کیا جرم ہے تو انہوں نے کہا:-

یہ شخص لوگوں سے کہتا ہے کہ انہیں خراج مت دو اور اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے۔ (صؔ ۳۸۵)

اس پر گورنر نے پوچھا کہ جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے بتاؤ کہ میں اسے کیا سزا دوں۔

سزائے موت

تو انہوں نے کہا کہ اسے صلیب دے دو۔ (صؔ ۳۹۰)

اس پر گورنر نے حضرت مسیحؑ کی سزائے موت کے فتویٰ پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ انجیل متّی میں ہے کہ جب آپ رومی سپاہیوں کی حراست میں تھے تو انہوں نے (معاذ اللہ) آپ کا تمسخر اڑایا:-

---

[1] اس کے جواب میں جو کچھ حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ محرف نظر آتا ہے۔ اس لئے ہم اسے نظرانداز کرتے ہیں۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان مذہبی پیشواؤں نے آپ کو پھنسانے کے لئے کس قسم کے حربے استعمال کئے تھے۔

انہوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جاکر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کر دی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب! اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چغے کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ (متی ۲۷ / ۳۱-۲۷)۔

اور ان تمام تفاصیل کے بعد ایک ضمنی شہادت! رومیوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جس شخص کو صلیب پر لٹکاتے اس کے ساتھ ایک تختی آویزاں کرتے جس پر لکھا ہوتا کہ اس شخص کو کس جرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہے۔ انجیل میں ہے کہ جو تختی حضرت عیسیٰؑ کی صلیب پر لٹکائی گئی تھی اس پر لکھا تھا :-

یہودیوں کا بادشاہ | یہ یہودیوں کا بادشاہ یسوع ہے (متی ۲۷ / ۳۷)

ہم نے ان تفاصیل کو یہ بتانے کے لئے درج کیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ اس خدا فراموش اور محکوم و مغلوب قوم کو روح اور بدن دونوں کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں آزادی کا راستہ دکھایا جائے۔ عصرِ حاضر کی تحقیق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ مسٹر (CECIL ROTH) اپنی مشہور تاریخ (A SHORT HISTORY OF THE JEWISH PEOPLE) میں لکھتا ہے :-

> حضرت مسیحؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی اربابِ حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالۂ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی۔ ان کے سامنے دو مقصد تھے۔ ایک طرف آپ اس مسیح موعود ہونے کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا اور دوسری طرف انہیں اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔

ہم نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی تفاصیل اناجیل اور دیگر مآخذ کی رو سے (سرِدست بلا تنقید و تبصرہ) پیش کی ہیں۔ قرآنِ مجید نے ان تفاصیل کا ذکر نہیں کیا لیکن انہیں ایک لفظ میں اس طرح سمو کر رکھ دیا ہے کہ اس ایجاز میں سارے اطناب سمٹ کر آجاتے ہیں۔ ہم سورۂ آلِ عمران کی آیت (۵۰) تک پہلے لکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد ہے :-

۳ / ۵۲ - ۵۱

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ

اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۳/ ۵۲-۵۱)۔

جب حضرت عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ یہودی ان کی مخالفت میں بہت آگے بڑھ رہے ہیں اور نہ معلوم وہ اگلا قدم کیا اٹھائیں تو انہوں نے اپنے رفقاء کی جماعت کو بلایا اور انہیں اس خطرہ سے آگاہ کر کے کہا کہ بتاؤ تم میں سے کون میرے اس خدائی مشن میں میرا مددگار رہے گا تو انہوں نے بیک زبان کہا کہ ہم آپ کے رفیق اور مددگار رہیں گے۔ ہم اس مشن کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ ہم آپ کی کس طرح اطاعت کرتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کیا کہ ہم اس ضابطۂ ہدایت پر ایمان لاتے ہیں جسے تو نے نازل کیا ہے۔ ہم اس مقصد کے لئے تیرے اس رسول کا اتباع کریں گے۔ تو ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں شمار کر لے جن کی زندگیاں اس قسم کے اقرار اور ایمان کی جیتی جاگتی شہادت ہوتی ہیں۔

یہ داستان تو اسی تسلسل کے ساتھ آگے چلنی چاہیئے تھی لیکن ہم تھوڑی دیر کے لئے رکتے ہیں یہ بتانے کے لئے کہ قرآن کی نگاہ کس قدر کشادہ اور اس کا دامن کس قدر وسیع ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے حواری

اناجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواری (شاگرد) تھے۔ ان میں سے ایک شاگرد (یہودا اسخر یوطی) نے غداری کی اور چند سکّوں کے عوض حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرا دیا۔ باقیوں کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے (متی ۲۶/ ۵۶)۔ یہ ہیں وہ حواری جنہیں عیسائیت میں "رسول" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جو اناجیل کے مؤلف ہیں اور جن سے مذہب عیسائیت آگے چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن کریم کو دیکھئے کہ وہ ان حواریوں کی کس قدر بلند سیرت پیش کرتا ہے۔ ایسی بلند سیرت کہ وہ جماعت مؤمنین سے کہتا ہے کہ تم بھی اپنے اندر ان ہی جیسا کیریکٹر پیدا کرو۔ ارشادِ خداوندی ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۔ ۔ ۔ ۔ (۶۱/ ۱۴)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے اپنے رسول کے اس طرح رفیق اور مددگار بن جاؤ جس طرح جب (حضرت) عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ خدا کے دین کی خاطر میرا مددگار کون ہوگا، انہوں نے کہا تھا کہ ہم اللہ کے دین کی خاطر تمہارے مددگار رہیں گے"۔

یعنی عیسائی اپنے پیغمبر کے رفقاء کا کردار یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان سے غداری بھی کی اور مصیبت کے وقت ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس قرآن ان کی سیرت و کردار کو مثالی قرار دیتا ہے یہ ہوتا ہے فرق خدا کی طرف سے نازل شدہ سچی تعلیم اور محرف وحی میں!

آیت (۳/۵۲) میں کہا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے پیش آنے والے خطرہ کا احساس کیا۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔

۳/۵۳ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿۳/۵۳﴾۔

مخالفین نے حضرت عیسیٰؑ پر ہاتھ ڈالنے کے لئے بڑے خفیہ طریقے اور تدبیریں شروع کر دیں ان کے مقابلے میں خدا نے (انہیں بچانے کے لئے) محض اسباب اور ذرائع پیدا کر دیئے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے تجویز کردہ طریقے بہر نوع بہتر ہوتے ہیں۔

حیات و وفات مسیح کا مسئلہ

یہاں سے حضرت عیسیٰؑ کا ایک نیا باب وا ہوتا ہے جس کا تعلق مسئلۂ حیات و وفات مسیحؑ سے ہے اور (جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، عیسائیوں کے اتباع میں اس نے) خود ہمارے ہاں ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ یہ گویا کفر اور ایمان کا معیار بن گیا ہے۔ بنابریں اسے تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ حضرت مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اسی طرح اس میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے اور اب قیامت کے نزدیک آسمان سے نازل ہوں گے۔ ہم نے یہ دونوں عقیدے عیسائیوں سے مستعار لئے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ عیسائیوں نے کسی سازش کے تحت ان عقائد کو ہماری کتب روایات میں داخل کر دیا اور اس طرح وہ ہمارے ہاں متواتر چلے آرہے ہیں۔

یہودی ایک آنے والے مسیحؑ کے منتظر تھے تاکہ وہ انہیں ذلت و پستی کی زندگی سے نکال کر پھر سے غلبہ و قوت عطا کر دے۔ (ہر قوم جو ضعف اور ناتوانی کا شکار ہو کر خود اعتمادی سے محروم ہو جائے اپنے آپ کو یہ فریب دے لیتی ہے کہ ایک آنے والا آئے گا اور ہمیں بام عروج پر پہنچا دے گا)۔ ان کے اس عقیدہ سے کئی فریب کار لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور جھوٹی نبوت کا دعوے کیا۔ یہودی اس قسم کے مدعیوں کی مخالفت بھی کرتے تھے اور آنے والے کے عقیدے پر جم کر بیٹھے بھی رہتے تھے (یہ حالت ہر اس قوم کی ہوتی ہے جو کسی آنے والے کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے چنانچہ یہی حالت ہم مسلمانوں کی بھی ہے قرآن مجید میں رسول اللہ کے بعد کسی آنے والے کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جب نبوت کو ختم کر دیا گیا تو پھر کسی اور مامور من اللہ کے آنے کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا) بہر حال یہودی آنے والے مسیحؑ کے انتظار میں تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے اس کا دعوے کیا تو وہ پنجے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کی اس شدید مخالفت کی وجوہات ظاہر ہیں۔ اوّل تو وہ حضرت مریمؑ کے اس انقلابی اقدام کی بناء پر جس سے انہوں نے اس کی رسم خانقاہیت کو توڑ کر رکھ دیا تھا، وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہی کو جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ دوسرے حضرت عیسیٰؑ نے ان کی

آنے والے کا انتظار

مذہبی پیشوائیت کے خلاف جس شد و مد سے جہاد شروع کر رکھا تھا اس میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی) انہوں نے حضرت مریمؑ سے جو کہا تھا کہ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۱۹/۲۷) اور اس پر یہ کہہ کر اضافہ کیا تھا کہ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (۱۹/۲۸) ـــــ یعنی وہ ان سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب و غریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا بیٹا لے کر آگئی! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین و ضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ تم تو ایک پابند شریعت گھرانے کی لڑکی تھیں۔ تم نے یہ کیا کیا، اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی ـــــ تو اس سے وہ اپنی مخالفت کی وجہ جواز پیدا کرتے تھے ـــــ لیکن اس کی حقیقی وجہ وہی تھی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ میں وہ علامات پائی جاتی تھیں جو یہودیوں کی کتب سابقہ میں آنے والے سے متعلق مذکور تھیں۔ دوسرے، حضرت عیسیٰؑ کا انقلاب آفریں پیغام مذہبی پیشواؤں کی فریب کاریوں، سرمایہ داروں کی خون آشامیوں اور رومی حکومت کے استبداد کی چکی میں پسنے والے عوام کے لئے بڑی کشش اپنے اندر رکھتا تھا۔ ہیکل کے سرغنہ پجاریوں کے دل میں اس سے خطرہ لاحق ہو گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی اس تعلیم سے متاثر ہو کر عوام ان کے خلاف اٹھ نہ کھڑے ہوں۔ انہوں نے اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ایک گہری تدبیر سوچی یہودیوں کے ہاں عقیدہ تھا کہ جسے صلیب دیا جائے وہ لعنتی موت مرتا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کر دیا جائے تو عوام کے دل سے ان کے تقدس کا احساس بھی ختم ہو جائے گا اور یہ کانٹا بھی ہمیشہ کے لئے نکل جائے گا۔ انہیں نے اس مقصد کے لئے حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ یہ تھا ان کا وہ پلان جسے قرآن نے "وَمَكَرُوا" (۳/۵۴) سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہ عزائم پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ شدہ شدہ یہ خبریں حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے رفقاء (حواریوں) تک پہنچ رہی تھیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی ہجرت

حضرات انبیاء کرام کی جو داستانیں قرآنِ کریم میں مذکور ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ جب حالات نہایت نازک ہو جاتے تھے تو انہیں اس مقام سے ہجرت کر جانے کا حکم مل جاتا تھا۔ یہی نازک گھڑی حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں بھی آپہنچی۔ اس کی مدافعت کے لئے مشیتِ خداوندی میں جو تدبیر تھی اسے قرآن نے "مکر اللہ" (۳/۵۴) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی "خدا کی مخفی تدبیر"۔ قرآن کریم میں حضور نبی اکرمؐ کی ہجرت کے سلسلے میں بعینہٖ یہی الفاظ آئے ہیں۔ سورۂ انفال میں ہے: وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ○ (۸/۳۰) "اے رسول! تم اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے مخالفین (قریشِ مکہ) اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اُدھر اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے اور ادھر ہماری مشیت بھی اپنی تدبیروں میں لگی ہوئی تھی (اس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ) کارگر تدبیر ہماری ہی مشیت کی ہوئی"۔

رسول اللہ کی ہجرت

یہ تدبیر کیا تھی اور وہ کس طرح کارگر ہوئی اُسے سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (۱۷:۱) "یعنی خدا اپنے بندے کو راتوں رات مکہ سے مدینہ کی طرف لے گیا" (تفصیل میری کتاب معراج انسانیت میں ملے گی) یہ رسول اللہ کی ہجرت تھی، اور اسی قسم کی ہجرت کا اہتمام حضرت عیسیٰ کے لئے بھی کر دیا گیا۔ ان کے خلاف یہودیوں نے بڑا وسیع جال پھیلا رکھا تھا۔ اس لئے آپ کو ان کی دست برد سے بچانے کے لئے تدبیر بھی ذرا مختلف اختیار کرنی پڑی۔

حضرت عیسیٰ موت سے تو نہیں ڈرتے تھے (کوئی مردِ مومن بھی موت سے نہیں ڈرتا چہ جائیکہ حضرات انبیاء کرام موت سے ڈر جائیں!) لیکن انہیں اس کا احساس ضرور ہوگا کہ اگر انہیں صلیب پر لٹکا دیا گیا تو وہ عوام کی نگاہوں میں ملعون قرار پا جائیں گے۔ آپ کی اس گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مطمئن رہو۔ تم صلیب پر نہیں لٹکائے جاؤ گے: اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ۔ "تم اپنی طبعی موت مرو گے" اور تم ملعون نہیں قرار پاؤ گے: وَرَافِعُكَ اِلَیَّ "ہمارے ہاں تمہارے مدارج بہت بلند ہوں گے" وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا "تمہیں یہ لوگ گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ ہم تمہیں ان کی دسترس سے بہت دور لے جائیں گے اور یہ لوگ جو تمہارے خلاف جھوٹے الزامات تراشتے ہیں ان سے تمہاری براءت ہو جائے گی۔ تم اپنے رفقاء سے بھی یہ کہدو کہ وہ گھبرائیں نہیں۔ اس وقت تو وہ کمزور اور مغلوب ہیں لیکن: وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ
۳
۵۴ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۳:۵۴)۔ "تھوڑے ہی عرصے کے بعد تمہارے یہ متبعین تمہارے مخالفین (یہودیوں) پر غالب آ جائیں گے اور ان کا یہ غلبہ عرصۂ دراز تک قائم رہے گا" یاد رکھو! اس قسم کی کشمکش کے فیصلے ہر شخص یا ہر گروہ کی اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتے ہیں۔ جس سے کسی کو مفر نہیں۔ ہر مجرم اس کی طرف کھنچے کھنچے چلا آتا ہے": ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (۳:۵۴)

صلیب کا بیان۔ انجیل کی رو سے

انجیل میں ہے کہ یہودیوں کی سازش سے حکومت نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لیا اور انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ لیکن صلیب پر ان کی موت واقع نہیں ہوئی۔ وہ ہنوز زندہ تھے کہ صلیب پر سے اتار لئے گئے۔[ب] ان کے بہی خواہوں نے انہیں ایک مصنوعی قبر میں جا لٹایا جہاں ان کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور پھر وہ وہاں سے آسمان کی طرف اٹھ گئے جہاں وہ زندہ موجود ہیں اور دوبارہ نازل ہو کر دنیا میں عیسائیت کا غلبہ قائم کریں گے۔ اس کے برعکس یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ (۴:۱۵۷)۔

ب ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صلیب پر جان دے دی تھی اور بعد میں زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔

"ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو صلیب دے کر لعنتی موت کو مار دیا تھا" اور یہ بات ان دونوں عیسائیوں اور یہودیوں میں وجہ نزاع ہی نہیں، موجب نفرت اور باعث عداوت چلی آرہی ہے۔ مسلمان اپنے مروجہ عقیدے کی بناء پر عیسائیوں کے ہمنوا ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ عیسائی کہتے ہیں کہ ان کے نزول کے بعد عیسائیت کو غلبہ حاصل ہوگا اور مسلمان کہتے ہیں کہ آپ اور امام مہدی (جن کا ظہور اُس زمانے میں ہوگا) اسلام کو دیگر مذاہب عالم پر غالب کر دیں گے۔ (یہودی ابھی تک آنے والے مسیحؑ کے منتظر ہیں)

آنے والے کا عقیدہ

واضح رہے کہ یہ عقیدہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کے ہر مذہب کے پیرو ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں جو آکر ان کے مذہب کو تمام مذاہب عالم پر غالب کر دے گا۔ ہندو کلنکی اوتار کا انتظار کرتے ہیں، بُدھ مت کے پیرو متیا بدھ کا، مجوسی عیسائیوں کی طرح منتھر کو زندہ آسمان پر تصور کرتے اور آخری زمانے میں اس کی آمد کے منتظر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ آنے والا ان کے مذہب کو دیگر مذاہب پر غالب کر دے گا اور جب ان کے مذہب کو اس طرح غلبہ حاصل ہو جائے گا تو پھر قیامت آجائے گی ___ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ جب ہندو مت، بدھ مت، مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور مسلمانوں کے یہ "آنے والے" قرب قیامت سے پہلے اکٹھے ہو گئے اور ہر ایک نے اپنے اپنے مذہب کے غلبہ کے لئے تلواریں سونت لیں تو اُس وقت بیچارے انسانوں کا کیا حشر ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی قیامت اور کیا ہوگی جس کا ظہور اسی کرۂ ارض پر ہوگا۔ قرآن کریم نے واقعہ صلیب کی اصلی شکل کیا بتائی ہے اسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس وقت یہ

حیاتِ مسیحؑ کے عقیدہ کی سند!

دیکھنا ضروری ہے کہ ہمارے ہاں جو یہ عقیدہ مروّج ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تو اس کی سند میں کیا کہا جاتا ہے؟ اس کی سند میں وہ روایات پیش کی جاتی ہیں جو ہماری کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ علامہ تمنّا عمادی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں ان تمام روایات پر تنقید کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ سب وضعی اور غیر معتبر ہیں۔ (یہ تنقید طلوع اسلام کی اشاعت بابت اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر دسمبر ۱۹۵۳ء اور جنوری۔ فروری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی)۔ اس تنقید کا اعادہ یہاں ناممکن ہے۔ اور ویسے بھی ہمیں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم اپنی بحث کو قرآن کریم تک محدود رکھتے ہیں۔ اس عقیدہ کے مؤیدین نے قرآن کریم سے کس طرح سہارا لیا ہے یہ نکتہ غور طلب بھی ہے اور اس کے ساتھ دلچسپ بھی۔ آیت (۳/۵۵) میں جو کہا گیا ہے: اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ۔ یہ حضرات

ترفع الی السماء

اس کا ترجمہ کرتے ہیں" میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف"۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ) اس میں یہ حضرات "اِلَیَّ" (اپنی طرف) کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنی طرف

اٹھا لیا۔ یعنی انہیں آسمان کی طرف اٹھا لیا اور وہ وہاں زندہ موجود ہیں اور وہیں سے قیامت کے قریب نازل ہوں گے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ یہ سہارا کس قدر محکم ہے!

جب ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو وہ کسی بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف محسوسات کو حقیقت سمجھتا تھا اس لئے اس نے اپنے معبودوں کو بھی محسوسات کا لباس اوڑھایا اور انہیں مٹی اور پتھر کی مورتیوں میں اپنے سامنے رکھا۔ حضرات انبیاء کرامؑ خدا کا منزہ تصور پیش کرتے تھے لیکن ان کے بعد جب ان کی تعلیم مسخ ہو جاتی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا تو ان کے متبعین خدا کو محسوس پیکروں میں ڈھال لیتے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے تصورات کو باطل قرار دیا اور کہا کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۳/۹۱) "خدا ان تمام تصورات سے بلند و بالا اور پاکیزہ منزہ ہے جسے یہ اپنے ذہنوں میں رکھے ہوئے ہیں"۔ وہ محسوس پیکر نہیں رکھتا اس لئے نہ وہ کسی خاص مقام میں مقیم ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کے لئے کسی خاص جگہ جانے کی ضرورت ہے: هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (۵۷/۴) "جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے"۔ اور نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶) "ہم انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"؛ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (۵۶/۸۵) لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ یہ تھا خدا کا وہ تصور جو قرآن کریم نے پیش کیا تھا ـــــ وہ خدا جو زمان اور مکان کی نسبتوں سے بلند اور محدودیت و محسوسیت کی ادنیٰ سی آلائش سے بھی پاک ہے۔ اس سلسلے میں اس مختصر سی گفتگو کو بھی دیکھئے جو ہم نے مطالب الفرقان کی تیسری جلد (ص ۲۲۲) زیر آیت (۲/۱۸۶) قربِ خداوندی کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ قربِ خداوندی سے مراد خدا اور بندے کے درمیان ایسا فاصلہ نہیں جسے محسوس پیمانوں سے ماپا جائے۔ اس سے مراد بلندیٔ مدارج ہے۔ اس ضمن میں انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کا مفہوم انڈکس کی مدد سے بھی دیکھئے۔

خدا کے متعلق قرآن کے اس پیش کردہ تصور کی رو سے: رَافِعُكَ اِلَيَّ (۳/۵۵) اور: بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۴/۱۵۸)۔ میں "اِلَیَّ" سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں متمکن ہے جس کی طرف اس نے حضرت عیسیٰؑ کو اٹھا لیا۔ ہم قرآن کریم کے مختلف مقامات سے "الیہ" کا مفہوم واضح کر سکتے تھے لیکن اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی (یہ تفصیلی بحث آپ کو میری کتاب شعلۂ مستور کے صفحات ص ۸۹-۸۸ اور مطالب الفرقان جلد سوم ص ۱۱۳ میں ملے گی جہاں: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) کا مفہوم بیان کیا گیا ہے)۔ یہاں قرآن کریم کے صرف دو مقامات کا حوالہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں جن سے واضح

اِلَیَّ کا مفہوم

ہو جائے گا کہ اِلَیَّ سے مراد کوئی ایسی سمت یا جہت نہیں جو اس مقام کی طرف لے جاتی ہو جہاں خدا متمکن ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے فلسطین ہجرت کی تو فرمایا: اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ (۲۹/۲۶)۔

"میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں"۔ دوسری جگہ ہے "اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ○ (۳۷/۹۹)" "میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ مجھے راستہ دکھائے گا"۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہجرت کر کے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے تھے۔ وہ اس طاغوتی ماحول کو چھوڑ کر ایسے مقام کی طرف منتقل ہو گئے تھے جہاں وہ خدائی پروگرام کو آزادانہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

باقی رہا لفظ رَفَعَ تو اس کے معنے بلندئ مدارج ہیں۔ یہ لفظ قرآن کریم میں ان معانی میں متعدد مقامات میں آیا ہے مثلاً سورۂ یوسف میں ہے: نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ط (۱۲/۷۶)۔ "ہم اپنی مشیت کے مطابق بلندئ درجات عطا کر دیتے ہیں"۔ یا نبی اکرمؐ کے متعلق ہے: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ط (۹۴/۴) "ہم نے تیرے ذکر کو بلند کر دیا"۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۷/۱۷۶) "ہم چاہتے تھے کہ اپنی تعلیم کی رو سے اسے بلند مقامات عطا کر

رفع کے معنی

دیتے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹ گیا"۔ حضرت ادریسؑ کے متعلق تو رفعت کے ساتھ مکان کا لفظ بھی آیا ہے جہاں کہا ہے: وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ○ (۱۹/۵۷) "ہم نے اسے نہایت بلند مقام عطا کر دیا"۔ رفعتِ مدارج عطا کرنے کی جہت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ کہا ہے۔" یعنی بلند مدارج عطا کرنے والا" (۴۰/۱۵)۔

ان تصریحات کی رو سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو کہا ہے کہ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ (۳/۵۴) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ط (۴/۱۵۸) تو اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا انہیں اٹھا کر اپنی طرف (آسمان پر لے گیا) اس کے معنے واضح ہیں۔ یہودیوں کا دعوےٰ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مرے۔ اس کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (۴/۱۵۷)۔ ان کا یہ دعویٰ ہی سرے سے غلط ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دے کر لعنتی کی موت مار دیا۔ وہ نہ ان کے ہاتھوں صلیب دیئے گئے نہ لعنتی موت مرے۔ خدا نے انہیں اپنے ہاں بلند مدارج عطا کئے۔

قرآن کریم نے خدا کے متعلق ایسا منزہ تصور دیا تھا جو مقام کی نسبتوں سے بلند اور جہت کی اضافتوں سے بالا تھا لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے جو کچھ پہلی امتوں کے ساتھ گزرا وہی کچھ صدیوں کے بعد ہمارے ساتھ ہوا۔ ہمارے ہاں بھی خدا کو محسوس پیکروں میں ڈھالا گیا۔ حتیٰ کہ تجسیمیہ نامی ایک فرقہ پیدا ہو گیا جس نے خدا کو محسوس شکل میں ڈھال دیا اور جب خدا محسوس قالب میں ڈھل گیا تو اس کے رہنے کے لئے کوئی مقام بھی متعین کرنا پڑا[1]۔ عیسائیوں کے ہاں خدا کے متعلق یہ تصور

---

[1] یہ بحث مختصراً پہلے باب میں گزر چکی ہے۔ وہیں وہ حدیث بھی درج کی جا چکی ہے جو آگے آرہی ہے۔ ربطِ موضوع کے تقاضا سے ہم نے

عام تھا کہ وہ آسمانوں کے اوپر ہے چنانچہ ان کی مشہور دعا میں ہے :-

آسمانوں کے اوپر خدا اے ہمارے باپ! جو تو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے (باب ۶ - آیت ۹)۔

اسی جہت سے انہوں نے اپنے پیغمبر، حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا کہ خدا نے انہیں اپنے ہاں آسمان پر اٹھا لیا۔

جب مسلمانوں نے خدا کو محسوس پیکر میں ڈھالا تو اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وہ آسمانوں کے اوپر عرش پر متمکن ہے۔ اس سلسلے میں متعدد روایات وضع کی گئیں۔ مثلاً احادیث کی مشہور کتاب، جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے :-

رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اکہتر، بہتر یا تہتر سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرشِ الٰہی ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

جب خدا کو اس قسم کے عرش پر بٹھا دیا گیا تو اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کا مفہوم لینے میں کوئی دشواری نہ رہی کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنی طرف اٹھا لیا اور وہ چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ زمین کی طرف نازل ہوں گے۔

علاوہ اس کے کہ یہ تمام تصورات قرآن کے خلاف اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لئے ہوئے ہیں، عصرِ حاضر کی افلاکی تحقیقات کی رُو سے ان آسمانوں کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے جن کا تصور اس قسم کی روایات میں دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے افلاکی کائنات کے متعلق جو کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا خلائی تحقیق ایک ایک قدم پر اس کی صداقت کی شہادت بہم پہنچائے چلی جا رہی ہے (یہ بہرحال ایک جداگانہ موضوع ہے)۔

یہ حقیقت کہ حضرت عیسیٰؑ بھی دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح وفات پا چکے ہیں قرآنِ کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے۔ ان کا ذکر

وفاتِ مسیحؑ اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں دو ایک شہادات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تیری یا تیری والدہ کی پرستش کیا کریں۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ معاذ اللہ میں بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ باقی رہے یہ لوگ جو میرے اُمتی ہونے کے مدعی ہیں، سو ان کے متعلق میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ج "جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران رہا: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط (۵/۱۱۶-۱۱۷)"۔ لیکن جب تو نے مجھے وفات دے

دی تو اس کے بعد ان کا نگران تو ہی ہو سکتا تھا"۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی کے دو ہی مرحلوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ مرحلہ جس میں وہ اپنے متبعین میں رہے۔ اس کے بعد ان کی وفات کے بعد کا مرحلہ۔ اس میں اس درمیانی مرحلہ کا کوئی ذکر نہیں جس میں وہ تمام عقیدے کے مطابق، آسمان پر چلے گئے۔ اس سے واضح ہے کہ اپنے متبعین میں رہنے کے بعد ان کی وفات ہو گئی تھی۔

سورۂ مریم میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنے دعوائے نبوت پیش کیا تو انہوں نے یہ بھی کہا: وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (۱۹/۳۱) کہ "اللہ نے مجھے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دے رکھا ہے جب تک میں زندہ ہوں"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ (مروّجہ عقائد کی رو سے) آسمانوں پر زندہ موجود ہیں اور لاکھوں کروڑوں برس تک وہاں رہیں گے تو وہاں آپ ان احکام خداوندی کی تعمیل کس طرح کرتے ہوں گے؟ صلوٰۃ کے متعلق تو کہہ دیا جائے کہ وہ وہاں نماز پڑھ لیتے ہوں گے لیکن زکوٰۃ کے فریضہ کی ادائیگی آپ کس طرح کرتے ہوں گے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اور آخری بات یہ کہ سورۂ مائدہ میں ہے کہ مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ ۗ كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۗ اُنْظُرْ كَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ ٥ (۵/۷۵)۔ "مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا ایک رسول تھا۔ ویسا ہی رسول جیسے رسول اس سے پہلے اپنے اپنے وقتوں میں آئے اور دنیا سے چلے گئے۔ اور اس کی ماں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ بڑی راست باز خاتون تھیں۔ وہ دونوں عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ یعنی انہیں دوسرے انسانوں کے مقابلے میں کوئی فوق البشر (طبیعی) خصوصیت حاصل نہیں تھی۔ تم غور کرو کہ ہم کس وضاحت سے تمام امور بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد تم اس پر بھی غور کرو کہ یہ لوگ بایں ہمہ کس طرف الٹے پھر رہے ہیں"؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ان تصریحات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر واقعۂ صلیب کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم نے اس کی وضاحت ایک لفظ میں کر دی ہے۔

یہودی بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکایا اور وہاں انہوں نے چلا چلا کر جان دے دی اور

اصل واقعہ کیا تھا؟

اس طرح وہ (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ عیسائی، یہاں تک تو سب متفق تھے (اور متفق ہیں) کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ انہوں نے

صلیب پہ جان دے دی اور بعض کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر مرے نہیں تھے۔ انہیں صلیب پر سے اتار لیا گیا اور ایک خفیہ مقام پر قبر میں رکھا گیا تھا۔ جہاں سے وہ اٹھ کر آسمان کی طرف چلے گئے تھے۔

صلیب کے متعلق اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی صورت موجودہ پھانسی کی سی نہیں تھی جس پر لٹکنے سے ایک جھٹکے میں جان نکل جاتی ہے۔ وہ کراس (+) کی شکل کے دو شہتیر ہوتے تھے۔ مجرم کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھوک کر اسے ان کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس کی فوراً جان نہیں نکل جاتی تھی بلکہ وہ ان میخوں کی اذیت، بھوک پیاس کی شدت اور موسم کی سختی کی وجہ سے سسک سسک کر جان دیتا تھا۔ بعض مجرموں کی صورت میں تو اس میں دو دو تین تین دن لگ جاتے تھے۔ اور صلیب سے اتارتے وقت ان کی ٹانگوں کی ہڈیاں بھی توڑ دی جاتی تھیں۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر صرف دو تین گھنٹے رہے اور وہاں سے اتارتے وقت ان کی ہڈیاں بھی نہیں توڑی گئیں۔ بہرحال اس داستان کے اتنے حصے تک تو (یہودی اور عیسائی) سب متفق ہیں کہ حضرت مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا دعوےٰ ہے کہ

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا (۴/۱۵۷)

یہ لوگ (یعنی یہودی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ) ہم نے مسیح ابن مریم کو ذلت کی موت مار دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نہ اسے قتل کر کے ذلت کی موت مارا اور نہ ہی صلیب پر چڑھایا۔ ہوا کچھ اور یہ سمجھے کچھ اور —— اور یوں ان پر

معاملہ مشتبہ ہو گیا اصل بات مشتبہ ہو کر رہ گئی۔ جو لوگ اس واقعہ کی جزئیات میں باہمی اختلاف کرتے ہیں اصل بات کا انہیں بھی علم نہیں۔ وہ بھی محض ظن و قیاس کی بنا پر باتیں کرتے ہیں۔ یقینی بات یہی ہے کہ انہوں نے اسے مارا ہی نہیں۔

وہ ملعون نہیں ہوا: بَلْ رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ۔ اللہ نے اس کے مدارج بلند کر دیئے (تفصیل اس کی آیت ۳/۵۵ کے تحت پہلے گزر چکی ہے)۔

یہ قرآن کریم کا بہت بڑا دعوےٰ ہے اور عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو چیلنج! مَا قَتَلُوهُ (حضرت مسیحؑ کے صلیب پہ جان دینے) کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقینی طور پر کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے لیکن: مَا صَلَبُوهُ (حضرت عیسیٰؑ کو صلیب بھی نہیں دی گئی) کے متعلق تو ان میں سے کسی کو کسی قسم کا شبہ نہیں تھا۔ لہٰذا، قرآن مجید کا یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ میں ایک عرصے تک اس باب میں غور کرتا رہا اور امکان بھر تحقیق بھی کی کہ جسے صلیب پر لٹکایا گیا تھا اگر وہ حضرت عیسیٰؑ نہیں تھے تو وہ کون تھا؟

میری سوچ کا رُخ اس سمت کو جاتا تھا کہ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی سیرت اور کردار کے متعلق جو کچھ کہا ہے (اور جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے رسول کو تنہا چھوڑ دیا ہو کہ یہودی انہیں گرفتار کر کے صلیب پر لٹکا دیں۔ کچھ ایسا ذہن میں آتا تھا کہ انہوں نے ایسی تدبیر کی ہوگی جس سے حضرت عیسیٰؑ پہلے ہی وہاں سے نکل گئے اور اس کے بعد اس خیال سے کہ یہودی اور عمالِ حکومت انہیں وہاں نہ پاکر ان کی تلاش میں نہ نکل کھڑے ہوں، انہوں نے عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ ان میں سے ایک جانثار نے مسیح کا روپ دھار کر اپنے آپ کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ اور باقی حواریوں نے اسے صلیب پر سے اتروا کر (جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے) اسے اپنے ساتھ لیا اور پھر سب وہیں چلے گئے جہاں اس سے پہلے حضرت عیسیٰؑ تشریف لے جا چکے تھے۔ اس خیال کی تائید کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھ ہی نہیں آئے تھے، سورۃ مائدہ کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات گنانتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کہ تم ہمارے اس انعام کو بھی یاد کرو: وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ (۵/۱۱۰) "جب ہم نے تمہیں یہودیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا"۔ یعنی تم ان کے ہاتھ ہی نہ لگے۔

قرآن کریم نے اس باب میں اتنا ہی کہا ہے۔ لیکن اب خود مغربی محققین اس امر کی تحقیق کر رہے ہیں کہ واقعۂ تصلیب کی حقیقت کیا تھی اور وہ کون تھا جسے صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ اس باب میں وہاں طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں اور آئے دن اس موضوع پر کوئی نہ کوئی کتاب شائع ہوتی رہتی ہے۔ چند برس ادھر اس موضوع پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس نے دنیائے

خود عیسائیوں کی تحقیق

عیسائیت میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کتاب کا نام ہے (THE PASSOVER[1] PLOT) اور مصنف کا نام ہے (DR. HUGH J. SCHONFIELD) ہم تو اس سے متفق نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہیں؛ لیکن اس مصنف کی تحقیق کی ساری عمارت اس مفروضہ پر استوار ہوتی ہے کہ یہ ایک سوچا سمجھا ڈرامہ تھا جو یروشلم میں یہودیوں کے سالانہ جشن کے موقع پر کھیلا گیا تھا۔ اسی جہت سے اس نے اسے (PLOT) کہہ کر پکارا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہودیوں کو ایک مسیحا کا انتظار تھا جس کی آمد کا ذکر اور متعلقہ علامات ان کی سابقہ کتابوں میں مذکور تھیں (حضرت) عیسیٰؑ کے دل میں (دانستہ یا نادانستہ) یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ آنیوالا مسیح میں ہی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے وہ علامات ان پر پوری اتریں جو یہودیوں کی الہامی کتابوں

---

[1] (PASSOVER) ایک سالانہ جشن تھا جسے یہودی بڑے جوش و خروش سے منایا کرتے تھے (شاید اب بھی مناتے ہوں)۔ واقعۂ تصلیب انہی دنوں ظہور میں آیا تھا جب یروشلم میں یہ جشن منایا جا رہا تھا۔ لفظ (PLOT) کی تشریح اوپر متن میں ملے گی۔

میں مذکور تھیں۔ ان علامات میں آخری علامات یہ بھی تھی کہ اس مسیح کو صلیب دیا جائے گا اور اس کے بعد وہ آسمان پر چلا جائے گا۔ اس مصنف کے کہنے کے مطابق (حضرت) مسیحؑ نے نہایت احتیاط سے اس پلان کی جزئیات مرتب کیں جن کی رو سے وہ صلیب پر تو چڑھائے جائیں لیکن انہیں چند گھنٹوں کے بعد وہاں سے اتار دیا جائے۔ ان کی ٹانگیں بھی نہ توڑی جائیں اور پھر وہ یروشلم سے کہیں باہر نکل جائیں۔ اس پلان میں ان کے حواریوں کے علاوہ، وہاں کا ایک با اثر دولت مند بھی شریک تھا جس کا نام یوسف تھا۔ یہودیوں کے علاوہ رومی گورنر کے ہاں بھی اس کا اثر رسوخ تھا اور دوسری طرف وہ حضرت عیسیٰؑ کا عقیدتمند بھی تھا۔ اس نے اس پلان کو کامیاب بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے ہم اس سے تو کسی صورت بھی متفق نہیں ہو سکتے کہ حضرت عیسیٰؑ (معاذاللہ) فریب خوردہ یا فریب کار مدعیٔ مسیحیت تھے لیکن اس سے اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہوا تھا اس میں آپ کے حواری برابر کے شریک تھے۔

ہم نے اس سے پہلے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام ہے (THE LIFE OF JESUS) اور جس کے مصنف ہیں (MARCELLO CRAVERI)۔ اس مصنف نے متعدد حوالوں کی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ

> جب رومی سپاہی (حضرت) عیسیٰؑ کو کشاں کشاں سوئے دار لے جا رہے تھے تو ضعف اور کمزوری کی وجہ سے آپ سے وہ شہتیر اٹھائے نہیں جاتے تھے جنہیں کا ڈکر صلیب بنانا مقصود تھا۔ راستے میں (SIMON) نامی ایک شخص ملا جو کھیتوں میں کام کاج کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ رومن سپاہیوں نے اسے بیگار میں پکڑا اور کہا کہ وہ ان شہتیروں کو اٹھا کر ساتھ چلے چنانچہ اس نے شہتیر اٹھا لئے تو (حضرت) عیسیٰؑ نے ایسا کیا کہ خود سائمن کی شکل اختیار کر لی اور سائمن (حضرت) عیسیٰؑ کا ہم شکل ہو گیا۔ چنانچہ سائمن کو سولی پر چڑھا دیا گیا اور (حضرت) عیسیٰؑ سائمن بنے صلیب کے نیچے کھڑے مسکراتے رہے۔ (ص ۳۹۵)

صلیب کسی اور کو دی گئی تھی

یہ مورخ حقیقت تک تو نہیں لیکن اس کے قریب قریب پہنچ گیا ہے۔ یعنی اس مقام تک کہ جسے صلیب دیا گیا تھا وہ حضرت مسیحؑ نہیں تھے، کوئی اور تھا۔ لیکن اصلِ حقیقت پر سے پردہ انجیل برنباس میں اٹھایا گیا ہے جو میرے اس قیاس کی تائید کرتی ہے جسے میں نے قرآن کریم کے اشارات کی روشنی میں قائم کیا تھا اور جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ حواریوں کے مشورہ سے حضرت عیسیٰؑ

ا۔ ہم اس سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک نبی کی عظمتِ کردار کے یکسر خلاف ہے۔ لیکن (یہودی یا) عیسائی اپنے انبیاء کی طرف اس قسم کے توہین آمیز افسانے منسوب کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

پہلے ہی وہاں سے ہجرت کر گئے تھے اور ان ہی میں سے ایک جاں نثار نے حضرت مسیح کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو رومن سپاہیوں کے حوالے کیا تھا۔ اور اسی جانباز کو صلیب پر چڑھایا گیا اور (جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے) زندہ اتار لیا گیا۔

انجیل برنباس انجیل برنباس کا مختصر سا تذکرہ اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ برنباس حضرت مسیحؑ کے حواریوں میں سے تھے۔ عیسائی ان کا شمار بھی "رسولوں" میں کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک انجیل مرتب کی تھی لیکن عیسائیوں نے نہ صرف یہ کہ اس کا شمار ان اناجیل میں نہ کیا جنہیں انہوں نے مستند قرار دے کر قبول کر لیا تھا بلکہ اسے دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا اس لئے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس سے عیسائیوں کے معتقدات اور دیگر اناجیل میں بیان کردہ واقعات کی تردید ہوتی تھی۔ اس تمام عرصے میں اس کا ذکر تو آتا رہا لیکن اس کا وجود کہیں نظر نہ آتا تھا۔ قریب تین سو سال اُدھر کا ذکر ہے کہ پوپ کی لائبریری سے اس کا نسخہ چوری کر کے باہر لایا گیا۔ اس کے بعد، من جملہ دیگر زبانوں کے عربی زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا اور عربی سے اس کا ترجمہ اردو میں ہوا جسے مولوی انشاء اللہ، مالک اخبار وطن لاہور نے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں واقعۂ تصلیب کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حواریوں کے مشورہ سے ہوا تھا اور جس یہودا اسخریوطی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ کی مخبری کی تھی اور چند سکوں کے عوض انہیں گرفتار کرا دیا تھا، وہ درحقیقت وہی جاں نثار تھا جس نے اپنے آپ کو اس جانکاہ خطرے میں رضا مندانہ ڈال دیا تھا۔ جس زمانے میں یہ انجیل لکھی گئی تھی اُس وقت کی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حقیقت کو اشارات کے پردوں میں لپٹا کر پیش کیا جائے۔ اگر مصنف کی اس احتیاط کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر اصل واقعہ کے سمجھنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہودا اسخریوطی (بظاہر) مخبری کرنے کے لئے رومیوں کے ہاں گیا اور حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرانے کے لئے سپاہیوں کو اپنے ساتھ لایا:-

> اور جب سپاہی یہودا کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہنچے جس میں یسوع تھا۔ یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا سُنا تب اسی لئے وہ ڈر کر گھر میں چلا گیا اور گیارھوں (شاگرد) سو رہے تھے۔ پس جب کہ اللہ نے اپنے بندہ کو خطرہ میں دیکھا اپنے سفیروں، جبرائیل، میخائیل، رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ یسوع کو اس دنیا سے لے لیویں۔ تب پاک فرشتے آئے اور یسوع کو دکھن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا۔ پس وہ اس کو اٹھا لے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں ان فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا۔ جو کہ ابد تک اللہ کی تسبیح کرتے رہیں گے۔ (فصل ۲۱۵ ۔ ص ۲۹۷)

اس کے بعد ہے:-

> اور یہودا زور کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا جس میں سے یسوع اٹھا لیا گیا تھا . . . . تب اللہ نے ایک عجیب کام

کیا۔ پس یہودا بولی اور چہرے میں بدل کر یسوع کے مشابہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے اعتقاد کیا کہ وہی یسوع ہے۔ (فصل ۲۱۶ صفحہ ۲۹۷)

پس سپاہیوں نے یہودا کو پکڑا اور اس کو اس سے مذاق کرتے ہوئے باندھ لیا۔ (فصل ۲۱۷ ۔ صفحہ ۲۹۸)۔

اسی یہودا کو صلیب پر چڑھایا گیا اور :۔

وہ شاگرد جو کہ اللہ سے نہیں ڈرے تو وہ رات کے وقت گئے اور یہودا کی لاش چرا کر اسے چھپا دیا اور خبر اڑا دی کہ یسوع جی اٹھا ہے (فصل ۲۱۸ ۔ صفحہ ۳۰۳)۔

یہ ہے حضرت مسیح کے ایک حواری کی وہ آنکھوں دیکھی شہادت جو قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴/۱۵۷)۔ باقی رہا اس آیۂ جمیلہ کا اگلا حصہ کہ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ تو اس سلسلے میں برنباس نے لکھا ہے:۔

اور یسوع کے چلے جانے کے بعد شاگرد، اسرائیل اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو گئے۔ رہ گیا حق جو شیطان کو پسند نہ آیا، اس کو باطل نے دبا لیا جیسا کہ یہ ہمیشہ کا حال ہے۔ پس شریروں کے ایک فرقہ نے جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ یسوع کے شاگرد ہیں یہ بشارت دی کہ یسوع مر گیا اور وہ جی نہیں اٹھا اور دوسروں نے یہ تعلیم پھیلائی کہ وہ درحقیقت مر گیا پھر جی اٹھا اور اوروں نے منادی کی اور برابر منادی کر رہے ہیں کہ یسوع ہی اللہ کا بیٹا ہے اور ان ہی لوگوں کے شمار میں پولس نے بھی دھوکا دیا۔ اب رہے ہم تو ہم محض اسی کی منادی کرتے ہیں جو میں نے ان لوگوں کے لئے لکھا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں تاکہ اخیر دن میں جو اللہ کی عدالت کا دن ہو گا چھٹکارا پائیں۔ آمین۔ (فصل ۲۲۲ ۔ صفحہ ۳۰۸)۔

اسی فصل پر انجیل برنباس ختم ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت مسیح ہجرت کر کے کہاں تشریف لے گئے اور کس مقام پر ان کی وفات ہوئی اس کے متعلق نہ انجیل میں کچھ کہا گیا ہے اور نہ ہی قرآن کریم میں اس کی بابت کچھ آیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثر انبیاء کرامؑ (حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط وغیرہ علیہم السلام) کی ہجرت کے بعد کی زندگی کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ یہی کیفیت حضرت عیسیٰؑ کی ہجرت کے بعد کی زندگی کی ہے۔

عیسائیوں نے یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی تھی اس لئے وضع کیا کہ ان کے کفارہ کے عقیدہ کا اثبات ہو جائے۔ جیسا کہ مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۳۹ زیر آیت (۲/۴۸) میں بتایا جا چکا ہے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے بیٹے نے اپنی جان دے کر ہمیں گناہوں سے نجات دلا دی۔ عیسائیت کی ساری تعلیم اسی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عیسائی کی موت کے وقت پادری آکر اس سے حضرت مسیح کی وفات اور کفارہ کے عقیدہ کا اقرار لیتا ہے۔

قرآن کریم نے آیات (۴/۱۵۷-۵۸) کے تسلسل میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہا ہے کہ

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (۴/۱۵۹)۔

عیسائیوں کا یہ عالم ہے کہ باوجودیکہ حقیقتِ حال کا انہیں بھی یقینی طور پر علم نہیں۔ وہ مسیحؑ کے جان دینے اور اس طرح ان کے گناہوں کے کفارہ بن جانے پر ایسا محکم یقین رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی موت کے وقت اس کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن جب یہ لوگ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان کی بنا پر اپنی بخشش کے لئے خدا کے حضور جائیں گے تو خود مسیح ان کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ان سے اس قسم کے عقائد رکھنے کا کبھی نہیں کہا تھا۔ یہ سب عقائد ان کے خودساختہ ہیں (اس کی تفصیل اپنے مقام پر آیات ($\frac{5}{116-118}$) میں ملے گی)۔

قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دی ہی نہیں گئی تھی عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد ہی ختم کر دی۔ اور ہم نے جو پہلے لکھا ہے کہ اب خود عیسائی محقق بھی اسی حقیقت کی طرف جا رہے ہیں کہ جسے صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت عیسیٰؑ نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفارہ کے عقیدہ کی عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے منہدم کر رہے ہیں۔

یوں قرآن نے اپنے دعاوی کو بزور منوایا ہے۔

❀

یہ ہیں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور وفات کے متعلق وہ حقائق جنہیں میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن مجید سے سمجھ سکا ہوں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے ان عقائد نے ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ ایسی اہمیت کہ انہیں کفر اور ایمان کا معیار قرار دے دیا گیا ہے۔ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے آپ اس سے ضرور اتفاق کریں۔ جو حضرات میری پیش کردہ تصریحات کو صحیح سمجھیں۔ وہ مجھ سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ جو ایسا نہ سمجھیں وہ جو عقائد جی میں آئے رکھیں۔ میں ان سے کسی قسم کی بحث میں نہیں الجھوں گا۔

❀

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم میں بتایا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس زیرِ عنوان بنی اسرائیل) میزانِ خداوندی میں

یہودیوں کی آخری تباہی

یہودیوں (بنی اسرائیل) کے جرائم کا پلڑا آہستہ آہستہ جھکتا چلا جا رہا تھا تا آنکہ وہ اس جرمِ عظیم کی وجہ سے (جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف کیا تھا) اپنی انتہا تک پہنچ گیا اور ان کی آخری تباہی کا وقت آ گیا۔ اس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی۔ انجیل متی میں ہے:

اور یسوع ہیکل سے نکل کر جا رہا تھا کہ اس کے شاگرد اس کے پاس آئے تاکہ اسے ہیکل کی عمارتیں دکھائیں۔ اس نے جواب میں ان سے کہا کیا تم ان سب چیزوں کو نہیں دیکھتے؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا

جو گرایا نہ جائے گا (متی ۲۴/۱-۲)۔

ان کی یہ آخری تباہی اسی رومی حکومت کے جرنیل (TITUS) کے ہاتھوں ظہور میں آئی جس حکومت سے ساز باز کرنے کے بعد انہوں نے (بزعم خویش) حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ یہ تباہی کس قدر عبرت انگیز تھی اس کی بابت انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے ان الفاظ پر غور کیجئے۔

۷۰ء ـــ اب یہودیوں کی تاریخ کو خوف و ہراس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی سقوطِ یروشلم عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلا دیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ وہ الساعت (انقلابِ عظیم) تھا جس کی آمد کی علامت حضرت عیسیٰؑ تھے۔ قرآن کے الفاظ میں: وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳/۶۱)۔ ہمارے عام طور پر "الساعت" سے مراد مرنے کے بعد آنے والی قیامت لی جاتی ہے لیکن قرآن مجید میں یہ اصطلاح ان انقلابات کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے جن کی رو سے قوموں کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں (تفصیل میری لغات القرآن میں دیکھئے)۔ یہی وہ الساعت تھی جس کے متعلق کہا گیا کہ یہودی جو اپنی سرکشی اور حدود فراموشی سے باز نہیں آتے تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ٥ (۴۳/۶۶)۔ کہ یہ اس انقلاب کے انتظار میں ہیں جو اس طرح دفعتاً آ جائے گا کہ وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ اور یہی تھا دنیا میں وہ عذابِ شدید جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران کی آیت (۳/۵۵) میں کیا گیا ہے۔ آیت (۳/۵۴) تک ہم پہلے آ چکے ہیں۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام یوں آگے چلتا ہے۔

آیت (۳/۵۴) کا اتنا حصہ پہلے آ چکا ہے۔ اِذْ قَالَ ... كَفَرُوْا۔ اور اس کی تشریح بھی وہاں کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد آیت کا بقایا حصہ آیات (۳/۵۶-۵۵) کے ساتھ ملانے سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۳/۵۵-۵۶	فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ٥ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۳/۵۶-۵۵)

جن لوگوں نے حقیقت اور صداقت سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کی ہے انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت عذاب دیا جائے گا اور اس عذاب (تباہی) سے انہیں کو بچا نہیں سکتا۔

ان کے برعکس جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں (اور یقین رکھیں گے) اور ہمارے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں (اور ہوں گے) ان کی محنت کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی کی محنت کے بدلہ میں کمی کر کے ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں، اللہ انہیں پسند نہیں کرتا۔

یہ آیات حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات کے تسلسل میں آئی ہیں، اس لئے ان میں کفر اور سرکشی برتنے والوں سے مراد۔ یہودی ہیں۔ ان پر اس دنیا میں تباہی کس طرح آئی تھی، اس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان کے برعکس حق و صداقت پر یقین رکھنے والے، اس دور کے عیسائی تھے، اور ان کے بعد اہلِ اسلام۔ ان عیسائیوں کے متعلق آیت (۳/۵۴) میں کہا گیا ہے۔

۳/۵۴ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۳/۵۴)

(اے عیسیٰؑ) اس وقت تیری جماعت کے افراد نہایت کمزور اور ناتواں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد (دنیا دیکھ لے گی) کمزوروں اور ناتوانوں کی یہی جماعت کس طرح ان یہودیوں پر غالب آجاتی ہے جو اس وقت اس قدر تشدد برت رہے ہیں۔ ان کا یہ غلبہ عرصۂ دراز تک قائم رہے گا۔ باقی رہے ان کے باہمی اختلافات، سو ان کا فیصلہ ہمارے ہاں سے ہوگا (اس دنیا میں اس وقت جب قرآن نازل ہوگا اور اس کے بعد آخرت میں)۔

یہودیوں پر حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کے غلبہ کی بشارت اس وقت دی گئی جب ان متبعین کو کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی،۔

یہودیوں پر عیسائیوں کا غلبہ

لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ لوگ کس طرح یہودیوں پر غالب آگئے، اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ (یہی تاریخ، ظہورِ اسلام کے بعد جماعتِ مومنین کے ضمن میں دہرائی گئی)۔ (ضمناً) اوپر کہا گیا ہے کہ متبعینِ حضرت عیسیٰؑ کا یہ غلبہ "الیٰ یوم القیامت" (قیامت کے دن تک) رہے گا۔ "قیامت کے دن تک" ایک محاورہ ہے جس کے معنی "لمبا عرصہ" ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ (مثلاً) کہا جاتا ہے "تم قیامت تک یہ کام نہیں کر سکو گے"۔

اس طرح حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات بیان کرنے کے بعد کہا:-

۳/۵۷ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۝ (۳/۵۷)

یہ ہیں وہ پُراز حکمت تاریخی حقائق جن کا علم تجھے (اے رسولؐ!) بذریعہ وحی دیا جا رہا ہے۔

قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے سلسلے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ اکثر و بیشتر ان کہانیوں سے مختلف ہیں جو اس زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں عام تھیں۔ وہ لوگ قرآنِ مجید میں بیان کردہ واقعات کو جھٹلاتے تھے (کیونکہ یہ ان کے ہاں کے مروجہ واقعات سے مختلف تھے اور ان سے ان کے عقائد پر سخت زد پڑتی تھی)۔ لیکن علمِ انسانی کی وسعت اور تاریخی تحقیق کی مدد سے جوں جوں حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں بیان کردہ واقعات کی صداقت کی شہادت ملتی جا رہی ہے حتیٰ کہ

خود یہودی اور عیسائی بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات مبنی بر حقیقت ہیں اور اُن کے ہاں کے مروّجہ واقعات غلط ہیں۔

اکثر مستشرقین اعتراض کیا کرتے ہیں حضور نبی اکرمؐ نے یہودی اور عیسائی علماء سے سابقہ انبیاء کرام کے قصے سن لئے تھے۔ انہی کو انہوں نے "وحی خداوندی" کہہ کر قرآن میں بیان کر دیا! جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں اُن کے اس قسم کے اعتراضات کا جواب خود انہی کے ہاں سے ملتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح حقیقت اپنے آپ کو منوا لیتی ہے!

۳/۵۸ اس کے بعد کی آیت میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ط (۳/۵۸) یہ آیت اور اس کی تشریح (حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں) پہلے گزر چکی ہے۔ اس کے بعد یہ دُہرایا کہ

۳/۵۹ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ o (۳/۵۹)

یہ ہے اس سلسلہ میں اصلی اور حقیقی بات جو تیرے رب نے بیان کر دی ہے اس کے بعد ان لوگوں کے لئے، دلائل و براہین کی رو سے بحث کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

کہا یہ کہ دلائل و براہین کی رُو سے بحث کرنے کی تو ان لوگوں کے پاس گنجائش نہیں، لیکن اگر یہ اس کے بعد محض ہٹ دھرمی، ضد، تعصب اور دھاندلی سے اپنی ہٹ پر قائم رہیں تو اس کا اس کے سوا کیا علاج ہے کہ ان سے کہہ دیا جائے کہ ہم تم سے مزید بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ تم اگر حقیقت اور صداقت کو نہیں ماننا چاہتے تو تم جانو تمہارا کام۔ ہم تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے۔

ضد اور تعصب کی بنا پر ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والوں سے بالآخر ایسا کہنا ہی پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو متعدد مقامات پر ایسا کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مثلاً سورۂ المزمّل میں ہے: وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا o (۷۳/۱۰) "اے رسولؐ! جو کچھ یہ لوگ تیرے خلاف کہتے اور کرتے ہیں تو اس سے دل برداشتہ نہ ہو۔ تم نے انتہائی کوشش کر لی کہ یہ زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ اگر اس کے باوجود یہ لوگ راہِ راست پر آنے کے لئے تیار نہیں اور اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہیں تو ان کے ساتھ بحث و تمحیص میں مزید وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا وقت بڑا قیمتی ہے اور تمہارے پیشِ نظر عظیم پروگرام ہے جسے تم نے تکمیل تک پہنچانا ہے۔ یہی وقت اور توانائی اُس کے لئے صرف کرو۔ ان لوگوں سے الگ

حسن کارانہ انداز سے قطع تعلق

ہو جاؤ، ان سے قطع تعلق کر لو۔ لیکن یہ قطع تعلق بھی حسن کارانہ انداز سے کرو۔ اس کا قطعاً خیال نہ کرو کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا۔ دوسری جگہ ہے۔ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ o (۱۵/۸۵)۔ یہاں بھی حسن کارانہ انداز سے قطع تعلق کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سورۂ زخرف میں اس حسن کارانہ انداز

میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کہا ہے: فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۴۳/۸۹)۔ اِن سے قطع علائق کرلو۔ لیکن ایسا کرتے وقت اُن سے کہہ دو کہ اگرچہ میں تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم سے الگ ہو رہا ہوں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمہاری تباہی کا خواہاں ہوں۔ نہیں! میں اب بھی تمہاری سلامتی کا خواہاں ہوں اور اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ تمہیں خیرباد کہتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میں جو کچھ تم سے کہتا تھا وہ تمہاری بھلائی کے لئے تھا، سو اس کے متعلق تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

یہ کس طرح سے معلوم ہوگا، اس کے متعلق دیگر مقامات میں وضاحت کر دی گئی۔ لیکن اسے سمجھنے کے لئے پہلے (ایک بار پھر) یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ مذہب میں جن اقدار کو "نیکی" کہہ کر پکارا جاتا ہے ان کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے نہیں آتا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان کا نتیجہ آخرت میں جا کر سامنے آئے گا۔ اس لئے اس امر کے پرکھنے کا ذریعہ کوئی نہیں ہوتا کہ جن کاموں کو ہم نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں وہ فی الواقعہ نیک ہیں یا نہیں۔ اس کے برعکس دین اس عملی پروگرام کا نام ہے جس کے نتائج اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ نبی اکرمؐ دین کے پروگرام کو پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کے مطابق عمل کرنے سے (آخرت کی فلاح اور کامرانی تو اپنی جگہ رہی) اس دنیا میں بھی کامیابی اور کامرانی نصیب ہو جائے گی۔ آپ کے مخالفین کہتے تھے کہ آپ کا یہ دعویٰ غلط ہے، کامیابی اور کامرانی ہمارے پروگرام پر چلنے سے حاصل ہوگی۔ اس باب میں پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اُن لوگوں کو دلائل و براہین کی رُو سے سمجھایا جاتا کہ ان کا دعوےٰ غلط ہے۔ ان کے پروگرام کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ کامرانیاں اس پروگرام کا نتیجہ ہوں گی جسے ہم پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ دلائل و براہین کو سُننے تک کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا، اس کے بعد یہی صورت باقی رہ جاتی تھی کہ اُن سے کہا جاتا کہ بہت اچھا۔ تم اپنے پروگرام پر عمل کرو، مجھے میرے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل انداز ہوتا ہوں، نہ تم میرے پروگرام میں مخل ہو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ حق پر مبنی تھا۔ نتائج کی رُو سے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت پیش کرنا وہ طریق تھا جس کے سامنے اب ساری دنیائے علم و بصیرت سر جھکاتی ہے۔ یہ وہ طریق کار تھا جسے آخرالامر حضورؐ نے اختیار فرمایا۔

اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ

ارشادِ خداوندی تھا: قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶)

"اِن سے کہہ دو کہ (اس باب میں کسی بحث و تمحیص یا جھگڑے جھیلے کی ضرورت نہیں)، تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے چلے جاؤ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد نتائج خود بتا دیں گے ـــــ اور بہت جلد بتا دیں گے ـــــ کہ آخرالامر

دنیا میں کامیابی کیسے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جو قوم انسانیت کے حقوق میں کمی کرتی ہے اس کی کھیتی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی"۔

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اور اُن کے کوائفِ حیات کے سلسلہ میں یہودی اور نصرانی اِس مقام تک آ پہنچے تھے جہاں وہ دلیل و برہان کی رُو سے کچھ سُننے اور علم و بصیرت کی بنا پر کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی ضد پر برابر اڑے بیٹھے تھے، اس مقام پر کہا گیا۔

۳/۶۰ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝ (۳/۶۰)

اگر اس علم و حقیقت کے بعد بھی یہ لوگ یونہی جھگڑتے چلے جائیں تو ان سے کہدو کہ میں اس معاملہ میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں ہماری روش یہ ہوتی ہے کہ ہم کنارہ کشی اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو اپنے مردوں اور عورتوں سمیت الگ کر لیتے ہیں (یعنی تنہا میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ میری جماعت کے افراد بھی)۔ تم اسی طرح اپنے لوگوں کو لے کر الگ ہو جاؤ۔ نہ تم ہمارے معاملات میں دخل دو۔ نہ ہم تمہارے معاملات میں مخل ہوں گے۔ ہمارا یہ پروگرام عملی ہے۔ اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ ہم میں سے کون جھوٹا ہے اور کون سچا۔ جھوٹا، زندگی کی اُن خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گا جو حق و صداقت کی راہ پر چلنے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

اس آیت میں لفظ "نَبْتَهِلْ" پہلی بار آیا ہے۔ جس کا مادہ (ب۔ ھ۔ ل) ہے ـــــ لغت کی رُو سے اس کے معنی ہیں کسی کو اس کے حال پر چھوڑ دینا۔ اَبْھَلَہٗ کے معنی ہیں اُسے اس کی رائے اور ارادے میں آزاد چھوڑ دیا۔ اَبْھَلَ النَّاقَۃَ کے معنی ہیں اُونٹنی کو بغیر مہار کے چھوڑ دیا کہ وہ جہاں جی چاہے چرتی پھرے۔ اِسْتَبْھَلَ الْوَالِی الرَّعِیَّۃَ کے معنی ہیں حاکم نے رعایا کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مُراد قطع تعلق کر لینا ہے۔ یہ وہی روش یا فیصلہ ہے جس کے لئے 'ہجر جمیلا' اور 'صفح جمیلا' کے الفاظ آئے ہیں اور جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

دوسرا لفظ ہے "لعنت"۔ اس کے معانی مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷۴ زیرِ آیت (۲/۸۸) اور جلد سوم صفحہ ۱۲۶ زیرِ آیت (۲/۱۵۹) بیان کئے جا چکے ہیں۔ یعنی زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی اور نامرادی۔

یہ ہیں نبتھل اور لعنت کے معنی۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے جو معنی لئے جاتے ہیں وہ عجیب ہیں۔ روایات کی رو سے کہا جاتا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپؐ سے ملنے کے لئے آیا۔ حضورؐ نے انہیں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق صحیح عقائد اور واقعات بتائے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو اس پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ تم انہیں مباہلہ کی دعوت

مباہلہ

دو۔ یعنی اُن سے کہو کہ میں اپنے بال بچوں کو لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہوں۔ تم اپنے بال بچوں کو لے کر مقابلہ میں بیٹھ جاؤ۔ پھر تم بھی کہو کہ جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ ہم بھی یہی کہیں گے۔ پتہ چل جائے گا کہ خدا کی لعنت کس پر برستی ہے۔ وہ اس چیلنج سے اس قدر خائف ہوئے کہ مقابلہ سے دست بردار ہو گئے۔ اِسے "مباہلہ" یا ملاعنہ (ایک دوسرے پر لعنتیں برسانا) کہا جاتا ہے۔

مباہلہ یا ملاعنہ کے الفاظ ہمارے ہاں فراموش ہو چکے تھے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ان کی تجدید کر دی۔ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں مرزا صاحب کا آخری حربہ یہی ہوتا تھا۔ یعنی وہ اُن سے کہتے تھے کہ آؤ مباہلہ کر لو۔ یعنی تم ہم پر لعنتیں برساؤ۔ ہم تم پر لعنتیں برساتے ہیں۔ پتہ چل جائے گا کہ جھوٹا کون ہے۔

مرزا غلام احمد کے مباہلہ کو تو چھوڑیئے۔ یہ دیکھئے کہ جس روایت کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ کس طرح بھی حضورؐ نبی اکرم کے شایانِ شان قرار پا سکتی ہے؟ حضورؐ اپنی دعوت کو علم و بصیرت کی رو سے پیش فرماتے تھے۔ آپؐ کا اعلان تھا: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ (۱۲/۱۰۸) "میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علم و بصیرت کی بنا پر ایسا کرتا ہوں۔ میری روش بھی یہی ہے، اور یہی روش میرے متبعین کی بھی ہوگی"۔ یعنی ہم اپنی دعوت علم و بصیرت کی بنا پر پیش کریں گے۔ حضورؐ ایسا کچھ اپنے متعلق فرماتے تھے اور اپنے مخالفین سے کہتے تھے کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲/۱۱۱) "اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو اس کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کرو"۔ یعنی وہاں ساری بحث دلائل و براہین کی بنا پر ہوتی تھی۔

تو کیا آپ اسے باور کر سکتے کہ جس رسولؐ کی دعوت کا انداز یہ ہو، وہ فریق مخالف سے یہ کہے گا کہ آؤ مباہلہ کرو۔ یعنی تم اپنے بال بچوں سمیت آجاؤ، میں اپنے بال بچوں کو لے آتا ہوں۔ اور پھر ہم اور تم دونوں کہیں کہ جھوٹے پر خُدا کی لعنت! اور لعنتیں برسانے کی اس روش کو (معاذاللہ) منسوب کیا جاتا ہے اُس ذاتِ گرامیؐ کی طرف جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت (رحمۃ اللعالمین) بنا کر بھیجا تھا۔ کیا حضورؐ خدا سے رحمت کی دعائیں مانگیں گے یا (معاذاللہ) لعنت کی؟ اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ سے اِرشادِ خداوندی تھا کہ ان لوگوں سے قطع علائق بھی کرو تو نہایت حسن کارانہ (حسین وجمیل) انداز سے۔ اُن سے رخصت ہو تو کہو کہ میں اس کے بعد بھی تمہارے لئے سلامتی کی دعائیں مانگوں گا۔ وہ ایسے سراپا غمگسار و دلگداز تھے کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۶/۳) "ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ راہِ راست اختیار کیوں نہیں کرتے؟ ایسا مجسمۂ شفقت و محبت کسی کے لئے بھی لعنت کی دُعائیں مانگے گا۔ یہ ہے مباہلہ کی حقیقت۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جو اس قسم کے الفاظ آتے ہیں (مثلاً) فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲/۸۹) یا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۙ (۷/۴۴) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کفر اور ظلم کا فطری نتیجہ انعاماتِ خداوندی سے محرومی ہے، یہ نہیں

کہ خدا ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ سے کہا:-

۳/۶۲-۶۱ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ○ (۳/۶۲-۶۱)

یہ واقعہ حقیقتاً وہی ہے جو تجھے سے بیان کیا گیا ہے، لہٰذا، تم اسے پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے رہو۔ ان کے اس قسم کے عقائد کہ عیسیٰؑ خدائی اختیارات میں شریک تھا، اور اسے مقامِ الوہیت حاصل تھا یکسر باطل ہیں۔ کائنات میں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار (اِلٰہ) نہیں۔ سارا غلبہ و اختیار جو یکسر حکمت و بصیرت پر مبنی ہے، اسی کو حاصل ہے۔ یہ کہہ کر ان سے الگ ہو جاؤ۔ اگر یہ لوگ علیحدگی کے اس معاہدہ سے پھر جائیں تمہارے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگیں اور اس طرح خواہ مخواہ فساد پر اتر آئیں تو خدا یہ بھی جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد فرمایا:-

۳/۶۳ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (۳/۶۳)

تم ان اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہو کہ تم ان جزئی باتوں کو چھوڑو اور اس اصل الاصول کی طرف آؤ جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اور جس کے ماننے کے (بظاہر) تم بھی مدعی ہو۔ یعنی یہ کہ

(۱) اللہ کے سوا کسی اور کے قوانین کی محکومی اختیار نہ کی جائے۔

(۲) اُس کے اس اختیار و اقتدار میں نہ کائنات کی کسی شے کو شریک سمجھا جائے اور نہ ہی انسانوں میں کسی کو خدائی اختیارات کا حامل قرار دیا جائے۔

اگر یہ لوگ توحید کے اس بنیادی نقطہ پر جمع ہو جائیں تو ہو المراد۔ لیکن اگر اس سے روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ تم جس طرف جانا چاہتے ہو جاؤ۔ ہم صرف ایک خدا کی محکومی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور اس کے تم بھی شاہد ہو۔

اہلِ کتاب کو یہ دعوت درحقیقت قرآن کریم اور رسالتِ محمدیہ پر ایمان لانے کی دعوت تھی۔ اس لئے کہ جن قوانینِ خداوندی کی محکومی اختیار کرنے کی انہیں دعوت دی گئی تھی وہ قرآن کے سوا کہیں موجود نہیں تھے (نہ ہی موجود ہیں) قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب سے بھی جماعتِ مؤمنین کی طرح ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا تھا (حوالوں کے لئے سابقہ انڈکس دیکھئے) اس آیت میں خطاب تو اہلِ کتاب سے ہے۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھئے تو اس کے مخاطب خود ہم (مسلمان) ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم اُس

مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر زمانۂ نزولِ قرآن میں اہلِ کتاب تھے۔ اس لئے جو کچھ قرآنِ مجید میں اہلِ کتاب کے متعلق کہا گیا ہے

ہماری حالت

اس کا اطلاق ہم پر کم و بیش اسی طرح ہوتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب مذہب کی جزئیات و فروعات میں اُلجھے رہتے ہیں لیکن دین کی اصل و اساس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دین کی اصل و اساس تھی (اور ہے) لَا نَعْبُدُ الا الله۔ خدا کے سوا کسی کی حکمرانی تسلیم نہ کی جائے۔ اس کے سوا کسی کے قوانین و احکام کی اطاعت نہ کی جائے۔ اہلِ کتاب کو دین کی اس اصل کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ اس کے بعد آپ اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ صدرِ اوّل کے بعد جب ہماری گاڑی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو ہم اسی قسم کی جزئیات اور فروعات میں میں الجھ گئے اور آج تک الجھے چلے آرہے ہیں۔ ہمارا سارا وقت، دولت اور توانائیاں اس قسم کے مباحث کی نذر ہو رہی ہیں کہ

ابنِ مریمؑ مرگیا یا زندۂ جاوید ہے ۔۔۔۔ ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے ۔۔۔۔ یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کی صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم ۔۔۔۔ اُمّتِ مرحومؑ کی ہے کس عقیدے میں نجات

ہمارے ہاں "اسلام" کے مہماتِ مسائل اس قسم کے ہیں کہ رسول اللہ بشر تھے یا نور، خدا عرش پر بیٹھا ہے یا آسمانِ اوّل پر آجاتا ہے۔ حوضِ کوثر کی لمبائی اور چوڑائی کس قدر ہے۔ یا اسی قسم کی فروعات کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں۔ آمین جلی کہنی چاہئیے یا خفی۔ تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں یا بیس وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے سب فرقے اسی قسم کے نظری عقائد اور فروعی مسائل کی بحثوں کو دین کی اہم خدمت قرار دیتے ہیں اور اس کی اصل و اساس (لا اله الا الله) کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ حالانکہ یہی وہ قدرِ مشترک ہے (یعنی صرف کتاب اللہ کی حکمرانی) جو ہمیں ایک اُمت بناتی ہے۔ اسی کا نام توحید تھا جسے ترک کر کے ہم بھی (اہلِ کتاب کی طرح) مختلف اقسام کے شرک میں مبتلا ہیں۔ (شرک کے متعلق سابقہ جلدوں میں گفتگو ہو چکی ہے۔ سابقہ انڈکس سے حوالہ دیکھئے)۔ ہم نے بھی، انہی کی طرح اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو خدا بنا رکھا ہے۔ ہم زبان سے تو "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کہتے ہیں (یعنی یہ کہ ہم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں) لیکن عملاً اطاعت انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسلامی شریعت نام ہی فقہی قوانین کا ہے نہ کہ قرآنی قوانین کا۔ یہی کیفیت اہلِ کتاب کی تھی اور یہی حالت ہماری ہے۔ نبی اکرمؐ نے انہیں اس قدرِ مشترک کی طرف آنے کی دعوت دی تھی جس کے وہ بظاہر مدعی تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سے منہ پھیر کر چل دیتے، بلکہ اس کی مخالفت پر اُتر آتے۔ یہی حالت آج ہماری ہے۔ اگر آج کوئی شخص ہم سے کہتا ہے کہ تم جب زبان سے کہتے ہو کہ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے اور اس کی کتاب کو "مکمل ضابطۂ ہدایت" کہہ کر پکارتے ہو ـــــ اور تم سب (تمام فرقے) اس (زبانی) دعوے میں متفق ہو تو عملاً بھی اس پر متفق ہو جاؤ، تو نہ صرف یہ کہ یہ اس دعوت کی طرف

سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں بلکہ دعوت دینے والے پر کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں، اور اسے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس سے زیادہ کیا کیا جا سکتا ہے جو خدا نے فرمایا تھا: فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ۝ (۳/۶۳) "اگر تم صحیح راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم بہر کیف خدا کی اطاعت کریں گے۔ اسے تم خود دیکھ لو گے"

اس کے بعد ان (اہل کتاب) سے کہا کہ تم حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مورث اعلیٰ تسلیم کرتے ہو لیکن مذہب کے معاملہ میں اپنے ہاں کی مروجہ تورات یا انجیل کو سند کے طور پر پیش کرتے ہو، حالانکہ یہ کتابیں (محرف ہونے کے علاوہ) حضرت ابراہیمؑ کے بعد کی ہیں۔ تم حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہو تو یہ دیکھو کہ حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم کیا تھی؟ وہ جسے تم پیش کرتے ہو یا وہ جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں؟

۳/۶۴-۶۶ يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡٓ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَآ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ‏ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝ (۳/۶۴-۶۶)

ان سے کہو کہ تم (کم از کم) ابراہیمؑ کے بارے میں (جسے تم اپنا مورث اعلیٰ مانتے ہو) یہ جھگڑے تو نہ نکالو کہ وہ یہودی تھا یا نصرانی۔ وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہو سکتا ہے جب کہ تورات اور انجیل اس کے (بہت) بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیا تم ایسی بدیہی بات سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے؟

تم نے اُن امور کے متعلق جھگڑا کر کے دیکھ لیا جن کی بابت تمہیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ علم تھا (اور اُن میں بھی منہ کی کھائی)۔ اس کے بعد سوچو کہ تم اُن معاملات میں کیا جھگڑ سکو گے جن کے متعلق تمہیں سرے سے کوئی علم ہی نہیں۔ (بتاؤ کہ مسلک ابراہیمؑ کے متعلق تمہیں کیا علم ہے؟)۔ تمہیں اس کی بابت کچھ علم نہیں، اور جھگڑتے ہو تم اس خدا کے ساتھ جسے اس کا پورا پورا علم ہے۔

یاد رکھو! ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھا نہ نصرانی۔ یہ تمہاری خود ساختہ نسبتیں ہیں۔ وہ خالص مسلم تھا۔ وہ دین میں گروہ بندیاں پیدا کرنے والے مُشرکین میں سے نہیں تھا (۳۰/۳۱-۳۲) یہ کچھ تم ہی کرتے ہو۔

یہاں ہم پھر اس حقیقت کو دہرا دینا چاہتے ہیں کہ بات تو یہ ظہور اسلام کے زمانے کے یہود و نصاریٰ کے متعلق ہو رہی ہے لیکن اس کا اطلاق حرف بحرف ہم پر ہوتا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے اور نصاریٰ

کہتے ہیں کہ وہ نصرانی تھے۔ ایسا کہتے وقت یہ اتنا نہیں سوچتے کہ حضرت ابراہیمؑ تو یہود اور نصاریٰ دونوں سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں، لہٰذا، وہ یہودی یا نصرانی کس طرح ہو سکتے ہیں ؟

ہم میں دو بنیادی فرقے، شیعہ اور سُنّی ہیں۔ شیعوں کا دعوےٰ ہے کہ رسولؐ اللہ کا وہی مذہب تھا جس کے پیرو وہ ہیں۔ —— یعنی (بقول اُن کے) رسولؐ اللہ شیعہ تھے۔ ان کے برعکس یہی دعوےٰ سُنّیوں کا ہے —— یعنی (بقول اُن کے) رسولؐ اللہ

رسُولؐ اللہ کا تعلق کون سے فرقہ سے تھا؟

سُنّی تھے۔ پھر سُنّیوں میں اہلِ حدیث، اور اہلِ فقہ ہیں۔ اہلِ فقہ میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی ہیں۔ حنفیوں میں دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک کا دعوےٰ ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کے مُتبع ہیں۔ سُنّتِ رسولؐ اللہ کے پیرو ہیں۔ یعنی (بقول اُن کے) رسولؐ اللہ اہلِ حدیث تھے، حنفی تھے۔ شافعی تھے۔ مالکی تھے۔ حنبلی تھے۔ دیوبندی تھے۔ بریلوی تھے۔ اور ان کے اس دعوےٰ کا قرآنی جواب یہ ہے کہ رسولؐ اللہ تو ان سب سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اس لئے وہ ان فرقوں میں سے کیسے ہو سکتے ہیں؟ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا کہ کَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا "وہ خالص مسلم تھے"۔ اسی طرح رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶/۱۶۴) "میں سب سے پہلا مسلم ہوں" اور یہ نام خود خدا کا مقرر کردہ ہے: هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (۲۲/۷۸) "خود خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا تھا —— قرآن سے پہلے بھی اور اس میں بھی"۔ لہٰذا، اس نام کے سوا اپنے آپ کو کسی اور نام سے پکارنا ارشادِ خداوندی اور سُنّتِ رسولؐ اللہ کے خلاف ہے۔ لیکن ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ تم کون ہو، اور آپ جواب میں کہہ دیں کہ "مسلمان" تو اس سے

تم کون سے مسلمان ہو؟

اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ پوچھتا ہے کہ کون سا مسلمان؟ یعنی خدا کے مقرر کردہ اور رسولؐ اللہ کے ارشاد فرمودہ نام سے تسلی نہیں ہوتی۔ تسلی ہوتی ہے ان ناموں سے جو بعد کے وضع کردہ ہیں —— اور تماشا یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کا مُدعی ہے اور سُنّتِ رسولؐ اللہ کے متبع ہونے کا دعویدار ہے۔ اور ہر فرقہ دوسرے کی تردید کرتا ہے۔ یہی کیفیت یہود و نصاریٰ کی تھی: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (۲/۱۱۳)۔ "یہودی، نصاریٰ کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کا مذہب باطل ہے، اور نصاریٰ، یہودیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حق پر نہیں۔ اور (ستم ظریفی یہ کہ) دونوں اس کے مدعی ہیں کہ وہ کتاب اللہ (عہد نامۂ عتیق اور جدید) کے پیروکار ہیں۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہم میں سے ہر فرقے کا دعویٰ ہے کہ وہ سنتِ رسولؐ اللہ کا مُتبع ہے۔ سُنتِ رسولؐ اللہ کا تعین حضورؐ کی احادیث کی رو سے کیا جاتا ہے، اور احادیث ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔ شیعہ اور سُنیوں کے تو احادیث کے مجموعے

ہی الگ الگ ہیں۔ سُنّیوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے فرقوں کی احادیث کے مجموعے الگ الگ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ ان کی قابلِ اعتماد احادیث بھی الگ الگ ہیں۔ اور یہی الگ الگ حدیثیں ہمارے ہاں کے الگ الگ فرقوں کی بنیاد ہیں اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقع پر غور فرمائیے۔ مشکوٰۃ المصابیح، احادیث کا قابلِ اعتماد مجموعہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس میں (سُنّیوں کے معتبر ترین) مجموعہ کی منتخب احادیث درج ہیں۔ کچھ عرصہ اُدھر کی بات ہے کہ احادیث کا ایک مجموعہ (زجاجۃ المصابیح) کے نام سے شائع ہوا تو اس پر (مولانا) عبدالماجد دریابادی (مدیر صدق۔ لکھنو) نے حسب ذیل تبصرہ کیا:۔

> خطیب تبریزیؒ کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبویؐ کا یہ مستند، کار آمد اور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے اور عوام خواص سب کے لئے شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے۔ لیکن صاحب مشکوٰۃ باوجود اپنی جلالتہ القدر کے بہر حال حنفی المذہب نہ تھے، شافعی تھے۔ اس لئے شافعی مذہب کی رعایت کا ان کی کتاب میں جا بجا آجانا قدرتی تھا اور اس لئے علماء حنفیہ ایک اس قسم کے دوسرے مجموعۂ احادیث کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس میں رعایت اُن کے مسلک و مشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدر آبادی فاضل کے حصے میں آئی ہے۔

حنفی مجموعہ احادیث

(صدق۔ لکھنو، ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء بحوالہ مقام حدیث)

یعنی مشکوٰۃ المصابیح اس مقصد کے لئے مرتب کی گئی تھی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ شافعی مذہب مطابق سنت رسول اللہؐ ہے۔ یہ بات حنفیوں کو بڑی کھلتی تھی۔ اس لئے یہ نیا مجموعہ یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے کہ حنفی مذہب مطابق سُنتِ رسول اللہ ہے۔ بالفاظ دیگر، مشکوٰۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کی گئی تھی کہ رسول اللہؐ شافعی المذہب تھے اور زجاجتہ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کی گئی کہ رسول اللہؐ حنفی المسلک تھے۔

شافعی اور حنفی تو اہلِ فقہ کے دو فرقے ہیں۔ اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ میں کس قدر بُعد اور تنازعہ ہے؟ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ (مولانا) مفتی محمد حسین (مرحوم)، (مولانا) اشرف علی تھانوی (مرحوم) کے خلیفہ۔ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے بانی تھے۔ (مولانا) جمیل احمد صاحب نے ان کا حسب ذیل واقعہ ہفتہ وار اخبار "خدام الدین" (لاہور) کی ۱۴ر جون ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

حدیث کسی حنفی سے پڑھو

> حضرت مفتی صاحب نے (اپنے قیام امرتسر کے دوران) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی (نور اللہ مرقدہ) سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ

> چونکہ تم نے احادیث مبارکہ اہلِ حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں اور میں حنفی ہوں۔ جوڑا پیدا نہیں ہوگا۔ لہذا، آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں، پھر درخواستِ بیعت کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے تین سال دیوبند میں تعلیم میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا۔

یہاں تک بات احادیث کی ہو رہی تھی۔ چند لمحات کے لئے کتاب اللہ کی طرف آجائیے۔ چند سال اُدھر کی بات ہے کہ تفسیر مدارک کا اُردو ترجمہ شائع ہوا تو اس کے تعارف میں، دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز مدرس (مولانا) سید المنظر شاہ صاحب نے تحریر فرمایا:۔

حنفی تفسیرِ قرآن

> صدیوں سے ہمارا سرمایۂ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختۂ مشق ہے۔ یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بُری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو خوش آئند ہے جس جماعت کی طرف سے ہو، قابلِ پذیرائی ہے مگر افسوس علم جیسے لازوال، ابدیت نشان سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طول طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہر حال جو کچھ ہوا ہو چکا ہے۔ اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطۂ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔ (پارۂ اوّل۔ جزو اوّل ص۴)

یعنی قرآن مجید کی شافعی تفسیر کے نقصان کے ازالہ کے لئے حنفی تفسیر! (یا للعجب)۔

سُنّی ترجمۂ قرآن

اسی قسم کی ایک اور مثال۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی (مرحوم) نے قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ اور تفسیر شائع کی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، دہلی کے ماہنامہ "برہان" نے اپنی مئی ۱۹۵۸ء کی اشاعت کے افتتاحیہ میں لکھا:۔

> انگریزی زبان میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمہ کی ضرورت تھی جس کو اہلِ سنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحت عقیدہ و خیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کلام کیا گیا ہو۔ بحمد اللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۸ء)

آپ سوچئے کہ اپنے عقائد اور نظریات کے تابع قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر، اگر کھلا ہوا شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ کیا اس قسم کے تراجم اور تفاسیر سے خالص کتاب خداوندی کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے؟ قرآن مجید نے اہلِ کتاب سے کہا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ، یہودی یا نصرانی کس طرح ہو سکتے تھے کیونکہ وہ تو ان فرقوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اس سے مجھے ایک بات یاد آگئی جو ہے تو (بظاہر) لطیفہ سی، لیکن ہمارے ہاں کی عام مذہبی ذہنیت کی بڑی جامعیت سے

کیا رسول اللہ غیر مقلد تھے؟

غمازی ہوتی ہے۔ ایک حنفی مولوی صاحب وعظ میں فرما رہے تھے کہ نجات صرف امام اعظم (ابو حنیفہؒ) کی تقلید سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو ان کا مقلد نہیں اس کی نجات نہیں ہو سکے گی۔ اس کے بعد ایک دن وہی مولوی صاحب سیرتِ نبویؐ پر وعظ فرما رہے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ حضورؐ کی وفات سنہ ھ میں ہوئی تھی۔ جس شخص نے پہلا وعظ سُنا تھا اس نے ان سے پوچھا کہ مولوی صاحب! امام ابو حنیفہؒ کا زمانہ کون سا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ان کی پیدائش ۸۰ھ میں اور وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ اس پر اس مُستفسر کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ کپکپا اٹھا۔ اور سہمتے لرزتے مولوی صاحب سے کہا کہ کیا رسول اللہ غیر مقلد ہی وفات پا گئے؟ (اس سے آگے آپ خود سمجھ لیجئے!)۔

یہ ہوتی ہے فرقہ وارانہ ذہنیت۔ یا اس قسم کی عصبیت پیدا کرنے کا نتیجہ! (معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ)۔ یہی تھی وہ ذہنیت یا عصبیت جس کی تردید کے لئے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے کہا تھا کہ (حضرت) ابراہیمؑ کو تمہاری گروہ بندیوں سے کیا تعلق۔ تمہاری یہ گروہ بندیاں ان کے بعد وجود میں آئی تھیں۔ وہ تو صرف مسلم تھے۔

قرآنِ کریم نے یہود اور نصاریٰ سے یہ بھی کہا تھا کہ یہودیت اور عیسائیت نے فرقہ بندی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور فرقہ بندی شرک ہے (۳۰/۳۰-۳۱)۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ یہودی یا نصرانی کیسے کہلا سکتے ہیں کیونکہ وہ مُشرک نہیں تھے (وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ ۳/۹۴)۔ وہ صرف مُسلم تھے۔ یعنی وہ اسلام کے پیرو تھے اور اسلام میں فرقہ بندی ہو نہیں سکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو بھی اپنی نسبت کسی فرقہ کی طرف کرتا ہے وہ نہ مسلم ہو سکتا ہے، نہ سُنّتِ رسول اللہ کا متبع۔ قرآن کا متبع ہی مسلم ہے اور وہی متبع سنتِ رسول اللہ۔ کیونکہ حضورؐ خود قرآنِ مجید کا اتباع کرتے تھے۔ حضورؐ سے کہا گیا تھا: اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۷) "جو شخص تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے تو اسی کا اتباع کر"۔ یہی حکم مسلمانوں کو بھی تھا: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) "جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اسی کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی بڑے (سازگار و سرپرست) کا اتباع نہ کرو"۔ یہی مسلکِ ابراہیمی تھا: فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (۳/۹۵)۔ اور اس سے انسان شرک سے مجتنب رہ سکتا ہے وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۳/۹۵)۔ اسی لئے فرمایا:

۳/۶۷ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳/۶۷)

(گروہ بندانہ نسبتیں رکھنے والوں کا ابراہیمؑ کے ساتھ کیا تعلق)۔ اس کے ساتھی اور قریبی وہ لوگ تھے جنہوں نے اُس کی

ملت کا اتباع کیا (۳/۶۸)، اور اب اس کا قریبی یہ نبیؐ ہے اور جماعت مومنین جو اس مسلکِ توحید کے علمبردار ہیں جس کی طرف ابراہیمؑ دعوت دیتا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا کی رفاقت اور سرپرستی حاصل ہے۔

فرقہ وارانہ عصبیت سے انسان کی کیفیت عجیب ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے فرقہ کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہتا، چاہتا یہ ہے کہ دوسرے بھی اس کا فرقہ اختیار کر لیں۔ نبی اکرمؐ نے یہود و نصاریٰ پر واضح کیا کہ اُن کی گروہ بندیاں دینِ خداوندی اور ملتِ ابراہیمیؑ کے خلاف ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان حقائق پر غور کر کے اپنے مسلک میں تبدیلی کرتے، اُن کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح حضورؐ اپنے مسلک میں کچھ تبدیلی پیدا کر لیں۔

۳/۶۸ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۳/۶۸﴾

مفاہمت نہیں ہو سکتی

"ان اہلِ کتاب کا ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تم تھوڑی سی مداہنت اختیار کر لو (۶۸/۹) اور قرآن میں ان کے مطلب کے مطابق کچھ تبدیلی کر دو (۱۰/۱۵) تو یہ تم سے مصالحت کر لیں۔ لیکن، یاد رکھو! حق اپنے مقام پر ہوتا ہے اور وہ اس سے نیچے اتر کر، کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے، ان لوگوں کی یہ خواہش، درحقیقت تمہیں حق سے روگرداں کر دینے کی کوشش ہے۔ لیکن اس قسم کی ناکام کوششوں سے یہ خود اپنے آپ کو حق سے روگرداں کرتے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔"

اس پر ارشادِ خداوندی ہوا:-

۳/۶۹ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۳/۶۹﴾

اِن (اہلِ کتاب) سے کہو کہ تم قوانینِ خداوندی سے کیوں انکار کرتے ہو، حالانکہ اِن کے سچے ہونے کی اس قدر نشانیاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔"

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ان اہلِ کتاب کی حالت یہ تھی کہ یہ حق اور باطل میں تلبیس بھی کرتے تھے اور حق کو چھپاتے بھی تھے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۲/۴۲) میں انہیں اس جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھئے مطالب القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۱۹۵۔ زیرِ آیت ۲/۴۲)۔ یہی الزام ان پر اس مقام پر بھی عائد کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

۳/۷۰ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳/۷۰﴾

"یہ (اہلِ کتاب) صرف حق سے انکار ہی نہیں کرتے۔ ان کا، اس سے بھی سنگین جرم یہ ہے کہ یہ حق اور باطل کو خلط ملط کر دیتے ہیں، جس سے حق مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اور حق کو چھپاتے بھی ہیں ——— اور یہ کچھ دیدہ دانستہ کرتے ہیں ———

ان سے پوچھو کہ اس سے بالآخر ان کا مقصد کیا ہے؟ (ﷺ)"۔

ہمارے ہاں التباسِ حق و باطل کی کئی قسمیں ہیں۔ ان کی مثالیں آپ کو کتبِ احادیث اور تفاسیر و تاریخ میں ملیں گی۔ کتبِ احادیث

ہمارے ہاں التباس حق و باطل

میں آپ کو ایک حدیث ایسی نظر آئے گی جو زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہی ہو گی کہ یہ واقعی ارشادِ نبوی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی روایت ملے گی جس کی نسبت رسول اللہ کی طرف کسی حال میں بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مقلدینِ احادیث کا اصرار ہے کہ آپ ان دونوں کو احادیث رسول اللہ ماننا ہو گا۔ (اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے ـــــ "جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث" از مولانا محمد اسماعیل (مرحوم))۔ یہی حال ہماری کتبِ تفاسیر اور تاریخ کا ہے۔ ان میں بھی حق اور باطل، غلط اور صحیح گڈمڈ شکل میں ملیں گے۔ اس تمام ذخیرہ سے حق کو باطل سے الگ کرنے کا ایک ہی طریق ہے کہ قرآنِ مجید کو معیار قرار دے کر ان کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ جو اس معیار پر پورا اترے، اسے حق تسلیم کیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دے کر مسترد کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کرنا تو ایک طرف، ہمارا مذہب پرست طبقہ اس قسم کی بات تک سننے کے لئے بھی تیار نہیں!

التباسِ حق و باطل کی طرح، کتمانِ حق کی بھی کئی قسمیں ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ سنگین شکل وہ ہے جو اہلِ معرفت

کتمانِ حقیقت

(تصوف) کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کے معانی سے حقیقت سامنے نہیں آتی۔ حقیقت ان الفاظ کے بطن میں پوشیدہ ہے۔ یعنی ان الفاظ کے باطنی معانی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو بذریعہ کشف و الہام بتاتا ہے۔ وہی معانی حقیقی ہیں۔ بالفاظِ دیگر، اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اصل

باطنی معانی

حقیقت کو قرآن کے الفاظ کے بطن میں چھپا رکھا ہے اور وہ ان پردوں کو اپنے مقربین کے لئے اٹھاتا ہے۔ اس طرح اصلی قرآن ان مقربین کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے۔ ان کے سوا دوسرے مسلمانوں پر، جو قرآنِ کریم کے الفاظ کے معانی کی رُو سے اسے سمجھنا چاہتے ہیں، حق مستور اور مکتوم رہتا ہے۔ سوچئے کہ اس سے خود ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ (کشف اور الہام اور تصوف کے متعلق، تفصیلی بحث مطالب الفرقان کے سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ حوالے سابقہ انڈکس کی مدد سے دیکھئے)

ان محاذوں پر شکست کھانے کے بعد ان اہلِ الکتاب نے تخریب کاری کا ایک ایسا طریق اختیار کیا، جس سے وہ اس زمانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے، لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جس سے مسلمانوں کی گاڑی دین کی پٹڑی

پر جا پڑی۔ اور وہ آج تک اسی پٹڑی پر چلی جارہی ہے۔ وہ سازش کیا تھی، اسے قرآن مجید کے الفاظ میں سنئے :۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۚ (۳/۷۲)

"اے جماعتِ مومنین! آؤ، تمہیں بتائیں کہ ان لوگوں کی سازش کیا ہے) یہ اپنے لوگوں سے کہتے ہیں کہ جاؤ! صبح کے وقت، مسلمانوں کے دین میں (منافقانہ طور پر) شامل ہو جاؤ (اور اس طرح، ان میں گھل مل کر، دین کی طرف سے ان کے دل میں شبہات پیدا کرتے رہو) اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ، اس دین کو ترک کر کے تمہارے ساتھ واپس آجائیں۔

انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ مسلمانوں سے الگ رہ کر ہم ان کے دین میں بگاڑ پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ مسلمان بن کر ان کی جماعت کے اندر چلے جاؤ۔ وہاں چپکے چپکے اپنے خیالات پھیلاؤ۔ انہیں ان کے دین سے برگشتہ کرو۔ نہایت مخلص اور ہمدرد بن کر، سرگوشیوں سے کام لو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ متذبذب افراد تمہارے ساتھ اس جماعت سے نکل کر باہر آجائیں۔ اگر اس کا فوری اثر نہ بھی ہو تو بھی جو خیالات تم وہاں چھوڑ آؤ گے وہ آہستہ آہستہ انہیں متاثر کرتے جائیں گے۔ یوں ان کی جماعت کے اندر یہ سست رفتار زہر (SLOW POISON) اپنا کام کر جائے گا۔

سرگوشیاں یا وسوسہ انگیزیاں کس قدر خطرناک ہوتی ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے

وسوسہ انگیزی کا زہرِ خاموش

تیس پاروں اور (۱۱۴) سورتوں میں اپنے پیغام کو مکمل کرنے کے بعد آخری (۱۱۴ویں) سورت میں مسلمانوں کو ایک وارننگ دی، اور اس وارننگ پر قرآن کو ختم کر دیا۔

وہ وارننگ یہ تھی کہ تمہیں خاص طور پر محتاط رہنا ہوگا۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۚ (۱۱۴/۴-۶)

ان لوگوں کی وسوسہ انگیزیوں سے جو دبے پاؤں آتے ہیں اور چپکے ہی چپکے کانوں میں کچھ پھونک کر پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔

ایسا کچھ جانے پہچانے لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کی طرف سے بھی جو اجنبی اور بیگانے ہوتے ہیں۔

ہماری (صدرِ اوّل کے بعد کی) ساری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلام کو غیر مسلموں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا نقصان ان لوگوں نے پہنچایا جو مسلمان بن کر اس اُمت کے اندر شامل ہوئے۔ انہوں نے اس طرح اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ دیا کہ ہمیں احساس تک بھی نہ ہوا، اور ہم دینِ خداوندی سے یکسر بیگانہ ہو گئے۔ اور اس سے بیگانہ ہی نہیں ہوئے بلکہ تمام غیر اسلامی نظریات، خیالات، تصورات۔ معتقدات کو اس طرح عینِ اسلام سمجھ کر اپنا لیا کہ اب اگر کوئی ہم سے کہتا ہے کہ

یہ اسلام نہیں تو ہم اس کی جان تک کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

بہ افرنگی بتاں دل باختم من ز تاب دیریاں بگداختم من

چناں از خویشتن بیگانہ بودم چو دیدم خویش را نشناختم من

اس سازش کی تفصیل کا یہ مقام نہیں، کیونکہ یہ بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ آپ اسے جاننا چاہیں تو میری کتاب "شاہکارِ رسالتؐ" کا آخری باب دیکھئے جو بڑا مفصل اور مبسوط ہے۔

بات اہلِ کتاب کی سازش کی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ تم مسلمانوں کے اندر جا کر ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرو۔ انہوں نے یہ اسکیم تو وضع کی، لیکن اس سے انہیں ایک خطرہ بھی لاحق ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام دلائل و براہین پر مبنی دین ہے۔ انہیں خدشہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کو ہم مسلمانوں کے اندر بھیج رہے ہیں، کہیں وہ خود ہی اسلام سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان سے تاکیداً کہا کہ

۷۳-۷۴ / ۳

وَلَا تُؤْمِنُوٓا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ أَنْ يُؤْتٰىٓ أَحَدٌ مِّثْلَ مَآ أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَآجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۚ ۙ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ (۷۳-۷۴ / ۳)

اور (یہ) اپنے لوگوں سے اس کی بھی تاکید کرتے ہیں کہ سوائے اُن لوگوں کے، جو تمہارے مسلک کا اتباع کریں، اور کسی کی بات پر اعتماد نہ کرو۔ نیز اُن سے کہتے ہیں کہ (اس کا تو تصور تک بھی دل میں نہ لاؤ کہ) جو دین تمہیں دیا گیا تھا، اس جیسا دین کسی اور کو بھی مل سکتا ہے، یا خدا کے حضور، تمہارے خلاف کسی کی حجت چل سکتی ہے۔ (یہ اپنے لوگوں کو اس طرح پکا کرتے رہتے ہیں)۔

ان سے کہو کہ

۱۔ جہاں تک کسی کی بات ماننے کا تعلق ہے، اس میں ہماری بات، یا تمہاری بات کا سوال ہی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ زندگی کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح راستہ وہی ہو سکتا ہے جو اللہ نے بتایا ہو۔ تم بتاؤ کہ وہ رہنمائی تمہارے پاس موجود ہے؟

۲۔ اب رہا یہ کہ جس قسم کا دین تمہیں ملا تھا، ویسا دین کسی اور کو نہیں مل سکتا، سو اس بات کا اختیار کسی انسان کو حاصل نہیں۔ اس کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق، جسے چاہتا ہے وحی سے نوازتا ہے۔ خدا کی نگہ انتخاب

تمہاری گروہ بندیوں میں گھر کر نہیں رہ سکتی۔ وہ بڑی وسعتوں کا مالک ہے اور لامحدود علم رکھتا ہے۔ اس وسعتِ علم کی بنا پر وہ خوب جانتا ہے کہ وحی کی امانت سونپنے کے لئے کون سا قلب سب سے زیادہ موزوں ہے۔ وہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔ تمہارے جیسا تنگ نظر نہیں"۔

ان آیات میں ایک بات تو وہ ہے جو اہلِ کتاب ان لوگوں سے کہتے تھے جنہیں وہ منافقانہ طور پر مسلمانوں کی جماعت میں بھیجتے تھے۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ وہاں جاتے ہو تو اس کا خیال رکھنا کہ ان کی کوئی بات تم پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ یاد رکھو! جو دین ہمیں دیا گیا ہے اس کی مثل کسی اور کو نہیں دیا گیا۔ اگر تم نے اتنا سا بھی مان لیا کہ ان (مسلمانوں) کے ہاں بھی کچھ سچی باتیں پائی جاتی ہیں تو انہیں تمہارے خلاف جھگڑنے کے لئے گنجائش نکل آئے گی۔ لہٰذا، وہاں جاؤ تو اس طرح جیسے بطخ پانی

مسلمان بن کر ان کے اندر جاؤ

میں جاتی ہے کہ اس کا ایک پر بھی بھیگنے نہیں پاتا۔ تم جیسے جاؤ، ویسے ہی وہاں سے نکل آؤ۔

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جو قومیں اس طرح منافقانہ مسلمانوں میں مل کر شامل ہوئیں، انہوں نے مسلمانوں کو تو اپنے رنگ میں رنگ لیا لیکن اسلام کا ایک چھینٹا تک بھی اپنے معتقدات و نظریات پر نہ پڑنے دیا۔ مذہبی دنیا سے ہٹ کر اس کی ایک حالیہ مثال سیاسی دنیا میں ملتی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندو راہنماؤں (جن کے سرخیل مسٹر —— یا ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق مہاتما گاندھی تھے) کا اُپدیش (وعظ) یہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ! سیاست کی بات سیاسی سطح پر کرو۔ مذہب کو درمیان میں مت لاؤ۔ وہ مسلمانوں سے یہ کہتے اور خود اپنی قوم کو تاکید کرتے کہ تم ہندو دھرم کے احیاء کے لئے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

چنانچہ نیشنلسٹ مسلمان (بالخصوص علماء کا طبقہ) ان کی اس سازش کا شکار ہو گیا، اور انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر

نیشنلسٹ مسلمان

دیا کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو نماز، روزہ، نکاح، طلاق وغیرہ کی آزادی حاصل رہے اور امورِ مملکت جمہوری (سیکولر) طریق پر سرانجام پاتے رہیں تو اس سے اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے کسی جداگانہ مملکت کی ضرورت نہیں۔ ہندو کی یہی سازش تھی جسے بے نقاب کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

نگہ دارد برہمن کارِ خود را — نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوشِ خود برد زنارِ خود را (ارمغانِ حجاز)

اہلِ کتاب کا دعویٰ تھا کہ ہدایتِ خداوندی صرف ان کے پاس ہے ۔ نہ یہ کسی اور کے پاس ہے، نہ کسی اور کو مل سکتی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی اصولی بات کہی کہ اگر اسے معیار تسلیم کر لیا جائے تو، دیگر اہلِ مذہب تو ایک طرف خود مسلمانوں کے باہمی فرقہ وارانہ جھگڑے بھی ختم ہو جاتے ہیں ۔فرمایا کہ سوال اس کا نہیں کہ حق و صداقت کی راہ تمہاری راہ ہے یا تمہارے فریقِ مخالف کی ۔حق و صداقت کی راہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے۔ (اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى - ۲/۱۲۰) ۔ الهدٰى (THE RIGHT PATH) صرف وہ ہے جسے اللہ نے نازل کیا ہے ۔تم ثابت

ہدایت صرف قرآن کے اندر ہے

کر دو کہ جس راہِ ہدایت کے تم مدعی ہو وہ خالصتہً خدا کی عطا فرمودہ ہے ۔ اس میں انسانی آمیزش کا کوئی دخل نہیں ۔تم اسے ثابت ہی نہیں کر سکتے ۔ ایسا ثابت کرنا تو ایک طرف، تمہاری مبینہ آسمانی کتب خود اس کی زندہ شہادت ہیں کہ وہ محرف ہیں ۔اس لئے تمہارا یہ دعویٰ کس طرح سچا ہو سکتا ہے کہ خالص اور غیر محرف ہدایتِ خداوندی تمہارے پاس ہے ۔

یہاں جو جواب اہلِ کتاب کو دیا گیا ہے، وہی جواب ہمارے ہاں کے مذہبی فرقوں کو دیا جا سکتا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ حقیقی اسلام اس کے پاس ہے، دوسرے فرقے کے ہاں نہیں ۔چنانچہ ہمارے ہاں ایک روایت مروج ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت میں (۷۳) فرقے ہوں گے ۔ ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا، باقی سب اہلِ جہنم ۔اس روایت کی رُو سے ہمارے ہاں کا ہر فرقہ اس کا مدعی ہے کہ ناجی فرقہ وہی ہے اور کوئی نہیں ۔قرآنِ کریم اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ سوال تمہارے دعاوی کا نہیں ۔ اصل سوال ان دعاوی کے ثبوت کا ہے ۔ثبوت کے لئے ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ ان هدى الله هو الهدىٰ : حق و صداقت کی راہ (ہدایت) وہی ہے جسے خدا نے نازل فرمایا ہے ۔یعنی جو قرآنِ مجید کے اندر ہے ۔ تم میں سے جس کا دعویٰ اس معیار پر پورا اترے گا (یعنی وہ قرآن کے مطابق ہوگا) وہ سچا ہوگا۔ جو اس کے خلاف ہوگا وہ ہدایتِ خداوندی نہیں ہوگا ۔

اگر ہمارے فرقے اس معیار کو تسلیم کر لیں تو فرقہ واری آج ختم ہو جائے ۔ لیکن اس معیار کو نہ اہلِ کتاب نے تسلیم کیا تھا، نہ ہمارے فرقے تسلیم کریں گے ۔

یہودیوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ نبوت کو بنی اسرائیل کے اندر محدود رہنا تھا ۔ یہ (ان سے باہر) بنی اسماعیل میں

نبوت نسلی نہیں

کس طرح چلی گئی ؟ (نبی اکرمؐ نسلی اعتبار سے بنی اسماعیل میں سے تھے) ۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ نبوت نہ کسی نسل کے ساتھ مختص ہے، نہ کسی خاص قبیلہ یا خاندان کے ساتھ ۔ اس اختصاص کا فیصلہ مشیتِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے، اسی لئے اس میں بنی اسرائیل یا بنی اسماعیل کی کوئی قید نہیں ۔ (نبوت ۔

رسالت۔ وحی وغیرہ کے متعلق مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث کی جاچکی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے)

اس کے بعد قرآن کریم ایک ایسے ابلیسی نظریہ کو سامنے لایا ہے جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اس نظریہ کی "جہنمیت" کا صحیح اندازہ اس سے پہلے لگ چکا ہو یا نہ، لیکن ہمارے زمانے میں یہ نکھر اور ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

۳/۸ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥ (۳/۷۵)

ان اہلِ کتاب کے ہاں چونکہ دین اجتماعی نظام کی شکل میں نہیں، محض انفرادی 'ضابطۂ اخلاق' کی صورت میں ہے، اس لئے ان میں انفرادی طور پر، ایسے لوگ مل جائیں گے کہ اگر اُن کے پاس چاندی سونے کا ڈھیر بھی بطورِ امانت رکھ دو، تو وہ جوں کا توں، واپس کر دیں۔ اور ایسے بھی کہ اگر اُن پر ایک روپے کا بھی بھروسہ کرو، تو وہ اُسے کبھی واپس نہ کریں، بجز اس کے کہ تم اُن کے سر پر (ڈنڈا لے کر) سوار رہو۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ ہر گروہ بندی میں ہوتا ہے) ان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا ہے کہ تم غیر اہلِ کتاب کے ساتھ جو جی میں آئے کرو، اس سے تم پر کوئی الزام عائد نہیں ہو گا۔ اور تماشا یہ کہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس بات کی اجازت خود خدا نے دے رکھی ہے۔ حالانکہ یہ اللہ کے خلاف صریح کذب و افتراء ہے۔ اور (ان کے مذہبی پیشوا جو عوام سے ایسا کہتے ہیں) خوب جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔

اس ابلیسی نظریہ کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ پہلے قرآن مجید کی کشادہ نگہی ملاحظہ کیجئے کہ اہلِ کتاب نے اسلام اور مسلمانوں کی

قرآن کی کشادہ نگہی

انتہائی مخالفت کی۔ اس کی تخریب میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن اس کے باوجود، ان میں جو لوگ دیانتدار تھے، قرآن مجید ان کی دیانتداری کا اعتراف کرتا ہے۔ دشمن کی خوبیوں کے اعتراف کے لئے جس وسعتِ ظرف کی ضرورت ہوتی ہے، قرآن اس کا آئینہ دار ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔ عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اُس نے کرۂ ارض پر لکیریں کھینچ کر نوعِ انسان کو مختلف قوموں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جس سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) "انسان نوعِ انسان کا شکاری" ہو گیا ہے۔ انسانوں کی اس تقسیم نے ضابطۂ اخلاق کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی ذاتی اخلاق (PRIVATE MORALITY) اور سیاسی اخلاق (PUBLIC MORALITY) پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں:-

(عصرِ حاضر کی سیاست کی رو سے) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔

پرائیویٹ اور پبلک ضوابطِ اخلاق

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانت دار، رحمدل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا "کارِ ثواب" ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO MORALS, ETC. P-13)

اسی بنا پر لارڈ گرے نے کہا تھا:-

سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پا سکتے

(IDEALS AND ILLUSIONS, BY SUSAN STEBBING. P-13)

اور والپول نے لکھا تھا:-

نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک نہیں جا سکتے (- DO - P-14)

(CAVOUR) جسے اٹلی کا معمار کہا جاتا ہے، کہا کرتا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے، تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

(FOREIGN AFFAIRS. JULY, 1952)

اس قسم کا "اخلاقی نظریہ" نیشنلزم کا پیدا کردہ ہے جس میں سب سے بڑا مُحبِ وطن (PATRIOT) وہ ہوتا ہے جس کا ایمان یہ ہو کہ (MY CONNTRY RIGHT OR WRONG) "مجھے اپنے ملک کا مفاد مطلوب ہے، خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔"

مذہب کی دنیا میں اسی قسم کی بدترین قومیت پرستی کی بنیاد یہودیوں (بنی اسرائیل) نے رکھی تھی۔ اُن کی قومیت کا مدار نسل پر تھا۔ وہ غیر بنی اسرائیل، کو اس دنیا میں تو ایک طرف، آخرت میں بھی، جنت میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا:-

---

لہ اس قسم کے ضابطۂ اخلاق۔ میکیاولی سیاست۔ اور نیشنلزم کی سیاہ کاریوں کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا"۔۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۝ (۲/۱۱۱)

یہود و نصاریٰ کے سوا جنت میں کوئی نہیں داخل ہو سکے گا"۔ یہ (ہُود و نصٰریٰ) دونوں بنی اسرائیل تھے۔ ان کی اس نسل پرستی پر مبنی قومیت نے "دو اخلاقی نظریہ" کی لعنت کی تخلیق کی۔ وہ عربوں کے غیر اسرائیلیوں کو اُمیّین کہہ کر پکارتے تھے۔ اور ان کا نظریۂ اخلاق یہ تھا کہ ان کے خلاف سب کچھ کرنا جائز ہے۔ (لیس علینا فی الامیین سبیلا)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے جن دیانت داروں کی طرف قرآنِ مجید نے اشارہ کیا ہے، ان کی دیانت داری بنی اسرائیل تک محدود تھی۔ غیر بنی اسرائیل کے ضمن میں ان کا مسلک بھی قومی تھا۔

ہمارے ہاں جو لوگ مغربی ممالک سے ہو آتے ہیں، وہ وہاں کے باشندوں (بالخصوص انگریزوں) کی خوش معاملگی اور حسنِ سلوک سے بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ خوش معاملگی اور حسنِ سلوک قابلِ تعریف محاسن ہیں۔ لیکن وہی مغربی باشندے جب قومی سطح پر آتے ہیں تو اخلاق و دیانت کے ہر اصول کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں، اور اپنی قوم کے مفاد کی خاطر وہ کچھ کرتے ہیں جو باعثِ ننگِ انسانیت ہوتا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے اسی نظریۂ اخلاق کی طرف اشارہ کیا ہے[1]۔ قرآنِ کریم نوعِ انسان کو اُمتِ واحدہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ ضابطۂ اخلاق کے سلسلہ میں اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اُس کا

قرآنی ضابطۂ اخلاق

ضابطہ تمام انسانوں کے لئے یکساں ہے۔ قرآنِ کریم یہ عظیم اصول پیش کرتا ہے کہ تم نے صداقت شعاری اور دیانت داری کا عہد کسی خاص شخص یا قوم سے نہیں کیا۔ تم نے یہ عہد اپنے خدا سے کیا ہے۔ اس لئے اس عہد کا پورا کرنا فریضۂ خداوندی ہے جسے تمہیں ہر حالت میں ادا کرنا ہوگا۔ خواہ فریقِ مقابل کوئی بھی ہو:

۳/۷۵ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳/۷۵)

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانون، اس باب میں، انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کا قانون یہ

---

[1] ہمیں افسوس ہے کہ سیکیاولی سیاست سے متاثر ذہنیتوں نے یہاں بھی اسی قسم کے ضابطۂ اخلاق کی تلقین کی اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے اسلامی ضابطۂ اخلاق کہہ کر پیش کیا۔ فرمایا:۔

راست بازی (صداقت شعاری) اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے، اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین بُرائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مرحوم۔ بحوالہ ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء۔ ص ۵۴)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے جھوٹ کی "ضرورت" اپنے سے "باہر" کے لوگوں کے سلسلہ میں ہی پیش آسکتی ہے۔

ہے کہ جس شخص نے بھی اپنا عہد پورا کیا، اور اس طرح قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی، تو یہی لوگ ہیں جو خدا کی نگاہ میں پسندیدہ ہیں۔
اس کے برعکس :-

۷۶/۳ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَیۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ٥ (۷۶/۳)

اس کے برعکس، جو لوگ اپنے عہد معاہدہ، اور قول اقرار کو جن کی پابندی کی تاکید قانونِ خداوندی اس شدت سے کرتا ہے، دنیاوی مفاد کی خاطر بیچ ڈالتے ہیں، تو انہیں مفادِ عاجلہ تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ اس دُنیا کا فائدہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، مستقبل کے مفاد کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہیں ہو سکتی ـــــ مستقبل کی خوشگواریوں کے سلسلہ میں قانونِ خداوندی ایسے لوگوں سے بات تک نہیں کرے گا۔ اُن کی طرف نگاہ اٹھا نہیں دیکھے گا۔ ان خوشگواریوں میں حصہ نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی صلاحیتیں دب کر رہ جائیں گی۔ ان کی ذات کی نشوونما نہیں ہوگی۔ اور اس طرح، یہ دردانگیز عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

غور کیجئے۔ یہاں اس عہد و معاہدہ کو جسے ایک انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کرتا ہے عَہۡدُ اللّٰہ کہہ کر پکارا ہے۔ اس سے قرآن کا پیش کردہ نظامِ اخلاق باقی دنیا سے ممتیز اور بلند ہو جاتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص (یا کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ) سے معاملہ کرتے وقت یہ نہیں کہتا کہ میں اس وقت تو تمہیں اپنی صداقت، دیانت اور پابندیٔ عہد کی یقین دہانی کر رہا ہوں لیکن بعد میں، میں ہر قسم کی بددیانتی اور بدعہدی کروں گا۔ وہ کبھی ایسا نہیں کہے گا۔ وہ اپنے عہد و معاہدہ کی پابندی کا یقین دلاتا رہے گا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ عہد اور معاہدہ تم نے اس شخص کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ خدا کے ساتھ کیا تھا۔ اس لئے اس کے لئے تم سے خدا کے ہاں مواخذہ ہوگا: وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ٥ (۳۴/۱۷) "اپنے عہد کو پورا کرو۔ اس کی بابت تم سے خدا کے ہاں بازپرس ہوگی"۔

زیرِ نظر آیت میں قرآن کریم نے کہا ہے : اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ بددیانتی اور بدعہدی کرنے والوں کو پیش پا افتادہ مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن آخرالامر (IN THE LONG RUN) وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ لیکن اگر آخرت سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی لی جائے تو اس سے ایک اور اہم سوال کا جواب مل جاتا ہے۔

کفار کے اچھے کاموں کا صلہ اسی دنیا میں

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ غیر مسلم (کفار) اکثر نیک کام بھی کرتے ہیں۔ کیا اُن کے نیک کاموں کا انہیں کوئی اجر

نہیں ملے گا؟ قرآنِ مجید میں ہے کہ یہ لوگ جب قیامت میں خدا سے یہی سوال کریں گے، تو ان سے کہا جائے گا کہ اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا ‌(۴۶/۲۰) "تم نے دنیا میں اچھے کام کئے تو ان اچھے کاموں کا بدلہ بھی وہیں مل گیا۔ تم نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کا حساب تم نے وہیں چکا لیا۔ اب ان کا بدلہ کیا مانگتے ہو"؟ یہی مطلب ہے یہاں ان الفاظ سے کہ اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ۔ "آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا"۔ دنیا اور آخرت کی نجات وسعادت کے سلسلہ میں یہ نکتہ بڑا اہم ہے لیکن اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اسے ہم مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں، مکافاتِ عمل اور نجات وغیرہ کے موضوعات کے تحت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ (انڈکس کی مدد سے حوالے تلاش کئے جا سکتے ہیں)۔

اس کے بعد قرآنِ کریم ایک اور اہم حقیقت سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عوام کے دلوں میں دیانت، امانت، صداقت وغیرہ کی اہمیت کا احساس موجود ہوتا ہے، اس لئے وہ اُن کی خلاف ورزی کی جرأت از خود بہت کم کرتے ہیں۔ یہ اُن کے مذہبی پیشوا ہیں جو انہیں "شرعی حیلوں" سے باور کراتے رہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ص۱۵۹ کے فٹ نوٹ میں لکھا جا چکا ہے وہ ان سے کہتے ہیں کہ ایسا کرنا تم پر "واجب ہے"۔[1]

۳/۷۷ وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ‌ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۳/۷۷)

ان میں (مذہبی پیشواؤں کا) گروہ ایسا ہے جو اپنی طرف سے باتیں وضع کرتے ہیں اور پھر انہیں وحیٔ خداوندی کے ساتھ اس طرح بٹ دیتے ہیں کہ وہ دونوں مل کر ایک ہی نظر آئیں اور یوں انسانوں کی باتیں خدا کی شریعت بن جائیں۔ جب ان سے پوچھو تو پوری دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ باتیں بھی خدا ہی کی ہیں، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ اس طرح یہ لوگ دیدہ دانستہ خدا کے خلاف جھوٹ بولتے اور افترا پردازی کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ لوگوں سے اپنی باتیں منوائیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔

یہاں ذکر تو اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کا ہے، لیکن مذہبی پیشوائیت جہاں اور جس قوم میں بھی ہوگی، وہاں یہی کچھ ہوگا۔ خود

---

[1] آپ کو شاید علم نہ ہو کہ فقہی قوانین کی کتابوں میں ایک باب الحیل بھی ہوتا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حیلے ہیں جن سے ان قوانین کو توڑا بھی جا سکتا ہے اور گناہ بھی نہیں ہوتا۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیت (۳/۷۵) کا مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں جو کچھ شریعت کے نام پر کیا اور کرایا جاتا ہے اس سے کون واقف نہیں؟ اور مذہبی فتوے جس طرح لکھے جاتے ہیں اس کا کسے علم نہیں۔ جب مذہب پیشہ (ذریعۂ معاش) بن جائے تو یہ سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ کچھ اسی صورت میں کرایا جا سکتا ہے جب عوام کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا جائے کہ یہ لوگ (مذہبی پیشوا) خدا کے نمائندے ہیں؛ اس لئے انہیں اختیاراتِ خداوندی حاصل ہیں۔ جب تک عوام میں یہ عقیدہ پیدا نہ کیا جائے انہیں کوئی بھی اپنے سامنے نہیں جھکا سکتا ہے ــــ خواہ وہ حکمران طبقہ ہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت۔ انسان دوسروں کا غلام بنتا ہی عقیدت کی بنا پر ہے اور قرآن کریم اسی عقیدت کو انسانوں کے دل سے ختم کرنے کے لئے آیا تھا تاکہ دُنیا میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے کا محتاج ہو اور نہ محکوم۔ وہ ساری دُنیا سے یہ ملا کہتا ہے کہ

کسی در ایں جا سائل و محکوم نیست عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس نے اس انقلابِ عظیم کا اعلان اِن الفاظ میں کیا ہے کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا
۳/۷۸ عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (۳/۷۸)

شرفِ انسانیت کا تقاضا اور دین کا اصول یہ ہے کہ محکومیت خدا کے قانون کے سوا اور کسی کی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس باب میں؛ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ، خدا اسے ضابطۂ قوانین؛ حکومت اور نبوت عطا کرے[1] اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہو گی کہ تم سب؛ اس کتابِ خداوندی کی اطاعت سے، جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور، جس پر غور و تدبر سے، اس کے مغز تک پہنچتے ہو، ربّانی (یعنی اس کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔

میں جب پہلے پہل اس آیۂ جلیلہ کے مفہوم کی گہرائیوں میں اترا اور اس منشور کے عملی نتائج کو سامنے لایا تو میرے دل سے بے ساختہ یہ خیال اُبھرا کہ اگر سارا قرآن میرے سامنے نہ بھی ہوتا، اس کی یہی ایک آیت سامنے آتی تو میں بلا تامل پکار اٹھتا کہ لاریب ! یہ خدا

---

[1] خدا کی طرف سے عطا شدہ ضابطۂ قوانین (کتاب) میں رسول اور اس کے متبعین دونوں شامل ہوتے ہیں کیونکہ وہ کتاب، رسول کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو بھی ملتی ہے۔ اسی طرح حکومت بھی۔ لیکن نبوت میں نبی کے سوا کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ اس لئے کتاب۔ حکومت اور نبوت کہنے سے؛ نبی اور غیر از نبی، سب آگئے۔ دیکھئے (۶/۹۰ ؛ ۴۵/۱۶)۔ نبی کی اُمت کو وارثِ کتاب بھی کہا گیا ہے : (۳۵/۳۲)۔

کا کلام ہے، کسی انسان کا نہیں ۔ انسان (فرد ہو یا قوم) کی انتہائی خواہش کیا ہے؟ آزادی ــــ لیکن آزادی کے لئے اس کی اس قدر شدید خواہش کے باوجود اس کا حاصل ہونا تو ایک طرف' وہ آج تک اس کی صحیح اور جامع تعریف (DEFINITION) بھی نہیں کر سکا ۔ آزادی کی ضد غلامی یا محکومی ہے ۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے ۔ آپ دیکھیں گے کہ غلامی یا محکومی کی شکلیں کچھ بھی ہیں' دو ہی قوتیں ہیں جو دوسرے انسانوں کو اپنا غلام یا محکوم بناتی ہیں ۔ حکمرانی کا اقتدار اور نمائندگانِ خدا (مذہبی پیشوائیت) کا جلال ۔ حکومت (یا حکمرانی) کا اقتدار محسوس شکل میں سامنے آتا ہے اور اس کی زنجیریں انسانوں کے جسم کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں ۔ لیکن خدا کے خود ساختہ نمائندوں کا الوہیاتی اقتدار غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے اور وہ انسانوں کے قلب و دماغ کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے ۔ انسان' لاکھ کوششوں کے باوجود ان (ہر دو) قوتوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکا ۔ ان قوتوں کی گرفت کی شکل و صورت بدلتی رہی ہے لیکن ان کی محکمیت میں کوئی فرق نہیں آیا ۔

انسانی آزادی کا عظیم منشور

قرآنِ کریم نے یہ انقلاب آفرین اعلان کیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام اور محکوم مطیع اور فرمان پذیر بنائے ۔ اس سلسلہ میں اس نے ان دونوں قوتوں کی تصریح کر دی جن کی محکومی کی زنجیروں میں انسان جکڑے چلا آ رہا تھا ۔ یعنی ــــ عام اصطلاح میں ۔ مادی (TEMPORAL) اور روحانی (SPIRITUAL) قوتیں ۔ "روحانی" یا مذہبی قوتوں میں بلند ترین مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے ۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے ۔ ظاہر ہے کہ جب نبیؑ کو بھی اس کا حق حاصل نہیں تو مذہبی پیشواؤں کو اس کا حق کیسے حاصل ہو سکے گا ؟ اس نے ایک ہی جھٹکے سے مذہبی اقتدار کی تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا ۔ اب رہی وہ مادی یا دنیوی حکومت' تو اس میں قدیم زمانوں میں بادشاہوں کے احکام کی اطاعت ہوتی تھی جس نے ہمارے زمانے میں ڈکٹیٹر شپ کا پیکر اختیار کیا ۔ سیاسی مفکرین نے افراد کے احکام کی اطاعت کو محکومی اور غلامی قرار دے کر یہ کہا کہ حکومت قوانین کی ہونی چاہیئے ۔ لیکن اُس نے قوانین سازی کا اختیار انسانوں کو دے دیا ۔ (اسے مغرب کا سیکولر جمہوری نظام کہا جاتا ہے) ۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ ایک انسان دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے یا انسانوں کا کوئی گروہ اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت دوسرے انسانوں سے کرائے' یہ بہر حال انسانوں کی غلامی یا محکومی ہے ۔ اسے آزادی نہیں کہا جا سکتا ــــ عہدِ قدیم کی حکومت بھی باطل' عصرِ حاضر کی حکومت بھی باطل !

آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے نبوت (مذہبی اقتدار) ۔ حکم (ملوکیت یا آمریت) کا اقتدار جس میں ایک فرد کے احکام کی اطاعت کرائی جاتی ہے) اور کتاب (قوانین سازی کے اقتدار) کی نفی کر کے کس طرح ان تمام زنجیروں کو توڑ دیا جس میں نوعِ انسانی کسی نہ کسی شکل میں جکڑی چلی آ رہی تھی ۔

لیکن جب انسانوں پر کوئی اقتدار بھی نہ رہے تو اس سے انا رکی (لاقانونیت) پھیل جائے گی۔ اس کے لئے اُس نے کہا کہ انسانوں پر دوسرے انسانوں کا اقتدار نہیں رہے گا۔ ان پر خدا کا اقتدار ہوگا۔

اس پر مذہبی پیشوائیت نے کہا کہ خدا اپنی حکمرانی کے لئے خود دنیا میں نہیں آتا، ہم اُس کے نمائندے ہیں۔ اس لئے ہماری اطاعت' خدا کی اطاعت ہے۔

قرآن نے کہا کہ یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے۔ خدا کا کوئی نمائندہ نہیں۔ اس نے ایک ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے۔ اس ضابطہ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوگی۔

آپ غور کیجئے کہ اس سے انسانوں نے دوسرے انسانوں کی محکومی سے کس طرح رستگاری حاصل کر لی۔ اسی کا نام صحیح آزادی ہے۔ انسانوں کی محکومی میں انسانی صلاحیتیں کچلی جاتی ہیں اور انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کتاب خداوندی کی اطاعت سے۔ انسانی صلاحیتیں نشوونما پاکر پروان چڑھتی ہیں اور انسان "احسنِ تقویم" کے بلند و بالا مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی اس دنیا میں انسانی زندگی کا منتہا ہے۔

سوچئے کہ اس قسم کا منشورِ آزادی کوئی انسان بھی وضع کر سکتا تھا؟ ایسا انقلاب آفریں منشور خدا ہی دے سکتا تھا۔ قرآن کی ساری تعلیم اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ (ان امور کی تفصیل مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں حکومت، نبوت، عبادت کے عنوانات کے تحت ملے گی)۔

جب ذہن انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو وہ مظاہرِ فطرت کو اپنا معبود بنالیتا تھا ـــــ اصنامیات یونان یا ہندوؤں کے دیوی دیوتا سب اسی ذہنیت کے تراشیدہ بُت ہیں۔ (سابقہ جلدوں میں ملائکہ کا عنوان دیکھئے)۔ یہ آگے بڑھا تو اُس نے رسولوں کو خدا کا درجہ دے دیا۔ قرآنِ کریم نے اس کی بھی تصریح کر دی کہ خدا کی سچی تعلیم کو پیش کرنے والا کبھی اس قسم کی توہم پرستانہ تعلیم نہیں دے گا۔

۳/۷۹ وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

وہ یہ بھی نہیں کہے گا کہ تم مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا بنا کر اُن کی پرستش شروع کر دو، یا تم اپنے انبیاء کو خدا بنالو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا عہد کر دو اور وہ تمہیں اس قسم کی کافرانہ تعلیم دے؟

اس آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ ان میں کفر و اسلام میں واضح طور پر خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ کسی انسان کی اطاعت نہ کی جائے ـــــ اس میں انبیاء۔ مذہبی پیشوا۔ حکام۔ مجالسِ قوانین ساز سب شامل ہیں۔ اطاعت صرف کتابِ خداوندی

کی کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ــــ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ــــ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ..... (۵/۴۴-۴۷)

جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں ــــ ظالم ہیں ــــ فاسق ہیں۔

یہی الدین ہے۔ اور دینِ خداوندی کوئی نئی چیز نہیں جسے پہلی بار قرآن مجید میں دیا گیا ہو۔ ہر نبیؑ کو یہی دین دیا جاتا تھا۔ (مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں "دین" کے عنوان کے تحت دیکھئے) لیکن ہوتا یہ کہ نبی کے چلے جانے کے بعد اس کے نام لیوا اس کی طرف نازل شدہ دین میں تحریف کر دیتے۔ اس کے بعد ایک اور نبی آتا جو اس محرف شدہ دین سے ان کی آمیزشوں کو الگ کر کے دینِ خداوندی کو پھر سے اس کی حقیقی اور منزّہ شکل میں پیش کر دیتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔

۳/۸۰ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۳/۸۰)

یہ سلسلۂ ہدایت کوئی نئی چیز نہیں؛ بلکہ ایک ہی پیغام ہے جو شروع سے اخیر تک مسلسل چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ انبیاءؑ کے ذریعے، اُن کی امتوں سے عہد لیا کرتا تھا کہ تمہیں یہ کتاب و حکمت دی گئی ہے؛ لیکن اس کے بعد، جب ہم (عند القرآن) کوئی دوسرا رسول بھیجیں، جو اس تعلیم کو سچا کر دکھائے جو تمہیں دی گئی تھی، تو تم گروہ بندانہ تعصب کی بناء پر اس کی مخالفت نہ شروع کر دینا، بلکہ اس کی صداقت پر ایمان لانا، اور اس کی مدد کرنا۔

یہ اس قدر اہم اصول تھا کہ اللہ ان سے بتاکید پوچھتا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور مجھ سے اس کا عہد کرتے ہو (کہ ایسا ہی کرو گے)؟ وہ کہتے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں (یعنی یہ چیزیں ان کا جزو ایمان ہوتی تھیں)۔ اس پر اللہ ان سے کہتا کہ اب تم اپنے اس عہد و اقرار کی نگرانی کرنا۔ اور میں بھی اس کی نگرانی کروں گا کہ تم اسے نباہتے ہو یا نہیں)۔ یہ اقرار امم سابقہ سے لیا جاتا تھا۔ (ایک اقرار خود انبیاء سے بھی لیا جاتا تھا جس کا ذکر (۳۳/۷) میں آئے گا)

اس پروگرام کے مطابق سلسلۂ انبیاءِ کرام کی آخری کڑی ــــ حضور نبی اکرمؐ ــــ تشریف لائے اور دینِ خداوندی، اس کی منزّہ اور مکمل شکل میں دنیا کو دے دیا۔ چونکہ منزّہ اور خالص دینِ خدا کی کتاب میں تکمیل تک پہنچ چکا تھا اور اس کی (قرآن مجید کی) حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تھا، اس لئے

سلسلۂ رُشد و ہدایت

اب سلسلۂ انبیاء کو جاری رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (اس کو ختمِ نبوت کہا جاتا ہے)۔ خدا کے اس آخری رسول پر ایمان لانے کی دعوت اہلِ کتاب اور دوسرے انسانوں (سب) کو دی گئی۔ اہلِ کتاب کے ہاں تو حضورؐ کی آمد کی پیشگوئیاں بھی موجود تھیں۔ اس لئے رسالتِ محمدیہ سے روگردانی اُن کے لئے بھی جائز نہیں تھی۔ اس لئے فرمایا:-

۳/۸۱ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳/۸۱﴾

اسی سلسلۂ رشد و ہدایت کے مطابق، اب یہ خدا کا آخری نبی آیا ہے۔ اس کی آمد کا اقرار بھی اِن (یہود و نصاریٰ) سے لیا گیا تھا۔ لیکن یہ اس عہد و اقرار سے رُوگردانی کرتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ جو بھی اس قسم کے عہد و پیماں سے روگردانی کرے گا، وہ یقیناً سیدھی راہ سے منحرف ہوگا۔

بات ہو رہی تھی الدّین کی۔ اور الدین نام ہے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا۔ سابقہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ خارجی کائنات کی ہر شئے قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ چونکہ اشیائے کائنات کو مجبور پیدا کیا گیا ہے اس لئے انہیں قوانینِ خداوندی سے یارائے سرکشی نہیں۔ مجالِ انکار نہیں۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ کائنات میں دینِ خداوندی جاری و ساری ہے۔ یہی دین (یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت) انسانوں کو بھی اختیار کرنا چاہیئے۔ فرمایا:-

۳/۸۲ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳/۸۲﴾

کیا یہ لوگ "دینُ اللّٰہ" کے بجائے کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ کائنات کی ہر شئے "طوعاً وکرہاً" قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اس محور کے گرد گردش کرنے پر مجبور۔

آپ دیکھیئے کہ اس آیت میں اسلام کی اصل و حقیقت کو کس وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے! لیکن اس میں ایک دو نکات غور طلب ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (کائنات میں جو کچھ ہے طوعاً وکرہاً قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہے)۔ اگرچہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں، لیکن عربی زبان میں 'ما' عام طور پر غیر جاندار اشیاء کے لئے آتا ہے اور 'مَنْ' بالعموم جانداروں کے لئے، اگرچہ اس میں بعض اوقات غیر جاندار بھی شامل ہوتے ہیں۔ اشیائے کائنات میں (انسان کو چھوڑ کر) جاندار (حیوانات، پرندے وغیرہ) بھی شامل ہیں جو قوانینِ فطرت کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح غیر جاندار اشیاء ان قوانین کی اطاعت ان کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ ایسا جبلّی طور پر (INTRINSICALLY) کرتے ہیں

خارجی کائنات میں اسلام

طوعاً کے معنی ہوتے ہیں ایسی اطاعت جو دل کی رضامندی سے کی جائے، اور کرہاً کے معنی ہوتے ہیں ایسی فرمانبرداری جس پہ دل تو رضامند نہ ہو لیکن اسے بامرِ مجبوری کیا جائے۔ اشیائے کائنات کی یہ حالت نہیں

طوعاً وکرھاً کا مفہوم

کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت پہ ان کا دل رضامند نہ ہو اور وہ ایسا بادلِ ناخواستہ کرتے ہوں۔ اس لئے دوسری جگہ اس کی صراحت کر دی کہ وہ یہ فرمان پذیری طوعاً کرتے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے کہ خدا نے ارض وسما کو پیدا کیا اور ان دونوں سے کہا: اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا "تم آؤ۔ طوعاً یا کرہاً"۔ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱/۱۱) انہوں نے کہا کرہاً کیوں؟ ہم طوعاً آتے ہیں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ آیت زیرِ نظر (۳/۸۲) میں جو کہا گیا ہے: وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ تو کرہاً اشیائے کائنات کے لئے نہیں آیا۔ وہ تو سب طوعاً اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی استثنا نہیں؛ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱) "جو کچھ ارض وسمٰوٰت میں ہے سب پروگرام خداوندی کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے" (نیز ۵۹/۲۴؛ ۶۱/۱ وغیرہ)۔ انسانوں کے متعلق اس نے کہا ہے کہ انہیں چونکہ صاحبِ اختیار دارادہ پیدا کیا گیا ہے، اس لئے ان میں بعض انہیں بطیبِ خاطر اختیار کرتے ہیں اور بعض انکار بھی کر دیتے ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ (۲۲/۱۸)۔

کیا یہ دیکھتے نہیں کہ کائنات کی ہر شے کس طرح قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہے ــــ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جاندار مخلوق۔ سب اس کے قوانین کی اطاعت میں مصروف ہیں۔ لیکن انسان کو چونکہ صاحبِ اختیار دارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے ان میں سے بعض ان قوانین کا اتباع کرتے ہیں، بعض ان سے سرکشی برتتے ہیں۔ اور جو سرکشی برتتے ہیں، وہ اس کا خمیازہ بھگتتے اور ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

جو لوگ ان قوانین سے سرکشی برتتے ہیں، وہ بطیبِ خاطر تو ان کی اطاعت اختیار نہیں کرتے، لیکن زمانے کے تقاضے انہیں مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ انہیں اختیار کریں۔ یہ انہیں کرہاً اختیار کریں گے۔ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔ یہ مجبور ہو کر اس طرف پلٹیں گے یعنی آخر الامر اطاعت قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔ جو طوعاً ایسا نہیں کریں گے، انہیں کرہاً ایسا کرنا پڑے گا، اور یوں یہ دعویٰ حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آجائے گا کہ

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (۹/۳۳)۔

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور ضابطۂ قوانین (دین الحق) دے کر بھیجا تاکہ یہ دین آخر الامر دنیا کے ہر دین (نظام)

پر غالب آجائے۔

اقوامِ مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے انسانوں کے وضع کردہ ادیان (نظاموں) کا تجربہ کرکے دیکھ لیا۔ ان کے ناکام ثابت ہونے پر اب وہ رفتہ رفتہ اسی نظام کی طرف آرہے ہیں جو خدا نے متعین فرمایا تھا۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں اسلام، نظام اور دین کے عنوانات کے تحت دیکھئے)۔ یُرْجَعُوْنَ پر غور کیجئے۔ یعنی یہ اس نظام کی طرف خود نہیں آئیں گے، یہ اُس کی طرف لائے جائیں گے۔ زمانے کے تھپیڑے انہیں مار مار کر اس کی طرف لائیں گے۔ جس نظام کو انہوں نے طوعاً اختیار نہیں کیا تھا، اسے یہ کرہاً اختیار کریں گے۔ اس کے سوا نوعِ انسان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ کوئی کشاد کی راہ نہیں۔ جو حقیقت کو از خود نہیں مانتا، حقیقت اس سے اپنے آپ کو خود منوالیتی ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ دین کوئی نیا دین نہیں۔ تمام انبیاء کرام کو یہی دین دیا گیا تھا۔ اسی لئے اسلام قبول کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ انبیاء سابقہ کو خدا کی طرف سے یہی دین ملا تھا۔ اس لئے فرمایا:

۳/۸۳ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۳/۸۳)

ان سے کہہ دو کہ ہم اس دین (نظامِ زندگی) کو طوعاً (بطیبِ خاطر) اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے ہم، خدا کی وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ وحی، جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اساساً اور بنیاداً وہی ہے جو اس سے پہلے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور اُن کی اولاد (میں سے انبیاءؑ) پر نازل ہوئی تھی۔ اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کو دی گئی تھی (۲/۱۳۶؛ ۲/۲۱۳)۔ ہم ان تمام انبیاءؑ کو دینِ خداوندی کا پیامبر سمجھتے ہیں اور اس اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ہم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں۔ اس نظام کا نام ہے اسلام۔ لہٰذا:

۳/۸۴ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۳/۸۴)

اس نظام کا نام ہے الاسلام۔ اور یہی نظام، خدا کی طرف سے، تمام عالمِ انسانیت کے لئے تجویز ہوا ہے۔ سو جو فرد

یہی اسلام ہے

یا قوم اس نظام کے سوا، زندگی کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہے تو میزانِ خداوندی میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ اس سے اُس قوم کو مفادِ عاجلہ تو حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن مستقبل میں وہ سخت نقصان میں رہے گی۔

ہم انسان کی نامرادیوں، حرماں نصیبیوں اور ناکام تجارب سے نقصان اٹھا کر آخرالامر صحیح راستے کی تلاش میں نکلنے کی داستان بڑی دلچسپی سے سن رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کفار کی سرگزشت بیان ہو رہی ہے۔ لیکن اس جذب و انہماک سے کچھ وقت کے لئے الگ ہٹ کر سوچئے تو نظر آجائے گا کہ

اے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے!

اپنی داستان، لیکن بہت بڑے فرق کے ساتھ۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان اقوام نے دین الحق کو کبھی اختیار ہی نہیں کیا تھا اور وہ عقل کے تجرباتی دین سے، صحیح راستے کی تلاش کر رہے ہیں، لیکن ہم (اُمتِ محمدیہ) نے اس نظام کو اپنایا۔ قائم کیا۔ اس کے درخشندہ نتائج کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اور اس کے بعد اسے چھوڑ کر غیر خداوندی راستے اختیار کر لئے۔ ذرا غور کیجئے کہ مندرجہ ذیل ارشادِ خداوندی میں ہمارا ہی ذکر تو نہیں!

۳/۸۵ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۳/۸۵)

اب رہے وہ (بدنصیب) جو ایمان لانے کے بعد، کفر کی راہ اختیار کر لیں یعنی صحیح اسلامی نظام قائم ہو جانے کے بعد، پھر غیر اسلامی نظام کی طرف لوٹ جائیں، درآنحالیکہ (اس نظام کے درخشندہ نتائج نے) یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کے رسول نے جو کچھ کہا تھا وہ کس قدر حقیقت پر مبنی تھا!

سو ظاہر ہے کہ جو قوم، صداقت کو اس طرح بے نقاب دیکھ لینے کے بعد بھی اس نظام سے سرکشی اختیار کر جائے تو اس پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کس طرح کھل سکتی ہے؟

اس "ایمان کے بعد کفر" کا جو نتیجہ ہوا، اس کے تصور سے بھی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اس لئے جی نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے

اس کا نتیجہ

سامنے آئے۔ لیکن وہ نتیجہ تو ایسا ہے جس کی شہادت خود ہماری حالت دے رہی ہے۔ اس لئے اسے چھپایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اس کو طوعاً و کرہاً سامنے لانا ہی ہوگا۔ جب اسے سامنے لانا ہی ہے تو پھر اسے خدا کے الفاظ ہی میں کیوں نہ سامنے لایا جائے۔ وہ الفاظ یہ ہیں:-

۳/۸۶-۸۷ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○ (۳/۸۶-۸۷)

یاد رکھو! ان لوگوں کی روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ نظامِ خداوندی کے خوشگوار ثمرات سے بھی محروم

رہیں۔ کائنات کی قوتوں کی برکات بھی ان کے حصے میں نہ آئیں۔ اور اقوام عالم بھی انہیں ذلیل و خوار سمجھ کر، اپنے سے دور دور رکھیں اور یوں ان پر ہر طرف سے محرومی و نامرادی کی پھٹکار پڑے۔

یہ ذلت و خواری ان پر مسلط رہے گی، اور (خدا و رسول کا زبانی اقرار) ان کی سزا میں ذرا سی تخفیف نہیں کر سکے گا، اور نہ ہی ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور میں تاخیر کی جائے گی۔ وہ اسی دنیا میں ان کے سامنے آجائیں گے۔

اُف! کس قدر الم انگیز ہے یہ انجام اور کیسا عبرت آموز ہے یہ مآل۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ عذاب ابدی اور یہ سزا ہمیشہ مسلط رہنے والا ہے یا اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ خدائے رحیم و رحمٰن سے یہ بعید تھا کہ وہ اپنے بندوں پر نجات و سعادت کی تمام راہیں بند کر دیتا۔ اس نے کہا کہ

۳/۸۸ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ (۳/۸۸)

اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ جس دوراہے پر اُن کے قدم غلط راستے کی طرف اُٹھ گئے تھے، وہ پلٹ کر وہیں جائیں۔ وہاں سے وہی سیدھا راستہ اختیار کریں اور خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اس طرح وہ تباہی سے محفوظ بھی رہ جائیں گے اور انہیں سامانِ نشوونما بھی میسر آجائے گا۔

دیگر اقوام کے ہاں چونکہ قرآن موجود نہیں اس لئے انہیں زمانے کے تقاضے مار مار کر اس طرف لائیں گے (اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ) ہمارے پاس چونکہ خدا کی کتاب موجود ہے، اس لئے ہمیں از خود پلٹ کر اس کی طرف آنا ہوگا۔ (اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا) لیکن ہم ہوں یا وہ، فلاح و سعادت کی راہ قرآن کریم کے سوا کہیں سے نہیں ملے گی۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لیکن :

۳/۸۹ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ۝ (۳/۸۹)

لیکن اگر یہ ایسا نہ کریں، اور زبان سے توبہ توبہ کہتے، لیکن عملاً اسی غلط راستے پر چلتے رہیں اور اس میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں، تو ظاہر ہے کہ غلط راستے پر چلنے والا، صحیح منزل پر کس طرح پہنچ سکتا ہے؟

اور اس کے بعد :

۳/۹۰ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِہِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَہَبًا وَّ لَوِ افۡتَدٰی بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّ مَا لَہُمۡ

مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝ (۳/۹۰)

پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس بازآفرینی کا امکان اسی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد اگر یہ چاہیں کہ زندگی کی سرفرازیاں نصیب ہو جائیں تو ایسا ہونا ناممکن ہوگا خواہ یہ، اس کے بدلے میں دنیا بھر کی دولت بھی کیوں نہ دے دینا چاہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب کی زندگی ہوگی اور کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس حالت میں ان کی کوئی مدد کر سکے۔

شروع چوتھا پارہ

آیت (۳/۸۵) میں کہا گیا تھا کہ اگر تم دین الحق کی خوشگواریوں سے فیض یاب ہونا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم اپنے موجودہ غیر قرآنی نظامِ زندگی کو چھوڑ کر، اُس نظام کی طرف پلٹو جسے قرآن نے متعین کیا ہے۔ لیکن اتنا سمجھ لو کہ یہ مرحلہ بڑا محنت طلب ہوگا اس میں بنیادی اصول یہ ہوگا کہ جب کبھی اقدارِ خداوندی اور تمہارے ذاتی مفاد یا خواہشات میں ٹکراؤ ہو، تو تمہیں اقدارِ خداوندی کو اپنے مفاد اور خواہشات پر ترجیح دینی ہوگی۔ اسی سے تم پر کشادگی راہیں وا ہوں گی۔

۳/۹۱ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ۝ (۳/۹۱)

اس کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جو لوگ دنیا اور آخرت، دونوں میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہیں وہ کیا کریں؟ بات سیدھی ہے۔ تم زندگی کی اور اپنی ذات کی کشاد چاہتے ہو۔ اس کے لئے کرنا یہ ہوگا کہ (مال و دولت میں سے) جو چیزیں تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہوں، انہیں صرف اپنے لئے سمیٹ کر نہ رکھو، بلکہ (نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لئے) کھلا رکھو۔ جو کچھ تم اس طرح ربوبیتِ عامہ کے لئے صرف کرو گے، خدا کو اس کا علم ہوگا۔ اس لئے تمہارا کوئی عمل نظر انداز نہیں ہونے پائے گا۔

اِنفاق انفاق کی بحث سابقہ جلدوں میں تفصیل سے آچکی ہے۔ (ان جلدوں کے انڈکس اور فہرست مضامین سے حوالے مل جائیں گے)۔ اس مقام پر انفاق کا اطلاق مال و دولت تک محدود سمجھا جائے گا۔ لیکن قرآنِ کریم نے مَحَبَّتْ کا دائرہ بڑا وسیع بنایا ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ

فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۠ (۹/۲۴)

(اے رسولؐ !) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہلِ خاندان۔ اور مال و دولت جو تم کماتے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) اور اس (کے قیام و بقاء) کی راہ میں جدوجہد، سے زیادہ عزیز ہے تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے، اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر، اِدھر اُدھر نکل جائے۔

اور وہ مقام تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ جہاں کہا گیا ہے کہ کُشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشاد کی راہ یہ ہے کہ ..... (اگر یاد نہ ہو تو مطالب الفرقان جلد سوم میں صفحہ ۱۵۴ پر آیت (۲/۱۷۷) دیکھئے۔ زندگی کی وسعتیں حاصل کرنے کا طریق آپ کے سامنے آجائے گا)۔

بات چلی آرہی تھی اصل کتاب اور ملتِ ابراہیمی کے اتباع کی۔ اب ہم پھر اُسی موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ یہودیوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ تم کہتے ہو کہ دین شروع سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ تم ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا خود بھی دعوے کرتے ہو اور ہمیں بھی اُسی کے اتباع کی دعوت دیتے ہو۔ اگر بات یہی ہے تو یہ (مسئلہ) بتاؤ کہ پھر ایسا کیوں ہے کہ بعض چیزیں ہمارے ہاں حرام ہیں اور تم انہیں حلال قرار دیتے ہو؟ ان سے کہا کہ

۳/۹۳-۹۲

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۳/۹۳-۹۲)

ان سے کہو کہ تم ابراہیمؑ کو اپنا مورثِ اعلیٰ مانتے ہو۔ جو چیزیں اس کی ملت میں حرام تھیں، اُنہی کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے (۶/۱۴۵)۔ باقی چیزوں کے متعلق ہوا یہ تھا کہ، نزولِ تورات سے پہلے یعقوبؑ (اسرائیل) نے بعض چیزوں کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا تھا۔ سو یہ چیزیں خدا کی طرف سے ابدی طور پر حرام قرار نہیں دی جاسکتیں۔ نیز بعض چیزوں کو یہودیوں پر، بطورِ سزا حرام قرار دیا گیا تھا (۶/۱۴۶) (۴/۱۶۰)۔ تم تورات لاؤ اور اس میں یہ دکھاؤ کہ کون سی چیزیں تھیں جو ملتِ ابراہیمیؑ میں ابداً حرام قرار دی گئی تھیں۔ اور انہیں اب حلال قرار دیا گیا ہے؟ یہ سب باتیں تم نے خود وضع کی ہیں۔ اور انہیں منسوب

کرتے ہو خدا کی طرف ! یاد رکھو! جو اس طرح حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی، خدا پہ بہتان باندھے، تو ایسے لوگ عدالتِ خداوندی میں مجرمین کی صف میں کھڑے ہوں گے ۔

حرام اور حلال کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۴۰ زیر آیت (۲/۱۷۳) آچکی ہے ۔ لیکن یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے ۔ کہا یہ گیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا تھا، ان میں سے بعض چیزیں حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کے مزاج کے

حضرت یعقوبؑ بعض چیزیں نہیں کھاتے تھے

موافق نہیں تھیں، یا مرغوب خاطر نہیں تھیں ۔ اس لئے وہ ان سے پرہیز کرتے تھے ۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں

قرآنِ کریم نے حلال کے ساتھ طیّب کا اضافہ بھی اسی مقصد کے لئے کیا ہے کہ حلال اشیاء میں سے جو چیزیں تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں یا تمہیں پسند نہ ہوں، انہیں بیشک نہ کھاؤ ۔ البتہ انہیں حرام مت قرار دو ۔ یہی کہو کہ وہ ہمیں پسند نہیں ۔ حضرت یعقوبؑ نے ایسا ہی کیا تھا، لیکن چونکہ وہ خدا کے رسول تھے، اُن کی اُمت (بنی اسرائیل) نے خیال کر لیا کہ وہ چیزیں بھی حرام کی فہرست میں داخل ہیں کیونکہ حضرت یعقوبؑ نے ان کا کھانا ترک کر دیا تھا ۔ اس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو اپنی زندگی کے معمولات میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ ہو سکتا تھا کہ ایک چیز وہ محض عادۃً کرتے ہوں اور ان کی امت انہیں دین کا تقاضا سمجھ لے ۔ اسی قسم کا واقعہ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں بھی پیش آیا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر حضورؐ کی توجہ مبذول کرائی ۔ سورہ التحریم میں ہے :-

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۶۶/۱)

"اے نبیؐ! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا تھا۔ تُو نے اسے اپنے لئے ممنوع کیوں قرار دے لیا ؟ تم نے تو اسے ایک

رسول اللہ بھی

معمولی بات سمجھ کر اپنی بیویوں کی رضا جوئی کی خاطر ایسا کیا (اور ایسا کرنا نہ جرم تھا نہ معصیت) لیکن نبی کی کیفیت عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے ۔ جس بات کو یہ محض عادتاً کرے، ہو سکتا ہے کہ اس کی امت بعد میں اسے دین کا تقاضا سمجھ لے ۔ تم اس خود عائد کردہ پابندی کو ختم کر دو (۶۶/۲) ۔ اس سے خدا کے ہاں مواخذہ نہیں ہوتا ۔"

دین کو خالص رکھنے کے لئے اس انتباہ کی بڑی ضرورت تھی ۔ ہمارے ہاں سنّتِ رسول اللہ (حضورؐ کے معمولاتِ زندگی)

سُنّت کی بحث

کو بھی غیر متبدل دین قرار دے کر اس کی اطاعت کو فرض ٹھہرایا گیا تو اس سے قسم قسم کی بحثیں وجود میں آگئیں ۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ سُنّت کہتے کسے ہیں ؟ قدامت پسند طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ نبی اکرمؐ نے کیا، یا کہا ۔ یا جس کام کو دیکھ کر آپ خاموش رہے (یعنی حضورؐ کے اقوال ۔ اعمال اور تقریر)

یہ سب احادیث ہیں؛ اور حدیث اور سنت ایک ہی چیز ہے۔ یعنی ہر حدیث سنت ہے[1]۔

اب ظاہر ہے کہ چونکہ ہر فرقہ کی حدیثیں الگ الگ ہیں، اس لئے ہر فرقہ کی سنتِ رسول اللہ بھی الگ الگ ہو گئی۔ اور چونکہ سنتِ رسول اللہ کو غیر متبدل دین قرار دے دیا گیا۔ اس لئے ہر فرقہ کا (گویا) دین الگ ہو گیا۔ آپ جس قدر فرقہ وارانہ بحثیں دیکھتے ہیں وہ سب اس اصل کی پیدا کردہ ہیں۔ اس کے خلاف سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے کہا کہ یہ صحیح نہیں کہ ہر حدیث، سنتِ رسول اللہ ہے۔ ان کے نزدیک!

سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔

مودودی مرحوم کا نظریہ

اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کون سا جزو عادت؛ بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو ... تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام۔ اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ص۳۱۷ ؛ ۳۱۱)

اس کتاب میں وہ ص۳۱۴ پر لکھتے ہیں:-

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

(1 جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث از مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) سابقہ صدر جمعیت اہل حدیث)

سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحی شرع میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا من جملہ اُن بدعات کے لئے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی مولانا اسماعیل صاحب کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنت رسول اللہ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی (مرحوم) کے نزدیک صحیح حدیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ

> میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً ۳۰۸)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں :-

> جو امور آپؐ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کرلیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے .... (صفحہ ۳۰۷)

اس سے یہ دشواری سامنے آئی کہ احادیث کے مجموعوں میں کسی جگہ اس کی تصریح نہیں کی گئی کہ حضورؐ نے فلاں کام رسول کی حیثیت سے کیا تھا یا اپنی بشری حیثیت سے اور اب ایسا متعین کرنے کا کوئی طریقہ یا ذریعہ بھی نہیں۔ مودودی (مرحوم) نے کہا کہ اس کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسول" کی نگہ بصیرت ہی کرسکتی ہے۔ ان کے الفاظ میں :-

مزاج شناسِ رسول

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کرکے احادیث کو پرکھنے کی نظر پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے ___ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ___ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض

کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زرین میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات حصہ اوّل۔ ص۳۰۲ تا ص۳۲۴)

اس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے کہا:۔

اس کی مخالفت

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کرے۔ پھر اسے اختیار دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق۔ مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے: تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن نہیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث ص۲۳)

یہی وہ بحثیں جو حدیث و سنت کے سلسلے میں ہمارے ہاں جاری اور اُمت میں وجۂ پریشانی و انتشار بن رہی ہیں جب تک اسلام ایک مذہب کی حیثیت اختیار کئے رہا۔ یہ بحثیں مناظروں اور مباحثوں یا فتویٰ بازیوں تک محدود رہیں۔ لیکن پاکستان

پاکستان میں قانون سازی

میں انہوں نے سیاسی حیثیت اختیار کر لی۔ یہاں مطالبہ یہ کیا گیا کہ مملکت کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ حضراتِ علماء کرام کی طرف سے یہ مطالبہ متفق طور پر پیش کیا گیا۔ لیکن میں[1] نے ان حضرات کی خدمت میں گزارش کیا کہ کتاب (یعنی قرآنِ مجید) تو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر خدا کی کتاب ہے لیکن سنت کی یہ پوزیشن نہیں۔ اوّل تو سنت کی تعریف (DEFINION) ہی متفق علیہ نہیں۔ اور اگر اس سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تو سنت کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں۔ ان حالات میں یہاں کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ آپ حضرات پہلے سنت کا ایسا مجموعہ مرتب کر لیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں۔ اس کے بعد کتاب و سنت کی رو سے متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے گا۔ اس کا جواب کفر کے فتوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا:

---

[1] میں اپنا نام درمیان میں لانے کے لئے معذرت خواہ ہوں، لیکن ایسا کرنا ناگزیر ہے کیونکہ یہ سوال میری ہی طرف سے اٹھایا گیا تھا اور مجھے اسی بناء پر منکرِ حدیث اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا تھا۔

بیس برس تک یہ (ناممکن العمل) مطالبہ پیش ہوتا رہا اور ہر حکومت کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ یہ لوگ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اس کے بعد ان حضرات کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ

کتاب و سُنّت کی رُو سے ناممکن ہے | کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) بحوالۂ ایشیا - ۲۳ راگست ۱۹۷۰ء)

اس کا اعتراف بھی کر لیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ مطالبہ اپنی جگہ قائم رہا کہ ملک میں کوئی قانون کتاب وسُنت کے خلاف وضع اور نافذ نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ اب (اواخر ۱۹۷۹ء میں) ملک کی ہائی کورٹوں پر مشتمل، شریعت بنچیں قائم کی گئی ہیں جن کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ مروجہ قوانین کے متعلق فیصلہ کریں کہ ان میں سے کون کونسا قانون "کتاب وسنت" کے خلاف ہے۔ انہوں نے یہ اہم فیصلے کرنے ہیں ان حالات میں کہ نہ "سنت" کی کوئی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) ان کے سامنے ہے اور نہ ہی سُنت کا کوئی ایسا مجموعہ جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سُنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں۔

اس سعیٔ لاحاصل کا جو نتیجہ برآمد ہوگا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں[1]۔ میں پھر دہرا دوں کہ دین کتاب اللہ کے اندر ہے جسے حضور نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ایک عملی نظام کی شکل میں قائم فرمایا تھا۔ ہم اسے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متشکل کریں گے۔ کتاب اللہ میں محفوظ دین ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ اس کے قائم، رائج اور نافذ کرنے کے طریق ہر دور میں بدلتے رہیں گے۔

یہ مقصد تھا قرآنِ کریم کا اس واقعہ کے بیان کرنے کا کہ خدا کے ایک رسول (حضرت یعقوبؑ) نے بعض حلال چیزوں کے استعمال کو ترک کر دیا جو انہیں ذاتی طور پر ناپسند اور ناخوش آئند تھیں، تو یہودیوں نے اُن کے اس عمل کو ابدی دین قرار دے دیا۔ ایسا تم نہ کرنا۔ یہودیوں سے کہا:-

۳/۹۴ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۳/۹۴)

ان سے کہو کہ سچی بات وہی ہے جسے خدا نے بتا دیا ہے۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ، اپنی کٹ حجتی چھوڑ کر ملتِ ابراہیمؑ

---

[1] اب (جون ۱۹۸۰ء میں) ان بنچوں کو توڑ کر مرکز میں ایک فیڈرل بنچ قائم کیا گیا ہے۔ لیکن نتیجہ اس کا بھی وہی نکلے گا۔ خرابی ان بنچوں میں نہیں۔ اصل خرابی یہ ہے کہ ان کے سپرد ایک ایسے اصول کے مطابق فیصلے کرنے کا کام کیا گیا ہے جو ناممکن العمل ہے۔

کی پیروی کرو۔ (ہماری دعوت بھی وہی ہے) ابراہیمؑ نے ہر طرف سے منہ موڑ کر، خالص خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔ (کہ خدا کے قانون کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے بھی ملا لیتا)"۔

یہودیوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس (یروشلم) تھا، مسلمانوں نے اپنا قبلہ علیحدہ (مکہ) کیوں بنالیا؟ اگلی دو آیات ($\frac{۳}{۹۶-۹۵}$) میں اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ قبلۂ کعبہ، مکہ، حج۔ ابراہیمؑ کے سلسلے میں تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ ان میں زیرِ نظر دو آیات ($\frac{۳}{۹۶-۹۵}$) بھی درج ہیں (جلد سوم ص۵۵ زیرِ آیت ($\frac{۲}{۱۲۵}$)۔ اس لئے ان کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں۔ بجز اس کے کہ یہودیوں نے جس طرح نبوت کو اپنی نسل (بنی اسرائیل) میں محدود کر رکھا تھا اس طرح ان کا قبلہ (بیت المقدس) بھی قومی تھا۔ اس کے برعکس اسلام عالمگیر دین (نظامِ حیات) تھا اس لئے اس نظام کا مرکز (قبلہ) بھی نسلی۔ قومی۔ جغرافیائی حدود و قیود سے ماوراء عالمگیر ہونا چاہیئے تھا۔ یہ وجہ تھی کہ جو بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ (مرکز) مقرر کیا گیا۔

متعلقہ آیات اور ان کا مفہوم درج ذیل ہے:۔

$\frac{۳}{۹۶-۹۵}$ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ ($\frac{۳}{۹۶-۹۵}$)

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ، قرآن نے 'بیت المقدس کی بجائے' کعبہ کو کیوں مرکز قرار دیا ہے؟ ($\frac{۲}{۱۴۲}$)۔ ان سے کہو، دنیا میں سب سے پہلے جس مقام کو نوعِ انسان کا مرکز تجویز کیا گیا تھا، وہ مکہ تھا۔ اسی مرکز سے اقوامِ عالم کو ثبات و استحکام اور نشو و نما کا سامان ملتا تھا، اور اسی کو وہ روشنی کا مینار بننا تھا جس سے عالمگیر انسانیت کے سامنے زندگی کا صحیح راستہ آسکے۔

یہ رہنمائی بڑی بیّن اور واضح ہے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں سے ابراہیمؑ کو اقوامِ عالم کی امامت کا مقام بلند حاصل ہوا تھا ($\frac{۲}{۱۲۶-۱۲۵}$)۔ اس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ جو شخص بھی اس مرکز میں داخل ہو جائے، اسے ہر طرف سے امن و سلامتی حاصل ہوگی۔ اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں ($\frac{۲۲}{۲۵}$)۔ سو جو لوگ بھی اس تک پہنچنے کی راہ پائیں، وہ یہاں جمع ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس نظام کا یہ مرکز ہے وہ نوعِ انسان کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے ($\frac{۲۲}{۲۸}$) بشرطیکہ ان کا اس طرح جمع ہونا خالص خدا کے لئے ہو، گروہ بندانہ مصلحتوں کے پیشِ نظر نہ ہو۔

یہ ہیں اس مرکزِ نظامِ خداوندی کی خصوصیات ۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے نظام اور اس کے مرکز سے انکار کریں، وہ اپنا ہی نقصان کریں گے ۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے ۔ خدا تو تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز ہے۔

یہودی جس طرح نبوت کے عالمگیر ہونے کے تصور کے خلاف تھے اسی طرح وہ ایک عالمگیر مرکز کے ہونے کے بھی خلاف تھے ۔ اسی بنا پر اُن سے کہا گیا :۔

۳/۹۷ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ٥ (۳/۹۷)

ان اہلِ کتاب سے کہو کہ تم (اس قسم کے منفعت بخش) قوانینِ خداوندی سے کیوں انکار کرتے ہو؟ یاد رکھو! جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کا قانونِ مکافات اس کی پوری پوری نگرانی کر رہا ہے ۔ اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آکر رہے گا۔

یہودی اگر اس دین کو ناپسند کرتے تھے تو انہیں اس کا اختیار تھا کہ وہ اسے قبول نہ کریں، لیکن وہ ان لوگوں کے راستے میں بھی رکاوٹیں پیدا کرتے تھے جو اسے بطیبِ خاطر اختیار کر چکے تھے ۔ یا اختیار کرنا چاہتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ اس کی انہیں اجازت نہیں دی جا سکتی تھی ۔ جب اسلام دوسروں کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتا تو وہ انہیں اس کی اجازت کیسے دے سکتا ہے کہ وہ اس میں مداخلت کریں ۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) کا مفہوم یہی ہے ۔ اس لئے اُن سے کہا گیا :۔

۳/۹۸ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥ (۳/۹۸)

ان سے کہو کہ تم، اس نظام میں داخل ہونا نہیں چاہتے تو نہ ہو، لیکن جو شخص اس کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے، اسے اس کی طرف آنے سے کیوں روکتے ہو؟ نیز تم یہ بھی چاہتے ہو کہ، خدا کی طرف لے جانے والی، اس سیدھی راہ میں الجھاؤ پیدا کر دو تاکہ لوگ، اس کے پیچ و خم میں کھو کر رہ جائیں اور منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکیں، حالانکہ تم حقیقتِ حال سے اچھی طرح باخبر ہو ۔ بہر حال جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

خدا کی راہ میں رکاوٹ

یہاں پر ایک ثانیہ کے لئے رُکئے اور دو باتوں پر غور کیجئے ۔ ایک یہ کہ عربی زبان میں محض زبر اور زیر کے فرق سے معانی میں کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) جو الفاظ استعمال کئے ہیں اِن میں کس قدر گہری حقیقت پوشیدہ ہے ۔ اس آیت میں کہا گیا ہے: تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۔ یعنی یہ لوگ، اسلام میں عِوَجًا پیدا کر دینا چاہتے تھے ۔ مادہ (ع ۔ و ۔ ج) کے معنی ہوتے ہیں ٹیڑھ پن ۔ کجی ۔ پیچیدگی ۔ اس مادہ سے لفظ عَوَجًا (ع کے زبر کے ساتھ) کے معنی ہوتے ہیں ایسا ٹیڑھا پن جو آنکھ سے صاف نظر آ جائے ۔ اور عِوَجاً (ع کے زیر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن

دین میں غیر محسوس ٹیڑھ پن

کو کہتے ہیں جو محسوس طور پر نظر نہ آئے بلکہ جسے عقل و بصیرت سے پہچانا جا سکے۔ اس آیت میں عِوَجًا آیا ہے۔ یعنی ایسا ٹیڑھ پن جو محسوس طور پہ دکھا نہ جا سکے بلکہ عقل و بصیرت کی رُو سے پہچانا جا سکے۔

دین کو مذہب میں بدلنے کی سازش کرنے والے کبھی ایسا نہیں کرتے کہ وہ دین کو اس طرح بدل دیں کہ صاف نظر آ جائے کہ یہ کوئی نیا دین ہے۔ وہ دین کے شعائر و ارکان کی شکل و صورت تو ایسی ہی رہنے دیتے ہیں لیکن اس کی غرض و غایت

ظواہر قائم۔ مقصد غائب

کو بدل دیتے ہیں۔ یہ ایسا ٹیڑھ پن ہے جو محسوس طور پر نظر نہیں آ سکتا۔ علم و بصیرت کی رُو سے گہرائی میں جا کر دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ یہودیت اور عیسائیت کو چھوڑیئے اور خود اپنے ہاں غور کیجئے کہ دینِ اسلام کو مذہب میں بدلنے کی سازش کرنے والوں نے اس کے ظواہر میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔ اس کے مقصد اور غایت کو بدل کر رکھ دیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

نماز و روز و قربانی و حج　　　یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

یا　　الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　　　مُلا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور

یعنی　　رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

(مثال کے طور پر) نماز میں "منظرف قبلے شریف کے" بنیادی شرط ہے۔ تعمیرِ مساجد کے وقت قبلہ کے تعین کے لئے اس قدر کوششیں کی جاتی ہیں کہ اس کی سمت میں بال برابر بھی فرق نہ رہے۔ اگر کسی نمازی کا رُخ جانبِ قبلہ سے ذرا بھی ادھر اُدھر ہو جائے تو دُھائی مچا دی جاتی ہے کہ "تیری نماز نہیں ہوئی"۔ اس پر تو اس قدر زور دیا جاتا ہے لیکن قبلہ کے مقصد اور اس کی جانب رُخ کرنے کی غایت یکسر فراموش ہو چکی ہے۔ قبلہ اُمت کا مرکزِ محسوس تھا اور اس کی جانب رُخ کرنے کا مقصد اُمت کی وحدت

قبلہ کا مقصد

قائم رکھنے کے لئے یک نگہی۔ اب صورت یہ ہے کہ اُمت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر فرقہ کی مسجد الگ الگ ہے۔ ایک فرقہ کا مقلد دوسرے فرقے والوں کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز نہیں پڑھتا لیکن ان تمام (الگ الگ) مساجد کے رُخ کو جانبِ قبلہ رکھنے کے لئے انتہائی کوششیں کی جاتی ہیں اور ہر مسجد کے نمازی کے قبلہ رُو ہونے کو نماز کی بنیادی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ معنوی طور پہ دیکھئے تو ہر فرقہ کا "قبلہ" (مرکزِ توجہ) الگ الگ ہوتا ہے لیکن محسوس طور پر سب کا قبلہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ ہے عَوَجًا اور عِوَجًا کا فرق۔ اگر ہر فرقہ (یا کوئی فرقہ) اپنا قبلہ محسوس طور پر الگ بنا لیتا تو اُسے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جاتا۔ دین کو مذہب میں تبدیل کرنے والوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے عَوَجًا نہیں بلکہ عِوَجًا کی ٹیکنیک اختیار کی۔ قبلہ کی محسوس شکل وہی رہنے دی۔ اس کی غایت بدل دی۔ محسوس نگاہوں سے

دیکھئے تو تمام مسلمانوں (ساری اُمّت) کا قبلہ ایک ہے۔ چشمِ بصیرت سے غور کیجئے تو اُمّت کے بیسیوں قبلے الگ الگ ہیں۔
غور فرمایا آپ نے کہ دین کو مذہب سے بدل دینے کی یہ ترکیب کس قدر نگاہ فریب اور دامِ ہمرنگ زمین کے مُرادف ہے۔
اِس کے بعد آپ سوچئے کہ قرآنِ کریم نے عَوَجًا کے بجائے عِوَجًا کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے! لاریب' یہ خدا کا کلام ہے!

بہرحال' قرآنِ کریم یہ کہہ رہا تھا کہ اہلِ کتاب کی کوششیں یہ ہیں کہ اس دینِ خداوندی کی طرف آنے والوں کے راستے میں کاوٹیں پیدا کریں' اور اگر وہ اس کے باوجود' اس دین کو اختیار کر لیں' تو اس میں ایسا ٹیڑھا پن پیدا کر دیا جائے کہ وہ محسوس طور پر تو نظر نہ آئے لیکن اس کا مقصد اور غایت یکسر بدل جائے۔ قرآنِ کریم نے اُدھر اہلِ کتاب کے متعلق تو یہ کہا اور اِدھر جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا کہ

۳/۹۹ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ٥ (۳/۹۹)

جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لا چکے' اور اِسے' اپنی زندگی کا نصب العین بنا چکے ہیں' اُنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ' اگر وہ' ان اہلِ کتاب کے کسی ایک گروہ کی باتوں میں بھی آکر ان کے پیچھے لگ گئے' تو وہ انہیں' ان کے ایمان کے بعد' پھر حالتِ کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

انہیں صرف تنبیہ ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کی وجہ بھی بتائی — اور یہ قرآنِ کریم کا مخصوص انداز ہے کہ وہ جہاں ایک حکم دیتا ہے وہاں اس حکم کی علّتِ غائی' وجہ اور سبب بھی بتا دیتا ہے۔ اِسے کتاب و حکمت کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی قانون اور اس کی علّت اور مصلحت (ITS RATIONALE) جماعتِ مومنین کو جو تنبیہ اوپر کی گئی ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے ۳/۸۵ اور اس کی تشریح) دین کی صداقت کے ثبوت کے لئے دو بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے — دین کا ضابطہ اور اس کے مطابق قائم کردہ نظامِ معاشرہ جس کے حیات بخش نتائج دین کے دعاوی کے ثبوت بنتے ہیں۔ کہا کہ جب یہ دونوں چیزیں تمہارے سامنے موجود ہیں تو دین سے انحراف اور ارتداد کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

۳/۱۰۰ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ٥ (۳/۱۰۰)

اے جماعتِ مومنین! تم حالتِ کفر کی طرف کس طرح لوٹ سکتے ہو؟ اس لئے کہ ایمان کے راستے پر قائم رہنے کے لئے' دو بنیادی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ قوانینِ خداوندی (اپنی اصلی شکل میں) انسان کے سامنے ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ' اُن قوانین پر عملی طور پر چلانے کے لئے' ایک زندہ اتھارٹی موجود ہو۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے ہاں موجود ہیں —

خدا کی کتاب اور اُس کا رسولؐ !

یاد رکھو! جس نے اس کتاب اور نظامِ خداوندی کے مرکز کو، محکم طور پر تھام لیا، اور اسے اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لیا' تو اُسے یقیناً، زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف رہنمائی مل گئی۔ (جب تک تم میں قرآن' اور قرآن پہ چلانے والا نظام باقی رہے گا، تم گمراہ نہیں ہو گے)۔

اس آیت میں " وَفِيكُمْ رَسُولُهُ " کے الفاظ وضاحت طلب ہیں۔ سطحی طور پر یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا یہ ہے کہ

فِيكُمْ رَسُولُهُ کا مفہوم

جب تک تم میں رسول موجود ہے' تم ہدایت پہ رہو گے۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جب تم میں رسول نہیں رہے گا تو پھر تم ہدایت سے پھر جاؤ گے۔ یہ منطقی نتیجہ' نظری یا امکانی ہی نہیں بلکہ اس نے عملی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی۔ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف پانچ حضرات مومن رہ گئے تھے۔ باقی سب (معاذاللہ) اسلام سے پھر گئے تھے۔ اس عقیدہ کے اثرات نے سُنیوں کی کتابوں تک میں بار پالیا۔ چنانچہ ان کی حدیث کی معتبر ترین کتاب بخاری (جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے) کی وہ روایت پہلے درج کی جا چکی ہے[1] جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت میں ملائکہ ایک گروہ کو دوزخ کی طرف لے جا رہے ہوں گے۔ رسول اللہؐ انہیں دیکھ کر فرمائیں گے کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب ملے گا کہ جب تک آپ اُن میں موجود تھے' یہ اسلام پر رہے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ اس سے منحرف ہو گئے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک وضعی روایت سے' ایک تیر سے کتنے شکار مار لئے گئے۔ صحابہ کرامؓ کو[2] (معاذاللہ) مُرتد ثابت کر دیا گیا۔ رسول اللہؐ کی تعلیم و تربیت کے متعلق یہ خیال اجاگر کر دیا کہ اس کا اثر عارضی سا ہوتا تھا۔ دیرپا نہیں تھا۔ اسلام کے متعلق یہ تاثر پیدا کر دیا کہ وہ زندہ شخصیتوں کے سہارے ہی' اپنے نتائج پیدا کر سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر زمانے میں ایک زندہ شخصیت موجود رہے۔

یہ نظریات' قرآنِ کریم میں پیش کردہ اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہیں۔ اگر اسلام اپنے نتائج پیدا کرنے کے لئے

شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا

شخصیتوں کا محتاج ہوتا تو نبوت کو کیوں ختم کیا جاتا۔ جس طرح اس سے پہلے انبیاء کرامؑ کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، اسی طرح یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رکھا جاتا۔ ختمِ نبوت اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ (مشیتِ خداوندی کی رُو سے) شخصیتوں کا دور ختم کر دیا گیا ہے۔ اسلام ایسا نظام ہے جو

---

[1] دیکھئے صفحہ ۸۷۔ آیت (۳/۱۰۶)

[2] صحابہ کبارؓ کے مقامِ بلند اور شانِ ارفع و اعلیٰ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل ص ۱۲۵ : ص ۳۱۳۔ زیرِ آیات (۲/۱۴۳) (۲/۱۳۷) دیکھئے

قرآنِ کریم میں عطا فرمودہ اقدار و اصول کے مطابق قائم کیا جاتا ہے؛ اور یہ نظام اپنے اندر اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ یہ اپنے حیات آور نتائج پیدا کرتا چلا جائے: اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (۱۳/۳۵) "اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کی آسائشیں پائیدار"۔ تُؤْتِیْٓ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ (۱۴/۲۵) "وہ قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے پھل ہر موسم (زمانے) میں دیتا جائے گا"۔ قرآنِ کریم کو اسی مقصد کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ لہٰذا، جو قوم بھی (اور جب بھی) اس کے مطابق اپنا نظام قائم کرے گی وہ اس کے زندگی بخش نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا کہ اسلام نبی اکرمؐ کی ذات سے وابستہ نہیں؛ نہ حضورؐ کی زندگی تک محدود۔ یہ آپؐ کے بعد بھی زندہ ہوگا۔ اِسی سورۃ (آلِ عمران) میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہے:-

۳/۱۴۴ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۴)

(تم اسلام کو شخصیتوں کے ساتھ وابستہ نہ سمجھو۔ چھوٹی موٹی شخصیتیں تو ایک طرف، اس باب میں تو) محمدؐ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے اسی طرح کے بہت سے پیغام رساں (رسولؑ) آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا، اگر یہ پیغام رساں بھی کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا؟ اور اس کے بعد تم اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو شخص ایمان کی روش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدرشناسی کرے گا، تو اسے اس کی کوششوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

لہٰذا، وَفِیْکُمْ رَسُوْلُهٗ (۳/۱۰۱) سے مراد یہ نہیں کہ جب تک رسولؐ زندہ موجود رہے گا، تم صراطِ مستقیم پر رہو گے۔ اس کے لئے اِعتصام بِکتٰبِ اللہ کی شرط ہے: وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (۳/۱۰۱) اور اعتصام بکتٰب اللہ، قرآنی نظام کی رو سے ہوگا۔ رسولؐ کے بعد یہ فریضہ اُس کی امت کو ادا کرنا ہوگا۔ رسول اللہؐ کا فریضہ "امر بالمعروف و نہی عنِ المنکر" تھا (۷/۱۵۷) یہی فریضہ اب اُمت سرانجام دے گی (۳/۱۱۰) اس کے لئے تمکن فی الارض (یعنی نظامِ مملکت) ضروری ہوگا (۲۲/۴۱) یوں پھر اسلام حضورؐ کے بعد بھی زندہ و تابندہ رہے گا۔ "رسول" کا یہ قرآنی مفہوم سمجھ لینے سے وہ بے شمار گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں جن میں امت صدیوں سے اُلجھی چلی آ رہی ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ

(۱) اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی پانے کا نام نبوّت ہے، اور اس وحی کو آگے پہنچانے اور اس کے مطابق دین کے نظام

کو قائم کرنے کا نام "رسالت"۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ پر نبوت کو ختم کر دیا۔ (حضورؐ کو خاتم النبیین کہا گیا۔ ۳۳/۴۰) لیکن رسالت (یعنی نظامِ خداوندی کو قائم رکھنے) کے سلسلہ کو حضورؐ کی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا تھا۔

اسلامی نظام کے اصول و اساسات

۲۔ رسول اللہ کی وفات پر جب اُمّت میں کہرام مچ گیا تو خلیفۃ الرّسول ابوبکر صدیقؓ نے برسرِ منبر اعلان کیا کہ جو شخص محمد عربیؐ کو اپنا "اِلٰہ" سمجھتا تھا وہ سمجھ لے کہ اس کا اِلٰہ فوت ہوگیا ہے، لیکن جو خدا کو اپنا "الٰہ" سمجھتا ہے اسے یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کا "اللہ" حی وقیوم (زندہ و پائندہ) ہے۔ اس لئے رسول اللہ کی وفات سے دین میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ یہ فرمایا اور اس کے بعد سورۂ آلِ عمران کی وہ آیت (۳/۱۴۴) تلاوت فرمائی جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے، اس سے امت کو اطمینان ہو گیا کہ اسلام اس نظام کو قائم رکھنے کا نام ہے جسے رسول اللہ نے وحی کی روشنی میں قائم فرمایا تھا۔ اب اس دین کو رسول اللہ کے جانشین (خلفاء) قائم رکھیں گے۔ اسی جہت سے اس نظام کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے اور حضورؐ کے بعد اس نظام کو قائم رکھنے والوں کو خلفاء راشدین کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔

۳۔ رسالت کے اس مفہوم کو سامنے رکھیئے تو "اللہ اور رسول کی اطاعت" کا عملی مفہوم، اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہو گا جسے وحیٔ خداوندی کی روشنی میں پہلے حضورؐ نے قائم فرمایا اور جسے حضورؐ کے بعد آپ کے خلفاء (جانشین (SUCCESSORS) قائم رکھیں گے۔

۴۔ جب تک یہ نظام قائم رہا، نہ تو "رسالت" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی دِقت پیش آئی، اور نہ ہی اطیعوا اللہ و اطیعوالرسول، کے ارشادِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوا۔ لیکن جب وہ نظام قائم نہ رہا اور خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تو "رسالت" کا صحیح مفہوم ذہنوں سے اوجھل ہو گیا اور اس قسم کے سوالات اُبھرنے شروع ہوگئے کہ "اطیعوا اللہ واطیعوالرسول" کی تعمیل کس طرح کی جائے؟ کہا یہ گیا کہ اطیعوا اللہ کی تعمیل تو قرآنِ مجید کی اطاعت سے ہو جائے گی، لیکن رسول اب ہم میں موجود نہیں۔ اُن کی اطاعت کی کیا صورت ہوگی؟ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ رسول اللہ کی اطاعت آپ کی احادیث کی رو سے کی جائے۔ اس سے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ واضح رہے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں رسول اللہ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اُس وقت "اطیعوا اللہ و اطیعوالرسول" کا قرآنی مفہوم اُن کے سامنے تھا۔ یعنی نظامِ خداوندی قائم تھا جس میں اس نظام کی اطاعت اطاعتِ خدا و رسول کے قائم مقام تھی۔ یعنی قرآنِ کریم کی اطاعت نظامِ اسلامی کی رُو سے۔

۵۔ احادیث کا یہ عالم کہ ان کے مختلف مجموعوں میں تو ایک طرف، کسی ایک مجموعہ میں بھی بکثرت احادیث ایک دوسرے

سے مختلف اور متضاد ہیں۔ اس سے امت میں فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

۶۔ اب ہمارے ہاں "اسلامی نظام" کے قیام کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان میں خدا اور رسولؐ کا مفہوم "قرآن اور احادیثؐ" لیا جاتا ہے۔ یعنی فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ "سے مراد" فِیۡکُمۡ۔ احادیث رسول اللہؐ" لیا جاتا ہے۔ اس سے جس قدر اختلافات پیدا ہو رہے ہیں، ظاہر ہے۔ ایسے اختلافات جن کی روشنی میں یہ حضرات اس اعلان پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کتاب و سُنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ جب حقیقت یہ ہو تو سوچئے کہ اس سے اسلامی نظام قائم کیسے ہو سکتا ہے؟

۷۔ یاد رکھئے، جب تک "فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ" کا صحیح مفہوم سامنے نہیں لایا جائے گا، نہ مسلمانوں کے اختلافات مٹ جائیں گے، نہ اُمّت میں وحدت پیدا ہو سکے گی۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اس کتابِ عظیم کی بنیادوں پر نظامِ مملکت قائم کر دیا جائے تو دین کی وہی شکل پھر سے سامنے آ جائے گی جو عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں تھی۔ دین کی یہی وہ اصل بنیاد ہے جسے اگلی آیات میں بیان کیا گیا ہے:-

۳/۱۰۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (۱۰۱)

لہٰذا، تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اس ضابطۂ خداوندی کی نگہداشت کرو، جیسا کہ نگہداشت کرنے کا حق ہے۔ اور یہ نگہداشت، محض ہنگامی اور وقتی طور پر نہ کرو، بلکہ اپنی ساری زندگی اسی نہج پر گزار دو۔ اور جب تمہیں موت آئے تو وہ بھی اس عالم میں کہ تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے ہوئے ہو۔

اس طرح اس نظام کے قیام و دوام کا سلسلہ، نسلاً بعد نسلٍ، آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے لئے دو شرائط لاینفک ہیں۔

(۱) اعتصام بحبل اللہ۔ کتاب اللہ کے ساتھ وابستگی یعنی جملہ امورِ حیات کے فیصلے اس کے مطابق۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ اسلام نہیں، کفر ہوگا۔ اور اگر اس کے ساتھ، انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو بھی یہی حیثیت دے دی گئی تو یہ شرک ہوگا۔

(۲) امتِ واحدہ بن کر رہنا۔ اگر امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی تو یہ توحید نہیں، شرک ہوگا جیسا کہ (۳۰/۳۱-۳۲) میں واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے۔

مزید فرمایا:-

۳/۱۰۲ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪ وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (۳/۱۰۳)

یاد رکھو! دین نہ انفرادی مسلک کا نام ہے، نہ گروہ بندیوں کے طریقے کا۔ لہٰذا، تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، سب کے سب بلا استثناء، اجتماعی طور پر کتاب اللہ کے ساتھ، محکم طور پر، وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت

دین کا اصل الاصول

آنے دو، کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۰/۳۱-۳۲) اور پارٹی بازی، خدا کا عذاب (۶/۶۵ ؛ ۳/۱۰۴)۔ ایسا کرنے والوں کے ساتھ رسول کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، (۶/۱۶۰ ؛ ۶/۱۵۹)۔ تم ذرا اپنی پچھلی حالت کو یاد کرو، جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے، فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا جس سے (تم میں صرف ظاہرا اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے ــــ تمہارا اس طرح، ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر، ایک برادری بن جانا، کتنا بڑا انعامِ خداوندی تھا ــــ تم اس سے پہلے، ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے، کہ اس (نظامِ خداوندی) نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا، (۲۹/۱۰ ؛ ۸/۶۳)۔ اللہ اس طرح اپنے قوانین وضوابط اور اُن کے نتائج وثمرات، واضح طور پر، بیان کرتا ہے، تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔

اس کے بعد آیت (۳/۱۰۴) میں بتایا گیا ہے کہ امت کا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔

ارشادِ باری تعالےٰ ہے:۔

۳/۱۰۴ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۳/۱۰۴)

اس نظام کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ تم ایسی جماعت بن کر رہو (۳/۱۰۹ ؛ ۲/۱۴۳) جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ تمام نوعِ انسان کو قرآن کی طرف دعوت دے (۲۲/۷۸)۔ اُن امور کو عملاً نافذ کرے جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرے اور اُن سے روکے جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ [یہی فریضہ اس وقت یہ رسولؐ ادا کر رہا ہے اور ایسا ہی تمہیں بھی کرنا ہوگا (۷/۱۵۷ ؛ ۹/۷۱ ؛ ۹/۱۱۲) اس کے لئے تمکن فی الارض ــــ اپنی آزاد مملکت کا وجود ــــ ناگزیر ہے ۲۲/۴۱]۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی سعی وعمل کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں اور جو نہایت کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں (۲۳/۱)۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر پوری اُمت کا فریضہ

جیسا کہ ذرا آگے چل کر (آیت ۳/۱۰۹) میں وضاحت کر دی گئی ہے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر پوری اُمت

مسلمہ کا فریضہ ہے، نہ کہ امت میں سے کسی مخصوص گروہ کا۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان کی تیسری جلد ص۹۲ زیر آیت (۲/۱۴۳) تشریح کی جا چکی ہے، وہاں دیکھ لیجئے۔ لیکن ایک نکتہ کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ میں نے اُس مقام پر کہا ہے کہ "لغوی تفصیل میں اُلجھے بغیر اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اس آیت میں "مِنْ" کا حرف تبعیض کے لئے نہیں آیا، تبیین کے لئے آیا ہے"۔ اس پر قارئین کی طرف سے جو استفسارات موصول ہوئے ہیں ان کے پیشِ نظر مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس نکتہ کی عام فہم الفاظ میں وضاحت کر دی جائے۔

منکم کا مفہوم

آیۂ زیرِ نظر (۳/۱۰۳) میں کہا گیا ہے، وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ ...... اور مِنْكُمْ کے معنی کئے جاتے ہیں "تم میں سے"۔ عربی زبان میں حرفِ "مِنْ" دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں "تم میں سے کچھ"۔ اسے تبعیض کہتے ہیں۔ یعنی سب کے سب نہیں بلکہ تم میں سے بعض یا کچھ۔ دوسرے ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ "تم سب کے سب"۔ یعنی اس امر کی وضاحت کے لئے کہ یہ فریضہ تم سب کا ہے۔ اسے تبیین کہتے ہیں۔ عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرفِ مِنْ کو تبعیض کے معنوں میں صرف اس مقام پر لینا چاہیئے جہاں اس کی جگہ لفظِ "بعض" بلا تکلف رکھا جا سکے۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنی تبیین کے لئے جائیں۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے اتقان۔ سیوطی)۔

حسبِ ذیل دو آیات اس فرق کو واضح کر دیں گی۔ سورۃ التغابن میں ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)۔ "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن"۔ ظاہر ہے کہ یہاں "مِنْ" کے معنی تبعیض ہی کے لئے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف سورۃ فاطر میں ہے: وَالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ (۳۵/۳۱)۔ "اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی جو حق پر مبنی ہے"۔ اگر یہاں مِنْ کے معنی "بعض" کئے جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ پر کتاب کا صرف کچھ (بعض) حصہ نازل کیا۔ پوری کتاب نازل نہیں کی۔ اِن معانی کی رُو سے اسلام کی اصل و اساس پر پانی پھر جاتا ہے۔ لہٰذا، اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے تمہاری طرف پوری کی پوری (سب کی سب) کتاب نازل کی۔ اور یہی کتاب حق پر مبنی ہے۔ لہٰذا، یہاں پر "مِنْ" کے معنی تبیین کے لئے جائیں گے، تبعیض کے نہیں۔

مِنْ کے یہی معنی آیت (۳/۱۰۳) میں لئے جائیں گے۔ یعنی یہ کہ تم (پوری کی پوری اُمت) وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے گی۔ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد سوم ص۹۲-۹۳ پر بتایا گیا ہے، قرآن کی رُو سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ساری کی ساری امت کا ہے، نہ کہ امت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے محض اپنے الگ مخصوص گروہ کے جواز کے لئے "مِنْكُمْ" کا ترجمہ "تم میں سے ایک گروہ" کر کے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم

کو منسخ کر دیا۔ اس کے بعد آیات (۳/ ۱۰۴-۱۰۶) میں اُمت میں تفرقہ کو باعثِ عذابِ عظیم کہا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے تفرقہ اور فرقہ بندی کے متعلق مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (انڈکس سے حوالے دیکھ لیجئے)۔ اس لیے یہاں ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ صرف آیت اور اُن کے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

۳/ ۱۰۴-۱۰۶ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۳/ ۱۰۴-۱۰۶)

"یاد رکھو! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح قوانینِ خداوندی آجانے کے بعد، فرقوں میں بٹ گئے (۶/ ۱۶۰؛ ۳۰/ ۳۲، ۴۲/ ۱۳) اور باہمدگر اختلافات کرنے لگ گئے۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ اس لئے اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے اس سے قومیں ذلیل وخوار اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

یہ دونوں گروہ ہمارے سامنے ہیں ــــ ایک وہ جو نظامِ خداوندی کے رشتے میں منسلک ہو کر، اُمتِ واحدہ کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ دوسرے وہ جو، فرقوں میں بٹ کر کفر و شرک کے مسلک پر چل نکلیں ــــ پہلا گروہ وہ ہے جن کے چہرے، کامیابیوں اور کامرانیوں سے چمک رہے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ذلت اور رسوائیوں کی وجہ سے رُوسیاہ ہے۔ یہ رُوسیاہ وہ ہیں جو، ایمان لانے کے بعد، پھر کفر کی حالت کی طرف لوٹ گئے۔ یعنی فرقوں میں بٹ گئے۔ اُن کا اس کافرانہ مسلک کی وجہ سے اُن پر ذلت اور تباہی کا عبرت انگیز عذاب چھا گیا۔ جن کے چہرے روشن ہیں، وہ خدا کی رحمتوں کے سائے میں ہیں (۱۱/ ۱۱۸-۱۱۹) جب تک یہ وحدت اور اخوت کی زندگی بسر کریں گے، خدا کی رحمتوں کے بادل ان پر سایۂ فگن رہیں گے۔

اِن تصریحات کے بعد فرمایا :-

۳/ ۱۰۷ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ ۝ (۳/ ۱۰۷)

یہ ہیں قوموں کی موت و حیات کے متعلق وہ قوانین و ضوابط جنہیں خدا، ایک حقیقتِ ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تو بڑا ظلم ہوتا کہ جن اصولوں کے تابع چلنے سے انسانی زندگی نے کامیاب ہونا تھا، وہ اصول انسان کو نہ بتائے جاتے۔

اس کے بعد کہا :-

۳/۱۰۸ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳/۱۰۸)

خدا نے یہ انداز کچھ تمہارے ہی لئے اختیار نہیں کیا۔ خارجی کائنات میں بھی اسی قسم کے قوانین و ضوابط کارفرما ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اور ہر تدبیر کا قدم اس کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ کائنات کی ہر اسکیم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

خارجی کائنات میں کس طرح قوانینِ خداوندی کارفرما ہیں، اس کے لئے انڈکس میں، کائنات اور قوانین کے عنوانات دیکھئے۔ نیز اسی جلد میں آیت (۳/۸۲) کی تشریح۔ باقی رہی انسانی دنیا، سو اس میں یہ قوانین اس اُمت کی وساطت سے کارفرما ہوں گے جسے وارثِ کتاب بنایا گیا ہے (۳۵/۳۲)۔ انہیں مخاطب کر کے کہا گیا :-

۳/۱۰۹ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۳/۱۰۹)

فرق یہ ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود کارفرما ہیں، اور انسانی دنیا میں، انہیں نافذ کرنے کے لئے، انسانوں کی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم نے، اے جماعتِ مؤمنین! تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے تاکہ تم ایک نظام قائم کرو جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اُن باتوں کا حکم دو جسے قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے، اور ان سے روکو جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں — لیکن تم دوسروں سے یہ کچھ اسی صورت میں کہہ سکتے ہو جب تم خود ان قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو۔

خیرِ اُمت

اگر یہ اہلِ کتاب بھی، اس نظام کی صداقت پر ایمان لا کر، اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں، تو یہ ان کے لئے بہتر ہوگا — یہ بھی اس خیرِ امۃ، کا جزو بن جائیں گے — ان میں سے کچھ لوگ تو اس پر ایمان لائے ہیں، لیکن اکثریت اُن کی ہے جو غلط راستوں پر چل رہے ہیں۔ (اور اس نظام کی سخت مخالفت کرتے ہیں)۔

ہم نے آیت (۳/۱۰۳) کی تشریح کرتے ہوئے جو کہا تھا کہ اس سے مراد ساری کی ساری اُمت ہے، نہ کہ امت کا کوئی خاص گروہ تو اس کی تائید زیرِ نظر آیت سے ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ فریضہ پوری کی پوری اُمت کا بتایا گیا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت (۹/۷۱) میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کر دی :-

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

وَيُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۷۱/۹)

(دوسرا گروہ) مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ہے۔ یہ سب نصب العین کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوتے ہیں۔ یہ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطۂ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے روکتے ہیں جنہیں وہ (ضابطۂ خداوندی) ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

ہر معاملہ میں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے فیض یاب ہوں گے، اور دنیا دیکھ لے گی کہ خدا قانون کس طرح قوت و حکمت پر مبنی ہے۔

(ضمناً) اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف مومن مردوں کا فریضہ نہیں، اس میں مومن عورتیں بھی

عورتیں امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں

برابر کی شامل ہیں۔ اس سے اس اہم سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ اسلام میں عورتیں امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ (۴۱/۲۲) اور جب (آیت ۷۱/۹ کی رُو سے) عورتیں بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں شامل ہیں تو وہ بھی امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں۔ (نیز دیکھئے ۱۱۲/۹)

آیت (۱۰۹/۳) میں کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ (بالخصوص یہود سے مُراد ہے) اس کتاب پر ایمان لے آئیں تو اس سے انہی کا فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ ایسا نہ کریں اور اپنی مخالفت سے باز نہ آئیں، حتیٰ کہ نوبت جنگ تک کی بھی آجائے، تو اس سے انہی کا نقصان ہوگا۔

۳/۱۱۰ لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ (۳/۱۱۰)

لیکن یہ لوگ، اس مخالفت سے تمہیں، بجز ذرا سی تکلیف اور پریشانی کے، اور کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

اگر یہ میدانِ جنگ میں تمہارے مدِمقابل آئیں گے تو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، اور ان کا کوئی یار و مددگار اور پشت پناہ نہیں ہوگا۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں داستانِ بنی اسرائیل بڑی شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے جرائمِ پیہم کی پاداش میں ذلت و پستی کے الم انگیز عذاب میں مبتلا ہوگئے۔ (مطالب الفرقان جلد دوم ص ۲۹۸ زیرِ آیت ۶۱/۲)۔

وہی الفاظ یہاں دہرائے گئے ہیں۔ جب کہا :-

۳/۱۱۱ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ (۳/۱۱۱)

تم دیکھتے نہیں کہ یہ کس قدر ذلت وخواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں ؟ دُنیا میں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں آسمانی کتاب کے حامل سمجھ کر پناہ دی۔ یا کسی قوم سے انہوں نے عہد و پیمان کر لیا اور اس کی وجہ سے انہوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ ورنہ، ان کی عام حالت یہی ہے کہ، خدا کا عذاب ان کے پیچھے لگا ہوا ہے اور یہ سخت محتاجی اور بدحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ، انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ اس حد تک سرکشی کہ نبیوں تک کو ناحق قتل کر دیا[1]۔ (۳/۱۱۱)

سوچو کہ جو قوم، اِس درجہ سرکش اور بے باک ہو جائے، وہ دنیا میں ذلیل و خوار نہیں ہوگی، تو اور کیا ہوگا ؟

ہمارے ہاں اکثر یہ مسئلہ زیرِ بحث رہتا ہے کہ کیا (قرآن کی رُو سے) یہودیوں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے ؟ اس کے متعلق مطالب القرقان جلد دوم صـ۱۶۸ زیرِ آیت ۲/۶۱ تشریح کی جا چکی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہودیوں میں کوئی بھی ایسے نہیں رہے جو صحیح راستہ اختیار کر کے اس عذاب سے بچ جائیں۔ (دیکھئے ۳/۱۹۸)۔ ذیل کی آیات میں انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

۳/۱۱۲-۱۱۴ لَيْسُوا سَوَآءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُونَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ ۗ وَأُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ ۢ بِالْمُتَّقِينَ ۝ (۳/۱۱۲-۱۱۴)

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ان کی ساری نسل میں صحیح راستے کی طرف آنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ ان میں ہنوز صلاحیت موجود ہے، اور یہی وجہ ہے کہ، ان میں سے جو لوگ اسلام لے آئے ہیں (۳/۱۹۸) اُن میں مومنانہ صفات کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ یہ لوگ حق پہ قائم رہتے ہیں۔ راتوں کو اُٹھ کر قوانینِ خداوندی کا مطالعہ کرتے ہیں، اور پھر ان کی پوری

---

[1] قتلِ انبیاء کے متعلق مطالب القرقان جلد دوم۔ صـ۳۰ زیرِ آیت (۲/۶۱)۔ دیکھئے

پوری اطاعت کرتے ہیں۔

یہ ہیں ان میں سے وہ لوگ جو صحیح معنوں میں اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن باتوں سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ صالحین (مؤمنین) کے زمرے میں شامل ہو چکے ہیں۔

خدا کا قانونِ مکافات' ان کے حُسنِ عمل کو اس لئے نہیں ٹھکرا دے گا کہ یہ بنی اسرائیل کے گھروں میں پیدا ہو گئے تھے۔ اسلام کا دروازہ ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ اس لئے جو اس کے دائرے میں آجائے' اُسے اُس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے' اس میں شرف و سعادت کا معیار صرف ایک ہے' اور وہ یہ کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کون کرتا ہے' اور کس حد تک کرتا ہے (۴۹/۱۳)۔

اگرچہ ان آیات کے مفہوم سے مطلب واضح ہو جاتا ہے لیکن اتنا دُہرا ضروری ہے کہ یہ خیال کہ یہودی یا نصاریٰ بے شک اپنے مذہب پر رہیں' قرآنِ کریم اُن کے ایمان اور اعمال کو اسلام کے مطابق سمجھتا ہے' صحیح نہیں۔ قرآنِ کریم اہلِ کتاب کے لئے بھی اسی طرح قرآنِ کریم (رسالتِ محمدیہ) پر ایمان لانے کو ضروری سمجھتا ہے جس طرح غیر اہلِ کتاب کے لئے۔ تفصیل مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے (انڈکس میں عنوان کتاب اہلِ کتاب) ملاحظہ کیجئے۔ خود اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر' ان کے قرآنِ کریم (مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ..... ۳/۱۹۸) پر ایمان لانے کا ذکر کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے ان تصریحات کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ یہودیوں کے ہاں دین قومی تھا۔ یعنی کسی غیر اسرائیلی کے لئے دین کے دروازے کھلے ہی نہیں تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ (اور تو اور خود) یہودی بھی قرآن پر ایمان لا کر ہی انعاماتِ خداوندی کے مستحق ہو سکتے ہیں جن کے مستحق باقی اہلِ اسلام ہیں۔

یہ تو تھے وہ اہلِ کتاب جو قرآنِ مجید پر ایمان لا کر اُمتِ مسلمہ کے دائرے کے اندر آ گئے۔

ان کے برعکس :-

۳
۱۱۶-۱۱۵

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْھَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَھْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۳/۱۱۶-۱۱۵)

جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار کر کے' دوسری روش اختیار کرتے ہیں' اُن کے پیشِ نظر صرف ذاتی مفاد کا خیال ہوتا

ہے، لیکن ان کی یہ مفاد پرستی —— خواہ کثرتِ اولاد کی صورت میں ہو یا مال و دولت کی شکل میں —— نظامِ خداوندی کے مقابلے میں، اُن کے کسی کام آنہ سکے گی۔ اُن کی غلط روش، انہیں اس طرح تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی کہ وہ پھر اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہیں گے۔

اُن کے پیشِ نظر صرف طبیعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ صرف کیا جائے، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے شدّت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے جنہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق، اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا۔ تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

یاد رکھو! اُن کی یہ تباہی، خدا کی طرف سے زیادتی نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کو غصب کر کے، خود اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں۔

آیت (۳/۷۵) میں بتایا گیا ہے کہ ان اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا ذاتی کردار اچھا ہے۔ اس سلسلہ میں پرائیویٹ اخلاق اور پبلک اخلاق کی تفریق کے متعلق بھی تشریح کی گئی ہے، اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے مفاد کے لئے تو بڑا ایثار کریں گے لیکن اپنی قوم سے باہر کے انسانوں میں ہر طرح کا سلب و نہب جائز رکھیں گے۔ یہودیوں کی تاریخ اس ثنویت کی زندہ مثال ہے۔ اور اسرائیلی مملکت اس کی موجودہ شہادت۔ اس مملکت کے قیام اور استحکام کے لئے دنیا بھر کے

یہودیوں کی مملکت

یہودی بے پایاں دولت خرچ کر رہے ہیں، لیکن اس کا مقصد کیا ہے؟ سب سے پہلے فلسطین کے مسلمانوں کی آزادی چھیننا اور انہیں ان کے گھر بار سے نکال باہر کرنا۔ اس کے بعد ان کے عزائم کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ انفاق جس سے ظلم کا بیج بویا جاتا ہے، اور جس کا آخرالامر نتیجہ خود ظالم قوم کی تباہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک انفاق "فی سبیل اللہ" ہے، جس کا مقصد عالمگیر انسانیت کی ربوبیت ہوتا ہے۔ اس کا بویا ہوا بیج شاخِ طیبہ کی طرح بڑھتا اور سدرۃُ المنتہیٰ تک پہنچتا ہے۔ (اس انفاق کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد اوّل ص ۱۰۵؛ جلد سوم صفحات ۲۱۶؛ ۳۲۱؛ ۳۰۲ ملاحظہ فرمائیے۔

اس کے بعد جماعتِ مومنین کو ایک بہت بڑے خطرے کی طرف سے متنبہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس انتباہ سے پہلے، ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت

حیثیت کیا ہو گی؟ انہیں ووٹنگ کا حق ہو گا یا نہیں؟ وہ پارلیمان کے ممبر بن سکیں گے یا نہیں؟ انہیں حکومت کے کلیدی مناصب

دیئے جاسکیں گے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اسلامی مملکت کہتے کسے ہیں؛ اور اس کے خواص و لزومات کیا ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی مملکت :

۱۔ ایمان اور عملِ صالح کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ ظلم و استبداد اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ (۲۴/۵۵)

۲۔ یہ مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ یہ دین کے تمکن کا ذریعہ ہوتی ہے (۲۴/۵۵)۔

۳۔ اس کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہوتا ہے (۲۲/۴۱)۔

۴۔ اس میں تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ (قرآنِ کریم) کی رُو سے ہوتے ہیں (۵/۴۴)۔

آپ سوچئے کہ جس مملکت کی اساس و بنیاد یہ ہو جس کی غرض و غایت یہ ہو جس کے مقاصد یہ ہوں۔ کیا اس مملکت کے کاروبار میں وہ لوگ شریک کئے جاسکتے ہیں (یا شریک ہوسکتے ہیں) جو اس کی اس اصل و اساس اور اس کے ان اغراض و مقاصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں؟ ایمان نہ رکھنا تو ایک طرف، جو انہیں صحیح نہ سمجھتے ہوں۔ جو ان کے مخالف ہوں؟ جواب ظاہر ہے کہ انہیں اس مملکت کے کاروبار میں شریک کیا ہی نہیں جاسکتا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مملکت کی آبادی کے ایک حصہ کو کاروبارِ مملکت سے باہر رکھنا، مغربی جمہوریت کے خلاف ہے، وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت دنیا کی دیگر تمام مملکتوں سے یکسر منفرد اور متمیز ہوتی ہے؛ اس لئے دنیا کے کسی نظام کو بھی اس مملکت کے لئے معیار قرار دینا بنیادی غلطی ہے۔ اس مملکت کا اپنا منفرد نظام ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر یہ نہ دیکھئے کہ دیگر نظام ہائے مملکت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کا نظام دنیا کے عام نظاموں جیسا ہی ہے تو پھر اسلامی نظام کے قیام کے دعاوی ترک کر دیجئے۔ "منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن" کی روش اسلام میں نہیں چل سکتی۔ اسلام میں تو ــــ یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر ــــ کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں غیرمسلموں کو تمام انسانی حقوق دیئے جائیں۔ لیکن انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جاسکے گا۔ کوئی حکومت بھی جو کسی آئیڈیالوجی (نظریہ یا عقیدہ) پر مبنی ہو، ان لوگوں کو شریکِ حکومت نہیں کرسکتی جو اس نظریہ یا عقیدہ کو نہ مانتے ہوں۔

قرآنِ کریم نے اس باب میں ایک اصولی اور بنیادی بات کہہ دی ہے اور وہ یہ ہے :-

۳/۱۱۷ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳/۱۱۷)

قرآن کی رُو سے انسانوں کی تقسیم خون۔ رنگ۔ زبان۔ وطن۔ قومیت کے بجائے آئیڈیالوجی (ایمان) کی بناء پر ہوگی۔ جو لوگ وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار پر ایمان رکھیں، اور نظامِ خداوندی کے قیام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں، وہ ایک جماعت۔ ان کے برعکس

جو لوگ، ان اقدار سے انکار کر کے، اپنے لئے کوئی اور نظام تجویز کریں، وہ دوسری جماعت کے افراد ——— چونکہ، وحدت اور یگانگت کے لئے، نصب العین کا اشتراک بنیادی شرط ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ان دو متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں میں قلبی تعلقات کبھی قائم

انہیں رازداں نہیں بنایا جاسکتا

نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا، اے جماعتِ مؤمنین! تم اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا کسی کو اپنا رازدان نہ بنانا۔ یہ (دوسرے) تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آجاتی ہیں، لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم نے یہ باتیں اس لئے واضح طور پر بیان کر دی ہیں کہ تم عقل و ہوش سے کام لے کر، ان کی طرف سے محتاط رہو۔ (۳/۲۸؛ ۹/۲۳؛ ۵۸/۲۲؛ ۶۰/۴)

اب ظاہر ہے کہ جنہیں "رازداں" نہیں بنایا جاسکتا، انہیں شریکِ حکومت کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد کہا:—

۳/۱۱۸ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا
خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

دیکھو! ایسا کبھی نہ کرنا کہ تم انہیں اپنا دوست بنالو۔ اگر تم ایسا کرو گے بھی، تو وہ تمہیں کبھی اپنا دوست نہیں بنائیں گے، حالانکہ تم ان تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اور اُن میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو ان (تمہارے مخالفین) کے انبیاء کی طرف نازل ہوئی تھیں۔ تم یہ کچھ خلوصِ قلب سے کرتے ہو۔ لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (قرآن پر) ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں، تو شدتِ عداوت سے تمہارے خلاف، غصہ میں، اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ! اپنے غصے میں مر مٹو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے ہو اور تمہارے سینے میں کیا چھپا ہوا ہے۔ تمہاری نفسیاتی کشمکش اور دورخی زندگی خود تمہارے لئے سامانِ ہلاکت بن جائے گی۔

صدرِ اوّل کے اہلِ کتاب کی اس قسم کی منافقانہ روش کے متعلق آیت (۳/۷۲) میں گفتگو ہو چکی ہے۔ ہمارے زمانے میں اس "لات و منات"[1] نے ایک اور شکل اختیار کر رکھی ہے۔ عیسائی سلطنتیں صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کرتی چلی آرہی ہیں، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ ان طاقتوں نے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے تک کی مذموم کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کمیونزم کے انقلاب

دورِ حاضر کے لات و منات

کے بعد انہیں روس کی طرف سے جو خطرہ محسوس ہوا تو اس کی مدافعت کے لئے انہیں مسلمان سلطنتوں کی تائید کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس پر انہوں نے نعرہ بلند کیا کہ

BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER

---

[1] بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں — اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات (اقبالؒ)

یعنی انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم بھی خدا کے ماننے والے ہو، ہم بھی خدا کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے آؤ! اس دھریت پر مبنی نظام (کمیونزم) کے مقابلہ کے لئے ہم اور آپ مل کر متحدہ محاذ قائم کریں۔ روس کا مقابلہ کرنے کے لئے تو مسلمانوں کو اس طرح دعوتِ اتحاد دی، اور مسلمان سلطنتوں کے خلاف اپنی ریشہ دوانیاں بدستور جاری رکھیں۔

روس کی دھریت ہو یا اقوامِ مغرب کی خدا پرستی، قرآن کی رُو سے دونوں کفر پر مبنی ہیں۔ وہ منکرینِ خدا اور اہلِ کتاب سب کو اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے، تو ان کا دوست نہ کوئی منکرِ خدا ہو سکتا ہے نہ (بزعمِ خویش) خدا پرست۔ سب ان کے خلاف دانت پیستے ہیں، ان کی حالت یہ ہے کہ

۳/۱۱۹ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۳/۱۱۹)

ان کے خُبثِ باطن کا یہ حال ہے کہ، اگر کوئی اچھی بات تمہیں چھو بھی جائے تو انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے، تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن تم ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اگر تم اپنے پروگرام میں ثابت قدم رہے، اور قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرتے رہے، تو ان کی تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اللہ کا قانونِ مکافات انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس لئے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوں گے، نہ کہ ان کی خواہشات کے مطابق۔

کفار (غیر مسلموں) کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی تفصیلی بحث، مطالب الفرقان جلد اوّل ص۱۷۵۔ زیرِ آیت (۲/۴) آچکی ہے۔ اس کی تفصیل نیز مندرجہ بالا آیات (۳/۱۱۹-۱۱۸) سے "دو قومی نظریہ" کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ غور کیجئے کہ جب

دو قومی نظریہ

قرآنِ کریم غیر مسلموں کے خیالات، نظریات اور مسلمانوں کے خلاف ان کے جذباتِ نفرت و عداوت کی اس طرح وضاحت کرتا ہو، اور مسلمانوں سے تاکیداً کہتا ہو کہ اُن پر کبھی اعتماد نہ کرنا، تو کیا وہ اور مسلمان (امتِ مسلمہ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں انڈکس میں "قوم اور قومیت پرستی" کے عنوانات ملاحظہ کیجئے۔

غیر مسلموں کے بُغض اور عناد کی پردہ کُشائی کرنے کے بعد قرآنِ کریم کفر اور اسلام کے تضادات کا ذکر کرتا ہے جو صدرِ اوّل میں رونما ہوئے تھے۔ ان کی تفصیل آئندہ باب میں سامنے آئے گی۔

؎ کفار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل ص۱۷۵۔ زیرِ آیت (۲/۴)۔

تیسرا باب

چراغِ مُصطفویؐ اور شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری

(آیات ۳/۱۲۰ تا ۳/۱۹۹)

۱ ــــ قریش کی مسلسل مخالفت

۲ ــــ نوحۂ ابوجہل

۳ ــــ جنگِ اُحد

۴ ــــ جنگ کا جذبۂ محرکہ ۔ اعلائے کلمۃ اللہ ۔

۵ ــــ مشاورت کا نظام

۶ ــــ مومن اور منافق چھٹ کر الگ الگ ہو گئے

۷ ــــ کاظمین الغیظ

۸ ــــ جرم کی سزا کے لئے دو شرائط

مجرم عادی ہو اور قانون کو سمجھ سکے

۹ ــــ شخصیتوں کے بجائے قانون اور نظام کا دور

۱۰ ــــ ہم نے پھر شخصیت پرستی شروع کر دی ۔

۱۱ ــــ کیا موت کا وقت مقرر ہے ؟

۱۲ ــــ توکل کسے کہتے ہیں ؟

۱۳ ــــ ثواب کا کیا مفہوم ہے ؟

۱۴ ــــ شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے ۔

۱۵ ــــ شرک کسے کہتے ہیں ؟

۱۶ ــــ بخل سے قوموں کی تباہی

۱۷ ــــ کائنات کے نظم و نسق پر غور و تدبر

۱۸ ــــ کائنات کا باطل سمجھنا کفر ہے

۱۹ ــــ قبولیت دعا ، اعمال کے اجر ملنے کا نام ہے

۲۰ ــــ ذکر کا مفہوم

۲۱ ــــ مومنین کی اجتماعی خصوصیات

اصبروا ۔ صابروا ۔ رابطو ۔ واتقو

تیسرا باب

شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاریاں

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

حضور نبی اکرمؐ، مکہ میں تیرہ سال تک انتہائی مصائب و نوائب کی زندگی گزارنے کے بعد، ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے[1]۔ قریشِ مکہ کو اگر حضورؐ اور جماعتِ مومنین کے خلاف یہی شکایت تھی کہ وہ ان کی بُت پرستی کی مخالفت اور ان کی مذموم عادات و خصائل پر تنقید کرتے تھے تو انہیں خوش ہونا چاہیئے تھا کہ یہ کانٹا نکل گیا۔ اب انہیں کسی قسم کی تنقید و تشنیع کا خدشہ نہیں رہا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے ان کا تعاقب کیا اور ہجرت کے دوسرے ہی سال ایک لشکرِ جرار کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ بدر کے مقام پر ان کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکہ کی تفصیل سورہ انفال میں آئی ہے۔ جسے اس مقام پر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قریش نے مسلمانوں کا تعاقب کیوں کیا تھا۔ اور وہ سات سال تک ان کے خلاف نبرد آزمائیوں رہتے تھے۔ انہیں کس بات کا خطرہ تھا جسکی وجہ سے انہوں نے اس طرح سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔

قریش کی مخالفت کی وجہ

بات واضح تھی۔ اگر اسلام بھی یہودیت، عیسائیت یا مجوسیت کی طرح ایک مذہب ہوتا تو انہیں (کم از کم ہجرت کے بعد) اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ نظامِ حیات ہے۔ اگر یہ نظام کسی جگہ بھی قائم ہو گیا تو قریش کی کوئی حیثیت

---

[1] ہجرت کے مقصد اور اہمیت کے متعلق سابقہ جلدوں میں بحث ہو چکی ہے (دیکھئے انڈکس)

باقی نہیں رہے گی۔ اُن کے نسلی اور نسبی تفوق کا یہ عالم تھا کہ وہ غیر عرب تو ایک طرف، عربوں کے بھی کسی دوسرے قبیلہ کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے، دنیاوی وجاہت کے علاوہ، کعبہ کے مجاور ہونے کی حیثیت سے انہیں ایسا مذہبی تقدس حاصل تھا جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا۔ وہ دور دراز ملکوں سے تجارت کرتے تھے اور اس مذہبی تقدس کی وجہ سے ان کے قافلے ہر مقام پر محفوظ رہتے تھے جبکہ عرب میں قافلوں کی لوٹ مار کا سلسلہ عام تھا۔ سینکڑوں غلام اور لونڈیاں اُن کے دروازوں پر بلا زنجیر بندھے رہتے تھے۔ وہ دن رات محنت اور مشقت کرتے اور یہ ان کی کمائی پر عیش اڑاتے تھے۔ ان کی یہ عیش سامانیاں اس وجہ سے بھی قائم و دائم تھیں کہ اُن کے دائیں بائیں، ایرانی اور بازنطینی حکومتوں میں رعایا کی حالت ان غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ انقلاب جس کی دعوت حضور نبی اکرمؐ دیتے تھے، کسی جگہ بھی ظہور میں آگیا تو اُس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر اُن کے ہاں کا زیر دست طبقہ سرکش ہو جائے گا جس کے بعد ان کی نہ وجاہت باقی رہے گی نہ ثروت۔ نہ تقدس باقی رہے گا نہ تفوق۔ یہ تھا وہ خطرہ جس کی وجہ سے وہ اسلامی نظام کے قیام میں (خواہ اس کا آغاز مدینہ میں ہی کیوں نہ ہو) اپنی موت دیکھتے تھے اور انتہائی کوشش کرتے تھے کہ ایسا نہ ہونے

نوحۂ ابوجہل

پائے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے ان خطرات کا نقشہ، نوحۂ ابوجہل کے عنوان سے جاوید نامہ میں بڑے بلیغ انداز میں کھینچا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ابوجہل نے غلافِ کعبہ کو تھاما اور انتہائی گریہ زاری سے اپنے "خداؤں" سے فریاد کی کہ

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ　　از دمِ اُو کعبہ را گل شُد چراغ
ساحر و، اندر کلامش ساحری است　　ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است
تا بساطِ دینِ آبا در نورد　　باخداوندانِ ما کرد، آنچہ کرد

وہ چلاتا تھا کہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

اس کے نزدیک، یہ حادثہ قیامت سے کم نہ تھا۔

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ　　با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند　　آبروئے دودمانے ریختند!

وہ اس نظام کی معاشی مساوات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا کہ

ایں مساوات ، ایں مواخات اعجمی است خوب مے دانم کہ سلمانؓ مزدکی[1] است

اس لئے وہ کبھی حجرِ اسود کو پکار کر کہتا کہ

باز گو ، اے سنگِ اسود باز گوے آنچہ دیدیم از محمد باز گوے

اور کبھی کعبہ کے سب سے بڑے "خدا" سے فریاد کرتا کہ

اے ہُبلؔ ! اے بندہ را پوزش پذیر خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

گلّہ ، شاں را بگرگاں کن سبیل تلخ کن خرمائے شاں رابر نخیل !

یہ تھے وہ خطرات جن کا احساس قریش کو ایک ثانیہ کے لئے بھی چین کی نیند سونے نہیں دیتا تھا۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ۲ھ میں بدر کے میدان میں نبرد آزمائی کی ۔ وہاں بُری طرح شکست کھانے کے بعد اگلے سال (شوال ۳ھ ۔ مطابق مارچ ۶۲۵ء) پہلے سے بھی زیادہ لاؤ لشکر کے ساتھ ، پھر مدینہ کی طرف اُمنڈ آئے ۔ مدینہ سے ڈیڑھ دو میل باہر کوہ اُحد کے قریب جماعتِ مجاہدین کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوا ۔ قریش کی جمعیت قریب تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی ۔ حضورؐ کی معیت میں کل ایک ہزار مجاہد تھے ۔ اس زمانے میں ہنوز مدینہ میں منافقین بکثرت موجود تھے ۔ ان کی کوئی تین سو کی جماعت (رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی زیرِ قیادت) مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوگئی ۔ یہ ہے وہ جنگ جس کا تذکرہ زیرِ نظر آیات میں سامنے آیا ہے[2] آیت (۱۱۹/۳) میں کہا تھا : وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ "اگر

جنگِ اُحد

تم نے استقامت اختیار کی اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی ، تو منافقین کی سازشیں تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی "۔ اس وعدے کی صداقت کے طور پر جنگِ اُحد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا :-

۱۲۰/۳ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۱۲۰/۳)

(اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کہ صبر و تقویٰ کا پھل کیا ہوتا ہے اور استقامت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کا نتیجہ کیا، تم اس جنگ ــــ اُحد ــــ کا واقعہ سامنے لاؤ) جب تو (اے رسولؐ !) صبح سویرے اپنے گھر سے نکلا تھا تاکہ جماعتِ مؤمنین کو لڑائی کے مرکزی مقامات پر متعین کردے ــــ اور اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا تھا ۔

---

[1] مزدکیت ۔ فارس کی کمیونزم ۔ (حضرت سلمانؓ فارسی نژاد تھے)

[2] اسلام اور جنگ کے موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے ۔ انڈکس کی مدد سے "جنگ" کا عنوان دیکھئے ۔

اس میں حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کہا گیا ہے کہ جنگ کے روز آپؐ صبح سویرے گھر سے نکلے تاکہ اپنے سپاہیوں کی پوزیشنیں متعین کر دیں۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک رسولؐ کے فرائض زندگی کیا ہوتے تھے؟ رسولؐ کے فرائض

رسولؐ کے فرائض

محض نمازیں پڑھانا اور وعظ کہنا نہیں تھے۔ وہ اپنی فوجوں کا "کمانڈر۔ اِن۔ چیف" بھی ہوتا تھا۔ اور میدانِ جنگ میں بہ نفسِ نفیس شریک ہو کر، فوجوں کی کمان کرتا تھا۔ ہم اپنی مذہبی پیشوائیت سے اتباعِ سنتِ رسول اللہؐ کے چرچے روز سنتے ہیں اور اس پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ تارکِ سنت کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ سنتِ رسولؐ اللہ (کہ جسے قرآن کریم نے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے تعبیر کیا ہے) کی اہمیت بجا اور درست، لیکن اتباعِ سنتِ رسولؐ اللہ کے ان دعویداروں سے پوچھئے کہ جنگ میں فوجوں کی کمان کرنا تو ایک طرف! انہوں نے کبھی میدانِ جنگ کی شکل بھی دیکھی ہے؟ ان کا، سنت کا تصور، کرتے پائجامے کی تراش خراش' یا "عقیقہ اور ولیمہ" کی دعوتوں تک محدود ہوتا ہے۔ سچ ہے ؎

مُلا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے اس لشکر میں منافقین کی جماعت بھی شامل ہو گئی تھی جو قریب تین سو افراد پر مشتمل تھی۔ تاریخ میں ہے کہ وہ راستے ہی میں ساتھ چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ اس طرح قریش کے تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں مجاہدین کی تعداد صرف سات سو رہ گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں ایسے اعراب (بدو) بھی شامل ہوں جن کے متعلق قرآن مجید نے کہا ہے کہ وہ مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ہنوز ایمان اُن کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا تھا۔ (۴۹/۱۴)

اس قسم کے وہ سپاہی تھے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے:۔

۳/۱۲۱ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۳/۱۲۱)

(اس دن مقابلہ ایسا سخت تھا کہ) تم میں سے دو گروہوں کے دل میں ہمت ہار دینے کا خیال پیدا ہو گیا حالانکہ انہیں قوانینِ خداوندی کی تائید اور سرپرستی حاصل تھی۔ (یہ وہی تھے جن کا ایمان ہنوز پختگی حاصل نہیں کر سکا تھا، ورنہ) مومنوں کی تو خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ اور خدا کے وعدوں پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔

یہاں 'توکّل' کا لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قرآنی مفہوم قدرے وضاحت سے سامنے لایا جائے، بالخصوص اس لئے کہ ہماری تباہیوں میں (قرآن کریم کی دیگر اصطلاحات کی طرح) اس اصطلاح کے غلط مفہوم کو بھی بڑا

توکّل کا مفہوم

دخل ہے۔ ہمارے ہاں توکل کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بے دست و پا بیٹھا رہے۔ کسی کام کے لئے نہ کوشش کرے، نہ محنت اور دل میں سمجھتا رہے کہ اس کی روزی اور دوسرے مقاصد کی کامیابی کے لئے خدا خود بخود غیب سے سامان پیدا کر دے گا۔ "توکل" کے اس مفہوم میں ہمارے ہاں کے تصوف کو بڑا اہمیت دخل ہے۔ "مقربین بارگاہِ خداوندی۔ یعنی اولیاء اللہ" ہر قسم کے مادی اسباب اور سہاروں کو خدا پر ایمان کے منافی قرار دے کر "توکل بخدا" بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے عقیدت مند اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ "حضرت صاحب کچھ نہیں کرتے، اس کے باوجود اُن کے سب کام بروقت ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ پر توکل رکھتے ہیں۔ حالانکہ "حضرت صاحب" کے توکل کا راز اس میں ہوتا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں (مُریدوں) کا ایک جمِ غفیر محنت کرتا ہے اور ان کی محنت کی کمائی پر حضرت صاحب کا کاروبار چلتا ہے۔ یہ عقیدت مند نذرانے پیش کرنا بند کر دیں، تو حضرت صاحب کے توکل علی اللہ کی قلعی کھل جائے!

توکل (مادہ: و - ک - ل) کے معنی اعتماد اور بھروسہ (CONFIDENCE) یا (TRUST) کے ہیں۔

اس کا مفہوم ایک دو مثالوں سے سمجھ میں آجائے گا۔ آپ نے ہوائی جہازوں سے پیراشوٹوں کو کودتے دیکھا ہوگا۔ وہ دس دس ہزار فٹ کی بلندی سے کس بے باکی اور بے تکلفی سے فضا میں کُود جاتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت انہیں کسی خطرے کا احساس تو ایک طرف، ذرا سا تذبذب یا تامل بھی نہیں ہوتا۔ وہ ایسا کس طرح کر جاتے ہیں؟ ان کے پاس ایک چھتری ہوتی ہے جو انہیں زمین پر گرنے سے بچاتی ہے۔ انہیں اس چھتری کی محکمیت پر اس قدر بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ بلا خوف و خطر فضا میں کود جاتے ہیں۔ اس قسم کے اعتماد اور بھروسہ کو توکل کہتے جاتا ہے۔

یا مثلاً آپ ایک سُوئی پانی میں پھینکیں تو وہ ڈوب جاتی ہے لیکن ہزاروں ٹن وزن کا لوہے کا جہاز اُسی پانی میں بسط کی طرح تیرتا پھرتا ہے۔ اس میں ہزاروں من سامان بھی لادا جاتا ہے اور مسافر بھی۔ ہم جہاز میں بلا تکلف سوار ہو جاتے ہیں اور اس کے ڈوب جانے کا خیال تک بھی ہمارے سدِ راہ نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ جہاز (پانی کا ہو یا ہوائی جہاز) قوانینِ فطرت کے مطابق تیار ہوتے ہیں، اور فطرت کے قوانین ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ وہ نہ کبھی ناکام رہتے ہیں اور نہ ہی دغا دیتے۔ اسی لئے اُن کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کیا جاتا ہے۔ انسان زندگی کا تمام کاروبار قوانینِ فطرت کی اسی ہمہ گیری اور محکمیت کے سہارے چلتا ہے۔ اسے "توکل" کہا جاتا ہے۔

یا مثلاً آپ کسی جگہ جانا چاہتے ہیں اور راستے میں چوراہا آجاتا ہے جہاں سے آپ کو علم نہیں ہوتا کہ کس طرف کو مُڑا جائے۔ کون سا راستہ اختیار کیا جائے جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ اس چوراہے پر ایک سائن پوسٹ

نصب ہوتا ہے جو مختلف راستوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ اس کے مطابق راستہ اختیار کرتے ہیں اور بلا تذبذب و تامل اس پر گامزن رہتے ہیں تاآنکہ آپ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ راستے کی اس نشاندہی (راہ نمائی) پر آپ کا اعتماد ہے جو آپ پورے جزم و یقین کے ساتھ وہ راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے اُس راہنمائی پر "توکل" سے تعبیر کیا جائے گا۔

لہٰذا، توکل علی اللہ سے مراد یہ ہے کہ آپ کو پورا پورا یقین ہو کہ قوانینِ خداوندی محکم اور اٹل ہیں۔ خدا نے جو وعدے کر رکھے ہیں، وہ پورے ہو کر رہتے ہیں۔ (درحقیقت قوانینِ خداوندی ہی کو خدا کے وعدے کہا جاتا ہے) اور جو رہنمائی خدا نے عطا کی ہے وہ آپ کو منزلِ مقصود تک یقیناً پہنچا دے گی۔ اسی کو بالفاظِ دیگر ایمان کہتے ہیں۔ ایمان کے معنی ہیں کسی کی بات پر ایسا یقین اور اعتماد جس سے آپ کو پورا پورا امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ قرآنِ کریم نے کفر اور ایمان میں یہی فرق بتایا ہے جہاں کہا ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) "جو قوم، ہر غیر خداوندی قانون اور نظام سے منہ موڑ کر، نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائے گی، تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا"۔ اسے توکل علی اللہ کہا جاتا ہے۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ سفرِ زندگی میں صحیح راستے کا میسر آ جانا، منزلِ مقصود تک پہنچنے کا یقین عطا کر دیتا ہے۔ سورۂ ابراہیمؑ میں مومنین کا قول درج ہے کہ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا (۱۴/۱۲) "ہم کیوں نہ خدا پر بھروسہ کریں کہ اس نے ہماری رہنمائی صحیح راستوں کی طرف کر دی ہے"۔ یہ صحیح راستے کون سے ہیں؟ رسول اللہ سے ارشادِ خداوندی ہے: وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ..... "جو کچھ تیری طرف من جانب اللہ وحی کیا جاتا ہے، اس کا اتباع کرو"۔ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ "اور اسی وحیِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد کرو"۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۳۳/۳) "اور اس حقیقت پر یقین کامل رکھو کہ قوانینِ خداوندی پر بھروسہ کرنے کے بعد کسی اور سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ سہارا، نہ تو ناکافی ہوگا، نہ ہی ناقابلِ اعتماد"۔ سورۂ فرقان میں، اس سلسلہ میں، ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ اعتماد اور بھروسہ عارضی اور ہنگامی نہیں۔ یہ ابدی اور دائمی ہے۔ فرمایا:۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ..... (۲۵/۵۸) "اس خدا پر بھروسہ کرو۔

خدا کے زندہ و پائندہ ہونیکا عملی مفہوم

جو زندہ ہے اور کبھی مرے گا نہیں"۔ خدا کا زندہ و پائندہ ہونا ہمارے لئے کیا معنی رکھتا ہے، اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق اس کی کتاب کی رُو سے ہے۔ (بالخصوص دیکھئے، مطالب الفرقان۔ جلد سوم صفحہ ۲۲۳ آیت ۲/۱۸۶)۔ اس کتاب کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی (۶/۱۱۶)۔ اور قیامت تک کے لئے محفوظ بھی (۱۵/۹)۔ لہٰذا، ہمارے لئے خدا کے زندہ و پائندہ ہونے کا عملی مفہوم، اس کی کتاب کا زندہ و پائندہ ہونا ہے۔ اور اس کتاب کے قوانین و قواعد پر یقینِ محکم، خُدا پر توکّل۔ وہ خدا۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ جس کے سوا اور کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اطاعت و محکومیت صرف اُسی کے قوانین کی کی جاسکتی ہے، اور کسی کے قوانین کی نہیں۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳/۱۲۲)۔ اور یہی ہے خدا پر توکّل کا عملی ثبوت۔

بات جنگِ اُحد کے سلسلہ میں یہ ہو رہی تھی کہ جن متذبذبین کے دلوں میں بے ہمتی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، انہیں خدا کے قوانین اور اُس کے وعدوں پر بھروسہ نہیں۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳/۱۲۱)۔ مومنین کی کبھی یہ کیفیت نہیں ہوگی۔ انہیں خدا کے وعدوں کی صداقت پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔ اور اس کا مظاہرہ تم اس سے پہلے جنگِ بدر میں کر چکے ہو:

۳/۱۲۲ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۳/۱۲۲)

تم اُس وقت دشمن کے مقابلہ میں تعداد میں بھی کم تھے اور اسلحہ اور سامان کے اعتبار سے کمزور بھی۔ اس کے باوجود خدا نے تمہاری مدد کی (۸/۹)۔ اور وہ نتیجہ تھا تمہاری تقویٰ شعاری کا۔ یعنی قوانینِ خداوندی پر نگہداشت رکھنے کا۔ اگر تم اب بھی اِن قوانین کی نگہداشت کرو گے تو تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں گی"۔

جنگِ بدر میں ملائکہ کے ذریعے نصرتِ خداوندی کا ظہور ہوا تھا۔ ملائکہ کس طرح تائید و تقویت کا موجب بنتے ہیں، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۶۹) پر بارِ دیگر نگاہ ڈال لیجئے۔ یہاں بھی، دو آیات آگے جاکر اس کی مزید تشریح کر دی گئی ہے۔ سرِدست اتنا سمجھ لیجئے کہ جنگِ بدر میں دشمن کے ایک ہزار سپاہی تھے، اس لئے وہاں ایک ہزار ملائکہ کا ذکر تھا۔ جنگِ اُحد میں دشمنوں کی فوج تین ہزار افراد پر مشتمل تھی، اس لئے وہاں تین ہزار ملائکہ بھیجے گئے۔ اور جنگِ احزاب میں اُن کی تعداد پانچ ہزار تھی، تو وہاں پانچ ہزار ملائکہ کا ذکر آئے گا۔ ذیل کی آیات میں ملائکہ کی اسی تائید و نصرت کا ذکر ہے:۔

ملائکہ کی تائید و نصرت

۳/۱۲۳ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ (۳/۱۲۳)

(جنگِ اُحد میں) جب تو (اے رسولؐ!) اپنی جماعت سے کہہ رہا تھا کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ اللہ ان تین ہزار ملائکہ سے تمہاری مدد کرے، جو تمہارے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر، تمہارے لئے ثبات و طمانیت کا موجب بنیں۔ (۳/۱۲۵؛ ۸/۱۰؛ ۸/۱۲؛ ۴۱/۳۰) {تین ہزار ملائکہ اس لئے کہ دشمن کی تعداد بھی اسی قدر تھی۔}

ملائکہ کی تائید و نصرت خود تمہاری استقامت اور قوانینِ خداوندی کی پابندی کا نتیجہ تھی:۔

۳/۱۲۴ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (۳/۱۲۴)

اور جب کبھی ایسا ہو کہ، دشمن تم پر پورے جوش و خروش سے حملہ کرے، اور تم، اس حملے کا جواب، پوری استقامت سے دو، اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، تو (اگر دشمن کی تعداد پانچ ہزار ہو گی) تو وہ تمہاری مدد پانچ ہزار ملائکہ سے کرے گا، جو دشمن کو تباہ کر دیں گے۔

نزولِ ملائکہ سے ہوتا کیا ہے، اس کے متعلق فرمایا:۔

۳/۱۲۵ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ (۳/۱۲۵)

ان ملائکہ کی امداد سے مفہوم یہ ہے کہ (اس یقین سے کہ تم حق و صداقت کی راہ میں لڑ رہے ہو، اس لئے خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید تمہارے شامل حال ہے) تمہارے دلوں میں پوری پوری طمانیت پیدا ہو جائے گی اور فتح و ظفر کی خوش خبریاں تمہارے لئے باعثِ تقویت بن جائے گی۔ یہ ہے وہ حقیقی تائید و نصرت جو خدا کے قانون کے کسی سے نہیں مل سکتی وہ خدا جو ہر شے پر غلبہ و اقتدار رکھتا ہے اور نظامِ کائنات کو اپنی حکمتِ بالغہ کے مطابق چلا رہا ہے۔ (اس سے وہ تغیرِ نفس پیدا ہوتا ہے جس پر خارجی تغیرات کا دار و مدار ہے۔ ۵۳/۸)

یہ سب اس لئے کہ

۳/۱۲۶ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ (۳/۱۲۶)

یہ اس لئے کہ، نظامِ خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی ایک جماعت کو (اُن کے اعمال کی وجہ سے) ہلاک کر دیا جائے (اور باقیوں کو) اس طرح شکست دے کر کمزور کر دیا جائے کہ وہ خاسر و ناکام واپس چلے جائیں۔

اس کے بعد، قرآن کریم ایک اور عظیم حقیقت کو سامنے لایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جنگ میں (اور اسی ایک جنگ میں کیا، اُس زمانے میں جماعتِ مومنین نے جس قدر لڑائیاں بھی لڑیں، ان سب میں) اللہ کے یہ سپاہی سر بکف اور کفن بدوش میدانِ جنگ

میں جانتے تھے۔ اپنے خون کی قیمت ادا کر کے فتح حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے میں جنگ کے دستور کے مطابق، دشمنوں سے ہاتھ آنے والا مالِ غنیمت فاتح فوج کے سپاہیوں کی ملکیت ہوتا تھا۔ اور جنگ کے قیدی غلاموں کی طرح اور ان کی عورتیں لونڈیوں کی طرح ان (سپاہیوں) میں تقسیم ہوتے تھے۔ لیکن قرآن نے آکر اس تمام نقشے کو بدل دیا۔ مالِ غنیمت کے متعلق

جنگ کا جذبۂ محرکہ

کہا کہ یہ سپاہیوں کی ملکیت نہیں۔ یہ سب مملکت کی تحویل میں جائے گا جو اسے نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف میں لائے گی (۱/۸)۔ جہاں تک جنگ کے قیدیوں کا تعلق ہے انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا:[۲] فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴)۔ عربوں میں لڑائی کے یہی محرکات تھے۔ انہیں ختم کر دینے کے بعد، جذبۂ محرکہ صرف ایک رہ گیا۔ یعنی نظامِ خداوندی کا غلبہ اور نظامِ باطل کی نگوں ساری۔ (۹/۸)

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

اس لئے حضورؐ سے ارشاد ہوا کہ

۳
۱۲۸ - ۱۲۷

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۳/ ۱۲۸-۱۲۷)

اِن مخالفین میں سے کون کون اپنی سرکشی کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا، اور کسے (سرزنش کے بعد) معاف کر دیا جائے گا، اس کا فیصلہ (اے رسول!) تیرے (یا کسی اور انسان کے ذاتی طور پر) کرنے کا نہیں۔ یہ فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق کیا جائے گا۔

یعنی خدا کے اس قانون کے مطابق جس کی رو سے ساری کائنات اُس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ عمل ہے۔ اسی کے مطابق قوموں کو تباہیوں اور بربادیوں سے حفاظت کا سامان ملتا ہے، اور اسی کے مطابق ان کی گرفت اور ہلاکت ہوتی ہے (۲/۲۸۴)۔ جو قوم اپنے آپ کو جس سلوک کا مستحق بنائے اس سے ویسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اُس

---

[۱] ایسا نظر آتا ہے کہ غنیمت کے متعلق یہ تبدیلی ذرا بعد میں جا کر ہوئی تھی۔ ابتدائی جنگوں میں غالباً سابقہ انداز جاری رہا تھا۔

[۲] عربوں میں غلامی کا یہی ذریعہ تھا۔ قرآنِ کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دے کر ہمیشہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا قرآنِ کریم میں جن غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر ہے وہ، وہ ہیں جو اس سے پہلے عربی معاشرہ میں موجود تھے۔ اس حکمِ خداوندی کے بعد کسی کو غلام بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کے قانون میں (گرفت اور سزا کے ساتھ) حفاظت اور پرورش کا سامان بھی موجود ہے۔ (لہٰذا، اُس میں کسی کے ذاتی انتقام کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا)۔

جنگِ اُحد کے متعلق اس مقام پر یہی آیات ہیں۔ اس کا باقی تذکرہ آگے چل کر آتا ہے، لیکن موضوع کے تسلسل کے لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اِن آیات کو بھی اِسی جگہ پیش کر دیا جائے۔ اس جنگ کی (STRATEGY) یہ تھی کہ حضورؐ نے اپنی فوج کو اُس مقام پر صف آرا کیا تھا جس کی پشت پر کوہِ اُحد تھا۔ اس پہاڑ میں ایک درہ تھا، جس میں سے دشمن یورش کر سکتا تھا۔ آپ نے ماہر تیر اندازوں کا ایک دستہ اس درّہ میں متعین کر دیا۔ جنگ شروع ہوئی تو بہت جلد دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس کا لشکر شکست کھا کر بھاگ اٹھا اور بہت سا ساز و یراق میدان میں چھوڑ گیا۔ مجاہدین کے لئے، اسلام لانے کے بعد، یہ دوسری جنگ تھی اور ایسا نظر آتا ہے کہ ابھی یہ احکام نافذ نہیں ہوئے تھے کہ مالِ غنیمت، انفرادی طور پر سپاہیوں کی ملکیت میں نہیں جائے گا بلکہ اجتماعی مفاد کی خاطر مرکز میں جمع ہو گا۔ اس لئے یہ مجاہدین، اپنی سابقہ روش کے مطابق، مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں تک تو خطرہ کی کوئی بات نہیں تھی، لیکن جو تیر انداز درّہ میں متعین تھے وہ

تیراندازوں کی غلط نگہی

بھی اس مال کی کشش (TEMPTATION) پر ضبط نہ کر سکے اور اس خیال سے کہ دشمن بھاگ گیا ہے، اپنے مقام کو چھوڑ کر، مالِ غنیمت کی طرف لپک کر آ گئے۔ دشمن ابھی قریب ہی تھا۔ اُس نے درّہ کو خالی دیکھا تو واپس مڑ کر اس پر قبضہ کر لیا اور جھکڑ کی طرح تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اس میدانِ جنگ میں افراتفری مچ گئی اور ایسا نظر آنے لگا کہ مسلمانوں کی فتح مبدل بہ شکست ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم نے اس حادثہ فاجعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

۱۵۱/۳ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۵۱/۳)

میدانِ جنگ میں قانونِ خداوندی کے مطابق) تم دشمن کو تہ تیغ کر رہے تھے (۱۲/۳)۔ تمہیں غلبہ حاصل ہو رہا تھا، اور اس طرح خدا کا وہ وعدہ پورا ہو رہا تھا جو اس نے تم سے کر رکھا تھا۔ لیکن، عین اس وقت، تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا ہو گئی۔ معاملہ پیشِ نظر میں تم نے باہمی تنازعہ شروع کر دیا۔ اور (تمہارے کمانڈر نے جو حکم تمہیں دے رکھا تھا) تم نے اس کی خلاف ورزی کی، حالانکہ فتح و کامرانی، جو تمہارا محبوب مقصد تھا، تمہاری آنکھوں

کے سامنے تھا ۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ قریبی مفاد پہ لوٹ پڑے، اور کچھ ایسے رہ گئے جن کی نگاہیں مستقبل کے مفاد پر تھیں۔ یوں تمہارا رُخ دشمن سے ہٹ کر، دوسری سمت کو پھر گیا، (تمہیں شکست ہوگئی اور) اس طرح تم پہ اپنی غلط نگہی کا نتیجہ واشگاف ہوگیا۔

بہر حال (اس کے بعد تم نے اپنی غلطی کو محسوس کیا۔ پھر اپنے مقام پہ واپس آگئے۔ تمہیں کامیابی حاصل ہوگئی اور یوں) تمہاری لغزش کے اثرات مٹ گئے۔ اللہ کا قانون یہی ہے کہ ایک بار کی لغزش سے، انسان، ہمیشہ کے لئے کامرانیوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔ وہ جب بھی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے پر آجائے، خدا کی نوازشات سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں دو نکات وضاحت طلب ہیں: ایک یہ کہ اس میں کہا گیا ہے کہ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ گروہ حیاتِ آخرت کا مُنکر ہو گیا تھا اور اُس نے محض دُنیاوی مفاد کو اپنا مقصودِ حیات قرار دے لیا تھا۔ قطعاً نہیں۔ اس طرح تو انسان مسلمان ہی نہیں رہتا۔ آخرت کے انکار سے ایمان اور اسلام ختم ہو جاتا ہے۔ 'دُنیا اور آخرت' کا مفہوم سابقہ جلدوں میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (انڈکس کے حوالہ سے اُن مقامات پہ دوبارہ نظر ڈال لیجئے) وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دُنیا کے معنی ہوتے ہیں پیش پا افتادہ یا عاجلہ مفاد' اور آخرت کے معنی ہوتے ہیں' مستقبل کی خوشگواریاں۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تیر اندازوں کا یہ دستہ پیش پا افتادہ مفاد (مالِ غنیمت) پر لپک پڑا، اور انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ان کے اس طرح درّہ کو چھوڑ دینے سے مستقبل کا کس قدر نقصان ہوگا۔ یہ ہے زیرِ نظر آیت کے اس ٹکڑے کا صحیح مفہوم، ورنہ قرآن کی رُو سے جماعتِ مؤمنین کا تو دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی، دونوں کی خوشگواریوں میں حصّہ ہوتا ہے۔ (۲/۲۰۱)

دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اسی گروہ نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس سے انہوں نے نقصان اُٹھایا۔ قرآنِ کریم مؤمنین کو اس قسم کا معصوم قرار نہیں دیتا کہ اِن سے کوئی چھوٹی موٹی لغزش بھی سرزد نہ ہو۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲)۔ "وہ سنگین جرائم اور بڑے بڑے گناہوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُن سے چھوٹی موٹی لغزشیں سرزد ہو جائیں"۔ یہ وہ لغزشیں ہیں جن کے داغ اُن کے اشکِ ندامت دھو ڈالتے ہیں۔ ویسے بھی، اجتماعی زندگی میں افراد کی چھوٹی موٹی لغزشوں سے پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی جماعت کے اجتماعی حُسنِ کردار سے ہو جاتی ہے: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) میزانِ خداوندی کا

لغزش کا امکان

بنیادی اصول ہے، یعنی اگر حسنات کا پلڑا بھاری ہے تو اس سے سیات کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے"۔ آیت (۳/۵۸) میں اس کی شہادت خود اللہ تعالےٰ نے بہم پہنچا دی ہے۔

اس کے بعد پھر ایک عظیم حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسولؐ کا منصب وعظ و نصیحت کرنا ہی نہیں تھا۔ وہ اسلامی مملکت کا سربراہ اور اپنی فوجوں کا کمانڈر۔ اِن۔ چیف بھی ہوتا تھا۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں اُس کی عظمتِ کردار کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اگلی آیت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا :۔

۳/۱۵۲ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِىْۤ اُخْرٰٮكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا ۢ بِغَمٍّ لِّـكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ‌ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ ۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۳/۱۵۲)

اس شکست میں، بدحواسی سے تمہاری حالت یہ ہو رہی تھی کہ تم منہ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے تھے اور کوئی، ایک دوسرے کی طرف، مڑ کر نہیں دیکھتا تھا (کہ اس پر کیا گزر رہی ہے) حالانکہ تمہارا رسولؐ، تمہیں پیچھے سے آوازیں دے رہا تھا۔ یوں تمہیں نقصان پہ نقصان ہوا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو کہ اپنے مقام سے، از خود، کبھی نہیں ہلنا چاہیئے۔ اگر تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی چیز تمہارے ہاتھوں سے نکلے جا رہی ہے تو تم، اِس خیال سے کہ اگر میں ڈیوٹی پر کھڑا رہا تو یہ چیز جاتی رہے گی، اپنی جگہ کو چھوڑ کر، اُس کے پیچھے نہ لپک پڑو۔ یا اگر کوئی سخت مصیبت آ رہی ہے تو اس سے گھبرا کر اپنا مقام نہ چھوڑ دو۔ تم اپنی جگہ پر جمے رہو، خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔

یعنی اس محشرستان میں افراتفری اور نفسا نفسی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر شخص بدحواسی کے عالم میں بھاگے چلا جا رہا تھا، لیکن ایک

اُسوۂ رسول اللہ

شخصیت ایسی تھی جو اس تلاطم انگیزی میں روشنی کے مینار کی طرح نہ صرف اپنے مقام پہ کھڑی تھی بلکہ بھاگنے والوں کو آوازیں دے کر بلا رہی تھی۔ یہ شخصیت تھی اس لشکر کے کمانڈر، ذاتِ رسالت مآبؐ کی —— یہ ہوتی ہیں قائد کی خصوصیات! جنگِ احزاب میں ایک مقام پر، اس سے بھی زیادہ ہولناک اور قیامت خیز حادثہ پیش آگیا تھا۔ اور اس میں بھی حضورؐ نے استقامت، شجاعت، غیرت، ہمت اور حوصلہ مندی کا عدیم النظیر مظاہرہ فرمایا تھا۔ وہی مقام تھا جہاں اللہ تعالےٰ نے جماعتِ مؤمنین سے کہا تھا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)۔ "تمہارے قائد (رسول اللہ) نے اُس وقت جس عزیمت اور استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس میں تمہارے لئے بہترین نمونہ (ماڈل) تھا"۔ یہ ہیں حضورؐ کی وہ "سُنتیں"، جنہیں خدا نے بہترین ماڈل قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ہے :۔

۳/۱۵۴
ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ ۖ
وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ
يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ
مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ
فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا
فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۳/۱۵۴)

رسول کی اس آواز میں مضمر عزم و ثبات نے میدانِ جنگ کا نقشہ بدل دیا، اور اس طرح، شکست کے غم و حزن کے بعد تم پر اطمینان و سکون کی فضا طاری ہو گئی (۸/۱۱) لیکن اطمینان و سکون کی یہ کیفیت صرف انہی پر طاری ہوئی، جن کے ایمان پختہ تھے، اور اُن سے محض یہ عارضی لغزش ہو گئی تھی۔ ان کے برعکس، دوسرا گروہ منافقین کا تھا جنہیں اب بھی اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے؛ اور اُن کا دل خدا کے متعلق، بربناءِ جہالت، عجیب قسم کے خیالات کی آماجگاہ بن رہا تھا — ایسے خیالات، جو زمانۂ جہالت میں تو عام تھے لیکن انہیں اسلام نے دور کر دیا تھا — کبھی وہ کہتے کہ جنگ کے معاملہ میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی اس بات کا فیصلہ کہ جنگ کرنا چاہیئے یا نہیں، اور اگر کرنا چاہیئے تو اس کا پروگرام کیا ہونا چاہیئے — ہماری مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ اس قسم کے فیصلے کسی فرد یا گروہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔ یہ معاملات، نظامِ خداوندی کے طے کرنے کے ہوتے ہیں اور اُسی کو اس کا کلی اختیار ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی باتیں محض دکھلانے کے لئے کر رہے ہیں؛ جو کچھ اُن کے دل میں ہے اُسے ظاہر نہیں کرتے۔ (اُن کے دل میں دین ہی کی طرف سے شک ہے)۔ یہ کہتے کہ اگر اس باب میں ہمیں کچھ اختیار دیا جاتا تو ہم اس مقام (پہ آکر) کبھی قتل نہ ہوتے۔ (ہم اپنے گھروں میں رہتے)۔ ان سے کہدو کہ اگر تم اپنے گھروں میں رہنے کا فیصلہ بھی کر لیتے، تو جماعتِ مؤمنین تمہاری تقلید نہ کرتی۔ جب ان پہ جنگ لازم قرار دی جاتی تو بخود بخود میدانِ جنگ کی طرف آجاتے۔

اس شکست سے ہوا یہ کہ جو کچھ کسی کے دل میں تھا، ابھر کر سامنے آگیا۔ منافقین کی منافقت ظاہر ہو گئی اور پختہ ایمان والے، مصائب کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے۔ اس لئے کہ اللہ تو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس زمانے میں مدینہ میں کثیر تعداد میں منافقین بھی موجود تھے اور وہ اسلامی لشکروں میں بھی

منافقین شامل ہو جایا کرتے تھے۔ مقصد اُن کا یہ ہوتا تھا کہ مختلف قسم کی وسوسہ انگیزی سے جماعتِ مؤمنین کے حوصلوں کو پست کر دیا جائے اور اُن میں باہمی پھوٹ ڈال دی جائے۔ (منافقین) کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)۔ اس قسم کی سازشیں حالتِ امن میں بھی کچھ کم فتنہ انگیز نہیں ہوتیں، لیکن جنگ کی حالت میں ان کی ہلاکت آفرینیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ یہ تھے وہ حالات جن سے اقامتِ نظامِ خداوندی کی خاطر جماعتِ مؤمنین (امتِ مسلمہ) کو گزرنا پڑا تھا، اس سفر میں، جس میں:

صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

ازاں بعد اللہ تعالیٰ نے تیر اندازوں کی اسی جماعت کی بریت کا اعلان کر دیا جن سے لغزش ہو گئی تھی۔ فرمایا:

۳/۱۵۴ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۵۴﴾ (۳/۱۵۴)

جب (اُس دن) دونوں لشکر آمنے سامنے آئے ہیں تو تم میں سے جن لوگوں نے گریز کی راہ اختیار کر لی تھی تو، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے ایمان میں فرق آگیا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کی بعض کمزوریوں کے باعث پیش پا اُفتادہ مفاد کی کشش نے اُن کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اس قسم کی ہنگامی لغزشوں سے خدا کا قانون درگزر کر لیتا ہے اور ملت کا اجتماعی حُسنِ عمل، افراد کی ایسی لغزشوں کے مُضر اثرات کی روک تھام کر دیتا ہے۔ خدا کا قانون ذرا ذرا سی باتوں پر بھڑک نہیں اٹھتا۔ وہ بڑا بھاری بھرکم، تحمّل اور بُردبار ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے کفر اور ایمان میں ایک ایسا خطِ امتیاز کھینچا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس کی گہرائیوں میں

کفر اور ایمان میں عجیب خطِ امتیاز اترتی ہے، موت اور حیات کی مشہود حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم دو ذہنیتیں سامنے لاتا ہے۔ ایک ذہنیت وہ ہے جسے سعدیؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

بدریا در منافع بے شمار است — اگر خواہی سلامت بر کنار است

یعنی اس میں شبہ نہیں کہ سمندر میں غوطہ زن ہونے سے بہت سے منافع حاصل ہوتے ہیں، لیکن اگر آپ امن و سلامتی چاہتے ہیں تو وہ ساحل پر رہنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خیریت اور عافیت اس میں ہے کہ انسان کسی قسم کا خطرہ مول نہ لے اور ایسی زندگی بسر کرے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ایک ذہنیت یہ ہے۔ اس کے برعکس دوسری ذہنیت وہ ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

بیا برا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و باموجش درآویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ساحل پر زندگانی بسر کرنا، زندگی نہیں۔ زندگی یہ ہے کہ انسان دریا میں کود کر موجوں کی طغیانیوں سے نبرد آزما ہو۔ اس نبرد آزمائی میں اگر وہ جان دے دے گا تو اُسے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جائے گی۔ اِس لئے

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی

جو قومیں خطرات سے جی چُراتی ہیں، وہ زندہ نہیں مُردہ ہوتی ہیں۔ تسخیرِ ارض وسماء اُنہی قوموں کا حصہ ہے جو خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں۔

اب دیکھئے قرآنِ کریم اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اوّل الذکر ذہنیت (یعنی خطرات سے منہ چُرانے والی ذہنیت) کفر ہے۔ اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان رزمگاہِ حیات میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر رہے۔ فرمایا:-

۳/۱۵۵ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَقَالُوا۟ لِإِخْوَٰنِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ أَوْ كَانُوا۟ غُزًّى لَّوْ كَانُوا۟ عِندَنَا مَا مَاتُوا۟ وَمَا قُتِلُوا۟ لِيَجْعَلَ ٱللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِى قُلُوبِهِمْ ۗ وَٱللَّهُ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (۳/۱۵۵)

اے جماعتِ مؤمنین! دیکھنا تم کہیں اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی۔ یعنی یہ ذہنیت پیدا کرلی کہ اگر ان کے بھائی بند باہر سفر میں گئے ہوں، یا جنگ میں مصروف ہوں، تو وہ کہتے ہیں کہ، اگر وہ ہماری طرح گھروں میں رہتے، تو کاہے کو مرتے یا قتل ہوتے! یہ اندازِ فکر، انسان کے سامنے یہ محکم اصول آنے ہی نہیں دیتا کہ زندگی، خطرات میں جینے کا نام ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی زندگی، جو مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اور اُن کی اس زندگی کے قابلِ رشک نتائج، ایسے لوگوں کے دل میں داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں جو چوڑیاں پہن کر گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ زندگی محض سانس لینے اور موت، سلسلۂ تنفس کے منقطع ہو جانے کا نام نہیں۔ حقیقی موت اور حیات کا تصوّر اس سے مختلف ہے، اور وہ خدا کے قانون سے وابستہ ہے، جو انسان کے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس قانون کی رُو سے حیات، مرگِ باشرف کو کہتے ہیں اور موت، حیاتِ بے شرف کا نام ہے۔ زندگی، مجاہدانہ تگ وتاز سے عبارت ہے اور بے عملی کا دوسرا نام موت ہے۔

یہاں ایک نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ فرمایا کہ وَاللّٰہُ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ۔ سطح بین نگاہوں سے اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ موت اور حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے؛ انسان اس باب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ موت نے جب آنا ہے اور جہاں آنا ہے وہ بہرحال آکر رہے گی ـــــ اس کی مُدت مقرر ہے۔ نہ اس میں ایک ثانیہ کا تقدم ہو سکتا ہے نہ تاخیر۔ (مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات پر ایک نظر بار دیگر ڈال لیجئے)۔ اس آیت میں اس دقیق مسئلہ کو ایک لفظ میں حل کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ کہا کہ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ۔

موت اور حیات کا تقابل

موت اور حیات کا فیصلہ تمہارے اعمال (کاموں) کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ زندگی سانس لینے کا نام نہیں۔ سانس تو درختوں کے پتے بھی لیتے ہیں؛ اور ہم بلاشعور، بلاارادہ صرف سانس لئے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا، سانس لینا عمل نہیں۔ پس زندگی کا مدار سانس لینے پر نہیں، حُسنِ عمل پر ہے، خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ط (۶۷/۲)۔ جو موت سے ڈر کر بھاگتا ہے؛ موت اسے جھپٹ لیتی ہے۔ جو موت کو پکڑنے کے لئے اس کا پیچھا کرتا ہے؛ موت اس سے ڈر کر بھاگ اٹھتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کس قدر حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ

از مرگ ترسی، اے زندہ جاوید؟ مرگ است صیدے، تو در کمینی!

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی! (زبورِ عجم صـ۱۲۴)

لیکن خطرات سے بےخوفی کے یہ معنی نہیں کہ انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لے۔ قرآنِ کریم نے اسے سختی

خودکشی کے خلاف

سے روکا ہے؛ جب کہا ہے کہ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ۔ (۲/۱۹۵)۔ "اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو"۔ اس میں اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی ہلاکت سے محترز رہنے کی تاکید ہے۔ مرگِ باشرف؛ زندگی کے بلند مقاصد (اقدارِ خداوندی) کی حفاظت کے لئے خطرات کا سامنا کرنے اور عندالضرورت جان تک دے دینے کا نام ہے۔ چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس کی وضاحت کر دی :۔

۳/۱۵۶ وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَحۡمَۃٌ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ○ (۳/۱۵۶)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے ذاتی مفاد اور نفس پروری کی خاطر خطرات مول لے اور اس طرح جان دے دینے کو "مرگِ باشرف" قرار دے لے۔ "مرگِ باشرف" انہی کی ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام اور بقاء کے لئے (جس کا مقصد نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت ہے) خطرات کا مقابلہ کریں اور عندالضرورت اپنی جان تک دے دیں۔ ایسا کرنے

والے اگر، اس کوشش میں مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں (۳/۱۵۸) تو ان کی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کے مُضر اثرات سے ان کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ اور انہیں ان کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی مل جاتا ہے۔ یہ چیز اس تمام سرمایہ سے بہتر ہے' جسے انسان ذاتی مفاد کے لئے جمع کرتا ہے۔

(مقتولین فی سبیل اللہ کی تشریح کے لئے سابقہ جلدوں میں عنوانات شہداء اور مقتولین دیکھئے) لیکن ایسا وہی کر سکتے ہیں جو حیات بالآخرت پر ایمان رکھیں۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟الَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ○ (۳/۱۵۷)

۳/۱۵۷ اس لئے کہ طبعی موت یا قتل ہو جانے سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ زندگی، گروہ درگروہ' کارواں درکارواں' اس منزل کی طرف بڑھے جا رہی ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔ اس طرح، رفتہ رفتہ' سب اس نقطہ کے گرد جمع ہونے والے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ افواج مسلمہ کے "کمانڈر۔ان۔چیف" بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ کمانڈر کو اپنے سپاہیوں سے قواعد و ضوابط کی پابندی کرانے کے لئے بعض اوقات سختی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ فوجی ضروریات کے علاوہ امورِ مملکت میں بھی احکام و قوانین کی پابندی کے لئے افراد اور جماعت پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ڈسپلن اور نظام قائم کرنے اور رکھنے کے لئے سختی کے معنی سخت گیری اور درشتی نہیں۔ قرآنِ کریم نے جنگ کے تذکرہ کے درمیان اس حقیقت کی بھی وضاحت ضروری سمجھی کہ اپنے رفقاء (صحابہؓ) کے ساتھ آپؐ کا سلوک انتہائی شفقت اور محبت،

حضورؐ کی شفقت اور رافت

رافت اور رحمت' نرم دلی اور جان سوزی کا ہوتا تھا۔ حضورؐ طبعاً رفیق القلب اور غمگسار واقع ہوئے تھے۔ اور یہی آپؐ کی پُرکشش خصوصیت تھی جس کی وجہ سے صحابہؓ پروانوں کی طرح آپؐ کے جانثار واقع ہوئے تھے۔ اس لئے فرمایا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ

۳/۱۵۸ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (۳/۱۵۸)۔ "اے رسولؐ! اگر تم تندخو اور سنگدل ہوتے اور انسانی کمزوریوں کی رعایت کے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ نہ ہوتا، تو تمہاری جماعت کے افراد تمہیں چھوڑ کر تتر بتر ہو چکے ہوتے۔ تمہاری یہ جمعیت ہی باقی نہ رہتی"۔ اس لئے فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۳/۱۵۸)۔ "جس حد تک قانونِ خداوندی اجازت دے' تم ان کے سہو و خطا سے درگزر کیا کرو اور اُن کی حفاظت کے لئے سپر بن جایا کرو"۔ سربراہِ مملکت اور قائد و سالارِ جماعت کی یہی خصوصیت ہے جو اس کی جمعیت کی شیرازہ بندی کی ضامن' اور اس کے اشارہ پر جان تک دے دینے کی محرک ہوتی ہے۔ تندخو اور سنگدل حاکم سے ہر شخص نفرت کرتا اور مخالفت کے موقع

کی تلاش میں رہتا ہے ؎

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے (اقبالؒ)

جس دل میں احترامِ انسانیت کے لئے سوز و گداز نہیں، وہ میرِ کارواں تو ایک طرف، انسان تک کہلانے کا مستحق نہیں۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے، حضور نبی اکرمؐ (سربراہِ مملکت) اور آپ کے رفقاء (افرادِ مملکت) کے ایک ایسے تعلق کا ذکر کیا ہے جس پر غور و فکر سے ہماری سینکڑوں اُلجھی ہوئی گتھیاں سُلجھ سکتی ہیں۔

یہ حقیقت متعدد بار پیش کی جا چکی ہے کہ اسلام کا مقصد، حکومتِ خداوندی کا قیام ہے۔ اور حکومتِ خداوندی سے مراد کتاب اللہ کی حکمرانی ہے (اس کے لئے دیکھئے بالخصوص مطالب الفرقان جلد سوم ص۹۔ زیر آیت ۲/۳)۔ لیکن کتاب اللہ (قرآن مجید) کی صورت یہ ہے کہ اس میں (چند ایک تفصیلی احکام کے سوا) دین کے اصول و اقدار دیئے گئے ہیں اور اس کو مملکتِ اسلامیہ پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق طریقے وضع کر لئے۔ انہیں آپ جزئی یا فرعی قوانین (BYE-LAWS) کہہ لیجئے۔ قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدودُ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی، لیکن ان حدود (BOUNDARY LINES) کے اندر وضع کردہ جزئی احکام، زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلتے جائیں گے۔ ثبات و تغیر کے اس امتزاج سے نظامِ اسلام (یا حکومتِ خداوندی) ہمیشہ کے لئے آگے بڑھتا رہے گا۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ جزئی احکام، امت کے مشورہ سے وضع کئے جائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ نظام مشاورتی کہلائے گا۔ ہماری غلط نگہی یہ ہے کہ ہم اسے مغرب کے جمہوری نظام کے مُرادف سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ مغربی جمہوریت میں، قوانین سازی کے کُلی اختیارات، بلا حدود و قیود، مجلسِ واضعینِ قوانین (پارلیمان) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اسلامی نظامِ مشاورت میں، یہ فریضہ قرآن کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا اس میں حکمرانی، خدا کی کتاب کی ہوتی ہے، مجلسِ واضعینِ قوانین (پارلیمان وغیرہ) اس حکمرانی کے عملی نفاد کے طور طریقے متعین کرتی ہے۔ یہ امت کے باہمی مشورہ سے ہوتا ہے۔ (اس سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں حکومت۔ جمہوریت۔ نظامِ اسلامی یا اسلامی نظام کے عنوانات دیکھئے)[۱]

مشاورتی نظام اور مغربی جمہوریت

یہ نظامِ مملکت سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا اور آپ ہی اس کے سربراہ تھے۔ اس لئے آپ کو حکم دیا گیا کہ

---

[۱] اسلامی نظامِ حکومت کی واضح شکل کے لئے میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں متعلقہ باب دیکھئے)

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ج (۱۵۸/۳)

اپنے رفقاء سے معاملاتِ حکومت میں مشورہ کیا کرو۔

یہ (آیۂ شوریٰ) اسلامی نظام کی بنیادی حقیقتوں میں سے ہے اور اُن بے شمار پیچیدگیوں کو دور کر دیتی ہے جن میں ہم (اپنی غلط نگہی سے) صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ رسول اللہ کے متعلق عقیدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ

رسول اللہ کی حیثیت

قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔۔۔ حتیٰکہ آپ کے نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے تمام معاملات بھی اسی حیثیت کے تابع آ گئے تھے۔۔۔۔ قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیتِ رسالت اور حیثیت انسان اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت "جس حالت میں" جو کچھ بھی کرتے تھے، رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم۔ تفہیمات حصہ اول صد ۲۴۳-۲۴۱)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضورؐ کے ہر عمل، ہر قول، ہر فیصلہ کے لئے خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی اور آپ اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ (مولانا) محمد اسماعیل (مرحوم) سابق صدر جمعیتِ اہلِ حدیث کے الفاظ میں:

جبریل، قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سُنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

لہٰذا،

احادیث کے متعلق عقیدہ

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا، ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا، اور جو احادیث قواعد صحیح اور ائمۂ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت کے خوارج کے مُرادف۔

(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صد ۲۶ ؛ صد ۴۸)

قرآنِ مجید غیر متبدل اور ابدی ہے۔ اسی طرح احادیثِ رسول اللہ بھی وحی منزل من اللہ۔ ابدی اور غیر متبدل قرار پاتی ہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن اور مثلہٗ معہٗ ـــــ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل،

عطا ہوا تھا۔ یہ مِثلہٗ معہٗ احادیث ہیں اور قرآن ہی کی طرح مبنی بر وحیٔ خداوندی۔ اس اعتبار سے یہ حضرات وحی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وحیٔ متلو (جس کی تلاوت کی جاتی ہے یعنی قرآن) اور دوسری وحیٔ غیر متلو (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، یعنی احادیث[1])۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں وحی کے عنوان میں ملے گی۔ اس عقیدہ کی رُو سے اسلام، قرآن اور حدیث دونوں کو یکجا کرنے سے مکمل ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں غیر متبدل اور ابدی ہیں یعنی (قرآن کی طرح) احادیث میں بھی نہ تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے نہ حک و اضافہ (کمی بیشی)۔ یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ اسلامی مملکت میں کوئی قانون "کتاب و سُنت" کے خلاف نافذ نہیں ہو سکتا، تو اس سے یہی مراد لی جاتی ہے۔

عقیدہ کے طور پر تو یہ مان لیا گیا کہ اسلامی مملکت میں ضابطۂ قوانین "کتاب و سُنت" (یعنی قرآن اور حدیث) کے مطابق ہوگا، لیکن جب عملی حیثیت سامنے آئی تو اس میں ایسی مشکلات پیش آئیں کہ ان کا کوئی حل ہی نہیں ملتا۔ قرآن ایک

قانون سازی میں مشکلات

جامع کتاب ہے جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر خدا کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سنت (یعنی احادیث) کی یہ کیفیت نہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے ہاں احادیث کے اپنے اپنے مجموعے ہیں۔ شیعوں کے مجموعے الگ، سُنیوں کے الگ۔ پھر سنیوں میں بھی اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی فرقوں کی تسلیم شدہ صحیح احادیث الگ الگ۔ ان حالات میں کتاب و سُنت (یعنی قرآن اور احادیث) کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کو ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) سے الگ رکھا جائے۔ شخصی قوانین کے متعلق ہر فرقہ کو اجازت دے دی جائے کہ وہ انہیں اپنے اپنے مجموعہ ہائے احادیث کی رُو سے مرتب کرے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ پبلک لاز کا کیا کیا جائے۔ وہ تو ہر فرقے کے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ پاکستان میں سالہا سال تک یہ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ یہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائیں۔ یعنی ایک ناممکن العمل مطالبہ۔ اور برسوں کی کشمکش اور چپقلش کے بعد بالآخر انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے، جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔
>
> (بیانِ مودودی مرحوم۔ ہفت وار ایشیا، مورخہ ۲۳ / اگست ۱۹۷۰ء)

یہی نہیں کہ مودودی (مرحوم) کو قانون سازی کے سلسلہ میں یہ مؤقف اختیار کرنا پڑا، انہیں خود سُنت کے متعلق، اپنے سابقہ

---

[1] ہمارے ہاں دو قسم کا یہ عقیدہ یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ وہ بھی تورات کو وحیٔ متلو اور روایت کو وحیٔ غیر متلو سے تعبیر کرتے تھے۔

عقیدہ میں تبدیلی کرنی پڑی۔ سنت کے متعلق ان کا سابقہ عقیدہ آپ صفحہ ۲۱۶ پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس کے بعد دیکھئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں :-

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے، وہ سب سُنت ہے۔ لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سُنت، اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں، کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں۔ اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا، کہ اس عمل کا کون سا جُزء سُنت ہے اور کون سا جُزء عادت بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۳۱۱-۳۱۰)

واضح رہے کہ احادیث کی کسی کتاب میں بھی یہ مذکور نہیں کہ حضورؐ نے فلاں کام رسولؐ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا اور فلاں کام انسان ہونے کی حیثیت سے۔ مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ سُنت انہی کاموں کو کہا جائے گا جو حضورؐ نے بحیثیت رسولؐ کئے تھے اور اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی مزاج شناسِ رسول کی نگاہِ بصیرت، اور صحیح احادیث میں سے سنت کا تعین بھی اُسی کے فیصلے پر منحصر! (یا للعجب) رسولؐ اللہ کے طریقِ عمل کے اس امتیاز کے متعلق وہ آگے چل کر لکھتے ہیں :-

بحث سنت

تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کرنے کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے۔ اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر، جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اول ص ۳۱۷)

اس کی وضاحت میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت، اور آپ کے عہدِ تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کو سنت بنانا تو مقصود تھا، نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس

طرز خاص کا لباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن، یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سُنت بنادیں۔

سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں، اُن کو خواہ مخواہ سُنت قرار دینا من جملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ (رسائل و مسائل حصہ اوّل ص۳۰۷)

پھر لکھتے ہیں :۔

جو امور آپ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل ص۳۰۷)

تحریف اور خطرناک تحریف کہتے ہیں :۔

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر اُن کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین۔ جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً۔ ص۳۰۸)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خود مودودی (مرحوم) کے فیصلہ کے مطابق جو امور سُنت ہیں، کیا وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہیں گے یا اُن میں بھی تغیر و تبدل کیا جاسکے گا۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں :۔

یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات پر اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے ـــــ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دُنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا، احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں اُن حالات میں اختیار کی گئی تھیں اُن کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حِکَم کے لحاظ سے اُن کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی

علاقہ نہیں . . . . جزئیات میں دلالۃ النّص اور اشارۃ النّص، تو درکنار، صراحۃ النّص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ در تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور اِنہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۳۲۸-۳۲۷)

آپ دیکھتے ہیں کہ سنت کے متعلق ان کے یہ خیالات' ان کے سابقہ عقیدہ کے تصور کے کس قدر خلاف ہیں۔ لیکن ان کے معاملہ میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ وہ ان کی تحریروں میں اس قسم کے متضاد خیالات اور عقائد موجود رہتے تھے اور وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ ان کا سابقہ عقیدہ خلافِ حقیقت تھا جس سے انہوں نے بعد میں رجوع کر لیا تھا، یعنی اسے چھوڑ کر دوسرا عقیدہ اختیار کر لیا تھا۔

❁

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ دین کے معاملہ میں ہمارے ہاں اکثر و بیشتر اُلجھنیں اس غلط عقیدہ کی پیدا کردہ ہیں۔ کہ احادیث رسول اللہؐ بھی' قرآن کی طرح، وحی منزل من اللہ ہیں۔ اور ابدی اور غیر متبدل۔ آیۂ شوریٰ نے اس عقیدہ کی واضح طور پر تردید کر دی۔ سوال یہ ہے کہ اگر رسول اللہؐ کا ہر قول۔ ہر عمل۔ ہر فیصلہ وحی کی رو سے ہوتا تھا تو آپ کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟ مشورہ تو ایسے امور میں کیا جاتا ہے جن کا حل انسانی فکر اور آراء کی رُو سے دریافت کیا جاتا ہو۔ اور جو کچھ مشورہ سے طے کیا گیا ہو' وہ دوسرے وقت میں (عندالضرورت) مشورہ سے بدلا بھی جا سکتا ہے۔ اس ایک آیت سے واضح ہے کہ قرآنی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کے لئے حضورؐ اپنے رفقاء کے ساتھ مشاورت سے جو طریق وضع فرماتے' جو احکام و ضوابط نافذ کرتے، وہ نہ ابدی تھے نہ غیر متبدل۔ چونکہ اسلامی نظام

اُمّت کو مشورہ کا حکم

کو حضورؐ کے بعد بھی بدستور قائم رہنا اور آگے چلنا تھا، اس لئے اُمّت کے لئے بھی یہی ارشاد ہوا کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات بھی باہمی مشاورت سے طے ہوں گے"۔ اس سے اس حقیقت کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ امورِ مملکت کے متعلق حضورؐ کے زمانے میں' جو فیصلے باہمی مشاورت سے طے ہوتے تھے' انہیں (حضورؐ کے زمانے میں یا) حضورؐ کے بعد اسلامی مملکت' اُمّت کے مشورہ سے' تبدیل بھی کر سکتی تھی اور ان میں حک و اضافہ بھی۔ اُمّت کے متقدمین میں' امام ابوحنیفہ

امامِ اعظمؒ کا مسلک

(امامِ اعظمؒ) کا مقام بہت بلند ہے۔ جس حقیقت کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے' وہ اسے خوب سمجھے تھے۔ تدوینِ فقہ کے سلسلے میں وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہؐ کا طریق یہ تھا

کہ تعیینِ جزئیات میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی تھی اُسے اختیار فرما لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے تھے کہ اگر میں بھی رسول اللہ کے زمانے میں ہوتا تو میں بھی اس مجلسِ مشاورت میں شریک ہوتا، اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے۔ چنانچہ

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سُنا کہ امام ابوحنیفہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں رسول اللہ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحٰق کو میں نے کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ابوحنیفہ کے سامنے اکثر نبی صلعم کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔

(تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱۳ صہ ۲۸۷)

اس کی تائید میں وہ فرماتے تھے :-

۱ ـــــ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے (ایضاً، ۳۹۰)

یہی وجہ ہے کہ امامِ اعظمؒ نے اپنی فقہ کی تدوین میں سترہ حدیثوں سے زیادہ سے استفادہ نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ وہ احادیث کو ابدی اور غیر متبدل نہیں سمجھتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ آیۂ شوریٰ نے اس (بظاہر) لاینحل مسئلہ کو کس خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔

۲ ـــــ آیۂ شوریٰ نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اسلامی میں شخصی حکومت (ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ) نہیں۔ اس میں نظامِ حکومت شورائی ہوگا۔ یعنی امورِ مملکت امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔

۳ ـــــ یہیں سے آج کل ایک اور غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے۔ یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے۔ اور جمہوریت سے مراد مغربی جمہوریت لیا جاتا ہے، حالانکہ اسلامی نظامِ شورائیت اور مغرب کے نظامِ جمہوریت میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ اس فرق کو پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اہم بنیادی نکتہ ہے اسے ہم دُہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں قانون سازی کلی اختیار، بلا حدود و قیود، انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس میں اقتدارِ مطلق انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی مملکت کو قانون سازی کے اختیارات، قرآنِ کریم کی غیر متبدل اور ابدی حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت درحقیقت، قوانین و اقتدارِ خداوندی کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس کی قانون سازی سے مراد ان طور طریقوں کا مرتب کرنا ہوتا ہے جن کی رُو سے قرآنی قوانین و اقدار نافذ کئے جائیں۔ اس میں اقتدارِ مطلق خدا (یعنی خدا کی کتاب) کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہے فرق مغرب کی جمہوریت اور اسلام

کے نظامِ شورائیت اور یہ فرق جزئی نہیں بلکہ بنیادی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مشاورت کا اصول جو دیا ہے اس کے طریق اور شکل و ہیئت خود متعین نہیں کئے۔ انہیں ہر دور کی اسلامی مملکت خود متعین کرے گی۔ (جمہوریت کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ دیکھئے انڈکس)

۔۔۔ اور اس آیۂ کریمہ سے نبی اکرمؐ کے رفقاء (صحابۂ کبار) کی عظمتِ فکر بھی سامنے آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جن حضرات سے خود رسول اللہ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ (اجازت نہیں بلکہ حکم دیا گیا تھا) اُن کی بلندیٔ فکر، اور پاکیزگیٔ سیرت کے لئے کسی اور سند کی ضرورت نہیں رہتی۔ کس قدر صائب تھی ان کی رائے اور کس قدر قابلِ اعتماد تھی ان کی سیرت۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم (صحابہؓ کی عظمتِ کردار کے متعلق سابقہ جلدوں میں صحابہ کا عنوان دیکھئے)

اب آگے بڑھئے۔ حضورؐ کے متعلق فرمایا تھا کہ آپ رقیق القلب اور نرم مزاج تھے۔ لیکن اس نرمی اور رقیق القلبی کے معنی یہ نہیں کہ آپ ذرا ذرا سی بات سے متاثر ہو کر گھڑی گھڑی اپنے فیصلے اور ارادے بدل دیا کرتے تھے۔ رقیق القلب اور متلون مزاج ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی بنا پر آیۂ شوریٰ کے ساتھ فرمایا کہ "تم اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرو"۔

مشاورت اور عزیمت

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (۳/۱۵۸) "جب آپ اس مشاورت کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں، تو پھر قانونِ خداوندی کی محکمیت پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے اس فیصلہ کو عمل میں لانا شروع کر دیں"۔ یہی تمہارا شیوہ ہونا چاہیئے اور یہی شیوہ تمہارے متبعین کا جنہیں اس قسم کی مشاورت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت، لینت اور عزیمت کا حسین امتزاج ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔

محمد رسول اللہ اور اُن کے رفقاءِ کار کی کیفیت یہ ہے کہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں لیکن باہم دگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد۔

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم نے فتح و کامرانی کے بنیادی اصول بتا دیئے ہیں۔ یعنی:-

۱۔ جملہ معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرنا۔

۲۔ امیرِ جماعت یا سربراہِ مملکت کا اپنے رفقاء کے لئے مشفق و غمخوار ہونا۔ اور اس کے ساتھ اس قدر صاحبِ عزم کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ ہو جائے، تو پھر اس پر جسم کر کھڑا ہو جانا اور اسے عملی شکل دینے کے لئے ہر قسم کے موانعات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا۔

۳۔ ان موانعات کے دور کرنے میں میدانِ جنگ تک میں اُترنا پڑے تو وہاں بھی کامل ثبات و استقلال سے دشمن کا مقابلہ کرنا، اور مفادِ عاجلہ کے بجائے، نگاہ مستقبل کی خوشگواریوں پر رکھنا۔

اس کے بعد فرمایا کہ

۳/۱۵۹ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ‎○ (۳/۱۵۹)

جماعتِ مومنین کے ساتھ رسول اللہ کی شفقت اور غمگساری، اور اس جماعت کی اہمیت کا تذکرہ مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً (۱۵/۸۸ ; ۲۶/۲۱۵ ; ۸/۶۲،۶۴)۔ لیکن یہ سیرتِ رسول اللہ کا ایک پہلو تھا۔ دوسری طرف رسول اللہ اور آپ کے صحابہؓ، دین کی محافظت کے لئے، چٹان کی طرح سخت اور محکم گیر تھے۔ (۹/۷۳ ; ۹/۱۲۳ ; ۴۸/۲۹)۔ غفور رحیمی اور جباری و قہاری، اپنے اپنے موقع پر دونوں حق کے گوشے ہوتے ہیں، اور یہی گوشے سیرتِ رسول اللہ اور جماعتِ صحابہؓ میں درخشاں نظر آتے ہیں۔

یہ ہے وہ قانونِ خداوندی جس کے مطابق فتح اور کامرانی نصیب ہوتی ہے — اور یہ یاد رکھو کہ جس کے ساتھ خدا کے قانون کی تائید شامل ہو، اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ لیکن جس کا ساتھ، خدا کا قانون چھوڑ دے، اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس لئے جماعتِ مومنین کا شیوہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ قانونِ خداوندی پر بھروسہ رکھے، اور اُس کا دامن کبھی نہ چھوڑے۔

نصرتِ خداوندی کا مفہوم

یہاں "نصرت" کا لفظ آیا ہے۔ جس کے عام معانی مدد کئے جاتے ہیں۔ لیکن نصرت میں جس قسم کی مدد کا مفہوم مضمر ہے وہ غور طلب ہے۔ عربوں کے ہاں کہا جاتا ہے: نَصَرَ الْغَيْثُ الْأَرْضَ "بارش نے زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا"۔ قرآن کریم میں، کامیابی اور کامرانی کے لئے عام طور پر "فلاح" کا لفظ آتا ہے جس کے معنی کھیتی کا پروان چڑھنا ہے۔ کھیتی کے پروان چڑھنے (ثمر بار ہونے) کے لئے دو اجزاء لاینفک ہیں۔ ایک بارش (سیرابی کا ذریعہ) اور دوسرے زمین۔ زمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس طرح تیار کی جائے کہ وہ بارش کو بقدرِ ضرورت اپنے اندر جذب کرے اور اس میں فصل پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ بارش تو بلاتمیز ہر خطۂ زمین

برسیگی' لیکن اس سے فصل صرف اس زمین سے پیدا ہوگی جسے اس مقصد کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ ایسی زمین پر جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو' بارش کا برسنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ ہی اس زمین سے جس میں زرعی صلاحیت تو ہو' لیکن اسے بارش سیراب نہ کرے' کچھ پیدا ہو سکتا ہے۔ فلاح و کامرانی کے لئے ایمان اور عمل کی ہم آہنگی کی اس طرح ضرورت ہے۔ ماحصل اس مثال کا یہ ہے کہ جو شخص اپنی سعی وعمل کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھے گا، اس کی کوشش بارآور ہوں گی۔ اس عمل میں جو حصہ قانونِ خداوندی کا ہوتا ہے' اسے نصرتِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس میں جو کردار انسانی کوشش ادا کرتی ہے' اسے بھی نصرت ہی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷)۔ اس کے عام معنی ہیں "اے جماعتِ مؤمنین! اگر تم نے خدا کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے خدا کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی کوششوں کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ رکھا، تو اس کا ابرِ رحمت تمہاری کھیتیوں کو سرسبز و شاداب کر دے گا ــــ خدا کی نصرت کرتی کیا ہے؟ فرمایا: وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۔ (۴۷/۷) "وہ تمہارے پاؤں جما دے گا"۔ تم میں ثبات اور استقلال پیدا کر دے گا۔ پاؤں تمہارے ہوں گے ان میں ثبات قانونِ خداوندی کے مطابق پیدا ہو گا۔

نصرت کے اس مفہوم سے آیت زیرِ نظر (۳/۱۵۹) کے معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر تمہاری کوششیں قانونِ خداوندی کے مطابق ہوں گی تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔

جماعت اور فرد کا تعلق

واضح ہے کہ قوانینِ خداوندی کی ہم آہنگی (اطاعت اور پابندی) سے انسان کی سیرت و کردار میں اس قسم کی تبدیلی آجاتی ہے جس سے وہ بڑی ہمت اور مردانگی سے ہر قسم کے خطرات' حتیٰ کہ موت تک کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی سیرت اس قسم کی نہ ہو' تو پھر کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ آیہ زیرِ نظر میں آیا ہے وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ ..... "خَذَلَ" کے معنی ہوتے ہیں کسی جانور کا اپنے گلے سے بچھڑ کر پیچھے تنہا رہ جانا۔ اور اس طرح ہر خطرہ کا ہدف بن جانا۔ اس ایک لفظ میں فرد اور جماعت کا تعلق اور عمل کا رشتہ سمٹ کر آجاتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی سعی وعمل کو قانون سے ہم آہنگ وہی رکھ سکتا ہے جس کا اس قانون کی محکمیت اور نتیجہ خیزی پر پورا پورا اعتماد ہو۔ اس کو "توکل" کہتے ہیں۔

لیکن قانون پر اس قسم کا بھروسہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس قانون کی صداقت پر کامل یقین ہو۔ قوانینِ خداوندی انسانوں تک اُس وحی کے ذریعے پہنچتے تھے جو اُن کے رسول پر نازل ہوتی تھی۔ وحی کا ذریعہ اس قدر غیر محسوس

ہوتا تھا کہ کوئی شخص کسی طریق سے معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ جس بات کو رسول وحیٔ خداوندی کہہ کر پیش کرتا ہے وہ فی الواقعہ مُنَزَّل مِنَ اللہ ہے۔ اس کا ایک ہی طریق تھا۔ اور وہ یہ کہ رسول کے متعلق یقین ہو کہ وہ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ اس میں کذب و افتراء کی ذرا سی بھی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان کے معنی ہیں قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد حقیقتِ مطلقہ کا یقین کرنا۔ قلب و

رسول کی صداقت پر ایمان

دماغ کے اس اطمینان کے لئے ضروری ہے کہ انسان غور و فکر اور علم و بصیرت سے کام لے (۲۵/۳)۔ لیکن رسول کے دعویٰ (یعنی اس کی پیش کردہ وحی) پر غور و فکر پر وہی آمادہ ہو گا جو یہ سمجھے کہ اس دعوے کا پیش کرنے والا جھوٹا اور مکار نہیں۔ سچا اور راست باز ہے۔ یہ وجہ ہے جو حضورؐ نے اپنے دعوۓ نبوت کے ثبوت کے لئے، اپنی قبل از نبوت زندگی کو بطورِ دلیل پیش کیا تھا (۱۰/۱۶)۔ اس طرح غور و فکر کے بعد انسان اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ جو کچھ یہ نبی پیش کرتا ہے وہ اس کی اپنی یا کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے (اور ہمارے زمانے میں اس کا امکان زیادہ ہو گیا ہے) کہ کوئی دانشور براہِ راست قرآنِ کریم پہ غور و فکر کے بعد از خود اس نتیجہ پہ پہنچ جائے کہ یہ کتاب انسانی ذہن کی تخلیق نہیں۔ اور اس طرح حضورؐ کی صداقت پر ایمان لے آئے۔

دونوں صورتوں میں نبوت کے مدعی کی صداقت پہ ایمان ضروری ہے۔ یعنی اس بات پر ایمان کہ اس کا یہ دعوےٰ کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے حقیقت پر مبنی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو کچھ اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے، یہ اس میں کسی قسم کی تحریف، آمیزش اور خیانت نہیں کرتا۔ اسے من وعن دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ نبی کی اس خصوصیت کے اظہار کے لئے فرمایا:-

۳/۱۶۰ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۳/۱۶۰)

نبیؐ کے لئے ایسا ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی وحی میں کسی قسم کی خیانت کرے۔ (انبیاء سابقہ میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے متبعین نے بعد میں ان کی وحی میں خیانت کر دی)۔ اب جب کہ خدا کی وحی پھر اپنی اصلی شکل میں آگئی ہے تو جن لوگوں نے انبیاء سابقہ کی وحی میں خیانت کی تھی، ان کی قلعی کھل جائے گی۔ اور خیانت کے ان مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا مل جائے گی۔ (یہاں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی) لیکن ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

حضور نبی اکرمؐ نے وحیٔ خداوندی (قرآن مجید) کا ایک ایک لفظ انسانوں تک پہنچا دیا۔ اسے مرتب، منضبط اور تحریری شکل میں جامع طور پر اُمّت کو دیا، اور سینکڑوں، ہزاروں حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، خدا نے قرآن مجید کی حفاظت

کا ذمہ لیا تھا۔ نبی کریمؐ نے اسے اس طرح محفوظ شکل میں اُمت کو عطا کر دیا اور اس طرح اس دعوائے خداوندی کا ثبوت بہم پہنچا دیا کہ نبیؐ اپنی وحی میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ (تفصیل انڈکس میں قرآن کے عنوان کے تحت ملے گی)۔

حضورؐ نے تو وحی کی حفاظت کے لئے اس قدر اہتمام فرمایا، لیکن حضورؐ کے بعد ہم نے اس وحی کے ساتھ وہی کچھ کیا جو کچھ انبیاء سابقہ کی امتوں نے، اُن انبیاء کی وحی کے ساتھ کیا تھا ——— ہم نے :-

اختلافِ قرأت کا عقیدہ

۱۔ اختلافِ قرأت کا عقیدہ وضع کیا۔ اختلافِ قرأت کے یہ معنی ہیں کہ مروجہ قرآنی نسخوں میں جس انداز سے آیات موجود ہیں، اُن میں سے بکثرت آیات، اُن سے مختلف الفاظ میں نازل ہوئی تھیں اور اکابرین صحابہؓ کے پاس ایسے مصاحف (قرآن کے تختے) تھے جن میں وہ آیات اس طرح درج تھیں جس طرح (بقول اُن کے) وہ درحقیقت نازل ہوئی تھیں۔ (یہ تمام تفصیل ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" میں ملے گی) چنانچہ آپ قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر میں اکثر ایسا لکھا دیکھیں گے کہ یہ آیت "اس قرآن" میں تو یوں ہے۔ لیکن قرأتِ حضرت ابن عباسؓ (وغیرہ) میں یہ اس طرح آئی ہے۔ سوچئے کہ اس سے اس وحی پر کچھ بھی یقین اور اعتماد باقی رہ جاتا ہے جو حضورؐ پر نازل ہوئی تھی؟ (نیز دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صـ۲۱۰)۔

مثلہ معہٗ

۲۔ پھر یہ عقیدہ وضع کیا کہ وحی ساری کی ساری قرآن کریم میں مندرج نہیں۔ اس کے علاوہ مثلہٗ معہٗ) قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل) اور وحی بھی نازل ہوئی تھی جو احادیث میں مندرج ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے "قرآنی وحی" کی حفاظت کا تو اس قدر اہتمام اور التزام کیا لیکن) وحی کے دوسرے حصے (احادیث) کو نہ لکھایا۔ نہ صحابہؓ کو یاد کرایا۔ نہ ان کا کوئی مصدقہ مجموعہ اُمت کو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُمت میں ہزاروں ایسی حدیثیں پھیلی ہوئی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح مانا جائے کہ ہزار ہا کی تعداد میں یہ حدیثیں وحیٔ خداوندی تھیں، تو فرمائیے حضورؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آئے گا جو وحیٔ خداوندی کو ایسی حالت میں چھوڑ گئے؟ اسی طرح ناسخ و منسوخ کا عقیدہ (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صـ۱۲۵)

قرآن کے باطنی معانی

۳۔ یہاں تک تو اربابِ شریعت گئے تھے۔ اہلِ طریقت ایک قدم اور آگے بڑھے انہوں نے ایک حدیث وضع کی جس کی رُو سے حضرت ابوہریرہؓ[1] نے فرمایا کہ نبی اکرمؐ نے مجھے علم کے دو بند برتن دیئے تھے۔ ایک برتن کو تو میں نے کھول کر اُمت کو دے دیا۔ اگر دوسرا برتن کھولتا تو میرا گلا کاٹ دیا جاتا۔

---

[1] صحابہؓ میں سب سے زیادہ احادیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ ہیں۔

(بخاری باب العلم)۔ ارباب طریقت کا کہنا ہے کہ اس دوسرے برتن میں قرآن کے باطنی (یعنی حقیقی) معانی اور تصوف کے رموز و اسرار بند تھے۔ یہ علم صوفیاء میں سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے اور "مغزِ دین" ہے۔

۴۔ اِن کے علاوہ ہم نے وحیٔ خداوندی میں کس کس طریق سے خیانت کی (اسے کس کس طریق سے چھپا کر اور اس سے خارج کو وحی بنا کر اُس کا اتباع شروع کر دیا) اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم ص۱۲۵ زیرِ آیت ($\frac{9}{159}$)۔ اور انڈکس میں تصوف کا عنوان ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے ہمارا جو حشر ہوا (اور ہو رہا ہے) اس کے متعلق اگلی آیت میں فرمایا:-

$\frac{3}{161}$ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ($\frac{3}{161}$)

یاد رکھو! جو شخص وحیٔ خداوندی سے پورا پورا ہم آہنگ ہو جائے، اُس کی کامل اطاعت کرے، اس کی حالت کبھی اس شخص جیسی نہیں ہو سکتی جو اس کے خلاف چلے، اور یوں عذابِ خداوندی کا مستوجب بن جائے (جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا فطری نتیجہ ہے)۔ ایسے شخص کا مقام جہنم ہے۔ کیسی بُری ہے یہ منزل جہاں انسان کی بے راہ روی اسے پہنچا دیتی ہے!

رضوان اللہ کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم ص۲۵۸ زیرِ آیت ($\frac{2}{207}$) دیکھئے۔ اور سَخَطَ (غضب) کے لئے جلد اوّل ص۵۴۔ زیرِ آیت ($\frac{1}{7}$)۔ سَخَطَ کے قرآنی استعمال کے لئے دیگر آیات ($\frac{5}{80}$، $\frac{47}{28-26}$) دیکھئے۔ مقصد ہے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا تباہ کن نتیجہ۔ اس کے برعکس، اربابِ رضوان اللہ کے متعلق فرمایا:-

رضوان اللہ

$\frac{3}{162}$ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ($\frac{3}{162}$)

اس کے برعکس قوانینِ خداوندی کے مطابق چلنے والوں کے درجات، اُن کی سعی و عمل کی نسبت سے، متعین ہوتے ہیں ($\frac{6}{132}$)۔ وہ شرفِ انسانیت کے ارتقاء کی سیڑھیاں چڑھتے، بلند سے بلند تر مقامات پر پہنچتے جاتے ہیں ($\frac{84}{19}$)۔ خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے کسی کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہتا۔

فرقِ مدارج

واضح رہے کہ انسان ہونے کی جہت سے تو ہر انسان واجب التکریم ہے ($\frac{17}{70}$) لیکن اس کے بعد مختلف انسانوں کے مدارج، اُن کے اعمال (اخلاق و کردار) کے مطابق متعین ہوتے ہیں اسلامی معاشرہ میں بھی اور بارگاہِ خداوندی میں بھی

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے خدا نے اپنا رسول بھیجا :

۳/۱۶۴ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳/۱۶۴)

جب کامیابی اور ناکامی، صحیح اور غلط روش، کا دارومدار قانونِ خداوندی پر ٹھہرا جو وحی کے ذریعے ملتا ہے، تو نوعِ انسان کے پاس، اس قانون کا، اپنی حقیقی شکل میں رہنا نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے لئے، خدا نے انہی میں سے، ان کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا۔ یہ، ایمان والوں پر، خدا کا احسان ہے (۴۹/۱۷)۔ اس لئے کہ وحی کسب و ہنر سے نہیں مل سکتی۔ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ہی مل سکتی تھی۔ وہ رسول، ان کے سامنے، قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں اُن کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے (۹/۱۰۳)؛ (۹۱/۹-۱۰) ؛ (۹۲/۱۸)۔ انہیں قانون اور اس کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اندھا دھند نہیں کراتا۔ ہر بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرا کر، علیٰ وجہ البصیرت اطاعت کراتا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتظام نہ ہوتا تو لوگ اسی طرح، حیران و سرگرداں، راہ گم کردہ، کھوئے ہوئے پھرتے، جس طرح اس سے پہلے پھرتے تھے۔ رسولؐ نے اس نظامِ خداوندی کو عملاً متشکل کر کے دکھا دیا، اور خدا نے اس کے ضابطہ (قرآن) کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا (۱۵/۹)۔

رسول کے جن فرائض یا مناصب کا یہاں بیان ہوا ہے، ان کا ذکر دیگر مقامات میں بھی انہی الفاظ میں آیا ہے، یعنی

فرائضِ رسالت

۱۔ آیاتِ خداوندی (وحیٔ الٰہی) کا دوسروں کے سامنے پیش کرنا۔ اسے تبلیغِ رسالت کہا جاتا ہے۔

۲۔ آیاتِ خداوندی کو پیش ہی نہیں کرنا، بلکہ انہیں سمجھانا بھی کہ قوانینِ خداوندی کیا ہیں اور ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ اسے تعلیمِ کتاب و حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ اور پھر ایسا عملی نظام قائم کرنا جس میں افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی ذات کا ارتقاء ہوتا جائے۔ اسے تزکیۂ ذات کہا جاتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم صفحہ ۲۵ آیت (۲/۱۲۹))

تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے دُعا کی تھی کہ ذریتِ اسماعیلی میں اس قسم کا رسول مبعوث ہو۔ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۶۴۔ آیت (۲/۱۲۹)۔ اور آیت (۲/۱۵۱) (صفحہ ۱۰۱) میں اس رسول کی بعثت کا ذکر ہے۔ ان فرائضِ رسالت کی اہمیت کے پیشِ نظر، انہیں آیت زیرِ نظر میں بھی دُھرایا گیا ہے، نیز آیت (۶۲/۲) میں۔

وحی کا عطا ہونا احسانِ خداوندی تھا

زیرِ نظر آیت میں رسولؐ کی بعثت (یا نزولِ وحی) کو خدا کا احسان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ کس طرح خدا کا احسان ہے، اس کے متعلق انڈکس میں وحی کا عنوان دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قوانین رسولوں کو بلا مزد و معاوضہ عطا کئے (حتیٰ کہ ان میں اُن کی سعی و کاوش کا بھی کوئی دخل نہیں تھا جن پر ان کا نزول ہوا تھا)۔ اور اُس کے رسول انہیں بلا مزد و معاوضہ دوسروں تک پہنچاتے اور اُن کی تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ (سورۂ ہُود کی ابتدائی آیات میں دیکھئے) ہر رسولؑ اپنی دعوت کو پیش کرنے کے ساتھ ہی اس کا اعلان بھی کرتا تھا: یٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا (۱۱/۵۱ اور دیگر آیات) "اے میری قوم میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔" یہی اعلان خود حضور نبی اکرمؐ نے بھی کیا (۳۴/۴۷)۔

آپ سوچیئے کہ بھولے ہوئے راہیوں کو، بلا مزد و معاوضہ، صحیح راستے کا پتہ نشان بتا دینا، ان پر کتنا بڑا احسان ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے برعکس، انسانی ردِعمل کو بڑے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو، بلا مزد و معاوضہ، صحیح راستہ بتائے اور وہ مسافر، اس رہنما سے کہے کہ چونکہ میں نے تمہارا بتایا ہوا راستہ اختیار کیا تھا، اس لئے تم میرا احسان مانو، تو اس کا یہ مطالبہ کس قدر مضحکہ انگیز ہوگا۔ اِس قسم کی ذہنیت کو واشگاف کرنے کے لئے اُس نے اعراب (بدوؤں) کی مثال پیش کی اور کہا:-

يَمُنُّوۡنَ عَلَيۡكَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا‌ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَىَّ اِسۡلَامَكُمۡ‌ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيۡكُمۡ اَنۡ هَدٰٮكُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ (۴۹/۱۷)

یہ لوگ (اے رسول!) تجھ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ دھرو۔ بلکہ یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کی راہ دکھا دی ہے۔ لہٰذا، اگر تم واقعی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے ممنونِ احسان ہو۔ نہ یہ کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان دھرو۔

ہم نے آیات (۳/۱۲۷-۲۸) تک جنگِ اُحد کا ذکر کرنے کے بعد درمیانی آیات چھوڑ دی تھیں، اور آیت ۳/۱۵۱ سے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا تھا۔ اب پھر انہی تصادمات کا ذکر ہے۔ جنگِ بدر میں مخالفین کو شکست ہوئی تھی۔ جنگِ اُحد میں بھی وہ پہلے شکست کھا کر بھاگ اٹھے تھے، لیکن بعد میں دوبارہ لوٹ کر آ گئے تھے، اس سے مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر میدان انہی کے ہاتھ میں رہا تھا۔ اس کی یاد دلاتے ہوئے کہا:-

۳/۱۶۴ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۶۴/۳)۔

مخالفین کے ساتھ مقابلہ میں کامیابی اور ناکامی کا مدار اس پر ہے کہ تم کس حد تک قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہو جنگِ بدر میں تم نے کامل اطاعت کی تو تعداد کی کمی اور سامانِ حرب کی قلت کے باوجود تمہیں کامیابی ہوئی اور دشمن کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگِ اُحد میں تم سے لغزش ہوگئی تو تمہیں فتح کے بعد شکست ہوگئی اور تمہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ ہرچند یہ یہ نقصان اس نقصان سے کم تھا جو جنگِ بدر میں دشمن کو تمہارے ہاتھوں اٹھانا پڑا، لیکن بایں ہمہ تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ یہ نقصان کیوں ہوا! اس کی وجہ کیا ہوئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

قبل اس کے کہ ہم آیت کے باقی حصہ کا مفہوم پیش کریں، ایک اہم سوال کا سامنے لانا ضروری ہے۔ آج ہم پر کوئی مصیبت

مصیبت کیوں آتی ہے؟

آئے ـــــ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ـــــ اور اس کے متعلق سوال ہو کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ نکلے گا کہ اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہ سادہ سے الفاظ تو عوام کی زبان پر تو آئیں گے۔ "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" اس سے بھی آگے بڑھیں گے اور کہیں گے "مرضی مولا، بر ہمہ اولیٰ"۔ کوئی مصیبت آئے، کیسی ہی تکلیف ہو، کتنا ہی نقصان ہو۔ زبان پر حرفِ شکایت لانا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف کبیدگی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ یہ خدا کے فیصلہ کے خلاف چیلنج ہوگا۔ مرضی مولا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں تو کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو۔ لوگ میرے لئے دعا نہ کریں۔

لیکن معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس سوال کا جواب کیا دیا تھا؟

ہماری اپنی وجہ سے

سوال یہ تھا کہ اَنّٰى هٰذَا ـــــ یہ مصیبت کیوں آئی۔ یہ نقصان کیوں اٹھانا پڑا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ جواب ملا ـــــ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ اس کے ذمہ دار خود تم ہو۔

ذرا غور کیجئے۔ کہنے والا خود خدا۔ جس کی وساطت سے یہ کہا گیا وہ رسولؐ۔ جن سے یہ کہا گیا وہ صحابہؓ کی جماعت۔ اس سے بڑھ کر "تقربِ بارگہ خداوندی" کا مقام کون سا ہوگا؟ لیکن اس کے جواب میں "مرضیٔ مولا" کا شائبہ تک نہیں آیا۔ صاف الفاظ میں کہہ دیا، هٰذَا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ۔

اس کے بعد ہے ـــــ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ـــــ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، "اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

غور کیجئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے بات کیا سامنے آتی ہے ؟

اے رسول! یہ پوچھتے ہیں کہ یہ مصیبت کیوں آئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ان سے کہدو کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ اور اس کے بعد ـــــ اللہ ہر چیز پہ قادر ہے۔

کہئے کہ اس ٹکڑے کا سابقہ ٹکڑوں سے کوئی ربط ہے؟ اس سے سابقہ جواب کا مفہوم باقی رہتا ہے؟ کیا اس سے (CONFUSION) پیدا نہیں ہو جاتی کہ خدا کہنا کیا چاہتا ہے؟ وہ ایک طرف کہتا ہے کہ اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ اور دوسری طرف کہتا ہے کہ اللہ ہر چیز پہ قادر ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کے مروّجہ تراجم سے کس قدر الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ کارگہِ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ جنگِ بدر میں تم نے ان قوانین کی اطاعت کی، تمہیں کامیابی نصیب ہوئی ـــ جنگِ اُحد میں تم نے ان (قوانین) سے سرتابی برتی، نقصان اٹھایا۔ بات صاف ہے۔ جو شخص سنکھیا پھانک لیتا ہے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی موت ہوتی ہے خدا کے اس قانون کے مطابق کہ سنکھیا مہلک ہے۔ (یا سنکھیا کی اس قدر مقدار مہلک۔ اسی کو پیمانہ کہتے ہیں)۔ لیکن اس کی موت کی ذمہ داری تو خود اس شخص پہ عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی موت خریدتا ہے۔ اسی لئے اسے خودکشی کہتے ہیں: ھُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ ..... اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ۔ کا یہ مفہوم ہے۔

اس کے بعد ہے:-

۳/۱۶۵ وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ (۳/۱۶۵)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ـــــ "جو تکلیف تمہیں اس جنگ میں پہنچی وہ خدا کے حکم سے تھی"۔ یہاں اِذْن کا ترجمہ حکم کر دینے سے وہی اُلجھن پیدا ہوگی جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اگر یہ کچھ خدا کے حکم سے ہوا تھا، تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ ھُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ: یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی مصیبت تھی؟ "اِذْن" کے معنی بھی قانون ہیں۔ اسی لئے اس بات کو پھر دہرایا گیا جو پہلے کہی گئی تھی کہ یہ کچھ ہوا ہے خدا کے قانون کے مطابق لیکن اس کے ذمہ دار خود تم ہو۔ چونکہ تقدیر اور اِذْن کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اس مقام پہ اسی پہ ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ (از رکس میں تقدیر اور اِذن کا عنوان دیکھئے)۔ اس کے بعد کہا کہ اس شکست سے نقصان تو تمہارا ضرور ہوا، لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ اور وہ یہ کہ وَلِیَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ

اِذْن کے معنی

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا (۳/۱۶۶-۱۶۵) اس سے مومن اور منافق الگ الگ ہو گئے۔ (منافقین کے متعلق سابقہ جلدوں میں انڈکس کی مدد سے دیکھئے)۔ منافقین کی یہ حالت ہے۔

۳/۱۶۶ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿۳/۱۶۶﴾

جب ان (منافقین) سے کہا گیا کہ چلو! نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے دشمن سے جنگ کرو، یا (حسبِ موقعہ) مدافعت کرو، (تو یہ بہانے بنا کر ادھر اُدھر کھسک گئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ تمہیں کامیابی ہوتی ہے) تو اب کہتے ہیں کہ ہمیں اس کا یقین نہیں تھا کہ وہاں جنگ ہو گی۔ اگر ہمیں اس کا یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ہم تمہیں اکیلا چھوڑ دیتے ان کا یہ انداز ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب ہے۔ یہ لوگ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں — اور اللہ پر خوب روشن ہے کہ یہ ظاہر کیا کرتے ہیں اور چھپاتے کیا ہیں۔

منافقت کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ۔ وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہوتا۔ بالفاظِ دیگر قلب اور زبان میں ہم آہنگی کا نہ ہونا منافقت ہے جس سے

منافقت

اور جہاں بھی، اس طرزِ عمل کا مظاہرہ ہو، وہ منافق ہے۔ منافقین کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک خصلت کا نام ہے ایسی ہی جیسے جھوٹ بولنے والوں کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ جھوٹ ایک خصلت کا نام ہے۔ جہاں اور جس سے بھی اس کا مظاہرہ ہو، وہ جھوٹا ہے۔ منافقت کی خصلت کے متعلق کہا کہ لِلْكُفْرِ أَقْرَبُ لِلْإِيمَانِ —— "یہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب ہوتی ہے"۔ اس سے اس جرم کی شدت کا اندازہ لگا لیجئے (منافقین کی مزید تفصیلات کے لئے انڈکس دیکھئے)۔ جنگ کے سلسلے میں جن منافقین کا ذکر آیا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ

۳/۱۶۷ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳/۱۶۷﴾

ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ لوگ خود بھی میدانِ جنگ میں نہ گئے (اپنے گھروں میں بیٹھے رہے) اور جو لوگ جنگ میں شریک ہوئے، اُن کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے ناحق جان گنوائی۔ اگر وہ ہماری بات مانتے تو کبھی قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ جو جنگ میں نہ جائے وہ موت سے محفوظ رہتا ہے، تو تم ذرا ایسا کر کے دکھاؤ کہ جب تمہارے سامنے موت آکھڑی ہو، تو اُسے نکال باہر کرو، اور اس طرح ہمیشہ زندہ رہو۔

اس کے بعد بتایا کہ اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کے مراتب و مدارج کیا ہوتے ہیں۔ فرمایا:-

۳/۱۶۸ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ

اِن کوتاہ اندیشوں کو کیا خبر کہ موت اور زندگی کسے کہتے ہیں؟ اِن سے کہو کہ جو لوگ نظامِ خداوندی کی راہ میں قتل ہو جائیں، اُن کے متعلق یہ گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مر گئے (۲/۱۵۴)۔ اس کی موت، حیاتِ باشرف ہے (۳/۱۵۵)۔ انہیں ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے زندگی اور ارتقاء کے تمام سامان میسر ہیں (زندگی، موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی[1])

ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

۳/۱۶۹-۱۷۰ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳/۱۶۹-۱۷۰)

وہ اپنے بلند مقامات کو دیکھ کر، جو انہیں عنایاتِ خداوندی سے ملتے ہیں بہت خوش ہوتے ہیں، اور اس احساس سے کہ اُن کی اس قربانی سے اُن لوگوں کے لئے جو ابھی دنیا میں موجود ہیں، ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں وہ ہر طرح کے خوف و حزن سے مامون ہوں گے، ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

وہ ان آسائشوں اور راحتوں سے، جو نوازشاتِ خداوندی سے انہیں حاصل ہوتی ہیں، بے حد خوش ہوتے ہیں۔ نیز اس حقیقت سے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کسی ایمان والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اس کا پورا

---

[1] طبیعی موت، ہر ذی حیات کے لئے ہے (۳/۱۸۴)۔ اس میں کسی کی استثناء نہیں (۳۹/۳۰)۔ اسی طرح مرنے کے بعد زندگی بھی ہر انسان کے لئے ہے (۲/۲۸)۔ یہاں مقتولین فی سبیل اللہ کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافقین نے کہا تھا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو مارے نہ جاتے۔ ویسے بھی اہلِ جنت کی زندگی اور جہنمیوں کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جہنم والے نہ زندہ ہوتے ہیں نہ مردہ (۲۰/۷۴)۔ انہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مرتے بھی نہیں (۱۴/۱۷)۔ اہلِ جنت کی زندگی بشارتوں کی زندگی ہے (۳/۱۷۰)۔ یہ خصوصیت بھی صرف انہی کے لئے نہیں جو میدانِ جنگ میں قتل ہو جائیں جو اس جدوجہد میں قتل ہو جائے یا ویسے ہی مر جائے، اس میں سب شامل ہیں (۳/۱۵۶؛ ۴/۷۴؛ ۹/۱۱۱-۱۱۲)۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو اس دُنیا سے چلا جائے، اس کا اس دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا (۳۵/۱۳-۱۴؛ ۴۶/۵-۶)

پورا بدلہ دیتا ہے۔

مقتولین فی سبیل اللہ کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں (انڈکس میں مقتولین فی سبیل اللہ اور شہداء کے عنوانات دیکھئے)۔ نیز اسی جلد میں زیر آیات (۳/۱۵۵-۵۷)

اس کے بعد ان مجاہدین (شہداء اور غازیوں) کی خصوصیات کا تذکرۂ جمیلہ ان الفاظ میں کیا:۔

۳/۱۷۱ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ (۳/۱۷۱)

اُن مؤمنین کے اعمال کا بدلہ جو مصائب و مشکلات کے زخم خوردہ ہونے کے باوجود، اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سرفروشانہ باہر نکل آتے ہیں (اسی سے وہ حقیقی زندگی کے مستحق قرار پاتے ہیں ۸/۲۴)۔

یہ ہے قانونِ خداوندی کی نگہداشت کا وہ حُسن کارانہ شعارِ زندگی جس کا ایسا عظیم اجر ملتا ہے۔

سورۂ انفال میں اللہ اور رسول کی دعوت کے متعلق کہا کہ وہ تمہیں اس چیز کی طرف بُلا رہے ہیں جو تمہیں زندگی عطا کرے گی (۸/۲۴)۔ یہ دعوت اُن لوگوں کو دی جا رہی تھی جو طبیعی طور پر (PHYSICALLY) زندہ تھے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ

موت و حیات کا مفہوم

قرآنِ کریم کے نزدیک "زندگی" طبیعی طور پر سانس لینے کا نام نہیں۔ یہ تو محض حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ اصل حیات، اقدارِ خداوندی کی حفاظت کے لئے جینا اور بوقتِ ضرورت اس کی خاطر جان دے دینے کا نام ہے۔

یہ وہ مردانِ خود آگاہ و خدامست ہیں کہ

۳/۱۷۲ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○ (۳/۱۷۲)

یہ ہے قانونِ خداوندی کی نگہداشت کا وہ حُسن کارانہ شعارِ زندگی جس کا ایسا عظیم اجر ملتا ہے۔ یہ وہ صاحبانِ عزم و یقین ہیں کہ جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جرار جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں اس سے ڈرنا چاہیئے، تو اس سے ان کا ایمان اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے، اور وہ دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ، دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے، ہمارے ساتھ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت شامل ہے۔ اور یہ وہ قوت ہے جس کے بعد کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی اور جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

ان کے اس ایمان و اعتماد و عزم و استقامت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ

۳/۱۷۳ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (۳/۱۷۳)

اس عزم و یقین اور جوش و خروش کے ساتھ جماعتِ مؤمنین، دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے، نکلی لیکن دشمن جنگ کئے بغیر بھاگ اٹھا، اور یوں یہ مجاہد کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر، خدا کی عطا کردہ آسودگیوں اور خوش حالیوں سے جھولیاں بھر بھر کر واپس لوٹ آئے۔ یہ سب اس لئے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع کیا تھا۔ اور قانونِ خداوندی اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑا پُر ثمر اور بار آور واقع ہوا ہے۔

اس کے بعد قرآن نے دشمنوں کی ایک سازش سے متنبہ کیا ہے۔ کہا:۔

۳/۱۷۴ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۷۴)

یاد رکھو! ان سرکش قوتوں کی (جو تم سے برسرِ پیکار ہیں) چال یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی ــــ پارٹی کی طرف سے دوسروں کے دل میں ڈر اور خوف پیدا کرتے رہتے ہیں (۳۹/۳۶) لیکن تم جب مومن ہو تو تمہارے لئے ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈرنا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے چاہیئے۔ (خدا کے دوستوں کو خوف کیسا؟ (۱۰/۶۲-۶۴) ــــ خوف تو شیطان کے دوستوں کو ہونا چاہیئے)۔

یہ تھے وہ صبر آزما ہمت شکن، جاں گسل مراحل جن سے اسلام اپنے ابتدائی دور سے گزر رہا تھا۔ مدینہ میں جماعتِ مؤمنین کی پناہ گزینوں کی سی زندگی۔ قریش کی مخالفت کا یہ عالم کہ وہ ہر شکست کے بعد تازہ جوش و خروش اور بکثرت سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے۔ (اعراب (اور دیگر منافقین) کی یہ حالت کہ جماعتِ مؤمنین کی فتوحات کو دیکھ کر جنگی مہمات میں ان کے ساتھ تو ہو لیتے تھے لیکن وقت پر دھوکہ دے جاتے تھے۔ ان حالات سے قلبِ نبویؐ کا متاثر ہو جانا قطعاً تعجب انگیز نہ تھا ــــ اپنی خاطر نہیں، بلکہ اس احساس سے کہ یہ مٹھی بھر جماعت جو ابھی ابھی اپنی سابقہ (ہر طرح سے کامیاب) زندگی چھوڑ کر، اس نظامِ نو میں داخل ہوئی ہے، اس گردشِ مدام سے کہیں گھبرا نہ جائے۔ اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے ارشادِ باری تعالےٰ ہوا:۔

۳/۱۷۵ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـــًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۷۵)

اے رسول! اپنے رفقاء سے کہہ دیجئے کہ جو لوگ کفر کی راہ میں اس تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں، تمہارے لئے ان کی وجہ سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنے اس انکار و سرکشی سے اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

اس سے ان کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ (وہ کچھ قریبی مفاد حاصل کرلیں تو اور بات ہے لیکن) مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔ اُن کے لئے گھل گھل کر مرجانا اور تباہ ہوجانا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ جس انجام وعواقب کا یہاں ذکر کیا گیا ہے' اِس کا تعلق نہ انہی لوگوں سے ہے' نہ موجودہ ہنگامی حالات سے۔ یہ حق و باطل کے معرکہ اور خیر و شر کی ستیزہ کاری کا ابدی اصول ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوتا ہے اور خیر انجامِ کار غالب آتا ہے۔ (حق و باطل کی کشمکش کے لئے انڈکس میں عنوان حق دیکھئے)۔ فرمایا :-

۳/۱۷۶ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۳/۱۷۶)

یہ چیز کچھ انہی سے مخصوص نہیں۔ جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیتے ہیں' تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کا انجام بڑا الم ناک اور درد انگیز ہوتا ہے۔

حق و باطل کی کشمکش

حق و باطل کی کشمکش میں جس بات سے مغالطہ پیدا ہوتا ہے ــــ اور وہ مغالطہ بعض اوقات حق کے غالب آنے کے یقین میں بھی تذبذب پیدا کر دیتا ہے ــــ وہ یہ ہے کہ ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ جونہی باطل کی قوتیں سر اٹھائیں' غیبی طاقتیں ان کا وہیں سر کچل دیں۔ چونکہ دنیا میں ایسا ہوتا نہیں اسی لئے ہمارے دل میں حق کے غلبہ کے بارے میں شکوک پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس باب میں قرآنِ مجید نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے' عمل اور اس کی نتیجہ خیزی میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اسے مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب ہونا ہوتا ہے لیکن مہلت کے وقفہ کے بعد۔ اس سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں "مکافاتِ عمل" اور "مہلت کا قانون" کے عنوانات دیکھئے۔ اسی قانونِ مہلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

۳/۱۷۷ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ (۳/۱۷۷)

ان لوگوں کو جو قریبی مفاد حاصل ہوجاتے تو یہی چیز انہیں مغالطہ میں ڈال دیتی ہے۔ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات کوئی شے نہیں۔ اس کی یونہی دھمکی دی جاتی ہے۔ یہ ان کی غلط نگہی ہے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ فوراً سامنے نہیں آجاتا۔ ایک وقت کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ (جس طرح بیج کو پھل بننے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے)۔

یہ قانونِ مُہلت، اُن لوگوں کے لئے نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو آخری تباہی سے پہلے اپنی روش میں اصلاح کرلیں۔ لیکن جو لوگ اپنی کفر کی روش میں آگے بڑھتے جائیں، اُن کے لئے یہ مہلت کا وقفہ، نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ اُن کے جرائم کا وزن بڑھتا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اُن کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں تاآنکہ وہ ذلت و خواری کے جہنم میں جا گرتے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جماعتِ مومنین کو کفار (یعنی کھلے دشمنوں) کے مقابلہ میں منافقین کے ہاتھوں زیادہ تکالیف برداشت کرنی پڑتی تھیں اور مدینہ کی ابتدائی زندگی میں یہ مسئلہ بڑا اذیت رساں اور توجہ طلب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں حضورؐ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ کفار کی مخالفت آخرالامر دم توڑ دے گی اور کامیابی تمہارے ہی حصہ میں آئے گی، وہاں منافقین کے

منافقین متعلق بھی فرمایا کہ ان کا مسئلہ بھی مستقل نہیں۔ یہ چھٹ کر الگ ہو جائیں گے اور آخرالامر تمہاری جماعت خاص مومنین پر مشتمل ہوگی۔ اس میں کوئی منافق نہیں ہوگا۔

۳/۱۷۸ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۷۸)

اس کا بھی یقین رکھو کہ خدا کا قانون ایسا نہیں کہ وہ تمہارے معاشرے کو اس حالت میں رہنے دے جس میں وہ اب ہے۔ کوئی تحریک بھی ہو، اس میں ابتداءً ہر قسم کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مصائب اور مشکلات کی بھٹیاں آہستہ آہستہ کھرے اور کھوٹے کو، الگ کرتی جاتی ہیں۔ یہ بات شروع ہی میں ازخود نہیں بتا دی جاتی کہ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔ آزمائشوں سے اُن کی چھانٹ ہوتی جاتی ہے۔ اور (اس طرح) کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملتا کہ مجھے محض بدگمانی کی بناء پر اپنے اندر شامل نہیں ہونے دیا گیا، یا الگ کر دیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں غیب سے یہ بات نہیں بتا دی (کہ فلاں منافق ہے اور فلاں مومن) اس میں شبہ نہیں کہ ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بعض امورِ غیب کا علم دیتے ہیں۔ (۷۲ / ۲۶-۲۷)؛ (۳ / ۴۳)؛ (۶ / ۵۰)؛ (۷ / ۱۸۸) لیکن اس بات کا علم رسول کو بھی نہیں دیا گیا۔ وہ بھی منافقین کو اُن کے انداز ہی سے پہچان سکتا ہے (۴۷ / ۲۹-۳۰)۔ اندریں حالات تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم خدا کے قانون اور اُس کے لانے والے کی صداقت پر یقینِ محکم رکھو (اور یہ نہ خیال کرو کہ اگر یہ سلسلہ خدا کی طرف سے ہے تو اُس نے شروع ہی میں کیوں نہ بتا دیا کہ منافق کون کون ہے)۔ اگر تم نے

اس یقین کو محکم کر لیا اور ان قوانین کی نگہداشت کی تو تمہارے لئے اس کا اجر بہت بڑا ہے۔

اس آیۂ جلیلہ میں بڑے اہم بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں۔ ان نکات کے متعلق مطالب الفرقان کی جلد اوّل میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ اس میں تو ایک پورا باب منافقین سے متعلق ہے۔ (صہ ۳۰)۔ زیر نظر نکات اس جلد کے صفحات نمبر ۲۲۷ - ۲۲۲ پر دیکھئے۔ اور علمِ غیب کے لئے غیب کا عنوان (انڈکس میں)۔ خبیث و طیب، منافقین و مخلصین کی یہ علیحدگی رسول اللہ کی زندگی میں ہو چکی تھی اور جنہیں رسول اللہ کے ساتھی (صحابہؓ) کہہ کر پکارا گیا ہے وہ سب ایمان میں مخلص اور مومن حقا تھے اور جنت کے مستحق (۸/۷۴؛ ۹/۱۰۰؛ ۸/۶۲-۶۴؛ ۴۸/۲۹؛ ۵۷/۱۰)

ہم نے جنگ کے سلسلہ میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے آیات (۳/ ۱۲۷ - ۱۲۸) کے بعد آیت (۳/ ۱۵۱) سے سلسلہ کلام شروع کر دیا تھا، اور آیات (۳/ ۱۲۹ - ۱۵۰) کو چھوڑ دیا تھا۔ آیت (۳/ ۱۲۸) کے بعد انفاق کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق بھی بالواسطہ جنگ ہی سے ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ پہلے آیات (۳/ ۱۲۹ - ۱۵۰) کو دیکھ لیا جائے اور اس کے بعد آیت (۳/ ۱۲۹) سے مسلسل آگے بڑھا جائے۔ آپ سابقہ صفحات میں آیات (۳/ ۱۲۷ - ۱۲۸) پر نگہ بازگشت ڈال لیجئے تاکہ سلسلہ مضامین مستحضر ہو جائے۔ وہاں بات ہو رہی تھی مخالفین کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:۔

۳ ۱۳۰ - ۱۲۹	يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ ؏ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۳/ ۱۳۰ - ۱۲۹)

لیکن تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میدانِ جنگ میں فتح حاصل ہو گئی تو دین کا مقصد پورا ہو گیا۔ وہاں کی فتح سے صرف، اُن تخریبی قوتوں کی مدافعت ہوتی ہے جو تمہارے نظام کی راہ میں حائل ہوں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ تمہارا معاشرہ صحیح خطوط پہ متشکل ہو۔ (۲/ ۲۱۷ - ۲۱۹)

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے (۲/ ۲۷۵ - ۲۷۹)، معاشرتی تباہی میں سب سے بڑا حصہ ربوٰ کا ہے (یعنی محض سرمایہ سے نفع کمانا)۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس سے دولت بڑھتی ہے۔ انفرادی طور پہ تو ایسا ہی نظر آتا ہے) لیکن درحقیقت اس سے (قومی دولت میں) کمی اور کمزوری واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا، اے جماعتِ مؤمنین! تم ربوٰ کے (سرمایہ دارانہ) نظام کو اختیار نہ کر لینا۔ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی کامیابی کی صحیح راہ ہے۔ اگر تم نے محنت سے دولت پیدا کرنے کے بجائے، سرمایہ کے زور پہ دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کرنی شروع کر دی (۳۰/ ۳۸ - ۳۹) تو، ہر اس قوم کی طرح، جو نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتی ہے، تمہارا معاشرہ

بھی جہنمی معاشرہ بن جائے گا۔

ربوٰ کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان، جلد سوم ص۲۷۴ زیرِ آیت ۲/۲۷۴ میں آچکی ہے۔ وہ بحث اس قدر جامع ہے کہ اس پر کسی اضافہ یا مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ زیرِ نظر آیت بھی وہاں آچکی ہے۔ البتہ ایک نکتہ کی طرف بارِ دیگر توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔ یہاں خطاب "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" یعنی مومنین سے ہے۔ اور کہا یہ گیا ہے کہ تم اس جہنم کے عذاب سے محتاط رہو: "اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ" جو کہ کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

ربوٰ کا نظام کفر ہے

جلد سوم میں بتایا جا چکا ہے کہ ربوٰ ایک معاشی نظام کا نام ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی ضد ہے، اور وہاں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم ربوٰ کے نظام کو ترک نہ کرو گے تو اسلامی نظام تمہارے خلاف اعلانِ جنگ کر دے گا۔ اور یہاں کہا گیا ہے کہ اس صورت میں تم اُس عذاب میں مبتلا کئے جاؤ گے۔ جو کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر مؤمنین (یعنی موجودہ اصطلاح میں مسلمان) اپنے ہاں خلافِ قرآن معاشی نظام رائج کرلیں تو اُن کا شمار مؤمنین کے زمرے میں نہیں رہے گا۔ وہ "خدا اور رسولؐ" کے دشمن ہو جائیں گے۔ اور کفار کے ساتھ عذابِ جحیم میں ماخوذ۔

۳/۱۳۱ اس عذاب سے محفوظ رہنے کی صورت یہ کہ "وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (۳/۱۳۱) اسلامی نظامِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نظام کی اطاعت کرو۔

۳/۱۳۲ وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ (۳/۱۳۲)

اور (اس طرح) اپنے نشوونما دینے والے کے سایۂ حفاظت میں جلدی سے پہنچ جاؤ اور ربوبیتِ خداوندی کی اس جنّت کو حاصل کرو جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے (۵۷/۲۱)۔ یہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار رکھی ہے جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

جنّت کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے (دیکھئے انڈکس)۔ وہیں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اُخروی جنّت (اور جہنم) پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے جنّت (اور جہنم) کا سلسلہ اسی دُنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں جنت کے متعلق کہا گیا کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ...... اس کی وسعتیں ارض و سمٰوات (جملہ کائنات) کو محیط ہیں۔ وہ ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ارضی جنّت خود بخود آجاتی ہے۔ یہ جنّت ہے متقیوں کے لئے۔

۳/۱۳۴ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۴)

یعنی، اُن لوگوں کے لئے جو (دوسروں کی کمائی پر نگاہ رکھنے کے بجائے) زندگی کی ہر حالت ـــــ غم و مسرت اور تنگی اور آسودگی ـــــ میں، اپنی محنت کی کمائی کو نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ جو اپنی زائد از ضرورت دولت ہی کو نہیں، قوت اور حرارت کو بھی (خواہ مخواہ مشتعل ہو کر تباہ و برباد کر دینے کے بجائے) تعمیری کاموں کی طرف منتقل (SUBLIMATE) کر دیتے ہیں؛ اور اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ دوسروں کی طرف سے اُن کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ ہوتا ہے۔ ان کا مقصد اپنی ذات اور معاشرہ میں حُسن پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ روش نظامِ خداوندی کے نزدیک بڑی پسندیدہ ہے۔

اس آیت میں ایک بڑا عمیق نفسیاتی نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ مومنین کی صفات میں کہا گیا ہے: وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ ـــ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ـــ غصہ کو دبانے والے ـــ عصرِ حاضر کی سائیکالوجی (علم النفس) کی تحقیق یہ ہے کہ غصہ (یا کسی اور جذبہ) کے دبانے (SUPPRESSION OF REPRESSION) سے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیاں (COMPLEXES) اور اعصابی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسی اعصابی بیماریاں جن کا کوئی طبعی (یا طبی) سبب

کاظمین الغیظ

معلوم نہ ہو سکے، ان کا علاج نفسیاتی طور پر کیا جاتا ہے۔ یعنی ماہرِ علم النفس کرید کرید کر معلوم یہ کرتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جسے دبا دیا گیا اور وہ اب مریض کے تحت الشعور سے اُس کا ذہنی اور اعصابی توازن بگاڑ رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غصہ کو دبا دینا قرآنی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

سائیکالوجی کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی جذبہ میں کسی وجہ سے شدت پیدا ہو جائے (شدت کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات کا توازن برقرار رکھنے کے لئے جس قدر جذبہ، توانائی، حرارت وغیرہ کی ضرورت ہے وہ اس سے زیادہ ہو جائے) تو ایسی صورت میں اس "زائد از ضرورت" جذبہ (یا توانائی) کا رُخ کسی دوسری سمت کو موڑ دینا چاہیئے جہاں اسے تعمیری کاموں میں صرف کیا جا سکے۔ اسے ان کی اصطلاح میں (SUBLIMATION) کہتے ہیں۔ یعنی انسانی جذبات یا توانائی کو پست سطح سے اٹھا کر بلند سطح کی طرف لے جانا۔

سائیکلوجی (PSYCHOLOGY) کی اِن تحقیقات کو سامنے رکھتے ہوئے اب اس آیت کی طرف آیئے۔ عربوں کے ہاں پانی کی بڑی کمی تھی۔ اُن کے ہاں تو آج بھی یہ حالت ہے کہ اُن کے دشت و صحرا پگھلا ہوا سونا (OIL) اگل رہے ہیں۔ جس سے دنیا بھر کی دولت اُن کی طرف سیلاب کی طرح اُمنڈے چلی آتی ہے لیکن وہ اپنے پینے کا پانی (بند برتنوں میں)

دوسرے ملکوں کے درآمد کرتے ہیں۔ انہیں "سونا" دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ ان سے پانی لیتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ صحرانشین عربوں کے لئے پانی کا مسئلہ کس قدر شدید تھا۔

انہی صحراؤں میں کہیں کہیں پانی ہوتا تھا۔ ایسے مقام پر وہ کرتے یہ تھے کہ پاس پاس بہت سے کنوئیں کھود لیتے تھے، اور انہیں آپس میں زمین دوز نالیوں (SUBTERRANEAN CHANNELS) کے ذریعے ملا دیتے تھے تاکہ جب کبھی کسی ایک کنوئیں کا پانی نیچے اُتر جائے تو دوسرے کنوئیں کا پانی خود بخود اس طرف آجائے (کیونکہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے)۔ اس طرح ایک کنوئیں کے زائد پانی کو دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل کرنے کے عمل کو وہ "کظامت" کہتے تھے۔ غور کیجئے کہ اس کا صحیح مفہوم (SUBLIMATION) نہیں تو اور کیا؟ "الکاظمین الغیظ" کے معنی یہ ہیں ان مؤمنین کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے ان کے غصہ میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اسے (وحشیوں کی طرح) تخریبی امور میں صرف کریں، اس کا رُخ دوسری طرف موڑ دیتے ہیں تاکہ اس زائد قوت کو تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس طرح (انفرادی طور پر) اس فرد کی ذات کا توازن بھی برقرار رہتا ہے اور (اجتماعی طور پر) معاشرہ کا توازن بھی۔ اسی لئے اِن "کاظمین الغیظ" پر عمل کرنے والوں کو محسنین کہہ کر پکارا۔ یعنی جن کا توازن برقرار رہتا ہے۔ جن کی ذات اور معاشرہ کا حُسن نہیں بگڑتا۔ (تفصیل انڈکس میں حسن کے زیرِ عنوان ملے گی۔ نیز نفس کے عنوان کے تحت)۔

مومنین کی اگلی خصوصیت یہ بتائی "وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ"۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں"۔ "معاف کر دینے" سے حقیقت نکھر کر سامنے نہیں آتی۔ "العفو" کی قرآنی اصطلاح کے متعلق دوسری اور تیسری

عَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ

جلد میں تفصیل آچکی ہے (دیکھئے انڈکس) یہاں عفو سے مراد وہ سلوک اور برتاؤ ہے جو معاشرہ میں دوسرے افراد سے کیا جائے گا۔ عفو کے معنی ہوتے ہیں کسی ناپسندیدہ بات کو زیادہ اہمیت نہ دینا اور ایسے لوگوں سے اُلجھے بغیر آگے بڑھ جانا۔ معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو کمینہ خصلت اور دنی الطبع ہوتے ہیں۔ وہ باہمی معاملات میں پست سطح پر اتر آتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ اُلجھنے کے بجائے، اپنا دامن بچا کر، شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاؤ اور اس طرح اپنی گراں قیمت صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔ دوسری جگہ ہے: وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ

لغویّت سے اعراض

اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳/۳) "یہ لوگ ہر قسم کی لغویت سے اعراض برتتے ہیں"۔ سورۂ فرقان میں ہے: اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵/۷۲) "اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی

لغزیں ان کی راہ میں آجائیں تو وہ اس سے کریمانہ انداز سے گزر کر آگے بڑھ جاتے ہیں"۔ یہ ہے عَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ کا مفہوم۔ یعنی وہ چھوٹی چھوٹی، ناقابلِ اعتنا باتوں میں الجھ کر اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرتے، بلکہ حُسن کارانہ انداز سے اُن سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مؤمنین کی صفات کے سلسلہ میں کہا :-

۳/۱۳۴ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥ (۳/۱۳۴)

اگر اُن سے کبھی (غلطی سے) کوئی معیوب حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا وہ اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں تو اُس پر اصرار نہیں کرتے، بلکہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں (۳/۱۰۱) اور اُس کے مطابق اپنی اصلاح کر کے اپنی غلطی کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں ــــ اور حقیقت یہ ہے کہ غلط اقدامات کے مُضر اثرات سے قانونِ خداوندی کے سوا کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟ {اس قانون کو (۱۱/۱۱۴) میں بیان کر دیا گیا ہے یعنی تعمیری کاموں سے تخریبی امور کے نقصان کے اثرات کا ازالہ}۔

فَاحِشَةً فحشاء کے معنی مطالب الفرقان جلد سوم ص۱۳۶ زیر آیت (۲/۱۶۸) واضح کئے جا چکے ہیں۔ فَاحِشَةً سے مُراد ہر معیوب اور قابلِ مذمت بات ہے۔ اس میں بے حیائی کی باتیں بھی آجاتی ہیں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں؛ فَعَلُوْا فَاحِشَةً اور اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ فَعَلُوْا فَاحِشَةً سے تو کسی معیوب بات کا سرزد ہو جانا مُراد ہے۔ لیکن ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اس سے الگ ہے۔ آپ سابقہ جلدوں میں نفس کا عنوان دیکھئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کے نفس" پر مرتب ہو جاتا ہے۔ جو کام، اس کے نفس (یا ذات) کی نشوونما کے راستے میں مخل ہوتے ہیں، انہیں اس کے نفس پر ظلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی اپنے آپ پر زیادتی۔ اس

اپنے آپ پر ظلم زیادتی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان سے کوئی جرم سرزد ہو جائے۔ اس جرم کا ایک اثر معاشرے پر پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا اثر خود اس شخص کی ذات پر بھی پڑتا ہے۔ یعنی اس کا جرم معاشرہ پر بھی ظلم ہوتا ہے اور اس کی ذات پر بھی ظلم۔

اب دوسری قسم کو لیجئے۔ ایک شخص آپ کو فریب دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ لیکن اسے ایسا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس لئے اُس سے معاشرہ پر ظلم سرزد نہیں ہوا۔ لیکن فریب دہی کے ارادے سے اس کے نفس پر تخریبی اثر تو مرتب ہو گیا۔ یعنی اُس نے اس سے اپنے آپ پر ظلم کر لیا۔ (تفصیل مکافاتِ عمل کے عنوان میں ملے

گی۔ دیکھئے انڈکس)

اپنے آپ پر ظلم کی دونوں قسمیں آپ کے سامنے آگئی ہیں۔ جو جُرم معاشرہ کے خلاف کیا جائے اور معاشرتی قانونِ عدل کی رُو سے اس کی سزا بھی مل جائے، اس سے دُنیاوی مکافات کا تقاضا تو پورا ہو گیا۔ لیکن اس کا جو اثر اُس شخص کی ذات پر ہوا تھا اُس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ نیٹشے نے اس لطیف سے فرق کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

جو جُرم تم نے میرے خلاف کیا ہے، اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اُس سے

جو جُرم تم نے اپنے آپ پر کیا ہے اسے کون معاف کر سکے گا؟

اسے معاف کرنے (یعنی اس کا جو اثر انسان کے اپنے نفس پر پڑا ہے، اُس کا اثر مٹانے) کے لئے انسان کو خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اسے توبہ اور استغفار کہا جاتا ہے۔ ان قرآنی اصطلاحات کا مفہوم سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے بیان کیا جا چکا ہے (انڈکس میں دیکھئے)۔

یہاں ایک نکتہ ایسا ہے جس کا اثر قانونِ عدل پر بھی پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کسی مُجرم کے جرم اور اس جرم کے تکرار و اصرار میں فرق نہیں کیا جاتا۔

سابقہ جلدوں میں جزا اور سزا کے فلسفہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے سامنے لائیے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ قرآنِ کریم کا مقصود اصلاح ہے، انتقام نہیں۔ انتقام کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے زندگی میں پہلی بار بھی کوئی لغزش سرزد ہو گئی ہے تو اُس کی بھی کھال اُدھیڑ دی جائے۔ لیکن اصلاح کا تقاضا ہے کہ ملزم اگر اپنے کئے پر نادم ہے

عادی مجرمین کو سزا

تو اسے اپنی اصلاح کا موقع دیا جائے۔ قرآنِ کریم نے اس مقام پر جو کہا ہے: وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوْا تو اس نے پہلی بار کے جُرم اور اس کے بار بار کے ارتکاب میں فرق کیا ہے۔ ندامت اور توبہ کی رُو سے اصلاح کی صورت میں سزا کی ضرورت نہیں۔ سزا اس مجرم کے لئے ہو گی جو بار بار اس جُرم کا اعادہ کرے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ـــــ مجرم کو علم ہو کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ خلافِ قانون ہے۔ اگر اُسے اس کا علم ہی نہیں، یا وہ دماغی طور پر اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو پھر بھی اس جُرم کی سزا نہیں دی جا سکتی۔

جو مومنین ان خصوصیات اور صفات کے حامل ہوں گے، اُن کے متعلق کہا:۔

۳/۱۳۵ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (۱۳۵/۳)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی اصلاح کا صلہ یہ ملتا ہے کہ خدا کا قانونِ ربوبیت، اُن کی سابقہ غلطی کے مُضر اثرات سے ان کی حفاظت کر دیتا ہے، اور انہیں زندگی کی سدا بہار خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں — اس دُنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

کام کرنے والوں کا یہ معاوضہ کس قدر حسین و خوشگوار ہے!

یہاں "نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ" کہہ کر واضح کر دیا کہ یہ صلہ اُن کے اپنے کاموں کا ہے۔ جنّت نہ مُفت میں ملتی ہے، نہ سفارش سے۔ یہ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبالؒ)

یا اس سے بھی مختصر الفاظ میں: جنّت تری پنہاں ہے ترے خُونِ جگر میں

بات چلی آ رہی تھی میدانِ کارزار میں حق و باطل میں تصادم کی۔ اس کے بعد جماعتِ مؤمنین (مجاہدین) کی صفات کا ذکر آ گیا۔ ازاں بعد پھر اسی سررشتۂ معنی کو آگے بڑھایا اور کہا:-

۳/۱۳۶ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳/۱۳۶)

اس ضمنی بیان کے بعد پھر اُسی موضوع کی طرف آؤ جو مسلسل چلا آ رہا ہے — اصول یہ بیان کیا جا رہا تھا کہ حق و باطل کے ٹکراؤ میں، باطل کی قوتیں شکست کھا کر خاسر و نامُراد رہ جاتی ہیں۔ یہ کوئی نیا اصول نہیں جو پہلی بار وضع کیا گیا ہو۔ یہ خدا کا ابدی قانون ہے جو شروع سے اسی طرح چلا آ رہا ہے) چنانچہ تم سے پہلے بہت سے نظام اور بہت سی اقوام گزر چکی ہیں۔ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو، اور ان برباد شدہ قوموں کی اُجڑی ہوئی بستیوں کو دیکھو۔ تمہیں نظر آ جائے گا کہ قوانینِ خداوندی کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

اور اس کے بعد کہا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشت اور اُن کے مآل و عواقب پر نگاہ تو ڈالو، تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم تم سے تاریخی داستانیں بیان کرنا چاہتے ہیں:-

۳/۱۳۷ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (۳/۱۳۷)

یہ اندازِ تذکیر (یعنی تاریخی شہادتوں سے نتائج اخذ کرنے کا طریق) اس لئے بنایا گیا ہے کہ لوگوں کے سامنے حقیقت اُبھر کر آ جائے، اور ان میں سے جو غلط روش کی تباہیوں سے بچنے کے آرزومند ہوں، انہیں

منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ، اور اخلاقی اقدار کے نشانات مل جائیں۔

یہ تعلیم و تذکیر "بیان" ہے، یعنی تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ راہ نمائی۔ ان میں سے مومنین نے ان ابدی صداقتوں کو بنیادی طور پر تسلیم کر لیا ہے اس لئے ان کا نصابِ تعلیم دوسرے لوگوں سے مختص ہوگا۔ (یہ اگلی کلاس میں پہنچ چکے ہیں، اس لئے ان کا نصاب مبتدیوں سے آگے ہوگا) تو اس لئے کہا:-

۳/۱۳۸ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸)

(خدا کے اس ابدی قانون کے مطابق) اگر تم بھی غلبہ و تسلط کی زندگی چاہتے ہو، تو اس کے لئے ایک اصول یاد رکھو۔ اور وہ یہ کہ جب فتح و کامرانی سے، سامانِ زیست کی فراوانی حاصل ہو، تو اس سے تمہارے اندر سستی اور کسلمندی نہ پیدا ہو جائے (۳/۱۱۰-۱۰۱) اور اگر کسی وقت حالات ناسازگار ہو جائیں، تو اس سے تم پہ افسردگی نہ چھا جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تمہیں قوانینِ خداوندی کی صداقت پہ پورا پورا یقین ہو۔

جب تم مومن ہو تو غمگینی اور افسردگی کے کیا معنی؟ جب تک تم اس روش پہ قائم رہو گے تم پہ کوئی بھی غالب نہیں آ سکے گا (۴/۱۴۱)۔

جماعتِ مومنین (اُمتِ مسلمہ) کا مقام یا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ تمام اقوامِ عالم پہ غالب ہوتی ہے۔ کسی قوم کا ان سے آگے بڑھ جانا تو درکنار، کوئی قوم ان کے ہم دوش بھی نہیں ہو سکتی۔ اَعْلَوْنَ کا لفظ اس کی شہادت دیتا ہے۔ یہ (SUPERLATIVE DEGREE) ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

اعلانِ خداوندی ہے کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱) یہ کبھی ہو نہیں سکے گا یہ ناممکن ہے کہ خدا کفار کو مومنین پہ غالب آ جانے دے۔

قرآن کریم نے جماعتِ مومنین (اُمتِ مسلمہ) کی یہ علامت بتائی ہے جس سے یہ متعین کرنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہو سکتی کہ ہمارا شمار جماعتِ مومنین میں ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر ہم اَعْلَوْنَ — سب سے بلند و بالا نہیں۔ اگر کفار ہم پہ غالب ہیں، تو خدائی فیصلہ کی رُو سے ہم مومن نہیں۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے، اسی لئے اس میں کسی کے بُرا ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے بعض دلوں میں یہ خیال ابھرا کہ اگر مومن ہونے کی شرط اور علامت یہ ہے تو ہمیں جو جنگِ اُحد میں شکست ہوئی تھی (خواہ وہ وقتی اور ہنگامی تھی) تو ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے جواب میں فرمایا:-

۳/۱۳۹ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ (۳/۱۳۹)

گردشِ دوابی باہمی ٹکراؤ میں ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ آج ایک فریق کا نقصان ہوگیا۔ کل دوسرے فریق کو شکست ہوگی۔ یہ مستقل غلبہ اور مغلوبیت نہیں ہوتی۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے جنگ وجدل کی ساری تاریخ اس گردشِ دوابی کا ریکارڈ ہے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ (۳/۱۳۹) اس امر کی ہر وقت جانچ ہوتی رہے (تم اپنے آپ کو (TEST) کرسکو کہ تمہارا) ایمان کس قدر محکم ہے اور کون اپنے دعوٰئے ایمان کی عملی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس قسم کی گردشوں میں اس کی احتیاط برتنی چاہیئے کہ تم کسی حالت میں بھی قوانینِ خداوندی سے سرتابی نہ برتو۔ فتح ہو یا شکست، قوانینِ خداوندی کا دامن کسی وقت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

۳/۱۴۰ **محو وثبات کا قانون** وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (۳/۱۴۰)

یہی وہ ٹکراؤ ہے جس سے وہ جماعت جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتی ہے، ناساعد حالات کی کٹھالی میں سے نکل کر، کندن بن جاتی ہے۔ اُسے ثبات واستحکام نصیب ہوتا ہے۔ اور، جو لوگ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں، کمزور ہوتے ہوتے مٹ جاتے ہیں۔

محص اور محق دونوں کا بنیادی مفہوم "کمی کرنا" ہوتا ہے۔ محص میں آلائشوں کو کم کرکے خالص اور محکم بنا دینے کا مفہوم ہوتا ہے، اور محق میں، توانوں کو کم کرکے مٹا دینے کا مفہوم۔ آگ ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ سونے کی آلائشوں کو دور کرکے اسے زرِ خالص بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ تصادمات اور ٹکراؤ، احتسابِ خویش کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتے ہیں:-

۳/۱۴۱ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ؀ (۳/۱۴۱)

یہ ہے محو وثبات کا وہ محکم اصول جس کے مطابق قومیں مٹتی اور باقی رہتی ہیں۔ اس کے بعد، تم اس خیالِ خام میں مگن رہو کہ تمہیں یونہی بیٹھے بٹھائے، کامرانیوں اور خوشگواریوں کی جنتی زندگی مل جائے گی، تو یہ تمہاری کتنی بڑی بھول ہوگی۔ یہ جنت حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہوگا کہ تم میں سے کون مسلسل جدوجہد کرتا ہے

اور باطل کے ساتھ ٹکراؤ میں ثابت قدم رہتا ہے (۲/۲۱۴)؛ (۹/۱۶)؛ (۲۹/۲)؛ (۳۳/۱۱-۱۰)۔

جنّت کس قدر جانکاہ مشقتوں کے بعد ملتی ہے، اس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں جنّت کا عنوان دیکھئے)۔ زیرِ نظر آیت (۳/۱۴۱) جلد سوم صفحہ ۲۹۷ پہ درج ہے۔ اس کے بعد وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم نے (خود فریبی کے لئے) حصولِ جنّت کے کس قدر آسان طریقے وضع کر رکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں "خود فریبی" کی ایک بیّن

حصولِ جنّت کے آسان طریقے

مثال سامنے آگئی۔ سورۂ الکہف میں دو باغوں والوں کا ایک تمثیلی قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک سرمایہ پرست ہے اور دوسرا محض گزارہ کرنے والا۔ سرمایہ پرست حسبِ معمول متکبّر بھی ہے اور مُستبد بھی۔ اس کا دوسرا ساتھی اسے وعظ و تلقین کر رہا ہے کہ وہ عدل و انصاف سے کام لے۔ وہ (سرمایہ پرست) بے اعتنائی برتتا ہے تو اس کا دوست اس سے کہتا ہے کہ چلئے! اسے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ تم دنیاوی زندگی خوشگواری سے گزارو گے؟ لیکن سوچو کہ کل قیامت کو، خدا کے حضور کیا جواب دو گے اور وہاں کے مواخذہ سے کس طرح بچ سکو گے۔ اس کے جواب میں اُس نے جو کچھ کہا ہے، وہ مذہبی خود فریبی کی درخشندہ مثال ہے۔ اُس نے کہا کہ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً اوّل تو میں سمجھتا ہوں کہ قیامت، آخرت وغیرہ سب افسانے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا (۱۸/۳۶) لیکن (جیسا کہ تم کہتے ہو) اگر بفرضِ محال خدا کے ہاں جانا بھی ہوا تو تم دیکھ لینا کہ وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ پُرآسائش مقام ملے گا۔ میں نے اس کا

یہاں بھی عیش وہاں بھی عیش

انتظام کر رکھا ہے! یہ انتظام کیا ہے؟ وہی جو ہمارا واعظ روز امیر آدمیوں کو سُناتا ہے ___ مسجد بنوا دو تو خدا تمہارے لئے جنّت میں موتیوں کا محل ریزرو کر دے گا۔ اپنی دولت میں سے اڑھائی فیصد غریب غرباء کو دے دو تو باقی دولت پاک اور صاف ہو جائے گی۔ حج کر آؤ تو ساری عُمر کے گناہ دُھل جائیں گے۔ صدقہ، خیرات، نذر نیاز سب حصولِ جنّت کے آسان طریقے ہیں۔ یہ ہیں وہ "اعمالِ حسنہ" جن کی بناء پہ وہ سرمایہ دار اپنے دوست سے کہتا تھا کہ تم دیکھ لینا، ہم وہاں بھی عیش کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مذہبی پیشوائیت کے معیار سے دیکھا جائے تو جنّت بنی ہی دولت مندوں کے لئے ہے۔ غریب بیچارے یہاں بھی دھکے کھاتے ہیں، وہاں بھی جہنّم رسید ہوں گے، اگرچہ ان کی طفل تسلی کے لئے ان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ جنّت بنی ہی غریبوں کے لئے ہے۔ امیروں کا اس میں گزر نہیں ہو گا۔

وہ حصولِ جنّت کے لئے قرآنی معیار۔ اور یہ ہے مذہب کی رُو سے خود فریبانہ ذریعہ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں راکہ خوش باش! — بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست (ارمغانِ حجاز)

یہ کہنے کے بعد جنت جان کے عوض ملتی ہے جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم نے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں فروخت کردیا تھا، جنت کے عوض (۹/۱۱۱)۔ وہ خدا کے ساتھ تمہارا معاہدہ تھا۔ اب اس معاہدہ کو پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اٹھو اور جان دے کر جنت خرید لو:۔

۳/۱۴۲ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ (۳/۱۴۲)

تمہیں یہ محکم اصول بھی بتایا گیا تھا کہ جیتا وہی ہے جو (حق کی راہ میں) مرنے کے لئے تیار رہتا ہے (۲/۹۴ ؛ ۲/۲۴۳) اس اصول کے مطابق تم، ہمیشہ مرنے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ اس وقت ہنوز اس کا موقع نہیں آیا تھا۔ اب وہ وقت آگیا ہے۔ اب تمہارا باطل کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا۔ جس میں موت تمہارے سامنے کھڑی ہوگی، اور تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوگے۔ اب معلوم ہوجائے گا کہ تم میں سے کس کی تمنا خام تھی اور کس کی پختہ!

اس کے بعد وہ آیتِ جلیلہ سامنے آتی ہے جس نے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے اہم مسائل حل کر کے رکھ دیئے ہیں۔ اسلام سے پہلے شخصیت پرستی کا دور تھا۔ سلطنت تھی تو ایک شخص کی ذات سے وابستہ۔ میدانِ جنگ میں شکست و

شخصیتوں کا دور ختم ہوگیا

فتح تھی تو ایک شخص (سپہ سالار) کی ذات کے ساتھ منسلک۔ اس وقت نظامِ اجتماعی کا تصور تک انسانوں کے سامنے نہیں تھا۔ اگر وہ شخص جو اس اجتماعیت کا نقطۂ پرکار تھا مرجاتا یا قتل کردیا جاتا تو قوم کا سارا شیرازہ بکھر جاتا۔ آپ دیکھیں گے کہ زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ انسانیت، شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ وہ تاریخ ہوتی ہی شخصیتوں کی تھی۔ لیکن اسلام نے آکر اس قدیم تصور کو یکسر بدل دیا۔ اُس نے کہا کہ قوموں کی ہیئتِ اجتماعیہ، شخصیتوں سے وابستہ نہیں؛ وہ نظام کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ جس قسم کا نظام

اجتماعی نظام کا دور

اُسی قسم کی اُس قوم کی ہیئت اجتماعی۔ جب تک اس کا نظام قائم رہے گا، وہ قوم زندہ رہے گی۔ جب وہ نظام مُضمحل یا منتشر ہوجائے گا، اس قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ لہٰذا، اب دورِ نظامہائے حیات آگیا ہے، شخصیتوں کا دور ختم ہوگیا۔

رسول اللہ نے ایک اُمت کی تشکیل فرمائی اور ایک مملکت قائم کی۔ عہدِ قدیم کے تصور کی رُو سے جماعت کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ اب تو یہ مملکت اس قدر مستحکم ہے۔ کل کو جب حضورؐ دُنیا سے تشریف لے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ اُمت میں اولوالعزم شخصیتیں موجود تھیں لیکن وہ رسول اللہ کا بدل تو نہیں ہو سکتی تھیں! صحابہؓ کے اس اندیشہ کے پیشِ نظر (بالخصوص اس لئے کہ اب رسول اللہ خود لڑائیوں میں بھی شریک ہوتے تھے جہاں موت کسی وقت بھی آسکتی تھی) اُن سے کہا گیا:-

۳ / ۱۴۳	وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۳/۳)

موت اور مقاتلہ کا ذکر آگیا ہے تو، اس ضمن میں ایک اہم اصول کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے - وہ یہ کہ تم اپنی زندگی اور قوت کا راز، اپنے نظام کے استحکام میں سمجھو - اسے شخصیتوں کے ساتھ وابستہ مت کرو - چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف اس باب میں محمدؐ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے - اس سے پہلے، اسی طرح، بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے - لہٰذا، اگر یہ پیغام رسان (محمدؐ) بھی کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے (۱۸۰/۳ ; ۱۸۲/۳ ; ۱۸۴/۳ ; ۳۰/۳۹) تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہوگیا؟ اور اُس کے بعد اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے - یاد رکھو! جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا، خود اپنا ہی نقصان کرے گا - لیکن جو ایمان کی روش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدرشناسی کرے گا، تو اُسے اُس کی کوششوں کا پورا پورا صلہ ملے گا - یعنی اس نظام کو، رسول کی موت کے بعد بھی، علیٰ حالہٖ قائم رکھنے سے - اُس وقت، رسولؐ کا جانشین (یعنی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی) وہی فرائض سرانجام دے گا جو فرائض اس وقت یہ رسولؐ (بحیثیت مرکزِ نظامِ خداوندی) سرانجام دیتا ہے - اس طرح دین (اسلام) آگے چلے گا -

اس آیت کی رُو سے، علاوہ دیگر مہماتِ اصول، ختمِ نبوّت کا مسئلہ بھی نہایت حُسن و خوبی سے حل ہوگیا۔ اگر رسول اللہ کے بعد کسی اور رسول نے بھی آنا ہوتا تو اس آیت میں کہا یہ جاتا کہ اگر کل کو یہ رسولؐ قتل ہو جائے یا اپنی طبعی موت سے انتقال کر جائے تو اس سے دین کا کچھ نقصان نہیں ہوگا - جیسا کہ شروع سے ہوتا چلا آیا ہے - ایک اور رسول آجائے گا اور دین کو پھر سے اس

ختمِ نبوّت

کی اصلی حالت پر لے آئے گا - لیکن یہ نہیں کہا - اس لئے کہ حضورؐ کی ذات پر سلسلۂ وحی ختم ہوگیا - آپؐ کے بعد کسی رسول نے نہیں آنا تھا - دین قرآن کی دفتین میں مکمل ہوگیا - قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا - رسول اللہؐ نے قرآنی اصول و اقدار کے مطابق ایک نظام قائم کر کے دکھا دیا - یہ نظام قرآنی بنیادوں پر آگے چلے گا -

لہٰذا، رسول اللہ کی وفات سے اسلام پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

قبل اس کے کہ ہم اس دلگداز اور عبرت انگیز المیہ کو سامنے لائیں کہ حضورؐ کے بعد ہم (مسلمانوں) نے کیا کیا، ایک نکتہ کی مختصر سی وضاحت ضروری ہے۔ اس آیت (۳/۱۴۴) میں کہا گیا ہے کہ اگر حضورؐ قتل کر دیئے جائیں یا وفات پا جائیں"۔ قتلِ انبیاء

حضورؐ کی وفات یا قتل

(اور اس کے امکان) کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۳۰ (زیرِ آیت ۲/۶۱) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ جہاں تک حضورؐ کی وفات کا تعلق، قرآن کریم نے، یہ کہہ کر، اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (۳۹/۳۰) "یہ حقیقت ہے کہ (اے رسولؐ!) تم نے بھی مرنا ہے اور اِن (تمہارے مخالفین) نے بھی مرنا ہے"۔ اور دوسرے مقام پر یہ کُلیہ بیان کر دیا کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴) "ہر متنفس (ذی حیات) نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔ موت ہر ایک کو آنی ہے"۔

آیت (۳/۱۴۴) میں جو کہا گیا ہے کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (۳/۱۴۴) اس رسولؐ سے پہلے بھی جتنے رسول علیہ آئے، سب اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس میں کسی کی بھی اِستثنا نہیں۔ اس سے وفات حضرت مسیحؑ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

اب آیئے اس المیہ کی طرف جسے ہم نے دل گداز اور عبرت انگیز کہہ کر پکارا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ سے کہا تھا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد تم زمانۂ قبل از اسلام کی روشِ کہن کی طرف نہ پلٹ جانا۔ اسلام نام تھا کتابُ اللہ پر مبنی نظام کا جس کا مدار شخصیتوں پر نہیں تھا، اور روشِ کہن سے مُراد تھی شخصیت پرستی۔ یہ تھی وہ وارننگ جو اللہ تعالیٰ نے دی تھی۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ بعینہٖ وہی جس سے خدا نے منع کیا تھا۔

حضورؐ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک تو اسلام کا نظام قائم رہا۔ اس کے بعد ہم شخصیتوں کی طرف پلٹ گئے۔ سب سے پہلے نظام کی جگہ شخصی حکومت نے لی، اور اس کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں شخصیت پرستی در آئی ——— نظام کی عدم

حضورؐ کی وفات کے بعد

موجودگی کا لازمی نتیجہ شخصیت پرستی ہوتا ہے۔ نظام میں جملہ اُمور کے فیصلے مرکزِ ملّت (حکومت کی سنٹرل اتھارٹی) کی طرف سے کئے جاتے، اور حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ نظام کے نہ رہنے سے زندگی میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہو گئی۔ دنیاوی امور حکومت نے سنبھال لئے اور "دینی امور" (یعنی مذہبی امور) علماء کے سپرد کر دئیے گئے۔ علماء میں سے ایک گروہ نے ائمہ محدثین (امام بخاریؒ۔ امام مسلمؒ وغیرہ) کو اتھارٹی بنا لیا اور دوسرے گروہ نے ائمہ فقہ (امام ابوحنیفہ۔ امام شافعی۔ امام مالک۔ امام حنبل رحمہم اللہ) کو اپنا مطاع۔ جب مدار شخصیتیں ٹھہریں تو پھر ان کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔ جس نے کسی شخصیت کو پسند کیا، اُسے اپنا

امام تسلیم کر لیا۔ (واضح رہے کہ میں یہاں شیعہ حضرات کے ائمہ کا ذکر نہیں کر رہا۔ وہ اپنے ائمہ کو ماموریں من اللہ مانتے ہیں، اور انہیں حضرت علیؓ کی اولاد میں محدود سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاں نظام کا تصور ہی نہیں) یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک مسلسل اور متواتر چلا آ رہا ہے۔ اس تمام دوران میں اسلام بحیثیت نظام خداوندی کہیں قائم نہیں ہوا۔ مسلمان اِسی زمانۂ قبل از اسلام کی روش پر گامزن چلے آئے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا۔ شریعت کا کوئی مسئلہ ہو، اس کی سند کسی شخصیت پر جا کر رُک جاتی ہے۔ نظام میں اس کی سند کتاب اللہ ہوتی ہے۔ اس کو قرآن کریم نے کفر و ایمان کا معیار قرار دیا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) اس کا واضح ارشاد اور حتمی فیصلہ ہے۔ یعنی "جو لوگ کتابُ اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے (معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کی رُو سے نہیں کرتے) وہی کافر ہیں۔"

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے شخصیت پرستی کے دور کو ابدی طور پر ختم کرنے کے لئے ختمِ نبوت کا اعلان کیا گیا تھا۔ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ امت کی ہدایت کے لئے اب کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ امت کو اپنے معاملات کے فیصلے کتابُ اللہ کے مطابق اپنے نظام کی رُو سے کرنے ہوں گے۔ ہم نے جب شخصیت پرستی کا اجرا (یا احیا) کیا تو

مجدّد۔ مہدی

ماموریں من اللہ کا تصوّر بھی ہمارے تحت الشعور میں کروٹیں لینے لگا۔ اس کے لئے ہم نے ہر صدی پر (مامور من اللہ) مجدّد کا عقیدہ وضع کیا۔ وحی کے قائم مقام، کشف اور الہام کا نظریہ مستعار لیا۔ آخری زمانے میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول اور امام مہدی کی آمد کا عقیدہ وضع کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے ہاں یہ تمام عقائد بھی مسلّم ہیں اور ختم نبوت پر ایمان بھی اپنی جگہ قائم۔ مدعیٔ نبوّت کے خلاف مناظرہ کرنے والے وہ علماء ہوتے ہیں جو کشف و الہام۔ مجدّد۔ نزول حضرت عیسیٰؑ اور آمدِ امام مہدی کے قائل ہوتے ہیں۔

یہ تمام خلفشار کس بات کا نتیجہ ہے؟ نظام کے باقی نہ رہنے کا! ہمارے زمانے میں اسلامی نظام کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام کے داعی کون لوگ ہیں؟ وہی جو شخصیتوں کو اسلام میں سند اور حجّت تسلیم کرتے ہیں اور اپنے اس عقیدہ میں ذرا سی ترمیم بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ نتیجہ یہ کہ ان کے تصور کے اسلامی نظام میں شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنے اپنے ہوں گے۔ اور پبلک لاز (PUBLIC LQWS) اس فقہ کے مطابق جس کے ماننے والوں کی اکثریت ہو گی۔

اسلامی نظام

یاد رکھیئے! اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو گا جب:-

۱۔ سب مسلمان ایک اُمت کے افراد ہوں۔ ان میں نہ مذہبی فرقے ہوں، نہ سیاسی پارٹیاں۔

۲۔ ساری قوم پر ایک ضابطۂ قوانین لاگو ہو۔ اس میں نہ شخصی قوانین اور پبلک لاز کی تفریق ہو، نہ کسی خاص فقہ کا عملی دخل۔ یہ ضابطہ قوانین خدا کی کتاب پر مبنی ہو، اور ان قوانین پر عمل درآمد کے طریق اُمت کے باہمی مشورے سے طے پائیں۔

اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ہم اسلام پر نہیں۔ زمانۂ قبل از اسلام کی روش پر گامزن ہوں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس سختی سے منع کیا تھا۔

آیت (۳/۱۴۴) میں نبی اکرمؐ کی وفات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے :-

۳/۱۴۴ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ (۳/۱۴۴)

ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "کوئی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے۔ لکھا ہوا ہے ایک وقت مقررہ" (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم)۔ اس ترجمہ کی رُو سے یہ عقیدہ عام ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اور خدا کے حکم کے بغیر کسی کو

کیا موت کا وقت مقرر ہے؟

موت نہیں آسکتی۔ اس ترجمہ کی رُو سے وہ تمام اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر تقدیر کے موضوع میں کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)۔ ایک اُلجھن توبڑی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جرمِ قتل کی سزا موت مقرر کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ قتل خدا کے حکم سے ہوا اور اس کے مقرر کئے ہوئے وقت پر، تو پھر قاتل کا جُرم کیا جس کی اُسے سزا دی جارہی ہے؟ ایک طرف خُدا قاتل کو حکم دیتا ہے کہ فلاں شخص کو قتل کر دو، اور دوسری طرف وہ عدالت سے کہتا ہے کہ قاتل کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دو!

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اِذْنِ اللّٰهِ کے معنی خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ لہٰذا، آیت کے اتنے حصے کا ترجمہ یہ ہوا کہ ہر شخص کی موت قانونِ خداوندی کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ "كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا"۔ اس میں مُّؤَجَّلًا کا لفظ وضاحت طلب ہے۔

ہمارے ہاں اجل کے معنی کئے جاتے ہیں۔ 'موت'۔ "فلاں کی اجل آگئی" عام استعمال کے الفاظ ہیں۔ لیکن عربی زبان

اجل کے معنی

کی رُو سے اجل کے معنی ہوتے ہیں دو حادثات یا واقعات کا درمیانی وقفہ۔ اسے مدت یا میعاد کہا جاتا ہے۔ انسان کی پیدائش اور اس کی موت کے درمیانی وقفہ کو اجل کہا جائے گا۔ اسے عام الفاظ میں عمر کہا جاتا ہے۔ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا کے معنی یہ ہیں کہ یہ وقفہ (جسے عمر کہا جاتا ہے) خُدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق

مقرر کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص حفظانِ صحت سے متعلق قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ درمیانی وقفہ (اجل یا عمر) لمبا ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص بڑی بے احتیاطی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ عرصہ کم ہو جاتا ہے۔ اور خودکشی کرنیوالا تو جس وقت بھی چاہیئے تو اسے ختم کر سکتا ہے۔ اسی لئے فرمایا: لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) "ہر وقفہ قانونِ خداوندی کے مطابق مقرر ہوتا ہے"۔ پہلے سے مقرر شدہ نہیں ہوتا۔ اس قانون کے مطابق جس کا جی چاہے اپنی عمر گھٹالے جس کا جی چاہے اسے بڑھالے — وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (۳۵/۱۱)۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانی صحت کے متعلق جس قدر تحقیقات ہو رہی ہیں ان کی رُو سے مختلف قوموں کے افراد کی اوسط عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیت زیرِ نظر پر دوبارہ نگاہ ڈالیئے:-

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۴)

ہر شخص کی موت خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق واقعہ ہوتی ہے۔ اُس کی عمر کا تعین اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

عمر کے تعین کے بعد، زندگی کا مقصد بھی انسان خود متعین کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو قسم کے لوگ ملیں گے۔ ایک وہ جو محض اس دنیا کے مفادات کو اپنا مقصود و مُنتہا سمجھیں، اور دوسرے وہ جو دنیاوی مفاد کے ساتھ اُخروی زندگی کے مفاد کو بھی سامنے رکھیں۔ جو جس قسم کا نصب العین اپنے سامنے رکھے گا، اُسی کے مطابق اس کی کوششیں بار آور ہوں گی: وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ○ (۳/۱۴۴)

مذہب کی دنیا میں ثواب کا لفظ جس قدر کثیر الاستعمال ہے اسی قدر بعید المفہوم ہے۔ اس قسم کے الفاظ صبح و شام آپ کے سُننے میں آتے ہوں گے — "فلاں نماز کے بعد آٹھ نفل پڑھ لئے جائیں تو اس کا بڑا ثواب ہوتا ہے"۔

ثواب کے معنی

"فجر کی نماز کے بعد یہ وظیفہ پڑھ لیا جائے تو اس کا بہت ثواب ہوتا ہے" — "فلاں مسجد میں نماز پڑھنے سے سو رکعتوں کا ثواب ملتا ہے" — آپ نے یہ لفظ سینکڑوں، ہزاروں بار سُنا ہوگا، لیکن اگر آپ ان الفاظ کے دُہرانے والوں سے پُوچھیں کہ صاحب! یہ ثواب ہوتا کیا ہے؟ تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے۔ وہ بھی اتنا ہی کہیں گے کہ "ثواب ہوتا ہے"۔ اگر آپ یہ پوچھیں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا تھا اس پر تو میں نے عمل کر دیا، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ مجھے اس کا ثواب بھی ملا ہے؟ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کا حساب خدا کے ہاں ہوتا ہے۔ یعنی ثواب ایک ایسا لفظ ہے جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں۔ اس کا تعلق آپ کے اعتقاد سے ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ فلاں کام کرنے سے مجھے اتنا ثواب ہوگا، تو آپ کو اس سے اطمینان حاصل ہو جائے گا

کہ (مجھے اتنا ثواب ہو گیا)۔ اس کا ثبوت کچھ نہیں کہ آپ کو واقعی ثواب مل گیا ہے؟

جو چیز چلی جائے، اس کے پھر سے واپس مل جانے" کو عربی زبان میں ثواب کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں" ثَابَ جِسمہٗ ثَوبانًا واثاب" — بیماری کے بعد اُس کا جسم پھر اپنی اصلی حالت پر آنے لگا اور اس طرح اس کی ضائع شدہ صحت اور توانائی پھر عُود آئی۔ اگر کسی حوض کی یہ کیفیت ہو کہ اس سے جس قدر پانی نکلے اُتنا ہی پیچھے سے آتا جائے تو اسے ثاب الماء کہیں گے۔

آپ کوئی بھی کام کیجئے، اس میں آپ کا وقت، توانائی اور ذہنی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔ اگر آپ کا وہ کام بے کار ہے۔ یعنی اس کا کوئی حاصل نہیں۔ تو آپ نے جو کچھ صرف کیا تھا، سب ضائع چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ کام نتیجہ خیز ہے، تو آپ نے جو کچھ صرف کیا تھا، وہ سب واپس مل جاتا ہے۔ اس (RESTORATION) کا نام ثواب ہے۔ کاروباری اصطلاح میں اسے اس سرمایہ کی (RETURN) کہیں گے جو لگایا گیا تھا۔ لہٰذا، ثواب کے معنی انسانی اعمال کے نتائج ہوں گے — جس قسم کے اعمال اسی قسم کے نتائج (ثواب) — نتائج کے لئے بھی قرآن میں یہ لفظ آیا ہے۔ سورۂ التطفیف میں ہے؛ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ — (۸۳/۳۶) کفار کو اُن کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ (اس مادہ سے کچھ اور معانی بھی آتے ہیں، اُن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر ہو گا)۔

سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق کام کرنے کے نتائج اسی دُنیا میں بھی مرتب ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور آخرت میں بھی سامنے آئیں گے۔ (انڈکس میں دیکھئے عنوان "دنیا") اسی بناء پر آیہ زیرِ نظر میں ثواب الدُّنیا اور ثواب الآخرۃ کہا گیا ہے۔ اور میں نے اس کا ترجمہ دنیاوی مفاد اور اُخروی مفاد کیا ہے۔ اسے آپ دنیاوی مفاد اور اُخروی مفاد کا حصّہ کہہ سکتے ہیں۔ مقصد بہر حال اعمال کے نتائج ہی ہے۔ اس ثواب کا مفہوم نظامِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں ہیں۔

ثواب کے اس قرآنی مفہوم سے یہ بھی واضح ہے کہ "ایصالِ ثواب" کا عقیدہ غیر قرآنی ہے۔ جب ثواب نام ہے ہر شخص کے اپنے عمل کے نتیجہ کا، تو کسی دوسرے کی طرف (اور وہ بھی مُردوں کی طرف) ثواب منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل اس اجمال کی "مکافاتِ عمل" کے زیرِ عنوان ملے گی (دیکھئے انڈکس)

بات کشمکشِ حق و باطل کی ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں کہا کہ جن تصادمات سے تم دوچار ہو رہے ہو، یہ کوئی بات نہیں۔ شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

۳/۱۴۵ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۵)

یہ بات کہ، تمہیں اپنے نظام کے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا، کوئی نئی بات نہیں، تم سے پہلے کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کی معیت میں نظامِ ربوبیت کے علمبرداروں نے مخالفین سے جنگ کی۔ اس راہ میں انہیں جو تکالیف پیش آئیں ان سے نہ تو اُن کے عزائم میں لغزش آئی۔ نہ اُن میں کمزوری پیدا ہوئی۔ نہ ہی وہ مسلسل محنت سے ہمت ہار گئے اور انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے۔ وہ ان تمام مشکل مراحل میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہے اور اسی لئے خُدا کا قانون اُن کا ساتھ دیتا رہا ــــ اس کے ہاں ثبات اور استقامت بڑی پسندیدہ خصلت ہے (۲/۲۱۴)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ انبیاءؑ کے ساتھ اُن کے رُفقاء نے بھی اس کشمکش میں برابر کا حصہ لیا۔ حضرات انبیائے کرامؑ کے رفقاء کی اہمیت اور ان کی بلندیٔ مقام کے متعلق انڈکس میں "صحابہ" کا عنوان دیکھئے۔ ان کی خصوصیت یہ بتائی کہ

۳/۱۴۶ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۶)

یہ لوگ اپنے آہنی عزم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اُن کی زبان پر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے کوئی لغزش یا کوتاہی ہو جائے، یا کسی معاملہ میں ہم حد سے بڑھ جائیں، تو ہمیں، ہماری ان غلطیوں کے مُضر اثرات سے محفوظ رکھنا۔ ہمیں ثابت قدم رہنے کی توفیق دینا، اور مخالفین پر غلبہ اور کامیابی عطا کرنا۔

غور کیجئے کہ مقام کون سا ہے! میدانِ جنگ جہاں جذبات کی اس قدر شدت ہوتی ہے کہ لڑنے والا (گویا) نشہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ مؤمنین کا شعار یہ ہے کہ وہ اس حالت میں بھی قوانینِ خداوندی کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یہاں دو قسم کی لغزشوں سے حفاظت کی آرزو کی گئی ہے۔ ایک ذنب اور دوسرا اسراف۔ ذنب کے معنی سہو یا کوتاہی سمجھئے

ذنب اور اسراف

یعنی جہاں جو کچھ کرنا چاہیئے تھا اس میں اگر ذرا سی کوتاہی یا سہو ہو گیا ہو، تو اس سے جو نقصان پہنچ گیا ہو اُس کی حفاظت۔ اور اسراف کے معنی ہیں حد سے آگے بڑھ جانا۔ یا کوئی کام اس طرح کرنا کہ اس سے جو مقصد حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو سکے۔

لہٰذا، ذنب اور اسراف سے بچنے کی آرزو کے معنی یہ ہوئے کہ میدانِ کارزار میں اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ جو کچھ ہمیں کرنا چاہیئے تھا، اس میں کوتاہی ہو گئی۔ یا ہم دشمن کی مخالفت میں (خدا کی مقرر کردہ) حد سے بڑھ گئے تو اس سے حفاظت کی دُعا!

انگریزی زبان میں اسے (OMISSION AND COMMISSION) کہا جائے گا۔ یہ ہے میدانِ جنگ تک میں مؤمنین کا شعار! اور اس کا نتیجہ؟

۳/۱۴۷ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۟ (۳/۱۴۷)

یہ تھے وہ لوگ جنہیں ہم نے، اُن کے حُسنِ عمل کے بدلے، دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا کیں اور آخرت کی زندگی کی نعمتیں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کے نزدیک وہی لوگ پسندیدہ قرار پاتے ہیں جو حُسن کارانہ انداز سے، بلند کردار کا ثبوت دیں۔

آیت (۳/۱۴۴) میں ثواب کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے، اس کی محسوس وضاحت سامنے آگئی۔ میدانِ جنگ میں فتح و کامرانی سے جو" ثواب الدُنیا" حاصل ہوتے ہیں اُن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ثواب مبہم یا غیر محسوس نہیں ہوتا۔ وہ "ثواب" ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔ مؤمنین کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں ثواب الدنیا بھی حاصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ثواب الآخرۃ بھی ــــ اور ثواب الآخرۃ، دنیاوی ثواب سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔ مؤمنین کی دُنیاوی زندگی بھی حسین ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی۔ اسی بنا پر انہیں محسنین کہا گیا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ وہ جو تمہیں کہا گیا تھا کہ رسولؐ کی وفات کے بعد انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴) کی کیفیت پیدا نہ کر لینا یعنی زمانہ قبل از اسلام کی طرف نہ پلٹ جانا، تو اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ ایسا کس طرح ہوا کرتا ہے۔ فرمایا:-

۳/۱۴۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۸)

اے جماعتِ مُومنین! تم اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ نظام، کسی شخص کی موت سے درہم برہم نہیں ہو سکے گا (۳/۱۴۴)۔ اس میں خرابی واقع ہوگی تو اس طرح کہ تم اُن لوگوں کی بات ماننے لگ جاؤ (اور اُن جیسے کام کرنے لگ جاؤ) جو اس نظام کے مخالف ہیں۔ یعنی تم کفار کا شیوہ اختیار کر لو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ لوگ، پھر اسی راستے کی طرف لے جائیں گے جس پر تم اس سے پہلے چلتے تھے۔ اس سے تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

ہماری ساری تاریخ اسی اجمال کی تفصیل ہے جب ہم نے غیر مسلموں کے عقائد، نظریات، تصورات، حتّٰی کہ مشارب و مسالک اختیار کر لئے۔ تو اسلامی نظام درہم برہم ہو گیا۔ اور ہم پھر عہدِ جاہلیہ کے دور میں پہنچ گئے۔ ہمارا موجودہ اسلام، انہی غیر قرآنی تصورات و معتقدات کا مجموعہ ہے اور جسے تبلیغِ اسلام، خدمتِ اسلام اور (آج کل کی اصطلاح میں) احیاءِ اسلام کہہ کر پکارا

جاتا ہے، وہ درحقیقت اپنی تصورات و معتقدات کو محکم سے محکم تر بنانے کی کوششیں ہیں۔ غلط پٹڑی پر پڑی ہوئی گاڑی کی رفتار میں جس قدر تیزی پیدا کی جائے، وہ اتنی ہی سرعت سے منزلِ مقصود سے دور لے جائے گی۔

اور اسی روش کا نتیجہ: فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ — تباہی، بربادی، نقصان، خسارہ!

۳/۱۴۹ اس کا علاج — بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۹)۔ خالص خدا کی اطاعت۔ اس لئے کہ وہی تمہارا مربی و نگہبان ہے، اور وہی حامی و ناصر۔ اس سے دنیا کی کوئی قوم تم پر غالب نہیں آئے گی۔ (۳/۱۳۸)

ان دونوں روشوں کا فرق کیا ہوگا؟ یعنی خدا کی اطاعت اور انسانوں کی اطاعت کا فرق؟ فرمایا:-

۳/۱۵۰ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۳/۱۵۰)

اگر تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے رہے تو تمہارے دل بے خوف اور بے باک ہو جائیں گے، — کیونکہ توحید کا لازمی نتیجہ بے خوفی ہے (۲/۳۸)۔ اس کے برعکس، جو لوگ توحید سے انکار کر کے شرک کرنے لگ جاتے ہیں وہ مقامِ آدمیت سے گر جاتے ہیں۔ میزانِ زندگی میں ان کا کوئی وزن نہیں رہتا (۲۶/۳۱)۔ اور ان کے سینے خوف کے نشیمن بن جاتے ہیں۔ شرک، انسان کا خود ساختہ عقیدہ اور اس کے ذہن کی پستی کی علامت ہے۔ خدا کی طرف سے، اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں ہوئی۔

یاد رکھئے توحید کے معنی ہیں صرف خدا کی محکومیت اختیار کرنا، جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے (۶/۱۱۵؛ ۵/۴۴)۔ اگر کتاب اللہ کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو شامل کر لیا جائے تو یہ شرک ہوگا (۱۲/۳۹؛ ۱۸/۲۶؛ ۱۸/۱۱۰؛ ۳۹/۲۹؛ ۴۲/۲۱)۔ شرک ظلمِ عظیم ہے (۳۱/۱۳)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خدا کو اس کے مقامِ بلند سے اتار کر نیچے لایا جاتا ہے۔ اور انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے اوپر لے جا کر مسندِ الوہیت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اپنے جیسے انسانوں کو "خدا بنا لینا" اور ان کی محکومیت اختیار کر لینا وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس سے لوگوں کی کیفیت وہ ہو جاتی ہے جس کا ذکر (۱۷/۴۲؛ ۳۹/۴۵) میں کیا گیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شرک کا نتیجہ خوف، اور خوف کا نتیجہ وہ جہنم کی آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (۱۰۴/۶-۷)۔ سو دیکھو کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کریں ان کا ٹھکانا کس قدر المناک اور ناخوشگوار ہوتا ہے۔

شرک کیا ہے اور اس کا نتیجہ خوف اور بزدلی کیوں ہوتا ہے۔ اس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ انڈکس میں حوالے مل جائیں گے۔

اس کے بعد جنگِ اُحد کے کوائف شروع ہوتے ہیں جو آیت (۳/۱۵۱) سے آیت (۳/۱۷۸) تک چلے جاتے ہیں۔ ان آیات کو پہلے لکھا جا چکا ہے۔

نظامِ اسلامی کے قیام کی جدوجہد کے سلسلے میں بھی مال و دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد اس مقصد کے حصول کے لئے بھی جس کے لئے یہ نظام قائم ہوتا ہے۔ یعنی نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لئے۔ مال و دولت کو ان مقاصد کے لئے کھلا رکھنے کے لئے قرآنِ کریم میں "انفاق فی سبیل اللہ" کی اصطلاح آئی ہے۔ اس اصطلاح کے لئے مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۱۰۵، جلد سوم صفحات ۳۰۳؛ ۳۲۶؛ ۴۱۶ دیکھئے۔ اور قرآن کے معاشی نظام کے لئے عنوان "معاشی نظام" (جس کے حوالے انڈکس میں ملیں گے)

انفاق کی ضد بخل ہے جس کے معنی سب کچھ اپنے لئے روک کر رکھ لینے کے ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا:-

۳/۱۷۹ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۳/۱۷۹)

اس نظام کا مقصد ہے نوعِ انسان کی عالمگیر پرورش۔ سو جو لوگ، اس سامانِ معیشت کو، جسے اللہ نے انہیں دے رکھا ہے، اُن لوگوں سے روک لیں جنہیں اس کی ضرورت ہے، تو وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ روش اُن کے حق میں بہت اچھی ہے۔ نہیں! یہ روش اُن کے لئے بڑی خرابی کا موجب ہے۔ جب نظامِ ربوبیت کے انقلاب کا وقت آئے گا، تو یہی سامان اُن کے گلے کا ہار ہو جائے گا۔ اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی یہ اُن کے لئے عذاب کا موجب ہوگا۔ (۹/۳۵؛ ۱۰۴/۲-۹؛ ۷۰/۱۸-۱۷؛ ۴۷/۳۸)۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام اشیائے کائنات، جن سے ان کا جمع کردہ مال اور اسباب ترکیب پاتا ہے، خدا کی ملکیت ہیں (اور اُس نے انہیں تمام انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا (۵۵/۱۰)۔ اس لئے کسی کا، انہیں صرف اپنے فائدے کے لئے سمیٹ کر رکھ لینا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ (ان سے کہدو کہ) تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

بخل سنگین جرم ہے

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ربوٰا اسی معاشی نظام کا نام ہے جو قرآنی نظامِ معیشت کی ضد ہے۔ اس لئے جو لوگ اس نظام کو نہ چھوڑیں، اسلامی نظام اُن کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔ ربوٰا اور بخل میں فرق یہ ہے کہ ربوا میں خالی سرمایہ پر مفاد حاصل کیا جاتا ہے اور بخل میں اپنے فاضلہ روپے کو منفعتِ عامہ کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اسے اپنے لئے روک کر رکھ لیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک اس

بخیل قوم باقی نہیں رہتی

قسم کی ذہنیت اور اس کی حامل قوم قرآنی معیار پر پوری نہیں اترتی - اس لئے اس قابل نہیں کہ وہ باقی رہ سکے - سورۂ محمد میں ایک نہایت اہم فیصلۂ خداوندی کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَكُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ۠ (۴۷/۳۸)

تم ہیں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے، اپنا مال کھلا رکھیں تو وہ بخل کرتے ہیں - انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو شخص اس معاملے میں بخل سے کام لیتا ہے، تو وہ بخل خود اس کی اپنی ذات کے خلاف جاتا ہے - اللہ تمہارا محتاج نہیں (کہ تم اسے نہ دوگے تو اس کی ضرورت رُکی رہ جائے گی) - تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے نظام کے محتاج ہو - اگر تم اس نظام سے روگردانی کروگے، اور اپنے عہد سے پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہاری جیسی نہیں ہوگی (اس لئے کہ قوموں کی موت وحیات اور استخلاف و استبدال کا قانون یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظامِ زندگی کی حامل ہو، وہ باقی رہتی ہے - جو غلط نظام رائج کرے، وہ تباہ ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو - قوموں کی موت وحیات کے فیصلے زندگی کے متعلق اُن کے نظریات اور عملی نظام کی رُو سے ہوتے ہیں) -

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ میزانِ خداوندی کی رُو سے بخل کتنا بڑا سنگین جرم ہے - اس نظام کی حامل قوم مصافِ زندگی میں باقی رہنے کے قابل نہیں ہوتی - اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے - ہمارے ہاں ربوا کے متعلق تو اس قدر بحثیں ہوتی ہیں (اگرچہ وہ بھی سُود یا بیاج کے معنوں میں) لیکن بُخل کے متعلق کبھی کوئی بحث نہیں ہوتی - اسے زیادہ سے زیادہ ایک معیوب عادت خیال کیا جاتا ہے - "وہ بڑا بخیل ہے" کہہ کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم اسے استبدالِ قومی کا بنیادی سبب قرار دیتا ہے - فاضلہ دولت، منفعتِ عامہ کے لئے کھلی رکھنے کے لئے ہے - نہ سرمایہ داری کے لئے اور نہ ہی روک رکھنے کے لئے - انفاق اور قرض فی سبیل اللہ کی آیات میں سطحی نگاہ سے دیکھنے والے نکتہ چینوں کو یہ بات ہاتھ میں آجاتی ہے کہ خدا تم لوگوں سے قرض مانگتا ہے تو کیا وہ محتاج ہے ؟ قرضِ حسنہ کے لئے دیکھئے انڈکس) اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

۳/۱۸۰ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○ (۳/۱۸۰)

ہمیں اُن کا بھی علم ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی کے محتاج نہیں؛ اور خدا یہ جو ان سے مال و دولت طلب کرتا ہے' ان کا محتاج ہے۔ ہم ان کی ان تمام باتوں کو، ایک ایک کرکے' نوٹ کر رہے ہیں۔ اسی قسم کے لوگ تھے جو' اس زعم باطل میں کہ وہ کسی کے محتاج نہیں — انہیں کسی کی کیا پرواہ ہے — اس نظام کی طرف دعوت دینے والے انبیاءؑ کی تخریب اور قتل کے ناحق درپے ہوگئے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ان کا سرمایہ اور اندوختہ ان کے کسی کام نہیں آئے گا، اور زندگی کی تمام لذتیں ان کے لئے زہر کا گھونٹ بن جائیں گی۔

خدا محتاج نہیں

سورۂ یٰسین میں کہا گیا ہے کہ اس قسم کی کٹ حجتیاں کرنے والے' اپنے بخل کو تقدیر کے پردے میں چھپانے کی سعیٔ ناکام کرتے ہیں۔ فرمایا :-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (۳۶/۴۷)

اور اس ضمن میں عجیب عجیب قسم کے اعتراضات پیش کرتے ہیں۔ (مثلاً) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو سامانِ زیست تمہیں خدا کے ہاں سے ملا ہے' اسے حاجت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو' تو جو لوگ خدا کے نظامِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں، وہ' ان لوگوں سے' جو اس نظام پر ایمان رکھتے ہیں' کہتے ہیں کہ اگر خدا کا یہی منشاء تھا کہ رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ دُنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے' تو اُس نے خود ہی ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا؟ انسانوں سے کیوں کہا کہ تم ایسا معاشرہ قائم کرو' جس میں ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں؟

انہیں کون بتائے کہ ایسا کہنے میں یہ کس قدر سخت غلطی کرتے ہیں۔ (انسانی معاشرہ میں' خدا اپنے نظام کو انسانی ہاتھوں سے قائم کرایا کرتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کرے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ ورنہ اُس (خدا) کے لئے کیا مشکل تھا کہ جس طرح اُس نے اشیائے کائنات کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں' اسی طرح انسانوں کو بھی مجبور پیدا کر دیتا — یہ کہہ کر کہ، اگر خدا کو منظور ہوتا تو ایسا کیوں نہ ہو جاتا، انسان اپنے آپ کو اختیار و ارادہ کے شرف سے محروم کرنا اور اپنی ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی بہت بڑی غلط نگہی ہے (۶/۱۴۹؛ ۱۶/۳۵؛ ۴۳/۲۰)۔

غور کیجئے۔ انسان کا اپنی بخیلی کو تقدیر کے پردہ میں چھپانے کو کا فرانہ شیوہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن نظام سرمایہ داری کو "دین" بنانے والے ان باتوں پر کب کان دھر سکتے ہیں؟ انہوں نے تقدیر کا بہانہ بنایا تھا۔ ان سے کہا کہ یہ تباہی تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوگی:۔

۳/۱۸۱ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ؕ (۳/۱۸۱)

ان کے ساتھ یہ کچھ ظلم اور زیادتی کی بنا پر نہیں ہوگا ــــ خدا کے قانون میں ظلم اور زیادتی کا کیا کام؟ یہ نتیجہ ہوگا اُن کے اپنے اعمال کا۔

مدینہ میں سب سے زیادہ مخالفت یہودیوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہب پرست قوم کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ جب اُن سے کسی ٹھوس، محسوس، پرابلم کے متعلق گفتگو کی جائے جس کا ان کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہ ہو، تو وہ (اس موضوع سے ہٹ کر) فریقِ مقابل کو نظری مسائل میں اُلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت موسٰیؑ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر دو۔ میں انہیں کسی دوسری جگہ لے جاؤں گا۔ اُس کے پاس حضرت موسٰیؑ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے اُن کی بات بیچ میں سے کاٹی اور کہا کہ موسٰیؑ! ذرا یہ بتاؤ کہ ہمارے بزرگ جو مر گئے ہیں، اُن کا کیا حال ہے؟ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں ــــ (قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۲۰/۵۱) ــــ یہ سوال کسی مولوی صاحب سے کیا جاتا، تو وہ ساری رات اس بحث میں ضائع کر دیتا۔ لیکن وہ تو خدا کے رسولؑ تھے، وہ فرعون کے جھانسے میں کب آنے والے تھے۔ فرمایا: عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ (۲۰/۵۲)۔ "اُن کا علم میرے رب کی کتاب آخرت میں ہے"۔ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى۔ (۲۰/۵۲) "وہ نہ غلطی کرتا ہے، نہ بھولتا ہے"۔ اس لئے وہ ان سے ٹھیک ٹھیک نپٹ لے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

یہودیوں کے ساتھ بات ہو رہی تھی نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے انفاق کی۔ بات ایسی معقول تھی کہ اُن سے اس کا جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جو آپ کی بات نہیں مان رہے تو اس کی وجہ کچھ اور ہے:۔

۳/۱۸۲ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (۳/۱۸۲)

یہ (یہودی) کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ تم کسی رسول پر ایمان نہ لانا جب تک وہ تمہارے پاس

سوختنی قربانیوں کا حکم نہ لائے۔ (یہ سب ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ اللہ نے ان سے کہیں ایسا نہیں کہا تھا)
ان سے کہو کہ اگر تمہارا اعتراض یہی ہے تو یہ بتاؤ کہ، مجھ سے پہلے، تمہاری طرف بہت سے رسول آئے جو اپنے ساتھ واضح
احکام و دلائل لائے۔ (اور بقول تمہارے) انہوں نے سوختنی قربانی کا بھی حکم دیا۔ تو تم، اُن پہ ایمان لانے کے بجائے
ان کی تخریب اور قتل تک کے درپے کیوں ہو گئے؟ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو اِس کا جواب دو؟

انہیں تو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا اور نبی کریمؐ سے فرمایا:۔

۳/۱۸۳	فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۳/۱۸۳)

سو (اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ، اس قدر واضح دلائل کے باوجود تمہارے مبنی بر وحی پیغامات کی تکذیب کرتے ہیں (۲۲/۴۲)، تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہی چلا آیا ہے۔ تم سے پہلے بھی، رسولوں کی، اسی طرح تکذیب ہوتی رہی ہے، جو واضح دلائل اور آسمانی صحیفے، یعنی (انسانی عقل کو) جلا بخشنے والے قوانین، لائے تھے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ رسولوں کو بینات۔ والزبر۔ والکتاب المنیر دی گئی تھی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کو خدا کی طرف سے وحی دی جاتی تھی، اور اس وحی کو مختلف ناموں سے اور مختلف صفات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں جو تین الفاظ آئے ہیں (بینات الزبر اور الکتاب) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ تین الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ درحقیقت وحی ہی کے تعارفات ہیں۔ بینات

زبور

یعنی واضح دلائل، وحی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اور اس کے احکام کو الکتاب کہا گیا ہے۔ جہاں تک زبور کا تعلق ہے تو اس کے معنی جلی حروف میں لکھی ہوئی کتاب کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے خدا کی ہر کتاب الزبور ہے۔

سورۂ نساء میں ہے؛ وَاٰتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا... (۴/۱۶۳)۔ (نیز ۱۷/۵۵)۔ عام خیال یہ ہے کہ زبورؔ حضرت داؤد کی کتاب کا نام ہے۔ لیکن یہ بات مزید غور کی متقاضی ہے۔ اِن ہر دو آیات میں زبوراً (نکرہ) آیا ہے اور خدا کی کتابوں (التوراۃ۔ الانجیل۔ القرآن) کو معرفہ کہا گیا ہے۔ اسی لئے زبوراً کے معنی ایک کتاب ہیں۔ یعنی (حضرت) داؤدؑ کو (دیگر انبیاء کی طرح) کتاب دی گئی تھی۔ سورہ الانبیاء میں البتہ الزبور آیا ہے:
کہا نہیں جا سکتا کہ یہاں اس سے کوئی خاص کتاب مُراد ہے یا ہر کتاب خداوندی! زُبُر جمع ہے زبوراً کی۔ یعنی کتابیں۔
یہ ضمنی نکتہ تھا۔ اصل موضوع تکذیب رُسل سے متعلق ہے۔ قرآنِ کریم میں تکذیب رُسل ہر رسول کے سلسلہ میں

تکذیبِ رسل کے معنی

آیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اِن انبیاء کرامؑ سے کہتے تھے کہ وہ جھوٹے ہیں۔
حضرات انبیاء کرامؑ کا اپنے معاشرہ میں بڑا بلند مقام ہوتا تھا اور وہ مکارمِ اخلاق و

پاکیزگی سیرت کے پیکر ہوتے تھے۔ اُن کی اس پاکیزگی سیرت کی شہادت اُن کے دشمن تک بھی دیتے تھے۔ وہ اپنی قوم سے کہتے تھے کہ تم جس روش پہ گامزن ہو، اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ اور وہ جواب میں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے۔ ہم پر کبھی تباہی نہیں آسکتی۔ یہ تھی تکذیب رسل۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ یہ مخالفین ان انبیاء کو جھوٹا نہیں کہتے تھے۔ اُن کی تنذیر (وارننگ) کو جھوٹا کہتے تھے، اس کی شہادت قرآن کریم میں موجود ہے۔ سورہ الانعام میں ہے:۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝ (۶/۳۳)

(اے رسولؐ!) ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ یہ لوگ تمہاری دعوت کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں وہ تمہارے لئے سخت ملال اور افسردگی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تجھے تو جھوٹا نہیں سمجھتے۔ (جو یہ بات تم پہ اس طرح گراں گزرے) یہ تو قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں (حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے ۲۷/۱۴)۔ اس لئے، ان کی ان باتوں سے دل پہ بُرا اثر لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ (اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں وہ ممدِ حیات ہے۔ تو اس سے اس کی جہالت پر افسوس تو ہوسکتا ہے ضیق اور ملال نہیں ہونا چاہیئے۔

اس سے نبی کو جھوٹا کہنے اور اس کے پیغام کو جھٹلانے کا فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد ہے:۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ (۶/۳۴)

پھر یہ بات کوئی نئی بھی نہیں۔ تم سے پہلے بھی جو رسول آئے اُن کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا۔ اُن کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اس طرح تکذیب ہوتی رہی۔ لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال اور استقامت سے اپنے پروگرام پہ عمل پیرا رہے۔ اور جس قدر تکالیف مخالفین کی طرف سے پہنچتی رہیں، انہیں ہمت سے برداشت کیا۔ یہاں تک کہ بالآخر (ہمارے قانون کے مطابق) ہماری طرف سے نصرت آپہنچی ــــ پہنچتی کیوں نہ؟ خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا۔ یہ حقیقت اُن انبیاءؑ کے احوال وکوائف سے واضح ہوجاتی ہے جن کے تذکرے (اس قرآن میں) تم تک پہنچ چکے ہیں۔

یہ تو تھی کفار کی طرف سے تکذیبِ دین۔ ہم (مسلمان) تکذیبِ دین کس طرح کرتے ہیں، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص۱۳۶۔ آیت (۲/۳۹) اور جلد سوم ص۳۳۳ آیت نمبر ۲۰/۲، ملاحظہ فرمائیے۔

اس کے بعد کہا کہ اس تکذیب کا فیصلہ اُن کے اعمال کے نتائج کر دیں گے۔ اگر یہ یہاں اس مؤاخذہ سے بچ بھی گئے تو اُخروی زندگی میں ماخوذ ہو جائیں گے جس سے کسی کو بھی مُفر نہیں۔

۳/۱۸۴ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (۳/۱۸۴)

ذائقہ

ان سے کہو کہ ہو سکتا ہے کہ تم اس قسم کی کٹ حجتیوں اور فریب کاریوں اور اپنی موجودہ غلط روش سے دنیاوی مفاد حاصل کر لو، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ) ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ اور جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں سامنے نہیں آتے ان کا پورا پورا بدلہ، آخروی زندگی میں سامنے آکر رہتا ہے۔ اُس زندگی میں جو شخص تباہ کُن عذاب سے دور رکھا گیا، اور جنت کی خوشگوار زندگی کا مالک بنایا گیا، تو وہ درحقیقت کامیاب ہوا (۳۹/۴۱)۔ اس کے برعکس، جو شخص صرف دنیاوی زندگی کے مفاد کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے (اور مستقبل کی زندگی کو نظر انداز کر دیتا ہے) اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑے دھوکہ میں رکھے ہوئے ہے۔ کامیاب وہ ہے جسے اس دُنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور اخروی زندگی کی کامرانیاں بھی۔ (۲/۲۰۱؛ ۱۰/۶۳-۶۴؛ ۱۴/۲۷)

نجات کا مفہوم

(ضمناً) نجات کا قرآنی مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رُو سے نجات کے یہ معنی نہیں کہ پہلے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں جھونکا جائے گا، اور پھر وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔ قرآنی مفہوم یہ ہے کہ جو جنت میں جانے کے اہل ہیں انہیں براہِ راست جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ جن میں اس کی صلاحیت نہیں ہوگی، وہ جہنم رسید ہوں گے۔ یہاں اس مفہوم کو یہ کہہ کر دھرایا گیا ہے کہ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ — جسے جہنم سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ کامیاب و کامران ہے۔

اس کے بعد جماعت مؤمنین سے کہا کہ تمہارا ٹکراؤ انہی لوگوں سے ہوگا جن کا نصب العین حیات، اس دنیا کے مفادات کا حصول ہے۔ اس ٹکراؤ میں،

۳/۱۸۵ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۳/۱۸۵)

تمہارا مقابلہ انہی لوگوں سے رہے گا، اور اس ٹکراؤ میں تم پر ایسی گردشیں آئیں گی جن میں تمہارے مال اور جان کا نقصان ہوگا (۲/۱۵۵)۔ اور ان اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب سے بڑی دُکھ دینے والی باتیں سُننی پڑیں گی۔ سو اگر تم نے ان مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کیا، اور قانونِ خداوندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو یہ تمہارے عزمِ بلند کی دلیل ہوگی، اور بڑی ہمت کی بات۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کس طرح بار بار اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ دین کا مُنتہا (مذہب کی طرح) "انفرادی نجات" نہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے جس میں باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراؤ لاینفک ہے۔

اس کے بعد قرآن پھر اہلِ کتاب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے :-

۳/۱۸۶ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ○ (۳/۱۸۶)

(یہ اہلِ کتاب جواب کہہ رہے ہیں کہ ہم سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا، اور وہ عہد لیا تھا۔ ان سے اس قسم کا کوئی عہد نہیں لیا گیا تھا)۔ ان سے عہد یہ لیا گیا تھا کہ "جو کچھ تمہیں (وحی کے ذریعہ) دیا گیا ہے اُسے چھپا کر نہ رکھنا، لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا" لیکن انہوں نے اُسے پس پشت ڈال دیا۔ (اور عمل درآمد اپنی خود ساختہ شریعت پہ کرنے لگے کیونکہ) انہیں اس سے دنیاوی مفاد حاصل ہوتے تھے —— اگر یہ ذرا عقل وفکر سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ان کا یہ سودا کس قدر خسارے کا ہے (۲/۱۶)۔ یہ تھا وہ عہد جو ان سے لیا گیا تھا، اور یہ ہے وہ انداز جس سے انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تھا!

"کتمانِ حق" کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص۱۹۵ (آیت ۲/۱۴۴) میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جو کچھ سابقہ اہلِ کتاب کے متعلق کہا ہے، اس کا اطلاق بعینہٖ خود ہمارے اُوپر بھی ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے) ہم مسلمان، اہلِ کتاب ہی کی سطح پر آچکے ہیں۔ انہوں نے بھی دین کو مذہب میں تبدیل کر لیا تھا اور کتاب اللہ کی بجائے خود اپنے وضع کردہ احکامِ شریعت کو دین کہہ کر پیش کرتے تھے۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی "دین" کو ذریعہ معاش بنا لیا جائے گا، یہی کچھ ہو گا۔

اس کے بعد کہا :-

۳/۱۸۷ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ (۳/۱۸۷)

یہ لوگ (اہلِ کتاب کے مذہبی پیشوا) اپنی اس روش پر بہت خوش ہیں، اور چاہتے یہ ہیں کہ یہ جو باتیں لوگوں سے (بطور وعظ ونصیحت) کہتے ہیں، لیکن خود ان پر عمل نہیں کرتے، اُن کی وجہ سے ان کی تعریف کی جائے (حالانکہ تعریف کام کی ہوتی ہے، باتوں کی نہیں)۔

یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ (جس طرح ہم دنیا والوں کو دھوکہ دے لیتے ہیں، اسی طرح خدا کو بھی دھوکہ دے دیں گے)۔ تم ان کے متعلق خیال تک بھی نہ کرو کہ یہ خدا کے عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ اس کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ اس سے کوئی نہیں چھوٹ سکتا۔ ان لوگوں کی تباہی بڑی دردناک ہوگی۔

قرآنِ کریم ایمان کے لئے، قلب اور زبان کی ہم آہنگی کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی ایمان، محض زبان سے چند الفاظ دُھرانے کا نام نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ جو کچھ تم زبان سے کہو اس کی تصدیق تمہارا دل بھی کرے۔ بقول اقبالؒ ؎

تو عریب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الا لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

اور مومن ہونے کے لئے وہ ایمان اور عمل میں ہم آہنگی کو لاینفک قرار دیتا ہے۔ جس ایمان (اقرار) کا مظاہرہ اعمال (کاموں) سے نہیں ہوتا، وہ ایمان نہیں محض تصنع ہے، فریب ہے۔ جب کوئی قوم عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہے، تو اس کے اکابرین کا شیوہ یہ ہو جاتا ہے (خواہ وہ اربابِ مذہب ہوں اور خواہ اعیانِ اقتدار) کہ وہ باتیں بڑی لمبی چوڑی اور دلآویز کرتے ہیں، لیکن ان باتوں کے مطابق کام نہیں کرتے۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ لوگ اُن کی باتوں کی وجہ سے ان کی شان میں قصیدے پڑھتے رہیں۔ یہ نہ پوچھیں کہ آپ کرتے کیا ہیں۔ جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے تو اس کی تباہی لازمی ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

(وہ ایسے لوگوں سے کہتا ہے کہ) تم اپنے معاشرہ میں تو ایسی صورت پیدا کر سکتے ہو کہ لوگ محض تمہاری باتوں سے (تمہارے منہ پر) تمہاری تعریف کر دیں، لیکن میزانِ خداوندی میں تو اعمال کا وزن ہوتا ہے، باتوں کا نہیں۔ سلسلۂ کائنات اس اصولِ محکم کی بناء پر کارفرما ہے :-

۳/۱۸۸ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۠ (۳/۱۸۸)

اس لئے کہ تمام کائنات میں اقتدار اور اختیار خدا ہی کا کارفرما ہے۔ یہ سلسلۂ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر ایک کام کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا ہے (۱/۴؛ ۳۴/۴۳؛ ۵۳/۳۱) ہر شے پر خدا کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس کے بعد وہ عظیم آیات سامنے آتی ہیں جن میں دین کا ملخص بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اکثر مقامات پر واضح کیا گیا ہے دین کا منتہیٰ ہے، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے صرف کرنا، اس سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے (حوالہ کے لئے دیکھئے، انڈکس میں عنوانات تسخیرِ فطرت۔ فطرت اور کائنات) یہاں اسی بلند اصول و منتہیٰ کو ان الفاظ میں دھرایا گیا ہے۔ فرمایا :-

۳/۱۸۹ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ

لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ (۳/۱۸۹)

لیکن یہ بات غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں' اُن کے لئے کائنات کی پیدائش اور دن اور رات کی گردش میں' قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

کارگہِ کائنات پر غور و فکر یہاں کائناتی نظم و نسق پر غور و فکر کو اولوالالباب کا خاصہ بتایا گیا۔ یعنی اربابِ علم و عقل۔ اصحابِ علم و بصیرت۔ اس میں مومن و کافر سب آجاتے ہیں —— بلکہ آجکل تو رموز و حقائقِ کائنات پر غور و فکر میں کفار آسمان کی بلندیوں تک پہنچ رہے ہیں —— مومن و کافر کی تفریق اگلی آیات میں کی گئی ہے۔ فرمایا :-

۳/۱۹۰ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۳/۱۹۰)

اُن صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے، جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے۔ لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں' اور کائنات کی تخلیقی ترکیب (اندازِ پیدائش) پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور کائنات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے' اور یہ بات تجھ سے بہت بعید کہ تو کسی شئے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت' یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں)۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم (علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد) اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح) تباہ کُن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

ذکر کا مفہوم اس میں دو تین نکات خاص طور پر غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس میں "ذکرِ خداوندی" کا مفہوم واضح کیا گیا ہے یعنی تخلیقِ ارض و سماوات پر غور و فکر کا نام ذکرِ خداوندی ہے —— بالفاظِ دیگر کائنات سے متعلق قوانینِ خداوندی کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا۔ "ذکر" کے اس قرآنی مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر اپنے ہاں کی "اللہ ہو" کی مجلسوں پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ وہاں ذکر کا مفہوم کیا لیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قوانینِ کائنات اور قوائے فطرت پر غور و فکر اور تحقیق و تفتیش

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے

کے بعد یہ ثابت کریں کہ خدا نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے۔ ہمارے ہاں تصوّف ہو یا شریعت، دونوں میں کائنات کو باطل قرار دیا جاتا ہے۔ تصوّف کا تو (افلاطون کے تتبع میں) عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا حقیقی وجود ہی نہیں، یہ محض ہمارے فریبِ تخیل کا نام ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

تصوّف کی ریاضتوں اور مراقبوں سے جب قوتِ خیال میں ارتقاء پیدا ہو جاتا ہے، تو انسان کے تخیل کی دُنیا میں عجیب غریب قسم کی "دنیاؤں" کے نقشے آتے ہیں۔ ان نکات کی میں نے اپنی زیرِ اشاعت کتاب — تصوّف کی حقیقت — میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تمام تصوّرات (HALLUCINATIONS) عالمِ خیال میں پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس دُنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ قرآن کے نظریہ کی رُو سے اِن کی یہ دُنیا 'حق' نہیں ہوتی۔ باطل ہوتی ہے۔ مثلاً آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس کی سامنے کی دیوار شیشے (آئینے) کی ہو، تو اس میں آپ کا پورا کمرہ آپ کے سامنے ہوگا۔ حتیٰ کہ کمرے میں ہر نقل و حرکت بھی بعینہٖ اس میں "موجود" ہوگی۔ لیکن یہ درحقیقت اس میں موجود نہیں ہوتی۔ یہ ہماری نگاہ کا فریب ہوتا ہے۔ کشف و الہام کی ہر "دنیا" کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ کہیں خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ ہمارے عالمِ تخیل میں ہوتی ہے۔

قرآن جو کائنات کو بالحق کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فی الحقیقت خارج میں موجود ہے۔ ہمارے تخیلات کی تخلیق نہیں۔ اس کے برعکس، تصوّف کی "کائنات" کہیں خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ عالمِ تخیل میں موہوم ہوتی ہے۔ لہٰذا، وہ بالحق نہیں کہلا سکتی۔ وہ باطل پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تو رہا اربابِ تصوف کے متعلق۔

اربابِ شریعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ اس کے قریب تک بھی نہیں جانا چاہیئے۔ "دنیا ایک لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کُتے"۔ "دُنیا ایک جیل خانہ ہے جس سے مومن دور بھاگتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے تمام عقائد و نظریات باطل ہیں اور قرآنی تصورِ کائنات کی ضد۔

ذِلّت وخواری کی زندگی

اس کے ساتھ ہی قرآن نے واضح کر دیا کہ جو قوم کائنات کو باطل تصور کرتی ہے، وہ تباہی و بربادی کے جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس عذاب النار کے معنی کیا ہیں — دُنیا کی زندگی میں ذلت و خواری۔

۳/۱۹۱ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ (۱۹۱/۳)

جو قومیں، اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے، اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں ـــــ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

کتنی عظیم حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی، وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور جو قوم ذلت و پستی کی زندگی بسر کرے، اُس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وہ دوسری قوموں کی محتاج اور گداگر ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گداگروں اور بھک منگوں کو کوئی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

اس کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی رُو سے "کفار اور مومنین" میں بنیادی فرق کی وضاحت کر دی۔ فرمایا:۔

۳/۱۹۲ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ أَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۚ (۳/۱۹۲)

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے (۱۳/۱۷)۔ یہ کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی راہنمائی پر ایمان رکھے۔

لہٰذا، ان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار یہ بھی ہوتی ہے کہ، اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ آؤ! اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ ـــــ ہم نے اس دعوت پر لبیک کہا، اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔

اس کے بعد، ان صاحبانِ عقل و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا (۲/۲۸۶) ہماری چھوٹی موٹی کوتاہیوں اور تدبیری ناہمواریوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت اور معیت میں کرنا، جن کے سامنے زندگی کی وُسعت اور کشاد کی راہیں کھل چکی ہیں۔

کیسی حسین ہیں یہ دُعائیں اور کس قدر انقلاب آفریں ہیں یہ آرزوئیں۔

۳/۱۹۳ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (۳/۱۹۳)

اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تُو نے ہم سے، اپنے رسولوں کے ذریعہ، جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ

کر رکھی ہے (۲۴/۵۵) اُن سے ہمیں بہرہ یاب کرنا۔ اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ تیرا ہر قانون صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔

اِدھر سے یہ حسین آرزوئیں زبان پہ آئیں، اور اُدھر سے بابِ استجاب نے یہ کہہ کر انہیں خوش آمدید کہا کہ

۳/۱۹۴ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (۳/۱۹۴)

تم میں سے جو بھی ہمارے قانون کے مطابق عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کہ تم ایک ہی نوع کے افراد ہو ۔۔۔ بلکہ ہر فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مرد اور عورت دونوں کے اجزاء (مادۂ تولید) سے مرکب ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یگانگت اور مساوات کی صورت اور کون سی ہو سکتی ہے۔

لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے قوانین کے مطابق نظام کرنے میں، تمہیں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں تمہیں اپنی ہر عزیز متاع کو چھوڑنا پڑے۔ تم گھروں سے بے گھر ہو جاؤ۔ بُری طرح سے ستائے جاؤ۔ لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جانیں دینی پڑیں۔ سو، جو لوگ اس پروگرام میں پورے اُتریں گے، اُن کے حسنِ عمل کی بدولت، ان کی چھوٹی موٹی ناہمواریوں کو مٹا دیا جائے گا، اور انہیں زندگی کی شادابیاں عطا ہوں گی جن پر کبھی، افسردگی اور پژمردگی نہیں چھائے گی۔ وہ ہمیشہ تر و تازہ رہیں گی۔ یہ خدا کی طرف سے، ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا ۔۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اعمال کا ایسا حسن کارانہ بدلہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ہی مل سکتا ہے۔

دُعا کی قبولیّت کا مفہوم

یہاں سے یوں ہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ غور سے دیکھئے کہ دعاؤں کی قبولیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ "ہم کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں ہو جانے دیتے ہیں"۔ اسی کا نام دعاؤں کا قبول ہونا ہے اور وہ اعمال کیا ہیں؟ اقدارِ خداوندی کی حفاظت کے لئے سر بکف میدانِ کارزار میں نکل آنا اور ہر قسم کی تکلیف، مصیبت اور مشقت کو استقامت سے برداشت کرنا۔ لہٰذا، مومن مفکر ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ مجاہد بھی ہوتا ہے، اور اِس کا اُسے بدلہ ملتا ہے۔ اس کے

بعد (نبی اکرمؐ کی وساطت سے) اِن مجاہدین سے کہا کہ

۳ / ۱۹۵-۱۹۶	لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ (۱۹۵-۱۹۶/۳)

اس نظام کی مخالفت کرنے والوں کی چہل پہل بستیوں میں ان کی گہما گہمی، تمہاری نگاہ کو فریب نہ دے، اور تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ قانونِ خداوندی کے خلاف چلنے سے بھی زندگی کی خوشگواریاں مل سکتی ہیں!

یہ خوشگواریاں بڑی بے حقیقت ہیں، اور اِن سے ان تھوڑی مدت کے لئے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد، تباہی اور بربادی کا جہنم ہوگا، اور یہ ہوں گے ــــ اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ان کے برعکس:-

۳ / ۱۹۷	لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ۝ (۱۹۷/۳)

جو لوگ خدا کے قانونِ ربوبیت کی نگہداشت کرتے ہیں اور وحیٔ خداوندی کے مطابق، بلند کردار زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کے لئے خوشگواریوں کی سدا بہار جنتیں ہیں۔ خدا کے ہاں اُن کی ایسی قدر و منزلت ہوگی جیسی کہ معزز مہمانوں کی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلند کردار، اور راستباز انسانوں کے لئے خدا کے ہاں جو کچھ بھی ہے یکسر خیر ہے۔ اس میں خرابی کا شائبہ تک بھی نہیں ہو سکتا۔

اور اس میں رنگ و نسل۔ زبان۔ وطن۔ وغیرہ کی کوئی تفریق نہیں۔

۳ / ۱۹۸	وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (۱۹۸/۳)

اور خدا کی اس جنت کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں ــــ ان اہلِ کتاب (یہودی) کے لئے بھی جن کا عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے سوا کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اہلِ کتاب میں سے بھی، جو لوگ (اس طرح) اللہ پر ایمان لے آتے ہیں (جس طرح تم لائے ہو)۔ اور اپنی سابقہ کتابوں پر ایمان لانے کے بعد، اس کتاب (قرآن) پر ایمان لائے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ اور انہوں نے اس طرح، قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، اور اپنی سابقہ روش کو چھوڑ دیا ہے جس میں وہ احکامِ خداوندی کو دنیاوی مفاد کے عوض بیچ دیا کرتے

تھے۔ تو ان کا بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہونا، ان کے راستے میں حائل نہیں ہوگا)۔ ان کے ایمان و اعمال کا اجر، ان کے رب کے قانونِ مکافات کی رُو سے ملے گا۔ وہ قانون جو انسان کے ہر عمل کا حساب بلا تاخیر کر دیتا ہے (۱۱۳-۱۱۲/۳) (نیز ۱۱۲-۱۱۱/۲)

قرآنِ کریم کا عمومی انداز یہ ہے کہ وہ ہر سُورہ کے آخر میں، دین کی کسی نہ کسی حقیقت کو، نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ اس سورہ میں زیادہ زور مؤمنین کی اجتماعی زندگی پہ دیا گیا ہے۔ آخر میں بتایا کہ اس اجتماعیت کی اساس کیا ہے۔ فرمایا:

۱۹۹/۳ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۱۹۹/۳)

لیکن یہ سب کچھ اس معاشرہ ہی میں ہو سکتا ہے جس میں تمام افراد کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنے نظام پر نہایت ثابت قدمی سے قائم رہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنیں اور اس میں، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں کریں۔ مخالفین کے مقابلہ میں استقامت دکھائیں۔ اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام رکھیں۔ ایک دوسرے سے جُڑ کر رہیں۔ مقصدِ پیشِ نظر کے حصول میں مُسلسل کوششیں کریں۔ اور ہر قدم پہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔

اے جماعتِ مومنین! تم یہی روش اختیار کرنا۔ تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔

ان چار الفاظ (اصبروا۔ صابروا۔ رابطو۔ واتقوا اللہ) پر غور کیجئے اور قرآن کے ایجاز و اعجاز پر جھوم جھوم جایئے۔ یہی امّتِ مسلمہ کی اجتماعیت کا راز ہے۔ اور آج اسی کے نہ ہونے سے ہم ملت (یا اُمت) کی زندگی نہیں، بلکہ افراد کی زندگی جیتے ہیں اور دنیا میں ناکام و نامراد ہوتے ہیں۔

چوتھا باب

معاشرتی اور عائلی زندگی

(۱) ــــــــــ یتیموں کی پرورش اور نگہداشت

(۲) ــــــــــ ازدواجی زندگی سے متعلق مسائل

(۳) ــــــــــ قوانینِ وراثت

(۴) ــــــــــ ربوٰا اور تجارت میں فرق

(۵) ــــــــــ صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات

(۶) ــــــــــ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مُراد

(۷) ــــــــــ اولی الامر کون ہیں ؟

(۸) ــــــــــ منافقین کی نقاب کشائی

(۹) ــــــــــ خدا اپنے پروگرام انسانوں کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچاتا ہے

(۱۰) ــــــــــ اللہ اور طاغوت کی راہ میں جنگ

(۱۱) ــــــــــ جرمِ قتل کی سزا

(۱۲) ــــــــــ وکالت کا پیشہ

(۱۳) ــــــــــ مذہبی پیشوائیت کی پیدا کردہ توہم پرستیاں

(۱۴) ــــــــــ شہادت کا عظیم اصُول

(۱۵) ــــــــــ سابقہ لغزشوں سے درگزر

(۱۶) ــــــــــ یہودیوں پر بعض حلال چیزیں حرام قرار دے دی گئیں

(۱۷) ــــــــــ قوموں کی تباہی کب ہوتی ہے ؟

(۱۸) ــــــــــ دین میں غلو کی ممانعت

چوتھا باب

معاشرتی اور عائلی زندگی

(آیت ۴/۱ تا ۴/۱۷۷)

سابقہ سورہ کا بیشتر حصّہ اُن تزاحمات و تصادمات کے احوال و کوائف پر مشتمل تھا جن سے اسلام کے ابتدائی دور میں جماعتِ مومنین کو عہدہ برا ہونا پڑا تھا۔ لیکن ان تصادمات میں بھی قرآنِ کریم اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا کہ خارجی قوتوں سے وہی قوم بطریقِ احسن نبرد آزما ہو سکتی ہے جس کے گھروں کی زندگی اطمینان و سکون کی ہو۔ اس زندگی کی اہمیت کے پیشِ نظر، اگلی سورہ (یعنی سورہ نساء) کا بیشتر حصّہ عائلی زندگی سے متعلق مسائل کے لئے وقف ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے پہلے تخلیقِ انسان کو مختصر الفاظ میں دُہرایا :-

۴/۱ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (۴/۱)

اے نوعِ انسان! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتداء، ایک جرثومۂ زندگی[1] سے کی (۳۹/۶ ؛ ۷/۱۸۹)۔ ازاں بعد، یہ جرثومہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا[2] جس سے نر و مادہ کی تقسیم وجود میں آئی۔ اور یوں نر و مادہ کے اختلاط سے، اس نے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلا دی، جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔

(جب نوعِ انسان، اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی درخت کی شاخیں ہے تو انسان کی خود ساختہ تقسیم و تفریق کے کیا معنی؟ تم تمام انسانوں کو ایک برادری سمجھو) اور اس طرح خدا کے نظامِ ربوبیت کی نگہداشت کرو جس کے ذریعے تمہاری وہ ضروریات پوری ہوتی ہیں جن کے لئے تم ایک دوسرے کے تعاون محتاج ہو (۵/۲)۔

خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کی ابتداء، اپنے خاندانی رشتے استوار کرنے سے کرو (جب یہ ہو جائے تو پھر اس

1. LIFE - CELL.　　2. SISTER CELLS.

حلقہ کو وسیع کرتے چلے جاؤ تا آنکہ پوری کی پوری انسانیت اسکے دائرہ کے اندر آجائے) اگر تم نے ایسا کیا تو قانونِ خداوندی تمہاری ہر طرح سے نگرانی اور نگہبانی کرتا جائے گا۔

انسانی تخلیق کے متعلق، مطالبُ الفرقان جلد دوم، باب اوّل میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اُس باب میں آدم کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتداء کسی ایک فرد کے ذریعہ نہیں ہوئی تھی۔ زیرِ نظر آیت میں عمودی نکتہ یہ ہے کہ جب نوعِ انسان کی تخلیق نفسِ واحدۃ (واحد جرثومۂ حیات) سے ہوئی ہے تو پھر زبان، وطن، رنگ، نسل کے اختلافات سے انسانوں میں تفریق کے کیا معنی؟ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ وحدتِ خالق سے وحدتِ مخلوق قرآن کا بنیادی نکتہ ہے، اور اس وحدت میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں، کیونکہ یہ تخلیقی سلسلہ ان دونوں کے اختلاط سے قائم ہے۔

(ضمناً) بَثَّ مِنْهُمَا۔ یا۔ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (۴۹ / ۱۳) کہ خدا کا قانونِ پیدائش یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اختلاط سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی اسی طریق سے ہوئی تھی کیونکہ خدا نے اپنے اس قانون میں کہیں استثناء کا ذکر نہیں کیا۔ (تفصیل سابقہ باب میں گزر چکی ہے) وحدتِ انسانیت کا اصول بیان کرنے کے بعد کہا:-

| ۴ / ۲ | وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ (۴ / ۲)

اس قانون کی رو سے، تمہارے اپنے بچوں اور یتیموں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس لئے، ان کے مفاد اور حقوق کی بھی اسی طرح نگہداشت کرو جس طرح تم اپنی اولاد کے مفاد کی نگہداشت کرتے ہو۔ ان کا مال و اسباب، بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں، اپنی نکمی چیزوں سے بدل لو۔ ان کا مال الگ رکھو، اپنا الگ۔ ان کے مال میں خرد برد کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے۔ (جو بیچارا، معاشرہ میں تنہا رہ جائے، اس کی مدد کرنی چاہیئے، نہ کہ الٹا اس کا حق تلف کر لینا چاہیئے)۔

یتامیٰ کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں حوالے ملاحظہ فرمائیے)۔ وہاں یتامیٰ النساء کا بھی ذکر آگیا ہے جس کے معنی ایسی عورتیں ہیں جو بے شوہر کے ہوں۔ خواہ وہ ناکتخدا لڑکیاں ہوں اور خواہ نکاح کے بعد بے شوہر رہ جانے والی عورتیں۔ اُن کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔ فرمایا:-

۴/۳ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝ (۴/۳)

(لیکن یتیموں کا مسئلہ، ان کے مال و اسباب کی حفاظت ہی سے طے نہیں ہو جاتا۔ بات اس سے آگے بھی چلتی ہے۔

تعددِ ازدواج

اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں ــــ مثلاً جنگ کی وجہ سے ــــ کہ معاشرہ میں مرد ضائع ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے، لڑکیاں) زیادہ رہ جائیں ــــ بالخصوص بے شوہر عورتیں۔ ۱۲۷/۴) اور اس مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ، منصفانہ حل نہ ملتا ہو۔ یا کہیں انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہو جائے (جس کا فیصلہ تمہارا معاشرتی نظام ہی کر سکتا ہے) تو ایسے حالات میں تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر، تم، ان بے شوہر عورتوں میں سے، حسب پسند (جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں ۱۹/۴) نکاح کر لو۔ (اس مقصد کے لئے "ایک مرد ایک بیوی" کے قانون میں استثناء کی جاتی ہے۔ اس صورت میں، جیسا بھی حالات کا تقاضا اور معاشرہ کا فیصلہ ہو تم) دو دو۔ تین تین۔ چار چار بیویوں تک (نکاح میں لا سکتے ہو)۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ تم، اس طرح، مختلف افرادِ خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے، تو پھر اسی "ایک بیوی" والے قانون پر کاربند رہو۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم، اس سے قبل، اپنے نکاح میں لا چکے ہو (کیونکہ اس کے بعد تو لونڈیاں اور غلام کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا)۔ بے انصافی (یا کثرتِ اولاد کے بوجھ) سے بچنے کے لئے، یہ راہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

یاد رکھو۔ یہاں جس عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مراد مختلف بیویوں میں سلوک اور برتاؤ کا عدل ہے نہ کہ جذبات کا عدل۔ اس لئے کہ جذبات میں مساوات اور یکسانیت رکھنا، نفسیاتی محال ہے جس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ (۱۲۹/۴)

نکاح کی جملہ تفاصیل اور تعددِ ازدواج اور مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ کے متعلق مطالب القرآن کی تیسری جلد میں لکھا جا چکا ہے (نکاح اور تعددِ ازدواج اور غلامی کے عنوانات انڈکس میں دیکھئے)۔ خود یہ آیت (۳/۴) جلد سوم ص ۳۴۶ پر آ چکی ہے۔

ان تفاصیل کے دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن نکاح کے سلسلہ میں ہماری مذہبی پیشوائیت کی ایک ستم ظریفی کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ حکومتِ پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین نافذ کئے۔ وہ بالکلیہ قرآن کے مطابق تو نہیں تھے، لیکن ان کی رُو سے موجودہ قوانینِ شریعت میں قدرے اصلاح کی گئی تھی اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ بھی ناقابلِ برداشت

تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان قوانین کی سخت مخالفت کی۔ (مخالفت کی اصل وجہ بقول اُن کے یہ تھی کہ قوانین شریعت کا تعلق علماء سے ہے حکومت ان میں دخل دینے والی کون ہوتی ہے؟) ۔ ان قوانین میں تعددِ ازدواج کے سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی سے شادی کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی اور حکومت کی تصویب ضروری ہوگی۔ یہ حضرات اس شرط کو بھی "خلافِ شریعت" قرار دیتے ہیں۔ لیکن قانون کی موجودگی میں وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کیا کرتے تھے، یہ ذرہ غور سے سُننے کے قابل ہے۔

زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے: وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ۔ "اگر تمہیں یتمٰی کے معاملہ میں اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس مسئلہ کا کوئی اور منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو تم ان میں سے کسی کے ساتھ حسبِ پسند نکاح کر لو"۔ ایک پانچویں جماعت کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ ــــ "اگر ... تو" ــــ والا جملہ شرطیہ کہلاتا ہے۔ اس میں "اگر اور تو" دونوں ہوں تو پھر جملہ مکمل ہوتا ہے۔ (مثلاً) آپ اپنے کسی دوست سے کہتے ہیں کہ "اگر تم چار بجے آ گئے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا"۔ اب اگر تمہارا وہ دوست چار بجے نہ آئے، چھ بجے آئے اور "اگر تم چار بجے آئے" کا جُملہ حذف کر کے کہے کہ تم نے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ چلوں گا" اس لئے تم اٹھو اور میرے ساتھ چلو، تو آپ اُس کے متعلق کیا کہیں گے۔

نکاح خوان (مولوی صاحب) کو خطبۂ نکاح میں اِنْ خِفْتُمْ ..... والی آیت بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ اگر یہ آیت پوری پڑھی جائے تو ایک سے زیادہ بیوی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ لیکن یہ حضرات اس باب میں کسی شرط کو جائز نہیں سمجھتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا کرتے تھے؟ یہ "اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی" کا حصہ حذف کر کے آیت کو شروع ہی "فَانْكِحُوْا" سے کرتے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو دھوکہ دے لیتے تھے کہ ہم نے تعددِ ازدواج کے لئے اس شرط کو اُڑا دیا؟ یہاں تک کہ میں نے ایک نکاح کا مطبوعہ فارم دیکھا تھا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت شروع ہی فَانْكِحُوْا سے کی گئی تھی!

اب آپ سوچئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا تھا کہ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ (۲/۲۳۱) "ہمارے احکام کا مذاق مت اُڑاؤ"، تو اس کی اس سے زیادہ نمایاں مثال کون سی ہو سکتی ہے؟ یہ ہے جو کچھ یہ حضرات خدا کی کتاب کے ساتھ کرتے ہیں اور قطعاً خدا سے نہیں ڈرتے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۳۵۱ پر لکھا گیا ہے اُسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔

نکاح کے سلسلہ میں اس شرط کو پھر دُہرا دیا۔

۴/۴ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝ (۴/۴)

اور اپنی بیویوں کا مہر، کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر، اس طرح دے دیا کرو جس طرح شہد کی مکھی، شہد دیتی ہے

مہر (اس میں کسی قیمت یا بدل کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ اس لئے کہ مہر تو ایک تحفہ ہے، نہ کہ کسی چیز کا بدلہ)۔ ہاں! اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے بلا تامل اپنے صرف میں لا سکتے ہو۔ (۴/۴)

اس آیت کا تعلق مہر سے ہے جس کے متعلق تیسری جلد (ص ۳۵۳) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

یتٰمی النساء کے درمیان تذکرہ کے بعد، پھر یتیموں کی حفاظت کی طرف رجوع کیا گیا اور فرمایا:۔

۴/۵ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ (۴/۵)

یہ بھی یاد رکھو کہ مال کو، خدا نے، تمہاری قومی معیشت کا ذریعہ (قیام کا موجب) بنایا ہے۔ اس سے قومیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس لئے اسے ایسے لوگوں کی تحویل میں نہ دو جو اس کے انتظام کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے روٹی کپڑے، اور صحیح تربیت کا انتظام کر دیا کرو۔

بات تو یہ یتامیٰ کے سلسلہ میں کہی گئی ہے، لیکن اس اصول کا اطلاق عمومی ہے۔ اور ہم نے اس کا مفہوم اسی عموم کے پیش نظر کیا ہے۔ یتیم اس کے اندر خود بخود آجاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے:۔

۴/۶ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ (۴/۶)

اور یتیموں کی بھی صحیح تربیت کرو، اور ان کی جانچ پڑتال کرتے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہوتی ہے، حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سنِ بلوغ $\frac{6}{153}$ ؛ $\frac{17}{34}$ ؛ $\frac{40}{46}$) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں عقل کی پختگی نظر آئے، تو ان کا مال انہیں واپس دے دو (اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر $\frac{4}{5}$ کے مطابق کرو)۔ اور اس خیال سے کہ وہ سنِ بلوغت کو جلدی پہنچ جائیں گے اور ان کا مال انہیں واپس دینا ہوگا، فضول خرچی کر کے، ان کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے مال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا معاوضہ، سو تم میں سے جو ضرورت مند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہئے۔ لیکن

جو ضرورت مند ہو (یعنی ان کی جائداد کے انتظام کے لئے اسے جو وقت صرف کرنا پڑے اس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگدست ہو جائے) تو وہ قاعدہ اور قانون کے مطابق، حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو، تو اس پر گواہ لے لیا کرو۔ اور حساب فہمی کے وقت، اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے؛ اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لے لینے والا ہے۔

(ضمناً) نکاح کی عمر کے سلسلہ میں اس آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے، اسے مطالب الفرقان۔ جلد سوم صفحہ ۳۳۶ پر دیکھئے

اس کے بعد چند آیات میں قوانینِ وراثت کا ذکر آیا ہے۔ وراثت کے مسئلہ نے ہمارے معاشرہ میں بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے اور اگر آپ دیوانی مقدمات کے اعداد و شمار جمع کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں اکثریت کا تعلق (بالواسطہ یا بلا واسطہ) وراثت سے ہوتا ہے۔ یہ تنازعات دیوانی (سول) ہی نہیں رہتے۔ بڑھتے بڑھتے فوجداری (CRIMINAL) تک پہنچ جاتے ہیں۔ قوم کی تباہی کا ایک اہم سبب یہ مقدمات بھی ہیں جن کی بیشتر بنیادی وجہ تقسیم وراثت کے پیدا کردہ تنازعات ہوتے ہیں؛ اس لئے وراثت کے قوانین کی اہمیت واضح ہے۔ لیکن ان قوانین تک پہنچنے سے پہلے چند تمہیدی وضاحتیں ضروری ہیں۔

قانونِ وراثت کی تمہیدات

(۱) وراثت کے معنی ہیں اس جائداد کی تقسیم جسے مرنے والا (متوفی) چھوڑ کر مرے۔ اسی اعتبار سے اسے ترکہ بھی کہتے ہیں۔ اور یہ اصطلاح قرآنِ کریم کے مَا تَرَكَ اور مِمَّا تَرَكَ سے ماخوذ ہے (یعنی مرنے والا جو کچھ چھوڑ کر مرے)۔

(۲) ہمارے ہاں عام طور پر یہ صورت ہوتی ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو کسی شخص کے ترکہ کے وارث سمجھتے ہیں، وہ اس شخص کی زندگی ہی میں اپنے آپ کو اس جائداد کا مالک سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی جائداد کی جس طرح چاہے (DISPOSAL) کرے۔ حتّٰی کہ وہ اسے اس کی منشاء کے مطابق اسے فروخت تک بھی کرنے نہیں دیتے۔ یہ خیالِ خام اور حقیقت کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے جس شخص کو جس چیز پر حقِ ملکیت حاصل ہوتا ہے اسے اس چیز کی (DISPOSAL) پر پورا پورا اختیار ہوتا ہے اور اس کے ورثاء (یعنی اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث) اس کی زندگی میں کسی قسم کا حق اور اختیار نہیں رکھتے۔ وہ صرف "مَا تَرَكَ" (جو کچھ وہ چھوڑ کر مرے) میں اپنا حق رکھتے ہیں۔ یعنی اس شخص کی موت کے بعد۔ اگر وہ کچھ بھی چھوڑ کر نہیں مرتا تو کسی کو

کچھ بھی نہیں مل سکتا۔

(۳) مالک کا اپنی زندگی میں حقِ ملکیت تو ایک طرف' قرآن کریم اُسے اس کا بھی حق دیتا ہے۔ (حق ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے) کہ وہ جو کچھ چھوڑ کر مرے' اس کی بابت وصیّت کرے کہ اس کی تقسیم اس طرح ہوگی۔ قانونِ وراثت کا صرف اس ترکہ پر اطلاق ہوگا جو وصیّت پوری کرنے کے بعد باقی بچے۔ اگر وصیّت پورے ترکہ کو محیط ہے تو دوسروں کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ (وصیّت کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم صـ۱۶۷ (زیر آیت ۲/۱۸۰) دیکھئے اور سوچئے کہ ان حضرات کی جرأت کس قدر بے باک ہے کہ قرآن کریم کی نصِ صریح کے خلاف ایک قانون وضع کرتے ہیں اور اسے قانونِ شریعت کہہ کر نافذ کرتے ہیں۔ دیگر اہلِ مذاہب نے اپنی کتابوں میں اس وقت تحریف کی تھی جب وہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں رہی تھیں۔ لیکن ہم قرآن مجید کی موجودگی میں اس کے خلاف قوانین وضع کرتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے)۔

(۴) قرآن کے معاشی نظام کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بتایا جاچکا ہے (انڈکس میں حوالے دیکھئے)۔ اس نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے۔ نہ وہ جائدادیں کھڑی کرسکتا ہے۔ نہ زمین پر حقِ ملکیت رکھتا ہے۔ لہٰذا، جب وہ نظام رائج ہو' تو پھر وصیّت یا تقسیمِ وراثت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے' یہ سوال تو مَاتَرَکَ سے متعلق ہوتا ہے۔ جب اس نظام میں کسی شخص کا مَاتَرَکَ (ترکہ) ہوگا ہی نہیں تو اس کی تقسیم کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟ لہٰذا، قرآن کریم کے وراثت یا وصیّت سے متعلق احکام کا نفاذ اس دور تک محدود ہوگا جب ہنوز قرآن کا معاشی نظام قائم نہیں ہوگا۔ (انہیں عبوری دور کے احکام کہا جائے گا)۔ ہاں! اگر قرآنی نظام کسی چیز کو کسی شخص کی ملکیت میں دے دے گا تو اس پر قوانینِ وصیّت اور وراثت کا اعلان ہوسکے گا۔

(۵) قرآن کریم نے وصیّت اور وراثت کے متعلق جو قوانین دیئے ہیں' وہ اس قدر صاف' سیدھے اور عدل و انصاف پر مبنی ہیں کہ غیر مسلم تک بھی ان کی افادیت اور اکملیت کے قائل ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں فقہ کی رُو سے جو احکام رائج ہیں وہ قرآن کے خلاف ہیں اور (معاف فرمائیے) صریحاً ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پیچیدہ اتنے کہ اور تو اور عُلماء حضرات میں بھی بہت کم ایسے ہوتے ہیں جنہیں ان پر عبور حاصل ہو۔ (اسے ان کی اصطلاح میں علم الفرائض کہا جاتا ہے)۔ پیچیدہ ہونے کے علاوہ' وہ اس قدر ناقص ہیں کہ پانچویں جماعت کا طالب علم بھی انہیں دیکھ کر محوِ حیرت ہوجاتا ہے۔ تقسیم کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ مختلف حصّوں کا حاصلِ جمع ایک (۱) نکلے۔ لیکن فقہی قوانین کی رُو سے جو حصّے کئے جاتے ہیں ان کی حاصل جمع ایک (۱) نہیں نکلتی۔ کبھی ایک (۱) سے زیادہ ہوتی ہے کبھی کم۔ اس کمی بیشی کو پورا کرنے کے لئے' کبھی ایک کے حصّے سے کچھ کم کرنا پڑتا ہے' کبھی دوسرے کے حصّے میں کچھ اضافہ۔ (اسے ان کی اصطلاح

میں عمل کہتے ہیں)۔ آپ سوچئے کہ جب ہم اس قسم کے قانون کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کریں گے تو دنیا اس کی بابت کیا کہے گی؟ وہ یہی کہے گی کہ ان کے خدا کو (معاذ اللہ) پانچویں جماعت کے بچے جتنا بھی حساب نہیں آتا!

یہ سب کچھ ہے لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت ان فقہی قوانین پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتی۔

اس تمہید کے بعد آئیے قرآنی احکام کی طرف۔ ہم پہلے ان آیات کو ان کے مفہوم کے ساتھ درج کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کی رُو سے تقسیم کو سادہ اور سلیس انداز میں پیش کریں گے۔

۴/۷ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (۴/۷)

مردوں کے لئے حصّہ ہے اس مال میں سے جو ان کے والدین یا وہ رشتے دار جو ان کے اقرب ہوں چھوڑ کر دیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے حصّہ ہے اس مال میں سے جو ان کے والدین یا وہ رشتے دار جو ان کے اقرب ہوں چھوڑ کر دیں۔ خواہ وہ تھوڑا سا مال ہو یا زیادہ۔ اس میں ہر ایک کا حصّہ مقرر ہے۔ (اس سے ظاہر ہے کہ عورت اپنے مال و دولت کی آپ مالک ہوتی ہے)۔

اس آیت (اور دیگر متعلقہ آیات) میں والدین سے مُراد صرف "ماں باپ" نہیں بلکہ باپ اور ماں سے اُوپر تک سلسلہ بھی اس میں شامل ہے۔ (مثلاً) دادا، پردادا، یا دوسری طرف نانی، پرنانی وغیرہ۔ اسی طرح اولاد کا لفظ بھی بیٹے بیٹی تک محدود نہیں۔ اس میں نیچے تک سب شامل ہوتے ہیں۔ (مثلاً پوتا، پرپوتا، دوہتا (نواسہ)، پردوہتا وغیرہ۔ ان مفاہیم کی اہمیت ذرہ آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں "یتیم پوتے کی وراثت" کے مسئلہ پر بحث کی جائے گی۔ سرِدست آپ وراثت سے متعلق دیگر آیات ملاحظہ فرمائیے:۔

۴/۸-۱۰ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝ (۴/۸-۱۰)

یتیموں کا مال ناحق کھانے والے

اگر تقسیمِ وراثت کے وقت ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصّہ نہ ہو، یا دوسرے یتیم اور مساکین، تو انہیں بھی اس میں سے

کچھ دے دو، اور سمجھاؤ دو کہ ترکہ کی تقسیم، قانون اور قاعدے کے مطابق ہوگی، جس کی رو سے انہیں بطور حق کچھ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ انہیں دے دیا گیا ہے، محض ان کی دل جوئی کی خاطر ہے۔

ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیئے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جاؤ، تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ ان سے بے انصافی ہو۔ لہٰذا، تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف، سیدھی اور محکم ہو۔

یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذباتِ حرص و ہوس اور بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کی نیت نہیں بھرتی، اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

اب آگے چلیئے:-

($\frac{4}{11}$) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ ($\frac{4}{11}$)

ترکہ کی تقسیم

اس اصولی تمہید کے بعد، قانونِ وراثت تمہارے سامنے آتا ہے۔ اس باب میں اولاد کے متعلق خدا کا حکم یہ ہے کہ

(۱) لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے ـــــ یعنی لڑکی = $\frac{1}{3}$ اور لڑکا = $\frac{2}{3}$ (اس لئے کہ کنبے کے اخراجات کا کفیل مرد ہے، عورت نہیں۔ $\frac{2}{3}$)۔ [ؔ]

ؔ آیت میں الفاظ الذکر اور الانثیٰ ہیں۔ یعنی نر اور مادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں حصے مقرر نہ ہوں اور وارثوں میں مرد اور عورتیں شامل ہوں تو وہاں یہی اصول کارفرما ہوگا۔ یعنی عورت کے مقابلہ میں مرد کا دگنا حصہ۔

اولاد کے معنی صرف بیٹا بیٹی نہیں۔ اس میں نیچے تک سب شامل ہوتے ہیں (پوتا پوتی وغیرہ)

(۲) اگر لڑکیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں، تو ان کے لئے ترکہ کا ⅔ حصّہ ہے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو نصف۔ (یعنی لڑکے ساتھ نہ ہوں۔ صرف لڑکیاں وارث ہوں)۔

(۳) اور متوفی کے ماں باپ ہیں۔ تو ہر ایک کا چھٹا (⅙) حصّہ ہے بشرطیکہ متوفی کی اولاد بھی ہو۔ لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کے وارث ہوں، تو اس کی ماں کا حصّہ تیسرا (⅓) ہے اور باپ کا (⅔)۔ اور اگر اس کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا حصہ چھٹا (⅙) ہے۔ یاد رکھو! یہ تقسیم متوفی کی وصیّت (جو فرض ہے ۱۸۰/۲) پوری کردینے اور قرضہ چکا دینے کے بعد ہوگی۔ (یعنی ترکہ سے سب سے پہلے متوفی کا قرضہ ادا کرو۔ پھر دیکھو کہ اس کی وصیّت کیا ہے۔ اگر وصیّت پورے مال پر حاوی نہ ہو۔ یا وہ وصیّت کر ہی نہ سکا ہو۔ تو اس صورت میں ترکہ کی تقسیم مذکورہ بالا حصّوں کے مطابق کرو)۔ اس لئے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ یا تمہاری اولاد میں سے کون سا رشتہ نفع رسانی کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے۔ اس لئے یہ حصّے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں، کیونکہ اس کا ہر فیصلہ علم اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ (یعنی متوفی تو جانتا تھا کہ کون سا رشتہ دار اس کے ترکہ کا زیادہ حقدار ہے۔ اس لئے اس کا وصیّت کرنا فرض قرار دے دیا گیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو پھر خدا نے اسے تم پر چھوڑنے کے بجائے حصّوں کا تعیّن خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے)۔

اس آیت میں الفاظ الذکر اور الانثیٰ آئے ہیں۔ یعنی نر اور مادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں قرآن نے خود حصّے متعیّن نہ کئے ہوں اور ورثاء میں عورتیں اور مرد دونوں شامل ہوں، وہاں اصولِ تقسیم یہ ہوگا کہ عورت کے مقابلے میں مرد کا دگنا حصّہ۔

نسبی رشتوں کے بعد قرآن مجید عقدی رشتوں کا ذکر کرتا ہے۔

۱۲/۴ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝ (۱۲/۴)

(۱) جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ کر مریں اس میں سے تمہارا حصّہ نصف (½) ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو۔

اگر ان کی اولاد ہو تو پھر ان کے ترکہ میں سے تمہارا حصہ (۱/۴) ہے۔

یہ تقسیم اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہوگی جو انہوں نے کی ہے۔ یا ان کے قرضہ کی ادائیگی کے بعد۔

(۲) تمہارے ترکہ میں تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ (۱/۴) ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو۔ اگر تمہاری اولاد ہو تو بیویوں کا حصہ آٹھواں (۱/۸) ہے۔ تمہاری وصیت پوری کرنے یا قرضہ ادا کرنے کے بعد (۳) اگر متوفی لاولد ہو اور اس کے ماں باپ بھی ہوں اور بھائی بہن بھی تو

اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ (۱/۶)

اور اگر بھائی بہنوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو تو وہ سب ایک تہائی (۱/۳) میں شریک ہوں گے۔

(جب ایسے متوفی کے ماں باپ بھی نہ ہوں تو اس کے ترکہ کی تقسیم (۴/۱۷۶) کے مطابق ہوگی۔ یہ تقسیم بھی وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے "غَیْرَ مُضَآرٍّ"، تو اس کا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سُدُس اور ثُلُث (چھٹے حصے اور تیسرے حصے) کی تقسیم اس طرح کرو کہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ ترکہ میں مختلف قسم کی چیزیں شامل ہوں گی۔ ان کے حصے اس طرح کرو کہ کسی کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔ (مثلاً ایک مکان ہے جس کے چھ حصے یا تین حصے کرنے ہیں، تو یہ حصے عدل و انصاف کی رُو سے کئے جائیں)۔ (وصیت کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۷۶-۱۷۷۔ زیر آیت ۲/۱۸۰ دیکھئے)

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ طریق تقسیم یہ ہے کہ پہلے عقدی رشتوں کے حقوق ادا کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں آیت (۴/۳۳) میں کہا گیا ہے:۔

۴/۳۳ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ (۴/۳۳)

مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوقِ ملکیت کا فطری تقاضا ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان سب کا حصہ ہو ___ صرف مردوں ہی کا نہ ہو ___ چنانچہ جو کچھ کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں، ہم نے اس کے لئے حصے دار مقرر کر دیئے ہیں۔ (۴/۱۱) یہ صرف نسبی رشتہ داروں تک محدود نہیں۔ عقدی رشتے بھی اس میں شامل ہیں۔

عقدی رشتے

عقدی رشتوں میں ایک تو میاں بیوی ہیں اور دوسرے وہ لوگ جنہیں از روئے وصیت (معاہدہ) تم کچھ دینا چاہو۔ اصولِ تقسیم یہ ہے کہ پہلے ان لوگوں کا حصہ نکال لیا جائے اور اس کے

بعد (بقایا) دوسروں میں تقسیم کیا جائے ۔ (اس طرح، بیوی کو اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ سے سب سے پہلے حصّہ ملے گا) ۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ خدا کی نگاہ ہر بات پر رہتی ہے ۔

آیت (۴/۱۲) میں کَلٰلَۃً کا لفظ بھی آیا ہے ۔ کَلٰلۃ کے معنی ہیں لاولد متوفی ۔ اس کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں ۔ ایک وہ جس کے ماں باپ اور بہن بھائی ہوں ۔ اس کے متعلق ـــــ مندرجہ بالا آیت میں حکم آگیا ہے کلٰلۃ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں متوفی کے نہ اولاد ہو اور نہ ہی ماں باپ ۔ اس کے متعلق حسب ذیل آیت میں حکم آیا ہے :-

۴/۱۷۷ يَسْتَفْتُونَكَ ۗ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ
وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ
لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً
رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۗ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ع (۴/۱۷۷)

(اس سورۃ کے شروع میں وراثت کے قوانین بیان کئے گئے تھے، جن میں کلالہ یعنی لاولد کا ذکر بھی آیا تھا ۔ وہاں اس لاولد مرنے والے کا ذکر تھا جس کے ماں باپ اور بہن بھائی موجود ہوں (۴/۱۲) ۔ اسی ضمن میں یہ لوگ تم سے کچھ مزید دریافت کرتے ہیں ۔ کہو کہ اس کے متعلق تمہیں خدا خود بتاتا ہے ۔

اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ ۔ تو اس کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی ۔

(۱) اگر متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو، تو ترکہ میں اس کا نصف حصّہ ہوگا ۔

(۲) اگر متوفیہ عورت ہو، اس کے ترکہ کا وارث اس کا بھائی ہوگا ۔

(۳) اگر ایک بہن کے بجائے دو بہنیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی (۲/۳) حصّہ ہوگا ـــــ دو سے زیادہ بہنوں کے لئے بھی یہی اصول ہوگا ۔ (۴/۱۱) ۔

(۴) اگر بھائی بہن ملے جلے ہوں تو "ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصّہ" کا اصول کارفرما ہوگا (۴/۱۱) (یہ تقسیم قرضہ کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی ۔ ۴/۱۱) ۔

اللہ تمہیں یہ احکام کھول کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو ۔ اور اللہ ہر بات کا صحیح صحیح علم رکھتا ہے ۔ اس لئے اس کے احکام و قوانین علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں ۔

وراثت کے متعلق احکام الٰہی آیات میں آئے ہیں، اگرچہ آیات کے اس مفہوم سے جو اوپر دیا گیا ہے، یہ احکام واضح ہو

جانتے ہیں، لیکن چونکہ ان معاملات سے ہم سب کا اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے، اسی لئے سہولت اسی میں ہوگی کہ تقسیم کا یہ پورا نقشہ بیک نظر سامنے آجائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ذیل میں یہ نقشہ دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ تقسیم اور حصص احکام قرآنی کے مطابق ہیں۔ ہمارے قوانین شریعت اور مروّجہ ملکی قوانین ان سے مختلف ہیں۔ نہ ہماری مروّجہ شریعت اور نہ ہی (سردست) ہماری مملکت میں قرآنی احکام نافذ ہیں۔ پہلے یہ اصول دیکھئے :۔

(۱) سب سے پہلے متوفی کا قرضہ ادا کیا جائے گا۔ پھر وصیت پوری کی جائے گی۔ اس کے بعد جو بچے گا وہ اس کا ترکہ کہلائے گا۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی :۔

(۲) پہلے عقدی رشتوں کے حصے ادا کئے جائیں گے۔ یعنی میاں بیوی کے۔ (میاں بیوی کے علاوہ جنہیں وعدہ کے طور پر کچھ دیا گیا ہو، انہیں بھی عقدی کہا جائے گا، لیکن ان کا معاملہ وصیت کی رو سے طے پائے گا۔)

(۳) اس کے بعد جو بچ جائے، اس میں سے ان وارثوں کے حصے ادا کئے جائیں گے جن کے حصے خدا نے مقرر کر دیئے ہیں۔

(۴) اس کے بعد جو باقی بچے، وہ ان میں تقسیم ہوگا جن کے حصے خود خدا نے مقرر نہیں کئے۔ صرف اصولِ تقسیم بتایا ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص لاوارث مرگیا ہو، یا مندرجہ بالا تقسیم کے بعد کچھ بچ جائے، تو وہ حقِ حکومت ہوگا۔

چونکہ ترکہ (یا وراثت) کی تقسیم کا مسئلہ معاشرہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ (قرآن کریم کی رو سے) اوپر بتایا گیا ہے، اسے ترتیب سے دوبارہ لکھ دیا جائے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ یہ تقسیم متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور وصیت پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچے، اس پر ہوگی۔

(۱) میاں بیوی

بیوی کے ترکہ میں سے خاوند کا حصہ :۔

۱۔ اگر بیوی کی اولاد ہو　($\frac{1}{4}$)　　۲۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو　($\frac{1}{2}$)

خاوند کے ترکہ میں بیوی کا حصہ :۔

۱۔ اگر خاوند کی اولاد ہو　($\frac{1}{8}$)　　۲۔ اگر خاوند کی اولاد نہ ہو　($\frac{1}{4}$)

(۲) ماں باپ کا حصہ

۱۔ اگر متوفی صاحبِ اولاد ہو تو ——

ماں اور باپ ہر ایک کو (۱/۶) ۔ (باقی اولاد کو)

۲۔ متوفی لاولد ہو اور وارث صرف ماں باپ ہوں تو ماں کو (۱/۳) ۔ اور باپ کو (۲/۳)

۳۔ اگر لاولد متوفی کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں کا حصہ (۱/۶) ہوگا ۔

(۳) اولاد

{اوپر کے حصے نکالنے کے بعد جو کچھ بچے اس میں سے}

۱۔ ایک لڑکا یا زیادہ لڑکے (جب لڑکی کوئی نہ ہو) تو یہ سب برابر برابر تقسیم کرلیں گے ۔

۲۔ لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا ۔

طریقہ یہ ہے کہ لڑکوں کی تعداد کو دگنا کرکے اس میں لڑکیوں کی تعداد جمع کرلو ۔ یہ کل حصے ہوجائیں گے ۔ ان میں اکہرا حصہ لڑکی کا ۔ دوہرا حصہ لڑکے کا ۔ مثلاً دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے اور ترکہ پانچ ہزار روپیہ ہے ۔

طریقہ : ۴ + ۱ = ۵ ، $\frac{۵۰۰۰}{۵}$ = (۱۰۰۰)

ہر لڑکا = ۲۰۰۰	(کل = ۴۰۰۰	۵۰۰۰ =
لڑکی = ۱۰۰۰	= ۱۰۰۰	

۳۔ اگر صرف لڑکیاں ہوں ۔

۱۔ صرف ایک لڑکی ہو تو ۔ (۱/۲)

۲۔ دو یا دو سے زیادہ ہوں تو (۲/۳) میں شریک ۔ جو باقی بچے وہ حکومت کی طرف منتقل ہوجائے گا ۔

۴۔ یتیم پوتا پوتی اپنے مرحوم باپ کے حصے کے وارث ہوں گے ۔ (تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی)

(۴) کلالہ (لاولد متوفی)

بیوی یا خاوند کا حصہ نکالنے کے بعد ۔

۱۔ اگر اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سب ہوں ۔

(۱) صرف ایک بھائی اور ایک بہن ۔ ہر ایک کو (۱/۶)

(۲) جب بھائی بہن زیادہ ہوں تو ۱/۳ میں سب شریک ۔

(۳) بقایا ماں باپ کو ۔ اس طرح کہ ماں کو (۱/۶) باقی باپ کو

(۴) اگر صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو (۱/۳) باپ کو (۲/۳)

۲۔ کلالہ کے ماں باپ نہ ہوں ۔ صرف بہن بھائی ہوں ۔

۱۔ متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو تو اسے (۱/۲)

۲۔ ایک سے زیادہ بہنیں (۲/۳) میں سب شریک ۔

۳۔ ملے جلے بہن بھائی سارے کا سارا لے جائیں گے بھائی کے دو، بہن کا ایک کے حساب سے ۔

[اخوۃٌ کے معنی بھائی بہن ملے جلے ہیں ۔ (۱۲:۴) ۔ (۱۷۷:۴)

۴۔ متوفیہ عورت ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا ـــــ بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب مساوی تقسیم کرلیں گے ۔

(کلالۃ :۔ لیس لہٗ ولد ۔ ولہٗ اخٌ او اخت او اخوۃٌ (۴:۱۲) ـــ (۴:۱۷۷)

لاولد متوفی ۔ ماں باپ ہونے یا نہ ہونے کی شرطیں نہیں ۔ ماں باپ ہوں گے تو تقسیم اور طرح ہوگی ۔ اگر ماں باپ بھی نہ ہوں تو دوسری طرح ۔ دونوں صورتیں اوپر دے دی گئی ہیں ۔

ان حصص کو بیان کرنے کے بعد ارشادِ خداوندی ہے :۔

۱۴-۱۳/۴ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ؑ (۱۴-۱۳/۴)

یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ۔ سو جو لوگ اس نظامِ خداوندی کی اطاعت کریں گے جس کی تشکیل رسول اللہ کے ہاتھوں سے ہوئی ہے، ان کے لئے ایسا جنتی معاشرہ پیدا ہو جائے گا جس کی شادابیاں سدا بہار ہوں گی ۔ اور یہ بہت بڑی کامرانی ہے۔ اور جو اس نظام کی نافرمانی کرے گا ۔ یعنی ان حدود اللہ سے تجاوز کرے گا ۔ تو اس کی زندگی ایسے ذلت آمیز عذاب میں گزرے گی جو اس کی انسانی صلاحیتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے گا ۔

اس سے آپ ان احکام کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں؛ اور اس کے بعد اس حقیقت پر خون کے آنسو بہائیے کہ جو قوانینِ وراثت ہمارے ہاں شریعت کے نام سے مروّج چلے آرہے ہیں؛ وہ علی الرغم ان کے خلاف ہیں !

فاعتبروا یا اُولوالالباب !

ان قوانین کے خلافِ قرآن ہونے کے علاوہ ان میں اکثر و بیشتر بے انصافی سے کام لیا گیا ہے، اور اس بے انصافی میں ہمارے نزدیک سب سے زیادہ نمایاں مثال یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم کرنے کا قانون ہے۔ چونکہ اس مسئلہ نے آج کل بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اِسے ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ میں اس موضوع پر گزشتہ قریب تیس سال سے لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میرا آخری مقالہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِسے یہاں درج کر دیا جائے کیونکہ وہ اس متنازعہ فیہ مسئلہ کے تمام گوشوں کی وضاحت کر دیتا ہے۔

قرآنِ مجید میں قانونِ وراثت کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ..... (۴/۷)

اقربون جن میں والدین بھی شامل ہیں، جو کچھ چھوڑ کر فوت ہوں (اس کی تقسیم یوں ہوگی)۔ دوسری آیت یہ ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ...... (۴/۱۱)

اولاد میں ترکہ کی تقسیم کے متعلق یہ حکم ہے:۔

ان آیات میں والدین۔ اولاد اور اقربون کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ہماری زبان میں والدین سے مراد صرف ماں باپ ہوتے ہیں اور اولاد سے مراد بیٹے بیٹیاں۔ لیکن عربی زبان میں ماں باپ اور ان سے اوپر تک (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں اور اولاد میں بیٹے بیٹیاں اور ان سے نیچے تک (پوتے پڑپوتے وغیرہ) سب۔ اس حقیقت کو اہلِ فقہ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اختلاف اقربون کے مفہوم میں ہے۔

قرآن کریم نے والدین کے ساتھ جو اقربون کا اضافہ کیا ہے تو اس میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے

مثال ۱

زید
بکر
عمر
حمید
رشید

اس میں بکر سے لے کر رشید تک سب زید کی اولاد میں شامل ہیں اور حمید سے لے کر زید تک سب رشید کے والدین میں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے زید کی وفات پر بکر سے لے کر رشید تک سب اس کے وارث قرار پا جائیں گے اور رشید کی وفات پر حمید سے لے کر زید تک۔ لیکن اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتیں۔ قرآن مجید نے اقرب کا اضافہ کر کے معاملہ صاف کر دیا۔ لیکن جس لفظ نے قرآنی منشاء کو اس قدر واضح کر دیا تھا فقہ نے اسی سے سارے معاملہ کو الجھا دیا۔ اقربون کا عام ترجمہ "رشتہ دار" یا "قریبی رشتہ دار" کیا جاتا ہے۔ اس ترجمہ یا مفہوم کی رو سے کہا جاتا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار

وارث نہیں ہو سکتا۔ اقربون کے اسی مفہوم کی رُو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم قرار دیا جاتا ہے۔ بات ذیل کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔

مثال ۲

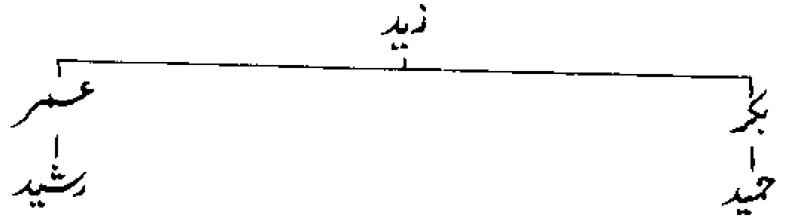

اہلِ فقہ کا کہنا ہے کہ بکر اور عمر زید کے "قریبی رشتہ دار" ہیں۔ اس لئے وہی زید کے ترکہ کے وارث ہوں گے۔ حمید اور رشید "دور کے رشتہ دار" ہیں۔ (بکر اور عمر کی موجودگی میں) وہ زید کے ترکہ کے وارث نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک بات ٹھیک ہے کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، یہ اقرب کے قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ زید کی زندگی میں بکر وفات پا جاتا ہے۔ اہلِ فقہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں عمر جو زید کا قریبی رشتہ دار ہے وہ اس کے کل ترکہ کا وارث ہوگا اور حمید جو زید کا دور کا رشتہ دار ہے وہ اس کے ترکہ سے محروم ہو جائے گا۔ یتیم پوتے کی محرومی کی ساری عمارت اس فقہی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

(۳) اقرب (جمع اقربون) کا مندرجہ بالا مفہوم صحیح نہیں۔ "اقرب" کا لفظی ترجمہ "قریب تر" ہے۔ "رشتہ دار" نہیں۔ رشتے داروں کے لئے قرآن مجید میں ذی القربیٰ وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ "اقرب" کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھئے کہ قرآنِ مجید نے یہ نہیں کہا کہ ترکہ "اقربون" کو ملے گا۔ اس نے کہا ہے کہ جو کچھ اقربون چھوڑ جائیں وہ ان کے ورثاء میں تقسیم ہو۔ یعنی اقرب کا لفظ متوفی کے لئے آیا ہے وارث کے لئے نہیں۔ بظاہر ان دونوں میں کچھ فرق نظر نہیں آتا لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان میں بڑا اہم فرق ہے۔ اقرب کے معنے ہیں وہ متوفی جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔ مثال ۲ کو سامنے لایئے۔ زید، بکر اور عمر دونوں کا اقرب ہے کیونکہ اس کے اور اس کے ان بیٹوں کے درمیان کوئی اور وارث حائل نہیں۔ لیکن وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں کیونکہ اس کے اور ان دونوں کے درمیان بکر اور عمر روک بن کر کھڑے ہیں۔ یعنی زید اور حمید کے درمیان بکر اور زید اور رشید کے درمیان عمر۔ لہٰذا، بکر اور عمر کی موجودگی میں وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا۔ وہ بے شک حمید اور رشید کا "والد" ہے لیکن ان کا اقرب نہیں۔ اس سے مثال ۲ کی حکمتِ بالغہ واضح ہو جائے گی۔

لیکن اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو وہ حمید کا اقرب ہو جائے گا کیونکہ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی جس کی وجہ سے وہ حمید کا اقرب نہیں تھا۔ البتہ وہ رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اور رشید کے درمیان

عمر کی رکاوٹ موجود ہے۔ لہٰذا، زید کی وفات پر رشید تو اس کے ترکہ سے محروم رہے گا، حمید نہیں۔

اب آپ سوچئے کہ جب قرآن مجید نے کہا ہے کہ اقرب جو کچھ چھوڑ کر مریں ان کے ترکہ کی وارث ان کی اولاد ہو گی تو حمید کو، جو زید کی اولاد بلا رکاوٹ ہے، زید کی وراثت سے محروم کر دینا قرآن مجید کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو کیا ہے؟ فقہ کا فیصلہ ہے کہ عمر جس طرح رشید کے راستے میں رکاوٹ ہے اسی طرح حمید (یتیم) کے راستے میں بھی رکاوٹ ہے۔ سوچئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بکر کی زندگی میں زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر تھا، نہ کہ عمر تو بکر کے مرنے کے بعد عمر، حمید کی رکاوٹ کیسے بن گیا؟ ذیل کی مثال کی دو لائنوں پر غور کیجئے۔

مثال ۳

زید	اور	زید
بکر		عمر
حمید		رشید

یہ دونوں لائنیں الگ الگ ہیں۔ بکر حمید کی رکاوٹ ہے اور عمر رشید کی۔ حمید کی رکاوٹ بکر کے مرنے سے دور ہو گی اور رشید کی عمر کے مرنے سے۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ فقہ بھی اسے تسلیم کرتی ہے کہ زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر ہے، عمر نہیں۔ اگر زید اور بکر کی زندگی میں حمید فوت ہو جائے تو اس کا وارث بکر ہوتا ہے۔ زید نہیں۔ لیکن اگر بکر، حمید سے پہلے فوت ہو جائے تو پھر فقہ، زید کو حمید کا وارث تسلیم کر لیتی ہے خواہ عمر زندہ ہی ہو۔ یعنی اس صورت میں عمر، زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بالفاظ دیگر، ہماری فقہ کی رُو سے یتیم پوتا تو دادا کی وراثت سے محروم قرار پا جاتا ہے لیکن دادا اپنے یتیم پوتے کی وراثت سے محروم نہیں قرار پاتا۔ یہ بات آپ کو عجیب سی لگے گی۔ لیکن عجیب ہو یا غریب ہے یہ واقعہ۔ فقہ کا یہی فیصلہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ فقہ خود تسلیم کرتی ہے کہ اقرب کے معنے "قریبی رشتے" نہیں بلکہ وہ متوفی ہے جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔

(۴) فقہ کے فیصلے کی رُو سے جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ زید اور اس کے دونوں بیٹے (بکر اور عمر) ایک جگہ کھڑے ہیں۔ کچھ ڈاکو زید پر حملہ کرتے ہیں۔ عمر اپنے باپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ بکر اسے بچانے کے لئے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتا ہے۔ گولی اسے بھی لگتی ہے اور زید کو بھی۔ بکر وہیں موقع پر مر جاتا ہے اور زید ہسپتال جا کر کچھ وقت بعد دم توڑ دیتا ہے۔ فقہ کے فیصلے کی رُو سے بکر کی یتیم اولاد زید کے ترکہ سے محروم رہ جائے گی اور عمر جو باپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ باپ کے سارے ترکہ کا وارث بن جائے گا۔

جب زید اور بکر کو گولی لگی تھی، اگر زید پہلے مر جاتا اور اس کے دو منٹ بعد بکر فوت ہو جاتا تو حمید کو زید کے ترکہ سے حصہ مل جاتا۔ لیکن اگر بکر زید سے دو منٹ پہلے مر جائے تو پھر حمید کو کچھ نہیں مل سکتا۔

(۵) اہلِ فقہ کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ پوتا اپنے باپ کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے۔ جب بکر کو' اپنے باپ سے پہلے مرجانے پر باپ کے ترکہ سے کچھ ملا ہی نہیں تو حمید کون سے ترکہ کا وارث ہو جائے گا؟ ان سے پوچھئے کہ اگر دلیل یہی ہے تو اگر بکر اور عمر زید سے پہلے مر جائیں تو زید کے مرنے پر حمید اور رشید کو اس کے ترکے کا وارث کیسے بنایا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے تو اپنے باپوں کا ترکہ لینا تھا۔ جب ان کے باپوں نے زید کا کوئی ترکہ ہی نہیں پایا تھا تو ان کے بیٹوں کو زید کا ترکہ کیسے مل جائے گا؟ لیکن فقہ خود اپنی دلیل کے خلاف انہیں ترکہ دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ حمید' اپنے باپ کے مرنے پر' باپ کی جگہ آجاتا ہے' اسی طرح رشید' اپنے باپ کے مرنے پر اس کی جگہ۔ اس وقت یہ زید کے "پوتے" نہیں رہتے "اولاد" میں شامل ہونے کی جہت سے' اس کے "بیٹے" بن جاتے ہیں۔ یعنی زید کے بیٹوں کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ یتیم پوتہ اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔

مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ یہ حضرات اپنے مؤقف کی تائید میں کون سی سند پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم قرار دینے میں مودودی (مرحوم) پیش پیش تھے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ اس کے لئے سند کیا ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا:۔

> فقہاء اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بناء قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہاء اُمت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ (رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ایڈیشن سوم صفحہ ۲۰۹)

یعنی انہیں اپنے مؤقف کی تائید میں نہ قرآن کریم سے کوئی حکم ملا نہ حدیث سے لیکن چونکہ اسلاف سے یہ مسلک متواتر چلا آرہا ہے اس لئے اتباع اسی کا کرنا چاہیئے۔ یہ وہی دلیل ہے جسے قرآنِ کریم متعدد مقامات پر یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (۳۱/۲۱)" جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جو ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے"۔

ما انزل اللہ، کے اتباع کی دعوت طلوعِ اسلام نے دی تھی۔ ان کے متعلق مودودی (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ

> یہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اُپچ کی بات نکالا

کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری اُمت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے اس طرح کے خطبوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟

(ترجمان القرآن بابت جون۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

علم اور دین کی بارگاہ سے اس قسم کے جوابات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جب ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ جب تک یتیم پوتوں کا دادا زندہ تھا وہ ان کی پرورش کا ذمہ دار تھا کیونکہ اس کی جائداد اس کے اپنے قبضے میں تھی اس کے مرنے کے بعد یہ جائداد یتیموں کے چچا کے پاس چلی جائے گی اور انہیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا تو یہ بے سہارا رہ جائیں گے۔ ان کی پرورش کا کیا انتظام ہوگا۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ

شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کا انتظام کریں۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۱)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ دادا ان کے حق میں کچھ وصیت بھی کر سکتا ہے۔ یعنی پہلے تو انہیں اس حق سے محروم کر دیا جو انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اور پھر ان کے چچا کو ترغیب دلائی کہ وہ ان بے سہارا یتیموں کی طرف (جن کے حصے کو وہ ہڑپ کر چکے ہیں) بھیک کے کچھ ٹکڑے پھینک دیا کریں (یتیموں کی جس طرح پرورش ہوا کرتی ہے اس کا کسے علم نہیں)۔ اس سے ہمیں یہودیوں کی وہ ذہنیت یاد آگئی جسے قرآن کریم نے ہماری عبرت آموزی کے لئے بیان کیا ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اپنے ہاں کے غریب اور بے سہارا لوگوں کو بستیوں سے نکال دیتے اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر قیدی بنا لیتے تو یہ ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے آپس میں چندے اکٹھے کرتے کیونکہ ان کے نزدیک قیدیوں کو رہا کرانا بڑے ثواب کا کام تھا۔ قرآن کریم نے اس پر ان کی سخت سرزنش کی ہے اور کہا ہے کہ اس "ثواب کمانے" کی خاطر تم جو پہلے جرم کرتے ہو تمہیں اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں اور کیا تمہارا یہ (بزعم خویش) ثواب کا کام اس کا کفارہ بن سکتا ہے؟ اس کے بعد کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے سے کفر برتتے ہو"۔ یاد رکھو: فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا کہ دنیاوی زندگی میں تم ذلیل و خوار ہو اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا"۔

یتیم پوتوں کے سلسلے میں ہم یہی روش اختیار کرتے ہیں۔ پہلے انہیں ان کے حق سے محروم کر دیتے ہیں اور پھر

ان کے اپنی رشتے داروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کر کے ثواب کمائیں نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

اس ضمن میں اتنا اضافہ غیر از محل نہ ہوگا کہ ۱۹۶۱ء میں حکومت کی طرف سے عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان میں ایک شق یہ بھی تھی کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے حصہ پا سکے گا۔ ہمارے علماء حضرات اس وقت سے لے کر آج تک ان قوانین کے بالعموم اور یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق شق کو بالخصوص منسوخ کرانے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان سطور کی تحریر (۱۹۸۰ء) تک تو انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اس میں کامیاب ہو جائیں جب یہاں حدود (شرعی سزاؤں) جیسے فقہی قوانین نافذ ہو سکتے ہیں، جو قرآنِ کریم کے بھی خلاف ہیں اور ناممکن العمل بھی، تو یتیم بچاؤں کو سہارا دینے والا قانون کیوں نہیں منسوخ ہو سکتا ہے؟ بہرحال، یہ بحث جدا گانہ ہے۔ قانونِ وراثت کے سلسلے میں آخری (اور نہایت اہم) شق، یتیم پوتے کی وراثت کا سوال تھا جسے ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

واضح رہے کہ ترکہ، وراثت اور وصیت کے متعلق احکامات اس عبوری دور کے لئے ہیں جب قرآن کا معاشی نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا ہو گا۔

تقسیمِ وراثت کے بعد قرآنِ کریم عائلی زندگی کی طرف آتا ہے اور اس ضمن میں بات تحفظِ عصمت سے شروع کرتا ہے۔ تحفظِ عصمت کو قرآن کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد سوم (ص ۲۰۴) میں بتایا جا چکا ہے، اب خود مغرب کے محققین بھی اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ جنسی مسئلہ انفرادی نہیں۔

حفاظتِ عصمت

اس کا اثر قوم کی اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے، اور جو قوم جنسی تعلقات کی پابندیوں میں ڈھیل دے دیتی ہے، وہ رو بہ انحطاط ہو جاتی ہے اور (ڈاکٹر انون کی تحقیق کی رُو سے) زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے حفاظتِ عصمت کو غیر متبدل ابدی قدر قرار دیا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر سابقہ جلدوں (بالخصوص جلد سوم) میں بڑی وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ کی اہمیت سے صرفِ نظر کر کے اپنے آپ کو اس کے قانونی پہلوؤں تک محدود رکھیں گے۔

(۱) زنا

اپنی منکوحہ بیوی کے سوا، کسی اور سے جنسی اختلاط زنا ہے۔ قرآنِ کریم میں مؤمنین کی خصوصیات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:-

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ؕ (۲۳/ ۵-۶)

(مومن وہ ہیں) جنہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا، اور انہیں صرف اپنی بیویوں پر صَرف کیا، یا ان لونڈیوں پر جو (انسدادِ غلامی کے متعلق قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے (۴۷/۴) ان کے ملک میں آچکی تھیں۔ (لیکن جنہیں نکاح کے بعد بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جاچکا تھا)۔ ان سے زناشوئی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔

اس کے بعد ہے:۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ (۲۳/ ۷) نیز (۷۰/ ۲۹-۳۱)

جو کوئی ان کے علاوہ، جنسی تعلق کی کوئی صورت اختیار کرے تو وہ قانون شکن ہوگی اور حدودِ خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے۔ ۲۳/۷)۔

(۲) زنا، جرم ہے اور اس میں (بجز زنا بالجبر کے) مرد اور عورت دونوں یکساں مجرم ہوتے ہیں۔ سورۂ النور میں ہے:۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲۴/ ۲)

زانی عورت اور زانی مرد، دونوں کو سو سو کوڑوں کی سزا دو۔ یہ قانون کا معاملہ ہے، اس لئے اس میں کسی قسم کی نرمی نہ برتو، اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو (یعنی اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو کہ یہ احکام خداوندی ہیں اور ان کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے —— خواہ اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ یہ سزا، مؤمنین کے ایک گروہ کی موجودگی میں نافذ کرو۔ (جو اس کے گواہ بن سکیں کہ سزا قاعدے کے مطابق دی گئی ہے)۔

پاکستان میں حدود (شرعی سزاؤں) کے نام سے جو فقہی قوانین مملکت کی طرف (۱۹۷۹ء میں) نافذ ہوئے ہیں، ان میں جرمِ زنا کے ارتکاب کے ثبوت کے لئے یہ شرط ہے کہ چار پاکباز گواہوں نے فعلِ دخول (ACT OF PENETR-ATION) کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ (یہ شرط قرآن کی عائد کردہ نہیں۔ فقہ کی ہے)۔ اس ناممکن العمل (اور معاف بغرمائیے، حیا سوز) شرط کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت تک زنا کا کوئی ایک جرم بھی ثابت نہیں ہو سکا، اس لئے کسی مجرم کو شرعی سزا نہیں مل سکی۔ علاوہ اس کے کہ اس سے اس گھناؤنے جرم کے مرتکبین کی جرأتیں کس قدر بےباک ہوگئیں، ہماری جگ ہنسائی بھی خوب ہوئی!

یہ تو تھی اثباتِ جرم کی شرط۔ جہاں تک سزا کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے اس کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہوئی ہے۔

لیکن (فقہ پر مبنی) جو قوانین پاکستان میں نافذ ہوئے ہیں۔ اُن کی رُو سے :-

۱ ـــــ سو کوڑے غیر شادی شدہ مجرمین کی سزا ہے۔

۲ ـــــ شادی شدہ کی سزا رجم (سنگسار) ہے۔

رجم کی سزا رجم یا سنگسار کی سزا یہودیوں کے ہاں رائج تھی۔ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ لہٰذا، فقہ کی رُو سے یہ سزا، قرآنِ کریم میں کھلی ہوئی تحریف ہے۔ یہاں سے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب قرآنِ کریم میں یہ سزائیں مذکور نہیں تو یہ حضرات اس کی سند کہاں سے لاتے ہیں؟ سند لاتے ہیں، حسبِ معمول، وضعی روایات سے اسے غور سے سُنئے۔ "الاتقان فی علوم القرآن" کی دوسری جلد (ص۲۵) میں، حضرات ابی بن کعبؓ سے ایک روایت درج ہے جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے :-

عن زر بن حبیش، قال قال لی ابی بن کعب کا ین تعد سورۃ الاحزاب قلت اثنین و سبعین آیۃ او ثلاثۃ وسبعین آیۃ۔ قال ان کانت لتعدل سورۃ البقرۃ۔ کنّا لنقراء فیھا آیۃ الرجم قلت وما آیۃ الرجم ـــــ ؟ قال اذا زنیا الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ۔ نکالا من اللہ۔ واللہ عزیز حکیم۔

(الاتقان فی علوم القرآن۔ جلد دوم۔ ص۲۵)

حضرت زر بن حبیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۂ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ یہی ۷۲-۷۳ (جو سورۂ احزاب میں موجود ہیں) انہوں نے کہا کہ نہیں۔ سورۂ احزاب میں سورۂ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ (یعنی ۲۸۶ ناقل) ان میں ایک آیہ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آیت رجم کیا تھی، فرمایا کہ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس روایت میں الفاظ الشیخُ والشیخۃُ آئے ہیں۔ عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ ان کے معنی ہیں بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے مراد ہیں شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت۔ عربی زبان میں یہ الفاظ ان معانی میں کہیں نہیں آئے۔ لیکن ان واضعین روایات نے تو زانیوں کو دو قسموں میں منقسم کرنا تھا۔ اس لئے سورۂ النور کی آیت میں جو الفاظ ـــــ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِی آئے ہیں، ان کے معنی کئے گئے "غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد" اور اس کے بالمقابل الشیخ والشیخۃُ کے معنی کئے گئے۔ "شادی شدہ مرد، اور شادی شدہ عورت"۔

اس روایت میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ سورۂ احزاب میں سورہ بقرہ جتنی آیات تھیں یعنی ۲۸۶ آیات۔ قرآن مجید میں سورہ احزاب کی کل آیات ۷۳ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بقایا ۲۱۳ آیات کا کیا ہوا؟ وہ کہاں چلی گئیں؟ ان میں سے ایک آیت کے متعلق جو رجم سے متعلق تھی انہوں نے تحقیق کر لی۔ غور سے سنئے کہ وہ تحقیق کیا تھی۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے)۔ کہا گیا ہے کہ جب قرآن کریم مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کرامؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت رجم سے متعلق تھی، اور دوسری رضاعت سے متعلق۔ چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے فرمایا کہ

> آیہ رجم اور آیہ رضاعتِ کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

لہٰذا، ان دونوں آیات کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا۔ لیکن (روایات کی رُو سے) اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ کے زمانے میں ہم آیہ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا۔ (غالباً اس زمانے میں جب وہ برسرِ اقتدار آئے) کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ آپ بھی اس آیت کی تلاوت رسول اللہ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے۔ تو آپ اسے قرآنِ کریم میں درج کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ کا جواب ملاحظہ فرمائیے:۔

> وقال عمرؓ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لا ثبتہ فی المصحف۔
>
> تفسیر کبیر، از امام رازی۔ نیا ایڈیشن۔ جلد ۲۲۔ ص ۱۳۴)
>
> حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں ضرور درج کر دیتا۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن مجید میں اضافہ کر دیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ تھا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ

(۱) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنِ حکیم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ صرف تلاوت کے لئے رہ گئی ہیں۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنِ حکیم میں تو موجود نہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ جیسے آیہ رجم۔

آپ نے غور فرمایا کہ رجم (سنگساری) کا حکم کس طرح قرآن مجید سے ثابت کیا گیا؟ اس پر تو آپ غور کریں یا نہ کریں لیکن اس پر ضرور غور کیجئے گا کہ اس کے بعد خود خدا کی کتاب کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اہلِ حدیث ہوں یا اہلِ فقہ قرآنِ حکیم کی اس حیثیت پر سب متفق ہیں۔

یہ تو رہا رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابقِ فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاری کا مجموعہ سرفہرست ہے — اس موضوع پر بخاری کی دو ایک روایات ملاحظہ فرمائیے:۔

عن عمرو بن میمون قال رأیت فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیھا قرود قد زنت فرجموھا فرجمت معھم۔ (صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ)

حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانۂ جاہلیت میں میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا[1] کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا۔ اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجرؒ عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:۔

عن عمرو بن میمون قال کنت فی الیمن فی غنم لاھلی وانا علی مشرف۔ فجاء قرد مع قردۃ فتوسد یدھا فجاء قرد اصغر منہ۔ فغمزھا۔ فسلت یدھا من راس القرد سلا رفیقا۔ فتبعتہ۔ فوقع علیہ وانا انظر۔ ثم رجعت وجعلت تدخل یدھا تحت قرد اول برفق۔ فاستقظ فزعا۔ فشمھا۔ فصاح فاجتمعت القرود فجعل یصیح ویومی الیھا بیدہ۔ فذھب القرود یمنۃ ویسرۃ فجاؤا بذلک القرد اعرفہ۔ فحفروا لھا حفرۃ فرجموھا۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری از ابن حجر عسقلانی۔ جلد ہفتم۔ صفحہ ۱۳۱)

حضرت عمرو بن مامون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر

---

[1] حیوانات کے متعلق زنا کا تصور پیش کرنا، ان وضعی روایات ہی کا حصہ ہے۔

کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری۔ تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے) چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کر دی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر اُدھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے۔ جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں پتھر مارے تھے)۔

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی جسے ان روایات کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ہے بہ رجم کی اس سزا کی سند جسے پاکستان میں قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے۔

آیت (۲۴/۲) میں جرم زنا کی سزا مِائَةَ جَلْدَةٍ مقرر کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ ہے "سو کوڑے"۔

کوڑوں کی تفصیل

ہمارے ہاں اس سے پہلے کوڑوں کی سزا جیل خانوں میں ایسے قیدیوں کو دی جاتی تھی جن سے (قید خانے کے اندر) کسی سنگین جرم کا ارتکاب ہوتا تھا۔ چونکہ یہ سزا جیل خانے کے اندر دی جاتی تھی، اس لئے باہر کی دنیا کو بالعموم اس سزا کی نوعیت یا شدت کا علم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پاکستان میں (۱۹۷۷ء سے) جو مارشل لا نافذ ہوا، تو اس میں کوڑوں کی سزا معمول بن گئی۔ یہ کوڑے (بالخصوص) سرِ عام لگائے جاتے تھے۔ اس کے لئے اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کیا جائے تاکہ ان کے سامنے کوڑے لگائے جائیں۔ بعض اوقات ان مجرموں کے منہ کے سامنے لاؤڈ سپیکر نصب کر دیا جاتا تھا تاکہ اُن کی چیخ و پکار دُور دُور تک سنائی دے۔ ان کوڑوں کی سنگینی کا یہ عالم تھا کہ کڑیل سے کڑیل نوجوان بھی پانچ سات کوڑوں سے زیادہ کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اس سے یہاں تو جو اثر پیدا ہوتا تھا وہ ہوا، مغربی ممالک میں یہ اعتراض کیا گیا کہ اسلام میں زنا کی سزا سو کوڑے مقرر ہے، کیا کوئی مجرم اس قسم کے سو کوڑے کھانے کے بعد زندہ بھی رہ سکتا ہے؟

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ جلدۃ سے قرآن کریم کی مُراد کیا ہے۔ اس کے متعلق جو تحقیق کی گئی، اُس کا ملخص طلوعِ سلام

کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں کہا گیا تھا:

۱۔ فقہی تحقیق

"قرآن مجید میں کوڑے کے لئے "جلدۃ" کا لفظ آیا ہے۔ جو اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجرم کو کسی ایسی چیز سے سزا دی جائے جس کا اثر صرف اس کی کھال تک محدود رہے۔ اسلامی فقہ کی تفصیلات کے مطابق اگر کوڑے لگانے سے مجرم کے کسی حصے کا گوشت اُڑ گیا، یا کھال پھٹ گئی، یا زخم کھال کے اندر تک پہنچ گیا تو ایسی سزا جائز نہیں ہوتی چنانچہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن سے اس قسم کے زخم وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تھی۔
دورِ نبوی میں تو جرائم کی تعداد بڑی محدود تھی اور شاذو نادر ہی کوڑوں کی سزا تک نوبت پہنچتی تھی۔ اس لئے اس دور میں کوئی مخصوص قسم کا کوڑا تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جب کوئی مجرم پکڑا جاتا تو اُسے جوتوں یا کھجور کی چھال سے سزا دی جاتی۔ قاضی ابوبکر جصاص دورِ نبوی کی سزا کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كان من ضرب النبی صلی الله عليه وسلم بالجريد والنعال۔

(احکام القرآن۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوڑے مارنے کا کام جوتوں یا کھجور کی چھال سے لیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ دورِ نبوی میں چمڑے سے بنے ہوئے کوڑے سے سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ یہی صورت حالات حضرت ابوبکرؓ کے دور میں رہی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس مقصد کے لئے مخصوص کوڑا تیار کرایا تھا جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

اتی عمر بسوط فيه شدة فقال اريد الين من هذا۔ فاتی بسوط فيه لين فقال اريد اشد من هذا فاتی بسوط بين السوطين۔ فقال اضرب۔ ولا يرى ابطلك واعط كل عضو حقه۔ (ایضاً۔ ص ۲۶۱)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک کوڑا لایا گیا جو بہت سخت تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اس سے ذرا نرم ہونا چاہیئے۔ اس پر آپ کے پاس دوسرا کوڑا لایا گیا۔ جو پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ نرم تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے ذرا سخت چاہیئے۔ چنانچہ آپ کے پاس ان دونوں کوڑوں کے درمیانی معیار کا کوڑا لایا گیا تو آپ نے مارنے والے سے فرمایا کہ اس سے اس طرح ضرب لگائی جائے کہ تیری بغل (ARM PIT) نظر نہ آئے۔ اور پھر یہ کہ یہ کوڑے جسم کے ہر حصے

پر لگائے جائیں۔

خیال رہے کہ کوڑوں کی سزا وہ اہلِ علم صحابہؓ دیتے تھے جنہیں شرعی احکامات و اصول کا پورا پورا علم ہوتا تھا۔ اور پھر یہ کہ یہ سزا کپڑے اتار کر نہیں بلکہ موسم کے مطابق مجرم نے جو کپڑے پہن رکھے ہوتے تھے ان کو اتارے بغیر دی جاتی تھی۔ بلکہ اگر کوئی مجرم خود بھی کپڑے اتارنا چاہتا تو اسے کپڑے اتارنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح سے روایت ہے:

ان ابا عبیدۃ بن الجراح اتی برجل فی حد مذھب الرجل ینزع قمیصہ وقال ینبغی لجسدی ھذا لمذنب ان یضرب ولیس علیہ قمیص۔ فقال ابو عبیدۃ لا تدعوہ تنزع قمیصہ فضربہ علیہ (ایضاً۔ صفحہ ۲۶۲)

حضرت ابو عبیدہؓ بن الجرح کے پاس شرعی سزا کا ایک مجرم لایا گیا۔ تو اس نے اپنی قمیص اتارنی شروع کر دی۔ اور کہنے لگا کہ اس گناہگار جسم کو اس حالت میں کوڑے پڑنے چاہیئے کہ اس پر قمیص نہ ہو۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا کہ اسے قمیص نہ اتارنے دو۔ پس اسے قمیص کے اوپر کوڑے مارے گئے۔

یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جلد کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے مجرم کو بھیڑ یا بکری کی کھال پہنا دی جاتی تھی۔ تاکہ کوڑوں کا اثر جلد کے اندر تک نہ پہنچنے پائے۔ حضرت سعد بن ابراہیم سے روایت ہے:

ولقد حدثنی ابی ان امہ ام کلثوم امرت بشاۃ فسلخت حین جلد ابوبکرۃ فالبسہ مسکھا۔ فھل کان ذلک الا من ضرب شدید۔ (ایضاً۔ ص ۲۶)

مجھ سے میرے باپ نے روایت بیان کی کہ ان کی والدہ ام کلثوم نے ایک بھیڑ ذبح کرنے کو کہا۔ اور جب ابوبکرہ کو کوڑے لگائے گئے تو وہ کھال انہیں پہنا دی گئی تو کیا یہ ضربِ شدید سے بچنے کے لئے نہ تھا۔ (دوسری روایت میں ضرب خفیف آیا ہے)

سعودی عرب میں شرعی سزائیں دی جاتی ہیں۔ وہاں کس قسم کے کوڑے لگائے جاتے ہیں، اس کا اندازہ کوڑوں کی اس سزا سے لگایئے جس کی تفصیل جون ۱۹۷۶ء میں اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا ہے:

لندن، ۱۵ جون (رائٹر) شراب کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سعودی عرب میں مزید دو برطانوی باشندوں کو سرِ عام کوڑے لگائے گئے اور سزائے قید دی گئی ہے ان دو برطانوی باشندوں کو سزائے قید اور کوڑوں کی سزا کا انکشاف برطانوی دفتر خارجہ نے کیا ہے۔ اس سے پہلے جن دو باشندوں کو شراب تقسیم کرنے پر سرِ عام کوڑے

لگائے گئے تھے، برطانیہ واپس چلے گئے ہیں۔ میڈمنٹ اور کوپر کو ستر ستر کوڑے لگائے گئے تھے اور چھ چھ ماہ سزائے قید دی گئی تھی۔ میڈمنٹ اور کوپر نے ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں تاہم انہوں نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ جن دو مزید افراد کو سزائے قید اور کوڑے لگائے گئے ہیں ان میں ۲۰ سالہ پیرتن اور ۵۰ سالہ پیڈی والش ہیں اور دونوں امریکی فرم لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کارپوریشن کے ملازم ہیں۔ پیرتن کو دو سو کوڑے اور دو سال قید اور پیڈی کو ڈیڑھ سو کوڑے اور اٹھارہ ماہ قید کی سزا دی گئی۔

(نوائے وقت۔ ۶/۷۸ ۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ کوڑے ایسے ہوتے ہیں کہ پچاس پچاس سال کے بوڑھے، ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سو کوڑے لگا کر بھی ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال، قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

۲۔ عینی شاہد کی روئداد

گذشتہ سال مجھے چند ماہ سعودی عرب کے ایک شہر "الخرج" میں گذارنے کا موقع ملا جہاں میں نے ایک بار کوڑوں کی سزا کے نفاذ کا منظر بھی دیکھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سو، دو سو کوڑے بیک وقت نہیں لگائے جاتے، بلکہ چالیس چالیس کوڑے ایک وقت لگاتے ہیں۔ یہ سزا نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد کے باہر میدان میں دی جاتی ہے۔ ایک سو کوڑے سزا ہو تو چار ہفتوں میں پوری کی جاتی ہے۔

اس روز دو مجرموں کو سزا دی گئی۔ جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک سعودی تھا۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ میدان میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے پاکستانی کو زمین پر منہ کے بل لٹا دیا گیا، دونوں ہاتھ سر سے اوپر آگے کر رکھے تھے۔ ایک قاضی کا نمائندہ اور ایک افسر سرہانے کھڑے ہو گئے اور دو پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں بید کی چھڑیاں لئے مجرم کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ بید کی چھڑی تقریباً چار فٹ لمبی ہو گی۔ مجرم کے کپڑے نہیں اتروائے گئے تھے۔ دونوں سپاہیوں نے کھڑے کھڑے باری باری بید مارنے شروع کر دیئے۔ بید مارتے وقت نہ تو انہوں نے گھٹنے جھکائے اور نہ کوئی زور لگایا۔ میرا خیال ہے کہ ۴۰ کوڑے لگانے میں انہیں ۴۰ سیکنڈ لگے ہوں گے مجرم کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح سعودی بھی چالیس کوڑے کھا کر اٹھ گیا، اور دونوں پولیس کی گاڑی میں

جا بیٹھے۔ ان میں سے نہ کسی کا کپڑا اٹھا اور نہ ہی کسی ضرب پر ان کے مُنہ سے آہ نکلی۔

اِس سے معلوم ہوا کہ کوڑوں کی سزا، معمولی چھڑی جنٹی بھی نہیں ہوتی۔ چونکہ قرآن کریم نے جلدۃ کا تعین خود نہیں کیا، اِس لئے قرآنی مملکت اِس کی نوعیت خود متعین کرے گی۔

اِن تفاصیل سے یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ مِائَۃَ جَلْدَۃٍ کا مفہوم کیا ہے۔

باقی رہا جرم اور سزا کا باہمی تعلق اور اس کا فلسفہ، سو اس کے متعلق 'مطالب الفرقان' کی سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں "جرم و سزا" ۔ "جزا و سزا" کے عنوانات دیکھئے)۔

جنسیات کے سلسلے میں جرائم اور اُن کی سزاؤں کے متعلق مزید احکام حسبِ ذیل ہیں:۔

لونڈی زنا کی مرتکب ہو تو اُس کی سزا (شریف عورت کے مقابلہ میں) نصف ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ (۴/۲۵)

لونڈی کی سزا

"جب یہ لونڈیاں تمہارے نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی مرتکب ہوں، تو اُن کی سزا، آزاد عورتوں کی سزا (۲۴/۲) سے نصف ہے۔ (اس لئے کہ ان کی تربیت اچھے ماحول میں نہیں ہوئی، اور ان کی پہلی زندگی میں اِس قسم کی حرکات معیوب تصوّر نہیں کی جاتی تھیں۔ اِس لئے اِن سے اخلاق کا وُہ بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو شریف گھرانے کی عورتوں سے متوقع ہو سکتا ہے۔ سزا کے تعیّن میں ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔) عـ۱"

اِس سے ایک اہم اصول مستنبط ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کسی جُرم کی سزا کا فیصلہ کرتے وقت، مجرم کے ماحول، تربیت، ذہنیت وغیرہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ "لونڈی" کی سزا نصف مقرر کرنے سے مقصد یہی ہے۔ دوسری طرف کہا گیا ہے کہ اگر (بفرضِ محال) نبیؐ کی بیویوں سے اِس قسم کا جرم سرزد ہو تو اُن کی سزا دوگنی ہو گی:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ

عـ۱: اگر (جیسا کہ اربابِ شریعت کہتے ہیں) شادی شدہ مجرمین کی سزا رجم ہے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ لونڈیوں کو رجم کی نصف سزا کس طرح دی جائے گی؟

ضِعۡفَيۡنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ۝ (۳۳/۳۰)

"اے نبی کی بیویو! اگر تم میں سے کسی سے نازیبا حرکت سرزد ہو گئی تو اُسے اس کی دُگنی سزا ملے گی۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہو گا۔ (یہ اس لئے کہ تمہاری زندگی کو دوسری عورتوں کے لئے نمونہ بن جانا ہے)"۔

ایسے حالات پیدا نہ کرو جن سے، وہ جو تمہارے زیرِ اثر ہوں، زنا کے لئے مجبور ہو جائیں۔ سورۃ النور میں ہے:

وَلَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَمَنۡ يُّكۡرِهۡهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ (۲۴/۳۳)

"اور تمہاری نوجوان لڑکیاں (نوکرانیاں یا لونڈیاں) جو نکاح کا ارادہ رکھتی ہوں، اُنہیں اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر نہ روکو۔ اس طرح وہ بدکاری پر مجبور ہو جائیں گی۔ اور اگر کوئی اُنہیں اس طرح مجبور کرے گا، تو قانونِ خداوندی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ وہ اس چیز کے خلاف، اُن کی حفاظت کرے اور اُنہیں سامانِ نشو و نما مہیا کرے۔ (اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا کرے)"۔

اضافہ رجم کی سزا کے سلسلے میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ حکومتِ پاکستان نے، ۱۹۷۹ء میں اسے قانونی حیثیت دے دی تھی۔ اوائل ۱۹۸۲ء میں خود حکومت کی طرف سے قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت نے اسے خلافِ قرآن قرار دے کر کہا کہ ۱۹۷۹ء کے قانون کو منسوخ کیا جائے۔ اس پر "علماء کرام" کی طرف سے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا مطالبہ یہ کیا گیا کہ اس قانون کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے۔ وفاقی، شرعی عدالت کے فیصلہ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ ان ججوں کو تبدیل کر دیا جائے جنہوں نے مذکورہ بالا فیصلہ دیا ہے اور شرعی عدالت میں علماء حضرات کو بطور جج مقرر کیا جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس مخالفت اور مطالبہ پر تمام فرقوں کے علماء متفق ہیں۔ (یہ ہماری بدنصیبی کی انتہا ہے کہ ہمارے مختلف فرقوں کا جب بھی کبھی اتفاق ہوا ہے باطل پر ہوا ہے!) اس وقت (مئی ۱۹۸۲ء) تک کی اطلاع یہ ہے کہ حکومت نے وفاقی شرعی عدالت میں تین علماء کو بطور جج مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نیز یہ کہ حکومت اس پر غور کر رہی ہے کہ یا تو اس عدالت کے فیصلہ کے خلاف حکومت خود سپریم کورٹ میں اپیل کرے اور یا موجودہ قانون میں تبدیلی کر کے، شرعی عدالت کو اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے کی مجاز قرار دے دے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس معاملہ میں آخر الامر فیصلہ کیا ہو گا لیکن اس وقت تک کے واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ جس تھیاکریسی کو ختم کرنے کے لئے مملکتِ پاکستان کا وجود عمل میں آیا تھا، یہاں وہ تھیاکریسی بڑے زور شور سے قائم ہو رہی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے خلاف ان حضرات کی دلیل وہی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ یعنی، عدالت نے کہا کہ سزائے رجم کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ قرآن کے حکم کے مطابق ہے۔ کہا گیا کہ قرآن میں تو ایسی کوئی آیت نہیں۔ جواب میں کہا گیا کہ قرآن میں یہ آیت تھی۔ لیکن موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔ پوچھا گیا کہ پھر وہ آیت ہے کہاں؟ فرمایا، وہ ہمارے پاس ہے۔ اور فیصلہ اُس قرآن کے مطابق نہیں ہوگا جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے، اور جو امت کے پاس ہے۔ فیصلہ اُس آیت کے مطابق ہوگا جو ہمارے پاس ہے۔

اور یہ کوئی نئی دلیل نہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ:

۱۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات پہلے نازل کی گئی تھیں لیکن بعد میں اُن آیات کو بھی اُٹھا لیا گیا اور ان کا حکم بھی باقی نہ رہا۔

۲۔ قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں جو صرف تلاوت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے قرآن میں رہنے دی گئی ہیں حکم ان کا منسوخ ہے۔ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو کہیں نہیں کہا کہ قرآن کی فلاں آیت کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اس کا فیصلہ ائمہ تفسیر کرتے ہیں کہ کون کون سی آیات کا حکم منسوخ ہے۔ اور

۳۔ ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن میں موجود نہیں لیکن حکم ان کا باقی ہے۔ وہ آیات ہمارے پاس ہیں۔ حکم اُس قرآن کا نافذ نہیں ہوگا جو امت کے پاس ہے۔ اُن آیات کا نافذ ہوگا جو ہمارے پاس ہیں۔ آیۂ رجم انہی میں سے ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے علماء کے متعلق کہا تھا کہ ان کی جرأتیں اس حد تک بیباک ہو چکی ہیں کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (۲/۷۹)۔ "یہ اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھتے ہیں اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے" (نیز ۳/۷۷)۔ بعینہٖ یہی کچھ ہمارے یہاں ہو رہا ہے۔

اسی ضمن میں آتی ہیں ان کی وہ (مزعومہ) آیات جو قرآن میں نہیں ہیں، لیکن جن کے متعلق دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ منزل من اللہ ہیں اور ان کے پاس ہیں۔ حکم انہی کا چلے گا! ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟ اس کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف چلئے۔

۲۔ لواطت اور سحاقت

اگر دو مرد (یا دو عورتیں) "فحش" کی مرتکب ہوں تو اُنہیں مناسب سزا دو۔ (اس کی سزا قرآن کریم نے خود مقرر نہیں کی) لیکن اگر ان میں اصلاح کا امکان ہو تو (عدالت کی صوابدید کے مطابق) اُنہیں معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

۴/۱۶ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (۴/۱۶)

"اگر دو مرد اس قسم کی (بے حیائی) کی حرکت کے مرتکب ہوں تو انہیں (مناسب) سزا دو۔ لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اس سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کرلیں، تو اُن سے درگزر کرو۔ اللہ کے قانون میں معافی کی گنجائش بھی ہے (جو اکثر حالات میں جُرم کی روک تھام کا موجب بن کر باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔")

اس آیت میں صیغہ (وَالَّذٰنِ) تو مذکر کا ہے (یعنی دو مرد) لیکن استنباطاً اس سے مراد "دو عورتیں" بھی ہوسکتی ہیں۔ ہم نے اس لئے عنوان میں "سحاقت" بھی لکھ دیا ہے جس کی مرتکب دو عورتیں ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے قصۂ قوم لوط میں "لواطت" (HOMO SEXUALITY) کو بڑا ہی شنیع اور مذموم فعل قرار دیا ہے اس سے بھی اس فعل کا ارتکاب جرم قرار پاتا ہے۔ (دیکھئے: ۷/۸۱ ؛ ۲۷/۵۵)

نوٹ: اختلاطِ ہم جنس کے لئے ہمارے ہاں "لواطت" کی اصطلاح عام ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ذہن حضرت لوط (علیہ السلام) کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو خدا کے رسول تھے، اس لئے اس اصطلاح کو نہ ہی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے۔ اس کے لئے "اغلام" کی اصطلاح بھی رائج کی جاسکتی ہے۔

۳۔ مبادیاتِ زنا

۱۔ جو عورت کسی ایسی حرکت کی مرتکب ہو جو زنا کی طرف لے جانے والی ہو (یعنی عام بے حیائی کی باتیں) اور اس کے لئے چار گواہ موجود ہوں، تو اُسے مکان سے باہر جانے سے روک دینا چاہیئے۔

۴/۱۵ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ (۴/۱۵)

اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو (جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہوسکتی ہو) تو اُن کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ (اگر وہ اس کی شہادت دیں اور جرم ثابت ہوجائے) تو ان عورتوں کو باہر جانے سے روک دو تاآنکہ انہیں موت آجائے، یا خدا کا قانون اُن کے لئے ایسی صورت پیدا کردے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رُک جائیں۔ مثلاً اگر وہ شادی شدہ نہیں تو اُن کی شادی ہوجائے۔ زنا کی سزا کا ذکر (۲۴/۲) میں ہے اور تہمت لگانے کا (۲۴/۴) میں۔

اس آیت میں "الفاحشة" کا ترجمہ عام طور پر زنا کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ اس لئے

کہ قرآنِ کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے (۲۴/۲) اور یہاں سزا صرف "پابند مسکن" کرنا ہے، اس لئے اس سے مُراد زِنا نہیں بلکہ ایسی بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا پر منتج ہو سکتی ہیں۔ ہم نے اس لئے اس کا مفہوم "مبادیاتِ زنا" لیا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت میں صرف عورتوں کا ذکر ہے۔ زِنا میں عورت اور مرد دونوں شامل ہوتے ہیں۔ تنہا عورتوں سے زنا نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس میں فاحِشہ کا لفظ زنا کے لئے نہیں آیا۔

جُرمِ زِنا کے ثبوت کے لئے گواہوں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔

۲۔ شادی شدہ عورت سے "کھلی ہوئی بے حیائی" کا ارتکاب ہو تو اس کے مہر میں سے کچھ رقم وضع کی جا سکتی ہے۔ (تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم، صفحہ ۳۸۸۔ زیرِ آیت (۴/۱۹) میں گزر چکی ہے)

۴۔ فواحش

۱۔ فواحش کے قریب مت جاؤ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا چھپی ہوئی: وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۶/۱۵۲ و نیز ۷/۳۳) "بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ"۔

۲۔ فواحش کی اِشاعت و تشہیر مت کرو ——— ایسا کرنا مستوجب سزا جرم ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲۴/۱۹)

یاد رکھو۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعتِ مؤمنین کے اندر، بے حیائی کی باتیں پھیلائیں، انہیں اس زندگی میں بھی (از روئے قانون) سخت سزا ملے گی۔ اللہ خوب جانتا ہے (کہ اس قسم کی باتیں کس قدر تباہی کا موجب ہوتی ہیں) اور تم اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس میں تمام وہ اسباب و ذرائع آجائیں گے جن سے معاشرہ میں بے حیائی کی باتیں یا خیالات پھیلتے ہیں۔

۳۔ ان جرائم کے مرتکبین میں اگر اصلاح کا امکان ہو تو معافی کی گنجائش ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۱۳۵)

اگر مومنین سے کبھی (غلطی سے) کوئی معیوب حرکت سرزد ہو جاتی ہے، یا وہ اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں، تو وہ اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے، بلکہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، اور اس کے مطابق، اپنی اصلاح کر کے، اپنی غلطی کے مُضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں ——— اور حقیقت یہ ہے کہ غلط اقدامات کے مُضر اثرات سے، قانونِ خداوندی کے سوا اور کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟

۵۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔ یا اُن کے خلاف غلط باتیں مشہور کرنا۔

یہ سنگین جرم ہے جس کی سزا حقوقِ شہریت سے محرومی سے لے کر موت تک ہو سکتی ہے۔ سورۂ احزاب میں پہلے کہا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ ٱلْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَٰبِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ○ (۳۳/۵۹)

اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑوں کے اوپر، ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں جس سے زینت نمایاں نہ ہو (۲۴/۳۱) یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں (کہ شریف بیبیاں جا رہی ہیں) اور کوئی بدقماش اُنہیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز، ان کے لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے حفاظت اور تربیت کا موجب بن جائے گی۔

اس کے بعد فرمایا:

لَّئِن لَّمْ يَنتَهِ ٱلْمُنَٰفِقُونَ وَٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَٱلْمُرْجِفُونَ فِى ٱلْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَآ إِلَّا قَلِيلًا ۚ مَّلْعُونِينَ ۖ أَيْنَمَا ثُقِفُوٓا۟ أُخِذُوا۟ وَقُتِّلُوا۟ تَقْتِيلًا ○ (۳۳/۶۰-۶۱)

تم اپنی احتیاط برتو۔ اگر اس کے بعد بھی منافقین یعنی وہ لوگ جن کے دل میں خباثتیں بھری ہوتی ہیں اور وہ فتنہ پرور جن کا کام ہی معاشرہ میں شر انگیز خبریں پھیلانا ہے، اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو پھر اُن کے خلاف قوت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ، کچھ عرصہ بعد، یہاں سے دُور ہو جائیں گے اور اُن تمام مراعات سے محروم کر دیئے جائیں گے (جو انہیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں) اگر یہ اس پر بھی اپنی سرکشی سے

باز نہیں آئیں گے نوجہاں کہیں بھی ہوں گے، اُنہیں گرفتار کیا جائے گا، اور سختی سے قتل کیا جائے گا۔

{اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل۔ صفحہ ۲۱۸۔ زیر آیت (۲/۹) بھی لکھا جا چکا ہے }۔

۶۔ تہمت تراشی

۱۔ پاک دامن عورتوں کے خلاف تہمت لگانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار گواہ لائے۔ اگر جرم ثابت نہ ہو تو تہمت لگانے والے کی سزا اسّی کوڑے ہے۔ اس کے بعد اُس شخص کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ ہاں اگر اس میں اصلاح کا امکان ہو تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲۴/۴-۵)

{نیز دیکھئے: (۲۴/۲۳) اور ۶۰/۱۲ }

(عصمت متاعِ گراں بہا اور مستقل قدر ہے، اس لئے اس کی حفاظت کے لئے بڑی پختہ تدابیر کرنی چاہئیں)۔

اس سلسلہ میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو اُنہیں اسّی کوڑے لگاؤ، اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی، جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائیں، گواہی قبول نہ کرو، (اور اُنہیں اُن حقوق سے بھی محروم کر دو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی اس سے باز نہ آئیں تو اُنہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو۔ ۲۴/۲۳) اس لئے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

ہاں اگر یہ لوگ اس کے بعد اپنی غلط روش سے باز آجائیں، اور اپنی اصلاح کر لیں، تو پھر اُنہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں، توبہ و اصلاح کے بعد عفو و درگزر کی گنجائش رکھ دی گئی ہے (اس سے اصلاح کے قابل مجرم، سزا سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور وہ سامانِ نشو و نما سے بھی محروم نہیں رہتا)۔

۲۔ جو شخص خود اپنی بیوی کے خلاف تہمت لگائے اور گواہ نہ لا سکے تو وہ چار مرتبہ قسم اٹھائے اور پانچویں مرتبہ اپنے اوپر لعنت وارد کرے، لیکن اگر اُس کے خلاف، اُس کی بیوی اپنی بریت کے لئے بھی اسی طرح قسم اٹھائے تو

پھر وہ مجرم تصور نہیں ہوگی۔ سورۃ النور میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۴/۶تا۹)

لعان "جو لوگ خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں، اور اُن کے پاس، سوائے اپنے آپ کے، اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے معاملہ میں یوں فیصلہ کیا جائے کہ مرد چار بار اللہ کو حاضر ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہو، تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ (یعنی میں اُن تمام حقوق و مفادات سے محروم کر دیا جاؤں جو مجھے مملکتِ خداوندی (اسلامی حکومت) کا شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں)۔

(اس سے وہ عورت مجرم قرار پا جائے گی۔ لیکن، اگر وہ بھی، اپنی مدافعت میں) اسی طرح خدا کو حاضر ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹ بولتا ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ (یعنی مجھے اس حلفِ دروغ گوئی کی سزا ملے)، تو اس سے وہ بری الذمہ ہو جائے گی)۔

۳۔ جُرم خود کرے (خواہ وہ کوئی جُرم ہو) اور اس کی تہمت دوسرے پر لگا دے، تو یہ خود جُرم ہے:

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۱۱۲ (۴/۱۱۲)

سوچو کہ اگر کوئی شخص جُرم یا خطا تو خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی دوسرے بے گناہ کے سر، تو یہ، بجائے خویش بہت بڑا جُرم ہے۔ اس طرح اس نے اپنے اوپر دوہرا بوجھ لاد لیا۔ ایک تو اُس جُرم کا بوجھ جو اُس سے سرزد ہو گیا تھا، اور دوسرا اُس بہتان کا بوجھ جو اُس نے دوسرے کے اوپر لگا دیا۔

جنسیات سے متعلق قرآنی قوانین ہمارے سامنے آ گئے۔ اس میں سورۃ النساء کی آیات (۴/۱۵) اور (۴/۱۶) بھی آ گئی ہیں۔ آیت (۴/۱۶) میں کہا گیا ہے کہ اگر مجرم اپنے کئے پر نادم ہو اور اپنی اصلاح پر آمادہ ہو تو اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسے توبہ کہا جاتا ہے۔ توبہ کے متعلق مزید تصریح یہ کہہ کر کر دی کہ

۴/۱۸-۱۷ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ

قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوۡبُ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۷﴾
وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ
الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَ ہُمۡ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ
اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۸﴾ (۴/۱۷ تا ۱۸)

معافی کس کے لئے ہے

لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ معافی ان کے لئے ہے جو غلطی سے کوئی جُرم کر بیٹھیں اور پھر، اس کا احساس بیدار ہونے پر، فوراً اصلاح کی طرف لوٹ آئیں۔ خدا کے قانون میں معافی انہی کے لئے ہے۔ اس لئے کہ اس کا قانون علم و حکمت پر مبنی ہے۔

ان کے لئے معافی نہیں جو عادی مجرم ہوں اور اپنی حرکات پر اُس وقت نادم ہوں جب موت اُن کے سامنے آکھڑی ہو۔ نہ ہی ان کے لئے جو قانون کو سرے سے تسلیم ہی نہ کریں اور ساری عمر اسی سرکشی میں بسر کر دیں۔ انہیں الم انگیز سزا دینی چاہیئے۔

توبہ کے قرآنی مفہوم کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۶ آیت (۲/۱) اور جلد دوم صفحہ ۲۶۶۔ آیت (۲/۵۴) میں لکھا جا چکا ہے۔ جرائم کے سلسلہ میں توبہ کی گنجائش خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ محض اثباتِ جُرم پر مجرم کو سزا نہیں دینی چاہیئے۔ سزا کا مقصد اصلاح ہے۔ اگر سزا کے بغیر اصلاح کا امکان ہو تو مُجرم کو اس کا موقع دینا چاہیئے۔ جرائم میں اس کی گنجائش رکھنا فی الواقعہ خدا کی رحمت ہے۔

۴/۱۹-۲۱ اس کے بعد آیات (۴/۱۹-۲۱) نکاح اور طلاق سے متعلق ہیں اور مطالب الفرقان جلد سوم صفحات ۳۸۸-۳۸۷۔ (آیت ۲/۲۲۷) کے تحت آ چکی ہیں۔ یہاں ان کے دُہرانے کی ضرورت نہیں اس میں البتہ اتنا اضافہ ضروری ہے کہ آیت (۲۲/۲۸) سے واضح ہے کہ اگر عورت سمجھے کہ حالات اُس کے موافق ہیں تو اُسے حُسن کارانہ انداز سے الگ کر دینا (طلاق دے دینا) چاہیئے، روک کے نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد آیات (۴/۲۲-۲۴) میں ان عورتوں کی تفصیل دی گئی ہے، جن سے نکاح حرام ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۳۴۲۔ زیرِ آیت (۲/۲۲۱) تفصیل دی جا چکی ہے۔ ۴/۲۲-۲۴

شروع پارہ ۵

(۴/۲۵) اگلی آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

لونڈیوں سے نکاح

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ

مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِهِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ

بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ

خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ۧ

(۴/۲۵)

"اگر تم میں سے کسی میں اس کی استطاعت نہ ہو کہ وہ آزاد مومن عورت سے شادی کرے، تو وہ مومنہ لونڈی سے شادی کرے۔ (تاکہ وہ لونڈیاں جو اس وقت تمہارے معاشرہ میں موجود ہیں، رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنتی جائیں اور اس طرح غلامی کا خاتمہ ہو جائے) یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ لونڈی سے شادی کرنا باعث ذلت ہے۔ جب وہ ایمان لے آئی اور تمہارے نکاح میں آگئی، تو آزاد عورتوں کے ہم مرتبہ ہو گئی۔ اللہ کی نگاہ تمہارے ایمان پر ہے یہی معیارِ فضیلت ہے۔۔ اسی کی بنا پر تم ایک دوسرے کے اجزا بنتے ہو (یعنی سب ایک ہو جاتے ہو) کوئی غیر نہیں بنتا۔

لیکن لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالک کی اجازت سے نکاح کرو اور قاعدے اور قانون کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔ وہ ایک پاکباز منکوحہ بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لئے نکاح کرے۔ محض تمہاری شہوت رانی کے لئے نہیں، خواہ اس کے لئے رسمِ نکاح ادا کر لی گئی ہو۔ یا ان تعلقات کو پوشیدہ رکھا جائے۔ دونوں شکلیں ناجائز ہیں (۵/۵) جائز صورت یہی ہے کہ باقاعدہ میاں بیوی کی زندگی بسر کرنے کے لئے ان سے نکاح کیا جائے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جنسی اختلاط سے مقصد، جائز طریق سے افزائشِ نسل ہے۔ محض جنسی تسکین اور لذت کشی نہیں۔ جو اختلاط محض حصول لذت کے لئے ہو وہ منشائے فطرت کے خلاف ہے، خواہ معاشرہ اسے معیوب سمجھے یا نہ۔ (۲/۲۲۳)

جب یہ لونڈیاں تمہارے نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی مرتکب ہوں، تو ان کی سزا، آزاد عورتوں کی سزا (۲۴/۲) سے نصف ہے۔ اس لئے کہ ان کی تربیت اچھے ماحول میں نہیں ہوتی اور ان کی پہلی

زندگی میں اس قسم کی حرکات معیوب تصوّر نہیں کی جاتی تھیں، اس لئے ان سے اخلاق کا وہ بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو آزاد گھرانے کی عورتوں سے متوقع ہوتا ہے۔ سزا کے تعین میں ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے)

یہ بھی یاد رکھو کہ جس انداز سے لونڈیوں کی تربیت ہوتی ہے، اس سے ان کی ذہنیت پست رہتی ہے۔ للہذا لونڈیوں سے شادی انہی کو کرنی چاہیئے جو سمجھے ہوں کہ نکاح کے بغیر ان سے لغزش سرزد ہو جانے کی۔ لیکن اگر تم ضبطِ نفس سے کام لو، تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ خدا کا قانون، جو تمہیں عفت و پاکبازی کی تعلیم دیتا ہے، تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہاری سیرت کی نشو و نما کا ذریعہ بنے گا۔ یاد رکھو! ضبطِ نفس ناممکن نہیں ($\frac{24}{33}$)

جنسیات کے معاملہ میں، بھوک پیاس کی طرح، اضطراری حالت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بھوک کی اضطراری حالت میں تو حرام کھا لینے کی اجازت ہے ($\frac{2}{173}$)، لیکن جنسی اختلاط کے لیے ناجائز فعل کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں۔

غلام اور لونڈی (مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ) کے متعلق بحث مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۷۰ زیرِ آیت ($\frac{2}{221}$) اور جلد دوم صفحہ ۳۵۸ آیت ($\frac{3}{25}$) میں گذر چکی ہے۔

قرآنِ کریم نے کتاب اور حکمت دونوں کو منزل من اللہ کہا ہے۔ (جیسا کہ مختلف مقامات پر واضح کیا جا چکا ہے) کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد ان قوانین کی غرض و غایت۔ ان کا مقصود و مطلوب۔

مندرجہ بالا آیت میں عائلی زندگی سے متعلق قوانین بیان کرنے کے بعد کہا:

$\frac{4}{26}$ یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ وَ یَہۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ یَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶﴾ ($\frac{4}{26}$)

عائلی زندگی کے یہ احکام، اس وضاحت سے، اس لئے بیان کئے گئے کہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں بتائے کہ اقوامِ سابقہ میں سے جنہوں نے معاشرتی اور ازدواجی زندگی کو صحیح قوانین کے تابع رکھا، ان کی زندگی کس قدر خوشگوار تھی اور جنہوں نے اس میں توازن برقرار نہیں رکھا، وہ کس طرح تباہ ہو گئیں۔ اللہ کا قانون، جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے، تم پر اپنی توجہات مرکوز رکھنا چاہتا ہے (تاکہ تم تباہ اور برباد نہ ہو جاؤ۔ یاد رکھو۔ جنسی اختلاط محض انفرادی مسئلہ نہیں۔ قوموں کی موت و حیات سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے معاشرہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دے جن سے جنسی بے راہ روی پیدا ہو جائے۔)

قرآن کریم نے جو یہاں اقوامِ سابقہ کے احوال و مآل کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کی اہمیت کا اندازہ عصرِ حاضر کے محققین کی تحقیق سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ڈاکٹر ٹائن بی کا حوالہ پہلے دے چکے ہیں۔ تجدیدِ یاد داشت کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۰۴ ملاحظہ فرمائیے۔

اگلی آیت میں اس کی مزید وضاحت یہ کہہ کر کر دی:

۴/۲۷ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ (۴/۲۷)

پھر سن لو کہ خدا کا قانون چاہتا ہے کہ تم تباہیوں سے بچ جاؤ۔ اس لئے وہ بار بار لوٹ کر تمہاری طرف آتا ہے۔ لیکن جو لوگ محض اپنے جذبات کے پیچھے چلتے ہیں، وہ یہی چاہیں گے کہ تم بھی (ان کی طرح) اعتدال چھوڑ کر، افراط و تفریط کی راہ اختیار کر لو۔

اور اس کے بعد اس ہدایت (راہ نمائی) کی ضرورت کو اس طرح واضح کر دیا کہ

۴/۲۸ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾ (۴/۲۸)

خدا کو اس کا علم ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خدا نے یہ قوانین و ضوابط اس لئے عطا کر دیئے ہیں کہ وہ انسان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے ——— وہ نہ ان کے جذبات کو رہبانیت کے شکنجوں میں کسنا چاہتا ہے (۵۷/۲۷) اور نہ ہی انہیں بلا لگام چھوڑ کر ان کے لئے سامانِ ہلاکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

انسان کو اگر وحی کی رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۶ پر دیکھئے۔ انسان اور اس کے جذبات کے متعلق انڈکس میں "جذبات" کا عنوان دیکھئے۔

جذبات سے مغلوبیت کا ذکر آیا تو قرآنِ کریم نے نگاہ کا رُخ اُس گوشے کی طرف پھیر دیا جو سب سے زیادہ وجۂ فسادِ آدمیت ہے۔ یعنی معاشی نظام۔ اس نظام کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے "معاشی نظام") یہاں اس کا ذکر اجمالاً کیا گیا ہے۔ فرمایا:

۴/۲۹ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ (۴/۲۹)

تجارت

انسان کا جذبات سے مغلوب ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ دوسرے کا مال بھی اس کے پاس آ جائے گا، خواہ اس کے لئے اسے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ یہ بڑی تباہ کن ذہنیت ہے۔ لہٰذا، اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھاؤ۔ معاشرہ میں، ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے (جسے تجارت کہتے ہیں)۔ اس کا انتظام باہمی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔ اس اصول کے مطابق کہ، ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ مل جائے۔ (۵۳/۳۹)۔ یہ نہیں کہ ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر، دوسروں سے زیادہ سے زیادہ بٹور لینے کی کوشش کرے۔ یہ ربوٰا ہے جسے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ (۲/۲۷۵) اگر ایسا کرو گے تو تم اپنے آپ کو تباہ کر لو گے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ تم سب کی نشوونما ہوتی رہی۔ لہٰذا جس معاشی نظام میں یہ مقصد فوت ہو جائے، وہ جائز نہیں قرار پا سکتا۔

جائز اور ناجائز تجارت کا فرق۔ ربوٰا سے متعلق بحث میں، جلد سوم (صفحہ ۴۷۹) میں آ چکا ہے۔ یہاں صرف ایک نکتہ کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کہا گیا ہے إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ "باہمی رضامندی سے تجارت"۔ ہمارے ہاں کے باطل معاشی نظام میں تجارت پیشہ (دُکان دار) حضرات کہا کرتے ہیں کہ ہم جس قدر منافع لیتے ہیں، گاہک کی رضامندی سے لیتے ہیں۔ جبراً نہیں لیتے، اس لئے ہماری تجارت قرآن کی رُو سے بالکل جائز ہے۔

اس "جائز" تجارت کی کیفیت کیا ہے، اس کے لئے آپ کسی دن صبح سویرے کسی منڈی میں جا نکلئے۔ وہاں آپ یہ آواز ہر ایک کی زبان سے سُنیں گے کہ فلاں چیز کا "بھاؤ" کیا نکلا؟ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا یہ "بھاؤ"، صبح سویرے چوہے کے کسی بِل سے باہر نکلا ہے جسے ان لوگوں نے دیکھ لیا ہے۔ لیکن یہ بھاؤ اس طرح نہیں نکلتا۔ ہوتا یہ ہے کہ اُس چیز یا اُس جنس کے کاروبار کرنے والے تاجر آپس میں مل بیٹھ کر یہ طے کرتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے میں بکنی چاہیئے۔ اسے کہتے ہیں "بھاؤ نکلا"۔ اور پھر ہر خریدار اُس چیز کو اُس قیمت پر خریدنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ چیز کہیں سے بھی اُس سے کم قیمت پر نہیں مل سکتی۔ بھاؤ نکالنے، کا یہ طریق، پالک، مُولی کی منڈی سے لے کر جنرل موٹرز اور بوئنگ ہوائی جہازوں کے کاروبار تک ہر جگہ کارفرما ہے۔ یہ تو اجتماعی تجارت کی کیفیت ہے۔ انفرادی طور پر یہ مسلک عام ہے کہ آپ کو (مریض کی جان بچانے کے لئے) کسی دوائی کی ضرورت ہے، جو یا تو واقعی کم یاب ہے یا مصنوعی طور پر اس کی قلت (SHORTAGE) پیدا کر دی گئی ہے۔ وہ دوائی صرف ایک دوا فروش کے ہاں موجود ہے۔ اُس کی مقررہ قیمت (مثلاً) بیس روپے ہے، لیکن وہ پچاس روپے مانگتا ہے آپ کہتے ہیں کہ یہ قیمت

بہت زیادہ ہے وہ جواب میں کہتا ہے کہ آپ کو سستے داموں کہیں اور سے مل سکتی ہو، تو وہاں سے لے لیجئے — اور کہیں اور سے دوائی مل نہیں سکتی — آپ کو اُس کے مُنہ مانگے داموں خریدنی پڑتی ہے — اور اس کے بعد وہ دکاندار بڑے دھڑلے سے کہتا ہے کہ میں نے اُس کی جیب نہیں کاٹی۔ ڈاکہ نہیں ڈالا۔ اُس نے اپنی مرضی سے وہ قیمت ادا کی ہے۔

یہ ہے باطل معاشرہ میں "تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" کی اِبلیسی تفسیر۔

تجارت، اشیاء کی تقسیم کا نام ہے۔ اور اس میں تقسیم کنندہ صرف اپنی محنت کا وہ معاوضہ لے سکتا ہے جسے اسلامی حکومت مقرر کرے۔ اس سے زیادہ لینا، قانونِ خداوندی سے سرکشی، اور ظلم و زیادتی ہے، جس کا نتیجہ اس معاشرہ کی تباہی ہے۔ (وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ارشادِ خداوندی ہمارے سامنے آچکا ہے)

۴/۳۰ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰ (۴/۳۰)

ایسی کھلی کھلی تاکید کے بعد بھی، جو قوم اپنا کاروبار اس انداز پر رکھے گی کہ ہر شخص دوسرے کے حق میں کمی کرے اور اپنی حد سے تجاوز کر جائے، تو وہ معاشرہ بہت جلد تباہیوں کی آگ سے جھلس کر رہ جائے گا۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے ایسا نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ، جو نظام، منفعتِ عامہ کے خلاف قائم ہو اس کی تباہی کے سامان خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

یہ نہایت سنگین جُرم ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

۴/۳۱ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱ (۴/۳۱)

جن باتوں سے تمہیں روکا جا رہا ہے، یہ معمولی باتیں نہیں۔ یہ انسانیت کے خلاف سنگین جرائم ہیں۔ اگر تم ان سے بچتے رہے تو تمہاری چھوٹی چھوٹی ناہمواریاں دور ہو جائیں گی اور تمہیں عزت اور مرفہ الحالی کی زندگی نصیب ہو جائے گی۔

(۴۲/۳۷ ؛ ۵۳/۳۲ ؛ ۱۱/۱۱۴)

غلط کاموں کے نقصانات کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے، اس کے لئے توبہ کا عنوان دیکھئے۔ اصول یہ ہے: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (۱۱/۱۱۴) تخریبی امور سے نقصانات کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام سرانجام دو۔ میزانِ خداوندی میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ پلڑا کونسا بھاری ہے — تخریبی کاموں کا یا تعمیری کاموں کا

مالی معاملات میں ظلم اور تعدی کی بات آئی تو ایک اور گوشہ بھی سامنے لایا گیا جس میں ظلم و تعدی عام تھی (اور اب بھی ہے) لیکن کسی کا اِس طرف دھیان تک نہیں جاتا تھا، کہ یہ بھی ظلم و تعدی ہے یعنی سمجھا یہ جاتا تھا (اور اب بھی اکثر و بیشتر ایسا ہی سمجھا جاتا ہے) کہ عورت کسی چیز پر حقِ ملکیت نہیں رکھتی۔ ملکیت صرف مرد کی ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا:

۴/۳۲ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ (۴/۳۲)

عورتوں کے حقوق ملکیت

ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے (۴/۷)، عورت اپنے مال اور جائداد کی آپ مالک ہوتی ہے۔ اِسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا مردوں کا کام ہے، عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ مرد اور عورتیں، سب اکتسابِ رزق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے۔ جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ۔ (یہ الگ بات ہے کہ گھر کی زندگی میں میاں بیوی کس طرح باہمی تعاون سے کام لیں) یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے، بعض باتوں میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اپنے آپ کو اپاہج بنا کر، مردوں کی کمائی کو تکتی رہیں اور خود کچھ نہ کریں۔ انہیں چاہیئے کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کی توفیق طلب کرتی رہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔

جیسا کہ دوسری آیتیں آگے چل کر بتایا جائے گا، تقسیمِ عمل اور اختلافِ وظائف (فرائض) حیات کی رُو سے، گھر کے اخراجات کی بنیادی ذمہ داری مرد کی ہے، لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ عورتوں کے لئے اکتسابِ رزق ممنوع ہے۔ وہ (عند الضرورت) کمائی کر سکتی ہیں اور اس کمائی کی مالک بھی وہ آپ ہوتی ہیں۔ اس طرح انہیں جو کچھ ورثہ میں ملے، وہ بھی اُن کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ تقسیمِ ترکہ (وراثت) کے متعلق تفصیلی بحث پہلے آ چکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اِس تقسیم میں سب سے پہلے عقدی اور عہدی وارثوں کا حصہ نکالا جائے گا۔

۴/۳۳ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ

فَاٰتُوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ﴿۳۳﴾ (۴/۳۳)

عقدی رشتہ کا ترکہ

مردوں اور عورتوں کے جداگانہ "حقِ ملکیت کا فطری تقاضا ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان سب کا حصہ ہو ——— صرف مردوں ہی کا نہ ہو۔ ——— چنانچہ جو کچھ

کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں، ہم نے اس کے لئے حصہ دار مقرر کر دیئے ہیں (۴/۱۱)۔ یہ صرف نسبی رشتوں تک محدود نہیں۔ عقدی رشتے بھی اس میں شامل ہیں۔ عقدی رشتوں میں ایک تو میاں بیوی ہیں اور دوسرے وہ لوگ جنہیں از روئے وصیت (معاہدہ) تم کچھ دینا چاہو۔ اصولِ تقسیم یہ ہے کہ پہلے ان لوگوں کا حصہ نکال لیا جائے اور اس کے بعد (بقایا) دوسروں میں تقسیم کیا جائے۔ (اس طرح، بیوی کو اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ سے سب سے پہلے حصہ ملے گا)۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ خدا کی نگاہ ہر بات پر رہتی ہے۔

اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس کے غلط ترجمہ اور مفہوم نے ہماری عائلی (گھر کی) زندگی اور اجتماعی معاشرہ کو حق جہنم بنا رکھا ہے۔ یعنی اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ..... كَبِيۡرًا (۴/۳۴)۔ یہ آیت، مع اس کے سیاق و سباق کے، مطالب الفرقان جلد سوم میں آچکی ہے اور قریب دس صفحات (۳۶۹ - ۳۵۹) میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ اس تشریح پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ عورتوں کے متعلق دیگر تشریحات کے لئے انڈکس میں 'عورت' کا عنوان دیکھئے۔

نوٹ: اس آیت میں عورتوں کی طرف سے سرکشی کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کبھی مردوں کی طرف سے اس قسم کی صورت پیدا ہو جائے، تو اسلامی نظام اس آیت کی روشنی میں اُن کے خلاف بھی مناسب اقدامات کر سکتا ہے۔ نیز دیکھئے (۴/۱۲۸)

۴/۳۵ ازاں بعد میاں بیوی میں شقاق (ناچاقی) کا معاملہ سامنے آتا ہے جو اکثر و بیشتر طلاق پر منتج ہوتا ہے۔ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا...... عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا (۴/۳۵) طلاق کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۳۸۵) میں آچکی ہے، جس کا آغاز اس (۴/۳۵) آیت سے ہوتا ہے۔ اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

قرآنِ کریم عائلی زندگی (فیملی لائف) کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۴۶۔ آیت ۲/۸۳)۔ وہ فیملی کو میاں بیوی اور اُن کی اولاد تک محدود نہیں رکھتا، ماں باپ اور دیگر اقارب کو بھی اس میں شامل کرتا ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک کے رشتہ کی نوعیت اور اُن کے ساتھ تعلقات کو الگ الگ بیان کرتا ہے۔ میاں بیوی سے متعلق گفتگو کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے:

$\frac{4}{36}$ وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـــًٔا ‌ؕ وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَـارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۙ ﴿۳۶﴾

($\frac{4}{36}$)

حسنِ سلوک

یہاں بیوی کے بعد، دوسرے رشتہ داروں کا سوال سامنے آتا ہے۔ لیکن معاملہ کسی کا بھی ہو، اصول ہر جگہ یہی کارفرما ہے کہ تم نے صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنی ہے۔ اس کے ساتھ نہ اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنا ہے، نہ کسی دوسرے انسان کے فیصلہ کو۔ خدا کے قانون کا یہ فیصلہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ۔ رشتہ داروں سے آگے بڑھ کر، ان تمام لوگوں کے ساتھ جو (والدین کے فوت ہو جانے سے، یا ویسے ہی) معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ یا جو حرکت سے معذور ہو جائیں۔ (اور ان کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے)۔ اور ہمسایہ کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ، خواہ وہ قریب کا ہمسایہ ہو یا دور کا ——— وہ اپنا ہو یا بیگانہ ——— رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار ——— نیز اپنے رفقائے کار کے ساتھ بھی، اور ان مسافروں کے ساتھ بھی، جن کے پاس زادِ راہ نہ رہا ہو، یا وہ ویسے ہی تمہارے حسنِ سلوک کے متمنی ہوں ——— اور ان لوگوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ جو تمہارے ماتحت کام کریں۔

دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے وہی پیش آسکتا ہے جس کا سینہ جوہرِ انسانیت سے معمور ہو۔ جو اخلاقِ کریمانہ کا پیکر ہو۔ جو دوسروں کی امداد میں خوشی محسوس کرے۔ جس میں کشادہ ظرف اور وسعتِ نگاہ ہو لیکن جو لوگ اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا ہوں۔ کوئی جوہر ان میں ہو، اور وہ باتیں بڑی بڑی کریں۔ شیخی بہت بھگاریں، لیکن دیں کسی کو کچھ نہ۔ تو ایسے لوگ قانونِ خداوندی کی نگاہوں میں کس طرح مستحق ستائش ہو سکتے ہیں؟

والدین کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۲۴۵۔ آیت $\frac{2}{83}$) میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ ان کی اطاعت فرض قرار نہیں دیتا۔ والدین کے علاوہ، ذی القربیٰ۔ یتامیٰ۔ مساکین۔ ابن السبیل کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ (انڈکس کی رو سے ان سے متعلق مقامات دیکھ لیجئے)۔ آیت زیرِ نظر میں الجار جار کا لفظ پہلی بار سامنے آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں وہ شخص جسے تم نے کسی ظالم کے جور و ستم سے بچنے کے لئے پناہ دی ہو۔ اس کے بعد یہ لفظ ہمسایہ کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مادہ

ہمسایہ کا مفہوم

کے بنیادی معنی کی روشنی میں ہمسایہ کا قرآنی مفہوم کیا ہے، یعنی وہ جسے آپ نے اپنی پناہ میں

لے دکھا ہو۔ سوچئے کہ اس سے بڑھ کر حقِ ہمسائیگی، کیا ہو سکتا ہے؟

"مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کے عام معنی غلام اور لونڈیاں کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے انڈکس میں عنوان "غلامی") لیکن اس کا مفہوم وہ لوگ بھی ہیں جو کسی کی زیر نگرانی — یا مروجہ اصطلاح کی رو سے — کسی کی ماتحتی میں) کام کرتے ہوں۔

مختال اور فخور

اس آیت میں مُخْتَالًا اور فَخُوْرًا کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مختال (مادہ خ۔ی۔ل) ایسے شخص کو کہتے ہیں جس میں جوہرِ ذاتی کوئی نہ ہو، لیکن وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر اس میں تمام جوہر انسانیت موجود ہیں۔ اور پھر اس خود فریبی کی بنا پر زعمِ باطل اور غرور اور تکبر کا شکار ہو جائے۔

فخر (مادہ۔ ف۔خ۔ر) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ ۱۔ وہ اونٹنی یا بکری جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں، لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو۔ اور (۲) وہ مٹکے جو اندر سے خالی ہوں، لیکن بجتے بہت زور سے ہوں۔ ہمارے ہاں مشہور محاورہ ہے: "تھوتھا چنا، باجے گھنا"۔ یہ فخور کی صحیح تصویر ہے۔ لیکن شیخی بہت زیادہ بگھارنے والا۔

اگلی آیت میں اس کی وضاحت کر دی کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں:

۴/۳۷ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۳۷ (۴/۳۷)

بخیل

ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھتے ہیں، اور کسی کو کچھ نہیں دینا چاہتے۔ پھر ایسے قوانین و ضوابط بناتے ہیں جس سے معاشرہ کی عام روش ہی ہو جائے اور بخل کو معیوب ہی نہ سمجھا جائے۔ اور یوں، ہر شخص ان چیزوں کو اپنے لئے چھپا چھپا کر رکھتا چلا جائے جو اسے خدا کے فضل و کرم سے عطا ہوئی ہوں۔

یاد رکھو! جو لوگ خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گذاری کرتے ہیں۔ اور ناسپاس گذاری یہ ہے کہ انہیں چھپا چھپا کر رکھا جائے اور نوعِ انسان کی پرورش کے لئے خرچ نہ کیا جائے۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ذلت آمیز تباہی ہے۔

بخیل کے متعلق اس جلد میں زیر آیت (۳/۱۷۹) بات ہو چکی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۱۶۴) اس کا صحیح مطلب اس کی ضد "انفاق" کے مفہوم کو سامنے لانے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ "انفاق" کے سلسلہ میں دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۱۰۵) اور جلد سوم صفحات (۳۰۳؛ ۳۲۶؛ ۴۱۶ اور بالخصوص صفحہ ۴۶۳ اور اس سے آگے)

ایک گروہ تو وہ ہے جو دوسروں کی مدد کرنے کے لیے کچھ دیتا ہی نہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو دیتے تو ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد، دوسروں کی نگاہ میں 'بڑا' بننا ہوتا ہے۔ اسے ریاکاری کہا جاتا ہے۔ یعنی دکھاوے کے لئے صرف کرنا۔ انفاق کے سلسلہ میں جو حوالے اوپر درج کئے گئے ہیں، ان میں ان لوگوں کا بھی ذکر آ گیا ہے جو محض دکھانے

کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔ اس لئے اس نکتہ کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

آیت اور اس کا مفہوم حسب ذیل ہے:

۴/۳۸ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ (۴/۳۸)

ریاکارانہ انسان

یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو مال و دولت کو اپنے مفاد کے لئے چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو اسے خرچ تو کرتے ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ وہ خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کی صداقت، قانونِ مکافاتِ عمل، اور موت کے بعد، زندگی کے مسلسل آگے بڑھنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ محض لوگوں میں اپنی نمود و نمائش کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اس کا جذبۂ محرکہ اپنے ایگو[1] کی تسکین ہوتا ہے اور بس۔ سوچا ہے کہ جس عمل کی بنیاد اس قسم کے پست جذبات پر ہو، اس کا نتیجہ کس طرح خوشگوار ہو سکتا ہے۔

یاد رکھو! اچھے سے اچھا معاشی نظام بھی، جس کی بنیاد ایمان بالآخرت پر نہ ہو، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ ایمان بالآخرت ہی ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے (پیدا کرے) اور اپنی ضروریات سے زائد، بطیب خاطر، دوسروں کے لئے دے دے۔

اس آیت میں، قرآن کے معاشی نظام اور سوشلزم یا کمیونزم کے نظام کی بنیاد کا فرق نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کے نظام کی بنیاد ——— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ ہے۔ اور سوشلزم یا کمیونزم، اللہ کا بھی منکر ہے اور آخرت کا بھی۔ اقبال نے جو روس سے کہا تھا کہ

جستۂ اورا اساسِ محکمے؟ ——— ایکہ می جوئی نظامِ عالمے

تو یہ اساسِ محکم، اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ اس کے بغیر عالمگیر ربوبیت کا کوئی نظام بھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ روس اور چین کی ناکامی ہمارے سامنے ہے۔ اس سلسلہ میں دیکھئے (انڈکس میں) عنوان "سرمایہ داری کا نظام"۔

اس کے بعد کہا:

۴/۳۹ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ

---

[1] حیوانی سطح زندگی کو ہم نے ایگو (EGO) سے تعبیر کیا ہے، اور جو جذبات خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار انسانیت کے لئے بروئے کار آئیں، وہ انسانی ذات (PERSONALITY) کی نمود ہوتی ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ (۴/۳۹)

یہ محض نگاہ کا ہیر پھیر اور پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ ورنہ اگر یہ لوگ خدا کی متعین کردہ اقدار کی صداقت، اور قانونِ مکافات پر یقین رکھتے، اور دولت کو انہی مقاصد کے لئے خرچ کرتے، نہ کہ اپنی نمود کی خاطر، تو ان پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟ لیکن خدا کو خوب علم ہے کہ انسان کس جذبہ کے تحت کوئی کام کرتا ہے۔

اس کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی:

۴/۴۰ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ (۴/۴۰)

اور چونکہ ہر عمل، اس مقصد کے مطابق نتیجہ پیدا کرتا ہے جس کے لئے وہ کیا جائے، اس لئے جو لوگ، اپنی نمود و نمائش کیلئے دولت خرچ کرتے ہیں، اگر میزانِ خداوندی میں ان کے اس عمل کا کوئی وزن نہیں ہوتا، تو یہ ان پر ظلم و زیادتی نہیں ہوتی۔ اللہ کسی پر ذرا برابر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ انہوں نے لوگوں کو دکھانے، اور ان میں بڑا بننے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ ان کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اگر ان کا مقصد، قانون خداوندی کی اطاعت ہوتا، تو یہ ایسا حسن عمل تھا جس کا بدلہ ان کے صرف کردہ مال سے، کئی گنا زیادہ ملتا۔ اس سے معاشرہ میں خوشگوار نتائج پیدا ہوتے اور ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی۔ یہ ہے وہ اجر عظیم جو قانونِ خداوندی کی رُو سے ملتا ہے۔

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ بھی نوعِ انسانی کی بھلائی کے کام کرتے ہیں، ان کے ان اعمال کا انہیں اجر ملنا چاہئے۔ اُن پر جنت کے دروازے کیوں بند کر دیئے جاتے ہیں۔

کُفار کے نیک اعمال کا اجر

اس اعتراض کا تفصیلی جواب تو آپ کو "مکافاتِ عمل" کے عنوان کے تابع (سابقہ جلدوں میں) ملے گا۔ یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو جب جہنم کے سامنے لایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ہمارے نیک اعمال کا کیا ہوا؟ کیا ہمیں اُن کا بدلہ نہیں ملے گا؟ فرمایا:

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿۲۰﴾ (۴۶/۲۰)

ان لوگوں کو (جو ہمارے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں) جب تباہی کے جہنم کے سامنے لا کھڑا کر دیا جائے گا تو ان سے

کہہ دیا جائے گا کہ تم نے صرف دنیا کی طبیعی زندگی کی آسائشوں کو اپنا نصب العین بنایا۔ وہ تمہیں وہاں مل گئیں لیکن وہ تمہاری طبیعی موت کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ تم انہی آسائشوں (مال و دولت) کے بل بوتے پر اکڑے پھرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم کام تو ایسے کرو جو حق و انصاف کے مطابق ہوں، لیکن بڑائی تمہارے حصے میں آجائے۔ اس لئے تم نے ہمارا تجویز کردہ سیدھا راستہ چھوڑ کر، اور راہیں اختیار کر لی تھیں۔ سو اس کا نتیجہ یہ رسوا کن اور ذلت آمیز عذاب ہے جس کے سامنے تم کھڑے ہو۔

ریاء الناس کی خاطر بھلے کام کرنے والوں کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہے:

(۴/۴۲-۴۱) فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾ (۴/۴۲-۴۱)

ان لوگوں نے یہ روش اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ ان کا خیال ہے کہ معاشرہ کا نقشہ ہمیشہ اسی انداز پر رہنا ہے جس میں فریب اور تصنع سے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ خیال خام ہے۔ اس نے ایسی شکل اختیار کر کے رہنا ہے جس میں مختلف جماعتوں کے سربراہ نمائندے اکٹھے ہوں گے اور رسول اللہؐ، ان سب پر نگران کار ہوں گے۔

(۱۶/۸۴-۸۹ ؛ ۲/۱۴۳)

اس وقت یہ لوگ، جو اب قوانین خداوندی سے انکار، اور رسولؐ کے فیصلوں سے سرتابی اختیار کر رہے ہیں، سخت پشیمانی اور ندامت سے اس کی تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم اس سے پہلے نسیاً منسیاً ہو چکے ہوتے۔ اس لئے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں، خدا پر خوب روشن ہے۔

اگر ان میں سے کسی پر یہ وقت یہاں نہ آیا، تو موت کے بعد ایسا ہوگا۔ اس لئے کہ خدا کے قانونِ مکافات کا سلسلہ یہاں سے وہاں تک برابر پھیلا ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے (متعدد مقامات میں) بتایا جا چکا ہے کہ اعمال کے نتائج کا سلسلہ اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے اور آخرت تک چلتا ہے۔ اس بنا پر ہم اس قسم کی آیات کا وہ مفہوم بھی بیان کر دیتے ہیں جو (ہماری بصیرت کے مطابق) اسی دنیا میں ظہورِ نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور اس کے بعد اس کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں کہ یہی صورت آخری زندگی میں بھی پیش آئے گی۔

رسول اللہؐ کے شاہد ہونے کا مطلب

قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کو شاہد اور شہید کہا ہے۔ سورہ احزاب میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۳۳/۴۵) - نیز (۴۸/۸) -
اور شہید کا لفظ آیت زیرِ نظر (۴/۴۱) میں بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے شاہد یا شہید ہونے سے مراد کیا ہے؟

شاہد یا شہید (مادہ ش۔ ھ۔ د) سے مراد نگران، نگہبان، یا شہادت دینے والا (گواہ) ہوتے ہیں۔
رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا کہ آپ اپنی امت پر شہید ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (۲/۱۴۳)۔ یہی الفاظ

اُمتِ مسلمہ کے شہید ہونے کا مطلب

آیت (۲۲/۷۸) میں بھی آئے ہیں۔ ان آیات میں اُمتِ مسلمہ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اقوامِ عالم پر شہید ہے اس میں، اس اُمت کے مقام، اس کے منصب، فریضہ اور ذمہ داری کی تصریح کی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس اُمت کا اتنا ہی فریضہ نہیں کہ وہ خود حق و صداقت کے راستے پر چلے، بلکہ یہ فریضہ بھی ہے کہ وہ دیکھے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی دوسروں پر ظلم و تعدی نہ کرے۔ قرآن کریم نے مومنین کا مقام اَعْلَوْنَ بتایا ہے (۳/۱۳۸)۔ اور نظامِ خداوندی کے متعلق کہا ہے۔ کہ وہ تمام نظام ہائے عالم پر غالب آجائے گا۔ (۹/۳۳)۔

ظاہر ہے کہ جس نظام کی یہ کیفیت ہو، اس کی حامل اُمت، تمام اقوامِ عالم کے اعمال اور کاروبارِ حیات پر نگاہ رکھے گی کہ کوئی جور و استبداد کی روش اختیار نہ کرے۔

اور خود اس اُمت کی کیفیت یہ ہوگی کہ رسول اُن کے اعمال و کردار پر نگاہ رکھے گا۔ جیسا کہ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ میں کہا گیا ہے، دوسرے مقام پر شَاهِدًا عَلَيْكُمْ (۷۳/۱۵)۔ اس آیت میں اُمتِ مسلمہ اور اقوامِ عالم دونوں آجاتے ہیں۔ نظامِ خداوندی کے متعلق ہم جو کچھ کہتے چلے آرہے ہیں اُس کی روشنی میں یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد یہی فریضہ، اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ادا کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اقوامِ عالم یا نوعِ انسان کے اعمال و کردار پر نگرانی کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود واضح الفاظ میں بتا دیا۔ سورہ النحل میں پہلے کہا: وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ "جس دن ہم ہر قوم میں سے خود اُن کے افراد بطور گواہ اُٹھائیں گے۔ اور ان سب پر، اے رسول! تم بطورِ شاہد کھڑے کئے جاؤ گے"۔ اس کے بعد ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝۸۹ (۱۶/۸۹)۔

"اور ہم نے تیری طرف اس کتاب کو نازل کیا ہے جو تمام اُمور کو واضح کر دیتی ہے۔ اور ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، ہدایت اور رحمت اور زندگی کی خوشگواریوں کی خوشخبری دینے والی ہے"۔ اس کے بعد اس کتاب کی نمایاں خصوصیات "عدل و احسان"، وغیرہ بتائیں۔ ($\frac{16}{91-90}$) اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس نگرانی یا شہادت سے مطلب یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اقوامِ عالم اِن اصولوں کے مطابق چل رہی ہیں یا نہیں جو اس کتابِ خداوندی میں دیئے گئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، بعثتِ محمدیہ کے بعد غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار، قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کتاب دی تھی جو اُس کی زندگی میں، یا جب تک وہ کتاب غیر محرف رہی، غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار تھی۔ بالفاظِ دیگر اُس دَور میں، وہ رسول، اپنی قوم پر شاہد یا شہید تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، تا آنکہ آخر میں خدا نے اپنی آخری کتاب، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نازل کر دی جو قیامت تک، تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے بعد، یہ کتاب، غلط اور صحیح کا معیار قرار پا گئی۔ اور یوں حضور نبی اکرمؐ ان سب پر شہید ہو گئے۔

جیسا کہ (قانونِ مکافاتِ عمل اور اُخروی زندگی وغیرہ عنوانات میں بتایا گیا ہے) قیامت میں ہر انسان اپنا اعمال نامہ آپ ہو گا، لیکن سمجھانے کی غرض سے قرآن نے (تمثیلی انداز میں) اس کا نقشہ ایسا کھینچا ہے گویا ایک کمرۂ عدالت ہے اس میں جج تشریف فرما ہے۔ ملزم اُس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر گواہ بلائے جاتے ہیں۔ اُن کی اُن کے حق میں اور اس کے خلاف، شہادات ہوتی ہیں۔ اس طرح جب جُرم ثابت ہو جاتا ہے، تو اسے سزا سنائی جاتی ہے اِس سلسلہ میں بھی کہا گیا ہے: يَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ($\frac{16}{89}$؛ $\frac{16}{84}$؛ $\frac{28}{75}$؛ $\frac{4}{41}$)۔ یہ رسول، اپنی اپنی اُمت کے متعلق، اُس زمانے تک جب وہ خود یا اُن کی کتاب اُن کی اُمت میں مشہود طور پر رہی شہادت دیں گے۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے بعد، انبیائے سابقہ کی اُمتیں تو دنیا میں موجود تھیں (اور موجود ہیں) لیکن ان کے خلاف شہادت، اُن کے رسول کی نہیں، بلکہ حضور نبی اکرمؐ کی ہو گی، کیونکہ رسالتِ محمدیہ (قرآن) تمام اُممِ سابقہ کو محیط ہے۔ بالفاظِ دیگر، اب عدالتِ خداوندی کے ہر بزم پر صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے کے لیے ضابطہ، قرآن کریم ہے۔ یہ مطلب ہے اس ارشادِ خداوندی کا: وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ ($\frac{16}{89}$) "اِن سب پر، اے رسول! تم گواہ ہو گے"۔

یہ شہادت کیا ہو گی؟ قرآن نے بتایا ہے کہ رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پیغاماتِ خداوندی اُن تک پہنچا دیئے تھے تو انہوں نے کیا جواب دیا تھا۔ ان کا ردِ عمل کیا تھا؟ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ($\frac{28}{65}$؛ $\frac{5}{109}$)

ظاہر ہے کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد ابلاغِ رسالت کا فریضہ اُمتِ مسلمہ پر عائد ہوگا۔ اور خدا کی طرف سے یہ سوال ہم سے ہوگا۔ لیکن ہم تو خود مجرمین کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، اس لئے ہم کیا شہادت دیں گے؟ ہم پر تو دُوہرا عذاب ہوگا ایک خود قرآن کو چھوڑ دینے کا، اور ایک، دوسروں تک قرآن نہ پہنچانے کا۔

اس کے بعد ایک آیت میں یہ بتایا ہے کہ جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس مقصد کے لئے جو نظام قائم ہوگا، اسے نظامِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات اس نظام کا لاینفک حصہ ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی، صلوٰۃ کے عنوان میں ملے گی جو انڈکس میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اگلی آیت میں اس (وقتی) اجتماعِ صلوٰۃ کے متعلق راہ نمائی دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

اجتماعاتِ صلوٰۃ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾ (۴/۴۳)

اس معاشرہ کے قیام و استحکام کے لئے صلوٰۃ کے اجتماعات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان اجتماعات میں شرکت کے سلسلہ میں چند ضروری ہدایات یہ ہیں کہ۔

۱۔ جب تم ہوش میں نہ ہو۔ یعنی تمہیں معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہے ہو، (خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو) تو اجتماعِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہو۔ اس صلوٰۃ سے فائدہ کیا جس میں تم سمجھو ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہو!

تیمم کا حکم

۲۔ جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کئے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو (اگر ایسی حالت میں پانی نہ ملے تو اس کے لئے آگے ہدایت دی گئی ہے) البتہ ایسی حالت میں اگر تمہیں اس اجتماع میں سے یونہی گذرنا پڑے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ اگر تم مریض ہو ——— اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے۔

یا حالتِ سفر میں ہو۔
یا۔ جائے ضرور سے فارغ ہو کر آئے ہو } اور پانی نہیں ملتا۔
یا۔ عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو

تو ان حالات میں، وضو کرنے کے بجائے (۵/۶) تیمم کر لیا کرو۔ یعنی، پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور ہاتھ منہ ویسے پونچھ لئے۔

یہ رعایت اس لئے دی گئی ہے کہ خدا کا قانون، مجبوری کی حالت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ان مخصوص حالات میں، عام حکم کی پابندی سے درگذر کر دیتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان اجتماعات میں شریک نہ ہونے سے تمہیں جو نقصان پہنچ سکتا تھا، اس سے تمہاری حفاظت ہو جائے۔

اس ضمنی گوشے کے بعد پھر نظام خداوندی کی طرف مراجعت کی گئی۔ فرمایا:

۴/۴۴-۴۵ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ (۴/۴۴-۴۵) (نیز دیکھئے آیت ۵/۶)

اس ضمنی گوشے کے بعد، پھر انہی لوگوں کی کیفیت کو سامنے لاؤ، جو نظام خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں (اور جن کا ذکر ۴/۳۷ میں کیا جا رہا تھا)۔ ان میں، ان لوگوں کی حالت خاص کر قابلِ غور ہے جنہیں اس ضابطۂ حیات کا، جس کی تکمیل اب قرآن میں ہوئی ہے، ایک حصہ دیا گیا تھا۔ یہ لوگ اپنی ساری کوششیں، گمراہی خریدنے میں صرف کر رہے ہیں، اور چاہتے یہ ہیں کہ تم بھی صحیح راستہ سے بھٹک جاؤ۔

اللہ تمہارے ان تمام دشمنوں سے واقف ہے (تم ان سے مت ڈرو)۔ تمہارے لئے قانونِ خداوندی کی سرپرستی اور نصرت کافی ہے۔

اہلِ کتاب کو مکمل ضوابطِ قانون نہیں دیئے گئے تھے

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ سابقہ اہلِ کتاب کو مکمل ضابطۂ قوانین نہیں دیا گیا تھا۔ اس کا صرف ایک حصہ دیا گیا تھا۔ جو ان کے زمانے کے تقاضوں تک کے لئے کافی تھا۔ مکمل ضابطۂ قوانین صرف قرآن ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور ابدی بھی۔ اس لئے یہ واضح ہے کہ سابقہ آسمانی کتابیں نہ صرف اس لئے ناقابلِ عمل ہیں کہ وہ محرف ہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ ان میں مکمل ضابطۂ قوانین نہیں دیا گیا تھا۔ دین کے اصول تو ہر رسول کو یکساں دیئے گئے تھے، لیکن قانونی ضوابط میں سے صرف اتنا حصہ دیا جاتا تھا جو اس رسول کے زمانے کے لئے مطلوب تھا۔

تحریفِ کتبِ سابقہ کے سلسلے میں فرمایا:

۴/۴۶ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَ

عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ط
وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ
وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ (۴/۴۶)

تحریف کتب

ان میں سے یہودی تو بہت ہی پست سطح پر اُتر آتے ہیں۔ یہ، وحی کے الفاظ تک کو، ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر، ان کے مفہوم میں ردوبدل کر دیتے ہیں۔ (۵/۱۳)۔ اور عام گفتگو میں بھی عجیب انداز سے ذومعنی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" کہیں۔ (یعنی ہم نے آپ کی بات سُن لی اور ہم اس کی اطاعت کریں گے) ۔یہ "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" کہیں گے۔ (ہم نے اسے سُنا ہے اور ہم اس کی نافرمانی کریں گے)۔ یا کہیں گے "اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" (تو ہماری بات سن، اگرچہ تیری بات نہیں سُنی جائے گی۔ یا طنزاً کہیں گے کہ تو بہرہ ہو جائے)۔ یا یوں کہیں گے کہ تم ہمیں فلاں رعایت دو تو پھر ہم تمہاری بات سنیں گے (۴/۱۰۴)۔ غرضیکہ یہ عجیب انداز سے، زبان کو توڑ موڑ کر باتیں کریں گے ——— مقصد اس سے ان کا یہ ہے کہ دینِ خداوندی کو ہدفِ طعن و تشنیع بنایا جائے۔ اس کا مذاق اڑایا جائے ——— اگر ان کی نیت نیک ہوتی اور سیدھی طرح کہتے کہ "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سُنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے) یا "اِسْمَعْ وَ انْظُرْنَا" (ہماری بات سُنیئے اور ہم پر نگہ التفات رکھیے) تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات صاف اور سیدھی ہو جاتی۔ لیکن انکار و سرکشی کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو چکی ہے یہ عام معاشرتی حسنِ آداب سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو ایمان لے آئیں ——— جن لوگوں کی ذہنیت اس حد تک پست ہو چکی ہو، وہ ایسی بلند تعلیم کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں!

دنائت اور کمینگی

بات مفہوم سے واضح ہے۔ ایک مخالفت قریش کی طرف سے تھی، جو شدت کے اعتبار سے انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنی مخالفت میں بھی اپنے قومی کردار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ وہ دنائت اور کمینگی کی سطح پر نہیں اُترتے تھے۔ لیکن یہودی تھے کہ مخالفت میں نکھر کر مقابلہ میں آنے کے بجائے انتہائی پست سطح کے کردار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رکیک حربے، شریف مخالف کے لئے بڑے سوہانِ روح ہوتے ہیں۔ وہ مقابلہ میں اس قسم کی پست سطح پر آنہیں سکتا۔ اس لیے اسے یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جو قوم صدیوں سے غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں جکڑی رہے، اس میں اس قسم کی کمینہ عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کی اصلاح کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ قرآن جیسی بلند پایہ کتاب پر ایمان لے

آئیں۔ یہ اُن کے کردار کو خود بلند کر دے گی۔ اس لئے انہیں اس کی دعوت دی گئی۔ فرمایا:

4/47 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ (4/47)

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

ان اہل کتاب سے کہو کہ تم اس ضابطۂ حیات پر ایمان لاؤ جو تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے (کہ آنے والا آئے گا ـــــ باطل کو شکست ہوگی۔ حق کا غلبہ ہوگا۔ زمین پر خدا کی مرضی چلے گی۔ وغیرہ ـــــ اس پر ایمان لے آؤ) قبل اس کے کہ دونوں فریقوں کے آخری ٹکراؤ کی نوبت آجائے۔ اُس وقت، یاد رکھو! تمہارے ان بڑے بڑے لوگوں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا، اور وہ ذلیل و خوار ہو جائیں گے؛ یا وہ، زندگی کی خوشگواریوں سے اس طرح محروم رہ جائیں گے جس طرح تمہارے اسلاف میں سے "اصحاب سبت" محروم رہ گئے تھے (جن کا ذکر 2/65 میں آچکا ہے) یاد رکھو! یہ تنبیہہ یونہی دھمکی نہیں۔ یہ قانونِ خداوندی کا اعلان ہے اور خدا کے قانون کے نتائج سامنے آکر رہا کرتے ہیں۔ اس کی کوئی اسکیم ناکام نہیں رہ سکتی۔

ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدا کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے اُن انسانوں کے وضع کردہ قوانین و احکام کی اطاعت کرتے تھے جس سے وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو چکے تھے۔ اسے شرک کہتے ہیں جو ایسا جرم ہے جس کے پیدا کردہ نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

4/48 اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ (4/48)

شرک کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے

یاد رکھو! سہو و خطا سے کوئی لغزش ہو جانا اور بات ہے۔ اس کے نقصانات سے انسان قانونِ خداوندی کے مطابق، محفوظ رہ سکتا ہے۔ لیکن جو شخص خدا کے قانون کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو شامل کرے۔ یا، ان کے علی الرغم، اپنے جذبات ہی کی اطاعت شروع کر دے (45/23)۔ یا جو صفات اور قوتیں صرف خدا کے لئے مخصوص ہیں، ان میں دوسروں کو بھی شریک سمجھ لے، تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ یہ تصور کہ کائنات میں، خدا کے علاوہ اور بھی صاحب اقتدار ہو سکتے ہیں

یہاں، اس کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی چل سکتا ہے، ذہنِ انسانی کا خودساختہ تصوّر ہے جو بڑی غلط بنیادوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ اس سے انسان کا دل، خوف کا نشیمن بن جاتا ہے (۲۲/۳۱)۔ وہ ہر وقت اپنے ذہن کے تراشیدہ "خداؤں" سے ڈرتا رہتا ہے اور اس طرح اس کی جرأت وبے باکی کی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں ——— ایسا شخص ان تباہیوں سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اسے پھر سن لو کہ شرک صرف بت پرستی کا نام نہیں۔ بُت پرستی تو جہالت کا مظاہرہ ہے۔ شرک یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اوروں کو بھی صاحبِ اقتدار سمجھا جائے اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے انسانوں کے خودساختہ قوانین کو بھی شامل کر لیا جائے خواہ وہ قوانین، مذہبی پیشوائیت کے فیصلے ہوں اور خواہ اربابِ حکومت کے وضع کردہ ضوابط۔

(۹/۳۱ ؛ ۱۷/۴۶ ؛ ۳۹/۴۵ ؛ ۴۰/۱۲)

شرک کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) اس لئے اس آیت کی تشریح میں کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

شرک سے انسان، شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت سے محروم رہ جاتا ہے، لیکن اس قسم کے لوگ اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارا "تزکیۂ نفس ہو رہا ہے، ہماری ذات کی نشوونما ہو رہی ہے، ہم "روحانیت" کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے ہاں کی خانقاہوں اور مزارات کو دیکھئے، اور غور کیجئے کہ وہاں کس قسم کے محسوس شرک کا مظاہرہ پیش ہوتا۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اسی فریبِ نفس میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے "روحانیت" کے بلند مدارج حاصل ہو رہے ہیں:

۴/۴۹ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۴۹﴾ (۴/۴۹)

تزکیۂ نفس کے مدعی

جو لوگ اس باطل تصوّر کو دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں، ذرا ان کی حالت پر غور کرو۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم جس نہج پر چل رہے ہیں اس سے ہماری ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اس سے ہم "روحانیت" کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

یاد رکھو! انسانی ذات کی نشوونما صرف اُس ضابطۂ خداوندی کی رُو سے ہو سکتی ہے جسے اس نے اپنی مشیّت کے مطابق، بذریعہ وحی عطا کیا ہے۔ اس کے مطابق، جو چاہے اپنی ذات کی نشوونما کر سکتا ہے۔ اس کی سعی وعمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی۔ وہ اپنا نتیجہ ٹھیک ٹھیک مرتب کئے جاتے ہیں۔

تزکیۂ نفس صرف اتباعِ قرآن سے ہو سکتا ہے

یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس سے اغماض برتنے سے ہم اس قدر کھلی ہوئی گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ارشادِ خداوندی یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما (تزکیۂ نفس) کا ثبوت یہ نہیں کہ وہ شخص خود اپنے متعلق اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ معیارِ خداوندی (قرآن کریم) پر بھی پورا اترتا ہے یا نہیں۔ آپ غور کیجئے۔ کشف و الہام کے جس قدر دعویدار ہیں اُن کے پاس اپنے دعویٰ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ ثبوت تو ایک طرف، وہ اپنی "روحانیت" کے متعلق کسی اور کو کچھ بتا بھی نہیں سکتے۔ وہ پوچھنے والے کے جواب میں اتنا ہی کہتے ہیں ——— ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی ——— "یہ وہ شراب ہے جس کے نشہ کی کیفیت وہی سمجھ سکتا ہے جو اسے خود پئے" گویا وہ اپنے دعویٰ ہی کو اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا معیار اُس کی کتاب ہے' اور بس۔ جو شخص کتاب اللہ سے اس کا ثبوت پیش نہیں کرتا، اور اس کے باوجود اسے منسوب کرتا ہے خدا کی طرف' وہ خدا پر بہتان باندھتا ہے۔

۴/۵۰ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ؀ ع

(۴/۵۰)

دیکھو! (یہ "روحانیت" کے مدعی) کس طرح اپنے خود ساختہ مشرب و مسلک کو، خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اس طرح کتنا بڑا جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ ان کی اپنی ذات میں (تقویت اور نشوونما کے بجائے) ضعف و اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی چیز ان کی تباہی کے لئے کافی ہے ——

ایسا کھلا ہوا جھوٹ۔ اتنا واضح جرم اور دعویٰ یہ کہ ہم خدا کے مقرب ہیں!

چونکہ ہم تصوّف کے متعلق سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں، اس لئے اس باب میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں (تصوف کے موضوع پر میں نے ایک خود مکتفی ضخیم تصنیف الگ مرتب کی ہے)

یہ اُن کے رُہبان (اربابِ طریقت) کی حالت ہے۔ دوسری طرف اُن کے احبار (اعیانِ شریعت) کو دیکھئے:

۴/۵۱-۵۲ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ؀ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ؀ (۴/۵۱-۵۲)

اُن کے علماء کی حالت

(یہ اُن کے "اہلِ طریقت" کا حال ہے۔ دوسری طرف) ان اہلِ کتاب کے اربابِ شریعت کو دیکھو! یہ چند بے جان رسومات اور بے حقیقت معتقدات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور غیر خدائی قوتوں (مذہبی پیشواؤں اور حکمرانوں) کے بنائے ہوئے قوانین پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ضد کا یہ عالم ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں، کافر زیادہ سیدھی راہ پر ہیں (حالانکہ تم، ان اہلِ کتاب کو، کفار پر ترجیح دیتے ہو)

یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے صحیح اور سچے ضابطۂ حیات کی برکات سے محروم رہ گئے۔ اور جو اس ضابطہ کی برکات سے محروم رہ جائے، اس کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہو سکتا۔

جبت کے معنی

طاغوت کے متعلق سابقہ جلدوں میں لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مراد غیر خداوندی اربابِ اقتدار ہیں۔ جبت ہر کھوکھلی شے کو کہتے ہیں ـــــ یعنی توہم پرستانہ نظریات اور مسالک، شعائر اور رسومات جن میں روح باقی نہ رہی ہو، جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ غور کیجئے، جو قوم ہی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے دین کو چھوڑ دیتی ہے، وہ کس طرح طاغوت اور جبت کو اپنا معبود بنا لیتی ہے یہودیوں کا ہیکل (جس کا نقشہ باب دوم میں ہمارے سامنے آ چکا ہے) طاغوت اور جبت کی پرستش کا مرکز تھا ان کے اربابِ شریعت خدائی اختیارات کے حامل تھے اور ان کے "اصحابِ طریقت" کھوکھلی ریاضتوں کے پیکر۔ مذہب میں ہوتا ہی یہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ غنیمت تھا کہ ان (مذہبی پیشواؤں) کا دائرۂ اختیار شخصی قوانین تک محدود تھا۔ اگر انہیں کہیں مملکت کے اختیارات کا بھی کچھ حصہ مل گیا ہوتا، تو یہ کسی کو کچھ بھی نہ دیتے، سب کچھ خود ہڑپ کر جاتے۔

تھیاکریسی میں کیا ہوتا ہے

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ (۴/۵۳)

۴/۵۳ یہ تو غنیمت ہے کہ انہیں ملک میں اقتدار و اختیار حاصل نہیں، ورنہ یہ لوگوں کو تل کے برابر بھی کوئی شے نہ دیتے۔

تاریخِ انسانیت میں بدترین ادوار وہ ہیں جن میں حکومت، مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ (اسے THEOCRACY کہتے ہیں) کسی فرعون یا نمرود نے "ابلیس" کے نام پر ایسے مظالم نہیں کئے ہوں گے جیسے ان "مقدسین" کے ہاتھوں "خدا" کے نام پر روا رکھے گئے۔

حسد کی وجہ سے مخالفت

بات یہودیوں کی طرف سے نبی اکرمؐ کی مخالفت کی ہو رہی تھی۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت ابراہیمؑ کے دو بڑے بیٹے تھے۔ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسماعیلؑ۔ یہودی (بنی اسرائیل) حضرت اسحٰقؑ کی اولاد سے تھے اور نبی اکرمؐ حضرت اسمٰعیلؑ کی ذریت سے۔ یہودیوں کو حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت سے شروع ہی سے کد تھی۔ اس سے پہلے نبوت اور حکومت بنی اسرائیل کے ہاں چلی آ رہی تھی، لیکن ظہورِ نبی اکرمؐ سے، یہ دونوں انعامات خداوندی (نبوت اور حکومت) بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہو گئے۔ یہودی اس سے بہت برافروختہ تھے اور حضور نبی اکرمؐ کے خلاف معاندت اور مخاصمت کا جذبۂ محرکہ ان کا یہی حسد تھا۔ اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا:

۴/۵۴ اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا (۴/۵۴)

اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس بات پر سخت حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کے فریقِ مقابل (جماعتِ مومنین) کو اس قدر خوشگواریاں کیوں عطا کر دی ہیں؟ ان سے کہو کہ خدا کے فضل و کرم کی یہ بارش کسی قومی طرفداری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ یہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی طرح، اس سے پہلے، خود ان کے اسلاف، یعنی آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت عطا ہوئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک عظیم مملکت بھی۔

کتاب و حکمت اور عظیم مملکت

آپ غور کیجئے۔ کتاب و حکمت تو خاصۂ نبوت تھی لیکن ان کے ساتھ انہیں ایک عظیم مملکت بھی عطا ہوئی تھی۔ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین، عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اور دین کی عملی شکل کو اسلام کہتے ہیں۔

اس کے بعد کہا کہ آلِ ابراہیمؑ اب دو گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو نبوتِ محمدیہؐ پر ایمان لا کر جماعتِ مومنین میں داخل ہو چکا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔

۴/۵۵ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡہُ ؕ وَ کَفٰی بِجَہَنَّمَ سَعِیۡرًا ○ (۴/۵۵)

اسی آلِ ابراہیمؑ میں ایک گروہ وہ ہے جو اس ضابطۂ خداوندی پر ایمان لے آیا ہے (لہٰذا) اس کی برکات سے متمتع ہو رہا ہے، اور دوسرا گروہ وہ ہے جو اس کی طرف نہیں آیا۔ ان کی غلط روش، ان کی سعی و کاوش کو نذرِ آتش کر رہی ہے۔ اور یہ (بجائے اس کے کہ صحیح راہ اختیار کر کے ان خوشگواریوں میں برابر کے حصہ دار ہو جائیں)

جل بھن کر، ان سے حسد کرتے ہیں۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں کا مآل مزید وضاحت سے بیان کر دیا۔ فرمایا:

۴/۵۶ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ط كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ○ (۴/۵۶)

ان سے کہہ دو کہ جو لوگ بھی قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں گے اور ان سے سرکشی اختیار کریں گے وہ تباہ و برباد ہو کر رہیں گے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک دفعہ مقابلہ کے لئے اٹھیں گے تو انہیں ایسی شکست ملے گی جس سے ان کی قوت ٹوٹ جائے گی۔ یہ پھر قوت فراہم کر کے سامنے آئیں گے اور پھر شکست کھائیں گے۔ اس طرح پیہم شکستوں اور ناکامیوں سے ان کی سختی اور شدت، قوت اور صلابت ختم ہو جائے گی۔ ایسا ہو کر رہے گا، اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات، بڑی قوتوں کا مالک اور اپنی جگہ محکم ہے۔ سنکھیا کھانے والا ہلاکت سے کیسے بچ جائے گا؟

تبدیلیٔ جلود کا مفہوم

ہم نے تبدیلیٔ جلود کا جو مفہوم اوپر درج کیا ہے، اس کا تعلق اس دنیا میں سزا (تخریبی اعمال کے نتیجہ) سے ہے۔ آخروی زندگی میں اس عذاب کی کیا شکل ہوگی، اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ ویسے جنت اور جہنم کے بیانات تمثیلی ہیں۔ (دیکھئے انڈکس میں عنوانات جنت اور جہنم)۔

اَلْجِلْدُ (جمع جُلُوْدٌ) کے عام معنی کھال کے ہوتے ہیں، لیکن اس مادہ کے بنیادی معنی قوت اور سختی کے ہیں (دیکھئے لغات القرآن)۔ اس نہج سے ہم نے مفہوم میں اس سے مراد مخالفین کی قوت کا ٹوٹ جانا لیا ہے۔

یہ ایک گروہ تھا۔ دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا:

۴/۵۷ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ز وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ۝۵۷ (۴/۵۷)

اس کے برعکس، جو لوگ ہمارے قانونِ حیات کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو وہ ایسی شادابیوں کی زندگی بسر کریں گے جو کبھی پژمردہ نہیں ہوں گی۔

اور ان کے رفقاء جو انہی کی طرح پاکباز ہوں گے، سب اس جنتی زندگی میں شریک ہوں گے اور انہیں خدا کی حفاظت اور سایۂ عاطفت نصیب ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس دنیا میں یہ جنتی زندگی، اس نظامِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوگی جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں قائم ہوگا۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت کے متعلق فرمایا:

۴/۵۸ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾ (۴/۵۸)

اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے ضروری ہے کہ یہ عظیم ذمہ داریاں انہی کے سپرد کی جائیں جو ان سے عہدہ برآ ہونے کے اچھی طرح اہل ہوں۔ انہیں نااہلوں کے سپرد نہ کرو۔ یہ ذمہ داریاں، درحقیقت نظامِ خداوندی کی امانتیں ہیں جن میں کبھی خیانت نہیں ہونی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جب تم لوگوں کے معاملات میں فیصلہ دو، تو یہ فیصلہ عدل کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جو حکومت، (فیصلے کرنے کی مشینری) عدل کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یاد رکھو! یہ بڑی اہم بات ہے جو تم سے کہی گئی ہے۔ امورِ حکومت کو سرانجام دیتے وقت ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ جب کوئی اور سننے والا نہ ہو، اس وقت بھی ایک سننے والا، اور جب کوئی اور دیکھنے والا نہ ہو، اس وقت بھی ایک دیکھنے والا (اللہ) موجود ہوتا ہے۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ "عدل" کے معنی ہیں الحق (کتابِ خداوندی) کے مطابق بلارو رعایت فیصلے کرنا۔ (۵/۱۸۱)

امانات اور عدل کا مفہوم

[امٰنٰت کا مفہوم مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۶۴ (آیت ۲/۱۷۸) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے مراد وہ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں جو کسی کے سپرد کی جائیں لہٰذا نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کی شرطِ اوّل یہ ہے کہ مملکت اور معاشرہ سے متعلق ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کی جائیں جو ان سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ اسلامی مملکت میں اربابِ حل و عقد کے سپرد اقتدارات اور اختیارات نہیں کئے جاتے۔ ان کے سپرد امٰنٰت کی جاتی ہیں۔ ایمان کا مادہ بھی (ایمان اور مومن کی طرح) امن ہے۔ لہٰذا اس ارشادِ خداوندی کا مقصود یہ ہوگا کہ یہ فرائض ان لوگوں کے سپرد کئے جائیں تاکہ افرادِ معاشرہ امن و اطمینان کی نیند سو جائیں۔ انہیں کسی قسم کا خوف، خطرہ یا خدشہ نہ رہے۔ یہ رہنمائی (بلکہ حکم) تو ان کے لئے ہے جو

ان لوگوں کا انتخاب کریں جن کے سپرد مملکت کی ذمہ داریاں کی جائیں۔ اب رہے وہ جن کے سپرد یہ ذمہ داریاں کی جائیں، تو ان سے کہا گیا کہ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو عدل کے ساتھ کرو (حکومت۔ حکم۔ حکمرانی کے لئے انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھئے، بالخصوص جلد سوم صفحہ ۹ آیت ۲/۱۱۳)۔ اور عدل کے عمومی مفہوم کے لئے عنوان عدل۔ لیکن یہاں بات عدالتی عدل کی ہو رہی ہے۔ مروجہ مفہوم کے مطابق، جب کسی معاملہ (مقدمہ) کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق کیا جائے تو اسے عدل کہیں گے۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر وہ قانون، جس کے مطابق اس معاملہ کا فیصلہ کیا گیا ہے، ظلم پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ عدل کرنے والے وہ لوگ ہیں اُمَّۃٌ یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱ و ۷/۱۵۹) "جو الحق کے مطابق دوسروں کی راہ نمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں"۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے عدل کے مطابق وہ فیصلہ ہوگا، جو الحق کی رو سے کیا جائے، اور الحق خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے (۵/۴۴ و ۵/۴۸ و ۳۸/۲۶)۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم خدا کے سوا کسی کو قانون سازی کا حق اور اختیار نہیں دیتا۔ الحق صرف خدا کے نازل کردہ قوانین ہیں اور انہی کے مطابق فیصلہ عدل کہلا سکتا ہے۔

اس کے بعد وہ آیۂ جلیلہ سامنے آتی ہے جو نظامِ خداوندی (یا اسلامی مملکت) کا عُروَۃُ الوُثقٰی ہے اور جس کا غلط مفہوم امت کی تمام اختلاف انگیزیوں اور تفرقہ بازیوں کا موجب ہے۔ اور وہ آیت ہے:

۴/۵۹ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۵۹﴾ (۴/۵۹)

اس آیت کا مروجہ ترجمہ اور صحیح مفہوم بعد میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے اس پس منظر کو دیکھئے جس میں اس آیت نے بنیادی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔

اس وقت تک قرآن کریم کا جتنا حصہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس سے آپ نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا ہوگا کہ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ حکومت یا اطاعت صرف خدا کی ہے۔ اُس کے سوا کسی کی نہیں۔ یہی الدین کی لِم ہے۔ یہی الاسلام کی غایت ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی خدا پر ایمان کا مقصدِ اوّلین ہے۔

قرآن کا سیاسی نظام

لیکن خدا کی ذات تو ایسی ہے کہ اُس کا محسوس اور مرئی طور پر ہمارے سامنے

آنا تو ایک طرف، وہ ہمارے قیاس وخیال، گمان و وہم سے بھی ماوراء ہے۔ اس سے، سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اس کے لئے اُس نے خود ہی بتا دیا کہ میں نے اپنی کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے۔ اس کتاب کی اطاعت یا محکومیت، میری اطاعت یا محکومیت ہو گی۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹ زیر آیت (۲/۱۱۳) گذر چکی ہے۔

اگر اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہوتا، تو ہر شخص اپنے اپنے طور پر کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت کر لیتا۔ لیکن اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۳۔ زیر آیت ۲/۴۳) اس لئے کتاب اللہ کی اطاعت، اجتماعی نظام کی رُو سے کی جا سکتی ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی عملی شکل اُس مملکت یا حکومت کی اطاعت ہو گی جو قرآن مجید کے احکام و اصول و اقدار کے نافذ کرنے کے لئے قائم کی جائے۔

اس قسم کی پہلی حکومت، حضور نبی اکرمؐ نے، قائم فرمائی تھی، اور خود حضورؐ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ اس بنا پر اس مرکزی اتھارٹی (رسول) کی اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی اطاعت یا، بالفاظ دیگر، خدا کی اطاعت تھی۔ اس کے لئے قرآن کریم نے "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مراد ہے اُس نظامِ خداوندی کی اطاعت، جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا۔ چونکہ اطاعتِ خداوندی کے اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی قائم رہنا تھا۔ اس لئے اللہ اور رسولؐ، کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت تھا۔ اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

"اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت

یہ حقیقت کہ اللہ اور رسولؐ سے مرکزِ ملت (یا نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ) مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی اس کے لئے قرآن مجید سے بکثرت شہادات پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگِ اُحد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو آپؐ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی اکرمؐ نے دی تھی۔ لیکن چونکہ یہ بُلاوا حضورؐ کا ذاتی بُلاوا نہ تھا، بلکہ آپؐ نے بہ حیثیت سربراہ مملکت یہ آواز دی تھی، اس لئے اس آواز کو خدا اور رسول کی آواز قرار دیا گیا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ (۳/۱۷۲)

جن لوگوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی پکار کا جواب دیا (اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے) باوجود یکہ (اس سے ذرہ ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے ، سو یاد رکھو ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں ، یقیناً ان کے لئے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے !

۲۔ یہودیوں نے مدینہ میں اُس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمؐ سے استوار کیا تھا ۔ اس عہد شکنی کو "خدا اور رسول" کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے ، اس لئے کہ یہ مخالفت نظامِ اسلامی کی مخالفت تھی :

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۵۹/۴)

یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے "اللہ اور اس کے رسولؐ" کی مخالفت کی ہے ، اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) اللہ کا قانون (پاداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے ۔

۳۔ نظامِ اسلامی کے خلاف بغاوت کرکے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں :

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (۵/۳۳)

بلاشبہ ان لوگوں کی جو" اللہ اور اُس کے رسولؐ "کے ساتھ جنگ کرتے ہیں[۱] ، اور ملک میں خرابی پھیلانے کیلئے دوڑتے پھرتے ہیں یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں ، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں ، یا اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف

---

[۱] سید ابو الاعلیٰ مودودی (مرحوم) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں : "زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو ۔ اور خدا و رسول سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو"

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۴۶۵ ۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

ستونوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا اُن کے لئے ضروری ہو، انہیں دی جائے) یہ ان کے لئے دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی اُن کے لئے عذاب عظیم ہے

۴۔ یہاں تو "اللہ اور رسولؐ" کے خلاف جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ سورہ احزاب میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾ (۳۳/۵۷) ۔ "جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے، اور خدا کی لعنت"۔ اس آیت میں اگر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ اور رسول سے مُراد رسول اللہؐ کی ذات لی جائے تو اس سے بڑی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول اللہؐ کو اذیت پہنچانے کی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے، کیونکہ آپ ایک انسان (بشر) تھے، اور ایک انسان (یا انسانوں کا گروہ) دوسرے انسان کو اذیت پہنچا سکتا ہے۔ (رسول اللہؐ کو اذیت پہنچانے کا ذکر قرآن مجید کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔) لیکن اللہ کو اذیت پہنچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے کون اذیت پہنچا سکتا ہے؟ اس لئے اس آیت میں "اللہ اور اس کے رسولؐ" کو اذیت پہنچانے سے مقصد نظامِ خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

۵۔ اب آگے چلئے۔ جب نظامِ حکومت کے قیام کے بعد، سب سے پہلا اجتماع عظیم (حج اکبر) ہوا، تو اس میں اس حکومت کی طرف سے کچھ عام اعلانات کئے گئے جن میں بتایا گیا کہ اس حکومت کی پالیسی اور امورِ خارجہ میں مسلک کیا ہوگا۔ اس ضمن میں جو سب سے پہلا اعلان کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے:

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١﴾ (۹/۱)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!)

جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا) معاہدہ کیا تھا، اب ان کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔

پھر تیسری آیت میں ہے:

وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولُهُ ۚ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣﴾ (۹/۳)

اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی (یعنی اُن میں اور نظامِ خداوندی میں اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا) پس اگر تم (اب بھی ظلم وشرارت سے) باز آجاؤ تو تمہارے لئے اس میں بہتری ہے اور اگر نہ مانو گے تو جان رکھو، تم نظامِ حکومت خداوندی کو عاجز نہیں کرسکتے، اور (اے پیغمبرِ اسلام!) جو لوگ کفر کی راہ چل رہے ہیں، اُنہیں عذاب دردناک کی خوش خبری سُنا دو۔"

پھر ساتویں آیت میں ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۹/۷)

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد "اللہ اور اس کے رسول" کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد وپیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا)، تو ان کا عہد ضرور عہد ہے، (اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں، تم بھی اُن کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔

اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ نظامِ اسلامی ہے

غور کیجئے۔ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے، اور اسی حکومت کے نمائندہ کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے تھے، لیکن انہیں اللہ اور رسولؐ کے منشورات کہا گیا ہے۔ اس تبیانِ حقیقت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہات کو اس نکتۂ ماسکہ کی طرف مرکوز کیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکام رسولؐ کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں، اس لئے کہ یہ نظامِ حکومتِ خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دین کے غلبہ و تمکن اور حزب اللہ کی کامیابی وظفرمندی کے متعلق متعدد مقامات پر وعدے کئے ہیں۔ اس غلبہ اور کامیابی کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسول کی کامیابی ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۸/۲۱)

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرا رسولؐ ہی غالب رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوت وغلبہ والا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور تسلط اسلامی حکومت ہی کا تمکن و تسلط تھا، ورنہ اللہ تو ہر جگہ غالب ہے۔ لہٰذا اللہ اور

رسول کے غلبہ سے مراد نظامِ اسلامی کے غلبہ ہی سے ہے۔ جب مسلمانوں کی مملکت قائم ہوگئی (جسے حکومت خداوندی یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس حکومت کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ مملکت کی آمدنی تھی، اِسے بھی قرآن کریم نے "خدا اور رسولؐ" کی دولت کہہ کر پکارا ہے۔ (۵۹/۷)۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں کہا کہ خمس (پانچواں حصہ) "اللہ اور رسول" کے لئے الگ کر لو۔ (۸/۴۱) ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ یہ پانچواں حصہ، امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے صرف کیا جائے گا۔

یہ حقیقت کہ ان مقامات میں اللہ اور رسولؐ سے مراد نظامِ خداوندی یا اسلامی حکومت ہے، میری اختراع نہیں۔ متقدمین اور متاخرین کے ممتاز مفسرین نے بھی اس سے یہی مراد لی ہے۔ میں اُن کے اقتباسات درج کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ (میں اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھتا چلا آ رہا ہوں، بالخصوص "اسلامی نظام" اور "اسلام میں قانون سازی کا اصول" نامی کتابچوں میں۔ طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۹ء میں، علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے محققانہ مقالہ "اسلامی نظام" میں بھی متقدمین کے بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں۔

ان تشریحات کی روشنی میں، آیت زیرِ نظر (۴/۵۹) کی طرف آئیے۔ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ اس سے پہلی آیت (۴/۵۸) میں بات نظامِ حکومت کی ہو رہی تھی۔ اس آیت میں اس نظام کے عملی پہلو کو سامنے لایا گیا ہے۔ کوئی حکومت بھی ہو، اس میں ایک تو اس کی مرکزی اتھارٹی (سنٹرل گورنمنٹ) ہوتی ہے، اور دوسرے اس کے افسرانِ ماتحت (عمالِ حکومت)۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ"۔ یعنی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی بھی اطاعت کرو، اور اس کے افسرانِ ماتحت کی بھی۔

اُولی الامر سے مراد

اس کے بعد ہے: "فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ"۔ اگر تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں اختلاف ہو جائے تو اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرو۔ پوری آیت کا مفہوم حسبِ ذیل ہو گا:

> نیز یہ بھی ضروری ہے کہ تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو، جسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے رسول نے قائم کیا ہے۔ اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگانِ حکومت (افسرانِ ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں، کسی بات میں اختلاف ہو جائے، تو اس کے لئے مرکز کی طرف

رجوع کرو ــــــ یعنی افسرانِ ماتحت کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو، جو اس تنازعہ کا، قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی۔ (۴۲/۱۰ و ۵/۴۸)۔

مرکزی اتھارٹی کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ، آخری ہوگا۔ اور چونکہ وہ فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا، جس پر تم ایمان رکھتے ہو، اس لئے اس فیصلہ کو بطیبِ خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کرو۔ (۴/۶۵)

یہ شہادت ہوگی اس بات کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطۂ ہدایت، اور قانونِ مکافاتِ عمل، اور حیاتِ اُخروی پر یقین رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ، اور انجام کار معاشرہ کا صحیح صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہوگی۔

بعد میں کیا ہوا؟ جب تک اسلامی نظامِ حکومت قائم رہا، اس آیت کا یہی مفہوم لیا جاتا رہا۔ حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ "تم پر میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سُنت کا اتباع لازمی ہے"؛ تو اس سے یہی مُراد تھی۔ خلفائے راشدین، کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ جب تک اسلامی نظام قائم رہا، اِس کے سربراہ "خُلفائے راشدین" کے لقب سے سرفراز رہے۔ یہ سوءِ اتفاق ہے (اور امت کی حرماں نصیبی) کہ یہ سلسلہ معدودے چند تک قائم رہا۔ بعد میں جب یہ نظام، ملوکیت میں بدل گیا، تو اس آیت کے مفہوم میں دشواری پیش آگئی۔ نظامِ ملوکیت میں، امت میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ دنیاوی امورِ حکومت کی تحویل میں آگئے، اور امورِ شریعت، علماء کی تحویل میں۔ اس ثنویت کی رُو سے، اس آیت کے معنی یہ کئے گئے کہ تم اطاعت کرو اللہ کی۔ اور اطاعت کرو اُس کے رسولؐ کی اور اربابِ حکومت (اُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ) کی۔ اگر تم میں اور حکومت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کے رفع کرنے کے لئے حضراتِ علماءِ کرام کی طرف رجوع کرو تاکہ وہ بتائیں کہ اس باب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا کیا حکم ہے۔ علماء کا فیصلہ تمہارے (عوام) اور حکومت دونوں کے لئے قولِ فیصل ہوگا۔

تھیاکریسی بادنےٰ تدبّر یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ اس سے آخری اقتدار، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آگیا، اور چونکہ وہ اپنے فیصلے کو "اپنا فیصلہ" قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے "خدا اور رسولؐ کا فیصلہ" کہہ کر صادر کرتے تھے۔ اس لئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے سرتابی کر سکے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم (خدا اور رسولؐ کے نام پر مٹنے کے لئے) اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس سے ایسی تھیاکریسی وجود میں آگئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات (مذہبی پیشوائیت) نے کسی حکومت کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جب تک حکومت اُن کے ساتھ ساز باز رکھتی، یہ اُس کے ہر فیصلے کو خدا اور رسولؐ کا فیصلہ

قرار دیتے۔ جونہی اس سے کوئی اختلاف ہوتا، یہ خدا اور رسولؐ کے نام پر عوام کو اس کے خلاف اٹھ کھڑا کرتے۔ یہی کچھ آج تک ہو رہا ہے۔

لیکن ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حضرات اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ''میں دو الگ الگ اطاعتیں بتاتے تھے۔ ایک اللہ کی اطاعت، اور دوسری رسولؐ کی اطاعت۔ ''اللہ کی اطاعت'' کے لئے تو قرآن مجید کہ دیا لیکن دشواری یہ پیش آئی کہ رسولؐ کی اطاعت کس طرح کرائی جائے؟ اس مقصد کے لئے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے پڑے۔ یہ بات قارئین کے لئے شاید نئی ہو، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ

رسولؐ کی اطاعت احادیث کی رُو سے

مختصر الفاظ میں ''احادیث'' کی تاریخ سامنے لائی جائے۔ (یہ تاریخ اور احادیث سے متعلق دیگر مباحث ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ ذیل میں انہیں اختصاراً پیش کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ رسول اللہؐ نے اس کی کتابت کرائی۔ حفاظ کو یاد کرایا۔ انہیں خود سنایا، ان سے سنا۔ اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کیا ——— کہ ''میں تم میں خدا کی کتاب چھوڑ چلا ہوں۔ اس کا اتباع کرتے رہو گے، تو گمراہ نہیں ہو گے۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے کسی اور چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اس نے نہ تو احادیث کو جمع کرایا، نہ اُن کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ اور نہ ہی اُن کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسولؐ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے، اس لئے کہ احادیث نبی اکرمؐ کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ چیز دین تھیں تو جس طرح آپؐ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سنا، دہرایا، اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے، احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ منصب رسالت کا یہی تقاضا تھا۔ اور بہ حیثیت رسول حضورؐ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں اُمت کے پاس چھوڑتے۔ لیکن حضورؐ نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا، احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا برعکس اس کے خود کتب احادیث میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضور نے فرمایا کہ

لَا تَكْتُبُوا عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ - وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ - (صحیح مسلم)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز لکھی ہو اُسے مٹا دے۔

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی درخواست پر انہیں اجازت عطا فرمادی تھی کہ وہ چاہیں تو حدیث لکھ لیا کریں لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی، اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر، اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کون سی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سُنی ہوں، اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کرلیا جاتا تھا۔ لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کرلینا ہی کافی تھا تو قرآن کریم کے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی! یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کا تو لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا اور پھر اُن سے سُن لیا جاتا تھا اور اس کی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگر کسی نے کچھ احادیث اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو امت کے لئے وہ سند نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ نبی اکرمؐ ان احادیث کو سُن کر اُن کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے، اور انہیں ایک کتاب میں محفوظ کر کے اُمت کو نہ دے جاتے اور پھر وہی احادیث قرآن کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمائیے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہؐ ان کی حفاظت کا کچھ انتظام بھی نہ کرتے؟

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قلمبند ہوئی تھیں۔ مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمّال کے نام بھیجے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

۱۔ پندرہ سو صحابہؓ کے نام (ایک رجسٹر میں)

۲۔ مکتوبات گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و امراء کو لکھے۔

۳۔ چند تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

۴۔ کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔ ان احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے اُن کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی وہ بعد میں اپنی اصلی شکل میں

کہیں موجود رہیں۔ لہٰذا رسول اللہؐ نے جو کچھ امت کو دیا تھا وہ صرف قرآن تھا۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہؐ نے امت کو نہیں دیا۔ خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (امت کے لئے) کیا چھوڑا ہے، تو آپ نے کہا کہ مَا تَرَكَ إِلَّا مَا بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ۔ یعنی حضورؐ نے قرآن کریم کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔

(اُردو ترجمہ جلد سوم صفحہ ۲۰۔ عربی بخاری جلد سوم کتاب فضائل القرآن صفحہ ۱۴۳)

صحابہؓ کا عمل

حضور نبی اکرمؐ کے بعد، صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ کا عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ مسند امام احمدؒ میں لکھا ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا[1]

ہم لوگ جو کچھ رسول اللہؐ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے تب ایک دن رسول اللہؐ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیئے)۔ پھر فرمایا (ستھری کرو۔ خالص رکھو) اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو۔ (صحابیؓ کہتے ہیں) کہ تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا۔ پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔

(تدوین حدیث صفحہ ۲۴۹)

امام ذہبی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق حسب ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس چاہیئے کہ رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔ پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ پس چاہیئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو۔ اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی بحوالہ تدوین حدیث صفحہ ۳۲۱)

---

[1] ہم نے ذیل کی روایات کو مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کی کتاب "تدوین حدیث" سے اقتباس کر کے لکھا ہے تاکہ ان کی صحت کے متعلق کوئی اعتراض نہ کیا جاسکے۔

امام ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے رسول اللہؐ کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت صدیق اکبرؓ) بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپ بے چین ہو رہے ہیں۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا) جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹی! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔　　(تدوین حدیث۔ ص۲۸۸-۲۸۵)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے، علامہ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

عمرؓ بن خطاب نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوں نے رسول اللہؐ کے صحابیوں سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوائی جائیں۔

لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ کامل ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔

(تدوین حدیث ص۳۹۴)

اور یہ اس لئے تھا کہ جیسا کہ (پہلے لکھا جا چکا ہے) خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔　　(صحیح مسلم)

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ حدیث کو جمع اور مدوّن نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے چنانچہ طبقات میں ہے کہ :-

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہوگئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔ حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دیئے۔ تب آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔　　(طبقات۔ جلد ۵ ص۱۴۱) تدوین حدیث)

یعنی حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ صحابہؓ نے نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق حضورؐ کے سامنے

انہیں جلا دیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر، ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذر آتش کر دیا۔

یہ کچھ دارالخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کے متعلق حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

عمرؓ ابن خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلم بند کر لیا جائے۔ مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلمبند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا۔ تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو، چاہیئے کہ اسے محو کر دے۔ یعنی ضائع کر دے۔

(جامع بیان العلم۔ جلد ۱ ص ۶۵) (تدوین حدیث ص ۴۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے "قرنِ اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امر اتفاقی نہیں، بلکہ مبنی بر مصلحت ہے"۔ انہوں نے اس سے پہلے امام ابن حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے شام تک، اور شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے، ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔

(تدوین حدیث ص ۲۱۶)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

یہ ہے کیفیت صحابہ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی۔ یعنی۔

۱۔ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔

۲۔ صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور پر لکھی تھیں، انہیں انہوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق جلا دیا۔

۳۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدون کردہ مجموعہ احادیث کو جلا دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدون نہیں کرنی چاہئیں۔

۵۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔
۶۔ اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوتی ہوں تو وہ انہیں ضائع کر دے۔ اور
۷۔ یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا۔ بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں ایسا دیدہ دانستہ کیا گیا۔

مزید شدّت حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جا رہے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، ابو درداؓ اور ابو مسعود انصاریؓ کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ (ان تمام روایات کے لئے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِ نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عمل رسول اللہؐ کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعہ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا ان کی زیرِ نگرانی مدوّن کیا گیا ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرما دیا تھا، خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہؐ کے بعد، خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

صحیفہ ہمام ابن منبہ علمائے حدیث کو بڑی تحقیق و کاوش کے بعد پہلی صدی ہجری کا ایک مجموعۂ احادیث ملا ہے جو صحیفۂ ہمام ابن منبہ کے نام سے متعارف ہے۔ اس صحیفہ کو چند سال اُدھر، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا۔ امام ہمام ابن منبہ

کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس صحیفہ میں کل ۱۳۸ حدیثیں ہیں جن کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے انہیں اپنے استاد (حضرت ابوہریرہؓ) کے سامنے لکھا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ۵۸ھ سے پہلے کا مرتب شدہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام ہمام ابن منبہ ۵۸ھ سے پہلے، مدینہ میں بیٹھ کر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں اور انہیں صرف ۱۳۸ احادیث ملتی ہیں۔ اور تیسری صدی ہجری میں جب امام بخاریؒ احادیث جمع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو انہیں چھ لاکھ احادیث مل جاتی ہیں۔ (امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ اور امام یحییٰ ابن معین کو بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں) نیز یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو احادیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ان کے شاگرد کے مجموعہ میں کل ۱۳۸ احادیث ہیں۔ بہرحال پہلی صدی ہجری میں انفرادی طور پر احادیث جمع کرنے کی جو کوشش ہوئی۔ اس کا ماحصل، صحیفۂ امام ہمام ابن منبہ کی ایک سو اڑتیس احادیث ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے کسی تحریری سرمایہ کا سراغ نہیں ملتا۔

اس کے بعد ۱۰۰ھ کے قریب خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کچھ احادیث اپنے طور پر جمع کرائیں

امام زہریؒ

ان کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی ۱۲۴ھ) نے خلفائے بنی امیہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا[1] لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جمع کردہ احادیث کسی مدوّن صحیفہ کی شکل میں موجود رہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے۔ البتہ بعد کی کتب احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا۔ جب لوگوں کو قرونِ اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان تصانیف کا مسالہ (MATERIAL) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع موضوع کو سمیٹا اور صرف انہی باتوں کو اکٹھا کیا جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ اس کے بعد دوسری اور تیسری صدی ہجری میں بعض حضرات نے ان باتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جو عام طور پر مروّج تھیں اور جنہیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتب احادیث ہے (احادیث

---

[1] مختصر جامع بیان العلم۔

کے معنی ہی بانیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت موجود ہے، امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس زمانے میں مدینہ میں ارکانِ اسلام کے متعلق صحابہؓ کا عمل کیا تھا۔ اس کے مختلف نسخوں میں تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتب احادیث مدوّن ہوئیں۔ عہدِ عبّاسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتب احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتبِ احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم ہیں) امام بخاری (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکرّرات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتبِ احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں اب دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے ان میں سے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں اہل سنت والجماعت (سنّی حضرات) صحیح ترین مانتے ہیں (انہیں صحاح ستہ۔ یعنی حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں کہا جاتا ہے) واضح رہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے[1] ہیں۔ وہ سُنّیوں کے مجموعوں کو صحیح نہیں مانتے۔ نہ ہی سُنّی ان کے مجموعوں کو قابلِ سند تسلیم کرتے ہیں۔

صحاح ستہ یہ ہیں :-

۱۔ صحیح بخاری۔
۲۔ صحیح مسلم۔
۳۔ ترمذی۔

---

[1] شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ الکافی :- جامع ابو جعفر محمد جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی۔
۲۔ من لا یستحضرہ الفقیہ :- یہ شیخ محمد ابن علی (متوفی ۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔
۳۔ تہذیب :- مؤلفہ شیخ ابو جعفر محمد بن حسن۔ متوفی ۴۶۰ھ۔
۴۔ استبصار : یہ بھی انہی کی تالیف ہے۔

ان میں سے بھی کوئی عرب نہیں۔

۴۔ ابوداؤد۔

۵۔ ابن ماجہ۔

۶۔ نسائی۔

ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے بخاری کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ۔ ان مجموعوں کے جامعین کے مختصر تعارف حسب ذیل ہے:۔

۱۔ **امام بخاریؒ**:۔ یہ بخارا میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ (یا بعض کے نزدیک ۲۶۰ھ) میں سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انہوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف قریب (۷۲۰۰) احادیث کو صحیح پایا اور انہیں اپنی کتاب میں درج کر لیا (باقی قریب پانچ لاکھ ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا) ان (۷۲۰۰) میں سے بہت سی احادیث مختلف ابواب میں مکرر نقل ہوئی ہیں۔ اگر ان مکررات کو شمار نہ کیا جائے تو باقی (۲۷۶۲) رہ جاتی ہیں۔ (یا ۲۶۳۰)

۲۔ **امام مسلمؒ**:۔ صحیح مسلم کے جامع امام مسلم بن حجاج تھے جو ایران کے مشہور شہر نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔

۳۔ **ترمذی**:۔ امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی۔ یہ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ سال ولادت ۲۰۹ھ اور وفات ۲۰۹ھ ہے۔

۴۔ **ابوداؤد**: سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں وفات پا گئے۔

۵۔ **ابن ماجہ**: ابوعبداللہ محمد بن زید ابن ماجہ۔ یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ سن پیدائش ۲۰۹ھ اور رحلت کا سن ۲۷۳ھ ہے۔

۶۔ **امام عبدالرحمٰن نسائیؒ**:۔ یہ مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک گاؤں نساء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن وفات ۳۰۳ھ ہے۔

ان ائمہ حدیث کے اس مختصر سے تعارف سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ **یہ سب کے سب ایرانی تھے**۔ ان میں عرب کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ مقام حیرت ہے کہ عربوں میں سے کسی نے بھی اس عظیم کام کا بیڑہ نہ اٹھایا۔ اور احادیث کی جمع و تدوین کا کام غیر عربوں (عجمیوں) کے

ہاتھوں سر انجام پایا۔

۲۔ یہ تمام حضرات تیسری صدی ہجری میں ہوئے۔

۳۔ انہوں نے لاکھوں حدیثیں پائیں لیکن ان میں سے بہت تھوڑی ایسی تھیں جنہیں انہوں نے صحیح قرار دے کر اپنے مجموعوں میں درج کیا۔

۴۔ یہ تمام احادیث، لوگوں نے انہیں زبانی سنائیں۔ ان کا کوئی تحریری ریکارڈ اس سے پہلے کا موجود نہیں تھا۔

۵۔ ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن کا انتخاب کیا، وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلہ کا نتیجہ تھا۔ ان احادیث کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس خدا کی سند تھی (یعنی خدا نے انہیں بذریعہ وحی نہیں بتایا تھا کہ فلاں حدیث صحیح ہے، اسے رکھ لو اور فلاں غلط ہے اسے مسترد کر دو) ۔ نہ ہی اس کی کوئی سند رسول اللہؐ نے عطا فرمائی تھی (کہ تم نے جن احادیث کا انتخاب کیا ہے وہ فی الحقیقت میرے اقوال ہیں) ۔ نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ تھا جس سے انہوں نے ان احادیث کا انتخاب کر لیا ہو۔ لوگوں کی زبانی باتیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنی فراست کے مطابق، صحیح تصور کر کے اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا تھا۔

اب آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی انفرادی کوششوں کے نتیجے کے متعلق کسی طرح بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یقینی طور پر رسول اللہؐ کے ارشادات ہیں؟ پھر اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ اس دو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں، جو باتیں لوگوں کی زبانی آگے منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ رسول اللہؐ کے الفاظ تھے جو اسی طرح باپ سے بیٹے یا استاد سے شاگرد نے سن کر حفظ کر لئے تھے۔ ان باتوں کو ہر راوی اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)

کتنی حدیثوں کو ردّ کر دیا

ضمناً، یہ بھی دیکھئے کہ ان حضرات کو کس قدر احادیث ملیں اور ان میں سے انہوں نے کتنی احادیث کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں داخل کیا:

۱۔ امام بخاری۔ چھ لاکھ میں سے مکررات نکال کر صرف ۲۷۶۲

۲۔ امام مسلم۔ تین لاکھ میں سے صرف ۴۳۴۸

۳۔ ترمذی۔ تین لاکھ میں سے صرف ۳۱۱۵

۴۔ ابو داؤد۔ پانچ لاکھ میں سے صرف ۴۸۰۰

۵۔ ابن ماجہ۔ چار لاکھ میں سے صرف　　　۴۰۰۰

۶۔ نسائی۔ دو لاکھ میں سے　　　۴۳۲۱

ظاہر ہے کہ جب رد و قبول کا مدار جامع احادیث کی ذاتی بصیرت ہو، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان لاکھوں کے انبار میں جنہیں ان حضرات نے مسترد قرار دے دیا تھا، کتنی صحیح حدیثیں بھی ضائع ہو گئی ہوں گی۔ باقی رہا یہ کہ جن احادیث کا ان حضرات نے انتخاب کیا، ان میں کتنی حدیثیں آگئی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی حضور نبی اکرمؐ کے اقوال یا افعال نہیں قرار دیا جا سکتا اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ جمع احادیث کی یہ سب کوششیں ان حضرات کی انفرادی تھیں جنہیں خدا اور رسولؐ کی سند حاصل نہیں تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر آپ خیال فرمایئے کہ کیا دین بھی ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ اور نبی اکرمؐ یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ امام بخاری اور دیگر حضرات نے اُن باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اُس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی تھیں۔ اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو "دین کا آدھا حصہ" (معاذ اللہ) بالکل کھو چکا تھا[1]۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کا اعلان قرآن کریم میں بالتصریح فرمائے اور وہ رسول گرامیؐ جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسول نے نہ آنا ہو، وہ دین کے ایک ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے؟ ایسا تصوّر میں بھی نہیں آ سکتا۔

یہ ہے احادیث کی کیفیت اور اُن کے جمع کرنے کی تاریخ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ان احادیث کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہا جاتا کہ یہ لفظاً لفظاً حضورؐ کے ارشادات ہیں۔ ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ "اقوال منسوب الی الرسولؐ" ہیں۔ یعنی جس زمانے میں انہیں جمع کیا گیا تھا، اُس زمانے میں لوگوں میں عام طور پر مشہور تھا کہ فلاں قول رسول اللہؐ کا ہے۔ چنانچہ آج بھی جب کوئی حدیث درج کی جاتی ہے، اُسے اس طرح لکھا جاتا ہے:
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ..... (رسول اللہؐ نے فرمایا)، اور آخر میں لکھا جاتا ہے: "اَوْ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ" (یوں یا جس طرح بھی رسول اللہؐ نے فرمایا ہو) یعنی کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ رسول اللہؐ

---

[1] "آدھا حصہ" ہی نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین کا ۹/۱۰ حصہ احادیث میں ہے اور صرف ۱/۱۰ حصہ قرآن میں۔

نے ضمنی طور پر ایسا ہی فرمایا تھا۔

علاوہ اس کے کہ احادیث ظنی اور قیاسی ہیں، کہ ان میں بے حد اختلاف ہے ____ احادیث کی مختلف کتابوں

احادیث میں اختلافات

میں ہی نہیں، ایک ہی کتاب میں متعدد احادیث ایک دوسرے کے خلاف ملتی ہیں۔ مسلمانوں میں جس قدر فرقے ہیں، ان سب کی بنیاد احادیث پر ہے کوئی کسی حدیث کا پیرو ہے، کوئی کسی کا۔ اور چونکہ ہر فرقہ اطاعتِ رسول اللہؐ کا مدعی ہے؛ اس لئے وہ اپنے مسلک میں ذراسی تبدیلی بھی جائز نہیں سمجھتا کیونکہ ایسا کرنا اُس کے نزدیک معصیتِ رسولؐ کے مُرادف ہوگا۔ احادیث کے متعلق ان حضرات کے عقائد کیا ہیں، یہ بھی غور سے سمجھنے کی بات ہے۔ جمعیت اہلِ حدیث، پاکستان کے سابق صدر، مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے ایک رسالہ شائع کیا تھا ____ "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث"۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

احادیث کے متعلق عقیدہ

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا، ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا...... جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مراوف (صفحہ ۴۸)

یعنی جو احادیث فرقۂ اہلِ حدیث کے نزدیک صحیح ہیں اُن میں سے کسی ایک حدیث کا انکار (یعنی یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ کی حدیث نہیں ہے) کفر ہے اور ایسا کہنے والا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک بخاری اور مسلم، صحیحین ہیں اس لئے ان کی کسی حدیث کا انکار کفر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> بخاری اور مسلم کی احادیث پر اُمت متفق ہے...... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (صفحہ ۵۵)

"اُمت" سے مراد ہے فرقہ اہلِ حدیث۔ کیونکہ (اوروں اور) حنفی حضرات (جو اُمت کی اکثریت کا فرقہ ہے) بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث کو صحیح نہیں مانتے۔

ان احادیث کا انکار کفر کیوں ہے؟ اس کے متعلق مولانا اسمٰعیل مرحوم فرماتے ہیں۔

حدیث بھی وحی ہے

> جبریل، قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (صفحہ ۶۰)

یعنی قرآن اور حدیث دونوں وحی خداوندی ہیں اور دونوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ اس کے لئے ایک روایت وضع کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر قرآن بھی نازل ہوتا ہے اور مثلہ، معہٗ اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز (حدیث بھی) پھر ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحیٔ جلی (قرآن) اور

وحی کی دو قسمیں

وحی خفی (حدیث)۔ وحیٔ جلی کو وحیٔ متلو بھی کہتے ہیں (یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور وحیٔ خفی کو وحیٔ غیر متلو (یعنی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) واضح رہے کہ وحی کی ان دو قسموں کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ حتیٰ کہ حدیث کے اولین لٹریچر میں بھی اس اصطلاح کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں — ایک شب کتب (جو لکھی جائے) اور دوسری قسم شب علفہ (جو لکھی نہ جائے، روایتہً آگے منتقل ہو) ان حضرات نے اس عقیدہ کو یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا، اور اسے عین دین بنا کر پیش کر دیا۔ ہم اس مقام پر اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ عقیدہ کس طرح قرآن کریم کی ضد ہے اور اس سے کس طرح دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ ہم صرف پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر حدیث بھی قرآن کے ساتھ قرآن کی "مثل" خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی تھی تو وحی کی حفاظت کا ذمہ تو خود خدا نے لیا تھا۔ اس وحی (یعنی حدیث) کو خدا نے محفوظ کیوں نہ رکھا (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اسے نہ پہلے رسول اللہؐ نے محفوظ کر کے امت کو دیا نہ خلفائے راشدینؓ نے اسے منضبط اور محفوظ کیا۔ نہ صحابہؓ میں سے کوئی اور اسے ضبط تحریر میں لایا۔ جس نے اپنے طور پر کچھ لکھا تھا اسے بھی جلا، یا جلوا دیا۔ اگر حدیث اور قرآن دونوں وحی تھے تو وحی کے ایک حصہ (قرآن) کی حفاظت کا وہ اہتمام اور اس کے دوسرے حصہ (حدیث) سے یہ بے اعتنائی بلکہ مخالفت؟ کیا یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں آسکتی ہے؟

حدیثیں کیوں نہ لکھی گئیں

ضمناً اس اعتراض کا جواب بھی سن لیجئے کہ حدیث اگر وحی تھی تو اسے قرآن کے اندر شامل کیوں نہ کر دیا گیا۔ مودودی صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اگر ایسا کر دیا جاتا تو۔

اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۲۳۶)

یعنی چونکہ اس طرح قرآن کی ضخامت بہت بڑھ جاتی اس لئے، اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وحی کے اس حصہ کو قرآن میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ بہت اچھا۔ قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کے خدشہ کی وجہ سے اسے قرآن میں شامل نہ کیا تو اسے ایک علیحدہ جلد میں کیوں نہ لکھ لیا گیا۔ تو اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ

اُس وقت لکھنے پڑھنے والے کم تھے اور سامانِ کتابت اور بھی زیادہ کمیاب تھا۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مارچ ۱۹۵۴ء)

یہ جواب مودودی صاحب کا ہے۔ لیکن حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر حمیداللہ صاحب (جو اب پیرس میں مقیم ہیں) اس کی وجہ کچھ اور بتاتے ہیں وہ اپنے ایک مقالہ میں (جو کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی رسالہ الاسلام کی یکم و پندرہ جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں۔

نبی اکرمؐ بہ حیثیت انسان اپنے افعال میں محتاط اور (MODEST) واقعہ ہوئے تھے۔ بہ حیثیت رسول خداؐ انہوں نے اس امر کے لئے ہر ممکن اور ضروری اقدامات کر لئے تھے کہ خدا کا پیغام، یعنی قرآن، نہ صرف لوگوں تک پہنچا دیا جائے بلکہ اسے محفوظ بھی کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنے اقوال کی حفاظت کے لئے بھی اس قسم کے اقدامات کرتے تو بعض لوگ اسے انانیت پر محمول کرتے۔ اس وجہ سے حدیث کی کہانی قرآن سے مختلف ہے۔

(طلوع اسلام۔ اپریل ۵۹۔ ص ۶۵)

یہ ہے اُس "وحی" کی کہانی جو قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل قرار دی جاتی ہے۔ جسے جبریل اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کریم کو اور جس کے انکار سے اسی طرح کفر لازم آتا ہے جس طرح قرآن کے انکار سے۔ یا للعجب۔

حدیث، قرآن سے اونچی ہے

یہاں تک تو ہم نے دیکھا ہے کہ اتنا ہی کہا جا رہا ہے کہ حدیث، قرآن کی مثل ہے۔ یعنی دونوں ہم پایہ ہیں۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھئے۔ امام اوزاعی کا قول ہے کہ

قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں[1]

اور، ایک اور امام حدیث، یحییٰ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ

حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں[1]

یعنی اگر قرآن اور حدیث باہمد گر متعارض ہوں تو جو فیصلہ حدیث دے اُسے قبول کرنا چاہیئے نہ کہ اُس فیصلہ کو جو قرآن دے۔

---

[1] مختصر جامع بیان العلم۔ ص ۲۲۳

حدیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے

اتنا ہی نہیں، ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ کرسکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم اپنے کتابچہ "فتنۂ انکارِ حدیث" میں لکھتے ہیں۔

نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے.... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ۔ (۲/۱۸۰) "تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کردیا اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۸۵)

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک أَطِيعُوا اللَّهَ سے مراد ہے قرآن کی اطاعت اور أَطِيعُوا الرَّسُولَ کی عملی شکل ہے احادیث کی اطاعت۔ لیکن جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اطاعت کے لئے قرآن کا نام محض تبرکاً لیا جاتا ہے۔ اسلام تمام کا تمام انہی احادیث میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

حدیث کا مقام بڑا نازک ہے۔ ایسا نازک کہ ؎ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا۔ اس کی نزاکت کا اندازہ آپ اس سے لگایئے کہ جب کسی بات کے متعلق کہہ دیا جائے کہ اس کی بابت رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہے تو کس کی جرأت ہے کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ وہ اگر یہ بھی کہے کہ یہ بات قرآن کے خلاف ہے، تو جواب ملے گا کہ رسول اللہؐ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے یا تم زیادہ سمجھتے ہو؟ حالانکہ وہ رسول اللہؐ کے کسی ارشادِ گرامی پر (معاذ اللہ) اعتراض نہیں کر رہا۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ جسے آپ رسول اللہؐ کا قول کہہ رہے ہیں، وہ حضورؐ کا قول ہو نہیں سکتا کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا۔ لیکن اس کے خلاف عوام کے جذبات اس قدر بھڑکا دیئے جاتے ہیں کہ اس بیّن سے فرق کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔

میں اس مقام پر اپنے دل کے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ اس حقیقت کو نوکِ قلم پر لانے کی جرأت کروں گا کہ جب تک احادیث کے مجموعوں کے متعلق وہ عقیدہ رہے گا، جو پہلے درج کیا جاچکا ہے، امت قرآن کی طرف کبھی نہیں آسکتی۔ اور جب تک یہ قرآن کی طرف نہیں آئے گی، نہ اس کے اختلافات دور ہوں گے نہ فرقہ پرستی ختم ہوگی، اور نہ انتشار کا خاتمہ ہوگا۔ یعنی نہ امت میں وحدت پیدا ہوگی نہ اسلامی نظام قائم ہوسکے گا، نہ اسلامی

مملکت وجود میں آسکے گی۔ اسلامی مملکت کی بنیادی شرط ساری مملکت میں ایک ضابطۂ قوانین کا نفاذ ہے۔ لیکن مروّجہ احادیث کی موجودگی میں اس قسم کا ضابطہ مرتب ہونا ناممکن ہے۔ مملکتِ پاکستان میں قانون سازی کی سعیٔ ناکام اس کی زندہ شہادت ہے۔

عملِ تطہیر اسلامی نظام کے احیاء اور امت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ احادیث کے مجموعوں کو قرآن مجید کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو روایت قرآن کے خلاف ہو، اسے یہ کہکر مسترد کر دیا جائے کہ یہ قول یا عمل رسول اللہؐ کا ہو نہیں سکتا۔ یہ انکارِ حدیث نہیں ہوگا، عملِ تطہیر ہوگا تاکہ دامنِ ناموسِ رسالتؐ ان دھبوں سے پاک اور صاف ہو جائے جنہیں غلطی سے حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

یہی میری عمر بھر کی پکار ہے، جس کی میں نے سرا ٹھکنی ہے۔

وفا خطا تھی، خطائیں نے زندگی بھر کی اب اس سے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی!

باقی رہا اطاعت کا عملی مفہوم، سو وہ اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہی سمجھ میں آسکے گا، جس میں قولِ فیصل، خدا کی کتاب ہوگا۔

اب آگے چلئے۔ آیت (۴/۵۹) میں اسلامی نظام کا مثبت پہلو سامنے لایا گیا تھا۔ یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت بوساطتِ نظامِ اسلامی۔ اب اس کا منفی پہلو سامنے آتا ہے۔ تاکہ لَآ اِلٰـهَ — اور اِلَّا اللّٰهُ کے تقابل سے حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ فرمایا:

۴/۶۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۞ (۴/۶۰)

غیر اللہ کی ملوکیت یہ تو سچے مومنین کا شیوہ ہے۔ ان کے برعکس، ان لوگوں کی حالت قابلِ غور ہے جن کا دعویٰ یہ ہے ——— یعنی وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پر اور کتبِ سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے انسانوں کے خودساختہ قوانین کی رو سے کرائیں۔ حالانکہ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ہر غیر خدائی قانون سے انکار کر دیا جائے۔ (۲/۲۵۶)

ان کی یہ روش اس لئے ہے کہ یہ، قانونِ خداوندی کے اتباع کے بجائے، اپنے مفاد پرستانہ جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ چیز انہیں راہِ راست سے بھٹکا کر کہیں کا کہیں لے جاتی ہے۔

طاغوت سے فیصلے

طاغوت کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ خدا کے سوا جس کسی کی بھی محکومیت اختیار کی جائے، وہ طاغوت ہے، خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو یا افراد کا گروہ (مثلاً کوئی قانون ساز ادارہ جو قرآنی حدود و قیود کے خلاف قوانین وضع کرے۔

اس آیت میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے منکر ہیں، یعنی کافر ہیں، ان کی یہ حالت ہے کہ وہ غیر اللہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں ذکر ان لوگوں کا ہے جو بزعم خویش اپنے آپ کو مومن (ایمان لانے والے) سمجھتے اور کہتے ہیں لیکن عملاً حالت یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کے فیصلوں کے لئے غیر خداوندی گوشوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ کیا یہ کچھ ہمارے متعلق ہی نہیں کہا گیا؟ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صدیوں سے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین و احکام کی اطاعت کرتے چلے آ رہے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی کتاب کے ماننے والے بھی سمجھتے ہیں! قرآن کریم نے کفر اور اسلام کی حدِ امتیاز ہی یہ بتائی ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴)

جو لوگ اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے، انہی کو تو کافر کہا جاتا ہے۔

دوسرے مقام پر اس نے ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت کو آمنے سامنے لا کر بات اور بھی واضح کر دی ہے۔ یعنی اگر کفر بالطاغوت نہیں تو ایمان باللہ بھی نہیں۔ (۲/۲۵۶)

اس طرح کے مدعیانِ ایمان کو وہ منافق قرار دیتا ہے۔

۴/۶۱ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ (۴/۶۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلوں کے لئے خدا کے قانون، اور اسے عملاً نافذ کرنے والے رسول کی طرف آؤ تو، جیسا کہ (اے رسول) تم دیکھتے ہو، یہ لوگ تم سے اعراض برتتے ہیں اور معاملات کے فیصلوں کے لئے تمہاری طرف آنے سے رکتے ہیں — یہ ایمان نہیں، منافقت ہے۔ کفر ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ (۵/۴۴)

یہ منافقت ہے

یہاں پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق انفرادی طور پر فیصلے کرنے کا نام اسلام نہیں۔ اس کے لئے نظامِ خداوندی کی مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

اس مرکز کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ ہزار برس سے ہمارے ہاں یہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنا چاہیئے یا خفی، تراویح کی رکعت بیس ہیں یا آٹھ۔ اقبالؒ کی اصطلاح میں یہ "صلوٰۃ بے امام" ہے جس میں کوئی کھڑا ہوتا ہے، کوئی رکوع میں ہے اور کوئی سجدے میں۔ سب خدا کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں لیکن کسی ایک کی حرکت دوسرے سے نہیں ملتی۔ صحنِ مسجد عجیب انتشار اور انفری کی آماجگاہ ہو رہا ہے۔ یہی حالت، بڑے پیمانے پر "ملت بے امام" کی ہوتی ہے۔

منافقین کے متعلق کہا:

۴/۶۲ فَكَيْفَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿۶۲﴾ (۴/۶۲)

منافقین کی حالت

ذرا سوچو کہ اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی، جب ان پر، ان کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے، مصیبت آئے گی، تو یہ تیرے پاس، خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے اور کہیں گے کہ دوسروں کی طرف رجوع کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ آپس میں میل ملاپ رہے اور حسن کارانہ طور پر زندگی بسر ہو۔ ورنہ ہمارا ایمان بڑا مضبوط ہے۔

یہاں یہ کہہ کر کہ مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ مسئلۂ تقدیر کو حل کر کے رکھ دیا۔ (تقدیر کے متعلق سابقہ جلدوں میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا جا چکا ہے) اس قسم کے لوگوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا فرمایا:

۴/۶۳ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَعْلَمُ ٱللَّهُ مَا فِى قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِىٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا ﴿۶۳﴾ (۴/۶۳)

لیکن خدا خوب جانتا ہے کہ ان کے دل میں کیا ہے اور یہ زبان سے کیا کہتے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں (۴/۶۳) سو تم انہیں اپنی جماعت میں شامل نہ کرو۔ ان سے اعراض برتو۔ البتہ انہیں حق و صداقت کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے رہو، اور اس انداز سے تلقین کرو کہ بات ان کے دل کی گہرائیوں تک اتر جائے ——— حق و صداقت کی زندگی اسی وقت بسر ہو سکتی ہے جب انسان میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔ جب تک دل نہ بدلے، انسان کی روش نہیں بدل سکتی۔ اس وقت ایمان محض ان کی زبان تک ہے۔ ان کے قلب کے اندر جاگزیں نہیں ہوا۔

نظام کے تابع اطاعتِ خداوندی کے تصور سے طرح طرح کے سوالات دل میں ابھرتے ہیں۔ اس میں انسان اور خدا کا تعلق کس قسم کا ہوتا ہے۔ مرکزِ نظامِ خداوندی (رسول) کی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ افراد کا اس مرکز کے ساتھ

کس انداز کا تعلق ہوتا ہے۔ ان سوالات کا جواب بڑے بلیغ انداز میں دیا۔ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (۴/۶۴) ۴/۶۴

مجرم۔ خدا اور رسول کا باہمی تعلق

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سلسلۂ ہدایت محض نظری عقائد اور رسومات کے لئے نہیں آتا۔ نہ ہی دین، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے کہ زبان سے خدا کا اقرار کر لیا اور پھر جس طرح جی چاہا، اپنے اپنے طور پر زندگی بسر کرتے رہے۔ دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جو، سب سے پہلے، خود رسول کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے، اور اس میں، اس کی حیثیت مرکزی اتھارٹی کی ہوتی ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق، اس کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اپنے اپنے طور پر، اپنے اپنے ذہن کے مطابق "خدا کی اطاعت" اطاعتِ خداوندی نہیں کہلا سکتی۔ اس اطاعت کی عملی شکل وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ قوانینِ خداوندی کے ساتھ، رسول کو بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں دیکھو کہ خدا کی اطاعت؛ اور خدا اور بندے کے تعلق کی عملی شکل کیا بنتی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی سے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے، اور اس کے بعد اس پر نادم ہو، تو (خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق کے نظریہ کے ماتحت) وہ اپنے گھر میں بیٹھا، توبہ کرے گا اور خدا سے معافی مانگ لے گا۔ لیکن دین کے نظام میں اس کی شکل مختلف ہو گی۔ اس میں، اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ (اے رسول!) تمہارے پاس آئے اور اپنی لغزش کی سزا سے بچنے کے لئے، قانونِ خداوندی سے حفاظت طلب کرے (اسے معافی مانگنا کہتے ہیں)

یہ معافی تم، (اے رسول!) ذاتی طور پر نہیں دے سکتے۔ اس کی معافی قانونِ خداوندی کی رُو سے ہو گی۔ اس کے لئے تم دیکھو کہ قانونِ خداوندی میں اس معافی کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر گنجائش ہو تم اسے معافی دے دو۔

اس معافی کا حکم اگرچہ تمہاری طرف سے صادر ہو گا، لیکن یہ درحقیقت خدا کی طرف سے معافی ہو گی کیونکہ قانونِ خداوندی میں اس کی گنجائش نہ ہوتی تو تم معافی نہیں دے سکتے تھے۔

فیصلہ قانونِ خداوندی کی رو سے ہو گا

تم نے دیکھا کہ دین کے نظام میں، مجرم۔ رسول اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔ نہ مجرم، براہِ راست خدا سے معافی طلب کر سکتا ہے، نہ خدا اسے براہِ راست معافی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس نظام کی وساطت سے ہوتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے

نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے۔ اور جب یہ نظام اسے معافی دیتا ہے، تو یہ معافی اس نظام کی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے، کیونکہ یہ اس کے قانون کے مطابق ملی تھی۔

مفہوم سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظام یا نظام کے مرکز، یا رسول کی اطاعت بالذات نہیں یعنی یہ اس نظام کے ارباب حل و عقد کی ذاتی اطاعت نہیں۔ اس قسم کی اطاعت کا تو (خدا کے سوا) کسی کو بھی حق حاصل نہیں۔ یہ اطاعت قانونِ خداوندی کی ہے جس کا عملی ذریعہ نظامِ مملکت ہے۔ جج، مقدمہ کا فیصلہ سناتا ہے، تو وہ کوئی اپنا ذاتی حکم نہیں منواتا۔ وہ قانون کی اطاعت کراتا ہے۔ ذاتی طور پر وہ نہ کسی کو سزا دے سکتا ہے، نہ معاف کر سکتا ہے وہ تو خود اس قانون کا پابند ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا خود حضور نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے ان الفاظ میں اعلان کرایا:

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾ (۶/۱۵)

رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں، تو اس کے عذابِ عظیم سے بچ نہیں سکتا۔ میں اس سے خائف ہوں۔

اپنا حکم منوانا تو ایک طرف، اس میں فیصلہ کرنے والے کے جذبات کا بھی کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ ایک اولوالعزم نبیؑ سے کہا گیا:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ (۳۸/۲۶)

اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں صاحبِ اقتدار بنایا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے الحق (قانونِ خداوندی) کے مطابق کرو، اور اسے اپنے جذبات سے متاثر نہ ہونے دو۔ یاد رکھو! یاد رکھو اس باب میں تمہارے جذبات تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔

یہاں تک تو بات تھی فیصلہ کرنے والوں کی۔ اب ان لوگوں کے متعلق ایک بنیادی حقیقت بیان کی جن کے فیصلے نظامِ خداوندی (اسلامی حکومت) کرے گی۔

آج دنیا کی ہر مہذب قوم میں عدالتی نظام قائم ہے، جہاں سے مجرموں کو سزائیں ملتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمام اقوامِ عالم شکوہ سنج (بلکہ نوحہ گر) ہیں کہ جرائم (کم ہونے تو ایک طرف) بڑھتے جا رہے ہیں! اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے بڑے بڑے کمیشن قائم ہوتے ہیں۔ تحقیقین کے مذاکرات ہوتے ہیں۔ کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا بنیادی سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مجرم، اپنے خلاف فیصلہ کو (خواہ

وہ فیصلہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو) اپنے اوپر ظلم اور زیادتی سمجھتا ہے۔ اس سے اس کے دل میں قانون (اور نظامِ عدل) کے خلاف بغاوت کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اور سرکشی پر اُتر آتا ہے اس سے جرائم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مُجرم کے دل میں قانون کا احترام

مُجرم اپنی اصلاح اسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کے دل میں قانون کا احترام ہو، اور عدالت کے متعلق یہ یقین کہ اُس نے اس کے خلاف فیصلہ میں حق و انصاف سے کام لیا ہے۔ اس سے وہ اپنے کردار کا جائزہ لے گا، اور جو زیادتی اُس سے سرزد ہو گئی تھی اس پر نادم ہوگا۔ اس سے اصلاح کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ جُرم و سزا کا بنیادی فلسفہ ہے جسے مطالب الفرقان جلد سوم میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے (صفحہ ۱۷۱۔ آیت ۲/۱۷۹)۔ قرآن کا نظامِ عدل اِن ہر دو شرائط کو پورا کرتا ہے۔ یعنی قانون کا احترام اور قانون نافذ کرنے والوں کے متعلق یہ یقین کہ وہ کبھی ظلم و زیادتی سے کام نہیں لیں گے، ہمیشہ حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

قانون کے احترام کے سلسلہ میں اُس کا پروگرام یہ ہے کہ وہ ضابطۂ قوانینِ خداوندی (قرآنِ عظیم) کو تعلیم کا نصاب بناتا ہے، اور علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے یہ حقیقت متعلمین کے دلوں میں راسخ کرتا ہے کہ اس میں دیئے گئے احکام و قوانین مبنی برحق ہیں اور اِن کی اطاعت سے خود اس کا بھلا ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی سے اُس کا نقصان۔ اس کے ساتھ ہی اُن قوانین کے نافذ کرنے والوں کی سیرت و کردار کھلی کتاب کی شکل میں اُن کے سامنے ہوتی ہے، جس سے وہ اعلیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اُن کا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہوگا۔

دل میں بھی کبیدگی نہیں ہوگی

اس نظامِ عدل کی رُو سے جو فیصلہ کسی کے خلاف ہوگا، اس سے اُس کے دل میں بغاوت تو ایک طرف، کبیدگی تک بھی پیدا نہیں ہوگی اور وہ اسے دل کی انتہائی رضامندی سے قبول کرے گا۔ اس سے وہ اپنی لغزش پر نادم ہوگا اور اصلاح کے لئے کوشاں۔

یہ ہے وہ نظامِ عدل جسے اِن بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

۴/۶۵ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (۴/۶۵)

یہ ہے خدا پر ایمان کا عملی مفہوم۔ لہٰذا، اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا اس پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حَکَم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ

تم صادر کرو، اس کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں (۴/۶۵)۔ دل میں گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کرنے کا اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ فیصلہ کسی مستبد حاکم کا فیصلہ نہیں جسے طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ فیصلہ اس قانون کا ہے جس کی صداقت پر یہ، بطیب خاطر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ اس فیصلہ کو دل کی رضامندی سے تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا ہو تو یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ انہوں نے، اس قانون کو بطیب خاطر قبول نہیں کیا تھا ان کا اس پر ایمان نہیں تھا۔ رسول، قرآن کے مطابق ہی فیصلے کرتا ہے۔ اپنی طرف سے نہیں کرتا (۵/۴۸؛ ۴/۶۰)

اصلاح کی بنیاد تغیر نفس پر ہے

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رُو سے، اصلاح کی بنیاد تغیرِ نفس پر ہے (جسے وہ ایمان کہہ کر پکارتا ہے)۔ اِس تغیرِ نفس کا نتیجہ ہے کہ یہ حقیقت افرادِ معاشرہ کا جزوِ ایمان بن جاتی ہے کہ ـــــ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ط (۴/۱۱۱)

جو کسی کے خلاف ظلم اور زیادتی کرتا ہے، تو وہ درحقیقت خود اپنی ذات کے خلاف ظلم اور زیادتی کرتا ہے۔

اور اس سے ہمیں نیٹشے کا وہ قول یاد آجاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ

جو جرم تم نے میرے خلاف کیا ہے، اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اس سے جو جرم تم نے خود اپنے خلاف کیا ہے، اسے کون معاف کرے گا؟

اسے مجرم خود ہی "معاف" کر سکے گا، یعنی اصلاحِ خویش کے ذریعے۔

آیت (۴/۶۵) کے سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کا تعلق صرف جرائم سے نہیں۔ اس کا اطلاق ہر اختلافی معاملہ پر ہوگا۔ یعنی اسلامی نظام میں ہر اختلافی معاملہ (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کے تصفیہ کے لئے حکومت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور وہاں کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ اس طرح امت میں کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔ اختلاف تو (قرآن کی رُو سے) خدا کا عذاب ہے۔ (۳/۱۰۴)

لیکن اس ضمن میں ابھی ایک اہم سوال باقی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اگر اس فیصلہ کے خلاف کوئی اپنے دل میں گرانی تک بھی محسوس کرے گا، تو اس کا دعویٰ ایمان باطل ہوگا۔ اسے مومن تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور اس پر خود خدا نے شہادت دی ہے کہ اس کا ایمان باقی نہیں رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ایسا شدید جرم کیوں ہے جس سے (خود خدا کی شہادت کے مطابق) ایمان ہی باقی نہیں رہتا؟ بات بالکل واضح ہے۔ ایمان کا نام ہے دل اور دماغ کی

کامل رضامندی کے ساتھ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور میں اس کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں گا۔

اختلافی معاملات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) "ہر اختلافی معاملہ میں خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فیصلہ کو قولِ فیصل تسلیم کرو"۔ کتاب اللہ سے فیصلہ لینے کے لئے رسولؐ کی طرف رجوع کرو، اور رسولؐ سے کہا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔

لہٰذا رسول (یا مرکزِ نظامِ خداوندی) کا فیصلہ درحقیقت قرآن کے حکم کا نفاذ ہوگا۔ اور چونکہ یہ شخص، قرآن پر، قلب و دماغ کی رضامندی سے ایمان لانے کا مدعی ہے، اس لئے اگر قرآن کے کسی فیصلہ کے خلاف اس کے دل میں کبیدگی پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا قرآن پر ایمان نہیں تھا۔ آیت (۴/۶۵) میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ

۱۔ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔ (۵/۴۴) اور

۲۔ جو لوگ قرآن کے فیصلوں (سے سرتابی تو ایک طرف اُن) کے خلاف دل میں گرانی تک بھی محسوس کرتے ہیں، اُن کا دعویٰ ایمان باطل ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

یہ ہے مفہوم قانون کے احترام کا۔ لیکن جن لوگوں کے دل میں قانون کا احترام نہیں ہوتا، ان کا معیار مفاد طلبی ہوتا ہے۔ وہ اگر قانون کی اطاعت میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں تو اُس کی اطاعت کرتے ہیں، اور اگر اس کی خلاف ورزی سے کسی منفعت کی اُمید ہوتی ہے تو اس سے فرار کی راہیں تلاش اور بہانے تراشتے ہیں۔

۴/۶۶-۶۸ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ﴿۶۶﴾ وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۶۷﴾ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ○ (۴/۶۶-۶۸)

مفاد پرستی

جن لوگوں کی عام معاملات میں یہ حالت ہے کہ غیر خدائی قانون میں ذرا زیادہ فائدہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑے دوڑے جاتے ہیں، اگر کہیں ایسا وقت آجائے کہ نظامِ خداوندی کی خاطر انہیں جان دینی پڑے یا گھر بار چھوڑنا پڑے، تو ان میں بہت تھوڑے ایسے نکلیں گے جو ان احکام کی

تعمیل کریں۔ حالانکہ اگر یہ اپنی زندگی کو اس نہج پہ ڈال لیں جس کی انہیں تلقین کی جاتی ہے، تو یہ ان کے لئے ہزار خیر و برکت کا موجب ہو، اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ثبات و استقامت کا باعث بنے۔

اگر یہ ایسا کر لیتے تو انہیں، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق، بہت بڑا معاوضہ ملتا اور یہ اُس توازن بدوش سیدھی راہ پر چلتے رہتے جو انہیں زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی۔

"صراطِ مستقیم" کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۴۷-۴۴-آیت ۱/۵) اس راستے پر چلنے والوں کو منعم علیہ بتایا گیا تھا۔ اور ان انعاماتِ خداوندی کی تفصیل بھی وہیں بتا دی گئی تھی (صفحہ ۵۳-۴۸) یہاں ان سعادت مند افراد کی نشان دہی کی گئی ہے جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ فرمایا:

۴/۶۹ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (۴/۶۹)

یہ اُن لوگوں کی راہ ہے جو انعاماتِ خداوندی سے نوازے جاتے ہیں (۱/۴) ——— انبیاء۔ صدیق۔ شہداء اور صالحین کی راہ ——— انبیاء جنہیں یہ قانون من جانب اللہ ملتا ہے۔ صدیق، جو اس قانون کے دعاوی کو عملاً سچ کر دکھاتے ہیں۔ شہداء، جو اس نظام کے بقاء و استحکام کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور صالحین، وہ افرادِ معاشرہ جن کی صلاحیتیں اس نظام کے مطابق نشوونما پاتی ہیں اور وہ ان صلاحیتوں کو اس نظام کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرتے ہیں۔

منعم علیہ حضرات کی رفاقت

لہٰذا، جو شخص بھی خدا اور رسول کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جس طرح اوپر کہا گیا ہے، وہ، مذکورہ بالا جماعتوں کا رفیقِ سفر بن جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سفرِ زندگی میں ان سے بہتر رفیق اور کون ہو سکتے ہیں۔

انبیاء۔ صدیق۔ شہداء۔ صالحین کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آ چکا ہے۔ اس لئے اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ (دیکھئے انڈکس) آیت کا مفہوم واضح ہے۔ لیکن ایک نکتہ ایسا ہے جس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والوں کو انبیاء۔ صدیق۔ شہداء اور صالحین کی معیت نصیب ہوگی۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے دعوئ نبوت کے لئے اس آیت کو بھی بطور دلیل پیش کیا کرتے تھے، اور

مرزا غلام احمد کا بے محل دعویٰ

وہ یہ کہ اگر کوئی شخص خدا اور رسول کی اطاعت سے صالح، صدیق، شہید بن سکتا ہے تو وہ نبی بھی بن سکتا ہے۔ یہ دلیل اس قدر بودی

اور قرآن کے خلاف ہے کہ اس کی تردید کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت نہیں۔ نبوّت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتا دیا کہ وہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملا کرتی تھی۔ اس میں کسی کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا (دیکھئے انڈکس میں عنوان وحی)۔ لہٰذا، نہ کوئی شخص اپنے کسب و ہنر سے نبی بن سکتا تھا، نہ کوئی کسی کو نبی بنا سکتا تھا۔

پھر اُس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ــــ یعنی انہیں اِن حضرات کی معیت نصیب ہوگی۔ اور آیت کے آخری ٹکڑے نے معیت کے معانی یہ کہکر واضح کر دیئے: وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا "یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں"۔ بالفاظِ دیگر انہیں ان حضرات کی رفاقت میسّر آئے گی۔ اگر انبیاءؑ کی معیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ خود نبی بن جائیں گے، تو پھر تمام صحابہ کرامؓ کو نبی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں ہے: مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (۴۸/۲۹)

اس میں وَالَّذِينَ مَعَهُ سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں۔ اگر نبی کی معیت سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے تھے، تو اس آیت کی رُو سے جملہ صحابہؓ کو نبی ماننا پڑے گا۔

ایک قدم اور آگے۔ اگر کسی کی معیت سے انسان وہی کچھ بن سکتا ہے، تو قرآنِ مجید میں بیشتر مقامات میں ہے: إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ وغیرہ۔ تو اس دلیل کی رُو سے، صابرین وغیرہ کو (معاذ اللہ) خدا تسلیم کرنا پڑے گا۔

ان تصریحات کی رُو سے واضح ہے کہ انسان جو کچھ اپنی محنت سے بن سکتا ہے، وہ کچھ بننے کا امکان ہر ایک کے لیے ہے۔ لیکن جو کچھ انسان خدا کی طرف سے وہبی طور پر بنتا ہے، وہ کچھ اپنی سعی و کاوش سے نہیں بن سکتا۔ صدیق اور شہداء بن جانے کے متعلق (۵۷/۱۹) میں تصریح موجود ہے۔ اور صالحین، مومنین کی لازمی خصوصیت ہے۔ خود نبی بن جانے یا کسی کو نبی بنا دینے کا تصوّر قرآن سے نہیں ملتا۔

لیکن مرزا غلام احمد اور اُن کے دعاوی کی بحث اب داستانِ پارینہ بن چکی ہے، کیونکہ پاکستان میں اُن کے متبعین (قادیانی اور لاہوری، دونوں کو) دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا گیا ہے۔ نظری طور پر جو حضرات اس بحث سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" کا مطالعہ فرمالیں۔

اس کے بعد ان انعاماتِ خداوندی کے متعلق کہا کہ

۴/۷۰ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ۝ (۴/۷۰)

ان حضرات کی معیت اور رفاقت اللہ کی عنایت اور فضل ہے جسے ایمان و اعمالِ صالح کی رُو سے حاصل کیا جا سکتا ہے

یہ یونہی نہیں کہا جا رہا۔ علم خداوندی کی رو سے کہا جا رہا ہے، جس کے بعد کسی اور سند اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی اسے یاد رکھو کہ خدا اور رسول کی اس طرح اطاعت سے، کوئی شخص نبی نہیں بن سکتا۔ وہ صرف صدیق و شہید و صالح بن سکتا ہے (اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ ۵۷/۱۹)

لیکن ان حضرات کی معیت اور نوازشاتِ خداوندوں سے تمتع، تفریح کے لئے نہیں۔ اس سے بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اُن ذمہ داریوں کا ملخص یہ ہے کہ

۴/۷۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ (۴/۷۱)

اس نظام کے استحکام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ تم اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان، ہر وقت تیار رکھو۔ اور عندالضرورت جنگ کے لئے نکلو ــــ الگ الگ ٹولیوں میں، یا سب کے سب اکٹھے ـ جیسا بھی حالات کا تقاضا ہو۔

اور یہ کوئی نیا پروگرام نہیں۔ ہر نبی اس مقصدِ عظیم کو لے کر آتا رہا، اور ربانیوں کی جماعت اُس کی معیت میں میدانِ کارزار میں سرفروشانہ انداز سے لڑتی رہی۔ (۳/۱۴۵) اور مفاد پرست بھی اس طرح نقاب پوشانہ اُن کے ہمرکاب رہے:

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ
۴/۷۲-۷۳ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ
لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ
فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۷۲-۷۳)

منافقین کی حالت

اور (ہم جانتے ہیں) کہ تم میں اِکّا دُکّا ایسا بھی ہے جو جنگ کی آواز پر (مختلف بہانوں سے) خود بھی سستی کر کے پیچھے رہ جاتا ہے اور دوسروں کو بھی سُست بنا دیتا ہے۔ پھر اگر ایسا ہو کہ اس جنگ میں تمہیں نقصان پہنچے تو کہتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے اور اس کا احسان کہ میں ان کے ساتھ نہ گیا، ورنہ مجھ پر بھی یہ مصیبت آجاتی۔

اور اگر تمہیں بفضلِ خدا، کامیابی نصیب ہو تو کہتا ہے کہ اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تاکہ ان کامرانیوں میں، میرا بھی برابر کا حصّہ ہوتا۔

یہ اس قسم کی باتیں یوں کرتا ہے گویا، اس میں اور تم میں کبھی کوئی تعلق اور رابطہ ہی نہ تھا۔ (حالانکہ یہ تمہاری جماعت کا فرد ہونے کا مدعی ہے!)

اِن کے برعکس جماعتِ مومنین ہے:

۱۰/۴ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا ﴿۷۴﴾ (۱۰/۴)

یہ درحقیقت وہ لوگ ہیں جو مفادِ عاجلہ کو مستقبل کے مفاد پر، اور اپنی طبیعی زندگی کو آخرت کی حیاتِ جاوداں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جماعتِ مومنین ہے کہ جب دنیاوی زندگی کے کسی تقاضے اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہوتا ہے، تو وہ اوّل الذکر کو قربان کر دیتے ہیں اور مستقل قدر کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو، جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، چاہیئے کہ وہ (بلا کسی حیل و حجت کے) اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اس میں دونوں طرح فائدہ ہے۔ اگر انہیں کامیابی ہو جائے تو بھی اجرِ عظیم اور میدانِ جنگ میں مارے جائیں، تو بھی صلۂ جزیل اس سے واضح ہے کہ غازی اور شہید دونوں یکساں مدارج کے مستحق ہیں۔

اِس کے بعد وہ آیۂ جلیلہ سامنے آتی ہے جس میں ایک ایسی حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے جس کی مثال دُنیا کے مذاہب یا عالمِ دانش و بینش میں کہیں نہیں ملتی۔

خدا نے انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آشنا کیا

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ تم ایک فقرہ میں بتاؤ کہ قرآن نے وہ کون سی ایسی حقیقت بیان کی ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی اور جو عالمِ انسانیت میں عظیم انقلاب آفرین ہے، تو میں بلا تامل جواب دوں گا کہ قرآن نے اِنسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کیا ہے۔ یہی اس کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور اس کے پیغام کی انقلاب آفرینی ہے۔

آپ تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں انسان کی جو حالت تھی، اقبالؒ نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

بُود انسان، در جہاں انساں پرست　　ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش　　بندھا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر　　بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دُوں شدہ　　نغمہ ہا اندر نَئے او خوں شدہ

احسن تقویم — قرآنِ کریم نے سب سے پہلے تخلیقِ انسان کے متعلق کہا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيٓ اَحْسَنِ

تَقْوِيْمٍ ○ (۹۵/۴) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت ــــ تقویم ــــ میں پیدا کیا" "اَحْسَنْ" حُسن سے ہے اور اس (احسن) سے اگلا درجہ کوئی ہو نہیں سکتا۔ پھر اسے "مسجود ملائک" قرار دیا۔ (۲/۳۴)۔

واجب التکریم

اسے واجب التکریم بنایا؛ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "اور اسے اپنی بیشتر مخلوق سے افضل قرار دیا: وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○ ؏له (۱۷/۷۰)

یہ خصوصیات ہی کچھ کم باعثِ شرف و اجتباء نہیں لیکن ان سب سے اُوپر ایک ایسی خصوصیت ہے جسے ہم نے بلند ترین مقام اور انقلاب آفرین مقام کہہ کر پکارا ہے۔ اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ خدا نے اسے اپنا رفیق قرار دیا ہے

خدا کا رفیق

لہٰذا قرآنِ کریم کی رو سے انسان اور خدا کا تعلق رفاقت کا ہے۔ فرمائیے؟ اس سے بلند مقام کسی کے تصوّر میں بھی آسکتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم میں مختلف طرق و انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

خدا کا تخلیقی پروگرام کچھ اس انداز کا ہے کہ جس شئے کی تخلیق مقصود ہوتی ہے، اُس کا خاکہ یا پلان (PLAN) عالمِ امر میں مرتب ہوتا ہے (عالمِ امر و خلق کی تفصیل جلد اوّل میں آچکی ہے) اس میں اس شئے کی آخری منزل (یعنی جو کچھ اُس نے آخرالامر بننا ہوتا ہے، اس منزل) تک پہنچنے کی صلاحیت اور اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کے قوانین اور اصول (جنہیں وہ کلمات اللہ کہکر پکارتا ہے) سب متعین کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اِسے عالمِ خلق میں لایا

ارتقائی منازل

جاتا ہے، اور اس کا آغاز نقطۂ اوّلین سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد ہوتے ہیں۔ سورہ السجدہ میں ہے:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (۳۲/۵)

(اللہ تعالیٰ، عالمِ امر میں طے شدہ اسکیم) کا آغاز اُس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی، آہستہ آہستہ بتدریج اُس منزل تک جا پہنچتی ہے جو خدا نے اُس کے لئے متعین

له یہ جو ہمارے ہاں انسان کو "اشرف المخلوق" کہا جاتا ہے، تو یہ صحیح نہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ یہ بیشتر مخلوق سے افضل ہے۔ کیا معلوم کہ اس حدود و فراموش کائنات میں کہاں کہاں اور کس کس قسم کی مخلوق ہے، جن میں سے بعض، انسان سے بھی افضل ہیں۔

کیا تھا۔ اِن ارتقائی مراحل کی مدّت تمہارے حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال، (بلکہ بعض اسکیموں کے سلسلہ میں پچاس پچاس ہزار سال) ہوتی ہے۔ (۳۲/۵)

ماہرین علمِ ارتقاء (EVOLUTION THEORY) بتاتے ہیں کہ اشیائے کائنات ہمیں جس حالت میں آج نظر آتی ہیں انہیں اس منزل تک پہنچنے کے لئے کثیر التعداد مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ ان مراحل میں سے ہر ایک مرحلہ کی میعاد لاکھوں، کروڑوں سال کی تھی۔ اقبالؒ کی حسین وجمیل تشبیہات کے مطابق:

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نسیم شبی
کشاکشِ زم و گرما۔ تب وتراش و خراش زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ جلبی
مقامِ پست و شکست وفشار و سوز و کشید میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

اِس میں اصولِ ارتقاء یہ مضمر ہے کہ ہر مرحلہ سے گزرنے کے بعد، وہ شے پہلے سے بہتر اور برتر ہو جاتی ہے۔

مغان کہ دانۂ انگور۔آب می سازند ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

(بانگِ درا ——— ارمغان)

اور یہ سلسلۂ ارتقاء بدستور جاری وساری ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

قرآن اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ان اشیاء کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو یہ خدا کے قانونِ ارتقاء کے مطابق نہایت طویل المیعاد عرصوں میں آگے بڑھتی اور بلند ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اس طریقِ عمل (PROCESS) کے ساتھ انسان کی رفاقت شامل ہو جائے، تو ہزار ہزار سال کے وہی مراحل، انسانی حساب وشمار سے دنوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ سورہ فاطر میں اس عظیم حقیقت کو اِن معجزانہ الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ (۳۵/۱۰) "خدا کے مقرر کردہ خوشگوار نظریاتِ حیات، جن میں بار آوری کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے، اپنے زورِ دروں سے منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے اور اٹھتے چلے جاتے ہیں "۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ط (۳۵/۱۰) " لیکن اگر انسان کے اعمالِ صالح اُن کے دست و بازو بن جائیں، تو وہ نہایت تیزی سے اُوپر کو اُٹھ جاتے اور اپنے نتائج برآمد کر دیتے ہیں "۔ خارجی کائنات میں انسان کی مشاطگی سے گیسوئے کائنات کس طرح سنورتے اور اس حُسن میں کس قدر نکھار پیدا کرتے ہیں، اقبالؒ نے اسے (پیامِ مشرق میں) اپنے مخصوص انداز میں " محاربہ مابین خدا اور انسان" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ (گویا) انسان کے تخریبی کارناموں پر اسے مطعون کرتے ہوئے اُس سے کہتے ہیں:

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم　　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم　　　تو شمشیر و تیغ و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

اس کے جواب میں انسان کہتا ہے کہ (حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو) عرض کروں کہ

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم!　　　سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(پیامِ مشرق صفحہ ۱۳۲)

بالِ جبریل میں انداز اور بھی شوخ ہو گیا ہے جہاں کہا کہ حضور!

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن　　　ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے　　　وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں　　　اُنہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لئے "کلم الطیب" خوشگوار، بار آور، نظریاتِ حیات مقرر کئے ہیں، اسی طرح انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے لئے بھی اس قسم کے قوانین اور نظریات متعین کئے ہیں۔ ان نظریات اور اصولِ حیات کو اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ثمر بار تو ضرور ہوتے ہیں، لیکن اس کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسان کی رفاقت شامل ہو جائے تو وہی نتائج چند دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ نظامِ خداوندی (قرآنی نظام ملکت) کا قیام اسی رفاقت کا دوسرا نام ہے۔ زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے انسان جن زنجیروں میں جکڑا چلا آتا تھا، خدا کے نظریاتِ زندگی نے انہیں توڑنا تو تھا، لیکن اس کے لئے بڑا لمبا عرصہ درکار تھا۔ ظہورِ نبوی سے جب انسانی اعمالِ صالح ان نظریات کے دست و بازو بنے تو یہ زنجیریں دنوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ اس لئے بعثتِ نبویؐ کا مقصد یہ بتایا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) "وہ (رسولؐ) ان بوجھل سلوں کو

اُتار پھینکے گا جن کے پیچھے انسانیت دبی چلی آرہی تھی۔ اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔" اقامتِ نظامِ خداوندی کا پورا پروگرام، اِسی مقصد کا حصول تھا۔ یہ خدا اور بندے کی رفاقت کا پروگرام تھا۔ جماعتِ مومنین کا اپنے مال اور جان کو خدا کے ہاتھ بیچ دینا (۹/۱۱۱) اس رفاقت کا عملی ثبوت تھا۔ یعنی اِس سے پہلے جو مقاصد، براہِ راست خدا کے ہاتھوں بروئے کار آتے تھے، وہ اب انسانی دست و بازو کی وساطت سے حاصل ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں اس "رفاقت" کی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن اس کی بیّن ترین مثال اس آیت میں سامنے لائی گئی ہے جس کے مفہوم تک پہنچنے کے لئے یہ تمہید پیش کی گئی ہے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کی بیشتر آبادی (اگرچہ وہ ہنوز تھی معدودسی) مدینہ چلی گئی، اور وہاں اُنہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی جس کی وجہ سے وہ ہر انسانی استبداد سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن ان میں سے کچھ آبادی مکہ میں رہ گئی اور قریش نے اُنہیں اپنے بے پناہ ستم و استبداد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان مجبور و مقہور، بے دست و پا مظلوموں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے خدا سے فریاد کرتے کہ وہ انہیں ان ظالموں کے پنجۂ ستم سے رہائی دلائے۔ خدا قادرِ مطلق ہے اس کے

اہلِ مدینہ کی پکار

لئے کیا مشکل تھا کہ وہ ان مظلوموں کی دادرسی براہِ راست کرکے، اُنہیں وہاں سے نکال لے جاتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے کیا کیا، اسے غور سے سنئے۔ اُس نے مدینہ کی جماعتِ مومنین سے کہا:

۴/۷۵ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا
وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ○ (۴/۷۵)

"اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ تم سُن نہیں رہے کہ مکہ کے کمزور و ناتوان مرد، عورتیں، بچے تمہیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم اور سفاک ہیں۔ اور ہمارے لئے اپنی جناب سے کوئی محافظ نگران، کوئی سرپرست اور مددگار بھیج دے۔"

خدا کا جواب

غور کیجئے! مکہ والے پکار تو رہے ہیں خدا کو، اور خدا اہلِ مدینہ سے کہہ رہا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ مظلوم تمہیں کس درد و سوز سے پکار رہے ہیں۔ تم اُن کی امداد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں!

صدرِ اول کے مومنین کی جس قدر لڑائیاں تھیں وہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے تھیں جسے خدا نے، اپنے رفیق ہونے کی جہت سے، اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہاں بات تو اہلِ مکہ کی نسبت سے کی گئی ہے، لیکن یہ حکم عام ہے۔

مظلوم کوئی بھی ہو، اور اس کی آواز کہیں سے بھی کیوں نہ اٹھے، اسلامی نظام کا فریضہ ہے کہ وہ ان مظلوموں کی امداد کے لئے اُٹھے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ صدرِ اوّل کے مجاہدین نے جس قدر لڑائیاں لڑیں، وہ "خدا اور بندے کی اس رفاقت" کا نتیجہ

جنگ بدر میں

تھیں۔ اس حقیقت کو قرآنِ مجید میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی سب سے پہلی جنگ غزوۂ بدر کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اس جنگ میں نظر تو یہی آ رہا تھا کہ تم مخالفین کو قتل کر رہے تھے لیکن: فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ (۸/۱۷) "تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، انہیں

تیر خود خدا چلا رہا تھا

(یوں سمجھو) خود خدا قتل کر رہا تھا"۔ وَمَا رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ (۸/۱۷) "ان کے خلاف تو تیر تو تمہاری کمانوں سے نکل رہے تھے، لیکن درحقیقت وہ تیر خدا خود چلا رہا تھا"۔ یہ تھی رفاقت کی گہرائی۔

غالبؔ نے اس حقیقت کو ایسے عمیق لیکن بےحد دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ میرے نزدیک، نعت کی دنیا میں، اس سے بہتر انداز شاید ہی کہیں اور ملے۔ اس نے کہا ہے کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است　　　اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ است

یہ ٹھیک ہے کہ قضا کے تیر خدا کے ترکش میں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تیر اپنے ٹھکانے پر اسی صورت میں لگتے ہیں، جب وہ محمدؐ کی کمان سے نکلیں۔ خدا کی قضا کے تیر اور محمدؐ کی کمان ——— جب یہ دونوں یک جا ہوں تو پھر باطل کا جگر چھدتا ہے۔

بیعتِ رضوان

ایک قدم آگے بڑھیے۔ کشاکش حدیبیہ میں ایک ایسا نازک مقام آ گیا تھا جب حضورؐ کو جماعتِ مومنین سے، خدا کے ساتھ باندھے ہوئے (جان سپردگی کے) عہد (۹/۱۱۱) کی تجدید کرنی پڑی۔ اُس زمانے کے طریق کے مطابق ایک مجاہد آتا۔ اپنا ہاتھ حضورؐ کے سامنے رکھتا۔ اور حضورؐ اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر اُس عہد کی توثیق فرما دیتے۔ اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ (۴۸/۱۰)

اے رسولؐ! یہ مجاہدین جو تجدیدِ عہد کے لئے تیرے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں، تو یہ معاہدہ تیرے ساتھ نہیں ہوتا، خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ توثیقِ عہد کے لئے جو تُو ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے، تو وہ تیرا ہاتھ نہیں ہوتا۔ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اقبالؒ نے اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں، کارکُشا، کارساز

یہی تھا انسان اور خدا کا باہمی رفاقت کا تعلق جس کی یاد حضور نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس میں یہ کہہ کر تازہ کی تھی کہ بل ھو الرفیق الاعلیٰ۔ اس رفیقِ اعلیٰ کی طرف! حضورؐ نے اس رفاقت کے تعلق میں بھی "خدا کو رفیقِ اعلیٰ" قرار دے کر کیسی عظیم حقیقت کا اظہار فرمایا ہے!

صدرِ اوّل کے بعد

صدرِ اوّل میں خدا اور بندے کی رفاقت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد ہماری بدنصیبی نے اِسے ختم کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد خدا کے حیات بخش نظریات (الکلم الطیب) معطل ہو کر رہ گئے؟ نہیں۔ خدا کے نظریات کبھی معطل نہیں ہوتے۔ انہوں نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ ہم اپنی کوتاہ نگہی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس کے بعد اسلام ایک عضوِ معطل بن گیا تھا — یہی نہیں۔ ہم اس سے بھی زیادہ گہرے فریب میں مبتلا ہیں۔ آجکل اسلام کے سلسلہ میں جو کوششیں عام طور پر ہو رہی ہیں۔ انہیں "احیاءِ اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ احیاءِ اسلام یا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام (معاذ اللہ) مُردہ ہو چکا تھا، ہم اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کس قدر گمراہ کُن ہے یہ تصور! اسلام نام ہے خدا کے متعین فرمودہ نظریاتِ حیات کا جو ابدی اور غیر متغیر ہیں۔ وہ خدائے زندہ کے فرمودہ نظریات ہیں جو زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اب رہا یہ کہ یہ نظریات اس انداز سے اپنے نتائج کیوں نہیں پیدا کر رہے جس انداز سے انہوں نے صدرِ اوّل میں برآمد کئے تھے! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہماری رفاقت نہیں رہی۔ اس وقت وہ کائناتی رفتار سے سبک خرام ہیں۔ ہماری رفاقت اُن کے شاملِ حال ہو جائے تو یہ پھر اُس برق رفتاری سے اپنے نتائج سامنے لے آئیں گے۔

یہ حقیقت کہ یہ نظریات کائناتی رفتار سے عالمِ انسانیت پر اثر انداز ہو رہے ہیں، ہماری خوش فہمی نہیں۔ اس چودہ سو سال کی تاریخِ انسانیت اس کی شاہد ہے۔ میں اس موضوع پر مختلف مقامات پر بڑی کثرت سے لکھ چکا ہوں، اس لئے اِس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں[1]۔ میں اس جگہ صرف چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا جو "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد سے ماخوذ ہیں۔ اس میں، میں نے کہا تھا:

---

[1] ایک پمفلٹ "کیا اسلام ایک چلا ہُوا کارتوس ہے؟" اپنے اختصار کے باوجود بڑا معلومات افزا ہے۔

اسلام ہی آگے چل رہا ہے

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور یہ تصور دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے

ملوکیت

انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اُس وقت ذہن کے لئے یہ تصوّر نامانوس تھا۔ آپ سوچئے کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال میں، ذہن انسانی کا رُخ ملوکیت کی سمت رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ "اسلام قبول کرتا" چلا گیا ہے، اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

غلامی

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرے کا جزءِ لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ۔ اِس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے یہ انقلابی تصوّر دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلافِ انسانیت ہے۔ اُس وقت کے ذہن انسانی کی عام سطح نے اس تصوّر کو ناقابلِ قبول سمجھا۔ لیکن غور کیجئے کہ اس کے بعد زمانے نے اِس تصوّر کو قابلِ قبول سمجھا یا اپنے قدیمی تصوّر کو؟

نسل پرستی

ذہن انسانی کا اُس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر، ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہرِ ذاتی سے ہے نہ کہ انتسابات نسبی سے۔ اُس زمانے نے اِس تصوّر کو اپنے لئے ناآشنا پایا۔ لیکن دیکھئے کہ اُس زمانے کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا؟

شخصیت پرستی

اس زمانہ میں ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ اِس لئے ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ تصوّر ذہن انسانی کے عہدِ طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر متشکل ہوں گی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اُس زمانے نے اس تصوّر کو اپنے لئے ناآشنا پایا، اس لئے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ کیا آج تمہارے زمانہ کا رُخ اس ردکردہ تصوّر کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

سرمایہ پرستی

اُس زمانے میں جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابقِ فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے یہ انقلاب انگیز تصوّر پیش کیا کہ ہر فردِ انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشوونما

ہے، اس لئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا۔ اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا، انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اس زمانے نے اس تصور کو ٹھکرا دیا، لیکن اب سوچئے کہ کیا زمانہ اس ٹھکرائے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب اور بے چین نہیں ہے؟

اس زمانے میں مختلف خاندانوں، قبیلوں، قوموں کا تو تصور تھا، لیکن عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآن کریم نے آکر کہا کہ نوع انسانی ایک عالمگیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل اس طرح ہو سکتی ہے کہ تمام دنیا کا نظامِ حکومت ایک ہو۔ یہ بات اس زمانے کے عام ذہن میں نہ آئی۔ لیکن دیکھئے کہ اس کے بعد دنیا کا رُخ عالمگیر انسانیت کی منزل کی طرف رہا ہے، یا انسانوں کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کی طرف ہے؟ آج دنیا نیشنلزم کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہے؟ اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہیں تو میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں سیاسیات سے متعلق باب ملاحظہ فرمائیں۔ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی نیشنلزم کے بعد مغربی مفکرین نے انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کی طرف رُخ کیا۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ راستہ بھی انہیں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ چنانچہ اب وہ اسے چھوڑ کر، عالمگیر انسانیت (UNIVERSALISM) اور تمام دنیا میں واحد حکومت (ONE WORLD GOVERNMENT) کی طرف آرہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انہیں کوئی بنیاد نہیں ملتی جس پر اس کی عمارت استوار کریں۔ (یہ بنیاد قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی)

نیشنلزم

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ انسانیت کس طرح پکار پکار کر اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

"خدا اور بندے کی رفاقت" کے تصور سے ہی اس اعتراض کا بھی جواب مل جاتا ہے جو آجکل عام طور پر زبانِ زدِ خلائق ہے۔ غلط معاشرہ میں جب مظالم کا شکار انسان دیکھتا ہے کہ اس کے مصائب کا کہیں سے مداوا نہیں ملتا، تو وہ دل کے انتہائی کرب کے ساتھ پکار اُٹھتا ہے کہ خدا کہیں موجود ہے تو وہ ان ظالموں کی کلائی کیوں نہیں مروڑتا؟ اس نے انہیں چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ وہ ہم کمزوروں اور ناتوانوں پر ظلم پر ظلم کرتے چلے جائیں۔

مصائب کا خاتمہ نظامِ خداوندی کے ہاتھوں ہو گا

بر اس لئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانونِ عدل، انسانی نظامِ رفاقت کے ہاتھوں بروئے کار آتا ہے اور آج کی دنیا میں وہ نظامِ رفاقت کہیں موجود نہیں۔ وہ نظام موجود ہو تو مظلوم کو خدا سے دعا کرنے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ اس حقیقت کو حضرت عمرؓ نے نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا تھا جب کہا تھا کہ خدا نے مجھے منصبِ خلافت اس لئے تفویض کیا ہے کہ میں تمہاری دعائیں اس تک نہ پہنچنے دوں۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ تمہاری ہر مشکل کا حل بہم پہنچاؤں اور ہر ضرورت کو پورا کروں۔ اس لئے، اوّل تو تم میں سے کسی کو اپنی کسی مشکل کے حل کے لئے خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اور اگر کسی وجہ سے اسے اس کی ضرورت لاحق ہو جائے تو اس کی ضرورت میں پوری کروں گا اور اس طرح اس کی دعا کو خدا تک پہنچنے سے روک لوں گا۔

یہ ہے خدا اور بندے کی رفاقت سے عالمگیر انسانیت کی مشکلات کا حل۔

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلامی مملکت کو جنگ کس مقصد کے لئے کرنی پڑتی ہے ــــ دُنیا بھر کے مظلوموں کی دادرسی کے لئے ــــ اس کے برعکس، اقوامِ عالم جنگیں اپنے اپنے مفاد کی خاطر لڑتی ہیں۔ اس حقیقت کو اگلی آیت میں بیان کر دیا جب کہا کہ

جنگ کا مقصد

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ (۴/۷۶)

بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور جنگ دو فریقوں میں ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ کون، کس مقصد کے لئے جنگ کرتا ہے۔ ایک جنگ دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لئے ہوتی ہے۔ اسے "اللہ کی راہ میں" جنگ کہا جائے گا۔ دوسری جنگ مظلوموں اور کمزوروں کا گلا گھونٹنے کے لئے ہوتی ہے یہ "طاغوت کی راہ میں" جنگ ہے۔ (طاغوت ہر وہ قوت یا نظام ہے جو قوانینِ حق و صداقت سے سرکشی اختیار کرکے، دنیا میں اپنی من مانی کرے)۔

ایمان والے ہمیشہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ کفار، طاغوت کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ سوائے جماعتِ مومنین! تم ان قوتوں کے خلاف جنگ کرو جن کا مقصد قوانینِ حق و عدل سے سرکشی اختیار کرنا ہے۔

اور اس کا یقین رکھو کہ، یہ لوگ تمہارے خلاف کتنی ہی خفیہ تدبیریں اور سازشیں کیوں نہ کریں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ جو تدبیریں ظلم و استبداد کے لئے کی جائیں، ان میں قوت کہاں سے آسکتی ہے؟ ریت کی بنیادوں پر قلعے تعمیر نہیں ہوا کرتے۔

یہاں فی سبیل اللہ اور فی سبیل الطاغوت کا مفہوم واضح ہے۔

اسلامی نظام ایک دن میں قائم نہیں ہو جاتا۔ اس کا پہلا مرحلہ تعلیم و تربیت، یعنی اگلے مرحلہ کے لئے ٹریننگ کا ہوتا ہے جہاں پہنچکر طاغوتی قوتوں سے تصادمات ہوتے ہیں۔ دین کو مذہب سمجھنے والے اس مرحلہ تک تو بہت خوش ہوتے ہیں اور جماعت کا ساتھ دیتے ہیں، لیکن جب اگلا مرحلہ آتا ہے تو عذر تراشیاں اور بہانہ سازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

نماز روزے تک اسلام۔ جنگ سے گریز

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا
۴/۷۷ الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ
عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ (۴/۷۷)

تم ان لوگوں کی حالت پر غور کرو کہ جب "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کے نظام کا ابتدائی دور تھا، جس میں اس تصور کو تعلیم و تربیت کے لئے نظری اور انفرادی طور پر پیش کیا جاتا تھا، اور کسی سے ٹکراؤ کی شکل پیدا نہیں ہوتی تھی، (تو یہ لوگ کس مستعدی کا ثبوت دیتے تھے۔ یوں نظر آتا تھا کہ وقت آنے پر یہ اپنا سب کچھ اس نظام کی خاطر قربان کر دیں گے)۔ لیکن جب امتحان کا وقت آیا، اور انہیں جنگ کا حکم دیا گیا، تو ان میں سے ایک گروہ کی حالت یہ ہوگئی کہ وہ فریقِ مقابل کے اپنے ہی جیسے انسانوں سے یوں ڈرنے لگ گئے جیسے اللہ (کے قانونِ مکافات) سے ڈرنا چاہیئے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ۔ اور کہنے لگے کہ یا اللہ! تو نے یہ جنگ ہم پر کیوں فرض قرار دے دی؟ اسے کچھ وقت کے لئے اور ملتوی کیوں نہ رکھا (تاکہ ہم کچھ اور دنیاوی مفاد حاصل کر لیتے)۔ ان سے کہو کہ طبیعی

زندگی کے مفاد، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، اُخروی زندگی کے مقابلہ میں کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مستقبل کے مفاد کس قدر خیر و برکت لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کے معاوضہ میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو مذہب پرست طبقہ کے لئے صرف مرحلۂ اوّل رہ جاتا ہے۔ مرحلۂ دوم حکومت کا ذمہ قرار پا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں (یعنی تمام دنیا کے مسلمانوں میں) صدیوں سے یہی تقسیم جاری ہے۔ آپ نے خود اپنے ہاں (پاکستان میں) دیکھا ہوگا۔ میدانِ جنگ میں صرف حکومت کی فوجیں گئی تھیں۔ مدعیانِ مذہب، نوافل پڑھنے اور ابیں دینے اور دعائیں مانگنے میں مصروف رہتے تھے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے تو موت کا خطرہ ہوتا ہے اور موت کے تصوّر تک سے اِن کی جان جاتی ہے۔ ان کے اِس خدشہ کے سلسلہ میں کہا کہ

۴/۷۸ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَ لَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ (۴/۷۸)

موت بہرحال آئے گی

باقی رہا یہ خیال کہ میدانِ جنگ میں جانے سے موت آجائے گی۔ سو موت کو تو بہرحال آنا ہے۔ اگر تم نہایت محکم اور مضبوط قلعوں کے اندر بھی ہو وہ (ایک دن) وہاں بھی آکر رہے گی۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر، ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو کیوں ترجیح نہ دی جائے — طبیعی موت ایک بے اختیار عمل ہے، اور حق کی خاطر جان دے دینا، عملِ با اختیار۔ اس میں رازِ حیات ہے۔

ہم نے دانستہ اِس آیت کا آدھا حصہ اوپر درج کیا ہے۔ یہ اِس لئے کہ اگر اس کے باقی ماندہ حصہ کے الفاظ کو سطحی طور پر لیا جائے تو اس سے بہت بڑی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ حصہ یہ ہے: وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ (۴/۷۸) "اُن کی کیفیت یہ ہے کہ جب انہیں کوئی کامیابی ہوتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اس میں اِس رسولؐ کے حُسنِ تدبّر کا کیا دخل ہے۔ ہمیں یہ سب خدا کی طرف سے ملا ہے۔ لیکن اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ رسولؐ کی غلط تدبیروں کا نتیجہ ہے۔" فرمایا: قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ (لفظی ترجمہ اس کا یہ ہوگا) "ان سے کہو کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔" اس کے بعد کہا کہ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا (۴/۷۸) "یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ اعتراض کئے جاتے ہیں اور اصل بات کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔" اصل بات یہ ہے کہ

۴/۷۹ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ

(۴/۷۹)

(اے رسولؐ! تم اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں سے کہو کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ) جو کامیابیاں اور خوشگواریاں تمہیں نصیب ہوتی ہیں، وہ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں، اور جو نقصانات تمہیں پہنچتے ہیں، وہ سب تمہارے اپنے کاموں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ایک بظاہر تضاد کا حل

ہم نے جس پیچیدگی کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ سامنے آگئی۔ آیت (۴/۷۸) میں کہا گیا ہے کہ نفع ہو یا نقصان، رنج ہو یا راحت ــــ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ، سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور آیت (۴/۷۹) میں کہا گیا کہ کامیابیاں اور خوشگواریاں تو خدا کی طرف سے ہوتی ہیں، لیکن ناکامیاں اور نقصانات تمہارے اپنے ہاتھوں کے لائے ہوتے ہیں۔

(بظاہر) ان دونوں میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ تضاد عدمِ تفقہ کا نتیجہ ہے۔ (لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا)۔ اگر غور و فکر سے بات کو سمجھا جائے تو ان میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ ان آیات میں کہا یہ گیا ہے کہ

۱۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ، بُرے کام کا بُرا نتیجہ ــــ لہٰذا، اس اعتبار سے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ــــ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ــــ مفہوم اس کا یہ سمجھنا چاہیئے کہ سب کچھ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوتا ہے۔

۲۔ اس قانون کی رُو سے ہوتا یہ ہے کہ جو کام ہدایتِ خداوندی کے مطابق کیا جائے، اُس کا نتیجہ خوش گوار ہوتا ہے ــــ (مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ) ــــ اور جو کام اس کے خلاف کیا جائے، اُس کا نتیجہ نقصان رساں ــــ (وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ــــ نیز دیکھئے آیت (۴۲/۳۰)

اس سوال کا تعلق مسئلۂ تقدیر سے ہے جس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اب رہا یہ سوال کہ ان تصادمات میں بعض اوقات جماعتِ مومنین کو بھی کچھ نقصان اُٹھانا پڑتا ہے حالانکہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہوتے ہیں، تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جماعت کے

عالمگیر انسانیت کا مفاد

پیشِ نظر اپنا مفاد ہی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی کُلّی منفعت ہوتی ہے جس کی خاطر یہ بطیبِ خاطر رزمگاہوں میں نبرد آزما ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک بڑی منفعت کے لیے چھوٹے نقصان کو اپنی رضامندی سے برداشت کرتے ہیں اُن کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

عام لوگوں کے سامنے صرف مفادِ خویش ہوتا ہے۔ رسول کے پیش نظر عالمگیر انسانیت کا مفادِ کلی۔ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (۴/۷۹)

اقبال ان ہر دو زاویہ ہائے نگاہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

عقل خود بین غافل از بہبودِ غیر   سُودِ خود بیند، نہ بیند سُودِ غیر

وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ   در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ   (اقبالؒ)

اور رسول چونکہ قوانین خداوندی کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کرتا ہے، اس لئے اس پروگرام کی اطاعت درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہوتی ہے:

۴/۸۰ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ (۴/۸۰)

رسول کی اطاعت: خدا کی اطاعت کا مفہوم

لہٰذا جو شخص اس رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ قانونِ خداوندی ہی کی اطاعت کرتا ہے۔

اور جو شخص (اپنے مفاد کی خاطر) اس سے روگردانی کرتا ہے، تو وہ اس کا نتیجہ خود بھگتے گا۔ (اے رسول!) تمہارا کام یہ نہیں کہ تم انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح گھیر گھیر کر، باڑے میں روکے رکھو تاکہ یہ تباہیوں سے محفوظ رہیں۔ (انہیں، اپنے لئے خود فیصلہ کرنے دو۔ اس نظام میں وہی لوگ شامل رہ سکتے ہیں جو دل کی رضامندی سے اس کی اطاعت اختیار کریں)

بطیبِ خاطر اطاعت اور مصلحتِ خویش کے لئے اطاعت میں بڑا بنیادی فرق ہوتا ہے:

۴/۸۱ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (۴/۸۱)

منافقین کی حالت

جو لوگ اپنی مصلحت کی خاطر تمہارے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں (اور یوں ان کی اطاعت دل کی رضامندی سے نہیں بلکہ، اپنی منفعت کی خاطر ہوتی ہے) ان کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اطاعت قبول کی، لیکن جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو

رانوں کو چپکے چپکے، ان باتوں کے خلاف مشورہ کرتے ہیں جو تم کہتے ہو (اور جی میں سمجھتے ہیں کہ اس کا کسے پتہ چل سکتا ہے؟ حالانکہ) خدا کا قانونِ مکافات، ان کی تمام باتوں کا ریکارڈ محفوظ رکھتا ہے۔

سو تم ان لوگوں سے قطع نظر کرو، اور قانونِ خداوندی کی محکمیت پر کامل اعتماد کرتے ہوئے، اپنے پروگرام پر کاربند رہو۔ یہ قانون تمہارے لئے کافی کارساز ثابت ہوگا۔

انسانی جذبات اور وحیٔ خداوندی میں فرق کیا ہوتا ہے، اسے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے:

۴/۸۲ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (۴/۸۲)

(ضمناً) ان لوگوں کی اس روش سے غور و تدبر کرنے والوں پر، یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ انسانی جذبات اور ضابطۂ خداوندی میں کیا فرق ہے؟ انسانی جذبات کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ ابھی کچھ کہتے ہیں، ابھی کچھ دن کو کچھ کرتے ہیں، رات کو کچھ۔ زبان پر کچھ ہوتا ہے، دل میں کچھ۔ لیکن خدا کا ضابطۂ قوانین (قرآن) ہے کہ اس میں کہیں، کوئی بات ایک دوسرے کے خلاف نہیں ملے گی۔ یہاں سے وہاں تک ایک ہی حقیقت ہے جسے مختلف پہلوؤں سے سامنے لایا گیا ہے۔ اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کا کلام ہوتا، تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

یہاں قرآن کے منجانب اللہ تعالیٰ کی ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ کوئی باہمی تضاد نہیں۔ لیکن یہ بات تدبر فی القرآن ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ سطح بین نگاہوں سے دیکھنے والوں اور بد باطن ذہنیت رکھنے والوں کو اس میں بکثرت تضادات نظر آئیں گے۔ تضاد اور تخالف نہ قوانینِ فطرت میں ہے، نہ کتاب اللہ میں۔

اس سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آگئی۔ اور وہ یہ کہ جو قوم قرآن کا اتباع کرے گی، اس میں باہمی اختلاف اور تفرقہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی قوم میں باہمی اختلاف ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ قرآن کی متبع نہیں۔ قرآن کے اتباع کا دعویٰ اور فرقہ بندی، (باہمی تفرقہ) خدا کے اس دعویٰ کو جھٹلاتا ہے کہ اس میں اختلافات نہیں۔ اتباعِ قرآن کی تو محسوس شہادت، امت کی وحدت ہوگی۔ اس سے سوچ لیجئے کہ ہم کس مقام پر ہیں۔

یہ اختلافات اسلامی نظام ہی میں دُور ہو سکتے ہیں ایک اُمت، ایک ضابطۂ قوانین، اور تمام معاملات میں قولِ فیصل کے لئے ایک مرکزی اتھارٹی ہوتی ہے۔ اس اتھارٹی کی اطاعت ہی اسلام ہے۔ اس کے برعکس:

۸۲/۴ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۸۳/۴)

ہر افواہ کو تحقیقاتی مرکز تک پہنچاؤ

ان کا دعویٰ اطاعت کوش کی یہ کیفیت ہے کہ جب یہ کہیں سے امن یا خوف کی کوئی اڑتی ہوئی بات سن پاتے ہیں، تو اسے لے دوڑتے ہیں اور خوب پھیلاتے ہیں۔ حالانکہ نظام سے وابستگی اور اطاعت کا تقاضا ہے کہ ایسی باتوں کو رسول (مرکزی اتھارٹی) یا اپنے افسران ماتحت تک پہنچایا جائے، تاکہ وہ لوگ جو بات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کریں۔

یہ تو اس نظام خداوندی کی برکات و رحمت ہے کہ ان لوگوں کی اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ اور سازشانہ حرکات سے تمہارا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو تم میں سے اکثر اس قسم کی افواہوں کے پیچھے لگ کر تباہیاں لے آتے ہیں۔

اس کی تشریح آیت (۵۹/۴) کے تحت تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد قرآن پھر اس موضوع کی طرف لوٹ آیا جس کے لئے فرمایا:

۸۴/۴ فَقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝ (۸۴/۴)

قتال کی اہمیت

سو (اے رسول!) تم اس کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ لوگ تمہارا ساتھ دیتے ہیں یا نہیں، نظام خداوندی کے قیام و بقا اور مظلومین کی امداد و حفاظت کے لئے، مخالفین کا میدان جنگ میں مقابلہ کرو۔ تم صرف اپنی ذات کی ذمہ داری لے سکتے ہو، اوروں کی نہیں۔ البتہ تم، مناسب تعلیم و تربیت اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما سے، اپنی جماعت کے افراد کی کمزوریوں کو رفع کرتے جاؤ تاکہ وہ جہاد زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔ اگر تم ایسا کرتے رہے، تو وہ وقت دور نہیں جب خدا، تمہارے مخالفین کی پیدا کردہ مشکلات و مصائب کی روک تھام کا انتظام کر دے گا۔ اس لئے کہ خدا کا قانون انہی بڑی قوتوں کا مالک اور محکم گیر ہے کہ وہ ان سرکشوں کو جکڑ کر رکھ دے گا۔

اس کے بعد ہے:

۴/۸۵ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ

تم صرف اپنی ذات پر، اور اپنے مخلص رفقاء کے بھروسے پر اپنا پروگرام مرتب کرو۔ اس کے بعد اگر کوئی اور بھی اس نظامِ حسنہ کے قیام کے لئے تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے گا، تو اسے بھی اس کے خوشگوار نتائج سے حصہ مل جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص فریقِ مخالف کا ساتھ دے گا، اور غلط نظام کی تائید میں کوشش کرے گا تو اس کے تباہ کن عواقب میں وہ بھی شریک ہو گا۔

شفاعتِ حسنہ اور سیئہ

"شفاعت" کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان۔ جلد دوم صفحات ۲۳۳-۳۷ (زیرِ آیت ۲/۴۸) آ چکی ہے۔ وہیں زیرِ نظر آیت (۴/۸۵) بھی درج ہے۔ اس کے معنی کسی کی مدد اور معاونت کرنا ہے۔ ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا مفہوم واضح ہے۔ نظام کے قیام کے علاوہ، انفرادی طور پر بھی اچھے کام میں کسی کا ساتھ دینا اور اس کی مدد کرنا، شفاعتِ حسنہ ہو گی۔ بُرے کام میں اس کی امداد، شفاعتِ سیئہ ہو گی۔

آیت کے آخر میں ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا۔ (۴/۸۵)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے "اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ یا ہر شے پر نگہبان ہے"۔ لیکن اس ترجمہ کی رو سے آیت کے دونوں ٹکڑوں میں ربط نہیں بنتا۔ آیت یہ ہے کہ جو شخص کسی اچھے کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس اچھے کام کے خوشگوار نتائج سے اسے بھی حصہ ملتا ہے۔ اور جو شخص کسی بُرے کام میں کسی کی معاونت کرتا ہے، تو اس بُرے کام کے تخریبی نتائج سے اسے بھی حصہ ملتا ہے۔ اور اس کے بعد ہے "اور اللہ ہر شے پر نگہبان ہے۔ یا قدرت رکھتا ہے"۔

مقیتاً کا مفہوم

لفظ مُقِيْتًا کا مادہ (ق۔ و۔ ت) ہے اور اَلْقُوْتُ (جمع اَقْوَاتٌ) کے معنی ہیں اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْمُقِيْتُ کے معنی ہوتے ہیں "وہ شخص جو کسی چیز کی حفاظت کرے، اور نگرانی کرے، اور اس کی خوراک کا بندوبست کرے"۔ یعنی اس کے معنی کسی کی حفاظت اور نگرانی کرنا اور صرف حفاظت اور نگرانی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے سامانِ زیست بہم پہنچانا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے، اس آیت سے ایک عظیم حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کی کیفیت یہ ہے کہ سامانِ زیست (خوراک وغیرہ) قوانینِ طبیعی کے ماتحت ہر شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ہر نام سنگھ، قانونِ زراعت کے مطابق کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس کی زمین سے بھی

اسی طرح فصل پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح کسی عبداللہ کی زمین سے۔ اس میں کافر اور مومن کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں۔ اسی طرح

قوانینِ طبیعی کے مطابق نتائج

اس میں بھی کوئی تفریق نہیں کہ ہرنام سنگھ اپنی فصل کو کس مصرف میں لاتا ہے وہ اسے اچھے کاموں میں صرف کرے یا بُرے کاموں میں، اس سے اناج کی پیداوار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۱۷/۱۸-۲۰ میں بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا، جن کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے:

(اس سے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب خدا کا قانونِ مکافات اس قدر محکم گیر ہے، تو پھر وہ قومیں، جو نہ مستقل اقتدار کو تسلیم کرتی ہیں اور نہ ہی مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھتی ہیں، مادی ترقی کس طرح کرتی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ) ہمارا قانون یہ ہے کہ جو کوئی، اس دنیا میں طبیعی مفادِ عاجلہ چاہتا ہے ــــــ اور اس کے لئے طبیعی قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے ــــــ ہم اُسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے ایسا بنایا ہے مادی مفاد دے دیتے ہیں۔ (جو کسان، ہمارے قوانینِ طبیعی کے مطابق، محنت کر کے فصل بوتا ہے، اُسے اُس کی محنت کا پھل مل جاتا ہے۔ اس میں کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے بعد) مستقبل کی زندگی میں، اس قوم کے لئے تباہی کا جہنم ہوتا ہے جس میں وہ بدحال اور دھتکاری ہوئی داخل ہو جاتی ہے۔

(۲/۲۰۰-۲۰۱ ؛ ۱۱/۱۵-۱۶ ؛ ۴۲/۲۰ ؛ ۴۶/۲۰)

اس کے برعکس، جو قوم (مفادِ عاجلہ کے ساتھ ساتھ ۲/۲۰۱) مستقبل کی خوشگواریاں بھی چاہتی ہے، اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتی ہے، جیسا کوشش کرنے کا حق ہے۔ اور مستقل اقدار پر یقینِ کامل رکھتی ہے۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی کوششیں، حال اور مستقبل دونوں میں، بھرپور نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

ہم اس طرح دونوں گروہوں کو (یعنی صرف مفادِ عاجلہ طلب کرنے والوں، اور مفادِ عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں چاہنے والوں کو)، اپنے طبیعی قوانین کی رُو سے، ان کی کوششوں کے مطابق، آگے بڑھانے چلے جاتے ہیں، اور تیرے نشوونما دینے والے کا عطا فرمودہ، سامانِ رزق، ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے، اسکے راستے میں، کسی کے لئے بند نہیں لگائے جاتے۔ (جو چیز قانونِ طبیعی کے مطابق حاصل ہوتی ہے، وہ ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو اُس قانون کے مطابق، اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔ زندگی کی اس دوڑ میں، کافر و مومن دونوں کے لئے یکساں طور پر میدان کھلا رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کافروں کو، اُس کی کوشش کے باوجود، پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا جائے، اور مومن کو، خواہ وہ کوشش نہ بھی کرے، آگے بڑھا دیا جائے۔ (۱۷/۲۰)

ہم سمجھتے ہیں کہ آیت (۴/۸۵) میں وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ مُّقِيْتًا کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی جو لوگ کسی اچھے کام کے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، انہیں بھی اس پروگرام کی تکمیل کے لئے سامان و ذرائع میسر آجاتے ہیں، اور جو لوگ کسی تخریبی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے کوشش کرتے ہیں، خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق انہیں بھی اسباب و ذرائع حاصل ہو جاتے ہیں۔ فرق اس میں نہیں پڑتا۔ فرق اُن کاموں کے نتیجہ میں پڑتا ہے جو خدا کے طبیعی قوانین نہیں بلکہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مرتب ہوتا ہے۔

ربوبیتِ عالمین اس قسم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کی متقاضی تھی۔ البتہ اسلامی نظام کے قیام اور استحکام کے سلسلہ میں تقاضا کچھ اس سے آگے ہے۔ اور وہ یہ:

۴/۸۶ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝۸۶ (۴/۸۶)

تحیۃ کا بدل جو تمہارے ساتھ کھڑا ہو کر تمہارے لئے زندگی اور سلامتی کا سامان بہم پہنچائے تم اس کے لئے اس سے بہتر اور حسین تر، حیات بخش سامان بہم پہنچاؤ۔ اور اگر ہو ز، حالات ایسے سازگار نہ ہوں کہ تم اسے، اس کی پیش کش سے زیادہ دے سکو، تو کم از کم اسے اتنا ہی لوٹا دو۔ نظامِ خداوندی ان تمام امور کا پورا پورا حساب رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

اور جب تم کو دُعا دے کوئی تو تم بھی دُعا دو اس سے بہتر یا وہی کہو الٹ کر۔ بے شک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (مرحوم))

اور اس ترجمہ کے حاشیہ میں اس کی تفسیر میں لکھا ہے "اگر کسی نے السلام علیکم کہا تو واجب ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو۔ اور زیادہ ثواب چاہو تو رحمۃ اللہ بھی بڑھا دو۔ اور اگر اس نے یہ لفظ بڑھایا ہو تو تم "برکاتہ" زیادہ کرو"۔

السلام علیکم اس میں شبہ نہیں کہ تحیۃ کے معنی دعا دینا بھی ہیں، لیکن جب اس کے مادہ میں حیات کا مفہوم بنیادی ہے تو آیت زیرِ نظر (۴/۸۶) میں تحیۃ کے معنی "حیات بخش" زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ اسی نسبت سے ہم نے آیت کے مفہوم میں اسے ملحوظ رکھا ہے۔ ویسے بھی، سابقہ آیت میں "مُقِيْتًا" کی جہت سے یہ مفہوم زیادہ قرینِ صواب ہے۔ لغت میں بھی تحیۃ کے معنی صرف دعا دینا نہیں، اس کے معنی کسی کو خوشگوار زندگی اور درازیٔ عمر کی دعا دینا ہیں۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" میں بھی سلامتی، رحمت اور برکات اسی مفہوم

کو محیط ہیں۔

لیکن یہ "السلام علیکم" جماعت مومنین کا ہے جو ایک دوسرے کی سلامتی اور حیات بخش کے آرزومند ہی نہیں ہوتے، عملاً اس کے لئے کوشاں بھی ہوتے ہیں۔ ہمارا "السلام علیکم" نہیں جو محض دو لفظوں کا رسمی طور پر دُھرا دینا ہے اور یا منافقت کا پردہ۔ دل میں مخاطب کے خلاف جذبات عداوت و نفرت موجزن اور زبان پر مسکراہٹ کے ساتھ "السلام علیکم"!

جماعت مومنین کا یہ تمام پروگرام کس مقصد کے لئے ہوتا ہے؟ دنیا میں اقتدارِ خداوندی قائم کرنے کے لئے:

۴/۸۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ (۴/۸۷)

اقتدار صرف خدا کا

بہرحال کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، تم اس آواز کو بلند کیے جاؤ کہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف ایک خدا کا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کے سامنے جُھکا جائے اور اُس کی محکومی اختیار کی جائے۔ انسانوں کی دنیا میں بھی صرف اُسی کا قانون رائج ہونا چاہیے۔ اس آواز کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ لیکن اس مخالفت کا فیصلہ اُس وقت ہوگا جب آنے والے انقلاب کے وقت، تم اور تمہارے مخالفین، میدانِ جنگ میں ایک ساتھ جمع ہوں گے۔ یہ ٹکراؤ ہوکر رہے گا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہ بات خدا کی طرف سے کہی جارہی ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا سے زیادہ سچی بات کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ دنیا میں بھی یہی ہوگا، اور آخرت میں بھی ایسا ہی۔

یہ تو جماعت مومنین کی دعوت اور اس پر اُن کا عمل ہوگا۔ ان کے برعکس:-

۴/۸۸ فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ (۴/۸۸)

منافقین

باقی رہے یہ منافقین، جن کا دعویٰ رفاقت اپنی مصلحت کوشیوں پر مبنی ہے، وہ بظاہر تمہارے دوست بنتے ہیں لیکن بباطن تمہاری تخریب چاہتے ہیں۔ ان کی پوزیشن ایسی واضح ہے کہ ان کی بابت دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے ایسا کیوں ہو کہ تم میں سے کچھ لوگ، ان کے بارے میں، ایک خیال کے ہوجائیں، اور کچھ لوگ دوسرے خیال کے، درآنحالیکہ وہ اپنی غلط روش اور بدعملی کی وجہ سے راہِ حق سے پھر چکے ہیں۔

تم یہ سوچو کہ جو لوگ اس طرح صحیح راستے سے ہٹ کر، دوسری راہیں اختیار کرچکے ہوں، تم انہیں کس طرح

صحیح راستے پر لا سکتے ہو؟ یاد رکھو! جو شخص قانونِ خداوندی کی رُو سے، غلط راستے پر پڑ جائے، اس کے لئے (بجز قانونِ خداوندی کے اتباع کے) صحیح راہ کی طرف آنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی ـــــ اور قانونِ خداوندی یہ ہے کہ انسان، بطیبِ خاطر، پوری دیانتداری سے، صحیح راستہ اختیار کرے۔ لوگوں کو فریب دینے کے لئے منافقت نہ برتے۔

اس آیت میں "مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ" اور "وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰہُ" کے صحیح مفہوم کے لئے سابقہ جلدوں میں تقدیر کا عنوان دیکھئے (انڈکس کے حوالے سے)

اسلامی زندگی، نظامِ خداوندی (اسلامی مملکت) کے تابع ہی بسر کی جا سکتی ہے۔ جس مقام پر اسلامی نظام قائم نہ ہو وہاں اِس نظام کے لئے کوشاں ہونا، اسلام ہے۔ اگر کسی مقام پر یہ نظام قائم ہو گیا ہے تو پھر اسلام اس نظام کے تابع رہنے ہی کا نام ہوگا۔ اس لئے جب مدینہ میں یہ نظام قائم ہو گیا، تو جہاں جہاں مسلمان آباد تھے، اُن سے کہا گیا کہ وہ وہاں سے منتقل ہو کر مدینہ آ جائیں۔ اِسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ اگر کسی خطۂ زمین کے "مسلمان" وہاں سے منتقل ہونے کی استطاعت اسباب و ذرائع کے باوجود ہجرت نہ کریں، تو قرآن اُنہیں مومن تسلیم نہیں کرتا۔ اُنہیں منافق قرار دیتا ہے اور اُن کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے جیسا برتاؤ منافقین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آیت (۴/۸۹) میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ فرمایا:-

۴/۸۹ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ (۴/۸۹)

ہجرت مومن ہونے کا ثبوت

(تم سمجھتے ہو کہ انہیں اپنے ساتھ ملا لو گے۔ اور) ان کے ارادے یہ ہیں کہ جس طرح یہ خود کفر اختیار کر چکے ہیں، اسی طرح تم بھی دینِ حق کو چھوڑ دو، تاکہ اس طرح یہ اور تم، دونوں، ایک سطح پر آ جاؤ۔ لہٰذا، ان میں سے کسی کو اپنا رفیق اور دمساز نہ بناؤ، تاآنکہ یہ اپنے دعوئ ایمان کی صداقت کا عملی ثبوت نہ دیں۔ اور وہ ثبوت یہ ہے کہ یہ نظامِ خداوندی کی خاطر، وہ سب کچھ چھوڑ دیں جس کا چھوڑنا ضروری قرار دیا جائے ـــــ گھربار۔ اعزہ۔ رفقاء۔ مال و دولت وغیرہ ـــــ ان سے یہ بات واضح طور پر کہہ دو۔ اگر یہ اس کے بعد، گریز کی راہیں نکالیں تو انہیں گرفتار کر لو تاکہ یہ اس فتنہ پردازی سے رک جائیں)

اور، اگر یہ تم سے جنگ کریں، تو تم بھی ان سے جنگ کرو، اور جہاں پاؤ انہیں قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو بھی اپنا دوست اور حمایتی تصور نہ کرو۔

ہجرت اور اس سے متعلقہ مباحث، مطالب الفرقان جلد سوم۔ صفحات ۵۰-۵۷ میں بڑی وضاحت سے بیان ہو چکے ہیں۔ وہیں آیات (۴/۹۷-۱۰۰) بھی درج کی جا چکی ہیں۔ اس لئے زیر نظر آیت (۴/۸۹) اور بحولہ بالا دیگر آیات کا یہاں دُہرانا ضروری نہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے متعلق بحث بھی پہلے گزر چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اس کے بعد کی آیت میں بھی انہی منافقین کے سلسلہ میں ہدایات دی گئی ہیں:۔

۴/۹۰ إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَنْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾ (۴/۹۰)

جنگ اور صلح کی شرائط

لیکن اگر یہ لوگ (تمہارے دشمن کا ساتھ چھوڑ کر) ایسے لوگوں سے جا ملیں جن کے ساتھ تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں (تو پھر یہ بھی اس حلیف قوم کے افراد سمجھے جائیں گے)، یا یہ جنگ سے تنگ آ کر تمہارے ساتھ آ جائیں، اور نہ تم سے جنگ کریں اور نہ تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم کے خلاف جنگ کریں (غیر جانبدار رہنا چاہیں۔ تو اس صورت میں بھی ان سے کچھ مواخذہ نہیں کرنا چاہیے)۔ اس لئے کہ اگر ان کے پاس، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق، تم پر غالب آ جانے کی قوت ہوتی تو یہ ضرور تم سے جنگ کرتے۔ لہٰذا، اگر یہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں، صلح کی درخواست کریں، تو پھر تمہیں، ان کے خلاف کچھ کرنے کی اجازت نہیں ——— اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں مقصود کسی سے انتقام لینا نہیں، بلکہ ان سرکش لوگوں کا زور توڑنا ہے جو دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کی مخالفت کریں۔ سو جب ان کا زور ٹوٹ جائے تو پھر ان کے خلاف کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

جنگ کے متعلق تفصیلی مباحث سابقہ جلدوں میں آ چکے ہیں (دیکھئے انڈکس)۔ اس آیت میں نیز اس سے اگلی آیت اور آیت (۴/۹۴) میں صلح کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان پر غور کریں اور دیکھیں کہ اسلام جنگ و قتال کا داعی ہے یا امن و سلامتی کا پیامبر؟ اس کی مزید وضاحت نکھر کر دی:

۴/۹۱ سَتَجِدُونَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى
الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ
يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ
جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

لیکن تم ایسے لوگ بھی دیکھو گے کہ وہ (یوں تو) تمہاری طرف سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی۔ لیکن جب کبھی ان کی قوم انہیں تمہارے خلاف فتنہ برپا کرنے کے لئے بلائے تو وہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے، بلکہ اس فتنے کی آگ میں، اندھا دھند کود جاتے ہیں۔ سو اگر یہ لوگ، اس قسم کی فتنہ پردازی کے بعد، نہ تو تم سے کنارہ کش ہوں۔ نہ صلح کی درخواست کریں۔ اور نہ ہی اپنی دست درازیوں سے باز آئیں۔ تو انہیں گرفتار کرو (تاکہ یہ فتنہ رک جائے)۔ لیکن اگر وہ تم سے جنگ کریں تو ان سے جنگ کرو اور جہاں پاؤ انہیں تہ تیغ کر دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکے خلاف اس قسم کی کاروائی کرنے کی تمہیں اجازت ہے۔

اس کے بعد دو آیات میں قتل اور اس کی سزا کا ذکر ہے۔ سلسلۂ کلام کی رو سے اس کا آغاز میدان جنگ میں قتل سے ہے (جسے قتال کہا جاتا ہے)، لیکن جرم کے اعتبار سے ان آیات کا تعلق انفرادی قتل کے جرائم سے ہے۔ قتل اور اس کی سزا کے متعلق جگہ جگہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے (انڈیکس میں دیکھئے عنوان قتل۔ قصاص۔ جرم اور سزا وغیرہ) لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کی قانونی حیثیت کو یکجا بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قرآن کے احکام کیا ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے انسانی جان کو کس قدر گراں بہا قرار دیا ہے۔ سورہ المائدہ میں ہے:

انسانی جان کی قدر و قیمت

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (۵/۳۲)

ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے کو قتل کر ڈالے —— بجز اس کے کہ وہ جرم قتل کے قصاص میں ہو (یعنی قتل ناحق کے لئے سزائے موت کے طور پر) یا ملک میں فساد برپا کرنے والے مجرمین کو قانون کے مطابق موت کی سزا دی جائے —— تو اس قسم کے بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو کو یا قاتل نے ایک فرد کو قتل نہیں کیا، پوری کی پوری نوع انسان کو قتل کر دیا۔ اس کے برعکس جس شخص نے کوئی ایک جان بچا لی، تو

اُس نے گویا پوری نوعِ انسان کی جان بچالی۔

انسانی جان واجب الاحترام ہے

۲۔ ہر انسانی جان واجب الاحترام ہے۔ اسے صرف اُن جرائم کی سزا کے طور پر تلف کیا جاسکتا ہے جن کی قرآن کریم نے سزائے موت تجویز کی ہے۔ اسے قتل بالحق کہا جائے گا۔ فرمایا:۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ۝ (۱۷/۳۳)

(یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ) جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (اُسے واجب الاحترام قرار دیا ہے یعنی بے گناہ کا قتل۔ ۵/۳۲)، اسے قتل مت کرو، بجز اس کے کہ ایسا کرنا قانونِ عدل کا تقاضا ہو۔ (۲/۱۷۸)۔ جو شخص ظلم سے ناحق مارا جائے (تو قاتل یہ نہ سمجھ لے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں، اس لئے مجھ سے کون باز پرس کرسکتا ہے) مقتول کے وارثوں کے لئے، ہم نے نظامِ خداوندی (اسلامی معاشرہ) کو صاحب غلبہ و اقتدار بنایا ہے۔ اس لئے یہ نظام، خود مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا لیکن معاشرہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جرم کی سزا، قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دے۔ اُن سے تجاوز نہ کرے۔

(۶/۱۵۲ ؛ ۴۲/۴۰) (۱۷/۳۳)

۳۔ جرمِ قتل کا مواخذہ کرکے اُس کی سزا دینا اسلامی عدالت کا فریضہ ہے۔ اپنے طور پر اس کا بدلہ نہیں لیا جاسکتا (اسے قصاص کہتے ہیں)

قصاص کا حکم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۱۷۸-۱۷۹)

یاد رکھو جس اصول کے مطابق مستبد قوم سے اجتماعی طور پر جنگ کرنا ضروری ہوجاتا ہے (یعنی حقوقِ انسانیت کے تحفظ کی خاطر) اُس اصول پر، اپنے معاشرہ میں، انفرادی طور پر، جرمِ قتل کی سزا دینی بھی ضروری قرار پائی ہے، کیونکہ اس کے بغیر کسی کی جان محفوظ نہیں رہ سکتی، اور انسانی جان کی قیمت بہت بڑی ہے۔ (۵/۳۲)۔ لہٰذا اس باب میں

قانون یہ مقرر کیا جاتا ہے۔ کہ قاتل کو معاشرہ کی طرف سے سزا ضرور دی جائے۔ (یعنی اسے خود معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے، افراد متعلقہ کے خلاف نہیں)۔

سزا کے سلسلہ میں، عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے یعنی اس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہو گی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے۔ (مثلاً) اگر قاتل آزاد مرد ہے، تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اُسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے، تو اُس کا عورت ہونا اُسے سزا سے نہیں بچا سکے گا، اُسے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔

جرم قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ قتل بالارادہ (قتلِ عمد) یا سہواً (نادانستہ) قتل۔ اوّل الذکر کی صورت میں سزائے موت ہے (زرِ فدیہ نہیں)۔ ــــ یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے، انتہائی سزا سے کم تر کوئی اور سزا (۴/۹۳) ــــ لیکن سزا کو جرم کی حد سے بڑھ نہیں جانا چاہیئے۔ (۴۲/۴۰ و ۱۷/۳۳)

لیکن اگر قتل، عمداً نہیں کیا گیا۔ یونہی سہواً ہو گیا ہے، تو اس صورت میں (۴/۹۲ کے مطابق) دیت (خون بہا) کی سزا دی جائے گی۔ اس دیت (کی رقم سے) اگر مقتول کا وارث، برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے، تو اُسے اس کا اختیار دیا گیا ہے۔ (۱۷/۳۳)۔ اس صورت میں مجرم کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ طے ہو گیا ہے اسکی پابندی کرے۔ اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ (قتلِ سہو کی سزا مقرر کرتے ہیں) تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تم سب کی صلاحیتیں مناسب نشو و نما پاتی رہیں۔

لیکن جو شخص اس طرح معاملہ طے ہو جانے کے بعد، زیادتی کرے، تو اُسے سخت سزا دی جائے۔

اگر تم، سطحی جذبات سے ہٹ کر، عقل و فکر کی رُو سے غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قصاص کے اس قانون میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم لاقانونیت کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

مندرجہ بالا آیت (۱۷/۳۳) میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ کہ اسلامی نظام مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا، اور مجرم کو قانون کے مطابق سزا دے گا۔

سلہ یہودیوں کی شریعت میں قصاص کی یہ شکل تھی:-

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ
وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ
كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ۔

(۵/۴۵)

اُنہی صحف میں ہم نے اُنہیں حکم دے رکھا کہ جس شخص نے کسی کو (ناحق) قتل کر دیا، اُس کی سزا موت ہو گی ـــــ جان کا بدلہ جان۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ ناک کا بدلہ ناک۔ کان کا بدلہ کان۔ دانت کا بدلہ دانت ـــــ یعنی صرف جرمِ قتل ہی مستوجب سزا نہیں۔ کسی کو زخمی کر دینا بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا دی جائے گی۔ اور سزا جرم کے مثل ہو گی۔ لیکن اگر مستغیث، مجرم کو خود معاف کر دے، تو یہ چیز مجرم کی سزا کا کفارہ ہو جائے گی۔

یہ تھا وہ قانونِ قصاص جو اِن کی کتابوں میں) اِن کے لئے دیا گیا تھا۔ انہیں اُس کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں تھے، اِس لئے کہ جو شخص اس ضابطۂ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرے جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ ہیں جو حق و انصاف سے کام نہیں لیتے، ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔

یہ قانون بنی اسرائیل کے لئے تھا۔ قرآنِ کریم میں اس قسم کا قانون مسلمانوں کے لئے نہیں آیا۔ اس قسم کی ضربات کی سزا اسلامی حکومت خود مقرر کرے گی۔

۵۔ قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ـــــ سہواً کسی کے ہاتھوں کسی کا قتل ہو جانا۔ اِسے قرآنِ کریم قتل بالخطا سے تعبیر کرتا ہے۔ اور عمداً اور ارادتاً کسی کو قتل کر دینا، اِسے وہ قتلِ عمد کہہ کر پکارتا ہے۔ ان دونوں جرائم کی سزا الگ الگ ہے:۔ قتل بالخطا

۶۔ قتل بالخطا کے متعلق ہے:

(۴/۹۲) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُوا۟ ۚ فَإِن كَانَ مِن
قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَ
كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۹۲﴾ (۴/۹۲)

کسی مومن کے لئے سزاوار نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے، اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔
اگر کسی کے ہاتھوں، کوئی مومن غلطی سے مارا جائے تو وہ اس کے بدلے میں، ایک مومن غلام آزاد کرے۔
نیز مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا ادا کرے (۲/۱۷۸)۔ اگر وہ خون بہا معاف کر دیں تو پھر اور بات ہے۔

قتل خطا کی سزا و دیت

لیکن اگر ایسا ہو کہ کوئی قوم تم سے برسرِ پیکار رہے اور ان میں کوئی مومن فرد رہے جو تمہارے ہاتھوں غلطی سے مارا جاتا ہے، تو اس کے کفارہ کے طور پر ایک مومن غلام آزاد کیا جائے گا (خون بہا نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ نہیں تم خون بہا دو گے وہ تو تم سے جنگ کر رہے ہیں)۔ لیکن اگر وہ شخص، ایسی قوم سے ہو (یعنی ان لوگوں میں رہتا ہو) جس کے ساتھ تمہارا معاہدۂ صلح ہے، تو اس صورت میں اس کے وارثوں کو خون بہا بھی دینا ہوگا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا بھی۔ لیکن اگر قاتل کے پاس غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہو۔ یا ایسی صورت ہو کہ غلام ملے ہی نہیں۔ تو وہ دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ یہ چیز، قانونِ خداوندی کی رُو سے عفوِ خطا کا موجب بن جائے گی۔ اُس قانونِ خداوندی کی رُو سے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قتل بالخطا کی سزا موت نہیں۔ صرف دیت (خون بہا) کی ادائیگی ہے۔ ظاہر ہے کہ خون بہا کا تعین عدالت کرے گی۔ مقتول کے وارثوں کو البتہ اس کا اختیار ہوگا کہ وہ اس میں کچھ کمی کر دیں یا بالکلیہ معاف کر دیں۔

اس سے آپ غور کیجئے کہ ہمارے مروّجہ قانون کی رُو سے، قتل بالخطا کی سزا کے طور پر جنہیں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے، وہ کس قدر قرآن کریم کے خلاف ہے اور قتلِ ناحق جیسا سنگین جرم۔

۷۔ قتلِ عمد کے متعلق کہا:

۴/۹۳ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ (۴/۹۳)

قتل عمد کی سزا

اگر کوئی مومن کسی مومن کو عمداً قتل کر دے، تو اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہوگا۔ اُس پر خدا کا غضب وارد ہوگا۔ وہ خدا کی نگاہوں میں ملعون ہوگا۔ اُس کے لئے خدا نے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں جرمِ قتل بالارادہ کی بنیادی سزا کا ذکر نہیں کیونکہ اس کی سزا کے متعلق آیات (۲/۱۷۸-۱۷۹) میں حکم

دیا جا چکا ہے ——— یعنی سزائے موت۔ اس میں البتہ دو باتیں قابلِ غور ہیں:۔

۱۔ خون بہا کی اجازت صرف قتل خطا میں ہے۔ قتلِ عمد میں خون بہا لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی سزا موت ہے۔

۲۔ آیت (۱۷۸/۲) میں جو کہا ہے کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (یعنی مقتول وارثوں کی طرف سے کچھ معافی) تو یہ صرف دیت (خون بہا) کی صورت میں ہو گی۔ یعنی قتل بالخطا کی صورت میں۔ قتلِ عمد میں جب خون بہا کی اجازت ہی نہیں تو اس میں سے کچھ معاف کر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ آیت (۹۳/۴) میں جو جہنم، خدا کے غضب اور لعنت کا ذکر ہے، اگر ان کا اطلاق اس دنیا میں کیا جائے تو اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قتل بالعمد میں بھی، جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزائے موت سے کم تر درجہ کی بھی سزا دی جا سکتی ہے۔ لیکن اس میں خون بہا کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں۔

جنگ جمل اور جنگ صفین

(ضمناً) قتلِ عمد کے متعلق خدا کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں اور اس کے بعد صدرِ اوّل کی مروجہ تاریخ میں ذرا اس جانسوز منظر کو سامنے لائیں کہ جنگِ جمل اور صفین میں صحابہ کبارؓ کی آدھی تعداد ایک طرف کھڑی ہے اور دوسری آدھی اس کے سامنے دوسری طرف، اور دونوں ایک دوسرے پر تلواروں اور نیزوں سے وار کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں جنگِ جمل میں دس ہزار (عام مومن ہی نہیں بلکہ) صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں، اور دوسری جنگ (جمل) میں ستر ہزار صحابہؓ (معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ)۔ میں نے اپنی کتاب "شاہکارِ رسالت" کے تعارف (گزرگاہِ خیال) میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ سب افسانے ہیں جو ہماری تاریخ میں ایک گہری سازش کی رو سے داخل کر دیئے گئے۔ اور ہم انہیں (اپنا مقدس ورثہ سمجھ کر) سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ احادیث (روایات) کے سلسلہ میں ہوا، وہی کچھ تاریخ کے ضمن میں بھی ہوا جب تک ہم ان (وضعی) روایات اور تاریخ سے پیچھا نہیں چھڑاتے، صحیح اسلام ہمارے سامنے آ نہیں سکتا۔

اس ضمنی جگر گدازی کے بعد پھر جنگ سے متعلق ہدایات کی طرف آیئے۔ فرمایا:۔

۹۴/۴ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ (۹۴/۴)

جنگ میں صلح

اے جماعتِ مومنین! جب تم خدا کی راہ میں (جنگ کرنے کے لئے) باہر نکلو، تو پہلے تحقیق کرلو کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔ یونہی ہر ایک کو دشمن تصور کرکے حملہ نہ کردو۔ اگر کوئی تمہاری طرف امن و سلامتی کا پیغام بھیجے، تو اس کے متعلق تمہارا پہلا ردِّ عمل یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ایمانداری سے ایسا نہیں کررہا۔ وہ امن کا خواہاں نہیں، دھوکا دیتا ہے۔ اس کے متعلق تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچو۔ یونہی ہر ایک سے لڑائی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کی غرض سے باہر نہیں نکلے، دنیاوی مفاد (مالِ غنیمت وغیرہ) کی خاطر نکلے ہو، تم ایسا خیال تک کبھی دل میں نہ لانا۔ تم قوانینِ خداوندی کے مطابق چلتے رہو اور پھر دیکھو کہ تمہیں کس قدر ساز و سامان جائز طریق سے ملتا ہے۔ اسلام سے پہلے تمہاری یہی حالت تھی کہ تم محض مالِ غنیمت کی خاطر لڑائیاں لڑا کرتے تھے۔ لیکن اللہ نے زندگی کا یہ نیا ضابطہ دے کر تم پر بڑا کرم کیا، اور تمہارے مقاصدِ حیات اور نقاطِ نظر کو بدل دیا۔ اس لئے اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کی پوری پوری تحقیق کرو اور صرف انہی سے جنگ کرو جن کے خلاف حق و صداقت کی خاطر جنگ کرنا ضروری ہو۔ یاد رکھو! اللہ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس لئے تم اپنی نیت کو اس سے نہیں چھپا سکتے۔

مرزا غلام احمد کے متبعین

آیت کا مفہوم واضح ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سامنے آگیا۔ جب (۱۹۷۴ء) میں قوم کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ مرزا غلام احمد کے متبعین (قادیانی اور لاہوری جماعتوں) کو غیر مسلم قرار دیا جائے، تو یہ (احمدی) حضرات کہا کرتے تھے کہ تم لوگ ہمیں غیر مسلم کیسے قرار دے سکتے ہو؟ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (۴/۹۴) (اور اس کا ترجمہ کرتے تھے) "جو شخص تمہیں السلام علیکم کہے، اُسے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو"۔ یعنی ان کے خیال کے مطابق، ہر اُس شخص کو جو اسلام علیکم کہہ دے، تسلیم کرلینا چاہیئے۔ کفر اور اسلام میں یہ کیسا دلچسپ خطِ امتیاز ہے؟ آپ نے دیکھا کہ قرآن کو کس طرح بازیچۂ اطفال بنایا جاتا ہے! آیت کا صحیح مطلب، مفہوم میں دیا جاچکا ہے۔

اگلی آیت میں جہاد میں شریک ہونے والوں کی دو روشوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کی، غالب کے الفاظ میں، کیفیت یہ ہے کہ

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے ۔۔۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اور بعض ایسے ہیں جو قدرے سست رفتار واقع ہوئے ہیں۔ جہاد کی برکات میں تو ان دونوں کا حصہ ہے، لیکن مدارج کے اعتبار سے (ظاہر ہے کہ) یہ ایک جیسے نہیں ہوسکتے۔ فرمایا:-

۴/۹۵-۹۶ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ
الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ
وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ (۴/۹۵-۹۶)

تیز گام اور سست رفتار

مومنین میں سے بھی جو لوگ بلا عذر، سست روی سے کام لیں، اور نہایت ذوق و شوق سے، خدا کی راہ میں مصروفِ جد و جہد رہیں، اور اس میں مال اور جان تک کی پرواہ نہ کریں، تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ قانونِ خداوندی کی میزان میں، جان و مال سے جد و جہد کرنے والوں کا درجہ، سہل انگاروں کے مقابلہ میں بلند ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ نظامِ خداوندی کی خوشگواریوں میں، سست رو افراد کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ تو سب کے لئے ہیں۔ لیکن جب سوال فرقِ مراتب کا آئے گا تو مجاہدین کے مدارج بہرحال سست رفتاروں سے بڑھ کر ہوں گے۔

یہ مدارج وہ سیڑھیاں ہیں جن سے انسانی ذات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ (۸۴/۱۹)۔ ان لوگوں کی مجاہدانہ سعی و عمل، ان کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے مضر اثرات سے ان کی حفاظت کرتی ہے، اور قانونِ خداوندی کی رو سے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ خدا کے قانون میں حفاظت اور پرورش کے سب سامان موجود ہیں۔

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

برابر نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کا کوئی عذر نہیں اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے۔ اللہ نے بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے بیٹھ رہنے والوں پر درجہ۔ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی کا۔ اور زیادہ کیا اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجرِ عظیم میں۔

ذرا غور کیجئے کہ اس ترجمہ کی رو سے، نقشہ کیا سامنے آتا ہے؟ جنگ کا اعلان ہو چکا ہے۔ مومنین کی ایک جماعت سر بکف میدانِ جنگ میں پہنچ چکی ہے، لیکن انہی میں سے دوسرے لوگ، بلا عذر، اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ سوچئے کہ اس طرح، بلا عذر، گھروں میں بیٹھے رہنے والوں کو بارگاہِ خداوندی میں مومن بھی قرار دیا جائے گا؟ لیکن (مندرجہ بالا ترجمہ کی رو سے) اللہ تعالیٰ ان دونوں گروہوں کو جنگ کے حسنات کا حقدار قرار دیتا ہے، صرف مدارج میں فرق بتاتا ہے؟ اگر صورت

یہی ہے تو ہر ایک کو کیا پڑی ہے کہ محض کچھ زیادہ مدارج حاصل کرنے کے لئے جنگ میں جاتے کی صعوبات برداشت کرے اور جان تک کا خطرہ مول لے، بلکہ جان تک دے دے۔ جو تین صحابہؓ کسی وجہ سے، ایک جنگ میں پیچھے رہ گئے تھے، سورہ توبہ میں دیکھئے کہ ان پر بیتی کیا تھی؟ (قرآن کے الفاظ میں "زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ اور وہ اپنی جان تک سے تنگ آگئے تھے۔" (۹/۱۱۸)

آیت (۴/۹۵) میں لفظ قاعدین آیا ہے۔ امام راغب نے کہا ہے کہ کسی کام میں سستی کرنے والے کو "قاعد" کہا جاتا ہے۔ (لغات القرآن۔ پرویز۔ صفحہ ۱۳۷۸)۔

اس آیت میں مقابلہ تیز روؤں اور سہل انگاروں میں ہے، نہ کہ ان میں جو جنگ میں شریک ہوگئے اور وہ جو آرام سے گھروں میں بیٹھے رہے!

۴/۹۷-۱۰۰ اس کے بعد آیات (۴/۹۷-۱۰۰) میں مہاجرین اور ہجرت نہ کرنے والوں کا بیان ہے اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ آیات، مطالب الفرقان جلد سوم، صفحات ۵۲-۴۵ میں تشریحات کے ساتھ آچکی ہیں۔ انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ان آیات کو (مع اُن کے مفہوم کے) درج کر دیا جاتا ہے:-

۴/۹۷ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾

ہجرت کی اہمیت

اب رہے وہ جو غیر خداوندی نظام کے تحت اطمینان سے بیٹھے زندگی بسر کرتے اور اس طرح اپنی ذات کا نقصان کرتے رہیں۔ اگر اسی حالت میں ان کی موت آجائے، تو اُن سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم غیر خداوندی نظام کی محکومی میں پڑے رہے؟ وہ کہیں گے کہ ہم بہت کمزور و ناتوان، اور بے بس و معذور تھے۔ ان سے کہا جائے گا کہ (یہ ٹھیک ہے کہ تم میں اتنی قوت نہیں تھی کہ تم وہاں کا باطل نظام بدل کر، نظامِ خداوندی قائم کر لیتے۔ لیکن) خدا کی زمین اس قدر وسیع تھی۔ کیا تم ہجرت کر کے کسی ایسے مقام کی طرف نہیں جا سکتے تھے جہاں نظامِ خداوندی قائم تھا، یا جہاں کی فضا اس کے لئے سازگار تھی؟ یہ لوگ جو یوں اپنی کمزوری اور ناتوانی کا سہارا لے کر غیر خداوندی نظام کے تابع قانع اور مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ یہاں بھی جہنم، کہ طاغوتی نظام کی غلامی میں رہے۔ اور وہاں بھی

جہنم، کہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہی نہیں ہوئی۔

۴/۹۸ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴/۹۸﴾

البتہ ان میں وہ کمزور و ناتوان، مرد۔ عورتیں اور بچے شامل نہیں جو فی الواقعہ اس قدر معذور ہو چکے تھے کہ نہ تو انہیں وہاں تبدیلیٔ حالات پر کوئی قدرت حاصل تھی اور نہ ہی وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ کھلا تھا۔

۴/۹۹ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۹۹ ﴿۴/۹۹﴾

اس قسم کی ـــــ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی ـــــ حالت قابلِ معافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ خداوندی میں ان جیسوں کے لئے، عفو و حفاظت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

۴/۱۰۰ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ؑ ﴿۴/۱۰۰﴾

خاکِ وطن کی جاذبیت محض جذباتی چیز ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ وطن، اور نظامِ خداوندی کے کسی تقاضے میں ٹکراؤ ہو، تو اس وقت، وطن کی جاذبیت کو اس بلند مقصد کی خاطر قربان کر دینا چاہیئے۔ جو شخص، اس مقصد کی خاطر، وطن کو چھوڑ دے گا، اسے دوسرے مقامات میں بہت سی پناہ گاہیں اور کشائش کی راہیں کھلی ملیں گی۔

جو شخص، اس طرح "خدا اور رسول" کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہو، تو اس کا یہ عزم ہی اتنے بڑے اجر کا موجب بن جاتا ہے کہ اگر وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہ بھی پہنچ جائے، اور اسے راستے ہی میں موت آ جائے، تو خدا کے ہاں سے اسے پورا پورا اجر مل جاتا ہے۔ خدا کے قانون میں ایسے افراد کے لئے حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہیں۔

واضح رہے کہ یہ ہجرت ایسے مقام کی طرف ہو گی جہاں نظامِ خداوندی قائم ہو، یا اس کے قیام کے امکانات روشن ہوں ـــــ اس کو "خدا اور رسولؐ" کی طرف ہجرت کہا جائے گا۔ یونہی ترکِ وطن کا نام ہجرت نہیں۔

(ضمناً) یہاں "اللہ اور رسول" کی طرف ہجرت کرنے کا ذکر ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ مقام ہے جہاں نظامِ خداوندی قائم ہو۔ اس سلسلہ میں آیت (۴/۵۹) کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔

ہجرت سے متعلق ان آیات سے پہلے بات جنگ کی ہو رہی تھی۔ اب پھر قرآن اُسی موضوع کی طرف آتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ حالتِ جنگ میں فریضۂ صلوٰۃ کی ادائیگی کس طرح کی جائے گی۔

صلوٰۃ کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں (بالخصوص جلد اوّل صفحہ ۷۹ تا آخر) میں بھی شرح و بسط سے آچکی ہے۔ جلد سوم میں، حالتِ خوف میں، صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۱۴۱ آیات ۲/۲۳۸-۲۳۹)۔

پہلی ہدایت یہ ہے کہ حالتِ جنگ میں صلوٰۃ کو مختصر کر لیا کرو۔

۴/۱۰۱ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَوٰةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿١٠١﴾ (۴/۱۰۱)

اور جب تم (جنگ کے لئے) باہر نکلو اور تمہیں دشمن کی طرف سے ضرر رسانی کا خطرہ ہو، تو اس میں، کچھ مضائقہ نہیں کہ تم اجتماعِ صلوٰۃ کو مختصر کر لیا کرو۔ اس لئے کہ مخالفین تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ وہ ایسے مواقع کی گھات میں رہتے ہیں۔

جنگ میں صلوٰۃ

اجتماعاتِ صلوٰۃ کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ جنگ میں بھی ان کی تاکید کی گئی ہے جیسا کہ جلد اوّل صفحہ ۱۲۳ پر بتایا گیا ہے، یہ اجتماعات درحقیقت مشاورت کے لئے ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ زمانۂ امن کے مقابلے میں جنگ کے زمانے میں مشاورت کی ضرورت اور اہمیت اور بھی زیادہ شدید ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس اختصار کی صورت یوں بیان کی کہ

۴/۱۰۲ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَٰحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾ (۴/۱۰۲)

اور (اے رسولؐ!) جب تو خود اپنی جماعت کے ساتھ ہو، اور قیامِ صلوٰۃ کا انتظام کرے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ آکر تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھے۔ اور جب یہ سجدہ کر چکیں، تو تمہارے پیچھے چلے جائیں، اور دوسرا گروہ، جس نے ابھی تک صلوٰۃ ادا نہیں کی، تیرے ساتھ صلوٰۃ میں شامل ہو جائے۔ یہ بھی اسی طرح احتیاط برتیں اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھیں۔ اس لئے کہ تمہارے مخالفین تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم ذرا اپنے اسلحہ اور سامان سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔ (اس لئے تم ہتھیاروں کو حالتِ صلوٰۃ میں بھی الگ نہ کرو)۔ ہاں اگر تمہیں بارش کی وجہ سے ایسا کرنے میں کوئی دقت ہو، یا مریض ہو، تو پھر ہتھیاروں کو الگ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس صورت میں بھی اپنی حفاظت کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

ان مخالفین کے لئے، خدا کی طرف سے رسوا کن (شکست) کی سزا تیار رکھی ہے جو انہیں مل کر رہے گی۔

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے۔ حضورؐ سے کہا یہ گیا ہے کہ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ ــــــ "جہاں یہ اجتماعِ صلوٰۃ ہو رہا ہو، اگر (اے رسولؐ!) تو وہاں خود موجود ہو، اُن کی امامت کے فرائض ادا کرو"۔ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) نبی اکرمؐ جیوشِ مجاہدین کے کمانڈر۔ ان چیف بھی تھے اور اس حیثیت سے فوجوں کی قیادت فرمایا کرتے تھے۔

امامت نمائندگانِ حکومت کا فریضہ ہے

مندرجہ بالا ارشادِ خداوندی سے مستنبط ہوتا ہے کہ فریضۂ امامت، سربراہِ مملکت یا اس کی عدم موجودگی، کوئی نمائندِ حکومت سرانجام دے گا۔ یہ جو ہمارے ہاں ائمۂ مساجد کا تصور ہے، یہ مذہب کی نماز کی امامت ہے۔ دین کی صلوٰۃ کے اجتماعات کا انعقاد اسلامی حکومت کی طرف سے ہوگا، اور ان کی امامت بھی عمالِ حکومت کا فریضہ ہوگی۔ جن اجتماعات میں اہم امورِ مملکت سے متعلق مشاورت مقصود ہوگی، انہیں خود سربراہِ مملکت یا دیگر نمائندگانِ حکومت ہی (CONDUCT) کر سکتے ہیں۔

اس آیت میں جنگ کی سی ہنگامی حالت میں، مختصر شکل میں، صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ عام حالات میں اس کی ادائیگی کا نہیں۔ اس کے بعد ہے:-

۴/۱۰۳ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ

كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ (۴/۱۰۳)

جب تم اس طرح صلوٰۃ ختم کر چکو (تو یہ نہ سمجھ لو کہ تم فریضۂ خداوندی سے سبکدوش ہوگئے۔ صلوٰۃ تو تمہاری ساری زندگی کو محیط ہے۔ جو کچھ تم نے اس وقت کیا ہے وہ مؤقت اجتماع میں شرکت ہے جو کلّی صلوٰۃ کا ایک جزو ہے اس لئے تم اس کے بعد بھی) اُٹھتے بیٹھتے لیٹے ہر وقت اور ہر حال میں، قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھو (جیساکہ ۳/۱۹۰ میں کہا جا چکا ہے)

ذکر اللہ سے مراد

اس میں دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ "ذکر اللہ" نماز تک محدود نہیں۔ یہ مومنین کی ساری زندگی کو محیط ہے، جیساکہ آیات (۳/۱۹۰-۱۸۹) میں گزر چکا ہے۔ سابقہ جلدوں میں جو کچھ ذکر کے متعلق کہا گیا ہے (دیکھئے ان جلدوں کا انڈکس)۔ اس سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہ "ذکر" نہیں جس سے "قلب پر ضربیں" لگائی جاتی ہیں۔ اس سے مراد زندگی کے ہر گوشے میں، ہر معاملہ میں، قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا ہے صلوٰۃ کا اجتماع اس کلّی ذکر کا ایک گوشہ ہے۔

سورہ جمعہ میں کہا گیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ (۶۲/۹) "اے جماعتِ مومنین! جب صلوٰۃ جمعہ کے لئے تمہیں آواز دی جائے تو اپنا کاروبار چھوڑ کر "ذکر اللہ" کی طرف لپک کر آجایا کرو۔ اس کے بعد ہے، فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (۶۲/۱۰) "جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر جہاں جی چاہے چلے جاؤ، اور تلاشِ معاش میں لگ جاؤ۔ لیکن وہاں بھی ذکر اللہ کو فراموش نہ کرو، بلکہ اور زیادہ شدت کے ساتھ اس پر عمل کرو۔ یہی فلاح اور کامیابی کی راہ ہے"۔ اس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ بھی ذکر اللہ کے لئے ہے اور ذکر اللہ کاروبارِ زندگی کے ہر گوشے میں جاری و ساری رہتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنا۔ اُن کے مطابق عمل کرنا۔

جمعہ کے دن کی چھٹی

(ضمناً) یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن چھٹی کرنا شریعت کا حکم ہے۔ یہ تو ہمیں پتہ نہیں کہ یہ کونسی "شریعت" کا حکم ہے، لیکن یہ تو واضح ہے کہ اُس دن کاروبار بند رکھنا قرآن کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب صلوٰۃ جمعہ کے لئے آواز دی جائے تو کاروبار چھوڑ کر اجتماعِ صلوٰۃ میں شرکت کے لئے لپک کر آجایا کرو۔ اس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ جمعہ سے پہلے کاروبار جاری رہے گا۔

اس کے بعد ہے کہ جب صلوٰۃ جمعہ ختم ہو جائے تو پھر کاروبار میں مصروف ہو جاؤ۔ اس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ جمعہ کے بعد بھی کاروبار بند نہیں ہوگا۔ کاروبار صرف صلوٰۃ کے وقت تک کے لئے بند رہے گا۔

آیت (۴/۱۰۳) میں صلوٰۃ کو مُوقت فریضہ قرار دیا گیا ہے یعنی یہ وہ فریضہ ہے جو وقتِ مقررہ پر ادا کیا جائے گا۔ جیسا کہ جلد اوّل میں بتایا جا چکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اجتماعات کے لئے جو وقت بھی مقرر کیا جائے (خواہ وہ اجتماعات

فریضۂ مؤقت کے معنی

ہنگامی ہوں اور خواہ نارمل ——— معمول کے مطابق) ان میں بروقت شرکت نہایت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے وقت کی پابندی نہایت ضروری ہے خواہ وقت کسی مقصد کے لئے بھی کیوں نہ مقرر کیا جائے۔ جو قوم وقت کے معاملہ میں سہل انگار یا لاپرواہ ہوتی ہے، وہ کاروبارِ حیات میں ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔ (جیسی کہ ہماری حالت ہے)۔ ہمارے ہاں نہ وقت کی کوئی قدر و قیمت ہے نہ مقررہ وقت کی پابندی کی کوئی اہمیت۔ اور اس کا جو نتیجہ ہے، وہ ظاہر ہے۔ مغرب کی قومیں وقت کی پابندی سے کہیں کی کہیں جا پہنچی ہیں۔ سوچیئے کہ زندگی کیا ہے؟ یہ وقت کے لمحات کے تسلسل ہی کا تو نام ہے۔ وقت کی اہمیت کے احساس کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور جب زندگی کی اہمیت ختم ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے قرآنِ کریم نے "مُوقتِ فریضہ" کہہ کر کتنی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں (PUNCTUALITY) پر زور دیا گیا ہے۔

اجتماعاتِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں ان ہدایات کے بعد، قرآنِ کریم پھر جنگ کے موضوع کی طرف آ گیا اور فرمایا:۔

۴/۱۰۴ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴/۱۰۴)

جنگ کے متعلق ہدایات

اور دیکھو! میدانِ جنگ میں دشمن کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو۔ بات بالکل واضح ہے۔ اگر (لڑائی میں) تمہیں کچھ مشقت اٹھانی پڑتی ہے تو فریقِ مخالف کو بھی اسی طرح مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ (للہذا، اس باب میں، تم اور وہ برابر ہو) لیکن نظامِ خداوندی کے قیام سے جو ثمرات و برکات تمہیں حاصل ہوں گی، وہ، انہیں تو حاصل نہیں ہوں گی، (اس لحاظ سے تم ان کے مقابلہ میں، کہیں زیادہ فائدے میں رہے)۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون، جو تمہیں اس قسم کے تاکیدی احکام دیتا ہے، یونہی اندھا دھند

ایسا نہیں کرتا۔ یہ احکام علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

جنگ یا دیگر کاروبارِ حیات کے سلسلہ میں کبھی کبھی "ذکر اللہ" کی یاد دہانی کی اہمیت کو ایک (پیش پا افتادہ سی) مثال کی رو سے سمجھئے۔ آپ نے کسی بڑھئی کو کام کرتے دیکھا ہوگا۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے کرتے، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد، اپنے اوزاروں (رندہ، چوکسی، آری وغیرہ) کو تیز کرنے لگ جاتا ہے۔ اوزاروں کا اس طرح تیز کرنا اس کے کام ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے بلکہ یوں کہیئے اس کام کے بطریقِ احسن سرانجام دینے کا ذریعہ۔ کاروبارِ زندگی کے دوران وقتاً فوقتاً قوانینِ خداوندی کی تجدیدِ یادداشت، کا مقصد یہی ہے کہ ہم جملہ امور ان قوانین کے مطابق سرانجام دیں۔

ذکر اور نوافل کا غلط مفہوم

لیکن آپ سوچئے کہ اگر آپ کسی بڑھئی کو دروازہ بنانے کے لئے روزانہ اُجرت پر متعین کریں اور سارا دن اپنا رندہ تیز کرنے میں صرف کر دے تو کیا آپ شام کو اسے مقررہ اُجرت دے دیں گے؟ آپ نے اُجرت دروازہ بنانے کی دی تھی۔ رندہ تیز کرنا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ جب اس نے وہ مقصد پورا نہیں کیا تو وہ معاوضہ کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ جو ہمارے ہاں بڑے بڑے متقی (خدا رسیدہ بزرگوں) کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے عبادت گزار ہیں۔ ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھتے ہیں اور دن میں لاکھ لاکھ دانے کی تسبیح پر وظیفہ کرتے ہیں۔ تو یہ سارا دن "رندہ تیز" کرتے رہنے والی بات ہوگی، دروازہ بنانے والی نہیں۔ ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ دین میں، شعائر اور "عبادات" ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مذہب میں ان کی ادائیگی مقصود بالذات بن جاتی ہے۔ جلد سوم میں حبط اعمال کا عنوان دیکھئے (صفحہ ۳۰۷) اور غور کیجئے کہ قرآن کریم اس حقیقت کو کیسے واشگاف انداز میں اجاگر کرتا ہے۔ اعمال کے بامقصد ہونے کا معیار قرآن کی رُو سے یہ ہے کہ

وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط (۱۳/۱۷)

بقا اس عمل کے لئے ہے جو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے ہو۔

جنگ ہو یا حالتِ امن، سربراہِ مملکت اور دیگر اربابِ حل و عقد کے سامنے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات آتے رہتے ہیں۔ ان کے فیصلوں کے متعلق اصولی حکم یہی ہے، کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق کئے جائیں۔ اس لئے حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

کتاب اللہ کے مطابق فیصلے

۴/۱۰۵ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ

النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۙ (۴/۱۰۵)

اے رسول! تمہاری طرف یہ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے نزاعی امور کے فیصلے اس علم کے مطابق کرو جو اللہ نے تمہیں اس طرح عطا کیا ہے۔ اور ایسا کبھی نہ کرو کہ دغاباز اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔

اس نکتہ کی وضاحت کہ تمام اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جائیں گے؛ مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر کی جا چکی ہے (بالخصوص دیکھئے جلد سوم، صفحہ ۹۔ آیت ۲/۱۱۳)۔ اس لئے اس کی مزید تشریح

خائنین کی وکالت مت کرو

کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا آیت زیرِ نظر کا آخری حصہ، سو اسی کے متعلق، آیت (۴/۱۰۷) کے تحت بحث کی جائے گی۔

یہ حکم دینے کے بعد (کہ معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جائیں گے) ایک ایسی اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی جو ہر فیصلہ کرنے والے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ فرمایا:

۴/۱۰۶ وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ (۴/۱۰۶)

حکومت اور عدالت کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس میں انسان کے ذاتی میلانات، فیصلوں پر اثرانداز ہو جایا کرتے ہیں۔ اس سے انسان اُسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ وہ، ہر وقت، قانونِ خداوندی کو اپنے ساتھ رکھے، اور اسی کے پیچھے پناہ لے۔ تم اسی طرح، اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے ہو۔ قانونِ خداوندی میں ایسی حفاظت اور مرحمت کا پورا پورا انتظام ہے۔

یہی ہے وہ احساس جس کی رو سے، ایک مومن جج اپنے فیصلوں میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ وہ دوسروں کے معاملات کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے کرتے وقت، اس کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے کہ خود اس کا پاؤں جادۂ عدل سے اِدھر اُدھر نہ ہٹ جائے۔ دوسری ہدایت ان لوگوں کے لئے ہے جو ملزم کے ساتھ کھڑے ہوتے، اس کے حق میں گواہی دینے یا صفائی پیش کرنے کے لئے عدالت میں آئیں۔ ان سے کہا کہ:

۴/۱۰۷ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙ (۴/۱۰۷)

اس بات کو پھر سمجھ لو کہ جب ایک دوسرے سے، یا خود اپنی ذات سے، خیانت کرتے ہیں ان کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہو۔ خیانت کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس سے اسے کچھ مل گیا ہے، حالانکہ، اس سے

اس کی ذات میں ایسی کمزوری آجاتی ہے جس سے اس کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ (اسی کو خود اپنی ذات سے خیانت کہتے ہیں)۔ سو ایسے لوگ قانونِ خداوندی کی نگاہ میں کیسے پسندیدہ قرار پاسکتے ہیں؟

آیت (۴/۱۰۵) میں کہا تھا کہ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا۔ اور اب کہا گیا ہے کہ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خیانت دو قسم کی ہے۔ ایک خیانت دوسروں کے خلاف ہوتی ہے اور دوسری خیانت، انسان کی خود اپنی ذات کے خلاف۔ دوسروں کے خلاف خیانت تو کھلی ہوئی بات ہے لیکن خود اپنی ذات کے خلاف خیانت کو بھی اسی زمرہ میں شمار کرنا، قرآن ہی کا خاصہ تھا۔

خیانت، امانت کی ضد ہے۔ امانت کا مفہوم مطالب جلد سوم صفحہ ۱۶۴۔ آیت (۴/۵۸) میں بتایا جاچکا ہے تجدیدِ یادداشت کے لئے واضح کر دیا جائے کہ لفظ امانت کا مادہ امن ہے اس لئے امانت کے معنی ہونے ہیں کسی کے ساتھ کوئی بات یا کوئی معاملہ کر کے، اپنے آپ کو کامل امن اور اطمینان کی حالت میں پانا۔ یعنی دوسرے پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہونا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ کبھی اس کے خلاف نہیں کرے گا اور مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ مجھے اس کی طرف سے کسی خطرہ یا نقصان کا احتمال نہیں۔

اس کے برعکس خیانت ہے۔ یعنی کسی کے اعتماد کو توڑ دینا۔ بدعہدی کرنا۔ جو بھروسہ اس نے تم پر کیا تھا، اس پر پورا نہ اترنا۔ عرب اس اعتماد شکنی کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کرتے تھے اور شاید آج بھی کرتے ہوں۔ وہ کہتے ہیں خَانَ الدَّلْوَ الرِّشَاءُ "رسی نے ڈول سے خیانت کی"۔ اب تو ہمارے کنوئیں ہی ناپید ہو گئے ہیں اس لئے ہماری

خیانت کا مفہوم

نئی پود کی سمجھ میں یہ مثال بمشکل آسکے گی۔ لیکن پرانے لوگ جانتے ہیں کہ کنوئیں سے ڈول کے ذریعے پانی نکالا جاتا تھا اور ڈول کے ساتھ رسی بندھی ہوتی تھی۔ پانی سے بھرا ہوا ڈول خاصا وزنی ہو جاتا ہے۔ اسے ہم اس بھروسے پر کھینچتے چلے جاتے ہیں کہ رسی اتنی مضبوط ہے کہ یہ ٹوٹ نہیں جائے گی۔ لیکن ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ آپ پورے زور سے ڈول کھینچ رہے ہیں کہ عین درمیان میں رسّی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس سے ڈول کا پانی میں گرنا تو ایک طرف، بسا اوقات ڈول کھینچنے والا بھی کنوئیں میں گر جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں رسّی کے اس عمل کو خیانت کہتے ہیں۔ یعنی رسّی کے جس اعتماد پر ڈول کو کھینچا جا رہا تھا، اس نے اس اعتماد کو پورا نہ کیا۔ اس نے خیانت کی۔

اس سے خیانت کا پورا پورا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ جس معاشرہ میں ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہے، اس میں تمام معاشرہ جس عدمِ اطمینان کے جہنم میں زندگی بسر کرتا ہے، اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

یہ تو رہا دوسروں کے ساتھ خیانت کا معاملہ۔ جہاں تک خود اپنی ذات کے خلاف خیانت کا تعلق ہے، وہ معاملہ بڑا ہی نازک ہے۔ آپ اپنے ساتھ وعدہ کرتے ہیں "میں جھوٹ نہیں بولوں گا" اور اس کے بعد آپ اس عہد پر قائم نہیں رہتے یہ اپنے ساتھ خیانت ہے۔ اس سے آپ کی خود اعتمادی باقی نہیں رہتی۔ اس سے آپ کی قوتِ ارادی کمزور ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں خود اعتمادی نہ ہو، اس پر دوسرے کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟ اور قرآن کریم تو خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ (۴۰/۱۹) نگاہ کی خیانت تک کو انسان کا خود اپنے خلاف جرم قرار دیتا ہے۔ جذباتی "مجبوریاں" نگاہوں کی خیانت کا موجب بنتی ہیں۔ اور یہ "مجبوریاں" درحقیقت قوتِ ارادی کی کمزوری کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ جگر نے اس دزدیدہ نگہی کو کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے جیسا کہا ہے کہ

کس قدر حُسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ، آہ! سر جھکائے نہ بنے، آنکھ اٹھائے نہ بنے

خیانت قوتِ ارادی کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، یا (بالفاظ دیگر) خیانت سے قوّتِ ارادی کمزور اور مضمحل ہو جاتی ہے دیکھئے قرآن کریم نے یہ کہہ کر "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا" اس حقیقت کو کس طرح واشگاف کیا ہے اثم کے معنی ہیں ہر وہ کام جو اضمحلال۔ افسردگی اور کمزوری پیدا کر دے۔ (دیکھئے لغات کس میں اثم) خوّان (جس پر بھروسہ نہ کیا جا سکے) اثیم ہوتا ہے!

یہ تو رہا خائن۔ قرآن کہتا ہے کہ خیانت کرنے والے کی حمایت اور وکالت کرنے والا بھی برابر کا مجرم ہوتا ہے۔ اور یہاں سے قرآن کریم کے نظامِ عدل کا ایک اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔

یوں تو خلافِ قرآن نظام (باطل) کا ہر گوشہ جہنم آغوش ہوتا ہے لیکن اس میں نظامِ عدل کو خاص اہمیت حاصل ہے اس نظام کے غلط (یعنی قرآن کے خلاف) ہونے سے معاشرہ کا سارا توازن بگڑ جاتا ہے اور کوئی شے بھی اُس مقام پر نہیں رہتی جس مقام پر اسے ہونا چاہیئے (اسے ظلم کہتے ہیں)۔ اس باطل نظام میں وکالت کا پیشہ بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ بس میں

وکالت کا پیشہ

وکیل کو مقدمہ لینے سے غرض ہوتی ہے۔ وہ خائن اور امین (حقدار اور غیر مستحق۔ ظالم اور مظلوم) میں تمیز نہیں کرتا۔ بلکہ امین کے مقابلہ میں خائن کا مقدمہ زیادہ پُرکشش ہوتا ہے۔ بڑے بڑے نامور وکلاء کی خصوصیت ہی یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سنگین ترین جرائم کے مجرموں کو بھی چھڑا لیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب اس قسم کے فرائض ذریعۂ معاش بن جائیں تو اس سے تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ (یہاں سے پھر نظامِ عدل کے ڈانڈے معاشی نظام سے جا ملتے ہیں)۔

قرآنی نظامِ عدل میں وکلاء کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ (خائن کی کوئی وکالت نہیں کر سکتا اور امین کو کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہوتی)

یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی جہاں قرآن کے نظامِ عدل کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوگی۔

اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجرم اگر وکالت کے زور پر مواخذہ سے بچ بھی جائے۔ یا غیر مستحق اپنے حق میں فیصلہ لے لے تو اسے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مواخذہ سے بچ گیا۔ وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔ اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ ان دنیاوی عدالتوں سے اوپر ایک اور عدالتِ عالیہ بھی ہے جس میں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ اس عدالت میں نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے۔ نہ کسی کی وکالت کا کوئی زور چل سکتا ہے۔ فرمایا:

۴/۱۰۸ يَّسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمۡ اِذۡ يُبَيِّتُوۡنَ مَا لَا يَرۡضٰى مِنَ الۡقَوۡلِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطًا ۔ (۴/۱۰۸)

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم، اپنے جرائم، لوگوں سے چھپا سکتے ہیں، اس لئے ہم پر کیا گرفت ہوگی؟ لیکن یہ خدا کے قانون کی نگاہوں سے کیسے چھپ سکتے ہیں؟ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ چھپ کر، ناپسندیدہ امور کے متعلق مشورے کرتے ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔ (۴/۱۹)

یہ تو رہا مجرموں کے متعلق۔ اب ان کی وکالت کرنے والوں کے متعلق کہا:

۴/۱۰۹ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَۤاءِ جَادَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فَمَنۡ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ يَّكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا ۔ (۴/۱۰۹)

قانونِ مکافات کے علی الرغم وکالت کیا کر سکتی ہے

(یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات ایسا نہیں کہ اس کا سلسلہ صرف اسی دنیا تک محدود ہو کہ اگر کسی نے ایسا انتظام کر لیا کہ وہ یہاں قانون کی گرفت سے بچ جائے، تو وہ مواخذہ سے چھوٹ گیا۔ بالکل نہیں، ہر جرم کا اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوتا ہے (۴/۱۱۱)۔ اور انسانی ذات اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی اس کا سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ اس لئے انسان کے اعمال کے نتائج مرنے کے بعد بھی سامنے آجاتے ہیں۔ بنابریں) اگر تم کسی مجرم کے طرفدار بن کر، اس کی طرف سے، اس دنیاوی زندگی میں جھگڑتے ہو؛ اور اسی طرح اسے غلط بیانیوں سے، قانون کی گرفت سے بچا بھی لیتے ہو، تو، یہ بتاؤ کہ اس کے اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت، اس کی طرف سے کون جھگڑ سکے گا، اور کون اس کی وکالت کے لئے کھڑا ہو سکے گا؟

اس مواخذہ کے نقصان سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے۔

۴/۱۱۰ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡۤءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۔ (۴/۱۱۰)

تم اس محکم اصول کو یاد رکھو کہ جرم کسی اور کے خلاف سرزد ہو، یا خود اپنی ذات کے خلاف (مثلاً قلب و نگاہ کی خیانت۔ برے ارادے تخریبی اسکیمیں وغیرہ) تو، تم دنیاوی قانون کی گرفت میں آجاؤ یا اس سے بچ جاؤ۔ قانونِ خداوندی کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتے۔ اس خطا کے ازالے کی صرف ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تم اپنے کئے پر نادم ہو۔ آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر و (۴/۱۱۰)۔ اور جتنا بڑا تم نے جرم کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ بھلائی کے کام کرو (۱۱/۱۱۴)۔

جرم خود اپنے خلاف

توبہ اور مغفرت کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات دیکھ لیجئے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے چار لفظوں میں ایک ایسا اصول بیان کیا ہے۔ جو جرم و سزا کے فلسفہ اور علم النفس کے رموز و اسرار کے سلسلہ میں اساس محکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز اس پر خدا کے قانونِ مکافات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ کسی کے خلاف زیادتی کرنے والا بزعم خویش سمجھتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے خلاف زیادتی کر رہا یا کسی اور کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ لیکن وہ اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھے تو اس پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی کہ وہ کسی دوسرے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے خلاف جرم کر رہا ہوتا ہے۔ اس سے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔

۴/۱۱۱ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔ (۴/۱۱۱)

اسے پھر سن لو کہ جو شخص جرم کرتا ہے، اس جرم کا اثر خود اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جرم دوسروں کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت، خود اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے ——— اور اس کا اثر، خدا کا قانون ہی زائل کر سکتا ہے جو علم و حکمت پر مبنی ہے۔ (معاشرہ کا نظام عدل، جرم کی جو سزا دے گا اس سے اس نقصان کا ازالہ تو ہو سکے گا جو اس جرم سے مستغیث یا معاشرہ کو پہنچا۔ لیکن اس کا جو نقصان خود مجرم کی ذات کو پہنچا اس کا ازالہ وہ خود ہی کر سکتا ہے۔ یعنی قلبی ندامت اور زیادہ سے زیادہ حسنات (اچھے کاموں) کے ذریعے (۱۱/۱۱۴)

اس حقیقت پر ایمان رکھنے والا مومن کہلاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جس کا اس حقیقت پر ایمان ہو وہ کبھی کسی جرم کے ارتقاب کا خیال تک بھی دل میں لا سکتا ہے؟ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ معاشرہ جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی ہے وہ ایمان جو قرآن کے نظام عدل کی بنیاد قرار پاتا ہے۔

غالبؔ خدا سے "ناکردہ گناہوں" کی حسرت کی داد چاہتا تھا۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔۔۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ملے

یہ محض شاعری ہے ۔ جیسے وہ ناکردہ گناہ کہتا ہے ۔ وہ کسی دوسرے کے خلاف سرزد نہ بھی ہونے پائے ہوں لیکن وہ خود اپنی ذات کے خلاف تو سرزد ہو جاتے ہیں ۔ جس جرم (گناہ) کی خواہش آپ کے دل میں پیدا ہوگئی اگر کسی وجہ سے اس کا ارتکاب نہیں ہو سکا تو بھی آپ کی ذات کے خلاف اس کا ارتکاب ہو گیا ۔ اس پر اس کا اثر پڑ گیا ۔ اس سے اس نے اپنا نقصان کر لیا ۔ اور جو اپنا نقصان اس نے خود آپ کیا ہے اس کا ازالہ بھی وہ خود ہی کر سکتا ہے ۔

جرم خود کرے اور اسے تھوپ دے دُوسروں کے سر

ایک طرف تو یہ لوگ ہیں کہ جس جرم کا انسان کے دل میں خیال تک بھی آگیا (حالانکہ وہ سرزد نہیں ہوا) وہ اپنے آپ کو اس کا بھی مجرم گردانتے ہیں ۔ اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو جرم کے مرتکب خود ہوتے ہیں لیکن اسے تھوپ دیتے دوسروں کے سر ۔ اس سے وہ دوسرے جرم کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں ۔

۴/۱۱۲ وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ خَطِيۡٓـئَةً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ يَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡٓــًٔا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۔ (۴/۱۱۲)

اس بنیادی حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد، تم سوچو کہ اگر کوئی شخص جرم یا خطا خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی دوسرے بے گناہ کے سر، تو یہ، بجائے خویش کتنا بڑا جرم ہے ۔ اسی طرح وہ اپنے اوپر دوہرا بوجھ لاد لیتا ہے ۔ ایک تو اس جرم کا بوجھ جو اس سے سرزد ہو گیا تھا، اور دوسرا اس بہتان کا بوجھ جو اس نے دوسرے پر لگا دیا ۔

اس قسم کے بلند و بالا اصولوں پر مبنی ضابطہ ہدایت کا مل جانا ، فی الحقیقت خدا کا فضل عظیم اور اس کی رحمت عمیم ہے انسانوں کا وضع کردہ ضابطہ قوانین ظاہر اور مرئی جرائم تک کو محیط ہو سکتا ہے ۔ انسانی جذبات پر کنٹرول ان کے بس کی بات نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے جو انسانی نظام عدل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عدل کی کارفرمائی ارتکاب جرم کے بعد شروع ہوتی ہے ۔ جو جرم سرزد نہیں ہوا وہ عدل کی دسترس سے باہر ہوتا ہے ۔ لیکن قرآنی قانون مکافات پر ایمان رکھنے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی جرم کا خیال تک بھی ان کے دل میں گزر رہا ہو تو اپنے آپ پر خود سزا وارد کر لیتے ہیں ۔ اس قسم کا ضابطہ عدل خدا ہی کی طرف سے مل سکتا تھا ۔

۴/۱۱۳ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهٗ لَهَمَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّضِلُّوۡكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَضُرُّوۡنَكَ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۴/۱۱۳)

یہ تو خدا کا خاص فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہیں اس قسم کا ضابطۂ ہدایت دے دیا جس میں ان تمام امور کے متعلق واضح ہدایت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین خداوندی کی علم اور حکمت، غرض اور غایت کیا ہے؛ اور اس طرح تمہیں وہ کچھ سکھا دیا جو تم (تنہا عقل کی رُو سے) کبھی نہیں سیکھ سکتے تھے۔ اگر تم پر خدا کا یہ فضل نہ ہوتا تو منافقین کا ایک گروہ اس کا تہیّہ کر چکا تھا کہ تمہیں صحیح راستے سے بھٹکا دے۔ اب اس قسم کے ارادوں سے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خود اپنے لئے سامانِ ہلاکت بہم پہنچاتے ہیں۔

اور خدا کا یہی فضل اور رحمت تھی جس نے اس جماعت مومنین کو منافقین کی ریشہ دوانیوں اور وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رکھا ورنہ یہ حربہ ایسا تھا جس کی مدافعت انتہائی مشکل تھی۔ ان کی ان سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

۴/۱۱۴ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴/۱۱۴)

یہ منافقین (جماعت مومنین سے الگ ہو کر) باہمی مشورے کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ مشورے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی بھلائی کی بات نہیں ہوتی۔ مشورے وہی اچھے ہوتے ہیں جو رفاہِ عامہ کے کسی کام کے لئے عطیات دینے کے لئے ہوں۔ یا معاشرے کے ان کاموں کے متعلق جنہیں قانون صحیح تسلیم کرے یا لوگوں کی اصلاح کی خاطر ہوں۔ جو لوگ ایسا کریں ——— اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس میں ذاتی مفاد کا خیال نہ ہو، خالصۃً لوجہ اللہ ہو۔ تو ایسے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ خوشگوار ہوگا اور، انہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔

مشوروں کا مقصد

نجویٰ کے معنی ہیں عام لوگوں سے الگ ہٹ کر رازدارانہ طور پر مشورہ کرنا۔ اسلامی نظام کا کاروبار باہمی مشاورت سے عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس مشاورت میں بعض اوقات ایسے امور بھی آجاتے ہیں جنہیں سر دست عام نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے لئے کھلے بندوں کے بجائے (PRIVATE) میٹنگز کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ خیر (نوع انسان کی منفعت اور بھلائی) کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس منافقین جو میٹنگز کرتے ہیں تو وہ خفیہ سازشوں کے طور پر ہوتی ہیں۔ وہ خیر نہیں، شر ہے۔ دیکھئے! مقصد کا فرق ایک ہی عمل کو کس طرح خیر سے شر اور شر سے خیر بنا دیتا ہے۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کو متنبہ کر دیا کہ وہ منافقین کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر ان کی سازشوں کو کامیاب بناتے

ہیں ان کے معاون و مددگار نہ بن جائیں۔ اس سے اسلامی نظام کو سخت نقصان پہنچے گا۔

۴/۱۱۵ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ (۴/۱۱۵)

اور جو شخص ایسی واضح راہنمائی کے بعد بھی الرسول (اسلامی نظام) کی مخالفت میں شریک ہو جائے اور جو راستہ جماعت مومنین (اسلامی نظام) باہمی مشورہ سے طے کرے (۴۲/۳۸) اس کے خلاف جائے اور مخالفین کی راہ اختیار کرے تو جو راہ اس نے اختیار کی ہے وہ جس منزل تک پہنچائے گی وہ وہیں پہنچے گا۔ یعنی جہنم میں جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔

ہمیں اس قسم کی آیات کے سمجھنے میں جو دقت پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے ایک جماعت (یا امت) کی تشکیل فرمائی جو حقیقی مومنین پر مشتمل تھی۔ بعض سازشی مسلمانوں کا بہروپ بدل کر ان میں شریک ہو جاتے تھے۔ لیکن جب وہ اپنی کرتوتوں سے بے نقاب ہو جاتے تو انہیں اس جماعت سے نکال دیا جاتا تھا۔

لیکن ہماری آج حالت یہ ہے کہ ہم صدر اوّل کی جماعت مومنین کی طرح ایمان خالص اور عمل صالح کی بنیاد پر کسی جماعت (یا امت) کے افراد نہیں بنے۔ ہم مسلمان نام رکھانے والی قوم میں پیدا ہو گئے اس لئے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہم (مسلمانوں) میں اور صدر اوّل کی جماعت مومنین میں بنیادی فرق ہے۔ قرآن کریم نے جو عیوب و ذمائم مشرکین، کفار، منافقین، اہل کتاب کے گنائے ہیں وہ سب ہم میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم میں جماعت مومنین کی راہ اور مسلمانوں کی راہ الگ الگ ہیں۔ یہاں جماعت مومنین کی راہ سے ہی نہیں اس لئے اس راہ کو چھوڑ کر نئی اور دوسری راہ کو اختیار کر لینے کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ ہم (من حیث القوم) جہنم کی طرف لے جانے والے راستے پر چل رہے ہیں کیونکہ ہم نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔

سبیل المومنین

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ جو "غیر سبیل المومنین" اختیار کرے گا وہ جہنم میں جائے گا تو ہمارے ہاں اس کے عجیب و غریب معنی لئے جاتے ہیں۔ یہاں ہر فرقہ اپنے مسلک کو سبیل المومنین قرار دیتا ہے اور دوسرے فرقوں کے مسالک و مشارب کو غیر سبیل المومنین ٹھہراتا ہے۔ جو فرقہ آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سبیل المومنین سے مراد مسلمانوں کی اکثریت کا راستہ ہے۔ یعنی وہ مومنین اور غیر مومنین کی راہوں کا تعین مردم شماری کے حساب سے کرتا ہے۔ اور قرآن سرے سے فرقوں کے وجود ہی کو شرک قرار دیتا ہے۔

اس آیت میں سبیل المومنین سے مراد یہ ہے کہ اسلامی نظام میں باہمی مشاورت سے جو فیصلہ کیا جائے اس کا

اتباع جماعت کے تمام افراد کے لیے لازمی ہوتا ہے (اس کو اجماع امت کہا جائے گا) جو شخص اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار اس جماعت میں نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی روش تو اسلامی نظام کے خلاف بغاوت ہو گی۔ یہ مراد ہے "سبیل المومنین" سے نہ کہ موجودہ مسلمانوں کے کسی فرقہ کی راہ، یا ان کی اکثریت کی راہ۔ ہماری اکثریت جس راستے پر آ چکی ہے۔ اس کے متعلق کچھ نہ کہنا بہتر ہے۔

بات منافقین کی ہو رہی تھی۔ منافقت کے متعلق ہمارے ذہن میں اتنا ہی ہے کہ دل میں کچھ اور اور ظاہر میں کچھ اور۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس دو رخی پالیسی کا جذبہ محرکہ کیا ہوتا ہے؟ مفاد پرستی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ تمہارے ساتھ رہنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ اور جب دیکھتے ہیں کہ تمہارے مخالفین کے ساتھ

منافقت شرک ہے

مل جانے سے زیادہ فائدہ کی توقع ہے تو اُدھر چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی لطیف نگہی پر غور کریں کہ وہ اسے بھی شرک قرار دیتا ہے۔ یعنی اپنے مفاد کی خاطر آقاؤں کو بدلینا۔ اور یہ میزانِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اس لئے کہا کہ:

(۴/۱۱۶) إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا۔ (۴/۱۱۶)

غور سے دیکھو تو صاف نظر آ جائے گا کہ منافقین کی یہ روش درحقیقت شرک کے مرادف ہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو گا کہ جن باتوں میں تمہیں فائدہ نظر آئے، ان میں خدا کے قانون کا اتباع کرو اور اس جماعت کے ساتھ ساتھ چلو جو اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے عمل پیرا ہے۔ لیکن جب اپنا مفاد، کسی دوسرے طریق میں نظر آئے، تو اس جماعت اور نظام کا ساتھ چھوڑ دو، جھٹ دوسری راہ اختیار کرو۔

انسان کی معمولی لغزشیں اور خطائیں قابلِ معافی ہوتی ہیں، اور جو شخص (قانون کے مطابق) معافی چاہے، اسے معافی مل سکتی ہے۔ لیکن شرک ایسا جرمِ عظیم ہے جس سے معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ (۴/۴۸) - یہ تو خدا کے مقابلہ میں متوازی حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ روش، انسان کو صحیح راستے سے دور لے جاتی ہے ——— بہت ہی دُور۔

قابلِ اعتماد وہی انسان ہوتا ہے جو اصول پرست ہو۔ لیکن اس کے برعکس جذبات (مفاد) پرست انسان پر بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر یہ لوگ جن لوگوں کے ساتھ جا ملتے

ہیں- ان کا سہارا بھی بڑا کمزور ہوتا ہے- ان دونوں کے دل میں چور ہوتا ہے- اس لئے وہ ایک دوسرے سے بھی مخلص نہیں ہوتے -

۴/۱۱۷ إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا - (۴/۱۱۷)

اس طرح شرک کرنے والے، خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے اور ان کے پیچھے چلتے ہیں ——— خواہ وہ خود اپنے جذبات ہوں (۲۵/۴۳) یا مذہبی پیشوا (۹/۳۱) وہ بے حد بودے ہوتے ہیں- ان میں کوئی قوت نہیں ہوتی- علاوہ بریں، قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی کوششیں، صحیح نتائج وثمرات سے محروم رہتی ہیں- (۵/۲)

شیطان مرید اس آیت میں شیطان کو مرید کہا گیا ہے- (میم کے زبر کے ساتھ) اس کے معنی سرکش کے بھی ہیں اور اس درخت کے بھی جس کے پتے نہ ہوں- جو "ٹنڈمنڈ" رہ گیا ہو- اس نہج سے میں نے اسے شاخ خزاں دیدہ سے تعبیر کیا ہے- مفہوم اس کا ہر قسم کی خوشگواریوں سے محرومی ہے- شیطان کو جو لعین اور رجیم کہا گیا ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں- لعنت کے اعتبار سے اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی ہے- یعنی

۴/۱۱۸ لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا - (۴/۱۱۸)

شاخ خزاں دیدہ یا بنجر زمین کی طرح محروم ——— اور تمہیں معلوم ہے کہ ان کے مذہبی پیشوا، انہیں ان راستوں کی طرف کیوں لے جاتے ہیں؟ محض اس واسطے کہ خدا کے بندوں کی کمائی میں سے، ایک مقررہ حصہ (مفت میں) خود لے لیں ——— چند پیسوں کی خاطر اتنی بڑی قبیح حرکت! کیسی ملعون ہے یہ زندگی اور کتنے مذموم ہیں یہ مقاصد؟

مذہبی پیشوا اس سے واضح ہے کہ یہاں شیطان کا کردار مذہبی پیشوا ادا کرتے ہیں جنہوں نے مذہب کو ذریعہ معاش بنا رکھا ہے- وہ عوام کو اپنے دام فریب میں ماخوذ رکھنے کی خاطر انہیں طرح طرح کی توہم پرستانہ رسوم میں الجھائے رکھتے ہیں-

۴/۱۱۹ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا - (۴/۱۱۹)

توہم پرستی انہوں نے یہ غلط راہیں ——— باطل عقائد اور توہم پرستانہ رسومات تجویز کر رکھی ہیں محض اپنی ذاتی منفعت کی خاطر، لیکن لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مرادیں پوری ہو جائیں گی-

اُن کی آرزوئیں برآئیں گی اس کے لئے کبھی ان سے کہتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے جانوروں کے کان چیرا کریں۔ اور کبھی یہ کہ وہ اشیائے فطرت میں یوں تغیر و تبدل کر دیا کریں ــــــ وہ اپنے مفاد کی خاطر انہیں اس قسم کی توہم پرستیوں میں الجھائے رکھتے ہیں، اور یہ (ان کے متبعین) اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے، ان گورکھ دھندوں میں الجھے رہتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جو قوم، عقل و بصیرت اور قانونِ خداوندی کو چھوڑ کر، اس قسم کا توہم پرستانہ مسلک اختیار کرے اور ان پیشواؤں کو، اپنا کارساز اور رفیق بنائے، تو اس کا نتیجہ، کھلی ہوئی تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

مذہبی پیشوا اور پیرانِ طریقت اپنے متبعین سے اسی دنیا کی مرادیں برلانے کے وعدے ہی نہیں کرتے۔ انہیں جنت میں لے جانے کا فریب بھی دیتے ہیں۔

۴/۱۲۰ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا - (۴/۱۲۰)

شیطان (کے یہ نمائندے) لوگوں کو جنت کے وعدے دیتے اور اُن کی آرزوئیں برآنے کے مژدے سناتے ہیں لیکن ان کے یہ تمام وعدے اور مژدے، دھوکا اور فریب ہیں۔

وعدے تو کرتے ہیں ان سے جنت کے، اور جس راستے پر خود چلتے اور انہیں چلاتے ہیں۔ وہ انہیں سیدھا جہنم میں لے جاتا ہے۔

۴/۱۲۱ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا - (۴/۱۲۱)

ان کا انجام جہنم کی تباہی ہے جس سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے ان کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں تو ان کی زندگی جنت کی ہوتی ہے۔

جنّت کی زندگی

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ

۴/۱۲۲ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا - (۴/۱۲۲)

ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، تو یہ لوگ ابدی شادابیوں کی جنت کی زندگی بسر کریں گے ــــ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ــــ یہ خدا کا وعدہ ہے جو ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجائے گا ــــ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

جنّت خوش فہمیوں سے نہیں مل سکتی

لیکن جنت کی زندگی خوش فہمیوں سے نہیں مل سکتی - اہل کتاب اسی خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ جنت انہی کے لئے ریزرو ہو چکی ہے - اسی طرح اگر تم بھی یہ سمجھ لو کہ جنّت فقط مسلمان کہلانے سے مل جائے گی تو یہ بھی خود فریبی ہے - جنّت فقط حسین آرزوؤں کے نتیجے میں نہیں مل جاتی - یہ کڑی جانکاہ مشقتوں کے بعد حاصل ہوتی ہے - اس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے (انڈکس دیکھئے) - خاص مقامات میں تو قرآن ان صبر آزما مراحل کی تفصیل دیتا ہے لیکن عام طور پر وہ اس کے لئے "ایمان اور اعمالِ صالح" کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے - وہ کہتا ہے :

۴/۱۲۲ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ
وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ (۴/۱۲۳)

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں، نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق مل سکتی ہیں۔ نہ فریق مخالف کی - اس میں کسی کے ذاتی جذبات کا سوال ہی نہیں - یہ سب ایک محکم اور غیر متبدل قانون کے مطابق ملتا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ جو کوئی غلط روش اختیار کرے گا، اس کے نتائج بھگتے گا - وہ ہزار جتن کرے کہ اسے کوئی ایسا دوست اور مددگار مل جائے جو اسے ان تباہیوں سے بچائے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اسے ان تباہیوں سے خدا کا قانون بچا سکتا تھا جس سے اس نے سرکشی اختیار کر لی تھی ۔

اور اس کے بعد کہتا ہے :

۴/۱۲۴ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۔ (۴/۱۲۴)

جنّت مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں

اس کے برعکس، جو شخص قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھے اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو ——— وہ مرد ہو یا عورت ——— ایسے لوگ زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب ہوں گے اور ان کی محنت کے ماحصل میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی - ایسا کرنا ظلم ہوگا - اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ۔

اور یہ جنّت نظامِ خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہے ۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی - اس دین کا ملخص دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ۔

۴/۱۲۵ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ

وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۔ (۴/۱۲۵)

ملّتِ ابراہیمیؑ

ان تصریحات کے بعد، ان سے پوچھو کہ اس نظامِ زندگی سے زیادہ حسین اور کونسا نظام ہو سکتا ہے جس میں ہر فرد اپنے جذبات، توجہات، بلکہ پوری کی پوری ذات کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دے، اور پھر، نہایت حسن کارانہ انداز کی زندگی بسر کرے —— یعنی اس مسلک کا اتباع کرے جسے ابراہیمؑ نے، تمام غیر خداوندی سمتوں سے منہ موڑ کر اختیار کیا تھا —— اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست اور رفیق بنا لیا تھا۔ سوچئے کہ جس شخص کو خود خدا اپنی رفاقت کے لئے چن لے، اُس سے زیادہ خوش بخت اور کون ہو سکتا ہے؟ یہی خوش بختی تمہارے حصے میں بھی آ سکتی ہے۔

"مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ" - یہ ہے اسلام - اپنے آپ کو مکمل طور پر قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دینا - یہی مسلکِ ابراہیمی تھا - قرآن کریم نے اس مسلک کی وضاحت کس طرح کی ہے - اور ملّتِ اسلامیہ کو اس کے اتباع کی تاکید کیوں کی ہے، اس کے لئے سابقہ جلدوں میں، عنوانات ابراہیمؑ - کعبہ - حج - دیکھئے -

جس نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا حکم مؤمنین کو دیا، یہ وہی نظام ہے جو خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے - یعنی قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت -

۴/۱۲۶ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۔ (۴/۱۲۶) ع

یہی وہ نظام ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے - جہاں ہر شے خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے - اور خدا کا قانون، ان اشیاء کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے - کوئی بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں -

اگر انسان بھی یہی روش اختیار کرے تو اس کا نظامِ زندگی اسی حسن و خوبی سے چل سکتا ہے جس حسن و خوبی سے نظامِ کائنات چل رہا ہے —— اس فرق کے ساتھ کہ کائنات میں یہ کچھ مجبوراً ہو رہا ہے اور انسان اسے اپنی مرضی اور ارادہ سے اختیار کرے گا جس سے اس کی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی جائے گی - یعنی معاشرہ کی زندگی بھی جنتی ہو گی اور افراد کی ذات کی تکمیل بھی ہوتی جائے گی -

---

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے قرآن کریم عائلی زندگی کی اہمیت پر بڑا زور دیتا ہے اور اس لئے اس نے اس شعبۂ زندگی کے متعلق احکامات بڑی تفصیل سے عطا کئے ہیں - تعددِ ازواج کے سلسلہ میں اسی سورت کی آیت (۴/۳) میں اصولی

ہدایات دی گئی ہیں (وہاں جلد سوم کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں مزید تفصیلات ملیں گی)۔ اگلی آیت (۴/۱۲۷) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس آیت کا ذکر (جلد سوم۔ صفحہ ۳۳۳ پر) آچکا ہے۔ اس لئے اس کے صرف مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا - (۴/۱۲۷) ۴/۱۲۷

یتامی النّساء

یہی وہ نظام ہے جس کے ایک گوشے (معاشرتی اور عائلی زندگی) کے متعلق کچھ احکام پہلے (ابتدائے سورۃ میں) دیئے جا چکے ہیں۔ اسی ضمن میں، اے رسول! لوگ تجھ سے عورتوں کے بارے میں مزید باتیں دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان امور کے متعلق، اللہ تمہیں، ان احکام کے تسلسل میں جو پہلے دیئے جا چکے ہیں، مزید احکام دیتا ہے۔ یہ احکام یتیم لڑکیوں یا اُن عورتوں کے متعلق ہیں جو بلا خاوند رہ جائیں (بیوہ ہو کر یا ویسے ہی خاوند نہ ملنے کی وجہ سے) (۴/۳)۔ تم ان کا وہ حق تو دیتے نہیں جو قانونِ خداوندی نے اُن کے لئے مقرر کیا ہے اور چاہتے یہ ہو کہ انہیں اپنے نکاح میں لے آؤ۔ یہ غلط ہے۔ ان کے واجبات انہیں ضرور دو۔ یہی حکم ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہے جو بے کس اور ناتواں رہ جائیں۔ مختصراً یہ کہ یتیم کوئی بھی ہو ——— عورتیں ہوں، لڑکیاں ہوں، یا لڑکے ہوں ——— ان کے ساتھ ہمیشہ انصاف کرو۔ بلکہ انصاف سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر، اُن سے حُسن سلوک کرو۔ جو بھلائی تم اُن کے ساتھ کرو گے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ خدا تمہارے ہر عمل کا علم رکھتا ہے۔

آیت (۴/۳۴) میں عام عورتوں کی طرف سے سرکشی کے سلسلہ میں ہدایات دی گئی ہیں۔ اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی بیوی کو اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی کا احتمال ہو تو اس صورت میں معاشرہ کیا اقدامات کرے۔ آیت (۴/۳۴) کی تشریح مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۶۵ (زیرِ آیت (۲/۲۲۱)) آچکی ہے اور آیت (۴/۱۲۸) کی تشریح اسی جلد میں صفحہ ۲۸۶ (۴/۳۴) میں۔ اس لئے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ مردوں کی طرف سے نشوز کا مسئلہ بھی عدالت کے طے کرنے کا ہے۔

اس سے اگلی آیت (۴/۱۲۹) بھی تعدد ازدواج کی صورت میں عدل کا ذکر آیا ہے۔ یہ مطالب جلد سوم۔ صفحہ ۳۴۸ (زیرِ آیت ۲/۲۲۱) آچکی ہے۔ اس کی مزید تشریح کی بھی ضرورت نہیں۔

اس سے اگلی آیت طلاق کے متعلق ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو مطالب جلد سوم۔ صفحات ۲۹۵ - ۲۸۵

گزر چکی ہے۔ لیکن وہاں یہ آیت (۴/۱۳۰) نہیں آئی اس لئے اسے مع مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۴/۱۳۰ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا۔ (۴/۱۳۰)

طلاق کی صورت میں معاش کا انتظام

لیکن اگر باہمی نباہ کی صورت ممکن نہ رہے (اور مصالحتی کوششیں بھی ناکام رہ جائیں) تو اس کا علاج علیحدگی (طلاق) کے سوا کچھ نہیں۔ تم اس علیحدگی (طلاق) سے اس لئے نہ ڈرکے رہو کہ اس سے معاشی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ ذمہ داری نظامِ خداوندی کی ہے کہ اپنے وسیع ذرائع سے تم دونوں کی ضروریات کا سامان بہم پہنچائے۔ اس نظام کی بنیاد ہی وسعت و حکمت پر ہے۔

سورۂ الطلاق میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ تم سامانِ معیشت کے متعلق متفکر نہ ہو اسلامی معاشرہ اس کا انتظام کر دے گا۔ (۶۵/۴-۳)۔ اس سلسلہ میں خارجی کائنات پر نگاہ ڈالو۔

۴/۱۳۱-۱۳۲ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (۴/۱۳۲-۱۳۱)

خارجی کائنات میں نظامِ ربوبیت

تم خارجی کائنات میں نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہر سے نظامِ خداوندی کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے، اور ان کی کس طرح نشوونما ہوتی جا رہی ہے! اسی لئے ہم نے، ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے ضوابط قانون دیئے تھے، کہا تھا، اور وہی بات اب تمہیں کہتے ہیں کہ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت رکھو۔ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ اگر تم نے اس روش سے انکار کیا تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کا سلسلۂ کائنات بدستور اسی طرح چلتا رہے گا۔ اسے خارجی سہاروں کی ضرورت نہیں۔ اور یہی چیز اس کے لئے وجہِ حمد و ستائش ہے۔

خدا کے نظام کو کسی اور کارساز و کارفرما کی ضرورت نہیں۔ اور اس حقیقت پر کائنات کی پستیاں اور بلندیاں شاہد ہیں۔

خارجی کائنات میں تمام اشیاء قوانینِ خداوندی کا اتباع کئے جا رہی ہیں۔ وہ نہ اس سے سرکشی اختیار کرتی ہیں۔ نہ تغافل برتتی ہیں نہ تساہل۔

۴/۱۳۳ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا - (۴/۱۳۳)

تمام نوعِ انسان کی جگہ دوسری نوع لے آتے

لیکن انسان کا معاملہ دیگر اشیائے کائنات سے، ان معنوں میں، مختلف ہے کہ اشیائے کائنات کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ خدا کے قانون سے سرکشی برت سکیں، اور انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اُس کا قانون اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ ہم نے یہ کچھ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق کیا ہے، ورنہ ہمارے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ ہم موجودہ نوعِ انسان کو (جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہیں) ختم کر کے، اس کی جگہ ایسی نوع لے آئیں جو اشیائے کائنات کی طرح، بے چون و چرا قوانینِ خداوندی کی اطاعت کئے جائے۔ ہم ایسا کرنے پر قادر ہیں۔ (۱۴/۱۹-۲۰ و ۳۵/۱۶)

لیکن خدا انسان کا اختیار و ارادہ سلب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اسے اس کا اختیار دیتا ہے کہ وہ جونسی راہ چاہے اختیار کرے جس قسم کی راہ وہ اختیار کرے گا اسی قسم کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

۴/۱۳۴ مَّن كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِندَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا - (۴/۱۳۴)

لیکن ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ ہم انسان کے اختیار و ارادے کو سلب نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم اسے اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ تم قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر، دوسرے راستے اس لئے اختیار کرتے ہو کہ تمہیں دنیاوی مفاد حاصل ہو جائیں۔ ہمارے قوانین کی اطاعت سے تمہیں دنیاوی مفاد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اُخروی زندگی کی کامیابیاں اور کامرانیاں بھی۔ خدا تمہاری، موجودہ زندگی کی آسائش طلبی کی درخواستوں کو بھی سنتا ہے اور مستقبل کی شاہراہوں کو بھی نگاہ میں رکھتا ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کے قانون میں اس کا امکان نہیں۔ ثواب کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

ثواب الدنیا اور ثواب الآخرۃ (اس زندگی اور اگلی زندگی کی خوشگواریاں) قرآنی نظام قائم کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور قرآنی نظام میں بنیادی اہمیت نظامِ عدل کو حاصل ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ وہ اساس ہے جس پر انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور نظامِ عدل کا بنیادی ستون (CENTRAL PILLAR)

شہادت کا عظیم اصول

شہادت (EVIDENCE) ہے۔ شہادت کی قانونی حیثیت کے متعلق مطالب جلد سوم صـ۴۸۶ پر تشریح کی جا چکی ہے۔ لیکن یہاں قرآن کریم نے ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر دنیا اس پر عمل درآمد کرنے لگ جائے تو عدالتی نزاعات (بلکہ عدالت کے باہر کے اختلافات کا بھی) وجود ختم ہو جائے۔ وہ اصول یہ ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ
عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا ۱۳۵/۴
اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ
اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۱۳۵/۴)

اس نظام کے قیام کے لئے، جس میں حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں، بنیادی شرط یہ ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو (۸/۵)۔ عدل کے لئے ایک بنیادی عنصر یہی شہادت ہے۔ تم شہادت، نہ مدعی کی طرف سے دو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مدنظر رکھ کر سچی سچی شہادت ہو، خواہ یہ شہادت (اور نتائج) خود تمہارے اپنے خلاف جائے۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں، امیر اور غریب میں بھی کوئی امتیاز نہ کرو۔ (حتّٰی کہ دشمن سے بھی عدل کرو۔ ۸/۵) تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر، ان کے خیر خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے۔ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے جذبات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچیدہ بات کرو۔ نہ شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال (جذبات و رجحانات تک) سے اچھی طرح واقف ہے۔

آپ اس اصول پر غور کیجئے۔ جتنی بار آپ اس پر گہری نگاہ ڈالیں گے آپ پر وجدانیت کا عالم طاری ہو جائے گا۔ غیر مسلموں کے لئے تو یہ اصول صرف راہ نمائی کا کام دے گا (کیونکہ یہ ان کی مرضی پر ہے کہ اسے اپنائیں یا نہ اپنائیں)

نظام عدل منفرد

لیکن جماعت مومنین کے لئے یہ خدا کا حکم ہے۔ آپ سوچئے کہ جو قوم (امت) اس حکم پر عمل پیرا ہو اس کا نظام عدل کیا ہوگا؟ کیا اس میں کسی مقدمہ کا فیصلہ بھی غلط ہو سکے گا؟ کیا اس میں ذرا سی دھاندلی بھی ممکن ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم (امت) میں مقدمات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ (ضمناً) ہمارے ہاں اسلامی نظام۔ اسلامی نظام کی رٹ لگائی جاتی ہے۔ اور اکثر سوچا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا کہاں سے

کی جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کی ابتدا اسی اصول شہادت سے کر دی جائے تو ہمارے اس قدر الجھے ہوئے مسائل اور معاملات خود بخود حل ہو جائیں گے ۔ اور اس کے ساتھ یہ بنیادی حکم کہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ۔ ($\frac{5}{44}$) ۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے ۔

مومنین کے لئے شہادت کی اہمیت کا ذکر ($\frac{5}{8}$) اور ($\frac{57}{34}$) میں بھی آیا ہے ۔ (ضمناً) چونکہ یہاں شہادت کا موضوع سامنے آگیا ہے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ قرآن کریم میں کون کون سے معاملات کے سلسلہ میں شہادت کا ذکر آیا ہے ۔

کون کون سے معاملات میں شہادت کا ذکر ہے

۱ ۔ قرضہ کے معاملہ میں، دستاویز کی تحریر کے سلسلہ میں ۔ ($\frac{2}{282-83}$)

۲ ۔ وصیت کے سلسلہ میں ۔ ($\frac{5}{106-108}$)

۳ ۔ جرم فحش (بے حیائی کی باتوں) کے سلسلہ میں ۔ ($\frac{4}{15}$)

۴ ۔ میاں بیوی میں تہمت تراشی کی صورت میں ۔ ($\frac{24}{6-9}$)

۵ ۔ طلاق کے فیصلہ کن مرحلہ کے وقت ($\frac{65}{2}$)

۶ ۔ گردوپیش کے معاملات سے استنباطِ شہادت ۔ (CIRCMSTAN TIAL EVIDENCE) جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے الزام کے سلسلہ میں، ایک شاہد نے کہا تھا ۔ ($\frac{12}{26-28}$)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے چند اہم امور کا ذکر کیا ہے ۔ عدالت کو اختیار ہے کہ جن دیگر معاملات میں ضروری سمجھے گواہ طلب کرے ۔

شہادت کی شرائط

شہادت کے سلسلہ میں اس بنیادی اصول کے علاوہ جس کا ذکر ($\frac{4}{135}$) میں کیا گیا ہے یہ بھی تاکید ہے کہ :

۱ ۔ شہادت کو چھپاؤ نہیں ۔ ($\frac{2}{283}$)

۲ ۔ جھوٹ اور سچ کی آمیزش مت کرو ۔ ($\frac{2}{42}$)

۳ ۔ کبھی غلط بیانی سے کام نہ لو ۔ ($\frac{25}{72}$)

۴ ۔ سنی سنائی بات کے پیچھے مت لگو ۔ ($\frac{17}{36}$)

۵ ۔ جب گواہ کو طلب کیا جائے وہ حاضری سے انکار نہ کرے ۔ ($\frac{2}{282}$)

۶ ۔ گواہوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے (۲/۲۸۲)
۷ ۔ عدالت کو اگر کسی گواہ کی دیانت پر شبہ ہو تو وہ اس کی جگہ دوسرا گواہ بلا سکتی ہے ۔ (۵/۱۰۸-۱۰۷)

اگلی آیت بڑی اہم ہے جس میں کہا گیا ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۔ (۴/۱۳۶) ۴/۱۳۶

اس نظام کے سلسلہ میں ایک اور اہم اور بنیادی حقیقت کو بھی سامنے رکھو ۔ اس نظام کے حامل وہ افراد نہیں ہوں گے جو محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے سمجھ لیں کہ وہ جماعت مومنین کے ممبر ہیں ۔ یہ جماعت آئیڈیالوجی (ایمان) کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اور وہی شخص اس کا ممبر ہو سکتا ہے اور رہ سکتا ہے جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر یقین رکھے ۔ لہٰذا، اے جماعت مومنین! تم ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھو ۔ (۲/۴۲ و ۵۷/۴۸) اور بنیادی اصول ہیں ـــــــ اللہ پر ایمان ۔ اس کے رسول پر ایمان ۔ اس کتاب پر ایمان جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ۔ اور ان تمام کتابوں پر ایمان جو اس نے اس سے پہلے نازل کی تھیں ۔ (اور ملائکہ اور حیاتِ اُخروی پر ایمان) جو شخص، اللہ ۔ اس کے ملائکہ ۔ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ۔ اور حیاتِ اخروی پر ایمان نہیں رکھتا، ان سے انکار کرتا ہے ۔ تو وہ زندگی کے صحیح راستے سے بہت دور جا پڑتا ہے ۔ (مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے والوں کے متعلق اصولاً تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ان امور پر ایمان رکھتے ہیں ۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت بھی ان امور پر یقین رکھیں)

"مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کی تاکید	اس آیت (اور اسی ضمن میں دیگر متعلقہ آیات) کی پوری پوری تشریح مطالب الفرقان ۔ جلد اول صفحہ ۸۷ سے آخر تک

کی گئی ہے ۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔ اتنا اضافہ کافی ہے کہ ایمان قرآن کریم کی صداقت پر علی وجہ البصیرت یقین کا نام ہے ۔ (۲۵/۷۳)

مطالب ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۴۹۰ (آیت ۲/۲۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ خود رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا

آیت (۴/۱۳۶) میں جو یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ حکم عہد رسالتمآب کے مؤمنین کے متعلق نہیں ہوسکتا کیونکہ قرآن کریم نے انہیں "مومن حقا" کہکر پکارا ہے۔ یہ حکم ہم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے۔ خدائے علیم کو اس کا علم تھا کہ بعد میں ایسے مسلمان آئیں گے جن کا نام تو مسلمانوں جیسا ہوگا لیکن ان کا ایمان نہیں ہوگا۔ یہ حکم انہی کے لئے ہے یعنی ہمارے لئے۔

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ایمان کے پانچ اجزاء بیان کئے ہیں۔ ۱۔ اللہ پر ایمان ۲۔ رسولوں پر ایمان ۳۔ ملائکہ پر ایمان ۴۔ کتابوں پر ایمان اور ۵۔ آخرت پر ایمان۔ لیکن ہمارے ہاں ان میں اپنی طرف سے ایک اور

چھٹا جزو ایمان؟

جزو کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقدیر پر ایمان۔ (یعنی معاذ اللہ خدا کی فہرست میں جو کمی رہ گئی تھی اسے ہم نے پورا کر دیا!) تفصیل اس کی مطالب جلد سوم۔ صفحہ ۱۵۵۔ آیت (۲/۱۷۷) میں گزر چکی ہے۔

اس کے بعد کفر اور ایمان کی مزید وضاحت کی گئی۔ فرمایا:

۴/۱۳۷ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا۔ (۴/۱۳۷)

ایمان سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کے دل میں کسی وقت بھی تذبذب پیدا نہ ہو۔ اگر کیفیت یہ ہو کہ کبھی ایک بات کو مان لیا۔ پھر اس سے انکار کر دیا۔ پھر مان لیا اور پھر انکار کر دیا۔ اور اس طرح انکار میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ تو ایسے لوگ، قانون خداوندی کے سائے میں، اپنی حفاظت کا سامان نہیں پا سکتے اور نہ ہی انہیں زندگی کی خوشگواریوں کا راستہ مل سکتا ہے۔

جو مسلمان اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب (کفر) اختیار کرے اسے مرتد کہا جاتا ہے اور ہمارے ہاں مرتد کی سزا قتل قرار دی جاتی ہے۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے بات ہو چکی ہے۔ (دیکھئے عنوانات۔ ارتداد۔ مرتد۔ جنگ۔

مرتد کی سزا قتل نہیں

دین وغیرہ) زیر نظر آیت بھی اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ جو شخص ایمان کے بعد کفر اختیار کرے۔ کفر کے بعد پھر ایمان لے آئے اور اس کے بعد پھر کافر ہو جائے اور اپنے کفر میں آگے بڑھتا چلا جائے تو اس کی مغفرت نہیں ہوگی۔ نہ ہی وہ صحیح راستہ اختیار کر سکیں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اسلام کے بعد کفر اختیار کر لے، اگر اس کی سزا موت ہو تو اس کے لئے دوبارہ اسلام لانے کا امکان کیسے ہوگا؟ اسے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے ساتھ ہی قتل کر دیا جائے گا۔ اس کا اسلام لانے کا امکان واضح کرتا ہے کہ وہ کفر اختیار کرنے کے بعد زندہ رہے گا۔ اس طرح دوبارہ کفر کے بعد بھی وہ زندہ رہے گا اور اس کا امکان ہوگا کہ وہ اپنے کفر میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔

ایسے مذبذبین کو قرآن منافق قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ

۴/۱۳۸ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (۴/۱۳۸)

نہ ہی ایمان کا یہ مطلب ہے کہ اقرار تو کر لیا اس آئیڈیالوجی کا، اور اتباع کرتے رہے اپنے جذبات و مفاد کی، یا ظاہرداری سے، ساتھ تو رہے جماعتِ مومنین کے، لیکن درپردہ ملے رہے جماعتِ مخالف سے۔ ایسے لوگوں کو منافق کہتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ الم انگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ:

۴/۱۳۹ اِلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ (۴/۱۳۹)

منافقین

یہ لوگ جو جماعتِ مومنین کو چھوڑ کر، مخالفین کے ساتھ یارانہ گانٹھتے ہیں، تو کیا یہ اُن کے پاس عزت اور قوت حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں؟ اگر یہ اس خیال کے ماتحت ایسا کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ حقیقی عزت اور قوت، صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے مل سکتی ہے۔ اس کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی وضاحت جلد اوّل۔ ص۱۷۵ (آیت ۳/۲۸) میں گزر چکی ہے۔ وہیں زیرِنظر آیت بھی درج ہے۔

ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات تو ایک طرف، کہا ہے کہ۔

۴/۱۴۰ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (۴/۱۴۰)

فریقِ مخالف (کفار) کے ساتھ دوستی کے تعلقات تو ایک طرف رہے، خدا نے اپنے ضابطہ قوانین میں، اس بات میں حکم یہ دیا ہے کہ جب تم کہیں دیکھو کہ آیاتِ خداوندی کا انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اُڑائی جا رہی ہے، تو تم ایسی مجلس میں بھی نہ بیٹھو۔ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ تاآنکہ وہ اس قسم کی باتیں چھوڑ کر دوسری باتوں میں نہ لگ جائیں۔ اگر تم ان کی اس قسم کی باتوں میں شریکِ محفل رہے تو اُس وقت تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے، حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی

بالفاظ دیگر۔

مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے محبت کا جنوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشان، سجدہ بے ذوق کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے (اقبالؒ)

اس کے بعد منافقین کی اضطرابی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ (۱۴۳/۴)

اُن کی اس روش سے انہیں وہ اطمینان حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو یقین محکم کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ پریشان خاطر حواس باختہ، درمیان میں لٹکے رہتے ہیں ــــ نہ ادھر کے نہ اُدھر کے (۲۲/۱۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ قانون خداوندی کی خلاف ورزی سے، خود اپنے اوپر زندگی کی خوشگواریوں کی راہ بند کر لیں، ان پر اس راہ کو کون کھول سکتا ہے؟ (یہ راہیں تو یقین محکم اور عمل پیہم ہی سے کھلا کرتی ہیں)

منافقین کا تذبذب

منافقین کے لئے مذبذبین کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ اور اس کا مادہ (ذ۔ب۔ب) ہے جس کے معنی مکھی کے ہیں۔ آپ کسی مکھی کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھئے۔ اسے کسی ایک جگہ قرار نہیں ہوتا۔ کبھی یہاں کبھی۔ وہاں۔ پھر آپ اس کے متعلق کہہ ہی نہیں سکتے کہ وہ جہاں بیٹھی ہے وہاں سے اڑ کر کہاں جا بیٹھے گی۔ اس قسم کی حالت منافقوں کی ہوتی ہے۔

اس لئے وہ سخت ناقابل اعتماد ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مومنین میں جن کی بنیادی خصوصیت استقامت اور محکمیت ہوتی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ (۳۰/۴۱) جن لوگوں نے دل کے کامل اطمینان کے بعد کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے (ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے)

چونکہ منافقین کے قول اور فعل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس لئے ان کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات وابستہ نہیں کئے جا سکتے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا۔ (۱۴۴/۴)

اے جماعت مومنین! تمہارے رفیق صرف وہی ہونے چاہئیں جو تمہاری جماعت کے افراد ہوں۔ اس لئے

تم ایسا کبھی نہ کرو کہ کفار (مع منافقین) کو اپنا دوست اور کارساز بنالو (۴ / ۱۱۷)۔ یہ ایک ایسا جرم ہوگا۔ جو قانونِ خداوندی کی رُو سے تمہیں سزا مستوجب قرار دینے کے لئے، کسی ثبوت اور دلیل کا محتاج نہیں ہوگا۔ تمہاری یہ روش تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لئے اپنی دلیل آپ بن جائے گی۔

منافقین اور کفار

(ضمناً) یہاں بات منافقین کی ہو رہی تھی اور اس آیت میں کہا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات کبھی نہیں ہونے چاہئے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے عالمگیر انسانیت دو ہی شقوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ مؤمنین اور غیر مؤمنین۔ غیر مؤمنین کو کافر کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مختلف خصوصیات کی رو سے کفار کی بھی مختلف قسمیں ہوں گی۔ مشرکین، منافقین، اہلِ کتاب وغیرہ۔ (کفار کے ساتھ تعلقات کے متعلق پہلے بحث آ چکی ہے)۔

اس کے بعد قرآن کریم نے منافقین کا صحیح مقام متعین کیا ہے۔ فرمایا:

۴ / ۱۴۵ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۔ (۴ / ۱۴۵)

یقیناً منافقین، جہنم کے سب سے نچلے درجے کے مستحق ہیں۔ یہ وہیں رکھے جائیں گے ——— ان کا کوئی رفیق اور مددگار نہیں ہو سکتا۔

منافقین درکِ اسفل میں

جہنم میں تو کفار بھی ہونگے اور منافقین بھی، لیکن منافقین سب سے نچلے درجے میں ہونگے یعنی انہیں عام کفار کے مقابلہ میں زیادہ شدید عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ بات واضح ہے۔ کافر کھلا دشمن ہے۔ وہ اعلانیہ سامنے آتا ہے اور کھلے بندوں وار کرتا ہے۔ اس کی مدافعت آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن منافق مارِ آستین ہے۔ وہ آپ سے گلے ملنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور آپ کی پشت میں خنجر گھونپ دیتا ہے۔ وہ آپ کے دشمن کے مقابلہ کے لئے آپ کے ساتھ جاتا ہے لیکن میدانِ جنگ کے نازک ترین مرحلہ میں خفیہ طور پر دشمن سے جا ملتا ہے۔ اس ذہنیت، اس کیرکٹر، اور اس روش کے لوگ بدترین انسان ہوتے ہیں۔ اس لئے (کفار۔ کھلے دشمنوں۔ کو نہیں) منافقین کو جہنم کے درکِ اسفل میں بتایا گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود قرآن ان کے لئے بھی اصلاح کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ:

۴ / ۱۴۶ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (۴ / ۱۴۶)

ہاں مگر، جو ان میں سے اپنی روش سے باز آجائیں، آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کرلیں۔ اس ضابطہ خداوندی کو محکم طور پر پکڑ لیں اور اطاعت و فرماں پذیری خالصتہً خدا کے لئے مختص کردیں تو اس سے یہ لوگ جماعت مومنین کے افراد بن سکیں گے اور اُس اجرِ عظیم میں شریک ہو جائیں گے جو، قانونِ خداوندی کی رُو سے، عنقریب، جماعتِ مومنین کو ملنے والا ہے۔

منافقین کے لئے بھی باز آفرینی کی گنجائش

"قرآن کا خدا" (ہمارے مفہوم کے مطابق) منتقم مزاج نہیں۔ وہ، یوں کہیئے کہ بڑا کشادہ ظرف اور وسیع القلب واقعہ ہوا ہے۔ جو بندہ بھی اشکِ ندامت آنکھوں میں لئے اس کے آستانہ عالیہ پر دستک دیتا ہے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے دروازہ کھول دیتا ہے اور اس کی ماضی کی لغزشوں کے نقصانات کی تلافی کی ہدایت دے کر اس کے سینے میں مستقبل کی تابناکی کی شمعیں روشن کردیتا ہے۔

اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والے (مومنین) کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور وہ ایسے ہی ہوتے ہیں ———

ہم نے جو خدا کی کشادہ نگہی اور وسعت قلب کی بات کی تو ایسا اپنی طرف سے نہیں کہا۔ خود خدا نے اگلی ہی آیت میں اس کی تصدیق کردی ——— اور کیسے خوبصورت الفاظ میں اس کی تصدیق کردی! فرمایا:

[۴/۱۴۷] مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۔ (۴/۱۴۷)

ان سے کہو کہ اگر تم ضابطہ خداوندی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالو اور خدا کی طرف سے عطا شدہ نعمتوں کی قدر کرو یعنی جس مقصد کے لئے وہ دی گئی ہیں، انہیں اسی کے لئے صرف کرو۔ تو خدا تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا؟ خدا کا قانونِ مکافات ہر ایک کے عمل سے واقف ہے، اور اس کی کوششوں کے بھرپور نتائج دیتا ہے۔

خدا منتقم مزاج نہیں

منتقم مزاج "جھکنے والے" کو ذلیل کرتا اور اسے اذیت پہنچا کر لذت لیتا ہے۔ (سائیکالوجی میں اس ملعون ترین ذہنیت کو (SADISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے) خدا انسانی جذبات سے ماوراء، بلند و بالا ہے۔ وہ جھکنے والے کو گرا کر اسے ذلیل نہیں کرتا۔ اسے اٹھا کر گلے سے لگا لیتا ہے۔ اقبال نے ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ؎ مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

شروع پارہ ششم

اتنا ہی نہیں کہ وہ اپنی اصلاح کرنے والوں کے ماضی سے درگزر کرتا ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ

۴/۱۴۸ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ط وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۔ (۴/۱۴۸)

جو لوگ اس طرح، سابقہ روش کو چھوڑ کر اپنی اصلاح کر لیں، تو ان کی گزشتہ غلطیوں کی تشہیر مت کرو ۔ بیجا تشہیر کسی کی بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ بات قانونِ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ ہاں اگر کسی شخص کے خلاف زیادتی ہوئی ہو تو وہ (اُس کے مداوا کے لئے) اس کا اعلان کر دے، تو اور بات ہے۔ خدا کا قانون سب کی سُنتا اور ہر بات کا علم رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تشہیر کس مقصد کے لئے کی جا رہی ہے۔

آپ سوچیئے کہ جس معاشرہ کی روش یہ ہو وہ کس قدر فردوس بداماں ہوگا! آپ اسلام کے صدر اول کے معاشرہ پر نگاہ ڈالیئے۔ اس میں ہر شخص کفر (جاہلیت) کی زندگی کو چھوڑ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ وہ کون سی برائی تھی جو زمانہ قبل از اسلام کے عربوں کے ہاں عام نہیں تھی۔ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں نے بھی (اس سے پہلے) اسی قسم کی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن اسلام لانے کے بعد ان کی سابقہ زندگی کی خوبیاں تو گنائی جاتی تھیں، ان کی برائیوں کا ذکر تک نہیں ہوتا تھا ـــــ بجز اس کے کہ کوئی خود ہی اپنے ماضی کا کوئی خاص واقعہ بیان کر دے۔ قرآن نے بھی مَا قَدْ سَلَفَ (ماضی کی فروگذاشتوں) کی معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ (۲/۲۷۵ ؛ ۴/۲۲ ؛ ۸/۳۸) ۔ زیر نظر آیت میں مظلوم کو ظلم کی داستان بیان کرنے کا جو حق دیا ہے تو یہ صرف انفرادی مظلومیت یا عدالتی چارہ جوئی تک محدود نہیں ۔

مظلوم کو ظلم کی تشہیر کا حق ہے

مظلوم معاشرہ کو بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ مستبد قہرمانیت کے خلاف آواز بلند کرے ۔ جو ہیئت حاکمہ اس کی بھی اجازت نہ دے تو وہ بھی مزید ظلم میں شامل ہوگا۔ ایسا کچھ بہرحال غیر اسلامی معاشرہ میں ہی ہوگا۔ قرآنی نظام میں اس قسم کے ظلم اور مظلومیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تو رہا دوسروں کی برائیوں کی تشہیر کے متعلق۔

۴/۱۴۹ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۔ (۴/۱۴۹)

بھلائی کی باتیں

باقی رہیں بھلائی کی باتیں - انہیں کھلے طور پر کرو یا پوشیدہ - یا برائی سے درگزر کرو - (تو ان میں سے کوئی بات بھی خدا کی نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکتی) - خدا کا قانون جہاں جرم کی سزا دینے کی قوت رکھتا ہے، وہاں، اس میں، درگزر کر دینے کی بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے -

ان کے برعکس -

۴/۱۵۰ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا - (۴/۱۵۰)

جو لوگ خدا اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں - یا خدا کو مانتے ہیں تو اس طرح (کہ کارگہ کائنات میں اس کے قوانین جاری و ساری ہیں، لیکن جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے وہ) اس قانون سے انکار کرتے ہیں جو اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجا ہے (۲۹/۶۱-۶۳) - یا اس کے قانون کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ کسی ایک رسول کی طرف نازل شدہ قانون کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کر لیا اور دوسروں کی تکذیب کر کے ان کے من جانب اللہ ہونے سے انکار کر دیا (۲/۸۵) - یا ایک ہی ضابطۂ قوانین کی ایک بات مان لی اور دوسری سے انکار کر دیا (۲/۸۵) - اور اس طرح، اقرار و انکار کے بین بین، تیسری راہ اختیار کرنے کی سوچتے رہے -

یہ جو کہا گیا ہے کہ "خدا اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا کفر ہے" اس کے یہ معنی نہیں کہ (معاذ اللہ) رسولوں کو خدا سمجھ لینا چاہیئے - (جیسا کہ عیسائیت میں کہا جاتا ہے) اس کا مطلب (جیسا کہ مفہوم میں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے) یہ ہے

خدا اور رسولوں میں فرق کرنے کا مفہوم

کہ کائناتی خدا کو تسلیم کر لینا (یعنی قوانین فطرت کی اطاعت کرنا) لیکن جو ضابطہ قوانین خدا نے انسانوں کے لئے اپنے رسولوں کی وساطت سے بھیجا ہے، اس سے انکار کر کے حکومت سیکولر قائم کر لینا، یہ کفر ہے - تفصیل اس اجمال کی، مطالب الفرقان جلد اوّل صـ۳۰۱ - زیر آیت (۲/۲۲) ملے گی -

اور "کتاب کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے انکار" کی تشریح مطالب جلد دوم - صـ۳۵۲ (آیت ۲/۸۵) میں کی گئی ہے -

اس قسم کی راہیں اختیار کرنے والوں کو 'کافر حقاً' کافر کہا گیا -

۴/۱۵۱ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا - (۴/۱۵۱)

تو یاد رکھو! یہ اقرار کی راہ نہیں بلکہ سراسر انکار کی راہ ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام بالکل وہی ہوگا جو دوسرے منکرین اور مخالفین کا ہونے والا ہے۔ یعنی رسوا کن تباہی۔

آیت (۸۵/۲) میں بھی اس عذاب کو دنیا میں ذلت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس

۱۵۲/۴ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ (۱۵۲/۴)

تفریق بین الرسل

مومن وہ ہیں جو خدا کو مانیں اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو مانیں۔ اور اسے بھی مانیں کہ یہ سلسلۂ رشد و ہدایت شروع سے حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے آ رہا ہے۔ وہ سب خدا کی طرف سے سچے نبی تھے۔ منصب نبوت کے اعتبار سے، ان میں کوئی فرق نہیں ——— ان لوگوں کی کوششوں کے ثمرات انہیں عنقریب مل جائیں گے۔ اور اگر ان سے کوئی کوتاہی ہو جائے گی، تو اس کے مضر اثرات سے ان کی حفاظت کر دی جائے گی اور ان کی نشوونما میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ خدا کے قانون میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

تفریق بین الرسل کے متعلق، مطالب الفرقان، جلد سوم صفحہ ۴۹ (آیت ۲۸۵/۲) اور صفحہ ۴۲ (آیت ۱۳۶/۲) میں بحث کی گئی ہے۔ اس تفریق کی بین مثال یہودی تھے جو بنی اسرائیل کے انبیاء پر تو ایمان کے مدعی تھے، اور ایک آنے والے کے منتظر بھی تھے۔ لیکن نبی اکرمؐ کی رسالت کے منکر اور مخالف تھے۔ وہ اپنے اس انکار اور مخالفت کے حق میں کوئی دلیل یا خدائی سند تو رکھتے نہیں تھے۔ قسم قسم کی کٹ حجتیاں کرتے تھے۔ انہی کٹ حجتیوں میں حضورؐ سے محسوس معجزات کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

۱۵۳/۴ يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۔ (۱۵۳/۴)

معجزات کا مطالبہ

یہ اہل کتاب (یہودی) تم سے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں اس صورت میں خدا کا سچا رسول مانیں گے کہ ایک بنی بنائی کتاب آسمان سے اتار کر دکھاؤ۔

تم ان کی اس قسم کی جہالت آمیز باتوں سے کبیدہ خاطر مت ہو۔ یہ لوگ (خود اپنے پیغمبر) موسیٰؑ سے، اس سے بھی

بڑھ کر مطالبے کیا کرتے تھے۔ اُس سے کہا کرتے تھے کہ خود خدا کو ہمارے سامنے لا کر دکھاؤ (۲/۵۵ ؛ ۴/۱۵۵) انہیں، ان کی اس بیہودگی کی سزا ملی تو انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی (۲/۹۲) حالانکہ، اس سے قبل، ان کے پاس خدا کی واضح تعلیم آچکی تھی۔ ہم نے ان کی اس حماقت سے بھی درگزر کیا، اور موسیٰؑ کو کھلا ہوا اقتدار اور غلبہ عطا کر دیا۔

حضور سے معجزات کے مطالبہ اور انکار کے لئے انڈکس ملاحظہ کیجئے۔ یہودیوں کے متعلق پھر کہا۔

۴/۱۵۴

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ (۴/۱۵۴)

پھر ہم نے ان سے، کوہِ طور کے دامن میں، قانونِ خداوندی پر کاربند رہنے کا پختہ عہد لیا (۲/۹۳)۔ اور (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے (۲/۵۸)) ان سے کہا کہ ہمارے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ۔ نیز ان سے یہ بھی کہا تھا کہ سبت سے متعلق احکام و ضوابط کی خلاف ورزی مت کرنا (۲/۶۵)۔ اور ان سے ان باتوں کا پختہ عہد لیا تھا۔

یہ تمام امور "داستانِ بنی اسرائیل" کے تحت بیان کئے جا چکے ہیں جس کے لئے انڈکس دیکھئے۔ اس کے بعد کہا۔

۴/۱۵۵

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (۴/۱۵۵)

نقضِ عہد

لیکن اُنہوں نے اپنے کسی عہد کی پابندی نہ کی۔ ان میں سے ایک ایک کو توڑا۔ احکام خداوندی سے کھلا ہوا انکار کیا۔ ان سے سرکشی برتی۔ اپنے انبیاء کو ناحق ذلیل و رسوا کیا۔ بعض کو جان تک سے مار دیا۔ انہیں جب کبھی قانونِ خداوندی کی طرف دعوت دی گئی، تو انہوں نے اس دعوت کو، نہایت استکبار سے، یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم اس سے بے نیاز ہیں۔ ہمارا دل ان باتوں کا اثر قبول نہیں کرتا۔ ہمارے اپنے پاس بہت کچھ ہے۔ (۲/۸۸)

قتلِ انبیاء و رسل کی بحث بھی پہلے آچکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

۱۵۶-۵۹/۴ اس کے بعد چار آیات (۱۵۶-۵۹/۴) میں یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کا ذکر ہے یہ آیات سابقہ صفحات میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں آچکی ہیں۔

یہودیوں کے ان جرائم کی جو سزا انہیں دی گئی اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ ان پر بعض حلال چیزوں کو حرام قرار دیدیا۔

۱۶۰/۴ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ کَثِیۡرًا ۔ (۱۶۰/۴)

ان جرائم کی سزا

(بہرحال، یہ ہیں وہ بنی اسرائیل جو آج تم سے اس قسم کے مطالبات کر رہے ہیں کہ آسمان سے لکھی لکھائی کتاب اتار کر بتاؤ) - ان کی اس قسم کی زبادتیوں اور سرکشیوں کا نتیجہ تھا کہ، وہ خوشگوار چیزیں جو پہلے ان کے لئے حلال تھیں، سزا کے طور پر، ان پر حرام قرار دی گئیں - (۱۶۰/۴)۔ ان کے جرائم کی فہرست طویل ہے۔ لیکن مختصراً یہ سمجھو کہ یہ لوگ ہمیشہ نظامِ خداوندی کی راہ میں، جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع بخشیوں کی راہ ہے، روک بن کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

ان چیزوں کی تفصیل جو ان پر اس طرح حرام قرار دی گئی تھیں، سورۂ انعام (۱۴۷/۶) میں دی گئی ہے۔ جہاں کہا گیا ہے؛

وَعَلَی الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا کُلَّ ذِیۡ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الۡبَقَرِ وَالۡغَنَمِ حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ شُحُوۡمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُوۡرُهُمَاۤ اَوِ الۡحَوَایَاۤ اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیۡنٰهُمۡ بِبَغۡیِهِمۡ ۫ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ۔ (۱۴۷/۶)

ان چیزوں کی تفصیل

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی، بجز اس چربی کے جو ان جانوروں کی پیٹھ یا انتڑیوں کے ساتھ لگی ہو۔ یا جو ہڈیوں کے اندر ملی ہو۔ (تو یہ چیزیں عام حالات میں حرام نہیں تھیں۔ بات یہ تھی کہ) انہیں، اُن کی قانون شکنی کی سزا دی گئی تھی، اور بطور سزا ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا تھا (۱۴۷/۶)۔

حلال چیزوں کو حرام قرار دینا خدا کا عذاب ہے

یہاں سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ حلال چیزوں کو قوم کے لئے حرام قرار دے دینا، خدا کا عذاب ہے۔ آپ انڈکس میں حرام اور حلال کا عنوان دیکھئے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ

نے امت مسلمہ (امت محمدیہ) پر گنتی کی چیزیں حرام قرار دی تھیں لیکن ہمارے فقہائے حرام چیزوں کی لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کر دیں۔ یہ چیزیں صدیوں سے امت پر حرام چلی آ رہی ہیں اور اب ان کا حرام ہونا اس قدر ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے کہ ان کے کھانے کے تصور تک سے ہمیں جھنجھنی آ جاتی ہے۔ یہ خود خدا کا عذاب ہے کہ اس کی حلال کردہ اشیاء کے استعمال کے تصور تک سے انسان کانپ اٹھے!

یہودی پیشواؤں کا ایک سنگین ترین جرم خدا کی راہ (سبیل اللہ) میں روک بن کر بیٹھ جانا بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ علمائے شریعت اور ارباب طریقت جہاں بھی ہوں گے وہ یہی کچھ کریں گے۔ وہ خدا کی طرف لے جانے والی راہ میں روک بن جائیں گے۔ (9/34)

ان کا اگلا جرم یہ تھا کہ

4/161 وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (4/161)

ربوٰ جائز کئے تھے

یہ محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے، ان کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے انہیں کچھ قرض دیتے تھے تو اصل سے زیادہ واپس لیتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ یہ اس طرح، نیز دوسرے طریقوں سے، لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جایا کرتے تھے اور اب تک یہی کچھ کرتے ہیں۔

(ربوٰ کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ انڈکس کی مدد سے حوالے دیکھ لیجئے)

یہودیوں نے اپنے مذہب کو اپنی نسل تک محدود کر رکھا تھا۔ کوئی انسان جو یہودی نسل سے نہ ہو، وہ نہ مذہب یہودیت اختیار کر سکتا تھا اور نہ ہی جنت میں جا سکتا (تفصیل بنی اسرائیل کے عقائد کے ضمن میں سابقہ جلدوں میں آ چکی ہے) لیکن قرآن نے کہا کہ خدا کے دین (اسلام) کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں۔ جو چاہے اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ (تفصیل جلد اوّل۔ زیر آیت (2/62) آ چکی ہے) یہاں بھی یہودیوں کے عام جرائم گنانے کے بعد کہا کہ

4/162 لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ

ان میں سے ایمان لانے والے

الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (4/162)

(لیکن اس کا مطلب نہیں کہ یہ لوگ اب، من حیث القوم راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں اور ان کے گھر پیدا ہونیوالا بچہ، محض بنی اسرائیل کی نسل سے متعلق ہونے کی وجہ سے، ہمیشہ کے لئے اس عذاب میں مبتلا رہے گا۔ ان میں سے جو شخص بھی اسلاف کی اندھی تقلید کے بجائے، غور و فکر سے کام لے کر، علیٰ وجہ البصیرت، اپنی روش بدل لے گا وہ عذاب سے نکل جائے گا)۔ چنانچہ ان میں سے ایسے لوگ، جنہوں نے ذاتی تقلید سے علم میں پختگی حاصل کر لی ہے، اس ضابطۂ ہدایت (قرآن) پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے، اور ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے انبیائے سابقہ پر نازل کی گئی تھیں۔ یہ لوگ اب، (جماعت مومنین کے افراد بن کر) قیام صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے نظام کو متشکل کریں گے جس کی بنیادیں اللہ اور آخرت پر ایمان پر استوار ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتوں کا اجر عظیم بہت جلد مل جائے گا (اور ان کا بنی اسرائیل کی نسل سے ہونا ان کے خلاف نہیں جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام، انسانیت کا دین ہے، یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق، کسی نسل میں محدود و کو کے نہیں رکھ دیا گیا)

یہ اس لئے کہ دین خداوندی نہ نسلی تھا نہ قومی۔ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ہدایت تھا (اور ہے) اور شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے۔

دین تمام انبیاءؑ کو دیا گیا تھا

۱۶۳/۴ إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَـٰرُونَ وَسُلَيْمَـٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا - (۱۶۳/۴)

یہ کوئی نیا دین نہیں۔ (اصلاً) وہی دین ہے جو، نوحؑ اور اس کے بعد دیگر انبیاءؑ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا۔ جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کو دیا گیا تھا۔ جو عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، اور سلیمانؑ کو دیا گیا تھا۔ یہی ضابطۂ ہدایت (دیگر انبیاءؑ کی طرح) داؤدؑ کو بھی دیا گیا تھا۔ اور خود یہودیوں کے پیغمبر، موسیٰؑ سے بھی خدا نے یہی باتیں کی تھیں۔

(اس کی تشریح انڈکس سے دین کے عنوان کے تحت دیکھئے)

(ضمناً) آپ دیکھئے کہ سلسلۂ رشد و ہدایت کا آغاز حضرت نوحؑ سے کیا گیا ہے اور باقی انبیاءؑ کو "من بعدہٖ" (اس کے بعد آنے والے) کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ سب سے پہلے

نبی (حضرت) آدمؑ تھے، قرآن کی رو سے صحیح نہیں۔ (آدم کی بحث جلد اوّل میں کی جا چکی ہے)

زبور کے متعلق بھی پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ (دیکھئے ۳/۱۸۴)

ان انبیاء کے متعلق فرمایا۔

۴/۱۶۴ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ (۴/۱۶۴)

غرضیکہ تمام انبیائے سابقہ کو یہی دین دیا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم، اس سے پہلے کر چکے ہیں لیکن بعض کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ذکر کیا ہو یا نہ، اصلاً ہر رسول کو یہی دین دیا گیا تھا اور رسول دنیا کی ہر قوم کی طرف آئے تھے۔ (۱۳/۷؛ ۳۵/۲۴) حضرت موسیٰؑ بھی انہی میں شامل ہیں۔

بعض رسولوں کا ذکر بعض کا نہیں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے اور اجمالی طور پر ہمارے لئے ضروری ہے (یہ ہمارے ایمان کا جزو ہے) کہ ہم ان سب کی نبوّت کا اقرار کریں، خواہ ان کا قرآن میں بالتصریح نام آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ جو اہل مذہب اپنے کسی بزرگ کے متعلق کہیں کہ وہ ان کے مذہب کے بانی تھے، ہم اجمالی طور پر تسلیم کریں گے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے رسول ہوں۔ اس عقیدہ کی بنا پر دنیا کے ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام ہم پر لازم ہو گا۔ اگرچہ ہم خدا کی تعلیم کی حامل اسی کتاب کو سمجھیں گے جو حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ یعنی قرآن کریم۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق دنیا کی ہر قوم میں انبیاء آتے رہے لیکن اس نے نام لے کر انہی انبیاء کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی اوّلین مخاطب قوم (عرب) شناسا تھی۔ یہ انبیاء ان کے وطن کے ارد گرد کے علاقوں اور ان کے ساتھ رہنے سہنے والے اہل مذہب کے انبیاء تھے۔ اس لئے قرآن نے ان کا نام لے کر ذکر کیا۔ اگر ان سے

صرف چند ایک کا ذکر کیوں کیا

ایسے انبیاء کا ذکر کیا جاتا جن کا انہوں نے کبھی نام تک نہیں سنا تھا تو، ان کے ذکر سے مستفید ہونا تو در کنار، یہ بحث چھڑ جاتی کہ وہ تھے کون اور رہنے والے کہاں کے تھے۔ (مثال کے طور پر اگر ان سے کہا جاتا کہ جناب کنفیوشس نے اپنی قوم سے یہ کہا تھا تو ان کے ہاں خود کنفیوشس کے متعلق بحث چھڑ جاتی اور جس مقصد کے لئے قرآن نے ان کا نام لیا تھا، وہ مقصد فوت ہو جاتا) یہ وجہ ہے جو قرآن نے نام لے کر صرف ان انبیاء کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی اوّلین مخاطب قوم بخوبی واقف تھی۔

حضرت موسیٰؑ کے خدا سے ہم کلام ہونے کے متعلق انڈکس (زیر عنوان موسیٰؑ) دیکھئے۔ ان انبیاء کا مشن کیا تھا، فرمایا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴/۱۶۵)

رسولوں کا مشن

ان رسولوں کا مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ نظامِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کیا کیا خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے، اور اس کے خلاف جانے سے کیا کیا تباہیاں آئیں گی۔ یہ رسول اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں صحیح راستہ تو بتایا نہیں گیا، اور تباہیاں یونہی مسلط کر دی گئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات جہاں اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا، وہ، وہاں اس قدر پُر حکمت بھی ہے، کہ یونہی اندھا دھند تباہیاں نہیں لے آتا۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ رسول اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ خدا نے ہمیں آگاہ تو کیا نہیں کہ کونسا راستہ صحیح اور کونسا غلط ہے، اور یونہی دھاندلی سے ہم پر تباہی مسلط کر دی گئی ہے تو اس میں بڑی اہم حقیقتیں مضمر ہیں جو وضاحت اور غور و فکر کی متقاضی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا اور ہر شے کو بتا دیا کہ وہ کونسی راہ ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ (انسان کے سوا) یہ راہنمائی ہر شے کی فطرت کے اندر مضمر ہوتی ہے جسے (TNSTiNCT) کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان۔ جلد اوّل میں ہدایت اور صراطِ مستقیم کے عنوانات دیکھئے۔

مواخذہ کی شرائط

۲۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ ہم نے ان کے لئے دونوں راستوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ (۹۰/۱۰)۔ اسے خدا کی طرف سے ہدایت ملا کرتی ہیں۔ لیکن یہ راہنمائی اشیائے کائنات کی طرح انسان کی فطرت (جبلت) میں نہیں رکھ دی گئی۔ اس کے لئے رسول بھیجے گئے، یعنی خدا نے انسانوں تک ہدایت پہنچانے کی خود ذمہ داری لی تھی، اسے پورا کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا گیا۔ یہ رسول انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے اس ذمہ داری کی ادائیگی اسی صورت میں سمجھی جا سکتی ہے کہ۔

اس قوم تک پیغام خداوندی پہنچ چکا ہو اور اس میں اسے سمجھنے کی صلاحیت ہو

۱۔ یہ راہنمائی ہر قوم تک پہنچ چکی ہو۔ اور

۲۔ اس قوم میں اس پیغام کے سمجھنے اور غور

کرنے کی صلاحیت ہو۔

۳۔ جن قوموں تک پیغام نہ پہنچے ان کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن قوموں میں اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، انہیں مرفوع القلم سمجھا جائے گا۔ قرآن کریم نے ہر دو نکات کی وضاحت کر دی ہے۔ پہلے تبلیغ رسالت (پیغامات خداوندی کے پہنچانے) کی مشق کر لیجئے۔ (ہم چند ایک مثالوں تک اکتفا کریں گے)

پہلے اس دنیا میں تباہ ہونے والی قوموں کو لیجئے۔ فرمایا:

سب تک ہدایت پہنچا دی گئی تھی

۱۔ یہ ظلم ہوتا اگر خدا کسی قوم کو تباہ کر دیتا درآنحالیکہ اسے اس کا پتہ ہی نہ ہوتا کہ سلامتی کی راہ کونسی ہے، اور تباہی کا راستہ کونسا۔ (۶/۱۳۲)؛ (۲۶/۲۰۸-۲۰۹)؛ (۳/۹)۔ اس کے لئے بالعموم یہ طریق اختیار کیا جاتا تھا کہ اس قوم کے مرکزی مقام میں رسول بھیج دیا جاتا اور وہ وہاں سے پیغامات خداوندی کو عام کرتا۔ (۲۸/۵۹)

۲۔ یہ اس لئے کہ کوئی قوم یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری طرف تو کوئی نذیر و بشیر آیا ہی نہیں تھا۔ (۵/۱۹)۔ رسول اللہ کو حضورؐ کی اولیں مخاطب قوم کی طرف اسی اتمام حجت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ (۳۶/۶)۔ لیکن وہ اس پر بھی مخالفت پر آئے (۳۵/۴۲)

۳۔ ایک قوم صحیح راہ پر چلنے کے بعد پھر غلط راستہ اختیار کرے تو اس پر بھی کشادگی کی راہ بند نہیں کی جاتی۔ تاوقتیکہ اسے آگاہ نہ کر دیا جائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ (۹/۱۱۵)

یہ تو دنیاوی زندگی کے متعلق تھا۔ اخروی زندگی کے متعلق قرآن کریم مختلف تفاصیل تمثیلی انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

۱۔ رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری قوم نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا۔ (۵/۱۰۹)

۲۔ خود ان مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ تم نے رسولوں کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا۔ (۲۸/۶۵)

۳۔ جہنم کا داروغہ ان سے کہے گا کہ کیا تمہارے پاس خدا کے رسول نہیں آئے تھے وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے۔ (۶۷/۸-۹)؛ (۴۰/۵۰)

۴۔ اہل جہنم اپنے عذاب کی ذمہ داری ایک دوسرے کے سر پر دھریں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اس بے معنی جھگڑے سے کیا حاصل؛ تم سب کو وارننگ دی گئی تھی کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔ (۵۰/۲۸)

قبل اس کے کہ ہم اس دوسرے نکتہ تک پہنچیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کا جواب دے دیا جائے جو آپ کے دل میں اٹھ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ لوگوں تک پیغامات خداوندی پہنچانے کے لئے خدا نے رسولوں کا

ختم نبوّت کے بعد تبلیغ ہدایت کا ذمہ

سلسلہ شروع کیا۔ لیکن یہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ختم نبوّت کے بعد تبلیغ رسالت کی شکل کیا ہو گی؟ اس کا جواب خدا نے خود ہی دے دیا۔

اس نے کہا کہ رسول خداؐ کی کتاب دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ خدا کی آخری کتاب (قرآن مجید) اپنی مکمّل اور محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اب رہا اس کی تبلیغ کا فریضہ، سو اسے اُمّتِ محمدیہ کے سپرد کر دیا۔ فرمایا:

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا۔ (۳۵/۳۲)

"رسول کے بعد ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا جنہیں ہم نے اس مقصد کے لئے منتخب کیا تھا۔" لہٰذا ختم نبوت کے بعد قرآن کریم کے اقوام عالم تک پہنچانے کا فریضہ امت مسلمہ (یعنی ہم مسلمانوں) نے ادا کرنا تھا ——— لیکن، اور یہ لیکن بڑا اہم ہے، جس قوم نے خود ہی قرآن کو چھوڑ دیا ہو وہ اسے دوسروں تک کیا پہنچائے گی؟ لہٰذا ہم دوہرے جرم کے مجرم ہیں۔ ایک خود ترکِ قرآن کے، اور دوسرے اسے اقوامِ عالم تک پہنچانے کے فریضہ کی عدمِ ادائیگی کے۔ اور اس دوہرے جرم کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔

(ضمناً) یہ الگ بات ہے کہ قرآن (لفظوں تک ہی سہی) کا انسانی تقاضوں کی رو سے دیگر اقوام تک پہنچ رہا ہے اور ان کے اربابِ فکر و دانش اس پر غور و فکر بھی کر رہے ہیں۔

سمجھنے کی صلاحیت

اب آئیے دوسرے نکتہ کی طرف۔ یعنی یہ کہ تبلیغ ان قوموں کی آتی ہے جن تک خدا کی راہنمائی پہنچ چکی ہو اور وہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے وہ اصولی طور پر کہتا ہے کہ اہل جہنم وہ ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے جو کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ جو دل (یا دماغ) رکھتے ہیں لیکن اس سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ (۷/۱۷۹) یعنی اہلِ جہنم وہ لوگ نہیں جن میں دیکھنے، سُننے، سمجھنے کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ یہ وہ ہیں کہ ان میں صلاحیت تو ہے اس سے کام نہیں لیتے اور غلط راستے کو نہیں چھوڑتے۔

۲۔ وہ صلاحیتوں کے باوجود راستہ کیوں نہیں چھوڑتے؟ اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی ہے اور ان کے جذبات ان پر غالب آجاتے ہیں۔ (۲۶/۲۲)

۳۔ اقوامِ سابقہ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ایک لفظ میں ساری بڑی بات سمٹا دی جب کہا کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ (۲۹/۳۸)۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔

ان مقامات (اور ان جیسے کئی دیگر مقامات) سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ پیغاماتِ خداوندی انہی کی راہنمائی کر سکتے ہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے حجت کا اتمام ہو چکا ہے (یعنی انسانوں تک ہدایت پہنچانے کی جو ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی تھی وہ ادا ہو جاتی ہے) اگر ان لوگوں تک جو اس پیغام کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ پیغام پہنچ جائے۔

یہاں وہ اعتراض سامنے آتا ہے جو قریب قریب ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ جن لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا ہی نہیں۔ یا جو اسے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، انہیں سزا کیوں دی جائے۔

یہ اعتراض اس بنا پر پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ذہن میں خدا کی طرف سے سزا کا وہی تصور ہوتا ہے جو دنیاوی عدالتوں کی طرف سے مجرموں کو ملتا ہے۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے "سزا اور جزا" کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اسے آپ انڈکس میں دیکھئے۔ اس مقام پر ہم اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی گاؤں میں سکول نہیں۔ یا سکول ہے تو کسی بچے کا باپ اسے سکول بھیجتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ہر دو صورتوں میں وہ بچہ علم سے محروم رہ جائے گا۔ علم سے محرومی بہت بڑی "سزا" ہے جسے وہ بچہ ساری عمر بھگتے گا۔ لیکن اس بنا پر وہ بچہ اس کا ذمہ دار نہیں تھا، آپ اسے علم سے محرومی کے نقصانات سے بچا نہیں سکتے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس گاؤں میں مدرسہ نہیں کھولا تھا۔ یا اس بچے کا باپ جس نے اسے سکول نہیں بھیجا تھا، اس جرم کی سزا پائیں گے لیکن ان کی سزا سے بھی بچہ علم کی فیوض سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گا۔

یہ ہے مثال ان کی (۱) جن تک پیغاماتِ خداوندی نہیں پہنچ پائے یا جن میں ان کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ نیز (۲) ان کی جنہوں نے ان پیغامات کو ان لوگوں تک نہیں پہنچایا، یا انہوں نے ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو بار آور نہیں ہونے دیا۔ اوّل الذکر پیغاماتِ خداوندی کے فیوض و برکات سے محروم رہ جائیں گے۔ اور آخر الذکر کو دوہری سزا ملے گی۔

اس کے بعد بتایا کہ اس امر کی شہادت کیا ہوتی تھی کہ رسول جس پیغام کو خدا کی طرف سے کہہ کر پیش کرتے تھے، وہ فی الواقعہ منزل من اللہ ہوتا تھا۔ فرمایا۔

۴/۱۶۶ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۔ (۴/۱۶۶)

وحی کی شہادت

"اب دیکھ لو، یہ دین، علم و بصیرت کی بنیادوں پر، تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس پر خود خدا کی شہادت موجود ہے۔ اور اس کی کائناتی قوتوں کی شہادات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کائنات میں ہر کام قانون کے مطابق ہوتا ہے اور قانون ہی کے مطابق ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اور وہ بنیادی شہادت، جس کے بعد کسی خارجی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، خود اس قانونِ خداوندی کی داخلی شہادت ہے یہ اپنے نتائج سے بتا دے گا کہ میں اسی خدا کا قانون ہوں جس کا قانون ساری کائنات میں جاری و ساری ہے (۴۱/۵۳)

ان شہادتوں کی تشریح آیت (۳/۱۷) میں سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے اس قسم کے محکم اور قابلِ اعتماد شہادات کے بعد بھی جو لوگ اس پیغام سے انکار کریں اور سرکشی کی راہ اختیار کریں، ان کے متعلق کہا:

۴/۱۶۷-۶۹ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

اس کے بعد کفر

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ دین سے انکار کریں اور نظامِ خداوندی کے قیام میں جو ربوبیت عامہ کی راہ ہے، سنگِ گراں بن کر بیٹھ جائیں، تو ان سے بڑھ کر گمراہی اور کس کی ہو سکتی ہے؟

ان کے انکار اور سرکشی کی روش، سوائے اس کے کہ انہیں تباہیوں کے ابدی جہنم کی طرف لے جائے، اور کیا نتیجہ مرتب کرے گی؟ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، انہیں ان تباہی سے کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی تصریحات بیان کرنے کے بعد کہا کہ:

۴/۱۷۰ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔ (۴/۱۷۰)

سوائے نوعِ انسان! یہ رسول، تمہارے خدا کا قانونِ ربوبیت لے کر، تمہاری طرف، حق و صداقت

نوعِ انسان کی طرف آخری رسولؐ

کے ساتھ آگیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت پر یقین کر کے، اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالو گے تو یہ تمہارے لئے اچھا ہو گا۔ اس سے یہ نظام جلدی متشکل ہو جائے گا اور تم اس کے ثمرات سے بہرہ یاب ہو جاؤ گے۔ لیکن اگر تم نے اس سے انکار کر دیا اور اپنی روش پر چلتے رہے، تو پھر خدا کا کائناتی قانون، جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے اور جو ارض و سما میں جاری و ساری ہے، اپنے انداز اور اپنی رفتار کے مطابق، اسے بتدریج آگے بڑھاتا جائے گا خدا کا کائناتی قانون تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی رفتار، تمہارے حساب و شمار کے مطابق بہت سست ہے۔ اس کا ایک ایک "دن" ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے (۳۲/۵)۔ بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا (۷۰/۴)۔

سابقہ رسول ایک ایک قریہ میں؛ ایک ایک قبیلہ یا قوم کی طرف آتے تھے۔ لیکن آخر میں ایک ایسا رسول بھی آگیا جو تمام نوعِ انسان کی طرف رسول تھا۔ اس رسول (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اس پیغامِ خداوندی کو نسلی، قبائلی، وطنی، لسانی، حدود و قیود سے ماوراء، اپنے دور کے ذرائع ابلاغ کے مطابق تا بحد امکان دور دور تک پہنچایا اور اس کے مطابق نظام قائم کر کے، دنیا کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ ممکن العمل بھی ہے اور اس قدر خوشگوار نتائج کا حامل بھی۔ حضورؐ کے بعد (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) یہ فریضہ امتِ محمدیہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اُمتِ محمدیہ ہم مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ جو قوم بھی اس پیغام کی صداقت کو تسلیم کر کے اسے اپنائے گی اس کا شمار امتِ محمدیہ میں ہو جائے گا یعنی اس اُمت میں جسے کتاب خداوندی کا وارث قرار دیا گیا تھا۔

لیکن اس قوم کو راہِ حیات کی ایک ایسی خطرناک گھاٹی سے آگاہ کیا گیا جو اکثر اُممِ سابقہ کے لئے باعثِ لغزش اور موجبِ تباہی ہوئی تھی۔ یہ مقام بڑا اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔ خطاب اہلِ کتاب سے ہے، اور تنبیہ ہمارے لئے۔ فرمایا۔

۴ / ۱۷۱-۱۷۲ يَآهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ
اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ
كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ز فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫
وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ
سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ م لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ

وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا ﴿ع﴾ لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ﴿ ۴/۱۷۱-۱۷۲ ﴾

دین میں غلو مت کرو

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمام انبیاء کو شروع سے دیا جاتا رہا۔ لیکن اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں بہت سی باتیں ہیں جنہیں موجودہ دین (جو قرآن کے اندر ہے) غلط قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے دین میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے (۵/۷۷)۔ اور اسے اس کے صحیح مقام پر نہیں رہنے دیا۔ ان سے کہہ دو کہ تم اس باب میں حقیقت سے تجاوز نہ کرو (۷/۱۸۱-۱۸۰) اور اللہ کی طرف حق بات کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ (مثلاً تم نے مسیحؑ کے متعلق عجیب و غریب اعتقادات و تصورات قائم کر رکھے ہیں ——— یہودیوں نے تفریط کی طرف اور عیسائیوں نے افراط کی طرف)۔ حالانکہ صحیح پوزیشن یہ ہے کہ وہ اللہ کا رسول تھا، اور اس رشد و ہدایت کے پروگرام کی ایک کڑی، جس کے متعلق مریم کو بتا دیا گیا تھا۔ اور اس کی تعلیم وحیٔ خداوندی پر مبنی تھی۔ سو تم (مسیحؑ کی الوہیت کے عقیدے کو چھوڑ کر) اللہ پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسولوں کو بس رسول سمجھو۔ اور تثلیث کا غلط عقیدہ چھوڑ دو۔ اگر تم اس قسم کے باطل عقائد کو چھوڑ دو گے تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔

عیسائیوں کے باطل عقائد

یاد رکھو! کائنات میں الٰہ صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ اللہ کی ذات ہے۔ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ اولاد تو انسانوں کے ہاں ہوتی ہے کہ ان کے کسی کام آئے ضعیفی میں ان کا سہارا بنے۔ خدا کو اولاد کی کیا ضرورت ہے جب کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو خود ساری کائنات کے لئے محکم سہارا ہے۔

تم (تثلیث کے عقیدے کی رو سے) مسیحؑ اور روح القدس (فرشتے) کو خدا کی شانِ الوہیت کا شریک بنا رہے ہو، اس خیال سے کہ اس سے چھوٹا درجہ اس کے شایانِ شان نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود مسیحؑ اور خدا کے مقرب ملائکہ اس حقیقت کے اعتراف میں قطعاً عار محسوس نہیں کرتے کہ وہ خدا کے بندے ہیں۔ جو کوئی خدا کا بندہ ہونے (اللہ کی محکومیت) میں ننگ و عار محسوس کرے، اور اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھے، تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ان تمام باتوں کے نتائج خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب

اور ظاہر ہوں گے۔ تم اس کے دائرے سے کہیں باہر نہیں جاسکتے۔ تمہیں گھیر کر وہیں لایا جائے گا۔

ان آیات میں جو کچھ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اسے سورۂ آل عمران کی متعلقہ آیات کے سیاق و سباق میں رکھ کر بآسانی سمجھا جاسکتا ہے جس مقام کو ہم نے تباہ کن خطرناک گھاٹی سے تعبیر کیا ہے وہ ہے غلو فی الدنیا۔ اور یہی وہ مقام ہے جو ہمارے گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔

غلو فی الدنیا کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۱۹۳ (زیر آیت ۲/۱۴) آغاز سخن کیا گیا تھا لیکن وہاں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو مقام الوہیت تک پہنچا دینے پر اکتفا کیا گیا تھا۔ رسولوں کے متعلق لکھا گیا تھا کہ "دنیا کے ہر اہل مذہب نے اپنے بانیٔ مذہب کو کسی نہ کسی شکل میں فوق البشر قرار دے رکھا ہے" اور حضور نبی اکرمؐ کے متعلق اس اعلان کو پیش کیا گیا تھا۔ کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ (۱۸/۱۱۰) "میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے" اس کے برعکس ہم نے جس طرح حضورؐ کو مقامِ بشریت سے اٹھا کر مقام الوہیت تک پہنچا رکھا ہے، اس کے متعلق میں نے وہاں کچھ نہیں لکھا تھا۔ میں نے اس موضوع پر تصوف سے متعلق اپنی حالیہ تصنیف کردہ کتاب میں شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ تفصیل وہاں ملے گی۔ یہ موضوع بڑا اہم اور نازک ہے۔ اسے ضمنی طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں میں اس کی صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔

رسول اللہ کے باب میں غلو

علامہ اقبال نے اپنے دور اول میں دو قطعہ بند شعر لکھے تھے۔ جب اُنہوں نے اپنا مجموعہ کلام (بانگ درا) مرتب اور شائع کیا تو اس میں سے یہ اشعار حذف کر دئیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود ان اشعار کو اپنی طرف منسوب نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد ان اشعار کو کھود کھود کر نکالا گیا اور اب انہیں اپنے عقائد کی تائید میں بڑے دھڑلے سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ (متروک) اشعار یہ ہیں۔

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ میرا کعبہ ہے ۔۔۔ میں بندہ اور کا ہوں، امت شاہ ولایت ہوں
جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں ہونے والے کو ۔۔۔ مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبت ہوں

ان (متروک) اشعار کو چھوڑیئے۔ اس قسم کے اشعار آپ کو قوالی کی ہر محفل میں ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سنائی دیتے اور ان پر، اربابِ معرفت وجد کرتے دکھائی دیں گے کہ:

وہی جو مستوئ عرش ہے خدا ہو کر ۔۔۔ اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰؐ ہو کر[1]

---

[1] نیز دیکھئے پانچواں باب زیر آیت (۴/۶۵)۔

حتیٰ کہ

ھوالاول، ھوالآخر، ھوالظاہر ھوالباطن — بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ، لوح محفوظ خدا تم ہو

نہ ہو سکتے ہیں دو اوّل، نہ ہو سکتے ہیں دو آخر — تم اوّل اور آخر - ابتدا تم، انتہا تم ہو

(حدائق بخشش ۔ مولانا احمد رضا بریلوی (مرحوم))

جب ان سے کہا جائے کہ یہ تو غلو ہے، جس سے خدا نے سختی سے منع کیا ہے، تو وہ جواب میں کہہ دیں گے کہ مجھے معذور رکھو میں مست صہبائے محبت ہوں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جب اہل کتاب (یا دیگر اہل مذہب) نے بانیانِ مذہب کو خدا، خدا کا اوتار، یا اس کا بیٹا قرار دیا تھا تو وہ محبت کی بنا پر تھا یا نفرت کی بنا پر! اگر ان کا بربنائے محبت و عقیدت غلو کفر اور شرک ہے، تو ہمارا غلو کس طرح عین دین تسلیم کیا جا سکے گا۔

ہمیں اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہر شے کا اس کے صحیح مقام پر رہنا الحق ہے۔ جس طرح اسے اس کے مقام سے نیچے گرا دینا غیرالحق ہے اس طرح اسے اس کے مقام سے اونچا لے جانا بھی غیرالحق ہے۔ خدا، خدا ہے اور رسول، رسول۔ اور یہی خدا اور اس کے رسول کی صحیح تکریم و تعظیم اور یہی قرآن کی رُو سے وہ ایمان ہے جس کے متعلق کہا:

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ
۴/۱۷۲-۱۷۳ وَ یَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡتَنۡکَفُوۡا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا
فَیُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۙ۬ وَّ لَا یَجِدُوۡنَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا
نَصِیۡرًا ○ (۴/۱۷۲-۱۷۳)

صحیح ایمان

"جو لوگ خدا کو اپنا الٰہ اور اپنے آپ کو اس کا عبد و محکوم سمجھتے ہیں اور اس کے احکام و قوانین کے مطابق عمل کرتے ہیں، انہیں ان کے حسن عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا ـــــ بلکہ خدا کی سہولت بخشیوں کی رو سے، ان کی توقعات اور اندازوں سے بھی زیادہ ـــــ لیکن جو لوگ خدا کا بندہ (محکوم) ہونے میں عار محسوس کریں گے اور اپنے آپ کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھیں گے کہ خدا کی اطاعت کی جائے، تو ان کی اس روش کے نتائج، درد انگیز تباہی کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گے۔ وہ بُری طرح برباد ہوں گے۔

اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ سب سے ذات خدا ہی کی ہے۔ سارا اقتدار اُسی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ ساز اور مددگار نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کا ایمان خدا کی اس کتاب کی صداقتوں پر یقین کامل رکھنے سے حاصل ہوتا ہے جس کی خصوصیات یہ ہیں کہ:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ
نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ (۴/۱۷۵) ۴/۱۷۵

اے نوعِ انسان! تمہارے پاس، تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے، واضح دلائل آ گئے یعنی اس نے تمہاری طرف ایک ایسا ضابطۂ ہدایت بھیج دیا ہے جو خود روشن ہے اور ہر چیز کو روشن کرتا ہے (روشنی کا خاصہ ہے کہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی ——— روشن چراغ کو دوسرے دیئے کی روشنی سے تلاش نہیں کیا جاتا۔ اس کی اپنی روشنی دیکھنے والے کو خود بخود اپنی طرف لے آتی ہے، نیز وہ ہر شے کا صحیح صحیح مقام متعین کر دیتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہی کیفیت قرآن کی ہے)

قرآن مجید کی خصوصیات

یہ کتاب عظیم:

۱۔ تمام نوعِ انسان کے لئے جامع ہدایت ہے۔

۲۔ یہ دلائل و براہین پر مبنی ہے۔

۳۔ یہ روشنی ہے جو زندگی کی راہیں تابندہ کرتی چلی جاتی ہے۔

۴۔ یعنی مبین ہے۔ خود بھی واضح ہے اور ہر معاملہ کو واضح کر دیتی ہے۔ جو لوگ دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد اس کی صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں:

فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ
مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ (۴/۱۷۶) ۴/۱۷۶

سو جو لوگ اللہ کے اس روشن اور تابناک ضابطۂ ہدایت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیں، اور اس سے محکم طور پر وابستہ رہیں، تو خدا کا نظامِ ربوبیت، ان کی ذات کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچا دے گا اور ان پر معاشی خوشحالیوں اور سہولتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور اس طرح وہ، اس سیدھی اور متوازن راہ پر چل نکلیں گے جو انہیں بلا خوف و خطر خدا کی متعین کردہ منزلِ مقصود تک لے جائے گی ———

اور یہ منزل اس کے سوا کیا ہے کہ:

نوعِ انسان کی منزلِ مقصود

۱۔ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری بن جائے۔ (۲/۲۱۳)

۲۔ کسی کو کسی قسم کا خوف و حزن نہ رہے۔ (۲/۳۸)

۳۔ کوئی انسان نہ کسی انسان کا محکوم ہو۔ (۳/۷۸) ۔ نہ اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

۴۔ تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پائیں۔ (۵/۴۴)

۵۔ نظامِ عدل و احسان اس درخشندگی سے قائم ہو کہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ (۳۹/۶۹)

۶۔ اور اس نور سے تمام افراد کی ذات کی صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو جائے کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں۔ (۴۴/۱۹)

اسی راہ کو خدا کی طرف سے جانے والی صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔

آپ دیکھیئے۔ اس میں خالی ایمان (صداقتوں کو صحیح تسلیم کرلینے) کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ اس کتاب کے ساتھ اعتصام بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اعتصام کے معنی کسی سہارے کو ایسی مضبوطی سے پکڑنے یا تھامنے کے ہیں کہ انسان گرنے سے محفوظ رہے۔ (۳/۱۰۲-۱۰۳)۔ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ میں "بِهٖ" کی ضمیر واحد نے واضح کر دیا کہ سہارا صرف قرآن ہے اور اعتصام صرف اسی کا لازم ہے۔ اس کے ساتھ کسی اور چیز کا نہیں۔ اس کو توحید کہا جاتا ہے۔

سورۃ النساء کے شروع میں وراثت سے متعلق تفصیلی احکام دیئے گئے تھے (۴/۱۲)۔ ان کی ایک ذیلی شق کا آخر میں اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

۴/۱۷۶ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (۴/۱۷۶)

(اس سورۃ کے شروع میں وراثت کے قوانین بیان کئے گئے تھے، جن میں کلالہ یعنی لاولد کا ذکر بھی آیا تھا۔ وہاں اس لاولد مرنے والے کا ذکر تھا جس کے ماں باپ اور بہن بھائی موجود ہوں (۴/۱۲)۔ اسی ضمن میں یہ لوگ تم سے کچھ مزید دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ اس کے متعلق تمہیں خدا خود بتاتا ہے۔

کلالہ کی وراثت

اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔ تو اس کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی:

۱۔ اگر متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو، تو ترکہ میں اس کا نصف حصہ ہوگا۔

۲ - اگر متوفیہ عورت ہو، تو اس کے ترکہ کا وارث اس کا بھائی ہوگا۔

۳ - اگر ایک بہن کے بجائے دو بہنیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی حصّہ ہوگا ——— دو سے زیادہ بہنوں کے لئے بھی یہی اصول ہوگا۔ (۴/۱۱)

۴ - اور اگر بھائی بہن ملے جلے ہوں، تو "ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصّہ" کا اصول کار فرما ہوگا۔ (۴/۱۱)
(یہ تقسیم قرضہ کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ ۴/۱۲)

اللہ تمہیں یہ احکام کھول کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو۔ اور اللہ ہر بات کا صحیح صحیح علم رکھتا ہے۔
اس لئے اس کے احکام و قوانین علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔
"کلالہ" کا ذکر سابقہ صفحات میں (قوانینِ وراثت کے ضمن میں) آچکا ہے۔

سُورۃُ النِّسَاء ختم

پانچواں باب

سُورَۃُ الْمَائِدَہ

کُفر اور اِسْلام کا معیار

(آیت $\frac{5}{1}$ تا $\frac{5}{12}$)

۱ ———— حرام و حلال کی بحث

۲ ———— عدل و احسان

۳ ———— دین کی تکمیل

۴ ———— قوموں کی تباہی کی دو شرطیں

۵ ———— اسلامی نظام کے قیام کا پروگرام

۶ ———— انسانی جان کی قیمت

(پہلا قتل)

۷ ———— جرائم کی سزائیں

۸ ———— کفر اور اسلام کا معیار ———— کتاب اللہ

۹ ———— جہنم میں لیڈروں اور عوام کے مکالمات

۱۰ ———— دین میں غلو

۱۱ ———— تصرف

۱۲ ———— حج کا مقصد

شروع سُورۃُ المَائِدَہ (پانچویں سُورت)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

سورۃ المائدہ کی پہلی آیت کا پہلا حصّہ یوں ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ط۔ عقود (اَلْعُقْدُ کی جمع ہے) اس کے بنیادی معنی مضبوطی سے گرہ باندھنے کے ہیں۔ عَقَدَ الْعَھْدَ "اس نے عہد کو مضبوط کر دیا"۔ پھر اس کے معنی عہد و پیمان کے ہو گئے۔ یا ان ذمہ داریوں کے جو انسان نے اپنے اوپر لے رکھی ہوں۔ اس مفہوم کے لئے "ایفائے عہد" آیا ہے جو مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ (۲۳/۸)۔ مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۶۵)

لہٰذا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کا مفہوم یہ ہو گا کہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے جس قدر ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں، اور جنہیں پورا کرنے کا تم عہد کرتے ہو، انہیں بحسن و خوبی پورا کرو۔ ان پابندیوں میں پہلے حرام و حلال کا ذکر آیا ہے۔ جس کے لئے فرمایا: "اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ط (۵/۱)۔ یعنی" تمہارے لئے بھیمۃ الانعام حلال کئے گئے ہیں بجز ان کے جن کی حرمت کے متعلق الگ احکام دیئے گئے ہیں۔ اور اس استثناء کے ساتھ کہ جب تم حج کی تقریب پر حالتِ احرام میں ہو تو ان (حلال جانوروں) کا بھی شکار نہ کرو"۔ دوسری جگہ صید البر کی تخصیص سے بتا دیا کہ حالتِ احرام میں صرف خشکی کے جانوروں کے شکار کی ممانعت ہے۔ (۵/۹۶)

قرآنِ کریم کے نظریہ حرام و حلال کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۴۰ پر دی گئی ہے اور حرام چیزوں کی فہرست اس کے صفحہ ۱۴۳ پر۔ یہاں دو ایک نکات کی تشریح ضروری ہے۔

بھیمۃ الانعام:

۱۔ یہاں بھیمۃ الانعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ انعام کے عام معنی مال مویشی کے ہیں۔ عرب عام طور پر اس لفظ کو اونٹ، بکری اور گائے کے لئے بولتے تھے۔ بعض نے ان میں بھیڑ اور دُنبہ کو بھی شامل کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اونٹ، گائے بھیڑ اور بکری، چاروں کو اس میں شامل کیا ہے۔ (۶/۱۴۳-۱۴۴)۔ اس میں مختلف مقامات پر ان کاموں کی تفصیل دی گئی ہے

جو انعام سے لئے جاتے ہیں۔ اس تفصیل کو "لغات القرآن" سے درج کیا جاتا ہے۔

سورۃ فاطر میں اَنۡعَامٌ کو انسان اور دوآبّ سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵/۲۸)۔ اگرچہ دوآبّ میں مجموعی طور پر تمام جاندار آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان د۔ ب۔ ب)۔ لیکن یہاں دوآب کے معنی پیٹ کے بل چلنے والے جانور ہونگے لہٰذا، اَنۡعَامٌ سے مراد چارپائے ہوں گے۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ نباتات سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے اَنۡعَامٌ کو بھی کھلاؤ۔ كُلُوۡا وَارۡعَوۡا اَنۡعَامَكُمۡ (۲۰/۵۴ نیز ۱۰/۲۴؛ ۳۲/۲۷؛ ۷۹/۳۳؛ ۸۰/۳۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَنۡعَامٌ چرنے چگنے والے جانور ہیں۔ جنہیں تم چرا کر لاتے ہو۔ (۱۶/۱۰)۔

سورۃ نحل میں ہے کہ تم اَنۡعَام کا دودھ پیتے ہو (۱۶/۶۶)۔ سورۃ المؤمنون میں ہے کہ تم ان کا دودھ بھی پیتے ہو اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان میں سے تم کھاتے بھی ہو اور سواری بھی کرتے ہو (۲۳/۲۱)۔ ان کی اون سے کپڑے بناتے ہو (۱۶/۵)۔ ان کی کھالوں کے خیمے بناتے ہو (۱۶/۸۰)۔ ان سے باربرداری کا کام لیتے ہو (۱۶/۷)۔ ان میں حَمُوۡلَةً بھی ہیں اور فَرۡشًا بھی (۶/۱۴۲)۔ یعنی جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے کام آئیں۔ (دیکھئے عنوان ح۔ م۔ ل)۔ اور جو ان کاموں کے لئے چھوٹے، یعنی زمین گیر ہوں (دیکھئے عنوان ف۔ ر۔ ش)۔ (۴۳/۱۲) میں اَنۡعَامٌ کے متعلق ہے کہ تم ان کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو۔ سورۃ یٰسین میں ان تمام فوائد کو اکٹھا بیان کر دیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ وَمِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ ۔ وَلَهُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ (۳۶/۷۲-۷۳)۔ "ان میں سے ان کے لئے سواری کا کام دینے والے ہیں۔ اور وہ بھی جنھیں یہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لئے ان میں (اور) بہت سی فائدہ کی چیزیں ہیں اور (پینے کا) دودھ بھی۔ اسی طرح سورۃ مومن ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَنۡعَامَ لِتَرۡكَبُوۡا مِنۡهَا وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ۔ وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَلِتَبۡلُغُوۡا عَلَيۡهَا حَاجَةً فِيۡ صُدُوۡرِكُمۡ وَعَلَيۡهَا وَعَلَى الۡفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ (۴۰/۷۹-۸۰)۔ اس میں بھی چوپایوں کے کھانے، ان سے سواری کا کام لینے، بوجھ لادنے اور دیگر فوائد کا ذکر ہے۔

سورۃ نحل میں ان مویشیوں کو الگ بیان کیا گیا ہے جنہیں وہ لوگ (عرب) صبح و شام چرایا کرتے تھے (۱۶/۶)۔ اور بوجھ اٹھانے والوں کا ذکر الگ ہے (۱۶/۷)۔ اور خَيۡلٌ (گھوڑے)، بِغَالٌ (خچر) اور حَمِيۡرٌ (گدھے) کے متعلق ہے لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً (۱۶/۸)۔ "وہ تمہارے لئے سواری کا کام دیتے ہیں اور باعث زینت بھی ہیں"۔ اسی طرح سورۃ آل عمران میں اَلۡخَيۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ وَالۡاَنۡعَامِ (۳/۱۳) الگ الگ آیا ہے۔ یعنی پلے

ہوئے نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی۔ سورۃ مومن میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۴۰/۷۹)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چار پائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سوار ہو۔ اور بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اَلْاَنْعَامُ سے مراد چرنے چگنے والے مویشی ہیں۔ ان کا دودھ پیا جاتا ہے۔ سواری اور باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ کھالوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں۔ نیز یہ وجہ زینت بھی ہوتے ہیں اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ (یعنی اُس زمانے کے عرب اَلْاَنْعَامُ سے یہ کام لیا کرتے تھے)۔ اَلْاَنْعَامُ میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، سب کھانے کے لئے حلال ہیں خنزیر چرنے چگنے والا حیوان ہے اس لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامُ میں شامل ہے۔ لیکن یہ بنص صریح حرام ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے "بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامُ" کہا ہے۔ بہیمہ کے معنی ہیں وہ جو بول نہ سکے۔ گونگا۔ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کے یہ معنی نہیں کہ مویشیوں میں سے وہ حلال ہیں جو بول نہیں سکتے۔ مویشی تو سب بہیمہ ہوتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل مویشیوں کی صفت ہے۔ یعنی مویشی جو بول نہیں سکتے۔ جیسے انگریزی زبان میں (DUMB CATTLE) کہا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی رُو سے، تمام مویشی حلال ہیں۔ بجز ان کے جنہیں اس نے حرام قرار دے دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ حرام چیزوں کی فہرست مطالب الفرقان جلد سوم۔ ص۱۴۳ پر دی گئی ہے۔ مزید وضاحت آیت (۵/۳) میں سامنے آئے گی۔

عالم امر کے فیصلے

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۵/۱) "یعنی خدا جو چاہتا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے"۔ مطالب الفرقان جلد اوّل۔ (ص۲۷۲ ؛ ص۲۸۳) میں عالم امر اور عالم خلق پر بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عالم امر میں ہر فیصلہ مشیت خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور عالم خلق میں ان قوانین کے مطابق جنہیں خدا نے متعین کیا ہے اور جن میں وہ تبدیلی نہیں کرتا۔ زیر نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ حلال اور حرام کا فیصلہ خدا کے عالم امر سے متعلق ہے اور خدا کے ارادہ پر مبنی۔ اس نے شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں عطا کی ہے ہم نہیں کہہ سکتے۔ یعنی ہم اس "کیوں" کا جواب نہیں دے سکتے۔ البتہ ان کے مصالح کو سمجھ سکتے ہیں۔

ان تشریحات کے بعد آیت (۵/۱) کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اے جماعتِ مومنین! تم پر قانون خداوندی کی رُو سے جتنی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور تم اُنہیں پورا کرنے کا عہد

کرتے ہو (اس لئے کہ یہ "ایمان" کا اولین تقاضا ہے) انہیں پورا کرو۔ (مثلاً) کھانے پینے کی چیزوں میں، بجز ان کے جن کے متعلق قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہو (۵/۳) تمام چرنے چگنے والے مویشی حلال ہیں۔ لیکن اگر تم حج میں ہو تو پھر ان کے شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ احکام خدا کے اُس قانون کی رو سے دیئے گئے ہیں جسے وہ خود اپنے اختیار و ارادے سے متعین کرتا ہے۔

اب ہم سورۃ مائدہ کی دوسری آیت کی طرف آتے ہیں اور اسے بھی جزءً جزءً پیش کرتے ہیں۔ فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ (۵/۲)۔ دین کے شعائر (محسوس علامات) اور ان کے احترام کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۱۲۲) اور جلد سوم (صفحہ ۱۲۲) پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ اور "شَهْرُ الْحَرَامِ" (حرمت کے مہینوں) کے متعلق مطالب جلد سوم (صفحہ ۲۲۱-۳۲ ؛ صفحہ ۲۸۱) پر۔

هَدْي کی بابت مطالب جلد سوم (صفحہ ۲۳) میں بتایا گیا ہے کہ یہ وہ تحائف تھے جو حج کے اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ ان میں بیشتر جانور ہوتے تھے۔ اس نشان دہی کے لئے (کہ یہ

قلائد حاجیوں کے لئے تحائف ہیں) ان کے گلے میں پٹہ سا باندھ دیا جاتا تھا۔ قَلَائِد (قلادہ کی جمع) انہی کو کہا جاتا تھا۔ اس طرح ان تحائف (اور جانور) کا شمار بھی شعائر اللہ میں ہو جاتا تھا۔

[ضمناً تقلید کا لفظ اسی (قلادہ) سے آیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تقلید سے انسان پر کس قسم کی غلامی وارد ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کے انڈکس میں تقلید کا عنوان دیکھئے]۔

زیر نظر آیت میں ان شعائر کے احترام کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ یعنی جو لوگ حج کی تقریب میں شرکت کے لئے جائیں ان کے احترام کی بھی۔ ان لوگوں کے متعلق کہا کہ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ حج کی تقریب میں شرکت کے مقصد کے متعلق کہا ہے کہ اس سے معاشی فوائد بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن مقصد صرف معاشی مفاد کا حصول نہیں۔ اصل غایت، اپنی زندگی اور نظام کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھنا ہے۔ (ان مفاہیم کے لئے انڈکس میں حج اور رضا جوئی باری تعالیٰ کے عنوانات دیکھئے)۔

پہلے کہا تھا کہ حالتِ احرام میں شکار حرام ہے۔ اب کہا ہے کہ جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ تو پھر شکار کر

کر سکتے ہو۔ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ (۵/۲)۔

اس کے بعد آیت (۵/۳) میں ایک ایسی بات آئی ہے جس کا، بظاہر، سابقہ احکام سے کوئی تعلق یا ربط دکھائی نہیں دیتا، لیکن درحقیقت اس کا ان سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

حرام وحلال کا معاشرتی پہلو

حرام وحلال کا نظریہ تو مطالب الفرقان۔ جلد سوم (صفحہ ۱۴۰) میں بیان ہو چکا ہے لیکن اس کا ایک معاشرتی پہلو بھی ہے جو بجائے خویش بڑا اہم ہے آپ کو کسی دوسرے مذہب کے پیروؤں سے عقائد کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس سے ان کے دل میں آپ کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات نہیں ابھرتے، لیکن حرام اور حلال کے اختلاف سے تعصب اور باہمی عداوت شدت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جس قدر فسادات برپا ہوئے ہیں ان کی بیشتر وجہ گائے کا ذبیحہ ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی خنزیر کا نام لے دے تو ہمارا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ بعثت نبی اکرمؐ کے زمانے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں حلت وحرمت کا سوال بنیادی اختلاف اور تفریق کا موجب تھا۔ قرآن کریم نے ان بیشتر چیزوں کو حرام قرار دے دیا جن کے قریش عادی چلے آرہے تھے۔ (۵/۳)

یہودی اونٹ کو حرام سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے ہاں یہ حلال تھا۔ عیسائی خنزیر کو حلال قرار دیتے تھے (حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے اسے قابلِ نفرت قرار دیا تھا) لیکن مسلمانوں کے ہاں وہ ایک ہی جانور تھا جسے قرآن نے نام لے کر حرام قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بحث وتمحیص رہتی ہوگی۔

دین کے اصولوں میں مفاہمت نہیں ہو سکتی

قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ یہ (غیر مسلم) کوشش کرتے تھے کہ حضورؐ کے ساتھ مفاہمت کی کوئی شکل پیدا ہو جائے تو اس میں حرام وحلال کا سوال بھی (فطرۃً) سامنے آتا ہوگا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرما دیا تھا کہ دین کے اصولوں میں ان لوگوں کے ساتھ مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (اور حلت وحرمت کا سوال دین کے اصولوں میں سے ہے)۔ بایں ہمہ، ان لوگوں کو اس کی توقع ہوگی کہ شاید مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل۔ صفحہ ۱...)۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس باب میں قطعی احکام دے دیئے تو ان کی یہ امیدیں ختم ہو گئیں۔ وہ اس طرف سے قطعۃً مایوس ہو گئے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اگلی ہی آیت (۵/۳) میں، جس میں حرام چیزوں کی فہرست دی گئی ہے، یہ کہہ دیا کہ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ ۔ "تمہارے مخالفین دین کے معاملہ میں اب تم سے قطعی طور پر مایوس ہو گئے ہیں" اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ۔ اب تمہارا دینی

غلبہ تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ اس دو ٹوک اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی مخالفت میں شدت اختیار کر گئے۔ اسی کے پیش نظر جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط تمہیں ان سے خوف زدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ڈرنا ان سے نہیں چاہیئے۔ ڈرنا چاہیئے اس سے کہ کہیں قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

قریش کی طرف سے جماعتِ مومنین کی مخالفت شروع سے چلی آرہی تھی۔ اس باب میں وہ اس حد تک متشدد تھے کہ انہیں (مومنین کو) کعبہ تک بھی نہیں آنے دیتے تھے، حالانکہ ان کے ہی شعائر اور قومی حصول کے مطابق بھی کعبہ کے

دشمنوں سے بھی عدل

دروازے ہر عرب پر کھلے تھے۔ اس کے بعد، یہ لوگ کھلی جنگ تک اتر آئے۔ یہی روش یہودیوں نے بھی اختیار کر لی۔

لیکن قرآن کریم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف ملاحظہ ہو کہ وہ حرام و حلال سے متعلق آیات کے عین درمیان، جماعتِ مومنین سے تاکید کرتا ہے کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ‎(۵/۲)‏ "دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی کہیں تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے زیادتی کرنے لگ جاؤ۔ تم ایسا کبھی نہ کرنا۔ ان سے ہمیشہ عدل کرنا" (۵/۸)۔

جنگ کے سلسلہ میں قرآنی احکامات سابقہ جلدوں میں آچکے ہیں (انڈکس ملاحظہ کیجیئے)۔ قرآن کریم حدود سے تجاوز کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن حلال و حرام سے متعلق کے احکام کے درمیان، اس قسم کی تاکید، قرآن کی دورنگی اور وسعتِ قلب کی بین شہادت ہے۔

ان تصریحات کے بعد، سورۃ مائدہ کی (پوری) دوسری آیت اور اس کا مفہوم ملاحظہ فرمایئے۔

ارشاد ہے:۔

۵/۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ط وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ط وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ص وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو یاد رکھو کہ اگرچہ اصل شئے نظامِ خداوندی سے وابستگی اور اس کی اطاعت ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جو چیزیں، اس نظام کی نمائندگی کے لئے بطورِ محسوس علامات مقرر کی جائیں، اُن کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ اس لئے کہ اُن کی بے حرمتی اِس امر کی دلیل ہوگی کہ تمہارے دل میں نظامِ خداوندی کا احترام نہیں (جس طرح کسی مملکت کے جھنڈے کا عدمِ احترام اس امر کی شہادت ہوتا ہے کہ اُس شخص کے دل میں اس مملکت کا احترام نہیں)۔ نیز، جن مہینوں میں جنگ کا سلسلہ ملتوی کرکے امنِ عامہ کا اعلان کیا جاتا ہے اُن کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔ نہ ہی اُن تحائف اور جانوروں کی جو حج کے بین الاقوامی اجتماع کے لئے بھیجے جائیں یا ان لوگوں کی جو اس اجتماع میں شرکت کے لئے جائیں تاکہ وہاں ملت کے معاشی فوائد کے حصول، اور زندگی کو، قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کرنے کی تدابیر سوچیں۔

اور جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ تو پھر شکار کر سکتے ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے مدِمقابل وہ قوم ہے جس نے تمہیں سخت ایذائیں پہنچائی تھیں۔ حتیٰ کہ تمہیں کعبہ تک پہنچنے سے روک دیا تھا (۴۸/۲۵)۔ اب تم ان پر غالب آگئے ہو تو دیکھنا! کہیں ان پر ظلم اور زیادتی نہ کرنے لگ جانا۔ یاد رکھو! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے زیادتی کرو۔ تم ان سے ہمیشہ عدل کرو (۵/۸)۔ اور ان تمام امور میں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کی راہیں کشادہ کریں، اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا موجب بنیں، ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ لیکن اُن امور میں کبھی تعاون نہ کرو۔ جو انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا موجب ہوں، یا خدا کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کا باعث۔ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات، ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرتے رہتا ہے۔ اُس کی گرفت بڑی سخت ہے اور وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔

اس کے بعد آیت (۵/۳) میں حرام چیزوں کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ یہ تفصیل مطالب جلد سوم (صفحہ ۱۴۳) میں آچکی ہے لیکن چونکہ اس آیت میں کچھ اور اہم نکات بھی آگئے ہیں، اس لئے اسے بمع مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۵/۳ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ وَأَتْمَمْتُ

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے (۲/۱۷۳) تم پر یہ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں:

۱۔ مُردار ——— اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو اپنی طبعی موت مر جائے اور وہ بھی جو گلا گھٹ کر مر جائے۔ چوٹ کھا کر مر جائے۔ جو اُوپر سے گر کر مر جائے۔ یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مر جائے۔ یا جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو۔ اگر ان جانوروں کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو پھر ان کا کھانا جائز ہے۔

۲۔ بہتا ہوا خُون (۶/۱۴۶)۔　۳۔ لحم خنزیر (سُور کا گوشت)۔

۴۔ ——— ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ نیز وہ جانور بھی حرام ہے جسے کسی استھان پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کیا جائے۔ یعنی ان مقامات پر جو لوگوں نے نذر نیاز کے لئے مقرر کر رکھے ہوں۔

لیکن اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے ——— یہ نہیں کہ جان بوجھ کر ممنوع اشیاء کے کھانے کی طرف مائل ہو ——— تو وہ، بقدرِ ضرورت، ان حرام چیزوں کو بھی کھا سکتا ہے (۲/۱۷۳)۔ قانونِ خداوندی میں، جو انسانوں کی حفاظت چاہتا ہے، خدا کی مہربانی سے اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تم قرعہ اندازی سے چیزوں کی تقسیم کیا کرو، یا فالیں نکالا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم صحیح راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاؤ گے۔ [متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے قرآنی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے عقل و فکر کی رُو سے کرنے چاہئیں۔ قرعے ڈالنے اور فالیں نکالنے سے عقل و فکر کو ماؤف کر کے (CHANCE) کے مطابق فیصلے لئے جاتے ہیں۔ عقل کی رُو سے فیصلہ میں اگر اجتہادی غلطی ہو جائے تو اس پر بارِ دگر غور و فکر سے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جن تدابیر اور طرق میں عقل کو ماؤف کر دیا جائے، ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کند ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سر توہم پرستی میں ہوتا ہے]

تمہارے مخالفین، اس وقت تک اس اُمید میں تھے کہ تمہارے ساتھ شاید کوئی مفاہمت کی راہ نکل آئے (۶۸/۹)۔ لیکن کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت، دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے، اس لئے اب یہ لوگ دین کے معاملہ میں تم سے مایوس ہو گئے ہیں، اور یقینی طور پر سمجھ چکے ہیں کہ یہ دین، ان سے کسی صورت میں مفاہمت نہیں کرے گا۔ لیکن تمہیں، ان سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم صرف اس سے ڈرو کہ کہیں

قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہو جائے، کیونکہ اس کے نتائج فی الواقعہ ایسے تباہ کن ہوتے ہیں کہ انسان ان سے خائف ہو۔ تمہاری کمزوری کا ابتدائی دور ختم ہو جانے کے بعد، ہم نے تمہارے مخالفین پر تمہارے دینی غلبہ کو مکمل کر دیا ہے، اور اس طرح ہم نے تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کر دیا ہے جن کی تم آرزو کیا کرتے تھے۔ (۲/۱۵۰)۔ اور تمہارے لئے اسلام کو بطورِ نظامِ زندگی تجویز کر دیا ہے (جس کے ساتھ کسی اور نظامِ حیات کی مفاہمت کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا)۔

یہ دین تمام نوعِ انسان کے لئے آخری، مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات ہے۔

قرعہ اندازی ازلام کے متعلق مطالب۔ جلد سوم (صفحہ ۳۲۴) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مراد قرعہ اندازی ہے جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی اس جگہ بتائی جا چکی ہے۔ یہاں ایک نکتہ کا اضافہ ضروری ہے۔ قرعہ اندازی کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے لیکن ہمارے ہاں قرعہ اندازی۔ لاٹریاں۔ فالیں۔ استخارے عام ہوتے ہیں اور انہیں کوئی ممنوع نہیں سمجھتا۔ اس کی سند میں ایک حدیث لائی جاتی ہے جس کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ جب سفر پر تشریف لے جاتے تو اس بات کا فیصلہ کہ ازواج مطہراتؓ میں سے کسے اپنے ہمراہ لے جائیں قرعہ کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ اس روایت کو صحیح قرار دینے والے اتنا نہیں سوچتے کہ، علاوہ اس کے کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اسے (معاذ اللہ) حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس سے حضورؐ کی خانگی زندگی کا کس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے اس قسم کا نقشہ کہ ازواج مطہراتؓ کی یہ کیفیت تھی کہ حضورؐ اگر، بہ تقاضائے حالات، کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کا خود فیصلہ فرماتے تھے تو وہ (باقی) ازواج مطہراتؓ پر گراں گزرتا تھا، اور اس کے مقابلہ میں وہ "اندھے اور گونگے پانسہ" کے فیصلہ کو ترجیح دیتی تھیں (معاذ اللہ)۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت اس زمانے کی وضع کردہ ہے جب مسلمانوں کے گھروں کی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ میاں، بیوی میں سے کسی کا فیصلہ بطیب خاطر قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان میں باہمی ہم آہنگی نہیں رہی تھی۔ اور یہی کیفیت عام معاشرہ کی ہو چکی تھی کہ معاملات کا فیصلہ عقل و فکر کی رُو سے کرنے کے بجائے، فالوں اور قرعوں کے فیصلوں کے تابع چلتے تھے۔ استبداد ملوکیت میں عقل و فکر کو اسی طرح ماؤف اور مفلوج کیا جاتا ہے۔ تقدیر کا عقیدہ بھی تو اُسی زمانے کا وضع کردہ ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر (سنہ ھ میں) نازل ہوئی تھی ۔اس کے بعد حضورؐ چند ماہ (قریب اسّی دن) زندہ رہے ۔ اس اعتبار سے اس آیت سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس میں تکمیل وحی کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ (اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ) سب سے آخر میں سورۃ توبہ نازل ہوئی تھی ۔ (ضمناً ۔ شانِ نزول اور زمانہ نزولِ آیات کی روایات بالعموم قابلِ اعتماد نہیں) ۔ اگر یہ آیت، حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس سے اس مفہوم کی تائید ہو جاتی ہے جسے ہم نے پیش کیا ہے ۔ یعنی یہ کہ اس سے مراد، دین کا غلبہ ہے جو حجۃ الوداع کے زمانہ میں تکمیل تک پہنچ چکا تھا ۔

اب آیت کے الفاظ کی طرف آیئے ۔ اَلْيَوْمَ میں يَوْم سے مراد دن نہیں ۔ اس سے مراد، زمانہ ۔ دور ۔ عہد، تاریخی مرحلہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں ۔ (دیکھیئے ۔ مطالب جلد اوّل ۔ صـ۲۹) اور دین کے معانی میں غلبہ اور اقتدار بھی شامل ہیں (ایضاً)

اَكْمَلْتُ وَاَتْمَمْتُ ۔ بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں، لیکن دوسروں نے ان میں یہ کہہ کر فرق کیا ہے کہ اتمام، کسی چیز کی کمی پوری کرنے کو کہتے ہیں اور کمالؔ، اس حد کو کہتے ہیں جس تک وہ اپنی نشوونما کے بعد پہنچ جائے ۔ یا وہ اس مقصد کو پورا کر دے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (ک ۔ م ۔ ل کے مادہ میں) شدت اور قوت کا پہلو بھی مضمر ہے ۔

جیسا کہ مطالب ۔ جلد سوم (صـ۴ پر) بتایا جا چکا ہے، اصولی طور پر دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا تھا فرق اس کی جزئیات میں ہوتا تھا ۔ چونکہ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب تھی جو تمام نوع انسان کے لئے ابدی ضابطہ حیات تھی، اس لئے خدا نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، اس میں اس کی تکمیل ہو گئی اور یوں نعمتِ خداوندی اتمام تک پہنچ گئی ۔

بعثتِ رسول اللہؐ کا مقصد یہ تھا کہ دینِ خداوندی، دیگر ادیان (نظامہائے عالم) پر غالب آ جائے ۔ یہ مقصد (اُس زمانے کے حالات کے مطابق) حضورؐ کے آخری ایام میں، پوری قوت اور غلبہ کے ساتھ پورا ہو گیا ۔ اس اعتبار سے بھی دین کی تکمیل ہو گئی ۔ اور وحیِ خداوندی کے اتمام کے متعلق سورۃ الانعام میں کہہ دیا کہ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) کلماتِ خداوندی، صدق و عدل کے ساتھ اتمام تک پہنچ گئے ۔ اب اس میں نہ کوئی کمی رہ گئی ہے، اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت ۔ اس کے بعد

نبوت ختم ہو گئی۔

تکمیلِ دین کی حدِ آخر ان تصریحات سے آیت (۵/۳) میں اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ہدایت خداوندی قرآن میں اتمام تک پہنچ گئی۔ صدرِ اوّل میں دین کی تکمیل (غلبہ و تمکن) بھی ہو گئی۔ اس کے بعد اس میں پیش کردہ نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب آنا ہے۔ (۹/۳۳)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا، اسلامی مملکت کے ذریعے ممکن ہوگا جسے امت تشکیل کرے گی۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا وہ مقصد حاصل نہیں ہوگا جس کے لئے قرآن نازل کیا گیا تھا۔

اب اگلی آیت کی طرف آئیے۔ اسے بھی مختلف ٹکڑوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمۡ ؕ قُلۡ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ

۵/۴ (اے رسول!) یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ حلال چیزیں کون کون سی ہیں۔ ان سے کہو کہ جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، انہیں چھوڑ کر باقی سب خوشگوار اور صاف ستھری چیزیں حلال ہیں۔

اس ایک آیت سے، قرآن کریم اور سابقہ مذاہب کی تعلیم کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ آپ تورات (بائبل۔ عہد نامہ عتیق۔ کتاب احبار باب ۱۱) دیکھئے۔ اس میں حرام چیزوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ انسان کو حلال چیزوں کی تلاش کے لئے کاوش کرنی پڑتی ہے۔ یعنی اس میں آزادی کم ہے اور پابندیاں زیادہ۔ اس کے برعکس قرآن کریم کو دیکھئے۔

پابندیاں کم۔ آزادی وسیع اس میں گنتی کی چند چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد کہا کہ باقی سب چیزیں حلال ہیں۔ یعنی اس میں پابندیاں بہت کم اور آزادی کا میدان بڑا وسیع ہے۔

اس وسیع میدان میں صرف طیب کی تخصیص ہے۔ حلال کے ساتھ طیب کی خصوصیت کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد اوّل۔ (ص ۳۰۵)۔ اور جلد دوم۔ (ص ۲۹۳) دیکھئے۔

اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا حلال جانوروں کے ذبیحہ کے متعلق ایک ضروری شرط یہ ہے کہ انہیں اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم (ص ۱۴۴ پر) گزر چکی ہے اس میں البتہ ایک نکتہ کا اضافہ ضروری ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ (i) جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے اسے کھاؤ۔ (۶/۱۱۹)۔ اور (ii) جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے مت کھاؤ (۶/۱۲۲)۔ آیت (۶/۱۲۰) میں ہے کہ وَمَا لَكُمۡ اَلَّا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ .... (۶/۱۲۰)۔ یعنی جن حلال جانوروں کو ذبح کرتے

حلال وطیّب

وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو، ان کا گوشت کھانے میں تمہیں تردد نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسے ہر جانور کا گوشت کھانا تم پر فرض ہے۔ حلال چیزوں کے کھانے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ طیّب (خوشگوار وغیرہ) ہوں۔ اگر وہ تمہارے لئے طیّب نہیں تو انہیں مت کھاؤ۔ لیکن کسی غیر خوشگوار چیز کے نہ کھانے اور اسے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) ممنوع سمجھنے میں بڑا فرق ہے۔ بعثت نبی اکرمؐ کے وقت جو غیر مسلم نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، بیشتر چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ اپنے سابقہ مذہب میں حرام اور ممنوع سمجھتے تھے لیکن جنہیں اسلام نے حلال قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے کھانے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہوگی۔ ان سے کہا کہ اگر تمہارا جی نہیں چاہتا تو انہیں بے شک نہ کھاؤ لیکن انہیں حرام اور ممنوع نہ سمجھو۔ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (۶/۱۲۰) حرام چیزوں کی تفصیل خدا نے بیان کر دی ہے۔ اس فہرست میں اضافہ نہ کرو۔

لیکن آپ حرام و حلال کی اپنے ہاں کی مروجہ فہرستوں کو دیکھئے اور پھر ان فقہی بحثوں کو جو مختلف فرقوں میں چلی آ رہی ہیں چونکہ ہم ان چیزوں کو جو فقہ کی فہرستوں میں درج ہیں صدیوں سے حرام سمجھتے چلے آ رہے ہیں، اس لئے اب ان میں، اور خدا کی حرام کردہ میں کچھ فرق نہیں کیا جاتا، اور ان کے کھانے کے تصور تک سے ہماری طبیعت ابا کرتی ہے؟ کیا یہ چیز اسی شق میں نہیں آجاتی جو خدا نے کہا تھا کہ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (۶/۱۲۰)۔ خدا کی حلال کردہ چیزوں کو تم ناجائز اور ممنوع کیوں ٹھہراتے ہو؟

جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینے میں ایک اہم نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہے۔ آپ روزمرہ کے عام کاموں میں مصروف ہیں کہ آپ کو یکایک کوئی خاص کام یاد آجاتا ہے۔ اُس وقت آپ کی تمام توجہات دیگر امور سے ہٹ کر، اس خاص کام پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ ایک عبد مومن کو جب ایسے حالات میں کسی ایسے کام کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے جس کا متعین اور خصوصی حکم خدا نے دیا ہو تو اس وقت اس کی زبان پر خدا کا نام آجانا عین نفسیاتی تقاضا ہوتا ہے حلال جانور کا ذبح کرنا ارشاد خداوندی کی تعمیل ہے۔ اس وقت تمام توجہات کا اس طرف مرکوز ہو جانا اور زبان پر اسم اللہ کا آجانا، اس امر کی شہادت ہے کہ یہ سب کچھ احکام خداوندی کی تعمیل میں کیا جا رہا ہے۔ انسانی توجہات کا اس طرح اس نکتہ پر مرکوز ہو جانا اسوہ ابراہیمی کی یاد دلاتا ہے جب انہوں نے باطل کے تمام خداؤں سے منہ موڑ کر کہا تھا کہ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۶/۸۰) "میں اپنی تمام توجہات کا مرکز اسی ذات بے ہمتا اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہوں۔ یہ میرا دو ٹوک فیصلہ ہے۔"

ذبح کرتے وقت، بِسْمِ اللّٰہِ کے ساتھ اَللّٰہُ اَکْبَرُ بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کا تعین قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن ایسے وقت، خدا کی کبریائی کا اعتراف و اعلان جو معنوی حقیقت اور نفسیاتی اہمیت رکھتا ہے اسے ہم نے مطالب الفرقان۔ جلد سوم ص۲۰۲ (زیر آیت ۲/۱۸۸) بیان کیا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔

آیت (۵/۴) کا اگلا حصّہ یہ ہے:

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (۵/۴) ۵/۴

اس آیت کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو، کہ ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے۔ سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے۔ اور اللہ کا نام لو اس پر۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے۔ بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

شکاری جانوروں کا سدھانا

اس ترجمہ کی رُو سے کہا یہ گیا ہے کہ شکاری کتوں کو تم اس طرح شکار کرنا سکھاؤ جس طرح تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔ اس سے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کسی انسان کو یہ نہیں سکھایا کہ جانوروں کو شکار کے لئے کس طرح سدھانا چاہئے؟ پھر یہ کیسے کہدیا کہ جس طرح خدا نے تمہیں سکھایا ہے، اس طرح تم انہیں سدھاؤ۔

خدا اس قسم کی باتوں کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے، اس کی تشریح، مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ (ص۱۸۴ پر) کر دی گئی ہے۔ وہاں اس آیت (۵/۴) کا یہ حصّہ بھی آگیا ہے۔ نیز مطالب الفرقان جلد سوم (ص۳۷۲) پر ان مقامات کو دیکھ لیجئے۔ بات واضح ہو جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا اہم ہے اس لئے اس تشریح کو غور سے دیکھئے۔

---

[1] مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ کے لفظی معنی ہیں اس (علم) کی رُو سے جیسے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے۔ "اللہ کے سکھانے" سے مطلب ہے وہ فطری طریقہ جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے دیکھئے (۲/۲۲۲؛ ۲/۲۸۲؛ ۹۶/۵-۴)۔

اگلی آیت ہے۔

۵/۵ اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ ۪ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ ۫ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَلَا مُتَّخِذِیۡۤ اَخۡدَانٍ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ع (۵/۵)

تم نے غور کیا کہ حلت و حرمت کے قرآنی احکام نے انسانی زندگی میں کیا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ اس سے پہلے انسانوں کی خود ساختہ شریعتوں نے اس باب میں ہزار قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس سے انسانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ قرآنی دور میں، چند چیزوں کو حرام قرار دے کر، باقی تمام خوشگوار چیزیں حلال قرار دے دی گئیں۔ اس سے کس قدر میدان وسیع ہو گیا؟

نیز اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو تمہارے ہاں حرام ہے اور) وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے جائز سمجھیں۔ کھانے پینے سے آگے بڑھ کر، ازدواجی زندگی کی طرف آؤ تو تمہارے لئے مومن پاکدامن عورتیں اور اُن لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، عقدِ نکاح میں لانے کے لئے جائز ہیں۔ جب تم اُن کے مہر ادا کر دو۔ بشرطیکہ اس سے مقصد ازدواجی زندگی کی پابندیاں پوری کرنی ہوں، نہ محض جنسی جذبہ کی تسکین (خواہ اس کے لئے رسمی طور پر "نکاح" کی شرط بھی کیوں نہ پوری کر لی جائے) یا ان تعلقات کو پوشیدہ رکھا جائے۔ دونوں شکلیں ناجائز ہیں۔ جائز صورت یہی ہے کہ باقاعدہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لئے نکاح کیا جائے اور اس سے عائد ہونے والی تمام ذمہ داریوں کو پورا کیا جائے (۴/۲۵)۔

یہ ہیں وہ پابندیاں جن کی نگہداشت ہر ایمان والے کے لئے ضروری ہے۔ سو جو شخص ان پابندیوں کو توڑ کر عملاً اپنے ایمان سے انکار کر دے تو اس کے دوسرے اعمال بھی وہ نتائج نہیں پیدا کر سکیں گے جو اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ دین ایک کُلی نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض باتوں کو مان لیا جائے اور بعض سے

ملہ واضح رہے کہ یہ صرف اجازت ہے جسے، اسلامی مملکت، دینی اور ملکی مفاد و مصالح کی خاطر، عند الضرورت، وقتی طور پر معطل بھی کر سکتی ہے ـــ وہ اسے منسوخ تو نہیں کر سکتی، لیکن وقتی طور پر اسے ساقط العمل کر سکتی ہے، جیسے (مثلاً ہیضہ وغیرہ کے دنوں میں) بعض پھلوں کے کھانے پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔

انکار کر دیا جائے (۲/۸۵)۔ ایسی روش سے، یہ تو ہوسکتا ہے کہ انسان کو کچھ پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہو جائیں، لیکن انجام کار اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اہل کتاب کے ہاں کے کھانے کے متعلق، مطالب الفرقان۔ جلد سوم (ص ۱۴۵) اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے متعلق اسی جلد کے (ص ۳۴۲) پر وضاحت کر دی گئی ہے۔ آیت کے باقی حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق عائلی قوانین سے ہے۔ ان قوانین کو بڑی وضاحت سے مطالب جلد سوم (ص ۳۱۲-۳۳۶) پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس میں (ص ۳۷۲ پر) آیت (۲/۲۲۳) کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے آیت زیر نظر (۵/۵) کے الفاظ۔ "مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ" کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مُحْصِنِيْنَ (مادہ ح۔ص۔ن) کے معنی ہوتے ہیں، بہا دینا۔ زنا میں مادہ تولید کو بہا دیا جاتا ہے اور نکاح میں اسے، بیوی کے رحم میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ (دیکھئے جلد سوم۔ ص ۳۷۶)۔ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کا مقصد جب "مادہ تولید کو بہا دینا" رہ جائے، تو اس سے قوم کی حالت کیا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ دانش ورانِ مغرب کی اس آہ و پکار سے لگائیے، جو ان اقوام کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی بے راہ روی کے احساس سے ان کے لبوں پر بے ساختہ آ رہی ہے۔ وہ آہ و پکار وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ کی محسوس شہادت ہے۔

شروع سورۃ سے، حرام و حلال اور عائلی زندگی سے متعلق احکام چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اگلی آیت میں، وضو سے متعلق تفصیل دی گئی ہے۔ فرمایا۔

۵/۶ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۵/۶)

اس نظام کے قیام کے لئے جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کا اتباع کرتے جائیں، اجتماعاتِ صلوٰۃ نہایت

ضروری ہیں۔ جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو (یعنی عزم صلوٰۃ کرو) تو تم اپنا منہ، اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھو لیا کرو۔ اور اپنا سر پونچھ لیا کرو۔ اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔ اور (جیسا کہ (۴/۴۳) میں بتایا جا چکا ہے) اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو (نہا دھو کر) پاک صاف ہو جایا کرو (اور پھر اجتماع صلوٰۃ میں شریک ہو)۔ اور اگر تم مریض ہو (اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہو (۴/۴۳)) یا حالتِ سفر میں ہو، یا جائے ضرورت سے فارغ ہو کر آئے ہو، یا عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو اور پانی نہیں ملتا۔ تو ان حالات میں، وضو کرنے کے بجائے تیمم کر لیا کرو۔ یعنی پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور منہ ہاتھ ویسے پونچھ لئے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانون یہ نہیں چاہتا کہ تم پر خواہ مخواہ تنگی عائد کر دے۔ وہ تو فقط اتنا چاہتا ہے کہ تم پاک صاف رہو۔ اس طرح وہ تمہیں ایک پاکیزہ اور شائستہ جماعت بنا کر، تم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج مرتب کر سکیں۔

(اس کے ساتھ آیت (۴/۴۳) ملانے سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے)

آپ انڈکس میں صلوٰۃ اور نماز کے عنوانات دیکھئے۔ وہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ صلوٰۃ کے اصولی حکم کے علاوہ، قرآن کریم میں نماز کے اجتماعات کی تاکید بھی آئی ہے۔ لیکن اس تاکید کے باوجود قرآن مجید میں نماز کی جزئیات نہیں دی گئیں۔ یہ جزئیات احادیث اور فقہ کی رُو سے متعین ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ کی نماز الگ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نماز کی جزئیات تو قرآن میں نہیں آئیں لیکن وضو کے متعلق اس قدر مُشرح حکم دیا گیا ہے۔ (وضو کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا۔ ویسے اس کے معنی روشن ہونے کے ہیں)۔

وضو میں اختلاف

اوپر کہا گیا ہے کہ نماز کی جزئیات میں مختلف فرقوں میں اختلاف ہے اور اس میں شیعہ اور سنیوں میں اختلاف ہے۔ شیعہ حضرات پاؤں نہیں دھوتے۔ ان پر مسح کرتے ہیں۔ سنی حضرات پاؤں دھوتے ہیں۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ایسے واضح حکم کی موجودگی میں یہ اختلاف کیسا؟

باریکیوں میں گئے بغیر، اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ اس آیت میں اَرْجُلَکُمْ (ل کے زبر کے ساتھ) آیا ہے اور جس سیاق میں یہ اس آیت میں آیا ہے گرائمر کی رُو سے اس کے معنی "پاؤں دھونے" کے ہوں گے۔ اگر یہ اَرْجُلِکُمْ (ل کے زیر کے ساتھ) ہوتا تو پھر معنی، مسح کرنے کے ہوتے۔

اس پر آپ پوچھیں گے کہ جب قرآن مجید میں اَرْجُلَکُمْ (ل کے زبر کے ساتھ) ہے تو پھر "مسح کرنے" کی بات کہاں سے آ گئی؟ آپ مطالب جلد سوم، کا صفحہ ۴۰ نکالئے۔ اس میں آپ کے سامنے "اختلاف قرأت"

کا نظریہ (یا عقیدہ) آئے گا جس کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں "یوں بھی نازل ہوئی تھیں اور یوں بھی"۔ اس عقیدہ کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ زیرِ نظر آیت (۵ / ۴) میں اَرْجُلِکُمْ ل کے زیر کے ساتھ بھی نازل ہوا تھا اور اس کے زبر کے ساتھ بھی۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ سُنّی حضرات اسے ل کے زبر کے ساتھ پڑھتے ہوں گے اس لئے وہ پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ حضرات اسے ل کے زیر کے ساتھ پڑھتے ہوں گے اس لئے وہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔

اختلافِ قرآن کا عقیدہ

لیکن ایسا نہیں۔ مودودی مرحوم سُنّی تھے۔ لیکن دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ پاؤں دھونے اور ان پر مسح کرنے میں سے کونسا طریق قرآن کے مطابق ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے پہلے قرآن مجید کی آیت (۵ / ۴) درج کی اور پھر کہا:

مودودی مرحوم کا مسلک

اس میں لفظ وَ اَرْجُلَکُمْ کی دو قرأتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابن عامر حفص، کسائی اور یعقوب کی قرأت وَ اَرْجُلَکُمْ (بفتح لام) ہے اور ابن کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرأت وَ اَرْجُلِکُمْ (بکسرِ لام) ان میں سے کسی قرأت کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشا کے مطابق الفاظِ قرآنی پر نحو و اعراب لگا دیئے ہوں۔ بلکہ یہ دونوں قرأتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرأت اختیار کی جائے تو وَ اَرْجُلَکُمْ۔ کا تعلق فَاغْسِلُوْا کے حکم سے جُڑتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں۔ "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک" اور اگر دوسری قرأت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَ امْسَحُوْا بِرُؤُسِکُمْ سے قائم ہوتا ہے۔ اور معنی یہ نکلتے ہیں "اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک"۔ یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قرأتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہو جاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے۔ لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں۔ کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جا سکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعدِ زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں۔ کیونکہ دلائلِ ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں اب آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھا جائے۔

اور اس کے بعد لکھا۔

قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لئے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت فروری ۵۹ء)

قطع نظر اس کے کہ شیعہ حضرات اسی "معتبر ذریعہ" کی رو سے پاؤں پر مسح کرتے ہیں اور سنی حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اسی "معتبر ذریعہ" کی رُو سے پاؤں دھوتے ہیں۔ مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ قرآنی آیت کی دونوں قرأتیں متواتر ہیں اور ایسی مستند کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ (مودودی مرحوم کے ارشاد کے مطابق) قرآن کریم کی یہ آیت، ارجلکم کے ل کے زبر کے ساتھ بھی نازل ہوئی تھی اور زیر کے ساتھ بھی۔ اور دونوں کا یہ اختلاف اس قدر اہم ہے کہ ایک قرأت کی رُو سے پاؤں دھونے کا حکم ملتا ہے اور دوسری قرأت کی رُو سے پاؤں پر مسح کرنے کا۔ اور اس طرح "قرآن کے الفاظ سے بات واضح نہیں ہوتی"۔

آپ سوچئے کہ اس کے بعد، قرآن مجید کے متعلق کیا تصوّر پیدا ہوتا ہے، اور ہم جو دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک حرف اور نقطہ کا بھی تغیرو تبدل نہیں ہُوا۔ اس دعویٰ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ — اور اس کے بعد سوچئے کہ ایسی کتاب نازل کرنے والے (خدا) کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصوّر قائم ہوتا ہے، جو متضاد احکام نازل کر دیتا ہے؟ اور اگر خدا نے اس آیت کو ایک ہی شکل میں نازل کیا تھا — یعنی ل کے زبر یا زیر کے ساتھ — تو اگلی صورت یہی سامنے آتی ہے کہ رسول اللہؐ نے (معاذ اللہ) کسی کو ل کے زیر کے ساتھ بتا دیا اور کسی کو زبر کے ساتھ۔ اس صورت میں سوچئے کہ خدا کے رسولؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصوّر سامنے آتا ہے۔ اور اگر یہ صورت بھی نہیں تو پھر فرمائیے کہ دو قرأتیں کس طرح وجود میں آئیں؟

آگے چل کر مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشا سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ (ایضاً) (یعنی ل کے زبر والی آیت کے مطابق)

لیکن اُنھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد ل کے زیر والی قرأت کا کیا بنے گا جو اسی طرح متواتر اور مستند ہے جس طرح ل کے زبر والی قرأت!

آپ نے غور فرمایا کہ وضو میں "پاؤں دھونے" اور "مسح کرنے" کے اختلاف کا سرچشمہ کیا ہے؟ قرآن کریم میں اختلاف قرأت کا عقیدہ جسے آج تک سب مانتے چلے آرہے ہیں! اس موضوع پر کتاب "مقام حدیث" (شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام) میں بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ٭ کہ بامن ہرچہ کرد، آں آشنا کرد

تیمم آیت میں دو الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ا۔ تیمم (مادہ ی۔م۔م)۔اس کے معنی کسی کام کا قصد یا ارادہ کرنا ہیں۔ اس سے اس کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی یہ وضو تو نہیں جو صرف پانی سے ہو سکتا ہے، لیکن اس سے انسان کے اس ارادے کا اظہار ہو جاتا ہے کہ وہ نماز کی تیاری کر رہا ہے۔ علم النفس کی رُو سے، نیت یا ارادے کے اظہار کا انسان کے جذبات و احساسات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم، محسوس افعال میں مضمر نفسیاتی محرکات کو کس حسن و خوبی سے بیان کر جاتا ہے؟ (تیمم کا ضمنی ذکر آیت (۴/۴۳) میں بھی آچکا ہے)

مسح دوسرا لفظ مسح ہے۔ اَلْمَسْحُ (مادہ م۔س۔ح) کے معنی، کسی لتھڑی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیر کر اس کی آلائش کو صاف کر دینے کے بھی ہیں، اور اس آلائش کو ہاتھ پھیر کر پانی کے ساتھ دھونے کے بھی۔ چونکہ آیت (۵/۶) میں مسح کا حکم، پانی کی جگہ آیا ہے، اس لئے اس کے معنی ہوں گے، آلائش کو پاک اور صاف مٹی سے صاف کر لینا اور ہاتھ اور منہ کو پونچھ لینا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس میں پانی نہ ہونے کی صورت میں خشک صفائی کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور نماز کی تیاری کا نفسیاتی پہلو بھی سامنے آجاتا ہے۔

اگلی آیت ہے۔

۵/۷ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (۵/۷)

تم اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ خدا نے اس قسم کا ضابطۂ حیات دے کر تم پر کس طرح اپنی نعمتوں کو عام کر دیا ہے۔ لیکن یہ نعمتیں یونہی نہیں مل جائیں گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے اس عہد و پیمان کو یاد رکھو جو تم نے خدا سے پختہ طور پر کر رکھا ہے (۹/۱۱۱)۔ وہ عہد جس کی رُو سے تمہارا فریضہ ہے کہ تم نظامِ خداوندی کے احکام کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ اور اپنی زندگی کو قوانینِ الٰہیہ سے ہم آہنگ رکھو ——— نہ صرف ظاہرا اعمال کو، بلکہ اپنی خواہشوں، آرزوؤں اور دلی خیالات تک کو بھی ——— اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات، دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی علم رکھتا ہے۔

اس میں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت (راہنمائی) اور اس کے احکامات کو اس کی نعمتیں کہہ کر پکارا ہے۔ چونکہ اس ہدایت اور ان احکامات سے مقصد، انسانی زندگی کی خوشگواری اور کامرانی اور اس کی صلاحیتوں کی برومندی ہے، اور یہ خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں، اس لئے یہ اس کی طرف سے فی الواقعہ انعامات ہیں۔

اس میں دوسری بات "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" کی ہے۔ قرآن کریم میں یہ الفاظ متعدد مقامات پر آ چکے ہیں۔ (مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۴۹)۔ علاوہ دیگر نکات، اس میں یہ نقطہ بھی پوشیدہ ہے کہ اطاعت کسی

سمعنا و اطعنا

زندہ شخصیت کی طرف سے صادر شدہ احکام کی جائے گی۔ یعنی اسلام میں، اطاعت تو خدا کی کتاب کی ہو گی لیکن یہ اطاعت ہو گی اس نظام کی وساطت سے جو انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہو گا اور اس میں احکامات بہرحال کسی زندہ اتھارٹی کی طرف سے صادر ہوں گے۔ یہ وجہ ہے جو "سمع اور اطاعت" اکٹھے آئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کا ذریعہ رسول کی اطاعت قرار دیا جو اس کی (خدائی) کتاب کے احکام محسوس اتھارٹی کی شکل میں نافذ کرتا تھا۔ اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، یہ اطاعت اس نظام کی ہو گی جو قرآنی احکامات کی محسوس طریق سے اطاعت کرائے گا۔ مجرد 'کتاب' میں "سمع" کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ نہ ہی پرستش میں یہ شرط پوری ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے "خدا کی پرستش" کا تصور بھی صحیح نہیں۔ خدا کی اطاعت کی جاتی ہے، نہ کہ پرستش۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے)

قرآن کریم میں "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" کے الفاظ جمع کے صیغے میں آئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اطاعت خداوندی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے۔ یعنی اپنی آزاد مملکت میں جس میں کتاب اللہ کی عملی حکمرانی ہو اور تمام امت اجتماعی طور پر اس کی اطاعت گزار اور فرمان پذیر ہو۔

آیت کے آخر میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ "خدا دلوں کے اندر گزرنے والے

اطاعت

خیالات تک سے بھی واقف ہے"۔ اس کا تعلق بھی "اطاعت" کے ساتھ بڑا گہرا ہے۔ اسلامی نظام میں احکام و قوانین، کی اطاعت نہ میکانکی طور پر کی جاتی ہے نہ مجبوراً۔ یہ دل کی رضامندی سے کی جاتی ہے۔ طَاعَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا وسیع ہو جانا۔ اس اعتبار سے اطاعت کے معنی ہوں گے، دل کی کشادہ اور پسندیدگی سے فرائض منصبی کی ادائیگی اور احکام خداوندی کی تعمیل کرنا۔ اِطَاعَ النَّخْلُ کے معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں یعنی اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑے گا۔ وہ کسی کی جھولی میں گرنے

کے لئے خود ہی آمادہ ہیں۔

اس سے اطاعت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی بطیب خاطر، دل کی پوری پوری رضامندی سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا۔ اگر اس میں دل کی رضامندی شامل نہیں، تو اسے اطاعت نہیں کہا جائے گا۔ مرتے بھرتے، مجبوراً احکام و قوانین کی فرمانبرداری کہا جائے گا۔ اس سے قانون کا منشا تو پورا ہو جائے گا، منشاء خداوندی پورا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہا کہ "ہماری نگاہ تمہارے دلوں پر ہوتی ہے کہ تم ہمارے احکام کی اطاعت بطیب خاطر کرتے ہو یا کُرھاً۔"

عدل کی تاکید

قرآنی نظام کے مقاصد اور مطامح کی فہرست تو طویل ہے لیکن قرآن کریم نے اس کے نقطہ ماسکہ کو ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اور وہ ہے عدل۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل کے تصوّر میں اس قدر وسعت ہے کہ (یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ) خارجی کائنات ہو یا انسانی دنیا، سب اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس پر بڑا زور دیتا ہے۔ یہ ایک خاص ذہنیت (ATTITUDE OF MIND) کا نام ہے جس کا مظاہرہ زندگی کے ہر گوشے میں ہوتا ہے۔ عدالتی یا قانونی عدل اس کا ایک سمٹا ہوا گوشہ ہے (دیکھئے انڈکس) آیت (۵/۲) میں کہا گیا تھا کہ دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بھی، حدود و عدل سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ اب مزید ارشاد ہوا۔

۵/۸ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (۵/۸)

اس نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو (۴/۱۳۵)۔ اس حد تک محافظ و نگران کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو (۵/۲)۔ ہمیشہ عدل کرو۔ اور دوست، دشمن، ہر ایک سے عدل کرو۔ یہ روش تمہیں اس معیارِ زندگی کے قریب تر لے آئے گی جس تک تمہیں خدا لانا چاہتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ اس روش کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

دشمنوں کے ساتھ بھی عدل

عیسائیت (روایتِ انجیل) کی تعلیم تھی "دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کرو۔" دشمن کے ساتھ محبت، ایک ناممکن العمل نفسیاتی تقاضا ہے، جو نہ کبھی

پورا ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے جواب خود عیسائی دانشور بھی اسے ناممکن قرار دے رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کے بجائے کہا کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ یہ ممکن العمل ہے اور ایسا زریں اصول کہ اگر افراد اور اقوام اس پر عمل کرنے لگ جائیں، تو نوعِ انسان کی بیشتر مشکلات حل ہو جائیں۔ لیکن ہم دوسروں کی کیا بات کریں۔ یہ جنس تو خود ہمارے ہاں بھی نایاب ہے۔ بلکہ (اگر برا نہ مانیں تو) ہماری حالت اُن اقوام سے بھی گئی گزری ہے۔

جب جماعت مومنین اس انسانیت ساز اصول پر عمل پیرا ہو گی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ فرمایا:

۵/۹ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝

اور یہ بھی یاد رکھو! خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو لوگ بھی اس ضابطۂ حیات کی صداقت پر یقین رکھ کر، اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں گے، اور پھر اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو زندگی کے خطرات سے اُن کی حفاظت ہو گی اور اُن کی محنت کے نتائج نہایت عظیم الشان ہوں گے۔

مغفرت (یعنی خطرات سے حفاظت) زندگی کا منفی پہلو ہے۔ مثبت نتیجہ "اجر عظیم" ہے۔

اس کے برعکس:

۵/۱۰ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝

ان کے برعکس، جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت سے انکار کریں گے اور اس کے قوانین کی تکذیب کریں گے، تو اُن کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ وہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائیں گے اور ان کی نشو و نما رک جائے گی۔

کفر تو یہ ہے کہ ان احکام و اقدار کی صداقت سے یکسر انکار کر دیا جائے۔ اور تکذیب یہ ہے کہ زبان سے ان کا اقرار کرتے رہیں لیکن اپنے عمل سے انہیں جھٹلاتے رہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے انڈکس میں عنوان "تکذیب")۔ جحیم کے معنی مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص۲۷ پر دیکھئے۔

اس مغفرت (خطرات سے حفاظت) کے سلسلہ میں ان سے کہا گیا ہے کہ:

۵/۱۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ع

اس ضابطۂ ہدایت کے مطابق عمل کرنے سے، خطرات سے کس طرح حفاظت مل جاتی ہے، اس کا مشاہدہ تم خود کر چکے

ہو۔ تمہارے مخالفین تہیہ کر چکے تھے کہ تم پر دست درازی کریں، لیکن اس نظام نے اُن کے ہاتھوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اُنہیں روک دیا۔ لہٰذا تم اس ضابطۂ قوانین کی نگہداشت کرو اور اس کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔ ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ اپنے نصب العین کی صداقت اور قانون کی محکمیت پر کامل اعتماد ہو۔

اس میں دشمنوں کی طرف سے کسی خاص تصادم و تزاحم یا جنگ کی طرف اشارہ معلوم نہیں ہوتا۔ ان کی مسلسل دست درازیوں سے محفوظ رکھنے کی نعمتِ خداوندی کی یاد دہانی مقصود ہے۔ اور یہ نتیجہ تھی تقویٰ اور توکل کا۔ تقویٰ کا مفہوم مطالب الفرقان۔ جلد اوّل (ص۵۵) پر آچکا ہے اور توکل کا زیرِ نظر جلد میں، آیت (۳/۱۲۲) کے تحت۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد یعنی اقوام سابقہ کے احوال اور کوائف، اور ان کے انجام و عواقب کو پیش کرتا ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے عنوان تاریخ) اور اس سلسلہ میں داستان بنی اسرائیل کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے (انڈکس میں دیکھئے عنوان بنی اسرائیل)۔ یہاں اسی سلسلہ میں کہا۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ
۵/۱۲ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَ
ضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْ
خِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝ (۵/۱۲)

(اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھو کہ نہ تو یہ نظام ہی کوئی نیا نظام ہے اور نہ ہی یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ، جو اس کے متعلق شبہ لاحق ہو جائے کہ ممکن ہے کہ یہ کامیاب ہو یا نہ ہو۔ یہ نظام اقوامِ سابقہ کو بھی دیا جاتا رہا، اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس کے نتائج کیا نکلے۔ اس میں بنی اسرائیل کی تاریخی شہادت نمایاں طور پر تمہارے سامنے ہے)۔

ان سے بھی اس نظام کے قیام کا عہد لیا گیا تھا۔ اُن کے بارہ قبائل تھے اور تنظیم کی غرض سے ہر قبیلہ کا ایک نقیب تھا جو اُن کے حالات سے باخبر رہتا، اور ان کی نگہبانی کرتا تھا۔ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر تم نے نظام صلوٰۃ کو قائم رکھا، نوعِ انسان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتے رہے، ہماری طرف سے بھیجے ہوئے پیغامبروں کی بات کو سچا مانتے رہے، اُن کے مشن اور پروگرام کی تعظیم کرتے ہوئے اُن کے رفیق اور مددگار بنے اور نوعِ انسان کی

مرفہ حالی کے لئے اپنا مال و دولت نظامِ خداوندی کو دیتے رہے کہ وہ تمہیں اس کے بدلے میں اس سے کہیں زیادہ کچھ دے، تو ہماری تائید و نصرت تمہیں نصیب ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے معاشرہ کی ناہمواریاں دُور ہو جائیں گی اور تمہیں خوشحالی، آسودگی اور خوشگواری کی ایسی جنت نصیب ہوجائے گی جس کی شادابی اور تازگی کبھی مُرجھائے گی نہیں۔ اس طرح تمہارا دیا ہوا مال و دولت سوگنا اور ہزار گنا ہو کر تمہیں واپس مل جائے گا (۲/۲۶۱)۔

لیکن جو اس کے بعد، اس روش سے انکار اور سرکشی اختیار کرکے، اپنی خود ساختہ روش پر چل نکلے گا، تو زندگی کی ہموار راہیں اس کی نظروں سے اوجھل ہوجائیں گی اور وہ اپنی منزلِ مقصود سے بہت دُور جا پڑے گا۔ قوموں کی کامیابی اور ناکامی کا یہی اصول ہے۔

میثاقِ بنی اسرائیل کا ذکر مطالب الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۱۶۹) پر آچکا ہے، اور داستان بنی اسرائیل اُس جلد کے صفحہ ۱۷۱) سے شروع ہوتی ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ سیناکی وادیوں میں اس قوم کو (غالباً انتظامی سہولت کی غرض سے) بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہاں کہا کہ ان پر بارہ نقیب مقرر کر دیئے گئے تھے۔ یعنی ہر گروہ پر ایک

بارہ نقیب

نقیب۔ عمومی طور پر تو اس سے مراد ان کے نگران اور محافظ ہوں گے لیکن معنوی طور پر اس کا مفہوم ذرا وسیع نظر آتا ہے۔ نقیب کے (مادہ ن۔ ق۔ ب) کے معنی ہوتے ہیں سوراخ کرنا، چھید کرنا اور اس کا مفہوم ہوتا ہے پوری پوری چھان بین سے کسی کے احوال و کوائف معلوم کرنا۔ اس سے مترشح ہوجاتا ہے کہ وہ منتظمین (INTELLIGENCE SERVICE) کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے جو اس قوم کی (بالخصوص اُس زمانے کی) حالت میں ازبس ضروری تھا۔

صلوٰۃ و زکوٰۃ و قرضِ حسنہ کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ یہ دین کے بنیادی اصول اور نظامِ خداوندی کے ستون تھے اس لئے ان کا حکم ہر رسول اور ان کی امت کو دیا گیا تھا۔ اسی کی تاکید بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی۔ اس آیت میں ایک بات تو (بظاہر) ضمناً کہی گئی ہے لیکن اس کی اہمیت غور و فکر کی مقتضی ہے۔ ان سے کہا یہ گیا ہے کہ اِنِّیْ مَعَکُمْ۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں"، لیکن خدا کی یہ معیت جن شرائط سے مشروط ان کا ذکر اس کے ساتھ ہی کر دیا گیا۔

لَئِنْ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اوپر مفہوم میں دیکھئے)۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کی معیت کن شرائط کے پورا کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کی تشریح اگلی آیت میں کر دی گئی۔

۵/۱۳ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

چنانچہ جب تک بنی اسرائیل اس روش پر قائم رہے، انہیں اقوامِ عالم میں نہایت ممتاز مقام حاصل رہا (۲/۴۷)۔ لیکن جب انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا تو وہ ان خوشگواریوں سے محروم ہو گئے، اور ان کے وہ قلوب جن سے ربوبیت عامہ کے چشمے پھوٹتے تھے، یکسر پتھر بن گئے (۲/۷۴؛ ۵۷/۱۶؛ ۶/۴۶)۔ چونکہ وہ ضابطۂ قوانین جو انہیں وحی کے ذریعہ دیا گیا تھا، ان کی مفاد پرستیوں کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس میں ہیر پھیر کرنا شروع کر دیا۔ جس جگہ یہ ایسا نہ کر سکے، اس پر ویسے ہی عمل کرنا چھوڑ دیا۔ یہ لوگ، بجز معدودے چند، اب تک بھی کچھ کرتے ہیں اور تمہیں ان کی خیانتوں کا پتہ بھی چلتا رہتا ہے۔

جن لوگوں کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہو، ان سے الجھنا بیکار ہے۔ اس لئے تم ان سے دامن بچاتے ہوئے اپنے پروگرام کے مطابق آگے بڑھتے جاؤ۔ یہی تمہارے لئے حُسن کارانہ روش ہے، اور یہی روش قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ ہے (۱۵/۸۵؛ ۴۳/۱۰؛ ۴۴/۱۱)۔

آیت کے معنی مندرجہ بالا مفہوم سے واضح ہیں۔ اور جب اسے داستانِ بنی اسرائیل کے مناظر میں دیکھا جائے تو بات واضح تر ہو جاتی ہے۔

حضرات انبیاء کرامؑ کا فریضۂ دین کی تبلیغ ہوتا تھا یعنی خدا کے احکام اور پیغامات کو لوگوں تک پہنچانا، اور انہیں اس کی دعوت دینا کہ وہ انہیں قبول کر کے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ ان کے مخالفین ان کی مخالفت کرتے تھے اور اس کشمکش میں آخر الامر وہ مقام آجاتا تھا جہاں ان سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اس کی آخری منزل کے لئے جامع اصطلاح ہجرت ہے، اگرچہ اسے دیگر الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ یہاں "فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ" کہا گیا ہے۔ اس مرحلۂ کنارہ کشی کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ (ص ۴۵) پر ملے گی۔

کنارہ کشی

لیکن اس کنارہ کشی میں بھی دو انداز خصوصی ہیں۔ ایک یہ کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۷۳/۱۰) اور فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵/۸۵)۔ ان سے الگ بھی ہو تو نہایت حسن کارانہ انداز سے ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے بعد بھی جہاں تک ممکن ہو انہیں زندگی کے خطرات سے آگاہ کرتے رہو۔ وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ ان کے سامنے قرآنی تعلیم پیش کرتے رہو اور یہ ہزار غلط کوشش اور غلط کار سہی۔ اس کے باوجود انہیں قرآنی روشنی سے محروم نہیں رکھا جانا چاہیئے۔ مزید تفصیل کے لئے

مطالب القرآن - جلد دوم (ص ۴۳۵) - مخالفین سے قطع علائق کے باوجود اس قسم کی کنارہ کشی، تعلیم خداوندی کا حصہ ہو سکتی ہے - تحریف کی جس شکل کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کی وضاحت آیت (۵/۱۴) کے تحت ملے گی -

یہ تو رہا یہودیوں کے ساتھ میثاق اور ان کی طرف سے نقضِ عہد - عیسائیوں کے متعلق کہا :

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (۵/۱۴)

یہ تو یہودیوں کا حال ہے - باقی رہے وہ جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں - تو ان سے بھی ہم نے اسی قسم کا عہد لیا تھا، لیکن انہوں نے بھی ہمارے ضابطۂ قوانین سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور اس کے ایک معتد بہ حصہ کو چھوڑ بیٹھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی - وہ فرقوں میں بٹ گئے اور (جیسا کہ فرقہ پرستی میں ہوتا ہے) ان میں باہمی عداوت اور کینے کی آگ بھڑک اٹھی جو ہمیشہ تک رہے گی - (کیونکہ نہ ان کے فرقے مٹیں گے، نہ باہمی عداوت ختم ہو گی) - لیکن اب جو نظامِ خداوندی قائم ہو رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس خود ساختہ روش کو یہ آسمانی راہنمائی کہہ کر پیش کرتے تھے، اس کی حقیقت کیا تھی -

نصاریٰ کے میثاق کا قرآن میں بالتخصیص ذکر نہیں آیا لیکن آیت (۳/۱۸۶) میں اہلِ کتاب کے میثاق کا جو اجتماعی ذکر آیا ہے اس میں نصاریٰ خود بخود آ جاتے ہیں - اور (۳/۸۰) میں انبیاء کرامؑ کے میثاق کا جو ذکر آیا ہے تو اس میں ان کی امتیں بھی شامل ہیں - یہ دونوں آیات (علی الترتیب تیسرے اور چوتھے باب میں) آ چکی ہیں - (ضمناً) آیت (۳۳/۷) میں انبیاء کے میثاق کا ذکر ہے تو اس میں اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ میثاق (عہد) حضور نبی اکرمؐ سے بھی لیا گیا تھا - اس میثاق کی تفصیل تو طویل ہو سکتی ہے لیکن اس کی اصل و بنیاد یہ تھی کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲/۱۳) - وہ، دین (نظام) خداوندی کو متشکل کریں اور فرقہ پیدا نہ ہونے دیں - آپ

فرقہ بندی

زیرِ نظر آیت (۵/۱۴) میں دیکھئے - نصاریٰ کے نقضِ میثاق کا نتیجہ (یا اس کی وجہ) یہ بتائی گئی ہے کہ ان میں فرقے پیدا ہو گئے - (فرقہ بندی توحید کی ضد اور شرک ہے (۳۰/۳۱) - آیات (۴۲/۱۳-۱۴) میں بھی تفرقہ کو شرک کہا گیا ہے - (انڈکس میں تفرقہ اور فرقہ کے عنوانات دیکھئے)

سلسلۂ استمداد و ہدایتِ خداوندی کا پروگرام یہ تھا کہ ایک رسول آتا اور خدا کی صحیح تعلیم لوگوں تک پہنچا دیتا - اس کے بعد اس کی امت اس (سچی) تعلیم میں خرابیاں پیدا کر دیتی تو دوسرا رسول آ کر اسے پھر خالص کر دیتا - یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ اس کی آخری کڑی، حضور نبی اکرمؐ کی بعثت سے سامنے آ گئی اور اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب سب کو

دعوت دی گئی کہ وہ اس رسول کی پیش فرمودہ تعلیم کو قبول کریں۔ اس ضمن میں حضورؐ کے مخاطب اہل کتاب سے کہا، (جن کا ذکر سابقہ آیات میں آ رہا تھا) کہ

۵/۱۵ يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيرٗا مِّمَّا كُنتُمۡ تُخۡفُونَ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ وَيَعۡفُواْ عَن كَثِيرٖۚ قَدۡ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٞ وَكِتَٰبٞ مُّبِينٞ ۝

ان اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہہ دو کہ تمہاری طرف خدا کا رسولؐ آگیا ہے جو بہت سی ایسی باتوں کو ظاہر کر دیتا ہے جنہیں تم کتاب خداوندی میں سے چھپاتے رہتے ہو۔ اور بہت سی باتوں سے جن کی چنداں اہمیت نہیں، درگزر کر دیتا ہے۔ تم پر زندگی کی راہیں تاریک ہو چکی تھیں۔ ایسے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی۔ یعنی ایک کھلا ہوا، واضح ضابطۂ قوانین۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ جو کچھ تم وحی خداوندی میں سے چھپاتے رہتے ہو، ان میں سے اکثر امور کو قرآن میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور بعض امور سے صرف نظر کر لیا گیا ہے، تو اس فرق کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ (جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے) دین کے اصول تمام انبیاءؑ کو یکساں دیئے گئے تھے۔ اور بعض وقتی احکام تھے جن کا تعلق اُس رسول کی مخاطب قوم یا اس زمانے کے حالات سے تھا۔ ان احکام کا ابدی طور پر باقی رکھنا مقصود نہ تھا۔ بنا بریں بعد میں آنے والے رسول کی وحی میں اصولِ دین تو علیٰ حالہٖ رکھے جاتے تھے اور وقتی اور ہنگامی احکام کو یا تو منسوخ کر دیا جاتا تھا یا تبدیل۔ (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ)۔ جن امور کو قرآن میں ظاہر نہیں کیا گیا تھا ان کا شمار اسی زمرہ میں ہوتا ہے۔ ان کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

قرآن کریم کی خصوصیات کے متعلق انڈکس میں قرآن کا عنوان دیکھئے، نیز ظلمات اور نور کے عنوانات۔ اس کے بعد ہے۔

۵/۱۶ يَهۡدِي بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضۡوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخۡرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذۡنِهِۦ وَيَهۡدِيهِمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ۝

اس (ضابطۂ قوانین) کے ذریعے، اللہ تعالیٰ ہر اس قوم کو، جو اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھے، سلامتی کے راستے دکھاتا ہے، اور انہیں ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر، زندگی کی جگمگاتی روشنی میں لے آتا ہے۔

اور اپنے قانون کے مطابق سیدھے اور توازن بدوش راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے تاکہ وہ رواں دواں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔

ہدایت صرف قرآن کے ذریعہ مل سکتی ہے

اس آیت میں قرآن مجید کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ۔ خدا اس کے ذریعے ہدایت (راہ نمائی) دیتا ہے۔ یعنی ہدایت خداوندی صرف قرآن کی رُو سے مل سکتی ہے۔ اس راہ نمائی کے ساتھ کچھ اور ملا دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ (انڈکس میں عنوان شرک دیکھیے)۔

سبیل السلام اور صراطِ مستقیم کے تعلق کے بابت، مطالب۔ جلد اوّل۔ (ص ۴۷) ملاحظہ فرمائیے۔

ازاں بعد ان چند اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں ان اہل کتاب نے مسخ کر کے، ان کی جگہ باطل عقائد وضع کر لئے تھے۔ ان میں عیسائیوں کا، الوہیت حضرت عیسیٰؑ کا عقیدہ تھا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا:

۵/۱۷ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

یاد رکھئے! منزل مقصود تک پہنچانے والی شاہراہِ اعظم تو ایک ہی ہے جسے صراطِ مستقیم کہتے ہیں، لیکن بہت سے چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو مختلف سمتوں سے آ کر اس میں مل جاتے ہیں۔ انہیں سُبُلُ (جمع کے صیغے میں) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ دین کے نظام کی اصل و بنیاد وہ غیر متبدل اصول و قوانین ہیں جو قرآن میں محفوظ ہیں، لیکن ان پر چلنے کے عملی طریق زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ عملی طریق، اسلامی نظام مملکت، اجتہادی طور پر متعین کرتا ہے۔ یہ ہیں وہ سُبُل جن کی طرف (۲۹/۶۹) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تم ہی نے نصاریٰ کا کفر تو بالکل واضح ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا خود مسیحؑ ابن مریم کی شکل میں دنیا میں آ گیا۔ اے رسولؐ! ان سے کہو کہ اگر اللہ اس کا ارادہ کرتا کہ مسیحؑ اور اس کی والدہ تو ایک طرف، کرۂ ارض پر جو کچھ ہے، ان سب کو ہلاک کر دے تو کسے اتنی قوت حاصل تھی کہ وہ اس کا ہاتھ روک دیتا؟ یاد رکھو! کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں، اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، ان سب پر خدا کا اور صرف خدا کا اقتدار و اختیار ہے۔ ہر شے کی تخلیق اُس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتی ہے اور ہر شے پر

اُسی کا کنٹرول ہے۔ اس لئے کوئی انسان، خدا نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی خدا، انسانی پیکر اختیار کرکے دنیا میں آیا کرتا ہے۔
عیسائیوں کے باطل عقائد کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ میں لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھیئے انڈکس عنوان
"عیسیٰ") ۔ اور زیر نظر جلد کے دوسرے باب میں بھی جو سابقہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اس میں کسی
اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ
۵/۱۸ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

ان یہود و نصاریٰ دونوں کا دعویٰ ہے کہ ہم خدا کے محبوب اور اس کی چہیتی اولاد ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر ایسا ہی ہے تو خدا تمہیں تمہارے جرموں کی سزائیں کیوں دیتا رہتا ہے (جس کے تذکرے سے تمہاری کتابیں بھری پڑی ہیں) ۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بھی (اور انسانوں کی طرح) خدا کے پیدا کردہ انسان ہو، اور جزا و سزا کا جو قانون دوسروں پر حاوی ہے، اسی کا اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے چہیتے اور کسی کے سوتیلے ہونے کا سوال ہی نہیں۔ جو قوم بھی، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے گی، زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہے گی۔ جو ان کے خلاف چلے گی، تباہ و برباد ہو جائے گی۔ دونوں راستے کھلے ہیں۔ جو نسا راستہ جس کا جی چاہے اختیار کرلے یہ کچھ اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کی رُو سے کائنات کا ایسا عظیم القدر سلسلہ اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے، اور اس کا ہر قدم اُس منزل کی طرف اُٹھ رہا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔

نجات کے متعلق یہودیوں کے باطل عقائد پر، مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ (صفحہ ۲۲۹ پر) تفصیلی بحث ہو چکی ہے وہاں زیر نظر آیت کا بھی ضمنی تذکرہ آگیا ہے۔ اور عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کے متعلق اسی کتاب (صفحہ ۲۳۹) پر بنابریں زیر نظر آیت کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ۔ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ۔ تو یہ، ان کے دعویٰ کی تردید کے لئے ایک مزید دلیل ہے۔ یہودی اس کے قائل تھے کہ ان سے حکومت چھن گئی۔ دولت و ثروت سے محرومی ہو گئی۔ عزت اور وقار نہ رہا۔ حتّٰی کہ ان کے لئے دنیا میں کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہ رہا۔ ان کے مقامات مقدسہ تک غیروں کے تسلط میں چلے گئے۔ چنانچہ وہ اس انتظار میں تھے (اور اب بھی ہیں) کہ ایک آنے والا آئے گا اور انہیں اس عذاب سے نجات دلائے گا۔

پھر عذاب کیوں؟

قرآن کریم نے ان سے کہا کہ (آخرت کی بات تو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ) اگر تم واقعی خدا کی چاہیتی اولاد ہو، تو وہ تمہیں دنیا میں ذلیل اور خوار کیوں کر رہا ہے؟ کوئی شخص اپنی اولاد کو ذلتوں اور رسوائیوں کے عذاب میں کبھی مبتلا نہیں کرتا۔ تمہاری دنیاوی حالت تمہارے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے کہ تم خدا کی چاہیتی اولاد ہو۔

ہماری حالت

ہم (مسلمانوں کا) یہ عقیدہ تو نہیں کہ ہم خدا کی چاہیتی اولاد ہیں۔ لیکن اس کا تو ہم بھی بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس کے محبوب کی امت ہیں، اور اس سے یہ مستنبط کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کبھی آتش دوزخ میں نہیں جھونکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو دلیل یہودیوں کے خلاف دی ہے وہی ہم پر بھی صادق آتی ہے کہ اگر ہم واقعی "اس کے محبوب کی امت ہیں" تو ہم دنیا میں اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ یہ بھی اُسی کا ارشاد ہے کہ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲) ۔ "یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا ہوگا۔" جو قوم دنیا میں ذلیل و خوار ہے، وہ آخرت میں معزز اور مقرب کیسے بن سکے گی؟ (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم صفحہ ۱۱۱-۱۱۲۔ انڈکس میں عنوان۔ دنیا عنوان شفاعت)

ان کے باطل عقیدہ کی تردید کے بعد کہا کہ اب یہ رسول آیا ہے جو وحی کی صحیح اور سچی تعلیم پیش کرے گا۔

۵/۱۹ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۠

اے اہل کتاب! یہ ہمارا رسول تمہارے پاس اس وقت آیا ہے جب سابقہ رسولوں کی دعوت کی گرمجوشی دھیمی پڑ چکی تھی۔ وہ اُن تمام حقائق کو پھر سے واضح کر رہا ہے جنہیں تم ضائع کر چکے تھے۔ یہ اس لئے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی ایسا پیغامبر نہ آیا جو ہمیں بتاتا کہ زندگی کی خوشگواریاں کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں اور غلط راستے پر چلنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ رسول، اسی فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے آیا ہے، اور خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق آیا ہے۔

فترۃ

اس میں کہا کہ یہ رسول "عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ" آیا ہے، فترۃ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی شدت کا مدھم ہو جانا۔ حرارت میں کمی واقع ہو جانا۔ ایک رسول کے بعد دوسرا رسول اس وقت آیا کرتا تھا جب سابقہ رسول کی آوردہ تعلیم اس کے امتیوں کی خطا کاریوں کی وجہ سے ماند پڑ جاتی تھی۔ اس کی تعلیم میں وہ گرمجوشی اور حرارت باقی نہیں رہتی تھی۔ حضور نبی اکرمؐ کی بعثت نے اُن عروق مردہ میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیا۔ نبی اکرمؐ کے بعد

کسی اور رسول کے آنے کی ضرورت اس لئے باقی نہ رہی کہ آپ کا آوردہ پیغام قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے ۔ جب کوئی قوم چاہے، اس کے ذریعے اپنی زندگی میں حرارت پیدا کرسکتی ہے ۔

اس کے بعد اس آیت میں ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے ۔ فرمایا کہ اس رسول کو اس لئے بھی بھیجا جارہا ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم غلط راستے پر جارہے تھے تو کوئی ایسا بھی تو نہ آیا جو ہمیں اس سے متنبہ کرتا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو یہ تمہیں تباہیوں کے جہنم کی طرف لئے جارہا ہے ۔ اگر ایسا آگاہ کرنے والا آجاتا تو ہم صحیح راستہ اختیار کرلیتے ۔

قوموں کی تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا

یہ اعتراض بڑا وزنی ہے ۔ انسان حق اور باطل غلط اور صحیح میں امتیاز اپنی عقل کی رو سے کر نہیں سکتا ۔ یہ صرف وحی کی رو سے ممکن ہے ۔ اگر کسی قوم کے سامنے وحی (سرے سے ہوہی نہ) یا اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہے، اور صحیح راستہ کا کوئی نشان نہ ملے، تو انہیں تباہ اور ہلاک کر دینا، انصاف سے بعید ہوگا ۔ یہ ظلم ہوگا ۔ اس موضوع پر ہم سابقہ باب میں (زیر آیت ۴/۱۶۵) گفتگو کر چکے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس نکتہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا دہرا دینا نامناسب نہ ہوگا ۔ بالخصوص اس لئے کہ اس سے کچھ اہم نتائج بھی مستنبط ہوئے ہیں جن کا وہاں ذکر نہیں آیا تھا ۔

قرآن کریم نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

(i) خدا کسی قوم کو تباہ نہیں کرتا، تاوقتیکہ اسے بتا نہ دیا جائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کونسا ۔ رسول اسی مقصد کے لئے آیا کرتے تھے ۔ اور

صحیح اور غلط راستے میں تمیز کر دی جائے

(ii) اس قوم کی ذہنی سطح ایسی ہو کہ وہ سمجھانے پر، غلط اور صحیح کا فرق سمجھ سکے ۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے ۔ فرمایا

۱۔ ہم کسی قوم کو تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ ہم اس کی طرف اپنا رسول نہ بھیج دیں ۔ (۱۷/۱۵ نیز ۲۶/۲۰۸) ۔ یہ رسول اس ملک کے مرکزی مقام (فی امھا) میں آتا تھا ۔ (۲۸/۵۹)

۲۔ مکافاتِ عمل کے وقت ان رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا (۵/۱۰۹) ۔ خود اس قوم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے رسول کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا (۲۸/۶۵) ۔

۳۔ جہنم کے داروغے، اہل جہنم سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس خدا کے رسول نہیں آئے تھے جو تم گمراہ رہے؟ وہ کہیں گے کہ وہ آئے تو تھے لیکن ہم نے ان کی بات نہیں مانی تھی ۔ (۶۷/۸) ۔ اگر ہم ان کی سنتے اور عقل و فکر سے کام

پیتے تو جہنم میں کیوں پہنچتے (۶۷/۱۱-۸)۔

۴۔ رسول اللہؐ سے فرمایا کہ آپ کی اوّلین مخاطب وہ قوم ہے جس کی طرف اس سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا (۳۶/۶)

(۳۲/۳)؛ (۲۸/۴۶)۔ تاکہ یہ لوگ ایسا نہ کہہ سکیں کہ اگر ہماری طرف رسول آتا تو ہم صحیح راستہ اختیار کر لیتے (۲۸/۴۷)؛ (۵/۱۹)۔

{ نیز دیکھئے (۹/۱۱۵)؛ (۳۰/۹)؛ (۳۵/۴۲) }

اس میں سمجھنے کی صلاحیت ہو

دوسری بات یہ کہ اس قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہو۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جہنم میں وہی لوگ جائیں گے جنہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو حاصل ہو لیکن وہ ان سے کام نہ لیں اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے رسولوں کے پیغام کی مخالفت کرتے جائیں۔ (۷/۱۷۹)۔ عادؔ اور ثمودؔ کے متعلق کہا کہ وہ اس لئے تباہ نہیں ہوئے کہ وہ پیغاماتِ خداوندی کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹/۳۸)۔ وہ صاحبِ فکر و نظر تھے۔ اور ارباب بصیرت تھے۔ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔ لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال رکھے تھے کہ ان کی سمجھ سوچ کی صلاحیت ان کے کسی کام نہ آئی۔ (۴۶/۲۶)۔ جیسا کہ اوپر بھی کہا جا چکا ہے، سورۂ ملک میں ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ تم جہنم میں کیوں داخل کر دیئے گئے۔ وہ کہیں گے کہ "اگر ہم عقل و فکر سے کام لیتے تو اہل جہنم میں سے کیوں ہوتے؟

(۶۷/۱۰)

اس سے جرم و سزا کے متعلق ایک عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جس قانون سے لوگوں کو پہلے آگاہ نہ کیا گیا ہو اس کی خلاف ورزی مستوجب سزا نہیں قرار پا سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ جن میں سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو (مثلاً مجنون یا بچے) انہیں مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس ضمنی نکتہ کے چند سابقہ مضمون کے تسلسل میں یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کہ تنذیر اسی کے لئے مفید اور کارگر ہو سکتی ہے جو "زندہ" ہو، ایک لفظ میں بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا کہ رسول کی دعوت سے وہی قوم مستفید ہو سکتی ہے "جو زندہ ہو"۔ لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ "تو انہی لوگوں کو زندگی کے خطرات

قوم کا زندہ ہونا ضروری ہے

سے آگاہ کر سکتا ہے جو زندہ ہوں اور ان میں زندہ رہنے کی رمق اور آرزو ہو"۔ جو قوم مر چکی ہو اور اس کے زندہ ہونے کا کوئی امکان نہ ہو اسے تیری دعوت کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ قبرستان میں وعظ کئے جانے سے کیا حاصل! اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ...

(۲۷/۸۰)۔ تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں (اقبالؒ)

(آیت ۳/۱ میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے لیکن یہاں اسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جارہا ہے)۔

اس حقیقت کو قرآن نے "زمینِ مردہ" سے تشبیہہ دی ہے۔ بارش تو ہر زمین پر برستی ہے لیکن فصل اُسی زمین سے پیدا ہوتی ہے جس میں روئیدگی کی صلاحیت ہو۔ جو زمین اس صلاحیت کو کھو کر مستقل بنجر ہو جائے، اسے بارش کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲/۶)

زندگی اور موت کا قرآنی مفہوم

زندہ سے مراد سانس لینے والے، اور مُردہ سے مراد طبیعی طور پر مرجانے والے نہیں۔ طبیعات کی رُو سے حیات اور موت کی تعریف اور ہے۔ اقدارِ خداوندی کی رُو سے کچھ اور۔ وہ چلتے پھرتے، زندہ انسانوں سے کہتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴) "اے جماعتِ مومنین! تم خدا اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو۔ اُس رسول کی دعوت پر جو تمہیں اس پروگرام کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کردے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رُو سے زندگی سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں۔ اس طرح تو حیوان بھی زندہ رہتے ہیں۔ زندگی انسانی سطح پر زندہ رہنے کا نام ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

کھول کر کیا بیان کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق عشق ہے مرگِ باشرف۔ مرگ، حیاتِ بے شرف
(اقبالؒ)

"حیاتِ بے شرف" موت ہے۔ یہ حیوانی سطح زندگی ہے۔ یہ کفر ہے (۴۷/۱۲)۔

اسلامی نظام کس طرح قائم ہوتا ہے

آج (۱۹۸۰ء) میں ہمارے ہاں تمام "دانشورانِ قوم" اس سعی لاحاصل میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ معلوم کیا جائے کہ "اسلامی نظام" کس طرح قائم ہوگا۔ یہ بحثیں عرصہ سے چل رہی ہیں اور حالت یہ ہے کہ ——— ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ قرآن کریم نے اس پروگرام کو چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے جس کی رُو سے اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا..... (۶/۱۲۲)

ذرا سوچو کہ کیا وہ جو مردہ تھا۔ پھر اسے ہم نے زندہ کیا۔ اور اس کے ہاتھ میں شمع قرآنی دی (کہ وہ اپنے راستے کو بھی

روشن کرے اور) عالمگیر انسانیت کی بھی راہ نمائی کرے۔ کیا ایسی قوم اس قوم جیسی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں زندگی بسر کر رہی ہو اور ان تاریکیوں سے نکلنا ہی نہ چاہے.....

اس آیت جلیلہ میں اس پروگرام کو واضح کر دیا ہے جس کے مطابق قرآنی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اور جسے حضور نبی اکرمؐ نے قائم کر کے دکھا دیا۔

آپ نبی اکرمؐ کے اختیار فرمودہ پروگرام پر نگاہ ڈالیئے۔ آپؐ کی بعثت کے وقت آپؐ کی مخاطب قوم زندہ نہیں، مردہ تھی۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کے سامنے اقدار خداوندی نہیں تھیں۔ حضورؐ نے اپنی حیات رسالت کا پچاس فی صد سے بھی زیادہ حصّہ (تیئیس برس میں سے تیرہ برس) ان مردہ انسانوں کو زندہ انسانوں کی صف میں لانے کے لئے صرف فرما دیا۔ آپ نے اس (قدیم) معاشرہ میں اسلامی نظام کی بات ہی نہیں کی۔ آپؐ نے اپنی مکی زندگی میں، نہ اسلامی آئین مرتب فرمایا۔ نہ اسلامی قوانین حکومت مدوّن کئے، حالانکہ اسلامی نظام کا قیام آپؐ کی رسالت کی غایت اور آپ کے مشن کا منتہیٰ تھا۔ آپؐ نے پہلے وہ افراد تیار کئے جن کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم ہونا تھا۔ آپؐ نے "عمر ابن خطاب" کو، اس کی (قدیم) سطح پر رہتے ہوئے، فاروقِ اعظمؓ نہیں بنایا تھا۔ آپؐ نے پہلے اسے دعائیں مانگ کر، مردوں کی بستی سے نکالا، کیونکہ آپؐ نے دیکھ لیا تھا کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے بعد قرآنی تعلیم و تربیت سے، (عمر بن خطابؓ اور ان جیسے دیگر افراد) کے تبکدۂ دل و دماغ کو تمام سابقہ معتقدات و نظریات سے پاک و صاف کیا۔ (یہ حصّہ لَا تھا) اور اس کے بعد، اس خالی گھر میں "اللہ کو بسایا" (یہ حصّہ اِلاّ تھا)۔ یہ تھا اس پروگرام کا مرحلۂ اوّل ـــــ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ ‏ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار ‏ اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

حضور نبی اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے المزّمّل کہہ کر پکارا تھا۔ مزمّل اُس کارواں سالار کو کہتے ہیں جو بہترین افراد کا رواں کا انتخاب کرے۔ حضورؐ کی مکی زندگی، ان افرادِ کارواں کی تیاری میں گزری۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) اس دور میں آپؐ نے اسلامی مملکت اور اس کے تضمنات کے متعلق کوئی تفصیلات طے نہیں فرمائیں حالانکہ آپؐ کی تمام سعی و کاوش کا منتہیٰ وہی تھا۔ اُس وقت آپؐ نے ساری توجہ اپنے رفقائے کار کی تعمیر کی طرف مرکوز رکھی، کہ یہی منزل تک پہنچنے کا صحیح پروگرام تھا (پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں): ؎

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم! ‏ کہ گفتہ اند نخستین رفیق، بعد طریق

ان رفقاء کے ہاتھ میں جب قرآن دیا تو پھر نہ اسلامی نظام و مملکت کے قیام میں کوئی دقت پیش آئی، نہ طریقِ انتخاب و مشاورت کی کوئی بحث اُٹھی۔

قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی قوم کے خارجی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس قوم کے افراد میں نفسیاتی تبدیلی نہ آچکی ہو۔ حضورؐ کے تعمیر کردہ معاشرہ کے افراد میں کس قسم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی آچکی تھی، اُسے قرآن کریم نے بڑے بسیط انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ (۴/۶۵)۔ "اے رسولؐ! تیرا رب اس پر شاہد ہے۔ اس کی گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک یہ اپنے تمام اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حکم (فیصلہ دینے والا) مقرر نہ کریں"۔ یہاں تک کسی نفسیاتی تغیر کی ضرورت نہیں۔ ایسا کچھ ہر حکومت قانون کی رُو سے کرا سکتی ہے۔ یعنی اختلافی معاملات کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ نفسیاتی تغیر کی بات آگے آتی ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اختلافی معاملات تیرے پاس لائیں۔ تو فیصلہ دے تو ان کی کیفیت یہ ہو کہ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ۔ "یہ تیرے فیصلے کے خلاف، دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی اور گرانی محسوس نہ کریں"۔ یہ بات داخلی تبدیلی (نفسیاتی تغیر) کے بغیر ممکن نہیں۔ (۴/۶۵)

یہ تھے وہ افراد جنہیں اس عظیم ذمہ داری (قیامِ نظامِ اسلامی) کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ان کی قلبی کیفیت اس قسم کی کیوں ہو گئی تھی؟ بات واضح ہے۔ ان سے کہا گیا کہ اپنے تمام اختلافی معاملات کے تصفیہ کے لئے حضورؐ کی طرف رجوع کریں، تو دوسری طرف حضورؐ سے فرمایا کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ...... (۵/۴۸) "تم ان کے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔ اور اس میں کسی کے جذبات کی رعایت نہ کرو"۔

یعنی فیصلے اس کتاب اللہ کے مطابق جس کی صداقت پر ان کا ایمان ہے اور فیصلہ دینے والا وہ، جس کی پاکیزگیٔ سیرت ان کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اور اسے بھی بہ تاکید کہ فیصلہ دیتے ہیں، نہ اپنے نہ کسی اور کے جذبات سے متاثر ہو ـــ یہ تھا وہ معاشرہ جس میں اسلامی نظام قائم ہوا تھا۔

یہیں سے ایک قدم آگے بڑھ جائیے تاکہ اس اہم سوال کا جواب بھی لگے ہاتھوں مل جائے جس کا تعلق نظامِ معاشرت سے ہے۔ سربراہ مملکت اور ان افراد معاشرہ کے باہمی تعلق کی بابت ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر اُس کے کسی فیصلہ کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی کبیدگی یا گرانی پیدا ہو جائے تو یہ اپنے آپ کو مومن نہیں

مشاورت

تصوّر کرسکتے۔ لیکن اسی سربراہِ مملکت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) "امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کیا کرو" اور اس مشورہ میں انہیں اس قدر آزادیٔ رائے حاصل تھی کہ وہ حضورؐ کی پیش کردہ تجاویز کی مخالفت کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے تھے۔ اور حضورؐ کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کی رائے زیادہ صائب ہوتی، تو آپ اپنی تجویز میں اس کے مطابق تبدیلی فرما دیتے۔ اور جب کسی معاملہ کے متعلق فیصلہ ہو جاتا تو پھر اس فیصلہ کی تعمیل میں کسی کے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس نظام میں نہ حکم دینے والے کی طرف سے کسی قسم کے جبر کا امکان تھا، نہ حکم ماننے والوں کے دل میں کسی قسم کی مجبوری کا احساس۔ یہ ہے اسلامی نظام کی وہ انفرادیت جس کی مثال دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کرسکتا۔ انسانی نظام خارج سے مسلط کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر باہر آتا ہے۔

چونکہ یہاں مشاورت کا ذکر آگیا ہے اس لئے ایک لطیف نکتہ کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ مشاورت کا حکم رسول اللہؐ کو بھی دیا گیا ہے (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) اور جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) الامر کے معنی نظامِ مملکت کے ہیں۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ وہی ہیں لیکن ان کی ترتیب میں جو (غیر محسوس سا) فرق ہے اس سے ایک عظیم حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ امورِ مملکت میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہؐ مملکت قائم کرچکے تھے اور اس مملکت کے سربراہ آپ خود تھے۔ آپؐ کی یہ سربراہی امت کے مشورہ سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ حضورؐ منصبِ رسالت کی حیثیت سے سربراہِ مملکت تھے۔ لیکن حضورؐ کے بعد صورت یہ نہیں تھی۔ اس وقت خود مملکت، یعنی سربراہ مملکت بھی امت کے مشورہ سے منتخب ہوتا تھا۔ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ سے یہی مراد ہے "أمرهم" میں سربراہ مملکت کے انتخاب سے لے کر جملہ امورِ مملکت تک شامل ہیں جو امت کے مشورہ سے طے پائیں گے۔ یہ مفہوم ہے ان مختصر سے تین لفظوں کا کہ أمرهم شورىٰ بينهم۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا خلافة الا بمشاورة (الکنز العمال)۔ جو مملکت مشاورت کے بغیر قائم ہو وہ خلافت (اسلامی مملکت) نہیں ہوسکتی وہ ملوکیت ہوگی۔

رسول، اس طرح ایک مردہ قوم کو زندگی عطا کرکے، اسے قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے تیار کرتا تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ...... (۲/۲۶۰) "مجھے بتاؤ کہ مردوں کو زندہ کرنے کا طریقہ کیا ہے" تو اس سے یہی مراد تھی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے۔ مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۵۸ آیت ۲/۲۶۰)۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم قومِ حضرت موسیٰؑ کی داستان کو بار بار سامنے لاتا ہے۔ فرمایا۔

$\frac{5}{20}$ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ○

ذرا ان یہود کا حال سُنیئے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔ ان سے ان کے پیغمبر موسیٰؑ نے کہا کہ تم اُن انعامات خداوندی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو جن کی رُو سے، اُس نے تم میں انبیاء پیدا کئے۔ اور تمہیں صاحب اقتدار و مملکت بنایا۔ اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو اس زمانے میں کسی اور قوم کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

داستان بنی اسرائیل کی تفاصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ انڈکس سے حوالے مل جائیں گے۔ اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ "وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا"، تو ملوک سے مراد اصطلاحی ملوکیت (بادشاہت نہیں) اس سے مراد مملکت کا اقتدار ہے۔ ($\frac{28}{6-5}$) تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب جلد دوم ۲آیت $\frac{2}{۲۴۸}$ ص۱۷۶)

ان احکاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کے بعد کہا کہ خدا کی طرف سے انہیں یہ کچھ عطا ہوا، اور ان کی یہ حالت تھی کہ ان میں ہمت اور استقلال قطعاً نہیں رہا تھا۔ (مطالب جلد دوم۔ ص۲۲۲)۔ اس کی شہادت میں اس نے سورۃ بقرہ میں "طالوت اور جالوت" کے معرکہ کا قصہ بیان کیا ہے۔ (دیکھئے مطالب جلد سوم۔ ص۴۲۶-۴۱۸)۔ اب وہ اس واقعہ کو سامنے لایا ہے جس کی رُو سے اُن سے" ارضِ مقدس" پر قبضہ کر لینے کے لئے کہا گیا تھا۔

اسے آیات ($\frac{5}{21-26}$) میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات، مع ان کے تناظر کے مطالب الفرقان جلد دوم۔ ص۲۹۴-۹۵ پر گزر چکی ہیں اس لئے ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ تجدیدِ یادداشت کے لئے ان کا مفہوم درج ذیل کر دیا جاتا ہے:

$\frac{5}{21-26}$ ان انعاماتِ خداوندی کی یاد تازہ کرانے کے بعد اُن سے کہا کہ تم اُٹھو، اور فلسطین کی اس بابرکت زمین میں فاتح و منصور داخل ہو جاؤ۔ جسے اللہ نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ تم آگے بڑھو اور اس ملک پر قابض ہو جاؤ۔ دیکھنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دشمن کو دیکھ کر میدان سے، پیٹھ دکھا کر، بھاگ نکلو۔ اگر ایسا کرو گے تو سخت نقصان اٹھاؤ گے ($\frac{2}{58}$) ($\frac{5}{21}$)۔

اس کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ اے موسیٰؑ! اس ملک میں تو بڑے بڑے زبردست لوگ بستے ہیں۔ جب تک یہ اس ملک سے نہ نکل جائیں، ہم وہاں قدم نہیں رکھنے کے۔ اگر یہ وہاں سے نکل جائیں، تو پھر ہم بڑے شوق سے وہاں

چلے جائیں گے۔ (۵/۲۲)

یہ جواب ساری کی ساری قوم کی طرف سے تھا، بجز دو آدمیوں کے، جو اُن جیسے نہیں تھے، اور جو خدا کے قانون سے اس قسم کا مذاق کرنے سے خوف کھاتے تھے۔ انہیں خدا نے حقیقت بینی کی نعمت سے نوازا تھا ——— یہ دونوں، خود موسیٰؑ اور ہارونؑ تھے ——— اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ (تم اس قدر بزدل کیوں بن رہے ہو؟) ایک دفعہ ہلّہ بول کر شہر کے دروازے میں درّانہ گھس جاؤ۔ پھر دیکھو، تم کس طرح ان پر غالب نہیں آجاتے؟ جن لوگوں کا اللہ پر ایمان ہو، وہ اس طرح ہمت نہیں ہارا کرتے۔ وہ اللہ کے قانون کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ بزدلی تو عدم یقین اور تذبذب سے پیدا ہوتی ہے (۵/۲۳)

لیکن اُن پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ اے موسیٰؑ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم کبھی نہیں آگے بڑھنے کے۔ تمہیں اگر اللہ کے قانون اور نصرت پر ایسا ہی بھروسہ ہے، تو تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ[ؑ] اور ان سے جنگ کرو۔ ہم یہاں بیٹھے نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں۔ (جب تم غالب آجاؤ تو ہمیں آواز دے لینا۔ ہم فوراً پہنچ جائیں گے) (۵/۲۴)

اس پر موسیٰؑ نے تنگ آکر کہا کہ اے میرے پروردگار! تو دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کیا کچھ کر رہے ہیں! میرا اب ان پر کوئی بس نہیں۔ میرا اختیار تو سمٹ سمٹا کر، خود میری ذات تک یا زیادہ سے زیادہ اپنے بھائی تک رہ گیا ہے۔ اب ہم ہیں اور اس قسم کی بے راہ رو قوم ہیں، تو ہی کوئی فیصلہ کر دے کہ ان کے متعلق ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ (۵/۲۵)

چنانچہ خدا نے فیصلہ دے۔ اور فیصلہ یہ تھا کہ وہ لوگ، اس سرزمین سے، جسے اُن کے نام لکھ دیا گیا تھا، چالیس سال تک محروم کر دیئے گئے۔ اور وہ اس بیابان میں مارے مارے پھرتے رہے ——— سرگرداں و پریشان۔ تباہ حال و خستہ خراب۔

یقیناً ان کی یہ حالت موسیٰؑ جیسے مشفق داعیٔ انقلاب کے لئے بڑی تأسف انگیز تھی (اور ہر نبی کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ (۱۸/۶؛ ۲۶/۳؛ ۳۵/۸) لیکن ہم نے اسے کہہ دیا کہ اس قسم کی بے راہ رو قوم کا یہی حشر ہوا کرتا ہے ———

اس لئے تم ان کی حالت پر افسردہ خاطر مت ہو۔ جو اپنے آپ کو خود تباہی میں ڈالے، اُسے کون بچا سکتا ہے؟

ؑ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اور تمہارا بڑا بھائی (ہارونؑ) دونوں جاؤ۔

یہ ہے خدا کی چہیتی اولاد ہونے کی مدعی قوم کا ماضی!

اس کے بعد قرآن کریم نے دو آدمیوں (ابنی آدم) کے باہمی معاملہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس سے مقصد کیا ہے، اسے ہم نے ان آیات کے مفہوم میں بیان کر دیا ہے۔ پہلے آپ آیت (۵/۲۷) اور اس کا مفہوم دیکھ لیجئے۔

۵/۲۷ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

(یہودیوں کی نافرمانیاں اور سرکشیاں زمانۂ حضرت موسیٰؑ تک ہی محدود نہ تھیں۔ اس کے بعد بھی وہ یہی کچھ کرتے رہے۔ ان کا آخری جرم، حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے درپے ہونا تھا۔ ان کے ان پیہم جرائم کی وجہ سے، خدا نے اُن سے، اپنی عنایات، ایک ایک کر کے چھین لیں، اور ان (عنایات) کا رُخ ان کے بھائی (اسماعیلؑ) کی شاخ کی طرف پھیر دیا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ یہ سمجھتے کہ اُن کی یہ محرومی ان کی اپنی کرتوتوں کا نتیجہ ہے، وہ الٹا حسد کرنے لگ گئے اور اس داعی الی الحقؐ کے درپے آزار ہو گئے (جو بنی اسماعیلؑ میں سے ہے)۔ ان سے کہو کہ یہ تو اُن دو فرزندانِ آدمؑ کے قصے کی سی بات ہو گئی (جن کا ذکر خود تمہارے ہاں تورات میں موجود ہے، لیکن جس میں تم نے بہت سی رنگ آمیزیاں کر رکھی ہیں۔ اس لئے) میں تمہیں ٹھیک ٹھیک بتاتا ہوں کہ بات کیا ہوئی تھی۔

ان دونوں بھائیوں نے (اپنے خیال کے مطابق) خدا کے ہاں مقرب بننے کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ اُن میں سے (اُن کے عقیدہ کے مطابق) ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔ اس پر، اُس دوسرے کو غصہ آ گیا اور اپنے بھائی سے کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اُس نے کہا کہ اللہ متقیوں کی پیش کش قبول کیا کرتا ہے۔ اس لئے اگر میری قربانی قبول ہو گئی ہے تو اس میں تمہارے لئے غصہ کی کون سی بات ہے، اور میرا کیا قصور ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قتل کرنے کے درپے ہو رہے ہو؟ (۵/۲۷)

ہابیل و قابیل

ہمارے ہاں چونکہ آدم سے مراد "پہلا انسان۔ اور حضرت آدمؑ" لیا جاتا ہے اس لئے اس آیت میں آدم کے دو بیٹوں سے مراد، حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے لیا جاتا ہے۔ تورات میں ان کا نام ہابیل اور قابیل آیا ہے۔ ہماری کتب تاریخ اور تفسیر میں انہیں ہابیل اور قابیل کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ہمارے مؤرخین تاریخ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے کرتے ہیں اور افسانہ در افسانہ سب رطب و یابس لکھتے

چلے جاتے ہیں اور کبھی نہیں بتاتے کہ اس کے لئے ان کا ماخذ (SOURCE) کیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری یہ تاریخ کس حد تک قابلِ اعتماد قرار پا سکتی ہے!

"آدم" کے متعلق آپ مطالب۔ جلد دوم باب اوّل و دوم میں دیکھ چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے مراد "آدمی" ہے۔ اور بنی آدم سے مراد نوعِ انسان۔ اس بنا پر آیت زیرِ نظر میں اَبْنَیْ آدَمَ سے مراد، آدم نامی کسی خاص شخص کے دو بیٹے نہیں بلکہ محض دو آدمی ہیں۔ قرآن نے بس اتنا ہی کہا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا نام بھی نہیں لیا۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے یا محض تمثیلی بیان، اس کا بھی بالتصریح کوئی ذکر نہیں۔ قرآن کریم نے اسے جس مقصد کے لئے بیان کیا ہے وہ آیت (۵/۳۲) سے واضح ہو جاتا ہے۔

یہ تو رہی ان دو لڑکوں کی بات۔ اب ان میں ایک کے قتل کے واقعہ کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں ہماری کتب تفسیر میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے نگاہیں نیچی کر کے لکھنا پڑتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کئی بار بتایا جا چکا ہے) تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں بڑی قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس واقعہ کے متعلق لکھا ہے۔

تفسیری افسانہ طرازیاں

"خدا فرماتا ہے۔ اسے نبی انہیں حضرت آدمؑ کے دونوں کا صحیح صحیح بے کم و کاست قصہ سنا دو۔ ان دونوں کا نام ہابیل و قابیل تھا۔ ضروری ہے کہ چونکہ اس وقت دنیا کی ابتدائی حالت تھی اس لئے یوں ہوتا تھا کہ حضرت آدمؑ کے ہاں ایک حمل سے لڑکا لڑکی ہوتے تھے، پھر دوسرے حمل میں بھی اسی طرح۔ تو اس حمل کا لڑکا اور دوسرے حمل کی لڑکی ان دونوں کا نکاح کر دیا جاتا تھا۔ ہابیل کی بہن تو خوبصورت نہ تھی اور قابیل کی بہن خوبصورت تھی۔ تو قابیل نے چاہا کہ اپنی ہی بہن نکاح کرلے۔ حضرت آدمؑ نے اسے منع کیا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ تم دونوں خدا کے نام پر کچھ نکالو جس کی خیرات قبول ہو جائے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا جائے گا۔ ہابیل کی خیرات قبول ہو گئی۔ پھر وہ ہوا جس کا بیان قرآن کی ان آیتوں میں ہے۔" مفسرین کی اقوال سنیئے":-

حضرت آدمؑ کی صلبی اولاد کے نکاح کا قاعدہ جو اوپر مذکور ہوا بیان فرمانے کے بعد مروی ہے کہ بڑا بھائی قابیل کھیتی باڑی کرتا تھا اور ہابیل جانوروں والا تھا۔ قابیل کی بہن بہ نسبت ہابیل کی بہن کے خوب رو تھی۔ جب ہابیل کا پیغام اس سے ہوا تو قابیل نے انکار کر دیا اور اپنا نکاح اس سے کرنا چاہا۔ حضرت آدمؑ نے اس سے روکا۔ اب ان دونوں نے خیرات نکالی کہ جس کی قبول ہو جائے وہ نکاح کا زیادہ حقدار ہے۔ حضرت آدمؑ اس وقت مکے چلے گئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے فرمایا۔ زمین پر جو میرا گھر ہے اسے جانتے ہو؟ آپ نے کہا نہیں۔ حکم ہوا مکے میں ہے تم وہیں جاؤ۔ حضرت آدمؑ نے آسمان سے کہا کہ میرے بچوں کی تو حفاظت کرے گا؟ اس نے انکار کیا۔ زمین سے کہا وہ بھی

انکاری ہوگئی۔ پہاڑوں سے کہا انہوں نے بھی انکار کیا۔ قابیل سے کہا۔ اس نے کہا ہاں میں محافظ ہوں۔ آپ جائیے۔ آ کر ملاحظہ فرمالیں گے اور خوش ہوں گے۔ اب ہابیل نے ایک خوبصورت موٹا تازہ بھیڑ، نام خدا پر ذبح کیا اور بڑے بھائی نے اپنی کھیتی کا حصہ اللہ نکالا آگ آئی اور ہابیل کی نذر تو جلا گئی جو اس زمانہ میں قبولیت کی علامت تھی اور قابیل کی نذر قبول نہ ہوئی اس کی کھیتی یونہی رہ گئی اس نے راہ للہ کرنے کے بعد اس میں سے اچھی اچھی بالیں توڑ کر کھالی تھیں۔ چونکہ قابیل اب مایوس ہو چکا تھا کہ اس کے نکاح میں اس کی بہن نہیں آنے کی اس لئے اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کی قربانی قبول فرمایا کرتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہی بھیڑا جنت میں پلتا رہا اور یہی وہ بھیڑا ہے جسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بچے کے بدلے ذبح کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ہابیل نے اپنے جانوروں میں سے بہترین اور مرغوب و محبوب جانور خدا کے نام قربان کیا اور خوشی کے ساتھ۔ برخلاف اس کے قابیل نے اپنی کھیتی میں نہایت ردّی اور واہی چیز اور وہ بھی مرے جی سے خدا کے نام نکالی تھی۔ ہابیل تنومندی اور طاقتوری میں بھی قابیل سے زیادہ تھا تاہم خدا کے خوف کی وجہ سے اس نے اپنے بھائی کی ظلم و زیادتی سہ لی اور ہاتھ نہ اٹھایا۔ بڑے بھائی کی قربانی قبول نہ ہوئی اور حضرت آدمؑ نے اس سے کہا تو اس نے کہا کہ آپ چونکہ ہابیل کو چاہتے ہیں اس کے لئے دعا کی تو اس کی قبول ہوگئی۔ اب اس نے ٹھان لی کہ میں اس کانٹے ہی کو اکھاڑ ڈالوں۔ موقعہ کا منتظر تھا ایک روز اتفاقاً حضرت ہابیل کے آنے میں دیر لگ گئی تو انہیں بلانے کے لئے حضرت آدمؑ نے قابیل کو بھیجا۔ یہ ایک چھری اپنے ساتھ چھپا کر چلا راستے میں ہی دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوگئی تو اس نے کہا کہ میں تو تجھے مار ڈالوں گا کیونکہ تیری قربانی قبول ہوئی اور میری نہ ہوئی۔ اس پر ہابیل نے کہا کہ میں نے بہترین اور عمدہ محبوب اور مرغوب چیز اللہ کے نام نکالی اور تو نے ردّی کھدّی واہی چیز نکالی اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کی نیکی قبول کرتا ہے۔ اس پر وہ بگڑا اور چھری بھونک دی۔

چونکہ اب تک زمین پر کوئی قتل نہیں ہوا تھا تو قابیل اپنے بھائی کو گرا کر کبھی اس کی آنکھیں بند کرتا کبھی اسے تھپڑ اور گھونسے مارتا۔ یہ دیکھ کر ابلیس لعین اس کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ پتھر لے کر اس کا سر کچل ڈال جب اس نے کچل ڈالا تو لعین دوڑتا ہوا آیا حضرت حوّاؑ کے پاس آیا اور کہا قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ انہوں نے پوچھا قتل کیسا ہوتا ہے ؟ کہا، اب نہ وہ کھاتا پیتا ہے نہ بولتا چالتا ہے نہ ہلتا جلتا ہے۔ کہا، شاید موت آگئی۔ اس نے کہا، ہاں وہی موت۔ اب تو مائی صاحبہ چیخنے چلانے لگیں اتنے میں حضرت آدمؑ آئے۔ پوچھا کیا بات ہے ؟ لیکن یہ جواب نہ دے سکیں۔ آپ نے دوبارہ دریافت فرمایا لیکن فرط غم و رنج کی وجہ سے ان کی زبان نہ اٹھی تو کہا تو اچھا۔ تو اور تیری بیٹیاں ہائے وائے میں ہی رہیں گی اور میں اور میرے بیٹے اس سے بری ہیں۔

یہ تو متقدمین تھے۔ ہمارے ہاں متاخرین بھی اسی ڈگر پر چلتے ہیں۔ شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ کا شمار بڑے بلند پایہ

ہمارے زمانے کے علماء

علماء میں ہوتا ہے۔ اور اسی زمرہ میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا شمار بھی۔ قرآن کریم کا ترجمہ شیخ الہندؒ کا ہے اور اس کی تفسیری حواشی مولانا عثمانیؒ کے۔ ان میں بھی آدمؑ کے بیٹوں کے نکاح کے سلسلہ میں یہی کچھ کہا گیا ہے۔ ان حضرات کو "بھائی بہنوں کے نکاح" کے سلسلہ میں جو الجھن پیش آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے آدمؑ اور اس کی بیوی (حوا) کو پہلا انسانی جوڑا قرار دیا۔ اس جوڑے کے جنسی اختلاط سے آگے بچے بچیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے، ان میں ہر لڑکی، لڑکوں کی حقیقی بہن تھی اور ہر لڑکا، لڑکیوں کا بھائی۔ شریعت کی رو سے، بہن بھائی کا نکاح ہو نہیں سکتا۔ اب مشکل یہ آن پڑی کہ نسل انسانی کا سلسلہ آگے کس طرح چلے؟ اس کے لئے کہا یہ گیا کہ آدمؑ اور حوا کے ہر حمل میں ایک لڑکا پیدا ہوتا تھا اور ایک لڑکی۔ ایک حمل میں پیدا ہونے والے لڑکے کا نکاح دوسرے حمل میں پیدا ہونے والی لڑکی سے کر دیا جاتا تھا۔ (یہ گویا بھائی بہن نہیں رہتے تھے!)

یہ الجھن کیوں؟

آپ نے غور فرمایا کہ تمام الجھنیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ آدم اور حوا کو پہلا انسانی جوڑا فرض کر لیا گیا۔ اگر یہ حضرات قرآن کریم تک محدود رہتے اور روایات میں نہ اُلجھتے تو نہ اس قسم کی کوئی اُلجھن پیدا ہوتی، نہ اسے حل کرنے کے لئے دور از کار کاوشیں کرنی پڑتیں۔

بہر حال انہوں نے پہلے ہابیل اور قابیل کی الجھن پیدا کی۔ پھر باہمی رقابت کا افسانہ تراشا۔ (حالانکہ قرآن کریم نے ایسا کہیں نہیں کہا)۔ اور کہا کہ بہشت میں پہلے گناہ کی ذمہ دار بھی عورت تھی۔ اور دنیا میں پہلے انسانی قتل کی ذمہ دار بھی عورت۔

آہ بے چاری عورت!

قرآن کریم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کیا منت تھی جو انہوں نے مانی تھی۔ کیا نذر تھی جو انہوں نے پیش کی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات نظر آتی ہے جب نذر نیاز کی قبولیت یا عدم قبولیت کے معیار، مذہبی پروہتوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس کے لئے کسی اور سند یا اتھارٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے ایک سے کہہ دیا ہوگا کہ تمہاری نذر قبول ہو گئی ہے۔ دوسرے کی نہیں ہوئی۔ اور اس سے ان کی باہمی مخالفت شروع ہو گئی۔

جس بھائی کو قتل کئے جانے کی دھمکی دی گئی تھی اس نے کہا:

لَئِنۢ بَسَطتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَآ أَنَا۠ بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ
۵/۲۹-۲۸ لِأَقْتُلَكَ ۖ إِنِّيٓ أَخَافُ ٱللَّهَ رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ إِنِّيٓ أُرِيدُ
أَن تَبُوٓأَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلنَّارِ ۚ وَذَٰلِكَ

جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۚ

بایں ہمہ، اگر تم دھاندلی سے میرے خلاف دست درازی کرو گے تو بس (اپنی مدافعت تو کروں گا، لیکن) تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں تو خدائے رب العلمین کے قانونِ مکافات سے ڈرتا ہوں کہ ناحق کسی کو قتل کر دوں۔ (۵/۲۸)

میں چاہتا ہوں کہ زیادتی ہو تو تمہاری طرف سے ہو، میری طرف سے نہ ہو۔ اور اگر میری اس مدافعت میں تمہیں کچھ نقصان پہنچ جائے تو میرے اس گناہ کا بار بھی تمہاری گردن پر ہو ——— اس طرح تمہارے ذمے دو جرم ہو جائیں گے۔ میرے قتل (یا اس کے ارادے) کا جرم، اور میری طرف سے تمہیں جو نقصان پہنچے، اس کا جرم ——— اس قسم کے مجرم کی سزا جہنم کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے (۵/۲۹)

اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔

۵/۳۰ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

لیکن اس نے غصے میں ایک نہ سنی۔ جذبات سے مغلوب ہو کر بھائی کو قتل کر دیا، اور اس طرح، خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ (جذبات سے مغلوب ہو جانے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے)۔

قبل اس کے کہ ہم اس آیت کا اپنا مفہوم بیان کریں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کے متعلق کیا سمجھتا ہے۔ اس مفروضہ کے تحت کہ یہ دنیا میں سب سے پہلا قتل (بلکہ سب سے پہلا موت کا واقعہ) تھا، انہوں نے یہ سوچا کہ قاتل نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ اس لاش کو کیا کرے؟ ابن کثیر میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ

جب مار ڈالا تو اب یہ معلوم نہ تھا کہ کیا کرے اور لاش کو کس طرح چھپائے؟ تو اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے

لاش کا کیا کیا جائے؟

وہ دونوں بھی آپس میں بھائی بھائی تھے۔ یہ اس کے سامنے لڑنے لگے یہاں تک کہ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ پھر ایک گڑھا کھود کر اس میں اس کی لاش رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ یہ دیکھ کر قابیل کی سمجھ میں بھی یہ ترکیب آگئی اور اس نے بھی ایسا ہی کیا۔

چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے نزدیک، جو کچھ اسلاف نے کہہ دیا ہے، وہ حرفِ آخر ہے۔ اس کے خلاف کچھ کہنا تو ایک طرف، اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے متاخرین نے بھی اپنی تفسیروں اور ترجموں میں یہی کچھ لکھ دیا ہے۔

جب قرآن کریم نے خود کوئی تفصیل نہیں دی تو ہم اس کے متعلق اپنے قیاس ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ متقدمین کی دشواری لفظ (سَوْءَةَ) سے پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس کے معنی "لاش" کے لئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے معنی لاش کے بھی ہوتے ہیں لیکن یہ وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے معانی ہر بری بات۔ ہر معیوب حرکت۔ ہر وہ قول اور فعل کے ہیں جس کے ظاہر ہونے پر شرم محسوس ہو۔ (حسنات کے مقابلہ میں، سیئات اس کی جمع ہے۔ جس کے

اس کا صحیح مفہوم

معنی برائیاں اور ناہمواریاں ہیں)۔ آیت میں "فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ" (۵/۳۱) سے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے کئے پر بڑا نادم تھا۔ اس قیاس کے تحت میں نے اس کا حسب ذیل مفہوم لیا ہے۔

۵/۳۱ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۚ ۛ

اس نے جوشِ غضب میں بھائی کو قتل تو کر دیا لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بیٹھ کر سوچنے لگا کہ یہ میں نے کیا کر دیا؟ وہ اسی حالت میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتفاق سے سامنے ایک کوا دیکھا جو زمین کو کرید رہا تھا۔ وہ اپنے کئے پر نادم تو پہلے ہی ہو رہا تھا، کوے کی اس حرکت سے اس کا خیال اس طرف منتقل ہو گیا کہ کوا مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے (بفرضِ محال) اپنے بھائی میں کوئی برائی دیکھی بھی تھی تو اس پر یوں مغلوب الغضب ہونے کی بجائے اسے چھپانے (پردہ پوشی) کی کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ اس پر اس نے اپنے آپ کو کوسا، اور جی میں کہا کہ کس قدر باعثِ افسوس ہے یہ امر کہ مجھ میں ایک جانور جتنی سمجھ بھی نہ ہوئی!

چنانچہ ان خیالات سے وہ اپنے دل میں بہت نادم ہوا۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی (سچ مچ کا) واقعہ نہ ہو بلکہ زندگی کے ایک اصول کے سمجھانے کے لئے تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہو۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میرے اس قیاس کی تائید میں ایک حدیث بھی ہے جسے خود ابن کثیر نے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ یہ واقعہ بطور ایک مثال کے ہے۔ تم اس میں سے اچھائی لے لو اور برائی کو چھوڑ دو۔ (ابن کثیر۔ چھٹا پارہ۔ سورۃ مائدہ۔ صفحہ ۸)

اس تفسیر کے مترجم مولانا محمد جوناگڑھی (مرحوم) نے اعتراف کیا ہے کہ

اس قصّہ کی تفصیلات جس قدر بیان ہوئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر حصّہ اہل کتاب سے اخذ کیا ہوا ہے۔

(ایضاً ص۸۰)

اس قصّہ سے ایک بات کو بالکل عیاں ہے کہ اس قتل کا جذبۂ محرکہ حسد تھا (حسد اس بنا پر کہ دوسرے شخص کی نذر قبول کیوں ہوگئی ہے!) قرآن کریم نے اپنی تعلیم، پیغام، راہ نمائی کو مکمل طور پر واضح کر دینے کے بعد آخری دو آیات میں چند ایک شرور سے محتاط رہنے کی تاکید ہے۔ ایک، مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۱۱۳/۵) "حسد کرنے والے کے حسد سے" اور دوسرے، مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴/۴) "وسوسہ انگیز (جھوٹا پراپیگنڈا اور سرگوشیاں) کرنے والے کے شر سے"۔ اور اس پر اپنی کتابِ عظیم کا اختتام کر دیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ حسد اور وساوس انگیزیاں کس قدر خطرناک ہیں اور ان کی پیدا کردہ تباہ کاریاں کس قدر مہیب!

قرآن کریم نے جس مقصد کے لئے اس تمثیل کو بیان کیا ہے، اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی ہے جس کی ابتدا "مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ" سے ہوتی ہے یعنی یہی وجہ تھی جو خدا نے بنی اسرائیل کی طرف یہ حکم نازل کیا کہ

۵/۳۲ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝

یہ قصّہ (جو بنی اسرائیل کے ہاں عام تھا) درحقیقت اُن کی اس جذباتی کیفیت کا ترجمان تھا کہ وہ بات بات پر آمادہ بہ قتل ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے ہم نے اُن کی طرف یہ تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے کو قتل کر ڈالے —— بجز اس کے کہ وہ جُرمِ قتل کے قصاص میں ہو (یعنی قتل ناحق کے لئے سزائے موت کے طور پر) یا ملک میں فساد برپا کرنے والے مجرمین کو قانون کے مطابق موت کی سزا دی جائے —— تو اس قسم کے بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو گویا اس شخص نے (ایک فرد کو قتل نہیں کیا) پوری کی پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ اس کے برعکس جس شخص نے کوئی ایک جان بچا لی، تو اُس نے گویا پوری نوعِ انسان کی جان بچا لی۔

یہی نہیں کہ انہیں یہ حکم ایک بار دیا گیا، اور پھر فراموش کر دیا گیا۔ اُن کی طرف ہمارے پیغامبر، واضح احکام و

دلائل لے کر آتے رہے، اور انہی باتوں کو دہراتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، ان کی اکثریت کا یہ عالم رہا ہے۔ (اور اب تک ہے) کہ وہ حدود شکنی اور زیادتی کرتے رہے۔

انسانی جان کی قدر و قیمت

یہ آیت، انسانی زندگی کی قدر و قیمت، اور انسانی جان کی حرمت اور عظمت کے متعلق ایک عظیم، بلند اور عالمگیر اصول پیش کرتی ہے جسے ہر ایوان عدلیہ کے در و دیوار پر سورج کی کرنوں میں منقوش کرنا چاہیئے۔ انسانی زندگی کے احترام اور قتل ناحق اور بالحق کے متعلق، مطالب الفرقان

قتل بالحق

جلد سوم۔ (صفحہ ۱۶۸) دیکھیئے۔ قتل بالحق کے معنی ہیں، قوانین خداوندی کے مطابق، عدل کا تقاضا پورا کرنے کے لئے سزائے موت۔ قرآن کریم نے اس کی تفصیل مختلف مقامات پر دی ہے۔ جب قرآن نے ہر بنی آدم (انسان) کو واجب التکریم (۱۷/۷۰) اور ہر انسانی جان کو قابل احترام قرار دیا ہے، تو (قانون خداوندی کے خلاف) کسی جان کا تلف کر دینا، سنگین ترین جرم ہے۔ اور کسی جان کو بچا لینا عظیم ترین عمل حسنہ۔

"فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ" کی تشریح اگلی آیت میں کر دی گئی ہے۔

۵/۳۳　إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۵/۳۳﴾

ان کی اس مفسدانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اب جب کہ، اس ملک میں نظام عدل و احسان قائم ہو چکا ہے جس میں انہیں ہر طرح کا آرام اور امن حاصل ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ اطمینان سے بیٹھیں، یہ بدستور تخریبی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ عدل و آئین پر مبنی نظام خداوندی کے خلاف بغاوت ہے۔ اس باب میں ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کریں، یا ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں، تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ یا سولی چڑھا دیا جائے یا مخالف سمت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں[۱]۔ یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے (یا نظر بند کر دیا جائے اور عام مراعات سے محروم کر دیا جائے) ـــــ غرضیکہ جرم

---

[۱] اس کے معنی الٹی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈال دینا بھی ہو سکتے ہیں۔

کی نوعیت، اور ملک کے حالات کے پیشِ نظر جو سزا مناسب سمجھی جائے، دی جائے۔ یہ سزا اُن کے لئے دُنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی۔ باقی رہی آخرت، سو وہاں بھی اُن کے لئے سخت تباہی ہوگی ——— اس لئے کہ اس جرم کا ایک اثر تو سوسائٹی کے نظام پر پڑتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے سزا ضروری ہے۔ اور دوسرا اثر خود مجرم کی اپنی ذات پر پڑتا ہے (۴/۱۱۱)۔ اس کا نتیجہ اس ذات کا ضعف و انتشار ہے جو حیاتِ اُخروی میں تباہی کا موجب ہے۔

اس آیت میں، "یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" کے الفاظ آئے ہیں جن کا مفہوم "نظامِ خداوندی" بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں تفصیلی بحث، اسی جلد کے چوتھے باب میں، آیات (۴/۵۹-۵۸)۔ (صفحات ۳۶-۲۳۵ پر) گزر چکی ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ "اللہ اور رسول" کی قرآنی اصطلاح کا یہ مفہوم میری اختراع نہیں۔ متقدمین اور متاخرین سب اس سے یہی مفہوم لیتے ہیں۔ اس مقام پر اس کی تھوڑی سی مزید وضاحت ضروری ہے۔ جب میں نے یہ مفہوم پیش کیا تو ہماری

"اللہ اور رسولؐ" کا مفہوم

مذہبی پیشوائیت نے طوفان برپا کر دیا کہ یہ شخص اطاعتِ رسول کا منکر اور سنتِ رسول اللہؐ کا منحرف ہے۔ یہ طوفان اس حد تک بڑھایا گیا کہ قریب ایک ہزار "علماء" کی طرف سے میرے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ لیکن دیکھئے کہ اس باب میں خود یہ حضرات کیا کہتے ہیں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں اس آیت (۵/۳۳) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> (فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ میں) زمین سے مراد وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو۔ اور "خدا اور رسول" سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔۔۔۔۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی اور ڈکیتی کی حد تک ہو، یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام کر دینے کے لئے ہو، دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔
>
> (تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ ص ۴۶۵۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک بات یہ حضرات کہیں تو عین مطابق اسلام، اور وہی بات ایسا شخص کہے جس کی مخالفت مقصود ہو، تو وہ کفر، اور بے دینی! ان حضرات کی طرف سے کفر کے فتوے اس طرح صادر ہوتے ہیں:

اس آیت میں "خدا اور رسول کے خلاف جنگ" سے مراد تو اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ باقی رہا

"فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ" تو اس میں ہر قسم کی قانون شکنی کی منظم سازشیں اور وارداتیں آ جاتی ہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے انڈکس میں عنوان فساد دیکھئے)۔

اس آیت میں ان جرائم کی جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں، ان کے متعلق، ذرا آگے چل کر، آیت (۳۸/۵) کے تحت بات کی جائے گی جہاں چوری کی سزا کا ذکر آیا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں جس عفو، مغفرت اور رحمت کا ذکر آیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ دین میں سزا کا جذبۂ محرکہ انتقام جوئی نہیں۔ اصلاح ہے۔ فرمایا:

۳۴/۵ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

لیکن جو لوگ اس روش سے از خود باز آ جائیں، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پا لو، تو اس حقیقت کو فراموش نہ کرو۔ کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ایسے لوگ سزا سے بھی محفوظ رکھے جا سکتے اور انہیں عام سہولتوں سے بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔

نظامِ عدل و حکومت میں یہ اصول بڑا اہم ہے۔ یہی وہ گوشے ہیں جہاں اسلامی نظام منفرد حیثیت اختیار کر لیتا اور انسانی نظاموں سے متمیز اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

قانون کا تقاضا تو یہی ہے کہ مغلوب ہونے سے پہلے تائب ہو جانے والوں کو معاف کر دیا جائے۔ لیکن عفو کریمانہ اور بذلِ رحیمانہ کا تقاضا کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ قریشِ مکہ نے بیس اکیس سال تک مسلسل حضورؐ کی شدید ترین مخالفت کی۔ آپ اور جماعت مومنین کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ سات برس تک متعدد لڑائیاں بھی لڑیں۔ اس کے بعد وہ فتح مکہ کے دن مغلوب و مفتوح، پابجولاں اور گردن نہادہ حضورؐ کے سامنے۔ قانون کا تقاضا تھا کہ انہیں سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ آپ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ وہ بھی ادا شناس تھے۔ پکار اٹھے کہ وہی جو ایک شریف اور شریف زادہ کیا کرتا ہے! آپ نے فرمایا:

عفوِ کریمانہ

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔ اِذْهَبُوا أَنتُمُ الطُّلَقَاءُ ۔۔

تم سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ جاؤ، تم سب آزاد ہو۔

اتنا ہی نہیں۔ ان لوگوں نے مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ وقت تھا کہ کم از کم ان مکانات کو مہاجرین کو

واپس دلایا جائے۔ لیکن حضورؐ نے مہاجرین سے کہا کہ تم اپنی مملوکات سے دستبردار ہو جاؤ اور یہ مکانات انہی کے پاس رہنے دو!

بدلہ لیا جاتا تو چند نفوس ختم ہو جاتے۔ عفو کریمانہ سے کام لیا تو وہی قریش کے افراد نہیں۔ قیامت ان کی نسلیں بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں۔

انتقام نہیں۔ اصلاح

قرآن کریم نے "مَا قَدْ سَلَفَ" (جو کچھ پہلے ہو چکا) سے درگزر کرنے کی جو تعلیم دی ہے وہ اس کی کشادہ ظرفی کی زندہ شہادت ہے۔ اس کے ضابطۂ قانون میں عدل کا مقصد انتقام جوئی نہیں، اصلاح ہے۔ اور جس قدر اصلاح کشادہ ظرفی اور وسعتِ قلب سے ہو سکتی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

سرکشوں اور قانون شکنوں کے متعلق گفتگو کرنے کے فوری بعد، جماعت مومنین سے کہا گیا کہ تم اس باب میں بڑی احتیاط برتنا۔ فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱبْتَغُوٓاْ إِلَيْهِ ٱلْوَسِيلَةَ وَجَٰهِدُواْ فِى سَبِيلِهِۦ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (۵/۳۵)

اے جماعت مومنین! دیکھنا کہیں تم نظامِ خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کر لینا۔ تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس میں بلند ترین مقام اور مرتبہ حاصل کرنے کی تڑپ اپنے دل میں پیدا کرو۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے پوری پوری جد و جہد کرو۔ اس سے تم اس مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔

"خدا تک پہنچنے" کے لئے انسانوں کو "وسیلہ" بنانے کا تصور غلط ہے۔ (۲/۱۸۶ ؛ ۱۷/۵۷)!

آیت کا مفہوم تو واضح ہے لیکن اس کے ایک لفظ (وسیلہ) کے غلط مفہوم نے دین کی پوری عمارت کو کس طرح منہدم کر کے رکھ دیا ہے، اسے مطالب الفرقان جلد سوم۔ (صفحہ ۴۴۸ پر) بیان کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر آیت بھی وہاں درج ہے۔

جماعتِ مومنین کو اس تاکید کے بعد کہ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں، ان قوانین کی مخالفت کرنے

والوں کے متعلق کہا:

$\frac{۵}{۳۶-۳۷}$ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○

جو لوگ اس نظام کی مخالفت کریں گے، انہیں، آنے والے انقلاب میں، دردناک مراحل کر رہے گی۔ اگر ان کے پاس دنیا بھر کے خزانے اور ان کی مثل اور بھی ہوں اور وہ چاہیں کہ انہیں بطور فدیہ دے کر، اس تباہی اور بربادی سے بچ جائیں، تو ایسا ہونا ناممکن ہوگا۔ (کوئی شخص اپنے سرمایہ کے زور پر، ان تباہیوں سے نہیں بچ سکتا جو ان لوگوں پر آتی ہیں جو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے نظام کے راستے میں روک بن کر بیٹھ جائیں)۔

اُس وقت ان کی وہ دولت جسے وہ نوعِ انسان کی خوش حالی کے لئے تقسیم نہیں کرتے تھے، ان کے لئے جہنم کا ایندھن بن جائے گی۔ ($\frac{۹}{۳۴-۳۵}$)۔ اور یہ آگ اُن کے دلوں کے اندر بھڑک رہی ہوگی ($\frac{۱۰۴}{۱-۹}$) اُس وقت وہ بیزار چاہیں کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جائے، ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ عذاب ان کے سر پر مسلّط رہے گا۔ ($\frac{۵}{۳۷}$)

یہاں کہا کہ یہ دولت تمہارے کام نہیں آئے گی، تو اس کے بعد جرم سرقہ (چوری) اور اس کی سزا کا ذکر کر کے بتایا کہ معاشرہ میں اس قسم کی بدنظمی بھی مطلوب نہیں کہ جو کسی کے جی میں آئے اٹھا کر یا چرا کر لے جائے۔ معاشرہ کا نظم و ضبط نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کہا:

$\frac{۵}{۳۸-۳۹}$ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ($\frac{۵}{۳۸-۳۹}$)

ملک میں بغاوت پھیلانے اور فساد برپا کرنے کے بعد، بڑا فتنہ چوری کا جرم ہے جس سے معاشرہ میں امن اور سکون باقی نہیں رہتا —— چور، مرد ہو یا عورت، مجرم ہونے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ اس لئے ان کی سزا میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس کے لئے ایسا طریق اختیار کرنا چاہیئے جس سے خود چور کے ہاتھ چوری

کرنے سے رُک جائیں اور دوسروں کے لئے بھی، قانونِ خداوندی کی رُو سے روک بن جائے۔ یعنی وہ مجرم کیلئے موجبِ اصلاح (CURATIVE) ہو اور دوسروں کے لئے جُرم سے اجتناب کا باعث (PREVENTIVE) لیکن اگر یہ دیکھو کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، اور یہ جُرم ہو رہا ہے، تو اُس کی انتہائی سزا یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ بہر حال، مقصد اس جُرم کی روک تھام ہے۔ خواہ غلبہ اور قوت سے ہو، خواہ حُسنِ تدبیر سے۔ (عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ" میں دونوں باتیں آجاتی ہیں)

جب ملک میں قرآن کا وہ معاشی نظام رائج ہو جس میں کسی شخص کی ضروریاتِ زندگی رُکی نہیں رہتیں، کیونکہ اُن کا پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتا ہے، تو جو شخص پھر بھی چوری کرتا ہے، وہ بڑے سنگین جُرم کا مرتکب ہوتا ہے) ($\frac{5}{38}$)

مقصد چونکہ جُرم کی روک تھام ہے، اس لئے جو شخص ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر نادم ہو، اور اپنی اِصلاح کر لینے کا یقین دلائے تو قانونِ خداوندی میں اس کے لئے معافی کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ ایسے شخص کو سزا سے بھی محفوظ رکھا جائے گا۔ اور عام سہولتوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ ($\frac{5}{39}$)

قرآن کریم کی رُو سے جُرم اور سزا کے فلسفہ اور عدلی تفاصیل کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ (صـ۱۷۱) پر بحث ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ حسب ذیل امور مزید قابلِ غور ہیں:

۱۔ قرآن کریم نے جن جرائم کی سزا خود تجویز کی ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

جرائم اور ان کی سزائیں

۱۔ جرمِ قتل۔ قصاص ($\frac{2}{178-79}$) مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صـ۱۶۸۔

قتلِ عمد۔ قتلِ خطا۔ ($\frac{4}{92-93}$)۔ زیرِ نظر جلد۔ چوتھا باب۔ (صـ۹۵-۳۹۴)

۲۔ بغاوت اور فساد ($\frac{5}{33}$)۔ سابقہ صفحات۔

۳۔ سرقہ۔ ($\frac{5}{38-39}$) زیرِ نظر

۴۔ زنا۔ ($\frac{24}{2}$)۔ (اپنے مقام پر آئے گا)

۵۔ مبادیاتِ زنا۔ ($\frac{4}{15}$)۔ زیرِ نظر جلد۔ چوتھا باب۔ (صـ۳۱۰)

۶۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔ ($\frac{33}{60-61}$)۔

۷۔ تہمت تراشی۔ ($\frac{24}{4-5}$)

فقہ کی رُو سے، قرآن کریم کی مقرر کردہ سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے، اور جو سزائیں فقہ نے تجویز کی ہیں، انہیں تعزیرات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حدود اور تعزیرات

اسلامی مملکت "حدود" کے متعلق ضروری شرائط متعین کرے گی، اور اپنے زمانہ اور معاشرہ کے حالات کے مطابق تعزیرات بھی وہی مقرر کرے گی۔ کسی زمانہ کی اسلامی مملکت کی مقرر کردہ شرائط یا تعزیرات آنے والی حکومت پر (BINDING) نہیں ہو سکتیں۔ ابدیت صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہے۔ انسانوں کے وضع یا مرتب کردہ قوانین کو نہیں۔ ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں غیر متبدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ قرآن کی مقرر کردہ سزاؤں (بلکہ احکام) کے متعلق اس بنیادی حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ اسلامی معاشرہ یا اسلامی نظام میں نافذ ہونے کے لئے ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ یا نظام کے لئے نہیں۔ اگر ان سزاؤں کو غیر اسلامی معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو یہ (غیر مسلموں کے الفاظ میں) وحشیانہ نظر آئیں گی اور ممکن العمل بھی نہیں ہوں گی۔ اس کا نہایت تلخ اور افسوسناک تجربہ مملکتِ پاکستان میں کیا جا چکا ہے۔ اوائل ۱۹۷۹ء میں، حدود کے نام سے کچھ قوانین نافذ کئے گئے۔ اوّل تو وہ قوانین، قرآن کے مطابق نہیں تھے۔ وہ فقہی قوانین تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان پر عمل ہی نہ ہو سکا۔ اور غیر مسلموں (بلکہ خود ہماری اپنی قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ) کے دل میں یہ تاثر راسخ ہو گیا کہ اسلامی سزائیں وحشتناک بھی ہیں اور ناممکن العمل بھی۔ اس سے اسلام، دنیا میں جس قدر بدنام ہوا، ظاہر ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ میں (وہ خواہ مسلمان نام رکھنے والی قوم پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو) اسلامی قوانین (FIT IN) نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی غیر اسلامی مملکت میں ان قوانین کو اپنایا بھی جائے تو، انہیں اسلامی قوانین کہہ کر نہیں پکارنا چاہیئے۔ اس مملکت کے قوانین کہنا چاہیئے۔ اس سے اسلام بدنام نہیں ہوگا۔ اگر بھارت کی حکومت اپنے ہاں شراب کو ممنوع قرار دے دے تو اسے اسلامی قانون نہیں کہا جائے گا خواہ وہ اسلامی قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

سرقہ کی سزا

اس تمہید کے بعد، جرم سرقہ کی سزا کی طرف آیئے۔ آیت میں "قطع ید" آیا ہے جس کے عام معنی "ہاتھ کاٹ دینا" لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی ہر حالت میں یہ نہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے لغت کی رُو سے دیکھ لیا جائے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ میں نے اپنی لغات میں (مادہ ۔ ق ۔ ط ۔ ع ۔ کے تحت) جو کچھ لکھا ہے اسے درج ذیل کیا جاتا ہے:

قطع ید کے معنی

قَطَعَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں جیسے قَطَعَ اللَّحْمَ۔ گوشت کاٹنا

اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کٹ جاتی ہیں، جیسے قَطَعَ السَّبِیْلَ۔ ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا۔ قَطَعَ لِسَانَہٗ۔ کسی پر احسان کر کے اس کی زبان بند کر دینے کو بھی کہتے ہیں[1]۔ قرآن کریم میں یَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ (۲/۲۷) میں، یہی معنوی انقطاع مراد ہے۔ یعنی انسانیت کے وہ رشتے جنہیں خدا نے ایک دوسرے کے ساتھ ملائے رکھنے کا حکم دیا تھا انہیں کاٹ کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ نوعِ انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

قَطَعَ خَصْمَہٗ بِالْحُجَّۃِ۔ اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو لاجواب کر دیا۔ قَطَعَ رَحِمَہٗ قَطِیْعَۃً۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر لئے۔ چنانچہ اُقْطُوْعَۃٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو قطع تعلقات کی نشانی کے طور پر بھیجی جائے (ابن فارس)۔ قَطَعَ عُنُقَ دَآبَّتِہٖ کے (یہ معنی نہیں کہ اس نے اپنے جانور کا گلا کاٹ دیا۔ بلکہ مجازاً اس کے) معنی ہیں اس نے اپنے جانور کو فروخت کر دیا[2]۔ قُطِعَتْ لِسَانُہٗ، کے معنی ہیں کہ وہ زبان جو پہلے قینچی کی طرح چلتی تھی اب اس میں وہ بات نہیں رہی۔ قُطِعَتْ یَدُہٗ کے معنی ہیں اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی بیماری ہو گئی کہ ہاتھ بیکار ہو گیا[3]۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں جہاں ہے قَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ (۱۲/۳۱) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر الگ کر کے پھینک دیئے۔ اس کے معنی ہیں ان کے ہاتھ کام کرنے سے رُک گئے۔ (یا فرطِ حیرت میں اُنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے ہمارے ہاں بھی ہاتھ کاٹ لینے سے مراد ہاتھ زخمی کر لینا ہوتا ہے)۔ اسی طرح قُطَّاعُ الطَّرِیْقِ۔ ڈاکوؤں کو کہتے ہیں جو راستہ روک کر راہزنی کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے (قومِ لوط کے ضمن میں) اسے تَقْطَعُ السَّبِیْلَ کہا ہے (۲۹/۲۹)۔ یا اس آیت میں تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ کے معنی ہیں خلافِ وضعِ فطری سے افزائشِ نسلِ انسانی کے راستے بند کر دینا۔ قُطِعَ بِہٖ کے معنی ہیں اس کے اور اس کی امیدوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی۔ وہ مایوس ہو گیا۔

قِطْعٌ مِّنَ الَّیْلِ۔ سے مراد رات کا حصہ ہے جو شروع رات سے تہائی رات تک ہوتا ہے۔ نیز آخری رات کو بھی کہتے ہیں (دیکھئے ۱۱/۸۱)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی رات کا کوئی حصہ ہے۔

قُطِعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی نا امید ہو گیا اور عاجز رہ گیا۔ قَطَعَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں کسی بات کا آخری فیصلہ کرنا[3]۔

---

[1] تاج۔ [1] غزوۂ حنین کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرداس کو چالیس اونٹ دیئے۔ وہ بہت غصہ ہوا اور ایک قصیدہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور جس طرح ہو میری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہؓ گئے اور وہ جتنے میں راضی ہوا اُسے دے کر راضی کر لیا۔ یہ تھا مطلب قطع لسان کا۔

(بحوالہ اصح السیر عبدالرؤف داناپوری۔ صفحہ ۲۹۶)

[2] تاج۔ [3] محیط۔

اسی سے آیت (۲۷/۴۲) میں ہے مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا ۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ کرنے والی نہیں ......

سورۃ المائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا (۵/۳۸) جس کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دو۔ لیکن لفظ قَطْعٌ اور قَطْعَ یَدٍ کے مذکورہ صدر معانی کے پیشِ نظر اس کے یہ معانی بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رُک جائیں۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی ماندہ ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے "جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۵/۳۸)۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانونِ خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک ہے۔ (نَكَالًا کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ل)۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رُک جائیں۔ اس لئے کہ اس سے آگے فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ (۵/۳۸)۔ اور جو مجرم ارتکابِ جرم کے بعد پشیمان ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اسے قانونِ خداوندی کی رو سے معاف کر دینا چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی یہ پشیمانی اور اصلاح سزا ملنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی۔ لیکن اگر سزا میں اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اُسے معافی مل جانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر اَیْدِیْ کے معنی اختیار اور مقدرت کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ی ۔ د ۔ ی) تو قطع ید کے معنی ہوں گے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس مقدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے۔ اس میں چوری کے علاوہ ہر قسم کی خیانت بھی آجاتی ہے۔

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد تائب ہو جائے اور اپنی اصلاح کا عزم کرلے، اسے معاف کر دیا جائے تو اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس جرم کی انتہائی سزا (اگر دی جائی بھی مقصود ہو۔ یعنی ہاتھ کاٹ دینا) تو وہ عادی مجرم کے لئے ہوگی۔ اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (۳/۱۳۵)

یہ عادی مجرم کی سزا ہے

اگر ان سے کبھی (غلطی سے) کوئی معیوب حرکت سرزد ہو جاتی ہے، یا وہ اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں، تو اُس پر، جان بوجھ کر، اصرار نہیں کرتے، بلکہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، اور اُس کے مطابق، اپنی اصلاح کر کے، اپنی غلطی کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں ——— اور حقیقت یہ ہے کہ غلط

اقدامات کے مضرات سے، قانونِ خداوندی کے علاوہ، اور کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟

جو عادی مجرم نہ ہوں ان کے متعلق کہا ہے۔ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ....

(۳/۱۳۵) ــ "انہیں معافی مل سکتی ہے"۔

لیکن اس باب میں اوّل اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس جرم کا ارتکاب اسلامی معاشرہ میں ہو۔ جب ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج ہو، جس میں کوئی فرد اپنی (اور اپنی اولاد کی) ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا، کیونکہ ان کا پورا کرنا

صرف اسلامی معاشرہ میں

حکومت کی ذمہ داری ہے، تو جو شخص پھر بھی چوری کرتا ہے، وہ بڑے سنگین جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور سخت سزا کا مستحق۔ لیکن جب معاشرہ کی حالت یہ نہ ہو، تو پھر چوری ایسا سنگین جرم قرار نہیں پا سکتی۔ اس کی تائید میں صدرِ اوّل کی تاریخ میں نظائر ملتے ہیں مثلاً

صدرِ اوّل کے واقعات

۱۔ روایات میں کہ حضورؐ نے چوری کے جرم کی سزا کے طور پر مجرم کے ہاتھ نہیں کاٹے۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں یہاں تک آیا ہے کہ ایک مجرم نے چار مرتبہ ارتکابِ جرم کیا لیکن حضورؐ نے درگزر فرمایا۔ نظر آتا ہے کہ حضورؐ نے یہ فیصلے بہ تقاضائے حالات کئے ہوں گے۔

۲۔ عہدِ فاروقی میں (حضرت) حاطب بن ابی بلتعہؓ کے غلاموں[1] کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر، ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے کام سخت لیتا ہے۔ لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے ان غلاموں کو تو معاف کر دیا۔ اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا انہیں دی جائے کیونکہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

(شاہکارِ رسالت۔ ص ۲۴۵)

---

[1] ظہورِ اسلام کے بعد ان (سابقہ) غلاموں کی پوزیشن ملازموں کی سی ہو گئی تھی لیکن تاریخ میں انہیں غلام کہہ کر ہی پکارا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔

۳۔ اسی قسم کے فیصلوں کی روشنی میں بعض فقہا (TURISTS) نے قوانین وضع کئے تھے کہ اضطراری (مجبوری کی) حالت میں، چوری مستوجب سزا نہیں ہوتی۔ (مثلاً) امام ابن حزمؒ (وفات ۴۵۶ھ) اندلس کے مشہور محدث

امام ابن حزم کا مسلک

اور فقیہہ ہیں اور المحلیٰ ان کی بڑی مستند کتاب۔ اس میں وہ پہلے لکھتے ہیں کہ:

فقہا کا قول ہے کہ اگر کوئی پیاسا ہے اور اسے موت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں پانی چاہے چھین کر پی لے، اگرچہ اس کے لئے اسے جنگ تک بھی کیوں نہ کرنی پڑے۔

فقہا کے اسی فیصلے سے استنباط کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

پھر اس میں کیا فرق ہے کہ پیاس کی وجہ سے موت سے بچنے کے لئے جنگ کو جائز قرار دیا جائے، اور بھوک اور عریانی کے سبب موت سے بچنے کے لئے جنگ سے منع کیا جائے، حالانکہ نوعیت دونوں کی ایک جیسی ہے۔

اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ:

مضطر (یعنی جو بھوک، پیاس کی وجہ سے مجبور ہو جائے) کو مقاتلہ کا حق حاصل ہے اور مقابلہ میں اگر وہ مارا جائے تو حق روکنے والے پر اس کا خون بہا لازم آجائے گا۔ لیکن اگر وہ روکنے والا مارا جائے تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی اس لئے کہ کسی کے حق کو روکنے والا در حقیقت بغاوت کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ (شاہکار رسالت۔ صفحہ ۳۶۷)

ان کی دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اضطراری حالت میں حرام چیزوں تک کے کھا لینے کی اجازت دی ہے۔ (۵/۳)۔ تاکہ اس سے مضطر کی جان بچ جائے۔ سو، اگر ایسے حالات میں حرام تک کھا لینے کی اجازت ہے؛ تو چوری کر کے جان بچا لینا جرم کیسے قرار دیا جائے؟

ہم فقہاء کے ان فیصلوں پر محاکمہ نہیں کرنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ حالات سے مشروط ہیں اور صرف اسلامی معاشرہ میں نافذ کی جا سکتی ہیں۔ اگر غیر اسلامی معاشرہ میں، قانون کے ڈنڈے سے اس قسم کی واردات کو روکنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے معاشرہ میں انارکی پھیل جائے۔ حضور نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں اس طرف بڑا لطیف اشارہ پایا جاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

کشتی والوں کی مثال

کچھ لوگ ایک سفر میں کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اُوپر کے حصے میں پہنچ گئے کچھ نچلے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی پینے کے لئے اوپر گئے۔ اُوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو (پانی دے کر) اس سے باز نہ رکھا جائے

تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر پانی دے دیا تو سب بچ جائیں گے۔

(ترمذی - جلد دوم - ابواب فتن)

جرائم کو روکنے کا درست یہ صحیح طریقہ ہے۔ سزا کا سوال اُس وقت پیدا ہو گا جب کشتی میں نیچے والے، پانی مل جانے کے باوجود کشتی میں چھید کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت ان کے ہاتھ روکنے کو کون ظلم اور زیادتی سے تعبیر کرے گا؟ آیت (۵/۳۸) میں نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ سے مراد ایسی تدابیر ہیں جو ارتکاب جرم میں روک بن جائیں۔ اور آیت کے آخر میں "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کا مطلب یہ ہے کہ اس کا علاج قوت (عزیز) ہی نہیں۔ حکمت (حکیم) بھی ہے۔ اور اپنے کئے پر نادم ہو جانے والے کے لئے غفور اور رحیم بھی۔ واضح رہے کہ آیات کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات آتی ہیں، وہ (معاذ اللہ) شعر کی ردیف اور قافیہ نہیں ہوتیں۔ ان میں اہم نکات پوشیدہ ہوتے ہیں۔

لہٰذا قرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ پہلے معاشرہ یا نظام کو اسلامی بنائیے اور پھر اس میں تعزیری احکام نافذ کیجئے۔ غیر اسلامی معاشرہ میں تعزیری احکام کی تنفیذ، سیکولرازم ہو گی خواہ وہ احکام اسلامی احکام کے مماثل بھی کیوں نہ ہوں۔

ہم نے آیت (۵/۳۳) کے ضمن میں کہا تھا کہ اس کی تشریح آیت (۵/۳۸) کے تابع سامنے آجائے گی۔ گزشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اطلاق جرم بغاوت اور فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ پر بھی ہوتا ہے اس میں بلکہ چار متبادل سزاؤں کا

جرم بغاوت کی سزا

ذکر ہے: قتل۔ تصلیب۔ قطع دست و پا اور قید یا جلا وطنی۔ متبادل سزاؤں سے مراد یہ ہے کہ جس قسم کے حالات ہوں، عدالت (یا اسلامی نظام) اس قسم کی سزا نافذ کر سکتا ہے۔ حالات تو ایک طرف، قرآن کریم تو سزا تجویز کرتے وقت، ملزم کی ذہنی کیفیت۔ تعلیم۔ تربیت۔ تمدنی حالات کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اس نے آزاد عورتوں کے جرم زنا کی سزا "سو کوڑے" تجویز کی ہے (۲۴/۲) لیکن لونڈیوں کی سزا اس سے نصف مقرر کی گئی ہے (۴/۲۵)۔ اور اگر (بفرض محال) نبیؐ کی بیویوں (یا اہل خانہ) سے اس جرم کا ارتکاب ہو تو اس کی سزا دگنی (۳۳/۳۰)۔ قرآنی سزاؤں کے متعلق گفتگو کرتے وقت، ان تمام امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(ضمناً) جرم بغاوت کی سزا میں قید یا جلاوطنی بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر بغاوت جیسے سنگین جرم کی سزا بہر حال "ہاتھ پاؤں کاٹ دینا" نہیں۔ بعض حالات میں قید کی سزا بھی کافی سمجھی جا سکتی ہے، تو چوری کے جرم کے متعلق یہ کیوں تصور کر لیا جائے کہ اس کی سزا، قطع ید کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتی۔ ان امور کے فیصلے اسلامی مملکت کی صوابدید پر چھوڑے جاتے ہیں کہ قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، حالات کے مطابق، قوانین وضع کرے۔

"سرقہ" کی قانونی تعریف (DEFINITION) بھی وہی متعین کرے گی۔ یعنی کوئی واردات قانون کی رُو سے کب سرقہ کہلائے گی۔ قرآن نے اسے بھی غیر متعین رکھا ہے۔

انسداد جرائم میں حکمت

ہم نے اوپر کہا ہے کہ جرم سرقہ سے متعلق آیت کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ایسے اقدامات سے مقصود، قوت اور غلبہ کی نمود نہیں، اس کا ایک اہم گوشہ حکمت بھی ہے۔ اس کی وضاحت قرآن کریم نے نہایت بلیغ انداز میں کردی جہاں کہا کہ:

۵/۴۰ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○

یاد رکھو! مُجرم کو سزا دے کر خدا اپنی قوّت و جبروت کا سکّہ دلوں پر بٹھانا نہیں چاہتا۔ اُس کی قوّت اور اقتدار کی زندہ شہادت تو یہ پوری کارگہِ کائنات ہے جو اُس کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سرگرمِ عمل ہے۔ تعزیری قانون سے مقصد یہ ہے کہ جو شخص ارتکابِ جُرم سے خود اپنے آپ کو سزا کا مستوجب قرار دے لے اُسے اُس کے کیے کا بدلہ مل جائے۔ جو امن پسند ہونے کی ضمانت دے دے، اُس کی حفاظت کردی جائے۔ نظامِ خداوندی میں (خواہ وہ خارجی کائنات میں ہو یا انسانوں کی دنیا میں) ہر عمل ایک خاص پیمانے کے مطابق نتیجہ مرتب کرتا ہے جس پر خدا کو پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ (۵/۴۰)

"يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ" کے مفہوم کے لئے انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھئے۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مجرم کو سزا خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ سابقہ آیت میں "جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا" سے یہ واضح کردیا کہ ایسا کچھ مجرم کے ارتکابِ جرم کا نتیجہ ہوگا۔

ان احکام کے بعد قرآن کریم اُس موضوع کی طرف لوٹ گیا جو پہلے چلا آرہا تھا۔ یعنی یہودیوں کی منافقانہ سازشیں۔ فرمایا:

۵/۴۱ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا

فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (۵/۴۱)

ان ضمنی احکام کے بعد اے رسولؐ! پھر اُسی موضوع کی طرف آؤ جس کا ذکر پہلے کیا جارہا تھا یعنی منافقین اور یہود کی تخریبی ذہنیت کی طرف۔ منافقین زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، لیکن وہ دل سے مومن نہیں ہوتے یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ وہ تمہاری مجلسوں میں آتے ہیں۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ جو کچھ یہاں بیان کیا جاتا ہے اسے دل لگا کے کانوں سے سن رہے ہیں، لیکن درحقیقت وہ جھوٹ موٹ کے کان لگائے رہتے ہیں۔ اُن کے خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ اُن کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہاں سے اُٹھ کر اپنے اُن ساتھیوں کے پاس جائیں جو یہاں نہیں آتے، اور جو کچھ یہاں سُنا ہو، اس میں جھوٹ سچ ملا کر، اور بات کو کچھ سے کچھ بنا کر، اُنہیں سنائیں۔ اس کے بعد، یہ اُن لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر رسولؐ وہی باتیں کہے جو ہم نے تم سے بیان کی ہیں تو اسکی بات مانو۔ اور اگر اس کے خلاف کچھ کہے تو اُسے ہرگز قبول نہ کرو۔ ان دونوں گروہوں کی یہ حالت ہے کہ بظاہر دیکھنے والا یہ سمجھے گا کہ اُن کی رغبت ایمان کی طرف ہے، لیکن درحقیقت یہ کفر کی طرف تیزی سے جارہے ہیں۔

ان کی تو یہ حالت ہے اور تم (اے رسولؐ:) اس غم میں گھلے جارہے ہو کہ یہ تباہ اور برباد نہ ہو جائیں (۱۸/۶ ؛ ۲۶/۳ ؛ ۳۵/۸)۔ تم سوچو کہ جو شخص خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق خود اپنی پیدا کردہ مصیبت میں مبتلا رہنا چاہیے تم، اُس قانون کے علی الرغم اس کے لئے کیا کر سکتے ہو؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن کے دل اِس قسم کے خیالات سے، پاک اور صاف نہیں ہو سکتے ——— وہ ان خیالات کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لئے اس دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی کا عذاب ہے اور آخرت میں بھی سخت مصیبت کا سامنا۔

یہاں جو رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کی اس قسم کی حرکات سے تم افسردہ خاطر نہ ہو جانا، تو اس سے حضورؐ کو کسی قسم کی تسلّی دینا مقصود نہیں تھا کہ آپ ہجومِ مخالفت سے تنگ آکر کہیں اپنا مشن نہ چھوڑ بیٹھیں قطعاً یہ مقصود نہیں تھا۔ رسول کسی حالت میں بھی اپنا مشن نہیں چھوڑا کرتے تھے۔

بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضورؐ بڑے رقیق القلب تھے (۳/۱۵۸)۔

آپ دلگیر نہ ہوں

آپ دیکھتے تھے کہ خدائی راہنمائی کی مخالفت کرنے والے، اپنی غلط روش سے تباہی اور بربادی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس احساس سے کہ یہ لوگ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں، ایک مشفق طبیب کی طرح آپ بڑے دلگیر ہوتے تھے۔ [دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ ص۲۳۴ (۳۵/۸ پ)] ایسے مقامات پر آپ سے یہ کہا جاتا تھا کہ آپ کا فریضہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ انہیں زبردستی راہ راست پر چلا دینا نہیں۔ اگر یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تو آپ اس قدر غمزدہ کیوں ہوتے ہیں۔ آیت میں خود یہ الفاظ کہ "اَلَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ" اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان لوگوں کا تباہی کے راستے پر اندھا دھند چلے جانا، حضورؐ کے لئے وجۂ محزونی اور باعثِ افسردگی ہوتا تھا۔

منافقت کفر ہے

اس آیت میں کفر کی ایسی شکل سامنے لائی گئی ہے جو خود ہمارے لئے بڑی غور طلب ہے۔ وہ شکل یہ ہے کہ زبان سے ایمان کا اقرار کرنا لیکن دل اس کی صداقت کو تسلیم نہ کرنا۔ غور کیجئے کہ ہم مسلمانوں کی بعینہٖ یہی حالت نہیں؟ ایمان تو دل اور زبان کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اور اس ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم زبان سے کہیں ہمارے اعمال، ہماری زندگی اس کی شہادت دے۔ یعنی ہمارا عمل ہمارے قول کے مطابق ہو۔ اگر ایسا نہیں تو یہ منافقت ہے جسے قرآن نے کفر کہہ کر پکارا ہے۔ (انڈکس میں عنوان منافقت دیکھئے)۔ قرآن کریم نے تو ان اعراب (بدوؤں) سے کہہ دیا تھا جو تازہ تازہ ایمان لائے تھے تم یہ نہ کہو کہ اٰمَنَّا (ہم ایمان لے آئے ہیں)۔ تم سردست یہی کہو کہ ہم نے اس نظام کی بڑائی تسلیم کر لی ہے۔ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹/۱۴)۔ ایمان ابھی تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ جب وہ تمہارے دل میں جاگزیں ہو جائے گا، تب اپنے آپ کو مومن کہنا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایمان کا ہمارے دل کی گہرائیوں میں اترنا تو کجا، ہم رسماً بھی ایمان نہیں لائے۔ ہم محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مسلمان (با ایمان والے) کہلاتے ہیں۔

اس آیت میں تحریف کی جو شکل سامنے لائی گئی ہے، وہ بھی غور طلب ہے۔ کہا گیا ہے کہ "یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ" یہ الفاظ (۴/۴۶) میں بھی آئے ہیں اور (۵/۱۳) میں بھی۔ یہود وغیرہ اپنی کتابوں میں جس قسم کی تحریف کیا کرتے تھے اس کی ایک شکل تو یہ تھی کہ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۲/۷۹ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب۔ جلد دوم۔ ص۱۸۲)۔

تحریف کی ایک اور شکل

یعنی وہ اپنی آسمانی کتاب کے الفاظ ہی بدل ڈالتے تھے۔ اس کی دوسری شکل یہ تھی کہ کتاب کا مفہوم بدل دیتے تھے۔ الفاظ اپنا صحیح مفہوم اسی صورت میں ادا کرتے ہیں جب انہیں ان کے اصلی مقام (CONTEXT) میں رکھ کر اس کا مطلب سمجھا جائے۔ اگر انہیں اس (CONTEXT) سے الگ کر دیا جائے تو عبارت کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ یہ تحریف کی نہایت خطرناک شکل اور فریب دہی کا بدترین حربہ ہے۔ الفاظ بدل دیئے جائیں تو تحریف ظاہر ہو جاتی ہے لیکن اگر الفاظ اسی طرح رہنے دیئے جائیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جائے تو اس تحریف کو بمشکل پکڑا جا سکتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متن قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود لیا۔ اس لئے اس میں لفظی تحریف تو ممکن نہیں تھی۔ لیکن الفاظ قرآن کو ان کے ضع سے ہٹا کر جو تفسیریں مرتب ہوئیں، ان سے قرآن کا مفہوم ہی بدل گیا۔ ہمارے ہاں کی عام تفسیروں کی یہی کیفیت ہے۔ قرآن کریم نے تصریف آیات سے اپنا مفہوم خود واضح کیا ہے۔ قرآنی الفاظ اور آیات کا جو مفہوم اس طرح متعین کیا جائے گا وہی قرآن کے مطابق ہوگا۔ (میں نے مفہوم القرآن اور اپنی دیگر تصانیف میں قرآنی مفہوم کے سمجھنے اور سمجھانے کا یہی طریق اختیار کیا ہے)

اس کے بعد کہا۔

5/42 سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (5/42)

اُن کا جُرم بھی تو کچھ کم نہیں۔ یہ لوگ تیری باتیں سننے کے لئے آتے ہی اس لئے ہیں کہ ان میں جھوٹ ملا کر باہر بیان کریں اور اس قسم کی غلط بیانیوں سے، دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھاتے رہیں۔ (یہ ان کے مذہبی پیشواؤں کا حال ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ۔ اگرچہ یہ، اپنے ہم مذہبوں کے معاملات کے فیصلے، اپنی شریعت کے مطابق کر سکنے کے مجاز ہیں، لیکن اگر یہ دیکھیں کہ کس معاملے میں ان کی شریعت کا حکم سخت ہے، تو یہ، فریقِ متعلقہ سے کچھ لے لوا کر اس سے کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنا مقدمہ مسلمانوں کی عدالت میں لے جاؤ۔ وہاں سے فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا)۔

لہٰذا، اگر یہ لوگ تیرے پاس اپنے مقدمات لے کر آئیں تو تجھ پر اس کی کوئی پابندی نہیں کہ تو ضرور ان کا مقدمہ سُنے۔ تمہارا جی چاہے تو ان کا مقدمہ سُن لو یا اُن سے کہہ دو کہ جن معاملات میں تمہارے مذہبی پیشوا

فیصلہ دینے کے مجاز ہیں (جیسا کہ اسلامی مملکت میں شخصی معاملات میں، غیر مسلموں کو اختیار دے دیا جاتا ہے) اُن میں اِن سے فیصلہ کراؤ۔ ایسا کہنے میں کوئی ہرج اور نقصان کی بات نہیں۔ لیکن جب اِن کا مقدمہ سُنو تو (جیسا کہ تمہارے ہاں مسلمہ اصول ہے) ان کا فیصلہ عدل و انصاف سے کرو۔ اس لئے کہ عدل و انصاف سے کام لینے والے ہی خدا کے ہاں پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔

یہودیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ" (نیز ۵/۶۳ ؛ ۵/۶۲)۔ سُحت یوں تو ہر ناجائز، حرام کمائی کو کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا ہے۔ یہودی من حیث القوم سود خوار تھے سرمایہ داری ان کا مسلک تھا۔ ان کے مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ عوام کی کمائی باطل طریق سے کھا جاتے تھے۔ (۹/۳۴)۔ باطل کے معنی ہیں تخریبی کام، برعکس حق کے جو تعمیری کاموں کی بنیاد ہوتا ہے۔

سُحت حرام ہے

سُحت کے سلسلے میں، "اَرْضٌ سُحْتَاءُ" اس زمین کو کہتے تھے جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ سرمایہ دار ہوں یا مذہبی پیشوائیت، ان کے کاروبار حیات میں پیدائش (PRODUCTION) کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ محنت کی کمائی جس سے کچھ پیدا ہوتا ہے، دوسرے کرتے ہیں، اور سرمایہ دار، اور مذہبی پیشوائیت، کچھ پیدا کئے بغیر ان لوگوں کی محنت کی کمائی کھا جاتے ہیں۔ یہ ہے سُحت جسے قرآن کریم نے رزق حرام قرار دیا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ان (یہودیوں) کے پاس اپنی (مبینہ) آسمانی کتاب (تورات) موجود ہے۔ انہیں اپنے معاملات کا فیصلہ اس کے مطابق کرنا چاہیئے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ تورات کا فیصلہ ان کے خلاف جاتا ہے یا انہیں قابلِ قبول نہیں، تو یہ اس کے فیصلہ کے لئے رسول اللہؐ کے پاس آ جاتے ہیں۔

خارج از قرآن اتھارٹی کے فیصلے

یہی کچھ ہمارے ہاں ہوتا ہے اسلام میں فیصلوں کا ضابطہ صرف خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ اس کے فیصلے سخت ہوں یا نرم، کسی کے لئے خوش آئند ہوں یا ناپسندیدہ، مسلمان کو انہیں قبول کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے ایک اور راستہ تراش لیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے معاملات کے فیصلے قرآن کی رو سے نہیں، روایات اور فقہ کی رُو سے ہوں گے۔ (دیکھئے مطالب۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۲۵)۔ پھر فقہ میں بھی یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ اگر کسی ایک مقام کی فقہ کا فیصلہ سخت، فلہٰذا، ناقابلِ قبول ہو، تو کسی دوسر

امام کی فقہ کا فیصلہ حاصل کر لینا چاہیئے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہم کس طرح قدم بقدم، سابقہ اہل کتاب کے رستوں پر چل رہے ہیں۔

اگلی آیت میں کہا کہ:

۵/۴۳ وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۵/۴۳)

ذرا سوچو کہ جب ان کے پاس تورات موجود ہے، جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اس میں احکام خداوندی درج ہیں۔ تو اسے چھوڑ کر، اپنے مقدمات تیرے پاس کیوں لے کر آتے ہیں؟ بات صاف ہے کہ ان لوگوں کا ایمان کسی چیز پر بھی نہیں۔ ان کا ایمان مصلحت بینی اور مفاد پرستی پر ہے۔ جب دیکھا کہ تورات کا حکم ان کے منشاء کے مطابق ہے، اس پر عمل کرتے رہے۔ جس معاملے میں اسے اپنے خلاف پایا، اسے مُنہ موڑ کر تمہاری طرف رُخ کر لیا۔

تورات کی تاریخ، مطالب۔ جلد دوم (صفحہ ۸۴ پر) بیان کی جاچکی ہے۔ اس سے (اور قرآن کریم کی شہادات کی رو سے) یہ واضح ہے کہ یہودیوں کے پاس وہ کتابیں جو ان کے انبیاء کرام کے تحت نازل ہوئی تھیں، اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں تھیں۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ "فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ" تو یہ یہودیوں کے خلاف ایک قسم کی تعریض ہے یعنی ان سے جب کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم پر ایمان لاؤ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ جب خود ہمارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے تو ہمیں کسی دوسری کتاب پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر تمہارے پاس فی الواقعہ احکام خداوندی موجود ہیں تو تم اپنے معاملات کے فیصلوں کے لئے اس رسول کے پاس کیوں آتے ہو جس کی رسالت کو تم تسلیم نہیں کرتے؟ یہ دین نہیں مصلحت بینی ہے۔ منافقت ہے۔

اصلی تورات میں واقعی احکام خداوندی تھے۔ اس میں نور بھی تھا اور ہدایت بھی۔ انبیاء بنی اسرائیل اور ان کے متبع، یہودیوں کے علماء اور مشائخ اسی کے مطابق معاملات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔

۵/۴۴ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا

اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○

دین (یعنی قانونِ خداوندی) کی سرگزشت یہ ہے کہ ہم نے تورات نازل کی (جو اُن مختلف صُحف کا مجموعہ ہے جو انبیاءِ بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے (۹۰-۸۴/۶)) - اس میں (ہر آسمانی کتاب کی طرح) صحیح راستے کی طرف راہنمائی اور روشنی تھی - اُن کے انبیاء جو سب کے سب مسلم تھے (یعنی قانونِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے) ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ، جو اپنے آپ کو یہودی کہتے تھے (حالانکہ انہیں بھی اپنے آپ کو مسلم ہی کہنا چاہیئے تھا) اِسی "نور و ہدایت" کے مطابق کرتے تھے - اور اُن کے علماء و مشائخ انہی صحف کے مطابق احکام دیتے تھے جو اُن کے انبیاء کی طرف نازل کئے گئے تھے اور جن کا اُنہیں (علماء و مشائخ کو) محافظ ٹھہرایا گیا تھا - اور وہ ان کے نگران بننے کے مدعی بھی تھے - ان سے خاص طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ تمام امور کے فیصلے انہی ضوابط کے مطابق کیا کرو اور لوگوں سے مت ڈرو، ڈرو صرف قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے اور قانون فروشی کی دُکان مت لگا بیٹھو - یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، وہ کافر ہے خواہ وہ زبان سے اِس قانون پر ایمان رکھنے کا مُدعی بھی کیوں نہ ہو - کافر و مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے، اور حکومت بھی وہی اسلامی کہلا سکتی ہے جو اپنا تمام کاروبار کتابِ خداوندی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے - (۵/۴۴)

اس میں دو نہایت نکات غور طلب ہیں - یہودیوں نے جس قدر حضورؐ کی مخالفت کی اور جس قدر تکالیف پہنچائیں، قرآنی تصریحات اس پر شاہد ہیں - مدینہ میں مسلسل منافقانہ جد و جہد کے بعد، خیبر وغیرہ کی لڑائیوں تک نوبت پہنچ گئی - لیکن جب ان کی کتاب کا ذکر آیا تو قرآن نے انتہائی وسعتِ قلب اور کشادگیٔ نگاہ سے، اس کا ذکر بھی انہی تحسین آفریں الفاظ میں کیا جن الفاظ سے خود قرآن کا تعارف کرایا تھا ——— فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ -

لیکن من حیث الکل یہ خصوصیات حقیقی اور اصلی تورات کی تھیں - جو تورات، نزولِ قرآن کے وقت ان کے پاس تھی اسے قرآن کریم نے محرف قرار دیا ہے - (دیکھئے مطالب - جلد دوم - صفحہ ۱۸۳-۸۴) اس محرف تورات میں بھی بہرحال کچھ ایسے احکام موجود تھے جو غیر محرف تھے -

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ (جیسا کہ مطالب - جلد دوم - صفحہ ۲۶۵ میں) بیان کیا جا چکا ہے، مرزا غلام احمد کے

متبعین اپنے بانی مذہب کے باطل دعویٰ نبوت کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے ہیں کہ نبی بلا کتاب آتا ہے اور (بزعم خویش) اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل، تورات کی رو سے احکام نافذ کیا کرتے تھے (۵/۴۴)۔ اس کے معنی (بقول ان کے) یہ ہیں کہ ان انبیاء کو الگ الگ کتابیں نہیں دی گئی تھیں۔ وہ اسی کتاب کی شریعت نافذ کرتے تھے جو حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔

"احمدیوں" کی مغالطہ آفرینی

یہ ان کی بنیادی غلط فہمی یا مغالطہ آفرینی ہے۔ جیسا کہ تورات کی تاریخ میں بتایا جا چکا ہے (دیکھئے مطالب۔ جلد دوم ص ۱۸۴)۔ تورات اس کتاب کا نام نہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام کتابوں کا جو حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تک کے انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں۔ آپ مروجہ بائبل کو دیکھئے۔ اس میں عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) میں ان تمام انبیاءؑ کی کتابیں شامل ہیں۔ اسی بائبل (عہد نامہ عتیق) کو تورات کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی اس آیت (۵/۴۴) کا مطلب یہ ہے کہ انبیاءؑ بنی اسرائیل اپنی اپنی کتابوں کے مطابق شریعت نافذ کرتے تھے۔ ان کتابوں کے مجموعہ کو بائبل (عہد نامہ عتیق) یا تورات کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ کہیں نہیں آیا کہ تورات حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ تورات میں صحف موسیٰؑ (۵۳/۳۶) بھی شامل ہیں اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے صحف بھی۔

اس کے بعد وہ اعلانِ عظیم آتا ہے جو دین کی اصل اور بنیاد ہے۔ آج ہمارے ہاں (پاکستان میں) اسلامی مملکت۔ اسلامی مملکت۔ اسلامی نظام۔ اسلامی قوانین وغیرہ اصطلاحات کا بڑا چرچا ہے۔ چرچا تو ان کا اس قدر ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اسلامی کہتے کسے ہیں اور اسلامی اور غیر اسلامی میں خط امتیاز کیا ہے۔ یعنی جب کسی بات کے متعلق کہا جائے کہ وہ اسلامی ہے تو یہ کیسے معلوم اور متعین کیا جائے کہ وہ فی الواقعہ اسلامی ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اور کفر میں حد تفریق کیا ہے؟

یہاں تو کوئی نہیں بتاتا۔ لیکن قرآن کریم نے ایک آیت کے چند لفظوں میں ساری بات واضح کر دی جب کہا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

۵/۴۴ جو لوگ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

کفر اور اسلام میں حد فاصل

یعنی کفر اور اسلام میں حد فاصل خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ یہی واحد معیار ہے جس کی رو سے متعین کیا جا سکتا ہے کہ فلاں مملکت۔ حکومت۔ نظام۔ قانون۔ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اگر وہ قرآن کے مطابق ہو تو اسلامی ہے۔ اگر قرآن سے ٹکراتا ہے تو غیر اسلامی

(کافرانہ) ہے۔ یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ نے معیار صرف کتاب اللہ کو قرار دیا ہے۔ خارج از قرآن کسی چیز کو نہیں۔ اس کی وضاحت مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۹ پر) کی جا چکی ہے۔ ایک نظر دیکھ لیجئے۔

اس سے آپ کی سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ "اسلامی۔ اسلامی" کے اس قدر چرچا کرنے کے باوجود، یہ کیوں نہیں بتایا جاتا کہ اسلامی کسے کہتے ہیں؟ اس لئے کہ صدر اوّل کے بعد سے آجتک، قرآن کریم کو کبھی اور کہیں بھی حکم نہیں تسلیم کیا گیا۔ اسلامی اور غیر اسلامی کے معیار غیر از قرآن عناصر (روایات اور فقہ) کو قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر، ہماری تاریخ میں (صدر اوّل کے بعد) نہ کہیں اسلامی مملکت قائم ہوئی ہے نہ اسلامی احکام نافذ۔ اسلامی مملکت وہی قرار پائے گی جس میں تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کی رو سے ہونگے۔ خالص کتاب اللہ کی رو سے۔

آیت (۵/۴۴) میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اگلی آیت (۵/۴۵) میں کہا گیا ہے کہ وہ ظالم ہیں اور آیت (۵/۴۷) میں یہ کہ وہ لوگ فاسق ہیں۔ لہٰذا، جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں اور کافر ہیں۔

خود فریبی میں مبتلا یا مغالطہ آفرینی کے مرتکب حضرات، عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ یہ آیات سابقہ اہل کتاب سے متعلق ہیں۔ ہم سے نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ دین، اصولی طور پر شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا ہے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۲) اور دین کا اصل الاصول، خدا کی حاکمیت ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، اس کی کتاب کی حکمرانی ہے۔ آپ سارے قرآن میں دیکھئے (بالخصوص سورۃ ھود) ہر رسول کی دعوت کا آغاز اس اعلانِ عظیم سے ہوتا تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۔ (۱۱/۵۰) محکومیت صرف خدا کی جائز ہے۔ اور کسی کی نہیں۔ لہٰذا، یہ اصول کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں، اس کا اطلاق ہر رسول، اس کی کتاب اور اس کی امت پر یکساں ہوتا ہے۔ اور ہم پر بالخصوص اس لئے کہ قرآن کو تمام کتب سابقہ کی حقیقی تعلیم کا مہیمن کہا گیا ہے (۵/۴۸) اور رسول اللہ سے فرمایا گیا ہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸-۴۹)۔ "تم ان کے معاملات کے فیصلے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (کتاب اللہ) کے مطابق کرو۔" لہٰذا یہ اصول ضمناً اور یقیناً ہم پر بھی عائد ہوتا ہے کہ (بلکہ اب تو عائد ہی ہم پر ہوتا ہے کہ دیگر اہل مذاہب کے پاس "مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" اس کی حقیقی شکل میں موجود ہی نہیں) ـــــ جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات۔ انجیل وغیرہ نہیں کہا۔ "مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" کہا ہے۔ ان کا "مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" ان کی کتابیں نہیں۔ ہمارا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قرآن مجید ہے۔

اس کے بعد تورات کے قانون قصاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

۵/۴۵ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ۝

اُنہی صُحف میں ہم نے اُنہیں حکم دے رکھا تھا جس شخص نے کسی کو (ناحق) قتل کر دیا، اس کی سزا موت ہوگی جان کا بدلہ جان۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ ناک کا بدلہ ناک۔ کان کا بدلہ کان۔ دانت کا بدلہ دانت ——— یعنی صرف جرم قتل ہی مستوجب سزا نہیں۔ کسی کو زخمی کر دینا بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا دی جائے گی۔ اور سزا جرم کے مطابق ہوگی۔ لیکن اگر مستغیث، مجرم کو خود معاف کر دے، تو یہ چیز مجرم کی سزا کا کفارہ ہو جائے گی۔

یہ تھا وہ قانونِ قصاص جو ان کی کتابوں میں ان کے لئے دیا گیا تھا۔ انہیں اسی کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں تھے، اس لئے کہ جو شخص اس ضابطۂ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرتے جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ ہیں جو حق و انصاف سے کام نہیں لیتے، ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ "آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان" تو یہ حکم یہودیوں کے لئے تھا (كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ سے یہ واضح ہے)۔ امت مسلمہ کے لئے نہیں، کیونکہ قرآن کریم نے جو قصاص کا حکم دیا ہے وہ اتلافِ جان تک محدود ہے (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص۱۴۶)۔ زخموں کے قصاص کا معاملہ اسلامی حکومت پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق قوانین خود وضع کرے۔ اس سلسلہ میں عنوان "ناسخ و منسوخ" دیکھئے۔ (بالخصوص مطالب الفرقان جلد اوّل۔ ص۱۲۵)۔

یہاں تک بات یہودیوں سے متعلق تھی۔ اس کے بعد وہ عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا، اور کم و بیش وہی کچھ ان سے کہا جو یہودیوں سے کہا گیا تھا۔ فرمایا:

۵/۴۷-۴۶ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم بِعِيسَى ٱبْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ ٱلْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۵/۴۶-۴۷)

پھر انہی انبیاء سابقہ کے نقشِ قدم پر، ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔ اُس کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ انبیاء بنی اسرائیل کے صحف میں سے یہودیوں کے پاس رہ گیا تھا۔ اسے سچا ثابت کر دکھائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ہم نے اسے انجیل دی جس میں، صحف سابقہ کی طرح، نور اور ہدایت تھی، اور جو ان صحف کی حقیقی تعلیم کو سچ کر دکھانے والی تھی۔ اس میں، اُن لوگوں کے لئے جو زندگی کے خطرات سے بچنا چاہتے تھے، سامانِ ہدایت و موعظت تھا۔

(۵/۴۶)

ہم نے اہل انجیل سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے معاملات کا فیصلہ اُس کے مطابق کریں جسے خدا نے نازل کیا ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو اُن کا شمار فاسقین میں ہوتا ہے یعنی صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لینے والے۔ (۵/۴۷)

انجیل کی تاریخ اس کتاب کے دوسرے باب میں گزر چکی ہے۔ مصدق کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۸۷ دیکھئے۔

ان انبیاء گزشتہ اور کتب سابقہ کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

۵/۴۸ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۵/۴۸)

اب ان تمام کتب سابقہ کے بعد (جب وہ اپنی اصلی حالت پر نہ رہیں اور مشیّت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آگیا کہ تمام نوعِ انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے جو ہمیشہ تک ان کی راہنمائی کرے) ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ ان تمام وعدوں اور دعوؤں کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو کتب سابقہ میں کئے گئے تھے۔ اور اس اصولی تعلیم کی جامع

اور نگران و نگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی، اور جس کا ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رکھنا مقصود ہے۔

یہ ہے اس کتاب عظیم کی پوزیشن۔ لہٰذا، اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کرو۔ اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد، لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے مت چلو۔

اس مقام پر ممکن ہے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر خدا نے تمام انسانوں کے لئے شروع سے اخیر تک اصولاً ایک ہی ضابطہ حیات تجویز کیا تھا، تو ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا کہ تمام لوگ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہتے۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ انسانوں کو، حیوانوں اور پتھروں کی طرح، مجبور پیدا کر دیتا اور وہ، اس کی طرف سے مقرر کردہ روش پر طوعاً و کرہاً چلتے رہتے۔ لیکن اس کے قانونِ مشیّت کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم، تم میں سے ہر ایک کو، اس کے اپنے اختیار کردہ منہاج اور طریقے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سب کو ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ انسان کا اختیار و ارادہ ہی ایسی صورتیں پیدا کرتا ہے کہ وہ نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں، اور اس طرح خود ان کی ذات میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

لیکن انسان کے اختیار و ارادہ کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ غلط راستے پر چلتا رہے گا۔ غلط راستوں پر چلنے کے تباہ کن نتائج (جنہیں زمانے کے تقاضے کہہ کر پکارا جاتا ہے) اور وحیٔ خداوندی سے متاثر فضا اسے رفتہ رفتہ، بتدریج صحیح راستے کی طرف لئے چلے جائیں گے، اور یوں لوگوں کی خود ساختہ، مختلف روشیں، زندگی کی صحیح شاہراہ میں آ کر ملتی جائیں گی۔

{ یہ طریقِ کار (جسے عقل کا تجرباتی طریق کہتے ہیں) بہت طول طویل ہوتا ہے اور اس طرح انسان کو صحیح راستے تک پہنچنے کے لئے بڑی بڑی جانکاہ مصیبتوں اور جگر پاش شقتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان چاہتا ہے کہ ان تباہیوں اور بربادیوں میں سے گزرے بغیر، بخیر و خوبی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو اس کا طریق یہ ہے کہ وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے اور اپنے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کرے }۔

قرآن مہیمن ہے

اس آیت میں قرآن مجید کی ایک صفت **مہیمن** بتائی گئی ہے۔ اس کے معنی ہیں اس قسم کی حفاظت اور نگرانی جس طرح پرندے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ان کے اوپر

اپنے پر پھیلا دیتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ دین کی جس قدر صداقتیں سابقہ انبیاءؑ کرام کی وساطت سے دی جاتی رہی تھیں لیکن وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں، وہ قرآن میں پہنچ کر بالکل محفوظ ہو گئی ہیں۔ قرآن ان کا مہیمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ایک صفت بھی المھیمن بتائی ہے (۵۹/۲۳) یعنی جملہ کائنات کا محافظ اور نگران۔ واضح رہے کہ قرآن کریم میں الدین کے ابدی قوانین واصول ہی جمع اور محفوظ کئے گئے ہیں۔ اُمم سابقہ کو دیئے گئے جزئی احکام نہیں کیونکہ ان کا ابدی طور پر غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہیں تھا۔

آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً"۔ یعنی اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہوتا تو وہ انسانوں کو، حیوانوں اور پتھروں کی طرح مجبور پیدا کر دیتا۔ پھر وہ باہمی اختلاف کر ہی نہ سکتے۔ لیکن اس نے اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ اس موضوع کی تشریح کے لئے انڈکس میں عنوان تقدیر دیکھئے۔ بالخصوص مطالب القرقان۔ جلد اوّل صفحہ ۱۸۱ جس میں اسی موضوع کی آیات کی تشریح کی گئی ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ جو واقعات قوانین خداوندی کی رو سے انسانوں کے ہاتھوں سرزد ہوتے ہیں انہیں بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے (دیکھئے جلد اوّل۔ صفحہ ۱۸۴)۔ اس سے آیت زیر نظر کے اس حصہ کی وضاحت ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" یعنی یہ مختلف راستے لوگوں نے خدا کے اس قانون کی رو سے اختیار کر رکھے ہیں جس کے مطابق اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے اور دین میں کسی قسم کے جبر کو روا نہیں رکھا۔

جیسا کہ ابھی سامنے آئے گا اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقہ کو الدین کے اصول دیئے تھے اور وہ احکام بھی جو ان انبیاء کے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق تھے۔ دین کے اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنے کے لئے تھے لیکن یہ جزئی احکام وقتی اور ہنگامی تھے (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ)۔ لیکن یہ وقتی احکام خدا نے دیئے ہوں یا لوگوں نے خود وضع کئے ہوں، بہرحال وقتی تھے۔ غیر متبدل صرف الدین کے اصول تھے۔ قرآن میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ ابدی اور غیر متبدل ہے۔

شریعت کے معنی

اس آیت میں لفظ شریعت (شِرْعَةً) پہلی مرتبہ آیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں اس لفظ کو خاصی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا مفہوم تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ لغات القرآن میں اس کی پوری تفصیل مذکور ہے۔ مناسب ہوگا اس کو یہاں دُہرا دیا جائے تاکہ بات

بالکل واضح ہو جائے۔

اَلشَّرِیْعَۃُ۔ وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لئے آتے ہیں لیکن اس کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو جو بند نہ ہوتا ہو، کھلا ہوا اور سطح زمین پر جاری ہو۔ یعنی (اسے حاصل کرنے کے لئے کسی رسی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو، تو وہ شریعۃ نہیں بلکہ کَرَعٌ کہلائے گا۔ اسی سے اَلشَّارِعُ۔ عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں۔ اَلشَّرْعُ۔ سیدھے راستہ کو جو واضح اور کھلا ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ شَرَعَ کے معنی ظَھَرَ ہیں۔ یعنی ظاہر ہوگیا۔ کھل گیا۔ شُرِعَتِ الرِّمَاحُ کے معنی ہیں نیزے سیدھے کئے گئے۔ اَشْرَعَ الشَّیْئَ۔ اس نے اس چیز کو بہت بلند کر دیا۔ اَلشِّرَاعُ۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں۔ اَلشَّرِیْعَۃُ۔ دروازے کی چوکھٹ کو بھی کہتے ہیں۔ اَلشَّرِیْعَۃُ وَالشِّرْعَۃُ۔ سیدھا اور واضح راستہ[1]۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا۔ یعنی اس طرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آ جائے۔

سورۃ شوریٰ میں ہے شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ۔ (۴۲/۱۳)۔ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی (اَلدِّیْنُ) یا قانون حیات کو نمایاں اور واضح کیا ہے۔ سورۃ جاثیۃ میں ہے ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ (۴۵/۱۸)۔ پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ۔ یا شَرِیْعَۃٍ مِنَ الْاَمْرِ) مفہوم خود الدین ہے یعنی خدا کا متعین کردہ راستہ۔ سورۂ مائدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو ان حقائق کو سچ کرکے دکھانے والی ہے جو اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آچکے ہیں۔ اور یہ ان سب کی تعلیم کی محافظ ہے۔ سو تو ان کے متنازع فیہ معاملات میں مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق فیصلہ کر۔ اور جب تمہارے پاس حق آچکا ہے تو پھر ان کے جذبات و خواہشات کا اتباع مت کرو"۔ اس کے بعد ہے لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا (۵/۴۸) "اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شرعۃ (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا تھا"۔ یہاں شِرْعَۃً کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرمؐ تک ہر نبی کو یکساں طور پر دیئے گئے تھے (۴۲/۱۳)۔ یہاں سے مراد، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے سابقہ کو وقتی ضروریات کے لئے دیئے جاتے رہے اور جن میں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی۔ قرآن کریم کا

---

[1] تاج و محیط۔

کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول، اور دوسری چیز ہے جزئی احکام۔ دین کے اصول ہمیشہ ایک رہتے ہیں لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس لئے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم، سابقہ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں۔ اس مفہوم کی تائید سورۂ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲/۶۷) "ہم نے ہر قوم کے لئے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں (اس طریق میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل دین میں نہیں) اس لئے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں۔"

اس آیت (لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا) کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے۔ جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے، ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارا کام الدین دے دینا ہے۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں۔ اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (۵/۴۸)۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بنا دیتا۔ لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا، اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ شریعت سے مراد، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر اُمّت کے لئے چلنا ضروری ہے۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دیئے ہیں۔ یہ اصول (اور وہ چند احکام جو قرآن کریم میں دئے گئے ہیں) ہمیشہ کیلئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمّت اپنے لئے جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشورہ سے خود مرتب کرے گی۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہیں گے اور یہ جزئی احکام تبدیل ہوتے رہیں گے۔ ان احکام کو اگر شریعت کہا جائے گا تو یہ شریعت بدلتی رہے گی اور اصولِ شریعت غیر متبدل رہیں گے۔

اَلشَّرِيعَةُ کے ان معانی کو سامنے لائیے جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ ان معانی کے لحاظ سے اَلشَّرِيعَةُ (یعنی الدین کے غیر متبدل اصولوں کی

روشنی میں، اسلامی معاشرہ کی مرتب کردہ جزئیات) کو واضح، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہیئے۔ نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو۔ ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں۔ جس تک ہر ایک کی رسائی ہو۔ جو مسلسل آرہا ہو۔ بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو۔ لہٰذا شریعت وہ ہو گی جس میں جمود، تعطل نہ ہو۔ جس میں تسلسل ہو۔ جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہو گی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہو جائے گی۔ وہ زندگی بخش نہیں رہے گی۔

شریعت کا قرآنی مفہوم آپ کے سامنے آگیا۔ اس کی روشنی میں سوچئے کہ ہمارے ہاں جو فقہ کے قوانین کو شریعت کہا جاتا ہے، وہ اس مفہوم کے کس قدر خلاف ہے۔ فقہ کے قوانین صدیوں پہلے، بعض انسانوں (فقہاء) نے مرتب کئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانے کے حالات کے مطابق ہوں جس میں انہیں مدون کیا گیا تھا۔ لیکن وہ ابدی طور پر دین تو نہیں قرار پا سکتے۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتا رہنا چاہیئے۔ اگر وہ جامد اور غیر متغیر ہوں تو انہیں "شریعت" کہا ہی نہیں جا سکتا۔ شریعت تو آبِ رواں کو کہا جاتا ہے۔ ساکن اور جامد پانی کو نہیں۔ اس اعتبار سے قوانینِ شریعت، خواہ وہ اقوام سابقہ کے ہوں یا خود ہمارے، ناقابلِ تغیّر نہیں ہو سکتے۔ اقوام سابقہ کی شریعتوں کو قرآن کریم نے آکر بدل دیا۔ ہمارے قوانینِ شریعت کو وقتاً فوقتاً اسلامی مملکت نے بدلنا تھا۔ ان قوانین کو جو جامد اور غیر متغیر قرار دیدیا گیا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ہاں اسلامی مملکت (یا قرآنی نظام) باقی نہ رہا۔ اس سے الدین کی جوئے رواں جوہڑ بن کر رہ گئی۔ اس کی حرکت متبدل بہ سکون ہو گئی۔ زمانہ بدلتا گیا اور امّت ایک مقام پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی — جامد، غیر متحرک، تقلید کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔

ان تمام مضرات کا علاج قرآنی نظام (یا مملکت) کا قیام ہے۔ لیکن قوانینِ فقہ و روایات کو غیر متبدل قرار دینے والے اس کے راستے میں سب سے بڑی روکاوٹ ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ اور وہ یہی کچھ کرتی رہے گی۔ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ - (۹/۳۴)۔ خدا کے تجویز کردہ راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ۔

منہاج کا مفہوم

دوسرا لفظ منہاج ہے۔ معنی تو اس کے بھی واضح راستے کے ہیں لیکن اس میں طریقہ کا مفہوم زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم احکام شریعت پر عمل پیرا ہونے کا طریق ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں اسی مقام پر آیا ہے۔ بہرحال، الدین کے جزئی قوانین ہوں (جنہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا) یا ان پر عمل کرنے کے طریق، یہ سب قابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ یہ سب

قوانین شریعت کس طرح مدون ہوں گے

قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی طرف سے

وضع اور مدون کئے جائیں گے۔ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ قرآن کی سند نہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلامی نہیں کہلا سکتے، یہ شرک قرار دیا جائے گا۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ط

($\frac{۴۲}{۲۱}$)

کیا انہوں نے خدا کے ایسے شریک بنا رکھے ہیں جو ان کے لئے شریعت کے ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جن کی کوئی سند کتاب اللہ سے نہیں مل سکتی۔

ایسے قوانین وضع کرنا جن کی تائید کتاب اللہ سے نہ ہوتی ہو، شرک ہے ایسے قوانین وضع کرنے والے خدا کے ہمسر۔ اور ان پر عمل کرنے والے مشرک۔ اس سے فرقے پیدا ہوتے ہیں جنہیں قرآن نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ ($\frac{۳۰}{۳۱-۳۰}$)۔ فرقہ بندی میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ج وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○

($\frac{۳۹}{۴۵}$) "جب ان لوگوں کے سامنے، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، خدائے واحد کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل سکڑ جاتے ہیں۔ لیکن جب خدا کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں" (نیز دیکھئے $\frac{۴۲}{۱۲}$ ؛ $\frac{۶}{۴۶}$ ؛ $\frac{۱۲}{۱۰۶}$)۔

جب یہ قوانین اسلامی حکومت کی طرف سے مرتب اور نافذ ہوں گے تو ان کا اطلاق تمام اُمّت پر یکساں ہوگا۔ اس لئے اُمّت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوگا۔ جب یہ افراد (فقہا) کی طرف سے مدون ہوں گے تو ان کا اطلاق صرف ان کی فقہ کے متبعین پر ہو سکے گا۔ اس طرح اُمّت میں مختلف فرقے پیدا ہونگے اور مستحکم رہیں گے۔

آیت ($\frac{۵}{۴۸}$) میں ہے "اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا"۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے انڈکس میں "راجعون" کا عنوان دیکھئے۔

اس کے بعد پھر اس اصولی تعلیم کی تاکید کر دی کہ تمام امور کے فیصلے، کتاب اللہ کے مطابق ہونے چاہئیں۔

$\frac{۵}{۴۹}$ وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ط وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ○

لہٰذا، اے رسولؐ! تم ان لوگوں کے فیصلے، اس کتاب کے مطابق کرو جسے خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اور اس میں لوگوں کے ذاتی مفاد اور خواہشات کی قطعاً رعایت نہ کرو۔ اس کا خاص طور پر خیال رکھنا تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کے مفاد اور میلانات ایسی صورت پیدا کر دیں کہ تمہارا نظام، اس ضابطۂ حیات سے جسے خدا نے نازل کیا ہے اِدھر اُدھر ہو جائے ـــــــ خواہ ذرا سا بھی کیوں نہ ہو۔ ایسا بالکل نہ ہونے دینا۔

اگر یہ لوگ، جن کے سامنے اپنی مفاد پرستیوں کے سوا کچھ نہیں، اس نظام سے روگردانی کریں تو سمجھ لو کہ ان کے جرائم ان پر تباہیاں لانے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ چاہتے ہی یہ ہیں کہ صحیح راستے سے منہ موڑ کر غلط راہوں پر چل نکلیں۔

تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق

آیت (۵/۴۴) میں کہا گیا تھا کہ کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز، کتاب اللہ ہے۔ یہاں اس حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے کہ اسلام اور عہد جاہلیت میں یہی حد فاصل اور نقطۂ امتیاز ہے۔ فرمایا:

۵/۵۰ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○

(اور) اس طرح پھر اُس نظامِ جاہلیت کو اختیار کرلیں جس پر وہ، قرآن سے پہلے، قائم تھے۔ لیکن جو لوگ اس نظام خداوندی کی صداقت اور محکمیت پر یقین رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ نوعِ انسان کے لئے، ضابطۂ خداوندی سے بہتر اور کوئی ضابطہ نہیں ہوسکتا۔

اہل کتاب کے سابقہ الدین کے اصولی اختلافات کی وضاحت کے بعد، پھر جماعت مومنین سے تاکیداً کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات نہ رکھیں۔ یک دلی اور ہمرازی صرف اُن کے ساتھ ہوسکتی ہے جو آئیڈیالوجی (دین) میں مشترک ہوں۔ یہی، قرآن کی رو سے، تشکیل قومیت کی بنیاد ہے۔ اس لئے فرمایا:

۵/۵۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؔۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

اے جماعت مومنین! تمہارے سامنے یہود اور نصاریٰ کی حقیقت کھل آگئی، اور یہ بھی کہ تم کس نظام کے قیام

کے لئے کھڑے کئے گئے ہو تم دیکھتے ہو کہ اُن کے مطمع نگاہ اور تمہارے مقصدِ زندگی میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔

لہٰذا تم کبھی انہیں اپنا دوست اور چارہ ساز نہ بنانا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ باہمی، ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز بن جائیں، لیکن تمہارے دلی دوست کبھی نہیں ہو سکتے (۳/۲۷، ۳/۱۱۷)۔

کفار (غیر مسلموں) کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل۔ صفحہ ۱۷۵ دیکھئے۔ نیز اسی جلد کے سابقہ ابواب میں سورۃ آل عمران اور سورۃ النساء کی متعلقہ آیات جن کا حوالہ فہرست میں ملے گا۔

اس کے بعد کہا۔

۵/۵۲ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝

اس وضاحت کے بعد بھی، تم میں سے جو شخص انہیں اپنا رفیق اور دوست بنائے گا تو اُس کا شمار انہی میں ہو گا۔ اس لئے کہ جو لوگ یوں دیدہ دانستہ، غلط راستے اختیار کر لیں، وہ صحیح راستے پر کیسے ہو سکتے ہیں؟

جن لوگوں کے دل میں منافقت کا مرض ہے، تُو دیکھے گا کہ وہ ان (یہود و نصاریٰ) کی دوستی کی طرف کیسے دوڑ کر جاتے ہیں، اور اس کے لئے وجۂ جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ان کی دوستداری چھوڑ دی تو ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔ تم ان کی باتیں سنتے رہو۔ وہ وقت دور نہیں کہ تمہیں ایک فیصلہ کن کامیابی حاصل ہو جائے اور اس طرح تم پر کشائش کی راہیں کھل جائیں۔ یا خدا کی طرف سے کوئی اور بات واقع ہو جائے۔ اُس وقت وہ تمام باتیں جنہیں یہ اس وقت اپنے دل میں چھپاتے ہیں، اُبھر کر سامنے آجائیں گی اور انہیں اپنی حرکات پر سخت شرمندہ ہونا پڑے گا۔

اس کے تسلسل میں کہا۔

۵/۵۳ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ۝

اُس وقت جماعت مومنین کے افراد کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو خدا کی سخت قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

ان (منافقین) کی تمام کوششیں غارت ہو جائیں گی اور یہ انجام کار سخت نقصان میں رہیں گے۔ منافقت کا

ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے۔

اس کے بعد جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ:

5/54 يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے نظامِ خداوندی سے پھر جائے، (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اللہ کا کیا بگاڑے گا) اللہ اُن کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کے افراد دنیا کی ہر شئے کے مقابلہ میں نظامِ خداوندی کو زیادہ عزیز رکھیں گے یعنی اُس کی اطاعت کریں گے، اور اُن کی اِس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا بھی اُنہیں عزیز رکھے گا، یعنی ان کی حفاظت کرے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اِس نظام کے ماننے والوں کے سامنے ریشم کی طرح نرم اور شاخِ ثمردار کی طرح خمیدہ ہوں گے، لیکن اِس نظام کے مخالفین کے مقابلے میں فولاد کی طرح سخت (۴۸/۲۹)۔ وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے۔ اور کسی کے طعن و تشنیع سے نہیں ڈریں گے۔ یہ نوازشاتِ خداوندی کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو قوم بھی انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنا چاہئے، اُسے حاصل ہو سکتی ہیں۔ خدا کے ہاں نہ تو گروہ بندانہ تنگ نظری ہے، اور نہ ہی انعامات کی اندھا دھند تقسیم۔

ارتداد اور مرتد کے معنی

انڈکس میں ارتداد اور مرتد کے عنوانات دیکھئے۔ نیز "استبدال اور استخلافِ قومی"۔ مطالب الفرقان جلد سوم (صـ۲۸۵) پر خود یہ آیت (۵/۵۴) آچکی ہے۔ اور اسی سلسلہ کی متعدد دیگر آیات۔ مرتد کی سزا کے متعلق جلد سوم۔ (صـ۲۷) دیکھئے۔ اس مقام پر البتہ ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ "مرتد کی سزا قتل"، کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ عہد صدیقیؓ میں "مرتدین" کے خلاف جہاد

مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد

کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار نہیں کر لیا تھا۔ یہ وہ قبائل تھے جنہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اور مدینہ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں ان کے خلاف جہاد کیا گیا تھا۔ ان کا جرم بغاوت تھا، نہ کہ تبدیلیٔ مذہب۔ وہ مسلمان تھے اور مسلمان رہنا چاہتے تھے۔ ان کی اس بغاوت کی تفصیل تاریخ کی تمام کتابوں میں ملتی ہے

بالخصوص دیکھئے مصری مؤرخ، محمد حسین ہیکل (دوم) کی عہد صدیقی کی تاریخ (ابوبکرؓ) - (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام - بابت نومبر ۱۹۸۰ء) -

زیر نظر آیت میں جماعت مومنین کی جو صفات اور خصوصیات گنائی گئی ہیں، انہیں پیش نظر رکھیئے اور پھر اپنی حالت پر غور کیجئے اور سوچیئے کہ ہمارا مقام کیا ہے؟ اس سلسلہ میں انڈکس میں مومن اور مومنین کے عنوانات دیکھئے۔ لیکن اس آئینے میں جو اپنی شکل نظر آئے اس سے (اُس حبشی کی طرح) آئینے کو نہ توڑ ڈالئے۔ آئینہ ہمیشہ سچ بتاتا ہے۔ سچ سننے اور سچ دیکھنے کی جرأت پیدا کیجئے۔

اس کے مثبت پہلو کو سامنے لاتے ہوئے فرمایا:

۵/۵۵ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝

اُمّتِ مسلمہ کے دوست

یاد رکھو! تمہارا رفیق اور چارہ ساز صرف یہ نظامِ خداوندی ہے۔ جو رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔ نیز تمہاری اپنی جماعت کے لوگ جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے عظیم فریضہ کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

صلوٰۃ۔ زکوٰۃ اور رکوع کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔

یہی جماعت "حزب اللہ" کہلاتی ہے۔

۵/۵۶ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ۝

سو جو لوگ بھی خدا کے نظام کو، جو اس کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے، نیز اپنے ان رفقاء کو جو اس نظام کی صداقت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں، اپنا دوست اور چارہ ساز سمجھیں، تو اُن کا شمار "خدا کی پارٹی" میں ہو جائیگا اور "خدا کی پارٹی" ہی آخرالامر غالب آئے گی۔

"حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کے لئے انڈکس دیکھئے۔

پہلے کہا تھا کہ کفار اہل کتاب کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اب ان کی خباثت جس کو نمایاں کرکے دکھایا گیا ہے۔ فرمایا:

۵/۵۸-۵۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى
الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝

اے ایمان والو! اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) ہوں یا کفار۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق سمجھ رکھا ہے، اور اس کی تحقیر و تذلیل کے لئے اس کی ہنسی اُڑاتے ہیں، انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ تم مومن ہو تو ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ دین کے مخالفین سے تمہارا کیا واسطہ؟ (۶/۷۰-۶۸ ؛ ۷/۵۱ ؛ ۴/۱۴۰)

ان کی دنائت کا تو یہ عالم ہے کہ جب تم اجتماعِ صلوٰۃ کے لئے لوگوں کو آواز دیتے ہو، تو یہ اس کی بھی ہنسی اُڑاتے اور مذاق کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے ورنہ اس حقیقت کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ جو اجتماعات، نوعِ انسان کی فلاح اور بہبود کے لئے منعقد ہوں، اُن کے انعقاد میں خود انہی کا فائدہ ہے۔ ان کا مذاق اُڑانا خود اپنا مذاق اُڑانا ہے۔

جو تمہارے دین سے تمسخر کریں

واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مراد نہیں کہ کفار اور اہلِ کتاب میں سے جو لوگ تمہارے دین کے ساتھ مذاق کرتے ہوں، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ جو ایسا نہ کرتے ہوں انہیں بیشک دوست بنا لو۔ ایسا سمجھنا قرآن کے تمام مقامات کے خلاف ہوگا جن میں بلا مشروط کہا گیا ہے کہ کفار اور اہلِ کتاب سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ کرو۔ آیات (۵/۵۲-۵۱) تو ابھی ابھی گزر چکی ہیں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ عربی زبان میں اس قسم کا مِنْ، بعیض کے لئے ہی نہیں آتا۔ یعنی "میں سے" کے لئے ہی نہیں۔ تبئین کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنی ان کی کسی اہم خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے۔ یہ چیز کہ فلاں مقام پر مِنْ کے کیا معنی لئے جائیں گے قرآن کریم کے دیگر متعلقہ مقامات کی روشنی میں متعین کی جائے گی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ (ص ۹۳-۹۰)۔ نیز سابقہ صفحات میں آیت (۳/۱۰۳)

یہاں کہا گیا ہے کہ جو لوگ تمہارے دین (دینکم) سے تمسخر کریں، اس کا مذاق اڑائیں، ان سے قطع تعلق کر لو۔ یہاں تک تو ہر اہلِ مذہب کریں گے ـــــ وہ کونسا مذہب ہے جس کے پیروان لوگوں کو اپنا دوست بنالیں جو ان کے مذہب کا تمسخر اڑائیں؟ کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن قرآن کریم اس سے

ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ " وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا .... (۶/۷ : ۵۱)

حتیٰ کہ جو خود اپنے دین سے تمسخر کریں

" جو لوگ اپنے دین کو کھیل تماشا سمجھ لیں، ان سے بھی قطع تعلق کر لو"۔ اس ارشاد میں ایک عظیم حقیقت پنہاں ہے۔ اور اس حقیقت کی وضاحت آیت کے اگلے لفظوں نے کر دی ہے۔

انسانی دنیا میں دو تصوّراتِ حیات ہیں۔ ایک تصوّر کو آپ " مذہبی تصوّر" کہہ لیجئے اور دوسرے کو " دنیاوی تصوّر"۔ مذہب میں (خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو) اقدار یا اخلاقیات کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہوتی ہے۔ وہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے ہیں اور اس میں (غلط یا صحیح) گناہ اور ثواب۔ جائز اور ناجائز۔ اچھے اور برے۔ نیکی اور بدی کا تصور بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور یہ ہے کہ زندگی کا مقصد مفادِ خویش حاصل کرنا ہے خواہ وہ کسی طریق

زندگی کے دو تصوّرات

سے ہو۔ اسے مادہ پرستی (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ اس میں اقدار یا جائز ناجائز کا تصوّر سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ یہ مطلب ہے " غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا " سے (تفصیل کے لئے انڈکس میں عنوان " دنیا " دیکھئے)۔ جو لوگ اس تصوّرِ حیات کے قائل ہوں وہ نفسِ مذہب (یعنی ہر مذہب کا خواہ اپنا ہو یا دوسروں کا بلکہ مذہبی تصوّرات) کا مذاق اڑائیں گے۔ اسے (SERIOUSLY) لیں گے ہی نہیں۔

یورپ میں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں جو مادیت کی لہر اٹھی اس نے ساری دنیا کو متاثر کر دیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مادی تصوّراتِ حیات عام ہوگیا اور اس کے عام ہونے سے مذہب (RELIGION) کے خلاف بغاوت اور استہزا بھی عام ہوگیا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کی نئی نسل بھی اس سے متاثر ہوگئی اور ان کے ہاں مذہب کا مذاق اڑانا (گویا) فیشن میں داخل ہوگیا۔ یا یوں کہئے کہ ماڈرن بننے کی نشانی قرار پاگیا۔ ان نوجوانوں سے عام طور پر میرا واسطہ پڑتا ہے۔ کیونکہ میرے پیغام اور (قرآنی) فکر کا اولیں مخاطب طبقہ یہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ نوجوان، مغرب سے اٹھی ہوئی لہر سے

ہماری نئی نسل

متاثر ہو کر مذہب کا مذاق نہیں اڑاتے، بلکہ اس مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں جو ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے ـــــ وہ مذہب جو عقل کا دشمن اور علم کا حریف ہے اور افسانہ نگاریوں اور توہم پرستیوں کا مجموعہ۔

میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو " چھوڑ دینے " (وَذَرِ الَّذِيْنَ) سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جسے آیت (۴/۱۴۰ ، ۶/۶۸)

میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جس مجلس میں اس قسم کا استہزاء ہوتا ہو وہاں سے اُٹھ کر چلے جاؤ۔ (تفصیل سابقہ باب میں گزر چکی ہے) میں نے یہ مفہوم اس لئے لیا ہے کہ (۶/۷۰) میں (وَذَرِ الَّذِيْنَ ....) کے بعد کہا ہے وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ..... "ان کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کرتے رہو تاکہ کوئی شخص قرآنی تعلیم سے محروم رہ جانے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے"۔

میرا تجربہ اس باب میں بڑا کامیاب رہا ہے۔ میں اُن نوجوانوں کو (جن کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے) جھڑکتا، ڈانٹتا نہیں، انہیں اپنے قریب لاتا ہوں اور علم و بصیرت کی روشنی میں قرآنی اقدار ان کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ نوجوان، نہ صرف یہ کہ اپنی سابقہ روش کو چھوڑ دیتے ہیں، بلکہ اسلام کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ قرآنی تاکید کا مقصد یہ ہے کہ تم ان میں بیٹھو گے تو خطرہ ہے کہ تم بھی اُن جیسے ہو جاؤ گے۔ (اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ ۴/۱۴۰)۔ وہاں سے اُٹھ کر چلے آؤ گے تو ایک تو تم خود اس خطرہ سے محفوظ ہو جاؤ گے اور دوسرے، انہیں اس کا احساس ہو گا کہ ان سے مذموم حرکت سرزد ہو رہی ہے۔ وہاں سے تو اٹھ کر چلے آؤ لیکن قطع علائق کی ایسی شکل اختیار نہ کرو کہ وہ تمہاری بات تک سُننے کے روادار نہ رہیں۔ اس صورت میں تم ان کے سامنے قرآنی تعلیم پیش کیسے کر سکو گے؟ غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم کی ہدایت میں کس قدر حکمت مضمر ہوتی ہے؟

آیت (۵/۵۸) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جو دین کی دعوت، اور اس کے اجتماعات کے لئے پکار (اذان) کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں تو یہ اندھے تعصب کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ عقل و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دین کا نظام تو خود ان کے فائدہ کے لئے

دین کا نظام تو خود ان کے فائدے کے لئے ہے

ہے کیونکہ وہ ربوبیت عالمینی کا نظام ہے۔ ان کی اس مخالفت کو اس مثال کی رو سے سمجھیے کہ اگر کسی گاؤں میں سکول یا ہسپتال کھولنے کی تجویز ہو، اور وہاں کی غیر مسلم آبادی اس تجویز کی اس لئے مخالفت کریں کہ تجویز مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے، تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ یہ لوگ عقل کے اندھے ہیں۔ خود اپنے فائدے کی بھی نہیں سوچتے۔ (پاگل کہتے ہی اُسے ہیں جسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہ ہو)۔ صلوٰۃ کے اجتماعات تو چھوٹے پیمانے پر ہوتے ہیں۔ اس نظام کے سب سے بڑے اجتماع (حج) کے متعلق کہا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو دعوت دو کہ وہ آئیں۔ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (۲۲/۲۸)۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (مشاہدہ کر لیں) کہ یہ نظام ان کے فائدے کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے؟ تفصیل کے لئے انڈکس میں عنوان "حج" دیکھئے)۔

لیکن اس باب میں قصور خود ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے اسلام کو کبھی اس شکل میں پیش ہی نہیں کیا کہ یہ اس کی غایت، مقصود اور منتہیٰ (بلاتفریق مذہب و ملّت) تمام نوع انسان کی بہبود ہے۔ ہم نے دنیا کو رب العالمین کا مفہوم ہی نہیں سمجھایا۔ جس سے قرآن کا آغاز ہوتا ہے۔ نہ ہی "ربّ الناس" کا مفہوم جس پر اس کتاب عظیم کا اختتام ہوتا ہے۔

(استہزاء کے متعلق مزید تفصیل۔ مطالب الفرقان۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۴۷ پر دیکھئے)۔

بات اہل کتاب کی طرف سے، مخالفت اور استہزاء سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:

۵/۵۹ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

اہل کتاب سے پوچھو کہ تم ہم سے کس بات پر بگڑتے ہو اور ہمیں کون سے جُرم کی سزا دینا چاہتے ہو؟ ہمارا "جرم" اس کے سوا کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو خدا نے ہماری طرف نازل کیا ہے، اور ان تمام قوانین پر جو اس سے پہلے (خود تمہاری طرف) نازل ہوئے تھے، لیکن تم میں سے اکثر نے اس راہ کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لی تھیں۔

تو کیا تم ہم سے اس بات پر بگڑتے ہو کہ ہم نے خدا کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار کر رکھا ہے؟

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے جو ان سے کہا گیا ہے کہ ہم تو تمہاری مقدس کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں (یعنی یہ ایمان کہ یہ اپنے وقت پر تمہارے انبیاء پر نازل ہوئی تھیں) اس لئے ظاہر ہے کہ (تم ہمارے خلاف جو روِ یہ جی چاہے اختیار کرو) ہم تمہارے استہزاء کے جواب میں "تمہارے انبیاء اور تمہاری کتابوں" کے خلاف گستاخی اور بے حرمتی کا ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔

اس کے بعد ان سے کہ حق و صداقت کے خلاف تمہاری اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا، اسے کان کھول کر سن لو۔

۵/۶۰ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝

ان سے کہو کہ تم، ہمارے خلاف، ہزار جذباتِ عناد و عداوت اپنے دل میں رکھو، اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ انجام اسی کا خراب ہوتا ہے جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ زندگی

کی سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر راکھ بن جاتی ہیں۔ ان سے کہو کہ تم تو خود اپنی تاریخ میں دیکھ چکے ہو کہ احکام سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں کا کیا حشر ہوا تھا؟ ان میں انسانیت کا شائبہ تک باقی نہیں رہا تھا۔ ان کی سیرت بدترین حیوانوں جیسی ہو گئی تھی (۲/۶۵)۔ ان پر ذلت اور محکومی کی مار پڑی (۲/۶۱) اور محکومی بھی کس کی؟ اُن کی، جن کی سرکشی اور تمرّد کی کوئی حد نہ تھی!

یہ ہیں وہ لوگ جو صحیح راستے سے بہت دُور نکل جاتے ہیں اور آخر الامر اس مقام تک جا پہنچتے ہیں جو انسان کے لئے بدترین مقام ہو سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کے بندر اور خنزیر بن جانے کے متعلق سبت کا عنوان دیکھئے جس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۰۰) پر دی گئی۔ وہیں زیرِ نظر آیت بھی درج ہے۔ اور لعنت۔ غضب۔ طاغوت کے لئے انڈکس دیکھئے یہاں یہ نکتہ بارِ دگر قابلِ غور ہے کہ جب کسی قوم کی ذہنیت بگڑتی ہے تو سب سے الم انگیز اور رسوا کن عذاب جس میں وہ مبتلا ہو جاتی ہے، یہ ہوتا ہے کہ مستبد اور سرکش قوتیں انہیں اپنا محکوم بنا لیتی ہیں (اسے ذلت اور مسکنت کے عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ واضح رہے کہ "طاغوت" کے لئے مستبد اور سرکش قوتوں کے الفاظ بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ خدا کے سوا کسی (انسان) کی بھی محکومیت ہو، وہ "طاغوت کی عبدیت" (انسانوں کی محکومیت) ہے اور حکومت کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کی بھی ہو، وہ قوت اور استبداد کے بل بوتے پر ہی قائم ہو سکتی، اور قائم رہتی ہے۔

اسی پستیٔ ذہنیت اور انسانوں کی ذلت آمیز محکومیت کا نتیجہ تھا کہ منافقت ان کی زندگی کا معمول بن چکی تھی۔ دنائت اور منافقت ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ فرمایا کہ ان کی حالت یہ ہے کہ:

۵/۶۱ وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ○

اس ذہنیت کی وجہ سے ان کی اب تک یہ حالت ہے کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ——— حالانکہ جب یہ آئے تھے تو اس وقت بھی ان کے دلوں میں کفر بھرا ہوا تھا اور جب گئے ہیں تب بھی اپنے ساتھ کفر ہی لے کر گئے ہیں، ایمان لے کر نہیں گئے ——— ان میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں رہی کہ کھلے بندوں کہیں کہ ہم تمہاری روش اختیار نہیں کر سکتے۔ حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کی اس قسم کی فریب کارانہ حرکات سے اُنہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ یہ اپنے دل میں چھپاتے ہیں، خدا کو اس کا پورا پورا علم ہے۔

منافقت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لہٰذا، اس آیت کے سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ہے۔

۵/۶۲-۶۳ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۵/۶۲) لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ (۵/۶۳)

تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ جرم و سرکشی اور حرام خوری میں سب سے تیز ہیں ——— کیا ہی بُرے ہیں یہ کام جنہیں یہ لوگ (دن رات) کرتے رہتے ہیں۔ (۵/۶۲)

اور تماشا یہ کہ ان کے عُلماء اور مشائخ بھی انہیں ان جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکتے۔ اُنہوں نے بھی مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے ——— کس قدر گھناؤنا ہے اُن کا یہ کاروبار! (۵/۶۳)

اثم۔ عدوان اور سحت پہلے آچکے ہیں۔

یہاں تک یہودیوں کی عام قوم کا ذکر تھا۔ اس کے بعد ان کے علماء اور مشائخ کا تذکرہ آتا ہے۔ احبار، اُن کی شریعت کے علماء تھے اور ربانی یا رھبان، ان کی طریقت (تصوف) کے مشائخ۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ قوم کو ان جرائم کے ارتکاب سے روکتے۔ لیکن اُنہوں نے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا۔ اس کے بجائے وہ کرتے کیا تھے، اسے قرآن نے ایک لفظ يَصْنَعُوْنَ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ صَنَعَ کے بنیادی معنی کوئی چیز کو نہایت عمدگی سے بنانے کے ہیں لیکن جب لفظ مذموم معنی میں استعمال ہو (جیسا کہ یہاں لَبِئْسَ سے واضح ہے) تو اس کا مفہوم ہمارے ہاں کے مروجہ الفاظ مصنوعی اور صنعت (کاروبار) تو پھر اس کے ترجمہ "کاری گری" سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ ان پیشوایانِ مذہب کا فریضہ یہ تھا کہ وہ دین کی اصل و غایت کو قوم کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ ان جرائم سے باز رہتے۔ اُنہوں نے اس کی جگہ، مصنوعی (خود ساختہ) رسوم و شعائر کا نام دین رکھ کر قوم کو اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ وہ منشائے خداوندی کو پورا کر رہے ہیں۔ اور مقصد اس سے اپنی صنعت (انڈسٹری) کو چمکانا تھا۔

احبار و رہبان کا کردار

آپ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے پیرانِ طریقت اور اربابِ شریعت کے کاروبار کو کس طرح ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا ہے یہ حضرات جہاں بھی، اور جس مذہب میں بھی ہوں، ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے مصنوعی رسوم کو دین بنانا اور اس سے اپنے مفاد حاصل کرنا۔ ان کا اکتساب رزق کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں ہوتا۔ مذہب ہی ان کا پیشہ (PROFESSION) ہوتا ہے۔

ذکر چلا آرہا تھا یہودیوں کی طرف سے استہزاء کا۔ اس کی ایک اور مثال سامنے لائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں دیکھئے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی کس قدر اور کس کثرت سے تاکید آئی ہے۔ حتیٰ کہ اسے "خدا کو قرض دینا" کہا گیا ہے۔ نگاہ میں کجی نہ ہو تو اس قسم کے احکام یا اصطلاحات کے صحیح مفہوم کا سمجھ لینا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن یہودیوں کی جس پست ذہنیت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے (اور تاریخ اس پر شاہد ہے) اس کی وجہ سے وہ اس پر بھی مذاق کرتے اور کہتے کہ

۵/۶۴ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ○

جب ہم جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مال و دولت صرف کرو تو یہ (یہود) اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا ان کے خدا کو دیکھو۔ جو ان سے کہتا ہے کہ ہماری راہ میں خرچ کرو۔ ہمیں قرضہ دو! کیا اس خدا کے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جو وہ انسانوں سے خرچ کرنے کو کہتا ہے اور ان سے قرض مانگتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ خود بخیل بن چکے ہیں، فلاحِ انسانیت کے کاموں میں کچھ خرچ نہیں کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی باتیں کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے رہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ——— اس کے دونوں ہاتھ کھلے اور کشادہ ہیں۔ وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنے خزانوں کے منہ کھلے رکھتا ہے۔ (لیکن اس کے انفاق کا انداز اپنا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک جماعت تیار کرتا ہے جو اس کے پروگرام کو پورا کرتی ہے۔ (۹/۱۱۱، ۳۶/۴۷)۔

تم نے دیکھا کہ خدا کے وہی احکام، جن سے ایمان والوں کے جذباتِ اطاعت ابھرتے اور بڑھتے ہیں، کس طرح، ان لوگوں کی سرکشی اور انکار کے جذبات کو بھڑکانے کا موجب بن جاتے ہیں ——— یہ ہے اندازِ نگاہ کا فرق اور نفسیاتی تبدیلی کا اثر۔ ان کی اس ذہنیت اور مذہب کو کاروبار بنا لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ان میں باہمی بغض و عداوت پیدا ہو چکی ہے ——— نہ یہ اپنی ذہنیت بدلیں گے، نہ بغض و عداوت کے جذبات مٹیں گے ——— ان کی حالت یہ ہے کہ یہ جہاں رہیں گے، ملک میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ انہوں نے کئی مرتبہ جنگ کی آگ بھڑکانے کی بھی کوشش کی لیکن اللہ نے (دوسری جماعتوں کے ذریعے سے روک تھام کر کے

(۲۲/۵) اسے بجھا دیا۔ اس لئے کہ اللہ فساد انگیزی اور خونریزی کو پسند نہیں کرتا۔

آیت ہیں كَيْفَ يَشَاءُ سے بات واضح کر دی۔ یعنی کرنے کو تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا کہ براہِ راست اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتا۔ لیکن اس کا انداز و طریق اس سے مختلف ہے۔ (كَيْفَ يَشَاءُ) انسانوں کی دنیا میں وہ اپنی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری کیا کرتا ہے۔ اس لئے انسانوں کے معاشی مسائل کا حل اس نظام کی رُو سے ہوگا جو قوانینِ خداوندی کی رُو سے قائم ہوگا۔ اس وقت جس انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی جارہی ہے وہ اس نظام کے قیام کے لئے ہے۔

اور یہاں پر قرآنِ کریم کی کشادہ نگہی کا ایک اور فردوس بداماں منظر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہودیوں نے نبی اکرمؐ اور آپ کے مشن کی مخالفت کی انتہا کر دی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا ردِّ عمل یہی ہوتا کہ ایسے دنی الطبع دشمنوں پر کامرانی اور شادمانی کی راہ کبھی کشادہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن خدائے رب العالمین کی طرف سے اس قسم کا انتقامی ردِ عمل نہیں ہوا۔ فرمایا کہ انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے یہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے چلے گئے اگر یہ اس راستے کو چھوڑ کر اب بھی صحیح راستہ اختیار کر لیں تو زندگی کی خوشگواریوں سے اس طرح بہرہ یاب ہو جائیں گے جیسے تم بہرہ یاب ہو۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ (۵/۶۵)

لیکن اس کے باوجود ہم نے ان پر سعادت و برکات کے دروازے بند نہیں کئے۔ اگر یہ لوگ (قرآن پر) ایمان لے آتے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہتے، تو ہم ان کی (خود پیدا کردہ) ناہمواریوں کو دور کر دیتے اور انہیں بھی زندگی کی سرفرازیوں اور خوشگواریوں سے نوازتے۔

اگر یہ پہلے بھی ذلت اور پستی کے عذاب میں ماخوذ ہوئے تھے، تو اس لئے نہیں کہ ہماری طرف سے ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی ہوئی تھی۔ یہ اس لئے ہوا تھا کہ انہوں نے وحی کا متعین کردہ راستہ چھوڑ دیا تھا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۵/۶۶)

جب یہ لوگ پہلے بھی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کئے گئے تھے تو اس کی وجہ کوئی ذاتی عناد نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کا اتباع چھوڑ دیا تھا۔ اگر یہ تورات و انجیل کی حقیقی تعلیم پر کاربند رہتے

تو ان پر آسمان و زمین کی برکات کے دروازے کھل جاتے اور ہر مقام سے رزق کے چشمے ابلتے چلے آتے۔ (۷/۹۶، ۷۲/۱۶)۔ لیکن انہوں نے بجز معدودے چند جنہوں نے میانہ روی اختیار کی، اپنے لئے بری بری راہیں تلاش کریں اور سخت معیوب حرکات شروع کر دیں۔

اب پھر ان کے لئے بار آفرینی کا موقعہ آیا تھا۔ اگر یہ اس ضابطہ ہدایت (قرآن) پر کاربند ہو جاتے تو پھر انہی برکات سے بہرہ یاب ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔

اس بنا پر حضورؐ سے کہا گیا کہ آپ، بلا امتیاز اور بلا تخصیص و تفریق پیغاماتِ خداوندی کو عام کرتے جائیں۔ انہیں علیٰ قدرِ وسعت ہر ایک تک پہنچاتے جائیں۔

۵/۶۷ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝

تبلیغ رسالت

بایں ہمہ، اے رسولؐ! تم اس ضابطہ ہدایت کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو، تاکہ کوئی شخص صحیح راہنمائی نہ پہنچنے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے (۶/۷)۔ تمہارا فریضہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے (۱۳/۴۰)۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یہ فریضۂ رسالت کی عدم ادائیگی ہوگی۔ تم ان لوگوں کی مخالفت کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ اللہ تمہارے مشن کو مخالفین کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھے گا (۳/۱۴۴)۔

تم اس حقیقت کو بھی یاد رکھو کہ تمہارے ذمے اس پیغام کو پہنچا دینا ہے۔ تم اس کے مکلف نہیں کہ لوگ اسے بالضرور قبول بھی کر لیں۔ (۲/۲۷۲، ۱۰/۹۹، ۲۶/۳، ۲۸/۵۶)۔ جو لوگ اس کا فیصلہ کر لیں کہ ہم نے کسی کی بات ماننی ہی نہیں، خواہ وہ کیسی ہی حق و صداقت اور علم و بصیرت پر مبنی کیوں نہ ہو، تو ایسے لوگ کبھی راہِ راست پر نہیں آسکتے۔ (۲/۶-۷)

مندرجہ بالا مفہوم میں جن آیات کے حوالے دیئے گئے ہیں، انہیں آپ دیکھ لیں گے تو مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہے گی۔ رسول اللہؐ کے بعد قرآن مجید کی تبلیغ امت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے آسمان سے کسی مامور من اللہ

امت کا فریضہ

کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے اس فریضہ کی ادائیگی میں تغافل برتا تو ہم بھی عذاب میں مبتلا ہیں، اور باقی اقوامِ عالم بھی زندگی کی کشمکش میں مبتلا۔ جو قوم بھی قرآن کو اپنا

راہنما بنا کر اسے دوسروں تک پہنچائے گی، وہی فریضۂ تبلیغ رسالت ادا کرے گی۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ تو اس کی تشریح کے لئے مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۰۱) آیت ۵/۶۱ دیکھئے۔ اس کے بعد پھر ان (اہل کتاب) سے کہا کہ تمہاری تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تم نے وحی کی رُو سے دی گئی ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اب وہی ہدایت (جو تمہارے پاس اس کی اصلی شکل میں موجود نہیں) اس قرآن میں جامع طور پر دے دی گئی ہے۔ اس کا اتباع کرو گے تو زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہو جاؤ گے۔

۵/۶۸ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ان اہل کتاب سے کہہ دو کہ یونہی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے اور اس طرح خود بھی دھوکے میں رہتے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جب تک تم تورات و انجیل کی حقیقی تعلیم پر جواب اس ضابطۂ خداوندی میں محفوظ کر دی گئی ہے، قائم نہیں ہو جاتے۔ تمہاری کوئی بات قابلِ اعتناء نہیں سمجھی جا سکتی۔

لیکن تم دیکھو گے کہ قرآن کی طرف دعوت ان لوگوں کے جذبات سرکشی اور عداوت کو اور تیز کر دے گی سو تم اُن کی تباہی پر تأسف نہ کرو۔ اس لئے کہ اُنہوں نے دیدہ دانستہ اپنی تباہی کو اپنے ہاتھوں خرید رکھا ہے۔ اس سے اُنہیں کون بچا سکتا ہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ، تو اس کی تشریح کے لئے اگلے صفحات دیکھئے۔ اس کے بعد پھر اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین کے دروازے ہر قوم اور ملّت کے لئے یکساں کھلے ہیں۔

۵/۶۹ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

تم اُن سے برابر کہتے جاؤ کہ اسلام کے دروازے ہر قوم اور ملّت کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ صابی ہوں یا وہ لوگ جو کسی رسمی گروہ میں داخل ہوئے بغیر، ویسے ہی خدا کو مانتے ہیں ——— یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے ——— غرضیکہ کوئی بھی ہو خدا کے اقتدار

اعلیٰ، زندگی کے تسلسل اور اس کے قانونِ مکافات پر اس طرح ایمان لائے جس طرح قرآن میں بتایا گیا ہے۔ (۲/۱۳۷) اور اس کے دئے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرئے تو انہیں کسی قسم کا خوف و خطر اور حزن و ملال نہیں ہوگا۔ وہ انتہائی اطمینان اور امن کی زندگی بسر کریں گے۔ (۲/۶۲)۔

یہ آیت، انہی الفاظ میں (۲/۶۲ میں) آچکی ہے۔ اس کی تفسیر، مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۹۴ - ۸۱) اور جلد دوم (صفحہ ۳۰۵ - آیت ۲/۶۲) پر دیکھئے۔

صابئین

صابئین کا لفظ یہاں بھی آیا ہے اور اس سے پہلے (۲/۶۲) میں۔ اور اس کے بعد (۲۲/۱۷) میں بھی آئے گا۔ سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ (زیرِ نظر آیت میں) یہ، یہود اور نصاریٰ کے ساتھ ہم اور سورہ حج میں یہود۔ نصاریٰ اور مجوس کے ساتھ۔

صابی مذہب بڑا قدیم ہے۔ عیسائیت سے بھی پہلے کا۔ اس لئے صابئین کی تاریخ زیادہ تر قیاسات پر مبنی ہے اصل کے اعتبار سے اس کا تعلق یونانی تصوف سے ہے۔ یونانی لفظ ناسٹک (GNOSIS) کے معنی عرفان (معرفت) کے ہیں۔ اس فلسفہ کے ماننے والے ناسٹک کہلاتے تھے۔ اس نے یہودیت پر بھی اپنا اثر ڈالا اور عیسائیت پر بھی اس کے پیرو مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک گروہ صابئین کے نام سے منسوب ہے۔ یہ اپنے آپ کو مندع (MANDAENS) بھی کہتے ہیں۔ اس کے معنی بھی عرفان اور نجات کے ہیں۔ ان کا اصلی وطن فلسطین تھا۔ بعد میں یہ وہاں سے نقل مکان کر کے وادی دجلہ و فرات میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی کتابوں میں لفظ "باروناً" اکثر آتا ہے جس کی اصل اردن ہے۔ معنی اس کے صاف و شفاف جاری پانی کے ہیں۔ ان کے مذہب کی بنیادی رسم بپتسمہ ہے جو جاری پانی کے سوا کسی پانی سے ادا نہیں ہو سکتی۔

فلسطین سے ان کا ایک گروہ وان کی طرف چلا گیا لیکن یہ بُعد محض مکانی نہ رہا۔ ان میں عقائد کا بھی اس قدر اختلاف ہو گیا کہ مندعانی اور وانی دو مستقل فرقے بن گئے۔ مندعانیوں میں ان کے اصلی عقائد کے کچھ کچھ نقوش باقی رہے لیکن وانیوں نے دیگر مذاہب سے اس قدر زیادہ اثرات لئے کہ یہ ایک الگ سا مذہب بن گیا ——— مکرانیوں کی ستارہ پرستی۔ بابلیوں کے طلسمی عقائد، جھاڑ پھونک وغیرہ۔ قرآن کریم میں جن صابئین کا ذکر آیا ہے (معلوم ہوتا ہے کہ وہ) مندعی ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن کے عرب ان سے واقف تھے۔ آجکل یہ عراق۔ کویت اور بصرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی بہت سی

مقدس کتابیں ہیں جن میں سے کتاب گینزا (GANZA) مفصل بھی اور مشہور بھی۔ لاطینی اور جرمنی زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے قائل ہیں۔ عبادات میں نماز کو اوّلیت حاصل ہے۔ نماز تین وقتوں کی ہے ـــــ طلوع آفتاب سے پہلے۔ زوال آفتاب کے بعد۔ اور غروب آفتاب کے بعد۔ نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں ـــــ غسل۔ وضو وغیرہ کو ان کے ہاں خاص اہمیت حاصل ہے ـــــ نماز ان کی قیام اور رکوع تک محدود ہے۔ سجدہ نہیں کرتے۔

لغت عربی میں صابی کا مادہ (ص۔ ب۔ ء) ہے جس کے معنی ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا ہے چونکہ ان لوگوں نے یہودیت سے نکل کر الگ دین اختیار کر لیا تھا اس لئے عرب انہیں صابی کہتے تھے۔ عرب انہیں "مغتسلہ" بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ نہانے، دھونے میں بڑی شدت برتتے تھے۔

ہیسٹنگز کے انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ درحقیقت الکیسائی (ELKESAITES) فرقہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہوا ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب فروغ حاصل ہوا (مزید تفصیل کے لئے میری لغات القرآن میں مادہ (ص۔ ب۔ ء) دیکھئے۔

اسکے بعد، یہودیوں کو اس عہد کی یاد دلائی گئی ہے جو ان سے (ان انبیاء کی وساطت سے) لیا جاتا تھا:

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا
۵/۷۰ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا
يَّقْتُلُوْنَ ۝

یہی پیغام تھا جو ہم نے مختلف پیغمبروں کی معرفت، بنی اسرائیل کی طرف بھی بھیجا تھا اور اُن سے اس پر قائم رہنے کا عہد لیا تھا۔ لیکن اُن کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جب کسی رسول نے ایسی بات کہی جو ان کے رجحان کے خلاف جاتی تھی۔ اور اس لئے انہیں ناپسند تھی، تو یہ وہیں اکڑ جاتے۔ پھر ان رسولوں میں سے بعض کی تکذیب کرتے اور بعض کو قتل بھی کر دیتے (۲/۸۷)

(اس کی تشریح اسی جلد میں صفحہ ۴۳۶ اور ۵۰۱ پر کی جا چکی ہے) قتلِ انبیاء کے لئے مطالب جلد دوم صفحہ ۳۰۰ آیت ۲/۶۱ دیکھئے۔

اور یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ انہیں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رہا تھا:

۵ / ۷۱ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

اُنہوں نے اپنے دل میں سمجھ رکھا تھا کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے کون باز پرس کرنے والا ہے۔ اور کون ہمیں تکلیف پہنچا سکتا ہے؟ اس تکبر اور نخوت کا نتیجہ تھا کہ یہ بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے (شدّتِ جذبات میں ہوتا ہی ایسا ہے)۔ لیکن اس کے باوجود قانونِ خداوندی نے انہیں مہلت دی اور جب انہوں نے اپنی روش بدل لی تو پھر زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد پھر ان کی وہی حالت ہو گئی اور انہوں نے پھر شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بھیر لیں اور صداقت کی آواز کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے ——— اور خدا کا قانونِ مکافات برابر دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

یہودیوں کے بعد روئے سخن عیسائیوں کی طرف منعطف ہوا، اور انہیں بتایا گیا کہ ان کی گمراہی کی وجہ وہ غلط عقائد ہیں جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ اور اُن کی والدہ (حضرت مریمؑ) کے متعلق وضع اور اختیار کر رکھے ہیں۔ یہاں اُن میں سے تین بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ یعنی الوہیتِ مسیح ـ تثلیث اور الوہیتِ حضرتِ مریمؑ۔ یہ آیات اور ان کا مفہوم درجِ ذیل ہے:

۵ / ۷۲ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

عیسائیوں کے غلط عقائد

انہی اہلِ کتاب کا ایک گروہ (نصاریٰ) یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مسیحؑ ابنِ مریم، خدا ہے۔ یہ صریحاً کفر ہے۔ مسیحؑ نے اپنی قوم، بنی اسرائیل سے وہی کچھ کہا تھا جو دوسرے انبیاء کہتے چلے آئے تھے۔ یعنی یہ کہ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ وہ تمہارا پروردگار بھی ہے اور میرا بھی۔ جو شخص اللہ کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک کر لیتا ہے اس پر جنت حرام ہو جاتی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ انسانوں کو خدا کا درجہ

دے دیا جائے۔ ایسے لوگوں کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ
وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا　(۵/۷۳-۷۴)
مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

یہ کہہ دیں گے کہ ہم اکیلے مسیحؑ کو خدا نہیں مانتے۔ ہم باپ بیٹا۔ روح القدس تینوں کے مجموعہ کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے ہم خدا کے خدا ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ ان سے کہو کہ یہ کون سا توحید کا عقیدہ ہے؟ یہ بھی کھلا ہوا کفر ہے۔ یاد رکھو خدائے واحد کے علاوہ اور کوئی الٰہ نہیں۔ نہ ہی اس کی شانِ الوہیت میں کوئی اور شریک ہے۔

اگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنے ان باطل عقاید سے باز نہیں آئیں گے تو اس کفر کا نتیجہ الم انگیز عذاب کے سوا اور کیا ہوگا؟ (۵/۷۳)۔

کیا (اس کے بعد بھی) یہ لوگ ان عقاید کو چھوڑ کر خدا (کی کتاب، قرآن) کی طرف نہیں آنا چاہتے، جہاں سے انہیں، اپنے سابقہ غلط عقاید کے مضرت رساں نتائج سے حفاظت بھی مل جائے گی اور ان کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی۔

کیا یہ خدا سے اپنی حفاظت بھی طلب نہیں کرنا چاہتے؟

اس کے بعد عقیدۂ الوہیت کی تردید ان الفاظ میں کی گئی ہے:

مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ
وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ　(۵/۷۵)
الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○

مسیحؑ ابن مریم خدا کا پیغامبر تھا ——— اس سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر ہو گزرے ہیں۔ اور اس کی والدہ ایک راستباز، سچی عورت تھی۔ وہ دونوں انسان تھے اور عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے (ان کے خدا ہونے کے خلاف یہی دلیل کافی ہے)

دیکھو! ہم کس طرح نکھار اور ابھار کر بات واضح کر رہے ہیں اور یہ کس طرح اپنے انہی باطل عقائد کی طرف اُلٹے پھر رہے ہیں۔

عیسائیوں کے ان عقاید کا ذکر زیرِ نظر جلد کے دوسرے باب میں کیا جا چکا ہے۔ ابن اللہ کے عقیدہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۴۳ آیت ۲/۱۱۶) دیکھئے۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی الوہیت کے خلاف ایک دلیل (آیت ۵/۱۷) میں بھی پیش کی گئی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۴۸۱)۔ اور خود حضرت عیسیٰؑ کی زبانی اس کی تردید ذرا آگے چل کر آیت (۵/۱۱۶) کے تحت ملے گی۔

اس کے بعد ایک ایسی حقیقت سامنے لائی گئی ہے جس سے ہر غیر اللہ کی الوہیت کا تصور جڑ بنیاد سے کٹ جاتا ہے۔ فرمایا:

۵/۷۶ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔

ان سے کہو کہ کیا تم خدا سے ورے ہی، ان ہستیوں کو اپنا الٰہ (صاحبِ اقتدار خدا) تسلیم کر لیتے ہو جنہیں نہ تمہارے نفع کا اختیار ہے نہ نقصان کا۔ ان کے برعکس خدا وہ ہے جو سب کچھ سننے والا، اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس آیت میں ایک بڑا اہم، اصولی اور بنیادی سوال سامنے آتا ہے۔ یعنی نفع اور نقصان کا سوال۔ جلبِ منفعت اور دفع مضرت وہ جذبات ہیں جو انسانی عمل کے محرکات بنتے ہیں۔ یعنی انسان وہ کام کرتا ہے جس میں اسے فائدہ متوقع ہو اور ان امور سے بچتا ہے جن کے متعلق اسے خیال ہو کہ وہ مضرت رساں ہیں (یعنی وہ اسے نقصان پہنچا دیں گے)

جلبِ منفعت و دفعِ مضرت

آپ نے عام لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ "وہ تو پاگل ہے، اسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں"۔ یعنی ہوشمند وہ ہے جسے اپنے نفع نقصان کا خیال ہو۔ جسے اس کا خیال نہ ہو، وہ پاگل ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان ڈرتا اس سے ہے، جس سے اُسے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، اور جاتا اس کی طرف یا جھکتا اس کے سامنے ہے جس سے کسی منفعت کی توقع ہو۔ آپ تاریخِ انسانیت پر غور کریں۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ جہاں بھی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے آگے جھکا ہے، اُس کا محرک یہی جذبہ تھا ——— وہ اربابِ اقتدار ہوں یا اعیانِ مذہب (اربابِ شریعت ہوں یا اصحابِ طریقت) انسانوں کے سامنے ہی نہیں۔ لوگوں نے اپنے تخیل اور واہمہ سے جن موہوم قوتوں کو نفع

نقصان پہنچانے کا مقتدر سمجھا، ان کے سامنے بھی اِس جذبہ کے تحت جُھکے۔ دیوی دیوتا، بھوت پریت، یا مذہبی پیشوا اور مدعیانِ رُوحانیت وغیرہ۔ انسان نے ہر چوکھٹ اور ہر آستانے پر اِس جذبہ کے تحت سر جھکایا۔

قرآن نے آکر اِس جذبۂ محرکہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی، اور اس طرح انسان کو صحیح شرفِ انسانیت اور آزادی سے متعارف کرایا، اور اسے سر اُونچا کر کے چلنے کے قابل بنایا۔

قرآن کریم نے نفع اور نقصان کو دو ہی شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک انسانی ذات (نفس یا خودی) کا نفع اور نقصان، اور دوسرا اس کی طبعی زندگی کا نفع اور نقصان۔ جیسا کہ مطالب الفرقان۔ جلد اوّل (صفحہ ۲۵۰ آیت ۲/۱۴) پر لکھا جا چکا ہے حقیقی نفع اور نقصان وہی ہے جس کا تعلق انسانی ذات سے ہے، کیونکہ انسانی ذات ہی درحقیقت اصلِ حیات ہے۔ قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ انسانی ذات کو انسان خود ہی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

انسانی ذات کا نفع نقصان

کوئی دوسرا نہ اُس کا کچھ نقصان کر سکتا ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے ارشادِ خداوندی ہے: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ عَلَيۡكُمۡ أَنفُسَكُمۡۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهۡتَدَيۡتُمۡۚ إِلَى ٱللَّهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيعٗا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمۡ تَعۡمَلُونَ ۝ (۵/۱۰۵) "اے جماعتِ مومنین! تم اپنی ذات کی حفاظت کا خیال رکھو۔ یاد رکھو، اگر تم سیدھے راستہ پر چلتے جاؤ گے تو غلط راستوں پر چلنے والے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اُن کی دسترس تمہاری ذات تک ہے ہی نہیں۔ اس کا تعلق خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے۔ وہیں سے یہ فیصلہ ہوگا کہ تم نے کونسے ایسے کام کئے تھے جو تمہاری ذات کے لئے منفعت بخش تھے اور کون سے ایسے جو اس کے لئے مضرت رساں تھے" یہ اس آیت کا سمٹا ہوا مفہوم ہے۔

طبعی زندگی کا نفع نقصان

جہاں تک انسان کی طبعی زندگی کے نفع نقصان کا تعلق ہے، قرآن کریم سب سے پہلے انسانی ذہن کو ان توہم پرستیوں سے آزاد کرتا ہے جن کی بنا پر وہ موہوم قوتوں کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر سمجھتا ہے۔ "موہوم" کے معنی یہ ہیں کہ جس شے (یا ہستی) میں کوئی قوت فی الحقیقت نہ ہو، اپنے ذہن میں خیال کر لینا کہ اس میں وہ قوت موجود ہے۔ دیوی دیوتا۔ مٹی اور پتھر کی مورتیاں۔ اِن سے آگے بڑھیئے تو پیر فقیر، صُوفیا، اولیاء۔ حتّٰی کہ اُن کے مزار اور آستانے سب انہی موہوم

توہم پرستی

قوتوں کے پیکر ہیں۔ یعنی ان میں اس قسم کی کوئی قوت درحقیقت نہیں ہوتی۔ انسانی ذہن کی عقیدتمندی انہیں ان قوتوں کا حامل سمجھ لیتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ان تمام قوتوں کا

خاتمہ کر دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات میں صاحبِ اقتدار صرف خدا کی ذات ہے، اور کسی میں نفع نقصان پہنچانے کا اقتدار نہیں۔ سارا قرآن اسی اصل الاصول کی تفسیر ہے۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ..... (۲۵/۵۵) - (نیز ۶/۷۱ ، ۱۰/۱۰۶ ، ۱۰/۱۸ ، ۲۱/۶۶ ، ۲۲/۱۲) "یہ لوگ ان کی معبودیت اختیار کرتے ہیں جنہیں ان کو نفع نقصان پہنچانے کا کوئی اقتدار نہیں" دوسروں کو نفع نقصان پہنچانا تو ایک طرف، ان (دیوی

پیر فقیر۔ اولیاء اللہ کسی میں یہ قدرت نہیں

دیوتاؤں، بتوں۔ فقیروں) کو تو خود اپنے آپ کو نفع نقصان پہنچانے کا بھی اختیار نہیں۔ (۲۵/۳)۔

انسانوں کی دنیا میں قرآن کریم کی ایک جامع اصلاح "اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ہے جنہیں لوگ، کسی نہج سے بھی حاجت روا سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی اس نے برملا کہہ دیا کہ تمہیں تو ایک طرف، وہ خود اپنے لئے بھی (قانونِ خداوندی کے خلاف) نفع نقصان پہنچانے کا اقتدار نہیں رکھتے: قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ..... (۱۳/۱۶)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہو کہ کیا تم، خدا کو چھوڑ کر، ان "اولیاء" کو حاجت روا سمجھتے ہو جنہیں اپنے آپ کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں"۔ جہاں عقیدت و احترام میں حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظمؐ سے بلند اور کون سی ہستی ہو سکتی ہے؟ آپ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرا دیا کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ..... (۷/۱۸۸ ، ۱۰/۴۹)

"ان سے کہہ دو کہ قانونِ خداوندی کے علی الرغم، میں خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی قسم کے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا"۔ اور جب اپنے لئے بھی اس کا اختیار نہیں رکھتا، تو تمہارے لئے کیا اختیار رکھوں گا؟ (۷۲/۲۱)۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین نافذ کر رکھے ہیں۔ ان کے مطابق چلنے سے انسان کو فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی خلاف ورزی سے نقصان۔ یہ قوانین اٹل ہیں اور انہیں بدلنے کا کسی کو اختیار و اقتدار نہیں۔ (۴۸/۱۱ ، ۱۰/۱۰۷)۔ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق چلتے ہیں تو تندرست رہتے اور (مریض ہونے کی صورت میں) شفایاب ہو جاتے ہیں۔

انسانوں کے ہاتھوں نقصان

اب رہے وہ نقصانات جو ہمیں خود انسانوں کے ہاتھوں اٹھانے پڑتے ہیں، تو اس باب میں بھی قرآن کریم ہمیں بڑا بلند اصول عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں نقصان اٹھانے میں بھی تمہاری اپنی غلطی یا کمزوری کا دخل ہوتا ہے۔ لوگ دھوکہ دے جاتے ہیں جس کی وجہ سے تمہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کا ایک قول بڑا بلیغ ہے

کسی نے کہا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ آپؓ نے کہا کہ بات پوری کہو۔ مومن وہ ہے جو نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اور یہ، درحقیقت، تفسیر تھی خدا کے اس ارشاد کی جس کی رو سے اس نے کہا تھا:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۲/۹)

"یہ لوگ خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ انہیں دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ درحقیقت خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اسے سمجھتے نہیں"۔ خدا تو بہر حال نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اور مومنین وہ ہوتے ہیں جو (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی اپنے اندر منعکس کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی بھی کیفیت

مومن نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں، نہ دھوکا کھاتے ہیں (بجز اس کے کہ کوئی تھوڑے سے وقت کے لئے منافقت کے پردے میں انہیں دھوکا دے جائے)

اب، انسانوں کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کے نقصان اٹھانے کی ایک ہی شکل رہ گئی۔ اور وہ ہے مستبد حکمرانوں کی طرف سے محکوموں کو اذیت رسانی جس کی دنیا میں روش عام ہے۔ اس باب میں قرآن کریم

مستبد حکام کی طرف سے مضرات

ایک ایسی عمیق اور حیات آور حقیقت سامنے لاتا ہے جس پر غور کرنے سے انسانوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ اس حقیقت کے بیان کرنے کا اس کا انداز بھی بڑا محاکاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہنم میں حکمرانوں اور محکوموں۔ لیڈروں اور ان کے پیچھے چلنے والے عوام میں باہمی مکالمات ہونگے۔ وہ ایک دوسرے کو مطعون کرینگے کہ ان کی وجہ سے وہ بھی گمراہ ہوئے اور جہنم میں پہنچے ہیں۔ (ان مقامات کی تفصیل میری کتاب "جہانِ فردا" میں ملے گی۔ آیاتِ قرآنی کے حوالوں کے لئے دیکھئے ۱۴/۲۱، ۳۴/۳۲، ۴۰/۴۷-۴۸، ۳۳/۶۷، ۳۷/۲۹-۲۷، ۳۸/۶۰)۔ ان مکالمات میں سے ایک مقالہ کو قرآن خاص طور پر نمایاں کر کے سامنے لایا ہے۔ کمزور اور ناتواں

جہنم میں عوام اور لیڈروں کے مقالمات

محکوم و مقہور لوگ، خدا سے عرض کریں گے کہ ان مستبد حکمرانوں اور لیڈروں کو دوہرا عذاب دیجئے۔ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ بنظر بظاہر ان کا اعتراض بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہاں تو معاملہ خدائے بصیر و حکیم سے ہوگا۔ جواب ملے گا کہ اگر انہیں دوہرا عذاب ملے گا تو تمہیں بھی دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کے پاس وہ کونسی قوت تھی جس سے مستبد اور ظالم بن گئے تھے۔ یہ ساری قوت خود تمہاری عطا کردہ تھی۔ یہ

تمہارا ضعف، ناتوانی، کمزوری، دوں ہمتی، بزدلی تھی جس کی وجہ سے ان کی جرأتیں بیباک سے بیباک تر ہوتی گئیں۔ اگر تم صاحبِ قوت و عمل اور اربابِ عزم و ہمت ہوتے تو ان کی کیا مجال تھی جو یہ تم پر (یا دوسرے انسانوں پر) ظلم و زیادتی کرتے۔ ان کے ظلم و استبداد کے خالق تم ہو۔ ان کی خدائی کی حقیقت اس سے زیادہ کیا تھی کہ۔

ایں خدا تا سجدہ اش کر دی خداست تا یکے اندر قیام آئی فناست (اقبالؒ)

تم ان کے حضور سجدے میں گرے رہے، تو یہ مسندِ خداوندی پر سرفراز رہے۔ تم اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تو یہ اس مسند سے خود بخود نیچے گر پڑتے۔ جو نہیں، مستبد حکمرانوں کے سامنے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، ان (حکمرانوں) کی ہستی غبارِ راہ کی طرح فضا میں گم ہو جاتی ہے اور تاریخ میں صرف ان کے مظالم کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کی خدائی، محکوموں کی غلامانہ روش کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

نگر، کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ان حقائق کی روشنی میں غور کیجئے قرآن کریم کی اس تعریض پر کہ ——— اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ (۵/۷۶)

بندوں کو اس طرح خدا بنا لینے کا راز قرآن مجید نے اگلی آیت میں، ایک لفظ میں، بیان کر دیا۔

۵/۷۷ فرمایا: قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ۝

ان سے کہو کہ اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو (مبالغہ) نہ کرو۔ ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر رکھو۔ اس سے آگے نہ بڑھاؤ۔ خدا کو خدا مانو۔ رسول کو رسول۔ اور ان لوگوں کے جذبات و تصوّرات کے پیچھے نہ لگو جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنے ساتھ اور بہت سوں کو گمراہ کر دیا۔ یہ سب سیدھے راستے سے بھٹک کر کہیں سے کہیں چلے گئے۔

یاد رکھو! انبیاء کی نبوّت سے انکار ہی گمراہی نہیں۔ انہیں، ان کے مقام سے آگے بڑھا دینا بھی گمراہی ہے اور سخت گمراہی۔

دین میں غلو | "غلو فی الدین" کے متعلق مطالب جلد دوم (صفحہ ۱۹۳ آیت ۴/۱۷۱) پر تفصیل سے

لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا اضافہ ضروری ہے کہ جس طرح ہم، مذہب کے دیگر معاملات میں اہلِ کتاب سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے، غلو فی الدین میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی[1]۔ قرآن کریم نے حضور نبی اکرمؐ کی بشریت کو بار بار اس لئے دُہرایا تھا کہ آپؐ کو فوق البشر نہ سمجھ لیا جائے۔ اسلامی نظام میں اس کا اس قدر اہتمام کیا گیا کہ

رسول اللہؐ کی شانِ اقدس میں غلو

کلمۂ شہادت میں، حضورؐ کی رسالت پر ایمان کے ساتھ ہی، آپ کی عبدیت کو بھی جزوِ ایمان بنا دیا ——— اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ——— اور دن میں کم از کم پانچ مرتبہ دنیا کے گوشے گوشے، اور کونے کونے (ہر مسجد) سے بآوازِ بلند (اذان میں) اس کا اعلان ضروری قرار دیا۔ لیکن ہم زبان سے اس اقرار و اعلان کے باوجود بڑے فخر اور مباہات سے پکارتے ہیں کہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر　　اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفےٰؐ ہو کر

اگر کسی نے اس پر لب کشائی کی جرأت کی تو جواب میں کہہ دیا

مجھے معذور رکھو، میں مستِ صہبائے محبت ہوں

(جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم نے بالفاظِ صریح کہہ دیا کہ حضورؐ کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا گیا۔ آپؐ کا معجزہ کتاب اللہ اور آپؐ کی سیرتِ مقدسہ ہے۔ لیکن ہم نے سینکڑوں معجزات وضع کئے اور انہیں حضورؐ کی طرف

معجزات

منسوب کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) کو بے مثل و بے نظیر قرار دیا تھا۔ عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہؐ کے اقوال۔ (احادیث) قرآن کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں عمل بھی اسی عقیدہ کے مطابق ہو رہا ہے۔ (دیکھئے مطالب القرآن جلد سوم صفحہ ۱۷۹ آیت ۲/۱۸۱)۔

احادیث

یہ عقیدہ، احادیث منسوب الی الرسول تک ہی محدود نہیں رہا۔ آگے بڑھئے تو فقہا کے مدوّن کردہ قوانین (فقہ) کے متعلق بھی یہی عقیدہ اختیار کیا گیا۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبداللہ الکرخی کا قول ہے:

فقہ

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحابؒ (ائمہ فقہ حنفیہ) ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ اس طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ بھی ماوّل یا منسوخ ہے (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ محمد الخضری مرحوم۔ اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ صفحہ ۴۲۱)

---

[1] یہ موضوع سابقہ باب (آیت ۴/۱۲۱ کے تحت) بھی آ چکا ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے اس کا کچھ حصہ یہاں بار دیگر پیش کیا جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے ہاں جو قوانینِ شریعت مُروج چلے آرہے ہیں، وہ قرآنِ کریم کے نہیں، فقہ کے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر و بیشتر قرآن کے خلاف ہیں۔

پیر اور مُرشد یہاں تک تو اربابِ شریعت کی بات تھی۔ اہلِ طریقت (پیروں اور مُرشدوں) کی طرف آئیے، تو وہاں جس انداز کا غُلو ملتا ہے، اس کا اندازہ ان حضرات کی مجلسوں، عُرسوں اور قوالیوں سے لگ سکتا ہے[1]۔ عام مشہور ہے کہ پیراں نمی پرند۔ مریداں پرانند ——— "پیر خود نہیں اُڑتے۔ اُن کے مُرید انہیں اڑاتے ہیں"۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا ہے تو وہ لطیفہ ہی، لیکن "مریداں پرانند" کی بڑی دلنشیں شہادت ہے۔ دو مُرید اپنے پیروں کی عظمت اور بزرگی کے متعلق ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ میرا پیر غوث ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا پیر قطب ہے۔ پہلے نے کہا کہ میرا پیر ابدال ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا پیر پیغمبر ہے۔ پہلے نے کہا کہ میرا پیر خدا ہے اس کے بعد کوئی مقام ہی باقی نہیں تھا اس لئے دوسرا مرید شکست کھا گیا۔ شکست کھا کر وہ بھاگا بھاگا اُس مُرید کے پیر کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کو کچھ علم ہے کہ آپ کا فلاں مرید کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ "میرا پیر خدا ہے"۔ کیا یہ سچ ہے؟ پیر صاحب نے کہا کہ توبہ۔ توبہ۔ معاذ اللہ۔ میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔

وہ فخر سے گردن اٹھائے پہلے مرید کے پاس آیا، اور کہا کہ تمہارا پیر کہتا ہے کہ میں خدا نہیں ہوں، میرا مرید غلط کہتا ہے یہ سُن کر اُس مُرید نے طیش میں آکر کہا کہ

آں بچۂ سگ چہ می داند۔ او خدا ہست

(اُس سگ بچہ کو کیا معلوم ہے! وہ خدا ہے)

اِس طرح مُرید پیروں کو اُڑاتے ہیں، اور اُن کے پیر بھی جانتے بوجھتے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ اُن کی خانقاہوں اور مزاروں کے ساتھ ان سب کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں یہ مسئلہ سارا معاشی ہوتا ہے۔ ہر دُکاندار اپنے مال کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہے۔ غُلو سے مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔

حکایتِ قدآں یار دل نواز کنم　　　بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

دین یہ ہے کہ خدا کو خدا کے مقام پر رکھو۔ رسولؐ کو مقامِ رسالت پر، اور انسانوں کو مقامِ انسانیت پر۔

---

[1] میں نے اِس موضوع پر بڑی تفصیل سے، اپنی نئی تصنیف ——— تصوّف کی حقیقت ——— میں بحث کی ہے۔ امید ہے وہ کتاب، اِس جلد کی طباعت کے وقت تک شائع ہو چکی ہوگی۔

سلاطین کے حق میں غلو

مذہب سے ہٹ کر سیاست کی طرف آئیے تو ہمارے ہاں ملوکیت (موروثی بادشاہت) کو تخلِ اسلام کی جڑ کاٹ دینے والا نظریہ اور ادارہ قرار دیا جاتا ہے۔ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے اور عملاً حالت یہ ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک (ہر زمانے اور ہر ملک میں) ہمارے ہاں ملوکیت ہی نہج حکومت چلی آرہی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ائمہ اور اکابرِ دین ان بادشاہوں کو السلطان ظلّ اللہ علی الارض کے مقام سے نوازتے اور محراب و منبر سے ان کی مملکت کے استحکام و استیفاء کی دعائیں مانگتے تھے (اور اب بھی مانگتے ہیں) آپ نے کبھی ہمارے اس تضادِ عمل پر بھی غور فرمایا ہے کہ یزید کی اس لئے مذمت کی جاتی ہے کہ اس نے بادشاہت کو ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ یزید کے بعد اس وقت تک جس قدر مسلمان سلاطین گزرے ہیں (اور ہیں) ان سب نے اسی طرح بادشاہت کی تھی (اور کی ہے) جس طرح یزید نے۔ یزید متفقہ طور پہ قابلِ مذمت اور یہ سلاطین متفقہ طور پر مستحق حمد و ستائش۔ ان سلاطین کو جن حقوق کا اہل قرار دیا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ

۱۔ الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبد الملک کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ بادشاہ قیامت کے دن، بغیر حساب کے بخشے جائیں گے

(تاریخ الیافعی۔ صـ۲۲۴ بحوالہ "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی"

از مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) صفحہ ۳۵)

۲۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر بادشاہ وقت سے ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور ہو، تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ (احکام القرآن۔ جصاص جلد دوم صـ۳۴ بحوالہ بالا صفحہ ۳۵)

۳۔ فقہ حنفی نے اس باب میں ذرا سی نرمی برتی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ امیر (سربراہِ مملکت) قتل کے سوا جو جرم بھی کرے تو اس پہ حد نہیں۔ (ہدایہ اولین مجیدی۔ صفحہ ۴۹۳)

یہ مقام عطا کیا ان حضرات نے اُن بادشاہوں کو جن کا وجود ہی سرے سے خلافِ قرآن تھا یعنی غلو کی انتہا یہ تھی کہ پہلے ان بادشاہوں کو ظلّ اللہ (خدا کا سایہ) قرار دیا اور پھر مواخذہ خداوندی کے سلسلہ میں انہیں حضورِ رسالتمآبؐ سے بھی بلند مقام عطا کر دیا۔ حضورؐ کے متعلق قرآن مجید میں ہے: (قُلْ) اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)۔ "ان سے کہہ دو (کہ) اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں تو اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔ مجھے اس کا خوف لاحق رہتا ہے"۔

یہ ہے اس قوم کا مشرب اور مسلک جسے متنبہ کیا گیا تھا کہ تم اہل کتاب کی طرح دین میں غلو نہ کرنا۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا   کہ افتاد است از بامِ بلندے   (اقبالؒ)

یہودیوں کے اس قسم کے اعتقادات اور جرائم تھے جن کی بنا پر اُن کے مختلف انبیاء نے انہیں ملعون قرار دیا تھا۔

۵/۷۸ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

بنی اسرائیل کے گمراہ کن عقائد اور تباہ کن روش کے متعلق جو کچھ اس وقت کہا جا رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ لوگ اس سے قبل، اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بنا پر خود اپنے دو برگزیدہ پیغمبروں، داؤدؑ اور عیسٰیؑ کی زبان سے بھی ملعون قرار دیئے گئے تھے۔ یعنی انہوں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ ان کی اس غلط روش کی وجہ سے ان سے نوازشات خداوندی چھینی جا رہی ہیں۔

جرائم عام ہو چکے تھے

پہلے کہا گیا تھا کہ اُن کے مذہبی پیشوا انہیں ان جرائم کے ارتکاب سے روکتے ٹوکتے نہیں تھے (۵/۶۳)۔ اب کہا کہ یہ جرائم اس قوم میں اس قدر عام ہو گئے تھے کہ کوئی انہیں قابلِ مذمت سمجھتا ہی نہیں تھا۔ کوئی ایک دوسرے کو روکتا ٹوکتا نہیں تھا۔ سب اسی رو میں بہے چلے جاتے تھے۔

۵/۷۹ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

اُس وقت اُن کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ اُن کے معاشرہ میں برائیاں عام ہو چکی تھیں اور ایک دوسرے کو روکتے ٹوکتے بھی نہیں تھے۔

صدیوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر اُن کے سامنے حق و باطل دونوں ہوں، تو یہ حق کی مخالفت کریں گے۔ اور باطل کی حمایت، کیونکہ حق انہیں اُن کی مفاد پرستیوں سے روکے گا۔

۵/۸۰-۸۱ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

اور اب تک اُن کی یہ حالت ہے کہ یہ اُن لوگوں سے اپنا یارانہ گانٹھتے ہیں جو دین خداوندی کے منکر اور مخالف ہیں۔

کتنا بُرا ہے یہ مسالہ جسے یہ اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے تیار کر رہے ہیں! خدا کے قانون سے اس طرح سرکشی برتنے کا نتیجہ اِس کے سوا اور کیا ہوگا کہ یہ ذلّت و رسوائی کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ (۵/۸۰)

جن کفّار سے یہ اس وقت یوں دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہیں، اگر وہ اللہ پر اور اس نبی پر جو کچھ اس پر نازل کیا گیا ہے، اس پر ایمان لے آتے، تو یہ کبھی اُنہیں اپنا دوست نہ بناتے۔ لہٰذا ان کفّار کے ساتھ ان کی دوستی محض اِس لئے ہے کہ وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ ان کی دوستی کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ وہ اگر آج اسلام کی دشمنی چھوڑ دیں، تو یہ ان سے دوستی چھوڑ دیں۔

اُن میں سے اکثریت سیدھی راہ کو چھوڑ چکی ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت، حضورؐ کی اوّلین مخاطب جماعتیں تین تھیں۔ مشرکینِ عرب (بالخصوص قریشِ مکّہ)۔ یہودی اور عیسائی۔ مشرکینِ عرب، آخر دم تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ تا آنکہ فتح مکّہ کے بعد اُن کی قوت ٹوٹ گئی تو مخالفت ختم ہوئی۔ مدینہ میں یہودی صاحب اثر و اقتدار تھے، اُنہوں نے بھی مسلمانوں کی سخت مخالفت کی تا آنکہ اُنہیں وہاں سے نکالنا پڑا۔ لیکن عیسائیوں کی حالت اِن سے قدرے مختلف تھی۔

عیسائی قدرے نرم مزاج تھے

ان پر ہنوز سیاست کا اثر غالب نہیں تھا۔ ایک تو عیسائیت کی تعلیم ہی ترکِ دنیا اور منکسر المزاجی کی تھی۔ دوسرے مدینہ میں اُن کا خاص اثر بھی نہیں تھا۔ وہ ایک صلح پسند اقلیت کی طرح رہتے تھے۔ اُن کے علماء اپنا زیادہ تر وقت علمی مصروفیتوں میں گزارتے تھے، اور اُن کے مشائخ تصوّف کی ریاضتوں میں۔ اس لئے وہ مسلمانوں کی مخالفت میں زیادہ نمایاں حصّہ نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر فرمایا:

۵/۸۲ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

اے رسول! تم یہود اور مشرکین (عرب) کو جماعتِ مومنین کے خلاف بدترین دشمن پاؤ گے۔ ان کے برعکس جو

لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں، تو دیکھے گا کہ وہ تمہاری جماعت کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں منکسر المزاج عالم اور تارک الدنیا راہب ہیں۔ جن کی طبیعت میں تکبر اور سرکشی نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ من حیثیت الجماعت یہ بھی نظام خداوندی کے دشمن ہیں۔ اس لئے دوستدار کے تعلقات ان سے بھی جائز نہیں (۵/۵۱)

"شروع ساتواں پارہ"

ان میں سے بعض نے اسلام قبول بھی کر لیا تھا۔

۵/۸۵-۸۳ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ○ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ○ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ○

یہی وجہ ہے کہ جب وہ قرآن کریم کی آیات سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان آیات میں انہیں حقیقت بے نقاب نظر آتی ہے اور وہ اُسے فوراً پہچان لیتے ہیں۔ اور پکار اُٹھتے ہیں کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اس پر ایمان لاتے ہیں سو تو ہمارا شمار بھی اس جماعت میں کر لے جو حق کی نگہبان اور نوع انسان کے اعمال کی نگران ہے (۲/۱۴۳)، (۵/۸۳)

وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کو اس طرح بے نقاب دیکھ لینے کے بعد کونسی بات باقی رہ جاتی ہے کہ ہم اللہ پر اور اُس کی کتاب پر ایمان نہ لے آئیں جو سرتاسر حق وصداقت ہے، اور اس بات کی آرزو نہ کریں کہ ہمارا پروردگار ہمیں صالحین کے زمرے میں شامل کرلے (۵/۸۴)

یہ لوگ اس طرح، جماعت مومنین میں شامل ہو گئے اور اپنے حسن کارانہ عمل کی وجہ سے زندگی کی ان خوشگواریوں

سے بہرہ یاب ہو گئے جن پر کبھی افسردگی نہیں آسکتی۔ یہ ان کے ایمان و عمل کا بدلہ ہے۔ (۵/۸۵)۔

ان کے برعکس:

۵/۸۶ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

ان کے برعکس جو لوگ اِس صداقت سے انکار کرتے ہیں اور ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ تو یہ لوگ زندگی کی ارتقائی منزل میں آگے نہیں جا سکیں گے۔ ان کے لئے شادابیوں کی جنّت کے بجائے تباہیوں کا جہنم ہے۔

سابقہ آیات میں عیسائیوں کے رُھبان کا ذکر تھا، جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ بڑے رقیق القلب اور منکسر المزاج تھے۔ ان میں سے بعض اسلام بھی لے آئے تھے۔ ان راہبوں کی تعریف کرنے کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ان کی ایک بنیادی غلط نگہی کی طرف توجہ دلا کر، جماعتِ مومنین کو اِس سے متنبّہ کیا۔

رُھبان کے متعلق یُوں سمجھئے کہ وہ ان کے ہاں کے صُوفیاء تھے۔ تارک الدّنیا۔ زندگی کی ہر خوشگوار شئے کو حرام قرار دینے اور اِس مسلک کو قربِ خداوندی کا موجب سمجھنے والے۔ قرآنِ کریم نے اِن کے اِس باطل مسلک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُمّتِ مسلمہ سے کہا:

۵/۸۷-۸۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

اِن عیسائی راہبوں کی غلطی یہ تھی کہ اُنہوں نے زندگی کی خوش گوار چیزوں کو جنہیں خدا نے حلال قرار دیا تھا مسلکِ خانقاہیت کی بنا پر اپنے اُوپر حرام قرار دے لیا ——— یعنی یہودی اگر افراط کی طرف چلے گئے اور حرام خوری تک اُتر آئے تو یہ (عیسائی راہب) تفریط کی طرف چلے گئے اور انہوں نے حلال و طیّب چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام قرار دے لیا ——— وہ بھی غلط تھا یہ بھی غلط۔

اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا کہ جن خوش گوار چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ انہیں اپنے اوپر حرام قرار دے لو۔ (۶۶/۱) نہ ہی یہ کہ جن چیزوں پر اس نے پابندیاں عائد کی ہیں تم ان پابندیوں کو توڑنے لگ جاؤ۔ حد سے گزر جانا، یعنی افراط و تفریط۔ دونوں اطراف ہیں بُرا ہوتا ہے۔ (۵/۸۷)

حق کی راہ یہ ہے کہ تم قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے زندگی کی خوش گواریوں سے

بہ رہا ب ہو، اور اس طرح، جو کچھ اللہ نے سامانِ رزق عطا کیا ہے اسے حلال و طیب طریق سے کھاؤ پیو۔
اور یوں اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ جس پر تم ایمان لائے ہو۔ ($\frac{5}{88}$)

حلال کو حرام مت قرار دو

دنیا کے ہر مذہب میں زور اس پر دیا جاتا ہے کہ حرام کے قریب تک نہ جاؤ لیکن یہ خصوصیت قرآن کو حاصل ہے جس نے اس کے ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا ہے کہ حلال کو حرام مت قرار دو۔ اس سے اس نے تصوّف کے مشرب اور مسلک کی جڑ کاٹ کر رکھ دی حرام اور حلال کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان جلد سوم میں گزر چکی ہے۔ (انڈکس سے حوالے دیکھ لیں) اس کے علاوہ، حلال کو حرام قرار دینے کے خلاف، اسی جلد (چہارم) کے دوسرے باب میں، آیات ($\frac{3}{92-93}$) کے تحت اور زیرِ نظر باب کے ابتدا میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جن چیزوں کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، ان کے سوا کسی اور چیز کو حرام قرار دینے، حتّٰی کہ خود اپنے لئے بھی "حرام" ٹھہرانے کا حق یا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ یہ قرآنی تعلیم کی بڑی نمایاں انفرادیت ہے۔ (مزید تفصیل انڈکس میں تصوّف کے عنوان کے تحت دیکھئے)

بعض لوگ غصّے میں (یا جہالت کی وجہ سے) قسم کھا لیتے ہیں کہ میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا اور اس طرح بھی حلال کو حرام کر لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی ایسی حماقت کر بیٹھے تو اس سے بازیابی ہو سکتی ہے۔

$\frac{5}{89}$ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

لغو قسموں کا کفارہ

اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے فلاں فلاں حلال چیزوں کے نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے اس لئے اب اس قسم کو کس طرح توڑیں؟ تو یاد رکھو۔ لغو اور مہمل قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا ($\frac{2}{225}$)۔ باقی رہیں وہ (غلط) قسمیں جو تم نے قصد و ارادہ سے نہایت

محکم طور پر کھائی ہوں، تو انہیں بھی توڑا جاسکتا ہے، لیکن اس صورت میں کچھ کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ، دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ کھانا ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ جیسا تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو کپڑا دینا۔ یا کسی غلام (گردن) کا آزاد کرانا[۱]۔ لیکن جسے یہ کچھ میسر نہ ہو (یا حالات ایسے ہوں جن میں یہ کچھ ممکن نہ ہو۔ مثلاً کوئی محتاج یا غلام موجود نہ ہو) تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری اُن (غلط) قسموں کا جو تم نے بالارادہ کھائی ہوں۔ لیکن جو قسمیں قوانین خداوندی کے خلاف نہ ہوں، اُن کی پاسداری نہایت ضروری ہے (خواہ وہ عہد دوسروں کے ساتھ کیا گیا ہو یا خود اپنے ساتھ)۔

اس طرح، اللہ اپنے قوانین و احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

قسموں کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۳۸۲ ۔ آیات $\frac{۲}{۲۲۴-۲۲۵}$) میں بحث ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ آیات ($\frac{۳}{۹۲-۹۳}$) کی تشریح اور مندرجہ بالا آیات ملانے سے، موضوع مکمل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اور امور کا ذکر ہے جن سے اجتناب لازمی ہے۔

$\frac{۵}{۹۱-۹۰}$ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ○

(قسموں پر قائم رہنا اس امر کی شہادت ہے کہ تمہارا عزم و ارادہ محکم ہے۔ تمہاری قوت ارادی اور قوت فیصلہ بہت مضبوط ہے۔ اس سے سیرت میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، ہر وہ کام جس سے عقل و فکر ماؤف، حوصلہ اور ہمت پست، اور عزم و ارادہ کمزور ہو جائے اس قابل ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ مثلاً) خمر، میسرہ انصاب، ازلام (جن کا ذکر $\frac{۲}{۲۱۹}$، $\frac{۵}{۳}$ میں آچکا ہے) ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں ($\frac{۵}{۹۱}$) اور جذبات سرکش و بیباک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روڑا بن کر نہ اٹک جائیں۔ ($\frac{۵}{۹۰}$)

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اتر آئے تو یہ چیزیں

---

[۱] محکوموں اور مظلوموں کی آزادی اسی زمرہ میں آجائے گی۔

(انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کردیں گی، اور قوانینِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے اور نظامِ صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔

کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں آؤ گے؟ ($\frac{5}{91}$)

خمر، میسرہ، انصاب اور ازلام کے متعلق مطالب جلد سوم (آیت $\frac{2}{219}$ صفحہ ۳۱۶) میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اور زیرِ نظر جلد میں آیت ($\frac{5}{3}$) میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت ($\frac{5}{91}$)۔ جلد سوم۔ صفحہ ۳۱۶ میں بھی آچکی ہے) اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے بعد فرمایا؛

$\frac{5}{92}$ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

تمہارے لئے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ تم اس نظام کی اطاعت کرو جو قوانینِ خداوندی کے مطابق اس کے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے اور ہر اس کام سے بچو جو اس نظام کے ضعف کا باعث ہو۔ لیکن اگر تم (یہ سب سمجھ لینے کے بعد بھی) گریز کی راہیں نکالو اور اس سے منہ موڑ لو، تو اس کا خمیازہ تم خود بھگتو گے۔ ہمارے رسول کے ذمے اتنا ہی ہے کہ وہ تم تک ہمارے قوانین و احکام واضح طور پر پہنچا دے۔ یہ تمہارے اختیار کی بات ہے کہ تم ان پر عمل کرو یا ان کی خلاف ورزی کرو (تم جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے)۔

قرآن مجید، انسانی آزادی پر ناروا پابندیاں عائد کرنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ ان پابندیوں کو اٹھانے اور ان زنجیروں کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ دنیا میں مذاہب اور ان کی شریعتوں نے انسانوں کو جکڑ رکھا تھا۔ ان کے راستے میں قدم قدم پر "شریعت" کا حکم آجاتا تھا ـــــ یہ کرو، یہ نہ کرو۔ یہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔ بیٹھ کر کھاؤ، کھڑے ہو کر

کوئی بیجا جکڑ بندی نہیں

نہ کھاؤ۔ ہاتھ سے کھاؤ، چھری کانٹے سے نہ کھاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے کہا کہ جن چیزوں اور باتوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے، پابندی صرف ان کی ہے۔ زندگی کے باقی معاملات میں انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی سہولت کے لئے جس طرح جی چاہے رہے سہے۔ کھائے پیئے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا؛

$\frac{5}{93}$ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور خدا کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو رہے ہیں، ان پر کھانے پینے کے معاملہ میں کوئی بندش نہیں (کہ یوں کھائیں اور یوں نہ کھائیں) بشرطیکہ وہ ان چیزوں سے بچیں جن سے انہیں روک دیا گیا ہے۔ اور اس طرح اپنے ایمان و کردار کا عملی ثبوت دیں۔ اس کے بعد، جن اور باتوں سے روکا جائے، ان سے بھی بچیں اور یوں اپنے ایمان کا عملی ثبوت دیتے جائیں۔ قابلِ اجتناب باتوں سے رُکتے جائیں اور حسن کارانہ طور پر زندگی بسر کرتے رہیں۔ یاد رکھو! کامیابی و کامرانی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ انسان تخریبی (منفی[1]) امور سے بچے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تعمیری (مثبت[2]) کاموں میں حصہ لے۔ یہی اندازِ زندگی قانونِ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

پابندی صرف حدود اللہ کی ہے

یہ معاشرتی امور ہیں جن میں دین مداخلت نہیں کرتا بجز اس مقام کے جہاں ——— انسان کا کوئی اقدام، خدا کی متعین کردہ حدود سے ٹکرائے۔ ان حدود سے بچتے ——— ہوئے زندگی آزادانہ گزارے۔ (کھانے پینے کے معاملات میں آیت (۶۱/۲۴) ملاحظہ کیجئے۔

شکار پر پابندی

شکار کے معاملہ میں ایک پابندی (آیت ۵/۱ میں) عائد کی گئی تھی کہ حالتِ احرام میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہے۔ ذیل کی تین آیتوں میں اس کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ چونکہ موضوع ایک ہی ہے، اس لئے ہم ان ہرسہ آیات اور ان کے مفہوم کو یکجا بیان کرتے ہیں۔ فرمایا:

۵/۹۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

اس قسم کی پابندیاں عائد کرنے سے مقصد، خود تمہاری ذات میں استحکام اور ثبات پیدا کرنا ہے۔ (مثلاً) ذرا تصور میں لاؤ اس منظر کو کہ تم حرمِ کعبہ کے اندر ہو اور شکار تمہارے ہاتھ کے نیچے، یا نیزے کی زد کے اندر آ چکا ہے۔ اب ایک طرف یہ شکار ہے جو تمہارے ہاتھ میں آیا ہوا ہے۔ دوسری طرف خدا کا حکم ہے کہ حرم کے اندر شکار نہیں پکڑا جائے گا

---

[1] NEGATIVE OR DESTRUCTIVE　[2] POSITIVE OR CONSTRUCTIVE

اس شکار میں بظاہر تمہیں کوئی نقصان رساں بات نظر نہیں آتی - لیکن تمہارا ایمان ہے کہ خدا نے جو پابندی لگائی ہے اُس کے توڑنے میں یقیناً ایسے مضرات پوشیدہ ہیں جو تمہیں سرِدست دکھائی نہیں دیتے -

اس کشاکش میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ تم پر پیش پا افتادہ فائدہ کی کشش غالب آتی ہے یا احکامِ خداوندی کے ان دیکھے نتائج کا احساس - اس قسم کی کشمکش زندگی میں تمہارے سامنے قدم قدم پر آئے گی - سو جو شخص خدا کی عائد کردہ پابندی کو توڑ کر حدود شکنی کرے گا، تو اُس کا الم انگیز نتیجہ اُس کے سامنے آجائے گا -

5/95 يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

لہذا، اے جماعتِ مومنین! تم حدودِ حرم کے اندر شکار مت کرو - (ہم نے کعبہ کو امن کا مقام قرار دیا ہے - 3/96؛ ہماری اس ضمانت کا تقاضا ہے کہ انسان تو انسان، حیوان بھی اس کے اندر آجائے تو اسے امن مل جائے) - اگر تم میں سے کوئی حدودِ حرم کے اندر ارادۃً شکار کرے، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جو جانور تم نے مارا ہے، اُس کی مثل کوئی مویشی تحفۃً کعبہ تک پہنچا دیا جائے (تاکہ وہ ضرورتمندوں کے کھانے کے کام آئے 22/28) - اس بات کا فیصلہ کہ کونسا جانور اس جانور کے ہم پلہ ہے جسے شکار کیا گیا تھا، تم میں سے دو صاحبِ انصاف آدمی کریں - (جنہیں اس کا علم ہو کہ کونسا جانور کس جانور کے ہم پلہ ہوتا ہے) -

یا اس کا کفارہ یعنی اس جانور کی قیمت کے برابر مسکینوں کا کھانا ہے - یا اُس کے برابر روزے رکھنا (اس حساب سے جس کا ذکر 5/89 میں کیا گیا ہے - یعنی یہ کہ تین روزے، دس مسکینوں کے کھانے کے برابر ہوتے ہیں) -

یہ اس لئے کہ تم نے جو دیدہ دانستہ حدود شکنی کی ہے اُس کا خمیازہ بھگتو - اور تمہارا نفس پابندیوں کے احترام کا خوگر ہو جائے) -

یہ حکم اب سے نافذ ہوگا - اس سے پہلے جو ہو چکا، سو ہو چکا - جو اس کے بعد ایسا کرے گا اُسے سزا دی جائے گی - اس لئے کہ وہ قانون، قانون ہی نہیں ہوتا جس کی خلاف ورزی کی سزا نہ ہو - اور اگر اس کے

پیچھے ایسی قوت نہ ہو جو اُس سزا کو عمل میں لا سکے تو وہ قانون، وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا نظامِ خداوندی میں، قانون شکنی کی سزا بھی ہے اور ایسی قوت بھی جو اس سزا کو نافذ کر سکے۔

۵/۹۶ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○

یہ پابندی، کہ حدودِ حرم کے اندر شکار کرنا حرام ہے، خشکی کے جانوروں تک محدود ہے۔ جہاں تک پانی کے جانوروں کا تعلق ہے، اُن کا کھانا جائز ہے ــــ خواہ انہیں تم خود شکار کرو، یا انہیں پانی اچھال کر خشکی پر پھینک دے، یا پانی کے پیچھے ہٹ جانے سے وہ خشکی پر رہ جائیں ــــ یہ تمہارے لئے اور اہلِ قافلہ کے لئے سامانِ زیست ہے۔ سو تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، جس کی خاطر تم ہر طرف سے کھنچ کر، اس مرکز میں جمع ہوتے ہیں۔

ماسلف کا مؤاخذہ نہیں آیات کا مفہوم تو واضح ہے، لیکن دو ایک نکات تشریح طلب ہیں۔ آیت (۹۵/۵) میں کہا ہے عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ "جو پہلے ہو چکا، سو ہو چکا"۔ یہ قرآن کریم کے نظامِ عدل کا بنیادی اصول ہے کہ قانون کا اطلاق اُس کے اجرا کی تاریخ سے ہوگا۔ کسی سابقہ تاریخ سے نہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا اُس کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ اصول اس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے (ملاحظہ ہوں آیات (۲۷۵/۲)، (۲۲/۴ - ۲۳/۴))۔ اور اس کے بعد بھی آئے گا۔

انتقام دوسری بات یہ کہ یہاں خدا کے لئے "ذُو انْتِقَامٍ" آیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم اس جلد کے باب اوّل میں، زیرِ آیت (۴/۳) آچکا ہے۔ اسے دیکھ لینا ضروری ہے، کیونکہ لفظ انتقام کا جو مفہوم ہمارے ہاں مروّج ہے، اُس کی رُو سے خدا کے متعلق بڑا غلط اور گمراہ کُن تصوّر قائم ہو جاتا ہے۔

طعامہ کا مفہوم تیسری بات یہ کہ آیت (۹۶/۵) میں صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ کو حلال بتایا گیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "پانی کے جانوروں کا شکار کرنا اور اُن کا کھانا"۔ لیکن حلال جانوروں کا شکار تو کیا ہی جاتا ہے کھانے کے لئے۔ اس لئے جب شکار حلال ہوگا تو اُس کا کھانا بھی حلال ہوگا۔ طَعَامُهُ کا مفہوم غور طلب ہے۔ سمندر کے جانور دو طرح ہاتھ آسکتے ہیں۔ ایک تو اس طرح کہ انہیں شکار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی جانور کو، پانی اچھال کر خشکی پر پھینک دے اور

لوگ اسے اٹھالیں۔ عرب، اس طرح ہاتھ آجانے والے جانور کو طَعَامُ الْبَحْرِ کہتے تھے۔ یعنی وہ جانور جسے سمندر کھانے کے لئے ازخود دیدے۔ قرآن کی اس تصریح میں ایک نکتہ پنہاں ہے۔ اس نے، حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کو ممنوع قرار دیا تھا اور سمندر کے شکار کو جائز۔ اگر سمندر کسی جانور کو ازخود خشکی پر پھینک دے تو سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ کیا اس کا شمار خشکی کے شکار میں ہوگا؟ قرآن نے اس کی وضاحت کر دی کہ اس کا کھانا بھی حلال ہے۔

آیت (۵/۹۶) کے اخیر میں "اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ" آیا ہے۔ یعنی اجتماعِ اُمت۔ اس سے خیال کعبہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے (بالخصوص اس لئے کہ سابقہ آیات میں حالتِ احرام میں کچھ پابندیوں کا ذکر تھا)۔ اس لئے اگلی آیت میں فرمایا:

(۵/۹۷-۹۸) جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

کعبہ کا مقام اور حج کا مقصد

یہ مرکز کعبہ ہے۔ یعنی وہ واجب الاحترام مقام جس کی مرکزیت سے مقصود یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوجائے اور کوئی فرد یا قوم، کسی دوسرے فرد یا قوم کی محتاج نہ رہے۔

یہ مقامِ اجتماع۔ اور وُہ مہینے جن میں جنگ کی ممانعت کر دی گئی ہے تاکہ لوگ امن و سلامتی سے یہاں جمع ہو سکیں۔ اور وہ تحائف اور جانور جو اس اجتماع کی ضروریات کے لئے بھیجے یا لائے جائیں۔ یہ سب اسی عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں یعنی عالمگیر انسانیت کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانے کے قابل بنا دیا۔

یہ باتیں تمہیں اس لئے بتائی جارہی ہیں۔ کہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ جس طرح خدا کائنات کے تقاضوں سے واقف ہے اور وہ، بغیر کسی خارجی سہارے کے، اس حسن و خوبی سے چل رہی ہے، اسی طرح وہ نوعِ انسان کے تقاضوں سے بھی واقف ہے اور چاہتا ہے کہ اس اجتماعی زندگی کا توازن بھی اسی طرح ٹھیک ٹھیک قائم رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس کا ہمہ گیر قانون، تمام اشیائے کائنات اور عالمِ انسانیت کی ضروریات، مصالح اور تقاضوں سے باخبر ہے۔ (۵/۹۷)

سو جو قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے گی، اُس کے لئے حفاظت اور پرورش کے تمام سامان مہیا ہوجائیں گے۔ اور جو اس کے خلاف جائے گی، اُسے سخت عواقب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس آیت کی وضاحت کے لئے انڈکس میں عنوانات، کعبہ، حج، قربانی دیکھئے۔ وہیں ھَدْیَ اور قَلَآئِدَ کا مفہوم بھی سامنے آجائے گا۔ یعنی وہ تحائف جو حج کے اجتماع میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھیجے جائیں، خواہ وہ جانوروں کی شکل میں ہوں اور خواہ دیگر اشیاء خورد و نوش یا مستعملہ کی شکل میں۔

حرام و حلال میں تفریق کے بعد کہا کہ رسولؐ کا ذمہ ان احکامات خداوندی کو تم تک پہنچا دینا تھا۔ اور اس نے ایسا کر دیا۔ اس کے بعد ان پر عمل کرنا، نہ کرنا تمہارا اپنا کام ہے۔ تمہیں زبردستی راہِ راست پر چلانا رسول کے ذمہ نہیں۔ (دیکھئے مطالب جلد اوّل صفحہ ۴۳)

5/99 مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ۝

ان عواقب سے بچنے کا یہ طریقہ نہیں کہ تم زبان سے ان قوانین کی صداقت کا اقرار کرلو اور دل میں ان کی خلاف ورزی کی آرزوئیں بیدار رکھو۔ بالکل نہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ظاہر و باطن دونوں پر پوری پوری نگاہ رکھتا ہے۔

باقی رہا یہ ہمارا رسولؐ۔ سو اس کے ذمے اس پیغام کا تم تک پہنچا دینا ہے۔ اس کی اطاعت یا خلاف ورزی کرنا تمہارے اپنے اختیار و ارادہ کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم اپنی روش کے ذمہ دار آپ قرار پاتے ہو۔

آیت کے آخری الفاظ غور طلب ہیں۔ احکام کی تعمیل بھی دو طرح ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ ان کی محض رسمی (میکانکی) پابندی یا قانون کے ڈر سے مجبوراً پابندی۔ اس طرح کے تعمیلِ احکام کا انسان کی نفسیات پر کچھ اثر نہیں

دل کی رضامندی سے اطاعت

ہوتا۔ اور دوسری، دل کی کامل رضامندی کے ساتھ (بطیب خاطر) ان کی ادائیگی۔ اس سے انسان کی داخلی دنیا میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ اور یہی دین کا مقصود ہے۔ رسولؐ تو صرف یہی دیکھ سکتا ہے کہ تم ان احکام کی پابندی کرتے ہو یا نہیں۔ لیکن خدا کی نگاہ اس پر بھی ہوتی ہے کہ تم یہ تعمیلِ احکام کس طرح کرتے ہو، محض رسماً یا قانون کے ڈر سے مجبوراً۔ یا دل کی رضامندی سے۔

اس کے بعد انسان کی ایک دُکھتی ہوئی رگ کو پکڑا اور کہا کہ ہرچند یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے جائز اور ناجائز، حلال اور حرام، کو الگ الگ کرکے بتا دیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کردی ہے کہ یہ دونوں کبھی ایک جیسے

خبیث کی کثرت

نہیں ہو سکتے، لیکن غلط معاشرہ میں ناجائز کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ عقلِ خود بین اسے اس فریب میں مبتلا کر دیتی ہے کہ اگر یہ چیزیں ایسی ہی نقصان رساں ہوتیں تو لوگوں کی اس قدر اکثریت ان کی گرویدہ کیوں ہو جاتی۔ اس سے اس کے دل میں ان چیزوں کی کشش (TEMPTATION) پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خطرناک گھاٹی میں سے محفوظ گزر جانا بڑی عزیمت چاہتا ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ
۵/۱۰۰ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

زندگی کی دو ہی روشیں ہیں ـــــ ایک طیب ہے، دوسری خبیث۔ تم اُن میں سے جو روش چاہو اختیار کرلو لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولو کہ وہ روش جو زندگی کے خوشگوار تعمیری پہلوؤں کو اُبھارے اور اس کے ثمرات نوعِ انسان کے لئے نشو و نما کا باعث ہوں۔ یہی وہ روش ہے جسے ہم نے طیب کہہ کر پکارا ہے۔ اور وہ روش جو ناخوشگوار، تخریبی نتائج پیدا کرے اور اس سے نوعِ انسان کی نشو و نما رک جائے (اُسے خبیث سے تعبیر کیا گیا ہے) یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتیں۔ خواہ یہ بات تمہارے لئے کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ دنیا میں بالعموم دور دورہ اس دوسری روش کا رہا ہے اور یہی ہر جگہ چھائی ہوئی ہے (یہ چیز اس روش کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں۔ یہ انسان کی کوتاہ نگہی ہے جو اُسے اس بنا پر صحیح قرار دیتا ہے کہ عام چلن اسی کا ہے)

لہٰذا، اگر تم عقل و شعور رکھتے ہو اور کوتاہ نگہی اور بے بصری سے کام نہیں لینے تو تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی سے تم کامیاب زندگی بسر کر سکو گے۔

خبیث اور طیب، قرآن کی دو کثیر الاستعمال اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم کئی ایک مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر وہ شئے یا عمل جسے قرآن جائز قرار دے، اور انفرادی طور پر وہ انسان کے مزاج اور ذوق کے لئے خوشگوار ہو، طیب ہے اور جو اس کی ضد میں ہو وہ خبیث۔ قرآن کی تعلیم کا ملخص یہ ہے کہ اُس نے خبیث اور طیب کو الگ الگ کر کے بتا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا اعجازِ بیان بھی ملاحظہ کیجئے۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ خبیث کی کثرت سے انسانی ذہن فریب کھا جاتا ہے اور اس کے جذبات (TEMPTATION) اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ انسان سطحی عقل (یعنی عقلِ خود بین) کے بجائے حقیقی عقل (عقلِ جہاں بیں، یعنی وحی کی روشنی میں کام لینے والی عقل) سے کام لے اور اس کی احتیاط برتے کہ اس کے جذبات قوانینِ خداوندی پر غالب نہ آنے پائیں۔

یہی کامیابی کی راہ ہے۔

احکام قرآنی کی جزئیات

جب یہ کہا کہ خبیث اور طیب کو الگ کر کے بتا دیا گیا ہے، اور اس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے تو خدائے خبیر و علیم کے سامنے فوراً وہ لوگ آ گئے جو اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں دین کی تکمیل ہو گئی ہے تو (مثلاً) بتاؤ کہ اس میں نماز کی رکعتوں کا کہاں ذکر ہے اور کہاں کہا گیا ہے کہ تم ہرن کا گوشت کھا سکتے ہو؟ یعنی ان کے نزدیک قرآن مجید کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں زندگی کی تمام جزئیات تک کے متعلق متعین احکام دیئے گئے ہوں۔

اس حقیقت کو بارہا بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے (بجز چند مستثنیات) زندگی سے متعلق دین کے اصول و اقدار دیئے ہیں۔ ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ یہ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے، اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق، اسلامی مملکت، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے گی۔ انہیں دین کے اصولوں کی جزئیات کہہ لیجئے۔ یہ جزئیات، بدلتی رہیں گی اور اصول اپنی جگہ اٹل رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے اس اصولی پروگرام کو، اپنی حکمت بالغہ کی رو سے، خود وضع فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا کو یہ جزئیات بھی دینی چاہیئے تھیں لیکن وہ (معاذ اللہ) بھول گیا۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے فرمایا:

۵/۱۰۲-۱۰۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ○

ہم نے "طیب" اور "خبیث" روشیں کہہ کر، عالمگیر اصول بیان کر دیئے ہیں۔ ان کی تفاصیل نہیں دیں۔ ان عالمگیر اصولوں کی روشنی میں تم خود متعین کر سکتے ہو کہ کون سے کام "طیب" کی شق میں آتے ہیں اور کون سے "خبیث" کے ضمن میں۔ زندگی کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں اور جن پیکروں میں وہ اصول کارفرما ہوتے ہیں، وہ بدلتے رہتے ہیں۔ انہی کو ان اصولوں کی جزئیات و تفاصیل کہا جاتا ہے۔ ہم نے قرآن میں "بالعموم" اصول دیئے ہیں۔ (بجز مستثنیات) ان کی جزئیات نہیں دیں۔ اصول یہ یاد رکھو کہ جو کچھ قرآن کے اندر دے دیا گیا ہے وہ

غیر متبدل ہے۔ جن اصولوں کی جزئیات قرآن میں نہیں دی گئیں انہیں تمہارا نظام مملکت باہمی مشاورت سے متعین کرے گا۔ افراد کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح متعین کردہ جزئیات قابلِ تغیّر و تبدّل ہونگی ثبات و تغیّر کے اس حسین امتزاج سے یہ دین ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل اور کارفرما رہے گا)

لہٰذا جن امور کی تفصیل ہم نے نہیں دی، تم اُن کے متعلق کُرید کُرید کر نہ پوچھا کرو، کیونکہ اگر ہم نے ان تفاصیل کو بھی متعین کر دیا تو وہ بھی غیر متبدل قرار پا جائیں گی اور جب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ تو اُن کا نباہنا تمہارے لئے مشکل ہو جائے گا۔ اور اس طرح وہ تفاصیل تم پر ناگوار گزرینگی) اور یہ ظاہر ہے کہ جب نزول وحی کا سلسلہ جاری ہے تو تمہارے اصرار پر ان امور کو ظاہر کر دیا جائے گا۔ بہرحال تم اس کا خاص خیال رکھو جو کچھ اس سے پہلے ہو چکا ہے اس سے ہم درگزر کرتے ہیں۔ آئندہ کے لئے تم احتیاط برتو۔ خدا کے قانون میں سابقہ غلطیوں کی معافی اور چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر بُردباری کی گنجائش ہے۔ ($\frac{5}{101}$)

یہ جو تمہیں تنبیہہ کی گئی ہے تو اس لئے کہ تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) نے اس قسم کے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے تھے ($\frac{2}{108}$)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اتنی قیود اور پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں جن کا نباہنا اُن کے لئے مشکل ہو گیا۔ اور وہ ان جزئیات کی پابندی سے گھبرا کر اصل دین ہی سے منحرف ہو گئے۔ ($\frac{5}{102}$)

اس اہم حقیقت کی وضاحت، مطالب۔ جلد دوم (صفحات ۴۳۵، ۳۱۷) پر کی گئی ہے، جہاں یہ آیات ($\frac{5}{101-102}$) بھی درج کی گئی ہیں۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔

اس اصل الاصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے کہ غیر متبدّل دین تمام کا تمام قرآن مجید کے اندر ہے۔ جو اس کے اندر نہیں، وہ دین نہیں، دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق ہیں جو قابلِ تغیّر و تبدل ہیں۔

قرآن کریم نے کہا کہ جب یہودیوں نے دین کی جزئیات کو بھی غیر متبدّل قرار دے لیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سرے سے، دین ہی سے منحرف ہو گئے۔ وجہ ظاہر ہے۔ وہ جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو ساتھ نہیں دیتی تھیں اور ان کے مذہبی پیشوا ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے سختی سے تقاضا کرتے تھے ـــــ چونکہ یہ ناممکن العمل تھا، اس لئے اُن کی نئی نسلوں نے یہ سمجھ کر کہ دین کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھا۔ اب وہ ایسا نہیں رہا۔ اس لئے وہ دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔

جزئیات کو غیر متبدل کہنے کا نتیجہ

اس کا تلخ ترین تجربہ ہم خود اپنے ہاں کر رہے ہیں۔ فقہی قوانین، دین پر عمل پیرا ہونے کی وہ جزئیات تھیں جو صدیوں پہلے کے حالات کے مطابق فقہانے وضع اور مرتب کی تھیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے انہیں غیر متبدل قرار دے دیا۔ پہلے تو یہ چیز محض نظری تھی، اس لئے زیادہ مضر اثرات نمودار نہ ہوئے۔ لیکن اب (۱۹۸۰ء میں) جو ان جزئیات کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ ناممکن العمل ثابت ہوئے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے نوجوان اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اسلام، کسی گزشتہ زمانے میں تو چل سکنے کے قابل تھا، لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی۔ چنانچہ اُنہوں نے اسے "چلا ہوا کارتوس" قرار دے کر، متروک سمجھ لیا، اور اس طرح اصل دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ دین کو مذہب بنا لینے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

دین کی جزئیات تلاش کرنے والوں کی ایک مثال اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ حضورؐ کی اوّلین مخاطب قوم عرب تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر آپ دینِ کامل لے کر آئے ہیں، تو بتائیے کہ قرآن میں بحیرہ۔ سائبہ، وصیلہ اور حام کا ذکر کہاں ہے؟

ایک مثال

فرمایا کہ اُن کے متعلق جو عقائد تمہارے ہاں مروّج ہیں، وہ خدا کے بنائے ہوئے نہیں۔ خود تمہارے افترا کردہ ہیں۔

۵/۱۰۳ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

یاد رکھو! قانونِ خداوندی کی رو سے نہ بحیرہ کی کوئی اصل ہے نہ سائبہ کی۔ نہ وصیلہ کی نہ حام کی (یہ سب توہم پرستی کے عقائد ہیں) ان لوگوں نے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے' ان عقائد کو خود وضع کر لیا ہے اور اس کے بعد انہیں خواہ مخواہ خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی مضحکہ خیز اور احمقانہ عقائد اور رسومات کو دینِ خداوندی سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا! دینِ خداوندی تو علم و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے۔ (۵/۱۰۳)

یہ ان لوگوں کی توہم پرستیوں کے مظاہر تھے۔ وہ اونٹنی یا بکری جو دس بچے جن چکی ہو، اُس کا کان چیر کر بتوں کے نام پر

سلہ عرب جاہلیہ میں، بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے تھے (جیسے ہندوؤں کے ہاں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) اور انہیں متبرک سمجھا جاتا تھا۔ یہ اسی قسم کے مختلف جانوروں کے نام ہیں (تفصیل لغات القرآن میں دیکھئے)۔

چھوڑ دیتے تھے۔ اسے بحیرہ (سفقہ گوش) کہتے تھے۔ اسی طرح وہ بعض جانوروں کو ویسے ہی بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے (جیسے ہندو سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھائے پئیں۔ اُن سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ انہیں سائبہ کہا جاتا تھا۔ (مادہ۔ س۔ ی۔ ب)

وہ بکری جو چھ بطن ہیں دو دو مادہ بچے دے اور ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ، تو وہ اس نر بچے کو ذبح نہیں کرتے تھے اور عورتیں اس بکری کا دودھ نہیں پیتی تھیں۔ اُس بکری کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اسے الوصیلہ کہتے تھے۔ اور حام وہ نر اونٹ تھا جو مقررہ تعداد میں اونٹنیوں کو حاملہ کر چکا ہو۔ وہ اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے، اور اس سے باربرداری کا کام نہیں لیتے تھے۔

قرآن کریم نے اُن کی ان توہم پرستیوں کی تردید میں دو باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی تھی۔ یہ عقائد اُن کے اپنے ذہن کے تراشیدہ تھے۔ اور دوسرے یہ کہ خدائی سند تو ایک طرف، اس جہالت کی تائید تو عقلِ انسانی بھی نہیں کرتی تھی۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ جن عقائد و مسالک کے لئے نہ خدا کی سند موجود ہو، اور نہ وہ عقل و بصیرت کے معیار پر ہی پورے اُتریں، تو لوگ اُن کے ساتھ متمسک کس بنا پر رہتے ہیں؟ قرآن نے اس کا وہ جواب دیا جو "مذہب" کی اصل و اساس ہے، یعنی اسلاف کی تقلید:

$\frac{5}{104}$ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

تقلید اسلاف

توہم پرستارانہ رسوم کو دین سمجھنے والوں کی حالت یہ ہے کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس نظام کی طرف آؤ جسے خدا نے نازل کیا ہے اور اس کے رسول کی طرف (جو اس کے مطابق ایک عملی نظام متشکل کر رہا ہے) تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے، وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ ($\frac{2}{170}$)

(کس قدر احمقانہ ہے یہ جواب کہ جو کچھ ہمارے اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے اُس کے پرکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم اسی پر آنکھیں بند کئے چلے جائیں گے خواہ) ان کے یہ اسلاف نہ علم و بصیرت رکھتے ہوں، اور نہ ہی خدا کی بتائی ہوئی راہ پر ہوں۔

مسلکِ تقلید کی تباہ کاریوں کے متعلق اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں عنوان تقلید دیکھئے)۔
اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دوسروں کی غلط روش کی تردید کرنے کے بعد، جماعتِ مومنین کے سامنے وہ اصول پیش کیا جو شاہراہِ حیات پر روشنی کے مینار کا کام دے۔ یعنی

۵/۱۰۵ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ

اے ایمان والو! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ تمہاری ذات کی حفاظت کی ذمہ داری تمہارے اپنے اوپر ہے (تمہارے اسلاف پر نہیں) - ۲/۱۴۱ -

نہ ہی تمہیں اس سے ڈرنا چاہیئے کہ اسلاف کی روش کی خلاف ورزی سے، وہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچا دیں گے۔ بالکل نہیں اگر تم سیدھے راستے پر چلتے جاؤ گے تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اُن کے اور تمہارے سب کے اعمال خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے سامنے پیش ہوں گے اور وہیں سے یہ فیصلہ ہوگا کہ کس قسم کے اعمال کس قسم کے ہیں۔

[اس مقام پر ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ اگر تم صحیح راستے پر چلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ غلط راستے پر چلنے والے تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیں۔ لیکن یہ نقصان تمہارے طبعی جسم یا مادی اشیاء تک محدود ہوگا۔ تمہاری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اپنی ذات کو نفع یا نقصان پہنچانا خالصتاً تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کسی دوسرے کی اُس تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تم اپنی ذات کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھو۔ اس کی ذمہ داری تمہارے اپنے اوپر ہے اور اس سے تم کبھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ]

یہ آیت اور اس سے متعلقہ آیات، سابقہ صفحات میں آیت (۵/۱۰۵) کی تشریح کے سلسلے میں بھی گزر چکی ہے۔ اسے ایک نظر دوبارہ دیکھ لیجئے۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم نے (بجز مستثنیات) دین کے اصول عطا کئے ہیں اُن کی تفصیلات اور جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ ان مستثنیات میں وصیت کے متعلق حکم بھی شامل ہے اس کی تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۱۷۴ - ۱۸۴) پر گزر چکی ہے اور آیات (۵/۱۰۶-۱۰۷) بھی وہیں درج کی جا چکی ہیں۔ ان کے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ آیت (۵/۱۰۸) وہاں نہیں آئی حالانکہ وہ بھی ان آیات کے تسلسل میں آتی ہے۔ اسے یہاں درج کر دیا جاتا ہے۔

۵/۱۰۸ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۠

(قانونِ خداوندی میں شہادت پر شہادت لینے کی گنجائش اس لئے رکھ دی گئی ہے کہ اس سے) اس امر کا امکان ہے کہ گواہ حقیقت کے مطابق شہادت دیں۔ کیونکہ انہیں اس کا خدشہ ہوگا کہ دوسرے گواہوں کی شہادت سے اُن کی شہادت کی تردید ہو جائے گی۔ (اور اس طرح وہ مجرم بھی قرار پائیں گے اور معاشرہ میں ان کی بدنامی بھی ہوگی)

اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان باتوں کو دل کے کانوں سے سنو اگر تم اس راہ کو چھوڑ کر کسی دوسری راہ پر چل نکلے، تو وہ راہ تمہیں کبھی منزلِ مقصود تک نہیں لے جائے گی۔

سابقہ صفحات میں (زیر آیت ۵/۱۹ صفحہ ۴۸۳) بتایا جا چکا ہے کہ کسی قوم کو اس کے اعمال کا مکلّف (ذمہ دار) اسی صورت میں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ جب

(i) انہیں پہلے پیغاماتِ خداوندی سے آگاہ کرا دیا جائے۔ اور

(ii) ان میں ان پیغامات کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہو۔

اس سلسلے میں آیت (۵/۱۰۹) کا وہاں بھی حوالہ دیا گیا تھا۔ آیت درج ذیل کی جاتی ہے۔ اس کی تشریح آیت (۵/۱۹) کے ضمن میں سمجھ میں آ جائے گی۔

۵/۱۰۹ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○

(یہ قوانین و ضوابط معاشرہ کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ انسان کے تمام اعمال کا اثر اُس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور انہی اثرات کے مطابق اس کا مستقبل تعمیر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم جھوٹ بول کر عدالت کی نگاہِ احتساب سے بچ گئے، تو بس چھٹی پائی۔ قطعاً نہیں۔ اس کا جو اثر تمہاری ذات پر مرتب ہوا ہے، اس کا نتیجہ بہر حال سامنے آئے گا ——— اس زندگی میں نہیں تو اس کے بعد کی زندگی میں۔ جب اللہ تمام رسولوں سے پوچھے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کو کس طرح قبول کیا تھا ——— دل سے مانا تھا یا محض ظاہرداری سے ——— تو وہ کہیں گے کہ ہم تو نظر بظاہر ہی دیکھ سکتے تھے (کیونکہ عدالت اتنا ہی کر سکتی ہے) دلوں کی حالت کا علم تو تجھے (خدا) ہی کو ہو سکتا ہے۔

یہ آیت (گویا) تمہید تھی داستان حضرت عیسیٰؑ کی جن کا تذکرہ اگلی آیت میں سامنے آتا ہے۔

۵/۱۱۰ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَىٰةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًۢا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَٰٓءِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

کوائف حضرت عیسیٰؑ

اس باب میں (اے ہمارے رسول!) عیسیٰؑ کے متبعین کی حالت خاص اہمیت رکھتی ہے، اس لئے اسے خصوصیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے اس پس منظر کو سامنے لاؤ، جب اللہ عیسیٰؑ ابن مریم سے کہے گا کہ میں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو جن نعمتوں سے نوازا تھا وہ تمہیں یاد ہوں گی۔ میں نے اس وحی کے ذریعے تمہیں تائید و تقویت عطا کی تھی جو بلا آمیزش تم تک پہنچی تھی اور جس سے تمہاری دعوتِ انقلاب کو دُور دُور تک پھیل جانا تھا۔ (۲/۸۷)۔ تم ابتدائی عمر میں بھی عمدہ باتیں کیا کرتے تھے۔ اور پھر (یہودیوں کی سازش کے علی الرغم، جو تمہیں مار دینا چاہتے تھے) پختہ عمر تک پہنچ کر بھی (۳/۴۵)۔ پھر میں نے تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی یعنی تورات و انجیل کا علم دیا۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کی انقلابی قوت کی بنا پر، تم بنی اسرائیل سے کہتے تھے کہ میں تمہیں ایسی حیاتِ نو عطا کر دوں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر، فضا کی بلندیوں میں اُڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔ (۳/۴۹)

یہ آسمانی روشنی، تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی جس پر تر و تازگی کا نشان تک باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی، اور تمہاری وہ پست خصلتیں دور ہو جائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ مختصراً یہ کہ وہ ذلت و خواری کی موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے مسلط ہے ایک نئی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔ (۲/۴۸، ۳/۱۱۱، ۶/۱۲۳)

تم (اے عیسیٰؑ!) اس قوم کے لئے یہ کچھ کر رہے تھے اور وہ لوگ تمہاری جان کے لاگو ہو رہے تھے۔ لیکن میں نے ان کی سازشوں کو ناکام بنا دیا اور انہوں نے ان حقائق سے یہ کہکر انکار کر دیا کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات اور دیگر کوائف حیات اس جلد کے دوسرے باب میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت، آیت (۳/۴۸) کے ذیل میں آچکی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں آیات کے الفاظ بھی قریب قریب یکساں ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں کی دست برد سے کیسے محفوظ رکھا گیا تھا اس کے متعلق بھی اسی باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کا ذکر ہے۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (۵/۱۱۱)

حواری

اور جب میں نے تمام حواریوں کو (انجیل میں بذریعہ وحی) حکم دیا تھا (جس طرح اب جماعت مومنین کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے) کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں۔ اس پر انہوں نے کہا تھا کہ ہم ایمان لائے۔ تم گواہ رہنا کہ ہم نے قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے کوائف اور ان کی بلندی کردار کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۹۶) نیز اس جلد کے باب دوم میں آیت (۳/۵۱) کے تحت۔ لہٰذا اس آیت میں جو ان کے ایمان لانے کا ذکر ہے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس میں ایک لفظ ایسا ہے جس کی نہ صرف وضاحت کی ضرورت ہے بلکہ اس کا غور سے سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ اور وہ لفظ ہے "اَوْحَيْتُ" (میں نے ان کی طرف وحی کی) وحی کے متعلق گزشتہ جلدوں میں مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے بکثرت لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں بالخصوص عنوانات، وحی۔ کلام۔ کشف و الہام۔ نبی۔ ہدایت وغیرہ دیکھئے) ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو گی کہ:

وحی کا تفصیلی مفہوم

۱۔ وحی اس علم کا نام تھا جو حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف براہ راست ملتا تھا اس میں صاحب وحی کی اپنی فکر، خیالات، کسب و ہنر، کوشش، حتیٰ کہ ارادہ تک کو بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ اس قسم کا علم حضرات انبیاء کرامؑ کے سوا کسی کو نہیں ملتا تھا، اور ختم نبوت کے بعد اس کا سلسلہ ویسے ہی ختم ہو گیا۔

لیکن قرآن کریم کی اس قدر وضاحت و صراحت کے باوجود گمراہی پھیلانے والوں کو ابلہ فریبی اور مغالطہ آفرینی

کے ہزار بہانے مل جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وحی غیر از نبی کو بھی مل سکتی ہے۔ اور اس کی تائید میں خود قرآن مجید کی کچھ آیات پیش کر دیں۔ انہی میں ایک آیت یہ بھی ہے۔ (یعنی ۵/۱۱۱) جس میں "اَوْحَیْتُ" کا لفظ حواریوں کے لئے آیا ہے۔ اس سے یہ حضرات یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری تو نبی نہ تھے۔ جب ان کی طرف وحی ہو سکتی تھی تو دیگر "غیر از انبیاء" کی طرف کیوں نہیں ہو سکتی؟ ان کی اس مغالطہ آفرینی کی تردید ہے جس کے لئے ہم نے کہا ہے کہ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ لغت کی رُو سے لفظِ وحی کا کیا مفہوم ہے۔ اس کی تفصیل میری "لغات القرآن" میں ملے گی۔ اس تفصیل کا ملخص یہ ہے کہ عربی زبان میں:

(i) اَلْوَحْیُ کے معنی ہیں نہایت تیز اشارہ۔ یعنی کسی سے اِشَارَۃً اور نہایت تیزی سے کچھ کہنا۔

(ii) اس کے معنی ہیں کتابت، یعنی کسی کو کچھ لکھ کر دینا۔

(iii) اَوْحیٰ کے معنی ہیں کسی کو حکم دینا۔ یا وہ بات جسے کسی تک پہنچا دیا جائے، اور اسے اس کا علم ہو جائے۔ خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو —— مخفی طور پر یا ظاہر۔

(iv) اَوْحیٰ اِلَیْہِ کے معنی ہیں کسی کی طرف اپنا پیغامبر بھیجنا۔

ان معانی کی رُو سے قرآنِ کریم نے اس فطری جبلّت کو بھی وحی سے تعبیر کیا ہے جو اشیاءِ کائنات میں (انسان کے سوا دیگر اشیاء میں خواہ وہ جاندار ہوں یا غیر جاندار) ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے اور جس کے مطابق وہ مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ (مثلاً) فلکیاتی کرّوں کے متعلق کہا: وَاَوْحیٰ فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲) "خدا نے ہر سماء (کرّہ) کی طرف اپنا امر (حکم) وحی کر رکھا ہے۔ زمین کے متعلق ہے: اِنَّ رَبَّکَ اَوْحیٰ لَهَا ۝ (۹۹/۵) "وہ ایسا اس لئے کرے گی کہ خدا نے اس کے متعلق اس کی طرف وحی کر رکھی ہے"۔ شہد کی مکھی کے متعلق ہے: وَاَوْحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (۱۶/۶۸) "تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر رکھی ہے"۔ ان آیات میں وحی سے مراد وہ جبلی ہدایات ہیں جو ان اشیاء کے اندر رکھ دی گئی ہیں، اور جن کی رُو سے، ہر ایک "اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتے ہیں"۔ (۲۴/۴۱)

۲۔ قرآن کریم میں ہے کہ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی۔ (۲۸/۷ ، ۲۰/۳۸) ۔ ہم نے اُمّ موسیٰؑ کی طرف یہ حکم یا پیغام بھیجا کہ خطرہ لاحق ہو تو اس بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دینا۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم کسی نبی کی معرفت بھیجا گیا ہوگا۔

۳۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق فرمایا کہ وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ (۵/۱۱۱)۔ امام راغب اور دیگر اربابِ لغت نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ حکم ہے جو انہیں حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے دیا گیا

تھا جیسا کہ ہر اُمتی کو اس کے رسول کی وساطت سے احکام دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ اور ایک وحی وہ ہے جو صرف حضراتِ انبیاء کرامؑ کی طرف بھیجی جاتی تھی۔ یہ قرآن کریم کی اہم اصطلاح ہے، اور اسے کسی غیر از نبی کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ اس اصطلاح کا مفہوم ہے وہ علم جو خدا کی طرف حضرتِ انبیاءِ کرامؑ کو براہِ راست ملتا تھا۔ اگر کوئی شخص اب اس کا مدعی ہے کہ اسے خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم ملتا ہے، تو وہ یا تو فریب خوردہ ہے اور یا فریب کار۔ دونوں صورتوں میں اس کا دعویٰ نبوّت کا ہے، جو باطل ہے اور کذب وافترا مبنی، خواہ وہ اسے وحی کہکر پکارے، اور خواہ کشف و الہام یا مبشرات جیسے الفاظ کے پردوں میں لپیٹ کو پیش کرے خدا کی طرف سے براہ راست علم، حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا، اور اب وہ قرآن مجید کے اندر موجود اور محفوظ ہے۔ نہ وہ اپنی غیر محرف شکل میں، قرآن سے باہر کہیں ہے اور نہ ہی، ختم نبوت کے بعد، قیامت تک کسی کو مل سکتا ہے۔ صوفیا کے کشف و الہام کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ (اس سلسلہ میں انڈکس میں تصوّف کا عنوان دیکھئے)۔

اس کے بعد آیات (٥/١١٥-١١٢) میں "مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" (آسمانی رزق) کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ مقام بھی بڑا اہم ہے، اور اس کے ساتھ بڑا نازک بھی ہے، اس لئے ہم اسے تفصیل سے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے ہم پہلے ان ایات کو درج کرتے ہیں، پھر ان کے مروّجہ ترجمہ کو۔ اس کے بعد اس کے متعلق، جو کچھ روایات کی رُو سے ہماری کتبِ تفاسیر میں آیا ہے، اسے پیش کریں گے۔ اور آخر میں ان کا قرآنی مفہوم۔ پہلے یہ آیات دیکھئے:

مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ

٥/١١٢ إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥

٥/١١٣ قَالُوْا نُرِيْدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ٥

٥/١١٤ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّأَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَ أَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ٥

٥/١١٥ قَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّيْٓ أُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهٗٓ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ٥

شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ نے ان آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

(۵/۱۱۲) جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰؑ مریم کے بیٹے کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے، بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے۔

(۵/۱۱۳) بولے کیا ہم چاہتے ہیں کہ کھاویں اُس میں سے اور مطمئن ہو جاویں ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور رہیں ہم اُس پر گواہ۔

(۵/۱۱۴) کہا عیسیٰؑ مریم کے بیٹے نے اے اللہ رب ہمارے اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن عید رہے ہماری پہلوں اور پچھلوں کے واسطے۔ اور نشانی ہو تیری طرف سے اور روزی دے ہم کو اور تو ہی ہے سب سے بہتر روزی دینے والا۔

(۵/۱۱۵) کہا اللہ نے میں بے شک اُتاروں گا وہ خوان تم پر پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد تو میں اُس کو وہ عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دوں گا جہان میں۔

اب ان کی تفسیر کی طرف آئیے۔ (جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے) تفسیر ابن کثیر کا شمار بڑی مشہور مستند اور قابلِ اعتماد تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں آیاتِ قرآنی کی تفسیر، روایات کی رُو سے کی گئی ہے۔ اس تفسیر میں، مندرجہ بالا آیات کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے:

تفسیر کی رُو سے

حضرت عیسیٰؑ نے پہلے تو اُنہیں سمجھایا، لیکن اُن کی نیک نیتی کے اظہار پر خدائے تعالیٰ سے دُعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، ساتھ ہی دھمکا بھی دیا۔ پھر فرشتوں کے ہاتھوں آسمان سے خوانِ نعمت اتارا جس پر سات مچھلیاں تھیں، سات روٹیاں تھیں۔ جہاں یہ تھے وہیں وہ اُن کے کھانے کو رکھ گئے، سب بیٹھ گئے اور شکم سیر ہو کر اٹھے۔ ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ اس مائدہ آسمانی میں گوشت روٹی اُترا تھا۔ حکم تھا کہ خیانت نہ کریں، کل کے لئے نہ لے جائیں۔ لیکن اُنہوں نے حکم کی خلاف ورزی کی، لے بھی گئے اور چُرا بھی لیا جس کی سزا میں وہ سؤر، بندر بن گئے۔ حضرت عمارؓ فرماتے ہیں، اس پر جنت کے میوے تھے۔ آپ فرماتے ہیں، اگر وہ لوگ خیانت اور ذخیرہ نہ کرتے تو وہ خوان یوں ہی رہتا، لیکن شام ہونے سے پہلے ہی اُنہوں نے چوریاں شروع کر دیں۔ پھر سخت عذاب کیے گئے۔ اسحٰق بن عبداللہ فرماتے ہیں، جن لوگوں نے مائدہ آسمانی میں سے چرایا، اُن کا خیال یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ختم ہو جائے اور کل کے لئے ہمارے پاس کچھ نہ رہے۔ مجاہدؒ سے مروی ہے کہ جب وہ اُترتے اُن پر مائدہ اُترتا۔ عطیہؒ فرماتے ہیں کہ وہ تھی تو مچھلی لیکن اُس میں ذائقہ ہر چیز

کا تھا۔ وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں ہر دن اس مائدہ پر آسمان سے میوے اُترتے تھے۔ قسم قسم کی روٹیاں وہ کھاتے تھے، چار ہزار آدمی ایک وقت اُس پر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر اللہ کی طرف سے غذا کی تبدیلی ہو جاتی۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر روٹیاں جَو کی تھیں۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں اس پر تمام چیزیں تھیں سوائے گوشت کے۔ عکرمہؒ فرماتے ہیں روٹی چاولوں کی تھی۔ حضرت وہبؒ فرماتے ہیں کہ ان کے اس سوال پر حضرت عیسیٰؑ بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ اور فرمایا تھا کہ زمین کے رزق پر قناعت کرو اور آسمانی دسترخوان نہ مانگو، اگر وہ اترا تو چونکہ زبردست نشان ہوگا اگر ناقدری کی تو بُری طرح پکڑے جاؤ گے۔ ثمودیوں کی ہلاکت کا باعث بھی یہی ہوا کہ اُنہوں نے اپنے نبی سے نشان طلب کیا تھا، لیکن حواریوں نے جناب عیسیٰؑ کی ایک نہ مانی اور اصرار کیا کہ نہیں آپ ضرور دعا کیجئے۔

مندرجہ بالا مچھلی کی مزید تفصیل یوں دی گئی ہے :-

اس خوان کے اوپر ایک رومال تھا جب رومال اٹھایا گیا تو سب نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی لمبی چوڑی اور موٹی بھنی ہوئی سالم مچھلی ہے جس کے اوپر چھلکا نہیں کانٹے ہیں۔ گھی اس میں سے بہ رہا ہے۔ اس میں ہر قسم کی سبزیاں ہیں سوائے گندنا اور مولی کے۔ اس کے سر کے پاس سرکہ رکھا ہے اور دُم کے پاس نمک ہے۔ سبزیوں کے پاس پانچ روٹیاں ہیں ......
(حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے مزید معجزہ کی درخواست کی تو) آپ نے مچھلی سے کہا کہ تو جیسے پہلے تھی ویسی ہی دوبارہ ہو جا اسی وقت اللہ کی قدرت سے وہ زندہ ہوگئی اور ہل جل کر چلنے پھرنے لگی اور آنکھیں جھپکنے لگ گئی۔ دیدے کھل گئے اور شیر کی طرح منہ پھاڑنے لگی۔ (اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے حکم سے وہ پھر ایسی ہوگئی اور) تیرہ سو آدمیوں نے پیٹ بھر کر کھایا لیکن وہ کھانا مطلقاً کم نہ ہوا۔　　(تفسیر ابن کثیر۔ ساتواں پارہ۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۲-۳۰)

ان آیات کا مروجہ ترجمہ اور تفسیر آپ نے دیکھ لی۔ اب آیئے قرآن کریم کی طرف۔ آیت (۵/۱۱۴) کے دو الفاظ وہ کلید ہیں جو تفسیر کے تالوں کو نہایت عمدگی سے کھول دیتے ہیں۔ وہ الفاظ ہیں وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۔ یعنی ان آیات میں خدا کی طرف سے رزق ملنے کی بات کی گئی ہے۔ انڈکس میں، رزاقیت۔ رزق اور معاشی نظام کے عنوانات دیکھئے۔ بات سمجھ میں آجائے گی کہ

قرآنی مفہوم

۱۔ جس رزق میں کسی انسان کو دوسرے انسان (یا انسانوں) کا دست نگر اور محتاج ہونا پڑے، وہ رزق باعثِ تذلیل انسانیت ہے، اور رزقِ حرام۔

۲۔ جو رزق اس نظام کی رُو سے ملے جو قوانین خداوندی کی رُو سے قائم ہوتا ہے، اس میں شرف و تکریم آدمیت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آتی۔ وہ رزق طیب، کریم اور حلال ہے۔

۳۔ حضراتِ انبیاء کرام، اسی قسم کے نظام قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ فراہمی رزق اس نظام کے بنیادی مقاصد میں سے تھا۔

قرآنِ کریم کے ان بنیادی حقائق کی روشنی میں ان آیات کے اس مفہوم کو لیجئے جسے راقم الحروف نے "مفہوم القرآن" میں پیش کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

اُس کے بعد اُس جماعتِ مومنین نے اے عیسیٰؑ تم سے کہا تھا کہ کیا ہمارا نشوونما دینے والا ہماری اس آرزو کو پورا کردے گا کہ ہم معاش کے لئے غیروں کے محتاج نہ رہیں اور ہمارے لئے سامانِ نشوونما خدا کے نظامِ ربوبیت سے ملا کرے ـــــ یعنی معیشت کے موجودہ "ارضی نظام" کی جگہ "سماوی نظام" قائم ہو جائے۔ اس کے جواب میں تم نے اُن سے کہا تھا کہ جب تم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ جب تم ایسا کرو گے تو اس کا وہ نظام قائم ہو جائے گا۔ جس میں رزق کی ذمہ داری خود نظام کے سر ہو گی۔ افراد پر نہیں ہو گی۔ ($\frac{5}{112}$)

اُنہوں نے کہا کہ ہماری تو دلی خواہش یہی ہے کہ ہم بلا منتِ غیرے، نظامِ ربوبیت ہی سے رزق حاصل کریں تاکہ اس طرف سے ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے اور ہمیں یقین آجائے کہ جو کچھ تو ہم سے کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر شہادت دیں ($\frac{5}{113}$)

اس پر تم نے (اے عیسیٰؑ) ہمارے حضور التجا کی تھی۔ کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان، نظامِ ربوبیت کی رو سے عطا ہو جائے تاکہ یہ چیز اس جماعت کے السابقون الاوّلون (سب سے پہلے ایمان لانے والوں) کے لئے بھی جشنِ مسرت کا موجب ہو، اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔ نیز یہ تیرے قانون کی صداقت کی عملی نشانی بن جائے۔ تو ہمیں اس طرح سامانِ زیست عطا فرما۔ اس لئے کہ جو رزق تیرے نظام کی رو سے ملے وہ اُس سے کہیں بہتر ہوتا ہے جو انسانوں کی وساطت سے حاصل ہو ـــــ انسانوں کے ہاتھ سے ملنے والے رزق سے تو پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔ اس رزق سے تو موت اچھی ہے۔ ($\frac{5}{114}$)

(آیت $\frac{5}{115}$) کا مفہوم بعد میں پیش کیا جائے گا۔

معاشی نظام چونکہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مشن اس قسم کا معاشی نظام قائم کرنا ہوتا تھا (خواہ وہ ابتدائی دور میں اپنی جماعت تک محدود ہو، اور خواہ اپنی مملکت قائم ہو جانے کے بعد، عالمگیر ربوبیت کی شکل میں)۔ اس لئے ظاہر ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ نے بھی اس قسم کا نظام قائم کیا ہو گا۔ ویسے تو سابقہ انبیاء کرام میں سے

ہر ایک کی یہی کیفیت تھی، لیکن حضرت عیسیٰؑ کے صحیح کوائفِ حیات اور ان کے مشن کی تفاصیل (بجز اُن کے جو قرآن کریم میں آئی ہیں) کہیں نہیں ملتیں۔ جو کچھ وہاں ملتا ہے، وہ اُن کی شانِ نبوّت کے خلاف ہے اور مقاصدِ رسالت کے بھی خلاف۔ بایں ہمہ، مُحرّف ریکارڈ میں کچھ ایسے نشانات مل جاتے ہیں جن سے ترشح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی جماعت میں نظامِ ربوبیت کی طرح ڈال دی تھی۔ اس کے متعلق (اسی جلد کے) باب ووم میں معاشی انقلاب کے عنوان کے تحت کچھ تصریحات پلیٹ کر دی گئی ہیں۔

عید کے معنی ضمناً۔ (آیت ۵/۱۱۴) میں لفظ عِیْد آیا ہے۔ عید کے لغوی معنی ہیں، وہ وقت جب خوشی (یا غم) لوٹ کر (بار بار) آئے۔ اصطلاحاً اسے بار بار آنے والے جشنِ مسرّت کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اسی مقام پر آیا ہے (ہماری عیدوں کے متعلق قرآن میں نہیں آیا)

اب آئیے آیت (۵/۱۱۵) کی طرف۔ اس نظام نے "رزقِ کریم" کا انتظام کر دیا۔ لیکن کہا یہ کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اب تم جو جی چاہے کرو، یہ رزق اسی طرح سے ملتا رہے گا۔ یہ رزق تو اس نظام سے مشروط ہے۔ اور اس نظام کا قائم رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر تم نے اسے قائم رکھا تو رزق کا یہ چشمہ جاری رہے گا۔ اگر اس کی طرف سے تغافل برتا یا اسے ترک ہی کر دیا، تو اتنا ہی نہیں کہ یہ رزق ملنا بند ہو جائے گا، تم روٹی کے لئے اس طرح غیروں کے محتاج ہو جاؤ گے کہ در در سے ٹکڑے مانگتے پھرو گے، اور ذلّت اور رُسوائیاں سایہ کی طرح تمہارا پیچھا کریں گی۔ آیت (۵/۱۱۵) میں اس کی وضاحت کی گئی ہے:

> اس پر ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہارے رزق کا اسی طرح انتظام کر دیں گے[1]۔ لیکن اپنے مُتّبعین سے کہہ دو کہ اگر تم نے اس نظام کی صحیح صحیح قدر دانی نہ کی اور جن بنیادوں پر اسے قائم کیا گیا ہے، تم اُن سے پھر گئے، تو اس کی ایسی سزا ملے گی جو دنیا میں کسی اور قوم کو نہ ملی ہو۔ (۵/۱۱۵)

یہ عذاب کس طرح اور کس شکل میں آتا ہے، اس کے لئے ہمیں کسی دوسری قوم کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں

---

[1] حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی جماعت کی زندگی کے جو بچے کھچے حالات تاریخ میں ملتے ہیں (جس میں خود اناجیل بھی شامل ہیں) اُن میں اسی نظامِ معیشت کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ دیکھئے عہد نامہ جدید میں "رسولوں کے اعمال" باب نمبر ۲ آیات نمبر ۴۶-۴۴، باب نمبر ۴ آیات نمبر ۳۵-۳۲۔ رسول اللہؐ کے عہدِ مبارک میں یہ نظام اُبھر کر سامنے آگیا تھا۔

یہ تو خود ہماری اپنی داستان ہے۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا، اور اس سے کس طرح رزقِ کریم جھولیاں بھر بھر کر" ملا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اس نظام کو پسِ پشت ڈال دیا تو پھر جس ذلّت وخواری کے عذاب میں گرفتار ہو گئے، اس کے لئے کہیں باہر سے شہادات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری حالت خود اس پر شاہد ہے۔

عیسائیوں کے باطل عقائد کی تردید

آیات (۵/۷۵-۷۱) میں نصاریٰ کے اُن باطل عقائد کا ذکر آیا تھا جو اُنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں وضع اور اختیار کر رکھے تھے۔ وہیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو کس طرح اس قسم کے عقائد سے مجتنب رہنے کی تاکید اور تنبیہ کی تھی۔ اس کو باندازِ دگر یہاں دُھرایا گیا ہے جب کہا کہ

۵/۱۱۶ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ (۵/۱۱۶)

اس کے بعد خدا (اپنے رسول) عیسیٰؑ سے پوچھے گا کہ تمہارے بعد، تمہارے نام لیواؤں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو معبود بنا کر، خدائی کا درجہ دے دیا تھا اور کہتے تھے کہ یہ خود تمہاری تعلیم تھی۔ کیا تم نے ان سے ایسا کہا تھا؟ (یہ تھی وہ بات جس کا ذکر ۵/۱۱۱ میں آیا تھا اور جس کے لئے یہ پسِ منظر سامنے لایا گیا ہے)

وہ اس کے جواب میں کہے گا کہ تیری ذات اس سے بلند ہے کہ تیرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے۔ مجھے بھلا یہ کب زیب دیتا تھا کہ میں کوئی ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق حاصل نہیں تھا؟ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ تجھ سے کیسے مخفی رہ سکتی تھی! یہ تو ہو سکتا ہے (اور امرِ واقعہ بھی یہی ہے) کہ جن باتوں کا علم تو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہے، وہ میرے (یا کسی اور کے) علم میں نہ آسکیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تیرے بندوں کے دل میں جو بات ہو، وہ تجھ سے پوشیدہ رہ جائے؟ تُو، تو ہر سربستہ راز اور مستقبل میں واقع ہونے والے حوادث تک سے واقف ہے۔ (اس لئے اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو وہ تجھ سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی؟) (۵/۱۱۶)

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے، حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ
۵/۱۱۷ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (۵/۱۱۷)

میں نے ان سے وہی کچھ کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ یعنی یہ کہ تم صرف اللہ کی عبودیت اختیار کرو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور میرا بھی جب تک میں ان میں رہا۔ ان کا نگران رہا (کہ وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں) لیکن جب تو نے مجھے وفات دے دی تو میری نگرانی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد تو ہی ان کا نگہبان تھا ــــ انہی کا کیا، تو تو کائنات کی ہر شے کا نگران و نگہبان ہے!

دوسرے باب میں حیات و وفات حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، زیر نظر آیت اس کی مزید وضاحت کر رہی ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے دو ہی ادوار کا ذکر ہے۔ "مَا دُمْتُ فِيْهِمْ ــــ جب تک میں ان میں تھا ــــ یہ آپ کی دنیاوی زندگی تھی۔ "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" ــــ اور وفات پا کر دنیا سے چلے جانے کا دور ــــ اس میں نہ آسمانوں پر زندہ رہنے کا ذکر ہے، نہ دوبارہ دنیا میں آنے کا ذکر۔

(ضمناً) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے سلسلہ میں بخاری کی جو (وضعی) روایت نقل کی گئی تھی (دیکھئے دوسرا باب صفحہ ۱۲۳) اس میں جو الفاظ حضورؐ کی طرف منسوب کئے گئے تھے، وہ وہی ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ یعنی وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو باطل عقائد وضع کر رکھے تھے، وہ سب "کفارہ" تک پہنچنے کے ذرائع تھے۔ یعنی اس عقیدہ تک پہنچنے کے کہ حضرت مسیحؑ نے صلیب پر چڑھ کر اپنے امتیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اسی آیت میں (حضرت عیسیٰؑ کی زبانی) اس عقیدہ کی بھی تردید کر دی گئی۔ انہوں نے بدرگاہِ باری تعالیٰ مزید عرض کیا کہ:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ
۵/۱۱۸ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۵/۱۱۸)

انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اس کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا جرم، سزا کا مستوجب ہے تو انہیں

اُس سے مجالِ سرتابی کیسے ہو سکتی ہے ؟ وہ تو تیرے بندے ہیں۔ اور اگر وہ ایسا ہے کہ اُن کے دوسرے اعمال اُس کی تلافی کر سکتے ہیں، تو وہ سزا سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں فیصلہ تیرے قانون مکافات کی رو سے ہوگا جو سرتا سر حکمت پر مبنی ہے اور اس کے نفاذ کا تجھے پورا پورا اختیار حاصل ہے (اپنے آپ کو میری طرف منسوب کرنا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا)

ارشاد باری تعالیٰ ہوا:

۵/۱۱۹ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۵/۱۱۹)

اللہ کہے گا کہ یہ اعمال کے نتائج کے ظہور کا دن ہے۔ اس میں صرف اُن لوگوں کا ایمان اُنہیں فائدہ دیگا جو اپنے دعوئے ایمان میں سچے تھے۔ یعنی اُنہوں نے اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے سچ کر دکھایا تھا۔ اُن کے لئے ایسی پُربہار زندگی ہے جس کی شادابیاں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گی۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھا تو خدا کے قانونِ مکافات نے اُنہیں اپنے ثمرات و برکات سے ہمکنار کر دیا۔ یہ یقیناً بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

یعنی افراد ہوں یا اقوام۔ ان کے فیصلے خدا کے قانون مکافات عمل کی رو سے ہوں گے اس میں نہ کسی کی سفارش (شفاعت) کا دخل ہوگا نہ کفارہ کا (وضاحت کے لئے انڈکس کی رو سے متعلقہ عنوانات دیکھئے)

اور یہ قانون اس خدا کا ہے جس کا اقتدار تمام کائنات کو محیط ہے۔

۵/۱۲۰ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ؑ

یہ ہے خدا کا قانونِ مکافات جو کائنات کے گوشے گوشے میں جاری و ساری ہے اس لئے کہ تمام کائنات اقتدار خداوندی کے تابع ہے۔ اس پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

یوں رسولوں کی شہادت، ان کی غلط رو متبعین کے خلاف جائے گی (۵/۱۰۹) چہ جائیکہ وہ ان کی سفارش کریں، یا اُن کے گناہوں کا کفارہ بن سکیں!

(اس آیت پر سورت المائدہ اختتام پذیر ہوجاتی ہے۔ فالحمد للہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

جلد پنجم

آغاز سورۃ الانعام (سورۃ ع ۶)

پہلا باب

تلبیسِ براہیمیؑ

۱ ——— سنت اللہ اور کلمات اللہ

۲ ——— انسان کے صاحب اختیار اور خدا کے صاحب اختیار ہونے میں فرق

۳ ——— نظام اسلامی کی بنیادی خصوصیت ——— ربوبیت

۴ ——— ختم نبوّت کی محکم دلیل

۵ ——— معجزات طلبی اور اس کا انکار

۶ ——— نظام سرمایہ داری کا استیصال

۷ ——— نیند اور موت میں فرق ——— نفس غیر شعوریہ

۸ ——— اعمال نامہ جو گردن میں معلّق رہتا ہے

۹ ——— حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ جلیلہ

۱۰ ——— مؤدة فی القربیٰ کا صحیح مفہوم

۱۱ ——— خدا کے ہاں "ذادی جانے" کا مفہوم

۱۲ ——— خدا کا ادراک آنکھوں سے نہیں ہوسکتا

اہلِ تصوّف کا پیدا کردہ الجھاؤ۔

۱۳ ——— اقوام کی موت وحیات کا قرآنی مفہوم

۱۴ ——— حرام وحلال کی بابت خدا کا فیصلہ

ذبیحہ پر خدا کا نام لینا۔

۱۵ ——— "اگر خدا چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے" ——— اس عقیدہ کی تردید

پہلا باب

سُوْرَۃُ الْاَنْعَام — (۶)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۶/۱ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ ط ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ○

کائنات کا گوشہ گوشہ اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے (۱/۶) اس میں ظلمت اور نور۔ تاریکی اور اجالے کی نمود بھی اُسی کے قانون کے مطابق ہوتی ہے (یہ نہیں کہ، جیسا کہ مجوسیوں کا عقیدہ ہے، تاریکی کا خدا' اہرمن ہے اور روشنی کا خدا' یزداں ہے)۔ یہ ان لوگوں کی غلط نگہی ہے جو توحید کا انکار کر کے خدا کے ساتھ اوروں کو بھی برابر کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

قرآنِ مجید (سورہ فاتحہ) کا پہلا لفظ حمد ہے جس کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اوّل (ص۳) میں بتایا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذباتِ تحسین بے ساختہ بیدار ہوں ان کے والہانہ اظہار کو عربوں کے ہاں حمد' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے شرطِ اوّل یہ ہے کہ جس شاہکار کی ستائش کی جارہی ہو وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شئے ہونی چاہیئے۔ وہاں (سورہ فاتحہ میں) خدا کی ربوبیتِ عالمینی کو وجۂ حمد قرار دیا گیا تھا۔ یہاں تخلیقِ ارض و سمٰوات کو سامنے لایا گیا ہے۔ ارض و سماء (کائنات) خدا کا کس قدر عظیم تخلیقی شاہکار ہے اس کے متعلق انڈکس میں ارض و سمٰوات۔ تخلیق۔ علماء۔ کائنات وغیرہ کے عنوانات نیز جلد چہارم میں آیات ۳/۱۸۹-۱۹۰ کے تحت دیکھئے۔

ظلمت اور نور (تاریکی اور روشنی) کے متعلق مطالب جلد اوّل ص۲۶۱ اور جلد سوم ص۴۵۲ میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ ایک تاریکی اور روشنی' خارجی کائنات کی ہے۔ اور دوسری انسانی دُنیا کی۔ انسانی

دُنیا میں باطل تصوّرات اور نظریاتِ حیات کو تاریکی سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اُن سے زندگی کی صحیح راہیں روشن

نور و ظلمت

نہیں ہوتیں اور وحی کے عطا کردہ نظریات کو نور کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ "جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ" (خدا نے تاریکی اور روشنی کو بنایا۔ جہاں تک خارجی کائنات میں تاریکی اور روشنی کا تعلق ہے، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ خدا کے متعیّن کردہ طبیعی قوانین (تکویرِ شمس و قمر اور گردش لیل و نہار) کے مطابق رونما ہوتی ہیں۔ لہٰذا جَعَلَ (اُس نے بنایا) سے مراد ہے اُس کے قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہونے والے تغیرات۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے خدا کی نازل کردہ (وحی) نور ہے۔ جو شخص اس نور سے استفادہ نہیں کرتا وہ تاریکی میں رہتا ہے، اسی طرح جیسے سورج اپنی روشنی کو عام کرتا ہے۔ لیکن جو شخص اپنی آنکھیں بند کرلے اُس پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی نور اور ظلمت خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ خارجی کائنات ہو یا انسانی دُنیا، جو کچھ خدا کے قانون کی رو سے واقع ہو اُسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ خواہ وہ (انسانی دنیا میں) کسی کے ہاتھوں سرانجام پائے۔ تفصیل اِس نکتہ کی مطالب جلد اوّل (ص ۱۸۴) میں ملے گی۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی دنیا سے متعلق امور میں جب (قرآن مجید میں) یہ کہا جائے کہ خدا نے ایسا کیا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ خدا کے قانون کی رو سے ایسا ہوا، خواہ اس کا کرنے والا کوئی ہو۔

نور و ظلمت کے مذکورہ بالا مفہوم سے مجوسیوں (پارسیوں) کے اِس عقیدہ کی بھی تردید ہوگئی کہ اہرمن (تاریکی یعنی شیطان) اور یزداں (روشنی یعنی خدا) دو مستقل بالذّات قوتیں آپس میں نبرد آزما ہیں۔ نیز خیر و شر کا مسئلہ بھی حل ہوگیا جس نے دانشورانِ عالم کو خواہ مخواہ پریشان کر رکھا ہے (دیکھئے انڈکس میں "خیر و شر")

تخلیق ارض و سموات (خارجی کائنات) کی طرح انسانی تخلیق بھی خدا کا شاہکار ہے۔ اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

۶/۲ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝

تاریکی اور روشنی تو پھر بھی کرّوں کی گردش کا نتیجہ ہے۔ خدا تو وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی اور پھر (تمہاری طبیعی زندگی کے لئے) ایک میعاد ٹھہرا دی۔ افراد کی موت و حیات کے علاوہ، اقوام کی موت و حیات کے لئے بھی ایک میعاد ہوتی ہے۔ یہ میعاد قانونِ خداوندی کے مطابق متعیّن

ہوتی ہے[1]۔ لیکن اس کے باوجود تم اس باب میں خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر رہے ہو۔

قانونِ موت وحیات | تخلیق انسان کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم کے ابتدائی باب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ موت وحیات سے متعلق بحث کے لئے انڈکس دیکھئے اور اس سوال کے جواب کے لئے کہ "کیا موت کا وقت مقرر ہے یا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟" **جلد چہارم۔ صفحات ۲۵۲-۲۵۳ ملاحظہ کیجئے**

(طبیعی دنیا میں (خواہ وہ خارجی کائنات ہو، خواہ خود انسان کی طبیعی زندگی) قوانینِ خداوندی کے تذکرہ کے بعد اس حقیقت کو اُجاگر کیا کہ انسان کی "انسانی زندگی" میں بھی اُسی کے قوانین کارفرما ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ جو قوم ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرے گی اُس کی زندگی کی راہیں روشن ہوں گی۔ جو ان سے آنکھیں بند کرے گی، اُس پر تاریکی چھا جائیگی۔)

۶/۳ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۙ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ○

لہٰذا تم یہ نہ سمجھ لو کہ خدا کا قانون، خارجی کائنات تک ہی محدود ہے۔ انسانوں کی زندگی اُس کے دائرۂ اثر و نفوذ سے باہر ہے (۲۹/۶۱-۶۳)۔ کائنات میں بھی اُسی کا قانون نافذ العمل ہے اور تمہاری تمدنی اور معاشی زندگی میں بھی اُسی کا قانون۔ (۲۱/۲۱-۲۲ ، ۴۳/۸۴)۔ وہ تمہاری اُن باتوں سے بھی واقف ہے جو اُبھر کر سامنے آتی ہیں اور اُن سے بھی جو چھپی رہتی ہیں۔ (وہ تمہاری مضمر اور مشہود، دونوں صلاحیتوں کو جانتا ہے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے باخبر ہے۔

ارض وسماء میں الٰہ | اللہ تعالیٰ کے الٰہ الارض اور الٰہ السماء ہونے کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۳۰) میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ آیت زیرِ نظر کے آخری الفاظ سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کوئی سا نظامِ حیات اختیار کر لے، اُس کے نتائج (اُس کی اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ) قوانینِ خداوندی کے مطابق

---

[1] افراد کی مدتِ حیات خدا کے طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے (۳/۱۴۴ ، ۵۶/۶۰)۔ اور انہی کے مطابق عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے (۳۵/۱۱)۔ اسی طرح قوموں کی موت وحیات کے لئے بھی قانون مقرر ہے۔ (مدت پہلے سے مقرر نہیں۔ قانون مقرر ہے) جس کے مطابق وہ قوم اپنی زندگی کی مدت خود مقرر کرتی ہے (۱۵/۴ ، ۱۳/۳۸ ، ۷/۳۴)۔ جب اس قانون کے مطابق کسی قوم کی زندگی کے دن ختم ہو جاتے ہیں تو اُسے اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ (۷/۳۴)

برآمد ہوں گے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنا انسان کی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔

۶/۴ وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝

لیکن اس کے باوجود، لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ (خدا کے کائناتی قوانین یعنی قوانینِ فطرت کے تو اس درجہ قائل ہیں کہ ان پر علوم سائنس کی اتنی عظیم عمارت قائم کر رکھی ہے لیکن) جب اُسی خدا کی طرف سے، (ان کی تمدنی اور معاشی زندگی سے متعلق) کوئی قانون سامنے آتا ہے تو اُس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مجید اپنے انداز کے مطابق سب سے پہلے اپنی اوّلیں مخاطب قوم کو، اُن کی غلط روی کے انجام سے متنبہ کرتا ہے اور اپنے دعویٰ کی شہادت میں اقوامِ گزشتہ کے انجام کو سامنے لاتا ہے۔ ارشاد ہے:-

۶/۵-۶ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝

یہی کیفیت ان مخاطبین کی ہے۔ جب خدا کا وہ ضابطۂ قوانین جو ٹھوس حقائق اپنے اندر رکھتا ہے، اُن کی طرف آیا تو انہوں نے اُسے جھٹلا دیا اور جس انقلاب کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اُس کی ہنسی اُڑانے لگے۔ لیکن کیا اس سے وہ انقلاب رُک جائے گا؟ وہ تو آ کر رہے گا!

یہ اپنی قوت اور دولت کے نشے میں بدمست ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نظامِ زندگی جس سے انہیں اس قدر خوش حالی اور فراوانی حاصل ہے انہیں کبھی تباہی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ لیکن کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جنہیں اس قدر ثروت اور سطوت حاصل تھی۔ جو انہیں بھی حاصل نہیں۔ ان پر رزق کی فراوانیوں کی بارش ہوتی تھی، اور معاشی خوش حالیوں کی نہریں بہتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے غلط نظامِ زندگی کی وجہ سے (جس میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے، محدود مفاد پرستی کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا) تباہ اور برباد ہو گئیں۔ اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

قوموں کے عروج و زوال اُن کے استبدال و استخلاف اور موت و حیات سے متعلق قوانین کے لئے انڈکس

دیکھئے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے دولت (معیشت) کی فراوانی کو بھی قوموں کی تباہی کا موجب بتایا ہے جب اسے تخریبی امور کے لئے صرف کیا جائے (۲۸/۵۸)۔ قرآن مجید کی اوّلیں مخاطب قوم (قریش) کو بھی اسی قسم کی معاش کی فراوانی حاصل تھی (۱۰۶/۴) جس کے نشے میں مست ہو کر وہ عقل و بصیرت پر مبنی کسی بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے چنانچہ جب انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا تو مطالبہ کرتے کہ رسول اللہؐ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ کہا کہ یہ بھی ان کی کٹ حجتی ہے یہ صحیح روشِ زندگی سے اس لئے انکار نہیں کرتے کہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس لئے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بات اُن کی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن چونکہ اس سے اُن کے مفادات پر زد پڑتی ہے اس لئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مخالفت تو اس لئے کرتے ہیں لیکن باتیں اور بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل ہو تو ہم پھر اس پر ایمان لائیں گے۔ (۱۷/۹۳) فرمایا

۶/۷ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝

ہم نے، اپنے نظام کے حق اور ان کے نظام کے باطل ہونے کے ثبوت میں خارجی کائنات، انسانی تخلیق اور تاریخی شواہد سے ایسے واضح دلائل پیش کر دیئے ہیں کہ ان کے بعد کسی صاحبِ عقل و بصیرت کو اس سے مجالِ انکار نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم دلائل و براہین کو نہیں جانتے۔ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ، تب ہم مانیں گے۔ لیکن یہ بھی ان کی محض کٹ حجتی ہے۔ اگر ہم ایسا کرتے کہ تم پر کوئی لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل کر دیتے جسے یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ لیتے کہ وہ سچ مچ کی کتاب ہے تو جنہوں نے نہیں ماننا وہ اس پر بھی کہہ دیتے کہ یہ کھلا ہوا فریب ہے۔

معجزات طلبی اور اس سے انکار

معجزات طلبی اور اس سے انکار کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اوّل (ص ۳۰۹) اور جلد سوم (ص ۲۳) پر بحث ہو چکی ہے۔

پھر فرمایا:۔

۶/۸-۹ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ ۝

یہ کہتے ہیں کہ اس رسولؐ پر کوئی ایسا فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا (جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں)۔ ان سے

کہو کہ فرشتے اُس وقت آیا کرتے ہیں جب قوموں کی تباہی کا وقت آجاتا ہے۔ اُس وقت ان کے معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ ہوجایا کرتا ہے اور کسی کو اس کی مہلت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی کرکے اُس تباہی سے بچ جائے۔

باقی رہا ان کی طرف پیغام رسانی کا معاملہ' سو' اس مقصد کے لئے اگر ہم (بالفرض محال) کوئی ایسا فرشتہ بھی بھیجتے جو انہیں نظر آسکتا تو وہ بھی اُن کے سامنے انسانی شکل ہی میں آتا۔ اُس صورت میں یہ پھر اُنہی شبہات میں مبتلا رہتے جن میں اب ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷ ــ ۹۵ـ۹۴)

(ہم جانتے ہیں کہ جب تو اُن سے کہے گا کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ میں خدا کا پیغام تم تک پہنچادوں، تو یہ تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ ذہن انسانی کے طفلانہ پن نے اسے ہمیشہ مغالطہ میں رکھا ہے کہ خدا کے رسولؐ کو، انسانوں سے الگ کوئی اعجوبہ سی مخلوق ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ) جب کبھی لوگوں کے پاس ہماری راہنمائی آئی تو ان کے' اس راہ نمائی کے قبول کرنے کے راستے میں ہمیشہ یہ بات حائل رہی کہ ہدایت لانے والا دوسرے انسانوں جیسا انسان کیوں ہے۔ (فرشتہ کیوں نہیں!)

ان سے کہو کہ (انسانوں کو رسول بناکر اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ دُنیا میں انسان بستے ہیں) اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور سکونت پذیر ہوتے تو ہم اُن کے لئے آسمان سے فرشتے کو رسول بناکر بھیجتے (۱۷ــ۹۵)

اس میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رسول کا فریضہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ منزل من اللہ، وحی کو لوگوں تک پہنچادے۔ اُس کا فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ اس وحی کے مطابق نظام معاشرہ قائم کرکے دکھادے۔ رسُول کا یہی کارنامہ

رسول کا فریضہ

دوسروں کے لئے اسوہ (نمونہ) کا کام دیتا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رسول کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ اسی صورت میں بن سکتی تھی جب رسول بھی انہی جیسا انسان ہوتا۔ یعنی وہ سمجھ لیتے کہ جب ایک انسان اس قسم کا نظام قائم کرسکتا ہے تو دوسرے انسان کیوں نہیں ایسا کرسکتے۔ اگر زمین پر بسنے والے انسانوں کی طرف کوئی فرشتہ (فوق البشر ہستی) رسول بن کر آتا اور یہ کچھ کرکے دکھاتا تو اُس کا یہ کارنامہ انسانوں کے لئے نمونہ کا کام دے ہی نہ سکتا۔

وہ کہہ دیتے (اور ایسا کہنے میں حق بجانب ہوتے) کہ وہ تو فرشتہ تھا جس نے ایسا کر دکھایا۔ ہم تو فرشتے نہیں۔ ہم سے ایسا کچھ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تھی وہ حکمت جس کے مطابق انسانوں کی طرف ایک انسان ہی رسول بنا کر بھیجا جاتا تھا۔

لیکن ہم نے اس حکمتِ خداوندی کو ختم کر کے رکھ دیا جب یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے معجزہ تھا۔ اور اس کے بعد اس خود فریبی میں مبتلا ہو کر بیٹھ گئے کہ رسول اللہؐ نے تو ایسا کچھ معجزات کی رو سے کر دکھایا تھا۔ ہم ایسا کس طرح کر سکتے ہیں، ہمیں تو خدا کی طرف سے معجزات نہیں ملتے؟

انسان اپنی بے عملی کے جواز کے لئے کس کس قسم کے بہانے تراش لیتا ہے؟ قرآن نے اس قسم کی بہانہ تراشیوں اور کٹ حجتیوں کو استہزاء سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا:۔

۶/۱۰ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس اہم معاملہ کو سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیتے ہی نہیں۔ یونہی ہنسی مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ کچھ (اے رسولؐ!) تمہارے ساتھ ہی نہیں ہو رہا۔ تم سے پہلے بھی جس قدر رسول آئے اُن کا اسی طرح مذاق اُڑایا گیا۔ جب اُنہوں نے اقتدار پرستوں اور مفاد طلبوں سے کہا کہ تمہارا غلط نظامِ زندگی تمہیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے تو اُنہوں نے اُن کی ہنسی اُڑائی۔ لیکن ان ہنسی اُڑانے والوں کو اُس تباہی نے آگھیرا جس کی وہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔

اس کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھا کہ

۶/۱۱ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

ان سے کہو کہ جاؤ! زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا کیا حشر ہوا جنہوں نے قانونِ خداوندی کو جھٹلایا تھا؟

اس کے بعد کہا کہ تم ان تاریخی شواہد سے ہٹ کر خود نظامِ کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ وہاں کس کا قانون اور اقتدار کارفرما ہے۔ اس کے جواب میں یہ لوگ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ اقتدار کسی انسان کا نہیں۔ خدا کا ہے (اس نقطہ کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی۔ سر دست آپ یہ حوالے دیکھ لیجئے (۲۳/۸۴-۸۵)، (۲۹/۶۱-۶۳)، (۳۱/۲۵)، (۴۳/۹)، (۴۳/۸۷)

لیکن آیۂ زیرِ نظر میں جس حقیقت پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے اس اقتدار کا مقصد اور سلسلۂ کائنات کے اس نظم و نسق کے ساتھ کارفرما رہنے کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے؟ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ اس کے لئے آپ پہلے آیت اور

اُس کا مفہوم ملاحظہ فرمایئے۔ فرمایا:-

۶/۱۲ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ قُلْ لِّلّٰهِؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ ان تاریخی شواہد کے ساتھ، نظامِ کائنات پر بھی غور کرو اور دیکھو کہ اس میں اقتدار اور قانون کس کا کارفرما ہے، اور یہ کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے یوں سرگرمِ عمل ہے؟ ان سے کہو کہ (جیسا کہ تمہیں خود اس کا اعتراف ہے، (۲۹/۶۱)[1]) یہ تمام سلسلہ، خدا کے پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اور چل اس لئے رہا ہے کہ ہر شے کو اُس کی نشو و نما کا سامان ملتا رہے۔ اس لئے کہ جس لئے اُسے پیدا کیا ہے اُس نے سامانِ نشو و نما کا بہم پہنچانا بھی اپنے ذمّے رکھا ہے۔ خارجی کائنات میں تو یہ نظام بلا روک ٹوک جاری رہتا ہے، لیکن انسان اپنی دنیا میں اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن اس کی مزاحمت کیسے روا رکھی جا سکتی ہے؟ لہٰذا سوچو کہ اگر تم اس نظامِ ربوبیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاؤ تو تمہیں کھڑا رہنے دیا جائے گا؟ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہونا پڑے گا ——— اور ضرور ہونا پڑے گا۔

ان حقائق کی موجودگی میں، ایسی عظیم صداقت سے انکار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو تباہ کر چکے ہوں۔

کہا کہ یہ کارخانۂ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ ہر شے کو اس کی نشو و نما کا سامان ملتا رہے (رحمت کے یہی معنی ہیں۔ دیکھئے انڈکس) ایک بیج منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے لیکن خدا کا قانون وہاں بھی اس لئے کارفرما ہوتا ہے کہ اس بیج میں نشو و نما پانے کی مضمر صلاحیتیں برومند ہو کر کونپل کی شکل میں اُبھر آتی ہیں۔ پھر وہ پودا آہستہ آہستہ اپنی انتہائی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ استقرارِ حمل کے بعد عورت کا جسمانی نظام اس قدر نظم و ضبط کے ساتھ (خود بخود) مصروفِ عمل رہتا ہے کہ جنین کو رحم کے اندر سامانِ نشو و نما ملتا ہے۔ حتّٰی کہ اس کی پیدائش کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ ہیں اس کی رحمت کے کرشمے! لیکن اس کیلئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ انتہائی غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ فرمایا:-

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَؕ

[1] دیگر حوالے اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

سامانِ نشوونما کا مہیا کرنا خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔

آپ انڈکس میں "عالم امر" اور "خلق" کے عنوان دیکھئے۔ اس میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ عالم امر میں خدا کا تخلیقی پروگرام جس طرح طے پاتا ہے وہ (ہمارے علم و تصور کی رو سے) کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ لیکن عالم خلق کے لئے خدا نے کچھ قوانین مرتب کر رکھے ہیں جن میں خود خدا بھی کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ اُن میں اکثریت تو ان کی ہے۔ جنہیں "قوانینِ فطرت" کہا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی انسانی زندگی ـــ (طبیعی زندگی نہیں۔ ان کی انسانی زندگی) کیلئے قوانین، وحی کے ذریعے دیئے گئے ہیں۔ ان قوانین یا احکام کے لئے لفظ کَتَبَ (یا کُتِبَ) آیا ہے۔ یعنی ایسا کرنا تم پر لازم قرار دیا گیا ہے۔ (مثلاً) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸)۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) وغیرہ۔ اور یہی لفظ خدا نے خود اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے جہاں فرمایا كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۱۲، ۶/۵۴) "خدا نے الرَّحْمَةَ کو اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔"

خارجی کائنات اور انسانوں پر خدا کا اقتدار تھا۔ اس لئے ان کے متعلق کہا کہ "خدا نے ان پر ایسا کرنا لازم قرار دے رکھا ہے۔" لیکن خدا کے اوپر تو کسی کا اقتدار نہیں تھا جو اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرتا۔ اُس نے کہا کہ ہم نے اپنے اوپر خود آپ پابندی عائد کر رکھی ہے۔" اس کے لئے کہیں "کَتَبَ" کا لفظ آیا۔ کہیں کہا کہ حَقًّا عَلَيْنَا (۱۰/۱۰۳، ۳۰/۴۷)۔ کہیں اُسے اپنا "وعدہ" کہہ کر پکارا، اور اس وعدہ کے متعلق کہا کہ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا (۴/۱۲۲)۔ "خدا کے وعدے

خدا کے وعدے

پکے اور سچے ہیں۔" ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی۔ (نیز ۱۰/۴ و دیگر متعدد مقامات) ایک جگہ تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا (۲۵/۱۶) "یہ خدا کا ایسا وعدہ ہے کہ اگر کبھی تمہیں (بالفرضِ محال) ایسا خیال گزرے کہ وہ پورا نہیں ہو رہا تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

الفاظ کچھ بھی کیوں نہ استعمال ہوئے ہوں۔ مفہوم سب کا یہ ہے کہ یہ ایسے قوانین ہیں جن کی خود خدا نے بھی اپنے اوپر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اس کو دیگر مقامات میں "سنت اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے جو غیر متبدل ہے (مطالب الفرقان جلد دوم۔ ص ۱۵۳ نیز عنوان تقدیر و مکافاتِ عمل وغیرہ)۔ "حکمت اللہ" کو (LAW IN THEORY) اور "سنت اللہ" کو (LAW IN PRACTICE) سمجھئے ـــ دونوں غیر متبدل ہیں۔

ان مقامات پر بعض سطح بین ذہنیتیں اعتراض کیا کرتی ہیں کہ خدا پر کسی قسم کی پابندی ہونے سے تو وہ قادرِ مطلق نہیں رہتا۔ لیکن یہ اُن کی سوچ کی کمی ہے۔ آپ کو آپ کا آقا (جس کے ہاں آپ ملازم ہیں) کہتا ہے کہ تمہاری

ڈیوٹی یہ ہے کہ صبح پانچ بجے اُٹھو۔ فلاں جگہ (جو یہاں سے تین میل کے فاصلے پر ہے) جاؤ وہاں یہ کام کرو اور پھر واپس آکر ناشتہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسا آپ کو مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ یہ ملازمت کی پابندی ہے۔ لیکن اگر آپ (اپنی صحت کی خاطر) خود فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ صبح پانچ بجے اُٹھ کر سیر کے لئے جایا کریں گے اور تین میل کی سیر کے بعد آکر ناشتہ کریں گے تو یہ آپ پر جبر نہیں۔ اس سے آپ کا اختیار سلب نہیں ہوجاتا۔ آپنے اپنے اختیار سے اپنے آپ پر پابندی عائد کی ہے۔ یہی مثال خدا کی اپنے آپ پر پابندیاں عائد کر لینے کی ہے۔ اس سے اُس کے قادرِ مطلق ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ نہ کوئی اثر پڑتا ہے۔

اور یہی صورت خود انسان کی ہے۔ خدا نے اُس کے لئے ایک قانون مقرر کیا اور اس کے بعد کہا کہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس پر عمل کرو یا نہ کرو۔ اب اگر کوئی شخص اِس پر عمل کرتا ہے تو اس پابندی سے اُس کا اختیار سلب نہیں ہوجاتا۔ اُس نے خود اپنے اختیار سے یہ پابندی قبول کی ہے۔ یہ پابندی تو بلکہ اُس کے صاحبِ اختیار ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ اپنے اختیار سے جس قدر قانونِ خداوندی کا پابند ہوتا جائے گا اُسی قدر صاحبِ اختیار متصور ہوگا ——

می شود از جبر پیدا اختیار۔

خدا اور انسان کے صاحبِ اختیار ہونے میں فرق

لیکن خدا اور بندے میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ انسان کے لئے جب خدا نے کُتِبَ عَلَيۡكُمۡ کہا تو اُسے اس کا اختیار دے دیا کہ چاہے اس پابندی کے مطابق عمل کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ لیکن خدا نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا۔ اس نے کہا کہ ہم نے اپنے لئے جو پابندی تجویز کی ہے ہم اُس کی خلاف ورزی کبھی نہیں کریں گے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو انسان صاحبِ اختیار رہتا ہے اور خدا "مجبور"۔

خدا کا اس قسم کا تصور آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ اور اسی قسم کا وہ چاہتا ہے کہ انسانی دنیا میں نظام قائم ہو جس میں ہر فرد اپنے اختیار و ارادہ سے قانون کی پابندیاں قبول کرے اور ان کی خلاف ورزی کبھی نہ کرے۔ اس قسم کا نظام اُس حسن و خوبی سے چلے گا جس حسن و خوبی سے نظامِ کائنات کارفرما ہے۔ وہاں نہ کوئی شے قانون کی پابندی سے سرتابی اختیار کرتی ہے (کہ انہیں اس کا اختیار ہی حاصل نہیں) اور نہ ہی اس نظام کا چلانے والا (خدا) اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ کس قدر قابلِ اعتماد ہے وہ نظام! اور اگر انسانی دنیا میں بھی اس قسم کا نظام قائم ہوجائے تو کس قدر امن و سکون کی مظہر اور برومندیوں اور شادابیوں کی پیکر ہوگی وہ زندگی! قوانینِ خداوندی کی

ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ:

(۶/۱۴-۱۳) وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

رات کی تاریکیاں ہوں یا دن کا اجالا، خدا کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے نہ تم اُس سے بھاگ کر کہیں جا سکتے ہو، نہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتے ہو۔ وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

ان سے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسے خدا کو چھوڑ کر جس نے اس عظیم سلسلۂ کائنات کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کی نشوونما کا ذمہ لیا، کوئی اور رفیق و کارساز تجویز کر لوں؟ اُس خدا کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو سامانِ زیست عطا کرتا ہے لیکن خود سامانِ زیست کا محتاج نہیں۔ اس لئے اُس کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ وہ کسی کی محنت اور مشقت کے ماحصل میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لینا چاہتا۔

یہی ہے وہ خدا جس کے متعلق مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اُس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں اور اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہ کروں (۶/۱۴)

اسلامی نظام کی خصوصیت

اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہوئی کہ هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ۔ وہ سب کو حسبِ ضرورت دے گا۔ کسی سے اپنے لئے کچھ نہیں لے گا۔ اس میں کسی قسم کی سلب و نہب نہیں ہوگی۔ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲) "اس میں نہ کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی ہوگی نہ سلب و نہب"۔ اس میں سربراہِ مملکت سب سے پہلے اعلان کرے گا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ○ "میں سب سے پہلے ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں" (۶/۱۶۴)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سابقہ میں آیت (۳/۲۸) کی تشریح اور انڈکس میں "حکومت" کا عنوان۔

یہاں کہا گیا ہے کہ رسول بھی ان قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا تھا۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ وہ مومنین کی طرح اپنی وحی پر ایمان بھی لاتا تھا (مطالب جلد سوم صہ ۴۸۹)۔ وہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا تھا اور ساتھ ہی کہتا تھا کہ

(۶/۱۸-۱۵) قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ

اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ ؕ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ بِخَیْرٍ فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ ؕ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ ○

رسُول بھی قوانین سے مستثنیٰ نہیں

ان سے کہو کہ میں کس طرح خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کر سکتا ہوں جب کہ مجھے معلوم ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت اُن کی خلاف ورزی کی پاداش ایسی سخت ہو گی جس سے مجھے ڈرنا چاہیئے۔ یعنی اُس کے قانونِ مکافات میں کسی کی رعایت نہیں ہو سکتی اُس کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کر دوں تو مجھے بھی اس کی سزا مل جائے گی۔

۱۰/۱۵ ، ۳۹/۱۴ ۔

جو شخص، اُس دن، اس عقوبت سے محفوظ رہا تو سمجھ لو کہ اُس پر خدا کا بڑا ہی فضل ہوا۔ یہ اُس کی بڑی کامیابی و کامرانی ہو گی، جو اُسے اُس کے اعمالِ حسنہ کے نتیجہ میں ملے گی۔

یاد رکھو! انسان کو جو نقصان، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے پہنچتا ہے اُس کے ازالہ کی، اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ انسان اُسی کے قوانین کا اتباع کرے۔ یہی صورت نفع پہنچنے کی ہے۔ اِس لئے کہ نفع اور نقصان کے پیمانے اُس کے قوانین کی رو سے متعیّن ہوتے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس کے قوانین کی زد سے کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا۔ وہ سب پر غالب ہیں لیکن اس کا یہ غلبہ، استبداد اور دھاندلی کا نہیں۔ وہ ہر بات سے باخبر ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

شفاعت کے خلاف

شفاعت کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ یہاں ایک اور زاویہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سوچئے کہ جو (بزرگ و برتر) ہستی اپنے متعلق کہے کہ اگر (بفرضِ محال) میں بھی معصیت کا مرتکب ہوں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا، کیا وہ یہ کرے گا کہ دوسرے معصیت کاروں کی سفارش کر کے اُنہیں اُن کے جرائم کی سزا سے بچا لے؟

آیت (۶/۱۸) میں خدا کے لئے ''قاہر'' کا لفظ آیا ہے۔ دیگر مقامات پر اُسے ''قہار'' بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے

قاہر اور قہار کا مفہوم

ہاں قہر اور قہار وغیرہ الفاظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے۔ ان سے مراد جابر اور مستبد حکمران ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف یہ مفہوم منسوب کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ عربی لُغت میں قہر کا لفظ گرفت۔ غلبہ اور اقتدار کے لئے آتا ہے۔ اس لئے خدا کے غلبہ (قہر) سے مراد اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت ہے جس سے نہ کوئی چھوٹ سکتا ہے نہ باہر رہ سکتا ہے۔ یہ مفہوم

اس سورہ میں ذرا آگے چل کر ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ ھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ وَ یُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً (۶/۶۱) "وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور اس کے لئے اس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ انسان کا ہر عمل محفوظ رہے تاکہ اسے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے"۔ خدا کے قانونِ مکافات کا یہی غلبہ ہے جس کی رو سے ظالموں کی جڑ کٹ جاتی ہے اور مظلوم اس پر شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں (۶/۴۵)۔ خدا نے ابھی ابھی کہا تھا کہ "اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے رکھا ہے"۔ اگر قہر کے عام معنی لئے جائیں تو پھر رحمت کے ساتھ قہر کیسے آسکے گا؟ لیکن ادنیٰ تدبر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے آہنی گرفت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی کلائی کا توڑ دینا، مظلوموں کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ اس بنا پر اقبالؒ نے بندۂ مومن کے متعلق کہا ہے کہ

قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پر شفیق　　　　(ضربِ کلیم ص ۱۲۹)

انسانوں کا قہر لیکن جب یہی قہر (غلبہ و تسلط) ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر ہو تو یہ وہ فرعونیت ہے۔ جس کی بربریت کے لئے ضربِ کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرعون کے جرائم کے سرِ فہرست یہی جرم تھا جس کی رو سے وہ کہتا تھا کہ اِنَّا فَوْقَھُمْ قٰھِرُوْنَ (۷/۱۲۷) "ان (بنی اسرائیل) پر ہمارا غلبہ اور تسلط ہے"۔

چونکہ جابر اور قاہر انسان کسی دوسرے انسان پر اسی صورت میں تسلط جماتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ وہ تنہا ہے اس کا یار و مددگار کوئی نہیں۔ اس لئے حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ (۹۳/۹) "جو معاشرہ میں تنہارہ جائے اسے کچلنے کی کوشش نہ کرنا"۔ اسی نہج سے عرب اس گوشت کو جسے بھوننے کے لئے آگ پر رکھا جائے "لَحْمٌ مَقْھُوْرٌ" کہتے تھے۔ اس سے انسانوں پر انسانوں کے قہر کی کیفیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ کسی کمزور و ناتوان کو اپنے قہر کی آگ پر رکھ کر اسے اپنے کھانے کے قابل بنا لینا (اللہ ہر ایک کو اس سے اپنے حفظ و امان میں رکھے)

۶/۱۹ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً ؕ قُلِ اللّٰہُ ۟ شَھِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ ۟ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّآ اَشْھَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۝

(تم) پوچھو کہ ان حقائق کی صداقت کے لئے (جنہیں میں بیان کرتا ہوں) کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟

میرے اور تمہارے درمیان خود خدا کی شہادت موجود ہے۔ اسی کا فیصلہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ شہادت

اور فیصلہ اس قرآن میں موجود ہے جو بذریعہ وحی دیا گیا ہے تاکہ میں، اس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد میں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں ۔ (۶۲/۲-۲)

کیا تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہے جس کے قوانین کی اطاعت کی جائے؟ ان سے کہو کہ اگر تمہارا یہی دعویٰ ہے تو میں اس کی صداقت کی شہادت نہیں دے سکتا۔ میرا دعویٰ تو یہی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی اور ایسی ہستی نہیں جس کے قانون کی اطاعت کی جائے۔ جنہیں تم اقتدار میں خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ان سے بیزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ اور ملائکہ وغیرہ کی شہادت کے متعلق (۳/۱۸) میں گفتگو ہو چکی ہے ۔ وہاں دیکھ لیجئے ۔ اس آیت میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ حضورؐ کی لسانِ مبارک سے کہا یہ گیا ہے کہ "میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ۔ تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی متنبہ کروں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد ازاں پہنچے ۔ قرآن کریم تمام اقوامِ عالم کیلئے قیامت تک کیلئے ضابطۂ راہنمائی ہے ۔ حضورؐ نے اپنے مخاطبین کو تو اس سے بذاتِ خود آگاہ کر دیا ۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلۂ تبلیغ رسالت ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے حضورؐ کی امت کی وساطت سے جاری رہنا تھا۔ قرآن کی یہ تبلیغ (لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ میں

ختمِ نبوّت کی ایک اور دلیل

قابلِ غور ہے) قیامت تک جاری رہے گی۔ اسے حضورؐ ہی کی جانب سے سمجھا جائے گا۔ سورۃ الجمعہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے (۶۲/۳) نبوّت حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گئی اور رسالت (یعنی قرآن کریم کی تعلیم کا دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ) امت کی وساطت سے ادا ہوتا رہے گا۔ اس لئے حضورؐ کے بعد کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت نہیں رہی، بالخصوص اس لئے کہ قرآن کریم، مکمل بھی ہے ۔ غیر متبدل بھی اور محفوظ بھی ۔ ایسی کتاب کی موجودگی میں کوئی رسول آئے گا کاہے کے لئے؟

جیسا کہ معلوم ہے رسول اللہؐ کی دعوت کی مخالفت ایک تو قریش کی طرف سے ہوتی تھی جو کسی آسمانی مذہب کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے ۔ دوسرا گروہ اہلِ کتاب کا تھا جن میں یہودی اور عیسائی شامل تھے ۔ یہودی اس مخالفت میں زیادہ متشدد تھے ۔ یہ دونوں (یہودی اور عیسائی) ایک آنے والے کے منتظر تھے جس کی علامات اور خصوصیات ان کی کتابوں میں مذکور تھیں، اور اگر تعصّب کی عینک اتار کر دیکھا جاتا تو حضورؐ ان خصوصیات کے مصداق نظر آجاتے ۔

یہود اور نصاریٰ کی طرف سے مخالفت

لیکن یہ لوگ سب کچھ جانتے بوجھتے اس دعوت کی مخالفت کرتے ۔ یہودی اس لئے مخالفت کرتے کہ یہ مدعیٔ نبوّت شاخ اسرائیل (حضرت اسحٰقؑ کی اولاد) سے متعلق ہونے کی بجائے ذریت اسمٰعیل سے کیوں ہے؟ اور عیسائی کہتے کہ وہ آنے والا آسمان سے زندہ اترنے والا مسیحؑ ہوگا ۔ قرآن کریم نے کہا کہ صداقت کے اس انکار سے لوگ کسی اور کا نہیں خود اپنی

ذات کا نقصان کر رہے ہیں۔

۶/۲۰ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

جن لوگوں کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی، وہ اس حقیقت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہے ـــــ یوں پہچانتے ہیں جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو پہچانتے ہوں۔ اس لئے ان کا انکار حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ اپنے آپ کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ (اور خطرات سے حفاظت تو وہی چاہتا ہے جسے زندہ رہنے کی آرزو ہو۔ ۳۶/۷)

اپنی ذات کے نقصان کی وضاحت کے لئے سابقہ جلد میں آیت (۵/۱۰۵) دیکھئے۔ وہ کہتے تھے کہ حضورؐ کا دعویٰ نبوت (معاذ اللہ) افترا ہے۔ فرمایا:

۶/۲۱ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ذرا سوچو کہ اُس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی طرف سے بات بنائے اور اُسے خدا کی طرف منسوب کر دے۔ اسی طرح اُس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا کون ہے جو خدا کے سچے قوانین کو جھٹلائے۔ یہ دونوں ظالم ہیں ـــــ وہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ سچ کو جھوٹ قرار دیتا ہے ـــــ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے (متعدد مقامات پر) ان مخالفین کو مشرک کہہ کر پکارا ہے۔ قریش تو بتوں کی پرستش کرتے تھے اس لئے

یہ مشرک کس طرح تھے؟

وہ عام مفہوم کے اعتبار سے ہی مشرک تھے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ (اور حضرت مریمؑ) کو الوہیت میں شریک تصور کرتے تھے۔ اُن کا شرک بھی کھلا ہوا تھا۔ یہودی معترض تھے کہ انہیں مشرک کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ کہا کہ تم احکام خداوندی کے بجائے اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام کی اطاعت کرتے ہو۔ یہی تمہارا شرک ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صـ ۱۹۵)

یاد رکھئے جب بھی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو خدائی احکام کا درجہ دے دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا، خواہ وہ مذہبی مقتداؤں کے احکام ہوں اور خواہ حکمرانوں کے احکام۔ ہم خود صدیوں سے اسی عملی شرک میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ہاں اطاعت کتاب اللہ کی نہیں، انسانوں کے وضع کردہ احکام کی ہوتی ہے۔ اسی قسم کے شرک کے متعلق کہا:-

۶ / ۲۴-۲۲ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ
الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ
رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ
مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

جس دن یہ سب مغلوب و محکوم ہو کر تمہارے سامنے آئیں گے (یا حیاتِ اخروی میں ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے) تو اس وقت اُن لوگوں سے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں، پوچھا جائے گا کہ بتاؤ! وہ کہاں ہیں جن کے متعلق تمہارا دعویٰ تھا کہ وہ خدائی اختیارات میں شریک ہیں (۱۷/۲۷)

شرک سے انکار

اُس وقت اُن کے پاس کوئی بات کہنے کے لئے نہیں ہوگی، بجز اس کے کہ وہ خدا کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا کرتے تھے۔

اُس وقت کہا جائے گا کہ دیکھو! یہ لوگ کس طرح خود اپنے خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ جس قدر افترا پردازیاں کیا کرتے تھے، وہ سب بے کار ثابت ہو چکی ہوں گی۔

یہ لوگ حضورؐ کی مجالس میں آکر بیٹھتے لیکن بالکل منافقانہ انداز سے۔ اس لئے کہ

۶ / ۲۵ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ
وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ
يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو محض دکھاوے کی خاطر تیری طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں ورنہ ضد اور تعصب کی بنا پر اُن کے دلوں پر ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اُن میں بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ اور تکبّر و نخوت کی وجہ سے اُن کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ چکے ہیں کہ کوئی آواز اُن کے دماغ تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ان کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ اگر اُن کے سامنے (دو، چار، دس نہیں) وہ تمام دلائل بھی آجائیں جن سے صداقت پہچانی جا سکتی ہے، تو یہ پھر بھی اُس پر ایمان نہ لائیں۔ یہی وجہ ہے، کہ یہ بات بات پر تجھ سے الجھتے اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ قرآن سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں، اس کے سوا رکھا ہی کیا ہے کہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں یہ دُہراتا رہتا ہے۔

اس قسم کی آیات کی تشریح اس سے پہلے بھی کی جا چکی ہے (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد اوّل صفحہ ۱۶۷) پھر اتنا ہی نہیں کہ یہ خود ہی قرآنی تعلیم سے اپنے آپ کو محروم رکھتے تھے۔ یہ دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے

تھے۔ یہ حسد اور مخالفت کی انتہا ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔

۶/۲۶ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝

اس طرح یہ لوگ، خود بھی قرآن کی راہ نمائی سے بے نصیب رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے رہتے ہیں لیکن اتنا نہیں سمجھتے کہ اس سے ہم کسی اور کا نقصان نہیں کرتے، خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

اس کے لئے یہ لوگ ٹیکنیک کیا اختیار کرتے تھے اُس کی بابت مطالب الفرقان جلد اوّل ص ۱۷۳ دیکھئے فرمایا کہ ان کی مخالفت کی شدت کا تو یہ عالم ہے لیکن بزدلی کی یہ کیفیت کہ عذاب کے سامنے آتے ہی یہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں گے اور منتیں سماجتیں کرنے لگ جائیں گے۔ منافق ہوتا ہی بزدل ہے۔ فرمایا۔

۶/۲۸-۲۷ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ وُقِفُوا۟ عَلَى ٱلنَّارِ فَقَالُوا۟ يَٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِـَٔايَٰتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا۟ يُخْفُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا۟ لَعَادُوا۟ لِمَا نُهُوا۟ عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَٰذِبُونَ ۝

اس وقت تو یہ یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ (لیکن اے مخاطب!) اگر تو اُس منظر کو دیکھ سکتا جب یہ تباہی اور بربادی کے جہنم کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی، تو یہ کس حسرت و یاس سے کہیں گے کہ اگر ہمیں ایک موقعہ اور دے دیا جائے، تو ہم قوانینِ خداوندی کی کبھی تکذیب نہ کریں اور اُن پر ضرور ایمان لے آئیں۔

یہ کچھ وہ اس لئے نہیں کہیں گے کہ وہ واقعی اپنی حالت بدلنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ جو کچھ وہ دوسروں سے چھپا کر کیا کرتے تھے (اور یوں مجرم ہونے کے باوجود، لوگوں کی نگاہوں میں بڑے معتبر بنے رہتے تھے) وہ بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا اور اُنہیں اپنے جرائم کے چھپانے کے لئے کوئی پردہ نہیں مل سکے گا۔ ورنہ اُن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اُنہیں اور موقعہ بھی دے دیا جائے تو پھر وہی کچھ کرنے لگ جائیں جن سے اُنہیں روکا گیا تھا۔ (ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ جب آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو گڑگڑا، گڑگڑا کر معافیاں مانگتا ہے اور وعدے کرتا ہے کہ اگر ایک دفعہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہو جائے تو آئندہ کبھی ایسا

نہیں کروں گا۔ لیکن، اس کے بعد پھر وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے۔)

لہذا، یہ لوگ ایسا کہنے میں بھی سچے نہیں ہوں گے کہ اگر انہیں ایک موقع اور مل جائے تو وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

دُنیا میں واپسی نہیں ہوگی | اس نکتہ کے متعلق کہ مرنے کے بعد اس دنیا میں دوبارہ نہیں آیا جا سکے گا، مطالب الفرقان جلد سوم، صفحہ ۳۵-۱۳۲ دیکھئے۔ نیز جلد اوّل ص۴۴۔

یہ تو وہ تھے جو مرنے کے بعد کی زندگی کے بہر نوع قائل تھے۔ لیکن دوسرا گروہ اُن کا تھا جو سرے سے اس کا قائل ہی نہ تھا۔

۶/۳۱-۲۹ وَقَالُوٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اِسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس لئے اگر ہم یہاں ایسا انتظام کریں کہ کسی کی گرفت میں نہ آسکیں۔ یا گرفت میں آنے کے بعد، جھوٹ سچ بول کر سزا پانے سے بچ جائیں، تو پھر اپنے آپ کو جائز اور ناجائز کی پابندیوں میں کیوں جکڑے رکھیں۔ (یاد رکھئے۔

حیاتِ آخرت کے منکر | قرآن پر وہی ایمان لائے گا جو حیاتِ اُخروی پر ایمان رکھتا ہو: ۹۳/۶ نیز ۴۷/۱۲)۔ یہی وجہ ہے کہ ارتکابِ جرم سے انسان اسی صورت ۲۴-۲۲/۴۵ میں بچ سکتا ہے، جب اسے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل، اور زندگی کے تسلسل (حیاتِ اُخروی) پر محکم یقین ہو (۲۴/۴۵)۔

اگر تم اس وقت کا تصور کرسکو، جب یہ ظہورِ نتائج کے وقت اپنے نشو و نما دینے والے کے سامنے کھڑے ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ بتاؤ! زندگی کے تسلسل اور حیاتِ اُخروی کا عقیدہ، حقیقتِ ثابتہ تھا یا نہیں؟ تو انہیں یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ ہاں! ہمارا نشو و نما دینے والا اس پر شاہد ہے کہ

یہ فی الواقعہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اُس وقت اُن سے کہا جائے گا، کہ اب اِس اعترافِ حقیقت سے کیا فائدہ؟ اَب تم اپنے اعمال کی سزا بھگتو جس سے تم یُوں انکار کیا کرتے تھے۔ غلط روش کے نتائج، اس زندگی میں بھی سامنے آسکتے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ غلط نظام کی قومی اور اجتماعی تباہیاں، یہیں سامنے آجاتی ہیں۔

جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات سے اِنکار کرتے ہیں، وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ جب وہ تباہ کُن انقلاب یک لخت اُن کے سامنے آئے گا، تو وُہ بصد حسرت و یاس کہیں گے کہ ہم سے بڑی تقصیر ہوئی۔ لیکن اُس وقت ایسا کہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ اپنے غلط اعمال کے بوجھ کے نیچے دبے ہونگے ——— اور کس قدر بُرا ہے وہ بوجھ جس سے اِنسان کی انسانیت یوں کُچلی جائے!

وہ دنیاوی زندگی ہی کو اصلِ حیات سمجھتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

۶/۳۲ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

یہ سب اس لئے کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ انسان کی طبیعی زندگی ہی بس حقیقی زندگی ہے۔ اور اس کے تقاضوں کا پورا کرنا ہی مقصودِ حیات ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ طبیعی زندگی کے تقاضوں کی اہمیت کے باوجود، جب کبھی ایسا ہو کہ اِن تقاضوں میں اور انسان کی ذات کے تقاضوں میں تصادم واقع ہو جائے، تو اس وقت طبیعی زندگی کے تقاضا کو کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ اور انسانی زندگی کے تقاضا کو اس پر قربان نہیں کر دینا چاہیئے۔ جو لوگ تباہی سے بچنا چاہتے ہیں، اُن کے نزدیک ایسے وقت میں، انسانی زندگی کا تقاضا، طبیعی تقاضا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اقدارِ خداوندی کی پابندی کرتے ہیں، خواہ اس سے انہیں مادی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

دنیاوی زندگی لہو ولعب

کیا ان کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آئی کہ زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی نہیں، اس سے بلند، انسانی سطح کی زندگی بھی ہے اور انسانی زندگی، بہر نوع، حیوانی زندگی سے بلند ہوتی ہے۔

دنیاوی زندگی کے لہو ولعب ہونے کا مطلب، اور دنیاوی اور اُخروی زندگی میں تقابل کے لئے اِنڈکس دیکھئے۔

اِس کے بعد پھر حضورؐ کو تسلّی دی گئی کہ ان لوگوں کے طرزِ عمل سے آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔۔ اس کے لئے

جس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے وہ بڑا اہم ہے اور اس کی وضاحت بڑی دلنشین ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ جو تمہاری مخالفت کرتے ہیں، تو یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے جو تمہیں اس پر ملال ہو۔ یہ قوانینِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ قوانین تمہارے نہیں، خدا کے ہیں (تم تو صرف انہیں اُن تک پہنچانے والے ہو)، اس لئے یہ اُن

یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے

قوانین کو جھٹلاتے ہیں تو اس میں تمہارے لئے بُرا ماننے کی کون سی بات ہے؟ یہ موضوع اس سے پہلے بھی متعدد مقامات میں آچکا ہے (انڈکس دیکھئے)، نیز آیت (۵/۴۱) کی تشریح جو سابقہ صفحات میں سامنے آچکی ہے۔ فرمایا:

۶/۳۳ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

(اے رسولؐ!) ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ یہ لوگ، اس نظام کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں، وہ تمہارے لئے سخت ملال اور افسردگی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تجھے تو جھوٹا نہیں سمجھتے (جو یہ بات اس طرح تم پر گراں گزرے) یہ تو قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں (حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے (۲۷/۱۴)۔ اس لئے ان کی باتوں سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ (اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا ہلاک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ سنکھیا ممدِّ حیات ہے۔ تو اس سے اس کی جہالت پر افسوس تو ہو سکتا ہے ضیق اور ملال نہیں ہونا چاہیئے)

اور پھر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا کچھ ہر رسول کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے:

۶/۳۴ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ۝

پھر، یہ بات کوئی نئی بھی نہیں۔ تم سے پہلے بھی جو رسول آئے، اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ اُن کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اسی طرح تکذیب ہوتی رہی۔ لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال اور استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہے۔ اور جس قدر تکالیف مخالفین کی طرف سے پہنچتی رہیں، انہیں ہمت اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا، یہاں تک کہ بالآخر (ہمارے قانون کے مطابق) ہماری طرف سے نصرت آپہنچی ——— پہنچتی کیوں نہ؟ خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا ——— یہ حقیقت اُن انبیاءؑ کے احوال و کوائف سے واضح ہو جاتی ہے جن کے تذکرے (اس قرآن میں) تم تک پہنچ چکے ہیں۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجۂ فگن نئے

وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

خدا کا اٹل قانون یہ جو کہا گیا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ——— قوانین خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ——— تو اس کا اعادہ متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ اور یہی دین کی اصل ہے۔ سابقہ صفحات پر آیت (۶/۱۲) کے تحت بھی اس سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں، حسبِ ذیل حوالے بھی دیکھئے: (۶/۱۱۶)؛ (۱۰/۶۴)؛ (۱۴/۲۴-۲۷)؛ (۱۸/۲۷)؛ (۵۰/۲۹)۔ اور سنتُ اللہ کے غیر متبدل ہونے کے سلسلہ میں (۱۷/۷۷)؛ (۳۳/۶۲)؛ (۳۵/۴۳)۔ نیز مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۵۳۔ اور اس کے تحت درج کردہ حوالے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو (کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام لے کر قوانین خداوندی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں، وہ کسی طرح بھی اس دعوت کو قبول نہیں کریں گے) ایک اور انداز سے سمجھایا گیا۔ فرمایا:

۶/۳۵ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

ان لوگوں کی طرف سے اس قدر مخالفت کے باوجود تم اس غم سے نڈھال ہو رہے ہو کہ یہ صحیح راستے کی طرف کیوں نہیں آتے؟ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں (۱۸/۶)؟ لیکن تم لاکھ غم کھاؤ اور ہزار افسوس کرو، یہ پھر بھی صحیح راستے پر نہیں آنے کے۔ اگر تم ایسا کر سکو تو زمین میں کوئی سرنگ لگا کر (پاتال تک جا پہنچو)، یا آسمان میں سیڑھی لگا کر عالم بالا تک پہنچ جاؤ۔ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے ان کی تسلی ہو جائے تو یہ اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے (۱۷/۹۰-۹۳)۔ (تمہاری یہ آرزو کہ لوگ صحیح راستے پر آجائیں، تمہارے خلوص اور انسانیت کے ساتھ تمہاری گہری ہمدردی کی دلیل ہے)، لیکن انہیں زبردستی صحیح راستے پر لانے کا سوال نہیں۔ اگر انسان کا اختیار و ارادہ سلب کر کے، سب کو ایک طریق پر چلانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے ایسا کرنا

معجزات میں کیا مشکل تھا؟ (۱۰/۹۹-۱۰۰)۔ لیکن اُس کی مشیت یہ ہے نہیں۔ وہ انسان کا اختیار

نہیں چھیننا چاہتا۔ یہ ہے اس کی وجہ۔ سو تُم اُن لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ اللہ نے تمام انسانوں کو نیک ہی کیوں نہ بنا دیا!

اس موضوع کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۳۱۲ - ۳۰۹ پر ہو چکی ہے، جہاں زیرِ نظر آیت بھی درج ہے۔ اس کے بعد کہا:

۶/۳۶ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ○

ہم نے ہدایت اور گمراہی کے لئے قانون یہ مقرر کر دیا ہے کہ جو شخص عقل و بصیرت سے کام نہیں لے گا، اس پر حقیقت مُشتبہ رہے گی (۲/۱۸)۔ اس کے برعکس، جو بات کو دل کے کانوں سے سُنے گا، وہ اس پر لبیک کہے گا۔ باقی رہے وہ جو بے حس ہیں، تو وہ آہستہ آہستہ بیدار ہوں گے، اور رفتہ رفتہ دینِ خداوندی کی طرف آئیں گے۔ [اس کے لئے تمہیں بڑی استقامت سے کام لینا ہوگا (۲/۲۶)]۔ لیکن جو لوگ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ختم کر چکے ہوں، اور ضد اور تعصب کی بنا پر سُننے کے لئے تیار ہی نہ ہوں، وہ تباہ ہو جائیں گے (۲/۷)

یہ موضوع بھی اس سے پہلے آ چکا ہے۔ حوالہ کے لئے انڈکس میں "عقل و فکر" کا عنوان دیکھئے۔ مندرجہ بالا مفہوم میں آیت (۲/۲۶۰) کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۱۶۴ - ۵۸۴) دیکھئے، اور آیت (۲/۷) کی تفسیر کے لئے جلد اوّل (صفحات ۱۵۸ - الآخر)

اس کے بعد ان لوگوں کے اس اعتراض کو پھر دہرایا گیا کہ رسولؐ معجزات کیوں نہیں دکھاتا؟

۶/۳۷ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

ان (کٹ حجتی کرنے والوں) کا اعتراض یہ ہے کہ خدا اپنے رسولؐ پر کوئی نشانی (حسّی معجزہ) کیوں نہیں نازل کرتا۔ ان سے کہو کہ حسّی معجزات کا رونما کر دینا، خدا کے لئے ناممکن نہیں، لیکن انہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ خدا چاہتا یہ ہے کہ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر غلط اور صحیح میں امتیاز کرو۔ وہ تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے حقیقت منوانا نہیں چاہتا۔

معجزات کے متعلق انڈکس دیکھئے، اور اس نکتہ کی وضاحت کے لئے کہ خدا کا قادرِ مطلق ہونے کے باوجود،

اپنے قوانین کے خلاف نہ کرنا، آیت (۶/۱۲) کے تحت سابقہ صفحات دیکھئے۔

معجزات طلبی معجزات دکھا کر کسی کو اپنی دعوت (اسلام) کا قائل کرالینا، اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینے کے مترادف ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے اگلی آیت میں دو قسم کی مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ انسان کے سوا کائنات کی جملہ مخلوق کو اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ اور دوسرے، انسان جسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ قوانین دونوں کے لئے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ایک نوع ان کی اطاعت پر مجبور ہے۔ دوسری نوع کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کی اطاعت کرے، اور چاہے ان سے انحراف برت لے۔ نتائج بہرحال ان کی روش کے مطابق مرتب ہوں گے۔

(۶/۳۸) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ○

یہ طریقِ کار (کہ سب کو مجبوراً ایک ہی راستے پر چلایا جائے) خارجی کائنات میں اختیار کیا گیا ہے۔ تم دیکھو کہ جس قدر زمین پر چلنے والے ذی حیات ہیں، یا فضائے آسمانی میں اڑنے والے پرندے، طبیعی تخلیق کے اعتبار سے، وہ بھی تمہارے ہی جیسی انواع ہیں۔ ان کے لئے ہم نے کتابِ فطرت میں تمام قوانین مکمل طور پر رکھے ہیں (یہی صورت انسانی راہنمائی کے لئے قرآنِ مجید کی ہے) اور وہ سب کے سب، بلاچون و چرا اپنے پروردگار کی طرف سے دی ہوئی راہنمائی کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اس سے ذرا ادھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ (۲۴/۴۱)۔ یہ اس لئے کہ انہیں اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ مجبور پیدا کیا گیا ہے۔

اس آیت میں ایک ایسا عظیم دقیق نکتہ ہے جسے سائنسدان ہی (APPRECIATE) کر سکتے ہیں۔ کہا کہ کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ذی حیات تمہاری ہی قسم کی انواع ہیں۔ مطالب الفرقان (جلد اوّل) میں بیان کردہ نظریۂ ارتقاء پر غور کیجئے۔ اس کی رُو سے سائنس کا انکشاف یہ ہے کہ زندگی کی ابتداء ایک جرثومۂ حیات سے ہوئی۔ پھر وہ ارتقائی منازل طے کرتی اور آگے بڑھتی ہوئی پیکرِ انسانی تک آپہنچی۔ اس سلسلہ میں جس قدر ذی حیات انواع وجود میں آئیں، وہ شکل و ہیئت میں الگ الگ ہیں، لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے کی مثل ہیں۔

نظریۂ ارتقاء آیۂ زیرِ نظر میں ''اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اُمَم کا لفظ جمع ہے امت کی اور اُمت کا مادہ اُم ہے جس کے لغوی معنی ''ماں'' ہیں اور مجازی معنی اصل اور بنیاد۔ نظریۂ ارتقاء کے مکتشف، ڈاروِن نے اپنی جس کتاب میں اس نظریہ کی وضاحت کی ہے اس کا نام ہے (ORIGIN OF SPECIES)

"اصل انواع"۔ آپ غور کیجئے کہ یہ الفاظ کس طرح "اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ" کی تشریح کرتے ہیں، یعنی اپنی اصل اور منبع کے اعتبار سے یہ تمام انواع تمہاری ہی مثل ہیں۔

اس کے بعد بتایا کہ ان انواع کے لئے قوانینِ فطرت متعین کئے گئے ہیں جو صحیفۂ کائنات میں بکھرے پڑے ہیں، اور انسانوں کے لئے یہ قوانین بذریعہ وحی عطا کئے جو (اب) قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ اوّل الذکر اس مرکز پر جمع ہونے کے لئے مجبور ہیں:

۶/۳۹ وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُکۡمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضۡلِلۡہُ ؕ وَ مَنۡ یَّشَاۡ یَجۡعَلۡہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ○

(لیکن انسان کی حالت اُن سے مختلف ہے۔ اسے عقل و فکر دے کر، صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو عقل و فکر سے کام لے کر، خدا کی راہنمائی اختیار کر لیتے ہیں۔ باقی عقل کے دیئے گُل کرکے اُسکے قوانین کو جھٹلاتے رہتے ہیں، اور یوں بہرے اور گونگے بن کر، جہالت اور تعصب کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

انسانوں کے لئے یہی خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ سو جو شخص، اس قانون کے مطابق، غلط راستہ اختیار کرلے، وہ غلط راستے پر رہتا ہے۔ اور جو صحیح راستہ اختیار کرنا چاہے، اُس کے سامنے زندگی کی سیدھی اور متوازن بدروش راہ آجاتی ہے۔

منافقین کا ایمان

اِس کے بعد تین آیتوں میں انسان کی اِس مضطربانہ اور عاجلانہ ذہنیت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جب یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو خدا کو پکار پکار کو یاد کرنے لگتا ہے، اور جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر اسے فراموش کر دیتا ہے۔ انسان کی اس قسم کی "خدا پرستی" کے متعلق کہیں کہا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَہٗ خَیۡرُ ۨ اطۡمَاَنَّ بِہٖ ۚ وَ اِنۡ اَصَابَتۡہُ فِتۡنَۃُ ۨ انۡقَلَبَ عَلٰی وَجۡہِہٖ ۚ (۲۲/۱۱) "ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کی ہدایت اس طرح اختیار کرتے ہیں گویا کنارے پر بیٹھے ہیں۔ اگر خدا پرستی سے مفاد حاصل ہوتے ہیں، تو خدا پرست ہیں۔ اگر کوئی مصیبت آجاتی ہے، تو منہ پھیر کر دوسری طرف چل دیتے ہیں"۔ ایسی روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: خَسِرَ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ (۲۲/۱۱)۔ "دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ، اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں"۔ اور کہیں کہا کہ مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ ٭ۖ لَاۤ اِلٰی

هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (۴/۱۴۳) "نہ یکسو ہو کر اس طرف، نہ یکسو ہو کر اُس طرف۔ مکھی کی طرح بھنبھناتے اور منڈلاتے ہوئے "یا درکھئے! دین بھی یکسوئی کا نام ہے اور کفر بھی یکسوئی کا۔ یہ بین بین کی روش منافقین کی ہوتی ہے جن کا ٹھکانہ جہنم کا سب سے نچلا درجہ بتایا گیا ہے۔ حق پرستی کے ساتھ سودا بازی کرنا، منافقت ہے۔ اس مضمون کو اگلی تین آیتوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

۶/۴۰-۴۳ قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ع وَلَقَدْ أَرْسَلْنَآ إِلٰٓى أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَخَذْنٰهُمْ بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ إِذْ جَآءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ خدا کے علاوہ اور قوتیں بھی اختیار و اقتدار رکھتی ہیں، تو جس وقت کوئی طبیعی آفت (آندھی۔ سیلاب۔ وبا وغیرہ) آتی ہے، یا کوئی تباہ کن انقلاب برپا ہونے لگتا ہے، تو تم ان قوتوں کو اپنی مدد کے لئے کیوں نہیں پکارتے؟ (بے ساختہ) خدا ہی کو کیوں پکارتے ہو؟ اُس وقت تم ان تمام قوتوں کو بھول جاتے ہو ـــــ پھر، وہ مصیبت بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق رفع ہوتی ہے۔ (لیکن اس کے بعد تم، قانونِ خداوندی کو پس پشت ڈال کر پھر غیر خدائی قوتوں کے پیچھے چلنے لگ جاتے ہو)۔

(اے رسولؐ!) یہ کچھ تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں، شروع سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ تم سے پہلے بھی ہم، دیگر اقوام کی طرف، اپنے پیغامبر بھیجتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عام مصیبتوں اور تکالیف میں مبتلا ہوگئے۔ یہ ابتدائی تنذیر ہوتی ہے تاکہ لوگ محتاط ہو جائیں اور اپنی اصلاح کرکے، قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔

لیکن اس تنذیر سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے، ان کے دل اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات اُن کے کاروبار کو اُن کی نگاہوں میں بڑا خوش نما بنا کر دکھاتے، اور ان سے کہتے کہ

WARNING　ملے

جس کام میں اس قدر جلد اور آسانی سے مفاد حاصل ہو رہے ہوں، انہیں چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

اگلی آیت میں تاریخِ انسانیت کے ایک اہم گوشے کو سامنے لا کر بتایا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی کے بنیادی اسباب کیا ہوتے ہیں۔ سورۃ النحل میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی قوم انعاماتِ خداوندی (زندگی کی مرفہ الحالی اور رزق کی فراوانی) سے کفر برتتی ہے، اور نظامِ خداوندی کے بجائے اپنا خود ساختہ نظام قائم کر لیتی ہے تو فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ

قوموں کی تباہی کے اسباب

الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) "اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلّط ہو جاتا ہے"۔ یعنی قوموں کی تباہی کا ایک سبب، رزق کی تنگی، معاشی بدحالی، مفلسی، غریبی، محتاجی، اپنی روٹی کے لئے بھی گداگری ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف کہا کہ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (۲۸/۵۸)۔ "کتنی قومیں ایسی تھیں جو دولت و ثروت کی فراوانی کی وجہ سے تباہ ہو گئیں"۔

قوموں میں بعض رزائم اور جرائم مفلسی اور بدحالی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض جرائم، دولت کی فراوانی کے نشہ کی وجہ سے۔ اوّل الذکر معائب کو اگر فالج سے تعبیر کیا جائے تو ثانی الذکر کو سرسام قرار دیا جائے گا۔ تباہی بہرحال دونوں قسم کے معائب سے واقع ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم ایسا متوازن اقتصادی نظام عطا کرتا ہے جس میں نہ کوئی شخص مفلسی اور محتاجی کا فالج زدہ ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی دولت کی فراوانی کے سرسام میں مبتلا۔ قوموں کی اس قسم کی تباہی کے متعلق کہا:

۶/۴۴ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○

انہیں یہ مفادِ عاجلہ حاصل اس لئے ہوتے کہ ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل، عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں، مہلت کا وقفہ رکھتا ہے، اس لئے انسان کی غلط روش سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ فوراً تباہ ہو جائے ــــ چنانچہ وہ لوگ خدا کے قانون کو پسِ پشت ڈال دیتے، لیکن اس کے باوجود، ان پر سامانِ زیست کے دروازے کھلے رہتے (۲۸/۵۸)۔ وہ اسی طرح، قوت اور دولت کے نشہ میں بدمست ہوتے چلے جاتے، اور اس کے ساتھ ہی، ان کی غلط روش کے تباہ کن اثرات بھی آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے، تا آنکہ ان کے ظہور کا وقت آ جاتا، تو وہ قوم اپنی توقعات کے یکسر خلاف، گرفت میں آ جاتی۔ اور ان پر ایسی تباہی آتی کہ ان کی باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔

رزق کے دروازوں کا ایک طرح کھلنا، قوانینِ خداوندی کی اتباع سے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ زمین و آسمان کی

برکات سے متمتع ہونا ہوتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ - (۷/۹۶)۔ اور دوسری طرف یہی دروازے، قوانینِ خداوندی کو فراموش کرنے سے کھلتے

جائز ذرائع سے فراوانیٔ رزق

ہیں، جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ رزق وہی ہوتا ہے۔ اس کا مصرف نتائج بدل دیتا ہے۔ رزق نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے ہو تو نتیجہ تعمیر و تحسین۔ ذاتی یا گروہی ملکیت کے لئے ہو، تو نتیجہ تباہی اور بربادی۔ کس نوعیت کی تباہی اور بربادی؟ اس کے لئے آپ نے شاید آیت کے آخری الفاظ پر غور نہیں فرمایا۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۔ ایسی تباہی جس سے وہ زندگی کی بازآفرینی کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں! اپنے مستقبل کی طرف سے مایوسی، شدید ترین عذاب ہوتا ہے اگر پودا اُوپر سے خشک ہو گیا ہے لیکن اس کی جڑ ثابت ہے تو اس کی بارِ دیگر سرسبزی و شادابی کی اُمید ہو سکتی ہے۔ لیکن جس پودے کی جڑ کٹ جائے، اُس کی حیاتِ نو کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے۔ ایسی ہی قومیں زندگی کی بازآفرینی کی طرف سے مایوس ہوتی ہیں۔

۶/۴۵ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس طرح اس قوم کی جڑ کٹ جاتی جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے انسانیت پر ظلم اور زیادتی کرتی تھی۔ جب ان کی تباہی سے نظامِ ربوبیت کی راہ میں حائل ہونے والے موانع دُور ہو جاتے، تو وہ نظام، دنیا کے لئے وجۂ ہزار حمد و ستائش بن جاتا۔ اس طرح یہ تخریبی مرحلہ تعمیری منزل کا پیش خیمہ بن جاتا۔ یہی ہمارا قانون ہے یہاں ہر تعمیر سے پہلے تخریب ہوتی ہے۔ حق کے نظام کے متمکن ہونے کے لئے، باطل کے نظام کی شکست و ریخت ضروری ہے۔ جب تک ظالم کی جڑ نہ کٹے، مظلوم کی کھیتی ہری نہیں ہوتی (ظالم کی تباہی پر ہر مظلوم بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ الحمد للہ رب العلمین ـــــ کس قدر سزاوارِ حمد ہے خدا کا عالمگیر نظامِ ربوبیت؟)

ظالم کی جڑ کٹ جاتی ہے

آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے کس مقام پر "الحمد للہ رب العلمین" کہا ہے؟ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے قرآن کریم (سورہ فاتحہ) کا آغاز ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، نظامِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ، ربوبیتِ عالمینی ہے جو وجۂ حمدیت ہے۔ جو عناصر اس ربوبیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، اُن کا راستہ سے ہٹا دینا عالمگیر انسانیت کے لئے جشنِ مسرت منانے کی تقریب ہوگی۔ ظالم کی جڑ کٹ جانے پر ہر مظلوم کی زبان پر بے ساختہ آئے گا کہ الحمد للہ رب العلمین

اور ان میں سے ہر ایک پکار اٹھے گا کہ

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی ست   باش! تا بینی کہ انجامِ تو چیست؟

عالمگیر ربوبیت کا راستہ روکنے والے، سرمایہ داروں سے جب کہا جائے کہ تم اس قدر مال و دولت کے واحد مالک کس طرح بن بیٹھے ہو، تو وہ (قارون کے الفاظ میں) جواب میں کہتے ہیں: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸) "اسے میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے، یہ میری ذاتی صلاحیتوں کا حاصل کردہ ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل دینے کا کیا حق حاصل ہے؟" قرآن کہتا ہے کہ یہ ذہنیت کسی ایک قارون تک محدود نہیں۔ دنیا کے ہر سرمایہ دار کی یہی ذہنیت ہوتی ہے۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹/۴۹) "اور یہی ذہنیت ساری خرابیوں کی جڑ اور فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے"۔

نظامِ سرمایہ داری کی تردید

حصولِ علم کا ذریعہ سماعت و بصارت (حواس) ہیں۔ انہی سے اکتسابِ رزق کی صلاحیت ترتیب پاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے یہ پوچھو کہ یہ ذرائع حصولِ علم تمہاری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہیں یا تم نے کسی سے خریدے ہیں؟ یہ تو خدا کے عطا کردہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔ یہ سب نعماء خداوندی ہیں جو انسان کو بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں، لہٰذا اس کی رو سے حاصل کردہ مال و دولت کا انسان "واحد مالک" نہیں ہو سکتا۔ یہ اسباب و ذرائع خدا کے عطا کردہ ہیں اور انسان کی صرف محنت ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل میں سے وہ صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ [لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)] باقی سب خدا کا ہے جسے اس کے حکم کے مطابق، ضرورتمندوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ (تفصیل ان امور کی 'قرآن کے معاشی نظام' کے تحت ملے گی جسے انڈکس میں دیکھ لیجئے)۔ یہاں اس نکتہ کی وضاحت اس انداز سے کی:

۶/۴۶ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝

(ان تاریخی شواہد کو سامنے لانے کے بعد، ان سے پوچھو کہ تم عوام کے حقوق کو یہ سمجھ کر غصب کرتے ہو کہ تم عقل و فکر میں ان سے بڑھ کر ہو، اس لئے تمہیں حق پہنچتا ہے کہ تم، مکر و فریب سے ان کا سب کچھ چھین جھپٹ لو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ عقل و خرد کی تمام صلاحیتیں دی ہوئی کس کی ہیں؟ یہ نہ تو تمہاری خود پیدا کردہ ہیں، نہ تم نے انہیں کہیں سے خریدا ہے۔ یہ تمہیں خالقِ فطرت کی طرف سے ملی ہیں) اگر وہ سمع و بصر و قلب کی ان صلاحیتوں کو سلب کر لے، تو کیا کوئی اور قوت ایسی ہے جو ان صلاحیتوں کو تمہیں واپس

دیدے ؟ ہم کس طرح مختلف دلائل وبراہین کو پھیر پھیر کر ان کے سامنے لاتے ہیں، لیکن، یہ اس کے باوجود، حق و صداقت سے منہ موڑے رکھتے ہیں۔

اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے وہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ قوموں کی تباہی ہوتا ہے۔

۶/۴۷ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ اگر وہ تباہ کن انقلاب تم پر اچانک آجائے۔ یا اس کی علامات قبل از وقت اُبھر کر تمہارے سامنے آجائیں، تو اس سے تمہاری ہلاکت ہوگی یا کسی اور قوم کی ؟ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ جو قوم دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتی ہے، وہ ہلاک ہو کر رہتی ہے، اور چونکہ تم ایسا ہی کرتے ہو، اس لئے تمہارے سوا اور کون سی قوم ہلاک ہوگی ؟ اس انقلاب میں تمہاری ہی تباہی اور بربادی ہوگی۔

اس حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ؟ تو یہ نہیں کہ اسے بتایا نہ گیا ہو کہ زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں کی راہ کون سی ہے اور تباہیوں اور بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ کونسا ؟ اس مقصد کے لئے اُس نے بعثتِ انبیاءِ کرامؑ کا سلسلہ جاری کیا تھا:

۶/۴۸-۴۹ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

ہمارا قانون جو پیغمبروں کی وساطت سے بھیجا جاتا ہے، ہر دو نظامہائے زندگی کے نتائج کو کھلے طور پر بیان کر دیتا ہے —— صحیح نظام کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں۔ غلط نظام کا مآل، تباہی اور بربادی ——

اس کے بعد، جو قوم صحیح روشِ زندگی اختیار کر لیتی ہے، اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس، جو قوم ہمارے قوانین کو جھٹلا کر غلط روشِ زندگی پر مُصر رہتی ہے، اُس پر تباہی اور بربادی کا عذاب مسلّط ہو جاتا ہے —— بے راہ روی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ حضراتِ مُرسلینؑ من اللہ کا فریضہ، رسالات (پیغامات) خداوندی کو انسانوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ خدا نے نوعِ انسانی تک جو آخری پیغام پہنچانا تھا، وہ قرآنِ کریم میں مکمل کر دیا گیا۔ اسے غیر متبدل قرار

دیا گیا، اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے بعد کسی ماُمور من اللہ کے آنے کی ضرورت نہ رہی۔ اسے ختمِ نبوّت کہا جاتا ہے۔

واضح راہ نمائی قرآنِ کریم نے ایمان و اعمالِ صالح اور دوسری طرف تکذیبِ رسالاتِ خداوندی کے عواقب کو ایسی محسوس شکل میں واضح کر دیا ہے کہ ان کی روشنی میں کوئی قوم اپنے آپ کو اس فریب میں مُبتلا نہیں رکھ سکتی کہ وہ ایمان و اعمالِ صالح کی پابند ہے یا تکذیب و کفر کی حامل۔ ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ خوف اور حزن سے مامونیت اور تکذیب و فسق کا نتیجہ تباہی اور بربادی۔ سو ہر قوم اپنی حالت سے اندازہ کر سکتی ہے کہ وہ مومن ہے یا فاسق۔

انبیاء کرامؑ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ غلط اور صحیح راستے میں امتیاز کر کے دکھا دیں، لیکن محسوسات کے خوگر انسان مطالبہ کرتے تھے کہ وہ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ یہ منشاءِ خداوندی کے خلاف تھا کہ انسان کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اُسے مجبوراً ایک خاص راستہ پر چلایا جائے۔ اس لئے اس مطالبہ کو مُسترد کیا جاتا رہا۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۳۰۹ اور جلد سوم صفحہ ۲۴ پر گزر چکی ہے۔ (نیز سابقہ صفحات میں) یہاں بھی اسی کو دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

۶/۵۰ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۠

(ان سے کہہ دو کہ میں بھی، انبیاء سابقہؑ کی طرح، تمہیں یہی بتانے کے لئے آیا ہوں کہ کونسی روش کا نتیجہ کیا ہوگا)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں، یا یہ کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ یا میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، اور جو کچھ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے، اُس کا اتباع کرتا ہوں۔ اور اس کی روشنی میں، اپنی آنکھوں سے دیکھ کر راستہ چلتا ہوں۔ اس کے برعکس، تم نہ وحی کا اتباع کرتے ہو، نہ عقل و فکر سے کام لیتے ہو۔ بس اپنے اسلاف کے راستے پر آنکھیں بند کئے چلے جا رہے ہو۔

مجھے بتاؤ کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا، دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے؟

بینا اور اندھا برابر نہیں ہو سکتے یہاں دو لفظوں میں بات نکھار کر بیان کر دی۔ یعنی عقل و فکر سے کام لینے والا بینا، اور توہم پرستی اور جہالت پر اصرار کرنے والا اندھا۔ پوچھا کہ بتاؤ کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ سو جب یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے، تو تم کیوں جہالت پر

اصرار کرتے ہو؟

آیت ۴۸ میں کہا گیا تھا کہ انبیاءؑ کا فریضہ تبشیر و تنذیر ہے۔ کہا گیا کہ انبیاء کرامؑ کو بے شک اپنا یہ فریضہ ادا کرتے رہنا چاہیئے، لیکن ان کی اس تبلیغ و تنذیر سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اس حقیقت پر یقین رکھیں کہ غلط کاموں کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

۶/۵۱ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

اے رسول! تو، اِس قرآن کی رُو سے، ان لوگوں کو زندگی کے پُرخطر راستوں سے آگاہ کر تا رہ جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تو نہ اُن کا کوئی رفیق و مددگار ہو سکتا ہے، نہ سفارشی، جو انہیں اُس کے تباہ کن نتائج سے بچا سکے۔

اُنہیں اس طرح سمجھانے سے مقصد یہ ہے کہ شاید یہ زندگی کے خطرات سے اپنی حفاظت کریں۔

حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اُن کی دعوت کو سب سے پہلے وہ لوگ قبول کرتے تھے جو معاشرہ میں ضعیف و ناتوان، محتاج و محروم، مستبد قوتوں کے دبائے ہوئے اور کچلے ہوئے تھے۔ یہ اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مقصد ان انسانوں کو، پستیوں سے اُٹھا کر شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کی بلندیوں پر لے جانا ہوتا تھا۔ ان کے برعکس، دولتمند اور مستبد طبقہ اُس کی مخالفت کرتا تھا۔ کیونکہ اس نظام کی کامیابی میں اُنہیں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ اس دعوت کی مخالفت تو اس بناء پر کرتے، لیکن اعتراض یہ کرتے تھے کہ ہم یہ کیسے برداشت کرلیں کہ یہ غریب اور مفلس انسان، جنہیں ہم اس معاشرہ میں ذلیل ترین افراد سمجھتے ہیں، ہمارے ہمدوش ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مطالبہ کرتے کہ ان لوگوں کو اس جماعت سے نکال دیا جائے، تو ہم پھر اس دعوت کو سننے کے لئے تیار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے اِس مبنی پر تمرد اور رعونت مطالبہ کو کسی صورت میں بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا تھا! رسولؐ کی طرف سے دو ٹوک الفاظ میں اسے مسترد کر دیا جاتا اس سے اُن کی مخالفت اور بھی بڑھ جاتی، اور اس مخالفت کا اوّلین ہدف، یہی کمزور اور ناتوان افراد بنتے۔ وحی اور رسالت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستانِ عبرت آموز ہے۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرتِ نوحؑ سے ہوا تھا، اور قرآنِ کریم نے اُن کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلے میں اِسی کشمکش کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے آیات (۱۱/۲۷-۲۹، ۲۶/۱۱۱-۱۱۴)

غریبوں کی جماعت

حضرتِ نوحؑ کا جواب تھا: وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ط (۱۱/۲۹)۔ "میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار

نہیں سکتا جو اِس دعوت کو قبول کر چکے ہیں "۔ یہی حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا:

۶/۵۲ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اس دعوتِ انقلاب پر سب سے پہلے بالعموم کمزوروں اور مظلوموں کا طبقہ لبیک کہے گا، اور اکابرین یہ کہکر اس کی مخالفت کریں گے کہ ہم اس تحریک میں کس طرح شامل ہو جائیں، جس میں ہم اور یہ پست درجہ کے لوگ ایک ہی صف میں بٹھا دیئے جائیں؟ تم انہیں اس جماعت سے خارج کر دو، تب ہم تمہارے ساتھ شامل ہوں گے۔ سو دیکھنا! کہیں ایسا نہ کرنا کہ (ان لوگوں کی خاطر) اپنی جماعت سے اُن لوگوں کو دُور دُور رکھنا شروع کر دو جو خالصتہً 'لِوَجْهِ اللّٰه' اس دعوت کے عام کرنے میں صبح و شام سرگرداں رہتے ہیں، اور اپنا کوئی ذاتی مفاد ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ یہ چیز کہ تمہاری جماعت میں بیشتر غریب اور مظلوم شامل ہوتے ہیں، تمہیں کسی طرح موردِ الزام ٹھیرا نہیں سکتی۔ (یہ کیا کام کاج کرتے ہیں، اور تم کیا کرتے ہو، اس بات کا تمہارے پروگرام پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑنا چاہیئے تمہارا اور ان کا رشتہ کاروبار کا نہیں، دین کا ہے۔ اور دین کے رشتے میں قریب ترین وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کی خاطر زیادہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔) اس لئے تمہاری یہ خواہش کہ اس جماعت میں بڑے بڑے لوگوں کو بھی شامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ دین کی تقویت کا موجب بنیں، کسی طرح اِن غریبوں کے خلاف نہیں جانی چاہیئے۔ اگر تم نے، اس مقصد کے پیشِ نظر، ان لوگوں کو دُور ہٹا دیا، تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ (۱۱/۲۷-۳۰ و ۲۶/۱۱۱-۱۱۴ و ۱۸/۲۸ و ۸/۶۲-۶۴ و ۸۰/۱-۱۱ و ۱۵/۸۸ و ۴۸/۲۹ و ۸/۷۴-۷۵ و ۹/۱۰۰ و ۳/۱۷۸)

اِس جماعت کی اہمیت کس قدر تھی، اور حضورؐ کو ان کی حفاظت اور رفاقت کے لئے کس شدت سے تاکید کی گئی تھی، اس کا تذکرہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آتا ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ انہیں استقامت سے اپنے ساتھ رکھو (۱۸/۲۸)۔

جماعتِ صحابہؓ کی اہمیت

کہیں یہ کہ ان کی حفاظت اور نگہ پرداخت نہایت رافت اور محبت سے کرو (۱۵/۸۸)۔ سورہ انفال میں اس جماعت کی اہمیت ایسے الفاظ میں ثبت کی گئی ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، ان حضرات کی عظمت اور رفعت درخشندہ سے درخشندہ تر ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ پہلے فرمایا کہ "اے رسولؐ! اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کے ذریعے تمہیں تقویت پہنچائیگا (۸/۶۲)" یعنی صرف نصرتِ خداوندی نہیں، بلکہ نصرتِ خداوندی اور رفاقتِ جماعتِ مؤمنین دونوں کے ذریعے۔ اور

ایک ہی آیت کے بعد اس کی وضاحت ان بلیغ الفاظ میں کر دی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۸/۶۴)

اے رسولؐ! تیرے لئے خدا اور یہ جماعتِ مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے، کافی ہے۔

یعنی اکیلا خدا کافی نہیں۔ خدا اور یہ جماعتِ مومنین، دونوں مل کر تیرے لئے کافی ہوں گے۔ غور فرمائیے کہ صحابہ کبارؓ کی عظمت کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا تھا اور اس آیۂ جلیلہ کی تو ابتداء ہی ان الفاظ سے کی گئی تھی کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۴۸/۲۹) جس میں دینِ خداوندی کی نہایت جامع اور دلکش تصویر بڑے حسین اور دلآویز انداز میں کھینچ گئی ہے۔

دوسری طرف ان صحابہؓ کے ایمان اور ان کے مقام کی کیا کیفیت اور نوعیت تھی، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اوّل۔ صفحہ ۲۲۵ پر گزر چکی ہے۔

ان کے برعکس ان رعونت و تکبر کے پیکروں کی ذہنیت آشکارا کرنے کے لئے کہا گیا کہ:

۶/۵۳ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ۝

یہ بڑے لوگ، ان چھوٹے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو! یہ ہیں وہ جنہیں ہم میں سے انعاماتِ خداوندی کے لئے چن لیا گیا ہے۔ ذرا ان کی حالت تو دیکھو؟ تم نے دیکھا کہ ان باتوں سے، ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح نکھر کر سامنے آگئی اور صاف معلوم ہو گیا کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو انہیں حق و صداقت کی طرف آنے سے روک رہا ہے؟ تم ان سے کہہ دو کہ اس نظام میں عزت اور ذلت کے معیار بالکل مختلف ہیں۔ یہاں، جو جس قدر، قوانینِ خداوندی کا پاسدار اور قدر شناس ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ (۴۹/۱۳)

دوسری طرف اس جماعت کے متعلق کہا:

۶/۵۴ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

لہٰذا، جب تمہاری جماعت کے لوگ تمہارے پاس آئیں تو ان سے کہو کہ وہ بالکل نہ گھبرائیں، ان کے لئے ہر طرح کا

امن اور سلامتی ہے۔ یہ نظام' ان بڑے لوگوں کی خاطر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اُوپر واجب قرار دے رکھا ہے کہ تمہاری پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر تم میں سے کسی سے کوئی بھول چُوک بھی ہو جائے' اور اس کے بعد وہ اپنے کئے پہ نادم ہو' اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لے' تو اسے بھی اس نظام کی حفاظت اور مرحمت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ (نظامِ عدل میں 'عفو و اصلاح کی گنجائش رکھ دینا بھی خدا کی رحمت ہے۔ اس طرح "عدل" "رحم" اور ایک دُوسرے سے متضاد نہیں رہتے۔ قانون کے مطابق 'عفو' بھی 'عدل' کا ایک گوشہ بن جاتا ہے)

اس آیت میں پھر کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ آیا ہے جس کی تشریح سابقہ صفحات' آیت (۶/۱۲) کے تابع گزر چکی ہے۔ توبہ کے متعلق انڈکس دیکھئے نیز اسی جلد میں آیت (۴/۱۷-۱۹) کی تفسیر۔ ان تصریحات کے بعد فرمایا:

۶/۵۵ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۟

ہم اس طرح اپنے قوانین کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تا کہ (سہو و خطا سے لغزش کرنے والوں اور دیدہ و دانستہ جُرم کرنے والوں کی راہیں ایک دوسرے سے' متمیز ہو جائیں۔

نظامِ عدل کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ قانون نہایت واضح طور پر ہر ایک کے سامنے آجائے[1]۔ یہ افراد کا فریضہ نہیں کہ وہ معلوم کرتے پھریں کہ قانون کیا ہے اور اس کا مفہوم و مطلب کیا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کی اس طرح نشر و اشاعت کرے کہ وہ ہر ایک کے علم میں آجائے۔ اور پھر ایسا انتظام کرے کہ متنازعہ فیہ

قانون غیر مبہم ہونا چاہیئے

امور کے سلسلہ میں متعلقہ فریق معلوم کر سکیں کہ اس باب میں قانون کیا ہے۔ اور اس کا منشاء اور مفہوم کیا' تاکہ ہر فریق سمجھ لے کہ اس کا دعویٰ قانون کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر حکومت کی طرف سے ایسی مشینری متعیّن کر دی جائے تو مقدمات کے تصفیہ کے سلسلہ میں وہ تمام اُلجھنیں دُور ہو جائیں جن کی وجہ سے آجکل لوگوں کو اس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس طرح مجرمین کا راستہ واضح طور پر الگ اور متمیز ہو جائے۔ یہ بڑی امن کی راہ ہے۔ آجکل حالت یہ ہے کہ معاشرہ میں فریب کار اور جرائم پیشہ لوگ دوسروں کے ساتھ اس طرح گھلے ملے رہتے ہیں کہ شریف لوگ انہیں پہچان ہی نہیں سکتے اور اس طرح اُن کے دامِ فریب میں آجاتے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو کہ

---

[1] اس کی وضاحت سابقہ باب میں زیرِ آیت (۵/۱۹) اور اس سے پہلے زیرِ آیت (۴/۱۶۵) میں کی جا چکی ہے۔

مجرم متمیز ہوں گے جرائم پیشہ لوگ آسانی سے پہچانے جا سکیں تو شریف انسان بڑے امن میں رہیں۔ قرآنِ کریم نے مثالی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ اس میں مجرمین شریف لوگوں سے الگ ہوں گے۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ۔ (۳۶/۵۹)۔ ایسے نمایاں طور پر الگ اور متمیز، کہ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ (۵۵/۴۱) "مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس طرح کوئی شخص دھوکا نہیں کھا سکے گا کہ جس سے وہ معاملہ کر رہا ہے وہ شریف ہے یا بدمعاش۔ یوں ان کی راہیں الگ الگ نظر آ جائیں گی۔

پیچھے سے بات یوں چلی آ رہی تھی کہ قوم کے بڑے بڑے سردار مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان مفلسوں اور ناداروں کو جنہیں وہ معاشرہ میں ذلیل سمجھتے تھے، اپنی جماعت سے الگ کر دیں تو پھر ہم آپ کے ساتھ شامل ہو سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ مطالبہ سراسر ان کے پست جذبات پر مبنی تھا۔ یعنی ان کی انانیت اور تکبّر کے جذبات اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ جنہیں وہ ذلیل سمجھتے ہیں وہ ان کے ہمدوش کھڑے ہو جائیں۔ ان سے کہا گیا کہ دین کا نظام قوانین پر مبنی ہے نہ کہ جذبات پرستی پر۔ قانون کا تقاضا مساواتِ انسانیہ ہے۔ اس لئے دین کا مدعی، قانون کو چھوڑ کر کسی کے جذبات کا اتباع نہیں کر سکتا۔ فرمایا:

۶/۵۶ قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ○

لہذا، (ان بڑے بڑے لوگوں سے) کہدو کہ تم خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو، مجھے اُن کی اطاعت سے روک دیا گیا ہے۔ میں تمہاری خاطر ایسا نہیں کر سکتا۔ تمہارا مطالبہ جذبات پر مبنی ہے اور میری دعوت قانونِ خداوندی پر۔ لہذا میں اس قانون کو چھوڑ کر تمہارے جذبات کا اِتباع نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں بھی تمہاری طرح راہ گم کردہ ہو جاؤں گا۔ سیدھے راستے پر نہیں رہوں گا۔

قانون دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے اور جذبات میں علم و بصیرت اور دلیل و برہان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جذبات پرست لوگ دھاندلی سے قانون کی تکذیب کرتے ہیں، اس لئے ان دونوں گروہوں میں مفاہمت کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی:

۶/۵۷ قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ○

مَیں اپنے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایک واضح راستے پر ہوں، اور تم اُسے جھٹلاتے ہو۔ (اس لئے مجھ میں اور تم میں مفاہمت کس طرح ہو سکتی ہے؟ تمہارا راستہ اور، میرا اور) باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ جس تباہی اور بربادی سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو، وہ جلدی کیوں نہیں آتی، تو عمل اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جیسے درخت کے پھل لانے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے)۔ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اُس مدت میں تخفیف کر کے، تباہی کو تمہارے سامنے جلدی سے آؤں۔ اِن باتوں کا فیصلہ خُدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ اپنے قانون کو ٹھیک ٹھیک طور پر بتا دیتا ہے اور پھر اُسی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ اُس سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی اور نہیں۔

اسکے بعد مخالفین کے اِس اعتراض کو پھر سامنے لایا گیا جو وہ اکثر کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ جس تباہی سے رسولؐ انہیں متنبہ کرتا ہے، وہ آتی کیوں نہیں اس میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

۶ / ۵۸-۵۹ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ○ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ○

اِن سے کہو کہ جس تباہی کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، اگر اُس کا جلد سے آنا میرے اختیار میں ہوتا، تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن (یہ چیز میرے بس کی نہیں)۔ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے کہ زیادتی کرنے والوں کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت کون سا ہے۔

اعمال کے اَن دیکھے نتائج، اور انسانی نگاہوں سے مستور حقائق و حوادث کو سامنے لے آنے والا قانون اُسی کا ہے۔ غیب کا علم اُس کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ کائنات کی خشکی اور تری (بحر و بر) میں کیا ہو رہا ہے۔ کس درخت سے کوئی پتہ کب جھڑے گا۔ زمین کی تاریکیوں میں دبا ہوُا دانہ کب پھوٹے گا۔ کوئی تازہ یا خشک میوہ کب کھانے کے قابل ہوگا۔ یہ سب کچھ اُس کے کائناتی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور یہ قانونِ فطرت کی کھُلی ہوئی کتاب میں درج ہے۔ (جو لوگ اس کتاب کو پڑھ لیں، انہیں ان امور کا علم حاصل ہو سکتا ہے اس علم سے خود ان کائنات کے تالے کھُل سکتے ہیں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ یعنی غیب کے متعلق کہا کہ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ۔ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو

نہیں۔ علمِ غیب کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۹۵-۹۰ پر بحث ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ وہ (خدا) جانتا ہے جو بحر و بر میں ہے ...... وغیرہ۔ ان امور کے متعلق صرف اتنا ہی کہا کہ خدا کو ان کا علم ہے

علمِ غیب۔ اور قوانینِ فطرت

ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا یا جان سکتا۔ لہٰذا، یہ امور، غیب میں سے نہیں۔ یہ سب صحیفۂ کائنات میں مذکور ہیں اور قوانینِ فطرت کے مطابق رُو نما ہوتے رہتے ہیں۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کو عطا کر دی گئی ہے۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کر لیں گے، انہیں ان امور کا علم ہو جائے گا۔ (قوانینِ فطرت کے متعلق انڈکس میں "فطرت" کا عنوان دیکھئے)۔

اسی قسم کی ایک اور آیت بھی ہے، جس پر غور نہ کرنے سے اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ ع (۳۱/۳۴)

یہ ظہورِ نتائج کی گھڑی، کب آئے گی، اس کا علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے، اگرچہ اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے ـــــ جس طرح بارش برستی تو ایک وقت پر جا کر ہے، لیکن وہ بننی شروع ہو گئی ہوتی ہے ایک مدت پہلے سے۔ یا جس طرح بچہ پیدا تو ہوتا ہے ایک وقتِ خاص پر جا کر، لیکن وہ رحمِ مادر میں بہت پہلے سے مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہوتا ہے۔

ان امور، یعنی بارش یا جنین کے مختلف مراحل میں سے گزرنے کا علم تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو، لیکن خدا وہ کچھ بھی جانتا ہے جو تم نہیں جان سکتے۔ (مثلاً) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا۔ اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہو گی۔ خدا سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے (اس لئے خدا کو اس بات کا علم ہے کہ ظہورِ نتائج کی گھڑی کب آئے گی۔ تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ ضرور آ کر رہے گی)

اس میں پہلے ہے: إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ۔ "علم الساعت خدا کے ہاں ہی ہے"۔ انسانوں کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہے: وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط بارش اور جنین کے متعلق صرف اتنا ہی کہا ہے کہ خدا کو ان امور کا علم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان کا علم صرف

خدا کو ہوتا ہے، انسانوں کو نہیں ہو سکتا۔ اِس کے بعد پھر دو امور کے متعلق کہا کہ انسان کو ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ کہ وہ کل کیا کرے گا، اور اُس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ اس قسم کی آیات میں یہ فرق کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جن کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ ان کا علم صرف اُسی کو ہوتا ہے، اور کون سے امور ایسے ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ خدا کو ان کا علم ہوتا ہے۔ اِن (ثانی الذکر) امور کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ علم غیب نہیں۔ علمِ غیب وہی ہے جسے خدا نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ وہ علم کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ (اگر خدا بذریعہ وحی عطا نہ کرے تو) رسولوں کو بھی نہیں۔

جس طرح کائنات میں سلسلۂ علت و معلول جاری ہے، یعنی ہر عمل کا نتیجہ قانونِ فطرت کی رُو سے مرتب ہوتا ہے۔ اِس طرح انسانی دُنیا میں قانونِ مکافات کا عمل کارفرما ہے جس کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اگلی آیت میں اِن ہر دو قوانین کی مثال ایک ہی مقام پر دے دی گئی ہے فرمایا:۔

۶/۶۰ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

(خارجی کائنات میں بہار و خزاں کی گردشوں کی طرح، خود تمہاری زندگی میں بھی لیل و نہار کی گردشیں جاری رہتی ہیں)۔ وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو۔ اس کے بعد وہ تمہیں رات کو سلا دیتا ہے، اور پھر تم دن میں اُٹھ بیٹھتے ہو (۳۹/۴۲)۔ اس طرح وقت گزرتا جاتا ہے تاکہ تمہارے اعمال کے نتائج کے ظہور کی مدت پوری ہو جائے۔ اور اس دوران میں تمہارا ہر قدم اُسی سمت کو اُٹھ رہا ہوتا ہے (اگرچہ تم اپنے ذہن میں سمجھ رہے ہوتے ہو کہ وہ بات آئی گئی ہو گئی)۔ حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب تمہارے اعمال کے نتائج محسوس شکل میں تمہارے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

"هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ" کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں رات کو وفات دے دیتا ہے (یعنی مار دیتا ہے)۔ (اور پھر دن کو زندہ کر دیتا ہے)۔ ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ "خدا وہ ہے جو تمہیں رات کو سلا دیتا ہے اور پھر تم دن میں اُٹھ بیٹھتے ہو"۔ یہ مفہوم قرآنِ کریم کے ایک اور مقام سے لیا گیا ہے جس میں ایک ایسی عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جس کا صحیح مفہوم دورِ حاضر کے علم النفس

(سائیکالوجی) کی روشنی میں سمجھ میں آسکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: اَللّٰہُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ج "اللہ نفوس کو وفات دیتا ہے اُن کی موت کے وقت، اور جو لوگ مرتے نہیں اُن کی نیند کی حالت میں"

نیند اور موت میں فرق

ہم نے یہاں یَتَوَفَّى کا ترجمہ "وفات دے دیتا ہے" کیا ہے اور نفوس کا لفظ بلا مفہوم رہنے دیا ہے۔ آیت کے اتنے حصے میں کہا گیا ہے کہ حالتِ موت اور حالتِ نیند میں نفسِ انسانی پر وفات طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے: فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّى ط جن پر موت وارد ہو جاتی ہے، اُن کے نفس کو روک لیتا ہے اور جن پر موت طاری نہیں ہوتی۔ یعنی وہ صرف نیند کی حالت میں ہوتے ہیں، اُن کے نفس کو واپس بھیج دیتا ہے ایک معیّنہ مدت کے لئے"۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۳۹/۴۲)۔ "جس حقیقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے، اس میں اربابِ فکر و تدبّر کے لئے مقصود و منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے نشانیاں ہیں"۔

کہا یہ گیا ہے کہ حالتِ نیند اور موت کے عالم میں نفسِ انسانی کو روک لیا جاتا ہے۔ اسے وفات دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جسے نیند اور موت کی حالت میں متوفّی کر دیا جاتا ہے۔ موت کی صورت میں اسے روک لیا جاتا ہے، اور نیند کی صورت میں اسے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

موت کی حالت میں کیا ہوتا ہے ہم نہیں جانتے۔ لیکن نیند کی حالت میں کیا ہوتا ہے، یہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے۔ ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں، جاگنے والے اور سونے والے میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بجز ایک بات کے۔ دونوں زندہ ہوتے ہیں۔ دونوں کے جوارح (دل۔ جگر۔ پھیپھڑے۔ تنفس وغیرہ) اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں جس طرح بیداری کی حالت میں۔ لیکن ان میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یعنی بیداری میں انسان کا شعور کام کر رہا ہوتا ہے۔ نیند کی حالت میں شعور کام نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن وہ معدوم نہیں ہوتا، صرف معطّل ہوتا ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ جاگنے پر اسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا، اس آیت میں نفس سے مُراد انسانی شعور ہے اور وفات دینے کے معانی عارضی طور پر معطّل کر دینے کے۔

نفس کے معنی شعور

کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ نیند کی حالت میں ہوتا ہے، وہی کچھ موت کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی دونوں حالتوں میں انسانی شعور معطّل ہوتا ہے۔ موت کی حالت میں اسے اس دنیا میں واپس نہیں بھیجا جاتا، وہیں روک لیا جاتا ہے یعنی

موت کی حالت میں بھی شعور (نفسِ انسانی) معدوم نہیں ہو جاتا۔ وہ موجود ہوتا ہے، صرف اُس کی کارفرمائی، عارضی طور پر، معطل ہو جاتی رہتی ہے۔ دوبارہ زندگی کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ معطل شدہ شعور پھر کام کرنے لگ جائے گا۔

حیاتِ آخرت لہٰذا، حیاتِ آخرت میں انسان کا موجودہ شعور، اپنی تمام صلاحیتوں۔ یعنی خیالات احساسات اور حافظہ کو بدستور لئے ہوئے کارفرما ہوگا۔ اس زندگی میں اس کی کارفرمائی کا ذریعہ (MEDIUM) طبیعی جسم ہوتا ہے۔ حیاتِ آخرت میں یہ ذریعہ کس قسم کا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا ذریعۂ فعالیت کچھ بھی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شعور تو وہی ہوگا اور وہی اس کی کارفرمائیاں۔

اِس مقام پر اِس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تفصیل وہاں آئے گی جہاں حیاتِ آخرت پر بحث کی جائے گی۔
ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہم نے آیت (۶/۶۰) میں یَتَوَفّٰکُمْ کا ترجمہ سو جانا کیوں کیا ہے۔

بات ہو رہی تھی قانونِ مکافاتِ عمل کی۔ اس تسلسل میں فرمایا:

۶/۶۱-۶۲ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝

اُس کا قانونِ مکافات تمام انسانوں پر غالب ہے۔ اُس نے ایسی قوتیں مقرر کر رکھی ہیں جو تم پر نگران رہتی ہیں (تاکہ تمہارا کوئی عمل بے نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اِس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ظہورِ نتائج، انسان کی اِس زندگی میں ہو جائے۔ زندگی کا سلسلہ اِس سے آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ) جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے کارندے (قانونِ فطرت کے مطابق) اُس کی دنیاوی زندگی کی مدت کو پورا کر دیتے ہیں۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہیں کرتے (۱۳/۱۱؛ ۱۷/۱۳-۱۴؛ ۵۰/۲-۴)

اس کے بعد زندگی اگلے دَور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہاں نتائج، ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔
یہ نتائج خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں کسی اور کا قانون نہیں چل سکتا۔ فیصلہ اُسی کا ہے۔
اُس کا قانونِ مکافات، نتائج مرتب کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرتا۔ یہ ساتھ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے (یہ الگ بات ہے کہ ان کا مجموعی اثر ایک وقت کے بعد جا کر نمودار ہو)۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے محفوظ کیا جاتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ وہ انسان کے اعمال ہیں جو نتیجہ خیزی کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں جس طرح بیج، زمین میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ علم النفس اس پر شاہد ہے کہ انسان کے ہر عمل، حتیٰ کہ اس کے خیالات اور ارادوں تک کا اثر اس کی ذات (نفس) پر مرتب ہوتا رہتا ہے

اعمال نامہ

یہ ذات، ان تمام اثرات و نقوش کو ساتھ لے کر مرنے کے بعد آگے جاتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے "اعمال نامہ" کہا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کو مختلف انداز سے سمجھایا ہے، یہاں حَفَظَةً کہا ہے محفوظ کر لینے والے۔ سورۃ الرعد میں کہا ہے:

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ... (۱۳/۱۱)

"انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے اُسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی۔ یوں انسان کا ہر عمل محفوظ ہو کر نتیجہ خیز ہوتا ہے"۔

سورۃ الانفطار میں ہے:

وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ﴿﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ﴿﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿﴾ (۸۲/۱۲-۱۰)

"اُس نے تم پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں ——— نہایت معزز اور امین ——— جو کچھ تم کرتے ہو انھیں اس سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ (اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے)"۔

سورہ اسریٰ میں اس ریکارڈ (اعمال نامہ) کو بڑی بلیغ مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ فرمایا: وَ کُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیۡ عُنُقِہٖ ؕ "ہر انسان کا اعمال نامہ مرتب ہو کر اُس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے، جس کے نتائج تبدیل کرنے پر اسے کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ (لفظِ طائر میں یہ مفہوم مضمر ہے)۔ جب تک ظہورِ نتائج کا وقت نہیں آتا، وہ دستاویز لپٹی رہتی ہے: وَ نُخۡرِجُ لَہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ کِتٰبًا یَّلۡقٰىہُ مَنۡشُوۡرًا ﴿﴾ (۱۷/۱۳) "جب ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے تو وہی لپٹی ہوئی دستاویز ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ یعنی اس وقت جو باتیں انسان کے نفسِ غیر شعوری کے تہ خانے میں مستور ہوتی ہیں۔ اس وقت نفسِ شعوریہ کے سامنے آجائیں گی۔ اُسے اُس وقت کہا جائے گا: اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ "تو اپنا اعمالنامہ خود پڑھ"۔ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا ﴿ؕ﴾ (۱۷/۱۴) تمہارا حساب کرنے کے لئے کہیں باہر سے محاسب بلانے کی ضرورت نہیں۔ تو خود ہی اسے پڑھ لے اور خود ہی حساب کر کے بتا دے کہ تیرا مقام کونسا ہے!"

اس طرح سمجھایا گیا کہ "اعمال نامہ" کہیں خارج میں نہیں رکھا رہتا۔ انسان کے اعمال اُس کی ذات پر اپنے

اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور انہی نقوش کی حامل انسانی ذات اس کا اعمال نامہ ہوتا ہے۔ موت سے انسانی جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اُس کی ذات، جو اُس کے اعمال کی حامل ہوتی ہے، محفوظ رہتی ہے۔ سورہ قٓ میں ہے کہ یہ منکرین حیاتِ آخرت کہتے ہیں کہ یہ تو عجیب سی بات نظر آتی ہے کہ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ (۵۰/۳) "جب ہم مر جائیں گے اور گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر زندہ ہونگے؟ یہ تو بڑی بعید از عقل بات ہے"! فرمایا: قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۵۰/۴)۔ "ان سے کہو کہ انسان کی جس چیز کو زمین کم کر دیتی ہے، اُس کا ہمیں علم ہے۔ موت اس کے طبیعی جسم کو منتشر کرتی ہے۔ اسکی ذات پر اسے کچھ تصرف حاصل نہیں ہوتا۔ اور چونکہ انسانی اعمال کا تعلق اُس کی ذات سے ہے نہ کہ اس کے جسم سے، اس لئے اس ذات کے محفوظ رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اعمال سب محفوظ رہتے ہیں ——
وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ ۔ (۲۳/۶۲)۔ اور یہ کتاب سچی سچی بات کہہ دیتی ہے۔ یہ ہے جسے (۶/۶۲) میں حَفَظَةً کہا گیا ہے۔

اُوپر کہا ہے اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۔ قانون صرف خدا کا کارفرما رہتا ہے۔ کائنات میں حکم صرف اس کا چلتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ جب کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو پھر خدا یاد آتا ہے۔ جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے:

۶/۶۴-۶۳ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ بحر و بر میں، جب کہیں بھی کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا کس قانون کے مطابق مل سکتا ہے؟ تم اس وقت، اپنی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں، کبھی گڑگڑا کر، اور کبھی چپکے چپکے دل میں اُسے مدد کے لئے پکارتے ہو، اور کہتے ہو کہ اگر خدا اس مصیبت سے ہمیں نجات دلا دے تو ہم ہمیشہ اُس کے شکر گزار رہیں گے۔

ان سے کہو کہ ان مصیبتوں سے، بلکہ تمام مصیبتوں سے، چھٹکارا، خدا کے قانون کے مطابق ہی ملتا ہے لیکن اس کے باوجود، تمہاری یہ حالت ہے کہ تم (اپنی زندگی کے معاملات میں) قوانینِ خداوندی کے ساتھ، اور قوانین بھی شامل کر لیتے ہو۔ اور یوں ایک غلط نظام قائم کر کے اپنے لئے تباہی مول لے لیتے ہو۔

قانونِ خداوندی کا اتباع ہر حال میں کرنا چاہیئے۔ اگر اُس زمانے میں جب حالات سازگار ہوں، قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے تو مصیبت آئے ہی نہیں۔ صحت کی حالت میں احتیاط برتی جائے ـــــ احتیاط برتنے کے معنی یہ ہیں کہ جو باتیں مُمدِ صحت ہیں اُنہیں اختیار کیا جائے اور جو مضرِ صحت ہیں، اُن سے پرہیز کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو پھر بیماری آتی ہی نہیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے زمانے میں احتیاط نہیں

قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہر حال میں

برتتے، اور جب اِس بد پرہیزی کی وجہ سے صحت خراب ہو جاتی ہے، مرض کا حملہ ہو جاتا ہے، تو پھر ڈاکٹروں حکیموں کی طرف بھاگتے دوڑتے ہیں اور وہ جس قسم کے پرہیز بتاتے ہیں، اُن پر عمل کرنے کا تہیّہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ تہیّہ چند دنوں تک رہتا ہے۔ پھر اُنہی بد پرہیزیوں پر اُتر آتے ہیں اور پھر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر تم حالت صحت میں پرہیز کرو تو بیمار کیوں پڑو۔ ایک ہندی دوھا ہے ؎

دُکھ میں تو ہر کو بھجیں، سکھ میں بھجے نہ کو — جو سُکھ میں ہر کو بھجیں، تو دُکھ کا ہکو ہو

افراد سے آگے بڑھیں تو یہی حالت اقوام کی ہوتی ہے۔ وہ خوش حالی اور سرفرازی کے زمانے میں ہر قسم کی بدعنوانیوں پر اُتر آتی ہیں، اور جب اِن بدعنوانیوں کے نتیجہ میں تباہی آتی ہے تو اس وقت اصلاحِ احوال کا خیال آتا ہے۔ اگر خوش حالی کے زمانے میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے تو تباہی آئے ہی کیوں!

قوانینِ خداوندی کی رُو سے غلط نظام کے نتیجہ میں جو تباہیاں آتی ہیں، اِس کی کئی ایک شکلیں ہوتی ہیں:

$\frac{6}{65}$ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝

نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اُوپر کے طبقے میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں، اور اُن کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقے میں لاقانونیت کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ ($\frac{16}{4-5}$)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں، اور خانہ جنگی پر اتر آتے ہیں ($\frac{6}{130}$)۔ اور یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔

دیکھو! ہم کسطرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ، اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔

مذہبی عذاب کی مختلف شکلیں

قرآن کریم نے یہاں انسانی زندگی کے اجتماعی نظام کے بڑے عمیق حقائق بیان کئے ہیں۔ کبھی (اور اکثر) ایسا ہوتا ہے کہ عوام تو ٹھیک ہوتے ہیں لیکن قوم کا اُوپر کا طبقہ (اربابِ اقتدار اور اعیانِ دولت و ثروت) بگڑ جاتے ہیں اور اُن کے بگڑنے سے سارا نظام تہس نہس ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس قوم پر تباہی آجاتی ہے۔ سورہ نمل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا تو اُنہوں نے عرض کیا کہ بارِ الٰہا! اس قوم کی اصلاح کسطرح ہوگی؟ وہ تو ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ایک فرد کی اصلاح (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہے۔ ارشادِ خداوندی ہُوا کہ ساری کی ساری قوم بگڑی ہوئی نہیں، نہ ہی ان کے ایک ایک فرد کی اصلاح کی ضرورت ہے: وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ‎(۲۷/۴۸)۔ مملکت کے مرکزی مقام (دارالسلطنت) میں نو اربابِ اقتدار ہیں جو بگڑے ہوئے ہیں۔ انہی کے

اکابرین کی تقلید

تتبع میں ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ اگر ان نو کی اصلاح کر دی جائے تو ساری قوم کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ عوام، اکابرینِ قوم کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اگر وہ بدعنوان ہوں، تو ساری قوم میں بدعنوانی پھیل جاتی ہے۔ وہ صحیح راستے پر چلیں، تو قوم انکے اتباع میں صحیح راستے پر چلتی رہتی ہے۔ لہٰذا، قوموں میں تباہی کی ایک شکل (یا ایک وجہ) یہ ہوتی ہے کہ اُس کا طبقۂ بالا بگڑ جاتا ہے، تو ساری قوم بگڑ جاتی ہے۔ اور یوں مملکت میں بدنظمی پھیل جاتی ہے۔

دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اربابِ اقتدار کا ظلم اور استبداد اس قدر حد سے بڑھ جاتا ہے کہ وہ قوم کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے، اور اس کے ردِ عمل کے طور پر عوام لاقانونیت پر اُتر آتے ہیں اور اس طرح معاشرہ کا نظم و نسق تباہ ہو جاتا ہے۔ اور ملک میں فوضویت (انارکی) پھیل جاتی ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر عوام کو اپنے پیچھے لگا کر الگ الگ پارٹیاں بنا لیتے ہیں، اور وہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا کر ملک کو تباہ کر دیتی ہیں۔

اجتماعی تباہی کی اِن شکلوں کی وضاحت کے بعد کہا کہ ہم ان امور کو اِس لئے بار بار سامنے لاتے ہیں۔ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۔ تاکہ لوگ غور و فکر سے کام لیں، اور جن اسباب و وجوہ سے معاشرہ پر تباہی آتی ہے اور اُن کی اِصلاح کریں۔ قرآنی نظام میں ان میں سے کوئی صورت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے بعد کہا:

‎(۶/۶۶) وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۗ قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝

لیکن تیری یہ قوم اس پر بھی نہیں سمجھتی، اور ایسی ٹھوس حقیقت کو برابر جھٹلائے چلی جارہی ہے۔ تم ان سے کہہ دو کہ (میرا کام، تمہیں نیک و بد سمجھانا ہے) میں تم پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ تمہیں زبردستی صحیح راستے پر چلاؤں۔

رسولؐ ان پر داروغہ نہیں

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر نبی اکرمؐ سے کہا ہے کہ آپ کا کام ان لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دینا ہے۔ زبردستی اس راستہ پر چلانا نہیں۔ اگر انسانوں کو زبردستی راستہ پر چلانا مقصود ہوتا تو انہیں پیدا ہی اس طرح کیا جاتا کہ یہ (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبوراً قوانینِ خداوندی کی اطاعت کئے چلے جاتے۔ لیکن خدا نے انہیں اختیار و ارادہ کی صلاحیت اس لئے دی ہے کہ یہ خود اپنے فیصلے سے اپنے لئے راستہ اختیار کریں۔

باقی رہا ان کا یہ اعتراض کہ اگر ان کی غلط روش کا نتیجہ تباہی ہے، تو وہ تباہی ان پر آتی کیوں نہیں۔ فرمایا:

۶/۶۷ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

تم جو کچھ کر رہے ہو اس کا نتیجہ اپنے وقت پر نمودار ہو جائے گا۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک مقام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے، اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔ تا آنکہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ (۷/۱۸۲-۱۸۳)

یہ کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، متعدد مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ انڈکس میں "مہلت" کا عنوان دیکھئے۔ یہاں ہر واقعہ یا حادثہ کے لئے "مستقر" کا لفظ لا کر قرآن کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ مستقر کے معنی ہوتے ہیں کسی متحرک شئے کا چلتے چلتے کسی نقطہ پر آکر رک جانا۔ کہا یہ گیا ہے کہ عمل، اپنے نتیجہ خیزی کے مقام کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ اس مقام پر آکر رک جاتا ہے جہاں اس کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ ہم اس حادثہ کو صرف اس وقت دیکھتے ہیں جب وہ محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے، حالانکہ وہ بہت پہلے سے مرتب ہونا شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۷/۱۸۲)۔ جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت کو جھٹلاتے ہیں ہم انہیں اس طرح بتدریج (STEP BY STEP) تباہی کی طرف لئے جاتے ہیں کہ انہیں اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا۔ نتیجہ خیزی کا

یہ عمل بڑا غیر محسوس ہوتا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیات (۲۱/۱۱ - ۱۵) میں اس عمل کو بڑے دلنشین انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مفہوم القرآن میں ان آیات کے معنی دیکھئے۔

احتیاطی تدابیر کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک اہم اصول کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بعض (بلکہ اکثر) امراض متعدی (CONTAGIOUS) ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے مریضوں سے دُور رہا جائے۔ فرمایا:

۶/۶۸ وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○

قرآن کریم کو سنجیدگی سے نہ لینے والے

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہمارے قوانین (قرآن) کو سنجیدگی سے نہیں سُنتے بلکہ اُس کے متعلق لغو اور بے کار باتیں کرتے ہیں، تو اُن سے کنارہ کش ہو جاؤ تا آنکہ وہ اس موضوع کو چھوڑ کر کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر تم اپنے خیالات میں منہمک، یا گفتگو میں جذب ہونے کی وجہ سے اس بات کو بھول جاؤ تو جس وقت بھی یہ یاد آئے ان لوگوں سے اُٹھ جاؤ۔ یہ لوگ، قرآن جیسی بلند پایہ کتاب کے متعلق اس قسم کا رویہ اختیار کر کے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔

ان امور کی تشریح آیات (۴/۱۴۰) و (۵/۵۷) میں آچکی ہے۔ (نیز دیکھئے ۲۵/۱۵)۔ اس کے بعد ہے:

۶/۶۹ وَ مَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ○

جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، اُن پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ یہ لوگ قرآن کے متعلق اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ ہم نے انہیں (ایسے لوگوں سے الگ ہو جانے کی) تاکید اس لئے کی ہے کہ ان کے لئے ایسی باتوں سے بچنا ضروری ہے۔

اگلی آیت میں اس تاکید کی مزید وضاحت کی گئی ہے جو (۶/۶۸) میں سامنے لائی گئی تھی:

۶/۷۰ وَ ذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ج وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ط اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ج لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ
اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○

جن لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ (نظامِ خداوندی تو ایک طرف) خود اُس آئین او رضابطہ کو بھی کچھ اہمیت نہ دیں جسے اُنھوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کو محض تماشا سمجھیں، اور اِس دھوکے میں رہیں کہ مقصدِ حیات عیش و عشرت ہے، اور بس۔ تم ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی جان مت کھپاؤ۔ انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ البتہ

ان تک قرآن پہنچاتے رہو

قرآنی تعلیم اُن کے سامنے پیش کرتے رہو۔ اس لئے کہ کسی شخص کو، اُس کے غلط اعمال کی وجہ سے، قرآن سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے، اِن غلط اعمال کے نتائج سے، قانونِ خداوندی کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس کے لئے نہ اُس کا کوئی رفیق اور نہ مددگار ہو سکتا ہے۔ نہ سفارشی۔ نہ ہی وہ کچھ بدلہ (کفارہ) دے کر ان کے نتائج سے بچ سکتا ہے۔ اُن لوگوں کو، اُن کے اعمال کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے اُس کی سزا بھگتیں۔ ($\frac{۵۲}{۲۱}$ ؛ $\frac{۴۴}{۳۸}$)۔ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ وہ چیزیں بھی، جو عام حالات میں انسان کی پرورش کا موجب بنتی ہیں، ان کے لئے تلخابۂ حیات، اور سوہانِ روح بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستے پر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور حق و صداقت سے سرکشی برتی تھی (جس کا دل مضطرب اور پریشان ہو، اُسے خوشگوار چیزیں بھی زہر لگتی ہیں)۔

قرآنِ کریم کی کشادہ نگہی اور شفقت اور غمگساری ملاحظہ فرمائیے۔ اِس قسم کے غلط کار لوگوں سے الگ ہو جانے کی تاکید کے ساتھ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اُن سے الگ تو ہو جاؤ، لیکن اُن تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہو۔ تاکہ وہ اس وجہ سے زندگی کی سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم نہ رہ جائیں کہ اُن تک خدا کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔ تمہارا فریضہ پیغاماتِ خداوندی کی تبلیغ ہے۔ تم اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ اس قسم کے غلط رو لوگوں کو تو بلکہ اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کا متعدی امراض کے مریضوں سے اپنی حفاظتی تدابیر اختیار کرنا اور اس طرح اُن سے ذرا ہٹ کر رہنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کا علاج چھوڑ دے۔ اسے اُن کا علاج بدستور جاری رکھنا چاہیئے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کی حامل (کتاب اللہ کی وارث) قوم کی ذمہ داریاں کس قدر شدید ہیں۔ بے راہ رو

اقوام سے الگ رہنے کی تو تاکید ہے (یعنی یہ کہ اُن کی روش اختیار نہ کی جائے) ۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اُن تک قرآن کا پیغام پہنچاتے رہیں ۔

لیکن جو قوم خود ہی قرآن کو چھوڑ بیٹھی ہو، وہ دوسری اقوام تک اس کا پیغام کیا پہنچائے گی ؟

قرآن مجید کی اصطلاحات بڑی غور طلب ہوتی ہیں ۔ پانی ممدِ حیات ہے اسی پر زندہ شئے کا سہارا ہے حیوانات تو ایک طرف، نباتات کی روئیدگی، نشو و نما اور ثمرباری کا بنیادی انحصار اسی پر ہے ۔ لیکن کسی پودے پر کھولتا ہوا پانی ڈالو، وہ اُسی وقت مُرجھا جائے گا ۔ اور پھر زندگی سے محروم ہو جائے گا ۔ پانی وہی تھا ۔ لیکن اُس کی کیفیت میں فرق آجانے سے وہ ممدِ حیات ہونے کے بجائے مہلک ہو گیا ۔ اسی طرح یخ بستہ پانی بھی ۔

غلط نظامِ زندگی میں زندگی کی ضروریات کی چیزیں وہی ہوتی ہیں، لیکن وہ انسانی ذات کے لئے ممدِ حیات ہونے کے بجائے ہلاکت آفرین بن جاتی ہیں ۔ دُودھ ممدِ صحت ہے، لیکن وہی دُودھ اگر چرا کر پیا جائے تو (طبیعی طور پر تو اس کی تاثیر میں کچھ فرق نہیں ہوتا لیکن) انسانی ذات کے لئے وہ ہلاکت کا موجب ہو جاتا ہے ۔

اس آیت میں قانونِ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں جو الفاظ آئے ہیں، اُن کی تشریح جلد دوم (صفحہ ۲۲۸-الخ) میں دیکھئے ۔ (یعنی آیت ۲/۸۱ کے تحت) ۔

جن لوگوں سے قطعِ علائق کر لینے کے لئے کہا گیا ہے، وہ ضرور پوچھیں گے کہ ہم میں کیا بُرائی ہے جو تم ہم سے اس طرح الگ ہو رہے ہو؟ اور تم سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہیں گے کہ صحیح راستہ وہی ہے جس پر ہم گامزن ہیں ۔ کہا کہ ان سے کہو کہ ؛

۶/ ۷۲-۷۱ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۗ وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

اِن سے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خدا کے قانون کو چھوڑ کر، ایسی ہستیوں کو پکارنے لگ جائیں جو ہماری ذات کو نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتیں، اور اس طرح ہم صحیح راستے پر گامزن ہو جانے کے بعد اُلٹے پاؤں پھر جائیں؛ اُس شخص کی طرح جسے اُس کے خود سر جذبات نے، صحیح راستے سے بھٹکا کر، لق و دق صحرا میں چھوڑ دیا ہو، جہاں وہ حیران و پریشان کھڑا ہو —— راہ گم کردہ اور تنہا —— اور اس کے ساتھی اُسے آوازیں دے رہے ہوں کہ تو کدھر چلا گیا۔ اِدھر، ہماری طرف آؤ۔ صحیح راستہ یہ ہے۔ (لیکن، وہ ان کی آوازیں سننے کے باوجود، اُن تک نہ پہنچ سکے)۔

اِن سے کہدو کہ زندگی کا صحیح راستہ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے اللہ کی طرف سے عطا شدہ راہنما (قرآن) کا راستہ —— یعنی وہ راستہ جو عالمگیر انسانیت کی پرورش کرنے والے کا تجویز کردہ ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس راستہ کو اختیار کریں اور خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم نظامِ صلوٰۃ قائم کریں اور خدا کے قانون کی پوری پوری نگہداشت کریں۔ اور اس حقیقت پر یقین رکھیں کہ نوعِ انسان نے آخر الامر اسی مرکز کے گرد جمع ہونا ہے۔

ہدایتِ خداوندی

اس آیت میں دین کی بنیادی حقیقت کو ان چار الفاظ میں سمٹا دیا گیا ہے۔ کہ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ۔ ہدایت، راہنمائی، صحیح راستہ، وہ اور صرف وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے متعیّن فرمایا ہے اور جسے اُس نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہدایتِ خداوندی قرآنِ کریم کے اندر مذکور و محفوظ ہے، وہ مکمل بھی ہے، اور غیر متبدل بھی (۶/۱۱۶)۔ اس کے سوا ہدایت کہیں اور نہیں۔ یہی توحید ہے اور اسی کو ضابطۂ ہدایت تسلیم کرنے کا نام اسلام ہے۔

یہاں خدا کی عطا فرمودہ ہدایت (قرآنِ مجید) کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو دین کا منتہیٰ کہا گیا ہے جس کا عملی نظام، ربوبیتِ عالمینی ہے۔ اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کہا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نظامِ خداوندی کا قائم کرنا ہے، اور نماز کے وقتی اجتماعات اس نظام کے قیام کے ذرائع ہیں۔ (تفصیل ان امور کی صلوٰۃ کے عنوان میں ملے گی جس کے لئے انڈکس کی طرف رجوع فرما دیں)۔

اُوپر "لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہا گیا ہے۔ عالَمین کی تشریح جلد اوّل۔ زیرِ آیت (۱/۱) کی جا چکی ہے۔ یہ انسانوں کی دنیا تک محدود نہیں۔ اس میں تمام "کائناتیں" آ جاتی ہیں۔ اسے قرآنِ کریم نے ارض و سمٰوٰت کہہ کر بھی پکارا ہے۔ ربوبیتِ عالمینی کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے "کائناتوں" کو پیدا کیا تو ان کی

نشو و نما کا سامان بھی ساتھ ہی فراہم کر دیا۔ اس حقیقت کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

$\frac{6}{73-74}$ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ يَقُولُ كُن فَيَكُونُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ○

یہ اُس خُدا کا قانون ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو ایک حقیقت کے طور پر تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس کی قوتوں کا یہ عالم ہے۔ کہ جونہی وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے، اس کے وقوع پذیر ہونے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

اُس کی ہر بات مبنی بر حقیقت ہوتی ہے ($\frac{86}{14-13}$)۔ یونہی شاعری نہیں ہوتی ($\frac{69}{1-4}$)۔ اس لئے کہ کائنات میں ہر جگہ اُسی کا اقتدارِ اعلیٰ کام کر رہا ہے۔ وہ ہر شے کی موجودہ حالت کو جانتا ہے، اور اس کے امکانات اور مضمر صلاحیتوں سے بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے، اور اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ جس انقلاب کی اس وقت خبر دی جا رہی ہے، وہ آ کر رہے گا۔ حق اور باطل کی قوتوں کا ٹکراؤ ہو گا۔ اور یہ ٹکراؤ یونہی اتفاقیہ رونما نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ خدائے خبیر کی محکم اسکیم کے مطابق ہو گا —— وہی اسکیم جس کے مطابق حق و باطل کا ٹکراؤ ہوتا چلا آ رہا ہے اور جس میں حق، فاتح و منصور ہو کر سامنے آ جاتا ہے ($\frac{21}{18}$؛ $\frac{8}{7-8}$؛ $\frac{42}{24}$؛ $\frac{34}{48-49}$)

تخلیقِ کائنات: اِس کے مبنی بر حق ہونے اور کُن فیکون، غیب و شہود وغیرہ کے سلسلہ میں تفصیلی بحث پہلے آ چکی ہے۔ انڈکس میں دیکھئے۔ وَلَهُ الْمُلْكُ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ۔ {($\frac{1}{4}$) صفحہ ۲۸} دیکھئے۔ نیز عنوانات —— آخرت، اُخروی زندگی اور قیامت۔

نفخِ صور نَفَخِ صُور کی تشریح کا اصل مقام، اُخروی زندگی اور اس کے متعلقات ہیں جن کا ذکر اپنے اپنے مقامات پر آئے گا۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ (i) اس سے مُراد میدانِ جنگ میں فوجوں کا تصادم بھی ہے۔ اور (ii) مُردہ اقوام (پیکرانِ آب و گل) میں حیاتِ تازہ کی نمود بھی۔ صُوَر، صورت کی جمع بھی ہے۔ اور صورت کے معنی (FORM) یا پیکر ہیں۔ یعنی ان انسانوں میں جو "مٹی کے مادھو" بن چکے ہوں، زندگی کی حرارتیں اور توانائیاں پھونک کر انہیں زندہ اقوام کی صف میں لا کھڑا کرنا۔ مقصد اس سے حق و باطل کے تصادم اور کشمکش ہے۔

حق و باطل کی کشمکش کا ذکر آیا تو قرآنِ کریم نے ذہن کا رُخ داستانِ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منتقل کر دیا، جن کی زندگی اس کشمکش کی مسلسل داستان تھی ۔ اس داستان کے بیشتر گوشے سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکے ہیں ۔ یہاں اُنکے اس واقعہ کا ذکر ہے جہاں اُنہوں نے اجرامِ فلکی کی الوہیت کے عقیدہ کی علیٰ وجہ البصیرت تردید کی تھی۔ پہلے ان کی اس تنبیہ کا ذکر جو اُنہوں نے خود اپنے والد کو کی تھی :

۶/۷۵ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

حق و باطل کی یہی کشمکش تھی جس سے ابراہیمؑ دوچار ہوا۔ اس کی ابتداء خود اس کے اپنے گھر سے ہوئی، جب اُس نے اپنے باپ، آذر سے کہا کہ یہ کیا ہے کہ تم نے اپنے ہاتھ کی تراشیدہ مورتیوں اور غیر خدائی قوتوں کو اپنا اِلٰہ بنا رکھا ہے! میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

اس کے بعد اجرامِ فلکی کی الوہیت کی تردید ہے۔ لیکن اس سے پہلے دو لفظوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خود اس نتیجے پر کیسے پہنچے تھے۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں وضاحت سے بتایا گیا ہے، نبی کو جو علم بذریعہ وحی دیا جاتا تھا، وہ اُس کی اپنی فکر، تجربات یا مشاہدات کا نتیجہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے براہِ راست خدا کی طرف سے عطا ہوتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب وہ ان پیغامات اور حقائق کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا تھا، تو وہ ان کی مخالفت کرتے تھے۔ انہیں ان کی صداقت کا قائل کرانے کے لئے ضروری تھا کہ اُن سے دلائل و براہین کی رُو سے بحث کی جائے۔ اُن دلائل کو چھوڑ کر جنہیں خود وحی نے بیان کیا ہوتا تھا، باقی دلائل و براہین نبیؑ کی اپنی فکر، تجربات و مشاہدات کی رُو سے حاصل کردہ ہوتے تھے۔ یہ مراحل نبیؑ کی بشریت کے دائرے میں ہوتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کو یہ حقیقت تو بذریعہ وحی معلوم ہو گئی تھی کہ نہ تو انسانوں کے خود تراشیدہ بُت خدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مظاہرِ فطرت کو درجۂ الوہیت حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بُت پرستی کے خلاف اُنہوں نے اپنے والد کو جو دلائل دیئے تھے ظاہر ہے کہ اُن کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اُن کی قوم بُت پرست کے علاوہ ستارہ

نبی کی بشریت

پرست بھی تھی۔ اُن کی اس باطل (بلکہ توہم) پرستی کی مخالفت کے سلسلہ میں بھی ضروری تھا کہ اُنہیں دلائل و براہین کی رُو سے اس کا قائل کیا جاتا۔ اس کے لئے اُنہوں نے اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کا بنظرِ غائر مشاہدہ اور معائنہ کیا، اور اس سے وہ اس قابل ہو گئے کہ حتم و یقین کے ساتھ

ان مخالفین سے بات کر سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

۶/۷۶ وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝

اس مقصد کے لئے ہم نے ابراہیمؑ کو کائناتی نظام کا مشاہدہ کرایا تھا جس سے اُسے یہ یقین حاصل ہوگیا کہ ساری کائنات میں فقط خدائے واحد کا قانون جاری و ساری ہے۔ اس لئے نہ تو کائنات کی کوئی شے اپنے اندر خدا بننے کی قوت رکھتی ہے، اور نہ ہی یہاں ایک سے زیادہ ہستیوں کا اقتدار چل سکتا ہے۔

اس یقین تک پہنچنے کا یہ طریق وہی ہے جسے سورہ آل عمران کی آیات (۳/۱۸۹-۱۹۰) میں بیان کیا گیا ہے یعنی مسلسل غور و فکر کے بعد اس حقیقت کا علیٰ وجہ البصیرت مشاہدہ کرلینا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج (۳/۱۹۰)۔ "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگہِ کائنات کو باطل نہیں پیدا کیا، بلکہ بالحق پیدا کیا ہے"۔

ان محکم دلائل سے آراستہ ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے قوم کی ستارہ پرستی کے خلاف مہم شروع کی۔ اگلی تین چار آیات میں اسی مہم کی تفصیل دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ جو کچھ اگلی آیات میں کہا گیا ہے، وہ کسی ایک واقعہ کا تذکرہ نہیں۔ وہ اس مسلسل مہم کی داستان ہے:

۶/۷۷-۷۹ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ج قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ج فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

ستارہ پرستی کے خلاف دلائل

اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مشاہداتی دلائل سے اپنی قوم کے باطل عقائد کا ابطال کرتا تھا۔ (مثلاً) جب رات کے وقت ستارہ نمودار ہوتا، (جس کی وہ قوم پرستش کرتی تھی) تو ابراہیمؑ اُن سے کہتا کہ اچھا! تم کہتے ہو کہ یہ میرا پروردگار ہے (اس کے سامنے جھکنا چاہیئے؟) اُس کے بعد جب وہ ستارہ ڈوب جاتا تو وہ اُن سے کہتا کہ، کیوں! یہی ہے جسے تم پروردگار ٹھہراتے ہو؟ بھلا ایسی چیز بھی پروردگار رہ سکتی ہے جو ابھی سامنے چمکتی ہو اور ابھی غروب ہو جائے

اِسی طرح جب چمکتا ہوا چاند نکلتا (اور اس کی پرستش کی جاتی) تو وہ اپنی قوم سے کہتا کہ تم کہتے ہو، یہ میرا پروردگار ہے؟ اُس کے بعد جب وہ بھی غروب ہو جاتا تو وہ اُن سے کہتا کہ تم مجھ سے کہتے تھے کہ میں اسے پروردگار تسلیم کر لوں؟ اگر میرے نشوونما دینے والے نے میری راہنمائی حقیقت کی طرف نہ کی ہوتی، تو میں بھی تمہاری طرح گمراہ ہو جاتا۔ اور اس قسم کے عناصر کو خدا ماننے لگ جاتا جنہیں اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں۔

جب سورج اپنی تابناکیوں کے ساتھ طلوع ہوتا، اور وہ قوم اِس کی پرستش کرتی تو وہ اُن سے کہتا کہ تم کہتے ہو کہ یہ بہت بڑا ہے، اس لئے اِسے پروردگار تسلیم کر لو؟ جب وہ بھی غروب ہو جاتا، تو وہ اُن سے کہتا کہ یہ دیکھو، تمہارے پروردگار کا کیا حشر ہوا!

اِن کائناتی دلائل کے بعد وہ اُن سے کہتا کہ تم جن قوتوں کو خدائی اختیارات و اقتدارات میں شریک سمجھتے ہو (وہ خواہ اجرامِ سماوی ہوں یا دیوی دیوتا۔ خواہ تمہارے مذہبی پیشوا ہوں یا خود تمہارا بادشاہ) میں اُن کے خدا ہونے کے تصوّر تک سے بیزار ہوں۔ (۳۷/۸۹)

آپ نے غور فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (نظری بحث کے بجائے) مشاہداتی دلائل سے کس طرح اُن کی توہم پرستی کا ابطال کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس حتم و یقین کے ساتھ، اور جس مدلل انداز سے، ایک سائنسدان قرآنی حقائق کا اثبات کر سکتا ہے، نظری علوم کے حاملین ایسا نہیں کر سکتے۔ نظری علوم کے حامل "سمجھا سکتے ہیں" سائنسدان "دکھا سکتا ہے" اور سمجھانے اور دکھانے میں

سائنٹفک طریقِ استدلال

جو فرق ہے، ظاہر ہے۔ قرآن کریم اسی لئے مشاہداتِ فطرت پر بار بار زور دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی طریق اختیار کیا تھا، اور اسی بنا پر اُن کے دلائل قاطع ثابت ہوئے تھے۔ (۶/۸۴) اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ کہا ہے (۶/۷۹) سورۃ الصّٰفّٰت میں اِنِّیْ سَقِیْمٌ کہا ہے۔ (۳۷/۸۹)۔

بدیہی طور پر یہاں واقعہ تو حضرت ابراہیمؑ کا بیان کیا گیا ہے، لیکن اس میں ایک ایسی حقیقت واضح کی گئی ہے جو ابدی بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ یہاں کہا یہ گیا ہے:

آفل کا مفہوم

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ۔ چاند، سورج، ستاروں کی جہت سے تو اس کا ترجمہ "ڈوب جانے والے" کیا جائے گا۔ لیکن افل کے درحقیقت معنی ہوتے ہیں وہ جو ایک حال پر نہ رہے، جس میں ہر آن تغیّر ہوتا رہے۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں تو لوگوں کو چند ایک چیزوں

ہی میں تغیر نظر آتا تھا۔ لیکن اب سائنٹفک (SCIENTIFIC) تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ کائنات کی ہر شے میں، ہر آن تغیر (CHANGE) واقعہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کوئی شے، ایسی نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو حتی کہ پتھر کی چٹان میں بھی ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ کائنات مادہ سے تشکیل پذیر ہوئی ہے۔ اور مادہ کی تحلیل کی جائے تو وہ آخر الامر توانائی محض (PURE ENERGY) رہ جاتا ہے، جو مسلسل حرکت ہے، اور تغیرات کی آماجگاہ۔ لہٰذا، یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تغیر پذیر شے خدا نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر، مخلوق میں سے کسی کو بھی مقام الوہیت حاصل نہیں ہو سکتا۔ الٰہ (خدا) وہی ہو سکتا ہے جو تغیر پذیر (آفل) نہ ہو۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (۵۵/۲۶-۲۷)۔ اس کا عام ترجمہ

فنا اور بقا کا مفہوم

کیا جاتا ہے "کائنات کی ہر شے فنا ہو جائے گی اور باقی صرف خدا کی ذات رہ جائے گی" اس میں شبہ نہیں کہ کائنات، جو مخلوق ہے، خدا کی طرح ابدی نہیں۔ ابدیت صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن یہاں اشیائے کائنات کو فانٍ کہا گیا ہے اور ذاتِ خداوندی کے لئے بقا کا لفظ آیا ہے۔ 'فنا' بقا کی ضد ہے۔ بقا کے معنی ہوتے ہیں اپنی حالت پر برقرار رہنا۔ اس لئے فنا کے معنی ہوں گے تغیر پذیر ہونا۔ بنابریں آیات (۵۵/۲۶-۲۷) کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے، اور تغیرات سے ماوراء صرف ذاتِ خداوندی۔ سورۃ القصص میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط (۲۸/۸۸)۔ یہاں ھالک کے معنی بھی فانٍ کے ہیں، لیکن ایک نہایت لطیف فرق کے ساتھ سائنسدانوں کی تحقیق یہ ہے کہ جس چیز کو ہم تغیر (CHANGE) کہتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ چیز تو ویسے

ہلاکت

کی ویسی رہتی ہے، اس میں ایک تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تغیر (CHANGE) سے وہ شے وہی نہیں رہتی۔ وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ، ایک نئی شے متشکل ہوتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی ایسی سرعت اور لطافت سے واقع ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اس چیز میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس تحقیق کی رو سے (کہ وہ شے معدوم ہو جاتی ہے) آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے فانٍ کے ساتھ ھالک کا لفظ لا کر کیسی عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ کائنات کی ہر شے میں اس "عدم و وجود" کا (PROCESS) جاری ہے۔ اس سے ماوراء صرف خدا کی ذات ہے۔

ہلاکت میں تغیر کے ساتھ، قوت میں کمی آجانے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اور سائنس کے انکشافات اس کی بھی تصدیق کر رہے ہیں کہ اشیائے کائنات (بالخصوص اجرامِ فلکی) کی قوت اور حرارت میں ہر آن کمی واقع

ہو رہی ہے ——— كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ ——— واضح رہے کہ آفِل، فَانٍ، ھالکٌ اسم فاعل ہیں، اور اسم فاعل کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک اسے، خاص طور پر، مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کر دیا جائے، اس کے معنی حال کے ہوتے ہیں۔ جیسے: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ (۲/۳۰) کے یہ معنی نہیں کہ میں زمین میں خلیفہ بناؤں گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں"۔ اسی طرح فَانٍ اور ھَالِكٌ کے یہ معنی نہیں کہ یہ چیزیں ایک دن فنا اور ہلاک ہو جائیں گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اشیائے کائنات فنا اور ہلاک ہو رہی ہیں۔ یعنی ان میں تغیّرات کا سلسلہ جاری ہے۔ صرف ایک ذاتِ خداوندی ہے جو تغیّر پذیر نہیں، اور وہی الٰہ ہونے کے لائق ہے۔

نفسِ انسانی

نفسِ انسانی (ذاتِ انسانی) کے متعلق سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ وہ "شے" ہے جس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی ہے۔ جس طرح خدا کی ایک صفت تغیر نا آشنا ہونا ہے، اسی طرح نشوونما یافتہ انسانی ذات بھی تغیّر نا آشنا ہو جاتی ہے۔ بارڈیو نے اسے (CHANGE-LESSNESS IN CHANGE) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس کائنات میں، جس میں ہر آن تغیّرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، انسانی ذات تغیر نا آشنا رہتی ہے۔ برگساں نے اس کے متعلق کہا ہے۔ (IT DOES NOT CEASE To EXIST) "یہ معدوم نہیں ہوتی"۔ آپ غور کیجئے کہ عصرِ حاضر کے مفکرین کس طرح قرآن کے الفاظ کی تشریح کر رہے ہیں۔

یہی معنی آفل کے ہیں۔ یعنی جس میں ہر آن تغیر ہوتا رہے۔ اور اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا تھا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ۔

ہمارے مفسرین!

حضرت ابراہیمؑ نے جس دلآویز طریق سے اپنی قوم کی گمراہی کی نقاب کشائی کی تھی، وہ ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن ہمارے مفسرین میں سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا تھا: هٰذَا رَبِّىْ، تو انہوں نے کچھ وقت کے لئے (معاذ اللہ) ستارہ، چاند، سورج کو اپنا ربّ (معبود) سمجھ لیا تھا، اور ان کے غروب ہو جانے کے بعد، ان کی الوہیت سے انکار کیا تھا۔ ان کی اس غلط نگہی کی تردید کے لئے کسی خاص دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں۔

یہ کہنا کہ ایک نبیؑ، حکما و عقلا کی طرح، ذاتی تجارب و مشاہدات کی ٹھوکروں کے بعد استقرائی طور پر

حقیقت نبوّت

صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے، حقیقتِ نبوّت سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ نبوّت اکتسابی ملکہ نہیں، جسے تجارب و مشاہدات سے حاصل کیا جائے۔ وہ خدا کی موہبتِ عظمیٰ ہے جس کا نزول قلبِ نبویؐ پر ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ (معاذ اللہ) کواکب پرستی کے شرک کے بعد توحید کی طرف آئے تھے۔ اتنی بڑی جسارت ہے جس کے تصوّر سے رُوح کانپتی ہے۔ خود قرآن کریم نے جس انداز و ترتیب سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، وہ اس پر شاہد ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) اعترافِ کواکب پرستی کا بیان نہیں، بلکہ قوم کے سامنے حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا ایک موثر انداز ہے جس میں نظری دلائل کے بجائے علمی مشاہدہ کے طریقہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ واقعہ کی ابتداء بُت پرستی کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کے اعتراض سے ہوتی ہے۔ (دیکھئے (۶/۷۴))۔ اس کے بعد كَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۷۵) سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ ملکوتِ ارض و سماوات

اندازِ براہیمی

(نظامِ ارضی و سماوی) کے متعلق مقامِ علم و یقین تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد اصل واقعہ فَلَمَّا سے شروع ہوتا ہے جو دونوں آیتوں کے باہمی تعلق کی ایک محکم کڑی ہے یعنی پہلے نظامِ ارضی و سماوی کے رازہائے سربستہ حضرت ابراہیمؑ پر منکشف کئے گئے اور اس کے بعد (فَلَمَّا) یہ واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی آخری آیت (۶/۷۸) میں ارشاد ہے کہ جب سورج بھی ڈوب گیا، تو کہا: قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ قوم سے تخاطب اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ یہ باتیں اپنی قوم کو سمجھا رہے ہیں، سورج، چاند اور ستاروں کے حالات پر غور کر کے (معاذ اللہ) اپنے شرک سے تائب نہیں ہو رہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے، آیت ۸۰ میں ارشاد ہے: وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ـــــ آپ کی قوم نے آپ سے جھگڑا شروع کر دیا ـــــ یہ ٹکڑا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ سارا معاملہ قوم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اور پھر آخری آیت (۶/۸۳) نے تو اس معاملہ کو بالکل شک و شبہ سے بلند کر کے رکھ دیا ہے، جہاں فرما دیا کہ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ۔ یہ وہ دلیلِ محکم (حجّت) و برہانِ قاطع تھی جو ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔ اب اس کے بعد معلوم نہیں کونسی چیز مبہم رہ جاتی ہے جو ذہن کو حضرت ابراہیمؑ کی (معاذ اللہ) ستارہ پرستی کی طرف منتقل کر دے؟ بجز اس کے کہ اسرائیلیات کے تتبّع میں ہمارے مفسرین نے ایسا لکھ دیا ہے!

حضرت ابراہیمؑ نے مظاہرِ فطرت کی الوہیت کے ابطال کے بعد فرمایا:

۶/۸۰ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۚ

میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اُس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اُس سے نہ ستاروں کو مفر ہے، نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی)، اس لئے میں اُس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دو ٹوک فیصلہ ہے۔

توحیدِ خالص اپنی تمام توجہات، خواہشات، آرزوؤں، تمنّاؤں، مقاصدِ حیات کو یکسُو ہو کر اس مقصد کے لئے وقف کر دینا، جسے خدا نے متعیّن فرمایا ہے، یہ ہے خدا پر ایمان لانا اور شرک سے مجتنب ہونا۔ اور یہ کچھ اتباعِ قوانینِ خداوندی کی رُو ہی سے ممکن ہے۔ ان قوانین کی خصوصیت یہی بتائی گئی ہے کہ یہ تغیّر آشنا نہیں (۶/۱۱۶)۔ قوانینِ خداوندی کے سوا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو یہ خصوصیت ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل سمجھنا (جیسا کہ فقہی قوانین کو سمجھا جاتا ہے) شرک ہے۔

لیکن اس قدر واضح اور قاطع دلائل کے باوجود وہ قوم حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ جھگڑتی رہی:

۶/۸۱ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

وہ قوم اسی طرح، ابراہیمؑ سے ردوکد کرتی اور چاہتی کہ اُسے، اس کے مسلک سے ہٹا دے۔ وہ اُن سے کہتا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں ردوکد کرتے ہو اور چاہتے ہو کہ میں اُس کا راستہ چھوڑ دوں، لیکن میں تمہاری بات کیسے مان سکتا ہوں (جب کہ خدا نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ (تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمہارے معبود بڑی قوتوں کے مالک ہیں اس لئے مجھے اُن سے ڈرنا چاہیئے۔ لیکن میں اُن کی

خوف، شرک میں ہوتا ہے حقیقت سے باخبر ہوں، اس لئے) اُن سے قطعاً نہیں ڈرتا۔ یہ مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ نقصان صرف قانونِ خداوندی کے مطابق پہنچتا ہے اور اس کی نگاہوں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں رہ سکتی (اس لئے مجھے صرف اس کی احتیاط کرنی چاہیئے کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہو)۔ حیرت ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی

تم حقیقت کو نہیں مانتے؟ اس کے بعد کہا:

۶/۸۲ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

توحید، خوف کی قاطع ہے

بھلا میں ان مٹی کی مورتیوں (معبودانِ باطل) سے کیوں ڈروں جنہیں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ ڈرنا تو تمہیں چاہیئے جو اللہ جیسی مختارِ کُل ہستی کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ اللہ نے تم سے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ واقعی میرے اختیار میں شریک ہیں۔

اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے تو بتاؤ کہ تم میں اور مجھ میں، کون امن و اطمینان کا زیادہ حقدار ہے (اور کسے لرزاں و ترساں رہنا چاہیئے) تمہیں یا مجھے؟ (خوف، شرک کا لازمی نتیجہ ہے (۲۲/۳۱)، توحید سے انسان کے دل میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا)۔

شرک کا مفہوم کیا ہے، اور شرک سے خوف کسطرح پیدا ہوتا ہے۔ یا خوف کا نتیجہ شرک ہوتا ہے، اسے سابقہ جلدوں میں واضح کیا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں شرک اور خوف کے عنوانات دیکھیئے)۔ لہذا کسی تغیّر پذیر اور فنا آشنا شے کو اپنے سے برتر سمجھ کر اس سے ڈرنا اور اس ڈر کی وجہ سے اس کے سامنے جھکنا شرک اور ظلم عظیم ہے۔ سورۃ القصص کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ (۲۸/۸۸)۔ پوری آیت یوں ہے: وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ اور دیکھنا تم مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۘ۔ خدا کے ساتھ دوسروں کی بھی اِلٰـہ (صاحبِ اقتدار) تسلیم نہ کر لینا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ یاد رکھو! صاحبِ اقتدار صرف خدا کی ذات ہے۔ اس لئے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ اس کے سوا کائنات کی ہر شے تغیّر پذیر ہے۔

حکومت صرف خدا کی ہے

اس سے سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کو الٰہ ماننے' اور اس کے سوا کسی اور کو الٰہ تسلیم نہ کرنے کا عملی مفہوم کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ لَهُ الْحُكْمُ۔ یعنی حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اگر انسانوں کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے، تو یہ شرک ہے اور اس سے انسان کا قلب، خوف کا نشیمن بن جاتا ہے۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸/۸۸)۔ زندگی کے تمام

معاملات کے تصفیہ کے لئے اُس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ۔ یعنی اس کا حل اس کی کتاب کی رُو سے تلاش اور اختیار کرنا چاہیئے ۔ کہ غیر متغیّر صرف اُسی کے احکام و قوانین ہیں ۔ امن و اطمینان اُنہی کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان غیر متغیّر قوانین کی اِطاعت کریں ، نہ کہ انسانوں کی محکومیت اختیار کرنے والوں کو جنہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اُن کا آقا اس وقت کیا کر رہا ہے اور کل کو کیا کہدے گا ! انسانوں کی حکمرانی میں کوئی آئین اور قوانین غیر متبدل نہیں ہوتے ، نہ ہو سکتے ہیں ۔ اِس لئے ان کے تابع رہنے والے اِنسانوں کو کبھی امن و اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا ۔ امن نصیب ہوتا ہے اُن لوگوں کو :

٦/٨٣ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

اِن حقائق کی روشنی میں ، اِس میں شک کی گنجائش کہاں ہے کہ امن و اطمینان اُنہی کے لئے ہے جو قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور عملاً اُس کی خلاف ورزی نہ کریں ۔ ہر شے کو اُسکے صحیح مقام پر رکھیں ، اور شرک سے مجتنب رہیں (٣١/١٣) ۔ (کیونکہ امن اور بے خوفی کے لئے ایمان اور اعمال صالح بنیادی شرط ہے ۔ ٢/٦٢) یہی وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ پر گامزن ہوں گے ۔

یہاں کہا گیا ہے کہ امن اور ہدایت اُن کے حصّے میں آتے ہیں جو اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہ ہونے دیں ۔ قرآنِ کریم میں شرک کو ظلم ، بلکہ ظلمِ عظیم کہا گیا ہے ۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (٣١/١٣) ظلم کے معنی ہوتے

شرک ظلم عظیم ہے

ہیں جس شے کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اُسے وہاں پر نہ رکھنا ۔ شرک میں مظاہرِ فطرت یا انسانوں کو اُن کے مقامِ عبدیّت سے اُوپر لے جا کر الوہیت کا درجہ دے دیا جاتا ہے ، اور خدا کو اُس کے بلند و بالا مقامِ احدیّت سے نیچے اُتار کر مخلوق کے ہمدوش کر دیا جاتا ہے ۔ یہ ظلم ہے ، بلکہ " ظلمِ عظیم " ۔ یہاں یہ آیت جس سیاق و سباق میں آئی ہے ، وہ واضح ہے ۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں کسی آفِل کو خدا کا درجہ نہیں دے سکتا ۔ اور آفِل کے معنی ہم نے دیکھ لئے ہیں ۔ یعنی تغیّر پذیر ۔ اِس ایک لفظ نے ، خدا کے سوا ، ہر شے کی الوہیت کو باطل قرار دے دیا ، کیونکہ کائنات میں تغیر سے ماوراء صرف خدا کی ذات ہے ۔ خدا نے کلمٰت اللّٰہ اور سنت اللّٰہ کو غیر متبدل کہا ہے ۔ (٦/١١٦ ؛ ٣٣/٦٢) ، یعنی قوانین و اقتدارِ خداوندی ہی غیر متبدل اور تغیّر نا آشنا ہیں ۔ انہی کی محکومیت اختیار کرنے سے انسان کو حقیقی امن نصیب ہو سکتا ہے ، اور یہی راہ اسے اُس کی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہے ۔ اگر ہم ان اقدار و قوانین کے بجائے انسانوں کے

وضع کردہ قوانین و احکام کا اتباع کریں گے، تو یہ شرک ہوگا۔ اب آپ سوچئے کہ کتاب اللہ کے بجائے انسانوں کے مرتب کردہ احکام و قوانین کا اتباع (خواہ وہ کسی نام سے موسوم ہوں) ظلم عظیم یعنی شرک قرار پائے گا۔ غور کیجئے کہ

مومن ہوتے ہوئے بھی مشرک

ہم نے کس طرح اپنے ایمان کے ساتھ اس ظلم کو ملوث کر رکھا ہے؟ قرآن کریم نے ہمارے ہی متعلق کہا تھا: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ (۱۲/۱۰۶)۔

"ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ وہ دعوائے ایمان کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں"۔ یہ وجہ ہے جو ہمیں نہ امن نصیب ہوتا ہے، نہ زندگی کی خوشگواریوں کے راستے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

یہ تھے وہ قطعی دلائل اور حتمی براہین جن سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کی باطل پرستیوں کی تردید کی تھی۔

۶/۸۴ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

یہ ہیں وہ قاطع دلائل جو ہم نے ابراہیمؑ کو، اُس کی قوم کے عقیدہ و مسلک کے خلاف دیئے تھے۔ (حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی ہمارے کائناتی نظام پر غور و فکر کے بعد، وحدتِ خالق اور وحدتِ قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتا ہے) ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اُسے بلند مقامات عطا کر دیتے ہیں۔ یقیناً تمہارے نشو و نما دینے والے کے فیصلے علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ (یہ نہیں کہ یونہی، جسے جی چاہا، مقام بلند عطا کر دیا۔ جسے چاہا، ذلیل و خوار کر دیا!)

بلندئ درجات

درجات قانونِ خداوندی کی رُو سے بلند ہوتے ہیں اور (قانونِ خداوندی یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ... (۴۶/۱۹) "ہر ایک کے مدارج اُس کے عمل کے مطابق متعین ہوتے ہیں"۔ —— اور حضرت ابراہیمؑ کے اعمال کے کیا کہنے! اُن کے مدارج بھی بلند ہوئے اور اُن کی ذریت میں بھی انبیاءؑ مبعوث ہوئے۔

۶/۸۴-۸۵ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ۙ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○

(ابراہیمؑ اپنے مشن میں کامیاب ہوا۔ ازاں بعد) ہم نے اُسے اسحاقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پوتا عطا کیا۔ ان سب کو ہم نے زندگی کی سیدھی راہ دکھا دی تھی۔ وہی راہ جو اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور پھر ابراہیمؑ کی نسل میں داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ ایوبؑ۔ یوسفؑ۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ کو دکھلائی تھی۔ (اور وہ اس راہ پر چل کر کامیاب و کامران ہوئے تھے) یوں ہم ان لوگوں کی محنت کو بارآور کیا کرتے ہیں جو حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں۔

اِنہی میں زکریاؑ۔ یحییٰؑ۔ عیسیٰؑ اور الیاسؑ کا شمار ہے۔ یہ سب صالحین میں سے تھے۔

نیز اسمٰعیلؑ۔ الیسعؑ۔ یونسؑ اور لوطؑ، اِسی زمرہ میں شامل تھے۔ ان سب کو، زندگی کی خوشگواریوں میں اقوامِ عالم پر فضیلت حاصل تھی۔

یہاں تک ان حضرات کا نام لیا گیا جو متعیّن طور پر زمرۂ انبیاء میں شامل تھے۔ اِن کے علاوہ:

۶/۸۸ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

اور اُن کے آباء و اجداد، اور ان کی نسل، اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے کتنوں کو برگزیدہ کیا۔ اور زندگی کی اُسی توازن بدوش، سیدھی راہ پر چلایا۔

مذکورہ انبیاء کرامؑ کے آباء و اجداد، نسل یا بھائی بندوں میں سے ہر ایک کو نبوت نہیں ملی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض انبیاء بھی ہوں۔ لیکن قرآنِ کریم نے ایسا بالتصریح نہیں کہا۔ اُن کے اجتبا (برگزیدگی) کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور برگزیدہ ہر نیک عمل انسان ہو سکتا ہے۔ سورہ حج میں جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے: هُوَ اجْتَبٰكُمْ۔ (۲۲/۷۸)۔ "خدا نے تمہیں برگزیدگی عطا کی ہے"۔ یہ تمام خدا کے متعیّن کردہ راستے پر چلتے تھے۔

۶/۸۹ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

یہ خدا کی طرف عطا شدہ وہ رہنمائی ہے جس سے ہر وہ شخص جو صحیح راستہ پر چلنا چاہے، صحیح راستے کا پتہ نشان پا لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ، اس راستے کے ساتھ دوسرے راستوں کو بھی ملا لیں، تو ان کی محنت رائیگاں ہو جائے گی (اُس مسافر کی طرح جو کبھی ایک راہ پر چل دے، کبھی دوسرے پر۔ یوں، دن بھر چلنے سے وہ تھک

تو ضرور جائے گا، لیکن منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ منزل تک وہی پہنچے گا جو ٹھیک اُس راستے پر چلتا جائے جو اُس کی منزل کی طرف جاتا ہے۔)

یہ وہ ہیں:-

۶/۹۰ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ○

یہ (جن کا اوپر ذکر کیا گیا) وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب (ضابطۂ قوانین)، حکومت (لوگوں میں کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرنے کے اختیارات) اور نبوّت (خدا کی طرف سے وحی پانے کا امتیاز خصوصی) عطا کئے تھے[1] (۳/۷۸؛ ۴۵/۱۶)

کتاب و حکم و نبوّت

اگرچہ (اہلِ کتاب جو ان انبیاء کے اتباع کے مدعی ہیں) اس ضابطۂ خداوندی پر چلنے سے انکار کرتے ہیں جو اب قرآن میں دیا گیا ہے، تو اس سے یہ ضابطہ لاوارث ہو کر نہیں رہ گیا) اسے ہم نے ان لوگوں کے سپرد کر دیا ہے جو اس کی صداقت سے انکار نہیں کرتے۔ (۳۵/۳۲)

اُوپر جن کا ذکر آیا ہے، ان میں انبیاءؑ اور غیر انبیاء سب شامل ہیں[2]۔ ان میں سے نبوّت صرف انبیاءؑ کرام کو عطا ہوئی تھی، اور نبوّت سے مُراد وحی کے ذریعے ملنے والی کتاب تھی جو ہر نبیؑ کو ملی تھی (۲/۲۱۳)۔ اس کتاب کو نبی اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ اسے دوسروں تک بھی پہنچاتا تھا، اور جو اُس کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے، وہ اُس کی اُمت میں شامل ہو جاتے تھے۔ اِس اعتبار سے کتاب میں انبیاءؑ اور غیر انبیاء دونوں شامل ہوتے تھے —— انبیاءؑ بلاواسطہ اور اُس کی اُمت بالواسطہ۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دوسری جگہ کہا ہے: وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (۴۵/۱۶)۔ اور اُمّتِ مسلمہ (اُمّتِ محمدیہ)

---

[1] و [2] جن کا ذکر اُوپر آیا ہے اُن میں انبیاءؑ اور غیر انبیاء سب شامل ہیں (انبیاءؑ کے آباء۔ نسل اور بھائی بندوں میں غیر انبیاء بھی شامل ہیں)۔ لہٰذا، ان میں انبیاء کرام پر وحی کے ذریعے کتاب نازل کی (۲/۲۱۳)۔ انبیاء کی وساطت سے کتاب اُن کے متبعین کو ملی۔ اور اسے نافذ کرنے کی عملی قوّت بھی۔ اس طرح کتاب و حکومت میں نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور نبوّت صرف انبیاء کا خاصہ ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد نبوّت ختم ہو گئی اور کتاب و حکومت، حضورؐ کی اُمت میں آگے چلی۔

کو وارث کتاب قرار دیا ہے (۳۵/۳۲)

کتاب، ضابطۂ قوانین کو کہتے ہیں، اور قوانین بے مقصد ہوتے ہیں جب تک اُن کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو۔ اِسے حکومت کہا جاتا ہے۔ اس لئے انبیاءؑ اور اُن کی اُمت کو کتاب کے ساتھ حکومت بھی عطا ہوئی تھی۔ سو بات یوں ہوئی کہ

(i) نبوّت نہ ہو تو خدا کی کتاب نہیں مل سکتی۔

(ii) کتاب نہ ہو تو ہدایت نہیں مل سکتی۔

(iii) کتاب کے ساتھ حکومت نہ ہو تو کتاب کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ وہ محض وعظ بن کر رہ جاتی ہے۔

(iv) کتاب، بلا حکومت ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے، اور کتاب کے ساتھ حکومت ہو تو دین متمکن ہوتا ہے اور دین کا تمکن ہی منشائے خداوندی ہے۔ (۲۴/۵۵)۔

لیکن اِس حکومت سے مقصد لوگوں کو اپنا محکوم یا غلام بنانا نہیں۔ انہیں خدا کا عبد بنانا مقصود ہوتا ہے اس کی وضاحت آیت (۳/۷۸) میں کی جا چکی ہے۔ وہاں بھی کتاب اور حکومت اور نبوّت تینوں کا ذکر ہے۔

قرآنِ کریم نے ان تمام انبیاء کو امتِ واحدہ (ایک ہی برادری کے افراد) قرار دیا ہے: اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲)۔ یہ تمام انبیاءؑ ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ کیونکہ یہ سب خدائے واحد کے فرستادہ تھے۔ انہیں دین بھی ایک ہی دیا گیا تھا (۴۲/۱۳)۔ اس لئے ان کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

۶/۹۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِیْنَ ۟

یہ (انبیاءؑ) وہ ہیں جنہیں اللہ نے زندگی کی صحیح راہ دکھا دی تھی۔ پس (اے رسولؐ!) تم بھی اُسی راستے پر چلو جس پر اللہ نے اُنہیں چلایا تھا۔ (اور لوگوں کو اِسی راہ کی طرف دعوت دیتے جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ) میں اس راہنمائی کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ تو تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات ہے (میری ذاتی ملکیت نہیں کہ تم سے اِس کی قیمت وصول کروں)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ایک چیز ہوتی ہے زندگی کے لئے اصول و اقدار۔ اُنہیں دین کہا جاتا ہے اور دوسری چیز ہوتی ہے ان اصولوں کو نافذ کرنے کے طور طریقے۔ اِسے اصطلاح میں شریعت (یا جزئیات)

کہا جاتا ہے۔ الدّین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ لیکن اس پر چلنے کے طور طریقے (شریعتیں) ہر رسولؑ کے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے مختلف تھیں۔ ان (احکامِ شریعت) میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں، اور بعض ان میں سے منسوخ بھی کر دی جاتی تھیں۔ (دیکھئے انڈکس میں عنوان ناسخ و منسوخ)۔ لہٰذا، شریعت ہر نبیؑ اور اس کی اُمت کی مختلف ہوتی تھی۔ آیۂ زیر نظر (۶/۹۱) میں جو کہا گیا ہے کہ تم اس ہدایت پر چلو جو ان تمام انبیاءؑ کو دی گئی تھی، تو اس سے مُرادُ الدّین ہے جو حضور نبی اکرمؐ کو (انبیاءؑ سابقہ کی طرح) بذریعہ وحی عطا ہوا تھا۔ اس سے مُراد ان (انبیاءؑ سابقہ) کی شریعتوں کا اقتدا نہیں، اس لئے کہ اوّل تو وہ شریعتیں اپنی غیر محرف شکل میں کہیں موجود نہیں تھیں۔ اور اگر موجود ہوتیں بھی، تو وہ وقتی اور ہنگامی تھیں۔ ابدی طور پر واجب الاتباع نہیں تھیں۔

الدّین کا اتباع

اس آیت میں چار لفظوں میں ایک عظیم حقیقت کا بیان کیا گیا ہے۔ یعنی رسولؑ اعلان کرتا ہے لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ" میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اور تمہارے لئے جو کچھ کرتا ہوں، اس کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

اجرِ رسالت

رسول ایک ناصح مشفق کی طرح اپنی قوم کی طرف آتا تھا۔ اُس کی نصیحت اس قوم کے بھلے کے لئے ہوتی تھی۔ ناصح کی ایک خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ حق اور صداقت پر مبنی ہو اور وہ اسے دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرے تاکہ وہ قوم کی عقل و فکر کو اپیل کرے۔ اور دوسری خصوصیت یہ کہ اس نصیحت فرمائی میں اُس کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ وہ خالصتًا ان لوگوں کی بہی خواہی پر مبنی ہو۔ یہ خصوصیت بڑی گراں بہا ہوتی ہے، اور نصیحت کے مؤثر ہونے کے لئے بڑا قوی ذریعہ۔ اگر مخاطبین کو یقین ہو جائے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد مضمر نہیں، تو اُن کا (کم از کم) ہوشمند طبقہ اُن سے کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ مضمر نہیں، اس لئے تم اس کی بات تو سُن لو۔ یہ جو دن رات اپنی جان کھپاتا ہے۔ اتنی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ اتنی مشقتیں اٹھاتا ہے، اور اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں، تو سوچنے کی بات ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ لہٰذا، بے غرض نصیحت اور بے اجر چارہ گری کا بڑا گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے چنانچہ اسی قسم کا تھا وہ فردِ ہوشمند جس نے بستی کے تخریب کاروں سے کہا تھا کہ تم ان مُرسلینؑ کا اتباع کرو۔ تم دیکھتے نہیں کہ وہ تم سے اس بہی خواہی کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے (۳۶/۲۱)۔ یہ وجہ ہے کہ ہر رسولؑ اپنے پیغام کو پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کرتا تھا کہ يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ (۱۱/۵۱)۔" اے مری قوم! میں

اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا[1]

حضور نبی اکرمؐ نے یہ کہکر کہ میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا، اس کی وضاحت کر دی کہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا ○ (۲۵/۵۷) "میرا مقصد فقط اِتنا ہے کہ تم میں سے جو چاہے، خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے، اور یہی میرا اجرِ رسالت ہے۔ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ ط (۳۴/۴۷) "اور یہ اجر خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ "میرا اجر، میرے خدا کے ہاں سے، مجھے ملے گا۔

یہ آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان کا مفہوم سمجھنے کے لئے کسی تشریح اور تفسیر کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک آیت، بلکہ اس کے چند الفاظ ایسے ہیں جن کے اختلافی مفہوم سے اُمت مستقل طور پر دو پارہ ہو گئی ہے۔

قبل اس کے کہ میں اس آیت کے مفہوم کی طرف آؤں، یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ، جیسا کہ میں شروع سے لکھتا چلا آ رہا ہوں، میرا تعلق کسی مذہبی فرقہ سے نہیں۔ میں فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہوں

میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں

میں صرف مسلمان ہوں اور قرآن کریم کا طالب علم۔ اس طالب علم قرآنی کے سلسلے میں بھی میرا یہ ایمان ہے کہ کسی خاص عقیدہ، نظریہ یا تصوّر کو پہلے سے ذہن میں جاگزین کر کے قرآن کے سمجھنے کی کوشش کرنا بھی شرک ہے۔ قرآن کی طرف خالی الذہن ہو کر آنا چاہیئے اور اس طرح اس کی بارگاہ سے جو تعلیم ملے اس کی صداقت پر ایمان رکھنا چاہیئے۔ اس صراحت کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ آیت زیرِ نظر کے اختلافی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے بھی مجھے نہ کسی فرقہ کی رعایت مقصود ہے، نہ کسی کی مخالفت مطلوب۔ میں صرف اسی نتیجہ کو پیش کروں گا جس تک میں، اپنی بصیرتِ قرآنی کی رُو سے، پہنچا ہوں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے ہر رسولؑ نے اس کا اعلان کیا، اور حضور نبی اکرمؐ نے تاکیداً فرمایا کہ "میں تم سے تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا"

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۲/۲۳ میں ہے:

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے:۔ (۱۰/۷۲ ؛ ۱۱/۲۹ ؛ ۱۱/۵۱ ؛ ۲۶/۱۰۹ ؛ ۲۶/۱۲۷،۱۴۵،۱۶۴ ؛ ۲۶/۱۸۰ ؛ ۳۴/۴۷)

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ (۴۲/۲۳)۔

مودّۃ فی القربیٰ

ایک گروہ اس کا ترجمہ کرتا ہے: "میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔" شیعہ حضرات "رشتے داروں" سے مراد لیتے ہیں "آلِ محمدؐ"۔ یعنی حضرت فاطمہؓ کے بطن سے حضرت علیؓ کی اولاد (اور آگے تک اُن کا سلسلہ)۔ انہیں عرفِ عام میں سیّد (سادات) کہا جاتا ہے۔ اِس مفہوم کی رُو سے، سیّدوں کی محبت، قیامت تک کے لئے، مُسلمانوں پر فرض قرار پاگئی۔ جس مسلمان کے دل میں کسی سیّد کے خلاف ذراسا (نفرت اور عداوت تو ایک طرف) بیزاری اور تکدر کا جذبہ پیدا ہوگیا، وہ معصیتِ رسولؐ کا مرتکب ہوگیا! یہ تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا کہ یہ ترجمہ یا مفہوم، خود عربی زبان کی رُو سے، بھی کس طرح ناقابلِ قبول ہے، اور یہ بھی کہ یہ کیسے وجود میں آیا۔ یہاں صرف یہ دیکھئے کہ اس مفہوم کی رُو سے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کی ساری عمارت کس طرح منہدم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم، تکریمِ انسانیت کا پیغام لے کر آیا اور اُس نے تمام نوعِ انسان کو، ایک عالمگیر برادری کی شکل میں، متشکل کرنا، اپنا نصب العین قرار دیا۔ اِس کے لئے اُس نے نسلی امتیاز و تفریق کے تصوّر کی جڑ کاٹ دی۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمام انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ اور ان کے مدارج ان کے اعمال کی رُو سے متعین ہوتے ہیں — وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ (۴۶/۱۹)۔ اِس معیار کی رُو سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جس کے اعمال سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ (۴۹/۱۳)۔ اس میں کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی یا اور رشتہ دار ہونا کچھ فرق نہیں پیدا کرتا۔ قرآنِ کریم نے اس کی پہلی مثال سب سے پہلے پیغمبر کی زندگی سے پیش کی ہے۔ جب حضرتِ نوحؑ نے خدا سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کو غرقابی سے بچایا جائے کیونکہ وہ اس کے اہل میں سے ہے تو جواب ملا کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ "اے نوحؑ! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے" اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ڤ (۱۱/۴۶)۔ "اُس کے اعمال صالح نہیں" اور اس کے بعد تنبیہ کی کہ فَلَا تَسْــَٔـلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ "جس بات کا تجھے علم نہ ہو، اُس کی ہم سے طلب نہ کیا کرو۔" اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (۱۱/۴۶) "تمہیں یہ نصیحت اس لئے کی جاتی ہے تاکہ تم جاہلوں جیسی باتیں نہ کرو۔" آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ نبیؑ کا بیٹا ہونا بھی اِسے کسی رعایت کا مستحق قرار نہیں دے سکتا۔

نسل پرستی کے خلاف

اور آگے بڑھئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے مختلف مراحل میں سے گزرنے کے بعد اپنے آپ کو انسانیت کے بلند ترین مقام کا اہل ثابت کر دیا تو ارشادِ باری تعالیٰ ہوا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (۲/۱۲۴) "ہم نے تمہیں نوعِ انسان کی امامت کا مستحق قرار دے دیا"۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ بارِ الٰہا! تیرا یہ وعدہ میرے ہی ساتھ ہے یا میری اولاد میں بھی یہ اس طرح منتقل ہوتا رہے گا۔ فرمایا: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۔ (۲/۱۲۴) "تیری اولاد میں سے جو تیرے نقشِ قدم پر چلتا رہے گا اُس کے ساتھ تو ہمارا یہ وعدہ برقرار رہے گا، لیکن جو اس سے انحراف کرے گا اور سرکشی برتے گا، اُس کے ساتھ ہمارا یہ وعدہ نہیں۔ اسے محض تمہاری اولاد میں سے ہونا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ اِس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) میرا وہی ہے جو میرا اتباع کرے گا، جو اس روش سے انحراف برتے، وہ میرا ہے ہی نہیں۔

انبیاءِ اکرامؑ کا رشتہ دار ہونا تو ایک طرف، نبی کریمؐ نے خود اپنے متعلق فرمایا: اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۶/۱۵) "اگر میں بھی خدا کی معصیت کا مرتکب ہوں تو ڈرتا ہوں کہ اُس کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا"۔

اِن تصریحات (اور قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم، قانونِ مکافاتِ عمل) کی روشنی میں کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ یہ فرمائیں گے کہ (اور وہ بھی ارشادِ خداوندی کی رُو سے کیونکہ آیت میں قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ .... ہے۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ .....) میں تم سے اپنی رسالت کا یہ اجر مانگتا ہوں کہ تم میری آل (سیّدوں) سے محبت کرو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس قسم کی نسل پرستی کی تعلیم کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا! حضورؐ نے جو اُمت متشکل فرمائی، اس میں مختلف نسلوں، قوموں، قبیلوں، خاندانوں کے افراد شامل تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب (صحابہؓ) کو مستحقِ شرف و اجتبا قرار دیا تھا۔ ان میں حضورؐ کے رشتہ دار بھی تھے۔ انہیں کسی خصوصی مرتبہ کا حقدار نہیں ٹھہرایا تھا۔ اِن کے برعکس ابولہب حضورؐ کا حقیقی چچا تھا، اسے خُدا نے (نام لے کر) جہنم کا ایندھن قرار دیا تھا۔ اور حضورؐ کی رشتہ داری اس کے کسی کام نہیں آ سکی تھی! آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ کا آغاز اس طرح فرمایا تھا کہ

یاد رکھو! جاہلیت کے تمام دستور و آئین میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ میں نے انہیں مسل ڈالا ہے۔ اِس کے بعد فرمایا:

ایھا الناس! الا ان ربکم واحد۔ و ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی

ولا لعجمی علی عربی ۔ ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر ۔ الا بالتقویٰ۔

"اے نوعِ انسانی اسُن رکھو کہ تمہارا سب کا رب ایک ہے ۔ تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب۔"

آپؐ نے اپنی وفات سے پہلے جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے آخری الفاظ تھے :۔

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

آپ سوچیئے کہ جو پیغمبر (اپنی بیٹی) حضرت فاطمہؓ سے یہ کہے، کیا وہ یہ کہے گا کہ اس (فاطمہؓ) کی اولاد سے محبت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو؟ خدا نے تمام مومنوں کو بھائی بھائی کہا ہے (۴۹/۱۰) ۔ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (۴۸/۲۹) اُن کی خصوصیت بتائی ہے ۔یعنی ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار۔ اس میں آلِ محمدؐ، کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں کی۔ اس لئے حضورؐ خصوصیت سے، اپنی اولاد (آل) کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ان سے محبت کرنا تم سب کا فریضہ ہے ۔

آیت کے معانی اب آیئے آیت کے الفاظ کے معانی کی طرف۔ الفاظ ہیں "اَلۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی" (۴۲/۲۳) ۔ قُربٰی کے معنی قرابت یا رشتہ داری کے ہیں۔ "رشتہ دار" کے نہیں۔ رشتہ داروں کے لئے قرآنِ مجید میں ذَوِی الۡقُرۡبٰی آیا ہے (۲/۱۷۷) یعنی "رشتہ داری والے" ۔ اگر میرے رشتہ دار کہنا ہوتا تو لاَ قْرَبَائِیۡ کہا جاتا۔

صلۂ رحمی، یا رشتہ داری کے تعلقات کی پاسداری (زمانۂ جاہلیت میں بھی) عربوں کی نمایاں خصوصیت تھی ۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جب حضورؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو اُس کی مخالفت میں، قریش، اور قریش میں سے بھی بنی ہاشم، یعنی آپ کے قبیلہ اور خاندان کے افراد (قریب ترین رشتہ دار) سب سے آگے تھے ۔یعنی اُنہوں نے اس مخالفت میں اپنی قومی خصوصیت کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ سورۂ توبہ میں ہے:

كَيۡفَ وَاِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ لَا يَرۡقُبُوۡا فِيۡكُمۡ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً‌ؕ ..... (۹/۸)

"اِن لوگوں سے ایفائے عہد کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے، جن کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کا تم پر زور چلے تو یہ، عہد و پیمان تو ایک طرف رہا، رشتہ داری کے تعلقات اور معاشرتی روابط کو بھی بالائے طاق رکھ دیں۔"

اس سے آگے ہے: لَا يَرۡقُبُوۡنَ فِىۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً‌ ؕ (۹/۱۰) ۔ "اُن کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے جو شخص اسلام لے آتا ہے، یہ اُس سے رشتہ داری کے عام تعلقات کی بھی پاسداری نہیں کرتے اور اسے

ایسی ایسی اذیتیں پہنچاتے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

یہ تھا اسلام کی ابتدائی دعوت کے دوران نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کے خلاف اُن کے رشتہ داروں کی مخالفت کی شدت کا عالم۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، حضورؐ نے اُن سے کہا تھا کہ

> میں تم سے اپنی رسالت کا تو کوئی اجر نہیں مانگتا، لیکن تم میری اور جماعتِ مومنین کی مخالفت اور اذیت رسانی میں اس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ اپنی قومی خصوصیت کے خلاف رشتہ داری کے عام (معاشرتی) تعلقات کو بھی بالائے طاق رکھ دو۔

یہ مفہوم ہمارا ہی اخذ کردہ نہیں۔ متقدمین میں بھی یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے:

> صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی تو حضرت سعید بن جُبیرؓ نے کہا اس سے مُراد قرابتِ آلِ محمدؐ سے ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: تم نے عجلت سے کام لیا۔ سنو! قریش کے جس قدر قبیلے تھے، سب کے ساتھ حضورؐ کی رشتہ داری تھی۔ تو مطلب یہ ہے کہ تم اس رشتہ داری کا لحاظ رکھو جو مجھ میں اور تم میں ہے۔ حضرت مجاہدؒ، حضرت عکرمہؒ، حضرت قتادہؒ، حضرت سدیؒ، حضرت ابومالکؒ، حضرت عبدالرحمٰنؒ وغیرہ بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں۔[1]
>
> (تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۲)

بعض لوگوں کا خیال ایک اور طرف گیا ہے۔ عربوں کی خانہ جنگی مشہور تھی۔ ایک ایک جنگ سالہا سال تک جاری رہتی تھی۔ اس سے ان کا معاشرہ تباہ ہو رہا تھا۔ اسلام کی تعلیم خونریزی اور مفسدہ پردازی کے سخت خلاف تھی۔ یہی حضورؐ کی دعوت تھی۔ لیکن وہ لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ میں تمہیں جو دعوت دیتا ہوں اس سے مقصد یہ ہے کہ تم باہمی خانہ جنگی سے رُک جاؤ۔ اس میں تمہارا بھلا ہے۔ میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ چاہتا یہ ہوں کہ تم باہمی رشتوں ناطوں ہی کا خیال کرو اور اس جنگ و قتال کے سلسلہ کو ختم کرو۔ اگر تم نے ایسا کر دیا تو مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ اس کی تائید سورۃ السبا کی اُس آیت سے بھی ہوتی ہے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے ــــ یعنی: قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ (۳۴/۴۷) "میں تم سے جو اجرِ رسالت مانگتا ہوں، وہ خود تمہارے بھلے کے لئے ہے"۔ مخالفین کو بات سمجھانے کا یہ بڑا دلنشین انداز ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ اسلام کے ابتدائی دور کی بات ہے۔ بعد میں ان لوگوں سے تعلقات منقطع کرنے کے احکام نازل ہو گئے تھے۔

غلط مفہوم کیسے لیا گیا

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن کریم کی ایسی واضح تعلیم اور خود اس آیت کے صاف الفاظ کی موجودگی میں وہ مفہوم کسطرح وجود میں آگیا جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے؟

یعنی یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میرا اجرِ رسالت یہ ہے کہ تم میری آل سے محبت کرو۔ یہ مفہوم پیدا کردہ ہے ان روایات کا جو سیاسی محرکات اور مصالح کی رُو سے وضع کی گئی تھیں۔ یہ داستانِ سیاست بڑی دراز ہے جو ان صفحات میں سما نہیں سکتی۔ اسے آپ میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں دیکھ سکتے ہیں۔ ملخصاً یوں سمجھئے کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں شروع سے مخاصمت چلی آرہی تھی۔ جب حکومت بنی امیہ کے ہاں آگئی تو بنی ہاشم کا جذبۂ مخاصمت مشتعل ہوگیا۔ چنانچہ بنی عباسؓ نے اُن کے خلاف سازشی تدابیر شروع کر دیں۔ ان کا مرکز ایران تھا، اور ابو مسلم خراسانی اس سازش کی دعوت کا سب سے بڑا النقیب۔ اُنہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ بنی عباس کے نام میں عوام کے لئے کوئی کشش نہیں۔ کشش اسی نام میں ہوسکتی ہے جس کی نسبت رسول اللہؐ سے ہو۔ چنانچہ اُنہوں نے طے یہ کیا کہ کسی کا نام لئے بغیر کہا یہ جائے کہ "امامت اہلِ بیت" کا حق ہے۔ اس مسلسل پراپیگنڈا کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۲ھ میں بنوامیّہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ اور اقتدار بنوعباس کے ہاتھ میں آگیا۔ زمامِ اقتدار تو ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن سب سے زیادہ اثر ایرانیوں کا تھا۔ ان کے علاوہ وہاں "اہلِ بیت" (یعنی ساداتؑ[1]) بھی تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ سلطنت حاصل تو اُن کے نام سے کی گئی ہے، لیکن اس پر قبضہ بنوعباس نے جمالیا ہے۔ چنانچہ ان میں باہمی چپقلش شروع ہوگئی۔ ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ روایات کی رُو سے ہی ہوسکتا تھا۔ چنانچہ وضعی روایات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

(ضمناً) شیعہ حضرات کی روایات کی چار کتابیں تو ان کی اپنی ہیں، اور سُنی حضرات کی روایات کے چھ معتبر ترین مجموعے (صحاح ستہ) اُن کے اپنے۔ ان سب کے جامعین ایرانی ہیں۔ مندرجہ بالا تینوں گروہوں کے حق میں جو روایات وضع ہوئیں، وہ ان مجموعوں میں موجود ہیں۔

---

[1] حضرتِ فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ ان کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو اولاد حضرت فاطمہؓ کے بطن سے ہوئی انہیں سیّد کہا جاتا ہے۔ اور جو اولاد دوسری بیویوں کے بطن سے ہوئی انہیں علوی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

وضعی روایات

سورۃ الجمعہ میں رسول اللہ کی تبلیغِ رسالت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ تبلیغ ان مخاطبین تک ہی محدود نہیں ——— وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۳) اس کا سلسلہ ان لوگوں تک بھی پہنچے گا جو ہنوز ان (مخاطبین) کے ساتھ ملے نہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

> کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ خاموش رہے۔ پھر اپنا ہاتھ (حضرت) سلمانؓ (فارسی) کے اوپر رکھا اور فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا پر بھی معلق ہوگا، تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے۔

سورہ محمد میں ہے:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) "اگر تم دین سے پھر جاؤ گے تو خدا تمہاری جگہ ایک اور قوم کو لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔"

جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ

> لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا؟ آپ نے (حضرت) سلمانؓ (فارسی) کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:
>
> "اس کی قوم کو۔ اس کی قوم کو۔"

اس قسم کی روایات سے اہلِ فارس کی برتری کی سند نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے مہیا کرنا مقصود تھا کیونکہ وہی خلافتِ عباسیہ میں جملہ مناصبِ حکومت پر قابض تھے۔

اب آیئے عباسیہ کی طرف۔ تفسیر جامع البیان میں آیت اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کی تفسیر میں کہا گیا ہے:

> آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تم (یعنی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد) کو اللہ اور رسولؐ کے لئے محبوب نہ رکھے۔ (نیز تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۳)

اس سے آلِ عباسؓ کی محبت مسلمانوں کے لئے ایمان کی شرط قرار پا گئی۔

جہاں تک سادات کا تعلق ہے، ان کے حق میں تو ایران میں تحریک کے زمانے ہی سے پراپیگنڈا

شروع ہو گیا تھا، اس لئے ان کی فضیلت، علوِ مرتبت اور مناقب و محامد سے روایات کے مجموعے بھرے پڑے ہیں۔ شیعہ حضرات کے، روایات کے، چار مجموعے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور اور مستند الکافی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں اہلِ بیت (یا سادات) کے حق میں کس قسم کی روایات ہیں، اس کا اندازہ صرف ایک روایت سے لگا لیجئے:

امام جعفر صادق (علیہ السلام) نے فرمایا ..... "ہم وہ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض قرار دی ہے۔ لوگوں کو بدوں ہماری معرفت کے چارہ نہیں، اور ہم سے جاہل رہنا قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ جس نے ہم کو پہچانا، وہ مومن ہے۔ اور جس نے انکار کیا، وہ کافر ہے۔ اور جس نے ہم کو نہ پہچانا، لیکن انکار نہ کیا، وہ گمراہ ہے جب تک اس ہدایت کی طرف نہ لوٹے جس کو اللہ نے ہماری اطاعتِ واجبہ کی صورت میں فرض کیا ہے ..... فرمایا امام محمد باقر (علیہ السلام) نے۔ ہماری محبت ایمان ہے۔ اور ہمارا بغض کفر ..... یہی اللہ اور اس کے ملائکہ کا دین ہے۔"

(الشافی۔ ترجمہ الکافی۔ جلد اوّل ص ۲۱۵-۱۶)

ان تصریحات کی روشنی میں بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ آیت "مودۃ فی القربیٰ" کا یہ مفہوم کیسے لیا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم سے کچھ اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میری آل سے محبت کرو چنانچہ جامع ترمذی میں حضرت سعید بن جبیر کی یہ روایت درج ہے:

اس آیت میں قربیٰ کے معنی آلِ محمدؐ کے ہیں۔ یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔

صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں ہے کہ

جب یہ آیت نازل ہوئی ——— يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۳۳/۵۶) ——— اے مومنو! نبیؐ پر درود بھیجو اور سلام۔ تو حضرت بشیرؓ بن سعدؓ نے نبی (صلعم) سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجا کریں؟ آپؐ نے دیر تک سکوت کیا، پھر فرمایا کہ کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ ..... (ایضاً ص ۲۵)

درود کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۱۱۳) پر بتایا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا اضافہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ صَلُّوْا عَلَيْهِ۔ رسولؐ پر درود بھیجو (۳۳/۵۶) اور روایت نے اس

حکم خداوندی میں "وَ آلِہٖ" کا اضافہ کرکے اس کی تکمیل کر دی! اور یہ درود شیعہ حضرات کا ہی نہیں، سنی حضرات اسے ہر نماز میں بھی پڑھتے ہیں اور لاکھوں بار اس کا ورد بھی کرتے ہیں۔ لہذا، ہر سنی، اپنی نمازوں میں سیدوں پر درود بھیجتا ہے، خواہ اُن کا کردار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

اور آگے بڑھیئے۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا:

وَ انی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ کتاب اللّٰہِ

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوط پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ۔ (صحاح۔ بحوالہ شبلی۔ سیرت النبیؐ۔ جلد دوم صفحہ ۱۵۶)

لیکن ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا:۔

میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط تھامے رہے تو بہکو گے نہیں۔ ایک دوسری سے زیادہ عظمت والی ہے۔ کتاب اللہ جو خدا کی طرف سے ایک لٹکائی ہوئی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک آتی ہے۔ اور دوسری چیز میری عترت، میری اہل بیت ہے، اور یہ دونوں جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر آئیں۔ (ابن کثیر۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۴)

آپ غور کیجئے کہ اس روایت کی رو سے، کتاب اللہ اور عترت (اولاد) رسول اللہؐ دونوں ہم پایہ ہو گئے اس طرح کہ ایک دوسرے سے زیادہ عظمت والی ہے۔ اور حضورؐ نے اُمت سے فرمایا کہ اگر یہ دونوں کو تھامے رکھیں گے تو گمراہ نہ ہوں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ آلِ محمدؐ کا مرتبہ کیا ہے۔ اور یہ دونوں روایتیں سُنیوں کے احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان کے جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں ان کے پنجتن پاک کے خصوصیت سے نام لئے جاتے ہیں۔ اور ان پر درود بھیجا جاتا ہے سُنیوں ہی کی ایک اور روایت ہے:۔

(حضرت) ابوذرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے کعبہ کے دروازے کو پکڑ کر یہ بیان کیا کہ میں نے نبیؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے

آگاہ ہو کہ میرے اہلِ بیت تمہارے لئے نوحؑ کی کشتی کے مانند ہیں۔ جو شخص کشتی میں سوار ہوا۔ اُس نے نجات پائی اور جو کشتی میں سوار ہونے سے پیچھے رہ گیا، وہ ہلاک ہو گیا۔

(مشکوٰۃ۔ اردو ترجمہ، جلد دوم۔ صفحہ ۴۴۳)

یعنی، ایمان، ہدایت، نجات سب رسول اللہؐ کی آل (عترت۔ اہلِ بیت) کی محبت اور ان کے ساتھ وابستگی سے مشروط ہیں، اور یہ ہے وہ اجرِ رسالت جس کا مطالبہ حضورؐ نے فرمایا تھا۔[1]

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے میری دیگر تصانیف۔ لغات القرآن، شاہکار رسالت، معراج انسانیت اور ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ مقام حدیث دیکھئے۔

یہ ہے روایات کی رُو سے "مودۃ فی القربیٰ" کی آیت کی تفسیر، قرآن کریم کی رُو سے اس کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

مذکورہ صدر مباحث، آیت ۶/۹۱ کے ضمن میں تھے۔ اب آگے بڑھیے۔ فرمایا:

۶/۹۲ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ○

جب یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسولؐ تو عام انسانوں جیسا ایک انسان ہے۔ خدا اس کی طرف اپنی وحی کیسے بھیج سکتا ہے؟ تو (اس سے نظر آتا ہے کہ) یہ لوگ خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگا سکے۔ (انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا کی ہر بات نرالی اور اچنبھے کی ہونی چاہیئے)۔ (۲۲/۷۵ ؛ ۳۹/۶۷ ؛ ۶/۱۰۲)۔

ان سے پوچھو کہ اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ جس کتاب کو کسی بشر (انسان) کی طرف نازل کیا جائے، وہ من جانب اللہ نہیں ہو سکتی، تو وہ کتاب کس کی طرف سے آئی تھی جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی؟ (موسیٰؑ بھی تو عام انسانوں جیسا انسان ہی تھا)۔ اُس کتاب میں بھی حقائق کی روشنی اور انسانوں کے لئے صحیح راہنمائی تھی۔ تم نے اس کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب تم اُس میں سے تھوڑے سے حصے کو (اپنی مصلحتوں کے مطابق) ظاہر کرتے ہو، اور باقی کتاب کو چھپا کر رکھتے ہو۔ حالانکہ اُس کتاب میں، اُن امور کا علم دیا گیا تھا جنہیں نہ تم جانتے تھے، نہ تمہارے آباء و اجداد۔

اِن سے کہو کہ اُس کتاب کو بھی اللہ ہی نے نازل کیا تھا (اور ایک انسان ہی کی طرف نازل کیا تھا۔ اگر یہ لوگ اسکے باوجود اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان کے پیچھے جان کھپانے کی ضرورت نہیں)۔ انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی لغویات سے کھیلتے رہیں۔

(نیز آیات ۲۲/۷۴ ؛ ۳۹/۶۷) دیکھئے

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ بڑا غور طلب ہے۔ ایک مغربی مفکر (غالباً لاک) نے کہا ہے

کہ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنے لئے کس قسم کا معبود اختیار کر رکھا ہے، تو میں اس قوم کے تمدن۔ معاشرت۔ معیشت۔ سیاست وغیرہ سب کے متعلق بتا دوں گا۔

یہ حقیقت ہے کہ خدا کے تصوّر کا قوموں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ دُنیا کی کسی مذہب پرست قوم کو لیجیئے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں ایک معبود کو مانتی ہوگی۔ لہذا یہاں تک اِن قوموں میں اشتراک ہوگا۔ یعنی کسی معبود کو ماننا۔ لیکن جب آپ ان کے معبود کے تصوّر (یا تفصیل) میں جائیں گے، تو کسی قوم کا معبود دُوسری قوم کے معبود سے نہیں ملے گا۔ ہر ایک کا "خدا" الگ الگ ہوگا۔ خدا کوئی محسوس شے تو ہے نہیں کہ اِسے سامنے لا کر دکھا دیا جائے۔ محسوس ہونا تو ایک طرف، وہ "نور" برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم" ہے۔ لہذا اُس کے متعلق ذہنوں میں تصوّر ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ خدا کا وہی تصوّر صحیح ہوسکتا ہے جو ان صفات کی رُو سے قائم کیا جائے جو اُس نے خود وحی کے ذریعہ بتائی ہیں، اور وہ اب اپنی اصلی شکل میں صرف قرآن کے اندر ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن صرف اس ایمان باللہ کو صحیح تسلیم کرتا ہے جو قرآنی صفات کے مطابق لایا جائے۔ دوسرے مذاہب کو تو چھوڑیئے، خود ہماری اپنی (مسلمانوں کی) حالت یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے اپنے ذہن (یا عقیدہ) کا الگ الگ خدا تجویز کر رکھا ہے۔ "قرآنی خدا" پر ایمان کہیں نظر نہیں آتا۔ اور اس لئے ہماری یہ حالت بھی ہے! خدا پر ایمان درست ہو جائے تو دیکھئے ہماری حالت کس طرح سنور جاتی ہے۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا تھا، وہ بنیادی طور پر اللہ کے صحیح تصوّر کی بدولت تھا۔ اِس کے بعد یہ تصوّر بحث و نظر کا موضوع بن گیا اور ہم دن بدن گرتے چلے گئے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی   آج کیا ہے فقط اِک مسئلۂ علمِ کلام

روشن اُس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو   خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام (ضربِ کلیم)

زیرِ نظر آیت میں اُس نے مذہب پرست طبقہ کی اس غلط نگہی کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کی رُو سے وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا ہر کام "اعجوبہ" ہونا چاہیئے۔ اُس نے کہا کہ یہ خدا کا غلط تصوّر ہے۔ انسانی دنیا میں اُس کے کام مبنی بر حکمت ہوتے ہیں۔ جو علم و بصیرت کی رُو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اُس کی طرف سے نازل کردہ تعلیم (کتاب) کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ اِسی خصوصیت کی حامل کتب سابقہ تھیں۔ اِس کی مشہود یہ کتاب (قرآن مجید) ہے۔

۶/۹۲ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝

اِسی طرح خدا نے اس کتاب کو ایک انسان پر نازل کیا ہے۔ یہ بڑی بابرکت کتاب ہے، اور اس تعلیم کو سچ کر دکھانے والی جو اس سے پہلے دی گئی تھی۔ (اے رسولؐ!) تم اس کے ذریعے (پہلے) اِس مرکزی مقام (مکہ) اور اس کے گردوپیش کے باشندوں کو اُن کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کرو۔ اِس پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے بعد کی زندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور اُنہیں یقین ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ ایک صحیح نظام آکر رہے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ خدا کے مقررکردہ نظامِ صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں۔

برکت کے معنی

یہاں کتاب اللہ کو "مبارک" کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں (لفظِ ثواب کی طرح) برکت کا مفہوم بھی محض ذہنی سا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم بڑا اہم ہے اور جب اس لفظ کو قرآن کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بَرَکَۃٌ کے معنی اس ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ بڑھ بھی رہی ہو۔ درخت اس کی نمایاں مثال ہے۔ وہ اپنے مقام پر مستحکم نہ ہو تو اُس کا وجود باقی نہیں رہتا، اور اگر اس میں نشوونما نہ ہو تو بھی وہ بے مقصد رہ جاتا ہے اور اسے اُکھیڑنا پڑتا ہے۔ ثبات اور نشوونما کا امتزاج ہے جس سے درخت شجرِ طیب بنتا ہے۔ قرآن مجید میں جو اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ پر مستحکم اور غیر متبدل ہیں لیکن ان کی روشنی میں ایسی ..... جزئیات وضع کی جاسکتی ہیں جو زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیں استحکام اور نشوونما (ثبات اور تغیر) کے اِس امتزاج سے یہ کتابِ عظیم مبارک قرار پاتی ہے۔ اس سے وہ معاشرہ یا نظام قائم ہوتا ہے جسے اُس نے الصّلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے صلوٰۃ)

خدا اور آخرت پر ایمان

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں، جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں (آخرت کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے) ایمان بالقرآن کی بُنیاد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہے۔ قرآن میں اس قانون کی تفصیل دی گئی ہے اس لئے ایمان بالقرآن اور ایمان بالآخرت لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ آخرت پر۔

یعنی ان الفاظ پر "ایمان" ہے، ان کے مقصود و مطلوب پر نہیں۔ اس لئے ہماری صلوٰۃ بھی رسمی نماز بن کر رہ گئی ہے۔

رسول اللہؐ کی رسالت تمام نوعِ انسان کے لئے تھی۔ لیکن اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچ جانا مقصود تھا۔ اس کا آغاز حضورؐ نے اپنے عشیرو اقربا سے کیا ——— وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶/۲۱۴)

تبلیغ کے دائرے کی وسعت

اس کے بعد اس کا دائرہ اصلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح تک وسیع کیا گیا۔ (زیر نظر آیت)۔ اس کے بعد پوری کی پوری قوم کو مخاطب کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ قوم کے دائرہ سے بھی آگے چلا گیا۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ سلسلہ اُمّتِ محمدیہ کی وساطت سے آگے بڑھنا تھا۔ یہ سلسلہ ایک وقت تک جاری رہا۔ اور اس کے بعد . . . . اس کے بعد ہم آ گئے جن کا خود اپنا ہی قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن کا پیغام نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے، نہ کسی خاص خطۂ ملک تک محصور۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ زندگی ہے، اور (قرآن کے دعویٰ کے مطابق) اسے دنیا کے تمام ضوابط پر غالب آ کر رہنا ہے، سو ایسا ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد کہا کہ وحی صرف انبیاء کرام کو عطا ہوتی ہے۔ غیر از نبی اگر اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کاذب اور فریب کار ہے:

۶/۹۴ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۗ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ○

ان سے کہو کہ اس سے بڑھ کر سنگین مجرم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں منسوب کر دے خدا کی طرف۔ یعنی اپنی طرف سے وضع کردہ عقائد و احکام کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرے، یا اس کا مدعی ہو کہ اس کی طرف خدا کی وحی آتی ہے (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے)، حالانکہ وحی صرف انبیاءؑ کی طرف آتی ہے، اور سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی یہ رسولؐ ہے۔ لہٰذا اس رسولؐ کی موجودگی میں یا اس کے بعد، یہ دعویٰ کہ مجھے خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے، کذب و افترا ہے۔ اور پھر اس سے بڑھ کر مجرم کون ہے جو یہ کہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، میں بھی اس جیسا دے سکتا ہوں (۱۰/۳۸)۔ یاد رکھو! وحی کی مثل کوئی شے

نہیں ہوسکتی، نہ ہی کسی انسان کا حکم، وحی کا درجہ رکھ سکتا ہے۔

یہ لوگ، اس وقت تو یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں، لیکن (اے مخاطب) کاش تو اُس منظر کو دیکھ سکتا جب حق و باطل کے تصادم کے وقت، یہ لوگ میدانِ جنگ میں دم توڑ رہے ہونگے۔ اور ہماری کائناتی قوتیں (ملائکہ) اِن پر مسلط ہو رہی ہوں گی کہ اُس ایگو[1] کو باہر نکالو، جو تمہارے غرور کا باعث تھا۔ اب وہ وقت آچکا ہے جب تمہیں (شکست کی) رسوا کُن سزا ملے گی۔ کیونکہ تم خدا کے خلاف ناحق افترا کیا کرتے اور غرورِ نفس کی بنا پر، اُس کے قوانین سے سرکشی برتا کرتے تھے۔

اِس میں تین گروہوں، یا دعاوی کا ذکر ہے۔ ایک وہ مذہبی پیشوا جو خود قوانین وضع کریں اور انہیں شریعتِ خداوندی کہکر عام کریں۔ (انڈکس میں دیکھئے شریعت سازی)۔ آپ آجکل عام طور پر اس قسم کے الفاظ سنیں گے کہ اسلام یہ کہتا ہے۔ اسلام کی رُو سے یہ جائز ہے، وہ ناجائز ہے۔ اسلام کا فیصلہ یہ نہیں۔ اسلام کا حکم یہ ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ کوئی خدائی سند (قرآنی حکم) پیش نہیں کریں گے۔ اگر آپ اسے کریدیں گے تو نظر آئے گا کہ اس سے مُراد اربابِ شریعت کے فتوٰی۔ فقہ کے مسائل۔ بزرگوں کے اقوال یا وضعی روایات ہوں گی۔ کسی انسان کی کسی بات کو خدا کی بات کہنا اِفترٰی عَلَی اللہ ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔ انسانوں کے فیصلوں کو خدا کی شریعت کہکر نافذ کیا جاتا ہے۔

تھیاکریسی

دوسرے لوگ وہ ہیں جو ختمِ نبوت کے بعد وحی کے مدعی ہوتے ہیں۔ (ختمِ نبوت کی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے، انڈکس دیکھئے)۔ لہذا، نبی کریمؐ کے بعد وحی کا مدعی، مکذب اور مفتری عَلَی اللہ ہے (انڈکس میں وحی کا عنوان دیکھئے)۔ وحی براہِ راست علم حاصل ہونے کا نام ہے، اور وحی کا سلسلہ ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کے بعد، خدا سے براہِ راست علم، کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہذا، کشف، الہام کو خدا کی طرف سے براہِ راست حاصل شدہ علم کہنا بھی افترٰی ہے۔ (انڈکس میں الہام اور کشف دیکھئے)۔

قرآن کریم بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔ اُس نے تمام نوعِ انسان کو چیلنج دیا کہ وہ اس کی مثل بنا کر دکھائیں۔ اس سلسلہ کی ایک شاخ تو بعض فلاسفروں کا یہ (باطل) نظریہ ہے کہ جنہیں انبیاءؑ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت

---

[1] EGO ۔ پندارِ نفس، جو جھوٹی عزت کے احساس سے انسان کو اعترافِ حق سے باز رکھتا ہے۔

نابغہ شخصیتیں (GENIUS) ہوتی تھیں جو اپنے غیر شعوری محسوسات اور خیالات کو منزل من اللہ وحی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ چیز کسی خاص شخصیت تک محدود نہیں۔ نابغہ اب بھی پیدا ہو سکتے ہیں (اور ہوتے ہیں)۔ ہم نے وحی کی بحث کے سلسلہ میں اس قسم کے نظریات کا ابطال کیا ہے۔ وحی بے مثل و بے نظیر ہوتی تھی جو غیر از انبیاءؑ کسی انسان کو نہیں ملتی تھی، اور اب اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

قرآن کی مثل

لیکن "قرآن کی مثل" کا ایک عقیدہ خود ہماری وضعی روایات کا پیدا کردہ ہے۔ اور (قیامت بالائے قیامت یہ کہ) اسے منسوب کیا جاتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی طرف۔ (مثلاً) اس قسم کی روایت

مقدم بن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مجھے قرآن اور اس کی مثل اس کے ساتھ (مثلہٗ معہٗ) دیا گیا ہے۔ خبردار ہو کہ ایک پیٹ بھرا شخص اپنے چھپر کھٹ پر پڑا ہوا کہے گا کہ بس، اس قرآن کو لازم جانو۔ جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو، اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حرام کیا رسول اللہؐ نے، وہ اس کے مانند ہے جس کو حرام کیا خدا نے۔

(مشکوٰۃ۔ اعتصام الکتاب والسنت۔ اردو ترجمہ جلد اوّل صفحہ ۸۸)

یہ مثلہٗ معہٗ (قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل) وہی ہے جسے وحی خفی کہا جاتا ہے اور جو روایات میں درج ہے۔ اس سے احادیث کو وحی قرار دیا جاتا ہے۔ (یہ تمام بحثیں پہلے آ چکی ہیں، اس لئے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی روایات کبھی رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ بعد کی وضع کردہ ہیں۔)

آیت کے آخری حصہ کو ہم نے اسی دنیا کے تصادمات پر منطبق کیا ہے۔ اگر اس کا تعلق انسان کی طبیعی موت سے سمجھا جائے تو اس کی تشریح اس پر کی جائے گی جہاں آخرت کی زندگی اور اس کے تضمنات سے متعلق بحث ہو گی۔

اگلی آیت میں ایک بڑا عمیق نکتہ سامنے آتا ہے:

۶/۹۵ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۧ

اور خدا کہے گا کہ (تمہیں اپنی متبعین کی جمعیت پر بڑا ناز تھا۔ لیکن) آج تم ہماری عدالت میں تنہا آ گئے، ویسے ہی تنہا جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تمہیں (مال و دولت وغیرہ) عطا کیا تھا

پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم تمہارے ساتھ، تمہارے اُن رفقاء کو کبھی نہیں دیکھ رہے جنکے متعلق تمہیں زعم تھا کہ وہ ہر حالت میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ آج تمہارے ان کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اور جسے تم حقیقت سمجھا کرتے تھے، وہ سراب نکلا۔

یہی خدا کا قانونِ مکافات ہے۔ نہ کوئی فرد پیدا ہوتے وقت، کسی اور کے یا اپنے سابقہ جنم کے، گناہوں کے اثرات اپنے ساتھ لاتا ہے (وہ سادہ لوح لے کر آتا ہے)۔ اور نہ ہی اس کے اعمال کے نتائج بھگتنے میں کوئی دوسرا شریک ہو کر اس کی مصیبت کو بانٹ سکتا ہے۔ اپنے اعمال کے نتائج کو خود بھگتنا، انسانی ذات کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ ($\frac{19}{95}$)۔

[انسان کی ذات، نفس، وہ ہے جسے وہ "میں" کہہ کر پکارتا ہے۔ باقی ہر شے کو میری کہتا ہے، حتّٰی کہ اپنے جسم کو بھی "میرا جسم" کہہ کر پکارتا ہے۔ موت کے بعد یہ "میں" تو آگے جاتا ہے، اور ہر وہ شے جسے وہ میری کہتا تھا پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہی انسان کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے، اور یہی اس کے تمام اعمال کی ذمہ دار۔]

فُرَادٰی کے ایک معانی وہ ہیں جنہیں مندرجہ بالا مفہوم کے پہلے حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے وُہ جن کا ذکر مفہوم کے دوسرے حصے میں کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح سابقہ جلدوں میں نفس کے عنوان کے تحت کی جا چکی ہے۔ بالخصوص دوسری جلد میں جس کے صفحہ ۲۹ پر زیرِ نظر آیت درج ہے۔

آیت زیرِ نظر کے الفاظ "وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی" سے ایک نہایت لطیف (باریک ترزمو) نکتہ عرصہ سے میرے ضمیر میں پہلو بدل رہا ہے لیکن وہ ابھی تک "مصرعِ موزوں" نہیں بن سکا۔ اس کے لئے مسالہ (MATERIAL) تو میرے پاس کافی ہے لیکن اس کے عنوان (یعنی مقصود) کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔ میرے منہ سے یہ الفاظ آپ کو شاید اچنبہ سا لگیں ——— جس شخص کی ساری زندگی الفاظ کی کہکشانی دنیا میں گزری ہو، اس کی یہ معذرت کہ اسے اپنے موضوع کے عنوان کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل رہے، یقیناً عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن ہے یہ واقعہ اور اس کی وجہ ہماری زبان کی کوتاہ دامنی ہے۔

انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ بنا بنایا نہیں آتا۔ اس نے کچھ بننا ہوتا ہے۔ بالفاظ صحیح، اس نے اپنے آپ کو کچھ بنانا ہوتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی، اشیائے کائنات کے سامان، اسباب یا ذرائع ہوتے ہیں جن سے اس نے

اپنے آپ کو کچھ بنانا ہوتا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے اس تمام موضوع کو ایک لفظ کے اندر سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے ساز و سامانِ حیات کو متاع سے تعبیر کیا ہے۔ عام الفاظ میں متاع ان اشیاء کو کہتے ہیں جن سے وقتی ضروریات پوری کی جائیں۔ بالخصوص وہ سامان جو سفر کے لئے ضروری ہو۔ مثلاً ڈول۔ رسّی۔ مشکیزہ راستے کے لئے ضروریات کے مطابق کچھ کھانے پینے کا سامان۔ اس لفظ میں دو اہم مفاہیم شامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ متاع زاید از ضرورت یا ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ ضرورت پوری کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد سمجھ میں آجاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ اشیاء مقصود بالذات نہیں۔ یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یعنی ان سے انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننا اس کا مقصدِ حیات ہے۔ جس طرح کمہار (کوزہ گر) کی مٹی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ اس مٹی کا اس نے کچھ بنانا ہوتا ہے ——— بدھنی، آبخورہ، ہنڈیا، مٹکا وغیرہ۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک وہ جو کچھ انسان نے اپنے آپ کو بنانا ہے۔ اور دوسرے وہ سامان جس سے اس نے کچھ بننا ہے۔ سامان ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات وہ ہے جو اس نے بننا ہے۔

یہ ہے وہ موضوع جس کے لئے میرے پاس (MATERIAL) تو فراواں ہے لیکن عنوان کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ انگریزی زبان زیادہ وسیع اور منجھی ہوئی ہے۔ اس میں یہ الفاظ مل جاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ یورپ سے واپسی پر مسولینی کی دعوت پر اسے ملنے گئے تھے۔ اس زمانے کے مسولینی کے دبدبہ اور طنطنہ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ زمانہ وہ تھا جب اقوامِ مغرب ایک ہونے والی جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) کی تیاریوں کے سلسلہ میں اسلحہ کی دوڑ میں ہانپ رہی تھیں۔ گفتگو کا یہی موضوع تھا۔ مسولینی نے کہا کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں

ONE WHO HAS STEEL, HAS EVERYTHING

علامہ نے اس سے کہا کہ میں اس میں ذرا سی لفظی تبدیلی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ

ONE WHO IS STEEL, IS EVERYTHING

انہوں نے "HAS" کو IS میں تبدیل کر کے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی!

اسی (IS) کے لئے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں مل رہا! علامہ اقبالؒ کا سارا فلسفۂ خودی اسی (IS) کی تفسیر ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک جامعہ لفظ مجھے ان کے ہاں بھی نہیں ملا ۔ وہ بھی اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ (قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ)

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

بات یہاں بھی ایمائیت سے آگے نہیں بڑھ سکی ۔

قارئین نے میری تحریروں میں جرمن، امریکن عالمِ نفسیات (ERICH FROMM) کے اکثر اقتباسات دیکھے ہوں گے ۔ پچھلے دنوں ایک عزیز کی وساطت سے مجھے ایک کتاب ملی جو شاید اس کی آخری تصنیف تھی ۔ اس کا موضوع بھی تھا جسے میں نے اوپر پیش کیا ہے ۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسے ، بعد از تلاش بسیار، اس کے لئے عنوان مل گیا ۔ اس کی کتاب کا ٹائیٹل ہے

TO HAVE — OR — TO BE

اس (TO BE) میں جو وسعت اور گہرائی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی ۔

"خودگری" یا "خویشتن سازی" میں بھی (TO BE) جیسی جامعیت نہیں حتیٰ کہ یہ برگساں کے (BEING) سے بھی مختلف اور آگے ہے ۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ " ولقد جئتمونا فرادی " تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام (HAVES) تم پیچھے چھوڑ آؤ گے کیونکہ انہوں نے اپنا مقصد پورا کر دیا تھا ۔ اور (BE) ہمارے ہاں آ جائے گا ۔ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ اور مقصود و منتہیٰ یہی ہے ۔ اور اس کے لئے اس میں بڑا (MATERIAL) ہے اگر حالات نے اجازت دی تو اس موضوع کو مرتب کرنے کا میرا ارادہ ہے ——— یہ الگ بات ہے کہ اس کا ٹائٹل مجھے اس وقت بھی نہ ملے ۔

اس ضمنی بحث کے بعد پھر آیت (۶/۹۵) کی طرف آ جائیے ۔

خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (پہلی بار پیدا کیا) ۔ سے قرآن کریم نے عقیدۂ تناسخ کی بھی تردید کر دی جس کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ ایک انسان لاکھوں اور کروڑوں مرتبہ، جون بدل بدل کر، دنیا میں آتا ہے ۔ قرآن نے ان کی موجودہ زندگی کو پہلی مرتبہ کی پیدائش قرار دیا ۔ اور اس کے بعد کی زندگی کو حیاتِ آخرت ، جس سے دُنیا کی طرف مراجعت نہیں ہو گی ۔ انسان کی ، مرنے کے بعد کی ، زندگی کے متعلق فرمایا :

۶/۹۶ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

باقی رہا انسان کو مرنے کے بعد زندہ کرنا ، سو یہ بھی ہمارے لئے کون سی مشکل بات ہے ۔ اسے سمجھنے

کے لئے تم نظامِ کائنات پر غور کرو۔ بیج (بظاہر) مُردہ ہوتا ہے، لیکن اس میں زندگی کی صلاحیت خوابیدہ ہوتی ہے۔ مناسب ماحول سے وہ خوابیدہ صلاحیت بیدار ہو کر حیاتِ نو (کونپل) کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اور باقی بیج مٹی میں مل جاتا ہے۔ پودا، پھر بیج پیدا کرتا ہے۔ اور اس بیج سے سلسلۂ حیات آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح خدا کا قانون موت سے زندگی پیدا کرتا اور زندگی کو موت میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

یہی قانون افراد کی صورت میں کارفرما ہے اور اسی کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ ہے خدا کا قانونِ موت و حیات۔ تم اس سے منہ موڑ کر کدھر بہکے جا رہے ہو؟

قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کی اور مثالیں:

۶/۹۷ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○

خدا کا یہی قانونِ گردش ہے جو رات کا پردہ چاک کر کے نُورِ سحر کو نمودار کر دیتا ہے (اور اس طرح شب کی تاریکیوں کو دن کے اُجالے میں بدل دیتا ہے)۔ تم دن بھر کام کرتے ہو۔ اس کے بعد دن کے کاروبار پر رات کا پردہ گرا دیتا ہے۔ اور تمہارے لئے آرام و سکون کا وقت آجاتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق چاند اور سورج اپنے اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں، اور اس طرح، تمہارے لئے مہینے اور سال شمار کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں ($\frac{۱۰}{۵}$ ؛ $\frac{۱۷}{۱۲}$)۔ یہ سب اندازے اور پیمانے اُس خدا کے مقرر کردہ ہیں جو ہر شے کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے، اور ایسی زبردست قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی شے اُس کے مقرر کردہ اندازے سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔

اجرام کی گردش کی رُو سے، سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد سوم میں بحث ہو چکی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۳۰)۔

ایک اور مثال:-

۶/۹۸ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

اُس کے اس کنٹرول کا نتیجہ ہے کہ فضائے آسمانی میں تیرنے والے ستارے ($\frac{۲۱}{۳۳}$ ؛ $\frac{۳۶}{۴۰}$) یوں ٹھیک ٹھیک اندازے سے گردش کرتے ہیں، کہ تم بیابانوں اور سمندروں کے سفر میں، رات کی تاریکیوں میں

اُن سے راستے کے نشانات متعیّن کر لیتے ہو (اور اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی)۔
ہم ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں، اپنے قوانین کو کس قدر واضح کر دیا ہے۔ (کہ وہ ذرا سے غور و فکر سے، اُنہیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں)۔

دوسرے مقام پر قرآنِ مجید نے ستاروں کی راہنمائی کو، وحی کی راہنمائی کے لئے بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ (۵۳/۱-۴) تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

قرآنِ کریم نے نظامِ کائنات کے مختلف گوشوں کو بطورِ شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ـــــــ یہ مثالیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے، نشاناتِ راہ ہیں۔ لیکن اُن ہی لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ قرآنِ کریم نے علومِ سائنس کی تحصیل پر کس قدر زور دیا ہے۔ ان علوم اور ان کی رُو سے انکشافات کو قرآنی حقائق تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ (انڈکس میں کائنات کا عنوان دیکھئے)۔

ان شہادات کے بعد وہ انسانی دُنیا کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے:-

۶/۹۹ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○

(یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی تھی۔ اب وہاں سے نیچے اُتر کر، ذرا انسانی دنیا کی طرف آؤ اور دیکھو کہ وہاں اُس کا قانونِ ارتقاء کس حسن و خوبی سے عمل پیرا ہے)۔ اس قانون کی رُو سے تمہاری زندگی کی ابتداء، ایک جرثومۂ حیات[1] سے ہوئی (۴/۱ ؛ ۳۹/۶)۔ اس کے بعد تم نے ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں، اس طرح کہ تمہارا کاروانِ زندگی کچھ وقت کے لئے ایک منزل میں ٹھہرا۔ پھر اُس منزل نے اُسے دوسری منزل کے سپرد کر دیا (۱۱/۴)۔ اس طرح یہ قافلہ منزل بہ منزل، آگے بڑھتا گیا تا آنکہ تم مقامِ آدمیت تک پہنچ گئے۔

ہم نے اپنے قوانین کو اُس قوم کے لئے کس قدر نکھار کر بیان کر دیا ہے جو سمجھ سوچ سے کام لیتی ہے۔ (۶/۹۹)

---

[1] SINGLE LIFE - CELL

تخلیقِ انسانی کی بحث، مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۳) میں تفصیل سے آچکی ہے۔ (وہاں زیر نظر آیت بھی دی گئی ہے)۔ نظریۂ ارتقاء کے سلسلے میں انڈکس دیکھئے۔ اگرچہ وہاں اس نظریہ کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن اس آیت میں دو لفظ ایسے آئے ہیں جن کی تشریح کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

نظریۂ ارتقاء

نظریۂ ارتقاء کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ زندگی جامد شے نہیں۔ متحرک ہے۔ یہ اپنے اوّلین جرثومے سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن مسلسل حرکت نہیں کئے جاتی۔ ایک منزل میں آکر تھوڑی دیر کے لئے رُکتی ہے۔ وہاں کے ماحول سے سامانِ نشو و نما اپنے اندر جذب کرتی ہے اور جب اس میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ رُکتی اور چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مستقر اور مستودع کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو بڑی جامع بھی ہیں اور ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی بڑی لطیف۔ جب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی کسی جگہ رُک جائے، تو اسے قرار کہتے ہیں۔ رُکی ہوئی تو منجمد شے بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے قرار کا لفظ نہیں بولتے۔ یہ لفظ صرف متحرک اشیاء کے عارضی طور پہ رُک جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔

اس رُک جانے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسے مستودع سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی امانت کو اُس کے سپرد کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز اس منزل کے پاس (جو اس کا مستقر تھا) فطرت نے بطور امانت رکھی تھی۔ اس نے وہ امانت اس کے سپرد کر دی جس کی وہ امانت تھی۔ اور اس طرح مستقر اور مستودع کی منزلیں طے کرتی ہوئی، زندگی سلسلۂ ارتقاء کی حد آخر تک پہنچ گئی۔

آپ نے غور کیا کہ سائنس جیسے حار و یابس موضوع کو بھی قرآن کس قدر شاداب و شگفتہ انداز میں پیش کرتا ہے! لیکن اس کے باوجود یہ حقائق اُنہی لوگوں کی سمجھ میں آسکتے ہیں جو تفقہ (غور و فکر) سے کام لیں۔

تخلیق کے بعد وہ ربوبیت (نشوونما) کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو! ہم نے اس کے لئے بھی کس قدر حیرت انگیز انداز سے انتظام کیا ہے:

۶/۱۰۰ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ
شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ

مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

تم اس پر بھی غور کرو کہ اُس نے تمہیں پیدا کیا، تو اس کے ساتھ ہی (بلکہ اس سے بھی پہلے) تمہاری نشو ونما کا سامان کس حسن وخوبی سے بہم پہنچا دیا۔ وہ اس کے لئے بادلوں سے مینہ برساتا ہے، جس سے ہر قسم کی روئیدگی نکلتی ہے۔ پھر اس روئیدگی سے ہری ہری ٹہنیاں اُبھرتی چلی جاتی ہیں اور ٹہنیوں میں گتھے ہوئے اناج کی بالیں لٹکنے لگ جاتی ہیں۔ اسی طرح کھجور کے درخت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جس کے خوشے جھکے پڑتے ہیں۔ یہی صورت انگور، زیتون اور انار (اور دوسرے پھلوں) کے باغات کی ہے ـــــ کوئی آپس میں ملتے جلتے۔ کوئی بالکل الگ ـــــ

تم ان کے پھلوں کو اس وقت دیکھو جب وہ شروع میں شاخوں میں لگتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ کس طرح بتدریج، غیر محسوس طور پر پختگی تک پہنچتے ہیں۔

جو لوگ نظامِ کائنات کی محکمیت پر یقین رکھتے ہیں، اُن کے لئے خدا کے قانونِ ارتقاء میں حقیقت تک پہنچنے کی، کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔

نظامِ کائنات میں آیات

یہاں کہا ہے: اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ـــــ ان میں اس قوم کے لئے آیات ہیں جو ان کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے۔ یہ کونسی "صداقتیں" ہیں جن پر یقین رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پیچھے سے مظاہر کائنات اور قوانینِ فطرت کا ذکر مسلسل چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں انہی قوانین کی صداقتوں پر یقین کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا، مومن ہونے کے لئے قوانینِ فطرت کی محکمیت اور نظامِ کائنات کے مبنی برحقیقت ہونے پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھنا ضروری ہے۔ اس راستے سے انسان، اقدارِ خداوندی اور انسانی زندگی سے متعلق وحی کے عطا کردہ اصول وقوانین کی صداقت پر ایمان لا سکتا ہے۔ یہ ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے جو کبھی ڈگمگاتا نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے علوم فطرت کی تحصیل وتحقیق پر اس قدر زور دیا ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو انسان (لفظی ایمان کے باوجود) توہم پرستیوں کا شکار ہو جاتا ہے

فرمایا:-

۶/۱۰۱ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ

بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۝

یہ ہے وہ خدا جس کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ تنہا کائنات کا نظم و نسق قائم نہیں رکھ سکتا۔ کچھ غیر مرئی (UN - SEEN) قوتیں بھی ہیں جو اس کے ساتھ شریک ہیں۔ حالانکہ یہ غیر مرئی قوتیں (جو کائنات میں جاری و ساری ہیں) خود خدا ہی کی پیدا کردہ ہیں۔

پھر ان کی اس جہالت کو بھی دیکھو کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بھی بنا رکھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ، خدا کے متعلق، انسان، اس قسم کے تصورات، اپنے ذہن سے تراش لیتا ہے۔ وہ (خدا) ان باطل تصورات سے مبرّا اور بلند ہے۔

اور اس کے لئے سب سے بیّن مثال عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت حضرت مسیحؑ کی ہے۔

۶/۱۰۲ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ‌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ‌ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝

[پہلے کہا جا چکا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی ہر بات فوق الفطرت اور اعجوبہ ہونی چاہیئے، وہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگاتے (۶/۹۲)۔ یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ خدا کے تخلیقی پروگرام کا ایک حصّہ وہ ہے جس کا تعلق عالم امر (یعنی تخلیق سے پہلے مرحلے) سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مرحلہ میں ہنوز "مخلوق" ہی نہیں تھی، تو مخلوق سے متعلق (مادہ اور طبیعی) قوانین بھی کارفرما نہیں تھے۔ وہاں کے معاملات انسانی عقل و فکر سے ماوراء، فلہذا، "اعجوبہ" ہوتے ہیں۔ جب کائنات کی تخلیق ہو گئی، تو قوانین فطرت بھی ظہور میں آ گئے۔ اب اس مرحلہ میں خدا کے سب کام ان قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ وہ چاہے تو بے شک ان کے خلاف بھی سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔ لہٰذا یہاں کے معاملات میں کچھ بھی "اعجوبہ" نہیں۔ ان دونوں مراحل کو ایک مثال سے سمجھئے]۔

وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ فطرت کے کسی قانون کے مطابق نہیں تھا۔ فطرت کے قوانین کی رُو سے کوئی معلول (EFFECT) علت (CAUSE) کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتا۔ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا بھی ہے۔ اولاد کے لئے قانونِ فطرت یہ ہے کہ اس کی پیدائش نر و مادہ (مرد اور عورت) کے جنسی اختلاط سے ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے، جسے خود یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ خدا کی بیوی نہیں۔ اور جب خدا کی بیوی ہی نہیں، تو اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے۔

وہ ہر شے کا خالق ہے۔ کسی کا والد نہیں۔ اور اس کا عمل تخلیق، سرتاسر، علم و حکمت پر مبنی ہے۔
ذرا سوچو کہ "خدا کے بیٹے" کا عقیدہ کس قدر باطل ہے، بیٹا سلسلۂ تولید[1] کا نتیجہ ہوتا ہے۔

خدا اور قوانینِ فطرت

یہ آیت مطالب الفرقان جلد دوم کے صفحہ ۳۴۳ پر آ چکی ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق چوتھی جلد میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس لئے یہاں کسی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں، بجز اس بنیادی نکتہ کے دُہرانے کے کہ تخلیقِ کائنات کے بعد جب خدا نے قوانین مقرر کر دیئے تو ان قوانین کی خلاف ورزی (یا ان میں استثنا) اور تو اور، وہ خود بھی نہیں کرتا۔

اور اس کے بعد کس برجستگی سے فرمایا کہ

۶/۱۰۲ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○

یہ ہے اللہ جو تمہارا نشو و نما دینے والا ہے اور جس کا قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اُس کے سوا کسی اور کا اقتدار و اختیار نہیں۔ وہ ہر شے کا خالق اور کارساز ہے۔ لہٰذا تم بھی اُسی کے قوانین کی محکومیت اختیار کرو۔

جس قوم کا خدا اس قسم کا ہو، سوچیئے کہ اُس کی زندگی کس قدر قانون کی پابند ہو گی۔ یعنی قوانینِ فطرت کے علاوہ، اِن قوانین کی بھی پابند جنہیں خدا نے انسانی زندگی کے لئے متعیّن فرمایا ہے! پوچھئے لاٹ سے کہ اس قسم کی قوم کے متعلق اُس کا اندازہ یا فیصلہ کیا ہے؟

لیکن اس سے ایسا پوچھتے وقت اُس کے سامنے خود نہ آیئے، کیونکہ اگر ہم اُس کے سامنے آ گئے تو وہ ہمارے خدا کا اندازہ ہماری حالت سے لگائے گا، اور یہ جس قسم کا اندازہ ہو گا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے پسِ پردہ رہ کر اُس سے یہ پوچھئے۔ اور اس سے یہ کہیئے کہ اس خدا کی یہ کیفیت بھی ہے کہ

۶/۱۰۳ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○

اِنسان کا علم، محسوسات تک محدود ہے۔ اس کی نگاہیں، غیر محدود و غیر محسوس ذاتِ خداوندی کی

[1] PROCREATION

کنہ وحقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس، علمِ خداوندی، تمام نگاہوں کو محیط ہے۔ وہ ایسا لطیف ہے کہ محسوسات کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ایسا خبیر ہے کہ تمام اشیائے کائنات کے احوال وکوائف سے واقف ہے۔ "لطیف" ہونے کی جہت سے وہ تمہاری نگاہوں کے احاطہ میں نہیں آسکتا۔ خبیر ہونے کی وجہ سے وہ تمہاری نگاہوں کا احاطہ کرلیتا ہے۔

ان حقائق کی وضاحت، مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۲۷۶) اور جلد سوم (صفحات ۲۲-۲۱) میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اعادہ کافی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عقیدہ ہے کہ "اولیاء اللہ" خدا سے ملتے جلتے رہتے ہیں، اور ہر شب اس کی محفل میں شریک ہوتے ہیں، وہ قرآنِ کریم کے صریحاً خلاف ہے

غلط عقیدہ

قرآن کا واضح ارشاد ہے کہ "کوئی آنکھ خدا کو نہیں دیکھ سکتی"۔ اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتی یعنی ذاتِ خداوندی، انسان کے فکری احاطہ میں آ ہی نہیں سکتی۔

پھر جس طرح اس کی ذات غیر مرئی ہے اور اس کا اندازہ صرف اس کی تخلیق پر غور و فکر سے ہو سکتا ہے، اسی طرح اس کے قوانین بھی غیر مرئی ہیں۔ ان کی حقیقت کا علم، ان کے محسوس و مرئی نتائج سے ہو سکتا ہے۔ قانونِ خداوندی جب الفاظ کے پیکروں میں ہوتا ہے، غیر مرئی ہوتا ہے۔ اسے کلمات اللہ کہکر پکارا جاتا ہے جب وہ عمل میں آکر محسوس نتائج پیدا کرتا ہے، تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان روشن دلیلوں کے بعد فرمایا:

۱۰۵/۶ قَدْ جَاۤءَكُمْ بَصَاۤىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝

لہٰذا، اے رسولؐ! تم ان سے کہدو کہ تم سے مطالبہ ذاتِ خداوندی کی کنہ وحقیقت تک پہنچنے کا نہیں۔ مطالبہ اس کے قوانین کی اطاعت کا ہے۔ اور یہ قوانین، جو یکسر علم و بصیرت پر مبنی ہیں۔ وحی کے ذریعے تمہارے پاس آچکے ہیں۔ (خدا کے ساتھ تمہارا تعلق صرف اس وحی کی بنا پر ہے جو قرآن میں محفوظ ہے)۔ پس جو شخص عقل و بصیرت سے کام لے کر ان قوانین کی صداقت کو تسلیم کرے گا، اس کا فائدہ خود اس کی ذات کو پہنچے گا۔ جو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لے گا، اس کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ میں تم پر پاسبان مقرر نہیں کیا گیا کہ تمہیں، بھیڑ بکریوں کی طرح، ایک خاص راستے پر چلنے کے لئے مجبور کردوں۔

علم و بصیرت

غور کیجئے! سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ تم بصارت (آنکھوں کی بینائی) سے خدا کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے متعلق کچھ معلوم کیسے ہو؟ فرمایا کہ اُس نے اپنی طرف سے "بصائر" نازل کر دیئے ہیں۔ یعنی وہ ان حقائق کو از روئے بصیرت سمجھاتا ہے۔ اور جو کچھ ان حقائق سے اس طرح سمجھا جا سکے، تم خدا کے متعلق اتنا ہی جان سکتے ہو۔ اس سے زیادہ جاننے کا نہ کوئی ذریعہ ہے، نہ ہی تم اس کے مکلف ہو۔ یہ جو "علم لدنی" اور "معرفت" کو خدا کو جاننے پہچاننے کے ذرائع بتائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی۔ (تفصیل کے لئے تصوف کا عنوان دیکھئے)۔

آیت کے آخری حصہ (فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا ۭ) نے قانونِ مکافاتِ عمل اور ہر انسان کی انفرادیت کی ایک اور سند بہم پہنچا دی۔

اس کے بعد ہے:-

6/106 وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

اس طرح ہم اپنے قوانین کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے اور اِدھر اُدھر کر کر ان کی وضاحت کرتے رہتے ہیں تا کہ یہ لوگ اسے تسلیم کریں کہ تم نے، انہیں نہایت دلنشین انداز سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کی حقیقت و اہمیت انہی پر واضح ہو سکے گی جو علم و بصیرت سے کام لیں گے۔

تصریفِ آیات

جیسا کہ میں نے متعدد مقامات پر لکھا ہے، قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ اسے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق کیا ہے۔ وہ طریق ہے تصریفِ آیات۔ عام انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اسے مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور جو موضوع جس باب سے متعلق ہوتا ہے اس میں اُس موضوع سے متعلق سب کچھ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ موضوع بیک نگاہ سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا انداز یہ نہیں۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر کہی جاتی ہے۔ اس میں اضافہ کسی اور جگہ کیا جاتا ہے۔ استثناء کسی اور جگہ۔ اس کی تشریح اور وضاحت کسی اور سلسلہ میں سامنے لائی جاتی ہے۔ پھر ایک ہی بات (اصول یا قاعدہ) کو مختلف مقامات میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس طریق وضاحت و صراحت کو تصریفِ آیات[1] کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرنا۔

---

[1] تصریف و تدریسِ آیات کے سلسلہ میں دیکھئے (3/28)؛ (6/46)؛ (6/65)؛ (7/58)؛ (17/41)؛ (17/89)؛ (18/54)؛ (20/113)؛ (46/27)

لوٹا لوٹا کر لانا۔ یہ تکرار نہیں ہوتی۔ جس مقام پر اس آیت کو لایا جاتا ہے، وہ آیت معاملۂ پیشِ نظر کی نہایت عمدگی سے وضاحت کر دیتی ہے، اور خود اس کا مفہوم بھی زیادہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو موضوع پیشِ نظر ہو، اس کے متعلق دیکھا جائے کہ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر اس موضوع کے متعلق کیا آیا ہے۔ ان مقامات کو یکجا مرتب کر لیا جائے تو پھر بات ایسی نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے سارے قرآن پر نگاہ ہونی ضروری ہے۔ میں نے قرآن کریم کو اس انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں میری ساری عمر صرف ہو گئی۔ لیکن بتوفیقِ ایزدی یہ مرحلہ اس طرح کامیابی سے طے ہو گیا کہ میرے لئے قرآن کا کوئی مقام مشکل نہ رہا۔

جب میں نے قرآن کریم کو خود سمجھ کر اسے دوسروں کو سمجھانے کا فریضہ اختیار کیا، تو انہیں بھی اسی طریق سے قرآن سمجھایا۔ میری تمام تصانیف میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ چونکہ میرا مقصد یہ بھی ہے کہ قرآن سمجھنے کے متمنّی میرے فہمِ قرآن ہی پر انحصار نہ کریں، بلکہ اسے خود بھی سمجھیں، اس لئے میں نے یہی طریق انہیں بھی بتایا ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہر شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود تصریفِ آیات سے قرآن کا مفہوم متعین کرے۔ اُن کی محنت بچانے کے لئے میں نے یہ کام اُن کے لئے خود کر دیا اور قرآن کی تعلیم اور پیغام کو (SUBJECT - WISE) تقسیم کر کے، اسے مرتب شکل میں پیش کر دیا۔ میری اس کتاب کا نام "تبویب القرآن" ہے جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ جو حضرات قرآن پر غور و تدبر کر کے اسے از خود سمجھنا چاہیں، وہ اگر میری دو تصانیف لغات القرآن اور تبویب القرآن سے مدد لے لیں، تو ان کے لئے یہ راستہ طے کرنا آسان ہو جائے گا۔

درس کے معنی

آیۂ زیرِ نظر (۶/۱۰۶) میں تصریفِ آیات کا مقصد یہ بتایا گیا ہے ــــ لِيَقُولُوا دَرَسْتَ ــــ تاکہ یہ لوگ اس کا اعتراف کریں کہ تو نے اسے نہایت وضاحت سے سمجھا دیا ہے۔ اس ضمن میں ــــ "دَرَسْتَ" کا لفظ بھی بڑا غور طلب ہے۔ گیہوں کے دانے اس کی بالوں کے اندر ملفوف ہوتے ہیں۔ دانوں کو بالوں سے الگ کرنے کے لئے کسان اسے "گاہتے" ہیں۔ اس کے لئے وہ کرتے یہ ہیں کہ خشک فصل کو گول دائرے میں زمین پر بچھا دیتے ہیں اور پھر اس پر بیلوں کو چلاتے رہتے ہیں۔ بیل سارا دن اس دائرے میں چکر کاٹتے رہتے اور گیہوں کی بالوں کو اپنے پاؤں تلے روندتے مسلتے رہتے ہیں تاآنکہ غلہ کے دانے چھلکوں (بھوسے) سے الگ ہو جائیں۔ عربی زبان میں اس عمل کو دَرَسٌ کہتے ہیں (اس سے آپ درس کے

معنی بھی سمجھ لیجئے) ۔اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تصریفِ آیات سے مقصد درس ہوتا ہے ۔معانی، الفاظ کے چھلکوں میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔اور عملِ تصریف وتدریس سے، وہ چھلکوں سے الگ ہو کر باہر آجاتے ہیں ۔میری لغات القرآن عملِ تدریس (گاہنے) کی مظہر ہے ۔اور تبویب القرآن تصریف کا نتیجہ ۔اگر کوئی ''شہری دانشور'' کسان کو گیہوں گاہتے ہوئے دیکھے تو وہ کہہ دے گا کہ اس کی عقل ماری گئی ہے جو بیلوں کو دائرے میں چلائے جا رہا ہے ۔اگر انہیں سیدھے راستے پر چلائے تو وہ شام تک بیس تیس میل کی مسافت طے کر لیں ۔اسے کیا معلوم کہ اس تدریس کا مقصد کیا ہے ۔جو سطحیین، قرآن کے انداز و اسلوب پر تکرار کا اعتراض کرتے ہیں، وہ دراصل گاہنے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

قرآن کی وضاحت خود خدا نے کر دی

عملِ تصریف وتدریس کے بعد کہا کہ وَلِنُبَيِّنَهٗ ـــــ تاکہ ہم اسے نکھار اور ابھار کر واضح کر دیں ۔اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی وضاحت اور تشریح خود خدا نے اپنے ذمہ لی تھی ۔فرمایا: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) ''اس کے بعد اس کتاب کے حقائق اور معانی کا اظہار ہمارے ذمہ ہے'' بیانٌ (مادہ ۔ب ۔ی ۔ن) کے بنیادی معنی الگ الگ کرنا اور مخفی چیزوں کو نمودار کرنا، دونوں ہیں ۔جب شاخوں سے پتیاں نکلتی اور شگوفوں کی نمود ہوتی ہے ۔اس کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔آپ دیکھئے تصریف وتدریس اور بیان سے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم میں کوئی راز (مخفی) نہیں ۔اس کے تمام رموز و اسرار کو خود اللہ تعالیٰ نے تصریف وتدریس سے واضح کر دیا ہے ۔اس کے کوئی باطنی معانی نہیں ۔اسی جہت سے قرآنِ کریم کو کتابِ مبین کہا گیا ہے اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) بھی ۔یعنی خود بھی نہایت واضح اور ظاہر ہے، اور دین سے متعلق ہر بات کو واضح اور ظاہر کرنے والی بھی۔

لیکن یہ تمام عمل میکانکی نہیں کہ از خود ہوتا چلا جائے گا ۔یہ سب کچھ کہنے کے بعد فرمایا ۔لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۶) ۔اس سے وہی استفادہ کر سکیں گے جو علم وبصیرت سے کام لیں گے ۔قرآن مجید کے متعلق، اس وضاحت کے بعد حضورؐ سے فرمایا کہ

۶/۱۰۷ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

بہر حال، اے رسولؐ! یہ تمہارا ساتھ دیں یا نہ دیں ۔تم اس ضابطۂ خداوندی کا اتباع کرتے جاؤ جو تمہارے

نشوونما دینے والے کی طرف سے، تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کا اتباع کیا جائے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے قانون کے ساتھ، اوروں کے قوانین بھی شامل کئے جا سکتے ہیں ——— یا یہ خیال کرتے ہیں کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا قانون نافذ العمل ہے، لیکن انسانی دنیا میں انسانوں کا خودساختہ قانون چلنا چاہیئے ——— تم ان سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔

رسول اللہؐ کو اتباعِ قرآن کا حکم

غور کیجئے! خود حضورؐ کو بھی اسی قرآن کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ (اور اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے)۔ اس سے ایک اصول واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ حضورؐ کے بعد جو کچھ حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (وہ تاریخ میں ہو یا کتبِ احادیث میں) وہ اگر قرآن کریم کے مطابق ہے تو اس کے متعلق کہا جا سکے گا کہ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو بلا تامل کہہ دیا جائے گا کہ وہ وضعی ہے حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں حضورؐ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ قرآن کا اتباع فرماتے تھے اور اس کی خلاف ورزی کو معصیت قرار دیتے تھے۔ (۱۰/۱۵)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک مشفق طبیب کی طرح حضورؐ پر یہ امر کہ لوگ تباہی کا راستہ کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں اور صحیح راستہ کی طرف کیوں نہیں آجاتے۔ کس قدر گراں گزرتا تھا۔ (۲۶/۳)۔ آیت (۶/۱۰۷) میں کہا گیا ہے کہ مشرکین سے اعراض برتو، تو اس سے حضورؐ کے قلبِ دردمند میں ان کی تباہی کے تصور سے افسردگی کا پیدا ہو جانا فطری امر تھا۔ اس کے لئے فرمایا:

۶/۱۰۸ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○

تم اس سے افسردہ خاطر ہو کہ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اپنے کائناتی قانون کے مطابق، انسانوں کو مجبور پیدا کر دیتے ——— اور اس طرح یہ کبھی دوسرے قوانین کی اطاعت اختیار نہ کرتے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم، انسان کا اختیار و ارادہ، جو ہم نے اسے دیا ہے، سلب نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں نہ ان پر پاسبان مقرر کیا ہے نہ داروغہ۔ کہ تم انہیں مجبوراً صحیح راستے پر چلاؤ۔ (۶/۱۴۹ ، ۴۳/۲۰)

چونکہ ہم اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں (دیکھئے عنوان تقدیر) اس لئے اس مقام پر کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

جب مشرکین سے اعراض برتنے کا کہا تو ساتھ ہی جماعت مومنین سے کہہ دیا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ان کے معبودوں، اور بزرگوں کو برا بھلا کہنے لگ جاؤ۔ باطل عقائد اور مسالک سے اختلاف اور اعراض کی اور بات ہے۔ اس کے جواب دینے کا موقعہ آئے تو دلیل و برہان کی رو سے جواب دیا جائے۔ ابتذال کی پست سطح پر اترنا مومنین کا شیوہ نہیں ہونا چاہیئے۔

۶/۱۰۹ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اے جماعت مومنین! اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کے معبود، باطل ہیں اور تم باطل پرست نہیں ہو۔ لیکن دیکھنا! کہ تم ایسی پست سطح پر نہ اتر آنا کہ ان کے معبودوں کو گالیاں دینے لگ جاؤ۔ تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ، جہالت کی بناپر، خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں گے۔

باطل معبودوں کو برا بھلا مت کہو

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں (دانستہ سرکشی اختیار کرنے والوں کے سوا) جو کچھ کوئی کرتا ہے، اچھا سمجھ کر ہی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جہالت کی وجہ سے اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لئے غلط راستے پر چلنے والے پر اس کی غلط روی کو واضح کرنا چاہئے اور اس کے سامنے صحیح راستہ لانا چاہیئے۔ ایسے برا بھلا کہنے سے اس میں اُلٹی ضد پیدا ہو جائے گی۔ اگر وہ سمجھانے کے باوجود صحیح راستہ کی طرف نہ آئے تو اس میں بھی غصے ہو جانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کا نقصان اُسی کو ہوگا۔ یاد رکھو! تمام لوگوں کے اعمال کے نتائج خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ ظہور نتائج کے وقت انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ صحیح روش پر چل رہے تھے یا غلط پر۔

آپ غور کیجئے۔ غلط روش پر چلنے والوں کی جہالت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا یہ لوگ غلط کام اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں وہ کام غلط یا برے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ انہیں اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے دکھا دیا جائے کہ وہ کیسے ہیں۔ اور ایسا علم و بصیرت

کی رو سے ہوگا۔ بُرا بھلا کہنے سے نہیں۔ باطل مذاہب کے پیرو، اپنے عقیدہ کی رو سے، مذہبی امور میں جس قدر مشقتیں اٹھاتے اور صعوبات برداشت کرتے ہیں وہ اس لئے ہے کہ وہ ان کاموں کو نیکی یا (ہماری اصطلاح میں) ثواب، کا کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اگر وہ انہیں بُرا سمجھیں تو ایسا کریں ہی کیوں! آپ دیکھئے کہ قرآن کریم غیر مذاہب کے پیرؤں کے ساتھ کس قسم کا انداز اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

دیگر مقامات میں کہا ہے کہ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٦/٤٣)۔ ان کے غلط کاموں کو شیطان مزیّن بنا کر دکھاتا ہے۔ شیطان کے متعلق بتایا جاچکا ہے (دیکھئے انڈکس) کہ یہ انسان کے غلط جذبات کا دوسرا نام ہے۔ جذبات، سرکشی اور مفاد پرستی کے بھی ہوتے ہیں اور باطل مذہبیت کے بھی۔ اس کا علاج یہ ہوتا ہے کہ جذبات کے تابع چلنے کے بجائے، علم و بصیرت اور دلائل و براہین سے کام لیا جائے۔

یہ، دلائل و براہین سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ رسولؐ کوئی معجزہ دکھا دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ یعنی رسولؐ انہیں علم و بصیرت کی دعوت دیتا ہے (١٢/١٠٨) اور یہ اس سے توہم پرستی کا مطالبہ کرتے ہیں (انڈکس میں معجزات کا عنوان دیکھئے)۔

٦/١١٠ وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ أَنَّهَآ إِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

یہ (مخالفین) خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی محسوس نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ اس قسم کی نشانیاں بھیجنے نہ بھیجنے کا معاملہ خدا سے متعلق ہے (میرا کام تو خدا کا پیغام تم تک پہنچانا ہے)۔

معجزات طلبی

(اے جماعت مومنین! ہو سکتا ہے کہ ان مخالفین کے اس مطالبہ سے تم میں سے بھی بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر انہیں اس قسم کا کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو اچھا ہی ہے۔ یہ اس طرح ایمان لے آئیں گے) لیکن تمہیں ان کی دلی کیفیت معلوم نہیں۔ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لانے کے۔ ویسے بھی، معجزات دکھا کر مومن بنانا ہمارے قانونِ مشیّت کے خلاف ہے۔ (اسلئے تم ان کی ان باتوں کا خیال نہ کرو۔ قرآن کو عقل و بصیرت کی بنا پر پیش کرتے رہو۔)

اور یہ امرِ واقعہ ہے۔

۶/۱۱۱ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ؏

(ان معترضین ومخالفین میں سے، اہلِ کتاب کا معاملہ تو بالکل صاف ہے) یہ پیغام، اس سے پہلے بھی ان کی طرف آتا رہا ہے، لیکن یہ اس پر ایمان نہیں لائے۔ اس لئے کہ پیغامِ خداوندی کی صداقت کو عقل و بصیرت کی رو سے پرکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ تعصب۔ توہم پرستی اور اسلاف کی اندھی تقلید کو اپنا مسلک بنالیں، اُن کی عقلیں اوندھی ہوجاتی ہیں، اور وہ اپنی پیدا کردہ تاریکی کی طغیانیوں میں بہے چلے جاتے ہیں۔ (۲۷/۱۴)

ضد پر اڑے رہنا

اگرچہ اس میں اشارہ اہلِ کتاب کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے ایک اور ذہنیت کا اظہار بھی مقصود نظر آتا ہے۔ وہ ذہنیت یہ ہے کہ اگر ایک بار، بلاسوچے سمجھے منہ سے نکل گئی تو پھر ہزار کوشش کیجئے، وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے، خواہ دل میں اپنی غلطی کا احساس بھی کیوں نہ ہوگیا ہو۔ (۲۷/۱۴)

آٹھواں پارہ شروع

۶/۱۱۲ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○

یقین مانو۔ اگر ہم (بفرضِ محال) ان کی طرف فرشتے نازل کردیتے۔ ان سے مردے باتیں کرنے لگ جاتے اور ہم ان کے سامنے دنیا جہان کی چیزیں لا کھڑی کرتے۔ تو یہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ اس لئے کہ ایمان وہی لاسکتا ہے جو وہ طریقہ اختیار کرے جسے خدا نے، ایمان لانے کے لئے، تجویز کر رکھا ہے۔ (یعنی عقل و بصیرت سے کام لینا۔ ۱۰/۱۰۰)۔ اور ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ عقل و بصیرت کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔ اور اپنی جہالت پر نازاں رہتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے لوگ کیسے ایمان لائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کے انکار اور سرکشی کی وجہ کچھ اور ہے، اور وہی چیز انہیں اس طرف آنے نہیں دیتی۔

یعنی ان کی مفاد پرستی۔

"اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ" کے معنی یہ ہیں کہ ایمان وہی شخص لا سکتا ہے جو خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق عقل و فکر سے کام لے کر پیغامِ خداوندی پر غور و فکر کرے۔ اس کی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے (وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ) نے کر دی۔ کہ اس کے برعکس یہ لوگ جہالت میں ڈوبے رہتے ہیں اور ڈوبے رہنا چاہتے ہیں۔ خود ان کی طرف سے معجزات کا مطالبہ اسی جہالت کا مظاہرہ ہے۔ لہٰذا، یہ لوگ کس طرح ایمان لا سکتے ہیں۔ ان کے عوام کی یہ حالت ہے کہ جہالت سے نکلنا نہیں چاہتے اور ان کا سرغنے پیغامِ خداوندی کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

۶/۱۱۳ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ○

یہ بات کوئی نئی نہیں۔ جو نبی بھی آیا، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنے، خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد تھے یا باہر، بدویت کی زندگی بسر کرنیوالے غیر مہذب، اُس کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ (۲۵/۳۱؛ ۵۲/۲۲)۔ (اس لئے کہ، اس دعوتِ انقلاب کی، اُن کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی)۔ اس کے لئے

انبیاء کے دشمن

وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے، اور عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے، ان سے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے۔ (اس لئے، اے رسولؐ! تم ان کی اس روش سے کبیدہ خاطر نہ ہو) اگر مقصود یہ ہوتا کہ دعوتِ آسمانی کی کہیں مخالفت ہی نہ ہو اور سب لوگ اسے 'طوعاً و کرہاً' مانتے چلے جائیں، تو ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا بھی کر سکتے تھے۔ لیکن یہ ہمارے پروگرام کے خلاف ہوتا جس کی رو سے ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اس لئے، تم ان سے اور ان کی فریب کاریوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو (اور اپنے پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہو)۔

شیاطین الانس والجن

"شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ" کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۵۲-۵۳) پر کی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہے کہ عربوں کی بہت تھوڑی آبادی شہروں میں متمدن زندگی بسر کرتی تھی اور ان کی اکثریت شہروں سے دور، صحراؤں میں خانہ بدوشی کی حالت

ہیں رہتے تھے۔ عربوں کے ہاں جن ان بدوی قبائل کو کہتے تھے کیونکہ وہ نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور انس شہری آبادی کو جو ایک دوسرے سے مانوس (SOCiAL LiFE) کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن کریم میں "جن وانس" جہاں بھی آیا ہے اس سے یہی دو آبادیاں مراد ہیں۔ رہتے تو یہ الگ الگ تھے لیکن ان کا آپس میں میل جول رہتا تھا۔ جیسے ہمارے ہاں (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک (NOMADIC TRIBES) خانہ بدوش لوگ شہروں میں آتے جاتے رہتے تھے ـــــ قلندر، مداری، مٹی کے کھلونے بیچنے والی ان کی عورتیں وغیرہ۔ اب بھی شہروں میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن مستقل رہائش ان کی باہر صحراؤں اور جنگلوں میں ہی ہوتی ہے۔ عرب میں اب تک یہ دونوں آبادیاں ایک دوسرے سے متمیز زندگی بسر کرتی ہیں۔

جنّات یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ فلاں کو جن چمٹ گیا۔ اور فلاں جگہ جنّات رہتے ہیں، یہ سب توہم پرستی ہے۔ اس قسم کی کسی مخلوق کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ لوگ اس ضمن میں جتنے قصّے بیان کرتے ہیں، تحقیق کرنے پر وہ توہم پرستی پر مبنی افسانے ثابت ہوتے ہیں۔ (یہ راقم الحروف کی شنید نہیں، دید بلکہ آپ بیتی ہے۔ تفصیل اس کی میری کتاب ـــــ (تصوّف کی حقیقت) میں ملے گی)۔

قرآن کہتا ہے کہ عوام کے یہ سرغنے، انہیں جھوٹ اور فریب پر مبنی ملمع سازی کی نہایت دلکش باتیں سناتے رہتے ہیں تاکہ وہ جہالت میں ڈوبے رہیں، اور عقل وفکر سے کام لے کر، اس پیغام خداوندی کی طرف آنے نہ پائیں ہمارے واعظ اکثر اسی قسم کے افسانے عوام کو سناتے رہتے ہیں تاکہ وہ قرآن کریم کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ ان مفاد پرست گروہوں کی یہ ٹیکنیک شروع سے چلی آرہی ہے۔ بنی اسرائیل کا "سامری" انہی میں سے تھا۔ سامری کے معنی ہی قصّہ گو اور افسانہ تراش کے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے اسے اگلی آیت میں یوں بیان کر دیا کہ:

۶/۱۱۴ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝

ان ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو دنیاوی زندگی کے مفاد ہی کو منتہیٰ سمجھتے ہیں اور حیاتِ اخروی، اور خدا کے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتے، ان کی طرف جھکے رہیں۔ انکی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ اور جو کارستانیاں یہ کرتے ہیں، وہ بھی ان میں شریک رہیں ـــــ یہ چاہتے ہیں

کہ سارہ معاشرہ انہی کے ڈھب پر چلتا جائے تاکہ کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ (وہ تم سے بھی اسی قسم کی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں)۔ ان سرغنوں کا مقصد قوم کی اصلاح نہیں ہوتا۔ جن باتوں سے عوام خوش ہوں یہ انہی میں انہیں اُلجھائے رکھتے ہیں اور جس طریق سے وہ دولت حاصل کرتے ہیں، انہیں ویسا ہی کرنے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کی مخالفت پر نہ اتر آئیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اس قسم کی ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل (حیاتِ آخرت) پر یقین نہیں رکھتے۔ مکافاتِ عمل پر یقین رکھنے والوں کی اثر پذیری کا معیار اور ہوتا ہے۔ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، فریب اور صداقت میں تمیز کرنا جانتے ہیں کیونکہ اس کیلئے ان کے پاس صحیح معیار ہوتا ہے۔

اور ان سب کے جواب میں، ایک اصولی بات کہدی کہ:

۶/۱۱۵ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَـقِّ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۝

حکومت صرف کتاب اللہ کی

ان سے پوچھو کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر، کسی اور کے قانون کے مطابق اپنے اور تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین بھیجدیا ہے۔ جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے (یعنی جماعتِ مومنین کے اربابِ علم و بصیرت۔ ۴۷/۱۳) وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ یہ فی الواقعہ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان مخالفین کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ آیت دین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ دین، حکومتِ خداوندی کا دوسرا نام ہے۔ اور حکومتِ خداوندی کی عملی شکل کتاب اللہ کی حکمرانی ہے۔ اس کی وضاحت مطالب الفرقان جلد سوم (صـ۹) پر آچکی ہے۔ وہیں یہ آیت بھی درج ہے۔ یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کتاب اللہ کو مفصل کہا گیا ہے۔ تفصیل کے معنی ہوتے

مفصّل کے معنی

ہیں بات کو نکھار کر، الگ الگ کر کے، بیان کرنا۔ ہمارے ہاں تفصیل کے معنی (DETAILS) ہوتے ہیں۔ قرآن اس معنی میں (DETAILED) نہیں کہ اس میں

قوانین کی جزئیات تک بھی دی ہوئی ہیں۔ قرآن نے قوانین، اصولی طور پر دئے ہیں اور اسے ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑا ہے کہ وہ ان قوانین کی جزئیات، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے قرآنی اصول و قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور حکومت کی مرتب کردہ جزئیات (عندالضرورت) بدلتی رہیں گی۔ اور اس حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کر دیا کہ:

۶/۱۱۶ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

مکمّل اور غیر متبدل کتاب

اس قرآن میں خدا کا ضابطۂ قوانین، تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے، اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، مکمّل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانین خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں ——— یعنی، یہ مکمل ایسا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ اور محکم ایسا کہ اس میں تغیّر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ (۱۸/۲۷) اسی لئے اب کسی نبیؑ کے آنے کی ضرورت نہیں رہی (۳۳/۴۰)۔ اور خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ (۱۵/۹)۔ یہ اس لئے کہ اس خدا کا ضابطۂ قوانین ہے جو سب کچھ سُنتا، اور ہر بات کا علم رکھتا ہے۔ (اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ انسانی راہنمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا ضروری تھا اس میں سے کوئی بات لاعلمی کی بنا پر رہ گئی ہو۔

اس اعلانِ عظیم نے اسلام کو تمام ادیانِ عالم میں منفرد حیثیت عطا کر دی۔ اس نے کہہ دیا کہ جو کچھ خدا نے نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ اب ان سے کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ۔ قرآن میں پہنچ کر دین مکمل ہو گیا۔ یہ ہوئی پہلی منفرد خصوصیت۔ دوسری یہ کہ، نہ صرف یہ کہ اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بھی کہ اس میں کسی تغیّر و تبدّل کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ قیامت تک غیر متبدل رہے گا (دوسری جگہ ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۱۸/۲۷)۔ کوئی ایسا نہیں جو اس میں تبدیلی کر سکے۔ نیز ۶/۳۴) (۱۰/۶۴) (۱۴/۲۴-۲۷)۔ سابقہ صفحات میں آیت (۶/۳۴) کے تحت بھی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے۔

مکمل اور غیر متبدل ہونے کی خصوصیات کا ذکر یہاں آیا ہے اور آیت (۱۵/۹) کی رو سے خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ قرآن کے متعلق ان تینوں خصوصیات سے ختمِ نبوت از خود ثابت ہو جاتی ہے خدا نے جو کچھ نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ قرآن میں آ کر مکمل ہو گیا۔ اس میں کسی تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں ہو گی اور

یہ قیامت تک محفوظ بھی رہے گا۔ تو پھر کسی نبیؐ کے آنے کی ضرورت کیا ہے؟ نبی تو خدا کا پیغام لے کر آتا تھا۔ جب خدا نے اب کوئی پیغام نوعِ انسان کو دینا ہی نہیں تو وہ نبیؐ کس مقصد کے لئے بھیجے گا؟۔ (انڈکس میں ختمِ نبوّت کا عنوان دیکھئے)۔

اگلی آیت میں قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ غلط اور صحیح کا معیار انسانوں کی رائے نہیں۔ نہ کسی ایک انسان کی اور نہ ہی انسانوں کی اکثریت کی۔ فرمایا:

۶/۱۱۷ وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ۝

اب رہا یہ سوال کہ یہ ضابطۂ خداوندی اس روش کے خلاف دعوت دیتا ہے جس پر نوعِ انسان کی اکثریت گامزن ہے تو یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی مسلک کے صحیح ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں کہ اسے اکثریت نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر تم (اس خیال کے مطابق) لوگوں کی اکثریت کا اتباع شروع کر دو، تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔ دنیا کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ لوگ محض ظن و تخمین کے پیچھے ہو لیتے ہیں (اور یقینی علم کے بجائے) قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔ (اس کے برعکس، خدا کی وحی جو کچھ پیش کرتی ہے، وہ سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔)

مغربی جمہوریّت کے خلاف

اس آیت نے ڈیماکریسی یا جمہوریت کے نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ یہ آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی تھی جب دنیا ہنوز ڈیماکریسی کے نظام سے واقف تک نہیں تھی۔ اور قرآن کریم نے اس زمانے میں اس کا ابطال کر دیا۔ ڈیماکریسی کسے کہتے ہیں اور اس کے متعلق عصرِ حاضر کے دانشور کس نتیجہ پر پہنچے ہیں، قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے اس کی صداقت اور عظمت سامنے نہیں آسکے گی جب تک اس نظام (ڈیماکریسی یا جمہوریت) کی تاریخ بیان نہ کر دی جائے۔ یہ بات ہوگی تو ذرا طویل، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت لاینفک ہے۔ بالخصوص ہمارے زمانے میں آپ اسے غور سے دیکھئے۔

کاروانِ انسانیت کی تاریخ، ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ انسان ایک نظریہ وضع کرتا ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز صعوبتوں۔ لرزہ انگیز خونریزیوں اور خوفناک فسادانگیزیوں۔ مہیب لڑائیوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد یہ حقیقت اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا

اس کے بعد، وہ اس کی جگہ ایک اور نظریہ وضع کرتا ہے، جو بالعموم سابقہ نظریہ کی ضد ہوتا ہے، اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی، اسی قسم کے فساد انگیز مراحل سے گزر کر ناکام ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک اسی قسم کے عمل اور ردِ عمل (ACTION AND RE-ACTION) تجارب سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کا تعلق اس کی زندگی کے ہر گوشے ——— معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سے ہے۔ سرِدست ہم اس کے سیاسی پہلو، اور وہ بھی اس کے ذیلی شعبے، اسلوبِ حکومت سے متعلق گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آج کس مقام پر کھڑا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

انسان مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہرحال، مل جل کر رہنا ہے۔ مل جل کر رہنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ افراد اور گروہوں کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ ان میں تنازع ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جن دو فریقوں میں باہمی تنازع ہو، وہ اسے از خود نہیں سلجھا سکتے۔ اس کے لئے کسی تیسرے فریق، (ثالث) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے حکومت کا تصوّر پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے، انسان نے قبائلی زندگی اختیار کی جو خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا۔ اس اندازِ زندگی میں قبیلہ کا بزرگ، یعنی مورثِ اعلیٰ، واجب الاحترام

قبائلی زندگی

سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے سب کے لئے واجب الاتباع تھے۔ یہ حکومت یا مملکت کا پہلا خاکہ تھا۔ اس میں عام طور پر مرد ہی سربراہ ہوتا تھا اگرچہ کہیں کہیں عورتیں بھی سربراہ نظر آتی ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں (اور ابتدائی کیا؟ اب بھی جہاں جہاں جہالت ہے وہاں) پروہتوں (PRIESTS) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصوّر کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصوّر تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان پروہتوں نے جب دیکھا کہ لوگ بزرگِ خاندان (یا قبیلہ) کو اس لئے سربراہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں کے دل میں جو ان کا (پروہتوں کا) احترام ہے، اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔

تھیاکریسی

چنانچہ انہوں نے کہا (اور عوام سے منوالیا) کہ درحقیقت حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ اس سے تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کے الوہیاتی اختیارات) کے بیج حکومت کی طرح پڑی۔

کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی زور آور نے کسی طرح قوت فراہم کر لی اور اپنے ساتھ اسی قسم کے اور شہ زور افراد ملالئے تو انہوں نے کمزور انسانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح "حکومت بزورِ قوت" کا انداز وجود میں آیا۔

اسے ملوکیت یا شاہنشاہیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان اربابِ قوّت (راجاؤں۔ بادشاہوں) نے جلد ہی

ملوکیّت محسوس کر لیا کہ خالی قوّت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبائے رکھنے میں خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ قوّت کے ساتھ احترام یا عقیدت کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے دیکھا کہ قوّت کے بغیر خالی عقیدت کے زور پر اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس باہمی ضرورت کے تحت بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں (راجاؤں اور پروہتوں) نے باہمی سمجھوتا کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے، راجہ کو ایشور کا اوتار، اور سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے دیا اور بادشاہوں نے کہا کہ انہیں یہ خدائی اختیارات، مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے حاصل ہیں۔ عملی زندگی میں انہوں نے دوائرِ اقتدار بانٹ لئے۔

سیکولرازم مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی گئی اور دنیاوی معاملات میں بادشاہوں کی۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔

اس مختصر سی روئداد سے ہم نے دیکھ لیا کہ انداز و اسالیبِ حکومت کتنے ہی کیوں نہ بدلتے رہے ہوں، نظریہ شروع سے اخیر تک ایک ہی کار فرما رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس نظریّہ کے تابع، حکمرانوں کے ہاتھوں محکوم انسان جس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے اور جن مظالم کا تختۂ مشق بنے، ان کے تصوّر سے خود انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب یہ بہیمیت اور درندگی انتہا تک پہنچ گئی تو مغرب کے بعض مفکّرین کے دل میں اس کے خلاف ردّعمل پیدا ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اندازِ حکومت کچھ ایسا ہونا چاہیئے جس میں انسان کی حکومت انسان پر نہ ہو۔ ان کی فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ نظامِ حکومت لوگوں کے باہمی معاہدہ سے

نظریّۂ میثاق قائم ہونا چاہیئے۔ اسے نظریّۂ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مشہور مفکّر، ہابز اور لاک سے ہوئی تھی لیکن چونکہ اس کی عملی تفاصیل روسو (ROUSSEAU - 1712 - 1778) نے مرتّب کی تھیں اس لئے ہم اس سرگزشت کو وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی آزادی برقرار رہے لیکن تمدّنی زندگی میں یہ ناممکن ہو چکا ہے، اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ تمام انسان مل کر اپنی اپنی انفرادیت کو اجتماعی معاشرہ میں جذب کر دیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے احکام کا اتباع ہر فرد کی اپنی ذات کا اتباع ہوگا اور کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوگا۔ اس اجتماعی معاشرہ کو روسو، اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) سے تعبیر کرتا ہے۔

اس نے کہا کہ ہر فرد کے "دو ارادے" ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک بہ حیثیت شہری ہونے کے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایک فرد کے ان ارادوں میں ٹکراؤ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ذاتی ارادے کو اجتماعی ارادے کے تابع رکھنا ہی عین آزادی ہے۔

الفاظ کی حد تک تو یہ نظریہ بڑا خوش آئند بلکہ دلکش تھا لیکن اس کے بعد جب اس کی عملی تفسیر کا مسئلہ سامنے آیا تو اس میں دشواری پیدا ہوئی۔ مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اس "اجتماعی ارادے" کا تعین کس طرح کیا جائے؟ اس کے جواب میں روسو نے کہا کہ اس کے لئے ہر فرد معاشرہ کی رائے دریافت کی جائے۔ لیکن یہ کہنے کے بعد اسے خود ہی خیال آیا کہ ایک مملکت کے تمام افراد کی آراء کا معلوم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لئے اس نے لاک کے نظریہ کا سہارا لیا جس نے کہا تھا کہ حکومت، افراد کے نمائندگان پر مشتمل ہونی چاہیئے اور اگر ان نمائندوں میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روسو اور لاک کے نظریات کے اس امتزاج کو قبول کر لیا گیا اور اس کے مطابق اسلوب حکومت کو ڈیما کریسی کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا ترجمہ جمہوریت کیا جاتا ہے۔

ڈیما کریسی

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ڈیما کریسی کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر قائم ہوتی ہے:۔

۱۔ اس اندازِ حکومت میں، حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔

۲۔ عوام کا منشاء ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

۳۔ کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریت رائے ہوتا ہے۔ اور

۴۔ اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افرادِ مملکت پر ان کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔

شخصی حکومتوں کے ڈسے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس نظریہ کو آیۂ رحمت سمجھا۔ اس کی شان میں مدح و ستائش کے قصائد نشید ہوئے۔ اس کے نفاذ پر مسرت اور شادمانی کے جشن منائے گئے۔ انسانیت نے سمجھ لیا کہ اس نے آزادی کے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا ہے۔ اس کا شہرہ مغرب تک ہی محدود نہ رہا۔ اطرافِ عالم میں اس پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے۔ دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے آگے

بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جمہوریت ۔ جمہوریت ۔ جمہوریت کے نعروں سے کرۂ ارض گونج اٹھا جس نے اس اندازِ حکومت کو اختیار نہ کیا، یا اُس کی مخالفت کی، اُسے انسانیت کا دشمن قرار دیا گیا۔

لیکن اس غلغلے اور طنطنے کی ہنوز صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اُسی مغرب سے اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہوگئیں کہ یہ نظریہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اسے نافذ کیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم ہوجائے گی لیکن ہؤا یہ کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مسلط ہوگئی، اس فرق کے ساتھ کہ عہدِ جاہلیت میں حکمران بے نقاب سامنے آتے تھے ۔

جمہوریّت کے خلاف

اب اس دورِ تہذیب میں وہ جمہوریّت کا نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اور عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا۔ یہ تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اپنے آپ پر خود حکومت کرتے ہو۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (CRISIS OF CIVILISATION) کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے تہذیب مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کی تباہی کا بڑا سبب، اندازِ جمہوریّت ہے۔ اس نے کہا تھا:

> اس نظریّہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصوّر کرنا، عملی ناممکنات سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقے پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت کو لامتناہی اختیارات کا حامل بنا دیتا ہے۔
>
> (ص ۶۸)

اس نظریّہ کے متعلق کہ اکثریت جسے صحیح کہہ دے، وہ صحیح ہوتا ہے، پروفیسر مذکور لکھتا ہے:۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریّہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوّت سے قائم کی جائیگی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوّت صحیح کہہ دے وہ بالضرور صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر

کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہدیں تو وہ (محض اس لئے کہ اتنے لوگوں نے اسے صحیح کہہ دیا ہے) صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہوسکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی ہمیشہ صحیح ہوگا، ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔" لیکن اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ صحیح وہی ہوسکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے، وہی صداقت ہے۔ (ص ۴۶)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:-

اقتدار اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصوّر ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم صرف اس صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرّہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے؟ اقتدار اعلیٰ سے مفہوم "اختیاراتِ مطلقہ" ہے۔ یعنی بلاحدود و قیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ بنابریں "اقتدارِ اعلیٰ" کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اسی مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں، یا کسی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا یہ تصوّر صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ قانون کا سرچشمہ عوام کا منشا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔ (ص ۵۸)

اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اس میں ایسے اصولی نکات پیش کئے گئے ہیں جن کی اہمیت اس وقت سامنے آئے گی جب ہم جمہوریت کا تجزیہ قرآن مجید کی روشنی میں کریں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (ACEWING) نے اپنی کتاب (INDIVIDUAL THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسیط سے بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران وہ لکھتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ جمہوری نظام میں استبداد یا غصب حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ اپنے اوپر استبداد، یا خود اپنے حقوق کا غصب کبھی روا نہ رکھیں گے۔ لیکن

اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی اس خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص ۱۱۶)

پروفیسر جوڈ (C.M JOAD) کو بھی، جو پہلے نظامِ جمہوری کا بڑا حامی تھا، بعد میں یہ کہنا پڑا کہ

سائنس (یعنی مادی نقطۂ نگاہ سے) ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے، کیفیت (QUALITY) کی رُو سے نہیں۔ سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری اندازِ حکومت میں فیصلے "سروں کی گنتی" سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سر مفکر کا اور دوسرا گدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید۔ (DECADENCE)

مشہور فرانسیسی مفکر، (RENE GUENN) لکھتا ہے:۔

فریبِ جمہوریّت

اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی...... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پیوست کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں...... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رُو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD -- P. 106)

ڈین اِنگے (DEAN INGE) نے اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ڈیماکریسی کے خلاف مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک اقتباس ہے:۔

آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہوریتیں مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی غلام۔ (MIRABEAU)

ایک اور:

جمہوریت، فطری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔

(IRVING BABBIT)

اور خود لانگے کی اپنی رائے یہ ہے کہ

ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک یہ نظریۂ جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے (صـ۱۱)

۱۹۴۷ء میں، اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے منعقد کی تھی کہ وہ جمہوری نظامِ حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکّرین اور مدبّرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اس کا نام ہے (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اصطلاح بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد کمیٹی نے دوسرا سوال پیش کیا کہ "کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟" اس کے جواب میں کہا گیا کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اسے بدلوا دے۔"

یہ ہیں جمہوریت کے متعلق دورِ حاضر کے مفکّرین . . . . کے خیالات۔ میں نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں، وہ میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" میں "سیاست" کا باب ملاحظہ فرمالیں۔

اقتدارِ اعلیٰ

سوال یہ ہے کہ جمہوریت کو مسترد کرنے کے بعد، یہ مفکّرین کس قسم کا نظام چاہتے ہیں؟ اس باب میں بنیادی اور متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ، انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے یکسر خلاف ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مفکّر (BERTAND DE JOUVENEL) نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (SOVEREIGNTY) وہ اس میں لکھتا ہے:-

یہ ادنیٰ تأمل یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ

سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص ۱۹۹)

حکومت قانون کی

ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں، قانون کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد ان کے ہاں بحث یہ چل رہی ہے کہ وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ اس حقیقت کو امریکی ماہرِ آئین، ایڈورڈ کاروَن، اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICRO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

حقیقی قانون مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان، اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے ..... نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (ص ۱۰)

مشہور اطالوی مدبّر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور بھی وضاحت سے لکھتا ہے:۔

قانون کیسا ہو؟

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت۔ آمریت) یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسان کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلّب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مطلق اور ناقابلِ تغیّر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت

قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیا جائے، خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا...... یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (QUOTED BY GRIFFITH-IN-INTER PRETERS OF MAN- P.P. 46-47)

اس قانون کو ابدی اور غیر متبدّل کہنے کے ساتھ ہی ان مفکّرین نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پابجولاں یا محبوس ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ قوانین و اصول تو بے شک غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق (جنہیں وہ قانون کی تعبیرات کہہ کر پکارتے ہیں) حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ وہائٹ ہیڈ (جس کا انتقال کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے) ہمارے زمانے کا بہت بڑا مفکّر تھا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:۔

زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں محبوس رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوں گے لیکن ان اصولوں کی تعبیرات حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ (SCIENCE AND THE MODERN WORLD- PP. 218-19)

ممتاز مغربی مفکّر (ERNEST BARKER) میری ہی ہم نوائی میں کہتا ہے:۔

مملکت کی اطاعت

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفّظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاشعاری کو عدم وفاشعاری میں بدل دوں تو اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے بادلِ ناخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کروں۔ (ص ۱۹۵) حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت اپنے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے اس کی اطاعت ہم پر بہر حال واجب ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے ارباب اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:-

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کسی بلند تقاضے کے ساتھ نہ ٹکرائے۔

PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY – P.P. 193; 195; 220.

یہاں آپ نے دیکھا کہ ان مفکرین کے نزدیک حقِ حکومت نہ فرد کو حاصل ہے نہ اکثریت کو۔ حکمرانی صرف اقدار کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ ان اقدار میں عدل کا تقاضا سرِ فہرست ہے۔ مغربی جمہوریت کی رو سے، اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ مملکت کے رائج الوقت قانون کے مطابق کر دیا جائے، تو اسے مطابقِ عدل کہا جائیگا لیکن اب یہ مفکرین کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ قانون کس قسم کا ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ قانون انسانوں کا وضع کردہ ہے تو اس کی رو سے فیصلہ مبنی بہ عدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عدل کا مفہوم

(EMIL BRUNNER) ہمارے دور کا فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ناپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی (خداوندی) معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ قبول۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے نگوں کی بیساکھی اور ملمع سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER.)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے؟ اس کا جواب کسی "مذہب پرست" شخص کی زبان سے نہیں، عصرِ حاضر کے بلند ترین سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنیئے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے:-

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا

اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ، سائنس کی رُو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دُنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین اور قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی سینے کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر یہ سائنس دان کہتا ہے:۔

وحی پر مبنی یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اُترتی ہیں اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

اور اسی پایہ کا ایک اور عالمِ طبیعیات ایڈنگٹن، اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:۔

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعۂ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا دُنیا کس طرح اس کی طرف آرہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قولِ فیصل یہ نہیں کہ ایک بات کو کتنے لوگ صحیح یا سچا سمجھتے ہیں۔ صحیح اور سچی بات وہی ہے جسے وحیِ خداوندی صحیح اور سچی قرار دے ...... فیصلہ کا معیار یہی ہے۔ نہ کہ انسانوں کی آراء۔ اس لئے:

۶/۱۱۸ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

لہٰذا، گمراہی اور راست روی کا معیار خدا کی وحی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق تیرا پروردگار فیصلہ کرتا ہے کہ کون اس کے تجویز کردہ راستے سے ہٹ گیا اور کون اس پر چل رہا ہے۔

" اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ " (۶/۱۱۶) میں ساری دنیا کے انسان آجاتے ہیں خواہ وہ کہیں ہوں اور کسی زمانے میں ہوں۔ لیکن زمانۂ نزولِ قرآن میں مخالفین کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی۔ ان کا ایک بنیادی اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر اسلام دینِ خداوندی ہے تو پھر یہ کیوں ہے کہ کئی ایک ایسی چیزیں جو اُن کی شریعت میں حرام تھیں

قرآن نے انہیں حلال قرار دے دیا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث پہلے آ چکی ہے (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ اور حرام و حلال۔ اس سلسلہ میں آیت (۶/۱۴۶) بھی دیکھئے)۔ قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے

ذبح کے وقت اللہ کا نام

(بالخصوص ۵/۳ میں)۔ ان کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال ہیں۔ لیکن ان کیلئے بھی ایک شرط عائد کر دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ انہیں ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے۔ اس ضمن میں ذیل کی دونوں آیات سامنے رکھیے۔

۶/۱۱۹ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝

(اس معیار کی روشنی میں تم ان اہل کتاب کے اس اعتراض کا جائزہ لو جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے بعض ایسی چیزوں کو حلال کیوں قرار دے دیا جنہیں وہ حرام سمجھتے ہیں۔ حرام اور حلال کا معیار، خدا کی وحی ہو سکتی ہے، کسی کا اپنا مسلک نہیں ہو سکتا، خواہ اس مسلک پر چلنے والوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو)۔

لہذا، اگر تم قانونِ خداوندی (قرآن) پر ایمان رکھتے ہو تو (جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے ان میں سے) جن پر خدا کا نام لیا جائے، انہیں اطمینان سے کھاؤ[1]

اور اگلی آیت۔

۶/۱۲۲ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝

جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے

بنابریں یہ نہ کہو کہ کسی چیز کو خدا کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرنے سے کیا بگڑتا ہے۔ اور اس پر خدا کا نام لے دینے سے کیا سنورتا ہے۔ وہ چیز دونوں صورتوں میں یکساں رہتی ہے ـــــ اس سے ایک گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے جس سے انسان کے قلب میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ لہذا جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ[2]۔ یہ چیز تمہیں صحیح راستے

---

[1] اس سے مقصد جانوروں کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا ہے۔ (۲۲/۳۶؛ ۲۸)

[2] جس جانور پر ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہ لیا جائے یا جس چیز کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، وہ حرام ہو جائے گی۔

سے دوسری طرف لے جائے گی۔ مخالفین کی جماعت کے سرغنے اپنے رفقاء کو اکساتے رہتے ہیں کہ وہ تم سے ان باتوں میں الجھتے جھگڑتے رہیں (اور کوشش کریں کہ تم ان کی بات مان جاؤ)۔ اے جماعتِ مومنین! اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی، انہی کی طرح مشرک ہو جاؤ گے۔

ان احکام سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ حلال جانوروں میں سے بھی انہی کا گوشت کھانا جائز ہے جن پر (ذبح کرتے وقت۔ $\frac{۲۲}{۳۶-۲۸}$) اللہ کا نام لیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ جن پر اللہ کا نام نہ لیا جائے ان کا گوشت کھانا حلال نہیں ہوگا۔ ان آیات سے واضح ہے کہ:

حلال و حرام

۱۔ جن جانوروں پر ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔

۲۔ یا کسی کا بھی نام نہ لیا جائے۔ وہ ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔ حلال وہی ہوگا جس پر اللہ کا نام لیا جائے، اور صرف اللہ کا۔

درمیان کی آیت ہے:

$\frac{۶}{۱۲۰}$ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ۝

جب خدا نے تمہیں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کون کون سی چیزیں حرام ہیں —— اور وہ بھی مجبوری کی حالت میں جائز قرار پا جاتی ہیں۔ ($\frac{۵}{۳}$ ؛ $\frac{۶}{۱۴۶}$)۔ تو جن چیزوں کو اس نے حلال و طیب قرار دیا ہے اور ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے ان کے کھانے میں کیا تردد ہو سکتا ہے؟ (انہیں اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہیں)۔ یہ لوگ جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں (کہ فلاں چیز پہلے، یہودیوں کے ہاں، حرام تھی۔ اب تم اسے کیوں حلال قرار دیتے ہو) تو انکی کوئی بات وحی کے علم و یقین پر مبنی نہیں۔ محض ان کے ذاتی خیالات ہیں جن کی بنا پر یہ تمہیں صحیح راستے سے بہکانا چاہتے ہیں۔ خدا نے حرام و حلال کی جو حدیں باندھی تھیں، ان لوگوں نے ان حدود کو از خود آگے بڑھا دیا۔ اب اس بات کا پورا پورا علم، وحیِ خداوندی (قرآن) میں دیا گیا ہے کہ حرام و حلال کی صحیح حدود کون سی ہیں اور کون ان حدود سے آگے بڑھ رہا ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، چند ایک چیزوں کے سوا، باقی سب حلال ہیں۔

حلال کے ساتھ طیّب بھی

اب یہ ضروری نہیں کہ جو چیزیں حلال ہوں تم پر لازم ہے کہ ان سب کو بالضرور کھاؤ۔ قرآن کریم نے حلال کے ساتھ "طیّب" بھی کہا ہے ۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں طبعاً پسند ہوں۔ مزاج کے موافق ہوں یطبی نکتہ نگاہ سے تمہارے لئے مضر نہ ہوں خوش گوار ہوں ۔ مرغوبِ خاطر ہوں ۔ وہ کھاؤ ۔ (اس سلسلہ میں انڈکس میں عنوان طیّب بھی دیکھئے)۔

یہ جو قرآن نے کہا مَا لَکُمۡ اَلَّا تَاۡکُلُوۡا ...... تو اس سے ایک اہم نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے ۔ ایک ہندو، اگر مسلمان ہو جائے تو وہ معاشرہ کی دیگر رسومات بآسانی اختیار کرے گا لیکن اگر اس کے سامنے گائے کا گوشت رکھ دیا جائے تو اس سے اس کی طبیعت ابا کرے گی ۔ اس لئے کہ وہ جس چیز کو ساری عمر اپنے لئے حرام سمجھتا چلا آرہا تھا اس کی طرف اس کی فوراً رغبت نہیں ہو سکتی ! اس حد تک تو ٹھیک ہے ۔ جب تک اس کا جی نہ چاہتے وہ نہ کھائے ۔ اُسے اس کی طبیعت کے خلاف اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا ۔ لیکن اگر اس کا یہ ردِّ عمل اس لئے ہو کہ وہ اسے ابھی تک حرام سمجھتا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ۔ جب وہ قرآن پر ایمان لے آیا ہے تو اس کا حلت و حرمت کا معیار بدل جائے گا اور اسے ہر اس چیز کو حلال سمجھنا ہو گا جسے قرآن نے حلال قرار دیا ہے ۔ اگر وہ ان میں سے بعض چیزوں کو بدستور حرام سمجھتا ہے تو یہ ایمان بالقرآن کے خلاف ہے ۔ کسی چیز کے "غیر طیّب" (نامرغوب) ہونے کی وجہ سے، اسے نہ کھانا اور بات ہے اور اسے حرام سمجھنا اور بات ۔ اور اس کی وضاحت اگلی آیت میں نہایت بلیغ انداز سے کر دی جب فرمایا کہ :-

۶/۱۲۱ وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَيُجۡزَوۡنَ بِمَا كَانُوۡا يَقۡتَرِفُوۡنَ ۝

پھر، اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ رکھو کہ جن باتوں سے روکا جائے اُن سے محض رسمی طور پر مت رُکو، بلکہ اُس ممانعت کی اصل و روح کو بھی پیشِ نظر رکھو ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو یہ سمجھتے ہیں کہ احکام کی صرف ظاہری پیروی ہی مقصود ہے، ان کی غرض و غایت سے کچھ واسطہ نہیں ۔

ظواہر اور غائب دونوں کو ملحوظ رکھو

اور نہ ہی ان میں سے جو یہ کہتے ہیں کہ احکام کے صرف باطنی مفہوم کا اتباع مقصود ہے، ظواہر کی کوئی حیثیت نہیں یہ دونوں غلطی پر ہیں ۔ جن باتوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے ——— اس لئے کہ ان سے تمہاری ذات میں اضمحلال واقع ہوتا ہے ——— اُن کے ظاہر و باطن دونوں سے بچنا ضروری ہے تاکہ تمہارے فکر اور عمل میں پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو ۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کریں گے،

اس کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔

ظاہر الاثم اور باطنہ کے معنی

" ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهُ " لفظ تو دو ہیں لیکن ان میں قرآن نے دونوں جہانوں کے حقائق سمیٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ بکرا حلال جانور ہے۔ اسے ذبح بھی اللہ کا نام لے کر کیا گیا ہے۔ اس کے حلال ہونے کی شرائط پوری ہوگئی ہیں۔ لیکن اگر وہ چوری کا بکرا ہے تو وہ رزق حلال نہیں۔ حرام ہے۔ اوّل الذکر شرائط کا تعلق ظواہر سے ہے۔ آخری شرط کا تعلق باطن سے ہے۔ قرآن کے مطابق عمل اس وقت سمجھا جائے گا جب ظاہر و باطن دونوں شرائط پوری ہوں گی۔ غور کیجئے کہ ان شرائط کی رُو سے ہمارے معاشرہ کا کس قدر رزق حلال ہوتا ہے اور کس قدر (حلال نظر آنے کے باوجود) حرام۔ (انڈکس میں رزق۔ حرام۔ طیّب کے عنوانات دیکھئے)۔ ناجائز طریق سے حاصل کئے ہوئے پیسے کا خریدا ہوا رزق، ظاہراً ہزار حلال ہو فی الحقیقت حرام ہی ہے۔

۲۔ خریدا ہوا بکرا ہے۔ ذبح کرتے وقت نام بھی اللہ کا لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا گوشت کسی پیر کی نیاز کے طور پر کھایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ظاہر کا حلال اور باطن کا حرام ہے کیونکہ قرآن کریم نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو غیر اللہ کی طرف منسوب ہو۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۵/۳)۔

۳۔ قرآن کے احکام و شعائر رسماً یا میکانکی طور پر ادا کئے جائیں تو انسان کی ذات (سیرت و کردار) اس سے متاثر نہیں ہوگی۔ یا یوں کہئے کہ ان کی صداقت کا احساس دل کی گہرائیوں سے نہیں اُبھرتا۔ تو یہ بھی اثم باطن کے ذیل میں آجائے گا۔

اہل طریقت کا غلط مسلک

اور آگے بڑھیئے تو بات اور بھی اہم سامنے آتی ہے۔ ہمارے ہاں ارباب طریقت (اہل تصوّف) میں سے اکثر کا یہ عقیدہ اور مسلک ہے کہ ظاہر احکام شریعت کی پابندی لازمی نہیں۔ انسان کو دل سے ان احکام کا پابند ہونا چاہیئے۔ یہ ظاہر الاثم ہے۔ اسلام تو نظامِ زندگی ہے اور نظام میں مقصد اور اس کے اصول کے عملی طور طریق دونوں ضروری ہوتے ہیں۔ اس لئے ظاہر شریعت سے بے اعتنائی برت کر دعویٰ یہ کرنا کہ "مقربین" کا اتباع کر رہے ہیں، منشائے قرآن کے خلاف ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں فرقہ ظاہریہ کے معتقدین بھی ہیں جو مقاصد و معانی کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ احکام شریعت کی پیروی ظاہری شکل میں کافی سمجھتے ہیں۔

یہ دونوں مسالک قرآن کے منشاء کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے، مقصد، اور اس کے حصول کے طور طریق۔

الفاظ اوران کے معانی ۔ عمل اور اس کی غایت ۔ کتاب اور اس کی حکمت لازم و ملزوم ہیں ۔ اسی حقیقت کو دو لفظوں میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا یا دنیا اور آخرت کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ (دیکھئے عنوانات دنیا۔ دین ۔ ظواہر) ۔

ظواہر و باطن کے اسی امتیاز کو سامنے لاکر قرآن، انسانی فکر کو بہت بلند مقام کی طرف لے گیا ہے ۔ اس نے کہا کہ تمہاری نگاہوں میں موت اور حیات کا محض طبعی تصوّر ہے تمہارے نزدیک سانس کی آمد و رفت کا نام زندگی ہے اور اس سلسلہ کے ختم ہو جانے کا نام موت ہے ۔ لیکن قرآنی نقطہ نگاہ سے موت اور زندگی کا ایک تصوّر اس سے الگ اور بلند ہے ۔ فرمایا:

۶/۱۲۳ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

موت اور حیات کا قرآنی تصوّر

" تم اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ یوں کرو کہ، ایک شخص مردہ ہو ۔ اسے از سرِ نو زندگی عطا ہو جائے، اسکے بعد اسے ایسی نورانی قندیل دیدی جائے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے ۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص ہے جو سخت تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا ۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں ؟ کبھی نہیں ——— یہی حالت ان ، صداقت سے انکار کرنے والوں ، کی ہے ۔ انہیں چمگادڑ کی طرح اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے اور روشنی آنکھوں میں کھٹکتی ہے ۔ اس لئے یہ ، وحیٔ خداوندی کے بجائے اپنے خود ساختہ معتقدات و رسومات میں خوش رہتے ہیں ۔

موت اور حیات کے معنوی مفہوم کے لئے انڈکس میں عنوان " موت " دیکھئے ۔ ان مقامات میں اس نکتہ پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے ۔ لیکن اس مقصد کے پیشِ نظر کہ قرآنی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکے گا ۔ نیز جلد چہارم میں زیرِ آیت (۸/۲۴) جہاں بتایا گیا ہے کہ خدائے زندہ کا پیغام حیات اور انہی افراد اور اقوام کے لئے منفعت بخش ہو سکتا ہے جو زندہ ہوں یا جن میں زندہ ہونے اور زندہ رہنے کی صلاحیت اور تڑپ ہو ۔ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) انہی کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہو گا (دیکھئے انڈکس جلد چہارم) ۔

اس دعوت اور نظام کی مخالفت کرنے والوں کے متعلق کہا:

۶/۱۲۴ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

یہ ہے وہ نفسیاتی کیفیت جس کی بنا پر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ جہاں کسی نے خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی دعوت دی، وہاں کے اکابر مجرمین نے اس دعوت کی مخالفت کے لئے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ اگر وہ ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ ان کی اس منصوبہ بندی میں خود ان کا اپنا نقصان تھا۔ اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا قیام ان کی بہتری کے لئے تھا۔ (اگر کسی گاؤں کے لوگ اپنے ہاں ہسپتال بنانے کی مخالفت کریں تو یہ مخالفت خود ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگی)۔

اکابر مجرمین کی طرف سے مخالفت

قرآنِ کریم، سلب و نہب اور ظلم و استبداد پر مبنی نظام کے ارباب حل و عقد کو "اکابر مجرمین" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی رُو سے، مجرم تو اس نظام کے تمام افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے اکابر مجرمین (اربابِ اقتدار (لیڈر) ہوتے ہیں جب حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا تو انہوں نے بحضور رب العزت گزارش کی کہ بارالٰہا! وہ قوم اس قدر کثیر التعداد ہے، اور ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے، اس کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی، تو جواب ملا کہ وہ قوم بے شک ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے لیکن وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ○ (۲۷/۴۸)۔ اس مملکت کے دارالسلطنت میں نو صاحبِ اقتدار ہیں جو سارے فساد کی جڑ ہیں۔ ان کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ ان کی اصلاح ہو جائے تو ساری قوم سنور جائے گی۔

قرآن کی رُو سے، قوموں کے بگاڑ اور اصلاح کے سلسلہ میں ان اربابِ اقتدار اور لیڈروں کی ذمہ داری بنیادی ہوتی ہے۔ یہی ہیں جو کاروان قوم کو (قرآن کے الفاظ میں) اس منڈی میں لا اتارتے ہیں جہاں اس جنس کا سودا کوئی خریدار نہیں ہوتا (۱۴/۲۸-۲۹)۔ لیکن وہ ان متبعین (FOLLOWERS) کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم آنکھیں بند کر کے دُوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے اور تباہی اور بربادی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں اور اربابِ اقتدار کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی۔ تم ان کی تقویت کا سامان بنے تو انہوں نے اس قدر تباہیاں مچا دیں۔ تم پر یہ حکومت بھی اسی لئے کرتے رہتے تھے کہ تم ان کے سامنے جھکے رہتے۔ اگر تم اُٹھ کھڑے ہوتے تو یہ

خود ہی بے دست و پا ہو جاتے۔

ایں خدا نا سجدہ اش کردی خداست　　　چوں یکے اندر قیام آئی فناست

لہٰذا یہ اور تم دونوں جہنم کے عذاب کے مستحق ہو۔ جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس میں عوام اور خواص سب ماخوذ ہو جاتے ہیں۔ (۸/۲۵)۔

اس حقیقت کو قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ عوام اور ان کے لیڈر، مذہبی پیشوا اور ارباب اقتدار، سب جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور وہاں ایک دوسرے کو طعن و تشنیع بنا رہے ہیں۔ تفصیل اس کی مطالب الفرقان جلد چہارم۔ زیر آیت (۵/۲۴)۔ ص ۵۴۹ گزر چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس جلد چہارم)۔

یوں قرآن کریم عوام اور ان کے لیڈروں۔ مذہبی پیشواؤں اور حکام کو یکساں تباہی کا ذمہ وار قرار دیتا ہے۔

بات منکرین کی ہو رہی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ان اکابر مجرمین کی انانیت اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ جب انہیں وحیِ خداوندی کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ:

۶/۱۲۵ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۝

پھر، ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کی طرف ہماری کوئی وحی آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر صرف اُس صورت میں ایمان لائیں گے کہ، جس طرح رسولوں پر وحی نازل ہوتی ہے، اُسی طرح ہم پر بھی براہِ راست وحی نازل ہو۔ (ان سے کہدو کہ خارجی دنیا میں تو خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ ہر نوع کے ہر فرد کو براہِ راست وہ راہنمائی دے دیتا ہے جس کے مطابق اُس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے، لیکن انسانی دنیا میں اس کا یہ پروگرام نہیں۔ یہاں پر قاعدہ ہے کہ ایک منتخب فرد کو وحی دی جاتی ہے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ (۴۲/۵۱)۔ اور یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑتا ہے کہ وہ چاہے اسے تسلیم کریں اور چاہے اُس سے انکار کر دیں۔ اگر ہر فرد کو براہِ راست وحی دی جائے، تو اشیائے کائنات کی طرح، انسان بھی اُس کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے اور عقل و فکر کو کام میں لا کر صحیح فیصلہ کرنے کا سوال باقی نہ رہے، حالانکہ یہی چیز باعث

شرفِ انسانیت ہے)

اس مقصد کے لئے خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کون سا فرد ہے جسے اس بلند منصب (یعنی وحی دیئے جانے) کیلئے منتخب کرنا چاہیئے (۳/۱۲۸)

لیکن یہ سب انکی کٹ حجتیاں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ناجائز کمائی کا لہو کچھ اس طرح ان کے منہ کو لگ گیا ہے کہ یہ اسے چھوڑنا چاہتے ہی نہیں۔ ان سے کہدو کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو، تمہیں ایک دن، اس نظام کے آگے جھکنا پڑے گا، اور اس وقت تمہیں ان سازشوں کی سخت سزا ملے گی۔

سابقہ جلدوں میں وحی، نبوت، رسالت کے متعلق تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھیئے۔ جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وحی میں کسی کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ خالصتہً وہبی علم تھا جسے اللہ تعالیٰ اس برگزیدہ ہستی کو عطا کر دیتا تھا۔ جسے اس مقصد کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔

(ضمناً) قرآن کریم نے ان مجرمین کے اس قسم کے مطالبہ کو "مکر" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ اس قسم کا مطالبہ سنجیدگی سے نہیں کرتے تھے۔ یہ محض کٹ حجتیاں اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی کی فریب کارانہ تدبیریں ہوتی تھیں۔

۶/۱۲۶ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

(اسی قسم کی دونوں جماعتیں شروع سے چلی آرہی ہیں —— یعنی ماننے والوں کی، اور مخالفت کرنے والوں کی —— اور یہ کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے)۔ وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص تعصب اور کم ظرفی

سینے کی کشاد

کو چھوڑ کر، اپنی نگاہوں میں اتنی وسعت اور سینے میں اتنی کشاد پیدا کر لے کہ اسلام کے حقائق پر کھلے دل سے غور و فکر کر سکے، اس پر صحیح راستہ واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص تعصب اور تنگ نظری سے کام لے، اس پر یہ راہ واضح نہیں ہوتی۔ تعصب سے اس کا سینہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ حق کو قبول کرنا اس کے نزدیک بڑی سخت گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف ہو جاتا ہے، جہاں قدم قدم پر اس کی سانس پھول جائے (۹۰/۱۲-۱۱)۔

جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں اور یوں ہی وحی کی صداقت سے انکار کیے جائیں، (۲/۴) ان پر بات واضح

نہیں ہوسکتی۔ اُن کے لئے معاملہ ہمیشہ مشتبہ رہتا ہے (۹ / ۱۴)۔
کہاکہ اس قسم کی کٹ حجتیوں اور فریب کارانہ سازشوں کا نتیجہ رجس ہوتا ہے۔ رجس کے معنی ہوتے ہیں، معاملہ کا یکسو اور صاف نہ ہونا۔ اس میں شک، تردد، التباس پیدا ہوجانا۔ اور اس کی وجہ سے اضطراب لاحق ہوجانا۔ سورہ یونس میں ہے۔ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰ / ۱۰۰) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر معاملات مشتبہ رہتے ہیں۔ شدید ترین۔ رجس منافقت کو کہا گیا ہے (۹ / ۹۵) مومنین کی کیفیت ان کے برعکس ہوتی ہے (۹ / ۱۲۴-۱۲۵)۔
ان کے برعکس صاف۔ سیدھی۔ واضح راہ، وحی کی عطا کردہ ہے۔

۶ / ۱۲۷-۲۸ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ان کے برعکس، جو لوگ عقل و فکر سے کام لے کر وحی کی صداقت پر ایمان لے آتے ہیں، وہ، تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے متعین کردہ، سیدھی اور متوازن راہ پر چلتے ہیں۔
دیکھو! ہم اپنے قوانین و حقائق کو، اُن لوگوں کے لئے جو انہیں پیشِ نظر رکھنا چاہیں، کس قدر واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں۔
یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسنِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں، ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ہر طرح کی سلامتی نصیب ہوتی ہے، اور قانونِ خداوندی کی کارسازی اور رفاقت انہیں میسر آجاتی ہے۔
اس جماعت کا مقصد نظامِ خداوندی کا قائم کرنا ہوتا ہے۔

۶ / ۱۲۹ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

جب وہ نظام قائم ہوگا تو ان مخالفین کی تمام پارٹیاں اکٹھی کی جائیں گی۔ شہری لوگ جو اسکیمیں بنایا کرتے تھے، اور بدوی، جو ان سکیموں کو کامیاب بنانے کے لئے ان کے دست و بازو بنا کرتے تھے ——

ان بدوی لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم نے ان شہری پارٹیوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اور ان پارٹیوں کے سرغنے اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ ہم اس دعوت کی مخالفت میں ایک دوسرے کو استعمال کیا کرتے تھے تا آنکہ وہ وقت آپہنچا جو ہمارے اعمال کے ظہورِ نتائج کے لئے مقرر تھا۔ (اور آج ہم اس طرح بندھے کھڑے ہیں)۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہارا ٹھکانہ تباہیوں کا وہ جہنم ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس میں تبدیلی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہو گا نہیں[1]۔ وہ قانون یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

"جن و انس" کا قرآنی مفہوم سابقہ صفحات (زیرِ آیت ۶/۱۱۲) آچکا ہے۔ ظہورِ اسلام کے زمانے میں جب یہ نظام قائم ہوا ہے تو اس کی مخالفت کے لئے قریش وغیرہ شہری لوگ اور بدوی قبائل سب متحد ہو گئے تھے لیکن انہیں اس قدر فاش شکستیں ہوئیں کہ یہ اٹھنے کے قابل نہ رہے اور ذلت اور پستی کے عذاب میں مبتلا ہو گئے یہ ان کے ساتھ اس دنیا میں ہوا۔ اور اُخروی عذاب اس سے بھی شدید ہو گا۔

یہی تھا اسلامی نظام کے خلاف ان پارٹیوں کا متحدہ محاذ جس کے متعلق فرمایا:

۶/۱۳۰ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

اس طرح ہم، سرکش لوگوں کی مختلف پارٹیوں کو، اُن کے مشترکہ جرم کی بنا پر، ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا کرتے ہیں۔ اور یوں وہ اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے ایک ہی بن جاتے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ سنت اللہ (خدا کی غیر متبدل روش) ہے کہ:

۱۔ کسی قوم کو تباہ نہیں کیا جاتا جب تک اسے پہلے متنبہ نہ کر دیا جائے کہ ان کی غلط روش کا نتیجہ کیا ہو گا۔

۲۔ ان میں غلط اور صحیح کے سمجھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو چکی ہو۔ (دیکھئے آیات ۴/۱۶۵ ؛ ۵/۱۹ ۔ مطالب الفرقان جلد چہارم)۔

اسی سنت اللہ کے مطابق فرمایا:۔

۶/۳۲-۱۳۱ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ

---

[1] قرآنی اسلوب یہ ہے کہ جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَآءَ اللّٰهُ وغیرہ آئے، جس سے مقصود مشیتِ خداوندی ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہو گا۔ ملاحظہ ہو لغات القرآن۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۱۶۱۸ عنوان (ن۔ س۔ ی)

اٰیٰتِیۡ وَ یُنۡذِرُوۡنَکُمۡ لِقَآءَ یَوۡمِکُمۡ ہٰذَا ؕ قَالُوۡا شَہِدۡنَا عَلٰۤی اَنۡفُسِنَا وَ غَرَّتۡہُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ شَہِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ اَنَّہُمۡ کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ ۝ ذٰلِکَ اَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ رَّبُّکَ مُہۡلِکَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ وَّ اَہۡلُہَا غٰفِلُوۡنَ ۝

ہم اُس دن دونوں گروہوں ——— بدویوں اور شہریوں ——— سے پوچھیں گے کہ کیا تمہاری طرف ہمارے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمہارے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ کوئی غیر نہیں تھے۔ وہ تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کرتے تھے اور تمہیں آگاہ کیا کرتے تھے کہ ایک دن تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے (۳۹/۷۱)۔ اس پر وہ اقرار کرینگے کہ یہ ٹھیک ہے۔ اس کے لئے کسی خارجی شہادت کی بھی ضرورت نہیں، ہم خود اپنے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ صداقت تو ان لوگوں کے سامنے آجاتی ہے اور اسے پہچاننے میں بھی کوئی دقّت نہیں ہوتی۔ لیکن طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد کی چمک دمک نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے اور وہ اس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آتے ہیں تو اس وقت ان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اپنے خلاف آپ شہادت دیتے ہیں کہ اُنہوں نے حق و صداقت کا انکار کرکے واقعی جُرم کیا تھا۔ (۶/۳۱)۔

تباہی کی دو شرائط

(یہ سب کچھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ) تیرا رب یہ نہیں کرتا کہ کسی قوم کو اس کا تو علم ہی نہ دیا جائے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے انکار سے تباہی آتی ہے، اور انہیں، اس جُرم کی پاداش میں تباہ کر دیا جائے کہ تم نے اِن قوانین سے انکار کیوں کیا تھا۔ ایسا کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اور خدا کسی پر زیادتی نہیں کیا کرتا۔

ان قوموں کی تباہیاں اور جماعتِ مومنین کی کامرانیاں اور خوش حالیاں یونہی اتفاقیہ واقع نہیں ہو جاتیں۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

۶/۱۳۴ وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ ۝

ہمارے قانون کی رُو سے، سزا اور جزا عمل کے مطابق ملتی ہے، اور عمل ہی کے مطابق ہر ایک کا درجہ متعیّن ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کسی کا کوئی عمل، ہمارے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہنے پائے۔

مدارج مطابق اعمال

یہاں ایک نکتہ بھی سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے (۱۷/۷۰)۔ اس کی یہ تکریم اور شرف، عطیۂ خداوندی ہوتا ہے۔ اس کے بعد معاشرہ میں اور میزان خداوندی میں اُن کے مدارج کا تعین اُن کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے اور انہی اعمال اور مدارج کی رُو سے قوموں کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔

۶/۱۳۴ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝

ان سے کہدو کہ خدا کا نظام کسی خاص قوم کا محتاج نہیں کہ وہ اسی کے ہاتھوں قائم ہوگا، کسی اور کے ہاتھوں قائم نہیں ہو سکے گا۔ وہ اپنی مہربانی سے ہر قوم کو نشو ونما حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اسی طرح اس نے تمہیں بھی مواقع بہم پہنچائے ہیں۔ اگر تم اس کے قانون کے مطابق، ان مواقع سے فائدہ نہ

استبدال واستخلاف قومی

اٹھاؤ گے اور اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرو گے، تو وہ تمہیں زندہ قوموں کی صف سے نکال دے گا اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی جسطرح اس نے تمہیں (بنی اسرائیل کی تباہی کے بعد) ایک دوسری قوم (بنی اسماعیل) کی نسل سے اٹھ کھڑا کیا ہے۔ (یہ ہے ہمارا قانونِ استخلاف واستبدالِ اقوام)

(۲۱/۱۱-۱۵) ؛ (۹/۳۸-۳۹) ؛ (۴۷/۳۸) ؛ (۷۰/۴۱-۴۲) ؛ (۵/۵۴)

قوموں کے استبدال واستخلاف اور ان کے عروج وزوال سے متعلق قانون کے لئے انڈکس دیکھیئے۔ اور اسکے بعد کہا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ خالی دھمکی نہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے جس کا نتیجہ تمہارے سامنے آکر رہے گا۔

۶/۱۳۵ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ۝

(اسے بگوش ہوش سن لو کہ ہماری یہ تنذیر خالی دھمکی نہیں)۔ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے، وہ ہو کر رہے گا تم ہمیں ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ تم ہمیں بے بس نہیں کر سکتے۔

یہ ہوگا کیسے؟ اس کے لئے صاف اور واضح پروگرام بتا دیا:

۶/۱۳۶ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝

ا سے کہدو کہ (اس باب میں کسی بحث تمحیص یا جھگڑے جھیلے کی ضرورت نہیں)۔ تم اپنے پروگرام

کے مطابق کام کرتے جاؤ ۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں ۔ اس کے بعد نتائج خود بتا دیں گے ـــــ اور بہت جلد بتا دیں گے ـــــ کہ آخر الامر دنیا میں کامیابی کسے ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جو قوم انسانیت کے حقوق میں کمی کرتی ہے، اس کی کھیتی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی ۔ ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا ۔

دعاوی کے سچّے اور جھوٹے ہونے کا معیار ـــ نتائج

تم کہتے ہو کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ کامرانیاں اور فتح مندیاں ہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہاری روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا ۔ فلاح و بہبود اس روش کا نتیجہ ہوگا جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے یہ نظری دعویٰ ہے ۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ کس کا دعویٰ سچا ہے ۔ کہا کہ یہ کچھ مشکل نہیں ۔ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاؤ ۔ ہم اس میں مداخلت نہیں کریں گے ۔ ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے ہیں تم اس میں دخل نہ دینا ۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نظر آجائے گا کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا ۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی ۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ ظلم کا یہ انجام کس طرح سامنے آجاتا ہے ۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن نے دعوے کی صداقت کے پرکھنے کا کس قدر عظیم اصول پیش کیا ہے ؟ "مذہب" میں ہر عمل کے نتیجہ کو "قیامت" پر اٹھا رکھا جاتا ہے ۔ دین میں دعوے کا (PRAGMATIC TEST) ہوتا ہے ۔ یعنی وہ دعاوی کے سچّے اور جھوٹے ہونے کا معیار عملی نتائج قرار دیتا ہے ۔ مذہب میں اپنے اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے مناظرے اور مباحثے کئے جاتے ہیں ۔ اور مباحثوں اور مناظروں سے کبھی فیصلہ کن حقیقت سامنے نہیں آتی ۔ دین ایک نظام قائم کرتا ہے اور اس کے محسوس نتائج جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں، اس کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بن جاتے ہیں جن کے جھٹلانے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی ۔

ہم دن رات، چلا چلا کر، اعلان کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام ہی سچا مذہب ہے ۔ لیکن اس کا کوئی عملی ثبوت ہم پیش نہیں کر سکتے ۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے دن رات کے دعاوی اور تبلیغی مشنوں کے باوجود، دنیا اس کی طرف رُخ نہیں کرتی ۔ اگر ہم کسی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم کر دیں تو اس کے زندہ اور درخشندہ نتائج کو دیکھ کر دنیا فوج در فوج اس کی طرف آجائے ۔

قرآن کریم نے اس چیلنج کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے (مثلاً) زیر نظر آیت کے علاوہ ($\frac{11}{93}$، $\frac{11}{121}$، $\frac{29}{39}$) اسی سلسلہ میں انڈکس میں عنوان "مکافاتِ عمل" اور "قانونِ مکافاتِ عمل" بھی دیکھئے ۔ مطالب الفرقان ۔ جلد دوم ۔

صفحات (۱۴۸-۷۹) پر زیرِ نظر آیت کی تشریح بھی دی گئی ہے۔ قرآن کا یہ دعوی بڑا عظیم ہے اور جس اعتماد کے ساتھ اسے پیش کیا گیا ہے، وہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ لیکن اس کے لئے مومنین کی جماعت کی ضرورت ہے جو اسے دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ہم تو ان آیات کو بھی اس "ثواب" کی خاطر پڑھ لیتے ہیں جو آخرت میں جا کر ملے گا۔

صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین نے مخالفین کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا اور پھر اس کے عملی نتائج سے، جو چند سالوں کے عرصہ میں محسوس شکل میں دنیا کے سامنے آ گئے تھے، اُس کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ مخالفین میں اس چیلنج کے قبول کرنے کی جرأت نہ پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی، اسے قرآن اگلی آیات میں بتاتا ہے۔ ان آیات کو یکجا درج کر دیا جاتا ہے۔

۶/۱۴۱-۱۳۷ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ○

اور لوگ بھلا تمہارے مقابلے میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں، جن کی جہالت کا ابھی تک یہ عالم ہے کہ انہوں

نے عجیب و غریب قسم کے عقائد و رسومات وضع کر رکھے ہیں جو یکسر توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ (مثلاً) یہ لوگ اس فصل میں سے، اور ان مویشیوں میں سے، جو خود خدا کے پیدا کردہ ہیں، ایک حصہ الگ کر لیتے ہیں اور، بزعم خویش، کہتے ہیں کہ یہ حصہ خدا کا ہے۔ اسی طرح ایک اور حصہ الگ کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے (خدا کے) شریکوں کا ہے۔ جو حصہ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے مختص کرتے ہیں اسے ان کے

توہم پرستیاں

پیر پروہت لے جاتے ہیں۔ اس میں سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نہیں پہنچتا۔ (یعنی خدا کے مستحق بندوں کو کچھ نہیں ملتا)۔ اور جو اللہ کے لئے نکالتے ہیں، وہ بھی ان کے پیر پروہت یہ کہہ کر لے جاتے ہیں کہ ہم اسے اللہ تک پہنچا دیں گے۔ اس طرح نام تو اللہ کا لیتے ہیں اور لے جاتے ہیں ان کے وہ پروہت جو معبودان باطل کے نمائندے بنتے ہیں۔

پیر اور پروہت

ذرا سوچئے کہ ان کے یہ عقائد کس قدر بُرے ہیں؟ (۶/۱۳۶) یہیں تک بس نہیں۔ ان کی توہم پرستی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ جنہیں یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، ان کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم ان کے حضور اپنی اولاد قربان کریں تو یہ بڑی نیکی کا کام ہے۔ (یہ سب ان کے مذہبی پیشواؤں کی کارستانیاں ہیں جو اس قسم کی توہم پرستیوں کو دین خداوندی کا نقاب

قتل اولاد

اوڑھا کر پیش کرتے ہیں، اور سادہ لوح عقیدتمندوں کے ہاتھوں) ان کی اولاد جیسی عزیز شے کو ہلاک کرا دیتے ہیں۔

(ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کی باتوں کو دیکھ کر تمہارا جی بہت کڑھتا ہے اور تم چاہتے ہو کہ یہ اس قسم کے عقائد کو چھوڑ کر دین حقہ اختیار کر لیں۔ لیکن، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ کچھ افہام و تفہیم کے ذریعے کرنا ہوگا۔ ورنہ اگر انسان کو مجبوراً سیدھے راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو) ان کی کیا مجال تھی کہ اس قسم کی حرکات کرتے (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے تم ان تک ہمارا پیغام پہنچاتے رہو اور اس کے بعد) انہیں، مع ان کے خود تراشیدہ عقائد و مسالک کے ان کے حال پر چھوڑ دو۔ (۶/۱۳۸)

(ان کی جہالت آمیز رسموں کا کیا پوچھتے ہو!) یہ، اپنے مویشیوں اور کھیتیوں سے کچھ حصہ الگ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے کوئی نہیں کھا سکتا۔ بجز ان کے جنہیں ہم، اپنے عقیدے کے مطابق، کھلانا چاہیں۔ اس طرح، یہ بعض جانوروں کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ (یہ فلاں پیر کا اونٹ ہے) اس پر کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بعض جانور ہیں جنہیں ذبح کرتے وقت، یہ اللہ کا نام نہیں لیتے (ان کا نام لیتے ہیں جن کے لئے انہیں بطور نذر و نیاز ذبح کیا جاتا ہے)۔

اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کے اس قسم کے خود تراشیدہ عقائد و رسومات کے

نتائج ان کے سامنے آجائیں گے۔ اب جہالت اور توہم پرستی کا دور جانے والا ہے۔ (۶/۱۳۹)
اسی طرح ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ فلاں جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے صرف مرد کھا سکیں گے عورتوں پر اس کا گوشت حرام ہوگا۔ لیکن اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو تو اس میں مرد اور عورتیں سب شریک ہو سکتے ہیں۔
اب عنقریب انہیں، ان کی ان توہم پرستیوں کی سزا ملے گی (اور خدا کا وہ دین عام ہو جائے گا جو) یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔ (۶/۱۴۰)
ذرا سوچئے کہ جو لوگ، ایسے باطل عقائد کی بنا پر، محض جہالت اور حماقت سے اپنی اولاد جیسی متاع عزیز کو اپنے ہاتھوں ہلاک کر دیتے ہیں، اور جو کچھ اللہ نے کھانے پینے کو دیا ہے اسے، محض اپنی افترا پردازیوں سے، اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں، اور پھر ان توہمات کو منسوب کرتے ہیں خدا کی طرف۔ تو ایسے لوگ اپنا کس قدر نقصان کرتے ہیں؟
جو لوگ اس طرح جہالت اور توہم پرستیوں کے غلط راستوں پر آنکھیں بند کئے چلتے ہیں، ان پر زندگی کی صحیح راہیں کس طرح کھل سکتی ہیں؟ (ہم نے پہلے کہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے (۶/۱۳۷) اب اس کی وجوہات تمہارے سامنے آگئیں۔ کامیابی کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے دل میں، قوانین خداوندی کے سوا، کسی کا خوف نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ انسان عقل و فکر سے کام لے۔ جو لوگ پتھر کی مورتیوں، جانوروں اور مویشیوں، اور اپنے جیسے انسانوں —— پیروں اور پروہتوں —— سے اس درجہ خائف ہوں کہ انہیں خدا بنا لیں، اور جہالت کا وہ عالم ہو جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، وہ قوم، اس قوم کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے جس کا دل، خوف سے خالی اور جس کا دماغ عقل و بصیرت سے منور ہو۔ اسلام، قوموں میں اسی قسم کا انقلاب پیدا کرتا ہے۔)
ان آیات میں عوام کی جہالت کا ذکر تو ہے ہی لیکن آیت (۶/۱۳۷) میں بتایا گیا ہے کہ یہ درحقیقت مذہبی پیشواؤں کی کارستانیاں ہیں جو اپنے (تھوڑے سے) مفاد کی خاطر لوگوں کی جہالت کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے رہتے ہیں۔ ان آیات کا تعلق زمانہ نزول قرآن کے جہلا، اور ان کے فریب کار مذہبی پیشواؤں سے ہی نہیں۔ ان کا تعلق خود ہم سے بھی ہے۔ ہمارے ہاں مُردوں سے متعلق مذہبی رسومات دیکھئے۔ اسقاط۔ قُل۔ جمعراتیں۔ چالیسویں۔ ان میں کھانے پینے کی چیزیں پھل۔ کپڑے سب مولوی صاحبان لے جاتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ان کا ثواب مرحوم کو پہنچے گا۔ یہ تو انفرادی "ایصال ثواب"

مذہبی پیشوائیت

ہماری توہم پرستیاں

کی تقریبات ہیں ۔ اجتماعی طور پر بزرگوں کے مزاروں پر نذر، نیاز۔ ان کے عرس اور آئے دن کی تقریبات پر کروڑوں روپے، انہی پیشواؤں اور متولیوں کے جیب میں چلے جاتے ہیں ۔ اور عوام مطمئن ہوتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کے نام پر ہوتا ہے اور (مرحوم) "حضرت صاحب" تک پہنچ جاتا ہے جس کے بدلے میں وہ ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں ۔ جو کچھ زمانۂ جاہلیتِ عرب میں ہوتا تھا اور جس کے خلاف قرآن نے یہ کچھ کہا تھا، وہ سب ہم مسلمانوں کے ہاں ہوتا ہے اور اسے عین اسلام (بلکہ مغز اسلام) کہا جاتا ہے۔

علاوہ اس کے کہ ان توہم پرستانہ رسومات پر اس قدر مال و دولت کا ضیاع ہوتا ہے، اس شرک سے سینے جس قدر خوف سے معمور ہوتے ہیں، اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے ۔ (اس کی تفصیل کے لئے شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے)۔

آپ کسی وعظ کی مجلس میں جائیے ۔ مولوی صاحب جھوم جھوم کر ان آیات کی تلاوت فرما رہے ہونگے اور ان توہم پرستیوں کی مذمت کر رہے ہونگے ۔ وہ انہیں زمانہ قبل از اسلام کی جاہلیت سے متعلق تو بتائیں گے، اپنے مخاطب (مسلمانوں) سے کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ یہ خود تمہارا ہی بیان ہے اور اس لئے نہیں کہیں گے کہ یہ خود ان کا معاشی مسئلہ ہے ——— جب مذہب کو ذریعہ معاش بنا لیا جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، اور ذریعہ رزق کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ عوام کو توہمات کی تاریکیوں میں مستحکم رکھا جائے ۔ اس قسم کی قومیں کبھی ان قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو علم و عقل سے کام لے کر حالات کا مقابلہ کریں ۔ ہم (مسلمان) جو صدیوں سے پست و زبوں حالی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں اس کی وجہ اسی قسم کی توہم پرستانہ مذہبیت ہے ۔ جو شخص ان کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرے، اسے مادہ پرست ۔ مغرب زدہ ۔ ملحد ۔ بے دین قرار دے کر نکّو بنا دیا جاتا ہے۔

ان دیوی دیوتاؤں اور پیروں فقیروں کے مقابلہ میں، اللہ تعالیٰ ہے جس نے تمام سامان رزق پیدا کیا ہے۔

۶/۱۴۲ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ښ

وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۙ

(یہ ہیں ان کے دیوی دیوتا اور پیر پروہت - ان کے برعکس) خدا کی ذات وہ ہے جس نے (تمام انسانوں کی پرورش کے لئے) باغات کا سلسلہ پھیلا دیا ہے۔ بعض بڑے بڑے مضبوط درخت جو بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہیں بعض نرم ونازک (انگور کی سی بیلیں) جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں - نیز سر بفلک کھجوروں کے پیڑ - اور مختلف پیداوار والی کھیتیاں - اور زیتون اور انار ——— ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی، اور الگ تھلگ بھی -

جب یہ درخت ثمر بار ہوں تو ان کے پھل شوق سے کھاؤ - اور اس میں سے "اس کا حق" دے دیا کرو -

(یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے عام کردو - (۲ / ۲۱۹)

اور (اپنی ضروریات کے تعین میں بھی) اسراف سے کام نہ لو - خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا -

اس آیت میں حقہ کے معنی "اللہ کا حق" کئے جاتے ہیں اور اس کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فہرستیں مرتب کی جاتی ہیں - قرآن کریم میں کہیں بھی "حقوق اللہ" کے الفاظ نہیں آئے - قرآن کریم میں انسانوں کے باہمی

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بحث

حقوق اور ذمہ داریوں ہی کا ذکر ہے - قرآن کریم کی تعلیم اور پیغام کا مقصد انہی حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین اور ان سے عہدہ برا ہونے کی تلقین کرنا ہے - ان احکام خداوندی کے مطابق عمل پیرا ہونے کا نام "خدا کی اطاعت" ہے، نہ کہ "اس کے حقوق کی ادائیگی - بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قرآن مجید میں جن امور کے متعلق "فی سبیل اللہ" کہا گیا ہے ان کا تعلق انسانوں کی فلاح و بہبود سے ہے - اللہ تو غنی عن العالمین ہے -

حقّہٗ کا مفہوم

اس آیت میں حقّہٗ کا ایک اور مفہوم بھی ہوسکتا ہے - آپ "قرآن کے معاشی نظام" کے موضوع کو دیکھئے - اس میں آپ دیکھیں گے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - وہ اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ اس کا ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ انسانیہ کو رزق بہم پہنچتا رہے - اس انتظام کے تابع کاشتکار زمین کی کاشت کریں گے - ظاہر ہے کہ اس فصل میں سے ان کاشتکاروں کی ضروریات بھی پوری ہوں گی - اور جو اس سے زائد ہوگا، وہ حکومت کے پاس چلا جائے گا تاکہ وہ اسی سے دوسرے

معاشی نظام

ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرے - اس فصل میں سے جس قدر حصہ حکومت کی تحویل میں چلا جائے گا، اسے حقّہٗ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی اس کے واجبات (DUES) -

یوں اس فصل میں سے خود کاشت کار اپنا حق (ضرورت کے مطابق حصہ) لے لیگا اور دیگر ضرورت مند اپنا حصہ جو حکومت کی وساطت سے اُن تک پہنچے گا۔ ان الفاظ کے معانی کچھ بھی لیجئے۔ مقصد یہی ہے کہ اس فصل میں جس طرح کاشتکار کا حق ہے، اسی طرح دیگر ضرورت مندوں کا بھی حق ہے۔ اور اسی اصول پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں "رَزَقَكُمُ اللّٰهُ" کے الفاظ نے بات اور بھی واضح کر دی۔ یعنی جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے، وہ انسانوں کے لئے ذریعہ رزق ہے۔ خدا کو اس میں سے کچھ نہیں چاہیئے۔

۶ / ۱۴۳-۱۴۵ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ۧ

اور دیکھو! اُسی خدا نے تمہارے لئے چارپائے پیدا کر دیئے ہیں ——— کچھ بلند قامت، جو بوجھ لادنے کے کام آتے ہیں۔ اور کچھ پست قامت (زمین سے لگے ہوئے)۔

جو کچھ اس نے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا کیا ہے، اُسے شوق سے کھاؤ۔ لیکن اپنے پست جذبات کے پیچھے نہ لگو (جن کا تقاضا یہ ہے کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لو۔) ایسا کرنا، عالمگیر انسانیت سے کھلی ہوئی دشمنی ہے ——— نہ ہی توہم پرستی میں پڑو۔

ان توہم پرستوں سے پوچھو کہ خدا نے ان مویشیوں میں سے (جو تمہارے ہاں عام طور پر پائے جاتے ہیں) آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں ($\frac{۳۹}{۶}$)۔ بھیڑ۔ نر اور مادہ۔ اور بکری۔ نر اور مادہ (باقی چار کا ذکر آگے آتا ہے)۔

حرام وحلال کی انسانی فہرستیں ان سے پوچھو کہ (تم نے جو حرام اور حلال کی فہرستیں از خود مرتب کر رکھی ہیں، اُن کی کوئی خدائی سند بھی ہے؟) خدا نے کہیں بھی یہ کہا ہے کہ ان (بھیڑ بکریوں) کے نر حرام ہیں (اور مادہ حلال) یا مادہ حرام ہیں (اور نر حلال)۔ یا اُن بچوں کو حرام

قرار دیا ہے۔ جو ان کے پیٹ میں ہوں۔ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو (کہ تمہاری حرام اور حلال کی فہرستیں خدا کی مرتب کردہ ہیں) تو مجھے بتاؤ کہ تمہارے پاس اس کی سند کیا ہے؟ (۶/۱۴۴)

اسی طرح خدا نے نر اور مادہ اونٹ پیدا کئے ہیں اور گائے اور بیل بھی۔ (یہ سب مل کر آٹھ نر اور مادہ ہو گئے یعنی چار نر اور چار مادہ)۔ ان سے پوچھو کہ کیا ان میں سے بھی خدا نے نروں کو حرام کیا ہے یا مادیوں کو۔ یا ان بچوں کو جو ان کے پیٹ میں ہوں۔ (تم جو کہتے ہو کہ تمہاری حرام و حلال کی تقسیم خدائی تقسیم ہے تو بتاؤ کہ) جب خدا نے ایسا حکم دیا تھا تو تم اُس وقت موجود تھے؟ (اے، ان کے مذہبی پیشواؤ! تم سوچو کہ) تم جو، علم و سندِ خداوندی کے بغیر، لوگوں کو اس طرح گمراہ کرتے ہو، اور اپنی خودساختہ فہرستوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہو، تو اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور ایسے اکابر مجرمین، قانونِ خداوندی سے کس طرح ہدایت حاصل کر سکتے ہیں؟

اگلی آیت میں پھر واضح کر دیا کہ حلت و حرمت کے اختیارات سب خدا کو حاصل ہیں۔ کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کرنے بیٹھ جائے۔

۶/۱۴۶ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ان سے کہو کہ (حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے)۔ اُس نے میری طرف جو کچھ وحی کیا ہے، میں اس میں کسی چیز کو، جسے عام طور پر لوگ کھاتے ہیں، حرام نہیں پاتا، بجز (ان چار چیزوں کے۔ یعنی) مردار۔ بہتا ہوا لہو۔ خنزیر کا گوشت۔ حکم خداوندی کے علی الرغم، ان کا کھانا شرفِ انسانیت کی نشو و نما کے روک دینے کا باعث اور غلط راستوں کی طرف لے جانے کا موجب ہے۔ نیز جس (حلال) چیز کو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ (یہ چیزیں حرام ہیں۔ انہیں مت کھاؤ، بجز اس کے کہ) اگر کوئی شخص (حلال چیزوں کے نہ ملنے کی وجہ سے) مجبور ہو جائے اور اس کی نیت قانون شکنی یا ہوس پروری کی نہ ہو۔ اور وہ اپنی اضطراری ضرورت سے آگے نہ بڑھے (تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے ان چیزوں میں سے جو میسر آجائے اسے کھا سکتا ہے)۔ ایسی حالت میں ان چیزوں کے کھانے سے تمہاری ذات پر جو مضر اثرات مرتب ہوں گے، قانون کے احترام کا محکم احساس تمہیں ان اثرات سے محفوظ رکھے گا۔ اور تمہاری صلاحیتوں کی نشو و نما بدستور ہوتی رہے گی۔ (۲/۱۷۳) (۵/۳)

ان امور کی وضاحت "حرام وحلال" کے عنوان میں ہو چکی ہے [انڈکس میں دیکھیئے]

آیت (۶/۱۱۹) میں، یہودیوں کے اس اعتراض کا ذکر کیا گیا تھا (جو وہ کہتے تھے کہ) جو چیزیں ان کی شریعت میں حرام ہیں، قرآن نے انہیں حلال کسطرح قرار دے دیا۔ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ چیزیں ان پر کیوں حرام قرار دی گئی تھیں۔

۶/۱۴۷ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○

یہودیوں پر حرام کردہ اشیاء

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی، بجز اس چربی کے جو ان جانوروں کی پیٹھ یا انتڑیوں کے ساتھ لگی ہو۔ یا جو ہڈیوں کے اندر ملی ہو۔ (تو یہ چیزیں عام حالات میں حرام نہیں تھیں۔ بات یہ تھی کہ) انہیں ان کی قانون شکنی کی سزا دی گئی تھی، اور بطور سزا ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا تھا (۴/۱۶۰)۔ یہ ہے اصل واقعہ (لہٰذا ان کا یہ اعتراض کہ جن چیزوں کو خدا نے پہلے حرام قرار دے دیا تھا، اب انہیں کیسے حلال قرار دیا جا رہا ہے، بے بنیاد ہے)۔

اس ضمن میں آیت (۴/۱۶۰) دیکھئے۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہودیوں پر جو زائد چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں، تو ایسا ان کے

ہمارے فقہا کی فہرستیں

جرائم کی سزا کے طور پر کیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں پر چند ایک چیزیں حرام قرار دی تھیں، لیکن ہمارے فقہا نے ان کے علاوہ بھی حرام اشیاء کی لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کر دیں جو تمام اُمت پر، قیامت تک، حرام قرار دے دی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں پر تو ایسا، اُن کے جرائم کی سزا کے طور پر کیا گیا تھا، اُمتِ محمدیہ پر ایسا اُن کے کن جرائم کی بنا پر کیا گیا ہے؟

اس کے بعد کہا کہ قرآن کریم میں ان چیزوں کو حلال قرار دینے کا (جنہیں یہودیوں پر حرام قرار دیا گیا تھا) ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کی سزا کی مدت ختم کر دی جائے۔ یعنی یہ اگر قرآن پر ایمان لے آئیں تو وہ چیزیں ان پر حلال ہو جائیں لیکن یہ ہیں کہ خدا کی اس رعایت اور رحمت سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے جیل خانہ کا دروازہ، ان کے لئے کھول

دیا گیا ہے، لیکن یہ باہر آنا ہی نہیں چاہتے۔ سو جو شخص اپنے اوپر اس طرح سزا وار کرے، یا سزا کو برقرار رکھنا چاہئے
اسے اس عذاب سے کون چھڑا سکتا ہے؟

۶/۱۴۸ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝

لیکن اگر اس تبیانِ حقیقت کے بعد بھی یہ لوگ نہ مانیں، اور تمہیں جھٹلاتے چلے جائیں۔ (اور کہیں کہ نہیں! یہ تمام چیزیں حرام ہیں) تو ان سے کہدو کہ خدا تو اپنی ربوبیت اور رحمت کے دامن کو وسیع رکھنا چاہتا ہے۔ (لیکن، اگر تم اس کے باوجود، اسے سکیڑنا چاہتے ہو، اور اپنے ہاں کی حرام چیزوں کو اب بھی حلال نہیں تصور کرنا چاہتے اور اس طرح اپنی سزا کی مدت کو ختم کرنے پر رضامند نہیں ہوتے، تو تمہاری مرضی)۔ جو خود مجرم بنے رہنا چاہے، اس سے سزا کیسے ٹل سکتی ہے؟ (جو اپنا دروازہ بند رکھنا چاہے، اس کے کمرے میں روشنی کیسے آ سکتی ہے؟)

اور اپنی اس ضد اور حماقت کی تائید میں وہی کہنہ دلیل!

۶/۱۴۹ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا
حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا
بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ
إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝

عقیدۂ تقدیر کی تردید

یہ لوگ جب چاروں طرف سے لاجواب ہو جاتے ہیں اور اپنے مسلک کے جواز میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کر سکتے، تو پھر یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ (دنیا میں خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا)۔ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم یا ہمارے آباؤ اجداد کبھی شرک نہ کرتے۔ نہ ہی کسی شے کو حرام قرار دیتے (اس لئے اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ یہ سب مرضیٔ مولا ہے)۔

یہ بات بھی کچھ نئی نہیں۔ ان سے پہلے لوگ بھی اس قسم کی کٹ حجتیوں سے حقیقت کو جھٹلاتے رہے، تاآنکہ انہوں نے، اپنی غلط روش کے نتیجہ میں ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل ہے (کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔ یہ مجبورِ محض ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے)۔ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ (۳۶/۴۷؛ ۴۳/۲۰؛ ۶/۱۰۸) حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل نہیں۔ تم محض ظن و قیاس کے پیچھے چلتے اور اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہو۔

اس کی تفصیل کے لئے عنوان تقدیر دیکھئے۔ اس کے برعکس دلیل۔

۶/۱۵۰ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

ان سے کہو کہ محکم اور حقیقت رس دلیل صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے وحیٔ الٰہی کی دلیل۔ (اگر تمہارے

حجۃ البالغہ

پاس وہ دلیل ہے تو اسے پیش کرو۔ باقی رہا مشیّت کا مسئلہ۔ تو) اگر خدا چاہتا تو وہ تمہیں بھی کائناتی قانون کے تابع رکھتا (اور اختیار و ارادہ نہ دیتا)۔ اس صورت میں تم بھی (جبرًا اور قہرًا) سب کے سب اُس کے قانون کے مطابق چلتے۔ (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا)۔

اس سے واضح ہے کہ دین میں قابلِ قبول سند، شہادت، دلیل صرف اللہ (یعنی کتاب اللہ) کی ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا:-

۶/۱۵۱ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ ذرا اُن لوگوں کو سامنے تو لاؤ جو اس کی گواہی دیں کہ ان چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا تھا۔ (اگر یہ اپنے احبار و رھبان کو لائیں، تو اُن سے اس باب میں خدا کی سند مانگو۔ اگر وہ اس پر بھی اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو تم ان سے کہدو کہ) ہم تمہارے ساتھ، اس غلط مسلک کے صحیح ہونے کی شہادت نہیں دے سکتے۔

جو لوگ دینِ خداوندی کی تکذیب کریں، مستقبل کی زندگی (اور خدا کے قانونِ مکافات) پر یقین نہ رکھیں (کیونکہ اگر انہیں اس قانون پر یقین ہو تو وہ یہ کچھ کریں ہی کیوں؟) اور اپنی خود ساختہ شریعت کو وحیٔ خداوندی کا درجہ دے دیں۔ تم اُن کے مسلک کی پیروی مت کرو۔

جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے، قابلِ تسلیم شہادت، کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں۔ ان کے پاس سند یا شہادت اُن کے فقہا (احبار و رھبان) کے احکام یا فیصلے تھے۔

سند صرف خدا کی کتاب ہے

قرآن کے نزدیک یہ شہادات قابلِ قبول نہیں تھیں۔ اصول یہ ہے کہ کوئی قول یا فیصلہ، جو کتاب اللہ کے خلاف جائے، وہ دین میں سند اور حجت نہیں ہو سکتا خواہ وہ کسی کا ہو (یا اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کی گئی ہو)۔ یہودیوں کی مشکل

یہ تھی کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں۔ اس لئے انہیں اپنے فقہاء کے فیصلوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ لیکن ہم دین میں سند اور حجت اس کتاب کو نہیں بلکہ انسانوں کی شہادات (فقہ۔ تاریخ۔ روایات) کو قرار دیتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی بات قرآن سے ٹکرائے تو عقیدہ یہ ہے کہ سند انسانوں کے قول کو سمجھا جائے۔ اور قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دیا جائے۔

اس کے بعد قرآن کریم نے اپنے چند ایک بنیادی احکام کو مرتکز کر کے یک جا بیان کر دیا ہے۔ فرمایا:-

۶/۱۵۲ قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْ
زُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

(یہ تو رہا کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق۔ اس کے بعد) ان سے کہو کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے نشوونما دینے والے نے تم پر کن باتوں کو واجب قرار دیا ہے۔ یہ کہ

۱۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ (یعنی اس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو واجب الاتباع نہ سمجھو۔ اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کرو۔)

۲۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ (وہ بڑھاپے کی وجہ سے تمہاری نگرانی اور مدد کے محتاج ہیں۔ ان کی مدد کرو۔ اس طرح جو کمی ان میں آگئی ہے اسے پورا کر دو)

۳۔ اپنی اولاد کو، اس خدشہ سے کہ ان پر خرچ کر کے تم غریب ہو جاؤ گے، صحیح تعلیم و تربیت اور نشوونما سے محروم نہ رکھو[1]۔ ہمارا نظام اس بات کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ تمہارے لئے اور تمہاری اولاد

---

[1] قتل کے بنیادی معنی مار ڈالنا اور ذلیل وخوار کرنا، دونوں ہیں۔ یہاں پر (نیز ۱۷/۳۱ میں) کہا یہ گیا ہے، کہ تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے "قتل نہ کرو"۔ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، جاہلیہ عرب میں، ایک آدھ قبیلہ کے سوا، مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کا رواج کہیں نہیں ملتا۔ البتہ شرم کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی شہادت ملتی ہے، اور

کے لئے سامانِ زیست مہیا کرے گا۔ (۱۷/۳۱)؛ (۱۱/۶)۔

۴۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو ـــــــ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ۔

۵۔ کسی جان کو، جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، ناحق قتل مت کرو۔ (ناحق قتلِ نفس بڑا سنگین جرم ہے)۔ (۴/۹۳)؛ (۵/۳۲)۔ یہ ہیں وہ اہم امور جن کا تمہیں خدا نے حکم دیا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے کر ان پر کاربند ہو۔

"حَرَّمَ عَلَيْكُمْ" کے معنی حرام قرار دینا ہی نہیں۔ اس کے معنی واجب، لازم قرار دینا بھی ہیں۔ ان احکام میں بعض کے متعلق کہا جائے گا کہ خدا نے ایسا کرنا حرام قرار دیا ہے۔ اور بعض کے متعلق یہ کہ اس لئے ایسا کرنا واجب قرار دیا ہے مثلاً والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک واجب ہے اور فواحش کا ارتکاب حرام ہے۔ یہ احکام حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ شرک اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے متعلق انڈکس دیکھئے (نیز ۱۷/۲۳-۲۴؛ ۱۶/۱۶؛ ۲۹/۸؛ ۳۱/۱۴-۱۵؛ ۴۶/۱۵)

۲۔ قتلِ اولاد (مفلسی کے خوف سے)۔ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، جاہلیہ میں (ایک آدھ قبیلہ کے سوا) مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کا رواج کہیں نہیں ملتا۔ شرم کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی شہادت ملتی ہے۔ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (۱۶/۵۸-۵۹؛ ۸۱/۸-۹) اس اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت میں مفلسی کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینے کا ذکر نہیں۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۱۷۳) میں لکھا جا چکا ہے، عربی زبان میں قتل کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ کسی کو کمزور اور پست کر دینے، یا ذلیل و خوار کر دینے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں مفلسی کے ڈر سے قتلِ اولاد سے مفہوم انہیں تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا، یا مناسب

(صفحہ نمبر ۱۳۸ کا بقیہ فٹ نوٹ) قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (مثلاً ۱۶/۵۸-۵۹؛ ۸۱/۸-۹)۔ اس اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر، افلاس کے ڈر سے، اولاد کو مار ڈالنے کا ذکر نہیں۔ انہیں صحیح تعلیم و تربیت نہ دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے ہم نے اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے، یہ حکم کسی خاص قوم یا زمانہ سے مختص نہیں رہتا۔ اس کا اطلاق عمومی ہو جاتا ہے۔ جہاں تک کسی کو مار ڈالنے کا تعلق ہے، اس کی بابت اسی مقام پر الگ کہا گیا ہے۔ اولاد کا مار ڈالنا اسی میں آ جائے گا۔

نشوونما نہ کرنا ہے۔ ویسے بھی قتل (بمعنی مار ڈالنے) کے متعلق بھی اسی آیت میں آیا ہے ـــــ قتلِ نفس بغیر الحق، میں قتلِ اولاد بھی آجاتا ہے۔

۳۔ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَإِيَّاهُمۡ ـــــ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری

رزق کی ذمہ داری

اولاد کے رزق کے بھی۔ خدا کی یہ ذمہ داری کس طرح پوری ہوتی ہے، اسے عُنوان "قرآن کا معاشی نظام"۔ مطالب الفرقان۔ جلد اوّل۔ (صفحہ ۵-۱۰۱) میں دیکھئے۔

یہ ذمہ داری اُسی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوگی جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی۔

۴۔ فواحش کے قریب بھی نہ جاؤ۔ فحش کا لفظ بڑا جامع ہے۔ جو عام بے حیائی سے لے کر اُس کے منتہیٰ تک کے لئے بولا جاتا ہے۔ فواحش سے ممانعت کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ان کے قریب تک نہ جاؤ، نفسیاتی اہمیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ پھر ما ظہر و ما بطن نے اسے اور بھی جامع بنا دیا۔ یہ بحث سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ باطن کے متعلق اس نے کہا ہے کہ يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡأَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِي الصُّدُورُ ۔ (۴۰/۱۹)۔ وہ (خدا) نگاہ کی خیانت اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر کام کے ضمن میں (بالعموم) لیکن جنسیات (SEX) کے ضمن میں بالخصوص، اس حدود فراموشی کا آغاز نیت یا ارادے سے ہوتا ہے۔ اس کو قرآن نے نگاہ کی خیانت یا دل کے پوشیدہ خیالات سے تعبیر کیا ہے۔ اگر نیت یا دل میں فتور نہ ہو تو فحش کاری تک کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ اس لئے قرآن کریم، نگاہ کی پاکبازی اور قلب کے تقویٰ پر بڑا زور دیتا ہے۔ انسانی جذبات میں،

جنسی خواہش اور ارادہ

جنسی خواہش سب سے زیادہ پُرزور ہوتی ہے۔ یہ اگر اُبھر آئے تو اس کا روکنا (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اسے نیت یا ارادہ کس طرح آسانی سے روک دیتا ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ ایک نوجوان، بدقماش لڑکا جنسی بے باکی میں اس قدر حدود فراموش ہے کہ راہ چلتی لڑکیاں تک اس کی دست درازی سے مامون نہیں ہوتیں۔ وہی لڑکا رات کو اپنے کمرے میں سوتا ہے۔ اس کمرہ میں اس کی جوان (اور خوبصورت) بہن بھی سو رہی ہوتی ہے۔ کمرہ میں ہی نہیں پورے مکان میں کوئی اور نہیں ہوتا۔ لیکن یہ لڑکا اپنی بہن کی طرف نگہ بد سے دیکھتا تک نہیں! ایسا کیوں ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جو اس کی جنسی بے باکی اور بدنہادی پر اس قدر زبردست کنٹرول رکھے ہوئے ہے؟ صرف دل کا ارادہ یا نیت ہے۔

قرآن کریم اپنی عدیم النظیر تعلیم سے، قلب و نگاہ کی تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے،

ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتے ہیں اس لئے ان کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ایسا کنٹرول کسی اور طریق سے نہیں ہو سکتا۔ وہ "باطن" پر کنٹرول سے "ظواہر" کی حدود بندی کر دیتا ہے۔ اور یہی لَا تَقْرَبُوا سے مراد ہے۔

۵۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ انسانی قتل کے متعلق انڈکس میں دیکھئے۔ نیز سابقہ صفحات میں آیت (۵/۳۲) کے تحت۔ یہاں جو کہا نَفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ۔ تو اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ "انسانی جان جس کا ناحق قتل کرنا خدا نے حرام قرار دیا ہے" اور دوسرے معانی یہ کہ ہم نے ہر انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے، اس لئے اسے ناحق قتل مت کرو۔

عورت کی دیت مرد سے نصف

(ضمناً) قرآن کریم نے ہر انسانی جان کو یکساں واجب الاحترام قرار دیا ہے (۱۷/۷۰)۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں۔ لیکن ہماری فقہ میں ہے کہ جرمِ قتل میں جو خون بہا دلایا جائے، تو مقتولہ عورت کا خون بہا، مقتولہ مرد کے خون بہا سے آدھا ہوگا! العظمۃ اللہ! یعنی ان حضرات کے نزدیک، عورت کی جان کی قیمت مرد کی جان کی قیمت سے آدھی ہے۔

اس کے باوجود ہم ساری دنیا سے چلّا چلّا کر کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام مساوات و ہمدوشی عطا کیا ہے جس کی مثال کسی مذہب اور تہذیب میں نہیں ملتی! یہ ہے اس مساوات کی شہادت!

قتل بالحق اور قتل بغیر الحق کے متعلق بھی انڈکس میں دیکھئے۔ انہی احکام کے تسلسل میں فرمایا:

۶/۱۵۲ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۙ

اس کا یہ بھی حکم ہے کہ

دیگر اہم احکام

۶۔ یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، اِلَّا یہ کہ خود ان کے فائدے، اور نگہداشت کے لئے عمدہ طریق سے کچھ خرچ کرنا پڑے۔ یہ بھی اس وقت تک کہ وہ جوانی کی عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ (۴/۶ ؛ ۱۷/۳۴)۔

۷۔ ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ (یعنی معاشی معاملات میں ہمیشہ حق اور انصاف کو

پیشِ نظر رکھو۔ (۱۷/۳۵ ؛ ۸۳/۱-۳) ۔ یاد رکھو ان احکام سے یہ نہ سمجھو کہ تم پر خواہ مخواہ پابندیاں عائد کی جارہی ہیں۔ بات یہ نہیں۔ ہمارے احکام اور قوانین کا مقصد تو یہ ہے کہ انسانی ذات میں وسعتیں پیدا ہوں ——— صحیح قوانین کی پابندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے (۲/۲۸۶ ؛ ۷/۴۲ ؛ ۲۳/۶۲) ۔

۸ ۔ اور تم جب بھی کوئی بات کہو، عدل کو سامنے رکھو، خواہ اس کی زد تمہارے قریبی رشتہ دار پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ (۴/۱۳۵) ۔

۹ ۔ اپنے اس عہد و پیمان کو پورا کرو جو تم نے، مومن ہونے کی جہت سے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رکھا ہے (۹/۱۱۱) ۔

یہ ہیں وہ احکام جنہیں خدا اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم انہیں، زندگی کے ہر گوشے میں سامنے رکھو۔

۱ ۔ یتامیٰ کے متعلق بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس) ۔

۲ ۔ کیال اور میزان کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا رکھنے کے متعلق "معاشی نظام" میں بحث آ چکی ہے۔ ان الفاظ کا مطلب صرف ناپ اور تول کے پیمانوں اور اوزان کا ٹھیک رکھنا ہی نہیں۔ اس سے مراد معاشی نظام کو عدل کے تقاضوں کے مطابق قائم کرنا ہے۔

۳ ۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ کا مفہوم، مطالب الفرقان ۔ جلد سوم (ص ۴۹۱) میں گزر چکا ہے۔

۴ ۔ عدل کے متعلق انڈکس میں دیکھئے ۔ نیز چوتھی جلد میں آیت (۴/۱۳۵) کے تحت۔

۵ ۔ عهد الله سے عمومی مراد تو خدا کے ہر حکم کی تعمیل ہے۔ انسان جب خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لاکر جماعتِ مومنین میں شریک ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا سے عہد کرتا ہے کہ وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ جامع شکل میں یہ عہد آیت (۹/۱۱۱) میں آیا ہے۔

اور یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر حضور نبی اکرمؐ خود گامزن تھے اور جس کے اتباع کا حکم مومنین کو دیا گیا۔

۶/۱۵۴ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ) یہ ہے تمہارے خدا کی مقرر کردہ، متوازن بدوش راہ، جو تمہیں سیدھی منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں۔ تم بھی اسی پر چلو۔ اسے چھوڑ کر اور راستوں کو اختیار نہ کرو۔ وہ تمہیں خدا کی راہ سے الگ کر دیں گے۔ اُس نے تمہیں اس کا اس لئے حکم دیا ہے کہ تم زندگی کے تمام خطرات سے محفوظ رہ کر، امن و سلامتی سے اپنے نصب العین تک جا پہنچو۔

صراطِ مستقیم ہمارے ہاں "اطاعتِ رسول"، "اتباعِ سنتِ رسولؐ" وغیرہ مسائل پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا کسی نقطۂ آخرین تک پہنچنا تو کجا، ابھی تک خود "سنت" کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا، نہ ہی یہ طے پایا ہے کہ حضورؐ کی یہ "سنت" جامع طور پر کس کتاب میں ملے گی۔ (یہ بحث" ادارہ طلوعِ اسلام" کی طرف سے شائع کردہ کتاب" مقامِ حدیث" میں ملے گی)۔

سنت رسول اللہؐ لیکن قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس بحث کو سمٹا دیا، جب مختلف احکامات دینے کے بعد، حضورؐ کی زبان مبارک سے کہلوا دیا کہ) اِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ۔ "یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر میں گامزن ہوں۔ تم سب اسی کا اتباع کرو"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنی احکام کا اتباع ہی اتباعِ سنت رسولؐ اللہ ہے۔ اسے کسی اور جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ جس کا نتیجہ تقویٰ ہے۔

سنت رسولؐ اللہ کی تفصیلی بحث چوتھی جلد میں زیر آیت (۳/۹۳) کی جا چکی ہے۔

پہلے بات یہودیوں سے ہو رہی تھی۔ ان قرآنی احکام کے بعد ان سے کہا:

۶/۱۵۵ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۟

(اُن سے یہ بھی کہہ دو) ہم نے، اس سے پیشتر، موسیٰؑ کو بھی، اسی قسم کا ضابطۂ قوانین دیا تھا تاکہ، اس کے ذریعے، اُس قوم پر اتمامِ نعمت کر دیا جائے جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے۔ اُس میں تمام ضروری احکام کو الگ الگ کر کے، نکھار کر، بیان کر دیا گیا تھا۔ اس میں صحیح راہ نمائی اور انسانی ذات کی نشوونما کا سامان تھا۔ یہ سب اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ قوم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھے۔

جن احکام کا قرآنِ مجید میں اعادہ کیا گیا ہے، اسی قسم کے احکام کتاب موسیٰؑ میں بنی اسرائیل کو دیئے تھے۔

کتاب موسیٰؑ

لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر دی۔ یہ جو نہیں قرآنی احکام اور اپنے احکامِ شریعت میں تفاوت اور اختلاف نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتاب میں تحریف ہو چکی ہے (جس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے۔ اس کی تفصیل، میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملیگی) اس کے بعد اس کتاب کو اسلئے نازل کیا گیا ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھی۔ نیز اس لئے کہ اسے دین کا آخری ضابطہ قرار دینے کے لئے اس میں احکام کی تکمیل کر دینا مقصود تھا۔

۶ / ۱۵۶ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

اب اس کے بعد، یہ مبارک کتاب (قرآن کریم) دی گئی ہے۔ بس، اب تم سب اس کا اتباع کرو اور تخریبی راستوں سے بچتے رہو، تاکہ تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف راہ نمائی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ عرب میں حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سکونت پذیر تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد اس قوم کی طرف کوئی رسولؑ نہیں آیا تھا (۳۶/۶)۔ اس اعتبار سے بھی ان کی طرف کتاب کا بھیجنا ضروری تھا۔

۶ / ۱۵۷-۵۸ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝

یہ کتاب اس لئے بھی تمہاری طرف نازل کی گئی ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے، یہود و نصاریٰ کی طرف جو کتاب

اہلِ عرب کی طرف کتاب

بھیجی گئی تھی ہم اس کے پڑھنے پڑھانے سے ناواقف تھے۔ یا تم یہ کہو کہ اگر ہماری طرف بھی ضابطۂ قوانین بھیجا جاتا تو ہم ان سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ بن کر دکھاتے۔

لہٰذا۔ تمہاری طرف (بھی) تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے وہ کتاب آگئی جس میں واضح دلائل ہیں۔ اس میں (سفرِ زندگی کے لئے) صحیح راہ نمائی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما کا پورا پورا سامان۔

اب بتاؤ کہ اس سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا جو احکامِ خداوندی کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ لیکن جو لوگ ان سے منہ موڑتے ہیں وہ کسی اور کا نقصان نہیں کرتے۔ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ان کیلئے بدترین قسم کی تباہی ہوگا۔

یہاں قرآنِ کریم نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہمارے لئے موجبِ صد عبرت ہے۔ پہلے کہا کہ قرآن کے اوّلین مخاطب (اہلِ عرب) کی طرف قرآن مجید اتمامِ حجت کے لئے بھیجا گیا۔ یعنی اس لئے کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہماری طرف خدا کی راہ نمائی آئی ہی نہیں۔ اگر وہ راہ نمائی آتی تو ہم بتاتے کہ اس کے مطابق کیسے زندگی بسر کی جاتی ہے!

وہ کتاب آگئی لیکن انھوں نے اس سے اعراض برتا اور اسطرح دینؑ کی تکذیب کی۔ ایک چیز ہوتی ہے کفر یعنی کسی صداقت کا ماننا ہی نہیں۔ اس کے صادق ہونے سے انکار کر دینا۔ اور دوسری چیز ہوتی ہے تکذیب۔ یعنی زبان سے اسکا اقرار کر لینا لیکن اس کے بعد اپنے اعمال سے اس کے دعاوی کو جھوٹا ثابت کرنا (دیکھئے انڈکس)۔ اس سے وہ قوم شدید عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

خدا کی وہ کتاب ہمارے پاس محفوظ شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ اگر ہمیں بھی آسمانی راہ نمائی مل جاتی تو ہم راہ ہدایت پر چل کر دکھاتے۔

ہماری حالت

ہم نے کتاب سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے خلاف زندگی بسر کرنے سے، دنیا کی نگاہوں میں اس کے دعاوی کو جھوٹا ثابت کر دکھایا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کتاب کے ماننے والے (مومن) تمام اقوام پر غالب رہیں گے۔ ہم نے دنیا سے کہا کہ ہم اس کتاب کے ماننے والے ہیں، لیکن اس کے بعد ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اقوامِ عالم میں پست ترین درجہ پر ہیں۔ اس سے وہ اقوام کس نتیجہ پر پہنچیں گی؟ اسی نتیجہ پر کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ (کہ اس کے ماننے والے تمام اقوامِ عالم پر غالب رہیں گے) (معاذ اللہ) جھوٹا ہے اس طرح ہماری حالت، قرآنِ کریم کے دعویٰ کی تکذیب کر رہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہے وہ مسلسل عذاب جس میں ہم ماخوذ چلے آ رہے ہیں۔

ان تصریحات اور تنبیہات کے بعد کہا:

٦/١٥٩ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ

تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

(اس قدر وضاحت کے ساتھ سمجھا دینے کے بعد بھی، یہ لوگ جو بات نہیں مانتے تو) شاید انہیں اس کا انتظار ہے کہ ان پر فرشتے نازل ہوں۔ یا خود خدا ان کے پاس چل کر آئے۔ یا اس کی طرف سے کچھ محسوس نشانیاں ان کے سامنے آ کھڑی ہوں (تو یہ ایمان لائیں)

ان سے کہدو کہ جس دن خدا کی "محسوس نشانیاں" سامنے آیا کرتی ہیں، اُس وقت کسی ایسے شخص کا ایمان لانا اُس کے لئے نفع بخش نہیں ہوتا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا۔ یا جس نے اپنے ایمان کے ساتھ عملِ خیر نہیں کیا تھا۔ ان سے کہو کہ تم ان چیزوں کا انتظار کرو، اور میں اس کا انتظار کرتا ہوں (کہ تم پر تباہی کی گھڑی کس وقت آتی ہے؟)۔

ایمان بلا عملِ خیر

"ایمان لانے" کے معنی ہوتے ہیں کسی دعویٰ کو یقینی طور پر سچا تسلیم کر لینا (مثلاً) قرآنِ کریم نے کہا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (۶/۲۱)۔ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ ظالم کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس دعویٰ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دل کے پورے یقین کے ساتھ سمجھ لیا جائے کہ ظلم کی روش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ ہیں ایمان کے معانی۔ اور ایمان سے مقصد یہ ہے کہ اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو ایمان بے مقصد ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اس صداقت کو اس وقت تسلیم کرے جب اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے وقت ہی نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ زبان سے تو اس دعوے کی صداقت کو تسلیم کر لیا جائے لیکن عمل اس کے مطابق نہ کیا جائے دونوں صورتوں میں ایمان بے معنی اور بے مقصد ہو گا۔ ایسے ایمان کو قرآن، ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں "مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل" اس ضمن میں توبہ کا عنوان دیکھئے۔ نیز "مہلت کا قانون" جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس وقت غلط اعمال کے نتائج سامنے آ جائیں اس وقت توبہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ فرعون کو، ایمان کا اعلان کرنے پر یہی جواب ملا تھا۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صـ۲۴۹)۔

دین کا مقصود و منتہیٰ، نوعِ انسان کے اختلافات اور تفرقات کو مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دینا ہے۔ اس کے لئے اس نے، آغاز کار کے لئے، ایک اُمت متشکل کی جس میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ

نہ تھا۔ اس امت کو متنبہ کر دیا کہ یاد رکھو! امت کی وحدت کو توڑ کر اس میں فرقے پیدا کر دینا، شرک ہے (۳۰/۳۱)۔

پھر نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ:

۶/۱۶۰ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

دین، ایک راستے پر چلنے کا نام ہے۔ مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں۔ اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ قانونِ خداوندی کے سپرد کرو۔ وہی بتائے گا کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟ (۳/۱۰۴، ۳۰/۳۱)۔

غور کیجئے کہ فرقہ بندی کے متعلق قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر یہ اُمت فرقوں میں بٹ گئی تو اس کا نہ خدا سے کوئی تعلق رہے گا نہ اس کے رسولؐ سے کوئی واسطہ۔ (ان امور کی وضاحت کے لئے انڈکس میں "فرقہ بندی" کا عنوان دیکھئے) قرآنِ کریم میں واضح الفاظ میں یہ تنبیہات موجود ہیں۔ تمام مسلمان بالعموم اور ہمارے مذہبی پیشوا بالخصوص ان آیات کو پڑھتے ہیں، خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں، اور فرقہ بندی کی گرہوں کو مستحکم سے مستحکم تر کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

فرقہ بندی سے رسولؐ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا

سوچئے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلام باقی بھی رہتا ہے؟

میں چالیس سال سے امت کی توجہ قرآنِ کریم کی ان آیات کی طرف مبذول کراتا چلا آرہا ہوں۔ بجائے اس کے کہ ہمارے علماء حضرات ان پر غور کرتے اور سوچتے کہ فرقوں کو مٹانے کی کوئی صورت کی جائے، الٹا مجھ پر کفر کے فتوے صادر کر دیئے! لیکن اس سے فرقہ بندی کا شرک توحید میں تو نہیں بدل گیا! یہ تو خود خدا کا فیصلہ ہے۔ اس نے جو کہا تھا کہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ۝ (۱۲/۱۰۶)۔ یہ لوگ دعوئے ایمان کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں، تو یہ ہمارے ہی متعلق ہے کہ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور فرقوں میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان کے آئین میں فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا کر دی گئی ہے کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں۔ اس کے باوجود، اس مملکت کو اسلامی کہا جاتا ہے اور ان احکام کو بھی اسلامی!

اس کے بعد قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک اصول بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ:

۶/۱۶۱ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا

يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

ان سے کہہ دو کہ جو شخص (دین کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے) حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، اُس کے عمل کے بیج، دس دس گنا پھل لاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی سے برائی سرزد ہو جائے تو اس کی سزا، اس کے برابر ہی ہوگی۔ اور اس پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔

حُسنِ عمل کے نتائج کی فراوانی کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۲۱۶ تا ۲۴۲) میں تشریح آ چکی ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں عدل کا بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ غلط کام کی پاداش اس کام کے مطابق ہوگی۔ زیادہ نہیں۔ کیونکہ اس میں زیادتی ظلم ہو جائے گا۔ اگر اس کا تعلق جرائم سے سمجھا جائے، تو بھی اس کا

جُرم کی سزا جُرم کے مطابق

مفہوم یہ ہوگا کہ جُرم کی سزا، جُرم کی نوعیت اور شدت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس سلسلہ میں انڈکس میں "جرم اور سزا" اور "جزا اور سزا" کے عنوانات دیکھئے (نیز $\frac{16}{126}$ ؛ $\frac{42}{40}$)۔

اگرچہ میں فقہ کی بحثوں میں نہیں الجھا کرتا لیکن اس ضمن میں ایک ایسی بات سامنے آ گئی ہے جس کی بابت میں نے متعدد بار سوچا کہ اس کا ذکر کر دیا جائے یا نہ، لیکن چونکہ ہمارے ہاں فقہی قوانین کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ بھی کیا جا رہا ہے، مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس کی ایک آدھ مثال پیش کر دی جائے تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے فقہی قوانین کس قسم کے ہیں۔ ان کے سامنے سوال یہ ہے کہ جرم کی سزا کس طرح دی جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس کے متعلق قرآن نے خود بتا دیا ہے جب کہا ہے کہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (یعنی "جُرم کی سزا اُس جیسی دی جائے") ($\frac{16}{126}$ ؛ $\frac{42}{40}$)۔ اس سے اصول یہ وضع کیا گیا کہ مجرم نے جس قسم کی ضرب، مضروب کو لگائی ہے اسے اسی قسم کی ضرب لگائی جائے اور اسی آلۂ ضرب سے لگائی جائے۔ اس سے آگے بڑھے تو کہا کہ قاتل نے جس طریق سے مقتول کو قتل کیا تھا اسے اسی طریق اور اسی قسم کے آلۂ قتل سے قتل کیا جائے۔ لیکن یہاں انہیں ایک دشواری پیش آئی۔ اور یہی وہ مقام ہے

فقہ کا شرمناک فیصلہ

جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ میں نے متعدد بار سوچا کہ اس کا ذکر کیا جائے یا نہ۔ (اسے اب، قارئین کے حُسنِ ذوق سے معذرت کے ساتھ، سینے پر پتھر رکھ کر بیان کیا جاتا ہے)۔ ان کے سامنے دشواری یہ آئی کہ اگر کسی کی موت اغلام (SODOMY) سے واقع ہو، تو اصولِ مماثلت کی رو سے قاتل کو کس طرح موت کی سزا دی جائے۔ اس کے متعلق فیصلہ یہ کیا گیا:

وللشافعیہ قول انہ یقتل بذالک فیتخذ عوداً علیٰ تلک الصفت و یطعن بہ فی دبرہ حتی یموت۔

(تفسیر قرطبی جلد پنجم۔ ص ۳۵۸ بحوالہ ماہنامہ محدث لاہور۔
بابت رجب و شعبان ۱۳۹۹ھ ص ۲۶)

عصمتِ قلم اس کا ترجمہ کرنے سے مانع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام لکڑی سے لیا جائے (استغفر اللہ)
یہ ہے ایک مثال اس نہج کی جس کے مطابق ہمارے قوانین فقہ مرتب کئے گئے تھے! قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہے کہ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس سے زیادہ سزا دینا مجرم پر ظلم ہوگا۔

دین کے یہ احکام اور عدل کا اصول بیان کرنے کے بعد کہا:

۶/۱۶۲ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○

ان سے کہہ دو کہ میرے نشوونما دینے والے نے، میری راہ نمائی، زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کیطرف کر دی ہے یعنی ایک ایسے نظامِ زندگی کی طرف جو خود بھی (اپنے زورِ دروں کی بنا پر) قائم ہے اور انسانیت کے قیام کا باعث بھی ہے۔ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جسے ابراہیمؑ نے، ہر طرف سے منہ موڑ کر، اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ اس میں، کسی اور روش اور طریقہ کو شریک نہیں کرتا تھا۔

ملّتِ ابراہیمیؑ

انڈکس میں ان مقامات کو بغور دیکھئے جن میں (حضرت) ابراہیمؑ کا تذکرۂ جلیلہ آیا ہے ان سے واضح ہو جائے گا کہ قرآنِ کریم نے خاص طور پر ملتِ ابراہیمیؑ کے اتباع کا کیوں حکم دیا ہے۔ ملّت کے معنی روش۔ طریقہ یا مسلک ہوتے ہیں۔ یعنی جس طریق (راستہ یا روش) پر چل کر حضرت ابراہیمؑ، امامتِ نوعِ انسان کے مستحق قرار پائے تھے، اس طریق کو بطور نمونہ (اسوہ) سامنے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر، ان کے حنیف ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ حنیف کے معنی ہوتے ہیں، ہر طرف سے منہ موڑ کر، کٹ کر،

حنیف

کسی ایک کا ہو جانا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اور جس کی زندگی ایسی ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۶/۸۰) یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس کے سامنے منزل متعین ہو اور اس تک پہنچنے کا راستہ صاف اور واضح، اسے ادھر اُدھر، دیکھنے یا کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی یہی حنیف ہونے کی خصوصیت ہے۔ اس میں، انسان کی ساری زندگی، اس کے خیالات، میلانات، رجحانات،

جذبات، سب کچھ اس مقصد کے حصول کے لئے وقف ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا (۶/۸۰)
اور اسی کا اعادہ حضور نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں فرمایا کہ :

۶/ ۱۶۲-۱۶۳ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

ان سے کہدو کہ (اس دین کو، اس انداز سے اختیار کرنے کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ) میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے۔ میرا مرنا اور جینا، خدا کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف ہے۔

اسلام اسے کہتے ہیں

میں اس میں کسی اور مقصد، جذبہ، یا خواہش کو شریک نہیں کرتا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور، سب سے پہلے، میں نے خود اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ اپنے آپ کو مسلم کہنا سزاوار ہی اس کو ہے جو یہ کہے کہ :

عشق میں ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

حضورؐ نے یہاں اپنے آپ کو "اول المسلمین" کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے مسلم ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی جماعتِ مسلمین کی تشکیل کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ مذہب میں ہر فرد الگ الگ "خدا پرست" ہوتا ہے۔ دین میں وہ امتِ مسلمہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔

(ضمناً) آیت (۶/۱۶۲) کا مطلب تو مذکورہ مفہوم سے واضح ہے۔ لیکن ایک لفظ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ ہے "نسکی"۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "قربانی" اور پھر اس ترجمہ کی رو سے اُن قربانیوں کے لئے سند

نسک کے معنی

لائی جاتی ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر دی جاتی ہیں۔ انڈکس میں قربانی کا عنوان دیکھئے۔ اس سے قربانی کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ اس ضمن میں لفظ نسک کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۴۷ جہاں یہ آیت بھی درج ہے)۔

اس کے بعد کہا گیا :

۶/ ۱۶۵ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ ؕ وَ لَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ کیا (تم چاہتے ہو) میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور نشو و نما دینے والے کو تلاش کروں؟ حالانکہ وہ کائنات کی ہر شے کا نشو و نما دینے والا ہے۔ انسانی صلاحیتوں کے بارے میں اس کا قانونِ نشو و نما یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار خود ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ اُسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ ($\frac{۲}{۱۴۱}$ ؛ $\frac{۲}{۲۸۶}$)۔ کوئی بوجھ

خُدا کے سوا کوئی ربّ نہیں

اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر ایک کا قدم خود بخود، خدا کے قانونِ مکافات کی طرف اٹھتا ہے ہر ایک کے اعمال کے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اور وہیں سے اُن معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔

آیت ($\frac{۶}{۱۱۵}$) میں "اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا" کہا گیا تھا۔ یعنی کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم کروں؟ یہاں "رَبًّا" کہا گیا ہے ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت اور مطابقت ہے۔ خدا کو حاکم تسلیم کرنے سے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس میں خود انسان ہی کا فائدہ ہے۔ اور وہ یہ کہ احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت

ربّ اور حاکم کا باہمی تعلق

سے انسان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اگر خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی اطاعت کی جائے تو انسانی ذات مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور قانونِ مکافاتِ عمل کی عِلّم اور بنیاد یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ہر عمل کے نتائج کا خود ذمہ دار ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریاں اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ یا کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی اور کے سر نہیں تھوپ سکتا۔

یہ نقشہ اس حکومت کا ہوگا جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی —— کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ نہ ہی ایسا ہوگا کہ جرم کوئی کرے اور اس کی سزا کوئی اور بھگتے۔ ہر شخص اپنے ہر کام کا ذمہ دار آپ ہوگا۔ اور اس کا نتیجہ بھگتے گا۔ منشائے خداوندی یہی ہے کہ اس انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ اس میں حکومت کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہوگی جو ربوبیتِ عامہ کی ذمہ داری لے گا۔

$\frac{۶}{۱۶۶}$ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۠

خدا وہ ہے جس نے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، تمہیں (سابقہ اقوام کا) جانشین بنایا ہے۔ اُسی کے قانون کے مطابق مختلف اقوام کے مختلف مدارج متعیّن ہوتے ہیں تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ جس قوم کو جو کچھ دیا جاتا

اقتدار سے ذمہ داریوں کی پرکھ

ہے، وہ اسے کس مقصد کے لئے کام میں لاتی ہے (۶/۱۶۵)
خدا کا قانونِ مکافات، اقوام کے اعمال کے نتائج ساتھ کے ساتھ مرتب کئے جاتا ہے۔ لیکن جو اقوام اس کے قانون کے مطابق، اپنی صلاحیتوں کو کافی مستحکم کر لیتی ہیں، وہ چھوٹی موٹی لغزشوں کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رہتی ہیں، اور ان کی نشو و نما میں فرق نہیں آتا (جو ایسا نہیں کرتیں، وہ تباہ ہو جاتی ہیں)۔

جب اُمّتِ مسلمہ کو حکومت عطا ہوئی تھی تو ان سے بھی یہی کہا گیا کہ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴) "اقوام سابقہ کے بعد ہم نے تمہیں حکومت اس لئے عطا کی ہے کہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو"۔ سیکولر حکومت اور اسلامی حکومت میں یہی بنیادی فرق ہے۔ سیکولر حکومت میں جسے بھی اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے اوپر کوئی ایسی اتھارٹی نہیں جو اس سے پوچھ سکے کہ تم اپنے اختیارات کا استعمال کس طرح کرتے ہو۔ لیکن اسلامی حکومت میں اس قسم کا اقتدارِ اعلیٰ کسی شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ خدا (کی کتاب) کو حاصل ہوتا ہے۔ اور مملکت کی اعلیٰ ترین اتھارٹی بھی جوابدہ ہوتی ہے کہ اس کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر اس کے فیصلے اس کے مطابق نہیں ہوتے تو اس سے اقتدار چھین لیا جاتا ہے اور یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "استبدال و استخلافِ قومی")۔

سُورۃ الانعام ختم شُد

دوسرا باب

سورۂ اعراف آیات ۱ تا ۵۸

قرآنی حقائق کی نقاب کشائی

۱ ——— اتباع اور اطاعت میں فرق۔

۲ ——— اطاعت زندہ اتھارٹی کی کی جاتی ہے۔

۳ ——— ملوکیت میں نہ اطاعت ہوتی ہے نہ اتباع۔ صرف استبداد ہوتا ہے

۴ ——— اعمال کا وزن

۵ ——— متاع کا مفہوم ——— قرآن کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ۔

۶ ——— تقلید اور تقدیر (عقیدۂ جبر) دونوں خلاف قرآن ہیں۔

۷ ——— زیب و زینت کو کوئی حرام نہیں قرار دے سکتا۔
مذہبی پیشوائیت کا خدا کو چیلنج۔

۸ ——— قوم کی اجل کا مفہوم۔

۹ ——— بہائیوں کی گمرہی۔ قرآن ابد تک کے لئے کتاب زندہ ہے۔

۱۰ ——— جہنم میں قوموں کا مکالمہ۔

۱۱ ——— اہل جنت کے سینہ میں غل نہیں ہوگا۔

۱۲ ——— فرانس کے ڈاکٹر مارس بکائی کی قرآنی تحقیق۔
ذوقِ تحقیق و تجسس کی کارفرمائیاں۔

۱۳ ——— تبویب القرآن کی اہمیت۔

۱۴ ——— اذن کے معنی قانونِ خداوندی۔

دُوسرا باب

آغاز سُورۃُ الاعراف

۷ / ۱-۲ الٓمّٓصٓ ۝ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْہُ لِتُنْذِرَ بِہٖ وَ ذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝

خدائے علیم وحکیم وبصیر کا ارشاد ہے کہ

ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تو، اس کے ذریعے، غلط راستے پر چلنے والوں کو، اُن کی روش کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اور جماعتِ مومنین کو اُن کے فرائضِ زندگی کی یاد دلاتا رہے، اور اس طرح یہ اُن کے لئے شرف وعروج کا باعث بن جائے۔

اس فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے تمہیں قطعاً گھبرانے کی ضرورت نہیں راستے کی مشکلات تو ضرور ہوں گی، لیکن منزل پر پہنچ کر ہر قسم کی آسائشیں اور خوشگواریاں میسر آئیں گی۔ (۲/۲)، (۲۲/۱۸)۔

نازل ہونے کی اہمیت قرآنِ کریم کے لئے لفظ نزول آیا ہے۔ اس میں بھی ایک خاص معنوی حقیقت مضمر ہے۔ وحی کے متعلق سابقہ جلدوں میں لکھا جاچکا ہے کہ اس سے مراد وہ علم ہے جو حضراتِ انبیاءؑ کرام کو خدا کی طرف (یعنی خارج) سے ملتا تھا۔ انسانی علم اس کے اپنے فہم وادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ علم داخلی (SUBJECTIVE) ہوتا ہے۔ یعنی انسان کے اندر سے باہر آتا ہے۔ اس کے برعکس وحی کا علم خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے یعنی یہ انسان کے اندر سے باہر نہیں آتا۔ باہر سے اندر جاتا ہے۔ اُوپر سے نیچے آتا ہے۔ اسے عربی زبان میں نزول (نازل ہونا) کہتے ہیں۔ لہٰذا ایک لفظ (انزل) سے علم وحی کی خصوصیت واضح ہو جاتی ہے۔ بنا بریں "کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ" کے معنی ہوئے "یہ وہ کتاب ہے جو، اے رسولؐ! تجھے بذریعہ وحی

ملی ہے۔"

آیت کا اگلا ٹکڑا ہے فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ ۔ حَرَجٌ کے معنی ہوتے ہیں اضطراب، عدمِ اطمینان، کبیدگیٔ خاطر، احساسِ مشقت۔ آیت کے یہ معنی نہیں کہ رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ تم قرآن کی وجہ سے اپنے دل میں کبیدگی پیدا نہ ہونے دینا ——— سورہ طٰہٰ میں ہے: مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی (۲۰ : ۲) "اے رسولؐ! ہم نے یہ قرآن تیری طرف اس لئے نازل نہیں کیا کہ اس کی وجہ سے زندگی تجھ پر بارِ گراں بن جائے۔" آیت (۷ : ۲) کا مطلب یہ ہے کہ جو انقلابی پروگرام اس کتاب میں دیا گیا ہے، اسے بروئے کار لانے کے لئے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ راستہ بڑا دشوار گزار ہوگا۔ لیکن قرآن تمہارے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دے گا کہ تم ان مشکلات اور تصادمات سے قطعاً نہیں گھبراؤ گے۔ تم میں انہیں بطیبِ خاطر برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جائیگی مشکلات اور مزاحمات کو اس طرح بطیبِ خاطر اور خندہ جبینی سے برداشت کرنے کی صلاحیت کو قرآن نے شرحِ صدر (سینے کی کشاد) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ جاؤ اور فرعون سے ٹکر لو، تو آپ نے دعا کی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۰ : ۲۵)۔ "اے میرے نشوونما دینے والے! میرے سینے میں ایسی کشاد پیدا کر دے کہ میں ان مشکلات کا دل کے پورے اطمینان سے مقابلہ کر سکوں اور کسی مقام پر گھبرا نہ جاؤں۔" اور یہی شرحِ صدر تھی جس سے حضور نبی اکرمؐ کو اس وقت نوازا گیا تھا جب آپ کو ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لئے مامور کیا گیا تھا، اور جس کا تذکرہ اس انقلابی پروگرام کی کامیابی کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ

شرحِ صدر

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (۹۴ : ۱-۴)

اے رسولؐ! ذرا سوچو کہ اس عظیم پروگرام کے آغاز میں، آنے والی مشکلات کس قدر ہمت شکن تھیں، لیکن تمہیں ایسی کشادِ قلب عطا ہوئی کہ جو مہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی، وہ نہایت آسان ہوگئی، اور ذمہ داریوں کے احساس کے جس بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی، وہ کس قدر ہلکا ہوگیا! اور تمہارا نام اور تمہارے پروگرام کی عظمت تا بہ ثریا پہنچ گئی۔

اس کے بعد ایک اصول بیان فرمایا کہ:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ (۹۴/۶-۵)

یاد رکھو! کامیابیاں اور کامرانیاں، مشکلات برداشت کرنے کے بعد ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔ یہ ہمارا اٹل قانون ہے۔

اس پروگرام کے راستے میں جن جانگسل مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تیغ و سنان کے زخم ہی نہیں تھے طنز و طعن کے تیروں کی بوچھاڑ بھی تھی۔

طعن و تشنیع کے نشتر جھوٹے الزامات، کذب و افترا پر مبنی اتہامات، حتیٰ کہ منافقین کی طرف سے سوقیانہ حربے۔ حضور نبی اکرمؐ کے سینے میں بھی ایک انسان کا دل تھا جس کا ان یورشوں سے متاثر ہو جانا بعید نہیں تھا۔ لیکن جگر شگاف طعن و تشنیع سے ملول خاطر ہو جانا اور بات ہے اور ان کی وجہ سے بد دل ہو جانا اور ہمت ہار دینا اور بات۔ قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے سے جو کشادِ قلب (شرحِ صدر) حاصل ہوتی ہے، وہ انسان کو ہمت نہیں ہارنے دیتی۔ ایسے ہی مقامات تھے جن کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ (۱۱/۱۲) (نیز ۱۵/۹۷، ۱۶/۱۲۷)

(اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں سے جو کہا جاتا ہے کہ ان پر تباہی آنے والی ہے، تو یہ بات انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے لیکن) یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تو، ان کی دلجوئی کے لئے، وحی کے ان مقامات کو چھوڑ دے جن میں اس قسم کی تنذیرات آتی ہیں۔

معجزات طلبی یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جب کہتے ہیں کہ اگر تو خدا کا رسولؐ ہے تو تجھ پر خزانے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ یا فرشتے تیرے جلو میں کیوں نہیں چلتے، تو ان کی طعن آمیز باتوں سے تو افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ لیکن تو جب فریضۂ رسالت و انذار کے لئے مامور کیا گیا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ (یہ ذمہ داری بڑی سخت اور یہ فریضہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں) اللہ کا قانون ہر معاملہ کی کارسازی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے (اس لئے تاٰلِ کار، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ۹۴/۱-۳)۔ (۱۱/۱۲)

ان آیات میں تخاطب تو حضور نبی اکرمؐ سے ہے، لیکن ان کا اصولی اطلاق جماعتِ مومنین پر بھی

ہوتا ہے۔ (مثلاً) جسطرح حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تصادمات و مزاحمات میں تمہارے دل میں اضطراب اور پست حوصلگی پیدا نہ ہو، اسی طرح جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲/۷۸) "تمہارے لئے اس دین کا انتخاب اس لئے نہیں کیا گیا کہ تم مصیبتوں میں پھنس جاؤ۔ اس سے تمہیں دنیا اور آخرت کی حفاظت حاصل ہوگی"۔ یہ اس لئے کہا کہ اسلامی انقلاب کے لئے شرحِ صدر لاینفک ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۶/۱۲۶)۔ (نیز ۳۹/۲۲)۔ قرآن کریم کے متعلق جو کہا ہے: شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷)۔ "یہ جملہ نفسیاتی امراض کے لئے شفا کا ضامن ہے"؛ تو اس سے مراد اسی قسم کے امراض ہیں۔

قرآنی تعلیم و تربیت سے کشادِ قلب اور وسعتِ نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ جس سے انسان کے حوصلے بڑھتے اور ہمتیں جوان ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے۔ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۲۳۴؛ جلد سوم صفحہ ۲۶) حضورؐ کی "کبیدگیٔ خاطر" کی ایک اور نوعیت کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ اسے کبیدگیٔ خاطر نہیں، بلکہ دلسوزی اور رقّتِ قلبی سے تعبیر کیا جائے گا۔ جب حضورؐ دیکھتے کہ ان کے مخالفین، اس قدر تنذیرات و تنبیہات کے باوجود تباہی کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، تو ان کے انجام کے تصور سے حضورؐ کو دلی صدمہ ہوتا۔ [دیکھئے آیات (۱۸/۵)؛ (۱۸/۱۶)؛ (۳/۲۶)؛ (۳۵/۸)] غور فرمایئے کہ ایک رسولؐ (اور رسولؑ کے اتباع میں ایک مصلح مشفق) کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے؟ مخالفین گالیاں دیتے اور پتھر مارتے ہیں، اور یہ اُن کی تباہی کے احساس سے خون کے آنسو روتے ہیں!

زیرِ نظر آیت (۷/۲) میں لِتُنْذِرَ بِهٖ آیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی تعلیم دیتے تھے، اور اسی کے ذریعے فریضۂ تنذیر ادا فرماتے تھے۔

قرآن کو ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ کہا گیا ہے (۷/۲)۔ ذکر کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آچکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اس کے بعد فرمایا:

(۳/۷) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)۔

اے جماعتِ مومنین! تم اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اور اس کے سوا کسی کارساز و رفیقِ کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح روشِ زندگی یہی ہے۔ لیکن) بہت تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ (وہ ہدایتِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے فیصلوں کو بھی شامل کرلیتے ہیں۔ یہ شرک ہے)۔ {(۱۲/۱۰۶) ؛ (۱۷/۴۶) ؛ (۳۹/۴۵) ؛ (۴۰/۱۲)}

اتباع اور اطاعت میں فرق

قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کا مقصد ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اس کیلئے اطاعت اور اتباع کے الفاظ آئے ہیں۔ مفہوم تو اتباع کا بھی اطاعت ہی ہے، لیکن ان میں ایک لطیف سا فرق ہے۔ اطاعت اُن احکام کی کی جاتی ہے جو کسی اتھارٹی کی طرف سے صادر ہوں (مطالب الفرقان جلد چہارم کے انڈکس میں "اللہ اور رسولؐ"، "حکومت" اور "اسلامی نظام" کے عنوانات دیکھئے)۔ اِن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ الدّین، قرآنی نظام کا نام ہے جس میں اطاعت اُن احکام کی کی جاتی ہے جو اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں۔ اس لئے اطعنا کے ساتھ سمعنا کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی "ہم نے سُنا اور اطاعت کی"۔ (۵/۷ ؛ ۲/۲۸۵ ؛ ۲۴/۵۱ ؛ ۶۴/۱۶) اس نظام کی اطاعت کو قرآن نے "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کہہ کر پکارا ہے۔ جلد چہارم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہوچکی ہے۔ {دیکھئے بالخصوص (۳/۳۱ ؛ ۴/۵۹ ؛ ۴/۸۰ ؛ ۵/۷ ؛ ۵/۳۳) کی تشریحات}

اتباع کے معانی

اتباع کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ دیکھئے کہ عرب اِس لفظ کو کس مقام پر استعمال کرتے تھے۔ جس طرح ایک نوزائیدہ بچھڑا اپنی ماں (گائے) کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، اسے وہ اتباع سے تعبیر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بچھڑا کسی خارجی حکم کی اطاعت کرتا ہوا اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہیں چلتا۔ یہ اُس کی اندرونی کشش کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعیّن کردہ راستے پر اس قسم کی کشش اور اندرونی تقاضا کی رُو سے چلنے کا نام اتباعِ قرآنی ہوگا۔ جس طرح جب آپ کو پیاس لگتی ہے تو آپ اُٹھ کر پانی پیتے ہیں۔ آپ ایسا کسی کے حکم کی اطاعت کی رُو سے نہیں کرتے۔ اپنے اندرونی تقاضے کی رُو سے کرتے ہیں۔ اسے اتباع کہتے ہیں۔ انسان اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور حکمرانوں کے حکم کی اطاعت۔ یہ نکتہ بڑا لطیف ہے کہ قرآن کے لئے اطاعت کا لفظ کہیں نہیں آیا، اتباع کا لفظ ہی آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرد کتاب کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ اس کی اطاعت ایک اتھارٹی کی رُو سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن ہدایت (یعنی راہ نمائی) عطا کرتا ہے۔ ایک راہرو جو سمجھ سوچ کر کسی راہ نما کے پیچھے چلتا ہے، تو وہ اس کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے اندرونی تقاضا

کی رُو سے ایسا کرتا ہے۔ اِس کو اتباع کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ملّتِ ابراہیمی کے اِتباع کا حکم دیا ہے (۴/۱۲۵) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس روش پر حضرت ابراہیمؑ گامزن رہے تھے، تم بھی اُس کی پیروی کرو۔ اُنہوں نے اپنے اور بیگانے کا معیار یہ قرار دیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴/۳۶) "جو میرا اتباع کرتا ہے، وہ میرا ہے"۔ یہی امّتِ مسلمہ کی تشکیل کا بنیادی نکتہ ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اطاعت کسی حکم کی کی جاتی ہے۔ اگرچہ خود لفظِ اطاعت میں بھی، بطیبِ خاطر تعمیل کا پہلو مضمر ہوتا ہے، لیکن حکومت کے احکام کی اطاعت، میکانکی طور پر بھی کی جا سکتی ہے، اور یہ اطاعت قانونی تقاضا پورا کر دیتی ہے۔ لیکن انسانیت کے بیشتر تقاضے ایسے ہیں جو اس قسم کی اطاعت کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتے۔ (مثلاً) قرآنِ کریم میں ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)۔ "خدا تمہاری نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ ارادوں اور خواہشات تک کو جانتا ہے"۔ دُنیا کا کون سا قانون ہے جو نگاہ کی خیانت اور دل کے مخفی ارادوں پر لاگو ہو سکے؟ اور کون سا نظام ہے جو ان کی گرفت کر سکے۔ اِس کے لئے تو انسان کے اندر ایک تبدیلی کی ضرورت ہے جس کی رُو سے اس قسم کی خیانت اور تخریبی ارادوں سے باز رہنا اس کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ یا (مثلاً) اس قسم کی ہدایات کہ بوڑھے ماں باپ سے درشت کلامی سے پیش نہ آؤ: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ (۱۷/۲۳)۔ یا (مثلاً) چلّا کر نہ بولو: وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (۳۱/۱۹)۔ اور اکڑ کر مت چلو (لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۳۱/۱۸) اس قسم کی ہدایات پر قانوناً یا حکماً عمل نہیں کرایا جا سکتا۔ ان کا اتباع اندرونی تقاضا ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے"۔ تو اس "اندرونی تبدیلی" کا مظاہرہ اِتباعِ ہدایتِ خداوندی کی شکل میں ہوتا ہے۔ احکام کی اطاعت سے معاشرتی نظم و نسق قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن قوم میں حقیقی تبدیلی اِتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ قرآنی نظام میں، اطاعت اور اتباع دونوں لازمی ہیں ——— یعنی ایک زندہ اتھارٹی کی طرف سے صادر کردہ احکامِ خداوندی کی اطاعت اور قلبی تقاضا کی رُو سے منشائے خداوندی کی تکمیل۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں جو نظام قائم ہوا تھا، اس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ بعد میں جب اس نظام کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو اسلام کا نظام ہی ختم ہو گیا۔

عہدِ ملوکیت میں اسلام باقی نہ رہا

سلاطین نے اپنے احکام منوانے شروع کر دیئے۔ مذہبی پیشوائیت نے اِطاعتِ "خدا و رسولؐ" کا مفہوم

اس طرح بدلا کہ اس میں نظام (یا زندہ اتھارٹی) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ انہوں نے کہا کہ "اللہ کی اطاعت" سے مراد ہے کتاب اللہ کی اپنے اپنے طور پر اطاعت، اور "اطاعتِ رسولؐ" سے مراد ہے احادیث کی اطاعت۔ اس میں سمعنا (ہم نے سنا) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے فقہ کے قوانین مرتب کئے گئے اور عقیدہ یہ پیدا کیا گیا کہ احکامِ فقہ کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف ہے۔ اس سے تھیاکریسی وجود میں آ گئی اور امت فرقوں میں بٹ گئی۔ باقی رہا اتباع تو اس کے لئے بزرگوں کے نقوشِ قدم کی پیروی شروع ہو گئی (یعنی مسلکِ اسلاف اور مرشدانِ طریقت کے منہاج کی پیروی)۔

اور یہی ہے وہ اسلام جو آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔ قرآن کریم نے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ کے مثبت حکم سے، اتباع کے لئے، صرف کتاب اللہ میں عطا فرمودہ راستہ بتایا تھا۔ اور وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ کے منفی حکم سے، کتاب اللہ کے سوا، ہر مسلک و مشرب کے اتباع کی مخالفت کی تھی۔ لیکن مروجہ اسلام میں قرآن کریم تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا ہے، اور اتباع کے لئے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیتیں مقرر کر لی گئیں ("اولیاء" کا مفہوم مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۴۴ پر واضح کیا گیا ہے)۔

حضورؐ بھی قرآن کا اتباع کرتے تھے

یاد رکھیئے! اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے، اور اس راستے کا اتباع جو قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ بھی قرآن کریم کا اتباع کرتے تھے۔ ارشاد ہے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۶/۱۵)۔ "میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔" اور اس کی خلاف ورزی سے جو عذاب خداوندی وارد ہوتا ہے، اس سے خائف رہتے تھے (۶/۱۵)۔ حضورؐ کو اسی کا حکم دیا گیا تھا: وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ (۱۰/۱۰۹)۔ "اے رسولؐ! جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے، اس کا اتباع کیا کرو۔" (نیز ۶/۲)۔ اسی راستے کے اتباع کو حضورؐ نے صراطِ مستقیم کا اتباع قرار دیا جب فرمایا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶/۱۵۴)۔

(ان سے کہہ دو) یہ ہے تمہارے خدا کی مقرر کردہ، توازن بدوش راہ، جو تمہیں سیدھی منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں۔ تم بھی اسی پر چلو (اسی کا اتباع کرو) اسے چھوڑ کر اور راستوں کو اختیار نہ

کرو۔ وہ تمہیں خدا کی راہ سے الگ کر دیں گے۔ اُس نے تمہیں اس کا اس لئے حکم دیا ہے کہ تم زندگی کے تمام خطرات سے محفوظ رہ کر، امن و سلامتی سے اپنے نصب العین تک پہنچ جاؤ۔

اسی کا نام اتباعِ سنتِ رسول اللہؐ ہے۔ (اس کی تشریح پہلے باب میں زیر آیت (۶/۱۵۴) گزر چکی ہے)۔

باقی رہا اسلاف کے راستے کا اتباع، سو قرآنِ کریم نے اس سے سختی سے منع کیا ہے۔ اس مسلک کے متبعین

اسلاف کے مسلک کا اتباع

کے متعلق فرمایا: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲/۱۷۰) "ان لوگوں کے پاس اپنے غلط نظام کی سند صرف یہ ہے کہ یہ نظام اُن کے اسلاف سے متوارث چلا آرہا ہے۔ سوچئے کہ یہ بھی کوئی سند ہے؟ یاد رکھئے! غلط اور صحیح، حق اور باطل کی سند اور معیار صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن یہ کبھی اُسے معیار تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے، اُس کا اتباع کرو، تو یہ کہیں گے کہ نہیں! ہم اُسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے — یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے! (۵/۱۰۴؛ ۱۰/۷۸؛ ۱۱/۶۲؛ ۱۱/۸۷؛ ۲۱/۵۳؛ ۲۳/۲۴؛ ۳۴/۴۳؛ ۳۸/۷؛ ۴۳/۲۲)"۔ (مزید تفصیل "تقلید" کے عنوان کے تحت دیکھئے)۔

انسان شخصیتوں کا اتباع اُن جذبات کی رُو سے کرتا ہے جو ان شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم، ان جذبات کے اتباع کو، جو ہدایتِ خداوندی کے خلاف ہوں، انتہائی ضلالت قرار دیتا ہے: وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ (۲۸/۵۰)۔ "اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہوگا جو ہدایتِ خداوندی کے علی الرغم اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے"۔

"اولیاء" کی تشریح مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۴۴۴) میں آچکی ہے جہاں زیرِ نظر آیت (۷/۳) بھی درج ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ تو اس سے واضح ہے کہ قرآن مجید کے سوا کسی کا اتباع بھی جائز نہیں خواہ وہ کتنی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں آیات (۱۲/۴۰؛ ۱۲/۱۰۶؛ ۱۷/۴۶؛ ۳۹/۴۵ اور ۴۰/۱۲) پر بھی ایک نگاہ ڈال لینی چاہیئے، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اگر قرآن کریم کے سوا کسی کا بھی اتباع کیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ دین میں سند اور حجت، اور قولِ فیصل صرف کتاب اللہ

کا ہے۔ اگر کسی انسان کے قول یا فعل کو یہ حیثیت دے دی جائے تو یہ شرک ہو جائے گا۔ قرآن، انسان پرستی کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے واضح طور پر کہا کہ جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی، تباہ ہو جائے گی۔ اقوامِ سابقہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

(۷/۵-۴) وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(ان سے پہلے) کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں (اُن کی غلط روی کی وجہ سے ہمارے قانونِ مکافات نے) ہلاک کر دیا یہ تباہی کسی قوم پر ایسے وقت میں آئی جب وہ لوگ رات کو (اطمینان سے) سو رہے تھے، اور کسی پر اس وقت جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے (یعنی وہ خوابِ غفلت میں پڑے تھے اور زندگی کے حقائق کی طرف سے یکسر غافل تھے۔

اقوامِ سابقہ پر تباہی

وہ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست تھے کہ انہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان پر تباہی آئے گی۔ اور جو شخص انہیں اس سے متنبہ کرتا تھا، اس سے کہتے تھے کہ ہم کون سے ایسے بُرے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے ہم پر تباہی آئے گی ($\frac{۲}{۱۱}$)۔ لیکن جب اُن پر تباہی کا عذاب آیا تو اُن کی آنکھ کھلی، اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم واقعی ظلم اور زیادتی پر اترے ہوئے تھے ($\frac{۲۱}{۱۱-۱۵}$)

قوموں کی تباہی کے اسباب و علل اور اُن کے عروج و زوال کے ابدی اصولوں کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث آ چکی ہے۔ (انڈکس جلد سوم میں دیکھئے عنوانات "استبدال و استخلافِ قومی" اور "قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول" اور انڈکس جلد چہارم میں عنوان "اقوام کے استبدال کا قانون")۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے: ($\frac{۵}{۵۴}$ و $\frac{۹}{۳۸-۳۹}$؛ $\frac{۱۱}{۵۷}$؛ $\frac{۲۱}{۱۱-۱۵}$؛ $\frac{۲۸}{۵۸}$؛ $\frac{۲۹}{۳۸}$؛ $\frac{۴۰}{۸۲}$؛ $\frac{۴۵}{۲۳}$؛ $\frac{۴۶}{۲۶}$؛ $\frac{۵۹}{۲}$ اور $\frac{۷۰}{۴۰-۴۲}$)

ان میں آیات ($\frac{۲۱}{۱۱-۱۵}$) کا تعلق براہِ راست اس موضوع سے ہے جس کا ذکر آیۂ زیرِ نظر ($\frac{۷}{۴}$) میں کیا گیا ہے، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے مفہوم کو یہاں پیش کر دیا جائے اس سے بات واضح تر ہو جائے گی۔ فرمایا:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝ (۲۱/۱۵-۱۱)

تباہی کا عبرت آموز نقشہ

اگر تم اپنی زندگی کا نقشہ نظامِ خداوندی کے مطابق کر لیا، تو تمہیں رفعت و عظمت حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے، تو تم بھی اُسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے جس طرح) ہم نے (تم سے پہلے) کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اور پھر، اُن کے بعد، ان کی جگہ، دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ (۲۱/۱۱)

اُن کی غلط روش کے نتائج، غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں اُن کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اُس روش سے باز آجائیں، لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج، آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے، حتیٰ کہ) جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ لگے بھاگنے (۷/۱۸۲ ؛ ۱۶/۲۶) - (۲۱/۱۲)۔

(لیکن اُس وقت بھاگنے کا کونسا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ) اب کہاں بھاگ کر جا سکتے ہو؟ مت بھاگو۔ اب اُلٹے پاؤں انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کئے تھیں) اور اپنے اُن محلات کی طرف پلٹو (جن کے اندر تم اپنے آپ کو اسقدر محفوظ سمجھا کرتے تھے)۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا۔ اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (۱۰۲/۸) — (۲۱/۱۳)

اُس وقت انہیں، اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے، اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔ (۲۱/۱۴)

(لیکن اس وقت اس تاسف سے کیا ہو سکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے) - چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں، اُن پر وہ بے حد متاسف ہیں، لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے

کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ (یا بُجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔ ۳۶/۲۸)...... (۲۱/۱۵)"
یہ ہوتا ہے حشر اُن اقوام کا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہیں۔

تباہی سے پہلے شرائط قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں بتایا ہے کہ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ یعنی (۱) اُن تک خدا کا پیغام پہنچ چکا ہو۔ (۲) ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ تفصیل ان امور کی مطالب الفرقان جلد چہارم (آیت ۴/۱۶۵ صفحہ ۱۴۴[1] آیت ۵/۱۹ صفحہ ۴۸۴) میں گزر چکی ہے۔ اِس مقام پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

۷/۶ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

یقیناً ہم اُن سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف ہم نے اپنے پیغامبروں کو بھیجا تھا (کہ تم نے اِس پیغام کو سننے کے بعد کیا کیا تھا)۔ اور خود رسولوں سے بھی پوچھیں گے (کہ تمہاری دعوت کا جواب کیا ملا تھا؟

"جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا" میں دونوں گروہ آ گئے۔ ایک وہ جنہوں نے اس پیغام کے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اور دوسرا گروہ اُن لوگوں کا جنہوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس پیغام کو اُن لوگوں تک پہنچائیں، جن تک یہ پہنچ نہ چکا ہو۔

جماعت مومنین کی ذمہ داری غور کیجئے کہ جماعتِ مومنین پر یہ کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ختمِ نبوّت کے بعد، وہ تمام ذمہ داریاں جو رسولوں پر عائد ہوتی تھیں، اس اُمّت پر عائد ہو گئیں، کیونکہ اسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ (۳۵/۳۲)

اِس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ رسولوں یا لوگوں سے اس طرح دریافت کرنے کے معنی یہ نہیں کہ خدا کو اس کا علم نہیں ہوگا۔ خدا کو تو ایک ایک بات کا علم ہوتا ہے۔ یہ دریافت کرنا کچھ اس طرح سمجھئے، جیسے عدالت میں ملزم سے اعترافِ جرم کرایا جاتا ہے، خواہ جج کو ذاتی طور پر اس کا علم بھی کیوں نہ ہو۔ اور قرآنِ کریم میں اس کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے قانون کا علم ہو جائے اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس۔ فرمایا:

۷/۷ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

---

[1] انڈکس جلد چہارم میں غلطی سے صفحہ کا نمبر ۱۴۱ لکھا گیا ہے۔ صحیح ۱۴۴ ہے۔ اسے درست کر لیجئے)

(اور یہ پوچھنا کچھ اس قسم کا نہیں ہوگا جیسے کوئی ناواقف کسی بات کو دریافت کر رہا ہو) - یہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے، کیونکہ ہم کسی وقت بھی غیر حاضر نہیں ہوتے - ہم سب کچھ خود بتاویں گے (کہ انہوں نے کیا پہنچایا اور انہوں نے اس کا استقبال کیسے کیا) -

ظہورِ نتائج کے وقت ہر انسان کے اعمال کے ذرّہ ذرّہ کا وزن ہوگا:

۷ / ۹-۸ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ○

ثقل وخفتِ موازین

(اس سے ظاہر ہے کہ جس جماعت کے ذمّے پیغام رسانی کا فریضہ عائد ہوتا ہے، اُس سے بھی پوچھا جائے گا کہ اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا تھا) حقیقت یہ ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت، ہمارے قانونِ مکافات کی میزان، ہر ایک کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن بتا دیتی ہے - جس کے مثبت، تعمیری اور صلاحیت بخش اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ وہ کامیاب و کامران ہوتا ہے - (ہے) اور جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوتا ہے تو یہی لوگ ہیں جو اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں - اور یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے قوانین سے سرکشی برتنے کا -

قانونِ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے - (دیکھئے انڈکس جلد سوم - عنوانات "مکافاتِ عمل" اور "قانونِ مکافات"۔ نیز انڈکس جلد چہارم، عنوان "مکافاتِ عمل") - لیکن اس آیت میں جو "میزان" کا ذکر آیا ہے تو اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔

میزان سے مراد

نظامِ کائنات، قانونِ ارتقاء کے تحت جاری و ساری ہے - اس قانون کی رُو سے ایک چیز (یا نوع) اپنے نقطۂ آغاز سے، ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتی ہوئی، اپنے منتہیٰ تک پہنچتی ہے - اس راستے کی ہر منزل میں اُس کا ٹکراؤ، تخریبی قوتوں سے ہوتا ہے - اگر اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ ہے تو وہ تخریبی قوتوں کو شکست دے کر باقی بھی رہتی ہے، اور ارتقاء کی اگلی منزل کی طرف بڑھ بھی جاتی ہے (قرآنِ کریم اسے "حق و باطل کی کش مکش" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے - کش مکش کا یہی سلسلہ انسانی زندگی میں بھی جاری ہے - تخریبی جراثیم ہر آن کروڑوں کی تعداد میں انسانی جسم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں - اگر اس فرد کی قوتِ مدافعت مستحکم ہے، تو وہ ان تخریبی عناصر کو شکست دے دیتی ہے - اس سے اُس کی صحت قائم

رہتی ہے۔ اگر تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، تو وہ بیمار ہوجاتا ہے۔ علاج کے معنی ہوتے ہیں اُس کی مدافعت کی قوّت میں اضافہ کرنا۔ اگر ایسا ہوجائے تو وہ تندرست ہوجاتا ہے۔ ورنہ بیماری بڑھتی جاتی ہے، اور آخرالامر اُس کی موت واقعہ ہوجاتی ہے۔

لیکن (جیسا کہ آپ سابقہ جلدوں میں دیکھ چکے ہیں) انسان صرف اُس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ اس کی ذات (نفس) بھی ہے۔ تعمیری اور تخریبی قوتوں کی کش مکش کا جو سلسلہ اس کے جسم میں جاری رہتا ہے، وہی اس کی ذات میں بھی ہنگامہ خیز رہتا ہے۔ اس کی تعمیری قوتیں، اعمالِ صالحہ (حسنات) سے مستحکم ہوتی ہیں، اور تخریبی قوتیں، اعمالِ سیّئہ (سیّئات) سے پرورش پاتی ہیں۔ اگر اُس کی تعمیری قوتیں غالب رہیں تو اُس کی ذات (جسے اقبالؒ خودی سے تعبیر کرتا ہے) محکم ہوجاتی ہے۔ اور اس قابل کہ وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں پہنچ جائے۔ (اسے جنّت کی زندگی کہا جاتا ہے)، اور اگر تخریبی قوتیں غالب رہیں، تو اُس کے ارتقاء کا سلسلہ رُک جاتا ہے، اور وہ منجمد ہوکر رہ جاتی ہے۔ (اسے جہنم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

قرآنِ کریم اس کش مکش کو میزان کے پلڑوں کی نہایت بلیغ تشبیہ کی رُو سے سمجھاتا ہے۔ اگر تعمیری پلڑا بھاری ہوتا ہے (جھکتا ہے)، تو انسانی ذات مستحکم ہوتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کے قابل۔ اگر یہ پلڑا ہلکا ہوتا ہے (اوپر اُٹھتا ہے)، تو وہ ناپختہ رہتی ہے۔ اس تشبیہ میں قانونِ ارتقاء کی ساری کارفرمائی آئینے کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ اِس قانون کی رُو سے ایسا نہیں ہوتا کہ باقی وہی رہے اور آگے وہی بڑھے جو تخریبی عناصر سے پاک اور صاف ہو۔ تخریبی عناصر اس میں بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ تعمیری عناصر کے مقابلہ میں کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے مغلوب رہتے ہیں۔ یہی کیفیت انسان کی ذات کی ہوتی ہے۔ (عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اِس قانون کی رُو سے) جنت میں جانے کا اہل وہی نہیں ہوتا ہے جو بالکل معصوم ہو، جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ جس کا دامن کسی لغزش سے آلودہ نہ ہو۔ صاحبِ اختیار و ارادہ انسان سے غلطی کا سرزد ہوجانا عین ممکن ہے۔ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا غلطیوں کا وزن زیادہ ہے یا حُسنِ عمل کا وزن۔ اس لئے وہ مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ

سوال معصوم ہونے کا نہیں

اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ (۵۳/۳۲)۔ "وہ بڑے بڑے گناہوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ اُن سے خفیف سی لغزشیں کبھی کبھی سرزد ہوجاتی ہیں۔ (اُن کے

اعمالِ صالحہ، اُن لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ کر دیتے ہیں" وہ اس کے لئے "پلڑوں کے جھکنے اور اُٹھنے" کو معیار قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔ (نیز ۱۳/۲۲ نیز ۲۵/۷۰ نیز ۲۸/۵۴)۔ "حسنات کا جھکا ہوا پلڑا، سیئات کا ازالہ کر دیتا ہے۔"

اس حقیقت کو ایک اور مثال کی رو سے سمجھئے۔ سکولوں اور کالجوں کے امتحانوں میں ——— (PASS-MARKS) رکھے جاتے ہیں۔ "پاس مارکس" (مثلاً) اگر ساٹھ فی صد ہیں، تو جو طالب علم اتنے نمبر حاصل کر لیتا ہے، اُسے اگلی کلاس میں ترقی دے دی جاتی ہے، حالانکہ اُس کا چالیس نمبر کا پرچہ غلط ہوتا ہے۔ ساٹھ فی صد کی قابلیت، چالیس فی صد کی کمزوری کا ازالہ کر دیتی ہے۔

لیکن اس میں ایک نکتہ مزید غور کا متقاضی ہے۔ ان مضامین میں بعض لازمی (COMPULSORY) ہوتے ہیں جن میں پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم لازمی مضمون کے پرچہ میں فیل ہو جاتا ہے، تو اُس کے باقی پرچے دیکھے ہی نہیں جاتے۔ اس کی سب محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حبطِ اعمال

دین کی امتحان گاہ میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص لازمی مضمون میں فیل ہو جاتا ہے، اُس کے سب اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم اسے حبطِ اعمال کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۳۰۷۔ آیت ۲/۲۱۷۔ اور جلد چہارم صفحہ ۵۸ آیت ۳/۲۱-۲۰)۔ جلد چہارم میں (ص ۴۶ پر) جو اہم آیت (۱۸/۱۰۵) درج کی گئی ہے، اس میں حبطِ اعمال کے بعد کہا گیا ہے: فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ——— "اُن کے اعمال تولنے کے لئے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔"

قرآن کریم نے مکافاتِ عمل کا اصول یہ بتایا ہے کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸)۔ "جو ذرہ برابر بھی قانونِ خداوندی کا اتباع کرے گا، اس کے حسنِ عمل کا خوشگوار نتیجہ اُس کے سامنے آجائے گا اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا، اس کی سزا پائے گا۔ ہر شخص کے اعمال کا ذرہ ذرہ اُس کے سامنے آجائے گا۔" اس اصول کی روشنی میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کون ہیں جن کے اعمال تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یہ وہی ہیں جو لازمی مضمون میں فیل ہوں گے، یا اُنہوں نے ان مضامین میں امتحان ہی نہیں دیا ہوگا۔ دین کے نصاب میں یہ (لازمی) مضامین ہیں ——— توحید اور ایمان بالآخرت

توحید کے معنی یہ ہیں کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ جو کسی انسان کے لئے حق حکومت کو جائز سمجھتا ہے وہ اس مضمون میں فیل ہو جاتا ہے۔ اور ایمان بالآخرت سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس دنیا میں سامنے آجائے اور خواہ مرنے کے بعد آخرت میں۔ یہ بھی لازمی مضمون ہے۔ اور جو اس میں فیل ہو جاتا ہے۔ اس کے اعمال کے تولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے، اس لئے وہ اپنے اچھے کاموں کے ثمرات اسی دنیا میں لے لیتا ہے۔ بغرضِ تفہیم کہا کہ

کفار کے نیک اعمال کا بدلہ!

یہ لوگ جب جہنم رسید کئے جائیں گے، تو کہیں گے کہ ہم نے دُنیا میں کچھ اچھے کام بھی تو کئے تھے۔ ان کا بدلہ تو ہمیں ملنا چاہیئے۔ اُن سے کہا جائے گا کہ اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا (۴۶/۲۰) "تم دنیاوی زندگی ہی کو منتہیٰ سمجھا کرتے تھے، اس لئے تم نے اپنے اچھے کاموں کے نتائج اُسی زندگی میں دیکھ لئے۔ تمہاری موت کے ساتھ تمہارے وہ اعمال بھی وہیں رہ گئے۔ معاملہ ختم ہوگیا۔" {آپ جلد چہارم صفحہ ۷۴ پر حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ کی تشریح ایک بار پھر دیکھئے۔ نظر آجائے گا کہ ہمارا انعام کیا ہے۔ ویسے میزان کا موضوع (۲۱/۴۷)؛ (۲۳/۱۰۲) اور (۱۰۱/۶-۹) میں بھی آیا ہے}

بغاوت کا نتیجہ

ایک اور مثال اس سے بھی زیادہ نمایاں اور بلیغ ہے۔ ایک شخص بڑا امن پسند ہے، معاشرہ کے رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، جس کی وجہ سے اُس کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اُس کے خلاف بغاوت کا جُرم ثابت ہو جاتا ہے، جس کی سزا موت ہے ظاہر ہے کہ اس ایک جُرم کی بنا پر اُس کے ماضی کے تمام اچھے کام رائگاں چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، توحید کے معنی یہ ہیں کہ حقِ حکومت صرف خدا (کی کتاب) کو حاصل ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے، وہ مملکتِ خداوندی کا وفادار شہری ہے۔ جو اس کے ساتھ کسی انسان کی حکومت کو بھی شریک کرتا ہے اور انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو قوانینِ خداوندی کا درجہ دیتا ہے، وہ اس مملکت کے خلاف جرمِ بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے ——— وَّلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶) "وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" انڈکس میں دیکھئے حکم اور حکومت کے عنوانات) قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اسے شرک کہا جاتا ہے، اور یہ ناقابلِ تلافی جُرم ہے۔ (جلد سوم اور چہارم کے انڈکس میں عنوان "شرک" دیکھئے)۔ یہ ہے وہ جُرم جس کے مرتکبین کے اعمال تولنے کے لئے میزان

تک کھڑی ہی نہیں کی جائے گی۔ وہ سب رائگاں جائیں گے۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے انسانوں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرتے ہوئے، حکومتِ خداوندی کے خلاف جُرمِ بغاوت کے مرتکب ہوتے چلے

ہمارے اعمال آرہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے وہ اعمال (نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ) جنہیں ہم بزعمِ خویش نیک اعمال سمجھ کر ادا کرتے ہیں، نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ رائگاں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اِن کے تولنے کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں کی جاتی۔

گناہوں کی بخشش کا سوال ہی نہیں آخر میں ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا جائے کہ خُدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، گناہوں کی معافی، بخشش، سفارش وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال، اعمال کے وزن کا ہے۔ جس کا اعمالِ حسنہ (قرآن کے مطابق اعمال) کا پلڑا بھاری ہے، وہ جنّت کا مستحق ہے۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہے، وہ اس سے محروم رہے گا۔

ایک نکتہ اور ــــــ آیت زیرِ نظر (۹) میں کہا گیا ہے: فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ــــــ نقصان اُن کی ذات (نفس) کا ہوگا۔ اُخروی زندگی میں نفع یا نقصان کا تعلق انسانی ذات سے ہوگا۔

ذات کا نقصان انسان کی طبیعی زندگی اور اُس کے لوازمات یہیں رہ جائیں گے۔ اسی لئے ہم نے شروع میں کہا ہے کہ "نیک اعمال" وہ ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام ہوتا ہے۔ "بُرے اعمال" وہ جن سے اس میں ضعف لاحق ہوتا ہے۔ خود لفظ "خسران" کے معنی کسی چیز میں کمی رہ جانے کے ہیں۔

اس کے بعد انسانی زندگی کے کوائف و ماجریات کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن تمہیدًا یہ کہا گیا ہے کہ

ع ۱۰ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ع

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں متمکّن کیا، اور اس میں تمہاری روزی کا سامان رکھ دیا۔ (یہ سب کچھ بلامزد

معاوضہ عطا کیا) لیکن تم میں بہت کم ہیں جو اس کے قدر شناس ہیں۔ (یعنی بجائے اس کے کہ اس سامانِ زیست کو عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لئے کھلا رکھیں، اسے فساد یعنی ناہمواریاں پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔)

نوعِ انسان کا تمکن فی الارض

اس آیت میں تخاطب تمام نوعِ انسان سے ہے۔ اس اعتبار سے جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ کی حقیقت بڑی غور طلب ہے۔ ارض (زمین) ——— تمام نوعِ انسان کے لئے سرچشمۂ رزق ہے۔ خاص افراد کے لئے نہیں۔ کوئی ایسا نظام جس میں کوئی فرد رزق سے محروم رہ جائے، منشائے خداوندی کے خلاف ہوگا۔ (انڈکس میں معاشی نظام کا عنوان دیکھئے)۔

اس کے بعد آیات (۷/۱۱) سے (۷/۲۴) تک ابلیس و آدم کا قصہ مذکور ہے۔ یہ داستان، سورہ بقرہ کی آیات (۲/۳۰) تا (۲/۳۹) میں آ چکی ہے، جن کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحات ۱۴۶-۷۲ میں کی گئی ہے۔ اور ان میں آیات (۷/۲۴-۱۱) بھی آ گئی ہیں۔ لہٰذا ان آیات کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں، ان کا صرف مفہوم درج کر دیا جاتا ہے، اور ان کے سامنے مطالب الفرقان جلد دوم کے صفحات کا حوالہ دیدیا گیا ہے، جہاں متعلقہ آیت کی تشریح ملے گی ——— {مفہوم آیات (۷/۲۴-۱۱)}:

۷/۱۱ یہ فساد کس طرح پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے تم اپنی سرگزشت پر غور کرو۔ (جسے ہم قصۂ آدم کے عنوان سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں (۲/۳۸-۳۰) اور جسے مزید تصریحات کے ساتھ پھر دہراتے ہیں۔)

وہ سرگزشت یہ ہے کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے کی ہے (۲۳/۱۲)۔ پھر (زندگی کو مختلف ارتقائی مراحل سے گزارتے ہوئے اسے) پیکرِ بشریت میں لے آئے۔ پھر تم میں ایسی صلاحیتیں رکھ دیں جنکے سامنے کائناتی قوتیں جھک جائیں۔ (تم فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لو) لیکن، اس کے ساتھ، تمہارے جذبات بھی ہیں کہ (جن کی اگر صحیح تربیت نہ کی جائے تو وہ) تم سے سرکشی اختیار کر لیتے ہیں، اور تم اتنی بڑی قوتوں کے مالک ہونے کے باوجود، بے بس ہو کر رہ جاتے ہو۔

اسے تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ ملائکہ سے ہم نے کہا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ، تو وہ جھک گئے، لیکن ابلیس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ (۷/۱۱)۔ {حوالہ۔ جلد دوم صفحہ ۹۸}

۷/۱۲ ہم نے اس سے پوچھا کہ جب ہم نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا، تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس حکم کی تعمیل سے باز رکھا؟ (۳۸/۷۵)۔ اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا، اور

اسے مٹی سے۔ (آب و گِل کے پیکرِ انسان پر، اُس کے تند و تیز جذبات غالب رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے اندر، وحی کے اتباع سے شرفِ انسانیت کو بیدار کر لیتا ہے، تو پھر وہ ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا (۱۵ / ۴۲-۴۴)

(حوالہ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰)

۷ / ۱۳ ہم نے کہا کہ (یہ تمہاری غلط نگہی ہے) ۔ یہ چیز (کہ تم میں تندیِ سرکشی ہے) تمہاری بڑائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ تم اس زعمِ باطل کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گئے۔ تم نے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ سو تم یہاں سے نکل جاؤ (یہاں انسان کے دو بنیادی غلط تصوّرات کی تردید کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ پیدائشی امتیاز باطل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ تعمیری کام کئے بغیر بڑائی کا دعویدار ہونا غلط ہے۔ تکبر بالحق جائز ہے۔ (۷ / ۱۴۶) ؛ (۴۱ / ۱۵) ؛ (۴۶ / ۲۰)۔

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۷}

۷ / ۱۴-۱۵ اُس نے کہا کہ (اب اگر میرا اور آدم کا باہمی تصادم رہنا ہے تو) مجھے اُس وقت تک انسان کے ساتھ رہنے کی مہلت دے دے، جب تک یہ اپنے راستے سے ان موانعات کو دُور نہ کرے جو اسے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اُس وقت اسے ایسی حیات نو مل جائے گی جس میں میرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ یا جبتک یہ دنیا سے اُٹھا نہ لیا جائے۔ (جذبات کی سرکشی اُسی صورت میں دُور ہو سکتی ہے کہ انسانی ذات میں اس قدر استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ انہیں غالب نہ آنے دے۔ یہ، اس دنیا میں، انسان کی حیاتِ نو ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ جذبات مرتے دم تک غالب رہتے ہیں۔) (۷ / ۱۴)

جواب ملا کہ ہاں! تمہیں اُس وقت تک کی مہلت ہوگی (۱۵ / ۳۵-۳۹) ؛ (۳۸ / ۷۷-۷۹) (۷ / ۱۵)

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۸}

۷ / ۱۶-۱۷ اُس نے کہا کہ تو نے جو مجھے گمراہ کر کے مجھ پر ہمیشہ کے لئے سعادت کی راہ بند کر دی ہے اور مجھے تباہ و برباد کر دیا ہے، تو میں بھی بنی آدم کی گھات میں بیٹھا رہوں گا کہ وہ اُس توازن بدوش راہ سے بھٹک جائیں جو تیری طرف لے جانے والی ہے۔ (۷ / ۱۶)

اس کے لئے میں ان پر ہر طرف سے یورش کروں گا ——— سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے پھر تو ان میں اکثر کو دیکھے گا کہ وہ تیری ان عنایات کے، جو تو نے ان پر ارزاں فرمائی ہیں، قدر شناس نہیں ہوں گے۔ (۱۵ / ۳۵-۳۸) ؛ (۱۷ / ۶۱-۶۲) ؛ (۳۸ / ۷۵)

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰}

۷/۱۸ خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ذلیل و دھتکارا ہوا ہے۔ (سرکش جذبات، جو انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دیں، ایسے ہی ہوتے ہیں)۔ جو ان میں سے تیرا اتباع کرے گا، تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ (وہ حیوانی سطح پر جئیں گے اور ان کی انسانی صلاحیتیں جُھلس کر رہ جائیں گی)۔ (آدم سے بھی معصیت ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا، تو اُس نے ندامت سے گردن جھکائی اور کہا کہ میں اپنے جُرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں خواستگارِ عفو ہوں (۷/۲۳)

جواب ملا کہ تو نے جب اپنی غلطی کا اعتراف اور اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے، تو اس سے نظر آتا ہے کہ تیری اصلاح کا امکان ہے۔

یہی سوال جب ابلیس سے کیا تو اُس نے کہا کہ میں کون ہوں انکار اور سرکشی کرنے والا؟ تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا، اس لئے مجھے تو نے خود گمراہ کیا ہے؛

جواب ملا کہ جب تو اپنی غلطی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اپنے جرم کو عقیدۂ جبر کے نقاب میں چھپاتا ہے تو تیری اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔

(یہ ہے ملخص ابلیس و آدم کے تمثیلی قصہ کا)

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۶}

۷/۱۹ انسان (مرد و عورت) کو اس قدر متضاد صلاحیتیں دے کر دنیا میں بسایا گیا۔ (یعنی ایک طرف اس کی قوتوں کا یہ عالم کہ تمام اشیائے فطرت اس کے سامنے جُھک جائیں۔ اور دوسری طرف اس کی یہ کیفیت کہ اپنے سرکش جذبات کو اپنے قابو میں نہ رکھے تو ان کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جائے)۔

ابتداءً انسانی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشو و نما کی بڑی فراوانی تھی۔ چنانچہ اُن سے کہا گیا کہ تم جہاں سے جی چاہے اپنی ضروریات پوری کرتے رہو۔ یہاں "میری اور تیری" کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن اگر تم نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے اور وحدتِ انسانیت کے بجائے خاندانوں قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئے تو تم پر گروہ بندانہ جذبات غالب آجائیں گے اور اس طرح یہ جنتی زندگی تم سے چھن جائے گی (۲/۳۵)۔ (۷/۱۹)

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۱۱)

۷/۲۰-۲۲ یہ زندگی بڑی فراوانی اور خوشگواری کی تھی (۲۰/۱۱۸)۔ لیکن انسان کے سرکش جذبات نے اُس کے

دل میں وسوسے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ اس کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے۔ جہاں تک ایک فرد کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے، اسے موت سے مفر نہیں۔ اسے حیاتِ جاوید اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ یہ وحی کے اتباع سے اپنی ذات کی نشوونما کرلے۔ لیکن اس کے حیوانی تقاضے اسے اور طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ شیطان نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ خدا نے جو تمہیں کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا چاہیئے، تو اس سے اُس کا مقصد یہ ہے کہ تم کہیں بے پناہ قوتوں کے مالک نہ بن جاؤ، یا حیاتِ جاوید حاصل نہ کر لو۔ تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں اس کا طریق بتاؤں (۲۰/۱۲۱)۔ تم زندہ رہ سکتے ہو اپنی اولاد کے ذریعے۔ مرنے کے بعد، تمہاری اولاد تمہارا نام زندہ رکھے گی۔ اس طرح تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ یوں اُس نے انسان کے جنسی جذبات کی تسکین کو مقصودِ حیات بنا کر، اُس کی زندگی کو حیوانی سطح تک محدود کر دیا، اور بلند انسانی زندگی کے تصوّر کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ (۷/۲۰)۔

شیطان نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیر خواہی کے لئے کر رہا ہوں۔ (۷/۲۱)

چنانچہ اُس نے، اس قسم کی باتوں سے انسان (مرد اور عورت[1]) کو بہکا دیا اور انہیں اُن کے مقامِ بلند سے گرا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے کر، وحی کی روشنی میں، اپنا نظامِ تمدن و معیشت قائم کرتا جبلی خواہشات اس پر غالب آگئیں، اور یوں اس کے تحت الشعور (UN-CONSCIOUS) میں چھپے ہوئے جذبات بے نقاب ہو کر سامنے آگئے۔

بہر حال، انسان کے سرکش جذبات نے اُس کی توجہ، انسانی ذات کی طرف سے ہٹا کر، محض زندگی کے طبیعی تقاضوں[2] پر مرکوز کر دی۔ اس نے انہی کی تسکین کو مقصودِ حیات سمجھ لیا۔ اس سے انفرادی مفاد پرستی

---

[1] بائیبل میں آدم کی لغزش کا ذمہ دار اُس کی بیوی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس لئے عورت کو تمام گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن، مرد اور عورت دونوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ صرف عورت کو ہی نہیں۔

[2] BIOLOGICAL URGES.

غالب آگئی۔ انسانوں میں باہمی تشتت و افتراق پیدا ہو گیا، اور عالمگیر انسانیت کا تصوّر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ نسل کو وجۂ یگانگت قرار دینے کا لازمی نتیجہ قبائلی اور قومی زندگی ہے جس سے عالمگیر انسانیت کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ خدا نے آدم (مرد و عورت) سے کہا کہ کیا میں نے تمہیں اس نہج زندگی سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، اس کے فریب میں نہ آجانا؟ (۲۲/۷)۔

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۱۶)۔

۲۳/۷ اُنہوں نے (مرد و عورت نے) کہا کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا (جو تیری بات نہ مانی)۔ اگر تیری طرف سے ہماری حفاظت اور رحمت کا انتظام نہ ہوا، تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(جب خدا نے ابلیس سے کہا تھا کہ تم نے ہمارا حکم کیوں نہ مانا، تو اُس نے اس کا ذمہ دار خدا کو قرار دیا تھا (۱۶/۷)۔ یہ جبر کا عقیدہ ہے جس سے انسان پر ابدی مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ (ابلیس کے بُنیادی معانی یہی ہیں) لیکن آدم نے اپنی خطا کا ذمّہ دار، خود اپنے آپ کو قرار دیا۔ اس لئے اس کے لئے اصلاح کے امکانات پیدا ہو گئے۔)

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

۲۴/۷ خدا نے کہا کہ ایسا ہی ہو جائے گا (۲۵/۷) لیکن اب تمہاری زندگی کا نقشہ کچھ اور ہو گا۔ تم نے اپنے آپ کو اُس مقامِ بلند سے گرا لیا جس میں تم سب ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے {(۲۱۳/۲)؛ (۱۹/۱۰)} اب تم گروہوں میں بٹ جاؤ گے، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دُشمن ہو جائے گا۔ نسلی یا قومی رشتوں کو تمدّن کی بُنیاد قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ اب تمہیں یہاں ایک مدّت تک رہنا ہے، اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اُٹھانا ہے۔ (لہٰذا اب تمہاری معاشی زندگی کی دشواریاں شروع ہو گئیں۔

(۱۱۹-۱۱۷/۲۰) (حوالہ کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۲۵)

متاع کا مفہوم آیت (۲۴/۷) میں ہے: وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ——— مُسْتَقَرٌّ کا مفہوم سابقہ باب (آیت ۹۹/۶) میں بیان ہو چکا ہے۔ مَتَاعًا کا لفظ، البتّہ، غور طلب ہے۔ سابقہ جلدوں میں، ''معاشی نظام'' کے عنوان

کے تابع بتایا گیا ہے کہ قرآن کے نظام کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے ۔ اور کسی کے پاس زائد از ضرورت (اندوختہ کرنے کے لئے) نہ رہے ۔ قرآن کریم نے سامانِ زیست کو متاع کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور (قرآن کا اعجاز ہے کہ) اس ایک لفظ میں اس کے معاشی نظام کا اصل الاصول سمٹ کر آجاتا ہے ۔ عربوں کی زندگی صحرانوردی اور دشت پیمائی کی تھی ۔ ظاہر ہے کہ دشت و صحرا میں ضروریاتِ زندگی کا فقدان ہوتا تھا ۔ اس لئے ہر مسافر کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایسی چیزیں اپنے ساتھ رکھے جو سفر میں لاینفک ہوں ۔ عربوں کے ہاں ۔ اَلْمُتْعَۃُ ۔ ضروریاتِ سفر ۔ مثل ڈول ۔ رسّی ۔ مشکیزہ ۔ توشہ ، کو کہتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ مسافر ان چیزوں کے بغیر سفر بھی نہیں کر سکتا تھا اور انہیں زائد از ضرورت ساتھ بھی نہیں لے جاتا تھا ۔ مثلاً وہ دو چار ڈول یا مشکیزے ساتھ نہیں رکھتا تھا ۔ صرف ایک ایک ساتھ رکھتا تھا ۔ سامانِ زیست کی اس تشبیہ (متاع) سے آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس حسنِ اعجاز ، لیکن جامعیت سے بیان کر دیا ہے ۔ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۔ حیاتِ ارضی میں تمہیں متاع کی ضرورت ہے ۔ تم یہاں مسافر ہو ۔ تمہارے پاس ضروریاتِ سفر کا ہونا ضروری ہے لیکن زائد از ضرورت تمہارے لئے بارِ دوش بن جائے گا ۔ اس مسافت کو اس طرح طے کرو ۔ ا

س کے بعد ہے :

۷/۲۵ قَالَ فِیْہَا تَحْیَوْنَ وَفِیْہَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْہَا تُخْرَجُوْنَ ؀

تمہاری زندگی ، ارض (زمین) سے وابستہ ہے جو تمہارے رزق کا سرچشمہ ہے ۔ اس کے غلط نظام سے تم پر موت طاری ہو جائے گی ، اور جب اس نظام کو صحیح خطوط پر لے آؤ گے تو تمہیں حیاتِ نو مل جائیگی اور حیاتِ نو کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہے گا ۔ انسانی ذات کا ارتقاء ، مادی اسباب و ذرائع کو ترک کر دینے سے نہیں ہوگا ۔ ان اسبابِ معیشت کو مسافروں کی طرح استعمال میں لایا جائے گا ۔ بقدرِ ضرورت ۔ تم اس جہانِ آب و گل میں رہو گے اور اس سے اُبھر کر تمہیں حیاتِ نو حاصل ہو گی ۔ ارتقائے ذات کی اوّلین شرط تسخیرِ مادہ ہے ۔

مرنے اور جینے کا مفہوم

ہمارے ہاں عام طور پر " فِیْہَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْہَا تُخْرَجُوْنَ " کے معنی لئے جاتے ہیں کہ تم نے مرنے کے بعد اس زمین میں دفن ہونا ہے اور پھر اسی زمین سے دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونا ہے ۔ یہ مفہوم بوجوہ صحیح نہیں ۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہاں تخاطب

بنی آدم (تمام نوعِ انسان) سے ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی بہت سی اقوام (بلکہ مذاہب) ہیں جو اپنے مُردوں کو دفن نہیں کرتے۔ (حیاتِ آخرت کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد، انسانی زندگی کا اس محبسِ آب و گِل سے نکل کر، ارتقاء کی اگلی منزل میں چلے جانا ہے۔ (دیکھئے عنوان ارتقاء)۔

اِس سلسلہ میں فرمایا:

۷/۲۶ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں

اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ طبیعی زندگی کے تقاضے یعنی اس دنیا کی زیب و زینت کی چیزیں، قابلِ نفرت ہیں اور صحیح مسلک وہ ہے جس میں ان سے قطعِ تعلق کر لیا جائے۔ بالکل نہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو تمہارے لئے وجہِ جاذبیت بنایا ہے۔ (۳/۱۴)۔ انہیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا (۷/۳۲)۔ ان کے حصول اور استعمال میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو ان میں سے کوئی چیز بھی شر نہیں رہے گی۔ سب خیر ہی خیر ہوگا۔
یہ امور ضابطۂ خداوندی سے متعلق ہیں اور اس لئے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ انہیں اپنے پیشِ نظر رکھیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی کہ

۷/۲۷ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

سرکش جذبات کا غلبہ

اے نوعِ انسانی! تم کہیں شیطان (سرکش جذبات) سے مغلوب نہ ہو جانا، اور نہ وہ تمہارے لئے بھی اسی طرح مصیبت کا موجب بن جائیگا جسطرح اُس نے تمہارے مورثین کو جنتی زندگی سے نکلوا دیا تھا، اور اُنہیں شرفِ انسانیت کے لباس سے عُریاں کر دیا تھا۔ اِس سے کبھی مامون اور غیر محتاط نہ رہنا۔ وہ اور اس کا گروہ، ایسے ایسے مقامات میں تمہاری گھات

میں رہتا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ (یہ جذبات تمہارے دل کی گہرائیوں اور لاشعور میں چھپے رہتے ہیں)۔

لیکن یہ انہی کے رفیق و دمساز بنتے ہیں جو ہمارے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے ——— جو لوگ بلند انسانی زندگی، مستقل اقدار، قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی پر یقین رکھیں، وہ حیوانی سطح کے جذبات سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ وُہ انہیں ہماری عائد کردہ حدود کے اندر رکھتے ہیں۔

"جنّت" سے یہاں مُراد وہی نظام ہے جس میں معاشرہ اقدارِ خداوندی کا پابند ہوتا ہے، اور کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ "ابلیس اور شیطان" کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (باب اوّل) میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ انسان کے بے باک جذبات کا نام ہے۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ "وہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں تم اُنہیں دیکھ نہیں سکتے"۔ تو اس میں علم النفس (سائیکالوجی) کے ایک عمیق نکتہ کی طرف

تحت الشعور کی دنیا

اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جذبات انسان کے "لاشعور" کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جہاں انہیں "شعور" کی نگاہ بھانپ نہیں سکتی ——— جب آپ کا غصّہ فوری طور پر بھڑک اُٹھتا ہے اور آپ فریقِ مقابل کو تھپڑ (بلکہ گولی) مار دیتے ہیں، تو آپ کے شعور کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اقدارِ خداوندی کی پابندی اِن جذبات کو ساحل فراموش نہیں ہونے دیتی۔ اِسی لئے کہا ہے کہ ان کا غلبہ "لَا يُؤْمِنُونَ" پر ہوتا ہے۔ دیگر متعدد مقامات پر بھی واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے مخلص بندوں پر ابلیس کا کوئی بس نہیں چل سکتا۔ قرآن کریم نہ تو (مسلکِ رہبانیت یا تصوّف کی طرح) جذبات کو فنا کرتا ہے، (جذبات فنا ہو نہیں سکتے۔ وہ صرف دب جاتے ہیں جسے SUPPRE-SSION بلکہ REPRESSION کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ PERVERSION ہوتا ہے) اور نہ ہی انہیں بے باک ہونے دیتا ہے۔ وہ ان سے، اقدارِ خداوندی کی راہنمائی میں، تعمیری کام لیتا ہے۔

اس کے بعد قرآن، ابلیس کے ایک نہایت فریب انگیز حربہ کا ذکر کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ابلیس نے اپنی غلط روی اور معصیت کی ذمّہ داری قبول نہیں کی تھی، بلکہ کہا تھا کہ یہ سب خدا نے کرایا ہے، وہی اس کا ذمّہ دار ہے۔ وہ یہی سبق انسانوں کو پڑھاتا ہے۔ فرمایا:

ع ۲۸ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

ابلیس کا خطرناک حربہ

جب حیوانی جذبات انسان کو کسی بے حیائی کی بات پر آمادہ کرنا چاہیں، تو شروع شروع میں اُنہیں، اس کے لئے کچھ زور لگانا پڑتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کی باتیں دو ایک نسلوں تک متواتر آگے چلتی جائیں، تو پھر لوگوں میں وہ جھجک باقی نہیں رہتی۔ جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے اسلاف کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے، اور (چونکہ ہمارے اسلاف خدا کے احکام کو ہم سے بہتر جانتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ انہیں) اس قسم کا حکم خدا ہی نے دیا ہوگا۔

ان سے کہو کہ خدا بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیا کرتا۔ تم جس بات کا علم نہیں رکھتے اسے خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ جس بات کے لئے تم کہو کہ وہ شریعت خداوندی ہے، اس کے متعلق تمہیں خود علم ہونا چاہیئے کہ وہ واقعی ایسی ہے۔ یہ کہہ دینا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے، اس لئے جس بات کو انہوں نے خدا کا حکم کہہ دیا ہے وہ واقعی خدا کا حکم ہوگا، کوئی دلیل اور سند نہیں۔

ابلیس کے حربے۔ تقدیر اور تقلید دونوں

یہاں دیکھئے تقلید اور تقدیر دونوں کو ابلیسی حربے بتایا گیا ہے۔ (سابقہ جلدوں میں اِن موضوعات پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے)۔ اس کے ان دونوں حربوں سے محفوظ رہنے کا طریق یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ خدا کا اس باب میں ارشاد کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا کے ارشادات، اُس کی کتاب (قرآن) ہی سے مل سکتے ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ ہم (مسلمان) صدیوں سے، ابلیس کے ان دونوں پھندوں (تقدیر اور تقلید) میں جکڑے چلے آرہے ہیں! علاج اس کا کتاب اللہ سے راہنمائی حاصل کرنا تھا۔ اسے ہم نے "ایصالِ ثواب" کے لئے رکھ چھوڑا۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ

۷/۲۹ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۟ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝

اُن سے کہو کہ میرا نشوونما دینے والا اعتدال کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ اس لئے تم، نہ تو اپنے جذبات کا بے باکانہ اتباع کرو۔ نہ اسلاف کی روش کو بطور سند پیش کرو۔ تم اپنی تمام توجہات کو قوانینِ خداوندی پر مرکوز رکھو۔ اُن کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردو

اور اطاعت کو اسی کے لئے خاص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اس طرح تم پھر اسی جنتی زندگی کو حاصل کر لو گے جس سے انسانیت کا آغاز ہوا تھا۔ (اور جس کا ذکر اوپر قصۂ آدم میں کیا گیا ہے۔

مسجد کے معنی "سجدہ" کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۹۸ پر بتایا جا چکا ہے، اور "مسجد" کے متعلق جلد سوم صفحہ ۱۰ (نیز جلد اوّل صفحہ ۲۱۷) پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس آیت میں "مسجد" کا لفظ اطاعت گاہ کے لئے نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ مصدری معنوں میں آیا ہے جس کے معنی اطاعت کرنا ہیں۔

آیت میں كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ آیا ہے۔ یعنی جس قسم کے معاشرہ سے تمہاری ابتدا ہوئی

پلٹ کر وہیں چلو تھی، وہی معاشرہ پلٹ آئے گا۔ ہم (مسلمانوں کے لئے) اس سے مراد وہ معاشرہ ہے جسے قرآنی اقدار کی رو سے، محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا تھا، اور جسے "فرعون۔ ہامان اور قارون" کی سازشوں نے برباد کر دیا تھا۔ حضورؐ نے اپنے اس جنتی معاشرہ کے متعلق فرمایا تھا کہ

"اِن الزمان قد استداء کھیئۃ یوم خلق اللّٰہ السّمٰوٰت والارض۔
زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطہ پر آ گیا ہے جس پر اللہ نے اسے آغازِ کائنات کے وقت متعین کیا تھا۔"

(خطبۂ حجۃ الوداع)

یہ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ کی تفسیر تھی جنت سے نکلے ہوئے آدم کے لئے، جنت کی بازیابی کا اس کے سوا کوئی طریق نہیں کہ یہ حضور خاتم النبیینؐ کے نقوشِ پا کو خضرِ راہ بنائے۔ زمانہ نوعِ انسان سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے — وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

یہ وضاحت کرنے کے بعد کہا کہ

۷/۳۰ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم، سب کے سب، اس طریق کو اختیار نہیں کرو گے۔ تم دو گروہ بن جاؤ گے۔

ایک گروہ ہمارے قوانین کا اتباع کر کے زندگی کی سیدھی راہ پر گامزن رہے گا۔ دوسرا گروہ، اپنے جذبات یا اسلاف کی اندھی تقلید کی روش پر چلے گا؛ تو اس پر سعادت کی راہیں بند ہوجائیں گی۔ اس لئے کہ انہوں نے، اللہ کے قانون کو چھوڑ کر، دوسری قوتوں کو اپنا کارساز بنا لیا اور بزعم خویش سمجھتے رہے کہ ہم بالکل سیدھی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔

دو گروہ

اس آیت میں دو بنیادی نکات مجملاً بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں گروہ دو ہی ہیں، ایک وحیٔ خداوندی کے مطابق صحیح راستے پر گامزن، اور دوسرا گروہ جو دیگر راہوں پر چلے۔ انسانوں کی یہ تفریق و تمیز دو قومی نظریہ کی بنیاد ہے۔ یہ دونوں (باہمدگر متضاد اور متخالف گروہ) مل کر ایک قوم بن نہیں سکتے۔ (انڈکس میں قوم۔ قومیت اور دو قومی نظریہ کے عنوانات دیکھئے)

دوسرا نکتہ یہ کہ لوگ چلتے تو ہیں غیر خداوندی (شیطنت کے) راستوں پر، اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ انڈکس میں "حبطِ اعمال" کا عنوان دیکھئے جس سے واضح ہوجائے گا کہ جو لوگ "بزعم خویش" سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے نیک کام کر رہے ہیں، درحقیقت کسی خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں (سابقہ صفحات میں آیات (۷/۸-۹) کی تشریح بھی دیکھئے)

کھلے ہوئے ملحد

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو علانیہ، خدا۔ وحی۔ حیاتِ اُخروی کا انکار کرتے ہیں۔ عام طور پر انہیں ملحد یا (ATHEISTS) کہا جاتا ہے۔ یہ گمراہ تو ہوتے ہیں، لیکن خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ خود فریبی میں مبتلا مذہب پرست طبقہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ سراسر غلط راہوں پر چلتے ہیں، لیکن بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ حق و صداقت کے راستے پر گامزن ہیں۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (۱۶/۶۳ و دیگر متعدد مقامات) "شیطان ان کے (غلط) کاموں کو مزین (مستحسن) بنا کر دکھاتا ہے"۔ ملحدین سے عقل و بصیرت کی بنا پر (دلائل و براہین کی رُو سے) بات کی جاسکتی ہے، اور اگر وہ مطمئن ہوجائیں تو صحیح راستے پر آ بھی جاتے ہیں، لیکن مذہب پرست طبقہ کو راہِ راست پر لانا، ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتا ہے۔ وہ علم و بصیرت کی رُو سے بات کرنا تو ایک

اور فریب خوردہ مذہب پرست

طرف، بات سننے تک کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے، اور اسلاف کے راستے سے (جسے انہوں نے بغیر سوچے سمجھے محض تقلیداً اختیار کر رکھا ہوتا ہے) ایک قدم اِدھر اُدھر ہٹنے کو کفر و الحاد سمجھتے ہیں۔ یہ میرا مدّت العمر کا

ذاتی تجربہ ہے۔ مغرب کے (ATHEISTS) میرے ہاں آتے ہیں۔ ان سے دلائل و براہین کی رُو سے بات کی جاتی ہے۔ وہ نہایت اطمینان و سکون سے سُنتے ہیں، اور جب وہ مطمئن ہو جائیں، تو کُشادہ نگہی سے اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہب پرست طبقہ کے افراد آتے ہی لٹھ لئے ہوتے ہیں۔ مقصد اُن کا تلاشِ حقیقت نہیں ہوتا۔

ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی

اپنی بات کو دوسرے پر ٹھونسا ہوتا ہے۔ جب اُن سے حق و صداقت کی کوئی بات کہی جائے، تو اُن کا پہلا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ یعنی اس بات کے غلط یا باطل ہونے کی دلیل یا سند یہ ہے کہ اسلاف میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا۔ سوچئے کہ اس قسم کی ذہنیت والوں کو حق و صداقت کی کوئی بات بھی سمجھائی جا سکتی ہے؟ وہ آتے ہی اس ذہنیت کے ساتھ ہیں کہ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ اور جاتے بھی یہی ذہنیت لئے ہوتے ہیں۔ اور ساری عمر اپنے اس مسلک پر قائم رہتے ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ (جیسا کہ آیت ۶/۱۲۵ کی زیرِ تشریح بتایا جا چکا ہے) قبولیت حق و صداقت کے لئے "سینے کی کشاد" کس قدر ضروری ہے۔

دنیا سے نفرت

مذہب پرست طبقہ میں باہمی اختلافات ہزار ہوں، ایک چیز ان سب میں بطور قدرِ مشترک ملے گی، یعنی مادی دنیا سے نفرت اور زیب و زینت، آرائش و زیبائش کی چیزوں سے خدا واسطے کا بیر۔ اہلِ شریعت میں یہ بُغض و نفرت پھر بھی ایک حد تک ہوتا ہے، لیکن اربابِ طریقت (اہلِ تصوّف) میں یہ انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ آرائش و زیبائش ہی نہیں، وہ کھانے پینے کی چیزوں کو بھی (جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال و طیّب قرار دے رکھا ہے) اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں اور اس اجتناب و تنفر کو حصولِ قربِ خداوندی کے لئے لازم سمجھتے ہیں۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "تصوف کی حقیقت" میں ملے گی)۔ اُس نے ان باطل عقائد کی تردید کے لئے فرمایا:

۷/۳۱ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

ترکِ زینت کا مسلک خلافِ قرآن ہے

"اے نوعِ انسانی! (یہ تصوّر غلط ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے لئے ترکِ دُنیا، ترکِ لذّات، ترکِ زیبائش و آرائش ضروری ہے۔ دنیاوی زیب و زینت، اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں

ہوتی۔ اس کے برعکس) اس اطاعت سے خود زیب و زینت کے پہلو اُبھرتے ہیں، کیونکہ اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہونا ہے۔ لہٰذا، تم ان چیزوں سے ضرور فائدہ اٹھاؤ۔ کھاؤ۔ پیو۔ لیکن، اُن حدود کا خیال رکھو جو خدا نے مقرر کر رکھی ہیں۔ حدود شکنی، قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، "مسجد" کے معنی سجدہ (یعنی اطاعت) کرنا ہیں۔ ان معانی کی روشنی میں، یہ نکتہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اُس نے یہی نہیں کہا کہ زندگی کے عام معمولات میں بھی حسن و رعنائی (زیب و زینت) کو ملحوظ رکھو، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اطاعتِ خداوندی کی ہر روش میں، اسے بالخصوص اپنا معمول قرار دو، یعنی اطاعتِ خداوندی نہایت حُسن کارانہ انداز سے بجا لاؤ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اطاعتِ خداوندی

اطاعت سے زندگی حسین ہو جاتی ہے

خود تمہاری زندگی کو حسین بنا دے گی۔ آپ سوچیئے کہ اُس نے چار لفظوں میں کس طرح، ان باطل عقائد کی تردید کر دی جن کی رو سے ترکِ دُنیا، ترکِ زیب و زینت اور ترکِ لذّات کو قربِ خداوندی کی راہ میں رُکاوٹیں سمجھا جاتا تھا۔

اِن اشیاء کے استعمال کا حکم دینے کے ساتھ، یہ تنبیہ بھی ضروری سمجھی کہ لَا تُسْرِفُوْا۔ اسراف کا ترجمہ عام طور پر فضول خرچی کیا جاتا ہے۔ فضول خرچی (یعنی جتنی ضرورت ہو اُس سے زیادہ خرچ کرنا) بھی اسراف ہے (کیونکہ اس کے بنیادی معنی حد سے تجاوز کرنا ہیں) لیکن اس استعمال کی رُو سے اس لفظ کے معانی اس سے زیادہ وسیع ہیں۔ اس مفہوم کو ایک مثال کی رُو سے سمجھیئے۔ کھیتوں کو پانی دینے کے لئے نالیاں بنائی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان نالیوں کے اندر بہ کر پانی کھیت تک پہنچ جائے۔ اگر کسی نالی کا کنارہ (حد) راستے میں ٹوٹ جائے۔ تو یہ پانی کھیت تک پہنچنے کے بجائے راستے ہی میں بیکار بہ جاتا ہے۔ اسے بھی اسراف کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر کہ سامانِ زیست کو جس مقصد کے لئے عطا کیا گیا ہے، اسے اس مقصد کے حصول کے لئے صرف اور استعمال کرنا، جائز ہی نہیں، ضروری ہے۔ لیکن جسطرح اس سے اِجتناب اور نفرت کرنا، خلافِ مشیتِ خداوندی ہے۔ اُسی طرح اُن کے استعمال میں حدود سے بڑھ جانا، یا اُنہیں ضائع کر دینا بھی خلافِ منشائے ایزدی ہے۔

یہاں تک تو ان باطل عقائد کی تردید مقصود تھی۔ لیکن اگلی آیت میں اس قسم کے عقائد رکھنے والے کو چیلنج دیا گیا ــــ اور جس تحدّی سے یہ چیلنج دیا گیا ہے، اسی سے واضح ہے کہ اس قسم کے عقائد کسطرح غیظ و غضبِ خداوندی کا موجب ہیں۔ فرمایا:

۷ / ۳۲ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

زیب و زینت کو کون حرام قرار دے سکتا ہے؟

(اے رسول! تم ان ارباب شریعت اور مسلکِ خانقاہیت کے پیروکاروں سے پوچھو کہ) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو اور خوشگوار اشیائے خورد و نوش کو حرام ٹھہرا سکتا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ چیزیں، اس دُنیا کی زندگی میں، مومنین اور دوسروں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں (اور ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق جس کا جی چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے (۱۷ / ۲۰-۱۸))

لیکن اُخروی زندگی میں یہ مختص ہوں گی اُن کے لئے جنہوں نے ایمان و اعمالِ صالحہ سے اپنے آپ کو ان کا مستحق بنایا ہوگا (یعنی اہلِ جنت کے لئے)۔

اِس طرح ہم، اُن لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں اپنے قوانین واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں۔

اِن آیات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے جمالیاتی پہلو کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اِس موضوع پر میں نے، (مطالب الفرقان جلد اوّل میں) سورہ فاتحہ کے پہلے لفظ، حمد، کی تشریح کرتے ہوئے، ضمناً روشنی ڈالی تھی، لیکن ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے زیب و زینت کی چیزوں (بلکہ فنونِ لطیفہ) کے خلاف جس شد و مد سے اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "آرٹ اور اسلام"[۱]۔ اس کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں:

آرٹ اور اسلام

۱۔ گلاب کے پھول کے متعلق کسی طبیب سے پوچھئے۔ وہ بتائے گا کہ اس کا مزاج حار و یابس ہے اور تاثیر کے اعتبار سے مُلیّن اور مُدِر۔ خواص کی طرف آیئے تو یہ مقوی و مفرحِ قلب ہے اور جگر کی اصلاح میں بھی مدد دیتا ہے۔ اِس کے عرق اور گلقند کا شمار منفعت بخش

---

[۱] یہ مقالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔

ادویات میں ہوتا ہے۔ فطرت نے اس میں بڑے فوائد رکھے ہیں۔

جمالیاتی پہلو

لیکن یہی پھول جب ایک ایسے صاحبِ ذوق کی نگۂ حسن شناس کے سامنے آئے جسے فطرت نے حسِ لطیف سے نوازا ہو، تو اُسے اس کے اندر، دلکش رعنائیوں اور کیف آور زیبائیوں کی ایک دُنیا مسکراتی، مچلتی، کھیلتی، ناچتی دکھائی دے گی۔ اس کی نرم و نازک پتیوں کی لطافت۔ اس کی شفق آمیز رنگینیوں کی نظافت۔ اس کی نکہتِ جاں نواز کی عطر بیزیاں۔ اس کی شگفتگی و شادابی کی مسرت خیزیاں، ہر چشمِ جمال آشنا کو یہ کہہ کر دعوتِ نظارہ دیں گی کہ

مژہ برہم مزن، تا نشکنی رنگِ تماشارا

اور کشش و جذب کا یہ عالم، پھولوں تک ہی محدود نہیں۔ اس نگہ سے دیکھئے تو صحنِ چمنِ کائنات کا ایک ایک گوشہ، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا آئینہ دار نظر آئے گا۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں افادی پہلو (UTILITARIAN ASPECT) کے ساتھ جمالیاتی پہلو (AESTHETIC PHASE) موجود نہ ہو۔ سورج کی نور پاشیوں میں، چاند کی ضیا باریوں میں، ستاروں کی مرصع کاری میں، کہکشاں کی روشن نگاری میں، بادلوں کی سبک خرامی میں، نسیمِ سحر کی خوش پیامی میں، سمندر کی تلاطم خیزیوں میں، ندی کی سکوت آمیزیوں میں، سرو قامت درختوں کی پرشکوہ صف آرائی میں، اور ان کی طرف لپک کر آنے والے پرندوں کی نغمہ سرائی میں، غرضیکہ نگارخانۂ کائنات کی کسی شے کو لیجئے، اس میں منفعت بخشی کے ساتھ ساتھ، جمال آفرینی یوں سموئی ہوئی نظر آئے گی جیسے کسی خوبصورت، محوِ خواب بچے کے خاموش لبوں کی بہار آفریں مسکراہٹ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کی پروردگاری (نشو و نما۔ ربوبیت) کا ذمہ لیا، تو ضروری تھا کہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے سامانِ نشو و نما مہیا کیا جاتا۔ انسان کی ضروریات، طبیعی ہی نہیں، جذباتی بھی ہیں اور اس کے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے مہیا کردہ سامانِ نشو و نما میں افادی اور جمالیاتی دونوں عناصر موجود ہوتے۔ حیوان اور انسان میں ایک خطِ امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوان کے تقاضے صرف طبیعی ہوتے ہیں لیکن انسان کو ذوقِ جمالیات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ایک گائے کے نزدیک پھول اور گھاس، یکساں چارہ اور شکم پری کا سامان ہیں۔ لیکن انسان ان دونوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ حیوانی سطح سے ابھر کر، انسانی سطح پہ آچکا ہو۔

لیکن جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کے لئے چند قواعد وضوابط کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کی جذباتی زندگی کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے بھی حدود وقیود لاینفک ہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، وہ حدود وقیود متعین کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسان کی طبیعی اور جذباتی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے، انسان کے جسم اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں بھی جنت بداماں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی، مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں دو اصطلاحیں مروج ہیں ——— جلال اور جمال۔ جلال میں قوت بھی شامل ہے اور ہر شے کا افادی پہلو بھی، کیونکہ افادی پہلو کا صحیح استعمال، قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کے برعکس، جمال، کسی شے کا تحسینی پہلو ہے۔ یعنی اس کی (APPRECIATIVE VALUE)، اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔

۳۔ خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق کہا ہے:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲/۷)۔

(خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو حسین ترین انداز میں پیدا کیا ہے۔)

خدا کا عمل تخلیق

حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کے توازن و تناسب (PROPORTION) میں ذرا سا فرق آیا، اس کا حسن جاتا رہا۔ پسکال نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق بڑی تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ تم اس میں کہیں عدم توازن نہیں دیکھو گے۔ کسی شے کو غیر متناسب نہیں پاؤ گے۔ اس کے کہنے کا انداز ملاحظہ کیجئے۔ سورہ الملک میں ہے: مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ "تم خدائے رحمٰن کی تخلیق (اشیائے کائنات) میں کہیں کوئی جھول۔ کوئی سلوٹ۔ کوئی شکن نہیں دیکھو گے، کہیں عدم تناسب نہیں پاؤ گے"——— فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ "طائر نگاہ کے پر کھول کر اسے کائنات کی فضائے بسیط میں اذن بال کشائی دو اور پھر اس سے پوچھو کہ کیا اسے کہیں کوئی سقم، کوئی عیب، کوئی شگاف، کوئی بدنمائی دکھائی دی ہے؟"——— ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ "ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ سے کہو کہ وہ اچھی طرح دیکھے۔ خوب تلاش اور تجسس کرے"——— یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ

خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷/۴-۳) "وہ خاسر اور واماندہ۔ ناکام اور مایوس کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔ نگارخانۂ فطرت میں اسے کہیں کوئی سقم دکھائی نہیں دے گا۔"

۴۔ سورۂ نحل میں، افادی اور جمالیاتی پہلو، بڑے حسین انداز میں سامنے لائے گئے ہیں۔ پہلے کہا:

مویشیوں کی دُنیا

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۱۶/۵) "تم مویشیوں کو دیکھو۔ ان میں تمہارے لئے کس قدر فائدے کی چیزیں ہیں۔ ان کی اُون سے تم گرم کپڑے بناتے ہو۔ ان کا گوشت تمہارے کھانے کے کام آتا ہے۔" وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۝ (۱۶/۷) "ان میں جو باربرداری کے کام آتے ہیں، وہ تمہارا سامان اُٹھا کر دُور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ سامان خود اُٹھانا پڑتا، تو تم کس مصیبت میں پڑجاتے۔" وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا ۝ "پھر تم گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو دیکھو، وہ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں، وَزِيْنَةً (۱۶/۸) اور بعض ان میں سے تمہارے لئے سامانِ زینت بھی بنتے ہیں۔"

یہ سب کچھ گنانے کے بعد کہا کہ ان میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن اُس "کچھ اور" کے دیکھنے کے لئے نگۂ نظارہ جُو کی ضرورت ہے، کہ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶/۶) "ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھو کہ علی الصبح، تاروں کی چھاؤں میں، نور کے تڑکے، جب فضا کی آنکھیں ہنوز نیم خوابیدہ، نیم وا ہوتی ہیں، اور چاروں طرف سکوت کا عالم، اُس وقت جب تم ان مویشیوں کو چوپال سے نکال کر، باہر چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو، تو یہ منظر کس قدر جمال آفرین ہوتا ہے۔

اور پھر شام کے وقت، جب سورج تھک کر، پہاڑوں کی اوٹ میں سستانے چلا جاتا ہے۔ فضا پر چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا ہے۔ کھیت اُداس اور راستے خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو اس وقت جب تم ان مویشیوں کے گلّے کو چراگاہوں سے خراماں خراماں بستی کی طرف واپس لاتے ہو، تو یہ سماں بھی کس قدر کیف بار ہوتا ہے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶/۶) تمہاری نگاہیں ان کے افادی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں برف کی قاش نہیں دھڑکنے والا دل ہے، تو تم محسوس کرو گے کہ ان کے اس جمالیاتی پہلو کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ یہ بے بہا ہیں۔

آپ نے مویشیوں کے اس طرح چراگاہوں کی طرف جانے اور واپس آنے کے مناظر، کسی عظیم ترین مصوّر کے نادر شاہکاروں میں دیکھے ہوں گے اور بار بار پھر قرآن کریم کے ان چند الفاظ میں۔ ذرا چشمِ تصوّر سے کام لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان الفاظ کے محاکاتی اعجاز کے سامنے ہر نگۂ جمال آشنا جھک جھک نہیں جاتی؟

۵۔ جنّت کی نعماء

خدا نے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ جنّت بتایا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنّتی معاشرہ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنّت۔ اس جنّت کی جو تفاصیل قرآن کریم میں آئی ہیں ——— اس دنیا میں حقیقی معنوں میں اور اُخروی زندگی میں تمثیلی انداز سے جن کا بیان ہوا ہے ان پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حسن و زیبائش کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جو اس میں نہ آگیا ہو؟ سب سے پہلے محاکاتی انداز میں اس منظر کو سامنے لائیے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ۔ آبِ رواں کے کنارے، سبزۂ نورستہ، گھنیرے درختوں کی چھاؤں، بہار کا موسم جس میں نہ زیادہ سردی نہ گرمی۔ لَا یَرَوۡنَ فِیۡهَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِیۡرًا ۝ (۷۶/۱۳)۔ دوسری طرف، اعلیٰ درجے کے صوفے۔ حریر و اطلس کے پردے۔ نرم و نازک ریشم کے ملبوسات (۱۸/۳۱)۔ چاندی اور سونے کے برتن۔ بلوریں آبخورے سونے کے کنگن۔ موتیوں کے ہار {(۷۶/۱۵-۲۱) و (۴۳/۷۱)}۔ مختصراً یہ کہ مَا تَشۡتَهِیۡهِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ ۚ (۴۳/۷۱)۔ اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی آرزو انسان کرے اور جس سے نگاہیں لذت یاب ہوں۔ حتّٰی کہ فَهُمۡ فِیۡ رَوۡضَةٍ یُّحۡبَرُوۡنَ (۳۰/۱۵)۔ سرسبز و شاداب باغات میں نہایت شُستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ (اَلۡحَبۡرَةُ) میں حسن و جمال، زیبائی و رعنائی اور انبساط و مسرّت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں، خواہ وہ جنّتِ نگاہ ہوں یا فردوسِ گوش۔ یہ ہے وہ جنّتی معاشرہ جس کا وعدہ اس دنیا میں کیا گیا ہے اور جس کا تمثیلی بیان جنّتِ اُخروی کے سلسلہ میں قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ آپ سوچئے کہ زیب و زینت کی جن حسین و جمیل اشیاء کو قرآن نے جماعتِ مومنین کی حسن کارانہ زندگی کا ماحصل بتایا ہے، کیا انہی اشیاء کے استعمال کو خدا حرام قرار دے گا؟

نعمائے جنّت کی جن حسین و جمیل اشیائے زیب و زینت کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ہمارے اربابِ شریعت انہیں حرام قرار دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ خدا کبھی ایسا بھی کرے گا کہ جو چیزیں اس دنیا میں حرام ہوں، انہیں جنّتی زندگی میں حلال ہی نہیں، بلکہ اپنی طرف سے نعماء قرار دے دے؟ یہ حرمت

ہماری وضع کردہ ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے دُرد و صاف رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، ان کے لئے انڈکس میں "حرام و حلال" کا عنوان دیکھئے اس میں نظر آجائے گا کہ خدا نے تو تین چار چیزوں کو حرام قرار دیا تھا، لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے حرام و

حرام و حلال کی فہرستیں

حلال کی طول طویل فہرستیں مرتب کر رکھی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا تھا: مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط "وہ کون ہے جو خدا کی حلال قرار دادہ اشیائے زیب و زینت اور رزقِ طیّب کو حرام ٹھہرا دے؟" خدا پوری تحدی کے ساتھ یہ کہتا ہے، اور ہمارے اربابِ شریعت و طریقت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں!

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اہلِ تصوّف سرے سے اس دُنیا ہی کو قابلِ نفرت قرار دیتے اور اسے ترک کر دینے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس کا نام رکھتے ہیں "مغزِ دین"۔ اس کے متعلق انڈکس میں تصوّف کا عنوان دیکھئے۔[1]

اس کے بعد کہا کہ یہ لوگ تو خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام قرار دیتے ہیں۔ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ خدا نے کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے:

۲۳ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

خدا کی حرام کردہ

ان چیزوں کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا۔ جن چیزوں کو اُس نے حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:-

۱- ہر قسم کی بے حیائی کی باتیں، خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا پوشیدہ (عملاً ہوں یا ان کی آرزوئیں دل میں کروٹیں

---

[1] "تصوّف کی حقیقت" کے عنوان سے میری مستقل تصنیف بھی اب شائع ہو گئی ہے۔

لیتی رہیں)۔

۲۔ ایسے امور جن سے انسانی صلاحیتوں میں افسردگی اور اضمحلال پیدا ہو، اور عملی قوتیں مفلوج ہو جائیں۔

۳۔ دوسری طرف، ناحق سرکشی اور زیادتی۔

۴۔ خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرنا (اس کے قوانین کے ساتھ انسانی قوانین کو واجب الاتباع سمجھنا)۔
اس کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ (سند صرف منزل من اللہ ہو سکتی ہے)

۵۔ اور یہ کہ تم خدا کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو کہ وہ فی الواقع خدا کی ہیں (خدا کی باتیں قرآن کریم کے اندر ہیں۔ خارج از قرآن کہیں نہیں)

فواحش کا مفہوم

اس آیت میں "فواحش" کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق انڈکس، نیز سابقہ باب میں آیت ($\frac{6}{152}$)، کی تشریح دیکھئے۔ فواحش کے عام معانی تو بے حیائی کی باتیں ہیں، لیکن قرآن کریم نے بعض مذموم اور شنیع افعال کو بالتصریح فحش بتایا ہے۔ مثلاً آیت ($\frac{4}{15}$) میں عام بے حیائی کی باتوں کو فحش کہا گیا ہے۔ اور اس سے ملحقہ آیت ($\frac{4}{16}$) میں سحاقت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آیت ($\frac{4}{25}$) میں زنا کو فحش کہا گیا ہے[1] (نیز ($\frac{17}{32}$) میں)۔ آیت ($\frac{7}{80}$) میں لواطت کے متعلق بھی یہی لفظ آیا ہے۔ سورہ نور کی آیت ($\frac{24}{19}$) میں فاحشات کی نشر و اشاعت سے بھی منع کیا گیا ہے۔ قرآن نہایت سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ متشکل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن امور سے خدا منع کرتا ہے، اُن کا تخریبی اثر افراد تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ قوموں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ اسی لئے وہ اگلی آیت میں کہتا ہے کہ

$\frac{7}{34}$ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝

ہمارا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم صحیح نظام پر کاربند رہتی ہے، اُسے عروج حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ اس روش کو چھوڑ دیتی ہے، تو آہستہ آہستہ تنزل کی طرف چل جاتی ہے تا آنکہ وہ وقت آ جاتا ہے جب اس کا شمار زندہ قوموں میں رہتا نہیں۔ یہ اس قوم کی معیادِ زندگی کہلاتی ہے ($\frac{13}{38}$)۔ جب یہ وقت آ جاتا ہے تو اس قوم کی تدبیریں اور اسکیمیں اسے ذرا بھی آگے پیچھے نہیں کر سکتیں۔ ($\frac{15}{4-5}$)۔

---

[1] یہ آیات مطالب الفرقان جلد چہارم میں آ چکی ہیں۔

(ہمارا وہ قانون، جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ فلاح و بقا اُسی نظام کے لئے ہے جس میں تمام نوعِ انسان کی بہبود اور منفعت پیشِ نظر رہے۔ ۱۳/۱۷)

قوموں کے عروج و زوال سے متعلق اصول و قوانین کا ذکر سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر آچکا ہے۔ اس کے لئے انڈکس دیکھئے۔ (جن آیات کا حوالہ انڈکس میں دیا گیا ہے، ان کے علاوہ یہ آیات بھی اس موضوع سے متعلق ہیں (۹/۱۴؛ ۲۹/۳۸؛ ۴۰/۸۲؛ ۴۵/۲۳-۲۴؛ ۴۶/۲۶؛ ۵۹/۲)۔ "اور" "استبدال و استخلاف" کے سلسلہ میں، جو اسی موضوع کا دوسرا عنوان ہے۔ (۲/۷؛ ۲/۲۰۹؛ ۵/۵۴؛ ۹/۳۸؛ ۱۱/۵۷؛ ۲۱/۱۱؛ ۲۸/۵۸؛ ۴۷/۳۸؛ ۷۰/۴۰-۴۱)۔

قوموں کی اجل

اجل کا مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۵۳ (زیر آیت ۳/۱۴۴) آچکا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اجل کے معنی "موت کی گھڑی" نہیں، بلکہ وہ مُدت ہے جس میں ایک قوم زندہ رہتی ہے، اور یہ مُدت قوانینِ خداوندی کی رُو سے متعین ہوتی ہے۔ اور یہ ہر قوم کے اپنے بس کی بات ہے کہ وہ اپنی زندگی کی مُدت متعین کرے۔ جب تک کوئی قوم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی رہے گی، زندہ رہے گی جب ان سے سرکشی برتے گی، زوال پذیر اور بالآخر ختم ہو جائے گی۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸؛ ۱۵/۴-۵)۔ "ہر مُدت کے لئے قانون مقرر ہے۔"

بہائیوں کی غلط نگہی

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ سے نگاہ بہائیوں کی غلط نگہی یا کوتاہ فہمی کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں دو (کاذب) مدعیانِ نبوّت پیدا ہوئے۔ ایک مرزا غلام احمد (قادیانی) اور دوسرا بہاء اللہ (ایرانی)۔ مرزا غلام احمد نے کہا کہ وہ نبی تو ہے، لیکن کوئی کتاب نہیں لایا۔ (انڈکس میں مرزا غلام احمد۔ احمدی۔ کتاب کے عنوانات دیکھئے)۔ اس کے برعکس، بہاء اللہ نے کہا کہ قرآن ایک خاص مدّت تک نافذ العمل رہنے کے لئے دیا گیا تھا۔ وہ مدت ختم ہو گئی ہے۔ میں اس کی جگہ ایک نئی کتاب لایا ہوں۔ اور اس کے لئے سند، اس آیت سے پیش کی۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ——— اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ ہر کتاب کے لئے ایک اجل (میعاد) مقرر ہوتی ہے۔ علاوہ دیگر امور، خود اس آیت کے الفاظ، اس ترجمہ (یا مفہوم) کی تردید کرتے ہیں۔ آیت کے الفاظ یہ نہیں کہ لِكُلِّ كِتَابٍ اَجَلٌ۔ یعنی ہر کتاب کے لئے میعاد مقرر ہے بلکہ الفاظ ہیں ——— وَ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ——— "ہر میعاد کے لئے قانون مقرر ہے"۔

قرآن ابدی ضابطہ خداوندی ہے

قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ (۲/۱۷۵

و دیگر آیات)۔ اس لئے جب تک نوعِ انسان کا ایک فرد بھی کرۂ ارض پر زندہ رہے گا، قرآن زندہ و پائندہ رہے گا۔ اِس لئے اس کے لئے کوئی مدّت مقرر نہیں کی گئی، اور یہ بات "بنی آدم" سے شروع ہی میں کہہ دی گئی تھی۔

۳۵ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

اس کے متعلق ہم نے، انسان کی تمدنی زندگی کی ابتداء ہی میں، بذریعہ وحی کہہ دیا تھا کہ تمہاری طرف ہمارے پیغامبر آئیں گے جو ہمارے قوانین تم تک پہنچائیں گے۔ سو جو لوگ بھی ان قوانین کی نگہداشت کریں گے، اور زندگی اور کائنات کو سنوارنے والے کام کریں گے، اُن کے لئے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۳۳ (زیر آیت ۳۸/۲) آ چکی ہے۔ علاوہ ازیں انڈکس میں "خوف و حزن" کا عنوان بھی دیکھئے۔ ان کے برعکس:

۳۶ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

ان کے برعکس، جو قوم ان قوانین کو جھٹلائے گی اور ان سے سرکشی برتے گی، وہ تباہ و برباد ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گی۔

تکذیب کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے (دیکھئے انڈکس) ہم نے اُوپر جھوٹے مدعیانِ نبوّت کا اشارۃً ذکر کیا ہے۔ ان کے متعلق کہا۔

۳۷ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ○

یہ ہے وہ اصول جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوں گے۔ اور یہ قوانین ہماری

طرف سے بذریعہ وحی ملیں گے۔ انسانوں کے خودساختہ نہیں ہوں گے۔

مفتری علی اللہ اب یہ سوچو اس سے بڑا مجرم اور کون ہوگا جو اپنے جی سے باتیں گھڑے، اور انہیں قوانینِ خداوندی کہہ کر پیش کر دے۔ (اس طرح وہ نہ معلوم کتنے لوگوں کو تباہ کر دیگا)

دوسری طرف، اس سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا جس کے پاس ہمارے صحیح قوانین پہنچیں اور وہ انہیں

مکذبین جھٹلا دے۔ ایسے مجرمین کی گرفت یقیناً ہوگی، لیکن ہمارا قانونِ مہلت ایسا ہے کہ اس کی رُو سے اعمال کے نتائج کا ظہور، کچھ وقت کے بعد جاکر ہوتا ہے۔ اس دوران میں مجرمین بھی، باقی لوگوں کی طرح، قانونِ طبیعی کے مطابق، سامانِ زندگی سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوتی ہے ($\frac{۴۶}{۲۰}$)۔

جب ان کی گرفت ہوگی تو اُن سے پوچھا جائے گا کہ اب بتاؤ! وہ ہستیاں کہاں ہیں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ کہیں گے وہ تو اب کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ اسکے بعد، اُن کی حالت پکار پکار کر کہے گی کہ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کرتا ہے۔

قرآن کریم نے محاکاتی انداز میں بتایا ہے کہ جب جہنم میں لیڈر اور اُن کے متبعین (عوام) یا مذہبی رہنما اور اُن کے معتقدین اکٹھے ہوں گے، تو وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ وہ ان کی وجہ سے

جہنم میں بازپرس عذابِ جہنم میں ماخوذ ہوئے ہیں۔ اس کا اجمالی ذکر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۹ (زیر آیت $\frac{۵}{۴۷}$) کیا گیا ہے[ل]۔ اس مقام پر قرآن نے کہا کہ یہ صورت افراد ہی کی نہیں کہ وہ اپنے مقتداؤں اور لیڈروں کی اندھی تقلید سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی بھی یہی حالت ہے۔ جو قوم ترقی یافتہ ہو، کمزور اور پس ماندہ قومیں اُس کی ہر روش کی تقلید کو اپنے لئے مایۂ ناز سمجھتی ہیں، اور آخرالامر اسی جہنم میں جا گرتی ہیں، جس میں وہ ترقی یافتہ اقوام گر کر تباہ ہوتی ہیں۔ اگلی آیات میں ان کے مکالمہ کا ذکر ہے:

[ل] کتابت کی غلطی سے وہاں مکاّر کو مقالہ، اور مکالمات کو مقالمات لکھا گیا ہے۔ قارئین اپنی کتاب میں تصحیح فرمالیں۔

ے ۳۹-۳۸ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ
فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا
فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا
فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا
تَعْلَمُونَ ○ وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا
مِن فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ○ ع

ایسی قوموں سے کہا جائے گا کہ اب تم بھی، ان مہذب اور غیر مہذب قوموں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ، جو اس سے پہلے، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کر کے، تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

جہنم میں قوموں کا مکالمہ

قوموں کی حالت بھی عجیب ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تقلید کرتی ہے لیکن، جب، کچھ عرصہ بعد، یہ بھی اسی گڑھے میں جا گرتی ہے جس میں پہلی قوم گری تھی، تو یہ (بعد میں آنے والی قوم) پہلی قوم کو ملعون کرنے لگ جاتی ہے کہ اُس کی وجہ سے اس کا بھی ایسا حشر ہوا۔ اس طرح قومیں تباہی کے جہنم میں اکٹھی ہوتی رہتی ہیں (تاریخ اقوام اس کی شاہد ہے)۔ بعد میں آنے والی قومیں، ہمیشہ پیش رو قوموں کو موردِ الزام قرار دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ، اے ہمارے نشوونما دینے والے! ان قوموں نے ہمیں بھی گمراہ کر دیا تھا۔ اس لئے انہیں دُگنا عذاب دینا۔ (ایک عذاب، اُن کی

سب کو دُگنا عذاب

اپنی گمراہی کی وجہ سے، اور دوسرا، اس لئے کہ انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا) انہیں جواب ملتا ہے، تم سب کو دُگنا ملے گا ——— گمراہ کرنیوالوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے، اور گمراہ ہونے والوں کو اس لئے کہ انہوں نے، اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے کی بجائے، اُن کی اندھی تقلید کیوں کی۔ نیز اس لئے بھی کہ یہ بھی تو بعد میں آنے والی قوموں کے لئے گمراہی کا موجب بنی تھیں)

اور پہلی قومیں، بعد میں آنے والی قوموں سے کہتی ہیں کہ، محض اس بنا پر کہ تم نے از خود کوئی غلط نظام وضع نہیں کیا تھا، بلکہ ہمارے قائم کردہ نظام پر چلتی رہی تھیں، تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں مل سکتی۔ اس لئے تم اپنے جرائم کی سزا بھگتو۔ یہ کیوں کہتی ہو کہ تمہارے جرائم کی سزا بھی ہم ہی بھگتیں؟

تاریخِ انسانیت، اقوامِ عالم کی انہی کیفیات کی داستان ہے۔ مختلف قوموں کی طرح، ایک قوم میں

لیڈروں اور اُن کے متبعین کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ دیکھئے (۳۳/۶۸)؛ (۳۴/۳۱-۳۴)؛ (۳۷/۲۷-۳۳)؛ (۳۸/۵۹-۶۱) اور (۴۰/۴۷-۴۸)۔

یہاں جو کہا گیا ہے کہ پسماندہ (مقلد) قوم کہے گی کہ ان کی پیش رو قوم کو دوہرا عذاب دیا جائے، تو یہی بات لیڈروں اور عوام کے مکالمہ کے سلسلہ میں کہی گئی ہے۔ (۳۳/۶۸)۔ مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۹ پر ہم نے اُن کی اس استدعا اور خدا کی طرف سے اُس کے جواب کا ذکر کیا ہے۔ انڈکس میں تقلید اور مکافاتِ عمل کے عنوانات دیکھئے اور سوچئے کہ قرآن کریم کس طرح ہر فرد اور ہر قوم کو اس کا مکلف ٹھہراتا ہے کہ وہ وحی کی روشنی میں اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر صحیح اور غلط میں خود تمیز کرے۔ اُن کا یہ عذر کہ ہم نے فلاں (بزرگ، لیڈر یا قوم) کا اتباع کرتے ہوئے غلط راستہ اختیار کیا تھا، قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و فکر کی روشنی عطا کی ہے، اور سے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اگر کوئی فرد یا قوم وحی کی روشنی اور اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتی، اور آنکھیں بند کرکے دوسروں کے پیچھے چلی جاتی ہے، تو وہ بھی قابلِ مؤاخذہ ہے۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا انسان کو خود موردِ جہنم بنا دیتا ہے (۷/۱۷۹)۔ اُنہیں دوہرا عذاب اس بنا پر ہے کہ ایک تو وہ غلط راستے پر چلے اور دوسرے اُنہوں نے اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیا۔ اُن کا انجام کیا ہوتا ہے، فرمایا:

(۷/۴۰-۴۱) إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ○ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ○

حقیقت یہ ہے کہ جو قوم بھی قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرے گی اور ان سے سرکشی برتے گی (خواہ وہ ازخود ایسا کرے، یا دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی، یہ روش اختیار کرلے)، وہ کبھی زندگی کی ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب نہیں ہوسکے گی جو خدا کے متعین کردہ آسمانی نظام کے اتباع کا فطری نتیجہ ہیں (۵/۶۶ ؛ ۷/۹۶)۔ ان کا معاشرہ کبھی جنتی معاشرہ نہیں بن سکے گا۔ یہ ایسا ہی ناممکن ہے جیسا (محاورہ کے الفاظ میں) کسی موٹے رسّہ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا۔ مجرمین کی غلط روش کے نتائج ایسے ہی ہوتے ہیں۔ (۴۰)

ایسی قوموں کا اوڑھنا بچھونا، جہنم کا عذاب ہوتا ہے۔ ظلم و سرکشی کا نتیجہ یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ (۴۱)

تکبر و تکذیب — یہاں تکذیبِ آیات اور استکبار، دو جرائم بتائے گئے ہیں۔ استکبار تو کھلے بندوں اقدارِ خداوندی سے انکار کر کے، علی الرغم ان کے خلاف نظام قائم کرنا ہے۔ جیسے اقوامِ مغرب کی سیکولرازم۔ تکذیب یہ ہے کہ زبان سے اِن اقدار کی صداقت کا اعتراف کیا جائے، اور عملاً اُن کی خلاف ورزی کی جائے۔ جیسے ہمارے ہاں کی سیکولرازم۔ (اس کی تشریح، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۳۶ اور جلد سوم صفحہ ۴۳۳ پر کی جاچکی ہے)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ "اُن کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے"۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۷/۹۶)۔

"اگر یہ بستیوں والے ایمان و تقویٰ کا شعار اختیار کرتے تو اِن پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن انہوں نے قوانینِ خداوندی کی تکذیب کی، تو اپنے غلط اعمال کی پاداش میں پکڑے گئے"۔

مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۲۹ پر آیت (۵/۶۶) کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ زمینی دروازوں کا

زمین اور آسمان کے دروازے — کھُل جانا، رزق کی فراوانی ہے، اور آسمانی دروازوں کے کھُل جانے سے مُراد ہے ہدایتِ خداوندی کا مل جانا،

سابقہ جلدوں میں "معاشی نظام" کا عنوان دیکھئے۔ زمین و آسمان کے ربطِ باہمی کا نام اسلام ہے۔ یعنی ارضی معاملات (انسانی زندگی) کو وحیِ خداوندی کے تابع رکھنا۔ اقبالؒ اسے "عشق اور زیرکی کا آمیزہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ جاوید نامہ میں ہے:

غربیاں را زیرکی رازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ (صفحہ ۱۷)

اِن کے برعکس:

(۷/۴۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جو قوم ہمارے قوانین کی صداقت کو تسلیم کرے گی اور ہمارے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوگی، تو اُن کا معاشرہ، جنّتی معاشرہ ہوگا ——— اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ———

وہ اسی میں رہیں گے۔ اُنہیں ہمارے قوانین کی اطاعت میں، اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن ان پابندیوں سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اِن کی ذات کی وسعتیں بڑھ جائیں ——— صحیح نظام قائم کرنے کے لئے یہ بنیادی شرط ہے۔ (۲/۲۸۶ ؛ ۶/۱۵۲ ؛ ۲۳/۶۲)۔

"لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" کی وضاحت، مطالب الفرقان جلد سوم میں کی جا چکی ہے علاوہ ازیں سابقہ باب میں زیر آیت (۶/۱۵۲) بھی یہ موضوع آچکا ہے۔ اگلی آیت میں، ان اہلِ جنّت کی ایک خصوصیت بتائی گئی ہے جس میں انسانی نفسیات کی وسعتیں سمٹ کر آگئی ہیں۔ فرمایا:

۷/۴۳ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (نیز ۱۵/۴۷)

اس جنّتی معاشرہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے بغض، کینہ، عداوت، سازش، مکر و فریب، غرضیکہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جسے انسان دوسرے سے چھپا کر رکھنا چاہے (۱۵/۴۷)۔ اس معاشرہ کی شادابیاں سدا بہار ہوں گی، جنہیں دیکھ کر وہ بے ساختہ پکار اُٹھیں گے کہ کس قدر در خورِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہماری راہنمائی اس حسین منزل کی طرف کر دی۔ اگر ہمیں یہ راہنمائی نہ ملتی، اور اسے اختیار نہ کرتے، تو کبھی اس مقام تک نہ پہنچ سکتے۔ خدا کے جو پیغامبر ہماری طرف آئے تھے، وہ حقیقی تعلیم لے کر آئے تھے، اور اُنہوں نے جو کچھ کہا تھا، بالکل سچ کہا تھا۔ وہ واقعہ ہو کر رہا۔

اُنہیں آواز دی جائے گی کہ (پہلی "جنّت" انسان کو بے مزدِ معاوضہ ملی تھی، اس لئے اس نے اس کی قدر نہ کی، اور وہ اس سے چھن گئی۔ لیکن) یہ جنّت، تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ تم سے نہیں چھینی جائیگی اس کا ہم نے تمہیں وارث بنا دیا ہے۔ اسے تم نے اپنے خونِ جگر کے عوض خریدا ہے۔

اِن کے دلوں سے غِلٍّ کو نکال دیا جائے گا۔ مادہ (غ۔ل۔ل) کی رُو سے اِس کے معنی ہوتے ہیں وہ چیز جس سے جکڑ کر کسی کو قید کر دیا جائے۔ مَغْلُوْلٌ۔ قیدی یا جکڑے اور بندھے ہوئے کو کہتے ہیں۔

غِلّ کے معنی

اَلْغِلُّ ۔ دل میں چھپی ہوئی دشمنی کو کہتے ہیں ۔ اس مادہ میں چھپا کر رکھنے کا پہلو غالب ہوتا ہے ۔ اس مقام پر جس مفہوم کے لئے یہ لفظ آیا ہے، اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی ۔

جنتی زندگی

غِلّ کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے ۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے ۔ یہ ہے مفہوم غِلّ سے ۔ جنتی معاشرہ کی اوّلیں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غِلّ نہیں ہوگا ۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے گا یہ گرہیں کھول دی جائیں گی ——— اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (۱۵/۴۷) ۔

اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ "وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے" لیکن لفظ سُرُرٍ کا مادہ (س ۔ ر ۔ ر) ہے، جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں ۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو ۔

يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۲۵/۷۵)

"وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے" یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا ۔ اس کے برعکس جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ (۳۸/۵۹) "وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے (بظاہر نہایت خندہ پیشانی سے) پیش آتے ہیں، لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے ۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے، اس لئے کہ ان کے دلوں میں غِلّ بھرا ہوتا ہے"

انتزاعِ غِلّ

اس غِلّ کے نکالنے میں ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غِلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا ۔ جیسے پھانس نکال دی جائے ۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں ۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے ۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض سمجھ کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے ۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا ۔ اب ماہرینِ علم النفس

(PSYCHOLOGISTS) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز گرہ گیر ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی شکل اختیار کر لیتا ہے ـــــــ پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی، لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان، تحت الشعور میں پیوست، پھانسوں کا علاج تجزیۂ نفس کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح "کھینچکر" باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریقِ علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آئیے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے: وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳)۔ "ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائیگا۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سِرِّ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی اُنکے شرحِ صدر کی۔

ہدایتِ خداوندی

دوسری بات (۷/۴۳) میں یہ کہی گئی ہے کہ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ "اگر ہمیں خدا کی طرف سے راہنمائی نہ ملتی تو ہم اس مقام تک کبھی نہ پہنچ سکتے"۔ اس سے واضح ہے کہ ہدایت (راہنمائی) صرف وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ملے، اور جواب اُس کی کتاب قرآن مجید میں محفوظ ہے۔

وراثتِ جنت

اور تیسری بات یہ کہ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ "یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اعمال کے نتائج میں مالک بنایا گیا ہے"۔ یعنی جنت صرف انسان کے اپنے اعمال کے بدلے میں مل سکتی ہے۔ اس اعلانِ خداوندی نے، سفارشوں اور شفاعتوں کے تمام غیر قرآنی معتقدات کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی، جہنّم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بلکہ اس سے بھی زیادہ معنی خیز کہ ـــــ جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اِس کے بعد اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے مابین ایک مکالمہ کا ذکر ہے[1]۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر واضح کیا جاچکا ہے، ہم اس زندگی میں، یعنی اپنے شعور کی موجودہ سطح پر، اُخروی زندگی کی کنہ وحقیقت کو سمجھ نہیں سکتے اس لئے قرآنِ کریم میں اُن کیفیات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مثالوں کی رُو سے، ہم اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق اُس زندگی کا کچھ تصوّر اپنے ذہن میں قائم کرسکتے ہیں۔ لیکن وہ ہمارے فہم و ادراک کا تخلیق کردہ تصوّر ہوگا، حقیقت نہیں ہوگی۔ جہاں تک اس دنیا کی جنّت اور جہنّم کا تعلق ہے، اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جنّتی معاشرہ دیکھنے کی، تو ہمیں سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ جہنّم میں ہم خود رہتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد اگلی آیت دیکھئے:

(۷/ ۴۵-۴۴) وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدْتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا‌ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ‌ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَۙ ۝ الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا‌ۚ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ‌ ۝

اور یہ (اہلِ جنّت)، جہنّم والوں کو پکار کر کہیں گے کہ ہمارے نشوونما دینے والے نے ہم سے جو وعدے کئے تھے، ہم نے انہیں اپنے سامنے ٹھیک ٹھیک دیکھ لیا ہے۔ وہ سب پورے ہوگئے ہیں۔ کہو! کہ جو کچھ خدا تم سے کہا کرتا تھا (کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا) وہ بھی ٹھیک نکلا یا نہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہاں! بالکل ٹھیک نکلا۔ وہ سب نتائج، ایک ایک کرکے، ہمارے سامنے آگئے۔

اِن کے درمیان ایک پکارنے والا پکارے گا کہ یہ بات پہلے ہی کہہ دی گئی تھی کہ جو قوم قوانینِ

---

[1] ان کے مکالمات کا ذکر دیگر مقامات پر بھی آیا ہے۔ دیکھئے: (۷/ ۵۰)؛ (۳۷/ ۵۱-۵۰)؛ (۵۷/ ۱۴-۱۳)؛ (۷۴/ ۴۲-۴۰)

خداوندی سے سرکشی اختیار کرے گی، وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گی۔ سو وہ ہو کر رہا۔
یعنی وہ قوم جو خدا کی طرف لے جانے والی راہ ——— خدا کے نظامِ ربوبیت کے راستے ——— میں روک بن کر کھڑی ہو گی اور انسانیت کو اس کی طرف آنے نہیں دے گی ——— اور ایسے سیدھی راہ میں پیچ و خم پیدا کرے گی۔ یہ لوگ درحقیقت نہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان رکھتے تھے، اور نہ ہی انہیں حیاتِ اُخروی پر یقین تھا۔

دونوں کے درمیان پردہ

اگلی آیت میں کہا ہے: بَيْنَهُمَا حِجَابٌ "ان دونوں کے درمیان ایک حجاب (پردہ) ہوگا۔ سورہ بنی اسرائیل میں اسے حِجَابًا مَّسْتُوْرًا کہا گیا ہے (۱۷/۴۵)۔ یعنی وہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوگا، اسے دیکھا نہیں جا سکے گا اس پردے کا تجربہ تو ہم یہاں ہر روز کرتے ہیں۔

حیوانات میں آپ دیکھئے۔ کسی ایک نوع کی شکل و صورت دوسری نوع سے نہیں ملتی۔ اس لئے وہ ایک دوسرے سے دھوکا نہیں کھاتے۔ بکری کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ جو سامنے سے آرہا ہے، ہرن ہے، اس لئے وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ اور وہ بھیڑیا ہے جو مجھے کھا جائے گا۔ لیکن نوعِ انسان کی صورت یہ ہے کہ اس میں ہر فرد، انسانی شکل لئے ہوتا ہے، اس لئے ہم انسانی ہرن اور بھیڑیا میں تمیز نہیں کر سکتے، اور ہر شاطر اور چالاک "درندہ انسان" سے مار کھاتے ہیں۔ اس طرح انسان اور انسان کے درمیان ایک "حجاب مستور" ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسا کچھ جہنمی معاشرہ میں ہوتا ہے۔ جنتی معاشرہ میں ایسا کوئی حجاب نہیں ہوگا (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کے سینے سے غلّ نکال دیا جاتا ہے، جس سے ان کا ظاہر و باطن یکساں ہو جاتا ہے۔ کیا اطمینان بخش ہوگا وہ معاشرہ جس میں بھیڑیا اور ہرن دُور سے پہچانے جائیں، اور کوئی کسی سے دھوکا نہ کھائے۔ وہاں مجرم، شریف انسانوں سے الگ کھڑے ہوں گے (۳۶/۵۹)۔ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۴۶/۷)۔

ان (اہلِ جہنم، ظالمین) میں دونوں گروہ شامل ہیں۔ ایک وہ جو کھلے بندوں لوگوں کو خدا کی طرف

مذہبی پیشوا

لے جانے والے راستے سے روکتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اس راہ میں پیچ و خم پیدا کر دیتے ہیں۔ راستہ بظاہر وہی ہوتا ہے، لیکن وہ صراطِ مستقیم نہیں ہوتا۔

اس میں ہزار پیچ وخم ہوتے ہیں جو راہ رو کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ، غیر مسلموں کا ہے اور دوسرا گروہ مذہبی پیشواؤں کا جو کہ اوّل الذکر سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بھیڑیا ہوتا ہے تو بھیڑیئے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ بھیڑیا، بکری کی کھال اوڑھے ہوتا ہے۔

ضمناً۔ اَلْعَوَجُ ("ع" کے زبر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے نظر آجائے اور اَلْعِوَجُ (عین کے زیر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن کو جو آنکھوں سے دیکھا نہ جاسکے، عقل و بصیرت کی رو ہی سے نظر آسکے۔ قرآن کریم نے عِوَجًا کہا ہے (عین کے زیر کے ساتھ)۔ اس سے واضح ہے کہ مذہبی پیشوائیت، دین کے راستے میں کس قسم کا پیچ وخم پیدا کرتی ہے۔ ہم اسی پیچ وخم میں الجھائے ہوئے راہرو راہِ وجہات ہیں۔

اَلْعَوَجُ اور اَلْعِوَجُ میں فرق

سورہ حدید میں منافقین اور اہلِ ایمان کے درمیان حائل شدہ دیوار کا ذکر ہے جس کے باطن میں رحمت ہے اور ظاہر میں عذاب (۵۷/۱۳)۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ اس کے بعد ہے:

۷/۴۶ وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝

جنّت اور دوزخ کی زندگی کا فرق تو اس قدر نمایاں ہے، لیکن کفر اور ایمان کے درمیان ایک اوٹ سی ہی ہوتی ہے ذرا نگاہ میں تبدیلی ہو جائے تو انسان اِدھر سے اُدھر چلا جاتا ہے (۵۷/۱۴-۱۳) ؛ (۱۷/۴۵)۔

جنّتی معاشرہ کے اربابِ نظم و نسق جو اپنے کردار اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے بلند مقامات پر ہوں گے (۲/۱۴۳ ؛ ۴/۱۴ ؛ ۵۶/۱۰-۱۱)۔ مختلف لوگوں کے انداز و رجحان سے جانچ لیں گے کہ ان کا رُخ کس سمت کو ہے۔ وہ ان لوگوں سے، جو ہنوز اس معاشرہ میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن جو اس کی آرزو دل میں رکھتے ہوں گے، آگے بڑھ کر کہیں گے کہ (تمہیں انتظار کس بات کا ہے!) آگے بڑھو اور اس معاشرہ میں داخل ہو جاؤ تاکہ تمہیں بھی ہر طرح کی سلامتی حاصل ہو جائے۔

اہلِ اعراف

حجاب کے متعلق پہلے لکھا جاچکا ہے۔ اس آیت میں تشریح طلب مقام اہلِ اعراف کا ہے۔ عرف (معرفت) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کرلینا۔ یہ اربابِ علم و بصیرت کی اہم خصوصیت ہے" کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت"

اسی اعتبار سے یہ لفظ رفعت و بلندی کے لئے بھی آتا ہے۔

ہمارے ہاں عام تصوّر یہ ہے کہ جنّت اور دوزخ کے بین بین ایک مقام ہوگا جس میں وہ لوگ ہونگے جن کی قسمت کا ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہوگا۔ کہ انہیں جنّت میں بھیجا جائے گا یا دوزخ میں یعنی یہ وہ لوگ ہونگے جن کے مقدمہ کا فیصلہ التوا میں رکھا جائے گا اور اس کا انہیں انتظار ہوگا۔

لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔ قرآن کریم نے دو ہی گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (۴۲/۷)۔ "ایک گروہ جنّت میں، اور ایک جہنّم میں"۔ اس میں کسی تیسرے گروہ کا ذکر نہیں ویسے بھی، قانونِ مکافات کی رُو سے یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ عدالتِ خداوندی کسی کا حتمی فیصلہ نہ کرسکے، اور اسے انتظار (SUSPENSION) میں رکھے۔

اس لفظ کے جو معانی اوپر بتائے گئے ہیں، ان کی رُو سے تو یہ لوگ اہل جنت میں بھی بلند اور ممتاز مقام کے حامل نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں ان کے متعلق کہا گیا ہے: وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۝ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ (۵۶/۱۰-۱۲)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اُخروی زندگی کی کیفیات کو ہم اپنی موجودہ زندگی کی سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ انہیں مثالوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے (کم از کم) میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اہلِ اعراف سے کون لوگ مراد ہیں۔ البتہ جہاں تک اس دُنیا کی جنّتی زندگی (قرآنی معاشرہ) کا تعلق ہے، بات واضح ہے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو، باقی نوعِ انسان کے مقابلے میں، بڑا بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ انہیں شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) کہہ کر پکارا ہے، اور رسول اللہؐ کو تمام اقوامِ عالم کے نمائندوں پر نگران (۴/۴۱) تفصیل کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹۰ آیت (۲/۱۴۳) اور جلد چہارم صفحہ ۳۲۳ دیکھئے۔ یہ کہ اہلِ اعراف سے مُراد "اُمتِ محمدیہ کے اربابِ علم و بصیرت ہیں" اس سے بھی واضح ہے، جو اُنکے متعلق کہا گیا ہے کہ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ (۷/۴۶)۔ "وہ سب کو اُن کے آثار و کوائف سے پہچان لیں گے"۔ میں نے انہی معانی کی رُو سے آیات (۷/۴۶-۴۹) کا مفہوم متعین کیا ہے۔ اس لیے ان کے صرف مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

۷/۴۷ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

یہ لوگ (جو ہنوز انتظار میں تھے) جب اُن لوگوں کی حالت پر نظر ڈالیں گے جو جہنمی معاشرہ میں گرفتار ہونگے تو وہ (فوری فیصلہ کریں گے اور) پکار اُٹھیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اِن لوگوں کے ساتھی نہیں بننا چاہتے جنہوں نے تیرے قوانین سے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

اِس کے بعد ہے:

۷/۴۸-۴۹ وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡكُمۡ جَمۡعُكُمۡ وَ مَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ۝ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡكُمۡ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ۝

پھر وہ اربابِ نظم و نسق (اعراف والے) دوسری روش کے حامل لوگوں سے کہیں گے، جنہیں وہ انکے انداز و رُجحان سے پہچان لیں گے، کہ دیکھو! تمہاری سرمایہ داری تمہارے کسی کام نہ آسکی، نہ ہی وہ قوت و اقتدار جس کی بنا پر تم قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتا کرتے تھے۔

(وہ جنّت میں جانے والوں کی طرف اشارہ کرکے، اِن جہنم والوں سے کہیں گے کہ) کیا یہ وہی لوگ نہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اُنہیں کبھی خدا کی رحمت نصیب نہیں ہوسکے گی۔ دیکھو آج اِنہی لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم پر جنّت کے دروازے کھلے ہیں، تمہیں اِس میں نہ کسی کا خوف ہوگا نہ حزن۔

اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے مکالمات کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی میں ایک اور اضافہ ہے:

۷/۵۰ وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ ۝

اور جہنمی معاشرہ والے، جنّتی معاشرہ والوں سے کہیں گے کہ یا تو ان زندگی بخش ذرائع نشوونما میں سے، جو تمہیں میسّر ہیں، ہمیں بھی دے دو تاکہ ہماری کھیتیاں بھی سیراب ہو جائیں۔ یا جو سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے اُس میں سے تھوڑا سا ہمیں عطا کردو (۱۲/۵۷) وہ کہیں گے کہ یہ چیزیں تو قوانینِ خداوندی پر ایمان لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا فطری نتیجہ ہیں۔ اُنہیں ان کی طرف منتقل کیا ہی نہیں جا سکتا جو ان قوانین سے انکار کرنے اور سرکشی برتتے ہوں۔ (جو اپنی آنکھیں بند کر رکھے، اُسے دوسرے کی بینائی کچھ فائدہ

نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کوئی شخص اپنی بصارت دوسرے کی طرف منتقل کر سکتا ہے)۔

یہ وہ لوگ ہیں:

۷/۵۱ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝

یہ لوگ (جو ان نعمائے خداوندی سے یوں محروم رہ گئے ہیں) وہ ہیں جنہیں طبیعی زندگی کی نگاہ فریب جاذبیتوں نے ایسا دھوکا دیا کہ انہوں نے اس حقیقت پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا کہ نظریۂ حیات

اپنے دین سے مذاق کرنے والے

اور اس نظام کو، جس کے مطابق انسان زندگی بسر کرتا ہے، کس قدر اہمیت حاصل ہے (۶/۷۰)۔ انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کا منتہی یہی دنیوی زندگی نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ سو یہ لوگ، بلند انسانی زندگی کے شرف و اعزاز سے اسی طرح محروم رہ جائیں گے جس طرح یہ اس زندگی کے وجود سے منکر تھے، اور ہمارے قوانین سے، محض ضد اور تعصب کی بنا پر، انکار کیا کرتے تھے۔

اپنے یا دوسرے کے دین کا مذاق اڑانے والوں کے متعلق تفصیلی طور پر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۳۲ آیات (۵/۵۸-۵۷)، نیز سابقہ باب میں زیر آیات (۶/۷۰-۶۸) دیکھئے۔

سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط پوری کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ قوم عقل و بصیرت کی رو سے بات سمجھنے کے قابل ہو، اور دوسری یہ کہ اس تک صحیح بات (قوانینِ خداوندی) پہنچ چکی ہو۔ یہاں ان اہلِ جہنم سے یہی کہا گیا ہے:

۷/۵۳-۵۲ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ع

ان تک ہدایت پہنچ چکی تھی

(اے رسولؐ! ان مخاطبین سے کہہ دو کہ) ہم نے انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیا ہے جو ہر بات کو، علم و حقیقت کی بنیادوں پر، کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر یقین رکھیں، سامانِ ہدایت و رحمت اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہ لوگ (جو اس قدر واضح حقائق پر بھی ایمان نہیں لاتے) کیا اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی غلط روشِ زندگی کے جس تباہ کُن انجام کی اُنہیں خبر دی جا رہی ہے، وہ اُن کے سامنے آجائے (تو پھر اُس پر ایمان لائیں؟) ــــ ($\frac{۹:۱}{۳}$)

ان سے کہہ دو کہ جب غلط روش کا انجام سامنے آکھڑا ہوگا، تو وہ لوگ جنہوں نے اُسے آج یوں فراموش کر رکھا ہے، پکار اُٹھیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، جو پیغامبر آئے تھے وہ واقعی حق پر تھے۔ اُس وقت وہ تلاش کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی سفارشی ایسا مل جائے جو ہمیں اس عذاب سے چھڑا دے۔ یا ہم پیچھے لوٹا دیئے جائیں تو ہم جو کچھ (غلط) کام کیا کرتے تھے، اُن کے برعکس کام کر کے دکھا دیں۔ لیکن اُس وقت یہ باتیں قطعاً فائدہ نہیں دیں گی۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر لیا اور اُن کا ساختہ پر داختہ اُن کے کسی کام نہ آیا۔

یہاں پہلی بات تو قرآن کریم کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ نہایت واضح کتاب ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ دوسری بات یہ کہ انہیں کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ملے گا۔ (انڈکس میں شفاعت کا عنوان دیکھئے)۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ کہیں گے کہ ہمیں دنیاوی زندگی کی طرف لوٹا دیا جائے تاکہ ہم اچھے کام کر سکیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، مرنے کے بعد پھر کسی کو اس دُنیا کی طرف لوٹایا نہیں جائے گا۔ (مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۴۳۔ آیت ($\frac{۲}{۱۶۷}$)۔ نیز نظریۂ تناسخ کے ابطال کے لئے جلد اوّل صفحہ ۴۴ آیت ($\frac{۱}{۵}$))

اس امر کی شہادت اور ثبوت کے لئے کہ قانونِ خداوندی کی کارفرمائی میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔ (سفارش یا شفاعت سے یہی مُراد ہوتی ہے)۔ قرآن نے حسبِ معمول، خارجی کائنات کے نظام کو پیش کر دیا۔ فرمایا:

$\frac{۷}{۵۴}$ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○

نظامِ فطرت

ان سے کہہ دو کہ تمہارا نشوونما دینے والا وہ خدا ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مراحل[1] میں پیدا کیا اور اس کے بعد، اس کا مرکزی کنٹرول خود اپنے دستِ قدرت میں رکھا۔ (۵۴/۷)۔ اُس کے قانون کے مطابق آسمانی کُرّے اس طرح گردش کرتے ہیں کہ رات کی تاریکیاں دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہیں اور پھر (یوں نظر آتا ہے جیسے) دن، رات کے پیچھے لپکے چلا آرہا ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے، سب اُس کے قانون کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو! یہ عالمِ محسوسات، اور اس کے ماوراء وہ عالم، جہاں سے اس کائنات کی تدابیر امور ہوتی ہے۔ سب خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ کار ہیں۔

کس قدر بابرکت ہے وہ ذات جس نے کائنات کی نشوونما کیلئے ایسا محیر العقول انتظام کر رکھا ہے!

اس میں جو الفاظ، یا اصطلاحات آئی ہیں، ان کے معانی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ "عالمِ امر و خلق" کے متعلق دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۲۷۲ ؛ صفحہ ۲۸۳)۔ تخلیقِ ارض و سموٰات کے لئے جلد اوّل (صفحہ ۳۵۲) ایام (واحد یوم) کے لئے جلد اوّل (صفحہ ۲۹) عرش کے لئے، جلد دوم (صفحہ ۶۷) اور جلد چہارم (آیت $\frac{3}{4}$ صفحہ ۲۱)۔ مبارک کا مفہوم سابقہ صفحات میں زیر آیات ($\frac{6}{93}$) و ($\frac{6}{156}$) بیان ہو چکا ہے۔

کائنات کا تخلیقی آغاز کیسے ہوا۔ چھ ایام (STAGES) سے کیا مراد ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر نکات، جو قرآن کریم کے متعدد مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں، کا تعلق علومِ سائنس سے ہے اور ان کی تشریح بڑی ادق اور ٹیکنیکل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات کے متعلق میری معلومات مطالعاتی ہیں، براہ راست میری اپنی تحقیق کا نتیجہ نہیں، کیونکہ یہ میرا میدان نہیں۔ میں نے اپنی مطالعاتی معلومات کو اپنی تالیف "انسان نے کیا سوچا" میں قلمبند کیا ہے جو متعدد موضوعات پر مشتمل ہے۔ جس چیز کا تعلق قرآن کے طالبعلم

سائنس کے انکشافات اور قرآنی آیات

---

[1] STAGES ——— OR ——— PERIODS

بلکہ ایک مسلمان سے ہے، وہ سائنٹفک معلومات نہیں۔ وہ یہ اہم نکتہ ہے کہ قرآن نے خارجی کائنات کے متعلق جو کچھ کہا ہے، سائنس کے انکشافات اس کی تائید کرتے ہیں یا اس کے خلاف جاتے ہیں۔ ہمارے حلقۂ احباب میں سے ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے، قرآن کریم کی بیشتر (متعلقہ) آیات کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عصرِ حاضر کے سائنٹفک انکشافات کس طرح ان کی تائید کرتے ہیں[1]۔ لیکن غیر مسلم سائنسدانوں میں سے جس محقق کا نام سرفہرست آتا ہے، وہ پیرس کے ایک نامور ڈاکٹر (سرجن) (MAURICE BUCCAILLE) ہیں جن کی کتاب کا نام ہے (THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE)[2]۔ ہمارے پیش نظر

ڈاکٹر مارس بکائے

موضوع کے سلسلہ میں تو اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ اس نے قرآن کریم کی متعدد آیات کے متعلق ثابت کیا ہے کہ سائنس کی تحقیقات کسطرح ان کی تائید کرتی ہیں، لیکن میں اس کا ذرا تفصیلی تعارف مناسب سمجھتا ہوں۔ میں ایسا کیوں سمجھتا ہوں، اس کی وجہ آپ کو اس کے تعارف سے سمجھ میں آجائے گی۔ اس نے لکھا ہے کہ "میں نے اس نگاہ سے بائیبل کا گہرا مطالعہ کیا کہ اس میں مظاہر فطرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سائنس کے انکشافات کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، یہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس میں جو کچھ اس باب میں کہا گیا ہے، جہالت اور توہم پرستی پر مبنی ہے۔ اس سے لامحالہ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر، (جیسا کہ ہم سے منوایا جاتا ہے) یہ خدا کی کتاب ہے، تو پھر وہ خدا (معاذ اللہ) بڑا ہی جاہل ہے۔ اور اگر خدا علیم و بصیر ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہوسکتی۔ زمانۂ قبل از تہذیب کے انسانوں کی پریشان خیالیوں کا مجموعہ کہلا سکتی ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ "میں نے سوچا کہ یہودیت اور عیسائیت کے بعد دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب اسلام بھی ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ جس کتاب کو اس مذہب کے پیرو منزل من اللہ کہتے ہیں، اس باب میں اس کی کیا کیفیت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ "میں اسلام کا معتقد نہیں"۔ میں نے ایک سائنسدان

---

[1] ان کی کتاب کا نام ہے (PHENOMENA OF NATURE AND QURAN)۔ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کی دوسری کتاب زیر طبع ہے۔

[2] اسے (AMERICAN TRUST PUBLICATIONS, INDIANAPOLIS, U.S.A.) نے شائع کیا ہے۔

کی حیثیت سے خالصتہً علمی نکتہ نگاہ سے اِس کتاب کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ بھی علوم سائنس کی حد تک۔ سائنس میں بھی میں نے اُن مسائل کو نہیں لیا جو ہنوز نظریات میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف اُن انکشافات کو لیا جو حقائق (FACTS) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اُس نے کہا ہے کہ "میں عربی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس لئے لامحالہ مجھے قرآن کے تراجم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

قدیم عربی زبان سیکھی

لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جہاں تک اہم حقائق کا تعلق ہے کوئی ایک ترجمہ دوسرے سے نہیں ملتا اور جہاں تک سائنس کے انکشافات کا تعلق ہے، تفاسیر بیشتر رطب ویابس کا مجموعہ ہیں۔ اِس لئے میں نے سوچا کہ اگر ریسرچ کا شوق ہے تو پھر اس کتاب کا براہِ راست مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ عربی سیکھی جائے، اور عربی بھی جدید نہیں، بلکہ وہ قدیم عربی جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔"

آگے بڑھنے سے پیشتر آپ سوچیئے کہ اس شخص کی نگاہ کتنی دُور تک پہنچی اور اُس نے کس طرح اس حقیقت کو پا لیا کہ قرآن مجید محاورۂ عرب کی رُو ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ عربی سیکھنے کے لئے خود عرب پہنچا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں اُس کی شاہ فیصل (مرحوم) سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

قرآن غیر محرف صحیفہ ہے

عربی زبان پر اس قدر دسترس حاصل کرنے کے بعد اُس نے سوچا کہ اُسے اس کا بھی اطمینان حاصل کرنا چاہیئے کہ جو کتاب آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی اُمّت کو دیا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب کا ایک پورا باب اس تحقیق کی نظر کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ کتاب بالکل غیر مُحرف ہے اور بلا شائبۂ تشکیک اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود۔ اس تحقیق کے دوران وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ یہ خدا کی کتاب ہے، اس لئے نہ اس کتاب کو محمدؐ کی کتاب کہنا چاہیئے، نہ اسلام کو محمدؐ کا دین۔

اُس نے لکھا ہے کہ "یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی جو اُنہوں نے مسلمانوں کو (MOHAMMADANS) اور اسلام کو (MOHAMMADANISM) کہنا شروع کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ خود مسلمان بھی اس فریب میں آ گئے محمدؐ نے کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام اُن کا وضع کردہ دین ہے۔"

اِس کے بعد اُس نے لکھا ہے کہ "میں نے سائنس کے ان ثابت شدہ حقائق کو لیا جن کا تعلق تخلیق کائنات، فلکیات، ارضیات، نباتات، حیاتیات اور خود انسانی تخلیق اور جنین کی پیدائش سے ہے، اور ان موضوعات کے متعلق قرآن کی

ورق گردانی شروع کی میں نے دیکھا کہ قرآن کا یہ انداز نہیں کہ وہ ایک موضوع پر، ایک ہی مقام پر، سب کچھ کہہ دے

تبویب القرآن

وہ اس کے متعلق مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوا کہ میرے پیشِ نظر موضوعات کے متعلق قرآن میں جہاں جہاں کچھ آیا ہے اسے الگ مدوّن کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح اُس نے قرآن کے اِن حصّوں کی تبویب کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ محاورۂ عرب کے بعد یہ وہ دوسرا بنیادی طریق ہے جسے قرآن کریم نے قرآن فہمی کیلئے خود تجویز کیا ہے اور جس پر میں پچاس سال سے کاربند چلا آرہا ہوں۔ یہ ریسرچ سکالر آج تک مجھ سے نہیں ملا اور جہاں تک میرا خیال ہے، میری کوئی کتاب بھی اس کی نظر سے نہیں گزری ہوگی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے قرآن فہمی کا یہ انداز مجھ سے مُستعار لیا ہے۔ یہ انداز خود قرآن نے تجویز کیا ہے اور جو شخص بھی آزادانہ قرآن پر غور کریگا' اُس کے سامنے یہ طریق خود بخود آجائے گا۔

اس کوہ کنی کے بعد وہ قرآنی سرچشمہ سے جوئے شیر لانے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی کسی ایک ثابت شدہ حقیقت کو لے کر اس سے متعلقہ آیات کو سامنے رکھتا ہے اور پھر آیت کے الفاظ کے معانی بنیادی عربی زبان کی رُو سے متعین کرتا اور ثابت کرتا ہے کہ ان معانی کی رُو سے قرآن میں پیش کردہ حقیقت کس طرح سائنس کے انکشافات کے عین مطابق ہے۔ وہ ایسے مقامات پر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قدیم مفسّرین تو معذور تھے کہ وہ قرآن کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے کیونکہ ان کے زمانے میں علمِ انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، لیکن مجھے افسوس آتا ہے دورِ جدید کے مترجمین اور مفسرین پر کہ وہ بھی آنکھیں بند کئے اُسی ڈگر پر چلے جارہے ہیں۔ وہ موجودہ دَور کے تراجم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

قرآن کے ترجموں کی کیفیت

اِن تراجم میں اس قسم کی فاش غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ قدیم زمانہ کے مفسّرین نے جو کچھ کہہ دیا یہ لوگ بلا تحقیق اسی کو سند تسلیم کئے چلے جارہے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق تو یہ عذر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک لفظ کے متعدد مفاہیم میں سے، اُس خاص مفہوم کا انتخاب نہیں کرسکتے تھے جو قرآن میں بیان کردہ سائنٹفک حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات نے اس مسئلے کو بالکل صاف کردیا ہے۔ لہذا اب ضرورت ہے کہ انسانی علوم کی روشنی میں ان تراجم اور تفاسیر پر نظرِ ثانی کی جائے۔ (صفحہ ۱۱۸)

وہ ایک ایک آیت کو لیتا ہے۔ اس طریق سے اُس کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ اس کے بعد بتاتا ہے کہ سائنس کے جدید ترین انکشافات کس طرح اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد وجد وکیف کے عالم میں جھوم کر کہتا ہے کہ اے دُنیا کے دانشورو! خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی فکر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی حقیقت بیان کر سکتا؟ ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اُس زمانے میں کوئی انسان یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا نہ کہہ سکتا۔ اس حقیقت کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے کہ اس علم کا سرچشمہ ماوراءِ عقلِ انسانی ہے؟ وہ ایک مقام پر بائیبل اور قرآن کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

قرآن انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتا

ان موضوعات کے متعلق جہاں بائیبل میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، قرآن میں مجھے اس قسم کی کوئی ایک غلطی بھی نہیں ملی۔ ایسے مقامات پر کھڑے ہو کر مجھے سوچنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنف کوئی انسان تھا تو اس کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ سائنس کے ان حقائق کو ساتویں صدی عیسوی میں پیش کر سکتا جن کا انکشاف اس دور میں آ کر ہوا ہے۔ جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلاشک وشبہ وہی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے دُنیا کو دیا تھا۔ لہٰذا اس میں بعد کے کسی ردّ و بدل، اضافہ یا آمیزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا عقلِ انسانی اس کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتی ہے کہ اُس زمانے میں ایک انسان نے یہ کچھ کیسے معلوم کر لیا؟ میں تو اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا .... (صفحہ ۱۲۰)

اس سے ذرا آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے وہ لامحالہ انسان کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک انسان، متنوع حقائقِ کائنات کے متعلق، جو اُس زمانے میں انسانوں کے سامنے آئے ہی نہیں تھے، ایسی باتیں کہہ دے جو چودہ سو سال کے بعد کہیں جا کر بے نقاب ہوئی ہوں۔ بنابریں میں تو قرآن کے متعلق یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہو سکتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۵)

ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ:

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے زمانے سے آگے تھیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ اُن کے ہاں رطب ویابس کا ملغوبہ ہے۔ جہاں

ایک بات صحیح ملتی ہے تو ننانوے باتیں اُس دور کی اوہام پرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کی یہ حالت نہیں۔ اس میں بے شمار ایسے حقائق کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق عصرِ حاضر کے علوم سے ہے۔ لیکن ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی تردید دورِ حاضرہ کے سائنٹیفک انکشافات نے کی ہو۔ یہ ہے فرق انسانی مفکرین کی دُور نگہی اور قرآن کے تبیانِ حقیقت میں! ..... (صفحہ ۱۶۳)۔

اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا نابغہ کیوں نہ ہو۔

اس سے آپ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ میں نے اس کتاب اور اس کے مصنف کا اس قدر تفصیلی تعارف کیوں ضروری سمجھا ہے! ضمناً۔ جب میں نے (اس کتاب کی اشاعت کے تھوڑا عرصہ بعد، ۱۹۷۸ء میں) اسکا تعارف کرایا، تو بعض احباب نے کہا کہ جب یہ شخص قرآن کی عظمت کا اس قدر قائل ہے، تو پھر یہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ میں نے کہا کہ بابا! اسے کچھ دن اور آزادانہ ریسرچ کر لینے دو۔ مسلمان ہو گیا تو پہلے ہی دن شور مچا دیا جائے گا کہ یہ شخص "سلف صالحین کی تفاسیر کے خلاف کہہ رہا ہے۔ پکڑو۔ یہ جانے نہ پائے" —— اور پھر اس کے خلاف کفر کے فتووں کی بوچھاڑ ہو جائے گی۔ سرسید (بیچارے) نے اتنا ہی کہا تھا کہ مسلمانوں کو فطرت (نیچر) کی قوتوں کو مسخر کرنا چاہیئے، تو اُسے "نیچری قرار دے کر" اس کے خلاف، مکہ۔ مدینہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کفر کے فتوے لے آئے تھے۔ قرآن پر، کسی "مسلمان نام رکھنے والی" قوم کی اجارہ داری نہیں۔ اس کا خطاب تمام عالمِ انسانیت سے ہے۔ لہٰذا، اگر کوئی غیر مسلم دانشور اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے، تو وہ مستحقِ تحسین و تبریک ہے۔ ڈاکٹر (BUCCAILLE) قرآن کی صداقت کا تو قائل ہے، لیکن وہ (غالباً) مسلمان اس لئے نہیں ہوتا کہ (ہم) مسلمانوں کی حالت اس کے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم (مسلمان) اُن کے راستے میں حائل نہ ہوتے، تو اقوامِ عالم میں سے کئی ایک حلقۂ بگوشِ اسلام ہو چکی ہوتیں۔

خارجی کائنات کی شہادت کے بعد، قرآن پھر اقدارِ خداوندی کی اطاعت کی طرف آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مرکزی موضوع تو انسانی راہنمائی ہے۔ اس کے ساتھ وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اس کے اس مرکزی موضوع کی تائید و توثیق کے لئے ہوتا ہے۔ فرمایا:

۷/۵۵ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

جب حقیقت یہ ہے کہ ربوبیت اسی کے قانون اور نظام کے مطابق حاصل ہو سکتی ہے، تو تم بھی اپنی نشوونما کے لئے اُسی خدا کو آواز دو ۔ اپنے دل کے ایسے کامل جھکاؤ کے ساتھ جو تمہارے تحت الشعور کی گہرائیوں سے اُبھرے ۔ اس لئے کہ سرکش ذہنیت کبھی پسندیدہ قرار نہیں پاسکتی ۔ (تم اس کی طرف اس طرح لپک کر جاؤ جسطرح بچہ، اپنی پرورش کے ذرائع ـــــ ماں کے تھنوں ـــــ کی طرف لپک کر جاتا ہے)

اُدْعُوْا (خدا کو پکارنے کا مفہوم سمجھنے کے لئے) انڈکس میں دُعا کا عنوان دیکھئے ۔

تضرع کا مفہوم

تَضَرُّعًا (مادہ ۔ ض ۔ ر ۔ ع) کا مفہوم قابلِ غور ہے ۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ گڑگڑانا اور خوف کھانا کیا جاتا ہے ۔ ہم (متعدد مقامات پر) خوف اور خشیتِ خداوندی کے سلسلے میں بتا چکے ہیں کہ ان الفاظ کا مفہوم (ہمارے ہاں کے تصوّر کے مطابق) "خدا سے ڈرنا نہیں ۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ اس احساس سے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ کس قدر مضرت رساں ہوگا، ان کی خلاف ورزی سے اجتناب کیا جائے ۔ اس میں خوف (ڈر) ہوتا ہے اُن قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن عواقب سے ۔ یہ اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا ایک جذبۂ محرکہ ہے ۔ دوسرا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت سے کس قدر فائدہ ہوگا ۔ اس سورۃ کی آیت (۷/۳) میں اِتباع کا مفہوم دیکھئے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اِتباع اس جذبۂ محرکہ کو کہتے ہیں جس کی رُو سے ایک گائے کا نوزائیدہ بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے ۔ یہی مفہوم تَضَرُّعًا کا ہے ۔ اس مادہ کے بنیادی معنی تو نرمی کے ہیں ۔ لیکن عربوں کے ہاں ضَرَعَ الْبَهْمُ کے معنی تھے ـــــ "مویشی کے بچے نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا" اس میں حصولِ نشوونما کے لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت (یا اتباع) کا پہلو نمایاں ہے ۔ چنانچہ آیت کے آخر میں "اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ" اور اگلی آیت کے شروع میں وَلَا تُفْسِدُوْا اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں ۔

باقی رہا "خُفْيَةً" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت نمائشی طور پر نہیں کی جائیگی اس کا تقاضا انسان کے تحت الشعور کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے ۔ اس کے بعد ہے:

۷/۵۶ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

جب اس طرح قانونِ خداوندی کے مطابق، معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جائیں، تو پھر اُس میں ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ (تمہاری عقلِ خودبین، کبھی تم سے کہے گی کہ تم دوسروں کی مدد کرتے کرتے خود تنگدست ہو جاؤ گے اور کبھی تمہیں یہ لالچ دلائے گی کہ ذرا سی بددیانتی سے، مفت میں، اتنا کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اسے کیوں چھوڑا جائے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آنا بلکہ) ہر ایسے مقام پر اپنی راہنمائی کے لئے، قانونِ خداوندی کو آواز دینا۔ یاد رکھو! جو شخص بھی خدا کے قانون کے مطابق، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، خدا کا عطا کردہ سامانِ نشو و نما اُس کے ہر وقت قریب رہتا ہے۔ (اس لئے اُسے نہ افلاس کا خطرہ ہوتا ہے، نہ زیادہ سمیٹنے کا لالچ۔

رفعِ مضرت اور جلبِ منفعت، دو ہی جذبات ہیں جو انسان کو آمادہ بر عمل کرتے ہیں۔ قرآن نے نہ رفعِ مضرت کی مذمت کی ہے نہ جلبِ منفعت کی۔ اُس نے کہا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں قوانینِ خداوندی کو ملحوظ رکھو۔ اِس سے تمہارے عمل میں توازن برقرار رہے گا۔ نہ تو رفعِ مضرت میں تم کسی اور کو نقصان پہنچاؤ گے، نہ ہی جلبِ منفعت میں کسی کا حق چھینو گے۔ اِسی اعتدال کا نام حسنِ عمل ہے اور ایسے لوگوں کو محسن کہا جاتا ہے۔ انہی کو سامانِ نشو و نما حاصل ہوتا ہے ——— طبیعی زندگی کے لئے بھی اور انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی

اس کی تائید میں پھر قوانینِ طبعی کی شہادت پیش کر دی۔ فرمایا:

۷/۵۷ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

نظامِ فطرت تم ذرا نظامِ کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ اُس میں خدا نے نشو و نما کا کیا عجیب انتظام کر رکھا ہے۔ وہ بارانِ رحمت سے پہلے، خوشگوار ہوائیں بھیجتا ہے جو بارش کی خوشخبری لاتی ہیں۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں تو اُس کا قانون، انہیں زمینِ مُردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، جہاں روئیدگی کا نشان تک نہیں ہوتا۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے اُسی زمین مُردہ سے) ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں، اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔

ہم اس طرح خارجی کائنات میں، موت کو زندگی سے بدل دیتے ہیں۔ ہم ان حقائق کو بیان اس لئے کر رہے ہیں کہ تم انہیں اپنی دنیا میں بھی پیش نظر رکھو۔

وحی کی راہ نمائی اور انسانی محنت

ثمر باری (پھل پیدا کرنے) کے لئے دو شرائط ضروری ہیں۔ ایک تو زمین کی روئیدگی کی صلاحیت، اور دوسرے اس کی آبیاری۔ صلاحیت تو اس کے اندر ہوتی ہے، اور پانی خارج سے ملتا ہے۔ انسانی زندگی میں یہ خارج سے ملنے والا سامانِ سیرابی، وحیٔ خداوندی ہے۔ لیکن وحیٔ خداوندی اسی صورت میں نتیجہ خیز ہوتی ہے جب اس کے ساتھ انسانی صلاحیت اور محنت شامل ہو۔ وحیٔ خداوندی تو صرف راہ نمائی دیتی ہے۔ چلنا تو انسان نے خود ہوتا ہے۔ اگر مسافر آمادہ بہ سفر نہ ہو تو خالی راہ نمائی کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ اگر مسافر کو صحیح راستے کا علم نہ ہو تو وہ منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکے گا۔

بارش سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں وہ عرصہ ہے جس میں نظامِ خداوندی ہنوز قائم نہ ہوا ہو اور جماعتِ مومنین اس کے قیام کے لئے سرگرمِ عمل ہو۔ اس کے قیام کے بعد بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے کَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى کا اوّلین تعلق تو زمینِ مُردہ کو حیاتِ تازہ مل جانے سے ہے، لیکن ثانیاً اس میں انسانوں کی حیات بعد الممات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جس کے متعلق ضمنی طور پر کچھ کہنا مفید نہیں ہوگا۔ اس لئے اسے ہم مناسب موقع تک ملتوی رکھتے ہیں۔ مسئلہ اہم بھی ہے اور نازک بھی۔

زمین کی صلاحیت کے متعلق فرمایا:

ع ۷ / ۵۸ وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زمین سے فصل پیدا ہونے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک بارش، اور دوسرے اس زمین کا اچھا ہونا جس پر وہ بارش برسے۔ اس قانون کے مطابق اچھی زمین سے عمدہ فصل پیدا ہوتی ہے۔ لیکن زمین خراب ہو تو اس پر محنت اور مشقت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے، اور اس کے بعد اس میں فصل بھی کم پیدا ہوتی ہے۔ اور جو پیدا ہوتی ہے وہ بھی ناقص!

دیکھو! اس طرح ہم اپنے قوانین کو، مختلف پہلوؤں سے سامنے لاکر واضح کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ

جو لوگ چاہتے ہیں کہ اُن کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں وہ اِن سے راہ نمائی حاصل کر لیں۔

(اُوپر کی مثال میں بارش ہمارا قانون ہے۔ اور زمین، تمہاری کوششیں۔ دونوں کی ہم آہنگی سے عمدہ نتائج مُرتب ہو سکتے ہیں)۔

طیّب اور خبیث قرآن کی دو اصطلاحیں ہیں جو متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ ان کے مفہوم کے لئے دیکھئے (۲/۲۶۷ ; ۳/۱۷۸ ; ۴/۲ ; ۵/۱۰۰)۔ اِن کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے۔ کلمۂ طیّب اور کلمۂ خبیث کا ذکر (۱۴/۲۶) میں آیا ہے۔

اذن کا مفہوم

ضمناً آیت (۷/۵۷) میں زمین سے کھیتی اُگنے کے متعلق کہا بِاِذْنِ رَبِّہٖ — (خدا کے اذن کے مطابق)۔ ظاہر ہے کہ اس سے مُراد زراعت سے متعلق قانونِ خداوندی ہے۔ اس قانون کا ذکر خود انہی آیات (۷/۵۷ ; ۷/۵۸) میں کیا گیا ہے۔ زمین کا کاشت کے قابل ہونا اور پھر اس کی سیرابی۔

تیسرا باب

سورۂ اعراف۔ آیات ۵۹ تا ۱۰۲

انبیاءِ سابقہ و اقوامِ گزشتہ

۱ ——— داستانِ حضرت نوحؑ۔

۲ ——— طوفانِ نوحؑ۔

۳ ——— دوقومی نظریہ کا آغاز۔

۴ ——— کشتیٔ حضرت نوحؑ کی افسانوی تفصیلات۔

۵ ——— حضرت نوحؑ کی عمر۔

۶ ——— قومِ عاد ——— حضرت ہودؑ

۷ ——— وہ قوم قوّت اور علم و بصیرت دونوں کی حامل تھی۔

۸ ——— قومِ ثمود ——— حضرت صالحؑ

۹ ——— خداوندی نظامِ معیشت کا بنیادی نقطہ۔ ناقۃ اللہ کا مفہوم۔
خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے۔

۱۰ ——— قومِ لوط اور حضرت لوطؑ

۱۱ ——— خلافِ وضعِ فطری جنسی اختلاط

۱۲ ——— قومِ مدین ——— حضرت شعیبؑ

۱۳ ——— مذہب اور سیاست

۱۴ ——— صلوٰۃ کا دائرہ عمل

۱۵ ——— سیکولرازم کا باطل تصوّر

۱۶ ——— دین و دنیا کا ارتباط

۱۷ ——— دل مانتا ہے لیکن جھوٹی عزّت کا خیال اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتا۔

تیسرا باب

اقوامِ سابقہ کی داستانیں

(آیات $\frac{7}{59}$ تا $\frac{7}{93}$)

قرآن کریم اپنے دعاوی کی صداقت کی تائید میں خارجی کائنات سے متعلق قوانین کی عمل پیرائی بھی پیش کرتا ہے اور تاریخی شواہد بھی۔ وہ تاریخ کو کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۱۰۵) میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ یہاں اس نے پہلے خارجی کائنات سے متعلق قوانینِ فطرت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انبیاءِ سابقہ (اور ان کی اقوام) کی سرگزشت سامنے لایا ہے۔ اور اس کی ابتداً حضرتِ نوحؑ کے تذکارِ جلیلہ سے کرتا ہے۔

میں نے انبیاءِ سابقہ کی داستانیں متفرق مقامات پر بیان کی ہیں، لیکن (میری تصانیف) جوئے نور، برقِ طور، اور شعلۂ مستور میں یہ بہ تسلسل مذکور ہیں۔ انہیں ان کتابوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ میں سلسلۂ مطالب الفرقان کو خود مکتفی (SELF_CONTAINED) بنانا چاہتا ہوں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس میں تفصیلاً بیان کر دیا جائے۔ یہاں حضرتِ نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر مختصراً پانچ آیات ($\frac{7}{59-64}$) میں آیا ہے۔ لیکن (قرآن کریم کے) دیگر مقامات میں ان واقعات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، انہیں یکجا کر دیا جائے تو اس سے یہ ایک مسلسل داستان بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم ان تمام واقعات کو اسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد جُوئے نور میں مذکور داستان ہے۔

داستانِ حضرت نوحؑ و قومِ نوحؑ:

آج دنیا کے گوشے گوشے میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اسی طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الامم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نسل انسانی کا اوّلیں سرچشمہ کسی ایک مقام پر تھا جہاں سے

اس کی سوتیں پھوٹیں اور ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطراف عالم میں بہ نکلیں۔

انسانی آبادی کا اوّلیں سرچشمہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اوّلیں سرچشمہ جھیل کیسپین (CASPIAN SEA) کے اطراف وجوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے تحت علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو، مختلف مماثلت ومشابہت کی بناء پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ آریائی (ایرین) مثلاً ہندی، ایرانی اور فرنگستانی اقوام۔

۲۔ تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی۔

۳۔ سامی (سمیٹک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب، اقوام عالم کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بناء پر کرتے ہیں۔ یعنی سفید فام (مثلاً امم سامیہ اور فرنگی) سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگانِ افریقہ) اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ) ان کے برعکس تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث (JAPHETH) حام (HAM) اور سام (SHEM) سے آگے بڑھی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل (SEMITIC RACE) سے تعلق ہے کیونکہ انبیائے کرامؑ کا وہ سلسلہ جس کا ذکر تورات میں ہے اسی نسل سے متعلق تھا۔

بنی سام کی اس قوم کا مولد ومسکن کون سا علاقہ تھا، یہ مسئلہ علمائے تاریخ کے نزدیک اہم مباحث کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ تاریخ کی قدیم ترین کتابوں میں اس موضوع پر بہت کچھ ملتا ہے لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اثری انکشافات نے بحث ونظر کا رُخ اسطرح بدل دیا ہے کہ اب بیسویں صدی میں یہ مسئلہ گویا متحقق ہوچکا ہے کہ امم سامیہ کا اوّلیں وطن، ملکِ عرب تھا، جہاں سے نکل کر وہ بابل، سیریا، مصر اور فینیشیا تک پھیل گئے۔ ان تحقیقات سے یہ اہم حقیقت بے نقاب ہوکر سامنے آرہی ہے کہ اُممِ سابقہ اور مللِ قدیمہ کی تاریخ وتمدن میں عرب کو کیا اہمیت حاصل رہی ہے۔ یعنی مصروشام، فلسطین وعراق وغیرہ کی تمام قومیں جنہیں الگ الگ سلسلہ کہا جاتا ہے، درحقیقت ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جو سرزمین عرب سے اُبھرا۔ اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبانوں کی اصل بھی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی۔ یہ امور ہنوز اُن انکشافات کا نتیجہ ہیں جو معرضِ شہود میں آچکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا اضافے ہوتے چلے جائیں گے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم نے بالتخصیص انہی اقوام اور انہی انبیائے کرامؑ کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہوسکتا ہے (اور قرائن اس پر شاہد ہیں) کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم (جس کا ذکر اوپر

آچکا ہے، سمٹ سمٹا کر اس نقطہ پر مرکوز ہوجائے کہ ان تمام اقوام عالم کی ابتداء ریگستان عرب ہی سے ہوئی جہاں کے شہر مکہ کو قرآن کریم اُمّ القریٰ (آبادیوں کی ماں) قرار دیتا ہے۔ بہرحال آج یہ قریب قریب متحقق ہوچکا ہے کہ سامی اقوام کا مولدِ اوّل عرب تھا جہاں سے وہ اطراف و حوالی میں پھیلیں۔ ان اقوام کے مورثِ اعلیٰ سام، حضرت نوحؑ کے بیٹے تھے

قومِ نوحؑ کا مولد

اس لئے قومِ نوحؑ کا وطن بھی انہی علاقوں میں تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔ تورات نے اس کا نام "ارارات" بتایا ہے۔ جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ آرمینیہ کے سلسلۂ کوہ میں واقع ہے۔ اس سلسلۂ کوہ سے دجلہ و فرات (TIGRIS AND EUPHRATES) بہتے ہوئے جنوب کی طرف آتے ہیں اور خلیج فارس کے کچھ اوپر آپس میں مل کر اس میں گرجاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قومِ نوح کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

اور زمانہ

اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کون سا تھا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قومِ عاد، قومِ نوح کی جانشین (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے $\frac{7}{69}$)۔

قومِ عاد کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ امم سامیہ اولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں کا نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس قبیلہ نے عرب، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ عاد کا زمانہ تین ہزار سال ق۔م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ قومِ نوح کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اپنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدت تو درکار ہوگی۔ بہرحال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ و اثریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآن کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام و ملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن سے آیا ہے۔

بایں ہمہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوامِ قدیمہ کے متعلق (جن کی بابت، اور تو اور خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا معلومات کا کوئی ذخیرہ نہ تھا) تاریخی و اثری انکشافات سے جو کچھ اُبھر کر سامنے آرہا ہے وہ ان خطوط و نقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ قرآنِ کریم میں ہے۔ وہ بلکہ ان کی تائید و تصدیق کرتا چلا جارہا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ جہاں کہیں حقیقت

قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد

کی نمود ہوگی، ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن یکسر حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اس میں ظن و تخمین اور ریب و تشکیک کا شائبہ تک نہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام "مسلّمات" افسانوں میں

تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں، قرآنی اجمالات کی توضیح و تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے دیجئے وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی دنیا (یا عربوں کے اپنے اندر اور ان کے باہر کی اقوام میں) اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے "تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

حضرت نوحؑ کی بعثت اپنی قوم کی طرف

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں سلسلۂ آمد و رفت اور ذرائع رسل و رسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں آباد تھا ایک مستغنی عن الغیر وحدت (SELF CONTAINED UNIT) تھا جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا، جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا:

۷/۵۹ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ○ (نیز ۱۱/۲۵ و ۲۳/۲۳ و ۲۹/۱۴ و ۷۱/۱)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا "اے میری قوم صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے) تو تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

حضرت نوحؑ بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ○ (۲۶/۱۰۶)

جب ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا "کیا تم قوانین خداوندی کی نگہداشت نہیں کرو گے"؟

ویسے بھی قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا اس لئے قبائل کے نام بھی یا تو ان کے جدِ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے۔ یا اس قبیلہ کی کسی عظیم

نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے

شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآنِ کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے بلکہ آپ کی قوم آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی، اور حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں خدا کے قانونِ مکافات کے لئے

مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہور نتائج کا وقت قریب آچکا تھا۔ سورۂ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶/۱۰۵)

قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی ۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے۔

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۲۵/۳۷)

اور جب قوم نوحؑ نے رسولوںؑ کی تکذیب کی تو ہم نے انکو غرق کر دیا۔ اور (آنے والے) انسانوں کے لئے آیۂ عبرت بنا دیا حقیقت یہ ہے کہ قانونِ مکافات کی رو سے ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیب رُسل ان کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی۔ (یعنی یہ نہیں کہ قوم نوحؑ کے بقیہ افراد کی آیندہ نسلوں نے تکذیب رسل کی تھی جسکی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے) یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے) بہر حال یہ رسول حضرت نوحؑ سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپکے ہمعصر ہوں قرآن کریم سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابیٔ قوم نوحؑ کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ (۵۱/۴۶) نیز (۵۳/۵۲)

اور ان سے قبل نوح کی قوم تھی۔ وہ بھی اس لئے تباہ ہوگئی کہ وہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتی تھی۔

ان لوگوں نے خدائے واحد کی عبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بُت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے انہیں خدائے واحد کی محکومیت کی دعوت دی تو ان کی قوم کے سرغنوں نے قوم سے کہا کہ :

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ (۷۱/۲۳)

انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑو۔ اور وؔد اور سوآع اور یغوؔث اور یعوؔق اور نسر دیوتاؤں کو مت ترک کرو۔

دعوت حضرت نوحؑ ۔ اور توحید

یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت نوحؑ تشریف لائے۔ آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدائے واحد کی عبودیت اختیار کرنے کی دعوت دی کہ یہی پیغام حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کا سنگِ بنیاد ہے۔

۷/۵۹ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف (تبلیغ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا " اے میری قوم اللہ تعالیٰ ہی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوائے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ (۱۱/۲۵-۲۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) "میں تمہیں (قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت و محکومیت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی کہا۔ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ پست درجے کے لوگ ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہولئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

خدا کی محکومیت

یہ دعوتِ نوحی کا اولین اور اساسی مطالبہ تھا۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ حکومت خداوندی کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اسے قائم کرنے والے کی اطاعت کی جائے۔ اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ (۲۶/۱۰۷-۱۰۸) (۷۱/۲۵-۲۶)

مجھے خدا نے تمہاری طرف امن و سلامتی کا پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو کیونکہ میں انہی قوانین کو نافذ کرنے پر مامور ہوں۔

انقلابی دعوت

دعوتِ نوحی کی تعلیم کے ان عناصر پر غور فرمائیے ۔ یہ تعلیم کیا تھی ؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو اس قوم کے آباء واجداد (اسلاف) سے متوارث چلا آرہا تھا اور ان کے سرداران یعنی، ارباب ثروت واقتدار کے تغلّب وتسلّط کے خلاف بغاوت! تاریخ انسانیت کے اوراق کو الٹتے جائیے ۔ حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق وصداقت کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں ۔ معتقدات خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آباء واجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو انسان کے نزدیک

تقلید آباء

ایسے گراں بہا متاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے چھننے سے اس کی ساری کائنات لُٹ رہی ہے لیکن کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے! (انڈکس میں تقلید کا عنوان دیکھئے) ۔

دوسری رُکاوٹ

اعترافِ حق وصداقت کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں نشۂ حکومت وسطوت ہے یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالیئے ۔ یہ صید وصیاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتوان انسان، زبردست اور قوی انسانوں کے پنجۂ تغلب وتسلط میں تڑپتے پھڑکتے، سسکتے، بلبلاتے، سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دینگے ۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی تھی کہ وہ ان کمزور اور ناتوان انسانوں کو جابر وظالم انسانوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں اذن پر کشائی دیں جہاں وہ پوری سرفرازی وسربلندی سے "انسانوں" کی طرح چل پھر سکیں اور انسان

صحیح آزادی کی دعوت

اور خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہ ہو۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوائے کسی اور کا محکوم نہ پائیں ۔ ظاہر ہے کہ ارباب حکومت وتسلط اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے ۔ وہ پوری کوشش کرینگے کہ اس قسم کی انقلاب انگیز آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں ۔ وہ اپنی ابلیسانہ سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے دامِ تغلب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں ۔ داعیان حق وصداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ ہے جس سے تصادم و تزاحم ضروری ہے ۔ قرآن کریم نے دعوتِ نوحی کے ضمن میں اس تصادم کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے ۔ فرمایا :

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ

اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚۖ (۲۳/۲۴)

اس قوم کے اکابرین نے جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں، اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور لوگوں سے کہنے لگے کہ یہ شخص اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے، اپنا مسلک مسلط کر دے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے آباء واجداد سے تو کوئی ایسی بات سنی نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تصادم اس سلسلۂ آسمانی کے ساتھ ہر مقام پر رہے گا، کہ بقول اقبالؒ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سرمایہ دار گروہ کی طرف سے مخالفت

آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن نے ان مخالفین کے لئے اَلْمَلَاُ کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں۔ یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوں۔ جن کے پاس کثرت سے مال و دولت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے بل بوتے پر اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں۔ اور پھر غریب انسانوں سے اپنا حکم منواتے ہیں۔ اسی کا نام (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں) نظامِ سرمایہ داری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آسمانی انقلاب جس کے داعی حضرات انبیائے کرامؑ تھے، اس غیر خداوندی نظام کو مٹانے کے لئے آتا تھا جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔ وہ ان ذرائع رزق کو انسانوں کے ہاتھوں سے چھین کر، قانونِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے۔ تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ اس انقلاب کی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصادم ہے جس کا ذکر سب سے پہلی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں سامنے آرہا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیات ۵۹-۶۴ میں اس کا اجمالی سا ذکر ہے۔ تفصیل دیگر مقامات میں مذکور ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں بیان کردہ ـــــ

اس مخالفت کی وجہ بھی سن لیجئے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

...... اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○ (۱۱/۲۸-۲۷)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔ اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ ہم ہی نچلے درجے کے ہیں۔ اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نوح نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیلِ روشن لئے ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے وحی کی رحمت بھی عطا کر دی ہو۔ مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟ یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ○ (۲۶/۱۱۱)

(قوم کے سرداروں نے کہا) کیا ہم تمہاری دعوت قبول کرلیں، حالانکہ (ہم دیکھ رہے ہیں کہ صرف کمینے (نچلے درجے کے لوگ) تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں؟

ان آیات پر غور فرمائیے۔ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو صاحبِ دولت و ثروت تھا۔ اور وجوہاتِ مخالفت میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کیا ہم اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں جو رذیل لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حق و صداقت کی

طبقاتی تقسیم

دعوت پر لبیک، سب سے پہلے غریب طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اربابِ ثروت و حکومت کے جور و استبداد سے تنگ آچکے ہوتے ہیں اور ہر اس آواز کا بطیبِ خاطر استقبال کرتے ہیں جو انہیں حقیقی آزادی کی طرف دعوت دے اور زندگی کی خوشگواریوں سے ہمکنار کر دے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمانہ حضرت نوح میں طبقات کی تقسیم وجود میں آچکی تھی۔ یعنی وہ قبائلی زندگی کا ایسا ابتدائی زمانہ نہیں تھا جس میں انسانی عزت و تکریم، دولت و ثروت کے معیار سے نہ ماپی جائے۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۲۶/۱۱۲)

(حضرت نوحؑ نے) کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ان لوگوں کا پیشہ کیا ہے۔ نہ ہی مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا کام کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت انسانوں کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے وجود میں آچکی تھی جو ذات پات کی تقسیم کا

بنیادی پتھر ہے اور جو انسانی مساوات کی جڑ پر ایسی کاری ضرب ہے، کہ یہ لعنت آج تک دور نہیں ہو سکی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا منصب، مساواتِ انسانی کو قائم کر کے عزّت و عظمت کا معیار حسن سیرت و کردار قرار دینا تھا۔ یعنی یہ معیار کہ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے اور بسطح نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو، وہی معاشرہ میں سب سے زیادہ عزّت و توقیر کا مستحق ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کا جواب اس پر شاہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجۂ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مؤمنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا۔ یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیہ کر چکی ہے کہ وہ خود بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور ان قوانین کو معاشرہ میں رائج بھی کرے گی۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝ وَ مَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۲۶/۱۱۲-۱۱۵)

نوحؑ نے کہا ان کے پیشہ اور کام سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے ہاں عزت و تکریم کے پیمانے اور ہیں جن کا حساب ہمارا خدا رکھتا ہے۔ اے کاش! تم اس حقیقت کو سمجھ سکتے! اسے بہرحال اچھی طرح سمجھ لو کہ میں یہ کبھی نہیں کروں گا کہ تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا رہوں۔

(نیز ۱۱/۲۹ ؛ ۱۰/۷۲ ؛ ۲۶/۱۰۹-۱۰۷)

اگر میں انہیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے ہاں مجرم ٹھیرایا جاؤں گا۔ کہیئے! اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکے گا؟ (۱۱/۳۰)

یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس، مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟ (۱۱/۳۱)

اربابِ استبداد کا جواب

اس کے جواب میں قوم نے کیا کہا؟ وہی جو سرکش و متکبّر کہا کرتے ہیں!

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۱۱/۳۲)

اس پر ان لوگوں نے کہا: اے نوحؑ تو نے ہم سے مفت میں جھگڑا شروع کر رکھا ہے اور اس میں بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو، (ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس تباہی کی تم دھمکیاں دیتے ہو اسے لے آؤ!

یعنی تو جو ہمیں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگی، درآنحالیکہ ہم نہایت خوش حالی و فارغ البالی

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف ہو جائے گی!

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ .... وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۱/۳۳-۳۵)

نوحؑ نے کہا۔ تباہی اور بربادی خدا کے قانون مکافات کے مطابق آیا کرتی ہے تم اسے روک نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو پھر میری غمخواری تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ تمہارے فیصلے تمہارے نشو ونما دینے والے کے قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اس کی طرف جانا ہے۔

(حکم الٰہی ہوا۔ اے نوحؑ) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اپنے جی سے یہ بات گھڑ لی ہے؟ تو کہہ دے۔ اگر میں نے یہ بات گھڑ لی ہے تو میرا جرم مجھ پر، اور تم جو جرم کر رہے ہو (اس کی پاداش تمہارے لئے) میں اس سے بری الذمہ ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ حضرت نوحؑ خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی انہی میں گزاری تھی۔ قوم نے اس سے پیشتر ان سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے سمجھا کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہے جو نہ ہماری دیدہ ہیں نہ شنیدہ۔ انہوں نے کہا

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (۲۳/۲۵ ؛ ۵۴/۹)

(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

تخویف و ترہیب لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں، اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں کی طرح بے ربط و بلا مقصد باتیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی ہر جنبش اور حرکت ایک خاص قبلۂ مقصود کی طرف منجر ہوتی ہے تو وہ ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے جو قوت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۱۶)

اے نوحؑ (تم ان اونی لوگوں کو مساوات کا سبق پڑھا کر معاشرہ میں فساد برپا کر رہے ہو) اگر تم اس روش سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

یہ دھمکی انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے تحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ (۷۱/۲۱-۲۲)

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو دیکھ رہا ہے کہ یہ لوگ برابر میری مخالفت کئے جا رہے ہیں اور اس شخص کے پیچھے لگ رہے ہیں جس کی اس کے سوا کوئی خصوصیت نہیں کہ اس کے پاس بہت سی دولت ہے اور افراد خاندان کی کثرت۔ حالانکہ یہی چیز اس کی تباہی کا موجب ہے۔ یہ میری دعوت کے خلاف بہت بڑی سازش کر رہے ہیں۔

دھمکیوں کے جواب میں ..... لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت چھوڑ دی؟ ایسا کسطرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تخویف و ترہیب ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ (۱۰/۷۱)

اگر تم پر بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) مقیم ہوں اور قوانین خداوندی کے مطابق تمہیں پند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اس میں اپنا پورا زور لگا لو اور اپنے حمائیوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی گوشہ نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے؟)

مخالفت کی انتہا چنانچہ ان کی مخالفت دن بدن بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت نوحؑ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ (۲۳/۳۹) ؛ (۵۴/۱۰)

(اور کہا) خدایا انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

حضرت نوحؑ کی پکار وہ قوم مخالفت اور سرکشی میں اس قدر بڑھ چکی تھی اور ان کے جرائم اس قدر متعدی ہوتے جانے رہے تھے کہ دوسرے انسانوں کو ان کے اثرات سے بچانا نہایت ضروری تھا۔

اس لئے حضرت نوحؑ نے اپنے رب سے فریاد کی کہ۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے میرے پروردگار! ان سرکشوں میں سے کسی ایک گھرانے کو بھی ملک میں بسنے کے لئے باقی نہ چھوڑ۔

اس لئے کہ

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (۷۱/۲۷)

اگر تو نے ان سرکش لوگوں کو چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو بری طرح گمراہ کریں گے۔ اور ان کی اولاد بھی (موروثی اور تربیتی اثرات کی وجہ سے انہی جیسی) بدکردار اور سرکش ہوگی۔ (اس لئے ان کا سلسلہ ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے)

کشتی کی تیاری ابتداء میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ آخر میں اللہ کے قانونِ مکافات کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آگیا۔ ادھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔ ادھر قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مہلت کا زمانہ گذر کر نتیجہ برآمد ہونے کا وقت آگیا۔ حضرت نوحؑ سے ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کرلو۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ (۱۱/۳۶-۳۷)؛ (۲۳/۲۷-۳۰)

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس پر (بیکار کو) غم نہ کھاؤ۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دو اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کرنا۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہو جانے والے ہیں۔

قوم کا تمسخر یہ کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سردار، ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود انکی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت انہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ...... وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (۱۱/۳۸-۳۹)

چنانچہ نوحؑ کشتی بنانے لگا۔

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کے سردار ادھر سے گزرتے اور انہیں کشتی بنانے میں مشغول دیکھتے تو تمسخر کرنے لگتے۔

نوحؑ کی طرف سے انہیں جواب ملتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو اڑا لو۔ جسطرح تم آج ہماری ہنسی اڑاتے ہو، ایک وقت آئے گا کہ ہم اسی طرح تمہاری حماقتوں پر ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کر دے۔ وہ عذاب وقتی نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دینے والا ہوگا

ظہورِ نتائج کا وقت | کشتی تیار ہوگئی اور تباہی کا وقت آپہنچا۔ حکم ہوا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ...... وَ مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ (۱۱/۴۰)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ قانونِ خداوندی کے مطابق ان کی تباہی کا وقت آگیا تو اردگرد کی پہاڑیوں سے بارش کا پانی جوش مارتا ہوا وادی میں آنا شروع ہو گیا (۱۱/۴۴) اور اس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی تو ہم نے (نوحؑ سے) کہا کہ ہر ضرورت کی شے کے دو دو جوڑے کشتی میں رکھ لو۔ اور اپنے "اہل" کو بھی ساتھ لے لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کی روش ثابت کر چکی ہے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے نہیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی ساتھ لے لو جو ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ○ ...... جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ○ (۵۴/۱۱-۱۴)

پس ہم نے موسلا دھار بارش کے لئے بادلوں کے دروازے کھول دیئے۔ اور زمین سے چشمے ابلنے لگے۔ تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس مقصد کے لئے جس کا قانونِ مکافات کے مطابق اندازہ ہو چکا تھا ایک جگہ جمع ہو گیا۔ اور ہم نے اسے (نوحؑ کو) میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کرا دیا۔ وہ ہماری زیرِ نگرانی چل رہی تھی۔ (اسطرح نوحؑ اور اس کے ساتھی اس تباہی سے بچ گئے اور) جنہوں نے نوحؑ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا غرق ہو گئے۔

زمین سے پانی۔ آسمان سے پانی۔ پوری کی پوری وادی لبریز۔ اس کے بعد

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۱۱/۴۴)

اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا کہ اے زمین! تو اپنا پانی پی لے! اور اے بادلو! تم تھم جاؤ۔ چنانچہ پانی کا چڑھاؤ اتر گیا اور جو ہونا تھا ہو گیا۔ پھر وہ کشتی، جودی پر ٹھہر گئی۔ اور جماعتِ مومنین کو بتایا گیا کہ وہ لوگ تباہ ہو گئے ہیں جو تم پر ظلم کیا کرتے تھے۔

اس طوفانِ بلا کے سامنے سرکش و مغرور قوم اور اس کے وہ تمام ساز و سامان جن کے بل بوتے پر انہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار

کر رکھی تھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور اس تباہی سے وہی محفوظ رہے جو کل تک بے یار و مددگار اور بے ساز و سامان سمجھے جاتے تھے اور جن کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ طوفان تھما۔ کشتی جودی پر جا کر رکی اور ارشاد ہوا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۱۱/۴۸)

اور ہم نے نوحؑ سے کہا کہ اب خطرہ کوئی نہیں رہا لہٰذا کشتی سے اتر پڑو۔ یہاں تمہیں اور تمہارے رفقا کو سامانِ زیست بڑی فراوانی سے ملے گا۔ باقی رہیں وہ جماعتیں جو تمہارا ساتھ نہیں دیں گی تو ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق رزق تو وہ بھی حاصل کر لیں گی لیکن ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور انجام کار وہ الم انگیز تباہی کا شکار ہوں گی (۲/۲۰۰؛ ۱۱/۱۵-۱۶؛ ۱۷/۱۵-۱۶؛ ۴۲/۲۰؛ ۴۶/۲۰)

یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے "اہل" کو عذابِ الیم سے محفوظ رکھا اور مخالفین کو نیست و نابود کر دیا۔ (۲۱/۷۶-۷۷؛ ۳۷/۷۵-۷۶)

اہل کا مفہوم

ان آیات میں "اہل" کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ اپنے اندر ایک عظیم الشان حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے جو تاریخ انسانیت میں مہمات اصول میں سے ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کے "اہل" کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ عام اصطلاح میں "اہل" سے مراد کنبہ اور خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن آسمانی لغت میں اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ سورۂ مومنین میں "اہل" میں ایک استثناء (EXCEPTION) بتائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا...... اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○ (۲۳/۲۷)

پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ جب ایسا ہو کہ ہمارے قانون مکافات کے مطابق تباہی کا وقت آ جائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں (ہر ضرورت کی چیزوں کے) دو دو جوڑے ساتھ رکھ لو۔ اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر اہل کے ایسے لوگوں کو نہیں جن کے کفر و عدوان نے بتا رکھا ہے کہ وہ تمہارے متبعین میں شامل نہیں ہوں گے۔ اور دیکھو جن لوگوں نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی ہے ان کے بارے میں کچھ ہم سے عرض معروض نہ کیجیو۔ وہ ڈوب کر رہیں گے۔

اس کی تفسیر سورۂ نوحؑ میں ان الفاظ سے کر دی گئی ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ○ (۷۱/۲۸)

(نوحؑ نے کہا) اے میرے رب! تو ان سرکشوں کی دراز دستی سے میری اور میرے ماں باپ کی حفاظت فرما اور میرے اہل خانہ میں سے اس کی بھی جو ایمان لائے۔ ان کے علاوہ دوسرے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی اور (ظالموں کو) جو (ایمان نہیں لاتے) تباہی اور بربادی میں اضافہ کئے جا۔

اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار

اس سے واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں "اہل" سے مراد کیا ہے۔ یہاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم، نسب اور قرابت داری کی رو سے نہیں ہوتی بلکہ کفر اور ایمان کی رو سے ہوتی ہے۔ دعوتِ نوحی میں یہ مقام ایسا بلند ہے جسے قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے تاکہ یہ اصولی اور اساسی معیارِ تقسیم واضح طور پر سامنے آجائے کیونکہ انسانی تمدن اور عمرانیت کی صحیح اور غلط تعمیر اسی معیار کے صحت اور سقم پر مبنی ہے۔ ذرا غور کیجئے، چاروں طرف طوفانِ بلا انگیز موجزن ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (۱۱/۴۲)

اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہیں کشتی انہیں لئے جا رہی ہے۔

بیٹا سامنے آجاتا ہے۔ محبتِ پدری جوش میں آتی ہے۔ آواز دیتے ہیں۔

وَ نَادٰى نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۱۱/۴۲)

اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

بیٹا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔

قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ○ (۱۱/۴۳)

اس نے کہا "میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا، وہ مجھے پانی کی زد سے بچا لے گا۔ تمہارے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوں گا۔ نوحؑ نے کہا (تو کس خیالِ خام میں پڑا ہے) اس طوفان سے جو قانون خداوندی کے مطابق آیا ہے بچانے والا کوئی نہیں۔ اس سے وہی بچ سکے گا جو ایمان لا کر اس کے آغوشِ رحمت میں پناہ لے لے۔ اتنی بات ہوئی تھی ان دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی۔ اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ ڈوب گیا۔

جب کشتی سے اتر کر حضرت نوحؑ کو اطمینان نصیب ہوا تو

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ ۚ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ

أَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ (۱۱/۴۵)

اور نوحؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بار الٰہا! تیرا وعدہ تھا کہ تو میرے "اہل"[1] کو بچالے گا۔ اور ظاہر ہے کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا۔ تو پھر وہ کیوں نہ محفوظ رہا اور تیرے وعدے تو ہمیشہ سچے ہوا کرتے ہیں اور تیرا فیصلہ آخری فیصلہ۔

اس درخواست کے جواب پر غور فرمائیے کہ یہی جواب تاریخ انسانیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (۱۱/۴۶)

(خدا نے) کہا اے نوحؑ تو نے "اہل" کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ بے شک وہ تیرا بیٹا تھا۔ لیکن وہ تیرے "اہل" میں سے نہیں تھا (تیرے اہل وہی ہو سکتے ہیں جن کی روش زندگی ہمارے قوانین کے مطابق ہو۔ یعنی ان کے اعمال صالح ہوں۔ اور اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ تو نے ہم سے یہ سوال اس لئے کر دیا کہ تو اس حقیقت سے واقف نہ تھا۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔

نسلی امتیاز اور قوموں کی تقسیم

واقعہ تو اتنا سا ہے لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ اس پر مزید غور کریں کہ اس کے اندر کس قدر عدیم النظیر حقیقت مضمر ہے۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں اور درختوں کی ابتدائی انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں وجہ جامعیت اشتراک نسل تھی۔ یعنی ایک مورث اعلیٰ کی اولاد مل جل کر اکٹھی رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ تھا۔ یہاں ایک قبیلہ، وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے تصادم پر ان قبائل میں جنگ وپیکار کے مظاہرے بھی رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس جنگ میں حریف وحلیف ہونے کا معیار حق وباطل کا معیار نہ تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا۔ یعنی قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی زندگی۔ اب ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر اپنے زمانہ میں پہنچ جائیے جو علم وتمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دورِ جہالت سے اتنا مختلف سمجھتا ہے۔ جتنا انسان اپنے آپ کو حیوان سے مختلف قرار دیتا ہے۔

آج کی تقسیم

لیکن ذرا غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیمِ انسانی کا تعلق ہے اس دورِ تہذیب وتمدن کا انسان اس دورِ جہالت وظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے، وہاں انسانوں کی تقسیم، قبائل کی

---

[1] سورۂ نوحؑ کی آیت (۷۱/۲۸) جو پہلے درج کی جا چکی ہے اور جس میں حضرت نوحؑ نے صرف انہی "اہلِ خانہ" کی مغفرت کی دعا کی ہے جو صاحب ایمان ہوں۔ زیر نظر واقعہ کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

رُو سے ہوتی تھی۔ یہاں وہ تقسیم اقوام کی رو سے ہوتی ہے۔ اور قوم کیا ہے؟ قبیلہ کی پھیلی ہوئی شکل۔ یعنی جب ایک قبیلہ بڑا ہو جائے تو اسے قوم کہا جاتا ہے۔ قوموں کی ابتدائی تقسیم اختلافِ نسب کی رُو سے ہوئی۔ (مثلاً ایرانی، تورانی، سامی) یا اختلافِ رنگ کی بناء پر (مثلاً سفید، سیاہ اور زرد اقوام) اس بنیادی تقسیم سے آگے بڑھیئے تو چھوٹی چھوٹی تقسیمیں جغرافیائی حدود کی رو سے طے پاتی ہیں۔ یعنی کسی دریا یا پہاڑ کی حدود کے اندر بسنے والے لوگ دوسری قوم۔ غور فرمائیے! بایں ہمہ ادعائے تہذیب و تمدّن انسان ابھی تک اسی چکر میں گرفتار ہے جہاں سے اس نے اپنی تمدّنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ ذرا یورپ کی تقسیمِ اقوام پر نگاہ ڈالیئے اور پھر ان کی سبعیت و بہیمیت اور وحشت و درندگی پر غور کیجئے۔ کیا آپ کو آلاتِ حرب و ضرب کی نوعیت اور سامان و ذرائع تباہی و بربادی کی ساخت و پرداخت کے علاوہ اُس دورِ جہالت اور اِس دورِ تمدّن میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اس لئے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق مسائل کا صحیح حل صرف وحی کی روشنی میں مل سکتا ہے اور یورپ اس روشنی سے محروم ہے۔ وَفِی طُغْیَانِہِمْ یَعْمَھُوْنَ۔

اس کے برعکس اس مسلکِ حیات کو دیکھئے جو وحی کی روشنی میں متعین کیا گیا۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جونہی ان کی دعوت کی ابتدا ہوتی ہے قوم دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک وہ جو اس دعوتِ آسمانی پر ایمان لاتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس کی تکذیب و مخالفت کرتا ہے۔ اس دوسرے طبقے میں صاحبانِ دولت و ثروت ہیں۔ اونچے گھرانے کے افراد ہیں۔ دوسری طرف مفلس و نادار انسانوں کی جماعت ہے جنہیں اوّل الذکر طبقہ "اراذل" شمار کرتا ہے۔ لیکن یہ جماعتِ مؤمنین (حزب اللہ) اللہ کے قانون کی حفاظت اور رسول کی تربیت و شفقت کے سائے میں بڑھتی ہے۔ جماعتِ مخالفین خود انہی کی قوم کے افراد ہیں۔ یقیناً ان کے رشتہ دار بھی ہونگے۔ لیکن اُن کے ساتھ اب ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے تعلقات کی بنیاد اب ایک اور ہی جذبہ ہے، اور وہ جذبہ ایمان کا ہے۔ حتّٰی کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی چونکہ مکذبین کی جماعت میں ہے، اس لئے اس قدر قریبی رشتے کے باوجود اُن کے "اہل" میں سے قرار نہیں پاتا۔ اب "اہل" اور "غیر" کی تقسیم کا معیار کچھ اور قرار پاچکا ہے۔ اب ان کے "اہل" وہ "غیر" ہیں جن سے اس سے پیشتر قرابت داری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دعوتِ نوحی سے اس حقیقتِ عظمٰی کی ابتدا ہوئی۔ اس سے آگے آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کے زمانہ میں اس تقسیم کے مظاہر سامنے آتے جائیں گے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی اس تقسیم کی رو سے کفار کی جماعت میں شامل تھی، نبیؑ کے اہل میں سے نہیں تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ اس تقسیم کی رُو سے "غیروں" میں شامل تھے۔ اپنوں میں سے نہیں تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم، باوجود اشتراکِ وطن، قومِ فرعون سے الگ تھی لیکن قومِ فرعون میں سے جو لوگ اشتراکِ ایمانی میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھے وہ قومِ موسیٰؑ میں سے قرار دیئے گئے۔ یہ سلسلہ اسی طرح

وسیع ہوتا چلا گیا۔ تاآنکہ رسول کافۃً للناس کے عہد مبارک میں تمام نوع انسانی کی تقسیم اسی اصول کے تحت قرار پاگئی۔ قرآن کریم نے جہاں "قوم الکافرین" کہا ہے تو اس میں دنیا میں ہر گوشے میں بسنے والے کفار آگئے۔ جب "قوم الظّٰلمین" اور "قوم الفاسقین" اور "قوم المجرمین" کہا گیا تو تمام صفحۂ ارض کے ظالمین و فاسقین و مجرمین اس جدید "قومیت" کے حلقے میں آگئے۔ اس کے برعکس جب ارشاد ہوا کہ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" تو اس قوم کی عالمگیریت و آفاقیت بھی حدود ناآشنا اور قیود فراموش قرار پائی۔ لہٰذا اس اصول کی رُو سے ساری دنیا کے مؤمن، باوجود اختلافِ رنگ و زبان، وطن، نسب ایک قوم کے فرد، اور اس کے برعکس دنیا بھر کے منکرین، جماعت مخالف کے افراد۔ ان دونوں جماعتوں میں دنیا بھر کے اشتراک وجوہات کے باوجود کوئی اشتراک نہیں تاآنکہ وہ آسمانی وجۂ اشتراک یعنی ایمان کے رشتہ سے اس قومیتِ حقہ کے رُکن نہ بن جائیں کہ

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیارِ قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیل آسمانی نہ تھی لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراک وطن یا نسل کو وجہ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعار ملّی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیار تقسیم انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آچکا ہے۔ اور اس کے ارباب فکر و نظر، قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے اس لئے اس مقام پر مزید تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی (انڈکس میں "قومیت پرستی"۔ "دو قومی نظریہ" "اسوۂ حضرتِ ابراہیمؑ" جیسے عنوانات دیکھئے)۔

داستانِ حضرت نوحؑ تو ختم ہو گئی لیکن اس میں دو ایک نکات ایسے ہیں جن کی مزید تشریح ضروری ہے۔

۱۔ حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی کہ

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اور نوحؑ نے دعا کی۔ اے اللہ ان نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ یو۔

کیا طوفان نوح عالمگیر تھا؟ بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور تمام صفحۂ ارض

اس کی پیٹ میں آ گیا تھا۔ اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں اور دانستہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے۔ (تورات۔ کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر مینہ برساؤں گا اور ہر ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔ (پیدائش ۷/۴) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا۔ اور ساتویں مہینے سفینۂ نوحؑ اراراط کی پہاڑیوں پر جا کر رکا۔ اور دسویں مہینے میں جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں۔ (پیدائش ۸/۴، ۵) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتی نوحؑ میں تھے ان کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۷/۲۱-۲۳) لیکن قرآن کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کا تخاطب اپنی قوم سے تھا۔ ان کی دعوت انہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہٰذا یہ تباہی بھی انہی پر وارد ہوئی۔ باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ طوفانِ نوحؑ کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی۔ باقی رہا یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی دعاء میں یہ کہا تھا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ۔

تو اس میں (اَلْاَرْضُ) سے مراد تمام صفحۂ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی، قرآن کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں "اَلْاَرْضُ" سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصۂ حضرت موسیٰؑ میں فرمایا ہے کہ

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ (۱۰/۸۳)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش تھا۔

یہاں الارض ملک مصر کے لئے آیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا، بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ... (۳۸/۲۶)

اے داؤدؑ ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤدؑ کی سلطنت تمام صفحۂ ارض پر نہیں تھی۔ بلکہ ایک خاص خطۂ ملک میں تھی۔ لہٰذا ان مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں، بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعۂ زیر نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصۂ حضرت نوحؑ میں "الارض" سے ہے۔

۲۔ حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا

اس کا عام ترجمہ یہ ہے:- (۲۹/۱۴)

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔

عمر نوحؑ

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال کی تھی؟ اگر تورات کی طرف جائیے تو حضرت نوحؑ آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ نو نوسو سال کی لکھی ہیں چین کے مذہب (TAOISM) کا ایک بہت بڑا مبلغ (KWANG) چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔ وہ یہ بتانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم رو بہ انحطاط نہیں ہوا۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی۔ یہ عرصۂ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا۔ یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔

اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ زیر نظر آیت میں ہے۔

فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ (۲۹/۱۴)

اس میں ایک ہزار سال کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِیْنَ کے ساتھ عَامًا کا۔ سَنَةٍ اور عَامًا دونوں کے معنی سال ہیں اس فرق کے ساتھ کہ سَنَة بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں۔ اور عَامًا خوشحالی کے سال کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا۔ جو نوسو سال تک رہا۔

اس ساڑھے نوسو برس کی مدت کو حضرت نوحؑ کے زمانۂ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نوسو باون سال کا فرق ہے۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور طلب ہے۔ عربی لغت میں سَنَةٌ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں

چار ہوتی ہیں۔ یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اَلْفَ سَنَۃٍ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عامٌ پورے سال کو کہتے ہیں۔ اس لئے اگر خَمْسِیْنَ عَامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دوسو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔

بہرحال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں ایسا ثابت کر دیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

جماعتِ مؤمنین کی حفاظت

ہم نے دیکھا ہے کہ جب حضرت نوحؑ کو آنے والے طوفان کی خبر دی گئی تو ان سے کشتی بنانے کے لئے کہا۔ اور اسی کشتی کے ذریعے انہیں اور ان کی جماعت کو غرقابی سے محفوظ رکھا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس طبیعی دنیا میں حفاظت اور ہلاکت، طبیعی اسباب کے ذریعے ہوتی ہے۔ فوق الفطرت اسباب سے نہیں۔ حضرت نوحؑ کے مخالفین انہیں کشتی بناتے دیکھتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اگر وہ ذرا بھی سوجھ بوجھ سے کام لیتے اور انہیں دیکھ کر اپنی کشتی بنا لیتے تو وہ بھی غرق ہونے سے بچ جاتے۔ حتیٰ کہ جب حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو آواز دی تھی، تو اگر وہ باپ کا کہنا مان کر کشتی میں سوار ہو جاتا، تو وہ بھی غرقابی سے محفوظ رہ جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک طبیعی اسباب اور طبیعی قوانینِ فطرت کا تعلق ہے، کافر اور مومن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے (اس نکتہ کی وضاحت مختلف مقامات پر سامنے آتی جائے گی)۔

اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ابتدائی ادوار میں، عام طبیعی اسباب کے لئے بھی وحی کی راہنمائی کا محتاج ہوتا تھا۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں لوگ کشتی بنانا بھی نہیں جانتے تھے۔ اس کے لئے وحی نے راہنمائی کی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ زندگی کے اسباب و عوامل جو آج پیش پا افتادہ اور عام ہیں، ان کی ابتدا وحی کی راہنمائی سے ہوتی ہوگی۔ جوں جوں انسانی علم و بصیرت نے ترقی کی، ان گوشوں میں وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہ رہی۔ اس کا دائرہ اقدار و اصولِ حیات تک محدود ہو گیا۔ یہ وہ وحی ہے انسان جس کا ابد تک محتاج رہے گا۔ اسی لئے اسے مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ کر کے، وحی کا دروازہ بند کر دیا۔

یہ ہے قومِ نوحؑ کی داستانِ عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر وحی فرمایا:-

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۱۱/۴۹)

(اے رسول!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو خود جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان تاریخی شواہد سے یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے کہ دعوتِ خداوندی کو کن صبر آزما مراحل میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخر الامر کامیابی اسی کے لئے ہوتی ہے۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے قصے نبی اکرمؐ کے زمانہ میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے' اس لئے حضورؐ اور اہلِ عرب ان سے واقف تھے۔ پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امورِ غیب ہیں جن سے نہ نبی اکرمؐ آگاہ تھے نہ ان کی قوم۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفاصیل قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبان زد خلائق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصۂ قومِ نوحؑ کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے

تورات کی تفاصیل

بیان کردہ قصے اور قرآنِ کریم کا مقابلہ کر کے دیکھئے حقیقت واضح طور پر سامنے آجائیگی کہ (اس) تورات میں ذہنِ انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے اور قرآنِ کریم کے بیان میں کس قدر صداقت اور پاکیزگی ہے۔ قصصِ قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مورخانہ وقائع نگاری مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصۂ قومِ نوحؑ میں اہم نقاط یہ ہیں کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گذر گیا تو وہ قوم طوفان کے ذریعے ہلاک ہو گئی۔ اب دیکھئے کہ بائبل طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے۔

> اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال روز بروز صرف بدی ہوتے ہیں ۞ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا ۞ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان اور حیوان کو بھی۔ اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک، کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں ۞ مگر نوحؑ پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔ (پیدائش ۵-۸/۵)

ذرا غور فرمائیے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالق ارض و سمٰوٰت نے بنانے کو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحۂ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصدِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوحؑ برپا کیا گیا۔

۲۔ کتاب پیدائش کے مذکورہ صدر بیان، نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رو سے طوفانِ نوحؑ

عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحۂ ارض پر جس قدر ذی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ تاریخی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار عنوان "طوفان" (DELUGE) کے تحت لکھتا ہے کہ

ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ ارباب تحقیق و خبر کے نزدیک بالکل مرفوع القلم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآن کریم کی رو سے یہ طوفان صرف قوم نوحؑ کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے۔

۳۔ تیسرا اہم نقطہ پسر حضرت نوحؑ کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ اس کے "غیر صالح اعمال" اسے کس طرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبتی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ "اپنا" ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائبل میں پسر نوح کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتاب پیدائش کے نویں باب میں ہے:۔

اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا ۝ اور اس کی مے پی کر نشے میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا۔ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی ۝ تب سم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا پران کی پیٹھ اس کی طرف تھی کہ انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا ۝ جب نوح اپنے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا ۝ تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا ۝ پھر بولا خداوند سم کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہوگا ۝ خدا یافت کو پھیلائے اور وہ سم کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔　(کتاب پیدائش $\frac{9}{20-27}$)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اول حام کا قصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا ستر دیکھ لیا۔ لیکن اس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں دوسرے یہ کہ قصور حام کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزاوار اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذاللہ۔ معاذاللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسول کو ایک ایسی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے جس سے سعید فطرت کا تصور بھی کانپ اٹھے اس کے برعکس قرآن کریم نے حضرت نوحؑ کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعت مرتبت اور علوِ مدارج درخشندہ و تابناک صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوحؑ خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰہِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ ($\frac{3}{32}$)

بلاشبہ (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عبد شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ (۱۷/۳)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا۔ اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسن نتائج سے بھرپور ہوئے تھے۔

خدا کے مومنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَلَقَدْ نَادَانَا نُوحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ۝ ...... إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝

(۳۷/۷۵-۸۱)

اور یقیناً نوحؑ نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں۔ اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو کرب عظیم سے نجات دی۔ اور اس کی نسل کو باقی رہنے والوں میں رکھا۔ اور آنے والوں میں اس کا (نیک نام) باقی رکھا نوحؑ پر اقوام عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُم مُّهْتَدٍ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۵۷/۲۶)

اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذریت) میں سے ہدایت پر بھی ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

خدا نے ان کی پکار کو سنا اور اسے شرف قبولیت سے نوازا۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝ (۲۱/۷۶) نیز (۳۷/۷۵-۷۶)

اور (اسی طرح) نوحؑ کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوںؑ) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے ہمیں پکارا تھا (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دے دی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکامات الٰہیہ کے سچے فرمانبردار، پیکر تسلیم و رضا اور مظہر اطاعت و انقیاد تھے۔ (۱۰/۷۱-۷۲)

مُسلم آیت (۱۰/۷۲) میں وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے نگینے کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقام نبوت وہ مقام ہوتا ہے جہاں خدا

کے قوانین و احکام کی کامل اطاعت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کریم نے جس سب سے پہلے رسولؑ کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلۂ زرّیں میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ بندے اسی گرامی نسبت سے خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کا راز ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضور ختمی مرتبت کے عہد ہمایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا۔ گویا سلسلۂ رسالت و نبوت کی داستانِ قدسی، اسلام اور امتِ مسلمہ کی ہی داستان ہے۔

لہذا، تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ بنا بریں یہ کہنا کہ قرآن میں مذکور واقعہ تورات سے اخذ کیا گیا ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذرّیت میں تمام انبیائے اہم سامیہ مبعوث ہوئے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء ہیں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدمؑ[1] کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ○ (۱۷/۳)

تم (اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا۔ وہ ایک عبدِ شکور تھا۔

تاریخ کے پارینہ اور منتشر اوراق اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال کا رُخ اسی موسسِ اولیٰ کی طرف ہے۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہدِ کہن کے متعلق کیا کیا امور منصۂ شہود پر آئیں گے۔ سرِدست اربابِ نظر کیلئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (DELUGE) کی داستانیں دنیا کی قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر

---

[1] آدم کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم میں بیان ہو چکا ہے۔

کرتی ہے۔ یونان۔ ایران۔ ہندوستان۔ چین۔ حتیٰ کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیرالاولین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصہ بڑے دلچسپ انداز میں مذکور ہے۔ ست پت براہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی کے لئے غسل کا پانی لایا گیا تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفانِ عظیم سے نجات دلا دوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا۔ اور اس کی ہدایت کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا۔ جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو وید وں کو چرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ راز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی۔ اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفان بلاانگیز برپا کر کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصّے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم آنیوالے انکشافات، ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصوں کی قدرِ مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہرحال قرآن کریم میں جس طوفان کا قصّہ مذکور ہے اُسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک "پرانا قصّہ" نہیں۔ اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینے میں تقدیرِ اُمم کے خطوط اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

جن افسانوں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ہمارے مناظر انہیں غیر مذاہب کے سامنے پیش کر کے ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ بھول جاتے ہیں کہ خود ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے افسانوں کی کمی نہیں۔ قرآن مجید میں کشتی حضرت نوحؑ کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن ہمارے ہاں تفسیر ابن کثیر بڑی "قابلِ اعتماد" سمجھی جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "اس کشتی کے لئے ایک سو سال لکڑیاں کاٹ کر تختے بنانے میں لگ گئے۔ پھر ایک سو سال کے عرصہ میں یہ تیار ہوئی۔"

اُس کا طول اسّی (۸۰) ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ کا تھا۔ اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا۔ پانی کاٹنے کے پُر پُرزے بھی تھے قتادہؓ کا قول ہے کہ لمبائی تین سو ہاتھ کی تھی۔ ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ کا تھا اور چوڑائی چھ سو ہاتھ کی تھی۔ کہا گیا ہے کہ طول دو ہزار ہاتھ اور چوڑائی ایک سو ہاتھ کی تھی واللہ اعلم۔ اس کی اندرونی اونچائی تیس ہاتھ کی تھی۔ اس میں تین درجے

تھے ہر درجہ دس ہاتھ اونچا تھا۔ سب سے نیچے کے حصے میں چوپائے اور جنگلی جانور تھے۔ درمیان کے حصے میں انسان تھے، اوپر کے حصے میں پرندے تھے۔ دروازہ چوڑان میں تھا اوپر سے بالکل بند تھی۔ ابن جریر نے ایک غریب اثر عبداللہ بن عباسؓ سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ بن مریم سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکم خدا کسی ایسے مُردے کو جلاتے جس نے کشتی نوحؑ دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں ——— آپ انہیں لے کر چلے، ایک ٹیلے پر پہنچکر وہاں کی مٹی اٹھائی اور فرمایا جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہی علم ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ یہ پنڈلی ہے حام بن نوحؑ کی۔ پھر آپؑ نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا۔ اللہ کے حکم سے اُٹھ کھڑا ہو۔ اُسی وقت ایک بڈھا سا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا؟ اس نے کہا نہیں مرا تو جوانی میں تھا لیکن اب دل پر دہشت بیٹھی کہ قیامت قائم ہوگئی۔ اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا! حضرت نوحؑ کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کرو۔ اس نے کہا کہ وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی تین درجوں کی تھی ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالےٰ نے حضرت نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دُم ہلاؤ۔ اس کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر زمادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پہ انگلی لگا۔ اس سے بلی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقاب ہونے کا علم کیسے ہوگیا؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کوّے کو خبر لینے کے لئے بھیجا لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا دیر تک نہ آیا آپ نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بددعا کی۔ اس لئے وہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ شہر ڈوب چکے ہیں۔ آپ نے اس کی گردن میں حمرہ کا طوق ڈال دیا اور اس کے لئے امن وانس کی دعا کی۔ پس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اے رسول اللہؑ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلئے کہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جبکہ اس کی روزی نہیں۔ پھر فرمایا اللہ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہو جا وہ اسی وقت مٹی ہوگیا۔　　　(حوالہ۔ تفسیر ابن کثیر بارھواں پارہ۔ صفحہ ۱)

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی، اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

نوح علیہ السلام کو حکم خدا ہوا کہ اپنے ساتھ کشتی میں جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر مادہ سوار کرلو۔ کہا گیا ہے کہ غیر جاندار کے لئے بھی یہی حکم تھا۔ جیسے نباتات ——— کہا گیا ہے کہ پرندوں میں سب سے پہلے درہ کشتی میں آیا اور سب

آخر گدھا سوار ہونے لگا۔ ابلیس اس کی دُم میں ٹنگ گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اٹھ سکا کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کر رہے تھے۔ یہ بہتیرا چاہتا تھا مگر پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتے تھے۔ آخر آپ نے فرمایا آجا گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آیا۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ شیر کو اپنے ساتھ لے جانا مشکل ہو پڑا۔ آخر اسے بخار چڑھ آیا تب اسے سوار کر لیا۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب تمام مویشی اپنی کشتی میں سوار کر لیئے تو لوگوں نے کہا شیر کی موجودگی میں یہ مویشی کیسے آرام سے رہ سکیں گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر بخار ڈال دیا۔ اس سے پہلے زمین پر یہ بیماری نہ تھی۔ پھر لوگوں نے چوہے کی شکایت کی کہ یہ ہمارا کھانا اور دیگر سب چیزیں خراب کر رہے ہیں تو خدا کے حکم سے شیر کی چھینک میں سے ایک بلّی نکلی جس سے چوہے دبک کر کونے کھدرے میں بیٹھ رہے۔ (ایضاً۔ ص۱۱)

یہ ہے اس تحقیق کا ماحصل جسے ہمارے مفسرین نے پیش کیا ہے۔ افسوس اس کا تو نہیں کہ انہوں نے اس قسم کی افسانہ تراشیاں کیوں کیں۔ رنج اور صدمہ اس بات کا ہے کہ یہ حضرات ان چیزوں کو منسوب کر دیتے ہیں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس سے دنیا کی نگاہوں میں حضورؐ کا جس قسم کا تصور قائم ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

سورۃ الاعراف میں جو ہمارے زیر نظر ہے آیات (۵۹-۶۴ / ۷) داستان قوم نوح سے متعلق ہیں۔ یہ داستان سابقہ صفحات میں سامنے آ چکی ہے۔ بایں ہمہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ آیات اور ان کا مفہوم بھی یہاں پیش کر دیا جائے تاکہ اس تفسیر میں تسلسل قائم رہے۔

(۷ / ۵۹) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

(خارجی کائنات پر غور و خوض کے بعد، تم تاریخی شواہد کی طرف آؤ اور دیکھو کہ خود عالم انسانیت میں ہمارا یہی قانون کس طرح کارفرما چلا آ رہا ہے)۔

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف (یہی قانون دے کر) بھیجا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم خدا کے قانون کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ

روش پر قائم رہے) تو مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

۷/۶۰ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○

جب اُس کی قوم کے اُن سرداروں نے جن کے ہاں فراوانی تھی، اس بات کو سُنا تو اُنہوں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو (ہمیں اس روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت اور قوت و اقتدار حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس سے ہم پر تباہی آجائے گی!)۔

۷/۶۱ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

نوحؑ نے کہا کہ میں، نہ خود غلط راستے پر ہوں، نہ ہی تمہیں غلط راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں اُس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ (تمہیں یہ پیغام اس لئے انوکھا سا نظر آتا ہے کہ تم صرف اپنی نشو و نما کی فکر کرتے ہو اور خدا کا قانون، عالمگیر انسانیت کی نشو و نما کا ذمہ دار ہے)۔

۷/۶۲ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

یہ وہ پیغامات ہیں جو تمہیں اپنے رب کی طرف سے تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، بدخواہ نہیں ہوں میں تمہارے چاکِ گریبان کی رفوگری کرنا چاہتا ہوں اور خدا کے عطا کردہ علم کی بنا پر تم سے وہ کچھ کہتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ تمہاری روش، فلاح و کامرانی کی راہ ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے)۔

۷/۶۳ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

تمہیں اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ خدا اپنے پیغام کو تم تک ایک ایسے آدمی کے ذریعے کیوں پہنچا رہا ہے جو تم میں سے ہی ہے، اور تمہارے جیسا ہی ہے: تاکہ وہ تمہیں اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے، اور تم تباہیوں سے بچ جاؤ، اور تمہاری نشو و نما کا سامان بہم پہنچ جائے۔ (تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ خدا کے پیغامبر کو عجیب الخلقت سا ہونا چاہیے!)

۷/۶۴ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ۠

غرضیکہ نوحؑ نے انہیں ہر ممکن طریق سے سمجھایا لیکن اُنہوں نے نوحؑ کی ہر بات کو جھٹلایا۔ آخرالامر ہم نے اُسے، اور

اس کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کر کے بچا لیا، اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا تھا، انہیں غرق کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ عقل و خرد کو کھو کر بالکل اندھے ہو گئے تھے۔ (ورنہ نوحؑ ان کے سامنے کشتی بنا رہا تھا اور آنیوالے سیلاب سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔ وہ ذرا بھی عقل و فکر سے کام لیتے تو اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی)۔

اس کے بعد آیات (۷۲-۶۵ / ۷) میں قوم عاد کی داستان ہے جس کی طرف حضرت ھودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس داستان کو بھی ہم اسی انداز اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں جسطرح داستان قوم نوحؑ پیش کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن کریم میں جہاں جہاں اس کا ذکر آیا ہے ان تمام مقامات کو مسلسل سامنے لایا جائے۔

قوم عاد ——— حضرت ھُودؑ

جیسا کہ سابقہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے۔ تورات کی رُو سے اقوام عالم کی تقسیم حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں (یافث، حام اور سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تورات کی اس تقسیم کی تاریخی حیثیت کچھ ہی ہو، لیکن تحقیقات جدیدہ اس نتیجہ تک ضرور پہنچ چکی ہیں کہ عرب اور اس کے گرد و پیش (شام عراق وغیرہ میں) اُمم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قبیلہ عاؔد کا تھا۔ قبیلہ کیا! یہ تو ایک عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف حضر موت اور یمن کے علاقے سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی۔ اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر اور شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال [ق۔ م] تک ان تمام علاقوں پر اسی قوم کا تسلّط و اقتدار نظر آتا ہے۔ سامؔ کے بیٹے اَرَمؔ کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو اڑھائی ہزار سال (ق۔م) اس قوم کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا تو اس زمانہ میں قوموں کے عروج و زوال کی رفتار کے اعتبار سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی ابتدا کب سے ہوئی ہوگی؟ یوں سمجھیے کہ قوم نوحؑ کی بربادی کے بعد جب یہ علاقہ دوبارہ آباد ہوا ہے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی ہے۔ یہی قوم عاد ہے جس کی طرف حضرت **ھودؑ** مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب رُبع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ تمثال ریت کے ٹیلے، خوف و دہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اُڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اُسے اس طرح نیچے دبا لیتے

ہیں کہ پھر محکمۂ آثار قدیمہ والے ہی اُن کا سراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے۔ کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبادیاں، قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کم از کم ایک کا ذکر تو سُن لیجئے۔ یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہودؑ کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے۔ اِلّا اُن کے جو حضرت ہودؑ کے ساتھ بچا لئے گئے اور جو پھر عاد ثانیہ کہلائے۔ کیونکہ عاد اولیٰ وہ تھے جو اپنی غلط روش زندگی کی وجہ سے تباہ ہو گئے تھے۔

قوم نوحؑ کی جانشین

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد قوم عاد کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ اور انہیں دُنیا میں بڑا اقتدار و تسلط اور وسعت و قوت عطا فرمائی۔

۷/۶۹ وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِى ٱلْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۖ فَٱذْكُرُوٓا ءَالَآءَ ٱللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

تم سوچو کہ قوم نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اس لئے کہ اُس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد خدا نے تمہیں ان کا جانشین بنایا تمہیں بڑی قوتیں اور فراخیاں عطا کیں۔ تم خدا کی ان قوتوں اور نعمتوں کو پیشِ نظر رکھو (اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی مت کرو) تاکہ تم کامیاب ہو۔

فارغ البال و مرفہ الحال

آب پاشی و سیرابی کے لئے قدم قدم پر چشمے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات افراد اور مواشی کی کثرت۔ یہی کچھ اُس زمانہ میں قوت و سطوت کے حصول و استحکام کے ذرائع تھے۔ حضرت ہودؑ نے انہیں قوانین الٰہیہ کی دعوت دیتے ہوئے انہی انعاماتِ خداوندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وَٱتَّقُوا ٱلَّذِىٓ أَمَدَّكُم بِمَا تَعْلَمُونَ ○ أَمَدَّكُم بِأَنْعَٰمٍ وَبَنِينَ ○ وَجَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ○ (۲۶/۱۳۲ - ۱۳۴)۔

تم اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس نے، جیسا کہ تم خود جانتے ہو، تمہیں سامان زیست کی اس قدر فراوانیاں عطا کر رکھی ہیں۔

مال مویشی کی کثرت۔ قبیلے کے افراد کی بہتات۔ لہلہاتے باغات۔ ان کی سیرابی کے لئے آب رواں کے چشمے۔ (یہ سب خدا نے دے رکھے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بنیادی طور پر تمہاری پیدا کردہ ہو۔ لیکن تم اس سامانِ زیست سے حاصل کردہ قوت کو، دوسروں پر ظلم و استبداد کے لئے استعمال کرتے ہو۔ (۲۶/۱۳۰)۔

وہ ایسے ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے حکومت کرنی ہے۔

وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ (۲۶/۱۲۹)

اور تم طرح طرح کے سازوسامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے رہتے ہو (اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو، بلکہ) اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و اقتدار اور جور و استبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

ستونوں والے

اسی بناء پر قرآن کریم نے انہیں "ستونوں والے" کہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (۸۹/۶-۸)

(ان لوگوں کا انجام بھی ویسا ہی ہونے والا ہے، جیسا انجام، انہی جیسی اقوام سابقہ کا ہوا تھا مثلاً) قوم عاد کا جو ارم کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں قابل اعتماد سامان زیست بڑی فراوانی سے حاصل تھا۔ (۲۶/۱۳۲-۱۳۴)۔ وہ بڑی عمارات بنانے اور بلند یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۲۶/۱۲۸)۔ انہیں، اپنی ہم عصر اقوام میں، بے نظیر مقام حاصل تھا۔

جیسا کہ دنیا کی بڑی بڑی صاحب قوت و سطوت اقوام کا شیوہ ہوتا ہے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں قائم کرتے تھے۔ اس قسم کی یادگاروں کی افادی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض اس قوم کے جذبۂ تکبّر و تعلّی کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں قرآن کریم کے الفاظ میں، حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ (۲۶/۱۲۸) "تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسی عمارات بطور یادگار بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں"۔

علم و بصیرت بھی

غرضیکہ انہیں ایسا تمکن عطا ہوا تھا کہ شاید ہی کسی اور کے حصہ میں آیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ تمام قوّت و حشمت، جہالت کو لئے ہوئے نہ تھی۔ بلکہ انہیں ذرائع علم (سماعت و بصارت قلب) بھی عطا ہوئے تھے۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً

(۴۶/۲۶)

(اور، وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع — سماعت، بصارت اور قلب — حاصل تھے۔

قرآنِ کریم نے سمع و بصر کے الفاظ اس علم کے لئے استعمال کئے ہیں جو مظاہر فطرت پر غور و تدبر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) جو حواس کے ذریعے مشاہدات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سمع و بصر، حواس کے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ تیسرا لفظ افئدۃ ہے۔ اس کے معنی (MIND) کے ہیں یعنی مشاہدات فطرت سے معلومات حاصل کرلینے کے بعد، قلب اور دماغ کے ذریعے استنباطِ نتائج کرنا۔ اسی قسم کا علم تھا جو قوم عاد کو حاصل تھا یہ سب کچھ تھا لیکن اس علم کے ماحصل (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ سائنس کی ایجادات وغیرہ) کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ قوانینِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ علم کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کیا جائے لیکن جو قومیں غلط روشِ زندگی پر چلتی ہیں وہ ان قوتوں کو باقی انسانوں کی غلامی کا ذریعہ بنالیتی ہیں اور ان کی محنت کی کمائی کے سلب و نہب (EXPLOITATION) کو اپنی کاریگری قرار دے لیتی ہیں۔ یہی کچھ قوم عاد کرتی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ہر مستبد قوم کی طرح ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جن قوموں پر ہاتھ ڈالا، آہنی شکنجے میں جکڑ لیا کہ ان کی غلامی کے جال کا کوئی حلقہ ڈھیلا نہ ہونے پائے۔

وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴿۲۶/۱۳۰﴾

اور تم، کمزوروں پر اپنے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دیتے تاکہ تمہارا غلبہ و اقتدار اور جور و استبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

تکذیبِ رسلؑ

اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رسولؑ بھیجے لیکن نشۂ حکومت و قوت میں بدمست قومیں پیغاماتِ خداوندی پر کان کب دھرتی ہیں؟ انہوں نے ان رسولوںؑ کی تکذیب کی اور اپنے ظلم و استبداد میں بڑھتے چلے گئے۔

کَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۶/۱۲۳﴾

قوم عاد نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

قوانینِ خداوندی سے بغاوت، اور اپنے سرکش و جابر اربابِ حکومت کا اتباع۔ یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔

وَ تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۱/۵۹﴾

یہ ہے سرگذشت قوم عاد کی، جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس کے رسولوںؑ (کی دعوت) سے سرکشی برتی۔ اور اس کے برعکس اپنے ان سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔

حضرت ہودؑ

بالآخر جب جور و استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہوگئی اور سنت اللہ (قانون مکافات) مطابق ان کی غلط روش زندگی کے ظہور نتائج کا وقت قریب آ پہنچا تو آخری کوشش کے طور پر ان کی طرف انہی میں سے ایک رسول (حضرت ہودؑ) کو بھیجا گیا۔

۷/۶۵ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (۷/۶۵) نیز (۱۱/۵۰ ؛ ۲۶/۱۲۴ ؛ ۴۶/۲۱)۔

اسی طرح، ہم نے قوم عاد کی طرف، ان کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ کیا تم غلط روش کی تباہ کاریوں سے بچنا نہیں چاہتے؟ (نیز ۱۱/۵۰ ؛ ۲۶/۱۲۴ ؛ ۴۶/۲۱)

خدا کی حکمرانی کی طرف دعوت

آپ آئے اور اس سرکش و متمرّد قوم کو اسی پیغام ازلی کی دعوت دی جو ہدایت آسمانی کی اصل و اساس ہے یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزاوار فقط ایک ذات باری تعالیٰ ہے۔ (۷/۶۵ ؛ ۱۱/۵۰ ؛ ۴۶/۲۱)۔

قوانینِ الٰہیہ اور دنیاوی برکات

قوم کو قوت و سطوت حاصل تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایت آسمانی کے اتباع سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم حکومت و دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زاویوں اور خانقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہودؑ نے اس باب میں ایک ایسی حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباع قوانین الٰہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ○ (۱۱/۵۲)

میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی غلط روش کی وجہ سے، آنے والی تباہی سے بچنے کے لئے قوانین خداوندی سے حفاظت طلب کرو۔ اور اپنے باطل عقائد چھوڑ کر، اس کی طرف لوٹ آؤ۔ تم اس کی شان ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح تمہاری خشک زمینوں کو بارش سے سیراب کرتا ہے جس سے تمہاری قوتیں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی اطاعت کر کے اپنی شکر گذاری کا ثبوت دو۔ نہ یہ کہ الٹا ظلم و ستم پر اتر آؤ اور مجرمین کی طرح اس کے قوانین سے منہ موڑ لو۔

یہ ہے عظیم فرق آسمانی ہدایت اور ذہن انسانی کے پیدا کردہ تصور مذہبیت میں۔ ذہن انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ

دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔ دنیا سے مراد ہے قوت و سطوت۔ دولت و حشمت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دینداری سے مفہوم ہے بے کسی و بے چارگی۔ عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگواریوں سے نفرت کی جائے اور ترکِ لذائذ سے "پرہیزگاری" کو مقصدِ حیات قرار دیا جائے لیکن یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ سرکش و متمرد انسانوں سے قوت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعتِ مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے بلکہ قوانینِ خداوندی کے تحت نظم و ضبطِ عالم کو ترتیب دے اور تمام نعمائے دنیا کو نوعِ انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی

نظامِ حکومتِ خداوندی کی عملی تشکیل

نشو و نما کے لئے عام کر دے (اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں بیان کی جا چکی ہے) حضرت ہودؑ نے یہی فرمایا کہ میں جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ فقط نظامِ معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہو گی کہ:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ (۲۶/۱۲۵-۱۲۶ ؛ ۲۶/۱۳۱)

میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، امن و سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا، تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے لئے، میری اطاعت کرو۔ (نیز ۲۶/۱۳۱)

غور کیجئے۔ منصبِ رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ نہیں۔ بلکہ اس حکومتِ خداوندی کے مرکزِ اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۲۷ ؛ ۱۱/۵۱)

یہ بھی سن لو کہ میں، اس کے بدلے میں، تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ مجھے خدا کی ربوبیتِ عالمینی کی طرف سے مل جائے گا۔ (نیز ۱۱/۵۱)

تکذیب۔ اربابِ اقتدار کی طرف سے

یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہودؑ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کسطرح اس نظام کو قبول کریں؟ اسکی سب سے پہلی تکذیب حسبِ معمول۔ قوم کے سرداروں کی طرف سے ہوئی۔ انہی سرداروں کی طرف سے

جن کے گھروں میں "برتن بھرے ہوئے تھے"۔

۷/۶۶ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

(قوم نوحؑ کی طرح) اُس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جو اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے، کہا کہ ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل اور ہوش کھو بیٹھے ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ، تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جائے گی، اور یہ پیغام تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے، یہ جھوٹ ہے۔

۷/۶۷-۶۹ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ہودؑ نے ان سے کہا کہ میں عقل و ہوش نہیں کھو بیٹھا۔ (میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں) میں اُس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام کائنات اور عالمگیر انسانیت کا نشو و نما دینے والا ہے۔ (چونکہ یہ تصور تمہاری انفرادی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے، اس لئے تم اس کی مخالفت کرتے ہو)۔

میں تمہاری طرف، اپنے نشو و نما دینے والے کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تم کو امن و سلامتی کی راہ دکھا رہا ہوں۔

کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ خدا نے تمہاری طرف، اپنا قانونِ ہدایت، ایک ایسے انسان کے ذریعے کیوں بھیجا جو تمہارے جیسا ہے، اور تم میں سے ہی ایک ہے تاکہ وہ تمہیں اسکی خلاف ورزی کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کرے؟ (تم سمجھتے تھے کہ خدا کا پیغامبر کوئی عجیب الخلقت انسان ہونا چاہیئے!) تم سوچو کہ قوم نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اسی لئے کہ اس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد خدا نے تمہیں اُن کا جانشین بنایا۔ تمہیں بڑی قوتیں اور فراخیاں عطا کیں۔ تم خدا کی ان قوتوں اور نعمتوں کو پیش نظر رکھو اور اُسکے قوانین کی خلاف ورزی مت کرو، تاکہ تم کامیاب ہو۔

ان آیاتِ جلیلہ میں دو تین باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ نشۂ حکومت و دولت میں سرمست انسان، دعوت الی الحق کو کس طرح نفرت و استہزاء سے ٹھکراتا ہے؟ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ اور لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ پر غور کیجیے۔ تمرّد و سرکشی کی بدمستیاں کس طرح چھلکتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ اس کے برعکس جواب دیکھئے! کس قدر متانت اور سنجیدگی کا مظہر ہے۔ شکن بجبیں نہیں۔ کف بدہاں نہیں۔ نعل بر آتش نہیں۔ گالی کا جواب (معاذ اللہ) گالی نہیں۔ کوئی اوچھاپن نہیں۔ سفاہت نہیں۔ اپنے مقام بزرگ و بلند پر پہاڑ کی طرح محکم کھڑے ہیں۔ اس لئے

محکم چوں کوہسار

کہ اپنی دعوت کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہے۔ قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کی مخالفت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قومِ مخالف کے جدال و قتال کی بہ نسبت ان کی طرف سے تکذیب و استہزا کا ذکر بڑا نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ جدال و قتال بھی اپنے مقام پر آزمائش کی گھاٹیاں ہیں۔ لیکن ایک داعی و مصلح کی راہ میں تکذیب و تحقیر کی منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ عام انسانوں پر نگاہ ڈالیے۔ وہ بالعموم بڑی بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کر لیں گے لیکن جونہی اُن پر کسی نے تنقید (CRITICISM) کی یا اُن کا استہزاء (RIDICULE) کیا۔ ان کی بات کو جھوٹا بتایا۔ اُن کی دعوت کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً آپے سے باہر ہو گئے۔ اور اس کے بعد ایسی چوکڑی بھولے کہ حصول مقصد و نصب العین کے لئے تگ و تاز کے بجائے، اسی تنقید و تنقیص کی خار دار جھاڑیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ استہزاء و تنقیص کے مرحلہ میں دامنِ ضبط و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، فی الواقعہ من عزم الامور ہے اور آسمانی انقلابِ ربوبیت کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ سردارانِ قوم کی اشتعال انگیز تنقیص پر نگہ ڈالیے اور اس کے بعد حضرت ہودؑ کے متین و سنجیدہ جواب پر — حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دوسری چیز، وہی ذہنِ انسانی کی اعجوبہ پسندی! یعنی قوم کو حیرت و استعجاب اس امر پر ہے کہ اُنہی جیسا ایک انسان (رَجُلٌ مِّنكُمْ) اور دعوائے رسالت! قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۴/۱۰) اُنہوں نے کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو) اور کوئی فوق الفطرت نشانی بھی تمہارے پاس نہیں۔ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۱/۵۳)۔ اس لئے

مَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ○ (۱۱/۵۳)

تم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جسے ہم واقعی محکم دلیل سمجھیں۔ ہم اپنے معبودوں کو محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔

اس کے بعد اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ تم جو (معاذ اللہ) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو اس کی وجہ ہماری سمجھ

ہیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں آتی کہ تم نے جو ہمارے دیوی دیوتاؤں کی اہانت کی ہے تو تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ (۱۱/۵۴)

ہمیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ (تم نے جو ہمارے معبودوں کی گستاخی کی ہے تو) تم پر، ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے (جو تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ اس سے پہلے تم اچھے بھلے تھے)

یہ جگر سوز طعن و تشنیع دیکھئے اور پیغمبرانہ جواب ملاحظہ فرمائیے کہ:

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (۱۱/۵۴)

اس کے جواب میں ہودؑ نے صرف اتنا کہا ——— اور اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں سے اور کہا بھی کیا جاتا! ——— کہ میں اس پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہنا کہ تم غیر اللہ میں سے جس جس کو اُس کا شریک قرار دیتے ہو، میں ان سے یکسر بیزار ہوں۔

اسلاف پرستی

یہاں تک تو نشۂ قوت و دولت کی سرمستیوں کے مظاہرے تھے۔ اب دنیائے معتقدات اور اس کی جذبات پرستی کی طرف آئیے! یعنی وہی سازِ کہن کہ چونکہ تمہاری دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ہم میں آباؤ اجداد سے متوارث چلا آ رہا ہے اس لئے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں! وہی اسلاف پرستی اور وہی قدامت پسندی۔

۷/۷۰ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ

انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمیں یہ کہنے کے لئے آئے ہو کہ جن ہستیوں اور قوتوں کو ہمارے آباؤ اجداد اپنا معبود مانتے چلے آئے ہیں، ہم انہیں چھوڑ دیں اور صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کر لیں؟

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے اس ادّعا کے جواب میں حضرت ہودؑ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس میں اربابِ فکر و نظر کے لئے حکم و بصائر اور معارف و حقائق کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ فرمایا۔

۷/۷۱ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ

وہ قوتیں جنہیں تمہارے اسلاف نے اپنا معبود بنا رکھا تھا، اُن کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ چند اصطلاحی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے وضع کر رکھے ہیں۔ خدا کی طرف سے ان کے اقتدار و اختیار کی کوئی سند

تمہارے پاس نہیں۔ اُس نے ان کی معبودیت کی کوئی سند نازل ہی نہیں کی (۵۳/۲۳) ؛ (۱۲/۴۰)۔

تبیانِ حقیقت

اس چھوٹے سے ٹکڑے پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کتنی عظیم حقیقت اس کے اندر منعکس ہے۔ یہ روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتداً میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا جس کا کچھ نام رکھ لیا گیا۔ جب وہ دو چار نسلیں متوارث چلا آیا، تو اس کی کہنگی، وجہ تقدس ہو گئی اور وہ نام، دل کی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ عقل و بصیرت کی کوئی دلیل اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک پتھر، پہاڑ کے کسی گوشے میں پڑا ہے، تو فقط پتھر ہے۔ لیکن اسے کسی چبوترہ پر الگ نصب کر کے اس کا کچھ نام رکھ دیجئے۔ اس نام کی ترویج دو تین نسلوں تک مسلسل ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ اس کی روایتی عظمت دلوں میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی! اور اس طرح وہی پتھر جو "گمنامی" کے گوشے میں پڑا تھا، قلوب و نگاہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ حالانکہ چشمِ حقیقت بیں کے نزدیک محض نام رکھ دینے سے اس کی ماہیت اور حقیقی قدر و قیمت (INTRINSIC VALUE) میں کچھ فرق نہیں آجاتا۔ اب اس خارجی دنیا سے ہٹ کر ذرا اپنے دماغ کے بتکدہ کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے "پتھر" ایسے رکھے ہیں جن کی قدر و قیمت کے متعلق آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل و شہادت نہیں کہ ان کے نام کی عظمت نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آرہی ہے اور محض قدامت کی بناء پر ان ناموں میں شانِ تقدس پیدا ہو چکی ہے۔ دیکھئے کہ یہ نام آپ کے نزدیک اتنے مقدس بن چکے ہیں کہ اُن کے خلاف آپ ایک لفظ تک سننا نہیں چاہتے! اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قدر و قیمت کے پرکھنے کے لئے کیا معیار مقرر فرمایا ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ یعنی ان ...... چیزوں کی عظمت و تقدس کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند تمہارے پاس نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ ہو۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھئے یہ "دھرم کانٹا" جو وزن بتائے وہی درست اور صحیح ہے، خواہ آپ کا ذہن یا اسلاف پرستی کے معتقدات کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ محض اسماء کو دلیل اور حجت سمجھ لینا، حقیقت فراموشی اور خود فریبی ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے فقط ایک ہی ہے۔ یعنی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ "جو اللہ نے نازل کیا ہے"۔

تکذیب میں شدت

حضرت ہودؑ کی دعوت اور قوم کی طرف سے تکذیب برابر آگے بڑھتی گئی۔ طبیب کی شفقت اور مریض کی ضد متوازی چلتی گئی۔ حضرت ہودؑ ان سے بار بار کہتے کہ دیکھو!

قوانین الٰہیہ سے سرکشی کا مسلک چھوڑ دو، ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوگا۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسمان کی فضا میں کس طرح اس وبا کے جراثیم پھیلتے جارہے ہیں جو قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت تم پر عذاب بن کر مسلّط ہو جائیں گے اور پھر کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔ لیکن قوت اور دولت کا نشہ ان باتوں کی طرف کب کان دھرنے دیتا ہے؟ سرکش و متمرّد انسان دیکھتے تھے کہ جس طرف ان کا قدم اٹھتا ہے عروج اور ترقی آگے بڑھ کر رکاب چومتی ہے۔ ان بڑھتی ہوئی کامیابیوں اور چڑھتی ہوئی کامرانیوں میں ہلاکت و بربادی کا تصور تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ لیکن وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ بادۂ رنگین کے اثرات سے جو سرخی چہرے پر نمودار ہوتی ہے، وہ خون کی تازگی اور صحت کی شگفتگی کی سُرخی نہیں ہوتی بلکہ محض فریبِ نگاہ ہوتی ہے۔

وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۙ (۲۹/۳۸)

اُن کے سرکش جذبات، اُن کی غلط روش کو نہایت خوش نما بنا کر دکھاتے تھے، اور اس طرح اُنہیں صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے تھے۔ وہ لوگ، یہ کچھ بربنائے جہالت نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے سوچتے اور دیکھتے بھالتے تھے (لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ جب انسان کے جذبات اس پر غالب آجاتے ہیں، تو اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ یہ صرف وحی کی حد بندیاں ہیں جو انسانی جذبات کو بے راہرو نہیں ہونے دیتیں۔ تنہا عقل کے بس کی یہ بات نہیں۔ کتنی قومیں ہیں جو علم وعقل کی بلندیوں پر ہونے کے باوجود، خود بھی تباہی کے جہنم کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اور باقی دنیا کو بھی اس میں جھونک دیتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے)۔[1] ـــــ نیز (۲۶/۴۶)۔ قرآنِ کریم نے علم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ـــــ یعنی تنہا علم نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ہر جگہ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کہا ہے[2] ـــــ یعنی جب علم کو کام میں لایا جائے تو پھر نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ جزاء عمل کی ہے، تنہا علم کی نہیں۔

وہ مستبصرین تھے

غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کس قدر جامع ہیں۔ شیطان حق وصداقت کی راہ روکے کھڑا تھا۔ اور جس راستہ پر وہ چل رہے تھے اُسے اُس نے جذبات کی گلکاریوں سے ایسا فریب نظر بنا دیا تھا کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ان حسین و دلفریب پھولوں کی کیاریوں کے پیچھے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے

---

[1] خود ہمارے زمانے میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی قومیں تہذیب و تمدن اور علم و حکمت میں کس قدر آگے نکل گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے اپنے معاشرہ کو کس قدر غلط خطوط پر متشکل کر رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ خود بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں، اور ان کے ساتھ باقی دنیا بھی تباہ ہو رہی ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ یہ قومیں وحی کی روشنی سے کام نہیں لیتیں۔ [2] (۳۲/۱۷ - ۴۶/۱۴ - ۵۶/۲۴)

ہولناک غار ہیں۔ حالانکہ وہ مستبصرین تھے۔ آنکھیں رکھتے تھے۔ صاحبِ دانش وبینش تھے۔ قرآن کریم نے اس مقام پر عقل وبصیرت اور "شیطنت" کے تقابل سے نگاہ کا رُخ ایک عظیم حقیقت کی طرف پھیر دیا ہے۔ "شیطنت" کے معنی ہیں ان جذبات کی غلامی جو وحی کے تابع نہ چلیں۔ اگر انسان پر یہ جذبات غالب آجائیں تو اس کی عقل اسے کبھی صحیح راستہ پر نہیں لاسکتی۔ بلکہ عقل تو ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے لئے اسباب وذرائع بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بھی تراشتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ قومیں جو وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتیں "مستبصرین" ہونے کے باوجود، بربادی کے جہنم میں جاگرتی ہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے قوم ہودؑ کے "مستبصرین" کے انجام کو سامنے لاکر نگاہ کا رُخ پھیرا ہے۔ سورۂ احقاف میں انہی "مستبصرین" کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۴۶/۲۶)

(اور، وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر جاہ وجلال اور غلبہ واقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم ودانش کے تمام ذرائع ——— سماعت، بصارت اور قلب ——— حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے وہ قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے تھے، اس لئے ان کی عقل ودانش اور فہم وفراست، ان کے کسی کام نہ آئے (۴۵/۲۳)۔ اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ (جب عقلِ انسانی، وحی کی روشنی میں کام کرے، تو اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے، تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی عقل ودانش ماؤف ہو جاتی ہے، جس طرح نشے کی حالت میں وہ ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے)۔

غور کیجئے۔ سمع وبصر وقلب علم وعقل کے ذرائع سب موجود ہیں لیکن وحی کی روشنی سے منہ موڑنے کی وجہ سے وہی کیفیت ہو چکی ہے جو آج مستبصرینِ مغرب کی ہے، جن کی دوربینیں مریخ تک کے احوال وکیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں اور چاند پر اتر کر اس کا عینی مشاہدہ کر لیتی ہیں لیکن تباہی وبربادی کا جو سیلاب ان کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہوتا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا اور جب کوئی "دیدہ ور" ان سے کہتا ہے کہ ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر وبر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے　　(اقبالؒ)

تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس روشنی کے زمانہ میں یہ "دقیانوسی خیالات" کا پیامبر کہاں سے آگیا؟ جب حضرت ہودؑ نے ان مکذبین سے کہا کہ:

إِنِّیٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۲۶/۱۳۵)

مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

تو اس کا جواب کیا ملا؟

قَالُوا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُن مِّنَ الْوَاعِظِينَ ۝ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ (۲۶/۱۳۶-۱۳۸)

اُنہوں نے یہ سب کچھ سُنا، اور نہایت طنز و حقارت سے کہا کہ آپ کے اِس وعظ کا شکریہ! لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا یا نہ کرنا، برابر ہے۔

(خدا، اُس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے دھمکاتے ہو۔ یہ سب) پرانے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ (نیز ۳۸/۷)

(آپ ہمارے غم میں یونہی بیکار نہ گھلے جائیے) مطمئن رہیئے کہ ہم پر کوئی تباہی نہیں آئے گی۔

تنذیر وہ بار بار، ایک ناصح امین کی طرح انہیں ان کے اعمال کے عواقب و انجام سے آگاہ کرتے لیکن وہ ہر بار یہی کہتے کہ:

۷/۷۰ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (نیز ۴۶/۲۲)

(تم کہتے ہو کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم پر تباہی کا عذاب آجائے گا)۔ سو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس تباہی کو لاکر دکھاؤ۔

اس کے جواب میں حضرت ہودؑ فرماتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ؏

حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

۷/۷۱ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ

اُس نے کہا تم اس تباہی کا انتظار کر رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تباہی تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے (تمہاری آنکھیں کھلی ہوتیں تو اس کے آثار سامنے نظر آجاتے) جس اضطراب اور ہیجان میں تم مبتلا ہو، یہ خدا کے عذاب کی علامات نہیں تو اور کیا ہیں؟

وہ پوچھتے کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ ارشاد ہوتا کہ:

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ (۴۶/۲۳)

اس کا علم میرے خدا ہی کو ہے کہ وہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا۔ میرا فریضہ تو اتنا ہی ہے کہ مجھے، جو پیغامات دے کر، تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، انہیں تم تک پہنچا دوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم بڑی احمق قوم ہو (کہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں، تم اس پر غور و فکر کرتے نہیں۔ اور اس پر اصرار کئے جا رہے ہو کہ جس تباہی سے تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے، وہ جلدی کیوں نہیں آتی)۔

اوچھے ہتھیار جب مجادلہ و مباحثہ سے کام نہ چلا تو قوم اُن حربوں کو لے کر مقابلہ میں آ گئی جو ارباب قوت و استبداد کا آخری جواب ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغاماتِ الٰہیہ کا پیامبر اور حقیقت کا مبصّر ہو، وہ بھلا اس تخویف و ترہیب سے کس طرح گھبرا جائے؟ حضرت ہودؑ نے فرمایا:

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـــًٔـا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ (۱۱/۵۵-۵۷)

تم جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے ہو، سب کے سب مل کر کر لو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو (اس کے بعد دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے!)۔

میرا بھروسہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے جو بڑا ہی محکم گیر اور قابلِ اعتماد ہے۔ اُس خدا کا قانون جو میرا اور تمہارا سب کا نشوونما دینے والا ہے۔ تم تو ایک طرف رہے، کائنات میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جو اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے باہر ہو۔ میرا خدا، (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدوش راہ پر ہے۔ (لہٰذا، تم بھی، اُس کے پیچھے پیچھے، اسی راہ پر چلو (۱/۵)؛ (۶/۵۳-۵۴)؛ (۴۲/۵۳))

اگر تم اس سے روگردانی کرو گے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوگی۔ میرے ذمے فقط اتنا تھا کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ سو وہ میں نے پہنچا دیا۔ اب تم دیکھ لو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات (تمہیں کس طرح تباہ و برباد کر کے) تمہاری جگہ ایسی قوم کو لے آتا ہے جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی (۹/۳۸-۴۳؛ ۴۷/۳۸)۔

تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز کا نگران ہے۔

ظہور نتائج کا وقت

حجت کا اتمام ہوگیا۔ قانونِ مکافات کے مطابق وہ وقت آپہنچا جب اعمال کی کھیتی پک جاتی اور اس کے نتائج نمودار ہوجاتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ...... كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۝

(۴۶/۲۴-۲۵) و (۴۱/۱۵-۱۶)

(اس وقت طویل خشک سالی کی وجہ سے انہیں بارش کی بہت ضرورت تھی) اُنہوں نے دیکھا کہ کالی گھٹا اُٹھی ہے جو اُن کی وادیوں کی طرف بڑھے چلی آرہی ہے۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ گھٹا ایسی بارش برسائے گی جس سے ہماری زمینیں سیراب ہوجائیں گی۔ لیکن وہ بارش برسانے والا بادل نہیں تھا۔ وہ اس آندھی کا جھکڑ تھا جو اُنکی اس تباہی کے لئے بڑھے چلے آرہا تھا جس کے لئے وہ جلدی مچانے تھے [جب کوئی قوم اقدارِ خداوندی کو پامال کردیتی ہے تو وہ حوادثِ فطرت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ یہ ہوتا ہے تعلق اخلاقی بدکرداری اور حوادثِ ارضی و سماوی کے ذریعے تباہی (عذاب) آنے میں۔ نیز انسان تنہا عقل کی رو سے خیر و شر میں تمیز نہیں کرسکتا۔ (۲/۲۱۶)]
چنانچہ وہ جھکڑ آیا اور اُس نے قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر شے اُکھاڑ پھینکی، اور چاروں طرف تباہی مچا دی۔ اس سے اُس بستی کی حالت یہ ہوگئی کہ اُس کے مکانوں کے کھنڈرات باقی رہ گئے، اور مکین سب ہلاک ہوگئے۔

اِس طرح ہم مجرمین کو اُن کے غلط اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (ان سے کہدو کہ اگر تم نے بھی اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا)۔ (۴۶/۲۵) (نیز ۴۱/۱۵-۱۶)

بربادی

وہی بادِ تند و تیز (آندھی اور جھکڑ) جس سے ریت کے تودے بستیوں اور آبادیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتے ہیں؛ اسی کو دوسری جگہ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ کہا گیا ہے۔ (۵۱/۴۱-۴۲)

آندھی کا یہ طوفان مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک جاری رہا۔ (۶۹/۶-۸)۔ اور اس طرح وہ قوم، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نشانات نصب کرتی، بڑے بڑے ستونوں پر عمارات تعمیر کرتی اور اپنے سے بڑھ کر کسی کو طاقتور نہ سمجھتی تھی۔ ایک جھکڑ کا مقابلہ نہ کرسکی اور ہلاک ہوگئی۔ (۲۶/۱۲۹-۱۴۰)۔ اس طرح ہلاک کہ ان کی جڑ تک کٹ گئی۔

۷/۷۲ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝

(سو جب ظہورِ نتائج کا وقت آیا، تو ہم نے ہُود اور اُس کے رفقاء کو (۱۱/۵۸) تباہی سے بچا لیا اور) جن لوگوں نے

ہمارے قوانین کو تسلیم نہیں کیا تھا اور اُنہیں جھٹلایا تھا، اُن کی جڑ کاٹ ڈالی۔
وہ حال اور مستقبل دونوں میں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگئے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ۝
وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا
بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ع (۱۱/۵۹-۶۰)

یہ ہے سرگزشت قومِ عاد کی جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس کے رسولوںؑ (کی دعوت) سے سرکشی برتی۔ اور اپنے اُن سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔ (۱۱/۵۹)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ، حال اور مستقبل، دونوں کی زندگی میں، نوازشاتِ خداوندی سے محروم رہ گئے ——
یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ اُنہوں نے اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے انکار کیا تھا ——
دیکھو! قومِ عاد کسطرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئی! (۱۱/۶۰)

یہ قوم دنیا سے نیست ونابود ہوگئی، اور جسطرح حضرت ہودؑ نے انہیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا، اُن کی جگہ دوسری قوم نے لے لی کہ مکافاتِ عمل کی رُو سے استبدال و استخلاف قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اٹل قانون ہے[1]۔ (۱۱/۵۷)

حضرت ہودؑ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دیدیا تھا (جس طرح حضرت نوحؑ کو طوفان کا پیشتر علم دیدیا گیا تھا) اور وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے تو فیصلہ ہی یہ کر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہودؑ کہیں اسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ

جماعتِ مومنین بچالی گئی

اُنہوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ وبرباد ہوگئے۔ اور حضرت ہودؑ اور اُن کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے۔ (۱۱/۵۸ نیز ۷/۷۲)۔ ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عادِ ثانیہ کہا گیا ہے اور جو تباہ ہوگئی اسے عادِ اولیٰ۔

وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى ۙ (۵۳/۵۰)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے جسکے قانونِ مکافات کے مطابق عادِ اولیٰ ہلاک ہوگئے۔

---

[1] انڈکس میں تفصیل دیکھئے۔

نگۂ بازگشت قومِ عاد کے اس سانحۂ عبرت آموز پر نگۂ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر اُبھر کر سطح پر نظر آرہی ہیں۔ قوم، قوت و دولت اور حکومت و سلطنت کی مالک ہے اور اسے اللہ کا فضل و احسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر سرکشی و تمرّد پر اُتر آتی ہے تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو! اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں۔ لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کر لو اور اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھاتا جائے گا۔ (یَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ ۱۱/۵۲) وہ نہیں مانتی تو وہ ایک رسوا کن عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ (لِنُذِیْقَھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَخْزٰی ۴۱/۱۶) اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی کے تحت عزّت و شوکت حکومت و سطوت، قوّت و ثروت

محکومی و رسوائی خدا کا عذاب ہے اللہ کے انعامات ہیں اور ذلّت و رسوائی کی زندگی عذابِ خداوندی ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قومِ نوحؑ کا جانشین بنایا گیا تھا۔ (۷/۶۹)۔ اور جب اس نے پیغاماتِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی تو اس سے کہدیا گیا کہ یاد رکھو، اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔ (۱۱/۵۷)۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ بھی اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت و حشمت کی وارث کسی دوسری قوم کو بنا دیا جائے۔

سعد و نحس قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ دن بڑا "منحوس" تھا جب ان پر اللہ کا عذاب طاری ہوا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَخْزٰی وَھُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝

(۴۱/۱۶) نیز (۵۴/۱۹)

سو جب ان کی تباہی کا وقت آیا ——— جو ظاہر ہے کہ اُن کے لئے بڑا ہی نامبارک تھا ——— تو ہم نے اُن پر ایسے زور کی آندھی چلائی جس نے اُنہیں آتشِ خاموش کی طرح ختم کر کے رکھ دیا (۵۴/۱۹)۔ اس طرح انہیں اس دنیا کی زندگی ہی میں ذلّت آمیز عذاب مل گیا۔ اور آخرت کی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کُن ہوگا۔ اُنہیں اُس عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ (نیز ۵۴/۱۹)

اسے قرآنِ کریم نے ایک "عظیم یوم" (عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ) بھی کہا ہے۔ (۴۶/۲۱ ؛ ۲۶/۱۳۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ سعد و نحس کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے غلط اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجاتا ہے تو

وہ گھڑی اس کے لئے نحس ہے۔ لہٰذا سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے۔ ستاروں کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں ۴۵/۱۲ سو جو خود محکوم و مسخر ہو وہ دوسرے کے مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے[1]۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہ ہے اس قوم عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو۔ ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں میں تمہارے لئے کون کون سے سامانِ موعظت مدفون ہیں۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ (۲۹/۳۸)

اسی طرح عاد و ثمود کے ساتھ بھی ہوا جن کی تباہی کی داستانیں ان کے مکانات کے کھنڈرات سے ظاہر ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اٹھ بیٹھے۔ جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے اس کے لئے ان ویرانوں کی ٹھیکریاں، عروج و زوالِ امم کی ہزاروں خاموش داستانیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ! "کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے؟"

سورۃ الاعراف میں قوم ثمود کا بھی ذکر آتا ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس سورت میں ان سے متعلق چند ایک آیات (۷۹ - ۷۳) آئی ہیں لیکن ان کی داستان قرآن مجید کے متفرق اوراق میں پھیلی ہوئی ہے اسے ہم حسبِ سابق مسلسل انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اس قوم کا جرمِ عظیم ایسا تھا جس کا تعلق براہِ راست ہمارے زمانے سے ہے جسے عہدِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہا جاتا ہے۔ اس میں قرآن کریم کے معاشی نظام کا اساسی نکتہ سامنے آجاتا ہے (اس معاشی نظام کی تفاصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہیں۔ جن کی نشاندہی انڈکس کرتا ہے)۔

---

[1] انڈکس میں 'تقدیر' کا عنوان دیکھئے۔

قومِ ثمود ـــــــــ حضرت صالحؑ

امم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے زیادہ مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کے عروج کا زمانہ عادِ اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم، عرب کے شمال مغربی حصّہ پر حکمران تھی جسے وادی قریٰ کہتے تھے۔ حجرؔ ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادی قریٰ کے گرد و پیش کا میدان سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز۔ قرآنِ کریم نے اس قوم کو عادؔ کا جانشین بتایا ہے۔

۷/۷۴ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

تم قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔ تم سے پہلے، قوم عادؔ نے اِن قوانین سے سرکشی برتی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ تم اُسی قوم کے جانشین ہو۔ اُن کے بعد، خدا نے تمہیں اِس ملک میں اِس طرح متمکن کر دیا کہ تم اس کے میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو، اور پہاڑوں کو تراش کر، اُن میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی اِن نعمتوں اور اس کے قانون کی قوتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھو، اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے پہلے ان کی تباہی ہو چکی تھی کیونکہ دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بدکرداریوں سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو قومِ نوحؑ و عاد و ثمود کا ہوا تھا۔ (۴۰/۳۰-۳۲) اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق۔م سے لے کر (۱۶۰۰) ق۔م تک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنی نوازشات کی گھر باری فرما رکھی تھی۔ انہیں متمکن فی الارض کیا تھا۔ (۷/۷۴)۔ قوم عاد کی طرح یہ بھی میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے جو فنِ سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷/۷۴ ؛ ۱۵/۸۲)۔ پُر فضا باغات۔ لہلہاتی کھیتیاں۔ صاف و شفاف اُبلتے ہوئے چشمے۔ (۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

دولت و سطوت

وادیٔ قریٰ میں سنگین عمارات۔

وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ○ (۸۹/۹)

اورقوم ثمود کا (انجام)، جو پہاڑوں کے دامن میں مستحکم قلعے بناتی تھی (نیز ۷/۷۴ و ۱۵/۸۲)
اور جنود و عساکر، کی اکثریت۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ۝ (۸۵/۱۷-۱۸)

(اُسی کا قانون انسانی دُنیا میں، مکافاتِ عمل کی شکل میں کارفرما ہے۔ اس کی شہادت کے لئے قرآن میں) ان لوگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ، قوانین خداوندی کی مخالفت کے لئے ہجوم کرکے آئے تھے۔

یعنی قوم فرعون، اور قوم ثمود کے لوگ ——— (ان کا جو انجام ہوا وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے)۔

یہ تھی وہ قوم جن کی طرف خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ لیکن اُنہوں نے اپنی دولت و حشمت، حکومت و قوت کے نشے میں قوانینِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۱۵/۸۰)

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔

یہاں ان کے دارالحکومت کی نسبت سے انہیں اصحٰب الحجر کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ان کا نام مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶/۱۴۱)۔ (نیز ۵۴/۲۳)

اور (دیکھو) قوم ثمود نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔

بعثتِ حضرت صالح ؑ تا آنکہ جب ان کی سرکشی و عدوان حد سے بڑھ گئی اور قانونِ مشیت کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو اُن کی طرف، اسی قبیلہ سے حضرت صالح ؑ مبعوث ہوئے۔

۷/۷۳ وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ (۷/۷۳) (نیز ۱۱/۶۱ و ۲۶/۱۴۲ و ۲۷/۴۵)۔

اور (دیکھو) ہم نے قوم ثمود کی طرف اُنہی کے بھائی بند صالح کو مبعوث کیا۔

اس وقت ہر جابر و مستبد قوم کی طرح، اس قوم کی بھی یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ ملک میں فساد برپا[1] کرتے تھے اس لئے

---

[1] فساد برپا کرنے سے ہمارا ذہن ڈاکہ زنی۔ قزاقی۔ بدامنی وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لیکن فساد کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ نظام جو غیر خداوندی قوانین پر مشتمل ہو، فساد ہے (خواہ اس میں بظاہر کیسا ہی امن کیوں نہ ہو) اور اس کے مقابلہ میں اصلاح صرف اس نظام کا نام ہے جو قوانین خداوندی پر قائم ہو۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے فساد اور مفسد کی قرآنی اصطلاحات کے صحیح معنی سمجھ میں آسکیں گے۔ (مزید تفصیل کے لئے انڈکس دیکھئے)۔ نیز (۲۶/۱۵۲، ۲۷/۴۸)

ان سے کہا گیا کہ:

۷/۲۳ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝

(تم خدا کی نعمتوں اور اس کے قانون کی قوتوں کو اپنے پیش نظر رکھو) اور ملک میں فسادمت برپا کرو۔

مفسدین کی قوم

وَ لَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ۝ (۲۶/۱۵۱-۱۵۲)

اور اپنے اُن لیڈروں کا کہا مت مانو جو عدل و انصاف کی حدود سے تجاوز کر کے، ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔

جب رزق کی تقسیم قوانین خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی تو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کو فساد فِی الْاَرْضِ کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں۔ جب یہ ناہمواریاں (قوانین خداوندی کے مطابق) ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں تو اسے اصلاح کہا جاتا ہے۔ قوم ثمود کے معاشرہ میں اسی قسم کی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دارالحکومت میں نو ناظم الامور تھے جن کے سپرد علاقہ کا انتظام تھا۔ اور چونکہ پورے کا پورا نظامِ حکومت بگڑ چکا تھا اس لئے یہ سب کے سب مفسد و مستبد تھے۔

وَ كَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ۝ (۲۷/۴۸)

اس قوم کے دارالسلطنت میں نو بڑے بڑے منتخب سردار تھے جن کے ذمے معاشرے کا نظم و نسق تھا۔ وہی ان تمام فسادات کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے۔ اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف آنے نہیں دیتے تھے (حقیقت یہ ہے کہ قوم کا دار و مدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار اور نظم و نسق ہو۔ وہی قوم کو بگاڑتے ہیں اور انہی کے سنوارنے سے معاشرہ سنورتا ہے)

ان کا سرغنہ ان سب سے بڑھ کر شقی و بدبخت تھا۔

اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا ۝ۙ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ...... (۹۱/۱۳-۱۲)

(اور یاد کرو) جب اُس (قوم) کا بدبخت ترین شخص اٹھا تو اللہ کے رسول (صالح) نے ان لوگوں سے کہا.....

ان حالات کے ماتحت بھلا احکامِ الٰہیہ کی طرف کون توجہ دیتا؟

وَ اٰتَيۡنٰهُمۡ اٰيٰتِنَا فَكَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۝ۙ (۱۵/۸۱)

اُنہیں ہم نے واضح قوانین دیئے تھے، لیکن وہ اِن سے روگرداں رہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک نکتہ پر غور کیجئے۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اس قوم میں فساد عام ہو چکا تھا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ان کے مرکزی مقام (دارالحکومت) میں نو سربرآوردہ ایسے تھے جو درحقیقت اس فساد کے سرچشمہ تھے۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قوموں میں فساد کا ذمہ دار درحقیقت اوپر کا طبقہ ہی ہوتا ہے۔

اُوپر کا طبقہ عوام تو ان کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ جس قسم کا اوپر کا طبقہ اسی قسم کے عوام۔ اگر اوپر کے طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو قوم خودبخود اصلاح یافتہ ہو جاتی ہے۔

وہی دعوتِ انقلاب یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت صالحؑ کی بعثت ہوئی۔ آپ تشریف لائے اور قوم کو اسی اساسی اور اصولی پیغام خداوندی کی طرف دعوت دی جو آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی اوّلین کڑی ہے۔ فرمایا:

۷/۷۳ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ (نیز ۲۷/۴۵ و ۱۱/۶۱)

(اس طرح، ہم نے قوم ثمود کی طرف، اُن کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ کو بھیجا)۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اُس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔

حکومت صرف ایک خدا کی۔ کسی انسان کی نہیں۔ اور اس حکومت کی عملی تشکیل اس طرح کہ دلوں میں تقویٰ اور مرکز کی اطاعت۔

اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝ۚ اِنِّىۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ۝ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ ۝ (۲۶/۱۴۲-۱۴۴)

(آخر کار) اُن کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ اُن کی طرف آیا اور اُن سے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنی غلط روش کی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

اگر بچنا چاہتے ہو تو سن لو کہ میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، امن و سلامتی کا پیغام لے کر آگیا ہوں۔

اس لئے تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ جو نظام میں متشکل کرتا ہوں اس کی اطاعت کرو۔
یعنی مفسدین کی حکومت کی اطاعت مت کرو۔ بلکہ اطاعت فقط حکومتِ خداوندی کی کرو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (۲۶ / ۱۵۲-۱۵۰)

اگر تم تباہیوں سے بچنا چاہتے ہو تو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے لئے میری اطاعت کرو۔
اور اپنے ان لیڈروں کا کہا مت مانو جو عدل و انصاف کی رُو سے تجاوز کر کے، ملک میں
ناہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔

کتنا بڑا اعلان بغاوت اور کیسا نعرۂ انقلاب ہے! حقیقت یہ ہے علمبردارانِ حکومتِ خداوندی دُنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ دوسرے انقلابات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک انسان کی حکومت کی جگہ کسی دوسرے کی حکومت قائم کر دی جائے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حکومت و اقتدار کی کنجیاں انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر اقتدار و اختیار کے حقیقی مالک۔ خدائے ارض و سمٰوٰت کے سپرد کر دی جائیں۔ اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے جس میں کسی انسان کو کسی شکل میں، دوسرے انسان پر، حکومت کا حق ہی حاصل نہ ہو۔ اور رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی کا محتاج نہ ہو۔ سب انسان برابر اور ایک خدا کے قانون کے محکوم جو رب العلمین ہے۔ جس کی حکومت میں ظلم و استبداد، سلب و نہب اور غصبِ حقوق کا امکان ہی نہیں۔ یہ تھی وہ حکومت جو حضرت صالحؑ قائم کرنا چاہتے تھے، وہ اربابِ قوت و سلطنت جن کے چہرے کی سُرخیاں اور حریمِ ناز کی رنگینیاں انسانی خون کی رہینِ منت تھیں، کس طرح اپنے اقتدار و اختیار سے دستکش

اربابِ قوت کی طرف سے مخالفت

ہو کر مخلوقِ خدا کے خدام کی صف میں کھڑے ہو جاتے؟ لہٰذا وہی ہُوا جو ہوتا چلا آیا ہے اور جو ہوتا چلا جائے گا کمزور و ناتواں اور مظلوم و مقہور انسانوں نے جو انسانی چیرہ دستیوں سے تنگ آ چکے تھے، اس دعوتِ ربّانی پر آگے بڑھ کر لبیک کہا۔ اور اربابِ دولت و قوّت اس کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے!

(۷ / ۷۶-۷۵) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ
مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

اس پر اس قوم کے سرکش اکابرین نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا جماعتِ مومنین سے

کہا ـــــ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، اُن کے افلاس وغیرہ کی وجہ سے، بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے ـــــ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ؟

اُنہوں نے کہا کہ اس میں کیا شک ہے ؟ جو پیغامات اسے خدا کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، ہم ان پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

(یہ حقیقت غور طلب ہے کہ نظامِ خداوندی کی مخالفت، بالعموم، اربابِ قوت و دولت کی طرف سے ہوئی اور قوم کے مظلوم اور کمزور طبقہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس انقلاب کی غرض و غایت کیا ہوتی تھی)۔

ان سرکش اور متکبّر سردارانِ قوم نے کہا کہ تم جس بات کو سچا مانتے ہو، ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

وہ آمادہ پیکار تھے۔ لیکن حضرت صالحؑ ایک ناصحِ مشفق کی طرح انہیں برابر سمجھاتے چلے جاتے تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبریں نہ کھودو۔ لیکن نشۂ حکومت میں ان نصائح کو سنتا کون ہے ؟

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ○ (۲۷ / ۴۷-۴۶)

(صالحؑ نے انہیں بہتیرا سمجھایا لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ تم جس تباہی کی دھمکی دیتے ہو، اسے لے کیوں نہیں آتے ؟)۔ اس پر صالحؑ اُن سے کہتا کہ تم کس قدر اپنے آپ سے دشمنی کر رہے ہو کہ زندگی کی خوشگواریوں سے پہلے ہی، تباہیوں اور بربادیوں کے لئے جلدی مچا رہے ہو ! تم ان تباہیوں کو آوازیں دے دے کر بلانے کی بجائے خدا سے ان سے محفوظ رہنے کا سامان کیوں نہیں طلب کرتے ! اس سے، نہ صرف یہ کہ تم ان تباہیوں سے محفوظ رہ جاؤ گے بلکہ تمہیں نشوونما کا سامان بھی بافراط مل جائے گا۔

اس کے جواب میں وہ کہتے کہ جب سے تم اور تمہارے ساتھی نمودار ہوئے ہیں، ہمارے کانوں میں مسلسل تباہی اور بربادی کی آوازیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے، ہم ان الفاظ سے نا آشنا تھے حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ بڑے منحوس ہو۔

اس پر صالحؑ اُن سے کہتے کہ تم پر یہ "نحوست" (تباہی اور بربادی) ہماری وجہ سے نہیں آرہی۔ یہ تو تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے "قانونِ مکافات" کے مطابق مرتب ہو رہا ہے۔ (لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ

باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی جب تک) تمہیں عذاب کی کٹھالی میں تپایا نہیں جائے گا۔

وہی دیوانگی کی تہمت

یہ انہیں نتائج وعواقب سے آگاہ کرتے، اور وُہ (معاذاللہ) اُن کا مذاق اڑاتے۔ وہ کہتے کہ (خاکم بدہن) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ (۲۶/۱۵۳)

(اُنہوں نے یہ سب کچھ سُنا اور اس کے بعد، نہایت حقارت سے کہا کہ ہمیں اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ) تو بھی ان لوگوں میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں (کہ خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے اور ہمیں دُنیا کی اصلاح کے لئے مامور کرتا ہے!)۔

انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ ہمارے ہی جیسا انسان دعوئے رسالت میں سچّا کیسے ہو سکتا ہے؟

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۱۵۴)

تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے تم خدا کے رسول کسطرح ہو سکتے ہو؟) بہر حال، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم پر تباہی آنے والی ہے، تو اس کے لئے کوئی نشانی پیش کرو۔

ایک انسان رسُول!

اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم اُمم سابقہ کے احوال وکیفیات میں دیکھ چکے ہیں۔ یعنی ان سے کہا جاتا تھا کہ میں جس نظام کی طرف دعوت دیتا ہوں اسے عقل اور فکر کے معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ اس میں بھلائیاں ہی بھلائیاں نظر آتی ہیں یا نہیں۔ اور وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہم بھلا اپنے جیسے انسان کو خدا کا رسول کیسے مان لیں۔ اگر تم خدا کے رسول ہو تو ہمیں کوئی محیر العقول بات کر کے دکھاؤ۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝ (۵۴/۲۴)

اور کہا کہ کیا ہم ایسے آدمی کے پیچھے لگ جائیں جو بالکل تنہا ہے اور کوئی جتھہ اُس کے ساتھ نہیں؟ اگر ہم نے ایسا کیا (اور اپنا جتھہ چھوڑ کر اس کے پیچھے لگ گئے تو یہ خواہ مخواہ تباہی اور بربادی کا مول لینا ہوگا) ایسا کچھ تو وہی کریگا جسے سلامتی کی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی ہو اور وہ اندھا بن کر کنوئیں میں جا گرے۔ یا وہ بالکل پاگل ہو) اور اپنا نفع نقصان ہی نہ پہچانے!

بشر کے ساتھ واحد کے ٹکڑے پر بھی غور کیجئے۔ چونکہ وہ نشۂ قوت میں بدمست تھے اس لئے یہ کہتے تھے کہ اگر

کوئی ایسا شخص ہوتا جس کے ساتھ کوئی بہت بڑی جماعت ہوتی تو اس جماعت کی قوت سے دب کر ہم اس کی بات

سفاہت مان بھی لیتے۔ لیکن اب ہم اس کی بات کیوں مانیں جب یہ بالکل اکیلا ہے۔ اور پھر، جیسا کہ شریر النفس لوگوں کی افتادِ طبع ہے، وہ اصول سے ہٹ کر ذاتیات پر اُتر آتے اور حق و صداقت کی دعوت کا جواب گالیوں سے دیتے۔

ءَ اُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ (۵۴/۲۵)

بھلا سوچو، کہ ہم سب، اتنے اتنے بڑے آدمی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور خدا نے اپنی وحی کے لئے اِسے (حضرت صالحؑ کو) چُن لیا! یہ تو ہمیں بالکل جھوٹا اور خود پسند نظر آتا ہے (جو بڑا بننے کے لئے، اپنے آپ کو، خدا کا رسول کہتا ہے)

اُدھر سے یہ دریدہ دہنی اور ادھر سے فقط اتنا جواب کہ:

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ (۵۴/۲۶)

(ہم نے صالحؑ سے کہا کہ تو ان کی جگہ پاش باتوں سے افسردہ خاطر نہ ہو) کل ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا اور خود پسند کون ہے!

(د) اسلاف پرستی یہ اربابِ قوت و ثروت کا رویہ تھا۔ ان کے ساتھ مذہبی پیشوا آگے بڑھے اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا کہ یہ شخص تمہیں تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا

وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ (۱۱/۶۲)

اُنہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ (کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے، ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اور اپنی قابلیت سے اس مذہب کو دُور دُور تک پھیلاؤ گے لیکن تم نے اب ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے ہماری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو سہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباء اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے

مسلک کے خلاف ہے)۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہی جو کورانہ تقلید کے مسلک کے پیرؤوں کیلئے صحیح جواب ہو سکتا ہے!

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ (۱۱/۶۳)

اس پر (حضرت) صالحؑ نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خدا نے مجھے وحی جیسی نعمت کُبریٰ سے نوازا ہے، اور اس کی بنا پر میں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی دینے والی روشن قندیل لئے کھڑا ہوں۔ اگر اس کے باوجود میں اس کے احکام سے سرکشی اختیار کروں تو مجھے اس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کون بچا لے گا؟ تم جو کچھ مجھ سے چاہتے ہو، اس سے تم میرے بھلے کی بات نہیں کرتے، بلکہ سراسر تباہی کی طرف لے جانے ہو۔ یعنی تم اپنے مسلک کی صداقت کے ثبوت میں یہ دلیل رکھتے ہو کہ یہ تمہارے آباء و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے اور میرے پاس میرے اللہ کی عطا فرمودہ وہ قندیل فروزاں ہے جس کی روشنی میں حق و باطل الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کہیئے کہ میں ایسی شمع نورانی کو چھوڑ کر اندھوں کی لاٹھی کے پیچھے کس طرح چل پڑوں؟

پھر یہ بھی دیکھیئے کہ ایک پیغمبر بھی اپنے آپ کو قوانینِ الٰہیہ کی معصیت کے انجام سے محفوظ خیال نہیں کرتا اور قانونِ مکافات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ ہے وہ ایمان جس پر نظامِ خداوندی کی ثریّا بوس عمارت مستحکم ہوتی ہے۔ یعنی اس نظام میں سب سے برگزیدہ و بلند ترین ہستی بھی اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کا مطیع و فرمانبردار سمجھتی اور اس کی خلاف ورزی سے خوف کھاتی ہے۔ (اپنے مقام پر یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ حضور نبی اکرمؐ نے بھی یہی فرمایا تھا)۔ (۶/۱۵، ۱۰/۱۵، ۳۹/۱۳)

خفیہ سازشیں

ادھر سے تذکیر و موعظت اور ادھر سے تکذیب و تہدید ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی خفیہ سازشیں بھی، کہ اربابِ قوت و استبداد کے یہی حربے ہیں جو حق و صداقت کا گلا گھونٹنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۷/۴۸-۴۹)

(جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) اس قوم کے دار السلطنت میں نو بڑے بڑے منتخب سردار تھے جن کے ذمے معاشرے کا

نظم ونسق تھا۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کیطرف آنے نہیں دیتے تھے

(جو۔ یہ نظامِ عدل کی طرف صالحؑ دعوت دیتے تھے اس سے اُن اربابِ اقتدار کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی، اس لئے وہی سب سے زیادہ اُس کی مخالفت کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور) آپس میں کہا کہ تم اللہ کی قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر، صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے۔ اور ہم مقتولین کے وُرثاء کے سامنے صاف مُکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے اُنہیں ہلاک ہوتے دیکھا تک نہیں، اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ اس مقام پر ذرا رکئے اور ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ "تم اللہ کی قسم اٹھاؤ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے تو انہیں اللہ پر ایمان لانے کی دعوت کیوں دی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔ یہاں مختصر اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دین جب بگڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں خدا پر ایمان تو ہوتا ہے لیکن اس خدا کا تصوّر وہ نہیں رہتا جو دین نے عطا کیا تھا۔ ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، لیکن رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لئے ہوئے تھے حضرت صالحؑ انہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے تو اس سے مراد یہ تھی کہ اُن کا اپنے تصوّر کے مطابق خدا پر ایمان، ایمان نہیں تھا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ تھے کہ حکومت صرف اس کے قوانین کی ہو..... اور رزق کے سرچشموں کا مالک بھی اُسی کو سمجھا جائے۔ یہ ہے فرق "مذہب" میں خدا پر ایمان، اور "دین" میں خدا پر ایمان میں؛ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اہلِ کتاب کو بھی اللہ پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے۔ (۲/۱۳۷)؛ حتیٰ کہ مسلمانوں کو بھی (۲/۶۲؛ ۴/۱۳۶؛ ۵/۶۹؛ ۵۷/۲۸) [تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے]

اب آگے بڑھئے۔ اس قوم کے مفسدین خفیہ سازش کر رہے تھے کہ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو چپکے سے قتل کر دیا جائے۔ ان خفیہ تدابیر کا جواب لوحِ مکافات کی پیشانی پر ایک ہلکے سے تبسّم کے سوا کیا ہو سکتا تھا حضرت صالحؑ نے انہیں بار بار آگاہ کیا لیکن انہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے، جو آنکھیں بند کئے ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف بڑھتے جا رہے تھے، علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ جاؤ! تم اس عذاب کو لے آؤ جس کی یوں دھمکی دیتے چلے آ رہے ہو!

۷/۷۷ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

اور صالحؑ سے کہا کہ اگر تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھمکی دیتے تھے، اسے لاکر دکھاؤ۔

ناقۂ صالحؑ

انسان بھی کس قدر خودشکن واقع ہوا ہے! اپنی ہلاکت کو بُلا بُلا کر گھر دکھاتا ہے۔ ان کی پاداشِ عمل کا وقت آ پہنچا تھا۔ مہلت کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ لیکن آخری حجت کے طور پر حضرت صالحؑ نے کہا کہ دیکھو یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ تم احکامِ خداوندی کا احترام کرنا چاہتے ہو یا نہیں، ایک محسوس چیز تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں کھول کر بات نہیں بتائی گئی۔

حضرت صالحؑ نے جس محسوس شے کو بطور فیصلہ پیش کیا اس تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ مابہ النزاع بات کیا تھی۔ اُس زمانہ میں مویشی اور چراگاہیں۔ چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے۔ اربابِ اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے تھے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکے پیاسے مر جاتے تھے۔ حضرت صالحؑ[1] کا پیغام یہ تھا کہ یہ چشمے اور چراگاہیں ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتی ہیں اس لئے انہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ہزار رد و کد کے بعد انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ہم سب کے جانوروں کو یکساں طور پر چراگاہوں میں چرنے اور چشموں سے پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ نہ کسی پر زیادتی ہو نہ کسی کے حقوق میں کمی۔ اُنہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے کہا کہ اس بات کا عملی ثبوت (کہ تم اس معاہدہ کا احترام کرتے ہو یا نہیں) یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اسے آزاد چرنے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تمہارے قلوب، قانونِ خداوندی کے احترام کی طرف مائل ہیں۔ اگر تم نے اسے ایذاء پہنچائی تو وہ اس امر کی دلیل ہو گی کہ تم اپنی روش پر قائم ہو۔ فرمایا۔

۷/۷۳ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (نیز ۱۱/۶۴)

---

[1] "خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین"۔ بس یہ ہے دین کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ۔ نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق

—— "اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے" (ابوداؤد)

یہ ایک اونٹنی ہے۔ تم اس کے متعلق یہ نہ دیکھو کہ یہ کس کی اونٹنی ہے ۔ کسی سردار کی ہے یا غریب آدمی کی ۔ بس یہ سمجھ لو کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے ۔ اور یہ اسی کی اونٹنی ہے ۔ دوسری طرف یہ زمین ہے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے ۔ اسی لئے وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی ۔

مَیں اس اللہ کی اونٹنی کو، اللہ کی زمین میں، کھلے چھوڑتا ہوں تاکہ یہ اس میں چرے چُگے (اور اپنی باری پر پانی پیئے ۹۱/۱۳) ۔ اگر تم نے اسے اس طرح چرنے چُگنے دیا تو یہ اس امر کی علامت ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز آجانیکا ارادہ رکھتے ہو ۔ لیکن اگر تم نے اسے نقصان پہنچایا تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ تم اپنی غلط روش کو چھوڑنے والے نہیں ۔ اس کے بعد، تم پر تباہی کا وہ عذاب آجائے گا جس کے ظہور کا وقت کچھ دُور نہیں ۔ میری آنکھیں اسے بہت قریب دیکھ رہی ہیں ۔

اس ناقہ کے لئے پانی پینے کی باری ٹھہرا دی ۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۚ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۲۶/۱۵۵-۱۵۶)

ہم باریاں مقرر کر لیتے ہیں اور اس کا اعلان کر دیتے ہیں ۔ یہ اُونٹنی اپنی باری پر پانی پیا کرے گی اور تمہاری اونٹنیاں اپنی باری پر ۔ اگر تم نے اس کی باری کے دن، اسے پانی پینے سے روکا اور کوئی اذیت پہنچائی تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز نہیں آنا چاہتے ۔ اور تمہاری یہ روش ایسی ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ۔

ان تمام حدود و شرائط سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ وہ احکامِ الٰہیہ کے احترام کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں یا نہیں ۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ (۵۴/۲۷-۲۸)

اور دیکھو، صالحؑ ! ذرا ہمت سے کام لو، اور تھوڑا سا انتظار کرو ۔ یہ اونٹنی، جس کے متعلق اُنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اسے اپنی باری پر پانی پینے اور چراگاہ میں چرنے دینگے، اُن کا جھوٹ اور سچ نکھار کر رکھ دے گی، اور جب یہ عہد شکنی کرینگے تو وہ ان کی تباہی کا موجب بن جائے گی ۔

تم انہیں واضح طور پر بتا دو کہ اس معاہدہ کی رو سے طے یہ پایا ہے کہ ہر ایک کے مویشی اپنی اپنی باری پر پانی پیا کرینگے ۔ اور اسطرح یہ اونٹنی بھی اپنی باری پر گھاٹ پر آیا کرے گی ۔

اسی لیئے اس اونٹنی کو ایک "واضح نشانی" کہا گیا ہے کہ اس سے ان کی قلبی کیفیات ورجحانات محسوس ومشہود طریق سے بے نقاب ہو سکتے تھے یعنی اس سے معاملہ محض نظری نہیں رہا تھا، عملی ہو گیا تھا۔

وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ (۱۷/۵۹)

(ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ اگر ان پر تباہی آنے والی ہے تو اس کی کوئی محسوس نشانی اُن کے سامنے آنی چاہیئے۔ ان سے کہو کہ ہمارے لئے اس قسم کی نشانیاں بھیجنا کچھ مشکل نہیں۔ ہم اقوام سابقہ کی طرف بھی ایسی نشانیاں بھیجا کرتے تھے۔ جو ان کے لئے ظہورِ عذاب کی پیش خبری بن جاتی ہیں۔ اسی طرح قوم ثمود کی طرف اونٹنی کو، اس قسم کی نشانی بنا کر بھیجا۔ یعنی اُن سے کہدیا کہ اگر انہوں نے اس اونٹنی کو اس کی باری پر پانی نہ پینے دیا تو اس امر کی نشانی ہو گی کہ وہ قانونِ خداوندی کی پاسداری نہیں کرنا چاہتے)۔

کھلی ہوئی سرکشی

کرنے کو تو ان لوگوں نے معاہدہ کر لیا لیکن سرمایہ پرستی، اور اقتدار خواہی کی لذت اتنی آسانی سے چھوٹا نہیں کرتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے قول واقرار کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

۷/۷۷ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

اُنہوں نے اُس اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اس طرح اس بات کا ثبوت دے دیا کہ وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے سے باز نہیں آنا چاہتے اور صالحؑ سے کہا کہ اگر تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھمکی دیتے تھے اسے لا کر دکھاؤ۔

اونٹنی کو کسی نے یونہی اتفاقیہ ہلاک نہیں کیا۔ ان سرکشی کرنے والوں نے خاص اہتمام سے اپنے سرغنہ کو بلایا اور اُس نے بھرپور ہاتھ مار کر اُسے ہلاک کیا۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ (۵۴/۲۹)

اُنہوں نے جا کر اپنے رفیق (قبیلہ کے سردار) کو ماجرا سنایا۔ (وہ سخت غصے میں آگیا اور کہا کہ ہیں! اُس کی اونٹنی، ہمارے مویشیوں کے برابر ہو گئی ؟) اُس نے بڑی جسارت سے اپنا ہاتھ بڑھایا، اور اُس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

ہلاک کرنے کو تو کر گئے۔ لیکن جب اس کا احساس بیدار ہوا کہ ہم نے کس قدر پختہ عہد کیا تھا اور اب اس سے کس طرح بیدردی سے پھر گئے ہیں، تو دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۵۷)

انہوں نے اس اونٹنی کو مارنے کو تو مار ڈالا، لیکن بعد میں سخت پشیمان ہوئے کہ اگر صالحؑ کی بات سچی نکلی تو پھر کیا ہوگا؟

چنانچہ وقت گزرتا گیا اور اس قوم کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ ان کا معمول یہ ہو گیا کہ حضرت صالحؑ نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی تکذیب کی اور ہر طرح سے اس کی خلاف ورزی کی۔ حضرت صالحؑ نے آخر میں کہا کہ آتش فشاں پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ یہ پھٹا چاہتا ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا سامان کرو۔ لیکن انہوں نے حسبِ معمول اس کا بھی مذاق اڑایا۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ (۱۱/۶۵)

صالحؑ نے ان سے کہا کہ تم اپنے گھروں میں تین دن تک اور بس لو، اس کے بعد تم پر تباہی آجائے گی۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوگا۔ (چونکہ وہ صالحؑ کی کسی بات کو سچا نہیں مانتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے بھی دھمکی ہی سمجھا)۔

غور کیجئے۔ انہیں تین دن پہلے بتایا جاتا ہے کہ اب تمہاری تباہی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے اس لئے انہوں نے اس وعید کا بھی مذاق اڑایا۔ اور آنے والی تباہی کی کوئی پرواہ نہ کی[1]

اس کے بعد؟

ہلاکت انگیز عذاب! اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کے تصور سے آج بھی ہر قلبِ سلیم سینے میں دھڑکنے لگ جائے اور ہر دیدۂ عبرت چشم حیراں بن جائے۔ ان آگ سے بھرے ہوئے (آتش فشاں) پہاڑوں میں ایک دھماکا ہوا جس سے ایک چیخ۔ ایک گرج۔ ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قوم ثمود کی بستیاں راکھ کا

---

[1] جیسا کہ ہم تذکرۂ حضرت نوحؑ کے ضمن میں بھی لکھ چکے ہیں کہ ان حوادث کے متعلق حضرات انبیائے کرامؑ کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تھا۔ (خواہ فراست کی بنا پر، یا وحی خداوندی کی رو سے)، وہ اپنے اس علم کو چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کا اعلان کر دیتے تھے لیکن چونکہ قوم ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے ان کے اس اعلان کو بھی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) نہیں لیتی تھی اور اپنی حفاظت کا سامان نہیں کرتی تھی۔ اس لئے تباہ ہو جاتی تھی۔

ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

۱۰/۷۸ فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ‏ ۝

سو ایک لرزا دینے والی تباہی (شدید زلزلہ ۱۱/۶۷) نے انہیں گھیر لیا اور وہ اپنے مکانوں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے۔

یہاں اس عذاب کو "لرزہ انگیز دہشت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے زور کی کڑک سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۙ كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوۡدَا۟ كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّثَمُوۡدَ ۝ (۱۱/۶۷-۶۸) نیز (۱۵/۸۳-۸۴) و (۴۱/۱۷) نیز (۵۴/۳۱-۲۹)

اور ان سرکش لوگوں کو ایک زور کی کڑک نے آ لیا اور اپنے گھروں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے۔ (نیز ۹۱/۱۴-۱۵ ؛ ۱۵/۸۳-۸۴ ؛ ۵۴/۳۱-۲۹ و ۴۱/۱۷)۔

اور وہ گھر اس طرح ویران ہو گئے گویا یہ لوگ اُن میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو! ثمود نے قوانینِ خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئے۔

اللہ کی تدبیر قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی تھی وہ تو ناکام و نامراد رہی اور قانونِ مکافات کی وہ تدبیر جو یوں اُن کے پاؤں کے نیچے پختگی کو پہنچ رہی تھی اس طرح اُبھری کہ کوئی اُبھرنے والا سامنے نہ رہا۔

وَمَكَرُوۡا مَكۡرًا وَّمَكَرۡنَا مَكۡرًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ‏ ۝ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكۡرِهِمۡ ۙ اَنَّا دَمَّرۡنٰهُمۡ وَقَوۡمَهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ‏ ۝ فَتِلۡكَ بُيُوۡتُهُمۡ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ‏ ۝ (۲۷/۵۰-۵۲)

وہ ادھر یہ تدبیر سوچ رہے تھے، اور ہم اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ایک اور تدبیر کر رہے تھے جس کا انہیں شعور و احساس تک نہ تھا۔

سو تم دیکھو کہ اُن کی تدبیر کا انجام کیا ہوا اور خدا کی تدبیر نے کیا کیا؟ (صالحؑ اور اس کی جماعت تو صحیح و سلامت رہی) اور وہ مفسدین، اور اُن کی قوم، سب تباہ و برباد ہو گئے۔

یہ ہیں ان کی بستیاں جو آج تک ویران پڑی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے

اس سرگزشت میں اُن لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔
وہ اس ہلاکت و تباہی کے خوفناک طوفانِ آتشیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اتنے عاجز و بے بس تھے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ کر سکے اور اس آفتِ جہاں سوز سے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ ($\frac{51}{43-45}$)

اور قوم ثمود کے واقعہ میں بھی (اسی طرح ہمارے قانونِ مکافات کی نشانیاں ہیں)۔ ہم نے انہیں مہلت دی اور کہا کہ اس مدت میں وہ سامانِ زیست سے اچھی طرح فائدہ اٹھالیں۔
لیکن انہوں نے مہلت کے اس وقفے سے فائدہ نہ اٹھایا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔ چنانچہ (ظہورِ نتائج کا وقت آیا تو) دیکھتے ہی دیکھتے، انہیں ایک ہولناک زلزلہ نے آپکڑا۔ (ان کے متکبرانہ دعوے سب خاک میں مل گئے) اور ان میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ گرنے کے بعد، ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوتے ——
یا اپنی مدد کے لئے کسی کو بلا سکتے —— خدا کے قانونِ مکافات کے خلاف مدد کون دے سکتا ہے؟[1]

ہلاکت اور ایسی ہلاکت! تباہی اور اس قدر تباہی!!

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝ ($\frac{25}{38-39}$)۔ نیز ($\frac{53}{51}$; $\frac{69}{5}$)

اور اسی طرح، قومِ عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا۔ اور دیگر بہت سی اقوام کا بھی، جو اُن کے درمیان ہو گزریں۔
ان تمام اقوام کے سامنے ہم، تاریخی شواہد پیش کر کے، بتاتے رہے (کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا انجام کیا ہوتا ہے، لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی غلط روش پر اڑے رہے اور آخر الامر) ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے تباہ اور برباد ہو گئے۔ (نیز: $\frac{53}{51}$ و $\frac{69}{5}$)۔

---

[1] ظاہر ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے انہیں قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا تو اگر وہ ان کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھتے اور وہاں سے نکل جاتے تو اس تباہی سے محفوظ رہتے جضرت صالحؑ اور ان کی جماعت اسی طرح اس تباہی سے محفوظ رہی تھی کہ وہ قبل از وقت وہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔

وہ تباہی جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجۂ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○ (۲۶/۱۵۹-۱۵۸)

اور صالحؑ کی بات سچی نکلی ——— اسے سچا نکلنا ہی تھا ——— چنانچہ ان پر تباہی آگئی۔ (جو قوم بھی دوسروں کو خدا کے دیئے ہوئے سامانِ زیست سے محروم رکھے گی، اس پر تباہی آجائے گی) ۔اس واقعہ میں بھی غور و فکر کرنیوالوں کے لئے ہزار سامانِ عبرت و موعظت ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ان میں سے اکثر، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(لیکن اس سے خدا کا کیا بگڑے گا؟) اُس کا قانون بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ان پر غالب آکر رہے گا، اور ایسا نظام قائم ہو گا جس میں خدا کا عطا کردہ سامانِ رزق تمام مخلوق کی نشو و نما کے لئے عام ہو۔ قانونِ خداوندی عزیز ہے ظالموں کے لئے، رحیم ہے مخلوقِ خدا کے لئے نیز (۴۵/۶)

یہاں آیت کے اخیر میں، خدا کے "عزیز و رحیم" ہونے کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ عزیز تو صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بڑھ کر غلبہ و اقتدار کس کا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایسا کرنا خدا کی صفتِ رحیمیت کا بھی تقاضا تھا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے؟ ان کی ہلاکت، رحمتِ خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے سامانِ رزق کو سطحِ ارض پر بکھیر رکھا ہے۔ لیکن مستبد قوتیں انہیں اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور مخلوقِ خدا بھوکوں مرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کریں لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی تھیں۔ یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو بھوکوں مرنے دیا جاتا۔ اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر، عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمتِ خداوندی (خدا کی ربوبیتِ عامہ کی اسکیم) کا تقاضا یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کر دیا جائے۔

سورۂ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا ۙ○ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۙ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْیٰهَا ؕ○ فَکَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۙ○ وَ لَا یَخَافُ عُقْبٰهَا ○ (۹۱/۱۵-۱۱)

(اس حقیقت پر تاریخی واقعات بھی شاہد ہیں۔ مثلاً) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اس قانون کو جھٹلایا۔ اور اسکی مخالفت کے لئے وہ شخص، اُن کے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا، جو ان میں سب سے شقی القلب اور بدبخت تھا۔

اُن کے رسول نے اُن سے کہا تھا کہ خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو، ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رہنے دو ــــــ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس اونٹنی کو ــــــ جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی فرد کی اُونٹنی نہیں، کہ اس کے مالک کی حیثیت کی نسبت سے اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ یہ ــــــ "خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی ہے" اسے اس کی باری پر پانی پینے دو۔ (نیز ۲۶/۱۵۵ ؛ ۷/۳)

اُنہوں نے اس بات کا وعدہ تو کر لیا لیکن پھر اپنے قول و اقرار سے پھر گئے، اور اُس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ (اور یوں ثابت کر دیا کہ وہ خدا کے نظام ربوبیت کی مخالفت سے باز نہیں آئیں گے)۔

تو ان کی اس روش کے نتیجے میں، خدا کے قانونِ مکافات کا دمدمہ آیا اور انہیں تہس نہس کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔ (انہیں پیس کر خاک راہ گزر بنا دیا)۔

اور ایسا کرتے وقت وہ (خدا) اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبرایا کہ اس کا انجام کیا ہوگا ؟ اس لئے کہ یہ بات ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی، بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آگیا۔ (لہٰذا قانون خداوندی کے لئے اس میں تذبذب، پشیمانی، اضطراب یا تاسف کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے)۔

قانونِ مکافات کی ہمہ گیری

آپ آخری آیت پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری و نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت فگن اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی بِذَنۡۢبِہِمۡ کا ٹکڑا اُبھر اُبھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شانِ جبروت و کبریائی (معاذ اللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لاپرواہی اور بدمستی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے جس کی رُو سے نظامِ کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے۔ جس میں ایک ذرّہ بے مقدار سے لے کر عظیم الشان کُرّوں تک ذرا سی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب خارجی کائنات میں اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال، قانون جزا و سزا کی گرفت سے کیسے باہر جا سکتے ہیں ؟ اور جب اس قانون کے تحت اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کے جذبات اثر انداز نہیں ہو سکتے کہ وہ جہاں رحمٰن و رحیم ہے وہاں مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ

بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردۂ ساز کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (قانونِ مکافاتِ عمل کا حاکمِ مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک گوشہ ہے کہ اگر قانونِ مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔ لہذا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا وہ محورِ عظیم ہے جس کے گرد تمام نظامِ کائنات گردش کر رہا ہے۔ خارجی کائنات بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی۔ جس کا فیصلہ عدل اور رحمتِ عامہ کے تقاضوں کے مطابق ہو، اسے اپنے فیصلے کے عواقب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی (قانون بنانے والے اور قانون کو نافذ کرنے والے کے لئے ہونا ہی ایسا چاہیئے کہ وہ جذبات سے متاثر نہ ہو۔

جماعتِ مومنین کو بچا لیا گیا

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ ہلاکت بہت قریب آرہی ہے یعنی حضرت صالحؑ کو اس آنے والے حادثہ کا علم پہلے سے دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

۷/۷۹ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝

(اس قوم پر یہ تباہی اس وقت آئی) جب صالحؑ، ان سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ جاتے وقت اس نے ان سے کہا تھا کہ اے میری قوم! میں نے اپنے نشوونما دینے والے کا پیغام تم تک پہنچا دیا، اور چاہا کہ تم کسی طرح تباہی سے بچ جاؤ۔ لیکن تمہیں میری خیر خواہی خوش نہ آئی۔ سو تم اپنی سرکشی کے نتائج بھگتو۔ میں بصد تاسف تم سے الگ ہو رہا ہوں۔

دوسرے مقام پر ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (۱۱/۶۶)۔ نیز (۲۷/۵۳ ؛ ۴۱/۱۸)

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو ہم نے صالحؑ کو اور اس کے ان ساتھیوں کو جو صاحبِ ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اس رسوا کن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقتور اور غالب رہنے والا ہے (نیز آیات ۲۷/۵۳ ؛ ۴۱/۱۸)۔

ان بقایائے ثمود سے جو نسل آگے بڑھی انہیں ثمودِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ ہے قومِ ثمود کی داستانِ عبرت انگیز جو ہر صاحبِ علم و بصیرت کے لئے اپنے اندر سامانِ بصیرت رکھتی ہے اور جن کی اُجڑی ہوئی بستیاں ہر رہ گذر سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ع

دیکھو، ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ (۲۷/۵۲)

یہ ہیں اُن کی بستیاں جو آج تک ویران پڑی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔ اس سرگذشت میں ان لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

اسی داستان کو قرآنِ کریم نے بغیر نام لئے سورۂ المؤمنون کی چند آیات میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ قومِ نوحؑ کی غرقابی کے بعد ارشاد ہے۔

ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ○ .... ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ○ (۲۳/۳۱-۴۲)

قومِ نوحؑ کے بعد ہم نے قوموں کا ایک اور دَور شروع کر دیا۔

چنانچہ (اس کے بعد آنے والی) قوم میں بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا، جس نے اسی پیغام کو دُہرایا یعنی یہ کہ تم صرف خدا کی اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے ہر قسم کا اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔ سو تم بتاؤ کہ تم اُس کے قوانین کی نگہداشت کرنے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔ (اگر تم نے ایسا کر لیا تو اپنی موجودہ غلط روش کی تباہیوں سے بچ جاؤ گے)۔

اس کی قوم کے اُن اکابرین نے جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، جو خدا کے قانونِ مکافات اور مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے، اور جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں (اور وہ دیکھتے تھے کہ نظامِ خداوندی کی زد اُن کے ذاتی مفادات پر پڑے گی، مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے) اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص (جو خدا کا پیغامبر ہونے کا مدعی ہے) تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ یہ بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو، وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ (یہ تم سے، کس حیثیت سے ممتاز ہے جو تم اس کی بات مانو!)

اگر تم نے اس، اپنے ہی جیسے انسان، کی اطاعت اختیار کر لی، تو سمجھ لو کہ تم تباہ ہو گئے۔ (اطاعت اُس کی اختیار کرنی چاہیئے جو فوق البشر خصوصیات کا حامل ہو ـــــ اُسے البشر کا اوتار، یا ظل اللہ علی الارض ہونا چاہیئے۔ ایک عام انسان کی اطاعت کے کیا معنی ؟ پھر جس نظام کی طرف یہ دعوت دیتا ہے ـــــ یعنی انسانی تکریم و مساوات کا نظام ـــــ اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے)۔

(دولت تمہارے پاس۔ اقتدار تمہارے پاس۔ تم جو چاہو سو کرو۔ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ نہیں! خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے جس کی گرفت سے تم بچ نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ اسی لئے یہ) تمہیں دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیوں کا ڈھیر رہ جاؤ گے، تو تم پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے (تاکہ جو ظلم اور زیادتی تم دنیا میں کرتے رہے ہو، اس کی تمہیں سزا ملے)۔

ذرا سوچو کہ یہ کیسی اَنہونی بات ہے! کیسی عقل سے دُور اور قیاس سے بعید بات جس سے یہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔

(مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا کیسا؟) زندگی، بس اسی دُنیا کی زندگی ہے (ہماری آنکھوں کے سامنے ہر روز) لوگ مرتے رہتے ہیں اور نئے بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ (یہ سب اسی دنیا میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ) ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔[1]

یہ شخص، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بناتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے ہم اس کی بات کبھی نہیں ماننے کے۔

اُس رسولؐ نے خدا سے کہا کہ اے میرے پروردگار! یہ لوگ میری بات سُننتے ہی نہیں، اور اندھا دھند تکذیب کئے جا رہے ہیں۔ تو اُن کے خلاف میری مدد کر۔

خدا نے کہا کہ (ان کی مہلت کا وقفہ ختم ہونے کو ہے)۔ عنقریب ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آجائیں گے، اور یہ اپنی ان باتوں پر خود ہی پشیمان ہونگے۔

---

[1] مادی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کچھ ہمارے ہی دور کی اختراع نہیں۔ یہ تصور بہت پرانا ہے۔

(چنانچہ زیادہ وقت گذرنے نہ پایا تھا کہ) ایک ہولناک آواز کے عذاب نے انہیں آپکڑا۔ اور ہم نے انہیں خس و خاشاک کی طرح پامال کر دیا۔ (کیونکہ وہ ہمارے تعمیری نتائج پیدا کرنے والے پروگرام کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے (۱۱/۶۸)۔

سو دیکھو کہ جو لوگ ظلم و استبداد کی روش اختیار کر لیتے ہیں، وہ کسطرح زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں (یہ ہمارا اٹل قانون ہے جو شروع سے ایسا ہی چلا آرہا ہے۔ اور حق و انصاف پر مبنی ہے)۔

پھر ان کے بعد، ہم نے اور قوموں کا دور شروع کیا۔

اور اس کے بعد وہ نقطۂ ماسکہ جو قوموں کی موت و حیات کے لئے ایک اٹل قانون کی حیثیت لئے ہوئے ہے یعنی:

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَأْخِرُوْنَ ۝ (۲۳/۴۳)

(وہ بھی اسی طرح اپنی غلط روش کے نتائج کی وجہ سے تباہ ہوگئیں۔ یاد رکھو! ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے) نہ تو کوئی قوم ظہورِ نتائج سے پہلے تباہ ہوتی ہے، نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ظہورِ نتائج کے بعد زندہ رہ سکے اس میں کمی بیشی ہو نہیں سکتی۔ (۷/۳۴ ؛ ۱۳/۳۸ ؛ ۱۵/۵)

یہ وقتِ معین (اجل) کسی قوم کے اجتماعی اعمال کے ظہورِ نتائج کا نام ہوتا ہے (اس کی تفصیل سابقہ جلد میں گذر چکی ہے۔ دیکھئے انڈکس)۔

سورۂ مومنون (۲۳) کی مندرجۂ صدر آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم صرف اس زندگی کو آخری زندگی سمجھے وہ کبھی اپنی عیش سامانیوں کو چھوڑ کر نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے جد وجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو صرف وہی آمادہ ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ زندگی کو مسلسل آگے چلنا ہے اور اگلی زندگی میں خوشگواریوں کا معیار یہ ہے کہ اس نے اس زندگی میں دوسروں کی پرورش کے لئے کیا کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ قرآن سرمایہ پرستی کے خون آشام نظام کو مٹانے کے لئے ایمان بالآخرۃ کو بنیادی تصور قرار دیتا ہے۔ (تفصیل قرآن کے معاشی نظام کے عنوان کے تابع سابقہ جلدوں میں ملے گی)۔

رسول اَجرِ رسالت نہیں مانگتا

قومِ ثمود کا قصہ یہیں تک ہے۔ لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جن پر آگے بڑھنے سے پیشتر مزید غور و تفکر کی ضرورت ہے۔

آپ نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم نے ان حضرات کا یہ قول خصوصیت سے درج کیا ہے کہ "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے"۔ حضرت صالحؑ کے تذکرہ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ (۱۴۵/۲۶)

اور دیکھو! میں اس بات کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے ذمے ہے۔

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا قرآن کریم نے یوں تکرار ذکر کیا ہے۔ ایک داعی الی الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتِ رشد و ہدایت کا معاوضہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک تبلیغ پیغامات الٰہیہ اور قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے جدّوجہد ایک اہم فریضہ ہے جس کی ادائیگی اس پر لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ انسانوں سے اس کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔ اور یہ اس داعیٔ الی الحق کے عدیم النظیر کیریکٹر کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ تفصیل اس کی سابقہ باب (سورۃ الانعام) میں گزر چکی ہے۔

ناقۃ اللہ

دوسری چیز یہ کہ اس اونٹنی کو جس کا ذکر قصۂ حضرت صالحؑ میں آیا ہے ناقۃ اللہ سے موسوم اور "آیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷۳/۷ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۷۳/۷)

صالحؑ نے ان سے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے، جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں —— خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی —— میں اسے کھلا چھوڑتا ہوں کہ یہ چراگاہ میں آزادانہ چرے۔ اگر تم نے اسے آزادانہ چرنے دیا تو یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ تم اپنے عہد پہ پابند ہو۔ اگر تم نے اسے کوئی گزند پہنچائی تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ تم اپنی سابقہ روش سے باز نہیں آئے۔ اس کا نتیجہ تمہارے لئے الم انگیز تباہی ہوگا۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس اونٹنی کو نَاقَۃُ اللّٰہِ کیوں کہا گیا تھا اور وہ کس بات کی نشانی تھی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اونٹنی، عام اونٹنیوں جیسی اونٹنی تھی۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کی تخلیق غیر معمولی انداز سے بطور خرقِ عادت ہوئی تھی۔ محض آیت کے لفظ سے یہ کہنا کہ اس کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی

تھی، قرآن کے اسلوبِ بیان اور حقیقی تعلیم سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ قرآن نے کشتیِ حضرت نوحؑ کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ آیت (نشانی) تھی۔

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَ اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَةِ وَ جَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ○ (۲۹/۱۵)

مخالفین غرق ہوگئے۔ اور نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو، جو کشتی میں سوار ہوگئے تھے، ہم نے اس تباہی سے محفوظ رکھا۔

اس واقعہ میں اقوامِ عالم کے لئے ہمارے قانونِ مکافات کی صداقت کی نشانی ہے (جو یہ بتاتی ہے کہ سرکش اور ظالم اقوام کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔

حالانکہ وہ عام طریقہ کے مطابق ہی تیار ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ

فِیۡهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ (۳/۹۶)

اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

کعبہ بھی آیت ہے

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خدا کے اس گھر کی تعمیر میں بھی کسی خرقِ عادت واقعہ کا دخل نہ تھا۔ معمارِ حرم (علیہ السلام) نے اس کی تعمیر اسی طرح کی تھی جس طرح اور مکانوں کی کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ملّتِ حنیفہ کے لئے مرکزِ محسوس اور ان کی موت و حیات کے پرکھنے کی ایک کھلی ہوئی علامت (آیت) ہے۔ جس طرح قومِ ثمود سے کہا گیا تھا کہ یہ ناقۃ اللّٰہ تمہارے کفر و ایمان پرکھنے کی ایک نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو یہ تمہاری اِنَابَت اِلَی اللّٰہ کی نشانی ہوگی اور اگر اسے ضرر پہنچایا تو اس سے تمہارا انکار وجود واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کی ایمانی قوّت و ضعف کے پرکھنے کا معیار بیت اللہ ہے۔ اگر ان میں بیت اللہ[1] کی حفاظت کی ہمّت رہی (یعنی اس نظام کی حفاظت جس کا مرکزِ محسوس کعبہ ہے) تو یہ ان کی ملّی زندگی اور حرارتِ ایمانی کی دلیل ہوگی۔ اور اگر اس پر دوسروں کا اثر غالب آگیا تو یہ ان کی اسلامی موت کی نشانی (آیت) ہوگی۔ قومِ ثمود نے ناقۃ اللّٰہ کی حفاظت نہ کی اور اللہ کے رسوا کن عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَ مِنۡ خِزۡیِ یَوۡمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ○ (۱۱/۶۶)

---

[1] کعبہ کے متعلق تفصیل "کعبہ"۔ "ابراہیم"۔ " حج " کے عنوانات دیکھئے۔

جنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے صالحؑ کو اور اُس کے اُن ساتھیوں کو جو صاحبِ ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اس رسواکن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقتور اور غالب رہنے والا ہے۔

اور ہم بیت اللہ کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو ذلت و رسوائی کا عبرت انگیز عذاب ہم پر مسلّط ہوگیا۔ اور قومِ ثمود کی طرح اُس نو ۹ نے کروڑ" ہجوم مومنین" کی یہ حالت ہوگئی کہ

فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا (۱۱/۶۸-۶۷)

جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

ہم اپنے دیار و امصار میں یوں مُردوں کی طرح اوندھے پڑے ہیں گویا ان میں کبھی زندوں کی طرح بسے ہی نہ تھے!

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً (۲۶/۱۵۸)

یقیناً اس میں ایک عظیم نشانی ہے۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۶/۱۵۸)

اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم میں سے اکثر ان حقائق و عبر پر "ایمان" نہیں رکھتے۔ یونہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ہماری ہی عبرتناک داستان ہے۔ کسی اور کا قصّہ نہیں۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے اس سے بالتخصیص یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے مشترکہ فائدے کے لئے ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ قومِ ثمود کے اکابر مویشیوں کی نسبت امیروں اور غریبوں کی طرف کر کے، غریبوں کے مویشیوں کو چشموں کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ جب ان سے اس بات پر معاہدہ ہوا کہ یہ چشمے اور چراگاہیں سب کے مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے تو اس کیلئے بطور نشان یہ کہا گیا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی امیر آدمی کی ہے۔ نہ غریب کی۔ یہ خدا کی مخلوق ہے اس لئے اسے خدا کی زمین میں چرنے کا حق ہے ناقۃ اللہ اور اَرْضِ اللہ میں یہی خصوصیت مضمر ہے۔ اُسی طرح، جیسے خدا نے کعبہ کو بیتی (میرا گھر) کہہ کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتا۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے مفاد کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے گا۔

واضح رہے کہ ارض کو اسی لئے ارض اللہ کہا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ اسے تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (تفصیل اس کی قرآن کے معاشی نظام" کے عنوان میں ملے گی)۔

قوم (حضرت) لوطؑ

ازاں بعد، سورۃ الاعراف کی آیات (۸۰-۸۴) میں داستانِ حضرت لوطؑ مذکور ہے۔ انہی کی نسبت سے اس قوم کو جس میں وہ مبعوث ہوئے تھے، قومِ لوطؑ کہا جاتا ہے۔

مطالب الفرقان (جلد سوم) میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکار جلیلہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ ...... (۲۹/۲۶) "ان کا برادر زادہ، لوطؑ ان پر ایمان لایا" اور ہجرت ابراہیمی میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ (۲۱/۷۱)۔ حضرت ابراہیمؑ تو ارضِ فلسطین میں متمکن ہو گئے لیکن حضرت لوطؑ سدوم کی طرف تشریف لے گئے۔

یمن سے بحرِ احمر (RED SEA) کے کنارے کنارے ایک قدیمی تجارتی قافلوں کی سڑک حجاز و مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی (قرآن کریم نے اس شاہراہ کو اِمَامٍ مُّبِیْنٍ کہا ہے۔ (۱۵/۷۹) قیاس یہ ہے کہ یہ علاقہ بحرِ میت (DEAD SEA) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آگیا۔ حضرت لوطؑ کو اسی علاقہ میں بسنے والی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ (وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ٥ (۳۷/۱۳۳)" اور بلاشبہ لوطؑ (ہمارے) پیغمبروں میں سے تھا" انہوں نے آکر اصولی طور پر اسی پیغام خداوندی کی طرف دعوت دی جس کی طرف اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرامؑ دعوت دیتے چلے آرہے تھے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِیْنَ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۚ (۲۶/۱۶۰-۱۶۳)

اسی طرح قومِ لوطؑ نے بھی پیغامبرانِ خداوندی کی تکذیب کی۔ (۱۵/۷۳؛ ۲۹/۲۸-۲۹؛ ۷/۸۰؛ ۲۱/۷۴؛ ۵۱/۳۵؛ ۱۵/۶۱؛ ۲۶/۱۶۵؛ ۲۷/۵۴؛ ۶۵/۱۹۵)

آخرالامر، ان کی طرف ان کے بھائی بندوں میں سے، لوطؑ آیا۔ اور اس نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

ہیں تمہاری طرف، خدا کے وہ قوانین لایا ہوں جو تمہارے امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔
لہٰذا ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو، اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو۔
دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت لوطؑ اس قوم میں پہلے رسول نہ تھے بلکہ یہ قوم آپ سے پیشتر اور رسولوں کی بھی تکذیب کر چکی تھی۔ اسی لئے کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶/۱۶۰) فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت لوطؑ کو اس قوم کا بھائی (اَخُوْهُمْ) کہا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں حضرت نوحؑ۔ ہود اور صالح (عَلَيْهِمُ السَّلَامُ) کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ انہی قبائل میں سے تھے جن کی طرف وہ مبعوث کئے گئے تھے اس لئے قبیلہ کی نسبت سے ان کے بھائی کہلا سکتے تھے۔ لیکن حضرت لوطؑ تو باہر سے تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے قوم سدوم سے کسی قبائلی نسبت کی بنا پر ان کا رشتۂ اخوت نہ تھا۔ انہیں ایسا ان میں رہنے سہنے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔
انہوں نے اللہ کی طرف دعوت دی اور ساتھ ہی وہ عظیم الشان اعلان بھی فرما دیا جو داعیانِ الی الحق کا امتیازی وصف چلا آرہا ہے۔ یعنی

وَمَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۶۴)

میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے ذمے ہے۔

یوں تو حضرات انبیائے کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے وہ قوم بالعموم کفر و شرک، فسق و فجور، معصیت کوشی اور بدکرداری، سرکشی و تمرّد اور سلب و نہب کی لعنتوں میں گرفتار ہوتی تھی اور ان حضرات کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ہلاکت انگیز نتائج سے آگاہ کریں۔ لیکن قوم سدوم جس شرمناک

شرمناک فحاشی

اور حیا سوز فحاشی میں مبتلا تھی وہ دنیا جہان سے نرالی تھی۔ یہ بدبخت، اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس فعلِ شنیع کی ابتدا بھی اسی قوم سے ہوئی۔ لفظ لواطت (تلوّط) خود اس پر شاہد ہے کہ اس کی نسبت قوم لوط سے ہے۔ انگریزی میں (SODOMY) سدوم (SODOM) کی نسبت سے ہے۔

(۸۱-۸۰/۷) وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝

اور اسی طرح ہم نے لوطؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اُس نے ان سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کے کام کرتے ہو جو تم سے پہلی قوموں میں کسی نے نہیں کئے۔

تم، عورتوں کو چھوڑ کر، شہوت رانی کے لئے، مردوں کی طرف آتے ہو، اور اس طرح، افزائشِ نسل کے مادہ کو بے محل صرف کر کے ضائع کرتے ہو، اور ان حدود سے تجاوز کرتے ہو جو قانونِ فطرت نے اس باب میں مقرر کی ہیں۔

سورۂ اعراف میں مُسْرِفُوْنَ ۸۱/۷ اور سورۂ شعراء میں عٰدُوْنَ (۲۶/۱۶۶) کی جامعیت پر غور فرمائیے! حدودِ فطرت سے تجاوز کی طرف کس بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ نمل میں فرمایا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ (۲۷/۵۵-۵۴)۔

اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے جس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سب کچھ دیکھتے بھالتے، سمجھتے سوچتے، اس قدر کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کرتے ہو!

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی خواہش کی تسکین کے لئے، عورتوں کو چھوڑ کر، مردوں کی طرف آتے ہو۔ یہ کتنی بڑی جہالت کی بات ہے۔

وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ یعنی دیدہ و دانستہ، جانتے بوجھتے، اس حیاسوز فعل قبیح کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس سے بڑی جہالت کچھ اور بھی ہوسکتی ہے؟ (اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ)[۱] سورۂ عنکبوت میں ہے کہ وہ لوگ اس درجہ بے غیرت اور آبرو باختہ ہو چکے تھے کہ کھلی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کیا کرتے اور اس سے ذرا شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان حیاسوز فحاشیوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی کھٹک تک بھی پیدا نہیں ہوتی تھی (۲۹/۲۹)

رہزنی بھی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان ایسی کھلی ہوئی معصیت کوشی کی زندگی پر اتر آئے تو پھر شرم و حیا باقی نہیں رہتی! آج بھی دنیا کی ان اقوام پر نگاہ ڈالئے جو جذبات پرستی اور فحش کاری کے سیلاب

---

[۱] تُبْصِرُوْنَ اور تَجْهَلُوْنَ کے تقابل پر غور فرمائیے۔ یعنی وہ لوگ فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بدترین جہالت میں مبتلا تھے۔ لہٰذا وہ علم جو سیرتِ انسانی کی صحیح تشکیل یعنی افکار و اعمال کی تطہیر نہیں کر سکتا۔ علم نہیں جہالت ہے روشنی نہیں تاریکی ہے۔ آج سے چار ہزار سال پیشتر بھی اور آج بھی۔

ہیں بہے جا رہی ہیں۔ ان میں غیرت اور حیا کہیں نام کو نہیں ہوتی۔ اس بے غیرتی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یوں تو انگلستان (بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی) اغلام کی لعنت (SODOMY) ایک عرصہ سے چلی آ رہی تھی، لیکن (۱۹۶۷ء میں) اسے انگلستان میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا! سچ کہا تھا قرآن نے کہ جب انسان پستی کی طرف گرتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ہم جنس سے جنسی اختلاط (اغلام) حیوانات کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

قوم لوطؑ، رہزنی بھی کرتی تھی۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ○ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۙ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ

(۲۹/۲۸-۲۹)

اور اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو جسے، اس سے پہلے، دنیا جہاں میں کسی نے اختیار نہیں کیا تھا۔

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے، عورتوں کو چھوڑ کر، مردوں کے پاس جاتے ہو۔ (۷/۸۰-۸۱) اور اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل کے لئے تجویز کیا ہے[1]۔ نیز تم اپنی مجلسوں میں نازیبا حرکتیں کرتے ہو۔

تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اس طرح (عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف مائل ہونے سے) اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل انسانی کے لئے وضع کیا ہے۔

تذکیر موعظت کا جواب

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے۔ جب آپ نے انہیں ان کی بدکرداریوں سے منع کیا تو ان کی طرف سے جو جواب ملا وہ ان کی فطرتِ خبیثہ کا صحیح آئینہ دار ہے۔

۷/۸۲ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ

---

[1] قطع السبیل کے معنی رہزنی بھی ہیں۔

يَتَطَهَّرُوْنَ ○

لوطؑ کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو یہ کہ آپس میں کہنے لگے "ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بننا چاہتے ہیں"۔

ابلیسی ذہنیت کی کیسی صحیح تصویر ہے، آج بھی کسی بدکردار کو اس کی حیاسوز حرکات سے منع کرنے کی کوشش کیجئے تو یہی جواب ملے گا۔ جب آپ نے زیادہ زور دیا تو یہ لوگ اس حربے پر اتر آئے جو نشۂ قوت کی بدمستی کا خاصہ ہوتا ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ○ (۲۶/۱۶۷)

تو وہ کہنے لگے "اے لوطؑ! اگر تو باز نہ آیا تو یاد رکھ تو لامحالہ (یہاں سے) نکال دیا جائے گا۔

انہوں نے یہ دھمکی دی اور آپ نے نہایت سکوت و سکون سے یہ جواب دے دیا کہ ان دھمکیوں سے تمہارے اعمال کے خلاف میرے دل کی نفرت کم تھوڑی ہو جائے گی؟

قَالَ اِنِّىْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ۗ (۲۶/۱۶۸)

لوطؑ نے کہا (تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، میرے خلاف کر لو، لیکن میں تمہاری ان حرکات کے خلاف لب کشائی سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ) یہ ایسا مذموم فعل ہے جسے دیکھ کر میرا دل جل جاتا ہے۔ (میرے سینے میں، جذبات نفرت کا سیلاب امنڈ آتا ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ جس فعل کو میں اس قدر شنیع سمجھوں، اس کے خلاف کچھ نہ کہوں۔ لہذا، میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں، اس سے باز نہیں آسکتا)۔

یہ سلسلہ جاری رہا۔ اودھر سے تذکیر و تنذیر اور ادھر سے ضد اور انکار برابر بڑھتا گیا۔ جب حضرت لوطؑ ان سے کہتے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اس نے جو تمہیں مہلت دے رکھی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جاؤ! وہ عذاب لے آؤ جس کی یوں دھمکی دے رہے ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (۲۹/۲۹)

اس قوم کے پاس، اس کی ان باتوں کا جواب کچھ نہیں تھا، بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو (کہ ہماری اس روش سے خدا کا عذاب آجائے گا) تو اس عذاب کو لا کر دکھاؤ۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ○ (۵۴/۳۶)

لوطؑ نے اپنی قوم کو بار بار تنبیہ کی تھی کہ خدا کے قانون مکافات کی گرفت سے ڈرو۔ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ

نہ کی اور سمجھے کہ وہ یونہی خالی دھمکیاں دیتا ہے، اس لئے اُس سے اُلٹا جھگڑنے لگے۔
جب حضرت لوطؑ ان راہ گم کردہ بدبختوں کے انکار وجحود اور سرکشی وتمرد کی ان حدود فراموشیوں کو دیکھتے تو اللہ سے دعائیں مانگتے کہ وہ انہیں اور ان کے متبعین کو اس انسانیت فروش قوم کے اعمالِ بد کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھے۔ اور اُن پر غلبہ ونصرت عطا فرمائے۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ○ (۲۶ / ۱۶۹)

اُس نے اُن لوگوں سے یہ کہا، اور پھر اپنے نشوونما دینے والے سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے رفقاء کو، اس تباہی سے بچالے جو ان لوگوں پر اُن کے اعمالِ بد کے نتیجے میں آنے والی ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۲۹ / ۳۰)۔

اس پر لوطؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بارالٰہا! مفسدین کی اس قوم کا مقابلہ کرتے ہیں، تو میری مدد فرما۔
یہ مہلت کا عرصہ یونہی گزرتا گیا حتّٰی کہ وہ وقت آپہنچا جب قانون مکافات کے مطابق اُن کے اعمال کی کھیتی پک گئی اور ظہور نتائج کا زمانہ آگیا۔ خدا کے فرستادہ اس قوم کی طرف آئے تاکہ آخری حجّت کا بھی اتمام ہو جائے۔ یہ راستے

ظہور نتائج کا وقت

میں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاں گئے اور انہیں حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی (تفصیل سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے) جب حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہوا کہ قوم لوطؑ پر تباہی اور بربادی کا عذاب آنے والا ہے تو اُن کی رقیق القلبی نے بہت چاہا کہ کسی طرح اُنہیں مہلت کا مزید موقعہ مل جائے جس سے وہ شاید اپنی حرکاتِ قبیحہ سے باز آجائیں۔ (۱۱ / ۶۹-۷۱) و (۱۵ / ۵۱-۵۶) و (۵۱ / ۲۴-۳۰)۔
لیکن مشیتِ ایزدی کے علم میں تھا کہ وہ قوم رجعت وانابت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ ان کی بازآفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں۔ ان کے اعمال کے ہلاکت آمیز نتائج مرتب ہو چکے ہیں۔ سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ○ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ○ (۱۱ / ۷۴-۷۶)

جب ابراہیمؑ کے دل سے، ان کی طرف سے پیدا شدہ گھبراہٹ دُور ہوگئی اور بیٹے کی خوشخبری سے اور بھی اطمینان حاصل ہوا، تو قومِ لوطؑ کے متعلق اُن سے سوال وجواب کرنے لگا۔ کہ اُنہیں کیوں ہلاک کیا جارہا ہے۔
ہمیں شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا متحمل مزاج تھا، اس لئے وہ ذرا سی بات پر یونہی بھڑک نہیں

اُٹھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سینے میں بڑا دردمند دل رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی مصیبت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومِ لوطؑ کی تباہی کی خبر کو اس نے اس طرح محسوس کیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی، اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر معاملہ کے فیصلے کے لئے ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ اس لئے اس کی رقیق القلبی، اتباعِ قوانین پر غالب نہیں آتی تھی۔

اُنہوں نے کہا۔ اے ابراہیمؑ! تو اس کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے) حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اب ان پر وہ تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔

خدا کے فرستادہ

اس کے بعد وہ حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر کسی ایک مقام پر کیا ہے اس لئے کہ یہ اس قوم کی بداعمالیوں کا نقطۂ آخریں (CLIMAX) تھا۔ خدا کے یہ برگزیدہ بندے، حضرت لوطؑ جیسے پاکباز انسان کے ہاں، مہمان آتے ہیں اور یہ بدبخت ان پر پل پڑتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ○ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ○ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ○ (۱۱/۷۷-۷۹)

چنانچہ جب ہمارے فرستادگان ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر لوطؑ کے پاس پہنچے، تو وہ ان کی وجہ سے پریشان ہوگیا، اور اپنی بے بسی کے احساس سے، دل میں کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے! (اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہاں کے لوگ، نو واردِ اجنبیوں سے کس قسم کا سلوک کیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ نو وارد، آکر ٹھہرے بھی لوطؑ کے پاس تھے، اس لئے وہ اور بھی زیادہ پریشان ہوگیا)۔

اُس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر، بدمستی میں دوڑتے ہوئے آئے ——— وہ پہلے ہی سے اس روشِ بد کے خوگر تھے ——— لوطؑ نے انہیں (الگ لے جا کر) کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ اُن کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو (یہ بڑی شرم کی بات ہے)۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل و ہوش کو نہ تیاگ دے؟

(۱۵/۷۵ ؛ ۲۹/۲۸-۲۹ ؛ ۱۵/۹۱ ؛ ۵۱/۳۵ ؛ ۲۱/۷۴ ؛ ۷/۸۰ ؛ ۲۶/۱۶۵ ؛ ۲۷/۵۴)

انہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں سے، جنہیں تو اپنی بیٹیاں کہتا ہے، کچھ دلچسپی نہیں۔ اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے۔ (۱۵/۵۷-۶۰ ؛ ۱۵/۶۲-۶۷ ؛ ۲۹/۳۳-۳۱)

حضرت لوطؑ کا اضطراب

غرضیکہ اُدھر سرکشی و تمرّد اور قوّت و استبلاء کے اندھے نشے کا بپھرا ہوا طوفان تھا جو چاروں طرف سے دیوار و در کی تمیز فراموش کئے، محیط تھا اور اِدھر خدا کا ایک تنہا بندہ ان نو وارد مسافروں کی حفاظت کے لئے سینہ سپر کھڑا تھا۔ پریشانی تھی تو صرف ان مہمانوں کے لئے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (۱۱/۸۰)

لوطؑ نے کہا کہ اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ کی خود طاقت ہوتی، یا کوئی قوی سہارا ہوتا جس کی مدد سے میں تمہیں ان حرکات سے باز رکھ سکتا۔

جب مہمانوں نے حضرت لوطؑ کی اس گھبراہٹ کو دیکھا تو انہیں تسلّی دی کہ مت گھبراؤ! یہ ہم تک دست درازی نہیں کر سکتے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ .... اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝ (۱۱/۸۱)

لوطؑ کے مہمانوں نے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں (اور اہتمامِ حجت کے لئے ان کی طرف آئے ہیں)۔ یہ لوگ تجھ پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ تُو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رہے گا۔ یوں کرو کہ جب رات کا تھوڑا سا حصّہ گزر جائے تو اپنے رفقاء کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ، اور اس سرزمین سے یوں دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہو کہ پھر اس کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھو۔ تمہارے سب رفیق تمہارے ساتھ چلے جائیں گے لیکن تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ (یہ دوسری پارٹی سے تعلق رکھتی ہے اس لئے) اسے وہی کچھ پیش آئے گا جو دوسروں کو پیش آنے والا ہے۔ ان کی تباہی کے لئے صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ اور صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔

نیز دیکھئے۔ (۱۵/۶۱-۶۶ ؛ ۲۹/۳۴)

عذاب کی نوعیت

قومِ سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔

آتش فشاں پہاڑوں کا انشقاق بڑا ہلاکت انگیز عذاب ہوتا ہے۔ کبھی تو آتش فشاں سیّال مادّہ (لاوا) کی شکل میں ایک بہتا ہوا جہنم بن کر گرد و پیش کے علاقوں کو دہکتے ہوئے انگاروں کی بھٹی بنا دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دہانہ سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برستا ہے جس کی بوچھاڑ دُور دُور تک جاتی ہے۔ پمپائی کی تباہی اسی قسم کی "بارش" سے ہوئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان پتھروں کی زد سینکڑوں میل تک تھی۔ قوم لوطؑ کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر ایسے زلزلے آئے کہ زمین نیچے دھنس گئی اور جھیل (DEAD SEA) کا پانی اوپر آ گیا۔ یہ علاقہ آج بھی بالکل کھنگر ہے، اور بحر میت کے پانی میں اس قدر تیزابی مادّوں کی آمیزش ہے کہ وہ خود ایک آتش سیّال ہے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ اعراف میں فقط اتنا کہا ہے کہ:

۷/۸۴ وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ ۠

اور ہم نے (اس قوم پر) پتھروں کی بارش کی (جو آتش فشاں پہاڑ سے اُڑ اُڑ کر آ رہے تھے)، سو تم دیکھو کہ ان مجرمین کا انجام کیا ہوا۔

یہ مینہ، جلے ہوئے پتھروں (کھنگروں) کا تھا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ۙ
مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ۠ (۱۱/۸۲-۸۳)

چنانچہ جب اس تباہی کا وقت آ گیا تو اس بستی کی تمام بلند عمارتیں نیچے گر کر پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ آتش فشاں پہاڑ کے ایک جھٹکے نے اسے تہ و بالا کر دیا) اور اس کے بڑے بڑے کھنگر ان پر بارش کی طرح برسنے لگے (۵۱/۳۳)
——— پیہم اور مسلسل بارش کی طرح۔

وہ پتھر، خدا کے ہاں سے موت کا پیغام بن کر ان پر نازل ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے، تباہی کا عذاب، ظالمین سے کچھ دُور نہیں ہوتا کہ اسے وہاں تک پہنچنے میں دیر لگے اور وہ اتنے میں اپنی حفاظت کا سامان کر لیں۔

یہاں پتھروں کی بارش کی تصریح کے ساتھ زلزلہ کا عبرت انگیز منظر بھی بیان کر دیا، جس سے بڑی بڑی بلند عمارات پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بلکہ وہ اتنا نیچے دھنس گئیں کہ پانی سطحِ ارض کے اوپر چڑھ آیا۔ (دوسری جگہ انہی کو مُؤْتَفِکٰت (وہ جن کی بستیاں اُلٹ دی گئی تھیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دیکھئے ۹/۷۰ (۶۹/۹)۔ سورۂ حجر میں ان دونوں چیزوں کے

ساتھ "صَیْحَۃ" (ایک ہولناک آواز) کا اضافہ کیا گیا، جس سے اس واقعہ کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ (دیکھئے ۱۵/۷۳-۷۷)۔ آیت (۱۵/۷۸) میں قوم سدوم کے ساتھ اصحٰب الایکہ کا بھی ذکر آ گیا ہے کیونکہ ان کا علاقہ ان سے ملحق تھا۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ یہاں یہ چیز مزید غور طلب ہے کہ قوم سدوم کے اس تباہ شدہ علاقہ کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی شاہراہ (اِمَامٌ مُّبِیْن (۱۵/۷۹)) پر واقع ہے جو نزول قرآن تک قائم (سَبِیْلٍ مُقِیْم) تھی یہ وہی تجارتی سڑک ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ قریش کے قافلے اس سڑک پر سے گزرتے تو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے [اسی لئے (۱۱/۸۳) میں کہا گیا ہے کہ وَمَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ "یہ علاقہ ان ظالمین سے کہیں دور نہیں"۔ اس پر تو یہ اکثر گزرتے رہتے ہیں]۔ اس کے باوجود ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکذیب و انکار کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

سورۂ شعراء میں اس عذاب کے متعلق کہا کہ حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو تو بچا لیا گیا اور دوسروں کو تباہ کر دیا۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۚ وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْھِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ○

(۲۶/۱۷۲-۱۷۳) نیز (۳۷/۱۳۶)

چنانچہ ہم نے ان سب کو جو اس طرح پیچھے رہ گئے تھے تباہ کر دیا۔

اور یہ تباہی ان پتھروں سے ہوئی جو کوہ آتش فشاں نے ان پر برسائے تھے کیسی تباہ کن تھی یہ بارش جو ان لوگوں پر ہوئی جنہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا، کہ اگر تم نے لوطؑ کی بات نہ مانی تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ (نیز ۳۷/۱۳۶) نیز دیکھئے۔ (۲۷/۵۸)؛ (۵۱/۳۲-۳۳)؛ (۵۴/۳۴)؛ (۵۴/۳۸)

اہل سے مراد! گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قوم لوطؑ کی تباہی کے ضمن میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ حضرت لوطؑ اور ان کے اہل اور آل کو بچا لیا گیا۔ البتہ ان کی بیوی ان میں شامل نہیں تھی۔

اہل اور آل سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر سورۂ ذٰریٰت میں ان الفاظ میں فرما دی۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ کَانَ فِیْھَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ فَمَا وَجَدْنَا فِیْھَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (۵۱/۳۵-۳۶)

(چنانچہ وہ ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر، قوم لوطؑ کی طرف گئے) وہاں لوطؑ کے گھر کے سوا، کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جنہے قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہو۔ ہماری ہدایت کے مطابق اس گھرانے کے افراد (سوائے لوطؑ کی بیوی کے)

وہاں سے نکل کر بحفاظت دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور باقی سب تباہ ہو گئے ۔
یعنی حضرت لوطؑ کے اہل سے مراد "گھر والے" اور "آل سے مفہوم" ان کی اولاد" نہ تھی بلکہ اس سے مراد جماعتِ مومنین تھی معیارِ خداوندی کے مطابق "اپنوں اور بیگانوں" کی تمیز و تفریق کے متعلق سابقہ عنوانات میں کئی ایک جگہ ذکر آچکا ہے بالخصوص تذکرۂ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ میں ۔ اسی سلسلہ میں اس کڑی کو بھی شامل کر لیجئے ۔ قرآن کریم کی رُو سے اپنے "اہل اور آل" وہ ہیں جو ایمان کے رشتہ سے منسلک ہیں ۔ جو اس رشتہ سے مربوط نہیں وہ بیٹا ہو یا باپ، بیوی ہو یا بھائی "اپنوں" میں سے نہیں ہو سکتا ۔ ان تمام رشتوں میں بیوی اور خاوند کا رشتہ، چولی اور دامن کا ساتھ ہوتا ہے ۔ قرآن کریم نے اسی لئے میاں اور بیوی کو "ایک دوسرے کے لباس" سے تشبیہ دی ہے ۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس اور تم اُن کے لئے لباس ہو !

لیکن ایمان کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ وہ چولی کو دامن سے اور لباس کو جسم سے الگ کر دیتا ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے دو مثالیں بیان کی ہیں ۔ سورۂ تحریم میں ہے ۔

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَّامْرَأَتَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَّقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ○ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○ (۶۶/۱۰-۱۱)

(قانونِ مکافات کے اٹل ہونے کے سلسلے میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے جو ان قوانین سے انکار کرتے ہیں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی مثال پیش کرتا ہے ۔ وہ ہمارے نہایت صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انہوں نے اُن سے خیانت کی (یعنی ایمان میں ان کا ساتھ نہ دیا) تو اُن کے شوہر، خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں ان کے کسی کام نہ آسکے، اور وہ عورتیں تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ ہو گئیں ۔ (یعنی خاوند کا حُسنِ عمل، بیویوں کے بھی کام نہ آسکا حالانکہ ان دونوں کا رشتہ بڑا ہی پیوستگی کا ہوتا ہے ۔

ان کے برعکس، اللہ مومنین کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے ۔ وہ ہمیشہ یہ دُعا مانگا کرتی تھی کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو اپنی طرف سے میرے لئے جنت میں گھر بنا دے، اور مجھے فرعون اور اسکے

غلط اعمال سے نجات دے۔ بلکہ اس پوری کی پوری قوم سے جس نے اس طرح ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔
(اس مثال میں خاوند کے بُرے اعمال بیوی کے ایمان پر اثر انداز نہیں ہوئے)۔
اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار کیا ہے۔ یہی معیار "دو قومی نظریہ" کی بنیاد ہے۔

داستانِ عبرت یہ ہے قومِ لُوط کا واقعہ اور ان کا ایسا انجام جس میں ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی لُٹی ہوئی عظمتوں اور چھپی ہوئی ثروتوں کے زندہ مرثیے ہیں۔ لیکن صرف اُن کے لئے جو حیاتِ آخرت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) پر ایمان رکھیں۔ ورنہ مٹی کے ڈھیر ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ علمائے آثار و حفریات کی دلچسپیوں کا مرکز۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو سورۂ فرقان میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ○ (۲۵/۴۰)

(ان قوموں کی داستانیں تو خیر، پھر بھی ان مخاطبین ——— عربوں ——— کے لئے ذرا دُور کی باتیں ہیں) اُس (قومِ لُوطؑ کی) بستی کے کھنڈرات پر سے تو ان کا گذر اکثر ہوتا رہتا ہے جسے کوہ آتش فشاں کے پتھروں کی بارش نے تباہ کر دیا تھا۔ کیا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ اُس قوم کا انجام کیا ہوا تھا؟ (دیکھتے تو ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ) قانونِ مکافاتِ عمل اور تسلسلِ حیات پر یقین نہیں رکھتے (اس لئے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیتے ہیں کہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا جو ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔)

چونکہ ان لوگوں کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں، اس لئے ان اُممِ گزشتہ کے یہ نشانات ان کے لئے عبرت کا موجب نہیں بنتے۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ○ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ (۲۵/۴۱-۴۲)

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں اور (ایک ایسے انداز سے جس میں استہزاء و استخفاف کے نشتر پوشیدہ ہوں) کہتے ہیں کہ "اچھا! یہ ہے وہ جسے خدا نے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے! اگر ہم اپنے مسلک پر ثابت قدم نہ رہتے تو اس نے ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا ہی دیا تھا۔

اس کے بعد فرمایا:

وَ سَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ حِیۡنَ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ مَنۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ○ (۲۵/۴۲)

جب ان کے سامنے عذاب آجائے گا تو اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے جو صحیح راستہ چھوڑ کر، غلط راہ پر چل رہا ہے۔

دیکھنے بوجھنے آنکھوں پر پردے اس لئے پڑ جاتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کا محکوم و پرستار بن جاتا ہے۔

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَیۡهِ وَكِیۡلًا ○ (۲۵/۴۳)

(حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات اور جذبات ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے) سو جو شخص اپنی خواہشات ہی کا غلام اور پرستار بن جائے، اسے کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ (ایسا شخص علم و عقل رکھنے کے باوجود غلط راہ پر چلتا رہتا ہے۔ ۲۵/۴۳)۔ اے رسولؐ! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو اس قسم کے آدمی کی اس طرح نگہبانی کر سکے کہ وہ تباہی کے جہنم میں نہ گرے؟ تو، ایسے شخص کا، ذمہ کبھی نہیں لے سکتا!

اور یہاں پہنچ کر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ فہم و بصیرت کی استعداد اور سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے اور یوں شرفِ انسانیت کھو کر حیوان بلکہ ان سے بھی گیا گزرا!

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ یَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ○ (۲۵/۴۴)

کیا تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے لوگ، دلائل و براہین پر کان دھرتے، اور عقل و خرد سے کام لیتے ہیں؟ (بالکل نہیں۔ جو شخص اپنے جذبات کے پیچھے ہی چلتا رہے، وہ عقل و خرد سے کیسے کام لے سکتا ہے؟) یہ لوگ (انسانی سطح زندگی تک پہنچے ہی نہیں) محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ غلط راہ پر چلتے ہیں۔ (اس لئے کہ حیوانات کم از کم، اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں، اور اُس راہ سے کبھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ ان کے برعکس، جذبات کے تابع چلنے والا انسان لمحہ بہ لمحہ اپنی روش بدلتا رہتا ہے۔ (۷/۱۷۹)؛ (۶۷/۱۰)۔

سورۂ شعراء میں قوم لوطؑ کی تباہی اور ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ○ (۲۶/۱۷۴)

اس واقعہ میں بھی، اربابِ بصیرت کے لئے سامانِ صد موعظت ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ان لوگوں میں سے

اکثر خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ قصص و وقائع ان لوگوں کے لئے اس لئے آ عبرت نہیں بنتے کہ یہ لوگ خدا کے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے اور عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔

وَلَقَد تَّرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○ (۲۹/۳۵)

(چنانچہ وہ قوم تباہ ہوگئی) - ان کی داستان میں بھی ہم نے عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لئے قانونِ مکافات عمل کی صداقت اور محکمیت کی واضح نشانی رکھی ہے۔

اور اللہ کی ان نشانیوں سے آنکھیں بند کئے گزر جاتے ہیں۔

وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ۝ وَبِاللَّيْلِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (۳۷/۱۳۸-۱۳۷)

تم صبح شام ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم اس پر بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور نہیں سوچتے کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے؟

اور قانونِ مکافات کی محکم گرفت سے نہیں ڈرتے۔

وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ○ (۵۱/۳۷)

اس واقعہ میں جو اس بستی کے کھنڈرات پر منقوش چلا آرہا ہے، ان لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان ہے جو غلط روشِ زندگی کے الم انگیز انجام سے ڈرتے ہیں۔

یعنی صحیح علم و بصیرت اور عقل و فکر کا یہ تقاضا ہے کہ ان واقعات سے استقرائی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ان اقوامِ گزشتہ نے یہ کچھ کیا تو ان کا انجام یہ ہوا۔ اگر ہم بھی وہی کچھ کریں گے تو ہمارا بھی انجام ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جس طرح فطرت کے اٹل قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی قوانینِ خداوندی جاری و ساری ہیں۔ اگر پانی آج بھی اسی طرح نشیب کی طرف بہتا ہے جس طرح قومِ لوطؑ و عادؑ و ثمودؑ کے زمانہ میں بہتا تھا تو غلط روش کے نتائج آج بھی وہی ہوں گے جو اس زمانہ میں ہوتے تھے۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲) قوانینِ الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہ ایک عام حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ اور ارسطو کے ذہن کی ضرورت نہیں۔ کتابِ فطرت ایک واضح صحیفہ ہے جو ہر سلیم الطبع انسان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسی لئے سورۂ قمر میں اممِ گزشتہ کے احوال و ظروف اور ان کے اعمال کے نتائج و عواقب بیان کرتے ہوئے ہر کڑی کے بعد فرمایا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ○ (۵۴/۴۰)

"ہم نے ان واقعات کو قرآن میں بیان کر کے بات کا سمجھنا بہت آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی ہے جو اس پر غور و فکر کر کے نصیحت حاصل کرے"؟

یہ ہے تذکرہ جلیلہ حضرت لوطؑ کا جنہیں اللہ نے حکم و علم عطا فرمایا۔

وَلُوۡطًا اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا وَّنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِيۡنَ ۝ (۲۱/۷۴) ؛ (۲۷/۵۸)

(ابراہیمؑ کے ساتھ لوطؑ نے بھی ہجرت کی تھی۔ اس وقت اُن کا شمار عام مومنین کی صف میں تھا۔ لیکن بعد میں) ہم نے اسے نبوّت کا علم، اور اس کے مطابق، لوگوں کے معاملات میں فیصلے کرنے کا منصب عطا کیا۔ اس کی بستی کے لوگ بڑی ناشائستہ حرکات کیا کرتے تھے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر بڑی خراب راہوں پر چل رہے تھے۔ ہم نے اُس بستی کو تباہ کر دیا اور لوطؑ کو وہاں سے محفوظ نکال کر دوسری جگہ لے گئے۔

تورات کا بیان

لیکن اس کے برعکس ذرا تورات کو اٹھا کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ کے ان برگزیدہ رسولوں کی سیرت کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش۔ باب ۱۸ آیت ۲۳ میں حضرت لوطؑ کو نیکوکار کہا گیا ہے۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر یہ قصہ بھی مذکور ہے جسے ہم سینے پر پتھر رکھ کر نقل کرتے ہیں۔

اور لوط ضُغر سے اپنی دو بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ ضُغر میں رہنے سے اسے دہشت ہوئی اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگیں۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم بستر ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اُنہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ پر اُس نے اس کے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات کو بھی اُنہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی۔ اور چھوٹی اُٹھ کے اس سے ہمبستر ہوئی اور اس نے اس کے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ اور بڑی ایک بیٹا جنی اس کا نام موآب رکھا اور وہ موآبیوں کا اب تک ہیں باپ ہوا۔ اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی اور اس کا نام بن عمّی رکھا۔ وہ بنی عمّوں کا جو اب تک ہیں باپ ہوا۔ (پیدائش ۱۹/۳۰-۳۸)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خرافات کا نقل کرنا بھی قارئین کے ذوقِ سلیم کے منافی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس قسم کے تقابل کے بغیر یہ حقیقت اجاگر ہو نہیں سکتی کہ سابقہ "کتبِ آسمانی" کی موجودگی میں خدا کی طرف سے ایک "نئی کتاب" (قرآنِ کریم) کی کیا ضرورت تھی؟ سابقہ "کتبِ آسمانی" کے ان بیانات سے محرّف اور خالص پیغامِ خداوندی کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

بیٹیوں سے مُراد

قرآنِ کریم میں قومِ لوط کی عبرت انگیز داستان اتنی ہی مذکور ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر دو ایک مقامات پر غور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بستی کے لوگوں نے ضیوفِ حضرت لوطؑ کو آن گھیرا ہے تو حضرت لوطؑ نے ان سے کہا کہ

يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ (۱۱/۷۸)

(اُس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر، بدمستی میں دوڑتے ہوئے آئے ——— وہ پہلے ہی سے اس روشِ بد کے خوگر تھے ———)۔ لوطؑ نے انہیں (الگ لے جا کر کہا کہ ذرا سوچو تو سہی تم کیا کر رہے ہو!) یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رُسوا نہ کرو۔ (یہ بڑی شرم کی بات ہے)۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل ہوش کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ (۱۵/۶۲، ۲۹/۲۸-۲۹؛ ۱۵/۶۱؛ ۵۱/۳۵؛ ۲۱/۷۴؛ ۷/۸۰؛ ۲۶/۱۶۵؛ ۲۷/۵۴)

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے انہیں "اپنی بیٹیوں" کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (۲۶/۱۶۶ نیز ۷/۸۱؛ ۲۷/۵۵)

تم عورتوں کو چھوڑ کر، جنہیں تمہارے نشو ونما دینے والے نے اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے (کہ ان سے فرائش

نسل ہو) مردوں کے پاس جاتے ہو۔ (تم تو بالکل حد سے گزر گئے)۔

اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مردوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت لوطؑ انہیں اس خلافِ فطرت خبیثانہ فعل سے روکتے تھے اور فطرت کی صحیح راہوں کی طرف ان کی توجہ ملتفت کراتے تھے۔ اس خاص مقام پر بھی آپ نے اپنی دعوت کو دہرایا اور ان سے کہا کہ اس حماقت سے کیا حاصل! تمہارے لئے تمہاری بیویاں (بستی کی عورتیں) پاک و صاف موجود ہیں۔ اُن کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟

"بستی کی عورتوں" کو آپ نے بیٹیاں کہا۔ ایک مرد بزرگ و پاکباز کے نزدیک بستی کی عورتیں بمنزلہ بیٹیوں کے ہوتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ حضرت لوطؑ اس قوم میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے قرآن کریم نے انہیں قوم لوطؑ کا بھائی [اَخُوْھُمْ = اُن کا بھائی $\frac{26}{161}$] کہا ہے اور اس برباد ہونے والی قوم کو [اِخْوَانِ لُوْط $\frac{50}{13}$] کہہ کر پکارا ہے۔ اسی نسبت سے حضرت لوطؑ نے بستی کی عورتوں کو، جنہیں ان بدبختوں نے چھوڑ رکھا تھا، اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کے نزدیک (اپنی بیوی کو چھوڑ کر) دنیا کی تمام عورتیں بمنزلہ اپنی بیٹیوں بہنوں اور ماؤں کے ہوتی ہیں۔

یہ مہمان کون تھے؟

دوسرا غور طلب مقام یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کے مہمان (بلکہ یوں کہیئے کہ ضیوفِ ابراہیمؑ) کون تھے؟ قرآنِ کریم نے انہیں اللہ کے فرستادہ (مرسلین) کہہ کر پکارا ہے اور اس کی کہیں تصریح نہیں کہ وہ فرشتے تھے۔ لیکن جس انداز سے قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بارگاہ ایزدی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ مثلاً سورۂ ھود میں کہا کہ

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ($\frac{11}{69}$)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے (قاصد) ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے تھے۔

یہی کچھ سورۂ عنکبوت ($\frac{29}{31}$) میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے فرستادہ تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیٹے کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے۔ سورۂ ھود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو ہم نے خوش خبری دی۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝

($\frac{11}{71}$)

ابراہیم کی بیوی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے یہ سن کر اطمینان ہوا اور وہ جی میں خوش ہوئی کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں عین اسی وقت ہم نے اسے اسحٰقؑ کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ اور یہ بھی کہ اسحٰقؑ کے بعد ان کے ہاں ان کا پوتا یعقوبؑ پیدا ہوگا، اور اس طرح اس سرزمین پر (قوم لوط کی تباہی کے بعد) اُن کی نسل پھیل جائے گی۔

اور دوسرے مقامات پر ہے کہ ان فرستادگانِ بارگاہِ ایزدی نے کہا کہ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ (۵۱ / ۲۸)

(اس پر بھی وہ کھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو ابراہیمؑ کو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی) اس پر انہوں نے کہا کہ گھبراؤ نہیں ہم سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ (ہم دشمن نہیں، دوست ہیں۔ ہم خدا کے رسول ہیں، اور اس کی طرف سے تمہیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو بڑا صاحبِ علم ہوگا۔

ان مقامات میں تطبیق مشکل نہیں۔ بشارت ان فرستادگان کی زبان سے دی گئی تھی اس لئے اسے ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بشارت ان کی اپنی طرف سے نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس کے پہنچانے والے تھے اس لئے (۱۱ / ۷۱) میں اس بشارت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

اسی طرح قوم لوط پر عذابِ خداوندی کے متعلق بھی دونوں نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ سورۂ حجر میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ۙ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ۙ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ (۱۵ / ۵۸ - ۶۰)

انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، یعنی قوم لوط کی طرف۔ وہ قوم تباہ ہو جائے گی، بجز لوطؑ کی اپنی جماعت کے لوگوں کے۔ انہیں بچا لیا جائے گا۔ حتیٰ کہ لوطؑ کے اپنے گھرانے کے لوگوں میں سے اس کی بیوی بھی تباہ ہو جائے گی۔ قرائن سے مترشح ہے کہ وہ لوطؑ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ قوم مخالف کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی۔

پہلی آیت میں ہے کہ "ہم قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں" اس سے آگے ہے کہ "ہم آلِ لوط کو نجات دیں گے" اس سے اگلی آیت میں ہے کہ یہ "ہمارا اندازہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی تباہ ہونے والوں میں سے ہوگی"۔ اسی طرح دیگر مقامات میں ہے (دیکھئے۔ ۵۱ / ۳۲ - ۳۳ و ۲۹ / ۳۱ - ۳۲ و ۲۹ / ۳۳ - ۳۴) ان تمام مقامات میں قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے، اور متبعین حضرت لوطؑ کو نجات دینے کی نسبت ان فرستادگان کی طرف

کی گئی۔ لیکن دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔
مثلاً سورۂ اعراف میں فرمایا:۔

۷/۸۴ وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝

ہم نے اُن پر (پتھروں کا) مینہ برسا دیا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ نیز (۱۱/۸۲ و ۵۴/۳۴)

ان مقامات میں بھی کوئی الجھاؤ نہیں۔ قوم لوطؑ پر عذاب اور جماعتِ مومنین کی اس سے رستگاری۔ دونوں خدا کے قانونِ مکافات کے تابع تھے۔ لیکن یہ فرستادگان چونکہ اس مقصد کے لئے مامور تھے کہ ان کے ذریعے اس سرکش قوم پر اتمامِ حجت ہو اور متبعین حضرت لوطؑ اس عذاب سے محفوظ رکھے جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان امور کو اپنی طرف منسوب کیا۔ جیسے، جب کوئی مامور من اللہ (رسول) اپنی قوم سے کہتا ہے کہ "میری بات سنو" تو اس سے مقصود پیغام خداوندی ہوتا ہے۔ یا وہ کہتا ہے کہ "میری اطاعت کرو" تو اس سے مفہوم اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سورۂ ہود کی ان آیات پر بھی غور کیجئے جن میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان فرستادگان سے سنا کہ وہ قوم لوطؑ کی تباہی کے لئے مامور ہو کر جا رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس قوم پر سے عذاب ٹل جائے اور انہیں مزید مہلت مل جائے تاکہ (شاید) وہ اس دوران میں اپنی اصلاح کر سکیں" یہ سب باتیں فرستادگان" سے ہو رہی تھیں۔ اور انہوں نے بھی جواب میں کہا تھا کہ

یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا ۚ اِنَّہٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ (۱۱/۷۶)

اُنہوں نے کہا کہ اے ابراہیمؑ! تو اس بات کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے)، حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ (اب ان پر تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔ ۱۱/۷۶)

لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کے متعلق کہا ہے کہ

یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ (۱۱/۷۴)

اس نے قوم لوط کے بارے میں ہم سے سوال و جواب شروع کئے۔

اس لئے کہ کسی پیغامبر سے پیغام کے متعلق کچھ کہنا، دراصل صاحب پیغام سے کہنے کے مرادف ہوتا ہے۔ پیغامبر تو کسی کا پیغام پہنچانے والا ہوتا ہے۔ پیغام کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ صاحب پیغام (جس کی طرف سے پیغام آیا ہے) سے ہی متعلق ہوگا۔ اللہ اور اس کے رسولوںؑ کے اس باہمی تعلق کو پیشِ نظر رکھنے سے انسان بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتا ہے۔

یہ بحث کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے امور کو انسانوں کی طرف اور انسانوں کے ہاتھوں سرانجام دئے گئے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے پہلے گزر چکی ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے)

یہ بھی واضح رہے کہ یہ "فرستادگان" ملائکہ نہیں تھے کیونکہ (جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۶۹ پر) بتایا گیا ہے، ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آیا کرتے چہ جائیکہ وہ انسانی پیکروں میں سامنے آئیں؟

قومِ مدین ——— حضرت شعیبؑ

اس بعد سورۃ الاعراف کی آیات (۸۵-۸۷) میں قوم مدین کا ذکر ہے جس کی طرف حضرت شعیبؑ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کا تذکرہ بھی حسب سابق مسلسل پیش خدمت ہے۔ ان کی انقلابی دعوت کا مرکزی نقطہ بھی حضرت صالحؑ کی طرح معاشیات سے متعلق تھا، اس فرق کے ساتھ کہ حضرت صالحؑ کا زمانہ زرعی معیشت کا تھا (یا یوں کہئے کہ ان کی قوم کی معیشت زرعی تھی)، اور حضرت شعیبؑ کی قوم کی معیشت کاروباری تھی۔

مطالب الفرقان (جلد سوم صفحہ ۳۸ پر) ذریت حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں دیکھا جا چکا ہے کہ آپ کی بیوی (قطورا) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ ارض حجاز میں متمکن ہوئے اور حضرت اسحٰقؑ فلسطین میں، مدین، حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل، تاریخ کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ سنہ ۲۱۰۰ یا سنہ ۲۲۰۰ ق م) ہے۔ اس لئے قوم مدین کے آغاز کا زمانہ سنہ ۲۰۰۰ ق م تصور کرنا چاہیئے۔ جو قافلہ حضرت یوسفؑ کو چاہِ کنعان سے بازارِ مصر میں لے گیا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ یہ قوم اس علاقہ میں بڑھی۔ پھولی پھلی۔ قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی جب

قومِ مدین

حضرت موسیٰؑ (قبل از نبوت) مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے یہاں پہنچ کر ایک کبیر سن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا۔ (ملاحظہ ہو $\frac{۲۰}{۴۰}$ ؛ $\frac{۲۸}{۲۲-۲۸}$) قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بزرگ

کون تھے لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ تورات میں ان کا نام کہیں رعوایل کہیں یترو اور کہیں حوباب لکھا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا جیسا کہ کتاب گنتی (۱۰/۲۹) میں مذکور ہے، باقی نام دراصل القاب تھے اور یہی حوباب ہیں جو قرآن کریم میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی سنہ ۱۶۰۰ (ق۔م)

اصحاب الایکہ تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا بیٹا دوان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے پٹا ہوا تھا۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کے علاوہ، اصحاب الایکہ کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ بنو دوان ہی تھے۔ ایکہ کے معنی ہیں جنگل۔ ان کی بستی کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ اسی شاہراہ (امام مبین) پر واقع تھی جو حجاز سے شام کی طرف جاتی ہے اور جس کا ذکر قوم لوطؑ کی سرگزشت میں آچکا ہے۔

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ۙ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۵/۷۸-۷۹)

اور اس طرح اصحاب الایکہ (گھنے جنگل کے رہنے والے) ————— بھی بڑے سرکش تھے۔ سو ہم نے انہیں بھی، ان کی سرکشی کی سزا دی ————— اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قوم لوطؑ اور قوم مدین کے شہر) عام شاہراہ پر واقع ہیں۔

یہ تھے وہ قبائل جن کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ (نسبی طور پر آپ مدین کے قبیلہ سے متعلق تھے)۔

۷/۸۵ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (نیز ۱۱/۸۴)

اور اہل مدین کی طرف ہم نے، اُن کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اُس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ تمہارے پاس تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے واضح تعلیم آچکی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ناپ تول کو پورا رکھو لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ (۸۳/۱-۳) اور معاشرہ میں، ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لئے ہے اگر تم اس پر یقین رکھو۔ (نیز ۱۱/۸۴)

آپ ان قبائل کی طرف سب سے پہلے رسولؑ نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے اور رسولؑ بھی آچکے تھے جن کی تکذیب کی گئی تھی۔

كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۚ (۲۶/۱۷۶)

اسی طرح اہل مدین نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی۔

انہی کو حضرت شعیبؑ نے مخاطب کیا تھا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ۝ (۲۶/۱۷۷-۱۷۸)

آخرالامر اُن کی طرف شعیبؑ آیا، اور ان سے کہا کہ کیا تم اپنی روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا نہیں چاہتے؟

(۷/۸۵-۸۷) ؛ (۱۱/۸۴) ؛ (۱۱/۸۷) اور (۸۳/۱-۶)

میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، ایسا ضابطۂ قوانین لے کر آیا ہوں جو امن و سلامتی کا ضامن ہے۔

دولت کے نشہ میں مست

ایک تو علاقہ سرسبز و شاداب۔ اس پر دُور دُور تک کی تجارت۔ اہل مدین دولت کے نشہ میں مست تھے۔ دولت کے ساتھ کثرتِ افراد بھی شامل تھی جو قبائلی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لئے دولت و قوت کی فراوانی سے یہ قوم طاغوتی سرکشیوں کا آتشیں پیکر بن چکی تھی۔ جب سرمایہ داری اور تجارت ایک خدا فراموش قوم کے ہاتھ میں ہوں، تو وہ لوگ جن ابلیسی حربوں سے لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ اس قوم میں یہ سب خرابیاں ایک ایک کر کے آچکی تھیں۔ اس تاجرانہ "جیب تراشی" کے علاوہ، یہ لوگ اپنی قوت و کثرت کے بل بوتے پر رہزنی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہاں کی عام حالت تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ نے (بعد از نبوت) بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کی ہے تو انہی علاقوں میں خیمہ زن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں انہی لوگوں سے خریدتے تھے۔ یہ انہیں یوں بھی لوٹتے تھے اور پھر ہر قسم کا فتنہ و فساد بھی برپا کرتے تھے۔ تورات (سفر القضاۃ اور سفر اعداد) میں دیکھئے، کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے خلاف کس کس قسم کی ننگِ انسانیت حرکتیں کیں۔ ان کی عورتوں نے بنی اسرائیل کے نوجوانوں کو (جو درحقیقت ان کی سپاہ تھی) اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر بداخلاقی کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں،

فتنہ و فساد

آہستہ آہستہ، ان کے سرداروں سے باغی کر دیا۔ اردگرد کے قبائل کے ساتھ سازشیں شروع کر دیں کہ بنی اسرائیل کو ان علاقوں سے نکال دیا جائے۔ غرضیکہ جس طرح ہر ستمبد قوم کا شیوہ ہے انہوں نے اس قسم کے (بلکہ فریب حربوں سے بنی اسرائیل کے جواہرِ ملّی کو ایک ایک کر کے چھین لینا چاہا۔ یہ تھا وہ وقت

جب حضرت شعیبؑ نے انہیں للکارا اور کہا کہ وہ اس قسم کے انسانیت سوز جرائم سے کیوں غضب الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں؟ سورۂ اعراف میں ہے۔

(۸۵-۸۶) وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝

اور اہل مدین کی طرف ہم نے، اُن کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے بھی ان سے یہی کہا کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اُس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح تعلیم آچکی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے واجبات میں کمی نہ کیا کرو۔ (۸۴/۱۱) ۔ اور معاشرہ میں، ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لئے ہے اگر تم اس پر یقین رکھو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو حق و صداقت کی طرف سے جانے والے راستوں پر راہزنوں کی طرح بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظام خداوندی قائم کرنے کے لئے اُٹھیں، اُنہیں دھمکیاں دے دے کر، اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپے رہو۔ تم اپنی اُس حالت کو یاد کرو جب تم تعداد میں بہت کم تھے (اور بے سروسامان بھی) سو خدا نے (امن و عافیت دے کر) تمہاری تعداد بھی بڑھادی اور تمہیں ویسے بھی بہت کچھ دیا۔ (اب تم معاشرہ میں فساد برپا کرتے ہو) لیکن اسے تو سوچ لو کہ معاشرہ میں فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

غور کیجئے۔ وہ تمام عیوب و جرائم جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کس طرح ایک ایک کر کے بیان کئے گئے ہیں۔ سورۂ ہود میں ارشاد ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ۝ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝ (۱۱ / ۸۶-۸۴)

اور اس طرح ہم نے قوم مدین کی طرف، اُنکے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اُس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوشحال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اور اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اُس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بُنیاد، عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ اور معاشرہ نہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! (جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے جمع کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے، لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا) ثبات و دوام صرف اُن مفادات کیلئے ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں ——— اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ (۱۳ / ۱۷) لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اسی صورت میں آسکے گی کہ تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ (اگر تم اس پر یقین نہیں رکھتے تو اسے تم سے جبراً نہیں منوایا جا سکتا اس لئے کہ) میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا (۱۱ / ۱۱۶ و ۸ / ۴۸)

دعوتِ شعیبی بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ دنیائے معاملات کا کون سا گوشہ ہے جو اس احاطہ کے اندر نہیں آجاتا۔ تم پوری پوری محنت کرو اور پھر اس محنت کے ماحصل کو خدا کے اس نظام کے تابع رکھو جو ربوبیتِ عامہ کے لئے متشکل ہوا ہے۔ وہاں سے اس رزق کی تقسیم قانونِ خداوندی کی رُو سے اس طرح ہو گی کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔ جو کچھ اس طرح سے حاصل ہو، حقیقی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس سے ملتی ہیں۔ اسی سے تمہاری صلاحیتوں کی نشو و نما اور انسانیت کی پرورش ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آیات (۲۶ / ۱۸۴-۱۷۹ و ۲۹ / ۳۶) بھی دیکھئے۔

دعوت کا جواب قوم کی حالت اور حضرت شعیبؑ کی دعوت ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس دعوت کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پیشتر کی اقوام میں ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس سے عبرت حاصل کی۔

لیکن باقی اپنی سرکشی میں بدمست رہے۔ (۷/ ۸۶)۔

قوم کی بدعنوانیاں اور حضرت شعیبؑ کی اصلاح کی کوششیں دوش بدوش آگے بڑھتی گئیں حتّٰی کہ وہ قوم ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی جو اندھی قوت کے آخری حربے ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے قوم اور حضرت شعیبؑ کے مکالمات کو اپنے خاص انداز میں بیان فرمایا ہے جسے اسی ترتیب و اسلوب سے درج کیا جاتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

نواں پارہ شروع

۷/ ۸۸ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

اس پر ان اکابرین نے، جو قوت اور دولت کے نشے سے بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو گی۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی سابقہ مسلک اختیار کرنا ہو گا، جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دینگے ———— تم خود سوچ لو کہ تم کیا چاہتے ہو؟

تخویف و ترہیب دیکھئے جب دانش و بصیرت پر مبنی کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو مستبد قوتیں کن دھمکیوں پر اتر آتی ہیں "یا تو اس انقلاب انگیز مسلک سے باز آجاؤ۔ ورنہ ملک بدر کر دیئے جاؤ گے"! لیکن جن کی آنکھیں حقیقت کو بے نقاب دیکھ چکی ہوں ان پر ان دھمکیوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ (۷/ ۸۸) خواہ ہم اس مسلک کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں! پھر بھی اسے اختیار کر لیں؟ غور کیجئے! استبداد کے مطالبات کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مستبد قوتیں اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ جسے آپ کی بصیرت درست سمجھے اسے اختیار کر لینے کا آپ کو حق حاصل ہو۔ آپ کو وہ مسلک اختیار کرنا ہو گا جسے ان کی مصلحتیں اپنے مفید مطلب سمجھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ علیٰ وجہ البصیرت ان گمراہ کن راستوں کو چھوڑ چکا ہو، وہ محض استبداد کے ڈر سے ان راہوں کو کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

۷/ ۸۸-۸۹ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ

بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ○ (۸۸-۸۹)

اس پر شعیبؑ نے اُن سے کہا کہ خواہ تمہارے مسلک و مشرب کو ہم ناپسند ہی کیوں نہ کریں، پھر بھی ہمیں، تمہارے ڈر کی وجہ سے، اُسے زبردستی اختیار کرنا پڑے گا؟

اگر ہم تمہارے مسلک کو اختیار کرلیں، حالانکہ (خدا نے اپنی وحی کی روشنی عطا کرکے) ہمیں اس باطل مسلک سے نجات دلائی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہمیں خدا نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، تو یہ سب افترا اور خدا پر بہتان ہی ہے۔ تم کان کھول کر سن لو کہ ہم، تمہارے مسلک کی طرف لوٹ کر نہیں آسکتے ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا[1]۔ ہم نے یہ دین، اُس خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہنمائی کی بنا پر اختیار کیا ہے جس کا علم تمام چیزوں کو محیط ہے۔ باقی رہیں تمہاری دھمکیاں، سو ہم ان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ہمارا بھروسہ قانونِ خداوندی کی محکمیت پر ہے۔

شعیبؑ نے پوری جرأت اور استقامت سے اُن اکابرین کو یہ جواب دیا اور پھر کہا کہ اے ہمارے نشوو نما دینے والے! تو اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہم میں اور ہماری قوم میں، کھلا کھلا اور آخری فیصلہ کر دے۔ تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (کیونکہ تیرا فیصلہ قانون اور عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے، نہ کسی کے خلاف تعصب اور انتقام کا جذبہ کارفرما)۔

جب حضرت شعیبؑ کی محکم خودی کے سامنے ان لوگوں کی کوئی پیش نہ چلی تو عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ خبردار! جو شخص اس کے پیچھے چلے گا سخت عذاب میں ماخوذ کر دیا جائے گا۔

(۹۰) وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○

---

[1] اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا کے یہی معنی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اسلوبِ قرآن کریم میں "استثنا بالمشیت" ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَآءَ اللّٰهُ وغیرہ ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا ہے، اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا (ملاحظہ ہو لغات القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۶۱۵۔ عنوان ن۔س۔ی)

اب اُس قوم کے اکابرین نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ اُنہوں نے شعیبؑ سے مزید بات کرنے کے بجائے اُس کے متبعین کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تم شعیبؑ کا اتباع کرتے رہے، تو یاد رکھو کہ تم سخت نقصان اُٹھاؤ گے۔

غور کیجئے! دعوتِ حق و صداقت کو کس طرح دبایا جاتا ہے! دنیا میں کوئی طاغوتی قوت ایسی نہیں جو دعوت الی اللہ کی عام تبلیغ اور اس کی اتباع و اطاعت کی اجازت دیدے۔ ابد سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور ازل تک یہی ہوتا چلا جائے گا۔

ایک نکھرا ہوا معیار آپ نے نہیں دیکھا کہ ابلیس، آدم کے ساتھ اس اسٹیج پر کن دعاوی کو ساتھ لے کر آیا ہے؟ لہٰذا اگر طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوت حق و صداقت کی دعوت نہیں خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاذب نگاہ اور نظر فریب پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتیں پرکھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کبھی، کہیں، کوئی استثنا نظر نہیں آئے گا۔ لہٰذا حضرت شعیبؑ کے ساتھ یہی کچھ کیوں نہ ہوتا؟

سورۂ ہودؑ میں قوم کی طرف سے ایک ایسے اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلام کی ایک بہت بڑی اصولی حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ اُنہوں نے کہا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُاؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝ (11/87)

اُنہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! (تم جو کچھ کہتے تھے اس سے ہم نے سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریق لے کر آئے ہو۔ اس لئے ہم نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے طریقے پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے۔ تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا ہی نہیں۔ تیری صلوٰۃ پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں بھی دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں)۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ نہ ہم جسطرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں۔ اور نہ ہی جسطرح

جی چاہے اُسے خرچ کریں؟ چہ خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آباء و اجداد، جن سے یہ موجودہ نظام منتقل ہو کر چلا آرہا ہے، سب ظالم اور جاہل تھے۔ اور عقل و فہم اور تحمل و بُردباری، غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری، سب تمہارے حصے میں آگئی ہے!

مذہب کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام ہے۔ اسے ......

مذہب و سیاست

دنیاوی معاملات سے کیا واسطہ؟ مذہب کا دائرہ۔ پوجا پاٹ۔ نماز روزہ "نیک عملی اور خدا پرستی" تک محدود ہے، اس سے آگے دنیاوی معاملات ہیں۔ ان معاملات میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خیال نیا نہیں۔ خدا کا سچا مذہب (جس کے لئے صحیح لفظ دین، یعنی نظامِ اطاعتِ خداوندی ہے) جہاں اور جب بھی پیش کیا گیا خود ساختہ قوانین پر چلنے والے انسانوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے۔ کہ "مذہب کو ان معاملات کے ساتھ کیا تعلق؟" خدا کی عبادت (بمعنی پوجا پاٹ) سے دنیا میں کوئی نہیں روکتا۔ اس سے دوسرے کا بگڑتا کیا ہے۔ آپ صبح سے شام تک اس شکل کی عبادت کرتے رہیئے آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہر جگہ آزادی ہے۔ لیکن جب آپ عبادت بمعنی عبودیت (یعنی انسانوں کے بجائے قوانینِ خداوندی کی محکومیت)، کو مذہب (یعنی دین) کی حیثیت سے اختیار کریں گے تو مستبد قوتیں کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔ اسلئے کہ دنیا کا نظامِ استبداد، انسانوں کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ لیکن اللہ کا نظام (یعنی دین) انسانوں سے یہ حق چھین کر اس ذات کے سپرد کر دیتا ہے جو حکومت کی فی الواقعہ سزاوار ہے۔ لہٰذا دوسروں پر اپنی مرضی چلانے کا خوگر انسان اسے کسطرح گوارا کر سکتا ہے؟ یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس کے تحت مستبد قوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مذہب پوجا پاٹ کی حد تک رہے تو بالکل درست۔ لیکن اگر ان کے معاملات میں دخل دینے لگ جائے تو سخن در این است۔ یہی ہے وہ اعتراض جو قومِ مدین نے کیا۔ انہوں نے حضرت شعیب سے کہا کہ آپ نمازیں پڑھتے رہیئے۔ ہم کب روکتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کی یہ نماز کیسی ہے جو کہتی ہے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں بلکہ اسے کسی اور قانون کے تابع رکھیں۔ "اموال" کے لفظ کو خاص طور پر سامنے رکھیئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ صرف مساجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات کو بھی اپنے اندر لے آتا ہے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ دینِ خداوندی ان ناہمواریوں کو دور

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "نظامِ ربوبیت"۔

کرنے کے لئے آتا ہے، جو تقسیم رزق کے بارے میں انسانوں نے اپنے خود ساختہ آئین و قوانین کی رو سے پیدا کر رکھی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر غیر خدائی نظام، نظامِ خداوندی کے مقابلہ میں آتا ہے اور اس سے بڑی شدت سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی صلوٰۃ کا دائرہ اپنی مساجد تک رکھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو ایک طرف میں تمہاری مساجد کی تعمیر، مرمت، روشنی، پانی، جھاڑ فانوس، فرش، قالین تک کے لئے مدد دوں گا لیکن اگر تم یہ کہو کہ خدا کا قانون ہماری معاشی زندگی کو بھی محیط ہے تو اس کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

یہ تو تھا آیت کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق۔ اب پہلے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اہلِ مدین بت پرست تھے بُت پرستوں سے پوچھئے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم پرستش تو درحقیقت خدا ہی کی کرتے ہیں لیکن ان بتوں کو خدا کی صفات کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔

مقصود سب کا ایک ہے بابا

لہٰذا تمہاری نماز اور ہماری بھگتی ایک ہی منزل تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ اور بُت پرستوں تک ہی کیا موقوف ہے! دنیا میں کسی "خدا کے بھگت" سے پوچھئے۔ وہ یہی کہے گا کہ راستے مختلف ہیں لیکن قبلۂ مقصود سب کا ایک ہے۔ کسی نے خدا خدا کہہ لیا۔ کسی نے رام رام۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ تعلیم بظاہر بڑی خوش آیند ہے اور دلآویز۔ اسی لئے مذہب کو خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق تک محدود رکھنے کے مدعی اور ساعی ہمیشہ اس قسم کے بزرگوں کے اقوال پیش کرتے رہتے ہیں جن سے یہ پایا جائے کہ راستے جدا جدا ہیں مطلوب سب کا ایک ہے۔ (جمنا ایک، گھاٹ بہتیرے۔ کہت کبیر سمجھ کے پھیرے) اور اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں کہ جب عالمگیر سچائیاں سب جگہ یکساں طور پر موجود ہیں[1] تو پھر اختلاف طریق پر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ دوسروں کو اپنے طریق کی دعوت دے۔ جس طریق پر کوئی چلا آرہا ہے ٹھیک ہے۔ غور کیجئے۔ قوم مدین نے حضرت شعیبؑ سے کیا یہی نہیں کہا؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے جس طریق پر چلے جا رہے ہیں اور جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تم جس انداز سے اپنے رب کی عبادت کرتے ہو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ لوگوں سے یہ کہو کہ وہ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کرلیں؟

متذکرہ صدر تصریحات کو سامنے رکھ کر آیت نظر پر پھر غور کیجئے کہ حقائق و عبر کا کتنا بڑا بحرِ ذخار ہے جو چند الفاظ کے سواحل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دینِ الٰہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین

---

[1] اس مسلک کی اشاعت مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنے ترجمان القرآن میں کی تھی۔

دین کا صحیح مفہوم

حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی معاملہ دین کی حدود سے باہر نہیں۔ اور دینِ خداوندی (اسلام) میں عبادت سے مفہوم پرستش (پوجا پاٹ) نہیں بلکہ اس ضابطۂ قوانین کی ـــــــ عملی اطاعت ہے جس کا نفاذ قوت و حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ عبادت کی مختلف شکلیں (نماز۔ روزہ وغیرہ) اسی اطاعت کا محسوس مظہر ہیں اور اس نظام کے قیام و بقا کا ذریعہ۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے)

قوم نے یہ کہا اور اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰی مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ ○ (۱۱ : ۸۸)

شعیبؑ نے کہا کہ اے میری قوم! ذرا اس پر غور کرو کہ میرے پروردگار نے عقل و بصیرت کے نمایاں راستے میرے سامنے کشادہ کر دیئے ہوں۔ اور لوٹ کھسوٹ، بددیانتی اور بے ایمانی سے حاصل کردہ روزی کی بجائے مجھے نہایت عمدہ، خوشگوار اور حلال و طیّب روزی عطا کی ہو۔ (تو میں اس کے بعد بھی تمہیں صحیح راستے کی طرف آنے کی دعوت نہ دوں؟)۔ نہ ہی میں ایسا کر سکتا ہوں کہ جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں، انہیں خود اختیار کروں۔ میں جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں خود اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا تہیّہ کر چکا ہوں کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا، میں تمہارے غلط نظامِ معاشرہ کی اصلاح کر دوں گا۔ (میں جانتا ہوں کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ سرِدست مجھے میسّر نہیں۔ لیکن) مجھے وہ تمام اسباب، قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو جائیں گے۔ اس کے قانون کی محکمیت پر مجھے پورا پورا بھروسہ ہے۔ اور سفرِ حیات میں میرا ہر قدم، اسی سرچشمۂ خیر و خوبی کی طرف اٹھتا ہے۔

اس بصیرت افروز جواب کے مختلف ٹکڑوں پر غور فرمائیے۔ قوم نے یہ کہا تھا کہ ہم اس روش پر چلے جا رہے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد سے ہم تک متوارث پہنچی ہے۔ تم اس کے خلاف کیوں کہتے ہو؟ آپ نے اس کے جواب میں وہی کہا جو اس سے پیشتر ہر رسولؑ نے اس اعتراض کے جواب میں کہا تھا۔ یعنی جب میرے پاس

اسلاف پرستی

اللہ کی طرف سے ایک کھلی ہوئی روشنی موجود ہے جس سے میں غلط اور صحیح کی پرکھ کر سکتا ہوں تو پھر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کئے کسی روش کہن پر چلے جانا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ یہ واضح دلیل اور کھلی ہوئی روشنی، حضرت شعیبؑ کی تعلیم تھی جو بذریعہ وحی آپ کو دی گئی تھی۔

اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ میں تمہاری تخویف وترہیب سے ڈر جاؤں۔ لیکن ڈرے وہ جو تمہارا محتاج ہو، جسے اللہ پر ایمان ہو وہ انسانوں کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے۔ تم میرے رازق نہیں ہو۔ مجھے رزق اس مبداءِ فیض سے ملتا ہے جو خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡن ہے۔ جس کا عطا کردہ رزق، درحقیقت رزق حسنہ (بہترین روزی) ہے تم غیر اللہ کو رازق سمجھتے ہو اور ان کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو۔ اس لئے تمہاری حالت یہ ہے کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے تمہیں دس مرتبہ مقامِ انسانیت سے گرنا پڑتا ہے۔ لیکن میرا خدا وہ ہے کہ رزق بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ دنیا جہان کی سرفرازیاں بھی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد، جانے برد آں خدا نانے دہد، جانے دہد

پھر فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ میں بھی تمہاری روش اختیار کرلوں، لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ جس بات کو میں علیٰ وجہ البصیرت صحیح سمجھتا ہوں اور اس پر چلنے کے لئے تمہیں دعوت دیتا ہوں، تو کیا میں خود اس کے خلاف چلنے لگ جاؤں؟ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں وہی کچھ خود بھی کرتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میری صلوٰۃ یہ کیوں حکم دیتی ہے کہ میں تمہارے "دنیاوی معاملات" میں بھی دخل انداز ہوں اور تم سے تمہارے آباؤ اجداد کی روش کہن چھڑا کر ایک اور راہ پر لے چلوں۔ سو یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی استطاعت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور اصلاح کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کرو کہ چونکہ تم نے پہلے ہی سے دل میں فیصلہ کرلیا ہے کہ میری مخالفت ضرور کرنی ہے اس لئے میں جو کچھ کہوں اُس کا اُلٹ کرتے جاؤ۔ یہ روش سرتاپا حماقت ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہلاکت وبربادی۔

وَيٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ‌ؕ وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡكُمۡ بِبَعِيۡدٍ ۝ (۱۱/۸۹)

اے میری قوم! دیکھنا! میری مخالفت میں تم کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارا بھی وہی حشر ہوجائے جو نوحؑ، ہودؑ یا صالحؑ کی قوم کا ہوا تھا۔ یا قومِ لوطؑ کا سا حال، جس سے تم اچھی طرح باخبر ہو کیونکہ وہ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں۔ نہ ہی ان کی تباہ شدہ بستیاں تم سے کچھ زیادہ دُور واقع ہوئی ہیں۔

محض ضد

غور کیجیئے! کیا دنیا میں حق و صداقت کی مخالفت عام طور پر اسی لئے نہیں ہوتی کہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ اس کی مخالفت کرنی ہے اور پھر اس کے بعد کبھی سوچا ہی نہیں جاتا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر غور تو کر لیا جائے؟ یہی وہ راہ ہے جو سیدھی تباہی اور بربادی کے جہنم تک لے جاتی ہے۔ اس روش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ○ (۱۱/۹۰)

تم اپنی موجودہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے اس طرح بچ سکتے ہو کہ تم اُس راستے کو چھوڑ کر، خدا کے راستے کی طرف آجاؤ۔ اور سلب و نہب کے موجودہ نظام کی جگہ خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کر کے، اُس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو ——— وہ نظامِ خداوندی نہایت شفقت آمیز انداز سے سامانِ مرحمت عطا کرتا ہے۔

قوم کے پاس ان محکم دلائل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن کیا اُنہوں نے لاجواب ہو کر اعترافِ حقیقت کر لیا؟ توبہ! توبہ! نخوت و تکبّر کے شیاطین بھلا کب اس کی اجازت دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○ (۱۱/۹۱)

اُنہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں! اس لئے اُنہیں ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تم کوئی ایسے صاحبِ قوت و اقتدار بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم تمہاری باتوں کو مجبوراً مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں محض تمہاری برادری کا لحاظ ہے۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور تم ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتے۔

اس جواب پر صحیح تبصرہ خود حضرت شعیبؑ کے ارشاد میں موجود ہے جو اس سے اگلی آیت میں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○ (۱۱/۹۲)

شعیبؑ نے کہا کہ اچھا! تمہیں خدا کے قانونِ مکافات کا کوئی ڈر نہیں۔ ڈر ہے تو میری برادری کا ہے۔ میں اب سمجھا کہ تم جو خدا کا نام لیتے رہتے ہو، وہ محض برائے وزنِ بیت ہے۔ تم نے اُسے بطور (EXTRA) اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے، کہ جب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس سے کام لے لیا جائے، ورنہ مدد اور سہارے

کے لیئے تمہاری نگاہیں اور ہی طرف اُٹھتی ہیں۔ حالانکہ اگر تم آنکھیں رکھتے تو تمہیں نظر آجاتا کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں انسان، دوسرے انسانوں کا پاسِ خاطر تو کرتا ہے لیکن خدا کا خیال کبھی نہیں کرتا! آپ نے کیسی حقیقت کشا اور دلآویز بات کہی ہے کہ کم بختو! تمہارے نزدیک میری

خدا کا قانونِ مکافات

برادری کی طاقت تو ایسی ہے جس کا تم پاس کرو لیکن خدا کا قانونِ مکافات تمہارے نزدیک (معاذاللہ) کچھ شے ہی نہیں کہ اس کا بھی کچھ خیال رکھا جائے! غور کیجئے! کیا دنیا میں تمام بڑی بڑی خرابیوں کی علت یہی نہیں کہ لوگ انسانوں کا پاسِ خاطر تو کرتے ہیں لیکن قانونِ خداوندی کو پسِ پشت ڈالے رکھتے ہیں۔ اگر اس کا دھیان پیشِ نظر رہے تو خلش و اضطراب اور فتنہ و فساد کا یہ جہنم، سکون و طمانیت کی جنت بن جائے۔

مندرجہ صدر آیت (۱۱/۹۲) میں ظِھْرِیًّا کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب وہ سفر میں جاتے تو چلنے اونٹوں کی فی الواقعہ ضرورت ہوتی ان سے ایک آدھ زاید ساتھ لے لیتے کہ اگر راستے میں متعینہ اونٹوں میں سے کسی کو کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا حادثہ پیش آگیا تو یہ فالتو اونٹ (EXTRA) کام آجائے گا۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ تم خدا کا نام ضرور لیتے ہو اور اس کے ماننے کے مدعی بھی ہو۔ لیکن عملی زندگی میں تم نے اس کی حیثیت، ایک ظِھْرِیٌّ جیسی رکھ چھوڑی ہے کہ جب اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو تو اسے بطور آخری حربہ استعمال کر لیا جائے۔ یہ ہے تمہارا خدا کو ماننا۔

غور کیجئے! کیا آج ہماری بھی یہی حالت نہیں؟

جب حضرت شعیبؑ نے دیکھا کہ قوم اپنی ضد پر بُری طرح سے جمی ہوئی ہے تو فرمایا کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ تم اگر تباہ ہونے پر تلے بیٹھے ہو تو تمہیں تمہاری غلط روش کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے؟

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ○ (۱۱/۹۳)

بہرحال، میں نے سمجھ لیا ہے کہ وعظ و نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے اب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ وہ کون ہے جس پر رُسوا کُن تباہی کا عذاب آتا ہے۔ اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

یعنی وہی اِستنتاجی طریقِ استدلال (PRAGMATIC TEST) کہ میرے پروگرام کو تکمیل تک پہنچ لینے دو، اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔

سورۂ شعراء میں ہے کہ قوم نے کہا کہ تمہاری ان باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) تمہارا دماغ چل گیا ہے۔تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۵)

اُنہوں نے کہا ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو کر کہ خدا اُن سے باتیں کرتا ہے، (قوم کے مصلح بننے کی کوشش کرتے ہیں)۔

بشر اور رسول؟

اس لئے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ تم پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔لیکن تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔تم پر وحی کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جو ہم اس سے پیشتر امم سابقہ کے احوال و کوائف میں سنتے چلے آئے ہیں۔

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۶)

تو ہماری طرح کا انسان ہے (اس لئے تو خدا کا رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟) ہم تمہیں تمہارے دعویٰ میں سراسر جھوٹا سمجھتے ہیں۔

اگر تم واقعی سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو!

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۷)

اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ ہماری اس روش کے نتیجے میں ہم پر تباہی آنے والی ہے، تو تم آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو (اور اس طرح اس ناگہانی آفت کو ہم پر لے آؤ)۔

اس کے جواب میں آپ نے فقط اتنا کہا کہ

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶/۱۸۸)

شعیبؑ نے کہا کہ (میں تم پر آسمانی آفت کیا گراؤں گا)، میرا نشوونما دینے والا خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو، (اور تمہارے یہ اعمال، تم پر کس قسم کی تباہی لائیں گے)۔

وہ تمہارے اعمال سے واقف ہے اور اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت بھی اُس کو معلوم ہے۔ اس لئے میں تم پر عذاب کیا لاؤں گا؟ عذاب لائیں گے خود تمہارے اعمال!

ظہورِ نتائج کا وقت قوم مدین اپنی بدعنوانیوں اور سرکشیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہوگیا اور ظہورِ عذاب شروع ہوگیا۔ تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ مدیانیوں کا فتنہ و فساد حد سے بڑھ چکا ہے اس لئے اب ان سے انتقام لو۔

پھر خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مدیانیوں کو تنگ کرو اور انہیں مارو۔ (گنتی ۲۵/۱۷-۱۶)

پھر خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہلِ مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے۔ اور تو بعد اُس کے اپنے لوگوں سے مل جائے گا۔ (گنتی ۳۱/۲)

چنانچہ ایک قیامت خیز جنگ ہوئی جس میں مدیانی بُری طرح سے تباہ ہوئے۔ قرآن کریم میں جنگ کا ذکر نہیں بلکہ اس کے بعد کا ذکر ہے جو زلزلہ اور آتش فشانی کی صورت میں اُن پر مسلّط ہوا اور جس سے اُن کی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد انہیں مزید مہلت دی گئی کہ وہ اپنی حالت میں اصلاح کر لیں۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی سرکشیوں اور بدعنوانیوں سے باز نہ آئے تو پھر اُن کی بربادی کا وقت آ پہنچا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

۷/۹۱-۹۲	فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝

(۷/۹۱-۹۲)

اس کش مکش کے بعد ہوا یہ کہ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا، انہیں لرزا دینے والے عذاب نے آگھیرا اور وہ اپنے گھروں میں، مٹی کے تودوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے۔

وہ اس طرح نیست و نابود ہوگئے گویا وہ ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ (وہ شعیبؑ کے متبعین سے کہا کرتے تھے کہ تم اپنی روش سے باز آجاؤ، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ لیکن ہوا یہ کہ نقصان انہی کا ہوا جو شعیبؑ کی تکذیب کیا کرتے تھے ــــــ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

یہی الفاظ سورۂ عنکبوت میں ہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ○ (۳۷/۲۹)

اُنہوں نے شعیبؑ کی تکذیب کی تو (آخرالامر) اُنہیں زلزلہ کی تباہی نے اس طرح آپکڑا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے پائے گئے۔

حضرت شعیبؑ اس سے پہلے ہی ان سے الگ ہو چکے تھے۔

۹۳/۷ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○

شعیبؑ اس تباہی سے پہلے ہی اُن سے الگ ہو گیا تھا۔ اُس نے جاتے وقت اُن سے کہا تھا کہ اے میری قوم! میں نے تمہیں، اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات پہنچا دیئے۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ تمہارا بھلا ہو جائے لیکن تم نے ایک نہ سُنی۔ (اور اپنی غلط روش پر برابر آگے بڑھتے چلے گئے)۔ اب اُس کے نتیجہ میں جو تباہی تم پر آ رہی ہے' میں اس پر کیا افسوس کروں!

آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمایئے۔ ان میں بظاہر قوم کے عبرت انگیز انجام سے بے تعلقی پائی جاتی ہے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس بے تعلقی میں بھی ہمدردی و شفقت کے کس قدر نازک اور شدید جذبات مضمر ہیں! مصلحین کو بھی کیسا دردمند دل عطا ہوتا ہے (نیز دیکھئے ۹۵-۹۴/۱۱ ؛ ۱۸۹/۲۶)

یہ ہے سرگزشت قوم مدین۔ اصحاب الایکہ کا ضمنی ذکر قرآن کریم کے دو اور مقامات میں بھی آیا ہے۔

وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ○ (۱۳/۳۸ ؛ ۱۴/۵۰)

نیز قوم ثمود۔ قوم لوط اور اصحاب الایکہ (اہل مدین) نے بھی۔ اُن کا بڑا لاؤلشکر تھا سب کے سب تباہ کر دیئے گئے۔) (نیز ۱۴/۵۰)

۹۴/۷ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○

(یہ محض چند واقعات ہیں جنہیں اس مقام پر سامنے لایا گیا ہے، ورنہ تمام اقوام سابقہ کی تاریخی یادداشتیں

اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ) ہم نے جب بھی کسی بستی کی طرف کوئی نبی بھیجا، (تو اُس کے اربابِ دولت و ثروت نے اس کی مخالفت کی ۳۴/۳۴ و ۳۴/۴۳۔ جب تک اُن کی غلط روش، اس درجہ تک نہ پہنچی کہ وہ اِن کی آخری تباہی کا موجب بن جائے) ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں آئیں۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ دیکھ کر، قوانینِ خداوندی سے سرکشی چھوڑ دیں، اور اُن کے سامنے جُھک جائیں۔ یہ مصیبتیں اور مشکلیں خود اُن کے غلط نظام کی پیدا کردہ ہوتی تھیں۔

سابقہ آیات میں اقوامِ گزشتہ کی داستانیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اس کے بعد ملخصاً بتایا گیا ہے کہ ان کی تباہی اور بربادی کی وجہ کیا تھی، اور وہ تباہی اُن پر کس انداز سے آئی۔ اگرچہ یہ حقیقت متعدد بار سامنے آچکی ہے، بایں ہمہ اسے چند الفاظ میں، بارِ دیگر، دُہرا دیا جائے کہ دین کی تاریخ اُس کشمکش کی تاریخ ہے جو نظامِ ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی

غلط کار قوموں کی تباہی

پیشوائیت اور نظامِ خداوندی میں پیہم اور مسلسل چلی آرہی۔ اس سے دین اور مذہب کا فرق بھی واضح ہوجاتا ہے۔ مذہب کو ان باطل نظامہائے زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ قسم کا تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے، جو پوجا پاٹ۔ بندگی۔ پرستش کے ذریعے ہر قسم کے نظام میں حاصل ہوسکتا ہے۔ دین ان باطل نظاموں کو مٹاتا اور ان کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کرتا ہے۔

اب رہا وہ طریق جس کے مطابق غلط کوش اور غلط کار قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔ غلط نظام آہستہ آہستہ خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر شروع ہی میں ان کی روک تھام کا انتظام کر لیا جائے تو قوم تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اگر ان خرابیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو وہ بڑھتی چلی جاتی ہیں، تاآنکہ ان کی آخری تباہی کی نوبت آجاتی ہے۔ زیرِ نظر آیات میں اسی حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے۔

یہاں ان ہلکے ہلکے جھٹکوں کا مقصد یہ بتایا گیا: لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ــــــ تَضَرُّعَ کا مفہوم آیت (۷/۵۵) کی تشریح میں بتایا جاچکا ہے۔ غلط نظام میں قوم زندگی بخش سرچشموں سے کٹ جاتی ہے۔ انہیں اس قسم کی وارننگ سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر ان چشمہ ہائے حیات بخش کی طرف پلٹ آئیں۔ وہ چشمے جن کی نشاندہی دوہی آیات آگے آیت (۷/۹۶) میں کی گئی ہے۔

۷/۹۵ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ
اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

وہ اِن قوانین کے سامنے جُھک جاتے، تو اُن کی مصیبتیں، خوشحالیوں میں بدل جاتیں۔ جب اُن پر، اس طرح، ایک عرصہ گزر جاتا، تو وہ پھر بھول جاتے کہ بدحالی اور خوشگواری، قانونِ خداوندی سے وابستہ ہے (۷/۹۴)۔ وہ کہتے کہ اس قسم کی تبدیلیاں، یونہی اتفاقی طور پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے اسلاف کی بھی یہی حالت رہی کہ اُن پر کبھی اچھے دن آجاتے، کبھی بُرے۔ اِس لئے قانونِ مکافات کوئی چیز نہیں۔ وہ اِس طرح، اپنی غلط روش میں اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جاتے، تا آنکہ ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا، اور وہ اسطرح اچانک پکڑے جاتے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا کہ اُن پر یوں تباہی آجائے گی۔

اِس میں قوموں کی عمومی ذہنیت سامنے لائی گئی ہے۔ یعنی اِن پر جھٹکا آتا ہے تو وہ سنبھل جاتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد، اسے بھول جاتی ہیں اور پھر اُسی روشِ کہن پر گامزن ہو جاتی ہیں۔

اِس کے بعد قرآنِ کریم نے تاریخ کے ایک عمیق فلسفہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جن لوگوں کی نگاہ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانینِ خداوندی پر نہیں (یعنی سیکولر نظامِ زندگی کے پیرو ہیں)، وہ اپنے آپ کو اس فریب

یہ کچھ اتفاقیہ نہیں ہوتا

میں مُبتلا رکھتے ہیں کہ اس قسم کے حادثات اتفاقیہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، اور اب بھی ویسے ہی ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد یہ ہے کہ کارگہِ کائنات میں کوئی واقعہ اتفاقیہ رونما نہیں ہوتا۔ یہاں ہر واقعہ اور حادثہ قانونِ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔ (انڈکس میں "تاریخ" اور "قوموں کے عروج و زوال کے قوانین" کے عنوانات دیکھئے)۔ قرآن کے دعویٰ کی صداقت کا عجیب ثبوت ہے کہ اب سیکولر مغرب کے دانشور بھی اِس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ دُنیا میں واقعی کوئی حادثہ اتفاقیہ (BY CHANCE) رُونما نہیں ہوتا۔ اِس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ جب تک وہ سبب ہمارے علم میں نہیں آتا، ہم اسے (CHANCE) کہتے ہیں۔ جب وہ سبب معلوم ہو جاتا ہے تو وہی چانس، قانون کے احاطہ میں آجاتا ہے۔

جب کوئی قوم اپنی تباہی کے آثار کو محض اتفاقی (CHANCE) سمجھتی رہے تو وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اصلاح سے مراد ہوتی ہے اس خرابی کا دُور کرنا جو اس تباہی کا سبب ہو۔ اور ایسا وہی قوم کر سکتی ہے جس کی نگاہ قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین پر ہو۔ جھٹکے کے وقت وہ سوچے گی کہ ہم سے کون سے قانون کی

تقدیر اور سیکولرازم

خلاف ورزی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ خرابی ہے۔ اور جب اس علت کی تحقیق کر لے گی تو اسے دُور کرنے کی تدبیر کرے گی۔ واضح رہے کہ جسے سیکولر اصطلاح میں چانس

کہا جاتا ہے، اُسے مذہب پرست طبقہ تقدیر کہکر پکارتا ہے۔ جانس میں بھی کوئی شخص اس حادثہ کی ذمہ داری اپنے سر پر نہیں لیتا
عقیدہ تقدیر میں بھی یہی ہوتا ہے۔ تقدیر پرست قومیں کبھی اپنی اصلاح کر ہی نہیں سکتیں۔ جب ان کی تباہی آتی ہے تو وہ
شعوری طور پر سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ سیکولر ذہنیت یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتی ہے کہ یہ محض
اتفاقی حادثہ ہے، اور تقدیر پرست یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی! ان کے برعکس قرآن
کہتا ہے کہ یہ سب (عروج وزوال) قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

۷/۹۶ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ
الْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

اگر یہ لوگ ہمارے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے، اور (اُس کے اتباع سے) زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے
کی فکر کرتے، تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے (۵/۶۶ و ۷/۳۰)۔ یعنی
اُن برکات کے دروازے جن سے اُنہیں اس دنیا کی زندگی کی خوشحالیاں اور سرفرازیاں بھی میسر آجائیں اور اُخروی
زندگی کی شادابیاں اور ثمرباریاں بھی۔ لیکن انہوں نے اُسے جھٹلایا تو اُن کے اعمال کے نتائج نے اُنہیں
آن پکڑا۔

یہ آیت، اس سے پہلے آیات (۵/۶۶ ؛ ۷/۳۰) میں آچکی ہے۔ وہاں مفہوم دیکھ لیجئے "ارض وسماء" کی
برکات کے ارتباط سے قرآن کریم نے دنیاوی زندگی اور وحی میں جس ربطِ باہمی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے نگہ بصیرت

دنیا اور دین کا ارتباط

وجد میں آجاتی ہے۔ اسلام نہ سیکولرازم ہے جس میں منتہیٰ ارض (محض دنیوی زندگی)
ہوتی ہے، اور نہ ہی مذہب یا تصوّف جس میں دنیا کو قابل نفرت قرار دے کر مقصد
حیات رمز عومہ "روحانیت" قرار دی جاتی ہے۔ اقبالؒ کے یہ بصیرت افروز اشعار نہ معلوم کتنی بار پہلے سامنے آچکے
ہیں، اور کتنی بار اور سامنے آئیں گے۔ کہ

غربیاں را زیرکی سازِ حیات ‏‏‏ شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس ‏‏‏ کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود ‏‏‏ نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ ‏‏‏ عشق را با زیرکی آمیز دہ

(جاوید نامہ صفحہ ۱)

یہ "عشق اور زیرکی" کا آمیزہ ہے جسے قرآن نے "ارض وسماء" کا ارتباط کہکر پکارا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے جو

از کلید دین درِ دنیا کشاد

دنیا کے ہر دروازے کو دین کی چابی سے کھولتا ہے۔

ان قوموں کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ارتباطِ "ارض وسماء" کے اس قانونِ ازلی کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ یہاں اَخَذْنٰهُمْ (ہم نے انہیں پکڑا) کے بعد بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ان کے غلط اعمال کی وجہ سے) کا اضافہ کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ خدا کی گرفت کیوں ہوتی ہے۔

اس کے بعد استعارہ کے طور پر بتایا ہے کہ ان قوموں کی حالت کیا ہو چکی ہوتی ہے۔

(۹۹-۹۷/۱۲) اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ۝ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(یہ ہیں وہ حقائق جو تاریخی شہادتوں سے ثابت ہیں) تو کیا اس کے بعد بھی (یہ تمہارے مخاطب جو مختلف بستیوں میں رہتے ہیں) اس سے نڈر ہو چکے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے جب وہ سو رہے ہوں۔ (۹۷)

کیا یہ اس سے بالکل بے فکر ہو رہے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آئے جب وہ بے خبر کھیل کود میں مشغول ہوں۔ (۹۸)

کیا یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہیں خدا کی تدبیروں کی طرف سے امان مل چکی ہے؟ یاد رکھو! اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں وہی قوم رکھ سکتی ہے جس نے تباہ اور برباد ہونا ہو۔ (۹۹)

تباہ ہونے والی قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یا تو وہ قوت اور دولت کے نشہ میں اس قدر مدہوش ہوتی ہیں کہ انہیں (سونے والے کی طرح) اس کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان کے گرد و پیش ہو کیا رہا ہے، اور تباہیاں اور بربادیاں کس طرح ان کے سر پر منڈلا رہی ہیں۔ اور یا یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جاگ رہے ہوتے ہیں، لیکن (شطرنج کھیلنے

تباہی کب آتی ہے

والوں کی طرح) اپنے جذبات کی دنیا میں اس قدر جذب ہوتے ہیں کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ (۱۷۹/۷) "ان کی آنکھیں تو ہوتی ہیں، لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ ان کے دل و دماغ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے"۔ وہ اس مدہوشی کے عالم میں قانونِ مکافات کی طرف سے بالکل بے فکر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا خیال تک

نہیں آتا کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

۷/۱۰۰ اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ○

یہ لوگ جو پہلی قوموں کی تباہی کے بعد، اُن کے ملک اور دولت کے وارث ہوئے ہیں، کیا ان پر یہ بات اب بھی واضح نہیں ہوئی کہ ہمارا قانون اِن کے جرائم کی بنا پر، اُنہیں مصیبتوں میں مُبتلا کرسکتا ہے؟

لیکن یہ جو، اِس قدر واضح دلائل وشہادات کے باوجود، ان باتوں پر کان نہیں دھرتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ، اسلاف کی اندھی تقلید، اور مفاد پرستیوں کے جذبات، نے اِن کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کردیا ہے۔

انڈکس میں قانونِ استبدال واستخلافِ قومی کا عُنوان دیکھئے۔ اِس میں قرآن نے کہا ہے کہ جب ایک قوم اپنی صلاحیت کھودیتی ہے تو اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ اِس قوم سے کہدیا جاتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے تمہیں سابقہ قوم کا جانشین بنایا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

اگر تم نے بھی اُسی قوم کی روش اختیار کی جس کے تم جانشین بنے ہو، تو تمہارا انجام بھی اُنہی جیسا ہو جائے گا۔ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی۔ یہاں تو اصول ہی یہ ہے کہ زندہ وہی قوم رہتی ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور مرنے والی قوم کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے۔

۷/۱۰۱ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ ○

بہر حال یہ ہیں وہ چند اقوامِ سابقہ جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کئے ہیں۔ ان کے رسول، ان کی طرف واضح دلائل واحکام لے کر آتے۔ وہ لوگ بجائے اس کے کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر غور وفکر کرتے، بلا سوچے سمجھے اُسے جھٹلا دیتے ——— کبھی اِس بنا پر کہ اس سے پہلے اُن کے آباواجداد، اُسے جھٹلا چکے تھے۔ اور کبھی یوں کہ ایک دفعہ، جو بات یونہی منہ سے نکل گئی، اس پر جم کر بیٹھ گئے ——— حقیقت سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر یوں مہریں لگا کرتی ہیں۔ اسلاف کی اندھی تقلید، اور اپنی بات کی پچ، انسان سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیا کرتی ہے۔

ضد اور تعصّب تباہ ہونے والی قوم کی ایک ذہنیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جس بات سے وہ ایک دفعہ انکار کر دیں، آپ لاکھ سمجھائیے، وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے (اس کی وضاحت آیات (۶/۱۱۰-۱۱۲) میں کی جا چکی ہے)۔ اس قسم کی ذہنیت، قوت اور استبداد کا نشہ پیدا کر دیتا ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ؀ (۲۷/۱۴)

ظلم اور تکبّر نے اُن کی ذہنیت ایسی کر دی تھی کہ وہ صداقت سے بدستور انکار کرتے چلے گئے، حالانکہ انہیں دل میں یقین تھا کہ بات سچی ہے۔ یہ وہ فسادِ قلب و نگاہ تھا جس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

آپ آیت (۷/۲) کی تشریح دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقت اور صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے کس قدر کشادِ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعصّب اور تنگ نظری بدترین خصلت ہے۔ اسے دلوں پر مُہر لگ جانا کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی یہ خالی الذہن ہو کر سوچتے ہیں تو صداقت کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن پھر تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں تو اپنے سابقہ اقرار پر قائم نہیں رہتے۔

۷/۱۰۲ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ؀

اِن اقوامِ سابقہ میں سے اکثر کی یہی حالت رہی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے وفاشعار نہ رہے۔ انہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا، اس پر قائم نہ رہے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چلنے لگ گئے۔

چوتھا باب

سورۃ الاعراف۔ آیات ۱۰۴ تا ۱۲۶

صاحبِ ضربِ کلیمؑ

۱ ——— تجلّی گاہِ طور

۲ ——— عقل کے تجرباتی طریق اور وحی میں فرق۔

۳ ——— عصا و ید بیضا۔

۴ ——— تسبیح اور ذکر کا انقلابی مفہوم۔

۵ ——— نبوّت سے پیشتر کے مراحل۔

——— خدا نبی کو "اپنے ایک کام" کے لئے تیار کرتا ہے۔

۶ ——— خدا کی معیت کا مفہوم۔

ہرمزان اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ

۷ ——— دربارِ فرعون میں۔

اسلاف کے متعلق نظریہ۔

۸ ——— ذبحِ ابنا اور پارٹی بازی ——— حکمتِ فرعونی

۹ ——— مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مناظرہ۔ ساحرین کا مفہوم

۱۰ ——— محکوم کی کوئی بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔

۱۱ ——— فرعون کا ادعا ——— انا ربکم الاعلیٰ۔

۱۲ ——— ساحرین کا ایمان

——— استبداد کی شعلہ فشانیاں۔

ایمان کی قوت۔

چوتھا باب

کشمکش فرعون وصاحب ضرب کلیمؑ

سابقہ باب میں اقوام (حضرت) نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب (علیہم السلام) کی داستانیں سامنے آ چکی ہیں۔ آئندہ آیات میں، حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش اور بنی اسرائیل کے کوائفِ حیات کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکار، سابقہ جلدوں میں بھی آچکے ہیں۔ آئندہ آیات میں سے جو آیات پہلے آچکی ہیں، اُن کا تو صرف حوالہ دیا جائیگا دیگر آیات کی تشریح کی جائے گی۔

حضرتِ موسیٰؑ کی داستانِ زندگی کے کچھ اشارات، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۷ (زیر آیت ۲/۴۹) دیئے جا چکے ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تفصیلی سلسلۂ کلام اس مقام سے شروع کیا جائے جہاں انہیں شرفِ نبوّت سے سرفراز کیا گیا تھا اور فرعون کے ساتھ تصادم کا حکم دیا گیا۔ جہاں تک خدا کے ساتھ ہم کلامی کا تعلق ہے، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۰ (زیر آیت ۲/۱۱۸) ذکر آچکا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے، مدین میں جہاں شادی کی تھی، تو ایک مُعینہ مدّت تک وہیں رہنے کا معاہدہ بھی کیا تھا۔ جب وہ مدّت ختم ہوگئی، تو آپؑ اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر وہاں سے چل نکلے۔ چرواہوں کی زندگی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اپنے ریوڑ کو لئے مختلف چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ آج اس جنگل میں۔ کل اُس نخلستان میں۔ ایک چھوٹا سا خیمہ۔ چند ضروریات کی چیزیں۔ سر پر اللہ کا آسمان۔ سامنے اس کی کھلی ہوئی زمین۔ صاف ہوا۔ مصفا پانی۔ اسی انداز میں، حضرت موسیٰؑ شبانی سے جہانبانی کے طریقے سیکھ رہے تھے کہ اب ایک اور منزل سامنے آئی۔

اندھیری رات، جاڑے کا موسم، جنگل کا سماں۔ اپنی بستی سے دور، کوہ طور کے دامن میں۔ شاید راستہ بھولے ہوئے دور، پہاڑ پر آگ دکھائی دی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ میں جاتا ہوں۔ وہاں سے آگ کا انگارہ بھی لاتا ہوں اور راستہ کا اتا پتا بھی۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ (۲۸/۲۹)

سو جب موسیٰ نے (مدین میں) اپنی مدت معینہ پوری کرلی اور اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر چلا۔ تو طور کی جانب آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہل خانہ سے کہا کہ ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تمہیں وہاں سے (راستے کی) کوئی خبر لادوں۔ یا آگ کا انگارہ۔ تاکہ تم تاپ سکو۔

تجلّی گاہِ طور یہ سورۂ قصص کی آیت ہے۔ لیکن سورۂ طٰہٰ میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے مذکور ہے اس لئے پہلے اس سورت کی متعلقہ آیات دیکھئے۔ فرمایا۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ م اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ (۲۰/۹-۱۰)

(اس حقیقت کبریٰ کو جاننے کے لئے کہ خدا کے ضابطۂ قوانین پر عمل پیرا ہونے سے اکسطرح ابتدائی دشوار گزار مراحل کے بعد، بالآخر کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوجاتی ہیں) تمہیں موسیٰؑ کی سرگزشت اپنے سامنے رکھنی چاہیئے۔

(اس داستان کا آغاز ہم اس مقام سے کرتے ہیں) جب اس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں۔ ممکن ہے میں وہاں سے تمہارے لئے ایک انگارا لے آؤں، یا کم از کم) الاؤ پر کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ہمیں (اس اندھیری رات میں) راستے کا پتہ نشان بتا سکے۔

(تنہا عقل انسانی، وحی کی مدد کے بغیر، اس طرح، قیاسات نشان راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے)۔

حضرت موسیٰؑ، آگ کے نشان پر نگاہ رکھے، اپنے دھیان میں چلے جارہے تھے کہ کسی پکارنے والے نے آپ کا نام لے کر پکارا۔

فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰى ۝ لا (۲۰/۱۱)

پھر جب وہ وہاں پہنچا، تو اس وقت پکارا گیا۔ اے موسیٰ!

اس سنسان جنگل میں، جہاں کوئی واقف معلوم نہیں ہوتا تھا، اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رہ گئے۔ کہ اتنے میں پکارنے والے نے خود ہی اس استعجاب کو رفع کر دیا۔ آواز آئی ۔

اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ (۲۰/۱۲)

میں تیرا نشوونما دینے والا ہوں۔ تو اب اُس مقام تک پہنچا ہے جہاں تیرے لئے عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق سے نتائج تک پہنچنے کی طول طویل مسافتیں لپیٹ دی گئی ہیں، اور اس کی جگہ وحی کا مقدس راستہ کھول دیا گیا ہے۔ جہاں حقائق از خود منکشف ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا تو اب اُس لمبے سفر کے سازوسامان کو الگ رکھ کر، اطمینان سے بیٹھ جا۔ وہ دور ختم ہو گیا۔ (۷۹/۱۶) نیز (۹۳/۷)۔

قارئین کو معلوم ہو گا کہ دنیا کی ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی، الفاظ کے حقیقی معانی (LITERAL MEANINGS) بھی ہوتے ہیں اور مجازی معانی بھی۔ قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا اسلوب بیان بھی عربی زبان ہی کا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید کے الفاظ کے حقیقی معانی بھی ہوتے ہیں اور مجازی معانی بھی۔ میں نے، قرآنی الفاظ کے حقیقی اور مجازی معانی سے متعلق، اپنی لغات القرآن کے بیشتر لفظ میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ واضح رہے کہ مجازی معانی لینے سے مراد یہ نہیں کہ جو معانی آپ کا جی چاہے لے لیں۔ بالکل نہیں۔ یہ معانی بھی ان الفاظ کے حقیقی معانی کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت لغات القرآن میں پیش کردہ معانی سے اچھی طرح سمجھ بھی آسکتی ہے۔ قرآن مجید کا مفہوم سمجھنے کا میرا انداز یہ ہے کہ جن الفاظ کے حقیقی معانی، اُس کے عمومی مفہوم میں فٹ نہ بیٹھتے ہوں ہیں وہاں ان کے مجازی معانی لیتا ہوں۔ ان سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ سابقہ جلدوں میں بیشتر مقامات پر آیات قرآنی کا مجازی مفہوم آپ کے سامنے آچکا ہے۔ بالخصوص جلد چہارم میں معجزات حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں (مطالب الفرقان۔ جلد چہارم۔ صـ ۱۱۱-۱۱۰)۔ داستان حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ آیت (۲۰/۱۲) کا حقیقی معانی کے اعتبار سے، ترجمہ یہ ہو گا — ”میں ہوں تیرا پروردگار پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔“

لیکن جب ہم وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو ایک بہت بڑی حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے ظاہر ہے کہ حقائق کائنات کے معلوم کرنے کا ذریعہ عقل ہے۔ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی ایک معاملہ کو لیتی ہے۔ اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرتی ہے۔ اس فیصلہ پر عمل کرتی ہے اور پھر تجربہ بتاتا ہے کہ وہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ غلط ہونے کی صورت میں وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے اور پھر اس پر تجربہ کر کے دیکھتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط ۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بہت لمبا بھی ہوتا ہے اور گوناگوں مشکلات کا حامل بھی۔ اس کے برعکس، وحی، انسان کو پہلے ہی دن

بنا دیتی ہے کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ اس لئے وحی کی راہ نمائی سے سفرِ زندگی کی طویل طویل راہیں سمٹ کر بہت مختصر ہو جاتی ہیں۔ طویٰ کے یہی معنی ہیں۔ لپٹی ہوئی۔ سمٹائی ہوئی۔ کہا یہ گیا کہ تو اب تجرباتی طریقوں سے نکل کر وحی کی سمٹی ہوئی مقدس وادی میں پہنچ گیا ہے اس لئے اب تو اس لمبے سفر کے ساز و سامان (نَعْلَيْكَ) کو الگ کر دے۔ وحی نے تیرے سفر کی منزلوں کو سمٹا دیا ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ○ (۲۰/۱۳)

میں نے تجھے، ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ سو جو بات تجھے، اس وحی کے ذریعہ بتائی جاتی ہے، اُسے دل کے کانوں سے سنو۔

وہ اولین وحی کیا تھی؟

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○ (۲۰/۱۴)

اس وحی کا اولین پیغام یہ ہے کہ اللہ میں ہی ہوں۔ میرے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار و اختیار نہیں۔ اس لئے تم صرف میری محکومیت اختیار کرو، اور میرے قانون اور نظام کو غالب کرنے کے لئے صلوٰۃ کا نظام قائم کرو۔

قیامِ حکومتِ خداوندی کی بنیاد یعنی قیامِ حکومتِ خداوندی کی وہی بنیادی تعلیم جو اس سے پیشتر تمام حضرات انبیائے کرامؑ کی زبانی ہم سنتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا جائز نہیں۔ عبودیت اسی کی اختیار کی جائے گی۔ اور اس عبودیت (یعنی اللہ کی محکومیت) کا نظام، الصّلوٰۃ سے قائم ہو گا۔ اس انقلابِ عظیم کی اولیں منزل، سرکش قوتوں کا استہلاک ہو گا کہ جب تک لَآ اِلٰهَ (ہر طاغوتی قوت سے انکار) کی تکمیل نہ ہو گی۔ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کی محکومیت) کا ظہور نہیں ہو گا۔ اس لئے:

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ○ (۲۰/۱۵)

(اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک) انقلابِ عظیم رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب، جو اس وقت ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اب نکھر کر سامنے آ جائے۔ یہ انقلاب اس لئے سامنے آئے گا تاکہ ہر شخص کو اُس کی محنت کا پورا پورا صلہ مل سکے (اور سلب و نہب کا موجودہ فرعونی، قارونی اور ہامانی معاشرہ جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی لے لیتا ہے، الٹ کر رکھ دیا جائے۔ یہ انقلاب نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے سے آئے گا)۔

وہ وقت اب قریب آنے والا ہے کہ سرکش قوتوں کے اعمال کے فطری نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں مستبد قوتوں کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی لے جاتا ہے

دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

لیکن اس انقلاب کے بعد، جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے ظہور میں آئے گا، ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گا جس میں سلب ونہب کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ کوئی مستبد قوت کسی سے کچھ چھین نہیں سکے گی۔

اس کے بعد، ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جو آنے والے راستہ میں بڑی خطرناک گھاٹی تھی۔ ایک طرف بنی اسرائیل کے متعلق علم تھا کہ ان کی خوئے غلامی نے ان کے ایمان و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر رکھا ہے اس لئے وہ اس جانگسل کشاکش حق و باطل میں قدم قدم پر ہمت ہار بیٹھیں گے۔ اس لئے یہ واضح کر دیا کہ ان کی بزدلی اور دوں ہمتی۔ عدم استقلال و فقدان استقامت ضعف ایمان اور کمزوری عمل حضرت موسیٰؑ کے راستہ میں سنگ گراں بن کر حائل نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف، قوم فرعون تھی جو اس انقلاب کی سب سے بڑی مزاحم بننے والی تھی۔ اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی۔ ان کی طرف سے شدید ترین مخالفت کا یقین تھا۔ لہذا یہ بھی بتا دیا کہ انکی اس مخالفت سے یہ خیال کبھی دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ چلئے ان سے مفاہمت کر کے بین بین کا راستہ اختیار کر لیا جائے حق اور باطل میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کی طرف اس ایک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝ (۲۰/۱۶)

اس کے لئے ایک بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو۔ جو لوگ اس آنے والے انقلاب کے واقع ہونے پر یقین نہ رکھیں اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہیں (انہیں اپنے ساتھ نہ رکھنا، ورنہ) وہ تمہارے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جائیں گے، اور اپنے ساتھ، تیری تباہی کا بھی موجب بن جائیں گے (یہ انقلاب انہی لوگوں کے ہاتھوں رونما ہو گا جو اس پر دل سے یقین رکھیں اور اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے خیال سے بالاتر ہو جائیں)

غور کیجئے کتنی اہم حقیقت ہے جسے اشاروں ہی اشاروں میں یوں بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں وہی قوم کامیاب و کامران ہو گی جو اپنی خواہشات و مقتضیات نفس اور امیال و عواطف قلب کو جذبۂ حصول مقصد کے تابع رکھے خواہ اس میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ جو اس انقلاب کے راستہ میں

سنگ گراں بن کر حائل ہوگا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآن کریم نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے (یہ ترجمہ آپ کو ہر مترجم قرآنِ کریم میں ملے گا) اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے کون سی حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی ترجمہ کیجیے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ○ (۲۰/۱۷)

اور "اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

عرض کیا۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ○ (۲۰/۱۸)

عرض کیا۔ میری لاٹھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

آواز آئی۔

قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ○ (۲۰/۱۹)

حکم ہوا" اے موسیٰ اسے ڈال دے"۔

انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔

فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ○ (۲۰/۲۰)

چنانچہ موسیٰ نے ڈال دیا۔ اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ○ (۲۰/۲۱)

حکم ہوا" اب اسے پکڑ لے اور مت ڈر۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کیے دیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ اٰيَةً أُخْرٰى ○ (۲۰/۲۲)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ پہلو میں رکھ، اور پھر نکال۔ بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا یہ تیرے لئے دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطور اعجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی نشانیوں کی تمہید ہیں۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۚ (۲۰/۲۳)

"یہ نشانیاں اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں"۔

دُوسرا مفہوم | یہ تو ہے ان آیات کا عمومی ترجمہ۔ لیکن اگر ہم ان الفاظ کے مجازی معانی لیں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے[1]۔

اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہو گا کہ جب حضرت موسیٰؑ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام و ہدایت دیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا کہ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (۲۰/۱۷) اے موسیٰ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاط نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے"؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا کہ بارالہا! یہ احکام کیا ہیں؟ هِيَ عَصَايَ (۲۰/۱۸) یہ تو میرے لئے سفر زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا۔ میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا۔ وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ۔ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطّل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۲۰/۱۸)۔ ان کے علاوہ دیگر معاملات زندگی بھی جو میرے سامنے آئیں گے ان میں ان سے بصیرت و راہ نمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى (۲۰/۱۹)

اس وفور شوق کے بعد جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام و ضوابط کے نتیجہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر غور کیا تو حضرت موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں، ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ (۲۰/۲۰) خدا نے کہا کہ موسیٰؑ اس خیال سے مت گھبراؤ۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو (قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ) ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ میں ان سے فلاں فلاں کام لوں گا) ہم انہیں ایسا ہی بنا دینگے۔ (سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى (۲۰/۲۱)۔ اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو۔ تو نہایت سکون و سکوت اور پوری دل جمعی سے اپنی دعوت کو روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان تمام مشکلات سے محفوظ و مصئون

---

[1] ان الفاظ کا مجازی مفہوم کس طرح لیا گیا ہے اس کی وضاحت آگے چل کر اس مقام پر کی جائے گی جہاں حضرت موسیٰؑ کے ساحرین دربار فرعون کے ساتھ مقابلہ کا منظر سامنے آئے گا۔

باہر نکل آئے گا۔ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ (۲۰/۲۲)۔ تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہوگی یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیانہ حیثیت سے نشان، اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے نشان۔ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ ۝ (۲۰/۲۳)۔ یہ احکام ہم تجھے اس لئے دیتے ہیں کہ تجھے دکھا دیں کہ انکے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ ہوگا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں[1]۔ ان احکام وضوابط اور ان کی اس طرح تبئین وتشریح کے بعد حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ

اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝ (۲۰/۲۴)

اب تم فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم واستبداد میں بہت ہی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہوگئی ہے۔

طَغَىٰ کے لفظ پر غور فرمائیے اور قرآنی بلاغت کے اعجاز پر وجد کیجئے۔ سرکشی ومعصیت کوشی کی تمام کیف بروہاں طغیانیوں کو کس طرح ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے!

جب حضرت موسیٰؑ نے سُنا کہ وہ مہم جس کے سر کرنے کے لئے انہیں مامور کیا جا رہا ہے کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہے تو اس کی توفیق کے لئے بھی اسی باب عالی کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي ۝ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ۝ (۲۰/۲۵-۳۵)

کہ اے میرے نشوونما دینے والے! (یہ مہم بڑی سخت ہے، اس کے لئے تو) میرے سینے میں وسعت اور کشاد عطا کر دے (کہ بڑی سی بڑی مشکل بھی مجھے پریشان نہ کر سکے۔ ۹۴/۱)۔

اور جو دشواریاں میری راہ میں آئیں، انہیں مجھ پر آسان کر دے۔

اور میری زبان میں ایسی طلاقت اور روانی پیدا کر دے (کہ میں تیرے پیغام کو بطریق احسن فریق مقابل تک

---

[1] واضح رہے کہ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ آپ ان آیات کا مجازی مفہوم ہی لیں۔ اگر آپ ان کے عمومی مفہوم سے مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں بہرحال ان کا وہی مفہوم لیتا ہوں جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

پہنچا سکوں)۔ اور میری بات اُن کی سمجھ میں آجائے (اور سیدھی اُن کے دل تک اُتر جائے)

(چونکہ یہ مہم بڑی سخت ہے اس لئے) میرے اہلِ خاندان میں سے، میرے بھائی، ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دے تاکہ وہ میرا بوجھ بٹائے۔ اُس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ اس عظیم مہم میں میرا شریکِ کار رہے گا۔

یوں ہم دونوں مل کر، تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں بہت زیادہ سرگرمِ عمل رہیں گے اور تیرے قانون اور نظام کو غالب بنانے کے لئے بیش از بیش قدم اٹھا سکیں گے۔

تُو ہم دونوں کے حالات سے باخبر ہے (اور جانتا ہے کہ ہم دونوں مل کر کس طرح اس مہم کو سر کریں گے)۔

زبان کی گرہ کشائی

سینہ کی فراخی (شرحِ صدر) وسعتِ ظرف اور دشواریٔ منزل کی آسانی کے ساتھ، زبان کی گرہ کشائی کی بھی دعا مانگی گئی ہے۔ اس لئے کہ ایک مدت تک مدین کے بیابانوں میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے زبان میں غالباً وہ طلاقت نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر حسنِ خطابت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کی تائید سورۂ قصص کی چونتیسویں (۳۴) آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (۲۸/۳۴)

(دوسری بات یہ ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک شہری آبادی سے دُور رہنے کی وجہ سے، میری زبان بھی ایسی صاف نہیں رہی کہ میں دربارِ فرعون کے لوگوں سے فصیح و بلیغ گفتگو کر سکوں) میرا بھائی، ہارونؑ، مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے۔

مذکورہ بالا آیات (۲۰/۳۳-۳۵) میں نُسَبِّحَكَ (تاکہ ہم تیری تسبیح کریں) اور نَذْكُرَكَ (ہم تیرا ذکر کریں) کے

تسبیح و ذکر کا مفہوم

ٹکڑوں پر بھی غور کیجئے۔ حضرت موسیٰؑ کے ذمہ فریضہ یہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ جائیں، فرعون اور اس کے طاغوتی لشکر کو شکست دیں۔ اور بنی اسرائیل کو غلامی و محکومی کی پستیوں سے نکال کر حکومت و سطوت کی بلندیوں پر لے جائیں اور ان کی حکومت کی بنیاد قوانینِ خداوندی پر رکھیں۔ اس عظیم الشان مہم کے لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے تائید و نصرت کی التجا کی۔ اور اپنے قوتِ بازو، حضرت ہارونؑ کو بھی اپنی معیت کے لئے مانگا۔ اور یہ اس لئے تاکہ وہ عظیم الشان مہم سر ہو سکے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں "تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی تسبیح اور ذکر سے صحیح مفہوم کیا ہے۔ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ و استیلاء (یعنی فساد) کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی

کاقیام وبقاء۔ یہ ہے تسبیح اور یہ ہے ذکر[1]۔ نہ کہ زاویوں اور خانقاہوں کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں، سر بزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا، اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا۔ وہ تسبیح و ذکر تھا مردانِ خود آگاہ وخدامست کا، اور یہ تسبیح و ذکر ہے ان کا جو کشمکش زندگی سے منہ موڑنے کا نام "معرفت" رکھ لیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ وخدامست

یہ مذہب مُلّا وجمادات و نباتات

☆

حضرت موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں اُس درگاہِ عاجز نواز سے ارشاد ہوا کہ

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسٰى ۝ (۲۰/۳۶)

ارشاد ہوا۔ اے موسیٰؑ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

اس لئے کہ جو کچھ مانگا گیا ہے وہ تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہے جس کے لئے تدبیرِ الٰہی کی مختلف کڑیاں اس سے پیشتر سامنے آچکی ہیں۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى ۝ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلٰى أُمِّكَ مَا يُوحٰى ۝ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي ۝ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَن يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنٰكَ إِلٰى أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ۝ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يٰمُوسٰى ۝ (۲۰/۳۷-۴۰)۔

(یہ سُن کر موسیٰؑ کا سرِ نیاز، اظہارِ تشکر کے لئے جُھک گیا، اور اُس نے کہا کہ بار الہا! یہ تیرا بہت بڑا احسان ہے

---

[1] مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔

جو مجھ پر کیا گیا ہے۔ اس پر بارگاہِ خداوندی سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰؑ! تم پر ہمارا یہ احسان کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔

جب ہم نے (تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی) تمہاری ماں کی طرف (اپنے ایک بندے کی معرفت) یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنے بچے کو صندوق میں ڈال دے، اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔ دریا کی لہریں اسے کنارے پر لگا دیں گی جہاں سے اسے وہ شخص لے جائے گا جو میرے احکام و قوانین کا بھی دشمن ہے اور خود اس بچے کا بھی دشمن۔

(اس طرح اے موسیٰؑ! تو فرعون کے محلات میں جا پہنچا، اور) ہم نے اپنی عنایت سے تجھے ایسا بنا دیا تھا کہ سب لوگ تجھ سے محبت کریں۔ یہ تمام انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم چاہتے تھے کہ تمہاری پرورش و تربیت ہماری زیرِ نگرانی (شاہی محلات میں) ہو (تا کہ تو ان رموزِ مملکت و سیاست سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کا تجھے آخر الامر مقابلہ کرنا تھا)۔

(تو جب وہاں پہنچ گیا تو فرعون کے گھر والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ تمہاری رضاعت (دودھ پلانے) کا بیا انتظام کیا جائے (اس وقت) تمہاری بہن وہاں سے گزری تو اس نے ان سے کہا کہ کیا میں تمہیں ایسی عورت کا پتہ بتاؤں جو اس کی پرورش کر سکے گی؟ (یہ عورت خود تمہاری والدہ تھی)۔ اس طرح ہم نے تجھے پھر تمہاری والدہ کی گود میں پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ (بیٹے کی جدائی کی وجہ سے) غمگین نہ ہو۔

(اس کے بعد تو بڑا ہوا تو) تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ لیکن ہم نے تجھے اس معاملہ کی پریشانی سے نجات دلائی۔ پھر تجھے (محلات سے نکال کر، سخت اور درشت زندگی کی) کٹھالیوں میں ڈالا (تاکہ تو کندن بنتا چلا جائے)۔

اس طرح تو کئی برس تک مدین میں چرواہا بن کر رہا۔

اس قدر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کہیں جا کر، تو ہمارے پیمانے پر پورا اترا۔

سب کچھ اندازے کے مطابق "علیٰ قدر" کے الفاظ پر غور فرمائیے یعنی جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ اتفاقاً نہیں ہو گیا وہ اللہ کے متعین فرمودہ پیمانوں اور اندازوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ ان منازل سے گزارنے کے بعد۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۚ (۲۰/۴۱)

اس طرح ہم نے، اے موسیٰؑ! تجھے اپنے ایک خاص کام کے لئے تیار کیا ہے۔ (یہ نہیں کہ تو بکریاں چراتے

چراتے، اتفاق سے آگ لینے کے لئے اِدھر آنکلا اور ہم نے تیرے سر پہ تاجِ نبوّت رکھ دیا!)
یعنی "تجھے اپنے لئے تیار کیا ہے"۔ دیکھئے! کتنے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نبی کو مقامِ نبوّت کے لئے وہبی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ عظمیٰ اس کے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی کہ نبوّت ہر کس و ناکس کو یونہی نہیں مل جاتی۔ جس سینہ کو مہبطِ وحی بنانا مقصود ہوتا ہے، اسے اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ قولِ بے خبراں ہے ـــ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ پیمبری ہر ایک کو یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ قدرت اسے پہلے دن سے پیمبری کے لئے تیار کر رہی ہوتی ہے اور جب وہ اس کو مقرر کردہ اندازے کے مطابق، اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ (ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى)

اس مقام پر ایک وضاحت نہایت ضروری ہے۔ نبی سے متعلق آیات کا ترجمہ فعل حال (PRESENT TENSE) میں اس لئے کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے بھی یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ (مثلاً) "جب وہ خدا کے مقرر کردہ اندازے کے متعلق اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے" (وغیرہ)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اب بھی ایسا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ نبوّت کا سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو نبوّت نہیں مل سکتی۔ لہذا، وحی اور نبوّت کے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ سب ماضی سے متعلق ہے۔ یعنی "ایسا ہوا کرتا تھا"۔ یہ نہیں کہ اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ وحی اور نبوّت کے متعلق جہاں بھی کچھ آئے، اس نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھئے۔

اس کے بعد پھر انہی آیات کی طرف آجایئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ "ہم نے تجھے اپنے ایک مقصد کے حصول کے لئے تیار کیا ہے"۔ حضرت موسیٰؑ کو جس مقصد کے حصول کے لئے مامور کیا گیا تھا وہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجۂ استبداد و استحصال سے چھڑا کر، انہیں ایسی آزادی کی فضا میں اذن بال کشائی دے جس میں محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔ اس مقصد کو خدا نے "اپنا ایک کام" قرار دیا ہے۔ آپ مطالب الفرقان۔ جلد چہارم۔ کے انڈکس میں "خدا" کا عنوان دیکھئے۔ اس کے تابع بتایا گیا ہے کہ خدا کس طرح اپنی ذمہ داریوں کو انسانوں کے ہاتھوں پوری کرایا کرتا ہے۔ نیز جلد اوّل (صفحہ ۱۸۴) جہاں بتایا گیا ہے کہ خدا انسانوں کے کاموں کو بھی کس طرح اپنی طرف منسوب کرتا ہے[1]۔ زیرِ نظر آیات میں، مقصد مظلوم بنی اسرائیل کی داد رسی ہے اور اسے خدا نے اپنا مقصد قرار دیا ہے اور

[1] اس سلسلہ میں میرا مقالہ بہ عنوان "تقدیر کی گرہیں" بھی دیکھئے جو طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کو اس مقصد کے حصول کے لئے مامور کیا ہے۔ ان مقامات سے، انسان اور خدا کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔
یہ کہنے کے بعد کہ ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے تیار کیا ہے، اس مقصد کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ (۲۰/۴۲)

سو اب تم اور تمہارا بھائی ـ دونوں، ہمارے قوانین کو لے کر، فرعون کی طرف جاؤ۔ اور دیکھنا میرے پروگرام کے مطابق عمل کرنے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا۔

یعنی اس مقصد کی تکمیل یوں ہوگی۔ یہاں پھر ذکر کا لفظ قابل غور ہے اور اس تشریح کی تائید کر رہا ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ٥ (۲۰/۴۳-۴۴)

(اس کے بعد موسیٰؑ اس مہم کے لئے روانہ ہو گیا، اور جب اس کا بھائی ہارونؑ بھی اس کے ساتھ آ ملا، تو انہی ہدایات کا پھر اعادہ ہوا اور) ان سے کہا گیا کہ تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و ستم میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی سرکشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

جب اس کی طرف جاؤ تو اس سے نرمی سے بات کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح نصیحت پکڑ لے، یا اپنی سرکشی کے عواقب سے ڈر جائے۔

دعوتِ انقلاب کے دو مقام

دعوتِ حق و صداقت کے سلسلہ کی پہلی کڑی پر غور فرمایئے یعنی فرعون کے پاس پہنچو تو پہلے نرمی سے سمجھانا۔ شاید اس کے دل پر اثر ہو جائے اور وہ صحیح بات کو سمجھ لے اور اپنے انجام و عواقب سے ڈر جائے۔ ایک داعیِ حق و صداقت کی پہلی آواز، نرمی اور نصیحت کی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے سرکش قوتوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اپنی معصیت کوشی میں اور زیادہ دلیر ہو گئی ہیں تو پھر ضربِ کلیمی کی باری آتی ہے جس کے لئے عصا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو زخم، مرہم سے مندمل نہ ہو اس کا علاج، نوکِ نشتر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے شکنجوں میں کسنا ہی پڑتا ہے۔ جو کچھ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے، وہ قیامت تک جماعتِ مومنین کے لئے شمعِ ہدایت ہے، انہیں بھی ایسے مقامات پر یہی انداز اختیار کرنا چاہیئے۔

مزید ہدایات

اِدھر حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم ملا اور اُدھر حضرت ہارونؑ[1] کو مصر میں اشارہ مل گیا کہ وہ جاکر اپنے بھائی سے ملیں۔ چنانچہ وہ ان سے راہ میں آکر مل گئے۔ اب واقعہ کی مزید کڑیاں اُس زمانہ سے متعلق ہیں جب یہ دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے تھے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ (۲۰/۴۵)

ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہمیں ڈر ہے کہ فرعون ہماری مخالفت میں پیش دستی نہ کرے یا سرکشی سے پیش نہ آئے۔

یہ خوف بیجا نہ تھا۔ اُدھر قہرمانی قوتوں کا ایک بپھرتا ہوا سیلاب، جیوش و عساکر، تلوار و سنان، تمرّد و فرعونیت کے ساز و سامان کی شکل میں موجزن۔ اور ادھر (یوں سمجھئے کہ) دو گدڑیئے! لیکن جو قوت اِن کے ساتھ تھی وہ فرعون اور اس کے جنود و عساکر کو کہاں میسّر تھی؟ فرمایا

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۝ (۲۰/۴۶)

خدا نے کہا کہ تم مت گھبراؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں سب کچھ سُنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں۔ اِسلئے وہ تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا۔

فرعون کے پاس بے دھڑک جاؤ۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (۲۰/۴۷)

تم اُس کے پاس بے دھڑک جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل پر اس قدر سختیاں نہ کرو، بلکہ انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ اگر تم اس راستے پر چلو گے جو خدا کا بنایا ہوا ہے، تو تمہارے لئے سلامتی ہو گی۔ سلامتی ہوتی ہی اُس کے لئے ہے جو خدا کے بنائے ہوئے راستے پر چلے۔

جو سیدھی راہ اختیار کرے اس پر امن و سلامتی کی بشارت ہے۔ لیکن جو اپنی ضد پر اڑ جائے تو

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ۝ (۲۰/۴۸)

---

[1] حضرت ہارونؑ بھی نبی تھے۔

لیکن اگر تم پیغام خداوندی کو جھٹلاؤ گے اور اس سے سرتابی اختیار کرو گے، تو پھر تباہی اور بربادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

اب تم خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو کہ تم کونسا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔

ان دونوں ٹکڑوں میں اسلام کی پوری خصوصیات سمٹ کر آگئی ہیں۔ جو سیدھی راہ اختیار کرے۔ وہ امن و سلامتی میں ہے اور یہی وہ جنت ارضی ہے جس کے لئے ابن آدم مارا مارا پھر رہا ہے اور اپنی ہر ناکام جستجو کے بعد تھک کر پکار اٹھتا ہے کہ

"تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

اسلام قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کو امن و سلامتی کی جنت عطا کرتا ہے ان کے برعکس جو سرکشی اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنا چاہے، اس کے لئے ہلاکت و بربادی کا رسوا کن عذاب ہے۔

آیت ($\frac{۲}{۴۶}$) میں کہا ہے کہ تم فرعون سے مت ڈرو۔ انی معکما "میں تمہارے ساتھ ہوں" سوال یہ ہے کہ خدا کی اس معیت کے معنی کیا ہیں۔ یوں تو اس نے تمام انسانوں سے کہا ہے کہ ھو معکم اینما کنتم ($\frac{۵۷}{۴}$) "تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے"۔ لیکن اس معیت میں اور اس میں جہاں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا گیا ہے کہ انی معکما، بنیادی فرق ہے۔ خدا کی اس معیت کے معنی کیا ہیں اس کے متعلق ہم سے نہیں۔ ایک ایسے مخالف کی زبان سے سنئے جس نے اس معیتِ خداوندی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ خلافتِ فاروقی میں، جب جماعتِ مومنین نے ایران کو فتح کیا ہے تو وہاں کا ایک نامور گورنر، ہرمزان، قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق فیصلہ تو بعد میں کیا جائے گا۔ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو جس نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس سے پہلے حالت یہ تھی کہ تم ایرانی ہم عربوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ ہمیں بڑی نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ دوستی تو ایک طرف، تم، ہم سے جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعثِ عار سمجھا کرتے تھے اور اگر کہیں مٹھ بھیڑ ہو جاتی تھی تو تم ایک ہی جھٹکے میں ان کے چھکے چھڑا دیا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا ہے کہ وہی عرب ہیں اور وہی ایرانی۔ لیکن صورت یہ ہے کہ عرب تمہیں ذلت آمیز شکست دیئے جا رہے ہیں اور تم پابہ زنجیر یہاں کھڑے ہو۔ یہ حیرت انگیز انقلاب کیسے رونما ہو گیا؟

ہرمزان نے کہا کہ عمرؓ! بات یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں ہم اور تم اکیلے ایک دوسرے سے نپٹتے تھے اس لئے ہم تم پہ غالب آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم (ایرانی) تو اکیلے ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ

تمہارا خدا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکیں!

یہی تھی خدا کی وہ معیت جس کا اس نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو یقین دلایا تھا۔ یعنی خدا کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدان میں نکل آنا اور اپنا ہر قدم اُس کے قوانین کی اطاعت میں اٹھانا۔ یہی ہے خدا اور بندے کا وہ تعلق جس کے متعلق فرمایا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) " اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا"۔ خدا کی معیت اور نصرت مشروط ہے اس سے کہ انسان خدا کے متعین کردہ مقصد کے حصول کے لئے میدان میں نکل آئے۔ جب وہ یہ کرے گا تو اسے خدا کی نصرت میسر آجائے گی! وہ نصرت کیا ہوگی؟ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔ تمہارے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔

مزید نکھرے ہوئے موتی

اس کے بعد اس داستانِ انقلاب کی اگلی کڑی آتی ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کے جن دیگر مقامات میں اتنا حصہ بیان ہوا ہے انہیں بھی سامنے رکھ لیا جائے تاکہ مفہوم بالکل واضح ہو جائے اور تمام جزئیات سامنے آجائیں۔ سورۂ قصص کی آیت ۲۹ پہلے لکھی جا چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح آگ لینے کے لئے پہاڑ کی طرف بڑھے۔ اس سے آگے ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۸/۳۰)

جب وہ وہاں پہنچا تو وادی کے دائیں کنارے، اُسے بابرکت زمین کے ایک درخت کی طرف سے آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آرہی ہے جو تمام اقوام عالم کا نشوونما دینے والا ہے (۲۷/۸-۷) {اس آواز کو وحی کہا ہے (۲۰/۱۳-۱۳)}

سورۂ طٰہٰ میں اسے " وَادِي الْمُقَدَّسِ طُوًى (۲۰/۱۲)۔ کہا گیا تھا۔ یہاں مزید وضاحت فرما دی کہ ندائے جمال وادی کے دائیں جانب، جھاڑی کے پاس سے آئی تھی۔ اس کے بعد ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝ (۲۸/۳۱)

پھر موسیٰؑ کو مختلف احکام و ہدایات دے کر کہا کہ) ان احکام کو، جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا اور وجۂ جامعیت

ہیں، فرعون کے سامنے پیش کرو۔ موسیٰؑ نے جب پیشِ نظر مہم اوران احکام و ہدایات پر غور کیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک مہم نہیں، جیتا جاگتا سانپ ہے جسے پکڑنے کا اسے حکم دیا جارہا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے خیال میں اس مہم سے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوا۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ اس مہم کو نہایت اطمینان سے سنبھال لو۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔ (۷/۱۰۷-۱۰۸)؛ (۲۰/۱۷-۲۴)؛ (۲۶/۳۲-۳۴)؛ (۲۷/۱۰-۱۲)۔

سورۂ طٰہٰ میں اسے حیۃ (سانپ) کہا گیا ہے۔ یہاں کَاَنَّھَا جَانٌّ کہہ کر وضاحت فرمادی کہ وہ "گویا سانپ" تھا۔ یہ ترجمہ مجازی نہیں۔ لیکن اگر ان الفاظ کو بطور استعارات لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کو مختلف احکام دے کر کہا کہ ان احکام کو جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا ہیں جا کر فرعون کے سامنے پیش کرو۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اس مہم اور اس سے متعلقہ احکام پر غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ فرعون کے خلاف یہ مہم نہیں۔ ایک اژدہا ہے جسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اس خیال سے حضرت موسیٰؑ نے دل میں کچھ خوف سا محسوس کیا۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۲۸/۳۲)

پھر موسیٰؑ کو ایسے احکام دیئے جن میں حُسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کی خوش خبریاں تھیں۔ نیز اُن تمام احکام کی تائید میں روشن اور تابناک دلائل و براہین۔ اُس سے کہا کہ ان دلائل کو نہایت دلجمعی سے پیش کرنا۔ لوگوں کے لیے یہ بہت خوش آئند ہوں گی۔ اِن میں سے کوئی بات بھی اُن کے لئے ناگواری کا باعث نہیں ہوگی۔ اگر کہیں خوف کا مقام آئے تو وہاں پھڑپھڑانا نہیں، بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر، پوری جمعیتِ خاطر سے، مقابلہ کے لئے تیار رہنا اور اپنی جماعت کی تنظیم اچھی طرح سے کرنا (۸/۱۵)۔ یہ دونوں قسم کے احکام (مُنذرات و مُبشّرات) تیرے پروردگار کی طرف سے، فرعون اور اُس کے اہلِ دربار کے لئے، واضح دلائل ہیں۔ انہیں اُن کے سامنے پیش کرو۔ وہ لوگ بڑے ہی غلط راستے پر چل رہے ہیں۔

قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کو مبشّرین اور منذرین کہکر پکارا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا فریضہ فریقِ مخالف

کو تباہ کرنا نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں سمجھاتے تھے کہ تم نے (قوانینِ خداوندی کے خلاف) جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ لیکن اگر تم اپنی اس روش کو چھوڑ کر، قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کر لو تو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں اور کامرانیاں تمہارے حصے میں آجائیں گی۔ حضرت موسیٰؑ کو جو پروگرام دیا گیا اسے "بُرْهَانٰنِ" کہا گیا ہے۔ یعنی دو روشن دلیلیں۔ ایک دلیل ان کی غلط روش کے نتیجہ میں ان کی تباہی۔ یہ تنذیر تھی۔ دوسری دلیل ان کی صحیح روش کے نتیجہ میں، درخشندہ کامیابیاں۔ یہ تبشیر تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا سے مراد یہی تبشیر تھی اور عصا سے مراد تنذیر۔

جب حضرت موسیٰؑ کو اس خدشہ کی طرف سے محفوظیت کا اطمینان دلا دیا، تو انہوں نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝ وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ۟ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ۝ (۲۸ / ۳۳-۳۴)

موسیٰؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! میرے ہاتھوں ان کا ایک آدمی مر گیا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے گرفتار کر کے قتل کر دیں گے۔

(دوسری بات یہ ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک شہری آبادی سے دور رہنے کی وجہ سے، میری زبان بھی ایسی صاف نہیں رہی کہ میں دربارِ فرعون کے لوگوں سے فصیح و بلیغ گفتگو کر سکوں) میرا بھائی، ہارونؑ، مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے۔ اسے میری امداد کے لئے میرے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ جو کچھ میں کروں یا کہوں، وہ میری تائید و تصدیق کرتا جائے۔ مجھے ڈر ہے وہ لوگ ضرور میری تکذیب کریں گے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۝ (۲۸ / ۳۵)

اللہ نے کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے بھائی کو تمہارے ساتھ بھیج کر، اسے تمہارا دست و بازو بنا دوں گا اور تم دونوں کو ایسا غلبہ عطا کروں گا کہ ان لوگوں کا ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تم ان احکامات کو لے کر ان کی طرف جاؤ تو سہی۔ تم دونوں، اور جو لوگ تمہارا اتباع کریں گے، یقیناً اہلِ فرعون پر غالب رہیں گے۔

دیکھئے! کس وضاحت اور یقین سے کہا گیا کہ جاؤ! ہماری طرف سے قوت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور تم اور تمہارے

متبعین، اس سرکش و جابر قوم پر غالب آجائیں گے۔

سورۂ نمل میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○ (۲۷/۷)

(یہ جو کہا گیا ہے کہ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے، اس کے لئے فرعون اور موسیٰؑ کی کشمکش کو دیکھو۔ اس داستان کا آغاز اس واقعہ سے کرو جب، ایک تیرہ و تار شب میں، موسیٰؑ اور اس کے ساتھی ایک پہاڑ کے دامن میں تھے۔ رات کی تاریکی میں راستے کا پتہ نشان نہیں ملتا تھا، اور سردی بلا کی تھی)۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ مجھے (دُور، پہاڑ پر) آگ دکھائی دی ہے۔ تم یہیں ٹھیرو۔ میں جاتا ہوں، اور یا تو وہاں کسی سے راستے کے متعلق پتہ نشان لاتا ہوں، اور یا آگ کا انگارہ، کہ تم لوگ اسے تاپ سکو (اور اس طرح رات بسر ہو جائے (۲۸/۲۹))

جب حضرت موسیٰؑ آگ کے نشان کی طرف بڑھے تو آواز آئی۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۲۷/۸)

جب موسیٰؑ آگ کے قریب پہنچا تو اسے آواز سُنائی دی کہ یہ مقام جس میں آگ نظر آرہی ہے (یعنی طور کی چوٹی) اور اس کا اردگرد (ارض فلسطین) بڑی مبارک سرزمین ہے (جہاں اس قدر انبیاء پیدا ہونے والے ہیں اور جو بنی اسرائیل کے لئے انقلابِ عظیم کی آماجگاہ بننے والی ہے (۷/۱۳۷ و ۲۸/۳۰))۔

(لیکن تم اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ تمام برکات و سعادات اسی خطۂ زمین تک محدود ہیں، باقی دنیا اس سے محروم ہے۔ نہیں، ایسا نہیں)۔ وہ خدا جو تمام نوعِ انسان کو نشو و نما دینے کا ذمہ دار ہے، وہ اس سے بہت بلند ہے (کہ وہ صرف کسی ایک خطۂ زمین کو اپنے سحابِ کرم کے لئے مخصوص کرے اور باقی دنیا اس کی گوہر پاشیوں سے محروم رہے۔ اس کی طرف سے عطا شدہ سامانِ نشو و نما ——— خواہ اس کا تعلق طبیعی ضروریات سے ہو یا انسانی ذات سے ——— تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نے سامانِ رزق بھی ہر قوم کو دیا ہے اور وحی کی رہنمائی بھی)

مقصود یہ بتانا تھا کہ یہ مقام (طور) اور اس کے ارد گرد کا علاقہ (ارضِ فلسطین) بڑی بابرکت زمین ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں مختلف انبیاء کرامؑ کی وساطت سے پیغاماتِ خداوندی کا عام چرچا ہوا تھا اور اب بھی یہ علاقہ (کچھ عرصہ بعد) نظامِ خداوندی کی آماجگاہ بننے والا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ برکات و سعادت اسی خطّہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خدا تو رب العالمین ہے۔ اس لئے اس کی رحمتیں تمام ارض پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اس تصوّر سے بہت بلند ہے کہ اس کی ربوبیت کو کسی خاص علاقہ یا خاص نسل میں محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ (۲۷/۹)

(موسیٰؑ حیران تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس پر) ندائے جمال نے کہا کہ اے موسیٰؑ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آئی ہے، جو بڑی قوتوں کا مالک اور عمدہ ترین تدابیر کا حامل ہے۔ (اس کی قوّت و حکمت کا مظاہرہ اس کشمکش میں ہوگا جو تیرے سامنے آنے والی ہے)۔

"عَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" کی صفتِ خداوندی پر غور فرمائیے۔ غالب اور حکمت والا۔ جس عظیم الشان مہم کو سر کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا جا رہا تھا اس کے لئے ایسے ہی غالب و حکیم خدا کی تائید و نصرت کی ضرورت تھی۔ غلبہ کے ساتھ حکمت (RATIONALITY) نہ ہو تو وہ دھاندلی ہوتی ہے، اور اگر حکمت کے ساتھ غلبہ نہ ہو تو وہ نرا وعظ۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ۖ (۲۷/۱۰)

(پھر موسیٰؑ کو، اس مہم کے سلسلہ میں، مختلف احکام دے کر کہا کہ) ان احکام کو، جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا اور وجۂ جامعیت ہیں (فرعون کے سامنے جا کر) پیش کرو۔ موسیٰؑ نے جب اس مہم، اور اسے سر کرنے کے پروگرام پر غور کیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا ہے جس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے خیال میں اس سے پیچھے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوا۔ (۷/۱۰۸؛ ۲۰/۱۷-۲۲ و ۲۶/۳۲-۳۳)۔

آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ جب ہم اپنے پیغمبروں کے ساتھ ہیں، تو پھر ان کے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی (۲۶/۱۵)۔ (یہاں لفظ مرسلون نے بات واضح کر دی کہ سانپ سے ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ رسالت کی بے پناہ ذمہ داریوں کے احساس کا خوف تھا)۔

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوٓءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۲۷/۱۱)

نہ ہی اُسے ڈرنے کی ضرورت ہے جس سے کبھی دانستہ زیادتی ہو گئی ہو، لیکن اُس نے اس سے توبہ کر کے زندگی کی حسین اور ہموار راہ اختیار کر لی ہو۔ اس لئے کہ ہمارے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش ہے کہ ایسے شخص کو، اس کی سابقہ لغزشوں کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رکھا جائے، اور اُس کی نشوونما برابر ہوتی رہے۔ (لہذا، اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہو کہ تم نے غلطی سے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، اور اس طرح تم سے ایک جرم سرزد ہو گیا تھا، اس لئے اب اس عظیم مہم کو کسطرح سرانجام دیا جا سکے گا، تو اس خیال کو بھی دل سے نکال دو۔)

پھر فرمایا۔

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ فِي تِسْعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِۦٓ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ قَوْمًا فَٰسِقِينَ ۝ (۲۷/۱۲)

پھر موسیٰ کو، ان احکام کی تائید میں، براہین نیرہ عطا کیں جن میں ارباب عقل و بصیرت کے لئے روشنی اور بینائی کا سامان تھا۔ وہ اگر ان پر غور و فکر کریں گے تو انہیں نظر آجائے گا کہ احکام خداوندی کے اتباع میں کسی خرابی کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ وہ تو سرتاپا خیر ہوتے ہیں (۲۸/۳۲) ۔ یہ دلائل ان نو (۹) آیات (۷/۱۳۳ ؛ ۷/۱۳۰ ؛ ۱۷/۱۰۱) سے متعلق تھے جنہیں لے کر موسیٰؑ، فرعون اور اس کی قوم کی طرف گیا تھا ـــــ وہ قوم جو زندگی کے صحیح راستے کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چل نکلی تھی۔

ان تسع ایات (نو نشانیوں یا احکام) کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مذکورہ صدر مقامات میں تفصیل دی گئی ہے لیکن سورۃ نازعات میں ان تفاصیل کو اجمال میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

فرمایا۔

هَلْ أَتَىٰكَ حَدِيثُ مُوسَىٰٓ ۝ إِذْ نَادَىٰهُ رَبُّهُۥ بِٱلْوَادِ ٱلْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ ٱذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ ۝ (۷۹/۱۵-۱۷)

(یہ انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں ہوگا۔ یہ سلسلہ تو شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مستبد قوتیں، کمزوروں کو دباتی رہی ہیں، اور انبیاء کرامؑ اُن کے رفقاء کی جماعتیں ان کمزوروں اور ناتوانوں کو ابھار کر اُوپر لاتی رہی ہیں۔ (مثلاً) موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کو لو۔ اور اس داستان کا آغاز وہاں سے کرو جب موسیٰؑ، اس مقام

ہیں پہنچ چکا تھا جہاں عقل کے تجرباتی طریق کی لمبی مسافتوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا، اور اس پر وحی کے ذریعے براہِ راست انکشافِ حقائق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ (۲۰ / ۱۲)۔ یعنی جب موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا، اُس وقت، اُس کے نشوونما دینے والے نے اُسے پکارا، اور کہا کہ)

تم فرعون کی طرف جاؤ۔ اُس نے دھاندلی مچا رکھی ہے۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ اُس نے کمزوروں کو بُری طرح دبا رکھا ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰٓ أَنِ ٱئْتِ ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۚ أَلَا يَتَّقُونَ ۝

(۲۶ / ۱۰ - ۱۱)

(اس حقیقت کی شاہد، داستانِ بنی اسرائیل ہے، جسے اس جگہ مختصراً دہرایا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء اس مقام سے کی جاتی ہے) جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی اور اُس سے کہا کہ تم اس قوم (فرعون) کی طرف جاؤ جس نے بڑی سرکشی اختیار کی ہے۔

ان کی طرف جاؤ اور اُن سے پوچھو کہ کیا وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے بچنا چاہتے ہیں یا نہیں؟

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّىٓ أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ ۝ وَيَضِيقُ صَدْرِى وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِى فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَـٰرُونَ ۝ (۲۶ / ۱۲ - ۱۳)

موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے ڈر ہے کہ وہ (میری بات نہیں مانیں گے بلکہ اُلٹا) مجھے جھٹلائیں گے۔

(ہو سکتا ہے کہ ان کی مخالفت اس قدر شدت اختیار کرلے کہ اس کا مقابلہ کرنا تنہا میرے بس کی بات نہ رہے) میرا دم گھٹنے لگ جائے اور میں ان سے کھل کر بات بھی نہ کر سکوں۔ اس لئے تو ایسا کر کہ ہارون کی طرف بھی پیغام بھیج دے (کہ وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہے)

سورۂ طٰہٰ کے الفاظ میں، حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (۲۰ / ۲۵) "اے اللہ! میرا سینہ کھول دے"۔ یہاں اس اہم ذمہ داری کے بوجھ کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے شرح صدر کی آرزو، دعا بن کر لب پر آ گئی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے سورۂ طٰہٰ میں عرض کیا تھا کہ "میری زبان کی گرہ کشائی فرما دیجئے تاکہ وہ

میری بات سمجھ لیں" (۲۰/۲۷-۲۸)۔ یہاں اپنے عجز بیان کے متعلق کہا کہ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ اس لئے حضرت ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (۲۸/۳۴)۔ (وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے)

اس کے بعد عرض کیا کہ ایک بات اور بھی ہے۔

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۚ (۲۶/۱۴)

(دوسری بات یہ بھی ہے کہ)، وہ لوگ میرے خلاف قتل کا الزام دھرتے ہیں، اس لئے مجھے خدشہ ہے کہ وہ مجھے گرفتار کر کے قتل نہ کر دیں

دیکھئے! حضرت موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ قتل عمد کے مرتکب نہیں تھے۔ بلکہ وہ حادثہ محض اتفاقی تھا۔ لیکن (جیسا کہ پہلے آچکا ہے) حکومتِ فرعونی کے ارباب بست وکشاد، آپ پر قتل عمد کا الزام دھر کر آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ (ملاحظہ ہو آیات (۲۸/۱۵-۲۱) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دونوں بھائی جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ (۲۶/۱۵)

خدا نے کہا کہ (مت ڈرو) اُن کی مجال نہیں کہ وہ ایسا کریں۔ (لیکن یہ ٹھیک ہے کہ مہم کی سختی کے پیش نظر، ہارونؑ کو بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیئے) پھر تم دونوں، ہمارے قوانین کو لے کر اُن کی طرف جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم ایک ایک بات کو سنتے (دیکھتے) رہیں گے۔ (۲۰/۴۶)۔

یہ تھے وہ واقعات جو سرِ طور لہرانے والی برقِ تجلی کے دامن میں، آگ کی تلاش میں نکلے ہوئے (حضرت) موسیٰؑ کو پیش آئے۔

طور سے واپسی

اہلِ خانہ انتظار میں ہونگے کہ آپ آگ لے کر آئیں! انہیں کیا معلوم کہ وہاں سے کون سی زندہ حرارت مل گئی ہے جو افراد کے خون میں ہی نہیں بلکہ قوم کی رگِ جان میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جائے گی۔ حضرت موسیٰؑ اس مقصدِ عظیم کو دل میں لئے، جس کے لئے آپ کو مامور کیا گیا تھا، مصر کی جانب روانہ ہو گئے۔ غور کیجئے! یہاں سے بھاگے تھے تو کس حالت میں۔ اور اب لوٹے ہیں تو کس انداز سے! اُس وقت فرعون اور اسکے ارباب حکومت کی سازش سے بچ کر نکلے تھے اور اب مراجعت ہوئی ہے تو یاں نمط کہ انقلابات کی ایک دنیا جلو میں ہے

دربار فرعون میں

اور سینے میں سوائے ایک اللہ کے کسی کا خوف مضمر نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی آمد

اوران کے ارادوں کی اطلاع، بنی اسرائیل اور فرعونی حکومت کو مل چکی ہوگی۔ بہر حال آپ فرعون کے پاس پہنچے اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

۷/۱۰۴ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۷/۱۰۴)

موسیٰؑ نے فرعون سے کہا کہ (تم نے انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ ایک گروہ کو پامال کرتے ہو، دوسرے کو سر پر چڑھاتے ہو۔ اس سے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں ۲۸/۴) میں اس خدا کی طرف سے پیامبر ہوں جو تمام نوعِ انسان کا نشو و نما دینے والا ہے۔ (اس کے نزدیک انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں، یہی انداز معاشرہ کا ہونا چاہیئے۔)

"میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ مطالبہ میرا فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کر۔ خدا کے فرستادہ کے حوالہ کر دے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر، خدا کی محکومیت میں لائے اور اس طرح انہیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائے۔"

۷/۱۰۵ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝

مجھ پر لازم ہے کہ میں خدا کے متعلق، حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس نشو و نما دینے والے کی طرف سے، کھلے کھلے دلائل اور قوانینِ حیات لایا ہوں۔ (ان قوانین کی رو سے، کسی قوم کو اپنی غلامی اور محکومی میں رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں)۔ لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ (تاکہ یہ آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں)۔ یہ خدا کے بندے ہیں، تمہارے نہیں، اس لئے انہیں میرے سپرد کرو تاکہ میں انہیں انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر، قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤں۔ اسی کا نام آزادی ہے۔ (۴۲/۱۸)

اس مقام کے علاوہ حسبِ ذیل آیات میں بھی اس بات کو دُہرایا گیا ہے۔

(۱۰/۷۵ ؛ ۱۱/۹۶-۹۷ ؛ ۲۳/۴۵-۴۶ ؛ ۲۵/۳۵-۳۶ ؛ ۲۶/۱۶-۱۷ ؛ ۴۰/۲۳-۲۴ ؛
۴۳/۴۶ ؛ ۴۴/۱۷-۲۷ ؛ ۵۱/۳۸)

حضرت موسیٰؑ نے سب سے پہلے یہی کہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مصری بُت پرست تھے اور ان کے بادشاہ شانِ الوہیت کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ بُت پرستی کا مسلک یہ ہے کہ

مختلف صفاتِ معبودیت کے لئے مختلف دیوتا تصوّر کر لئے جاتے ہیں اور پھر ہر دیوتا کا مجسّمہ تراش کر، ان سے وہی کچھ مانگا جاتا ہے جس کا اسے دیوتا قرار دیا جاتا ہے۔ بارش برسانے والا دیوتا۔ ہوائیں چلانے والا دیوتا۔ اولاد

فرعون کا استفسار

دینے والا دیوتا۔ وقس علیٰ ہذا۔ پھر ہر قبیلہ اور ہر قریہ کا جدا جدا دیوتا اور الگ الگ "خدا" ہوتا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں اپنے (یا تمہارے) رب کی طرف سے پیغامبر ہوں تو فرعون نے سب سے پہلے ہی سوال کیا کہ

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ (۴۹/۲۰)

"اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟"

کون سے رب کی طرف سے؟ کون سے خدا کی جانب سے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے چار لفظ کہے ہیں اور غور کیجئے تو کس طرح بساطِ کائنات کے چاروں گوشے ان کے اندر سمٹ کر آ گئے ہیں وحی کا انداز ہی یہ ہوتا ہے۔ فرمایا:-

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (۵۰/۲۰)

موسیٰؑ نے کہا کہ ہمارا رب، کسی خاص گروہ یا قوم کا رب نہیں۔ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے (جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ رہنمائی وحی کے ذریعہ آتی ہے، جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں)۔

حضرت موسیٰؑ کا جواب

وہ رب جس نے ہر شے کو خلقت عطا فرمائی۔ غور کیجئے۔ ہر شے کا پیدا کرنے والا۔ یہ نہیں کہ صرف بارش برسانے والا۔ اولاد عطا فرمانے والا۔ بلکہ اس وسیع و عریض کائنات میں جس شے کا بھی تصوّر کر سکو اس کا خالق اور صرف خالق ہی نہیں بلکہ پیدا کرنے کے بعد ہر شے کو جس منتہیٰ تک پہنچنا ہے، وہاں تک کی راہ نمائی کرنے والا۔ سلسلۂ ارتقاء کی اوّلین اور آخری کڑیوں کا مالک کہئے! ایسے خدا کی موجودگی میں کسی شے کو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں کسی اور "خدا" کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جو کہا تھا کہ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۰۴/۷) اور اس کے جواب میں ——— فرعون نے پوچھا تھا کہ وہ "رب" کونسا ہے تو اس میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ فرعون کا دعویٰ تھا [اور دنیا کے ہر "فرعون" کا یہی دعویٰ ہوتا ہے] کہ (اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۲۴/۷۹)) لوگوں کو میں سامانِ زندگی عطا کرتا ہوں اس لئے میں ہی ان کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے جو کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں تو اس سے

فرعون کے اس دعوائے ربوبیت کی بھی تردید کردی۔ اس لئے فرعون نے دُہرا کر پوچھا کہ وہ کون سا رب ہے جس کی طرف سے تم آئے ہو۔ اس سرزمین میں "رب" تو میں ہی ہوں۔

بہرحال فرعون نے سوچا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو اس الجھاؤ میں الجھالے گا۔ لیکن جواب ایسا مسکت اور جامع ملا کہ سٹی بھول گیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ سے کترا کر دوسری طرف نکل جائے۔ کہنے لگا اچھا! یہ بتاؤ کہ جو لوگ پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ان میں سے کون راہ راست پر تھا اور کون گمراہ۔ خدا کے ہاں اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟ کس کی نجات ہوئی اور کون عذاب میں مبتلا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۝ (۲۰/۵۱)

(جب فرعون نے دیکھا کہ اس سوال کے جواب میں موسیٰؑ پر گرفت کی گنجائش نہیں نکل سکتی تو اس نے بحث کا رُخ بدلا اور خاص "حکمتِ فرعونی" سے کام لینا چاہا۔ اس کے گرد و پیش، امراء و وزرا بیٹھے تھے۔ وہ اور اُن کے آباء و اجداد مشرک تھے، اور موسیٰؑ کے معیار کے مطابق، جہنم کے سزاوار۔ اس لئے) اُس نے موسیٰؑ سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ جو لوگ پچھلے زمانے میں گزر چکے ہیں (یعنی ہمارے اسلاف) اُن کا کیا حشر ہوگا۔ (کیونکہ وہ تو تمہارے خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے)۔

یہ سوال ایسا تھا کہ اس کے جواب سے فرقہ وادی اور گروہ سازی کی ہزار افتراق انگیز راہیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے فرعونی سیاست کی دسیسہ کاری کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ اس قوم کے اسلاف میں سے کسی کے متعلق بھی یہ کہیں گے کہ وہ گمراہ تھے تو فرعون اپنے اہلِ دربار اور عوام سے کہے گا کہ دیکھو! یہ شخص تمہارے واجب الاحترام بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح اُن کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں حضرت موسیٰؑ کا مخالف بنا دیا جائے گا۔ اور یوں وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے وہ آئے ہیں نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے گا

ایک اور بصیرت افروز جواب

لیکن (جیسا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے مخالف بادشاہ کے مکالمہ میں دیکھ چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم ص۵۶) حضرات انبیائے کرامؑ کا مسلک، مجادلانہ نہیں ہوتا، اعیانہ ہوتا ہے، وہ بحث و مناظرہ کے لفظی گورکھ دھندے سے بچ کر، اس انداز سے حقیقت کشائی کر دیتے ہیں جس سے پوچھنے والا ساکت بھی ہو جائے اور مطمئن بھی۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ (۲۰/۵۲)

(اُس نے یہ سوال اس نیت سے کیا تھا کہ جب اس کے جواب میں موسیٰؑ کہے گا کہ وہ سب جہنم میں جائیں گے تو اس کے اہلِ دربار مشتعل ہو جائیں گے اور یوں بنی اسرائیل کی آزادی کا مسئلہ مذہبی جذبات کے سیلاب میں بہ جائے گا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا سابقہ کس سے پڑا ہے) موسیٰؑ نے کہا کہ اس بات کا مجھے کچھ علم نہیں (کہ وہ لوگ کس حال میں ہیں) ۔ اس کا علم میرے پرورد گار کے نوشتے میں ہے (اس لئے اُن کے معاملہ کا فیصلہ، خدا کے نوشتے کے مطابق ہو جائے گا) ۔ وہ خدا ایسا نہیں کہ کھویا جائے، یا بھول میں پڑ جائے ۔ (اس لئے ان کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک اُن کے اعمال کے مطابق ہو جائے گا۔ تم اپنے پہلے سوال کا جواب سنو، کہ جس رب نے ہمیں تمہاری طرف بھیجا ہے، وہ رب کیسا ہے؟)

جواب کے ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے اور حقائق و معارف کی اس بصیرت افروز دنیا میں جذب ہو جائیے۔ فرمایا کہ اسلاف کا علم، نوشتۂ الٰہی میں ہے اور وہ نوشتہ ایسا ہے جس میں کسی قسم کی غلطی اور سہو کا امکان نہیں۔[1] اس لئے مجھے (یا تمہیں) اس بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ۔ ان لوگوں کا حال اُن کے رب کے علم میں ہے لیکن تمہارے لئے فقط اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر اور محیطِ کل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی اور غلطی کا امکان نہیں ۔ اس لئے تمہیں فکر اپنی اپنی کرنی چاہیئے ۔ ہماری نجات کے لئے ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں بزرگ بڑا ہے یا فلاں ۔ اور فلاں کی نجات ہوگی یا نہیں ۔ ان کے متعلق ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم عرض کریں کہ ۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ (۵۹/۱۰)

اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو ہمارے لئے بھی سامانِ حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لئے بھی، جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں ۔

ان کے اعمال کے متعلق ہم سے باز پرس نہ ہوگی ۔

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَہَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا

---

[1] یہ آیۂ جلیلہ حیات بعد الممات کے اہم گوشہ سے متعلق ایک بنیادی اصول بھی بیان کر رہی ہے ۔ لیکن چونکہ وہ نکتہ ایک مبسوط تشریح کا محتاج ہے اس کا بیان اس کے اپنے مقام پر آئے گا۔

یَعۡمَلُوۡنَ ۞ (۲/۱۴۱)

بہر حال، اگر اس کے باوجود، تم اصرار کرتے ہو کہ تمہارے اسلاف ایسے نہیں تھے، ایسے تھے، تو اس سے اصل بات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ جیسے بھی تھے، اُن کے اعمال اُن کے لئے تھے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کس روش پر چلتے تھے اور کیسے کام کرتے تھے۔ تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے ——— یہ ہے دین کی اصل جس میں کسی جھگڑے کی گنجائش نہیں۔

اُن کے اعمال ان کے ساتھ۔ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ۔ اس لئے اس فکر کی کیا ضرورت ہے کہ ان کا کیا حال ہے؟ فکر یہ کرو کہ ہمارا کیا حال ہوگا؟

آیۂ عبرت! حضرت موسیٰؑ کے اس جواب پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس سے فرعون کی چال کس طرح ناکام بنا کر رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ ہم تشتت و افتراق کے جس جہنم میں مبتلا ہیں کیا اس کی ایک بڑی وجہ یہی نہیں کہ بجائے اس کے کہ ہم اسلاف پرستی کے اس سوال کے جواب میں (جو فرعون نے کیا تھا) وہی طریق اختیار کریں جو زبانِ وحی سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ كِتٰبٍ۔ ایک ایک کے متعلق عدالت کی کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور (معاذ اللہ) خدائے احکم الحاکمین کا منصب بھی خود ہی اختیار کر لیتے ہیں؟ اس سے باہمی تکفیر و تفسیق کے دروازے کھل جاتے ہیں اور یوں، ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب کی ماننے والی اُمتِ واحدہ، سینکڑوں فرقوں میں بٹ کر عملی شرک کی نظیر بن جاتی ہے۔ اور، قیامت بالائے قیامت، کہ تحزب و تشیع اور فرقہ سازی اور گروہ بندی کی ان تمام مذموم کوششوں کا نام "خدمتِ اسلام" رکھا جاتا ہے! یا للعجب!!

بہر حال، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس سوال کا بھی ایسا مسکت جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات بن نہ پڑی چونکہ اس جواب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے قانون مکافاتِ عمل کی طرف اشارہ کیا تھا اس لئے اس کی مزید تفصیل میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا بھی اجمالی تذکرہ کر دیا جس سے قانونِ کائنات کی ہمہ گیری سے، قانونِ مکافات، پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یعنی مبداء سے معاد کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی) آپ نے فرمایا:-

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ○ع مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ○ (۲۰/۵۵-۵۳)

وہ ربّ، وہ ہے جس نے تم سب کے لئے اس وسیع و عریض زمین میں سامانِ پرورش جمع کر دیا، اور تمہاری نقل و حرکت کے لئے راستے بنا دیئے۔ وہ ربّ جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس کی آب پاشی سے انواع و اقسام کی نباتات پیدا کر دیتا ہے۔

تاکہ تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ اس تمام نظامِ فطرت میں، صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے اس حقیقتِ کبریٰ کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں، کہ کائنات میں پروردگاری صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔ (لہٰذا، کسی فرعون کا یہ کہنا کہ "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی"۔ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔ (۷۹/۲۴)۔ یہ زمین۔ یہ دریا۔ یہ ملک سب میری ملکیت ہیں (۴۳/۵۱)۔ اس لئے تم میرے محتاج اور محکوم ہو۔ بے بنیاد دعویٰ اور حماقت پر مبنی تصوّر ہے)۔

اُس پروردگارِ حقیقی نے تم سب کو اس زمین (بے جان مادہ) سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ (تمہارے بے جان مادی جسم کو) اسی میں لوٹا دیتا ہے، لیکن اس کے بعد، تمہیں حیات نو عطا کر کے اس سے اٹھا کھڑا کریگا جو پہلی کڑیوں سے مختلف ہو گی (اُخریٰ مونث ہے آخر کی)۔ لہٰذا، انسانوں میں آقا اور بندہ۔ حاکم اور محکوم کی تفریق کیسی؟ آقا اور حاکم صرف خدا ہے۔ سب انسان آپس میں برابر اور اُس کے محکوم ہیں)۔ (کیا اب تم سمجھ گئے ہو کہ وہ خدا کون سا ہے جس کا پیغام لے کر ہم تمہاری طرف آئے ہیں؟)

سورۂ شعراء میں بھی اس مکالمہ کا ذکر ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (۲۶/۲۳)۔ (فرعون نے پوچھا کہ رب العلمین کون ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ○ (۲۶/۲۴)۔ (موسیٰؑ نے کہا کہ وہ پستیوں اور بلندیوں کا اور ان سب کا جو ان کے درمیان ہیں، ربّ ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو تو)۔ ظاہر ہے کہ اس الٰہ حقیقی کا عقیدہ، نہ صرف قوم فرعون کی اصنام پرستی ہی کو جڑ سے اکھیڑ دیتا تھا بلکہ خود فرعون کے دعوائے ربوبیت کو بھی خاک میں ملا دیتا تھا۔ اس لئے کہ فرعون کا دعویٰ

فرعون کا دعوائے ربوبیت

یہ تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (۷۹/۲۴) "میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں" اور حقیقت یہ کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایک فرعون موسیٰؑ ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا میں ہر مستبد قوت، اپنے دبدبہ و اقتدار کو انہی راہوں سے قائم کرتی ہے۔ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے اور پھر بھوکے انسانوں سے، جو جی میں آئے منوا اور کرا لیتی ہے۔ ورنہ انسان اگر اپنی روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو تو کسی کے سامنے جھکے کیوں؟ فرعون کے دعوائے ربوبیت کی بھی یہی بنیاد تھی۔ اس لئے جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میرا خدا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شے کا پروردگار۔ اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں تفصیل سے بتا دیا کہ خدا کس طرح مخلوق کے لئے سامانِ رزق مہیا کرتا ہے (۲۰/۵۵-۵۳)۔ تو فرعون نے اپنے حواریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ "سنتے ہو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟" (۲۶/۲۵)۔ فرعون کے اس استفسار میں ایک طرف تضحیک کا پہلو بھی ہے، لیکن دوسری طرف، اپنے اربابِ حکومت کی توجہ اس انقلابی روح کی طرف بھی منعطف کرا دی گئی ہے جو حضرت موسیٰؑ کے اس دعوائے ایمان میں جھلک رہی تھی۔ جس شخص کا ایمان یہ ہو کہ کائنات کی تمام اشیاء کا نشو و نما دینے والا خدائے بزرگ و برتر کے سوا کوئی نہیں، وہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے بھلا کب جھکنے دے گا؟

اور اس دعوے کا ابطال

فرعون کی نگاہوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس سادہ سے جملہ میں انقلابِ آسمانی کی وہ تمام بجلیاں بھانپ لیں جو اس قسم کے ایمان کے سحاب میں بے تاب ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی استہزاء آمیز تنقید کو اسی حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئے۔ اور فرمایا۔ قَالَ رَبُّکُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ ٥ (۲۶/۲۶) "وہ اللہ تمہارا رب اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہے۔" اس ٹکڑے میں درحقیقت ضمناً فرعون کے اس "نشتر" کا بھی جواب تھا کہ تم لوگوں کی ربوبیت کے مدعی ہو۔ حالانکہ تم اور تمہارے آباء و اجداد (جنہیں تمہاری طرح یہی دعویٰ تھا) سب اپنی پرورش کے لئے بھی اسی بارگاہِ صمدیت کے محتاج تھے (اور ہیں) سو جب تم خود اپنی پرورش کے لئے کسی اور کے محتاج ہو تو تم دوسروں کی پرورش کیا کر سکتے ہو؟ فرعون نے پھر اہلِ دربار کی طرف دیکھا اور کہا کہ سنتے ہو! اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں اور میرے آباء و اجداد (یعنی وہ تمام شہنشاہ جن کی عظمت کے سامنے دنیا کانپتی تھی) اس کے نزدیک سب محتاج ہیں؟ کیا اس قسم کی باتیں کوئی سلیم العقل انسان کر سکتا ہے؟

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○ (۲۶/۲۷)

فرعون نے اپنے اہلِ دربار سے مخاطب ہوکر کہا کہ لو بھئی! خدا نے تمہاری طرف اپنا رسول بھی بھیجا تو ایک پاگل بھیجا!

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی اس جگہ پاش تنقید سے پھر اسی بے رُخی کا برتاؤ کیا جس کی وہ سزاوار تھی، اور اپنے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں ہی کا پروردگار نہیں۔ بلکہ ساری دنیا میں بسنے والی مخلوق کا رب ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ (۲۶/۲۸)

(موسیٰؑ نے اُس کے ہفوات پر پھر کوئی توجہ نہیں دی، اور اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے)

کہا کہ وہ خدا مشرق و مغرب، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پرورش کرنے والا ہے۔ اگر تم ذرا بھی عقل و خرد سے کام لو تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

تخویف کا اوچھا حربہ

فرعون یہ کچھ سنتا جارہا تھا اور غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ اس کے دعوائے ربوبیت کی یوں پے درپے دھجیاں بکھری جارہی ہیں۔ اور وہ بھی اس کے ارکینِ سلطنت کے سامنے۔ تو کھسیانہ ہوکر، اس حربہ پر اُتر آیا جو مستبد قوتوں کے پاس آخری "وسیل" ہوتا ہے۔ کہا

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○ (۲۶/۲۹)

(اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اُس نے طیش میں آکر موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی زبان بند کرو، اور کان کھول کر سُن لو کہ) اگر تم نے (میری مملکت میں رہتے ہوئے) میرے سوا کسی کو صاحبِ اقتدار تسلیم کیا (خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو، تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی جس کی پاداش میں) تمہیں جیل بھجوادوں گا۔ (۲۶/۲۹)

دیکھئے! سیاستِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی کی تفاصیل کس طرح اس مختصر مکالمہ کے اندر جھلمل جھلمل کررہی ہیں دنیا میں فرعونی قوتیں، انسانوں سے اپنی "معبودیت" تسلیم کرانا چاہتی ہیں اپنے مزعومہ دعوائے "ربوبیت" کی بنا پر اور حکمتِ کلیمی ان کے دعوائے ربوبیت کی حقیقت کو بے نقاب کرکے ان کی "معبودیت" کے زعمِ باطل کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ شروع سے آج تک دنیا میں یہی کشمکش جاری ہے۔ اور جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سلسلۂ صید و صیّاد

یوں تو دنیا میں ہر شکار میں لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک اس وقت پہنچتی ہے جب ایک انسان کا شکار دوسرا انسان ہو۔ یہ وہ لہو ہے جو منہ سے لگے نہیں چھوٹتا۔ تاریخ نوعِ انسانی پر غور کیجئے تو یہ اسی سلسلۂ صید و صیاد کی خونچکاں داستان نظر آئے گی۔ قومِ بنی اسرائیل، مصریوں کے پنجۂ آہنی میں بےبس شکار کی طرح تڑپ رہی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ اس کے سوا کیا تھا کہ اس مظلوم شکار کو چھوڑ دو اور اجازت دو کہ میں انہیں ساتھ لے کر چلا جاؤں جہاں یہ آزادی کی فضائے بسیط میں اطمینان کا سانس لے سکیں۔ بنظرِ معقولیت (یعنی بنگاہِ انسانیت) دیکھئے تو اس پر اہلِ فرعون کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اگر وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے تو پھر اپنی ہوسِ حکمرانی کی تشنگی کس طرح بجھاتے؟ مستبد قوتیں، صرف اپنے معاملات کی درستی کے لئے اپنی حکومت قائم نہیں کرتیں۔ انہیں اپنے جذبۂ حکومت کی تسکین کے لئے کسی دوسری قوم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے خون کی رنگینی ان کے قصرِ دولت کی آرائش و زیبائش کے کام آسکے۔ اس لئے اس قسم کی مستبد قوتیں کبھی اجازت نہیں دے سکتیں کہ محکوم قوم ان کے نظامِ حکومت سے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس سے وہ محکوم قوم برابری کے درجہ پر آجاتی ہے۔ محکوم نہیں رہتی۔

فرعون کی حیلہ کاریاں

اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مستبد قوم کی حکومت کے لئے، کسی محکوم قوم کا وجود ضروری ہوتا ہے جسے وہ مختلف حیلوں اور حربوں سے دبائے رکھے۔ یہی کچھ فرعون نے کر رکھا تھا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ○ (۲۸/۴)

واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے اپنی مملکت میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اور ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ اس کے لئے اس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا اور جو ان جوہروں سے عاری ہوتے، انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کر کے، ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا (۴/۲؛ ۱۴۱/۷؛ ۲۵/۴۰)۔

اس آیۂ جلیلہ کے غوامض پر غور کیجئے۔ مفسد اربابِ حکومت کی دسیسہ کاریوں کی طولانی فہرست چند لفظوں میں

دسیسہ کاریاں اور گروہ سازیاں

سمٹ کر آگئی ہے۔ گروہ سازی اور پارٹی بندی، وہ بنیادی حربہ ہے جس پر ابلیسی نظام کے قیام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ (جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا) اور ان میں سے ایک جماعت کو کمزور رکھنے کی ہر ممکن کوشش تاکہ وہ ابھرنے نہ پائے۔ ان میں سے جو لوگ ایسے نظر آئیں جن میں جرأت و حریت کے جوہر ہوں انہیں ذلیل و خوار کیا جائے اور جو لوگ ان صفات سے عاری ہوں انہیں معزز و مقرب بنا دیا جائے۔ اس طرح اس محکوم قوم پر احسان بھی رکھا جائے کہ اس سے کس قدر فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں دبائے بھی رکھا جائے۔ یہ ہے وہ فسادِ آدمیت جو ہر فرعونی نظامِ حکومت کا خاصہ ہوتا ہے (اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ) اور اسی فساد کو مٹانے کے لئے ضربِ کلیمی اور حزب اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ غور کیجئے! کہنے کو تو یہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کی ایک قوم کی داستان ہے۔ لیکن درحقیقت یہ وہ ابدی حقائق ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوا کرتے۔ یہ حقیقت آج بھی اسی طرح تازہ اور زندہ ہے جس طرح آج سے چار ہزار سال پہلے تھی۔ قرآن، حقائق سے بحث کرتا ہے جو فطرت کے اٹل قوانین کی طرح غیر متبدل ہوتے ہیں۔ طاغوتی سیاست کی جن مُہرہ بازیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ سے متعلق نہیں۔ ابلیس شروع سے آدم کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گا۔ وَفِيْهَا اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

مطالبات

یہ تھے وہ حالات جن میں، حضرت موسیٰؑ نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دیدی جائے۔ یہ مطالبہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایسا نہیں تھا جسے آسانی تسلیم کر لیا جاتا۔ اس کی مخالفت میں تو ہر ممکن قوت صرف ہو جانی چاہیئے تھی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

پھر حضرت موسیٰؑ کا دوسرا مطالبہ، کہ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرو، فرعون کے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جس روش پر آبا و اجداد کے وقت سے چلے آرہے ہیں، اس کا چھوڑ دینا! جس حکومت اور "شانِ خداوندی" کو اسلاف سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اسے تیاگ دینا!! جس نشۂ قوت و ثروت میں صدیوں سے بدمست چلے آرہے ہیں اسے ترک کر دینا!!! کچھ آسان نہ تھا۔ اس کے لئے بڑے محکم ایمان کی ضرورت تھی۔ قومِ فرعون بھلا اسے کس طرح آسانی سے قبول کر لیتی؟ اگر ایسے مطالبات اتنی آسانی سے قبول کو لئے جایا کرتے تو دنیا میں باطل شکن بازوؤں کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟

قومِ فرعون سے ان مطالبات کی مخالفت اور سخت مخالفت غیر متوقع نہ تھی۔ لیکن مشیّت کو یہ منظور تھا کہ جس

مظلوم قوم کو اس درجہ کمزور و ناتوان بنا دیا گیا ہے اسے دنیا میں سرفرازی عطا کرے۔ (کیونکہ ان میں ہنوز اس سرفرازی کی صلاحیت باقی تھی)۔

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝ (۲۸/۵-۶)

چنانچہ اس کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا، اُسے ہماری نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے۔

جہاں اُن کی اپنی حکومت ہو، اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار (ہامان) اور اُن کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھایا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے، اور جس سے بچنے کیلئے وہ اس قدر محکم تدابیر اختیار کیا کرتے تھے ـــــ یعنی اُن کی تباہی اور بربادی۔

خدا کا احسان کیا ہوتا ہے؟

دوسری آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ اہلِ فرعون کو یہی خوف تھا کہ بنی اسرائیل کسی دن اُبھر کر سامنے نہ آجائیں۔ اسی لئے وہ انہیں کچلنے کی مختلف تدابیر اختیار کرتے رہتے تھے۔ لیکن مشیّتِ خداوندی نے یہ اعلان کر دیا کہ بالآخر وہی ہو کر رہے گا جس سے وہ یوں لرزاں تھے۔ بنی اسرائیل اُبھرے اور فلسطین اور اس کے گردونواح کی زمینوں پر (جو اس زمانہ میں حکومتِ مصر کی باجگذار ریاستیں تھیں) قابض ہو گئے۔ یہ تھا کمزوروں پر اللہ کا احسان۔

لیکن کیا یہ احسان یونہی بیٹھے بٹھائے سایہ فگن ہو گیا تھا؟ اس کے جواب کے لئے ابھی چند صفحات کا اور انتظار کیجئے۔ جب وہ ٹکڑا سامنے آئے گا تو اس وقت معلوم ہو گا کہ یہ احسان کن جاں گداز اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد وجۂ سرفرازی ہوا تھا۔

دعوتِ موسوی کا استقبال

بہرحال، یہ تھا حضرت موسیٰؑ کا وہ مطالبہ اور یہ تھی ان کی وہ دعوت۔ اب دیکھئے کہ اس دعوت کا استقبال کس طرح سے ہوا۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی طرف سے رسولؑ ہو اور اس مقصد کے لئے مامور کئے گئے ہو کہ بنی اسرائیل

کو یہاں سے آزاد کر کے لے جاؤ۔ لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ تم واقعی مامور من اللہ ہو!

۷/۱۰۶ قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ○

فرعون نے کہا کہ اگر تم خدا کی طرف سے کوئی واضح دلیل لائے ہو، تو اسے اپنے دعوے کی صداقت میں پیش کرو۔

اس کے جواب میں

۷/۱۰۸-۱۰۷ فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ○ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ع (۷/۱۰۸-۱۰۷)

اس پر موسیٰؑ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جن کی بنا پر اس نے وہ دعویٰ کیا تھا اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ محکم دلائل، اپنی صداقت کے زورِ دروں پر، اس طرح آگے بڑھے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت اور شدت واضح طور پر سامنے آ رہی تھی[1]۔ (ان کی شدت سے مراد یہ تھی کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ کس قدر ہلاکت انگیز ہوگا۔

پھر وہ ان روشن دلیلوں کو سامنے لایا جن کی رو سے بتایا گیا تھا کہ ان قوانین کی اطاعت سے زندگی کا ہر گوشہ کس طرح تابناک ہو جائے گا۔ یہ بصیرت افروز دلائل ہر دیدۂ بینا کے لئے چراغِ راہ بن سکتے تھے۔ (۲۱/۲۰-۱۷؛ ۲۶/۳۳-۳۲؛ و ۲۸/۳۲)

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جس کے سہارے انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا اور جسے وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ دلائل و براہین اپنے زورِ دروں سے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت و شدت واضح طور پر سامنے آتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ ان براہین کو سامنے لائے جن میں بتایا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار و تابناک ہوگا

---

[1] یہ ان الفاظ (عصا۔ ثعبان مبین۔ ید بیضا) کے مجازی معنی ہیں جنہیں، ہمارے نزدیک، استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔ (اس کی سند لغات القرآن میں اپنے اپنے مقام پر ملے گی)۔ ویسے عصا کے حقیقی معنی لاٹھی۔ ثعبانِ مبین کے معنی نمایاں اژدھا۔ اور ید بیضا کے معنی سفید چمکیلا ہاتھ ہیں۔

ان دلائل کی درخشندگی و تابناکی ہر دیدہ بینا کو نظر آتی چلی جا رہی تھی۔
ارباب حکومت نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

۷ / ۱۱۰-۱۰۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ (۷ / ۱۱۰-۱۰۹)

اس پر فرعون کے سرداران قوم نے ایک دوسرے سے کہا، یہ تو بڑا ماہر سحر کار نظر آتا ہے (جو اپنے زور بیان سے جھوٹ کو سچ بنا کر دکھاتا چلا جا رہا ہے[1])
اس کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ (اس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر) تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے۔ اور یہاں اپنی حکومت قائم کرے۔ سو کہو کہ تمہارا اس باب میں مشورہ کیا ہے؟ (۲۶ / ۳۵)
اس کے بعد انہوں نے فرعون سے کہا۔

۷ / ۱۱۲-۱۱۱ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝

انہوں نے (باہمی مشورہ کے بعد) فرعون سے کہا کہ تم موسیٰؑ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو تو سردست التوا میں رکھو، اور اس اثنا میں نقیبوں کو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بھیجو کہ وہاں سے سحر کار مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کر کے لائیں (تاکہ وہ ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دے سکیں)۔

اس مقام پر ذرا رُکئے اور مذہبی پیشواؤں کی ذہنیت پر غور کیجئے۔ فرعون نے انہیں بلایا تھا کہ وہ (حضرت) موسیٰؑ کے دعاوی کے مقابلہ میں اپنے معتقدات اور مسلک کی حقانیت کو ثابت کریں۔ یہ ان کا مذہبی فریضہ بھی تھا اور اپنے آپ کو برسرِ حق ثابت کرنے کے جذبہ کا تقاضا بھی۔ اس لئے انہیں نہایت جوش و خروش سے آگے بڑھنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ فرعون سے اس طرح معاملہ بازی کرتے ہیں گویا وہ اس کا کوئی کام کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے وہ پہلے طے کر لینا چاہتے ہیں کہ اس کام کی انہیں اُجرت کیا ملے گی؟ مذہبی پیشوائیت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ ان کا ذریعۂ معاش مذہب ہوتا ہے اس لئے وہ ہر مذہبی فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ لیتے ہیں ——— ، اذان دینے کا معاوضہ خطبہ دینے کا معاوضہ۔ نماز پڑھانے کا معاوضہ۔ نکاح پڑھانے کا معاوضہ۔ حج کے مناسک ادا کرانے کا معاوضہ۔

---

[1] سحر کے معنی جھوٹ اور فریب کے بھی ہیں۔

وقس علی ہذا۔ جہاں جہاں مذہبی پیشوائیت ہے، وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے ان (مذہبی پیشواؤں) کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ (۹/۳۴) ان علماء و مشائخ کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مال غلط طریق سے کھا جاتے ہیں۔ یہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے اور لوگوں کی محنت کی کمائی پر پلتے ہیں۔ ان سادہ لوحوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم تمہاری راہ نمائی خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف کرتے ہیں، لیکن درحقیقت خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں سب سے بڑی روک یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت (PRISTHOOD) کے ادارہ ہی کو ختم کر دیا۔ قرآنی نظام میں ان کا تصور تک باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نظام قائم نہ ہونے پائے۔

یہی کچھ آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے ہوتا تھا۔ یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

بات یہاں تک ہوئی تھی کہ فرعون کے اہل دربار نے اس سے کہا کہ (حضرت موسیٰؑ سے نپٹنا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں۔ اسے مذہبی پیشواؤں سے بھڑا دیجئے۔ عوام مذہب پرست واقع ہوتے ہیں۔ یہ (مذہبی پیشوا) انکے جذبات کو بھڑکا دیں گے تو "عوامی تحریک" اسے (حضرت موسیٰؑ کو) سیلاب کی طرح بہا کر لے جائے گی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس مقام پر ہم فقط اتنا دیکھیں گے کہ فرعون اور اسکی قوم کی طرف سے اس دعوت کا استقبال کسطرح ہوا۔ قرآن کریم مختلف مقامات پر اس گوشہ کے متنوع پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ سورۂ اعراف کی متعلقہ آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ○ (۱۰/۷۶)

چنانچہ جب ان کے سامنے ہمارا وہ پیغام پیش کیا گیا جو سر تا سر حق و صداقت پر مبنی تھا، تو انہوں نے یہ کہکر اس سے انکار کر دیا، کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ اور باطل ہے۔

اس کا جواب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے کیا ملا؟ فرمایا۔

قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ أَسِحْرٌ هَٰذَا ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ○ (۱۰/۷۷)

موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ کیا تم اس حق کے متعلق جو تمہارے سامنے اس طرح پیش کیا جا رہا ہے، یہ کہتے ہو کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کے دعوے جھوٹ اور باطل پر مبنی ہوتے ہیں، وہ کبھی

کامیابی کا منہ نہیں دیکھا کرتے۔ (اور تم دیکھ لو گے کہ میں اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا ہوں۔)

اسلاف پرستی

اس بصیرت افروز دلیل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ، بجائے اس کے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیتے، علم و عقل کی راہ چھوڑ کر، فوراً اس روش کی طرف آ گئے جسے ہم امم سابقہ کے تذکرہ میں دیکھ آئے ہیں۔ یعنی اسلاف پرستی کا اندھا جذبہ!

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ؀ (۱۰ / ۷۸)

(جو قانونِ خداوندی موسیٰؑ نے پیش کیا تھا، وہ لوگ، علم و براہین کی بنا پر تو اس کی تردید کر نہیں سکتے تھے، اس لئے انہوں نے وہی روش اختیار کی جو باطل پرستوں کے ہاں شروع سے چلی آ رہی ہے)۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس مسلک سے برگشتہ کر دو جو ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلا آ رہا ہے؟ اور اس طرح ہمارے اقتدار کو ختم کر کے، مملکت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لو! (ہم تمہاری چالوں کو خوب سمجھتے ہیں، اس لئے) ہم تمہاری کوئی بات ماننے کے نہیں۔

اسلاف پرستی کی عقیدت اور قوت و حکومت کا نشہ، انہیں کس طرح چھوڑا جا سکتا تھا؟

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ؀ (۱۷ / ۱۰۱)

ہم نے موسیٰؑ کو (قومِ فرعون کی آخری تباہی سے پہلے) نو کھلی کھلی نشانیاں دی تھیں۔ (اے رسولؐ! تم اپنی قومِ مخاطب سے کہو کہ اگر یہ اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو) بنی اسرائیل سے دریافت کر لیں کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ (۷ / ۱۳۲-۱۳۰ ؛ ۲۷ / ۱۲)۔ ہوا یہ تھا کہ جب موسیٰؑ قومِ فرعون کی طرف آیا تو فرعون نے سب کچھ سننے کے بعد، اس سے کہا کہ (تم جو کہتے ہو کہ تم خدا کی طرف سے رسول ہو، تو اس باب میں یا تو تمہیں خود دھوکہ لگ گیا ہے۔ یا) تم دوسروں کو دھوکا دیتے ہو۔ (۱۷ / ۱۰۱)

(ان نشانیوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا) دوسری جگہ ہے۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ؀ (۵۱ / ۳۹)

فرعون نے، اپنی قوت کے زعم میں، ان قوانین سے روگردانی کی، اور موسیٰؑ کے متعلق کہا کہ وہ یا تو بڑا

چالاک اور جھوٹا ہے، اور یا پاگل ہو گیا ہے۔
سچ ہے! قوت کے نشہ میں، عقل و ہوش کی باتیں ایسی ہی نظر آیا کرتی ہیں۔ جیسے رنگین چشمہ سے ہر شے رنگ دار نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ (۱۰۲/۱۷)

موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ تو (یقیناً اپنے دل میں اس حقیقت کو پاچکا ہے کہ) یہ روشن دلائل، یہ قوانین و ضوابط، جنہیں میں نے تمہارے سامنے پیش کیا ہے، مجھ پر خدائے ارض و سمٰوٰت کے سوا کسی نے نازل نہیں کئے۔ (تم میرے متعلق کہتے ہو کہ مجھے دھوکا لگ گیا ہے) لیکن میں دیکھتا ہوں کہ دھوکے میں تم خود مبتلا ہو کہ تباہی تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے، تم اس میں چاروں طرف سے گھر چکے ہو، (اور وہ تمہیں نظر نہیں آتی)۔

کس طرح لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی سے نظر آ رہا ہے کہ تمہاری ہلاکت کے دن قریب آ چکے ہیں۔ غور کیجئے! یہ اس مستبد بادشاہ سے کہا جا رہا ہے جس کے نام کی نسبت سے دنیا میں سرکشی و عدوان متعارف ہے۔ یعنی فرعونیت، رعونت اور تکبّر کی شدید ترین صورت کا نام بن چکی ہے۔ لیکن جو مردِ خدا صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب سے ڈرنے والا ہو، اس کے سینے میں کسی اور کا ڈر کیسے آ سکتا ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ، خوف تو شرک سے پیدا ہوتا ہے۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے نہایت مسکت دلائل سے واضح کر دیا کہ وہ کس خدا کے فرستادہ ہیں تو فرعون نے کہا

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰی ۝ (۵۷/۲۰)

اُس نے موسیٰؑ سے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے باطل مذہب اور نگاہ فریب دلائل کے زور سے، ہمیں ہماری مملکت سے نکال باہر کرے؟

سورۂ مومنین میں، سرداران حکومت کی طرف سے ایک ایسا جواب منقول ہوا ہے جو حقائق و معارف کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتا ہے

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (۲۳/۴۷)

اُنہوں نے (بجائے اس کے کہ جو کچھ اُن کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس پر غور کرتے) کہا کہ کیا ہم اُن کی بات مان لیں جو انسان ہونے کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے ہیں۔ (فوق البشر نہیں)۔ اور جہاں تک رتبہ اور درجہ کا تعلق ہے، وہ اُس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔ (محکوم قوم کے پاس عقل و بصیرت کہاں ہو سکتی ہے؟ اور پھر اُنہیں یہ جرأت کیسے ہو گئی کہ اپنی حاکم قوم کو آ کر سبق پڑھانے لگیں! یہ ہمارے لئے سخت باعث ذلت ہو گا اگر ہم اُن کی بات مان لیں)۔

رسولوں کی بشریت پر اعتراض پہلے حصہ میں ہے کہ کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں جو ہماری ہی طرح کے دو انسان ہیں! یہ وہ اعتراض ہے جو اس سے پیشتر بھی ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ یعنی انسانوں کی اعجوبہ پسند طبیعت اسے باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی کہ اپنی جیسا ایک انسان خدا کا رسول ہو سکتا ہے! یہی وجہ ہے جو تمام اقوام و ملل نے اپنے اپنے "بانیان مذاہب" کو انسانیت کے مقام سے اٹھا کر، الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا اور پھر ان کی طرف ایسے ایسے "طلسم ہوش رُبا" کے سے افسانے منسوب کر دیئے جنہیں سُن کر انسان جادو کے جزیروں میں پہنچ جائے۔ یہی اعتراض قوم فرعون نے کیا۔

محکوم کی بصیرت لیکن اس اعتراض کا دوسرا حصہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو اُس قوم کے فرد ہیں جو خود ہماری محکوم ہے۔ غور کیجئے، حاکم قوم کی نفسیاتی کیفیت کو چند سادہ الفاظ میں کس قدر وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں، حاکم قوم کے نزدیک، محکوم قوم کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ قوم غالب کی ہر ادا میں ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے جسے مغلوب قوم بلا سوچے سمجھے اختیار کئے جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی اس قوم کا تمدن اور اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس محکوم قوم کے خیالات، نظریات و معتقدات بھی وہی کچھ ہو جاتے ہیں جو حاکم قوم کے نزدیک قابلِ ستائش ہوں۔ وہ دیکھتی ہے تو اُن کی آنکھوں سے، سنتی ہے تو اُن کے کانوں سے اور سوچتی ہے تو اُن کے دماغ سے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (۷/۱۷۹)۔ "دل ہیں لیکن ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے

نہیں۔ کان ہیں مگر سنتے نہیں اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۝ (۷-۱۷۹) "یہ (انسان نہیں) حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ"۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷-۱۷۹) "یہ لوگ (اپنے مقام سے) بے خبر ہیں"۔

لیکن ان کے برعکس قوم غالب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ بات ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ محکوم قوم کے ہاں بھی کوئی معقول بات ہوسکتی ہے! اور سچ پوچھئے تو وہ ایسا سمجھنے میں چنداں مورد الزام بھی نہیں قرار پاسکتے۔ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ بھوکا اگر یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس دنیا بھر کے افلاس اور محتاجی کا حتمی علاج موجود ہے تو اسے کون ہوشمند صحیح تسلیم کرے گا؟ اس لئے جو قوم عملاً غلام ہو، اس کی بات پر اعتماد کون کرسکتا ہے۔ بقول حکیم الامتؒ ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی | جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر | کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

آج کا مسلمان آئینہ کے سامنے

آج مسلمان حیران ہے کہ اسلام جب ایک حقیقت ثابتہ ہے تو اسے دنیا بے غل و غش قبول کیوں نہیں کرلیتی۔ لیکن یہ کہتے وقت وہ کبھی نہیں سوچتا کہ دنیا، اسلام کو اس کے پیش کرنے والوں کی حالت سے جانچتی ہے۔ جن پیش کرنیوالوں کی حالت یہ ہو (جو ہماری آج ہے) تو ان کی بات سننا کون پسند کرے گا، وہ جہاں بھی جائیں گے یہی جواب پائینگے کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ کیا ان کی بات پر ایمان لے آئیں جو دنیا میں انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں! اگر اس نسخۂ کیمیا میں ایسا ہی حیات بخش اثر ہے جیسا بتاتے ہیں تو ان کی اپنی حالت ایسی ناگفتہ بہ کیوں ہو رہی ہے؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کا کوئی جواب بن نہیں پڑسکتا۔ اسلام کو پیش کرنے کا حق اس قوم کو حاصل ہے جس کی اپنی حالت اسلام کے درخشندہ نتائج کی زندہ دلیل ہو۔ نہ کہ ان بھکاریوں کا جو اپنی روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہوں۔ انہیں تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنے سے بھی شرم آنی چاہیئے کہ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام جیسا مہر عالمتاب، گہن میں آرہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو

از درود خود میالا نام او

کس قدر الم انگیز ہے یہ حقیقت جسے زبان و قلم کے بجائے خون کے آنسوؤں ہی سے بیان کیا جاسکتا ہے؟

احسانات کی یاد دہانی

پھر لوٹیئے اصل قصہ کی طرف! سورۂ شعراء میں اس واقعہ کے ضمن میں ایک اور ایسی بات آگئی ہے جو دنیا میں سیاست فرعونی کی اہم حقیقت اپنے آغوش میں لئے ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے تو فرعون نے کہا کہ "موسیٰؑ! تو، اور اس قسم کی بغاوت کی باتیں! حالانکہ تجھے یاد ہونا چاہیئے کہ ہم نے کس ناز و نعمت سے تیری پرورش کی۔ اور پھر تو یہاں سے کتنا بڑا جرم کر کے بھاگا تھا لیکن ہم نے اس پر بھی تجھ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا۔ تو بڑا ہی احسان فراموش واقع ہوا ہے"۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲۶ / ۱۸-۱۹)

فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ! کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے بچپن سے اپنے ہاں تمہاری پرورش کی، اور تم نے اپنی عمر کا ایک حصہ ہمارے ہاں بسر کیا۔ تم رب العٰلمین کہتے ہو! تمہاری پرورش تو خود ہم نے کی تھی۔

لیکن تم نے ان احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ خود ہماری ہی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا ——— تم کیسے ناشکر گزار آدمی ہو؟

فرعون کے طعن کا دوسرا حصہ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی طرف ایک جرم کو منسوب کر رہا تھا اس لئے آپ نے پہلے اسی کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ[1] ۝ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶ / ۲۰-۲۱)

موسیٰؑ نے کہا کہ ——— میں نے دانستہ اسے قتل نہیں کیا تھا۔ میں نے تو اسے محض ایک مکا مارا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ مکے سے مر ہی جائے گا (۲۸ / ۱۵) ——— (۲۶ / ۲۰)

اس کے بعد، میں یہاں سے اس لئے بھاگ گیا تھا کہ (مقتول تمہاری قوم کا آدمی تھا، اس لئے) میں ڈرتا تھا کہ (تم انصاف سے نہیں، بلکہ قومی عصبیت سے کام لو گے، اور میرے خلاف قتل عمد کا جرم عائد کر دو گے)۔

---

[1] ضَآلِّیْنَ کی تشریح بعد میں آئے گی۔

اِس کے بعد، خدا نے مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا۔ مجھے معاملات میں صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ اور میرا شمار، خدا کے رسولوںؑ کے زمرہ میں کر دیا۔ (اور اب میں اِسی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔

"ہاں میں بھاگ گیا تھا! اس لئے نہیں کہ میں واقعی قتلِ عمد کا مرتکب تھا اور اپنے آپ کو اس جرم کا مجرم سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ تیرے ظلم و ستم اور تیرے اربابِ حکومت کی سازش سے ڈرتا تھا کہ ان کے اثر کی وجہ سے، فیصلہ حق و انصاف کی رو سے نہیں بلکہ دیگر رجحانات و مقتضیات کے مطابق ہونا تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ مجھے اللہ کی طرف سے عطا ہوا اس سے وہ تمام خوف دور ہو گیا۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم لوگوں نے میری پرورش کی تو اس کے جواب میں، میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ ○ (۲۶/۲۲)

(باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم نے بچپن میں میری پرورش کی اور محلات میں ناز و نعمت سے پالا۔ تو) تم اپنے اِن احسانات کا بدلہ یہ چاہتے ہو کہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھو! (تم نے ایک فرد پر جو احسانات کئے ہیں، انہیں تو جتاتے ہو، لیکن اس کی پوری قوم پر جو مظالم کر رہے ہو، ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟)

غور فرمایئے: حضرت موسیٰؑ نے کیسی حقیقت کشا بات کہی ہے؟ مستبد حکومت کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے چند ایک ممتاز افراد کو نوازتی رہتی ہے تاکہ وہ اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکیں اور پھر ان کی ساری قوم کو محکومی کے شکنجے میں کسے رکھتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس احسان کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کے ایک فرد کی پرورش کی اور اس کی قیمت اتنی وصول کر رہے ہو کہ ساری کی ساری قوم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے؟ کیا اسی کا نام احسان ہے؟

فرعون نے جب تمام باتیں سنیں تو بھانپ گیا کہ حضرت موسیٰؑ انقلابات کی کتنی دنیائیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سن لیا! یاد رکھو۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ○ (۲۶/۲۹)

ؔ اس سے لفظ اِلٰہ کے معانی کسقدر واضح ہیں۔ یعنی صاحبِ اقتدار۔ حاکم۔ نہ کہ وہ جس کی پرستش کی جائے۔ (اسکی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے)۔

(اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اس نے طیش میں آکر موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی زبان بند کرو اور کان کھول کر سُن لو کہ) اگر تم نے (میری مملکت میں رہتے ہوئے) میرے سوا کسی اور کو صاحب اقتدار تسلیم کیا (خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو، تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی، جس کی پاداش میں) تمہیں جیل بھجوا دونگا۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس، میرے دعوے کے ثبوت میں واضح دلائل موجود ہوں تو کیا تو پھر بھی اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہے گا؟

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۶/۳۰﴾

موسیٰؑ نے کہا کہ اگر میں اپنے دعوے کی تائید میں کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آؤں (تو کیا تم پھر بھی مجھے قید کردو گے؟ کیا تم معاملہ کو دلائل و براہین کی رُو سے، طے کرنے کے بجائے، دھاندلی سے کام لینا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے ہاں استبدادِ فرعونی کے علاوہ اور کوئی قانون نہیں؟)

فرعون نے کہا

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۶/۳۱﴾

(اس جواب سے فرعون کچھ جھینپا اور موسیٰؑ سے) کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو لاؤ میں بھی دیکھوں، وہ کون سی نئی بات ہے جسے تم پیش کرنا چاہتے ہو؟

عصا اور ید بیضا کے الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں جہاں کہا گیا تھا کہ ان الفاظ کے مجازی معانی کی تشریح اس مقام پر کی جائے گی جہاں حضرت موسیٰؑ کے، ساحرین دربارِ فرعون کے ساتھ مقابلہ کا منظر سامنے آئے گا۔ وہ مقام اب آ رہا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان الفاظ کی تشریح کردی جائے۔

عصا کا مفہوم مطالب القرآن جلد دوم (صـ۲۴۵) میں بیان کیا جاچکا ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معانی جمعیت اور ائتلاف کے ہیں۔ یعنی قوت اور محکمیت کے ذرائع اور اسباب۔ اسی جہت سے یہ لفظ جماعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور لاٹھی کو بھی اسی لئے عصا کہا جاتا ہے کہ وہ تقویت اور سہارے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ طبیعی طور پر تو لاٹھی سہارے کا موجب بنتی ہے لیکن جب یہ لفظ معنوی اعتبار سے مستعمل ہوگا تو اس سے مراد محکم دلائل ہوں گے جو مدعی کے لئے سہارے کا موجب ہونگے۔

الیَد (ہاتھ) کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، جسطرح ہمارے ہاں "ہاتھ" لفظ۔ یا فارسی میں دست

اور انگریزی میں (HAND) طبیعی طور پر اس کا مطلب پانچ انگلیوں والا پنجہ (ہاتھ) ہوتے ہیں، لیکن مجازی طور پر اس سے مراد ہر قسم کی قوّت اور گرفت ہوتی ہے۔

البیاض (بیضاء) کے بنیادی معنی سفیدی کے ہیں لیکن چونکہ عربوں کے ہاں بَیَاضٌ (سفید) افضل ترین رنگ تھا اس لئے وہ جملہ خصائل حمیدہ اور صفات کریمانہ کو بیاض سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ جو شخص کسی عیب کے ساتھ آلودہ نہ ہوا سے ابیض الوجہ کہتے تھے۔ اسی لئے اس کے معنی بے داغ کردار اور روشن سیرت لئے جاتے تھے۔ جب یہ لفظ دلائل اور براہین کے لئے آئے گا تو اس سے مراد نہایت محکم، روشن اور درخشندہ دلائل ہونگے جن میں کوئی سقم نہ ہو۔ عربوں کے ہاں اَلْیَدُ الْبَیْضَاءُ روشن اور واضح دلیل کو کہتے تھے (دیکھئے لغات القرآن۔ عنوان (ب۔ ی۔ ض)۔ یہی اس کے مجازی معانی ہونگے۔

سحر (ساحرین) کے متعلق، مطالب الفرقان جلد دوم۔ میں تفصیلی بحث آچکی ہے۔ اس کے عام معانی تو جادو کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر باطل عقیدہ یا فریب کارانہ مسلک کے لئے ہوتا ہے۔ قدیم مذاہب میں مذہبی پیشوا اپنے تقدس اور مقام الوہیت کو ساحرانہ شعبدہ کاریوں کے بل بوتے پر قائم رکھتے تھے اس لئے ساحرین کا لفظ مذہبی پیشواؤں کے لئے بھی بولا جاتا تھا۔ پھر ان مذہبی پیشواؤں کا، نظم و نسق حکومت میں بھی بڑا عمل دخل ہوتا تھا اس لئے بلند مرتبہ ارباب مذہب اور اعیان حکومت بھی ساحرین کہلاتے تھے۔ فرعون کے ہامان کو دیکھئے۔ وہ صرف مذہبی پیشوا ہی نہیں۔ ان کے جنود (لشکر) بھی ہیں۔ نیز وہ شعبۂ عمارات مملکت کا بھی مقتدر اعلیٰ تھا۔ لہذا جب فرعون نے فیصلہ کیا کہ (حضرت) موسیٰؑ کا مقابلہ ساحرین سے کرایا جائے تو اس سے مراد جادوگروں کے ساتھ مقابلہ نہیں تھا۔ ان بلند پایہ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مقابلہ مقصود تھا جو حیطۂ حکومت میں بھی اعلیٰ مناصب رکھتے تھے۔

اسی سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ حضرات انبیا کرامؑ (معاذ اللہ) جادوگر نہیں ہوتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جادو اور جادوگروں کی شدید مذمت کی ہے۔ اسی لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰ اور ساحرین دربار فرعون کے مابین مقابلہ "جادوگری" کا تھا۔ حضرات انبیاء کرامؑ پیغام حق کے داعی ہوتے تھے اور باطل پرستوں سے ان کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس مقابلہ کی بنیاد دلائل و براہین (بینات اور آیات خداوندی) پر ہوتی تھی، اور انہی کی رو سے وہ باطل پرستوں پر غالب آتے تھے۔ یہ حضرات اپنے مخالفین کو چیلنج ہی یہ دیتے تھے هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۷/۶۴) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ بنابریں حضرت موسیٰؑ اور فرعونی مذہبی پیشواؤں میں مقابلہ حق و باطل کے دعاوی کا تھا جس کی تائید اور تردید

دلائل کی رو سے ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں ان کے مجازی مفہوم میں لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو ایک پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ اپنی دعوت حقّہ کو جادو کے زور سے منواتے وہ تو بلکہ جادو، اور اسی نوعیت کی دیگر توہم پرستیوں کو مٹانے کے لئے آتا تھا۔ دین کی عمارت علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، نہ کہ طلسمانہ جہالت اور شعبدہ کارانہ فریب کاریوں پر۔ اس سلسلہ میں، مطالب القرآن کی سابقہ جلدوں میں (انڈکس کے حوالوں کی رو سے) معجزات کا عنوان دیکھئے ——— بالخصوص جلد چہارم میں حضرت عیسیٰؑ کے مبینہ معجزات کا عنوان۔

ان حقائق کی روشنی میں، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہم نے ان الفاظ کے مجازی معانی کیوں لئے ہیں۔ بایں ہمہ جو حضرات ان الفاظ کے حقیقی معانی سے مطمئن ہیں، وہ بخوشی وہی معانی اختیار کریں۔ میری ان سے کوئی بحث نہیں۔

سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں کوئی دلائل رکھتے ہو تو انہیں پیش کرو۔

فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ۝ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ۝

(۲۶ / ۳۲-۳۳)

اس پر موسیٰؑ نے وہ قوانین و ضوابط پیش کئے جو اسے خدا سے ملے تھے اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ قوانین و ضوابط کیا تھے، گویا ایک اژدھا تھا جو باطل معتقدات کو نگلے جا رہا تھا۔ (ان کی رو سے بتایا گیا تھا کہ اہلِ فرعون کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا۔ ۷ / ۱۰۸-۱۰۷؛ ۲۹ / ۲۵-۱۷؛ ۲۸ / ۳۲-۳۱)

اس کے بعد موسیٰؑ ان براہینِ نیّرہ کو سامنے لایا جن کی رو سے واضح کیا گیا تھا کہ قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت سے ان کا مستقبل کس قدر روشن ہو جائے گا۔ ان دلائل کی درخشندگی اور تابناکی ہر دیدۂ بینا کو صاف نظر آ رہی تھی۔

اس پر فرعون نے ارکینِ سلطنت سے کہا

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ۝ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝ (۲۶ / ۳۵-۳۴)

اس پر فرعون نے اپنے اہلِ دربار (سردارانِ قوم) سے کہا، کہ یہ شخص یقیناً ایک ماہر سحر کار ہے جو

جھوٹ کو سچ بنا کر دکھاتا چلا جا رہا ہے۔

اس کا ارادہ یہ نظر آتا ہے کہ یہ اپنی فریب کاریوں سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر، یہاں اپنی حکومت قائم کر لے اور تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے۔ سو بتاؤ کہ تمہارا اس باب میں کیا مشورہ ہے؟ (۷/۱۱۰)

یہ تمہارا دین بدل دے گا (یعنی نظام حکومت)۔ (۴۰/۲۶)

میں ان کے ابناء کو قتل کر دوں گا ——— (۷/۱۲۷)؛ (۴۰/۲۵)

اُنہوں نے کہا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝ (۲۶/۳۶-۳۷)

اُنہوں نے کہا کہ (ہمارا خیال یہ ہے کہ) سردست موسیٰؑ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو معرض التوا میں رکھو، اور مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں ہرکارے بھیجدو کہ وہ، مختلف معبدوں سے، ماہرین سحرکار پروہتوں کو تمہارے پاس بلا لائیں۔

اس سلسلہ میں سورۂ اعراف کی جو آیات پہلے گذر چکی ہیں ان میں کہا گیا تھا کہ ارباب حکومت نے باہمی مشورہ کیا اور پھر فرعون سے کہا کہ پیشواؤں کو جمع کراؤ۔ یہاں فرمایا ہے کہ ارکین سلطنت سے پوچھا تو اُنہوں نے ایسا مشورہ دیا۔ بات ایک ہی ہے۔ فرعون نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے باہمی مشورہ کیا۔ اور فرعون کے سامنے اپنی تجویز پیش کر دی۔ سورۂ نمل میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ قوم فرعون کے لوگ حضرت موسیٰؑ کی صداقت وحقانیت کے دل سے قائل ——— ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی ضد اور قوت وحکومت کے نشہ کی بدمستی کی بنا پر انکار کئے جا رہے تھے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۷/۱۳-۱۴)

لیکن جب اس قوم کے پاس ہمارے اس قدر بصیرت افروز احکام آئے، تو بجائے اس کے کہ وہ لوگ ان پر ایمان لے آتے، اُلٹا کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے (کہ موسیٰؑ کو خدا نے یہ احکام دے کر ہماری طرف بھیجا ہے، اور اگر ہم نے اُنہیں نہ مانا تو ہم پر تباہی آجائے گی)۔

حالانکہ اُنہیں دل میں یقین ہو چکا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں، لیکن اُنہوں نے محض، اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کر دیا۔ سو تم دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے انسانی معاشرہ میں اس طرح فساد برپا کر رکھا تھا (انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنا، عدالتِ خداوندی میں سب سے بڑا جرم ہے)۔

غور کیجیئے۔ قرآن نے کتنی بڑی حقیقت، دو لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ باطل اور فریب کی بنیادوں پر بڑا بننے کا جذبہ انسان میں ایسی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ان حقائق سے جن کی صداقت کا وہ دل سے قائل ہوتا ہے اس لئے انکار کئے جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کی ہیٹی ہوگی اور اسے دوسروں کی نظروں میں خفیف ہونا پڑے گا۔ ظلم و استبداد کی رو سے حاصل کردہ عزت و شوکت کی حقیقت ملمع کی سی ہوتی ہے جس کا رنگ ایک تاؤ دینے سے فق ہو جاتا ہے۔ عزت و عظمت وہی پائیدار ہوتی ہے جو حق پر مبنی معتقدات اور حسنِ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت کی بنا پر حاصل ہو۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس لئے ان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں مردانہ وار اس کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک بات کو دل سے مانیں لیکن مصلحت بینی کی بنا پر اسے زبان پر نہ لائیں یا زبان سے وہ کچھ کہیں جو ان کے دل میں نہ ہو۔ دل اور زبان کی ہم آہنگی ان کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی　　　اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

قومِ فرعون کی پستیٔ کردار دیکھئے۔ طبیعی طور پر دبدبہ اور طنطنہ کا یہ عالم کہ ایک قوم کی قوم کو اپنے پنجۂ آہنی کی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اور کیریکٹر کی کمزوری کی یہ کیفیت کہ ایک بات کو صحیح مانتے ہیں لیکن مصلحت بینی کی بنا پر اسے زبان پر لانے کی ہمت نہیں پاتے۔ اس قسم کی روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی　　　خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ ان لوگوں کی دوں فطرتی اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ جب ان سے فریقِ مقابل کے دلائل کا جواب نہیں بن پڑتا تو یہ استخفاف اور استہزاء پر اتر آتے ہیں۔ (جیسا کہ مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۲۴۷ پر لکھا جا چکا ہے) یہ دنائت اور کمینگی کی انتہا ہوتی ہے۔ چنانچہ جب فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کے پاس حضرت موسیٰؑ کے دلائلِ باہرہ کا کوئی جواب نہ رہا تو وہ اس حربہ پر اتر آئے۔ فرمایا

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ۝ (۴۳ / ۴۶ - ۴۷)

(مثلاً) ہم نے موسیٰؑ کو، اپنے قوانینِ خداوندی دے کر، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔

اُس نے اُس سے کہا کہ مجھے خدائے رب العلمین نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔

جب اُس نے اُن کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کیا تو وہ اُن کا مذاق اڑانے لگے۔

سورۂ قصص میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○ (۲۸/۳۶)

چنانچہ جب موسیٰؑ ہمارے قوانین کو لے کر اُن کے پاس گیا تو اُنہوں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ یہ سب جھوٹ پر مبنی من گھڑت باتیں ہیں۔ ہم نے ایسی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سُنیں۔ (اس لئے ہم اُنہیں ماننے کے لئے تیار نہیں)۔

اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا:-

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۲۸/۳۷)

موسیٰؑ نے کہا کہ (یہ بھلا کون سی دلیل ہے کہ چونکہ یہ باتیں تم نے اپنے آباء و اجداد سے نہیں سُنیں، اس لئے یہ سب جھوٹ ہیں۔ باقی رہا تمہارا یہ اعتراض کہ میں نے یہ باتیں اپنی طرف سے خود وضع کی ہیں اور اُنہیں منسوب کر رہا ہوں خدا کی طرف۔ تو تم ان باتوں کو پرکھ کر دیکھو کہ یہ کیسی ہیں۔ جہاں تک اُن کی منجانب اللہ ہونے کا تعلق ہے) میرا نشوونما دینے والا خوب جانتا ہے کہ کون فی الواقعہ اس کی طرف سے قوانین لے کر آتا ہے۔ (اور کون اس کی طرف غلط باتیں منسوب کرتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی جانتا ہے کہ) انجام کار کامیابی کس کی ہوگی۔ اِس لئے کہ اُس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اُس کے قوانین سے سرکشی برتیں، (یا اُس کی طرف غلط باتیں منسوب کریں) وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس کے جواب میں فرعون نے ارکین سلطنت سے کہا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (۲۸/۳۸) (نیز ۴۰/۳۶-۳۷)

فرعون نے اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ (موسیٰؑ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض "مذہبی" گفتگو نہیں۔ یہ تو گہری

سیاست ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اقتدار و اختیار، سروری اور حاکمیت سب خدا کے لئے ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں۔ لیکن) میں اپنی مملکت میں، تم لوگوں کے لئے، اپنے اقتدار و اختیار کے سوا کسی کا اقتدار نہیں جانتا۔

اس کے بعد اُس نے ہامان سے استہزاءً کہا کہ یوں کرو کہ پزاوہ میں اینٹیں پکاؤ۔ پھر ان اینٹوں سے میرے لئے ایک بہت بلند محل تعمیر کراؤ تاکہ میں اُس پر چڑھ کر، موسیٰؑ کے خدا تک پہنچوں اور دیکھوں کہ وہ کیسا ہے!

بہر حال' میں اسے، اس کے دعویٰ میں جھوٹا سمجھتا ہوں، اس لئے اس کی کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ (۲۸/۳۸) (نیز ۴۰/۳۰ اور ۴۰/ ۳۷ - ۳۶) ۔

بہر حال فرعون نے سب کچھ دیکھنے سمجھنے کے باوجود، حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی۔ استہزاء پر اتر آیا اور ان اصولوں سے سرکشی برتی جن کی طرف آپ دعوت دے رہے تھے۔ سورۂ نازعات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا تھا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ (۷۹/ ۱۹ - ۱۸)

اُس سے کہو کہ (تم نے دولت اور قوت بہت جمع کر رکھی ہے، لیکن اپنے مقام انسانیت کے متعلق تم نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں)۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے شرفِ انسانیت کی بھی نشو و نما ہو جائے؟ اور میں تجھے وہ راستہ بتاؤں جو تمہیں خدا کی ربوبیتِ عامہ کی طرف لے جائے ——— اس سے یہ کچھ کہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے اُس کا احساسِ شرفِ انسانیت بیدار ہو جائے، اور وہ اپنی موجودہ روش سے، جو اسے تباہیوں کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے، رُک جائے۔ (اس سے کم از کم اتمامِ حجت ہی ہو جائے گا)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس کی طرف گئے اور فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ (۷۹/ ۲) "زندگی کا بلند و بالا اصول اس کے سامنے پیش کیا"۔ لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ انقلاب سے سرکشی برتی۔ فَكَذَّبَ وَعَصٰى (۷۹/ ۲۱) ۔ اور منہ پھیر کر چل دیا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ (۷۹/ ۲۲) ۔ اور اپنی رعایا کو جمع کیا اور منادی کرادی۔ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ (۷۹/ ۲۳) ۔ کیا منادی کرائی؟ یہ کہ یاد رکھو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (۷۹/ ۲۴) ۔ میں تمہارا "ان داتا" ہوں۔ سو یاد رکھو، میرے سوا کسی کی بات نہ ماننا۔

سورۂ زخرف میں اس "منادی" کی مزید تفصیل دے دی گئی ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ہٰذَا الَّذِیْ ہُوَ مَہِیْنٌ ۙ۬ وَّ لَا
یَکَادُ یُبِیْنُ ۝ فَلَوْلَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَہَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ مُقْتَرِ
نِیْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَاَطَاعُوْہُ ؕ اِنَّہُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ (۴۳/۵۱-۵۴)

(فرعون، اس انقلابی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اس قدر خائف تھا کہ) وہ ملک میں اس قسم کے اعلانات کرتا رہتا تھا کہ اے میری قوم! کیا میں مملکتِ مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں، جو میرے انتظام کے تحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں ہیں؟ کیا تم ان باتوں پر غور نہیں کرتے؟ (۷۹/۲۴)

کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلہ میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں، جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے، اس لئے نہایت پست اور کمزور۔ پھر، یہ ایسا دہقانی اور گنوار ہے کہ اسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ (۲۳/۴۷)۔

اگر اس کے خدا نے اسے اتنے بڑے اقتدار کا مالک بنانا تھا تو اسے، سرداری کے امتیازی نشان کے طور پر، سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے۔ یا اس کے جلو میں صف در صف فرشتے کیوں نہ بھیجے گئے۔

چنانچہ وہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے اپنی قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ سمجھ سوچ سے کام نہ لے سکیں بلکہ اندھا دھند اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ وہ قوم خود ہی غلط راستوں پر چلنا چاہتی تھی۔ (ورنہ اگر قوم صحیح راستے پر چلنا چاہے تو مستبد قوتوں کی طرف سے اس قسم کا پراپیگنڈا اسے متاثر نہیں کر سکتا)۔

ان آیات پر غور کیجئے اور پھر تصور میں لائیے ان جذبات کو جن سے متاثر ہو کر اس نے یہ اعلان کیا ہوگا۔ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ؟ کیا یہ مملکتِ مصر (اور اس کی حکومت) میری نہیں؟ کیا اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں نہیں؟ کیا تم یہ کچھ نہیں دیکھ رہے؟ قوت و شوکت کے سب سامان ایک طرف اور دوسری طرف (نقل کفر، کفر نباشد) یہ ذلیل و کمزور سا انسان، جو اچھی طرح (مہذب انسانوں کی طرح) بات بھی نہیں کر سکتا! جس کے پاس ایک پیسہ تک نہیں۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو اس کے جلو میں آسمان کے فرشتوں کے پرے کیوں نہیں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی اس کی بات نہ سنے! قوم کی کیا مجال تھی جو اس فرعونی حکم سے سرتابی برتتی (حالانکہ جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے۔ وہ دل سے حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے معترف تھے) اس قوم نے اپنے بادشاہ

ہی کی اطاعت کی۔ اس لئے کہ قوم بھی تو ویسی ہی تھی جیسا خود فرعون۔ اِنَّھُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۝

پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کس قدر گہرا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس کے پیشِ نظر فرعون کو ایسے اعلانات کی ضرورت پڑی۔ غور فرمایا آپ نے کہ ایک داعیٔ انقلاب، رسول برحق، کی آواز میں کس قدر زلزلہ انگیز کڑک ہوتی ہے کہ وہ دلوں کی بستیوں کو ہلا دیتی ہے۔ دنیا میں علمبرداران حق و صداقت کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ غیر خدائی نظام ہائے زندگی میں ایسا تزلزل پیدا کر دیں کہ ہر طاغوتی قوت بلبلا اٹھے!

پھر اس نکتہ کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ فرعون نے کہا کہ اگر یہ شخص صاحبِ حشمت و دولت ہوتا تو بھی اس کی بات سن لی جاتی! لیکن یہ "غیر مہذب" سا مفلس و نادار انسان اور دعویٰ اس قدر بلند آہنگ! یعنی اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم قومِ نوح کے زمانہ سے سنتے چلے آرہے ہیں!

جیسا کہ ہم شروع سے بتاتے چلے آرہے ہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا مطیع و محکوم بنانے کا طریق یہ ہے انہیں روٹی کا محتاج کر دیا جائے۔ مستبد قوتوں کی حکمرانی کا راز ہی اسی میں ہوتا ہے کہ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں اور پھر بھوکے لوگوں سے جو چاہے منواتی اور کراتی ہیں۔ فرعون نے اپنے اعلان میں یہی دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تم پر رزق کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں گے، اور یہ شخص (حضرت موسیٰؑ) تمہیں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکے گا کیونکہ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں! سرکس کے شیر کو بھوکا ماریئے اور پھر اس سے جو چاہے کرائیے!

قوتِ کلیمی

فرعون نے اپنی بوکھلاہٹ میں یہ سب کچھ کہا لیکن، بایں ہمہ، اسے خطرہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دلکش تعلیم اور اس کی تائید میں ایسے واضح دلائل کہیں عوام کو متاثر نہ کر دیں۔ اس لئے اس نے اس کا علاج یہی سوچا کہ اپنی قوم کے پیشوایانِ مذہب کے ساتھ اس کا مناظرہ کرایا جائے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ باوجود اپنی (بظاہر) بے سروسامانی کے حضرت موسیٰؑ اپنے اندر کتنی بڑی قوت رکھتے تھے کہ فرعون کو یہ جرأت نہیں پڑی کہ انہیں پکڑ کر قتل کرا دے یا قید کر دے۔ سیرتِ بلند کی قوت بے پناہ ہوتی ہے۔ محکوم قوم ہی کیوں نہ ہو، اسے ایک کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر سرکشی و استبداد کی سب قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وہ کلیم جس کے متعلق کہا ہے کہ

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف ما بمیداں سربجیب او سربکف

پادشاہاں در قبا ہائے حریر زرد رو از سہمِ آں عُریاں فقیر (اقبالؒ)

بہر حال، فرعون نے حکم دیا کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کیا جائے۔ اب حق و باطل کی کشمکش کا ایک نیا میدان سامنے آیا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔

۷/۱۱۳ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ○

چنانچہ ان کے مذہبی پیشوا (ہامان اور اس کے ساتھی پروہت) فرعون کے پاس جمع ہو گئے[1] انہوں نے اس سے کہا کہ اگر ہم موسیٰؑ پر غالب آ گئے تو ہمیں امید ہے کہ ہمیں اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ (مذہبی پیشواؤں کے پیشِ نظر "اُجرت" ہوتی ہے، حق کا بول بالا کرنا نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ مذہب پرستی اُن کا پیشہ ہوتا ہے، لہذا ذریعۂ معاش)۔ (۲۶/۴۲)

فرعون نے کہا۔

۷/۱۱۴ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○

فرعون نے کہا "ضرور ملے گا، اور تم سب میرے مقربوں کی صف میں داخل ہو جاؤ گے" اس سے بڑا انعام اور کیا حاصل ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔

قبل اس کے کہ ہم اس رزمگاہِ حق و باطل کا منظر سامنے لائیں، ایک اہم وضاحت ضروری ہے۔ آیت (۲۸/۳۸) میں لکھا جا چکا ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ "ایک پختہ محل بناؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰؑ کے خدا کو آسمان پر جھانک لوں" اس کے علاوہ ہامان کا ذکر ان آیات میں بھی آیا ہے (۲۸: ۶، ۸)؛ (۲۹: ۳۹)؛ (۴۰: ۲۴، ۳۶)؛ اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب "برقِ طور" میں بھی لکھا ہے لیکن اس کا یہاں دہرانا ضروری ہے۔

تورات (عہد عتیق) کی کتاب آستر میں ایک ہامان کا ذکر آیا ہے جو ایران کے شاہنشاہ، 'اخسویرس' کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ وہ یہودیوں کی نسل کشی کے درپے تھا لیکن شہنشاہ کی محبوبہ 'آستر' نے بادشاہ کو اس طرح اپنے دامِ فریب میں پھنسایا کہ اس نے خود ہامان کو حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ یورپ کے بعض متعصب مستشرقین نے یہ بیہودہ اعتراض کیا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) ایران کے ہامان کا قصہ سن کر اسے فرعون مصر کی داستان کے ساتھ چپکا دیا ہے لیکن حق کی قوّت ملاحظہ ہو کہ وہیں کے تاریخ کے محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ (۱) تورات میں شامل کتاب آستر اور اس میں مذکور ہامان کی کہانی سب جعلی ہے۔ اور (۲) جس ہامان کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس تحقیق کا ملخص یہ ہے کہ آمن رع (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا، اور اس کے مندر کا اعلیٰ پجاری، شان و شوکت کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ یہی آمن رع قرآن کا ہامان ہے ——— جیسے تورات کا آرون

[1] لفظی معنی جادوگر ہیں۔

(AORON) تغیر لفظی سے قرآن کریم میں ہارون ہوگیا۔ ڈاکٹر سٹینڈورف (STEINDORFF) اپنی کتاب (THE RELIGION OF THE ANCIENT EGYPTIANS) میں ہامان کے متعلق لکھتا ہے۔

آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اوّل (یعنی سب سے بلند مرتبہ کاہن) کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی تھا۔ مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا نظم و نسق اسی کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج، یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور انتظام کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اسکے پجاری اس کے دائرۂ اقتدار میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام منادر کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمن کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سویں آبادی پر اس کی حکومت تھی۔

اسی محقق نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جرمنی میں مصر کا ایک قدیم مجسمہ ہے جس پر منقوش ہے کہ وہ آمن کے سردار کاہن بکن خونس کا ہے جو فرعون، رعمیس ثانی کے زمانے میں تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں (تحت لفظ مصر) مذکور ہے کہ۔

فراعنۂ مصر کے اٹھارھویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اہمیت اختیار کر لی تھی اس خاندان کے زمانے میں آمن رع (واقعہ تھیبس) کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ہو چکے تھے جن کی وجہ سے وہ بے حساب دولت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر (BREASTED) نے بھی اپنی کتاب (A HISTORY OF EGYPT) میں لکھا ہے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ہوتا تھا۔ (حوالوں کے لئے دیکھئے برق طور۔ عنوان ہامان)۔

ان حقائق کی روشنی میں ان قرآنی آیات کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے جن میں ہامان کا ذکر ہے۔ (واضح رہے کہ جس طرح مصر کے شہنشاہوں کا نام نہیں بلکہ لقب فرعون تھا اسی طرح آمن رع کے سب سے بڑے پجاری کا لقب ہامان تھا)۔

ان تصریحات کے بعد، ہامان (آمن رع) کے جنود (یعنی پجاریوں کی فوج کے دستے) اور صاحب ضرب کلیم کے مقابلہ کی طرف آیئے۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ اس معرکہ کے لئے جشن کا دن مقرر کیا گیا تھا اور ذرا دن چڑھے کا وقت تا کہ لوگ ضروریات سے فارغ ہوں اور مجمع زیادہ رہے۔ اہل فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَآ أَنتَ مَكَانًا سُوًى ○ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ○

(۲۰/۵۸-۵۹)

اگر یہی بات ہے تو ہم تیری سحر طرازیوں کا جواب، سحر طرازیوں سے دیں گے (اس کا جواب ہمارے مذہبی پیشوا دیں گے)۔ سو تو، ہمارے اور اپنے درمیان مقابلہ کے لئے ایک دن مقرر کر لے۔ اس کی خلاف ورزی نہ ہم کریں، نہ تم کرو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ مقابلہ برابر کی سطح پر ہوگا۔

موسیٰؑ نے کہا کہ بہت اچھا۔ تمہارے سے مقابلہ کے لئے جشن کا دن مقرر ہوا۔ دن چڑھے لوگوں کو اکٹھے ہو جانا چاہیئے۔

چنانچہ معاملہ طے کر کے، فرعون ان سے الگ ہوا اور اب اپنی تدابیر کی تکمیل کی فکر کرنے لگا۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ○ (۲۰/۶۰)

اس فیصلہ کے بعد فرعون نے اُن کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ اپنی تمام تدابیر کو یکجا جمع کیا، اور مقررہ وقت پر مقابلہ کے لئے آگیا۔

جب مقابلہ کا دن آیا تو حضرت موسیٰؑ نے مجمع کو (یا ان کے مذہبی پیشواؤں کو) مخاطب کر کے کہا۔

قَالَ لَهُم مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ○ (۲۰/۶۱)

(جو مذہبی پیشوا، موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے بلائے گئے تھے) موسیٰؑ نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! تم تباہ ہو جاؤ گے۔ تم خدا کے خلاف افترا پردازی مت کرو۔ اپنی طرف سے مذہب تراش کر، اسے اُس کی طرف منسوب مت کرو۔ یاد رکھو! خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، وہ خاسر و نامراد رہتے ہیں۔ وہ انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا کرتا ہے۔

اس خطاب کا یہ اثر ہوا کہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ○ (۲۰/۶۲)

(اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ) ان مذہبی پیشواؤں نے آپس میں رد و کد شروع کر دی اور باہم سرگوشیاں کرنے لگ گئے۔ (عوام پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا)۔

ارباب حل و عقد نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ تو مقابلہ سے پہلے ہی میدان مارے جا رہے ہیں تو مجمع (یا مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ دونوں بھائی کیا کیا منصوبے باندھ رہے ہیں؟ گوش ہوش سے سنو۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝ (۲۰/۶۳-۶۴)

(فرعون کے درباریوں نے جب مجمع کی یہ حالت دیکھی تو انہیں خطرہ لاحق ہو گیا) انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ دونوں بھائی (موسیٰؑ اور ہارونؑ) کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ باطل مذہب کے پیشوا ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی فریب کاریوں سے اپنا تسلط جما لیں اور تمہیں تمہاری مملکت سے نکال باہر کریں اور تمہارے مذہب و مسلک کو، جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا ہے تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور اس طرح تمہارے ارباب حکومت اور پیشوایانِ طریقت کا تمام شرف و اقتدار چھین کر لے جائیں۔

(پھر انہوں نے اپنے مذہبی مناظروں کو خصوصیت سے مخاطب ہو کر کہا کہ) اپنے باہمی اختلافات کو چھوڑ کر، اس مشترکہ دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے، اپنی تمام ہنرمندیوں اور تدابیر کو یکجا کر لو اور پھر پرا باندھ کر ان کے مقابلے کے لئے ڈٹ جاؤ۔ یاد رکھو! یہ معرکہ بڑا فیصلہ کن ہے۔ جو آج بازی لے جائے گا، وہی کامیاب ہو گا۔ (۷/۱۱۱-۱۱۳) و (۷۹/۱)۔

دیکھئے! کس طرح ان کے جذبات کو مشتعل کیا جا رہا ہے تاکہ حضرت موسیٰؑ کی موعظت اور تنذیر نے جو اثر کیا تھا اسے زائل کر دیا جائے اور یہ انہیں اپنے ملک اور تہذیب و تمدن کا دشمن خیال کرنے لگ جائیں کہ یہ نہ صرف تمہارا ملک ہی چھیننے کی فکر میں ہیں بلکہ اس بلند و بالا تہذیب و تمدن کے تمام ڈالنے کی بھی تدبیریں سوچ رہے ہیں جس کے تم وارث ہو۔ آنکھیں کھولو! کس سوچ میں ہو! دیکھو کہ یہ دونوں بھائی کس انقلاب کی ٹھانے بیٹھے ہیں!!!

سورۂ شعراء میں ہے۔

۱؎ یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو قارئین حقیقی معانی کو ترجیح دینا چاہیں وہ ان الفاظ کے معانی کسی با ترجمہ قرآن کریم کے نسخے سے دیکھ لیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝ (۲۶ / ۳۸)

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور ملک کے بڑے بڑے سحر کار پروہت، تاریخ اور وقت مقررہ پر، موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے جمع ہو گئے۔

مذہبی پیشواؤں کے علاوہ عوام کو بھی دعوت شمولیت دی گئی تھی۔

وَّقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ۝

(۲۶ / ۴۰-۳۹)

علاوہ ازیں، عام لوگوں سے بھی کہا گیا کہ وہ بھی جمع ہو جائیں۔

تاکہ جب یہ پروہت کامیاب ہوں تو ان کا شاندار جلوس نکالا جائے۔

اس کے بعد ان کے مذہبی پیشواؤں کی صلہ جوئی اور معاوضہ طلبی کی درخواست کا ذکر ہے جسے سورۂ اعراف کی آیات (۷ / ۱۱۴-۱۱۳) میں بیان کیا جا چکا ہے (دیکھئے ۲۶ / ۴۲-۴۱)۔ اس کے بعد مقابلہ شروع ہوا۔ اور سوال یہ پیدا ہوا کہ پہل کون کرے۔

مقابلہ | ۷ / ۱۱۶ | قَالَ أَلْقُوا ۖ فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ۝

موسیٰؑ نے کہا کہ تم پہل کرو۔ سو جب اُنہوں نے اپنے مسلک کو پیش کیا، تو ان کی سحر بیانی کی چمک سے لوگوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی، اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے لوگوں کو اس سے بھی ڈرایا کہ تم نے فرعون کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟) اور اس طرح اُنہوں نے بہت بڑے مکر و فریب کا جال بچھا کر رکھ دیا۔

اس کے بعد۔

۷ / ۱۱۷ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ۝

اور ہم نے، موسیٰؑ سے، وحی کے ذریعہ کہہ دیا کہ تم اپنی تدبیرات کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ پیش کرو[1]۔ جب اُس نے اُنہیں بیان کیا تو مخالفین کا فریب باطل ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔

---

[1] یہاں بھی لفظ ''عصا'' آیا ہے۔

"عصائے موسوی" باطل کی نظر فریب "رسیوں" کو نگل گیا۔ اور اس طرح۔

(۷ / ۱۱۹-۱۱۸) فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝

سو اس طرح حق ثابت ہوگیا۔ اور اُن کا کیا کرایا سب اکارت گیا۔ (۱۰ / ۸۲-۷۶) (۲۰ / ۶۷-۶۵)

یہ سب کچھ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوا تھا۔ (۱۰ / ۸۲)

اور فرعون اور اُس کی قوم کو، وہیں دیکھتے دیکھتے، مغلوب اور ذلیل ہو کر پسپا ہونا پڑا۔

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں بھی اس مناظرہ کا ذکر (قریب قریب) انہی الفاظ میں آیا ہے (دیکھئے ۱۰ / ۸۲-۷۵؛ ۲۰ / ۶۹-۶۵ ؛ ۲۶ / ۴۸-۴۳) آیت (۲۰ / ۶۷) میں ہے کہ فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا انداز بیان اس قدر سحر آفریں تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کے دلائل (محض لفاظی کے زور پر) اثر انداز نہ ہو جائیں اور اس طرح وہ کامیاب ہو جائیں۔ لیکن خدا نے انہیں اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے دلائل ان اثرات کو زائل کر دیں گے۔

ساحرین کا کیریکٹر

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں (جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فرعون اور اس کے اہل دربار، دل میں تو حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے لیکن ان کی انانیت اس اعتراف حقیقت کے برملا اظہار کے راستے میں حائل ہو رہی تھی اس لئے وہ اس کی مخالفت کئے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس سامنے آتا ہے۔ قوم فرعون کے ان مذہبی پیشواؤں کا جو مقام تھا اس کی بابت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان کا منصب اور ان کے مقام کی عظمت اربابِ اقتدار سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔ پھر اس مقابلہ کی اہمیت اور نزاکت بھی ان پر واضح تھی۔ اس میں کامیابی کا جو صلہ انہوں نے طلب کیا، اور فرعون نے جس کا اقرار کیا تھا، اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو فرعون کی طرف سے اس کا کیا ردِ عمل ہوگا!

ان تمام ترغیبات اور ترہیبات کے علی الرغم ان کی پختگی سیرت اور بلندیٔ کردار کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ کے دلائل کی رو سے ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ الٰہ حقیقی فرعون (یا آمن) نہیں بلکہ خدائے ارض و سمٰوات ہے، تو انہوں نے تمام عواقب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اس کا کھلے بندوں اعلان کر دیا۔ اور خدائے حقیقی

کے حضور والہانہ انداز سے سجدہ ریز ہو گئے۔ وَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ ﴿۱۲۰/۷﴾

یہ وہ سجدہ تھا جس سے زمین و آسمان رقص میں آجائے جس سے باطل کے "ہر خدا" کی اصلیت بے نقاب ہو جائے۔ اس سجدے کی عظمت کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ ص۱۰۳ ملاحظہ فرمائیے۔

سجدے سے اٹھے اور کہا:

۱۲۲-۱۲۱/۷	قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ○ (۱۲۲-۱۲۱/۷)؛ (۲۰/۷۰؛ ۲۶/۴۸-۴۷)

انہوں نے کہا کہ "ہم اس خدا پر ایمان لاتے ہیں جو جملہ کائنات کا پروردگار ہے۔ جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کا رب ہے۔

کیسا درخشندہ تھا طالع ان بیدار بخت مذہبی پیشواؤں کا جس پر ساری کائنات کی عظمتیں اور ثروتیں نچھاور کر دی جائیں وہ سجدہ نصیب ہوا جس سے ان کی خاک آلود پیشانیوں میں رفعتوں کے ہزار عرش جگمگا اٹھے۔ یہی وہ سجدہ تھا جس نے انہیں وہ جرأت عطا کر دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ سے سرفرازانہ آگے بڑھ جائیں۔ ہم غلامانہ ذہنیت کے خوگر اس سجدہ کی لذت کو کیا جانیں ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

فرعون کی شعلہ بازی

ہم ساحرین کے تحیّر انگیز جذبۂ ایمان کے کیف بار و نشاط آور منظر میں کچھ اس طرح جذب ہو گئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ فرعون کی قلبی کیفیت کا بھی جائزہ لے لیں کہ اس پر اس غیر متوقع انقلاب سے کیا گزری؟ اس میدان مبارزت میں ساحرین کی ناکامی ہی کچھ کم الم انگیز نہ تھی۔ اس پر جب دیکھا کہ وہ "موسیٰؑ کے خدا" پر ایمان لے آئے ہیں (یعنی بزعم فرعون، دشمن سے جا ملے ہیں) تو آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ اس کے دل و دماغ کی حالت کیا ہو گئی ہو گی! ذلّت اور ایسی کھلی ہوئی ذلّت! شکست اور ایسی رسوا کن شکست!! وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کف بر دہاں سیلاب کی طرح امڈا۔ کہ ہیں! میری آنکھوں کے سامنے ایسی کھلی ہوئی بغاوت:

۱۲۳/۷	قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

(اس پر فرعون کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی)۔ اس نے کہا کہ کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے ہو؟ میں اب سمجھا کہ یہ تم سب کی ملی بھگت ہے۔ یہ تو ایک گہری سیاسی سازش معلوم ہوتی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ تم میرے دارالخلافہ سے اربابِ اقتدار کو نکال باہر کرو (اور خود مملکت پر قبضہ کر لو۔ تم سب اندر سے ملے ہوئے نظر آتے ہو) تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ اس سازش کا نتیجہ کیا ہے۔

کسی مسلک کو صحیح جان کر اس پر ایمان لے آنا انسان کے اپنے دل کے فیصلہ پر موقوف ہونا چاہیئے۔ لیکن استبداد اس کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ کی عقل و بصیرت اور قلب و دماغ کا فیصلہ کچھ ہو۔ کرنا وہ ہو گا جس کا حکم دیا جائے۔ اسی لئے فرعون نے کہا کہ "میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے ہو" پھر جیسا کہ مستبد حکومتوں کا دستور ہے۔ فرعون نے ساحرین کے اس فیصلہ کو ایک سازش قرار دیدیا تاکہ انہیں بغاوت کے الزام میں ماخوذ کیا جائے۔ ساحرین کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت تھا۔ لیکن چونکہ اس سے قصرِ حکومت میں تزلزل واقع ہوتا تھا اس لئے اسے سازش قرار دے دیا گیا جس کی سزا فرعون کی "عدالت" میں اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ:

۷ / ۱۲۴ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے کٹواؤں گا (یا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلواؤں گا) اور تم سب کو سُولی پر چڑھا دونگا۔

سورۂ طٰہٰ میں فرعون کے قول کا ایک اور ٹکڑہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ساحرین کے اس اعتراف سے عوام پر بےحد بُرا اثر پڑا ہے تو معاملہ کو مشتبہ بنانے کے لئے مشہور کر دیا کہ یہ مذہبی پیشوا (در پردہ) حضرت موسیٰؑ کے شاگرد ہیں اور ان کی آپس میں ملی بھگت ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۖ فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ ۝ (۲۰ / ۷۱) (نیز ۲۶ / ۴۹)

(اس پر فرعون، مارے غصے کے لال پیلا ہو گیا اور اُن سے گرج کر کہا کہ ہیں!)—— تم میرے حکم کے بغیر ربِ موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لائے ہو؟ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ موسیٰؑ) تمہارا پیر و مرشد ہے جس سے تم نے یہ سب فریب انگیزیاں سیکھی ہیں (اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا، سب تمہاری ملی بھگت تھی۔ تم دیکھو میں تمہیں کیسی عبرت انگیز سزا دیتا ہوں) میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا (یا تمہیں اُلٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلواؤنگا)

اور تمہیں کھجوروں کے تنوں کے ساتھ لٹکا کر سولی دی جائے گی۔ اور اس طرح تم دیکھ لوگے کہ ہم دونوں (فرعون اور موسیٰؑ) میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے۔

ساحرین کا ایمان

جور و استبداد کی ان قہرمانی تجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا! اب ساحرین کے کوہ تمثال عزم و ایمان کی تجلیات کا تابناک منظر بھی دیکھئے۔ اب ساحرین بھی وہ نہیں تھے جن کا اندازہ فرعون نے کیا تھا۔ وہ اب خدائے حیّ قیوم پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لا چکے تھے اور یہ وہ ایمان ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

دنیا میں حقیقی قوتوں کا راز، ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے، اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں شکست و کامرانی کا بنیادی مدار قاطبۃً ساز و سامان پر نہیں، یقین و عدم یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب و شادکام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین، ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے۔ اور ایمان ہو، اَللّٰہُ وَاحِدُ الْقَهَّارُ پر۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی۔ لہٰذا، فرعون کی دھمکی، ایمان و ایقان کے ان آہنی پیکروں پر کیا اثر کر سکتی تھی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

فرعون نے اپنے انتہائی غضب و جلال میں کہا کہ میں "تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہاری تکا بوٹی کر دوں گا۔ ڈرو میرے غضب سے! خوف کھاؤ میرے انتقام سے!" لیکن اس سے ان استقلال و استقامت کے مجسموں پر کیا اثر ہوا؟ انہوں نے ایک خفیف سی ہنسی سے فرعون کی طرف نگۂ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ جن حقائق کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کیا تمہارے ڈر سے ان کی تکذیب کر دیں؟

قَالُوا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا .... (۷۲/۲۰)

اُنہوں نے (اس گرج کو نہایت اطمینان کے ساتھ سُنا اور دل کو پورے سکون سے) کہا کہ جو حقیقت دلائل و براہین کی رُو سے ہم پر منکشف ہو چکی ہے، نہ ہم اس پر اپنی باطل پرستی کو ترجیح دے سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اُس خدا

سے منہ موڑ کر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تمہارا حکم مان سکتے ہیں۔

"فرعون"! تو کیا جانے کہ ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ خدا پر ایمان کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ یہ تیری دھمکیاں اور تخویف و ترہیب کی شعلہ باریاں، ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰ / ۷۲) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے، کر ڈال۔ جو تیرے جی میں آئے کر گزر۔ تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ ہماری طبیعی زندگی تک گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۲۰ / ۷۲)۔ تو صرف اسی دنیاوی زندگی تک ہی حکم دے سکتا ہے۔ ہم اپنے اللہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اس ایمان سے ہمیں کوئی نہیں پھیر سکتا"۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ○ (۲۰ / ۷۳)

ہم اپنے نشوونما دینے والے پر ایمان لا چکے۔ اُس سے ہماری دعا یہ ہے کہ وہ ہماری سابقہ غلطیوں کے مہلک اثرات سے ہماری حفاظت کرے۔ یہ ——— بالخصوص باطل پرستی کی اس خطا کارانہ روش کے اثرات سے جس پر چلنے کے لئے تم نے ہمیں مجبور کر رکھا تھا۔ (ہم اب دیکھ چکے ہیں کہ) خدا کا قانون ہی بہترین اور باقی رہنے والے نتائج کا حامل ہے۔

ساحرین، فرعون کو یہ جواب دے رہے تھے اور آسمان کے فرشتے محوِ تحیّر، بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے تھے کہ الٰہ العالمین! تیرا ارشاد بجا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اسی آدم کی ذریت میں، جسے ابلیس نے بہکانے اور پھسلانے کا یوں دعویٰ کیا تھا، ایمان اور ایقان کے ایسے فولادی پیکر بھی ہوں گے، جن کی کیفیت یہ ہوگی کہ

بچو مرگ آید تبسم بر لب اوست

| ۷ / ۱۲۶-۱۲۵ | سورۂ اعراف کی آیات (۷ / ۱۲۶-۱۲۵) اور سورۂ شعراء کی آیات (۲۶ / ۵۱-۵۰)۔ میں بھی اسی واقعہ کو دہرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں نے فرعون کی دھمکیوں کا جواب کس قدر حقارت آمیز ہنسی سے دیا۔

ایک ایمان یہ تھا اور ایک ایمان اس انداز کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ ٝ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ٝ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ○ (۲۲ / ۱۱)۔

(ایک طبقہ تو اُن لوگوں کا ہے جو قانونِ خداوندی سے اِس طرح روگردانی کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ اُن کا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ) وہ قانونِ خداوندی کی اِطاعت کرتے ہیں، لیکن اس طرح گویا وہ کنارے پر کھڑے ہیں۔ اگر دیکھتے ہیں کہ اس قانون کی اطاعت میں فائدہ ہے، تو اس پر مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس سے اُنہیں کسی قسم کا نقصان ہوتا ہو۔ تو وہ اس سے بلا تامل منہ پھیر لیتے ہیں (۴/۱۴۳)۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی حال کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے اور مستقبل کی بھی ——— دُنیا میں بھی خسارہ اور آخرت میں بھی ——— اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے (جس کے لئے کسی دلیل و بُرہان کی ضرورت نہیں۔

علیٰ وجہ البصیرت ایمان اور "پیدائشی مسلمان" کے ایمان میں یہی فرق ہوتا ہے۔

ما ہمیداں سر بجیب۔ او سر بکف

دارد اندر سینہ تکبیر اُمم　　در جبین اوست تقدیر اُمم
قبلۂ ما گہ کلیسا، گاہ دیر　　او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر
صبح و شام ما بفکرِ ساز و برگ　　آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ
در جہانِ بے ثبات اورا ثبات　　مرگ اورا از مقاماتِ حیات
اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل　　گِل ز فیضِ صحبتش دارائے دل
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن　　او ہمہ کردار و کم گوید سخن
ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست　　فقرِ او از لا الٰہ تیغے بدست
ما پرِ کاہے اسیرِ گرد باد　　ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد

محرمِ او شو، ز ما بیگانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

(اس ضمن میں مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵ بھی ملاحظہ فرمایئے)۔

یہاں تک داستانِ حضرت موسیٰؑ کا وہ حصہ سامنے آیا ہے جس کا تعلق فرعون کے ساتھ ٹکراؤ سے ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کا ذکر نہیں آیا۔ اس کے بعد (آیت ۷/۱۲۷ اور اس سے آگے) فرعون اور بنی اسرائیل دونوں کا تذکرہ آئیگا۔ بنی اسرائیل کی رکم وبیش) پوری داستان مطالب الفرقان جلد دوم میں، اور بعض کوائف جلد چہارم میں آچکے ہیں لہذا، اب ہم ایسا انداز اختیار کرینگے (کہ سورۃ الاعراف کی جن آیات میں بنی اسرائیل کے ان واقعات کا ذکر آئے گا جو سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکے ہیں، وہاں صرف سابقہ جلدوں کا حوالہ دیدیا جائے گا اور جو واقعہ ایسا ہوگا جو پہلے نہیں آچکا، اس کی عند الضرورت تشریح کر دی جائے گی۔

پانچواں باب

سورۃ الاعراف۔ آیات ۱۲۷ تا ۱۵۸

کوائفِ بنی اسرائیل

۱ ——— وراثتِ ارض کا ابدی قانون۔

۲ ——— فرعونی نظام کے ابتدائی تباہ کن نتائج

۳ ——— قوم فرعون کی غرقابی۔

۴ ——— بنی اسرائیل کا عبورِ دریا۔

۵ ——— نفسیاتِ غلامی کے مظاہرے۔

۶ ——— گوسالہ پرستی۔

۷ ——— تفرقہ، شرک سے بھی بدتر۔

۸ ——— حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی استدعا۔

اس کا جواب۔

۹ ——— قوم کی طرف سے خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ۔

دونوں میں فرق۔

۱۰ ——— الواحِ حضرت موسیٰؑ۔

۱۱ ——— حضرت موسیٰؑ کی درخواست کہ ان کی قوم کو دنیا اور آخرت کی حسنات سے نوازا جائے۔

۱۲ ——— اس کا جواب کہ ایسا اتباعِ محمدیؐ سے ہو گا۔

۱۳ ——— بعثتِ نبی اکرمؐ کا مقصود و منتہیٰ۔

نوعِ انسانی کی آزادی۔

۱۴ ——— خدا کا آخری رسولؐ۔

پانچواں باب

کوائفِ بنی اسرائیل

سابقہ باب میں (آیت ۷/۱۲۶ تک) حضرت موسیٰؑ کے کوائفِ حیات بیان ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں (منجملہ دیگر امور) داستانِ بنی اسرائیل کے متعدد گوشے سامنے لائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر بھی آئے گا۔ لیکن یہ ذکر ضمنی ہوگا۔ نفقداً داستانِ بنی اسرائیل ہی کی بیان ہوگی۔ یہ داستان مطالب الفرقان جلد دوم میں شرح و بسط سے بیان ہو چکی ہے۔ اُن واقعات میں سے، سورۃ الاعراف کی آئندہ آیات میں جن کا ذکر آئے گا، ان کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے متعلق صرف مطالب الفرقان جلد دوم کا حوالہ دیا جائے گا۔ البتہ جن آیات میں کسی سابقہ واقعہ میں کوئی اضافہ ہوگا، ان کی تشریح کر دی جائے گی۔

اس التزام کے مطابق، آئندہ آیات ملاحظہ فرمائیے۔ آیت (۷/۱۲۷) میں ہے

۷/۱۲۷ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○

فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ (تم نے ان مذہبی پیشواؤں کے خلاف تو اپنا فیصلہ دے دیا لیکن) کیا تیرا ارادہ یہ ہے کہ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ ملک میں فتنہ و فساد برپا کرتے پھریں اور ایسا پراپیگنڈا کریں جس سے خود تیری قوم، تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے۔

فرعون نے کہا کہ (نہیں! میں ان کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن ان کے لئے میرے ذہن میں دوسری تدبیر ہے۔ یہ ہماری محکوم قوم ہے، اسے ہم سیاسی حربوں سے کچل دیں گے)۔ ہم اس قوم کے معزز افراد کو

جن میں جوہر مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی ہو اور جن سے خطرہ کا امکان ہو، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیں گے، اور جو طبقہ ان جوہروں سے عاری ہو گا، اسے معزز اور مقرّب بنا کر آگے بڑھاتے جائیں گے[1]۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے یہ قوم تباہ ہو جائے گی (۲/۴۹ ؛ ۴۰/۲۵)۔

فرعون کی طرف سے تشدّد

اس کا ذکر آیت (۷/۱۴۱) میں بھی آیا ہے۔ مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۷ پر آچکا ہے۔ فرعون کی حکومت، اپنی محکوم قوم (بنی اسرائیل) کو جس جس طریق سے اذیتیں دیتی تھی، اس کا ذکر (مطالب جلد دوم میں) آچکا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی آمد سے پہلے یہ اذیتیں اور انداز کی تھیں۔ صاحب ضربؑ کلیم نے جو انقلابی آواز بلند کی تو اس سے بنی اسرائیل کی حیثیت ایک باغی قوم کی ہو گئی۔ لہذا قوم فرعون کی طرف سے اذیتیں بھی شدّت اختیار کر گئیں۔ بنی اسرائیل نے ان تکالیف سے گھبرا کر حضرت موسیٰؑ سے شکایت کی، تو آپ نے انہیں یہ کہکر تسلّی دی کہ تکالیف کا یہ دور جلدی گزر جائیگا اور اس کے بعد تم محکوم قوم سے حاکم قوم بن جاؤ گے۔ اگلی دو آیات میں اسی انقلاب کا ذکر ہے:

۷/۱۲۹-۱۲۸

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۗ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ ع

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ فرعون کی ان دھمکیوں سے مت ڈرو۔ تم قانون خداوندی کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دیتے جاؤ اور خدا سے اس کی توفیق مانگو (۱/۴) اور اپنے پروگرام پر ثابت قدم رہو۔ (حکومت و مملکت ان کے باپ کی جاگیر نہیں کہ وہ ابدی طور پر ان ہی کے پاس رہے خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کرتے رہیں) یہ تو خدا کے قانون کے مطابق ملتی اور اس کے مطابق چھنتی ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ یہ ملتی اُس قوم کو ہے جس میں اس کی صلاحیت ہو (۲۱/۱۰۵)۔ جو قوم اُس کے قانون کی نگہداشت کرے گی، یہ آخر الامر اُس کے پاس جائے گی۔

اس پر موسیٰؑ کی قوم نے اُس سے کہا کہ جب تم یہاں نہیں تھے تو اُس وقت بھی ہمیں مصیبتوں کا سامنا رہا۔ تمہارے آنے سے یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ اب ہمارا پاپ کٹ جائے گا، اور آرام سے زندگی بسر ہو گی۔ لیکن فرعون سے

---

[1] لفظی معنی "ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے"۔

لڑائی مول لے کر) تم نے ہمیں پھر مصیبت میں ڈال دیا۔

استقامت کی تلقین

موسیٰؑ نے کہا کہ گھبرانے کیوں ہو۔ (پہلے تمہاری مصیبتیں، محکومی اور غلامی کی وجہ سے تھیں، لیکن اب جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ حصولِ آزادی کے لئے ہوں گی۔ اگر تم نے ثبات و استقامت سے کام لیا تو تم دیکھو گے کہ) تمہارا نشو و نما دینے والا کسطرح تمہارے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے، اور اُس کی مملکت تمہارے حصّے میں آجاتی ہے۔

اس کے بعد وُہ خدا یہ دیکھے گا کہ، مملکت حاصل ہونے کے بعد تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟ اس کا ذکر آیت (۷/۱۳۷) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

۷/۱۳۷ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝

اور جس قوم کو وہ اس قدر کمزور و ناتواں (اور ذلیل و حقیر) سمجھا کرتے تھے، اُسے (مختلف مراحل سے گزر کر) اُس ملک کے مشرقی اور مغربی حصّوں کا وارث بنا دیا جو ہمارے قدرتی خزائن اور پیداوار سے مالامال تھا۔ یوں تیرے نشو و نما دینے والے کا پروگرام، بنی اسرائیل کے حق میں، اس حسن و خوبی سے تکمیل تک پہنچا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اس تمام جدوجہد میں بڑی استقامت کا ثبوت دیا تھا۔ اُن کے برعکس، قوم فرعون کے ساختہ پرداختہ کو برباد، اور اُن کی عالیشان عمارات کو تہس نہس کر دیا۔

(لیکن یہ اس داستان کا آخری حصّہ ہے جسے ہم نے اس مقام پر بیان کیا ہے)۔

اس تمکن فی الارض کی تفسیر مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۷۶ تا ۲۹۴ پر آچکی ہے۔

قوموں پر اُن کے غلط نظام کے نتیجے میں، تباہیاں کسطرح آتی ہیں، ان کی تفصیلات سابقہ جلدوں میں آچکی ہیں۔ (ملاحظہ ہو انڈکس)۔ اس کا اصولی تذکرہ آیت (۷/۹۴) میں بھی سامنے لایا گیا ہے۔ اس اصول کے مطابق، قوم فرعون پر بھی تباہیاں آئیں، جن کا ذکر آیات (۷/۱۳۰) و (۷/۱۳۳) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

۷/۱۳۰ وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

قوم فرعون پر تباہیاں

(اُس اُصول کے مطابق جس کا ذکر (۹۴/۷) میں کیا جا چکا ہے) قوم فرعون کے غلط نظام کے نتائج رفتہ رفتہ سامنے آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ وہاں خشک سالی کی وجہ سے، فصلوں میں کمی ہو گئی تو سارے ملک میں قحط پھیل گیا۔ (انہیں اس سے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ غلط نظامِ معاشرہ میں قدرتی حادثات کے مقابلہ کی سکت نہیں ہوتی۔ اس قسم کے حوادث کے مضر اثرات کی روک تھام کا انتظام نظامِ ربوبیت ہی کی رُو سے ہو سکتا ہے)۔

۱۳۳/۷ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

اُن پر سیلاب آئے۔ ٹڈی دل نے تباہی مچائی۔ فصلوں کو برباد کرنے والے کیڑے پیدا ہوئے مینڈکوں کی کثرت ہو گئی۔ فسادِ خون کی بیماریاں رُونما ہو گئیں۔ یہ سب کھلی کھلی علامات تھیں (اس بات کی کہ جب ملک کا نظام صحیح خطوط پر متشکل نہ ہو، تو وہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اربابِ نظم و نسق اپنی عیش پرستیوں میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ انہیں اس طرف توجّہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی)۔ قوم پر اس قسم کی مصیبتوں کے باوجود، اس کا حکمران طبقہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا۔ وہ درحقیقت تھا ہی مجرموں کا گروہ! (جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا، وہ انہی کے جرائم کا نتیجہ تھا)۔

لیکن، بجائے اس کے کہ وہ ان جھٹکوں سے عبرت پکڑتے اور سبق حاصل کر کے اپنے نظام کی اصلاح کرتے، وہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا ذمّہ دار ٹھہراتے۔ فرمایا:

۱۳۲-۱۳۱/۷ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب اُن پر خوش حالی کا زمانہ آتا تو کہتے کہ یہ ہمارے حُسنِ انتظام کا نتیجہ ہے۔ اور جب سختی آتی تو کہتے کہ یہ موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے ہے۔

اُن کی اس مصیبت کا سبب، موسیٰؑ اور اُس کی جماعت کی نحوست نہ تھی (نحوست کسی میں بھی نہیں ہوتی) یہ اُن کی اپنی غلط روش کا نتیجہ تھا جو قانونِ خداوندی کے مطابق مرتب ہو رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ

اس حقیقت کو نہیں جانتے اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کے بجائے دوسروں کو ان کا ذمہ دار قرار دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔) (۴۲/۴) ؛ (۶۹/۴) ؛ (۴۲/۳۰) ؛ (۱۶۴/۳)

قومِ فرعون، موسیٰؑ سے کہتی کہ تو ہم سے اپنا باطل مذہب منوانے کے لئے جتنا جی چاہے زور لگالے، اور جس قسم کی مصیبت ہم پر لاسکتا ہے، لے آ۔ ہم تجھ پر کبھی ایمان نہیں لانے کے۔

اس کے بعد ہے:

۷/۱۳۴-۱۳۵ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝

جب ان پر تباہی آتی تو وہ کہتے کہ اے موسیٰؑ! تو اپنے رب سے دعا کر۔ اگر وہ ہم سے اس عذاب کو ٹال دے، تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے، چونکہ (تو کہتا ہے کہ) خدا نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اس لئے وہ تیری دعا ضرور قبول کرے گا۔

سو جب ہم، کچھ وقت کے لئے، ان سے اس سختی کو دور کر دیتے، جس تک انہوں نے بالآخر اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچکر رہنا تھا[1]، تو وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے۔

اس کے بعد ان کی آخری تباہی کا ذکر ہے، جس میں وہ غرق دریا ہوگئے تھے:

۷/۱۳۶ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝

جب وہ اس طرح (مسلسل اور پیہم) ہمارے قانون کو جھٹلاتے رہے اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کی طرف سے لاپرواہ رہے، تو ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ صورت یوں ہوئی کہ وہ اپنی قوت کے نشے میں بدمست، موسیٰؑ اور اس کی قوم کا تعاقب کرتے ہوئے، سمندر (یا دریا) میں کود پڑے، اور غرق ہوگئے۔ یوں ہم نے

---

[1] قرآن کریم نے اس جگہ کتنی بلند حقیقت کو بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ مصیبت انسان کی طرف نہیں آتی۔ انسان خود مصیبت کی طرف جاتا ہے۔

انہیں تباہ کر دیا۔

غرق ہوتے وقت فرعون کے ایمان لانے کا واقعہ اور اس کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا ذکر مطالب الفرقان جلد دوم صفحات ۲۴۹ تا ۲۵۲ پر آچکا ہے۔

بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے کا ضمنی سا اشارہ آیت (۱۳۸/۷) میں آیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۴ میں ملے گی۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ صحرائے سینا پہنچنے کے بعد بنی اسرائیل نے کس طرح بُت سازی کی فرمائش کی۔

(۱۴۱-۱۳۸/۷) وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○

قوم فرعون ڈوب گئی اور بنی اسرائیل کے لئے ہم نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ سمندر (یا دریا۔ ۵۰/۲) کے پار اتر گئے۔ اس کے بعد اُن کا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جو اپنے بتوں کی پرستش پر جمی بیٹھی تھی (اور یہی چیز ان میں وجہ جامعیت تھی)۔ موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ سے کہا کہ جس قسم کے ان کے دیوتا ہیں، ہمیں بھی اس قسم کا دیوتا بنا دو!

موسیٰؑ نے کہا کہ (میں، اس کے سوا تم سے کیا کہوں کہ) تم بڑے ہی جاہل ہو۔ (۱۳۸)

جس مسلک پر یہ (بُت پرست) چل رہے ہیں، وہ مسلک تباہ ہو کر رہنے والا ہے، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، وہ یکسر باطل ہے۔ اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں۔ (۱۳۹)

اُس نے کہا کہ کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ تجویز کر دوں، حالانکہ وہ خدا ایسا ہے جس نے تمہیں اپنی ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کی ہے۔ (۱۴۰)

اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۳ میں آچکی ہے۔

ان آیات میں صرف بُت سازی کی فرمائش کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ان کی گوسالہ پرستی کا ذکر اس طرح آیا ہے:

۱۴۸ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ۝

گوسالہ پرستی

بہرحال، موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں، اُس کی قوم نے اپنے زیورات وغیرہ گلا کر بچھڑے کا ایک دھڑ سا بنایا۔ (یعنی اس قسم کی طلائی مورتی بنالی جس کی پرستش اہلِ مصر کیا کرتے تھے۔ سامری نے اُس میں ایسی کاریگری رکھ دی (۲۰/۸۸) کہ اس میں سے، ہوا سے، گائے جیسی آواز نکلتی تھی۔ توہم پرست، جاہل قوم کے لئے، یہی چیز، اس جسدِ بے جان کو معبود تسلیم کرنے کے لئے کافی تھی حالانکہ اگر وہ، ذرا بھی عقل و خرد سے کام لیتے تو یہ حقیقت اُن پر واضح ہوجاتی کہ وہ "معبود" اُن سے باتیں نہیں کرتا (اُس میں سے صرف ایک بے معنی سی آواز نکلتی ہے۔ اور وہ آواز ہمیشہ ایک ہی جیسی ہوتی ہے) نہ ہی وہ کسی معاملہ میں اُن کی راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن، اس کے باوجود، اُنہوں نے، اس بچھڑے کو اپنا دیوتا بنالیا۔ وہ کس قدر راہِ حق سے ہٹی ہوئی قوم تھی۔

(ایک مدت کی غلامی نے، اُن سے غور و فکر کی صلاحیتیں اِس حد تک چھین لی تھیں، اور اُن میں اِس قدر احساسِ کمتری پیدا ہوچکا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے حیوان کے بُت کو، اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور اُس کے سامنے جھکتے تھے۔ شرک اِسی لئے جرمِ عظیم ہے کہ وہ اِنسان کو اُس کے مقامِ بلند سے بہت نیچے گرا دیتا ہے۔)

یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔ وہ جب واپس آئے تو:

۱۵۰-۱۵۱ وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝

جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف واپس آیا تو (اُسے ان کی حماقت پر، غصہ بھی آیا) اور افسوس بھی ہوا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ تم نے میری عدم موجودگی میں جو کچھ کیا ہے، بہت بُرا کیا ہے۔ مجھے یہاں سے

گئے ہوئے کچھ ایسا لمبا عرصہ تو نہیں ہو گیا تھا کہ تم مایوس ہو گئے اور خدا کے غضب کو آوازیں دے دیکر بُلا لیا۔ (۲۰/۸۶)۔

پھر اُس نے الواحِ تورات کو ایک طرف رکھ دیا، اور (غصّے میں) اپنے بھائی کے بال پکڑ کر کھینچے (۲۰/۹۴)۔ بھائی نے کہا کہ (مجھ پر اس طرح ناراض نہ ہو۔ میری بات سُن لو۔ میں نے اُنہیں اِس بات سے اس لئے زبردستی نہیں روکا کہ تو آکر کہے گا کہ تم نے قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا، اور میری واپسی کا انتظار تک نہ کیا (۲۰/۹۴)۔ میں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے میری نرمی کو) میری کمزوری پر محمول کر لیا۔ قریب تھا کہ یہ مجھے قتل ہی کر ڈالتے۔ سو تم اب یہ تو نہ کرو کہ مجھے بھی اِن سرکش مجرموں کے زمرے میں شامل کر لو، اور میرے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کرو جس سے ہمارے دُشمن ہم پر ہنسیں (۱۵۰)۔

شرک اور تفرقہ

(جب موسیٰؑ اِس طرح حقیقتِ حال سے باخبر ہوا تو اُس نے) کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھ سے اور میرے بھائی سے جو خطا ہو گئی ہو، اُس سے ہماری حفاظت کا سامان بہم پہنچا۔ اور اپنی نظرِ عنایت کو بدستور، ہمارے شاملِ حال رکھ۔ اس لئے کہ تجھ سے بڑھ کر سامانِ رحمت و عاطفت بہم پہنچانے والا اور کون ہے؟ (۱۵۱)

اِن آیات کے درمیان بنی اسرائیل کی توبہ کا ذکر ہے:

ع/۱۴۹ وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ وَرَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝

جب (موسیٰؑ کے سمجھانے سے اُنہوں نے اپنے کیے پر غور کیا تو) اُس پر سخت نادم ہوئے اور اُنہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ سخت غلطی کر بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ اگر ہمارے نشوونما دینے والے نے ہم پر مہربانی نہ کی، اور ہماری اِس حماقت کے تباہ کن نتائج سے ہمیں محفوظ نہ رکھا، تو ہم یقیناً سخت نقصان میں رہیں گے۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں یہ واقعات صفحات ۲۵۷ تا ۲۵۹ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہے:

ع/۱۵۴ وَلَمَّا سَكَتَ عَنۡ مُّوۡسَى الۡغَضَبُ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ ۖۚ وَفِيۡ نُسۡخَتِهَا هُدًى وَّرَحۡمَةٌ

لِلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ○

اور جب موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا تو اُس نے تختیوں کو اُٹھایا جن پر وحی منقوش تھی۔ جو کچھ اُن پر لکھا تھا، اس میں، اُن لوگوں کے لئے جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف ہوں صحیح راستے کی طرف راہنمائی اور سامانِ رحمت تھا۔

آیات (۱۵۳-۱۵۲/۷) میں ان کی سزا کا ذکر ہے:

(۱۵۳-۱۵۲/۷) إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ○ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

اس پر خدا نے کہا کہ (تم دونوں سے ہم نے درگزر کیا)۔ لیکن جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی اُنہیں، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق سزا ملے گی۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو بے جان حیوان سے بھی زیادہ حقیر سمجھا، اس لئے وہ دُنیا میں ذلیل و رسوا ہوں گے (۲/۶۷)۔ ہم افترا پردازوں کو اُن کی بدعملی کی اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں (۲/۵۴)۔

لیکن جن لوگوں سے (سہواً) کوئی لغزش ہو جائے، اور اس کے بعد، وہ پھر اپنے مقام کی طرف لوٹ آئیں (اپنے کئے پر نادم ہوں اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیں)۔ اور خدا کے ضابطۂ حیات کو اپنا نصب العین بنالیں۔ تو تیرے نشوونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت میں، اُن کی حفاظت اور رحمت کی گنجائش ہے۔

اس سزا کی تفصیل واقعۂ سبت کے ضمن میں سامنے آئے گی جس کا ذکر چند آیات بعد کیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ (آیت ۲/۵۵) میں ہے کہ ان لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر کیا ہوا، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷ پر گزر چکی ہے۔ اسی واقعہ کو آیہ درجِ ذیل میں دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

(۱۵۵/۷) وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ
مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ
وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ○

خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ

اور موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقرر کردہ وقت کے لئے چنے (۷/۱۵۵) جب انہیں سخت زلزلہ نے آ پکڑا تو —— موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! اگر تو چاہتا تو مجھے اور ان لوگوں کو اس سے پیشتر ہی (جب ان لوگوں نے یہ سوال کیا تھا۔ ۲/۵۵) ہلاک کر دیتا۔ (لیکن جب تو نے ایسا نہ کیا تو اس سے ظاہر ہے کہ تیری مشیّت یہی تھی کہ ہم اس طرح ہلاک نہ ہوں۔ تو اب) کیا تو اس بات کی وجہ سے جو ہم میں سے کچھ بیوقوف لوگ کر بیٹھے ہیں، ہمیں ہلاک کر دے گا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ انگیزی، ہماری ہلاکت کے لئے نہیں، بلکہ یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ ہم میں حوادث برداشت کرنے کی کس قدر صلاحیت آ چکی ہے۔ (تاکہ ہم اپنے متعلق کسی غلط اندازے میں نہ رہیں)۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے مقامات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ایسے نازک کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے لوگ، انہی سے غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کا قدم صحیح راستے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔

بہرحال، تو ہمارا کارساز اور سرپرست ہے جو غلطی ہو گئی ہے اس کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت اور رحمت کا سامان کر دے۔ اس لئے کہ سب سے بہتر سامانِ حفاظت عطا کرنے والا تیرا ہی قانونِ ربوبیت ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی اس درخواست کا باقی حصہ اگلی آیت میں ہے، اور اس کے ساتھ، خدا کی طرف سے جواب جو آیت (۷/۱۵۷) تک چلا گیا ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے گزارش کیا کہ:

۷/۱۵۶ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ
عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ○

حضرت موسیٰؑ کی درخواست

اور ہمارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشگواریاں پیدا کر دے اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ اس لئے کہ ہم تیری طرف رجوع کر رہے ہیں۔

اس پر خدا نے کہا کہ میری طرف سے تباہی میرے قانونِ مشیّت کے مطابق صرف اُس پر آتی ہے (جو میرے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ورنہ) میرا عام پروگرام یہی ہے کہ کائنات کی ہر شے، نشوونما حاصل کرکے، اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ (تم دیکھتے ہو کہ خارجی کائنات میں میرا یہ نظامِ ربوبیت ورحمت کس طرح کارفرما ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں) یہ ربوبیت انہیں مل سکتی ہے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں اور دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں، یعنی وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھیں۔

یہ تھا جو ہم نے موسیٰؑ سے کہا۔

اس میں چار اہم نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ دنیا اور آخرت کی حسنات (خوش گواریاں)

۲۔ رحمتِ خداوندی کی وسعت اور عالمگیریت۔

۳۔ انسان اپنے اوپر مصائب آپ لاتا ہے۔

۴۔ رحمتِ خداوندی کے مستحق کون لوگ ہیں۔

دنیا اور آخرت میں حسنات کے موضوع پر، مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحات ۱۵۰-۱۴۹) اور جلد سوم صفحہ ۴۵۲ دیکھئے۔ دین (نظامِ خداوندی) کا ماحصل ہی یہ ہے۔ دنیاوی خوش گواریوں سے وہ رہبانیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اور اُخروی خوش گواریوں سے سیکولرازم کی۔

رحمتِ خداوندی کے قرآنی مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۲۰) دیکھئے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ یہ رحمت کسطرح پوری کائنات کو محیط ہے۔

انسان اپنے آپ کو اس رحمت سے محروم کرکے، کسطرح مصائب کا شکار اور تباہیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے لئے سابقہ جلدوں میں تقدیر اور مکافاتِ عمل کے عنوانات دیکھئے۔ بالخصوص مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۲۰) جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصیبتیں انسان کی اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔

چوتھے نکتہ کے متعلق مختصر سا اشارہ زیرِ نظر آیت میں دیا گیا ہے۔ لیکن تفصیل اگلی آیت میں آئی ہوئی ہے ہم دونوں آیات کا مفہوم یکجا بیان کریں گے۔ واضح رہے کہ آیت نمبر (۷/۱۵۷) میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے مخاطب حضرت موسیٰؑ معلوم نہیں ہوتے کیونکہ اس میں تورات کے ساتھ انجیل کا بھی ذکر ہے۔ اس کے مخاطب

نبی اکرمؐ کی مخاطب قوم، یا اقوام ہیں جن میں بنی اسرائیل (یہودی) بھی شامل ہیں[1] اس کی تائید آیت (۷/۱۵۸) سے بھی ہوتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اس رحمت کے سزاوار وہ لوگ ہوتے ہیں:

۷/۱۵۷ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀

اتباعِ رسولِ اکرمؐ

(ہمارا یہ قانون، سابقہ انبیاءؑ کی وساطت سے بھی ملتا رہا، اور اب یہی قانون اس رسولؐ کی معرفت آیا ہے۔ اس لئے اب ہماری ربوبیت اور رحمت ان لوگوں کے حصّے میں آئے گی، جو نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے) اس رسول کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو (قرآن سے پہلے) اُمّی تھا (۲۹/۴۸)۔ جس کی علامات (یہود و نصاریٰ) اپنے ہاں، تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتا ہے جسے وحیٔ خداوندی صحیح تسلیم کرتی ہے، اور اُن امور سے روکتا ہے جو اس وحی کی رُو سے ناپسندیدہ ہیں۔ اسی وحی کی رُو سے وہ زندگی کی تمام پاکیزہ، خوشگوار چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے، اور اُن خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔ (جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے ۶/۱۴۶)۔ اور (مذہبی پیشواؤں کے جن خود ساختہ آئین و شرائع اور مستبد حکام کے جور و ستم کے) جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی، اس بوجھ کو اُس کے سر سے اتارتا ہے۔

نوعِ انسان کو آزادی عطا کرنا

اور (تقلید و اوہام کی جن زنجیروں میں، انسانی قلب و دماغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے (۴/۴۸) ——— اور اِس طرح انسان کو صحیح آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ (حدود اللہ کا پاس رکھتے ہوئے) اپنی سعی و کاوش سے جن بلندیوں تک جانا چاہے، چلا جائے۔ اس کے راستے میں کوئی روک نہ ہو۔ قرآن کا نظام، ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ (۳/۷۸)۔ وہ

---

[1] ہو سکتا ہے کہ یہ امور حضرت موسیٰؑ ہی سے بطور پیشگوئی کہے گئے ہوں جیسطرح اُن سے حضورؐ کی آمد اور بعثت کا ذکر بطورِ پیشگوئی کیا گیا تھا۔ مخاطب کوئی بھی ہو، ان امور کا اطلاق عام ہے۔

رزق کے سرچشموں کو اربابِ اقتدار کے ہاتھوں سے چھین لیتا ہے تاکہ وہ دوسروں کی محتاجی سے فائدہ اٹھا کر اُن کے آقا نہ بن بیٹھیں۔ (۷۹/۲۴) و (۴۳/۵۱)۔ وہ تقلیدِ آباء کے قلادوں کو توڑ پھینکتا ہے۔ (۲/۱۷۰) و (۴۳/۲۳-۲۲)۔ وہ احبار و رہبان کی فریب کاریوں کو بے نقاب کر کے، اُن کے معتقدین کو خود فیصلے کرنے کے قابل بنا دیتا ہے (۹/۳۱) و (۹/۳۴)۔ وہ نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں کاٹ دیتا ہے (۹/۳۵-۳۴)

لہٰذا جو لوگ اس کی نبوت پر ایمان لے آئیں، اور اس کے پیش کردہ پیغام کے مخالفین کے لئے روک بن کر اُس کی مدافعت کریں۔ اس نظام کے قیام میں اُس کی مدد کریں۔ اور اس مقصد کے لئے اُس روشنی کو اپنے لئے چراغِ راہ بنائیں جسے اِس رسولؐ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ تو یہی لوگ ہونگے جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی، اور جو کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے۔ (۷/۱۵۷)

آیت کا مطلب تو مفہوم سے واضح ہے، کیونکہ وہ بڑا مشرح ہے۔ اس بنا پر چند ایک اشارات کافی ہونگے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جو الدّین نبی اکرمؐ کی وساطت سے (قرآن مجید میں) عطا فرمایا، وہ آخری دین مکمل اور غیر متبدل تھا، تمام نوعِ انسانی کے لئے اور آخری زمانے (قیامت) تک۔ اِس لئے اِس کے بعد تمام سابقہ ادیان (جو مختلف اوقات میں خدا کی طرف سے ملے تھے) منسوخ ہوگئے، اور تمام نوعِ انسان کے لئے (خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہلِ کتاب)، ضابطۂ حیات صرف قرآن مجید رہ گیا۔ سابقہ جلدوں میں اس حقیقت پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ اصل کے اعتبار سے دین ایک ہی تھا جو مختلف انبیائے کرام کو دیا گیا۔ لیکن ان انبیاء کی اُمتوں نے یا تو اس میں تحریف کر دی، اور یا وہ ضائع ہوگیا۔ وہی الدّین اپنی مکمل اور غیر متبدل شکل میں آخری بار قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے ــــــ یہ آخری دین اس لئے ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر سلسلۂ وحی ختم کر دیا گیا ــــــ حضورؐ آخری نبیؐ۔ قرآن آخری کتاب اور الاسلام آخری دین ہے (اہل کتاب کو بالخصوص ایمان لانے کی دعوت کے لئے، دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۸۳۔ اور جلد دوم صفحہ ۱۸۲)

۲۔ لفظ اُمّی کے مفہوم کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۴۷

۳۔ نبی اکرمؐ کی بعثت (یا نزولِ قرآن) کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کو آزادی دلائی جائے ہم سمجھتے ہیں کہ

اسلام کا مقصد ــــــ نوعِ انسان کی آزادی

اسلام کی غرض و غایت کے لئے اس ایک لفظ (آزادی) سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ انسانی غلامی کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ۱۔ ملوکیت۔ یعنی

قوت کے بل بوتے پر کمزور انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرانا۔ ملوکیت خواہ سابقہ زمانوں کی شہنشاہیت ہو، خواہ عہد حاضر کی ڈکٹیٹرشپ اور خواہ مغربی جمہوریت، سب انسانوں کی حاکمیت کی مختلف شکلیں ہیں اسلام ان سب کے خلاف نعرۂ انقلاب ہے۔ ۲۔ نظام سرمایہ داری۔ یعنی انسانوں کو روٹی کا محتاج بنا کر، اُن سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا۔ قرآن اس نظام کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اور ۳۔ مذہبی پیشوائیت۔ یعنی انسانوں کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اُن سے خدا کے نقاب میں اپنی اطاعت کرانا۔

قرآن کریم غلامی کی ہر نوع کے لئے موت کا پیغام تھا۔ وہ ہر قسم کے اغلال و اصر کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ اسکے نظام میں، انسان، خدا کے احکام کے سوا کسی کا محکوم نہیں رہتا۔ یہی بعثت محمدیہؐ کا مقصود و مطلوب تھا۔

۴۔ زکوٰۃ کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔ نیز "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے لئے۔

۵۔ حلال و حرام کی پوری تفصیل سابقہ جلدوں میں ملے گی (انڈکس دیکھئے)

۶۔ رسول اللہؐ اور قرآن پر ایمان لانے والوں کا فریضہ الدین (نظام خداوندی) کا قیام اور استحکام قرار پاتا ہے۔ یعنی ایمان اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کا اتباع ضروری ہے۔

۷۔ کہا یہ گیا ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) رسول اللہؐ کی بعثت کی پیشین گوئیاں اپنی کتابوں (تورات اور انجیل) میں موجود پاتے ہیں۔ ان کتابوں میں، زمانۂ نزولِ قرآن تک میں بھی تحریف و تنسیخ ہو چکی تھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" یا مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں دیکھئے)۔ لیکن اس کے باوجود ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے بچے کھچے آثار میں بھی یہ پیش گوئیاں کسی نہ کسی رنگ میں موجود تھیں۔

کتب سابقہ میں پیش گوئیاں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہؐ کا تذکرہ اپنی کتابوں میں مذکور پاتے ہیں۔ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ۔ بالخصوص یہودی) اس تلاش میں رہتے تھے کہ قرآن کے خلاف اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے۔ اگر وہ اپنی کتابوں میں حضورؐ کی آمد کا تذکرہ موجود نہ پاتے، تو وہ حضورؐ کے دعویٰ نبوت کے خلاف طوفان برپا کر دیتے۔ لیکن انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ اُس زمانے میں ان کتابوں میں یہ تذکرہ موجود تھا۔ اس چودہ سو سال میں، ان کتابوں میں جس قدر تحریف ہوئی ہے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بھی اشارات اور تلمیحات کے انداز میں بعض نشانات ملتے ہیں، (مثلاً) تورات کی کتاب استثنا میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:

میں ان کے لئے (یعنی بنی اسرائیل کے لئے) ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا،

اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔ (باب ۱۸ آیت ۱۸)

بنی اسرائیل کے بھائی، بنی اسمٰعیل تھے۔ اور بنی اسمٰعیل میں سوائے نبی اکرمؐ کے کوئی نبی نہیں آیا اس لئے اس میں اشارہ حضورؐ ہی کی طرف ہے۔ اس کتاب میں ذرا آگے چل کر ہے:۔

خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ ان پر جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ (باب ۳۳ آیت ۲)

فاران مکہ کی پہاڑی کا نام ہے۔ اور دس ہزار قدسی وہی ہیں جن کی معیت میں حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے تھے۔

انجیل۔ کتاب متی (باب ۲۱۔ آیات ۴۳۔۴۲) میں ہے۔

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے گی، دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کے بعد خدا کی بادشاہت کا دعویٰ نبی اکرمؐ کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا (نیز مرقس ۱۲ / ۱۱-۱) یوحنا کی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے کہا:

میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بھیجے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔

(۱۴ / ۱۶)۔ نیز (۱۴ / ۲۶)

اصل لفظ فارقلیط تھا جس کا ترجمہ انجیلوں کے مختلف نسخوں میں، مختلف کیا گیا۔ میرے پیش نظر بائبل کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے برٹش اینڈ بائبل سوسائٹی (لاہور) نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں اس کا ترجمہ "مددگار" کیا گیا ہے اور حاشیہ میں "وکیل یا شفیع" لکھا ہے۔ اور اسی باب کی آیت ۲۶ میں "مددگار یعنی روح القدس" لکھا ہے۔ اس کے سولھویں باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا:

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا (یہاں بھی حاشیہ میں وکیل یا شفیع لکھا ہے)

عیسائیوں کی چار مروجہ انجیلوں کے علاوہ ایک اور انجیل بھی ہے جسے "انجیل برنباس" کہتے ہیں۔ (برنباس بھی حضرت عیسیٰؑ کے ایک معزز حواری تھے)۔ یہ انجیل قدرے غیر محرّف معلوم ہوتی ہے (اس لئے عیسائی اسے مستند تسلیم نہیں کرتے

انجیل برنباس کی شہادت

کی چوتھی جلد میں اس کی تفصیل دیکھی ہو گی)۔ اس انجیل میں متعدد مقامات پر حضورؐ کا نام (محمّد الرّسول اللہ) لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی فصل ۱۶۳ میں ہے:

اس وقت یسوعؑ نے کہا: بھائیو! اس میں شک نہیں کہ برگزیدگی کا سابق میں ہو جانا ایک بڑا بھاری راز ہے۔ تا آنکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اسے صاف طور پر نہیں جانتا مگر فقط ایک ہی انسان۔ اور وہی انسان ہے کہ اُس کی طرف قومیں گردن اٹھا کر دیکھ رہی ہیں۔ وہ ایسا انسان ہے کہ اللہ کے راز اُس پر پوری طرح واضح اور جلی ہوں گے۔ پس زہے نصیب ان لوگوں کے جو اس کے کلام پر کان لگائیں گے۔ جب کہ وہ دنیا میں آئے گا۔

شاگردوں نے جواب میں کہا! اے معلم! وہ آدمی کون سا ہوگا جس کی نسبت تو یہ باتیں کہہ رہا ہے، اور جو کہ دنیا میں عنقریب آئے گا۔

یسوعؑ نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا: بیشک وہ محمّد الرّسول اللہؐ ہے (۲۴۲)

میرے سامنے انجیل برنباس کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے مولوی انشاء اللہ (مرحوم) نے اپنے اخبار وطن سے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے دیگر صفحات (صفحہ ۷۰، صفحہ ۶۴، صفحہ ۱۶۷، صفحہ ۳۰۶) پر بھی اسی طور حضورؐ کا اسمِ گرامی (محمد الرسول اللہؐ) مذکور ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اب یہ سوال محض نظری بن کر رہ گیا ہے، کیونکہ انہیں خود اس امر کا اعتراف ہے کہ اُن کے پاس ان کی کتابیں غیر محرف (اصلی شکل میں کہیں نہیں۔ ہمارے لئے یہی امر موجب اطمینان ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں جب یہ دعویٰ کیا گیا تو یہود اور نصاریٰ میں سے کسی نے اسے چیلنج نہیں کیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اسے صحیح تسلیم کرلیا۔ ویسے بھی اس سے قبل (خود راقم الحروف کی زندگی کے ابتدائی ایام میں، عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے اکثر مناظرے ہوتے تھے، اور ان میں اس قسم کے مسائل زیر بحث آتے تھے۔ لیکن اب زمانے کے تقاضوں نے ہوا کا رُخ بدل دیا ہے۔ اب مذاہب کے بجائے، نظامہائے زندگی کے متعلق بحث ہوتی ہے اور مذہب کا مدار بھی دلائل و براہان پر ہوتا ہے۔ جوں جوں علم و بصیرت کی روشنی بڑھے گی، مذاہب ختم ہوتے جائیں گے اور بات ادیان (نظامہائے حیات) کی رہ جائے گی۔ ان میں اسلام (الدّین) کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکے گا۔

---

* مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا تھا کہ بعثتِ نبی اکرمؐ کے بعد فلاح و بہبودِ انسانیت مشروط ہو چکی ہے رسالتِ محمدیہؐ

(قرآنِ مجید) کے اتباع سے۔ اگلی آیت میں اِسے نکھار کر بیان کر دیا کہ رسالت محمدیہ، تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اِس لئے اب انسانیت کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ فرمایا:

۷/۱۵۸ قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

خدا کے آخری رسولؐ

(اے رسولؐ!) تم تمام نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں (قبائل و اقوام کی قیود، اور نسلی، وطنی اور مذہبی گروہ بندیوں کی حدود سے بلند ہو کر) پوری کی پوری انسانیت کی طرف خدا کا پیغامبر بن کر آیا ہوں ——— اُس خدا کا پیغامبر جس کی حکومت کا تختِ اجلال تمام کائنات میں بچھا ہوا ہے، جس کا قانون ہر جگہ کارفرما ہے۔ اُس کے سوا کائنات میں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ افراد اور اقوام کی زندگی اور موت کے فیصلے اُسی کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم (اپنے اپنے غلط معتقدات و تصورات کو چھوڑ کر) اُس خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسولؐ پر جو {(قرآن ملنے سے پہلے ۲۹/۴۸)} اُمّی تھا۔ وہ خود بھی، سب سے پہلے، خدا پر، اور اُس کی طرف سے نازل کردہ قوانین پر ایمان لایا ہے۔ تم، ان قوانین کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلو۔ بس یہی ایک راستہ ہے جو تمہیں کامیابی کی منزل تک لے جائے گا۔

ہمارے ہاں، مسئلۂ ختمِ نبوّت پر بھی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ (ﷲ الحمد کہ ——— مرزا غلام احمد کے متبعین کو قانوناً دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کے بعد بحثوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا)۔ میں سمجھتا ہوں کہ (دیگر آیات کے علاوہ) صرف یہ ایک آیت اس موضوع پر قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے۔ جس رسولؐ کی رسالت "جمیع نوعِ انسان" کے لئے ہو، اس کے بعد انسانوں کی طرف کسی اور رسول کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آیت (۷/۱۵۵) تک حضرت موسیٰؑ کا تذکارِ جلیلہ، اور اسی ضمن میں داستانِ بنی اسرائیل مسلسل آ رہی تھی۔ درمیان میں تین آیات (۷/۱۵۶-۱۵۸) میں نبی اکرمؐ کا ذکرِ مبارک آ گیا جسے اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم نے درمیان میں سے آیات (۷/۱۴۷-۱۴۲) کو چھوڑ دیا تھا کہ ان میں ایک الگ حقیقت بیان ہوئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ان آیات پر بھی غور کر لیا جائے۔ اور اسکے بعد

آگے بڑھا جائے۔ پہلے آیات ۱۴۳، ۱۴۲ کو یکجا لیجئے، کیونکہ ان میں ایک ہی مضمون آیا ہے۔

(۱۴۳-۱۴۲)
وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ
رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ
قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا
وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ
اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی آرزو

پھر ایسا ہوا کہ موسیٰؑ، ہمارے حکم کے مطابق، ایک ماہ دس دن کے لئے اپنی قوم سے الگ ہوا (۲/۵۱)۔ اُس نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری عدم موجودگی میں، میری جانشینی کرنا اور قوم کی اصلاح کی کوشش کرتے رہنا۔ اور دیکھنا! ان میں ایسا شرارتی عنصر بھی ہے جو انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُن کی راہ نہ چلنا۔ اُن سے محتاط رہنا۔ (۱۴۲)

اور جب موسیٰؑ ہمارے مقرر کردہ وقت پر پہنچا، اور اُس کے رب نے اُس سے باتیں کیں، تو وہ شدتِ اشتیاق سے بے اختیار پکار اُٹھا کہ اے میرے پروردگار! تو میرے سامنے بے حجاب آ جا، تاکہ تیرے دیدار سے میری نگاہ کامیاب ہو۔ اس نے کہا۔ اے موسیٰؑ! تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن تو اُس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہا تو تُو مجھے دیکھ سکے گا۔ سو جب جلالِ خداوندی نے اس پہاڑ پر اپنی نمود کی۔ تو اُس نے اُسے ریزہ ریزہ کر دیا (۵۹/۲۱)۔ اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑا[1]۔ پھر جب وہ ہوش میں آیا تو کہا کہ بار الہا! تو واقعی اس سے بہت بلند ہے کہ انسان تجھے دیکھ سکے میں تیری طرف (ویسے) ہی متوجہ رہوں گا (جیسے تو نے کہا ہے)۔ میں اس حقیقت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں (کہ انسان کے لئے خدا کا دیکھنا محال ہے)۔

---

[1] یہ نبوت کے مقامات ہیں جن کی حقیقت و ماہیت سے غیر از نبی آشنا نہیں ہو سکتا۔ ان حقائق کو بیان تو ہمارے ہی الفاظ میں کیا جاتا ہے لیکن ان کی اصل و غایت کچھ اور ہوتی ہے۔ جسطرح ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جبرئیل، نبیؐ پر وحی کسطرح لاتا تھا، اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ نبیؐ اور خدا کا تعلق کیا ہوتا تھا۔ ہم نبیؐ کی طرف نازل شدہ وحی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کے ہم مکلف بھی نہیں۔

حضرت موسیٰؑ سے متعلق ایک خصوصیت خدا سے ہم کلامی کی بتائی گئی ہے۔اس کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم ۔صفحہ ۲۲۔۲۱ ؛ صفحہ ۲۸۴ پر گزر چکی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ الفاظ کوئی بھی ہوں، مقصد یہ ہے وحیٔ خداوندی ہوتا ہے۔اور چونکہ یہ خاصۂ نبوت ہے، اس لئے کوئی غیر از نبی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کی کنہ وحقیقت کیا ہوتی ہے۔وحی کسطرح نبی پر نازل ہوتی تھی۔اُس وقت نبی کی قلبی کیفیت کیا ہوتی تھی۔وغیرہ وغیرہ۔ہمارا تعلق وحی کے متن سے ہے جسے رسول، دوسرے انسانوں تک، بعینہٖ انہی الفاظ میں پہنچا دیتا تھا۔اور غور وفکر سے اسے سمجھا جاسکتا تھا۔اور سمجھا جاسکتا ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا کو بے حجاب دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔خدا کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم بسیط سے بسیط لفظ بھی استعمال نہیں کرسکتے۔وہ ذات برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ہے۔اس لئے اس کے لئے الفاظ کون سے استعمال کئے جاسکتے ہیں، اس کی جو صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں، ہم انہی کی نسبت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا ہے، اور ایسا ہے۔لیکن اُس وہ کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔چہ جائیکہ اسے آنکھوں سے دیکھا جاسکے۔اس کے خلاف اُس نے خود کہہ دیا ہے کہ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ......(۶/۱۰۴) اس کے یہی معنی نہیں کہ اُسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔یہاں لفظ ادراک آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بصارت اور بصیرت ہر دو اعتبار سے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔اس لئے اُسے آنکھ سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن اس کے باوجود ——— میں نامرادہ دل کی تسلی کو کیا کروں؟ یہ سوال بڑا نازک ہے، اس لئے گہرے غور وتدبر کا محتاج ہے۔

زندگی اپنے ابتدائی مراحل طے کرتی، حیوانی سطح تک آئی تو وہ (یوں کہئیے کہ خالص) طبیعاتی (PHYSICAL) یا مادیاتی (MATERIAL) تھی، اس لئے اس کی دنیا محسوسات تک محدود تھی۔اس کے تقاضے بھی اسی حد تک

انسانی ذات

محدود تھے، اور اس کی خواہشات بھی وہیں تک محصور۔لیکن جب یہ پیکرِ انسانی میں پہنچی تو اس میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔اس کا جسم اور اس کے تقاضے تو طبیعاتی سطح پر تھے۔ لیکن اسے ایک اور شے بھی عطا ہوئی تھی، جسے اس کی ذات، نفس یا خودی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ غیر مادی ہے، اس لئے محسوسات کے دائرے میں آ نہیں سکتی[1] اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ چھو سکتے ہیں۔یعنی اس کا

---

[1] نفسِ انسان کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔دیکھئے انڈکس۔

وجود ہے، لیکن محسوسات سے ماوراء۔ اس حد تک دیکھئے تو یہ صفتِ خداوندی کی حامل ہے۔ اس کا بھی وجود ہے، لیکن محسوسات سے ماوراء۔

مادیت سے اس قدر ماوراء ہونے کے باوجود، نفسِ انسان کا فردِ متعلقہ کے مادی جسم سے تعلق لاینفک ہے۔ وہ اپنے تمام فیصلوں کو انسانی جسم کی وساطت سے بروئے کار لاتا ہے۔ جسمِ انسانی کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہونے کے باوجود نفسِ انسانی، انسانی جسم کی گرفت میں نہیں آسکتا ـــــــ لیکن انسان کو کچھ اور صلاحیتیں بھی دی گئی ہیں۔ (مثلاً) قیاس۔ تخیّل۔ تصوّر وغیرہ۔ فوق الطبیعاتی حقائق (REALITIES) کو تشبیہات اور تمثیلات کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو انسان، اپنے تخیّل اور تصوّر کی رُو سے انہیں محسوس قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی وہ غیر محسوس حقیقت کو، لباسِ مجاز میں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے ـــــــ اور شدّت سے آرزو۔ انسان کی اسی شدّتِ آرزو کا نتیجہ تھا کہ اس نے خدا کو اوتاروں کی شکل میں ڈھال لیا۔ اور ان کے بعد ان کے مجسموں کی پرستش شروع کر دی۔ یوں بُت پرستی کی طرح پڑ گئی۔ دنیا کا قریب قریب ہر مذہب (خواہ وہ عام طور پر متعارف ہو یا غیر معروف) اسی توہم پرستی کا شکار ہے۔ وہ خدا کو کسی نہ کسی محسوس شکل میں دیکھتا ہے۔ اسی سے اس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔

خدا اور انسان

قرآن کریم نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس نے خدا کا ایسا فوق الطبیعاتی منزہ تصوّر پیش کیا، جو کسی محسوس قالب میں ڈھل ہی نہیں سکتا۔ اس نے منسوب بھی ایک محسوس شے اپنی طرف کی۔ یعنی بیت اللہ (کعبہ)، لیکن وہ ایسا ہے جو بُت کی شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک کسی انسان کے خدا بنا دینے کا تعلق ہے، اس کے لئے حضور نبی اکرمؐ کی طرف بھی نگہِ عقیدت اُٹھ سکتی تھی۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی بشریت کو اس وضاحت و صراحت اور اصرار و تکرار کے ساتھ پیش کیا کہ آپؐ کے (خدا ہونے کا تو ایک طرف) فوق البشر ہونے کا تصوّر بھی ختم کر دیا۔ (مسلمانوں نے بعد میں کیا کیا' وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کے لئے میری کتاب "تصوّف کی حقیقت" دیکھئے، یا سابقہ جلدوں میں "غلو" کا عنوان۔ میں یہاں کتاب اللہ کی بات کر رہا ہوں نہ کہ مسلمانوں کے عام عقائد کی)۔

فوق الفطرت حقیقت کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کی یہی شدتِ آرزو تھی جو اس استدعا کی شکل میں حضرت موسیٰؑ کی زبان پر بے ساختہ آگئی کہ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (۱۴۳/۷)۔ اِدھر سے یہ استدعا زبان پر آئی اور اُدھر سے کسی توقف اور تامّل کے بغیر یہ جواب کہ لَنۡ تَرٰىنِیۡ (۱۴۳/۷) "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔[1]

[1] خدا نے تو اپنے متعلق یہ کہا کہ کوئی انسانی آنکھ اُسے دیکھ نہیں سکتی۔ ہم نے اس باب میں کس قدر غلو کیا، اسکے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷۸ دیکھئے۔

اِس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کیا گزری اور پہاڑ پر کیا بیتی، یہ معاملات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اس قسم کے واقعات کا تعلق نہ احکام سے ہوتا ہے، نہ راہنمائی سے۔ اس لئے اگر یہ ہماری سمجھ میں نہ بھی آئیں تو اس سے قرآنی راہنمائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ (جہاں تک پہاڑ کے متزلزل ہونے کا تعلق ہے، اس کا ذکر سورۃ حشر کی آیت ۲۱ (۲۱/۵۹) میں بھی آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو دیکھتا کہ اس پر کسطرح لرزہ طاری ہوجاتا ہے" لیکن وہیں کہہ دیا گیا ہے کہ وہ محض تمثیلی بیان ہے)۔

نبی کی بشری حیثیت

ہمارے لئے اس واقعہ میں ایک ہی نکتہ موجب موعظت ہے۔ اور وہ ہے نبی کی نبوی اور بشری حیثیت میں فرق۔ نبی کو حقائق کا علم وحی کے ذریعے ہوتا تھا۔ جو حقائق اسے بذریعہ وحی نہیں بتائے جاتے تھے، یا جب تک بتائے نہیں جاتے تھے، اُن کا اسے علم نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن عام معمولات میں وہ اپنے معاشرہ ہی کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اور اس سے اُسے صرف وحی منفرد کرتی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے دل میں اگر خدا کو بے نقاب دیکھنے کی آرزو اُبھری تو یہ بہ تقاضائے بشریت تھی۔ وحی نے فوراً بتا دیا کہ خدا محسوسات کا پیکر اختیار نہیں کرسکتا۔ وہ اس سے بلند و بالا اور منزہ ہے۔ اِس کے بعد ایسی آرزو کبھی اُن کے لب پر نہیں آئی۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ قوم موسیٰؑ نے بھی کیا تھا اور اس کی استدعا حضرت موسیٰؑ نے بھی کی لیکن دونوں میں بنیادی فرق تھا۔ قوم بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ (۵۵/۲)۔ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے نقاب نہیں دیکھ لیں گے۔ اور یہ ایسی شرط تھی جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا یہ مطالبہ یا استدعا نہیں تھی۔ جاہلانہ ضد تھی۔ اس کے برعکس جب حضرت نے اس کی استدعا کی اور وہ پوری نہ ہوئی تو اُنہوں نے فوراً کہا کہ انا اول المؤمنین (۱۴۳/۷)۔ میں سب سے پہلے اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ خدا کی ذات ایسی ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ ہوتا ہے فرق ضد پر مبنی مطالبات اور حسنِ نیت پر مبنی درخواستوں میں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کو اُن کے مقام بلند سے آگاہ کیا اور ضروری احکامات وحی فرمائے:

۱۴۴/۷ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ○

اللہ نے کہا کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے دوسرے لوگوں سے ممتاز کیا ہے، دو باتوں میں ——
ایک یہ کہ تجھ سے میں نے باتیں کی ہیں (یہ نبوّت ہے)؛ اور دوسرے یہ کہ تجھے اس پر مامور کیا ہے کہ جو کچھ تم سے کہا گیا اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ (یہ رسالت ہے) لہذا جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے —— یعنی احکامِ خداوندی —— اُسے مضبوطی سے تھامے رہو اور (ان پر عمل پیرا ہو کر) ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہو جاؤ جنکی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کیا کرتی ہیں۔

الواحِ حضرت موسیٰ اُس زمانے کے معمول کے مطابق حضرت موسیٰ نے ان احکام کو تختیوں پر لکھ لیا تھا۔ محققین آثارِ قدیمہ کو اُس زمانے کے کھنڈرات سے ایسی مٹی کی (پربیاں) تختیاں ملی ہیں جن پر تحریریں منقوش ہیں۔ واضح رہے کہ یہ نہیں تھا کہ خدا آسمان سے لکھی لکھائی تختیاں نازل کیا کرتا تھا یا کتابیں۔

حضراتِ انبیاء کرام خدا کی وحی کو اس طرح محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ فرمایا:

۷/۱۴۵ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ۝

اور ہم نے ان تختیوں پر (جن پر موسیٰ نے وحی لکھی تھی) دین کے ہر گوشے سے متعلق احکام اور اخلاقی قدریں صاف صاف بیان کر دی تھیں۔ (یعنی ہم نے ان امور کو موسیٰ پر وحی کیا اور موسیٰ نے انہیں، اس زمانے کے قاعدے کے مطابق، تختیوں پر نقش کر لیا) ہم نے موسیٰ سے کہہ دیا کہ (وہ بھی انہیں ہر وقت پیشِ نظر رکھے) جو معاملہ سامنے آئے، یہ دیکھے کہ ان احکام میں سے کونسا حکم اُس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اُس کا اتباع کرے ($\frac{۳۹}{۱۸}$)۔ (اگر تمہاری قوم نے ایسا کیا تو) وہ بہت جلد دیکھ لے گی کہ (ان کے مطابق عمل کرنے سے کیسے خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں اور) ان کے خلاف چلنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

انہی کے متعلق کہا:

۷/۱۴۶-۱۴۷ سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا
كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا
وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا

عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ
هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ع

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ، نوعِ انسانی کے لئے تعمیری کام کئے بغیر دنیا میں بڑائی حاصل کریں (۲۸/۳۹) وہ ہمارے قوانین سے اپنا رُخ پھیر لیتے ہیں[۱] اُن کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ خواہ اپنی غلط روش کے ایک ایک نتیجہ کو بھی اپنے سامنے کیوں نہ دیکھ لیں، وہ پھر بھی صحیح روش اختیار نہیں کرتے۔ (ان کا بے جا غرور انہیں اس طرف آنے ہی نہیں دیتا) اُن کے سامنے زندگی کی صحیح روش کیسی ہی نمایاں طور پر کیوں نہ آجائے، وہ اس پر کبھی نہیں چلتے۔ لیکن اگر غلط راستہ سامنے آجائے تو اُس پر فوراً چل پڑیں گے۔ ان کی یہ حالت اِس لئے ہو جاتی ہے کہ وہ ہمارے قوانینِ زندگی کو جھٹلاتے ہیں اور اس سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ (۱۴۶)

یاد رکھو! جو لوگ بھی ہمارے قوانین کو جھٹلائیں، اور اسے کبھی تسلیم نہ کریں کہ اُن کی غلط روش کے نتائج، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ضرور سامنے آکر رہیں گے (خواہ اس دنیا میں، یا اِس کے بعد کی زندگی میں) اُن کا کیا کرایا سب رائگاں جاتا ہے۔ (اس سے وہ خوشگوار نتائج کبھی مرتب نہیں ہوتے جو اُن لوگوں کے پیشِ نظر ہوتے ہیں جس قسم کا عمل، ویسا ہی اُس کا نتیجہ (لہذا، جن اعمال میں تعمیرِ انسانیت کا کوئی پہلو نہ ہو ان کا نتیجہ تعمیری کسطرح ہو سکتا ہے؟)

آیات کا مفہوم تو واضح ہے، لیکن ان میں جو آیا ہے: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ تو ان الفاظ کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے —— "میں پھیر دوں گا اپنی آیات سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق"۔

قانونِ مکافاتِ عمل

"میں پھیر دوں گا" سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ خدا لوگوں کو اپنی آیات (احکام یا قوانین) سے پھیر دیتا ہے، لیکن اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ (مثلاً عنوان "تقدیر" یا "مکافاتِ عمل" وغیرہ) کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسا کچھ قوانینِ خداوندی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہاں تو بات ویسے بھی واضح ہے۔ قوانینِ خداوندی

---

[۱] الفاظ یہ ہیں "ہم ان کا رُخ پھیر دیں گے"۔ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جو نتائج خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق برآمد ہوتے ہیں، اُن کی نسبت خدا خود اپنی طرف کرتا ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھئے (۹/۱۲۷ ; ۵۱/۹ ; ۶۱/۵ ; ۸۳/۱۴)۔ اِس ضمن میں (۲/۷) اور (۴/۱۵۵) بھی قابلِ غور ہیں۔

سے رُخ اُن کا پھرنا ہے ــــــ اَلَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۔ یعنی جو زمین میں ناحق تکبّر کرتے ہیں۔ قوانینِ خداوندی کے بجائے اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں۔ اگلے الفاظ نے اس کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہزار نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ صحیح راستہ سامنے آجانے کے بعد بھی اُسے اختیار نہیں کریں گے۔ غلط راستے کی طرف سبقت کرتے جائیں گے۔ ان امور سے بھی واضح ہے کہ یہ سب انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا نام مکافاتِ عمل ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا...... نے بات بالکل واضح کر دی۔ یعنی یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں۔

یہاں یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۔ کو جُرم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی وحیٔ خداوندی کو چھوڑ کر اقتدار (کبریائی) حاصل کرنا جرم ہے۔ بالفاظِ دیگر اقتدار حاصل کرنا جُرم نہیں، اسے وحیٔ خداوندی کے تابع نہ رکھنا جُرم ہے۔ وحیٔ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنے کے لئے تو اقتدار (استخلاف، تمکن) لاینفک ہے ــــ الدین نام ہی اس کا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۴۳ (آیت ۱۲-۱۱ / ۲) میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ آیات (۲۳ / ۱۰) و (۸۳ / ۲۸) و (۱۵ / ۴۱) و (۴۲ / ۴۲) و (۲۰ / ۴۶) میں بھی اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔ (انڈکس میں عنوان علو دیکھئے)

اس کے بعد آیات (۱۵۸ / ۷) تک پہلے آچکی ہیں، اور آیت (۱۵۹ / ۷) سے پھر داستانِ بنی اسرائیل شروع ہو جاتی ہے۔ جو اگلی جلد میں سامنے آئے گی۔

بنگر کہ جوئے نور چہ مستانہ می رود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۵

نواں پارہ ———— ساتویں سُورۃ

سُورۃ الاعراف (۷)

از

آیت نمبر ۱۵۹

پہلا باب
سُورۃ الاعراف

قرآن اور سائنس

۱. عدل کا قرآنی مفہوم
۲. داعیانِ حق کی دلسوزی۔
۳. محکومیت کا رُسواکُن عذاب۔
۴. ایضاعِ صلوٰۃ کا مفہوم۔
۵. یومِ الست کا غلط عقیدہ۔
۶. خدا کے مختلف تصورات۔
۷. نسلِ انسانی کا تسلسل خدا کی ربوبیت کی زندہ شہادت
۸. تارکینِ قُرآن کی مثال
۹. اہلِ جہنم کی علامات ۔عقل وفکر سے کام نہ لینے والے۔
۱۰. علومِ سائنس کی اہمیت۔
۱۱. صفاتِ خداوندی کے اپنانے میں اعتدال۔
۱۲. اَلسَّاعَۃ ۔یعنی انقلابِ عظیم
۱۳. ہمارا شرک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(آغاز)

سورۃ الاعراف

آیت نمبر ۱۵۹

مطالب الفرقان، جلد پنجم کا اختتام سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۸ (۷/۱۵۸) پر ہوا تھا۔ اس سورہ کا بیشتر حصہ کوائفِ حضرت موسیٰؑ اور داستانِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہے۔ جلد پنجم کے آخری صفحات میں بھی انہی کے متعلق آیات درج تھیں، لیکن ان کے درمیان بعثتِ نبی اکرمؐ کا تذکارِ جلیلہ آگیا تھا اور ہم نے اسی آیت (۷/۱۵۸) پر اس جلد کی تکمیل کی سعادت حاصل کی تھی۔ اب آیت (۷/۱۵۹) سے سلسلۂ کلام آگے چلتا ہے۔ ارشاد ہے:

۷/۱۵۹ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓی اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۝

(جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسی قسم کا ضابطۂ ہدایت موسیٰؑ کو بھی دیا گیا تھا) اور اس کی قوم میں بھی ایک گروہ ایسا تھا جو حق کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی کرتا تھا اور اس کے مطابق لوگوں کے فیصلے عدل و انصاف سے کیا کرتا تھا۔ (عدل، ہر قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کو نہیں کہتے۔ اگر قانون ہی غلط ہو تو اس کے مطابق فیصلے کو مبنی علی الحق کیسے کہا جائے گا؟ عدل وہ ہے جس میں ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہو) (۷/۱۸۱؛ ۵/۴۴؛ ۵/۴۸؛ ۳۸/۲۶)۔

اس آیۂ مقدسہ میں دو نکات غور طلب ہیں۔ پہلا یہ کہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کی طرف سے دعوت

دشمن سے بھی عدل

نبی اکرمؐ کی جس قدر مخالفت ہوئی تھی اور اس باب میں وہ جن پست سازشوں اور کمینہ حربوں تک اُتر آئے تھے، قرآنِ کریم میں ان کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلبی کا یہ عالم ہے کہ ان میں اگر کوئی گروہ حق پرستی کا مسلک اختیار کرتا تھا تو قرآن اس کی تعریف کرنے میں ذرا بھی بخل نہیں برتتا۔ عدل کا یہی تقاضا ہے کہ [جیسا کہ قرآنِ کریم نے خود اس کی تاکید کی ہے (۵/۸)] انسان، دشمن کو بھی، خندہ پیشانی سے اس کا حق دیدے۔

دوسرا نکتہ عدل کے مفہوم سے متعلق ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق ضمنی اشارہ مطالب الفرقان، جلد چہارم، ص ۳۳۶ میں کیا جا چکا ہے، لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، ہم اس کی مزید وضاحت (اور اس کا اعادہ) ضروری سمجھتے ہیں۔ دنیا کے عام دستور کے مطابق، اگر کسی مروّجہ قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے تو اسے عدل کہا جائے گا۔ اس سے بحث نہیں ہوگی کہ خود وہ قانون کس قسم کا ہے۔ کیا وہ بھی عدل پر مبنی ہے یا نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ عدل اسی فیصلہ کو کہا جائے گا جو اُس قانون کے مطابق ہو جو الحق (وحیٔ خداوندی) پر مبنی ہو۔ اس کے نزدیک، حق اور باطل، صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، انصاف اور بے انصافی، عدل اور ظلم کا یہی معیار ہے۔ حتّٰی کہ کفر اور اسلام میں بھی حدِ امتیاز یہی ہے۔

عدل کا قرآنی مفہوم

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ ○ ..... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ .... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۵/۴۴؛ ۴۵؛ ۴۷) — "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں — ظالم ہیں — فاسق ہیں"۔ قومِ موسیٰؑ میں بھی جو لوگ اس وحی کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے جو انبیاء بنی اسرائیل پر نازل کی گئی تھی، وہی درحقیقت عادل تھے۔ حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں ان کی کتابوں میں تحریف ہو چکی تھی اور خالص وحی صرف قرآنِ کریم میں محفوظ تھی۔ اس لئے یہودیوں کو بھی سابقہ آیت (۷/۱۵۸) میں رسالتِ محمدیہ پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب قانون، وہی صحیح قانون ہے جس کی تصدیق قرآنِ کریم کرے اور عدل وہی ہے جو اس قانون کے مطابق ہو۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام پھر داستانِ بنی اسرائیل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

۷/۱۶۰ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَیْنَآ

اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

قومِ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے اور وہ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے تھے. جب اس کی قوم نے موسیٰؑ سے پانی کی درخواست کی تو (ہم نے اُس کی راہنمائی اُس پہاڑ کی طرف کردی جہاں پانی کے چشمے مستور تھے. چنانچہ) وہ اپنی قوم کو لے کر اس طرف گیا چٹان پر سے مٹی ہٹائی تو اس میں سے (ایک چھوڑ اکٹھے) بارہ چشمے پھوٹ نکلے (۲/۶۰). اُس نے ان چشموں کو نامزد کردیا اور ہر قبیلہ کو بتا دیا کہ اُس کا چشمہ کون سا ہے.

پھر اُس بیابان میں پانی سے بھرے ہوئے بادل اُن کے سر پر سایہ فگن رہتے تھے. کھانے کے لئے پرندوں کا گوشت اور جنگل کی نباتاتی شیرینی جو ان کے لئے وجہ سکون اور باعث اطمینان تھی (۲/۵۷).

سامانِ رزق کی اس قدر فراوانیاں عطا کرکے ہم نے اُن سے کہا کہ ان پاکیزہ اور خوشگوار چیزوں کو کھاؤ پیو. (لیکن اس پر بھی انہوں نے ہمارے قانون کا اتباع نہیں کیا. سو) اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا. انہوں نے اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کیا.

اس آیت میں بنی اسرائیل کی زندگی کے حسبِ ذیل سوانح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے.

۱. اسباطِ بنی اسرائیل.
۲. استسقا (پانی کی طلب).
۳. بادلوں کی سایہ افگنی.
۴. منّ و سلویٰ.

مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۱۵۹ - ۱۵۸) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ یہ قوم بارہ قبائل (اسباط) پر مشتمل تھی جو حضرت موسیٰؑ کی معیت اور قیادت میں سینا کی وادیوں میں گشت کر رہی تھی۔ اِس صحرانوردی کے دوران پانی کے چشموں کا واقعہ پیش آیا تھا جس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۲۹۷) میں گزر چکی ہے۔

بادلوں کی سایہ افگنی کا بھی وہیں ذکر ہے (جلد دوم صفحہ ۲۸۲) اور منّ وسلویٰ کا بھی (صفحہ ۲۸۳)۔ اُس قوم نے ان عطایائے خداوندی کی کس قدر ناسپاس گزاری کی اس کی تفصیل ان مجلدات میں متفرق مقامات پر ملے گی (دیکھئے مختلف جلدوں کا انڈکس)۔ اصولی طور پر اسے پھر دہرا دیا کہ "خدا کسی قوم پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ قومیں غلط روشِ زندگی اختیار کر کے خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہیں اور تباہ ہو جاتی ہیں۔" (اس سلسلہ میں عنوان "مکافاتِ عمل" اور "قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین" دیکھئے۔

اس کے بعد اُن کی تاریخ کا ایک اور المیہ سامنے لایا جاتا ہے۔ فرمایا:-

(۶۲-۱۶۱) وَاِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ○ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ○

ہم نے ان سے کہا کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے رہو سہو (۵۸/۲؛ ۲۱/۵) اور اس طرح اپنی مرضی سے، جیسے اور جب جی چاہے، سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاؤ، اس شرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو گے۔ اس طرح تمہاری صحرانوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور جو غلطیاں تم سے سرزد ہو چکی تھیں، ان کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان بھی مل جائے گا اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرو گے تو ان فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا

جائے گا (۲/۵۸)۔

لیکن تم نے سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کے بجائے آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی اختیار کر لی (۲/۶۱) اور اس طرح ہمارے قوانین سے سرکشی برتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے سماوی قانونِ مکافات کے مطابق، تم میں مسلسل کمزوری آتی گئی اور جرأت اور ہمت باقی نہ رہی (۲/۵۹؛ ۲۴-۲۲/۵)۔

یہ واقعہ (انہی الفاظ کے ساتھ) آیت (۲/۵۸) میں بھی آچکا ہے جس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۲۸۹-۲۸۵) میں کی جا چکی ہے۔

اگلی آیت میں واقعہ سبت کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ فرمایا:۔

۷/۱۶۳ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

سبت کی خلاف ورزی

اور ان سے اُس بستی والوں کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے واقع تھی۔ (چونکہ یہودیوں کے ہاں سبت کے دن شکار کرنے کی ممانعت تھی اور رفتہ رفتہ مچھلیوں نے اس کا اندازہ کر لیا تھا کہ اُس دن انہیں کوئی نہیں پکڑتا، اس لئے) وہ اس دن پانی کے اوپر تیرتی پھرتی نظر آیا کرتی تھیں اور ہفتے کے دوسرے دنوں میں نیچے نیچے رہتی تھیں۔ جن لوگوں کے دل میں قانون شکنی کے جذبات پرورش پاتے، وہ اتنا بھی ضبط نہ کر سکتے کہ سبت کے دن کاروبار بند رکھنے کی بابت جو طے پایا تھا، اُس کا احترام کرتے۔ چنانچہ وہ اس قاعدے کو توڑ کر بے راہ روی اختیار کرتے (۲/۶۵؛ ۴/۴۷؛ ۴/۱۵۴؛ ۵/۶۰؛ ۱۶/۱۲۴)۔

اس کا اگلا حصہ آیت (۷/۱۶۶) میں یوں آیا ہے:

۱۶۶ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

جب انہوں نے اس بات سے سرکشی اختیار کرلی جس سے انہیں روکا گیا تھا، تو ہمارے قانونِ مکافات نے یہ فیصلہ کردیا کہ وہ ذلت وخواری کے چلتے پھرتے پیکر بن جائیں (۲/۶۵) اور زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ جائیں (۷/۴۷)۔

اس واقعہ کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۳۱۰-۳۰۷) میں کی جاچکی ہے اور مزید وضاحت جلد چہارم (صفحہ ۵۳۶) پر ہے۔

واقعہ سبت کے تمہیدی بیان (۷/۱۶۳) کے بعد کہا:-

۱۶۴ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

(جن لوگوں کا ذکر (۷/۱۵۹) میں کیا گیا ہے، وہ دوسروں کو اس قانون شکنی سے باز رہنے کی نصیحت کرتے لیکن اُن پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا) اس پر اور لوگ اُن سے کہتے کہ تم ان لوگوں کو وعظ ونصیحت کرکے اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ ان کی خوئے سرکشی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ یا تو یکسر ہلاک ہوجائیں گے یا کسی اور سخت عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے (ان میں راہِ راست پر آنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی)۔

اس پر وہ ان سے کہتے کہ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تباہی سے بچ جائیں (اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو) کم ازکم ہم تو خدا کے حضور سرخرو ہوجائیں کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کردیا تھا۔

داعیانِ الی الحق کے احساسِ ذمہ داری اور دل سوزی کا یہی عالم ہوتا ہے (۲۶/۳، ۱۸/۶)

آیت (۷/۱۵۹) میں بتایا جاچکا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک گروہ ایسا تھا جو حق کے ساتھ ان کی راہنمائی کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کے سرخیل خود حضرت موسیٰؑ تھے اور باقی افراد اُن کے متبعین۔ حق و صداقت کی طرف دعوت دینے والوں کی بھی کیفیت عجب ہوتی ہے۔ وہ جنہیں تباہی سے بچانا چاہتے ہیں، وہ اُنہیں گالیاں دیتے ہیں، پتھر مارتے ہیں، طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں۔ انہیں اُن کے گھر بار سے نکال

باہر کرتے ہیں. حتیٰ کہ ان کے خلاف میدانِ جنگ تک میں اُتر آتے ہیں. لیکن اس کے باوجود ان داعیانِ حق و صداقت کے دل میں ان کے خلاف جذباتِ نفرت و انتقام نہیں ابھرتے، بلکہ ان کی تباہی اور بربادی کے احساس سے وہ اور زیادہ ملولِ خاطر ہو جاتے ہیں اور اُن کے غم میں اپنے آپ کو نڈھال کر لیتے ہیں. حضور نبی اکرمؐ سے خود خدا کو کہنا پڑا کہ

داعیانِ حق کی جانسوزی

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

اے رسولؐ! ہم جانتے ہیں کہ تو اپنے سینہ میں ایسا دردمند دل رکھتا ہے) اگر یہ لوگ ایسی واضح حقیقت پر بھی ایمان نہ لائے تو تُو ان پر آنے والی تباہی کے غم میں اپنی جان گھلا لے گا.

اس مقام پر قرآن نے کہا کہ جب ان مخالفین کی یہ حالت ہے کہ یہ تمہاری بات تک سُننے کے لئے تیار نہیں، تو ان سے الگ ہو جاؤ. لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ان تک پیغامِ خداوندی پھر بھی پہنچاتے رہو. سورۃ الانعام میں ہے:

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ (۶/۷۰)

جن لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ (نظامِ خداوندی تو ایک طرف) خود اُس آئین اور ضابطہ کو بھی کچھ اہمیت نہ دیں جسے انہوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھیں اور اِس دھوکے میں رہیں کہ مقصدِ حیات عیش و عشرت ہے اور بس، تم ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی جان مت کھپاؤ. انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو. البتہ، قرآنی تعلیم اُن کے سامنے پیش کرتے رہو اس لئے کہ کسی شخص کو اُس کے غلط اعمال

کی وجہ سے، قرآن سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے. یہ الگ بات ہے کہ اُسے، اُس کے غلط اعمال کے نتائج سے، قانونِ خداوندی کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا. اس کے لئے نہ اُس کا کوئی رفیق اور مددگار ہو سکتا ہے، نہ سفارش، نہ ہی وہ کچھ بدلہ (کفارہ) دے کر اُن کے نتائج سے بچ سکتا ہے. اِن لوگوں کو اُن کے اعمال کے حوالے کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کی سزا بھگتیں (۷۰/۶، ۵۲/۲۱، ۳۸/۴). وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں. حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی، جو عام حالت میں انسان کی پرورش کا موجب بنتی ہیں، ان کے لئے تلخابۂ حیات اور سوہانِ روح ہو جاتی ہیں اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستے پر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور حق وصداقت سے سرکشی برتی تھی (۶/۷۰).

(تشریح اس آیت کی مطالب الفرقان جلد پنجم ص ۴۹-۴۸ پر گزر چکی ہے). وہ یہ فریضہ کسی قسم کی ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید سے نہیں کرتے. وہ اسے خدا کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کے طور پر ادا کرتے ہیں. زیرِ نظر آیت (۷/۱۶۴) میں یہ دونوں نکات آگئے ہیں. جب ان داعیانِ حق سے لوگ کہتے کہ تم ایسے سرکشوں کو پند و نصائح سے اپنی جان کیوں کھپاتے ہو تو وہ کہتے کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۔ اس لئے کہ شاید یہ تباہی سے بچ جائیں. اور جب پوچھا گیا کہ تمہاری اِن جانسوز کاوشوں کا جذبۂ محرکہ کیا ہے تو کہا کہ مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ ۔ اس سے ہم اپنے ربّ کے حضور سُرخرو ہو جائیں گے کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا تھا. قوم کو تباہی سے بچانے کی سعی و کاوش کرنے والوں میں ان دو خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، یعنی غم و غصہ اور نفرت و انتقام کے بغیر، بلا مزد و معاوضہ اپنی کوششوں میں لگے رہنا. اس کو عمل فی سبیل کہا جاتا ہے.

جب داعیانِ حق و صداقت کی ان جانکاہ کاوشوں کے باوجود یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے اور پانی سر سے گزر گیا تو تباہی نے انہیں گھیر لیا۔

۷/۱۶۵ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِۦٓ أَنجَيْنَا ٱلَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ ٱلسُّوٓءِ وَأَخَذْنَا ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ بِعَذَابٍۭ بَـِٔيسٍۭ بِمَا كَانُوا۟ يَفْسُقُونَ ۝

نتیجہ جب ان لوگوں نے قانونِ خداوندی کو یکسر پسِ پشت ڈال دیا، تو ہم نے اُن لوگوں کو، جو انہیں برائیوں سے روکا کرتے تھے الگ کرلیا اور ان نافرمانوں کو، اُن کی سرکشی کی وجہ سے سخت ذلّت آمیز عذاب میں مبتلا کردیا۔

ہم اقوامِ سابقہ کی داستانوں میں دیکھ چکے ہیں کہ جب کسی قوم کی تباہی کا وقت آتا تھا تو ان افراد کو جو حق و صداقت کے پیرو ہوتے تھے، وہاں سے نکال لیا جاتا تھا اور اس کے بعد اُس قوم کو تباہی محیط ہوجاتی تھی۔ قومِ بنی اسرائیل کے ضمن میں یہ تباہی ان کی کسی خاص بستی یا خطۂ زمین کی بربادی کی شکل میں وارد نہیں ہوتی تھی۔ اس قوم پر غلامی و محکومی کی ذلّت آمیز زندگی کی صورت میں عائد ہوتی تھی۔ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جن افراد کے متعلق یہاں کہا گیا ہے کہ انہیں اس عذاب سے محفوظ کرلیا گیا تھا، وہ وہاں سے ہجرت کرکے کسی اور ملک کی طرف چلے گئے ہوں گے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اُس قوم پر غلامی اور محکومی کی مار ماری گئی تھی۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے؛

۷/۱۶۷ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(یہ تھی بنی اسرائیل کی مجموعی حالت۔ اس کی وجہ سے) تیرے نشوونما دینے والے نے (وحی کے ذریعے) اعلان کردیا کہ (اگر یہ لوگ سرکشی سے باز نہ آئے تو) ہم ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسے لوگوں کو مسلّط کرتا رہوں گا جو انہیں بدترین قسم کی سزائیں دیں گے۔ (انہوں نے ہمارے قانونِ مکافات کو یونہی مذاق سمجھ رکھا تھا حالانکہ) یہ حقیقت ہے کہ وہ قانون اپنے پیمانوں کے مطابق، نتائج مرتب کرنے میں کبھی دیر نہیں لگاتا۔ اس میں مہلت کا وقفہ اِس

لئے رکھا گیا ہے کہ اگر لوگ اِس دوران میں اپنی روش میں تبدیلی کرلیں تو ان کے لئے سامانِ حفاظت و مرحمت مہیا ہو جائے۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں داستانِ بنی اسرائیل شرح وبسط کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے۔ اگر آپ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیں تو یہ مقامات جو یہاں اشارۃً یا اختصاراً آئے ہیں، اچھی طرح سمجھ میں آجائینگے

قیامت تک کا مفہوم

اِس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ اس قوم کی تباہی کے سلسلہ میں قانونِ خداوندی کی رُو سے فیصلہ ہوا (یعنی ان کی بے راہ روی اور سرکشی کا نتیجہ یہ تھا) کہ ان پر اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (قیامت تک) ایسے لوگ مسلّط ہوتے رہیں گے جو انہیں بدترین قسم کی سزائیں دیں گے۔ " اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ " کے معنی یہ نہیں کہ مصطلحہ "قیامت کے دن" تک ایسا ہوتا رہے گا۔ یہ ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں، ہمیشہ یا لمبے عرصہ تک۔ خود ہمارے ہاں بھی یہ محاورہ مروّج ہے۔ جب ہم کسی سے کہتے ہیں کہ " تم قیامت تک ایسا نہیں کرسکو گے"، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم کبھی ایسا نہیں کرسکو گے۔ یا جب ہم کہتے ہیں کہ تم میں اور ہم میں یہ لڑائی قیامت تک جاری رہے گی، تو اس کے معنی " ہمیشہ ہمیشہ کے لئے" یا لمبے عرصہ تک کے لئے ہوتے ہیں۔ ان متسلّطین کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر کیا گزری، یوں تو اُن کی ساری تاریخ اس کی شاہد ہے لیکن ان کی دو تباہیاں (جن کا ذکر خود قرآن نے کیا ہے) بڑی قیامت خیز اور عبرت آموز تھیں۔ ان کا ذکر —— مطالب الفرقان جلد دوم —— صفحات ۱۶۵ - ۱۶۰ پر آچکا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہودی مغضوب علیہ قوم ہے۔ اُنہیں کبھی سلطنت اور حکومت میسر نہیں آسکتی۔ ہمارے واعظ اور خطیب اسے اکثر دہراتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب جبکہ یہودیوں کی ایک ایسی مملکت قائم ہو چکی ہے جو مسلمانوں کی قریب چالیس آزاد اور بڑی بڑی سلطنتوں کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے، یہ حضرات برابر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ انہیں حکومت نہیں مل سکتی۔ ہم نے اس غلط فہمی (یا خوش فہمی) کے ازالہ کے لئے مطالب الفرقان جلد دوم ص۱۶۸ میں وضاحت کردی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا کہ اس تباہی سے ان کی حالت کیا ہو گئی۔ فرمایا؛

۷/۱۶۸ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ

دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

(چنانچہ ان کے عذاب کی ابتدا، اس طرح ہوئی کہ) ان کی مرکزیت تباہ ہوگئی اور وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے (کسی قوم کا مختلف پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانا، خدا کا سخت عذاب ہوتا ہے (۶/۶۵)۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہوئے، زندگی کو سنوارتے تھے اور کچھ ایسے پیچھے جو اس روش کے خلاف چلتے تھے۔ ہم اُن کی قومی زندگی کے مختلف پہلو بدلتے رہے۔ کبھی ان پر خوشحالی کا دور آجاتا، کبھی بدحالی کا۔ (انہیں یک لخت تباہ نہیں کر دیا گیا تھا) اور یہ اس لئے کہ ممکن ہے وہ قانونِ خداوندی کی طرف لوٹ آئیں۔

تفرقہ خدا کا عذاب ہے تفرقہ (فرقہ بندی اور پارٹی بازی) کس قدر شدید عذاب ہے اور قرآن کی رُو سے شرک، اس کے متعلق متعدد مقامات پر نہایت وضاحت سے لکھا جاچکا ہے (اس سلسلہ میں انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات دیکھئے)۔ داستانِ بنی اسرائیل کا آغاز اس سے ہوا کہ فرعون انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا (وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا ۲۸/۴)۔ انہیں اِس عذاب سے نجات دلائی گئی۔ اس طرح وہ ایک امت بن گئے تو انہیں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کا وارث بنا دیا گیا۔ انہوں نے اپنے اوپر خود تفرقہ کی لعنت مسلّط کر لی تو ذلّت وخواری کے بدترین عذاب میں ماخوذ ہو گئے۔ اقبالؒ نے اس غضبِ الٰہی کا ذکر ہمارے سلسلہ میں بھی کیا ہے کہ "امتے بودی اُمم گردیدہ"۔ تم ایک امت تھے۔ اس کے بعد مختلف فرقوں اور پارٹیوں، نسلوں اور قوموں گروہوں، قبیلوں، ذاتوں اور برادریوں میں بٹ گئے۔

آیۂ زیرِ نظر میں پھر بنی اسرائیل کے دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو حق کے پیرو تھے۔ دوسرے وہ جو اس کے خلاف روشں پر گامزن تھے۔

اِس آیت میں خدا کے قانونِ مہلت کا بار دیگر ذکر آیا ہے، یعنی قوموں کی تباہی یک لخت وارد نہیں ہو جاتی۔ انہیں مہلت دی جاتی ہے کہ شاید وہ اِس دوران میں اپنی غلط روش میں تبدیلی کر لیں۔ (اِس کی

وضاحت کے لئے انڈکس دیکھئے بالخصوص جلد اوّل صفحہ ۱۹۷؛ جلد چہارم صفحہ ۲۳۶ اور جلد پنجم صفحات ۴۷؛ ۴۸)۔
اور اس کے بعد:

۱۷۰-۱۶۹ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ
عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَاِنۡ
يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ
مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ وَدَرَسُوۡا
مَا فِيۡهِ ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّـلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا
تَعۡقِلُوۡنَ ۝ وَالَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ
اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ۝

(ابتداءً ان کی یہ حالت رہی) لیکن اس کے بعد جو نسلیں ان کی جانشین ہو کر، ہمارے ضابطۂ قوانین کی وارث بنیں، ان کی حالت یہ تھی کہ وہ پیشِ پا افتادہ، دنیاوی مفاد پر جھپٹ پڑتے اور کہتے کہ اس کی ہمیں معافی مل جائے گی۔ اس کے بعد اس قسم کا کوئی اور مفاد سامنے آجاتا تو اسے بھی جھپٹ لیتے۔ یعنی ان کی روش ہی یہ ہوگئی کہ جونہی کوئی فائدہ سامنے آیا، اصول اور ضابطہ، قاعدہ اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر اس کی طرف لپک پڑتے۔

(ان سے کوئی پوچھتا کہ) کیا تم سے کتاب اللہ کے مطابق، یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ تم خدا کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہو گے؟ — یہ اُس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے بھی رہتے ہیں۔ — (اُس کتاب میں یہ لکھا ہوا تھا کہ) اُن لوگوں کے لئے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں (حیوانی سطحِ زندگی کے قریبی مفاد کے مقابلہ میں) مستقبل کی خوشگواریاں کہیں

بہتر ہیں. کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ (۷/۱۶۹)

(اور اُس کتاب میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ) جو لوگ خدا کے ضابطۂ قوانین سے متمسک رہیں گے اور نظامِ صلوٰۃ کو قائم کریں گے. تو ہم اُن لوگوں کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کریں گے جو اپنی زندگی اور معاشرہ کو سنوارنے والے ہوں (۷/۱۷۰).

اس قسم کے ناخلف جانشینوں یا اُمتوں کا ذکر سورۂ مریم میں بھی آیا ہے.

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ (۱۹/۵۹)

(یہ لوگ تو اِن خصوصیات کے حامل تھے، لیکن) ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا، یعنی (قوانینِ خداوندی کے اتباع کے بجائے) اپنے مفاد اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے. (اب ان کے لئے پھر ایک موقع آیا ہے. اگر انہوں نے اسے بھی کھو دیا) تو یہ بہت جلد اپنی ہلاکت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ لیں گے.

ایضاعِ صلوٰۃ صلوٰۃ کس طرح ضائع کی جاتی ہے، اس کے لئے (انڈکس میں) صلوٰۃ کا عنوان دیکھئے. صلوٰۃ کا مفہوم سمجھ میں آجانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے اور ایضاعِ صلوٰۃ سے مراد کیا؟ اقامتِ صلوٰۃ ہے دینِ خداوندی (قرآنی نظام) کا قائم کرنا اور ایضاعِ صلوٰۃ کے معنی ہیں، قرآنی نظام کو بگاڑ کر اس کی جگہ غیر قرآنی نظام کو اسلام قرار دے لینا.

آیۂ زیرِ نظر (۷/۱۶۹) میں وارثینِ کتاب کا ذکر آیا ہے. ہمیں بھی وارثینِ کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے، لیکن ذکر ہمارا ان الفاظ میں کیا گیا ہے.

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَ مِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ ؕ (۳۵/۳۲)

(اس کتاب — قرآن — میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو انسان کی راہنمائی کے لئے ضروری ہے. اس لئے اب وحی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا. اس کے بعد کرنا صرف یہ ہوگا کہ انسانی

معاشرہ کو اس تعلیم کے مطابق متشکل کیا جائے)اس کام کے لئے ایک جماعت (امت) کی ضرورت ہوگی۔ یہ اُمّت منتخب کرلی گئی ہے (۲/۱۴۳؛ ۳/۱۰۹) اور اس کے سپرد اس کتاب کو کردیا گیا ہے۔

لیکن اس امت کی یہ حالت ہوگی کہ ان میں سے کچھ تو قرآن کے مطابق عمل کرنے میں آگے بڑھ جائیں گے، کچھ میانہ روی اختیار کریں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو اسے چھوڑ کر اپنے آپ پر ظلم کریں گے۔ جو آگے بڑھ جائیں گے وہ بلند مدارج کے مستحق ہوں گے۔

ناخلف جانشین ہمیں اپنی حالت کا جائزہ لے کر خود فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہمارا شمار کس زمرہ میں ہوتا ہے۔ حالت ہماری اس قدر واضح ہے کہ اس کی روشنی میں امر کا فیصلہ کرنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئے گی۔

اس کے بعد داستانِ بنی اسرائیل کی ایک اور کڑی سامنے لائی گئی ہے۔ یعنی

۷/۱۷۱ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ع

اور جب اس پہاڑ میں زلزلہ آیا جس کے دامن میں بنی اسرائیل ٹھہرے ہوئے تھے اور ایسا نظر آنے لگا گویا وہ ایک سائبان ہے جو اس طرح ہل رہا ہے کہ ان کے سروں پر گرا چاہتا ہے۔ (اس سے اُن کی توہم پرستی نے اُن کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کرنے شروع کردیئے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ان حوادثِ فطرت سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں) جو کچھ ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے دیا ہے اس پر نہایت مضبوطی سے کاربند رہو اور اس کی تعلیم کو ہر وقت سامنے رکھو۔ اس سے تم تمام خطرات سے محفوظ رہو گے۔

کوہِ طور کا ذکر مطالب الفرقان جلد دوم ص۳۰۶ پر بھی آیا ہے۔ یہاں پہاڑ کے زلزلہ کا ذکر ہے۔ زلزلوں جیسے حوادثِ ارض کے ساتھ آج بھی دنیا کی بیشتر اقوام کے توہمات وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ آج سے

ہزاروں سال پہلے کا زمانہ تھا اور قوم وہ تھی جو اپنے سامنے بنائے ہوئے گوسالہ کی پرستش کرنے لگ گئی تھی۔ اُس کے زلزلہ سے توہم پرستی کا شکار ہو جانے پر کیا تعجب ہو سکتا ہے۔ اس توہم پرستی کے ساتھ خوف بھی شامل تھا۔ غور فرمائیے کہ وحیٔ خداوندی نے اس کا علاج کیا بتایا ہے۔ یہ کہ جو تعلیم انہیں دی جارہی ہے، اس کے محکم طور پر پابند رہیں۔ اس سے وہ اس قسم کے حوادث سے بھی محفوظ رہیں گے اور توہمات سے بھی مامون۔

حوادثِ فطرت سے محفوظیّت

یہ تعلیم کیا تھی؟ بات واضح ہے۔ آپ انڈکس میں "تسخیرِ فطرت" اور "کائنات" کے عنوانات دیکھئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وحی نے اس راز کا انکشاف کیا کہ سلسلۂ کائنات، علّت اور معلول Cause and effect کے محکم نظام کے تابع کارفرما ہے جس کے لئے غیر متبدّل قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے اور پھر عمل پیرا ہونے سے کائناتی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور انسان ان کے مُضر اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ جو تعلیم وحی نے عطا کی ہے، اس پر پوری قوت سے عمل پیرا ہو گے تو تم اس قسم کے خطرات سے محفوظ رہو گے۔ اس سے واضح ہے کہ جو کتاب حضرت موسیٰ کی طرف نازل ہوئی تھی، اس میں (قرآنِ کریم کی طرح) قوانینِ فطرت بھی تھے (اس کتاب کا آج پتا نشان تک نہیں ملتا (ملاحظہ فرمائیے عنوان "تورات")۔

لیکن ہماری تفاسیر اور ان پر مبنی قرآن کے تراجم، جب تک حقیقت کو افسانہ نہ بنادیں، انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تفسیر ابنِ کثیر میں زیرِ نظر آیت کے سلسلہ میں لکھا ہے:

ہماری کُتبِ تفاسیر

مروی ہے (یعنی یہ تفسیر مفسّر کی اپنی نہیں، ایک روایت پر مبنی ہے) کہ جب کلیم اللہ (علیہ صلوٰت اللہ) نے ان سے فرمایا کہ لو! اللہ کی کتاب کے احکام قبول کرو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں سناؤ، اس میں کیا احکام ہیں۔ اگر آسان ہوئے تو ہم قبول کرلیں گے، ورنہ نہ مانیں گے۔ حضرت موسیٰ کے بار بار کے اصرار پر بھی یہ لوگ یہی کہتے رہے۔ آخر اُسی وقت خدا کے حکم سے پہاڑ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے سر پر معلق کھڑا ہو گیا اور خدا کے پیغمبر نے فرمایا، لو! اب بھی مانتے ہو یا خدا تعالیٰ تم پر پہاڑ گرا کر تمہیں فنا کردے؟ اس وقت یہ سب کے سب مارے

ڈر کے سجدے میں گر پڑے۔

(تفسیر ابن کثیر، اُردو ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی مرحوم، نواں پارہ صفحہ ۲۲)

اس آیت کے ساتھ داستانِ بنی اسرائیل کا سلسلہ (سر دست) اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آغازِ سخن ایک ایسی آیت سے ہوتا ہے جس کے غلط مفہوم نے کئی ایک ایسے غلط عقائد، باطل تصورات اور گمراہ کن نظریات پیدا کر دیئے ہیں جن سے اسلام (یعنی قرآن) کی بنیادی تعلیم تک اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتی ہے۔ وہ آیت اور اس کی متعلقہ آیات یوں ہیں؛

(۷ / ۱۷۲-۱۷۴) وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ
قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا
كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا
مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ۝

قبل اس کے کہ ہم ان آیات کا صحیح مفہوم (مفہوم القرآن سے) درج کریں، مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا مروّجہ ترجمہ پیش کر دیا جائے جس پر وہ تمام غلط نظریات وغیرہ مبنی ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ مروّجہ تراجم میں، شیخ الہند مولانا محمود الحسن (دیوبندی) کا ترجمہ نہایت معتبر تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ترجمہ یوں ہے؛

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر ۔ کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ کبھی کہنے

لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے اُن کی اولاد اُن کے پیچھے. تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے. اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تاکہ وہ پھر آ ئیں.

اِس پر شاہ عبدالقادرؒ کا تشریحی حاشیہ یوں درج ہے ؛

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے انسانی اولاد اور اُن سے اُن کی اولاد نکالی سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا. پھر پشت میں داخل کیا. اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے اب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے..... اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل ؛ تو یوں سمجھو کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے. سارا جہان قائل ہے. جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے، سو اپنی عقلِ ناقص کے دخل سے. پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے.

اس پر حسبِ ذیل عقائد و نظریات بطورِ مسلّمات ہمارے ہاں مروّج چلے آ رہے ہیں (اور مقامِ تأسف ہے کہ ان کی تائید و تصدیق میں احادیث درج کی جاتی ہیں جن کے متعلق بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں اور وہ وضعی ہیں) . وہ عقاید یہ ہیں:

یومِ الست کا غلط عقیدہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی پیدائش سے پہلے اُن سے اپنی ہستی کا اقرار لے لیا تھا.

(۲) خدا کی ہستی کا اقرار ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے. انسان کی فطرت خود خدا کی فطرت ہے جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے.

(۳) خیر و شر (غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز) کی تمیز بھی انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے. اسے ضمیر کی آواز کہہ کر پکارا جاتا ہے.

یہ نظریات قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں اور واقعات و مشاہدات بھی ان کی تائید نہیں کرتے مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۲۷-۳۲) میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے کہ انسان کی فطرت کا نظریہ غلط ہے. فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے (جسے جبلّت بھی کہا جاتا ہے) صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کی نہیں. انسان کو کچھ صلاحیتیں دی گئی ہیں اور اسے اِس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ انہیں جس طرح جی چاہے استعمال کرے.

جس طریق اور جن مقاصد کے حصول کے لئے وہ انہیں استعمال کرے گا' اس کے مطابق نتائج مرتب ہو جائیں گے۔
اسی طرح یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان
جلد دوم (صفحہ ۳۸) میں ملے گی۔ اسی بنیاد پر متفرع' ایک اور عقیدہ بھی ہے جسے ضمیر کی آواز Human
Conscience کہتے ہیں۔ یہ عقیدہ اتنا عام ہے کہ ہم اٹھتے بیٹھتے اس قسم کے الفاظ سنتے رہتے ہیں کہ
"انسان کو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرنا چاہیئے"۔

فطرت، ضمیر وغیرہ کے باطل نظریات

اگرچہ' جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے اس کے پیشِ نظر' اس غلط نظریہ کے ابطال کے لئے کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں' لیکن اس کی ہمہ گیریت کے احساس اور عمومی اہمیت کے زیرِ نظر اس کی مزید وضاحت غیر محل نہیں سمجھی جائے گی۔ اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ذیل کی چند سطور اس سے مقتبس ہیں:۔

"عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوتِ تمیز موجود ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا۔ اس قوتِ تمیز کا نام "ضمیر" Conscience رکھا گیا ہے۔ اس کو انسان کے اندر کی آواز یا دل کا فتوےٰ کہا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع انسان کے اندر کوئی قوتِ تمیز ہے جو اُسے جائز اور ناجائز کا فرق بتا دے؟ یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق اور باطل' خیر اور شر' جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے اندر سے ایک آواز ضرور اٹھتی ہے جو اسے بعض کاموں سے روکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ آواز حق اور باطل کی تمیز بھی کرتی ہے؟ مشاہدہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حق اور صداقت' مطلق اقدار Absolute values کا نام ہے' اضافی اقدار کا نام نہیں' یعنی حق کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک انسان کے لئے حق ہو اور دوسرے کے لئے حق نہ ہو۔ اگر انسان کے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے اندر سے یکساں اٹھنی چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گوشت کھانے والے خاندان کے بچے کے سامنے جب گوشت

آتا ہے تو اس کی ضمیر اسے بالکل نہیں ٹوکتی. لیکن ایک سبزی خور گھرانے کے بچے کے سامنے گوشت کا نام آجانے سے اُس کی طبیعت اِبا کرنے لگتی ہے. جرائم پیشہ قبائل (مثلاً ٹھگوں) کے بچے بلا تکلف انسان کی جان لے لیتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں. لیکن جینیوں کا بچہ کیڑوں مکوڑوں کو بھی ایذا نہیں پہنچاتا. اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ لوّامہ برائی سے روکتا ہے.

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ (۷۵/۲)

اور نہیں، میں انسان کے احساسِ ندامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں.

لیکن وہ صرف اس برائی سے روکتا ہے جسے وہ برائی سمجھتا ہے. اس نفس میں لوّامیّت کا جوہر تو ہے لیکن وہ اس چیز کے خلاف ملامت کرتا ہے جسے اُس نے (مختلف اثرات کے ماتحت) قابلِ ملامت سمجھ رکھا ہے. لہٰذا جس چیز کو "ضمیر کی آواز" کہا جاتا ہے وہ حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ "آواز" خارجی اثرات سے متاثر ہوتی ہے."

Samuel اِس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

اگر یہ صحیح ہوتا کہ انسان کے اندر ایک ایسی فطری جبلت ہے جو دیگر اثرات سے آزاد ہے اور حق و باطل کے فیصلہ میں کبھی غلطی نہیں کرتی تو نیک عملی کے ہر معاملہ میں تمام انسان ہمیشہ متفق ہوا کرتے اور آج بھی متفق نظر آتے. لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم آہنگی نہ کبھی پہلے ہوئی ہے اور نہ آج ہے. اس سے ظاہر ہے کہ کسی آدمی کا یہ کہنا کہ "میں نے فلاں بات کو نہایت دیانت داری سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے" اس بات کو فی الحقیقت حق نہیں بنا سکتا.

(ابلیس و آدم صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۸)

لہٰذا جس چیز کا نام ضمیر رکھا ہے وہ ان اثرات سے مرتب ہوتی ہے جو انسان غیر شعوری طور پر وراثت، ماحول، تربیت اور تعلیم سے اخذ کرتا ہے. اس کے سوا اس کا اپنا وجود کچھ نہیں ہوتا. اقبالؒ کے الفاظ میں ضمیر Internalized Society کا نام ہے. لہٰذا ضمیر میں یہ صلاحیت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ حق اور باطل، خیر اور شر، غلط اور صحیح کا امتیاز کر کے بتا دے.

اقرارِ الوہیت انسان کے اندر نہیں

یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنی ہستی کا اقرار ہر انسان کی رُوح سے (اُس کی پیدائش سے بھی پہلے) لے لیا تھا لہٰذا اس کی ہستی کا تصور ہر انسان کے اندر خود موجود ہے، بالبداہت غلط ہے. لاکھوں کروڑوں انسان ہیں جو خدا کے وجود کے منکر ہیں. وہ خود بھی منکر ہیں اور اُن کے بچے بھی اسی انکار کو لئے ہوئے بڑے ہوتے ہیں. اگر یہ کہا جائے کہ ان کے اندر تو وجودِ باری تعالیٰ کا تصور موجود ہوتا ہے لیکن ان کی "ناقص عقل" اسے محو کر دیتی ہے، تو (اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا) جس عقیدہ کو انسان کی ناقص عقل محو کر دے، اسے روزِ ازل سے اس کے اندر رکھنے سے حاصل کیا ہوا؟

اس عقیدہ پر دوسرا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر وجودِ باری تعالیٰ کا تصور روزِ ازل سے تمام انسانوں کے اندر رکھ دیا گیا تھا، تو یہ تصور تمام خدا پرستوں کے ہاں یکساں ہونا چاہیئے تھا، لیکن واقعات اور مشاہدات اس کی تردید کرتے ہیں. مختلف افراد ہی میں نہیں مختلف مذاہب میں بھی خدا کا تصور ایک دوسرے سے مختلف ہے. خدا کے تصور کا یہی اختلاف ہے جس کی وجہ سے قرآن اور نوادر اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ تک) سے بھی خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے، یعنی اُس خدا پر جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے.

خُدا کا تصوّر

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (مختصر الفاظ میں) "خدا کے تصور" کے متعلق مختلف نظریات پیش کر دیئے جائیں. اسے ہم اپنی کتاب "من و یزداں" سے ملخصاً درج کرتے ہیں:-

آپ تاریخِ انسانی کے کسی دَور سے گزریئے اور رُوئے زمین کے کسی خطّہ پر نظر ڈالئے، ایک چیز آپ کو، بلالحاظِ زمان و مکاں بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی، یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی فوق البشر قوّت کا احساس جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے، جس سے مرادیں مانگی جائیں، جس سے ڈرا جائے، جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں، جس کے چرنوں میں شردھا (عقیدت) کے پھول، چڑھائے جائیں. دنیا کے سیّاح، مغربی محققین اور مکتشفین، اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں، جہاں اس سے قبل کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے (تہذیب و تمدّن سے قطعاً ناآشنا) یکسر حیوانی سطح کی وحشت و درندگی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو (اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ) ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی،

بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ مشہور یونانی مؤرخ، پلوتارک Plutarch AD 102-42 اس باب میں لکھتا ہے:

زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں۔ ایسے بھی جہاں محلات ہیں، نہ ورزش گاہیں، نہ تھیٹر۔ لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں، جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں، جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

تصوّر میں اختلاف

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے، اس کا تصور اور اس کی تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ ایک ہی ملک میں، ایک قبیلے کا "معبود" دوسرے قبیلے کے معبود سے نہیں ملتا۔ ایک ملک کا "خدا" دوسرے ملک کے "خدا" سے مختلف ہے۔ ایک قوم کا "دیوتا" دوسری قوم کے "دیوتا" سے جداگانہ ہے۔ ایک فرقے کا "ایشور" دوسرے فرقے کے "ایشور" سے متباین ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر تک، مغربی محققین کے ایک گروہ کا خیال تھا (اور ممکن ہے اب بھی اس خیال کے مؤید وہاں موجود ہوں) کہ ابتدائی دَور کے انسان نے جب دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں (مثلاً موسمی تغیرات، طوفان باد و باراں یا وبائی امراض وغیرہ) جن کے علل و اسباب اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور اس کے ذہن کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، ان حوادث کے پیچھے کوئی بہت بڑی قوتیں ہیں جو اسے نظر نہیں آتیں۔ اس طرح انسان کے ذہن میں "خدا" کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصوّر مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے تحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اور انسان ترقی کرتا گیا، اس تصوّر میں بھی جِلا پیدا ہوتا گیا! اس طرح بتدریج "خدا" کا وہ تصوّر وجود میں آگیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو "خدا کے تصوّر کا ارتقاء" کہا جاتا ہے جس کی تفصیل گرانٹ ایلن GRANT ALLEN کی کتاب The Evolution of the Idea of God یا فریزر Frazer کی Golden Bough وغیرہ کتابوں میں ملے گی۔ لیکن بعد کے محققین نے اس نظریہ کی تردید کر دی اور کہا کہ خدا کا صحیح تصوّر شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ اس میں تدریجی

اس کی تردید

ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی Dr. Arnold Toynbee اپنی کتاب An Historien's approach to Religion میں لکھتا ہے کہ

> پروفیسر شمٹ کی تحقیق یہ ہے کہ خدا کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے، یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے انہوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مذہب یہی تھا جس کا احیاء بلند مذاہب نے کیا ہے۔ (صفحہ ۱۸)

پروفیسر شمٹ Schmidt کی جس کتاب The Origin and Growth of Religion سے ڈاکٹر آرنلڈ نے مذکورہ بالا نتیجہ پیش کیا ہے، وہ اس موضوع پر دورِ حاضر کی بہترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ "انسان کے ابتدائی تمدن میں جس بلند ہستی کا تصور پایا جاتا ہے، وہ وہی تصور تھا جو توحید کے علمبردار مذاہب کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ نسلِ انسانی کے قدیم ترین قبائل میں سے اکثر کی نسبت یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خدا کے متعلق اُن کا یہی تصور تھا۔ لہٰذا 'ارتقائی مذہب' کا نظریہ اب عمرانیات کے پورے میدان میں یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے۔"

چونکہ ہماری کتاب کا موضوع خدا کے تصور یا عقیدہ کا تاریخی استقصا نہیں، اس لئے ہم اس نکتہ کی مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھتے۔ ہمارے مقصد پیشِ نظر کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا، خدا کی طرف سے، بوساطتِ انبیائے کرامؑ وحی کی راہنمائی آنی شروع ہوگئی۔ اس تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا۔

خدا کا صحیح تصوّر

اور ظاہر ہے کہ جب اس علم (وحی) کا سرچشمہ ایک ہی (خدا) تھا تو یہ تصور بھی شروع سے اخیر تک ایک ہی ہوگا (اور ایک ہی تھا)۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا، کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدیس کے پیشِ نظر ان کے مجسّمے کھڑا کرتا، بُت تراشتا۔ چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا ــــ اِندر ــــ اگنی ــــ سورج ــــ چاند ــــ گنگا ــــ جمنا ــــ

سانپ، گائے، بیل، سب اس جذبہ خوف و امید (یعنی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں.

جب ذہنِ انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جاتیں، تو پھر ایک اور رسول آ جاتا جو خدا کے پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے، ساجد نہیں. اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رُو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے. سمندروں کی شورانگیزیاں، پہاڑوں کی گراں سامانیاں، تحت الثریٰ کی آتش نشانیاں، اوجِ ثریا کی طلعت آفرینیاں اور نورپاشیاں، دریاؤں کی (گاہ) وحشت خیز تلاطم خیزیاں اور (گاہ) سکوں افزا روانیاں، ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں، خوفناک صحراؤں کی دہشت انگیزیاں اور حیرت افزائیاں، غرضیکہ یہ جملہ کائنات اور اس کے مختلف اور متنوّع مظاہر سب انسان کے سامنے ہاتھ باندھے خدمت کے لئے کھڑے ہیں. لہٰذا ان چیزوں کے سامنے جھکنا اور انہیں اپنا آقا اور حاکم تصوّر کرنا چہ معنے؟

وحی کا یہ سلسلہ اس نہج و انداز سے جاری رہا، تا آنکہ جب ذہنِ انسانی سنِ شعور کے قریب پہنچ گیا تو خدا کا پاکیزہ اور منزّہ، صاف اور شفاف، بلند و بالا تصوّر، ایک مکمل صورت میں، قرآن کے اندر دے دیا گیا اور اس صحیفۂ آسمانی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا. چنانچہ اب خدا کا صحیح تصوّر (جسے خود خدا نے بیان کیا ہو) اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں (جس میں ذہنِ انسانی کی رنگ آمیزی کا شائبہ تک نہ ہو) قرآن کی دفتین کے اندر ہے، اس سے باہر اور کہیں نہیں. اس لئے کہ آج دنیا کا کوئی مذہب بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ جس کتاب کو آسمانی کتاب کہتے ہیں، وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو اُن کے پیغمبر کو خدا کی طرف سے ملی تھی (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی). لہٰذا جو شخص چاہتا ہے کہ اسے خدا کے متعلق وہ تصوّر مل جائے جسے خود خدا نے بیان کیا ہے، تو اس کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں.

اِن تمہیدی تصریحات کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۷/۱۷۲) کی طرف آئیے. اس کے صحیح قرآنی مفہوم کے سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہوتی، لیکن تصوّف اور اس کی دمساز عجمی شاعری نے "یوم الست"، "عہدِ الست"، "دُرِ مستِ الست" کی اصطلاحات سے فضا کو اس قدر متأثر کر رکھا ہے کہ حقیقت ان رنگین اور دبیز پردوں کے پیچھے چھپ کر رہ گئی ہے. یہ آیت مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحات ۲۹۸-۲۹۲) پر بھی آ چکی ہے. وہاں بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسان کو ہلاک کرنے والی قوتیں شروع ہی سے اس کے خلاف نبرد آزما چلی آ رہی ہیں. ان

میں خارجی حوادث بھی شامل ہیں اور خود انسانوں کے ہاتھوں' دوسرے انسانوں کو ہلاک کرنے کے سامان و اسباب بھی. اُس مقام پر کہا گیا تھا

اسبابِ ہلاکت

"زندگی کو ہلاک کرنے والے یہ خطرات" دو قسم کے ہیں. ایک، کائنات کے طبیعی (ارضی اور سماوی) حوادث. جہاں تک ان حوادث کا تعلق ہے ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو کس دنیا میں پایا؟ سر پر مسلسل آگ برسانے والا ہیبت آتشیں گولہ ــ یعنی آفتاب ــ چاروں طرف بڑے بڑے خوفناک پہاڑ ادھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور ان کی تباہ کن تلاطم خیزیاں. یہاں وہاں کف بر دہاں دریاؤں کی وحشت سامانیاں، تاحدِ نگاہ ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدھے کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک کبھی ہلاکت انگیز آندھی کبھی بلاخیز جھکڑ. کہیں آتش فشاں پہاڑوں کی مرگِ سیّال، کہیں زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم. شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدھام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سروسامان ابنِ آدم! اس ماحول سے اُس نے اپنی زندگی کا آغاز کیا. لیکن لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا اعجاز دیکھئے کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود نوعِ انسان کا یہ کارواں بلاانقطاع آگے بڑھتا چلا آیا. اس مقام پر سورۃ الاعراف کی ایک نہایت حقیقت کشا آیت بے ساختہ سامنے آجاتی ہے، وہ آیت جس کے عام مروجہ مفہوم نے اُسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے آپ نے خانقاہیت کے ازکار و میں بالخصوص "یومِ الست"، "مستِ الست" یا "قَالُوْا بَلٰی" وغیرہ طلسماتی الفاظ سنے ہوں گے اور پھر ان کی

یومِ الست

بنیادوں پر اٹھائے گئے وہ افسانے جنہیں (اقبالؒ کے الفاظ میں) اندیشۂ عجم نے زیبِ داستان کے لئے تراش رکھا ہے. وہ آیت ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۙ (۷/۱۷۲)

قرآنِ کریم نے بنی آدم سے کہا یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود' جن کا ذکر اوپر کیا

لے ہم اس تکرار کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے یہ ناگزیر تھا.

نسلِ انسانی کا تسلسل

گیا ہے' اور ان خارجی حوادث کے علاوہ' خود انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تباہیوں کے علی الرغم' نسلِ انسانی کا اس تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آنا' خدا کی ربوبیت کی زندہ شہادت ہے یا نہیں؟ نسلِ انسانی کا وجود' ربوبیتِ خداوندی کی کس طرح مُنہ بولتی تصویر اور اعلانیہ شہادت ہے' اس کے متعلق کسی سائنسدان سے پوچھئے' وہ بتائے گا کہ قرآنِ کریم اس ایک آیت میں کیسی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔

جہاں تک حوادثِ ارضی و سماوی کا تعلق ہے' ان سے نمٹ لینا بھی آسان تھا' کیونکہ خالقِ کائنات نے انسانوں سے کہہ دیا تھا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُسے خدا نے اپنے قوانینِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان پر غلبہ پا کر انہیں منفعت بخش کاموں میں صرف میں لاؤ. جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے گی' وہ نہ صرف یہ کہ ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے گی' بلکہ ان سے بڑے بڑے کام لے سکے گی." یہ وہ "ملائکہ" تھے جو "آدم" کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اس لئے اُن کی طرف سے بنی آدم کو کوئی خطرہ نہیں تھا. خطرہ اُس "ابلیس" سے تھا جس نے اُس سے بغاوت اور سرکشی اختیار کی ——— یہ ابلیس ہے' انسان کے وہ جذبات جو وحی کی قیود سے بیباک ہو جائیں. انہی جذبات کا نتیجہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے وہ باطل نظام ہیں جن میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کا منظر سامنے آتا ہے' یعنی جن میں انسان خود نوعِ انسان کا شکار ہو جاتا ہے."

(مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۹۴-۲۹۳)

داستانِ بنی اسرائیل میں آپ دیکھئے. فرعون کے عہدِ غلامی میں وہ ایسے مظالم کے شکار رہے جن میں زندہ اور سلامت رہنا معجزہ سے کم نہیں تھا. سینا کی ابتدائی زندگی میں طبیعی حوادث بھی کچھ کم ہلاکت انگیز نہ تھے. بایں ہمہ وہ قوم نہ صرف زندہ رہی' بلکہ پھولتی پھلتی آگے بڑھتی چلی گئی. اس تسلسل میں آیات (۱۶۴-۱۷۲) ہمارے سامنے آتی ہیں جنہیں پہلے درج کیا جا چکا ہے. اب ان کا مفہوم پیشِ خدمت ہے. فرمایا:

(اے قومِ مخاطب! تم نے بنی اسرائیل کی داستان سے دیکھا کہ قومیں کن خطرناک مراحل سے گزر کر' اور کیسے کیسے مہیب موانع کو راستے سے ہٹا کر آگے بڑھتی ہیں! یہ بات کسی خاص قوم تک محدود نہیں. خود نوعِ انسان کا مسلسل آگے بڑھتے چلے آنا' خدا کے نظامِ ربوبیت

کی زندہ شہادت ہے، تم ذرا اس پر غور کرو کہ اس قدر نامساعد حالات کے باوجود، بنی آدم کی نسل کا سلسلہ پُشت ہا پُشت سے جاری ہے اور اس میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ ان کا وجود اس حقیقت کی شہادت ہے کہ کائنات میں خدا کا قانونِ نشو و نما کارفرما ہے۔ ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ اس حقیقت حال کی ناطق شہادت ہوتا ہے۔ ہم یہ دلائل و شواہد اس لئے تمہارے سامنے لارہے ہیں کہ جب تمہارے تخریبی اعمال کے نتائج متشکل ہو کر تمہارے سامنے کھڑے ہوں، تو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ مشیت کا پروگرام تعمیری کام چاہتا ہے یا تخریبی۔ (۱۷۲)

یا یہ کہہ دو کہ ہمارے اسلاف یہ مانتے چلے آرہے تھے کہ کائنات میں اکیلے خدا کا قانونِ ربوبیت کارفرما نہیں، اور قوانین بھی ہیں۔ ہمارے اسلاف کا یہ عقیدہ تھا اور ہم بعد میں آنے والے اُنہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ تو کیا ہمیں اُن لوگوں کے جرم کی پاداش میں ہلاک کیا جارہا ہے جو اس قسم کے باطل عقائد رکھتے تھے؟ (۱۷۳)

ہم اس طرح اپنے احکام و قوانین نکھار کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ غلط راستوں کو چھوڑ کر، صحیح راہ کی طرف رجوع کریں۔ (۱۷۴)

کاروانِ نوعِ انسانی کے راستوں میں اس قسم کے تزاحمات و تصادمات کا ذکر کرنے کے بعد، بتایا کہ قوموں کے عروج و زوال کی یہ کیفیت نہیں کہ جو قوم ایک دفعہ قعرِ مذلت میں گر گئی، وہ وہاں سے اٹھ ہی نہیں سکتی۔ اگر اس میں زندہ رہنے کی رمق بھی باقی ہے تو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ان لوگوں میں اتنی توانائی آسکتی ہے کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں۔ اسی طرح، جو قوم ایک دفعہ بامِ عروج پر پہنچ جائے ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، وہ زوال پذیر نہیں ہوسکتی۔ عروج حاصل ہو جانے کے بعد اسے مستحکم رکھنے کے لئے قوانینِ خداوندی کا مسلسل اور متواتر اتباع ضروری ہے۔ اگر وہاں پہنچ کر اس راستے کو چھوڑ دیا، تو وہ قوم ایسی پستیوں میں گر جاتی ہے جہاں سے اُبھرنا بڑا ہمت طلب ہوتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو ایک مثال کی رُو سے سمجھایا گیا۔ فرمایا۔

۱۷۵/۷ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝

تارکِ حق وصداقت قوم

(لیکن حق کی راہ اختیار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دفعہ کسی قوم نے یہ روش اختیار کرلی تو اس کے بعد آنے والی نسلیں جو جی میں آئے کریں، وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرحال بہرہ یاب ہوتی رہیں گی — قطعاً نہیں ——— ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ بیان کرتے ہیں)

اے رسولؐ تم اسے اپنی جماعت (مؤمنین) کے سامنے پیش کرو اور ان سے کہو کہ اسے دل کے کانوں سے سن لیں۔

ایک شخص کو خدا نے اپنے احکام و قوانین دیئے۔ وہ ان پر کاربند ہوا تو اسے خوشحالی اور عروج حاصل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ انہیں چھوڑ کر ان میں سے اس طرح صاف نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی میں سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ جب اس نے ان قوانین کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو حیوانی سطح زندگی کے جذبات اس پر بُری طرح غالب آگئے اور وہ (حق کا راستہ چھوڑ کر) غلط راہوں پر چل نکلا۔

(۱۷۶/۷) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝

اگر وہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق چلتا رہتا (جواسے دیا گیا تھا) تو ہم اسے (آسمان کی) بلندیوں تک لے جاتے۔ لیکن اس نے ہمارے قوانین کی بجائے اپنے جذبات ہی کی پیروی شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ (آسمان کی بلندیوں کے بجائے) زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک گیا۔ (اس کی زندگی کا سارا مقصد دنیاوی مفاد کا حصول رہ گیا۔ اب اس

کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے دوڑاؤ اور تھکاؤ، تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور اگر ویسے چھوڑ دو، تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے (یعنی پھر بھی انسان کی ہوس کی تسکین ہی نہیں ہوتی خواہ وہ کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو۔ اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا)۔

یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قانونِ ربوبیت کو جھٹلاتی ہے۔ سو اے رسولؐ! تم انہیں یہ باتیں سناؤ تاکہ یہ ان پر غور و فکر کریں۔

یہ آیات اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہیں کہ ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے گہرے غور و تدبر کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی کہ یہ خود ہماری (ملتِ اسلامیہ کی) عبرت انگیز داستان ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے　　مسلمانے، بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　کہ افتاد است از بامِ بلندے

(ارمغانِ حجاز، طبع دوم، اگست ۱۹۴۴ء)

آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے: فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ○ "ان کے سامنے یہ مثال پیش کرو تاکہ یہ سوچیں کہ ہمارے ساتھ کیا بیتی اور اس کا علاج کیا ہے۔" لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے تو "مذہب" کے معاملہ میں سوچنا حرام قرار دے رکھا ہے۔ اس لئے جب تک ہم اس (خود وضع کردہ) مذہب کے ساتھ چمٹے رہیں گے، ذلتوں کی ان پستیوں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اسی لئے خدا نے ہمارے متعلق کہہ دیا:

(۱۷۷-۱۷۸) سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ○ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

کس قدر بری حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کو جھٹلاتی ہے اور یوں اپنے آپ پر زیادتی کرتی ہے (۷/۱۷۷)۔ اور اتنا نہیں سمجھتی کہ زندگی کے خوشگوار راستوں کی طرف راہنمائی صرف قوانینِ خداوندی کی رو سے مل سکتی ہے۔ جو قوم ان قوانین کو چھوڑنے اسے

صحیح راستہ کبھی نہیں مل سکتا اور وہ سخت نقصان اٹھاتی ہے۔
اور اس کے بعد واضح الفاظ میں بتا دیا کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والی قوموں کی حالت کیا ہوتی ہے:

(۷/۱۷۹) وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○

اہلِ جہنّم کی علامات

(لیکن یہ باتیں تو عقل و فہم اور غور و تدبر سے سمجھ میں آ سکتی ہیں) اور انسانوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ ____ متمدن اقوام ہوں یا جاہل بادیہ نشیں، ان کی روشِ زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جہنّم میں سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام کبھی نہیں لیتے۔ اُن کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں، لیکن اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ کان بھی رکھتے ہیں لیکن اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ انسان نہیں، بالکل حیوان ہوتے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، (اس لئے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلّی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں اور اس قسم کے انسان، ان حدود سے بھی) بے خبر رہتے ہیں۔

ہم میں سے کون ہے جو یہ جاننا نہیں چاہے گا کہ آخرت میں اُس کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اہلِ جنّت میں سے ہوگا یا عذابِ جہنّم میں مبتلا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں، مختلف مقامات پر بڑی تفصیل سے بتایا ہے۔ لیکن یہاں اُن لوگوں کی جن کا مآل جہنّم ہوگا، ایک ایسی متعیّن علامت بتائی ہے جس سے اس امر کا فیصلہ کرنے میں کچھ بھی دشواری پیش نہیں آ سکتی کہ ہمارا (افراد یا اقوام کا) انجام کیا ہوگا؟ وہ اٹل قانون یہ ہے کہ جو لوگ

عقل و فکر کی اہمیّت

سوچنے سمجھنے کی صلاحیّت رکھنے کے باوجود عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، ان کی زندگی جہنّم کی ہے ____ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ سورۃ الملک میں ہے کہ جب ان لوگوں کو، جو عذابِ جہنّم کے مستحق قرار پائیں گے، جہنّم میں داخل

کرنے کے لئے لایا جائے گا تو جہنّم کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی شخص نہیں آیا تھا جس نے تمہیں بتایا ہو کہ اگر تم فلاں قسم کی زندگی بسر کرو گے تو اس کا مآل جہنّم ہوگا؟ (۶۷/۸)۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں! اس طرح آگاہ کرنے والا آیا تو تھا، لیکن ہم نے اُس کی بات کو اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ اسے بگوشِ ہوش سنتے؛ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ (۶۷/۱۰)

اگر ہم اُس کی بات کو دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو آج اہلِ جہنّم میں سے کیوں ہوتے؟ ــــــ بات واضح ہے کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا مآل جہنّم ہے۔

قرآن کریم نے علم کی تعریف Definition اِن الفاظ میں کی ہے؛

علم کسے کہتے ہیں

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○ (۱۷/۳۶)

اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (اور جس کی خود تحقیق نہ کر لو) اسکے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ) تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر اِن معلومات کی بنا پر اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ ان میں سے اگر ایک کڑی بھی گُم ہوگئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے (اس لئے کہ خدا نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے، مجبورِ محض نہیں بنایا اور اس اختیار کے استعمال کے لئے ذرائع علم و تحقیق عطا کر دیتے ہیں۔ ان سے کام نہ لینے والا اپنی ذمہ داری سے جی چراتا ہے)۔

یعنی انسان کے حواس (Senses جنہیں قرآن نے مخففاً "سمع و بصر" سے تعبیر کیا ہے) معلومات فراہم کر کے دل (یا دماغ) تک پہنچاتے ہیں جو ان کی روشنی میں کسی فیصلہ پر پہنچتا ہے۔ اسے علم کہا جاتا ہے۔ (ہم نے اس فیصلہ کرنے والی قوّت کو دل یا دماغ کہہ کر پکارا ہے کیونکہ اربابِ علم و تحقیق ہنوز کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچے کہ انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوّت کونسی ہے۔ ہمارے ہاں عرفِ عامہ میں اسے دل یا دماغ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے بالعموم قلب اور بعض مقامات پر فُؤاد کا لفظ استعمال کیا ہے ــ بہر حال یہ قوّت جو بھی ہو[1] قرآن کی رُو سے، خارجی کائنات کے متعلق معلومات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے اسے

[1] یہ بڑا اہم سوال ہے کہ انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوّت کونسی ہے۔ اہم اس لئے کہ انسانی اعمال کی ذمہ داری اسی پر

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

علم کہا جائے گا[1] محض نظریات ـ یا قیاسات کے ماحصل کو علم نہیں کہا جائے گا. بنا بریں' قرآن کریم نے کہا ہے کہ جو لوگ اس قسم کا علم حاصل کر کے عقل و فکر سے کام نہیں لیتے' ان کا شمار اہلِ جہنم میں ہوگا.

زیرِ نظر آیت (۱۷۹/۷) کے الفاظ پر ایک بار پھر نظر ڈالئے. اس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ آنکھیں رکھتے ہیں، لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے. کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے. اور جب وہ سماعت و بصارت (حواس) کی رُو سے معلومات ہی حاصل نہیں کرتے تو ان کا قلب سمجھنے سوچنے کا کام کیا کرے گا.

یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ دنیا میں ہر شخص جو آنکھیں رکھتا ہے' ان سے دیکھتا ہے. جو کان رکھتا ہے' ان سے سنتا ہے. پھر قرآن کریم نے یہ کیسے کہا ہے کہ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے. قرآن کریم نے دیکھنے اور دیکھنے' سننے اور سننے میں فرق کیا ہے. (اور یہ عربی زبان کی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس میں اس امتیاز کے لئے الفاظ بھی الگ الگ ہیں). اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر کہا.

نظر اور بصر کا فرق

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

(۷/۱۹۸)

لیکن ان کی اندھی عقیدت کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے باوجود) اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف دعوت دو' تو یہ تمہاری کبھی نہیں سنیں گے. تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف تک رہے ہیں. لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں رہے ہوتے (ان کی آنکھیں بظاہر تمہاری طرف ہوتی ہیں لیکن دل کہیں اور ہوتا ہے ۴۳- ۱۰/۴۲ ؛ ۴۷/۱۶).

یہاں کہا کہ تم انہیں مخاطب کر کے سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہو' لیکن یہ تمہاری بات ہی نہیں سنتے. ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اس دعوت پر توجہ نہیں دیتے. اسے دل کے کانوں سے نہیں سنتے. اس کے بعد کہا کہ یہ تمہاری مجلس میں بیٹھے تمہاری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں' لیکن ان کا خیال کہیں اور ہوتا

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) جائز ہوگی. ہمارے نزدیک' یہ فیصلہ کرنے والی قوت' انسانی ذات (نفس) میں ہوسکتی ہے.

[1] یہاں بات خارجی کائنات کے متعلق علم کی ہو رہی ہے. وحی اس سے یکسر الگ ہے.

ہے۔ اس لئے یہ تمہیں صرف تک رہے ہوتے ہیں، "دیکھ نہیں رہے ہوتے"۔ یہاں نظر اور بصر کے الفاظ نے دونوں مفاہیم میں فرق کر دیا۔

سورۃ یونس میں اس حقیقت کو اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا؛

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (۴۲-۴۳/۱۰)

ان میں سے ایسے لوگ ہیں کہ تمہارے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو اس طرح، گویا تمہاری باتیں بہت غور و خوض سے سُن رہے ہیں، حالانکہ وہ محض سُن ہی رہے ہوتے ہیں (ان کا خیال کہیں اور ہوتا ہے (۴۷/۱۶)۔ تم سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سنا سکتے ہو جو عقل و فکر سے کام ہی نہ لیں؟ (۴۲)۔

اور وہ بھی ہیں جو تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور تمہاری طرف تکتے رہتے ہیں گویا وہ ہمہ تن توجہ ہیں لیکن وہ صرف تک رہے ہوتے ہیں، دھیان اُن کا بھی کہیں اور ہوتا ہے (۷/۱۹۸)۔ سوچو کہ تم ایسے اندھوں کو کس طرح راستہ دکھا سکتے ہو جو عقل و بصیرت سے کام نہ لیں؟ (۴۳)

اس سے واضح ہے کہ سُننا وہی سُننا ہے جس کے ساتھ عقل شامل ہو۔ دیکھنا وہی دیکھنا ہے جس میں توجہ مرکوز ہو۔

جس سمع و بصر کے ساتھ عقل اور توجہ شامل نہ ہو اس کے متعلق فرمایا؛

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۣ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ۝ (۴۷/۱۶)

ان مخالفین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو (تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ یہ بڑے غور و خوض سے تمہاری باتیں سُن رہے ہیں (۷/۱۹۸؛ ۱۰/۴۲)، لیکن جب وہ مجلس سے باہر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں کتاب اللہ کی سمجھ بوجھ ہوتی ہے پوچھتے ہیں کہ اس رسول نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟ (یہ اس لئے نہیں کہ قرآن کی زبان ان کی

سمجھ میں نہیں آتی. بلکہ اس لئے کہ یہ قرآن کا پیغام سُننا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہی نہیں). یہ محض اپنے مفاد اور خواہشات کا اتباع کرتے ہیں۔(اور جن لوگوں کی یہ حالت ہو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ، ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی.

(۱۵۵/۴ ؛ ۷۴/۱۰ ؛ ۱۰۷-۱۰۶/۱۶ ؛ ۴۵/۱۷ ؛ ۲۴/۴۷ ؛ ۱۴/۸۳)

آیت کے آخری الفاظ نے واضح کر دیا کہ دلوں پر مُہر کس طرح لگتی ہے اور کن لوگوں کے دلوں پر لگتی ہے. (انڈکس میں خَتَمَ اللّٰهُ اور صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ کے عنوانات دیکھئے) اس سے (ضمناً) یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یہ جو ہم قرآن کے الفاظ مطلب سمجھے بغیر دیکھ کر (ناظرہ) پڑھتے ہیں اور تراویح میں ان الفاظ کو (بلا مطلب سمجھے) سنتے رہتے ہیں، قرآن کی رُو سے اس طرح پڑھنے اور سننے کو کس زُمرہ میں شمار کیا جائے گا؟ اس سے بھی آگے بڑھئے اور اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے علم کی تعریف Definition ہی یہ کی ہے کہ حواس کے ذریعہ مظاہرِ فطرت سے معلومات حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچا جائے. علم کی اس قرآنی تعریف کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ہمارے ہاں جنہیں عالِم کہا جاتا ہے کیا اُن کا علم قرآن کے معیار کے مطابق، علم کہلا سکتا ہے؟ ان کا علم بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے اور فلاں مصنف نے یہ کہا ہے. اس موضوع پر ہم تفصیل سے پہلے لکھ چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد اوّل، صد ۷، جلد دوم صد ۸۶-۸۷ اور صد ۳۶۹). اس کے علاوہ انڈکس میں تقلید، کائنات، تسخیرِ فطرت، علوم سائنس علم و عقل کے عنوانات بھی دیکھئے. ان مقامات پر قرآنی شواہد منتشر طور پر ملیں گے. لیکن یہ موضوع اس قدر اہم اور بنیادی ہے کہ اس کے متعلق قرآنی تعلیم جامع طور پر یکجا سامنے آجائے تو مفید رہے گا.

مادی اور روحانی دُنیا

دنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس نے انسانی زندگی، بلکہ جملہ تخلیقِ خداوندی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یعنی مادی Material اور روحانی Spiritual یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد اور معاند ہیں، ایسے معاند کہ، نہ صرف یہ کہ یہ یکجا اکٹھے نہیں ہو سکتے' اہلِ مذہب' مادیت کو انتہائی قابلِ نفرت قرار دیتے ہیں اور مذہب

---

[1] واضح رہے کہ عقل و خرد سے بیگانگی جہنم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے. دیگر اسباب قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں درج ہیں. انڈکس میں جہنم کا عنوان دیکھئے.

کا سخت دشمن۔ دوسری طرف اہلِ مادیت (جنہیں آجکل کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہہ لیجئے) مذہب کو جہالت اور توہم پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان دونوں میں جنگ، قدیم سے چلی آرہی ہے۔ عصرِ حاضر کی سیکولرازم مذہب کے خلاف اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مذہب کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے۔

لیکن قرآنِ کریم کی منفرد خصوصیت کو دیکھئے کہ وہ (یوں کہئے کہ) مذہب کے اسٹیج پر کھڑا ہو کر مادی کائنات کے نظام کو اپنی صداقت کی تائید میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نکتہ قانون کی عملداری Rule of law ہے۔ اس کا منتہیٰ اور مقصود تو انسانی دنیا میں قانونِ خداوندی کی حاکمیت ہے لیکن چونکہ قانون کی حاکمیت، خارجی کائنات کے محسوس پیکروں میں نہایت آسانی سے سامنے آجاتی ہے، اس لئے وہ انہیں قرآنی دعاوی کی تائید میں بطور شواہد پیش کرتا ہے۔ (مثلاً سورۃ واقعہ میں ہے:- فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ..... (۵۶/۷۵) "نہیں! بات یہ نہیں کہ میں اپنے دعاوی کے ثبوت میں نظری دلائل یا بسیط حقائق Abstract Realities پیش کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ نظری یا تجریدی دلائل عام فہم نہیں ہوتے۔ میں کائنات کے مرئی اور محسوس نظام کی مثالوں سے واضح کروں گا کہ یہ تمام نظام کس طرح قوانین کے تابع مصروفِ گردش ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ستاروں کی گزرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں" وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (۵۶/۷۶) "اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کس قدر محکم اور پائدار ہے"۔

کائناتی شواہد

ہم شہروں کے رہنے والے ستاروں کی گزرگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے متعلق پوچھئے صحرا نورد بدوؤں سے جن کی ساری زندگی سفر میں گزرتی تھی اور سفر بھی بیشتر رات کی تاریکی میں اُس صحرا میں جہاں نہ کوئی نشانِ راہ ہوتا تھا نہ دلیلِ منزل۔ ان حالات میں ان کے سفر کی راہنمائی صرف ستاروں کی گزرگاہوں سے ہوتی تھی۔ وہ ان سے راستہ کا تعین کرتے تھے اور انہیں اس کا علیٰ یقین ہوتا تھا کہ وہ نہ راستہ بتانے میں کبھی غلطی کریں گے، نہ منزل کی طرف لے جانے میں فریب دیں گے۔ آج بھی ان گزرگاہوں کی اہمیت جہاز رانوں اور علم الافلاک کے محققین سے دریافت کی جاسکتی ہے۔ ان گزرگاہوں کو بطورِ شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۵۶/۷۷)

جس طرح یہ ستارے تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں چراغِ راہ بنتے ہیں اور اس میں کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ قرآن بھی انسانی زندگی کے سفر میں تمہاری راہنمائی کرے گا اور اس میں غلطی نہ کرے گا، نہ دھوکا دے گا۔

سورۂ تکویر میں اس اجمال کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا کہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۙ﴿ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ۙ﴿ (۸۱/۱۶-۱۵) "یہی نہیں، بلکہ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں بھی جو برق رفتار غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں"۔ وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ﴿ وَ الصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴿ (۸۱/۱۸-۱۷) "اور شہادت میں پیش کرتا ہوں لیلائے شب کو جب وہ دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے لوٹ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عذرائے سحر کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ساری دنیا کو حیاتِ نَو کا پیغام دینے، مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔

میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کی تصدیق کے لئے کہ

اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿ۙ (۸۱/۱۹)

"جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو، وہ یہ کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ وہ تو ہمارا قاصد ہے اور ہمارا پیغام تم تک پہنچا رہا ہے۔ وہ قاصد نہایت واجب التکریم ہے اور یہ پیغام بھی واجب التکریم (۵۶/۷۷) اور جس خدا نے اسے بھیجا ہے وہ بھی واجب التکریم (۸۲/۶)"۔

سورۃ الطارق میں ہے: وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ﴿ۙ (۸۶/۱۱) "یہ فضائی کرّے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے مدار میں مصروفِ گردش ہیں" (۳۶/۴۰) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں، وہ بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اور یہ زمین بھی جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے ایک کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَ الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ (۸۶/۱۲) یہ سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ــــ اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿ۙ (۸۶/۱۳) "یہ قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل کو نکھار کر الگ الگ کر دیتا ہے"۔ وَّ مَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ (۸۶/۱۴) "یہ یونہی مذاق نہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی"۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ

بِهِ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) " یہ بھی تمہارا واہمہ ہے۔" فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۳۹-۳۸/۶۹) " جو کچھ تمہیں دکھائی دیتا ہے، یعنی یہ عالمِ محسوس اور جو کچھ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے" وہ سب، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۝ (۴۱-۴۰/۶۹) " یہ قرآن ایک واجب التکریم قاصد کی وساطت سے پہنچنے والا ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔ یہ شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں جو مرورِ زمانہ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جایا کرتے ہیں۔"

قرآنِ کریم میں بکثرت مقامات ہیں جہاں نظامِ کائنات، اور اس کے عناصر کو قرآنی حقائق اور دعاوی کی تائید میں بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ نظامِ کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے تمام رموز و اسرار بیک وقت سامنے نہیں آجاتے۔ جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرے گا اور محققین کی کاوشیں ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتی جائیں گی، یعنی انہیں Discover بےنقاب کرتی جائیں گی' یہ ابھر کر سامنے آتے جائیں گے۔ اسی بنا پر قرآن نے کہا ہے کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (۴۱/۵۳)

ہم عالمِ انفس و آفاق، یعنی انسان کی خود اپنی زندگی اور خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے اور ہر حقیقت جو اس طرح بےنقاب ہوگی اس امر کی شہادت پیش کرے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ تمام مستور حقائق اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ وہ تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں' اس سے نہیں۔

اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے عظیم حقائق کو پیش کیا ہے۔ اس نے اربابِ علم و دانش کو تاکید کی ہے کہ وہ رموزِ فطرت دریافت کرنے میں مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ اور دوسرے اس نے یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم کے احکام و اوامر تو ہر دَور میں واضح طور پر سامنے رہیں گے' لیکن اس کے حقائق و معارف تمام کے تمام کسی ایک دَور میں منکشف نہیں ہو جائیں گے۔ علمِ انسانی کی سطح جوں جوں بلند ہوگی' یہ رفتہ رفتہ بےنقاب

ہوتے جائیں گے. اس لئے یہ ہر زمانے کے اربابِ علم کے لئے موضوعِ تحقیق و ہدفِ کاوش رہے گا. اس کا حرفِ آخر آخری دَور کے انسان کے لئے چھوڑا گیا ہے. لہٰذا کسی دَور کے انسانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں

مومنین کا شیوہ

ہوگا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا ہے. اب اس میں فکر و تدبّر کے لئے کچھ باقی نہیں رہا.

نظامِ کائنات کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اس نے علمی تحقیقات پر اس قدر زور دیا ہے. (مثلاً) سورۃ آلِ عمران میں ہے:-

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۙ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ..... عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ (۳/۱۸۹-۱۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے تخلیقِ کائنات اور گردشِ لیل و نہار میں قوانینِ خداوندی کی حقیقت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات اور انکشافات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگہِ کائنات کو نہ تو عبث و بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے. تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اتنے عظیم نظام کو بلا مقصد پیدا کر دے. یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں. تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کُن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں.

علماء کون ہیں؟

ہمارے ہاں جن حضرات کو "علماء کرام" کہا جاتا ہے، قوانینِ فطرت کے متعلق ان کے مبلغِ علم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں. لیکن دیکھئے کہ قرآنِ مجید علماء کن لوگوں کو قرار دیتا ہے. سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ...... (۳۵/۲۷) تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع واقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں. یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں"...... وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ (۳۵/۲۷) "اور پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادۂ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں ــ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ" (اور ہر خطہ اپنے اندر ارتقائی منازل کی داستانیں رقوم و محفوظ رکھے ہوئے ہے). وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ...... (۳۵/۲۸) "اسی طرح انسان اور دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف النوع ہیں"۔

آپ غور کیجئے کہ علومِ سائنس کے مختلف شعبے ان آیات کے اندر آگئے ہیں. اس کے بعد کہا کہ صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادت ہیں، سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کرتے ہیں. اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (۳۵/۲۸) "یہی لوگ ہیں جو علماء کہلانے کے مستحق ہیں اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور جو لوگ ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، وہ انہیں کس قدر سامانِ حفاظت عطا کر دیتا ہے" (نیز ۲۴-۳۰/۲۲). آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کو قرآنِ کریم نے علماء کہا ہے کیا وہ وہی نہیں جنہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے؟

تسخیر کائنات

قرآنِ کریم نے نظامِ کائنات پر غور و فکر کی محض نظری طور پر تاکید ہی نہیں کی، اس نے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳)

اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کی رُو سے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) کو تمہارے تابعِ تسخیر کر دیا ہے، لیکن اس حقیقت کو وہی لوگ سمجھ سکیں گے جو غور و فکر سے کام لیں گے.

اس نے کہا یہ ہے کہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ تم اس سے فطرت کی قوتوں کو

مسخر کرسکو گے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے جو شروع ہی میں کہا تھا کہ اس میں خود تمہارے لئے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے، تو وہ دعویٰ کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلیتی ہیں، انہیں کس قدر قوت اور ثروت حاصل ہوجاتی ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن امتِ مسلمہ کے لئے یہ چیزیں' شرف و مجد کا صرف ایک پہلو ہیں۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں قرآن کی ابدی اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے۔

علامہ اقبالؒ نے قصۂ آدم کو اپنے تمثیلی انداز میں بڑے خوبصورت اسلوب سے پیش کیا ہے۔ آدم فرشتوں کے جلو میں زمین کی طرف آتا ہے تو روحِ ارضی یہ کہہ کر اس کا استقبال کرتی ہے کہ

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل' یہ گھٹائیں — یہ گنبدِ افلاک' یہ خاموش فضائیں!

یہ کوہ' یہ صحرا' یہ سمندر' یہ ہوائیں — تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(بالِ جبریل صفحہ ۱۳۳-۱۳۲)
(ایڈیشن ہشتم ۱۹۸۹ء)

خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر اب خود انسان کی طرف آیئے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ انسان' حیوانات سے اشرف اور ممتاز اس لئے ہے کہ اسے غور و تدبر' عقل و فکر' علم و بصیرت کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انسان کے حیطۂ علم و بصیرت سے صرف ایک چیز باہر ہے اور وہ ہے وحی کی کُنہ و حقیقت' یعنی یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو وحی کس طرح ملتی تھی اور اس کا سرچشمہ کیا تھا۔ صرف یہ چیز عقلِ انسانی سے ماوراء ہے۔ عقلِ انسانی نہ وحی کی تخلیق کرسکتی ہے اور نہ یہ جان سکتی ہے کہ نبی کو وحی ملتی کس طرح تھی۔ اس کے بعد' جب حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے' وحی انسانوں تک پہنچ جاتی تھی' تو اسے غور و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جاسکتا تھا۔ قرآنِ کریم نے علم و عقل اور فکر و بصیرت کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔

وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنمی قرار دیتا ہے. سورۃ الاعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ .... (۷/۱۷۹)

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے

صحرائی اور شہری آبادیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا انداز زیست زبان حال سے بتاتا ہے کہ یہ جہنمی مخلوق ہیں...... لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ........ (۷/۱۷۹)" یہ وہ لوگ ہیں جو سینوں میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے. وہ ماتھے پر آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے. ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے. یہ لوگ دیکھنے میں تو انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوان ہوتے ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے.

سورۃ انفال میں ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۸/۲۲)" خدا کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے." سورۃ ملک میں ہے کہ جہنم کا داروغہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جہنم میں داخل کئے جارہے ہو؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (۶۷/۱۰)" اگر ہم سچی بات دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو اہل جہنم میں سے نہ ہوتے." عقل و فکر سے کام نہ لینا ہے جس کی وجہ سے ہم جہنم میں دھکیلے جارہے ہیں. سورۃ حٰمٓ میں ہے کہ قرآن تو ہے ہی ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہوں. كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱/۳)" قرآن واضح عربی زبان کی کتاب ہے جس کے احکام و حقائق نکھار کر بیان کئے گئے ہیں. لیکن یہ اس قوم کے لئے ہے جو علم و عقل سے کام لے."

قرآن کریم تدبر و تفکر پر بڑا زور دیتا ہے. وہ قرآن سے اعراض برتنے والوں کے متعلق کہتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ (۴۷/۲۴)" یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے. کیا انہوں نے اپنے دلوں پر (خود ساختہ) تالے ڈال رکھے ہیں؟" (نیز ۲۳/۶۸). سورۃ النساء میں ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ

اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ فکر و تدبر سے کام لیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور یہ بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔" سورۃ ص میں ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۳۸/۲۹) "یہ مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس میں غور و تدبر کریں اور صاحبانِ عقل و بصیرت اس سے حقائق پر آگاہ ہوں۔"

ظاہر ہے کہ یہ غور و تدبر کسی خاص دَور تک محدود نہیں تھا کہ قرآن پر جس قدر تدبر کیا جانا تھا وہ اس دَور میں کیا جا چکا ہے اور اب اس پر مزید غور نہیں کیا جا سکتا۔ "تدبر" کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ جب قرآن قیامت تک کے لئے ضابطۂ راہنمائی ہے تو اس پر غور و فکر کے دروازے بھی ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں۔ یہ کہنا کہ غور و تدبر اسلاف تک محدود تھا، انہوں نے 'جتنا تدبر کیا جانا ضروری تھا' کر لیا۔ اب ہمیں ان کی تقلید کئے جانا چاہیئے، خود قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم اس تصور اور مسلک کی بڑی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے عقل و فکر اور علم و بصیرت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور انسان 'انسانی سطح سے گر کر' حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے، جہاں ہانکنے والا جدھر چاہے اسے ہانک کر لے جائے۔ نہ کسی دَور میں علم کی راہیں مسدود ہوتی ہیں' نہ قرآن میں غور و تدبر کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بلا سوچے سمجھے ان باتوں کو مان لے جو ہمارے ہاں روایتاً چلی آ رہی ہیں۔ لیکن سنئے کہ قرآن 'مومن' کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵/۷۳) "مومن وہ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے، غور و فکر کے بعد انہیں قبول کرتے ہیں۔" اسے کہتے ہیں قرآن کی رو سے ایمان! یہ وجہ ہے جو وہ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہتا ہے (۴/۱۳۶)۔

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رُو سے، عقل و فکر اور علم و بصیرت کی اہمیت۔ صدرِ اوّل کے مسلمان اسی طرح ایمان لائے تھے اور تمام معاملات پر اسی انداز سے غور و فکر کرتے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن اس کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا تو مخالفینِ اسلام نے سب سے پہلے قندیلِ قرآنی کو انسانی

تخیلات کے دبیز پردوں سے ڈھانپ دیا جب وہ روشنی بُجھ گئی تو اس کے ساتھ ہی عقل وفکر کی شمعیں بھی گل ہونا شروع ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا مقصد یہ بتایا تھا:۔

لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔۔۔۔۔۔۔۔ (۵۷/۹) نیز (۱۴/۱)

یہ تمہیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر (علم وبصیرت کی) روشنی میں لے آئے گا۔

اس کے برعکس طاغوتی قوتوں کا حربہ یہ بتایا تھا: يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۔۔۔۔۔۔ (۲/۲۵۷) "وہ انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جائیں گی"۔ ان قوتوں نے یہی حربہ استعمال کیا اور اس کے لیے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ انہوں نے کچھ روایات وضع کیں اور انہیں احادیثِ رسولؐ اللہ کے نام سے مشہور کر دیا اور ان کے متعلق عقیدہ یہ وضع کر دیا کہ ان کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے

چند وضعی روایات

خارج ہو جاتا ہے۔ یہ روایات کس قسم کی ہیں، انہیں آپ احادیث کے کسی بھی مجموعہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں دو چار ایسی روایات پیش کروں گا۔ جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱ یا ۷۲۔ ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھُروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ نبیؐ اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں۔ کبھی سردی آجاتی ہے، کبھی گرمی۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ

> دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصے نے میرے دوسرے حصے کو کھا لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں اور ایک گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو تو یہ بھی جہنم کی سانس ہے۔

اسی بخاری میں ہے:۔

حضرت ابو ہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب۔ ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔

اسی کی ایک اور روایت :-

حضرت ابو ہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ اور حضرت موسیٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو ہم لوگوں کے ساتھ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا اور حضرت موسیٰؑ اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ "ثوبی یا حجر! ثوبی یا حجر!!" اے پتھر! میرے کپڑے دیدے۔ یہاں تک بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰؑ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں[1]۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کے علوم کا حصول اور تسخیرِ فطرت کے دروازے تمام انسانوں کے لئے کھلے ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ اس میں کفار اور مومنین کی کوئی تمیز نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں میں کوئی فرق ہے۔ اور اگر فرق ہے تو وہ کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے صرف کرتے ہیں اور ان اقدار پر ایمان نہ لانے والے (کفار) اُنہیں اپنے قومی اقتدار، غلبہ و تسلط اور سلب و نہب کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ انسانیت

---

[1] ان روایات کے حوالوں کے لئے طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" دیکھئے۔

کی تباہی ہوتا ہے. ایسی قومیں دوسروں کو تو تباہ کرتی ہی ہیں' ان کے ساتھ خود بھی تباہ ہو جاتی ہیں. انہی اقوام کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے:

مومن سائنسدانوں اور کفار میں فرق

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ؏ (۴۶/۲۶)

(اور وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا' ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں. نیز' وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی. انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ——— سماعت' بصارت اور قلب ——— حاصل تھے. لیکن چونکہ ان پر جذبات پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے وہ قوانین خداوندی کی مخالفت کرتے تھے' اس لئے ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست' ان کے کسی کام نہ آئے (۴۵/۲۳) اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے' انہوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا. (جب عقلِ انسانی وحی کی روشنی میں کام کرے تو اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں. لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی عقل و دانش ماؤف ہو جاتی ہے (جس طرح نشے کی حالت میں وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے).

اس اعتبار سے دیکھئے تو اقوام عالم تین شقوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں:-

۱۔ جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف میں لائیں' انہیں جماعت مومنین کہا جائے گا.

۲۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اپنے ذاتی مفاد اور تخریبِ نوعِ انسانی کے لئے استعمال کریں' انہیں کفار کہا جائے گا (جیسے مغرب کی موجودہ قومیں). اور

۳۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی بجائے ان کی مغلوب' اور شق نمبر (۲) کی اقوام کی دست نگر اور محکوم

رہیں، جیسے ہم مسلمانانِ عالم، خسر الدنیا والآخرۃ۔

○

قرآن نے اہلِ جہنم کے زمرے میں شمار ہونے سے محفوظ رہنے کا طریق خدا پر ایمان بتایا جس کا ذکر اگلی آیت میں آیا ہے۔ اس میں دو ایک ایسے بنیادی اور منفرد نکات ہیں جو انتہائی غور طلب ہیں۔ پہلے آپ اس آیت اور اس کے مفہوم کو دیکھئے۔

۷/۱۸۰ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(اس جہنم کی زندگی کو جنت سے بدلنے کا طریق یہ ہے کہ) تم صفاتِ خداوندی کو ——— جو کاملِ حسن و توازن کی مظہر ہیں ——— اپنے اندر اجاگر کرتے جاؤ اور اس میں اعتدال اور توازن کا خیال رکھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اُن میں سے کسی ایک صفت کو لے کر افراط کی طرف نکل جاتے ہیں[1] (اور یوں زندگی کا توازن کھو دیتے ہیں ——— ۴/۱۷۱؛ ۴۱/۴۰)۔ ان کی غلط روش بہت جلد اپنا نتیجہ ان کے سامنے لے آئے گی۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے ذاتِ خداوندی کی کُنہ و حقیقت کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ انسان کا محدود ذہن، لامحدود کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ خدا کے متعلق اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا علم اُس نے اپنے متعلق خود عطا فرمایا ہے۔ اور یہ علم اس نے اپنی صفات بیان کر کے عطا کیا ہے، یعنی ہم خدا کے متعلق اتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا ہم اس

صفاتِ خداوندی

[1] جیسے عیسائیوں نے خدا کی صفت "رحم" میں اس قدر غلو کیا کہ اس کے قوانینِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا اور نجات و سعادت کو اعمال پر نہیں بلکہ اُس کے رحم پر موقوف کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس پر عیسائیت کی تاریخ شاہد ہے۔ قرآنِ کریم صفاتِ خداوندی کو اپنانے میں اعتدال اور صحیح تناسب کی تعلیم دیتا ہے۔

کی صفات کی رُو سے جان سکتے ہیں۔ اللہ رازق ہے۔ رزّاقیّت کا مفہوم تو ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن جو (اللہ) رازق ہے اُس کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ قرآنِ کریم نے صفاتِ خداوندی کو الاسماء کہہ کر پکارا ہے۔ قرآنِ کریم کی پہلی انفرادیت تو یہ ہے کہ اس نے جو صفاتِ خداوندی بیان کی ہیں، مذاہبِ عالم کی کسی (مُبیّنہ) آسمانی کتاب میں وہ صفات اس جامعیّت کے ساتھ نہیں ملتیں۔ لہٰذا، خدا کا جو تصوّر ان صفات کی رُو سے قائم ہوتا ہے، اس قسم کا اعلیٰ اور منزّہ تصوّر اور کسی طریق سے قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ (اوّلین) وجہ ہے جو قرآن، ان لوگوں سے بھی جو اپنے طور پر خدا کو مانتے ہیں، خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ "قرآنی خدا" کی یہ خصوصیّت ہے جس کی بنا پر اُس نے "خدا پرستوں" کے متعلق بھی کہا ہے کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ ایمان لائیں جس طرح (اے قرآن پر ایمان لانے والو!) تم ایمان لائے ہو، تب سمجھا جائے گا کہ یہ راہِ راست پر آ گئے ہیں۔"

یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ خدا پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان (علیٰ حدِّ بشریّت) صفاتِ خداوندی کو اپنی ذات میں منعکس کرے، یعنی اس کی سیرت و کردار سے ان صفات کی نمود ہو۔ یہ بات قرآن پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح جو نظام خدا کے نام پر قائم کیا جائے، اسے بھی ان صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں تو اسے نظامِ خداوندی یا اسلامی نظام نہیں کہا جائے گا۔

صفاتِ خداوندی کے سلسلہ میں قرآن کی دوسری انفرادیت یہ ہے کہ اس نے اِن صفات کو اَلْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى کہہ کر پکارا ہے۔ (زیرِ نظر آیت، نیز ۱۷/۱۱۰؛ ۲۰/۸؛ ۵۹/۲۴)۔ الحسنٰی کے معنی ہیں حسن کی مظہر۔ اور جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) حُسن صحیح صحیح توازن Proportion کا نام ہے۔ جس شے کا ذرا سا توازن بگڑ جاتے اس کا حُسن باقی نہیں رہتا۔ کسی حسین ترین چہرے کی آنکھ کی سیاہی ذرا اپنے مقام سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کا حُسن ختم ہو جاتا ہے۔ جسمِ انسانی کی مختلف اخلاط میں توازن اور اعتدال ہو تو اسے صحت کہتے ہیں۔ کسی خلط میں کمی بیشی ہو جائے (یعنی اخلاط کا توازن بگڑ جائے) تو انسان بیمار ہو جاتا ہے (اب تو نہ وہ طب رہی ہے نہ طبیب، ورنہ اس سے پہلے) ہم نے حاذق ترین اطبا کو دیکھا۔ وہ نسخہ تو بلا تأمّل تجویز کر دیتے تھے، لیکن اس نسخہ کے اجزاء کے اوزان متعیّن کرنے کے لئے گہری سوچ میں ڈوب جاتے تھے۔

اور جسمِ انسانی تک ہی کیا موقوف ہے، سارا سلسلۂ کائنات صحیح توازن اور اعتدال کی بنا پر اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔

آپ قرآنِ کریم میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی کو دیکھئے، اس میں ایسی صفات نظر آئیں گی جو باہم دیگر متضاد ہیں۔ (مثلاً) وہ غفور الرّحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، بطشِ شدید بھی ہے اور عفوِ کریمانہ بھی۔ سطح بین نگاہوں کو ان میں تضاد نظر آئے گا۔ لیکن ان میں تضاد

صفات میں اعتدال

نہیں۔ نظامِ عالم قائم رکھنے کے لئے ان میں سے ہر صفت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ہر صفت کا ظہور صرف وہاں ہو جہاں اس کی ضرورت ہو اور اسی حد تک جس حد تک ان کا ظہور مقصد پیشِ نظر کے لئے لاینفک ہو۔ اس سے ان میں وہ توازن (حسن) قائم رہے گا جو (مثال کے طور پر) ایک حاذق طبیب کے نسخہ کے اوزان میں ہوتا ہے۔ اس میں سنکھیا بھی ہوتا ہے اور کافور بھی، لیکن خاص توازن لئے ہوئے۔ ایک فرد کی انفرادی زندگی میں ہو یا اسلام کے اجتماعی نظام میں، ان صفاتِ حُسنہ کی نمود بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگی، یعنی ہر مقام پر یہ دیکھا جائے گا کہ وہاں کس صفت کے ظہور (استعمال) کی ضرورت ہے اور کس حد تک ضرورت۔ ان صفات میں اس قسم کا اعتدال بھی قرآن کی انفرادیت ہے۔ وہ اس قسم کے مومن پیدا کرتا ہے جو ان صفات کی نمود میں کامل اعتدال قائم رکھیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(ضربِ کلیم صفحہ ۶۰ ایڈیشن ہشتم ۱۹۸۹ء)

بانگِ درا میں ہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تُند رُو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اس قسم کی سیرت قرآنی تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اہلِ مذاہب نے جہاں صفاتِ خداوندی کو مسخ کر دیا، وہاں ان صفات کے توازن کو بھی بگاڑ دیا۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے، وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ ط "تم ان لوگوں سے الگ ہو جاؤ جو صفاتِ خداوندی میں الحاد برتتے ہیں"۔ دوسری جگہ ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ط (۴۱/۴۰) "جو لوگ ہمارے قوانین میں الحاد کرتے ہیں، وہ ہم سے مخفی نہیں"۔

آجکل عام طور پر قبر کے لئے ایک مستطیل گڑھا کھودا جاتا ہے جس میں مردہ کو دفن کر دیتے ہیں لیکن پہلے (اور بعض مقامات پر اب بھی) اس مستطیل گڑھے کی بغل میں (ایک طرف) ایک اور گڑھا کھودا جاتا تھا جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا تھا۔ اسے لحد کہتے تھے (قبر اور لحد کے الفاظ مرادف سمجھے جاتے تھے)۔ لحد کے معنی ہوتے ہیں اعتدال کی راہ سے ہٹ کر ایک طرف کو مڑ جانا، جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر افراط و تفریط اختیار کر لینا۔

غُلُوْ فِی الدِّیْنِ

آیاتِ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ صفاتِ خداوندی میں اعتدال، توازن اور صحیح تناسب کا قائم رکھنا دین ہے۔ اگر اس اعتدال کو چھوڑ کر صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت میں افراط یا تفریط اختیار کی جائے تو یہ الحاد[1] ہو گا جس کی سخت ممانعت کی گئی ہے یہودی شریعت میں عدل (جرم کی سزا) کے سلسلہ میں ایسی شدت اختیار کی گئی کہ مجرم (یا گنہگار) کے لئے توبہ (اصلاح یا بازآفرینی) کی گنجائش ہی نہ رہی۔ یہ شدت، عدل میں الحاد ہے۔ دوسری طرف عیسائیت میں عدل کا تصور ہی نہیں۔ اس میں نجات کا دارومدار خدا کے رحم (یعنی کفارۂ حضرت مسیحؑ کے ایمان) پر ہے۔ یہ عقیدہ قانونِ مکافاتِ عمل (عدل) میں تفریط ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان، جلد اوّل ص۲۵)۔ اسے اسے غُلُوْ فِی الدِّیْن سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

ہم سے کہا گیا تھا کہ جو لوگ صفاتِ (و قوانینِ) خداوندی میں الحاد کی راہ اختیار کریں تو تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لیکن ہم، اس باب میں، دیگر اہلِ مذاہب سے بھی آگے بڑھ گئے۔ عیسائیوں کا الحاد یہ تھا کہ تم جس قدر بھی چاہے گناہ کرو، اگر حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان لے آؤ گے تو نجات ہو جائے گی۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:-

والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء

---

[1] ہمارے ہاں الحاد کا لفظ بے دینی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا متعین مفہوم افراط و تفریط اختیار کر لینا ہے۔

بقوم یذنبون فیستغفرون۔

اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا جس کا شیوہ یہ ہوگا کہ گناہ کرے گی اور خدا سے بخشش طلب کرے گی۔

اس کے علاوہ ہم نے دین میں کس قدر غلوّ کیا ہے اس کے متعلق انڈکس میں عنوان غلوّ دیکھئے (بالخصوص مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۹۳، جلد چہارم صفحہ ۴۴۵-۴۴۷: صفحہ ۵۵)۔ قانون کے بارے میں ہمارے الحاد کے متعلق تو پوچھئے ہی نہیں۔ ہمارے فقہی قوانین میں بہت کم ایسے ہوں گے جو قرآن کے مطابق جادۂ اعتدال کی راہ پر ہوں۔ عدل ویسے بھی قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کرنے کو کہا جائے گا۔ فرمایا:

(۱۸۱/۷) وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝

ان کے برعکس، ہمارے پیدا کردہ وہ لوگ بھی ہیں جو حق کے ساتھ دوسروں کی راہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے ذریعے اعتدال اور توازن کو ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔

اسی کو حق و عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا کہتے ہیں۔ الحق، قرآن مجید کا دوسرا نام ہے۔

یہی آیت (۱۵۹/۷) میں بھی کہا گیا ہے تشریح وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

ان کے برعکس،

(۱۸۲-۱۸۳/۷) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

جو لوگ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں (ان کی گرفت فوری نہیں ہو جاتی) ہم انہیں آہستہ

---

[1] اس حدیث کو (مولانا) ابو الکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد اول (شائع کردہ زمزم کمپنی لاہور) کے صفحہ ۱۰۹ پر مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

آہستہ، بتدریج (۶۸/۴۴) تباہی و بربادی کے اس مقام تک لے آتے ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا (۴۵-۴۶/۱۶؛ ۲۵/۳۹)۔ (یہ اس لئے کہ ہمارا قانون

قانونِ مہلت

یہی ہے کہ بیج ڈالنے اور فصل کے پکنے میں ایک مدتِ معینہ کا وقفہ رہے) یہی ان کے لئے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے (یہ بات نہیں کہ ان کی غلط کاریوں پر گرفت کرنے والا ہی نہیں ہوتا)۔ ہمارے قانونِ مکافات کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے (اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا)۔

قانونِ مہلت کے لئے دیکھئے عنوان "مکافاتِ عمل" اور "مہلت"؛ نیز توبہ، عملِ سُوء (غلط کام) اور اس کے آخری نتیجہ کے نمودار ہونے میں تدریج اور مہلت کا قانون خدا کی رحمت ہے جس کی بنا پر خطا کار کے لئے باز آفرینی کا امکان ہوتا ہے ـــــ منشاءِ ایزدی انسان کی اصلاح ہے، انتقام جوئی یا ایذا رسانی نہیں۔ اس ضمن میں "جرم و سزا" کا عنوان دیکھئے۔

یہ لوگ غلط روش کیوں اختیار کرتے ہیں، اس کی وجہ وہی بتائی گئی جس کی تفصیل آیت (۷/۱۷۹) میں گزر چکی ہے، یعنی غور و فکر سے کام نہ لینا۔ فرمایا:

(۱۸۴-۱۸۵ آیت) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝

ان لوگوں کے انکار اور تکذیب کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اگر یہ عقل و فکر سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ان کا یہ رفیق ـــــ یعنی ہمارا رسولؐ ـــــ پاگل نہیں۔ وہ انہیں جن تباہیوں سے خبردار کر رہا ہے، وہ واقعی

ان پر آنے والی ہیں (۴۶/۳۴)۔

اگر یہ لوگ کائنات کے عظیم سلسلہ اور تخلیقِ خداوندی پر ہی غور کر لیتے تو یہ بات ان کی سمجھ میں آجاتی کہ یہ رسولؐ جو کچھ کہتا ہے، وہ سچ کہتا ہے (۴۵/۲۲)۔ تخریبی روش کا نتیجہ کبھی منفعت بخش نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ اپنی آنکھوں پر اس طرح پردے نہ ڈالتے تو انہیں نظر آجاتا کہ ان کی تباہی کا وقت کس قدر قریب آرہا ہے (اس کی محسوس علامات سامنے کھڑی ہیں۔ اگر یہ اس پر بھی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تو) اس کے بعد وہ کونسی بات باقی رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ ایمان لائیں گے؟ ——— خارجی دنیا میں کائنات کا یہ محیّر العقول نظام اور ان کی داخلی دنیا میں اس قسم کی معاشرتی خرابیاں، ان شواہد کے بعد اور کونسی ایسی دلیل آجائے گی جس کی بنا پر یہ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں گے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا نتیجہ حسن و خوبی ہے اور اس کی خلاف ورزی کا انجام تباہی و بربادی۔

اس کے بعد اس قانونِ محکم کا پھر اعادہ کیا گیا کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور ضد اور تعصب کی بنا پر حقائق کا اندھا دھند انکار کئے جاتے ہیں، وہ صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔

(۷/۱۸۶) مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ (خدا کے قوانین کو چھوڑ کر) غلط راستہ اختیار کرلیں، تو پھر کوئی قوت ایسی نہیں ہوتی جو انہیں صحیح راستہ کی طرف لے آئے۔ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے خدا کے قانون کو چھوڑ دیتے ہیں، تو خدا کا قانون انہیں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ زندگی کی تاریکیوں میں حیران و سرگرداں مارے مارے پھریں (۲/۱۵)۔

آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "جسے خدا گمراہ کر دے، اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا" لیکن اس سے جو غلط فہمی (بلکہ گمراہی) پیدا ہوتی ہے، اس کی وضاحت متعدد مقامات پر کی جا چکی ہے (مثلاً مطالب الفرقان، جلد اول صفحہ ۱۸۸-۱۷۹ نیز انڈکس میں متعلقہ عنوانات) مطلب اس قسم کی آیات کا

یہی ہے کہ جو شخص صحیح راستہ اختیار ہی نہیں کرنا چاہتا، اسے کوئی بھی اس راستے پر نہیں لا سکتا۔ اس کی پہلی منزل وہی ہے جو آیت (۷/۱۷۹) میں گزر چکی ہے، یعنی عقل و فکر سے کام نہ لینا۔

○

مطالب الفرقان کی متعدد جلدوں میں قرآنی حقائق کے متعلق جو تفصیلات آپ کے سامنے آ چکی ہیں، ان سے آپ نے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لیا ہو گا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصدِ عظیم یہ ہوتا تھا کہ اربابِ اقتدار نے ظلم و غارت گری اور سلب و نہب پر مبنی جو نظام قائم کر رکھا تھا، اسے مٹا کر اس کی جگہ حق و انصاف پر مبنی انسانیت ساز نظامِ خداوندی قائم کر دیا جائے۔ اس انقلابِ عظیم کو جو ان حضرات کے ہاتھوں رونما ہوتا تھا، مختلف اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے جن میں سب سے نمایاں اصطلاح السَّاعة ہے۔ اس لفظ کا مادہ (س۔ و۔ ع) اور (س۔ ی۔ ع)

السَّاعة

دونوں سے آتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں، کسی کیفیت یا حالت میں مسلسل تغیر واقع ہوتے چلے جانا تا آنکہ وہ رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر تباہ ہو جائے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ حق و باطل کی کشمکش میں باطل کی قوتیں بتدریج کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں تا آنکہ ایک ایسا وقت آ جاتا ہے جب ان میں قائم اور باقی رہنے کی سکت نہیں رہتی اور وہ تباہ ہو جاتی ہیں۔ قوموں کے اس انقلاب کو قرآنِ کریم السَّاعة سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ظہورِ نتائج کا وقت بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اعمالِ انسانی کے نتائج کا خاتمہ اس دنیا میں ہی نہیں ہو جاتا، مرنے کے بعد اُخروی زندگی میں بھی ان کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے اسے بھی قرآنِ کریم نے السَّاعة کہہ کر پکارا ہے۔ اسے قیامت بھی کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ السَّاعة سے مراد دونوں قسم کے انقلاب ہوں گے ــــ ایک وہ انقلاب جو اس دنیا میں واقع ہو، دوسرا وہ جو مرنے کے بعد آخرت میں ظہور پذیر ہو گا۔ قرآنِ مجید کی مختلف آیات میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے دیکھ لینا چاہیئے کہ اس سے کونسا انقلاب مراد ہے۔

حضرات انبیاء کرامؑ مخالف قوتوں سے مسلسل کہتے رہتے تھے کہ جس روش پر تم چلے جا رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی ہو گا۔ یہ اس انقلاب کی رُو سے مرتب ہو گا جو رفتہ رفتہ ہیئت پذیر ہو رہا ہے۔ وہ (مخالفین) بجائے اس کے کہ اس وارننگ (تنذیر) سے عبرت حاصل کر کے اپنی غلط روش میں اصلاح کر لیتے، بار بار پوچھتے کہ جس انقلاب کی تم دھمکی دیتے چلے آ رہے ہو، وہ کب نمودار ہو گا؟ چونکہ اس انقلاب کو خدا کے قانونِ

مکافات کی رُو سے مہلت کا وقفہ ختم ہو جانے کے بعد واقع ہونا ہوتا تھا۔ اس لئے انبیاء کرام اس کا وقت متعین نہیں کرسکتے تھے۔ وہ حقائق خداوندی کی روشنی میں یہ تو حتمی طور پر جانتے تھے کہ اسے واقع ہو کر رہنا ہے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کب واقع ہو گا۔ یہ سوال و جواب قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں آئے ہیں۔ اس مقام پر فرمایا:

(۷/۱۸۷) يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔ
ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ
يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ انقلاب کی وہ گھڑی (جس کی بابت تم اس قدر دھمکیاں دے رہے ہو) کب واقع ہوگی (سعی عمل کی کشتی رواں اپنی نتیجہ خیزی کے لئے کب لنگر انداز ہوگی)۔

ان سے کہو کہ اس کا علم میرے پروردگار ہی کو ہے (۳۳/۶۳ ؛ ۴۲/۱۷ ؛ ۷۹/۴۲)۔

اس کے سوا کوئی نہیں جو اسے نمودار کردے (اس کا فیصلہ اس کے قانون کی رُو ہی سے ہوسکتا ہے (۱۳/۳۸ - ۴۰) لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ انقلاب ایسا عظیم ہوگا کہ) وہ زمین و آسمان پر بھاری ہوگا اور تم پر اچانک آجائے گا (۶/۳۱ ؛ ۱۲/۱۰۷ ؛ ۲۲/۵۵ ؛ ۴۷/۱۸ ؛ ۴۳/۶۶ نیز ۱۶/۷۷ ؛ ۵۴/۵۰ ؛ ۳۶/۴۸ - ۵۰)۔ یہ تجھ سے اس کے متعلق اس طرح پوچھ رہے ہیں گویا تو اسی کاوش میں لگا رہتا ہے (اس کے سوا تیرے لئے کوئی اور کام ہی نہیں)۔ ان سے کہہ دو کہ (میں اس کے متعلق قطعاً کوئی کاوش نہیں کرتا) اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے (اور اس کے متعلق یونہی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں)۔

اس کے لئے وقت کا تعین علمِ غیب سے متعلق ہے اور مجھے غیب کا علم حاصل نہیں بجز اس علم کے جو مجھے خدا بذریعہ وحی عطا کر دے۔ غیب کا علم تو ایک طرف میری تو یہ کیفیت ہے کہ

۷/۱۸۸ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؏

نفع و نقصان کی مقدرت

ان سے کہو کہ (یہ تو بہت بڑی چیز ہے کہ میں بتا سکوں کہ یہ انقلاب کب آئے گا۔ میری تو یہ کیفیت ہے کہ) میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع نقصان کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ کچھ بھی خدا کے کائناتی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لئے بہت سی نفع بخش چیزیں اکٹھی کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو تک نہ سکتی۔ (میری پوزیشن تو صرف یہ ہے کہ) میں اس قوم کو جو خدا کے قوانین پر یقین رکھتی ہے صحیح روش کے خوشگوار نتائج اور غلط روش کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتا ہوں (کیونکہ مجھے اس کا علم وحی کے ذریعے دیا گیا ہے۔ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا (۲۷/۶۵)۔ حتیٰ کہ رسولوں کو بھی از خود غیب کا علم نہیں ہوتا (۶/۵۰ ؛ ۱۰/۲۰)۔ انہیں جس قدر علمِ غیب خدا دینا چاہے، بذریعہ وحی عطا کر دیتا ہے (۳/۱۷۸ ؛ ۲۷-۷۲/۲۶ ؛ ۳/۴۳ ؛ ۱۱/۴۹) —— لہٰذا جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے علم پا کر پیش گوئیاں کرتے ہیں، وہ وحی پانے کے مدعی ہوتے ہیں اور یہ عقیدہ ختمِ نبوت کے خلاف ہے)۔

علمِ غیب کے متعلق تصریحات مختلف مقامات پر آچکی ہیں۔ انڈکس میں عنوان "غیب" دیکھئے، بالخصوص مطالب الفرقان جلد اوّل صـ۹۰-۹۷، جلد پنجم صـ۳۲ اور صـ۳۸-۴۰۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ جملہ اقتدارات اور اختیارات کا مالک خدا ہے۔ اس میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کے بعد سب سے بلند و بالا مقام حضرات انبیاء کرامؑ کا ہے، لیکن ان کے متعلق بھی یہ وضاحت کر دی کہ وہ دوسرے انسانوں جیسے انسان ہیں (بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ)۔ انہیں اپنی ذات کے لئے بھی (بجز قوانینِ خداوندی) نفع یا نقصان کا اختیار نہیں چہ جائیکہ وہ کسی اور کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ اُنہیں غیب کا علم بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اُن کی خصوصیت ایک ہی ہے کہ ان کی طرف وحی نازل ہوتی ہے، جس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو آگاہ کر دیں کہ نجات و سعادت کی راہ کون سی ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ کون سا۔ ظاہر ہے کہ جب نوعِ انسان کی برگزیدہ ہستیوں کی یہ کیفیت ہے تو کسی اور انسان کو کسی قسم کی فوق البشر قوت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک حقیقت کی وضاحت سے قرآن نے کس طرح شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی! اس کا نام توحید ہے۔

دنیا کے دیگر مذاہب[1] میں خدا کا نام تو بس برائے وزنِ بیت ہوتا ہے۔ ان کی جملہ عقیدت مندیوں اور اطاعت گزاریوں کا مرکز غیر خدائی قوتیں ہوتی ہیں (جو درحقیقت ان کے اپنے ذہن کی تراشیدہ ہوتی ہیں)۔ ان میں وہ آفاقی قوتیں بھی شامل ہوتی ہیں جن کا درحقیقت کوئی وجود نہیں ہوتا۔ (مثلاً) دیوی دیوتاؤں کے موہوم تصورات، ان موہوم تصورات کو محسوس پیکروں میں سامنے لانے کے لئے ان کے بُت (مجسمے) تراش لئے جاتے ہیں۔ ان سے آگے بڑھئے تو انسان پرستی جس کی ان گنت شکلیں ہیں۔ ان انسانوں میں جن کی پرستش کی جاتی ہے، ایک خصوصیت مشترک ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ انہیں دوسرے انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور مقدس و متبرک سمجھا جاتا ہے ـــــ کوئی غیر برہمن کسی برہمن کا ہمتا نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم نے انسانی تخلیق کی حقیقت واضح کر کے نسلی تفوّق کے باطل نظریہ کو بھی خاک میں ملا دیا۔

قرآن نے آیت (۷/۱۸۸) میں، بعد از خدا بزرگ ترین شخصیت کا ذکر کرنے کے بعد، آئندہ آیات (۷/۱۸۹ ـ ۱۹۵) میں شرک کی ان مختلف شکلوں کی تردید کی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے مفہوم کا درج کرنا کافی ہوگا۔ اس کے بعد بعض خصوصی نکات کی وضاحت کی جائے گی۔

---

[1] میں جب مذاہب کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں اسلام کو بھی مذاہب کی صف میں شامل کرتا ہوں۔ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ مذاہب کے ضمن میں اس کا ذکر محض بغرضِ تقابل ہوتا ہے۔

۱۸۹ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ○

ان لوگوں سے کہو کہ (میں جس خدا کے قانون کی طرف دعوت دیتا ہوں وہ) وہ خدا ہے جس نے تمہاری پیدائش کا سلسلہ آغاز ایک جرثومۂ حیات سے کیا۔ پھر وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر نر اور مادہ میں تقسیم ہو گیا (۱/۴) اور اس طرح رفتہ رفتہ، عورت اور مرد کا وجود عمل میں آ گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور باہمی رفاقت سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے (۳۰/۲۱)۔ اس سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ جب ایسا ہوتا ہے کہ مرد عورت کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو اسے حمل قرار پا جاتا ہے۔ شروع میں وہ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ اسے اس کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی شدت محسوس ہونے لگتی ہے[1]۔ پھر جب وضعِ حمل کا وقت قریب آ جاتا ہے تو میاں بیوی دونوں اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ اگر تُو نے ہمیں ایک تندرست و توانا بچہ عطا کر دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔

۱۹۰ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○

لیکن جب وہ انہیں تندرست بچہ عطا کر دیتا ہے تو وہ اس بچے کی پیدائش کے سلسلے

---

[1] حمل اور رضاعت کی مدت کے متعلق اپنے مقام پر تشریح کی جائے گی (زیرِ نظر آیت کے علاوہ متعلقہ آیات (۲/۲۳۳) و (۳۱/۱۴)؛ (۴۶/۱۵) اور (۶۵/۶) ہیں۔ رضاعت کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (ص۱۲۳) پر لکھا جا چکا ہے۔

میں خدا کے ساتھ اوروں (زندہ اور مردہ پیروں فقیروں) کو بھی شریک کرنے لگ جاتے ہیں (اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جنہیں وہ خدا کا ہمسر قرار دیتے ہیں) اللہ کا مقام اُن سے کس قدر بلند ہے۔

۷/۱۹۱ اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ شَیۡـًٔا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ۫ۖ○

ان کی حماقت دیکھئے کہ وہ خدا کا ہمسر انہیں بناتے ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ اُن کا کسی چیز کو پیدا کرنا تو ایک طرف، وہ خود کسی کی تخلیق ہیں۔

۷/۱۹۲ وَ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ لَہُمۡ نَصۡرًا وَّ لَاۤ اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ○

وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی کوئی مدد کر سکیں۔ ان کی مدد کرنا تو درکنار، وہ خود اپنی مدد کرنے کے بھی قابل نہیں۔

۷/۱۹۳ وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَتَّبِعُوۡکُمۡ ؕ سَوَآءٌ عَلَیۡکُمۡ اَدَعَوۡتُمُوۡہُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ صَامِتُوۡنَ ○

(ان لوگوں پر اپنے معبودانِ باطل کی عقیدت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ، اس بارے میں کسی کی بات تک سننے کے روادار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ) اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف دعوت دو، تو وہ تمہارا اتباع کبھی نہیں کریں گے۔ لہٰذا تمہارے لئے یکساں ہے کہ تم انہیں صحیح راستے کی طرف دعوت دو، یا خاموش رہو (۲/۶)۔

۷/۱۹۴ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡہُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○

(ان سے کہو کہ) جن ہستیوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، وہ تمہارے ہی جیسے (خدا کے) بندے ہیں۔ ان میں کوئی خدائی قوت نہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ ان میں خدائی

تو تیں ہیں، تو تم انہیں اپنی احتیاجوں میں مدد کے لئے پکارو. پھر دیکھو کہ کیا وہ تمہاری احتیاج کو پورا کر دیتے ہیں؟

(۷/۱۹۵) اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝

(اور یہ مٹی اور پتھر کے بُت، جن کی تم پرستش کرتے ہو، وہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں. تم نے ان کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان سب بنا دیئے ہیں. لیکن سوچو کہ) کیا ان کے پاؤں ایسے ہیں جن سے یہ چل سکیں. کیا ان کے ہاتھ ایسے ہیں جن سے یہ کچھ پکڑ سکیں. کیا ان کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے یہ دیکھ سکیں یا ان کے کان ایسے ہیں جن سے یہ سُن سکیں.

اے رسولؐ! ان سے کہو کہ (یہی ہیں نا تمہارے وہ معبود جن کے بل بوتے پر تم سمجھتے ہو کہ مجھے شکست دے دو گے. سو) تم انہیں بلاؤ اور سب کو دعوت دو کہ وہ میرے خلاف جو تدبیریں چاہیں کریں، اور مجھے (اس باب میں) ذرا سی بھی مہلت نہ دیں.

شرک

ان آیات میں شرک کی مختلف شکلوں کی تردید کر کے، ایمان و ایقان کو خالصتاً ذاتِ خداوندی پر مرکوز کر دیا گیا ہے. شرک سے انسان کس طرح شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے اور خوف سے اس کے اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں، اس کے لئے انڈکس میں شرک و خوف اور شخصیت پرستی کے عنوانات دیکھئے. اب آیئے ان آیات کے بعض خصوصی نکات کی طرف.

آیت (۷/۱۸۹) میں کہا گیا ہے کہ خدا نے تم سب (تمام انسانوں) کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا. انسانی تخلیق کی تشریح اور نفسِ واحدہ کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد دوم کے باب اوّل میں کی جا چکی ہے

نسلی امتیاز کا خاتمہ

نیز جلد پنجم صؔ ۸۶ پر. انڈکس میں عنوان ارتقا اس موضوع پر مزید روشنی ڈالے گا. ان مقامات پر تخلیقِ انسانی کے حیاتیاتی

Biological

مراحل کو سامنے لایا گیا ہے۔ لیکن اس سے جو اخلاقی نکتہ ہویدا ہوتا ہے وہ اس سے بھی اہم اور درحقیقت اصل مقصود ہے۔ جب تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں تو ان میں پیدائشی (اور نسلی) تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ درخت کے تمام پتے ایک اصل (جڑ) سے نمو پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی پتا دوسرے پتے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تم سے افضل و اعلیٰ ہوں۔ یہی وحدتِ اصل مساواتِ انسانیہ کی بنیاد ہے۔ اس ایک نکتہ سے قرآن نے تفریقِ انسانی کے تمام باطل تصورات اور طبقاتی امتیازات کو ختم کر کے رکھ دیا۔

اس کے بعد کہا کہ اس نفسِ واحدہ سے مذکر و مؤنث (مرد اور عورت) کی تخلیق ہوئی۔ اس سے مرد اور عورت کی مساوات کا تصور ذہن نشین کرا دیا۔ اس سلسلہ میں انڈکس میں عنوان "عورت" دیکھئے، بالخصوص مطالب الفرقان جلد دوم صـ۱۲۳، جلد سوم صـ۳۵۹۔ نیز عنوان "عائلی قوانین"۔

ازدواجی تعلقات

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات میں خاوند اور بیوی کو ایک دوسرے کا زوج قرار دیا۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد اوّل صـ۳۳۸ پر گزر چکی ہے۔ زوج کے معنی ہوتے ہیں ہم آہنگ اور یک رنگ رفقاء۔ اس سے مردوں کی بالادستی اور تفوق کا غلط تصور باطل قرار دے دیا۔

ان کے ازدواجی رشتہ کا مقصد بتایا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا، تاکہ وہ زندگی میں سکون حاصل کر سکیں۔ عربوں کے ہاں اَلسُّكَّانُ کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے بھی بڑھتی جاتی ہے اور اس کا توازن بھی برقرار رہتا ہے۔ لہٰذا ازدواجی رشتہ سے مقصود یہ ہے کہ زندگی کی کشتی اس طرح آگے بڑھتی چلی جائے کہ اس کا توازن بھی برقرار رہے۔ دوسرے مقام پر اس میں اضافہ فرماتے ہوئے کہا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۰/۲۱)

جامد مادہ سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جرثومہ[1] کی شکل میں تھی۔ وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اس کا ایک حصہ نر بن گیا اور دوسرا مادہ ــــــــ

[1] Life Cell

اس طرح تم ــــــ مرد اور عورت ــــــ ایک دوسرے کے زوج (جوڑے) بن گئے۔
مقصد اس سے یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کی رفاقت سے سکونِ قلب حاصل کرو۔ اس نے
تم میں ایک ایسا گہرا رشتہ پیدا کر دیا جو تمہاری، مرد اور عورت دونوں کی، صلاحیتوں کی نشوونما
کا موجب بن گیا۔
زندگی کے اس نقشے میں بھی، ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، قانونِ
خداوندی کی محکمیت اور حیات بخشی کی نشانیاں ہیں۔

اور اس پُرسکون مودّت اور رحمت کی رفاقت کے ساتھ افزائشِ نسل کے فریضہ کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس میں بھی محض حیاتیاتی عمل کو سامنے نہیں لایا گیا بلکہ نہایت لطیف پیرایہ میں شرک کے ایک گوشہ کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ کہا کہ جنین کی حالت میں تو ان کی توجہ کا مرکز خدا ہی ہوتا ہے، لیکن جب تندرست و توانا بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اسے "اللہ دتا" کی بجائے "پیراں دتا" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی مائیں اپنے نوزائیدہ بچوں کو کون کون سے دواروں، کون کونسی خانقاہوں، کون کونسی درگاہوں پر لئے لئے پھرتی اور ان آستانوں پر منتیں پوری کرتی اور نذرانے چڑھاتی ہیں، یہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ میں نے اپنی کتاب "تصوّف کی حقیقت" میں ان درگاہوں اور آستانوں کی طرف منسوب کردہ بکثرت کراماتوں کا ذکر کیا ہے، لیکن حصولِ اولاد کے سلسلہ میں مجھے ایک ایسا قصہ یاد آ رہا ہے جو بڑا دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ عرصہ کی بات ہے، لاہور سے ایک رسالہ شائع ہوا کرتا تھا ــــــ انوار الصوفیہ ــــــ شاید اب بھی نکلتا ہو۔ اس میں حضرات اولیاء کرام کی محیّر العقول اور حیرت فروش کرامات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس رسالہ کی مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں ایک سرمست بزرگ شاہ سید قلندر (جنہیں شاہ سیدہ ولی بھی کہا جاتا تھا) کی ایک کرامت کا تفصیلی تذکرہ شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے تحریر یہ تھا:

ایک دن ایک عورت شاہ سیدہ ولی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگی کہ جناب میرے ہاں کوئی بال بچہ نہیں ہے۔ دعا فرمایئے کہ خداتعالیٰ مجھ کو لڑکا عطا فرمائے۔ آپ نے نظرِ باطن سے دیکھ کر فرمایا کہ تیری قسمت میں کوئی بچہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ وہ بہت دلگیر ہوئی اور پھر عرض کی مگر پھر بھی وہی جواب ملا۔ آخر وہ عورت مایوس ہو کر واپس چلی گئی اور جب وہ چوک کنک منڈی میں پہنچی تو ایک ولی اللہ نور شاہ گدیلہ نامی جن کا مزار اب بھی اُسی جگہ بازار

کی دکانوں میں موجود ہے اس عورت کو ملے۔ اس نے ان کی خدمت میں حصولِ اولاد کے لیئے التجائے دعا کی۔ نور شاہ نے کہا جمع خاطر رکھ، خدا تجھ کو لڑکا دے گا۔ پس وہ اپنے گھر چلی گئی اور خدا نے اُسے پورے دنوں پر لڑکا عطا فرمایا۔ وہ عورت حیران تھی کہ شاہ سیّدہ کی بات کبھی خطا نہیں گئی۔ اُن کا کہا پورا ہوجاتا ہے اور میری بابت آپ نے کہا تھا کہ تمہاری قسمت میں کوئی اولاد نہیں ہے، تو پھر یہ لڑکا میرے ہاں کیسے پیدا ہوا۔ پس وہ عورت لڑکے کو لے کر شاہ سیدہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُن سے کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں کوئی اولاد نہیں، دیکھو خدا نے مجھ کو یہ لڑکا عطا فرمایا۔ آپ نے پھر نگاہ لوحِ محفوظ کی طرف کی اور دیکھا تو وہاں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں پایا اور اس عورت سے کہا کہ تیری قسمت میں تو لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا کہیں نظر نہیں آتا، یہ لڑکا تمہارے ہاں کیسے ہوگیا۔ عورت نے جواب دیا کہ جس روز میں آپ کے پاس اسی مطلب کے لئے آئی تھی اور مایوس ہوکر چلی گئی تھی اور سیدھی نور شاہ کے ہاں پہنچی تو ان سے اولاد کے لئے عرض کی تو انہوں نے کہا کہ جاؤ خدا تم کو لڑکا دے گا۔ پس ویسے ہی ہوا اور خدا نے مجھ کو پورے دنوں پر یہ لڑکا عطا فرمایا ہے۔ شاہ سیدہ نے جب نور شاہ کی طرف نگاہ کی تو ان کی زبان پر لکھا ہوا پایا تب شاہ سیدہ نے کہا کہ بیشک درست ہے۔ اگر نور شاہ نہ کہتا تو کبھی لڑکا پیدا نہ ہوتا، کیونکہ خدا نے نور شاہ کی زبان پر لکھا ہوا تھا۔ تو ثابت ہوا کہ فقیروں کی زبان بھی لوحِ محفوظ ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ فقیروں کی زبان پر لکھ دیتا ہے۔ وہ جیسا فرمائیں ویسا ہوجاتا ہے۔ پس بطورِ مذاق شاہ سیدہ صاحب نے عورت سے کہا کہ یہ تو لڑکی ہے، تو کہتی تھی کہ یہ لڑکا ہے۔ جب عورت نے دیکھا تو وہ لڑکی نظر آئی۔ حیران ہوئی کہ میں تو گھر سے لڑکا لے کر آئی تھی، یہ لڑکی کیسے ہوگئی۔ پس وہ عورت لڑکی کو لے کر نور شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچی اور اُن سے سب حال سنایا کہ آپ کی دعا سے خدا نے مجھ کو لڑکا عطا فرمایا اور شاہ سیدہ کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں اولاد ہی نہیں ہے اور میں اُن کو دکھلانے گئی تھی کہ آپ تو کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں اولاد ہی نہیں ہے اور نور شاہ کے کہنے پر مجھ کو خدا نے لڑکا عطا فرمایا ہے تو آپ نے یہ سُنکر کہا کہ یہ لڑکا نہیں، لڑکی ہے تو اُن کے

کہنے سے یہ لڑکی ہوگئی ہے. اس پر نور شاہ صاحب مسکرائے اور کہا کہ نہیں مائی! لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے. غور سے دیکھ. جب عورت نے دیکھا تو لڑکا ہی نظر آیا. وہ پھر شاہ سیدہ کے پاس گئی اور کہا کہ دیکھو شاہ صاحب! یہ لڑکا ہے لڑکی نہیں. اس پر شاہ صاحب نے کہا کہ اے عورت! تم غلطی کرتی ہو. یہ تو لڑکی ہے، لڑکا کہاں ہے. جب پھر عورت نے دیکھا تو وہ لڑکی ہوگئی. پس وہ اُسی وقت پھر نور شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچی اور کہا کہ جناب یہ تو پھر لڑکی ہوگئی ـــ جس پر نور شاہ صاحب نے کہا کہ تو پاگل ہے، دیکھ یہ تو لڑکا ہے. اُن کے کہنے پر پھر جب عورت نے دیکھا تو لڑکا ہی پایا. تب عورت نے کہا کہ میں کیا کروں ـــــــ جب آپ کے پاس آتی ہوں تو لڑکا ہو جاتا ہے اور جب شاہ سیدہ کے ہاں جاتی ہوں، لڑکی ہو جاتی ہے. اس پر نور شاہ صاحب نے کہا کہ اب شاہ سیدہ کے پاس نہ جانا اور سیدھی اپنے گھر کو چلی جانا تو پھر لڑکا ہی رہے گا. اے عزیزا دیکھا کہ خدا کے بندے ایک نظر میں کچھ کا کچھ کرکے دکھا دیتے ہیں[1].

اس سے قرآن کریم کے اس ارشادِ گرامی کا مفہوم نکھر کر سامنے آگیا ہوگا؛ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا (۷/۱۹۰) اور یہ کسی ایک مائی اور کسی ایک قلندر کا قصہ نہیں، ہماری ساری قوم اِسی قسم کے خرافات میں کھوئی ہوئی ہے.

اِس کے بعد اِس قسم کی جہالت اور توہم پرستی کی تردید کی گئی ہے ـــــ اور تردید بھی قرآنِ کریم کے اپنے مخصوص انداز میں. فرمایا کہ یہ لوگ جن سے جا کر اولادیں مانگتے ہیں اور جو اولادیں دینے کے مدعی ہیں، ان کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ "ان کا کسی چیز کو پیدا کرنا تو ایک طرف، وہ خود بھی مخلوق (کسی کے پیدا کردہ) ہیں"؛ یہ حقیقت بالبداہت واضح ہے کہ کوئی انسان کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتا. "پیدا کرنے" سے مراد ہے کسی شے کو عدم Nothingness سے وجود میں لانا. جن چیزوں کو انسانی ایجادات کہا جاتا ہے، ان کی کیفیت اتنی ہی ہوتی ہے کہ خدا کی پیدا کردہ مختلف اشیاء میں، خاص تناسب سے امتزاج پیدا کرکے انہیں ایک نئی چیز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے. یہ تخلیق (یعنی عدم سے وجود میں لانا) نہیں، نہ ہی Discovery

[1] بحوالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام، بابت جولائی ۱۹۴۱ء (صفحہ ۵۱ - ۴۹).

کو تخلیق کہا جاسکتا ہے۔ وہ تو کسی موجود شے پر پڑے ہوئے پردہ کو اٹھا دینا ہوتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ یہ لوگ خود اپنی پیدائش پر بھی قادر نہیں۔ یہ خود پیدا شدہ ہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا "بزرگ" کیوں نہ ہو، اگر اس کے ماں باپ کے جنسی اختلاط سے استقرارِ حمل نہ ہوتا، تو اُن بزرگوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ باقی رہا اُن کا عالی نسب ہونا، سو اس پر بھی اُن کا کوئی اختیار نہ تھا کہ یہ کس کے گھر پیدا ہوں گے۔ جو خود مخلوق ہو وہ تخلیق پر قادر کس طرح ہو سکتا ہے؟ (۷/۱۹۱)۔ اب رہا اُن سے جاکر مرادیں مانگنا، تو یہ خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی خدا کے پیدا کردہ اسباب و ذرائع کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ بھی انہی عناصر اور قویٰ کے سہارے زندہ رہتے ہیں جنہیں خدا نے زندگی کے قیام و بقا کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے (۷/۱۹۲)۔ لہٰذا، یہ تمہارے ہی جیسے انسان ہیں۔ ان میں کوئی خدائی قوت نہیں (۷/۱۹۴)۔

ان کی جہالت کی انتہا ہے کہ (انسان تو ایک طرف) یہ مٹی اور پتھر کی ان مورتیوں (بتوں) کو بھی خدا بنا لیتے ہیں جنہیں یہ خود اپنے ہاتھ سے تراشتے اور گھڑتے ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات مضحکہ انگیز نہیں کہ ایک پتھر کے ٹکڑے کو تراش خراش سے انسانی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس کے کان اور آنکھیں بنا دیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا جہان کی باتیں سنتے ہیں اور آسمانوں تک کے احوال و ظروف کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ان کی داستان بھی اتنی ہے کہ ـــــ تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔

یہ ہیں اُن کے وہ حمایتی اور مددگار جن کے بل بوتے پر یہ (اے رسولؐ!) تمہارے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمہیں شکست دے دیں گے! تم ان سے کہہ دو کہ نہ میں تم سے ڈرتا ہوں، نہ تمہارے ان معبودانِ باطل سے خوف کھاتا ہوں۔

۷/۱۹۶ اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ○

(میں اس چیلنج کو اس حتم و یقین اور جرأت و بیباکی سے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ) میرا رفیق و دمساز وہ خدا ہے جس نے مجھے اس قسم کا محکم ضابطہ حیات دیا ہے اور وہ ان تمام لوگوں کی رفاقت اور کارسازی کرتا ہے جو اُس کے بنائے ہوئے صلاحیت بخش

پروگرام پر عمل پیرا ہوتے اور معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنوارتے ہیں.

اس کے بعد پھر دہرایا کہ

۷/۱۹۷ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝

اس کے برعکس جن معبودوں کو تم 'خدا کے سوا' پکارتے ہو' وہ نہ تمہاری کچھ مدد کرسکتے ہیں، نہ اپنے آپ کی.

جن لوگوں کی جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہو اور اپنے خود ساختہ خداؤں کی عقیدت کا یہ عالم ہو کہ یہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہ ہوں' ان پر حق کی دعوت کیا اثر کرسکتی ہے.

۷/۱۹۸ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

(لیکن ان کی اندھی عقیدت کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے باوجود) اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف دعوت دو' تو یہ تمہاری کبھی نہیں سنیں گے. تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف تک رہے ہیں' لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں رہے ہوتے. (ان کی آنکھیں بظاہر تمہاری طرف ہوتی ہیں' لیکن دل کہیں اور ہوتا ہے (۴۳-۴۲/۱۰) ؛ ۴۶/۱۶ ؛ ۲۰/۱۱).

نظر اور بصر کا فرق' سابقہ صفحات میں (آیت ۷/۱۷۹ کے زیرِ تشریح) سامنے لایا جاچکا ہے. جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے' قرآنی تعلیم اور حقائق پر وہی لوگ ایمان لاسکتے ہیں جو تعصبات اور باطل کی عقیدت مندیوں سے الگ ہٹ کر' قرآنی دعوت پر عقل و فکر کی رُو سے غور کریں.

سابقہ آیات میں شرک کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے' اُس سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ کچھ زمانۂ نزولِ قرآن

ہمارا شرک

کے عربوں سے متعلق ہے' ہمارا اس سے کچھ واسطہ نہیں (کیونکہ ہم تو خدا کے فضل سے "مومن اور توحید پرست ہیں). لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کے شرک کی کونسی نہج اور جہت ہے جس میں ہم خود مبتلا نہیں؟ ہم

ہیں اور ان (عربوں) میں فرق یہ ہے کہ وہ ان معبودانِ باطل کی پرستش کرتے تھے تو دھڑلے سے اس کا اقرار کرتے تھے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم شرک میں ان سے بھی زیادہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، لیکن اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھے ہوئے ہیں کہ ہم خدا پرست ہیں۔ گویا ہم عملاً مشرک بھی ہیں اور اس کے ساتھ منافق بھی۔ وہ مشرک منافق نہیں تھے۔

خود شرک میں بھی ہم ان سے ایک قدم آگے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی انسان کو نہیں۔ ہم ہزار برس سے انسانوں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں، اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے اسلامی حکومت کہہ کر پکارتے ہیں، حالانکہ خدا کے حقِ حکومت میں کسی انسان کو شریک کرنے کو خود خدا نے شرک قرار دیا ہے (۱۸/۲۶)۔

ایک اور نکتہ کا اعادہ بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس سختی سے شرک سے منع کیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اگر خدا کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر لیا جائے تو اس سے خدا کی کبریائی میں کوئی فرق آجاتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ خدا تو اس وقت بھی خدائے مقتدر تھا جب اس کا نام تک لینے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا، یعنی وہ تخلیقِ کائنات سے بھی پہلے خدا تھا۔ اس لئے اگر اسے کوئی بھی نہ مانے یا اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کر لے تو اس سے اُس کا کیا بگڑتا ہے؟ اس نے شرک سے اس لئے منع کیا ہے کہ اس سے انسان خود اپنے مقام سے گر جاتا ہے، شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا سینہ خوف و حزن کا مہبط بن جاتا ہے۔ شرک سے خدا کا تو کچھ نہیں بگڑتا، لیکن انسان کا کچھ رہتا ہی نہیں۔

ان حقائق کی وضاحت کے لئے انڈکس میں شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے، نیز عنوانات حکومت، خدا کی حکومت، اسلامی یا قرآنی نظام وغیرہ۔

آیت (۷/۱۵۷) میں بعثتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ غلامی کی اُن تمام زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آرہی تھی۔ ان اطواق و سلاسل کی شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں، ان سب کے لئے قرآن کی جامع اصطلاح شرک ہے۔ شرک کی مختلف نوعیتوں کی وضاحت کے بعد حضور نبیِ اکرمؐ کی توجہ ان کے پیشِ نظر مرکزی پروگرام کی طرف مبذول کرائی۔ فرمایا:-

۷/۱۹۹ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ○

(اس کا مفہوم بعد میں دیا جائے گا)۔

اس آیۂ جلیلہ میں تین اہم امور کا حکم دیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے والوں سے اعراض، امر بالمعروف اور خذ العفو۔ کفار کے ساتھ تعلقات اور اُن سے اعراض برتنے کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے (انڈکس میں عنوان کفار دیکھئے)۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر امتِ مسلمہ کا بنیادی فریضہ ہے۔ آیت (۷/۱۵۷) میں خود نبی اکرمؐ کا بھی یہی فریضہ بتایا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلامی نظام کا بنیادی فریضہ یہی ہے یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکنا جنہیں وہ ناجائز قرار دیتا ہے۔ اس آیت میں معروف کی جگہ عُرف آیا ہے جس سے مراد معروف ہی ہے، بالخصوص جب آیت (۷/۱۵۷) میں رسول اللہ کے متعلق "معروف کا حکم دینے والا" آیا ہے اور یہاں حضورؐ کا فریضہ، عرف کے مطابق حکم دینا بتایا گیا ہے۔ عرف کے

عرف عام معنی کسی قوم کے رسم و رواج کے بھی ہیں۔ فقہ میں کسی قوم کے رسم و رواج کو بھی شریعت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ چیز غور طلب ہے۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر واضح کیا جا چکا ہے قرآن کریم بالعموم، دین کے اصول و اقدار بیان کرتا ہے اور اسے اسلامی مملکت پر چھوڑتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات خود وضع کرے۔ قرآنی اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے، لیکن ان کی جزئیات بہ تقاضائے حالات، بدلی جا سکیں گی۔ اگر کوئی اسلامی مملکت یہ دیکھے کہ کسی قوم کا کوئی رواج ایسا ہے جسے قرآن کے کسی اصول کے جزئی قانون کی حیثیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے، تو وہ اس (عرف) کو مملکتی قانون قرار دے سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ عُرف اُس قوم کے رواج ہونے کی وجہ سے اسلامی قانون تسلیم نہیں کیا جائیگا، بلکہ اس لئے اسلامی قانون تسلیم کیا جائے گا کہ اسلامی مملکت نے اسے صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ اگر کسی قوم کا کوئی عُرف (رواج) قرآنی اصولوں سے ٹکرائے گا، تو اس کا شمار معروف کے بجائے منکر میں ہوگا۔

اب آیئے خُذِ الْعَفْوَ کی طرف۔ جیسا کہ لغات القرآن میں بتایا گیا ہے، عَفو کے متعدد معانی ہیں جن میں دو نمایاں ہیں، یعنی (۱) درگزر کرنا۔ اور (۲) زائد از ضرورت مال و دولت۔

خُذِ الْعَفْوَ جب کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں اور قرآنِ کریم میں وہ لفظ مختلف آیات میں آیا ہو تو قرآنی طالب علم کے لئے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس لفظ کے متعدد معانی میں سے کون سا معنیٰ زیادہ موزوں ہے۔ اس کے لئے قرآن کے دیگر مقامات کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ اس طریق سے جن معانی کو ترجیح دی جاتے گی وہ قرآنی مفکر کا فکری اجتہاد ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی (بڑے سے بڑے مفکر) کا فکری اجتہاد بھی نہ وحیِ خداوندی کی طرح حرفِ آخر ہو سکتا ہے نہ غیر متبدل۔ دوسرے تو ایک طرف، وہ خود بھی مزید غور و تدبر سے اپنے سابقہ فکری استنباط میں تبدیلی کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تائید لغت اور قرآن کی کلی تعلیم سے ہوتی ہو۔

العفو کا لفظ آیت (۲/۲۱۹) میں آیا ہے جہاں بالبداہت "زائد از ضرورت" معنی ہی موزوں ہیں۔ چنانچہ میں نے (مفہوم القرآن میں) بھی یہی معانی لکھے اور 'مطالب الفرقان' جلد سوم (ص ۳۲۶) پر بھی اس کے مطابق وضاحت کی۔

اس کے بعد یہ لفظ (زیرِ نظر آیت ۷/۱۹۹) میں آیا تو مجھے "اپنی بصیرت کی رُو سے" اس کا دوسرا مفہوم یعنی "درگزر کرنا" موزوں دکھائی دیا۔ چنانچہ میں نے یہی ترجمہ مفہوم القرآن میں دے دیا (اس کا عام طور پر یہی ترجمہ کیا جاتا ہے)۔ اس کے بعد ایک بحث کے دوران میں نے محسوس کیا کہ یہ مفہوم مزید تحقیق کا متقاضی ہے، بالخصوص لفظ خُذْ کے پیشِ نظر جس کے معنی "وصول کرنے یا لینے" کے ہیں۔ اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی آیت (۹/۱۰۳) ــــــ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ــــــ اس کی مؤید تھی۔ اس غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آیت (۷/۱۹۹) میں بھی اَلْعَفْو کا وہی مفہوم زیادہ موزوں ہے جو آیت (۲/۲۱۹) میں دیا گیا ہے، یعنی زائد از ضرورت مال۔ اس آیت میں اسلامی نظام (یا اس کے سربراہ حضور نبیِ اکرمؐ) سے کہا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین کا زائد از ضرورت مال، اپنی تحویل میں لے لیا کرو تاکہ اس طرح اجتماعی طور پر قرآن کا معاشی نظام قائم رہے۔ مفہوم القرآن (آیت ۷/۱۹۹) کے مفہوم میں ترمیم، اس کے نئے ایڈیشن میں کر دی جائے گی۔ البتہ اس دوران میں 'تبویب القرآن' میں عفو کے عنوان کے تابع، یہ مفہوم دے دیا گیا ہے۔ (ص ۱۰۲۴)

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ مفہوم القرآن میں اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ اَلْعَفْو کے دو معانی میں سے پہلی ترجیح کی جگہ دوسری ترجیح کو زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے۔ یہ معنی لغت کی رُو سے بھی اور قرآن

کے دیگر شواہد کی روشنی میں بھی صحیح ہیں۔ اس طرح آیت (۷/۱۹۹) کا مفہوم حسبِ ذیل ہوگا:

(بہرحال تم اے رسولؐ! نظامِ ربوبیت کے قیام کے سلسلہ میں عملی پروگرام اختیار کئے رکھو۔ اس پروگرام کی رُو سے، جماعتِ مومنین کا زائد از ضرورت مال، ان کے پاس رہنے کے بجائے، نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہے گا۔ اس لئے تم) اس مال کے وصول کرنے کا انتظام کرو۔ قرآنی قوانین کو عام کرتے جاؤ اور جہلا سے کنارہ کش رہو کہ وہ ناحق تمہارا وقت ضائع نہ کریں۔

واضح رہے کہ اَلْعَفْوَ کے وصول کرنے کا حق اسی نظام کو حاصل ہوگا جو امر بالمعروف (قرآنی قوانین نافذ کرنے) کا فریضہ ادا کرے۔ غیر قرآنی نظام، اسلام کے نام پر کسی سے ایک پائی لینے کا بھی حقدار نہیں ہوگا۔ وہ جو کچھ لے گا، غصب اور استحصال ہوگا۔

اس کے بعد ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جو اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں پیش آئیں گے اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر۔ فرمایا:

۷/۲۰۰ وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ○

اگر کسی قسم کا کوئی وسوسہ (یا ان مخالفین کا کوئی سرغنہ) تم میں باہمی فساد ڈالنے کی کوشش کرے (۱۷/۵۳) یا کسی اور خرابی کا سبب بنتا نظر آئے، تو تم ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اور شدت سے متمسک ہو کر، اس کی پناہ میں آجاؤ۔ یاد رکھو! (تمہارا) خدا سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے (۱۶/۹۸)؛ (۴۰/۲۷)۔

شَيۡطٰن کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۵ دیکھئے جہاں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کے وہ جذبات اور خواہشات ہیں جو اسے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی یا سرکشی کے لئے ابھارتے ہیں اور شَيٰطِيۡن، اس پارٹی کے سرغنوں کو کہا گیا ہے جو دین کی مخالفت کے لئے آمادۂ نبرد آزما رہتی ہیں۔ یہ اپنے سرکش جذبات ہوں یا مخالفین کے سرغنے، ان سے محفوظ رہنے کے لئے استعاذ باللہ کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ بڑی اہم تدبیر ہے۔

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ

۷/۲۰۱

اس کے مفہوم کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۱۲) پر کی گئی ہے۔ آیت (۲۰۱/۷) کا ذکر بھی وہیں آگیا ہے۔ اسے بغور دیکھ لیا جائے۔ ان کے برعکس:

۷/۲۰۲ وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ۝

(ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع نہیں کرتے، ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اوّل تو انہیں خود ہی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ اور اگر کبھی ایسا ہونے کا امکان ہوتا ہے تو) ان کے بھائی بند (جوڑی دار) انہیں ان کی غلط روی اور سرکشی میں کھینچ کر اور آگے لے جاتے ہیں اور وہ کسی مقام پر رُکتے ہی نہیں (آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کے قرین ——— غلط رو ساتھی اور مصاحب اسے بُری طرح تباہ کرتے ہیں۔ (۳۶-۳۸/۴۳؛ ۲۵/۴۱؛ ۵۷-۵۱/۳۷؛ ۲۸-۲۳/۵۰)۔

غلط رو انسان کے مصاحب اسے کس طرح تباہ کرتے ہیں، اس کے متعلق سورۃ زخرف میں ہے:

قرین

وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ۝ وَ اِنَّهُمْ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ ۝ (۳۶-۳۸/۴۳)

(لیکن اکثر لوگ اس بنیادی اصولِ حیات سے روگردانی کرتے ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ) جونہی کسی نے نظامِ ربوبیت کے تصور سے مُنہ موڑا، اُسی جیسے اور سرکش لوگ جھٹ سے اس کے ساتھ آملے اور اس پر بُری طرح سے مسلط ہو گئے (۲۵/۴۱)۔

یہ ساتھی ایسے لوگوں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (اور فریب انگیزیوں کا ایسا جال بچھاتے ہیں کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ صحیح راستے سے ہٹ چکے ہیں)۔

وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم بالکل سیدھی راہ پر چل رہے ہیں ———

تا آنکہ ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اُس وقت اُن

کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ کفِ حسرت مل کر کہتے ہیں کہ اے کاش! ہم میں اور ہمارے ان ساتھیوں میں بُعد المشرقین ہوتا ــــــــــــ یہ ساتھی کس قدر بُرے تھے جو اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے۔

سورۂ نساء میں ہے؛ وَمَنۡ يَكُنِ الشَّيۡطٰنُ لَهٗ قَرِيۡنًا فَسَآءَ قَرِيۡنًا (۴/۳۸) جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو اس سے بُرا ساتھی اور کون ہوسکتا ہے۔ یہ مصاحب اس کے غلط کاموں کو بھی مزین بنا کر دکھاتے ہیں (۴۱/۲۵)۔

پرانے زمانے میں یہ لوگ درباری مصاحب ہوتے تھے جن کا منصب قصیدہ خوانی ہوتا تھا۔ آج کل عوام کی زبان میں انہیں "چمچے" کہا جاتا ہے۔ خوشامدی، ہٹتی کرنے والے، غلط کاموں پر بھی مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے بلند کرنے والے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اہلِ جنت ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ہمارا ایک قرین ہوتا تھا جو ہمیں ہمیشہ اُلٹی پٹی پڑھایا کرتا تھا۔ وہ یہاں نظر نہیں آتا۔ وہ بنظرِ غائر دیکھیں گے تو وہ جہنم میں دکھائی دے گا (۳۷/۵۱-۵۷)۔ یہ (اہلِ جنت) وہ ہوں گے جو ان مصاحبوں کی باتوں میں نہیں آئے تھے۔ جو ان کی باتوں میں آگئے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ جہنم میں ہوں گے اور ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ لیکن ان کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوگا (۲۵/۲۳-۲۸)۔

اس قسم کے مصاحبوں نے جس طرح بڑی بڑی سلطنتوں تک کو تباہ کرادیا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے ان سے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔

مخالفین کا ایک ہتھکنڈہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جب دیکھتے ہیں کہ انہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں تو وہ مفاہمت اور مصالحت Compromise کی کوشش کرتے ہیں اور حق کی دعوت دینے والوں سے کہتے ہیں کہ کچھ تم جھکو کچھ ہم جھکتے ہیں اور اس طرح باہمی صلح کر لیتے ہیں۔ جو لوگ باطل پر ہوں اُن کے اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن جو حق پر ہو وہ اگر اس سے ایک قدم بھی ہٹ جائے تو اس کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

مفاہمت کی کوشش

(مثال کے طور پر) ایک شخص کہتا ہے کہ دو اور دو چھ ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر دوسرے سے

کہتا ہے کہ آؤ! ہم باہمی صلح کر لیں۔ میں' اپنے مقام سے ہٹ کر، تسلیم کئے لیتا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ تم بھی اسے تسلیم کر لو، جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ جو شخص دو اور دو چھ کہتا تھا، وہ باطل پر تھا۔ اس نے اگر دو اور دو پانچ مان لیا، تو بھی وہ باطل پر ہی رہے گا۔ لیکن جو شخص دو اور دو چار کہتا تھا، اس نے اگر دو اور دو پانچ مان لیا، تو وہ حق کو چھوڑ کر باطل پر آ گیا۔ وہ اسے کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟ لوگ اسے اُس کی ضد کہیں گے۔ لیکن یہ ضد نہیں۔ حق کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے مقام پر اٹل ہو، بے لچک ہو۔ اس لئے وہ باطل سے مصالحت کر ہی نہیں سکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

نبی اکرمؐ کی دعوت کے مخالفین حضورؐ سے اس قسم کی مصالحت چاہتے تھے۔ فرمایا:

۷/۲۰۳ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے مفاہمت کرنا چاہتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ تم ان کی مرضی کے مطابق قرآن کے احکام لاؤ۔ ۱۰/۱۵؛ ۱۱/۱۱۳؛ ۱۷/۷۴؛ ۶۸/۹)۔ جب تو انہیں اس قسم کے احکام نہیں دیتا، تو یہ کہتے ہیں کہ (اگر تمہارا خدا اس بات پر راضی نہیں ہوتا تو تم اپنی طرف سے اس قسم کے احکام وضع کیوں نہیں کر لیتے؟

ان سے کہو کہ (میں کوئی بات اپنی طرف سے وضع نہیں کر سکتا)، میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے نشوونما دینے والے کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ ضابطۂ قوانین تمام دنیا کے لئے بصائر و دلائل کا مجموعہ ہے اور جو لوگ اس کی صداقت پر ایمان لائیں، ان کے لئے ہدایت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔

(جیسا کہ مندرجہ بالا مفہوم میں مذکور حوالوں سے واضح ہے) قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس "مصالحت" کا ذکر آیا ہے۔ سورۂ یونس میں اسے نسبتاً زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جب

کہا کہ

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (۱۰/۱۵)

جب ان لوگوں کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں، تو جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے، کہتے ہیں کہ یا تو تم، اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ، اور یا پھر اس (کے مطالب) میں ہی کچھ ردّ و بدل کر دو (یعنی وہ خدا کے اٹل اور غیر متبدّل قوانین کو اپنی منشاء اور مفاد کے مطابق تبدیل کرانا چاہتے ہیں)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں۔ میرا مقصد صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میری طرف نازل ہوتی ہے۔ اگر میں اپنے نشوونما دینے والے کے احکام سے سرتابی کروں، تو اس کا قانونِ مکافات مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں اس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ (۶/۱۵؛ ۳۹/۱۳)۔

یہ رہا مخالفین کی طرف سے مصالحت کی دعوت کا جواب۔ لیکن ہماری حالت ان سے بھی ابتر ہے۔ ہم خود دین میں مصالحت سے کام لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خالصتاً اپنی کتاب کی اطاعت کا حکم دیا تھا اور اس کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو شرک قرار دیا تھا۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے شریعت کے متعدد مآخذ تجویز کر رکھے ہیں؛ قرآن، روایات، فقہ، تفاسیر، اجماع، قیاس وغیرہ۔ ان میں سے جو زیادہ Suit کرتا ہے اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ اس مسلک کا نام ہم نے "اسلام" رکھ چھوڑا ہے! سوچئے کہ کیا یہ وہی مسلک نہیں جسے اختیار کرنے کا مطالبہ مخالفینِ عرب کرتے تھے؟ اس مسلک کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۵۹ پر کی گئی ہے۔ رہی سہی کسر "ناسخ و منسوخ" کے عقیدہ نے پوری کر دی۔ مخالفین کا مطالبہ یہی تھا کہ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دی جائے یا اس کے احکام کو منسوخ کر کے، ان کی جگہ دوسرے احکام لائے جائیں۔ حضورؐ نے اسے معصیتِ خداوندی کہہ کر اُن کے مطالبہ کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ لیکن ہم نے

قرآن مجید کی کثیر التعداد آیتوں کے متعلق کہہ دیا کہ وہ منسوخ ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ روایات یا فقہ کے احکام نافذ العمل ہیں (ناسخ و منسوخ کے ضمن میں دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل ص۱۲۵، جلد دوم ص۴۲۴، جلد سوم ص۱۷۹ اور جلد چہارم ص۲۲۶)۔ یاد رکھئے! خدا کی طرف سے جو وحی رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی، وہ پوری کی پوری (بلاکم و کاست) قرآن مجید کے اندر مندرج و محفوظ ہے اور یہی امت کے لئے ضابطۂ قوانین اور تمام نوعِ انسان کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ نہ اس کا کوئی ایک لفظ منسوخ ہے اور نہ ہی کسی قسم کے اضافہ کا محتاج۔ اس لئے حضورؐ سے فرمایا کہ

۷/۲۰۴ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

(تم) ان لوگوں سے صرفِ نظر کر کے اپنی توجہات کو اپنی جماعت پر مرکوز رکھو اور ان سے کہو کہ جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے (یعنی اس کے احکامات کا اعلان کیا جائے، اس کی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جائے) تو اسے پوری پوری توجہ کے ساتھ، خاموشی سے سنا کرو۔ اس سے تمہیں نوازشِ خداوندی سے، سامانِ نشوونما مل جائے گا۔

قرآن کو خاموشی سے سننے کے معنی یہ ہیں کہ اس پر غور و فکر کیا جائے ——— مخالفین کی ایک ٹیکنیک یہ بھی تھی کہ جہاں کہیں قرآن کی آواز بلند ہو، شور مچا دیا جائے تاکہ لوگ اسے خاموشی سے سن نہ سکیں (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد اوّل ص۱۴۳)۔ یہی آج ہماری حالت ہے۔ آپ قوم کو دنیا بھر کے قصے کہانیاں سنائیے، کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ جونہی آپ نے قرآنِ خالص کی دعوت دی، تو چاروں طرف سے "مقدس شور" بلند ہونا شروع ہو گا کہ اس کی بات مت سنو۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے اور خدا جانے کیا کیا ہے! (انڈکس میں عنوان "قرآن" دیکھئے)۔

اگلی آیت اسی کے تسلسل میں ہے۔ فرمایا؛

۷/۲۰۵ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ

مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ○

(ان سے کہو جب اس قانونِ خداوندی کو اچھی طرح سُن لو تو یہ نہ سمجھ لو کہ بس مقصد پورا ہو گیا) اسے صبح، شام، ہر وقت، اپنے پیشِ نظر رکھو۔ اس پر غور و فکر کرو اور دل کے ایسے جھکاؤ کے ساتھ جو تمہارے تحت الشعور کی گہرائیوں سے اُبھرے (۷/۵۵) اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اس سے مطمئن نہ ہو جاؤ کہ قرآن کو اونچے اونچے پڑھ لیا تو تلاوتِ قرآن کا فریضہ ادا ہو گیا۔ مقصد یہ ہے کہ تم اس سے کسی حالت میں بھی غافل نہ رہو۔

تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۲۱۲ دیکھئے۔

بعض حضرات اس آیت کو بھی اوقاتِ صلوٰۃ کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اوقاتِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۱۳۸-۱۲۴ میں گزر چکی ہے، نیز جلد چہارم صفحہ ۲۰۴ میں۔

سورۂ اعراف کی آخری آیت میں جماعتِ مومنین کی بنیادی خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں جہاں فرمایا:-

(۷/۲۰۶) اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ○

خدا کے مقربین (مومنین) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی اطاعت سے کبھی سرتابی اختیار نہیں کرتے۔ وہ اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں انتہائی جدوجہد کرتے ہیں اور صرف اُسی کے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں، کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔

یہی مضمون بعض دیگر مقامات پر بھی آیا ہے (مثلاً ۱۶/۴۹؛ ۲۱/۱۹؛ ۳۲/۱۵؛ ۴۱/۳۸)۔ عبادت، تسبیح، سجدہ کے مفہوم کے لئے انڈکس ملاحظہ فرمایئے۔ ان سے مراد قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور قرآن میں متعین فرمودہ مقاصد کے حصول کے لئے، انتہائی جدوجہد ہے۔ رکوع و سجود اس اطاعت کے علاماتی مظاہر ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نواں پارہ ——— آٹھویں سورۃ

سورۃ الانفال (۸)

بابِ دوم

سُورَۃُ الْاَنْفَال

ہنگامۂ رستاخیز

۱۔ قریش اس نظام کے مخالف کیوں تھے؟
۲۔ ایفائے عہد کا ایمان افروز مظاہرہ۔
۳۔ دو قومی نظریہ کا عملی ثبوت۔
۴۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!
۵۔ تیر قضا در کمانِ محمدیؐ۔
۶۔ خدا کی معیّت کا عملی ثبوت، ہر مژان کی زبانی
۷۔ مومن بالاتے بر بالا ترے۔
۸۔ بدترین خلائق ـــــ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔
۹۔ زندگی اور عمر میں لطیف فرق۔
۱۰۔ سیلاب نہ پرسد کہ در خانہ کجا است۔
۱۱۔ انفرادی نیکیاں اجتماعی تباہیوں کو روک نہیں سکتیں۔
۱۲۔ دین کے تمکّن کے لئے مستحکم مملکت لانیفک ہے۔
۱۳۔ نظامِ ربوبیّت کی راہ میں سنگِ گراں ـــــ بیوی بچے۔
۱۴۔ تقسیمِ دولت کا اصول ـــــ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔
۱۵۔ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ کا مطلب۔
۱۶۔ نفسیاتی تغیّر کے بغیر خارجی انقلاب آ نہیں سکتا۔
۱۷۔ قانون کا احترام کس طرح ہو سکتا ہے۔
۱۸۔ صحابہؓ کی عظمت۔
۱۹۔ بیٹی کا ہار۔

باب دوم

سُورَۃُ الاَنفَالِ

آٹھویں سورۃ

اس سورت میں جنگ کے متعلق عمومی ہدایات دی گئی ہیں اور جنگِ بدر کے احوال و کوائف کا خصوصی تذکرہ ہے۔ بدر کا ضمنی ذکر اس سے پہلے سورۃ آلِ عمران (آیت ۳/۱۲۲) میں آیا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صـ۲۰۴)۔ اس کی تفصیلات زیرِ نظر سورہ میں دی گئی ہیں۔

قرآنِ کریم کی رو سے جنگ کن حالات میں ناگزیر ہو جاتی ہے اور اس سے مقصد کیا ہونا ہے، اختصاراً اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد دوم (صـ۱۹۹-۸۰)، جلد چہارم صـ۳۷۸ پر لکھا گیا ہے لیکن تفصیلی بحث جلد سوم (صـ۲۶۴) میں کی گئی ہے (متعین طور پر انڈکس میں جنگ، جہاد اور قتال کے عنوانات دیکھئے)۔ چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآنِ کریم کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں شرف و تکریم انسانیت کا فروغ ہو اور کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو نہ محتاج۔ پابندی ہو تو اُن اقدارِ خداوندی کی جن کے تحفظ سے یہ نظام قائم رہتا ہے۔ اس میں نہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہوتا ہے نہ نظامِ سرمایہ داری بار پا سکتا ہے، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مفاد پرست قوتوں کی طرف سے اس نظام کے قیام و استحکام کی شدید مخالفت ہوگی۔ کوشش کی جائے گی کہ انہیں بدلائل و براہین سمجھایا جائے کہ یہ نظام خود ان کے لئے بھی بڑا مفید ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنی مخالفت سے باز نہ آئیں اور بزورِ شمشیر اسے ختم کر دینا چاہیں تو اپنی مدافعت کے لئے اس نظام کے حامیوں کو بھی میدانِ جنگ میں اترنا پڑیگا۔ اسی قسم کی پہلی جنگ تھی جو نبئ اکرمؐ کو ۲ھ میں بدر کے میدان میں لڑنی پڑی۔ اس کا پس منظر سامنے

آجانے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جماعتِ مومنین میدانِ جنگ میں اُترنے کے لئے کس طرح مجبور ہوگئی تھی۔ اس کے نتائج کس قدر دُور رس تھے

جنگِ بدر کا پس منظر

نبیٔ اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز مکی زندگی میں کیا اور وہیں سے قریش نے اس آواز کی مخالفت شروع کردی۔ اس کے باوجود اس دعوت و تبلیغ کا اثر مُشک خرامی سے آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا۔ جو سعادتمند افراد اس پر لبیک کہتے وہ قریش کی ایذا رسانیوں اور صعوبات انگیزیوں کا نشانہ بنتے۔ اس کا سلسلہ اس قدر دراز اور ناقابلِ برداشت ہوگیا کہ ایک مختصر سی جماعت حبش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ان میں حضرت عثمانؓ اور اُن کی حرم محترم (رسول اللہ کی صاحبزادی) حضرت رقیہؓ بھی شامل تھیں۔ لیکن قریش کی مخالفت کا جوش ٹھنڈا نہ ہوا۔ آخرِ کار خود نبیٔ اکرمؐ (صحابہؓ کی مختصر جماعت کے ساتھ) ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ عام حالات میں اب قریش کو اُن کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیئے تھا کیونکہ اب نہ تو مکہ میں اُن کے کانوں میں وہ آوازیں پڑتی تھیں جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ وہ انہیں ناگوار گزرتی ہیں اور نہ ہی ان کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ ہی لاحق تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے باوجود قریش اُن کا پیچھا کیوں کررہے تھے۔ اس کی وجہ کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں۔ حضورؐ مکہ میں جس نظام کے قیام کی دعوت دیتے تھے، اس سے انہوں نے سمجھ

قریش کی مخالفت کی وجہ

لیا تھا کہ اگر یہ نظام (مکہ چھوڑ) ملک کے کسی حصے میں بھی قائم ہوگیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج میں اس قدر کشش اور جاذبیت ہوگی کہ لوگ جُوق در جُوق اس کی طرف کھنچے چلے جائینگے اور اس طرح قریش کی زندگی کا سارا نظام تہ و بالا ہوجائے گا۔ ان کی زندگی کا کاروبار غلاموں کے سر پر چلتا تھا۔ اسلامی نظام میں آقا اور غلام کی تمیز ہی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس نظام کے قائم ہوجانے کے بعد ان کے غلام اور لونڈیاں ان کے پاس رہ نہیں سکتے تھے! قریش کعبہ کے متولّی تھے اور اس مذہبی پیشوائیت کی بنا پر وہ تمام قبائل کے نزدیک واجب التکریم تھے۔ اسلامی نظام میں مذہبی پیشوائیت اور ذاتی تولّیتِ کعبہ کا سلسلہ ہی ختم ہوجاتا تھا۔ اسی احترام کی وجہ سے قریش کی تجارت بھی محفوظ تھی جس کی وجہ سے ان کے سرمایہ دارانہ کاروبار کو بڑا فروغ حاصل تھا۔ اسلامی نظام میں سرمایہ داری کا وجود باقی نہیں رہتا۔ نسلی اعتبار سے قریش سب سے بڑی امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ اسلامی نظام میں نسلی تفوق اور نسبی امتیاز باقی

نہیں رہتا۔ یہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر قریش اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے تھے کہ ملک کے کسی حصہ میں بھی یہ اسلام قائم ہوجائے۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں نوحۂ بوجہل کے عنوان سے اس کا نقشہ بڑے دلآویز انداز میں کھینچا ہے۔ اسے ہم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۱۹۹ پر بڑی تفصیل سے پیش کرچکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تہیہ کرلیا کہ مسلمانوں کا تعاقب کیا جائے اور جب تک ان کی تحریک کا استیصال نہ کرلیا جائے چین سے نہ بیٹھا جائے۔ ہجرت نبی اکرمؐ سے پہلے عبداللہ بن اُبی مدینہ کا رئیس تھا۔ قریش نے اسے خط لکھا کہ:

> تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کرڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کردیں گے اور تمہیں فنا کرکے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔[۱] (بحوالہ سنن ابو داؤد)

نبی اکرمؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے عبداللہ بن اُبی کو سمجھایا کہ اس مخالفت میں تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے۔ اس لئے کہ (اُس کے بھائی بند) انصار مسلمان ہوچکے تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے قریش کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر قریش نے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ ۲ھ کے اوائل میں مکہ کے ایک رئیس، کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی ایک چراگاہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے مویشی لوٹ کرلے گیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب قریش کا قافلہ شام کی طرف تجارت کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس قافلہ کو واپسی پر اسی راستے سے گزرنا تھا۔ امیر کارواں ابوسفیان کو کسی نے یہ غلط خبر پہنچادی کہ مسلمان تمہارے قافلے کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اُس نے اس کی اطلاع قریشِ مکہ کو بھیج دی۔ وہ

قریش کی لشکر کشی

پہلے ہی مدینے پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ! ایک لشکرِ جرار لے کر مدینہ کی طرف اُمنڈ آئے۔ ہزار سپاہیوں کی جمعیت، سو سواروں کا رسالہ، رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ تمام رؤسائے قریش (باستثنا ابولہب) شریکِ فوج۔ ان کے مقابل، حضورؐ کے جانثاروں کی کُل جماعت ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی اور بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ان کے ساتھ کُل دو گھوڑے تھے۔ قریش کو بدر کے مقام کے قریب

---

[۱] یہ تمام تفاصیل سیرتِ نبویؐ پر میری کتاب "معراجِ انسانیت" میں مذکور ہیں۔

معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے باہر نکل گیا ہے اور اب اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ موہوم خطرہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ اُن کا مقصد اسلامی نظام کے خطرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا تھا۔ وہ ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ وادی کے دوسری طرف حضورؐ فروکش تھے۔ حضرت حباب بن منذرؓ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ میدان کا یہ انتخاب وحی کی رُو سے ہوا ہے یا حضورؐ نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں۔ میں نے خود ہی اندازہ کیا ہے کہ یہ مقام ہمارے لئے مفید رہے گا۔ اس پر حضرت حبابؓ نے کہا کہ پھر اس مقام سے فلاں مقام زیادہ مناسب ہے۔ ہمیں وہاں جاکر اترنا چاہیے۔ حضورؐ نے معاملہ کے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جنہیں حضرت حبابؓ نے پیش کیا تھا' اور فرمایا کہ حبابؓ کی رائے زیادہ صائب ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اس پر عمل فرمایا۔ رات کو بارش ہوئی تو موقع کے حسنِ انتخاب نے میدان کا نقشہ الٹ دیا۔ اب جو دیکھا تو بساطِ جنگ کا ہر گوشہ مجاہدین کے حق میں تھا۔

حضورؐ کا ہر ارشاد وحی پر مبنی نہیں ہوتا تھا

یہاں ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ وحی' تمام کی تمام قرآن میں محفوظ نہیں۔ حضورؐ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا وہ بھی وحی کی رُو سے تھا۔ اس وحی کو وحیِ خفی یا وحیِ غیر مکتوب کہا جاتا ہے اور یہ احادیث میں درج ہے۔ اس عقیدہ کے خلافِ حقیقت ہونے کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں تفصیل سے گفتگو کی جاچکی ہے (دیکھئے انڈکس میں عنوانات وحی اور حدیث)۔ اس مقام پر یہ دیکھئے کہ حضورؐ نے جنگ کے میدان کے متعلق ایک فیصلہ فرمایا؛ دریافت کرنے پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ فیصلہ وحی کی رُو سے نہیں کیا گیا' آپؐ کا قیاس ہے۔ اس پر حضرت حبابؓ نے متبادل موقع کی تجویز پیش کی جسے حضورؐ نے قبول فرمالیا۔ اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ حضورؐ کے اپنے ارشادات یا عمل وحی کی رُو سے نہیں ہوتے تھے۔ وحی وہی تھی جو قرآن میں درج ہوجاتی تھی۔

سب سے پہلے روزے

روزے پہلے پہل ۲ھ میں فرض ہوتے تھے اور یہ اسی رمضان کی سترہ تاریخ تھی جب حق و باطل کا یہ معرکہ پیش آگیا۔ قرآنِ کریم نے روزوں کا مقصد یہ بتایا ہے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم اس قابل ہوجاؤ کہ دنیا میں خدا کی کبریائی (اقتدارِ اعلیٰ) قائم کرسکو۔ ان سترہ دنوں کے روزوں نے اس کا عملی مظاہرہ کرکے

دکھادیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے روزوں میں اور مومنین کے روزوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے: ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس معرکہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب دونوں فوجیں میدانِ جنگ میں صف آرا ہوگئیں تو آپؐ جھولی پھیلائے بارگاہِ ایزدی کے حضور کھڑے ہوگئے اور والہانہ جذب و انہماک سے عرض کیا کہ:

حضورؐ کی دُعا

بارِ الہا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

حضورؐ اس جذب و کیف سے یہ دُعا فرما رہے تھے اور محویت کا یہ عالم تھا کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر پڑتی تھی اور حضورؐ کو خبر تک نہ تھی۔ حضورؐ کی یہ دعا مبنی بر حقیقت تھی۔ حضورؐ آخری نبی تھے اور آپؐ کی عمر بھر کی دعوت و تبلیغ کا ماحصل یہی تین سو تیرہ نفوس تھے۔ اگر وہ اُس وقت ختم ہوجاتے تو پھر قیامت تک ایسی جماعت پیدا نہ ہوسکتی۔ اس معرکہ کی اہمیت کا یہ عالم تھا۔

عین اُس وقت دو صحابی (حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ابو حسیلؓ) دوڑتے دوڑتے آئے اور صفوں میں شامل ہوگئے۔ ایسے موقع پر لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی ہزار مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ صحابہؓ کو بڑی خوشی ہوئی۔ آنحضرتؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ ہم کسی اور طرف سے آرہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کو جارہے ہو۔ ہم نے انکار کیا اور وعدہ کیا ہم اس جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔

ایفائے عہد کی عدیم النظیر مثال

اس طرح ہم مجاہدین سے آملے ہیں۔ آپؐ نے سُنا تو فرمایا کہ تم نے اُن سے عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہوسکتے۔ فکر نہ کرو، ہماری مدد اللہ کرے گا۔

غور کیجئے! بلندیٔ کردار اور حسنِ سیرت کی اس قدر تابندہ مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟ اس کے برعکس یہ دیکھئے کہ ہمارے زمانے کے اقامتِ دین کے مدعی ہمیں کیا تعلیم دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۸ میں گزر چکی ہے۔

دو قومی نظریہ کا عملی مظاہرہ

دونوں صفیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ ان میں ہمیں ایک عظیم حقیقت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مطالب الفرقان، جلد پنجم، (صفحہ ۲۳۵ - ۲۳۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ مجید نے نوعِ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں ایک عظیم انقلاب یہ بھی برپا کیا کہ اُس نے قومیت کا مدار، وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ کے اشتراک کے بجائے، دین کا اشتراک قرار دیا۔ اسی معیار کی رُو سے، دنیا بھر کے مسلم ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں اور تمام غیر مسلم، ان کے بالمقابل، دوسری قوم کے افراد (تفصیل کے لئے دیکھئے انڈکس میں عنوانات قوم، قومیت، دو قومی نظریہ، اُسوۂ ابراہیمی وغیرہ)۔ بدر کے اس میدان میں یہ "دو قومی نظریہ" ایسی محسوس اور مرئی شکل میں سامنے آجاتا ہے کہ اس کی صداقت میں کسی قسم کا ابہام یا التباس نہیں رہتا۔ اِس میدان میں دونوں طرف جو افراد ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں، ان کا وطن ایک ہے، نسل ایک ہے، زبان ایک ہے۔ حتّٰی کہ حسب و نسب کے لحاظ سے بھی وہ ایک ہیں۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود، وہ دو ایسے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں کسی قسم کا اشتراک نہیں۔ اس تفریق و تقسیم کی بنیاد کیا ہے؟ کفر اور اسلام ـــــ یہی وہ معیارِ تفریق تھا جس کی بنا پر ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف مقابلہ میں اُن کا بیٹا۔ اِدھر حضرت حذیفہؓ تھے تو صفِ مخالف میں ان کا باپ عتبہ۔ اِدھر حضرت عمرؓ تھے، اُدھر آپ کا ماموں۔ اِدھر حضرت علیؓ تھے تو دوسری طرف اُن کے بھائی عقیل۔ نہیں، ذرا آگے بڑھئے۔ اِدھر خود (ذاتِ رسالتمآبؐ) محمدؐ تھے تو سامنے کی صف میں آپ کے چچا عبّاس اور داماد ابوالعاص۔ یہی تھی وہ تقسیم و تفریق جس کی بنا پر حبش کا رہنے والا اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا غیروں میں سے۔ رُوم کا صہیب یگانہ تھا لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ اسی سے دو قومی نظریہ (جس کا آغاز سلسلۂ نزولِ وحی کی ابتدا ـــــ عہدِ حضرت نوحؑ سے ہو چکا تھا) ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ رہا تھا۔

اب سورۂ انفال ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۸/۱) يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ ۚ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ ۖ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ

وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○

اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ حکومت کی جو آمدنی مقررہ واجبات کے علاوہ ہو وہ کس کے پاس جائے گی[1]؟ ان سے کہہ دو کہ وہ آمدنی "خدا اور رسول" (نظامِ مملکت) کی ہوگی. (تم اس بارے میں جھگڑو نہیں بلکہ) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور آپس میں معاملات درست رکھو اور ہمواریاں پیدا کرتے رہو اور "خدا و رسول" ۔۔ نظامِ خداوندی کی اطاعت کرتے رہو. یہی مومنین کا شعار ہے.

مالِ غنیمت عربوں کے ہاں عام ذریعہ معاش "مالِ غنیمت" تھا یعنی جو کچھ دشمن سے لوٹ لیا جائے. عام قاعدہ یہ تھا کہ جو سپاہی دشمن کے جس فرد کو قتل کرے اُس کا مال اُس سپاہی کی ملکیت میں آجاتا تھا. یہی (لوٹ کا مال) ان کے لئے جنگ کا جذبہ محرکہ تھا. اس (لوٹ کے مال) کے لئے ان کی اصطلاح "غنیمت" تھی. اَلْغَنَمُ کے معنی بھیڑ بکریاں ہیں. چونکہ عربوں کے معاشرہ میں مویشی ہی سب سے بڑی دولت تھی، اس لئے جنگ میں بھی زیادہ تر یہی ہاتھ آتے تھے. اس اعتبار سے جنگ میں لوٹے گئے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا. (قرآنِ کریم میں یہ اصطلاح ان مقامات میں آتی ہے (۶۹، ۴۱/۸؛ ۹۴/۴؛ ۱۹، ۱۵، ۲۰/۴۸).

(ضمناً) مرورِ زمانہ سے جس طرح الفاظ کے معانی میں تبدیلی آجاتی ہے، اس کی ایک مثال لفظ غنیمت بھی ہے. (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) غَنَمٌ بھیڑ بکریوں کو کہا جاتا تھا. یہیں سے لفظ "غنیمت" بنا. اس سے آگے چل کر "غنیم" جس کے معنی دشمن ہیں. ہمارے ہاں لفظ غنیمت جس مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے. مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "اس گئے گزرے زمانے میں ان کا دم غنیمت ہے."

---

[1] اَنْفَالٌ جمع ہے نَفْلٌ اور نَفَلٌ کی. اس کے معنی "زیادتی" کے ہیں، یعنی جو چیز زیادہ ہو. اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو مال لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہو (فاضلہ دولت) وہ ربوبیتِ عامہ کے لئے مملکت کی تحویل میں رہے گا. اس کی تائید (۲/۲۱۹) سے بھی ہوتی ہے، نیز (۷/۱۹۹) سے.

جنگ میں ہاتھ آنے والے مال کے لئے دوسرا لفظ ـــــ فَیْءٌ ـــــ ہے. جس انداز سے یہ لفظ (۵۹/۶) میں استعمال ہوا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ وہ مال ہے جو دشمن سے مقابلہ کے بغیر حاصل ہو جائے، یعنی وہ مال جسے دشمن لڑے بغیر میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ جائے. آیت (۵۹/۶) کے علاوہ یہ لفظ آیت (۳۳/۵۰) میں بھی آیا ہے. اس کا مفہوم اس مقام پر بیان کیا جائے گا.

انفال اس سلسلہ کی تیسری اصطلاح "انفال" ہے. اَلنَّفَلُ کے معنی ہیں ہر وہ عمل جو واجب سے زیادہ ہو. (مثلاً آیت (۱۷/۷۹) میں رسول اللہ کے متعلق ہے: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ..... یعنی رات کا یہ جاگنا فرائض میں داخل نہیں. یہ فرائض پر اضافہ ہے اور حضورؐ کے لئے مختص (تشریح اپنے مقام پر آئے گی). آیت (۲۱/۷۲) میں یہ لفظ پوتے کے لئے آیا ہے، یعنی بیٹے سے زائد. چونکہ بعض لوگ "انفال" سے مراد بھی مالِ غنیمت لیتے ہیں، اس لئے ہم نے اس مقام پر اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے. ورنہ ہمارے نزدیک اس سے مُراد وہ تمام آمدنی ہے جو حکومت کی طرف سے عائد کردہ واجبات کے علاوہ ہو (انہیں عطیات کہہ لیجئے. تفصیل ان امور کی 'معاشی نظام' کے عنوانات میں ملے گی جس کے لئے انڈکس دیکھئے).

قرآنِ کریم نے جنگ کے سلسلہ میں جو اصلاحات کی ہیں، ان میں ایک اہم اصلاح مالِ غنیمت کے متعلق ہے. جیسا کہ کہا جا چکا ہے، عربوں کے ہاں مالِ غنیمت سے مراد لوٹ کا مال تھا، یعنی جو جس کے ہاتھ آجائے، وہ اسی کا ہو جائے. یہی لوٹ کا مال اُن کا بیشتر ذریعۂ معاش تھا اور جنگ کا جذبۂ محرّکہ. اسی بنا پر وہ جنگوں کا سلسلہ جاری رکھتے تھے ـــــ چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو.

انقلاب آفریں اصلاح قرآنِ کریم نے بیک جنبشِ قلم اس سارے سلسلہ کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مالِ غنیمت افراد کی ملکیت نہیں ہوگا (کہ جو جس کے ہاتھ میں آجائے وہ اُسی کا ہو جائے). یہ سب مال اسلامی مملکت کے ہاں جمع ہوگا اور وہ اسے افرادِ مملکت کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے گی. اس سے نہ تو اس مال کی ناہموار تقسیم باقی رہی اور نہ ہی جنگ کا جذبۂ محرّکہ مالِ غنیمت. اس کا جذبۂ محرّکہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ قرار پا گیا. جذبات کا اس طرح بدل دینا آسان کام نہیں تھا. ایسا نبی اکرمؐ کی تعلیم و تربیت کی رُو سے ہی ممکن تھا. ان "لٹیرے" عربوں میں یہ تبدیلی کس حیرت انگیز طریق سے رونما ہوئی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ جب

ایران کا مالِ غنیمت

ایران فتح ہوا تو سپہ سالار حضرت سعد بن وقاصؓ نے تمام مالِ غنیمت (عرب جس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے تھے) مرکز میں بھیج دیا اور حضرت عمرؓ کو خط میں لکھا کہ اس مال سے جو مسرت آپ کو ہوگی اس سے کہیں زیادہ وجۂ مسرت ایک اور بات ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تمام نوادرات ہماری افواج کو ایسے ایسے مقامات سے ملے ہیں جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہمارے سپاہیوں میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب مال لاکر مرکز میں جمع کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور فرمایا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکتی ہے؟ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ! تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری سپاہ اس قدر نیک نیت کیوں ہے؟

چونکہ آپ کا دامن پاک ہے، اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔ (شاہکار رسالت صفحہ ۱۸۲)

رعایا تھی یا ان کا سربراہ، اُن عربوں میں یہ محیرّ العقول تبدیلی قرآنی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن مجید نے سب سے پہلی اصلاح یہ کی کہ مالِ غنیمت لوٹا نہیں جائے گا۔ یہ سب مملکت کے بیت المال میں جمع ہوگا اور حکومت کی طرف سے حسبِ ضرورت اس کی تقسیم ہوگی۔ (ان امور کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں مالِ غنیمت کی تقسیم کی آیات آئیں گی)۔

(ضمناً) آیت زیرِ نظر میں ہے کہ یہ مال "اللہ اور رسول" کے لئے ہے۔ یہ بحث سابقہ جلدوں میں بالتفصیل سامنے آچکی ہے کہ "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی مملکت یا قرآنی نظامِ حکومت ہوتا ہے۔ اس کے لئے انڈکس دیکھئے، بالخصوص جلد چہارم، صفحات ۴۷۲، ۴۰۰، ۳۴۰۔

○

مومنین کی خصوصیات

آیت کے اخیر میں کہا تھا: اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔ اگلی آیت میں مومنین کی بنیادی خصوصیات کا ذکر ان الفاظ میں کر دیا:

(۸/۲) اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۚ ○

مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تعلیمِ خداوندی کا مجموعی تصور ان کے سامنے لایا جاتا ہے
تو (اس کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اُس کے احساس سے) ان کے دل کانپ
اٹھتے ہیں اور جب قوانینِ خداوندی ان کے سامنے آتے ہیں تو (اُن پر عمل پیرا ہونے
کے خوشگوار نتائج کے تصور سے) ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے نشوونما دینے
والے (کی رہنمائی) پر پورا پورا بھروسا رکھتے ہیں کہ وہ انہیں کبھی دھوکا نہیں دے گی۔

توکل کا مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۰۲ پر بیان ہوچکا ہے۔ یہ تھا مومنین کی قلبی کیفیت کا عالم۔ ان کی عملی زندگی کے متعلق فرمایا:

۸/۳ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ؕ

یہ لوگ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور جو سامانِ نشوونما انہیں ملتا ہے، اسے نوعِ انسان
کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور انفاق، نظامِ خداوندی کے بنیادی ستون ہیں جن کے متعلق تفصیلی گفتگو سابقہ جلدوں میں ہوچکی ہے (ملاحظہ ہو انڈکس)۔ ایمان و عمل کی ان خصوصیات کی حامل جماعت کے متعلق کہا:

۸/۴ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ۚ

یہ ہیں پکے اور سچے مومن۔ ان کے نشوونما دینے والے کے ہاں ان کے مدارج بہت بلند
ہیں اور ان کے لئے سامانِ حفاظت اور باعزت رزق فراواں ہے۔ (۸/۷۴؛ ۸/۶۴-۶۲؛
۹/۱۰۰؛ ۵۷/۱۰؛ ۴۸/۲۹)۔

یہ تھی سرفروشوں کی وہ جماعت جسے اب دین کی حفاظت کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں اترنا تھا۔

اس کے بعد جنگِ بدر کی تفاصیل سامنے آتی ہیں جن کا آغاز جنگ کی Strategy سے

متعلق بحث سے ہوتا ہے۔

(۸/۵-۶) كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝

دلیکن یہ نظام یونہی قائم نہیں ہو جاتا اور اس انداز کا رزقِ کریم' بلا محنت و مشقت نہیں مل جاتا۔ اس کے لئے بڑی قربانیوں اور جانفشانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً بدر کی جنگ کا واقعہ ہی لو جس میں تو اپنے نشوونما دینے والے کے پروگرام کے مطابق' دشمن کے مقابلہ کے لئے مدینہ سے باہر نکلا تھا' حالانکہ تمہاری جماعت (مومنین) میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مشورہ کے وقت اس سے متفق نہیں تھا۔ وہ باہر نکلنے کے بجائے شہر کے اندر رہتے ہوئے مدافعانہ جنگ کے حق میں تھا[1]۔

وہ تجھ سے اس باب میں بحث کرتے تھے کہ تمہارا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں' حالانکہ معاملہ ان پر بالکل واضح ہو چکا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بحالاتِ موجودہ شہر سے باہر نکلنا' دیدہ دانستہ اپنے آپ کو موت کی طرف ہانک کر لے جانے کے مرادف ہوگا۔

یہاں ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد چہارم' (ص ۲۱۵) میں بتایا جا چکا ہے،

---

[1] ہم نے جس انداز میں مفہوم بیان کیا ہے' اس سے مترشح ہوگا کہ یہ ایک گزرے ہوئے واقعہ کی داستان ہے لیکن **يُجَادِلُوْنَكَ** اور **يُسَاقُوْنَ** (مضارع) کے پیشِ نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات عین اُس وقت نازل ہوئیں جب واقعہ سرزد ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے اس واقعہ کا بیان زمانۂ حال کے الفاظ میں کرنا زیادہ موزوں ہوگا اور آیت ۷ کا مفہوم بھی زیادہ واضح ہو جائے گا' یعنی وہ وعدہ کسی گزرے ہوئے زمانہ میں نہیں ہوا تھا بلکہ حال ہی کا بیان ہے۔ خدا جماعتِ مومنین سے یہ وعدہ کر رہا ہے۔

رسول اللہ کو حکم دیا گیا تھا کہ وحی کے احکام و اصول کو عملاً نافذ کرنے کے طور طریقوں کے متعلق اپنے رفقار (صحابہ کبار) سے مشورہ کیا کریں۔ اس مشورہ کے وقت ہر ایک کو اظہارِ رائے کی کس قدر آزادی حاصل تھی، اس کی ایک جھلک آیۂ زیرِ نظر میں سامنے آتی ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی پہلی جنگ تھی جس میں کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف یہ بے سروسامان مہاجرین تھے اور ان کے ساتھ انصار کی جماعت جنہیں بالعموم لڑائیوں سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ مقابلہ میں قریش کا لشکرِ جرار تھا جو فنونِ حرب کے بھی ماہر تھے اور سامان و اسلحہ بھی ان کے پاس وافر تھا۔ ان حالات میں

مشاورت کا منظر

جماعتِ مومنین کے بعض افراد کی ہچکچاہٹ قابلِ فہم تھی۔ وہ باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ واضح رہے کہ یہ حضرات جنگ میں شرکت سے اس لئے نہیں گھبراتے تھے کہ اس میں جان کا خطرہ تھا۔ یہ تو وہ مومن تھے جو اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے (۹/۱۱۱)۔ انہیں باہر نکل کر جنگ کرنے میں زیادہ خطرات اور نقصانات کا احتمال تھا۔ اور مجلسِ مشاورت میں بحث اسی نکتہ پر تھی۔ اس بحث میں آزادیٔ رائے کس حد تک تھی، اس کے لئے قرآن کریم میں یُجَادِلُوْنَكَ آیا ہے۔ جدال اس قسم کی بحث کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کی بات کو یونہی کاٹ نہ دیا جائے، بلکہ اسے اجازت ہو کہ وہ جو کچھ اور جس قدر کہنا چاہتا ہے، کہے۔ یہ بحث اُمتیوں کی اپنے رسولؐ کے ساتھ ہوتی تھی۔ غور فرمائیے کہ اس سے حضورؐ نے اپنے متبعین کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کی کس قسم کی تربیت فرمائی تھی۔ اس کے مقابلہ میں آپ آج کے حکمرانوں کو تو ایک طرف، دین کے علمبرداروں کو دیکھئے۔ ان سے ذرا سا اختلاف کیجئے تو جھٹ سے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے اور اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ ہم سنتِ رسول اللہ کے سب سے بڑے پیرو ہیں۔

اس کے بعد ایک اور سوال بھی فیصلہ طلب ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قریش کا ایک قافلہ سامانِ تجارت کے ساتھ مدینہ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ اس پر چھاپا مارا جائے لیکن منشائے خداوندی اس کے برعکس تھا۔

(۸/۷-۸) وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّہَا لَکُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَ یُرِیْدُ

اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ ۙ﴿۷﴾
لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸﴾

پھر جب تم آگے بڑھے تو حالات بتا رہے تھے کہ اللہ کے اُس وعدے کے مطابق جو اس نے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض کے لئے کر رکھا ہے (۲۴/۵۵) فریقِ مقابل کے دو گروہوں میں سے ایک پر تم ضرور غالب آ جاؤ گے۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہارا ٹکراؤ اُس گروہ کے ساتھ ہو جو غیر مسلح تھا اور لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اللہ یہ چاہتا تھا کہ تمہارا مقابلہ ان کے لشکر سے ہو تاکہ اس طرح یہ ثابت ہو جائے کہ حق، باطل پر غالب آیا کرتا ہے اور اس سے انکار کرنے والوں کی جڑ کٹ جایا کرتی ہے۔

اور اس طرح حق، حق اور باطل، باطل بن کر دنیا کے سامنے آ جائے، خواہ مجرمین پر یہ بات کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

یہاں سے پھر اسلام میں جنگ کا مقصد نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ جماعتِ مومنین کے سامنے دونوں ممکنات Possibilities تھیں۔ وہ جنگ کئے بغیر قافلہ کو بھی لوٹ سکتے تھے اور دوسری طرف اس کا بھی امکان تھا کہ جنگ کی صورت میں وہ قریش پر غالب آ جاتیں۔ جن ناساعد حالات کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اس کے پیشِ نظر وہ فطری طور پر قافلہ پر چھاپہ مارنے کو ترجیح دیتے تھے لیکن اس سے منشائے خداوندی پورا نہیں ہوتا تھا۔ منشائے خداوندی یہ تھا کہ باہمی ٹکراؤ سے یہ حقیقت نکھر کر اور اُبھر کر سامنے آ جائے کہ حق کی علمبردار جماعت، ساز و براق کی کمی (بلکہ فقدان) کے باوجود کس طرح باطل پرست جماعت کو شکست دے سکتی ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق یعنی حق پر مبنی نظریہ اور مسلک کا غلبہ مومنین کا فریضۂ حیات ہے اور ان کے دین کا مقصد۔ اس کے مقابلہ میں مال و دولت کی بڑی سے بڑی کشش بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے آسانی سے ہاتھ آ جانے والی دولت کے مقابلہ میں سر دے دینے کو ترجیح دی اور فیصلہ کیا کہ وہ قریش کے لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ کس قدر ہمت طلب تھا یہ فیصلہ! لیکن جو لوگ اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ فروخت کر چکے ہوں، ان کے لئے اس قسم

کے فیصلے زندگی کے معمولات بن جاتے ہیں۔

فیصلہ کیا اور پھر بحضور رب العزت فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں۔ مانگنے والوں نے انتہائی عجز و نیاز سے مانگا اور دینے والے نے اس طرح بذل کریمانہ اور ترحم خسروانہ سے نوازا کہ قرآن کے الفاظ میں؛

۸/۹ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ○

(تمہیں دشمن کی قوت کا اس قدر شدید احساس تھا کہ) تم خدا سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعائیں سن لیں اور کہا کہ (اگر دشمن کا لشکر ایک ہزار ہے تو گھبراؤ نہیں) میں تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کروں گا جو لگاتار آئیں گے (لیکن وہ تمہیں دکھائی نہیں دیں گے ۹/۲۶ ; ۹/۴۰ ; ۳۳/۹ ; ۴۱/۳۰) کائناتی قوتیں تمہارے حق ہی میں جائیں گی (۸/۱۱)۔

ملائکہ کی مدد ملائکہ کس طرح مدد کرتے ہیں، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۶۹) اور جلد چہارم (ص ۲۰۴) میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہاں اس نصرت کا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ

۸/۱۰ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ ع

(کامیابی تو تمہیں ہونی ہی تھی) اللہ نے اس نصرت کے وعدے کو تمہارے لئے خوشخبری بنا دیا تاکہ اس سے اطمینانِ قلب نصیب ہو جائے (۳/۱۲۵ ; ۴۱/۳۰)۔ حقیقت یہ ہے کہ فتح و نصرت خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے (اور تمہیں بھی اسی وجہ سے فتح حاصل ہونی تھی کہ تم اس کے قانون پر عمل پیرا تھے)۔ وہ قانون جس میں قوت اور تدبیر

دونوں موجود ہوتی ہیں۔

ہم نے جلد دوم (عنوان ملائکہ) میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات میں، فطرت کی قوتیں جو امورِ الٰہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں انہیں بھی ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بدر کے میدان میں یہ قوتیں کس طرح مومنین کے لئے باعثِ تقویت بنی تھیں، اس کا تذکرہ اگلی آیت میں آیا ہے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور عرب میں پانی کی قلت۔ اس کے ساتھ ہی اس وادی میں زمین ریتلی تھی جس سے پیادہ فوج کے پاؤں زمین میں دھنسے جاتے تھے (اور مجاہدین تمام تر پیادہ ہی تھے)۔ لڑائی کی رات بارش ہوگئی جس سے اُن کے پاس پانی کی فراوانی ہوگئی اور زمین کی حالت بھی بدل گئی۔ اُن کے خدشات دور ہوگئے تو وہ رات بھر نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ سوئے۔ صبح دم اُٹھے تو وہ تازہ دم تھے۔ حالات اِس طرح سازگار ہو جائیں تو وہ جنگ کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔ یوں فطرت کی قوتیں باعثِ قوت اور موجبِ تسکین بن جاتی ہیں۔

(۸/۱۱) اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ؕ

اس (خوشخبری) سے تم پر امن و سکون کی فضا طاری ہوگئی اور خوف و ہراس جاتا رہا (۳/۱۵۳)۔ پھر تم پر بادلوں سے پانی برسا تا کہ تم نہا دھو کر پاک و صاف اور تر و تازہ ہو جاؤ اور فریقِ مخالف کی طرف سے پانی بند کر دینے کا جو خطرہ تمہیں لاحق ہو رہا تھا اس سے تمہارا اطمینان ہو جائے اور وہاں کی ریتلی زمین ایسی ہو جائے کہ تم وہاں اپنے پاؤں جما سکو — ایک بارش سے یہ تمام خطرات و وساوس دُور ہو گئے اور تمہیں جمعیتِ خاطر نصیب ہوگئی — کائناتی قوتیں یوں بھی مدد کر دیتی ہیں۔

یہ ایک واقعہ جہاں مجاہدین کے لئے ثباتِ قلب اور استقامتِ اقدام کا موجب بن گیا، دشمنوں کے دل پر اس سے خوف و ہراس طاری ہوگیا۔

۸/۱۲ اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ۝

ا یہ وہ وقت تھا جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا تھا کہ میری تائید و نصرت جماعتِ مومنین کے ساتھ ہے۔ تم ان کے دل میں اطمینان و سکون پیدا کر کے انہیں ثابت قدمی عطا کر دو۔ میں مخالفین کے دل میں اُن کا رُعب طاری کر دوں گا۔ (سو اے جماعتِ مومنین!) تم مخالفین کی گردنیں اڑا دو اور ان کی قوت و گرفت کے تمام اسباب و ذرائع کو تہس نہس کر دو۔

یہ اس لئے کہ یہ لوگ اِس نظام کو ملیامیٹ کرنے کے مذموم عزائم لے کر اُٹھے تھے جو نوعِ انسان کے لئے انتہائی منفعت بخش تھا۔ یہ شرف و تکریم انسانیت کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتے تھے۔ اُن کی ان دست درازیوں اور چیرہ دستیوں کی روک تھام ضروری تھی۔

۸/۱۳-۱۴ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ
فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝

یہ اس لئے کہ یہ لوگ قانونِ خداوندی اور اُس کے نافذ کرنے والے رسولؐ (یعنی نظامِ خداوندی) کی مخالفت کرتے ہیں۔ سو جو لوگ بھی اس نظام کی مخالفت کریں گے خدا کا قانونِ مکافات انہیں سخت سزا دے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اعمال کی سزا ہے۔ سو اس کا مزہ چکھ لو۔ (اور یہ چیز صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں قانونِ خداوندی کی مخالفت کرنے والے جہاں بھی ہوں گے ان کے لئے اسی قسم کا تباہ کرنے والا عذاب

ہو گا۔

عین اُس وقت جب دونوں فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہو گئیں، یہ تنبیہہِ خداوندی نازل ہوئی کہ

(۸/۱۶-۱۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۝ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

سیدھے جہنم میں

اے جماعتِ مومنین! (فتح و ظفر کی ان خوشخبریوں اور تائید و نصرت کے ان تمام وعدوں کے بعد تم اچھی طرح سُن لو کہ) جب تمہارا مقابلہ دشمن کی فوج سے ہو تو انہیں پیٹھ مت دکھانا۔ یاد رکھو! جو ایسے وقت میں پیٹھ دکھائے گا وہ خدا کے عذاب کا مُورد بن جائے گا اور سیدھا تباہی و بربادی کے جہنم میں جا گرے گا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں مگر جو جنگ کی مصلحت کی بنا پر اپنا پینترا بدلے یا اپنی پارٹی کی طرف پلٹنا چاہے اور اس طرح اپنے مقام سے ہٹ کر ادھر اُدھر ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔

غور فرمایئے کہ یہ کون ہیں جنہیں اس قسم کی تنبیہہ کی جا رہی ہے؟ یہ وہ ہیں جو اپنا جان و مال خدا کے ہاتھ بیچنے کا معاہدہ کر کے اس نظام میں داخل ہوتے ہیں، جن کے لئے موت، حیاتِ جاوید کی پیامبر اور جنت الفردوس کی نشید جانفزا ہے، جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس شہادت گہہِ الفت میں رقص کناں آتے ہیں۔ یہ تنبیہہ اس لئے نہیں تھی کہ اس کا امکان تھا کہ یہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے۔ یہ صرف اُس جنگ کی اہمیّت واضح کرنے کا انداز تھا ——— نہیں! یہ درحقیقت ہمارے لئے وعید تھی کہ یاد رکھو! تمہارا جو قدم نظامِ خداوندی کی شکست یا ضعف کا موجب ہو گا اس کا نتیجہ سیدھا جہنم ہو گا۔ تمہارے ہزار روزے اور لاکھوں نمازیں تمہیں اس عذاب سے بچا نہیں سکیں گی۔ اس وعید کا زندہ ثبوت ہم مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ ہم نے نظامِ خداوندی کی جگہ ملوکیت کا نظام قائم کیا اور اسے مسلسل قائم کئے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا

ذلّت اور خواری کا وہ جہنّم ہے جس میں ساری کی ساری اُمّت (تمام مسلم اقوام) مبتلا چلی آرہی ہے' اور اس کی کروڑوں نمازیں' لاکھوں روزے اور ہزاروں حج' اس عذاب میں ذرا سی تخفیف نہیں کر سکتے. ہم اس میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگے ہوئے مجرم ہیں.

تیر قضا اور اس کے بعد میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار اور تیر و سناں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی. مجاہدین کی شجاعت و بسالت کے اس عدیم النّظیر کارنامے پر بارگاہِ خداوندی سے جس تبریک و تحسین کے پھول برسائے گئے' اس رشکِ صد فردوس نظارہ کے تصوّر سے روح وجد میں آجاتی ہے. فرمایا:

۸/۱۷ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ان مخالفین کو تم نے میدانِ جنگ میں (از خود) قتل نہیں کیا' بلکہ انہیں درحقیقت اللہ نے قتل کیا. اور جو تیر اندازی تم نے کی' وہ بھی تم نے (از خود) نہیں کی' بلکہ خود اللہ ہی نے کی. (اس لئے کہ تم نے یہ جنگ و قتال خدا کی اجازت سے کیا ہے' (۲۲/۳۹) از خود نہیں کیا. اور خدا نے اس کا حکم اس لئے دیا تھا کہ اتنے عرصہ کی مسلسل جانکاہ مشقّتوں کے بعد جماعتِ مومنین کے سامنے (ان کی محنتوں کا ماحصل اور) زندگی کا خوشگوار پہلو آجائے. اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے (لہٰذا کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی بشرطیکہ وہ صحیح طریق سے کی گئی ہو).

انسان جو کام قوانینِ خداوندی کے مطابق سرانجام دیتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ کس طرح اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور انسانی دنیا میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لیتا ہے' اسے کس طرح انسانوں کے ہاتھوں پورا کراتا ہے' ان اہم امور کے متعلق مطالب الفرقان' جلد اوّل' صفحہ ۱۸۴ - ۱۶۹ اور جلد چہارم صفحہ ۳۷۷' ۳۷۳' ۲۶۰) میں دیکھئے. وہیں سے " وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ " کی تفسیر وجۂ فروغِ دیدہ ہوگی. اُن تشریحات کو ایک

نظر (بارِ دیگر) ضرور دیکھ لیجئے کیونکہ اس سے خدا اور بندے کے باہمی تعلق اور شرف و مجدِ انسانیت کے مقام بلند کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے' اور یہی اسلام کا صحیح مقصود و مطلوب ہے۔

اس کے بعد کہا کہ جنگِ بدر میں مخالفین کی ذلت آمیز شکست' اس کشمکشِ حق و باطل کی آخری منزل نہیں۔ یہ تو اس کا مرحلۂ آغاز ہے ـــــ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

۸/۱۸ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ○

اور یہ تو ابھی تمہاری پہلی فتح ہے۔ اس کے بعد سمجھ لو کہ اللہ' ان مخالفین کی ساری تدبیریں ناکام کردینے والا ہے۔ (انہیں شکست پر شکست ہوتی جائے گی۔ انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام انسانوں ہی کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس لئے یہ سب کچھ تمہارے ہاتھوں ہی سے ہوگا ۹/۱۴؛ ۲۲/۴۰)۔

فرمایا کہ ان مخالفین سے کہہ دو کہ؛

۸/۱۹ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْــًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ۧ

تم مخالفین سے کہہ دو کہ تم چاہتے تھے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان دو ٹوک فیصلہ ہو جائے۔ سو وہ بھی تم نے دیکھ لیا۔ لہٰذا اگر تم اب بھی رک جاؤ اور نظامِ خداوندی کی مخالفت سے باز آجاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم پھر پلٹ کر جنگ کے لئے آؤ گے تو ہم بھی مقابلہ کے لئے آجائیں گے اور تمہارا لاؤ لشکر تمہارے کسی کام نہیں آئے گا' خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ خدا کا قانون جماعتِ مومنین کے ساتھ ہے۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے؛ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ہم' جو نہ خدا کے صحیح تصور سے آشنا ہیں' نہ

مومنین کی صفات سے بہرہ ور کیا سمجھیں کہ "خدا کی معیّت" کس طرح ہوتی ہے۔ اسے سمجھا تھا ان لوگوں نے جنہوں نے اس "معیّت" کے نتائج کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔

فتح ایران کے بعد تستر کا گورنر ہرمزان گرفتار ہو کر آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سے سب سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ ہرمزان! یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے تم ایرانی، ہم عربوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے اور نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا جو، ہم لوگوں کے ہاتھوں، تم اس قدر ذلت آمیز شکست پر شکست کھاتے چلے جاتے ہو؟ اس نے کہا کہ عمرؓ! بات یہ ہے کہ ایامِ جاہلیّت میں ہم اور تم اکیلے ایک دوسرے سے نپٹتے تھے، اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم اکیلے ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔ (شاہکار رسالت صفحہ ۱۳۳)۔

ہرمزان کی شہادت

ایک ایران ہی کیا، ان "دونوں" (خدا اور مومنین) کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم بھی نہیں کر سکتی۔ جب تک خدا ان کے ساتھ رہا، دنیا کا کوئی ملک بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ خدا کے ساتھ ہونے کے معنی یہ تھے کہ یہ لوگ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ) خدا کے متعین کردہ نصب العین کی خاطر، باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراتے تھے اور اس ٹکراؤ میں خدا کے مقرر کردہ قوانین و اقدار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ اس طرح خدا کا یہ وعدہ قدم قدم پر پورا ہوتا تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنین پر غالب آجائیں۔ اس کے لئے ایک بار پھر تاکید کر دی؛

۸/۲۰ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝

(یہ تو تم ان سے کہو اور خود اس بات کو دل کے کانوں سے سن لو کہ اس فتح سے تمہارے دل میں کہیں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ ہمیں اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو! یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد ابھی تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے) تم "خدا اور رسول" (نظامِ مملکتِ خداوندی) کی پوری پوری اطاعت کرو اور اس کے احکام کو سننے کے بعد ان سے کبھی گریز کی راہیں نہ نکالو۔

"اللہ اور رسول" سے عملاً مراد اسلامی نظام یا اسلامی مملکت (اور اس کا سربراہ) ہے۔ اس کی تشریح اس سورت کی پہلی آیت کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ یہاں "اللہ اور رسول" (تثنیہ) کے لئے عَنۡہُ کی ضمیرِ واحد بھی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد سربراہِ مملکتِ اسلامیہ ہے

علاوہ ازیں، یہ بھی بصراحت کہا گیا ہے، "وَ اَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ" (درآنحالیکہ تم اس کے احکام سُن رہے ہو) یہ ظاہر ہے کہ کسی زندہ اتھارٹی کے احکامات ہی کو سُنا جا سکتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اطاعت، اس کی کتاب اور رسولؐ کی اطاعت حضورؐ کی احادیث کی رُو سے کی جاتی ہے، تو اس مفہوم کی رُو سے

زندہ اتھارٹی کی اطاعت

"اَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ" کی شرط پوری نہیں ہوئی۔ یہ مفہوم اُس زمانے میں وضع کیا گیا تھا جب (ہمارے عہدِ ملوکیت میں) نہ اسلامی مملکت باقی رہی تھی، نہ اس کا سربراہ۔ اس وقت دین، مذہب سے بدل گیا تھا۔ مذہب میں اطاعت اپنے اپنے طور پر کی جاتی ہے۔ اس میں کسی زندہ اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔
اگلی آیت میں اس "سماعت" (سننے) کا مفہوم اور بھی واضح کر دیا۔ پہلے کہا؛

(۸/۲۱) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝

دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے احکام کو سُن لیا ہے، لیکن درحقیقت وہ اُنہیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔

بصر اور نظر (دیکھنے اور دیکھنے کے باوجود نہ دیکھنے) اور سماعت و عدمِ سماعت (سننے کے باوجود نہ سننے) میں فرق، متعدد مقامات پر سامنے لایا جا چکا ہے۔ بالخصوص دیکھئے مطالب الفرقان (جلد اوّل صفحہ ۱۶۸)؛ (جلد چہارم صفحہ ۴۷۳)، نیز اس جلد میں آیت ۷/۱۹۸ کے تحت۔ اگلی آیات میں؛

(۸/۲۲-۲۳) اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝ وَلَوۡ عَلِمَ اللّٰهُ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا لَّاَسۡمَعَهُمۡ ؕ وَلَوۡ اَسۡمَعَهُمۡ لَتَوَلَّوۡا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝

قانونِ خداوندی کی رُو سے، بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں

شَرَّ الدَّوَآبِّ اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (۲/۱۸ ؛ ۱۶/۷۶ ؛ ۸/۵۵)۔
(اس قسم کے لوگ جو عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں' اس قابل ہی نہیں رہتے کہ صحیح بات قبول کر سکیں) اگر ان میں صحیح بات قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی تو اللہ (اپنے قانون کے مطابق) ایسا کر دیتا کہ وہ اسے قبول کر لیں. لیکن اگر وہ (اپنے ان سے' بغیر اس صلاحیت کے زبردستی) قبول کراتا تو وہ اس سے مُنہ پھیر لیتے' جیسا کہ وہ اب مُنہ پھیرے ہوئے ہیں (سو ان کا اعراض اس امر کی دلیل ہے کہ ان میں قبولِ حق کی استعداد ہی نہیں رہی' حالانکہ اتنے لمبے عرصہ تک انہیں حق کی تبلیغ کی جاتی رہی ہے)۔

" لَا یَعْقِلُوْنَ " سے بات واضح ہو گئی کہ " سننے کے باوجود نہ سننے " کا مفہوم کیا ہے. اس کی وضاحت اسی جلد میں زیرِ آیت (۷/۱۷۹) کی جا چکی ہے. انسانوں کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں کس طرح سلب ہو جاتی ہیں اور خدا اسے اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے' اس کی وضاحت مطالب الفرقان جلد اول (ص ۱۸۸-۱۸۰) میں کی جا چکی ہے. علاوہ ازیں انڈکس میں تقدیر کا عنوان بھی دیکھئے کہ وہ بڑا جامع ہے. بلخص ان تمام تشریحات کا یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسان کی اپنی ہی غلط روش کا نتیجہ ہوتا ہے. صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ:

۸/۲۴ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ○

اے جماعتِ مومنین! (دیکھنا! تم کہیں ایسا نہ ہو جانا) تم "اللہ اور رسول" (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو' جب وہ تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے. (اس کے لئے عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند کی ضرورت ہوتی ہے. بیشک انسان کے اندر ایسے جذبات بھی تو ہیں جو اس کے حوصلوں کو پست کر دیتے ہیں)۔ لہٰذا تم اس حقیقتِ حال سے بے خبر نہ رہو کہ) ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کہ بجائے اس کے کہ خدا کا حکم' انسان کے ارادوں کی پختگی کے ساتھ پیوست رہے' وہ اس کے جرأتمندانہ

ارادوں اور حوصلوں کے پست کر دینے والے جذبات کے درمیان گھر جاتا ہے اور اس طرح اس انسان میں تذبذب کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ (اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم ہر وقت اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ) تمہیں نظامِ خداوندی کے مرکز کے گرد ہی جمع ہونا ہے! اسے چھوڑ کر کسی اور طرف نہیں نکل جانا۔ اور تمہارے ہر اقدام کی تم سے جواب طلبی ہونی ہے۔ (یہ خیال تمہارے دل میں جاگزیں رہا تو پھر تمہارے ذاتی جذبات تمہارے حوصلوں کو پست نہیں کر سکیں گے)۔

اِس آیت میں پھر دیکھئے ـــــــ "اللہ اور رسول" (تثنیہ یعنی دو)، لیکن "دَعَاكُمْ" میں ضمیر واحد کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ اور رسول" الفاظ تو بے شک دو ہیں، لیکن اس سے مراد نظامِ اسلامی ہے (یعنی وہ نظام جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم کیا تھا)۔ انڈکس میں "اللہ اور رسول" اور "اسلامی نظام" کے عنوانات دیکھئے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی اُن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو عام معانی میں (طبیعی طور پر) زندہ ہیں اور کہا یہ گیا ہے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں اس پروگرام (جہاد) کی دعوت دیتا ہے "جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا"۔ زندہ انسانوں سے کہنا کہ تم اس آواز پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی، زندگی اور زندگی کے نہایت نازک،

زندگی اور زندگی میں فرق

لطیف اور عمیق فرق کو نمایاں طور پر سامنے لے آتا ہے۔ ایک زندگی محض نفس شماری کی زندگی ہے یعنی سانس کی آمد و رفت۔ اس زندگی میں حیوان اور انسان سب برابر کے شامل ہوتے ہیں۔ دوسری زندگی شرفِ انسانیت کی ہے جو اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس زندگی میں تو موت سے بھی حیاتِ جاوید حاصل ہو جاتی ہے۔ ان نکات کی تشریح اس سے قبل (مختلف جلدوں میں) سامنے آ چکی ہے ـــــ انڈکس میں "حیات اور موت" کے عنوانات دیکھئے (مطالب الفرقان جلد دوم صـ۲۸۱ پر تو زیرِ نظر آیت بھی درج کی جا چکی ہے)۔ اس مقام پر ایک شعر بے ساختہ نوکِ قلم پر آ گیا۔ شعر تو عمومی غزل کا ہے لیکن اس میں زندگی اور عمر میں جو فرق کہا گیا ہے وہ بڑا لطیف ہے۔ کہا ہے: ؎

جی لیا چار دن جوانی میں   زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

عمر اور زندگی میں جو فرق ہے' وہی فرق قرآنی مفہوم میں موت اور حیات میں ہے. عمر' سانس لینے کی طبیعی حیات ہے جسے ۹۰ سال سے پایا جاتا ہے. اس عمر میں' زندگی اُس حصہ کا نام ہے جو شرفِ انسانی کی سطح پر کسی بلند مقصد کے لئے بسر کی جائے. پس دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہماری "عمر" میں "زندگی" کا کتنا حصہ ہے. موت کے بعد' عمر تو ختم ہو جاتی ہے' لیکن زندگی آگے (ساتھ) جاتی ہے. قرآنی سطح پر زندگی کا تعین حضور نبی اکرمؐ کے ایک مختصر سے ارشادِ گرامی میں ہیرے کی طرح چمکتا دکھائی دیتا ہے. پوچھا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ فرمایا،

> جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو. جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو. یوں مومن کی ساری عمر' زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے. جس شخص کی عمر کا جتنا حصہ زندگی ہو گا' وہ اتنا ہی' فی الحقیقت' زندہ انسان ہو گا.

○

آیت کا آخری حصہ بڑا غور طلب ہے. ظاہر کہ قرآن کے مطابق مجاہدانہ (سعی و عمل کی) زندگی بسر کرنے کے لئے عزمِ راسخ کی ضرورت ہوتی ہے' یعنی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم اور پھر اس کے حصول کے لئے عزمِ راسخ. اگر ان میں ذرا بھی تذبذب پیدا ہو گیا تو وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا. اس قسم کے عزمِ راسخ کے راستے میں' انسانی مفاد پرستی کے جذبات حائل ہو جاتے ہیں جو اسے کبھی اِدھر لے جاتے ہیں اور کبھی اُدھر. اس سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے.

اس آیت میں اَلْمَرْءِ اور قَلْبِہٖ کے الفاظ انہی بنیادی معانی میں استعمال ہوئے ہیں. اَلْمَرْءُ (مادہ م۔ ر۔ ء) کے معنی کمالِ مردانگی ہے اور انسانی جذبات اسے ایک مقام پر نہیں ٹکنے دیتے. ان دونوں میں کشمکش جاری رہتی ہے. مومن کے ایمانِ محکم کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نہ ہلے، اپنے عزم و ارادہ میں تزلزل نہ پیدا ہونے دے. وہ تذبذب کا شکار نہ ہو جائے. اس کو تمثال استقامت کے لئے ضروری ہے کہ یہ افراد اپنے مرکز کے گرد جمع رہیں. وہاں سے اِدھر اُدھر نہ ہوں. یہ بات خدا کے قانونِ مکافات پر یقینِ محکم سے پیدا ہو سکتی ہے. اگر قوم کا یہ انداز نہ رہے تو پھر ایسی تباہی آتی ہے جس کے متعلق فرمایا،

۸/۲۵ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ

خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ اگر جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اس قسم کے تذبذب میں گرفتار ہوں) تو اس سے جو مصیبت آتی ہے وہ ظالمین تک محدود نہیں رہتی. وہ سارے کے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے. اس لئے کہ خدا کا قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بڑا سخت واقع ہوا ہے (اجتماعی اعمال کے نتائج بھی اجتماعی ہوتے ہیں. اس لئے اس سے بہت محتاط رہو اور ایسا انتظام کرو کہ تمہارے ہاں ایسی صورت پیدا نہ ہونے پائے) (۸/۲۵).

اجتماعی تباہی

یہ آیۂ جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہے. قرآنِ مجید کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ "مذہب" کے اسٹیج سے گفتگو کرتا ہے، لیکن انسان کو جذبات میں الجھانے کے بجائے حقائق Facts کا سامنا کرنا سکھاتا ہے. مذہب کی دنیا یہ کہے گی کہ کیسی ہی تباہی آئے خدا اپنے نیک بندوں کو اس سے محفوظ رکھے گا. قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جن حوادث کا تعلق طبیعی اسباب Physical Causes سے ہے، وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں. وہ مومن اور کافر یا نیکوکار اور فاسق وفاجر میں کوئی تمیز نہیں کرتے. ان سے حفاظت بھی طبیعی اسباب کی رُو سے مل سکے گی اور ان کی رُو سے واقع ہونے والے نقصان کا ازالہ بھی طبیعی اسباب ووسائل کے ذریعے ہی ممکن ہوگا (مثلاً) دریا کے کنارے بسنے والے گاؤں کے باشندے اگر دریا کا بند باندھنے میں کوتاہی برتیں گے تو سیلاب ان لوگوں کے گھروں کو بھی بہا کرلے جائے گا جو اس کوتاہی کے ذمہ دار تھے اور ان کے گھروں کو بھی جو اس سے بری الذمہ تھے. وہ خدا کے نیک بندوں کے گھروں کو بھی اسی طرح تباہ کردے گا جس طرح فاسق وفاجر لوگوں کے گھروں کو. حتیٰ کہ سیلاب، مسجد اور مندر میں بھی تمیز نہیں کرے گا.

کسی شہر میں ہیضہ کی وبا پھوٹے گی تو اس سے وہی محفوظ رہیں گے جنہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کرلی ہوں گی یا اس سے متأثر ہو جانے کے فوری بعد ضروری علاج کرالیا ہوگا. چھتوں پر چڑھ کر اذانیں دینے سے نہ سیلاب کا رُخ بدل سکتا ہے نہ وبائی امراض کے اثرات زائل ہو سکتے ہیں. یہ حوادث خدا کے مقرر کردہ طبیعی قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور انہی قوانین کی رُو سے ان کا ازالہ ہو سکتا ہے. جنگ

اُحد میں، تیر اندازوں کے محافظ دستہ کے ایک غیر دانشمندانہ اقدام سے نہ صرف فتح مبدّل بہ شکست ہوگئی، بلکہ رسول اللہ تک بھی حریف کے وار سے محفوظ نہ رہ سکے اور زخمی ہوگئے (تفصیل مطالب الفرقان جلد چہارم میں گزر چکی ہے)۔ قرآنِ کریم میں انبیائے سابقہ کی جو داستانیں بیان ہوئی ہیں، ان میں آپ دیکھیں گے کہ جب کسی بستی پر تباہی آنے والی ہوتی تھی تو جماعتِ مومنین کو اس سے محفوظ رکھنے کا طریق یہ اختیار کیا جاتا تھا کہ وہ وہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام کی طرف ہجرت کر جائیں۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس بستی میں رہیں۔ تباہی آئے اور کفار کے گھر تو تباہ ہو جائیں اور ان مومنین کے گھر محفوظ رہ جائیں۔ حضرت نوحؑ اور اور ان کے ساتھی اس لئے سیلاب سے محفوظ رہے تھے کہ انہوں نے کشتی بنا لی تھی۔

مومن اور کافر کا فرق آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ جنگ میں شکست دونوں کو ہوتی ہے جماعتِ مومنین کو چونکہ اپنے مقصد کی صداقت پر یقین ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کو وہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور اس راہ میں موت کو حیاتِ جاوید، اس لئے وہ اس شکست سے مایوس نہیں ہو جاتے۔ وہ اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں۔ اُن نقائص کو دُور کرتے ہیں جو اس کا سبب بنے تھے اور اس کے بعد، تازہ ولولوں اور پُرعزم حوصلوں کے ساتھ پھر میدانِ کارزار میں نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ ان کے اس ایمان کی قوّت ہوتی ہے جو ان کے تین سو مجاہدوں کو دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں پر کامیابی عطا کر دیتی ہے (۸/۶۵)۔

آیت (۸/۶۵) کی تشریح تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں برسبیلِ تذکرہ ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اگر تم میں بیس مجاہد بھی ایسے ہوتے جو میدانِ جنگ میں جم کر کھڑے ہوگئے تو وہ دو سو مخالفین پر بھاری رہیں گے اور اگر سو مجاہدین ایسے نکلے تو وہ دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں پر غالب آجائیں گے (۸/۶۵)۔ خدا نے یہ نہیں کہا کہ تم میں سے کوئی میدان میں نکلے یا نہ نکلے، تمہیں بہرحال کامیابی نصیب ہو جائے گی۔ ایک ہزار پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک سو مجاہدین کا باہر نکلنا ضروری ہے۔ ان کے ایمان کی قوّت ان کی عددی کمی کا ازالہ کر دے گی۔ لیکن ان مجاہدین کا مقابلہ کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ طبیعی حوادث کا مقابلہ بہرحال طبیعی اسباب و ذرائع کی رُو سے ہی کیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان مجاہدین کی فکر و نظر کی بلندی اور عزم و ارادہ کی پختگی، ان کی طبیعی کمی کا ازالہ کر دے۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی۔

اسباب کی کمی کا ازالہ

آیت (۸/۶۵) میں کہا گیا ہے کہ تمہارے سو سپاہی، ہزار پر غالب آجائیں گے۔ آیت (۸/۶۶) میں کہا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت اس صورت میں ہے جب طبیعی اسباب و ذرائع (سامانِ حرب ضرب وغیرہ) کے لحاظ سے تمہاری اور دشمن کی پوزیشن یکساں ہو۔ سرِ دست چونکہ صورت ایسی نہیں۔ ان اسباب و ذرائع کے اعتبار سے تم دشمن کے مقابلہ میں کمزور ہو۔ اس لئے یہ نسبت ایک اور دو کی ہوگی، یعنی تمہارے ایک سو سپاہی دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آسکیں گے اور ایسا تمہاری استقامت کی وجہ سے ہوگا۔

معاشرہ میں ایک مقام البتہ ایسا آجاتا ہے جہاں انفرادی راستبازی اور اس کے مقابل مفاد پرستانہ ذہنیت طبیعی اسباب کے نتائج و ثمرات پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ مرض بھی وہی ہوتا ہے تشخیص بھی وہی دوائیاں بھی وہی، لیکن ایک ڈاکٹر نوعِ انسانی کے جذبۂ ہمدردی اور بہی خواہی کے ساتھ مریضوں کا علاج کرتا ہے اور

ذہنیت کا اثر

دوسرا ذاتی مفاد پرستی کے تابع۔ دونوں کے علاج کے نتائج میں جو نمایاں فرق ہوتا ہے، وہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ قرآن، ڈاکٹر تیار کرنے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ انہیں "انسان" بنانے کی بھی سخت تاکید کرتا ہے۔ غلط (غیر قرآنی) معاشرہ میں (مثلاً) ڈاکٹر تو بہت ہوتے ہیں، لیکن ان میں انسان بہت کم۔ صحیح (قرآنی) معاشرہ میں پوزیشن اس کے برعکس ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو اُس معاشرہ میں دوائی خاطر خواہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، صحیح علاج کے لئے (۱) ڈاکٹر (۲) اُس کا حسنِ کردار اور (۳) صحیح دوائی تینوں لازم و ملزوم ہیں اور یہ عناصر صحیح نظام میں ہی ممکن ہوتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن اس بات پر کیوں زور دیتا ہے کہ اس امر کی خاص احتیاط برتو کہ معاشرہ میں غلط ذہنیت اور مفسدانہ کردار کے لوگ بار نہ پانے پائیں۔ وہ دریا کا بند تعمیر کرنے میں سیمنٹ کی جگہ ریت بھر دیں گے اور پھر ساری بستی سیلاب کی نذر ہو جاتے گی! تمامی تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے انفرادی "نیکیاں" کچھ کام نہیں دیتیں۔ اس کے لئے صحیح (قرآنی) نظام کی ضرورت لاینفک ہے۔ انفرادی نیکیاں تو قرآن غیر مسلموں میں بھی تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی امانات کو نہایت دیانتداری سے واپس کر دیتے ہیں (۳/۷۵) لیکن اس کے باوجود انہیں بھی امتِ مسلمہ (اسلامی نظام) میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ صحیح نظامِ معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ صحیح نظام کی تشکیل

کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ فرمایا:

۸/۲۶ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

(تم اس نظام کی اطاعت کے حسین نتائج کا اندازہ خود اپنی حالت سے لگاؤ۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ) تم تعداد میں بھی کم تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی بے حد کمزور تصور کئے جاتے تھے۔ تمہیں ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ مخالفین تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ ان حالات میں قانونِ خداوندی نے تمہاری اطاعت اور استقامت کے بدلے میں، تمہیں ایسا ٹھکانا دیا جہاں تم اکٹھے رہ سکتے ہو۔ اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت پہنچائی اور خوشگوار چیزیں دے کر تمہارے رزق کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب اس لئے کہ (نظامِ خداوندی کے قیام و بقا میں) تمہاری جد و جہد بھرپور نتائج پیدا کر سکے۔

قرآنِ کریم نے یہاں تین انعاماتِ خداوندی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ ۱۔ خوف کی جگہ امن۔ ۲۔ محفوظ ٹھکانا اور ۳۔ رزقِ طیب۔ اُس نے اس کا ذکر دیگر متعدد مقامات پر بھی کیا ہے۔ اُس نے بھوک اور

بھوک خدا کا خوف ہے

خوف (لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ) کو خدا کا عذاب کہہ کر پکارا ہے (۱۶/۱۱۲) اور قریش کو جن انعامات کی خصوصیت سے یاد دلائی ہے وہ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۴) ہیں، یعنی بھوک اور خوف سے نجات۔ داستانِ بنی اسرائیل میں بتایا کہ اس قسم کا حقیقی امن، ٹھکانا اور سامانِ زیست، تمکن فی الارض سے میسر آتا ہے۔ (تفصیل مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۷، پر گزر چکی ہے)۔ امتِ مسلمہ کے ضمن میں بھی فرمایا کہ یہ انعامات استخلاف فی الارض سے حاصل ہوتے ہیں، یعنی استخلاف فی الارض سے دین (نظامِ خداوندی) متمکن ہوتا ہے اور اس کے تمکن کا نتیجہ حقیقی امن ہوتا ہے۔ حقیقی امن کا معیار یہ ہے کہ اس میں قوم اس قابل ہوتی ہے کہ محکومیت صرف احکام و قوانین کی ہو، کسی انسان کی نہ ہو سورۃ

النّور میں اس حقیقتِ ابدی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۲۴/۵۵)

استخلاف

ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (۲۷/۳۳). (اور ان کی حکومت اس خطۂ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی ۳۹/۷۴) ـــــ یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکّن فی الارض) عطا کی تھی (۶/۲۸) ـــــ اسی قانون کے مطابق ہم ان مومنین کے ایمان اور اعمال کے نتیجہ میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے اور اُن کے اس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے. اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کا خوف، امن سے بدل جائے گا، تاکہ وہ نہایت اطمینان سے، ہمارے اور صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں. (دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے ساتھ، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں).

(لیکن اسے اچھی طرح سُن رکھو کہ یہ سلسلہ اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد اس سے عملاً انکار کر دیں گے (اور احکامِ خداوندی کے بجائے اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں گے)، تو یہ لوگ اُس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر، جو انہیں صحیح منزل کی طرف لے جا رہی تھی، اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے (اور اس لئے اس جنتی معاشرہ کی برکتوں سے محروم

ہو جائیں گے۔ یہ برکات ایمان و عمل کا نتیجہ تھیں۔ جب ایمان و عمل نہ رہا تو وہ برکات کیسے باقی رہیں گی؟)۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ بنی اسرائیل کو تمکن عطا کرنے کے سلسلہ میں کہا:۔

وَ نُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ جُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝

(۲۸/۵-۶)

چنانچہ فرعون کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا اسے ہماری نعمتوں سے نوازا جائے یعنی انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے۔ جہاں ان کی اپنی حکومت ہو اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار ہامان اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھا دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے اور جس سے بچنے کے لئے وہ اس قدر محکم تدابیر اختیار کیا کرتے تھے، یعنی ان کی تباہی اور بربادی۔

بنی اسرائیل اور امتِ محمدیہ میں فرق

جیسا کہ معلوم ہے کہ قوم بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہاں رہتے ہوتے ان کے لئے اس امر کا امکان نہیں تھا کہ وہ ایسی آزادی حاصل کر سکیں جس میں حکومت صرف احکامِ خداوندی کی ہو۔ اس کے لئے ان کا وہاں سے نکل آنا ضروری تھا۔ یہ اُن کی آزادی کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے زیرِ قیادت عمل میں آئی۔ اسے قرآن نے "خدا کا احسان" کہہ کر پکارا ہے کیونکہ اس میں اُن کی سعی و عمل کا دخل نہیں تھا۔ یہ اس کے فرستادہ پیغمبر حضرت موسیٰؑ کی حسنِ قیادت کا نتیجہ تھا۔ اس کے برعکس امتِ مسلمہ کے استخلاف فی الارض کو ان کے ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ کہہ کر پکارا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی رسول اللہ کی بعثت تھی۔ اسے قرآن نے خدا کا احسان قرار دیا ہے (۳/۱۶۳)۔ لیکن امتِ مسلمہ اور بنی اسرائیل میں بنیادی فرق تھا۔ حضرت موسیٰؑ ایک بنی بنائی قوم کی طرف مبعوث ہوئے

تھے۔ ان کا قدمِ اوّل اس قوم کو مصر سے باہر لے جانا تھا تاکہ وہ اس خلا میں اپنی مملکت قائم کر سکیں۔ حضورؐ کا فریضہ ایک اُمت کی تشکیل تھا۔ اس فریضہ کا آغاز حضورؐ کی مکّی زندگی سے ہوا۔ اس امت کی تشکیل "ایمان و اعمالِ صالح" کی رُو سے کی گئی، اور جب وہ اس طرح تیار ہو گئی تو مدنی زندگی میں ان کے تمکن کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس طرح ان کا تمکن فی الارض اس امت کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ تھا۔ لیکن بنی اسرائیل ہو یا امتِ مُسلمہ، دونوں کے استخلاف کی شرط یہ تھی کہ یہ اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک قوم نظامِ خداوندی کی پابند رہے گی۔ اگر انہوں نے اس سے اعراض برتا تو یہ نعمت ان سے چھن جائے گی۔ چنانچہ دونوں کی صورت میں ایسا ہی ہوا۔ بنی اسرائیل نے قوانینِ خداوندی سے مُنہ موڑا تو ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ امتِ مسلمہ نے ان سے اعراض برتا تو ملوکیت کے پنجۂ استبداد کا شکار ہو گئی اور اس کے بعد ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا۔

ملتِ پاکستانیہ ہم ملتِ پاکستانیہ کی داستان بنی اسرائیل سے ملتی جلتی ہے۔ ہماری آزادی کا قدمِ اوّل، انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس کے لئے ہمیں الگ خطۂ زمین عطا ہو گیا تاکہ ہم اس میں نظامِ خداوندی قائم کر سکیں۔ یہ محض احسانِ خداوندی تھا جس کا ذریعہ علامہ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت اور قائد اعظمؒ (محمد علی جناح) کا حسنِ تدبر تھا۔ خطۂ زمین تو ہمیں مل گیا، لیکن جس مقصد کے لئے یہ عطا ہوا تھا، اس کے لئے ہم نے ابھی تک ایک قدم بھی نہیں اٹھایا— اس منزل کی طرف قدم اٹھانا تو ایک طرف، ہم پھر اپنے عہدِ ملوکیت کی طرف لوٹ رہے ہیں[1]۔ اس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ بھی وہی کچھ نہ ہو جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا کے قوانین اٹل ہوتے ہیں ؎ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

ہم تو اس جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جس سے اگلی آیات میں، متنبہ کر دیا گیا ہے کہ:

(۸/۲۷-۲۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا

[1] نوشتہ ۱۹۸۳ء

إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

اے جماعتِ مومنین! تم نہ تو اس نظامِ خداوندی (خدا و رسولؐ) سے کسی قسم کی خیانت کرو اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا (۸/۵۸)۔ تم اسے بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ (انفرادی مفاد کے مقابلہ میں) انسانیت کے مفادِ کُلّی کو اپنا نصب العین قرار دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، مال اور اولاد کی کشش ہوتی ہے۔ اگر ان کی کشش تم پر غالب آگئی ہو تو یہ چیز تمہاری تباہی کا موجب بن جائے گی۔ لیکن اگر تم نے، ان کی کشش و جاذبیت کے باوجود انسانیت کے مفادِ کُلّی کو ترجیح دی، تو تم اس کٹھالی میں سے کندن بن کر نکلو گے اور دیکھو گے کہ نظامِ خداوندی کی طرف سے اس کا کس قدر عظیم بدلہ ملتا ہے۔

بیوی بچّے اور بلند اقدار بیوی بچّے بے شک اپنے اندر کشش و جاذبیت رکھتے ہیں اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں۔ لیکن جب کبھی اس کشش و محبت اور بلند اقدارِ خداوندی میں تصادم ہو تو اُس وقت اِس کشش کو ان اقدار کے راستے میں روک نہیں بن جانا چاہیئے (۲۵/۷۴؛ ۱۵-۶۴/۱۴؛ ۲۴-۹/۲۳)۔

ہم نے اس خطۂ زمین کے لئے یہ کہہ کر خدا سے استدعا کی تھی کہ ہم اس میں اُس کا نظام قائم کریں گے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں یہ خطۂ ارض بطور امانت ملا تھا۔ ہم نے اس امانت میں بھی خیانت برتی اور جو ذمہ داریاں ہمارے سپرد ہوئیں، ان میں بھی خیانت برتی کیونکہ انہیں ان کے سپرد نہ کیا جو ان کے اہل تھے (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۵)۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے بتایا کہ ان مقدس امانات میں خیانت کے محرکات کیا ہوا کرتے ہیں۔ نظامِ خداوندی کا مطلب ربوبیتِ عالمینی ہے، یعنی "اپنوں اور بیگانوں" کی تفریق و تمیز سے بلند و بالا ہو کر، عالمگیر انسانیت کی نشوونما کا انتظام کرنا۔ اس کی ابتداء بہرحال اپنی مملکت کے افرادِ معاشرہ سے ہوگی یعنی تمام افرادِ

معاشرہ کی طبیعی اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے اسباب و وسائل مہیا کرنا۔ اس کے برعکس، غلط معاشرہ میں، ہر شخص اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش اور نشوونما کی فکر آپ کرتا ہے۔ ان سے آگے کسی اور کی پرورش کی اسے فکر یا پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنے بچوں کی پرورش تو حیوانات بھی کرتے ہیں۔ اگر انسان کی حدِ نگاہ بھی یہیں تک ہو تو اس میں اور حیوان میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ وحیٔ خداوندی اس کی نگاہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتی ہوئی اسے عالمگیر انسانیت تک لے جاتی ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر		سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سُودِ ہمہ		در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ

تفصیل ان امور کی سابقہ جلدوں میں، ربوبیّت اور معاشی نظام کے عنوانات کے تحت ملے گی۔ قرآن رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک گھربار، مال و دولت، بیوی بچے اپنے اندر کشش رکھتے ہیں اور یہ کشش نہ معیوب ہے نہ ممنوع۔ اس کے برعکس، وہ اہل و عیال کی زندگی میں (بشرطیکہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے) مودّت، سکون اور رحمت کا سامان بتاتا ہے (۳۰/۲۱)۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کسی وقت، بیوی بچوں کی کشش اور دین کے کسی بلند مقصد میں تصادم ہو (ٹکراؤ آ پڑے) تو اس وقت اگر بیوی بچوں کی کشش اس بلند مقصد پر غالب آجائے، تو یہی بیوی بچے فتنہ بلکہ تمہارے دشمن بن جاتے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۳۶۔

اس ضروری تنبیہ کے بعد کہا کہ:

۸/۲۹ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

اگر تم ان کی بیجا کشش و جاذبیت سے بچنے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا اور تمہاری ناہمواریوں کو تم سے دور کر دے گا اور تمام خطرات سے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا۔ یاد رکھو! اللہ کا نظام بڑی

عظیم خوشحالیوں کا ضامن ہے۔
قرآنی نظام میں زندگی بسر کرنے کے نتیجہ کو "فرقان" کہہ کر قرآن سب کچھ کہہ گیا۔ کفر و اسلام میں فرق کرنے والی زندگی، حق و باطل میں تفریق کرنے والی زندگی، اقوامِ عالم میں امتیازی مقام عطا کرنے والی زندگی۔ ؎

موئنے بالاتے ہر بالا ترے　　　غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

یہ امتیازی زندگی قرآن کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اُس نے خود قرآن کو بھی فرقان کہہ کر پکارا ہے (۲/۱۸۵؛ ۳/۳؛ ۲۵/۱)۔ لیکن یہ امتیازی زندگی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنے سے ملتی ہے۔ اسی لئے اُس نے بدر کی جنگ کو یوم الفرقان کہا ہے (۸/۴۱)۔ اس "یوم الفرقان" تک پہنچنے کے لئے انہیں جن جانگسل اور زہرہ گداز مراحل سے گزرنا پڑا تھا اُن کی یاد یہ کہہ کر دلائی کہ:

۸/۳۰ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

(اے رسولؐ! تم اُس وقت کو یاد کرو) جب فریقِ مخالف (کفارِ مکہ) اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے کہ تجھے قید کرلیں یا قتل کردیں یا جلاوطن کردیں۔ وہ اُدھر اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے اور اِدھر ہمارا قانون بھی اپنی تدبیروں میں لگا ہوا تھا (اس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ) کارگر تدبیر ہمارے ہی قانون کی ہوئی۔

اس کے بعد بتایا کہ ان مخالفین کی کیا حالت تھی:

۸/۳۱ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ان کی حالت یہ تھی کہ جب اُن کے سامنے قرآن کی آیات پیش کی جاتیں تو وہ (عجیب حقارت آمیز انداز سے) کہتے کہ ہم نے انہیں سُن لیا ہے (ان میں کون سی خاص بات

ہے؟ اگر ہم چاہیں تو انہی جیسی آیات ہم خود بھی بنا سکتے ہیں. ان میں' اس کے سوا رکھا ہی گیا ہے کہ یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں!

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوگا:

۸/۳۲ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝

(اور جب ان سے کہا جاتا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر خدا کی طرف سے تباہی آجائے گی، تو) وہ کہتے کہ اے اللہ اگر یہ وعید فی الواقع تیری طرف سے ہے اور سچی ہے، تو پھر تجھے انتظار کس بات کا ہے؟ تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے یا ہمیں کسی اور عذاب میں مبتلا کر دے.

یہ کوتاہ اندیش اپنی تباہی کے لئے اس قدر جلدی مچاتے ہیں، لیکن ہمارے قانونِ مہلت کا تقاضا کچھ اور ہے. وہ اس انتظار میں ہے کہ آپؐ (نبی کریمؐ) کی تبلیغ و تنذیر سے جتنے خوش نصیب' نظامِ خداوندی کی پناہ میں آسکتے ہیں (یعنی امتِ مسلمہ کے زمرے میں داخل ہو سکتے ہیں) وہ اِدھر آجائیں' تو پھر (ان باقیماندہ افراد پر) عذاب وارد ہو ـــــ

۸/۳۳ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۝

لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اُن پر تباہی آجاتی' درآنحالیکہ تم ہنوز اُن میں مصروفِ تبلیغ تھے اور اس کا امکان تھا کہ ان میں سے کئی لوگ' حق کو قبول کر کے پناہِ خداوندی میں آجائیں گے

اب وہ مہلت کا وقفہ گزر گیا ہے اور باقی وہی لوگ رہ گئے ہیں جو اپنی ضد اور تعصب کی بنا پر حق کی بات

سننے تک کے لئے تیار نہیں۔

(۸ / ۳۴-۳۵) وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا أَوْلِيَآءَهٗ ؕ إِنْ أَوْلِيَآؤُهٗٓ
إِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ
صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

اب کونسی بات باقی رہ گئی ہے کہ ان پر (ان کے اعمال کے نتیجے میں) تباہی نہ آجائے اور انہیں مزید ڈھیل دی جائے؟ ان کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے اُن مقاصد اور مصالح کی راہیں بند کر رکھی ہیں جن کے لئے ہم نے کعبہ کو واجب الاحترام قرار دیا تھا۔ اس لئے یہ قطعاً اس قابل نہیں رہے کہ انہیں کعبہ کا محافظ و متولی رہنے دیا جائے۔ اس کے متولی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ لیکن ان میں تو اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ جانتے تک بھی نہیں (کہ تولیتِ کعبہ کا مقصد کیا ہے؟)۔

بے مقصد صلوٰۃ

(کعبہ اور اُس کی تولیت کا عظیم مقصد تو ایک طرف) ان کی تو خانہ کعبہ میں صلوٰۃ تک بھی اس کے سوا کچھ نہیں رہ گئی کہ سیٹیاں بجائیں اور تالیاں پیٹیں —— یعنی چند بے معنی آوازیں اور کچھ بے مقصد حرکتیں —— یہ صلوٰۃ کی اصل حقیقت سے یکسر انکار کے مرادف ہے۔ اس لئے اُن سے کہو کہ تم اب اپنی ان حرکات کا نتیجہ بھگتو اور تباہی و بربادی کا مزہ چکھو۔ (جو قوم بھی احکامِ خداوندی کی اصل و غایت کو نظر انداز کر کے محض رسوم و ظواہر کو منتہیٰ قرار دے لیتی ہے وہ عذابِ خداوندی میں ماخوذ ہو جاتی ہے)۔

جس طرح اُن کے ہاں کعبہ نام رہ گیا ہے اینٹ اور پتھروں کی عمارت کا اور اس کا مقصود و منتہیٰ یکسر نگاہوں سے گم ہو چکا ہے، اسی طرح ان کے ہاں اُس صلوٰۃ کا لفظ تو باقی رہ گیا ہے جس کا نظام ان کے

مُورثِ اعلیٰ، حضرت ابراہیمؑ نے قائم کیا تھا، لیکن اس کی حقیقت کی جگہ چند بے معنی حرکات و سکنات نے لے لی ہے۔ ان اینٹوں اور پتھروں کی پوجا اور صلوٰۃ کے نام سے چند بے مقصد حرکات و سکنات تو انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں جو ان کی غلط روشِ زندگی کا فطری نتیجہ ہے۔

کیا ہماری حالت بھی بعینہٖ یہی نہیں ہو چکی؟ (اس کے لئے صلوٰۃ اور کعبہ کے عنوانات دیکھئے)۔

یہ تو رہی ان کی (نام نہاد) عبادات کی حقیقت۔ جہاں تک مال و دولت خرچ کرنے کا تعلق ہے، ان کی حالت یہ ہے کہ

۸/۳۶ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ

یہ لوگ جو نظامِ خداوندی سے انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں اور مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو "خدا کے راستے" کی طرف آنے سے روکیں، سو انہیں اپنی دولت اس طرح خرچ کرنے دو۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ان کی ان تمام حرکات کے علی الرغم نظامِ خداوندی قائم ہو کر رہے گا اور اس وقت یہ مغلوب ہو جائیں گے اور بصد حسرت و یاس کہیں گے (کہ ہم نے اپنی دولت اس ناکام مقصد کے لئے ناحق صرف کی!)۔

اس مقام پر پھر ایک ثانیہ کے لئے رُک جایئے اور سوچئے کہ جو کچھ (اور جتنا کچھ) ہم (بزعمِ خویش) خدا کی راہ میں (فی سبیل اللہ) خرچ کرتے ہیں، اُس میں سے کتنا اس منزل کی طرف لے جانے والے راستے میں صرف ہوتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور کتنا اس راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے؟ اس تفصیل میں گئے بغیر کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وہ کون کون سے عناصر ہیں جو خدا کی طرف جانے والے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے یا روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ایک عنصر تو ایسا نمایاں ہے جو بالبداہت نظر آجاتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (۹/۳۴)

خدا کا راستہ روکنے والے

اے ایمان والو! ان کے علمار و مشائخ میں سے جنہیں یہ خدائی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ، جھوٹ اور فریب سے، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے)۔

قرآن کی رُو سے یہ علمار و مشائخ ہیں جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں لیکن، درحقیقت، وہ اس راستے میں رکاوٹیں بن کر کھڑے رہتے ہیں کہ اُمت منزلِ مقصود تک جانے نہ پائے۔ یہ مذہب کو ذریعۂ معاش بنا لیتے ہیں (ان کا کوئی ذریعۂ معاش ہوتا ہی نہیں)۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۹/۹)

یہ لوگ ذرا سے فائدے کی خاطر جھٹ سے قوانینِ خداوندی کو بیچ ڈالتے ہیں اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں، وہ کس قدر بُرا ہے!

سوچئے کہ ہمارا کس قدر روپیہ (جسے ہم سمجھتے ہیں کہ اسے ہم خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں) ان رکاوٹوں کے پیدا کرنے اور کھڑی کرنے میں خرچ ہوتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سارا روپیہ، بالواسطہ یا بلا واسطہ، اسی مد میں چلا جاتا ہے! مذہب، بذاتِ خود دین کے راستے میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ اسی لئے جو کچھ مذہب کے فروغ کے لئے کیا جائے گا وہ دین کا راستہ روکنے کا موجب ہوگا۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جس قدر (اور جہاں بھی) مذہب آگے بڑھا ہے، دین پیچھے ہٹ گیا ہے۔

آیت (۸/۳۶) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ، دین کا راستہ روکنے میں، جتنا زور چاہے لگا کر دیکھ لیں، یہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ دین کا نظام، بالآخر کامیاب ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ نے اسے ثابت کر کے دکھا دیا۔ لیکن قرآن کا یہ دعویٰ اُسی زمانے تک محدود نہیں تھا۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جسے قرآن میں متعدد مقامات میں بیان کیا گیا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کو آخر الامر

غالب آنا ہوتا ہے اور وہ غالب آکر رہتا ہے ـــــ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) کا تعلق کسی خاص دَور سے نہیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت کا بیان ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ باطل غالب ہے اور حق سرنگوں، تو یہ اس لئے کہ حق کی سربلندی کے لئے کوئی جماعت کھڑی نہیں ہوتی اور حق محض اپنی فطری رفتار (اندرونی قوت) سے آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی یہ رفتار بڑی سبک خرام اور غیر محسوس ہوتی ہے۔ تشریح اس نکتہ کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے (انڈکس میں عنوانات 'حق و باطل یا خیر و شر کی کشمکش، ابلیس و آدم میں نبرد آزمائی یا دین کا غلبہ وغیرہ دیکھئے)۔

حق کی مخالفت کرنے والوں میں ایک گروہ وہ ہوتا ہے جو کھلے بندوں مخالفت کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے سیکولرازم کے حامی کہیئے۔ ان کا مقابلہ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ مذہب پرستوں کا ہوتا ہے۔ ان کی ایک ٹیکنیک 'کتمانِ حق' ہوتی ہے، یعنی حق کو یکسر چھپائے رکھنا اور اپنے باطل مسلک کو رائج کرنا۔ جن اہلِ مذاہب کی آسمانی کتاب محفوظ نہیں ہوتی، یہ ٹیکنیک وہاں کامیاب رہتی ہے۔ دنیا میں قرآن کے سوا کوئی (مبینہ) آسمانی کتاب بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اس لئے جملہ اہلِ مذاہب کی یہی کیفیت ہے۔ (ہم) مسلمانوں کی آسمانی کتاب محفوظ ہے' اسی لئے ہماری مذہبی پیشوائیت کتمانِ حق تو کر نہیں سکتی۔ ان کی ٹیکنیک تلبیسِ حق و باطل ہوتی ہے۔ یہ اپنے باطل نظریات و مسالک کو کتاب اللہ کی غلط تاویلات کے سہارے پیش کرتے اور آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کی مخالفت بڑی مشکلات پیدا کرتی ہے کیونکہ عوام ان کے دامِ فریب کے شکار ہوتے ہیں۔

حق کے غالب آجانے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ حق اور باطل' طیّب اور خبیث چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں تاکہ کوئی شخص مذہب پرستوں کے دھوکے میں نہ آسکے۔ اس حقیقت کو اگلی آیت میں یہ کہہ کر واضح کیا گیا ہے کہ (حق کے غلبہ سے مقصود یہ ہے کہ):

۸/۳۷ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

یہ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات، خوشگوار نظریۂ حیات رکھنے والی جماعت کو تخریب

پیدا کرنے والی جماعت سے الگ کرلے اور تمام تخریبی جماعتیں، حق کی مخالفت میں ایک دوسرے سے مل کر انبار در انبار بن جائیں۔ اور پھر قانونِ خداوندی اس پورے ڈھیر کو بربادی اور تباہی کے جہنم میں جھونک دے اور اس طرح انہیں بتادے کہ وہ کس طرح خاسر و نامراد رہتے ہیں (۵۵/۴۱؛ ۳۶/۵۹؛ ۳/۱۷۸)۔

حق (یعنی نظامِ خداوندی) کے قیام کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں مجرم اور شریف انسان الگ الگ نظر آجاتے ہیں، اس لئے کوئی کسی سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اس میں يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱)——"ہر مجرم اپنی پیشانی سے پہچانا جاتا ہے"۔ یوں سمجھئے گویا اس کا جرم اس کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے۔ اس میں (یوں سمجھئے کہ) اعلان کیا جائے گا: وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹)— "اے مجرمو! تم شرفاء سے الگ ہو جاؤ"۔

(ضمناً) رسول اللہ کے زمانے میں معاشرہ میں منافقین کی کثرت تھی اور قرآن شاہد ہے کہ ان کی وجہ سے کس قدر مشکلات پیش آتی تھیں۔ حق و باطل کی کشمکش اور بالآخر حق کے غلبہ کا ایک مقصد (یا ایک نتیجہ) یہ بھی تھا کہ معاشرہ، منافقین کے وجود سے پاک ہو گیا تھا۔ (تفصیل اس کی مطالب الفرقان، جلد چہارم صفحہ ۲۲۷ پر دیکھئے)۔

ان تنبیہات کے بعد کہا کہ:

۸/۳۸ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ان مخالفین سے کہہ دو کہ یہ اب بھی حق کی مخالفت سے باز آجائیں، تو جو کچھ یہ اس وقت تک کر چکے ہیں، اس کا ان سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ وہی کچھ پھر کرنے لگ گئے تو جو کچھ اقوامِ گذشتہ کے ساتھ ہوا ہے، وہی ان کے ساتھ ہوگا (۸/۳۸)۔

اسلامی نظام کی کس قدر کشادہ نگہی ہے کہ وہ مخالفین کے خلاف آخری قدم اٹھانے سے پہلے بھی

انہیں متنبہ (وارن) کرتا ہے کہ اگر وہ اپنی مخالفت اور سرکشی سے باز آجائیں، تو ان کے سابقہ جرائم کو بھی معاف کر دیا جائے گا۔ "اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" قرآن

قانون کا اطلاق تاریخ اجرا سے ہو گا

کے نظامِ عدل کا بنیادی اصول ہے، یعنی قانون کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد ہو گا۔ اس سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو جو اس قانون کے خلاف تھا تو اسے جُرم قرار نہیں دیا جائے گا۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد سوم، صفحہ ۱۷۴، نیز آیات ۲/۲۷۵، ۲۳-۲۲/۴، ۲۲-۲۳/۴؛ ۵/۹۵)۔

اور ان تنبیہات اور مراعات کے باوجود اگر یہ اپنی مخالفتوں سے باز نہ آئیں اور میدانِ جنگ تک میں اُتر آئیں، تو پھر تمہارے لئے مدافعت ناگزیر ہو جائے گی۔ اس لئے

۸/۴۰-۳۹ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

بہرحال، جب تک یہ اپنی حرکات سے باز نہیں آتے، تم ان کے خلاف جنگ جاری رکھو، تاآنکہ (ظلم واستبداد کا) وہ فتنہ فرو ہو جائے جو انہوں نے برپا کر رکھا ہے اور ایسی فضا پیدا ہو جائے جس میں، جس کا جی چاہے، پوری آزادی سے دین کو خالصتہً بوجہ اللہ (بلاجور واکراہ) اختیار کر سکے (۲/۱۹۳؛ ۲/۲۵۶)۔

اگر یہ لوگ اس فتنہ سے باز آجائیں، تو پھر ان سے مواخذہ کی ضرورت نہیں (کیونکہ جنگ سے مقصد ہی اس فتنہ کو فرو کرنا اور دین کے معاملہ میں لوگوں کو پوری پوری آزادی دینا تھا تاکہ جو شخص جسے بزعمِ خویش سچا دین سمجھتا ہے، اسے بطیبِ خاطر اختیار کرے اور جسے ایسا نہیں سمجھتا اس سے انکار کر دے)۔ یہ دینِ خداوندی آہستہ آہستہ ایسا کرے گا کہ اپنے خوشگوار تعمیری نتائج سے تمام غلط نظاموں (باطل ادیان) پر غالب آجائے۔

(۹/۲۳) ؛ اور اس صورت میں قانونِ خداوندی اس پر نگاہ رکھے گا کہ یہ اس کے بعد کیا کرتے ہیں (۸/۳۹)۔

اور اگر یہ بعد میں اپنے معاہدہ سے پھر جائیں (تو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں) تمہارا رفیق و دمساز تو بہرحال خدا کا قانون ہے۔ وہ کیسا اچھا رفیق اور کارساز اور کیسا اچھا معین و مددگار ہے (۸/۴۰)۔

اسلام میں جنگ کی اجازت کن حالات میں ہے؛ اس کے اشارات اسی سورۃ کے ابتدا میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ آیت (۲/۱۹۳) میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان، جلد سوم صفحات ۲۶۵ تا آخر ملاحظہ فرمائیے۔

شروع سورہ میں بتایا جا چکا ہے کہ جنگ کے ضمن میں قرآنِ کریم نے ایک اہم اصلاح یہ بھی کی کہ دشمن سے جو مال و اسباب ہاتھ آئے اسے "لوٹ کا مال" تصور نہ کر لیا جائے کہ جو جس سپاہی کے ہاتھ آجائے، وہ اس کا ہو جائے۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ جو سپاہی جس دشمن کو قتل کرے، اس کا مال و اسباب اس سپاہی کی ملکیت قرار پاتے۔ اس نے کہا کہ وہ سب مال، مملکت کی تحویل میں دیا جائے گا جسے وہ حسبِ ضرورت تقسیم کرے گی۔ فرمایا:

دسواں پارہ شروع

(۸/۴۱) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

جنگ کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ اس سے پہلے تمہارا دستور یہ تھا کہ جنگ میں جو کچھ کسی کے ہاتھ آجائے وہ اُسی کا ہو۔ یہی لوٹ کا مال، وہ بنیادی جذبہ تھا جس کے لئے تم میدانِ جنگ میں جایا کرتے تھے۔ لیکن اب جنگ ظلم کو روکنے اور نظامِ عدل و احسان قائم کرنے کے لئے ہوگی۔ اس لئے اس میں جذبۂ محرکہ لوٹ کا مال حاصل کرنا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو! میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ "خدا اور رسول" ——— یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات ——— کے لئے رکھ کر، باقی ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا ——— مثلاً (میدانِ جنگ میں جانے والوں اور کام آجانے والوں کے) اقربا کے لئے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں، نیز اُن مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں[1]۔

تقسیم کا اُصول ہم جانتے ہیں کہ اس طرح ہاتھ آتے ہوتے مال سے، یوں دست کش ہو جانا کچھ آسان کام نہیں، لیکن اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اُن احکام پر جو ہم نے اپنے بندے پر اُس دن نازل کئے تھے جب دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل آئے تھے اور جب حق و باطل نکھر کر سامنے آگیا تھا (تو تمہارے لئے ایسا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ مستقل اقدار پر ایمان، اس قسم کی تمام جاذبیتوں کو ٹھکرا سکتا ہے)، اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ اللہ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور اُن پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے (اس لئے اس کے قانون پر عمل پیرا ہونے سے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا)۔

سابقہ جلدوں میں، قرآن کے معاشی نظام کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے کہ جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا مملکت کی ذمہ داری ہوتا ہے۔ اس نظام کی رُو سے کسی کے پاس زائد از ضرورت کچھ رہنے کا سوال

---

[1] تقسیم کا اصول یہ تھا کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب شاہکارِ رسالت صفحہ ۳۷۹، ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)۔

پیدا نہیں ہوتا. آیت زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ "اللہ اور رسول" (نظامِ مملکت) کی تحویل میں رہے گا اور بقایا (۵/۴) حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تقسیم کیا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم قرآنی مملکت کے ابتدائی ایام سے متعلق ہے. اس کی تکمیل کے بعد[1] اس قسم کی الگ الگ تقسیم کی ضرورت نہیں رہے گی. (مالِ فَے کے متعلق (۵/۱) اور (۵/۴) کی تفریق نہیں تھی. وہ سب کا سب حکومت کی تحویل میں رہتا تھا تاکہ وہ اسے ضرورتمندوں میں مناسب طریق سے تقسیم کرے (۵۹/۷).

مالِ غنیمت کی ملکیت اور تقسیم کی اصلاح سے مقصد یہ تھا کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ (۵۹/۷) "دولت اُوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہ کرتی رہے." وہ دورانِ خون کی طرح ملّت کے پورے کے پورے "جسم" میں گردش کرے. آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم ہر مقام پر کس طرح اپنے معاشی نظام کے اصولوں کو نمایاں کرتا چلا جاتا ہے. جس نظام میں دولت اوپر کے طبقہ (اغنیاء) ہی میں گردش کرتی رہے اور نچلا طبقہ اُن کا محتاج ہو، وہ نظام غیر قرآنی ہے.

جس مال کے متعلق کہا کہ وہ "اللہ اور رسول" (نظامِ مملکت) کی تحویل میں رہے گا، وہ بھی سربراہِ مملکت کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا تھا. وہ رفاہِ عامہ کے لیے خرچ کرنے کے لیے ہوتا تھا. چنانچہ حضورؐ نے یہ کہہ کر اس کی تشریح کر دی تھی،

> تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لیے پانچواں حصّہ ہے اور یہ حصّہ بھی تم ہی لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے. (بخاری و مسلم)

کمیونزم کے مدعی بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ دنیا کی معاش کا حل کارل مارکس نے یہ بتایا تھا کہ؛

> ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے، اور ہر ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے.

یہ اصول بڑا درخشندہ اور تابناک ہے اور نوعِ انسان کی معاشی مشکلات کا اطمینان بخش حل. لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ اصول مارکس نے نہیں، حضور نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور مارکس کی طرح محض نظری طور پر ہی پیش نہیں کیا تھا، بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا. (مثلاً، مالِ غنیمت کو دیکھئے.

---

[1] اس کی تفصیل میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی.

ظاہر ہے کہ جنگ میں تمام سپاہی (مجاہدین) یکساں حصہ لیتے تھے اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق نبرد آزمائی کرتے تھے۔ مالِ غنیمت میں ان سب کا حصہ یا تو یکساں ہونا چاہیئے تھا یا ان کی کارکردگی کے مطابق۔ لیکن حضورؐ نے اصول یہ طے فرمایا کہ ہر ایک کو اُس کی ضروریات کے مطابق حصہ دیا جائے۔ (بخاری، کتاب الجہاد)۔ اور عملاً اس کا مظاہرہ یوں ہوتا تھا کہ مجرّد (غیر شادی شدہ) کو ایک حصہ ملتا تھا اور اہل و عیال والے کو دو حصے۔ (ابو داؤد، کتاب الخراج الامارہ)۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے لئے وظائف مقرر کئے گئے، تو ان کے لئے بھی یہی اصول اختیار کیا گیا، یعنی ہر ایک کا وظیفہ اس کی ضروریات کے مطابق نہ کہ خدمات کے تناسب سے۔

بات تو مالِ غنیمت کی تقسیم کی ہو رہی ہے، لیکن جس آیت (۵۹/۷) کا ذکر مالِ فے کے سلسلہ میں آیا ہے، اس کے ضمن میں ایک ایسا نکتہ سامنے آیا ہے جسے پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حدیث کے مقام اور اطاعتِ رسول کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے، جس سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے اطاعت، احکامِ خداوندی کی ہے۔ نبی اکرمؐ خود بھی انہی احکام کی اطاعت کرتے تھے اور اُمّت سے بھی انہی کی اطاعت کراتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت الگ ہے اور رسول اللہ کی اطاعت الگ۔ اطاعتِ رسولؐ سے عہدہ برآ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جس بات کا حضورؐ نے حکم دیا، اسے بجالایا جائے گا۔ جس سے آپؐ نے منع فرمایا، اس سے رُکا جائے گا۔ رسول اللہ کے یہ اوامر و نواہی کتبِ احادیث میں ملیں گے۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ کہہ دیتے ہیں کہ دیکھئے! خود خدا نے فرمایا ہے، وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (۵۹/۷)

"جو کچھ تمہیں رسولؐ دے، اسے لو، جس سے منع کرے، اس سے رُک جاؤ"۔

ہم اس وقت "اطاعتِ رسولؐ" کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن تک میں دستبرد سے بھی نہیں چوکتے۔ قرآن کے جو الفاظ یہ حضرات پیش کرتے ہیں، وہ اس آیت کا حصہ ہیں جو (سورۃ) الحشر میں اس طرح آئی ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ
وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا
يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ

فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹/۷)

دشمن کا جو مال و اسباب، اس طرح جنگ کئے بغیر ہاتھ آجائے، اس کی نوعیت عام مالِ غنیمت سے مختلف ہوتی ہے (۸/۴۱)۔ یہ مال سب کا سب، نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ اس کو ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے صرف کیا جائے۔ مثلاً (جنگ میں شریک ہونے اور کام آجانے والوں کے) اقربا کے لئے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے، ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو یا جو کسی وجہ سے کام کاج کرنے کے قابل نہ رہ گئے ہوں، نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔ اسے اس طرح نہیں بانٹنا چاہیئے کہ یہ دولت مندوں کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے (اور محتاج اور غریب، اپنی ضروریاتِ زندگی تک سے بھی محروم رہ جائیں)۔ لہٰذا، اس کی تقسیم میں، جو کچھ تمہیں رسولؐ (مرکزِ نظامِ خداوندی) دے، اسے بطیبِ خاطر قبول کرو اور جس مال سے تمہیں روکے، اس سے برضا و رغبت رک جاؤ (۹/۵۹)۔ تم ہر حال میں، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ ان قوانین کی خلاف ورزی پر سخت مواخذہ ہوتا ہے۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ مالِ غنیمت (فَے) کی تقسیم کے سلسلہ میں جو کچھ رسولُ اللہ کسی کو دیں، اسے بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہیئے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ مجھے کم دیا گیا ہے اور فلاں کو زیادہ۔ یہی بات قرآن نے صدقات کی تقسیم کے متعلق بھی کہی ہے (۹/۵۹)۔ آپ غور کیجئے کہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ کس چیز کے لئے آیا ہے اور یہ حضرات اسے اپنے کس

اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ

مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں؟ سوچئے کہ ان کی کتنی بڑی جرأت ہے! ان سے کون کہے کہ اپنے مسلک کی تائید میں اور جتنی دلیلیں جی چاہے لے آیئے لیکن قرآن کو تو مسخ نہ کیجئے۔ اطاعتِ رسولؐ کے ضمن میں قرآن مجید میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ قرآن نے جو غنائم کے متعلق خاص طور پر کہا ہے کہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ

عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹/۷)، تو اس کی وجہ ظاہر ہے. جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عربوں کے ہاں یہ دستور چلا آتا تھا کہ مقتول دشمن کا مال و اسباب سپاہی کی ذاتی ملکیت ہو جاتا تھا. قرآن نے اس رواج اور دستور کی جگہ یہ قاعدہ مقرر کیا کہ مالِ غنیمت سب کا سب حکومت کی تحویل میں رہے گا اور وہیں سے تقسیم ہو گا. ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی اکثر سپاہیوں کے مفاد کے خلاف جاتی تھی). اس لئے جو کچھ انہیں ملتا تھا وہ اس سے خوش نہیں ہو سکتے تھے. ان پر اس تبدیلی کے بلند مقاصد واضح کرنے کے لئے ان سے کہا گیا کہ اس تقسیم کی رُو سے جو کچھ سربراہِ مملکت تمہیں دیدے، اُسے بطیبِ خاطر قبول کرو. جب اس نظام کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے تو تم خود پکار اٹھو گے کہ یہ تقسیم فی الواقع بہترین ہے.

آیت (۸/۴۱) میں جنگِ بدر کو یوم الفرقان کہہ کر پکارا گیا ہے. اس کے بعد اس جنگ کی مزید تفصیلات سامنے آتی ہیں. اس کا نقشہ یوں تھا کہ قریش کا قافلہ، مدینہ سے قریب نسبتاً پست راستے سے گزر رہا تھا. ان کا لشکر (مکہ سے) دور دراز راہیں طے کرتا ہوا آ رہا تھا. مجاہدین مدینہ سے باہر نکل کر بدر کے میدان میں پہنچ رہے تھے.

۸/۴۲ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَىَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ

اُس دن (جنگِ بدر کے موقع پر) تم اِدھر قریب کے ناکے پر تھے اور دشمن اُدھر دُور کے ناکے پر اور قافلہ نچلی طرف سے گزر رہا تھا. اگر تم نے آپس میں ہی فیصلہ کرنا ہوتا کہ جنگ کی جا بانہ اور کی جائے تو کب اور کہاں کی جائے تو تمہارا اس باب میں ضرور اختلاف ہو جاتا.

(اس لئے کہ تم میں کچھ لوگ دشمن کی کثرت سے خائف تھے اور کچھ قافلہ لوٹنا چاہتے تھے)۔ لیکن قانونِ خداوندی کا تقاضا یہ تھا کہ فریقِ مخالف سے تمہارا ٹکراؤ ہو جائے۔ تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے' وہ بھی کھلی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے' وہ بھی کھلی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے (یعنی جسے زندہ رہنا ہے' وہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچائے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور جسے مرنا ہے' وہ دنیا کو دکھا دے کہ اُس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ دونوں شکلیں ٹکراؤ سے سامنے آسکتی ہیں اور یہی قانونِ ارتقاء ہے)۔

سابقہ صفحات (زیرِ آیات ۷-۵/۸) میں بتایا جا چکا ہے کہ جنگ کے اس تناظر میں مجاہدین کے دلوں میں کس طرح متضاد خیالات رونما ہو رہے تھے۔ اگر فیصلہ انہی پر چھوڑا جاتا تو ان حالات میں ممکن تھا ان میں باہمی اختلاف ہو جاتا۔ کوئی جنگ کرنے کے حق میں ہوتا' کوئی قریش سے صلح کرنے کے حق میں اور کوئی قافلہ لوٹنے کو ترجیح دیتا۔ لیکن خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کے مطابق بہتر یہی تھا کہ حق و باطل کا

جنگ کا مقصد

فیصلہ میدانِ جنگ میں ہو جاتے۔ جنگ کے مقاصد کے متعلق پہلے بات کی جا چکی ہے۔ آیت (۸/۸) میں اس کا مقصد بتایا تھا: لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ یعنی اس سے حق کا اثبات اور باطل کا ابطال ہو جائے۔ سورۃ توبہ (۹/۴۰) میں کہا ہے: وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ ـــــ تاکہ اس طرح باطل کے نظریات اور مسالک پست ہو جائیں اور نظامِ خداوندی غالب آجائے۔ یہاں کہا: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ ـــــ تاکہ جسے زندہ رہنا ہے' وہ بھی دلیل و بُرہان کی رُو سے زندہ رہے۔ جسے ختم ہونا ہے' وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ختم ہو۔ اس آیت میں قوموں کے عروج و زوال اور فنا و بقا کا عظیم اصول بیان کیا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہاں نہ کوئی قوم خدا کی چہیتی اولاد ہے کہ وہ' جو جی میں آئے کرتی رہے' زندگی کی کامرانیاں اور کامیابیاں اس کے ہمرکاب رہیں گی۔ نہ ہی کوئی قوم سوتیلی اولاد ہے کہ وہ کتنی ہی صلاحیتوں کی مالک ہو' وہ راندۂ درگاہ رہے گی نہیں۔ یہاں اصول یہ کارفرما ہے کہ جو قوم بدلائل و براہین ثابت کر دے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ـــ اور استعداد ہے' وہ زندہ رہے گی۔ جو ایسا ثابت نہ کر سکے' وہ ختم ہو جائے گی کشمکش حق و باطل کا مقصد

یہی ہے اور اسی کشمکش کا آخری مرحلہ میدانِ جنگ ہوتا ہے جہاں یہ صلاحیتیں نکھر اور اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں (انڈکس میں دیکھئے "قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین").

انسان کی نفسیاتی تبدیلی کس طرح خارجی احوال و کوائف میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ اگر تم نے استقامت سے کام لیا، تو اوّل تو اپنے سے دس گنا فریق مقابل پر غالب آجاؤ گے (۸/۶۵) اور اگر تم ساز و یراق میں کم ہوئے تو اپنے سے دگنوں پر ضرور کامیابی حاصل کر لو گے (۸/۶۶)۔ خدا کی طرف سے اس یقین دہانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کی تعداد سچ مچ ان کی نگاہوں میں کم دکھائی دینے لگی۔

(۸/۴۳-۴۴) اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

جب اللہ نے تیری نگاہ میں دشمنوں کی تعداد کو تھوڑا کر دکھایا تھا ــــــ یعنی تم جان گئے تھے کہ ان کی کثرت ان کے کسی کام نہ آسکے گی اور یہی آخرالامر ہوا بھی ــــــ اگر وہ تمہاری نظروں میں بہت زیادہ دکھائی دیتے تو تم ہمت ہار دیتے اور جنگ کے معاملہ میں باہم جھگڑنے لگ جاتے۔ لیکن اللہ نے تمہیں اس صورتِ حال سے بچا لیا۔ اس لئے کہ اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں کیا کیا خیالات گزر رہے ہیں (۴۳)۔

جب تم ایک دوسرے کے سامنے آئے تو دشمن کو تمہاری نظروں میں کم کر کے دکھایا گیا (یعنی تم سے صرف دو چند حالانکہ وہ درحقیقت تم سے سہ چند سے بھی زیادہ تھے[۲/۱])۔

اس لئے کہ تم خلوص اور استقامت کے ساتھ میدان میں آئے تھے اس کی وجہ سے دشمن کی کثرت تمہیں مرعوب نہیں کر رہی تھی (۳/۱۷۲)۔ ان کی نگاہوں میں تمہیں اور بھی تھوڑا کر کے دکھایا (کیونکہ وہ قوت کے نشے میں بدمست تھے اور تمہیں کسی خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے)۔ یہ اس لئے کہ خدا اس معاملہ کا فیصلہ کر دے جو واقع ہو کر رہنے والا تھا۔ اور (یاد رکھو) تمام امور، قوانینِ خداوندی کے گرد گردش کرتے اور انہی کی رُو سے تمام معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ (تم نے اس سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی حوادث میں کس طرح تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو نفسیاتی تبدیلی کہا جاتا ہے ۸/۵۳)۔

سابقہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ جماعتِ مومنین نے استقامت سے کام لیا تو انہیں ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی (۸/۹-۱۰؛ ۴۱/۳۰؛ ۴۶/۱۳) اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں اطمینانِ قلب میسر آجائے گا۔ اسے (عصرِ حاضر کی اصطلاح میں) نفسیاتی تبدیلی کہا جاتا ہے جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آیت (۸/۵۳) میں آئے گا۔ اس نفسیاتی تبدیلی کا اثر یہ تھا کہ مجاہدین کی نگاہوں میں دشمن جچتے ہی نہیں تھے۔ وہ انہیں ان کی تعداد سے بہت کم نظر آتے تھے۔ دوسری طرف مخالفین نشۂ قوت میں بدمست تھے جس سے ان میں ایسا احساسِ برتری Superiority Complex پیدا ہو گیا تھا کہ وہ لوگ مجاہدین کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ غور کیجئے، دونوں کی نگاہوں میں فریقِ مقابل اصل سے کم نظر آتا تھا لیکن مجاہدین کے زاویۂ نگاہ کی یہ تبدیلی اطمینانِ قلب کا نتیجہ تھی اور مخالفین کی نگاہ کی تبدیلی قوت کے نشہ کی پیدا کردہ۔ اس فرق کا نتیجہ جلد ہی سامنے آگیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نفسیاتی تبدیلی کے اثرات اور نتائج کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کا جذبۂ محرکہ کیا ہے۔ علم النفس کے ماہرین کے لئے اس نکتہ میں بھی غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔ اس فرق کی طرف آئندہ آیات میں بھی توجہ دلائی گئی ہے۔

(۸/۴۶-۴۵) يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ

رَبِّحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ۚ

(اب سنو کہ کثیر لشکر کم کس طرح ہوا کرتا ہے اور چھوٹی جماعت بڑی پر غالب کیسے آیا کرتی ہے) اس سلسلہ میں یاد رکھو کہ جب بھی تمہارا مقابلہ کسی جماعت سے ہو، تم ثابت قدم رہو اور قوانینِ خداوندی کو شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو (اور اپنا ہر قدم ان کی روشنی میں اٹھاؤ)۔ یہ کرو گے تو تمہیں یقیناً کامیابی ہوگی (۴۵)۔

اور "اللہ اور رسولؐ" ــــ یعنی اپنے نظام ــــ کی پوری پوری اطاعت کرو۔ یہ نہ ہو کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگ جاؤ اور انفرادی مفاد کی خاطر باہمی تکرار شروع کر دو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے تم ہمیشہ ثابت قدم رہو۔ یاد رکھو! قوانینِ خداوندی کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں (۴۶)۔

زندگی کے ہر معرکہ میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ مصائب اور مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرنا۔ سربراہان کی اطاعت کرنا۔ آپس میں جھگڑنا نہیں۔ ایک تبدیلی اس طرح واقع ہوگی۔ اس سے نصرتِ خداوندی تمہارے شاملِ حال رہے گی، یعنی کامرانی و فتحمندی۔ ــــ اس کے برعکس:

(۴۷/۸) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

اور دیکھنا! تم کہیں اُن لوگوں (اپنے مخالفین) کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے (جنگ کے لئے) نکلے تو عجیب انداز سے اتراتے ہوئے، اور لوگوں کے دکھاوے کی خاطر نکلے۔ یہ تو ان کے اوچھے پن کی کیفیت تھی اور مقصد یہ کہ لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف آنے سے روکیں جو نوعِ انسان کی سلامتی اور بہبود کی راہ ہے۔ لیکن خدا کا قانون

انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا. وہ ان کے تمام اعمال کو محیط تھا.

آپ نے دیکھا کہ دونوں فریقوں کے اندازِ نگاہ اور مقاصد میں کیا فرق تھا. ایک فریق (مجاہدین) ایک بلند مقصد کے حصول کی خاطر باہر نکلا. اس میں اُن کے پیشِ نظر نہ ستائش کی تمنا تھی، نہ صلہ کی امید. بلند اقدارِ خداوندی کا حصول اُن کی تمنا تھی اور اس ہی کامیابی اُن کا صلہ. دوسرے فریق کے سامنے کوئی بلند مقصد نہیں تھا. لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کے لئے اپنی قوت کی نمود ان کا جذبہ محرکہ تھا. اُس قسم کے بلند مقصد اور اُس سے پیدا شُدہ جرأت و ثبات کے مقابلہ میں اس قسم کے پست مقاصد اور ان کے حصول کے لئے سعی و کاوش کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ ایمان کی قوت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا.

ے
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

قرنِ اول کے مسلمانوں (جماعتِ مومنین) نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے تھے ان کی بنیادی وجہ اُن کے ایمان کی محکم قوت تھی. ے

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

۸/۴۸ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِىٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۗ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۟

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ان کے ایک شریر سرغنے نے (جو انہیں جنگ کے لئے اکسا تا تھا)، ان کے پروگرام کو اُن کی نگاہوں میں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا اور ان کے کان میں یہ افسوں

پھونک دیا کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا. لیکن جب اس نے دیکھا کہ دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آگئے ہیں تو پچھلے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا اور صاف کہہ دیا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں. میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے (مجھے نظر آتا ہے کہ تمہیں کس بُری طرح شکست ہونے والی ہے). مجھے خدا (کی اس جماعت) سے بہت ڈر لگتا ہے. میں جانتا ہوں کہ ان کے ہاتھوں تمہیں کس قدر سخت سزا ملنے والی ہے.

جس قوم کی منافقت کی یہ حالت ہو تو اس کے سرغنے بھی ایسے ہوتے ہیں. پہلے انہیں ٹکراؤ کے لئے اکسائیں اور پھر وقت پر دغا دے جائیں. ہماری (صدرِ اوّل کے بعد کی) تاریخ اس قسم کے منافقوں اور فریب کاروں سے اَٹی پڑی ہے. منافقین کو حقیقت اپنے اصلی رنگ میں نظر ہی نہیں آیا کرتی ـــــ

(۸/۴۹) اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

اور جب منافقین ـــــ یعنی وہ لوگ جن کی نیت میں خرابی تھی ـــــ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکا دے رکھا ہے (جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قلیل التعداد ہونے کے باوجود غالب آئیں گے کیونکہ ہم حق پر ہیں. انہیں اس کا علم نہیں کہ یہ دھوکا نہیں بلکہ حقیقت ہے جو ان لوگوں کو صاف نظر آجاتی ہے) جو قانونِ خداوندی کے محکم اور استوار ہونے پر کامل اعتماد رکھتے ہیں ـــــ وہ قانون جو یہ بھی جانتا ہے کہ غالب کیسے آیا جاتا ہے اور یہ بھی کہ محکم تدبیریں کس طرح کی جاتی ہیں.

قرآنِ کریم نے منافقت کو "دل کا روگ" کہہ کر پکارا ہے. اسی کو عصرِ حاضر میں نفسیاتی مرض کہا جاتا ہے. غور فرمایئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ایسی عمیق اور نازک حقیقت کا انکشاف قرآن ہی کا حصہ ہو سکتا تھا! ایسے مریضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے قوانینِ خداوندی کی صداقت پر کامل یقین اور اعتماد کی ضرورت

نفسیاتی امراض کے علاج کی شرط

ہوتی ہے۔ اس میں پھر نفسیاتی امراض کے علاج کے سلسلہ میں ایک بنیادی نکتہ سامنے لایا گیا ہے نفسیاتی امراض کے علاج کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ مریض کو معالج پر پورا پورا اعتماد ہو۔ ایسا نہ ہو تو بڑے سے بڑا نفسیاتی معالج مریض کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم نے جماعت مومنین سے کہا کہ تم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہو، یا جو تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اسے محکم اور پائدار رکھنا چاہتے ہو، تو اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تمہیں قوانینِ خداوندی کی صداقت اور حقیقت پر پورا پورا اعتماد ہو۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ـــــ اللہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی اس کے معنی یہ ہیں کہ صحیح نہجِ زندگی اور اس میں کامرانیوں اور کامیابیوں کے لئے قوت کی بے شک ضرورت ہوگی، لیکن قوت کے ساتھ حکمت Wisdom بھی ناگزیر ہے (حکمت اور قوت کے امتزاج کے لئے انڈکس میں عنوانات ـــــ "قوانین اور قوت" یا "قوت اور علم" دیکھئے)۔ یہ قرآنی نظامِ زندگی کی منفرد خصوصیت ہے جس میں قوت اور حکمت کا امتزاج ہے۔ خالی حکمت فلسفہ ہے جس سے زندگی کے عملی مسائل حل نہیں ہوسکتے اور خالی قوت چنگیزیت ہے۔

اس سیلِ سُبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

(ضربِ کلیم)

اسلامی نظام کو عزیز (صاحبِ قوت) بھی ہونا چاہیئے اور حکیم (صاحبِ عقل و دانش) بھی۔

منافقین اپنی ابلہ فریبیوں اور مکارانہ سازشوں کی عارضی کامیابی پر کتنے ہی شاداں و فرحاں ہوں اُن کا انجام بڑا دردناک اور عبرت آموز ہوتا ہے۔

(۸/۵۰) وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○

(یہ لوگ اس وقت تو یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کررہے ہیں لیکن اے مخاطب!) اگر تو

کہیں ان کی اس حالت کو دیکھ سکے جب (میدانِ جنگ میں) ملائکہ ان کی روح قبض کر رہے ہوں گے اور انہیں آگے اور پیچھے سے 'تو بڑ تو' مار پڑ رہی ہوگی اور وہ ان سے کہتے ہوں گے کہ اب تم اُس سوزناک عذاب کا مزہ چکھو (جس کی تم ہنسی اڑایا کرتے تھے (۶/۹۴).

اور یہ عذاب خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۸/۵۱ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو تم کر چکے ہو. خدا اپنے بندوں پر زیادتی نہیں کیا کرتا.

جیسا کہ ہم شروع سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں' قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کے اصول اور قوانین پیش کرتا ہے اور ان کی تائید اور شہادت میں اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف اور ان کا انجام و مآل بیان کرتا ہے. اس مقام پر بھی اُس نے' قریش کو یہ بتانے کے بعد' کہ ان کی غلط روشِ زندگی کا انجام تباہی ہوگا' ان کی توجہ قومِ فرعون کے انجام کی طرف مبذول کرائی ہے. فرمایا:

۸/۵۲ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(یہ معاملہ جو اب سامنے آ رہا ہے' ایسا ہی ہے) جیسا اس سے پہلے' قومِ فرعون کے ساتھ ہو گزرا ہے. نیز اُن اقوام کے ساتھ جو اس سے پہلے گزر چکی تھیں. انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی' تو اُس کے قانونِ مکافات نے اُنہیں اُن کے جرائم کی پاداش میں پکڑ لیا. بے شک خدا کا قانونِ مکافات بڑی قوت والا اور

مؤاخذہ کرنے میں بڑا ہی سخت ہے (۸/۵۲)۔

اور اس کے بعد نفسیاتی تغیّر کا وہ عظیم اصول بیان فرمایا ہے جس کی بنیادوں پر افراد اور اقوام کی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

۸/۵۳ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ خدا کا یہ محکم قانون ہے کہ وہ، زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو عطا کرتا ہے، اُن میں اُس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم، خود اپنے اندر، ایسی نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کر لیتی جس سے وہ ان خوشگواریوں کی اہل نہ رہے۔ جو قوم اپنی ذہنیت کو تخریب کی طرف نہ لے جائے اور اپنے معاشرہ کو، قوانینِ خداوندی کی روشنی میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ منطبق کرتی جائے، اور جہاں کوئی ذرا سی خرابی نظر آئے اس کی ساتھ ساتھ اصلاح کرلے، تو اس قوم کا عروج، مبدّل بہ زوال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ قوموں کا عروج و زوال یونہی اندھا دھند واقع نہیں ہو جاتا۔ یہ اُس خدا کے محکم اصولوں کے مطابق واقع ہوتا ہے جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے (۱۳/۱۱)۔

نفسیاتی تغیّر کے بغیر خارجی انقلاب ممکن نہیں

سورۃ الرّعد میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳/۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی نفسیات کو

نہ بدلے۔ (چنانچہ) جس طرح یہ ایک محکم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں، وہ اس سے نہیں چھنتیں جب تک وہ ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے (۸/۵۳)۔ یہ بھی ایک غیر متبدل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر، اس کے اعمال کے نتیجے میں تباہی آتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے (۱۳/۱۱)۔

قرآن کریم نے ان آیات میں ایک ایسا بنیادی اصول بیان فرمایا ہے جس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کا دارومدار ہے۔ جس قسم کا زاویۂ نگاہ، اُسی قسم کی زندگی۔ ہمارے ہاں کے شعراء کے ہاں (اور ہمارے ہاں کے شعراء ہی کیوں؟ دنیا بھر کے شعراء کے ہاں) یہ موضوع بڑا مقبول اور محبوب چلا آ رہا ہے۔ وہ اسے نفس کے بجائے دل کہہ کر پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

ایک اور شاعر نے کہا ہے

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی　　فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

بیدلؔ اس حقیقت کو اپنے انداز میں بیان کرتا ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ　　تو غنچہ کم ندمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

اختر شیرانیؔ کا انداز اپنا، اور بڑا پُرکیف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو　　کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

ان تعبیرات کا تعلق جذبات سے ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کے پیشِ نظر اقدار Values کا تغیر ہے۔ اقبالؒ اسے تعمیرِ خودی سے تعبیر کرتا ہے جس کے احاطہ میں جذبات اور اقدار دونوں آجاتے ہیں۔ اس کا سارا فلسفہ اس نکتہ کے گرد گردش کرتا ہے۔ وہ اشیائے کائنات کی قدر و قیمت کا پیمانہ خود انسان کو قرار دیتا ہے۔ وہ (اسے) کہتا ہے:

قدرِ خویش　　تو قدرِ خویش نہ دانی بہا ز تو گیرد
دگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

اس لئے وہ سارا زور تعمیرِ خویش پر دیتا ہے:

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس سے بھی زیادہ واشگاف الفاظ ہیں:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مُسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

(ارمغانِ حجاز)

قرآن "خودی کے مُسلمان ہونے" کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے. ایمان چار لفظوں کے دُہرا دینے کا نام نہیں. یہ دل کی تبدیلی کا نام ہے. دیکھئے! سورۂ حجرات میں قرآن نے اسے کس قدر بلیغ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے. فرمایا: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ یہ بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں. قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا ان سے کہہ دو کہ تم ابھی صاحبِ ایمان نہیں ہوئے. اس لئے تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں. وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا انہیں سرِدست یہی کہنا چاہیئے کہ ہم نے اس نظام کی اطاعت قبول کر لی ہے. وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) "ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا." جب یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، تو اقدار بدل جاتی ہیں. اِسی کا نام تغیّرِ نفس ہے. جب ہم کہتے ہیں کہ صدرِ اوّل کی جماعتِ مؤمنین نے جو عالمگیر انقلاب برپا کر دیا تھا، وہ ان کے ایمان کی بدولت تھا، تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اُن کی نگاہ کا زاویہ بدل جانے سے اشیائے کائنات کی قدر و قیمت بدل گئی تھی. اس کی ایک مثال وہی ہے جسے ہم نے اس سورۃ کے شروع میں تقسیم مالِ غنیمت کے اُس وقت کے مروجہ قاعدہ میں اصلاح کے سلسلہ میں بیان کیا ہے. اسے (اس نکتہ کی اہمیت کے پیشِ نظر) پھر دہرا دیا جائے کہ عربوں کی معیشت اور معاشرت کا بڑی حد تک دار و مدار مالِ غنیمت اور جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لینے پر تھا. مالِ غنیمت پر ان کی اقتصادیات کا انحصار تھا اور معاشرہ میں تمام کام کاج غلام کرتے اور لونڈیاں ان کی بے محابا جنسی خواہش کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتیں. یہی مفاد اور جاذبیتیں ان کے لئے جنگ کے محرکات بنتے. قرآن نے بیک جنبشِ قلم جنگ کی ان دونوں جاذبیتوں (یا محرکات) کو ختم

کر دیا۔ مالِ غنیمت کے متعلق کہہ دیا کہ یہ مملکت کی تحویل میں رہے گا۔ اور جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہہ دیا کہ انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا۔ رہا کیا جائے گا (۴۷/۴)۔ جنگ کے ان محرکات کے ختم ہو جانے سے جنگ کے لئے ان کے جوش اور ولولے کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد انہوں نے میدانِ کارزار میں ایسی جرأت و بسالت اور بے جگری اور استقامت کا مظاہرہ کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ کس طرح ہوا تھا؟ ان کی نگاہ کا زاویہ بدل جانے سے۔ انہیں جنگ کا محرکہ جذبہ اعلائے کلمۃ الحق بتایا گیا اور ان کی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت اتنی بلند ہو گئی کہ مالِ غنیمت اور غلام اور لونڈیوں کی کشش اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آنے لگی۔ ایمان کی رُو سے اسی قسم کی (قدر و قیمت کی) تبدیلی، دنیا کی ہر شے میں پیدا ہو گئی اور اسی تبدیلی (تغیرِ نفس) سے خارج میں وہ تبدیلی نمودار ہو گئی جس کے تصور سے ہم ہی نہیں، ساری دنیا محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ ان میں یہ تغیرِ نفس کس طرح پیدا ہو گیا تھا؟

قرآنِ کریم میں حضور نبی اکرمؐ کا فریضۂ رسالت یہ بھی بتایا گیا ہے: وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲)۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس ــــ تزکیۂ نفس کے معنی آپ تطہیرِ ذات کر لیجئے یا انسانی ذات کی نشو و نما، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی حضورؐ کا فریضۂ رسالت یہ تھا کہ افرادِ امت کو قرآن کے احکام و ضوابط اور اُن کی غرض و غایت کی اس طرح تعلیم دیں کہ ان کی اہمیت ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور اس طرح اشیائے کائنات کی اقدار کے پیمانے بدل جائیں۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں حضورؐ نے، نومسلموں کی زندگی میں اسی قسم کا تغیرِ اقدار پیدا کر دیا۔ یہ حضرات جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، نہ تو باہر سے آئے تھے، نہ ہی (موجود) افراد کے بعد آنے والی نسل تھی۔ یہ وہی عرب تھے جن کی قبل از اسلام (زمانۂ جاہلیہ) کی زندگی کے متعلق دنیا بھر کے مؤرخین متفق ہیں کہ وہ ہر قسم کے جرائم اور معائب سے معمور تھی۔ ان عربوں میں ایسی تبدیلی پیدا کر دینا کہ ان کی پاکیزہ سیرت اور تابندہ کارناموں پر خدا اور اس کے ملائکہ تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کریں (۴۳/۳۳)، اسی تغیرِ نفس کا نتیجہ تھا۔ بدر و اُحد کے میدانوں میں مجاہدین بھی اسی طرح سر بکف نکلے تھے جس طرح کفار (قریش)۔ لیکن قرآن نے فریقِ اوّل کی جنگ کو فی سبیل اللہ کہا ہے اور فریقِ مقابل کی جنگ کو فی سبیل الطاغوت (۴/۷۶)۔ یہ فرق مقاصد و اقدار ہی کا تھا جسے تغیرِ نفس (نگاہ کی تبدیلی) نے پیدا کر دیا تھا۔[1]

[1] اس کی تشریح میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں ملے گی۔

نگاہ کی تبدیلی کی اہمیت کا احساس اُن قوموں میں بھی ہے جن کا انداز زیست سیکولر ہے. وہ اپنے نوجوانوں کو وطن پرستی Patriotism کی تعلیم دیتی ہیں اور اس جذبہ کو ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہیں کہ "My Country right or wrong". اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی قوم کے افراد، قومی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں اور وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں. قرآن بھی امتِ مسلمہ کو "مفاد طلبی" کی تعلیم دیتا ہے، لیکن وہ انفرادی مفاد کے مقابلہ میں اپنے وطن اور اپنی قوم کے مفاد کو ترجیح دینے کے بجائے عالمگیر انسانیت کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے. اس کی تعلیم

اسلام کی خصوصیت

یہ ہے کہ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط (۱۳/۱۷) — دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کیا جائے — وطنیت کا نتیجہ اپنی قوم کے سوا، دنیا کی تمام اقوام سے نفرت اور عداوت ہوتا ہے. موجودہ عالمگیر جہنم اسی جذبہ کا پیدا کردہ ہے. عالمگیر انسانیت کے مفاد کا جذبہ اس زمین کو فردوسِ بریں میں تبدیل کر دیتا ہے. علاوہ ازیں سیکولرازم میں قومی جدوجہد کے نتیجہ میں، مادی سامان و وسائل حاصل ہوتے ہیں. قرآنی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے سے مادی اسباب براق کے حصول کے ساتھ ساتھ، انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے. قرآن اسے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱) کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے. علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کو مسولینی کے حوالے سے بڑے لطیف انداز میں سمجھایا تھا. مسولینی کا نظریہ یہ تھا کہ "جس کے پاس فولاد ہے اُس کے پاس روٹی ہے." "He who has steel, has bread". علامہ اقبالؒ نے اس میں یہ تبدیلی کی تھی کہ " جو خود فولاد ہے، اس کے پاس سب کچھ ہے[1]." "He who is steel, has every thing"

(خطبۂ صدارت، مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء)

---

[1] میں نے اپنے ایک مقالہ میں ذرا سی ترمیم کی جرأت کی تھی اور کہا تھا کہ He who is steel, is everything اس کے بعد میرے سامنے مشہور ماہر نفسیات ERIC EROMM کی کتاب آئی جس کا ٹائیٹل تھا To Hare or to be اس نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے. قرآن کی بارگاہ سے یہ دونوں نعمتیں مل جاتی ہیں. اگر فرصت اور توفیق مل گئی تو میں اس موضوع پر ایک جامع تصنیف مرتب کرنا چاہتا ہوں.

سیکولرازم میں صرف روٹی ملتی ہے۔ قرآنی نظام میں سب کچھ ملتا ہے! اور مذہب میں نہ وہ ملتا ہے نہ یہ۔ اس میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس میں انفرادی نجات مقصود ہوتی ہے۔ اس عقیدہ سے محض ذاتی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جسے خود فریبی سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہے۔ جہاں تک محسوس و مرئی نتائج کا تعلق ہے — مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید — کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

(ضمناً) پاکستان میں ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں درحقیقت سیکولرازم رائج ہے لیکن ہم کھلے بندوں اس کا نام لینے سے جھجکتے اور جھینپتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم قوم میں سیکولرازم کا سا تغیرِ نفس بھی پیدا نہیں کرتے۔ نہ ہی ہمارے ہاں دین (قرآنی نظام) ہے۔ اسی لئے ہم قرآنی اقدار کے لئے تغیرِ نفس پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ یہاں تغیرِ نفس کے بغیر تعبیرِ احوال کی کوشش کی جا رہی ہے اور (بدقسمتی سے) اسے "احیاءِ اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال کی کوشش کرنا اور سمجھنا کہ اس میں ہمیں کامیابی ہو جائے گی، درحقیقت خدا کو چیلنج دینے کے مترادف ہے۔ خدا کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۵۳) تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال، تم تو ایک طرف، خدا بھی نہیں کرتا۔ اور ہم اُس سے (زبانِ حال سے) کہہ رہے ہیں کہ "تم دیکھ لینا ہم تغیرِ نفس کے بغیر ہی تغیرِ احوال کر کے دکھا دیں گے" (معاذ اللہ)۔ ایسا سمجھنے والوں کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے: فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۸/۱۰۵) "ان کا کیا کرایا سب رائگاں جائے گا"۔ اس کا نقصان اتنا ہی نہیں ہوگا کہ ہماری تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ ہم دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ اس طرح اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ جب ہماری کوششیں ناکام رہ جائیں گی تو دنیا اسلام کے متعلق یہ رائے قائم کرے گی (اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہوگی) کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ ہونے کی سکت اور صلاحیت ہی نہیں۔

اسلام کے اس (مزعومہ) احیاءِ نو کے لئے ہم کر یہ رہے ہیں کہ فقہ کے صدیوں کے فرسودہ (اور ناقابلِ عمل) قوانین میں قدرے ترمیم کر کے انہیں اسلامی قوانین کے نام سے نافذ کرتے ہیں — اور ستم ظریفی یہ کہ انہیں نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ یہ ناممکن العمل ہیں[1]۔ ہم اتنا نہیں سمجھتے کہ

---

[1] یہ سطور اپریل ۱۹۸۳ء میں لکھی گئی تھیں۔

جب تک قوانین کا احترام دل میں نہ ہو' ان پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ قوانین کے احترام کا (قرآنی) طریق یہ ہے کہ پہلے قانون کی پوری پوری وضاحت کی جائے۔ پھر سمجھایا جائے کہ اس کی غرض وغایت' علت و حکمت' مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ وہ کس طرح ہمارے لئے مفید ہے۔ اس سے کیا کیا فوائد مرتب ہوں گے۔ اس سے ہماری دنیا اور عاقبت کس طرح سنورے گی۔ اس سے تغیرِ نفس پیدا ہوگا اور قانون کا احترام اعماقِ قلب سے اُبھرے گا۔ تغیرِ نفس کے بغیر قانون سازی یا نفاذِ قانون کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ ادھر قانون مرتب کرنے کی کوشش ہو رہی ہوتی ہے اور اُدھر قوانین شکن عناصر یا افراد' اس قانون سے گریز' اغماض یا فرار کی راہیں تراش رہے ہوتے ہیں۔

جرائم کس طرح مٹ سکتے ہیں

قانون کس طرح اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے' اس کے لئے قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ "اے رسولؐ! تیرا رب اس حقیقت پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک اپنے متنازعہ امور میں تجھے حکم نہ بنائیں اور فیصلہ کے لئے تیری طرف رجوع نہ کریں"۔ یہاں تک قانون کی رُو سے کیا اور کرایا جا سکتا ہے۔ اس کے آگے ہے: ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)" پھر جو فیصلہ تو دے' اس کے خلاف اپنے دل میں (اپنے نفس میں) بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں اور یوں قانون کی اطاعت کریں"۔ قانون کے مطابق فیصلہ سے دل میں گرانی محسوس نہ کرنا' تغیرِ نفس کے بغیر ناممکن ہے اور قانون کے نتیجہ خیز ہونے کا یہی طریق ہے۔ یہ جو دنیا میں (بالعموم) اور ہمارے ہاں بالخصوص اچھے اچھے قوانین کی موجودگی میں جرائم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دلوں میں قوانین کا احترام نہیں پیدا ہوا' اور یہ احترام تغیرِ نفس کے بغیر ناممکن ہے۔

اور تغیرِ نفس صحیح تعلیم و تربیت اور اربابِ اثر و اقتدار کی سیرت و کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے چائے کے لئے پانی کی پتیلی چولہے پر رکھیں لیکن نیچے آگ نہ جلائیں۔

یہ ہے اس عظیم اصول کی اہمیت جسے قرآن نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور جس کے تعویذ بنا کر ہم' نفسیاتی امراض کے مریضوں کے گلے میں ڈال دیتے ہیں ــــ بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا؟

آیت (۸/۵۳) سے پہلے بھی ان اقوام کا ذکر تھا جنہوں نے تغیرِ نفس پر مبنی نظامِ حکومت کے بجائے قوت اور استبداد کی رُو سے اپنا تسلّط قائم رکھا تھا۔ ان میں سرِفہرست فرعونی نظام آتا ہے جو شخصی حکومت کے جَور وظلم میں ضرب المثل ہے۔ اور اس آیت کے بعد پھر اسی شخصی نظام کا ذکر آتا ہے تاکہ اس تقابل سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ بہترین نظام وہ ہے جو اقدارِ خداوندی کی رُو سے تغیرِ نفس پر مبنی ہو اور بدترین نظام شخصی حکومتوں کا ہے۔

(۸/۵۴) كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوا ظَالِمِينَ ۝

یہی وہ قانون تھا جس کے مطابق (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قومِ فرعون اور ان کی پیشرو اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے قوانین کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں، اُن کے جرائم کی پاداش میں پکڑ لیا اور قومِ فرعون کو غرق کردیا۔ یہ تمام اقوام، جو اس طرح تباہ ہوئیں، وہی تھیں جنہوں نے ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی تھی۔

اَهْلَكْنٰهُمْ (انہیں ہم نے ہلاک کردیا) کے ساتھ بِذُنُوبِهِمْ اور ــــــ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ کا اضافہ کرکے یہ واضح کردیا کہ ان کی ہلاکت ان کے ــــــ اپنے جرائم کا نتیجہ تھی۔ چونکہ وہ واقع ہوئی تھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کے متعلق کہا:

(۸/۵۵) إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

یاد رکھو! معیارِ خداوندی کے مطابق، بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی سے

سرکشی برتتے ہیں اور لاکھ سمجھائیے وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے (۸/۲۲ ؛ ۷/۱۷۹)
اگر اُن دیگر مقامات کو بھی ساتھ ملا لیا جائے جہاں انعام وآب کا ذکر آیا ہے (۲/۱۸ ؛ ۷/۱۷۹ ؛ ۸/۲۲ ؛
۱۶/۷۶) تو واضح ہو جائے گا کہ اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں کو بدترین خلائق کیوں کہا گیا ہے۔
اس پائندہ اصول (کہ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال ناممکن ہے) اور اس کی تائید میں اقوامِ سابقہ
کی تاریخی شہادت کے بعد، پھر اُن مخالفین کا ذکر کیا جو حضورؐ کے مقابلہ کے لئے میدانِ جنگ تک میں
اُتر آئے تھے۔ فرمایا کہ:

۸
۵۶-۵۷ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ
فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ
فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ۝

(اسی قسم کی یہ قوم ہے جو اب تمہارے مدِّمقابل ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب تو ان سے
کوئی معاہدہ کرتا ہے، تو یہ ہر بار اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے ہیں اور عہد شکنی کے نتائج
سے بالکل نہیں ڈرتے (۵۶)۔

سو اگر یہ لوگ میدانِ جنگ میں تمہارے سامنے آئیں تو انہیں ایسی سخت سزا دو
کہ یہ خود بھی متوحّش ہو کر بھاگ کھڑے ہوں اور جو لوگ، اسی مقصد کے لئے ان کے
پیچھے آ رہے ہیں، انہیں دیکھ کر وہ بھی بھاگ اٹھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ لوگ عبرت
پکڑیں اور آئندہ کے لئے یاد رکھیں کہ عہد شکنی کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

جو لوگ عہد و پیمان کے کبھی پابند نہ ہوں، ضروری ہے کہ ان کی قوت توڑی جائے۔ ان کی عہد شکنی اور
پیمان فراموشی کا تو یہ عالم تھا۔ ان کے برعکس جماعتِ مومنین کو اُس آئین کا پابند کیا گیا تھا جس کی رُو
سے عہد و پیمان کی اہمیت اس قدر تھی کہ

۸
۵۸-۵۹ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ

عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۝ وَ لَا
یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ ۝

معاہدات کی پابندی

(عہد کی پابندی اتنی اہم ہے کہ) اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا اندیشہ ہو، تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر یونہی معاہدہ نہ توڑو، بلکہ انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو اور اس طرح دونوں ایک سطح پر آجاؤ۔ اور اس طرح قبل از وقت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اس کی تلافی کر کے اُن سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے بدعہدی کو کبھی پسند نہیں کیا جا سکتا (۸/۵۸)۔

جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کر کے بدعہدیوں پر اُتر آتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ خدا کے قانونِ مکافات کی دست بُرد سے آگے نکل جائیں گے۔ وہ اسے کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ وہ اسے بے بس نہیں کر سکتے (۵۹)۔

آپ دنیا بھر کے قوانینِ جنگ کا مطالعہ کیجئے۔ جس بلند اصول کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کی مثال آپ کو شاید ہی کہیں مل سکے۔ یہ معاملہ ان لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے جن کے متعلق ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ وہ عہد و پیمان کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتے۔

اس کے ساتھ ہی جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ تم اپنی حفاظتی تدابیر کی طرف سے غافل نہ ہو جانا۔ اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرنا۔

(۸/۶۰) وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ
الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِیْنَ
مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا
تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَ

اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ○

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤ اور سمجھ لو کہ مخالفین کو یونہی شکست ہو جائے گی۔ انہیں شکست تمہارے ہاتھوں ہی سے ملے گی۔ اس لئے تم دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ امکان بھر سامانِ حفاظت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو۔ (کیونکہ مملکت کا استحکام اس کی سرحدوں کے استحکام کے بغیر ممکن نہیں) تاکہ تم' ان کے ذریعے' ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کے بھی دشمن ہیں اور نظامِ خداوندی کے بھی دشمن ہیں اور ان کے علاوہ' انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا تمہیں ابھی علم نہیں ہوا۔ اللہ کو ان کا علم ہے۔ ان تمام انتظامات کے لئے روپے کی ضرورت ہوگی۔ سو تم سمجھ لو کہ تم نظامِ خداوندی کے قیام اور استحکام کے لئے جو کچھ بھی خرچ کرو گے' وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

"مِنۡ قُوَّۃٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ" کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ سامانِ حفاظت زمانے کے تقاضوں اور حالات کے مطابق ہوگا۔ اگر صدرِ اوّل میں اس کے لئے پیادہ فوج اور گھوڑوں کے رسالے کافی تھے تو آج توپوں' مشین گنوں' ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی ضرورت ہوگی (۸/۱۶؛ ۴۲/۳۶)۔

اس کے بعد پھر جنگ کے اصولوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ فرمایا؛

(۸/۶۱-۶۲) وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَہَا وَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ○ وَاِنۡ یُّرِیۡدُوۡۤا اَنۡ یَّخۡدَعُوۡکَ فَاِنَّ حَسۡبَکَ اللّٰہُ ؕ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ○

اور اگر تمہارا دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ۔ (یہ نہ خیال کرو کہ اب ہمیں فتح حاصل ہونے لگی تھی تو وہ صلح کی طرف مائل ہو گیا۔ ہم صلح کیوں کریں؟

یاد رکھو! اس جنگ سے مقصد فتنہ فرو کرنا تھا۔ اگر وہ صلح سے فرو ہو جاتا ہے تو یہی تمہاری فتح ہے)۔ تم اپنا بھروسا قانونِ خداوندی پر رکھو جس کے مطابق تم جنگ اور صلح کرتے ہو۔ یہ اُس خدا کا قانون ہے جو سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (۶۱)۔

اور اگر دشمن (اپنے آپ کو مائل بہ صلح ظاہر کر کے) تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو (اے رسولؐ!) تم گھبراؤ نہیں۔ تمہارے لئے خدا کا قانون کافی ہے، اُس خدا کا قانون جس نے اپنی مدد سے اور اس جماعتِ مومنین کے ذریعے، تمہیں اس قدر سامانِ تقویت بہم پہنچایا ہے (۶/۵۲؛ ۴۸/۲۸؛ ۱۸/۲۹؛ ۴۸/۲۹)۔ (دین کا غلبہ قانونِ خداوندی کی اطاعت اور صحابہؓ کی رفاقت ہی سے ممکن ہوا تھا)۔ (۶۲)

یہ اصول جس قدر بیش بہا، بلند پایہ اور بے مثال ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کا مقصد جنگ کرنا نہیں، بلکہ امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا ہے۔ میدانِ جنگ میں جب دشمن پسپا ہو رہا ہو، اس کی طرف سے صلح کا پیغام آئے تو فریقِ غالب اوّل تو اسے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھے گا اور اگر اس کی ضرورت بھی سمجھے گا تو شکست خوردہ دشمن سے ذلت آمیز شرطیں منوائے گا۔ لیکن قرآن کی تلقین و ہدایت یہ ہے کہ جن حالات میں بھی دشمن آمادہ بہ صلح ہو، اس کی پیشکش کو قابلِ قبول سمجھو۔ حتیٰ کہ اگر حالات سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہو کہ وہ شکست کے نقصانات سے بچنے کے لئے صلح کی پیشکش کو بطور حربہ استعمال کر رہا ہے، تو بھی اسے یونہی مسترد نہ کرو۔ دشمن اگر دھوکا بھی دینا چاہے گا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس ایسے نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ساز و سامان ہے۔ (بقول غالبؔ) ؎

بے دست و پائیم کہ ہنوز از دفورِ عشق ۔۔۔ سوداست در سرم کہ بساماں برابر است

؂ یہاں سامانِ تقویت کے ضمن میں دو عناصر کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے: قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہونے والی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت۔ قرآنِ کریم میں صحابہ کبارؓ کی عظمت کے متعلق مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ لیکن اس آیت اور اس کے ساتھ آیت (۸/۶۴) میں ان کا مقامِ بلند اُبھر اور نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ کامیابیوں کے لئے خدا کی نصرت کے بعد اور کیا چاہیئے؟ یہ ہر طرح سے کافی ہوگی۔ لیکن حضورؐ سے کہا گیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے دو

عناصر ضروری ہیں ـــــ خدا کی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت۔ آیت (۸/۶۴) میں اسے اور بھی نکھار کر بیان کر دیا جہاں کہا کہ

۸/۶۴ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

صحابہؓ کی عظمت

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا (یعنی اُس کی نصرت) تیرے لئے بھی کافی ہے اور مومنین کے لئے بھی جو تیرا اتباع کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اے رسولؐ! تیرے لئے خدا (کی نصرت) اور یہ جماعتِ مومنین جو تیرا اتباع کرتی ہے کافی ہیں۔ چونکہ آیت (۸/۶۲) میں کہا گیا ہے کہ "خدا نے تجھے اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کے ذریعے تقویت پہنچائی ہے"، اس لئے آیت (۸/۶۴) کا دوسرا مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے یعنی یہ کہ کامیابی کے لئے خدا کی تائید و نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت دونوں ضروری ہیں۔

۸/۶۳ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور تمہاری جماعت کے افراد کے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی ہے۔ یہ وہ گراں مایہ متاع ہے جو دنیا بھر کی دولت خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صرف قانونِ خداوندی پر ایمان لانے سے ممکن تھا (جس سے ان کی توجہ انفرادی مفاد پرستیوں سے ہٹ کر، زندگی کے بلند نصب العین کی طرف منتقل ہو گئی اور یہ چیز ان میں قلبی یگانگت کا موجب بن گئی)۔ خدا کا یہ قانون غلبہ اور تدابیر دونوں اپنے اندر رکھتا ہے۔

جماعتِ صحابہؓ کی اس خصوصیت کا کہ ان کے دل باہمدگر پیوست تھے، دیگر مقامات پر بھی ذکر آیا ہے (بالخصوص دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحات ۸۲-۱۸۵)۔

صحابہؓ کی اس قسم کی جماعت اور رسول اللہ جیسا معلم اور مربی! وہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸)
بالائے ہر بالاتر ے کے مقام پر فائز کیوں نہ ہو جائے؛ فرمایا:

(۸ / ۶۵-۶۶) یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ
یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ
وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ
اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ
یَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ
اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

اے رسولؐ! تو اپنے عملی پروگرام کے ذریعے اپنی جماعت کی کمیوں اور کمزوریوں کو رفع کرتا رہ، تاکہ یہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار حصہ لینے کے قابل ہو جائیں۔ اس سے ان میں

سو مجاہد ہزار پر بھاری

ایسی توانائی پیدا ہو جائے گی کہ اگر تم میں بیس سپاہی ثابت قدمی دکھائیں گے تو وہ مخالفین کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر ایک سو ایسے جانباز ہوں گے تو وہ فریقِ مقابل کے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔ یہ اس لئے کہ تمہارے مخالفین، عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے انتقام اور نفرت کے جذبات سے اندھے ہو کر میدانِ جنگ میں آتے ہیں۔ اور کامیابی کے لئے اوّلین شرط یہ ہے کہ لڑنے والے سمجھ اور سوچ سے کام لیں (۶۵)۔

لیکن یہ ایک اور دس کی نسبت (یعنی ایک سو کا ایک ہزار پر غلبہ حاصل کر لینا) اُسی

صورت میں ہے جب کمی، تعداد کے اعتبار سے ہو، سامانِ حرب و ضرب میں تمہاری اور دشمن کی پوزیشن یکساں ہو. لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس وقت پوزیشن ایسی نہیں. تم تعداد میں بھی کم ہو اور سامان کی بھی قلت ہے. اس لئے، اس وقت نسبت صرف ایک اور دو کی ہوگی. اگر تم میں ایک سو سپاہی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے، تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے. اگر ایک ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر فتح پالیں گے. یہ سب خدا کے اُس قانون کی رُو سے ہوگا جس کی تائید اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو ثبات اور استقامت سے کام لیتے ہیں (۶۶).

آیات کا مفہوم واضح ہے. البتہ دو نکات خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں. ایک تو یہ کہ ان مخالفین کی شکست کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ سراسر جذبات سے مغلوب ہوتے ہیں، عقل و فکر سے کام نہیں لیتے. جنگ کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ جذبات کے زور پر لڑی جاتی ہے. جس فوج میں جذبات کی جس قدر شدت ہوگی، وہ اسی قدر بے جگری سے لڑے گی. یہ بھی درست ہے. لیکن قرآن کریم جنگ میں بھی تَفَقُّہ اور تعقّل

میدانِ جنگ میں عقل و فکر

(عقل و فکر) کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتا. میدانِ کارزار میں ہوش و حواس کا بجا رکھنا اور عقل و فکر سے کام لینا ــــــ کارِ ہر دیوانہ نیست ــــــ اس سے اس امر کا اندازہ لگ سکتا ہے کہ قرآنی تعلیم و تربیت نے جماعتِ مومنین کی فکری صلاحیتوں کو کس قدر پختہ کر دیا تھا کہ وہ میدانِ جنگ میں بھی اندھے جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے تھے. ورنہ یہاں تو اچھے اچھے دانشوروں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ　　　مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ دیوانہ

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا کی نصرت کے لئے استقامت (صبر) شرط ہے. زندگی کے اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ــــــ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے.

بنا بریں کامیابی کے عناصرِ ترکیبی یہ ہوں گے:

۱. قوانینِ خداوندی پر یقینِ محکم اور اُن کی اطاعتِ پیہم. اس سے نصرتِ خداوندی حاصل ہوگی. اس کے ساتھ حالات کے مطابق، سامانِ حرب و ضرب اور حفاظتی تدابیر.

۲. جماعت کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ الفت اور محبت، رشتۂ مودّت اور یگانگت،

قلب و دماغ میں ہم آہنگی اور یک رنگی اور امیرِ جماعت کا کامل اتباع۔
۳۔ تصادمات کا نہایت استقامت سے مقابلہ، ہجومِ مشکلات میں پاؤں میں لغزش نہ آنے دینا۔
یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں تو اپنے سے دُگنے بلکہ دس گُنے دشمنوں پر بھی غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

اب جنگ کے سلسلہ میں اگلے اصلاحی اقدام کی طرف آیئے۔ شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سلسلہ کا پہلا قدم مالِ غنیمت کی تقسیم تھا جس کی رو سے یہ (لوٹ کا مال بننے کے بجائے) مملکت کی تحویل میں آجاتا تھا، تاکہ وہ اسے حسبِ ضرورت صرف میں لائے۔ اس سے جنگ کا وہ جذبۂ محرکہ ختم ہو جاتا تھا جو اُس زمانے کے عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے ان کے لئے جنگ کا دوسرا جذبۂ محرکہ جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت غلام اور لونڈیاں عربی معاشرہ کا جزو بن چکی تھیں۔ ابتداءً یہ جنگ میں گرفتار قیدیوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ بعد ازاں انہیں فروخت بھی کیا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق حتمی طور پر کہہ دیا کہ انہیں رہا کرنا ہو گا۔ زرِ فدیہ لے کر، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو احساناً (۴۷/۴)۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ انڈکس میں غلامی کا عنوان دیکھئے' نیز جنگ کا۔

جنگِ بدر جس کا تذکرہ زیرِ نظر ہے' اسلام میں پہلی جنگ تھی۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ اُس وقت تک جنگ کے قیدیوں کے متعلق حتمی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس جنگ میں دشمن کے جو سپاہی گرفتار ہوئے تھے اُن کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کے خلاف قرآن کے احکام اس سے پہلے نازل ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ سوال تو نہیں تھا کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

جنگ کے قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جاتے (بلکہ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے رشتہ دار قیدیوں کو خود قتل کر دے) تاکہ یہ فتنہ ختم ہو جائے۔ لیکن ابوبکر صدّیقؓ کی رائے تھی کہ ان سے زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضورؐ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور قیدیوں سے زرِ فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا گیا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے' انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔

جب تک انہیں رہا نہیں کیا گیا' انہیں صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا تھا کہ وہ انہیں بطور مہمان اپنے ہاں رکھیں۔ جن کے پاس کپڑے نہیں تھے' انہیں کپڑے فراہم کئے گئے۔ (حضرت) عباسؓ کشیدہ قامت تھے' اس لئے کسی کا کُرتہ انہیں پورا نہیں آتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی (جو اسلام نہیں لایا تھا اور دراز قد تھا) نے اپنا کُرتہ منگا کر (حضرت) عباسؓ کو دیا۔ (حضرت) عباسؓ' حضورؐ کے چچا تھے۔ آپؐ نے اسے اپنے اوپر احسان تصور کیا۔ عبداللہ بن اُبی تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ لیکن اس کی وفات پر حضورؐ نے خود اپنا کُرتہ کفن کے لئے بھیجا۔ بخاری کی روایت کے مطابق' یہ کُرتہ' اس کُرتے کے بدلے میں تھا جو اس نے (حضرت) عباسؓ کے لئے بھیجا تھا۔

کس قدر منفعت بخش رہا ابن اُبی کا یہ سودا! جب زلیخا مصر کے بازار سے حضرت یوسفؑ کو نیلام میں خرید کر لے گئی تو اس پر (غالباً مولانا جامیؒ نے) لکھا ہے کہ اُس نے اس سودے پر کہا کہ

درا ہم چند دادم' جاں خریدم تعالیٰ اللہ چہ ارزاں خریدم!

یہ تو شاعری تھی۔ عبداللہ بن اُبی کا سودا فی الحقیقت ایسا منفعت بخش تھا جس کی مثال نہیں۔

جن قیدیوں کو رہا ہونے تک صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا تھا' انہیں کس طرح رکھا گیا تھا' اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے جسے خود ایک قیدی (ابو عزیز) نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس انصاری نے مجھے اپنے گھر رکھا تھا' ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح و شام کھانا لاتے تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ اسے ہاتھ نہ لگاتے اور یہ کہہ کر زبردستی مجھے کھلا دیتے کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔

یہ وہ عرب تھے جو کل تک جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنایا کرتے تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ تغیرِ نفس سے کس طرح خارجی کائنات بدل جاتی ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ان قیدیوں کا فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔ ان قیدیوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے ہم آج بھی چشمِ تصور کے سامنے لاتے ہیں تو آنکھوں میں نور اور قلب میں سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان قیدیوں میں حضورؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابوالعاص بھی تھے جو اُس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ حضرت زینبؓ ابھی مکہ میں ہی تھیں۔ آخر محمد (صلعم) کی بیٹی تھیں۔ دل کے نازک گوشوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ حضورؐ نے اپنی شادی کے وقت ایک

بیٹی کا ہار!

ہار حضرت خدیجہؓ کو تحفتہً دیا تھا۔ بیٹی (حضرت زینبؓ) کی شادی کے وقت ماں نے وہی ہار بیٹی کے گلے میں ڈال دیا اور اب بیٹی نے وہی ہار شوہر کے فدیہ میں بھیج دیا۔ اس ہار نے زمانے کی طنابوں کو پچیس تیس سال پیچھے کھینچ دیا اور حضورؐ کو وفا شعار بیوی کی یاد دلادی جس نے تمام مصائب اور مشکلات میں بڑی جگر سوزی اور ولدوزی سے ساتھ دیا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے پردۂ سیمیں کی طرح نگاہوں کے سامنے آگئے اور حضورؐ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ذرا حضورؐ کے مقام کو سامنے لائیے۔ بہ حیثیتِ رسولؐ اور سربراہِ مملکت، مسلمانوں کے جان ومال کے مختار ہیں۔ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف مجال سرتابی تو ایک طرف کسی کے دل میں گرانی تک محسوس نہیں ہوسکتی۔ لیکن چونکہ اس معاملہ کا تعلق آپؐ کی ذات کے ساتھ تھا، اس لئے خود فیصلہ نہیں فرماتے۔ صحابہؓ سے کہتے ہیں کہ اگر تم متفق ہو تو اس ہار کو واپس لوٹا دیا جائے۔ سب نے بطیبِ خاطر رضامندی کا اظہار کیا اور ہار واپس کردیا گیا۔

یہ تھا حضورؐ کا وہ اُسوۂ حسنہ جسے اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے "بہترین نمونہ" قرار دیا تھا ہمارے ہاں اتباعِ سنت کے ضمن میں جھگڑا اس پر کیا جاتا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ذرا نیچے۔ یا مسواک اتنی بڑی ہونی چاہیئے یا اُتنی بڑی۔ اگر ان فروعات کے بجائے زور اتباعِ اُسوۂ رسول اللہ پر دیا جاتا تو امت کی حالت کچھ سے کچھ ہوتی۔

ان تمہیدی وضاحتوں کے بعد جنگ کے قیدیوں سے متعلق آیات کی طرف آیئے۔ فرمایا:

(۸ / ۶۸-۶۷) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

یاد رکھو! اس خیال کو اپنے دل میں کبھی نہ آنے دو کہ تم دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی

گرفتار کر لو تاکہ اُن کے زرِ فدیہ سے تمہارے پاس بہت سا مال جمع ہو جائے (۴۷/۴۱)۔ جنگ سے تمہارا مقصد دولت حاصل کرنا نہیں۔ تمہارے پیشِ نظر نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ اس کے لئے تمہیں ملک میں ایسا غلبہ و اقتدار حاصل ہونا چاہیئے جس سے حق کے مخالفین بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔ تم قریبی پیشِ پا افتادہ مفاد حاصل کرنا چاہتے ہو اور قانونِ خداوندی کی نگاہ مستقبل پر ہے۔ یاد رکھو! قانونِ خداوندی، غلبہ اور حکمت، دونوں کو اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ (اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ بات نبی کے شایانِ شان کیوں نہیں تھی کہ وہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بجائے اپنی نگاہ دشمن کے قیدیوں کو گرفتار کرنے پر رکھتا۔ تم غلطی سے ایسا کرنے لگے تھے) (۶۷)۔

اگر قانونِ خداوندی میں، اس قسم کی فرو گزاشتوں سے درگزر کر دینے کی گنجائش پہلے سے موجود نہ ہوتی، تو جو کچھ تم کرنے لگے تھے اس پر تمہاری سخت گرفت ہو جاتی (۶۸)۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عربوں کے ہاں جنگ کے محرکات دو ہی تھے ـــ مالِ غنیمت اور جنگ کے قیدی جنہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ مالِ غنیمت کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوگا مملکت کی تحویل میں رہے گا۔ اور اب جنگی قیدیوں کے سلسلہ میں کہہ دیا کہ تمہاری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ قیدی گرفتار ہوں۔ مقصد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہے جس کے لئے دشمن کو ایسی شکست ہونی چاہیئے کہ وہ حق کی مخالفت کے لئے سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔

جہاں تک ان قیدیوں کا تعلق تھا، اُن سے کہا گیا کہ

(۸ / ۷۰۔۷۱) يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّمَن فِىٓ أَيْدِيكُم مِّنَ ٱلْأَسْرَىٰٓ إِن يَعْلَمِ ٱللَّهُ فِى قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

وَإِن يُرِيدُوا۟ خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا۟ ٱللَّهَ مِن قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

اے رسولؐ! ان قیدیوں سے، جو تمہاری گرفت میں آچکے ہیں کہہ دو کہ اگر ہم نے قانونِ خداوندی کی رُو سے دیکھا کہ تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات موجود ہیں، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، تمہیں اس سے بہتر واپس دے دیا جائے گا اور تمہاری ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی۔ اللہ کے قانون میں حفاظت اور رحمت کا سامان موجود ہے (۷۰)۔

لیکن اگر یہ نظر آیا کہ تمہارے دل میں عہد شکنی اور خیانت کے جذبات پرورش پا رہے ہیں، تو تم پہلے بھی خیانت کر کے دیکھ چکے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہوا تھا۔ اس نے کس طرح، جماعتِ مومنین کو تم پر غلبہ عطا کر دیا تھا۔ اللہ کا قانون علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تمہاری نیت کیا ہے اور یہ بھی کہ تمہاری تخریبی کارروائیوں کی مدافعت کے لئے کیا تدبیر کرنی چاہیئے۔

قرآن کریم کی وسعتِ قلبی اور کشادہ نگہی پر غور فرمایئے۔ دنیا کے کسی آئین و قوانین میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا منشاء امن و آزادی کی فضا پیدا کرنا ہے، کسی سے انتقام لینا نہیں۔ اُس کی سیاست میں زیادہ سے زیادہ عفو و درگزری ہے۔ مؤاخذہ صرف ناگزیر حالات میں ہے۔

○

ان احکام کے درمیان غنیمت کے متعلق ایک آیت آتی ہے، یعنی ــــ

(۸/۶۹) فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

البتہ: یہ مالِ غنیمت جسے تم نے فتح کے بعد حاصل کیا ہے، اسے حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ۔ لیکن اس باب میں بھی ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو! حفاظت اور رحمت کا سامان، قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ حکم اجتماعی ہے اور مملکت سے متعلق جس کی تحویل میں مالِ غنیمت دیا گیا تھا۔

○

یہ ہیں اسلام میں پہلی جنگ سے متعلق احوال و کوائف و احکام جو اس سورہ میں آئے ہیں۔ (بدر کا

لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے، یعنی سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۲۲ میں بملاحظہ ہو مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۰۴)۔ اِس جنگ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ جماعتِ مومنین حال ہی میں پناہ گزینوں کی طرح مدینہ میں آئی تھی۔ مدینہ کے انصار کے ہاں بھی قریش کے مقابلہ کے لئے عسکری قوت اور ساز و سامان نہیں تھا۔ ایسے حالات میں قریش کا اپنے عظیم لشکر کے ساتھ یورش کر کے

پہلا رمضان

اُمنڈ آنا اس جماعت کو ختم کر دینے کے مترادف تھا۔ یہ ۲ھ کی بات ہے جب پہلے پہل روزے فرض ہوتے تھے۔ ابھی انہوں نے ۱۶/۱۷ ہی روزے رکھے تھے کہ بدر کے میدان میں آنا پڑا۔ قرآن مجید میں روزوں کا مقصد خدا کی کبریائی کا قائم کرنا بتایا گیا ہے۔ (لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۲/۱۸۵)۔ ان مٹھی بھر روزہ داروں نے عملاً بتا دیا کہ خدا کی کبریائی کس طرح قائم کی جاتی ہے۔ نزولِ قرآن کی ابتدا بھی رمضان میں ہوئی تھی اور یہ فتح مبین بھی رمضان ہی کے مہینے میں ہوئی۔ اس پر جس قدر بھی مسرت و بہجت کے جشن منائے جاتے، کم تھے۔ چنانچہ اس فتحِ عظیم پر وہ پہلی عید منائی گئی جو اب ہمارے ہاں محض ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ سچ ہے۔ ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

اس ہجومِ مومنین کا اندازہ اسی سے لگتا ہے کہ وہ حقیقی مومن صرف (۳۱۳) تھے جنہوں نے قریش جیسے مخالفین کا زہرہ گداز کر دیا تھا اور آج یہ ہجوم قریب ایک ارب پر مشتمل ہے اور باطل کی ہر قوت کے سامنے ترساں و لرزاں ہے۔

یہی تھے وہ (۳۱۳) جن پر تحسین و تبریک کے پھول برساتے ہوئے، خدا نے کردگار نے کہا تھا کہ

(۸/۷۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط

ہم نے اس آیت کا آدھا حصہ یہاں درج کیا ہے۔ (بقایا ذرا آگے چل کر درج کیا جائے گا)۔ اس کا مفہوم یہ ہے:

یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے اور اس نظام کی خاطر جس چیز کے چھوڑنے کی ضرورت پڑی' اسے بلا ادنیٰ تامّل چھوڑ دیا۔ حتّٰی کہ گھر بار تک کو چھوڑ دیا اور یہاں آ گئے اور اپنے مال و جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔

دوسری طرف وہ مومنین' جنہوں نے' ان سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو ٹھکانا دیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی۔

یہی لوگ باہم دیگر ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہیں۔

اگلی آیت میں انہیں ایک ایسی سنہری سند عطا فرمائی گئی ہے جو تا ابد درخشندہ و تابندہ رہے گی۔ فرمایا:۔

(۸/۷۴) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○

تمام صحابہؓ مومن حقا ہیں

پھر سن رکھو! جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے اور پھر اس کی خاطر سب کچھ حتّٰی کہ وطن تک بھی چھوڑ دیا اور اس کے قیام کی خاطر مسلسل جدوجہد کرتے رہے' اور وہ لوگ جنہوں نے ان خانہ ویرانوں کو رہنے کا ٹھکانا دیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی، تو یہ ہیں وہ لوگ جو فی الحقیقت مومن کہلانے کے مستحق ہیں (یہی پکے اور سچے مومن ہیں)، ان کے لئے سامانِ حفاظت اور رزقِ باشرف کی فراوانیاں ہیں۔

اس کے ساتھ آیت (۸/۴) ملایئے اور پھر سوچئے کہ جنہیں خدا کی طرف سے مومن حقا (پکے اور سچے مومن) ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا ہو جائے' جنہیں بلند مدارج' مغفرت اور رزقِ کریم کے وعدے دیئے جائیں' ان کی بلندئ مرتبت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ اور یہ سرٹیفکیٹ' ان میں سے منتخب افراد کے لئے نہیں تھا۔ تمام مہاجرین و مجاہدین اور انصار کے لئے یکساں تھا۔ اتنا ہی نہیں کہ جن صحابہؓ کا اس آیت کے زمانۂ نزول

کے وقت اس زمرے میں شمار ہوتا تھا، یہ سندِ خداوندی انہی کے لئے تھی۔ فرمایا:

۸/۷۵ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت بھی کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا، تو یہ لوگ بھی تم میں سے ہی ہیں (یہ سب اس برادری کے افراد ہیں جو ایمان کی بنیادوں پر متشکل ہوئی ہے)۔ اگرچہ جہاں تک قانونِ وراثت وغیرہ کا تعلق ہے، رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ یہ فیصلہ اُس خدا کا ہے جو سب کچھ جانتا ہے (ان آیات نیز (۸/۴) سے صحابہ کبارؓ کا مقام واضح ہو جاتا ہے)۔

لہٰذا، نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں جس قدر بھی حضورؐ کے ساتھی (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (۴۸/۲۹)) تھے، جنہیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے، ان سب کے لئے خدا کا یہ اعلان تھا۔ ان میں کسی قسم کی تفریق کرنا قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے (انڈکس میں صحابہؓ کا عنوان دیکھئے)۔ نہ ہی یہ ذمہ داری ہمارے سپرد کی گئی ہے کہ ہم ان کی فہرستیں مرتب کریں۔

آیت (۸/۷۵) میں ایک استثناء کی گئی ہے۔ قرآن نے تمام مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں (ان میں مرد، عورتیں سب شامل ہیں)۔ لیکن اخوت کا یہ رشتہ دینی ہے۔ قرآن میں نسبی رشتوں کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں، وہ اس (اخوتِ دینی) کے باوجود اپنی جگہ برقرار ہیں۔

ان کے مقابلہ میں غیر مسلموں کے متعلق فرمایا:

۸/۷۳ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ

تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝

(ایک طرف یہ جماعتِ مومنین ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے دوست اور بہی خواہ ہیں۔ دوسری طرف) وہ لوگ ہیں جو اس نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔ لہٰذا، اگر تم وہ کچھ نہ کرو گے جس کا اوپر حکم دیا گیا ہے (یعنی ان کا مقابلہ) تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔

قرآنِ کریم ہر مقام پر مسلم اور غیر مسلموں کو دو الگ الگ فریق قرار دیتا ہے، جو ایک دوسرے کے مخالف ہی نہیں، معاند ہیں۔ اسی کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔

آیت (۸/۷۲) کا ایک حصہ باقی رہ گیا تھا جسے اب سامنے لایا جاتا ہے۔ انڈکس میں "ہجرت" کا عنوان دیکھئے۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دین یا اسلامی نظام اور مملکت کے قیام میں اس مرحلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مختصر الفاظ میں اسے دُہرا دیا جائے کہ اقامتِ دین کا مدعی، اپنے پیغام کو اُسی سرزمین سے شروع کرتا ہے جس میں وہ مقیم ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ اس نظام کے لئے وہ سرزمین سازگار نہیں، اور کوئی اور خطۂ ارض اس کے لئے زیادہ مساعد ہے، تو وہ اس خطے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے اصطلاح میں ہجرت کہتے ہیں۔ وہ وہاں اپنے پروگرام کا آغاز کرتا ہے۔ اس کی جماعت کے کچھ لوگ اس کے ساتھ ہی ہجرت کر لیتے ہیں۔ کچھ ان کے بعد آہستہ آہستہ ادھر آتے رہتے ہیں۔ ان اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو بڑی مشقتیں برداشت کرنا اور بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ان کی کوششوں اور قربانیوں کے بعد جب اُس جگہ اسلامی مملکت قائم ہو جاتی ہے تو یہاں وہاں بکھرے ہوئے مومنین وہاں کھچے چلے آتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں اتنی سختیاں ہوتی ہیں کہ انہیں وہاں سے نکلنے بھی نہیں دیا جاتا۔ ان کی امداد کے لئے آیت (۲/۲۷۳) میں تاکید آئی ہے۔ مکّہ کے کمزور محصورین کو وہاں سے نکالنے کے لئے آیت (۴/۷۵) میں حکم دیا گیا تھا۔

لیکن اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو وسعت، استطاعت اور امکان کے باوجود ہجرت نہیں کرتے اور غیر اسلامی علاقہ اور نظام میں پاؤں توڑ کر بیٹھے رہتے ہیں، اُن کے خلاف بڑے سخت احکام دیئے گئے۔ فرمایا:۔

(۸/۷۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

لیکن جو لوگ جماعتِ مومنین میں شامل تو ہو گئے، لیکن انہوں نے اپنے وطن کو نہیں چھوڑا (اور بلا عذر، غیر خداوندی نظام میں، مخالفین کے ساتھ رہنا گوارا کر لیا)، تو ان کی اعانت و رفاقت کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، تا آنکہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ساتھ نہ آملیں (۴/۹۷)۔

جو اسلامی مملکت کی طرف نہ آئیں

البتہ اگر وہ وہاں بحالتِ مجبوری، گھر چکے ہوں (۴/۷۵) اور دین کے معاملہ میں تم سے کوئی مدد مانگیں تو تم پر اُن کی مدد واجب ہے، بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اللہ کا قانون تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے۔

غور فرمایئے! ان چند الفاظ میں کتنے اہم اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جماعتِ مومنین کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے اپنے تعلقات منقطع کریں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ یہی نقطہ موضوعِ نزاع تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام میں (جو مغربی جمہوریت کے اصولِ اکثریت کی رُو سے بہرحال غیر اسلامی تھا) ہمیں "مذہب" کی آزادی ہوگی، اس لئے ایک الگ خطۂ ارض حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُن سے کہا جاتا کہ غیر اسلامی نظام کے تحت، محض نماز، روزہ کی آزادی کا نام اسلامی زندگی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی، اسلامی نظام ہی کے تابع ممکن ہے جس کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کا قیام ضروری ہے۔ بنابریں، اصولی طور پر ان کی پوزیشن ایسی ہی تھی، جیسی آیت زیرِ نظر میں اُن مسلمانوں کی بتائی گئی ہے جو اسلامی نظام کی طرف منتقل ہو جانے کے امکان کے باوجود، اُدھر منتقل ہو کر نہ آئیں، یعنی وہ اسلامی نظام پر غیر اسلامی نظام کو ترجیح دیں۔ اس سلسلہ میں سورۃ النساء کی آیات (۴/۹۷-۱۰۰) بھی دیکھئے۔

اسلامی نظام قائم ہو جانے کے بعد جو مسلمان (امکان کے باوجود) اس طرف منتقل ہونا نہ چاہیں بلکہ غیر اسلامی نظام میں مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں، اُن میں اور ان لوگوں میں، جو یہ کہیں کہ اسلامی مملکت قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں، غیر اسلامی مملکت میں بھی اسلام پر عمل ہو سکتا ہے، کیا فرق ہے ؟

تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ یہی نقطۂ نزاع تھا اور اُن کی اس روش نے اس تحریک کو سخت نقصان پہنچایا تھا ــــــــ تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اِدھر منتقل ہو کر آ گئے اور اپنے سابقہ مؤقف کی خود تردید کر دی۔

کہا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اگر وہ لوگ دین کے معاملہ میں تم سے مدد کے طالب ہوں تو اُن کی مدد کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس میں پھر ایک استثنا کر دی! کہا کہ اگر ان کی اس طرح مدد کرنا کسی ایسے معاہدہ کے خلاف ہو جو تم نے کسی غیر قوم کے ساتھ کر رکھا ہے، تو پھر ان کی مدد نہیں کی جا سکتی۔

غور فرمایئے کہ قرآن کریم معاہدات کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ امداد کے طالب مسلمان ہیں۔ وہ دین کے کسی معاملہ میں مدد کے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر یہ چیز کسی ایسے معاہدہ کے خلاف جاتی ہے جو تم میں اور کسی غیر مسلم قوم میں طے پا چکا ہے، تو پھر ان کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ (انڈکس میں جنگ اور معاہدات کے عنوان دیکھئے)۔

اللہ اکبر! یہ ہیں قرآنی سیاست کے اصول !!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دسواں پارہ ——————— نویں سورة

سُوۡرَۃُ التَّوۡبَۃِ (۹)

تیسرا باب

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

۱۔ مرکزِ نظامِ اسلامی (کعبہ) کا جماعتِ مومنین کی تحویل میں آجانا۔
۲۔ حجِ اکبر کے دن کا اعلامیہ۔
۳۔ معاہدات کی اہمیت۔
۴۔ جنگ کے مقاصد۔
۵۔ دین، رسوم و مناسک کی ادائیگی کا نام نہیں۔
۶۔ جزیہ کا مفہوم۔
۷۔ علماء و مشائخ کو خدا بنالینا۔
۸۔ الدّین کا تمام ادیان (انسانوں کے وضع کردہ نظامہائے حیات) پر غلبہ۔
۹۔ مال و دولت جمع کرنے کے خلاف سخت وعید۔
۱۰۔ منافقین کی عذر تراشیاں اور حیلہ جوئیاں۔
۱۱۔ منافقین کے لئے استغفار کا مفہوم۔
۱۲۔ اعراب (صحرانشین بدوؤں) کی حالت۔
۱۳۔ صدقات کی قبولیت۔
۱۴۔ صدقات، زکوٰۃ نہیں۔
۱۵۔ مسجدِ ضرار ——— ہماری مساجد کی کیفیت۔
۱۶۔ مومنین اور خدا کا معاہدہ۔
۱۷۔ جنگ میں پیچھے رہ جانے والے صحابہؓ۔
۱۸۔ تَفَقُّہ فی الدّین حاصل کرنے کا طریق۔
۱۹۔ اسلام ——— شمشیر اور قرآن کا امتزاج۔

تیسرا باب

سُورَۃُ التَّوبَۃِ

نویں سورۃ

قرآنِ کریم کے اسلوب و ترتیب کے مطابق، ہر سورۃ کے آغاز میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا جاتا ہے، لیکن اس سورۃ کے شروع میں بِسۡمِ اللّٰہ نہیں لکھی جاتی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ حتمی طور پر معلوم نہیں تھا کہ یہ سورۃ سابقہ سورۃ (الانفال) ہی کا حصہ ہے یا الگ سورۃ ہے۔ اس اختلاف میں تطبیق کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ اسے تسلیم تو الگ سورۃ ہی کیا گیا، لیکن اس کے آغاز میں بِسۡمِ اللّٰہ نہ لکھی گئی —— چونکہ مطالب الفرقان میں اہمیت حوالوں کو ہے، اور حوالے کے لئے اسے نویں سورۃ تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے ہمارے نزدیک سرِ آغاز بِسۡمِ اللّٰہ کے سوال کی چنداں اہمیت نہیں رہتی۔ یہ نویں سورۃ ہے۔

نظامِ اسلام میں کعبہ کو کس قدر اہمیّت حاصل ہے، اسے سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے (انڈکس میں قبلہ اور کعبہ کے عنوانات دیکھئے)۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی اور وہ آہستہ آہستہ مستحکم بھی ہوتی گئی اور پھیلتی بھی گئی۔ منشاءِ خداوندی کے مطابق کعبہ کو نوعِ انسان کی عالمگیر اجتماعیت کا مرکز قرار پانا تھا۔ وہ تو بعد کی بات تھی، لیکن اس کا آغاز مملکتِ اسلامیہ سے ہونا چاہیئے تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کی مدنی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال میں صورت یہ تھی کہ اسلامی مملکت قائم تھی (اور اس کا دار الخلافہ مدینہ تھا)، لیکن کعبہ غیر مسلموں (بلکہ اسلام کے دشمنوں) کے قبضہ میں تھا۔ آپ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹۶ پر دیکھئے۔ خود قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو مشہود کیا ہے کہ رسول اللہ کی نگاہیں کس طرح بار بار آسمان کی طرف اٹھتی تھیں، یہ التجا لئے ہوئے کہ جب کعبہ کو اس اُمّت اور اس کے نظام کا مرکز بننا ہے، تو اسے اسی امت کی تحویل میں ہونا چاہیئے، نہ کہ مخالفینِ اسلام کے قبضہ میں!

ان ملتجیانہ نگاہوں کو شرفِ باریابی ۸ھ میں حاصل ہوا جب مکہ فتح ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں حج فرض ہوا۔ اس میں حضور نبی اکرمؐ بہ نفسِ نفیس شریک نہ ہو سکے اور اپنی جگہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بطور امیرِ حجاج روانہ فرمایا۔ آپ اس اجتماع کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔ تیرہ سالہ مکہ کی زندگی اور آٹھ نو سال کی مدنی زندگی، اسی روزِ سعید کے انتظار میں گزری تھی۔

حجِ اکبر اس اعتبار سے قرآن میں اسے یَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ (۹/۳) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے ایجنڈا میں سرِفہرست یہ نکتہ تھا کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ اب سے کعبہ کی تولیت خالصتہً امتِ مسلمہ کے ہاتھ میں رہے گی اور کوئی غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ مکہ ۸ھ میں فتح ہوا تو وہاں کے غیر مسلم (جنہیں قرآن، اہلِ کتاب سے تمیز کرنے کے لئے مشرکین کہہ کر پکارتا تھا) اسلام لے آئے تھے لیکن جو قبائل، ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے، ان میں بیشتر ہنوز مشرک تھے۔ لیکن مملکتِ مدینہ کے ساتھ ان کے معاہدات تھے۔ اُن کی اِطلاع کے لئے اس تبدیلی کا اعلان مملکتِ اسلامیہ کی طرف سے تھا۔ لیکن قرآن نے اپنے مخصوص اسلوب کی رُو سے، اسے "خدا اور رسول" کی طرف سے اعلان قرار دیا ہے۔

مشرکین سے مُراد اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قرآن میں جہاں مشرکین کے ساتھ معاہدات، ان معاہدات کی تنسیخ یا اُن کے خلاف اعلان کا ذکر آیا ہے، اِس سے مُراد اُس زمانہ کے مخالفینِ اسلام تھے نہ کہ ساری دنیا اور مستقبل تک کے تمام مشرکین۔ کعبہ کی تولیت (اس کے نظم و نسق) میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انہیں (مخصوص شرائط کے تحت) کعبہ میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ قرآنِ کریم نے مملکتِ اسلامیہ سے کہا ہے کہ انہیں حج کے اجتماع میں مبصرین کی حیثیت سے، شرکت کی دعوت دو تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے (مطالب الفرقان، جلد سوم، ص۲۳۵)۔ نیز تاریخ سے اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں غیر مسلم کعبہ میں آتے جاتے تھے (شاہکارِ رسالت ص۲۷۳، ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

اس اجتماعِ عظیم میں اعلان کیا گیا کہ:

(۹/۱) بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى الَّذِيۡنَ عَاهَدۡتُّمۡ

مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۟

اے جماعتِ مومنین! تم اُن مشرکینِ عرب کے متعلق، جن کے ساتھ تم نے معاہدات کئے تھے، لیکن وہ اپنے معاہدہ پر قائم نہیں رہے (۴/۹)، اعلان کر دو کہ نظامِ خداوندی ان کے معاہدات کو کالعدم قرار دیتا ہے۔

اعلان کے الفاظ کا دبدبہ اور طنطنہ بتا رہا ہے کہ یہ فیصلہ ایک ایسی مملکت کی طرف سے ہو رہا ہے جسے پورا پورا غلبہ و تسلط حاصل ہے اور وہ اپنے معاملات میں بلا شرکتِ غیرے، صاحبِ اقتدار ہے۔

لیکن یہ اعلان اسلامی مملکت کی طرف سے ہو رہا تھا، (کسی سیکولر حکومت کی طرف سے نہیں) اس لئے یہ نہیں کیا گیا کہ اِدھر اعلان ہوا اور اُدھر اُن لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی کہا گیا:

(۲/۹) فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۟

یہ لوگ، اس کے بعد چار ماہ تک، بلا روک ٹوک، اس مملکت میں رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد، اگر یہ مملکت کے پُر امن شہری بن کر رہنا چاہیں تو فبہا، ورنہ ان سے جنگ ہو گی۔ (ان سے کہہ دو کہ تم اپنی خلافِ اسلام حرکتوں سے نظامِ خداوندی کو بے بس اور مغلوب نہیں کر سکتے۔ اس نظام میں اتنی قوت ہے کہ وہ سرکشی اختیار کرنے والوں کو نیچا دکھا دے۔

اعلان کا اگلا حصہ یہ تھا:

(۳/۹) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْۤءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا

أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۙ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝

آج اس اجتماعِ عظیم کے دن ——— جو تشکیلِ مملکت کے بعد، سب سے بڑے اجتماع کا دن ہے ——— تمام لوگوں کی اطلاع کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ نظامِ خداوندی، مشرکینِ عرب کے عہدوپیمان سے بری الذمہ ہے اب ان کے ساتھ کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی سرکشی سے باز آجاؤ، تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن اگر تم نے (صحیح روش سے) اسی طرح منہ موڑے رکھا، تو اس خیال کو دل سے نکال دو کہ تم نظامِ خداوندی کو بے بس کر دو گے۔ تمہیں دردناک سزا دی جائے گی۔

اذان کا مفہوم آیت میں "اذان" کا لفظ آیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگالیجئے کہ اسلامی نظام میں اذان کے معنی کیا ہیں؟ یعنی مملکتِ اسلامیہ کی طرف سے اعلامیہ Proclamation اور آج اذان سے مراد کیا ہے! اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ فیصلہ اُن لوگوں کے متعلق تھا جنہوں نے معاہدات کی پابندی نہیں کی تھی اور مملکتِ اسلامیہ کے مخالفین کی مدد بھی کرتے رہے تھے۔ جنہوں نے ایسا نہیں کیا تھا' ان کے متعلق اعلان تھا کہ

۹/۴ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

البتہ جن مشرکینِ عرب کے ساتھ تم نے معاہدات کئے تھے اور انہوں نے نہ تو اپنا معاہدہ پورا کرنے میں کسی قسم کی کمی کی اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کو مدد دی' تو اُن کے ساتھ'

جتنی مدت کے لئے معاہدہ ہوا تھا' اس مدت کو پورا کرو' اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے' وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو معاہدات کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اوّل الذکر گروہ کے متعلق جنہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی' فرمایا:

(۹/۵) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

جب چار ماہ کا عرصہ گزر جائے (اور اس کے بعد یہ' نہ تو اس مملکت کے پُرامن شہری بن کر رہنا چاہیں اور نہ ہی کسی دوسری جگہ منتقل ہوں' تو ان کے خلاف لامحالہ جنگ کی جائے گی) اس صورت میں' انہیں جہاں پاؤ قتل کرو' گرفتار کرو' ان کا محاصرہ کرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں رہو (اس لئے کہ انہیں فتنہ و فساد پھیلانے کے لئے کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا)۔

لیکن اگر یہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں (اور غیر مسلم امن پسند شہریوں کی حیثیت سے یہاں رہنا چاہیں) یا (۹/۱۱) (اسلام لا کر) نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ میں تمہارے شریکِ حال ہو جائیں تو پھر ان سے تعرض نہ کرو۔ نظامِ خداوندی میں امن چاہنے والوں کے لئے حفاظت و حرمت کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

یہاں دو تین نکات غور طلب ہیں۔ پہلے یہ کہا کہ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ ___ "جب وہ مہینے گزر جائیں جن کا احترام لازماً کیا جائے گا" ___ جیسا کہ مطالب الفرقان' جلد سوم' (صفحہ ۲۸) میں بتایا گیا ہے' قرآنِ کریم کی رُو سے سال میں چار ماہ ایسے رکھے گئے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار پائی ہے۔ انہیں اشھر الحرام (حرمت کے مہینے) کہا جاتا ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں حُرمت کے مہینے وہ ہیں جن

کے متعلق اعلان میں کہا گیا ہے کہ وہ مخالفین کے لئے مہلت کا وقفہ ہیں. ان میں ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی. مملکت کے اعلان کو واجب الاحترام قرار دینا، قرآن کے نظامِ سیاست ہی کا حصہ ہوسکتا تھا!

اگلا نکتہ یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اس کے بعد — "انہیں جہاں پاؤ قتل کرو"، تو اس سے مراد یہ نہیں کہ ان کا قتلِ عام شروع کردو. مطلب یہی ہے کہ پھر ان کے خلاف، ان حدود و شرائط کے مطابق، جو قرآن نے متعین کی ہیں، ان کے خلاف جنگ کی جائے گی.

اقامتِ الصلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ

اس کے بعد کہا کہ اگر یہ اپنی سرکشی سے باز آجائیں اور "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کے اسلامی مملکت کے پروگرام میں تمہارے ساتھ شریک ہوجائیں، تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی متصور ہوں گے (۹/۱۱). مقصد تو یہی ہے کہ اسلام لاکر یہ لوگ دین کے سارے نظام میں تمہارے شریکِ حال ہوجائیں، لیکن اس میں "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" خصوصیت کے ساتھ کہا گیا ہے. قرآنِ کریم کی ان دو اصطلاحات کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بڑی وضاحت سے بیان ہوچکا ہے (دیکھئے انڈکس). ان مقامات سے آپ دیکھ لیں گے کہ دین کا سارا نظام انہی دو محوروں کے گرد گردش کرتا ہے. نظامِ صلوٰۃ میں دین کا معاشرتی اور سیاسی پہلو آجاتا ہے اور ایتائے زکوٰۃ میں اس کا معاشی گوشہ. دیگر مقامات میں اسلامی مملکت کے قیام کے بنیادی مقاصد یہی دو اساسی نکات قرار دیئے گئے ہیں (مثلاً ۲۲/۴۱). قرآنِ کریم کی رُو سے یہ دو گوشے اس قدر اہم اور جامع تھے کہ سارا دین سمٹ کر ان کے اندر آجاتا تھا. لیکن مذہب (یعنی ہمارے مروجہ اسلام) میں ان گوشوں کا مطلب ہے نماز کی چند رکعتوں کی ادائیگی اور اپنے بے حد و نہایت جمع کردہ مال میں سے اڑھائی فیصد خیرات! ٹھیک کہا تھا اقبالؒ نے کہ

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

ہمارا مذہب پرست طبقہ اتنا بھی نہیں سوچتا کہ قرآن نے کہا ہے: اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ — اگر ان لوگوں (جماعتِ مومنین) کی اپنی مملکت قائم ہوگئی، تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا

کریں گے۔ اس سے واضح ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی کے لئے اپنی مملکت کا قیام لازمی ہے۔ لیکن اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا جو مفہوم اب لیا جاتا ہے، اس کے لئے اپنی مملکت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ ہر مملکت میں ادا کئے جا سکتے ہیں، جیسا ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ان اصطلاحات کا مفہوم نیشنلسٹ علماء اور مطالبۂ پاکستان کے حامیوں کے درمیان بنیادی وجۂ نزاع تھا۔

بہر حال قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو پھر تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے۔ اس کے بعد ایک ایسا درخشندہ اصول بیان فرمایا جسے اسلام کے نظامِ عدل و آزادی کا بنیادی ستون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ مخالفین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ ان کا کوئی فرد مسلمانوں کے ہاں پناہ کا طالب ہے۔ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا ۔ فرمایا؛

۹/۶ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

اگر ان مشرکین میں سے (جن کے ساتھ معاہدات ختم کر دیئے گئے ہیں) کوئی تمہارے پاس آکر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ پھر اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے، اس نظام میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اگر اس کے لئے یہ پوزیشن قابلِ قبول نہ ہو اور وہ مملکت سے چلا جانا چاہے، تو تم اُسے (بہ حفاظت) اُس کی پناہ گاہ تک پہنچا دو۔

یہ اس لئے کہ یہ لوگ، جہالت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ (ورنہ اگر یہ علم و عقل سے کام لے کر سوچتے تو انہیں صاف نظر آجاتا کہ نظامِ خداوندی میں رہنا اُن کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔

مذہبی آزادی

وہ بے شک تمہارا دشمن ہے، تمہارے خلاف مصروفِ جنگ و جدال ہے۔ لیکن ایک انسان کی حیثیت سے تمہارے ہاں پناہ لینے کے لئے آگیا ہے۔ اس کی مخالفت اور عداوت کو بھول جاؤ اور اُسے پناہ دو۔ پناہ دینے کے بعد کیا کرو؟ اسے زبردستی مسلمان کرلو؟ کہا کہ

قطعاً نہیں۔ اس کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کرو۔ اگر وہ اسے قابلِ قبول نہ سمجھے اور اپنے ہاں واپس جانا چاہے، تو اسے اپنی حفاظت میں اس مقام تک پہنچا آؤ جہاں وہ کہے کہ اسے امن حاصل ہو جائے گا۔ ان کی مخالفت کی وجہ یہ بتائی کہ انہیں قرآن کی تعلیم کا علم نہیں۔ انہیں ضروری معلومات بہم پہنچا دو پھر دیکھو اُن کا ردّ عمل کیا ہوتا ہے۔

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے، وہ زیادہ نہیں تو قرآن کے اس حکم ہی کو دیکھیں اور خود فیصلہ کرلیں کہ اسلام نے کس قدر مذہبی آزادی عطا کی ہے! یہ پناہ گزین، غیر مسلم ہر طرح مسلمانوں کے قبضے میں تھا اس سے جو چاہے منوایا جا سکتا تھا۔ لیکن اُس کے متعلق بھی کہا کہ اسے قرآن سناؤ۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرنا چاہے تو اسے اپنی حفاظت میں اُس کے مامن تک پہنچا آؤ۔ (دین میں جبر کے عنوان پر سابقہ جلدوں میں بہ تفصیل لکھا جا چکا ہے)۔

اس کے بعد چار آیات بھی معاہدات ہی کے متعلق مزید تصریحات آتی ہیں۔ آیات مع اُن کے مفہوم کے درجِ ذیل ہیں:

(۹/۷) كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

(تم سوچو کہ جو لوگ اس طرح بار بار عہد شکنی کریں) نظامِ خداوندی کی رُو سے اُن کے عہد کو عہد کس طرح سمجھا جائے۔ عہد ان کا قابلِ اعتناء ہوگا جن کے ساتھ تم نے مسجدِ حرام کے نزدیک (اب) عہد کیا ہے۔ سو جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی عہد کو استوار رکھو۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے عہد کی نگہداشت کرتے ہیں۔

۹/۸ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

ان لوگوں سے بھلا کیا عہد ہو سکتا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو عہد و پیمان تو ایک طرف رہا، وہ معاشرہ کے عام ضوابط و واجبات تک کو بھی بالائے طاق رکھ دیں۔ ان کی پاسداری بھی نہ کریں۔ یہ چکنی چپڑی باتوں سے تمہیں راضی رکھنا چاہتے ہیں اور دل میں تمہارے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بھرے رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو (معاہدات کی رُو سے طے شدہ حدود و قیود سے بھی) اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔

۹/۹ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

یہ لوگ ذرا سے فائدے کے لئے، جھٹ سے قوانین خداوندی کو بیچ ڈالتے ہیں اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں، وہ کس قدر بُرا ہے!

۹/۱۰ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝

اس نظام کو قبول کرنا تو ایک طرف رہا، ان کی حالت یہ ہے کہ (ان میں سے) جو شخص اس نظام کو تسلیم کر لیتا ہے، یہ اس کے ساتھ، عام معاشرتی تعلقات و روابط کی بھی پاسداری نہیں کرتے (۴۲/۲۳)، نہ ہی کسی عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے

ہی حدود شکن واقع ہوتے ہیں۔

ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ وہ جاہلیت کا زمانہ تھا اس لئے وہ لوگ نہ بین الاقوامی روابط کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور نہ ہی عہد و معاہدات کی پابندی کو ضروری خیال کرتے۔ لیکن سوال عہدِ جاہلیت اور (موجودہ) دورِ تہذیب کا نہیں۔ ہمارا دورِ تہذیب اس باب میں عہدِ جاہلیت سے بھی دس قدم آگے ہے۔ ہمارے زمانے میں میکیاولی سیاست کا دور دورہ ہے جسے عرفِ عام میں سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ معاہدات کے متعلق میکیاولی کی تعلیم یہ ہے کہ:

میکیاولی سیاست

بادشاہ کے لئے صفتِ رُوباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے۔

دورِ حاضر کی سیاست کا مدار سیکولرازم پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قومیں کسی مستقل اقدار کی پابند نہیں ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت قوت کے سوا کوئی ذریعہ نہیں جس سے آپ کسی قوم کو کسی معاہدہ کی پابندی پر مجبور کر سکیں۔ مشہور مقنن سولن کا قول ہے کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے جو اپنے سے کمزور کو بآسانی پھنسا لیتا ہے اور زوردار کی سانس سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ چونکہ معاہدہ کرنے والے فریقین کے من میں چور ہوتا ہے، اس لئے معاہدہ کے مسودہ میں سیاسی زبان Diplomatic Language استعمال کی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک صاف اور سیدھے معاملہ کے متعلق معاہدہ کے مسودہ میں الفاظ کے انتخاب اور اتفاق پر فریقین کے کئی

معاہدات کی پابندی

کئی دن بحث و مباحثہ میں لگ جاتے ہیں اور جب کوئی نزاعی مقام آتا ہے تو وہ معاہدہ اعلیٰ سے اعلیٰ بین الاقوامی اداروں اور عدالتوں میں پیش ہوتا ہے کہ وہ اس کے صحیح معانی متعین کریں۔ جن اقوام نے ابھی کل ہی اس معاہدہ پر (کافی سوچ

بچار کے بعد) متفقہ طور پر دستخط کئے تھے، وہ اس کے مفہوم پر متفق نہیں ہوتیں. اور اگر وہ متفق ہوں بھی تو کوئی قوت اُنہیں اس کی پابندی پر مجبور نہیں کرسکتی. یہ صرف اخلاقی اقدار پر ایمان ہے جو افراد (اور اقوام) کو عہد و پیمان (معاہدات) کا پابند بنا سکتا ہے. یہی وجہ ہے جو قرآن نے عہد و پیمان کی پابندی پر (خواہ وہ انفرادی ہوں خواہ اجتماعی) اس قدر زور دیا ہے اور اسے جماعتِ مومنین کا شعارِ زندگی قرار دیا ہے (۲/۱۷۷ ؛ ۲۳/۸) اور اس ضمن میں خدا نے خود اپنی مثال پیش کی ہے کہ: فَلَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰہُ عَہۡدَہٗۤ (۲/۸۰) "خدا اپنے عہد کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا." بلکہ یہاں تک کہ — وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ (۹/۱۱۱) "خدا سے زیادہ عہد کی پابندی کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟"

یہ وہ قوم ہوگی جو بلا کسی جبر و جور کے اپنے معاہدات کی پوری پوری پابندی کرے گی. چونکہ معاہدات کرتے وقت ان کے من میں چور نہیں ہوگا، اس لئے وہ معاہدہ کے وثیقہ میں پُرپیچ اور ذومعنی الفاظ استعمال نہیں کرسکے گی، کیونکہ ان کے خدا کا حکم ہے دَ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا (۳۳/۷۰) "ہمیشہ صاف، سیدھی، غیر مبہم زبان استعمال کرو."

یہ تھے وہ دو فریق جن کے معاہدات کا ذکر مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے — ایک فریق سیکولرازم کا حامی، دوسرا فریق احکامِ خداوندی کا پابند!

اِس کے بعد پھر اسی بات کو دُہرایا جس کا ذکر آیت (۹/۵) میں کیا جاچکا ہے، یعنی:

۹/۱۱ فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۝

بایں ہمہ اگر یہ لوگ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر اسلام لے آئیں اور اس طرح نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے قیام میں تمہارے شریک ہوجائیں، تو وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے.

ہم اُن لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں اپنے قوانین کو نکھار کر بیان کردیتے ہیں.

اس کے برعکس، اگر یہ لوگ عہد شکنی کریں اور معاہدات کے پابند نہ رہیں، تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے.

۹/۱۲ وَ اِنۡ نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَہۡدِہِمۡ وَ طَعَنُوۡا

فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ
لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ○

لیکن اگر یہ لوگ، معاہدہ کر لینے کے بعد، پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور نظامِ خداوندی کے خلاف طعن و تشنیع شروع کر دیں، تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ آئینِ کفر کے ان سرغنوں کے خلاف جنگ کی جائے۔ پھر ان کا عہد ہی نہیں رہے گا ____
اور یہ جنگ اس لئے کی جائے گی کہ یہ لوگ ظلم و سرکشی سے باز آجائیں۔

جنگ سے متعلق جو آیات بھی آپ کے سامنے آئیں، ان میں دیکھتے جائیے کہ قرآنِ کریم نے کن حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے اور کون سے مقاصد کے لئے؟ اسی آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔

جنگ کا مقصد جنگ اس لئے ناگزیر ہوگئی تھی کہ یہ لوگ عدل و انصاف سے سرکشی برتتے تھے۔ ملک میں ظلم و فساد برپا کرتے تھے۔ انہیں ہزار سمجھایا، لیکن وہ ظلم و تعدّی سے باز نہ آئے۔ مجبوراً طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ○ تاکہ یہ اپنی ان انسانیت سوز حرکات سے باز آجائیں، جنگ ختم کر دی جائے۔ اس کی تاکید میں کہا:

(۹/۱۳) اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ
الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ
فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

تم خود ہی سوچو کہ ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنے میں کیا تامّل و توقّف ہو سکتا ہے، جنہوں نے اپنے معاہدات کو توڑ ڈالا ہے، جنہوں نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ رسول کو، اس کے گھر بار سے باہر نکال دیں گے۔ (اور جب وہ گھر بار چھوڑ کر مدینہ آگیا تو اس پر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔) اور تمہارے خلاف جنگ کرنے کی پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہٰذا اب کون سی بات باقی رہ گئی ہے جو ان کے خلاف قدم نہ اٹھایا جائے؟ کیا تم ان سے

ڈرتے ہو؟ سُن رکھو کہ اگر تم خدا پر ایمان رکھتے ہو تو پھر صرف خدا کا قانون ایسا ہے جس کی خلاف ورزی کے نتائج سے تمہیں ڈرنا چاہیئے (اس کے سوا کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں)۔

لہٰذا، یہ ضروری ہو گیا ہے کہ

(۹ / ۱۴-۱۵) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

تم ان کے خلاف جنگ کے لئے نکلو اور پھر دیکھو کہ خدا کس طرح انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلوا تا ہے (۸/۱۷؛ ۲۲/۴۰؛ ۵۹/۲)، انہیں ذلیل و رسوا کرتا ہے اور تمہیں ان پر غلبہ عطا کرتا ہے، ایسا غلبہ جس سے جماعتِ مومنین کے دلی دکھ دُور ہو جائیں گے۔

اور وہ کرب و بے چینی جس میں یہ مومنین، اتنا عرصہ تک، ان مخالفین کے ہاتھوں مبتلا رہے ہیں، سب ختم ہو جائے گی۔ (ان مخالفین میں سے کچھ تو ختم ہو جائیں گے اور باقی تائب ہو کر اسلام لے آئیں گے۔ تمہیں اس پر تعجب تو ضرور ہو گا کہ ان کے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی خدا کی طرف سے ان کے لئے باز آفرینی کا دروازہ کُھلا رہے گا؟ ہاں! وہ کُھلا رہے گا)۔ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو شخص (یا قوم) بھی چاہے کہ خدا اپنی عنایات کو اس کی طرف مبذول کر دے (اور وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لے) تو خدا اپنی توجہات اس کی طرف پھیر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اُس کے اُس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ عالمِ انسانیت میں خدا اپنی ذمہ داریاں انسانوں (جماعتِ مومنین) کے ہاتھوں پوری کرتا ہے؛ براہِ راست ایسا نہیں کرتا۔ اس ضمن

خُدا اپنی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پُوری کراتا ہے

ہیں مطالب الفرقان، جلد اوّل، صفحات ۱۷۹-۱۸۴ اور جلد چہارم صفحات ۲۶۰، ۲۷۷-۳۷۳ ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں کہا کہ کشمکشِ حق و باطل میں خدا ان مخالفوں کو سرنگوں کرنا چاہتا ہے (یُخۡزِھِمۡ) اور تمہیں ان پر غلبہ عطا کرنا چاہتا ہے (یَنۡصُرۡکُمۡ عَلَیۡھِمۡ) لیکن یہ سب کچھ کرانا تمہارے ہاتھوں ہی سے چاہتا ہے (یُعَذِّبۡھُمُ اللّٰہُ بِاَیۡدِیۡکُمۡ) یہ ہے خدا اور بندۂ مومن کا تعلق۔ خدا اپنے مقاصد کی تکمیل جماعتِ مومنین کے ذریعے کرتا ہے، براہِ راست خود نہیں کرتا (حالانکہ وہ ایسا کرنے پر ہر آن قادر ہے)۔

چونکہ خدا کے مقاصد مومنین کے ہاتھوں ہی سے حاصل ہوتے اور تکمیل تک پہنچتے ہیں اس لئے مومن کی ساری زندگی جدّوجہدِ مسلسل کی زندگی ہوگی۔ یہ نہیں کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا اور پھر سمجھ لیا کہ اس سے وہ جنت کا مستحق ہوگیا ہے اسے کچھ اور کرنا ہی نہیں:

۹/۱۶ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَلَمۡ یَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلَا رَسُوۡلِہٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلِیۡجَۃً ؕ وَ اللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۠

اے جماعتِ مومنین! کیا تم سمجھ رہے ہو کہ چونکہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا ہے اس لئے اب تمہارے لئے سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جائے گا اور تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یہ خیالِ خام ہے۔ دعوائے ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے مصروفِ جدّوجہد رہتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ اور جماعتِ مومنین کے سوا کسی کو اپنا دوست اور رازدار نہیں بناتا۔ یاد رکھو! خدا کی نگاہ تمہارے کاموں پر ہوتی ہے۔ فقط ایمان کا دعوے کافی نہیں ہوتا (۲/۲۱۴؛ ۳/۱۴۱؛ ۲-۲۹/۱)۔

اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے [انڈکس میں "مومنین" کا عنوان دیکھئے اور جنگ (جہاد) کا عنوان بھی]۔ آیت زیر نظر کی تحدّی قلبِ حساس میں لرزش پیدا کر دیتی ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا...... کیا تم اس وہم و گمان میں مبتلا ہو؟ کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو؟ کیا تمہاری یہ خوش فہمی ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ تم، جو جی میں آئے، کرو (یا نہ کرو) جنت کا پٹّا تمہارے نام لکھ دیا گیا ہے؟ وہ تمہاری ہو چکی ہے؟ اس میں تمہارا گھر بن چکا ہے؟ حالانکہ ابھی تک یہ دیکھا ہی نہیں گیا کہ تم وہ کام بھی کرتے ہو یا نہیں جو تمہیں جنت کا مستحق بنائیں گے۔

جنّت کا استحقاق

خدا کی اس وارننگ نے ہماری خوش فہمی اور خود فریبی کی کتنی ہی خیالی جنتوں کو ہم سے چھین لیا! اس سے آپ نے سمجھ لیا کہ ہمیں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے سے کیوں روکا جاتا ہے؟ اس لئے کہ اس سے ہمارے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی جنت فروشی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِس سے اُن کے اِس اعلان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ ـــــ جس نے کہہ دیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

قرآن کی رُو سے جنت اتنی ارزاں نہیں مل جاتی ۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ نے یہ حقیقت نکھار کر بیان کر دی کہ خدا کی میزان میں وزن اعمال کا ہے، الفاظ کا نہیں۔

اس سلسلہ میں حسبِ ذیل روایت کو ہمارے ہاں کے واعظ بڑی خوش عقیدگی سے، جھُوم جھُوم اور گا گا کر بیان کرتے ہیں۔ روایت کا ایک حصّہ تو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور دوسرا حضرت عمرؓ کی طرف۔ میں نے اسے ملخصاً اپنی کتاب شاہکارِ رسالت (صفحہ ۷۵) میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

> روایت ہے کہ ایک دفعہ نبئ اکرمؐ تنہا کسی طرف تشریف لے گئے۔ جب آپؐ کی واپسی میں دیر ہو گئی، تو صحابہؓ کو تشویش لاحق ہوئی اور وہ آپؐ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے آپؐ کو ایک باغ کے اندر پا لیا۔ حضورؐ نے انہیں اپنے نعلین (جوتے) عنایت فرمائے اور کہا کہ انہیں لے جاؤ اور جو شخص بھی باہر ملے اسے میری طرف سے خوشخبری دے دو کہ جس شخص نے بھی کلمۂ شہادت پڑھ لیا، وہ جنت میں چلا جائے گا۔

اگلا حصّہ حضرت عمرؓ سے متعلق ہے اور وہ یوں کہ:

حضرت ابو ہریرہؓ باغ سے باہر آئے تو سب سے پہلے ان کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی. جب انہوں نے حضورؐ کی دی ہوئی خوشخبری آپ کو سنائی تو آپ (حضرت عمرؓ) نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا کہ ابو ہریرہؓ! اسی وقت رسول اللہؐ کی طرف واپس چلو. جب یہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں پہنچے، تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ابو ہریرہؓ کو اس خوش خبری کے عام کر دینے سے کیوں روکا؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ:

حضورؐ! ایسا نہ کیجئے. مجھے ڈر ہے کہ لوگ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے. انہیں عمل کرنے دیجئے.

اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا! انہیں عمل کرنے دیجئے. (بحوالہ طنطاوی، عمرؓ ابن خطاب)

روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضعی ہے. جو رسولؐ اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ تاکید کرے کہ:

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو میں تمہیں خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکوں گا.

کیا وہ اس قسم کا اِذنِ عام جاری کر دے گا کہ جس نے کلمہ پڑھا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا؟ باقی رہا روایت کا وہ حصّہ جس کا تعلق حضرت عمرؓ سے ہے، تو وضع کرنے والے نے اس سے (بزعمِ خویش) حضرت عمرؓ کا مقام تو بہت بلند کر دیا لیکن یہ نہ سوچا کہ اس سے اُس نے حضور نبیٔ اکرمؐ کو (معاذ اللہ) کس مقام پر پہنچا دیا!

بہر حال، قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تم اس زعمِ باطل میں مبتلا نہ ہو جانا کہ محض کلمہ پڑھ لینے سے تم جنت میں چلے جاؤ گے (۳/۱۴۱) اس کے لئے تو عمر بھر مجاہدانہ زندگی بسر کرنی ہو گی.

اس کے بعد چند آیات میں وضاحت سے بتایا کہ مومن کی زندگی کیا ہے اور اس کا مطلوب و مقصود کیا. سب سے پہلے یہ واضح کیا کہ خدا کا متعیّن فرمودہ پروگرام اُن لوگوں کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچے گا جو خالصتہً اُس کے احکام کی اطاعت کریں گے. جو ان سے انکار کریں گے، تو وہ ایک طرف رہے. جو اس میں کسی اور کی بھی اطاعت شامل کریں گے، وہ بھی اس میں حصّہ نہیں لے سکیں گے. فرمایا!

(۹/۱۷) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ○

یہ بھی سُن رکھو کہ تمہارا نظام، خالص قوانینِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ ایک خدا کے قوانین و احکام کے اطاعت گزار نہ ہوں، بلکہ مختلف نظریاتِ زندگی کے حامل ہوں، تمہارے نظام کا قیام ان کے ہاتھوں سے نہیں ہوگا۔ یہ تمہاری مساجد (یعنی نظامِ خداوندی کے قیام و نفاذ کے مراکز) کی آبادی کا باعث نہیں ہوسکتے۔ یہ ان کی بربادی کا باعث بنیں گے (۱۸/۷۲)۔ نہ ہی اس نظام کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوگا جو تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کریں (۹/۱۰۷)۔ یہ بھی درحقیقت مشرک ہی ہوتے ہیں (۳۰/۳۱)۔ ان کا تو وجود ہی اس حقیقت کی شہادت ہے کہ یہ اس نظام کے خلاف ہیں۔ یہ اپنے کفر و شرک پر اپنے خلاف خود آپ گواہ ہیں۔

(بہرحال، تم ان سے بالکل خائف نہ ہو) جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس سے کبھی وہ نتائج مرتب نہیں ہوں گے جو ان کے پیشِ نظر ہیں۔ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ وہ کبھی ثمر بار نہیں ہوسکیں گی۔

مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۱۵) میں بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کی رُو سے "مسجد" کا مفہوم کیا ہے۔ اس سے مراد وہ عمارت ہی نہیں جس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسجد کا یہ محدود مفہوم مذہب کا پیدا کردہ ہے

مسجد کا مفہوم

جس میں عبادت کے معنی پرستش ہوتے ہیں اور مسجد پرستش گاہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے مساجد، اسلامی نظام کے مراکز کا نام ہے جن میں جملہ کاروبارِ مملکت سرانجام پاتے تھے۔ کعبہ، یعنی مسجد الحرام کو ان سب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس سورہ کی آیت نمبر ۱ (۹/۱) میں بتایا گیا ہے کہ کعبہ کے ملتِ اسلامیہ کی تولیت میں آجانے کے بعد، مملکت کی طرف سے اعلان کردیا گیا تھا کہ اب اس کے نظم و نسق سے مشرکین کو کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ اسے خالصتہً امتِ مسلمہ

سرانجام دے گی۔ اسی کا اعادہ زیرِ نظر آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ حصّہ "لَا" ہے۔ اگلی آیت کا متن "اِلَّا" سے متعلق ہے۔ جس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ــــ

9/18 اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ ○

نظامِ خداوندی کے مراکز کی تعمیر اور آبادی صرف ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوگی جو خدا اور اس کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اُخروی پر یقین رکھیں اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور ان کے دل میں، قانونِ خداوندی کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سامنے سعادت اور خوشگواری کی راہ کھلی دیکھ لیں گے۔

اس کے بعد ایک ایسا اہم اصول سامنے لایا گیا ہے جو مذہب اور دین کے فرق کو اُبھار کر سامنے لے آتا ہے۔ فرمایا:

9/19 اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ○

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور خانۂ کعبہ کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دینے سے، انسان اُس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ اُخروی پر ایمان رکھے اور نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے مسلسل جدّوجہد کرے۔ (تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ سمجھو) معیارِ خداوندی کے مطابق یہ کبھی برابر

نہیں ہو سکتے۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مشیت کبھی ایسے لوگوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا جو ظلم سے باز نہ آئیں (اور اس قسم کے خیراتی کام کر کے اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہم نے بڑا تیر مارا ہے۔ حقیقی عمل اُس نظام کا قیام ہے جس سے دنیا میں ظلم باقی نہ رہے)۔

مذہبی مراسم کی ادائیگی سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ (۲/۱۷۷) میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ مذہب اور دین میں فرق کیا ہے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان، جلد سوم صفحہ ۱۵۴ میں ملے گی، نیز جلد اوّل صفحہ ۸۴ میں قرآن کریم کی رُو سے، مذہب نام ہے پرستش کی چند رسومات ادا کر دینے کا اور دین سے مراد ہے پورے کا پورا نظامِ زندگی۔ زیرِ نظر آیت میں اسی بنیادی حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ایک زاویہ نگاہ یہ ہے کہ مذہبی رسوم و شعائر کو میکانکی طور پر ادا کر لیا جائے تو فریضۂ خداوندی ادا ہو جاتا ہے۔ دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ خدا کے ہر مقرر کردہ پروگرام کے حصول کے لئے مسلسل مصروفِ جدّ و جہد رہنا دین کا مقصود ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات خدا کی نگاہ میں یکساں نہیں۔ اوّل الذکر حاملین کو اس نے "راہ گم کردہ ظالم" قرار دیا ہے۔ اسلام کو مذہب قرار دینے والوں کے لئے یہ نکتہ دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ وہ انہیں راہ گم کردہ ظالمین قرار دیتا ہے۔

(ضمناً) متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے اجزائے ایمان پانچ ہیں، اللہ، رسلؑ، ملائکہ، کتب، آخرت پر ایمان۔ کہیں کہیں وہ، ان میں سے بعض کا ذکر (اختصاراً) کرتا ہے، بعض کا نہیں۔ وہ ان میں سے کسی کا ذکر کرے یا نہ کرے، اجزائے ایمان بہرحال یہ تمام (پانچ کے پانچ) ہیں۔

اگلی دو آیات میں اس اجمال کی تفصیل بیان کر دی؛

(۹/ ۲۰-۲۲) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ

مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین حیات پر یقین رکھتے ہیں اور نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان و مال سے مسلسل جدّوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے اسے بلا تأمل چھوڑ دیتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے مدارج، معیارِ خداوندی کے مطابق، بہت بلند ہیں اور یہی لوگ کامیاب و کامران اور فائز المرام ہیں۔

ان کا نشوونما دینے والا انہیں اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لئے سامانِ نشوونما اور عنایاتِ خداوندی کی فراوانی ہوگی۔ انہوں نے اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے یکسر ہم آہنگ کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی خوشگوار زندگی ہے جس میں سدا بہار نعمتیں ہوں گی۔

یہ لوگ زندگی کی ان شادابیوں سے ہمیشہ بہرہ یاب رہیں گے اور آپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کتنا بڑا اجر ملتا ہے۔

یہ ہے مومن کی زندگی اور دین کے تقاضے۔ جنت کی طرف لے جانے والے یہی راستے ہیں۔

سابقہ جلدوں میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کو بڑی شدت سے روکا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اپنا دوست اور رازدان نہ بنائیں۔ (انڈکس میں "کفار کے ساتھ تعلقات" کا عنوان دیکھئے۔ نیز زیرِ نظر باب میں آیت (۹/۱۶) جو ابھی ابھی گزر چکی ہے)۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے، آئندہ دو آیات میں پوری وضاحت اور سخت تاکید کے ساتھ دُہرا دیا۔ فرمایا:

(۹ / ۲۴-۲۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ
اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ
ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ
فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

اے ایمان والو! (اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سے سمجھ لو کہ آئینِ خداوندی کی رُو سے، اپنوں اور بیگانوں کی تفریق نسلوں اور خاندانی رشتوں کی بنا پر نہیں ہوگی، بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک کی رُو سے ہوگی۔ لہٰذا، اور تو اور،) اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کریں، تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ۔ یاد رکھو! اس تنبیہ کے بعد بھی جو انہیں دوست رکھے گا، تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ یہ قانونِ خداوندی سے سرکشی کے مرادف ہوگا۔

(اے رسولؐ!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہلِ خاندان اور مال و دولت جو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو، اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) اور اس (کے قیام و بقا) کی راہ میں جدوجہد سے، زیادہ عزیز ہوگی، تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اُس کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر، اِدھر اُدھر نکل جائے۔

آپ نے دین کا تقاضا ملاحظہ فرمالیا! اس کے بعد آپ دیکھئے کہ جو لوگ مسلموں اور غیر مسلموں کو

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات

ملاکر، ایک (متحدہ) قومیت متشکل کرنے کے دعویدار تھے (اور آج بھی اسی سُر کو الاپتے چلے جاتے ہیں) بارگاہِ قرآنی سے انہیں کیا جواب ملتا ہے؟ عزیزوں، رشتہ داروں تک ہی نہیں، اگر اسلامی مملکت و نظام کے مقابلہ میں دُنیا کی کوئی متاع اور کشش بھی زیادہ عزیز ہوگئی تو قوم گمراہ ہوگئی اور اس کا شمار فاسقین کے زمرہ میں ہوگا۔ قرآن نے دین کو اَلْعَقَبَۃُ (۹۰/۱۲) سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ تو وہ اسی قسم کے صبر آزما مقامات کی بنا پر کہا ہے۔ اسلام میں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

عشق میں ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

عرب جاہلیت میں زندگی قبائلی تھی اور قبیلہ کی تشکیل نسبی رشتوں کی بنا پر ہوتی تھی یہی رشتہ دار ایک دوسرے کی اعانت اور تقویت کا موجب ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے تشکیلِ امت کا اصول ایمان کا اشتراک قرار دیا جس کی وجہ سے ان عزیزوں، رشتہ داروں سے نہ صرف قطعِ علائق کرنا پڑا بلکہ وہ مخالفین کی صف میں کھڑے ہوگئے۔ جو لوگ ہزارہا سال سے قبائلی (یعنی رشتہ داری) کی جتھہ بندی کی زندگی کے خوگر تھے، ان کے لئے یہ تبدیلی بڑی جرأت آزما تھی۔ اُن کے دل میں یہ خیال اُبھرتا ہوگا کہ اگر کل کو کوئی مصیبت آپڑی تو ہمارا معاون اور مددگار کون ہوگا! اُن کے اِس واہمہ کے ازالہ کے لئے انہیں یاد دلایا کہ جو لڑائیاں انہوں نے لڑی ہیں، ان میں نہ صرف یہ کہ انہیں اُن سابقہ "اپنوں" کی حمایت اور اعانت حاصل نہیں تھی، وہ لڑائیاں خود اُنہی "اپنوں" کے خلاف لڑی گئی تھیں۔ اُن سے کہا کہ تم سوچو کہ ان لڑائیوں میں تمہاری مدد کس نے کی تھی؟ ان لڑائیوں میں سے بھی مثال کسی ایسی جنگ کی نہیں دی جس میں مسلمانوں کا شروع سے آخر تک پلڑا بھاری رہا ہو۔ مثال اُس جنگ کی دی جس میں انہیں ایسی شکست ہوئی تھی کہ ان کے

جنگِ حنین کی یاددہانی

لشکر کا پتا نشان تک نہیں ملتا تھا۔ اس قسم کی شکست کے بعد انہیں اُسی میدان میں، اُس وقت نہایت قابلِ رشک کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ یہ جنگِ حنین تھی جس کی یاد قرآن نے دلائی ہے۔ یہ جنگ، فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں لڑی گئی تھی:

(۹ ۲۵-۲۶) لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ

إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا
وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم
مُّدْبِرِينَ ۞ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ
وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ
عَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۞

(تم ان چیزوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہو اور اپنے ان رشتہ داروں سے اس لئے تعلقات وابستہ رکھنا چاہتے ہو کہ تمہیں یاد رہے کہ ان کے بغیر تم بے یار و مددگار رہ جاؤ گے. حالانکہ تم خود مشاہدہ کر چکے ہو کہ اللہ نے بہت سے نازک مواقع پر کس طرح تمہاری مدد کی ہے. بالخصوص جنگِ حنین کے موقع پر، جب تم اپنی تعداد کی کثرت پر اترا گئے، لیکن دشمن کے مقابلے میں، تمہاری کثرت، تمہارے کسی کام نہ آسکی اور زمین، اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھے.

پھر اللہ نے مومنین اور اپنے رسولؐ کے دل میں سکون پیدا کر دیا (۴۸/۴) اور (تمہارے قلوب کی دنیا میں) وہ لشکر اتارے جنہیں تم آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے (۸/۱۰ ; ۹/۴۰ ; ۳/۱۲۵ ; ۴۱/۳۰). جب اس طرح تمہارے دلوں کو سکون حاصل ہوگیا تو میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا اور فریقِ مخالف کو سخت سزا ملی ــــ زندگی کی صحیح روش سے انکار کرنے والوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے.

قرآنِ کریم میں جنگِ حنین کا ذکر اسی مقام پر آیا ہے. تاریخ سے اس کی جو تفاصیل سامنے آتی ہیں، وہ درج ذیل ہیں؛

مکہ عربوں کا قومی مرکز تھا. اس کے فتح ہو جانے سے مختلف قبائل کے حوصلے پست ہوگئے اور انہوں نے جوق در جوق آکر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا (يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ

اَفْوَاجًا (پ ۳۰) واضح رہے کہ مکہ فتح ہونے پر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا؛ لیکن ہوازن اور ثقیف کے دو جنگجو قبیلے ایسے تھے جن کی آتشِ حسد و عداوت اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے بڑے شد و مد سے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان، حنین کی وادی میں، دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ بدر اور احزاب کے زمانہ میں مسلمان کمزور اور قلیل التعداد ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنی قوتِ بازو سے کہیں زیادہ بھروسا تائید و نصرتِ قوانینِ خداوندی پر ہوتا تھا۔ حنین کی جنگ میں قریب بارہ ہزار کی مسلح فوج، ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ، اس دبدبہ اور طنطنہ سے صف آرا ہوئی کہ بعض مجاہدین کی زبان پر بے اختیار آ گیا کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے؟ دنیا میں مادی قوتیں نہایت ضروری ہیں، لیکن اگر مادی قوتیں، قوتِ قلب (جسے قوتِ ایمانی کہتے ہیں) کو کمزور کرنے کا باعث بن جائیں تو یہی مادی قوتیں اس قوم کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ قوتِ ایمانی کی کمزوری کے معنی یہ ہیں کہ انسان ان اصول و اقدار کے مقابلہ میں جن کے تابع مادی قوت کو رکھا جاتا ہے، مادی قوت کو زیادہ اہمیت دے دے۔ یہ

شکست

بات کسی وقت یونہی سہواً بھی ہو جاتی ہے۔ یہی چیز اُس وقت ہوئی تھی۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست کھائی کہ بارہ ہزار کے لشکر کا کچھ پتا ہی نہ تھا کہ کہاں تتر بتر ہو گیا۔ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی، دشمنوں کا ریلا بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ اپنی فوج شکست کھا کر بھاگ رہی تھی۔ اس خلفشار میں ایک پیکرِ استقامت تھا جو روشنی کے بلند مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ پریشانی، نہ مایوسی تھی اور نہ ہزیمت کے کوئی آثار۔ یہ پیکرِ ہمت و استقلال خود ذاتِ گرامی تھی جنابِ محمد رسول اللہ کی۔ اس تشتت و انتشار کے عالم میں آپؐ نے پوری جمعیتِ خاطر سے دائیں طرف مڑ کر آواز دی کہ یا معشر الانصار! نہ معلوم اس آواز میں کیا اثر تھا کہ بھاگنے والوں کے قدم وہیں رک گئے اور پوری دل جمعی سے آواز دی کہ لبیک یا رسول اللہ لبیک! پھر حضورؐ نے بائیں جانب

یہی صدا بلند کی اور اس کا یہی جواب گونج کر واپس آیا۔ پھر آپؐ نے دشمنوں کو مخاطب کر کے آواز دی کہ " اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب " (بحوالہ بخاری) " میں خدا کا پیغمبر ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں"۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ باطل ہم پر غالب آجائے۔ چند ثانیوں میں پوری فوج پھر اسی مرکزِ حق و صداقت کے گرد جمع تھی اور اس کے بعد ایک ہی حملہ میں میدان صاف تھا۔　　　(معراجِ انسانیت صفحات ۲۸۹-۲۸۸، پانچواں ایڈیشن (طلوعِ اسلام) ۱۹۹۴ء)

یہ تھی وہ نصرت و اعانت جو انہیں ایسی پریشانی اور درماندگی کے عالم میں ملی تھی۔ یہ مدد قبائل کی طرف سے نہیں حاصل تھی، قوانینِ خداوندی کے اتباع سے میسر آئی تھی۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ یہ قوانین ابدی ہیں اور جب بھی کوئی ان پر عمل پیرا ہوگا، ان کے نتائج سامنے آجائیں گے۔

(۹/۲۷) ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

اور خدا کا یہ قانون اس کے بعد بھی جاری و ساری ہے کہ جس جماعت سے کوئی غلطی ہو جائے اور اس کے بعد وہ اپنی اصلاح کر لے، تو خدا کی برکات پھر اس جماعت کی طرف لوٹ کر آجاتی ہیں (یعنی ایک بار کی لغزش سے قوم ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو جاتی)۔ قانونِ خداوندی میں، لغزش کے مضر اثرات سے حفاظت اور رحمت کی گنجائش بھی رکھ دی گئی ہے۔

حنینؔ کی جنگ کے عواقب میں (تاریخ میں) دو ایک ایسے مراحل کا ذکر آتا ہے جو، جہاں فکری اعتبار سے بڑے بلند ہیں، وہاں سوز و گداز کی ایک دنیا بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں ـــــ سوز و گداز کا یہ عالم ہے کہ میں قریب پچاس سال سے مسلسل قرآنِ مجید کو وجہِ شادابیٔ قلب و نگاہ بناتے ہوئے ہوں لیکن میری کیفیت یہ ہے کہ میں جب بھی غزوۂ حنینؔ کے اِن مقامات پر پہنچتا ہوں، بلا ساختہ دل میں جذبات کا تلاطم برپا ہو جاتا ہے جو آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے۔ یہ بخیلی ہوگی اگر میں قارئین کو اس میٹھے درد کی لذت میں شریک نہ کروں۔

طائف کا محاصرہ

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج کفار طائف میں جا کر جمع ہو گئی۔ حضورؐ نے جا کر شہر کا محاصرہ کیا۔ بیس دن تک محاصرہ رہا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا زور ٹوٹ چکا ہے تو آپؐ محاصرہ اٹھا کر واپس تشریف لے آئے۔

حنین میں بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ اس کی تقسیم میں حضورؐ نے یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ قریش مکہ میں سے جو لوگ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے اُن کی تالیفِ قلوب کے لئے انہیں زیادہ حصہ دیا جائے (واضح رہے کہ تالیفِ قلب سے مراد "رشوت" یا لالچ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے دین کی خاطر کسی قسم کا نقصان اٹھایا ہو، اُن کے اس نقصان کی تلافی کر کے ان کی دلجوئی کا سامان کر دیا جائے)۔ اس سے انصار کے بعض افراد کے دل میں غالباً یہ خیال اُبھرا کہ یہ لوگ چونکہ

مالِ غنیمت کی تقسیم

رسولؐ اللہ اور مہاجرین کے اہلِ قبیلہ اور اعزّہ و اقارب ہیں، اس لئے انہیں زیادہ مال دیا گیا ہے۔ نبی کریمؐ کو بحیثیتِ امیرِ ملّت، تقسیم غنیمت کے کلّی اختیارات حاصل تھے۔ آپؐ کے فیصلوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے اس خیال کو اُبھرنے سے روک دیتے، لیکن یہ مستبدانہ آمریت تصوّر میں بھی نہیں لائی جا سکتی تھی۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جو ایک طرف فنِ بلاغت میں اعجاز کا حکم رکھتا ہے اور دوسری طرف اُن قلبی تعلقات کو نکھار کر سامنے لا رہا ہے جو حضورؐ کو انصار کے ساتھ تھے۔ حضورؐ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا؛

"کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تم میں اتّفاق و ائتلاف پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے تمہیں دولت مند کر دیا؟" آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور انصارؓ ایک ایک فقرہ پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ نہیں تم ٹھیک جواب نہیں دے رہے۔ تم یہ جواب دو کہ:

محمدؐ! جب اور لوگوں نے تجھے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ جب لوگوں نے تجھے

چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی. تو مفلس آیا تھا ہم نے تیری ہر طرح کی مدد کی!
یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ کہتے جاؤ اور میں ایک ایک فقرے پر کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو. اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ:
اے انصارؓ! یہ سب سچ ہے، لیکن کیا تم یہ پسند نہیں کرو گے کہ یہ لوگ اُونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ!
اب کسے یارائے ضبط تھا. مجمع کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے پکار کر کہا کہ یا رسولؐ اللہ! انہیں سب کچھ دے دیجئے اور ہمارے لئے صرف "محمدؐ" کو رہنے دیجئے.

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دُعا کے بعد

اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں. اس کے بعد حضورؐ نے انہیں سمجھایا کہ اس رعایت سے کیا مقصود[1] تھا. اور یوں اُن کے "دل" کے ساتھ "دماغ" کو بھی مطمئن کر دیا کہ حضورؐ کا فیصلہ کس طرح عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ اسلام میں بات منوائی ہی دل اور دماغ کے پورے پورے اطمینان کے ساتھ جاتی ہے. اس میں نہ آمرانہ استبداد ہوتا ہے اور نہ ہی خالص جذباتی اپیل. اس میں "عشق اور زیرکی" دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے.
حنین کے چھ ہزار قیدی ابھی تک محصور تھے. آپؐ نے انتظار کیا کہ ان کے اعزہ و اقارب آئیں تو فدیہ کی بات کی جائے. لیکن ان میں سے کوئی نہ آیا تو آپؐ نے ' ایک سفارت کی درخواست پر ' سب کو احساناً چھوڑ دیا کہ یہی قرآن کا حکم ہے. فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴/۴۷)　　(معراجِ انسانیت صفحات ۲۹۰-۲۹۱)

جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کے مدعی اس حکمِ خداوندی اور عملِ رسولؐ اللہ پر غور کریں.

[1] بحوالہ بخاری و فتح الباری.

غیر مسلم اعزہ و اقربا سے قطعِ علائق کی تاکید کے بعد پھر دین کی اس اصل کو دہرایا کہ ــــــ حق و باطل میں شراکت نہیں ہو سکتی، اس لئے مشرکین کو نظم و نسقِ مملکتِ اسلامیہ میں دخیل اور شریک مت کر۔

۹/۲۸ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُواْ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦٓ إِن شَآءَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو بھی سمجھ رکھو کہ (کعبہ کی تولیت اس قوم کے ہاتھ میں رہ سکتی ہے جو خدائے واحد کے قوانین کی مطیع و محکوم ہو۔ مشرکین کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا) ان کی قلبی نجاست کی وجہ سے انہیں، اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ نظامِ خداوندی کے اس پاکیزہ مرکز کو ملوث کریں۔ اس لئے، یہ مشرکین، اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب تک نہ جائیں۔ اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ ان کے یہاں نہ آنے سے تمہیں کاروبار میں نقصان ہوگا اور تم مفلس ہو جاؤ گے، تو اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق تمہیں اس قدر سامانِ رزق عطا کر دے گا کہ تم کسی کے محتاج اور دست نگر نہیں رہو گے۔ یاد رکھو! خدا جب کسی بات کا حکم دیتا ہے تو اسے اس کا خوب علم ہوتا ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ اس کے پروگرام میں، اس کے لئے بھی ضروری تدابیر موجود ہوتی ہیں۔

نجس کے معنی

یہاں پر کہا گیا ہے کہ مشرک نجس ہیں، انہیں مسجد الحرام کے قریب نہ آنے دو۔ تو نجس کے معنی جسمانی کثافت یا آلودگی نہیں۔ امام راغب نے کہا ہے کہ نجاست دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو محسوس ہو اور دوسری وہ جسے چشمِ بصیرت سے دیکھا جا سکے، جیسے دل کی آلودگی، نگاہ کی ناپاکی (لغات القرآن، مادہ ن۔ ج۔ س)۔ یہاں مشرکین کی اسی نجاست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیئے!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ (۵۶/۷۹) ــــــ "مطہرین کے سوا اسے کوئی مَس نہیں کر سکتا"۔ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کے حقائق و معارف کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غیر قرآنی معتقدات، تصورات، نظریات اور خیالات کو قلب و دماغ سے نکال کر، دل و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔ اسی طہارت (پاکیزگی) کے مقابلہ میں مشرکین کی نجاست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ویسے مسجد الحرام یا قرآنِ کریم کے پاس آنے کے لئے قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ جسمانی پاکیزگی کی اہمیت بھی واضح اور ایک نفسیاتی تقاضا ہے (ہو سکتا ہے کہ مملکت کے سیاسی مصالح کے پیشِ نظر ان دشمنوں کو کچھ وقت کے لئے اسلام کے مرکز، مکہ میں آنے سے روک بھی دیا گیا ہو)۔

یہ جو کہا گیا کہ تمہیں یہ خطرہ لاحق ہے کہ مشرکین کو ادھر آنے سے روک دیا گیا تو اس سے تمہارے کاروبار پر مضر اثر پڑے گا تو اس خدشہ کی وجہ یہ تھی کہ مکہ تمام قبائلِ عرب اور دیگر غیر عرب بستیوں کا کاروباری مرکز بھی تھا۔ قرآنِ کریم نے ان سے کہا کہ اوّل تو اسلامی مملکت کے اس قدر عظیم مقاصد کے مقابلہ میں اگر تمہیں کچھ مالی نقصان بھی ہو جائے تو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے (۹/۲۴)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اس کا بھی یقین دلا دیا کہ تمہیں یہ نقصان بھی نہیں ہوگا۔ اسلام کا معاشی نظام ایسا ہمہ گیر ہے کہ وہ اس قسم کے بدیہی موانعات کے باوجود یوں ثمر بار ہوگا کہ تمہیں کسی کا محتاج نہیں ہونے دے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کے نزدیک معاشی تقاضوں کو بھی کس قدر اہمیت حاصل ہے!

ــــــ O ــــــ

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی اوّلین مخاطب قوم دو گروہوں میں منقسم تھی۔ ایک مشرکینِ عرب جن سے مراد ایسے لوگ تھے جو نہ کسی خاص مذہب کے پابند تھے اور نہ ہی کسی آسمانی کتاب کی پیروی کے مدعی۔ دوسرے، اہلِ کتاب تھے جن سے مراد ایسے لوگ تھے جو اپنے آپ کو انبیاء سابقہ میں سے کسی نبی کا متبع کہتے تھے۔ انہیں قرآن، اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے، جن میں سرِ فہرست یہودی اور عیسائی تھے (انڈکس میں "اہلِ کتاب" کے تحت تفصیلات ملیں گی)۔ قرآنِ کریم کا رسالتِ محمدیہ پر ایمان لانے کا مطالبہ عالمگیر انسانیت سے تھا، جس کے معنی یہ تھے کہ وہ اہلِ کتاب سے بھی اسی طرح ایمان کا مطالبہ کرتا تھا جس طرح مشرکینِ عرب سے۔ اس کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۸۳، جلد دوم

صفحہ ۱۸۲، جلد سوم صفحہ ۷۳ نیز انڈکس)۔
مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کی تفصیلات سابقہ آیات میں سامنے آ چکی ہیں۔ اگلی آیت میں اہلِ کتاب کے ساتھ جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا:

(۹/۲۹) قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ۝

مشرکین کے علاوہ اُن اہلِ کتاب سے بھی جنگ کرو، جن کا یہ حال ہے کہ وہ نہ تو خدا اور آخرت پر (اس طرح) ایمان رکھتے ہیں (جس طرح تم ایمان رکھتے ہو ۲/۱۳۷) اور نہ ہی اُن امور کو اپنے اوپر واجب ٹھہراتے ہیں جنہیں نظامِ خداوندی واجب قرار دیتا ہے اور نہ ہی اس حق و صداقت پر مبنی نظام کی اطاعت اختیار کرتے ہیں (یعنی اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین و احکام کا احترام اور اطاعت نہیں کرتے) تا آنکہ ان کی سرکشی کی قوت ٹوٹ جائے۔ وہ حکومت سے معاہدہ کریں جس کی رُو سے حکومت ان کی جان، مال، آبرو، معابد وغیرہ کی حفاظت کا ذمہ لے اور وہ اس حفاظت و آسائش کے عوض، حکومت کا ٹیکس ادا کریں (اس طرح، وہ اس مملکت میں امن و امان سے باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں)۔

جزیہ کا مفہوم | اس آیت میں جزیہ کا لفظ آیا ہے جو ان اعتراضات کے پیشِ نظر جو غیر مسلم (بالخصوص عیسائی) اس کے خلاف عائد کرتے چلے آ رہے ہیں، تفصیلی وضاحت کا متقاضی ہے۔

اسے ہم اپنی کتاب 'شاہکارِ رسالت' سے پیش کرتے ہیں:

جزیہ کا لفظ قرآنِ کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ اس کے لغوی معانی اور جس مقام پر قرآنِ کریم میں یہ لفظ آیا ہے، اس سے اس کا پورا پورا مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ ذمی یا اہل الذمہ کے الفاظ قرآنِ کریم میں

جزیہ اور ذمّی

نہیں آتے۔ یہ جزیہ کا لازمی یا فطری نتیجہ تھے۔ یا یوں کہیئے کہ جزیہ اور ذمّہ لازم و ملزوم تھے۔ اب ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لایئے۔

قرآنِ کریم میں جن مقاصد کے لئے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے یا جن حالات میں ان پر جنگ کرنا فرض ہو جاتا ہے، ان کی تفصیل سابقہ باب (جہاد) میں دی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ مختصراً یہ کہ اسلام میں جنگ کی اجازت (یا حکم) حسبِ ذیل حالات میں ہے؛

۱۔ اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے۔

۲۔ مظلومین کی امداد کے لئے، خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں بھی ہوں۔

۳۔ اگر کسی جگہ لاقانونیت پھیل جائے اور کوئی قدرِ انسانیت محفوظ نہ رہے، تو اس کی روک تھام کے لئے۔

۴۔ غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لئے۔

جب اسلامی مملکت ان مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتی تھی تو یہ نہیں کہ اس علاقہ پر یکایک حملہ کر دیا جاتا تھا۔ وہ وہاں کی حکومت اور باشندوں پر واضح کرتی تھی کہ ان کے خلاف اس اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ اس کے بعد ان کے سامنے تین شرطیں رکھ دی جاتی تھیں۔

۱۔ اگر تم برضا و رغبت، دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، اسلام کو سچا دین سمجھو تو اسے اختیار کرلو۔ اس صورت میں، تم ہم میں سے ہو جاؤ گے۔

۲۔ اگر ایسا نہیں چاہتے تو تم صرف ہمارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کرلو۔ تمہاری مملکت بھی تمہارے پاس رہے گی اور ہم تمہاری جان و مال، عزت، آبرو، مذہب، معابد، غرضیکہ ہر قابلِ حفاظت شے کی حفاظت کا ذمّہ لیں گے۔ اور

۳۔ اگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا۔

یہ صورت تھی جنگ سے پہلے کی۔ اگر معاملہ جنگ تک پہنچ جاتا اور اس علاقہ کو فتح کر لیا جاتا تو اس مفتوح قوم کے سامنے، پہلی دو شکلیں پھر سے رکھ دی جاتیں، یعنی اگر بطیبِ خاطر اسلام لانا چاہو تو ہم میں سے ہو جاؤ اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر ہمارے اقتدار کی برتری تسلیم کرکے، ہماری ذمّہ داری قبول کرلو۔ جو قوم اس پر رضامند ہو جاتی اس سے معاہدہ کر لیا جاتا —— یعنی مفتوح قوم کے ساتھ معاہدہ —— اگر وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوتے تو پھر ان کے ملک کو اپنے زیرِ اقتدار لے آیا جاتا۔ جو قوم اس دوسری شرط کو قبول کر لیتی،

یعنی اسلامی مملکت کے زیرِ حفاظت آجانے کی شرط کو، تو اس سے تھوڑا سا ٹیکس وصول کر لیا جاتا۔ اسے جِزیہ کہا جاتا ہے۔ جِزیہ کے لغوی معنی ہیں کسی خدمت کا صلہ یا معاوضہ۔ ایسا معاوضہ جو اس خدمت کے لئے کافی سمجھا جائے اور اس سے زیادہ کچھ اور طلب نہ کیا جائے۔ اگرچہ بظاہر یہ ٹیکس، اُس حفاظت کے بدلے میں لیا جاتا تھا جس کی ذمہ داری اسلامی مملکت پر عائد ہو جاتی تھی۔ لیکن درحقیقت یہ علامت Token ہوتی تھی اس امر کی کہ اس قوم نے اسلامی حکومت کے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لیا ہے اور عہد کیا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہیں کرے گی۔ (لغت میں، لفظ جِزیہ معاہدہ کے معنوں میں بھی آتا ہے) چنانچہ قرآنِ کریم میں جس مقام پر یہ لفظ آیا ہے، وہاں سے اس مفہوم کی وضاحت سامنے آجاتی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو۔ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (۹/۲۹) تا آنکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر، تمہارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لیں (وَهُمْ صٰغِرُوْنَ) اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

جِزیہ کی رقم

جِزیہ کی رقم کتنی ہوتی تھی، اس کے متعلق تاریخ میں مختلف بیانات ملتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی مقدار ہر قوم کے حالات کے مطابق ہوتی تھی۔ لیکن تاریخ میں جو زیادہ سے زیادہ شرح ملتی ہے اسے امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں اس طرح درج کیا ہے کہ مالداروں سے اڑتالیس درہم سالانہ، متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم اور کم آمدنی والوں سے بارہ درہم۔ واضح رہے کہ درہم تقریباً ایک چونّی کے برابر ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے جِزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بارہ روپے فی کس سالانہ اور کم از کم تین روپے سالانہ ہوتی تھی۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج، محتاج اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ یہ قلیل سی رقم انہیں ادا کرنی پڑتی تھی اور اس کے عوض انہیں، ان کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، معابد، حتّٰی کہ ان کی مملکت کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی تھی۔ آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں اس سے زیادہ سستا سودا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! آپ صرف اپنے گھر کی رکھوالی کے لئے چوکیدار ملازم رکھیں، تو ایک روپیہ ماہوار (بارہ روپے سالانہ) پر وہ کبھی نہیں ملے گا! اور پھر یہ معاملہ کیا جاتا تھا مفتوحہ قوم کے ساتھ۔ یہ ضمانت، زبانی کلامی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے ان کے ساتھ باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوتا تھا۔ ان معاہدات کی تفصیل تو "فتوحات" کے سلسلہ میں سامنے آئے گی لیکن

ذمیوں کے ساتھ معاہدات

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ اتنی سی رقم کے عوض مفتوحہ اقوام کو کس کس قسم کے تحفظات کی ضمانت دی

جاتی تھی۔ اس مقام پر دو ایک معاہدات کا (مثال کے طور پر) درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ خود حضور رسالتمآبؐ نے جو معاہدہ کیا تھا اُس کے الفاظ یہ تھے۔

> نجران اور اس کے گردوپیش کے باشندے' اللہ کے جوار (ہمسائیگی) اور محمدؐ رسول اللہ کی ذمہ داری میں ہیں۔ ان کے اموال' جانیں' اراضیات' مذہب' ان کے غائب اور حاضر خاندان' ان کی عبادت گاہیں غرضیکہ ان کی ہر چیز جو ان کے قبضہ میں ہے' تھوڑی ہو یا بہت' سب محفوظ رہیں گی۔ کسی پادری کو اس کے منصب سے' کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے' کسی کاہن کو اس کی کہانت سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ نہ کوئی شخص ان کے کسی فرد کو نقصان پہنچائے گا' نہ ہی ان پر کسی قسم کی سختی کی جائے گی' نہ ہی کوئی اور ان پر حملہ آور ہو سکے گا۔ ان میں کا جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا' اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اس طرح کہ ان میں نہ کوئی ظالم ہوگا نہ مظلوم۔ کسی کے جرم کی وجہ سے کسی اور کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

رسول اللہؐ کے بعد' حضرت صدیق اکبرؓ نے اس معاہدہ کی باقاعدہ تجدید کی اور ایسا ہی حضرت عمرؓ نے بھی کیا۔ لیکن ان کے دورِ خلافت میں' اہلِ نجران نے سازشیں اور بغاوتیں شروع کر دیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ وہ شام اور عراق کی طرف منتقل ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں انہیں یہ فرمان لکھ کر دیا کہ:

> ان میں سے جو شخص جانا چاہے' وہ ہر طرح سے محفوظ رہے گا اور کوئی مسلمان انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے معاہدات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے گی۔

انہیں اس امر کی ضمانت دی اور عراق اور شام کے گورنروں کو لکھ کر بھیجا کہ:

۱۔ جس علاقے میں یہ اہلِ نجران آباد ہوں' انہیں فراخدلی کے ساتھ زمینیں دی جائیں۔

۲۔ مسلمان ان کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کریں۔

۳۔ کوئی دوسرا بھی ان پر ظلم نہ کرنے پائے۔ اگر اس کی نوبت آجائے تو مسلمان خود اس کی مدافعت کریں۔

۴۔ انہیں دو سال تک سرکاری محاصلات کی معافی دی جائے۔

اسی طرح جب' خیبر کے یہودیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا' تو ان کی تمام غیرمنقولہ

جائداد (باغات اور زمینوں) کا حساب لگا کر، رقم ان کے حوالے کر دی۔

۲۔ دوسرا عہدنامہ جسے ہم مثال کے طور پر درج کرنا چاہتے ہیں، وہ ہے جسے حضرت عمرؓ نے باشندگانِ ایلیاء (بیت المقدس) کو لکھ کر دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذَا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ یہ وہ امان نامہ ہے جو عبداللہ[1] (اللہ کے بندے) عمرؓ امیر المؤمنین نے اہلِ ایلیاء کو لکھ کر دیا ہے۔

> یہ امان، ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ہے۔ اس طرح پر کہ نہ ان کے گرجاؤں کو ڈھایا جائے گا، نہ انہیں مسکن بنایا جائے گا۔ حتّٰی کہ ان کے احاطے کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں یا ان کی جائدادوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جائیگا۔ نہ ہی ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جائے گی۔ ایلیاء میں ان کے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔ اہلِ ایلیاء پر فرض ہوگا کہ وہ دیگر شہروں کی طرح جزیہ ادا کریں اور یونانیوں اور چوروں کو اپنے ہاں سے نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال محفوظ رہیں گے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ میں پہنچ جائے۔ جو ایلیاء ہی میں رہنا چاہے اسے بھی امن ہوگا بشرطیکہ وہ بھی اہلِ ایلیاء کی طرح جزیہ ادا کرے۔ ایلیاء والوں میں سے جو لوگ یونانیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں، ان کے جان و مال اور صلیبوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جائیں۔ اگر یہ لوگ اپنی فصلوں کے کاٹنے تک یہاں رہنا چاہیں تو بھی انہیں ہر طرح کا امن ہوگا۔

جو کچھ اس امان نامہ میں تحریر ہے اس پر خدا، رسول کا، خلفاء کا اور تمام مسلمانوں کا ذمہ ہے۔

[1] اپنے آپ کو عبداللہ (اللہ کا بندہ، محکوم) کہنا ازرہِ انکسار نہیں۔ یہ عظیم انقلابی اعلان ہے۔ مومن دنیا میں کسی (بڑی سے بڑی) طاقت کا بھی محکوم (عبد) نہیں ہوتا۔ وہ صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہوتا ہے۔ اسی لئے (قرآنی شہادت کے مطابق) ہر رسول سب سے پہلے اسی عبدیّت (صرف خدا کی محکومیت) کا اعلان کر کے، دنیا کی ہر طاقت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہے۔ یہی اعتراف و اعلان اُن رسولوں کے متبعین کرتے تھے — خدا کے عبد اور ساری کائنات کے حاکم۔

اس ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ آپؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک مکتوب میں لکھا:۔

> اپنے لشکر کو ذمیوں کی بستیوں سے دور ٹھہراؤ اور وہاں صرف وہی لوگ جائیں جن کی دیانت پر تمہیں پورا پورا اعتماد ہو۔ وہاں کے کسی باشندے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے کیونکہ ان کی عزت اور حرمت کا تم نے ذمہ لے رکھا ہے اور تم پر اس کی پابندی لازم ہے۔ اہل ذمہ پر کسی قسم کا ظلم کر کے، دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔

اُس دورِ ہمایوں میں، پابندیٔ عہد کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں دیکھ کر آج کا انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔

معاہدات کی پابندی کی احتیاط کی انتہا

حضرت عبادہؓ بن صامت، ایک دفعہ دمشق کے ایک گاؤں کے قریب سے گزرے۔ رفیقِ سفر سے کہا کہ گاؤں کے کسی درخت سے مسواک کاٹ لایئے۔ وہ اُٹھا ہی تھا کہ آپ نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا ہے، اس میں اس قسم کی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیں یہاں سے مسواک نہیں لینی چاہیئے۔ اسی طرح، حضرت ابو دردا ؓ کا جب کسی اہل ذمہ کے گاؤں پر سے گزر ہوتا اور آپ وہاں پانی پینے یا جانور کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو روانگی کے وقت، ایک ایک پائی کا حساب کر کے قیمت ادا کر دیتے اور اس میں یہ کہہ کر کچھ زاید بھی شامل کر دیتے کہ ہم ان کے درختوں کے سائے تلے بھی تو بیٹھے تھے۔ اس آسائش کا بھی معاوضہ دینا چاہیئے۔

اسے نہ بھولیئے کہ یہ ان کے مفتوحہ علاقے تھے اور وہاں کے باشندے ان کے محکوم!

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اہل الذمہ اپنے مذہب کے معاملات میں آزاد ہوتے تھے۔ "مذہب" میں ان کے

اہل الذمہ کے شخصی قوانین

عقائد، پرستش اور دیگر مذہبی رسوم ہی شامل نہیں تھے۔ اس میں ان کے شخصی قوانین Personal Laws بھی شامل تھے اور ان معاملات میں وہ اپنے مقدمات کے فیصلے بھی آپ ہی کر لینے کے مجاز تھے۔ انہیں اپنے رسوم و رواج کی کس حد تک آزادی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے ہیں تو اذرعات کے عیسائی باجے بجاتے اور پھول برساتے آپ کے استقبال کے لئے نکلے۔ آپ نے انہیں روکنا چاہا تو حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ سے کہا کہ انہیں ان کے حال پر رہنے دیجئے۔ روکئے نہیں۔ انہیں ان کے رسوم و رواج کی آزادی ہے۔ (اس سے واضح ہے کہ اگر کسی معاہد قوم کے رسوم و رواج ہمارے دین

سے نہیں ٹکراتے، تو انہیں اس کی بھی آزادی ہو گی کہ وہ اس کا مظاہرہ خود مسلمانوں کے سامنے بھی کر سکیں، عیسائی اہل الذمّہ کو اس کی بھی اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنی عید کے دن صلیب کا جلوس نکال لیں اور دن رات میں جب جی چاہئے ناقوس بجائیں، البتہ نماز کے اوقات اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔

اُن کی زبان

حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کی دفاتری زبان بھی نہیں بدلی تھی۔ اسلام سے پہلے عراق کا دفتر فارسی زبان میں، شام کا رومی زبان میں اور مصر کا قبطی زبان میں تھا۔ ان ممالک کے فتح ہونے کے بعد، دفاتری کاروبار انہی زبانوں میں باقی رکھا گیا۔

بہرحال، یہ ہے جزیہ کی حقیقت اور ذمّیوں کے ساتھ صدرِ اوّل کی اسلامی حکومتوں کا سلوک۔ اس جزیہ کی حقیقت اور اُن ذمّیوں کے ساتھ سلوک جن کے متعلق غیر مسلم مصنّفین (بالخصوص عیسائیوں) نے اس قسم کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ ان کے الفاظ کے سنتے ہی، ایک ناواقف کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو دنیا کی وحشی ترین قوم خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت تھی صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی جن کی حکومت اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل تھی اور جن کی سیرت حضور نبی اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی۔

مُسلمان بادشاہوں کی روش

ان کے بعد، سلاطین نے کیا کیا، اس کا ذمّہ دار نہ اسلام ہے، نہ صدرِ اوّل کے مسلمان۔ اس کے ذمّہ دار وہ خود ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کے جرائم کی سزا (بیچارے) اسلام کو بھگتنی پڑتی ہے۔ (میری اس کوشش کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ صدرِ اوّل کی تاریخ (یعنی قرآنی معیار کے مطابق صحیح تاریخ) دنیا کے سامنے پیش کی جائے تاکہ اسلام کے دامن سے وہ دھبے دُھل سکیں جو ہماری نادانستہ عاقبت نااندیشیوں یا دانستہ مفاد پرستیوں نے اس پر ڈال رکھے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

○

یہ تو رہے آئینی اور قانونی تحفّظات جو ان غیر مسلم ذمّیوں کو حاصل تھے۔ بہ حیثیت انسان اُن کے احترام کی کیا کیفیت تھی، اس کا اندازہ ایک ایسے واقعہ سے لگائیے جو قامت میں کہتر ہے لیکن قیمت میں

ل فقہ کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کے خنزیر یا خمر کو ضائع کر دے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ (درالمختار)

دُرِّ یتیم کی طرح بے بہا۔ ایک دفعہ حمص کے حاکم حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے ایک ذمی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے :

" اَخزٰکَ اللّٰہُ ۔۔۔۔۔ خدا تجھے رسوا کرے ۔۔۔۔۔۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تأسف ہوا کہ سیدھے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو کر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور کہا کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں اس منصب کا اہل ہی نہیں۔ بہتیرا سمجھایا لیکن وہ استعفیٰ واپس لینے پر آمادہ نہ ہوتے۔

(شاہکار رسالت صفحہ ۳۲۵)

اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب یہ لوگ پہلے ہی خدا پر ایمان رکھتے تھے، تو ان سے پھر خدا پر ایمان لانے کے مطالبہ کے کیا معنی تھے؟ وہ خدا پر کس قسم کا ایمان رکھتے تھے، اس کی تشریح اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ :

۹/۳۰ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ○

(یہ اہلِ کتاب وہ ہیں، کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آجانے کے بعد بھی ان کی حالت یہ رہی کہ ان میں سے) یہودیوں نے، مصری دیوتا عزیر OSIRIS کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی اور عیسائیوں نے مسیح کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ کیا اسے "خدا پر ایمان" کہا جائے گا؟ اگر یہ خدا پر ایمان ہے، تو پھر کفر و شرک کسے کہا جائے گا؟ یہ بلا سوچے سمجھے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں جن کی ان کے پاس اس کے سوا کوئی سند اور دلیل نہیں کہ وہ لوگ جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، اس قسم کے عقائد رکھتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ۔۔۔۔۔ خدا انہیں غارت کرے۔ یہ صحیح راستے کو چھوڑ کر کس طرف بہکے بہکے چلے جاتے ہیں؟

عزیر کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۴ پر تشریح کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو اور "خدا" بنا رکھے تھے ان کے متعلق کہا؛

۹/۳۱ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

(اتنا ہی نہیں، بلکہ) یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کو، خدا سے ورے ہی، اپنا خدا بنا لیتے ہیں (اور ان کی خود ساختہ شریعت کو دینِ خداوندی سمجھنے لگ جاتے ہیں) اور مسیح ابنِ مریم کو بھی خدا تسلیم کر رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ صرف خدائے واحد کی اطاعت اختیار کریں۔ اس کے سوا کائنات میں کسی اور کا اقتدار و اختیار نہیں۔ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریکِ حکم کر لیا جائے (۱۸/۲۶ ؛ ۱۸/۱۱۰)۔

احبار و رہبان کو خدا کس طرح بنایا جاتا ہے اس کی وضاحت ایک حدیث میں اس طرح کی گئی ہے:

حضرت عدی بن حاتمؓ سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا ــــ عدی! اس بت کو گلے سے اتار پھینک۔ اُس وقت آپؐ سورۃ توبہ کی (مندرجہ بالا) آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا ــ یا رسول اللہ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا؛ کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے، اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال قرار دیتے ہیں اور تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے، اسے یہ لوگ حرام کہہ دیتے ہیں اور تم اسے حرام سمجھنے لگ جاتے ہو؟ میں نے کہا کہ بے شک واقعہ یہی ہے۔ تو فرمایا کہ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے۔ (جامع بیان العلم ۔ ابنِ عبد)

خود ہم نے اپنے احبار و رہبان (فقہاء، علماء، مشائخ) کو کس طرح خدا بنا رکھا ہے، اس کے متعلق گزشتہ

جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے جلد چہارم صفحہ ۵۵۲ - ۵۵۱) ہمارے ہاں حلال و حرام کا تعین فقہ کی مرتب کردہ فہرستوں کی رو سے ہوتا ہے، نہ کہ خدا کی کتاب کی رو سے۔ فقہ حنفی کی مشہور اور بنیادی کتاب **ھدایۃ** کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ھدایۃ کالقرآن ـــ ہدایہ قرآن کی مثل ہے''ـــ ان تفصیلات کے لئے انڈکس میں عنوانات ـــ احبار و رہبان، مذہبی پیشوائیت، فقہ اور فقہاء، حرام اور حلال وغیرہ دیکھئے اور ان کا گہرے غور و فکر سے مطالعہ کیجئے تاکہ ہم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے کہ ہم بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو کچھ وہ قومیں کر رہی تھیں جن کے مسلک اور معتقدات کی قرآن کریم اس شدت سے مخالفت اور تردید کرتا ہے۔ ہم قرآن میں یہ کچھ پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ تنبیہات اور تنذیرات اقوامِ سابقہ یا دیگر مذاہب کے متبعین کے متعلق ہیں۔ ہم سے ان کا تعلق نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس خود فریبی سے ہم خدا کے عذاب سے تو نہیں بچ سکتے جو اس قسم کے شرک کا لازمی نتیجہ ہے (اور ہم صدیوں سے اس عذاب میں مبتلا چلے آ رہے ہیں)۔

جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کو خدا بنا لینے کا تعلق ہے، انڈکس میں عنوانات ''عیسیٰؑ اور مسیح'' دیکھئے۔ اس باب میں بھی ہم نے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق جو عقائد وضع کر رکھے ہیں، اس کے لئے انڈکس میں عنوان ''غلو'' دیکھئے۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ یا دیگر مذاہب کے متبعین کو جن جن امور سے منع کیا تھا، ہم وہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن انہیں باطل پرست اور اپنے آپ کو حق کے پیرو سمجھتے ہیں! لیکن اس خود فریبی سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔

جیسا کہ سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آ چکا ہے، نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت مشرکین عرب کی طرف سے بھی ہوئی تھی اور اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی طرف سے بھی۔ یہ مخالفت کس بات کی تھی؟ یہ لوگ انسانوں کے وضع کردہ قوانین و ضوابط یا رسوم و مناسک کا اتباع کرتے تھے اور قرآن کی دعوت یہ تھی کہ اتباع و اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے، غیر اللہ کی نہیں خواہ اسے انبیاءؑ کی طرف (غلط) منسوب کر دیا جائے اور خواہ وہ علماء و مشائخ کے وضع کردہ ہوں ـــ یعنی خدا کی اطاعت بالمقابل انسانوں کی اطاعت ـــ قرآن نے ان کی مخالفت کے متعلق کہا:

۹/۳۲ يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے اس نور (قرآن) کو جو انہیں اس قسم کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے آیا ہے (۱۴/۱، ۵) پھونکیں مار مار کر بجھا دیں (۶۱/۸) لیکن ان کی ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا (یعنی اس نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب کرے گا) خواہ یہ بات ان مخالف لوگوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔

شمع قرآنی کو بجھانے کی مذموم کوششیں

نور اللہ سے مراد خدا کی راہنمائی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر وحیِ خداوندی کو نور سے تشبیہ دی ہے اور جہاں یہ نور (روشنی) نہیں اسے ظلمات (تاریکیاں) کہہ کر پکارا ہے۔ دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۲۹۲ (نیز ۱۴/۱: ۵۷/۹)۔ سورۃ النور (اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) میں فضائے کائنات میں پھیلی ہوئی آسمانی راہ نمائی کو اللہ کا نور کہا گیا ہے جسے محسوس شکل میں قرآن کے الفاظ میں محفوظ کر دیا گیا ہے (۲۴/۳۵) (تشریح اس آیت کی اپنے مقام پر آئے گی)۔ سورۃ المائدہ میں اہلِ کتاب سے کہا گیا ہے: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵/۱۵)۔ "تمہاری طرف منجانب اللہ ایک نور آ گیا یعنی یہ کتابِ مبین"۔ سورۃ الاعراف میں جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا ہے: وَاتَّبَعُوا

نور

النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ (۷/۱۵۷)۔ "وہ اس نور کا اتباع کرتے ہیں جسے رسول اللہ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (۴/۱۷۵)۔ "اے نوعِ انسان! تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف واضح دلائل و براہین آ گئے یعنی اس نے تمہاری طرف درخشندہ روشنی نازل کر دی"۔ سورۃ الزمر میں اسلام کو نور کہا گیا ہے (۳۹/۲۲)۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۴۵۰ پر بتایا جا چکا ہے، قرآن کو نُور اور نورِ مبین کہنے میں ایک لطیف اور بلیغ یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ یہ خود بھی روشن ہے اور انسانی زندگی کی تاریک راہوں کو بھی روشن کرتا ہے۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں

ہوتی۔ روشن چراغ کو کسی دوسرے دیئے سے تلاش نہیں کیا جاتا۔ اس کی اپنی روشنی دیکھنے والے کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ قرآن کریم خود قرآن سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے خارجی سہاروں کی ضرورت نہیں۔ البتہ جس طرح چراغ کی روشنی سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے، اسی طرح قرآنی تعلیم سے وہی فیض یاب ہو سکتا ہے جو علم اور عقل سے کام لے۔ قرآن کی روشنی اور عقل کی آنکھ، آسمانی راہنمائی سے مستفید ہونے کے لئے کافی ہے۔

پھر روشنی کا خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر شے کے متعلق واضح کر دیتی ہے کہ اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ تاریکی میں آپ رسی کو سانپ سمجھنے لگتے ہیں۔ روشنی آجانے کے بعد نظر آجاتا ہے کہ وہ رسی ہے سانپ نہیں۔ کافروں پر یہ روشنی اس لئے گراں گزرتی ہے کہ جن ہستیوں کو انہوں نے خدا بنا رکھا ہے، یہ روشنی ان کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔

آیت زیر نظر میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس چراغ کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں لیکن ان کی یہ سعی لاحاصل کارگر نہیں ہو سکے گی۔ سورۃ النور کی جس آیت (۲۴/۳۵) کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اس میں نور قرآن کو ایک مثال کی رُو سے یوں سمجھایا گیا ہے کہ (گویا) ایک جگمگاتا چراغ ہے جو ایسے طاق میں رکھا گیا ہے جو تین اطراف سے بند ہے کہ ہر طرح محفوظ رہے اور سامنے سے کھلا ہے کہ اس کی روشنی فضا میں پھیل سکے۔ اس چراغ کو شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں کوئی چیز حائل نہ ہو اور ہر طرف کی مخالف ہواؤں سے محفوظ بھی رہے۔ دورِ حاضر کی ایجاد کی رُو سے یوں سمجھئے کہ یہ ایک بجلی کا قُمقمہ (بلب) ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بلب کی روشنی کو پھونکوں سے بجھایا نہیں جا سکتا۔ قرآن کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں مخالفت کی کس قدر آندھیاں اُٹھیں، کس قدر جھکڑ چلے، لیکن قرآن کے کسی ایک حرف کو مٹانا تو ایک طرف اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکے۔

لیکن اس سے صرف قرآن کی محفوظیت ثابت ہوئی۔ اسے محفوظ رکھنے کا مقصد اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا:

(۹/۳۳) هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ

كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○

اللہ نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ حیات یعنی دینِ حق دے کر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ یہ
نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آئے، خواہ یہ بات اُن لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ
گزرے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریکِ حکومت کرنا چاہتے ہیں (۴۸/۲۸)۔

(آیات (۳۳- ۳۲/ ۹) کو (۹ - ۸/ ۶۱) میں بھی دہرایا گیا ہے اور (۳۳/ ۹) کو (۴۸/۲۸) میں)۔

قرآنی نظام غالب آ کر رہے گا

یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے بڑی اہم ہے اور اس کے غیر قرآنی مفہوم سے جو غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جائے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ بعثتِ نبی اکرمؐ اور نزولِ قرآن سے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے جو نظامِ زندگی (الدّین) متعین کیا ہے، وہ انسانوں کے خودساختہ تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائے، یعنی انسان اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرے اور اس طرح ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرے۔

سب سے پہلے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جاچکا ہے) اسلام، دین ہے، مذہب نہیں۔ یہ جو ہم آئے دن اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں سے ان کے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی افضلیت ثابت کرتے ہیں، یہ اصولی طور پر بےمعنی ہے۔ جب اسلام مذہب ہے ہی نہیں، تو اس کا مذاہب سے مقابلہ کیا؟ اسلام ایک نظامِ حیات ہے۔ اس کا دنیا کے نظامہائے حیات کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً شہنشاہی نظامِ حکومت، آمریت، مغربی جمہوریت، سیکولرازم، نیشنلزم، انٹرنیشنلزم، نظامِ سرمایہ داری، سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ کے ساتھ مقابلہ۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ یہ تمام غیر خدائی نظامہائے حیات پر غالب آجائے تو اس سے یہی مراد ہے۔ مذاہب نے تو اپنی موت آپ مرجانا ہے، اس لئے مذاہب پر غالب آنے کے معنی کیا؟

اسلام ایک نظامِ حیات (اَلدّین) ہے، جسے قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ نظام، دنیا کے ہر نظام پر غالب آئے گا۔

اس نظام کے غالب آنے کی ایک شکل یہ ہے کہ جو قوم اس نظام کو اپنے ہاں تشکیل کرے، اگر کسی

دوسرے نظام کی حامل قوم، اس نظام کو ناکام بنانے کے لئے اس سے متصادم ہوگئی، تو وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ اس نظام کی حامل قوم، مخالف قوم پر غالب آئے گی۔ عہدِ نبی اکرمؐ میں یہ نظام کس طرح متشکل ہوا تھا، اسے قرآنِ کریم کی آیات (۴۸/۲۸-۲۹) میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس جماعت کو جس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوا تھا، کہیں امتِ مسلمہ کہیں جماعتِ مومنین اور کہیں حزب اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان پر کوئی قوم غالب نہیں آسکے گی۔ اصولی طور پر کہا گیا ہے کہ

اسلام کے غلبے سے مراد

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۵۸/۲۱) ـــ "اللہ نے یہ لکھ دیا ہے، اس کا غیر متبدل قانون ہے کہ وہ (خدا) اور اس کے رسولؐ غالب آکر رہیں گے، اس لئے کہ خدا (کا نظام) بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔" اگلی آیت میں اُن قوموں کو جن کے ہاتھوں اس نظام کو یہ غلبہ حاصل ہوگا حزب اللہ کہا اور اعلان کردیا کہ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲) ـــ "یہ اللہ کی پارٹی ہے جو یقیناً کامیاب ہوگی۔" اور اس کی مخالف پارٹی جسے حزبُ الشیطان کہا گیا ہے ناکام رہے گی (۵۸/۱۹) (نیز ۵/۵۶: مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۳۱)۔ دوسری جگہ انہیں "خدا کے لشکر" کہا گیا (۳۷/۱۷۳)۔ سورۃ النّساء میں اور بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا (۴/۱۴۱)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۴۲۷۔ سورۃ آلِ عمران میں کہا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (۳/۱۳۹) "تم مومن ہو تو تم سب پر غالب رہوگے۔" صدرِ اوّل میں جب جماعتِ مومنین نے اس نظام کو متشکل کیا تھا، تو یہ تمام دعاوی سچ ثابت ہوکر سامنے آگئے تھے۔ یہ دین کے غلبہ اور جماعتِ مومنین کے اعلَون ہونے کی پہلی شکل تھی۔ ان امور کی مزید تفصیل کے لئے مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۰۲ اور ۳۶۲)، جلد سوم (صفحہ ۳۰۲) اور جلد چہارم (صفحہ ۲۶۳) بھی دیکھئے۔

آپ دیکھیں گے کہ ان تمام آیات میں جن میں اس جماعت کے غلبہ و تسلّط اور برتری و افضلیت کا ذکر آگیا ہے، اسے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ سے مشروط کیا گیا ہے، یعنی یہ صورت اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک تم اس نظام کو باقی رکھوگے۔ اگر تم نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو تم دنیا کی باقی قوموں جیسی ایک قوم بن جاؤ گے جن کا بس نام "مسلمان" ہوگا۔ ان دونوں حیثیتوں سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے، اس کے متعلق فارس کے شکست خوردہ گورنر، ہرمزان نے جو کچھ حضرت عمرؓ سے کہا تھا، عبرت و بصیرت کی ہزار داستانیں

ہرمزان کا حقیقت کُشا بیان

اپنے اندر رکھتا ہے۔ جب وہ قیدی ہو کر حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تو آپ نے اسے کہا کہ ہرمزان! میں تم سے ایک اہم سوال کا جواب سننا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے حالت یہ تھی کہ تم (ایرانی) ہم عربوں کو اس قدر حقیر اور کمزور سمجھتے تھے کہ ہمارے ساتھ جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعث ننگ تصوّر کیا کرتے تھے۔ اب وہی ہم عرب ہیں اور وہی تم ایرانی۔ لیکن حالت یہ ہے کہ عرب تمہاری سلطنت کے علاقوں کے علاقے فتح کئے جا رہے ہیں۔ تمہارے سپاہی تو ایک طرف، افسروں تک کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے چلے جا رہے ہیں۔ تمہارا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگے بھاگے پھر رہا ہے۔ یہ انقلاب کس طرح واقع ہو گیا؟

اُس نے کہا کہ عمرؓ! بات بڑی صاف اور سیدھی ہے۔ پہلے جب ہماری جنگ تمہارے ساتھ ہوتی تھی، تو ایک طرف ہم ہوتے اور دوسری طرف تم (عرب)۔ اب جنگ میں ایک طرف ہم (ایرانی) تنہا ہوتے ہیں اور دوسری طرف" تم اور تمہارا خدا"۔ ان دونوں قوتوں کا مقابلہ کرنا ایرانی تو ایک طرف، دنیا کی کسی طاقت کے بس کی بھی بات نہیں۔

یہ تھی لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ کی عملی تفسیر۔ مسلمان دنیا کی غالب ترین قوم تھے جب خدا کا نظام اُن کے ساتھ تھا۔ جب اُنہوں نے اسے چھوڑ دیا تو یہ "بے یار و مددگار" رہ گئے۔

سوال یہ ہے کہ جب کوئی ایسی قوم نہ رہے جو اس نظام کو قائم کرے یا مستحکم رکھے اور اس طرح یہ نظام (غالب رہنا تو ایک طرف) باقی ہی نہ رہے، تو کیا یہ صورتِ حال ابدی طور پر ایسی ہی رہے گی؟ یہ تو اس نظام کی شکست ہو گی۔

اس سوال نے ہمارے نوجوان طبقہ کو اس قدر متأثر کیا ہے کہ وہ عام طور پر کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ اسلام آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانے میں تو اس قابل تھا کہ ایک اچھا نظام قائم کر سکے لیکن اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے۔ اب اسلام (اُن کے طنز آمیز الفاظ میں) "ایک چلا ہوا کارتوس ہے"۔ وہ اسلام کے مستقبل کے متعلق پہلے ہی مایوس تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت کے احیاء کے نام سے جو ناکام کوششیں ہو رہی ہیں[1]، ان سے وہ دل برداشتہ ہی نہیں، برگشتہ خاطر ہو رہے ہیں اور اسلام کی طرف سے متنفر

---

[1] نوشتہ ۸۳-۱۹۸۲ء

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

ہی نہیں بلکہ سرکش. میں نے اس موضوع پر مطالب الفرقان (جلد اول، صفحہ ۲۴۱ اور ۲۵۸) میں مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی تھی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق تفصیلاً گفتگو کی جائے، اس طرح کہ اس کے تمام گوشے بیک وقت سامنے آجائیں. سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ایک خاص زمانے میں زندہ قوت بننے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے یا اس میں زمانے کی امامت کی اب بھی صلاحیت ہے؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ غیر متبدل، اٹل قوانین کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظیم اس حُسن وخوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے. عام اصطلاح میں انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے. ظاہر ہے کہ یہ قوانین کروڑہا کروڑ سالوں سے اسی طرح کارفرما چلے آرہے ہیں. نہ یہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رُک گئے ہیں، نہ ہی ان کے نتائج واثمار میں کسی قسم کا نقص یا خلفشار رُونما ہوا ہے. مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) تم تخلیقِ خداوندی میں کہیں کوئی خلل نہیں پاؤ گے.

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لئے اٹل قوانین متعین کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار مقرر کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، افراد اور اقوام کو زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی معاشرہ سکون واطمینان کا گہوارا اور عروج وارتقار کا طیارہ بن جاتا ہے.

لیکن اشیائے کائنات اور انسانی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے. اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں. انہیں ان کی خلاف ورزی کا اختیار ہی نہیں لیکن

انسانی دُنیا

انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے. لہٰذا اُسے اس کا اختیار ہے کہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی اختیار کرلے. جب کوئی قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوگی. جب وہ انہیں چھوڑ دے گی تو وہ ذلتوں اور پستیوں کے جہنم میں جا گرے گی. اگرچہ بات بالکل واضح ہے لیکن میں دو ایک مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ دل کی گہرائیوں میں

اُتر جائے۔ ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نسخہ کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے! اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ نسخہ ناکام رہ گیا یا یہ کہیں گے اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر مرض کو پھر بلا لیا؟

یا (مثلاً) ایک شخص کسی خاص مقام تک جانے کے لئے موٹر میں سوار ہوا۔ راستے میں اس نے موٹر کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ریسٹ ہاؤس میں جا کر سو گیا اور یوں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ کہیئے! آپ اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس موٹر میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ اگلا راستہ طے کر سکتی یا اُس مسافر کی تن آسانی کا ماتم کریں گے؛

یا (مثلاً) ایک شخص چھت پر جانے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھا لیکن نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر پہلے بیٹھ گیا اور پھر نیچے اُتر آیا۔ فرمایئے! آپ اس پر یہ کہیں گے کہ اس مکان کی سیڑھیاں بڑی نازک ہیں جو کسی کو چھت تک نہیں لے جا سکتیں یا اس شخص کی دُوں ہمتی کو الزام دیں گے؟

یا (مثلاً) ہمارے ہاں" بائیں طرف چلو Keep to the left ٹریفک کا قانون ہے۔ ایک عرصہ تک ہمارا معاشرہ اس قانون کے مطابق چلتا رہا تو ٹریفک کا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ اس کے بعد ایک دن ہر راہرو یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ میں اس قانون کی پابندی نہیں کروں گا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمایئے! کیا آپ اس سے یہ نتیجہ مرتب کریں گے کہ اس سے پہلے تو اس قانون میں ٹریفک کے حادثات روکنے کی صلاحیت تھی لیکن اس کے بعد اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ بالکل بے کار ہو گیا ہے! یہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی ٹریفک کا ساتھ دے سکے۔

ان مثالوں کے بعد آپ پھر اصل موضوع کی طرف آجایئے۔ اسلام نے زندگی کے کچھ اصول (قوانین) دیئے۔ ایک قوم نے ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کیا۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کی درخشندگی اور تابناکی سے آج بھی تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مجھے اس باب میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں' اس لئے کہ اس سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرتے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چل سکا۔ اس حد تک تو وہ بھی معترف ہیں کہ اسلام نے اُس زمانے میں نہایت شاداب نتائج پیدا کیئے تھے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اس قسم کے نتائج پیدا کرتا چلا جائے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ؛

۱۔ کیا ایسا ہوا تھا کہ وہ قوم ان قوانین پر بدستور عمل پیرا رہی لیکن اس کے باوجود وہ ان ثمر بار نتائج سے محروم ہوگئی جن سے وہ پہلے بہرہ یاب ہوئی تھی یا اس نے ان قوانین کا اتباع چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نتائج سے محروم ہوگئی۔

۲۔ اگر واقعہ یہ ہو کہ وہ قوم ان قوانین کے مطابق بدستور زندگی بسر کرتی رہی، لیکن اس کے باوجود عروج واقبال سے محروم ہوگئی تو پھر یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ آگے چل سکتے۔ لیکن اگر واقعہ اس کے خلاف ہو، یعنی حقیقت یہ ہو کہ اس قوم نے ان قوانین کی پابندی چھوڑ دی تھی تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ اور اگر ان پر آج بھی عمل پیرا ہوا جائے تو اس سے وہی نتائج مرتب ہوسکیں جو اُس زمانے میں ہوئے تھے۔ آیئے! ان سوالات پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں اور جذبات سے الگ ہٹ کر دیکھیں کہ تاریخی شواہد اور واقعاتِ عالم کا مطالعہ ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا

پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا اُس قوم نے اسلام کے اصولوں کا اتباع بدستور جاری رکھا تھا یا انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس سلسلہ میں میں اس مقام پر صرف چند ایک اصولوں کا ذکر کروں گا اور وہ بھی اجمالاً۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے سوال کے جواب میں سامنے آئے گا

۱۔ ملوکیت اسلام نے اصول یہ دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ قوانینِ خداوندی کا نافذ کرنا ہے جن کا اطلاق مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا، حتیٰ کہ ان سے سربراہِ مملکت بھی مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ امت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور معاشرہ میں عزت وتکریم کا معیار جوہرِ ذاتی اور سیرت وکردار کی بلندی ہوگا، نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت وثروت۔ اس اصول نے ملوکیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ افرادِ معاشرہ کو وہ حقیقی آزادی حاصل ہوگئی جس سے ان کی مضمر

صلاحیتیں دنوں میں سرسبز و شاداب ہو کر نکھر اور اُبھر آئیں. اُس قوم نے اپنی ہمعصر اقوام میں جو اس قدر امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا' اس کا بنیادی سبب یہی تھا.

کچھ عرصہ کے بعد اُنہوں نے اسلام کے اس بنیادی اصول سے انحراف برت کر' اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کر لیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو استبدادِ ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے ـــــــ یعنی شرفِ انسانیت کی تذلیل.

۲. برہمنیت اسلام نے یہ اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں. ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہِ راست قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر سکتا ہے. اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو گیا اور یوں اس استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا. اس آزادی سے' انسانوں کو حریتِ فکر و نظر نصیب ہوئی اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوش کے راستے میں بُری طرح حائل تھیں. نتیجہ یہ کہ وہ قوم چند دنوں میں علم و بصیرت کی فضائے بسیط میں بے محابا پرواز کے قابل ہو گئی. اس کے بعد اُس قوم نے اس اصول سے سرکشی برتی اور اپنے ہاں پھر سے برہمنیت کو رائج کر لیا. یہ وہ عذاب ہے جس میں یہ قوم اب تک ماخوذ چلی آرہی ہے.

۳. سرمایہ داری اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجہِ ذلتِ انسانیت ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لئے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو. نظامِ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لے. اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہو گا کہ ذرائعِ پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے. اس سے جہاں تمام افرادِ قوم رزق کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گئے' وہاں معاشرہ ہوسِ زراندوزی کی لعنت سے بھی پاک ہو گیا. اس قسم کے نظام میں عروج و ارتقاء کی راہیں جس برق رفتاری سے کشادہ ہو جاتی ہیں' اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے. لیکن کچھ عرصہ کے بعد' جب اس قوم نے ملوکیت کو اپنے ہاں پھر سے رائج کر لیا' تو نظامِ سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ ہی آگئی. حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' سرمایہ داری' ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں. جب یہ قوم اسلامی اصولوں پر کاربند تھی تو حالت یہ تھی کہ بائیس لاکھ مربع میل پر

پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ (عمر فاروقؓ) کے تہبند پر دس دس بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے لیکن جب ان میں ملوکیت بار پاگئی تو کیفیت یہ تھی کہ اُموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک جب (سیر و تفریح کے لئے نہیں) حج کے لئے چلا ہے تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہوگی کہ اس قوم نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا یا باقی رکھا تھا!

۴۔ تکریمِ انسانیت اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس ایک اصول نے نسلی اور خاندانی تفاوت و امتیازات کی ساری عمارت منہدم کرکے رکھ دی اور وہ خطۂ ارض، مساواتِ انسانیہ کے نور سے جگمگا اٹھا۔ اس معاشرہ میں حبش کا ایک غلام (بلالؓ) سردارانِ قریش سے زیادہ واجب التعظیم قرار دیا گیا کہ سیرت و کردار کی رُو سے وہ اُن سے ممتاز تھا۔ اور امیر المومنین (حضرت عمرؓ) کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے روم کے ایک مزدور (صہیبؓ) کو منتخب کیا گیا۔ نسلی امتیازات اور گروہ بندانہ تفریقات کے مٹنے کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہوگئی۔ یہ وہی چٹان تھی جس سے ٹکرا کر مخالفت کی ہر قوت پاش پاش ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پھر نسلی امتیازات کو بیدار کرلیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ تک تو سلطنت امتِ مسلمہ کی تھی، لیکن اس کے بعد مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ امت کی حکومت کہیں قائم نہیں ہوئی۔ یہ حکومتیں بنوامیہ، بنو عباس، بنو فاطمہ کی تھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۵۔ غلامی تکریمِ انسانیت کا فطری نتیجہ غلامی کا ختم کر دینا ہے ظہورِ اسلام کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عرب معاشرہ میں موجود تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لئے اس لعنت کو ختم کر دیا۔ معاشرہ میں جذب کردہ غلاموں کو مقام کیا دیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب حضرت عمرؓ سے، ان کی شہادت کے وقت کہا گیا کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپ اپنی رائے دیں تو آپ نے کہا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام، سالمؓ موجود ہوتا تو میں خلافت کے لئے اس کا نام تجویز کرتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس قوم نے شرفِ انسانیت کے اس اصول کو ترک کر دیا اور اپنے ہاں غلامی کو پھر رائج کرلیا۔ نتیجہ یہ کہ خلیفہ کے حرم میں ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں ہوتی

تھیں اور بغداد میں ان کی خرید و فروخت کے لئے ایک بازار مخصوص تھا جہاں حکومت کی زیرِ نگرانی انسانیت بکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لئے کہ اس قوم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر پھر سابقہ روش اختیار کر لی تھی، اتنی مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ بنابریں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام نے کچھ وقت کے لئے تو خوشگوار نتائج مرتب کئے تھے لیکن اس کے بعد اس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔

کیا اسلام میں اب بھی اس کی صلاحیت ہے؟

اس کے بعد ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام میں اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے؟ اور اس سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ "اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت" تو ایک طرف، اس چودہ سو سال میں دنیا میں چلا ہی اسلام ہے، کوئی دوسرا نظام چلنے کے قابل ہی نہیں ہوا۔ میرا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے محض جذباتی نعرہ نہیں۔ اس کے لئے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ جو ابدی اصول اور مستقل اقدار، انسانی راہ نمائی کے لئے منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ سورۂ فاطر میں ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (۳۵/۱۰) ان نظریاتِ حیات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو اُبھرتے ہوئے، عروج وارتقاء کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ ان نظریات کو قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے اور ان موانعات کو جو ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اسی کشمکشِ حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) الحق

کائناتی رفتار

باطل پر اپنا نشانہ لگاتا رہتا ہے، تا آنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح ـــــ یا یوں کہیئے کہ ان نظریاتِ حیات کے اپنی

منزلِ مقصود تک پہنچنے کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے۔ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗۤ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) ان کی اس رفتار کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کی رُو سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اسے آپ انسانی تاریخ کی رفتار کہہ لیجئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی کوئی جماعت ان نظریات کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کرلے، تو پھر ان کے نتائج، انسانی حساب و شمار کے مطابق دنوں میں مرتب ہو جاتے ہیں چنانچہ جہاں اس نے کہا ہے کہ: اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ ان نظریات میں از خود اُبھرنے کی صلاحیت موجود ہے، اس کے بعد کہا ہے کہ: وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵/۱۰) انسانی اعمالِ صالح کی قوت انہیں تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان، اپنی عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے، مسائلِ حیات کے حل کرنے کی کوشش میں لگا چلا آرہا ہے۔ غاروں کے زمانے سے لے کر اس دورِ تہذیب و تمدن تک کی تاریخ اس کی انہی کوششوں کی مسلسل داستان ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ Trail and Error کے طریق سے معاملات کو سمجھتی اور سلجھاتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے، اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سیکڑوں برس کی لاتعداد ہی خارا شگافیوں کے بعد، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر کوئی اور نظریہ وضع کرتی ہے اور اسی طریق پر، اس کا تجربہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح صدیوں کے پیہم ناکام تجارب کے بعد وہ کسی صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ عقل کے اس تجرباتی طریق کی رُو سے ایک صحیح نظریہ تک پہنچنے کے لئے، جہاں انسان کو ہزاروں سال کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے، وہاں آگ اور خون کی سیکڑوں خندقیں بھی پھاندنی پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس، وحیٔ خداوندی انسان کو پہلے ہی دن صحیح نظریاتِ حیات عطا کر دیتی ہے۔ ان نظریات کی صداقت کو اعلیٰ وجہ البصیرت، تسلیم کرکے، ان کے مطابق عمل پیرا ہو جانے والی جماعت، ان راستوں کو، جنہیں تنہا عقلِ انسانی نے قرن ہا قرن میں طے کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر جانکاہ مشقتوں کے بعد، چند دنوں میں، نہایت امن و سکون کے ساتھ طے کر جاتی ہے۔ اس طرح ان نظریات کے وہ نتائج، جو عقل کے تجرباتی

طریق کی رو سے، ہزارہا سال میں جاکر برآمد ہونے تھے، چند دنوں میں ظہور پذیر ہوجاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی علم و عقل بھی، رفتہ رفتہ، ان صحیح نظریات تک پہنچ جاتی ہے جنہیں وحی نے عطا کیا تھا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل کی راہیں بڑی طول طویل اور پُر از خطرات و صعوبات ہوتی ہیں اور وحی کی روشنی میں یہ راستہ طرفۃ العین میں طے ہوجاتا ہے اور نہایت امن و سلامتی کے ساتھ ———

افلاطون Plato نے ہزاروں سال پہلے اس حقیقت کو پالیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ،

یہ (اربابِ فکر) کچھ بنائیں گے۔ اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے، تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان، خدائی راستوں سے ہم آہنگ کریں گے۔ Republic

اقبالؒ نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ: ؎

ہر دو امیرِ کارواں، ہر دو بمنزلے رواں
عقل بہ حیلہ می بَرَد، عشق بَرَد کشاں کشاں

صدرِ اوّل میں اسلام

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف آیئے۔ انسان تنہا عقل کی رُو سے، زندگی کے طول طویل راستوں پر گامزن چلا آرہا تھا ——— اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ہڈیاں تڑواتا ——— کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، قندیلِ وحی نے ان راستوں کو یک دم روشن کردیا۔ عرب میں بسنے والی قوم نے اس کے عطا کردہ نظریاتِ حیات کو اپنایا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد اُس قوم نے وحی کی راہنمائی کو چھوڑ دیا اور کاروانِ انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہِ حیات پر گامزن ہوگیا۔ اب اس کی رفتار پھر سُست ہوگئی۔ رفتار تو بے شک سُست ہوگئی لیکن اس کا ہر قدم اُٹھتا اُسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس طرف اسے وحی کی روشنی لے جا رہی تھی ـ چنانچہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے جن غلط نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے تھا اب رفتہ رفتہ انہیں چھوڑتا جا رہا ہے اور ان نظریات کی طرف آرہا ہے جنہیں قرآن نے عطا کیا تھا۔ یہ ہے مطلب میرے اس کہنے کا کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، اسلام ہی آگے چلا ہے۔

اسلام کے خلاف نظریات سب ناکام ثابت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آیئے' اس کی چند ایک مثالیں سامنے لائیں۔

۱۔ حقِ حکومت

چھٹی صدی عیسوی میں' ساری دنیا میں' اندازِ حکومت ملوکیت تھا جس کی رُو سے' راجہ کو ایشور کا اوتار' قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور کسریٰ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ عین اُس ماحول میں قرآن نے آکر کہا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اسے ضابطۂ قوانین' حقِ حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو' کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اس ایک اصول کی رُو سے' قرآن نے' ملوکیت تو ایک طرف' حکومت کی کوئی ایسی شکل باقی نہ رہنے دی جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اب رہا یہ کہ پھر حکومت ہو کس طرح سے؟ اس نے کہا کہ حکومت انسانوں کی نہیں ہوگی' بلکہ ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' باہمی مشاورت سے' اپنے معاملات طے کرے گی (۴۲/۳۸)۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا' اس لئے یہ نظام تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگا۔ اس اصول کے مطابق مسلمانوں نے نظامِ حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجہِ شادابیٔ عالم بن گئے۔ اس کے بعد' اس قوم نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور انسان پھر تنہا عقل کی رُو سے' ایک اطمینان بخش نظامِ حکومت کی تلاش میں چل نکلا۔ اب آپ دیکھئے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں' انسان کا قدم ملوکیت کی طرف اٹھا ہے یا یہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا کسی ایسے نظام کی تلاش کرتا رہا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ وہ اپنی اس تلاش میں' ہزاروں خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کے بعد' اس نظام تک پہنچ پایا ہے جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملوکیت کے مقابلہ میں جمہوری نظام' اسلام سے زیادہ قریب ہے۔

مغرب کا جمہوری نظام

لیکن چونکہ یہ نظام' مستقل اقدار کے تابع نہیں' اس لئے مکمل طور پر اسلامی نظام نہیں بن سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان

اس نظامِ جمہوریت سے مطمئن بھی نہیں۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاستدان اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ مثلاً فرانسیسی مفکر Rene Guenn لکھتا ہے:-

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ پہلے کبھی وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی........ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان میں کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔
>
> Crisis of the Modern World

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

"اکثریت کے فیصلوں" کے متعلق ایک اور مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ:-

> (یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے) اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔
>
> The Crisis of civilization

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ "فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو" سوال یہ ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ معیار، وہ مستقل اقدار ہیں جو وحی کی رُو سے عطا ہوتی ہیں۔ دیکھئے اس باب میں اٹلی کا مشہور مدبّر میزینی کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ انسان (جمہوریت)، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے، خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ حکومت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھیے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

C.F. GRIFFIN INTERPRETTER OF MAN

ہم سمجھتے ہیں کہ میزینی نے بات دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ عصرِ حاضر کی ساری کشمکش یہی ہے۔ میکیاولی اصولِ سیاست جسے سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے، خواہ وہ مارکسی نظام ہو یا مغرب کا جمہوری نظام، کا ملخص یہ ہے کہ دنیا میں غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کوئی نہیں۔ انسان اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے میں اختیارِ مطلق رکھتا ہے۔ اس کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ کہا تھا کہ اگر انسان امن و سلامتی سے ترقی کی راہیں طے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے فیصلوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار مستقل اقدار کو قرار دے۔ میزینی نے یہی کہا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں دیگر مفکرین کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر BREND عصرِ حاضر کی بے لگام سیاست

کے متعلق لکھتا ہے:۔

انسانوں کی کوئی جماعت ہو' ایک فرد کو' ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت ہی جذبات کی آزادی دی جاتی ہے. اگر وہ اپنے جذبات کو' اس محدود حلقہ سے باہر اور ان محدود شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے. لیکن آج کوئی ایسا اقتدار اعلیٰ نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کر سکے. اس لئے اقوام کو اپنے جذبات کو بے لگام چھوڑنے کی پوری آزادی حاصل ہے. آج اقوامِ عالم کی حالت بالکل عہدِ طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اُس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو.

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو!
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں دین سے مراد یہی مستقل اقدارِ خداوندی ہیں' نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ رسوم و عقائد.

جس زمانے میں متحدہ اقوام کا "حقوقِ انسانیت کا منشور" زیرِ تدوین تھا' اس کے ادارہ UNESCO نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کر کے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاستدانوں کے پاس بھیجا. اس ادارہ نے بعد میں' ان مشاہیر کے جوابات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا جس کا تعارف Jacques Maritain نے لکھا تھا. اس نے اس تعارف میں کہا تھا کہ:۔

انسانیت کے حقوق کی Definition کی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے. حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو. اسی کو فلسفۂ زندگی کہا جاتا ہے.

" فلسفۂ زندگی مستقل اقدار کا دوسرا نام ہے. اسی کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات کے متعلق راشڈل لکھتا ہے کہ:۔

ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ:۔

> مستقل اقدار کے معنی یہ نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیئے جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔

Between Man and Man

یہ اقدار ملتی کہاں سے ہیں، اس کے متعلق غور سے سنئے اور سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا کہنے والا کوئی ملّا یا پادری نہیں۔ کہنے والا، عصرِ حاضر کا سب سے بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

> یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں، اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

Out of my later days

جس نظام میں ان اقدار کو نظرانداز کر دیا جائے، اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق، اس عالمگیر شہرت کے حامل دانشور کی زبان سے سنئے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یعنی The making of Humanity کا مصنّف، برفا۔ وہ لکھتا ہے:۔

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے، اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے:۔

> وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہو آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی شخص کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے

اس ناانصافی کی وجہ سے انجامِ کار تباہ ہو جاتی ہے۔

برنؔفانے یہاں کسی نظام کی کامیابی کے لئے عدل کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ عدل کا عمومی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروّجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل کہلائے گا۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے اگر وہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ملک کے قوانین کو اَلحَقّ کے مطابق ہونا چاہیے، یعنی مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق (۷/۱۸۱) تاکہ جو فیصلے اس قانون کے مطابق کئے جائیں وہ فی الواقع مبنی بر عدل کہلا سکیں۔ دیکھئے اس باب میں دورِ حاضر کا ایک مشہور فلسفۂ قانون کا ماہر EMIL BRUNNER کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Justice and the Social order میں لکھتا ہے :۔

عدل کا مفہوم

> جو شخص فی الواقع سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے لوگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔

میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اصول یہ دیا تھا کہ :۔

۱۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس لئے ملوکیت، آمریت وغیرہ سب نظامِ حکومت باطل ہیں۔ انسان کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔

۲۔ لیکن اس مشاورت میں ایک شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف

نہ ہو جو حق مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔

ایک قوم نے آج سے چودہ سو برس پہلے اس اصول کو نظامِ حیات بنایا اور دنیا نے اس کے نتائج دیکھ لئے۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول کو ترک کر دیا اور باقی دنیا کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ گئی۔

۳۔ اس کے بعد عقل کے تجرباتی طریق نے انسان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ملوکیت آمریت وغیرہ نظام غلط ہیں۔ اس کے برعکس نظامِ مشاورت صحیح نظام ہے جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس حد تک دنیا میں اسلام کا پیش کردہ اصول آگے چلا ہے یا وہ اصول جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا اور اسلام نے اسے باطل ٹھہرایا تھا۔

۴۔ لیکن ہمارے زمانہ تک عقلِ انسانی ہنوز اسلامی اصول کے ایک حصہ کو اپنا سکی ہے، یعنی ملوکیت کی جگہ مشاورتی نظام کو۔ اس اصول کے دوسرے حصہ، یعنی یہ کہ اس مشاورت کو مستقل اقدار کے تابع رہنا چاہیئے، تک ابھی نہیں پہنچ سکی۔ بایں ہمہ اسلامی اصول کے اس حصہ کی صداقت اور اہمیت، دورِ حاضر کے مفکرین کی نگاہوں کے سامنے آ رہی ہے اور وہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسے بھی اپنایا جائے۔ وہ دن دُور نہیں جب انسان اس اصول کو اپنانے پر بھی مجبور ہو جائے گا، اس لئے کہ اس نظامِ زندگی کے حیات سوز اور تباہ کن اثرات، جسے عصرِ حاضر نے مستقل اقدار کو نظر انداز کر کے تعمیر کیا، اس قدر نمایاں طور پر سامنے آ رہے ہیں کہ خود وہ قومیں جنہوں نے اس نظام کو متشکل کیا تھا، ان کی وحشت سامانیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اس چیخ و پکار کی تفصیل میں جانے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت[1] ہو گی۔ میں اس مقام پر دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے لارڈ اسنل SNELL نے The New World کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی تھی۔ وہ اس میں کہتا ہے:-

> نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دَور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" جس سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں۔

اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطّوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی ایک مقصد کے لئے ——— کبھی خام پیداوار کے لئے، کبھی مال کی منڈیوں کی تلاش میں، کبھی دفاعی مقصد کی غرض سے ——— وہ لڑائیاں خاندانی وجاہت اور مادّی تفوّق کے لئے ہوتی تھیں۔ لیکن گزشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگِ عظیم) کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت، انسانی قلب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی: نسلی افتخار، جذباتِ تغلّب و تسلّط اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔

لہٰذا، جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظّم شر کی قوّتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانے پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں.........

انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ یہ مصیبتیں نتیجہ ہیں اُن میکانکی قوّتوں کا جنہیں انسان نے ایجاد تو کر دیا، لیکن ان پر قابو پانا نہ سیکھا۔ ہر جگہ ریب و شکوک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ زندگی اس بیم و رجا، فتح و شکست، امید و یاس کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناتواں زندگیوں کی شکستہ عمارت کو از سرِ نو محکم بنیادوں پر استوار نہ کیا تو ہماری تقدیر بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

حکیم مشرق نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

یہ تو ہے عصرِ حاضر کی اقدار فراموش دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، علم تحلیلِ نفسی کے عظیم محقق ڈاکٹر ینگ نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ:

عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دَور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے جہاں تعمیر و تخریب کی قوتیں ہر تراز و کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

Modern Man in Search of Soul

عصرِ حاضر کے راہ گم کردہ انسان کی یہی وہ قلبی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مارؔ — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو ناکام کہنے والوں سے کہ اقوامِ دورِ حاضر کی یہ چیخ و پکار، اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دے رہی ہے یا اس سے دُور بھاگنے کی تلقین کر رہی ہے؟

نظریۂ قومیت

اب ایک اور سوال کو سامنے لائیے۔ انسان نے جب مل جُل کر رہنے کی زندگی شروع کی تو اسے لامحالہ کسی ایسی بنیاد کی تلاش ہوئی جس سے افراد مل کر ایک جتھہ بن سکیں۔ اُس دَور میں یہ بنیاد خون کے رشتوں کے سوا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ اس سے ایک خاندان کے افراد مل کر ایک جتھہ بن گئے۔ انہی خاندانوں نے وسعت اختیار کر کے قبائل کی شکل اختیار کر لی اور قبائل وسیع تر ہو کر، نسلی امتیازات کے حلقے بن گئے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں، یہی امتیاز، قومیت کا معیار تھا۔ اسلام نے یہ انقلابی آواز اٹھائی کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے نتائج بڑے خطرناک مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب انسانی آبادی اور بڑھی اور وسائلِ رسل و رسائل اور

ذرائع مواصلات عام ہوئے تو قوموں کا باہمی تصادم خود نوعِ انسانی کو تباہ کر دے گا۔ اس نے کہا کہ قومیت کا معیار، خون، رنگ، نسل، زبان کے اشتراک کے بجائے، فکر و نظر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے۔ اسی کو آئیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس اشتراک کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اسے تمام نوعِ انسان کو محیط ہونا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر، اس نے کہا کہ رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک کی بنا پر مختلف قومیں تشکیل کرنے کے بجائے نظریاتِ زندگی کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ اس بنیاد پر اُس نے ایک امت کی تشکیل کی جس نے زندگی کے غلط نظاموں کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا...... اس کے بعد اُس اُمت نے بھی اس اصول کو فراموش کر دیا اور پھر انہی قدیم معیاروں کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے بعد دنیا، عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے، اسلام کے پیش کردہ اصولِ اجتماعیت کی طرف آرہی ہے یا اس کے خلاف جارہی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی تفریق کی بدترین شکل ہندوستان میں رائج تھی جہاں بھارت سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں بلکہ ملیکش (ناپاک حیوان) سمجھا جاتا تھا اور بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کو چار ورنوں (ذاتوں)۔۔۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ۔۔۔ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم اَٹ تھی، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ برہما کی بنائی ہوئی ہے اور اس لئے ان کے دھرم کا بنیادی حصہ ہے۔ آج وہاں یہ ساری تقسیم آئینی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی معاشرہ کی یہ تبدیلی قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی کامیابی کا ثبوت ہے یا اس کی ناکامی کی دلیل۔ اس سے کبھی آگے بڑھئے۔ اس سے پہلے دنیا کی ساری آبادی مختلف نسلوں میں بٹی ہوئی تھی ۔۔۔ اصولی طور پر، سیاہ، سفید، سرخ اور زرد نسلوں میں اور فروعی طور پر ہر نسل کے اندر سیکڑوں شاخوں میں۔ عصرِ حاضر کی سائنٹیفک تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلوں کی یہ تفریق یکسر غیر فطری ہے۔ کسی نسل کو دوسری نسل پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ اور عملاً ان نسلوں کا امتیاز مٹتا چلا جا رہا ہے۔ کہیئے کہ دنیا اسلام کے قریب آرہی ہے یا اس سے دور چلی جا رہی ہے؟

لیکن عقلِ انسانی کا تجرباتی عمل ابھی یہیں تک پہنچ سکا ہے۔ اس نے ہنوز انسان کو وطن کی تنگنائے سے باہر نہیں نکالا، یعنی اب انسانوں کی تفریق اور قوموں کی تقسیم، وطن کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے وضع کردہ اس نظریہ کے

نتائج سے مطمئن ہے یا اس کے ہاتھوں نالاں ہے. اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود اس نظریہ پر عمل پیرا اقوامِ مغرب کی زبانی سنیئے ـــــــ پروفیسر الفریڈ کوبن، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے:۔

توميت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا اور عداوت پر پرورش پاتا ہے. ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو. پھر ان قوموں کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا. جونہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مسلّط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدّعی ہوں. ان وجوہات کی بنا پر لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے نیشنلزم کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے.

پروفیسر میتسن اپنی کتاب Creative Freedom میں لکھتا ہے کہ:۔

جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے. جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے، ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے.

پروفیسر ولیم برنڈ نے، دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ:۔

اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوامِ یورپ چند سال تک نبرد آزمائی میں نہیں الجھیں گی. کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے. لیکن نیشنلزم کا وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے، باقی رہے گا. اس لئے مستقبل میں جنگ کو ختم کرنے کے لئے آج کی سیاستدانی کی پرکھ اسی سے ہو گی کہ موجودہ جنگ کے بعد نیشنلزم کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدبیر اختیار کی جاتی ہے.

Foundations of Human Conflict

برٹرینڈ رسل، اپنی کتاب The hopes for a changing world میں لکھتا ہے:۔

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے. اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے. (دیکھو تماشا یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز

ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم اچھی چیز ہے۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے نیشنلزم کو محض ایک سیاسی مسلک کی حیثیت سے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مذہب کی پوزیشن دے رکھی ہے۔ وہاں وطن کو ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے جس کی پرستش ہوتی ہے — آلڈوس ہکسلے اس باب میں بڑی وضاحت سے لکھتا ہے اور بہ تکرار و اصرار لکھتا ہے کہ:

> نیشنلزم ایک بُت پرستانہ (مشرکانہ) مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ مذہب جو فساد و تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی خدا پرست مذہب فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا سا مسلک ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

> نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بُت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے، یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکشی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رُو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کے بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں، اس کا وجوب ہوتا ہے۔ یاد رکھئے! ہر نیشنلزم ایک بُت پرستانہ مذہب ہے۔[1]

ضمناً، ہکسلے نے نیشنلزم کو آج ایک "باطل خدا" کہا ہے۔ اقبالؒ نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کہا تھا کہ ؎

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے میری کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — (صفحہ ۲۴۱-۲۴۰)۔

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس کا نتیجہ یہ بتایا تھا کہ:-

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے　　تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اس کے بعد مسلمانوں سے تاکید کی تھی کہ: ع
اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے

بہرحال، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اِس نیشنلزم کے ہاتھوں، جسے اسلام نے فسادِ آدمیت کی بنیاد قرار دیا تھا، خود اقوامِ مغرب کے مفکر اور سیاستدان اس قدر گریاں و نالاں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو چلا ہوا کارتوس کہنے والوں سے کہ اقوامِ یورپ کا یہ واویلا، اسلامی اصولِ قومیت کی صداقت کی شہادت ہے یا اس کے ناکارہ ہونے کی دلیل!

یہ اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو تھا، یعنی نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے خلاف اقوامِ مغرب کا نالہ و شیون۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس فساد کا علاج کیا ہے؟ پروفیسر برنڈ نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم قومیت کی جگہ بین الاقوامیت (انٹرنیشنلزم) کو فروغ دیں۔ اس کے خلاف مسٹر EMERY REVES نے کہا کہ:-

ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ (اقوامِ متحدہ کی ناکامی اس کا بیّن ثبوت ہے) جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر دے۔ اس کا حل انسانی

عالمگیریت ہے یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ The Anatomy of peace

کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری TEILARD-D- CHARDIN جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب Building of the Earth میں لکھتا ہے:-

اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصّبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نَو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیّت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگنائوں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر HUGH MILLER اپنی کتاب میں، جس کا نام ہی اس نے Communicty of Man رکھا ہے، لکھتا ہے:-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اُس انسانی برادری کا احیا کرے جو انسانی زندگی کی ابتدا میں موجود تھی، لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندان، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اُسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہمدگر جوڑ دے۔ انسانی ارتقار کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کہے بغیر آگے بڑھ جاؤں کہ جو کچھ اس مفکر نے کہا ہے، وہ گویا قرآنی آیات کا ترجمہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط (۱۰/۱۹) نوعِ انسان، شروع میں ایک ہی برادری تھی، لیکن اس کے بعد اس نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا اور مختلف خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ اس میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی (۲/۲۱۳)۔ اس نے کہا ہے کہ انسانیّت کی بارگاہ میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جو یَقْطَعُوْنَ

مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۲/۲۷) جس بکھری ہوئی انسانیت کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا، وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ قرآنِ کریم کی ان آیاتِ جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر پروفیسر ٹلر کے مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے اور پھر بتائیے کہ کیا وہ انہی آیات کا ترجمہ نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اپنے غلط نظریات کا ستایا ہوا انسان آخرالامر کس آستانہ پر پہنچ کر پکارتا ہے کہ

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

انسان جس عالمگیر انسانی برادری کی تلاش میں ہے، اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا، اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہرِ اقتصادیات GUNNER MYARDAL لکھتا ہے:۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اُسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آ جائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان، جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اور اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ:۔

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔ Beyond the Welfare State

اس "مذہب" کے متعلق جو MYRDAL کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، ایک ممتاز ماہرِ نفسیات ERIC FROMM لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:۔

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ

وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کردے گا، جو مشرق و مغرب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا. وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو. وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے. اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے.

قرآنِ کریم اُس دین کی یہی خصوصیات بتاتا ہے جسے اس نے عالمگیر انسانیت کے لئے بطور ضابطۂ حیات تجویز کیا ہے. اس مفکر نے کہا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کی رُو سے اس مذہب کی نمود ہوگی اور قرآنِ کریم نے یہی طریق اپنے مستور حقائق کی نمود کے لئے بتایا تھا. اس نے کہا تھا کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (۴۱/۵۳).

(جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرے گا اور انسانی تقاضے بڑھیں گے) عالمِ انفس و آفاق کے مستور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور جوں جوں یہ حقائق بے نقاب ہونگے، یہ حقیقت سامنے آتی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا.

یہ مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے

اب رہا یہ سوال کہ دنیا کو جس عالمگیر مذہبِ انسانیت کی تلاش ہے کیا وہ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، ایک غیر مسلم کی زبان سے سنئے. اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ غیر مسلم کون ہے اور کس پایہ کا مفکر ہے. یہ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا مورّخ، پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی ہے. وہ اپنی کتاب The World and the West میں لکھتا ہے ـــــ اور دیکھئے کہ وہ ایسا لکھتے وقت ہمارے مُنہ پر کتنے زور سے طمانچہ مارتا ہے ـــــ وہ کہتا ہے کہ:

مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے. ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے. تُرک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے

تصوّر سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جارہے ہیں جس طرح اور مغربی تصوّرات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلالحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایک تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصوّر آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے، مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے، برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں محض قومیت کے معیار پر درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک، دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہوسکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوّرات حیات کو آنکھیں بند کیئے اپنائے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودّت واخوت کے تصوّر کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصوّر اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصوّر، ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہوگئی ہے۔

پروفیسر ٹوئن بی کے نزدیک، دنیا میں عالمگیر برادری متشکل کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظریہ اجتماعیت ہے۔ اور اسے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ اگر یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا تو دُنیا کا کیا حشر ہوگا! میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ہاں کی فریب خوردہ ذہنیتوں سے کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے یا دنیا اسے اپنی نجات کے لئے آخری سہارا قرار دے رہی ہے! اور پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں قومیت زدہ مسلمانوں سے کہ وہ سوچیں کہ دُنیا اُن کے ساتھ کیا توقعات وابستہ کیئے ہوئے ہے اور وہ کس طرف جارہے ہیں؟ غالب نے کسی ایسے ہی حسرت آمیز منظر سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ؎

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

نظامِ سرمایہ داری

اب میں انسانی زندگی کے ایک اور اہم گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں. یہ وہ گوشہ ہے جس نے عصرِ حاضر میں خاص طور پر بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے یعنی معاشی نظام کا مسئلہ. انسانی زندگی کا مدار زمین کی پیداوار پر ہے. جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ اس ذریعۂ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ چلا آرہا ہے اور وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں، غلاموں سے کام کراتے ہیں. قرآن نے آکر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہو سکتی ہے، نہ کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زائد (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے. اس سے ایک طرف تو غلامی کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری کی بساط اُلٹ گئی اور قرآن کی حامل قوم نے ایسا معاشرہ متشکل کرکے دکھا دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم تھا اور نہ ہی کوئی تن آسان دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا. اس طرح دنیا کو بتا دیا گیا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی ـــــ مسلمانوں نے کچھ عرصہ بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور قرآنی اصول پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے بڑھنے لگے.

آپ سوچئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسان کے قدم نظامِ سرمایہ داری کی طرف اُٹھے ہیں یا اُس نظامِ معیشت کی طرف، جسے قرآن نے وجہ حریتِ انسانیت قرار دیا تھا! آج اس باب میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں. آج اس نظام کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو رہا ہے. کیا یہ اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت ہی آگے چلا ہے اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے حیات بخش نظام بن سکے. لیکن عقل کا تجرباتی طریق ابھی اس نظام کے مادی پیکر تک پہنچ سکا ہے. اس کی روح تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی. وہ اس کی بالائی عمارت کو چھو سکا ہے، اس کی بنیادوں کو ابھی نہیں پا سکا. اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام اوّل تو اپنی پہلی منزل ـــــ یعنی سوشلزم ـــــ میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے. آخری منزل ـــــ کمیونزم ـــــ تک پہنچ ہی نہیں پایا. اور دوسرے سوشلزم بھی ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے جھگڑوں کے زور سے فضائے عالم پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے، قلب و دماغ کے اطمینان سے زندگی کی بنیاد نہیں بن رہا. یہ اس لئے کہ اس قسم کے معاشی نظام کی بنیاد جس تصورِ حیات پر استوار ہو سکتی ہے، وہ اس کی نگاہوں سے ہنوز اوجھل ہے. وہ بنیاد ہے مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت پر ایمان. وہ ایمان، جس کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرنے والے (عمر فاروقؓ) نے کہا تھا کہ:

اگر (انسان تو ایک طرف) دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا تو خدا کی قسم، عمرؓ سے
اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

"باز پرس" کا اس قسم کا احساس، صرف حیاتِ آخرت کے ایمان سے پیدا ہوتا ہے اور جب تک یہ احساس بیدار نہ ہو، یہ معاشی نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسلِ حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ میں کیوں نہ اس کے اپنے الفاظ Quste کردوں۔ اس نے کہا ہے کہ:

That man is dead even in this life who has no
belief in another

سوشلزم، عقل کے تجرباتی طریق کا قدمِ اوّل ہے۔ اس کے عملی نفاذ کے بعد جب اس تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا تو وہ اس بنیاد تک بھی پہنچ جائے گی جس کے بغیر یہ عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر روس کے متعلق کہا تھا کہ:

فکرِ او در تُند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند!
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

اس لئے کہ: ؎

درمقامِ لَا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

بُنیادی حقوقِ انسانیت

Fundamantel Human Rights — ہمارے زمانے میں بنیادی حقوقِ انسانیت

لے (1) Qusted by DIXON in the Human Situation

کا بڑا چرچا ہے اور اقوامِ متحدہ (U.N.) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اُس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآنِ کریم نے دیا تھا اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ میں ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لیے اجمالاً چند ایک کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے' قرآنِ کریم کی رُو سے وہ حقوق کیا ہیں:-

۱۔ تکریمِ آدمیت۔ یعنی ہر انسانی بچہ' محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے (۱۷/۷۰)۔
۲۔ جنسی مساوات۔ زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔
۳۔ مدارج کا تعین افراد کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی رُو سے کیا جائے گا۔
۴۔ اطاعت صرف قانون کی ہو گی' اشخاص کی نہیں۔
۵۔ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے۔ اور جس شخص میں کوئی کمی ہو گی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔
۶۔ ہر شخص کو رزق (سامانِ زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہو گی۔
۷۔ جان کی حفاظت کا حق۔
۸۔ جو چیز قانوناً کسی کی ملکیت میں دی جائے اُس کی حفاظت کا حق۔
۹۔ سکونت کا حق ۱۰۔ عصمت کی حفاظت کا حق۔
۱۱۔ شادی میں انتخاب کا حق۔ ۱۲۔ حسنِ ذوق Aesthetic Taste کا حق۔
۱۳۔ مذہبی آزادی کا حق۔
۱۴۔ سچی بات کہنے کا حق۔ ۱۵۔ مظلوم کو فریاد کا حق۔
۱۶۔ پرائیویسی کا حق۔ ۱۷۔ حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق۔
۱۸۔ اثباتِ جرم کے بغیر ہر ایک کو بے گناہ تصور کئے جانے کا حق[1]۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآنِ کریم نے اُس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصور

---

[1] ان تمام حقوق کے قرآنی حوالے میرے مجموعۂ مضامین "بہارِ نَو" میں ملیں گے۔

بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں' انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے: اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف' فکرِ انسانی اس باب میں بھی ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے' جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس' اقوامِ متحدہ کے متعین کردہ حقوق کی کیفیت کیا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے ان حقوق کے تعین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن نے دنیا بھر کے دانشوروں سے مشورہ کرنے کے بعد جو رپورٹ شائع کی تھی' اس میں لکھا تھا:-

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق' بالآخر انسانی حقوق ہیں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عاید کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو غیر مشروط کہا جاتا ہے' ان میں بھی' ان حقوق کا مالک ہونے اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن اُن کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر ازروئے قانون عائد کی جائیں گی۔

اور "ازروئے قانون" ان حقوق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے' اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں! یہی وجہ ہے کہ یونیسکو کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر Quincy Wright نے کہا تھا کہ:-

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھا ہے۔

یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدارِ مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے تو اُس سے کوئی باز پُرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس' قرآنی مملکت پر مستقل اقتدارِ خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانونِ مکافات کی عدالت میں جوابدہ ہوتی ہے۔ فکرِ انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق کے

چارٹر تو شائع ہو جاتے ہیں، ان پر عمل درآمد کہیں نہیں ہوتا۔

اس مقام پر میں ایک اور اعتراض کی طرف آنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھا نظریہ سامنے آیا، انہوں نے کہہ دیا کہ اسلام میں یہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ جب دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صحیح نظریہ پہلے ہی سے اسلام کے اندر موجود ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سے

مُسلمان یونہی کہہ دیتے ہیں

ان کی مراد کیا ہوتی ہے اور ان کے اس قسم کے دعویٰ کا اُن کے پاس ثبوت کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں اور متعیّنہ اتھارٹی کی بنا پر کہتا ہوں۔ میری اتھارٹی قرآنِ کریم ہے جس کے متعلق ساری دنیا کو تسلیم ہے کہ وہ چودہ سو سال سے دنیا میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے (یا اس سے پہلے بھی جو کچھ کہتا چلا آرہا ہوں) ان میں سے ایک ایک دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیات موجود ہیں اور جب بھی کوئی طلب کرے، انہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں ؎

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

غلط فہمی کی وجہ

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اسلام آگے نہیں چلا"؛ جہاں تک میں نے غور کیا، ان کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ، (ہم) مسلمانوں کو اور اسلام کو مرادف سمجھ لیتے ہیں اور اسی وجہ سے انتہائی جسارت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں فی الواقع ایسی صلاحیت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت اس قدر پست کیوں ہے؟ اس اعتراض کا جواب میں شروع ہی میں دے چکا ہوں اور وہ یہ کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں مسلمان کچھ عرصہ تک اس اسلام پر کاربند رہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور اپنی خود ساختہ روشوں پر کاربند ہو گئے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لہٰذا، موجودہ مسلمان اور اسلام ایک دوسرے کے مرادف نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بنابریں، مسلمانوں کی موجودہ حالت کو اسلام کے لئے بطور دلیل پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے

جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ قیاس اور مفروضہ پر مبنی نہیں، ایک حقیقت کا بیان ہے۔ حقیقی اسلام کے بنیادی خط و خال سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ آپ انہیں پیشِ نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ تمام عالمِ اسلام (یعنی مسلمانوں کے ممالک) میں کسی جگہ بھی اسلام کا نظام نافذ العمل ہے؟ آپ کو وہ نظام کہیں بھی رائج نظر نہیں آئے گا۔ ہر ملک میں غیر اسلامی نظام رائج نظر آئے گا۔ اس حقیقت سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سے حقیقی اسلام کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنا یا کوئی رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ حقیقی اسلام کے متعلق، جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے۔ آپ اُس پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس میں نظامِ عالم بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں! جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہمارا موجودہ اسلام، مُنَزَّل مِنَ اللہ دین نہیں، بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے، اور مذہب کوئی بھی ہو، اس میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ پروفیسر HOCKING کے الفاظ میں:۔

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی)۔ ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

Living Religions and a world faith

لہٰذا جب تک اسلام کو مذاہب کی صف سے نکال کر، دین (ضابطۂ حیات) کی حیثیت سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کے زندۂ جاوید ہونے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکے گی۔ اسلام مذہب کی جامد رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ زندگی کے غیر متبدل اصول و اقدار کا ضابطہ ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور وہ برابر آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ جیسا کہ آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا نے الحق پر مبنی دین

اسلام ہی غالب رہے گا

(نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظامِ حیات پر غالب آکر رہے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ تھی جس کے پیشِ نظر گوئٹے نے Ecker Mann سے کہا تھا کہ:

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

میں نے اِن صفحات میں اسلامی نظام کے جس قدر اصول آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، آپ سوچئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رفتہ رفتہ وہی اصول انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کی جگہ لے رہے ہیں! چونکہ یہ اصول ابدی ہیں، اس لئے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی خاص زمانے میں تو اپنے انسانیت ساز نتائج مرتب کئے ہوں اور اس کے بعد یہ درخت سوکھ گیا ہو۔ ان اصولوں کے متعلق کہا یہ ہے کہ: مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ان کی مثال اس پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۴) یہ شجرِ طیّب ہر موسم میں پھل دیتا جائے گا، کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

نہ ہی یہ اصول یہودیت کی طرح کسی خاص نسل یا قوم کے اندر محدود و محصور رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ قرآن ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے، یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات۔ اگر کوئی قوم انہیں اپنانے کے بعد چھوڑ دے، تو یہ اصول معطّل ہو کر نہیں رہ جاتے۔ انہیں جو قوم بھی اپنا لے گی، ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہوگی۔ اس نے خود مسلمانوں سے برملا کہہ دیا تھا کہ: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اِن بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نواہا باقی است

زخمہ ما بے اثر افتد اگر / آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی / از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست / احتیاجِ روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیشِ ما بردارش / پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

یاد رکھئے! دنیا کی کوئی قوم نہ خدا کی چہیتی اولاد ہے، نہ سوتیلی۔ وہ رب العالمین ہے تمام اقوام کا نشوونما دینے والا۔ اس لئے جو قوم اس کے عطا کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی، ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ جو انہیں چھوڑ دے گی ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا / قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

اس سلسلہ میں انڈکس میں "استبدال و استخلافِ قومی" کا عنوان دیکھئے۔

حرف آخر

جو کچھ میں نے ان صفحات میں پیش کیا ہے آخر میں اسے چند ایک الفاظ میں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے، یہ صدقہ ہے خدا کی اُس رحمت کا جسے اُس نے تمام اقوامِ عالم کے لئے عام کر دیا تھا۔ (وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[21])۔ دُنیا قرآنی اصولوں اور اُن کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کسی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوونما ارتقا کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں، نہ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بزمِ ہستی میں جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے، وہ اسی آفتابِ عالمتاب کی ضیا باریوں کے تصدق ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا ہے، وہ اسی جانِ بہار کی نکہت پاشیوں کا رہینِ منت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو / آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست / یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنی نظام کی مخالفت، مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب کے احبار و رہبان (مذہبی پیشوا) دونوں کرتے تھے۔ یہ دراصل ان کا معاشی مسئلہ تھا۔ مشرکین اس کا کھلے بندوں اعتراف و اظہار کرتے تھے۔ مذہبی پیشوا اسے مذہب کے مقدس نقاب میں چھپاتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا نظام

مذہبی پیشوائیت کا نظامِ سرمایہ داری

سرمایہ داری، سیکولر نظام سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ سیکولر نظامِ سرمایہ داری میں سرمایہ دار کچھ سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کو غصب کرتا ہے لیکن مذہبی سرمایہ دار ایک پائی کا سرمایہ لگائے بغیر عوام کا استحصال کرتا ہے۔ وہ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں اور منتیں کرتے ہیں کہ ان کی اس نذرِ محقر کو شرفِ قبولیت عطا فرما دیا جائے۔ اس کاروبار کو برقرار رکھنے کے لئے یہ حضرات طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے سابقہ آیات سے پیوستہ ان دونوں گروہوں کی تخریب کاری کو بے نقاب کر دیا جہاں کہا کہ:-

(۹ / ۳۵-۳۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

علماء و مشائخ (مذہبی پیشواؤں) میں سے جنہیں لوگ خدائی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ

حالت ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال مفت میں کھاتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن درحقیقت اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستے کی طرف آنے نہ پائیں۔ اس راستے میں سب سے بڑی روک خود ان کا وجود ہے۔ اے رسولؐ! تم اُن کے اِن علماء و مشائخ کو اور ان کے ساتھ اُن لوگوں کو جو (اُن کی خودساختہ شریعت کی آڑ میں نظامِ سرمایہ داری کو منشائے خداوندی کے عین مطابق سمجھ کر) سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے، الم انگیز عذاب کی خبر سنا دو (۳۴)۔

(نظامِ خداوندی کے دور میں) اِس مال کو جہنّم کی آگ میں تپایا جائے گا (جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں ۷-۱۰۴/۶؛ ۱۸-۷۰/۱۷) اور اس سے ان کی پیشانیاں اُن کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جسے تم نے تنہا اپنے لئے جمع کر رکھا تھا (اور دوسروں کو اس سے محروم کر رکھا تھا)۔ سو جو کچھ تم نے یوں جمع کر رکھا تھا اُس کا اب مزہ چکھو (۳۵)۔

اِس مقام پر قرآنِ کریم نے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے خلاف دو جرم عائد کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ـــــ اور دوسرے یہ کہ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ ہم پہلے دوسرے جرم کو لیتے ہیں۔ دُنیا کے ہر مذہب میں مذہبی پیشواؤں کو انسان اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے توسط کے بغیر خدا کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ اُن کی وساطت کے بغیر خدا تک نہ بندوں کے نذرانے جا سکتے ہیں، نہ ان کی دعاؤں کی وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ انہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

دنیا کے مذاہب کا یہ عقیدہ اور مسلک ہے اور ان سب کے خلاف، قرآن کا انقلاب آفریں اعلان کہ جن کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا تک لے جانے والے راستے میں تمہارے قائد ہیں، درحقیقت اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہیں۔ جب تک انہیں راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا، تم خدا تک پہنچ ہی نہیں سکو گے۔

مذہبی پیشوائیت کے خلاف

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس قدر عظیم انقلابی اعلان ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ انسانیت کو تباہ کرنے کے لئے تین ہی لعنتیں ہیں:

ملوکیت یا انسانوں کی حکومت (فرعون)، نظام سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان)، اُس نے ایک ایسا نظام قائم کیا جس میں ان تینوں کا وجود ختم ہوگیا. لیکن اس کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل ہوگیا تو یہ تینوں عذاب، ملت پر مسلط ہو گئے. شخصی حکومت اور نظامِ سرمایہ داری کو چھوڑیئے. مذہبی پیشوائیت (علماء و مشائخ) کا جال ہم پر اس وسعت اور گہرائی سے چھایا ہوا ہے کہ ہم اس کے پھندے سے نکل ہی نہیں سکتے. یاد رکھیئے، جب تک مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی ہے، اسلام ہمارے ہاں قدم نہیں رکھ سکتا. (قرآن کے الفاظ میں) اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ انہی کا وجود ہے. یہ بات ہم تک ہی محدود نہیں، انبیاء گزشتہ اور اقوام سابقہ کی جو تاریخ قرآن نے بیان کی ہے، اس میں آپ دیکھیں گے کہ ان کی دعوت کی سب سے بڑی مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی. حضرت عیسیٰؑ نے ان کے متعلق کیا کہا تھا، اس کی تفصیل مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۱۶۳ پر گزر چکی ہے اور ان کی عام حالت اس جلد کے صفحہ ۲۲۰ پر. انڈکس میں مذہبی پیشوائیت اور احبار و رُہبان کے عنوانات کے تحت مزید تصریحات ملیں گی.

قرآن نے ان کے خلاف دوسرا جُرم یہ عائد کیا ہے کہ انہوں نے مذہب کو ذریعۂ معاش Profession بنا رکھا ہے. حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت ہے ہی معاشی مسئلہ. ان کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے تو یہ اپنے لئے ایک وقت کی روٹی بھی کما نہیں سکتے. آپ سوچیئے کہ لاکھوں، کروڑوں بے کار انسانوں کا انبوہ جو ملک کی پیداوار میں کوئی حصہ نہ لیں اور پھر محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں، ملک کی تباہی کا باعث نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؛ مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے. ملاحظہ ہو (بالخصوص جلد اوّل (صفحات ۶۲؛ ۲۵۲)، جلد دوم صفحہ ۱۹۴) جہاں زیرِ نظر آیت (۹/۳۴) بھی آگئی ہے اور (صفحہ ۲۴۰) جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ خود ہی شریعت کے احکام وضع کرتے ہیں اور انہیں احکامِ خداوندی کہہ کر (فتووں کی شکل میں) عوام کے ہاتھ بیچتے ہیں.

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، دونوں ایک ہیں. اسی لئے قرآن کریم نے دونوں کا ذکر ایک ہی آیت (۹/۳۴) میں کیا ہے اور (۹/۳۵) میں اس کی مزید تفصیل بیان کر دی ہے. سابقہ جلدوں میں قرآن کے معاشی نظام کے موضوع پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے. انڈکس کی

دولت جمع کرنے کے خلاف

مدد سے ان تفاصیل کو ایک بار پھر دیکھ لیجئے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی نظام کے مطابق مال و دولت کو جمع کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں ہر فرد اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق نہایت دیانتداری سے کام کرتا ہے۔ اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے بقدرِ ضرورت رکھ کر باقی سب اسلامی نظام کی تحویل میں دے دیتا ہے تاکہ اس سے دیگر حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرے۔ لہٰذا (اس نظام میں) کسی کے پاس زائد از ضرورت مال و دولت جمع رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کے مختلف مقامات میں، دولت جمع کرنے کو عذابِ جہنم کا مستوجب بتایا جاتا ہے۔ انہی میں ایک (زیرِ نظر) آیت بھی ہے جو مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۴۰ پر درج ہے۔

جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری بھی دوبارہ زندہ ہو گیا۔ لیکن اس کے راستے میں ایک رکاوٹ تھی۔ قرآنِ کریم میں مال و دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر کثرت سے آیا ہے کہ اس کی موجودگی میں سرمایہ داری کا جواز ملنا مشکل کیا، ناممکن تھا۔ اس کے لئے حل یہ نکالا گیا کہ جتنا جی چاہے مال و دولت جمع کرو، مگر اس میں سے سال کے بعد تھوڑے سے پیسے (بالعموم

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

اڑھائی فیصد) "خدا کی راہ میں" دے دو تو باقی مال حلال و طیب ہو جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ و مسلک کیسے پیدا کیا گیا تھا اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۲۰۹) دیکھئے۔ اسے "اسلام کا معاشی نظام" کہہ کر پکارا جاتا ہے، اور جس کا ہمارے زمانے میں سب سے زیادہ پروپیگنڈا مودودی مرحوم نے کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۷۶)۔

اب اسلام نام رہ گیا ہے (۱) ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ فقہی احکام کا، جس کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت ہے اور (۲) نظامِ سرمایہ داری کا۔ یہ (انسانوں کا خود ساختہ اسلام) زمانے کے تقاضوں سے رفتہ رفتہ مٹتا جا رہا تھا، لیکن اسے پاکستان میں حیاتِ نو عطا کی جا رہی ہے۔ مغرب کی استعمار پرست مملکتیں Fundamentalism کا فریب انگیز نام دے کر اس کی اس حیاتِ نو کے لئے تقویت کا موجب بن رہی ہیں[1]۔ اقبالؒ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

---

[1] یہ سطور وسط ۱۹۸۳ء میں لکھی جا رہی ہیں۔

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد   کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دَیرے بنا کردند آنجا   پرستد مومن و کافر تراشد

(ارمغانِ حجاز)

اسلام کے صدرِ اوّل میں اسلام کے خلاف جو کچھ ایران نے کیا تھا، اب وہی کچھ مغرب کی قوتیں کر رہی ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "شاہکارِ رسالت" کا آخری باب)۔

قریش کے ہاں کوئی منظم مذہب تو نہیں تھا، لیکن کعبہ کی تولیّت کے سلسلہ میں وہ جن رسوم و آداب کے پابند تھے، انہیں مذہبی تقدّس سا حاصل تھا۔ اور جن قبائل کے سپرد وہ ذمّہ داریاں تھیں، اُن کا منصب مذہبی پیشواؤں کا سا سمجھا جاتا تھا۔ یہود و نصاریٰ کے تذکرہ کے تسلسل میں اُس نے قریش کے مذہبی پیشواؤں کے کاروبار کی بھی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اسی کا تعلق نسیّ کی رسم سے تھا جس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۲۳۱) میں آچکی ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں گے تو ذیل کی آیات کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

نسیّ کی رسم

(۹/ ۳۶-۳۷) اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ
كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ
اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا
فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا
يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۝
اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا

عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ۧ

(یہ ہیں ــــ مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے ــــ وہ باطل نظام جنہیں ختم کرنے کے لئے خدا کا یہ نور ــ قرآن ــــ اور اس کا رسولؐ آیا ہے۔ اس مقصد کے لئے عندالضرورت جنگ بھی کرنی پڑے گی۔ اس سلسلہ میں چند تمہیدی اصول پھر سُن لو۔ سب سے پہلے یہ کہ) جنگ مسلسل جاری نہیں رکھی جائے گی۔ (بین الاقوامی معاہدات کی رُو سے) سال میں چار مہینے ضرور ایسے رکھے جائیں جن میں جنگ ملتوی کردی جائے (۲/۲۱۷)۔ (جب ایک دفعہ جنگ ملتوی کردی جائے تو اس سے مشتعل جذبات میں سکون پیدا ہوجاتا ہے اور اکثر و بیشتر ایسا ہوجاتا ہے کہ اس کے بعد جنگ ختم ہوجاتی ہے) یہ محکم قانون ہے اس کی پابندی ضرور کرو۔

قاعدہ تو تمہارے ہاں اب بھی یہ موجود ہے لیکن تم اس سلسلہ میں کرتے یہ ہو کہ (ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا اضافہ کرکے) بارہ مہینوں کے بجائے تیرہ مہینوں کا سال بنا لیتے ہو اور پھر اُن مہینوں میں گڑبڑ کردیتے ہو جن میں جنگ روک دی گئی ہے (۳۷)۔

یہ غلط ہے۔ اس سے وہ مقصد فوت ہوجاتا ہے جس کے لئے ان مہینوں میں جنگ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ مہینے متعین ہونے چاہئیں اور ہر ایک کو معلوم ہو۔ اس کے لئے تم کرو یہ کہ سال کے بارہ مہینے ہی شمار کرو (کبھی بارہ اور کبھی تیرہ کا حساب مت رکھو)۔ یہ چیز اُس قانونِ فطرت کے مطابق ہے جو خدا نے تخلیقِ ارض و سماء کے وقت مقرر کیا تھا (یعنی زمین، سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے۔ اس مدت کی تقسیم بارہ ماہ سے کرلینی چاہیئے)۔ سو، ان مہینوں میں گڑبڑ مچاکر خواہ مخواہ اپنے اوپر زیادتی مت کرو۔ تم (اے جماعتِ مومنین) ان مہینوں کو چھوڑ دو اور باقی سال میں، ان مخالفین سے پورے زور سے

جنگ کرو، جس طرح یہ تم سے پوری شدت سے جنگ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ لیکن جنگ میں بھی قوانینِ خداوندی کو نظر انداز نہ ہونے دو۔ یاد رکھو' خدا کی تائید و نصرت اُنہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ہر حال میں اُس کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں اور کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتے (۳۶)۔

یاد رکھو! جن مہینوں میں جنگ کرنا جائز قرار دیا جائے' انہیں اپنی جگہ سے ہٹا دینا' معاہدات کا عملی انکار اور بین الاقوامی قانون سے سرکشی ہے ۔۔ اور بہت بڑی سرکشی ۔۔ یہ لوگ کرتے یہ ہیں کہ ایک ہی مہینے کو ایک سال جنگ کے لیے جائز قرار دیتے ہیں اور دوسرے سال اسے ناجائز ٹھہرا دیتے ہیں۔ اس طرح ان مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے ہیں جن میں خدا نے جنگ کو حرام قرار دیا ہے، لیکن مہینوں کو اِدھر اُدھر کر دینے سے' عملاً خدا کے حرام قرار دیئے ہوئے کو حلال ٹھہرا دیتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس سے ہم کسی جُرم کے مرتکب نہیں ہوتے ۔۔ بلکہ اسے بڑی خوبی کی بات خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سیدھی سی بات ہے کہ جو امور ایک مرتبہ بین الاقوامی طور پر طے پا جائیں' کسی ایک قوم کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود ہی ان میں تغیر و تبدل کرلے۔ اس قسم کی قوم پر' جو ایسی حرکات کی مرتکب ہو' کبھی کامیابی کی راہ کشادہ نہیں ہوتی (۳۷)۔

ناپختہ ایمان والے مُسلمان

ابتدائے اسلام میں جماعتِ مومنین میں' ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جن کا ایمان ہنوز پختہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ابھی مومن نہ کہیں، سورۃ الحجرات میں ہے؛ قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ (۴۹/۱۴)۔۔ "یہ اعراب (بدو) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہ ایسا نہ کہیں بلکہ یوں کہیں کہ ہم نے مملکتِ اسلامیہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک ایمان اُن کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا" یہ تھے وہ لوگ جو مشقت طلب مہمات میں شامل ہونے سے ہچکچاتے تھے۔ آیات نمبر ۳۸ لغایت نمبر ۴۲ میں روئے سخن انہی کی طرف ہے۔

فرمایا؛

9/38 یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَکُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَکُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ

سَبِيۡلِ اللّٰهِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَى الۡاَرۡضِ‌ؕ اَرَضِيۡتُمۡ بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا مِنَ الۡاٰخِرَةِ‌ۚ فَمَا مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيۡلٌ ۝

اے جماعتِ مومنین! (معاشرہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ) دنیاوی مفاد کی خاطر جنگ کرنے کے لئے تو وہ ہر وقت آمادہ ہوں گے، لیکن) جب ان سے کہا جائے کہ وہ حق و صداقت کی راہ میں جنگ کے لئے نکلیں تو اُن کے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے ہیں. زمین سے اُٹھتے ہی نہیں. ان سے کہو کہ کیا تم بلند انسانی مفاد اور مستقل اقدار کو چھوڑ کر، طبیعی زندگی کے مفاد کو پسند کرتے ہو؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ طبیعی زندگی کے مفاد کتنے ہی گراں بہا کیوں نہ دکھائی دیں، وہ انسانی زندگی اور مستقبل کی خوشگواریوں کے مقابلہ میں متاعِ قلیل ہوتے ہیں.

اس کے بعد ہے:

۹/۳۹ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡـــًٔا‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝

ان سے واضح الفاظ میں کہہ دو کہ اگر تم نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کی خاطر جنگ کے لئے نہیں نکلو گے، تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے بڑا الم انگیز ہوگا، یعنی خدا اپنے قانونِ استخلاف و استبدالِ اُمم کے مطابق تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو متمکن کر دے گا (۳۸/۴۷؛ ۱۴/۹) اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے. یاد رکھو! خدا کی ہر بات اس کے مقرر کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے جس پر اسے پوری پوری قدرت حاصل ہے. (اس کا قانون یہ ہے کہ زمین کی وراثت اُسی قوم کے حصے میں آتی ہے جس میں اس کی صلاحیت ہو (۲۱/۱۰۵).

قرآنِ مجید میں قانونِ استبدال و استخلافِ اقوام کے متعلق بڑی وضاحت سے آیا ہے۔ انڈکس سے متعلقہ مقامات دیکھئے۔ اس کے بعد اُن سے کہا کہ اگر تم ان مہمات میں رسولؐ کا ساتھ نہ دو گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مشن ناکام رہ جائے گا۔ خدا نے اس کی مدد ایسے حالات میں بھی کی ہے جب یہ رسولؐ (بظاہر) بے یار و مددگار تھا؛

(۹/۴۰) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

اگر تم (نظامِ خداوندی کے سلسلہ میں) رسولؐ کی مدد نہیں کرتے (تو نہ کرو)۔ خدا نے اس کی مدد اس زمانے میں کی تھی (جب وہ بظاہر بے یار و مددگار تھا) جب کفار نے اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اس حالت میں کہ اُس کے ساتھ، صرف اُس کا ایک رفیق تھا۔ وہ دونوں اپنی حفاظت کے لئے غار میں چھپے بیٹھے تھے (اور دشمن تعاقب میں تھا)۔ ایسی مایوسی کے عالم میں بھی اُسے خدا کی نصرت پر ایسا محکم یقین تھا کہ جب اس کا رفیق اس خیال سے کہ رسولؐ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے، متردد دکھائی دیا، تو اُس نے اُس سے دل کے پورے اطمینان سے کہا کہ مت غمگین ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اضطراب انگیز حالات میں اللہ نے اپنے رسولؐ کو سکون و قرار عطا فرمایا تھا۔ (اس کے بعد بدر کے میدان میں جب حالات سخت ناسازگار تھے) ایسے لشکروں سے اُس کی مدد کی جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے تھے (۹/۲۶)۔ اس طرح اُس نے مخالفین کو سرنگوں کر دیا۔ اس کے بعد تم دیکھ رہے

ہو کہ نظامِ خداوندی کو کس طرح سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط حاصل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس نظام میں تدابیر اور قوت دونوں موجود ہیں ــــــــ نصب العین اس قدر بلند، بازوؤں میں قوت، ذہن میں حسنِ تدابیر کی صلاحیت، اس کے بعد کامیابی کے لئے اور کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ (یاد رکھو! کامیابی سے مراد ہے دینِ خداوندی کا غالب آنا اور ہر نظامِ باطل کا مغلوب ہونا۔ اسلام میں جنگ سے بھی یہی مطلوب و مقصود ہے نہ کہ جوع الارض)۔

ہجرت کا واقعہ ہجرت کے متعلق تفصیل کے ساتھ مطالب الفرقان، جلد سوم صفحہ ۵۲ - ۴۵؛ صفحہ ۳۰۸ پر لکھا جا چکا ہے۔ ملائکہ کی مدد کے متعلق مطالب الفرقان، جلد چہارم صفحہ ۲۰۵ - ۲۰۴ پر، نیز آیت (۹/۲۶) کے تحت سابقہ صفحات میں اور اسلامی جنگ کا مقصد چار لفظوں میں بیان کر دیا، وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ــــــــ "ہر غیر خداوندی نظام (کفر) مغلوب ہو جائے اور نظامِ خداوندی غالب آ جائے۔ اور یہ کامیابی، قوت اور حکمت دونوں کی رُو سے حاصل ہو کیونکہ خدا عزیز بھی ہے اور حکیم بھی"۔

اس کے بعد ان مذبذبین کے متعلق کہا کہ

9/42 لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِن بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ع

(باقی رہے یہ ڈھلمل یقین کے لوگ، سو ان کی حالت یہ ہے کہ) اگر تم انہیں ایسی لڑائی کے لئے کہتے جس میں انہیں فائدہ پڑا نظر آ جاتا (اور سفر بھی زیادہ صعوبت انگیز نہ ہوتا، تو یہ ضرور تمہارے پیچھے چل پڑتے۔ لیکن اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سفر انہیں بڑا لمبا اور پُرمشقت نظر آتا ہے۔ (اصل بات تو یہ ہے۔ لیکن یہ طرح طرح کی بہانہ سازیاں کریں گے

اور) قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم میں اس کی استطاعت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے
ساتھ چلتے. یہ لوگ اس قسم کی منافقانہ باتوں سے اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں (کسی کا کچھ
نہیں بگاڑ رہے). کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔

آیت کے آخری الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان (مذبذبین) میں منافق بھی شامل تھے. بہرحال یہ جو بھی تھے، قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کے متعلق ارشاد فرمایا:

۹/۴۱ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(لہٰذا، اے جماعتِ مومنین! تم اس کا خیال نہ کرو کہ تم مخالفین کے مقابلہ میں کچھ ہلکے ہو) تم ہلکے ہو یا بھاری، تم فراخی کی حالت میں ہو یا تنگی کی، تمہارے پاس اسلحہ بھی پورا ہے یا نہیں، تم ان باتوں سے نہ گھبراؤ. تم باہر نکل پڑو اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے، سرتوڑ کوشش کرو (تمہارا یقینِ محکم اور ثبات و استقامت تمہاری کمیوں کو پورا کر دے گا). اگر تم بات کو اچھی طرح سمجھ لو تو تمہارا مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہونا، تمہارے لئے بہتر ہے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ یہ آیات (اور ان کے بعد اسی مضمون کی دیگر آیات) کا تعلق جنگِ تبوک سے ہے. عہدِ نبویؐ میں اُس وقت تک جتنی جنگیں ہوئی تھیں ان کا سلسلہ اندرونِ عرب تک محدود تھا. مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوتوں کو دیکھ کر رومی سلطنت کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اس قوت کو یہیں روک دینا چاہیئے مبادا یہ بڑھتے بڑھتے ان تک بھی جا پہنچے. غسانیوں کا عیسائی خاندان رومی مملکت کے زیرِاثر

جنگِ تبوک

شام پر حکمران تھا. اس مقصد کے لئے انہوں نے اس خاندان کو متعین کیا. انہوں نے اس مہم کے لئے بڑی تیاریاں شروع کیں، جن کی خبریں مدینہ تک بھی پہنچیں اور عرب کے دیگر علاقوں میں بھی عام ہوئیں. اب مداخلت ضروری تھی. اس لئے حضورؐ نے مجاہدین کو

تیاری کا حکم دیا۔ موسم سخت گرم تھا اور سوءِ اتفاق کہ ملک میں قحط پڑ رہا تھا۔ اس لئے جنگ کے لئے حالات سخت ناسازگار تھے۔ لیکن مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ معرکہ اخلاص و منافقت اور ایمان کی پختگی اور ناپختگی کی کسوٹی بن گیا۔ سورۃ توبہ کی بیشتر آیات کا تعلق اسی سے ہے۔ اس کی ابتداء آیت (۹/۴۲) سے ہوئی۔ جنگ کی تیاری کا حکم ہوا تو یہ اعراب اور منافقین مختلف قسم کے (جھوٹے) عذر لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ انہیں پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔

منافقین کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۲۳ پر بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہہ دیا تھا کہ ہم نہیں بتائیں گے کہ ان میں سے کون کون منافق ہے۔ تمہیں انہیں اپنے قیاس سے خود پہچاننا ہوگا (۴۷/۳۰)۔ جنگِ تبوک کے سلسلے میں جو لوگ (جھوٹے) عذر پیش کر کے جنگ سے مستثنیٰ رہنے کی اجازت طلبی کے لئے حاضر ہوئے تھے (معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے) انہیں اجازت دے دی۔ اس پر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(۹/۴۳) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○

تم نے (اے رسولؐ! ان کی منافقانہ عذرداریوں کو سچا سمجھ کر) انہیں پیچھے رہنے کی اجازت دے دی۔ (تم نے کشادہ نگہی سے کام لیا، لیکن ان کی نیت نیک نہیں تھی۔ بہرحال) اللہ نے اسے درگزر کر دیا ہے۔ (اگر تو ذرا توقف کرتا تو) تجھ پر آشکارا ہو جاتا کہ تمہاری جماعت میں کون سچا ہے اور کون جھوٹی عذرداریاں کرتا ہے۔

فیصلہ کے اعتبار سے تو یہ بات اتنی اہم نہیں، لیکن اس میں ایک نکتہ پوشیدہ ہے جو بڑا اہم اور اصولی ہے۔ انڈکس میں آپ "رسول" کے عنوان کے تحت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی نبوی حیثیت اور بشری حیثیت میں نمایاں طور پر فرق کر دیا ہے۔ نبی کی حیثیت سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی جس میں

حضورؐ کا اجتہادی سہو

آپ کی اپنی مرضی یا خیال یا خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بعد آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے یا فیصلے کرتے، وہ آپ کی بشری

حیثیت سے تھا جس میں اجتہادی سہو کا امکان تھا. قرآنِ کریم میں (زیرِ نظر آیت کے علاوہ) دیگر مقامات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے. لیکن ہمارے ہاں جب دین، مذہب سے بدلا تو یہ عقیدہ وضع ہوا کہ حضورؐ اپنی زندگی کے ہر سانس میں نبی تھے. حضورؐ کا ہر قول، ہر عمل، ہر فیصلہ وحی کی رُو سے ہوتا تھا (اس موضوع پر ہم، وحی کے عنوان کے تحت سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں). زیرِ نظر آیت بھی ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے. ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا (ان لوگوں کو اجازت دینے کا) فیصلہ وحی کی رُو سے ہوتا تو خدا کی طرف سے تادیب کیوں ہوتی ؟

اس کے بعد متعدد آیات میں منافقین کی اسی قسم کی حرکات کا ذکر ہے. ہم ان آیات اور ان کے مفہوم کے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، بجز اس کے جہاں کوئی نکتہ تشریح طلب ہو.

(۹/۴۴) لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ○

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ فی الواقع اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ ہم اپنے مال و جان سے جہاد کرنے سے معذور ہیں، اس لئے ہمیں اجازت دے دی جائے کہ ہم جنگ میں شریک نہ ہوں (وہ تو ایسے مواقع کے آرزومند رہتے ہیں). اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جو اپنے فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں (اور کون ہیں جو ان سے جی چراتے ہیں).

(۹/۴۵) اِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ○

اس قسم کی اجازتیں وہی لوگ مانگا کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر سچے دل سے یقین

نہیں رکھتے. حیاتِ آخرت اور مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے والا موت سے کبھی نہیں ڈرتا. ان کے دلوں میں شکوک ہیں اور اسی وجہ سے وہ متذبذب ہیں. (ورنہ ایمانِ محکم کے بعد عمل میں تذبذب کیسا؟)۔

۹/۴۶ وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ○

(یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ) اگر ان کی نیت جنگ میں شرکت کی ہوتی تو یہ (کچھ نہ کچھ) سفر کی تیاریاں کرتے — اور یہ اچھا ہی ہے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ نہ جانے کا ہی فیصلہ کر لیا اور پیچھے رُک گئے. ورنہ اگر یہ مزید منافقت برتتے اور ساتھ چل پڑتے تو نظامِ خداوندی کے حق میں یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی (اس کا نتیجہ نقصان رساں ہوتا).

۹/۴۷ لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ○

یہ، بجز اس کے، کچھ نہ کرتے کہ تمہاری جماعت میں انتشار پیدا کرتے. تمہیں مصیبت میں ڈالنے کے لئے بھاگے بھاگے پھرتے. ہر طرح کی خرابی کے لئے کوشش کرتے. اور (تم جانتے ہو کہ، تمہارے اندر ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی باتوں پر دھیان دھرنے والے ہیں (یا خود ان کے جاسوس ہیں). اس لئے ان کا تمہارے ساتھ جانا تمہارے لئے بڑی خرابی کا موجب ہوتا. خدا خوب جانتا ہے کہ کون لوگ ظلم و زیادتی کرنے والے ہیں.

۹/۴۸ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ
حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝

(ان کی یہ حرکتیں کچھ نئی نہیں) اس سے پہلے بھی یہ لوگ فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے تمہارے خلاف ہر قسم کا الٹ پھیر کرکے دیکھ لیا ہے۔ ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ حق آگے بڑھ گیا' خدا کا نظام غالب آگیا اور یہ کڑھتے ہی رہ گئے۔

۹/۴۹ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا
فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ
بِالْكٰفِرِيْنَ ۝

ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ مجھے مصیبت میں نہ ڈالیے۔ (ایسے لوگوں کو اس کا احساس نہیں کہ یہ اپنی حرکات سے) مصیبت میں تو پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں (منافق کی زندگی راحت اور اطمینان کی زندگی تھوڑی ہوتی ہے؟) جہنم کی آگ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور اس میں پڑے جل بھن رہے ہیں۔

۹/۵۰ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ
مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ
يَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝

ان کی یہ حالت ہے کہ اگر تمہیں کوئی خوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ ان پر بہت شاق گزرتا ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے' تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی دوراندیشی سے کام لے کر اپنا انتظام کر لیا تھا۔ یہ کہہ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

۹/۵۱ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ
وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ ہمیں جو واقعہ بھی پیش آئے گا، قانونِ خداوندی کے مطابق پیش آئے گا (دنیا میں سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے)۔ وہی ہمارا کارساز و کارفرما ہے ــــــ اور ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے، جو لوگ بھی اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں، انہیں اس پر پورا پورا بھروسا رکھنا چاہیئے۔

۹/۵۲ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَ
نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ
مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ
مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝

ان سے کہہ دو کہ تم ہمارے متعلق دو ہی باتیں سوچ سکتے ہو ــــــ یا ہم میدانِ جنگ میں مارے جائیں اور یا فاتح و منصور واپس آئیں۔ ہمارے لئے یہ دونوں باتیں بڑی خوشگوار ہیں۔ اس کے برعکس، ہم تمہارے متعلق اس کا انتظار کرتے ہیں کہ تم پر قانونِ خداوندی کے مطابق کہیں باہر سے کوئی تباہی آ جائے یا خود ہمارے ہاتھوں سے تمہیں سزا مل جائے۔ سو تم اپنے خیال کے مطابق انتظار کرو اور ہم اپنے اس تصور کے مطابق انتظار کرتے ہیں۔ پھر دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے! تم میدانِ جنگ میں شکست کھا جاؤ گے (۹/۱۴)۔ مال و دولت وجہ عذاب بن جایا کرتے ہیں (۹/۵۵؛ ۹/۸۵)۔

۹/۵۳ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ
اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

(اور اگر یہ منافق چاہتے ہیں کہ) طوعاً و کرہاً کچھ مالی امداد دے کر، جنگ میں جانے سے بچ جائیں، تو ان سے کہہ دو کہ تمہاری مالی امداد ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اس لئے کہ تم صحیح راستے کو چھوڑ کر، غلط راہوں کی طرف نکل گئے ہو۔

۹/۵۴ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۝

ان سے کہہ دو کہ ان کی مالی امداد قبول نہ کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دعوئ ایمان صرف زبانی ہے یہ درحقیقت خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے، ان سے انکار کرتے ہیں۔ تمہارے صلوٰۃ کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں تو مارے' بندھے' محض دکھاوے کی خاطر (۴/۱۴۲) اور ایسے رسمی طور پر جس سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو (۵/۱۰۷)۔ اور اگر مالی امداد دیتے ہیں تو بطیب خاطر نہیں' بلکہ سخت مجبوری اور ناگواری سے۔ (لہٰذا' ایسے لوگ اس نظام کے ارکان کیسے بن سکتے ہیں جس نظام کی ساری عمارت دل کی رضا و رغبت پر استوار ہوتی ہے)۔

اس آیت (۹/۵۴) میں کہا ہے کہ ان منافقین کی صلوٰۃ "کسالیٰ" ہوتی ہے۔ اس کی تشریح مطالب القرآن' جلد چہارم میں صفحہ ۲۲۹ پر گزر چکی ہے۔ اسے ایک بار پھر دیکھ لیجئے' کیونکہ پیش کردہ نکتہ بڑا اہم ہے جس کا اطلاق ہماری نمازوں پر بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔

اس کے بعد پھر متعدد آیات میں منافقین کا مزید ذکر ہے:

۹/۵۵ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ

اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ○

اِس میں شبہ نہیں کہ ان کے پاس مال و دولت بھی بہت ہے اور ان کے افرادِ خاندان کی تعداد بھی کثیر ہے جس کی وجہ سے ان کا جتھہ کافی بڑا ہے۔ لیکن یہ باتیں تمہارے لئے وجہ تعجب نہیں ہونی چاہئیں۔ یہی چیزیں تو ہیں جو انہیں نظام خداوندی کی طرف آنے نہیں دیتیں۔ اس لئے انہی کی وجہ سے ان کی دنیاوی زندگی ان کے لئے وبالِ جان بن جائے گی اور یہ اپنے آپ کو کفر ہی کی خاطر ہلاک کریں گے (۹/۵۵)۔

۹/۵۶ وَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ ؕ وَمَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلٰـكِنَّهُمۡ قَوۡمٌ يَّفۡرَقُوۡنَ ○

یہ لوگ خدا کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ وہ تمہیں میں سے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تم میں سے نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ بڑے بزدل ہیں (اور منافقت برتتا ہی وہ ہے جو بزدل ہو) اس لئے اپنے آپ کو تم ہی سے ظاہر کرتے ہیں۔

۹/۵۷ لَوۡ يَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوۡا اِلَيۡهِ وَهُمۡ يَجۡمَحُوۡنَ ○

ان کی حالت یہ ہے کہ اگر انہیں کہیں پناہ گاہ مل جائے یا کوئی غار یا کسی قسم کا اور چھپنے کا مقام نظر آ جائے تو یہ تمہارا ساتھ چھوڑ کر اُس کی طرف یوں لپک کر چلے جائیں جیسے کوئی جانور رسہ تڑا کر بھاگ رہا ہو (اگر یہ تمہارے ساتھ ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں کہیں اور پناہ کی جگہ نظر نہیں آتی)۔

مالی معاملات میں الزام کمینہ فطرت مخالفین کا سب سے ذلیل حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مخالف جماعت، بالخصوص اُس کے سربراہ کے خلاف، مالی معاملات میں خیانت کا (جھوٹا) الزام لگا دیتے ہیں۔ اس الزام کے نتائج جس قدر زود رس ہو سکتے ہیں ظاہر ہے ....

اگلی آیت میں ان کے اس کمینہ حربہ کا ذکر کیا گیا ہے:

۹/۵۸ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝

(ان میں بعض لوگ بڑی کمینہ حرکات تک اتر آتے ہیں. مثلاً) وہ تمہارے خلاف یہ الزام تراشتے ہیں کہ تم نے صدقات کی تقسیم میں دیانت داری سے کام نہیں لیا (مقصد ان کا اس سے یہ ہے کہ اس طرح تمہاری جماعت میں افتراق اور بدظنی پیدا ہو جائے). حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ اگر تو انہیں اُن کے حق سے کچھ زیادہ دے دیتا تو یہ بہت خوش ہو جاتے (اور پھر تمہاری تقسیم عین مطابق حق و انصاف قرار پا جاتی). لیکن چونکہ تم نے انہیں زیادہ نہیں دیا، اس لئے اس طرح بگڑ بیٹھے ہیں (اور الزامات تراش کر اپنا غصہ نکال رہے ہیں)۔

اس کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد اول (صفحہ ۲۱۲) میں کی جا چکی ہے. اس کے برعکس صحیح شیوہ یہ ہونا چاہیئے تھا:

۹/۵۹ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝

ان کے لئے کیا ہی اچھا ہوتا کہ انہیں، نظامِ خداوندی کی طرف سے جو کچھ حصۂ رسدی ملا تھا، اس پر مطمئن ہو جاتے (۷/۵۹) اور کہتے کہ جو کچھ ہمیں، قاعدے اور قانون کے مطابق ملا ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے. اس کے بعد ہمیں نظامِ خداوندی بہت کچھ دیگا۔

ہم اپنے دل کی پوری کشادہ اور ارادے کی وسعت کے ساتھ اس نظام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس میں جو کہا گیا ہے ـــــ مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ـــــ تو اس کا صحیح مفہوم (بلکہ یوں کہئے کہ مروجہ غلط مفہوم کی تردید) سورۃ انفال کی آیت (۸/۴۱) کے تحت گزر چکی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ صدقات کے مصارف کیا ہیں؛

(۹/۶۰) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ○

صدقات[1] کے متعلق (یعنی اُس مال کے متعلق جسے مملکت رفاہِ عامہ کے لئے صرف کرتی ہے) یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی تقسیم کسی کے ذاتی مفاد یا انفرادی جذبات کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ درحقیقت اُن لوگوں کا حق ہے؛

۱۔ جو اپنی نشوونما کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں، یعنی کسی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہ ہوں۔

۲۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار یا نقل و حرکت (کسی وجہ سے) رُک گئی ہو۔

۳۔ جو لوگ صدقات (مملکت کی اس آمدنی) کی وصولی پر مامور ہوں ان کی کفالت کے لئے۔

---

[1] یہ احکام اُس زمانے سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلامی نظامِ مملکت مکمل طور پر متشکل نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو عطیات وصول کئے جاتے تھے انہیں صدقات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ آجکل ہمارے ہاں ان مدات کو "زکوٰۃ" کی مدات سمجھا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔ قرآن کریم کے پیش کردہ معاشی نظام کی رُو سے مملکت کی ساری آمدنی "زکوٰۃ" ہے کیونکہ اسے نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے صرف کیا جاتا ہے ("ایتائے زکوٰۃ" کے معنی نشوونما دینا ہے)۔ جسے آجکل زکوٰۃ کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

۴۔ جن کی تالیفِ قلوب مقصود ہو (یعنی جو لوگ ویسے تو نظامِ خداوندی کی طرف آنے کے لئے تیار ہوں، لیکن بعض معاشی موانع اُن کے راستے میں اس طرح حائل ہوں کہ وہ انہیں اس طرف آنے نہ دیں۔ اُن موانع کے دُور کرنے میں اُن کی امداد کی جائے۔

۵۔ جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں، انہیں آزادی دلانے کے لئے۔

۶۔ ایسے لوگ جو دشمن کے تاوان یا قرض کے بوجھ کے نیچے اس طرح دب گئے ہوں کہ اس کا ادا کرنا اُن کے بس میں نہ ہو۔

۷۔ نیز، اُن باہر سے آنے والوں کا جنہیں مالی امداد کی ضرورت لاحق ہو جائے۔

۸۔ ان کے علاوہ، اور جو کام بھی نظامِ خداوندی کے لئے مفید اور نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ہوں، انہیں سرانجام دینے کے لئے یہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے ضوابط ہیں اور اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ضوابط علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی رُو سے، تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں اِزکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ یہ اسلامی مملکت کی ساری کی ساری آمدنی کو محیط ہوگی۔ جہاں تک افراد کی کمائی کا تعلق ہے، وہ اس میں سے اتنا لیں گے جو ان کی ضروریات کی کفایت کرے۔ اس سے زیادہ مملکت کی تحویل میں دے دیں گے، تاکہ وہ اس سے اپنی "زکوٰۃ" کی ذمہ داریوں کو پورا کرے (تفصیل اِن امور کی سابقہ جلدوں میں 'معاشی نظام' 'زکوٰۃ اور صدقات' کے عنوان میں گزر چکی ہے)۔ یہ اُس وقت ہوگا جب اسلام کا معاشی نظام قائم ہو جائے گا۔

جب یہ نظام ہنوز قائم نہیں ہوگا (زیرِ تکمیل ہوگا) اُس زمانے میں اصحابِ ثروت، اس نظام کے قیام کے لئے عطیات دیں گے۔ اُس وقت اس نظام کی آمدنی کی مدات یہ ہوں گی: مالِ غنیمت (انفال بھی اس میں شامل تھا) اور اصحابِ ثروت کے عطیات۔ ان عطیات کو صدقات کہہ کر پکارا گیا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد سوم (صفحہ ۴۹۱)۔ سابقہ آیات میں منافقین نے انہی صدقات کی تقسیم کے سلسلہ میں حضورؐ کے

صدقات کے مصارف نہ کہ زکوٰۃ کے

خلاف الزام تراشی کی تھی۔ زیرِ نظر آیت میں انہی صدقات کے مصارف کا ذکر ہے۔ جب اسلام کا معاشی نظام قائم ہو گیا تو پھر صدقات کی ضرورت نہ رہی۔ اُس وقت ہر فرد کی زائد از ضرورت کمائی مملکت کی تحویل

میں چلی جاتی تھی، لہٰذا، نہ اُن کے پاس صدقات دینے کے لئے کچھ رہتا تھا، نہ ایسے محتاج ہوتے تھے جن کی مدد کے لئے (انفرادی طور پر) صدقات دیئے جاتے۔

لیکن جب دین، مذہب سے بدل گیا اور زکوٰۃ نام رہ گیا اُس ۲½ فیصد کا جو اپنی جمع شدہ دولت میں سے خیرات کے طور پر نکال دیا جاتا ہے تو قرآن نے جو مصارف صدقات کے بتائے تھے اُن کے متعلق کہہ دیا کہ وہ زکوٰۃ کے مصارف ہیں، حالانکہ قرآن نے نہ زکوٰۃ کو صدقات کہا ہے، نہ زکوٰۃ کے مصارف متعین کئے ہیں۔ قرآن نے جسے زکوٰۃ کہا ہے، اس کے مصارف متعین کئے ہی نہیں جا سکتے۔ اس کے مصارف اسلامی مملکت کا بجٹ مقرر و متعین کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اس بجٹ میں حسبِ ضرورت تبدیلی ہوتی رہے گی۔

لیکن ہمارے ہاں، صدقات کے انہی مصارف کو زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن نے یہ مصارف، صدقات کے بتائے ہیں، انہیں زکوٰۃ کے مصارف کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے!

آپ نے غور فرمایا کہ جب دین کو مذہب میں تبدیل کیا گیا تو اسے کس کس قسم کے مقدس نقاب اوڑھائے گئے!

قرآنِ کریم نے صدقات کے جو مصارف بتائے ہیں، ان کی تشریح مفہوم سے ہو گئی ہو گی۔ حوالوں کے لئے حسبِ ذیل مقامات دیکھئے:

۱۔ فقراء (۲/۲۷۳ ; ۲/۲۷۱ ; ۵۹/۸)۔ ۲۔ مساکین (۹۰/۱۶ ; ۲/۱۷۷ ; ۴/۳۶ ; ۱۷/۲۶ ; ۳۰/۳۸ و ۵۹/۷)۔

۳۔ ابن سبیل (۲/۱۷۷ ; ۴/۳۶ ; ۱۷/۲۶ ; ۳۰/۳۸ ; ۵۹/۷)۔ ۴۔ فی الرقاب (فك رقبة ۹۰/۱۳)۔

اس فہرست میں "فی الرقاب" خصوصیت سے غور کے قابل ہے۔ سورۃ البلد میں دین کے جو بنیادی فرائض بتائے گئے ہیں، ان میں سرِ فہرست "فَكُّ رَقَبَةٍ" ہے (۹۰/۱۳) یعنی "انسانوں کی گردنیں آزاد کرانا"۔

غُلاموں کو آزاد کرانا

یہ بندھی ہوئی گردنیں، انفرادی طور پر غلاموں اور لونڈیوں کی ہوں گی اور اجتماعی طور پر اُن قوموں کی بھی جو دوسری قوموں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ قرآنی نظام قائم کرنے والی اُمتِ مسلمہ کا فریضہ ہو گا کہ وہ ہر مقام پر انسانوں کو محکومی اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائے۔ دین کے اس بنیادی فریضہ کی روشنی میں یہ کہنا کہ اسلام میں غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے، کس قدر قرآن میں تحریف اور دین کی مخالفت ہے؟ جو دین فَكُّ رَقَبَةٍ (گردنوں کو آزاد کرانے) کو بنیادی فریضہ قرار دے، کیا وہ خود غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دے گا؟

یہ ہمارے دورِ ملوکیت کا اسلام (مبنی بر فقہ اور روایات) ہے جس نے ہر خلافِ اسلام روش کو اسلام بنا دیا اور وہی اسلام ہمارے ہاں رائج چلا آرہا ہے۔

○

اس کے بعد پھر منافقین کا ذکر کیا گیا:

۹/۶۱ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ أُذُنٌ ؕ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو (طرح طرح کی باتیں کر کے) نبیؐ کو اذیت پہنچاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کانوں کا کچا ہے' ہر ایک کی بات سنتا ہے۔ ان سے کہو کہ (یہ کان کا کچا نہیں' اگرچہ) یہ حقیقت ہے کہ یہ ہر ایک کی سن لیتا ہے۔ اور یہ چیز تمہاری بہتری کے لئے ہے کہ تم اپنی ہر بات اس تک پہنچا سکتے ہو۔ (اس نے اپنے ہاں حاجب و دربان مقرر نہیں کر رکھے۔ نہ ہی وہاں یہ حالت ہے کہ اُس تک خاص خاص لوگوں ہی کی رسائی ہو سکتی ہو۔ باقی رہا یہ الزام کہ یہ ہر ایک کی بات کا یقین کر لیتا ہے' تو یہ کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے کہ یہ رسولؐ) خدا کے قوانین پر محکم یقین رکھتا ہے' اس لئے یہ صرف ان لوگوں کی باتوں پر اعتماد کرتا ہے جو اُس کی طرح' خدا کے قوانین پر یقین رکھتے ہیں (۱۷/۳۶؛ ۴۹/۶)۔

اس سے یہ نہ سمجھ لو کہ یہ پارٹی بازی کی عصبیت کی وجہ سے' جماعتِ مومنین کی باتوں پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کا پیغام و نظام تمام نوعِ انسان کے لئے باعثِ رحمت ہے (۲۱/۱۰۷) لیکن یہ واضح ہے کہ اس رحمت سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے ہیں جو اس پیغام کی صداقت پر یقین رکھیں۔ یہ وجہ ہے کہ جماعتِ مومنین اس سے بہرہ یاب ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ رسولؐ کے لئے وجہ اذیت بنتے ہیں' وہ اس سے محروم رہ کر الم انگیز تباہیاں

مول لے لیتے ہیں۔

آپ غور فرمایئے کہ حق و صداقت کے داعی کو کس کس قسم کی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں میدان

طعن و تعریض کے تیر

جنگ کا تصادم تو ان کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ زبان کے تیروں کے زخم فولاد کی سناں کے مقابلہ میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔

یہی تھے وہ زخم جن کے اندمال کے لئے خود خدا کو یہ شفقت آمیز تاکید کرنی پڑی کہ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (۲۰/۱۳۰) "یہ لوگ جو باتیں تیرے خلاف کرتے ہیں انہیں ہمت اور استقامت سے برداشت کرو" اور تلخ باتوں کے برداشت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا اثر نہ لیا جائے۔ کسی کی بات کی تلخی آپ کے اثر لینے کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اگر آپ اثر نہ لیں گے تو بات ہوا میں تحلیل ہو کر بے اثر ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد منافقین کے ایک اور حربہ کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ منافق کرتے یہ ہیں کہ حکومت سے بالا بالا افراد سے یارانہ گانٹھتے ہیں اور اس طرح جماعت کے اندرونِ خانہ معاملات تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، نیز اس سے جماعت کے اندر پھوٹ پڑ جانے اور حکومت کے خلاف جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

جماعتِ مومنین کو منافقین کے ساتھ قطع تعلق کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کا ذکر مختلف مقامات میں آچکا ہے۔ یہاں کہا کہ؛

۹/۶۲ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

اے جماعتِ مومنین! یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمہارے سامنے قسمیں کھا کھا کر تمہیں راضی کر لیں۔ لیکن تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ (یہاں افراد کے راضی کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔) اصل سوال خدا اور رسولؐ (نظامِ خداوندی) کو راضی کرنے کا ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس نظام کی صداقت پر سچے دل سے ایمان لائیں۔

منافقین کے ساتھ قطع علائق

یہ رہنمائی ایک ابدی اصول اپنے اندر رکھتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں افراد کے کسی غیر کے ساتھ ذاتی تعلقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی دوستی اور دشمنی، یگانگت اور بیگانگی، تعلقات اور لاتعلقی، سب اجتماعی فیصلوں کے تابع ہونی چاہیئے۔ اس سے اُن کا اجتماعی نظم و نسق بھی قائم رہے گا اور نظامِ حکومت بھی مستحکم۔

۹/۶۳ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ۝

کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ جو شخص نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لئے جہنّم کا عذاب ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ــــ اور یہ عذاب کیا ہے؟ بہت بڑی ذلت و رسوائی! (نظامِ خداوندی کی مخالفت درحقیقت بلند اخلاقی اقدار کی مخالفت ہے، جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟)۔

منافقین کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اُن کی منافقت کا پردہ چاک نہ ہو جائے ــــ

۹/۶۴ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ۝

یہ منافق اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں کی طرف کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو اُن باتوں کو ظاہر کر دے جو ان منافقین کے دل میں پوشیدہ ہیں۔

ان سے کہو کہ تم (زندگی سے مذاق کر رہے ہو) مذاق کئے جاؤ۔ جس بات کا تمہیں اندیشہ ہے، وہ تو ہو کر رہے گی۔ منافقت کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ وہ ایک دن ضرور ظاہر

ہو کر رہتی ہے۔

یہ لوگ دین کو Seriously نہیں لیتے۔ اسے ہنسی مذاق کا کھیل سمجھتے ہیں؛

9/65 وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ○

اگر تم ان سے پوچھو (کہ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو تو) یہ کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی دل لگی کی باتیں کرتے تھے۔ ان سے کہو کہ کیا تم خدا سے اس کے احکام وقوانین سے اور اس کے رسولؐ سے دل لگی کرتے ہو! (اور سوچتے نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟)۔

دین کو مذاق سمجھنے والے

دین کو Seriously نہ لینے والوں کے لئے سخت وعید آئی ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صـ۵۳۲ و جلد پنجم صفحات ۴۸ اور ۲۰۴)۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے ان سے واضح طور پر کہہ دیا کہ اس قسم کی بہانہ سازیوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں اس روش کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

9/66 لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○ؑ

لیکن یہ سب باتیں یونہی بہانہ سازی کی ہیں۔ (سچی بات، کیوں نہیں کہتے کہ) تم ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر چکے ہو۔ (لیکن تم میں بھی دو گروہ ہیں: ایک ان کا جو جان بوجھ کر جرمِ کفر کے مرتکب ہوتے ہیں)۔ یہ مجرمین کا گروہ ہے۔ انہیں ضرور سزا دی جائے گی۔

(دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو یونہی دوسروں کی دیکھا دیکھی' بغیر جانے بوجھے' ان کے پیچھے لگ گئے ہیں. اگر یہ لوگ صحیح راستہ پر آجائیں تو) ان سے باز پرس نہیں ہوگی.

قرآن مجید کی کشادہ نگہی قابلِ غور ہے. جو لوگ محض دیکھا دیکھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے' ان سے رعایت برتی گئی. انہیں موقع دے دیا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر' صحیح روش اختیار کرلیں تو ان کے سابقہ جرائم سے درگزر لیا جائے گا.

ان گروہوں میں تمیز کرنے کے بعد کہا کہ منافقت درحقیقت ایک قلبی کیفیت اور نفسیاتی عارضہ ہے. ان کی مخالفت کی روش اور انداز و اسالیب میں فرق ہو سکتا ہے' لیکن علتِ مرض سب کی ایک ہی ہے.

۹/۶۷ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

یاد رکھو! منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں. ان کی حالت یہ ہے (کہ شیوۂ مومنین کے بالکل برعکس) جن باتوں سے قانونِ خداوندی منع کرتا ہے' یہ لوگوں کو ان کے کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ (نظامِ خداوندی کے لئے خرچ کرنے سے) روکے رکھتے ہیں. جب انہوں نے اس طرح نظامِ خداوندی کو چھوڑ دیا تو نظامِ خداوندی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا (۵۹/۱۹) اور اپنی برکات و ثمرات سے انہیں محروم کر دیا' اس لئے کہ منافق (خواہ زبان سے کتنا ہی اقرار کیوں نہ کریں' درحقیقت) خدا کا راستہ چھوڑ کر' دوسری راہوں پر چل نکلتے ہیں.

اس سورت میں ذرا آگے چل کر مومنین کے متعلق کہا ہے کہ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱). ان کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بتایا گیا ہے اور منافقین کا ان کے برعکس امر بالمنکر اور نہی

عن المعروف. یہی تفریق ان دونوں گروہوں میں مابہ الامتیاز ہے. یہ تفریق بڑی جامع ہے جس میں دین کی
مخالفت کا ہر گوشہ آجاتا ہے. ان کا انجام کیا ہوگا، فرمایا؛

۹/۶۸ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۙ۝

یہ وجہ ہے کہ منافقین کا حشر بھی کفار جیسا ہی ہوگا. حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں کچھ فرق نہیں، دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے (بلکہ منافق جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے (۴/۱۴۵)) یہ اس سے نکل نہیں سکیں گے. یہی ان کے اعمال کا صحیح صحیح بدلہ ہے ـــــ یعنی نظامِ خداوندی کی برکات و ثمرات سے محرومی اور ہمیشہ رہنے والی تباہی.

اور یہ کوئی نئی بات نہیں. کشاکشِ حق و باطل شروع سے چلی آرہی ہے اور مومنین کے مقابلہ میں کفار کے ساتھ منافقین کا گروہ شانہ بشانہ چلا آرہا ہے.

۹/۶۹ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ) تمہاری حالت بالکل ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ وہ قوت میں بھی تم سے بڑھ کر تھے اور دولت اور افرادِ خاندان کی کثرت کی وجہ سے ان کی جتھہ بندی زیادہ مضبوط تھی۔ لیکن وہ ان چیزوں سے صرف تھوڑے سے وقت کے لئے فائدہ اٹھا سکے (اس کے بعد تباہ ہو گئے) سو تم بھی' انہی کی طرح' ان چیزوں سے کچھ وقت کے لئے فائدہ اٹھا لو اور جس طرح وہ بیہودہ اور فضول باتوں میں اپنی زندگی ضائع کرتے رہے' تم بھی ضائع کرتے ہو۔

یاد رکھو! یہی لوگ ہیں جن کے تمام پروگرام' خواہ وہ قریبی مفاد کے لئے ہوں یا مستقبل کے لئے ـــــ دنیا کے لئے ہوں یا آخرت کے لئے ـــــ سب بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں، یعنی وہ نتائج مرتب نہیں کرتے جن کے لئے انہیں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان کے حصے میں نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔

تاریخی حقائق اس کے شاہد ہیں؛

۹/۷۰ اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

کیا ان لوگوں تک' اقوامِ سابقہ کی سرگزشت نہیں پہنچی ـــــ یعنی قومِ نوحؑ، قومِ عادؑ، قومِ ثمودؑ، قومِ ابراہیمؑ' اہلِ مدین کی ـــــ نیز دیگر اقوام کی جن کی بستیاں الٹ دی گئی تھیں۔ اُن کے رسول' اُن کے پاس واضح قوانین لے کر آئے (لیکن انہوں نے اُن سے سرکشی اختیار کی اور اس طرح' اپنے جرائم کی پاداش میں تباہ ہو گئے۔ یاد رکھو! خدا نے ان پر زیادتی نہیں کی تھی ـــــ خدا کسی پر بھی زیادتی نہیں کرتا ـــــ انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی اور ان کے اعمال اُن کو لے ڈوبے۔

اس کے برعکس:

9/71 وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝

(یہ تو گروہِ منافقین کی حالت تھی۔ ان کے برعکس دوسرا گروہ) مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ہے۔ یہ سب، نصب العین ایمان کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوتے ہیں۔ یہ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطۂ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر معاملہ میں، خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے فیضیاب ہوں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ خدا کا قانون کس طرح قوت و حکمت پر مبنی ہے۔

آیت (۹/۶۷) میں بتایا گیا ہے کہ منافقین، معروف سے روکتے ہیں اور منکر کا حکم دیتے ہیں یہاں جماعتِ مومنین کا فریضہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر بتایا گیا ہے۔ یہ اس سے پہلے بھی متعدد بار آچکا ہے (انڈکس میں عنوان امر کے تحت دیکھئے)۔ خود نبی اکرمؐ کا بھی یہی فریضہ بتایا گیا ہے۔ دیکھئے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۴۰۸)۔ سابقہ صفحات میں زیرِ آیت (۷/۱۹۸) میں بھی اس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ المعروف ہر وہ کام جس کی تائید قرآن سے ہوتی ہو اور جسے اسلامی مملکت Approve کرتی ہو۔ اس کے برعکس، منکر وہ ہے جو قرآن کے خلاف ہو اور اسلامی مملکت کے آئین و ضوابط اس کی ممانعت کرتے ہوں۔ امتِ مسلمہ اور حکومتِ اسلامی کا یہی فریضہ ہے، بلکہ یوں کہئے کہ اس کی ہستی کی وجہِ جواز

یہی ہے. جو مملکت اس فریضہ کو ترک کردے یا اس کی سرانجام دہی میں تغافل برتے' وہ اسلامی نہیں رہتی. اُس کی اِس روشِ حیات کا نتیجہ ہے ؛

(۹/۷۲) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۟

یہ ہیں وہ مومنین ــــــ مرد اور عورت ــــــ جن کے لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے زندگی کی سدا بہار خوشگواریاں ہیں جن سے یہ ہمیشہ متمتع ہوتے رہیں گے ــــــ فردوس منظر چمنستاں میں آرائش و آسائش کا نہایت پاکیزہ ساز و سامان' عُمدہ رہنے کی جگہ اور ان سب سے بڑھ کر ایک اور چیز یعنی ان کی ذات کی ایسی نشو و نما جس سے وہ (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ و یک رنگ ہو جائے (۹/۱۰۰ ؛ ۳۸ - ۳۶/۴۲ ؛ ۷۶/۳۱). یہ تھا وہ اصل مقصود جس کی خاطر وہ یہ سب کچھ کیا کرتے تھے. اس مقصد کا حصول' ان کی حقیقی کامیابی ہے ــــــ اور کتنی عظیم القدر ہے یہ کامیابی (جس سے ان کی ذات' زندگی کے مزید ارتقائی مدارج طے کرنے کے قابل ہو جائے گی) (۵۷/۱۲ ؛ ۶۶/۸).

جنّتِ عدن "جنّتِ عدن" قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے. مادّہ کے اعتبار سے عدن کے معنی "قیام گاہ" کے ہیں. لہٰذا جنّتِ عدن سے مراد وہ باغات ہیں جن میں راحت و آرام سے قیام کیا جائے (جنّت کا مفہوم سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے).

رضوان اللہ یہاں جنّت کی نعماء بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ. رضوان کے مفہوم کے لئے انڈکس میں رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ دیکھئے جہاں مرضات اللہ وغیرہ کا بھی مفہوم آگیا ہے (بالخصوص مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۶۰ - ۲۵۹).

مومن کی زندگی کا منتہیٰ جنت ہے، لیکن اس سے بھی بلند درجہ رضوان اللہ کا ہے۔ یوں سمجھئے کہ جنت کی زندگی آسائشوں کے تعلق سے ارتقاء کی اگلی منزل ہے، تو نفسِ انسانی (انسانی ذات) کی صفاتِ خداوندی سے (تا بحدِ بشریت) ہم آہنگی، شرف و مجدِ انسانیت کی رفعتوں کا مقام ہے۔ ان آسائشوں کے ساتھ اس ہم آہنگی کو فوزالعظیم کہا گیا ہے۔ واضح رہے کہ رضوان من اللہ اکبر کا مقام قرآنِ کریم کی اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لئے (تصوف کی قسم کے) الگ مسالک و مشارب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تصوف کا رضوان تو بلکہ قرآن کے خلاف ہوتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "تصوف کی حقیقت")۔ یہ سب مومن ہی کی خصوصیات ہیں۔ خود اسی آیت میں دیکھئے رضوان من اللہ اکبر کا وعدہ مومنین اور مومنات ہی سے کیا گیا ہے۔ نعماء حیات اور انسانی ذات کی نشوونما دونوں قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس سے (عام اصطلاح میں) "روح اور مادہ کی ثنویت" ختم ہو جاتی ہے۔

انسان، طبیعی جسم اور اس کی ذات دونوں (یکجا) کا نام ہے۔ (میں نے "دونوں کے مجموعہ" یا "دونوں کے مرکب" کے الفاظ قصداً استعمال نہیں کئے کیونکہ ان سے بہت سی فلسفیانہ الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں)۔

جماعتِ مومنین کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد پھر روئے سخن منافقین کی طرف مبذول ہوا۔ کہا کہ جب یہ لوگ دلائل و براہین کی رو سے کوئی بات سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے اور نظامِ خداوندی کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ چکے ہیں، تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کی دراز دستیوں کی روک تھام قوت کے ذریعے کی جائے۔

(۹/۷۳) يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

اے رسولؐ! تم ان منافقین اور کفار کے خلاف، (جو نظامِ خداوندی کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ چکے ہیں) پوری پوری جدوجہد کرو اور شدت اور سختی سے ان کا مقابلہ کرو تاآنکہ یہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں پہنچ جائیں اور دیکھ لیں کہ زندگی کا یہ ٹھکانا کس قدر

صعوبت انگیز ہے (۹/۱۲۳)۔

ان کی حالت یہ ہے کہ

۹/۷۴ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

ان کے کیریکٹر کی یہ حالت ہے کہ یہ کفر کی باتیں کرتے رہتے ہیں ــــــ باتیں ہی نہیں کرتے بلکہ درحقیقت، بظاہر اسلام لانے کے بعد پھر کفر کی زندگی اختیار کر چکے ہیں تمہاری تخریب کے لئے ہر قسم کے منصوبے باندھتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں ان میں، ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ حالت ان کی یہ ہے، لیکن اس کے بعد جب ان سے پوچھا جائے تو خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہہ دیں گے کہ ہم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی!

ان سے کوئی پوچھے کہ تم جو جماعتِ مومنین سے اس طرح انتقام لے رہے ہو، تو کس بات کا؟ ان کا بالآخر جرم کیا ہے؟ یہی نا کہ نظامِ خداوندی نے انہیں اس قدر خوشحال کیوں کر دیا ہے؟

بہرحال، یہ لوگ اب بھی اپنی روش سے باز آجائیں تو ان کے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن اگر یہ اپنے وعدوں سے اسی طرح پھرتے رہے تو خدا کا قانونِ مکافات، انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت ترین سزا دے گا اور ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ دنیا میں ان کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ہوگا۔

ان منافقین میں بیشتر یہودی تھے۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) اہلِ مدینہ ..... اور اس کے گرد و پیش کے قبائل کا مالی نظم و نسق انہی کے ہاتھ میں تھا۔ سود پر ان کا گزارہ تھا۔ اس کے لئے (ہر سرمایہ دار کی طرح) ان کی انتہائی خواہش اور کوشش تھی کہ وہاں کی آبادی خوشحال نہ ہونے پائے، مفلس و محتاج رہے تاکہ ان کی رگِ جان ان کے پنجہ میں رہے۔ اسلام آنے کے بعد وہاں قرآنی نظام کا آغاز ہو گیا۔ اسی سے مسلمانوں کو مرفہ الحالی نصیب ہو گئی اور یہودیوں کے دست نگر اور محتاج نہ رہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی جو وہ اسلامی نظام (اور مسلمانوں) کے خلاف اس قدر مذموم کوششیں اور سازشیں کرتے رہتے تھے۔

قرآن نے جو کہا تھا کہ یہ تباہ و برباد ہوں گے اور دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا، تو یہ بات اُس زمانے میں کہی گئی تھی جب ہنوز اسلامی مملکت کو اتنی طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی، لیکن آنے والے واقعات نے بتا دیا کہ قرآن نے جو کچھ کہا تھا وہ کس طرح سچ ہو کر رہا۔ عربی قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہودیوں کو (اُن کی پیہم سازشوں اور سرکشیوں کی وجہ سے) ملک بدر کر دینا پڑا تھا (اس کی تفصیل سورۃ الحشر (سورۃ نمبر ۵۹) میں ملے گی)۔

دعوئ ایمان کی عملی تصدیق کے لئے قدمِ اوّل یہ تھا کہ مومن اپنی کمائی میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھے اور زیادہ سے زیادہ مفلسوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے۔ لیکن منافقین اس اندازِ معیشت کو گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے۔

(۹/۷۵-۷۷) وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ
لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰهُم
مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُم مُّعْرِضُوْنَ ۝
فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ
اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو وعدے کیا کرتے تھے کہ اگر اللہ ہمیں رزق کی فراوانی عطا کرے

تو ہم اسے نظامِ خداوندی کی راہ میں خرچ کر کے، اپنے قول کو سچ کر دکھائیں گے اور اس طرح صالحین کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے ــــــ یعنی اُن لوگوں کے زمرے میں جو لوگوں کے کام سنوارتے ہیں (۷۵)۔

لیکن جب اللہ نے انہیں رزق کی فراوانی عطا کر دی، تو انہوں نے سب کچھ اپنے ہی لئے سمیٹ لیا اور اپنے وعدوں سے صاف پھر گئے ــــــ اور اب تک ان سے پھرے ہوئے ہیں (۷۶)۔

ان کی ان مسلسل وعدہ خلافیوں اور کذب بیانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقت (کی وہ زندگی جسے انہوں نے شروع میں وقتی مصلحت کے طور پر اختیار کیا تھا) ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئی۔ اب یہ وہاں سے مرتے دم تک نہیں نکل سکتی (۷۷)۔

منافقت کی زندگی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ شروع شروع میں تو اسے مصلحتاً اختیار کیا جاتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اصلاح (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔ منافق اس خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے، اس کی حقیقت کا کسی کو علم نہیں ہوگا۔ اگر اُس کو اس کا یقین ہو کہ لوگ اس کی فریب دہی سے بخوبی واقف ہیں، تو پھر منافقت کی روش جاری نہیں رکھے گا ــــ یا اپنی اصلاح کر لے گا اور یا کھلے بندوں غلط کار بن جائے گا۔ جن منافقین کا یہاں ذکر چلا آ رہا ہے، وہ بھی اسی فریبِ نفس میں مبتلا تھے کہ ان کی زیرِ نقاب حرکتوں سے کوئی واقف نہیں۔ کہا کہ

۹/۷۸ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۟ۚ

کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ اللہ ان کے خفیہ رازوں اور پوشیدہ مشوروں سے واقف ہے، اس لئے کہ وہ غیب کی باتوں کو جانتا ہے اور اچھی طرح سے جانتا ہے۔

"خدا کے باخبر ہونے" کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا۔ یہ ہزار نقاب اوڑھیں، اُس کے قانون کی نگاہوں سے کچھ بھی پوشیدہ

نہیں رہ سکتا. اصل یہ ہے کہ اگر انسان کا اس حقیقت پر ایمان (یقین) ہو کہ جو کچھ میں کرتا ہوں (خواہ وہ دل کے ارادے اور نگاہ کی خیانت ہی کیوں نہ ہو (۴۰/۱۹))' وہ سب خدا کے علم میں ہے اور اس کا نتیجہ اُس کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا' تو وہ منافقت نہیں کرے گا. اگر چور کو واردات سے پہلے علم ہو جائے کہ اسے پولیس کا سپاہی دیکھ رہا ہے' تو وہ چوری نہیں کرے گا (چوری منافقت ہی کی ایک قسم ہے). وہ یا تو چوری سے تائب ہو جائے گا اور پُر امن شہری بن جائے گا اور یا ڈاکہ زنی کرے گا (ڈاکہ زنی کفر ہے).

منافقت دل کا مرض (نفسیاتی روگ) ہے جس میں انسان دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوشی حاصل کرتا ہے. اس اذیت رسانی کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں. ان میں طنز و تشنیع اور طعنہ زنی سب سے زیادہ زہر آلود ہوتی ہے. زیرِ نظر منافقین کی بھی یہی روش تھی اور اس تیر افگنی میں وہ کسی کو بھی نہیں بخشتے تھے' حتیٰ کہ ذاتِ رسالتمآبؐ کو بھی نہیں (۹/۵۸). ان کی حالت یہ تھی کہ

(۹/۷۹) اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ان کی حالت یہ ہے کہ جماعتِ مومنین میں سے جو لوگ' نظامِ خداوندی کے لئے دل کی رضامندی سے مالی امداد کرتے ہیں' یہ انہیں ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں اور جو (مومنین) ایسے ہیں کہ اُن کے پاس دینے کے لئے روپیہ پیسہ نہیں ہوتا' لیکن وہ اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنی محنت پیش کر دیتے ہیں' تو یہ (منافقین) ان کی غریبی پر ان کی ہنسی اڑاتے ہیں. لیکن یہ نہیں جانتے کہ خدا کا قانونِ مکافات خود ان کی ہنسی اڑا رہا ہے (۲/۱۵) کہ یہ کس خود فریبی میں مبتلا ہیں اور انہیں اتنا نظر نہیں آتا کہ یہ' انہی فاقہ کش محنت کرنے والوں کے ہاتھوں' کس طرح ایک الم انگیز عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں.

ابتدائے اسلام میں معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ اُن میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اسلامی نظام کی تشکیل کے لئے مالی امداد کر سکتے تھے. باقی وہ تھے جو اپنی محنت کی پیشکش کر سکتے تھے. خدا کے نزدیک ان محنت کشوں کے درجات بھی کم نہ تھے. اس نظام کی تعمیر اور استحکام میں ان سب کا برابر کا حصہ تھا. فٹ بال یا ہاکی کے میچ میں گول کیپر خواہ ایک بار بھی گیند کو نہ چھو سکے' میچ کی کامیابی میں وہ بھی برابر کا شریک ہوتا ہے "ٹیم ورک" میں تقسیم کار کا اصول کار فرما ہوتا ہے. ذرا آگے چل کر آپ دیکھیں گے (۹/۹۲ میں) کہ ان نادار و فاقہ کشوں کی حالت یہ تھی کہ جہاد کا اعلان ہوتا ہے' لیکن ان کے پاس سواری نہیں ہوتی کہ وہ لشکر میں شامل ہو سکیں. وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں (معاشرہ ابھی اس حالت میں ہے کہ) حضورؐ بھی اُن کے لئے کچھ نہیں کر سکتے. یہ واپس جاتے ہیں تو اس طرح کہ ان کی آنکھوں سے وہ آنسو ٹپکتے ہیں جنہیں "شانِ کریمی موتی سمجھ کر چُن لیتی ہے". ان پیکرانِ خلوص و ایثار کے خلاف' بدبخت منافقین طعنہ زنی کرتے تھے. سوچئے کہ اس سے زیادہ گہرا زخم کس نشتر کا لگ سکتا تھا؟

منافقین کی طعنہ زنی

ان مخالفین کی دنایت و خصومت کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف وہ ذاتِ رسالتمآبؐ (کہ انہی مخالفین کی ناوک افگنی سے جن کا سینہ چھلنی ہو رہا تھا) جن کے دلِ دردمند کی یہ کیفیت کہ وہ وقفِ اضطراب رہتے تھے کہ یہ کسی طرح تباہی سے بچ جائیں، اس حد تک وقفِ اضطراب کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ

۹/۸۰ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؑ

(اے رسولؐ! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا دل دردمند اب بھی یہ چاہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے جس سے یہ لوگ اُس آنے والے عذاب سے محفوظ رہ سکیں' لیکن) تمہاری ہزار آرزوئیں بھی انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتیں جو' خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے

اُن کے اعمال کے بدلے میں' اُن پر آنے والی ہے (تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ اس نظام پر سچے دل سے ایمان تو رکھتے ہیں' لیکن بعض کمزوریوں کی بنا پر ان پر سہواً کچھ لغزشیں ہو جاتی ہیں. لیکن یہ حقیقت نہیں). یہ لوگ خدا اور رسولؐ (نظامِ خداوندی) سے دل سے انکار کرتے ہیں اور محض ظاہرداری سے اس کا اقرار کرتے ہیں ـــــ اب سوچو کہ جو لوگ اِس طرح صحیح راستے سے الگ ہو جائیں' ان پر سعادت کی راہیں کس طرح کشادہ ہو سکتی ہیں؟ (۶-۵/۶۳؛ ۴/۶۴).

حضورؐ کی رقیق القلبی کا تذکرہ سابقہ جلدوں میں بھی آ چکا ہے. انڈکس میں عنوان "رسول اللہ" کے تابع دیکھئے (نیز آیات (۳/۱۵۸)؛ (۵/۴۱)؛ (۱۸/۶)؛ (۳۵/۸)؛ (۶/۳۵)؛ (۲۶/۳).

کفّار کے لئے حضورؐ کی آرزوئے مغفرت

اس آیت میں کہا گیا ہے: اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "اگر تم ان کے لئے ستر بار بھی دعائے مغفرت کرو گے" ـــــ اور ستر کے متعین عدد کے پیشِ نظر بعض روایات بھی کتبِ احادیث میں ملتی ہیں. لیکن جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان' جلد اوّل' صفحہ ۳۵۲ اور جلد سوم' صفحہ ۲۶۳، عربی محاورہ میں "سبع" کا لفظ "بکثرت" کے معنوں میں بھی آتا ہے. اسی لئے میں نے اس کا ترجمہ "ہزار آرزوئیں" کیا ہے. یہ محاورۂ عرب کے مطابق ہے (اسند ان معانی کی میری کتاب لغات القرآن میں ملے گی).

آیات (۴۲-۴۳/۹) میں بتایا جا چکا ہے کہ بعض منافقین نے حضورؐ سے جنگ سے مستثنیٰ رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی. وہ اپنی اس فریب کارانہ کامیابی پر بہت خوش تھے.

(۹/۸۱) فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِهِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوۡۤا اَنۡ يُّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَقَالُوۡا لَا تَنۡفِرُوۡا فِى الۡحَـرِّ‌ؕ قُلۡ نَارُ جَهَـنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا‌ ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَفۡقَهُوۡنَ ۝

جو (منافقین تمہارے ہمراہ، جنگ کے لئے نہیں نکلا) پیچھے رہ گئے ہیں، وہ اپنے جی میں بہت خوش ہیں کہ ہم، رسول اللہ کی خواہش کے علی الرغم پیچھے بیٹھے ہیں ـــــ انہیں، راہِ خدا میں، اپنے جان ومال سے جہاد کرنا، بہت ناگوار گزرا۔ (اس لئے یہ خود بھی پیچھے رہے اور دوسروں سے بھی) کہتے رہے کہ دیکھو! اس شدت کی گرمی میں جنگ کے لئے مت نکلو۔ ان سے کہہ دو کہ جہنم کی آگ، موسم کی گرمی سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ اے کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ سکتے (اگر خدا کے نظامِ عدل واحسان کو شکست ہو جائے اور ظلم واستبداد کے نظام کے تحت زندگی بسر کرنی پڑے تو یہ عذاب کس قدر دردانگیز اور شدید ہوگا)۔

آیت کے آخر میں کہا ہے: لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ـــ "اے کاش! یہ لوگ عقل وفکر سے کام لیتے"۔ اس سے واضح ہے کہ اگر غلط کار لوگ، اپنی منفعت پرستی کے جذبات میں بہ جانے کے بجائے، غور وفکر سے کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کی روش انہیں کس طرح تباہیوں کی طرف لئے جارہی ہے۔ اس سے بھی عیاں ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک عقل وفکر کی اہمیت کس قدر ہے۔ جذبات کی رُو سے انسان کے سامنے صرف مفاداتِ عاجلہ ہوتے ہیں۔ مستقبل پر اس کی نگاہ نہیں ہوتی۔ وحی کی روشنی میں عقل وفکر سے کام لیا جائے تو مستقبل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے، صرف مفادِ عاجلہ کو زندگی کا منتہیٰ قرار دینے والوں کے انجام کا نقشہ بڑے عبرت آموز انداز میں پیش کیا ہے، ارشاد ہے:

۹/۸۲ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

یہ اپنی اس "کامیابی" پر بہت خوش ہیں۔ ان سے کہو کہ تم اس موہوم خوشی میں تھوڑا سا ہنس لو۔ اس کے بعد تمہارے لئے عمر بھر کا رونا ہوگا اور یہ رونا ہوگا تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں!

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ رنج وراحت، خوشی اور غم، خندہ وگریہ سب اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں ـــــ انفرادی اعمال یا اجتماعی اعمال۔

آخری فیصلہ یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی منقطع کر لئے جائیں۔

۹/۸۳ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝

(اگر اس جنگ سے) واپسی پر' پھر ایسی صورت پیدا ہو کہ ان کا کوئی گروہ' تمہارے ساتھ جنگ میں جانے کے لئے تم سے اجازت مانگے' تو ان سے صاف کہہ دینا کہ نہ تم میرے ساتھ کبھی باہر نکل سکتے ہو' نہ ہماری معیّت میں کسی دشمن سے جنگ کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ تم وہی ہو جنہوں نے (اُس نازک وقت میں) پیچھے رہ جانے کو ترجیح دی تھی۔ سو اب تم ہمیشہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہو۔ ہمارے ساتھ تمہارا کیا کام ہے؟

۹/۸۴ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

یہی نہیں' بلکہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی منقطع کر لو (تاکہ انہیں اور اُن جیسے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تم اُن کی اِن حرکات کی وجہ سے' اُن سے کس قدر ناراض ہو) معاشرتی تعلقات کی ایک صورت' میّت کی تجہیز و تکفین میں شرکت اور اس کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار بھی ہوتی ہے۔ تم اُن کے ساتھ ان باتوں میں بھی شریک نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ عمر بھر نظامِ خداوندی سے سرکشی اختیار کئے رہتے ہیں اور اسی انکار و نافرمانی کی حالت میں مر جاتے ہیں (سو ایسے لوگوں سے' معاشرتی تعلقات کیسے رکھے جا سکتے ہیں؟)

(صَلِّ کے مفہوم کے لئے دیکھئے ۹/۹۹؛ ۹/۱۰۳؛ ۵۶، ۳۳/۴۳؛ ۴/۶۴)۔

معاشرتی قطعِ علائق

قطع علائق کی آخری شکل یہ ہے کہ جن کے ساتھ ان کی زندگی میں کوئی تعلق نہیں، ان کے مرنے کے بعد بھی ان سے کوئی معاشرتی تعلق نہ رکھا جائے۔ ان آیات میں خطاب تو رسول اللہ سے ہے، لیکن ان احکام کا اطلاق تمام مومنین پر ہوتا تھا۔ انہوں نے بھی ان لوگوں سے اسی انداز سے قطعِ علائق کر لیا تھا۔ میت سے متعلق رسوم کے مقاطع کے معنی (دراصل) اس کے پسماندگان سے قطعِ علائق ہوتے ہیں کیونکہ میت کے لئے تو یکساں ہے خواہ کوئی ان میں شریک ہو یا نہ ہو۔

اس آیت سے واضح ہے کہ میت کے لئے (کسی شکل میں ہی ہو) خیر خواہانہ آرزوؤں کے اظہار کا دستور عربوں کے ہاں پہلے سے چلا آ رہا تھا اور یہ معاشرتی روابط کے اظہار کا طریق تھا۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں 'معاشیات' کے عنوان کے تابع لکھا جا چکا ہے 'جو شخص یا قوم' قوانینِ فطرت کے مطابق اکتسابِ رزق کے لئے محنت کرے گی' اُسے اسی نسبت سے معاشی خوشحالی میسر آ جائے گی۔ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں ہو گی۔ لیکن کسی قوم کی محض معاشی خوشحالی اُس کے برسرِحق ہونے کا ثبوت نہیں۔ حق و باطل کا معیار اقدارِ خداوندی یا وحی کا اتباع ہے۔ حق پر وہ ہے جو قوانینِ فطرت کی رُو سے حاصل کردہ رزق کو وحی کے مطابق خرچ اور تقسیم کرتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جہاں مفلسی اور محتاجی قوموں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے' وہاں مال و دولت کی افراط بھی جس میں قوانینِ خداوندی سے اعراض برتا جائے' تباہی لاتی ہے۔ اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے فرمایا،

(۹/۸۵) وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○

(جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ ۹/۵۵) ان لوگوں کی مال و دولت کی فراوانی اور افرادِ خاندان کی کثرت تمہارے لئے وجہِ تعجب نہیں ہونی چاہیئے (یہی چیزیں تو انہیں حق و صداقت کے راستے کی طرف آنے نہیں دیتیں)۔ تم دیکھنا کہ یہی چیزیں کس طرح دنیا دی

زندگی میں ان کے لئے وبالِ جان بن جاتی ہیں اور یہ کفر کی حالت ہی میں ہلاک ہو جاتے ہیں! (۲۸/۵۸ ; ۳۹/۴۹ ; ۴۰/۸۲ ; ۴۶/۲۶)۔

جیسا کہ معلوم ہے، دعوائے ایمان کی صداقت کا معیار جہاد (میدانِ جنگ) ہے۔ مومن نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہوتا ہے (۹/۱۱۱) اور اس بیع و شریٰ کی تصدیق عند الطلب، جان کی قربانی ہوتا ہے۔ منافقین کے کفر و ایمان کی قلعی اسی مقام پر جا کر کھلتی ہے۔ وہ طرح طرح کی بہانہ سازیوں سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔

(9/86-87) وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَٰعِدِينَ ○ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ○

ان کی حالت یہ ہے کہ جب کبھی ایسا حکم نازل ہوتا ہے کہ یہ قوانینِ خداوندی پر دل سے یقین رکھتے ہوئے، رسولؐ کی معیت میں جہاد کے لئے نکلیں، تو ان میں سے جو لوگ صاحبِ استطاعت ہیں، وہ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں کہ انہیں پیچھے رہنے والوں میں چھوڑ دو۔

یعنی وہ اپنے لئے یہ پسند کرتے ہیں کہ (مردوں کے ساتھ جنگ میں جانے کے بجائے) چوڑیاں پہن کر عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہیں۔ یہ اس لئے کہ ضد اور منافقت کی وجہ سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی (ورنہ بات ایسی صاف ہے کہ اس کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی بھی ضرورت نہیں (۸۷))۔

ان کے برعکس،

(9/88-89) لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا مَعَهُۥ جَٰهَدُوا بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَٰتُ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ع

اس کے برعکس، رسولؐ اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں (جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں) اپنے مال و جان سے جہاد میں شرکت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں اور خوشگواریاں ہیں اور انہی کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی (۸۸)۔

ان کے لئے' ان کے خدا نے' ایسا جنتی معاشرہ تیار کر رکھا ہے جس کی شادابی اور شگفتگی میں کبھی فرق نہیں آئے گا — اس دنیا میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی — یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے (۸۹)۔

غور فرمایئے: میدان جنگ میں شریک ہونے والوں میں رسولؐ سرفہرست ہوتا ہے۔ سربراہ کا یہی وہ عملی (اسوہ) ہے جو اس کے رفقاء اور متبعین کے دلوں میں جذبۂ سرفروشی کی روح پیدا کرتا ہے۔

ان عذر خواہوں میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' اعراب (صحرانشین بدو) بھی شامل تھے۔

(۹/۹۰) وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(یہ شہری تو ایک طرف رہے) بدوؤں (صحرانشینوں) میں سے بھی بعض لوگ جھوٹے عذر لے کر آ رہے ہیں کہ انہیں پیچھے رہنے کی اجازت دی جائے (حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنگ کی طرف لپک کر جایا کرتے ہیں۔ لیکن وہ جنگ' لوٹ مار کے لئے ہوتی تھی اور اب جنگ حق و صداقت کی مدافعت کے لئے ہے۔ اس لئے اس جنگ سے جی چراتے ہیں) حقیقت

یہ ہے کہ ایسی جنگ کے وقت صرف وہی لوگ پیچھے رہتے ہیں جو نظامِ خداوندی سے وابستگی کے دعوے میں جھوٹے ہوتے ہیں. یہ لوگ جو (زبانی دعوائے ایمان کے باوجود) اس سے عملاً انکار کرتے ہیں، الم انگیز سزا کے مستوجب ہیں (۴۹/۱۴).

یہ ٹھیک ہے کہ بعض لوگوں کو جنگ میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا، لیکن یہ وہ لوگ ہوں گے جو فی الواقع معذور ہوں.

۹/۹۱ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ

البتہ جو لوگ کمزور یا بیمار ہیں یا جن کے پاس (سامانِ جنگ کے لئے) خرچ کرنے کو کچھ نہیں (۴۸/۱۷)، ان کے لئے پیچھے رہ جانے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ پیچھے رہ کر، نظامِ خداوندی کی بہی خواہی کے لئے کوشاں رہیں، معاشرہ کو انتشار سے بچائیں اور لوگوں میں اس کی خیر سگالی کے خیالات کو عام کریں. اس قسم کے حسن کارانہ انداز سے پیچھے رہ جانے والوں کے خلاف کوئی الزام نہیں. اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں سب کے لئے سامانِ حفاظت و مرحمت ہے (بشرطیکہ وہ اپنے اپنے مقام پر اس نظام کے استحکام کے لئے کوشاں رہیں ـــــ مجاہدین اپنی جگہ ـــــ اور غیر محارب اپنی جگہ).

معذورین کی فہرست میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کا ذکر خصوصیت سے الگ کیا گیا. اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے مستحق بھی تھے کہ ان کا ذکر الگ کیا جاتا. فرمایا:۔

۹/۹۲ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ

اَلدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝

نہ ہی وہ لوگ پیچھے رہ جانے میں موردِ الزام قرار دیئے جا سکتے ہیں جن کی حالت یہ تھی کہ وہ (سفر کے لئے) سواری کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' اس لئے وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ اُن کے لئے سواری کا انتظام کر دیا جائے۔ اور تنگی کا یہ عالم تھا کہ تم بھی اس کا انتظام نہیں کر سکتے تھے' اس لئے تم نے بھی اپنی معذوری کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ وہ بے بس ہو کر لوٹ گئے دراں عالم کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ان کا دل اس احساس سے پھٹا جاتا تھا کہ افسوس! آج ہمارے پاس اتنا بھی نہیں کہ ہم اس سے جہاد کے لئے سواری کا انتظام کر سکیں!

غور فرمایئے کہ قرآنی معاشرہ کے قیام کے اولیں دور میں معاشی حالت کیا تھی؟ آسائش کی غرض سے تو ایک طرف جنگ کی ضروریات کی فراہمی تک کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

اور اس کے ساتھ مخلصین کے جذبات جن کے تصور سے آج بھی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس :-

(۹/۹۳) اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

الزام اُن کے اُوپر ہے جو سب کچھ رکھتے ہوئے (اور جہاد میں جانے کے قابل ہونے کے باوجود) تم سے اجازت مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پیچھے عورتوں میں بیٹھے رہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا! اس لئے نہیں سمجھتے کہ سہل انگاری اور مفاد پرستی کے جذبات نے ان کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے اور اس طرح' سمجھ اور سوچ کی سب راہیں ان پر مسدود ہو چکی ہیں۔

گیارہواں پارہ شروع

ان کی حالت یہ ہے کہ

۹/۹۴ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۗ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۗ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

جب تم میدانِ جنگ سے واپس آ ؤ گے، تو یہ لوگ تمہارے سامنے، طرح طرح کی معذرتیں پیش کریں گے۔ ان سے کہہ دینا کہ اس قسم کی بہانہ سازیوں کی باتیں مت کرو۔ ہم ان باتوں پر کبھی یقین نہیں کریں گے، اس لئے کہ اللہ نے ہمیں تمہارے متعلق صحیح صحیح باتیں بتا دی ہیں۔ باقی رہا آئندہ کا معاملہ، سو اللہ اور اس کا رسول (نظامِ خداوندی کا مرکز) تمہارے اعمال پر نگاہ رکھے گا اور تمہاری ہر نقل و حرکت، اُس خدا کے قانونِ مکافات کی کسوٹی پر پرکھی جائے گی جو اُن باتوں سے بھی باخبر ہوتا ہے جو انسانوں کی نگاہ سے اوجھل ہوں اور اُن سے بھی جو محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ وہ کسوٹی بتا دے گی کہ تمہارے اعمال کی حقیقت کیا ہے اور تم کس قسم کے سلوک کے مستحق ہو۔

اس جگہ کہا گیا ہے کہ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ "خدا نے ہمیں تمہارے متعلق صحیح صحیح باتیں بتا دی ہیں"۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق وحی کے ذریعہ حضورؐ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ خدا نے تو منافقین کے سلسلہ میں کہا تھا کہ وَلَوْ نَشَاءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۗ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۴۷/۳۰)۔۔ "اگر ہمارا قانونِ مشیت ایسا ہوتا کہ ہم لوگوں کے جملہ امور وحی کے ذریعے بتا دیتے، تو ہم تمہیں بتا دیتے کہ ان میں کون کون

منافق ہیں، لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اے رسولؐ! تمہیں ان کی حرکات و سکنات سے خود پہچاننا ہوگا کہ ان میں کون کون منافق ہیں۔ لہٰذا جب کہا کہ (قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰہُ مِنْ اَخْبَارِکُمْ) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقت کی علامات اس وضاحت سے بتا دی ہیں کہ ہمارے لئے چنداں مشکل نہیں رہا کہ ہم منافقین کو پہچان سکیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو منافق کی باتیں اس کی منافقت کی غماز ہو جاتی ہیں۔ باقی رہا ان کے اعمال کی جزا کا معاملہ، سو اس کا فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوگا جس کی نظروں سے ان کا کوئی عمل چھپا ہوا نہیں ____ اور ظاہر ہے کہ فیصلے انسانی اعمال کی رو سے ہوتے ہیں۔ قرآن کے معاشرتی نظام میں بھی اور خدا کی میزانِ اخروی میں بھی "اللہ اور رسولؐ" کی نگاہ اعمال پر ہوتی ہے۔

غور فرمایئے! معاشرتی معاملات میں اور قانونِ مکافاتِ عمل میں کس قدر فرق ہے! معاشرتی معاملات کے فیصلے نظامِ عدل کی رُو سے ہوتے ہیں جو بہرحال انسانوں کا قائم کردہ ہوتا ہے۔ خدا اس میں دخل نہیں دیتا۔ قانونِ مکافاتِ عمل از خود کارفرما رہتا ہے۔ دین کے ضمن میں یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور قرآنی تعلیم کا بنیادی اصول۔

اس قسم کے لوگوں سے اعراض برتنے کی تاکید کی گئی۔

(۹/۹۵-۹۶) سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْہِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْہُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْہُمْ ؕ اِنَّہُمْ رِجْسٌ ز وَّمَاْوٰىہُمْ جَہَنَّمُ ۚ جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ○ یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْہُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْہُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ○

تمہاری واپسی پر یہ لوگ خدا کی قسمیں کھا کھا کر اپنے سچا ہونے کا یقین دلائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ ان سے اعراض برتو، اس لئے کہ ان کے دلوں میں نفاق کا مرض ایسا ہے جو ان کے خیالات میں تکدر اور ان کے قلوب میں شکوک و اضطراب

پیدا کرنا رہتا ہے (د ۹/۱۲)۔ اس لئے یہ، تمہاری جماعت کے سچے رکن نہیں بن سکتے۔ ان کا ٹھکانا تمہارا جنّتی نظام نہیں، جہنّم ہے جو ان کے اعمال کا صحیح صحیح بدلہ ہے (۹۵)۔
یہ سمجھتے ہیں کہ تم لوگوں کو ان سے کوئی ذاتی رنجش ہے، اس لئے اگر تمہیں کسی طرح راضی کرلیا تو سب معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ قسمیں کھا کھا کر تمہیں راضی کرنے کی کوشش کریں گے لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ یہ معاملہ تمہاری ذات سے متعلق نہیں جو تمہیں ذاتی طور پر راضی کرلینے سے بات رفع دفع ہوجائے گی۔ اس معاملہ کا تعلق قانونِ خداوندی سے ہے اور قانونِ خداوندی کبھی ان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا جو اس کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کرلیں۔ لہٰذا انہیں سمجھ لینا چاہیئے تمہارا ذاتی طور پر راضی کرلینا ان کے لئے ذرا بھی مفید مطلب نہیں ہوگا۔ (نظامِ خداوندی میں محبت یا عداوت، ذاتی جذبات کی رُو سے نہیں ہوتی، نظام کے نقطۂ نگاہ سے ہوتی ہے (۹/۲۳-۲۴؛ ۹/۶۲)۔ (۹۶)۔

ہم نے آیات (۹/۹۵)؛ (۹/۹۶) کا مفہوم جس انداز سے بیان کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے گویا ان منافقین کی یہ کوشش رسول اللہ کی ذات سے تھی۔ لیکن آیت (۹/۶۲) میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ وہاں ہم نے یہ مفہوم لیا تھا کہ ان لوگوں کی یہ سازش تھی کہ نظامِ مملکت سے بالا بالا صحابہؓ سے مصالحت کر لی جائے۔ لیکن جس طرح آیت (۹/۶۲) میں صیغے جمع کے تھے، اسی طرح آیات (۹/۹۵)؛ (۹/۹۶) میں میں بھی جمع کے صیغے ہیں۔ بنابریں، ان آیات میں بھی یہی مراد ہوگی کہ یہ لوگ نظامِ مملکت سے بالا بالا افرادِ مومنین سے مصالحت کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اگر ان میں مراد صرف رسول اللہ لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ رسول اللہ کا ذاتی معاملہ ہے، اس لئے اُن سے (مملکتی نہیں بلکہ) ذاتی سطح پر مصالحت کرلی جائے۔ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کے امراء سے مصالحت کی کوشش ہو یا رسول اللہ کے ساتھ ذاتی مفاہمت، یہ دونوں کوششیں، نظامِ اسلامی کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل تھیں۔ اس نظام میں افرادِ مملکت حتّٰی کہ سربراہِ مملکت کی بھی ذاتی پوزیشن کچھ نہیں ہوتی۔ پوزیشن ساری نظامِ مملکت کی ہوتی ہے۔ جس فیصلہ کو نظامِ مملکت کی تائید حاصل ہوگی، وہ قابلِ قبول ہوگا۔ جو اس کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ قبول نہیں ہوگا، وہ (جماعتِ مومنین یا سربراہِ مملکت میں سے) کسی

کے نزدیک بھی درخورِ اعتنا نہیں ہوگا۔ اس میں تو مسلک یہ ہوتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ لَا شَرِیْکَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (۶/۱۶۲ - ۱۶۴) "تم کہہ دو کہ میرے تمام فرائضِ زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے، میرا مرنا اور میرا جینا، خدا کے متعین فرمودہ نظام کے لئے وقف ہیں۔ اس میں کسی اور مقصد، جذبہ یا خواہش کو شامل کرنا شرک ہے (جس کا میں مرتکب نہیں ہو سکتا)۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے جس کے سامنے میرا سرِ تسلیم خم ہے"۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد پنجم صفحہ ۱۵۰)۔ لہٰذا اگر کوئی فرد یا گروہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس نظام سے ہٹ کر تمہارے ساتھ ذاتی طور پر مصالحت کرے، تو وہ نہ تمہارے مسلکِ حیات سے واقف ہے، نہ تمہارے نظام سے شناسا۔ اُسے معلوم نہیں کہ تم توحید پر ایمان رکھتے ہو — اور ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نظامِ مملکت کے استحکام کے سلسلہ میں کس قدر بنیادی راہنمائی عطا کر رہا ہے۔ عام نظامِ مملکت میں بھی اگر کوئی شخص، اس نظام سے بالا بالا کسی سے کچھ سودا بازی کرتا ہے، تو اُسے مملکت کا غدار کہا جاتا ہے اور یہاں یہ غداری خدا کے ساتھ ہے۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی کہ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا ...... (۶/۱۶۵) کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور رب کی تلاش کروں؟ کسی اور کو اپنا رب بنا لوں؟ اس کا نام شرک ہے اور اسی کو غداری کہا جاتا ہے۔

جن صحرا نشین بدوؤں (اعراب) کے متعلق کہا تھا کہ ہنوز ان کا ایمان ناپختہ ہے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ:

(٩/٥) اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۝

یہ صحرا نشین بدو کفر و نفاق میں شہریوں سے بھی دو قدم آگے اور سخت متشدد واقع ہوئے

ہیں. اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے حالات ایسے ہیں کہ ان کے لئے قرآنی تعلیم کا اچھی طرح سمجھنا ذرا دشوار ہے. اس کے لئے وقت درکار ہوگا (۱۴/۴۹) اس لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے (شہریوں کے مقابلہ میں) ان سے کچھ مختلف سلوک کیا جائے گا).

یہ ان کی ذہنی اور قلبی کیفیت تھی. جہاں تک عمل کا تعلق تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ:

(۹/۹۸) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ وہ جو کچھ نظامِ خداوندی کے لئے خرچ کرتے ہیں (بہالت کی بنا پر) اپنے اوپر جرمانہ سمجھتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ تم پر کوئی گردش آجائے (تو یہ پلٹ جائیں). یہ نہیں سمجھتے کہ اگر انہوں نے یہی روش جاری رکھی تو (یہ) خود بُری گردش کے شکار ہو جائیں گے. یہ اُس خدا کا ارشاد ہے جو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے.

آپ نے غور فرمایا کہ نظامِ خداوندی کے داعی کو کس کس قسم کے افراد سے واسطہ پڑتا ہے. لیکن وہ اس سے گھبراتا نہیں. وہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے برابر کوشش کرتا رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

(۹/۹۹) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

لیکن انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سچے دل سے اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کے ہاں بلند درجات اور رسولؐ کی طرف سے تحسین و آفرین کا موجب سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ یقین رکھیں کہ اس سے انہیں واقعی خدا کے ہاں بلند مدارج حاصل ہوں گے اور اللہ انہیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرے گا۔ اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کے سامان موجود ہوتے ہیں۔

یہ وہ (ناپختہ ایمان والے) تھے جن کے متعلق کہا تھا کہ اگر وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت گذار رہے تو ان کے اعمال یقیناً نتیجہ خیز ہوں گے (۴۹/۱۴) ان کی یہ قلب ماہیت اس اطاعت کا نتیجہ تھی۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جو لوگ تازہ تازہ ایمان لائیں اُن کے ایمان کی ناپختگی سے دل برداشتہ نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ اس سے ان کا ایمان (قرآن کے الفاظ میں) ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا اور اس کا مظاہرہ ان کے حسنِ عمل سے ہوگا۔

ان کے برعکس، وہ سعادت مند حضرات تھے جو اس نظام کے ایوان کی بنیاد کی اینٹیں بنے تھے۔ ان کے مقامات بڑے بلند تھے۔ ان کا تذکرہ سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر آچکا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ یہاں ان کے متعلق فرمایا:۔

(۹/۱۰۰) وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

اور مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے اس نظام کے قیام کے لئے پہل کی، جبکہ حالات بڑے ہی ناسازگار اور واقعات سخت حوصلہ شکن تھے اور جن لوگوں نے حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا — وہ خواہ شہری ہوں یا دیہاتی — تو چونکہ انہوں نے قوانین سے ہم آہنگی اختیار کی، اس لئے اُس کی برکات و سعادات ان سے ہم آہنگ ہوگئیں

اور اُن کے لئے ایسا جنّتی معاشرہ تیار کر دیا گیا جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی. وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (اس زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی) اور یہ انسان کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے. (۶۴-۸/۶۲؛ ۷۵-۸/۷۴؛ ۸/۲۸؛ ۴۸/۲۹؛ ۵۷/۱۰).

مفہومِ بالا کے آخر میں جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے انہیں ضرور دیکھ لیجئے. ان سے صحابہؓ کی رفعت اور عظمت نکھر کر سامنے آجائے گی. ان کے متعلق جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہ ہمارے ایمان کا جزو بن جاتا ہے. اس لئے اس سے انحراف تو ایک طرف اختلاف بھی قرآن سے انکار کے مترادف ہے. اسلام، قرآن پر کاملتہً ایمان لانے کا نام ہے.

اس کے بعد پھر تصویر کا دوسرا رُخ ہے.

(۹/۱۰۱) وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۛ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝

اور تمہارے اردگرد بسنے والے بدوؤں میں بعض لوگ منافق ہیں اور مدینہ کے رہنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ منافقت گویا ان کی گھٹی میں پڑ چکی ہے. تم انہیں نہیں جانتے. ہم جانتے ہیں (تمہارا ان کے ساتھ جوں جوں رابطہ بڑھتا جائے گا، تم ان کی رفتار و گفتار سے انہیں پہچانتے جاؤ گے) ہم انہیں (پہلے) دو مرتبہ معمولی سزا دیں گے اور اگر یہ اس پر بھی باز نہ آئے تو انہیں سخت سزا دی جائے گی.

اس میں کہا گیا ہے: "لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ" تم انہیں نہیں جانتے. ہم جانتے ہیں. لیکن (جیسا کہ آیت (۹/۹۴) میں بتایا جا چکا ہے) خدا نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ نہیں بتائے گا کہ منافق کون کون سے ہیں. اس کا اندازہ تمہیں خود لگانا ہو گا.

اس کے بعد کہا ہے کہ "سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ" "ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دیں گے"۔ لیکن ان پر یہ عذاب جماعتِ مومنین کے ہاتھوں، میدانِ جنگ میں وارد ہوا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ خدا کے پروگرام کے مطابق جو امور جماعتِ مومنین کے ہاتھوں سرانجام پاتے ہیں، خدا انہیں اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس طرح خدا نے جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں بھی انہی مومنین کے ہاتھوں پوری کراتا ہے۔ قرآن کی رُو سے، خدا اور بندوں کے تعلقات کو سمجھنے کے لئے ان نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ (تفصیل ان امور کی پہلے گذر چکی ہے۔ انڈکس میں دیکھئے عنوان 'خدا')۔

ان کی جوں جوں اصلاح ہوتی گئی، وہ (مخلص) جماعتِ مومنین کے قریب آتے گئے۔ اصلاح کی ابتدا، اپنی غلطیوں کے اعتراف سے ہوتی ہے (دیکھئے عنوان توبہ)۔

9/102 وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے کچھ کام اچھے بھی کئے ہیں اور کچھ بُرے بھی۔ (اور چونکہ انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا ہے، اس لئے) قانونِ خداوندی کی رُو سے ان کی معذرت قبول کر لی جائے گی۔ قانونِ خداوندی میں (غلطیوں کا اعتراف کر لینے والوں کے لئے) حفاظت و رحمت کی گنجائش رکھی ہوئی ہے۔

اور اس امر کا عملی ثبوت (کہ انہیں مخلص جماعتِ مومنین کی صف میں شریک کر لیا گیا) یہ ہے کہ ان کے عطیات قبول کر لئے جائیں گے۔

9/103 خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ

سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ٥

لہٰذا اب تم ان کی مالی امداد قبول کر لیا کرو (جس کا مطلب یہ ہے کہ اب انہیں اس نظام کے ارکان تسلیم کر لیا گیا ہے) اور جماعت کے دیگر ارکان کے ساتھ تعلیم و تربیت سے ان کے قلب و دماغ کی تطہیر اور ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا انتظام کرو اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین و ستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کرو۔ اس سے انہیں اطمینانِ خاطر اور سکونِ قلب حاصل ہو جائے گا (اور اپنی سابقہ غلطیوں کی وجہ سے ان کے دل میں جو احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا' وہ زائل ہو جائے گا)۔ یقیناً اللہ ہر ایک کی بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ یاد رکھو! بطیبِ خاطر مال کی قربانی انسانی ذات کی نشو و نما کا ذریعہ ہوتی ہے (۹۲/۱۸)۔

اس آیت میں چند نکات غور طلب ہیں:

۱۔ جیسا کہ سابقہ آیات سے ظاہر ہے' یہ اُس زمانے کا ذکر ہے' جب ہنوز قرآنی نظام اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس نظام میں' ہر فرد اپنی آمدنی میں سے' اپنی ضروریات کے بقدر لے کر باقی سب مملکت کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے کہ وہ اس سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرے (۲/۲۱۹۔ دیکھئے عنوان "معاشی نظام")۔ لیکن جب یہ نظام قائم نہ ہوا ہو' تو افرادِ معاشرہ بطیبِ خاطر' عطیات دیتے ہیں انہیں صدقات کہا جاتا ہے۔ انہی صدقات کے مصارف (۹/۶۰) میں بیان ہوئے ہیں۔

صدقات کی وصولی

۲۔ مال کی بطیبِ خاطر قربانی سے انسان کے بُخل' خود غرضی' مفاد پرستی' تکاثر وغیرہ جیسے جذبات کی تطہیر ہو جاتی ہے۔

۳۔ اور اس سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے (۹۲/۱۸)۔ یہی ایمان ہے جو "زیادہ سے زیادہ محنت کرنے' اس کے ماحصل میں سے کم از کم اپنے لئے رکھنے اور دیگر حاجتمندوں کے لئے زیادہ سے زیادہ دے دینے" کا جذبۂ محرکہ قرار پاتا ہے ___ وہ جذبۂ محرکہ جس کے نگاہ کے سامنے نہ ہونے سے مارکس نے کہا تھا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل تو اس نظام میں ہے' لیکن میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کے لئے جذبۂ

محرّک کیا ہوگا۔ اِس لئے اُس نے اپنے پیشِ نظر معاشی نظام "کمیونزم" کو نافذ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کوئی، قرآن کو اساس بنائے بغیر اسے نافذ کر سکتا ہے۔

۴۔ ان لوگوں کو مخلص جماعتِ مومنین کے زمرہ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس لئے (ظاہر ہے کہ) انہوں نے اپنے عطیّات بطیبِ خاطر پیش کئے تھے۔ کسی قسم کی ستائش کی تمنّا اور صلہ کی اُمید کے بغیر۔

انہیں شاباش دو

لیکن اس کے باوجود حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ ان کے اس حُسنِ عمل پر انہیں شاباش دو۔ اِس سے اِن کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور سکونِ قلب بھی حاصل ہوگا۔ یہی وہ " درود " ہے جس کا تفصیلی مفہوم 'مطالب الفرقان' جلد سوم صـــ۱۱۳ پر آچکا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ انہیں بتاؤ کہ جس خدا پر تم ایمان لائے ہو، "اُس کا دامن کس قدر وسیع اور اُس کی نگاہ کس قدر کشادہ" ہے۔

(۹/۱۰۴) اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ○

کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ خدا کے بندوں میں سے، جو لوگ اپنی غلطیوں کا احساس کر کے آئندہ کے لئے اُن سے باز رہنے کا تہیّہ کر لیتے ہیں، تو ان کی معذرت قبول کر لی جاتی ہے اور (دیگر ارکانِ جماعت کی طرح) ان کے صدقات قبول کر لئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں اس قسم کی دلی معذرت سے، سامانِ رحمت عطا ہو جانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

دیکھئے! آیت (۹/۱۰۳) میں رسول اللہؐ سے کہا تھا کہ ان کے صدقات قبول کرو اور یہاں کہا کہ "خدا ان کے صدقات قبول کرتا ہے۔" غور کیجئے کہ اس حقیقت کو کس طرح قدم قدم پر واضح کیا جا رہا ہے کہ انسان جو کام خدا کے احکام و پروگرام کے مطابق سرانجام دیتا ہے، اسے خدا اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ توبہ کے یہ معنی نہیں کہ تم نے معذرت پیش کی، ہم نے اسے قبول کر لیا اور بات ختم ہو گئی۔ نہیں! بات ختم نہیں ہوگئی۔ بات تو بلکہ اب شروع ہوئی ہے۔ دیکھا یہ جائے گا کہ تمہارے اعمال

(کام) تمہاری معذرت کے پُرخلوص ہونے کی شہادت دیتے ہیں یا نہیں۔

9/105 وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ان سے کہہ دو کہ تمہاری معذرت قبول کرلی گئی ہے۔ اب تم اپنے اعمال سے ثابت کرو کہ یہ معذرت دل سے کی گئی ہے۔ اللہ اور اس کا رسولؐ (نظامِ خداوندی کا مرکز) اور مومنین (اس نظام کے ارکان) تمہاری کارکردگی پر نگاہ رکھیں گے۔ تمہارے کام اُس خدا کے قانونِ مکافات کی میزان میں تولے جائیں گے جو ان امور سے بھی باخبر ہوتا ہے جو انسانی نگاہوں سے بھی اوجھل ہوتے ہیں اور ان سے بھی جو محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ وہ میزان ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک وزن بتا دیتی ہے۔

غور کیجئے! اعمال کے متعلق کہا کہ یہ وہ محسوس اور مرئی کام ہیں جنہیں "خدا، رسولؐ اور مومنین" دیکھ سکیں، یعنی جو نظامِ خداوندی اور جماعتِ مومنین کے سامنے آجائیں۔ باقی رہی تمہاری دلوں کی حالت، سو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے۔ اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوگا۔ یہاں محسوس

محسوس اعمال اور مضمر جذبات

اعمال اور ان کے جذباتِ محرکہ دونوں کا ذکر آگیا۔ محسوس اعمال معاشرہ کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں اور اُن کا جذبۂ محرکہ قانونِ مکافاتِ عمل کی نظروں میں۔ محسوس اعمال اور نادیدہ جذبۂ محرکہ، دونوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ محسوس اعمال کو قلبی جذبات ہی کا مظہر ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ منافقت ہے۔ اعمال اور جذبات، دونوں کے پرکھنے کا خارجی معیار قرآن ہے۔ خدا کو "عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ" ماننے کا عملی مفہوم یہی ہے۔

بنیادی طور پر، ذکر اُس جنگ کا چلا آرہا تھا جس میں منافقین نے طرح طرح کی بہانہ تراشیاں کی

تھیں کہ وہ کسی طرح جنگ میں شرکت سے باز رہ جائیں اور پھر طرح طرح کے حربے بھی استعمال کئے تھے، جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد مملکتِ اسلامیہ نے ایک "انکوائری کمیٹی" بٹھائی کہ وہ متعلقہ منافقین کے معاملات کا جائزہ لے اور تحقیق کرے کہ ان میں سے کون کس جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ ان میں سے اکثر کے معاملات کا فیصلہ ہوگیا لیکن کچھ ایسے رہ گئے جو مزید تحقیق و تفتیش کے متقاضی تھے۔

9/106 وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝

اس کے بعد ان چند لوگوں کا معاملہ تصفیہ طلب رہ جاتا ہے (۹/۱۱۸) جن کے متعلق (ابھی تحقیقات مکمل نہیں ہوئیں اور) یہ طے نہیں پایا کہ انہیں سزا دی جائے یا معاف کر دیا جائے (اس کا ذکر آگے چل کر (۹/۱۱۸) میں آئے گا)۔ اللہ کا قانون یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

عدالتی نظام کی بنیاد ان کا ذکر آیت (۹/۱۱۸) میں آتا ہے، اس لئے ہم بھی ان کی تفصیل وہیں پیش کریں گے۔ آیت زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ "وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عدالتی قانون بھی علم و حکمت پر مبنی ہونا چاہیئے (Based on Knowledge and wisdom) اور اسی نہج سے تصفیہ طلب امور کے فیصلے ہونے چاہئیں۔ جس فیصلے کے حق میں قرآن کی سند (علم) اور عقل Resason کی تائید نہ ہو، اسے مبنی بر عدل نہیں کہا جائے گا۔

مسجدِ ضرار اس کے بعد قرآن کریم نے منافقین کی اس سازش کو بے نقاب کیا ہے جسے اسلام کی جڑ بنیاد کو اکھیڑ دینے کے لئے اختیار کیا گیا تھا اور وہ سازش تھی ایک مسجد کی تعمیر۔ سوچئے کہ کیا کسی کے تصور میں بھی آسکتا ہے کہ مسجد کی تعمیر اسلام کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دینے کا موجب ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ کسی کی قیاس آرائی نہیں۔ خود خدا نے بہ نصِ صریح اسے ایسا قرار دیا ہے۔ یہ مسجد، مسجدِ ضرار کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان کی جلد اوّل کے صفحات ۲۱۵ - ۲۱۸ پر آچکی ہے۔ اسے دیکھ لیجئے۔ ہم اس مقام پر متعلقہ آیات اور ان کا مفہوم درج کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

(۹/۱۰۷) وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

اوران منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں (جو اپنی چالوں میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں) کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی. (اور اس طرح یہ ظاہر کیا کہ وہ بڑے پکے مومن اور نظامِ خداوندی کے خدمت گذار ہیں) لیکن اس مسجد سے درحقیقت ان کی غرض یہ تھی کہ اس سے اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں، یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے اور اس طرح یہ مسجد ان لوگوں کے لئے کمین گاہ بن جائے جو پہلے سے نظامِ خداوندی کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں. یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی نیک نیتی سے تعمیر کیا ہے. لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں.

غور فرمایئے! اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کو "خدا اور رسولؐ کے دشمنوں کی کمین گاہ" کہہ کر پکارا ہے. اسے موجبِ کفر قرار دیا ہے. اس کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ وہ مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب تھی. لہٰذا کوئی عقیدہ، کوئی عمل، کوئی حرکت جو مسلمانوں میں تفرقہ (فرقہ بندی) پیدا کرنے کا موجب ہو، کفر ہے، خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت ہے، خواہ وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو! اور ہماری ہر مسجد کسی نہ کسی فرقہ سے منسوب ہوتی ہے، اس لئے مسجدِ ضرار.

اس مسجد کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا:

(۹/۱۰۸) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى

مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○

تم اے رسولؐ! اس مسجد میں قدم نہ رکھنا، جو مسجد، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کردے، کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ اس میں قدم رکھا جائے؟ تمہارا نہ ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہو سکتا ہے نہ ان کی تعمیر کردہ مسجد سے کوئی تعلق (۶/۱۶۰)۔ اس کی مستحق صرف وہ مسجد ہے جس کی بنیاد، پہلے دن سے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے اصولِ محکم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہی لوگ آتے ہیں جو فرقہ بندی اور گروہ سازی کے شرک سے پاک اور صاف رہتے ہیں (۳۰/۳۱-۳۲)۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ (یاد رکھو! اسلام کی غایت عالمگیر انسانیت کی وحدت ہے (۲/۲۱۳ ؛ ۱۰/۱۹)۔ اس عظیم پروگرام کا آغاز ایک امّت کی تشکیل سے ہوتا ہے (۲/۱۴۳)۔ لہٰذا جب اس اُمّت میں وحدت نہ رہے، تفرقہ پیدا ہوجائے، تو اسلام کی بنیاد ہی منہدم ہوجاتی ہے۔ اس نہج سے تفرقہ شرک ہے (۳۰/۳۱)۔ ایسے لوگ اُمّتِ محمدیہ کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ جس طرح مسجدِ ضرار کے بانیوں کے متعلق کہا (۶/۱۶۰ و ۱۵۴)۔ یہ عذابِ خداوندی کے مستحق ہوجاتے ہیں (۳/۱۰۵)۔

بغرضِ تقابل کہا:-

۹/۱۰۹ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

ان سے پوچھو کہ کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد قوانینِ خداوندی کی نگہداشت

اور منشائے خداوندی سے ہم آہنگی پر رکھی ہو؛ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے یہ بنیاد ریت
کے ایسے تودوں کے کنارے پر رکھی ہو جو کٹ کٹ کر دریا میں گرتے چلے جارہے ہوں اور
اس طرح وہ عمارت اپنے بنانے والے کو ساتھ لے کر جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔ حقیقت
یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں، ان پر زندگی کی کامرانی
کی راہ کبھی نہیں کھل سکتی۔

۹/۱۱۰ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ
إِلَّا أَن تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

یاد رکھو! ان کی یہ عمارت، جو انہوں نے اس مقصد کے لئے بنائی ہے، ان کے دل میں
کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ اس سے ان کے دل کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جائیگا۔
ان کے غصے اور حسد کی آگ میں کمی نہیں ہوگی، تا آنکہ ان کے دل شدتِ اضطراب سے
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی یہ باتیں یونہی ڈھکی نہیں، علم و حکمت پر مبنی
حقائق ہیں جو واقع ہو کر رہیں گے۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد اوّل میں بتایا جا چکا ہے، ہماری ہر مسجد کسی نہ کسی فرقے کی مسجد ہے اور
اس فرقہ بندی کی شدت کا یہ عالم ہے کہ فرقوں کے باہمی جھگڑوں پر مساجد پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ پولیس
آ جاتی ہے۔ منتظمین اور متولی جیلوں میں چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی ایک فرقہ کی مسجد میں دوسرے فرقہ کا
مسلمان نماز پڑھ لیتا ہے، تو اوّل تو اس مسجد کے اتنے حصے کا فرش اکھاڑ دیا جاتا ہے، ورنہ (کم از کم) اسے
اچھی طرح دھلوایا جاتا ہے۔ یہ ہے مساجد کے باعثِ تفریق ہونے کا عالم۔ اس تفرقہ کا عملی مظاہرہ دیکھنا ہو
تو کسی وقت شہر کی کسی بڑی شاہراہ پر کھڑے ہو جائیے۔ سب مسلمان اکٹھے دکھائی دیں گے، لیکن جونہی نماز
کی اذان سنائی دے گی، وہی مسلمان مختلف مساجد میں بٹ جائیں گے، یعنی مساجد میں نہ جانے والے (نماز
نہ پڑھنے والے) تو اکٹھے رہیں گے اور مساجد میں جانے والے فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ جن مساجد کا یہ عالم ہو
انہیں "مسجد ضرار" نہیں کہا جائے گا تو اور کس نام سے پکارا جائے گا؟

تعمیر شدہ مساجد کو چھوڑیے۔ یہ حضرت نماز کے وقت کس طرح اپنی اپنی الگ "مسجد" بنا لیتے ہیں،

اس کی دو ایک ابھری ہوئی مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان میں "نظامِ مصطفےٰ" کے قیام کے نام سے ایک تحریک شروع ہوئی تھی جس میں مختلف فرقوں کے علماء حضرات شامل تھے اور اسے "متحدہ محاذ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس "مقدس مقصد" کے لئے متحدہ محاذ میں (شیعہ سُنّی کو چھوڑیئے۔ سُنّیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کو بھی چھوڑیئے) حنفی فقہ کے دو فرقے بریلوی اور دیوبندی بھی شامل تھے۔ ان کے متعلق حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی (نام ہم نے حذف کر دیئے ہیں)۔

فرقہ وارانہ نمازیں

"۲۵ اگست ۱۹۷۷ء کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے، تو اسلامی اخوت اور نظامِ مصطفےٰ کے قیام کے دعوے داروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دیوبندی فرقہ کے مفتی صاحب، دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی، جبکہ بریلوی فرقہ کے نمائندہ، جماعت اسلامی کے ارکان سمیت، دوسری طرف کھڑے ہو گئے اور انہوں نے الگ جماعت کرائی۔"

(مساوات، ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء)

اس سے واضح تر بریلوی فرقہ کے مولانا صاحب کی وہ تقریر ہے جو معاصر ایشیا کی (۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا:

ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور دیگر تین حضرات (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات کو) جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دار العلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد اُن سے رکھوایا جائے۔ تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا: میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں۔ آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اس فراخدلی کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے، قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سُنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا، جنرل صاحب! بڑا افسوس ہے، آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم

ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بڑی وسعتِ قلبی ہے. لیکن گستاخِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں. ہم میں رواداری ہے' لیکن حضور پُرنور کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں. اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امامِ اہلِ سنّت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوئؒ کا لکھا ہوا مجموعۂ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علمارِ حرمین شریفین کے فتاویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے. ہم اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو، خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہو' ملتان کا ہو' اچھرہ کا ہو' کسی شاتمِ رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے. اور میں نے کہا، جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں. ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے. یہ مُلاّ جو چار چار ٹکے کے ہیں. ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. آپ کو یہ غلط اطلاع ملی ہے' آپ مطمئن رہیں. ہمارے مسلک میں ایسی رواداری' فراخدلی اور وسعتِ قلبی نہیں ہے. ہمارے قلب میں شاتمِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے' نہ آئندہ ہو گی اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے. قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوئی تھی. علاّمہ (—) موجود ہیں. ان لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف' اس کے دیکھنے والے ایک نہیں' دو نہیں' بے شمار لوگ ہیں."

(بحوالہ طلوعِ اسلام' بابت فروری ۱۹۷۸ء صـ ۶۲)

یہ انہی دو فرقوں اور ان کے دو نمائندوں کی بات نہیں. تمام فرقوں کی یہی حالت ہے (قرآن کی رُو سے فرقہ بندی کتنا سنگین جرم ہے' اس کے لئے انڈکس میں عنوانات تفرقہ اور فرقہ بندی دیکھئے) بہ حالتِ موجودہ تو ان "مساجدِ ضرار" کا کوئی علاج نہیں. قرآنی نظام میں فرقوں کا وجود ہی نہیں ہوگا' اس لئے فرقوں کی طرف مساجد کی نسبت بھی نہیں رہے گی. اگر کوئی فرقہ اس نسبت کے برقرار رکھنے پر مصر ہو گا تو ظاہر ہے کہ وہ نظام اس مسجد کو مسمار کر دے گا کیونکہ مسجدِ ضرار کو' رسول اللہؐ کے حکم پر صحابہؓ نے آگ لگا دی تھی.

ـــــــــ o ـــــــــ

ان کے برعکس' مومنین ہیں' جن کی بنیادی خصوصیت ایک آیت میں اس جامعیت اور حسنِ ارتکاز سے بیان کر دی گئی ہے اور اس میں تمام تفصیلات سمٹ کر آ گئی ہیں. فرمایا:

۹/۱۱۱ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ
يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَ
الْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ
الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

ان (منافقین) کے برعکس، جماعتِ مومنین ہے جس کا نظامِ خداوندی کے ساتھ ایک عظیم معاہدہ ہوتا ہے[۱]۔ اس معاہدہ کی رُو سے، نظامِ خداوندی، ان کا جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے تمام وسائل و اسباب کی فراہمی اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے۔ ۱۱۸-۱۱۹/۲۰)۔ اس معاہدہ کے بعد وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور نظامِ خداوندی کے استحکام کی خاطر، عند الضرورت، جان ہتھیلی پر رکھ کر، میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو قتل کر کے، فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں اور مرنے کے بعد جنت کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

---

[۱] اس معاہدہ کی رُو سے کہا گیا ہے کہ خدا مومنین سے ان کی جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ محض ذہنی اور اعتقادی نہیں کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہے اور خدا نے آپ کو جنت دے دی۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں نظامِ خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے متشکل فرمایا تھا اور جسے حضورؐ کے بعد آپ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور مستحکم رہنا تھا۔ اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہونا تھا (اخروی جنت کی کیفیت اور ہے)۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (۴۸/۱۰)۔

یہ معاہدہ کوئی نئی بات نہیں. یہ سابقہ آسمانی کتابوں، تورات و انجیل میں بھی مذکور تھا اور اب اُسی کی تجدید قرآن میں کی گئی ہے. اس عہد کا پورا کرنا اللہ نے خود اپنے ذمے لے رکھا ہے. اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کوئی نہیں. سو (اے جماعت مومنین !) تم اس سودے پر، جو تم نے نظامِ خداوندی سے کیا ہے، خوش ہو جاؤ. اس لئے کہ یہی زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہے.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ یہ آیت بڑی جامع ہے. اس کی تشریح 'مطالب الفرقان' جلد اوّل ص۱۱۱ پر بڑی وضاحت سے کی جا چکی ہے. اسے ایک نظر ضرور دیکھ لیجئے. اس معاہدہ میں جہاں تک جانفروشی کا تعلق ہے، اس کی طرف خود اسی آیت میں یہ کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ اس کا مقام قتال فی سبیل اللہ (جنگ یا جہاد) ہے. جہاں تک مال فروشی کا تعلق ہے، یہ قرآن کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے (اس کے لئے انڈکس میں "معاشی نظام" کا عنوان دیکھئے). اِس مقام پر ہم اس کے بنیادی خط و خال مختصر الفاظ میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں. قرآن کریم کی رُو سے :-

۱. جملہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کی ذمہ داری ہے.

۲. ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں. واضح رہے کہ جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر پر نہیں لیتی، اسے ان ذرائع کو اپنی تحویل میں لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا.

۳. جہاں تک افراد کی محنت کے ماحصل کا تعلق ہے، وہ اس میں سے بقدرِ اپنی ضروریات کے، لینے کے حقدار ہوں گے. بقایا دوسرے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مملکت کی تحویل میں چلا جائے گا.

قرآن کریم کے متعین کردہ اس اقتصادی نظام کی رُو سے وہ تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جنہیں آج (جب قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں) بحث و نزاع کا موضوع بنایا جاتا ہے اور بے مقصد وقت اور توانائی ضائع کی جاتی ہے.

ظاہر ہے کہ جب قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں ہوگا (جیسے کہ آجکل ہماری حالت ہے) اس وقت جیسا کچھ ہو رہا ہے، ویسا ہی ہوتا رہے گا. لیکن اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا. یہ سمجھ لینا البتہ ضروری ہے

کہ جو مملکت قرآن کو اپنا ضابطۂ حیات مقرر کرے اور اس کے معاشی نظام کو نافذ کرنے کا پروگرام بنالے تو وہ اسے اپنے حالات کے مطابق بتدریج نافذ کرے گی۔ اس عرصہ کو عبوری دور کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس دور کے لئے بھی احکام (صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ) دیئے ہیں۔ جب قرآن کا معاشی نظام مکمل طور پر نافذ ہو جائے گا تو وہ عبوری دور کے ان احکام کی جگہ لے لے گا (تفصیل ان امور کی میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی)۔

یہ ہے وہ معاہدہ جس سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔

آیت میں ہے کہ جو کچھ یہاں (قرآن میں) کہا گیا ہے، تورات و انجیل میں بھی وہی کچھ کہا گیا تھا۔ تورات یا انجیل اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں اس باب میں کیا کچھ ہو گا۔ لیکن جس شکل میں بھی وہ آج موجود ہیں، ان میں بھی اس ضمن میں نشاناتِ راہ ملتے ہیں۔ تورات میں مختصر الفاظ میں اور انجیل میں قدرے وضاحت کے ساتھ عہد نامہ عتیق (تورات) کتاب استثنا میں ہے۔

کُتبِ سابقہ میں اس نظام کے آثار

(حضرت موسیٰ نے کہا) اے اسرائیل سُن لے اور اس کے کرنے پر دھیان رکھ تاکہ تیرا بھلا ہو اور تم نہایت فراواں ہو جاؤ، اس زمین میں جس میں شیر اور شہد بہتا ہے... تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ۔

(استثناء، باب ۶، آیات ۳-۵)

اپنے سارے دل و جان اور سارے زور سے خدا کو دوست رکھنے کا نتیجہ شیر اور شہد کی فراوانیاں ہوں گی۔

انجیل (متی) میں ہے کہ ایک شخص حضرت عیسیٰؑ کے پاس آیا اور آپ سے کہا کہ جو احکام آپ نے مجھے دیئے تھے، میں نے ان پر عمل کر لیا ہے۔ کیا میں اب کامل ہو گیا ہوں ○ اس پر یسوع نے اسے کہا کہ اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا! اپنا مال اور اسباب بیچ کر غریبوں کو دے، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا...... اور وہ نوجوان غمگین ہو کر چلا گیا۔ کیونکہ بڑا مالدار تھا ○

اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت

میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔ شاگرد یہ سُن کر بہت ہی حیران ہوئے اور بولے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے۔ یسوع نے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا، لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس پر پطرس نے جواب میں اس سے کہا کہ دیکھ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر تیرے پیچھے ہو لیئے ہیں۔ پس ہم کو کیا ملے گا۔

یسوع نے ان سے کہا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لیئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا باپ ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا.......... (متی باب ۱۹، آیات ۲۰-۲۹)

انہیں اس دنیا کی جنتی زندگی اس نظام کی شکل میں ملی تھی جسے احکامِ خداوندی کی رُو سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحات ۱۱۳، ۱۱۴) میں دی گئی ہے۔

یہ تھا خدا کے ساتھ بیع و شریٰ (خرید و فروخت) کے اس معاہدہ کا عملی نقشہ جس کا ذکر سورۃ توبہ کی آیت (۹/۱۱۱) میں کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ (خدا نے کہا ہے کہ) دین کے اصول شروع سے آخر تک ایک ہی رہے ہیں (۴۲/۱۳)۔ غنیمت ہے کہ محرّف انجیل میں بھی اس قسم کے آثار باقی ہیں۔

لیکن قرآن کے ان نصوصِ صریحہ اور انجیل کے ان آثار کے باقی رہنے کا فائدہ کیا ہے، جبکہ ان کی ماننے والی قوموں (مسلمان اور عیسائی) دونوں کا نظام سرمایہ داری ہے جسے ختم کرنے کے لئے دین آیا تھا۔ عیسائیوں نے مذہب کو سیاست سے الگ کر کے گرجا کی چار دیواری میں محبوس کر لیا ہمارے ہاں قرآن کی جگہ، وضعی روایات اور دورِ ملوکیت میں مرتب شدہ فقہ نے لے لی اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری عین مطابق اسلام قرار پا گیا۔ ع "ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں۔" (اقبالؒ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، "ارمغانِ حجاز")

مومنین کی اس بنیادی خصوصیت (خدا کے ساتھ معاہدہ) کے بعد، قرآن نے ان کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

۹/۱۱۲ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ان افرادِ معاشرہ کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں :-

۱. سفرِ حیات میں وہ جہاں محسوس کریں کہ ان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا ہے وہ وہیں رُک جاتے ہیں اور جہاں سے قدم غلط اٹھایا تھا، وہاں واپس آکر صحیح رستے پر ہو لیتے ہیں.

۲. وہ قانونِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور اپنی جملہ صلاحیتوں کو خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صرف کرتے ہیں (۱/۴).

۳. وہ انفس و آفاق کی ہر شے پر غور و فکر کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کارگہِ کائنات کی ایک ایک چیز اپنے خالق کی حمد و ستائش کی مُنہ بولتی تصویر ہے (۱/۱/۱، ۳/۱۹۰؛ ۴۱/۵۳).

۴. اس مقصد کے لئے وہ دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں.

۵. ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں، اور

۶. دل کے پورے جھکاؤ سے، اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں.

۷. وہ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان باتوں سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے.

۸. وہ اُن تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جو قوانینِ خداوندی نے متعین کی ہیں اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں. یہ ہیں وہ مومنین جن کے لئے دُنیا اور آخرت کی زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں (ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں. ۳۳/۳۵؛ ۶۶/۵؛ ۱-۹/۲۳؛ ۲۲-۲۴/۷۰).

مومن کی خصوصیات

مومن کی دیگر خصوصیات کے لئے انڈکس میں عنوان "مومنین" دیکھئے، نیز وہ آیات جن کا حوالہ اوپر مفہوم میں دیا گیا ہے۔ یہ تو وہ الفاظ ہیں جن میں ان کی خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں۔ جہاں تک مومن کے جامع تصور کا تعلق ہے وہ قرآن کریم پر غور و فکر سے ہی سامنے آسکتا ہے۔ اس سے ایک ایسا پیکر وجہ فروغ دیدہ اور باعث شادابی قلب و دماغ ہوتا ہے جسے الفاظ میں محصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ع بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔ اس کے متعلق جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے وہ ہی ہے جسے اقبالؒ قرآن کا مقصود و منتہی قرار دیتا ہے۔ ان کے الفاظ میں قرآن کرتا یہ ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

مشیّتِ خداوندی جو چاہتی ہے کہ انسان کو ایسا ہونا چاہیئے، قرآن انسان کو ویسا بنا دیتا ہے۔ اسے مومن کہتے ہیں۔ اقبالؒ نے قرآن کے متعلق کہا تھا کہ ـــــ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است ـــــ یہی کچھ ہم مومن کے متعلق کہہ سکتے ہیں آں چیزے دیگر است۔ اتنا تو بہرحال واضح ہے کہ قرآن مومن کی جو صفات بتاتا ہے کم از کم ہم تو ان پر پورے نہیں اترتے۔

سیاحت کرنے والے

مومن کی ایک صفت "سَآئِحُوْن" بھی بتائی گئی ہے جس کے معنی ہیں "سیاحت کرنے والے۔" آپ سابقہ جلدوں میں دیکھیں گے۔ قرآن کریم نے تباہ شدہ اقوام سابقہ کے احوال و ظروف پر غور کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ تم ان کی بستیوں کے کھنڈرات کا نگہ بصیرت سے جائزہ لو۔ ان پر ان کی بربادی کی داستانیں کھلے الفاظ میں لکھی ملیں گی۔ اس کے لئے کہا کہ "سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ" دنیا کے مختلف علاقوں کی سیاحت کرو اور اقوام گذشتہ کے ان باقیات کا مطالعہ کرو۔ اس "سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ" کے لئے یہاں "سَآئِحُوْن" آیا ہے۔ لیکن یہ لفظ جامع ہے۔ اس سے مراد زندہ اقوام کے ممالک میں سیر و سیاحت سے ان کے حالات و کوائف کا مطالعہ کرنا بھی ہیں، نیز خود فطرت کے گوناگوں مظاہر کا بھی۔ گذشتہ زمانوں میں کہیں صدیوں میں جا کر ایک نامور سیّاح پیدا ہوتا تھا (مثلاً ابن بطوطہ وغیرہ) اور تاریخ اس کی سیاحت کے ماحصل کو بڑے فخر سے محفوظ کر لیتی تھی۔ لیکن آجکل یہ سیاحت عام ہو گئی ہے۔ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس کی اہمیت پر زور دیا اور مومنین کی خصوصیات میں اس کا شمار کیا۔ اس

سے آپ قرآن کی دُور نگہی کا اندازہ لگائیے. سوچئے کہ اگر یہ قوم قرآن کو اپنا چراغِ راہ قرار دیتی تو آج اس کا مقام کیا ہوتا.

یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے دنیا میں قومیں، جماعتیں، پارٹیاں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو قرآن پر ایمان رکھتی ہیں، دوسری وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتیں. اوّل الذکر کو جماعتِ مومنین امّتِ مسلمہ، ملّتِ اسلامیہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور دوسرے گروہ کو غیر مسلم. اس میں امّتِ مسلمہ کے سوا دنیا کے تمام انسان شامل ہیں. قرآن نے بتا دیا ہے کہ چونکہ باہمی تعلّقات کی بنیاد ایمان کے اشتراک پر ہے اس لئے جماعتِ مومنین، غیر مسلموں کے ساتھ دوستداری کے تعلقات وابستہ نہیں کر سکتی. جیسا کہ (اس جلد میں) آیات (۸۰ ؛ ۸۴ ؛ ۹/۸۴) کے تحت بتایا جا چکا ہے، ان لوگوں سے معاشرتی تعلّقات کے انقطاع کی اس حد تک تاکید کی گئی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد میّت کی تجہیز و تدفین کی رسوم میں بھی شرکت نہیں کی جا سکتی. یہاں پر اسے دہرایا گیا ہے. فرمایا؛

۹/۱۱۳ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۝

جماعتِ مومنین اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو صرف خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں. جو لوگ اس میں، خدا کے علاوہ اوروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں (یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین ملا لیتے ہیں) ان سے اس جماعت کا کوئی تعلق نہیں. ان کے معاملہ میں تو، خود نبی، یا مومنین کے لئے اتنا بھی جائز نہیں کہ جب وہ (مشرکین) معاشرتی عدل کی رُو سے قانونِ خداوندی کے مطابق سزا کے لئے ماخوذ ہوں تو ان کے لئے اس سزا سے محفوظ رہنے کی آرزو کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، درآنحالیکہ ان پر واضح ہو چکا ہو (جیسا کہ ہر شرک کے بارے میں

واضح ہے) کہ وہ لوگ جہنم کی سزا کے مستحق قرار پا چکے ہیں. یہ مؤاخذہ اُخروی زندگی میں ہوگا.
اس کے بعد ایک شک کا ازالہ کیا گیا:

۹/۱۱۴ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۝

اس پر تمہارے دل میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی مغفرت کی آرزو کیوں کی تھی، حالانکہ وہ بھی مشرک تھا. اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس (ابراہیمؑ) نے (اس توقع پر کہ اُس کا باپ خدا پر ایمان لے آئے گا) اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُس کے لئے خدا سے مغفرت چاہے گا. لیکن جب ابراہیمؑ پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ وہ خدا پر ایمان نہیں لائے گا، بلکہ وہ اس کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہوگیا. اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا ہی غم خوار اور بُردبار تھا (جو اتنا عرصہ اس توقع میں رہا کہ اس کا باپ اللہ پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اس کی حفاظت میں لے آئے گا. (۱۹/۴۷؛ ۱۴/۴۱؛ ۶۰/۴)

حضرت ابراہیمؑ کا باپ کے لئے استغفار

(داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں دیکھئے (جسے سابقہ جلدوں میں پیش کیا گیا ہے) وہ اُس باپ کے گھر میں پیدا ہوئے تھے جو مملکت کا سب سے بڑا پروہت تھا. خود بھی بُت پرست تھا اور بُت پرستی میں قوم کی قیادت بھی کرتا تھا. حضرت ابراہیمؑ نے (منصبِ نبوت پر فائز ہونے کے بعد) توحید کی تبلیغ کا آغاز خود اپنے گھر سے کیا اور اپنے والد کے غلط عقائد اور باطل مسلک کی شدت سے مخالفت کی. نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ باپ نے ان سے کہہ دیا: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۱۹/۴۶).

"اگر تُو ان باتوں سے باز نہ آیا تو یاد رکھ میں تجھے دھتکار دوں گا. اگر تُو اپنی خیر چاہتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جا."

اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے کہا:
"قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ○
(۱۹/۴۷) ـــ" ابراہیمؑ نے (اس سخت کلامی کا جواب نہایت نرمی سے دیا اور) کہا کہ خدا آپ کو (صحیح راستے کی طرف ہدایت کرے) امن و سلامتی میں رکھے میں اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہوں گا کہ وہ آپ کو (ایمان عطا کرکے کفر کی تباہیوں سے) محفوظ رکھے۔
وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میرے حال پر اس کی عنایات بے پایاں ہیں۔"

اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ میں آپ کے لئے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا۔ [مغفرت کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۸۶ پر آچکا ہے۔] حضرت ابراہیمؑ نے باپ سے کہا یہ تھا کہ آپ کی موجودہ روش آپ کو تباہی کی طرف لئے جارہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ اس غلط روش کو چھوڑ کر حق پرستی کا مسلک اختیار کریں اور اس طرح اس تباہی سے بچ جائیں جو آپ کی موجودہ روش کا لازمی نتیجہ ہے۔ آیۂ زیرِ نظر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ باپ کو برابر تبلیغ کرتے رہے، لیکن جب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ اپنی غلط روش سے باز نہیں آنے کا، تو اس سے قطع تعلق کرلیا۔ [آیت (۶۰/۴) میں اس کی وضاحت کی گئی ہے]۔

یہ ہے حضرت ابراہیمؑ کے اپنے والد کے لئے استغفار کا مطلب۔ اگر مغفرت یا استغفار کا قرآنی مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے تو اس قسم کے شکوک پیدا ہی نہیں ہوتے۔ مغفرت (یعنی غلط کاموں کے نقصان رساں نتائج سے حفاظت) تو انسان نے (صحیح اعمال کے ذریعے) خود ہی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ دوسرے اس کی رہنمائی صحیح راستے کی طرف کرسکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب یہ مغفرت (فردِ متعلقہ نے) صحیح اعمال کے ذریعے خود ہی حاصل کرنی ہوتی ہے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی مغفرت کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے؟ مرنے کے بعد تو خود بھی اپنی مغفرت کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ وہاں تو اس دنیا میں کئے گئے اعمال کے نتائج ہی سامنے آئیں گے۔ وہاں "یہاں کے" بوئے ہوئے کو کاٹنا ہوگا۔ نئے سرے سے کچھ بویا نہیں جائے گا۔

مُردوں کی مغفرت

حصولِ مغفرت کا قدمِ اول توبہ ہے، یعنی غلط راستے سے باز آ کر صحیح راستے پر گامزنی۔ اس لئے کہا ہے کہ جب موت سامنے آکھڑی ہو تو پھر توبہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی (۴/۱۸)۔ اس لئے اُس وقت کام

کرنے کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ سو جب مرنے والا موت کے سامنے آجانے اور مر جانے کے بعد اپنی "مغفرت" کے لئے خود بھی کچھ نہیں کر سکتا تو دوسرے اس کی مغفرت کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ مرنے والے کے لئے دعائے مغفرت صرف نیک آرزوں کا اظہار ہوتا ہے جس سے اس کے پسماندگان کو کچھ سکون حاصل ہو جاتا ہے. معاشرتی تعلقات کا زیادہ تر مقصد یہی ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مخالفین سے معاشرتی تعلقات کے مقاطع کے یہ معنی نہیں کہ انہیں حسن سلوک اور حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا جاتا ہے. بالکل نہیں. اس سے مراد انہیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اپنوں میں سے نہیں اور کسی کے ساتھ منافقانہ تعلقات وابستہ رکھنا ہمارے مشرب کے خلاف ہے. باقی رہے حقوقِ انسانیت، سو ان میں وہ دوسرے انسانوں کے برابر شریک ہوں گے۔

اس کے بعد جزا اور سزا کے سلسلہ میں ایک اصول بیان فرمایا:

(۹/۱۱۵) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

یہ بات خدا کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی قوم کو صحیح راستہ دکھا کر، پھر یونہی اس پر کامیابی کی راہ بند کر دے۔ وہ پہلے اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ انہیں کن باتوں کی پابندی کرنی چاہیئے اور کن امور سے بچنا چاہیئے۔ اس وضاحت کے بعد جو لوگ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کریں، ان پر کامیابی کی راہ بند ہو جاتی ہے (اس سے ظاہر ہے کہ معاشرتی عدل میں بھی نظامِ خداوندی میں مواخذہ اسی عمل پر ہوگا جسے جرم قرار دے کر اس کا اعلان کر دیا گیا ہو) یقیناً اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

یہ حقیقت متعدد بار واضح کی جا چکی ہے کہ خدا نہ کسی قوم کو خود سیدھے راستے پر چلاتا ہے اور نہ ہی کسی کو (معاذ اللہ) گمراہ کرتا ہے. وہ غلط اور صحیح راستے (وحی کے ذریعے) متمیز کر دیتا ہے اور اس کے بعد اسے انسان کے اختیار اور مرضی پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ غلط اور صحیح راستے کے متمیز کرنے کی اہمیت اس قدر ہے کہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ کسی قوم کو تباہ

نہیں کیا جاتا۔

۱۔ تاوقتیکہ اسے پہلے متنبہ نہ کر دیا جائے کہ وہ جس روش پر چل رہی ہے وہ اسے تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے، وہ اسے چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لے۔ اور

جُرم وسزا کا اصُول

۲۔ اس قوم میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ سمجھ سکے کہ اسے کیا کہا جا رہا ہے۔

تفصیل ان نکات کی مطالب الفرقان جلد چہارم صفحات ۴۸۴ — ۴۸۵، ۴۹۱ پر ملے گی (انڈکس میں "قوموں کے عروج و زوال" اور "اقوام کے استبدال و استخلاف کا قانون" دیکھئے)۔

اقوام سے نیچے اُتریے تو یہی اصول افراد کے لئے جرم و سزا کا قانون طے پائے گا، یعنی سزا اُس جرم کے ارتکاب کی ہوگی جس سے متعلق قانون کی پہلے ہی وضاحت کر دی گئی ہو اور مجرم میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

قوموں کے اس عروج و زوال کو ان کی "موت و حیات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ سابقہ آیت کے تسلسل میں ہے۔

(۹/۱۱۶) اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

یہ اس کی وسعتِ علمی ہے جس کی بنا پر کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اس کا اقتدار اور کنٹرول ہے اور اسی کے قانون کے مطابق، قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو! قانونِ خداوندی کے سوا، تمہارا کارساز اور مددگار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہ فیصلے میدانِ جنگ میں بھی ہوتے ہیں جن کا ذکر زیرِ نظر سورہ میں بہ صراحت چلا آ رہا ہے۔ جنگ میں بعض اجتہادی غلطیوں اور بعض سہواً لغزشوں کی وجہ سے عارضی شکست بھی ہو جاتی ہے لیکن اگر قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو وہ شکست کے بعد جی نہیں ہار دیتی بلکہ سنبھلتی ہے اور کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ غلط اقدام یا لغزش کے بعد سنبھل جانا توبہ کہلاتا ہے۔ توبہ درحقیقت بازآفرینی کا

موقع بہم پہنچاتی ہے اور یہ خدا کی رحمت ہے۔

٩/١١٧ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو اپنی رحمت سے نوازا اور مہاجرین و انصار کی اس جماعت کو بھی جس نے بڑی عسرت اور بے سروسامانی کے عالم میں اس کے پیچھے قدم اٹھایا۔ ایسے ناساعد حالات میں، جب کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ (مشکلات اور صعوبات کے ہجوم کی وجہ سے) ان میں سے ایک گروہ کا دل ڈول جاتا اور قدم ڈگمگا جاتے۔ لیکن اللہ نے ایسے ناسازگار حالات میں انہیں اپنی رحمت سے بہرہ یاب کیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کا دل ڈولا نہ ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی) حقیقت یہ ہے کہ اس کے قانون میں راحت و رحمت کی بڑی گنجائشیں ہیں۔

آیت (۹/۱۰۶) میں بتایا جا چکا ہے کہ کچھ لوگ جو جنگ میں پیچھے رہ گئے تھے اُن کا معاملہ فیصلہ طلب تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں دوسروں کا معاملہ تو طے پا گیا، صرف تین باقی رہ گئے تھے۔ ان کے متعلق فرمایا:

٩/١١٨ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۟ ع

اور اسی طرح اس نے تین شخصوں کو بھی اپنی رحمت سے نوازا جو (جنگ میں) پیچھے رہ گئے تھے (اور جن کا معاملہ التوا میں رکھا گیا تھا ۹/۱۰۶)۔ ان کا معاملہ معلق رہنے کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ "زمین" اپنی تمام وسعتوں کے باوجود، ان پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ نظامِ خداوندی کے حکم کی خلاف ورزی کے بعد انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی، بجز اسی نظام کے دامنِ عافیت کے۔ اس کے بعد اللہ، ان کی طرف اپنی رحمت سے ملتفت ہوا اور ان کی معذرت قبول کر لی، تاکہ وہ، اپنے معاشرہ کی طرف واپس آ جائیں (جہاں سے انہیں الگ کر دیا گیا تھا)۔ اللہ کے قانون میں دل سے معذرت کرنے والوں کے لئے سامانِ رحمت کی گنجائش ہے۔

حضرت کعبؓ بن مالکؓ کا معاملہ

تاریخ میں ہے کہ یہ واقعہ جنگِ تبوک کا ہے اور جن تین حضرات کا معاملہ فیصلہ طلب تھا ان میں ایک حضرت کعبؓ بن مالک بھی تھے۔ یہ واقعہ اس قدر اہم اور اس کے تضمنات اس قدر عبرت آمیز اور حقیقت کشا ہیں کہ میں نے اسے اپنی کتاب "معراجِ انسانیت" (سیرتِ نبی اکرمؐ) میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اسے یہاں دہرا دینا مناسب ہو گا۔ میں نے اس میں لکھا ہے:

حضورؐ مدینہ واپس تشریف لائے تو متخلفین (پیچھے رہ جانے والوں) کا معاملہ پیش ہوا۔ یہ قریب اسّی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی معذرت پیش کی اور حضورؐ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن تین صحابہؓ ایسے تھے، جن کے لئے وحی کے حکم کا انتظار کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک کعبؓ بن مالک تھے (باقی دو بلال بن امیہؓ اور مرارہ بن ربیعؓ تھے)۔

یہ واقعہ خلوص و صداقت اور ضبط و انضباط کا ایک مرقع ہے جس کا ہر گوشہ نگہ بصیرت کے سامنے لانے کے قابل ہے۔ بہتر ہو کہ آپ یہ ماجرا خود حضرت کعبؓ کی زبان ہی سے سنیں! ان کا بیان ہے کہ اس سفر میں میرا گھر پر رہ جانا محض ابتلا تھا۔ نہ ہی ایسا کرنے کا میرا ارادہ تھا اور نہ ہی کوئی عذر تھا، بلکہ میں نے اس کے لئے خاص تیاری کر رکھی تھی۔ جس روز لشکرِ اسلام روانہ ہوا، مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے کہا خیر کل چلا جاؤں گا۔ دو تین دن اسی طرح سستی میں گزر گئے۔ اب لشکر اتنی دور نکل چکا تھا کہ جا کر اس سے ملنا بہت دشوار تھا۔ مجھے نہایت صدمہ تھا کہ یہ کیا ہوا؟ میں اسی تذبذب میں رہا کہ اتنے میں

رسول اللہ واپس بھی تشریف لے آئے۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جس طرح اور لوگوں نے حیلے بہانے بنا کر معذرت قبول کرالی ہے تم بھی ایسا ہی کرو! لیکن میری روح اس تصور سے کانپتی تھی کہ جھوٹ اور وہ بھی رسول اللہ کے سامنے! میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا ٹھیک ٹھیک بیان کردیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "تم اپنے گھر میں ٹھہرو اور حکمِ خداوندی کا انتظار کرو!

بلا کسی عُذر کے ملّت کے اجتماعی امور میں عدم شرکت اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کا فیصلہ رسول اللہ خود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان تینوں سے بات چیت نہ کرے اور نہ ان کے پاس بیٹھے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اب زندگی اور اس کی تمام جاذبیتیں ہمارے لئے وبالِ جان بن گئیں۔ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہوگئی۔ میرے دو ساتھی تو گھروں میں بیٹھ کر روتے رہے۔ لیکن میں باہر نکلتا تھا، نماز میں بھی شریک ہوتا تھا، لیکن کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ میں حضورؐ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور کنکھیوں سے حضورؐ کی طرف دیکھتا رہتا۔ لیکن نگہِ کرم کا میری طرف التفات نہ ہوتا۔ ایک شام میں اپنے چچازاد بھائی کے باغ میں گیا۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت تھی۔ میں نے جاکر سلام کیا تو انہوں نے میرے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی! میں تم سے قسمیہ پوچھتا ہوں کہ بتاؤ، کیا میں خدا اور رسولؐ کو دوست نہیں رکھتا؟ انہوں نے اس پر بھی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر پوچھا تو پھر بھی ساکت رہے۔ میں نے تیسری مرتبہ قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی جانتا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں واپس چلا آیا۔ ایک دن میں بازار میں چکر لگا رہا تھا کہ ایک شامی سوداگر میرے پاس آیا اور ملک غسان کا خط مجھے دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا تم سے خفا ہو گئے ہیں اور باقی لوگ بھی تمہارے ساتھ

ملّت سے وفاشعاری

اچھا سلوک نہیں کر رہے۔ حالانکہ تمہارا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اس طرح چھوڑ دیئے جاؤ۔ تم یہ خط پڑھتے ہی ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہاں آکر تم دیکھ لوگے کہ تمہاری قدر و منزلت کس طرح پہچانی جاتی ہے۔

غور فرمائیے! یہ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ لیکن جس دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو اس کے لئے یہ آزمائش کیا حیثیت رکھتی ہے؟ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اس خط سے میرے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے وہ خط اُسی قاصد کے سامنے جلا دیا اور کہا کہ اپنے آقا سے جاکر کہنا کہ تمہاری عنایات و

التفات سے مجھے میرے آقا کی بے التفاتی لاکھ درجہ خوشتر ہے! میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کی طرف سے ایک اور حکم موجود ہے کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ رہو۔ میں نے پوچھا کہ کیا طلاق کا حکم ہے؟ کہا، نہیں' صرف علیحدہ رہنے کا۔ یہ سُن کر میں نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ پچاس دن اسی کرب والم میں گذر گئے۔ پچاسویں دن میں اسی غم میں اپنی چھت پر بیٹھا تھا کہ میں نے آواز سنی کہ کوئی شخص جبل سلع سے بلند آواز میں پکار رہا تھا کہ اے کعبؓ! مبارک ہو۔ میں سجدہ میں گر گیا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کر لی! اس کے بعد لوگ بشارت لے کر یکے بعد دیگرے میری طرف آنے لگے۔ لوگ گھوڑوں پر چڑھ کر اس تیزی سے آرہے تھے کہ ہر طرف سے بشارت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ جس نے سب سے پہلے آکر مجھے یہ مژدۂ جانفزا سنایا، میرے پاس دو کپڑے تھے، میں نے دونوں اتار کر اسے دے دیئے۔ اس کے بعد میں جلدی جلدی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا، تو راستہ بھر لوگ جماعت در جماعت' مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ مسجد میں پہنچا تو احباب دوڑ دوڑ کر آئے اور مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ میں نے رسولؐ اللہ کو سلام کیا، تو حضورؐ نے فرمایا، اے کعبؓ! مبارک ہو! آج کا دن تیرے لئے سب سے مبارک ہے۔ میں نے کہا یا رسولؐ اللہ! یہ آپ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟ فرمایا، خدا کی جانب سے! میں نے فرطِ مسرت میں عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں خدا کے اس احسان کے شکریہ میں اپنا سب کچھ صدقہ کر دوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ اپنے لئے بھی رکھ لو۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے میری صداقت کو اپنے بذل و احسان سے نوازا!

عبرت و موعظت ہم نے اس واقعہ کو شرح و بسط کے ساتھ اس لئے بھی درج کیا ہے کہ اس میں آج' ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں۔ وہاں تو یونہی تکاسل اور سہل انگاری سے ایسا ہو گیا تھا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ کھلے بندوں ملت کے اجتماعی مفاد کے خلاف غداری کی جاتی ہے اور اس کے بعد یہ غدارانِ ملت اس طمطراق کے ساتھ اکڑتے پھرتے رہتے ہیں: نہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی قوم میں یہ احساس کہ ایسے غداروں کا کم از کم معاشرتی بائیکاٹ ہی کیا جائے' اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ معاندین کس طرح اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ایسے ملت فروشوں کو فوراً خرید لیا جائے۔ اس قسم کے سوداگروں کی پیشکش کا جواب وہ تنور ہے جس میں حضرت کعبؓ نے والیٔ غسان کا خط چاک کر کے ڈالا تھا لیکن

"جعفرانِ ایں زماں" تو خود ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یاد رکھئے:

جعفر اندر ہر بدن ملّت کُش است
ایں مسلمانے کہن ملّت کُش است

ان کا ایک ہی علاج ہے کہ قوم ان کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ قرآن کے الفاظ ہیں:

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (۹/۱۱۸)

ان پر زمین اپنی کشادگیوں کے باوجود تنگ ہو جائے، حتّٰی کہ وہ خود اپنی جان سے تنگ آ جائیں اور انہیں یقین ہو جائے کہ

اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (۹/۱۱۸)

خدا کے بھاگے ہوئے کو سوائے خدا کے در کے، اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

اور وہ اس حقیقت کو محسوس طور پر اپنے سامنے رکھ لیں کہ

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا است
بندۂ غدار را مولا کجا است

جب تک وہ قانونِ خداوندی کے سامنے آ کر جھک نہ جائیں، انہیں دنیا میں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے۔

اس تفصیل میں اور نکات غور طلب ہیں؛

۱۔ ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے تمام عمر جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا، وہ سب وحی تھا جو قرآن سے باہر ہے۔ ہم اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد واضح کر چکے ہیں کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ وحی کی ایک ہی قسم تھی جو قرآن کے اندر مندرج ہے۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اور کہا، وہ آپؐ کی بشری حیثیت سے تھا۔ زیرِ نظر واقعہ میں حضورؐ نے حضرت کعبؓ کا بیان سُن کر فرمایا کہ "تم اپنے گھر میں ٹھہرو اور حکمِ خداوندی کا انتظار کرو۔" اور جب انہیں معافی مل گئی، تو انہوں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یہ آپؐ کی طرف سے ہے کہ خدا کی طرف سے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ "خدا کی جانب سے۔" اس سے وحیِ خداوندی اور حضورؐ کی بشری حیثیت متمیز ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ امت کے فرد کا (مسلمان ہونے کے باوجود) ملّت کے اجتماعی پروگرام سے (بلا قابلِ قبول عذر) الگ رہ جانا، بڑا سنگین جرم ہے۔ اسلام اجتماعی نظامِ زندگی ہے اور اجتماعیت

کا یہی تقاضا ہے. اس کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۲۱۱-۲۱۲) میں کی جا چکی ہے۔ کتب روایات میں بہت سی روایات ہیں جن میں حضورؐ (اور خلفائے راشدینؓ) نے جماعت کے ساتھ رہنے کی تاکید فرمائی ہے. ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

تمسک بالجماعت کی روایات

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انی امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ، والسمع، والطاعۃ، والھجرۃ، والجھاد فی سبیل اللہ. فانہ من خرج من الجماعۃ حین شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ الا ان یرجع. ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من اھل جھنم. قالوا یا رسول اللہ! وان صام و صلی. قال وان صلی و صام و زعم انہ مسلم۔

حضورؐ نے فرمایا: میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے: جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد. یقین جانو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی زندگی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے. لوگوںؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! (کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا!) خواہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو؟ فرمایا: ہاں، اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔"

ایک اور روایت میں حضورؐ نے فرمایا:

من فارق الجماعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ

جو جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا۔

دوسری جگہ ہے: ید اللہ علی الجماعۃ. من شذہ. شذ فی النار۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے. اللہ خود اس کا محافظ ہوتا ہے. جو جماعت سے الگ ہوا، سیدھا جہنم میں گیا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:

لا اسلام الا بالجماعۃ: جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔
ایک روایت کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ فرمایا:
ایاکم والتفرقہ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب الا! من دعا الی ھذا الشعا فاقتلوہ ولو کان تحت عمامتی ھذاہ۔
تفرقے سے ہمیشہ بچنا۔ کیونکہ جو انسانوں سے الگ رہتا ہے، اسے شیطان دبوچ لیتا ہے جیسے اس بھیڑ کو بھیڑیا دبوچ لے جو گلہ سے الگ ہو جائے۔ یاد رکھو! جو شخص جماعت سے الگ ہو جانے کی زندگی کی طرف بلائے، اسے قتل کر ڈالو خواہ وہ سر میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو (معاذ اللہ)
تمسک بالجماعت کی تاکید اگلی آیت میں کر دی، جہاں فرمایا:

(۹/۱۱۹) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

(اس واقعہ کا ذکر، خصوصیت کے ساتھ، اس لئے کیا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کا شعارِ زندگی یہ ہے کہ) وہ قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کریں۔ (لیکن یہ چیز انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے انہیں) صادقین کی جماعت کے ساتھ رہنا ہوگا (۲/۴۳)۔ یعنی سفرِ زندگی، دیگر افرادِ کارواں کی معیّت میں طے کرنا ہوگا۔ جماعت کے ساتھ رہ کر، قوانینِ خداوندی کی اطاعت، یہ ہے جنّت میں جانے کا راستہ (۳۰-۲۹/۸۹)۔
(یاد رکھو! مذہب انفرادی مسلک کا نام ہے، لیکن دین اجتماعی نام ہے۔ اس نظام سے الگ ہو جانے سے خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا)۔

---

[1] ان روایات میں "جماعت" سے مراد خود امّت یا امّت کا اجتماعی نظام ہے۔

اس کے بعد پھر روئے سخن اُن کی طرف منعطف ہوا جنہوں نے جنگ میں شرکت سے گریز کیا تھا۔

۹/۱۲۰ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ

اہلِ مدینہ اور اس کے اردگرد بسنے والے بدوؤں کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ جہاد کے وقت رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دیتے اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھتے (۶/۳۳)۔ (یہ انہوں نے اس لئے کیا کہ وہ اس راستے کی مشکلات اور مصائب سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں) بھوک اور پیاس کی جس مصیبت کو وہ جھیلتے، جو تکان اور مشقت وہ اٹھاتے ان کا ہر وہ مقام جو اس مقام پر پڑتا جہاں اس کا پڑنا فریقِ مخالف کے لئے غیظ و غضب کا موجب ہوتا، حتیٰ کہ ہر وہ نقصان جو انہیں دشمن کی طرف سے پہنچتا، ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حسن کارانہ عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اس سے آپ جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کی اہمیت اور اس کے صلہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ ایمان کی صداقت پیش کرنے کا آخری مقام اور خدا کے ساتھ بیع و شریٰ (۹/۱۱۱) کے معاملہ کے عملی

مظاہرہ کا وقت تھا۔ وہ معاملہ جان اور مال دونوں کی فروخت کا تھا۔ مخلص مومنین مال کا ایثار بھی کر رہے تھے اور جان کا نذرانہ بھی پیش کر رہے تھے۔

۹/۱۲۱ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

یاد رکھو! اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں ــــ خواہ تھوڑا ہو یا بہت ــــ یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں' ان سب کے نتائج مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں تاکہ خدا کا قانونِ مکافات' انہیں' ان کے اعمال کا حسین ترین صلہ دے۔

صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے سامنے کس قدر مصروف پروگرام تھا' اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت کی تشکیل' منافقین کی سازشوں کی روک تھام' نظامِ ربوبیت کا قیام اور ان سب سے بالاتر' مخالفین کے ساتھ تصادمات۔ اس آخری شق کی کیفیت یہ تھی کہ ۲ھ سے لے کر ۱۰ھ تک بڑی بڑی جنگوں اور چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کو ملا کر (۸۲) کے قریب نبرد آزمائیاں ہوئیں۔ ان ہوش رُبا' صبر آزما اور استقامت طلب مصروفیات میں کچھ اور سوچنے کے لئے کیا ایک لمحہ بھی مل سکتا تھا؟ لیکن دین کا بنیادی مقصد سیرت سازی اور اس کے لئے حضورؐ کا اوّلین فریضہ تعلیم کتاب و حکمت تھا (۲/۶۲)۔ جب تک جماعت مدینہ تک محدود تھی تعلیم و تعلّم کا یہ سلسلہ بآسانی سرانجام پا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ تحریک بیرون مدینہ (دیگر قبائل تک) بھی پھیل گئی تو اس کے لئے جداگانہ پروگرام مرتب کرنا پڑا۔

تَفَقُّہ فی الدین

اور وہ پروگرام یہ تھا کہ ہر قبیلہ کے کچھ لوگ' باری باری' تحریک کے مرکز (مدینہ) میں آ کر ضروری معلومات حاصل کریں اور واپس جا کر' انہیں باقی افرادِ قبیلہ تک پہنچائیں۔ اس سے تَفَقُّہ فی الدین کا اہم فریضہ ادا ہوتا رہے گا۔

۹/۱۲۲ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ
مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَ
لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جنگ اور قتال میں مصروف رہنے کے یہ معنی نہیں کہ تم دین کے دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دو۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تعلیم و تعلّم کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ لہٰذا' جماعتِ مومنین کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب ایک ہی کام کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ چاہیئے یہ کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ (مرکزِ نظامِ خداوندی میں آکر) اس نظام کے متعلق پوری پوری سمجھ بوجھ حاصل کریں اور پھر اپنے لوگوں کی طرف واپس جا کر انہیں اس سے آگاہ کریں۔ اس طرح پوری کی پوری قوم' اپنے آپ کو غلط باتوں سے محفوظ رکھ سکے گی (اور صحیح نظام کے مطابق چلنے کے قابل ہو جائے گی)۔

یہ تھا اسلامی نظام میں تعلیم و تعلّم کا پروگرام۔ جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ انہوں نے آکر یہ دعویٰ کیا کہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا علماء کا فریضہ ہے اور انہی تک محدود۔ ہم اس خلافِ اسلام' نظریہ کی تردید وضاحت سے کر چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان' جلد سوم' صفحہ ۹۰' جلد چہارم' صفحہ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ دیکھئے انڈکس میں امر بالمعروف اور امت کے عنوانات)۔

ہمارے علماء حضرات اپنی پیشوائیت کے جواز میں' زیرِ نظر آیت بھی پیش کیا کرتے ہیں' لیکن اس کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے' اس سے واضح ہے کہ یہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ اس میں ساری امت شریک ہوگی۔ اس کے لئے یہ پروگرام تھا' جو تحصیل و تبلیغِ علم کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

تحصیلِ علم کے ساتھ پھر جنگ کی اہمیت کو سامنے لایا گیا۔

۹/۱۲۳ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ
الْمُتَّقِيْنَ ○

دوسری طرف، دین کی حفاظت کے لئے جنگ کی ضرورت اور اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ تم ان مخالفین سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس پھیلے ہوئے ہیں تاکہ وہ تمہاری قوّت اور شدّت کو محسوس کرلیں (اور سمجھ لیں کہ تم یونہی نگلے نہیں جاسکتے)۔
اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی تائید اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو اُس کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں۔

آپ مومنین کی خصوصیات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ایک طرف تَفَقُّہ فِی الدّین کے پروگرام میں بھی حصّہ لے رہے ہیں اور دوسری طرف شمشیر بکف میدانِ جنگ میں بھی نبرد آزما ہیں۔ یہی مومن کی حقیقی زندگی ہے۔

مومناں را تیغ با قرآں بس است

تلوار اور قرآن

لیکن ہمارے علمارِ کرام تَفَقُّہ فِی الدّین کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں، اور تلوار کی انہوں نے کبھی شکل تک نہیں دیکھی۔ دوسری طرف ہمارے مجاہدین (یعنی فوج سے متعلقین) ہیں جن کا دین کا علم (بالعموم) اُس خطبہ تک محدود ہوتا ہے جسے فوج کا امام، جمعہ کے اجتماع یا دیگر تقاریب میں دہرا دیتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں یہی ثنویت کارفرما رہتی ہے۔

(۹ / ۱۲۴-۱۲۵) وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ
زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ
اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ
وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○

جب ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے (جنگ و قتال کے سلسلے میں) کوئی سورۃ نازل

ہوتی ہے تو (منافقین میں سے) بعض لوگ، از راہِ تمسخر، کہتے ہیں کہ تم میں سے وہ کون ہیں جن کا ایمان ان نئے احکام نے بڑھا دیا ہے؟ سو جو لوگ فی الواقع صاحبِ ایمان ہیں اُن کا ایمان اِن احکام سے یقیناً بڑھ جاتا ہے اور وہ اس پر خوشیاں مناتے ہیں (۱۲۴)

لیکن جن لوگوں کے دلوں میں منافقت کا روگ ہے، تو اس قسم کے احکام سے ان کے شکوک اور اضطرابات اور زیادہ ہو جاتے ہیں (۹/۹۵) اور وہ حالتِ کفر ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں (۱۲۵)۔

حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کر لیتے کہ اخلاص پر مبنی ایمان سے جماعتِ مومنین کی قوت میں کس قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، تو انہیں منافقت کے انجام کے سمجھ لینے میں چنداں دقت نہ ہوتی۔

9/126 اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

کیا یہ لوگ اس پر بھی غور نہیں کرتے کہ کوئی سال ایسا نہیں گزرتا کہ وہ ایک یا دو مرتبہ (تمہارے ہاتھوں ۹/۱۴) کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے ہوں۔ اس پر بھی یہ اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے اور اتنا نہیں سمجھتے (کہ منافقت ہمیشہ مصیبتوں کا موجب ہوا کرتی ہے)۔

منافقت میں ان کا یہ عالم ہے کہ:

9/127 وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ط هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ط صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○

حالت ان کی یہ ہے کہ جب کبھی (جنگ وغیرہ کے سلسلہ میں) کوئی احکام نازل ہوتے ہیں، تو یہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں (یہ پوچھتے ہوئے) کہ تمہیں کوئی دیکھ تو

نہیں رہا (کیونکہ تمہارے چہرے کا تغیر تمہاری قلبی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے)۔ پھر وہ مُنہ پھیر کر چل دیتے ہیں (مُنہ پھیرنا کیسا؟) قانونِ خداوندی کی رُو سے ان کے تو دل ہی پھر چکے ہیں' کیونکہ یہ لوگ عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے (اپنے جذبات نفرت و عداوت میں بہکے چلے جاتے ہیں)۔

دلوں کا پھر جانا آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ کہا: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ جس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے"۔ لیکن اگلے الفاظ اس کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ "اس لئے کہ انہوں نے غور و فکر سے کام لینا چھوڑ دیا"۔ یہ خدا کا قانون ہے کہ جو قوم غور و فکر سے کام لینا چھوڑ دے اس کے دل حقائق کی طرف سے پھر جاتے ہیں۔

فکر و تدبر سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ اپنا نفع نقصان بھی نہیں پہچانتے۔ اگر کوئی شخص کسی گاؤں میں ہسپتال تعمیر کرنے کا ارادہ کرے اور گاؤں والے اس کی مخالفت کریں' تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں' جو اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ شخص اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کر کے' ان کے لئے ہسپتال تعمیر کر رہا ہے اس کا ان پر کس قدر احسان ہے۔

ہسپتال تو چند مریضوں کے طبیعی امراض کے علاج کے لئے ہوتا ہے۔ کسی قوم میں رسولؐ جیسے ناصح مُشفق' طبیبِ غمگسار اور حکیمِ جانسوز کی بعثت پوری کی پوری قوم پر احسان تھا۔ جو لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے' ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکے گا کہ وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

۹/۱۲۸ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝

(اگر یہ ذرا بھی عقل و فکر سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے کہ) ان کی طرف' انہی میں سے ایک رسولؐ آیا ہے جس کی دردمندی اور غم گساری کا یہ عالم ہے کہ اگر انہیں کوئی ذرا سی تکلیف بھی پہنچتی ہے تو اُسے اس سے بے حد رنج ہوتا ہے اور اس کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی

بھلائی کا سامان پیدا ہو جائے (۳/۱۶۳ ؛ ۴۹/۱۷)۔ پھر ان میں سے جو لوگ (اس کی مخالفت اور سرکشی چھوڑ کر) نظامِ خداوندی پر ایمان لے آتے ہیں، وہ ان کی حفاظت اور نشوونما کا پورا پورا انتظام کرتا ہے۔

سورت کی آخری آیت میں کہا کہ ان لوگوں کو سمجھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ اگر اس پر بھی وہ نہ سمجھیں اور اس نظام سے رُوگردانی اختیار کریں، تو ان کا خدا حافظ!

۹/۱۲۹ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰہُ ۫ۖ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ۝

اگر یہ لوگ، اس قسم کے نظام اور ایسے مُشفق میرِ کارواں سے رُوگردانی کریں، تو اے رسولؐ! (تم ان سے کہہ دو کہ (مجھے تمہارے جیسے ساتھیوں کی ضرورت نہیں) میرے لئے خدا کی تائید و نصرت (اور مخلص مومنین کی رفاقت (۸/۶۴) کافی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار اور اختیار نہیں۔ مجھے اس کے قانون کی محکمیت پر پورا پورا بھروسا ہے۔ اس لئے کہ وہ قانون اُس خدا کا ہے جو کائنات کی مرکزی اور بنیادی قوتوں کو اپنے کنٹرول میں رکھے ہے اور تمام دنیا کی ربوبیّت کا ضامن ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گیارھواں پارہ ———— دسویں سورت

سُوۡرَۃُ یُوۡنُسَ (۱۰)

چوتھا باب
سُوْرَۃُ یُوْنُسَ

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے

۱۔ حضرت یونسؑ کے کوائفِ حیات۔
۲۔ تسخیرِ فطرت کے سلسلہ میں تین گروہ
۳۔ مومنین کی خصوصیات۔
۴۔ تباہی سے پیشتر تنذیر اور قوم میں سمجھنے کی صلاحیت۔
۵۔ اقتدار تمہیں دیا گیا تاکہ دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔
۶۔ مخالفین کی مفاہمت کی کوششیں اور انکار
۷۔ رسول اللہؐ سے بھی (بالفرضِ محال) معصیت سرزد ہو تو مؤاخذہ ہوگا۔
۸۔ دعوئ نبوت کی صداقت کا ثبوت۔ زمانۂ قبل از نبوت کی زندگی۔
۹۔ وحدتِ انسانیت۔
۱۰۔ سزا بمطابق جُرم۔
۱۱۔ روزِ جزا کو تمام سربستہ رازوں کا انکشاف۔
۱۲۔ ذالکم اللہ۔
۱۳۔ اس جدّوجہد کے نتائج حضورؐ کی زندگی میں مرتب ہوں گے یا بعد میں؟
۱۴۔ اگر (بالفرضِ محال) خدا کا وعدہ پورا نہ ہو تو اس کی بابت پوچھا جا سکتا ہے۔
۱۵۔ جشنِ نزولِ قرآن۔
۱۶۔ قبلہ اور اقامتِ صلوٰۃ کے معنی۔
۱۷۔ دُعا اور عمل کا باہمی رشتہ۔
۱۸۔ دین میں جبر نہیں۔
۱۹۔ احادیث پرکھنے کا معیار۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَۃُ یُوْنُسُ

اس سورۃ میں حضرت یونسؑ کا ذکر صرف ایک آیت (۱۰/۹۸) میں آیا ہے. بقایا سورت دیگر موضوعات پر مشتمل ہے. حضرت یونسؑ کا تذکرہ دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے، لیکن ہم اسے اس مقام پر پیش کئے دیتے ہیں.

حضرت یونسؑ بھی انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں. ان کا عبرانی نام "یوناہ" تھا جو عربی میں آکر یونس ہو گیا. توراۃ میں ان کا صحیفہ "کتابِ یوناہ" کے نام سے موجود ہے. ۸۶۰ ق.م کے قریب اُن کا زمانہ قیاس کیا جاتا ہے.

اس سے پہلے جن اقوام و ملل کے حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان کا انداز یہ تھا کہ خدا کا رسول انہیں ان کے غلط اعمال کے انجام سے متنبہ کرتا، لیکن وہ صحیح راستہ اختیار کرنے کے بجائے مخالفت اور سرکشی پر اُتر آتے اور خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق تباہ ہو جاتے. لیکن حضرت یونسؑ کے تذکرہ میں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے، یعنی انہوں نے جب قوم کو ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کیا، تو انہوں نے کچھ سوچ بچار کے بعد اپنی روش کو بدل لیا اور ہدایت کا راستہ اختیار کر لیا. لیکن حضرت یونسؑ نے اس کا انتظار نہ کیا اور اس خیال سے کہ قوم پر عذاب آنے والا ہے، وہاں سے چل نکلے. اس کے بعد کیا ہوا، وہ آگے چل کر سامنے آجائے گا. لیکن پہلے یہ دیکھئے کہ محرّف تورات جس حالت میں بھی وہ اب ہے، وہ اس باب میں کیا کہتی ہے. اس ضمن میں "کتابِ یوناہ" میں جو کچھ موجود ہے اس کا ملخص حسبِ ذیل ہے:

آپؑ کو بارگاہِ خداوندی سے حکم ملا کہ نینوا جا کر وہاں کے باشندوں کو عذابِ خداوندی سے ڈرائیں

لیکن وہ نینوا جانے کے بجائے ایک کشتی میں سوار ہو کر ترسیس کی طرف چل دیے۔ راستے میں وہ کشتی طوفان میں گھر گئی۔ اُس زمانے میں ملاحوں کا عقیدہ تھا کہ کشتی میں کوئی گنہگار ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایسا طوفان آتا ہے۔ جب تک اُسے کشتی سے نکال نہ دیا جائے، طوفان تھمتا نہیں چنانچہ مسافروں نے قرعہ اندازی شروع کی کہ کسے حوالۂ دریا کیا جائے۔ حضرت یونسؑ نے سُنا تو اپنے جی میں خیال کیا کہ مجھ سے زیادہ گنہگار کون ہوگا جو خدا سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ آپؑ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا، اور ملاحوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا جہاں آپ کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ وہ تین

مچھلی کے مُنہ میں

دن تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس کے بعد اس نے آپؑ کو ساحل پر اُگل دیا۔ اس حادثہ کے بعد آپؑ کو پھر نینوا جانے کا حکم ہوا کہ وہاں کے باشندوں کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں، تو انہوں نے معصیت کے بجائے خدا کے حضور تذلل و تعبّد کا اظہار شروع کر دیا جس سے عذاب ٹل گیا۔ لیکن (حضرت) یونسؑ پر یہ بات گراں گزری کہ خدا نے وعدہ خلافی کیوں کی۔ وہ شہر سے باہر ایک چھپر بنا کر بیٹھ گئے جس پر رینڈی کے درخت کی شاخیں پھیل گئیں۔ لیکن ایک دفعہ اس کی جڑوں میں کیڑا لگ گیا جس سے درخت سُوکھ گیا۔ اس سے آپؑ کو سخت صدمہ ہوا۔

> تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس رینڈی کے درخت پر تو رحم آیا جس کے لئے تُو نے کچھ محنت نہیں کی تھی، نہ ہی اُسے اُگایا تھا۔ وہ ایک ہی رات میں اگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا تو کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں، جو اپنے دائیں بائیں میں امتیاز نہیں کر سکتے اور مویشی بھی بہت ہیں، شفقت کروں؟
>
> (یوناہ نبی، باب ۴، آیات ۱۱-۱۰)

یہ تورات کا بیان تھا۔ اب دیکھئے قرآنِ کریم میں داستانِ حضرت یونسؑ کو کس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ صٰفٰت میں ہے:۔

وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ ۝ (۳۷/۱۴۰-۱۳۹)

یونسؑ بھی ہمارے مرسلین میں سے تھا (بات ہم اُس وقت کی کر رہے ہیں جب) وہ بھاگ

کہ ایک ایسی کشتی میں سوار ہو گیا جو سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔

قرآنِ کریم نے نہ تو اس واقعہ کی پہلی کڑیاں بیان کی ہیں اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے جو ان تمام کڑیوں کی غمازی کر رہا ہے۔ اَلْاٰبِقُ کے معنی ہوتے ہیں، اپنے فرائضِ منصبی کو چھوڑ کر بھاگ جانے والا یا چھپ جانے والا۔

ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول پہلے اپنی قوم کو حق کی دعوت دیتا۔ لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد دیکھا جاتا کہ وہ قوم صحیح راستے کی طرف آنا نہیں چاہتی، تو وہ خدا کے حکم کے مطابق اس قوم کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا جہاں کے متعلق اندازہ ہوتا کہ وہاں اس دعوت کے لئے فضا سازگار ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں، جس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

ہجرت قبل از وقت

جب حضرت یونسؑ نے دیکھا کہ قوم اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی تو وہ قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے لئے چل نکلے، حالانکہ ابھی خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ یہ اقدام انہوں نے اپنے اندازہ کے مطابق کیا۔ یہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی۔ یوں کہیئے کہ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ قرآنِ مجید میں دو الفاظ ایسے آئے ہیں جن سے ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا .... (۲۱/۸۷) یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے میں آ کر چلا گیا۔ ان کے اس اقدام کے متعلق کہا: فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۷/۱۴۱)۔ دحض کے معنی ہوتے ہیں پاؤں کا پھسل جانا، ذراسی لغزش ہو جانا۔ عام لوگوں سے اس قسم کی لغزش کوئی بڑا جرم قرار نہیں پاتی، لیکن ــــ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے ــــ ایک نبی سے اس قسم کی لغزش بھی قابلِ مؤاخذہ قرار پا جاتی ہے۔ لیکن انہیں اس کا خیال تک نہیں تھا کہ یہ کوئی قابلِ گرفت جرم ہے۔ چنانچہ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا کے بعد ہے: فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱/۸۷) "اس نے خیال کیا کہ اس کی وجہ سے اس پر کوئی تنگی نہیں ہوگی" ــــ اس کا یہ اقدام کسی مؤاخذہ کا مستوجب تصور نہیں کیا جائے گا۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۷/۱۴۱) کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ دوسری سواریوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گیا، لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دریا میں جا گرا[1]۔ قرآن نے

(۱ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یہ نہیں بتایا کہ وہ کشتی ڈگمگا گئی تھی یا ڈوب گئی تھی. اس نے اتنا ہی کہا ہے کہ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ (۳۷/۱۴۲) ـــــ اسے ایک بہت بڑی مچھلی نے مُنہ میں دبوچ لیا. وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا (کہ اس نے عجلت میں کیا کیا).

یہاں الفاظ " فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ " آئے ہیں. لَقِمَ اور اِلْتَقَمَ منہ میں دبوچ لینے کو کہتے ہیں، خواہ اس کے بعد نگل لیا جائے یا نہ. لُقْمَہ یہاں سے ہی ہے جس کے معنے مُنہ میں ڈالے ہوئے نوالے کے ہیں. اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اس مچھلی نے حضرت یونسؑ کو مُنہ میں دبوچ لیا. اس کی تائید اگلی آیات سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا ہے. فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۙ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۚ (۱۴۳-۱۴۴/۳۷). مُسَبِّحِيْنَ کے عام معنی کئے جاتے ہیں "تسبیح کرنے والے" اور کہا جاتا ہے کہ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں یہ تسبیح پڑھی تھی ـ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ (۲۱/۸۷). یہ "تسبیح" بڑی مشہور ہے اور ہمارے ہاں ہر مصیبت کے وقت اس کا ورد کیا جاتا ہے. "تسبیح" کے معنی مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳ پر گزر چکے ہیں. اس مادہ (س. ب. ح) کے بنیادی معنی تیرنے کے ہوتے ہیں. اَلسَّبَّاحُ ایسے تیراک کو کہتے ہیں جو پورے ہاتھ پھیلا کر تیرے اور " اَلسَّوَابِحُ " اُن گھوڑوں کو کہتے ہیں جو پورے قدم

مُسَبِّحِيْنَ کا مفہوم

اٹھا کر انتہائی تیزی سے دوڑیں. ان بنیادی معانی کی رُو سے سَبَحَ کے معنی ہوتے ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے انتہائی جدوجہد کرنا، پوری پوری تگ و تاز کرنا، ہاتھ پاؤں مارنا. لہٰذا آیت زیر نظر کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی نے حضرت یونسؑ

(گزشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) سَهَمَ کے معنی ہیں (i) دوسروں کے ساتھ شریک و سہیم ہونا. (ii) دوسروں کے ساتھ مل کر قرعہ اندازی کرنا. (iii) کمزور اور لاغر ہو جانا. ان میں سے کوئی سے معنی بھی لے لیجئے، مطلب دریا میں گر جانے یا گرائے جانے کے ہو گئے اور اگر ان کے اس اقدام کی نوعیت کو لیجئے تو مطلب " لغزشِ پا " ہو گا، یعنی خفیف سی اجتہادی غلطی. لفظ " لغزش " کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے. ایک لغزش وہ ہوتی ہے جو معصیت نہیں ہوتی. اسے قرآن نے لَمَم کہہ کر پکارا ہے (۵۳/۳۲) یعنی یونہی قابل ملامت اجتہادی غلطی. دوسرا مفہوم معصیت ہو گا، یعنی احکام خداوندی کی خلاف ورزی. انبیاء کرام سے اس قسم کی لغزش سرزد نہیں ہوتی تھی.

کو اپنے مُنہ میں دبوچ لیا۔ انہوں نے اس کی گرفت سے چھوٹنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، انتہائی جدّوجہد کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور اچھے تیراک نہ ہوتے تو مچھلی انہیں نگل لیتی اور پھر وہ کبھی بھی اس کے پیٹ سے باہر نہ نکل سکتے۔

اس غم والم کے عالم میں انہیں اپنے غلط فیصلے کا شدت سے احساس ہوا اور انہوں نے خدا کو پکارا۔ اب سورۃ انبیاء کی دونوں متعلقہ آیات کو سامنے لائیے۔ فرمایا:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۲۱/۸۷ ـ ۸۸)

اور اسی طرح ذوالنونؑ کا معاملہ بھی ہے۔ وہ اپنی قوم کے لوگوں سے تنگ آکر غصہ میں وہاں سے چلا گیا۔ (حالانکہ اُسے ابھی ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ کسی کشی کے ارادے سے نہیں کیا تھا) اس نے یہ خیال کیا تھا کہ چونکہ یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں، اس لئے خدا اس پر مواخذہ نہیں کرے گا اور مجھے کسی سختی میں نہیں ڈالے گا۔ پھر جب وہ (اپنے غلط پروگرام کی وجہ سے) مشکلات میں گھر گیا تو اُس نے ہمیں پکارا اور کہا کہ بارِ الٰہا! تیرے سوا کسی کو اس کا اقتدار و اختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے) میں نے اس فیصلے میں جو عُجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو یہ میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہوتا ہے۔ (۱۴۱/۳۷؛ ۴۸/۶۸)۔

غم سے نجات

سو ہم نے اس کی پکار کو سُن لیا اور اسے غم سے نجات دی۔ اسی طرح ہم، ان لوگوں کو غم و حزن سے نجات دیتے ہیں جو ہمارے قوانین کی صداقت و محکمیت پر یقین رکھتے ہیں۔"

وہ نجات یہ تھی:۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً

مِنْ یَّقْطِیْنٍ ۚ (۱۴۵ ـ ۱۴۶/۳۷)

ہم نے اسے، دریا کے کنارے، کھلے میدان میں ڈال دیا (۴۹/۶۸) لیکن اس کشمکش اور دہشت کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اس نے ایک بڑے بڑے پتّوں والے پودے کے سائے میں جاکر آرام کیا تو اس کی حالت سنبھلی۔　　نیز (۵۰ ـ ۴۸/۶۸)۔

اور اس کے بعد انہیں پھر ان کی قوم کی طرف بھیج دیا اور وہ ایمان لے آئی:۔

وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ۚ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ۚ (۱۴۷ ـ ۱۴۸/۳۷)

اور ہم نے پھر اسے اس کی قوم کی طرف بھیج دیا (اور وہ بہت بڑی قوم تھی) جس کی تعداد ایک لاکھ، بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔ وہ لوگ ہمارے قانون پر ایمان لے آئے تو ہم نے انہیں ایک مدّتِ معیّنہ تک، زندگی کے سازوسامان سے نوازا۔ (اس قوم نے ایمان لے آنا تھا۔ یونسؑ نے جلدبازی سے کام لیا جو ان سے مایوس ہوکر، وہاں سے چلا گیا۔ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم اُس وقت ملا کرتا ہے جب اُس قوم میں حق و صداقت کی قبولیت کا امکان باقی نہ رہے۔ اس سے پہلے، وہاں سے چلے جانا، گویا اپنے فرضِ منصبی کو چھوڑ دینا ہے۔ یہی حضرت یونسؑ کی اجتہادی غلطی تھی)۔

یہ تھی وہ قوم جس کا ذکر سورۃ یونس کی آیت (۱۰/۹۸) میں آیا ہے:۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۚ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (۱۰/۹۸)

ہمارے اس دعوے کی شہادت خود تاریخ سے ملتی ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جو تباہی سے پیشتر (حالاتِ امن میں) ایمان لے آئی ہو، اور اس طرح اپنے ایمان کی نفع بخشیوں سے فیضیاب ہوکر تباہی سے بچ گئی ہو۔ اس میں اگر کوئی استثناء ہوئی ہے تو قومِ یونسؑ کی جو (عذاب آنے سے پہلے) ایمان لے آئی تو ہم نے اُن سے اُس عذاب کو دُور کر دیا جو انہیں دنیا میں ذلیل کر دیتا۔ اور انہیں ایک مدّت تک زندگی کی

خوشگواریوں سے متمتع کیا۔ (۱۴۸-۱۴۷/۳۷)؛ (۲۱/۸۷)؛ (۴۸/۶۸)۔

○

ہم نے دیکھا ہے کہ آیت (۲۱/۸۷) میں آپ کو ذوالنون کہا گیا اور آیت (۶۸/۴۸) میں صاحب الحوت۔ اس آیت میں رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ آپ احکامِ خداوندی کی فرماں پذیری میں مستقل مزاج رہیئے اور صاحب الحوت کی طرح (جلد بازی سے کام نہ لیجئے)۔ اس کے بعد کہا ہے کہ خدا نے انہیں بھی صالحین کے زمرے میں شمار کر لیا تھا (۶۸/۵۰)۔ آیات (۴/۱۶۳) اور (۶/۸۷) میں ان کا نام زمرۂ مرسلین کرام میں آیا ہے۔

اس کے بعد آیئے (مسلسل) سورۂ یونس کی طرف۔ اس کی پہلی دو آیتیں یوں ہیں:۔

۱۰/۱ الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ○

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ اُس ضابطۂ قوانین کی آیات ہیں جو سرتاسر حکمت پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ہے:

۱۰/۲ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ○

کیا ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی کی طرف اپنی وحی کیوں بھیجی ہے، تاکہ وہ، اس کے ذریعے انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے نتائج سے آگاہ کرے اور جو لوگ اس ضابطۂ حیات پر ایمان لائیں، انہیں خوشخبری دے کہ اُن کے نشوونما دینے والے کے نزدیک اُن کا مقام بہت بلند اور حقیقی شرف کا موجب ہے۔

(وہ لوگ، بجائے اس کے کہ اس کتاب کی تعلیم پر غور و فکر سے اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے، مطالبہ یہ کرتے ہیں کہ رسول کو فوق البشر ہونا چاہیئے جو انہیں کچھ عجوبے دکھائے۔ اور جب یہ رسول اس کے جواب میں کہتا ہے کہ وہ انہی جیسا ایک انسان ہے تو یہ) مخالفین اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔

سابقہ جلدوں میں مختلف مقامات پر یہ حقیقت بیان کی جاچکی ہے کہ رسولؐ اس امر کا واضح اعلان کرتے تھے کہ وہ انہی جیسے بشر ہیں اور عجوبہ پسند انسان اس پر اعتراض کرتے تھے کہ عام انسان

رسولوں کی بشریت

پر وحی کیسے آسکتی ہے۔ رسول کو فوق الفطرت ہونا چاہیئے۔ اگر اس کے باوجود وہ (رسول) اپنے دعویٰ بشریت پر اصرار کرتا تو یہ لوگ کہتے کہ اگر یہ عام انسان ہے تو اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ اس کی طرف من جانب اللہ وحی آتی ہے۔
ان کا یہی قول یہاں درج کیا گیا ہے کہ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝

سحر کے متعلق تفصیلی گفتگو مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۴۴ تا آخر) میں کی جاچکی ہے وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس مادّہ کے بنیادی معنے ایسے جھوٹ یا فریب کے ہیں جس کا بظاہر پتا نہ چلے۔ اس جہت سے یہ لفظ جادو کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے گا وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ اس مقام پر ان میں سے کون سے معنے موزوں اور مناسب ہیں۔ داستانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ لفظ بکثرت آیا ہے۔ نیز جیسا کہ جلد دوم میں بتایا گیا ہے کہ کفار نبی اکرمؐ کو رَجُلًا مَّسْحُوْرًا بھی کہتے تھے، یعنی جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی سختی سے تردید کی۔

یہاں کہا گیا ہے کہ یہ شخص (یعنی نبی اکرمؐ) ساحر ہے۔ اس کے معنے جھوٹا یا فریب کار ہوں گے۔ دوسرے مقام پر "ساحرِ کذاب" کہا ہے (۳۸/۴)۔ ہو سکتا ہے کہ وہ حضورؐ کو جادوگر ہی کہتے ہوں کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ جو شخص آپؐ کے قریب جاتا ہے وہ (بالعموم) آپؐ کے کلام، بیان اور وجاہت سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ اسے "سحر" (جادو) کے سوا کچھ اور سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔

اس کے جواب میں کہا کہ تم اس شخص کی بشریت کی طرف نہ دیکھو۔ دیکھو یہ کہ جس خدا کی طرف سے نزولِ وحی کا یہ مدعی ہے، اس خدا کا نظام کس قدر محیّر العقول ہے۔ اگر اس کے حیرت انگیز ہونے پر تمہیں اعتراض نہیں، تو اس کا کلام کیوں موجبِ اعتراض ہے؟ جس طرح کائناتی نظام پہ غور کرنے سے تم کسی

نتیجہ پر پہنچ گئے ہو' اسی طرح اس کے کلام کو بھی ON MERIT پرکھ کر کسی نتیجے پر پہنچو۔ یہ انداز تو کسی طرح بھی معقول نہیں قرار دیا جا سکتا کہ تم اس کلام کو (بلا دیکھے بھالے) اس لئے جھٹک دو کہ اس کا پیش کرنے والا فوق البشر کارنامے (معجزے) کیوں نہیں دکھاتا ـــــ وہ خدا وہ ہے:۔

(۱۰/۳) اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

تمہارا پروردگار جس کی طرف سے یہ کتاب نازل ہوئی ہے' وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مختلف ادوار میں پیدا کیا اور اس کے پورے کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ تمام کائنات کا نظم و نسق اسی کے قوانین کے مطابق' اس حُسن و خوبی سے سرانجام پا رہا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ایک شئے کسی دوسری شئے کے ساتھ مل کر ایک نیا نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ چیزیں اس کے قانون کے مطابق آپس میں نہ ملیں' تو پھر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

(اسی طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی تائید و حمایت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے' تو اس کی یہ تائید و حمایت بھی اُسی صورت میں مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے جب وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو)۔

یہ ہے وہ اللہ جو (کائناتی اشیاء کی طرح) تمہارا نشو و نما دینے والا بھی ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم اُسی کے قوانین کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو ـــــ کیا تم اس حقیقت کو اپنے سامنے نہیں رکھتے؟ (جس خدا کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں' یہ رسول اُس خدا کے قوانین تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا انسان ہونا ان قوانین کے جھوٹا ہونے کی دلیل کس طرح ہو سکتی ہے؟)

شفاعت اور اذن کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے (دیکھئے انڈکس) عرش اور تدبیرِ امور کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۷۶ پر کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی ہے' اسی طرح انسانوں کے اعمال بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور کوئی شخص اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ وہ قانون تمام انسانوں کو محیط ہے۔

(۱۰/۴) اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○

شفاعت اور رجعت الی اللہ

یاد رکھو! تم جو روش بھی چاہو اختیار کر لو، تمہارا ہر قدم اُسی کے قانون کی طرف اٹھے گا۔ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ اُس کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوگا۔ تم اس کے احاطہ سے باہر جا نہیں سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو تم سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ اس کا کائناتی قانون یہ ہے کہ وہ مختلف اشیاء کو ان کے نقطۂ آغاز سے پیدا کرتا ہے' اور پھر ان کے مختلف پہلو بدل کر طرح طرح کی گردشیں دے کر متعدد ارتقائی منازل کے بعد انہیں تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اُس کے اسی قانون کے مطابق انسانی اعمال بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں' یعنی وہ لوگ جو اس قانون پر ایمان لے آتے ہیں اور پھر اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش (کائنات' انسانی معاشرہ اور خود انسانی ذات کو سنوارنے والے) پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں' انہیں

حق و انصاف کے مطابق ان کے اعمال کا بدلہ مل جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس قانون سے انکار کر کے، دوسری راہیں اختیار کر لیتے ہیں، ان کے اعمال ایسے نتائج پیدا کرتے ہیں جن سے، ان کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پانے کے بجائے، جھلس کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح انہیں بڑی دردانگیز سزا ملتی ہے۔ (۲۴/۳۳)، (۴-۳/۳۴)، (۲۲/۴۵)، (۳۱/۵۳)۔

"رجعت الی اللہ" کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے مراد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری ہے (انڈکس میں "رَاجِعُوْنَ" کا عنوان دیکھئے)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ خدا کا تخلیقی پروگرام اس لئے جاری و ساری ہے کہ انسانی اعمال صحیح صحیح نتیجہ پیدا کر سکیں۔ تخلیق کائنات اور قانونِ مکافاتِ عمل میں باہمی تعلق کیا ہے، اس کی بابت مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۹۲ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کی طرف یہاں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ سعدی نے یہ کہہ کر شاید اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ:

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند　　　کہ تُو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اس کے بعد پھر سلسلۂ کائنات کی طرف رُخ کیا گیا۔ فرمایا:-

(۱۰/۵) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

یہ اُس خدا کا قانون ہے جس نے سورج کو ایسا درخشندہ اور چاند کو ایسا تابناک بنا دیا اور چاند کی منازل متعین کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو (اسی طرح سورج کی رُو سے بھی حساب رکھا جا سکتا ہے)، (۶/۹۷؛ ۱۷/۱۲)۔ اللہ نے یہ سب کچھ مبنی برحقیقت اور تعمیری نتائج پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے (نہ یہ محض

"حلقۂ دامِ خیال" ہے اور نہ ہی اس کا انجام تخریب ہے۔ اس نے اپنے قوانین و حقائق
کو ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں، کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔

شمسی اور قمری کیلنڈر شمسی اور قمری کیلنڈر کے سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۳ پر بحث ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر آیت بھی وہاں درج کی گئی ہے۔ اس لئے اس پر یہاں مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ہے:۔

۱۰/۶ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ○

یقیناً رات اور دن کی گردش میں؛ اور خدا نے جو کچھ کائنات میں پیدا کیا ہے، اس میں، اُن قوموں کے لئے جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں، بڑے بڑے حقائق پوشیدہ ہیں۔

قرآنِ مجید میں نظامِ کائنات اور مظاہرِ فطرت کے متعلق اس شدّ و مد اور اصرار و تکرار سے آیا ہے کہ (بظاہر) ایسا دکھائی دیتا ہے گویا یہ سائنس کی کتاب ہے۔ ہم نے علومِ سائنس کی اس اہمیت کے پیشِ نظر، اس جلد میں (سورۂ اعراف کی آیت ۷-۹ کے تحت) اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد، ہمارے خیال میں، کائنات سے متعلق آیات کی الگ الگ تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بجز اس کے کہ کوئی ایسا خاص نکتہ آجائے جو مزید وضاحت طلب ہو۔ قرآن کے ان تمام مقامات میں ایک اہم بات نمایاں دکھائی دے گی اور وہ یہ کہ اس کے نزدیک کارگہِ کائنات پر غور و فکر سے مقصود صرف نظری تحقیق یا دنیا کے طبعی مفاد کا حصول نہیں۔ ان کے علاوہ اس سے مقصد، انسانی ذات کی نشو و نما، ارتقاء اور تزکیہ بھی ہے جس کا سلسلہ موت کے بعد آگے بھی چلتا ہے، یعنی وہ امورِ کائنات کی عقدہ کشائی سے انسانی ذات کی بالیدگی اور اُخروی زندگی کی شادابی کی راہیں استوار کرتا ہے۔ یہی فرق ایک سیکولر سائنسدان اور مومن محقق میں ہے۔ اس فرق کو قرآنِ کریم نے اگلی آیت میں بلیغ انداز سے واضح کیا ہے۔ فرمایا:۔

۱۰/۷-۸ إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ

الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

تسخیرِ فطرت

ان کے برعکس

(۱) جو لوگ قوانینِ فطرت کا علم تو حاصل کر لیں لیکن زندگی فقط اِس دنیا کی زندگی سمجھیں اور حیاتِ اُخروی (یعنی خدا کے قانونِ مکافات) کے منکر ہوں اور طبیعی مفاد پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں ــــ یا

(۲) جو اِن قوانین سے یکسر بے خبر ہوں۔

یہ دونوں ناکام و نامراد رہیں گے۔ ان کا دنیوی معاشرہ بھی جہنم جیسا ہوگا اور اُخروی زندگی بھی جہنمی۔

اس لئے کہ دنیا اور آخرت کی کامرانیاں اُنہی قوموں کے حصّہ میں آئیں گی جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں قوانین و اقدارِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے صرف میں لائیں (۱۳/۱۷)۔

تسخیرِ فطرت کے سلسلہ میں 'مطالب الفرقان' جلد دوم صفحہ ۹۲ پر تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر اور اس سے اگلی آیت میں انہی تینوں گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔ سیکولر تصورِ حیات کے حامل مغربی سائنسدان فطرت کی قوتوں کا احاطہ کرکے انہیں اپنی اپنی قوموں کے مفاد اور دیگر اقوام کی تخریب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے جس جہنم کے شعلے اٹھتے ہیں وہ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اور تو اور، خود وہ قومیں بھی چیخ پکار کر رہی ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت ہم مسلمانوں کی ہے جو اس میدان میں تمام اقوامِ عالم سے پیچھے ہیں۔ ان قوموں کو تو پھر بھی دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہم ان سے بھی محروم ہیں۔ جن قوموں میں مذہبی پیشوائیت کا غلبہ حاصل ہوگا ان کی یہی حالت ہوگی۔ اس لئے کہ یہ حضرات عقل و فکر کو شجرِ ممنوعہ اور سائنسی علوم کی تحصیل کو حرام قرار دیتے ہیں، یاد رکھئے!

جب تک ہماری قوم ان کے پنگل سے آزاد نہیں ہوتی، مقامِ آدم یعنی انسانی سطح پر نہیں آسکتی۔ مقامِ مومن تو اس کے بعد کی بات ہے یہی اصل جنت ہیں۔

۱۰/۹ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○

ان کے برعکس، جو لوگ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھنے کے بعد، تسخیرِ فطرت کریں گے اور ان قوتوں کو کائنات کے سنوارنے میں صرف کریں گے تو اللہ ان کے اس ایمان کی بنا پر ان کی راہنمائی زندگی کے صحیح راستہ کی طرف کر دے گا۔ اُس راستے کی طرف جو انہیں اُس معاشرہ کی سمت لے جائے گا جس کی شادابیوں پر خزاں نہیں آسکتی اور جس کی آسائشوں میں کبھی کمی واقع نہیں ہوسکتی۔

اس دنیا کے جنتی معاشرہ اور اُخروی جنت کی خصوصیات قرآن کے صفحات پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں یہاں بھی ان میں سے چند ایک باعثِ فروغِ دیدہ ہیں۔ فرمایا:۔

۱۰/۱۰ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؏

مومنین کی خصوصیات

وہ معاشرہ جو ان کے اس دعوے کی زندہ شہادت ہوگا کہ یہ چیز خدا کے قانون سے بہت بعید ہے کہ وہ صحیح کوششوں کے تخریبی نتائج پیدا کر دے، اس معاشرہ میں ہر فرد، دوسرے افراد کے لئے حیات بخش آرزوئیں اور سلامتی بیز تمنائیں لئے ہوگا اور ان کی اس دعوت کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ

اس نظامِ ربوبیت کے عالمگیر نتائج کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظام کس قدر مستحقِ حمد و ستائش ہے (۱/۱)۔

ان خصوصیات میں سے ہر ایک ایسی جامع ہے کہ اس کی تشریح کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے۔ لیکن چونکہ ان کے تذکرے مطالب الفرقان کے مختلف مقامات پر آ چکے ہیں؛ اس لئے ہم ان کے مفہوم پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ اس کے ہر ذرے میں آفتاب اور ہر قطرے میں سمندر مضمر ہے۔ ان کے متعلق سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ

دفتر تمام گشت بہ پایاں رسید عمر　　ما ہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

قانونِ مکافاتِ عمل کا ذکر آیا تو اسی ضمن میں قانونِ مہلت کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ فرمایا:۔

(۱۰/۱۱) وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ○

قانونِ مُہلت

اور دیکھو! جس طرح انسان اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے جلد بازی سے کام لیتا ہے، اگر اللہ کا قانونِ مکافات، اسی طرح نقصان پہنچانے (مواخذہ کرنے) میں جلدی کرتا، تو ان لوگوں کا (جو غلط راستے پر چلتے ہیں) کبھی کا وقت پورا ہو چکا ہوتا! (لیکن اس نے تخم ریزی اور ثمر باری کے درمیان ایک وقفہ مقرر کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس قانونِ مہلت کی رُو سے ہوتا یہ ہے کہ) جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں، ان کی گرفت فوری نہیں ہو جاتی؛ انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس میں حیران و سرگرداں پھرتے رہیں۔ (اگر غلط اقدام پر فوری گرفت ہو جائے، تو ہم نے جو یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ انسان بلا جور و اکراہ، کامل غور و فکر کے بعد اپنی مرضی سے صحیح راستہ اختیار کرے؛ اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے)۔۔۔ مثلاً کسی ظالم کا جو ہاتھ

مظلوم کے خلاف اُٹھے' وہ اگر دہیں پتھر بن کر رہ جائے تو اسے دیکھ کر ساری دنیا ایمان لے آئے۔ لیکن یہ ایمان غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ اور جو ایمان عقل و فکر کے ماؤف ہونے سے لایا جائے' اُسے ایمان کہا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ تو فکری اکراہ کا نتیجہ ہوگا۔ (۲/۲۵۶)۔

قانونِ مہلت کے متعلق سابقہ جلدوں میں ذکر آچکا ہے (مثلاً جلد اوّل' صفحہ ۱۹۷' جلد چہارم' صفحہ ۲۳۶' جلد پنجم' صفحہ ۴۷' ۳۷)۔ اس قانون کے ان مصالح کے علاوہ' جن کا ذکر اوپر مفہوم میں کیا گیا ہے' ایک اور اہم نکتہ بھی ہے۔ قرآنِ کریم نے اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں میزان کے پلڑوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے' یعنی تعمیری اعمال کا پلڑا اور تخریبی اعمال کا پلڑا۔ قوموں کی موت اور حیات کا مدار ان پلڑوں پر ہے کہ کون سا جھکتا ہے اور کس حد تک جھکتا ہے۔ اس ثقل اور خفت میں بہرحال' وقت لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک قوم کے اعمال کے تخریبی پلڑا میں ذرا سا جھکاؤ پیدا ہو (یعنی اس کے تعمیری اعمال تخریبی اعمال کے مقابلہ میں کم ہو جائیں) اس کی وجہ سے اسے کچھ خفیف سے جھٹکے لگیں تو وہ سنبھل جائے اور اپنے حسنِ عمل میں اضافہ کرے' تو تباہی رُک جاتی ہے۔ یہ جو ہم اقوامِ عالم کی تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ ایک قوم میں خرابیاں عام ہونے کے باوجود وہ زوال آمادہ ہوتی ہے تباہ نہیں ہوتی' تو اس کی یہی وجہ ہے۔ اسے اصلاحِ خویش کا موقع دیا جاتا ہے۔

حضرت یونسؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں قانونِ مہلت کی طرف اشارہ کرنے کی یہ اہمیت بھی ہے کہ یہ قانون اُن کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُن سے اپنے فیصلہ میں اجتہادی سہو ہو گیا۔ اُس قوم نے اِس وقفہ میں اپنی اصلاح کر لی اور اُس وقت تباہی سے بچ گئی۔

○

اس کے بعد جذباتی انسانوں کی اس نفسیاتی کمزوری کو سامنے لایا گیا جس کا ذکر کئی ایک۔ دیگر مقامات پر بھی آیا ہے' یعنی یہ کہ:۔

(۱۰/۱۲) وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن

لَّمۡ یَدۡعُنَاۤ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗ ؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ
مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○

انسان کی عُجلت پسندی

انسان (جب اپنے جذبات کے تابع چلتا ہے اور ہمارے قانون کا اتباع نہیں کرتا تو اس) کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کھڑا، بیٹھا، لیٹا ہمیں پکارتا ہے۔ لیکن جب اس سے وہ مصیبت ٹل جاتی ہے، تو وہ اس طرح مُنہ موڑ کر چل دیتا ہے گویا اس نے ہمیں اپنی مصیبت میں کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ (اور اس کے بعد وہ پھر اسی غلط روش پر چلنے لگتا ہے۔ سو دیکھو کہ) جو لوگ ہمارے قوانین کی حد سے باہر نکل جاتے ہیں، انہیں ان کے اعمال کس قدر حسین اور خوشنما دکھائی دیتے ہیں، (لیکن آخر الامر ان کی تباہی آجاتی ہے۔ عقل و فکر کی رُو سے ایمان لانے سے یہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی)۔

قرآنِ کریم اُس شخص کے ایمان کو ایمان قرار دیتا ہے جو جملہ (متعلقہ) حقائق کو خالی الذہن ہو کر علم و عقل کی رُو سے پرکھتا ہے اور کامل غور و فکر کے بعد، قلب و دماغ کی رضامندی سے، ان کی صداقت کا معترف ہوتا ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جس میں خارجی حالات کی تبدیلی سے نہ لغزش پیدا ہوتی ہے، نہ تبدیلی آتی ہے۔ اس مردِ مومن کا ایمان بحرِ ذخار میں چٹان کی طرح محکم ہوتا ہے کہ حوادثِ ارضی و سماوی کی طغیانیاں آئیں اور اپنا سر ٹکرا کر خاسر و ناکام لوٹ جائیں۔ جماعتِ مومنین کے ایمان کا یہی وہ ثبات ہے جس کا ذکر، اس کے شایانِ شان زیبائی و رعنائی اور درخشندگی و تابندگی کے ساتھ، مطالب الفرقان جلد سوم کے چوتھے باب (صفحہ ۱۰۸) کے ابتداء میں کیا جا چکا ہے اور آئندہ بھی اپنے اپنے موقع پر کیا جائے گا کہ ان کے اس ایمان کی تابندگی ہے جو ہر متلاشیِ حقیقت کے لئے بحرِ ظلمات میں روشنی کے مینار کا کام دیتی ہے۔ (علیہم الصلوٰۃ و السلام)۔

خدا کے مذکورہ بالا قانونِ مکافات کے مطابق قوموں کی تباہی واقع ہوتی ہے:-

۱۰/۱۳ وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ

وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا ؕ
كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝

(اسی قانونِ مہلت اور مکافات کے مطابق) ہم نے اس سے پہلے بہت سی قوموں کو تباہ کر دیا جب انہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کر کے' لوگوں پر ظلم اور زیادتی شروع کر دی۔ ان کی طرف ہمارے پیغامبر' واضح قوانین اور کھلے کھلے دلائل لیکر آئے لیکن انہوں نے ان کی صداقت کو تسلیم نہ کیا (اور وہ تباہ ہو گئے)۔ اسی طرح ہم ہر دور کے مجرمین کو ان کے کئے کا بدلہ دیتے ہیں۔

قوموں کے عروج و زوال کے قوانین' جنہیں قوانینِ استبدال و استخلافِ قومی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے' سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے بیان کئے جا چکے ہیں (انڈکس سے تمام مقامات سامنے آجائیں گے)۔ ان میں سے ایک اصول بڑا اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی قوم پر تباہی وارد نہیں ہوتی جب تک

تباہی سے پہلے دو شرطیں

دو شرائط پوری نہ ہوں — انہیں ان کی غلط روش کے انجام سے پہلے آگاہ کر دیا جائے اور ان میں اس تنذیر کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ اس ضمن میں مطالب الفرقان' جلد اوّل (صفحہ ۱۹۶)' جلد دوم (صفحہ ۱۵۳)' جلد چہارم (صفحہ ۴۸۴' ۱۴۱' ۴۴)' جلد پنجم (صفحہ ۱۲۵' ۴۸) بالخصوص قابلِ غور ہیں۔ یہاں بھی ایک شرط کو اجاگر کیا جب کہا کہ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ۔ اور آخر میں یہ کہہ کر کہ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝ اس کی وضاحت کر دی کہ یہ کوئی وقتی یا ہنگامی بات نہیں۔ یہ خدا کا ابدی قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

جب کسی سابقہ قوم کی جگہ نئی قوم لیتی ہے تو اسے بتا دیا جاتا ہے کہ وہی قانون جس کی رُو سے سابقہ قوم سے حکومت و سطوت چھنی ہے اس کا اطلاق تم پر بھی اسی طرح ہوگا۔ تاریخی تناظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ وارننگ خود جماعتِ مومنین کو بھی دی گئی تھی جب کہا کہ:-

(۱۰/۱۴) ثُمَّ جَعَلۡنٰكُمۡ خَلٰٓئِفَ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ

لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ○

تم کیسے کام کرتے ہو؟ ان اقوامِ سابقہ کے بعد، ہم نے، اے جماعتِ مومنین، تمہیں ان کا جانشین بنایا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ (جس قسم کے تمہارے اعمال ہوں گے، اسی کے مطابق تمہارے متعلق بھی فیصلہ ہوگا۔ ہمارا قانونِ مکافات سب پر یکساں نافذ ہوتا ہے)۔ ۹/۳۹ ؛ ۴۷/۳۸)۔

صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے لئے اس وارننگ کو غیر متبدل سنت اللہ کی یاد دہانی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہماری (یعنی اہلِ پاکستان کی) صورت میں یہ وارننگ ایک بدیہی حقیقت ہے جس میں دو آرا ہو نہیں سکتیں۔ ہمیں یہ مملکت (بنی اسرائیل کی طرح. ۲۸/۵) ملی ہی اسی لئے تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم کس قسم کے کام کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے کام معیارِ خداوندی پر پورے نہ اترے تو ان سے وہ مملکت اور حکومت چھن گئی۔ ہمارے اعمال بھی اسی قسم کے ہوئے تو یہ مملکت ہم سے بھی چھن جائے گی۔ قرآنی بارگاہ میں کوئی قوم خدا کی چہیتی نہیں ہوتی۔

○

سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ سرکش طبقہ، رسول کی دعوت کی شدت سے مخالفت کرتا۔ لیکن جب اس طرح اسے کامیابی کی صورت نظر نہ آتی تو وہ مفاہمت کی کوشش کرتا۔ لیکن غیر متبدل اصولوں میں (جسے الحق سے تعبیر کیا جاتا ہے) مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول ان کی اس دعوت کو سختی سے جھٹک دیتا۔ تفصیل اس اجمال کی مطالب الفرقان، جلد اوّل (صفحہ ۱۷۹) اور جلد دوم (صفحہ ۳۶۶) پر گزر چکی ہے۔ ان میں مفصل آیت وہ ہے جو اب سامنے آتی ہے:۔

10/15 وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ ہٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡہُ ؕ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ

نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ

اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۝

جب ان لوگوں کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں، تو جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے، وہ چاہتے ہیں کہ رسول کے ساتھ کچھ مفاہمت Compromise کی صورت نکل آئے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یا تو تم اس

مفاہمت کی کوششیں

قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لاؤ اور یا پھر اس (کے مطالب) میں کچھ ردّ و بدل کر دو (یعنی وہ خدا کے اٹل اور غیر متبدل قوانین کو اپنی منشاء اور مفاد کے مطابق تبدیل کرانا چاہتے ہیں)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں میرا مقصد اس وحی کی پیروی کرنا اور کرانا ہے جو میری طرف نازل ہوتی ہے۔ اگر (بفرضِ محال) میں بھی اپنے نشوونما دینے والے کے احکام سے سرتابی کروں تو اس کا قانونِ مکافات مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں اُس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ (۱۱/۱۱۳؛ ۱۷/۷۵؛ ۶۸/۹؛ ۲۹/۵۱)۔

اگرچہ یہ آیت پہلے لکھی جا چکی ہے، لیکن اس میں دو نکات اس قدر اہم ہیں کہ ان کا دہرانا ضروری نظر آتا ہے۔

(۱) ان مخالفین کا جھگڑا رسولؐ کی ذات سے نہیں تھا، اس کی تعلیم اور دعوت سے تھا جسے رسول پیش کرتا تھا۔ یعنی قرآنی دعوت سے۔ اس لئے وہ اس میں ترمیم و تغیر کی تجویز پیش کرتے تھے۔

(۲) رسولؐ اللہ کا جواب تھا کہ میں اس میں اپنی طرف سے تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ یہ وحی کے من جانب اللہ ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ نیز قرآن کے سوا حضورؐ نے اپنے کسی ارشاد کے متعلق نہیں کہا کہ میں اس میں تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ بلکہ روایات بتاتی ہیں کہ آپؐ نے اپنے کئی فیصلوں میں تبدیلی کی۔ اس سے واضح ہے کہ وحی صرف قرآن کے اندر تھی۔

(۳) حضورؐ صرف وحی کا اتباع کرتے تھے۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اتباعِ رسالت سے مراد اتباعِ قرآن

ہے۔ سنّتِ رسولؐ اتباعِ قرآن کا دوسرا نام ہے۔

(۴) اور آخر میں، خدا کا قانونِ مکافات جس سے رسولؐ بھی نہیں بچ سکتے۔ غور فرمائیے کہ جب رسول خود معصیت کی سزا سے نہیں بچ سکتا تھا، تو وہ معصیت کاروں کو کس طرح بخشوا سکتا ہے؟

معصیتِ رسولؐ واضح رہے کہ رسول اللہ نے جو فرمایا ہے ''اِنْ عَصَيْتُ'' (اگر میں بھی معصیت کا مرتکب ہو جاؤں) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حضورؐ (معاذ اللہ) اپنی معصیت کا اقرار کر رہے تھے۔ آیت کے اس ٹکڑے کا مقصد، قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری کی وضاحت تھی۔ اس کا ترجمہ یوں کیجئے کہ ــــ ''اگر (بفرضِ محال) مجھ سے بھی معصیت کا ارتکاب ہو جائے تو اس کی سزا سے میں بھی نہیں بچ سکوں گا''۔ معصیت کے معنے ہوتے ہیں ''دیدہ دانستہ خدا کے کسی حکم سے سرتابی برتنا''۔ رسولوں سے اس قسم کے جرائم کا ارتکاب نہیں ہوتا تھا۔

اگلی آیت اس دعوے کی دلیل ہے ــــ اور بڑی محکم دلیل۔ فرمایا:

(۱۰/۱۶) قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(یہ لوگ اِس قسم کی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم ان احکام کو اپنی طرف سے وضع کر کے ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہو، اور کہتے یہ ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں) ان سے کہو کہ میں، تم میں کوئی اجنبی نہیں کہ تمہیں معلوم نہ ہو سکے کہ میرا کردار کیسا ہے۔ میں نے اس دعویٰ نبوت سے پہلے، تم میں، ایک عمر بسر کی ہے۔ میری یہ زندگی تمہیں کس بات کی شہادت دیتی ہے؟ کیا اس کی کہ میں جھوٹا اور فریبی ہوں یا یہ کہ میں سچا اور پاکباز انسان ہوں؟ تم اس حقیقت پر غور کرو اور عقل و فکر سے کام لے کر سوچو کہ اگر یہ چیز مشیّتِ خداوندی کے مطابق نہ ہوتی اور خدا تمہاری طرف وحی کا یہ علم نہ بھیجنا چاہتا، تو میں یہ باتیں (اپنے جی سے گھڑ کر) کبھی تمہارے سامنے پیش نہ کرتا۔ کذب و

افترا تو میری روش زندگی کے خلاف ہے۔

وحی کے مدعی کے لیے ایک مسئلہ بڑا مشکل بھی ہوتا تھا اور نہایت نازک بھی۔ وحی خداوندی کا ایک ایسے واسطہ سے جو نہ صرف غیر مرئی اور غیر محسوس تھا، بلکہ ان کے فکر اور قیاس سے بھی بالا' قلب نبوی پر القا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے کسی کو دکھانا تو ایک طرف' سمجھایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ نبیؐ کے مخالفین اس سے اس کا ثبوت طلب کرتے تھے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے' وہ اس کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں' منزل من اللہ ہے۔ وہ اس

اپنی ماضی کی زندگی

کے جواب میں دلائل و براہین پیش کرتا' لیکن وہ (مخالفین) انہیں سننے تک کے لیے بھی تیار نہ ہوتے۔ وہ معجزات طلب کرتے تو رسول یہ کہہ کر ان کے مطالبہ کو مسترد کر دیتا کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں' فوق الفطرت قوتوں کا حامل نہیں ہوں (اس کی تفصیل مطالب الفرقان' جلد اول' صفحہ ۳۰۹ پر گزر چکی ہے) سوچیے کہ اس کے بعد وہ کونسی ممکن العمل صورت ہوسکتی تھی جس سے وہ انہیں مطمئن کراسکتا کہ وہ (معاذ اللہ) جھوٹ نہیں بول رہا' فریب کاری سے کام نہیں لے رہا! اس کے لیے حضورؐ نے ایک ثبوت پیش فرمایا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ میں تم میں اجنبی نہیں ہوں' کہیں باہر سے نہیں آگیا۔ میں نے اس دعویٰ سے پہلے (چالیس سال) کی زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں نے اتنے طویل عرصہ میں کبھی جھوٹ بولا ہو' کبھی فریب کاری سے کام لیا ہو؟ کہو' تم کیا کہتے ہو؟ کسی نے اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ ذرا سوچو کہ جس شخص نے چالیس سال کی عمر تک نہ کبھی جھوٹ بولا' نہ دھوکا دیا' نہ فریب کیا' کیا یہ ممکن ہے کہ وہ راتوں رات اس طرح بدل گیا ہو کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ بولے' ایسا سنگین افترا کرے' اس طرح دھڑلے سے فریب دے!!! کہو' تم کیا کہتے ہو؟

اس پر بھی کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ اگر وہ کچھ کہتے تو اس کا ذکر بھی قرآن میں آجاتا۔

آپؐ نے اپنے دعوے کی صداقت کے حق میں ایسا ثبوت پیش فرمایا جس کا کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

عام معمول ہے کہ جب کوئی شخص شہرت اور عزت' بلکہ عوام کی عقیدت حاصل کرلیتا ہے تو احتیاط برتتا ہے کہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس کی شہرت کو نقصان پہنچے اور عقیدت داغدار ہو جائے۔ لیکن اسے کیریکٹر نہیں کہا جائے گا۔ یہ بزنس (کاروبار) کہلائے گا۔ یہ وہی دیانت اور امانت

ہے جس کے متعلق کاروباری دنیا میں کہا جاتا ہے کہ Honesty is the best Policy اس قسم کا "کیریکٹر" بطور پالیسی اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جس زمانے میں ایک شخص عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو اور ان عیوب و ذمائم سے بچا رہے جو اس کے معاشرہ کا معمول بن چکے ہوں، تو اسے حقیقی کیریکٹر کہا جائے گا۔ حضورؐ نے اپنے اس کیریکٹر کو اپنے دعویٰ کی صداقت کے ثبوت میں پیش فرمایا اور یہی تھا حضورؐ کا وہ سب سے بڑا معجزہ جس نے تمام مخالفین کو لاجواب کر دیا (معجزہ کہتے ہی اسے ہیں جسے دیکھ کر سب لاجواب ہو جائیں)۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لاکھوں اوراق منقوش ہوئے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کا اپنے مخاطبین کے سامنے اپنے زمانہ قبل از نبوت کی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا اور ان کا خاموشی سے اُسے تسلیم کر لینا، ان ہزاروں کتابوں اور لاکھوں صفحات پر بھاری ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ خود خدا نے اسے پیش کرنے کا حکم دیا (قرآن کریم میں جو کچھ حضورؐ کی لسانِ مبارک سے فرمایا گیا ہے وہ وحی پر مبنی تھا، لہٰذا ارشادِ باری تعالیٰ)۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد اول ص۳۲۳ بھی دیکھئے۔

اور اس سے حضورؐ نے انسانوں کے کیریکٹر کے پرکھنے کا محکم معیار تجویز فرما دیا۔ اس سے ہمیں یہ ہدایت دی گئی کہ جب کوئی شخص کسی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے سامنے آئے تو تم اس کے ماضی کو دیکھو کہ وہ کس قسم کا تھا اور اس سے اس کی دیانت و امانت کے متعلق فیصلہ کرو۔ اول تو یہ دیکھو کہ اس کے ماضی کی زندگی بے داغ تھی۔ اگر اس میں کوئی داغ ہوں تو وہ اس کا کھلے بندوں اقرار کرے اور آئندہ ان سے مجتنب رہنے کا وعدہ کرے۔

ہم (بصد آداب) پوچھتے ہیں، سنتِ نبویؐ کا اتباع اور اُسوۂ رسول اللہؐ کی پیروی کے مدعیوں سے کہ کیا وہ (سنتِ رسول اللہؐ کی اتباع میں) اپنی زندگی کے متعلق اس قسم کا دعویٰ اور اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں؟

اسی کا نام کیریکٹر ہے

ہمارے ہاں سیاسی نظام کے سلسلہ میں اس قسم کی بحثیں چلتی رہتی ہیں۔ امیدواروں کی شرائط کیا ہونی چاہئیں اور ووٹ دینے والوں کی خصوصیات کیا؟ اس کے لئے سب سے اہم شرط اور بنیادی خصوصیت یہی ہونی چاہئیے کہ ان کی ماضی کی زندگی کیسی

تھی۔ اُس وقت تو وہ قرآن اٹھا اٹھا کر دعویٰ کریں گے کہ وہ نہایت امین اور صداقت شعار رہیں گے۔ لیکن معیارِ ردّ و قبول اُن کے اُس وقت کے دعوے نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ اُن کا وہ ماضی ہونا چاہیئے جس میں انہوں نے کسی مصلحت یا مفاد پرستی کے خیال کے بغیر حسنِ کردار کا مظاہرہ کیا ہو۔

اس کے بعد اس کا دوسرا رُخ سامنے لایا گیا۔

۱۰/۱۷ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

اس کے بعد تم اس حقیقت پر غور کرو کہ جو شخص اپنے جی سے باتیں گھڑے اور ان کے متعلق کہے کہ وہ خدا کی وحی ہیں، وہ کتنا بڑا مجرم ہوگا! دوسری طرف، وہ شخص بھی کچھ کم مجرم نہیں ہوگا جس کے سامنے خدا کی سچی وحی آئے اور وہ اُسے جھٹلا دے۔

یہ دونوں یکساں مجرم ہیں۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ مجرموں کو اُن کے پروگرام میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتا۔

(لہٰذا، تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو۔ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ اس کے بعد نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ ہم میں سے کون جھوٹا اور مجرم ہے۔ جو ناکام رہا وہ جھوٹا ہوگا)۔ ۶/۱۳۶ (نیز ۶/۱۴۵)۔

تکذیب تکذیب کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحہ ۱۳۶، جلد سوم، صفحہ ۳۳۴ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ خدا کے احکام کی صداقتوں سے انکار کرنے والا (کفر) اور زبان سے اقرار کر کے عملاً ان کے خلاف جانے والا (تکذیب) دونوں برابر کے مجرم ہیں اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ظالم ہی نہیں، اظلم ہیں (ظلم کی تشریح سابقہ جلدوں میں ہو چکی ہے)۔

خدا اور اس کی وحی کی عظمت کا ذکر کرنے کے بعد تصویر کا دوسرا رُخ سامنے لایا گیا۔

۱۰/۱۸ وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَ لَا یَنْفَعُھُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ ھٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ

اللّٰہِ ؕ قُلۡ اَتُنَبِّــُٔوۡنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعۡلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ○

یہ لوگ، خدا کو چھوڑ کر، ایسی چیزوں کو اپنا معبود بناتے ہیں جو نہ انہیں نفع پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ معبود خدا کے ہاں ہماری سفارش کریں گے (گویا ان کے معبود ان کے متعلق خدا کو ایسی باتیں بتائیں گے جن کی بنا پر وہ قابلِ معافی قرار پا جائیں گے)۔ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو، اپنے متعلق، ان کے ذریعے مطلع کرنا چاہتے ہو جن کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ زمین و آسمان میں کسی بات کا علم نہیں رکھتے! خدا اس سے بہت دُور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ذریعہ حقیقتِ حال معلوم کرنے کا محتاج ہو ـــــ وہ ان سے بہت بلند ہے جنہیں تم اس کا شریک قرار دیتے ہو۔

نفع نقصان

نفع اور نقصان کے حقیقی مفہوم اور معیار کے متعلق مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۲۵۰ پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ ان مشرکین کے معبود بُت تھے اور بتوں کے متعلق یہ ظاہر ہے کہ وہ کسی کو کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کے متعلق ان کے پرستاروں کا اپنا عقیدہ ہے جس کی رُو سے وہ انہیں نفع نقصان پہنچانے پر قادر سمجھ لیتے ہیں (پیر پرستی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے)۔ ویسے بھی نفع یا نقصان خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

اس مقام پر ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے خدا کی "عبادت" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت یا اطاعت ہے، پرستش نہیں۔ اسی اعتبار سے خدا کے معبود ہونے سے مراد اس کا حاکم ہونا ہے، پرستیدہ نہیں۔ قرآن میں خدا کی پرستش کا تصور ہی نہیں۔ اس لئے جب عبد اور اس کے مشتقات کے جو الفاظ خدا کے متعلق آئیں گے، ان کا مفہوم خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہوں گے۔

لیکن جب یہ الفاظ غیر مسلموں کے سلسلہ میں آئیں گے، تو چونکہ وہ خدا (یا اپنے دیگر معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں، اس لئے ان الفاظ کے معنی "پرستش" ہوں گے۔ قرآنی الفاظ یا اصطلاحات کے مفہوم میں اس بنیادی فرق کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ (مثلاً زیرِ نظر آیت میں "یَعۡبُدُوۡنَ" کے معنی ـــ

"پرستش کرتے ہیں"۔۔۔ ہوں گے اور معبود کے معنی، جن کی پرستش کی جاتی ہے۔۔ اُس زمانے کی مخاطب قوم کے ہاں تو یہ حیثیت بتوں کی ہوتی تھی، لیکن ہمارے ہاں انسانوں کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ انہیں نفع نقصان پہنچانے پر قادر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے ہاں سفارش کر کے انہیں بخشوا دیں گے۔ یعنی ان کے ہاں جو عقائد بتوں کے متعلق ہیں، ہمارے ہاں انسانوں کے متعلق رائج ہیں۔ اسے ہم میں سے ہر ایک شرک قرار دیتا ہے، لیکن اپنے ہاں کے شرک کو عین اسلام ٹھہرایا جاتا ہے اور اسے شرک قرار دینے والے کے خلاف کفر کے فتوے عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ جب دین، مذہب بن جائے تو اس میں ہر چیز معکوس ہو جاتی ہے۔ اس میں خرد کا نام جنوں رکھ دیا جاتا ہے اور جنوں کا نام خرد!

اس کے بعد بتایا کہ شرک کو اس قدر سنگین جرم کیوں قرار دیا گیا ہے اور توحید کا مفہوم کیا ہے اور اس سے مقصود کیا ہے۔۔ فرمایا:

۱۰/۱۹ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری

(اے رسولؐ!) تمہاری دعوت، جس کی یہ مخالفت کرتے ہیں، اس کے سوا کیا ہے کہ تم نوعِ انسان کے اختلافات مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنانا چاہتے ہو۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام انسان ایک ضابطہ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسی کا نام توحید ہے، جو شرک کی نقیض ہے۔ تمہاری یہ دعوت نہ کوئی نئی دعوت ہے، نہ انہونی بات)۔ نوعِ انسان کی تمدنی زندگی کی تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے دور میں (جب ان کے مفاد میں باہمی تصادم نہیں ہوا تھا) سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے (۲/۲۱۳)۔ اس کے بعد انفرادی مفاد پرستیوں نے ان میں اختلاف پیدا کرنے شروع کر دیئے اور ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے (۲/۳۶)۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم انہیں پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ اختلاف

نہ کرسکتے۔ یا اگر یہ اختلاف کرتے تو ہم اپنی قدرت سے، ان اختلافات کو زبردستی مٹا دیتے۔ لیکن ہم نے اس کے لئے ایک اور قاعدہ مقرر کیا جس سے انسانوں کی آزادی سلب نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے وحی کے ذریعے ایسی تعلیم عطا کی جس سے یہ اختلافات مٹ سکتے تھے (۲/۲۱۳ ؛ ۲/۳۸)۔ مفاد پرست لوگ اس تصور کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن اس سے ہمارا پروگرام رُک نہیں سکتا۔ نوعِ انسان کو آخر الامر ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا ہے)۔

شرک (اور توحید) کے متعلق سابقہ جلدوں میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ یہاں توحید کی غایت بتائی گئی کہ اس سے مقصد نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعے، بکھری ہوئی نوعِ انسانی کو امّتِ واحدہ بنانا چاہتا ہے اور یہاں قرآن پر ایمان رکھنے کی مدعی امت کا یہ حال ہے کہ یہ سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے ــــ نسلوں، قوموں، قومیتوں، مملکتوں، سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کے ٹکڑوں میں ــــ اس سے بڑی تکذیب کی مثال کیا ہوگی؟ قرآن نے اسی لئے اسے شرک کہا ہے (۳۰/۳۱)۔

اس کے بعد قرآن کریم پھر اس تقابل کو سامنے لایا ہے کہ وحیٔ خداوندی کا مقصود کس قدر عظیم اور بلند و بالاتر ہے۔ لیکن ان لوگوں کی توہم پرستیوں کا یہ عالم ہے کہ یہ رسولؐ سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں ــــ

(۱۰/۲۰) وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ۝

معجزات طلبی

اور یہ لوگ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ اس رسول کو اس کے رب کی طرف سے کوئی ایسا آسمانی نشان کیوں نہیں ملتا جسے دیکھ کر ہم سمجھ لیں کہ یہ واقعی خدا کا رسولؐ ہے۔

اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں ایک نظامِ زندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں، جس کے وہ نتائج جو ابھی تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں، خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہو کر رہیں گے۔ لیکن اس کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا۔ لہٰذا تم اُس

وقت کا انتظار کرو جب اس کے محسوس نتائج تمہارے سامنے آجائیں. میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں. وہی نتائج میری صداقت کے "آسمانی نشان" ہوں گے.

لیکن یہ اوہام پرستی اور اعجوبہ پسندی جاہلیّتِ عرب تک ہی محدود نہ تھی. ہم اس باب میں اُن سے بھی دس قدم آگے ہیں. ہم "کرامات" میں جس قدر کشش محسوس کرتے ہیں، قرآنی حقائق کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آتا. کرامات تو پھر بھی نظر آجانے والے مظاہر ہوتے ہیں، ہم تو قبروں تک کی بھی پرستش کرتے ہیں. عرب جاہلیّت کی تاریخ میں قبر پرستی کا کہیں سراغ نہیں ملتا (معجزات اور کرامات کے متعلق انڈکس دیکھئے اور ان کی حقیقت کے لئے میری کتاب "تصوّف کی حقیقت"). سابقہ صفحات میں آیت (۱۰/۱۶) کے تحت بھی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے).

یہ جو کہا گیا ہے کہ "تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں"، تو یہ بات قرآن میں مختلف مقامات پر آئی ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ مہلت کا بنیادی نکتہ ہے. (انڈکس میں "مکافاتِ عمل"، "قانونِ مکافات" اور "قانونِ مہلت" دیکھئے).

لیکن ان کی عجلت پسندی انہیں اس قدر انتظار کہاں کرنے دے گی ——

۱۰/۲۱ وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیْۤ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝

لیکن یہ لوگ اتنا انتظار کہاں کریں گے. انسان کی عجلت پسندی کا یہ عالم ہے کہ جب اسے ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں چلا چلا کر پکارنے لگتا ہے (۱۰/۱۲). لیکن جب اس کے بعد اسے راحت نصیب ہوتی ہے تو ہمارے قوانین سے اعراض برتنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیتا ہے.

تم ان سے کہہ دو کہ اللہ کا قانون تدبیر سازی میں تم سے بھی تیز واقع ہوا ہے. اس مقصد کے لئے اس کی مقرر کردہ قوتیں، تمہاری ہر ایک تدبیر کو ریکارڈ کرتی رہتی ہیں (اس

لئے تمہاری تدابیر خدا کے سامنے ہیں اور اس کی گرفت سے باہر نہیں جاسکتیں (۴۲/۸۰))۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا:۔

۲۲-۲۳/۱۰ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ○ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم ۖ مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○

تلوّن مزاجی

لوگوں کی اس عجلت پسندی اور تلوّن مزاجی کا تماشا دیکھنا ہو تو حالتِ سفر میں دیکھو۔ ان کا سفر خشکی اور تری دونوں میں ہوتا ہے۔ جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور ہوا موافق ہوتی ہے تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جب بادِ مخالف کا تُند و تیز جھکڑ انہیں آلیتا ہے اور سمندر کی موجیں چاروں طرف سے تلاطم خیز ہو کر چڑھ آتی ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم ہلاکت میں گھر گئے، تو یہ اللہ کو اس طرح پکارنے لگتے ہیں گویا اس کے احکام و قوانین کے مخلص اطاعت گزار یہی ہیں، اور اس کے حضور گڑ گڑا

کر دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو ہمیں اس ہجومِ بلا سے نجات دلادے تو ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیرے شکر گزار رہیں گے (۲۲)۔

لیکن جب انہیں اس مصیبت سے نجات مل جاتی ہے' تو خدا اور اس کے احکام سب نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں اور یہ ملک میں ناحق سرکشی اور فساد پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔

اے رسولؐ! تم نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ اگر تم قوانینِ خداوندی سے سرکشی اور بغاوت اختیار کرو گے تو یہ' درحقیقت' خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف بغاوت ہوگی۔ اس سے تمہیں' اس طبیعی زندگی کے کچھ مفاد حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن زندگی تمہارے جسم کی طبیعی زندگی ہی تو نہیں۔ اصل حیات' انسانیت (انسانی ذات) کی زندگی ہے' جس کے لئے ہماری طرف سے الگ قوانین مقرر ہیں۔ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ ان قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ ان سب کا مجموعی نتیجہ بالآخر تمہارے سامنے آکر رہے گا۔ (۲۳)

اس میں پھر اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ بے لوث اطاعتِ خداوندی سے کیا مفہوم ہے اور مفاد پرستانہ اطاعت کا مطلب کیا۔

بغاوت بغیر الحق

اس کے بعد دو مزید نکات غور طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ بغاوت بغیر الحق جرم ہے۔ الحق' قرآن ہے' لہٰذا' الحق کے خلاف بغاوت کے معنی ہیں اس نظام یا قانون کے خلاف سرکشی۔ یہ جائز ہی نہیں' بلکہ (حالات کے مطابق) ایسی بغاوت فرو کرنا جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کا نظام ظلم و استبداد پر مبنی ہوگا' اور ظلم و استبداد کا مٹانا اس جماعت کے فرائض میں داخل ہے۔ واضح رہے کہ ان امور کا فیصلہ اسلامی مملکت کرے گی' افراد نہیں۔

دوسری بات یہ کہی کہ جو شخص الحق کے خلاف سرکشی برتے گا وہ درحقیقت اپنی ذات کے خلاف سرکشی اختیار کرے گا۔ قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ جرم کرنے والا اپنی ذات کے خلاف جرم کرتا ہے۔ ظالم خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔

بات واضح ہے۔ حق کی اطاعت سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس لئے ہر وہ عمل جو حق کے خلاف ہوگا' اس سے انسانی ذات کی نشوونما رک جائے گی۔ جو شخص ڈاکٹر کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتا ہے' وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ اس مقام پر مجھے ہمیشہ نیٹشے کا وہ بصیرت افروز مقولہ یاد آجاتا ہے جسے

ہیں نے (شاید اس سے پہلے بھی درج کیا ہے. اس نے کہا ہے؛

"جو زیادتی تم نے میرے خلاف کی ہے اسے تو میں معاف کردوں گا. لیکن اس سے جو زیادتی تم نے اپنے خلاف کی ہے اُسے کون معاف کرے گا؟"

ان امور کی تفصیل قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت ملے گی جسے مطالب الفرقان[1] میں شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے. کیونکہ وہ دین کی اساس ہے. اسی طرح "دنیا اور دین" اور "دنیا اور آخرت" کے تقابل پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے (انڈکس کی مدد سے یہ تمام مقامات سامنے آجائیں گے).

اس کے بعد اس دنیاوی زندگی کا تذکرہ ہے جو اقدارِ خداوندی (وحی) کو نظرانداز کرکے بسر کی جائے؛

۱۰/۲۴ إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ۗ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتٰىهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ۚ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

صرف دُنیاوی زندگی

اس دنیاوی (طبیعی) زندگی کی مثال یوں سمجھو جیسے ہم نے بادلوں سے مینہ برسایا اور زمین کی روئیدگی جو انسانوں کے لئے خوراک اور مویشیوں کے لئے چارا کا کام دیتی ہے (۲۰/۵۴؛ ۳۲/۲۷) اس سے مل کر (بڑھی، پھولی اور اس کی شگفتگی اور شادابی کا یہ عالم ہو گیا گویا) زمین نے رنگارنگ پھولوں کے گہنے پہن رکھے ہیں اور تزئین و آرائش سے دلہن بن گئی ہے اور

[1] جلد اوّل صفحہ ۴۶ تا ۵۲، جلد دوم صفحہ ۱۵۵، ۲۳۰، جلد سوم صفحہ ۲۹۲۔

کھیتی والوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب تمام فصلیں ہمارے قبضے میں آچکی ہیں کہ اتنے میں رات یا دن کے کسی حصے میں، ہمارے قانون کی ایک گردش آئی تو اس سے وہ لہلہاتی فصلیں، یوں کٹے ہوئے کھیت کی طرح ہوگئیں، گویا کل ان کا یہاں نام و نشان تک بھی نہ تھا۔ ہم (اس قسم کی مثالوں سے) اپنے قوانین کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو غور و فکر سے کام لیں (۱۰/۲۴-۵۷)۔

یہاں پھر اس نکتہ پر غور کیجئے کہ قرآن کریم نے بات نہایت مفصل بیان کی ہے۔ لیکن اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو غور و فکر سے کام لیں گے۔ قرآن نے جو کتاب کے ساتھ حکمت کو چسپاں کیا ہے تو اس سے مراد ہی یہ ہے کہ قرآنی احکام و قوانین کو غور و فکر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دین اپنے مخاطب کو دلیل و برہان Reason کی رُو سے مطمئن کر کے، اسے تسلیم کرنے یا اس کی اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مذہب میں فکری اطمینان کا مطالبہ کرنا، جرم قرار پا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے تھیاکریسی اور ملوکیت یا آمریت، ایک ہی سطح پر ہوتی ہیں۔ دونوں میں عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مسلوب کر کے، اطاعت ڈنڈے کے زور سے کرائی جاتی ہے۔

اس کے بعد دونوں راستوں کا تقابل سامنے لایا گیا:۔

(۱۰/۲۵-۲۶) وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(لہٰذا) جو لوگ صرف دنیوی مفاد کو اپنا نصب العین بنالیں اور مستقبل کی کوئی فکر نہ کریں، ان کی روش وقتی خوشنمائیوں، لیکن آخرالامر تباہیوں کی موجب ہوتی ہے۔ اس

کے برعکس) وہ روش ہے جس کی طرف خدا دعوت دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہر قسم کی تباہی سے سلامتی اور بربادی سے عافیت ہوتا ہے۔ یہ ہے کامیابیوں کی وہ توازن بدوش راہ جس کی طرف خدا کا قانون ہر اُس شخص کی راہنمائی کرتا ہے جو اس سے راہنمائی حاصل کرنا چاہے (۲۵)۔ جو لوگ اس روش کو اختیار کرکے حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، اس کا نتیجہ اتنا ہی نہیں ہوتا کہ ان کی اپنی زندگی حسین ہو جاتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ ان کا معاشرہ ذلّت و رسوائی کے کرب انگیز عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور ایک ایسی جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ (۱۰/۳۰ ؛ ۱۶/۶۰ ؛ ۵۵/۶۰ ؛ ۴۲/۹ ؛ ۸۹/۲۷ ؛ ۳۵/۵۰ ؛ ۳۶/۱۱)۔

اس کے برعکس؛

۱۰/۲۷ وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

اس کے برعکس، جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والی روش اختیار کرتے ہیں تو اس قسم کی ناہمواریاں خود ان کی اپنی ذات میں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس طرح ان کا توازن بگڑ جاتا ہے اور ان کا معاشرہ بھی ذلیل اور رُوسیاہ ہو جاتا ہے۔ انہیں، اس رُسوا کن عذاب سے جو قانونِ خداوندی کی رُو سے واقع ہوتا ہے، کوئی نہیں بچا سکتا۔ ان کی رُوسیاہی کا یہ عالم ہوتا ہے گویا کسی نے رات کی تاریکی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کا نقاب ان کے چہرے پر اوڑھا دیا ہو۔ ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے جس میں یہ ہمیشہ رہتے ہیں۔

سزا مطابق جرم

اس آیت میں عدالتی انصاف کے ایک اہم اصول کو سامنے لایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جرم کی سزا جرم

کے مطابق ہونی چاہیئے' اس سے زیادہ نہیں (اس سورت میں سَیِّئَاتِ اور سَیِّئَۃٍ کو جرم کے معنوں میں لیا جائے گا)۔ جرم اور سزا کے فلسفہ کے متعلق مطالب الفرقان' جلد سوم صـــ۱۷۱ پر تفصیلی بحث کی جاچکی ہے (نیز دیگر مقامات پر جن سے انڈکس کی مدد سے' مستفید ہوا جا سکتا ہے)۔

لیکن اس کا ایک مفہوم فقہ کی رُو سے بھی لیا جاتا ہے۔ اسے ہم نے مطالب الفرقان' جلد پنجم صـــ۱۴۸ پر بیان کیا ہے۔ وہاں تو ہم نے اُسے بصد دلِ نخواستہ لکھ دیا ہے، لیکن وہ اس قدر شرمناک ہے کہ اسے دہرانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ قارئین وہیں دیکھ لیں۔

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر' جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کے مابین مکالمات کا ذکر کیا ہے۔ (مطالب الفرقان' جلد چہارم صـــ۵۴۹' (۲۸/۶۳) نیز (۳۳/۶۸))، نیز مختلف قوموں کے درمیان مکالمات (۷/۳۸)' (جلد پنجم صفحہ ۱۹۳)۔

اگلی آیت میں اس قسم کا ایک منظر سامنے لایا گیا ہے:

(۱۰ / ۲۸ - ۲۹) وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ○ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ○

جہنم میں مکالمہ

جب ہم ان سب کو یکجا اکٹھا کریں گے تو جو لوگ شرک کرتے تھے ان سے کہیں گے کہ تم اور جنہیں تم ہمارے شریک ٹھہراتے تھے' اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو۔ پھر انہیں الگ الگ کر دیا جائے گا۔ اس پر جن ہستیوں کو وہ خدا کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے ان سے کہیں گے کہ یہ غلط ہے کہ تم ہمارے کہنے پر ہماری پرستش کیا کرتے تھے۔ (۲۸)

اس حقیقت پر خدا شاہد ہے ـــــــ اور اس کی شہادت ہمارے اور تمہارے دعوے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے ـــــــ کہ ہمیں اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ تم ہماری پرستش کرتے تھے (چہ جائیکہ ہم نے تم سے کہا ہو کہ تم ہماری پرستش کرو) (۲۹)۔

اس سلسلہ میں (انڈکس میں) عنوانات "مکافاتِ عمل"، "تقلید" بھی دیکھئے۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی جب کہا:۔

(۱۰/۳۰) هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ع

غرضیکہ جو کچھ کسی انسان نے پہلے کیا ہوگا، وہ اُس وقت نکھر کر سامنے آجائے گا اور تمام اعمال، خدا کے قانونِ مکافات کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ وہی اس حقیقی میزان کا مالک اور سرپرست ہے۔ اور جو کچھ لوگ اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کیا کرتے تھے، وہ سب رائیگاں جائے گا (یعنی اس کا وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جو ان کے ذہن میں تھا۔ عمل وہی نتیجہ خیز ہوتا ہے جو خدا کے قانون کے مطابق کیا جائے)۔

آیت میں تَبْلُوْا کا لفظ قانونِ مکافاتِ عمل کے اساسی گوشے کی وضاحت کرتا ہے۔ اس مادہ (ب۔ل۔و) کے معنی ہوتے ہیں پوشیدہ بات کا ظاہر ہو جانا (دیکھئے لغات القرآن)۔ قرآن کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے لیکن وہ نمودار ہوتا ہے کچھ وقت کے بعد (اسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے جس کے متعلق پہلے گفتگو کی جا چکی ہے)۔ قیامت اس مرحلہ Stage کا نام ہے جب انسان کے اعمال کے نتائج نکھر کر سامنے آجائیں، خواہ وہ اس دنیا میں ہو اور خواہ اُخروی زندگی میں۔ اسی کو دوسری جگہ "رازوں کا بے نقاب ہونا" بھی کہا گیا ہے۔ سورۃ الطارق میں ہے: يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔ ہمارے نزدیک

سب راز بے نقاب

اس سے شدید عذاب کچھ اور ہو نہیں سکتا کہ انسان کی وہ (حقیقی) سیرت و کردار جسے اس نے لوگوں سے

چھپا کر رکھا تھا انہی لوگوں کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔ یہ ہے جہنم کی وہ آگ جس کے شعلے (قرآن کے الفاظ میں) دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں (۱۰۴/۷)۔ آیت کے آخر میں، مَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ نے ان رازوں کی نوعیت کا افشا کر دیا جنہیں انہوں نے لوگوں سے چھپا رکھا تھا۔ اِفْتِرَآءٌ کہتے ہیں کسی بات کو خود وضع کرنا (تراشنا) اور اسے دوسروں کے سر تھوپ دینا، لوگوں کی طرف عجیب عجیب (خود وضع کردہ) باتیں منسوب کر دینا، یعنی یہ مشہور کرنا کہ وہ احکامات خداوندی ہیں۔ مذہبی پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں۔ اِفْتِرَآءٌ میں یہ سب کچھ آجاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جس دن اُن کے اِن اعمال پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے تو کیسے کیسے "مقدس چہرے" بے نقاب ہو کر سامنے آئیں گے!

خدا کے قانون کی بات چلی تو اس کی ہمہ گیری اور محکمیت کی طرف توجہ دلائی گئی:-

۱۰/۳۱ قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

اے رسولؐ! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو زمین و آسمان کی بخشائشوں کے ذریعے تمہارے لئے سامانِ زیست عطا کرتا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضے میں تمہارے ذرائع علم مثلِ سماعت و بصارت ہیں؟ وہ کون ہے جو غیر ذی حیات اشیاء سے زندگی کی نمود کرتا ہے اور زندہ چیزوں سے مردہ اشیاء نکالتا رہتا ہے؟ (مختصراً) وہ کون ہے جو اس تمام کائنات کے نظم و نسق کو چلا رہا ہے؟ (تم دیکھو گے کہ اس کے جواب میں) وہ کہہ دیں گے کہ وہ اللہ ہے۔ تم ان سے کہو کہ (جب تمہیں اس کا اعتراف ہے کہ ساری کائنات میں خدا کا قانون جاری و ساری ہے تو اپنے معاشرے میں اس کے قوانین کی نگہداشت

کیوں نہیں کرتے ؟ (تم ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا قانون کارفرما ہے لیکن تمہاری معاشرتی زندگی اس کے حدودِ مملکت سے باہر ہے۔ اس میں اس کا قانون نہیں چلتا۔ یہ تصور یکسر باطل ہے۔ یہ ذات جو الٰہُ السّمآء ہے (یعنی خارجی کائنات میں جس کا اقتدار و اختیار ہے) وہی الٰہُ الارض ہے (یعنی انسانوں کی معاشرتی و معاشی زندگی بھی اسی کے قانون کے تابع رہنی چاہیئے)۔ (۶/۳)؛ ۵۱-۱۶/۵۰؛ ۲۲-۲۱/۲۱؛ ۲۳/۸۴-۸۷؛ ۹/۴۳؛ ۸۹-۲۳/۸۴؛ ۳۹/۳۸)۔

الٰہُ الارض و الٰہُ السّمآء

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ کائنات کو کس نے بنایا اور کون اس کے نظم و نسق کو اپنے کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے، تو یہ کہیں گے کہ اللہ ہی نے ایسا ہی کیا ہے اور وہی ایسا کر رہا ہے (حوالہ کے لئے خصوصیت سے ان آیات کو دیکھئے : (۶۳-۲۹/۶۱؛ ۳۱/۲۵؛ ۴۳/۹)۔ عرب میں اس زمانے میں یہود و نصاریٰ بستے تھے۔ وہ تو خدا کو مانتے ہی تھے لیکن ایامِ جاہلیت (زمانہ قبل از اسلام) میں خود عرب بھی اللہ کو مانتے تھے۔ علاوہ دیگر شہادات کے، خود ان کے نام اس پر شاہد ہیں (حضورؐ کے والدِ ماجد کا نام عبداللہ تھا)۔

لیکن وہ کائنات کی تخلیق اور تنظیم کی حد تک خدا کا اقتدار تسلیم کرتے۔ انسانی دنیا میں اس کے اقتدار کو نہیں مانتے تھے، یعنی وہ خدا کی اُس وحی کو نہیں مانتے تھے جو انسانی معاملات کو نظم و ضبط میں رکھتی ہے۔ خدا کو ماننے کا اصلی مقصد تو یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے ایمان باللہ کو ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک تم قرآن کو ضابطۂ حیات نہ مانو خدا پر ایمان کا دعویٰ بے معنی ہے۔

سیکولرازم میں خدا پرستی

اس قسم کا خدا پر ایمان دورِ حاضر کے مغربی سائنسدانوں کا ہے۔ ان میں سے بیشتر خدا کو مانتے ہیں لیکن صرف کائناتی خدا کو انسانی دنیا میں وہ سیکولرازم کے قائل ہیں۔ وہ پھر بھی کائناتی خدا کو علی وجہ البصیرت مانتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ کائناتی خدا کو محض عقیدۃً مانتے ہیں اور انسانی معاملات میں کتاب اللہ کی حکمرانی کے عملاً منکر ہیں۔ معلوم نہیں خدا پر اس قسم کے ایمان کا کیا نام رکھا جائے گا؟

اگلی آیت میں بات واضح کر دی کہ :۔

۱۰/۳۲ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ ۖ فَأَنّٰى تُصْرَفُونَ ۝

یہ ہے تمہارا حقیقی نشوونما دینے والا (جو خارجی کائنات کی نشوونما کا بھی ذمہ دار ہے اور انسانی دنیا کی نشوونما کا بھی۔ (خدا ہونا اسی کو زیب دیتا ہے)۔ اب سوچو کہ اس قسم کے خدا کے قوانین سے انکار کرنے کا نتیجہ گمراہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان سے پوچھو کہ اس خدا کو چھوڑ کر تم اپنا رُخ کس طرف کرنا چاہتے ہو؟

ذاتِ خداوندی کی کُنہ و حقیقت، انسانی علم و ادراک تو ایک طرف، اس کے وہم و قیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ سوال یہ ہے کہ جس خدا کی یہ کیفیت ہو، اس پر ایمان کی دعوت اور مطالبہ کے کیا معنی ہیں؟ یعنی انسان کس خدا پر ایمان لائے؟ اگر خدا کو اسی طرح "غیر متعین" چھوڑ دیا جائے تو ہر شخص اپنے اپنے ذہن اور تصور کے تراشیدہ خدا پر ایمان لائے گا۔ اس سے نہ وحدتِ فکر پیدا ہو سکے گی، نہ وحدتِ عمل، نہ وحدتِ نظام نہ وحدتِ انسانیت۔ اس کا نتیجہ تشتت و انتشار کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کے متعلق تو یہی کہا ہے کہ جو کچھ تم اپنے ذہن سے اس کے متعلق کہو، وہ اس سے بلند و بالا ہے (۲۳/۹۱)۔ لیکن اس نے اپنی صفات اس تفصیل اور جامعیت سے بیان کر دیں کہ ان کی رُو سے خدائے واحد پر ایمان لانا، ناممکن تو ایک طرف، مشکل بھی نہ رہا۔ اب خدا پر ایمان کے معنی ہوں گے، اُن صفات کی حامل ذات پر ایمان جس کی وہ صفات ہیں۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان، جلد سوم (ص ۲۲۳) میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر، صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ" **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ**

یہ ہے تمہارا اللہ (حوالوں کے لئے ۶/۱۰۲؛ ۳۵/۱۳؛ ۳۹/۶؛ ۴۲/۱۰)۔

میں نے اپنی کتاب "من و یزداں" میں قرآن میں بیان کردہ تمام صفاتِ خداوندی کے تذکرہ کے بعد آخری باب کا عنوان دیا ہے:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

یہ ہے تمہارا اللہ

جہاں تک میری نگاہ میری یاوری کرتی ہے، دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں متعین طور پر یہ نہیں کہا گیا کہ ـــ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ. جب خود خدا نے اپنے متعلق متعین طور پر یہ کہہ دیا تو پھر اسی ایمان کو خدا پر ایمان کہا جاسکے گا جو قرآن میں بیان کردہ صفات کا حامل ہے. ان صفات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل یا کمی بیشی، الحاد (خدا کا انکار) کہلائے گا. اگلی آیت میں یہی کہا گیا ہے:

١٠/٣٣ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

(اگر یہ لوگ اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی، قانونِ خداوندی پر ایمان نہیں لاتے، تو سمجھ لو کہ) ان کے بارے میں تمہارے خدا کا یہ قانون صادق آگیا کہ جو لوگ صحیح راستہ چھوڑ کر اس طرح اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں، وہ خدا کے قانون پر ایمان نہیں لایا کرتے.

صفاتِ خداوندی کے اقسام

ان صفاتِ خداوندی میں حک و اضافہ یا تغیر و تبدل تو ایک طرف، ان میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا. واضح رہے کہ خدا کی کچھ صفات تو ایسی ہیں جو کاملۃً اس کے لئے مختص ہیں (مثلاً) وہ اوّل ہے، وہ آخر ہے یا ـــ وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے. وقس علی ذٰلك. ظاہر ہے کہ ان صفات میں کسی اور کے شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا. لیکن بعض صفات ایسی ہیں جو انسان کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں ـــ (مثلاً) خدا علیم ہے، تو انسان بھی علم حاصل کر سکتا ہے. ان صفات میں صورت یہ ہے کہ جب ایسی صفت، خدا کے لئے ہوگی تو وہ لا انتہا بھی ہوگی اور بغیر کسی ذریعے یا واسطہ کے ہوگی. لیکن انسان میں وہ صفت حدِ بشریت کے اندر ہوگی. لا انتہا ہوگی نہ ذرائع اور وساطت سے بے نیاز. خدا کا علم لا انتہا ہے اور کسی کے ذریعے سے حاصل کردہ نہیں. انسان کا علم محدود ہوتا ہے اور مختلف ذرائع سے حاصل کردہ.

جو صفات خدا کے لئے مختص ہیں، ان میں کسی اور کو شریک سمجھنا یا دیگر صفات کو انسانوں میں (خدا کی طرح) لا انتہا سمجھنا شرک ہے. اگلی آیت میں اس شرک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

١٠/٣٤ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ

یُعِیۡدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ فَاَنّٰی تُؤۡفَكُوۡنَ ○

ان سے پوچھو کہ جن ہستیوں کو تم خدا کا شریک سمجھتے ہو' ان میں کوئی ایسی ہستی بھی ہے جو کسی شے کی تخلیق کی ابتداء کر سکے اور اس کے بعد اسے مختلف مراحل میں سے گردش دیتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرائی چلی جائے؟ ان سے کہو کہ ایسا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ صرف قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے۔ وہ تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور مخلوق اشیاء کو' مختلف ادوار میں گردش دیتا ہوا' ان کے نقطۂ تکمیل تک لئے جاتا ہے۔ سو جب حقیقت یہ ہے تو پھر تمہارے الٹے خیالات تمہیں کس طرف لئے جا رہے ہیں؟

یہاں تک کائناتی خدا کا ذکر تھا۔ اُس کے بعد اس خدا کا ذکر آیا جس کا تعلق عالمِ انسانیت سے ہے اور یہ تعلق اُن قوانین کی رُو سے قائم ہوتا ہے جو اُس نے بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔ جس طرح کائناتی قوانین (قوانینِ فطرت) خدا اور صرف خدا کے متعین کردہ ہیں' اسی طرح انسانی راہنمائی کے لئے قوانین بھی اسی کے عطا فرمودہ ہیں۔ اس راہنمائی میں بھی کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔

۱۰/۳۵ قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآئِكُمۡ مَّنۡ یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ یَهۡدِیۡ لِلۡحَقِّ ؕ اَفَمَنۡ یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ اَحَقُّ اَنۡ یُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا یَهِدِّیۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّهۡدٰی ۚ فَمَا لَكُمۡ ۟ كَیۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ○

ان سے پوچھو کہ کیا ان غیر خدائی قوتوں میں سے' جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو' کوئی قوت بھی ایسی ہے جو تمہاری راہنمائی کسی ایسے پروگرام کی طرف کر دے جو مبنی بر حقیقت ہو اور ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے کی ذمہ دار! ان سے کہو کہ اس قسم کی راہ نمائی

صرف قانونِ خداوندی کی رُو سے مل سکتی ہے۔

ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر بتاؤ کہ کیا وہ قانون جو اس قسم کی راہ نمائی عطا کرے' اس کا مستحق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے یا وہ ہستیاں جو خود اپنی راہنمائی کے لئے بھی دوسروں کی محتاج ہوں؟

ان سے کہو کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسے واضح حقائق کے بعد بھی' تم غلط فیصلے کرتے ہو!

اس کے بعد ہدایتِ خداوندی اور انسانی فکر کی تراشیدہ راہنمائی کے تقابل سے بتایا کہ مبنی بر حق صرف ہدایت خداوندی ہے. انسانی علم اور اس پر مبنی ہدایت' حق نہیں ظن ہے اور ظن حق کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا.

۱۰/۳۶ وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝

اصل یہ ہے کہ ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جن کے پاس حقیقت کا یقینی علم کچھ نہیں' اور وہ محض ظن و قیاس کے پیچھے چلتے رہتے ہیں' حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ظن و قیاس' حق و یقین کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ کام دے سکتا ہے جو یقینی علم دیتا ہے. جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں وہ خدا کے علم میں ہے (وہ جانتا ہے کہ یہ کس طرح محض قیاسات کے پیچھے چلتے ہیں)۔

اس آیت میں قرآنِ کریم نے دین کی اصل واساس چند لفظوں میں بیان کر دی ہے. اس نے

حق اور ظن کا تقابل

کہا ہے کہ حق کا اتباع دین ہے اور ظن و قیاس کا اتباع دین کی ضد. ظن حق کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا. حق کے معانی اور مفہوم' سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں (انڈکس دیکھئے) یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ حق

کے معنی ہیں، یقینی بات، یعنی جس بات کے یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں ظن ہے، یعنی جس کے متعلق یقین نہ ہو۔

دنیا کے کسی مذہب کے پیرو اس کا دعویٰ ہی نہیں کرتے کہ جس کتاب کو وہ اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں، وہ یقینی طور پر حرفاً حرفاً وہی ہے جسے ان کے نبی نے انہیں دیا تھا۔ اگر (بفرضِ محال) کوئی ایسا دعویٰ کرے بھی تو خود ان کی تاریخ اس دعوے کی تردید کر دیتی ہے (تفصیل ان امور کی میری کتاب "مذاہب عالم کی مبیّنہ آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔ لہٰذا' وہ سب ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے الحق خود قرآن ہے اور قرآن کے متعلق قرآن نازل کرنے والے کا یہ دعویٰ ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) "یہ یقینی بات ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ مسلمان ہونے کے لئے اس دعویٰ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لہٰذا' مسلمان کا دعوٰی یہ ہے کہ وہ جس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ یقینی طور پر مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ اور محفوظ ہے۔

لیکن یہ ان کا زبانی دعویٰ ہی ہے۔ عملاً وہ بھی جن امور کی پیروی کرتے ہیں' وہ ظن ہیں۔ وہ حدیث کی پیروی کرتے ہیں یا فقہ کی اور یہ دونوں ظن ہیں۔

احادیث کس طرح جمع اور مدوّن ہوئی تھیں' اسے تفصیلی طور پر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحات ۳۴۳ (الآخر) میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث کے دیگر گوشوں کے متعلق انڈکس دیکھا جا سکتا ہے۔ حدیث کے متعلق اس طول طویل بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حدیث کو دین ماننے والوں میں سے کوئی کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ لفظاً لفظاً قولِ رسولؐ ہے۔ ان کی صورت یہ ہے کہ جب وہ کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں قال رسولُ اللّٰہ (رسول اللہ نے فرمایا) اس کے بعد اس حدیث کو نقل کرتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں ـــــ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (یوں یا جس طرح رسولؐ اللہ نے فرمایا ہو)۔ اس سے واضح ہے کہ وہ کسی حدیث کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہتے کہ وہ قولِ رسولؐ ہی ہے۔ لہٰذا' احادیث تمام کی تمام ظنّی ہیں۔

احادیث

احادیث کی اصل و حقیقت تو یہ ہے، لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں۔ بلکہ حدیث قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے[1]۔ قرآن کا

([1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

دعویٰ یہ ہے کہ حق کے مقابلہ میں ظن کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ظن، حق کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کا عمل بھی اس پر ہے۔

حدیث کے بعد فقہ کی باری آتی ہے۔ صدرِ اوّل میں جب تک اسلامی مملکت قائم رہی، اتباع صرف حق (قرآن کریم) کا تھا۔ مملکت جس کے سربراہِ اوّل، نبی اکرمؐ تھے، قرآنی احکام نافذ کرنے کا ذریعہ تھی۔ قرآن نے جن احکام کی تفصیل خود نہیں دی تھی، ان کی تفاصیل، امّت کے باہمی مشورے سے طے پاتی تھیں اور مملکت کی طرف سے نافذ ہوتی تھیں۔ لہٰذا، اُس دَور میں نہ حدیث کے اتباع کا سوال پیدا ہوا تھا، نہ فقہ وجود میں آئی تھی۔

فقہ جب قرآنی نظامِ حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی تو دین باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس کی تاریخ کے اس پورے دَور میں (یعنی اُس زمانے سے لے کر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں، لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔ ملوکیت نے سب سے پہلے ثنویت کی طرح ڈالی، یعنی امورِ مملکت (جنہیں موجودہ دَور میں اصطلاح میں پبلک لاز کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین اربابِ مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ امورِ مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اس تاثر کو علماء کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ ان بادشاہوں کے حق میں محراب و منبر سے أَيَّدَ اللّٰهُ بِنَصْرِهٖ اور خَلَّدَ اللّٰهُ مُلْكَهٗ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْأَرْضِ "زمین پر خدا کا سایہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امورِ مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتوے سے لگایئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب ہدایہ اولین مجیدی، صفحہ ۴۹۳ میں ان الفاظ میں درج ہے:

كل شيء صنعه الإمام الذي ليس فوقه امام فلا حد
عليه إلا القصاص

یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے، سربراہِ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا بجز قصاص

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) تفصیل کے لئے دیکھئے، طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث"۔

کے۔ یعنی سربراہِ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے،

اَئمہءِ فُقہاء

چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی اس لئے مختلف فقہاء نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امتِ واحدہ فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہاء کی تعداد تو بہت زیادہ تھی، لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی

(۱) امامِ اعظمؒ (کوفی)............ پیدائش ۸۰ھ، وفات ۱۵۰ھ

(۲) امام مالکؒ (یمنی، مدنی)............ پیدائش ۹۳ھ، وفات ۱۷۹ھ

(۳) امام شافعیؒ (عسقلانی، مکی)............ پیدائش ۱۵۰ھ، وفات ۲۰۴ھ

(۴) امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی)............ پیدائش ۱۶۴ھ، وفات ۲۴۱ھ

(اہلِ تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے)۔

شروع شروع میں تو ان ائمہءِ فقہاء کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں۔ نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حک و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے مخالف ہو جس کا فتوےٰ اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہر وہ آیت جو اس طریقہ کی مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مئوّل ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مئوّل ہے یا منسوخ[1]۔

یہی نہیں کہ فقہ کو قرآن کا ناسخ قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے متعلق ایسا عقیدہ وضع کیا گیا جس سے اسے الُوہیت کا مقام دے دیا۔

قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدّل ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دینے کے مترادف ہوگا۔ قرآنِ کریم نے سابقہ اہلِ کتاب کے خلاف جو اعتراض کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی، مؤلفہ علامہ محمد الخضری کا اردو ترجمہ "تاریخ فقہ اسلامی"۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ صفحہ ۴۲۱۔

دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱) کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دیتے تھے' تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآنِ کریم نے امت میں فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۳۰/۳۱)۔ فرقے کا وجود اس عقیدے پر قائم ہوتا ہے کہ اس کے متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے عقائد و احکام کو منفرد' ابدی اور غیر متبدّل سمجھتے ہیں۔ کچھ عرصہ اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال اُبھرا کہ مروّجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے ایک حنفی مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا:

فقہ غیر متبدّل

> "یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی' دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اس کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے........ لہٰذا اگر تحقیقات اسلامی سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دَور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردُود ہے۔ اس پر امّتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔"
>
> (بحوالہ ایشیا' ۱۴ اگست ۱۹۶۸ء)

یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آرہا ہے' حالانکہ جن ائمہ نے فقہ مدوّن کی تھی' نہ ان کا یہ عقیدہ تھا نہ ان کا یہ منشاء۔ فقہ میں امامِ اعظمؒ (ابو حنیفہؒ) کو جو مقام حاصل ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے متعلق خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

> "نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابو حنیفہ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس سے پوچھا "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا "ہاں"۔ اس پر امامؒ نے فرمایا "خیال رکھنا! تم بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جارہے ہو۔" (خطیب ج ۱۳' ص۳۵۲)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں' کیا یہ سب حق ہے جس

امام اعظمؒ کا مسلک

میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ؟ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام ابو حنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفر کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابو حنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا، یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً)۔ سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابو حنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا: فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ (۳۹/۱۸) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دے دو، جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں (ایضاً۔ ج ۱۴، ص ۳۵۲)۔ حسن بن زیاد لؤلوی کہتے ہیں کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہو گی۔ (ایضاً)۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے۔ اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار نہیں پا سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے:

> محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظم فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپؐ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحاق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابو حنیفہ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔
>
> (البغدادی، جلد ۱۳، ص ۳۸۷)

آپ کے اس مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے:

"ابو عوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو[1]۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچئے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔"

(ایضاً ص۲۹۰)

یہ ہے فقہ کی حقیقت! ظاہر ہے کہ یہ سراسر ظنّی ہے۔ جس طرح ہم نے حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ وہ (خود حدیث کو دین ماننے والوں کے نزدیک بھی) یقینی نہیں، ظنّی ہے۔ اسی طرح فقہ کا اصول یہ ہے کہ قانون کے ماخذ چار ہیں ــــ قرآن، حدیث، اجماع، قیاس۔ قرآن اور حدیث کے متعلق تو ہم ان حضرات کا عقیدہ نقل کر چکے ہیں کہ فقہ کا فیصلہ ان دونوں پر غالب رہے گا۔ اجماع کے متعلق آج تک یہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ یہ بہرحال واقعہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کے متعلق تمام امت نے مُتّفقہ طور پر کوئی قانون مرتب کیا ہو، یا جس پر تمام امت کا اتفاق ہو۔ بنا بریں، فقہ میں قانون سازی کی بنیاد قیاس ہی رہ جاتا ہے اور قیاس، ظن ہی کا دوسرا نام ہے۔

اجماع

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حق امّت کی زندگی سے خارج ہے اور اس کے مذہب اور شریعت کا سارا مدار ظن پر ہے۔ اور ظن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد ہے وہ ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں جو کہا ہے: اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ○ (خدا جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں)، تو اس سے روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔

اتباعِ ظن کے خلاف، قرآنِ کریم کے دیگر کئی ایک مقام میں بھی آیا ہے۔ مثلاً۔ (۶/۱۱۷؛ ۶/۱۴۹؛ ۱۰/۶۶؛ ۵۳/۲۳؛ ۵۳/۲۸)۔

---

[1] یہ اس زمانے کے قوانین تھے جن کی ہم پر پابندی لازم نہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ الحق صرف قرآن ہے۔ اس کے بعد قرآن کی خصوصیات سامنے لائی گئی ہیں۔ فرمایا:

(۱۰ ۳۷-۲۸) وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

واقعہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی قرآن جیسا ضابطۂ قوانین مرتب کرسکے۔ اس لئے جھوٹا قرآن بنایا ہی نہیں جاسکتا۔ (ذرا غور کرو کہ اس قرآن کی

تحدّی۔ قرآن کی مثل بنا کر دکھاؤ

خصوصیات کیا ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ (ایک علمی نظام کے ذریعے) یہ اُن تمام اصول و قوانین کو سچ کر دکھانے والا ہے جو اس سے پہلے بذریعہ وحی دیئے جاتے رہے تھے۔ پھر یہ اپنے قوانین کو اس طرح نکھار اور اُبھار کر بیان کرتا ہے کہ ان میں نہ شک و شبہ کی گنجائش رہتی ہے اور نہ ہی کوئی اضطراب اور ذہنی کشمکش! اور یہ قوانین اُس خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو تمام کائنات اور عالمگیر انسانیت کی نشو و نما کا ضامن ہے۔ (لہٰذا اس میں نہ کسی خاص قوم سے رعایت برتی گئی ہے اور نہ ہی کسی کی خواہ مخواہ مخالفت کی گئی۔ یہ ضابطۂ انسان اور انسان میں فرق نہیں کرتا) (۳۷)۔

غور کرو کہ یہ لوگ اس قسم کے ضابطۂ حیات کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں، اس رسولؐ کا خود ساختہ ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ

اس قسم کا ضابطۂ حیات انسان بنا سکتا ہے، تو اس دعوے کو ثابت کرنے کا آسان طریق یہ ہے کہ تم (سارا قرآن نہیں، صرف) اس کی ایک سورت کی مانند بنا کر دکھاؤ۔ اور اس مقصد کے لئے تم، خدا کو چھوڑ کر، جس جس کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو، بلا لو۔ (اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ ۲/۲۳؛ ۱۱/۱۳؛ ۱۷/۸۸)۔ (۳۸)

قرآن کریم کا یہ چیلنج کہ، تم اس کی مثال بنا کر دکھاؤ، پہلے بھی گزر چکا ہے ــــ اور اس کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان، جلد اول (صفحات ۲۱۴ ـ الآخر) میں آ چکی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ قرآن کریم سمجھنے کا طریق کیا ہے؟

۱۰/۳۹ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝

(بات یہ نہیں کہ یہ لوگ، علم و بصیرت کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن منجانب اللہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کی صداقت کو سمجھنے اور پرکھنے کا جو صحیح طریقہ ہے یہ اُسے اختیار ہی نہیں کرتے۔ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ:

(i) انسان کی علمی سطح اتنی بلند ہو کہ اس کے حقائق کا احاطہ کر سکے۔ یا

(ii) قرآن ایک عملی نظام پیش کرتا ہے جس کے محسوس نتائج اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس کا انتظار کرے کہ وہ نظام متشکل ہو اور اس کے نتائج سامنے آ جائیں۔

(iii) اور اگر کوئی یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم تاریخی شواہد کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس سے پہلے جن قوموں نے ان اصولوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے سرکشی اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا۔ اب ان لوگوں کی نہ تو علمی سطح اتنی بلند ہے، نہ ہی یہ اسے بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ ہی انتظار کرتے ہیں کہ اس نظام کے نتائج سامنے آ جائیں

تو اُن سے اندازہ لگایا جاسکے۔ بس یونہی اسے جھٹلائے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں دیکھتے
کہ جن لوگوں نے ان سے پہلے ایسی روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ (۲۷/۸۴؛
۱۰/۴۱؛ ۷/۵۳؛ ۴۱/۵۳؛ ۱۰/۱۰۲)۔

یہ موضوع اس سے پہلے بھی زیرِ نظر آچکا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۴۸۔
قرآن پر صحیح معنوں میں ایمان بھی وہی لوگ لاسکتے ہیں جو اسے اس طریق سے سمجھیں۔ اس وقت دنیا میں
قرآنی نظام تو کہیں بھی نافذ نہیں کہ اس کے زندگی بخش نتائج سے قرآنی دعاوی کی صداقت کو پرکھا جاسکے۔
یہ ہماری حرماں نصیبی ہے۔ بنا بریں ہمارے لئے دوسرے دو طریق ہی قابلِ غور ہو سکتے ہیں (میں نے اپنی بصیرت
اور استعداد کے مطابق انہی طریقوں سے افہام و تفہیمِ قرآن کی کوشش کی ہے)۔ اس طریق سے قرآن
سمجھا بھی جاسکتا ہے اور سمجھایا بھی جاسکتا۔

۱۰/۴۰ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ
بِهٖ ۚ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

اگر انہوں نے قرآنی حقائق کے پرکھنے کا یہ طریق اختیار کر لیا، تو ان میں سے کچھ لوگ ضرور
اس پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن جن لوگوں کی نیت میں فتور ہے اور ان کا منشا ہی فساد
برپا کرنا ہے، تو ایسے لوگ کبھی ایمان نہیں لانے کے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ ایسے لوگ
کون سے ہیں۔

۱۰/۴۱ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ
اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تَعْمَلُوْنَ ۝

اس کے بعد اگر یہ لوگ تجھے جھٹلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ تم یونہی دھمکیاں دیتے ہو
کہ ہماری روش کا نتیجہ تباہ کن ہوگا اور تمہارا نظام کامیاب ہو کر رہے گا) تو ان سے

کہہ دو کہ (میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو. تمہارے پروگرام کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا. میں اس سے بری الذمہ ہوں گا. میرے پروگرام کا نتیجہ میرے سامنے آجائے گا. اس کی کچھ ذمہ داری تمہارے سر نہیں ہوگی. بات صاف ہو جاتے گی (۶-۱۰۹/۱).

جیساکہ آپ کو معلوم ہے، الدِّین ایک عملی پروگرام کا نام ہے. اس کی رُو سے ایک نظام قائم کیا جاتا ہے جس کے درخشندہ نتائج اس کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں. حضورؐ اس نظام کے لئے کوشاں تھے اور مخالفین اس کی مزاحمت کرتے تھے. آپ نے ان سے کہا کہ اگر تم نظری دلائل و براہین کی رُو سے بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے تو پھر فیصلہ کن حقیقت تک پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ میں جس پروگرام پر عمل پیرا ہوں تم اس میں دخل نہ دو. میں تمہارے پروگرام میں مداخلت نہیں کروں گا. نتائج خود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے.

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے دعویٰ کی صداقت کے پرکھنے کا یہی حتمی اور مؤثر طریق ہے. آج اسلام کی

دعویٰ کی صداقت کا ثبوت — نتائج

تبلیغ کے لئے جس قدر کوششیں کی جاتی ہیں ان کے ناکام رہنے کی ایک ہی وجہ ہے.

جب آپ غیر مسلم اقوام سے کہتے ہیں کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل پیش کر سکے، تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگر اسلام میں واقعی یہ صلاحیت ہے تو پھر تمہاری اپنی حالت اس قدر زبوں و خوار کیوں ہے؟ پہلے تم اپنی حالت کو سنوارو. اس کے بعد اسلام کی حقّانیت کی بات کرلینا.

ان کا اعتراض بالکل بجا ہے. ڈاکٹر خود جس مرض میں مبتلا ہو، وہ اس مرض کے بیماروں سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارا حتمی علاج کر سکتا ہوں یعنی وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پہلے اپنا علاج کیجئے، پھر ہم سے کہیئے. بلکہ یوں سمجھئے کہ جب تم اپنا علاج کر کے اچھے ہو جاؤ گے، تو پھر تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ میں تمہارا علاج کر سکتا ہوں. مریض جُوق در جُوق آپ کی طرف کشاں کشاں آئیں گے. صدرِ اوّل میں اسلام پھیلا ہی اس طرح تھا. اُمّتِ مسلمہ نے اسلامی نظام قائم کیا. دنیا نے اس کے انسانیت ساز نتائج دیکھے اور لوگ (قرآن کے الفاظ میں) فوج در فوج اس کی طرف کھچے چلے آئے (۱۱۰/۳). گداگری کا کشکول ہاتھ میں لیکر لوگوں سے کہنا کہ ہمارے پاس ایسا نسخہِ کیمیا ہے جو پتھر کو سونا بنا دیتا ہے،

اپنا مذاق اڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟ نظری دلائل تو ایک طرف' لوگ جنت کے وعدوں پر بھی اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

اسی دنیا میں نتائج

جب حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو ایک دن قبیلہ بنی عامر کا ایک بوڑھا معزز سردار اپنا عصا ٹیکتے' حضورؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہا کہ لکل قول حقیقۃ وما حقیقۃ لك — ہر دعوے کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور اپنے بھائی عیسٰیؑ کی ذمہ داریوں' بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کردوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مجھے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: نعم النصر و التمکین فی البلاد — "خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔" (شاہکارِ رسالت ص۱۴۷' ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

یہ تھا اس نظام کا دعوے جسے اس نے عملاً پورا کر کے دکھلا دیا' اور یہی چیز اسلام کے فروغ کا باعث بنی۔ اسی کی طرف حضورؐ نے اشارہ کیا تھا جب مخالفین سے کہا تھا کہ مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اس نظام کو قائم کرسکوں۔ اس کے بعد تمہارے اس سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا کہ میرے دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے۔ اس حقیقت کو دیگر متعدد مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے۔ مثلاً (۱۱/۹۳؛ ۱۱/۱۲۱؛ ۳۹/۳۹)۔

مطالب الفرقان' جلد پنجم (ص۱۲۷) میں اس پر گفتگو بھی کی گئی ہے۔ پاکستان کا خطۂ زمین' اسلام کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن ہماری سوختہ سامانی کہ ہم نے یہاں جو روش اختیار کی' اس سے اسلام کا رہا سہا بھرم بھی مٹ گیا۔ ہم نے دین کے نظام کی جگہ تھیاکریسی کا اقتدار بڑھایا اور نام اس کا رکھا' اسلام کا احیاء۔ اس سے اسلام دنیا میں اضحوکہ بن گیا۔ وائے من! یا دائے من!!

ان سے کہا گیا کہ تم اسلامی نظام کے قیام اور اس کی خوشگوار ثمر باری تک کا انتظار نہیں کرنا چاہتے تو دلائل و براہین کی رو سے قرآن کریم کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے لئے وہ حضورؐ کی مجلس میں آکر بیٹھ

تو جاتے، لیکن بایں نمط کہ:

۱۰/۴۲ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَيۡكَ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَ لَوۡ كَانُوۡا لَا يَعۡقِلُوۡنَ ○

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ تمہارے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو اس طرح، گویا تمہاری باتیں بہت غور سے سُن رہے ہیں، حالانکہ وہ محض سُن ہی رہے ہوتے ہیں (ان کا خیال کہیں اور ہوتا ہے۔ ۴۷/۱۶)۔ تم سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سنا سکتے ہو جو عقل اور فکر سے کام ہی نہ لیں؟ لہٰذا' قرآنی الفاظ کا بلا سمجھے دہراتے رہنا یا سنتے رہنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا)۔

یہ نکتہ بڑا اہم ہے اور ہمارے لئے نہایت عبرت آموز۔ کہا یہ گیا ہے کہ وہ قرآن کو سنتے تھے لیکن اسے عقل و فکر کی رُو سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

سوچئے کہ کیا ہمارے ہاں بھی قرآنِ کریم کے ساتھ یہی کچھ نہیں ہو رہا! جس قدر ہم قرآن کو سنتے ہیں، وہ تو اس قدر سنتے ہی نہیں ہوں گے۔ علاوہ روزمرّہ کی زندگی کے' ہم رمضان میں' ایک ماہ میں پورا قرآن سنتے ہیں۔ ایک ماہ میں ایک نہیں' ایک ایک رات میں سینکڑوں' ہزاروں کی تعداد میں سنانے والے اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں سننے والے، لیکن دونوں — لَا یَعۡقِلُوۡنَ کے مجسّمے۔ نہ سنانے والے کو علم کہ جو کچھ میں سُنا رہا ہوں' اس کا مطلب کیا ہے' نہ سننے والوں کو معلوم کہ جو کچھ ہم سن رہے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں؟

بلا سمجھے قرآن سُننا

جب ہمارا قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات پر سے گذر ہوتا ہے تو ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ ان کا تعلق زمانۂ رسالت کے کفار سے ہے' ہم سے نہیں۔ ہم نہ کبھی سوچتے ہیں نہ مذہبی پیشوا' اُمت قوم کو یہ سوچنے دیتی ہے کہ ان کا اطلاق ہم پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح زمانۂ رسالتمآبؐ کے کفار پر ہوتا ہے۔ ہماری تو بلکہ ان سے بھی ابتر حالت ہے۔ اُن کی زبان عربی تھی' اس لئے وہ کچھ نہ کچھ تو سمجھ ہی لیتے ہوں گے۔ ہم تو اتنا بھی نہیں کر سکتے — یہ تو رہی سننے والوں کی حالت۔ دیکھنے والوں کی کیفیت اس سے بھی زیادہ تأسف انگیز تھی۔

۱۰/۴۳ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ○

اور وہ بھی ہیں جو تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور تمہاری طرف تکتے رہتے ہیں گویا وہ ہمہ تن توجہ ہیں؛ لیکن وہ صرف تک ہی رہے ہوتے ہیں، دھیان اُن کا بھی کہیں اور ہوتا ہے (۱۹۸/ ۷)۔ سوچو کہ تم ایسے اندھوں کو کس طرح راستہ دکھا سکتے ہو جو عقل بصیرت سے کام نہ لیں؟

نظر اور بصر نظر اور بصر کا فرق مطالب الفرقان، جلد اوّل، ص ۱۶۸ پر بتایا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے تاکہ اس سے بصیرت حاصل ہو۔ علاوہ ازیں اس جلد میں آیت (۱۹۸/ ۷) کے تحت بھی یہ موضوع آچکا ہے۔

یہ لوگ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہیں کہ وہ اس دلیل کی بنا پر قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ جائیں گے کہ وہ جماعتِ مومنین کے ساتھ رسول اللہ کی مجالس میں بیٹھا کرتے اور قرآن "سنا کرتے تھے"۔ قرآن نے اس خود فریبی کو "اپنے آپ پر ظلم" کہہ کر پکارا ہے۔

۱۰/۴۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

(حالت ان کی یہ ہے، لیکن جب یہ تباہی اور بربادی کے عذاب میں گرفتار ہوں گے تو کہیں گے کہ ہم پر یہ ظلم کیوں؟ ہم تو اس جماعت کے ساتھ تھے؛ ان کی محفلوں میں بیٹھتے تھے اور ان کی باتیں سنا کرتے تھے) یقین رکھو! خدا کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود، اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں (اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں)۔

ہم اس حقیقت کو واضح کرتے چلے آرہے ہیں کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اعمال کے نتائج کی نمود اور ظہور آخرت کی زندگی میں تو ہو گا ہی؛ لیکن اس دنیا میں بھی ان کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم نے قیامت، حشر اور میزان وغیرہ کے متعلق بیشتر مقامات پر لکھا ہے کہ ان کا تعلق اُخروی زندگی اور

اِس زندگی، دونوں سے ہے۔ حیاتِ اُخروی (قیامت وغیرہ) سے متعلق تفصیلی گفتگو تو قرآنِ کریم کے آخری پاروں میں کی جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے بھی جن آیات میں ان کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے متبادر ہوتا ہے، وہاں ہم نے اسی نہج سے مفہوم متعین کیا ہے۔ مثلاً اگلی آیت کا تعلق حیاتِ اُخروی سے بھی ہو سکتا ہے اور دنیاوی زندگی سے بھی۔ اس سیاق و سباق سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر اس کا مفہوم اس دنیا سے متعلق سمجھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ، بہرحال، ترجیحات کا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اُخروی زندگی سے بھی متعلق سمجھ سکتے ہیں۔ سابقہ آیات میں مخالفین کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا ذکر تھا۔ آیت (۱۰/۴۶) میں ان کے تخریبی اعمال کے نتائج کو اسی دنیا سے متعلق بتایا گیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان آیت (۱۰/۴۵) آتی ہے:

۱۰/۴۵ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ○

جس وقت اللہ انہیں (میدانِ جنگ میں) اکٹھا کرے گا (تاکہ یہ اپنی غلط روش کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھ لیں تو) اس وقت انہیں احساس ہوگا کہ یہ تمام مدت، جس میں وہ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں بدمست رہے، اتنی سی تھی جیسے دن میں ایک گھڑی۔ اُس دن، آمنے سامنے کے لشکر ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ اور جو لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ انہیں کبھی قانونِ خداوندی کا سامنا کرنا ہوگا، اُس وقت سخت نقصان میں رہیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا[1] (۲۰/۱۰۳)

حضور نبیِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو ایک داعیِ انقلاب کی زندگی کی جہت سے سامنے لائیے۔ دعویٰ

---

[1] اس کیفیت کا تعلق مرنے کے بعد کی زندگی سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن ہم نے، اس کے بعد کی آیات کے پیشِ نظر، اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔

نبوّت سے پہلے، آپ نہایت امن و سکون اور عزّت و اکرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ دعویٰ کیا تو وہی معاشرہ اس طرح مخالف ہو گیا کہ حضورؐ پر جینا محال کر دیا۔ چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم، ہر طرح کے تصادمات، تزاحمات، مصائب و نوائب، پریشانیاں اور دشواریاں۔ نہ دن کا چین، نہ رات کا آرام۔ اِدھر ذمہ داریوں کا بارِ گراں اُدھر بے سروسامانی۔ اس انداز کی چند دنوں کی زندگی ہی کچھ کم ہمت شکن اور حوصلہ فرسا نہیں ہوتی، چہ جائیکہ حضورؐ کو مکہ میں تیرہ سال اسی کشمکش میں گزارنے پڑے۔ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو پیہم لڑائیوں اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ الدّین (نظامِ خداوندی) کی اقامت گاہ کا جو وعدہ خدا نے کیا تھا، اس کے پورا ہونے کے آثار تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان حالات میں حضورؐ کے دل میں اس قسم کے احساس کا پیدا ہونا عین فطری تھا کہ بارِ الٰہا! جس نظام کے قیام کے لئے میں یہ جدّوجہد کر رہا ہوں، کیا اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکوں گا یا میری تمام زندگی مخالفتوں کے اس ہجوم میں گزر جائے گی؟ انسانی سطح پر سوچا جائے

کیا میں بھی دیکھ سکوں گا؟

تو خدا کی طرف سے اس استدعا کا اس قسم کا تسلّی بخش جواب ہونا چاہیئے تھا کہ گھبرایئے نہیں، یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہو جائے گا۔ لیکن وہاں واسطہ اُس خدا کے ساتھ تھا جس نے قانون کی پابندیاں خود اپنے اوپر بھی عائد کر رکھی ہیں۔ اس کی طرف سے اس قسم کے "جذباتی" جواب کی توقع کس طرح کی جا سکتی تھی؟ ارشاد ہوا:

۱۰/۴۶ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝

(تمہارے دل میں اے رسولؐ! یہ خیال پیدا ہو گا کہ فریقین میں یہ فیصلہ کن گھڑی کب آئے گی، تو) ہو سکتا ہے کہ جن تباہیوں کی بابت ہم انہیں متنبہ کر رہے ہیں، ان میں سے کچھ تمہاری زندگی میں سامنے آجائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے ہی تمہارا وقت پورا ہو جائے (اس لئے کہ اس کا تعلق ہمارے قانونِ مکافات اور

قانونِ مہلت سے ہے، کسی فرد کی عمر سے اس کا تعلق نہیں) لیکن اس کا یقین رکھو
کہ زُود یا بدیر ان سب کو لوٹ کر ہمارے قانونِ مکافات کے سامنے ضرور آنا ہے
— اُس قانون کے سامنے جو ان کے ہر عمل کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوتے ہے —
یہ اس سے بچ نہیں سکتے۔ (۱۳/۴۰؛ ۲۳/۹۵؛ ۴۳/۴۲)۔

دوسری جگہ اس کا اضافہ کر دیا کہ؛ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰)
— "تمہارا کام اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ کار رہنا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قوانینِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آئے گا۔

آپ غور فرمایئے کہ ایک انقلابی کی زندگی کس قدر جہدِ مسلسل کی زندگی ہوتی ہے جس میں یہ بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ اس جدوجہد کا آخری نتیجہ کب مرتب ہو گا۔ اپنے مشن کی صداقت پر یقین کامل ہوتا ہے جو اُسے اس خارا شگافی اور کوہ کنی میں ہمت ہارنے نہیں دیتا۔ اگر اس یقین میں ذرا سا بھی تزلزل آجائے تو وہیں تیشہ رکھ کر بیٹھ جائے۔ ویسے اس والہانہ سعیٔ پیہم میں بھی جس میں یہ معلوم نہ ہو کہ منزل کب سامنے آئے گی (اقبالؒ کے الفاظ میں) — ایسا کیف و سرور ہوتا ہے جو جادہ و منزل کی تمیز اٹھا دیتا ہے؛

انقلابی کی زندگی

تپیدن و نہ رسیدن چہ عالمے دارد خوشا کسے کہ بہ دُنبالِ محمل است ہنوز

ویسے، اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اے محمدؐ! آپ کا کام مصروفِ عمل رہنا ہے، یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مہلت کی رُو سے اس کا نتیجہ کب نکلے گا، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم میں اس کی قدرت نہیں کہ اس کا نتیجہ آپ کی زندگی ہی میں نمودار ہو جائے۔ وَإِنَّا عَلَىٰ أَنْ نُرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَادِرُونَ ۝ (۲۳/۹۵) اس قدرت کے باوجود، ہم اپنے قانون میں استثنار یا لچک پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ سورۂ زخرف میں اس حقیقت کو دہرانے کے بعد کہا؛ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۴۳/۴۳) "تم وحیٔ خداوندی کے ساتھ متمسک رہو۔ اس کے مطابق جادہ پیما رہو۔ یہ حقیقت ہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، یہ سیدھا منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ لہٰذا، تم اِس سے اِدھر اُدھر نہ ہو۔"

اور مخالفین کا یہ انجام خود حضورؐ کی زندگی ہی میں سامنے آگیا۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے ایک انقلابی کی زندگی!

اگلی آیت میں اسی مسئلہ کی تشریح کر دی۔ سب سے پہلے یہ کہا کہ یہ کوئی نیا قاعدہ نہیں جسے اِس قوم یا اِس رسولؐ کے ضمن میں اختیار کیا گیا ہے۔ شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے ــــ

۱۰/۴۷ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

ہمارے قانونِ مکافات کا یہ انداز شروع سے چلا آ رہا ہے کہ ہر قوم کی طرف ہمارا پیغامبر آتا ہے اور اس کے آنے پر تمام معاملات کا فیصلہ، عدل و انصاف کی رُو سے کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔

پہلے یہ بتایا کہ رسول کی وساطت سے احکامِ خداوندی کا ابلاغ، کوئی نیا پروگرام نہیں۔ دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول آتے رہے ہیں۔

سامی النسل اقوام ہی کا ذکر

قرآنِ کریم میں جن رسولوں کا ذکر آتا ہے وہ وہی ہیں جو ان اقوام کی طرف مبعوث ہوتے تھے جو بابل نینوا یا شام و فلسطین کے علاقوں میں آباد تھیں۔ اُن اقوام اور اُن کی طرف مبعوث انبیاء کرامؑ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ قرآن کی اوّلین مخاطب قوم (عرب) ان اقوام سے بھی واقف تھی اور ان کی طرف بھیجے گئے رسولوں سے بھی متعارف۔ اس لئے جب ان کے سامنے ان اقوام اور رسولوں کا ذکر آیا تو انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے، کہاں کے رہنے والے تھے ہم کیسے مان لیں کہ ان کا وہی حشر ہوا تھا جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ انہوں نے ان سوالات کو موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ چین میں جس قوم میں کنفیوشس پیدا ہوا تھا، تم جانتے ہو انہوں نے کیا کیا اور ان کا انجام کیا ہوا۔ تو بحث اس محور کے گرد گردش کرتی رہتی کہ چین کونسا ملک ہے۔ کنفیوشس کون تھا۔ اس کی قوم نے کیا کیا تھا۔ ان کا حشر کیا ہوا تھا۔ حضورؐ کا سارا وقت انہی سوالات کے جواب میں صرف ہو جاتا۔ اور پھر بھی کوئی مانتا اور کوئی نہ مانتا اور تبلیغ و رسالت کا موقع ہی نہ آتا۔ اس کے لئے بہت تھوڑا وقت بچتا۔ قرآن نے متعین طور پر ذکر انہی اقوام اور انہی انبیاء کا کیا جن سے وہ لوگ پہلے واقف تھے۔ اور اس کے ساتھ اس کی وضاحت

کر دی کہ اس قسم کے رسولؐ دنیا کی ہر قوم کی طرف آتے رہے ہیں (۱۳/۷)۔ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن میں آگیا ہے۔ باقیوں کا ذکر نہیں کیا گیا (۴۰/۷۸)۔ (اس سلسلہ میں) مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۴۴۲-۴۴۰) کی تشریحات بھی دیکھئے جن سے اس امر کی مزید وضاحت ہو جائے گی کہ کسی قوم پر تباہی نہیں آتی جب تک اسے پہلے وارننگ نہ دے دی جاتے اور اس میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو۔

یہ تھا خدا کا قانون، لیکن مخالفین رسولؐ سے بار بار پوچھتے تھے کہ ہماری جس تباہی کی تم اس شدومد سے وارننگ دیتے ہو، وہ کب آئے گی؟

۱۰/۴۸ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

خود یہ لوگ بھی تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر تم اپنی باتوں میں سچے ہو تو بتاؤ کہ وہ تباہی جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو، کب آئے گی؟

ہو سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے دل میں جو خیال اُبھرا تھا کہ اس مہم کا نتیجہ آپ کی زندگی میں برآمد ہوگا یا نہیں) تو اس کے محرک مخالفین کے اس قسم کے استفسارات بھی ہوں۔ ان سوالات کا جواب وہی تھا کہ یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے:

۱۰/۴۹ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝

ان سے کہو کہ (اس تباہی کا لے آنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق واقع ہوگی۔ میری حالت تو یہ ہے کہ) میں خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ بھی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس قانون کے مطابق ہر قوم کے اعمال کے ظہورِ نتائج کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر وہ نہ ایک ثانیہ پیچھے

رہ سکتی ہے نہ آگے بڑھ سکتی ہے (۴۰ - ۱۳/۳۸؛ ۲۳/۴۳)۔

نفع نقصان کی قدرت

اس میں دو اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں — ایک یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں۔ نفع اور نقصان کی اصولی بحث مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۶ پر آچکی ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ جلد میں آیت (۷/۱۸۸) کے تحت بھی وضاحت کی گئی ہے جہاں یہی الفاظ آتے ہیں۔ آیت (۱۰/۱۸) میں بتایا جا چکا ہے کہ نفع یا نقصان کا تعلق قوانینِ خداوندی سے ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ قوموں کی موت و حیات کے لئے قوانین مقرر ہیں۔ اور جب کسی قوم کی تباہی کا وقت آتا ہے تو اس میں تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے عروج و زوال اور موت و

قوموں کی موت و حیات

حیات کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی کثرت سے لکھا جا چکا ہے (انڈکس کی مدد سے ان تمام مقامات کو دیکھا جا سکتا ہے)۔ قوموں کی اجل کے متعلق بالخصوص مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۵۲) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اور جلد پنجم (صفحہ ۱۸۹) میں بھی جہاں یہ آیت بھی درج ہے۔

اس کے بعد اس تباہی کا ذکر ہے جسے عذاب کہہ کر پکارا گیا ہے:

(۱۰ / ۵۰-۵۲) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ (اس بات کو چھوڑو کہ تمہاری تباہی کا وقت کب آئے گا۔ مجھے یہ بتاؤ

کہ) اگر اس کا عذاب تم پر رات کے وقت آجاتے یا دن کے وقت تمہیں گھیر لے (تو تمہارے پاس اس سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ جب حالت یہ ہے کہ ان کے پاس اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تو پھر) وہ کیا بات ہے جس کے لئے 'یہ مجرمین' اس قدر جلدی مچارہے ہیں؟

(کیا اس وقت انہوں نے' اس سے حفاظت کی کوئی تدبیر سوچ رکھی ہے جو بعد میں بے کار ہوجائے گی؟) (۵۰).

یا تم اس کا انتظار کر رہے ہو کہ وہ تباہی تمہارے سامنے آجائے تو اسے دیکھ کر تم ایمان لاؤ! (لیکن اُس وقت ایمان لانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا. اُس وقت تو تم سے صرف اتنا کہا جائے گا کہ) یہی وہ تباہی ہے جس کے لئے تم اتنی جلدی مچایا کرتے تھے. (اُس وقت تمہارے ایمان لانے سے وہ تباہی ٹل نہیں جائے گی. اس لئے کہ جب اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آجاتا ہے تو پھر وہ نتائج پیچھے نہیں لوٹا کرتے). (۵۱).

اُس وقت ان لوگوں سے، جو ظلم و زیادتی کیا کرتے تھے' کہا جائے گا کہ اب اس ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مزہ چکھو. یہ سب تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے (۵۲).

دُنیا میں تباہی آیت (۱۰/۴۴) کے تحت لکھا جا چکا ہے کہ اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کا تعلق بیشک اُخروی زندگی سے ہے' لیکن یہ تباہی اِس دنیا میں بھی آجاتی ہے، بالخصوص قوموں کی ہلاکت اور تباہی. زیرِ نظر آیات میں دیکھئے. کہا گیا ہے کہ تم پر یہ عذاب "دن کے وقت بھی آسکتا ہے اور رات کے وقت بھی". اس سے ظاہر ہے کہ اس سے دنیاوی زندگی میں عذاب (تباہی) ہی مقصود ہے. پھر آیت نمبر ۵۱ میں ان کے ایمان لانے کا ذکر ہے. یہ اِس زندگی سے متعلق ہے. اگلی آیت (۱۰/۵۲) میں اسے "عذاب الخلد" کہا گیا ہے، یعنی ابدی تباہی. اس سے قوم کی وہ تباہی مراد ہے جس کے بعد وہ زندہ نہیں ہوسکتی، یعنی ایسا زوال جس کے بعد عروج نہیں.

اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ ان سے کہا جارہا ہے' وہ مبنی بر حقیقت ہے، یونہی ڈراوا نہیں.

۱۰/۵۳ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ
وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ○

یہ لوگ، تجھ سے (بار بار) پوچھتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا یہ واقعی سچ ہے؟ ان سے کہو کہ ہاں! میرا خدا اس پر شاہد ہے کہ یہ بالکل سچ ہے۔ یہ واقع ہو کر رہے گا۔ تم قانونِ خداوندی کو بے بس نہیں کر سکتے کہ جو کچھ اس کی رُو سے ہونا ہے وہ نہ ہو سکے۔

اس تباہی کی ہمہ گیری کی یہ کیفیت ہوگی،

۱۰/۵۴ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ
لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَ
وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

پھر یہی نہیں کہ اس تباہی کا آنا یقینی ہے۔ وہ محکم گیر ایسی ہے کہ جس ظالم اور سرکش پر وہ آئے اگر وہ چاہے کہ تمام دنیا کی دولت دے کر بھی اس سے چھٹکارا حاصل کر لے، تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ایسے لوگ جب اس تباہی کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ بہرحال، ان کے معاملہ کا فیصلہ بالکل حق و انصاف سے کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی زیادتی نہیں ہوگی۔

یہ اس لئے کہ یہ سب خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوگا جو اٹل ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے راستے میں روک بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔

۱۰/۵۵ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ
وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

یہ لوگ خدا کے قانونِ مکافات کو بے بس کس طرح کر سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ،

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب پر اقتدار و اختیار خدا ہی کا ہے۔
اس لئے جس بات کے متعلق خدا نے کہہ دیا کہ وہ ایسے ہو گی، وہ ایسے ہو کر رہے گی (۲۵/۱۶)
لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے (اور اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ انہیں
کوئی پوچھنے والا ہی نہیں)۔

آیت میں کہا گیا ہے: اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ (خدا کا وعدہ حق ہے)۔ وَعۡدٌ کے معنی خدا کا قانون ہے جو محکم اور اٹل ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو گا۔ اس مضمون کی آیات مختلف مقامات پر آئی ہیں۔ یہ بتانے کے لئے کہ خدا کے وعدے اٹل ہیں، سورۃ فرقان میں ایک ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگاہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ فرمایا: كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا (۲۵/۱۶)

خدا کے وعدے

خدا کا وعدہ پکا اور محکم ہے، جو ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا۔ (اگر بفرضِ محال یہ پورا نہ ہوا تو تمہیں حق حاصل ہو گا کہ پوچھ سکو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا!
تم خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ جیسا تم نے کہا تھا، ویسا کیوں نہیں ہوا!
اللہ اکبر! کیا عدیم النظیر تصور ہے خدا کا اور کتنا بلند مقام ہے انسان کا جسے خدا نے عطا کیا ہے۔
اس کا وعدہ ــــ یعنی وہ قانون کہ زندگی اور موت کی ڈور جس کے ساتھ بندھی ہوئی ہے؛

۱۰/۵۶ هُوَ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝

وہ قانونِ مکافات کہ (افراد تو ایک طرف، اقوام تک کی) زندگی اور موت جیسا انقلابِ عظیم بھی اس کے مطابق واقع ہوتا ہے اور تمہارے اعمال بھی اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں ــــ اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر جا ہی نہیں سکتے (سوچو کہ وہ قانونِ خداوندی کس قدر لاانتہا قوتوں کا مالک ہے)۔

خدا کا وہ قانون آخری مرتبہ اپنی مکمل، غیر متبدل شکل میں قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا؛
وہ قرآن جس کی کیفیت یہ ہے:

۱۰/۵۷ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ○

وہی قانون ہے جو آب، اے نوعِ انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، اس ضابطۂ ہدایت کی شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔ اِس میں ہر اُس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کرلیتی ہے، کامیابی کی راہ کی طرف راہنمائی کردیتا ہے اور انہیں سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کردیتا ہے۔

قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ ان میں سے جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لے آئیں وہ ان کی راہنمائی، انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف کردیتا ہے اور انہیں سامانِ نشوونما مرحمت فرمادیتا ہے۔ اس ضابطہ کی رفعت وعظمت کا یہ عالم ہے کہ اسے دیکھ کر خود اس کا عطا کرنے والا "جھوم جھوم کر" کہتا ہے:

۱۰/۵۸ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ○

ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت کا مل جانا خدا کے فضل ورحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا، تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اُس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر۔ (۱۳/۳۶)۔

دنیا کی ہر قوم نے سال میں کچھ دن ایسے مقرر کر رکھے ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے قومی تہواروں کے طور پر مناتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ دنیا میں آئی تو اس کے ذمے عالمگیر آسمانی انقلاب برپا کرنے کا پروگرام

جشنِ نزولِ قرآن

تھا جس میں اسے تہوار منانے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی تھی۔ بایں ہمہ ایک تقریب ایسی تھی جسے بطور تہوار منانے کے لئے خود ان کے خدا نے حکم دیا اور وہ ہے نزولِ قرآن کی تقریب۔ نزولِ قرآن کا آغاز رمضان کے مہینے میں ہوا تھا (۲/۱۸۵)۔ اس عظیم القدر واقعہ کی یاد میں اس تہوار کے منانے کا حکم دیا گیا۔ اسے عید الفطر کہا جاتا ہے جو درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔

ہر چند قرآنی حقائق اور وقائع کے سلسلے میں 'میں اپنی ذات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں یہ (خود عائد کردہ پابندی) بلا ساختہ ٹوٹ جاتی ہے۔ عید الفطر کا تہوار شروع ہی سے منایا جاتا چلا آرہا ہے، لیکن اس کی وجہ متعین طور پر بتائی نہیں جاتی۔ یہ سعادت اس ہیچمدان کے حصے میں آئی جس نے اسے "جشنِ نزولِ قرآن" کہہ کر پکارا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ تعارف اب عام ہوگیا ہے۔

اس امت کے لئے یہ ایک ہی جشن ہے جسے منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے، اور جسے صدرِ اول میں جماعتِ مومنین مناتی تھی (۱۳/۳۶)۔ ابھی دنیا قومیتوں کی تنگنائوں میں گھری ہوئی ہے۔ جب یہ قرآن کی راہنمائی میں امتِ واحدہ کی صورت میں متشکل ہوئی تو، یہ جشن ساری دنیا میں منایا جائے گا کیونکہ اس کا خطاب النّاس سے ہے۔

زندگی کی ہر متاع سے گراں بہا اور عزیز تر!

خدا نے ایسا ضابطۂ قوانین دیا جو مکمل اور غیر متبدل ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کہا کہ نہیں' یہ ناتمام ہے۔ اس کی تکمیل ہم کریں گے!

۱۰/۵۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ
مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ
عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے جو سامانِ رزق پیدا کیا ہے، تم اس میں سے خود ہی' (اپنے معتقدات کے مطابق) کسی کو حلال

قرار دیتے ہو، کسی کو حرام۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ تم خود ہی حلال و حرام کے فیصلے کرنے لگ جاؤ؟) حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے آپ کچھ فیصلے کر لیتے ہو اور پھر انہیں شریعت کا نام دے کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔ یہ بہت بڑا افترا ہے۔ (۶/۱۱۶ ؛ ۶/۱ ؛ ۶۶/۱ ؛ ۷/۳۲ ؛ ۶/۱۴۶)

حرام و حلال حرام و حلال کی تفصیلی بحث کے لئے انڈکس دیکھئے۔

ان لوگوں کے حوصلے کتنے دراز اور جرأتیں کس قدر بیباک ہیں جو خدا کے خلاف کذب و افترا سے بھی نہیں چوکتے!

۱۰/۶۰ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

جن لوگوں کی جرأت و بیباکی کا یہ عالم ہے کہ خود ہی کچھ فیصلے کر لیتے ہیں اور پھر انہیں خدا کی طرف منسوب کر کے (دین کے نام سے نافذ کر دیتے ہیں)، ان سے پوچھو کہ انہوں نے بالآخر قیامت کے متعلق کیا سمجھ رکھا ہے؟ (کیا ان کا یہ خیال ہے کہ یہ 'جو جی میں آئے کرتے رہیں'، انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟ کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کی یہ ڈگر ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی اور کوئی ایسا انقلاب نہیں آئے گا جس سے ان کی زندگی کا نقشہ بدل جائے؟ اصل یہ ہے کہ ان کی یہ خود فریبی 'خدا کے قانونِ مہلت کی وجہ سے ہے جس کی رُو سے اعمال کے نتائج ایک وقت کے بعد جا کر برآمد ہوتے ہیں' اس لئے یہ لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ مکافاتِ عمل کا کوئی قانون ہی نہیں۔ حالانکہ اگر یہ غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ مہلت کا قانون) خدا کی طرف سے نوعِ انسان پر خاص فضل ہے (کیونکہ اس سے تباہی آنے سے پہلے، اُس سے بچ جانے کا امکان ہوتا ہے) لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی صحیح قدر

نہیں پہچانتے۔

یہ قانونِ مہلت ہے جس کی وجہ سے ان کی جلد گرفت نہیں ہوتی، ورنہ خدا کے قانونِ مکافات کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے مواخذہ سے کوئی بھی محفوظ و مامون نہیں رہ سکتا ـــــ

۱۰/۶۱ وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

ہمارے قانونِ مکافات کا تو یہ عالم ہے کہ (اے رسول!) تم جس حال میں بھی ہو، اور قرآن کا کوئی حصہ بھی ان کے سامنے پیش کر رہے ہو، (اے لوگو!) تم جو بھی کام کرو ـــــ خواہ تم اس میں اس قدر منہمک ہو کہ تمہیں اس کا احساس تک بھی نہ رہے کہ تم پر کسی کی نگاہ ہے، لیکن ہماری نگاہ تم پر برابر ہوتی ہے۔ زمین و آسمان میں ایک ذرّہ برابر بھی کوئی شے نہیں جو تیرے نشو و نما دینے والے کی نگاہوں سے چھپی رہے ـــــ ذرّہ کے برابر، یا اس سے چھوٹی یا بڑی، کوئی چیز ہو، سب خدا کے قانونِ مکافات اور لوحِ علم کے واضح نوشتوں میں محفوظ رہتی ہے۔

اسی قانون کے مطابق معصیت کاروں کو سزا ملتی ہے اور قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والوں کو جزا ـــــ

۱۰/۶۲ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

اَولیاءُ اللہ یاد رکھو! جو لوگ، قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اللہ کے رفیق (اولیاء اللہ) بن جاتے ہیں، انہیں نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے، نہ داخلی کشمکش سے اندوہناکی (۲/۳۸)۔

"اولیاء اللہ" کے متعلق تفصیلی گفتگو، مطالب الفرقان، جلد سوم (صفحات ۲۴۴-الآخر) میں کی جاچکی ہے اور ایک اضافہ جلد پنجم صفحہ ۹۱ پر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ "اولیاء اللہ" کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ مومنین ہی کی ایک صفت ہے جس طرح متقی ہونا ان کی صفت ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یہ کہہ کر کردی کہ:

۱۰/۶۳ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ؕ

ان لوگوں (اولیاء اللہ) کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو قوانینِ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں (یعنی مومنین اور متقین ہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے)۔

ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں ہیں:

۱۰/۶۴ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ؕ

ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی شادابیاں اور کامرانیاں (یعنی یہ نہیں کہ یہ لوگ دنیا میں محتاجی اور فقیری کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مادی اشیاء سے نفرت اور قطعِ تعلق سے "روحانی ترقی" اور عاقبت سنوارنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ خانقاہیت کا مسلک ہے جسے قرآنی نظام سے کوئی تعلق نہیں (۵۷/۲۷))۔ یہ خدا کا قانون ہے (کہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی، نہایت کامیاب اور تابناک ہوگی) اور خدا کا قانون کبھی بدلا نہیں کرتا۔

یہ بہت بڑی کامیابی ہے جو ان کے حصے میں آئی ہے (یعنی حال اور مستقبل دونوں

کی خوشگواریاں) دنیا کی خوشگواریوں سے مفہوم یہ ہے کہ انہیں استخلاف فی الارض (مملکت) حاصل ہوگا (۲۴/۵۵)، اقوامِ عالم میں ان کا مقام سب سے بلند ہوگا (۳/۱۳۸) اور کفاران پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے (۴/۱۴۱)، یہ سب کچھ قرآن کی اتباع سے حاصل ہوگا، کیونکہ مومنین کے لئے وہی حقیقی بشریٰ ہے ـ ۱۶/۸۹ ; ۱۶/۱۰۲)۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے "اولیاء اللہ" کا تفصیلی بیان جلد سوم میں گزر چکا ہے. لیکن اس میں سے ایک نکتہ کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے. ہمارے ہاں اولیاء اللہ (اللہ والوں یا مقربین بارگاہِ خداوندی) کا نقشہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے (بلکہ بعض اوقات ننگ دھڑنگ)، ایک گدڑی تنگ و تاریک سا حجرہ یا جھونپڑی، مٹی کا ایک مٹکا اور پیالہ، بھوک، پیاس، غربت و افلاس، مسکینی و محتاجی، دنیا سے الگ تھلگ، گوشہ نشینی کی زندگی یہ سب تصوف کے "اولیاء اللہ" کی نشانیاں ہیں. قرآنی اولیاء اللہ (جماعتِ مومنین) کی دنیا کی زندگی بھی حسین ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی. جس جماعت کو اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (بالائے ہر بالا ترے) کہہ کر پکارا گیا ہے، کیا اس کی زندگی محتاجی و مسکینی مفلسی و بیکسی و بے بسی کی ہوگی؟ محتاجی اور مفلسی کو تو خدا نے عذاب سے تعبیر کیا ہے (۱۶/۱۱۲).

دین کی اتباع سے اس قسم کی حیات بخش اور انسانیت ساز، کامرانیوں اور شادمانیوں کی زندگی کے حصول کے بعد، رسول اللہ سے کہا کہ تمہارے مخالفین جو ہمت شکن اور حوصلہ فرسا باتیں کرتے ہیں ان کا قطعاً اثر نہ لیں. یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں. قرآن کی اتباع کا لازمی نتیجہ عزت و عظمت اور اقتدار و اختیار ہے ـــــ

۱۰/۶۵ وَلَا يَحۡزُنۡكَ قَوۡلُهُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ؕ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝

لہٰذا اے رسولؐ! تم ان مخالفین کی باتوں سے دل گرفتہ مت ہو۔ (یہ کون سی قوتوں کے مالک ہیں جو تم پر غالب آجائیں گے اور تمہارے نظام کو شکست دے دیں گے؟).

حقیقت یہ ہے کہ قوت و اقتدار، تمام کا تمام خدا ہی کو حاصل ہے اور اس کے قوانین کی متابعت سے ملتا ہے، وہ خدا جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے.

اس کا ثبوت یہ بیان فرمایا؛

۱۰/۶۶ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیّر العقول سلسلہ، کس طرح اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے (تم خدا کے اقتدار کا اندازہ اس ایک بات سے لگاؤ. یہ ایسی حقیقت ہے جس کی شہادت علم و بصیرت کی بارگاہ سے مل سکتی ہے) لیکن جو لوگ، اس اقتدار میں خدا کے ساتھ، اوروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں، کیا وہ علم و بصیرت کا اتباع کرتے ہیں؟

بالکل نہیں. وہ صرف وہم و گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں.

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جہاں مشرکین کے متعلق کہا ہے کہ وہ غیر اللہ کو پکارتے ہیں تو اس سے لازمی طور پر وہ بُت ہی مراد نہیں جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ان میں ان کے احبار و رہبان (مذہبی مقتدی اور پیرانِ طریقت) بھی شامل ہوتے ہیں جن کے احکام کی وہ اطاعت کرتے تھے.

اِدھر ان کے ضعف و ناتوانی کا ذکر کیا اور دوسری طرف خدا کے جلال و اقتدار کا تذکرہ؛

۱۰/۶۷ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ○

(یہ لوگ) اگر علم و بصیرت کی رُو سے نظامِ کائنات کے صرف ایک گوشے پر ہی غور کرتے

تو قانونِ خداوندی کی عظمت ان کے سامنے آجاتی. یہ دیکھتے کہ اس نے چاند سورج جیسے عظیم الجثہ اجرامِ سماوی کو یوں اپنے اقتدار کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ برابر مصروفِ گردش ہیں. ان کی گردش سے کبھی رات آجاتی ہے جس میں تم آرام کرتے ہو، پھر دن نکل آتا ہے جس کی روشنی میں تم اپنا کاروبار کرتے ہو. اس میں ان لوگوں کے لئے جو فی الحقیقت بات کو سنتے (اور سمجھتے) ہیں، قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری اور محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

مشرکین ہی میں ایک اہلِ کتاب (عیسائی) بھی تھے جن کے عقائد بُت پرستوں سے بھی زیادہ جہالت پر مبنی تھے؛

۱۰/۶۸ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اِبْنُ اللہ کا باطل عقیدہ

انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے (جو اس کے کاروبار میں اس کی مدد کرتا ہے)۔ ان سے کہو کہ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اسے اپنی مدد کے لئے اولاد کی احتیاج ہو. وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں. کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہے (جو خدا ایسی عظیم قوتوں کا مالک ہو، اسے کسی کی مدد کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟)۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس اس عقیدہ کی تائید میں کوئی سند اور دلیل بھی ہے یا تم خدا کی طرف یونہی ایسی باتیں منسوب کرتے رہتے ہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں!

حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی تردید سابقہ جلدوں میں (عنوان "عیسیٰؑ" کے تحت)

کی جا چکی ہے. بالخصوص دیکھئے جلد دوم (صفحہ ۳۴۳) اور جلد چہارم (صفحہ ۸۹). اس تردید کے بعد کامل حتم ویقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اس قسم کے عقائد کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے. جوں جوں علم وعقل کی روشنی پھیلے گی، یہ عقائد محو ہوتے چلے جائیں گے. چنانچہ اب عیسائی قوموں کے اربابِ فکر ونظر خود ہی انہیں چھوڑتے چلے جا رہے ہیں.

(۶۹/۱۰) قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ۝

ان سے کہہ دو کہ جو لوگ اپنے ذہن کے تراشیدہ عقائد کو، ناحق خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے (جوں جوں دنیا میں علم کی روشنی پھیلتی جائیگی اس قسم کے توہم پرستانہ معتقدات باطل قرار پاتے جائیں گے).

مذہبی پیشوا اس قسم کے عقائد کو اس لئے قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ان کا ذریعۂ معاش ہے. حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب ہو، مذہبی پیشوائیت کا ذریعہ معاش بن جاتا ہے، اس لئے وہ اس کے تحفظ کی انتہائی کوشش کرتے ہیں.

(۷۰/۱۰) مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝

اس قسم کی خانہ ساز باطل پرستی سے (مذہبی پیشوائیت کو) کچھ دنیاوی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن آخرِ کار، ان تمام امور کا فیصلہ ہمارے قانون کی رُو سے ہوگا. اُس وقت ان لوگوں کو، اپنی منکرانہ جدوجہد اور توہم پرستانہ عقائد کے سخت تباہ کن نتائج بھگتنے پڑیں گے.

اس کے بعد قرآن، اپنے معمول کے مطابق، تاریخی شواہد سے اپنے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتا

ہے اور آغازِ سخن حضرت نوحؑ سے کرتا ہے جو قرآن میں بیان کردہ سلسلۂ رشد و ہدایت کی اوّلین کڑی ہیں۔

۷۱-۷۳/۱۰ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ۝ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ۝

(منکرانہ جدّ و جہد اور توہم پرستانہ عقائد کس قسم کے نتائج مرتب کیا کرتے ہیں، اس کے لئے ان کے سامنے اقوامِ گذشتہ کی سرگزشت لاؤ۔ سب سے پہلے) انہیں قومِ نوحؑ کی داستان سناؤ۔ جب نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا ــ اگر میرا یہاں ٹھہرنا اور تمہیں قوانینِ خداوندی سے آگاہ کرنا، تم پر ایسا ہی شاق گزرتا ہے (تو گزرے، میں تمہاری خاطر اپنے اس اہم فریضہ سے باز نہیں رہ سکتا۔ میں تمہاری مخالفت کی کچھ پرواہ نہیں کرتا)، تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اس میں اپنا پورا زور لگا لو اور اس کے لئے اپنے حمایتیوں کو بھی بلا لو اور اسے اچھی طرح دیکھ بھال لو کہ میری مخالفت کا کوئی پہلو تمہاری نظروں سے

ادھل نہ رہ جائے۔ اور تم نے جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اور مجھے قطعاً مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ خدا پر ہے۔ (اگر میں اس کے قوانین کے مطابق چلوں گا تو وہ مجھے کبھی ناکام نہیں رہنے دے گا)۔ (۷۱)

اور اگر تم مخالفت سے باز آجاؤ (اور حق کی راہ اختیار کرلو تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے) میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ میرا خدا مجھے عطا کردے گا۔ وہ خدا جس کا مجھ سے ارشاد یہ ہے کہ میں اُن لوگوں میں سے ہو جاؤں جو اس کے قوانین واحکام کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتے ہیں (اور دوسروں سے بھی کہوں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں)۔ (۷۲)

(اس نے یہ کچھ اپنی قوم سے واضح طور پر کہہ دیا) لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا (اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے) تو ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو جو کشتی میں سوار تھے، طوفان سے بچا لیا اور انہیں ان کے مخالفین کا جانشین بنا دیا۔ اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی، انہیں غرق کردیا۔

ان سے کہو کہ ذرا اس پر غور کرو کہ جن لوگوں کو اُن کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کیا گیا تھا، جب انہوں نے اس تنذیر پر کان نہ دھرا، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ (۷۳)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ اور انبیاء گذشتہ کی داستانیں متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہیں۔ ان میں اکثر کوائف کا تو اعادہ ہی کیا گیا ہے اور بعض نئے نکات بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اسلوب یہ اختیار کر رکھا ہے کہ جن واقعات کا محض اعادہ کیا گیا ہے، ان آیات کا صرف مفہوم درج کردیا جاتا ہے۔ لیکن جو جدید نکات سامنے لائے گئے ہوں ان کی تشریح کردی جاتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی پوری داستان مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۲۲۰ سے آخر تک میں شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔ زیرِ نظر آیات میں کسی نکتہ کا اضافہ نہیں کیا گیا، اس لئے ان کے مفہوم پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اگلی آیت میں حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے درمیانی عرصہ میں آنے والی اقوام کے متعلق

صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ دیگر مقامات پر آیا ہے ـــ

۱۰/۷۴ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

نوحؑ کے بعد بھی ہم نے اسی طرح، مختلف اقوام کی طرف رسول بھیجے۔ وہ ان کے پاس واضح قوانین اور روشن دلائل لے کر آئے۔ لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ان کے پیغام کو سننے سمجھنے سے پہلے ہی اسے جھٹلا دیتے۔ اور جس بات کو یوں جھٹلا دیتے، پھر اپنی بات کی پچ میں، اسے قبول نہ کرتے، خواہ ان کے سامنے کتنی دلیلیں کیوں نہ لائی جاتیں۔ جو لوگ اپنی ضد اور ہٹ میں اس قدر حدود فراموش ہو جائیں، ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہا کرتی (۲/۷)۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کی داستانِ حیات کے منتخب اوراق چند آیات میں سامنے لائے گئے ہیں۔ سابقہ جلدوں میں اس داستان کی تفاصیل شرح و بسط سے پیش کی جا چکی ہیں۔ انڈکس کی مدد سے آپ ان مقامات کو بار دیگر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں، بنی اسرائیل، حضرت موسیٰؑ، فرعون، ساحرین وغیرہ عنوانات زیادہ اہم ہیں۔ جلد پنجم کا چوتھا باب (صـ۳۲۳) پورے کا پورا اس داستان کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ بنا بریں، آئندہ آیات میں، ان مقامات کے سوا جن میں کوئی اضافہ کیا گیا ہے، صرف مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا۔

۱۰/۷۸-۷۵ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا

قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ
لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا یُفْلِحُ
السّٰحِرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا
عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ؕ
وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِیْنَ ۝

ان اقوام کے بعد ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنے قوانین دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ انہوں نے بھی ان قوانین سے سرکشی اختیار کی، اس لئے کہ

موسیٰؑ و ہارونؑ

وہ ایک ایسی پارٹی بن چکے تھے جس کا شیوہ یہ تھا کہ وہ کمزوروں پر ظلم و زیادتی کریں اور ان کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر لے جائیں (وہ حق و انصاف کی بات پر کس طرح کان دھرتے) (۷۵/۱۰)۔

چنانچہ ان کے سامنے ہمارا وہ نظام پیش کیا گیا جو سرتاسر حق و صداقت پر مبنی تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیا کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ اور باطل ہے (۷۶)۔

موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ کیا تم اس حق کے متعلق جو تمہارے سامنے اس طرح پیش کیا جا رہا ہے، یہ کہتے ہو کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کے دعوے جھوٹ اور باطل پر مبنی ہوتے ہیں، وہ کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھا کرتے (اور تم دیکھ لو گے کہ میں اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا ہوں)۔ (۷۷)۔

(جو قانونِ خداوندی موسیٰؑ نے پیش کیا تھا، وہ لوگ، علم و براہین کی بنا پر تو اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے) اس لئے انہوں نے وہی روش اختیار کی جو باطل پرستوں کے ہاں شروع سے چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس مسلک سے برگشتہ کر دو جو ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلا

آرہا ہے؟ اور اس طرح ہمارے اقتدار کو ختم کر کے، مملکت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لو! (ہم تمہاری چالوں کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے) ہم تمہاری کوئی بات ماننے کے نہیں۔ (۷۸)۔

آیت (۷۶/۱۰) میں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے (حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے) کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ تم یہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ محض وعظ و نصیحت کرنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ ان کا منصب نظامِ خداوندی کا قیام ہوتا تھا اور یہ بعد کا خیال After thoughts نہیں ہوتا تھا۔ یہ مقصد شروع ہی سے ان کے پیشِ نظر ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہے:

(۱۰ / ۷۹-۸۱) وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِیۡ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ○ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَۃُ قَالَ لَہُمۡ مُّوۡسٰۤی اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ ○ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا قَالَ مُوۡسٰی مَا جِئۡتُمۡ بِہِ ۙ السِّحۡرُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ○

فرعون نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر سحر کار، مذہبی پیشوا ہیں انہیں ہمارے حضور پیش کرو۔[1] (۷۹)

چنانچہ وہ باطل پرست مذہبی پیشوا آ گئے تو موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ تم جو کچھ پیش کرنا چاہتے ہو، پیش کرو۔ (۸۰)

جب انہوں نے اپنے دعاوی اور دلائل کو پیش کر دیا تو موسیٰؑ نے کہا کہ جو کچھ تم نے

---

[1] ان امور کی تفصیل (۱۱۴ - ۱۱۳/۷) جلد پنجم (ص ۳۸۴) میں گزر چکی ہے۔

پیش کیا ہے، وہ یکسر باطل اور فریب پر مبنی ہے (اس کی حقیقت کچھ نہیں)۔ اسے اللہ عنقریب ملیامیٹ کر دے گا، اس لئے کہ تمہارے اس باطل مذہب اور نظام کا منشار انسانیت میں فساد برپا کرنا ہے۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ فسادِ آدمیت پیدا کرنے والوں کے کام کبھی سنورا نہیں کرتے ۔ (۸۱)

حضرت موسیٰ کے ساحرین کے ساتھ مقابلہ کے سلسلہ میں (سابقہ جلدوں میں) بتایا جا چکا ہے کہ یہ جادوگری کا مقابلہ نہیں تھا۔ یہ حق پر مبنی دعوت کا مقابلہ باطل کی دعوت کے ساتھ تھا اور اس میں موسیٰ کی طرف سے دلائل و براہین پیش کئے گئے تھے۔ اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ "خدا نے حق کو اپنے کلمات کے ذریعے ثابت کر دیا" — کلمات اللہ قوانینِ خداوندی ہی کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، حضرت موسیٰ کا یہ غلبہ دلائل و براہینِ خداوندی کی رُو سے تھا، جادوگری کی رُو سے نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ نے تو (ارشادِ خداوندی کی رُو سے) خود ہی کہہ دیا تھا: وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ (۱۰/۷۷) (ساحرین کامیاب نہیں ہو سکتے)۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰ نے "جادو کے زور" سے یہ مقابلہ جیتا تھا، تو یہ چیز خود موسیٰ کے اعلان (ارشادِ خداوندی) کے خلاف جاتی ہے۔ لہٰذا، یہ کامیابی سحر (جادو) کے زور سے نہیں تھی۔ کلمات اللہ کی رُو سے تھی، یعنی ان دلائل و براہین کی رُو سے جن کی بنا پر قوانینِ خداوندی کو برحق ثابت کیا جاتا ہے۔

۱۰/۸۲ وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ع

حق کا غلبہ قوانین کی رُو سے

لہٰذا، تم دیکھ لو گے کہ اللہ اپنے قانونِ محکم کے ذریعے کس طرح (تمہارے فساد برپا کرنے والے نظام کے مقابلہ میں)، تعمیری نتائج پیدا کرنے والے نظامِ حق و انصاف کو محکم طور پر قائم کرتا ہے، خواہ اس کا ثبات و قیام اس پارٹی پر کتنا ہی گراں گزرے جس نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔

(نظامِ خداوندی کا غلبہ کلمات اللہ — قوانینِ خداوندی — کے مطابق ہوتا ہے خواہ وہ دلائل و براہین کی رُو سے ہو اور خواہ سرکش قوتوں کے مقابلہ میں میدانِ جنگ میں۔

۸ — ۹/۷)

اس سے اگلی آیت میں قوموں کی نفسیات کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ محکوم قوموں

ہیں بڑے بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور نوجوان بھی۔ بڑے بوڑھوں میں (بالعموم) انقلابی آواز پر لبیک کہنے کی ہمّت نہیں ہوتی۔ ان کے حوصلے پست، ہمتیں فرسودہ اور جرأتیں پژمردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ لیکن قوم کے اُبھرنے والے (نئی نسل کے) نوجوانوں میں انقلاب کے لئے تڑپ ہوتی ہے' اس لئے وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ یہی تھے وہ نوجوان جنہوں نے حضرت موسٰیؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا اور انہی کے "ذبح کرنے" کا حکم فرعون نے دیا تھا (۴۰/۲۵)۔ "ذبحِ ابناء" کے سلسلہ میں مطالب الفرقان، جلد دوم (صـ۱۷۳) دیکھئے۔ فرمایا:

۱۰/۸۳ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۚ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

نوجوان ایمان لائے

(موسٰیؑ نے دلائل و براہین سے قومِ فرعون کو قائل کر دیا کہ وہ حق پر نہیں) لیکن اس پر' سوائے اس کی اپنی قوم کے چند نوجوانوں کے، کوئی ایمان نہ لایا۔ اس لئے کہ وہ لوگ ڈرتے تھے کہ فرعون اور اس کی قوم کے اکابرین انہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دیں۔ فرعون اپنی مملکت میں بڑا ہی سرکش اور مستبد تھا (اور جو لوگ اس کے مخالفین کے ساتھ جا ملیں ان سے انتقام لینے میں) کسی حد پر رُکنے والا نہیں تھا۔

اسی بنا پر اقبالؒ نے خدا سے دعا مانگی تھی:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نورِ بصیرت عام کر دے

بلکہ یہاں تک کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن ۔۔۔ دارم از روزے کہ مے آید سخن

برجوانان سہل کن حرفِ مرا بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا[1]

یہی وہ نوجوانانِ ملت تھے جنہیں حضرت موسیٰؑ تلقین کرتے تھے کہ:

۱۰/۸۴-۸۶ وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ جب تم قوانینِ خداوندی پر ایمان لاچکے ہو تو پھر کسی سے نہ ڈرو۔ تم ان قوانین کی محکمیت پر پورا پورا بھروسا رکھو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے تم تمام غیر خداوندی قوانین سے مُنہ موڑ کر ان قوانین کی اطاعت کرسکو گے (۸۴)۔

انہوں نے کہا کہ (آپ مطمئن رہیئے) ہم ان قوانین پر پورا پورا بھروسا رکھیں گے پھر انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے (خدا) کے حضور اپنی یہ آرزو پیش کی کہ توہمیں اس سے محفوظ رکھ کہ ہم فریقِ مخالف کے جَور وستم کا تختۂ مشق بن جائیں (۸۵)۔

تُو ہمیں اپنی رحمت سے، ان لوگوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلا جو قانونِ حق و انصاف سے سرکشی برت رہے ہیں (۸۶)۔

فرعون کے ساتھ کشمکش میں اب وہ مقام آگیا تھا جہاں نظر آتا تھا کہ باہمی تصادم ہوگا۔ اس کے لئے قوم (بنی اسرائیل) کو تیار کرنا ضروری تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قومِ فرعون نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کشمکش میں حضرت موسیٰؑ کا مقصد بنی اسرائیل کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اس لئے وہ کھلے بندوں اس قسم کی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ ان حالات میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ افرادِ قوم کے گھروں

---

[1] اس موضوع پر دلچسپی رکھنے والے قارئین، میری کتاب "اقبال اور قرآن" میں اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام ملاحظہ فرمادیں۔

کو اجتماعات کا مرکز بنالیں اور وہاں ان کی تربیت کا انتظام کریں۔

۱۰/۸۷ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

(اس کے بعد اس نظام کے لئے عملی اقدام کا آغاز کر دیا گیا) اس کے لئے ہم نے موسٰے اور ہارونؑ سے کہا کہ سرِدست مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے، وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کردو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ جماعت کے افراد کے لئے کوئی تربیتی مرکز بناؤ جہاں ان کے اجتماعات ہوا کریں۔ اس لئے) تم فی الحال اپنی جماعت کے اراکین کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کردو اور اس طرح اس نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کردو (جسے آخر الامر تمام معاشرہ کو محیط ہو جانا ہے) اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج و ثمرات کی خوشخبری دیتے رہو (تاکہ ان کی ہمتیں تازہ اور حوصلے بلند رہیں)۔

قبلہ اور اقامتِ صلوٰۃ

آیت میں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے گھروں کو "قبلہ" بنا لیا جائے تاکہ وہاں "اقامتِ صلوٰۃ" کا مقصد پورا کیا جا سکے۔ "قبلہ" اور "اقامتِ صلوٰۃ" کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے (بالخصوص مطالب الفرقان جلد دوم صـ۲۱۶) جہاں قرآن کی ان ہر دو اصطلاحات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ اس اجتماعی تربیت کے بعد اس قوم کو مصر سے نکال کر سینا کی وادیوں میں متمکن کیا گیا تھا جہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کی تھی۔

یہ تھا دین میں قبلہ اور اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ دین کا تصور نہیں، اسلام کی حیثیت ایک مذہب کی رہ گئی ہے، اس لئے قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر میں اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ قومِ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں "قبلہ رُخ جگہ (بطور مصلّے) مخصوص کر لیں اور وہاں نماز پڑھ لیا کریں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے قوم کے ان خیالات کو بحضور رب العزت پیش کیا جو ان کے دلوں میں ابھرتے تھے (اور آج بھی ہم میں سے مفلسوں اور محتاجوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں)۔

۱۰/۸۸ وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۝

موسیٰ نے کہا (کہ میں یہ سب کچھ کر دوں گا لیکن) میری قوم کے لوگوں کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم و استبداد پر مبنی نظام کبھی ثمر بار نہیں ہوسکتا تو یہ کیوں ہے کہ (فرعون اور اس کے سرداروں کو زیب و زینت اور آرائش کا سامان اور متاعِ زیست اس قدر فراوانی سے مل رہا ہے کہ اس کے بل بوتے پر وہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ اس لئے اے نظامِ ربوبیت کے مالک! تو ان کے مال و دولت کو تباہ کر دے اور جس عقلِ فریب کار اور حیلہ جُو سے یہ اس قسم کی انسانیت سوز تدابیر سوچتے رہتے ہیں اسے سلب کر لے۔ اس لئے کہ یہ لوگ تیرے قوانین کی صداقت پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک یہ اس قسم کے الم انگیز عذاب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے۔

یعنی (اس قوم کے دل میں جس کی ایک عرصہ کی محکومی کی وجہ سے عمل کی قوتیں مسلوب ہوچکی تھیں، خیالات یہ ابھرتے تھے کہ خدا ان مستبد حکام کو تباہ و برباد کر دے اور ان سرمایہ داروں کے مال و دولت کو جلا کر راکھ کر دے۔ خدا خود ہی یہ سب کچھ کر دے: ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے!

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ نے بحضور رب العزت یہ درخواست گزاری تو جواب ملا:

۱۰/۸۹ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

دُعا اور عمل کا باہمی تعلق

اس پر اللہ نے کہا کہ ہم نے تم دونوں بھائیوں کی دعا کو سن لیا ہے اور یہ قابلِ قبولیت بھی ہے لیکن اس کا پورا ہونا خود تمہاری جدوجہد پر موقوف ہے۔ لہٰذا تم اپنے پروگرام میں پوری ثابت قدمی دکھاؤ اور (جلد بازی میں) ان لوگوں کا طریق نہ اختیار کرو جو (ہمارے قوانین اور ان کے نتیجہ خیز ہونے کے انداز سے) واقف نہیں ہوتے (اس لئے وہ جلدی نتائج پیدا کرنے کے لئے غلط تدبیریں اختیار کر لیتے ہیں) (۲۰/۳۶؛ ۲۰/۴۲)۔

انہوں نے درخواست پیش کی (یا دُعا مانگی) اور خدا نے کہا "ہم نے تمہاری دُعا قبول کر لی ہے۔

آپ سوچئے کہ جب خدا کی طرف سے براہِ راست یہ یقین دہانی ہو جائے کہ ان کی دُعا قابلِ قبول ہے تو اس کے بعد انہیں کچھ کرنے کی ضرورت کیا رہے گی؟

لیکن نہیں! وہاں دُعا اور اس کی اجابت کا مفہوم کچھ اور تھا۔ خدا نے کہا کہ "تمہاری دعا قبول کر لی گئی ہے — فَاسْتَقِيْمَا — سو اب تم اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے جم کر کھڑے ہو جاؤ اور اس ثبات و استقامت کے ساتھ اسے بھی پیشِ نظر رکھو کہ تمہارا قدم صحیح راستے کی طرف اٹھے۔ غلط راستے پر چلنے والے جو تدابیر جی چاہے اختیار کریں، تم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے رہو۔ جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ اس طرح پورا ہو جائے گا۔ جو کچھ تم نے مانگا ہے، وہ اس طرح مل جائے گا۔

سورۃ طٰہٰ میں یہ کہنے کے بعد کہ ہم نے تمہاری درخواست کو قبول کر لیا ہے (۲۰/۳۶) یہ کہا کہ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (۲۰/۴۲) — دیکھنا! ہمارے قوانین کی تعمیل میں غفلت اور سستی نہ ہونے پائے۔ یہ کہنے سے (کہ تمہاری دُعا قبول ہو گئی ہے) مراد یہ ہے کہ تمہاری دُعا ہمارے (خدا کے) قانون کے مطابق ہے اس لئے اگر تم اسی انداز سے کام کرو گے تو یہ ضرور بار آور ہو گی۔

دُعا کا مفہوم سابقہ جلد (۱) میں واضح کیا جا چکا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے دُعا اور عمل کے باہمی رشتہ

کی اور بھی وضاحت ہوگئی۔ ذرا سوچئے کہ یہ (دو نبیوں کی) وہ دعائیں تھیں جن کے متعلق خدا نے براہِ راست کہہ دیا تھا کہ وہ قبول کرلی گئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ان کے پورا ہونے کے لئے عمل کی اس قدر سخت تاکید کردی۔ ہماری آپ کی دعاؤں کا جواب تو اس طرح سے نہیں ملتا۔ لیکن ہم دعا مانگنے کے بعد اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ خدا کردے گا۔

یاد رکھئے! انسانوں کی دنیا میں، خدا نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے، وہ اسے انسانوں کے ہاتھوں ہی سے کراتا ہے۔ دعا ہماری آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے لیکن وہ آرزوئیں پوری ہوتی ہیں خدا کی راہنمائی میں خود ہمارے کام کرنے سے، بشرطیکہ وہ خدا کے قوانین کے مطابق ہوں۔ اُسی دعا کو قابلِ قبول کہا جائے گا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو اور اس کی قبولیت مشروط ہوگی دعا مانگنے والے کی جدّوجہد سے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم (درمیانی کڑیوں کو چھوڑ کر) بنی اسرائیل کے مصر چھوڑنے کے مقام پر آجاتا ہے:

۱۰/۹۰ وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○

(آخر الامر ہوا یہ کہ) ہم نے بنی اسرائیل کو (فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور انہیں) صحیح وسلامت دریا (سمندر) کے پار اتار دیا۔ فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا تاکہ انہیں پکڑ کر ان پر ظلم اور زیادتی کی جائے۔ (وہ قوت اور سرکشی کے نشے میں اس قدر بدمست ہوگئے کہ اس کا بھی اندازہ نہ لگایا کہ وہ غرق ہوجائیں گے۔ چنانچہ

فرعون کا ایمان

جب فرعون اپنے لشکر کے ساتھ خود) غرق ہونے لگا (اور اس نے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا تو اس سے بچنے کے لئے) پکار اٹھا کہ میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ اُس خدا کے سوا کسی کا اقتدار نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ بس وہی ایک ہے میں بھی ان میں سے ہوجانا چاہتا ہوں جو اس کے

قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔

اس کا جواب ملا:

۱۰/۹۱ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ۞

(اس پر وحیِ خداوندی نے، بزبانِ موسیٰؑ کہا کہ) تو ساری عمر، حق وانصاف کی راہ سے سرکشی اختیار کئے رہا اور ملک میں فساد انگیزیاں کرتا رہا۔ (تجھ سے بار بار کہا جاتا رہا کہ اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ لیکن اُس وقت تُو نے ایک نہ مانی۔ اب جب موت سامنے کھڑی دکھائی دی تو) ایمان یاد آ گیا۔ اب اس ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔ (اس لئے کہ جو ایمان، ڈر اور خوف کی بنا پر لایا جائے، وہ ایمان کہلا ہی نہیں سکتا)۔

اس کا جواب

نیز توبہ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ انسان اپنے اعمالِ حسنہ سے، سابقہ لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ کرلے۔ لیکن جب موت سر پر کھڑی ہو تو عملِ صالح (اچھے کام) کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُس وقت کی توبہ بے معنی ہوتی ہے (۱۸-۱۷/۴)۔

فرعون غرق ہو گیا، لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا:

۱۰/۹۲ فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ ۞

اب تجھے غرق ہونا ہے۔ البتہ ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندری موجوں سے محفوظ رکھیں تاکہ وہ، ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، موجبِ عبرت ہو۔ اس لئے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں جو ہمارے قانونِ مکافات کی غیر محسوس نشانیوں سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ (ان لوگوں کے لئے اس قسم کی محسوس نشانیاں ہی موجب

عبرت و موعظت ہوسکتی ہیں)۔

بنی اسرائیل کا عبورِ دریا، فرعون کی توبہ، اس کی محفوظیت وغیرہ واقعات پہلے تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں، بالخصوص جلد دوم (صفحات ۲۴۵ - الآخر) ہیں۔ زیرِ نظر آیات بھی وہاں درج کی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل ان کی دیگر مقامات پر آ چکی ہے:

۱۰/۹۳ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

(یہ تو تھا اس پروگرام کا منفیانہ پہلو، یعنی فرعون اور اس کے لشکر کی تباہی اور بنی اسرائیل کی اُن کے پنجۂ استبداد سے رستگاری۔ اس کا مثبت اور تعمیری پہلو یہ تھا کہ) ہم نے بنی اسرائیل کو ایسی جگہ متمکن کر دیا جہاں سامانِ زیست کی فراوانیاں تھیں اور اس طرح انہیں خوشگوار اور باعزت رزق سے بہرہ یاب کر دیا۔ ہم نے تو انہیں ان نعمتوں سے نوازا، لیکن ان کی حالت یہ رہی کہ ان کی طرف مختلف انبیاء کی وساطت سے وحی آتی رہی لیکن وہ ہمیشہ اس میں اختلافات پیدا کرتے رہے۔ اسی روش کے مطابق یہ اب، اس وحی (قرآن) سے بھی اختلاف رکھتے ہیں) سو جن امور میں یہ اختلاف کرتے ہیں ان کا فیصلہ (دلائل و براہین سے نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہ لوگ دلائل و براہین پر کان دھرنے کے لئے تیار ہی نہیں)۔ اُس انقلابِ عظیم کے وقت ہو گا جب ان کی تباہی تمہارے ہاتھوں سے آئے گی (۲/۵۹)۔ (اُس وقت تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور جس طرح فرعون اور اس کے لشکروں کی تباہی اُن کے سامنے ہوئی تھی ان کی تباہی تمہارے سامنے ہو گی۔ اس لئے کہ غلط

روش کا نتیجہ ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتا ہے، خواہ اس پر فرعون گامزن ہو خواہ بنی اسرائیل۔

غور فرمائیے! بنی اسرائیل کے تمکن کے بعد جس سب سے بڑی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے "رزقِ طیّب" ہے، خوشگوار اور باعزت رزق۔ دُنیا میں روٹی تو سب کو ملتی ہے، لیکن ایک روٹی وہ ہے جو عزت و تکریم بیچ کر ملتی ہے۔ اور دوسری روٹی وہ ہے جس میں عزت و تکریم بھی ہوتی ہے۔ یہ (دوسری قسم کی) روٹی ہے جو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے (اسلامی نظامِ معیشت میں) ہر فرد کو میسّر ہوتی ہے۔

باعزت رزق

قرآن نے اس کو رزقِ طیّب اور رزقِ کریم کہہ کر پکارا ہے۔ ان امور کی تفصیل سابقہ جلدوں میں "معاشی نظام" کے عنوان کے تحت ملے گی۔

یہاں کہا گیا ہے کہ "جن امور میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا فیصلہ قیامت کے دن کر دیا جائے گا۔ اگر یہاں قیامت سے مراد اُخروی زندگی کی قیامت لیا جائے تو بات صاف نہیں ہوتی۔ اُخروی زندگی میں اگر لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کیا گیا اور اس طرح اختلافات مٹ گئے، تو اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ وہاں تو اختلافات کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں قیامت سے مراد وہ قرآنی انقلاب ہے جس نے حق و باطل میں امتیاز کر کے دکھا دیا اور اس طرح اختلافات کا فیصلہ کر دیا۔ (قیامت کے مفہوم کے متعلق سابقہ جلدوں میں گفتگو کی جا چکی ہے)۔

ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد قومِ مخاطب (یعنی مخالفین عرب) سے کہا کہ —

۱۰/۹۴ فَاِنْ كُنْتَ فِىْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

اے قومِ مخاطب! اگر تمہیں اس حقیقت میں کسی قسم کا شک و شبہ ہو جو اس قرآن میں تمہاری طرف نازل کی گئی ہے (اور جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارا قانونِ مکافات کس طرح اقوامِ سابقہ میں کارفرما رہا ہے) تو جو لوگ اس سے پہلے کتابِ خداوندی کے حامل رہے ہیں

(یعنی یہود و نصاریٰ) ان سے پوچھ لو (کہ یہ واقعات جو بیان کئے گئے ہیں درست ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد تمہیں یقین ہو جائے گا) کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے بیان ہوا ہے، وہ حقیقت ثابتہ ہے۔ پس جب واقعہ یہ ہے تو تم اُن لوگوں میں سے کیوں ہوتے ہو جو خواہ مخواہ جھگڑے کی صورت نکالتے رہتے ہیں نہ ہی تکذیب کرنے والوں میں سے ____

۱۰/۹۵ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

یا ان لوگوں میں سے جو قوانینِ خداوندی کو جھٹلاتے رہتے ہیں۔ اگر تم ویسے ہی ہو گئے تو انہی کی طرح تم بھی نقصان اٹھاؤ گے۔

اس کے بعد ہدایت اور گمراہی کے متعلق قانونِ خداوندی کو سامنے لایا گیا ____

۱۰/۹۶-۹۷ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝

(ہم نے یہ حقائق اس طرح واضح طور پر بیان کر دیے ہیں اور ان کی تائید میں دلائل و براہین اور تاریخی شہادتیں بھی پیش کر دی ہیں۔ اس سے ہر صاحبِ عقل و فراست اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان حقائق کے تسلیم کرنے میں اب کسی کو تامل و توقف نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن) جن لوگوں نے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا ہے کہ ان پر دلائل و براہین کا کوئی اثر ہی نہیں ہو سکتا ____ یعنی جو ضد پر اڑے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں

عقل اور ایمان لیتے (۱۰/۷۴ : ۱۰/۱۰۰) وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے سامنے کیسی ہی کھلی کھلی نشانیاں کیوں نہ آ جائیں۔ تا آنکہ وہ اپنے اعمال کی

پاداش میں تباہی کے عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لیں (۱۰/۸۸). (یہ اُس وقت، فرعون کی طرح ایمان لائیں گے (۱۰/۹۰) لیکن یہ اُس وقت کا ایمان انہیں کیا فائدہ دے گا) یہ سب کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے (۹۷ - ۱۰/۹۶).

خدا کا قانونِ مکافات (یا قانونِ مہلت) یہ بھی ہے کہ اگر کوئی قوم تباہی آنے سے پہلے اپنی غلط روش کو چھوڑ دے اور صحیح راستہ اختیار کر لے، تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے. اس لئے قومِ یونس کی مثال سامنے لائی گئی ہے.

۱۰/۹۸ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝

ہمارے اس دعوے کی شہادت خود تاریخ سے ملتی ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جو تباہی سے پیشتر (حالتِ امن میں) ایمان لے آئی ہو اور اس طرح اپنے ایمان کی نفع بخشیوں سے فیضیاب ہو کر تباہی سے بچ گئی ہو. اس میں اگر کوئی استثنا ہوئی ہے تو قومِ یونس کی جو (عذاب آنے سے پہلے) ایمان لے آئی تو ہم نے ان سے اس عذاب کو دُور کر دیا جو انہیں دنیا میں ذلیل کر دیتا. اور انہیں ایک مدت تک زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع کیا. (۱۴۸ - ۳۷/۱۴۷ ؛ ۲۱/۸۷ ؛ ۶۸/۴۸).

قومِ یونسؑ کا تذکرہ، اِس سُورہ کے ابتدا میں کیا جا چکا ہے. وہاں یہ آیت بھی درج ہے.

اس کے بعد اس ابدی قانون کو سامنے لایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو مجبور نہیں بلکہ صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے کہ وہ (غلط اور صحیح راستوں میں سے جونسا راستہ چاہے) اپنی مرضی سے اختیار کر سکتا ہے. اس سے وہ اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے.

۱۰/۹۹ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ

جَمِيعًا ۚ أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا

مُؤْمِنِينَ ○

یہ سب اس لئے ہے کہ ہمارا قانونِ مشیّت یہ ہے کہ کفر یا ایمان کی راہ اختیار کرنا انسان کے اپنے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے (اس میں ہم بالکل دخل نہیں دیتے۔ اگر ہم نے دخل دینا ہوتا) تو ہم انسان کو بھی اسی طرح مجبور پیدا کر دیتے جس طرح کائنات کی دوسری

جبر کا ایمان، ایمان نہیں

چیزیں مجبور پیدا کی گئی ہیں اور وہ سب ہمارے مقرر کردہ قانون کے مطابق سرگرمِ عمل رہتیں)۔ اس صورت میں تمام روئے زمین کے انسان مومن ہی ہوتے۔ لہٰذا (جب ہمارا قانون یہ ہے کہ کفر اور ایمان کے معاملہ میں انسانی اختیار و ارادہ کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تو اے رسول!) تو لوگوں کو کس طرح مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں؟

آیت کے آخر میں خود رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ وہ بھی لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کا فریضہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا ہے، اس راستے پر انہیں زبردستی چلانا نہیں۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۴۳ پر آ چکی ہے۔

اس کے بعد کہا کہ ایمان خدا کے قانون کے مطابق لایا جاتا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ جو لوگ وحیٔ خداوندی کو عقل و فکر کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان پر بات واضح ہو جاتی ہے۔ جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے، اُن پر معاملہ مشتبہ رہتا ہے۔

۱۰/۱۰۰ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَجْعَلُ

الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ○

ایمان عقل و فکر کی رو سے

یاد رکھو! کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا جب تک وہ، ہمارے قانون کے مطابق، عقل و فکر سے کام لے کر صحیح نتیجے پر نہ پہنچے۔ اس لئے ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، ان پر بات

واضح نہیں ہو سکتی۔ وہ الجھاؤ میں رہتے ہیں (۲/۱۲۶ ؛ ۱۰/۳۹)۔

مطالب الفرقان، جلد سوم (صـ ۴۲۵) پر یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ "بِاِذْنِ اللّٰہِ" کے معنی قانونِ خداوندی ہیں اور جلد اوّل صـ ۷۵ پر یہ بحث آ چکی ہے کہ ایمان، عقل و بصیرت اور علم و فکر کی رُو سے لایا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات دو ٹوک بیان کر دی کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے، ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔

رِجْسٌ کے معنی ہوتے ہیں، التباس، شک، تردّد، اضطراب، آلائش، معاملہ کا صاف اور یکسو نہ ہونا۔ اس اعتبار سے ناپسندیدہ بات کو بھی رجس کہتے ہیں۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد پنجم صـ ۱۲۳)۔

ان آیات سے یہ واضح ہو گیا کہ (i) ایمان کے معاملہ میں جبر اور اکراہ کا کوئی کام نہیں، خواہ وہ جبر اربابِ اقتدار کا استبداد ہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت کا استبداد جس میں عقل و فکر ماؤف کر کے تقلیداً عقائد منوائے جاتے ہیں اور جو نہیں مانتا اس پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔ اور (ii) ایمان وہی قابلِ تسلیم ہے جو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے علم و عقل کی رُو سے لایا جائے۔ عقل سے کام نہ لیا جائے تو معاملہ مشتبہ رہتا ہے اور عقل و فکر کا اوّلین تقاضا ہے کہ نظامِ کائنات پر غور و فکر کیا جائے۔

۱۰/۱۰۱ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○

(عقل و فکر سے کام لینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان جذبات سے الگ ہٹ کر خارجی کائنات کا گہری نظر سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس میں کونسا قانون کار فرما ہے۔ لہٰذا اے رسولؐ! ان سے کہو کہ) تم خارجی کائنات اور خود انسان کی تمدنی زندگی پر غور و فکر کرو۔ (ان میں تمہیں حقیقت کی بڑی نشانیاں ملیں گی (۴۱/۵۳)۔

لیکن یہ نشاناتِ راہ اور تباہیوں کا احساس پیدا کرنے والی تنذیرات اُس قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں جنہوں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہو کہ ہمیں اس قانون کو ماننا ہی نہیں (۲/۶ ــــ ۷)۔

جو لوگ اس طرح حقائق کو تسلیم نہیں کرتے، وہ غلط روش پر گامزن رہنے پر مُصر رہتے ہیں۔ ان کی تباہی یقینی ہوتی ہے جو مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد آ جاتی ہے ــــ فرمایا:

۱۰/۱۰۲ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کریں، ان کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اور جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہو چکا ہے، وہی کچھ ان کے ساتھ ہو۔ اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ (اگر یہی بات ہے تو) تم انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ (تاکہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں اور اس طرح تم یقین کے آخری نقطہ تک پہنچ جاؤ) (۱۱/۹۳)۔

انتظار کرو قانونِ مہلت کی تفاصیل متعدد مقامات پر گذر چکی ہیں اور رسولؐ اللہ کا یہ ارشاد بھی کہ "تم بھی نتائج کا انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں"۔ اس کے بعد نتائج خود فیصلہ کر دیں گے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ اس آیت میں بھی دیکھئے کہ تاریخ کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں انڈکس دیکھئے۔

قوانینِ خداوندی سے سرتابی برتنے والوں کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ ان کی متابعت کرنے والوں کو اس تباہی سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ یہ کس طرح سے ہوتا تھا، اس کے متعلق مختلف اقوامِ سابقہ اور انبیاء گذشتہ کے احوال و کوائف کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۱۰/۱۰۳ ثُمَّ نُنَجِّىْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ع

(ان سے کہہ دو کہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جاتا ہے تو اس تباہی سے) خدا کے پیغامبر اور ان کے ساتھیوں کی جماعت ہی محفوظ رہا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس جماعت کا محفوظ رکھا جانا ہمارے قانون کی رُو سے واجب ہوتا ہے۔ (۴۷/۳۰؛ ۲۱/۵۸؛ ۹-۴۷/۷)۔

نجات کے متعلق سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل

خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے

کرنا ہی نہیں۔ اس کے معنی اس مصیبت سے (سرے سے) محفوظ رہنے کے بھی ہیں۔ اس آیت میں بھی اس کے معنی تباہی سے محفوظ رہنے کے ہیں۔

سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ خدا نے (اپنے لا انتہا اقتدارِ مطلق کے باوجود) خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جنہیں وہ کبھی نہیں توڑتا (دیکھئے جلد اول ص۲۷۴ وجلد پنجم ص۱)۔ یہاں بھی کہا گیا ہے ـــ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ "مومنین کو تباہی سے محفوظ رکھنا ہم نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے"۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ غور طلب ہے۔ اگر مومن (نام رکھنے والی) قوم مصائب و آلام کی شکار رہے (جیسی ہماری حالت ہے) تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ؛

(۱) اگر ہم واقعی مومن ہیں اور مصائب میں مبتلا، تو پھر (معاذ اللہ) خدا کا وعدہ غلط ہے۔

(۲) لیکن خدا کا وعدہ غلط ہو نہیں سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ

(۳) ہم ہی مومن نہیں۔

دعوائے ایمان پرکھنے کا معیار

اپنے دعوائے ایمان کے پرکھنے کا یہ اٹل معیار ہے۔ قومِ مومن کا ہنگامی اور وقتی طور پر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے، اور اس کا مستقلاً بے کس و بے بس، بلکہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا اور بات۔ اگر قوم مومن ہے تو اس کی حالت ثانی الذکر کی سی ہو نہیں ہو سکتی۔ (انڈکس میں "رسول" اور "مومنین" کے عنوانات دیکھئے) اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہم (یعنی دنیا بھر کے مسلمان) صدیوں سے جس نکبت اور زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی رُو سے ہم اپنے آپ کو مومن کہہ سکنے کے قابل ہیں؟

ان تصریحات کے بعد، عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے اعلان فرمایا؛

(۱۰ / ۱۰۴-۱۰۵) قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي
فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَ

لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ
حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم میرے پیش کردہ نظامِ زندگی کی صداقت کے بارے میں اب بھی شک میں ہو تو تمہارے اس شک سے میرے یقین پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ان قوتوں کی اطاعت اور محکومیت اختیار کروں جنہیں تم خدا کے سوا، صاحبِ اقتدار و اختیار مانتے ہو۔ میں تو صرف اُس خدا کی محکومیت اختیار کروں گا جس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اور تو اور خود تمہاری موت و حیات بھی، اُس کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھے اس کا یہی ارشاد ہے کہ میں اس جماعت میں رہوں جو اُس کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے (۱۰۴)۔

اور اپنی توجہات کو ہر طرف سے ہٹا کر اس کے متعین کردہ نظامِ زندگی پر مرکوز کروں اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لئے مختلف قوتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ، غیر خداوندی قوانین کو بھی شامل کر لیتے ہیں (۱۰۵)۔

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسولؐ خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا اور جماعتِ مسلمین کا اوّلین فرد ہوتا تھا۔ یہاں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ کا شمار جماعتِ مومنین کے زمرہ میں ہوتا تھا۔ جماعتِ مومنین کے سربراہ کا شمار اپنی جماعت کے افراد میں ہوتا ہے اور ان سے الگ نہیں ہوتا۔

یہ اعلان کرنے کے بعد اس اندازِ زیست کی مخالفت کرنے والوں سے کہا:

۱۰۶-۱۰۷ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا
يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

(میرا تم سے بھی یہی پیغام ہے کہ) تم خدا کو چھوڑ کر ان قوتوں کی اطاعت مت اختیار کرو، (جنہیں تم محض اندھے عقیدے کی بنا پر اختیار و اقتدار کی مالک سمجھتے ہو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں اس کی قدرت ہی نہیں کہ وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچا سکیں. اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی انہیں میں سے ہو جاؤ گے جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں (اور ان کا انجام تمہیں معلوم ہی ہے) (۱۰۶)۔

یاد رکھو! اگر تمہیں قانونِ خداوندی کی رُو سے کوئی تکلیف پہنچے تو کائنات میں کسی کو اس کی قدرت حاصل نہیں کہ (اس کے قانون کے علی الرغم) اس تکلیف کو رفع کر سکے۔ وہ اس کے قانون کے مطابق ہی رفع ہوگی. اور اس کے قانون کے مطابق تمہیں کوئی نفع پہنچنے والا ہو تو کوئی قوت ایسی نہیں جو اسے روک سکے. اس میں کسی کی تخصیص نہیں. جو شخص بھی، اس کے قانون کے مطابق، اس نفع بخش صورت کو حاصل کرنا چاہے، حاصل کر سکتا ہے. وہ نفع اسے ضرور مل جائے گا. یاد رکھو! نقصانات سے بچنے کا سامان ہو یا نشو و نما حاصل ہونے کے اسباب، یہ سب اس کے قانون سے وابستہ ہیں (۱۰۷).

اس کے بعد دہرایا کہ غیر خدائی قوتوں کے دروازوں پر دستک دینے کا جذبہ محرکہ جلبِ منفعت اور رفعِ مضرت ہوتا ہے. لیکن منفعت اور مضرت خدا کے قوانین کے ساتھ مستلزم ہے. تشریح ان نکات کی پہلے آچکی ہے.

پھر تمام نوعِ انسان سے کہا؛

۱۰/۱۰۸ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝

(اے رسولؐ! تم) تمام نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے وہ ضابطۂ حیات آگیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر تم اس کی راہنمائی میں سفرِ زندگی اختیار کرو گے تو اس سے تمہاری ہی ذات کو فائدہ پہنچے گا۔ اب یہ تمہارے اپنے فیصلے پر منحصر ہے کہ تم کونسی راہ اختیار کرنا چاہتے ہو) میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ تمہیں زبردستی سیدھی راہ پر چلاؤں۔

کس قدر عظیم اصول بیان فرما دیا کہ "جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا اُس کا فائدہ اُسی کو ہوگا جو غلط راستہ اختیار کرے گا اُس کا نقصان اُسی کو ہوگا"۔ اس ابدی اور غیر متبدل قانونِ مکافات نے مسئلۂ تقدیر کی تمام گتھیوں کو سلجھا دیا۔ صحیح اور غلط راستوں کی نشاندہی خدا نے کر دی ہے لیکن انسان انہیں اختیار خود کرتا ہے۔ اور جس قسم کی روش اختیار کرتا ہے، اس قسم کے نتائج اس کے سامنے آجاتے ہیں۔

عقیدۂ جبر کی تردید

اس پیغام رسانی کے بعد (اے رسول!)

۱۰/۱۰۹ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

(تم اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دو) اور خود اس ضابطہ (قرآن) کا اتباع کرتے رہو جو تمہیں وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اور اس پر ثابت قدمی سے جمے رہو تاآنکہ خدا کا قانونِ مکافات تم میں اور ان مخالفین میں آخری فیصلہ کر دے۔ وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ خود وحی (قرآن کریم) کا اتباع کرتے تھے. اس سے یہ مسلّمہ اصول ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ کوئی قول یا عمل جسے رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جائے' اگر وہ قرآن کے خلاف ہے' ـــ تو اس کے متعلق بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ کا نہیں ہو سکتا. حضورؐ کی طرف اس کی نسبت غلط ہے. احادیث کے پرکھنے کا یہی معیار ہے (میں اسی کا پابند ہوں).

لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اسے "انکارِ حدیث" کہہ کر پکارتا ہے اور الحاد اور بے دینی قرار دیتا ہے' اس کے خلاف میری روش وہی ہے جسے اختیار کرنے کا حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا ـــ یعنی وَاصْبِرْ ـــ اپنی روش پر استقامت سے قائم رہو ـــ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ـــ تاآنکہ خدا کا قانون فیصلہ کر دے کہ کس کی روش صحیح ہے. میں دیکھ رہا ہوں کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے فیصلہ ہوتا چلا جا رہا ہے. میری تیس چالیس سال کی مسلسل جدّوجہد کے بعد' اب یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ احادیث کے پرکھنے کا صحیح معیار یہی ہے. اس سے جہاں حضورؐ کی سیرتِ طیّبہ سے وہ داغ دُھل رہے ہیں جو وضعی (خلافِ قرآن) روایات نے لگا رکھے تھے' وہاں قانون سازی کے سلسلے میں اکثر پیچیدگیوں کے دُور ہو جانے کا بھی امکان ہے ـــ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

(نوشتہ ۱۹۸۴ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گیارہواں پارہ ——— گیارہویں سورت

سُوْرَۃ هُوْد (۱۱)

پانچواں باب

سُورَۃُ ھُودِ

کاروانِ پیامبرانِ انقلاب

۱. رزق کی ذمہ داری نظامِ خداوندی (اسلامی مملکت) کے سر پر ہے۔
۲. مقصودِ حیات — سلسلۂ ارتقاء کی منازل طے کرنا۔
۳. اُخروی زندگی اور قرآن پر ایمان لانا لازم وملزوم ہیں۔
۴. مذہبی پیشوائیت خدا کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔
۵. مغرب کے عقل پرستوں کی ناکامی۔
۶. دین تک آنے کے لئے مذہب چھوڑنا ضروری ہے۔ یہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔
۷. طبقاتی تفریق خلافِ شرفِ انسانیت ہے۔
۸. اپنوں اور بیگانوں کا معیار — نسبی رشتے نہیں، ایمان کا اشتراک۔
۹. مستبد حکام کی اطاعت بھی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔
۱۰. اللہ کی زمین، اللہ کی مخلوق کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔
۱۱. صلوٰۃ کا دائرہ معاشیات کو بھی محیط ہے۔
۱۲. قوموں کے جرائم اور اُن کے نتیجہ میں تباہی۔
۱۳. جرائم اور طبیعی حوادث میں ربط کیا ہے۔
۱۴. تباہی کی مدت کا مفہوم۔
۱۵. سیّآت کا ازالہ حسنات سے ہو سکتا ہے۔

سُوْرَۃُ هُوْدٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱۱/۱) الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ..... یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس کے قوانین محکم بنیادوں (مستقل اقدار) پر استوار کئے گئے ہیں اور ایسے واضح اور نکھرے ہوئے انداز سے بیان کئے گئے ہیں (کہ ان میں کسی قسم کا اشتباہ و ابہام نہیں)۔ اس لئے کہ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو حکیم بھی اور خبیر بھی ـــــ جو کائنات کے تمام حالات اور انسانی مقتضیات سے واقف ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔

آیاتِ قرآنی کے محکم اور متشابہ ہونے کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم (ص۱۸ الخ) میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ وہیں زیرِ نظر آیت کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ آیات کے محکم اور متشابہ ہونے کی الگ الگ خصوصیات کے باوجود، قرآن کی جملہ آیات محکم ہیں (۳/۶) یعنی اپنے مقام پر اٹل، غیر متبدل، تغیر نا آشنا۔ اسی کو الحق کہتے ہیں جو قرآن کی اساس و بنیاد ہے۔ یہ آیات رسول اللہ کی وساطت سے نوعِ انسان تک پہنچی ہیں۔ وحی کا اوّلین پیام یہ تھا:

(۱۱/۲) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ

وَ بَشِيْرٌ ۙ

اس ضابطۂ حیات کی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اطاعت صرف خدائے واحد کے قوانین کی کرو۔ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ (اس باب میں) اور تو اور، خود اس رسولؐ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ بھی تم سے اپنی اطاعت نہیں کراتا۔ وہ خدا ہی کے قوانین کی اطاعت کراتا ہے اور) تمہیں بتاتا ہے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے اور ان کی خلاف ورزی کرنے کا انجام کیسا تباہ کن ہوگا۔

محکومیت صرف خدا کی آپ آگے چل کر اس سورۃ میں بھی دیکھیں گے اور قرآن کریم کے دیگر بے شمار مقامات میں بھی وحی کا اوّلین پیغام یہ ہے کہ اطاعت اور محکومیت خدا کے سوا کسی کی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ رسول کی بھی حیثیت یہ ہوتی تھی کہ وہ خود اس وحی کی اطاعت کرتا تھا اور دوسروں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا تھا کہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے تمہیں کس قدر خوشگواریاں میسر آئیں گی، اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے زندگی کتنی شقتوں میں گزرے گی (۲۰/۱۲۴)۔

(۱۱/۳) وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝

(اس سلسلہ میں وہ تم تک خدا کا یہ پیغام بھی پہنچاتا ہے کہ) تم خدا کے قانونِ ربوبیت سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو اور تمام گوشوں سے ہٹ کر صرف اسی کے قانون کی طرف رجوع کرو۔ وہ تمہیں ایک مدتِ معینہ تک (جس کا تعین خود تمہارے اعمال و کردار کے

مطابق ہوگا) نہایت خوشگوار اور پسندیدہ سامانِ زیست سے بہرہ یاب کرے گا اور تم جس قدر حصولِ معاش کی استعداد بڑھاتے جاؤ گے، وہ اسی قدر معاشی آسائشیں بہم پہنچاتا جائے گا. لیکن اگر تم اس اصول سے انحراف کرو گے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی.

پہلی بات یہ کہی کہ قرآن کی اطاعت سے (اُخروی زندگی کی سعادتیں تو الگ رہیں) اسی زندگی میں خوشگواریاں میسر آجائیں گی. "متاع" قرآن کے معاشی نظام کی اہم اصطلاح ہے جس کا مفہوم مطالب الفرقان جلد پنجم (ص۱۶۴) میں بتایا جا چکا ہے.

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ رزق کی یہ فراوانیاں تمہاری محنت اور استعداد کی نسبت سے بڑھیں گی (اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں "معاشی نظام" کے زیرِ عنوان دیکھئے. یہ حصولِ رزق کا بنیادی اصول ہے جس سے اعراض برت کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی).

(۱۱/۴) اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝

یاد رکھو! اس کے قانون سے روگردانی کر کے، تم کہیں پناہ نہیں لے سکتے. تمہاری زندگی کی ہر گردش کا رُخ اسی کی طرف ہے اور تمہارے ہر عمل کا نتیجہ اسی کے مطابق مرتب ہوتا ہے. اس نے عمل اور اس کے نتیجے کے لئے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے (اس لئے انسان کا کوئی عمل، خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے بچ نہیں سکتا).

لیکن اس قانون کی پابندی خلوصِ دل سے کرنی ہوگی، منافقت سے نہیں کہ سود لو اور اسے "منافع" کہہ کر لوگوں کو دھوکا دو، یا اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاؤ کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے جائز ہے. یہ قطعاً جائز نہیں. انہی منافقین کے متعلق کہا کہ وہ ہوتے در اصل کچھ اور ہیں اور اپنے آپ کو ظاہر کچھ اور کرتے ہیں.

(۱۱/۵) اَلَاۤ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ ؕ اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ ۙ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ

وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝

منافقت لہذا، ان کی کوشش کہ یہ دُہری شخصیت کی زندگی بسر کریں — سینے کے اندر چھپا کر کچھ اور رکھیں اور باہر کچھ اور ظاہر کریں — اور اس طرح سمجھ لیں کہ ہم اس کے قانون کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں یا اپنی شخصیت (۷۴/۴) کو یکسر چھپانے کی کوشش کریں (تو یہ اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے)، اس لئے کہ جو کچھ یہ چھپائیں اور جو کچھ یہ ظاہر کریں، خدا کے قانونِ مکافات پر سب کچھ عیاں ہے۔ وہ تو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے (۷/۷۱)۔

آیت میں یَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ آیا ہے۔ ثَوۡب کے معنے کپڑا ہیں جس کی جمع ثِیَاب ہے۔ لیکن عرب اس سے مراد کسی کی شخصیت لیتے ہیں — یعنی خود کپڑے پہننے والا۔ چنانچہ سورہ المدثر میں جہاں نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ (۷۴/۴)، تو اس کے معنے یہ نہیں کہ تم اپنے کپڑوں کو پاک اور صاف رکھو۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ اپنی شخصیت، اپنی ذات کو پاکیزہ رکھیں۔ زیرِ نظر آیت میں یَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ کے معنے یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ اپنی حقیقی شخصیت یا سیرت و کردار کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ہوتے کچھ ہیں اور اپنے آپ کو دکھاتے کچھ اور ہیں۔

اِسی سے لفظ ثواب ہے جس کا مفہوم جلد چہارم میں بیان ہو چکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)۔

شروع بارھواں پارہ

آیت (۱۱/۳) میں حصولِ معاش کا ذکر آیا تھا۔ جیسا کہ آپ سابقہ جلدوں میں، قرآن کے معاشی نظام کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں، اس نظام کی اساس اس مسلمہ پر ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری، اسلامی مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ معاشی نظام کی تمام جزئیات اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اس اساس اور بنیاد کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے:

(۱۱/۶) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

(پہلے بتایا جاچکا ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے رزق کی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں (۱۱/۳) لیکن یہ فراوانیاں کسی خاص گروہ کے اندر محدود ہو کر نہیں رہ جانی چاہئیں۔ رزق زندگی کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اسے ہر ذی حیات تک حسبِ ضرورت، پہنچنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُروئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے نہ لے رکھی ہو۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ ایک ذی حیات کو کسی ایک منزل میں ٹھہرنے پھر قانونِ ارتقار کی رُو سے اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے کس قدر اور کون سے سامانِ نشوونما کی ضرورت ہوگی (۶/۹۹)۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کی کتاب میں واضح طور پر درج ہے (۲۹/۵۵)۔ لہٰذا منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں کوئی ذی حیات رزق سے محروم نہ رہنے پائے۔ جو نظام خدا کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گا وہی نظامِ خداوندی کہلا سکے گا۔ ۶/۱۵۲؛ ۲۹/۶۰؛ ۴۱/۱۰؛ ۳۶/۴۷)۔

رزق کی ذمہ داری

تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ اس معاشرہ کے زیرِ تحویل تمام ذی حیات) کی ضروریاتِ زندگی کا فراہم کر دینا اسلامی نظام کا فریضہ ہے۔ یہ آیت قرآن کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہے۔

قرآنِ کریم میں دَآبَّةٍ کا لفظ رینگنے والے جان داروں اور دو پاؤں پر اور چار پاؤں پر چلنے والے جانوروں سب کے لئے آیا ہے (۲۴/۴۵)۔ اسی لئے اس میں مجموعی طور پر انسانوں سمیت تمام ذی حیات آجاتے ہیں (۶/۶۱؛ ۱۸/۲۲؛ ۳۵ - ۲۸/۳۵)۔ اس کی اسی جامعیت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ انسان تو ایک طرف، اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا، تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

زیرِ نظر آیت میں مستقر اور مستودع کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان کا مفہوم مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۸۵
پر پیش کیا جا چکا ہے۔[1] اس میں سلسلۂ ارتقاء کی تمام کڑیاں آجاتی ہیں۔ اس کے بعد تخلیق ارض و سماء اور
ذی حیات نفوس کے ضمن میں ارتقاء کا اصول سامنے لایا گیا ہے۔

(۱۱/۷) وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ
اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ
اَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ
بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اس کا نظام یہ ہے کہ اس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو گوناگوں عناصر سے
ترکیب دے کر مختلف ادوار اور منازل سے گزارا (تا آنکہ وہ اس قابل ہو گئے کہ ان میں
ذی حیات اشیاء کی نشو و نما ہو سکے۔ اس نے زندگی کی بنیاد

پانی۔ مدارِ زندگی

پانی پر رکھی (۲۱/۳۰) اور اس پر مرکزی کنٹرول اپنا رکھا پھر ذی حیات
اشیاء میں موت اور زندگی کی کشمکش رکھی تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ تم میں سے کون
توازن بدوش زندگی بسر کر کے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے (۶۷/۲)۔ (توازن
بدوش زندگی وہ بسر کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتا
ہے ۵ ـ ۹۲/۷ ؛ ۹۲/۱۸)۔ اس سے وہ نظام قائم ہو جاتا ہے جس میں رزق ہر ذی حیات
تک پہنچتا چلا جاتا ہے (یاد رکھئے! اعمالِ حسنہ وہ ہیں جن سے خوشگوار زندگی حاصل
ہوتی ہے، اس دنیا میں عزت و وقار کی زندگی اور آخرت میں حیات جاوید ۸/۲۴ ؛
۳۶/۷۰)۔

جو لوگ ان بنیادی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے، اگر ان سے کہا جائے کہ زندگی کا سلسلہ

---

[1] مزید دیکھئے اگلا صفحہ (۴۳۳)۔

موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے، تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے. زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے (۴۵/۲۴)۔

مطالب الفرقان، جلد دوم، باب اوّل میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رُو سے نظریۂ ارتقا کا کیا مفہوم ہے۔ کس طرح زندگی کی ابتدا، پانی سے ہوئی اور خدا کے عرش کے پانی پر ہونے سے مراد کیا ہے (مطالب الفرقان، جلد دوم صـ۶۷، ۶)۔ ضمناً ـ مطالب الفرقان، جلد چہارم صـ۱۳۰ پر بتایا گیا ہے کہ (عرش کے قرآنی مفہوم کے برعکس) ہماری روایات اس کا کیا تصور پیش کرتی ہیں. اس سلسلہ میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمایئے. مشکوٰۃ میں ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ ایک دیہاتی کو منجملہ دیگر امورِ خدا کے متعلق سمجھا رہے تھے. آپؐ نے فرمایا:

عرش کا روایاتی مفہوم

"تو جانتا ہے خدا کی عظمت کیا ہے؟ اس کا عرش اس کے آسمانوں پر محیط ہے...... عرش کے اس قدر بڑا ہونے کے باوجود، اس کی کیفیت یہ ہے کہ (جب خدا اس پر بیٹھتا ہے تو) وہ اس طرح چرچراتا ہے جس طرح اونٹ کا کجاوا چرچراتا ہے، جب کوئی اس پر سوار ہوتا ہے"۔

(بحوالہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، جلد دوم، اردو ترجمہ صـ۳۴۸)

قانونِ ارتقا یہ ہے کہ جو نوع جس مرحلہ میں ہے، اگر وہ اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے تو وہ زندہ رہتی ہے. اس طرح وہ مرحلہ اس کا مستقر بن جاتا ہے. لیکن ارتقا کسی مقام پر رُک جانے کا نام نہیں. اس سے مقصود آگے بڑھنا ہے. لہٰذا، جو نوع اتنی صلاحیت پیدا کر لے جس سے وہ اپنے اس مقام (مستقر) سے آگے بڑھ جائے تو اس طرح زندگی کی اگلی (اور بلند) منزل میں پہنچ جاتی ہے (یہ

قانونِ ارتقا

مقام اس کا مستودع ہوتا ہے)۔ اگر وہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھتی ہے تو یہی مستودع اس کا مستقر بن کر اسے اگلے مرحلہ میں جانے کے قابل بنا دیتا ہے. سورہ المدثر ہے، كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۸) ہر فرد اپنے اعمال کے دائرے میں محصور ہوتا ہے۔" اس سے پہلے ہے؛ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷) جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے. "مشروب جنت" کی خصوصیت کے متعلق کہا: وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳/۲۶)" اس سے آگے

بڑھنے کے متمنی آگے بڑھ سکتے ہیں"۔

زیرِ نظر آیت (۷/ ۱۱) میں خدا کے تخلیقی نظام کے بعد کہا: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ یہ نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے مصروفِ گردش ہے کہ تمہیں مواقع بہم پہنچائے کہ تم ایسے کام کر سکو جن سے تم سلسلۂ ارتقا میں آگے بڑھنے کے قابل ہو سکو۔

حیوانات تک ارتقا صرف طبیعی (جسمانی) ہوتا ہے۔ لیکن انسانی سطح پر پہنچ کر، یہ ارتقا انسانی نفس (یا ذات) کا ہوتا ہے۔ جو اعمال نفسِ انسانی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں، انہیں نیک کام، عملِ خیر یا اعمالِ حسنہ کہا جاتا ہے۔ جو اس کے آگے بڑھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں، وہ بُرے کام، عملِ شر یا اعمالِ غیر صالح قرار پائیں گے (جہنم کو جحیم اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیتی ہے)۔

ان تشریحات کے پیشِ نظر "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" کا مفہوم سمجھ میں آ جائے گا۔ جس ذات (نفس) میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، علم النفس کی اصطلاح میں اسے متوازن ذات کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے "اَحْسَنُ عَمَلًا" کہہ کر پکارا ہے۔ حُسن نام ہی توازن کا ہوتا ہے۔

متوازن شخصیت میں مرنے کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لئے آیت (۷/ ۱۱) کے آخری حصہ میں اُخروی زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو لوگ اُخروی زندگی کے امکان ہی سے انکار کرتے ہوں، وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے لئے اعمالِ حسنہ یا ابدی اقدار کی پابندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جن اعمال سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ان میں انفاق (یعنی دوسروں کی نشو و نما کے لئے اپنی زائد از ضرورت دولت کو اسلامی نظام کی تحویل میں دے دینا تاکہ وہ تمام افراد کو فراہمیٔ رزق کی ذمہ داری کو پورا کر سکے) سرِ فہرست آتا ہے۔ اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۱۸/ ۹۲)۔ "جو اپنا مال دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشو و نما ہو جائے"۔

حیاتِ اُخروی تو ایک طرف، ان لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی قانونِ مکافات کی نتیجہ خیزی پر یقین نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے تو یہ اس کا مذاق اڑانے لگ جاتے ہیں۔

۸/۱۱ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ

لَيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝

(یہ ہے نہ ماننے والوں کی وہ جماعت جسے رسولؐ ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا ہے ــ ۱۱/۲ لیکن) خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ظہورِ نتائج ــ یعنی

قانونِ مُہلت

پاداشِ عمل ــ کا وقت، ایک معیّنہ میعاد کے بعد آتا ہے. اس وقفہ کے دوران، ان کی طرف سے طعن وتشنیع شروع ہو جاتی ہے کہ کہاں ہے وہ تباہی جس کی تم اس طرح دھمکیاں دے رہے تھے؟ وہ کونسی چیز ہے جس نے اسے، ہم تک آنے سے روک رکھا ہے؟ ان سے کہہ دو کہ اس حقیقت کو بگوشِ ہوش سُن رکھو کہ وہ تباہی آکر رہے گی اور جب وہ آئے گی تو دنیا کی کوئی قوّت اسے روک نہیں سکے گی. نہ وہ کسی کے ٹالے ٹل سکے گی، نہ ہی کوئی اس کا رُخ دوسری طرف پھیر سکے گا. اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ جس چیز کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے تمہیں کس طرح چاروں طرف سے گھیر لیا.

اس کے بعد انسان کی عجلت پسندی اور بے صبری کی کیفیت بیان کی گئی ہے. اس کا ذکر پہلے بھی متعدد مقامات پر آچکا ہے۔

(11 / 9-10) وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا
مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ۝ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ
بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ۚ
إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝

انسان (جب ہمارے ضابطۂ حیات پر ایمان نہیں رکھتا (۱۱/۱۱) تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ زندگی کی جو آسائش اسے میسّر ہو، اگر وہ اس سے چھن جائے تو اس

انسان کی عُجلت پسندی

کے لئے تمام ممکناتِ حیات، تاریکی کے پردوں میں گم ہوجاتے ہیں اور یوں وہ اپنی ذات کے لامحدود ممکنات اور مضمر صلاحیتوں سے انکار کرکے زندگی سے یکسر مایوس ہوجاتا ہے۔ (اس لئے کہ اس کے نزدیک، زندگی نام ہی آسائشوں کا ہوتا ہے (۹)۔

اور اگر اسے اس تکلیف کے بعد پھر سامان آسائش مل جائے، تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ بس میری تمام مصیبتیں رفع ہوگئیں، اور اس طرح وہ آپے سے باہر ہوجاتا ہے اور شیخیاں بگھارتا ہے اور ڈینگیں مارتا پھرتا ہے۔ (گویا اسے زندگی کا مقصود حاصل ہوگیا)۔

ان کے برعکس:

۱۱/۱۱ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ○

لیکن جو لوگ (حیوانی سطح سے بلند ہوکر) زندگی کی انسانی سطح پر یقین رکھتے ہیں، ان کی حالت ان کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ عسر اور یسر — تنگی اور آسائش — دونوں حالتوں میں ایک ہی روش پر چلتے ہیں اور) اس پروگرام پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کو ابھارتا اور معاملات کو سنوارتا ہے، (وہ نہ مشکلات سے گھبراکر مایوس ہوتے ہیں نہ آسائشوں پر اترا کر آپے سے باہر ہوجاتے ہیں)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے، زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے کا سامان اور بلندیاں اور توانائیاں پیدا کرنے والا اجر عظیم ہے۔

سابقہ سورۃ کی آیت (۱۰/۱۵) کے تحت بتایا جاچکا ہے کہ مخالفین رسول اللہ کے ساتھ مفاہمت کی بھی کوشش کرتے تھے اور ان کی اس خواہش کو بڑی سختی سے مسترد کردیا گیا تھا۔ وہ معجزات کی بھی فرمائش کرتے تھے۔ اس سے بھی انکار کیا گیا تھا۔ یہاں انہی حقائق کا اعادہ کیا گیا ہے۔

۱۲/۱۲ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ

بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ
اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ۝

(اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں سے جو کہا جاتا ہے کہ ان پر تباہی آنے والی ہے، تو یہ بات انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے لیکن) یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تو ان کی دل جوئی کے لئے وحی کے ان مقامات کو ترک کر دے جن میں اس قسم کی تنذیرات آتی ہیں۔

معجزات طلبی یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جب کہتے ہیں کہ اگر تو خدا کا رسول ہے تو تجھ پر خزانے کیوں نہیں اتارے جاتے یا فرشتے تیرے جلو میں کیوں نہیں چلتے تو ان کی ان طعن آمیز باتوں سے تُو افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ لیکن تو جب فریضۂ رسالت و انذار کے لئے مامور کیا گیا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ (یہ ذمہ داری بڑی سخت اور یہ فریضہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں) اللہ کا قانون ہر معاملہ کی کارسازی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ (اس لئے آلِ کار سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۳-۱/۹۴)۔

آپ غور کیجئے کہ ایک داعیٔ انقلاب کے مراحلِ کشمکش کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے خلاف نہ کوئی تدبیر اختیار کر سکتا ہے نہ ہی مفاہمت اختیار کر سکتا۔ چنانچہ جب وہ (مخالفین) اُدھر سے مایوس ہو گئے تو پھر اس اعتراض پر اُتر آئے جسے وہ متعدد بار پیش کر چکے تھے یعنی یہ کہ وحی وغیرہ کا دعوے (معاذ اللہ) ڈھونگ ہے۔ قرآن اس مدعیٔ رسالت کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان کا اعتراض اور اس کا وہی جواب جو ہر بار دیا جاتا رہا، بارِ دیگر دہرایا گیا ہے۔

۱۱/۱۳ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ
مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ○

یا' یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن اپنی طرف سے بنا لیا ہے اور اسے خدا کی طرف یونہی منسوب کر رہا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو (کہ یہ خدا کی کتاب نہیں' انسان کا کلام ہے) تو تم' اس قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور جسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہو کر لو۔ بات صاف ہو جائے گی (۲/۲۳؛ ۱۰/۳۸)۔

۱۱/۱۴ فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰہِ وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ○

لیکن اگر (نہ تو تم خود ہی ایسا کر سکو اور نہ ہی) وہ لوگ تمہاری اس دعوت کو قبول کریں جنہیں تم اس مقصد کے لئے' اپنے ساتھ ملانا چاہو' تو اس کے بعد تمہیں جان لینا چاہیئے کہ یہ قرآن' علم خداوندی کی رُو سے نازل ہوا ہے (رسولؐ کا خود ساختہ نہیں) اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا تمام اقتدار صرف خدا کے لئے ہے' اس میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم اس کے بعد بھی اس ضابطہ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرو گے؟

یہاں پھر ان بنیادی حقائق کو دہرایا گیا جو پہلے بھی سامنے لائے جا چکے ہیں' یعنی

(۱) یہ لوگ' جو اتنی وضاحتوں کے باوجود' قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زندگی' اس دنیا کی زندگی کو سمجھتے ہیں' حیاتِ اُخروی کے قائل نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا ۙ

قرآن کا چیلنج

(۱۷/۴۵) "جب تو اُن کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے' تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' اُن کے اور قرآن کے درمیان ایک حجاب حائل ہو جاتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے"۔ لہٰذا' قرآن پر ایمان لانے کی اوّلین شرط' اس حقیقت کا تسلیم کرنا ہے کہ زندگی صرف انسان کی طبیعی زندگی کا نام نہیں جس کا تعلق اس کے طبیعی جسم سے ہے اور جو موت کے

ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ طبیعی جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کا نفس یا ذات کہتے ہیں، جو طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اسی کو حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔

اُخروی زندگی پر ایمان

قرآنی تعلیم کا مقصد جہاں انسان کو اس دنیا کی خوشگواریوں کا حامل بنا دینا ہے، وہاں اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے نفس کی اس طرح تربیت کر دی جائے کہ اس میں زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ سو ظاہر ہے کہ جو شخص زندگی کے اس تصور ہی کا قائل نہیں، وہ قرآن پر کیسے ایمان لا سکتا ہے؟

(۲) اگلا نکتہ یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ طبیعی اسباب و ذرائع کی رو سے حاصل ہو سکتا ہے، اس میں کافر و مومن میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ جو شخص بھی، قوانینِ فطرت کے مطابق طبیعی اسباب و ذرائع سے کام لے کر کوشش کرے گا، وہ طبیعی مفاد حاصل کرے گا۔ تفصیل ان امور کی سابقہ جلدوں میں آ چکی ہے۔

یہاں فرمایا:

(۱۱/ ۱۵-۱۶) مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ
اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ
وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝

(لیکن اگر تم، اس کے باوجود، اپنی مفاد پرستیوں ہی کو زندگی کا مقصود بنائے رکھو، تو تمہیں یہ مفاد حاصل رہیں گے۔ اس لئے کہ) ہمارا قانون یہ ہے کہ جو شخص صرف طبیعی زندگی کے مفاد اور زیب و زینت چاہتا ہے، اس کی کوششوں کے پورے پورے نتائج اُسے اِسی دنیا میں مل جاتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں جاتی (۱۷/۱۸)۔

لیکن ان لوگوں کا مستقبل (حیاتِ آخرت) کی خوشگواریوں میں کوئی حصہ نہیں

ہوتا (۴۶/۲۰) اُن کا اِس دنیا کا ساختہ پرداختہ (آخرت میں) سب اکارت چلا جاتا ہے اور اُن کا کیا کرایا سب غارت ہو جاتا ہے۔ ان کے لئے وہاں ایسی تباہی و بربادی ہو گی جو سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی (۱۶)۔

اس کے برعکس:

۱۱/۱۷ أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن کی صداقت کے سمجھنے کے تین طریقے ہیں: علم و بصیرت کی رُو سے یا اس کے عملی پروگرام کے نتائج کو دیکھ کر اور یا تاریخی شواہد کی رُو سے (۱۰/۳۹)۔

تم ذرا سوچو کہ کیا وہ شخص جو (۱) اس عقل و بصیرت سے کام لے جو اُسے اُس کے نشوونما دینے والے کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور (۲) وہ دیکھے کہ ایک شخص ضابطۂ خداوندی کے مطابق کام کرتا ہے اور اس کے اعمال کے نتائج اس ضابطہ کی صداقت کی عملی شہادت بنتے جا رہے ہیں، اور (۳) تاریخ کے یہ نوشتے بھی اس کے سامنے ہوں کہ اس سے قبل (مثلاً) موسیٰؑ نے بھی اس قسم کے ضابطۂ خداوندی کو اپنایا اور اپنی قوم کا راہنما بنایا تھا تو اس سے انہیں کس قدر زندگی کی فراوانیاں مرحمت ہو گئی تھیں ——— (تو کیا ایسا شخص کبھی اس ضابطہ کی صداقت سے انکار کر سکے گا؟ کبھی نہیں) یہی وہ لوگ ہیں جو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔

ان کے برعکس، جو لوگ، اس سے انکار کرتے ہیں، وہ پارٹی سے متعلق ہوں، ان کا ٹھکانا تباہی و بربادی کا جہنم ہے۔ تم (ان لوگوں کے انجام و مآل کے بارے میں) ذرا بھی شک نہ کرو۔ یہ ایک حقیقت ہے جو خدا کے قانون کے مطابق واقع ہو کر رہے گی۔ لیکن اکثر لوگ (ایسے واضح دلائل و براہین کے باوجود) اس کا یقین نہیں کرتے۔

مندرجہ بالا مفہوم سے آیت کے معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ہے:

۱۱
۱۸-۱۹ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ
يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ
الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي
الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ
يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

(یہود و نصاریٰ کے مذہبی پیشوا کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن کے احکام، ان کی شریعت کے خلاف ہیں، اس لئے یہ منجانب اللہ نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے یہ شریعتِ خداوندی کہتے ہیں وہ ان کی خود ساختہ شریعت ہے اور اسے یہ منسوب خدا کی طرف کرتے ہیں۔ سو ذرا غور کرو کہ) اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں دینِ خداوندی کہہ کر پیش کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو عدالتِ خداوندی میں پیش ہوں گے، اور گواہی دینے والے اس کی تصدیق کریں گے کہ انہوں نے فی الواقع اپنے رب کے خلاف بہتان باندھا تھا۔ یاد رکھو! اس قسم کے ظالم، زندگی کی شادابیوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جاتے ہیں (۱۸)۔

ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خود ساختہ مسلک کو، شریعتِ خداوندی کا نام دے

مذہبی پیشواؤں کی فریب کاریاں

کر، لوگوں کو خدا کے سچے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ وخم پیدا کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ مستقبل کی زندگی (حیاتِ اُخروی) پر ایمان ہی نہیں رکھتے (مذہب کو انہوں نے اپنا پیشہ بنا رکھا ہے) (۱۹)۔

مذہبی پیشواؤں کی دسیسہ کاریوں کا ذکر اس سے پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔ یہاں پھر ان کی سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر دینِ خداوندی اپنی اصل شکل میں رہے تو عوام اسے کبھی نہ چھوڑیں۔ لیکن یہ اس میں پیچیدگیاں پیدا کر کے اسے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ یوں یہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں یہ حقائق بیان، تو اس طرح کئے جاتے ہیں جیسے یہ کسی اور مذہب (بالخصوص یہودیت) کی داستان ہو، لیکن یہ کسی خاص قوم یا خاص مذہب سے مختص نہیں۔ یہ ایسے حقائق ہیں جن کا تعلق ہر مذہب اور مذہب پرست قوم سے ہے۔ آپ خود اپنے ہاں مذہبی پیشوائیت کے احوال وکوائف پر نگاہ ڈالیے۔ انہوں نے خارج از قرآن اور غیر از قرآن عقائد، رسوم وعبادات کو اس شدّ ومد سے عام کر رکھا ہے کہ عوام

ہماری مذہبی پیشوائیت

دینِ خالص کو خلافِ اسلام سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کی بات کرتا ہے تو (مذہبی پیشواؤں کے اکسانے پر) عوام اس طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں گویا وہ انہیں دین سے بہکا رہا اور (اپنی طرح) ملحد وبے دین بنا رہا ہے۔ یہ ہوتی ہے مذہبی پیشوائیت کی تکنیک، خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہوں۔ انہی مذاہب میں اب اسلام بھی شامل ہو چکا (یا کر دیا گیا) ہے۔ لہٰذا زیرِ تشریح آیت میں نظر بظاہر بات یہودیت یا عیسائیت کے مذہبی راہنماؤں کی ہو رہی ہے، لیکن درحقیقت یہ ابدی حقائق ہیں جن کا اطلاق ہر قوم اور ہر زمانے کے مذہبی پیشواؤں پر یکساں ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کی دینِ خداوندی کو مٹانے کی مذموم مساعی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ حق اپنے زور دروں سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

(۱۱ / ۲۰-۲۲) أُولَٰٓئِكَ لَمْ يَكُونُوا۟ مُعْجِزِينَ فِى ٱلْأَرْضِ وَمَا كَانَ

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۤءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝

لیکن یہ خدا کے قانونِ مکافات سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ نہ ہی قانونِ خداوندی کے سوا، ان کا کوئی کارساز ہو سکتا ہے۔ (جس قدر ان کی سرکشی بڑھتی جا رہی ہے، اسی نسبت سے) ان کی سزا میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، ایک تو ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور دوسرے اس لئے کہ یہ اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ (انہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایسی حالت پیدا کر لی ہے کہ) نہ ان میں حق بات سننے کی تاب رہی ہے اور نہ ہی یہ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں (۲۰)۔

یہ لوگ، اپنی اس روش سے کسی اور کا کچھ نقصان نہیں کر رہے۔ ان کی افترا پردازیاں سب اکارت چلی جائیں گی (۲۱)۔

(انہیں اس سے کچھ دنیاوی فائدے ضرور حاصل ہو جاتے ہیں لیکن) یہ حقیقت ہے کہ آخرت میں یہ لوگ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ ان کا مستقبل بیحد خراب ہوگا (۲۲)۔

آپ غور کیجئے! دنیا میں جن اقوام نے علم و عقل سے کام لینا شروع کیا، ان میں مذہب یا تو سرے سے مٹ ہی گیا (جیسے روس یا چین) یا اُن کی پرستش گاہوں کی چار دیواری میں محبوس ہو کر رہ گیا (جیسے انگلینڈ وغیرہ) لیکن انہوں نے جب اس آکاس بیل کو اتار پھینکا تو ان کے شجرِ حیات میں برگ و بار آنے شروع ہو گئے اور وہ زمین کی پستیوں سے ابھر کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ لیکن چونکہ (بدقسمتی سے) اُن

کے ہاں خدا کا دین موجود نہیں تھا' اس لئے ان کی یہ تمام کوششیں، طبیعی زندگی تک محدود ہو کر رہ گئیں اور بین الاقوامی رقابتوں کی وجہ سے باہمی فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کا موجب بن گئیں۔ لہٰذا' قرآن نے جو کہا تھا کہ..... لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ○ (۱۱/۲۲) — "آخر کار یہ لوگ سخت خسارے ہی رہیں گے"۔ تو

باہمی فساد انگیزیاں

مذہبی پیشوائیت ان عقل پرستوں کے ہاتھوں لُٹ اور پِٹ گئی' اور عقل پرست' وحی کی روشنی سے محرومی کی وجہ سے تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ جب یہ اس قسم کی ہمت شکن صحرانوردیوں سے تھک جائیں گے تو انہیں وحی کی روشنی کی تلاش ہوگی۔ اُس وقت کاروانِ انسانیت' اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوگا۔ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ — ان عقل پرستوں کا بہرحال انسانیت پر احسان ہے کہ انہوں نے اسے مذہبی پیشوائیت کے فالج سے نجات دلا دی۔ امید ہے کہ اس کے بعد وہ جس سرسام کا شکار ہو گئے ہیں اس سے بھی جلد نجات حاصل کریں گے۔ مغرب کے اربابِ فکر و دانش موجودہ حالات کے ہاتھوں بیحد مضطرب و بے قرار اور وحی کی روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ان کے مقابلہ میں :—

۱۱/۲۳ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○

کامیاب لوگ

ان کے برعکس، جو لوگ' ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے کام سنوارتا ہے۔ اور (اس طرح) اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کے سامنے عملاً سر جھکاتے ہیں' تو یہی لوگ ہیں جو زندگی کی سدا بہار شادابیوں سے بہرہ یاب ہوں گے۔

مذہبی پیشوائیت اور دین کے علمبرداروں کا تقابل ملاحظہ فرمائیے:

۱۱/۲۴ مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ کَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِیْرِ

وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝

عقل کے اندھے

ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرہ ہو اور ایک دیکھنے اور سننے والا۔ کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہوسکتی ہے؟ (۱۹ — ۱۳/۱۶؛ ۱۹/۳۵)۔ کیا اس کے بعد بھی تم سمجھتے سوچتے نہیں (کہ زندگی کی صحیح راہ کونسی ہوسکتی ہے؟)۔

یہاں سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ ایک ثانیہ کے لئے رُکئے اور غور کیجئے کہ مومن اور کفار، اہل جنت اور جہنم کی امتیازی خصوصیات، کیا بتائی گئی ہیں۔ مومن اور اہل جنت دیکھنے اور سننے والے۔ کفار اور اہل جہنم اندھے اور بہرے۔ تقابل عقل اور جہالت کا کیا گیا ہے۔ جب قوم مذہبی پیشوائیت کی پھیلائی

عقل اور جہالت

ہوئی جہالت کی تاریکی سے نکلے گی تو دین کی روشن فضا میں پہنچے گی۔ لہٰذا، دین تک آنے کے لئے قدمِ اوّل، مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ یہ وہ مرحلہ لَاؔ ہے جسے طے کئے بغیر آپ منزلِ اِلَّاؔ میں نہیں پہنچ سکتے أَفَلَا تَذَكَّرُونَ؟ کیا آپ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے؟ مذہب کو چھوڑے بغیر دین اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کعبہ سے "تین سو ساٹھ بت" نکال باہر نہیں کئے جاتے، وہ بیت اللہ (خدا کا گھر) نہیں بن سکتا۔ تاریخی کوائف اس کے شاہد ہیں۔ شروع سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ (مثلاً)

(۱۱ / ۲۵-۲۶) وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ

يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝

(اگر یہ لوگ، ان واضح دلائل کے بعد بھی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، تو پھر ان کے سامنے وہ تیسرا طریق لاؤ (۱۰/۳۹) یعنی ان سے کہو کہ وہ تاریخ کی شہادت پر غور کریں اور دیکھیں کہ جب اقوامِ گذشتہ نے اس حقیقت سے انکار کیا تو ان کی روش کا

نتیجہ کیا برآمد ہوا) (مثلاً) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور اس نے ان سے کہا کہ میں تمہیں واضح طور پر بتانے کے لئے آیا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں (۲۵)۔

تمہیں چاہیئے کہ اپنی روش کو چھوڑ کر صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تمہیں بہت بڑی تباہی گھیر لے گی (۲۶)۔

قرآن کریم سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کرتا ہے۔ اس سورۃ میں حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ (قومِ عاد)، حضرت صالحؑ (قومِ ثمود)، حضرت لوطؑ (قومِ لوط)، حضرت شعیبؑ (قومِ مدین) اور حضرت موسیٰؑ (قومِ فرعون) کا ذکر آیا ہے۔ ہمارا انداز یہ چلا آرہا ہے کہ ان انبیاء یا اقوام کے متعلق جو کچھ پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کی بارِ دیگر تشریح صرف ایسے نکات کی کی جاتی ہے جو پہلے نہ آچکے ہوں۔ یہی انداز زیرِ نظر سورۃ میں اختیار کیا جائے گا۔ داستانِ حضرت نوحؑ تفصیلی طور پر مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحات ۲۴۷-۲۱۷) پر بیان کی جا چکی ہے [اور اختصاراً اس جلد میں زیرِ آیات ۷۴-۱۰/۷۱ میں]۔ جلد پنجم میں ان آیات میں سے بھی بیشتر آچکی ہیں جن کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر ان تمام حضرات کی دعوت کا نقطۂ اساس یہ تھا کہ محکومیت، خدا کے سوا، کسی کی جائز نہیں اور یہ کہ ہم اپنی دعوت و تبلیغ کے لئے کسی معاوضہ کے متمنی نہیں۔ اس تمہید کے بعد اگلی آیات اور ان کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت نوحؑ کی دعوت کے جواب میں سردارانِ قوم نے کہا:

(۱۱/۲۷) فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝

داستانِ قومِ نوحؑ

اس پر، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرداروں نے، جن کے پاس سامانِ زیست کی فراوانی تھی ــــ یعنی صاحبِ دولت و اقتدار

طبقہ جس نے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی — کہاکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے یہ کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو)۔ باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں، تو ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ہم میں ادنیٰ درجے کے (نیچ قوم کے) لوگ ہیں۔ اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رُو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی، بلا سوچے سمجھے، تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں، ہمارے مقابلہ میں، کوئی برتری حاصل ہو۔ لہٰذا، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہو۔

حضرت نوحؑ نے جواب دیا:

۱۱ / ۲۸-۳۰ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

اس پر نوحؑ نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے عطا کردہ علم و بصیرت سے کام لوں۔ اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے، بطور موہبت، ایک ضابطۂ ہدایت دیا ہو جو سرتاسر رحمت ہے۔ لیکن تمہیں ان میں سے کوئی بات بھی نظر نہ آئے اور تم اسے بھی پسند نہ کرو کہ ان حقائق کو تمہیں سمجھا

دیا جائے (تو میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں، جو کر رہا ہوں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم ان باتوں کو زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں (اس لئے کہ ایمان، علم و بصیرت کی رُو سے، بطیب خاطر دل کے فیصلے کا نام ہے۔ اسے یونہی کسی کے گلے منڈھا نہیں جاتا)۔ (۲۸)

طبقاتی طریق خلافِ انسانیّت ہے

پھر اس پر بھی غور کرو کہ میں جو کچھ تمہارے لئے کر رہا ہوں اس کے معاوضہ میں، تم سے کسی مال و دولت کا طالب نہیں (اس لئے مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ تم سے جھوٹ بولوں؟) میری محنتوں کا معاوضہ میرے خدا کے ذمے ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کردوں (کہ تم انہیں رذیل سمجھتے ہو اور ان کے ساتھ مل بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ اگر میں ایسا کروں اور یاد رکھو! کوئی رسول بھی ایسا نہیں کرے گا (مثلاً ۲/۵۲) تو یہ جب اپنے رب سے ملیں گے تو میرے متعلق کیا کہیں گے؟ (یعنی یہ بات، منشائے خداوندی کے سخت خلاف ہوگی) تم انہیں جاہل کہتے ہو، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے جیسی جاہل قوم کوئی ہے ہی نہیں (۲۹)۔

میں اگر تمہاری خاطر، ان لوگوں کو ہنکا کر الگ کردوں تو (تم اس سے بیشک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ) قانونِ خداوندی کی رُو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہوگی، اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ وہ کون ہے جو قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے؟ (۳۰)

تم نے جو اعتراض کیا تھا کہ "تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو" تو اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں کوئی فوق البشر ہستی ہوں اور مجھے فوق الفطرت قوتیں حاصل ہیں۔

(۱۱/۳۱) وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ

تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ؕ اَللّٰهُ

اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

(باقی رہا تمہارا یہ اعتراض کہ میں تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں، تم پر کوئی معاشی برتری بھی حاصل نہیں۔ تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ) میرے پاس اللہ کے دیے ہوئے دولت کے خزانے ہیں اور میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور یہ کہ میں (انسان نہیں بلکہ) فرشتہ ہوں۔ میں نے یہ کچھ بھی نہیں کہا۔ البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ تم جو سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور رذیل خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل اور رذیل ہیں، اور انہیں اس کے ہاں سے خوشگواری اور بہتری کا سامان نہیں مل سکتا۔ یہ غلط ہے۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے، معیارِ عزت و تکریم اور استحقاقِ خیر و برکت انسان کے ذاتی جوہر ہیں۔ اس کی نگاہ ظاہری پوزیشن پر نہیں، بلکہ ان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر اس باب میں، میں تم سے متفق ہو جاؤں، تو میں بھی ان میں سے ہو جاؤں گا جو خدا کے قائم کردہ معیار سے سرکشی برتتے ہیں۔

مخالفین کے پاس اس کا کچھ جواب نہیں تھا۔ انہوں نے چڑ کر کہا:

۱۱/۳۲ قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا

بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝

اے نوحؑ! تم نے ہم سے مفت کا جھگڑا شروع کر دیا اور اس میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ اب اس قصہ کو ختم کرو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو جس تباہی کی تم بار بار دھمکیاں دیتے ہو، اسے آؤ۔

وہی مطالبہ کہ تم سچے ہو تو جس تباہی سے تم ہمیں بار بار ڈراتے ہو، اسے وارد کرو!

۱۱/۳۳-۳۵ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ

بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ۭ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ۧ

نوحؑ نے کہا کہ اس تباہی کا لانا یا نہ لانا میرے اختیار میں نہیں۔ وہ تو خدا کے قانون کے مطابق آ کے گی۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ضرور آ کر رہے گی۔ تم قانونِ خداوندی کو عاجز اور بے بس نہیں کر سکتے کہ اس کی رُو سے جو کچھ ہونا ہے، وہ نہ ہو سکے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اگر تم نے اپنے آپ کو اپنے اعمال کی وجہ سے، عذاب خداوندی کا مستوجب بنالیا، تو پھر اگر میں بھی ہزار چاہوں کہ تمہارے چاکِ داماں کی رفوگری کروں تو ایسا نہیں کر سکوں گا۔ اُس وقت میری غمخواری بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی۔ تمہارا آقا اور مالک خدا ہے، میں نہیں۔ اور تمہارا ہر قدم اُس کی طرف اٹھ رہا ہے۔ تمہارے تمام اعمال کے نتائج اُس کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوں گے (اس میں، میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا)۔

(خدا نے کہا: اے نوحؑ! کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے یہ باتیں از خود وضع کر لی ہیں اور انہیں خدا کی طرف غلط منسوب کرتے ہو؟ ان سے کہہ دو کہ اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میرا جرم مجھ پر ہے (تم سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی) اور جرائم تم کر رہے ہو، ان کی پاداش تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں (تم یہ کہہ کر مطمئن نہ ہو جاؤ کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرا خود ساختہ ہے تم یہ دیکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ کیسا ہے؟) (۳۵)۔

اس بحث و جدل کی آخری منزل قریب تر آگئی:

۱۱
۳۹-۳۶ وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

کشتی سازی

اس مقام پر نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ جو لوگ اس وقت ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اور کوئی ایمان نہیں لائے گا. لہٰذا جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس پر تم اس کا غم نہ کھاؤ. تمہاری غم خواریاں اور جاں گدازیاں، ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں گی. اب وقت آگیا ہے کہ تم ان سے الگ ہو جاؤ (۳۶).

اب تم ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنانا شروع کر دو اور دیکھو ان سرکشوں کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا. اس لئے کہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کی تباہی مسلّم ہو چکی ہے. یہ سب غرق کر دیے جائیں گے (۲۳/۲۷) ــــ (۳۷)

چنانچہ انہوں نے کشتی بنانی شروع کر دی. اُس کی قوم کے سردار جب اُدھر سے گزرتے اور اسے کشتی بناتے دیکھتے، تو اس کا تمسخر اڑاتے. اس کے جواب میں نوحؑ ان سے کہتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑانا چاہتے ہو تو اڑا لو. جس طرح تم آج ہماری ہنسی

اڑاتے ہو، ایک وقت آئے گا کہ ہم اسی طرح تمہاری حماقتوں پر ہنسیں گے۔ (۳۸)
اور اِس میں زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔ تم عنقریب دیکھ لوگے کہ وہ عذاب کس
پر آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا۔ اور وہ وقتی عذاب نہیں ہوگا، ہمیشہ کے لئے
نیست و نابود کر دینے والا ہوگا۔ (۳۹)

جزائے اعمال اگرچہ یہ نکات جلد پنجم میں بھی آچکے ہیں، لیکن ان کی اہمیت کے پیشِ نظر، مختصر الفاظ میں ان کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کو تباہی سے محفوظ رکھنے کا جو وعدہ کیا گیا تو اس کے لئے طبیعی ذریعہ (کشتی) اختیار کیا گیا۔ کسی فوق الفطرت ذریعہ سے انہیں محفوظ نہیں رکھا گیا۔

دوسرے یہ کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بناتے دیکھ کر مخالفین ان سے تمسخر کرتے تھے۔ اگر وہ اس پر غور و فکر کر کے انہی کی طرح کشتی بنا لیتے تو وہ بھی محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ جو تباہی طبیعی اسباب کے ذریعے آتی ہے (مثلاً سیلاب)، اس سے حفاظت طبیعی اسباب (کشتی) کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

تیسرے یہ کہ اُس زمانے میں انسان کی تمدّنی حالت ایسی تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی وحی کے ذریعے سکھائی گئی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کی تحقیقات کی رُو سے زمانہ قبل از تاریخ کی اقوام کے ہاں سے جو بعض نادر اشیاء برآمد ہوتی ہیں، ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ان کا علم اُن انبیاء کی وساطت سے ہوا ہوگا جو اُن کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ بعد میں اُن انبیاء کے تذکرے تو محو ہو گئے یا انہوں نے مسخ ہو کر افسانوی یا توہم پرستانہ حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن وہ معلومات روایتی طور پر آگے منتقل ہوتی رہیں۔ عصرِ حاضر کی اثری تحقیقات اور حضریات کے دوران ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں پہنچ کر محققین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اُس دَور کے انسانوں نے یہ کچھ کیسے کر لیا! ایسے مقامات پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نوادرات کا سرچشمہ علمِ وحی تھا۔

پھر تباہی کا وقت آ گیا:

(۱۱ / ۴۰ - ۴۱) حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا
مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ

الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝ وَ
قَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ
رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

(چونکہ اُن لوگوں نے اپنا یہ شیوہ بنا لیا تھا کہ نوحؑ کی ہر بات کی مخالفت کی جائے اور ہر معاملہ میں اُن کی ہنسی اڑائی جائے، اس لئے انہوں نے نوحؑ کی کشتی سازی کے معاملہ پر بھی سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ ورنہ اگر وہ عقل و فکر سے ذرا کام لیتے اور جس طرح نوحؑ انہیں آنے والے خطرہ سے آگاہ کر رہا تھا اُس کی بات پر کان دھرتے، تو وہ ایسا نہ کرتے۔ بہرحال، وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے تا آنکہ) جب قانونِ خداوندی کے مطابق وقت آ گیا تو ارد گرد کے پہاڑوں سے بارش کا پانی جوش مارتا ہوا، وادی میں آنا شروع ہو گیا (۱۱/۴۴) اور اس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ ہم نے نوحؑ سے کہا کہ ہر ضرورت کی شے کے دو دو جوڑے اپنے ساتھ کشتی میں رکھ لو اور اپنے "اہل و عیال" کو بھی اپنے ساتھ لے لو، بجز اُن کے جن کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے کہ وہ اپنی غلط روش کی بنا پر عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں (یعنی نوحؑ کا بیٹا (۱۱/۴۵) اور ان کی بیوی (۶۶/۱۰)۔ نیز اُن لوگوں کو بھی ساتھ لے لو جو ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ (۴۰)۔

اپنوں اور بیگانوں کا معیار

چنانچہ نوحؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ (انہوں نے پوچھا کہ جانا کہاں ہے؟ اس پر نوحؑ نے کہا کہ اس کی بات مت پوچھو۔ تم سوار ہونے کی کرو)۔ اس کشتی کو اللہ کے نام پر چلنا ہے اور اُسی کے نام سے رُکنا ہے۔ (یہ سب کچھ اس کی وحی کے مطابق ہو رہا ہے۔ البتہ اس کا یقین رکھو کہ اس سے کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ) خدا کا قانونِ ربوبیت (جس کے مطابق یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے) اپنے اندر سامانِ حفاظت اور ذرائع پرورش، سب کچھ رکھتا ہے (۴۱)۔

اس مقام پر "اپنوں اور بیگانوں" کے ابدی معیار کو پھر دہرایا گیا، یعنی اپنے وہ جو ایمان کے رشتے کے ساتھ منسلک ہوں. بیگانے وہ جو ان اقدار میں شریک نہ ہوں، خواہ وہ اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۱ ۴۲-۴۳

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰى
نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا
وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ○ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ
يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ
اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ
فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ○

چنانچہ (وہ چل پڑے) ان کی کشتی انہیں ایسی تلاطم انگیز موجوں میں (بحفاظت) لئے جارہی تھی جو پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھیں.

پسرِ نوحؑ

(کشتی کے روانہ ہونے سے پہلے) نوحؑ نے اپنے بیٹے کو آواز دی، جو اس کی جماعت میں شامل نہیں ہوا تھا، کہ بیٹا! تم بھی ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور ان انکار کرنے والوں کا ساتھ چھوڑ دو (۴۲)۔

اس نے کہا کہ (تم جاؤ. میں تمہارے ساتھ جانا نہیں چاہتا. ایسا ہی ہوگا تو) میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جو مجھے سیلاب سے بچا لے گا. اس پر نوحؑ نے کہا کہ بیٹا! تم غلط فہمی میں مبتلا ہو. آج اس طوفان سے، جو خدا کے قانون کے مطابق آرہا ہے، کوئی بچانے والا نہیں. اس سے وہی بچ سکے گا جو خدا پر ایمان لا کر اس کی رحمت کے دامن میں پناہ لے لے۔

اتنی بات ہوئی تھی کہ دونوں کے درمیان ایک بلند موج حائل ہوگئی اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ ڈوب گیا (۴۳)۔

پانی تھم گیا:

11/44 وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقۡلِعِي وَغِيضَ
ٱلۡمَآءُ وَقُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ وَٱسۡتَوَتۡ عَلَى ٱلۡجُودِيِّۖ وَ
قِيلَ بُعۡدٗا لِّلۡقَوۡمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝

اور پھر (اللہ کا حکم ہوا کہ) اے زمین! تو اپنا پانی پی لے اور اے بادلو! تم تھم جاؤ۔ چنانچہ پانی کا چڑھاؤ اُتر گیا اور یوں وہ حادثہ ختم ہو گیا اور نوحؑ کی کشتی، صحیح و سلامت، جودی پر ٹھہر گئی۔ اور جماعتِ مومنین کو بتا دیا کہ وہ ظالم (جو تمہیں اس طرح تنگ کیا کرتے تھے) زندگی اور اس کی کامرانیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

حضرت نوحؑ کے بیٹے کی غرقابی کا واقعہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لیکن حضرت نوحؑ یہ بات سمجھنا چاہتے تھے کہ جب خدا نے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ حضرت نوحؑ کے اہل بچا لیے جائیں گے تو ان کا بیٹا، جو ان کے اہل میں سے تھا، اسے کیوں نہ بچایا گیا؟ حضرت نوحؑ کا یہ سوال اسی طرح اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لئے تھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے یہ سوال کیا تھا کہ مجھے دکھا کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے؟ (تفصیل مطالبِ الفرقان، جلد دوم، صـ۲۷۴ اور جلد سوم، صـ۴۵۵ پر گزر چکی ہے)۔

11/45-47 وَنَادَىٰ نُوحٞ رَّبَّهُۥ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي
وَإِنَّ وَعۡدَكَ ٱلۡحَقُّ وَأَنتَ أَحۡكَمُ ٱلۡحَٰكِمِينَ ۝ قَالَ
يَٰنُوحُ إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَۖ إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيۡرُ صَٰلِحٖۖ
فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌۖ إِنِّيٓ أَعِظُكَ
أَن تَكُونَ مِنَ ٱلۡجَٰهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ

اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَ تَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ○

جب یوں اطمینان ہو گیا تو نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میرا بیٹا میرے اہل سے تھا اور تیرا وعدہ تھا کہ میرے اہل کو بچا لیا جائے گا اور تیرے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں اور تیرے اوپر کوئی حاکم بھی نہیں جو تیرے فیصلوں کو بدل دے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر، میرے بیٹے کو تو محفوظ رہنا چاہیئے تھا۔ وہ کیوں غرق کر دیا گیا! (۴۵)

"اَھْلُ" کا قرآنی مفہوم

اس پر خدا نے کہا کہ اے نوحؑ! تو نے "اھل" کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ وہ بیشک تیرا بیٹا تھا، لیکن وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا (تیرے اہل میں سے وہی ہو سکتے ہیں جن کے اعمال صالح ہوں) اور اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ ("اپنے" اور "بیگانے" کا یہ وہ معیار ہے جس کا تجھے علم نہیں تھا) لہٰذا، تجھے اس چیز کا مجھ سے مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے جس کا تجھے علم نہ ہو۔ میں تمہیں ان باتوں کی اس لئے نصیحت کرتا ہوں کہ تمہیں حقائق کا علم ہو جائے (۴۶)۔

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میں اگر تجھ سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ کر بیٹھتا ہوں جس کا مجھے علم نہیں ہوتا (تو تو جانتا ہے کہ محض ناواقفیت کی بنا پر ہوتا ہے، کسی اور خیال سے نہیں ہوتا)۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ ان امور میں تیری شفقت اور رافت میری پوری طرح دیکھ بھال کرتی رہے گی۔ اگر تیری طرف سے مجھے سامانِ حفاظت اور پرورش نہ ملا تو میں برباد ہو جاؤں گا (۴۷)۔

یوں حضرت نوحؑ اور اُن کے ساتھیوں کو امن و سلامتی کے ساتھ زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہو گئیں۔

۱۱/۴۸ قِيۡلَ يٰـنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ‌ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ

يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ہم نے کہا کہ اے نوحؑ! اب کشتی سے اتر پڑو کیونکہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا. (شاید تمہارے ساتھیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جو زمین اتنے دنوں تک غرقاب رہی ہے اس میں سامانِ زندگی کہاں سے ملے گا سو اس بات کی فکر نہ کرو. تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو سامانِ زیست بڑی فراوانی سے ملے گا. باقی رہیں وہ جماعتیں جو تمہارا ساتھ

رزق سب کے لئے

نہیں دیں گی' سو ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق انہیں بھی دنیاوی زندگی میں سامانِ زیست ملے گا' لیکن ان کا مستقبل تاریک ہو گا اور وہ آخر الامر دردناک تباہی میں مبتلا ہوں گے. (۱۶۱- ۱۵/۱۱؛ ۱۶- ۱۵/۱۷؛ ۲۰/ ۳۲؛ ۲۰/ ۴۶؛ ۲/۱۲۶).

یہ جو کہا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین کو تو سامانِ رزق ملے گا ہی' لیکن اس نظام کے مخالفین بھی اس سے محروم نہیں رہیں گے' تو اس کے متعلق ان مقامات پر وضاحت کی گئی ہے جن کے حوالے مندرجہ بالا مفہوم کے آخر میں دیئے گئے ہیں. قریب ترین اس جلد کے سابقہ صفحات پر زیرِ آیات (۱۶۱- ۱۵/۱۱) دیکھئے.

ان کوائف کو بیان کرنے کے بعد کہا:

۱۱/۴۹ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ ع

اے رسولؐ! یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم تمہیں بذریعہ وحی بتا رہے ہیں. غیب اس لئے کہ اس سے پہلے تم یا تمہاری قوم' ان تفاصیل سے واقف نہیں تھی. اور بتا اس لئے رہے ہیں کہ تاریخ کے ان نوشتوں سے تمہارے دل کو تقویت حاصل ہو کہ ابتداً کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے' آخر الامر کامیابی اسی جماعت کی ہوتی

ہے جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرے۔ جب حقیقت یہ ہے تو تم نہایت استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو۔ تمہاری کامیابی یقینی ہے۔

انبیاء سابقہ کی سرگذشتیں اہلِ کتاب کے صحیفوں میں بھی تھیں اور عرب بھی ان سے آشنا تھے۔ لیکن وہ اس قدر مسخ شدہ حالت میں تھیں کہ ان سے نہ صرف یہ کہ تاریخی شواہد کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا' بلکہ وہ انبیاء کرامؑ کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرتی تھیں جنہیں دیکھ کر حیا' شرم کے مارے گردن جھکا لے۔ وہ کوائف صحیح شکل میں وحی کی رو سے' قرآن میں مذکور ہوئے' تو بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

آیت کا آخری حصہ اس مقصد کو نمایاں طور پر سامنے لے آیا جس کے لئے انبیاءِ سابقہ اور اقوامِ سابقہ کی داستانیں پیش کی گئی ہیں۔ رسول اللہ سے کہا گیا کہ مخالفتوں کا یہ ہجوم جس کا مقابلہ آپ کو کرنا پڑ رہا ہے' کوئی نئی بات نہیں۔ ہر رسول کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس مخالفت کو نہایت استقامت سے برداشت کیا۔ اس لئے فَاصْبِرْ تم بھی ہمت اور استقامت سے ان کا مقابلہ کرو اور جماعتِ مومنین سے بھی کہو کہ وہ حوصلہ نہ ہاریں۔ یہ تاریخی شواہد بتا رہے ہیں کہ آخر الامر کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اس راستے پر جم کر کھڑے رہیں۔ انجام کار وہی کامیاب و کامران ہوں گے۔

قومِ عاد (حضرت ہودؑ)

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی داستان سامنے آتی ہے جو قومِ عاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ داستان تفصیلی طور پر' مطالب الفرقان' جلد پنجم (صفحات ص۲۴۷ تا ص۲۶۴) میں بیان ہو چکی ہے ہم اپنے معمول کے مطابق' سورۃ ہود کی متعلقہ آیات مع مفہوم درج ذیل کرتے ہیں:

(۱۱ / ۵۰ - ۵۱) وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ○

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى الَّذِىْ فَطَرَنِىْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

اسی طرح، قومِ عاد کی طرف، ان کے بھائی بندوں میں سے، ہودؑ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے ان سے کہا کہ اے میری قوم! تم صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار نہیں۔ اس لئے تمہارا الٰہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم اس کے علاوہ کوئی اور عقیدہ رکھتے ہو، تو وہ تمہارا خود ساختہ من گھڑت مذہب ہے۔ (۱۱/۵۹ ؛ ۲۶/۱۲۷ ؛ ۴۶/۲۱ ؛ ۴۱/۱۵)۔ (۵۰)

اے میری قوم! میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اور تمہاری بہبود کے لئے جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، اس کے لئے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا اجر و معاوضہ اُس خدا کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام لو تو یہ بات بآسانی تمہاری سمجھ میں آجائے کہ جس بات میں ایک شخص کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو، وہ اخلاص ہی پر مبنی ہو گی)۔ (۵۱)۔

وہی پیغامِ ازلی یعنی محکومیت صرف اللہ کی اختیار کرو اور تبلیغ کے صلہ میں مَیں تم سے کسی معاوضہ کا خواہاں نہیں، بے لوث بہی خواہی ــــ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ نے اس حقیقت کو بھی دہرا دیا کہ یہ تعلیم، علم و عقل کی بنا پر پیش کی جا رہی ہے۔

اس کا مقصد:

۱۱/۵۲ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنی غلط روش کی وجہ سے آنے والی تباہی سے بچنے کے

لئے قوانین خداوندی سے حفاظت طلب کرو اور اپنے تمام باطل عقائد چھوڑ کر اس کی طرف لوٹ آؤ۔ تم اس کی شانِ ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح تمہاری خشک زمینوں کو بارش سے سیراب کرتا ہے جس سے تمہاری قوتیں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی اطاعت کر کے اپنی شکرگزاری کا ثبوت دو، نہ یہ کہ الٹا ظلم و ستم پر اتر آؤ اور مجرمین کی طرح اس کے قوانین سے منہ موڑ لو۔

قوم کا جواب:

۱۱/۵۳ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

انہوں نے ہودؑ سے کہا کہ تم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جسے ہم واقعی محکم دلیل سمجھیں۔ ہم اپنے معبودوں کو محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔

اگلی آیت کے پہلے حصہ میں ان کی طرف سے بڑا طنز آمیز نشتر چھوڑا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں حضرت ہودؑ کی طرف سے جواب تو ایک طرف اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا۔

۱۱/۵۴ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

ہمیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ (تم نے جو ہمارے معبودوں کی گستاخی کی ہے تو) تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے (جو تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ اس سے پہلے تم اچھے بھلے تھے)۔

اس کے جواب میں ہودؑ نے صرف اتنا کہا ۔ اور اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں سے اور کہا بھی کیا جاتا ! ۔ کہ میں اس پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ تم غیر اللہ میں سے جس جس کو اس کا شریک قرار دیتے ہو، میں ان سے یکسر بیزار ہوں.

اس کے بعد چیلنج کہ تم جو بھی چاہو کر دیکھو، مجھے خدا کے قوانین پر پورا پورا اعتماد ہے کہ آخر الامر کامیابی حق کی ہو گی جس کا میں علمبردار ہوں.

۱۱/۵۵-۵۶ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ○ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

تم جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے ہو، سب کے سب مل کر کر لو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو. (اس کے بعد دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے !) (۵۵)

میرا بھروسا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے جو بڑا ہی محکم گیر اور قابلِ اعتماد ہے ۔ اُس خدا کا قانون جو میرا اور تمہارا سب کا نشو و نما دینے والا ہے. تم تو ایک طرف رہے، کائنات میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جو اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے باہر ہو. میرا خدا (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدوش راہ پر ہے. (لہٰذا تم بھی اسی راہ پر چلو ۔ ۵/۱۱؛ ۱۲۷ ـ ۶/۱۲۶؛ ۱۵۴ ـ ۶/۱۵۳؛ ۴۲/۵۳) ۔ (۵۶) ۔

آیت کے آخر میں ہے : اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ اس کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد اوّل (ر) صفحات ۴۶-۴۷، ۹۸-۹۹ پر بیان ہو چکا ہے. اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے.

اور اس کے بعد ان کی غلط روش کے انجام کی نشاندہی؛

۱۱/۵۷ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ۝

اگر تم اس راہ سے رُوگردانی کرو گے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔ میرے ذمے فقط اتنا تھا کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ سو اسے میں نے پہنچا دیا۔ اب تم دیکھو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات (تمہیں کس طرح تباہ و برباد کر کے) تمہاری جگہ ایک ایسی قوم لے آتا ہے جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (۳۹ - ۹/۳۸؛ ۴۷/۳۸)۔ تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز کا نگران حال ہے۔

استبدالِ قومی

خدا کے قانونِ استبدال و استخلافِ قومی کا ذکر سابقہ جلدوں میں آچکا ہے انڈکس سے حوالے مل جائیں گے۔
وہ اپنی غلط روی سے باز نہ آئے اور تباہ ہو گئے۔

11/58 وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ۝

چنانچہ جب اس قوم کی غلط روش کے نتائج برآمد ہونے کا وقت آگیا، تو ہم نے ہودؑ اور اس کے ساتھیوں کو جو خدا پر ایمان لاتے تھے، اپنی رحمت سے اس سخت عذاب سے محفوظ رکھا (جس میں وہ قوم مبتلا ہونے والی تھی)۔

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کی تباہی کس طور پر واقع ہوئی۔ مطالب الفرقان، جلد پنجم، ص۲۶۱ پر بتایا گیا ہے کہ ایک تباہ کن جھکڑ نے ان کی بستیوں کو تہ و بالا کر دیا تھا۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا جُرم کیا تھا جس کی پاداش (یا نتیجہ) میں ان پر تباہی مسلط ہو گئی فرمایا:

11/59 وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝

یہ ہے سرگذشت قوم عاد کی، جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس

کے رسولوں (کی دعوت) سے سرکشی برتی اور اپنے ان سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔

مستبد حکّام کی اطاعت ان کے حکام مستبد، جابر اور سرکش تھے۔ اُن کا یہ جرم تھا اور قوم کا جُرم یہ تھا کہ وہ اس قسم کے حکّام کی اطاعت کرتی تھی۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر بتایا ہے کہ جہنم میں مستبد حکمران اور اُن کی اطاعت کرنے والے عوام، نیز مذہبی پیشوا اور اُن کے متبعین ایک دوسرے کو ملعون کریں گے کہ وہ اُن کی وجہ سے ہی اِس عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ وہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مستبد حکّام کی اطاعت کرنے والی قوم عذاب میں کیوں مبتلا ہوتی ہے تفصیل ان امور کی مطالب الفرقان، جلد چہارم صـ ۵۴۹ اور جلد پنجم (صـ ۱۹۲) پر ملے گی۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو قومیں اِس دنیا میں تباہ ہوتی ہیں، وہ آخرت میں بھی مبتلائے عذاب ہوتی ہیں؛

۱۱/۶۰ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۠

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حال اور مستقبل، دونوں کی زندگی میں نوازشاتِ خداوندی سے محروم رہ گئے۔ یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے انکار کیا تھا ——— دیکھو! قوم عاد کس طرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئی!

قومِ ثمود (حضرت صالحؑ)

قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود کا تذکرہ سامنے آتا ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوتے تھے۔ اُن کی تفصیلی داستان مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۲۶۵ لغایت ۲۸۹ پر آچکی ہے۔ اس جگہ ہم حسب

معمول، سورۃ ہود کی متعلقہ آیات سے مفہوم پیش کریں گے۔

۱۱/۶۱ وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝

اسی طرح قومِ ثمود کی طرف ' ان کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیّت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس نے تمہیں اس ملک میں اٹھا کھڑا کیا اور اچھی طرح آباد کیا۔ تمہیں چاہیئے کہ تمہاری غلط روش کی بنا پر جو تباہی تم پر آنے والی ہے' اُس سے بچنے کے لئے' خدا کے قوانین سے حفاظت طلب کرو۔ ہر طرف سے مُنہ موڑ کر' اس کی طرف رجوع کرو اور یوں اُس کی رحمت کے سائے تلے آجاؤ۔ یاد رکھو! وہ تم سے دُور نہیں' قریب ہے اور تمہاری ہر پکار کا جواب دیتا ہے (۲/۱۸۶)۔

پیغام کا بنیادی نکتہ وہی ہے کہ محکومیّت صرف خدا کی جائز ہے' اور کسی کی نہیں۔

قوم کا جواب:

۱۱/۶۲ قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝

انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں (کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے' ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اپنی قابلیت

سے اس مذہب کو دُور دُور تک پھیلاؤ گے۔ لیکن تم نے ایسی باتیں شروع کر دی ہیں جن سے ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو سہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے)۔

قوم کے جواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت صالحؑ اپنی قوم میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ایک حضرت صالحؑ ہی نہیں، تمام حضرات انبیاء کرامؑ کی یہی کیفیت تھی کہ اپنی دعوتِ نبوی سے پہلے قوم میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حضور نبی اکرمؐ نے تو اپنی زمانۂ قبل از نبوت کی زندگی کو اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کیا تھا (۱۰/۱۶)۔ یہ وجہ ہے جو قوم ان کے دعویٰ کی مخالفت کے باوجود اُن پر جلدی سے ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر پاتی تھی۔ اس سے واضح ہے کہ جو شخص بھی کسی تحریک کی قیادت کے لئے اٹھے، تو ضروری ہے کہ اپنے سابقہ کردار کی بنا پر قوم میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو۔

باقی رہی مخالفت کی وجہ! سو وہ وہی تقلیدِ اسلاف! حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی تباہی کا باعث یہ ذہنیت ہوتی ہے کہ پیشِ نظر معاملہ پر علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے غور کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے، اسے اس بنا پر مسترد کر دیا جائے کہ وہ اُن کے اسلاف کی روش کے خلاف ہے (انڈکس میں 'تقلید' کا عنوان دیکھئے)۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے فرمایا؛

(۶۳/۱۱) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ

کہ اے میری قوم! کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خدا نے مجھے وحی جیسی نعمت

کبریٰ سے نوازا ہے اور اس کی بنا پر میں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی دینے والی روشن قندیل لئے کھڑا ہوں، اگر اس کے باوجود میں اس کے احکام سے سرکشی اختیار کروں، تو مجھے اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کون بچائے گا؟ تم جو کچھ مجھ سے چاہتے ہو، اس سے تم میرے بھلے کی بات نہیں کرتے بلکہ سراسر تباہی کی طرف لے جاتے ہو۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد پنجم میں بتایا جا چکا ہے، اُس قوم میں جاگیردارانہ معاشی نظام رائج تھا اور حضرت صالحؑ اُس کی جگہ نظامِ ربوبیّت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سورۃ میں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت صالحؑ نے قوم سے کہا:

۱۱/۶۴ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ○

نَاقَةُ اللّٰهِ

(تم نے اس سامانِ رزق پر، جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے، اور جو تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے، حد بندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ تم غریبوں اور کمزوروں کے جانوروں تک کو نہ کھلی زمین میں چرنے چگنے دیتے ہو، نہ چشموں سے پانی پینے دیتے ہو۔ تم نے انہیں اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ دیکھو!) یہ ایک اونٹنی ہے۔ تم اس کے متعلق یہ نہ دیکھو کہ یہ کس کی اونٹنی ہے۔ کسی سردار کی ہے یا غریب آدمی کی۔ بس یہ سمجھو کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے اور یہ اُسی کی اونٹنی ہے۔ دوسری طرف یہ زمین ہے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، اس لئے وہ کسی کی ذاتی ملکیّت نہیں ہو سکتی۔ میں اس اللہ کی اونٹنی کو اللہ کی زمین میں کھلے چھوڑتا ہوں تاکہ یہ اس میں چرے پھرے (اور اپنی باری پر

پانی پیئے (۹۱/۱۳)۔ اگر تم نے اسے اس طرح چرنے چگنے دیا تو یہ اس امر کی نشانی ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز آجانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن اگر تم نے اسے نقصان پہنچایا تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ تم اپنی روش کو چھوڑنے والے نہیں۔ اس کے بعد تم پر تباہی کا وہ عذاب آجائے گا جس کے ظہور کا وقت کچھ دور نہیں۔ میری آنکھیں اسے بہت قریب دیکھ رہی ہیں۔

قوم نے عہد کیا کہ وہ اس نظام کے پابند رہیں گے جس میں تمام لوگوں کے مویشیوں کو، چراگاہوں سے متمتع ہونے کی یکساں اجازت ہوگی۔ لیکن وہ اس عہد کے پابند نہ رہے۔

۱۱/۶۵ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝

انہوں نے اُس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالحؑ نے کہا کہ تم اپنے گھروں میں تین دن تک اور بس لو۔ اس کے بعد تم پر تباہی آجائے گی۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوگا۔ (چونکہ وہ صالحؑ کی کسی بات کو سچا نہیں مانتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے محض دھمکی سمجھا)۔

یہ تین دن کا وقفہ، آخری مہلت تھی کہ شاید وہ اپنے کئے پر نادم ہو جائیں اور صحیح راہ اختیار کر لیں لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا اور تباہی کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔

۱۱/۶۶-۶۷ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے صالحؑ کو اور ان کے ساتھیوں کو جو صاحبِ

ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اُس رُسوا کُن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقت ور اور غالب رہنے والا ہے (۶۶)۔

اور اُن سرکش لوگوں کو ایک زور کی کڑک (اور زلزلہ ۷/۷۸) نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے (۱۵-۱۴/۹۱)۔ (۶۷)۔

اُن کے گھر اس طرح ویران ہوئے کہ:

(۱۱/۶۸) كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ۝

گویا وہ لوگ کبھی بھی ان میں بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو! ثمود نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئے۔

قومِ لُوط

قومِ لوطؑ کی داستان بھی مطالب الفرقان، جلد پنجم میں آچکی ہے (دیکھئے صفحات ۲۹۰ تا ۳۰۹)۔

یہ داستان جہاں جہاں بھی بیان ہوئی ہے، اس کا آغاز ان "مہمانوں" کے تعارف سے کیا گیا ہے جو پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے۔ [مثلاً (۵۶-۵۱/۱۵؛ ۳۴-۳۱/۲۹؛ ۳۰-۲۴/۵۱)] — مطالب الفرقان، جلد پنجم (ص ۳۰۶) میں بھی ان مہمانوں کا ذکر ہے۔ یہاں بھی آغازِ سخن انہی کی آمد سے ہوتا ہے۔

(۱۱/۶۹) وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَٰهِيمَ بِٱلْبُشْرَىٰ قَالُوا۟ سَلَـٰمًا ۖ قَالَ سَلَـٰمٌ ۖ فَمَا لَبِثَ أَن جَآءَ بِعِجْلٍ

حَنِيذٍ ○

(اور اسی طرح قوم لوط کی تباہی ہوئی. ان کا قصہ یوں ہے کہ) خدا نے اپنے فرستادگان ابراہیمؑ کی طرف بھیجے جنہوں نے اسے خوشخبری دی (جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے). انہوں نے ابراہیمؑ کو سلامتی کی دُعا دی جس کے جواب میں ابراہیمؑ نے بھی ویسی ہی دُعا دی اور اس کے بعد بلاتوقف ان کے لئے ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آیا کہ مہمانوں کی تواضع کی جائے۔
لیکن انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔

11/70 فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَيۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ‌ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمِ لُوۡطٍ ○

لیکن اس نے دیکھا کہ وہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ اس سے وہ اُن کی طرف سے بدگمان سا ہوا اور دل میں خطرہ محسوس کیا۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس ملک کا دستور تھا کہ جو کسی کے ہاں بُرے ارادے سے آتے، وہ اُس کے ہاں کھانا نہیں کھاتا تھا) جب انہوں نے ابراہیمؑ کے ان وسواس کو محسوس کیا تو اُس سے کہا کہ ڈرو نہیں ہم قوم لُوط کی طرف بھیجے گئے ہیں (تاکہ ان کی تباہی سے پہلے اتمامِ حجت ہو جائے جس طرح ثمود کی تباہی سے پہلے ناقہ صالحؑ کے ذریعے اتمامِ حجت ہوا تھا (۲۷/۵۴) ۔ (۷۰)

اس کے بعد تین آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں اولاد کی بشارت کا ذکر ہے۔ اس کا داستان لُوط کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ یہی مہمان حضرت لُوطؑ کی طرف بھی گئے تھے۔

١١/٧١-٧٣ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ
وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى
ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا
لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ
رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ
حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

ابراہیمؑ کی بیوی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے یہ سُنکر اطمینان ہوا اور وہ جی میں خوش ہوئی کہ خطرہ کی بات کوئی نہیں۔ عین اُس وقت ہم نے اُسے اسحٰقؑ کی پیدائش کی خبر دی اور یہ بھی کہ اسحٰقؑ کے بعد اُن کے ہاں اُن کا پوتا یعقوبؑ پیدا ہوگا۔ اور اِس طرح اُس سرزمین پر (قومِ لوط کی تباہی کے بعد) اُن کی نسل پھیل جائے گی (۷۱)

اِس پر ابراہیمؑ کی بیوی نے کہا کہ یہ تو بڑی تعجب انگیز — اور میرے لئے مجوب کُن — بات ہے کہ میرے ہاں اس عمر میں جبکہ میں اس قدر سن رسیدہ ہو چکی ہوں، اولاد ہوگی اور یہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں اولاد کا ہونا حیرت انگیز سی بات ہے (۲۱/۹۰) — (۷۲)۔

اس پر انہوں نے کہا کہ تم اللہ کے کاموں پر تعجب کیوں کرتی ہو؟ اے اہلِ خانہ! یہ تو تمہارے لئے خدا کی رحمت اور برکت کی خوش خبریاں ہیں۔ اس کی رحمتوں ہی سے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر سزاوارِ حمد و ستائش اور کس قدر فراوانیاں عطا کرنے والا ہے (۵۱/۲۹) — (۷۳)

اولاد کی بشارت

(ضمناً) جہاں تک بڑھاپے میں اولاد پیدا ہونے کا تعلق ہے قرآن کریم نے اس کی وضاحت حضرت ذکریاؑ کے قصے میں کر دی ہے۔ انہیں بھی

بڑھاپے میں بیٹے (حضرت یحییٰؑ) کی پیدائش کی بشارت دی گئی تھی تو انہیں تعجب ہوا تھا. قرآن کریم نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ اُن کے ہاں اولاد نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیوی میں کوئی طبیعی نقص تھا جس کی وجہ سے اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی ـــ وَ اَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ ـــ (۲۱/۹۰)۔ (علاج معالجہ سے) وہ نقص دُور ہو گیا اور اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو گئی. بڑھاپے میں اولاد، کوئی فوق الفطرت سانحہ نہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب اُن مہمانوں سے سُنا کہ قومِ لوط پر تباہی آنے والی ہے، تو انہوں نے اُن سے سوال و جواب شروع کر دیے۔

(۱۱ / ۷۴-۷۵) فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِيۡمَ الرَّوۡعُ وَجَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰى يُجَادِلُـنَا فِىۡ قَوۡمِ لُوۡطٍؕ ۝ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ۝

جب ابراہیمؑ کے دل سے ان کی طرف سے پیدا شدہ گھبراہٹ دور ہو گئی اور بیٹے کی خوشخبری سے اور بھی اطمینان حاصل ہوا، تو قومِ لوط کے متعلق ان سے سوال و جواب کرنے لگا کہ انہیں کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے (۷۴)۔

اس میں شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا متحمل مزاج تھا اس لئے وہ ذرا ذرا سی بات پر یونہی بھڑک نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سینے میں بڑا دردمند دل رکھتا تھا جس کی وجہ سے دوسروں کی مصیبت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا. یہی وجہ تھی کہ قومِ لُوط کی تباہی کی خبر کو اُس نے اِس طرح محسوس کیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر معاملے کے فیصلے کے لئے ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ اِس لئے اُس کی رقیق القلبی اِتباعِ قوانین پر غالب نہیں آتی تھی (۷۵)۔

مہمانوں نے انہیں بتایا کہ وہ قوم اپنی غلط روش میں اُس مقام تک پہنچ چکی ہے جہاں قانونِ مکافات

کی رُو سے تباہی لازم ہوجاتی ہے، لہٰذا اُن کے غم میں دلسوزی سے کچھ نہیں ہوسکتا۔

۱۱/۷۶ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ○

انہوں نے کہا۔ اے ابراہیمؑ! تو اس بات کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے)۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اب اُن پر وہ تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔

اس کے بعد وہ حضرت لُوطؑ کے ہاں پہنچ گئے:

۱۱/۷۷ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِىٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ○

قومِ لُوط کی طرف

چنانچہ جب ہمارے فرستادگان، ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ اُن کی وجہ سے پریشان ہوگیا اور اپنی بےبسی کے احساس سے دل میں کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے! (اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہاں کے لوگ، نووارد، اجنبیوں سے کس قسم کا سلوک کیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ نووارد، آکر ٹھہرے بھی لوطؑ کے پاس تھے، اس لئے وہ اور زیادہ پریشان ہوگیا)۔

اِدھر یہ وارد ہوئے اور اُدھر سے ——

۱۱/۷۸ وَجَآءَهُۥ قَوْمُهُۥ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِن قَبْلُ كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ هَٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِى

هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ○

اُس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر، بدمستی میں دوڑتے ہوئے آئے — وہ پہلے ہی اِس روشِ بد کے خُوگر تھے — لوطؑ نے انہیں (الگ لے جاکر کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تم کیا کر رہے ہو!) یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ (یہ بڑی شرم کی بات ہے) کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل و ہوش کو ہاتھ سے نہ جانے دے! (۱۵/۷۲؛ ۷/۸۰؛ ۱۵/۷۱؛ ۲۱/۷۴؛ ۲۶/۱۶۵؛ ۲۷/۵۴؛ ۲۸ — ۲۹/۲۹؛ ۵۱/۳۵)۔

قرآنِ کریم کی پاکیزگیٔ ذوق اور لطافتِ اسلوب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ اس قوم کی فحاشی کا ذکر نام لیکر نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اس قدر نفرت انگیز تھی کہ اس کے ذکر سے حیا کی نگاہیں بھی شرم کے مارے جُھک جائیں۔ وہ اشاروں، کنایوں میں بات کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اُس معاشرہ میں بے حیائیاں اور بدکرداریاں کس حد عام ہو چکی تھیں۔ حضرت لوطؑ کے ایک مختصر سے فقرے نے اس کی مکمل تصویر کشی کر دی جب انہوں نے کہا کہ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ — کیا تم میں ایک بھی رجل رشید باقی نہیں رہا؟ — جب کسی معاشرے کی پستیٔ کردار اس قدر عام ہو جائے، تو پھر اُس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہا کرتی۔

حضرت لوطؑ کی اس قدر سخت اور شدید تعریض کا بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس پر نادم ہوتے، انہوں نے نہایت ڈھٹائی سے کہا:

۱۱/۷۹ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ○

انہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں سے جنہیں تو اپنی بیٹیاں کہتا ہے۔ کچھ
دلچسپی نہیں اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے!
حضرت لوطؑ نے انتہائی تاسف اور قلق کے ساتھ کہا:

۱۱/۸۰ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ۝

حضرت لوطؑ نے کہا کہ اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ کی خود طاقت ہوتی یا کوئی
قوی سہارا ہوتا جس کی مدد سے میں تمہیں ان حرکات سے روک سکتا۔
اس پر ان مہمانوں نے اپنی حقیقت کو واشگاف اور جس مشن کو وہ لے کر آئے تھے اُسے واضح کردیا۔

۱۱/۸۱ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ فَاَسْرِ
بِاَهْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ
اِلَّا امْرَاَتَکَ ؕ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ
مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ۝

لوطؑ کے مہمانوں نے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں (اور اتمامِ حجت کے لئے ان کی طرف آئے ہیں) یہ لوگ تجھ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ تُو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رہے گا۔ یوں کرو کہ جب رات کا تھوڑا حصہ گزر جائے تو اپنے رفقاء کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور اس سرزمین سے یوں دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہو کہ پھر اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھو۔ تمہارے سب رفیق تمہارے ساتھ چلے جائیں گے، لیکن تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ (یہ دوسری پارٹی سے تعلق رکھتی ہے اس لئے) اسے وہی پیش آنے والا ہے۔ ان کی تباہی کے لئے صبح کا وقت مقرر ہوچکا ہے اور صبح ہونے میں کچھ دیر نہیں۔

یہاں پھر "اہل" کا مفہوم واضح ہوگیا۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا ایمان نہیں لایا تھا تو وہ ان کے اہل

میں نہیں رہا تھا۔ یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی ایمان میں مشترک نہیں تھی، تو وہ بھی اہل میں نہیں رہی۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد پنجم (ص: ۳۰ - ۲۹۹) ملاحظہ فرمائیے:

(۱۱ / ۸۲-۸۳) فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝

تباہی چنانچہ جب اس تباہی کا وقت آ گیا تو اس بستی کی تمام بلند عمارتیں نیچے گر کر پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ (آتش فشاں پہاڑ کے ایک جھٹکے نے، اسے تہ و بالا کر دیا) اور اس کے بڑے بڑے کھنگران پر بارش کی طرح برسنے لگے (۵۱/۳۴) —پیہم اور مسلسل بارش کی طرح— (۸۲)۔

وہ پتھر خدا کے ہاں سے موت کا پیغام بن کر اُن پر نازل ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے تباہی کا عذاب، ظالمین سے کچھ دُور نہیں ہوتا کہ اسے وہاں تک پہنچنے میں دیر لگے اور وہ اتنے میں اپنی حفاظت کا سامان کر لیں (۸۳)۔

قومِ مَدیَن (حضرت شعیبؑ)

حضرت شعیبؑ اور قومِ مدین کے کوائف، مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۲۳۱ - ۳۰۹ پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ ہم اپنے معمول کے مطابق ان آیات کا متن اور صرف مفہوم درج کرتے جائیں گے جن میں کوئی نیا (وضاحت طلب) نکتہ نہیں آیا۔ تمہیداً اتنی صراحت ضروری ہے کہ قومِ ثمود کی معیشت زرعی تھی، اس لئے وہاں چراگاہوں اور چشموں کی منصفانہ تقسیم کا سوال درپیش تھا۔ قومِ مدین کی معیشت (بیشتر) کاروباری تھی۔ اس لئے ان کی اصلاح کا تعلق لین دین کے منصفانہ اصولوں سے تھا۔ یہ فرق صرف

نوعیت کا تھا. جُرم کی اساس و بنیاد ایک ہی تھی — یعنی قوت کے بل پر کمزوروں کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھانا.

١١/٨٤ وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ○

اسی طرح ہم نے قومِ مدین کی طرف، ان کے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا. اس نے بھی ان سے یہی کہا کہ تم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو. اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں. میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوشحال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں، سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں. اس حالت کو بدلو اور اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو. ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو. اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی. (۷/۸۵، ز ۳-۱/۸۳).

پیغام کا بنیادی نکتہ وہی ہے کہ اطاعت اور محکومیت صرف قوانین خداوندی کی جائز ہے. ان قوانین کا تقاضا ہے کہ کاروبار دیانت اور امانت کے اصولوں پر مبنی ہو. اگلی آیت میں اسی اصول کی مزید وضاحت کی گئی ہے —

١١/٨٥ وَيَٰقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ○

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی

کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

قرآن میں الفاظ تو "ناپ تول" کے آئے ہیں، لیکن اس سے مراد تجارت کا جملہ کاروبار ہے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ آیت کے آخر میں لفظ "مفسدین" آیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے "فساد" کے ڈانڈے کہاں کہاں جا کر ملتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ہو، اگر اس میں اقدار و اصولِ خداوندی کو ملحوظ نہ رکھا جائے، تو اس سے جو تخریبی نتائج مرتب ہوں گے انہیں فساد کہا جائے گا۔

اقتصادی ناہمواریاں

وہ لوگ کاروبار میں "ڈنڈی مارنے" سے جو ناجائز کمائی کر لیتے تھے، اسے بڑا منفعت بخش سمجھتے تھے۔ کہا گیا کہ حقیقی منفعت، دیانتدارانہ کاروبار ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

۱۱/۸۶ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○

یاد رکھو! (جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے جمع کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے، لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا) ثبات و دوام صرف ان مفادات کے لئے ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں (۱۸/۴۶) ـــ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو (۱۳/۱۷) لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اُس وقت آسکے گی، جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کر و گے۔ (اگر تم اس پر یقین نہیں رکھتے تو اسے تم سے جبراً منوایا نہیں جا سکتا) اس لئے کہ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک بڑا اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے دین اور مذہب کا فرق نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

۱۱/۸۷ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ○

صلوٰۃ اور معاشیات

انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! تم جو کچھ کہتے تھے اُس سے ہم نے سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریق لے کر آئے ہو' اس لئے ہم نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے طریقے پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے۔ تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں۔ تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں بھی دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں' کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ نہ ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور نہ ہی جس طرح جی چاہے اسے خرچ کریں؟ چہ خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آبا و اجداد' جن سے یہ موجودہ نظام منتقل ہو کر چلا آ رہا ہے' سب ظالم اور جاہل تھے اور عقل و فہم' تحمل اور بردباری' غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری' سب تمہارے حصے میں آ گئی ہے۔

اس آیت کی مفصل تشریح' مطالب الفرقان جلد پنجم' صفحہ ۳۱۶ پر آ چکی ہے۔ اُسے ایک نظر بار دیگر دیکھ لیں۔ حضرت شعیبؑ نے جواب دیا:

۱۱/۸۸ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا

الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○

شعیبؑ نے کہا کہ اے میری قوم! ذرا اس پر غور کرو کہ میرے پروردگار نے عقل و بصیرت کے نمایاں راستے میرے سامنے کشادہ کر دیے ہوں اور لوٹ کھسوٹ، بددیانتی اور بے ایمانی سے حاصل کردہ رزق کے بجائے، مجھے نہایت عمدہ، خوشگوار اور حلال و طیب روزی عطا کی ہو (تو میں اس کے بعد بھی تمہیں صحیح راستے کی طرف آنے کی دعوت نہ دوں؟)۔ نہ ہی میں ایسا کر سکتا ہوں کہ جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں، انہیں خود اختیار کر لوں۔ میں جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں خود اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا تہیہ کر چکا ہوں کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا میں تمہارے غلط معاشرہ کی اصلاح کر دوں گا۔ (میں جانتا ہوں کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ سردست مجھے میسر نہیں۔ لیکن) مجھے وہ تمام اسباب قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو جائیں گے۔ اس کے قانون کی محکمیت پر مجھے پورا پورا بھروسا ہے اور سفرِ حیات میں میرا ہر قدم، اُس چشمۂ خیر و خوبی کی طرف اٹھتا ہے۔

اس کے بعد انہیں وارننگ دی۔

(۱۱/۸۹-۹۰) وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ○ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ○

اے میری قوم! دیکھنا میری مخالفت میں تم کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارا

بھی وہی حشر ہو جائے جو نوحؑ، ہودؑ اور صالحؑ کی قوم کا ہوا تھا یا قومِ لوطؑ کا ساحلؒ جس سے تم اچھی طرح باخبر ہو، کیونکہ وہ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں۔ نہ ہی ان کی تباہ شدہ بستیاں تم سے کچھ زیادہ دور واقع ہوئی ہیں (۸۹)۔

تم اپنی موجودہ روش کے تباہ کن نتائج سے اس طرح بچ سکتے ہو کہ تم اس راستے کو چھوڑ کر، خدا کے راستے کی طرف آجاؤ اور سلب و نہب کے موجودہ نظام کی جگہ خدا کا نظامِ ربوبیّت قائم کر کے، اس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو۔ وہ نظامِ خداوندی نہایت شفقت آمیز انداز سے سامانِ مرحمت عطا کرتا ہے (۹۰)۔

اس کے جواب میں انہوں نے کہا:

۱۱/۹۱ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○

انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں! اس لئے انہیں ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تم کوئی ایسے صاحبِ قوت و اقتدار بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم تمہاری باتوں کو مجبوراً مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں محض تمہاری برادری کا لحاظ ہے۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ نہ ہوتے، تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور تم ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکتے (۸۸/۷)۔

غور فرمائیے! حضرت شعیبؑ اُسی قوم کے ایک فرد ہیں۔ اُنہی کی زبان میں اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا! مطلب یہ نہیں کہ تمہارے الفاظ کے معنے ہم نہیں سمجھ رہے بلکہ تم جو تعلیم دے رہے ہو، تمہاری تبلیغ و تلقین کا جو مقصد ہے، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب کسی شخص کے قلب و دماغ پر مفاد پرستی کے جذبات غالب آجائیں، تو ان مفادات

کے خلاف کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔ لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ عربوں کی زبان عربی ہے پھر وہ قرآن کے پیغام کو کیوں نہیں سمجھتے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کی زبان کو تو وہ سمجھتے ہیں، لیکن ان کے مفاد پرستی کے جذبات انہیں اس کی طرف آنے نہیں دیتے۔ اور ایک عربوں ہی پر کیا موقوف، تمام مسلم ممالک میں عربی زبان کے جید عالم موجود ہیں، لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ بھی قرآن سے ایسے ہی لابلد ہوتے ہیں جیسے ایک عربی نہ جاننے والا جاہل۔ قرآن فہمی کے لئے عربی زبان کا جاننا بیشک ضروری ہے لیکن صرف عربی زبان جاننے سے قرآن سمجھ میں نہیں آجاتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَآ اِلٰهَ اِلَّا

اور دل اسی صورت میں گواہی دے سکتا ہے، جب اسے (قرآن کے الفاظ میں) تمام غیر قرآنی تصورات، نظریات، عقائد تک سے پاک اور صاف کر لیا جائے (۵۶/۷۹)۔ علامہ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ؎

ترے دماغ میں بُتخانہ ہو تو کیا کہیئے! بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے

یہی ذہنی اور قلبی کیفیت قومِ مدیَن کی تھی جس کی سمجھ میں (حضرت) شعیبؑ کی بات نہیں آرہی تھی۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا؛

۱۱/۹۲ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○

شعیبؑ نے کہا کہ اچھا! تمہیں خدا کے قانونِ مکافات کا کوئی ڈر نہیں۔ ڈر ہے تو میری برادری کا ہے۔ میں اب سمجھا کہ تم جو خدا کا نام لیتے رہتے ہو، وہ محض برائے وزنِ بیت ہے۔ تم نے اسے بطور اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے کہ جب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس سے کام لیا جائے، ورنہ مدد اور سہارے کے لئے تمہاری نگاہیں اور ہی طرف اٹھتی ہیں۔ حالانکہ اگر تم آنکھیں رکھتے تو تمہیں نظر آجاتا کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اس میں خدا کے لئے جو ظِهْرِيًّا کا لفظ آیا ہے، اس کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد پنجم، ص ۳۲۲ پر بیان کیا جا چکا ہے۔

اس تمام نظری مواعظ کے بعد وہی عملی طریق جس سے نظامِ خداوندی کے محسوس انسانیت ساز نتائج رسولؐ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں، اس کے لئے فرمایا؛

۱۱/۹۳ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ○

نتائج بطورِ شہادت بہرحال، میں نے سمجھ لیا ہے کہ وعظ و نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ وہ کون ہے جس پر رُسوا کُن تباہی کا عذاب آتا ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

اس کے بعد تباہی کی گھڑی آپہنچی۔

۱۱/۹۴-۹۵ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ○ ع

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے شعیبؑ اور اس کے رفقاء کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت کے مطابق بچا لیا اور جن لوگوں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی انہیں زلزلہ کے سخت عذاب نے گھیر لیا۔ اور جب صبح ہوئی تو دیکھا گیا کہ

وہ اپنے گھروں میں بے حس و حرکت پڑے تھے (۹۴)۔
اور اُن کے گھر اس طرح ویران ہو چکے تھے گویا ان میں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا۔
دیکھو! اہلِ مدین بھی اسی طرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئے جس طرح
ان سے پہلے قومِ ثمود محروم رہ گئی تھی (۹۵)۔

اس تباہی کی تفصیل مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۳۲۴ تا ۳۳۱ پر بیان ہو چکی ہے۔
یہاں پر قومِ مدین کی داستان ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو ایک آیات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کی طرف محض اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱۱ / ۹۶-۹۷) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ○

اور اسی طرح ہم نے موسیٰؑ کو اپنے قوانین اور واضح سند (اتھارٹی) دے کر فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ انہوں نے موسیٰؑ کی بات نہ مانی اور فرعون کا حکم مانتے رہے، حالانکہ فرعون کے احکام یکسر استبداد پر مبنی تھے اور انہیں عقل و بصیرت سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ (آیات ۹۶ اور ۹۷)۔

یہاں بھی فرعون کا جرم، جور و استبداد بتایا گیا ہے اور اس کی قوم کا جرم یہ کہ وہ اس قسم کے مستبد حکمران کی اطاعت کرتی تھی۔ اطاعت کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ اس کے مظالم کو خاموشی سے برداشت کرتے رہتے تھے، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ فرعون کے جور و ستم پر مبنی احکام کا عملی نفاذ وابستگانِ حکومت کے ہاتھوں ہوتا تھا۔ اس نہج سے وہ بھی ان جرائم میں برابر کے شریک تھے۔ قرآن کریم کے اس قسم کے مقامات میں سیاستِ مُدن کے بڑے عمیق اصول پوشیدہ ہیں۔ مستبد حکمران اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والی حکومت کی مشینری کے ارکان و داعیان، پوری کی پوری حاکم قوم۔ دوسری طرف وہ محکوم قوم جو خاموشی سے ان مظالم کو برداشت

کئے چلی جائے. قرآنِ کریم بڑے بصیرت افروز انداز میں ان سب کے جرم کا تجزیہ کرتا ہے.

۱۱/۹۸-۹۹ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ
بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً
وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝

(ہم نے موسیٰؑ سے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں) جب بنی اسرائیل تمہارے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے، تو یہ (فرعون) ان کی مخالفت میں اپنی قوم کو لے کر نکلے گا اور خود ان کی قیادت کرے گا اور اس طرح انہیں تباہی اور بربادی کے گھاٹ پر لے جائے گا اور وہ بہت ہی بُرا گھاٹ ہوگا جس پر یہ لوگ پہنچیں گے (۱۴/۲۸). یہی حالت ان کی آخرت کی زندگی میں ہوگی جہاں یہ (فرعون) اپنی قوم کو جہنّم تک پہنچادے گا (۹۸).

چنانچہ یہی ہوا. وہ قوم اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگئی اور مستقبل کی زندگی کی شادابیوں سے بھی. یہ کیسا ناخوشگوار صلہ ہے جو کسی کو اس کی جدّوجہد کا ملے. (لیکن جب جدّوجہد ہی غلط ہو تو اس کا صلہ کس طرح خوشگوار مل جائے؟) (۹۹).

اس سورۃ میں بہت سی اقوامِ سابقہ کا تذکرہ آگیا ہے.

۱۱/۱۰۰ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ
وَّحَصِيْدٌ ۝

یہ اقوامِ گذشتہ میں سے چند ایک کی سرگزشت ہے جسے ہم تم سے بیان کر رہے ہیں. ان میں سے بعض آبادیوں کے پسماندگان ابھی تک موجود ہیں اور باقی اُجڑ چکی ہیں.

ان کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا؛

۱۱/۱۰۱ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ
عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ
تَتْبِيْبٍ ○

(تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ) ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی (جو قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر، غیر خداوندی قوتوں کی اطاعت اختیار کر لی)۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھ بیٹھے تھے وہ اُن کے کسی کام بھی نہ آسکیں۔ اُن کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ اُلٹا ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔

یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوا:

۱۱/۱۰۲ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ
ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ○

(لہٰذا، تاریخ کے ان نوشتوں سے تم اس محکم اصول کو یاد رکھو کہ) جب بھی کوئی قوم ظلم و سرکشی پر اُتر آئے، تو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت اُسے پکڑ لیتی ہے اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔

اگلی آیت کے پہلے حصہ میں کہا گیا ہے کہ ان داستانوں کو محض تاریخی سوانح سمجھ کر آگے نہ بڑھ جاؤ۔ ان میں عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔

۱۱/۱۰۳ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ

اقوامِ گذشتہ کی اِن داستانوں اور قانونِ مکافات کے اِس غیر متبدل اصول

میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اُس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہ کاریوں اور بربادیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اُن سے بچنا چاہتی ہے۔

ان تاریخی شواہد میں جہاں ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ جن اقوام نے قوانینِ خداوندی کے خلاف اپنا نظام اور معاشرہ قائم کیا، ان کا انجام کیا ہوا۔ دوسری طرف یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ حق وصداقت کی طرف دعوت دینے والوں کو کس قسم کے جانگسل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مخالفتوں کے ہجوم میں انہیں کس قدر صبر آزما صعوبات برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ دیگر سورتوں میں ان حضرات (انبیاء کرامؑ) میں سے ایک ایک دو دو کے کوائف سامنے لائے گئے تھے۔ سورۃ ہودؔ میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک کے جملہ انبیاء اولوالعزم کے احوال وظروف یکجا بیان کئے گئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "سورۃ ہودؔ نے مجھے بوڑھا کر دیا"۔ ان انبیاء کرامؑ کو جن جانگداز مراحل میں سے گزرنا پڑا تھا، انہیں دیکھ کر اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے بوڑھا ہو جانا فطری تھا!

عین اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اُن صعوبات کی ایک جھلک بھی دکھا دی جن سے حضورؐ (اور جماعت مومنین) کو دوچار ہونا تھا۔ آیت (۱۱/۱۰۳) کا اگلا حصہ اور اگلی آیت یوں ہے:

۱۱ / ۱۰۳-۱۰۴ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝

محاذ آرائی کا نتیجہ

(اسی محکم قانون کے مطابق اُس قوم کا بھی حشر ہوگا جو اے رسول! تیری دعوت کی اس طرح مخالفت کر رہی ہے)۔ ان کی اس روش کے نتائج اُس دن سامنے آئیں گے جب دونوں فریق ایک میدان میں ایک دوسرے کے مقابل جمع ہوں گے۔ یہ وہ دن ہوگا جب اعمال کے نتائج مشہود طور پر سامنے آجائیں گے (یعنی اس انداز سے جیسے سب محسوس طور پر دیکھ لیں) (۱۰۳)۔

ہم اپنے قانونِ مہلت کے مطابق اُس دن کو ایک مدتِ معینہ کے لئے ملتوی کر رہے ہیں۔ (لیکن، آخر یہ آکر ضرور رہے گا) (۱۰۴)۔

اس کشمکش کی باقی تفاصیل آئندہ آیات میں سامنے آئیں گی، لیکن انہیں سامنے لانے سے

پہلے ایک اہم نکتہ پر غور ضروری ہے۔ اس ضمن میں دو تین امور بالخصوص قابلِ توجہ ہیں:

عذاب اور جرائم کی تشریح

(۱) ان اقوام پر عذاب یونہی "آسمان سے" نازل نہیں کر دیا گیا تھا۔ یہ تباہی ان کے جرائم کا فطری نتیجہ تھی۔ بالفاظِ دیگر، یہ تباہی خود ان جرائم کے اندر پوشیدہ تھی۔ پہلے وہ مضمر تھی پھر بار زہو کر سامنے آگئی۔

(۲) یہ جرائم کیا تھے؟ ان کے غلط سیاسی، معاشرتی، معاشی نظام، جن کی عمارت استبداد اور استحصال کی بنیادوں پر استوار تھی۔ (نماز، روزے کی اہمیت اپنی جگہ پر لیکن) ان میں سے کسی قوم کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اس لئے تباہ ہوگئی کہ وہ نماز نہیں پڑھتی تھی، روزے نہیں رکھتی تھی۔ کہا یہی گیا ہے کہ ان کا غلط نظام ان کی تباہی کا موجب بنا یا یوں کہیئے کہ ان کی تباہی ان کے غلط نظام کا نتیجہ تھی۔ حضرات انبیاء کرام ان کے غلط نظام کی جگہ صحیح نظام استوار کرنے کی تلقین و تبلیغ کرتے تھے۔ (انڈکس میں قوموں کے عروج و زوال" یا ان کی تباہی کے عنوانات دیکھئے)۔

(۳) تیسرے یہ کہ ان کی تباہی، حوادثِ فطری (طبیعی اسباب و ذرائع) سے عمل میں آئی — سیلاب، آندھیاں، جھکڑ، زلزلے، آتش فشاں پہاڑوں کی شعلہ باریاں وغیرہ۔ اُن کے جرائم اور اُن کی تباہی کے ان اسباب میں ربط اور تعلق کیا تھا، اس کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد اوّل ص۱۸۹ پر تفصیلی ذکر آچکا ہے۔ اس ایک بار پھر دیکھ لیجئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے مذہب پرست حضرات اپنے وعظوں میں ہمیشہ اسے دہراتے ہیں کہ یہ قومیں "فسق و فجور" میں مبتلا تھیں، اس لئے خدا نے انہیں (کسی فوق الفطرت، خارقِ عادات طریق سے ہلاک کر دیا۔ اس سے ہمارا نوجوان طبقہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (آپ کے کہنے کے مطابق کسی قوم میں فحاشی عام ہو جاتی ہے تو اُن کے اس گناہ کی پاداش میں اللہ تعالیٰ ان پر زلزلہ بھیج کر اُن کی بستیوں کو زمین دوز کر دیتا ہے۔ اِن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فحاشی اور زلزلہ میں بالآخر تعلق کیا ہے؟ اور آج ہمارے سامنے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں فحاشی سیلاب کی طرح پھیل رہی ہے، لیکن نہ سیلاب آتا ہے نہ زلزلہ! مطالب الفرقان جلد اوّل (ص۱۸۹) میں انہی پریشان کن سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔

اس کے بعد پھر اُس کشمکش کی طرف آیئے جس کی سرداستان، آیت (۱۱/۱۰۳) میں آئی تھی، یعنی

رسول اللہ کے زمانے میں حق و باطل کی قوتوں کا ٹکراؤ. جیسا کہ ہم شروع سے واضح کرتے چلے آ رہے ہیں، افراد یا اقوام کے صحیح اور غلط اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آتے ہیں اور اخروی زندگی میں بھی. جو نتائج اِس زندگی میں سامنے آتے ہیں وہ چونکہ محسوس اور مرئی شکلوں میں ہوتے ہیں، اس لئے انہیں ہم دیکھ بھی سکتے ہیں، سمجھ بھی سکتے اور سمجھا بھی سکتے ہیں. لیکن اُخروی زندگی میں ان کا راز کیا ہوگا، اس کی کُنہ و حقیقت سے ہم واقف نہیں ہو سکتے. اس لئے انہیں بلا تشریح بیان کر دینے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے. اِس زندگی میں یہ نتائج، اجتماعی طور پر قوموں کے ٹکراؤ کی شکل میں سامنے آتے ہیں. عہدِ رسالت مآبؐ میں (جب قرآن نازل ہو رہا تھا) یہ ٹکراؤ مخالفین کے ساتھ جنگوں کی صورت میں سامنے آیا. اس لئے قرآن مجید میں جہاں (عہدِ رسالت مآبؐ میں) اس قسم کے ٹکراؤ کا ذکر آیا ہے، اسے جنگ کی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے. ہم بھی اپنی تشریح کو وہیں تک محدود رکھتے ہیں. اس وضاحت کے بعد سورۃ ہود کی اگلی آیت دیکھئے

۱۱/۱۰۵ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ○

محاذ

اُس وقت سب فیصلے قانونِ خداوندی کے مطابق ہوں گے اور کوئی شخص اس کے خلاف بات تک نہیں کر سکے گا. (آج کی طرح نہیں کہ جس نے کچھ قوت فراہم کر لی، اس کی بات قانون بن گئی).

اُس وقت دونوں گروہ نکھر کر الگ الگ ہو جائیں گے (۳۶/۵۹) ایک وہ جو زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جائیں گے. یہ بڑے بدقسمت ہوں گے. دوسرے وہ جو ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوں گے. یہ بڑے خوش بخت ہوں گے.

اس کے بعد ان دونوں گروہوں کا ذکر آتا ہے. بدنصیب گروہ:

۱۱/۱۰۶-۱۰۷ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝

زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ جانے والوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی (کہ وہ عمل تھے ہی ایسے نتائج پیدا کرنے والے) اور ان کے لئے عمر بھر کا چیخنا چلّانا اور واویلا کرنا ہوگا (۱۰۶/۲۱، ۱۰۰/۲۱)۔

یہ قومیں ہیں جن میں دوبارہ زندہ ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے ان پر ہمیشہ کے لئے تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ یہ قوانین تیرے پروردگار نے کائنات کے کلی پروگرام کو سامنے رکھ کر، اپنے اختیار و ارادہ سے بنائے ہیں، اس لئے نہ ان میں کوئی دخل دے سکتا ہے، نہ ان پر معترض ہو سکتا (۱۰۷)۔

خوش بخت گروہ:

(۱۱/۱۰۸) وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝

ان کے برعکس، خوش بخت قوم زندگی کی خوشگواریوں سے شادکام ہوگی، اور ان خوشگواریوں کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا (۹۵/۴) ـــ یہی تقسیم اس زندگی کے بعد بھی قائم رہے گی۔ بدبخت جہنم میں ہوں گے اور خوش بخت جنت میں۔

ابدیت سے مراد

ان آیات میں جہنم اور جنت کی زندگی کو "ابدی" بھی کہا گیا ہے ـــ اور اس کے ساتھ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (جب تک یہ کائنات باقی ہے) اور اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ بھی۔ جنت اور جہنم کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ اگرچہ ان میں ابدی خلود کہا گیا ہے، لیکن (ظاہر ہے کہ) یہ ابدیت ذاتِ خداوندی جیسی ابدیت

نہیں ہو سکتی۔ وہ ازلیت جس کی کوئی ابتدا نہیں اور وہ ابدیت جس کی کوئی انتہا نہیں ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کا تعلق ہے نظر آتا ہے کہ یہ الفاظ بطور محاورہ استعمال کئے گئے ہیں جن کے مجازی معنی "ہمیشگی" کے ہیں۔ جیسے "خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا کے الفاظ، ہمیشگی کے مفہوم میں مزید تیقن پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں۔" اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ " کے متعلق مطالب الفرقان جلد پنجم ص ۱۲۴ پر بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ جنت اور جہنم کے خلود اور ابدیت کے متعلق میں نے اپنی کتاب "جہانِ فردا" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن سب کچھ کہہ سُن لینے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ اُخروی زندگی کے کوائف کے متعلق ہم نہ حتمی طور پر کچھ سمجھ سکتے ہیں' نہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں زمان و مکان کا تصور ہمارے موجودہ تصورات سے یکسر مختلف ہوگا جسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کے مبنی برحق ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو الفاظ اس نے استعمال کئے ہیں ان کے مجازی معنی ہی سے ہم اس حقیقت کا' اپنے شعور کی محدود سطح کے مطابق کچھ تصور کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت' بہرحال' واضح ہے کہ (قرآن میں کہیں نہیں کہا گیا کہ) اُخروی جہنم سے نکل کر کوئی فرد' جنت میں چلا جائے گا اور (جنت کے ارتقائی منازل تو ہوں گے لیکن) وہاں سے بھی کسی کو نکالا نہیں جائے گا۔ جہاں تک جنتِ ارضی کا تعلق ہے' جب تک کوئی قوم اس نظامِ خداوندی کو قائم رکھے گی جس کے نتیجے میں اسے وہ جنتی خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں' وہ خوشگواریاں باقی رہیں گی۔ جب وہ اس نظام کو بدل دے گی' وہ سعادات اس سے چھن جائیں گی۔ جہاں تک جہنم کا تعلق ہے' اگر کوئی قوم اس طرح تباہ ہوئی ہے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی تو اس کی یہ تباہی ابدی ہوگی۔ اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت تو تھی' لیکن وہ عارضی طور پر دب گئی تھی' تو اس کے دوبارہ زندگی حاصل کر لینے کے امکانات رہتے ہیں۔ اگر وہ اپنی روشِ کہن کو چھوڑ کر زندگی بخش اسالیب اختیار کرے گی تو حیاتِ تازہ سے نوازی جائے گی۔ اسی حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

۱۱/۱۰۹ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۚ مَا يَعْبُدُوْنَ

إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ
نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ۝

سو یہ لوگ، جو خدا کو چھوڑ کر، دوسری قوتوں کے سامنے جھکتے ہیں، ان کے انجام کے متعلق تم اپنے دل میں ذرا سا شبہ بھی پیدا نہ ہونے دو۔ یہ انہی قوتوں کی اطاعت کرتے ہیں جن کی اطاعت ان کے آبا و اجداد کیا کرتے تھے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سو جس قسم کا انجام ان کا ہوگا) ہمارا قانونِ مکافات ہر عمل کا بدلہ، بلا کم و کاست، پورا پورا، دے دیا کرتا ہے۔

اس کی زندہ مثال قوم بنی اسرائیل تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے فرمایا:

۱۱/ ۱۱۰ ـ ۱۱۱ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۚ وَلَوْ
لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ
لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝ وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ
رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

اس سے پہلے کتابِ موسیٰؑ میں بھی، ہم نے یہی کچھ کہا تھا۔ لیکن اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا (یہی وہ اُن کا خود پیدا کردہ اختلاف ہے جس کی بنا پر یہ یہود تمہاری مخالفت کر رہے ہیں) اگر تمہارے پروردگار کے قانونِ مکافات میں مہلت اور تدریج کی گنجائش نہ رکھی گئی ہوتی، تو ان کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ یہ لوگ (اس مہلت کی وجہ سے) اس قانون کی نتیجہ خیزی کے متعلق شبہ میں پڑ گئے ہیں اور ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے (۱۱۰)۔

حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ تیرے پروردگار کا قانونِ مکافات ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہتا ہے۔ وہ ہر ایک کے عمل سے باخبر ہے (۱۱۱)۔

امم سابقہ اور انبیاؑ گذشتہ کے ان تصادمات کو بیان کرنے کے بعد حضورؐ سے فرمایا؛

۱۱/۱۱۲ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

لہذا، تم ان کے متعلق کوئی تشویش نہ کرو۔ تم اور تمہارے ساتھ وہ لوگ جو، اپنی غلط روش کو چھوڑ کر، سیدھے راستے پر آجاتے ہیں اور یوں تمہاری جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، سب کے سب اس توازن بدوش انقلاب کی راہ پر ثابت قدم رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ۔۔۔ پھر سن لو کہ اس میں اعتدال اور توازن کو ہمیشہ ملحوظ رکھو اور حدود سے تجاوز نہ کرو۔ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے اعمال پر بھی کڑی نگاہ رکھتا ہے۔

اور جیسا کہ (پہلے بھی متعدد مقامات پر کہا جا چکا ہے) ان مخالفین سے کسی قیمت پر بھی مفاہمت نہیں کی جائے گی؛

۱۱/۱۱۳ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝

مفاہمت نہیں ہو سکتی

(یہ لوگ تم سے مفاہمت کی بھی کوشش کریں گے اور چاہیں گے کہ کچھ تم پیچھے ہٹو، اور کچھ یہ آگے بڑھیں اور اس طرح مصالحت کر لی جائے ۱۵/۱۰؛ ۷۴/۱۷؛ ۹/۴۸۔ لیکن تم ہرگز ایسا نہ کرنا) اور یہ لوگ جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برت رہے ہیں ان کی طرف بالکل نہ جھکنا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی تباہی کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ اس تباہی سے بچانے والا صرف خدا کا قانون ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں۔ اگر اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، تو پھر کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔

اس کا عملی پروگرام نظامِ صلوٰۃ کا قیام ہے؛

۱۱/۱۱۴ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ‌ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ‌ؕ ذٰ لِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ‌ۚ ۝

اجتماعاتِ صلٰوۃ

اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ تم اجتماعاتِ صلٰوۃ کا نہایت پابندی سے اہتمام کرتے رہو۔ صبح، شام، رات گئے (۸/۱۷/۷۸ ؛ ۲۴/۵۸)۔ اس سے معاشرہ کی تشکیل صحیح متوازن خطوط پر ہو جائیگی اور وہ ہمواریاں پیدا ہو جائیں گی جو تمام سابقہ ناہمواریوں کو دُور کر دیں گی ـــ یاد رکھو! ناہمواریاں دور کرنے کا طریق ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہمواریاں پیدا کر دی جائیں۔ تخریبی کاروائیوں کے نقصان رساں اثرات مٹتے ہی تعمیری کاموں سے ہیں۔ ـــ یہ ہر اُس قوم کے لئے محکم اصولِ حیات ہے جو قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا چاہتی ہے۔

صلٰوۃ کا تفصیلی مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان کیا جا چکا ہے اور اوقاتِ صلٰوۃ کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد اوّل صـ۱۳۱ پر اور ضمناً جلد چہارم صـ۴۰۴ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جہاں زیرِ نظر آیت بھی درج ہے۔ اس مقام پر اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

اس آیت میں فرد، معاشرہ اور قوم کی اصلاح کا بنیادی اصول بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ اصلاح کا ارادہ ہو تو پہلے سابقہ غلط کاری سے رُکا جائے (اسے توبہ کہتے ہیں)۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ صحیح

حسنات سے سیّات کا ازالہ

(تعمیری) کام کئے جائیں (انہیں حسنات کہتے ہیں)۔ ان تعمیری کاموں کے نتائج ان نقصانات (سیّات) کا ازالہ کر دیں گے جو سابقہ غلط کاری کی وجہ سے ہوئے تھے۔ تفصیل ان امور کی مطالبُ الفرقان جلد دوم صـ۲۸۸ پر آ چکی ہے اور ضمنی اشارہ جلد اوّل صـ۷۲ پر۔ انہی مقامات سے توبہ اور مغفرت کا مفہوم بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ قرآنِ مجید نے جو ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُ اور خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُ کا اصول بیان کیا ہےؑ یعنی نیکیوں (تعمیری

ؑ (۱۰۱/۶۰۸)

کاموں) کا پلڑا بھاری ہو تو کامیابی ہو جاتی ہے، تو اس سے بھی یہی مقصود ہے (یہ آیت بھی جلد دوم صفحہ ۲۸۸ پر آ چکی ہے)۔ اصلاحِ احوال کے لئے یہ اصول اس قدر بنیادی اور اہم ہے کہ اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے ـــــ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ـــــ اور اس پر جم کر کھڑے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

۱۱/۱۱۵ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس پروگرام پر نہایت استقامت سے کاربند رہا جائے (کیونکہ اس کے نتائج ایک وقت کے بعد جا کر برآمد ہوں گے)۔ یہ استقامت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ تمہارا اس حقیقت پر ایمان محکم ہو کہ جو قوم خدا کے تجویز کردہ پروگرام پر حسن کارانہ انداز سے عمل پیرا ہو، اس کی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اس کے نتائج مرتب ہونے میں وقت تو لگتا ہے، لیکن اس کی محنت رائیگاں نہیں جا سکتی ـــــ یہ اس حقیقت پر یقین ہی ہے جو اس صبر آزما مرحلہ میں کسی کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا۔

اصلاحِ احوال کا پروگرام

لہٰذا، قرآن کریم کی رو سے، اصلاحِ احوال کا طریق یہ ہے؛

(۱) نظامِ صلوٰۃ کا قیام۔

(۲) اس قدر تعمیری کام کئے جائیں کہ وہ سابقہ تخریبی امور سے پیدا شدہ نقصانات کا ازالہ کر دیں، اور

(۳) اس پروگرام پر جم کر کھڑا رہا جائے۔

اسی کا نام توبہ ہے۔ یہی مغفرت ہے۔

اس تاکید اور توثیق کے بعد پھر اقوامِ سابقہ کی تاریخ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی۔ فرمایا؛

۱۱/۱۱۶ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ

أَنجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ۝

(ان تمام تفاصیل کے بعد جو اوپر دی گئی ہیں، تم دیکھو کہ اقوامِ گذشتہ کے کوائف سے تم کس نتیجہ پر پہنچتے ہو؟ اسی نتیجہ پر کہ) جن لوگوں کو ہم تباہی سے بچا لیتے تھے، ان میں سے بھی (بالعموم) صرف معدودے چند ایسے رہ جاتے تھے جو اپنے مفاد کو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے تاکہ وہ غیر متغیر رہیں اور انہیں ثبات و دوام حاصل رہے (۱۳/۳۵؛ ۱۱/۸۶) اور لوگوں کو، ملک میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے تاکہ انکی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے)۔ یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔

ان کی تباہی اسی کا نتیجہ تھی۔ اس کا اٹل قانون یہ ہے کہ:

(۱۱/۱۱۷) وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا (اور نہ ہی وہ ایسا کرتا ہے) کہ کسی بستی کو یونہی (اندھا دھند) ظلم و زیادتی سے تباہ کر دے، درآنحالیکہ اس کے رہنے والے اپنے اور دوسرے لوگوں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔

نہ تو دھاندلی سے کسی قوم کو تباہ کیا جاتا ہے اور نہ کسی کو مجبور کر کے راہِ راست پر چلایا جاتا ہے۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ جس طرح اپنے اختیار کو استعمال کرے گا، اس کے مطابق اس کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

۱۱/ ۱۱۸–۱۱۹ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝

(۱) اس سے شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خدا نے ایسا سلسلہ کیوں رکھا ہے کہ لوگ حق و صداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طرح باہمی کشمکش پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ سب انسان ایک ہی راستے پر چلتے۔ سو جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے (۵/۴۸) (۲)۔ خدا کے لئے یہ قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو بھی کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح، بلا اختیار و ارادہ پیدا کر دیتا اور اس طرح وہ سب مجبوراً، ایک راہ پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ باہمدگر اختلاف کرتے ہیں۔

اختلافات ختم کرنے کا طریق

ان اختلافات سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں (۳۸ – ۲/۳۶)۔ ایک صاحبِ اقتدار ہستی کے قانون کا اتباع کرنے سے اختلافات خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا قانون بھی عطا کر دیا ہے۔ انسان کو اس انداز سے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ تھا (۵۱/۵۶) کہ وہ، اپنے اختیار و ارادہ سے، قانونِ خداوندی کے اتباع سے اپنے اختلافات مٹا کر ایک امت بن کر رہے۔ ایسا بالآخر ہو کر رہے گا (۲/۲۱۳؛ ۴۳/۳۳)۔ لیکن (اس دوران میں) جو لوگ علم و بصیرت سے کام لینے کے بجائے، اپنے جذبات کے پیچھے لگے رہیں گے (۷/۱۷۹)، وہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا بسیں گے (۱۹/۵۹)، خواہ وہ شہروں کی مہذب

آبادی سے متعلق ہوں یا بدوی یا صحرائی زندگی بسر کررہے ہوں ـــ یہ ہمارا اٹل قانون ہے (اور تاریخ کے نوشتے اس کی شہادت دیتے ہیں کہ کس طرح صحیح ثابت ہوتا چلا آرہا ہے)۔

تمام انسانوں کو بہ جبر امّتِ واحدہ بنانے کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۲۲ - ۵۲۳ اور جلد سوم صفحہ ۳ - ۴ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

تفرقہ اور اختلافات خدا کا عذاب ہیں۔ اس کے متعلق انڈکس دیکھئے، نیز وہ حوالے جو مندرجہ بالا مفہوم میں دیے گئے ہیں۔ انسانی اختیار و ارادہ کی بحث کے لئے بھی انڈکس دیکھئے۔

یہ جو کہا گیا کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے پہلے سے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ "تمام جن و انس سے جہنم بھر دیا جائے گا"۔ یہ مفہوم یکسر غلط ہے۔ خدا نے قانونِ مکافات نافذ کر رکھا ہے جس کے مطابق جنت اور جہنم میں جانے کے فیصلے افراد اور اقوام کے اعمال کی رُو سے ہوتے ہیں۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب کچھ اس کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا جسے خدا نے پہلے سے مقرر کر رکھا ہے۔

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ کے بھی یہ معنی نہیں کہ انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اختلاف کرتے رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ چاہیں تو باہمد گر متفق رہیں اور چاہیں تو ایک دوسرے سے اختلاف کریں۔ باہمی اتّفاق اور مودّت سے رہنے والوں پر خدا کی مرحمت کا سایہ ہوتا ہے اور اختلاف کرنے والے جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

جن و انس کے جہنم میں جانے کے متعلق قانون کی وضاحت آیت (۷/۱۷۹) میں کی گئی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ انبیاءؑ سابقہ کی یہ داستانیں کیوں بیان کی جاتی ہیں:

۱۱/۱۲۰ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○

اے رسولؐ! ہم تمہیں (اقوامِ سابقہ اور) انبیائے گذشتہ کی یہ داستانیں اس لئے

سناتے رہتے ہیں کہ اس سے تمہارا دل مضبوط ہو (۱۱۲ — ۱۱۵/۱۱)۔ اس قرآن میں ہم نے تمام حقائق (واضح انداز میں) بیان کر دیے ہیں۔ یہ حقائق اور اس کی اخلاقی قدریں جماعتِ مومنین کو اس حقیقت کی یاد دلاتی ہیں (کہ ان کی زندگی کا نصب العین کیا ہے اور وہ کس طرح سے حاصل ہوگا)۔

ان تاریخی شواہد کا ملخص یہ ہے کہ کشمکش کتنی ہی شدید اور تصادمات کتنے ہی جرأت آزما کیوں نہ ہوں، کامیابی بالآخر حق کی ہوتی ہے۔ اس حقیقت پر یقین، حق کی علمبردار جماعتوں کے دل میں حزن اور پاؤں میں لغزش پیدا ہونے نہیں دیتا۔

اور اس کے بعد اس کشمکش کی فیصلہ کن کڑی مخالفین کے سامنے پیش کر دی گئی:

(۱۱ / ۱۲۱-۱۲۲) وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

(اے رسولؐ! ان دلائل و براہین اور تاریخی شواہد کی روشنی میں، تم بھی اپنے مخالفین سے کہہ دو، جس طرح انبیائے سابقہ نے کہا تھا۔ ۱۱/۹۳) کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو۔ ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہیں (۱۲۱)۔

اس کے بعد، تم بھی نتائج کا انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں (۱۲۲)۔

اس قسم کا چیلنج وہی دے سکتا ہے جسے یقین ہو کہ اس کے پروگرام کے تعمیری نتائج اس کے دعویٰ کی صداقت کا ناقابلِ تردید ثبوت بن کر سامنے آئیں گے (جیسا کہ پہلے دیکھا جا چکا ہے)۔ اس قسم کا چیلنج ہر رسول کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا۔ اس یقین کی بنا یہ تھی کہ:

(۱۱ / ۱۲۳) وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

(تمہارا یہ چیلنج اُس خدا کے اٹل قانون پر مبنی ہے) جس کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل

کے لئے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے مصروفِ عمل ہے اور تمام معاملات کا فیصلہ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے (اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کے جس پروگرام کی تکمیل کے لئے تم اٹھے ہو' وہ کامیاب نہ ہو)۔ بس تم اس کے قانون کی کامل اطاعت کرتے رہو اور ان کی نتیجہ خیزی پر پورا پورا بھروسا کرو۔ یاد رکھو تمہارا پروردگار کسی کے عمل سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اس کا نتیجہ مرتب ہونے سے رہ جائے۔ ایمان اس قسم کی خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے۔

سورۃ ھود ختم شد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بارھواں پارہ ——— بارھویں سُورۃ

سُورۃ یُوسُف (۱۲)

باب اوّل

سُورۂ یُوسُف

احسن القصص

- جمالِ یُوسفی۔
- ستاروں کا سجدہ۔
- برادرانِ یُوسفؑ کی آتشِ حسد۔
- یُوسفؑ درچاہ اور صبرِ یعقوبؑ
- بازارِ مصر سے عزیز کے محلات میں۔
- جذبات بے باک کی دست درازیاں اور بُرہانِ ربّ سامنے رکھنے والے کا کردار۔
- غیر فطری تہذیب میں غیرت کا حشر۔
- قید خانہ اور وعظِ یوسفیؑ۔
- بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی تعبیر۔
- رہائی سے قبل (عورتوں کے) معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ۔
- مسندِ بلند پر سرفرازی اور حسنِ انتظام۔
- بھائی غلہ لینے آئے۔
- شاہی کٹورا کی گمشدگی اور بھائیوں کے ترکشِ حسد کا آخری تیر۔
- لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔
- تاویل الاحادیث۔
- خوابوں کی دُنیا۔
- سجدہ۔
- دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت۔ رسولؐ کی سُنّت۔
- داستانِ یوسفؑ — سامانِ عبرت و موعظت۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب اوّل

سُورَۃ یُوسُفَ

بارھویں سورۃ

جمالِ یُوسفی

(حُسنِ سیرت کی رعنائیاں)

مَطالبُ الفُرقان، جلد سوم (صفحہ ۵۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس طرح اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے کِنعان اور شام کے علاقہ میں آئے۔ وہاں اُنھوں نے ایک مملکت قائم کی جو آلِ ابراہیمؑ تک قائم رہی (۴/۵۴)۔ اُن کے چھوٹے بیٹے حضرت اِسحاقؑ تو اِس مملکت کے نگران رہے لیکن بڑے بیٹے حضرت اِسماعیلؑ کو حجاز میں بسایا گیا جہاں تولیّتِ کعبہ کی نہایت استقامت طلب خِدمت اُن کے سپُرد ہوئی۔ حضرت اِسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ بھی کنعان میں رہے لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ اُن کے زمانے میں مملکت سمٹ کر قبیلہ کی سرداری تک محدُود ہو گئی تھی۔ قرآنِ کریم میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا تفصیلی ذکر نہیں آیا، صرف اُن کا شمار زمرۂ انبیاءؑ میں کیا گیا ہے۔ (۲/۱۳۶ ؛ ۶/۸۴)۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ تھے جن کی داستانِ جمیل و جلیل اِن صفحات کے لیے وجۂ زینت بن رہی ہے۔ میں نے اس داستان کو اپنی کتاب جوئے نوُر میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ جو کچھ اب بیان کیا جانے گا وہ بیشتر اِسی سے مقتبس ہوگا۔

داستانِ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دو خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ دیگر انبیاء کرامؑ کے احوال و کوائف قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں منتشر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ تصریفِ آیات کے قرآنی اسلوب کے مطابق انہیں چن چن کر سلکِ گہر دار میں پرو دیا گیا ہے لیکن حضرت یوسفؑ کی داستان ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ دیگر اُولوا العزم انبیاء کرامؑ کی داستانیں ان انقلابات کے تذکرے ہیں جو انہوں نے برپا کیے اس سلسلہ میں ان انبیاء کرامؑ سے کہیں زیادہ اُن اقوام کے احوال و کوائف مذکور ہیں جنھوں نے ان کی دعوتِ حق و صداقت کی مخالفت کی اور بالآخر تباہ و برباد ہوگئیں۔ داستانِ حضرت یوسف اس قسم کے کسی تصادم یا انقلاب کا تذکرہ نہیں۔ یہ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ایک فرد کے جوہرِ ذاتی، اس کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی، اُسے کس طرح خاک نشینی سے اُٹھا کر مدارج و مناصبِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن یہ راہ، صحنِ گلستان کی روش نہیں کہ جس میں انسان رنگینیٔ بہار کے جھُوے جھُولتا، مچلتا، لوٹتا، اٹھکیلیاں کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ بلکہ یہ وہ کٹھن راستہ ہے جہاں قدم قدم پر ایسی صبر آزما اور نظر فریب لغزش کی گھاٹیاں آتی ہیں کہ وہاں سے ذرا پاؤں پھسلا اور انسان سیدھا ذلّت و خواری کے جہنّم میں جا گرا۔ اس راستہ سے ہر کانٹے سے دامن بچاتے اور ہر گھاٹی سے قدم سنبھالتے مردانہ وار صحیح و سلامت آگے بڑھ جانا یقیناً مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس میں ہر چشمِ بصیرت کو قدم قدم پر جمالِ یوسفی کی رعنائیاں جلوہ بار نظر آتی ہیں اور وہ قدم قدم پر اُن کے نقوشِ پا کے منتسّم ذرّات کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتی ہے کہ ؎

موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی!

لوحِ جبیں میں مستقبل کا آئینہ

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فلسطین کی سرزمین میں حضرت یعقوبؑ کے ہاں حضرت یوسفؑ کی پیدائش ہوئی۔ لوگ اس بچے کو عام چہرے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے لیکن باپ (حضرت یعقوبؑ) کی حقیقت بین نگاہیں بیٹے کی پیشانی میں کچھ اور ہی جھلکتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ اُس کی خُداداد ذہانت و فطانت اور سنجیدگی و متانت سے اس کی لوحِ جبیں پر کھُلے کھُلے الفاظ میں پڑھ رہے تھے کہ دائیہ فطرت اُسے کس طرح مویشیوں کی پاسبانی سے جہانداری و جہانبانی کے طور طریق سکھا رہی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر بیٹا باپ کی آنکھوں کا تارا بن رہا تھا لیکن یہ چیز دُوسرے بھائیوں[1] کی آنکھ میں

[1] تورات بتاتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے (مختلف بیویوں سے) بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسفؑ اور بنیامین حقیقی بھائی تھے۔ (باقی ص۳ پر)

کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ یہیں سے اس قصے کی ابتداء ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے تمہیداً خود قرآن مجید کا خصوصی تعارف کرایا گیا ہے۔ فرمایا:

(۱۲ / ۲-۱) الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ایک واضح ضابطۂ قوانین کی کتاب ہے (۱) ہم نے قرآن کو واضح اور فصیح اس لیے بنایا ہے کہ تم اچھی طرح سمجھ بوجھ سے کام لے سکو، تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ یعنی نزولِ قرآن کا مقصد انسانی عقل کو جِلا دینا ہے (۲) اے رسولؐ! ہم اس قرآن کو، تم پر وحی کے ذریعہ نازل کر کے، تم سے انبیاء سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کی سرگزشتیں بہترین طریق پر بیان کرتے ہیں۔ وہ سرگزشتیں جن سے تم نزولِ قرآن سے پہلے باخبر نہیں تھے۔ (انہی میں یوسفؑ کی سرگزشت ہے جسے اب بیان کیا جاتا ہے)۔" (۱۲ / ۳-۱)

آیات کا مفہوم تو واضح ہے لیکن آیت نمبر ۲ میں ایک ایسی عظیم حقیقت آگئی ہے جس سے یونہی آگے بڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کہا گیا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا۔ قرآن کا اسلوبِ بیان نہایت واضح، صاف اور سُلجھا ہوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ کسی قسم کا ابہام نہیں۔ یہ رہی قرآن کے اسلوبِ بیان کی خصوصیت۔ اس کے بعد ہے: لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ تم سمجھ سکو، یا سمجھ جاؤ"۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کا اسلوبِ بیان ایسا نہیں کہ یہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن کے طالبِ علم کو خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جس طرح (مثلاً) خارج میں روشنی ہو تو دیکھنے والے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی آنکھ کھُلی رکھے۔ اس کے بعد سب کچھ خود بخود نظر آنے لگ جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صد ۲) اور بنیامین سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت یوسفؑ کی طرف باپ کا میلانِ خصوصی، سوتیلے بھائیوں کی آتشِ حسد و رقابت کا موجب بن گیا تھا (کتاب پیدائش باب ۳۵: ۲۲-۲۶ ، باب ۳۷: ۳-۴)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا یہ مفہوم حقیقت اور منشاءِ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کریم خود بخود سمجھ میں نہیں آجاتا۔ اس کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس حقیقت کو قرآن نے ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا۔ "تَعْقِلُوْنَ" فعل کا صیغہ ہے۔ اور فعل اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ فاعل وہ کام کرے۔ جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے لفظ عقل کو فعل کے طور پر کسی زبان میں استعمال نہیں کیا گیا۔ کم از کم اُردو میں تو قطعاً نہیں۔ اس لیے تَعْقِلُوْنَ کا ایک لفظ میں ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ نہ اِس قبیل کے دیگر الفاظ کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ (۲/۲۶۶)۔ "اس طرح خدا نے اپنی آیات کو واضح طور پر بیان کر دیا تاکہ تم ان پر غور و فکر کرسکو۔" لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا مفہوم کچھ اس قسم کے الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے "تاکہ تم عقل سے کام لے سکو" "تاکہ تم عقل کو بروئے کار لاسکو۔" اس مفہوم کی وضاحت اس قسم کی آیات میں کر دی جہاں کہا۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۱۷۱)۔ "یہ لوگ بہرے، گونگے، اندھے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے "عقل" ایک صلاحیت ہے جو خود بخود کام نہیں کرنے لگ جاتی۔ اس سے کام لیا جائے تو وہ اپنا منصب ادا کرتی ہے، کام نہ لیا جائے تو بیکار رہ جاتی ہے۔ اس صلاحیت کو قرآن نے قلب کہہ کر پکارا ہے، جہاں کہا ہے: فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ (۲۲/۴۶)۔ "تاکہ ان کی عقل سے کام لینے کی صلاحیت بیدار ہو۔" گویا قلب وہ ذریعہ ہے جس سے انسان عقل کو بروئے کار لاتا ہے۔ مقصد اس بحث کا یہ ہے کہ عقلِ انسانی (آنکھ کی بینائی یا سماعت کی طرح) ایسی صلاحیت نہیں جو خود بخود بروئے کار آجائے۔ اسے بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

اِس گفتگو سے واضح ہے کہ:

۱۔ کسی بات کے سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا اسلوبِ بیان واضح، صاف، نکھرا اور سُلجھا ہُوا ہو۔ قرآنِ کریم نے اسی لیے بار بار کہا ہے کہ اس کا اندازِ بیان نہایت واضح اور مُبین ہے۔

۲۔ لیکن اس کے اندازِ بیان کے واضح اور مُبین ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے انسان کو خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ اسے اپنی عقلی صلاحیت کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جو ایسا نہیں کرے گا، قرآن کے اسلوبِ بیان کی وضاحت اُسے کچھ فائدہ نہیں دے گی۔ یہ اُس قوم کے لیے منفعت بخش ہے جو عقل سے کام لے۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۰/۲۸)۔

اسی سورۃ میں چار آیات آگے چل کر کہا گیا ہے: لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ (۱۲/۷)

یُوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی اِس داستان میں اُن لوگوں کے لیے عبرت و موعظت کی نشانیاں ہیں جو حقیقت کے مُتلاشی اور صداقت کے جویا ہوں، جنھیں اس کی احتیاج ہو"۔ اس سے قرآن نے یہ بتایا کہ اس کے متن سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دِل میں حقیقت تک پہنچنے کی طلب پیدا ہو، اِس سے عقل کی صلاحیت بیدار ہوگی اور قرآنی مفاہیم سمجھ میں آئیں گے۔ اِس سے آپ اُس قوم کی حالت کا اندازہ لگا لیجیے، جو ساری عمر ناظرہ قرآن پڑھنے میں صرف کر دے۔ ناظرہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ، ان کے معنی اور مطلب سمجھے بغیر، رٹتے چلے جائیں۔ جو ان الفاظ کو ایک ایک رات میں دُہرا کر (جسے شبینہ کہا جاتا ہے) ثوابِ دارین حاصل کرتے ہیں جنھیں اس کے مترجم یا مفسّر ہونے کا دعویٰ ہو، (یا جو اِن تراجم یا تفاسیر کی رُو سے اِسے سمجھنے کی کوشش کریں)، وہ بھی اپنی عقل و فکر سے کام لینے کی بجائے صدیوں پہلے کے انسانوں کی عقل و فکر کو حرفِ آخر سمجھیں، جو نہ خود "سائلین" کے زُمرے میں آئیں نہ "عاقلین" کی صف میں، وہ قرآن سے کس طرح نفع یاب ہو سکیں گے؟ قرآن انہی کی سمجھ میں آسکے گا جو انسانی علم، تجربہ، مشاہدہ۔ جس سطح تک وہ پہنچ چکا ہے۔ اس کی رَوشنی میں، قرآنِ کریم کو، خود قرآنِ کریم کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اِس کے لیے دوسروں کے علم و ادراک سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن اِسے اتھارٹی نہیں سمجھا جاسکتا۔ قرآن کی اتھارٹی خود قرآن ہی ہے۔

اِس تمہید کے بعد داستانِ حضرت یوسفؑ کی طرف آئیے، جس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔

۱۲/۴ إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿٤﴾

جب یُوسفؑ نے اپنے باپ (یعقوبؑ) سے کہا کہ میں نے (خواب میں ۱۲/۳۶) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں، اور چاند اور سُورج، یہ سب میرے سامنے جُھکے ہُوئے ہیں"۔

بیٹے کا خواب سُن کر باپ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا:

۱۲/۵ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٥﴾

باپ نے بیٹے سے کہا کہ اس خواب کو اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا (جو سوتیلے تھے ۵۹/۱۲) ورنہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبے کی خفیہ تدبیریں کرنے لگ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان (حسد و عداوت کا جذبہ) انسانوں میں تفرقہ پیدا کر کے، بھائی کو بھائی کا بیری بنا دیتا ہے۔"

یہاں دیکھئے، (حضرت) یوسفؑ کے بھائیوں کے حسد کو کس طرح "شیطان کی عداوت" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شیطان اور ابلیس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۹۹ تا ۲۸۱) میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے کہ وہ خود انسان ہی کے بے راہرو جذبات کا نام ہے۔

باپ نے بیٹے (حضرت یوسفؑ) سے یہ تاکید کی؛ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اسے اُس کا مستقبل کس قدر درخشندہ نظر آ رہا تھا۔ فرمایا:

۶/۱۲ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦﴾

"میں جو تجھ میں مضمر صلاحیتوں کے آثار دیکھتا ہوں تو اس سے مجھے نظر آتا ہے کہ تیرا پروردگار تجھے کس عظیم مقصد کے لیے منتخب کرے گا اور تجھے ایسی فراست و بصیرت عطا کر دے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام و مآل تک فوراً پہنچ جائے۔ وہ تجھے اپنی عنایات سے سرفراز کرے گا اور تیرے ذریعہ یعقوبؑ کے گھرانے پر اتمام نعمت کرے گا، جس طرح اُس نے، اس سے قبل، تیرے آباء و اجداد — ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ — پر اتمام نعمت کیا تھا۔ یقیناً تیرا پروردگار ہر بات سے واقف ہے اور اس کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔"

"تاویل الاحادیث" سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ حضرت یوسفؑ پر اتمام نعمت کس طرح ہوا۔

اس کے بعد بتایا کہ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں پر کیا گذری۔ لیکن پہلے یہ واضح کر دیا کہ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جس میں ازمنۂ گزشتہ کے احوال و کوائف محض واقعات کے طور پر درج ہیں۔ یہ انسانی زندگی

کے لیے ضابطۂ حیات ہے اور تاریخی شواہد اس ضابطہ کے کسی نہ کسی گوشہ کی تشریح و تائید کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ (جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے) فرمایا:

۱۲/۷ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ ﴿٧﴾

(آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قصّہ، یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی آویزش کی داستان بیان کرنا مقصود نہیں)، اس میں ہر اُس شخص کے لیے عبرت و موعظت کی واضح نشانیاں ہیں جو اپنے آپ کو ان نشانیوں کا ضرورت مند سمجھے۔ (سب سے پہلے تو خود رسول اللہؐ اور جماعتِ مومنین کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ جس مشن کو لے کر یہ اُٹھے ہیں، اس میں انھیں سب سے پہلے اپنے بھائی بندوں کی طرف سے طرح طرح کی تکالیف پہنچیں گی، لیکن انجامِ کار کامیابی انھیں ہی حاصل ہوگی)۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے، شدّتِ حسد و عداوت کی بنا پر، یہ اسکیم تیار کی کہ کسی نہ کسی طرح اس کانٹے کو الگ کر دیا جائے۔

۱۲/۸-۹ إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨﴾ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾

"برادرانِ یُوسفؑ، آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارا باپ، ہماری نسبت یُوسفؑ اور اُس کے (حقیقی) بھائی سے زیادہ محبّت کرتا ہے، حالانکہ ہمارا جتھّہ بڑا ہے اور اس اعتبار سے ہماری قوّت بھی زیادہ ہے۔ یقیناً اس باب میں ہمارا باپ بڑی غلطی کرتا ہے۔

چنانچہ اُنھوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اس مصیبت کا حل یہ ہے کہ یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا کسی دُور دراز جگہ پھینک دیا جائے تاکہ، اس کے بعد، باپ کی ساری توجّہ ہماری طرف مبذول رہے۔

اور ہمارے سارے کام سنور جائیں "۔
آیت کے آخر میں "صالحین" کا لفظ غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں صالحین کا ترجمہ خدا کے نیک بندے اور اعمالِ صالحہ سے مُراد نیک کام لیے جاتے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اگر یہ لیا جائے کہ اُنھوں نے کہا کہ یوسفؑ کو باپ سے الگ کر دیا جائے تاکہ اس کے بعد باپ کی ساری توجہ ہماری طرف مبذول رہے اور اس طرح ہم نیک بندے بن جائیں" تو اس سے بات نہیں بنتی۔ اُنھوں نے کہا یہ تھا کہ اس وقت حالت یہ ہے کہ باپ کی ساری توجہ یوسف پر مرکوز رہتی ہے جس سے ہمارے حالات اَبتر رہتے ہیں۔ یہ رکاوٹ دُور ہو جائے تو ہمارے حالات سنور جائیں گے۔ "صُلح، اصلح، صالحہ" وغیرہ سے مُراد حالات کا سُدھرنا اور سنور جانا ہوتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ سے مراد ایسے کام اور ایسا نظام ہے جس میں انسانی ذات بھی سنور جائے اور معاشرہ میں بھی ہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ فرد اور معاشرہ دونوں کی اِصلاح ہو جائے (اس کی تشریح مطالبُ الفرقان۔ جلد اوّل صـ۳۲۱ میں گزر چکی ہے۔)

تورات[۱] میں ہے کہ ان میں سے ایک بھائی (روبن) نے کہا کہ یُوسفؑ کو قتل نہ کرو، کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دو۔ قرآنِ کریم میں ہے:

۱۲/۱۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُـبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۱۰﴾

"ان میں سے ایک نے کہا کہ یُوسفؑ کو قتل نہ کرو۔ اگر تم نے اِس کے خلاف ضرور کچھ کرنا ہی ہے تو اِسے کسی (اندھے) کنوئیں کی گہرائی میں پھینک دو۔ کوئی راہ گیر قافلہ اِدھر سے گزرتا ہُوا اسے نکال کر لے جائے گا اور اس طرح تُمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا"۔
اِس سازش کے بعد وہ باپ کے پاس آئے۔

۱۲/۱۱—۱۲ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾

"(چنانچہ اس اسکیم کو سب نے پسند کیا اور) باپ کے پاس آکر کہنے لگے کہ ابّا جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ یوسفؑ کے معاملہ میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے (اور اُسے ہمارے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیتے

[۱] کتاب پیدائش باب ۳۷ : ۲۲

حالانکہ ہم اس کے دلی خیر خواہ ہیں۔
ہم کل باہر جارہے ہیں، اسے بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ یہ کھائے پیئے، کھیل تفریح کرے۔
ہم سب اس کی حفاظت کریں گے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کی خصوصی تربیت کے لیے اسے اپنے قریب رکھتے تھے، لیکن دوسرے بیٹے اسے عدم اعتماد پر محمول کرتے تھے اس لیے انہوں نے باپ سے شکایت کی کہ وہ اس باب میں ان پر اعتماد کیوں نہیں کرتے۔ اس پر حضرت یعقوبؑ نے کہا کہ بات عدم اعتماد کی نہیں۔

۱۲/۱۳ قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

" باپ نے کہا کہ (بے اعتمادی کی بات نہیں) مجھے خطرہ یہ ہے کہ تم اسے جنگل میں سیر و تفریح کیلئے ساتھ لے جاؤ، اور ذرا سی غفلت برتو، تو اسے بھیڑیا کھا جائے۔"

قرآنِ کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ اُس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر کیا تھی۔ حضرت یعقوبؑ کے بیان کردہ خدشہ سے مترشح ہوتا ہے کہ اُن کی اُس وقت عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ تورات کا بیان ہے کہ اُس وقت اُن کی عمر سترہ برس کی تھی۔

یعقوبؑ کا احوال یہ ہے کہ یوسفؑ سترہ برس کا ہو کے اپنے بھائیوں کے ساتھ گلّہ چراتا تھا اور وہ جوان اپنے باپ کی جوروؤں، بلہاؔہ اور زلفاؔ کے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا اور یوسفؑ اُن کے باپ کے پاس اُن کے بُرے کاموں کی خبر لاتا تھا۔ (پیدائش۔ ۳۷/۲)

لیکن قرآنِ کریم میں بیان کردہ حضرت یعقوبؑ کے خدشہ سے اِس کی تائید نہیں ہوتی۔ بہرحال، باپ کے اِس خدشہ پر بیٹوں نے کہا:

۱۲/۱۴ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اُنہوں نے کہا کہ ابّا جان! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اتنے بڑے جتھے کی موجودگی میں بھی اسے بھیڑیا کھا گیا (توحیف ہے ہمارے جینے پر!) اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے

ہو گئے ؎۱

گلہ بانی کی زندگی میں بھیڑیوں کے حملے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ حضرت یعقوبؑ نے اس خیال سے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیٹوں کی بدخواہ طبیعت نے اِس چیز کو اپنے سلسلۂ مکروفریب کی ایک کڑی بنانے کے لیے گرہ میں باندھ لیا۔ بھائی اُنہیں ساتھ لے گئے اور اپنی طے شدہ خفیہ تجویز کے مطابق حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا۔

۱۲/۱۵ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ج

چنانچہ وہ یوسفؑ کو ساتھ لے گئے، اور سب اِس بات پر متفق ہوگئے کہ اسے گہرے کنوئیں میں گرا دیا جائے۔"

یوسفؑ درچاہ ذرا اندازہ لگائیے اس جگر گداز سانحہ اور ہوش رُبا منظر کا، کہ باپ کا چہیتا بیٹا، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں، زندہ درگور کیا جا رہا ہے۔ اس بھیانک قبر میں حضرت یوسفؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ لیکن اُدھر اُنھوں نے حضرت یوسفؑ کو (بزعمِ خویش) دُنیا کے تمام اسباب و علائق سے منقطع کیا اور اِدھر اسباب و علل کے مالکِ حقیقی نے فوراً وحی بھیجی کہ مت گھبراؤ!

۱۲/۱۵ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۵﴾

"(عین اُس وقت جب وہ یوسفؑ کو کنوئیں میں گرا رہے تھے) ہم نے اُسے وحی کے ذریعہ بتا دیا کہ (تم بالکل نہ گھبراؤ، تم صحیح و سلامت رہو گے۔ اور اِس کے بعد ایک دن ایسا آئے گا کہ) تم اُنہیں بتاؤ گے کہ اُنھوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا اور اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تم زندہ کیسے رہ گئے اور اس مقام تک کیسے پہنچ گئے)۔" (۱۲/۱۵)

بھائیوں کی واپسی مکروفریب کے یہ سنگدل مجسّمے شام کے قریب گھر لوٹے لیکن عجیب ڈھونگ رچائے ہُوئے:

۱۲/۱۶ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿۱۶﴾

"(یوسفؑ کو کنوئیں میں گرا دینے کے بعد) وہ رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہُوئے آئے"

اور کہا:

۱۲/۱۷ قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾

"اور کہا کہ ابّا جان! ہم جنگل میں گئے تو یوسفؑ کو سامان کے پاس بٹھا دیا اور ہم دوڑ میں مصروف ہو گئے کہ دیکھیں، کون آگے نکلتا ہے۔ اتنے میں ایک بھیڑیا آیا اور اس نے یوسفؑ کو پھاڑ کھایا۔
ہم جانتے ہیں کہ خواہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں، آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے۔
لیکن واقعہ یہی ہے جو ہم نے آپ سے بیان کر دیا ہے۔"

آیت کے آخری ٹکڑے پر پھر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ برادرانِ یوسفؑ کے قلبِ خائن (GUILTY CONSCIENCE) کی دھڑکنیں اُن کے مکر و فریب کے چلمنی پردوں سے کس طرح پھٹ پھٹ کر باہر آ رہی ہیں۔ "اگرچہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں، آپ تو ہمارا یقین کریں گے ہی نہیں"۔ نفسِ نیم شعوری (SUBCONSCIOUS MIND) کی بے تابانہ لیکن غیر محسوس کیفیت کا ایسا نقشہ قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے فریب کارانہ طور پر رونا دھونا بھی شروع کیا اور ساتھ ہی اس مکر کی تکمیل کے لیے حضرت یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تاکہ اسے بطورِ شہادت پیش کر دیا جائے:

۱۲/۱۸ وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ

"اور وہ یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا کر ساتھ لے آئے تھے۔"

اُنہوں نے اپنی طرف سے تو اس سوانگ میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن ایک صاحبِ فراست کی نگہ بصیرت کے لیے اس قسم کے جھوٹ اور سچ میں فرق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ کیوں یونہی باتیں بنا رہے ہو۔ یہ ساری کہانی تمہارے فریبِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔

۱۲/۱۸ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

"باپ نے اِس داستان کو سُن کر اور کُرتے کو دیکھ کر کہا کہ یُوسفؑ کو بھیڑیئے نے بالکل نہیں کھایا۔ یہ سب تمہاری خود ساختہ کہانی ہے) جسے تمہارے فریبِ نفس نے تمہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا ہے (کہ یہ تدبیر بڑی کامیاب رہے گی)۔ بہرحال، میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں صبر اور ہمت سے کام لوں (اور گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دوں) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اس پر خُدا سے مدد مانگوں۔"

اُدھر یہ ہو رہا تھا، اِدھر ایسا ہُوا کہ ایک قافلہ کا گزر اس راستہ سے ہُوا جس پر وہ کنواں پڑتا تھا جس میں حضرت یُوسفؑ کو گرایا گیا تھا۔

۱۲/۱۹ وَجَاۤءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اُدھر ایسا ہُوا کہ جنگل میں ایک قافلہ آیا اور اُنہوں نے اپنے پیش رَس کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ وہ اس کنوئیں پر پہنچا اور اس میں ڈول لٹکایا۔ (نیچے سے یوسفؑ نے آواز دی۔ اُس نے کنوئیں میں جھانکا تو دیکھا کہ وہاں ایک لڑکا ہے)۔ اُس نے دُوسرے افرادِ کارواں کو آواز دی اور کہا کہ ایک خوشخبری سنو! کنوئیں سے ایک لڑکا مِلا ہے۔ اُنہوں نے اُسے چُھپا کر رکھ لیا کہ کہیں دُور لے جا کر فروخت کرینگے۔ اُنہوں نے یہ کچھ لوگوں کی نگاہوں سے چُھپا کر کیا۔ لیکن خُدا تو سب کچھ دیکھ رہا تھا۔"

تورات[له] میں ہے کہ یہ قافلہ اسمٰعیلی عربوں کا تھا جو اپنا سامانِ تجارت لے کر مصر جا رہا تھا۔ نیز یہ کہ حضرت یُوسفؑ کے بھائیوں نے اُنھیں بیس سکّوں کے عوض قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ لیکن قرآن کریم کا یہ بیان ہے کہ اہلِ قافلہ نے انھیں چُھپا کر رکھ لیا تھا کہ اُن کا کوئی دعویدار نہ آنکلے۔ آج بھی خانہ بدوش قبائل جو اس قسم کی بَردہ فروشی کرتے ہیں، ہاتھ پڑے بچّوں کو اِسی طرح چُھپا کر کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔

اب حضرت یوسفؑ کی زندگی کا ایک نیا دَور شرُوع ہوتا ہے (اور اندازہ لگائیے کہ کس رُوح فرسا مرحلہ سے شرُوع ہوتا ہے)۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فلسطین کی زندگی بدوی زندگی تھی، جیسے جنگلوں میں مویشی چرانے والوں کی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مصر اُس زمانہ میں تمدّن و حضارت کی ان بلندیوں پر تھا کہ آج بھی جب اس کے نوادرات کے زمین دوز دفینے باہر نکلتے ہیں تو چشمِ حیرت کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہے کہ وہ زمانہ اور اس قسم کے تہذیب و تمدّن کے نمُونے! جس طرح آج بھی شہروں کی "مہذّب" آبادی کے نزدیک گاؤں والوں کی غیر مہذّب زندگی نفرت کی نگاہ سے

له پیدائش۔ باب ۳۷: ۲۵-۲۸

دیکھی جاتی ہے۔ اہلِ مصر، اپنے گرد و پیش کے چرواہوں کو سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ بہرحال، صحرائی علاقہ کے چرواہوں کا ایک لڑکا مصر کی آبادی میں پہنچتا ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ ایک اجنبی قافلہ والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے جو اسے بازار میں جنس کی طرح بیچنے کے لیے لیے جا رہے ہیں۔

۱۲/۲۰ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿۲۰﴾

"قافلہ والوں نے، یوسفؑ کو (مصر کے بازار میں ظلم و تعدی سے (جیسا کہ غلاموں کی خرید و فروخت میں ہُوا کرتا تھا۔ ویسے بھی انسانوں کی خرید و فروخت قرآن کی رُو سے بہرحال ظلم و زیادتی ہے۔ بخس کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے) معمولی سی قیمت پر جو چند درہموں سے زیادہ نہ تھی، بیچ ڈالا۔ انھوں نے اس کی فروخت میں بے رغبتی سے کام لیا، (اس لیے کہ ایک تو انہیں یہ مال مُفت ملا تھا اور دوسرے انھیں خیال ہوگا کہ اس کا کوئی دعویدار نکل آیا تو مشکل ہو جائے گی)۔"

اُنہوں نے اِس "غلام" کو سرِ بازار فروخت کر دیا اور چونکہ مال مُفت ہاتھ آگیا تھا اس لیے اس کی بھی چنداں پروا نہ کی کہ کتنے میں بِک رہا ہے، جو کسی نے دیا، لینے کی کی۔

اللہ اکبر! غلام، اور اس بے قدری سے بِکا ہُوا غلام! یوں مصر میں داخلہ ہُوا۔ تورات میں ہے کہ جس شخص نے حضرت یوسفؑ کو خریدا تھا، اُس کا نام فوطیفار تھا۔

اور مدیانیوں نے اسے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا، بیچا۔ (پیدائش ۳۶/۳۷)

قرآنِ کریم نے اُسے لفظ عزیز (بڑی عزت والا، یا صاحبِ اختیار) کے لقب سے پکارا ہے کہ مقصد اس کی حیثیت کا تعارف تھا نہ کہ اُس کے عہدے کا ذکر۔ عزیز نے حضرت یوسفؑ کو ایک غلام کی حیثیت سے خریدا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اُس نے آپ کی راست بازی، دیانت داری، حُسنِ سیرت اور خُدا داد فراست سے اندازہ لگا لیا کہ یہ لڑکا اس قابل ہے کہ اس پر کُلی اعتماد کیا جائے اور گھر کا نظم و نسق اُس کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ:

۱۲/۲۱ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ

"جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ (اس لڑکے کے ساتھ عام غلاموں کا سا برتاؤ نہ کرنا بلکہ) عزّت سے رکھنا (کیونکہ اس کے چہرے بُشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ اِس لیے) ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے کسی فائدے کا موجب بن جائے یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔"

قرآنِ کریم نے اَکْرِمِیْ مَثْوٰىهُ (اسے عزّت کے ساتھ رکھو) کہہ کر کہانی کا ایک بہُت بڑا حصّہ دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ حیاتِ یُوسفی میں پہلا انقلاب تھا۔ یعنی غلام کی حیثیت سے گھر میں داخل ہوئے، اور وہ بھی کنعانی غلام (یعنی مصریوں کے نزدیک ایک گنوار غلام) کی حیثیت سے اور چند ہی روز میں مصر کے ایک بہُت بڑے صاحبِ منصب امیر کے گھر بار کے معتمد علیہ ناظم بن گئے۔

۱۲/۲۱ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اِس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یُوسفؑ کے پاؤں جما دیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اُس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہوجائے اور اُس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں (کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے)۔"

ذرا غور کیجئے، مشیّت کی تدبیر کو اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچنے کے لیے اسباب و علل کی کون کون سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن عام انسانوں کی نگاہوں سے چونکہ یہ راز پنہاں ہوتا ہے اِس لیے وہ تدابیر کی ان کڑیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

اِس طرح حضرت یُوسفؑ نے اس جدید ماحول میں پرورش پانا شروع کی:

۱۲/۲۲ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"چنانچہ جب یوسفؑ (اس قسم کے ماحول میں تربیت پاکر) جوان ہُوا تو وہ کارفرمائی اور جہان داری کے سلیقوں سے واقف اور علم و بصیرت کی فراوانی سے مالامال تھا۔ (یہ وہ چیزیں تھیں جو اُسے اپنی صحرائی زندگی میں میسّر نہیں آسکتی تھیں) لیکن اسے یہ حاصل اس لیے ہوگئیں کہ اُس نے یہاں نہایت حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی۔

جو لوگ بھی اس طرح زندگی بسر کریں، اُنھیں اسی کا ایسا ہی صلہ مل سکتا ہے (وحی البتہ اس طرح نہیں مل سکتی)۔"

جب حضرت یوسفؑ نے عمر کے کچھ اور مراحل طے کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کارفرمائی کی قوّت اور علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور یہ سب اُن کے حُسنِ عمل کی بدولت تھا۔ (وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ) غور کیجئے قرآنِ کریم نے اِس پہلے انقلاب کے ساتھ ہی نگاہوں کو کس طرح قصّے کے عبرت و موعظت کی طرف مُلتفت کر دیا۔ یعنی یہ انقلاب یونہی اتفاقیہ سرزد نہیں ہوگیا تھا، بلکہ خدا کے اُس اٹل قانون کے تحت واقع ہُوا تھا کہ حُسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کا لازمی نتیجہ ایسا ہوتا ہے۔ (وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)۔

اب اس زرّیں داستان کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اُس وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں سیرت و کردار کی آزمائش کے لیے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب مناظر، سامانِ صد ہزار بداماں لیے، دامِ ہمرنگ زمیں کی طرح چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اُس وقت بھرپور جوانی کی تھی۔ اُن کا ابتدائی زمانہ تمدّن و حضارت کی اعصاب شکن مصنوعی زندگی سے دُور، دشت و بیاباں کی کھلی فضاؤں میں گزرا تھا۔ آج بھی اس کا اندازہ لگانا ہو کہ کھلی فضائیں اور سادہ و بیباک زندگی، انسانی حُسن کو کس طرح نکھارتی ہے تو آزاد قبائل کے کسی بچے کو دیکھئے۔ افلاس و غربت کا یہ عالم کہ بدن پر کپڑے نہیں، چیتھڑے ہیں، لیکن صحت و تندرستی کو دیکھئے تو رگ رگ سے ارغوانی موجیں تلاطم خیز ہیں۔ حُسن صحت کا نام ہے اور جب صحت و جوانی یکجا ہو جائیں تو ان کے امتزاج سے جذب و کیف کا ایک ایسا بلّوریں مجسّمہ وجود میں آجاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائی و رعنائی سے مُرتسم دکھائی دیتی ہے۔ پھر رگوں میں خانوادۂ نبوّت کا صالح خون، ان تمام خصوصیات کے ساتھ حسنِ عفت سونے پر سُہاگہ۔ تندرست جوانی اگر قلب و نگاہ کی پاکیزگی میں گزرے تو اس سے بڑا حُسن اور کیا ہوسکتا ہے؟ — یہ ہیں حضرت یوسفؑ — اور دُوسری طرف عزیز کی بیوی۔ تہذیب و تمدّن کی بیباکیوں کی تخلیق، عشرت و کامرانی کے ماحول کی پروردہ، دَولت کی

مُرصّع کاریوں سے جگمگاتا حُسن۔ غرضیکہ دونوں طرف جذب وکشش کے پُورے پُورے سامان۔ لیکن ایک طرف جذباتِ نفس کی مکمل حکمرانی اور دُوسری طرف ترغیباتِ نفس پر حدُودُ اللہ کی حکمرانی۔ نتیجہ یہ کہ حضرت یُوسفؑ کا خیال کبھی بھُولے سے بھی اُدھر نہ گیا۔ لیکن عزیز کی بیوی کی دِل باختگی، آتش خاموش کی طرح سُلگتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن جوشِ فریفتگی نے شعلۂ بیباک کی صُورت اختیار کر لی۔ حضرت یوسفؑ کمرے کے اندر تھے۔ وہ عشوہ طرازیوں کا فتنۂ مجسّم، ہزاروں بجلیاں اپنے دامنِ نگاہ میں لیے وہاں آپہنچی۔ دروازے بند کر لیے اور ناز، ہزار نیازمندیوں کے ساتھ ایک نگہِ التفات کے لیے مُلتجی ہُوا۔ قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو چند لفظوں میں سمو دیا ہے۔ فرمایا:

۱۲/۲۳ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾

"اور جس عورت کے گھر میں یُوسفؑ رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی) وہ اس پر ریجھ گئی۔ لیکن یُوسف کی نیّت میں کبھی خرابی پیدا نہ ہُوئی۔ بالآخر، اُس عورت نے تہیّہ کر لیا کہ اِسے بہلا پھسلا کر مجبُور کر دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اُس کی بات مان لے۔ چنانچہ اس نے ایک دن مکان کے تمام دروازے بند کر دیے اور یُوسفؑ سے کہا کہ اِدھر آؤ۔

یُوسفؑ نے کہا کہ معاذ اللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی) میرے پروردگار نے مجھے سیرتؔ کردار کے ایسے بلند اور حسین مقام پر پہنچا دیا ہے۔ (کیا تو مجھے اس مقام سے نیچے گرانا چاہتی ہے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا)۔ یہ تو کھلی ہُوئی حدود فراموشی ہے اور حدود فراموش انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

لیکن اُس کی آتش جذبات کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس دیوانگی میں سب کچھ بھول کر مُعاملہ کی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ذرا غور کیجئے۔ اُس کمرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے والا نہ تھا۔ جذباتِ نفس کی تسکین کے پُورے سامان موجُود تھے۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اِس سیلاب انگیزیوں کے باوجود حضرت یُوسفؑ کے دامنِ عفت کو تر نہ ہونے دیا! فقط ایک اللہ کا خیال! یعنی اس بات پر ایمان اور غیر متزلزل ایمان کہ جب کوئی اور ——

دیکھنے والا نہ ہو تو ایک ذات ایسی ہوتی ہے جو سب کچھ دیکھتی ہے۔ اِس بات کا یقین کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُد سے ہر غلط کام اپنا تباہ کُن نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے خواہ اُس پر کوئی گرفت کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہ تھا امرأۃ العزیزؔ اور اور حضرت یوسفؑ میں فرق۔ ایک کی آنکھ پر تحریصاتِ نفس کے گہرے پردے پڑے ہُوئے تھے اور دوسرے کی نگہِ حقیقت رُس ایسے خود فراموش ماحول میں بھی قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہی تھی ورنہ انسان ہونے کی جہت سے جوانی کی اُمنگیں دونوں طرف تھیں۔ دیکھئے۔ قرآن کریم نے اس بیّن فرق کو ایجاز و اختصار کے باوجود کس حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا:

(۱۲/۲۴) وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ؀

"لیکن وہ عورت اِس بات کا تہیہ کر چکی تھی اور اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اگر یوسفؑ ——— ——— کے سامنے اپنے پروردگار کی درخشندہ و تابندہ اخلاقی قدر نہ ہوتی تو وہ بھی اس پر آمادہ ہو جاتا۔ اِس اخلاقی قدر کے پیشِ نظر رہنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اس بے حیائی کے کام سے مجتنب رہا اور بُرائی کا مرتکب نہ ہُوا۔ اور یُوں اُس نے اپنے حُسنِ سیرت سے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے مُخلص بندوں میں سے تھا۔ (بعد میں اس کا اعتراف و اقرار خود اُس عورت نے بھی کر لیا کہ یُوسفؑ کی نیت خراب نہیں ہوئی تھی (۱۲/۵۱))"

داستان اس قدر پُر کیف، دلکش اور جاذب ہے کہ دلوں کا تقاضا ہے کہ

نگہ بر ہم مزن، تا نہ شکنی رنگ تماشا را

(آنکھ بھی نہ جھپکو، کہ اس سے رنگینیٔ تماشا میں شکن پڑ جائے گی!)

لیکن اِس میں ایک مقام ایسا نازک اور اہم آگیا ہے جس کی وضاحت کیفِ داستان سے بھی زیادہ گراں بہا ہے۔ اس لیے ہم اِس گریز کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

آیت نمبر ۲۴ میں ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ۔ ہماری کتبِ تفاسیر میں بالعموم اس کا ایسا مفہوم بیان کیا گیا ہے جس سے دامنِ یوسفؑ تار تار ہو جاتا ہے۔ ان مفاہیم کا ملخص

یہ ہے کہ اُس عورت نے غلط اقدام (بدکاری) کا ارادہ کر لیا اور حضرت یوسفؑ نے بھی اس کا ارادہ کر لیا لیکن وہ اس سے عملاً باز رہے کیونکہ اُنھوں نے "برہانِ ربّ" دیکھ لی تھی۔ ایسا کہنے والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ فعلِ بد کا قصد و ارادہ، عملِ بد سے کم معصیت نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم کی رُو سے قصد و ارادہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اُس نے قتلِ عمد (بالارادہ) کی سزا موت مقرر کی ہے اور قتلِ خطا (بلا ارادہ) کے لیے صرف خون بہا (دیت) ادا کرنے کا کہا ہے (۴/۹۲-۹۳) اُس نے عام معاشرتی معاملات میں بلا ارادہ لغزش کو قابلِ مواخذہ قرار نہیں دیا۔ قابلِ مواخذہ وہ ہے جس میں دل کا ارادہ شامل ہو۔ (مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ. ۳۳/۵)۔ اس کی تائید اس دُعا سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج (۲/۲۸۶) — یعنی جو لغزش سہواً یا بلا ارادہ ہو جائے اس پر مؤاخذہ نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ظلم سنگین جُرم ہے لیکن ظلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظُلم وہ ہے جو دُوسرے پر کیا جائے۔ دُوسرا ظُلم وہ ہے جو خود اپنے آپ پر کیا جائے۔ (وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۲/۵۷) اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ کسی شخص پر آپ بالارادہ زیادتی کرتے ہیں۔ اس زیادتی کا جو اثر اُس پر ہُوا وہ تو اُس پر ظلم ہُوا۔ لیکن اس کا جو اثر آپ کی ذات پر ہُوا، وہ آپ کا اپنے آپ پر ظُلم ہے۔ دُوسری شکل یہ ہے کہ آپ سے کسی کے خلاف بلا ارادہ زیادتی سرزد ہو گئی۔ اس سے اُس پر تو ظلم ہُوا ہے مگر آپ کا اپنے آپ پر ظلم نہیں ہُوا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی پر زیادتی کا ارادہ کیا لیکن وہ زیادتی عمل میں نہیں آئی۔ اس سے اُس شخص پر تو ظُلم نہیں ہُوا، لیکن آپ کا اپنے آپ پر ظلم ہو گیا ہے۔ قصّۂ زیرِ نظر میں، اس عملِ شنیع کا ارتکاب تو نہیں ہُوا، لیکن وہ عورت مُجرم قرار پا گئی کیونکہ اُس نے اِس کا ارادہ کیا تھا۔ اگر حضرت یوسفؑ کے متعلق بھی یہ خیال کر لیا جائے کہ اُنھوں نے بھی اس کا ارادہ کر لیا تھا تو ان میں اور اُس عورت میں فرق کیا ہو گا۔؟ لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت یوسفؑ نے بھی اس کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ اپنے ارادے کو عمل میں نہ لا سکے کیونکہ اُنہوں نے اپنے ربّ کی بُرھان دیکھ لی تھی، ایک نبیؑ کے شایانِ شان نہیں۔

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ حضرت یوسفؑ نے پہلے فقرہ میں کہا ہے: (۱) مَعَاذَ اللّٰهِ: میں قوانینِ خداوندی اور اقدارِ الٰہیہ کی پناہ طلب کرتا ہوں؛ پھر کہا: (۲) اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ - میرے ربّ نے مجھے حُسنِ سیرت سے نوازا ہے۔ میں اس آئینے کو کس طرح داغدار کر سکتا ہوں؟ اور اس کے بعد کُھلے الفاظ میں خدا کا یہ فیصلہ کہ: (۳) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ - اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا۔

اور زنا تو صریح ظلم ہے ــــــ ان نظریات کا حامل اور ان ارادوں کا مالک یوسفؑ کبھی فحش کاری کا قصد کر سکتا تھا؟ ــ (معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ)۔ آیت کا مطلب واضح ہے کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ جس طرح عزیز کی بیوی اس اقدام کا قصد کر چکی تھی (کیونکہ اُس کے سامنے اقدارِ خداوندی نہ تھیں) اسی طرح اگر فریقِ مقابل بھی ایسا ہی ہوتا جس کے سامنے اقدارِ خداوندی نہ ہوتیں، تو وہ بھی اس کا قصد کر لیتا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے چونکہ بُرھانِ خداوندی تھی، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کا قصد کرتے۔ قرآن کریم نے یہاں دو رُجحاناتِ قلبی کا فرق نمایاں کیا ہے۔ ایک اُس کا رُجحان جو کسی بلند قدر کا پابند نہ ہو۔ دُوسرا اُس کا جو اپنے آپ کو ان اقدار کا پابند سمجھے۔ اوّل الذکر کی نظیر عزیز کی بیوی کی تھی۔ ثانی الذکر کی آئینہ دار سیرتِ یوسفی!

(حضرت) یوسفؑ نے جو "بُرھانِ ربّ" دیکھی تھی اس کے متعلق بھی ہماری کتبِ تفاسیر میں عجیب و غریب افسانے ملتے ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ:

> حضرت یوسفؑ نے اپنے والد (حضرت یعقوبؑ) کو دیکھا کہ وہ اپنی اُنگلی منہ میں ڈالے کھڑے ہیں اور حضرت یوسفؑ کے سینے پر اُس نے ہاتھ مارا۔ (تفسیر ابن کثیر۔ بارہواں پارہ صفحہ ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ضابطۂ اقدار و قوانین (قرآن) کو بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ کہہ کر پکارا ہے (۴/۱۷۴)۔ اس لیے خدا کا ہر حکم، اُس کا ہر قانون، اُس کی ہر قدر بُرہانِ خداوندی ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جو کہا تھا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲/۲۳)، تو یہ سب سے بڑی بُرہان خداوندی تھی جو اُن کے پیشِ نظر تھی اور اس سے وہ اس غلط اقدام کے قصد سے باز رہے تھے۔

اور سب سے بڑی دلیل وہ جسے خُود خدا نے اِن الفاظ میں بیان کر دیا کہ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲/۲۴) وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا جن کے متعلق خود ابلیس نے کہا تھا:

> قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۱۵/۳۹-۴۰)

وہ اُس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے جو اس طرح زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیا اور مجھ پر خوشگواریوں کی راہ مسدُود کر دی تو میں بھی اب ایسا کروں گا کہ انسانوں کو، ان کی طبیعی زندگی کے مفاد و اسباب اس طرح خوشنما بنا کر دکھاؤں گا کہ وہ اُنہی میں اُلجھ کر رہ جائیں اور انسانی زندگی کے بلند مقاصد کو یکسر نظر انداز کر دیں (اور یوں، میری طرح یہ بھی زندگی کی حقیقی سعادتوں سے محروم رہ

جائیں۔ (۱۵/۳۹)

ہاں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے اُن پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ (وہ اپنے آپ کو وحی کے تابع رکھیں گے۔ اس لیے سرکش جذبات ان پر غالب نہیں آسکیں گے۔" (۱۵/۴۰)

اور خدا نے کہا تھا کہ:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ۔ (۱۵/۴۲)

"میرے اِن (مخلص) بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ تیرا غلبہ اُنہی پر ہو سکے گا جو اس متوازن راہ کو چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں۔"

اِس لیے حضرت یوسفؑ اِن نظر فریب مناظر کے دامِ تزویر میں کس طرح آ سکتے تھے! اللہ کے بندے اِن تمام خار دار جھاڑیوں سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل جاتے ہیں ؎

بندۂ را کہ بفرمانِ خدا راہ رَوَد
نگذارند کہ در بندِ زلیخا ماند (غالب)

اب سُنیے اِس داستانِ نور و نکہت کی اگلی کڑی کی طرف۔ (حضرت) یوسفؑ کے انکار پر وہ عورت، جذبات سے بے قابو ہو کر دست درازی تک اُتر آئی۔ حضرت یوسفؑ دامن چھڑا کر بھاگے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں، وہ عورت بھی لپکی کہ آگے بڑھ کر اُنہیں روک لے۔

۱۲/۲۵ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ...

"یوسفؑ، دروازے کی طرف بھاگا کہ کسی طرح باہر نکل جائے اور وہ عورت اس کے پیچھے بھاگی کہ اُسے نکلنے نہ دے۔"

وہ دونوں دروازے کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت یوسفؑ سے آگے نہ بڑھ سکی تو پیچھے سے کُرتہ پکڑ لیا اور وہ پھٹ گیا:

۱۲/۲۵ وَقَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ...

عورت نے پیچھے سے یوسفؑ کا کُرتہ پکڑ لیا، لیکن یوسفؑ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور اُس کا کُرتہ

پیچھے سے پھٹ گیا۔"

اور سامنے ؟ — لیکن اتنے میں حضرت یوسفؑ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے اُس عورت کا خاوند کھڑا ہے :

۱۲/۲۵ وَّ اَلۡفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الۡبَابِ ؕ...

"اور ان دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازہ کے سامنے کھڑا ہے۔"

اس اچانک سانحہ نے امرأۃ العزیز کے قلب کے ہیجان کا رُخ بدل دیا۔ بالآخر بوالہوس ہی تو تھی۔ فوراً اس ذلیل ترین حربہ پر اُتر آئی جو اس قسم کے کیریکٹر کا خاصہ ہوا کرتا ہے :

۱۲/۲۵ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ يُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۲۵﴾

"(اُس عورت نے ایک سیکنڈ میں بات بنا ڈالی اور جھٹ سے اپنے خاوند سے کہا کہ) جو شخص تیری بیوی سے بدکاری کا ارادہ کرے، اس کی سزا کیا ہونی چاہیئے ؟ کیا اس کی سزا یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ اُسے جیل خانہ بھجوا دیا جائے ؟ یا اُسے — اس سے بھی زیادہ الم انگیز سزا دی جائے !"

حضرت یوسفؑ نے فرمایا :

۱۲/۲۶ قَالَ هِيَ رَاوَدَتۡنِيۡ عَنۡ نَّفۡسِيۡ ...

"اس پر یوسفؑ نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتی ہے۔ خود اُسی نے یہ سب مکر و فریب کیا اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں اس فعلِ شنیع کا مرتکب ہو جاؤں۔ (لیکن میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ نکلا۔)"

وہ اُنہیں مُلزم قرار دے رہی ہے، اور یہ نہ صرف اقبالِ جُرم سے منکر ہیں، بلکہ اُسے مُلزم ٹھہراتے ہیں۔ کمرے کے اندر کوئی تیسرا تھا نہیں۔ حضرت یوسفؑ اپنی بریّت میں کیسے بطور گواہ پیش کر سکتے تھے ؟ لیکن جب بات آگے بڑھی تو خود اُس عورت کے خاندان میں سے ایک صاحبِ دانش اور

شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا

حقیقت شناس نے کہا کہ جب کوئی اور گواہی نہیں مل سکتی تو احوال و کوائف کی گواہی (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) کو دیکھنا چاہیے۔

۱۲/۲۶—۲۷ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ

مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ
قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

"(بات آگے بڑھی تو) خود اُس عورت کے خاندان میں سے ایک پسندیدہ شخص نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر یوسفؑ کا کُرتہ آگے سے پھٹا ہے تو یہ عورت سچّی ہے اور یوسفؑ جھوٹا۔ اور اگر کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھُوٹی، اور یُوسفؑ سچّا ہے۔"

اُس نے ایک اصول متعیّن کر دیا جو فی الواقعہ فیصلہ کُن تھا۔ عزیز نے جب دیکھا تو حضرت یوسفؑ کا کُرتہ پیچھے سے پھٹ رہا تھا، جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی بیوی انہیں پیچھے سے پکڑ کر روکنے کے لیے کوشاں تھی۔

۱۲/۲۸ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ
اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

"چنانچہ جب کُرتے کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹا تھا (اس سے واضح ہو گیا کہ یوسف سچّا ہے اور عورت جھُوٹی) اس پر اُس عورت کے خاوند نے (بیوی سے) کہا کہ تم عورتیں بڑی مکار ہوتی ہو۔ تمہاری مکاریوں سے خُدا کی پناہ! تمھاری چالیں کس قدر گہری اور تمھارے فریب کس قدر خطرناک ہوتے ہیں۔"

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اُس زمانہ تہذیب و تمدّن میں عورتوں کے متعلق عام خیال کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ عزیزِ مصر کا قول ہے۔ لیکن بعض سادہ لوح اس فقرہ کو جنسِ نسواں کے مکر و فریب کی تائید میں بطور آسمانی شہادت پیش کرتے ہیں۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! عورتیں ہوتی ہی مکر و فریب کی گٹھڑیاں ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم میں ہے: اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ[1] لیکن قرآن کا دامن ان اتہامات سے پاک ہے۔ اُس کے نزدیک مرد نہ محض مرد

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ

ہونے کی حیثیت سے دیانت داری اور راست بازی کا مجسّمہ ہے اور نہ عورت محض عورت ہونے کی جہت سے مکر و فریب کی پیکر۔ دیانت و امانت اور مکر و فریب کی استعداد دونوں میں موجود ہے اور دونوں اپنے اپنے اعمال کے مُطابق واجبُ التکریم یا مستوجبِ نفرین ہیں۔

---

[1] اس قسم کے مقبولِ عام مقولے جب شاعروں کے ہتھے چڑھ جائیں تو پھر پوچھئے نہ کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ (ہیر وارث شاہ پنجابی
(باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں پر ایک ثانیہ کے لیے رُکیے۔ جُرم کے اثبات کے لیے بالعموم عینی شاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن نظامِ عدل میں ایک اور شہادت کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور وہ شہادت ہے واقعاتی یا احوالی (CIRCUMSTANCIAL) یعنی موقعہ کے احوال و کوائف کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ دورِ حاضر میں ان کوائف کے مطالعہ نے سائنٹیفک اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس میں طبیعی تحقیق و تفتیش بھی شامل ہے۔ مثلاً مقتول کے خون کا ٹیسٹ، ضرب اور آلۂ ضرب کا باہمی تعلق وغیرہ۔ ان شواہد کو بالعموم دورِ حاضر یا دورِ تمدن کی خصوصیات سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن کے اس بیان کی رُو سے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ماضی کے اس قدر بعید زمانہ میں بھی واقعاتی شہادت کو اس قدر اہمیت دی جاتی تھی۔ زیرِ نظر شاہد نے واقعاتی شہادت کی رُو سے یہ ثابت کیا ہے کہ مجرم عورت ہے، نہ کہ (حضرت) یوسفؑ۔ اگرچہ اس ذریعۂ اثباتِ جرم کو قرآنِ کریم نے اپنی طرف سے پیش نہیں کیا، لیکن جس انداز سے اُس نے اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اسے اُس کی تائید حاصل ہے۔ اگر وہ اس کے حق میں نہ ہوتا تو کہہ دیتا کہ اثباتِ جرم کا یہ طریق قابلِ قبول نہیں قرار پا سکتا۔ بہرحال، جرائم کی تفتیش اور فیصلہ کے سلسلہ میں واقعاتی شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

لیکن جو قوانین پاکستان میں نافذ کئے گئے (اور نافذ کیے جا رہے ہیں[1])۔ ان میں اثباتِ جُرم کے لیے طریق ہی الگ اختیار کیا گیا ہے۔ جُرمِ زنا کے سلسلہ میں مطالبُ الفرقان جلد چہارم (ص ۲۹۵) دیکھئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس جُرم کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ اس کی شہادت دیں کہ انہوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر چار عینی گواہ نہ ہوں، یا اُن میں کسی ایک جزئی بات میں بھی اختلاف ہو، تو مُلزم بری ہو جائے گا اور گواہ مُجرم قرار پا جائیں گے۔ فقہ حنفی کی مشہور اور مستند کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں ہے کہ "اگر تین گواہوں نے عینی گواہی دے دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید تو کر دی لیکن کہا یہ کہ اُس نے مُلزم مرد اور عورت کو ایک لحاف میں دیکھا تھا تو

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) زبان کی کلاسیکی شاعری کی شاہکار ہے۔ اس میں عورتوں کے متعلق کہا ہے "ایہہ تریتاں مکر دیاں کُتیاں نیں"۔ عورتیں مکر و فریب کی کُتیاں ہیں۔ آک (مدار) کا پودا بڑا زہریلا ہوتا ہے۔ اس میں جو پھل لگتا ہے اس کی شکل آم کی سی ہوتی ہے لیکن اندر زہر سے بھرا ہوتا ہے۔ اُسے کُتی کہتے ہیں جس کی جمع کُتیاں ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ وارث شاہ عورتوں کے متعلق کیا کہہ گیا ہے جو ضرب المثل بن چکا ہے۔ سند اس کی اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ ـ کُنَّ سے کُتی۔

[1] یہ سطور ۱۹۸۴ء میں قلمبند کی جا رہی ہیں۔

اِس سے اس ملزم پر حد (سزا) جاری نہیں ہوگی اور پہلے تین گواہوں کو جرمِ قذف (جھوٹی تہمت لگانے) کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور اُنہیں اَسّی اَسّی کوڑے مارے جائیں گے"۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ اُردو ترجمہ صفحہ ۳۴۲،

بحوالہ طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۷۹ء صفحہ ۱)

اِن قوانین کے نفاذ کے وقت، طلوعِ اسلام نے ان پر تفصیلی تبصرہ کیا اور کہا کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ اِن کی رُو سے کسی ملزم کے خلاف جُرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۹ء تا اکتوبر ۱۹۷۹ء) لیکن اِس دَور میں قرآن کی آواز سُننے کے لیے کون تیار ہوتا ہے؟ اس کے بعد خود صدرِ مملکت' جنرل محمد ضیاء الحق' نے اعتراف کیا کہ جس قسم کی شہادت کو شرط قرار دیا گیا ہے اُس کی رُو سے جُرم ثابت ہی نہیں ہو سکے گا۔ یہ قوانین (حدود آرڈیننس) فروری ۱۹۷۹ء میں نافذ ہوئے تھے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد اُنہوں نے امریکہ کی (C.B.S.) کی ٹی۔وی ٹیم کو ایک اِنٹرویو دیا تھا۔ اِنٹرویو لینے والوں نے اعتراض کیا کہ یہ قوانین بڑے وحشیانہ ہیں۔ اس کے جواب میں صدرِ مملکت نے فرمایا تھا:

> یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں اِس کی وضاحت کر دوں گا۔ اِسلام، سزا کے بجائے، تخویف (DETERRENCE) پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ اِس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۹ء ـ بحوالہ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۸۲ء)

ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے' بین الاقوامی شہرت کے حامل میگزین (ASIA WEEK) کے ایڈیٹر انچیف (MICHAEL O'NEILL) نے اواخر ۱۹۸۱ء میں صدرِ مملکت سے مُلاقات کی جس کی رپورٹ اِس جریدہ کی ۴ دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اِس میں ان قوانین کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ اس کے اس اعتراض کے جواب میں کہ (ان قوانین کی رُو سے) کسی مجرم کو سزا دی ہی نہیں جاسکے گی، صدرِ مملکت نے کہا:

> یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کر سکتے۔ قرآنی قوانین کا بُنیادی فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوّت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مِل سکیں جو شہادت دیں کہ اُنہوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا ناممکن ہے [1]

(طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۸۲ء)

---

[1] اِن قوانین کی رُو سے عورت کی شہادت بھی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

لیکن اِس کے باوجود یہ قوانین مملکتِ پاکستان میں بدستور موجود ہیں۔ یہ قوانین درحقیقت اُن فقہی قوانین پر مبنی ہیں جو آج سے ہزار سال پہلے ہمارے دورِ ملوکیت میں اُس زمانے کے متقنّنین نے مرتّب کیے تھے اور ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری میں اس قسم کے جرائم بالعموم اوپر کے طبقہ میں عام ہوتے ہیں۔ (ہم کسی کی نیّت پر شُبہ کرنا نہیں چاہتے، لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ) ان جرائم کی سزائیں تو نہایت سخت رکھی گئیں لیکن انہیں شرائط ایسی کے ساتھ مشروط کر دیا کہ جن کی رُو سے جرم ثابت ہی نہ ہو سکے — نہ جُرم ثابت ہو، نہ سزا مل سکے۔

لیکن یہ قوانین نہ اسلامی تھے، نہ اَبدی کہ ہم پر ان کی پابندی لازم ہو۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے خُدا کی کتاب (قرآن) ابدی اور غیر متغیّر ضابطۂ حیات ہے جس کے احکام و قوانین، ہر دور کی اُمت (یعنی اسلامی مملکت) اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، باہمی مشاورت سے نافذ کرے گی۔ (واضح رہے کہ اسلامی مملکت اسے کہتے ہیں جس کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کی حدُود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے)۔ قرآنِ کریم نے جُرمِ زنا کے ثبوت کے لیے عینی شاہد کی شرط عاید کی ہے، نہ رجم (سنگسار کرنے) کو اس کی سزا قرار دیا ہے۔ (جرائم اور ان کی قرآنی سزاؤں کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم (ص ۲۹۹ تا آخر) دیکھیے۔)

اب پھر سلسلۂ داستان کو لیجیے۔ عزیزِ مصر نے اپنی بیوی کی تو اس طرح ملامت کی اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ اِس معاملہ کو رفت گزشت کرو۔ ان کی بریّت کی توثیق کے لیے ایک مرتبہ پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اپنی خطاؤں کی معافی مانگو، جُرم تیرا ہی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے:

۱۲/۲۹ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ﴿٢٩﴾

(حضرت) یوسفؑ سے کہا کہ (میاں صاحبزادے!) اس معاملہ سے درگزر کرو۔ (اِس پر مٹی ڈالو۔ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں[1]۔ کیا کیا جائے)۔ پھر بیوی سے کہا کہ تم خطا کار رہو۔ یوسفؑ سے اپنے قصُور کی معافی مانگو۔

اِس سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس تمدّن میں جس کی بُنیاد خُدا فراموشی پر ہو اور جس میں اخلاق باختگی عام ہو جائے انسان میں غیرت و حمیّت کا کتنا عنصر باقی رہ جاتا ہے؛ کسی بدوی قبیلہ میں یہی واقعہ ہوتا (جو مہذّب شہریوں کے نزدیک

[1] اِس قسم کے معاشرہ میں غیرت کا جنازہ نکل چکا ہوتا ہے۔

جاہل اور گنوار ہوتے ہیں) تو خاوند کی غیرت ایسی بیوی کی گردن اُڑا دیتی۔ لیکن اس "تہذیب کے فرزند" کو دیکھئے کہ آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہُوا۔ بیوی کا جُرم ثابت ہو گیا اور اس پر بیوی سے زیادہ سے زیادہ کہا تو فقط اتنا کہ تمہارا فرقہ بڑا ہی مکّار ہے اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ میاں صاحبزادے! اس قصے کو آگے نہ بڑھانا۔ یہیں ختم کر دینا۔

یہ آج سے چار ہزار سال پیشتر کی تہذیبِ مصرہی کا نتیجہ نہ تھا، ہر وہ تہذیب جس کی عمارت حدُود اللہ کی بُنیادوں پر استوار نہ ہو، اس میں غیرت اور حمیت، جہلا کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اِس میں مرد اور عورت دونوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ، بقولِ اکبرؔ

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذّب ہیں
حیا اُن کو نہیں آتی، اِنہیں غُصّہ نہیں آتا!

حقیقت یہ ہے کہ غیرت، ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے اور "تہذیب" کی حکمرانی میں خدا سے انکار کیا ہی اِس لیے جاتا ہے کہ نفس کی کامرانیوں میں کوئی روک ٹوک نہ رہے۔

عورتوں کی محفل

اِس کے بعد قرآن نے، اِس قصہ کی اگلی کڑی یوں بیان کی ہے:

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ
(۱۲ / ۳۰ — ۳۱) تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰهَا
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ
وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا
وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ
اَيْدِيَهُنَّ ۫ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا
مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

"جب اس واقعہ کا چرچا ہُوا تو شہر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اُنھوں نے کہا کہ عزیز کی

کی بیوی نے اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے شروع کیے ہیں، وہ اُس کی محبت میں دیوانی ہو رہی ہے، لیکن اس کے لیے اُس نے جو طریقہ اختیار کیا وہ غلط تھا (اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا مقصد حاصل نہ ہُوا، غلام بری الذمّہ قرار پاگیا اور وہ مجرم قرار پاگئی۔ اسے یوں نہیں، یوں کرنا چاہیئے تھا۔ جس سے یا تو مقصد براری ہوجاتی یا غلام، مجرم قرار پاجاتا)۔ (۳۰)

جب عزیز کی بیوی نے اُن کی تدبیر سُنی (تو اُس نے کہا، اسے بھی آزما دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ) اُس نے انہیں (رازدارانہ طریق سے) کھانے پر بُلایا۔ اُن کے لیے مسندیں بچھا دی گئیں اور چھُریاں (چمچے وغیرہ) سامنے رکھ دیے گئے۔ پھر اُس نے یُوسف کو بلایا۔ (چنانچہ اُنھوں نے وہ سب کچھ کرکے دیکھا جس کے لیے اِس قدر اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن اُن کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اِس پر وہ یُوسفؑ کی پختگیٔ سیرت کی قائل ہوگئیں)۔ اور کہنے لگیں کہ سُبحان اللہ! یہ انسان نہیں، واقعی کوئی واجبُ التکریم فرشتہ ہے۔ (اب وہ اپنی تدبیر کے دُوسرے حصّے کی طرف آئیں۔ کہ اگر مقصد براری نہ ہوسکے تو یُوسفؑ مجرم قرار پاجائے۔ اِس کے لیے اُنھوں نے) اپنے ہاتھ زخمی کرلیے۔ (یہ اُن کی بہت بڑی چال تھی۔ (۱۲/۵۰))"(۳۱)

ضمناً، قرآنِ کریم نے یہاں "قطعِ ید" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر کلائیوں سے الگ کردیے تھے۔ اِس سے مُراد یا تو محض ہاتھ روک لینے کے ہیں اور یا ہاتھوں کو زخمی کرلینے کے۔ قرآنِ کریم نے چور کی سزا کے سلسلہ میں جو "قطعِ ید" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اُن کا مطلب یہاں سے واضح ہوجاتا ہے۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان، جلد چہارم، ص۵۰۳)

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اِس مجلس میں جو کچھ ہُوا، اِسے حضرت یُوسفؑ نے ان عورتوں کا کیدؔ (مکر، خُفیہ سازش) کہہ کر پکارا ہے (دیکھئے ۱۲/۳۳ ؛ ۱۲/۵۰) اور اپنے ربّ سے دُعا کی ہے کہ مجھے اِس کی توفیق عطا فرما کہ ان کے حربوں کا مقابلہ کرسکوں (۱۲/۳۳)۔ اِس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ خُود وہ عورتیں بھی حضرت یُوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ اِس کی تائید اِس سے بھی ہوتی ہے کہ جب بادشاہ نے اس معاملہ کی تحقیق کی تو اس نے ان عورتوں سے (یعنی اکیلی عزیز کی بیوی سے نہیں بلکہ دوسری عورتوں سے بھی) کہا تھا:

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ (۱۲/۵۱)

"(چنانچہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی خود تحقیق کی) اور ان عورتوں سے کہا کہ سچ سچ بتاؤ کہ جب تم نے یوسفؑ کو

اُس کے ارادے سے پھیرنا چاہا تھا، تو اُس وقت کیا بات پیش آئی تھی ؟ اُنھوں نے کہا حاشَا ﷲ ! ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی کی بات نہیں دیکھی تھی۔ (وہ بالکل بے گناہ تھا)۔ ۱۲/۵۱"

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ تنہا عزیز کی بیوی نے نہیں بلکہ سوسائٹی کی اور عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا۔ لہٰذا، ہوسکتا ہے کہ اس محفل میں اُن کا مبہوت ہو کر اپنے ہاتھ زخمی کر لینا اور حُسنِ یوسفؑ کی اس قدر تعریف کرنا، ان کی "ایکٹنگ" ہی ہو جس سے مقصود خود اپنی محبت کا اظہار ہو۔ اِس لیے کہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ بڑا مُوثر ہوتا ہے کہ کسی کے حُسن کی اِس طرح والہانہ تعریف کی جائے اور اُسے باور کرایا جائے کہ اُسے دیکھ کر بڑے سے بڑے بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔

اِس کے بعد :

۱۲/۳۲ قَالَتۡ فَذٰلِكُنَّ الَّذِىۡ لُمۡتُنَّنِىۡ فِيۡهِ‌ؕ وَلَقَدۡ رَاوَدْتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ فَاسۡتَعۡصَمَ‌ؕ

"(عزیز کی بیوی نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ کیوں ؟ تم نے بھی آزما کر دیکھ لیا ناں !) یہ ہے وہ "غُلام" جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں (کہ مجھ سے اتنا بھی نہیں ہوسکا کہ ایک غلام کو رام کر لوں) میں نے اِسے اس کے ارادے سے پھیرنے کے لیے سب کچھ کر دیکھا، لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہُوا۔"

جذبۂ انتقام

اِس کے بعد وہ عورت ضد پر آگئی۔ اور اس نے برملا کہہ دیا :

وَلَئِنۡ لَّمۡ يَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسۡجَنَنَّ وَلَيَكُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾

" اگر اب بھی اُس نے میرا کہنا نہ مانا تو اِسے ضرور قید کرا کر رہوں گی اور اسے ذلیل وخوار ہونا پڑے گا۔ (اس لیے کہ اب، تمہاری اس تدبیر کی وجہ سے، اِس کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے محکم ثبوت موجود ہے کہ اُس نے تم پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا اور اس کی مدافعت میں تمھارے ہاتھ زخمی ہوگئے)۔"

ذرا اس تصوّر کو سامنے لائیے۔ دُنیا جہان میں قاعدہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس لیے حوالۂ قید و بند کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابُو نہ رکھ سکے اور اُنھوں نے کسی کی عصمت پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہاں مُعاملہ مُختلف ہے۔ حضرت یُوسفؑ کو اس لیے قید کی دھمکی دی جارہی ہے کہ اُنھوں نے اپنے جذبات پر قابو کیوں رکھا ! یہ ایک نئی آزمائش تھی۔ محل کی آرام کی زندگی،

عزّت و وقار۔ دولت و حشمت اور اس کے مقابلہ میں جیل خانہ کی عقوبت! حضرت یوسفؑ کو اختیار حاصل تھا کہ ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند کریں۔ انہوں نے ایقان و ایمان کی پوری قوت سے بلا تامّل کہہ دیا:

۱۲/۳۳ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

"(یوسف اب اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ ان عورتوں کے ارادے کیا ہیں۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرے گا لیکن اپنی سیرت و کردار کو داغدار نہیں ہونے دیگا)۔ اُس نے اپنے نشوونما دینے والے سے کہا کہ جس بات کی طرف مجھے یہ بلاتی ہیں، اس کے مقابلہ میں مجھے جیل جانا زیادہ پسند ہے۔ بارالٰہا! تو میری مدد کر اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ثابت قدم رہوں۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہُوا اور میں ان کے فریب میں آکر اُن کی طرف مائل ہو گیا تو یہ بڑی حق ناشناسی ہو گی۔"

عورتوں کی نگاہوں میں حضرت یوسفؑ کا حُسن صورت ہی تھا، لیکن دیکھنے والی آنکھ کے لیے اُن کے حُسن سیرت کی جمال آفرینی حُسن صورت سے کہیں بڑھ کر تھی۔

یہاں پھر دیکھئے۔ حضرت یوسفؑ نے یہی کہا ہے کہ "مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ" جس بات کی طرف مجھے یہ عورتیں بُلا رہی ہیں، اُس سے قید خانہ کہیں اچھا ہے۔ اس سے بھی اس توجیہہ کی تائید ہوتی ہے جسے ہم مجلس ضیافت والے واقعہ میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی اس مجلس کے تمام اہتمامات اس غرض کے لیے تھے کہ وہ عورتیں حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کریں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے طرح طرح کے مکر و فریب سے کام لیا تھا۔ انہی میں سے ایک ہاتھ کاٹنے کا تریا چلتّر بھی تھا۔

اِدھر سے، خدا کے اس مخلص بندے نے اپنے ربّ کو مدد کے لیے پکارا اور اُدھر سے اُس کے ربّ نے بابِ اجابت وا فرما دیا:

۱۲/۳۴ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

"سو اُس کے پروردگار نے اُس کی دعا کو شرف قبولیّت عطا فرمایا۔ چنانچہ اُن کا جادو نہ چل سکا اور وہ اسے اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہیں۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

بلا جرم قید و بند

جب عزیزِ مصر کی بیوی نے دیکھا کہ دھمکی سے بھی کام نہ چلا تو اُس نے دھمکی کو سچ کر دکھانے کا سوچا اور اپنی ہمراز عورتوں کے صلاح و مشورے سے کچھ ایسی بات بنائی کہ عزیز اور اُس کے متعلقین کو اِسی میں مصلحت نظر آئی کہ حضرت یوسفؑ کو کچھ وقت کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا جائے :

۱۲/۳۵ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

"(یوں ناکام رہنے کے بعد، اِن عورتوں نے یوسفؑ کے خلاف جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا) ججوں نے مختلف قرائن سے دیکھ لیا کہ یوسفؑ بے گناہ ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اِسی میں مصلحت سمجھی کہ یُوسفؑ کو کچھ مُدت کے لیے قید کی سزا دے دی جائے۔ (اِس قسم کے معاشرہ میں "اعلیٰ طبقہ" کی مصلحتیں کچھ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یوسفؑ کو داخلِ زنداں کر دیا گیا)۔"

آگے بڑھنے سے پہلے، راستہ کے اِس گوشہ پر ایک مرتبہ پھر نگہِ بازگشت ڈالیے۔ عزیزِ مصر دیکھ چکا تھا کہ اُس کی بیوی حضرت یوسفؑ کی طرف کس طرح مائل ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو وہ حضرت یوسفؑ کو محلّات سے الگ کر سکا (اسلیے کہ اس کی بیوی کبھی ایسا نہ ہونے دیتی) اور نہ ہی اپنی بیوی کر اُس کے مذموم ارادوں سے روک سکا۔ یہ سب اس لیے کہ اِس قسم کی مصنوعی تہذیب میں عورت کے مقابلہ میں مرد بیچارے کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حالت اکیلے عزیز ہی کی نہ تھی، دیگر امراء و اراکین بھی ایسے ہی تھے اس لیے کہ ان کی عورتوں کی کیفیت بھی ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یعنی اس سوسائٹی کی عام معاشرتی حالت ہی ایسی ہو چکی تھی۔ پھر دیکھئے کہ ایک ناکام محبت عورت اپنے جذبۂ انتقام میں کیا کچھ کرتی ہے؟ اور تیسرے یہ کہ مرد کس طرح عورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ عزیز اور اس کے گھرانے کے لوگ حضرت یوسفؑ کی راست بازی اور عصمتِ نفس کی نشانیاں دیکھ چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ قصور کس کا ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجبور ہو گئے کہ امراۃ العزیز نے جو دھمکی دی تھی اُسے پُورا کر دیا جائے۔ خدا فراموش سوسائٹی میں حق و انصاف کی اِسی طرح مٹی پلید ہُوا کرتی ہے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اِس سورۃ میں حضرت یوسفؑ کی عظمتِ سیرت کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس وقت تک اس میں ایک گوشہ نمایاں طور پر ہمارے سامنے آیا ہے۔ یعنی حفاظتِ عصمت ـــ اِس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، حفاظتِ عصمت کس قدر گراں بہا قدر ہے۔ قرآن کریم نے حضرت یوسفؑ کے علاوہ ایک اور ہستی کی انفرادی زندگی کا تفصیلی تذکرہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ ہیں حضرت مریم (علیہا السّلام)۔ مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں یہ تذکرہ محفوظ ہو چکا ہے (دیکھئے۔ بالخصوص جلد چہارم۔ صـ۲ تا آخر)۔ وہ نبی تو نہیں لیکن اُن کے لیے بھی

اِصْطَفٰـكِ (برگزیدگی) کا لفظ انبیاء کرام کی طرح آیا ہے (۴۴/۳)۔ ان کی اس بلندئ مرتبت کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ — اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱/۹۱) انہوں نے اپنے دامنِ عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔ (اور اسی خصوصیت کی بنا پر اُن کے اُسوہ کو دُنیا جہاں کی عورتوں کے لیے مثالی قرار دیا۔ (۶۶/۱۲)

حیوانی سطح پر جنسی اختلاط کا تعلق عمل افزائشِ نسل سے ہے۔ لیکن انسانی سطح پر اس کا مقام کچھ اور ہے۔ اس کے متعلق ہم نے مطالبُ الفرقان جلد اوّل (ص۲۳ پر) لکھا تھا کہ اور تو اور خود مغرب کے محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قوموں کے عروج و زوال کا اس کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہم نے وہاں کہا تھا کہ اس کے متعلق مناسب مقام پر تفصیل سے لکھیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مقام اس تشریح کے لیے مناسب ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J.D. UNWIN) نے اس سوال کو اپنی تحقیقات کا موضوع قرار دیا کہ جنسی جذبہ کی تسکین محض ایک انفرادی فعل ہے جس کا تعلق دو افراد سے ہوتا ہے یا اس کا کوئی اثر اس قوم کی تہذیب و تمدن پر بھی پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے دُنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے اَسّی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ کیا، اور پھر سولہ مہذب اقوام کی معاشرتی زندگی کا۔ اس کے بعد اس نے اپنی تحقیق کے نتائج کو اپنی گراں قدر تصنیف (SEX AND CULTURE) میں پیش کیا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر انون اس وقت حیات ہیں یا وفات پا چکے ہیں، لیکن ان کی زندۂ جاوید کتاب ہمارے سامنے ہے جس کے ضروری اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

"دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط نتائج اِس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں"۔

متنِ کتاب سے بھی پہلے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک اُن لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو اُن حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اُس گروہ نے جنسی تعلقات پر عاید کر رکھی ہوں۔ (XVII)

اس کلیہ کو اس نے متنِ کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ:

کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اُس

نے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (صفحہ ۳۲)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک جبلی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دار و مدار اس جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ:

"اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔" (صفحہ ۳۰۳)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

"جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔" (صفحہ ۳۳)

اس لیے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو، یعنی اُسے دنیا میں تمدنی عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لیے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی، اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرّد

سب سے پہلے تجرّد کی زندگی (CELIBACY) کو لیجئے، جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لیے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ:

"جبری تجرّد (COMPULSORY CELIBACY) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔" (صفحہ ۸۴)

جبری تجرّد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقاید یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرّد کی زندگی وجہِ شرف تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرّد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرّد کی زندگی ہی وجہِ شرفِ انسانیت ہے تو دوسری طرف آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد

کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صفحہ XII)

آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ:

"جو قومیں اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلاقیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ اُن کے پاس کسی اور کام کے لیے توانائی ہی نہ رہی۔" (صفحہ ۳۹۹)

ڈاکٹر فرائڈ (ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز محقق) اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ:

"جب جنسی جذبات پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تو یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں جسے (SUBLIMATION) کہتے ہیں)، اور اس لیے افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر اُن گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔"

(INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS
TRANSLATED BY J. RIVIERE P. 17)

اس کے برعکس، جو قوم جنسی جذبات کی تسکین کو بے محابا چھوڑ دیتی ہے اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ:

"اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی[1]۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ اُسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مُطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو اُن کی سمجھ میں نہ آئے، کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے

---

[1] دیکھیے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ (۷/۱۷۹)

حیوانات کو جو انہیں محیرّ العقول نظر آئیں، اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت اُن کی سمجھ میں نہ آئے، جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے، وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی موت کے بعد بھی اُسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان تمام توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ، تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے) اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد اُن پر کسی طرح اثرانداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور ان کی لاشوں کو تہِ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہوجاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں[1]۔ (صفحہ ۳۴۶-۳۴۵)

یہ ایک غیر مسلم مغربی محقق کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا قوم کی موت و حیات سے کس قدر گہرا تعلق ہے اور قرآنِ حکیم نے اس پر جو اس قدر پابندیاں عائد کی ہیں، اُن کی غرض و غایت کیا ہے۔ ہمارے ہاں کا نوجوان طبقہ (اقوامِ مغرب کی تقلید میں) عام طور پر کہہ دیا کرتا ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین فطرت کا تقاضا ہے، اسے جس طرح بھی پورا کرلیا جائے، ٹھیک ہے۔ اس پر پابندیاں معاشرتی تقاضے ہیں معاشرہ مناسب سمجھے تو انہیں نرم کردے، یا سرے سے ختم ہی کردے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے ـــ اعتراض وہ ہو سکتا ہے جسے خود اقوامِ مغرب کے ایک محقق نے اپنی مدت العمر کی تحقیق کے بعد عائد کیا ہے۔ ان پابندیوں کا تعلق قوم کے عروج و زوال سے ہے۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قرآنِ کریم نے داستانِ حضرت یوسفؑ میں اس واقعہ کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے اور اسے ہمارے لیے کیوں موجبِ عبرت و موعظت قرار دیا ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ محلات کے نظم و نسق کا کارفرما اور (فی الجملہ) وہاں کی آرام و آسائش کی زندگی کا خوگر، یوسفؑ اب قید خانے کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ اور اس جرم میں کہ اُس نے جذبات کو مشتعل کردینے والے اسبابؑ مواقع میں بلند اخلاقی قدر کی، جو خدا کی طرف سے متعین ہوئی تھی، پابندی کیوں کی! حضرت یوسفؑ کی پاکبازی شرافتِ نفس اور نیکوکاری کچھ ڈھکی چھپی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ اسی جگہ گزارا تھا جہاں اُنہیں اب قید میں ڈالا گیا تھا۔ اس لیے قید خانہ میں بھی ان کا احترام اور تقدس مسلّم تھا۔ جیل میں آپ کے ساتھ دو اور

---

[1] یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اس طرح کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان!

نوجوان بھی تھے۔ ایک بادشاہ کے ساقیوں کا سردار اور دوسرا داروغہ مطبخ۔ یہ کسی معاملہ میں زیرِ عتاب آگئے اور

قیدخانہ کے ساتھیوں کے خواب

قیدخانہ میں ڈال دیئے گئے۔ انھوں نے ایک رات خواب دیکھے اور چونکہ حضرت یوسفؑ کی فراست اور بزرگی پہلے سے معروف تھی، وہ اُن کے پاس گئے کہ اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کریں۔

۱۲/۳۶ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

یوسفؑ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی جیل خانہ میں آئے۔ (ایک دن) اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے انہیں (نوچ نوچ کر) کھا رہے ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ ان کا مطلب اور مآل کیا ہے، کیونکہ تم بڑے سمجھدار اور نیک آدمی دکھائی دیتے ہو۔

قیدخانہ میں حضرت یوسفؑ جو کچھ ان قیدیوں کے متعلق دیکھ اور سن رہے تھے، اُس سے اُن کے خوابوں کی تعبیر کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا۔ اس لیے آپؑ نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ نوجوان اپنی ضرورت کی غرض سے آپ کی طرف خاص طور پر متوجہ تھے۔ آپؑ نے سوچا کہ دینِ حقیقی کے متعلق ایک اصولی بات اُن کے کان میں ڈال دی جائے۔ ممکن ہے وہ اُسے بادشاہ تک پہنچا دیں۔ لیکن انہوں نے ان نوجوانوں کو نفسیاتی طور پر مزید متاثر کرنے کے لیے انھیں تھوڑا سا انتظار میں رکھنا ضروری سمجھا:

۱۲/۳۷-۳۸ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

(ایک مبلّغِ پیغاماتِ خداوندی کی طرح، جو اس مقصد کے لیے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، یوسفؑ نے سوچا کہ یہ نوجوان، اِس وقت اُس کی بات سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں، لہٰذا، اِن کے کان میں توحید کی آواز ڈال دینی چاہیئے)۔ چنانچہ اُس نے اُن سے کہا کہ میں تمہارے کھانے کے وقت سے پہلے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ (لیکن پہلے، یہ تو سُن لو کہ میں کون ہوں اور میرا پیغام کیا ہے)۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا، بلکہ اُس علم کی بنا پر کہتا ہوں جو مجھے میرے پرورد گار کی طرف سے ملا ہے۔

سب سے پہلے یہ سُن لو کہ میں اُن لوگوں کے مسلک پر نہیں ہوں جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

(تم نے ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کا نام تو سُنا ہوگا)۔ میں انہی کی اولاد میں سے ہوں اور انہی کے مسلک کا پیرو ہوں۔ ہم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے۔ اس حقیقت کا پالینا (کہ اقتدارِ خداوندی میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیئے) خدا کا بہت بڑا فضل ہے جو اس نے ہم پر اور دُوسرے انسانوں پر (جو اس مسلک کے متبع ہیں)، کیا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اُس کے اِس فضلِ عظیم کی قدرشناسی نہیں کرتے۔

وعظِ یُوسفی اپنے کیش و مشرب کا یُوں تعارف کرانے کے بعد اب مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کی تشریح ارشاد فرمائی اور اس میں دینِ خداوندی کی اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کر دیا جو اسلام کا اصل الاصول ہے۔ فرمایا:

(۱۲ / ۳۹ــــ۴۰) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

(توحید کے اس نکتہ کو میں تمہیں ایک اور انداز سے سمجھاتا ہوں) ایک شخص صرف ایک آقا کا نوکر ہے۔ اور وہ آقا بھی ایسا ہے جو ہر قسم کے اختیارات رکھتا ہے۔ اور دُوسرا شخص بیک وقت متعدد مالکوں کی نوکری کرتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اُن میں سے کس کی زندگی اچھی طرح سے گزرے گی؟ ظاہر ہے کہ اس کی زندگی اچھی ہوگی جو ایک آقا کا ملازم ہے اور وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔

بس یہی صُورت ایک خُدا کی اطاعت اختیار کرنے والوں کی اور ان کے مقابلے میں، اُن کی ہے جو مختلف آقاؤں کو اپنا خُدا مانیں۔ تم لوگ مختلف خداؤں کے سامنے جُھکتے ہو۔ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان خداؤں کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ بس اتنی ہی کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ورنہ اُن کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں۔ (تم سے کہا جاتا ہے کہ یہ خُدا اس کے نمائندے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے) خُدا نے اُن کے لیے کوئی سند نہیں بھیجی (کہ اُس نے انہیں اپنے اختیارات دے رکھے ہیں)۔ یاد رکھو! اختیارات واقتدارات کا واحد مالک خُدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے۔ یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار نقشہ۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے؛

اِسلام کیا ہے؟ — وعظِ یوسفی کے اِن مختصر سے جُملوں کی عملی تفسیر۔ یُوں کہیے کہ سارا قُرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہجہان کو جب قلعۂ آگرہ میں قید کر دیا گیا تو اُس نے ایک نادرہ کار صنّاع سے کہا کہ اس کے کمرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا نگینہ اس انداز سے ٹکا دے کہ وہ کمرے کے اندر جہاں بھی ہو، اُٹھتے بیٹھتے پُورے کا پُورا "تاج" اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ وعظِ یُوسفی کے اِن چھوٹے چھوٹے نگینوں کو دیکھیے، ایک ایک نگینہ میں پُورے کا پُورا "تاج" کس طرح جھلمل جھلمل کرتا نظر آرہا ہے۔! ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ توحید کی پُوری کائنات اس نگینہ کے اندر سمائی ہُوئی ہے۔ اِنسان اُسی کے سامنے جُھکتا ہے جس میں (بزعمِ خویش) شانِ ربوبیت سمجھتا ہے۔ جس کے متعلق اُسے خیال ہوتا ہے کہ مجھے کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے (یا نقصان دے سکتا ہے)۔ ذرا سوچئے کہ خُدا تراشی کے اس مسلک میں اُسے دُنیا میں کس کس کے سامنے جُھکنا پڑتا ہے اور وہ کن کن چوکھٹوں کی ذِلت آمیز خاک سے اپنی پیشانی

کو داغدار کرتا ہے۔

گاہ اُو را با کلیسا سازباز گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ اُو آئینِ او سوداگری است عنتری اندر لباسِ حیدری است (اقبالؒ)

مثل مشہور ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اُس "عملی مشرک" کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے نئے آقا کے سنگِ آستاں پر جبیں سائی کرنی پڑے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اُن میں سے کسی میں بھی وہ قوت نہ ہو جس کے احساس سے وہ ان کے سامنے جھکتا ہے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ سو جب کسی انسان میں ربوبیّت کی قدرت ہی نہیں تو ایک انسان کسی دوسرے انسان کی محکومیت کیوں اختیار کرے؟ حکومت صرف اُس ذات کو زیبا ہے جس کے قانون کے مطابق نفع و نقصان کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لیے سُن رکھو کہ (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ) اس کا حکم ہے کہ اس کے قانون کے سوا اور کسی قانون کی اطاعت نہ کرو۔ یہ ہے (دینِ قیّم) محکم نظام جس کے تابع انسان کو چلنا چاہیئے۔ سابقہ جلدوں میں شرک اور توحید، خُدا کی حکومت، عبدیّت، اسلامی مملکت، قرآنی نظامِ حکومت کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ انڈکس کی مدد سے ان مقامات کو سامنے لائیے۔ وعظِ یوسفی کی تشریحات پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ ریز ہو جائیں گی۔

۱۲/۴۱ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۭ﴿۴۱﴾

(اس تبلیغ کے بعد، یوسفؑ نے ان سے کہا کہ اب سنو اپنے خوابوں کی تعبیر)۔ تم میں سے ایک (جس نے دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے) اپنے آقا کی ساقی گری کرے گا اور دُوسرا سُولی پر چڑھا دیا جائے گا جہاں سے پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ تم نے جن خوابوں کے متعلق مجھ سے پوچھا ہے اُن کی تعبیر یہ ہے۔ تعبیر کیا؟ بس یوں سمجھو کہ یہ قطعی فیصلہ ہے (میرا اندازہ یہی ہے)۔

جس کے متعلق سمجھا تھا کہ وہ مصائب سے نجات پا جائے گا، حضرت یُوسفؑ نے اُس سے کہا کہ سو قع پا کر

بادشاہ سے ان امُور کا تذکرہ کر دینا جو میں نے تم سے کہے ہیں، یعنی توحید باری تعالیٰ اور حکومتِ خداوندی سے متعلق۔ لیکن ان باتوں کا اثر اسی صُورت میں ہوسکتا تھا جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوجائے کہ وہ قیدی بے گناہ ہے ورنہ ایک مجُرم قیدی کے پند و نصائح پر کون کان دھرتا ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا ہوگا کہ بادشاہ سے میری قید کی حقیقت بھی کہہ دینا۔ وہ دونوں نوجوان قید سے نکال لیے گئے اور حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر کے مطابق ہی ان کے ساتھ سلوک ہوُا لیکن وہ نوجوان جو اپنے منصب پر بحال ہوگیا تھا حضرت یُوسفؑ کی بات بھُول گیا اور یُوں

۱۲/۴۲ وَقَالَ لِلَّذِىْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِىْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِى السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

ان میں سے جس کے متعلق یوسفؑ کا اندازہ یہ تھا کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس سے یوسفؑ نے کہا کہ تم جب اپنے آقا کے پاس جاؤ تو اس سے ان باتوں کا ذکر ضرور کرنا جو میں نے تم سے کی ہیں۔

چنانچہ وہ قید سے رہا ہوگیا لیکن شیطان نے اُسے بھُلا دیا کہ وہ ان باتوں کا ذکر اپنے آقا سے کرے۔

اس بات کو کئی برس ہوگئے اور یوسفؑ قید میں پڑا رہا۔

بادشاہ کا خواب

وقت گزرتا گیا حتیٰ کہ ایک رات بادشاہ نے عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی تعبیر بتانے سے دربار کے اہلِ دانش عاجز رہ گئے۔

۱۲/۴۳-۴۴ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّىْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِىْ فِىْ رُءْيَاىَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

ایک رات بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات خوشے ہرے ہیں اور (سات) سُوکھے ہُوئے۔

اُس نے اپنے درباریوں سے اپنا خواب بیان کیا اور ان سے کہا کہ اگر تم خوابوں کی تعبیر بتا سکتے ہو تو بتاؤ میرے

خواب کی تعبیر کیا ہے؟

انہوں نے کہا کہ یہ خواب نہیں، محض پریشان خیالی ہے۔ اور اس قسم کی پریشان خیالیوں کی تعبیر ہم نہیں جانتے؛

اہلِ دربار میں جب اس کا چرچا ہوا تو ساقیوں کے سردار کو اپنا قید خانہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی بتائی ہوئی تعبیر اور تعبیر کی صداقت یاد آگئی۔

۱۲/۴۵ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿۴۵﴾

اُن دو قیدیوں میں سے جس نے رہائی پائی تھی، اُسے (اس خواب کے سلسلہ میں) مدت کے بعد یوسفؑ کی یاد آگئی۔
اُس نے کہا کہ مجھے (قید خانے میں) جانے دو۔ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا دوں گا؛
چنانچہ وہ بھاگا بھاگا حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا:

۱۲/۴۶ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۴۶﴾

وہ قید خانہ میں آیا اور یوسفؑ سے کہا کہ اے سچی تعبیریں بتانے والے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتاؤ کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور (سات) خشک۔
میں اس کی تعبیر کو اُن لوگوں تک پہنچاؤں گا (جنہوں نے مجھے اس مقصد کے لیے یہاں بھیجا ہے) وہ اس سے تمہاری قدر و قیمت پہچان لیں گے؛

غور کیجئے یہ وہی نوجوان ہے جسے حضرت یوسفؑ نے اس کی رہائی کا مژدہ سنایا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ اس کا ذکر بادشاہ سے کرے۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا بلکہ اظہارِ تشکر کے لیے بھی اُن کے پاس نہ آیا اور اب جبکہ ایک غرض لاحق ہوئی، تو حضرت یوسفؑ یاد آئے۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو سب سے پہلے اس نوجوان سے ان تمام امور کا گلہ کرتا اور معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس سے کہتا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر کیوں بتاؤں؟ بادشاہ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو مجھے یہاں سے نکالے، میں خود جا کر بتاؤں گا لیکن

ایک عام انسان اور اللہ کے مخلص بندوں میں کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کا یہی فرق ہوتا ہے۔ آپ نے نہ اُس سے کسی قسم کی شکایت کی اور نہ ہی اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ تعبیر بھی بتا دی اور اس تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی۔

(۱۲ / ۴۷—۴۹) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

یوسفؑ نے اس سے (ایک حرفِ شکایت کہے بغیر کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا) کہا (کہ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بھی بتاتا ہوں اور وہ تدبیر بھی جس سے تمہارا ملک آنے والی تباہی سے بچ جائے گا۔ لو سُنو) تم لوگ سات سال تک خوب محنت سے کھیتی باڑی کرو۔ اور جب فصل کاٹو تو سوائے اتنے غلّے کے جو تمہارے کھانے کے کام آئے، باقی اناج، بالوں کے اندر ہی رہنے دو (تاکہ وہ کیڑوں سے محفوظ رہے)۔

اس کے بعد سات سال ایسے آئیں گے جو (قحط سالی کی وجہ سے) سخت مصیبت کے ہوں گے۔ اس قحط سالی کے زمانے میں وہ سارا غلّہ تمہارے کام آئے گا جسے تم نے ذخیرہ کر رکھا ہوگا۔ اس میں سے اتنا ضرور بچا رکھنا (جو بیج کے کام آئے)۔

کیونکہ اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں عام بارش ہوگی (اناج بھی بافراط پیدا ہوگا اور انگور بھی) جس کا عرق لوگ نچوڑیں گے[1]

جب بادشاہ نے اس تعبیر اور اس کے ساتھ حسنِ تدبیر کو سنا تو اس پر حضرت یوسفؑ کی دانش و بینش اور فراستِ تدبّر کے جوہر آشکارا ہو گئے اور اُس نے فوراً حکم دیا کہ اس شخص کو قید خانے سے رہا کر کے دربار میں لایا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کا قاصد رہائی کا حکم لے کر حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا۔

اِس مقام پر سیرتِ یوسفیؑ کا ایک اور تابناک گوشہ وجہِ شادابیٔ قلب و نگاہ ہوتا ہے۔ جب تک قرآن کریم نہ بتائے، آپ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ اُنہوں نے قاصد کو کیا جواب دیا ہوگا! اس لیے کہ اس کے بعد جواب

---

[1] خوابوں کی حقیقت کے متعلق سورۃ کے آخر میں گفتگو کی جائے گی۔

کیسا؟ قیاس یہی کہتا ہے کہ آپ نے قید و بند کے مصائب سے نجات ملنے کو غنیمت سمجھا ہوگا اور فوراً اُس کے

سیرتِ یوسفی کی ایک اور جھلک

ساتھ دربار میں تشریف لے گئے ہوں گے۔ ہر شخص ایسے موقع پر یہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کی خودی میں اتنی بیداری اور جس کے کیرکٹر میں اتنی بلندی پیدا ہو چکی ہو، وہ یہ نہیں کرے گا۔ اس سے الگ کچھ اور کرے گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ بادشاہ کی توجہ فرمائی کا شکریہ۔ لیکن میں اس ترحمِ خسروانہ کے صدقے قید خانہ سے نکلنا نہیں چاہتا۔ بادشاہ سے جاکر کہو کہ پہلے میرے مقدمہ کی تحقیق کرے اور جب ثابت ہو جائے کہ میں بے گناہ ہوں تو پھر میری رہائی کا حکم بھیجے۔ میرا مقصد قید و بند کے مصائب سے خلاصی حاصل کرنا نہیں، اپنی بریت ثابت کرنا ہے۔

۱۲/۵۰ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾

(جب اُس شخص نے یہ تعبیر اور تدبیر بادشاہ تک پہنچائی تو وہ دنگ رہ گیا۔ اور) اُس نے کہا کہ اُس قیدی کو میرے پاس لاؤ (جس نے یہ تعبیر اور تدبیر بتائی ہے)۔ جب بادشاہ کا قاصد یوسفؑ کے پاس آیا (اور اُسے قید سے نکلنے کے لیے کہا۔ تو) یوسفؑ نے کہا (کہ میں اس طرح، ترحمِ خسروانہ کی بنا پر قید سے نہیں نکلنا چاہتا) تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ (وہ پہلے میرے مقدمہ کی ازسرِنو تحقیقات کرائے تاکہ) یہ واضح ہو جائے کہ عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کا ماجرا کیا تھا اور وہ کتنا بڑا فریب تھا جو مجھے پھنسانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ اس وقت تو اس حقیقت کا علم صرف میرے خدا کو ہے (لیکن مقدمہ کی تحقیق کے بعد اُس کا علم عام ہو جائے گا کہ قصور کس کا تھا۔ اگر میں اس طرح بے گناہ ثابت ہو گیا تو پھر قید خانے سے باہر آؤں گا)۔

اللہ اکبر! کتنی بلند سیرت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن توراتؔ میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہاں یہی مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ

توراتؔ کا بیان

نے لباس تبدیل کیا اور فوراً دربار میں چلے گئے۔

تب فرعون نے یوسفؑ کو بلوایا۔ وہ جلد اُسے قید خانے سے لے آئے اور اُس نے سر منڈایا اور کپڑے بدل کے فرعون کے حضور آیا۔ (پیدائش ۴۱/۱۴)

ہمارے ہاں کی ایک روایت

یہاں پہنچ کر ہمیں اپنے ہاں کی بھی ایک روایت یاد آگئی۔ تورات کے متعلق تو ہمارا یقین ہے کہ وہ محرّف ہے لیکن مقامِ تأسف ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جنہیں "اصح الکتب" کہا جاتا ہے، اس سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جیسے بادشاہ کا قاصد آیا تھا، اگر میں حضرت یوسفؑ کی جگہ ہوتا تو فوراً اس کے ساتھ چلا جاتا۔

لو لبثت فی السّجن ما لبث یوسف۔ لاجبت الدّاعی۔

اگر میں قیدخانہ میں اتنے عرصہ تک رہا ہوتا جتنے عرصہ تک یوسفؑ رہے تھے تو میں قاصد کے ساتھ ہو لیتا۔

صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایتیں معاندینِ اسلام (یہود و نصاریٰ) کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حضورؐ کی سیرتِ اقدس کو گھٹا کر پیش کرنا چاہتے تھے[1] لیکن گلہ ان پر نہیں، اپنوں پر ہے کہ یہ اس قسم کی روایتوں کو سینہ سے لگائے پھرتے ہیں اور اگر حضورؐ کی عظمت و تقدس کا خیال کسی کو اس امر پر مجبور کر دے کہ وہ ان روایات کو حضورؐ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہ کرے تو اس کی تکفیر و تفسیق کے فتاویٰ صادر کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ سب کچھ اس لیے کہ یہ روایتیں بخاری اور مسلم کی کتابوں میں درج ہیں۔ یعنی حضورؐ کی شانِ اقدس میں (معاذ اللہ) طعن پایا جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن بخاری اور مسلم میں غلط روایات کے امکان کا خیال نہ پیدا ہونے پائے۔ بایں ہمہ، حقیقت بیں نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ غلطی سے مبرا اس آسمان کے نیچے کتابُ اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

مُعاملہ کی تحقیق

فرعون، حضرت یوسفؑ کی دانش و بینش کا تو پہلے ہی معترف ہو چکا تھا، جب آپ کا یہ جواب سُنا تو آپ کی بلندیٔ سیرت کا احترام بھی اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اُس نے فوراً تحقیقات کا حکم دے دیا اور اُن عورتوں سے دریافت کیا کہ بتاؤ اصل مُعاملہ کیا ہے۔

۱۲/۵۱ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ

---

[1] اس قسم کی ایک اور سازش کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد سوم (ص۹۶) دیکھیے جہاں بتایا گیا ہے کہ ان روایات کی رُو سے نمازوں کی تعداد کس طرح متعین ہوئی تھی اور پھر یہ روایات کہ حضورؐ ایک عرصہ بعید تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ (مطالبُ الفرقان جلد سوم۔ ص۸۳)

حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ...

(چنانچہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی خود تحقیق کی) اور ان عورتوں سے کہا کہ سچ سچ بتاؤ کہ جب تم نے یوسفؑ کو اُس کے ارادے سے پھیرنا چاہا، تو اُس وقت کیا بات پیش آئی تھی؟

اُنہوں نے کہا حاشا للہ! ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی کی بات نہیں دیکھی تھی۔ (یہ بالکل بے گناہ ہے)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان عورتوں نے بھی حضرت یُوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور مجلسِ ضیافت کی تمام حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں اسی غرض کے لیے تھیں اور اس کے بعد حضرت یوسفؑ کو قید خانہ میں بھجوانا بھی انہیں کے دامِ تزویر کی ایک کڑی تھی جو امراۃ العزیز کے ایما پر مرتب کی گئی تھی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اِمرأۃ العزیز کا نام نہیں لیا۔ صرف ان عورتوں کی طرف اشارہ کیا (۱۲/۵۰) اس لیے کہ قمیص پھٹنے والے واقعہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عزیز نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا کہ اس معاملہ کو رفت گزشت سمجھو۔ حضرت یوسفؑ کو ابھی تک اس بات کا خیال تھا اس لیے اپنے مربّی کی بات کا پاس کیا اور اُس کی بیوی کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب عورتوں کے مُعاملہ کی تحقیق ہُوئی تو سب کچھ بے نقاب ہو گیا۔ اس دوران میں عزیزِ مصر کی بیوی کے جذبات کی آندھیاں بھی اُتر چکی تھیں اور وہ حضرت یوسفؑ کی بلندئ سیرت کی قائل ہو چکی تھی۔ لاکھ جذباتِ انتقام ہوں، سیرت کی بلندی اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب دُوسری

حقیقت بے نقاب

عورتوں نے حضرت یوسفؑ کی پاکیزگیٔ داماں کی قسم کھائی تو اُس سے بھی نہ رہا گیا، اور اُس نے برملا کہہ دیا کہ ان کا مُعاملہ تو ایک طرف، خود میرے مُعاملہ میں بھی یوسفؑ کا کوئی قصور نہ تھا۔

[۱۲/۵۱] قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

(یہ سُن کر عزیز کی بیوی بھی لب کشائی پر مجبور ہو گئی اور اس نے جُھکی ہُوئی نگاہوں اور لرزتے ہُوئے ہونٹوں کے ساتھ) کہا۔ اب جبکہ حقیقت اس طرح بے نقاب ہو گئی ہے تو مجھے اس کا اقرار کر لینا چاہیے کہ وہ میں ہی تھی جس نے یوسفؑ کو پھسلانا چاہا تھا۔ بے شک یوسفؑ اپنے بیان میں بالکل سچا ہے۔

اس پر حضرت یوسفؑ نے کہا:

۱۲/۵۲ ذٰلِكَ لِيَعۡلَمَ اَنِّىۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ كَيۡدَ الۡخَآئِنِيۡنَ ﴿۵۲﴾

(یوسفؑ نے کہا کہ میں نے اس مقدمہ کی از سرِنو تحقیق پر اس لیے بھی زور دیا تھا کہ میرے مربّی اور مہربان) عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے، اس کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ خدا کا قانونِ مکافات' خیانت کرنے والوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ (خیانت اس کی بیوی نے کی تھی۔ وہ خاسر و نامراد سامنے کھڑی ہے۔ میں امین تھا۔ آخرالامر کامیابی میرے ہی حصّہ میں آئی)۔

تیرھواں پارہ شروع

پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

۱۲/۵۳ وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ‌ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ ‌ؕ اِنَّ رَبِّىۡ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۳﴾

عزیز کی بیوی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں اپنے بے گناہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ میرے نفس[1] نے مجھے بہکا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اُسے بُرائی کے لیے اُکساتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ وہی اس قسم کی لغزشوں سے محفوظ رکھنے والا اور مرحمت کرنے والا ہے؛

کون تھا جس کے دل میں سیرتِ یوسفی کی اس درخشندگی سے احترام و عظمت کے جذبات بیدار نہ ہو جاتے! دانش و بینش، تدبّر و فراست کے ساتھ، سیرت کی اتنی بلندی اور کیریکٹر کی اتنی پختگی۔ بادشاہ کی نگہِ جوہر شناس نے فوراً اس کندن کو پہچان لیا۔

۱۲/۵۴ وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِىۡ بِهٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡهُ لِنَفۡسِىۡ‌ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ ﴿۵۴﴾

---

[1] نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنّہ کے متعلق دیکھیے مطالب الفرقان۔ جلد دوم، صـ۵۷

بادشاہ نے (حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کے بعد) کہا۔ یوسف کو میرے پاس لاؤ۔ میں اُسے دوسروں سے ممتاز کرکے، خاص اپنے لیے مختص کر لینا چاہتا ہوں۔ (وہ میرا مشیرِ خاص ہوگا) چنانچہ جب بادشاہ نے یوسفؑ سے بات چیت کی (تو اس کے اور جوہر بھی اُس پر نمایاں ہوگئے)۔ اس نے کہا۔ آج سے تم ہماری نگاہوں میں بڑی عزّت و تمکین کے مالک قرار پاچکے ہو۔ تمہاری امانت اور دیانت مسلّم ہے۔

اللہ اکبر! کنعان کا چرواہا، بازارِ مصر میں نیلام شدہ غلام، برسوں کا قیدی اور بادشاہ کی طرف سے ان الفاظ کا مخاطب کہ:

اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ (۱۲/۵۴)

حضرت یوسفؑ نے سلطنت کے نظم و نسق کے مختلف شعبوں پر نگاہ ڈالی اور اندازہ لگالیا کہ کس شعبہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے باقی انتظامات صحیح رُخ اختیار کرلیں گے۔

۱۲/۵۵ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا کہ (مملکتِ مصر کی خوشحالی کا راز، اُس کی زمین کے خزانوں میں مضمر ہے) تم ان خزانوں (زمین کی پیداوار اور معاشی معاملات) کو میری تحویل میں دے دو۔ میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کس طرح کیا جاتا ہے۔

غور کیجئے۔ جب حضرت یوسفؑ عزیز کے محلّات میں پہنچے تھے اور وہاں کا نظم و نسق ان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۲۱)

جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا وہ (اُسے اپنے گھر لے آیا اور) اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ (اس لڑکے کے ساتھ عام غلاموں کا سا برتاؤ نہ کرنا بلکہ) اسے عزّت کے ساتھ رکھنا (کیونکہ اس کے چہرے بُشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس لیے) ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے کسی فائدے کا موجب بن جائے۔ یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنالیں۔

اِس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسفؑ کے پاؤں جما دیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں (کہ ایسا کیوں اور کس طرح

ہو رہا ہے)۔

یعنی اس تمکّن سے غرض یہ تھی کہ حضرت یوسفؑ کے لیے معاملات فہمی اور حسنِ تدبیر کے مواقع بہم پہنچائے[1] جائیں۔ اس عملی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ آج حضرت یوسفؑ اتنے بڑے انتظام کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر فرمایا:

۵۶/۱۲ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

اس طرح، ہم نے یوسفؑ کو، مملکتِ مصر میں، صاحبِ اختیار بنا دیا — ایسا صاحبِ اختیار کہ وہ اس کے نظم و نسق کو جس طرح چاہتا چلاتا۔ ہم اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق، لوگوں کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں۔

اور وہ قانونِ مشیّت یہ ہے کہ جو شخص حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے، ہم اس کی محنت ضائع نہیں کرتے۔ اُسے اُس کا اجر مل کر رہتا ہے۔

تَمَكَّنَ فِي الْأَرْضِ — اور ایسا تمکّن کہ آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو۔ جہاں چاہیں اپنا حکم چلائیں۔ دُنیا میں حسنِ عمل اور تطہیرِ فکر و نظر کی اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے۔ باقی رہی اس دُنیا سے اگلی منزل، سو وہاں کے مناصب و مدارج کے کیا کہنے:

۵۷/۱۲ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾

حسنِ عمل کے ایسے خوشگوار نتائج اسی دنیا تک محدود نہیں رہتے، یہ آخرت کی زندگی میں بھی مسلسل ساتھ جاتے ہیں اور وہاں ان کی کیفیت، اس دنیا کی خوشگواریوں سے بھی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور تخریبی روش سے بچ کر، ان کے مطابق زندگی بسر کریں، انہیں یہ سب کامرانیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے زمین سے متعلق انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور انہیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک کو قحط سے دوچار ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ اس کی روک تھام (بلکہ مُلک کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں انہوں نے کیا تدابیر اختیار کی تھیں، قرآنِ کریم میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ تورات میں

---

[1] جس طرح اور جس مقصد کے لیے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے محلات میں پہنچایا گیا تھا۔ (مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۳۴۲)

البتہ اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ تورات کے بیانات یقینی نہیں سمجھے جا سکتے کیونکہ اس میں تحریف ہو چکی ہے لیکن اُن ارضی انتظامات کے سلسلہ میں اس میں جو کچھ آیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اِس ضمن میں کس قسم کی تدابیر اختیار کی تھیں۔ کتاب پیدائش۔ باب ۴۷ میں ہے:

نظامِ یوسفی

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی، اس لیے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ حضرت یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی، اُس غلّہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا، جمع کی اور یوسفؑ اُس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چُک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چُک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں روٹی دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کے پاس لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے اُن کو روٹیاں دیں۔ اور اُس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا، وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اُسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلے بھی لے لیے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو نپٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اُس نے اُنہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اُس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو! میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لیے ہے۔ کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیج بونے

اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کے حضور میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین بنایا جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا، مگر کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علّتِ مرض پر غور کیا تو اُنہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ اُنہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمینیں انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آگئیں۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچائیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشت کار اپنی محنت کے ماحصل کے آپ مالک تھے۔ زمیندار کاشت کار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ تفصیل کے لیے میری کتاب "نظامِ ربوبیت" دیکھیے۔

اس کے بعد قحط سالی شروع ہوئی تو مصر کے ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بھی غلّہ لینے کے لیے اُسی چشمۂ فیض کی طرف آنے شروع ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا قبیلہ بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو برادرانِ یوسفؑ غلّہ لینے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن چونکہ یہ بات اُن کے بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ یوسفؑ اس مقامِ بلند پر فائز ہوگا، اس لیے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا۔

۱۲/۵۸ وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٥٨﴾

(اس واقعہ پر کئی سال گزر گئے۔ اس کے بعد ملک میں قحط پڑا تو دور و نزدیک سے لوگ غلّہ لینے کے لیے دارالسلطنت میں آنے لگے۔ اس سلسلہ میں) یوسفؑ کے بھائی بھی آئے۔ یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اُسے نہ پہچان سکے۔ (اس لیے کہ یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ یوسفؑ اس مقام پر فائز ہوگا۔)

ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اُن سے "اُن کے گھر" کے تمام حالات کرید کرید کر پوچھے ہوں گے اور اسی طرح باتوں باتوں میں یہ بھی اُن سے کہلوا لیا ہوگا کہ ان کا ایک سوتیلا بھائی اور بھی ہے جو باپ کے پاس ہے۔ چنانچہ وہ واپس جانے لگے تو آپ نے اُن سے کہا کہ اب لوٹ کر آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو بھی ساتھ لانا۔

۱۲ ۵۹—۶۰ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾

جب یوسفؑ نے اُن کے لیے غلّہ وغیرہ لدوا دیا تو جاتے وقت اُن سے کہا کہ اب کے جو آؤ تو اپنے ساتھ اپنے اس بھائی کو بھی لیتے آنا (جس کے متعلق تم نے کہا ہے کہ وہ باپ کی طرف سے تمہارا بھائی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ (میں کوئی مستبد حاکم نہیں جو کسی پر ظلم و زیادتی کروں گا)۔ میں ماپ تول بھی پورا دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کی مہمان نوازی بھی کرتا ہوں۔ (اس لیے تمہارے باپ کو۔ جس کے متعلق تم نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اُس بیٹے کو باہر بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اُسے یہاں بھیجنے پر کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیئے) اگر تم اُسے میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں غلّہ مل سکے گا اور نہ ہی تم میرے قریب آسکو گے۔

انہوں نے کہا:

۱۲ ۶۱ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾

انہوں نے کہا ہم پوری کوشش کریں گے کہ ہمارا باپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اس باب میں کامیاب ہو جائیں گے اور اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لے کر حاضر خدمت ہوں گے۔)

حضرت یوسفؑ نے ان کے دوبارہ آنے کے امکان کو مزید پختہ کرنے کے لیے اُن کی پونجی بھی اُن کی بوریوں میں رکھوا دی۔

۱۲ ۶۲ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

یوسفؑ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان لوگوں کی رقم، جس کے عوض انہوں نے غلّہ خریدا ہے (میری طرف سے) ان کی بوریوں میں اس طرح رکھ دو کہ جب یہ گھر پہنچ کر اپنا سامان کھولیں تو (یہ رقم اُن کے سامنے آجائے اور) یہ پہچان لیں کہ یہ انہی کی رقم ہے اور اس طرح یہ دوبارہ غلّہ لینے کے لیے آجائیں۔

اُنہوں نے واپس جاکر حضرت یعقوبؑ سے "امیرِ مصر" (یعنی حضرت یوسفؑ) کی شرط بیان کی:

۱۲/۶۳ فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

چنانچہ جب وہ لوٹ کر اپنے باپ کے پاس گئے تو انہوں نے (دیگر واقعات بیان کرنے کے بعد) کہا کہ ہم سے کہا گیا ہے کہ نہیں دوبارہ غلّہ اُسی صورت میں مل سکے گا کہ تم اپنے بھائی کو بھی ساتھ لاؤ (اگر ایسا نہ کیا تو، غلّہ ملنا تو ایک طرف، تم میرے قریب تک نہیں پھٹک سکو گے) لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم غلّہ لاسکیں۔ اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔

اس پر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

۱۲/۶۴ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

اس پر (حضرت یعقوبؑ) نے کہا کہ کیا میں اس کے بارے میں بھی تم پر اسی طرح اعتبار کرلوں جس طرح اُس سے پہلے، اس کے بھائی (یوسفؑ) کے بارے میں تم پر اعتبار کیا تھا؟ اس لیے (میں اسے تمہاری حفاظت میں نہیں دے سکتا) یہ اللہ ہی کی حفاظت میں رہے گا کیونکہ وہی سب سے بہتر محافظ اور سامانِ رحمت مہیا کرنے والا ہے۔

اس کے بعد جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں اپنی پونجی موجود پائی تو اس پر انہوں نے (حضرت یوسفؑ کی توقع کے مطابق) باپ سے مزید اصرار شروع کر دیا۔

۱۲/۶۵ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا

وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿٦٥﴾

پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ غلے کے ساتھ، ان کی رقم بھی واپس کر دی گئی ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے کہ ہمیں غلہ بھی مل جائے اور قیمت بھی لوٹا دی جائے۔ (اب آپ سوچیے کہ اگر ہم محض اس لیے غلہ لینے نہ جاسکے کہ آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتے تو اس سے کس قدر نقصان ہوگا؛ للذا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اپنے گھرانے کے لیے غلہ لے آئیں۔ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔ (اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اس کے حصہ کا) ایک اُونٹ کا بوجھ اور بھی لا سکیں گے۔ جو غلہ ہم لائے ہیں وہ بہت تھوڑا ہے۔ یونہی ختم ہو جائے گا۔)

بالآخر حضرت یعقوبؑ نے ان سے اللہ کے نام پر عہد لیا کہ وہ بن یامین کو بخیریت واپس لے آئیں گے اور اس کے بعد اُسے جانے کی اجازت دی۔

۱۲/۶۶ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾

باپ نے کہا کہ (اب جو تم مجھے اس طرح مجبور کر رہے ہو تو میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ) تم اللہ کو درمیان میں رکھ کر میرے ساتھ اقرار کرو کہ تم اسے میرے پاس ضرور واپس لے آؤ گے، بجز اس کے کہ تم خود ہی کہیں گھیر لیے جاؤ (اور اس طرح بالکل بے بس ہو جاؤ) جب انہوں نے اس بات کا عہد دے دیا تو اس نے کہا کہ ہم نے جو باہمی قول و اقرار کیا ہے، اللہ اس پر نگہبان ہو۔

تورات میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی پہلی مرتبہ مصر گئے ہیں تو اُن پر جاسوسی کا شبہ گزرا تھا حضرت یعقوبؑ کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ مبادا ان پر دوبارہ کچھ ایسا ہی شبہ گزر جائے اور یہ گھیر لیے جائیں اور ان کے ساتھ بن یامین بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس لیے اُنہوں نے احتیاطاً اُن سے کہا کہ مصر میں داخل ہونا تو ایک جتھے کی صورت میں نہ جانا، الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔

۱۲/۶۷ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ

مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

جب وہ جانے لگے تو باپ نے ان سے کہا کہ (دیکھو بیٹا!) جب تم اُس شہر میں جاؤ تو سب کے سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا (اکٹھے داخل ہُوئے تو اجنبیوں کا ایک جتھہ دیکھ کر شہر والوں کی نظریں خواہ مخواہ تمہاری طرف اُٹھنے لگ جائیں گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ میرے دل میں یونہی ایک خیال سا آگیا ہے جس کی بنا پر میں نے یہ بات احتیاطاً تم سے کہہ دی ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کے بعد، تم ہر خطرہ سے مامون ہو جاؤ گے اور تمہیں کسی احتیاط اور انتظام کی ضرورت نہیں رہے گی) میری یہ احتیاطی تدبیر تمہیں کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر سکتی جو (وقت اور موقع کے لحاظ سے) قانونِ خداوندی کے مطابق کرنی چاہیئے۔ یاد رکھو! امن اور خطرہ، نفع اور نقصان سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو اس کا اختیار نہیں۔ میرا بھروسہ بھی اسی پر ہے (اور تمہیں بھی اسی پر اعتماد کرنا چاہیئے۔۔ اور ایک میں اور تم ہی کیا) ہر بھروسہ کرنے والے کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد ہے:

۱۲/۶۸ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

چنانچہ ان بھائیوں کا قافلہ اسی طرح شہر میں داخل ہُوا جس طرح باپ نے کہا تھا۔ لیکن (جیسا کہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا) یہ تدبیر اس واقعہ کو روک نہیں سکتی تھی جو قانونِ خداوندی کی رُو سے یہاں پیش آنے والا تھا (اور جس کی رُو سے بن یامین کو یہاں روک لیا جانا تھا) یہ تدبیری احتیاط محض ایک خیال کا نتیجہ تھی جو یعقوبؑ کے دل میں پیدا ہُوا اور جس کی خلش کو اُس نے اس طرح دور کر لیا۔ یہ خیال بھی علم و دانش پر مبنی تھا (یونہی توہم پرستی نہیں تھا) اس لیے کہ یعقوبؑ کو ہم نے علم و فراست عطا کر رکھی تھی۔ وہ علم و فراست جس سے اکثر لوگ محروم ہوتے ہیں۔

جب یہ قافلہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا تو آپ نے اپنے بھائی (بن یامین) کو بتا دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں۔ غمگین نہ ہو۔

۱۲/۶۹ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور اُسے بتا دیا کہ میں تیرا بھائی (یُوسف) ہوں اور ساتھ ہی اس کی بھی تلقین کر دی کہ دوسرے بھائیوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی وجہ سے تم رنجیدہ خاطر نہ ہونا۔

حضرت یُوسفؑ ہزار دل سے چاہتے ہوں گے کہ بن یامین اُن کے پاس رہ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا تاوقتیکہ اُسے یا تو یونہی روک لیتے یا بھائیوں پر اس راز کا انکشاف کر دیتے کہ وہ کون ہیں؟ اوّل الذکر مرفوع القلم تھا، اس لیے کہ قانونِ مملکت اس کی اجازت نہیں دیتا تھا اور استبداد آپ کی ذات سے ناممکن تھا۔ دوسری طرف بھائیوں پر اس راز کا انکشاف ابھی قبل از وقت تھا۔ اس لیے آپ نے مجبورًا دل پر پتھر رکھ کر اُن کے ساتھ بھائی کو بھی الوداع کہہ دیا۔ حضرت یوسفؑ نے اُن کی واپسی کا سامان مہیا کر دیا۔ جب یہ سامانِ سفر تیار ہو رہا تھا تو اُن بھائیوں میں سے ایک نے چُپکے سے حضرت یوسفؑ کا شاہی کٹورا بن یامین کی بوری میں رکھ دیا۔ نیّت یہ ہوگی کہ اگر کسی کی نگاہ نہ پڑی تو کٹورا گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بن یامین بدنام ہوگا اور باپ کی نظروں سے گر جائے گا۔

اس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔ جب محلات کے کارندوں نے مختلف چیزوں کا جائزہ لیا تو شاہی کٹورا کو وہاں نہ پایا۔ چونکہ یہ کنعانی قافلہ وہاں ٹھہرا تھا اس لیے اُن کا لامحالہ انہیں پر شُبہ گزرا۔ وہ اُن کے پیچھے گئے اور انہیں آواز دے کر ٹھہرا لیا اور پوچھا کہ کیا تم پیالہ لے آئے ہو؟

۱۲/۷۰—۷۲ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ

جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿٧٢﴾

جب یوسفؑ نے ان کا (واپسی کا) سامان تیار کرا دیا تو (اُن بھائیوں میں سے ایک نے) شاہی کٹورا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا (کہ اگر پتہ نہ چلا تو کٹورا گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بنیامین بدنام ہوگا جب اُن کی روانگی کے بعد یوسفؑ کے آدمیوں نے دیکھا کہ کٹورا گُم ہے تو اُن میں سے) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ او قافلہ والو ٹھہرو۔ تم چور ہو۔ (۱۲/۷۵، ۱۲/۸۳، ۱۲/۸۹)

وہ یوسفؑ کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تمہارا کیا گُم ہو گیا ہے (جو ہمیں چور ٹھہراتے ہو)!

انہوں نے کہا کہ شاہی کٹورا گُم ہو گیا ہے۔ جو شخص اُسے ڈھونڈ نکالے اُسے ایک بارِ شتر انعام ملے گا (ان کارندوں کے سردار نے کہا کہ) اس کا میں ضامن ہوں (کہ یہ انعام ضرور ملے گا)

ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں سے ایک نے یہ کٹورا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا تھا تو اس کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر جب حضرت یوسفؑ نے اپنے متعلق بھائیوں کو بتایا کہ وہ یوسفؑ ہیں تو اُن سے کہا کہ۔ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ (۱۲/۸۹) تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟۔ بنیامین کے ساتھ اُنہوں نے خاص طور پر کیا کیا تھا، اس کا ذکر اس قصے میں نہیں، بجز اس مقام کے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بنیامین کی بوری میں یہ کٹورا انہی بھائیوں میں سے کسی نے رکھا تھا اور یہی وہ سازش تھی جس کی طرف حضرت یوسفؑ نے اشارہ کیا تھا۔

بہرحال شاہی کارندوں نے اُن سے پوچھ گچھ شروع کی اور اُنہوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ ہم چور نہیں ہم تو ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں تم نے دیکھ لیا تھا کہ ہم نے کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں کی تھی۔

۱۲/۷۳ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِيْنَ ﴿٧٣﴾

یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ خدا شاہد ہے کہ ہم یہاں اس لیے نہیں آئے کہ کسی قسم کی شرارت پیدا کریں یا قانون شکنی کریں (ہم یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں۔ اس لیے) تم ہمارے متعلق جانتے ہو (کہ ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں۔ یقین مانیئے! ہم چور نہیں ہیں۔

شاہی کارندوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ یونہی سہی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تلاشی لینے پر پیالہ تمہارے پاس نکل

آیا تو اس کی کیا سزا؟

۱۲/۷۴ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

شاہی کارندوں نے کہاکہ اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا؟

انہوں نے جواب دیا کہ سزا واضح ہے۔ جو چور ہو' وہ اپنے جُرم کی پاداش میں اپنی سزا آپ بن جائے۔ یعنی اُسے روک لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے۔

۱۲/۷۵ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

(اُن میں سے جنھیں معلوم تھا کہ کٹورا کس کی بوری میں ہے ۱۲/۷۰) کہاکہ جس کی بوری میں کٹورہ نکلے، وہ اس کے بدلے میں دھر لیا جائے۔ ہم اپنے ہاں مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

چنانچہ کارندوں کے سردار نے (جس نے پہلے کہا تھا کہ جو پیالہ لے آئے اُسے انعام دیا جائے گا اور اس کا میں ضامن ہوں) تلاشی لینی شروع کر دی اور پیالہ بن یامین کی بوری سے برآمد ہو گیا۔

۱۲/۷۶ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ .....

تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورہ نہ ملا)۔ آخر میں یوسفؑ کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورا نکل آیا۔

یہاں تک دیکھئے کہ ہُوا کیا ہے؟ حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس رکھ لیں لیکن (اُن وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ برادرانِ یوسفؑ میں سے ایک نے بنیامین کی بوری میں کٹورا رکھ دیا۔ کٹورہ حاصل کرنے یا بن یامین کو بدنام کرنے کی غرض سے — جب کٹورہ کی تلاش ہوئی تو برادرانِ یوسفؑ نے خود ہی کہہ دیا کہ جس کے پاس چوری کا کٹورہ نکلے گا وہ ماخوذ ہو جائے گا، اور اپنی سزا بھگتنے کے لیے یہاں رہ جائے گا۔ کٹورا بنیامین کی بوری سے نکلا اور اس طرح اس کے یہاں رُکنے کی صورت پیدا ہو گئی۔

قرآنِ کریم میں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسا نہیں کہا گیا کہ اُس کٹورے کے چھپانے اور برآمد کرانے میں حضرت یوسفؑ کا ہاتھ تھا یا اُن کی اسکیم تھی۔ لیکن جنھیں حضرات انبیاء کرامؑ کو مطعون کرنا مقصود ہو وہ ایسے افسانے تراش لیتے ہیں۔ تورات، کتاب پیدائش۔ باب ۴۴ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے وہ پیالہ خود ہی بن یامین کی بوری میں رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہو چکا تو خود ہی اپنے کارندوں کو تعاقب میں بھیج دیا کہ اُن کی تلاشی لیں اور چور کو پکڑ کر لے آئیں۔

لیکن تورات پر کیا افسوس کہ وہ تو ہے ہی محرّف، اور یہودیوں کا کیا گِلہ کہ وہ تو اپنے انبیاءؑ کی طرف ایسے ایسے افسانے منسوب کر دیتے ہیں جن کے تصور تک سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔ افسوس تو اپنے ہاں کے مفسرین پر آتا ہے کہ وہ بھی اس باب میں یہودیوں سے کم نہیں ؎

زگُل فروش ننالم کہ از اہلِ بازار است
تپاک گرمیٔ رفتارِ باغبانم سوخت

تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں کی مستند تفسیر ہے۔ اس میں اس واقعہ کے ضمن میں پہلے کہا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بنیامین سے کہہ دیا تھا کہ:

"میں کوشش میں ہوں کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اپنے پاس روک لوں"۔

اس "کوشش" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب آپ اپنے بھائیوں کو حسبِ عادت ایک ایک اونٹ غلّے کا دینے لگے اور ان کا سامان لدنے لگا تو اپنے چالاک ملازموں سے چپکے سے اشارہ کر دیا کہ چاندی کا شاہی کٹورا بن یامین کے اسباب میں چپکے سے رکھ دیں ...... پس آپ کے ملازمین نے ہوشیاری سے وہ پیالہ آپ کے بھائی بن یامین کی خورجی میں رکھ دیا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ کس طرح کٹورا بن یامین کی خورجی سے برآمد کرا لیا گیا اور انہیں روک لیا۔ اور اس پر تبصرہ یوں کیا ہے کہ:

یہ تھی وہ ترکیب جو جناب باری تعالیٰ نے اپنی حکمت اور حضرت یوسفؑ اور بن یامین کی مصلحت کے لیے حضرت یوسفؑ کو سکھائی تھی۔　　(تفسیر ابن کثیر اور ترجمہ تیرہواں پارہ صفحہ ۵)

غور فرمائیے۔ ان حضرات کی تفسیر کی رُو سے (معاذ اللہ) خدا ایک فریب کارانہ اسکیم تجویز کر کے اپنے نبی کو سکھاتا ہے اور نبی اس پر عمل کر کے اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد یہ صاحب ارشاد

فرماتے ہیں:

خدا جس کے درجے بڑھانا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ (معاذ اللہ۔ استغفر اللہ)

یہ ہے آپ کے جلیل القدر ائمۂ مفسرین کے فہمِ اسلامی کی مثال۔ انہیں نہ خدا کی عظمت کا کوئی احساس ہے، نہ حضرات انبیاء کرام کی عصمت کا کوئی اندازہ۔ نہ انہیں اقدارِ خداوندی کا کوئی علم ہے، نہ عالمگیر ضابطۂ اخلاق کا ادراک۔ گلہ ان پر نہیں، کہ ان کے علم و فہم کی سطح ہی ایسی تھی۔ پوچھئے ان حضرات سے جو ان تفسیروں کو سینے سے لگائے اور سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ انہیں پڑھتے بھی ہیں اور پڑھاتے بھی۔ اور اس تعلیم کی رو سے علاّمہ قرار پاتے ہیں۔

جہاں تک حضرت یوسفؑ کا تعلق ہے قرآن نے چار لفظوں میں اُن کے عُلوِ مرتبت کی شہادت دیدی۔ فرمایا:

نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ (۱۲/۷۶)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جو کچھ کیا تھا اس سے ان کے درجات بلند ہوئے تھے۔ اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھ کر واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مملکت کا قانون ان کے راستے میں حائل تھا۔ وہ اگر قانون شکنی کرتے (کھلے بندوں یا کسی مخفی طریق سے) تو وہ اپنے اس مقامِ بلند سے نیچے گر جاتے جس پر وہ مملکت میں فائز تھے۔ وہ اگر فریب کارانہ طریق سے اپنی مطلب براری کرتے تو مملکت کے پیمانوں کے علاوہ میزانِ خداوندی میں بھی ان کا وزن کم ہو جاتا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے ضبطِ نفس سے کام لیا۔ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے وہ اپنے مقامِ بلند سے گر جاتے۔ اس ضبطِ نفس سے ان کی عظمتِ کردار اور بڑھ گئی۔ خدا کا قانونِ مشیّت ایسا ہی ہے کہ جو خدا کی عاید کردہ پابندی کی پاسداری کرتا ہے اس کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔

نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ (۱۲/۷۶)

حضرت یوسفؑ کے ارادے یا عمل دخل کے بغیر جو کچھ ہو گیا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ کَذٰلِکَ کِدۡنَا لِیُوۡسُفَ ..... (۱۲/۷۶)، اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "۔ اور اس طرح ہم نے (یعنی خدا نے) یوسفؑ کے لیے ایک تدبیر کردی"۔ اور اس سے کہا یہ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذ اللہ) خدا نے کیا تھا۔ ایسا کہنا قرآنِ کریم کے اسلوبِ بیان سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات ایسے ہیں جن میں خدا نے کسی عمل (یا بات) کو اپنی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے خود ایسا کیا تھا۔ دو ایک مثالیں دیکھئے:

۱۔ ہم بچوں کو بولنا سکھاتے ہیں۔ لیکن قرآن میں ہے خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ۝ (۵۵/۳-۴) خدا

نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔" اسی طرح ہم بچوں (بلکہ ناخواندہ بڑوں) کو لکھنا سکھاتے ہیں لیکن ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (۹۶/۴)۔ خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے (لکھنا) سکھایا۔ ظاہر ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان میں گویائی (نطق)..... تحریر کی صلاحیت ودیعت کر دی ہے۔ اِن صلاحیتوں سے کام لینا (نہ لینا) انسان کا اپنا کام ہے۔ خدا نے کسی کو خود بولنا سکھایا ہے نہ لکھنا۔

۲۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ جب کاتب کو دستاویز لکھنے کے لیے کہا جائے تو وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ (۲/۲۸۲) کاتب کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے اُسے چاہیئے کہ اس طرح اس دستاویز کو لکھ دے۔" ظاہر ہے کہ اس سے بھی مراد تحریر کی وہ صلاحیت ہے جسے خدا نے انسان میں ودیعت کر رکھا ہے۔ وہ خود کاتب کو لکھنا نہیں سکھاتا۔

۳۔ سورۃ مائدہ میں شکاری جانوروں کے متعلق ہے۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ..... (۵/۴) جو کچھ تمھیں اللہ نے سکھایا ہے اُس کے مطابق تم شکار کرنیوالے جانوروں کو سدھاتے ہو۔" ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ شکاریوں کو یہ نہیں سکھاتا کہ وہ شکار کرنے والے جانوروں کو کس طرح سدھائیں۔

۴۔ سورۃ یٰسین میں ہے۔ وَاٰیَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ (۳۶/۴۱) اور یہ بات بھی ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی نشانی ہے کہ ہم ان کے بال بچوں کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیتے ہیں۔" حالانکہ وہ خود سوار ہوتے ہیں یا ان کے بڑے انہیں سوار کراتے ہیں (کیا قانونِ فطرت کے مطابق عمل کرنے کو خدا نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا؟)

۵۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے لیے مختلف قسم کے اسباب اور سامان پیدا کیے ہیں جنھیں انسان اپنی منشاء کے مُطابق استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُسے بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ نحل میں ہے۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا (۱۶/۸۰)" اللہ تعالیٰ نے تمھارے گھروں کو تمہارے لیے جائے سکونت بنایا ہے"۔ اس کے بعد ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا..... (۱۶/۸۰) خدا نے مویشیوں کی کھالوں سے تمھارے لیے گھر بنائے"

۶۔ ایک بات اصولاً سمجھ لینی چاہیئے۔ خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو شخص (خاص مقدار سے زیادہ) سنکھیا کھائیگا وہ

ہلاک ہوجائے گا۔ وہ کبھی کہتا ہے کہ جو شخص سنکھیا کھائے گا وہ ہلاک ہوجائے گا اور کہا یہ کہ سنکھیا کھانے والے کو ہم ہلاک کر دیتے ہیں۔ معروف آیت ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ..... (۲/۷) "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی"۔ اور اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۸۳/۱۴) جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ زنگ بن کر اُن کے دلوں پر چڑھ جاتا ہے (اور یوں اُن پر مہر لگ جاتی ہے۔)

ان مقامات کی مزید تشریح کے لیے سابقہ جلدوں میں عنوان "تقدیر" دیکھئے۔ نیز لغات القرآن اور کتاب التقدیر میں مَا يَشَآءُ اور مَنْ يَّشَآءُ (قانونِ مشیت) کے موضوع۔

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کا بالضرور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اُس کام کو اُس نے خود کیا ہے ۔ وہ کچھ کرتا انسان ہی ہے۔ کبھی قانونِ قدرت کیمطابق، کبھی ان صلاحیتوں کے مطابق جو انسان میں ودیعت کی گئی ہیں اور کبھی ان اسباب و ذرائع کو استعمال میں لاکر جو اس کام کے لیے ضروری ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (۱۲/۷۶) تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ نے (کٹورا کی اسکیم) خود وضع کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب و ذرائع پیدا ہو گئے جن کی رُو سے (حضرت) یوسفؑ کی خواہش بھی پوری ہوگئی اور ان پر حرف بھی نہ آیا۔ آیت ۷۶ اور اس کا مفہوم یوں ہوگا:

۱۲/۷۶ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶

تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورا نہ ملا) آخر میں یوسفؑ کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورا نکل آیا۔

(دیکھو! بات چلی کیسی تھی اور رُکی کہاں جاکر! اس سوتیلے بھائی نے بنیامین کی بوری میں کٹورا کس نیت

سے رکھا تھا، لیکن اس کا یہ فعل یوسف کے لیے بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کا موجب بن گیا) اس طرح ہم نے یوسف کے لیے بنیامین کو روک لینے کی تدبیر پیدا کر دی، ورنہ شاہِ مصر کے قانون کے مطابق، وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے لیے مشیت ہی کوئی تدبیر کر سکتی تھی (جس سے یوسف کی دلی آرزو بھی پوری ہو جائے اور اسے کوئی ایسی بات بھی نہ کرنی پڑے جس سے وہ اپنے مقامِ بلند سے گر جائے)، یوں ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق بلندئ مدارج عطا کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا علم، ہر صاحبِ علم کی علمی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

(ضمناً) لغات القرآن میں دیکھئے۔ دین کے معنیٰ قانون بھی ہیں۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ۔ بادشاہ کے قانون کے مطابق یوسف اپنے بھائی کو روک نہیں سکتا تھا۔

اب معاملہ حضرت یوسف کے سامنے آچکا تھا۔ وہ اس سے پہلے بنیامین کو اپنے متعلق بتا چکے تھے۔ اس لیے بنیامین کے لیے نہ تو اس الزام سے گھبرانے کی کوئی وجہ تھی اور نہ معاملے کے حضرت یوسف کے سامنے پیش ہونے سے کوئی تشویش۔ حضرت یوسف نے تو اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا، لیکن برادرانِ یوسف کو بنیامین سے پہلے ہی دشمنی تھی (اس لیے کہ وہ یوسف کے باپ کا چہیتا تھا)۔ اس لیے جوشِ حسد و عداوت میں بے اختیار پکار اٹھے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کچھ عجب نہیں، یہ ان کے ہاں کا معمول ہے۔ اس کا ایک بھائی تھا وہ بھی ایسا ہی تھا۔ اندازہ فرمائیے کہ حضرت یوسف نے کس دل سے اس الزام کو سنا ہوگا لیکن ابھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہ کیا جائے۔ اس لیے سن کر پی گئے۔ اور کہا تو صرف اتنا کہ اپنے بھائی کو چور بنا کر تم اپنے متعلق بھی کچھ اچھا ظن پیدا نہیں کر رہے۔ تم بھی تو اسی خانوادہ کے نونہال ہو۔

۱۲/۷۷ قَالُوٓا إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُۥ مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِى نَفْسِهِۦ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿٧٧﴾

اس پر یوسف کے بھائیوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کا ایک اور بھائی تھا۔ اس نے بھی اسی طرح پہلے چوری کی تھی۔ (لہٰذا، یہ بات ان کے ہاں عادۃً چلی آرہی ہے)۔

(اُف! کس قدر زہریلا تھا یہ نشتر جو یوسفؑ کے دل کی گہرائیوں میں اُتارا گیا؟ جی میں تو آیا ہو گا کہ ان کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس لیے یوسفؑ نے) اس بات کو دل میں رکھا۔ اور صرف اتنا کہا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا یقینی علم تو خدا کو ہے، لیکن (اگر واقعہ یہی ہے جو تم بیان کر رہے ہو، تو) تم شریف لوگ نظر نہیں آتے۔ (اس لیے کہ تم سوتیلے ہی سہی، ہو تو اُنہی چوروں کے بھائی! خاندان تو تمہارا بھی وہی ہے)۔

قرآن کریم نے ان کے الزام کی تردید ایک لفظ میں کر دی جب کہا فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ۔ یوں سمجھئے جیسے ہم کہیں کہ "یوسفؑ اُسے پی گیا"۔ ادبِ لطیف و عمیق کی ایک خصوصیت 'ایمائیت' (SUGGESTIVENESS) ہوتی ہے۔ یعنی بات کھلے کھلے الفاظ میں کہنے کی بجائے بلیغ اشارے میں کی جائے اور اسے قاری کے حُسنِ فہم پر چھوڑ دیا جائے کہ ۔" خاے دید و احوال چمن گفت"۔ قرآن مجید میں یہ اندازِ بیان بھی پایا جاتا ہے اور اس کی ایک مثال فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ جو الزام برادرانِ یوسفؑ نے عاید کیا تھا وہ جھوٹا تھا لیکن یوسفؑ اسے (سرِدست) زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

قرآن نے تو قرینہ سے بتا دیا کہ الزام جھوٹا تھا۔ لیکن ہمارے مفسرین حضرات بھلا اسے کب مان سکتے ہیں۔ انہوں نے دھڑلے سے کہا کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ سچ تھا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

> وہ واقعہ یہ تھا کہ (یوسفؑ بچپن میں) اپنے نانا کا بُت چپکے سے اُٹھا لائے تھے اور اُسے توڑ دیا تھا۔

اس کے بعد ہے کہ:

> یہ بھی مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ایک بڑی بہن تھی جن کے پاس اپنے والد حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ایک کمر پٹہ تھا جو خاندان کے بڑے آدمی کے پاس رہا کرتا تھا۔ حضرت یوسفؑ پیدا ہوتے ہی اپنی ان پھوپھی صاحبہ کی پرورش میں تھے۔ انہیں حضرت یوسفؑ سے کمال درجے کی محبت تھی۔ جب آپ کچھ بڑے ہوئے تو حضرت یعقوبؑ نے آپ کو لے جانا چاہا۔ بہن صاحبہ سے درخواست کی، لیکن بہن نے جُدائی کو ناقابلِ برداشت بیان کر کے انکار کر دیا۔ اُدھر آپ کے والد صاحب حضرت یعقوبؑ کے شوق کی بھی انتہا نہ تھی۔ سر ہو گئے۔ آخر بہن صاحبہ نے فرمایا۔ اچھا کچھ دنوں رہنے دو، پھر لے جانا۔ اسی اثناء میں انہوں نے ایک دن وہی کمر پٹہ حضرت یوسفؑ کے کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ پھر تلاش شروع کی۔ گھر بار چھان مارا۔ نہ ملا۔ شور مچا۔ آخر یہ ٹھہری کہ گھر میں جو ہیں اُن کی تلاشیاں لی جائیں۔ لی گئیں۔ کسی کے پاس کچھ ہو تو

نکلے۔ آخر حضرت یوسفؑ کی تلاشی لی گئی۔ ان کے پاس سے برآمد ہوا۔ حضرت یعقوبؑ کو خبر دی گئی اور ملّتِ ابراہیمیہ کے قانون کے مطابق آپ اپنی پھوپھی کی تحویل میں کر دیئے گئے اور پھوپھی نے اس طرح اپنے شوق کو پورا کیا۔

اس بات کا طعنہ آج بھائی دے رہے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، اُردو ترجمہ، پارہ تیرھواں صفحہ ۴۶)

یہ نقشہ کھینچا جا رہا ہے خانوادۂ نبوّت کا۔! (استغفراللہ)

سوال یہ ہے کہ جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں اس کی ان کے پاس دلیل یا اتھارٹی کیا ہوتی ہے؟ اس کی اتھارٹی ہوتی ہے "یہ بھی مروی ہے" یعنی روایات میں یوں آیا ہے۔ دین میں تحریف کی یہ سازش بڑی منظم ہے۔ منافقین نے جھوٹی روایات وضع کیں اور ان کا نام رکھا "رسولؐ اللہ کی احادیث"۔ جامعین احادیث (امام بخاری و مسلم وغیرہ) نے انہیں اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا اور اس لیے انہیں صحیح احادیث ہونے کی سند مل گئی۔ طبری نے انہی کی بنا پر تاریخ مرتّب کی اور اس طرح انہیں دوہری سند حاصل ہو گئی۔ یعنی روایات میں یوں آیا ہے اور تاریخ نے یہ کہا ہے۔ اس کے بعد مفسّرین نے اپنی تفسیروں میں اور مؤرخین نے اپنی تاریخ میں "مروی ہے" کہہ کر انہیں بلا غل و غش درج کر لیا۔ انہی کے مجموعہ کا نام "اسلام" ہے جو ہزار بارہ سو سال سے رائج چلا آ رہا ہے۔ اب نہ ان روایات پر کسی قسم کی تنقید ہو سکتی ہے (کیونکہ انہیں "احادیثِ رسولؐ اللہ" کہا جاتا ہے، نہ ان تفسیروں کو الگ کر کے قرآن مجید کو سمجھایا جا سکتا ہے) ایسا کرنا "سلف صالحین" کے مسلک کے خلاف ہو گا۔

اس اسلام کی وجہ سے ہم تو ڈوبے ہی تھے، حقیقی اسلام کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

جب جذباتِ بغض و عناد ٹھنڈے ہوئے تو برادرانِ یوسفؑ منّت سماجت پر اُتر آئے۔ پست کردار میں یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کذب تراشی اور تملّق پیشگی۔ کہنے لگے۔

(۱۲/۷۸) قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

اُنہوں نے کہا کہ اے عزیزِ مصر! اس (بن یامین) کا باپ بہت بوڑھا ہے (اور وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے) آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے اور اسے چھوڑ دیجئے۔ ہم نے آپ کو بڑا ہی نیک انسان پایا ہے۔ آپ بڑے ہمدرد ہیں (اس لیے ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہماری اس درخواست کو ضرور قبول کر لیں گے)

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چور اپنی سزا آپ بھگتے۔ اب ہم

اس کی جگہ کسی دوسرے کو کیسے روک لیں۔

١٢/٧٩ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿٧٩﴾

یوسفؑ نے کہا۔ معاذ اللہ! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس شخص کو چھوڑ دیں جس سے چوری کا مال برآمد ہوا ہے اور اس کی جگہ ایک بے گناہ کو پکڑ لیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ صریح ظلم ہوگا۔

اسے نہ بھولیے کہ بن یامین کو علم تھا کہ روکنے والا یوسفؑ ہے۔ اس لیے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنی کوششوں میں مایوس ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

١٢/٨٠—٨٢ فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِىْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِىْۤ اَبِىْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِىْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِرْجِعُوْۤا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ وَسْــَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِىْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِىْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾

جب وہ یوسفؑ کی طرف سے مایوس ہو گئے (کہ وہ ان کی بات نہیں مانے گا) تو الگ بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑے بھائی نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے (بن یامین کے بارے میں) اللہ کو درمیان رکھ کر محکم عہد لیا تھا۔ اور اس سے پہلے تم یوسفؑ کے معاملہ میں بڑی زیادتی کر چکے ہو۔ اس لیے (کم از کم) میں تو یہیں رہوں گا (باپ کے سامنے ہرگز نہیں جاؤں گا) تا آنکہ خود باپ مجھے (وہاں آنے کی) اجازت دے۔ یا اللہ میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر دے۔ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

تم باپ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تمہارے (لاڈلے) بیٹے نے (پرائے ملک) میں جا کر چوری کی ہے! (ہم نے بے شک تم سے اس کی نگرانی اور حفاظت کا عہد کیا تھا لیکن) ہم انہی امور میں اس کی نگرانی کر سکتے تھے جو ہمارے علم میں واقع ہوتے۔ اس قسم کی باتوں میں جو اس نے ہم سے چھپا کر کرنی شروع کر دیں ہم اس کی کیا نگرانی کر سکتے تھے!

آپ اُن بستی والوں سے پوچھ لیجئے جہاں یہ واقعہ ہوا ہے۔ یا اُن قافلہ والوں سے دریافت کر لیجئے جن کے ساتھ ہم آئے ہیں کہ ہم سچ کہتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا اس نشتر کو دیکھتے جائیے جو اس طعن آمیز فقرہ میں چھپا ہوا ہے کہ یٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ ج "اے باپ! تیرے بیٹے نے چوری کی ہے"! دل میں بغض و عناد کے جذبات نہ ہوتے تو سیدھی طرح کہتے کہ ہمارے بھائی نے چوری کی ہے۔ یا بن یامین نے چوری کی ہے۔ لیکن باپ کو جتا کر کہنا کہ دیکھ یہ ہے آپ کے اس

قساوتِ قلبی کی ایک جھلک

بیٹے کی کرتوت، جسے آپ یوں سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ کس قدر کلیجے کو چھلنی کر دینے والا گھاؤ ہے! اور پھر شقاوتِ قلب دیکھئے۔ یہ نشتر کس وقت رگِ جاں میں پیوست کیے جانے کی تجویز ہو رہی ہے؟ اس وقت جب ضعیف باپ پہلے ہی ایک بیٹے کے غم میں نیم سوختہ ہو رہا تھا اور اس کے بعد اب دوسرے بیٹے کے متعلق یہ خبر سنائی جانے والی تھی کہ وہ بھی تم سے جُدا ہو گیا۔ یہ وقت تھا کہ اس خبر کو انتہائی ہمدردی کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنی الطبع لوگوں کی قساوتِ قلبی ایسے مواقع پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔

چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان میں آ کر یہ قیامت خیز خبر ان جگر شگاف الفاظ میں باپ کے گوش گزار کر دی۔ حضرت یعقوبؑ نے اس پر پھر وہی فقرہ دہرایا جو بھیڑیئے والا افسانہ سن کر بیٹوں سے کہا تھا۔

۱۲/۸۳ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

(چنانچہ اس مشورہ کے بعد وہ باپ کے پاس پہنچے۔ باپ نے جب یہ کچھ سنا تو) کہا کہ (نہیں، بن یامین کبھی چوری نہیں کر سکتا) یہ سارا قصہ تمہارا خود وضع کردہ ہے جسے تمہارے دل نے تمہیں سجھا دیا ہے۔ (دراصل حقیقت کچھ اور ہے) میں اس پر بھی وہی کہوں گا جو اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملہ پر کہا تھا۔ (۱۲/۱۸) کہ میرے

لیے یہی بہتر ہے کہ میں صبر سے ہمت سے کام لوں (اور گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دوں) مجھے اُمید ہے کہ ایک دن اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔ یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا لڑکا جو وہاں رہ پڑا تھا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور تمام معاملات کو حکمت اور تدبیر سے آخر تک پہنچانے والا ہے۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا پر غور کیجئے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بات کو کبھی دل سے نہیں مانا تھا کہ حضرت یوسفؑ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ اب جو بن یامین کے متعلق یہ سب کچھ سُنا تو ان تمام واقعات پر غائر نگاہ ڈالنے سے آپ کی فراست نے بھانپ لیا کہ یہ کڑیاں کچھ غیر معمولی سی ہیں۔ اس سے آپ کی نگاہِ دُور رس نے بن یامین کی گم گشتگی میں سب کے دوبارہ اکٹھے ہو جانے کی جھلک دیکھ لی (یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا بیٹا جو باقیوں کے ساتھ نہیں آیا تھا) بن یامین کی جُدائی نے پچھلے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا اور یوسفؑ کی یاد اور بھی شدت سے ستانے لگی۔ ہر چند انہیں امید کی جھلک نظر آ چکی تھی لیکن فراق آخر فراق ہے۔ جب حتماً مایوسی نہ ہو بلکہ بیم و رجا کا عالم ہو تو دردِ فراق کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۱۲/۸۴ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اُس نے بیٹوں کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور اس نئے زخم نے اس کے دل میں یوسفؑ کی یاد تازہ کر دی تو اُس نے آہ بھر کر کہا، "ہائے! یوسفؑ کا دردِ فراق"۔ وہ اس صدمہ سے بیقرار رہتا تھا اور شدتِ غم کی وجہ سے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی تھیں۔

پھر اس آتشِ غم کی جگر سوزی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ چارہ ساز تو ایک طرف، کوئی غمخوار بھی پاس نہ تھا۔ بیٹے تھے تو ایسے کہ انہیں یوسفؑ اور بن یامین کے نام سے چڑ تھی۔ خود بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایسے میں بیٹوں کی ہر بات سُننی پڑتی ہو گی اور ان باتوں کا زخم، داغِ جدائی سے بھی زیادہ کرب انگیز ہوتا ہو گا۔

۱۲/۸۵ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

(باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹے) ــــ بجائے اس کے کہ اس سے غمخواری اور غمگساری کریں، اکٹر کہنے کہ) آپ اس قصے کو چھوڑیں گے بھی، یا ہر وقت "یوسفؑ یوسفؑ" پکارتے رہیں گے؟ اگر آپ یہی کچھ کرتے رہے تو خدا شاہد ہے، آپ اس غم میں گھُل گھُل کر مر جائیں گے۔ اور اگر مریں گے نہیں تو از کار رفتہ ضرور ہو جائیں گے۔

حضرت یعقوبؑ یہ سب کچھ سُنتے اور جواب میں کہتے تو فقط اتنا کہ میں تم سے تو کچھ نہیں کہتا۔ میں تو اپنا درد و غم چارہ سازِ حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیا تمہیں اتنا بھی گوارا نہیں!

(۱۲ / ۸۶-۸۷) قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

باپ اس کے جواب میں کہتا کہ (میں تم لوگوں سے تو کچھ نہیں کہتا) میں تو اپنے غم و الم کا اظہار اپنے خدا کے سامنے کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (اس لیے میری امیدوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے مجھ سے ایک دن ضرور ملیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس انتظار کی مدت زیادہ طویل نہ ہو۔ لہٰذا) اے میرے بچو! تم ایک بار پھر جاؤ، یوسفؑ کا کچھ سُراغ لگاؤ اور بن یامین کا حال احوال دریافت کرو۔ رحمتِ خداوندی کی نسیم جاں فزا سے کبھی مایوس نہ ہو۔ اس سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں جو اس کے اِس قانون پر یقین نہیں رکھتے (کہ سعی و عمل اگر صحیح خطوط پر ہوں تو وہ کبھی بلا نتیجہ نہیں رہتے)۔

دیکھئے یہاں اُمیدوں کی دنیا کس طرح بیدار ہوتی نظر آرہی ہے۔ بیٹے غلّہ لینے کے لیے پھر مصر پہنچے۔ قحط زدگی سے ان کی حالت بڑی سقیم ہو چکی تھی۔ اس لیے بیع و شریٰ کے معاملہ کی بجائے حضرت یوسفؑ سے بھیک کے طلبگار ہوئے۔

(۱۲ / ۸۸) فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا

اِنَّ اللّٰهَ یَجۡزِی الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ ﴿۸۸﴾

(چنانچہ وہ پھر مصر گئے اور یوسفؑ سے کہا کہ) اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھرانے پر بڑی سختی کے دن آ گئے ہیں، ہمارا منہ تو نہیں تھا کہ پھر آپ کے پاس آتے لیکن کیا کریں ہم سخت مجبور و لاچار ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس نہ غلہ رہا ہے اور نہ ہی غلہ خریدنے کے لیے پوری رقم ہے۔ بس) یہ حقیر سی پونجی ہے جسے لے کر ہم آ گئے ہیں (اسے قبول کر لیجئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ) ہمیں بطور خیرات پورا غلہ دیجئے۔ اللہ خیرات کرنیوالوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

ذرا غور کیجئے، عزیز مصر (حضرت یوسفؑ) کی عاجز نوازیوں کی شہرت کتنی عام تھی کہ اُن (اجنبیوں) نے اتنے وثوق سے کہہ دیا کہ ہماری بضاعت کی طرف نہ دیکھئے اپنے رحم و کرم کی طرف دیکھئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ صدقہ و خیرات کا خیال کیجئے۔ کیسا دردانگیز اور عبرت آموز تھا یہ منظر! یہ سنگ دل اور جفاکیش اس یوسفؑ سے بھیک کے سوالی ہیں جسے انہوں نے اس بے دردی سے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ یہ سُن کر حضرت یوسفؑ کا بھی جی بھر آیا اور اُنہوں نے کہا:

۱۲/۸۹ قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِیُوۡسُفَ وَاَخِیۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ﴿۸۹﴾

(یہ سُن کر یوسفؑ کا جی بھر آیا اور اب مزید توقف کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان سے) کہا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حماقت سے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ (۸/۱۲) کیا کیا تھا؟

اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ۔ پر نگاہ ڈالیے۔ سیرتِ یوسفی کی زیبائیاں جھلک کر باہر آ رہی ہیں۔ ایک یہ بھائی تھے کہ بن یامین تو ایک طرف، اس کے بھائی کے متعلق بھی چوری کا الزام لگانے سے نہ جھجکے۔ حتیٰ کہ بوڑھے باپ سے بھی طعن آمیز نشتر کے بغیر بات نہ کی۔ اور اُنہی کے بھائی حضرت یوسفؑ ہیں کہ ایسے شقی القلب بھائیوں کو ان کی شقاوتِ قلبی کی یاد دلائی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم سے یہ کچھ نادانی اور جہالت سے ہو گیا تھا۔

سامنے حضرت یوسفؑ ہیں

حضرت یوسفؑ نے اپنی کشادہ نگہی سے الزام کی سختی کو اس قدر نرم کر دیا لیکن اس کے باوجود ذرا تصور میں لائیے کہ یہ معلوم کر کے کہ سامنے یوسفؑ

کھڑا ہے، بھائیوں کے قلب و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ قرآنِ کریم نے اس اضطرابی کیفیت کو ایک عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کے مُنہ سے یہ الفاظ سُنے تو بوکھلاہٹ میں بول اُٹھے:

۹۰/۱۲ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ

ہیں! کیا تم یوسفؑ ہو؟ واقعی یوسف!

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

اس نے کہا۔ہاں! میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی (بن یامین) ہے۔تم نے تو ہماری ہلاکت کے لیے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی، لیکن ہمارے خدا نے ہم پر بڑا کرم کیا — اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی غلط راہوں سے بچتا ہُوا، صحیح روش پر گامزن رہتا ہے اور اس راستے پر جس قدر مشکلات آئیں، پامردی سے ان کا مُقابلہ کرتا ہے، تو وہ اِس قسم کی حسن کارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

غور کیجئے، لسانِ یوسفی نے دو لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ۔ جو کوئی زندگی کی تباہ کن رَوش سے بچتا اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے اور پھر ہجومِ مشکلات میں ثابت قدم رہتا ہے، اس پر اللہ کی نوازشات کی گہرباری ہوتی ہے۔ اُس اللہ کی جو مخلص انسانوں کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس کے بعد برادرانِ یوسفؑ[1] پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ بیان میں نہیں، تصوّر ہی میں آسکتا ہے۔ اُنہوں نے شرم و ندامت سے گردن جُھکالی اور کہا:

۹۱/۱۲ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

(یہ سُن کر ان کے سر شرم اور ندامت سے جُھک گئے اور) انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم فی الواقعہ اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت دی ہے۔ اور ہم بڑے ہی خطاکار ہیں۔

غور فرمائیے۔ وہ بھائی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا تھا جو آج تک دُنیا میں بطورِ ضرب المثل مشہور[1]

[1] "برادرانِ یوسفؑ" ظلم و تعدی، فریب کاری اور کذب تراشی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

ہے۔ آج اسی بھائی کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ اُن سے پورا پورا انتقام لیا جاتا۔ لیکن جنہیں اللہ نے وسعتِ ظرف عطا فرمائی ہو، وہ ذاتی انتقام نہیں لیا کرتے۔ ان کی دوستی اور دشمنی عفو اور انتقام، اقدارِ خداوندی کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

۱۲/۹۲ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٩٢﴾

یوسفؑ نے کہا۔ جاؤ! اب میں تم پر کوئی سرزنش نہیں کرتا۔ تم نے جو کچھ میرے خلاف کیا، میں اُسے معاف کرتا ہوں۔ (لیکن اس سے جو کچھ تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُس کو کون معاف کرسکتا ہے؟ اس کی معافی کی تو ایک ہی شکل ہے کہ) تم پھر سے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرکے خدا کی حفاظت میں آجاؤ۔ جرائم سے تمہاری ذات میں جو کمی واقع ہوگئی ہے وہ اسے پورا کرکے اس کی نشو و نما کر دے گا۔ وہ سب سے بہتر نشو و نما کرنے والا ہے۔

اللہ اکبر! جمالِ یوسفیؑ کا مہرِ عالمتاب نصف النہار پر نظر آرہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بھائیوں سے کہا کہ اب تم یوں کرو کہ:

۱۲/۹۳ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾

(واپس گھر جاؤ اور) یہ میری قمیص اپنے ساتھ لے جاؤ (جو میری وجاہت اور منصب کی محسوس نشانی ہے) جب تم اسے ابا جان کے سامنے پیش کروگے تو وہ ساری بات سمجھ جائیں گے اور جو کچھ تم کہوگے اس کا یقین کرلیں گے۔ پھر تم اپنے تمام اہل خاندان کو لے کر یہاں آجانا۔

پیرہنِ یوسفیؑ

یہی بھائی اس سے پیشتر باپ کے پاس ایک کرتہ لائے تھے جسے دیکھ کر روتے روتے باپ کی آنکھیں سفید ہوگئی تھیں۔ آج وہی بھائی اُسی یوسفؑ کا ایک اور کرتہ لے کر اُسی باپ کے پاس جاتے ہیں جس کرتے سے بوڑھے باپ کی متاعِ گم گشتہ واپس مل رہی ہے۔ قافلہ مصر سے روانہ ہوا اور مختلف منازل طے کرتا اس بستی کے قریب آپہنچا جہاں حضرت یعقوبؑ اور اُن کا گھرانہ آباد تھا۔ یہاں سے باقی قافلہ آگے چلا گیا اور برادرانِ یوسفؑ کے اونٹ الگ ہوگئے (وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ)

قافلہ کی آمد کا چرچا عام ہو رہا تھا۔ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ قافلہ کا انتظار کس شدّت سے کر رہے ہوں گے۔ایسا انتظار کہ دل کی ساری حسرتیں سمٹ کر آنکھ کے تِل میں آ گئی ہوں گی۔اِن کے دل اور دماغ کی تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرتکز ہو چکی ہوں گی۔

شمیمِ یوسفی کی عطر بیزیاں

قرآنِ کریم نے حضرت یعقوبؑ کی وجد و مسرّت کی اس والہانہ کیفیت کو عجب دلآویز پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ارشاد ہے:

۱۲/۹۴ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

جب یوسفؑ کے بھائیوں کا قافلہ روانہ ہُوا تو یعقوبؑ نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اگر تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ بڑھاپے کی وجہ سے میری عقل ماری گئی ہے تو مجھے یوسفؑ اور اس کی عظمت و اقتدار کی مہک آ رہی ہے۔

سُننے والوں کی نگاہیں بھلا وہ کچھ کب دیکھ سکتی تھیں جو قلبِ یعقوبؑ کو محسوس اور دیدۂ یعقوبؑ کو نظر آ رہا تھا۔ہو سکتا ہے کہ اب وحی کی طرف سے بھی کچھ اشارہ مل گیا ہو جیسا کہ (۱۲/۹۶) سے مترشح ہوتا ہے۔لیکن سُننے والے اسے (معاذ اللہ) خبط ہی کہتے تھے۔

۱۲/۹۵ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

سُننے والوں نے کہا کہ بخدا! تم ابھی تک اپنے اُس پُرانے خبط میں مبتلا ہو۔(یوسفؑ کا نام و نشان تک بھی گم ہو چکا ہے اور تمہیں اُس کی عظمت و اقتدار کی مہک آ رہی ہے!)

اتنے میں وہ بیٹا جس کے پاس کُرتہ تھا، اس مژدۂ جانفزا کو لے کر حضرت یعقوبؑ کے پاس آ پہنچا۔

۱۲/۹۶ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ط قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

چنانچہ وہ قافلہ کنعان پہنچ گیا اور خوش خبری دینے والے نے یوسفؑ کا کُرتہ یعقوب کے سامنے پیش کیا تو اُسے یقین آ گیا (کہ فی الواقعہ یوسفؑ زندہ بھی ہے اور اس قدر شان و شوکت کا مالک بھی) اس نے لوگوں سے

کہا کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم دیا گیا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا۔

اس مقام پر کہا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں وحی کا اشارہ بھی شامل تھا، اگرچہ ایک نبی کی ذاتی فراست و بصیرت بھی کچھ کم حقیقت آشنا نہیں ہوتی۔ باپ کی اس کیفیت کے ساتھ بیٹوں کی حالت کا بھی اندازہ لگائیے۔ باپ کے سامنے اُن کی نگاہیں اُوپر کو نہیں اُٹھ سکتی تھیں۔ اُنہوں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا:

۱۲/۹۷ قَالُوْا یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا کُنَّا خٰطِئِیْنَ ﴿۹۷﴾

بیٹوں نے باپ سے کہا کہ ہم بڑے خطا وار ہیں۔ (ہم اس قابل تو نہیں کہ ہمیں معاف کیا جائے لیکن ہماری پھر بھی آپ سے درخواست ہے کہ) آپ ہمارے لیے معافی طلب کریں۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

۱۲/۹۸ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۹۸﴾

یعقوبؑ نے کہا: میں تمہارے لیے اپنے ربّ سے سامانِ حفاظت طلب کروں گا۔ اس لیے کہ اس کے قانونِ مکافات میں (جرائم سے تائب ہو جانے والوں کے لیے) حفاظت و مرحمت کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد یہ تمام گھرانا شاداں و فرحاں جانبِ مصر روانہ ہوا۔ حضرت یوسفؑ نے شہر[1] سے باہر اُن کا استقبال کیا۔

۱۲/۹۹ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْہِ اَبَوَیْہِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

جب وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس ٹھہرایا اور باقی اہلِ خاندان سے بھی کہا کہ اب تم مصر میں، ان شاء اللہ، آرام سے رہو گے (یعنی چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لیے تم آرام سے رہو گے۔ اس مشروط ہے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے)۔

عزّت و تکریم کی مَسندیں

حضرت یوسفؑ نے جشنِ مسرت کے طور پر دربار منعقد کیا۔ ماں باپ کیلئے مَسند بچھائی۔ اہلِ دربار تعظیم بجالائے۔ عزت و وقار اور عظمت و اجلال کا

[1] اس زمانہ میں مصر کا دارالحکومت (عمسیس) تھا اور اُسے جشن کا شہر کہتے تھے۔

یہ وہ منظر تھا جسے آج سے بہت عرصہ پہلے حضرت یوسفؑ نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ آج یوں پورا ہوا:

۱۲/۱۰۰ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

اُس نے اپنے ماں باپ کو عزت و تکریم کی بلند مسندوں پر بٹھایا اور تمام متعلقین، اہل کار اور خدام یوسفؑ کی وجہ سے ان کی تعظیم بجالائے۔

اُس وقت یوسفؑ نے کہا۔ ابا جان! یہ ہے میرے اُس خواب کی تعبیر جو میں نے اتنا عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ میرے نشوونما دینے والے نے خواب کو حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے قیدخانے سے نکال کر (اس مقام بلند تک پہنچا دیا) اور مخالفت کی اس خلیج کو پاٹ کر، جو شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان حائل کر دی تھی، آپ سب کو صحرا سے یہاں منتقل کر دیا (کہ سب عزت اور آرام کی زندگی بسر کریں)۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا نشوونما دینے والا، اپنی اسکیموں کو بڑے ہی لطیف انداز سے بروئے کار لاتا اور تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اس کی ہر بات علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔

ان نوازشاتِ بے پایاں کے احساس سے حضرت یوسفؑ کی گردن اس محسن حقیقی کے حضور جھک گئی جس کی ذرہ نوازیوں کے صدقے یہ سب کچھ دیکھنے میں آیا تھا اور اس کی بارگاہ میں عرض کیا:

۱۲/۱۰۱ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

(ان تمام گزشتہ واقعات کی یاد سے یوسفؑ کے دل میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہو گئے۔ اور

اس نے بحضور ربّ العزت عرض کیا کہ) اے میرے نشو ونما دینے والے! تیرا کتنا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس قدر اختیارات و اقتدارات کا مالک بنا دیا۔ مجھے تدبیرِ امور اور عاقبت اندیشی کا علم وسلیقہ عطا فرما دیا۔

اے کائنات کے پیدا کرنے والے! تو ہی حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت، میں میرا کارساز ورفیق ہے۔

مجھے توفیق عطا فرما کہ میری ساری زندگی تیرے قوانین کی اطاعت میں گزرے اور میرا شمار اُن نیک بخت لوگوں میں ہو جن کے سب کام سنور گئے ہوں!

غور فرمائیے۔ دنیا کی حکومت اور شوکت کے ساتھ ساتھ دعا کیا مانگی جا رہی ہے؟ یہ کہ جب دنیا سے جاؤں تو ایک عبدِ مُسلم کی حیثیت سے جاؤں اور عاقبت میں تیرے صالح بندوں کے زمرہ میں شریک ہوں! یہ ہے ایک عبدِ مومن کی دین و دنیا کی آرزوؤں کا منتہٰی! کیسا خوش بخت ہے وہ انسان اور کیسی طالعمند ہے وہ قوم جس کو وہ مبداءِ فیض، دین و دنیا کی سرفرازیاں عطا فرما دے۔ لیکن یہ سب کچھ عطا ہوتا ہے ایمان وعملِ صالح کے نتیجہ میں، نہ کہ صرف خاص قسم کے نام رکھ لینے اور رسمی دعائیں مانگ لینے سے!

یہ ہے حسنِ عمل کی وہ سرگزشتِ زرّیں جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور نبی اکرمؐ پر نازل فرمایا:

(۱۲ ۱۰۲ — ۱۰۴) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝۱۰۲ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۴

اے رسولؐ! یہ وہ تاریخی سرگزشتیں ہیں جو تیرے علم میں نہیں تھیں اور جنھیں ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے بتایا ہے۔ — تم برادرانِ یوسفؑ کے پاس کھڑے نہیں تھے جب وہ اپنی سازش پر متفق ہو گئے تھے اور وہ یوسفؑ کے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے۔ (اس لیے تمہیں اِن واقعات کا علم کیسے ہو سکتا تھا)۔

(تمہارے رسولؐ ہونے کی یہ بھی ایک واضح شہادت ہے، لیکن اس کے باوجود) بہت سے لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے خواہ تم کتنا ہی کیوں نہ چاہو۔

حالانکہ تو ان سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا۔ بلا مزد و معاوضہ ان کی بھلائی کے لیے اس قدر کوشش کر رہا ہے۔

یہ داستانِ شیریں ختم ہوگئی۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اس کے چند ایک اہم مقامات پر نگہ بازگشت کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو "تاویل الاحادیث" کا علم عطا فرمایا تھا۔ چونکہ حضرت یوسفؑ

تَاوِیْلُ الْاَحَادِیْثِ

نے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی اس لیے عام طور سے سمجھ لیا گیا کہ تاویل الاحادیث سے مراد خوابوں کی تعبیر کا علم ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائیگا۔ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تاویل الاحادیث کے اندر شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن تاویل الاحادیث سے مراد فقط تعبیر علم المنام نہیں۔ تاویل کے معنی نتیجہ اور مآلِ کار کے بھی ہیں اور احادیث کے معنی ہیں باتیں۔ لہٰذا تاویل الاحادیث کے معنی ہوئے کسی بات سے یہ معلوم کرلینا کہ اس بات کا صحیح صحیح مطلب کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو معاملہ فہمی کہتے ہیں۔ یعنی کوئی معاملہ سامنے آئے، اُس کے سیاق و سباق اور متعلقات و تضمنات پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ اس کا مآل و انجام کیا ہوگا؟ غور کیجئے۔ دُنیا میں ایک عام انسان اور ایک صاحبِ تدبّر و فراست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ معاملات و واقعات ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ایک عام ذہنی سطح کا انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ لیکن ایک دیدہ ور کی نگاہیں ہواؤں کے رُخ سے طوفان کی آمد کا اندازہ کرلیتی ہیں۔ قوموں کی زندگی، ان کے مفکّرین کی دیدہ وری اور مآل اندیشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ وہ مفکّرین جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگِ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت (اقبالؒ)

حضرت یوسفؑ کنعان کے گلہ بانوں کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ہر چند قبیلہ کی سرداری ان کے گھرانے میں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ انہیں وہاں حضریت کی سیاستِ مُدن اور عمرانیات و معاشیات کے مہمات و معاملات سے متعلق نہ کوئی تعلیم مِل سکتی تھی، نہ تربیت کے سامان موجود تھے۔ بدوی اور حضری زندگی کا فرق چھپا ہُوا نہیں۔ اس لیے اس قسم کا ایک دہقانی بچہ جب ایک غلام کی حیثیت سے شہر میں آئے تو اس کی زندگی ایک غلام (گھر کے ملازم) سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف بلند پایہ فراست عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ایسے مواقع بہم پہنچائے

جن میں آپ نے عملی طور پر اہم معاملات کے نظم و نسق کا سلیقہ سیکھ لیا[۱]۔ یعنی عزیزِ مصر نے آپ کو اپنے کاروبار کا مختار اور معتمد علیہ بنا لیا اور اس طرح آپ کو ان امور کا عملی تجربہ ہو گیا جو تمدنی زندگی کی خصوصیات میں سے تھے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشیت کی طرف سے اس کا انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ یوسفؑ کو تاویل الاحادیث کا علم سکھا دیا جائے۔ خوابوں کی تعبیر کا علم سکھانے کے لیے تمکن فی الارض کی ضرورت نہیں تھی۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ ز وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ۔ (۱۲/۲۱)

اس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسفؑ کے پاؤں جما دیئے اور ایسا انتظام کر دیا کہ اس کی اچھی طرح سے تعلیم و تربیت ہو جائے اور اس میں معاملہ فہمی اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔
اللہ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے)۔

اسی خداداد فراست اور عملی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت یوسفؑ کو حکومت و مملکت کے اختیارات تفویض کیے گئے تو آپ نے اس حسنِ تدبّر سے ان امور کا انتظام کیا کہ سب کی گردنیں آپ کے سامنے جھک گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے مملکت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ "تاویل الاحادیث" کا علم بھی دے دیا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قف اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱)

(ان تمام گزشتہ واقعات کی یاد سے، یوسفؑ کے دل میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہو گئے، اور اس نے بحضور رب العزت عرض کیا کہ) اے میرے نشو و نما دینے والے! تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تُو نے مجھے اس قدر اختیارات و اقتدارات کا مالک بنا دیا۔ مجھے تدبیرِ امور اور عاقبت اندیشی کا علم و سلیقہ عطا فرما دیا۔

اے کائنات کے پیدا کرنے والے! تو ہی حال اور مستقبل، دنیا اور آخرت میں میرا کارساز و رفیق ہے، مجھے توفیق عطا فرما کہ میری ساری زندگی تیرے قوانین کی اطاعت میں گزرے اور میرا شمار اُن خوش بخت لوگوں میں ہو جن کے سب کام سنور گئے ہوں ۔۔۔!

---

[۱] اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو بھی بچپن ہی میں فرعون کے محلات میں پہنچا دیا گیا تھا تاکہ وہ وہاں کی اس داخلی سیاست کا مشاہدہ کر سکیں جس سے انہوں نے بعد میں دوچار ہونا تھا۔

ان مقامات سے تاویل الاحادیث کا مفہوم واضح ہے یعنی پیشِ نظر احوال وکوائف سے استنباطِ نتائج کی صلاحیت۔
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت

۲۔ خوابوں کی دُنیا

قصۂ حضرت یوسفؑ میں خوابوں کے تذکرہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ اُس وقت سے اربابِ فکر ونظر کی توجہات کا مرکز بنا چلا آرہا ہے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا۔ عصرِ حاضر میں تجزیۂ نفس کے ماہرین (بالخصوص فرائڈ اور اس کے مکتبِ فکر) نے اس مسئلہ کو خاص طور پر اپنے غور وفکر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بنایا ہے جن کی عملی کاوشوں کی بنا پر اس چیستان کے کئی ایک گوشوں پر روشنی پڑچکی ہے۔ چونکہ یہ علم ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے اس لیے یہ روشنی ابھی دھندلی سی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس موضوع کے کچھ نہ کچھ خط وخال سامنے ضرور آچکے ہیں۔ اس علم کی رُو سے انسان میں نفسِ شعوریہ (CONSCIOUS MIND) کے علاوہ نفسِ غیر شعوریہ (UNCONSCIOUS MIND) بھی[1] ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سے احوال وکوائف ایسے ہوتے ہیں جنہیں نفسِ شعوریہ کچھ وقت تک یاد رکھتا ہے لیکن اس کے بعد یا تو ان واقعات کو یکسر بھلا دیتا ہے یا ان کے خصوصی احساسات اور تاثرات کے نقوش اپنی لوح سے محو کردیتا ہے۔ لیکن نفسِ غیر شعوریہ ان واقعات کے اہم حصص اور ان کے خصوصی تأثرات کو اپنی گرہ میں باندھ کر رکھ لیتا ہے۔ یہ تأثرات نفسِ شعوریہ کے ساتھ متصادم ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح انسان کے نظامِ عصبی کو غیر محسوس طور پر متأثر کرتے رہتے ہیں۔ ان سے اس قسم کے عوارضات لاحق ہوجاتے ہیں جن کا کوئی طبعی سبب (PHYSICAL CAUSE) سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ حصہ ایک جداگانہ بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ مبحث زیرِ نظر کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اس وقت اپنا عمل شروع کرتا ہے جب نفسِ شعوریہ کی فعالیت (ACTIVITY) معطل ہوتی ہے (مثلاً حالتِ نشہ میں یا ملکے سے غش یا ہسٹریا وغیرہ کے دَورے میں)۔ لیکن نفسِ غیر شعوریہ کو اپنی کارفرمائی کے لیے ان ہنگامی مواقع سے بھی زیادہ فرصت کا زمانہ اس وقت ملتا ہے جب انسان سو رہا ہو۔ اس وقت نفسِ شعوریہ کی حرکت معطل ہوتی ہے اور نظامِ جسمانی میں کسی قسم کا انتشار واضطراب بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے نفسِ نیم یا غیر شعوری اپنے "جادو" کے البم کو کھولتا ہے اور پھر بھُولے ہوئے افسانوں کی مختلف

---

[1] نفسِ انسانی سے متعلق بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ انڈکس دیکھئے۔

تصویریں ذہن کے پردۂ سیمیں پر لاتا ہے۔ واقعات میں ترتیب اور ان کے نتائج و عواقب میں ربط وضبط نفسِ شعوریہ کا منصب ہے۔ اس لیے نیم یا غیر شعوریہ نفس جن تأثرات یا واقعات کے ٹکڑے سامنے لاتا ہے، ان میں کوئی باہمی ربط یا ترتیب نہیں ہوتی۔ بنابریں، اس کی پیش کردہ فلم عجب بے ربطی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ (اگرچہ بعض اوقات ایسے ٹکڑے بھی سامنے آجاتے ہیں جو اچھے خاصے مربوط ہوتے ہیں) اسی کا نام خواب ہے۔ ان تأثرات میں جنہیں نفسِ شعوریہ بھلا دیتا ہے اور نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اپنے اسٹور میں جمع رکھتا ہے، ہزاروں خوں گشتہ آرزوئیں، سینکڑوں پامال شدہ تمنائیں، بیسیوں ایسی للچائی ہوئی نگاہیں جو حسرت بن کر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی ہوں، خوابیدہ ہوتی ہیں۔ جب نفسِ شعوریہ کی دنیا سوتی ہے تو یہ خوابیدہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن بے ربطیٔ مضمون سے طلسم ہوشربا کا سا افسانہ بن کر سامنے آتی ہیں اور جب نفسِ شعوریہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھولے ہوئے واقعہ کی دھندلی سی یادیوں تازہ کرا دیتے ہیں جیسے مرمریں گردنیں ڈوبی ہوئی وادیٔ کہسار کے اُس پار، رات کے سناٹے میں دُور سے بنسری کی آواز دل کے نرم و نازک گوشوں میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر خواب کا افسانہ، اس کی بے ربطی ہی کی نذر ہو جاتا ہے۔ علمِ تجزیۂ نفس کے ماہرین، خوابوں کے ان بے ربط ٹکڑوں سے نفسِ نیم یا غیر شعوریہ کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کی ٹوہ[1] لگاتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں بڑی صبر آزما محنت کرنا پڑتی ہے۔ وہ خواب دیکھنے والے کی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف معلوم کرتے ہیں۔ وہ ان نیم کشش تیروں کی انیاں تلاش کرتے ہیں جو دل کے اندر ٹوٹ کر رہ گئی ہوں۔ وہ ایسی پھانسوں کی ٹوہ لگاتے ہیں جو رگِ جان میں ڈوب کر پھر نہ ابھری ہوں۔ اس طرح وہ خواب دیکھنے والے کے خیالات کی رَو اور ذہن کی افتاد کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اس سے بعض اہم نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قیاسی ہوتا ہے، حتمی طور پر وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے — بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ محقق اپنے قیاسات سے خواب کے معاملات کو آنے والے واقعات سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مستقبل کے واقعات خواب یا اس کی تعبیر کے مطابق نکل آتے ہیں لیکن یہ محض اتفاقی امور ہیں۔ انہیں حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثلاً ہوتا کیا ہے؟ آپ کی شدید تمنا ہے کہ آپ کا مستقبل فلاں سانچے

---

[1] بیداری کے وقت جو کچھ خواب کے متعلق یاد رہتا ہے وہ سب کچھ وہی نہیں ہوتا جو نفسِ غیر شعوریہ حالتِ خواب میں سامنے لاتا ہے۔ جو کچھ خواب میں سامنے آتا ہے، علمِ تجزیۂ نفس کی رُو سے اُسے (LATENT CONTENT) کہا جاتا ہے اور حالتِ بیداری میں جو کچھ یاد رہتا ہے اُسے (MANIFEST CONTENT) کہتے ہیں۔ اس (MANIFEST CONTENT) سے (LATENT CONTENT) کا سراغ لگانا خواب کی تعبیر کہلاتا ہے۔

میں ڈھلے لیکن حالات اور واقعات آپ کو اس طرف جانے نہیں دیتے۔ آپ کا نفسِ شعور یہ حالات اور واقعات کے مطابق کام کرتا ہے لیکن جونہی آپ سوتے ہیں نفسِ نیم یا غیر شعور یہ آپ کی تمنا کی سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک حسین خواب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب آپ جاگتے ہیں تو پھر اپنے احوال وظروف کے مطابق مصروفِ کار ہو جاتے ہیں۔ اب آخر میں دو صورتوں میں سے ایک صورت پیدا ہوگی۔ یا تو آپ کا مستقبل آپ کی آرزوؤں کے خلاف عام احوال وظروف کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اس صورت میں آپ کے خواب جو آپ کے مستقبل کو آپ کی تمناؤں کے رنگ میں پیش کیا کرتے تھے، محض واہمہ بن کر رہ جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہوگیا کہ آپ نے احوال وظروف کے علی الرغم، اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق متشکل کر لیا تو اُس صورت میں آپ کے خواب "حرف بحرف سچ ہو کر" سامنے آجائیں گے۔ اس وقت آپ کہہ اٹھیں گے کہ مجھے پہلے ہی خواب میں اشارہ ہوگیا تھا کہ میرا مستقبل کیا بننے والا ہے۔ اس طرح آپ کے خواب "پیش گوئی" (PROPHETIC) ہو جائیں گے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس پر دیگر واقعات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) بہت سی باتیں تو اتفاقی امور (COINCIDENCE) سے متعلق ہوتی ہیں۔

یہ ہے خواب کی حقیقت جو اس وقت تک کی علمی تحقیق کی رُو سے سامنے آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، علمِ تجزیۂ نفس اور اس کے تضمنات ہنوز اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ اس وقت تک سامنے آیا ہے، وہی حقیقت ہے۔

لیکن بہرکیف علمی تحقیقات کی رُو سے، جو کچھ سامنے آیا ہے وہ یہی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے، خواب انسان کے اپنے ہی گم گشتہ خیالات و تصورات اور دبی ہوئی تمناؤں اور آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے جس قسم کے خیالات و تصورات ہوں گے اُسی قسم کے خوابوں کی دنیا ہوگی۔ جن لوگوں کے خیالات و تصورات اور تمنائیں اور مقاصد کثافتوں سے پاکیزہ ہوں گے، اُن کے خواب بھی آئینے کی طرح مصفّیٰ ہوں گے۔ جن کے فکر ونظر کی تطہیر ہو چکی ہوگی ان کے خوابوں کی دنیا میں بھی کوثر وسلسبیل کی آبشاریں نغمہ بار ہوں گی۔ حضرات انبیاء کرامؑ خیالات و تصورات کی پاکیزگی ورفعت میں انسانی امکان کی بلند ترین سطح پر ہوتے تھے، اس لیے جیسی ان کے قلب ونگاہ کی دنیا، ویسے ان کے خواب!

اب رہا خواب کی تعبیر کا سوال، سو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس کا تعلق انسانی فراست سے ہے۔ جو مختلف احوال وظروف کی روشنی میں قیاساً کسی نتیجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعبیرات محض ظنّی اور قیاسی ہوتی

ہیں۔ اس میں نبی اور غیر نبی کا فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ نبی بھی اس باب میں جو کچھ کہے گا وہ اس کی ذاتی (بشری) فراست پر مبنی ہوگا۔ وحی پر مبنی نہیں ہوگا۔[1]

اس تمہید کو سامنے رکھ کر قصۂ حضرت یوسفؑ کے خوابوں پر غور کیجئے۔ پہلا خواب خود حضرت یوسفؑ کا ہے۔ ہر چند وہ ان کے (قریب قریب) بچپن کا زمانہ ہے، لیکن خانوادۂ نبوّت کا چشم و چراغ اور خود بھی ہونے والا نبی۔ اس لیے آپ کا خواب بھی انہی بلند خیالات کا آئینہ دار تھا، جن کی آماجگاہ آپ کا قلب و دماغ تھا۔ شمس و قمر اور روشن ستارے سجدہ ریز! یہ تھا خواب، اور اس کی تعبیر بتانے والے حضرت یعقوبؑ، جنہیں بیٹے کا طالع بلند اس کی سیرت کی پیشانی میں درخشاں نظر آ رہا تھا۔

دوسرا خواب قید خانہ کے ساتھیوں کا تھا۔ اس کی تعبیر کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ کچھ وقت تک ساتھ رہنے سے فراستِ یوسفی نے بھانپ لیا ہوگا کہ ان میں ایک بے گناہ ہے اور دوسرا واقعی مجرم۔ خود ان کے خیالات کی رَو کا پہچان لینا بھی مشکل نہ تھا۔ اس لیے ان کے خوابوں کی تعبیر چنداں دشوار نہ تھی۔ یہ درحقیقت آپ کی صلاحیت تاویل الاحادیث ہی کا ایک مظاہرہ تھا۔ یعنی اس میں معاملہ فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک طرف قرآن نے اس تعبیر کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے جس سے سوچ کا رُخ اس طرف جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم آپ کو بذریعہ وحی عطا کر دیا تھا۔ آپ نے تعبیر بتانے کے بعد فرمایا۔ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ (۱۲/۴۱) جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے۔ اور فیصلہ وہ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ دوسری طرف قرآن نے اگلی آیت میں کہا ہے۔ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا (۱۲/۴۲) ان میں سے جس کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا (ظَنَّ) کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس سے کہا...." یہاں کہا گیا ہے کہ خواب کی یہ تعبیر حضرت یوسفؑ کا ظن تھی۔ ظن کے معنی کے متعلق امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ کسی چیز کی علامات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے، اُسے ظن کہتے ہیں اور یہ صرف قیاس اور اندازہ ہوتا ہے، یقینی بات نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعبیر آپ کی اپنی فراست کا نتیجہ تھی۔ وحی کی صورت میں اسے ظن نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وحی تو یقین ہوتا ہے بلکہ یقین کی بھی

---

[1] بعض اوقات طبیعت کے اثر سے بھی خواب مرتب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوتے میں پیاس لگے تو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں جُھلس رہا ہے، یا پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ پیاس سے اُس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ اس قسم کے خواب محض مزاج کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں "اضغاث احلام" (پریشان خیالی) کہا جاتا ہے۔ یہ طب کی دنیا سے متعلق ہے۔

انتہائی شکل۔

تیسرا خواب بادشاہ کا ہے۔ حضرت (یوسفؑ) جیسے دیدہ ور صاحبِ فراست کے لیے، جو اس ملک کے حالات کا یقیناً گہری نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ کر رہے ہوں گے، یہ اندازہ لگا لینا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ ملک کی زرعی معیشت کس طرف جا رہی ہے۔ اس کا آئینہ دار بادشاہ کا خواب تھا۔ اس میں قرآنِ کریم نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تعبیر اور تدبیر کی بنیاد وحی کا علم تھا۔

یہاں تک داستانِ حضرت یوسفؑ سے متعلق خوابوں کا ذکر تھا لیکن قرآنِ کریم میں دو اور اہم خوابوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ برمحل ہوگا اگر ان کا ذکر بھی اس مقام پر کر دیا جائے۔ ان میں ایک خواب ذبحِ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق، حضرت ابراہیمؑ کا ہے اور دوسرا خواب (صلح حدیبیہ کے متعلق) نبی اکرمؐ کا۔

حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے خدا کے حکم پر محمول کر لیا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس مقام پر خود خدا نے ان سے کہا کہ یہ تو محض تمہارا خواب تھا جسے تم نے حقیقت سمجھ لیا۔ یہ خدا کا حکم نہیں تھا۔ تفصیل اس کی مطالبُ الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۵ میں گزر چکی ہے۔

دوسرا خواب نبی اکرمؐ کا صلح حدیبیہ سے متعلق تھا۔ آپ ہجرت فرما کر مکّہ سے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں آپ کے مشن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن چونکہ نظامِ خداوندی کا مرکز کعبہ تھا، اس لیے اس کی تولیت کی آرزو آپ کے دل میں بڑی شدت سے بیتاب رہتی تھی۔ انڈکس میں آپ قبلہ کا عنوان دیکھئے۔ یہ حقیقت واضح طور پر آپ کے سامنے آجائے گی۔ اسی شدتِ آرزو کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ۶ھ میں خواب میں دیکھا کہ آپ مع صحابہؓ مکّہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔

اس وقت تک مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا، لیکن زمانہ قبل از اسلام میں عرب حج بھی کیا کرتے تھے اور عمرہ بھی — چنانچہ آپ نے اپنے خواب کی بنا پر عمرہ کے ارادے سے مکّہ کا قصد فرما لیا اور شدتِ شوق میں صحابہؓ کی قریب ڈیڑھ ہزار کی جماعت آپ کے ہم رکاب ہو گئی۔ ابھی آپ مکّہ سے ایک منزل دور حدیبیہ کے مقام پر تھے کہ قریش نے پیغام بھیج دیا کہ وہ آپ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، آپ اگلے سال آئیے۔ چنانچہ اس کے مطابق قریش کے ساتھ معاہدہ بھی ہو گیا اور حضورؐ مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ اس سے صحابہؓ کے دل میں

کھٹک پیدا ہوئی کہ جب آپ نے اپنے خواب کی بنا پر یہ عزم فرمایا تھا تو پھر اس میں کامیابی کیوں نہ ہوئی (روایت میں یہ بھی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے آپ سے براہِ راست دریافت کیا کہ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم کعبہ کا طواف کریں گے۔ آپ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سال کریں گے" (سیرت النبی شبلی نعمانی۔ حصہ اوّل ص۴۷۷) قریش نے آپ کے خواب اور اس ناکامی کا (معاذاللہ) مضحکہ اڑایا۔ قرآن کے الفاظ میں وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۱۷/۶۰) یہ خواب لوگوں کے لیے فتنہ کا موجب بن گیا۔ دو سال بعد جب مکہ فتح ہوا اور حضورؐ فاتح و منصور اس میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ۔ (۴۸/۲۷) خدا نے رسولؐ کا خواب سچ کر دکھایا" ہم نے اس مقام پر ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت زیرِ بحث صرف خوابوں کا ذکر ہے ۔ (ان موضوعات تفصیلات اپنے مقام پر آئیں گی۔)

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ:

۱۔ حضورؐ کا خواب اس شدّتِ آرزو کا آئینہ دار تھا جو تولیتِ کعبہ کے لیے آپ کے دل میں موجزن رہتی تھی۔

۲۔ اس خواب کی بنا پر آپ نے عمرہ کا عزم بھی کر لیا لیکن وہ ناکام رہا۔

۳۔ خواب کی تعبیر میں آپ سے اجتہادی غلطی ہوئی جو آپ نے (حضرت عمرؓ کے سوال کے جواب میں) فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ رسولؐ اللہ کے خواب میں بھی وحی کا دخل نہیں تھا۔

جو کچھ سابقہ صفحات میں لکھا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ خواب انسان کے اپنے ہی خیالات و تصوّرات کا پریشان سا عکس ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا، خوابوں کی دنیا کو ایک مستقل عالم قرار دے کر اس پر حقائق کی بنیاد رکھ دینا، افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقائق کا تعلق علم سے ہے۔ عام انسان کسب و ہنر سے علم حاصل کرتا ہے جو یقینی بھی ہوتا ہے اور ظنّی بھی۔ یکسر یقینی علم وحی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔ خوابوں کا اِن دونوں اقسام کے علم سے تعلق نہیں ہوتا۔ نہ کسی کا خواب کسی دوسرے (یا خود خواب دیکھنے والے) کے لیے حُجّت ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تعبیر کوئی خدائی سند اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ لیکن حقائق سے منہ موڑ لینے کے مسلمانوں کے ہاں جس طرح اوہام پرستی کے سینکڑوں اور دروازے کھُل گئے، ان میں خوابوں کی توہم پرستی بھی

شامل ہوگئی کہ فلاں بزرگ خواب میں آکر یہ ارشاد فرما گئے ہیں۔ اب اس کی تعمیل آیتِ خداوندی سے بھی زیادہ مقدم ہے۔ مقدم ہی نہیں بلکہ اگر ان کا وہ ارشاد حکمِ شریعت کے صریحاً خلاف بھی جاتا ہے تو بھی یہ کہہ کر اس کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شریعت ظواہر پرستی ہے اور وہ بزرگ حقیقت شناس ہیں۔ اس لیے ان کے ارشاد میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جسے ظاہر بین آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی پر بس نہیں[1] قیامت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی تفسیر بھی علم المنام کی رُو سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم کی کسی آیت کا واضح مفہوم اگر ان کے مفید مطلب نہیں تو وہ کہیں گے اس میں فلاں فلاں لفظ کے متعلق تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے (اور تعبیر ناموں میں ایک ایک لفظ کے متعلق تین تین مفہوم درج ہوتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق تعبیر لے لے)۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا مفہوم ہے۔ یعنی ان لوگوں کے نزدیک قرآنِ کریم (معاذاللہ، معاذاللہ) اللہ کے خوابوں کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر (نہیں، بلکہ تعبیر) تعطیر المنام (خوابوں کے تعبیر نامہ) کی رُو سے کی جائے گی۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔ حقائق کی تفسیر ایسے ظنیات و خرافات کی رُو سے! اور اس پر دعویٰ یہ کہ اس "قرآن فہمی" کا سرچشمہ خاص علم الٰہی ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے!

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ اللہ تعالیٰ نے (نبی اکرمؐ کے بعد) وحی کا دروازہ بند کر دیا تو ان لوگوں نے اسؔ کے دریچے کھول لیے۔ ان میں ایک دریچہ خواب بھی ہیں۔ (جنھیں مبشرات کہا جاتا ہے) اور مبشرات کو نبوت کا چالیسواں حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ کاذب مدعیانِ نبوّت اپنے دعوٰی کی بنیاد خوابوں پر رکھتے ہیں۔

غور فرمائیے مسلمان کتاب اللہ کے سرچشمۂ نور و ہدایت کو چھوڑ کر جہل اور اوہام کی کیسی کیسی تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔

سجدہ

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کا کنبہ مصر میں آیا تو آپ نے اپنے ماں باپ کے لیے مسند بچھوائی اور اہلِ دربار بطورِ اظہارِ تعظیم کورنش بجا لائے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ج (۱۲/۱۰۰)

---

[1] تفصیل ان امور کی میری کتاب "تصوّف کی حقیقت" میں ملے گی۔

اس نے اپنے ماں باپ کو عزت و تکریم کی بلند مسندوں پر بٹھایا اور تمام متعلقین، اہل کار اور خدام یوسفؑ کی وجہ سے ان کی تعظیم بجا لائے۔

لفظ سجدہ کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد دوم ص۳۶۰ پر بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم پیشانی کو زمین پر رکھ دینا نہیں بلکہ اطاعت شعاری کا طریق اظہار ہے جو صرف اللہ کے لیے مختص ہے اور حق بھی یہ ہے کہ انسان کی گردن اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنی نہیں چاہیئے۔ اس لیے قصۂ حضرت یوسفؑ میں سجدہ سے مراد یہ نہیں کہ اہلِ دربار (یا ان کے بھائیوں) نے سچ مچ زمین پر پیشانی رکھ دی بلکہ اس سے مراد تعظیم ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہی سجدہ ہے جس سے انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے تو اس صورت میں "لَہٗ" میں ضمیر کا مرجع خدا لینا ہوگا۔ یعنی اس شوکت و جلال کو دیکھ کر حضرت یوسفؑ کے ماں باپ اور بھائی سب خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگئے لیکن زبان کے قاعدہ کی رُو سے "رَفَعَ" کے فاعل (حضرت یوسفؑ) کو لَہٗ کی ضمیر کا مرجع قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے (اس اعتبار سے) اس آیت کا مفہوم وہی درست ہوگا جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اہلِ دربار (اور حضرت یوسفؑ کے بھائی) ادباً اور تعظیماً آپ کے سامنے جُھک گئے۔ یا اگر "لَہٗ" کے معنی یہ لیے جائیں کہ "حضرت یوسف کی خاطر" تو اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور آپ کے بھائیوں نے آپ کی اس قدر عظمت و شوکت دیکھی تو اس کے لیے خدا کے حضور سجدۂ تشکر ادا کیا۔ بہرحال' یہ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لیے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے (تعظیم ہی کے لیے کیوں نہ ہو) سجدہ ریز ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ عبدِ مومن ایک خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر ساری دنیا کی چوکھٹوں سے سرفرازانہ بے نیاز گزر جاتا ہے۔

نہ تو قرآن کریم نے اس کی تصریح کی ہے کہ شاہِ مصر آپ پر ایمان لے آیا تھا یا نہیں اور نہ ہی تاریخ اس واقعہ پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ اس لیے اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ خدا کے رسُول تھے۔ ان کا مقصد فقط اتنا ہی نہ تھا کہ اپنی بریّت ثابت کرا کر قید خانہ سے نکل آئیں اور اس کے بعد بادشاہ کی حکومت میں شریک ہو کر نظامِ مملکت کی اصلاح کریں۔ رسول کے ذمّہ خدا کا پیغام پہنچانا اور اس کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا ہوگا۔ حالات بھی اس کے موید ہیں۔ بادشاہ نے آپ کے بلند کیریکٹر کا خود مشاہدہ کر لیا۔ ملک کے انتظام میں —

لہ آپ کی رسالت کے متعلق دیکھئے ۸۳-۸۲/۶

فراست و تدبر نکھر کر اس کے سامنے آگئے۔ جب یہ سب کچھ اس کے سامنے آگیا تو حضرت یوسفؑ کی صداقت پر ایمان لانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا؟ پھر حضرت یوسفؑ اخیر عمر تک اس ملک میں رہے اور وہیں متمکن فی الارض ہوئے۔ اگر وہ آپ کی دعوت کا انکار کرتا تو نہ آپ وہاں رہنا گوارا کرتے نہ وہ آپ کو وہاں رہنے دیتا۔ ان قرائن سے بھی ظاہر ہے کہ نظامِ مملکت حضرت یوسفؑ کے تجویز فرمودہ خطوط پر متشکل ہوا ہوگا۔ اگرچہ نسبت کی رُو سے اسے "بادشاہ کا قانون" ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو وہاں کس قسم کے اختیارات حاصل تھے؟ اس کے لیے قرآنِ کریم کے ان الفاظ پر پھر غور فرمائیے جہاں ارشاد ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (۱۲/۵۶) اس طرح ہم نے یوسفؑ کو مصر میں متمکن کر دیا کہ وہ جس طرح چاہے وہاں کے نظم و نسق کو چلائے۔ یعنی آپ کے اختیارات اس قدر وسیع تھے۔ بائبل میں اس موقع پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو کُل اختیارات دے رکھے تھے۔ خود حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ (۱۲/۱۰۱) "میرے اللہ نے مجھے حکومت عطا فرمائی"۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ آخر الامر حکومت آپ ہی کی قائم ہوئی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ (معاذ اللہ) کسی طاغوتی نظام کے ممد و معاون نہ تھے، بلکہ آپ نے اس طاغوتی نظام کو خدائی نظام میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس باب میں سب سے عظیم اور محکم شہادت تو یہ ہے کہ جو شخص قید خانہ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "حق حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں" اور اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲/۴۰) "اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو"؛ کیا ایک ثانیہ کے لیے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے باطل کے نظام... کی محکومیت اختیار کر لی ہوگی۔

سورۂ مومن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم بھی حضرت یوسفؑ پر ایمان لے آئی تھی اگرچہ سب کی سب نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن میں (جن کی بعثت حضرت یوسفؑ سے قریب چار سو سال بعد ہوئی) دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ط
حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ط ... (۴۰/۳۴)

اور دیکھو! اس سے پہلے یوسفؑ بھی تمہاری طرف خدا کے واضح قوانین لے کر آیا تھا لیکن تم نے اُن قوانین کے بارے میں بھی شک کرنا نہ چھوڑا۔ چنانچہ جب وہ فوت ہوگیا (تو تم خوش ہوگئے چلو یہ قصہ ختم ہوا)۔ اب اس کے بعد اللہ کسی رسول کو ہماری طرف نہیں بھیجے گا (اور کوئی ہمیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا)۔

یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام (رسالت) قومِ مصر تک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا اسے پوری کی پوری قوم نے ردّ کر دیا یا تسلیم بھی ہوا اور ردّ بھی ہوا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ حقیقت کہ حضرت یوسفؑ عمر بھر مصر میں رہے اور ممتاز حیثیت سے رہے، اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان کے پیغام کو تسلیم کیا گیا تھا ورنہ نہ یہ ممکن تھا کہ پوری قوم کی مخالفت کے باوجود آپ ایک ممتاز حیثیت سے وہاں رہ سکتے اور نہ ہی یہ کہ آپ بحیثیت رسول، اپنی تبلیغ سے باز رہتے۔ اس لیے اس حقیقت اور دربارِ فرعون کے مردِ مومن کی محولہ صدر تقریر کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آپ کا پیغام تسلیم بھی کیا گیا اور اس کی بابت شک بھی کیا گیا اور یہ بھی کہ بادشاہ اور اس کا آئینِ حکومت حضرت یوسفؑ کی منشاء کے مطابق تھا۔ اس کے لیے اس عظیم شہادت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو ابھی پیش کی جا چکی ہے یعنی اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰)

نبوّت اور وراثت

قرآن کریم سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ بھی نبی تھے۔ پھر اُن کے بعد اُن کے بیٹے حضرت یعقوبؑ اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے حضرت یوسفؑ بھی۔ اس سے سطحی نگاہیں اس طرف جا سکتی ہیں کہ خاندانِ حضرت ابراہیمؑ میں نبوّت وراثتاً منتقل ہوتی رہی تھی، یہ صحیح نہیں۔ آپ انڈکس میں نبوّت اور وحی کے عنوانات دیکھئے، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نبوّت کا ورثہ میں مل جانا تو ایک طرف، یہ کسی کو کسب و ہنر سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اسلام میں تو حکومت بھی وراثتاً نہیں مل سکتی۔ چہ جائیکہ نبوّت وراثتاً مل جائے۔ نبوّت خالصتہً موہبتِ خداوندی تھی۔ ہونے والے نبی کو تو وحی ملنے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ نبوّت سے سرفراز ہونے والے ہیں چہ جائیکہ نبوّت وراثتاً مل جائے۔ نبوّت انتخابِ خداوندی کا نتیجہ ہوتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی شخصیت اس مقصد کے لیے معیارِ خداوندی پر پوری اُترتی تھی تو اُسے اس لیے مسترد نہیں کر دیا جاتا تھا کہ وہ کسی نبی کا بیٹا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں جس طرح بادشاہت وراثتاً منتقل ہوتی ہے، اسی طرح "پیری مریدی" بھی۔ بادشاہ کا بیٹا (پہلے ولی عہد اور اس کے بعد) بادشاہ۔ اسی طرح حضرت صاحب (پیر جی) کا بیٹا (پہلے خلیفہ اس کے بعد) خود پیر۔ اور یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا ہے۔ یہی کیفیت ذاتوں، برادریوں، گوتوں کی ہے۔ سید کا بیٹا سید۔ راجپوت کا بیٹا راجپوت، حتّٰی کہ ناموں کے ساتھ قاضی اور مفتی (یعنی کسی زمانے میں ان کے اسلاف میں سے کوئی قاضی یا مفتی ہوگا) اس کی اولاد پیدائشی قاضی اور مفتی بن گئی!

یہ وہ نسل پرستی ہے جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس عظیم مقصد کو بھی چند الفاظ میں سمیٹ کر بیان کر دیا جائے جس کے لیے قرآنِ کریم نے اس داستان کو اس تابندگی سے پیش کیا ہے۔

مساعد حالات اور موافق ماحول میں راست بازی اور دیانت داری کی زندگی بسر کرنا چنداں دقّت طلب نہیں ہوتا لیکن مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں ماحول نامساعد اور حالات مخالف ہوں۔ ایسے وقت میں حق و صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یقیناً من عزم الامور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کے صحیح کیریکٹر اور بلندیٔ سیرت کا اندازہ بھی ایسے ہی ناموافق حالات میں لگایا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف مکر و فریب کے جال بچھ رہے ہیں۔ جھوٹ اور ملمع کاری کو ہر طرف فروغ حاصل ہے۔ جو جس قدر زیادہ زمانہ ساز اور فریب کار ہے، اتنا ہی کامیاب و کامران ہے۔ صداقت اور راست اطواری کا ہر طرف گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ اس طرزِ زندگی سے قدم قدم پر مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مسابقت، تصنّع اور فریب کاری سے حاصل ہو رہی ہے۔ سچّے اصولوں پر کاربند رہنے سے ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے۔ آپ اس دوراہے پر ٹھٹک کر رُک جاتے ہیں۔ ذہنی کشمکش آپ کو کچھ فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ کامیابیوں کا لالچ آپ کو بھی یہ فریب دیتا ہے کہ جن حربوں سے دوسرے لوگ کام نکال رہے ہیں، وہی مجھے بھی استعمال کرنے چاہئیں۔ دوسری طرف اصول پرستی ہے کہ وہ اس فریب کارانہ روش میں ہر مقام پر عناں گیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں وہ لوگ جن کے سامنے نصب العین فقط حصولِ مفاد ہوتا ہے، (خواہ اس کے لیے کسی قسم کے ذرائع بھی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں) اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ اور لوگ کر رہے ہیں ہمیں بھی وہی کرنا چاہیئے۔ نفس کا فریب یہ خوش آئند دلیل پیش کرکے "اطمینان" دلا دیتا ہے کہ ایک فرد کی اصول پرستی سوائے اس کے کہ اس کی اپنی تباہی کا موجب بن جائے، اور کیا نتیجہ پیدا کرسکتی ہے۔ عوام ہی نہیں (بلکہ تنہا عقل کے زور پر مسائلِ حیات کو حل کرنے والے نظام میں) بڑے بڑے مفکّرین بھی اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ کا فلسفۂ اخلاق کا بہت بڑا علمبردار "ہربرٹ اسپنسر" (HERBERT SPENCER) لکھتا ہے:-

مثالی زندگی بسر کرنے والے انسان کے لیے دوسری قسم کے انسانوں کے اندر مثالی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ ان فریب کار لوگوں میں جن کا کوئی اصول نہ ہو، خالص سچائی اور صاف دلی، یقیناً ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔

ایسی روشِ زندگی پر، جو عام مروّجہ مسالکِ زندگی کے خلاف ہو، کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہا جاسکتا۔ یہ چیز آخرکار اس انسان کی اپنی یا اس کی نسل کی یا دونوں کی موت کا باعث ہوتی ہے۔

(THE PRINCIPLES OF ETHICS PART II P. 106)

ان لوگوں کے ایسے ہی فیصلے ہونے چاہئیں۔ لیکن جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے وہ ناموافق حالات اور نامساعد احوال وظروف کے طوفان میں حق وصداقت کی چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ آخرالامر (ان کے اپنے سامنے یا ان کے بعد) ماحول کو ان کی روش کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی حیاتِ طیّبہ کا ایک ایک لمحہ اس حقیقتِ کبریٰ کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ ؎

حدیثِ بے خبراں ہے" تو بازمانہ بساز"
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز!

حضرت یوسفؑ کی داستانِ زرّیں اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک فرد کا حسنِ کردار، باطل کے نظام کو اُلٹ کر حق کا نظام قائم نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس فرد کا مثالی کردار، اس قسم کی جماعت پیدا کرنے کے لیے بڑا ممد ومعاون ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے (FIRST CRYSTAL) بن جاتا ہے!

اس قصّے میں دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ عالمِ اسباب میں اللہ تعالیٰ اپنی مشیّت کے پروگرام کو اسباب وعلل کی کڑیوں سے ہی ظہور میں لاتا ہے۔ کنعان کے ایک "چرواہے" کو ان بلندیوں تک پہنچانے میں، جہاں "چاند اور ستارے" اُس کے سامنے جھکیں، اندھے کنوؤں، مصر کے بازاروں اور قید وبند کی مصیبتوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بلندیاں ملتی ہی اس استحکامِ خودی کے نتیجہ میں ہیں جن کا مظاہرہ ان نامساعد حالات میں ہوتا ہے۔

سورۂ یوسفؑ، آیت (۱۲/۱۰۲) تک پہلے آچکی ہے۔ آخری تین آیتوں میں کہا گیا تھا کہ ان واقعات کو حضورؐ پر بذریعہ وحی منکشف کیا گیا تھا، لہٰذا یہ یقینی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ (اے رسولؐ!) تم اس کے لیے ان سے اجر نہیں مانگتے۔ لیکن اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ قرآن اسی قوم کے لیے نہیں کہ اگر انہوں نے اسے نہ مانا تو یہ بیکار

رہ جائے گا۔ یہ قیامت تک نوعِ انسانی کے لیے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اگر یہ اسے قبول نہیں کرتے تو اور قومیں اسے اختیار کرلیں گی۔ نوعِ انسان کو آخرالامر آنا اسی کی طرف ہے۔

(جیسا کہ معلوم ہے) قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی کے سلسلہ میں اقوامِ سابقہ کی روش و نظامِ زندگی کے عواقب اور خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کو بطور دلائل اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ داستانِ حضرت یوسفؑ کے خاتمہ پہ کہا کہ اگر یہ لوگ اس قسم کے تاریخی شواہد پر غور و فکر نہیں کرتے تو اس میں تعجب اور تأسف کی کون سی بات ہے۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ:

۱۲/۱۰۵ وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ﴿١٠٥﴾

(قرآن کی تعلیم تو پھر بھی ایک نظری دعوت ہے جو حروف و الفاظ کی شکل میں ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ) کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کی کتنی کتنی بڑی محسوس شہادات ہیں، جن سے یہ منہ پھیرے گزر جاتے ہیں (اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔)

دُنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے۔ لیکن اکثریت ان کی ہے جو خدا کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ انسانوں کی اطاعت اور محکومیت بھی اختیار کیے رہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا کہ:

۱۲/۱۰۶ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ﴿١٠٦﴾

(ان میں کچھ تو ایسے ہیں کہ قوانینِ خداوندی سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ اور) اکثر ایسے ہیں کہ وہ خدا کے قانون کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اقتدار و اختیار تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح 'مطالب الفرقان' جلد پنجم صفحہ ۶۲ میں گزر چکی ہے۔ زیرِ نظر سورہ (یوسفؑ) میں ایمان باللہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۔۔۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ..... (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸/۱۱۰) اس میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔

انڈکس میں "شرک" کے عنوان کو دیکھئے۔ واضح ہو جائے گا کہ زیرِ نظر آیت (۱۲/۱۰۶) خود ہمارے متعلق ہے۔ یہ ہم ہی

ہیں جو خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور انسانوں کی محکومیت بھی اختیار کرتے ہیں۔ حاضر و موجود حکمرانوں کو چھوڑیئے، مذہب کی دنیا میں ساری کی ساری اطاعت شخصیتوں (اسلاف) کی ہوتی ہے خواہ ان کا نام کچھ ہی رکھ لیا جائے۔ یاد رکھیے! دین کے معاملہ میں جہاں (کتاب اللہ کو نہیں بلکہ) کسی انسان کو اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے تو یہ شرک ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو جتنا کوئی شخص زیادہ مذہب پرست ہوگا اتنا ہی زیادہ مشرک ہوگا۔ سیکولرازم کفر ہے لیکن اس قسم کی مذہبیت شرک ہے۔ یہی آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے۔

قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی، حق و باطل کی آمیزش (شرک) کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے (۱۲/۱۰۵) انڈکس میں اقوامِ سابقہ کا عنوان دیکھیے۔ اس مقام پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی جب فرمایا کہ:

۱۲/۱۰۷ اَفَاَمِنُوۡۤا اَنۡ تَاۡتِيَهُمۡ غَاشِيَةٌ مِّنۡ عَذَابِ اللّٰهِ اَوۡ تَاۡتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾

کیا یہ لوگ اس سے بالکل مطمئن ہو چکے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے آنے والی تباہیوں میں سے ان پر کوئی ایسی تباہی نہیں آئے گی جو ان پر ہر طرف سے چھا جائے؛ یا وہ آنے والا انقلاب اس طرح اچانک آ جائے کہ انہیں اس کے آنے کا احساس تک نہ ہو۔

اگلی آیت میں دین کی اصل و اساس کو چند لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآن اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتا اور دلیل و برہان کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ فریقِ مخالف سے بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جو زبردستی لایا جائے۔ یعنی جن دعاوی کو علم و عقل کی رُو سے تسلیم نہ کیا جائے وہ اسے ایمان ہی نہیں قرار دیتا۔ آپ انڈکس میں علم، عقل، بصیرت وغیرہ عنوانات دیکھئے۔ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ چونکہ دین کی اس بنیادی حقیقت کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اس مقام پر کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہاں قرآنی دعوت پر علم و عقل کی رُو سے غور و فکر کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

۱۲/۱۰۸ قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ‌ؔ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ‌ؕ وَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

ان سے کہو میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف دلائل و براہین کی رُو سے، علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں — میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے — خدا اس سے بہت بلند ہے کہ (اسے کائنات کے چلانے کے لیے اور قوتوں کی بھی ضرورت ہو۔) اس لیے میں ان میں سے نہیں ہوں جو قانونِ خداوندی کو بھی تسلیم کریں اور اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی اختیار و اقتدار کی مالک سمجھیں۔ (اور یوں مومن کہلاتے ہوئے مشرک کے مشرک رہیں)۔

علم و بصیرت کی رُو سے دین کو پیش کرنا اور دلیل و برہان کی رُو سے اُسے ماننا۔ یہ ہے ارشادِ خداوندی — اور یہ ہے سنّتِ رسول اللہ — اور اسی کو جماعتِ مومنین کا شیوہ اور طریق بتایا گیا۔ دین کی دعوت پیش کرنے میں جو شخص اس طریق کو اختیار نہیں کرتا وہ ارشادِ خداوندی سے سرکشی برتتا اور سنّتِ رسول اللہ کی مخالفت کرتا ہے۔

دین کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں آپ غور فرمائیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدرِ اوّل میں اسلام، بزورِ شمشیر پھیلایا گیا تھا اور یہ کہ جو شخص اسلام چھوڑنا چاہے (مُرتد) اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ کس طرح دین کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ انڈکس میں "مودودی ازم" کا عنوان دیکھئے۔ نیز جنگ، قتال اور جہاد کے عنوانات

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ رسول انہی جیسا انسان کیوں ہے۔ فرمایا:

۱۲/۱۰۹ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۱۰۹

(اور یہ جو اُن کا اعتراض ہے کہ ایک انسان کس طرح سے رسول ہو سکتا ہے، تو ان سے کہو کہ) مجھ سے پہلے بھی خدا نے کسی رسول کو نہیں بھیجا بجز اس کے کہ وہ وہاں کی بستی کے رہنے والوں میں سے ایک آدمی تھا۔ (۱۶/۴۳ ؛ ۲۱/۷)

کیا یہ لوگ (جو اس قسم کی کٹ حجتیاں کرتے ہیں) دُنیا میں چلے پھرے نہیں جو دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے ان سے پہلے (اس قسم کی روش اختیار کی تھی)؟ اگر یہ لوگ (آنکھیں کھول کر تاریخی شواہد کا

مطالعہ کرتے اور (عقل و فکر سے کام لیتے، تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ (حق و باطل کی کشمکش میں) آخرالامر کامیابی اور تمکن انہی کو حاصل ہوا جو تخریبی کارروائیوں سے بچتے ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ (لہٰذا، ان سے کہو کہ حق و باطل کا فیصلہ اس سے نہیں ہوتا کہ رسول، دوسرے انسانوں جیسا انسان ہوتا ہے یا، تمہارے تصور کے مطابق، فوق البشر، اس کا فیصلہ اس سے ہوتا ہے کہ جو قانون وہ پیش کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کیا؟ اس کی شہادت تاریخی سرگزشتیں بھی بہم پہنچا سکتی ہیں)۔

آپ عنوان "رسول" کے تحت دیکھیں گے کہ یہ اعتراض ہر رسول کے خلاف کیا جاتا تھا اور اس کا جواب یہی دیا جاتا تھا کہ رسول فوق البشر نہیں ہوتے۔

اس آیت میں، اور اس کے علاوہ دو مقامات پر اور (۱۶/۴۳ ; ۲۱/۷) میں رسولوں کو رِجَالًا کہا گیا ہے۔ یعنی مرد۔ اگرچہ عربی زبان میں رجال کا لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم "لوگ"، یا "اشخاص" کے الفاظ بولتے ہیں (دیکھئے لغات القرآن) لیکن یہ واقعہ ہے کہ تمام رسول مرد ہی تھے۔ اس سے وہ لوگ جنھوں نے اس پر ادھار کھا رکھا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کمتر ثابت کیا جائے، یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ کوئی عورت نبی نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ عورت، مرد کے مقابلہ میں فروتر ہے۔

نبوت اگر اس شخص کا ذاتی معاملہ ہوتا جسے وحی عطا ہوتی تھی، تو عورتوں کی طرف بھی وحی ہو جاتی[1]۔ لیکن نبی کا فریضہ رسالت بھی تھا اور اس فریضہ کا مفہوم تھا دنیا جہان کی سرکش طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر کے انقلابِ عظیم برپا کرنا۔ اگر عورت کے ذمے یہ فریضہ عاید کر دیا جاتا تو فطرت کی طرف سے جو مخصوص وظائف اس کے سپرد کیے گئے تھے، وہ انہیں سرانجام نہ دے سکتی۔ یہ تقسیم عمل ہے جس کے یہ معنیٰ نہیں کہ عورتیں، عورت ہونے کی جہت سے مردوں سے کم تر ہیں۔ انڈکس میں عنوان "عورت" دیکھئے۔

اس کے بعد قرآن اس کشمکش کا ذکر کرتا ہے جس سے رسول کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ رسالت کا اولین مرحلہ یہ تھا کہ رسول اپنی قوم کے لوگوں تک اپنی دعوت پہنچاتا اور انہیں اسے قبول کرنے پر آمادہ کرتا۔ اس میں اسے (اکثر) بہت کم کامیابی ہوتی، حتیٰ کہ ایک ایسا مقام آجاتا جہاں یہ نظر آتا کہ جن سعادت مند اشخاص نے اس کی دعوت کو قبول کرنا تھا وہ کر چکے ہیں۔ باقی مخالفین اُسے قبول نہیں کریں گے۔ ان کے اس دعوت کے قبول کرنے کے راستے میں ایک بات

---

[1] جیسے اہلِ تصوف کے ہاں عورتیں بھی "ولی" ہوتی ہیں (مثلاً رابعہ بصریؒ)

یہ بھی حائل ہوتی کہ رسول جو ان سے کہتا کہ اگر انہوں نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا تو وہ اصرار کرتے کہ اس تباہی کو جلدی لاؤ۔ لیکن اسے خدا کے مقرر کردہ قانونِ مُہلت کی رُو سے اپنے وقت پر آنا ہوتا تھا۔ اس پر وہ خیال کر لیتے کہ تباہی کی وعید محض دھمکی ہے، درحقیقت ایسا نہیں ہوگا (سابقہ جلدوں میں یہ حقیقت بار بار سامنے آچکی ہے) اس کے بعد فیصلہ کُن مرحلہ آتا جس میں حق کے مخالفین کو شکست ہوتی (یا وہ تباہ ہو جاتے) اور جماعتِ مومنین کامران و کامیاب ہو جاتی (اس سلسلہ میں مطالبُ القرآن جلد سوم صفحہ ۲۹۵ الی آخر دیکھئے جہاں ان مراحل کی تفصیل بیان کی گئی ہے) فرمایا کہ اس کشمکش میں ایسے مراحل آتے کہ:

۱۲/۱۱۰ حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ
نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

(لیکن یہ تاریخی شہادتیں یہ بھی بتائیں گی کہ حق و باطل کی اس کشمکش کا فیصلہ یونہی جھٹ سے نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں بعض اوقات یہ عرصہ اتنا لمبا ہو جاتا تھا کہ رسول دل برداشتہ ہو جاتے تھے کہ اب یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور لوگ اپنے دل میں سمجھ لیتے تھے کہ انہیں تباہی اور بربادی کے جس عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، وہ خالی دھمکیاں ہیں۔ تو اُس وقت ہمارے رسولوں کی طرف ہماری نُصرت آتی تھی۔ سو ہم اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق (رسول اور اس کی جماعت کو) تباہی سے محفوظ رکھتے تھے، اور مجرمین سے وہ عذاب ٹلا نہیں کرتا تھا۔

(سو جس طرح، اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہُوا، اسی طرح اِن لوگوں کے ساتھ ہوگا)

اور آخر میں ان جُملہ حقائق کو ایک آیت میں سمٹا کر رکھ دیا۔

۱۲/۱۱۱ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى
وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ہم اقوامِ سابقہ کے جو احوال و کوائف بیان کرتے ہیں، ان میں ان لوگوں کے لیے سامانِ عبرت و موعظت ہے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ) قرآن کوئی من گھڑت کتاب نہیں۔ یہ اُن تمام دعاوی کو سچ کر دکھائے گا

جو اس سے پہلے، انبیاء سابقہ کی وساطت سے کیے گئے تھے۔ اس میں وہ تمام اصول و قوانین دے دیئے گئے ہیں جن کی نوعِ انسان کو صحیح زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ اِن اصول و قوانین کو اس طرح نکھار اور اُبھار کر بیان کیا گیا ہے (کہ اِن میں کسی قسم کا التباس نہیں رہا)

یہ وہ ضابطہ ہے جو ہر اُس قوم کو، جو اس کی صداقت پر یقین رکھے، سفرِ حیات میں راہ نمائی کا کام دے گا اور اس کے لیے سامانِ نشوونما فراہم کرے گا۔

(یہ ہے تمام نوعِ انسان کے لیے خدا کی طرف سے آخری اور مکمل ضابطۂ حیات)

اس ارتکاز پر سورۃ یوسف اختتام پذیر ہوتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تیرہواں پارہ ——— تیرہویں سورۃ

سورۃ الرعد (۱۳)

باب دوم
سُوْرَةُ الرَّعْدِ

يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

- قرآنِ کریم اور سائنسی حقائق۔
- نظامِ کائنات اور اجرامِ فلکی۔
- کائنات میں نظامِ ربوبیّت سے حیاتِ آخرت پر استدلال۔
- قوموں کی زندگی میں موت و حیاتِ نو کے اصُول۔
- قرآن، علوم سائنس کا نصاب نہیں، انسانی رہنمائی کا ضابطہ ہے۔
- قوموں کے احوال میں تبدیلی، تغیرِ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔
- مسئلہ خیر و شر۔
- بقا اُسی کے لیے ہے جو نوعِ انسان کے لیے منفعت بخش ہے (قانون بقا للانفع)۔
- دنیا اور آخرت کی خوشگواریوں کا تقابل۔
- اُمّتِ واحدہ کی تشکیل کا عملی پروگرام، نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ انفاق کا قیام۔
- قرآن اپنے دعاوی کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا ہے جبکہ عجوبہ پرستی کا تقاضا معجزہ طلبی ہوتا ہے۔ دین کو زبردستی منوانا مقصودِ ربانی نہیں۔
- اطمینانِ قلب، خدا کے قانون کی مُطابقت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔
- جنّت اور جہنّم کی حقیقت بسیط حقائق کا تمثیلی اندازِ بیان۔
- رسولوں کی بشریّت۔
- خُدا کا قانونِ محو و ثبات۔
- رسولوں کا فریضہ خدا کے پیغام کو انسانوں تک پہنچا دینا ہے۔ نتائج اس کے قانونِ حساب کے مُطابق ظہُور پذیر ہوتے ہیں۔
- قرآن انسانی دُنیا میں جو انقلاب لانا چاہتا ہے اُسے روکا نہیں جاسکتا۔

باب دوم

سُورَۃُ الرَّعدِ

تیرھویں سُورۃ

آپ مطالبُ الفرقان کی سابقہ جلدوں کو دیکھئے۔ قرآن کریم نے تسخیرِ کائنات کے متعلق بڑی کثرت، تفصیل اور تکرار سے بیان کیا ہے (انڈکس میں کائنات اور ملائکہ کے عنوانات بالخصوص دیکھئے) اس سے دو اہم مقصد پیشِ نظر تھے۔ ایک تو یہ کہ انسان نے اپنے عہدِ طفولیت میں مظاہرِ فطرت کو الوہیاتی مقام دے رکھا تھا۔ وہ انہیں دیوی دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کرتا تھا۔ عربوں کے ہاں بھی یہ عقاید بڑی شدت سے موجود تھے (دیکھئے $\frac{53}{19-27}$) قرآن نے انسان کے ان جہالت آمیز عقاید کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ فطرت کی ان قوّتوں کو الوہیاتی اقتدار حاصل نہیں — یہ سب خدا کے مقرّر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، اس لیے خود خدا نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ معیّن قوانین کے مُطابق یہ قوّتیں مصروفِ عمل ہیں۔ ان کے سمجھنے کی صلاحیت انسان میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ جو قوم ان قوانین کا علم حاصل کرے گی وہ ان قوّتوں کو مسخر کرلے گی۔ اس سے "آدم مسجودِ ملائکہ" بن جائے گا۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان جلد دوم باب اوّل ص۷۶)۔ رعد (بادل کی گرج) بھی انہی ملائکہ میں شامل ہے جیسا کہ سابقہ حوالہ میں بتایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بھی کہا گیا ہے کہ رعد "ملک من الملائکہ" (ملائکہ میں سے ایک ملک) ہے۔ غالباً اس کی اس اہمیت کے پیشِ نظر اس سورۃ کا نام سُورَۃُ الرَّعد رکھا گیا ہے۔ رعد کا لفظ ایک تو اسی سورۃ کی آیت نمبر ۱۳ میں آیا ہے اور دوسرے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۹ ($\frac{2}{19}$) میں۔ یوں تو علومِ سائنس کے متعلق مطالبُ الفرقان میں جستہ جستہ مختلف مقامات پر لکھا جا چکا ہے لیکن جلد ششم، سورۃ الاعراف کے آخری حصہ میں اس موضوع پر تفصیل سے آیا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر موجودہ سورۃ (الرّعد) میں مظاہر و قوای فطرت کے متعلق جو کچھ آئے گا اس کے

متعلق کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہاں صرف حوالہ دے کر آگے بڑھ جایا جائے گا۔ اس سُورۃ کی پہلی آیت ہے:

۱۳/۱ الٓمّٓرٰ قف تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ①

خدائے علیم وحکیم ورحیم کا ارشاد ہے کہ یہ کتابِ خداوندی (قرآن) کی آیات ہیں یعنی اُس ضابطۂ خداوندی کے قوانین جو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، تجھ پر بذریعہ وحی نازل کیا جاتا ہے اور جو یکسر مبنی برحقیقت ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کے باوجود اس کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے فوری بعد نظامِ کائنات کا ذکر آگیا:

۱۳/۲ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

یہ اُس خدا کی طرف سے ہے جس نے اتنے بڑے بڑے اجرامِ فلکی کو، فضا کی بلندیوں میں معلق کر رکھا ہے اور، جیسا کہ تم دیکھتے ہو، کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں۔ (یہ صرف اس کا قانونِ کشش وجذب ہے جس کے سہارے یہ قائم ہیں) اس لیے کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اس نے سورج اور چاند، سب کو اپنے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک مدتِ معینہ کے لیے اپنے اپنے راستے پر چلا جا رہا ہے۔

جس خدا کا ہمہ گیر قانون خارجی کائنات میں یوں تدابیر الامور کرتا ہے، وہی خدا، اپنے اُس قانون کو جس کے مُطابق انسان کو زندگی بسر کرنی چاہیئے، کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں اس حقیقت کا یقین ہو جائے کہ تمہیں بھی اسی قانون کا سامنا کرنا ہے۔ تم اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا میں ایک عظیم سائنٹیفک حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اتنے اتنے بڑے عظیم الجثہ کرّوں کا فضا میں معلّق اور مصروفِ گردش رہنا بڑا محیّر العقول واقعہ ہے۔ تمہاری نگاہ ان ستونوں کو تلاش کر رہی ہوگی جن کے سہارے یہ کرّے قائم ہیں۔ کہا کہ وہ ستون تو ہیں لیکن غیر مرئی۔ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ستون کشش و جذبِ باہمی ہے جس سے یہ کرّے معلّق ہیں۔ لیکن کشش وجذب غیر محسوس اور غیر مرئی قوّت ہے۔ یہی الفاظ (۳۱/۱۰) میں بھی

آئے ہیں۔

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ یہ تمام مظاہرِ فطرت ایک مدتِ معیّنہ کے لیے رواں دواں ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ کائنات نہ ازلی ہے (کیونکہ مخلوق ہے) نہ ابدی۔ (۱۴ ؍ ۴۹)

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ سلسلۂ کائنات مشین کی طرح (AUTOMATICALLY) خود بخود نہیں چلا جا رہا۔ اس کا خالق اس کے پیچھے ہے۔ اس کی تدابیر کے مطابق یہ سرگرمِ عمل ہے۔

اس کے بعد بنیادی نکتہ اگلے الفاظ میں واضح کر دیا کہ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں جس میں قوانین و مظاہرِ فطرت کی سرگرمیوں کا ذکر ہے اور بس۔ کہا کہ یہ ذکر ایک عظیم مقصد کی طرف لے جانے کے لیے ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح نظامِ فطرت ایک ضابطۂ قوانین کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اسی طرح خود انسان کے اعمال بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق نتائج مرتب کرتے ہیں۔ قوانینِ فطرت کے تذکرہ سے مراد تمہاری توجہ قانونِ مکافات کی طرف منتقل کرانا ہے۔

نظامِ فطرت اور قانونِ مکافاتِ عمل کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد دوم ص۹۳ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس قانون کی ابتداء نظامِ ربوبیت سے ہوتی ہے جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔

۱۳ ؍ ۳-۴ وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۞ ۳ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ
جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی
بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۞ ۴

تم غور کرو کہ اس کا قانونِ ربوبیت، کائنات میں کس طرح کارفرما ہے۔ اس نے (زمین کے گول ہونے کے باوجود) اس کی سطح کو اس طرح پھیلا دیا ہے (کہ تم اس پر آسانی سے رہ سکو) اور اس میں پہاڑ بنا دیئے اور ان سے دریاؤں

کا سلسلہ جاری کر دیا اور اس میں ہر اک پھل کے جوڑے، دو دو قسم کے، پیدا کر دیئے اور زمین کی گردش کا ایسا قاعدہ مقرر کر دیا کہ اس سے) رات کی تاریکی، دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ان تمام امور میں، ان لوگوں کے لیے، جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، ہمارے قانون کی ہمہ گیری کی، کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔

پھر اس پر بھی غور کرو کہ زمین کے مختلف قطعات، ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں (لیکن ان میں) کسی میں انگور کے باغ ہیں، کسی میں کھیتیاں ہیں، کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے اُگتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن مختلف درختوں کے پھل، خوبیوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں (ایک میں ایک خوبی ہے تو دوسرے میں دوسری) اس طرح ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

ان امور میں بھی اُن لوگوں کے لیے، جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں، ہمارے نظامِ ربوبیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

مختلف درخت ایک ہی زمین سے اُگتے ہیں۔ ان کا (SOIL) ایک جیسا ہوتا ہے۔ وہ سیراب بھی ایک ہی جیسے پانی سے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ ثمرات کا یہ فرق بیج کی وجہ سے ہوتا ہے جس قسم کا بیج، اُسی قسم کا پھل! اسی طرح انسانی زندگی کے ثمرات بھی اُن اعمال کے مطابق ہوتے ہیں جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں جس قسم کے کسی کے اعمال، اُسی قسم کی اُس کی زندگی۔

ضمناً، یہاں پر مَدَّ الْاَرْضَ کہا ہے۔ یعنی زمین کو گول ہونے کے باوجود اس طرح پھیلا دیا ہے کہ اس پر انسان بستے ہیں اور ان کی نشو و نما کے لیے فصلیں بھی اُگتی ہیں۔ دوسری جگہ کہا ہے اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ [۱۵/۱۶] وہ تمہیں اپنے ساتھ لیے گھوم رہی ہے۔ یہی وہ گردش ہے جو (علاوہ دیگر امور) رات اور دن کے اختلاف کا موجب ہے۔ (يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ) اس تمام نظام میں بھی ایک عظیم مقصد کی نشانیاں (آیات) ہیں۔ لیکن یہ آیات اُنہی کو نظر آ سکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔ (لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ)

ان آیات میں سب سے بڑی آیت یہ ہے کہ ایک ایسی گٹھلی سے جس میں زندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی، لہلہاتے پودے کی نمود ہوتی ہے۔ جو نشو و نما پا کر مکمل درخت بن جاتا اور ثمر بار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کی حیاتِ آخرت پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۵/۱۳) وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ ۖ
وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ⑤

(خدا کے قانونِ تخلیق و نشوونما کی اس قدر گونا گوں نشانیوں کے باوجود، اے مخاطب!) اگر تو کوئی تعجب انگیز بات سُننا چاہے تو وہ، ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ "جب ہم گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہم ایک نئے انداز سے پھر پیدا ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ (جو سمجھتے ہیں کہ انسان کی زندگی بس اس طبیعی جسم کی زندگی ہے اس سے آگے کچھ نہیں) خدا کے قانونِ تخلیق و ربوبیت سے انکار کرتے ہیں (اس لیے کہ "ربوبیت" کے معنی ہی کسی شے کو اس کی تکمیل کے آخری نقطہ تک پہنچانا ہے۔ اور انسان کی تکمیل کا آخری نقطہ اس کی موت نہیں) ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جو (جہالت اور تقلید کی) زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ (ان کی نگاہ دور تک جا ہی نہیں سکتی۔ وہ وسعتِ نظر اور کشادگیٔ علم سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ یہ لوگ زندگی کی وسعتوں سے انکار کر کے کسی اور کا نقصان نہیں کرتے بلکہ اپنے مستقبل کی کھیتیوں کو اس طرح جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا لیتے ہیں کہ ان میں نشوونما کا امکان ہی نہیں رہتا۔

یہاں حیاتِ آخرت سے انکار کو خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کے مُرادف قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں زمینِ مُردہ کو حیاتِ تازہ "عطا کرنا" قانونِ ربوبیت کی کارفرمائی قرار دی گئی ہے۔[19] یہی قانونِ ربوبیت انسان کی حیاتِ نَو کے سلسلہ میں کارفرما ہوتا ہے۔[19] قوموں کی زندگی میں موت و حیاتِ نَو کا سلسلہ اس دُنیا میں بھی جاری رہتا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی۔ دنیاوی زندگی میں اس کشمکش کے متعلق فرمایا:

۱۳/۶ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ
الْمَثُلَاتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ
رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ⑥

(ان کی اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہے کہ یہ) بجائے اس کے کہ اس کا انتظار کریں کہ تمہاری جدوجہد کے حسین و خوشگوار نتائج سامنے آجائیں، تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جس تباہی کے متعلق تم ان سے کہتے ہو وہ جلدی سے آجائے۔ انہیں اس کا علم نہیں کہ ان سے پہلے قوموں کی تباہی کی ایسی سرگزشتیں گزر چکی ہیں جو دنیا میں کہاوتیں بن گئی ہیں۔

اس باب میں تیرے نشوونما دینے والے کا قانون یہ ہے کہ لوگوں کے ظلم اور زیادتی کے باوجود (عمل اور اس کے

نتیجہ میں مُہلت کا وقفہ رکھا جائے تاکہ جو لوگ اس دوران میں غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرلیں، آنیوالی تباہی سے اُن کی حفاظت ہوجائے (لیکن جو لوگ اس مہلت کے وقفہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ تباہ و برباد ہوجاتے ہیں) حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات اعمال کا پیچھا کرنے میں بڑا سخت گیر واقع ہُوا ہے۔

قرآنی تعلیم کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اُس نے عجوبہ پسندی اور کرشمہ بینی کے خوگر انسانی ذہن کو طلسماتی تخیلات سے نکال کر اس پر قانونِ اسباب وعلل (CAUSE AND EFFECT) کی اہمیت اور ہمہ گیری مرتسم کی ہے۔ انسانی دنیا کا یہ محیّر العقول انقلاب ہے۔ آج انسانی تہذیب و تمدن کی جو ہوش رُبا ندرت کاریاں ہماری نگاہ کو خیرہ کرتی ہیں وہ سب اسی قرآنی انقلاب کا صدقہ ہیں۔ یہی وہ انقلاب تھا جسے دورِ جاہلیت کا عربی ذہن آسانی سے قبول نہیں کر رہا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ انہیں قانون کی تعلیم دیتے تھے اور وہ معجزات طلب کرتے تھے۔

(۱۳/۷) وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾

یہ لوگ جو اس ضابطۂ قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، درحقیقت "قانون" کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اسی لیے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ رسول کوئی محسوس معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ حالانکہ تیرا کام صرف یہ ہے کہ تو انہیں خدا کے اس قانون سے آگاہ کردے کہ اگر تم غلط روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ اگر تیری دعوت اسی قوم مخاطب تک محدود ہوتی تو معاملہ کچھ مختلف ہوتا لیکن تجھے تو ہر موجودہ اور آنے والی) قوم کے لیے راہ نما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس لیے تیرا منصب یہی ہے کہ تو خدا کے عالمگیر، غیر متبدّل قوانین پیش کرے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہوں اور جن پر غور و فکر سے ہر قوم راہنمائی حاصل کر سکے۔

"لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" حضورؐ کے آخری نبی ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔ حضورؐ کی پیش فرمودہ راہنمائی ہر قوم کیلئے ہے، جو مکمل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ اس لیے کسی قوم کے لیے بھی کسی اور نبی کی ضرورت نہیں۔

آیت (۱۳/۶) میں کہا گیا ہے کہ عمل اور اُس کے محسوس نتیجہ کے ظہور میں آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یعنی عمل کا بیج مختلف مراحل میں سے گزر کر ثمر بار ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مثالوں سے کر دی۔ فرمایا۔

(۱۳/۸) اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا

تَزۡدَادُ ؕ وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ﴿۸﴾ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّہَادَۃِ الۡکَبِیۡرُ الۡمُتَعَالِ ﴿۹﴾

(یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے تو اس کی بین مثال ان کے سامنے ہے کہ کس طرح حمل قرار پانے سے بچہ پیدا ہونے تک کا عرصہ ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ علمِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ مادہ کے پیٹ میں کیا ہے اور رحم کے اندر اس میں کون کونسی چیزیں کم ہوتی رہتی ہیں اور کون کون سی بڑھتی ہیں۔ نیز کونسا بچہ تکمیل تک پہنچتا ہے اور کون سا ناتمام رہ جاتا ہے۔ یہ سب اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھے ہیں۔

اُس خدا کے اندازوں کے مطابق جو جانتا ہے کہ کسی شے کی موجودہ حالت کیا ہے اور مستقبل میں وہ کن مراحل سے گزرنے والی ہے۔ (اس کے کون کون سے جوہر مشہود ہو چکے ہیں اور کون کون سے ہنوز پوشیدہ ہیں)۔ اس کا قانون بڑی قوتوں کا مالک اور بلند ترین مقام پر متمکن ہے۔ ایسے بلند ترین مقام پر کہ اس تک کسی کا ہاتھ ہی نہیں پہنچ سکتا۔ جو اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔ وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر ہے۔

آیت (۸) کے آخر میں کہا گیا ہے کہ "عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ" اس سے ایک اہم نکتہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ خُدا کے علمِ غیب کے متعلق انڈکس کی طرف مراجعت کیجئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن امور کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کا علم خُدا کو ہے، کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، یا انسان بھی ان کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحات ۳۸-۳۹) پر بحث ہو چکی ہے۔ وہاں (اور غیب سے متعلق دیگر مقامات میں) یہ بتایا گیا ہے کہ جن امُور کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں ان کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن جو امور کسی طبعی قانون کے تابع نہیں اُن کا علم انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ آیت (۱۳/۸) میں جو کہا تھا کہ وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ۔ تو اس سے مراد وہی امور ہیں جن کے لیے قوانین مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ کائنات کے غیب و شہود کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم (ص۹۵) دیکھئے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم میں قوانینِ فطرت اور مظاہر کائنات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے مقصد یہ نہیں کہ قرآن علوم سائنس کا کوئی نصاب ہے۔ وہ انسانی راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لیے ان امور سے مقصد ان قوانین کی تائید میں شہادات پیش کرنا ہے جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں قوانینِ فطرت سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد فرمایا:

۱۰ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾

اُس کے قانون کی نگاہ اس قدر باریک بین ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی بات کو چھپائے یا اُسے ظاہر کر دے، یا کوئی شخص دن کی روشنی میں کھلے بندوں چلے یا رات کی تاریکی میں (ادھر اُدھر کچھ کرتا پھرے) اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔

انسانی اعمال کو محفوظ رکھنے کے متعلق قرآنِ حکیم میں بے شمار مقامات پر تصریحات آئی ہیں (انڈکس میں مکافاتِ عمل کا عنوان دیکھئے) مندرجہ بالاآیات میں کہا کہ انسان کے ہر عمل کا خدا کو علم ہوتا ہے۔ اگلی آیت کے پہلے حصہ میں ان اعمال کے محفوظ رکھے جانے کا (گویا) عملی طریق بتایا گیا ہے۔

۱۱ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ

اس کے قانونِ مکافات کی کارفرمائی کے لیے) ہر انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کرکے، اُسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی ہے (۱۰/۸۲) اور انسان کا ہر عمل محفوظ ہو جاتا ہے اور نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے۔

انسانی اعمال درحقیقت محسوس مظاہر ہوتے ہیں اُس کے خیالات، نفسیاتی میلانات ورجحانات، اس کی آرزوؤں، تمناؤں، اُس کے مقاصد اور ارادات کے۔ مطالب الفرقان جلد ششم میں زیرِ آیت (۵۳/۸) تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ فرد ہو یا قوم اُن کی زندگی کا مدار اُن کی ذہنیت اور نفسیات پر ہوتا ہے۔ جب تک اُن میں تبدیلی نہ ہو، اُن کی زندگی میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ جن عوامل سے یہ تغیر واقع ہوتا ہے، قرآن انہیں ایمان کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

(اور پھر، چونکہ قوم افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اس لیے یہی قانون آگے بڑھ کر اقوام کو بھی محیط ہو جاتا ہے۔ اس قانون کا نتیجہ ہے کہ) خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے یعنی اپنے اندر قلبی اور ذہنی تبدیلی پیدا نہ کرے۔

وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

(چنانچہ جس طرح یہ ایک محکم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ اس سے نہیں چھنتیں جب تک وہ ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے (۵۳ـ۸) اسی طرح) یہ بھی ایک غیر متبدّل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر اس کے اعمال کے نتیجہ میں، تباہی آتی ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ پھر قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرلے تو وہ اس کی مدد کرسکتا ہے۔

نفسیاتی تغیرات سے جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ بجز اس کے کہ کوئی قوم نفسیاتی تغیر کی صلاحیتوں ہی کو معدوم کر چکی ہو) اس کے لیے تغیرِ احوال کا امکان ہے۔ مَا لَهُمْ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ نے نگاہ کا رُخ، دوبارہ زندگی حاصل کر سکنے کی اُمید کی طرف موڑ دیا اور اس کے لیے پھر مظاہرِ کائنات کی مثال سے اس بسیط حقیقت کو سمجھا دیا۔ فرمایا:

۱۲ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝۱۲ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۝۱۳

(تباہیوں کی ایسی یاس انگیز حالت میں، قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی امید افزا کیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے تم پھر کائنات میں غور کرو کہ ایک ہی حادثہ میں کس طرح، بیم و رجا، ملے جُلے ساتھ آتے ہیں، تم دیکھو کہ بجلی چمکتی ہے تو اس سے خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، پانی سے بھرے ہُوئے بادل اُمنڈے چلے آتے ہیں جو تمہارے لیے نفع بخشیوں کے پیغام بر ہوتے ہیں۔

ان بادلوں کی گرج بلکہ تمام کائناتی قوتیں، قانونِ خداوندی کی ہیبت سے لرزہ براندام، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتی ہیں تاکہ اُس کی ربوبیت اس طرح نکھر کر سامنے آجائے کہ ہر دیکھنے والے کی زبان پر بے ساختہ کلماتِ تحسین آجائیں (۱/۲)۔ باقی رہیں بجلیوں کی تباہ کاریاں، تو وہ اُس پر گرتی ہیں جو اُن کی زد میں اپنا آشیانہ بنا کر خود تباہ ہونا چاہتا ہے اور یہ کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ لوگ (اس قدر زندہ شہادتوں کے باوجود) قانونِ خداوندی کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں (اور نہیں

سمجھتے کہ خدا کا جو قانون، کائنات میں یہ کچھ کر رہا ہے وہ) انسانی دنیا میں بھی کس قدر سختی سے مواخذہ کرنیوالا ہے۔
لیکن یہ امن و امان، یہ خوشحالیاں اور سرابیاں بیٹھے بٹھائے اور محض زبانی یا اللہ یا اللہ کہہ دینے سے حاصل نہیں ہو جاتیں۔ اس کے لیے اُس خدا کے قوانین کا اتباع ضروری ہے جس کے قوانین کی خلاف ورزی سے تباہیاں آتی ہیں۔

۱۳/۱۴ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

(اس لیے جو قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی کوششیں ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کریں، اُسے اُس کے قوانین کا اتباع کرنا چاہیئے اس لیے کہ) ٹھوس، تعمیری نتائج پیدا کرنے والی ہر بانگ اُس کے قانون سے وابستہ ہے۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ اس کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کی رُو سے تعمیری نتائج پیدا کر لیں تو اُن کی یہ آرزو اور کوشش اسی طرح رائیگاں جائے گی جس طرح اُس شخص کی آرزو اور کوشش رائیگاں جاتی ہے جو دُور سے پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر سمجھے کہ پانی اس کے منہ تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ حالانکہ اس طرح پانی اُس کے ہونٹوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ (یہ چیز قانونِ خداوندی کے خلاف ہے) لہٰذا اس کے قانون سے انکار کرنے والوں کی آرزوئیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ (۱۴/۱۴)

اس ضمن میں انڈکس میں دعا اور جنت کے عنوانات بھی دیکھئے۔ اس کے بعد پھر مظاہرِ فطرت کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ فرمایا:

۱۳/۱۵ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾

(یہ لوگ جو ہمارے قانون سے انکار کرتے ہیں، دیکھتے نہیں کہ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی ہے "طَوْعًا وَّ كَرْهًا" ہمارے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہے[۱] (۳/۸۳ : ۱۳/۱۵) اگر یہ لوگ کائنات کی بڑی بڑی چیزوں کو دیکھنا نہیں چاہتے تو، کم از کم اپنے جسم پر ہی غور کریں جو خدا کے قانونِ طبیعی کے تابع ہے۔ وہ دیکھیں کہ) ان کا سایہ کس طرح،

---

[۱] اس کی تشریح کے لیے (۳/۸۳) دیکھئے۔

صبح سے دوپہر تک ایک سمت میں اور دوپہر سے شام تک دوسری سمت میں رہتا ہے۔ (کیا انہیں اس پر اختیار ہے کہ وہ اس سایہ کی سمت کو بدل دیں؟ یہ لوگ یہاں تک تو مانیں گے کہ اس کے بدلنے پر انہیں اختیار نہیں لیکن اسے تسلیم نہیں کریں گے کہ خدا کا قانون ان کے سایہ سے آگے بڑھ کر، ان کی ذات پر اور انسانی معاشرہ پر بھی نافذ ہوتا ہے)۔

اشیائے کائنات کی طوعاً وکرھاً سجدہ ریزی کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد چہارم کے صفحہ ۱۶۶-۱۶۷ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ آیت زیرِ نظر میں البتہ ظلال (سایوں) کی جو مثال دی گئی ہے وہ بڑی عمیق حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت بہرحال کرتی ہے۔ اس سے خلاف ورزی کا کسی کو اختیار نہیں۔ انسان صاحبِ اختیار ہے لیکن جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے وہ بھی قوانینِ فطرت کی اطاعت پر مجبور ہے۔ (مثلاً) سانس پر اُس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اُسے اس کا تو اختیار ہے کہ سانس لے یا نہ لے۔ لیکن اُسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ سانس بند کر لے اور پھر بھی زندہ رہے[1] یہاں وہ دیگر جانداروں کی طرح مجبور ہے۔ اس جبر واختیار کی ایک بیّن مثال اس کا سایہ ہے۔ ایک شخص کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ دائیں طرف جائے یا بائیں طرف۔ آگے کی طرف چلے یا پیچھے کی طرف۔ لیکن اُسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ اپنے سایے کا رُخ بھی اپنی مرضی کے مطابق متعین کر لے۔ اس کا رُخ فطرت کا قانون مقرر کرتا ہے جس کے بدلنے پر اس کو کوئی اختیار نہیں۔

خدا کا یہی قانون اس کی انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اُسے اس کا تو اختیار حاصل ہے کہ وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے یا ان کی خلاف ورزی کرے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ زندگی تو اقدار و قوانینِ خداوندی کے خلاف بسر کرے اور وہ تباہیاں جو اس خلاف ورزی کا نتیجہ ہوں، انہیں آنے نہ دے۔ روک لے۔ بالفاظِ دیگر اسے اپنے اعمال پر تو اختیار ہے، اعمال کے نتائج بدلنے پر نہیں۔

اقدارِ خداوندی پر ایمان نہ رکھنے والوں (سیکولرازم کے پیروکاروں) کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف کائناتی قوانین کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، اپنی داخلی زندگی سے متعلق قوانینِ خداوندی کو تسلیم نہیں کرتے۔

۱۳/۱۴ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

---

[1] یہ جوگیوں، سنیاسیوں کے "حبسِ دم" کے واقعات سامنے آتے ہیں یہاں اُن سے بحث مقصود نہیں، انسان کی عام زندگی کی مثال پیش کی جانی مقصود ہے۔

مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۤءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ
شُرَكَاۤءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

(ان کی اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ) اگر تم ان سے پوچھو کہ خارجی کائنات (زمین و آسمان) میں کس کا قانون کارفرما ہے، تو جس طرح تم کہتے ہو، یہ بھی کہہ دیں گے کہ وہاں اللہ ہی کا قانون نافذ العمل ہے (۲۳/۸۴-۹۰ ؛ ۲۹/۶۱-۶۳) ان سے کہو کہ پھر تم اپنی داخلی دنیا میں (اس کے قانون کو چھوڑ کر) دوسری قوتوں کو کیوں کارساز بناتے ہو جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ (دوسروں کے لیے تو ایک طرف) خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع اور نقصان کی قدرت نہیں رکھتیں — تم جب خدا کو "اِلٰهٌ السَّمَآءِ" مانتے ہو تو اُسے "اِلٰهٌ الْاَرْضِ" کیوں نہیں مانتے۔ (۶/۳ ؛ ۴۳/۸۴ ؛ ۲۱/۲۱-۲۲)

اِن دلائل کے بعد، ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اندھیرا اور اُجالا یکساں ہو جائے؟ (۱۱/۲۴ ؛ ۳۵/۱۹)

یا ان سے پوچھو کہ انہوں نے جن ہستیوں کو خدا کی کارسازی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے، کیا انہوں نے بھی خدا کی مخلوق کی طرح کوئی مخلوق پیدا کی ہے اور ان دونوں کی مخلوق ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے جس سے یہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ خدا یگانہ نہیں، اُس جیسے اور بھی ہیں۔

ان سے کہو کہ ان کا یہ خیال باطل ہے۔ ہر شے کا خالق صرف خدا ہے۔ وہ بے مثل اور یگانہ ہے اور تمام قوتوں کا واحد مالک اور سب پر غالب۔

مفہوم میں جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان پر غور کرنے سے حقائق اور بھی واضح ہو جائیں گے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن ہر شخص کے اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو ماننے کو ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ اس ایمان کو ایمان باللہ تسلیم کرتا ہے جو اُس خدا پر ہو جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث مطالبُ الفرقان جلد اوّل صفحہ پر گزر چکی ہے۔

کائنات میں خیر کے ساتھ شر بھی ہے۔ یعنی تعمیری قوتوں کے ساتھ تخریبی قوتیں بھی۔ جن مسائل حیات کا صحیح مفہوم

سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان غلط نگہی بلکہ گمرہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک اہم مسئلہ "خیر و شر" کا بھی ہے۔ اس سے جو اُلجھن پیدا ہوتی ہے اُسے فلسفہ کی زبان میں سینٹ تھامس کا معمّہ (ENIGMA) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اُلجھاؤ یہ ہے کہ اگر شر (EVIL) خدا کا پیدا کردہ ہے اور اس کی مرضی سے کارفرما رہتا ہے تو خدا خیرِ مطلق نہیں۔ اگر وہ خدا کی مرضی کے علی الرغم سرگرمِ عمل رہتا ہے تو خدا قادرِ مطلق نہیں۔ یہ اُلجھن خیر و شر کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

کائنات میں سلسلۂ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ نظریۂ ارتقاء کا ملخّص یہ ہے کہ زندگی جس پیکر یا جس مرحلہ میں بھی ہے اُس کا ٹکراؤ مخالف قوّت سے ہوتا ہے۔ اگر اس نوع میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیّت اور قوّت ہے تو وہ مخالف قوّت پر قابو پا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایسی قوت نہیں تو مخالف قوّت سے مغلوب ہو کر معدُوم ہو جاتی ہے اور اگر ایسا ہے کہ مخالف قوّت سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا تو وہ جامد ہو جاتی ہے۔

مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں کشمکشِ حق و باطل، نظریۂ ارتقاء، ابلیس یا شیطان کے عنوانات کے تابع اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مقامات کا مطالعہ اس سوال کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوگا۔ بانگِ درا میں ارتقاء کے عنوان سے علامہ اقبالؒ کی جو نظم درج ہے اس میں اس ٹکراؤ کی وضاحت بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز		چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی
حیات شُعلہ مزاج و غیور و شور انگیز		سرشت اُس کی ہے مشکل کشی، جفاطلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی		ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی!
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش		ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید		میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام		یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی

"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

قرآنِ کریم میں شر یا تخریبی قوّتوں کو ابلیس یا شیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (سابقہ جلدوں میں اس کی وضاحت بھی آچکی ہے)۔ عبرانی زبان میں شیطان کے معنی (HINDERER) کے ہیں۔ یعنی رکاوٹ پیدا کرنے والا۔ اس

میں ٹکراؤ اور تصادم کا مفہوم واضح ہے۔ ابلیس بھی اقبالؒ کا خاص موضوع ہے۔ وہ زندگی کے فروغ اور ارتقاء کے لیے اس تصادم کو اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ کہتے ہیں ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے　　　　که یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہ دراصل تصوّف کے مسلک پر تنقید ہے جس میں "نفس" کے فنا کر دینے کو مقصدِ حیات قرار دیا جاتا ہے۔

دوسری طرف وہ مومن بھی اُسے قرار دیتے ہیں جس میں ابلیس کے ساتھ ٹکر لینے اور اُسے مغلوب کرنے کی صلاحیت اور قوّت ہو۔ اقبالؒ کو موجودہ مسلمانوں کے خلاف شکایت یہ ہے کہ ان میں شر کی تخریبی قوتوں (باطل) کے ساتھ ٹکر لینے کی ہمت ہی نہیں۔ وہ اس حقیقت کو جاوید نامہ میں ایسے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ ابلیس بحضور ربُّ العزّت فریاد کرتا ہے کہ اگر تیری یہ مخلوق اس قدر دُوں ہمت، بُزدل اور کمزور تھی تو مجھے اس قدر بے پناہ قوّت دینے کی ضرورت کیا تھی! اخروٹ توڑنے کے لیے (ROAD ROLLER) تو درکار نہیں ہوتا! وہ کہتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ ؎

صَیدِ خود صیّاد را گوید بگیر　　　　الاماں از بندۂ فرماں پذیر!

اس کے بعد وہ کہتا ہے: ؎

آنچناں تنگ از فتوحاتِ آدمم　　　　پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم

یہ ہے مصافِ زندگی میں تصادم کی اہمیت۔ آپ انڈکس میں جنّت کا عنوان بھی دیکھیے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ جنّت کی راہ کس قدر صبر آزما، ہمّت طلب، لرزہ انگیز، خارہ شگاف تصادمات سے پٹی پڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قوتیں پیدا کیں اور انسان کو اس کی صلاحیت عطا کر دی کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کرے اور اس کا اختیار بھی کہ وہ انہیں جس مقصد کے لیے چاہے استعمال کرے۔ اگر وہ ان قوتوں کو (جن میں اس کی اپنی قوتیں بھی شامل ہیں) وحیِ خداوندی کی روشنی میں تعمیری مقاصد کے لیے صَرف کرتا ہے تو یہ قوتیں بھی خیر بن جاتی ہیں اور انسان کا یہ عمل بھی عملِ خیر۔ اس کے برعکس۔ اگر وہ انہیں تخریبی مقاصد کے لیے صرف کرتا ہے تو یہ قوتیں شر بن جاتی ہیں اور انسان کے یہ کام بھی شر۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس نے صرف قوتوں اور صلاحیتوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ انسان ہے جو انہیں شر بنا دیتا ہے۔ خدا نے وحی کی راہ نمائی مرحمت فرمائی جو سرتاسر خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے مومن کی زبان سے کہلوایا کہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ (۲۶/۳)۔ "تو خیر ہی خیر عطا کرتا ہے۔" شر ہم پیدا کر لیتے ہیں۔ میں نے اس نکتہ پر اپنی "لغات القرآن" میں بھی بحث کی ہے۔ مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ متعلقہ اقتباس یہاں درج کر دیا جائے۔

"سُورۃ الفلق" میں مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳/۲) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اُس کے شرّ سے حفاظت۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرّ (EVIL) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو (جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شرّ ہے نہ خیر۔ ہر چیز میں شرّ کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی۔ اس کے شرّ کے پہلو سے بچنا چاہیئے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آجائے تو شرّ ہو جائے گا۔ کائنات کی ہر قوت کو وحیٔ خداوندی کی روشنی میں صَرف اور استعمال کرنا، خیر ہے اور اسے انسانیت کی تخریب کے لیے استعمال کرنا شرّ"۔ (لغات القرآن۔ جلد دوم، صفحہ ۹۴۰)

ان تصریحات کی روشنی میں سورۃ الرّعد کی آیت ۱۳/۱۷ کی طرف آیئے۔

۱۳/۱۷ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ ﴿۱۷﴾

(اب رہی یہ بات کہ اگر کائنات میں سب کچھ اُسی کا پیدا کردہ ہے تو پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ یہاں صاف اور ستھرے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی ہے اور خوشگواریوں کے ساتھ ناخوشگواریاں بھی۔ خیر کے ساتھ شرّ بھی ہے اور حق کے ساتھ باطل بھی؟ ان سے کہو کہ یہ اس لیے ہے کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے۔ اور اس کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ) وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے تو ندی نالے، اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے، زمین کا میل کچیل جھاگ بن کر زمین کی سطح پر آجاتا ہے تو سیلاب کی رَو اسے بہا کرلے جاتی ہے (اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے)۔

یا یوں سمجھو کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے تاکہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں

بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ، جھاگ بن کر اوپر آجاتا ہے (اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے)۔

اسی طرح کائنات میں، خدا کے قانونِ کشمکش کے مطابق، تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ محو و ثبات۔ (۱۳/۳۹ ؛ ۲۱/۱۸ ؛ ۴۲/۲۴)

ان تصریحات کی روشنی میں جو پہلے پیش کی گئی ہیں، آیت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ (اس کو آیت ۱۳/۳۹ میں قانونِ محو و ثبات سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ ویسے بھی یہ آیت مطالبُ الفرقان، جلد سوم، صفحہ ۲۰۰ پر کشمکشِ حق و باطل کے ضمن میں آچکی ہے۔ مزید وضاحت وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن آیت کے آخر میں جو بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے وہ دین کا ملخص، اسلام کا منتہیٰ اور انسانی اعمال کے پرکھنے کی صادق ترین کسوٹی ہے۔ فرمایا کہ

بقا اس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسان کے لیے منفعت بخش ہے۔

جس قدر کوئی نظریہ، کوئی نظام، کوئی عمل نوعِ انسان کے لیے منفعت کا باعث ہے، اسی قدر اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ بقا اسی کے لیے ہے۔ یہ ایسی کسوٹی ہے جس سے پرکھ ہو جاتی ہے کہ انسان کے کون سے اعمال 'اعمالِ صالحہ، حسنات' باعثِ ثواب یعنی "نیک" ہیں۔ وہی جو دوسرے انسانوں کے لیے نفع بخش ہیں۔ بقا سے مراد یہ ہے کہ وہ اس زندگی میں بھی موجبِ بقا ہیں اور اگلی زندگی میں بھی باقی رہنے والے۔ اس قدر مختصر الفاظ میں ایسا بلند اصول قرآن ہی پیش کر سکتا تھا۔

پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کہا ہے۔ یعنی وہ کام جو کسی خاندان، خاص قبیلہ، خاص برادری، حتیٰ کہ کسی خاص قوم کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ جو عالمگیر انسانیت کے لیے نفع بخش ہو۔

یہ ہے دین کا مقصود و مدعا۔ یہ ہے اسلام کا مطلوب و منتہیٰ۔ یہ ہے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت اور یہ ہے اسلامی مملکت کی تشکیل کی وجہِ جواز۔ یہ ہے امتِ مسلمہ کی بعثت کی غرض و غایت۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۱۰) تم وہ امتِ خیر بدست ہو جسے نوعِ انسان کی منفعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیا انسانوں کا وضع کردہ کوئی نظام اس مقامِ بلند کو چھو بھی سکتا ہے؟ اور کیا کوئی اور نظام امنِ عالم کا ضامن ہو سکتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ عظیم کے اس عالمگیر زریں اصول کو ہر ایوانِ حکومت کے دروازے پر منقوش اور ہر محرابِ مسجد پر کندہ ہونا چاہیے۔ مغربی سیاست دانوں نے قانونِ ارتقاء "بقاء للاصلح" بنایا تھا مگر قرآن نے وہ اصول "بقاء للانفع" بنایا۔ اصلح اپنی ذات کے لیے ہے۔ انفع عالمگیر انسانیت کے لیے۔ ع

عقلِ خود بیں دیگر و عقلِ جہاں بیں دیگر است

حق و باطل کی کشمکش کا یہی اصول قوموں میں بھی کارفرما ہے۔ اس تقسیم کے اعتبار سے، گروہ دنیا میں دو ہی رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کے مسلک پر کاربند ہو، دوسرا وہ جو اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔

۱۳/۱۸ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾

اس طرح خدا، مثالوں کے ذریعے بات واضح کر دیتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو خدا کی دعوت پر نہایت حسن کارانہ انداز سے لبیک کہتے ہیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جس دعوت کو لے کر وہ اُٹھے ہیں اس میں کس طرح تخریبی قوتوں سے تصادم ہوگا اور بالآخر کس طرح حق کی کامیابی ہوگی۔

باقی رہے وہ لوگ جو اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے (بلکہ اس کی مخالفت کرتے ہیں، تو ان سے کہہ دو کہ قانونِ خداوندی کی رو سے ان کی تباہی یقینی ہے۔ آج تو اُن کے لیے موقعہ ہے کہ وہ اس دعوت کو تسلیم کر کے اس تباہی سے بچ جائیں۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو اس وقت) اگر ایسا ہو کہ ان کے پاس تمام رُوئے زمین کی دولت ہو اور اس کے ساتھ اتنی ہی دولت اور جمع ہو جائے اور وہ چاہیں کہ اس تمام دولت کو دے کر اس تباہی سے بچ جائیں تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ان کے اعمال کا حساب، اُن کے حق میں بہت بُرا ہوگا اور ان کا ٹھکانا تباہیوں کا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

یہ دو گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۱۳/۱۹ أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

ذرا سوچو کہ ایک شخص وہ ہے جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ حق

ہے اور دوسرا وہ ہے جو اس حقیقت کی طرف سے بالکل اندھا ہے۔ کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟

لیکن ان مثالوں سے انہی لوگوں کے سامنے حقیقت آسکتی ہے جو عقل و دانش سے کام لیں۔

لیکن وہ عقل نہیں جو "سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر"۔ اقبالؒ، اس عقل کو جو انفرادی مفاد کے حصول کے لیے کوشاں اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے ساعی ہو، "عقلِ خود بیں" کہہ کر پکارتا ہے اور اس عقل کو جو ماینفع الناس کی علمبردار ہو، "عقلِ جہاں بیں"، اسی عقل کے حامل ہیں جن کی قرآن ان الفاظ میں خصوصیت بیان کرتا ہے۔

۱۳/۲۰ اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

وہ عقل و دانش نہیں جو جذبات کے تابع جبلتی اور انفرادی مفاد پرستیوں کی راہیں دکھاتی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی عقل و دانش جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ سے باندھ رکھا ہے (۹/۱۱۱) اور اپنے اقرار کو کبھی نہیں توڑتے۔

اس کے ساتھ:

۱۳/۲۱ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

جو انسانیت کے ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا (۲/۲۷)۔ اس لیے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔

یہاں ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ "انہیں ملاتے ہیں جنہیں بلانے کا خدا نے حکم دیا ہے"۔ سورۃ البقرہ میں (اس کے برعکس) فاسقین اور مفسدین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ انہیں توڑتے ہیں جنہیں جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے (۲/۲۷) نیز (۱۳/۲۵)۔ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ کی آیت (۲/۲۱۳)، اور سورۃ یونس کی آیت (۱۰/۱۹) میں کر دی گئی۔ مطالب الفرقان جلد سوم (ص ۲۰۰ پر) دیکھیے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ منشاء خداوندی تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں منسوط کرنا ہے۔ ابتداءً تمام انسان ایک اُمت، ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے تو یہ مختلف قبائل اور مختلف اقوام اور پھر ایک قوم کے اندر مختلف ذاتوں، برادریوں یا مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کی شکل میں بٹ گئے۔ وحیٔ خداوندی کا مقصود، نوعِ انسان کے ان تمام تفرقات کو مٹا کر پھر سے ایک عالمگیر برادری کی شکل میں امتِ واحدہ بنانا تھا۔ اس کی ابتداء اس قوم (جماعتِ مومنین) سے کی گئی جسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا فریضہ تھا کہ وہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر کے، عالمِ انسانیت کو اس دائرے کے اندر سمولے۔ یہی اسلام کا منتہیٰ اور دین کی غایت تھی۔

لیکن اس اُمّت نے کیا کیا؟ بجائے اس کے کہ نوعِ انسان کے اختلافات ختم کر کے انہیں ایک عالمگیر برادری کی شکل دیتی، خود ہی مختلف قوموں، فرقوں، برادریوں، پارٹیوں میں بٹ گئی اور جس جہنّم میں غیر مسلم عذاب کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس کو خود اپنے اوپر وارد کر لیا۔ آپ انڈکس میں فرقہ، تفرقہ جیسے عنوانات دیکھئے۔ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ سو جو قوم خود شرک میں مبتلا ہو وہ وحدتِ انسانیت کی علمبردار کیسے بن سکتی ہے؟ یاد رکھئے، اسلام، انسانیت کے رشتوں کو جوڑنے کا نام ہے، توڑنے کا نہیں۔ بلالحاظ رنگ، نسل، زبان، وطن، صرف ایمان کے اشتراک سے ایک عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل۔ اس سے انسان اس عذاب سے نجات حاصل کر سکے گا جس میں وہ بُری طرح ماخوذ ہے۔

لیکن اقوامِ عالم اپنے گروہ بندانہ مفادات کو آسانی سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوگی جس کی راہ میں بڑے بڑے صبر آزما مراحل آئیں گے۔ اس لیے یہ مسافت بڑے ثبات و استقامت کی متقاضی ہوگی۔ موجودہ مسلمان اگر اس منشاء خداوندی کو پُورا کرنا چاہیں گے تو انہیں سب سے پہلے اپنے ہاں کی مذہبی فرقہ بندی کو ختم کر کے، خود اُمّتِ واحدہ بننا ہوگا۔ پھر مسلمان ممالک اور اقوام کو حبل اللہ (قرآن) کے رشتے میں پرو کر اُمّتِ مسلمہ میں وحدت پیدا کرنا ہوگی۔ اس کے بعد عالمگیر انسانیت کی وحدت کا مرحلہ آئے گا۔ اس کا عملی پروگرام — نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ انفاق (نظامِ ربوبیت) کا قیام ہے۔ (انڈکس میں صلوٰۃ۔ انفاق۔ ربوبیّت۔ رزق وغیرہ کے عنوانات بھی دیکھیئے۔)

۱۳/۲۲ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

جو اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے، جو اُن کے پروردگار نے اُن کے لیے متعیّن کر رکھا ہے، نہایت ثبات و استقامت سے سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور نظامِ صلوٰۃ متشکل کرتے ہیں اور جو سامانِ نشو و نما انہیں دیا جاتا ہے — خواہ ان کی مضمر صلاحیتیں ہوں یا محسوس سامانِ زیست — اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لیے، حسبِ ضرورت خفیہ یا اعلانیہ صَرف کرتے ہیں اور یوں، معاشرہ کی ناہمواریوں کو، اپنے حسنِ عمل سے دور کرتے ہیں (۲۸/۵۴، ۱۱/۱۱۴) یہی وہ لوگ ہیں جن کا انجام نہایت خوشگوار ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس امت سے اس پروگرام کی ابتداء کرنے کو کہا جا رہا ہے اس میں تو خود صدہا

خرابیاں ہیں۔ پہلے ان کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کا طریقہ قرآنِ حکیم نے خود ہی بتا دیا ہے۔ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔ یعنی تخریبی کاموں کے نقصانات کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں۔ یہ ایک عظیم اصول ہے۔ اس کا مفہوم توبہ کے عنوان سے بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی واضح تشریح سورۃ ھُود کی آیت (۱۱/۱۱۴) میں ملے گی جہاں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) حسنات، سیئات کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ برائیوں کا ازالہ اچھائیوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ افراد ہی نہیں بلکہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے بھی یہ اصول اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ہیں وہ لوگ جن کا انجام نہایت خوشگوار رہے۔

(۱۳ — ۲۳—۲۴) جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اِس گھر (دنیاوی زندگی) کا انجام نہایت اچھا ہے۔ یعنی جنّتی معاشرہ جس میں وہ داخل ہوں گے — وہ بھی اور اُن کے ماں باپ۔ بیویاں اور اولاد بھی، بشرطیکہ اُن کے اعمال صالح ہوں جن سے وہ اس زندگی کے اہل قرار پا چکے ہوں اور ان پر چاروں طرف سے ملائکہ کا نزول ہوگا۔ (۴۱/۳۰)

جو یہ خوشخبریاں لیتے آئیں گے کہ تمہارے لیے ہر طرح امن اور سلامتی ہے۔ اس لیے کہ تم نے نہایت استقامت اور استقلال سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ سو دیکھو کہ اس جدوجہد کے بعد، تمہاری زندگی کا انجام کیسا خوشگوار رہا۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ جنّتیوں کے رشتے دار (ماں باپ۔ بیوی بچے) محض اُن کے رشتہ دار ہونے کی بنا پر جنّت میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ان کے اعمال صالح ہوں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے کسی بڑے سے بڑے کے ساتھ بھی رشتہ داری کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ فیصلہ ہر ایک کے اپنے ذاتی اعمال کی رُو سے ہوگا۔ مَوَدَّةً فِي الْقُرْبٰى (۴۲/۲۳) کے متعلق تفصیلی بحث مطالبُ الفرقان، جلد پنجم (صفحہ ۶۷-۶۸) میں گزر چکی ہے۔ سورۃ ھُود میں دیکھیے۔ ہر رسول نے اپنی دعوت کا آغاز اس اعلان کے ساتھ کیا تھا کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۱۱/۲۹ وغیرہ) میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا۔ اس کا اعادہ متعدد دیگر مقامات میں بھی کیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ بلا اجر کی اہمیت اس قدر ہے کہ کہا گیا۔ اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶/۲۱) جو لوگ راہِ راست پر ہوں اور تم سے کوئی اجر بھی نہ مانگتے ہوں، ان کا اتباع کرو۔

مومنین پر نزولِ ملائکہ کے متعلق دیکھئے (۴۱/۳۰)
اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو ان کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

۱۳/۲۵ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

ان کے برعکس، وہ لوگ ہیں جو اس عہد کو جو انہوں نے خدا کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا تھا، توڑ ڈالتے ہیں اور انسانیت کے جن رشتوں کو جوڑنے کا اُس نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں (۲/۲۷؛ ۲/۱۳) اور اس طرح دنیا میں فساد اور ناہمواریاں برپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کا انجام بڑا ہی خراب ہوتا ہے۔

چونکہ یہ ضد ہے پہلی روشِ زندگی کی، اس لیے اس کی الگ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم کا یہ عام انداز ہے کہ وہ اضداد کے تقابل سے اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہے اور یہ انداز بڑا بلیغ بھی ہوتا ہے اور مؤثر بھی۔ بقول غالبؔ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا ہو نہیں سکتی!

اُوپر کہا گیا ہے کہ جو لوگ مشیّت کے پروگرام کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا انجام تباہ کُن ہوتا ہے۔ اس پر عام طور پر ذہنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے متموّل اور خوشحال ہوتے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

۱۳/۲۶ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

یاد رکھو! دنیا میں سامانِ معیشت خدا کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ جو فراواں لینا چاہے اور (اس کے لیے کوشش کرے تو اسے) فراواں مِل جائے گا۔ جو نپا تُلا لینا چاہے اُسے نپا تُلا ملے گا۔ (یہ سب خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتا ہے۔ جو شخص، اس قانون کے مطابق کھیتی میں زیادہ محنت کرتا ہے اس کی فصل اچھی ہوتی ہے (۱۷/۱۸-۲۱)۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانیت کے رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں، ان کا انجام خراب ہوتا ہے۔ تو یہ وہ لوگ

ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ اسی دنیا کے مفاد کو نصب العین قرار دے لیتے ہیں اور اسی میں مگن رہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اگر انسان کا مستقبل (اُخروی زندگی) تاریک رہے تو اس زندگی کی خوشحالی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ (۲/۲۰۰-۲۰۱)

دنیا اور آخرت کی خوشگواریوں کا تقابل قرآن حکیم کا اہم موضوع ہے اور ہم نے مختلف مقامات پر اس کی تشریح کی ہے۔ مثلاً مطالبُ الفرقان جلد سوم (صفحہ ۲۵۴) اور وہاں دیئے گئے دیگر حوالے۔ علاوہ ازیں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۱۸-۲۱) میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ان مقامات میں اس اصول کو سامنے لایا گیا ہے کہ جہاں تک طبعی زندگی کے مفادات کا تعلق ہے، جو شخص بھی طبعی قوانینِ کائنات کے مطابق کوشش کرے گا اُسے اس کا ثمر مل جائے گا۔ اس میں مؤمن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ یہ تمیز اس مقام پر سامنے آتی ہے جہاں ان ثمرات اور مفادات کے استعمال کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اگر ان کا استعمال اقدار و اصولِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ اس دنیا میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اگر ان کا استعمال ان کے خلاف ہوتا ہے تو یہ دنیا بھی جہنم بن جاتی ہے۔ اور اُخروی زندگی کا جہنم تو بہرحال موجود ہی ہے۔

قرآن حکیم اپنے دعاوی کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور کیا جائے اور ان کی صداقت کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لیکن انسانیت کے بچپن کا ذہن (اور انسانوں کی معتد بہ اکثریت ہنوز عہدِ طفولیت ہی میں زندگی بسر کر رہی ہے) عجائبات اور فوق الفطرت طلسمات کا خوگر ہے۔ اس لیے وہ حضرات انبیاء کرامؑ کے دعاوی کے جواب میں ان سے معجزات کا مطالبہ کرتا چلا آیا ہے۔ عہدِ نبی اکرمؐ میں بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ مخاطبین نے معجزات کا مطالبہ کیا اور لسانِ وحی نے اس سے انکار کرتے ہوئے بتایا کہ اس انکار اور استرداد کی وجہ کیا ہے۔ آپ انڈکس میں "معجزات" کا عنوان دیکھئے۔ متعدد مقامات آپ کے سامنے آجائیں گے۔ اس سورۃ میں چند صفحات پہلے، آیت (۱۳/۷) کے تحت بھی یہ بحث آچکی ہے۔ یہاں پھر اس اعتراض کو سامنے لایا گیا ہے۔

۱۳/۲۷ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿٢٧﴾

(اب پھر اُسی اعتراض کی طرف آؤ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے (۱۳/۷) یعنی) یہ لوگ جو اس ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس رسول کو اس کے نشو ونما دینے والے کی طرف سے کوئی (محسوس) نشان (معجزہ) کیوں نہ ملا؟

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ غلط اور صحیح راستہ پر چلنا انسان کے اختیار وارادے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو شخص غلط راستے پر چلنا چاہے گا، قانونِ خداوندی اُسے غلط راستے پر چلنے دے گا۔ اُسے اُس راستے سے موڑ کر زبردستی صحیح راستے کی طرف نہیں لائے گا۔ اور جو شخص صحیح راستے کی طرف رجوع کرے گا اُسے خدا کا قانون صحیح راستے پر چلنے دے گا (یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت پیش کی جاتی ہے تاکہ ہر شخص اپنے دل کے پورے اطمینان سے اسے تسلیم کرے۔ اس پر کسی قسم کی زبردستی نہ ہو۔ نہ جسمانی اکراہ، نہ ذہنی)۔

اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھئے۔ وہیں سے "مَنْ یَّشَآءُ" کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ زیرِ نظر آیت کا مطلب مفہوم سے واضح ہے۔

تقدیر کے عقیدہ سے انسان کو ایک جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جب یہ عقیدہ راسخ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں ہماری بہتری ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ ہمیں بہرحال راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان عقاید کی رُو سے انسان کو جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے لیکن قرآن اس قسم کے فریبِ نفس کو زائل کر کے بتاتا ہے کہ حقیقی اطمینان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۳/۲۸ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

یہی وہ خدا کا قانون ہے جس سے ذہنی اور قلبی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس قسم کے اطمینان کے بغیر ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایمان انہی کا ہے جو اس طرح، بطیبِ خاطر، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، حقیقت کو تسلیم کریں۔

پھر سُن لو کہ صحیح اطمینانِ قلب، خدا کے اس قانون کی رُو سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (یعنی انسان کے اختیار وارادے پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو اور وہ بطیبِ خاطر، اعترافِ حقیقت کرے)

"ذکر" کا مفہوم سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ ملخص اس کا یہ ہے کہ پیش آمدہ معاملہ کے فیصلہ کے لیے قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو سامنے رکھنا اور ان کے مطابق عمل کرنا **ذکر اللہ** ہے۔ ذکر کے اس مفہوم کا عام کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ تصوّف نے اسے ایسے غلط معانی پہنا رکھے ہیں جو اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف ہیں۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی تائید خود قرآنِ کریم کی اگلی آیت سے ہو جاتی ہے۔ فرمایا:

۱۳/۲۹ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوۡبٰی لَہُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

جو لوگ اس طرح ایمان لائیں اور اس کے بعد خدا کے متعیّن کردہ پروگرام کے مطابق ایسے کام کریں جن سے، ان کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور انسانیت کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں، ان کے لیے ہر قسم کی خوشگواریاں ہیں اور نہایت حسین و متوازن مقامِ زیست ہے۔ (۳/۱۴)

طوبیٰ کا مادہ (ط۔ ی۔ ب) ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدگی۔ دائمی خوشحالی اور خوش بختی کی زندگی۔ دنیا اور آخرت کی بکثرت خوشگواریاں۔ ہمارے شاعروں نے اسے جو معنی پہنائے ہیں وہ شاعرانہ مضمون آفرینی سے زیادہ کچھ نہیں۔ طیّب کی طرح طوبیٰ بھی ایسا جامع لفظ ہے جس میں دنیا اور آخرت کی تمام خوشگواریاں سمٹ کر آگئی ہیں۔ جن کے لیے خدا طوبیٰ لہم کہہ دے انہیں اور کیا چاہیئے ؎

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اِس دُعا کے بعد

اس کے بعد کہا کہ جو کچھ اس قرآن میں کہا جا رہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی رسول آتے رہے۔ اور خدا کی وحی لوگوں تک پہنچاتے رہے اور اُن لوگوں نے بھی اسی طرح پیغاماتِ خداوندی کی مخالفت کی جس طرح "اے رسول! تیری قوم اس کی مخالفت کر رہی ہے۔"

۱۳/۳۰ کَذٰلِکَ اَرۡسَلۡنٰکَ فِیۡۤ اُمَّۃٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہَاۤ اُمَمٌ لِّتَتۡلُوَا عَلَیۡہِمُ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ ؕ قُلۡ ہُوَ رَبِّیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ اِلَیۡہِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

اے رسول! ہم نے تجھے اس قوم کی طرف اسی طرح رسول بنا کر بھیجا ہے جس طرح ان سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف

رسول بھیجے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں تو ان کے سامنے پیش کر دے (۵/۴۲)۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خدائے رحمٰن کو نہیں مانتے۔ تم، اُن سے کہہ دو کہ وہ میرا نشوونما دینے والا ہے اور اس کے سوا کائنات میں کسی کا اختیار و اقتدار نہیں۔ میرا سارا بھروسہ اسی کے قوانین کی محکمیت اور نتیجہ خیزی پر ہے اور اسی لیے میں، ہر معاملہ میں، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

پھر عنانِ توجہ معجزات کے موضوع کی طرف موڑ دی۔ فرمایا:

(۱۳/۳۱) وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳۱)

(ان لوگوں کی طرف سے جو محسوس معجزات کا مطالبہ ہوتا ہے (۱۲/۲) تو اس سے خود تمہاری جماعت کے بعض افراد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو یہ سب ایمان لے آئیں اور یہ بہت اچھا ہو۔ ان سے کہہ دو کہ) اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگ جاتے اور زمین کی دور دراز مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے ہو جاتیں، حتیٰ کہ اس سے مردے بھی بولنے لگ جاتے (تو یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ ۶/۷؛ ۶/۲۵؛ ۶/۱۱۲؛ ۱۵/۱۴-۱۵؛ ۱۷/۹۰-۹۳) یہی وجہ ہے کہ خدا نے تمام امور کو اپنے (قوانین کے) تابع رکھا ہے اور اس باب میں قانون یہ ہے کہ جو ہدایت حاصل کرنا چاہے وہ عقل و فکر سے کام لے ۱۰/۱۰۰)

کیا اب بھی تمہاری جماعت کے لوگ (مؤمنین) اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر لوگوں کو زبردستی مؤمن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہ تھا (کہ وہ لوگوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا) کہ سب صحیح راستے پر چلتے۔ (لیکن اس نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو انسان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑا ہے۔ لہٰذا) جو لوگ اس دعوت سے انکار کر رہے ہیں وہ سرکشی کی راہ اختیار کیے رہیں گے (اور اس کی مخالفت میں میدانِ جنگ تک میں اُتر آئیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) ان پر ان کی کرتوتوں کی وجہ سے آفتیں آتی رہیں گی اور یہ

سلسلہ یہاں تک بڑھے گا کہ جنگ کی مصیبت خود ان کے گھر (مکّہ) کے قریب نازل ہو جائے گی — (یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا) تا آنکہ یہ کشمکش فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ جائے گی (اور انہیں آخری شکست ہو جائے گی)۔ ایسا ہو کر رہے گا

کیونکہ خدا کا قانون اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہے۔ اس کے وعدے پورے ہو کر رہتے ہیں۔

یہ سوال، کہ اگر دین کو زبردستی منوانا مقصودِ خداوندی ہوتا تو وہ انسان کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ سب انسان پیدائشی طور پر اسی دین پر ہوتے، متعدد مقامات میں آچکا ہے۔ مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۳۰۹-۳۱۲، اور جلد پنجم صـ۲۳ بالخصوص دیکھئے۔

اَفَلَمْ یَایْئَسِ میں یَایْئَسِ کا مادہ (ی۔ ء۔ س) ہے جس کے عمومی معنی یاس اور نا اُمیدی کے ہیں لیکن لغت میں اس کے معنی اَفَلَمْ یَعْلَمْ بھی دیئے گئے ہیں۔ یعنی "کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا؟" زیرِ نظر آیت میں یہی معنی موزوں اور مفہوم کے مطابق ہیں۔ (دیکھئے۔ لغات القرآن۔ مادہ (ی۔ ء۔ س) صـ۱۷۸۲)۔

اس کشمکش کا آخری مرحلہ کیا ہوگا، فرمایا۔

۱۳/۳۲ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

(یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوگا۔ اور اس دوران میں، یہ لوگ تمہاری باتوں کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔ لیکن تم اس سے دل برداشتہ نہ ہونا) اس قسم کا استہزاء تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے۔ ان لوگوں کو بھی ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق مُہلت کا وقفہ ملتا رہا۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی غلط روش سے باز نہ آئے تو ان کی گرفت ہوئی۔ (اُس وقت انہیں معلوم ہوا کہ) اُن کے اعمال کے نتائج کس طرح ان کا پیچھا کر رہے تھے اور ہماری عقوبت کیسی سخت ہوتی ہے۔

خُدا کے رسولوں اور اس کی آیات سے استہزاء بھی متعدد مقامات میں آیا ہے۔ (انڈکس دیکھئے) یہ دنایت کی آخری حد ہوتی ہے۔

قرآن کی بنیادی تعلیم "الٰـہ واحد" ہے۔ یعنی تمام قوتوں کا مالک ایک خُدا۔ ذہن خداوندی اپنے عہدِ طفولیت میں اسے بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ عظیم تصوّر اس کے ذہن میں سما نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مختلف

قوتوں کے لیے مختلف اِلٰہ (خدا) وضع کر رکھے تھے۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ قرآن نے کس کس انداز سے اور کیسے کیسے پیرایہ میں اس کی تردید کی ہے، اس کے لیے انڈکس میں شرک کا عنوان دیکھئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے۔

۱۳/۳۳ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

(ان سے کہو کہ ذرا اس پر غور کرو کہ) جس خدا کے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری اور خبر رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر فرد کے اعمال پر اس طرح نگاہ رکھتا ہے، کیا وہ (اپنی مدد کے لیے ان کا محتاج ہو سکتا ہے) جنہیں یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟ ان سے کہو کہ (خدا کے علم کی وسعتوں کے متعلق تو تمہیں بتا دیا گیا ہے۔ اب تم جن ہستیوں کو اس کا شریک قرار دیتے ہو ذرا) ان کے علم کی تفصیلات بھی بیان کرو تاکہ پتہ چلے کہ روئے زمین پر کون سی بات ایسی ہے جو خدا کے احاطۂ علم سے باہر رہ گئی ہے اور اس کی خبر تم ان شرکاء کے ذریعے خدا کو دینا چاہتے ہو۔ اُن شرکاء کے ذریعے جو کچھ بھی نہیں جانتے۔

یا کیا یہ بات ہے کہ تم نے ان امور کی گہرائیوں میں اتر کر کبھی غور نہیں کیا۔ محض سطحی طور پر (جو سنتے آئے وہی دُہرا دیا)۔

(حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس، ان کے دعوٰی کی صداقت کی دلیل کوئی نہیں۔ یہ محض جذبات سے کام لیتے ہیں جن کی وجہ سے) انہیں اپنی تدابیر بڑی خوش آیند دکھائی دیتی ہیں اور اسی سے یہ صحیح راستے کی طرف آنے سے رُک گئے ہیں۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں اور اپنے جذبات کی رَو میں بہہ جائیں، وہ کبھی صحیح راستے کی طرف نہیں آ سکتے۔ سو جو لوگ اس طرح غلط راستہ اختیار کر لیں، انہیں کون صحیح راستہ دکھا سکتا ہے۔

اس میں شرک کے ایک گوشے کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ اس لیے معبود تراشتے ہیں تاکہ وہ ان کی بات خدا تک پہنچا دیں (۔) ہم (مسلمان) جب اس قسم کی آیات پڑھتے ہیں تو ہماری نگاہیں مشرکین کے عقاید، ان کے دیوی دیوتاؤں، ان کی عبادت گاہوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہم کبھی اپنے گھر کی طرف جھانک کر نہیں دیکھتے۔ ہم

کس طرح "حضرت صاحبان" کی بارگاہوں میں حاضر ہو کر گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں کہ یا حضرت! ہمارے لیے خدا سے دعا کیجئے۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نہ ہمارے احوال سے واقف ہے نہ ہماری بات براہِ راست سُنتا ہے۔ یہ بزرگ خدا کے مقرب ہیں۔ یہ ہماری بات خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیا یہ وہی شرک نہیں جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے؟ چونکہ ہم اس موضوع پر شرک اور دعا کے عنوانات کے تحت بہت کچھ لکھ چکے ہیں (اور میری کتاب۔ تصوّف کی حقیقت ــــ اس موضوع پر مستقل تصنیف ہے) اس لیے یہاں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ــــ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوگا؟ فرمایا:

۱۳/۳۴ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ان کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان پر اس دنیا کی زندگی میں بھی تباہی آئے گی اور آخرت کی تباہی اس سے بھی زیادہ جگر پاش ہوگی۔ انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

قرآن کریم اس حقیقت کو بار بار دُہراتا ہے کہ غلط روشِ زندگی کا تباہ کن عذاب اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے (اور اس طرح صحیح طرزِ زندگی کی خوشگواریاں بھی) بالفاظِ دیگر جنّت اور جہنّم کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے اور مسلسل اُخروی زندگی تک چلتا ہے۔ انڈکس میں جنّت اور جہنّم کے عنوانات دیکھئے۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آجائے گی۔ زیرِ نظر آیت میں دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب کا ذکر آگیا ہے۔

یہ تو تھا جہنّم۔ اس کے برعکس جنّت:

۱۳/۳۵ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

(ان کے برعکس، صحیح راستے پر چلنے والوں کے لیے جنّت کی زندگی ہوگی)، اس جنّت کی مثال یوں سمجھو کہ، ایک باغ ہے جس میں پانی کی ندیاں جاری ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ اس کے پھل وقتی نہیں دائمی ہیں اور اس کی آسائش پائدار (۱۳/۳۵ ; ۴۷/۱۵)۔ اس قسم کا مآلِ زندگی ہوگا ان لوگوں کا جو غلط روش سے بچ کر، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ ان کے برعکس، جو لوگ اِن قوانین سے انکار کریں گے ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا۔

بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو تمثیلی انداز ہی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اُخروی زندگی کی ہر حقیقت ماوراء الطبیعات ہے اس لیے قرآنِ کریم نے اسے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان حقائق کو مادی اور محسوس نہیں سمجھنا چاہیئے۔ تمثیلات سے ان کا ایک تصور ذہن میں آ سکتا ہے۔ وہ درحقیقت ہیں کیا، اسے ہم اپنے تصور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔

جیسا کہ متعدد مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے، قرآنِ کریم قوموں کی اس دنیا کی زندگی کو بھی جنّت اور جہنّم سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کا بیان بھی درحقیقت تمثیلی اور تشبیہی ہی ہے۔ (مثلاً) وہ "دودھ کی نہریں اور شہد کی ندیاں" کہتا ہے تو اس سے مراد سچ مچ کی ندیاں اور نہریں نہیں ہوتیں بلکہ اس کا مطلب بکثرت اور بافراط ہوتا ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ "وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں"۔ سو جنّت اور جہنّم اُخروی زندگی کے ہوں یا اس دنیا کے، ان کے بیانات کو تمثیلی سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تمثیلات و تشبیہات وہی ہو سکتی تھیں جو زمانۂ نزولِ قرآن کی مخاطب قوم (عربوں) کی سمجھ میں آجائیں۔ وہ ایران اور روم کی تہذیب و تمدّن اور وہاں کی معاشرتی آسائشوں اور آرائشوں کو (IDEAL) سمجھتے تھے۔ اس لیے قرآن میں مثالیں بھی بیشتر انہی کے معاشرہ کی دی گئی ہیں۔ اس موضوع پر اس سے پیشتر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اس لیے یہاں ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد اوّل ص۱۴۳؛ ص۱۹۵؛ ص۲۳۲۔ وہاں زیرِ نظر آیت بھی آ گئی ہے۔)

جنّت کی زندگی قرآنِ کریم کے اتباع سے ملتی ہے۔ سورۃ یونسؑ کی آیت ۱۰/۵۸) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ وہ ایسی نعمتِ بے بہا کے ملنے پر جشنِ مسرت منائیں یہاں اسی کا اعادہ کیا گیا جو فرمایا کہ:

۱۳/۳۶ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

جن لوگوں کو ہم نے اس قسم کا ضابطۂ ہدایت دیا ہے (جس پر عمل پیرا ہونے کے نتائج ایسے خوشگوار ہیں) وہ ہر اس بات پر جو تیری طرف نازل کی جاتی ہے جشنِ مسرت مناتے ہیں۔ باقی رہیں دوسری جماعتیں، سو ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن پر بعض احکام بہت ناگوار گزرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ (تمہیں خوش لگے یا ناگوار گزرے) مجھے تو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف اللہ کی اطاعت اور محکومیت اختیار کروں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں

اسی مسلک کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف خود بھی رجوع کرتا ہوں۔

یہاں جو کہا گیا کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض حصے سے انکار کرتے ہیں یا وہ احکام انہیں ناگوار گزرتے ہیں تو اس کی تفصیل سورۃ بقرہ۔آیت (۸۵/۲) میں گزر چکی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ اس روش کا نتیجہ دنیا میں ذلت اور خواری کی زندگی اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا۔ اسلام یہ ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس میں کسی اور اتھارٹی کو شریک نہ کیا جائے۔ قرآن اسی مقصد کے لیے نازل کیا گیا ہے۔

۱۳/۳۷ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

اور اسی مقصد کے لیے ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نہایت واضح طور پر نازل کیا ہے۔ اے مخاطب! اگر تو اس علم و حقیقت کے پالینے کے بعد بھی، ان راہ گم کردہ لوگوں کے خیالات کا اتباع کرے تو یہ سمجھ لے کہ قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی دوست اور کارساز ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی گرفت سے تجھے کوئی بچا سکتا ہے۔

اس کے بعد مخاطبین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ یہ رسول، عام انسانوں جیسا انسان کیوں ہے؟ فرمایا کہ یہ بات اس رسول کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ تمہارے (اہلِ کتاب) کے ہاں بھی تو رسول آتے رہے ہیں۔ وہ بھی عام انسانوں جیسے انسان ہی ہوتے تھے (دیکھیے۔ انڈکس میں عنوان رسولؐ) خدا کے ہاں فیصلے قانون کی رُو سے ہوتے ہیں۔ رسولوں کی بشریت یا فوق البشریت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۳/۳۸ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

(باقی رہا ان کا یہ اعتراض کہ انہی جیسا ایک انسان کس طرح رسول بنا دیا گیا تو ان سے کہہ دو کہ) ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے تھے (وہ بھی تمہاری طرح انسان ہی تھے اور) ان کے بیوی بچے بھی تھے۔

اس کے بعد ان کے اس تقاضا کی طرف آؤ کہ جس تباہی کا تم بار بار ذکر کرتے ہو، وہ آتی کیوں نہیں۔ تو ان سے کہہ دو کہ) یہ بات کسی رسول کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ اس قسم کی کھلی نشانی کو جب جی چاہے اپنی مرضی کے

مطابق لے آئے۔ یہ چیزیں اللہ کے قانون کے مطابق، اپنے وقت پر ظہور میں آتی ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجے کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفہ کو میعاد یا اجَل کہتے ہیں۔ یہ اجَل ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یعنی اس بات کے لیے قانون مقرر ہے کہ ایک عمل اپنے نتیجہ خیز ہونے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ اس طرح قوموں کی بھی اجَل ہے (۴۹/۴)

اس میں اسم نکرہ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ہے۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد پنجم (ص۱۸۹) میں آچکی ہے۔ نیز جلد چہارم ص۲۵۳۔ اس سلسلہ میں عنوان ـ قوم یا اقوام بھی دیکھیے، جہاں قوموں کے عروج وزوال اور استبدال واستخلاف سے متعلق قوانین کا ذکر آیا ہے۔ اس کو "قانونِ محو وثبات" بھی کہا جاتا ہے۔

۱۳/۳۹ يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُ ۖۚ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

جو قوم، نظریۂ زندگی، یا نظامِ حیات اس قابل نہیں ہوتا کہ باقی رہے، وہ خدا کے قانون کے مطابق مٹا دیا جاتا ہے اور جو اپنے آپ کو، قانونِ خداوندی کے مطابق، محکم اور استوار ثابت کر دیتا ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے (۱۳/۱۷، ۴۴/۴۲)

یہ سب کچھ اُن اصولی قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو تخلیقِ کائنات کے ساتھ، اللہ نے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے مطابق اس کا نظم ونسق چل رہا ہے۔

قانونِ محو وثبات ایک عظیم حقیقت ہے۔ سلسلۂ ارتقاء اس قانون کے مطابق جاری وساری رہا ہے (اور ہے)۔ جس نوع میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ رہی، وہ مٹ گئی۔ جس میں اس کی صلاحیت تھی، وہ باقی رہی۔ قوموں کی موت وحیات کا فیصلہ بھی اسی قانون کی رُو سے ہوتا ہے۔

سورۃ شوریٰ کی آیت (۴۲/۲۴) میں کہا گیا ہے کہ باطل محو ہو جاتا ہے اور حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے اور یہ سب کچھ خدا کے قوانین (بِكَلِمٰتِهٖ) کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے، ہر مقام پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب کچھ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ یونہی اتفاقیہ یا دھاندلی سے نہیں ہوتا۔

یہ کہ یہ قانون غیر متبدل ہے اور کسی کی خاطر اس میں رعایت نہیں ہوتی۔ اس کی وضاحت خود حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کی رُو سے کر دی جہاں کہا:

۱۳/۴۰ وَاِنۡ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا

عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

جن باتوں کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ تو بہرحال ہو کر رہیں گی ۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں تیرے سامنے وقوع پذیر ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اس سے پہلے ہی وفات پا جائے (لہٰذا، اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتے جائے ۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں ۔

یہ مضمون سورۃ یونسؔ کی آیت (۱۰/۴۶) میں بھی آ چکا ہے ۔ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمایئے ۔

قانون کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ہی رسول اللہ پر یہ واضح کر دیا کہ اس انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے ۔

۱۳/۴۱ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

(یہ جو ہر وقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ وہ نظامِ ربوبیت کب قائم ہوگا جس میں ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ختم ہو جائیں گی تو) کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم کس طرح زمین (وسائلِ پیداوار) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر، ان کے مقبوضات کو کم کرتے چلے جاتے ہیں (۲۱/۴۴) اسی طرح ایک دن ایسا آجائے گا جب ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا ۔ سب کچھ نوعِ انسان کے لیے عام ہو جائے گا (۱۴/۴۳) یہ خدا کا فیصلہ ہے ۔ اور جو فیصلہ خدا کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان فیصلوں کو ٹال سکے ۔ وہ محاسبہ کرنے میں بڑا تیز ہے ۔

مطالب الفرقان، جلد اوّل (صـ۲۹۶) پر بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رُو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں رہ سکتی ۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے عام افرادِ معاشرہ کی پرورش کا انتظام کر سکے ۔ اس انقلاب کے آغاز کے متعلق جلد اوّل صـ۳۰ میں بھی ذکر آ چکا ہے ۔ جب یہ انقلاب اپنی تکمیل تک پہنچ جائے گا تو تمام ذرائع رزق ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عام ہو جائیں گے ۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہے گی ۔

زیرِ نظر آیت میں ارض کے معنی "زمین" لیے گئے ہیں اور قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے یہ معانی بھی درست ہیں ۔

لیکن آیت (۲۱/۴۴) میں انہی الفاظ کے بعد کہا ہے ۔ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۔ کیا ان کا غلبہ باقی رہ جائے گا ؟ یہاں اس غلبہ کا ذکر ہے جو زمینداری اور جاگیرداری کی رُو سے حاصل ہوتا ہے اس لیے ان آیات میں غلبہ کا مفہوم بھی درست ہے ۔ زمین کی ملکیت کا کم اور ختم ہونا اور غلبہ کا باقی نہ رہنا لازم و ملزوم ہیں ۔ قرآنی انقلاب میں، نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ

محکوم. اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس انقلاب کو کوئی روک نہیں سکتا.

۱۳/۴۲ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾

ان سے پہلے بھی (مفاد پرست گروہوں نے) بڑی بڑی تدبیریں کر دیکھیں (کہ خدا کے فیصلے نافذ نہ ہونے پائیں لیکن کسی کی کچھ پیش نہ گئی) ان کی تدبیریں خدا کے قوانین کے مطابق ہی نتیجہ پیدا کرتی رہیں.

حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جو کچھ بھی کرے، خدا کو اس کا علم اچھی طرح ہوتا ہے. لہٰذا قوانینِ خداوندی سے انکار کرنیوالوں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ آخرالامر بازی کس کے ہاتھ میں رہتی ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے؛

باقی دنیا کو چھوڑیئے. اس کے خلاف سب سے بڑی سازشیں تو خود ہم (مسلمانوں) نے کیں جو نظامِ ملوکیت کو لے آئے. اس کے ساتھ نظامِ پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری خود بخود آ گئے. آج بھی دنیا نظامِ سرمایہ داری سے تنگ آ کر ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس میں نہ کوئی شخص روٹی کے لیے کسی کا دستِ نگر ہو اور نہ کسی کا محکوم اور ذلیل لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت آج بھی نظامِ سرمایہ داری کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہی ہے مگر قرآنی نظام کی مخالفت کرنیوالے دیکھ لیں گے کہ انجام کار کامیابی کسے حاصل ہوتی ہے؛

قرآن سے انکار کرنے کے معنی رسول کی رسالت سے انکار کرنا ہوتا ہے.

۱۳/۴۳ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾

یہ لوگ جو قانونِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ تو خدا کا پیغامبر نہیں (اس لیے کہ تو اس تباہی کو جلدی نہیں لاتا جس کی دھمکیاں دیتا ہے) ان سے کہہ دو کہ (میں اس بات پر تم سے قطعاً جھگڑا نہیں کرنا چاہتا) تمہارے اور میرے درمیان جو فیصلہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوگا وہ میری صداقت کی کافی شہادت ہوگا یا اس شخص کی شہادت جو قانونِ خداوندی سے واقف ہو (اور اس لیے سمجھ سکتا ہو کہ جو کچھ میں پیش کرتا ہوں وہ خدا کا قانون ہے یا میرا خود ساختہ!)

آپ کو شاید علم نہ ہو کہ ہمارے علماء کے ہاں "علم الکتاب" ہوتا ہی نہیں. انہیں اٹھارہ اٹھارہ علوم پڑھائے جاتے ہیں لیکن قرآن ان کے نصاب میں نہیں ہوتا. آخری سال تبرکاً سورۃ بقرہ کی تفسیر پڑھا دی جاتی ہے اور بس. قرآنی انقلاب تو وہی لا سکے گا جس کے پاس علم الکتاب ہوگا!

سورۃ الرعد ختم شد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیرہواں پارہ ــــــــــــــــــ چودہویں سورۃ

سورۃ ابراہیم (۱۴)

باب سوم

سُوۡرَۃُ اِبۡرٰھِیۡم

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(انقلابِ قرآنی)

- نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لیجانے والی کتابِ ہدایت۔
- اَیَّامِ اللہِ۔ قومِ موسیٰ کی مثال۔
- انبیائے سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے احوال وکوائف کی یاد دہانی۔
- نبوّت انسان کا اکتسابی ملکہ نہیں، یہ موہبتِ خداوندی ہے۔
- جہنّمی زندگی۔ لیڈروں اور متّبعین کے مکالمات۔
- جنّتی زندگی۔ شادمانیاں اور کامرانیاں۔
- خوشگوار نظریۂ حیات اور غلط نظریۂ زندگی، اور اُن کے حاملین کا تقابل۔
- قانونِ مکافاتِ عمل اور کائنات میں جاری وساری نظامِ ربوبیّت۔
- عالمگیر نظامِ ربوبیت کی بنیاد کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں تعمیرِ کعبہ۔
- اس نظام کے قیام کے لیے ابراہیمؑ کی حسین آرزوئیں۔
- تاریخی کوائف وحوادث کا تذکرہ موعظت وعبرت۔
- باطل معاشرہ میں اصلاحِ احوال ممکن نہیں۔ اس کی جگہ نیا معاشرہ قائم کرنا ضروری ہے۔

باب سوم

سُوْرَۃُ اِبْرٰهِيْمَ

چودھویں سُوْرَۃ

۱۴/۱ الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ①

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطۂ قوانین ہم نے تیری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تو، اس کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (۵/۱۴؛ ۴۳/۳۳) اور ان کے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق، انہیں اس خدا کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ (۴۲/۱)

قرآن کریم کا مقصد یہ بتایا کہ یہ نوعِ انسان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے گا۔ اُس راستے سے جو خود خدا کا تجویز فرمودہ ہے۔ "ظلمات اور نور"، قرآنِ مجید کی بڑی اہم اور معروف اصلاح ہے جسے اس نے اکثر استعمال کیا ہے۔ اس کا مفہوم — مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۲۶۱ پر دیکھئے۔ ہر وہ عقیدہ، نظریہ، مسلک جو الحق (قرآن)، کے خلاف ہو ظلمات کے تحت آجاتا ہے اور النّور خود قرآنِ مجید ہے۔ لیکن یہاں چند قدم آگے چل کر، قرآن نے ظلمات اور نور کی کشمکش کے ایک خاص گوشے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ پانچویں آیت میں ہے کہ صاحب ضرب کلیم، حضرت موسیٰؑ کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ قوم بنی اسرائیل کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ بنی اسرائیل، شخصی حکومت (فرعون) کے استبداد، مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے "مقدس دام" اور سرمایہ داری (قارون) کی ہوسِ خون آشامی کی تاریکیوں میں بُری طرح گھرے ہُوئے تھے۔ انہیں ان محکومیوں اور غلامیوں کے پنجے سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں لے جانا، تاکہ وہ صرف اپنے خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کر سکیں، ظلمت سے نور کی طرف لے جانا تھا۔ اس کشمکش میں خدا اور ملائکہ کی مدد کس طرح مومنین کے شاملِ حال ہوتی ہے، اسے (۴۳/۳۳) کے ان الفاظ میں واضح کر دیا جنھیں عرفِ عام میں درود کہا جاتا ہے

اور جس کا مفہوم مطالبُ الفرقان، جلد سوم ص۳۱ میں دیا گیا ہے) یہاں اس نکتہ کی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اخراج من الظُّلمٰت الی النّور کا مرحلہ قرآنِ کریم میں دیئے گئے پروگرام کی رُو سے طے ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم حامل قرآن ہونے کے دعوے کے باوجود ظُلُمٰت (ذلّت، پستی، محکومی، غلامی، مفلسی، ناداری، کمزوری، بداخلاقی وغیرہ) سے نکل نہیں سکتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ اس کتابِ عظیم کو تو گلے میں لٹکائے یا طاقوں میں سجائے رکھتی ہے، عمل اس کا اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم قرآن پر عمل پیرا ہو اور پھر "ظُلمٰت کی ظلمٰت" میں رہے۔

اِذنِ اللہ کے معنی قانونِ خداوندی ہیں۔ (دیکھئے مطالبُ الفرقان، جلد سوم ص۲۵) یہاں اس خُدا کا راستہ (صراط) کہا گیا ہے جو عزیز بھی ہے اور حمید بھی۔ وہ جس کے قوانین کا غلبہ اور قوت حمد آفریں نتائج پیدا کرتے ہیں (انڈکس میں عنوان حمد دیکھئے) اس کا مظہر نگارخانۂ کائنات ہے۔

۱۴/۲ اَللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ﴿۲﴾

وہ خدا، کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اُس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ جو لوگ اس کی تجویز کردہ راہ پر چلنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے سخت تباہی و بربادی ہے۔ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہ کون لوگ ہیں؟

۱۴/۳ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۳﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اس طبعی (حیوانی) زندگی اور سطحِ انسانیت کی (اُخروی) زندگی کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو یہ طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (کیونکہ اس سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے) اور کوشش کرتے ہیں کہ اس سیدھی راہ میں (اپنے خود ساختہ مذہب و شریعت کی آڑ میں) کجی پیدا کر دیں اور اس طرح دین کو کچھ سے کچھ بنا دیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جو ایک بہت بڑی گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

مذہبی پیشوائیت کی ان دسیسہ کاریوں (یعنی خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانے اور سیدھے سادے دین میں

الجھنیں پیدا کر دینے) کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اس کا تفصیلی مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۴۷۹ زیر آیت (۳/۹۸) دیکھئے۔ یہاں اس "کارستانی" کو مذہبی پیشوائیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان لوگوں کو بھی اس کے اندر شامل کر لیا ہے جو دنیاوی مفاد کو اقدارِ خداوندی پر ترجیح دیتے ہیں اور اول الذکر میں زیادہ کشش اور جاذبیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ قرآنی راستے سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔

بات شروع سے قرآن کے متعلق ہو رہی تھی۔ خود قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسے عربی مبین میں نازل کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۳۲۰۔ قرآن کریم کے عربی میں نازل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ صرف عربوں کے لیے تھا (اور انہی کے لیے ہے) قرآن کا تو خود دعویٰ ہے کہ یہ تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ (اس کے باوجود) یہ صرف کسی ایک زبان ہی میں نازل ہو سکتا تھا۔ اور وہ وہی زبان ہونی چاہیے تھی جو رسول اللہ کی اولین مخاطب قوم کی تھی اور وہ عربی تھی۔ باقی دنیا کو (اسے سمجھنے کے لیے) اس کی زبان سیکھنی ہو گی۔ علم حاصل کرنے کا طریق ہی یہی ہے بالخصوص اس کتاب کا علم جس کا (کسی زبان میں بھی) ترجمہ اس کی اصل کا صحیح مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ (دیکھئے مذکورہ بالا حوالہ) اس قرآن سے ہدایت (صحیح راستے کی طرف رہنمائی) حاصل ہو گی اور اسے چھوڑ دینے سے افراد اور اقوام گمراہ ہو جائیں گی۔

۱۴/۴ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اور ہم نے جتنے رسول بھی بھیجے ہیں وہ اپنی قوم کی زبان میں پیغامِ حق پہنچاتے تھے تاکہ وہ اس طرح لوگوں پر قوانین خداوندی کو بالکل واضح کر دیں۔ (اس کے بعد لوگوں کو اختیار دیا گیا کہ) جو چاہے قانونِ خداوندی کے مطابق سیدھی راہ اختیار کرے اور جو چاہے غلط راستے پر چلتا رہے۔ اللہ کا قانون غلبہ اور حکمت پر مبنی ہے۔

اس کے بعد قوم موسیٰ کے اخراج مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ کا ذکر آیا ہے۔

۱۴/۵ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

اسی نہج کے مطابق ہم نے موسےٰ کو، اپنے ضابطۂ قوانین کے ساتھ بھیجا کہ وہ بنی اسرائیل کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشنی میں لے آئے اور انہیں ان تاریخی سرگزشتوں کی یاد دلائے جن میں نظامِ خداوندی کو غلبہ اور تسلّط حاصل ہُوا تھا۔ اِن سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی کوششیں بھرپُور نتائج کی حامل ہوں۔

داستانِ بنی اسرائیل گزشتہ جلدوں میں متعدد مقامات پر بشرح وبسط سے آچکی ہے (انڈکس دیکھئے) اس لیے زیرِنظر آیات کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا، بجز کسی خاص یا جدید نکتہ کے۔

غور فرمائیے۔ یہاں تذکرہ دو قوموں کی کشمکش اور تصادم کا ہے اور اسے ایّامَ اللّٰہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ دو قوموں کی کشمکش نہیں، درحقیقت حق و باطل کی کشمکش ہے اور اسی نہج سے اسے ایّام اللّٰہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخ اور باقی دنیا کی تاریخ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اسلام کی تاریخ حق و باطل کی کشمکش کی تاریخ ہوگی اس لیے اسے ایّام اللّٰہ کہا جائے گا۔ باقی دنیا کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی (ایک قوم کی حیثیت سے) تاریخ بھی ایّام اللّٰہ نہیں کہلائے گی۔ وہ بھی، دیگر اقوامِ عالم کی تاریخ کی طرح ایک قوم کی تاریخ ہوگی۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد حق و باطل کی کشمکش کا دور ختم ہو گیا تھا اس لیے اس کے بعد ایّام اللّٰہ کا دور بھی باقی نہ رہا۔ اس کے بعد ہماری تاریخ، اسلام کی تاریخ نہیں، مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اس فرق کو پیشِ نظر نہ رکھنے سے بڑی اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ واقعات سلاطین کے عہد کے ہوتے ہیں (خواہ وہ کسی ملک میں ہوں) اور انہیں اسلامی تاریخ کی حیثیت سے مزعومہ اسلام کی تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، صدرِ اوّل کے بعد ہماری ساری تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ ایّام اللّٰہ تو اس کے بعد وجۂ فروغِ دیدہ ہوئے ہی نہیں۔ دنیا میں جس قدر کتابیں "اسلام کی تاریخ" کے نام سے متداول ہیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اسلام کی تاریخ آج تک مرتب ہی نہیں ہوئی۔ یہ جب بھی مرتب ہوگی، اس کا انداز یہ ہوگا کہ اسلام اصل (دورِ ابتداء) میں کیا تھا۔ اب اس کی شکل کیا ہو چکی ہے اور یہ تبدیلی کیسے ہوئی — یہ ہوگی اسلام کی تاریخ۔ میں نے اپنی کتاب — شاہکارِ رسالتؐ — کے آخری باب میں اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کی تفصیلی تاریخ لکھنے کی خواہش ایک عرصے سے دل میں مچل رہی ہے لیکن (دیگر زیادہ اہم مصروفیات کی وجہ سے) اس کے لیے ابھی تک وقت نہیں مل سکا۔ (بیدہ التوفیق)

ایّام اللّٰہ اور عام تاریخ میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہوگا کہ عام تاریخ تو محض واقعات کا مجموعہ ہے یا زیادہ سے زیادہ ان واقعات کے طبیعی اور سیاسی اسباب کا تذکرہ۔ لیکن ایّام اللّٰہ (کی تاریخ) میں ہر صبّار اور شکور، قوم کے لیے

سفرِ حیات کامیابی سے طے کرنے کے لیے عظیم نشاناتِ راہ ہوں گے (انڈکس میں تاریخ کا عنوان دیکھئے)

اس داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

۱۴/۶ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶

جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ان عنایاتِ خداوندی کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں کس طرح، فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی۔ وہ لوگ تم پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر سخت عذاب لاتے تھے۔ ان میں بدترین عذاب یہ تھا کہ وہ تمہاری قوم کے معزز افراد کو ذلیل کیا کرتے تھے اور جو جوہرِ مردانگی سے عاری ہوتے تھے انہیں معزز و مقرب بنایا کرتے تھے (۴۹)۔ تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا کر تمہاری قومی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی اور یہ اس کی طرف سے بہت بڑی نعمت تھی۔

یہ تمام واقعات پہلے آچکے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا:

۱۴/۷ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷

اور تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہیں صاف صاف بتا دیا کہ اس عظیم انقلاب سے مقصد یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ امکانات پیدا کر دیئے جائیں کہ تم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر سکو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا اور ان صلاحیتوں کو ہمارے پروگرام کے مطابق صحیح مصرف میں لائے تو جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے اس میں اور اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور جو کچھ ملا ہے اس کی قدر نہ کی تو اس کا نتیجہ سخت تباہی اور بربادی ہوگا۔

اور اس کے ساتھ اس امر کی بھی تشریح کر دی کہ:

۱۴/۸ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

چنانچہ موسیٰ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے، ان سے کہہ دیا کہ اگر تم نے خدا کی اس بخشائش کی قدر نہ کی — اور تم ہی نہیں، اگر ساری دنیا کے انسان بھی اسی طرح ناسپاس گزاری کی راہ اختیار کرلیں تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ انسانوں کی اپنی ہی تباہی ہوگی۔ وہ تمہاری سپاس گزاری کا محتاج نہیں۔ پورا نظامِ کائنات اس کے سزاوارِ حمد و ستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے (لہٰذا وہ تم سے جن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے)۔

اور پھر قرآن کے عام انداز کے مطابق، انبیاءِ سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے احوال و کوائف کی یاد دلائی کرائی۔

۱۴/۹ اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ
اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾

(موسیٰ نے ان سے یہ بھی کہا کہ) کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ ان قوموں پر کیا بیتی تھی جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں — قومِ نوحؑ، قومِ عاد، قومِ ثمود اور کئی قومیں جو ان کے بعد آئیں اور جن کے حالات کسی تاریخ میں محفوظ نہیں۔ صرف اللہ کو معلوم ہیں۔ ان کی طرف، ان کے پیغامبر واضح قوانین لے کر آئے۔ لیکن، ان لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ ان کی آواز کو بلند نہ ہونے دیا جائے۔ ان کی بات آگے نہ بڑھنے پائے۔ انہوں نے ان رسولوں سے اعلانیہ کہہ دیا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو، ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں اور جس نظام کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو، ہمیں اس کی صداقت اور کامیابی پر قطعاً یقین نہیں۔ ہمارے دلوں میں اس کے متعلق بڑے شکوک و اضطرابات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے جواب میں:

۱۴/۱۰ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾

ان رسولوں نے اُن سے کہا کہ کیا تمہیں اُس خدا کے بارے میں شک ہو رہا ہے جس نے اس کائنات پست و بلند کو پیدا کیا ہے؟ — جو نظام اُس خدا کا تجویز فرمودہ ہو، کیا تمہیں اس کی صداقت اور کامیابی کے متعلق شک ہے؟ وہ تمہیں اس نظام کی طرف صرف اس لیے دعوت دیتا ہے کہ تمہارے لیے اس تباہی سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر دے جو تمہارے جرائم کی وجہ سے تم پر آنے والی ہے اور اس طرح تمہیں ایک مدتِ معینہ تک زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہونے کا موقع عطا کر دے۔

اس کے جواب میں وہ کہتے کہ تم ہماری طرح کے ایک انسان ہو (اس لیے تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ تمہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے)۔ تم چاہتے ہو کہ جن ہستیوں کی اطاعت و عبودیت ہمارے اسلاف نے اختیار کر رکھی تھی، ان سے ہمیں روک دو (تاکہ ہم تمہارا مسلک اختیار کرلیں)

نیز، انہوں نے کہا کہ تم ان دلائل اور تاریخی شہادات کو چھوڑ و۔ تم جو کہتے ہو کہ تمہاری یہ دعوت ضرور غالب آئے گی، تو اسے غالب کر کے دکھاؤ — اس طرح غالب کر کے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے — (اس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔)

اس آیت میں ایک تو مخالفین کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو، پھر تم خدا کے رسُول کیسے ہو سکتے ہو؟ (وہی قدیمی اعتراض!) دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ـ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تمہاری تحریک غالب آئے گی، تو اسے غالب کر کے دکھاؤ۔ اس میں تاخیر کیوں کر رہے ہو اور دوسرے معانی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہمیں کوئی کھلا ہوا معجزہ دکھاؤ۔ اس کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ:

۱۴/۱۱ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ
اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

ان کے رسولوں نے اُن سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں لیکن خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق،

اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، نبوت بطور موہبت عطا کر دیتا ہے۔ باقی رہا غلبہ وتسلط، سو وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ (وہ کب حاصل ہوگا، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا ہمیں یقین ہے کہ وہ حاصل ضرور ہوگا۔ ہمیں قانونِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ ہے اور یہ صرف ہم پر ہی موقوف نہیں) جو لوگ بھی قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، انہیں اس کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

آیت کے پہلے حصہ میں ان کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ ایک بشر، رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ نبوت انسان کا اکتسابی ملکہ نہیں۔ یہ موہبت خداوندی ہے (تفصیل نبوت اور وحی کے عنوانات میں گزر چکی ہے) دوسرا جواب سلطان کے متعلق ہے۔ سو یہاں بھی اس سے مراد "غلبہ اور کامیابی" اور معجزہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ دوٹوک بات بہرحال یہی تھی کہ ہمارا بھروسہ قوانینِ خداوندی پر ہے اور چونکہ وہ قوانین محکم ہیں اس لیے ہمیں اپنے دعاوی پر پورا پورا یقین ہے۔ ان قوانین پر بھروسہ اور اعتمادِ کامل کیوں ہے؟

(۱۴/۱۲) وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ہم اس کے قانون کی محکمیت پر اعتماد نہ کریں جبکہ اس نے زندگی کی مختلف راہوں کو ہمارے سامنے اس طرح واضح طور پر بے نقاب کر دیا ہے (کہ ہر حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے آگئی ہے)۔ اس کے قانون کی محکمیت پر اعتماد ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہماری کیفیت یہ ہے کہ تم ہمیں جس قدر اذیتیں پہنچاؤ گے ہم انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور ان سے ہمارا قدم کبھی نہیں ڈگمگائے گا۔

جب خدا کا قانون اس قدر محکم ہے تو ہر بھروسہ کرنیوالے کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

سبیل کی بجائے سُبُل (جمع) کی تشریح مطالبُ الفرقان جلد اول (ص۲۳ پر) کی جا چکی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ جو ہماری طرف آنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے ہم اُسے سُبُل کی طرف راہنمائی کر دیتے ہیں (۲۹/۶۹)۔ منزل وہی رہتی ہے، (جسے خدا نے متعین کر دیا ہے) یعنی اس کی طرف جانے والی شاہراہ (صراطِ مستقیم) بھی ایک ہی ہے۔ لیکن حالات کے مطابق پگڈنڈیاں (طریقِ کار) مختلف ہو سکتی ہیں جو بالآخر اس شاہراہ میں جا کر مل جاتی ہیں۔ لیکن پگڈنڈی ہو یا شاہراہ، یہ سفر اسی اعتماد کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے کہ یہ سب ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیں گی۔ ان (مخالفین) کی طرف سے وہی جواب ملتا رہا جو ہر سرکش، مستبد کا وطیرہ ہے۔

۱۴/۱۳ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ

اس پر ان لوگوں نے جو قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے، اپنے رسولوں سے کہا کہ (ہم زیادہ باتیں سننے کے لئے تیار نہیں)۔ یا تو (چپکے سے) ہمارا مسلک اختیار کرلو ورنہ ہم تمہیں اپنی سرزمین سے باہر نکال دیں گے۔

اُنہوں نے یہ کہا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ سے کہا:

۱۴/۱۳-۱۵ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِن بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾

انہوں نے انہیں یہ دھمکی دی اور ان کے نشو ونما دینے والے نے انہیں بذریعہ وحی کہہ دیا کہ (گھبراؤ نہیں) ہم ان ظلم و زیادتی کرنے والوں کو تباہ کر دیں گے۔ اور ان کی تباہی کے بعد، تمہیں ان کے ملک میں آباد کر دیں گے (دیکھو! اس لیے نہیں ہوگا کہ ہمیں تمہاری طرف داری مقصود ہے اور ان سے یونہی عداوت ہے۔ یہ سب ہمارے اٹل قانون کے مطابق ہوگا) اور ہر اس قوم کے حق میں ایسا ہی ہوگا جو جانتی ہے کہ کائنات میں قانونِ خداوندی کا مقام کیا ہے اور اس قانون کے خلاف چلنے کا نتیجہ کیا۔ اور وہ اس نتیجہ سے خائف رہتی ہے۔

چنانچہ وہ لوگ دلائل و براہین سے نہ مانے اور انہوں نے چاہا کہ ایک فیصلہ کن بات سامنے آجائے، تو وہ آگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر سرکش اور باغی (جس نے قانونِ خداوندی کا مقابلہ کیا تھا) ناکام و نامراد رہا۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بعض رسولوں نے تو مملکت قائم کی تھی لیکن بعض ایسے بھی تھے جنہیں مملکت اور حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ زیرِ نظر آیات میں بات تمام رسولوں کے متعلق ہو رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ انہیں ان کے مخالفین کی تباہی کے بعد، ان کی جگہ متمکن کیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ مخالفین کی بربادی کے بعد خدا کے رسول ان کی جگہ متمکن ہُوئے تھے اور انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اقتدار کسی وسیع و عریض مملکت میں ہی قائم ہو۔ یہ کسی محدود خطۂ ارض میں بھی ہو سکتا تھا۔ قرآن کی یہ شہادت بہرحال یقینی ہے کہ اپنے مخالفین کی تباہی کے بعد یہ ان کی جگہ متمکن ہُوئے تھے۔ اگر کسی مقام پر تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی تو یہ تاریخ کی کوتاہی ہے اور اگر قرآنِ حکیم میں ہر رسول کے سلسلہ میں اس کی تفاصیل نہیں آئیں تو یہ اس لیے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں۔ یہ کتابِ ھُدیٰ ہے اور یہ اتنا ہی بیان کرتا ہے جتنا ہدایت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا

چاہیے کہ جب بھی عام تاریخ اور قرآن کے بیان کردہ کسی اصول یا تصریح میں تضاد ہو تو قرآن کے بیان کو مبنی بر صداقت کہنا چاہئے۔ ہمارا ایمان قرآن پر ہے نہ کہ تاریخ پر۔ (انڈکس میں تاریخ کا عنوان دیکھئے)۔

یہاں دو غیر متبدّل اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ظالم، جبّار، عنید (مستبد، سرکش، آمر حکمران) آخرالامر ناکام رہتے ہیں اور جو لوگ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے محتاط رہتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ غیر متبدّل قانونِ خداوندی ہے۔ ان نتائج کے برآمد ہونے میں وقت تو لگتا ہے لیکن ایسا ہو کر رہنا یقینی ہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ۔ ایک ابدی اصول اور غیر متبدّل قانون کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔

حکومت اور اقتدار، دولت اور حشمت کا چھن جانا ہی کچھ کم عذاب نہیں ہوتا، لیکن اس سے بھی زیادہ شدید عذاب ایک اور ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے 'محکومی اور غلامی' ذلّت و پستی کی زندگی۔ یعنی اس شکست اور ناکامی سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائے۔ وہ زندہ رہتی ہے اور یہ زندگی اس کے لیے زیادہ شدید عذاب کا سبب بنتی ہے۔

متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ اُخروی زندگی کی جنّت اور جہنّم برحق ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآنِ حکیم کی رُو سے، جنّت اور جہنّم کی زندگی اس دنیا ہی سے شروع ہو جاتی ہے (انڈکس میں عنوانات دیکھئے جنّت اور جہنّم) زیرِ نظر آیات میں محکوم قوموں کی اسی دنیا کی جہنّم کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ غور کیجئے کہ محکوم کی زندگی کا قرآن نے کیسا عبرت انگیز نقشہ کھینچا ہے فرمایا:

۱۴ / ۱۶-۱۷ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

(اور یہ ناکامی اور نامرادی وقتی نہ تھی، بلکہ یہ) ایک مستقل عذاب تھا جو ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس ذلّت کی زندگی میں انہیں کھانے کو ملتا تھا لیکن بجائے اس کے کہ اس سے ان کی نشوونما ہوتی، وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما میں اُلٹا رکاوٹ بن جاتا تھا۔

(انہیں اس ذلّت کی زندگی کا احساس تھا۔ اس لیے) یہ سامانِ زیست ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا تھا۔ لیکن اسے طوعاً وکرہاً اسے نگلنا پڑتا تھا۔ انہیں چاروں طرف سے موت کے سامان دکھائی دیتے تھے (اور وہ چاہتے بھی تھے کہ انہیں موت آ جائے تاکہ اس عذاب سے چھٹکارا ہو جائے) لیکن انہیں موت بھی نہیں آتی تھی (دیکھئے ۸۷ / ۱۳) بلکہ

موت آنے کی بجائے اس عذاب کی شدت اور بڑھ جاتی تھی ـــ داُف! ذلت اور محکومی کا عذاب بھی کس قدر الم انگیز اور جانگسل ہوتا ہے!)

یہ عذاب اس دنیا کا تھا۔ اُخروی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ جانکاہ ہوگا۔ اصل جہنم کی غذا کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے۔ (۴۴/۴۹ و ۵۶/۵۵)

یہاں کہا ہے کہ اس زندگی میں موت ہر طرف سے آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مریں گے بھی نہیں۔ دوسری جگہ ہے لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی۔ (۲۰/۷۴) وہ نہ زندہ ہوں گے نہ مُردہ۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ محکومی کی زندگی تو ایک طرف، اس کی موت بھی ہزار عبرت کا موقع ہوتی ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "قبر"۔ (اپنے مُردہ سے) قبر کہتی ہے:

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟ میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میّت سے مری تاریکیاں تاریک تر تیری میّت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر! محکوم کی میّت سے سو بار الحذر!
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

یہ ہے محکوم کی جہنم کی زندگی اور اس کی ذلت آمیز موت! واضح رہے کہ دنیا کے عام نقطۂ نظر سے ایک قوم پر اگر کوئی دوسری قوم حاکم ہو تو وہ قوم محکوم کہلائے گی لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے اگر کسی قوم پر کتاب اللہ کے سوا کسی کی حکمرانی ہو تو وہ محکوم ہے، خواہ وہ حکمرانی خود اپنی قوم ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی تمام "آزاد" قومیں ہزار سال سے محکوم کی محکوم چلی آرہی ہیں۔ اسلام میں' انسانوں پر انسانوں کی حکومت، خواہ کسی شکل میں ہو، غلامی اور محکومی ہے۔ آزادی صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت کا نام ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

ان لوگوں کے اعمال کے متعلق کہا:

(۱۴/۱۸) مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹰاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ﴿۱۸﴾

(اور یہ چیز صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں) جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے انکار کر کے غلط راستوں پر چل نکلتے ہیں (وہ

کہیں ہوں اور کسی زمانے میں ہوں، ان کے اعمالِ زندگی کی مثال یوں سمجھو جیسے ہلکی سی راکھ ہو جس پر آندھی کے دن، زور کا جھکڑ چلے اور وہ ساری راکھ اُڑ کر کہیں کی کہیں چلی جائے اور اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے (ان کے اعمال، کوئی ٹھوس تعمیری نتیجہ مرتب نہیں کرتے، اس لیے وہ رائیگاں جاتے ہیں)

غور کرو کہ انسان کی ناکام اور بے نتیجہ کوششوں کی اس سے بُری مثال اور کیا ہوگی۔

حبطِ اعمال قرآن کی اہم اصطلاح ہے۔ اس کے مفہوم کے لیے دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد چہارم صـ۴۲ ، اور جلد پنجم صـ۱۶۸۔

یہ اس لیے کہ کائنات کی مشینری تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ جو کام ان قوانین کے مطابق نہیں ہوں گے وہ اس پروگرام میں فٹ نہیں بیٹھ سکیں گے اس لیے تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں کہا:

(۱۴/۱۹) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ

(یہ اس لیے کہ ان کی زندگی کا نقشہ کائناتی نقشہ کے یکسر خلاف ہے) کائناتی نظام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہاں ہر شے تعمیری نتیجہ مرتب کرتی ہے۔

(۱۴/۱۹—۲۰) اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۙ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ﴿۲۰﴾

(اور جس چیز میں اس کی صلاحیت نہیں رہتی وہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے) لہٰذا ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے تو تم کائناتی نقشہ میں فِٹ نہیں بیٹھ سکو گے اور خدا کا کائناتی قانون تمہیں نکال کر باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے گا (۳۳/۴ ؛ ۹/۳۹ ؛ ۴۷/۳۸)

اور ایسا کرنا خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

قرآنِ کریم میں ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے آنے کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے (دیکھئے انڈکس بالخصوص ۹/۳۹ ؛ ۴۷/۳۸) لیکن خدا کے لیے یہ بھی مشکل نہیں کہ اگر ساری کی ساری نوعِ انسانی غلط راہوں پر چل نکلے تو ان کی جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے۔ (جیسا کہ آیت ۴/۱۳۳ میں بالتصریح آیا ہے) زیرِ نظر آیت میں قومِ مخاطب کا استبدال بھی منصور ہو سکتا ہے اور نوعِ انسانی کا استبدال بھی۔ قومی استبدال کا مفہوم لینے سے اگلی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

(۱۴/۲۱) وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ

هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

(ابھی تو وہ انتظار کا وقفہ ہے جس میں آخری فیصلہ کن تصادم کی تیاری ہوتی ہے۔ جب یہ وقفہ گزر جائے گا) اور سب قانونِ خداوندی کا مقابلہ کرنے کے لیے نکھر کر میدان میں آجائیں گے اور وہ وقت ہوگا جب (مضمر) چھپے ہوئے نتائج محسوس (مشہود اور بارز) شکل میں سامنے آجائیں گے تو اس وقت اس تباہی کو دیکھ کر کمزور لوگ (یعنی عوام جو لیڈروں کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں) اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے، تو آج کیا تم ایسا نہیں کرو گے کہ اس تباہی سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کر دو؟ وہ کہیں گے کہ اگر ہمیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر آتی تو ہم تمہارے بچاؤ کی بھی کوئی شکل بتاتے۔ (لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ) ہمیں خود اپنے بچاؤ کی بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی، اس لیے تمہیں کیا بتائیں؟ اب تو وہ وقت آچکا ہے کہ خواہ ہم اپنی روش پر بدستور چلتے جائیں خواہ اسے چھوڑ دیں، نتیجہ یکساں ہے۔ اب اس تباہی سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ (۴۷/۳۳ ؛ ۳۴/۳۲ ؛ ۳۷/۲۷-۲۹ ؛ ۳۸/۶۰ ؛ ۴۰/۴۷)

جہنم میں لیڈروں اور پیش روؤں کے مکالمات کے لیے وہ آیات دیکھیے جن کے حوالے اُوپر مفہوم میں دیے گئے ہیں۔ نیز مطالب الفرقان۔ جلد چہارم (صفحہ ۵۴۹) ؛ جلد پنجم (صفحہ ۱۹۲)۔

اور اس کے بعد شیطان!

۱۴/۲۲ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور جب اس تصادم کا آخری فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان (یعنی انفرادی مفاد پرستیوں کا باطل نظام، جس پر یہ لوگ چلے آ رہے تھے) کہے گا کہ ایک بات تم سے نظامِ خداوندی نے کہی تھی، سو وہ بات حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی۔ اور ایک بات تم سے میں نے کہی تھی تو واقعہ اس کے خلاف ہوا۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی

کہ میں تمہیں اپنے پیچھے زبردستی لگا لیتا۔ جو کچھ ہُوا وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں آواز دی تو تم نے اس پر فوراً لبّیک کہہ دیا اور اس طرح میرے بلاوے کو قبول کر لیا۔ لہٰذا تم مجھے الزام مت دو۔ خود اپنے آپ کو الزام دو۔ اب میں بھی چیخ پکار کرتا ہوں (کہ میں گیا) اور تم بھی چیخ و پکار کر رہے ہو (کہ تم تباہ ہوئے۔ سارا معاشرہ کہرام مچا رہا ہے۔ چھوٹے بڑے سب دہائی دے رہے ہیں لیکن، نہ میں ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں، نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تم نے، اس سے پہلے جو یہ روش اختیار کر رکھی تھی کہ میرے قوانین و احکام کی اطاعت، قوانینِ خداوندی کی طرح کیا کرتے تھے، میں تمہاری اس روش سے بری الذمہ ہوں (اسے تم نے خود ہی اختیار کیا تھا) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں، اُن کے لیے الم انگیز تباہی ہوتی ہے۔

شیطان (اور ابلیس) کا ذکر سابقہ جلدوں میں بکثرت آ چکا ہے۔ ان کی ماہیت کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد دوم (ص۵، ص۹۹ پر) تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ یہاں صرف ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم اپنے ہر غلط کام کو شیطان کی طرف منسوب کر کے خود بری الذمہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چونکہ شیطان خود ہمارے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے اس لیے غلط کاموں کے لیے کسی اور کے ذمہ دار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں (بغرضِ تفہیم) "شیطان" کو ایک جُدا گانہ ہستی قرار دے کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ غلط کاموں کا ذمہ دار شیطان نہیں ہوتا، تم خود ہوتے ہو۔ انسان کے سرکش جذبات، اسے غلط کاموں کے لیے اُکساتے ہیں (اسے اس کی دعوت دیتے ہیں) اور یہ ان کی دعوت پر لبّیک کہہ دیتا ہے۔ ذمہ دار بہرحال یہ خود ہی ہوتا ہے اس لیے ان کا خمیازہ بھی خود ہی بُھگتتا ہے۔

ان کے برعکس، وہ قوم ہے جس کی زندگی قوانینِ خداوندی کے مُطابق بسر ہوتی ہے۔

۱۴/۲۳ وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴿٢٣﴾

ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھ کر، اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، انہیں شادکامیوں اور کامرانیوں کی جنّت میں داخل کیا جائے گا جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آنے گی اور یہ سب کچھ خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہوگا۔ اس (جنّتی معاشرہ) میں ہر ایک کی آرزو اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ دوسروں کے لیے، زیادہ سے زیادہ زندگی اور سلامتی کا سامان بہم پہنچائے۔

یہ دو جماعتیں ہیں بلکہ دو نظریاتِ زندگی ہیں جن کے یہ ثمرات ہیں۔ اسے مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

۱۴ ۲۴—۲۵ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

ذرا غور کرو کہ اِن ہر دو متضاد نظریاتِ حیات اور نظام ہائے زندگی کو خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں (یعنی اسے معاشی زندگی میں مادی تمکن بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ بلند اخلاقی اقدار سے بھی ہم کنار ہو جن کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماوراء ہے) وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں، ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح تجریدی اور نظری حقائق کو، محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

یہ مثال بڑی جامع ہے جس میں اسلام کی اصل و اساس سمٹ کر آگئی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز اس نظریہ میں مضمر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے معاشرہ کی عمارت استوار کرتی ہیں۔ ایک نظریۂ حیات وہ ہے جو مادی کائنات اور اقدارِ خداوندی دونوں پر پرورش پاتا ہے۔ تسخیرِ کائنات سے وہ مادی قوتوں کو مسخر کرلیتا ہے اور پھر ان قوتوں کو اقدارِ خداوندی کے مُطابق (نوعِ انسان کی نشو ونما کے لیے) استعمال کرتا ہے۔ اس نظریہ کے زندگی بخش اور حیات افزا نتائج مستقلاً برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی جب تک کوئی قوم اس پر عمل پیرا رہتی ہے اس کی برکات سے فیض یاب ہوتی رہتی ہے۔ دوسری جگہ اس کے متعلق کہا اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (۱۳/۳۵)۔ اس کا سایہ بھی دائمی ہوتا ہے اور پھل بھی۔ جنّتی معاشرہ کے پھلوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ چھوٹے بڑے ہر ایک کی دسترس میں ہوتے ہیں، ان تک ہر ایک کی رسائی ہوتی ہے، سب یکساں طور پر اُن سے متمتع ہوتے ہیں۔ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۶۹/۲۳)۔ اس کے درختوں کی پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں یوں سمجھو گویا ہر ایک کی جھولی میں ہوتی ہیں۔ وہ پھل از خود تمام افرادِ معاشرہ تک پہنچتے ہیں۔ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (۵۶/۳۲-۳۳)۔ پھل بڑی کثرت سے ہوں گے اور ان کے راستے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مُطابق میسّر ہوں گے۔ یہ تو جنّتی معاشرہ (نظامِ سرمایہ داری) ہے جس میں پھل تو بکثرت ہوتے ہیں لیکن باغوں پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں کہ کوئی محتاج اور ضرورت مند ان کے قریب تک نہ آنے پائے۔ سورۃ القلم اور سورۃ کہف (۶۸/۱۷-۲۴، ۱۸/۳۲) میں باغ والوں کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔

سو خوشگوار نظریۂ زندگی کے ثمرات بھی قائم و دائم ہوں گے اور ان سے متمتع بھی بلا امتیاز تمام انسان ہوں گے۔ یہ ہے اسلامی نظامِ زندگی کا نقشہ اور قرآنی نظریۂ حیات کا مآل!

اس کے برعکس:

۱۴/۲۶ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾

اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی مثال، ایک ایسے نکمّے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اُسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ (جو غلط نظام، اخلاقی اقدارِ خداوندی سے ہمکنار نہیں ہوتا، اسے ثبات و قرار نصیب نہیں ہوتا)۔

اس لئے کہ — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

اِن ہر دو نظریاتِ حیات کے فرق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ طیّب نظریۂ حیات کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک کوئی قوم اس پر عمل پیرا رہے گی وہ اسے اپنے ثمرات سے متمتع کرتا رہے گا۔ خبیث نظریۂ حیات کی یہ حالت ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے باوجود قوم زندگی کے حقیقی خوشگوار ثمرات سے محروم رہے گی۔ "خوشگوار ثمرات" سے مراد طبیعی اسباب و وسائل کی کثرت ہی نہیں، ان سے حاصل ہونے والا امن و سکون اور اطمینان و سلامتی بھی ہے جو غیر خداوندی نظریہ سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

طیّب نظریۂ حیات مفصلاً قرآنِ کریم ہے اور مجملاً لَآ اِلٰـهَ - اِلَّا اللّٰهُ (حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں)، یہ شرف و مجدِ انسانیت کا ضامن ہے۔ طیّب نظریۂ حیات پر کاربند رہنے والی قوم کی حالت کیا ہوتی ہے:

۱۴/۲۷ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾

اس طرح اللہ، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی (دونوں) میں، ثبات اور تمکّن عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

چونکہ وہ قوم قولِ ثابت (محکم نظریۂ حیات)، پر کاربند ہوتی ہے اس لیے اُسے زندگی میں ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے۔

اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ ہے قرآنی نظریۂ حیات کی امتیازی خصوصیّت۔ یہ دنیا بھی حسین اور تابناک اور اُخروی زندگی بھی درخشندہ و تابندہ۔ یہ کچھ یونہی اتفاقیہ نہیں ہو جاتا، خُدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہے۔ یہی اس نظریہ کے ثبات اور اس کی حامل قوم کے استحکام کی دلیل ہے۔

لیکن کَلِمَۃً طَیِّبَۃً (خوشگوار نظریۂ حیات) یہ کچھ از خود ہی نہیں کر دیتا۔ جب انسان اس پر عمل پیرا ہوں تو پھر اپنے نتائج مرتّب کرتا ہے۔ سورۃ فاطر میں اس عمیق حقیقت کو بڑے برجستہ انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا: اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵/۱۰) کلمۂ طیّب میں اُوپر کو اُٹھنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اُسے بلند انسان کے اعمالِ صالح ہی کرتے ہیں۔ نہ نظریۂ زندگی بلا انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتا ہے نہ انسانی اعمال بلا نظریۂ حیات برومند ہو سکتے ہیں۔ سورۃ انفال کی آیت (۸/۱۷)۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ ۔ میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ خدا کا متعیّن کردہ نظریۂ زندگی اور بندۂ مومن کے ہاتھ کا تعاون ۔ کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جو قومیں غیر خداوندی نظریات پر عمل پیرا ہوتی ہیں، ان کے لیڈر انہیں تباہی اور بربادی کے جہنّم کی طرف لے جاتے ہیں۔

۱۴/۲۸—۲۹ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾

(اب تم اس قانونِ مشیّت کو سامنے رکھ کر اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور) ان راہنمایانِ قوم کی حالت پر غور کرو جنھیں اللہ نے زندگی کی خوشگواریاں اور فراوانیاں عطا کیں۔ لیکن انہوں نے ان کی قدر نہ کی (ان کا غلط استعمال کیا) اور اپنی ملت کے کارواں کو ایسی منڈی میں لا کر ٹھہرا دیا جس میں ہر طرف کساد بازاری تھی۔ جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہ تھا۔ یعنی انہیں تباہی اور بربادی کے جہنّم میں جھونک دیا۔ اور یہ کیسی بُری جگہ تھی جہاں انہوں نے اس قافلے کو اُتارا!

غور فرمایئے، قرآن نے تاریخِ انسانیت کو کس طرح چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے ۔ کُوزے میں محصور ہُوا اضطراب دریا کا ۔ اور یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ قوموں کی زندگی میں جہنّم سے کیا مراد ہوتی ہے؛ قوم کی کس مپرسی، بے قدری، خستہ حالی۔ ذلّت و خواری کی زندگی جس تک اُس کے راہ نماؤں نے اُسے پہنچا دیا ہو۔

اُنہوں نے یہ کیسے کیا؟

۱۴/۳۰ وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا

فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

اُنہوں نے کیا یہ کہ (نام تو لیتے رہے قوانینِ خداوندی کا، لیکن) اس کے ہم پایہ ٹھہرانے رہے غیر خداوندی قوانین کو، تاکہ اس طرح لوگوں کو، خُدا کے تجویز کردہ راستے سے بہکا کر، دُوسرے راستے پر ڈال دو۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم نے بھی ایسی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سو اس سے تھوڑے دنوں تک فائدے حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارے لیے بھی تباہی اور بربادی ہے۔

اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ خوشگوار نظریۂ حیات (کلمۂ طیّب) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان قوانینِ الٰہیہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں۔ اس سے وہ مقامِ انسانیّت پر فائز ہوتا ہے۔ یہی توحید ہے۔ باطل نظریات کے حامل، انسانوں کو بھی حکمران قرار دیتے ہیں۔ یہ شرک ہے، جو وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ (جیسا کہ شرک کے عنوان کے تحت آپ، مطالبُ الفرقان کی مختلف جلدوں میں دیکھ چکے ہیں) نہ توحید پر ایمان سے خدا کا کچھ سنورتا ہے، نہ شرک سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ ان کا تعلق خود انسان کے سنورنے اور بگڑنے سے ہے شرک سے کچھ عرصہ کے لیے دُنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس نظریّہ سے انسان اپنے مقام سے گر جائے اس کا نتیجہ ذلّت و رسوائی کے سوا کیا ہو سکتا ہے!

اِن کے برعکس، کلمۂ طیّب کے حاملین کے متعلق فرمایا:

(۱۴/۳۱) قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

اِن کے برعکس، تم میرے اِن بندوں سے، جو میرے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، کہہ دو کہ (وہ اس سے نہ گھبرائیں کہ باطل کا نظام ہر طرف مسلّط ہے اس لیے، اس سے کس طرح نکلا جائے گا؟) وہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے — وہ ان کی مضمر صلاحیتیں ہوں یا محسوس سامانِ زیست — اُسے حسبِ موقع و ضرورت، علانیہ اور پوشیدہ، اس بلند مقصد کے لیے صَرف کرتے چلے جائیں، ابھی تو اس کا موقع ہے۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ یہ جنس وہ نہیں ہے جسے، جب

جی چاہے، بازار سے خرید لیا جائے یا کسی دوست سے احساناً مانگ لیا جائے۔ داسے تو موقع پر خونِ جگر سے حاصل کیا جاتا ہے)۔ (۲۵/۴۸)

اِس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے۔ اس کی تشریح مطالبُ الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۲۲۴) اور جلد سوم (صفحہ ۴۳۱) پر دیکھیے۔ اگرچہ یہ موضوع (مکافاتِ عمل) سابقہ جلدوں میں پھیلا ہُوا ہے کہ قرآنی تعلیم اور دعوت کا نقطۂ ماسکہ یہی ہے، اسی پر نظامِ ربوبیت کی بنیاد ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔

۱۴/۳۲—۳۳ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾

اس طرح انسانی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے گا جس کے اسباب و ذرائع خارجی دُنیا میں پہلے سے مہیا کر دیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے جس کی آبیاری سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں تاکہ وہ تمہارے لیے سامانِ زیست بنیں۔ اس نے تمہارے لیے کشتیوں (اور جہازوں) کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے قانون کے مطابق سمندروں میں چلتے رہیں اور تمہارے لیے دریا بھی مسخر کر دیے (تاکہ تم ان سے آب پاشی کا کام لے سکو)

اور اس نے تمہارے لیے چاند اور سورج کو بھی قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ وہ ایک مقررہ قاعدے کے مطابق، برابر چلے جا رہے ہیں۔ نیز اس نے تمہارے لیے دن اور رات کو بھی مسخر کر دیا۔

یہ (نظامِ کائنات) اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی میسر آتی رہیں۔

۱۴/۳۴ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

غرضیکہ اس طرح اس نے، (اپنے کائناتی قانونِ ربوبیت کے مطابق) تمہیں وہ سب کچھ دے دیا جس کی تمہیں، اپنی نشوونما کے لیے ضرورت ہے (۵۵/۲۹)۔ یہ سامانِ رزق اس قدر متنوع اور فراواں ہے کہ اگر تم اسے گننے لگو تو اس کا احاطہ نہ کر سکو (یہ سامانِ رزق ہم نے تمام انسانوں کی عالمگیر پرورش کے لیے دیا تھا۔ لیکن انسانوں نے اسے اپنے قبضے میں لے کر، ایسی دست درازیاں شروع کر دیں کہ) ہر ایک دوسرے کے حقوق چھیننے لگا اور جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا، اُسے دبا کر بیٹھ گیا۔

خدا نے سامانِ زیست، بلا حدود و قیود ساری دُنیا میں پھیلا دیا تھا۔ لیکن انسانوں نے اس کی تقسیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جس سے تمام ناہمواریاں وجود میں آگئیں۔ اس طرح بالادست انسانوں کی دست درازیوں سے نظامِ ربوبیت تہ و بالا ہو گیا۔

سرکش اور بالادست انسانوں کے اس ظلم و جور اور سلب و نہب کو روکنے کے لیے خدا نے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ان کے ہاتھوں نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ کو ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ اُنھوں نے مقامی حدود سے نکل کر عالمگیر انسانیت کے نظام کی بنیاد رکھی تھی جس کا مرکز کعبہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ جلیلہ سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ (انڈکس میں دیکھیے عنوانات ابراہیمؑ اور کعبہ) یہاں ان کی اس دُعا کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے تعمیرِ کعبہ کی تکمیل کے بعد مانگی تھی۔

۱۴/۳۵ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ ٱلْأَصْنَامَ ﴿٣٥﴾

(سرکش انسانوں کی ان دست درازیوں اور ناہمواریوں کی روک تھام کے لیے، ابراہیمؑ نے نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھی اور اس کے لیے ایک مرکز قائم کیا۔ ۲/۱۲۵) اور اس سلسلہ میں خدا سے دُعا کی کہ اے نوعِ انسان کو نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو (جسے میں نے تیرے نظام کا مرکز قرار دے دیا ہے) ایسا بنا دے کہ یہ سرکش اور مستبد قوتوں کے ستائے ہوئے انسانوں کے لیے مقامِ امن بن جائے اور مجھے اور میری اولاد کو (جو اس مرکز کی محافظ ہوگی)، اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم ہر اُس کام اور اُس شے سے مجتنب رہیں جو تیرے قانون کی اطاعت کے راستے میں حائل ہوں، اور ہمیں تجھ سے بیگانہ بنا دے۔

صنم (جمع اصنام) کا ترجمہ عام طور پر "بُت" کیا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔

امام راغب (اپنے مفردات میں) کہتے ہیں کہ " ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ کر دے اور اس کی توجہ کسی دوسری طرف پھیر دے، صنم کہلاتی ہے"۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ " حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کرلیں تو اس سے مراد ایسی ہی خواہشات(۵۹) کے پیچھے لگ جانا تھا کیونکہ انھیں اس کا خدشہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بتوں کی پرستش شروع کر دے گی"۔ (لغات القرآن (پرویز۔ ص۱۰۵۰)۔ یہی وہ اصنام ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخِ حرم! ہر زماں در آستیں وارد خداوندے دِگر

اور یہ کہ:

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر رُست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

حضرت ابراہیمؑ کے اِستعارے کے طور پر:

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لَآ اِلٰہ میں ہے

اس اعتبار سے دیکھیے تو ہم سب اصنام پرست ہیں۔ لَآ اِلٰہ سے مراد مٹی اور پتھر کی مورتیوں کو توڑنا ہی نہیں، ان تمام خواہشات، مقاصد، مفادات اور رجحانات کو دل کے صنمکدہ سے نکال باہر کرنا بھی ہے جو اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں حائل ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی دعا ہمارے لیے مانگی تھی کہ ملتِ ابراہیمیؑ کے پیرو ہونے کی جہت سے ہم بھی ان کی معنوی ذریّت میں شامل ہیں۔

اصنام کا مندرجہ بالا مفہوم اگلی آیت نے واضح کر دیا جب کہا کہ:

(۱۴/۳۶) رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اے میرے نشوونما دینے والے! ان غیر خدائی قوتوں اور جاذبیتوں نے، بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے (اور یہ جو میں نے دعا کی ہے کہ میری اولاد کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا ہو تو یہ اس لیے کہ اگر وہ تیرے راستے پر چلے گی تو اس نظام کے مرکز کی تولیت کی اہل رہے گی۔ اگر وہ اس راستے پر نہ چلے گی تو محض میری اولاد ہونا اسے اس کا اہل نہیں بنا سکے گا۔ (۲/۱۲۴)۔ اس نظام میں "اپنے" اور بیگانے کا معیار ہی بدل جاتا

ہے) میرا "اپنا" وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں۔ جو اس سے سرکشی برتے گا (تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، خواہ وہ میری اولاد میں سے ہی کیوں نہ ہو (۱۱/۴۶) البتہ اس کی حفاظت اور پرورش کا انتظام تیرے طبعی قانون کے مطابق، اسی طرح ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں کا انتظام ہوتا ہے۔ (کیونکہ تیرا طبعی قانون کافر و مومن سب کے لیے یکساں ہے۔ (۲/۱۲۶)

انسانوں کو گمراہ کرنے والے مٹی اور پتھر کے بت نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جو لوگوں کو غیر خدا کی معبودیت کا سبق پڑھاتے ہیں اور اس طرح خدا کی طرف جانے والے راستے کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آیت کے اگلے حصہ میں کہا کہ "میرا وہ ہے جو میرا اتباع کرے" یہ دو قومی نظریہ کی اساس و بنیاد ہے۔ "ہم میں سے وہ ہے جو ہمارا اتباع کرتا ہے" نہ وہ جس کا ہم سے کوئی نسبی یا صلبی رشتہ ہے۔ (دو قومی نظریہ کے لیے دیکھیے انڈکس میں عنوانات قوم، قومیت یا دو قومی نظریہ بالخصوص مطالب الفرقان۔ جلد پنجم ص۲۳۳ اور جلد سوم ص۴۳) حضرت ابراہیمؑ کی ساری زندگی اسی ابدی اصول کی زندہ تفسیر ہے۔ باپ سے قطع تعلق، قوم سے قطع تعلق، گھربار سے قطع تعلق، وطن سے قطع تعلق۔ غرضیکہ ہر اس شخص یا رشتے سے قطع تعلق جو خدا کے راستے میں حائل ہو (۶۰/۴)۔

اس کے بعد انہوں نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا۔

۱۴/۳۷ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصدِ عظیم کے لیے) اپنی کچھ اولاد کو، تیرے واجب الاحترام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے (اسے "تیرا گھر" اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہو کر، عالمگیر انسانیت کی مشترکہ جائے امن ہے) یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں۔

میں نے یہ سب اہتمام اس لیے کیا ہے کہ میری اولاد نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرے۔ یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں۔ سو اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ایسا کر دے

کہ (ان تمام، بظاہر، نامساعد حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز، تو ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق فراہم کر دے (۲/۱۴)، تاکہ (یہ معیشت کی طرف سے مطمئن ہو کر، اس مقصد کے حصول کے لیے، ایسے جذب و انہماک سے کام کریں کہ) ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔

رزق کی دُعا کے متعلق مطالبُ الفرقان۔ جلد سوم (صفحہ ۱۶) دیکھئیے اور انڈکس میں "قرآن کا معاشی نظام" وہاں آیۂ زیرِ نظر بھی آگئی ہے۔

اس آیت میں دو ایک اور اہم نکات بھی آئے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ (۱) اس شہر میں امن و امان قائم رہے۔ اور (۲) رزق کی طرف سے انھیں اطمینان ہو۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ۔ تاکہ وہ اقامتِ صلوٰۃ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس سے مراد (جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے) نماز پڑھنا ہی ہے تو اس کے لیے ان شرائط کی ضرورت نہیں۔ نماز تو ہر حال میں پڑھی جا سکتی ہے۔ بلکہ حالتِ خوف اور افلاس میں لوگ زیادہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ اس سے مراد نظامِ خداوندی قائم کرنا ہے (تشریح اس کی انڈکس میں صَلٰوۃ کے عنوان میں ملے گی)۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۲/۱۱۰)

اور اگلی بات یہ ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ ہمارے ہاں شکر کا جو مفہوم لیا جاتا ہے (یا اللہ تیرا شکر!) ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی ان شرائط کی ضرورت نہیں۔ شکر کے مفہوم کے لیے (دیکھیے مطالبُ الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۲۶۳) آیۂ زیرِ نظر سے بھی اس مفہوم کی مزید تشریح ہوتی ہے۔ یعنی انھیں امن و سکون، خوشحالی اور فارغ البالی میسر ہو تاکہ جس بلند مقصد کے لیے وہ سرگرم ہوں، اس میں ان کی محنت بھرپور نتائج پیدا کر سکے۔ اگر نہ معاشرہ میں امن ہو نہ رزق کی طرف سے اطمینان، تو انسان کوئی کام دلجمعی سے نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کی مساعی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ سعدیؒ تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اور یہ کہ صبح میں جب نماز کے لیے کھڑا ہوا تو دل اس پریشانی میں مبتلا رہا کہ — چہ خورد بامداد فرزندم؟ — اس کے بعد عرض کیا کہ بارِ الہا! جو کچھ میں گزارش کر رہا ہوں یہ محض میرے دل کی آواز ہے اور تو اسے خوب جانتا ہے۔

۱۴/۳۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى
عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۳۸

اے ہمارے پروردگار! جو کچھ ہمارے دلوں کے اندر ہے اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں، تجھ پر سب روشن ہے (اور ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کچھ بھی ایسا نہیں جو تجھ سے پوشیدہ ہے (اس لیے تو یہ بھی جانتا ہے کہ جس نظام کی ابتداء اس چھوٹے سے پیمانے پر ہمارے ہاتھوں کرائی جا رہی ہے، اس کا مستقبل کیا ہونے والا ہے)۔

مستقبل کے لیے جو کچھ مانگا، اس کے ساتھ ہی بارگاہِ خداوندی میں ان نوازشاتِ کریمانہ کا شکریہ بھی ادا کیا جو ماضی میں ان کے حال پر ارزانی ہوتی تھیں۔ فرمایا:

۱۴/۳۹ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ
وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝۳۹

(میں اس کے مستقبل کے متعلق بڑا پُرامید ہوں۔ اس لیے کہ یہ کچھ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کہ حالات کی نامساعدت کے باوجود، تیری عنایات سے وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی انسان کو عام طور پر، توقع نہیں ہو سکتی۔ مثلاً) تو نے مجھے، میری کبر سنی میں (جبکہ میں اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا) اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ جیسے بیٹے عطا کیے جو تیری حمد و ستائش کے زندہ پیکر ہیں۔ لہٰذا مجھے پورا پورا یقین ہے کہ میرا خدا، میری دعا کو ضرور شرفِ قبولیت عطا کرے گا۔

اور دعا وہی ہے جو پہلے مانگی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بارِ دیگر پیشِ خدمت کر دیا۔

۱۴/۴۰ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَ
تَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝۴۰

اس دعا کو، کہ وہ مجھے اور میری اولاد کو اس قابل بنا دے کہ ہمارے ہاتھوں نظامِ صلوٰۃ قائم ہو جائے، اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو میری اس آرزو کو ضرور پورا کر دے۔

اور اس کے ساتھ ہی

۱۴/۴۱ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

نیز میری یہ بھی دعا ہے کہ مجھسے، میرے ماں باپ سے اور دوسرے مؤمنین سے، اگر کوئی چھوٹی موٹی
کوتاہیاں ہو جائیں تو ظہورِ نتائج کے وقت ہم ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں (۱۱/۹۰)

باپ کے لیے دُعائے مغفرت کے سلسلے میں، مطالبُ الفرقان، جلد ششم میں زیر آیت (۱۱/۹۰) دیکھیے۔ نیز وہ حوالے جو اُوپر مفہوم میں دیے گئے ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے قرآن کریم ان داستانوں کو تاریخی کوائف وحوادث کے طور پر بیان نہیں کرتا، ان سے مقصد عبرت و موعظت اور تذکیر و تنذیر ہوتی ہے۔ جس مقصد کے لیے داستانِ ابراہیمؑ کو اس مقام پر دہرایا گیا ہے، آئندہ آیت میں یوں واضح کر دیا کہ:

۱۴/۴۲ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلًا عَمَّا یَعۡمَلُ الظّٰلِمُوۡنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُہُمۡ لِیَوۡمٍ تَشۡخَصُ فِیۡہِ الۡاَبۡصَارُ ﴿ۙ۴۲﴾

(ان آرزوؤں اور التجاؤں کے ساتھ، ابراہیمؑ نے اس نظام کی ابتداء کی تھی جس کی تکمیل کے لیے اے رسول! اب تم اُٹھے ہو، اس لیے) تم یہ خیال نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، ہم اس سے بے خبر ہیں۔ (ہمارا قانونِ مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے) لیکن یہ وقفہ مُہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جائے گا اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ان کے ڈھیلے باہر نکل آئیں گے۔

میدانِ کارزار میں شکست کھانے کے بعد ان کی حالت یہ ہو گی کہ:

۱۴/۴۳ مُہۡطِعِیۡنَ مُقۡنِعِیۡ رُءُوۡسِہِمۡ لَا یَرۡتَدُّ اِلَیۡہِمۡ طَرۡفُہُمۡ ۚ وَ اَفۡـِٕدَتُہُمۡ ہَوَآءٌ ﴿ؕ۴۳﴾

افراتفری کا یہ عالم ہو گا کہ یہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر، مُنہ اُٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ (سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ) ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل

امید سے خالی ہو جائیں گے۔ یاس انگیز جذبات ان پر بُری طرح سے چھا جائیں گے۔
اس وقت یہ لوگ، جو اس قدر سرکشی اختیار کر رہے ہیں، یوں ذلیل و خوار ہوں گے۔

۱۴/۴۴ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾

اے رسول! تو ان مخالفین کو تباہی کے اس قسم کے ہولناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اُس وقت یہ سرکش اور مستبد لوگ، خدا سے گڑگڑا کر التجا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت دیدے ہم تیری دعوت قبول کر لیں اور تیرے رسول کی پیروی کریں گے۔
ان سے کہا جائے گا کہ تم اس سے پہلے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ ہماری قوتوں کو زوال نہیں آسکتا (اب دیکھو کہ زوال کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے آیا کرتا ہے؟)

اُنھیں یاد دلایا جائے گا کہ:

۱۴/۴۵ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

تم ان لوگوں کی بستیوں میں بسے تھے جنھوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی تھی۔ ہم نے تمہیں اُن کے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ہمارا قانونِ مکافات اس قسم کے لوگوں سے کیا کیا کرتا ہے۔ نیز اور بھی طرح طرح کی مثالوں سے تم پر حقیقت واضح کر دی تھی۔

اور یہ بھی کہ:

۱۴/۴۶ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

ہم نے تمہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُن لوگوں نے نظامِ خداوندی کی مخالفت کے لیے طرح طرح کی چالیں چلیں — ایسی چالیں کہ اُن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں — لیکن ہمارے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں ان کی کوئی چال کارگر نہ ہو سکی۔

اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ:

۱۴/۴۷ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ﴿۴۷﴾

لہٰذا، تم اس زعم میں نہ رہو کہ خدا اپنے پیغامبروں سے (جو اس انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں) وعدہ خلافی کرے گا (اس کی ہر بات پوری ہو کر رہے گی) اس لیے کہ وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہر غلط عمل کی سزا مل کر رہتی ہے۔ اس سے کوئی اِدھر اُدھر نہیں بھاگ سکتا۔

"خدا کے انتقام" کے مفہوم کے لیے مطالب الفرقان۔ جلد چہارم صفحہ ۶ دیکھیے؛

اس تصادم کے بعد جو انقلاب آئے گا اُسے قرآن نے چار لفظوں میں اس جامعیت اور حسن و خوبی سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ شعور اور ذوق دونوں اس پر وجد کرتے ہیں۔ فرمایا:

۱۴/۴۸ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

(اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میری اس دعوت سے ایسا انقلاب آئے گا کہ) یہ زمین ایک دوسری زمین بن جائے گی۔ آسمان اور آسمان ہو جائے گا[1]۔ یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ موجودہ معاشرہ کی

---

[1] اگر ان الفاظ سے (مجازی نہیں بلکہ) حقیقی معانی لیے جائیں تو اس سے مفہوم وہ کائناتی (طبیعی) انقلاب ہوگا جو کسی وقت آئے گا۔ اس کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو نبی اکرمؐ کے ہاتھوں، اس معاشرہ میں رُونما ہوا اور جس نے سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس اعتبار سے ہم نے ان الفاظ کے مجازی معنی لیے ہیں۔

کی جگہ ایک نیا معاشرہ وجود میں آجائے گا اور تمام لوگ اس خدا کے سامنے اُبھر اور نکھر کر آجائیں گے جس کے قانون کے سامنے اور کسی کا قانون نہیں چل سکتا، اور جو بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

معاشرہ میں ممکن اِنقلاب کا نقشہ کس جامعیت سے کھینچا گیا ہے۔ یعنی اس سے باطل کے سابقہ نظام کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔ یہ تو حصّہ لَآ ہوگا۔ اس کی جگہ حق کا نظامِ نو متمکن ہو جائے گا۔ یہ حصّہ اِلَّا ہوگا ۔ خاک باخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ۔ دوسرے مقامات پر (انبیاء سابقہ کے سلسلہ میں) کہا تھا۔ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۔ (۱۱/۸۲ ؛ ۱۵/۷۴) " اسے تہ و بالا کر دیا گیا تھا"۔ لیکن حضورؐ خاتم النبیینؐ کے ہاتھوں جو انقلاب آیا، اس سے " یہ زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا"۔ آپ دُنیا کے غیر مُسلم مؤرخین سے پوچھئے۔ وہ بھی بتائیں گے کہ اس انقلاب کی رُو سے زمین اور آسمان کس طرح بدل گئے تھے۔ یہ پیوندسازی نہیں تھی، تعمیرِ نو تھی ۔ تجدید نہیں تھی، تاسیس تھی۔ قرآن انقلاب کی دوسرے معاشرہ سے مفاہمت یا مصالحت نہیں کرتا، وہ اُسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ یکسر نیا معاشرہ قائم کرتا ہے۔ لَآ اِلٰـہَ کی رُو سے تو ہر نظامِ کہن کی بنیادی اینٹوں تک کو اُکھیڑ پھینکنا ہوتا ہے۔

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند ؏ اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

یہی قرآن کے انقلابِ اوّلیں کے وقت ہُوا تھا۔ یہی اُس قوم کو کرنا ہوگا جو بارِ دگر قرآنی انقلاب برپا کرنے کا تہیہ کرے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :

یا بکُش در سینۂ من آرزوئے انقلاب ؏ یا دگرگوں کُن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چُناں کُن یا چُنیں !

(زبورِ عجم۔ صہ ۳۵)

اس سے بھی آگے :

کافرا دل آوارہ دگر بارہ باو بند ؏ برخویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

باطل معاشرہ میں اِصلاحِ احوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اصلاح نہیں ہوتی، اس کا استیصال ہوتا ہے۔ جبھی تو اس کی جگہ ایک نیا معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ جو لوگ باطل معاشرہ کو اصلاحات کی

رُو سے "اسلامی" بنانے کی سعیٔ لاحاصل کرتے ہیں، اُن کی کوششیں کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ ۵

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے　　شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اس انقلاب کی رُو سے، سابقہ زمین کی جگہ نئی زمین آجائے گی اور سابقہ آسمان کی جگہ نیا آسمان۔ وہ زمین جو ربوبیتِ خداوندی کے نورسے جگمگا اُٹھے گی:

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹)

۱۴/۴۹—۵۰ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

اُس دن، تو ان مجرمین کو دیکھے گا (جو اس وقت یوں سرکشی اختیار کر رہے ہیں) کہ یہ (جنگی قیدیوں کی شکل میں)، زنجیروں میں جکڑے جا رہے ہوں گے۔

ان کی زرہیں، جو انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے پہنی تھیں، تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر، ان کے لیے وبال جان بن رہی ہوں گی۔ ان کے چہرے، جنگ کی آگ سے جھلسے ہوئے ہوں گے۔

یہ کچھ ظلم و استبداد کی رُو سے نہیں ہوگا (جیسا کہ دنیاوی انقلابات میں ہوتا ہے) یہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوگا۔

۱۴/۵۱ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

یہ سب اس لیے ہوگا کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قانون، اعمال کا محاسبہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتا۔ وہ بہت تیز واقع ہوا ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا:

۱۴/۵۲ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا

هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ تمام حقائق اور واقعات اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ:

۱۔ ان کی روشنی میں انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔

۲۔ لوگ آگاہ ہو جائیں کہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوتا ہے۔

۳۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کائنات میں اقتدار اور اختیار صرف خدا کا ہے کسی اور کا نہیں — اور

۴۔ صاحبانِ عقل و بصیرت ان حقیقتوں کو سامنے رکھیں جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور ان سے عبرت حاصل کریں۔

مفہوم پوری پوری تشریح کر رہا ہے۔ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

اختتام — سُوْرَۂ ابراھیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چودھواں پارہ ——— پندرہویں سورۃ

سورۃ الحجر (۱۵)

باب چہارم

سُورَۃُ الحِجر

قرآنی اِنقلاب آیا ہی چاہتا ہے

- قرآنی انقلاب آیا ہی چاہتا ہے جس کے بعد انکار کرنے والے حسرت میں رہیں گے۔
- تباہ ہونے والی اقوام حیوانی سطحِ زندگی پر جی رہی ہوتی ہیں، تاہم ان کی تباہی سے پہلے انہیں مہلت کا وقفہ ملتا ہے۔
- قرآن کی حفاظت کا ذمّہ اس کے نازل کرنے والے نے لے رکھا ہے۔
- ماضی میں بھی ہدایتِ خداوندی لانے والے رسولوں کا استہزاء کیا گیا۔
- قرآن آ جانے کے بعد علم و یقین کا ایک چمکتا ہُوا شعلہ ہر قیاس و تخمین کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔
- ارض و سمٰوٰت میں ہر جگہ نظامِ ربوبیّت کارفرما ہے۔
- زندگی اور موت خدا کے قانون کے مُطابق ملتی ہے۔
- سامانِ زیست بھی قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔
- کشمکشِ حیات میں عرُوج، خدا کے عطا فرمودہ صراطِ مستقیم پر چلنے سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس اصُول کی وضاحت کے لیے قصّۂ ابلیس و آدم کی مثال۔
- قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی سے بچنا ممکن نہیں۔
- قوموں کا عروج و زوال اور استخلاف و استبدال بھی اسی قانون کے تابع ہے۔
- حضرت ابراہیمؑ اور قومِ لُوطؑ کی مثالیں۔
- قومِ لُوطؑ جنسی بدنہادی کے سبب تباہ ہُوئی۔
- 'اصحاب الایکہ' حدُود فراموشی اور 'اصحاب الحجر' قوانینِ خداوندی سے اعراض کے سبب اپنی ہستی کھو بیٹھے۔
- اُن کی تباہ شدہ بستیوں کے آثار ان کی تباہی کی مُنہ بولتی تصاویر ہیں۔
- اقوامِ سابقہ کی تاریخ اور قرآن کے حقائق اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآنی انقلاب برپا ہو کے رہے گا۔
- اگرچہ ابتداء میں لوگ ساتھ نہیں دیتے اور قرآنی حقائق کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔
- داعیٔ انقلاب کو صبر و استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہنے کی تلقینِ خداوندی۔

باب چہارم

سُورَۃُ الْحِجْرِ

پندرھویں سُورۃ

اَصْحَابُ الْحِجْرِ کے الفاظ اس سورۃ کی آیت (۸۰) میں آئے ہیں۔ اسی سے اس کا نام اَلْحِجْر ہے۔ یہ قومِ ثمود کا دارالخلافہ تھا جس کا تفصیلی تذکرہ مطالبُ الفرقان، جلد پنجم (صفحہ ۲۶۵-۲۴۹) میں آچکا ہے۔ نیز جلد ششم (سُورۃ الاعراف میں)۔ اس داستان کے جو کوائف پہلے آچکے ہیں، ان کے حوالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ تشریح ان نکات کی، کی جائے گی جو اس میں پہلی بار آئیں گے۔ سورۃ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱/۱۵) الٓرٰ قف تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ وَقُرۡاٰنٍ مُّبِيۡنٍ ①

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ اُس ضابطہ خداوندی یعنی قرآن کریم کی آیات ہیں جو اپنے مطالب کو بڑے واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔

قرآن کریم کو بیشتر مقامات میں کِتابِ مُبِین کہا گیا ہے۔ یعنی خود بھی واضح اور ہر متعلقہ بات کو واضح طور پر بیان کرنے والی۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن اپنے مطالب آپ واضح کرتا ہے۔

اس سورۃ کی اس پہلی آیت سے سابقہ پارہ (۱۳) ختم ہوجاتا ہے اور اگلی آیت سے چودھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

چودھواں پارہ

۱۵/۲ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝٢

(اے رسول! اب یہ انقلاب اپنے فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے بعد) یہ لوگ، جو اس کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں، اس حسرت میں رہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی اسے تسلیم کر لیتے۔

قرآنی تعلیم کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس کشمکش میں حق کی علمبردار جماعت کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخر الامر حق غالب آتا ہے اور باطل ناکام رہ جاتا ہے۔ اس میں البتہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس میں باطل کے پرستار اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فتح و کامرانی انہی کے حصے میں آئے گی۔ لیکن اس وقفہ کے ختم ہو جانے پر وہ خاسر و نامراد رہ جاتے ہیں اور اس وقت انہیں اس کا افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے شروع ہی سے اس حقیقت کا اندازہ کیوں نہ لگا لیا اور حق کی مخالفت کر کے خواہ مخواہ اس قدر نقصان اٹھایا۔

۱۵/۳ ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝٣

(اس وقت) تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے، کہ یہ زندگی کی حیوانی سطح پر (۴۷/۱۲) کھائیں، پئیں اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھائیں (اس لیے کہ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔ یہ انہی مشاغل میں اُلجھے رہیں اور اس طرح) ان کی لمبی چوڑی آرزوئیں (۱۰۲/۱) انہیں (زندگی کے بلند مقاصد سے) غافل رکھیں۔ وہ وقت دُور نہیں کہ انہیں اپنی اس غلط روش کے انجام کا علم ہو جائے گا۔ (ابھی مُہلت کا وقفہ ہے)

قرآنِ حکیم دو نظریات، دو ذہنیتوں، دو مسالک اور ان کی بنیادوں پر انسانوں کے دو گروہوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی، اس کے جسم کی طبیعی زندگی ہے جسے طبیعی قوانین کے تابع بسر کیا جاتا ہے۔ کھایا، پیا، افزائشِ نسل کی، اور موت آنے پر مر گئے۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے، جسے کفر کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (۴۷/۱۲)۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اس کے جسم کی زندگی ہی نہیں،

جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات (نفس) کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش اور نشوونما طبیعی قوانین کے تابع ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما قوانینِ خداوندی (ابدی اقدارِ الٰہیہ) کی رُو سے ہوتی ہے۔ انسانی اعمال کے نقوش اس کی ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ موت سے انسان کا جسم تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات آگے بھی جاتی ہے۔ اسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔ حق و باطل کی کشمکش درحقیقت انہی دو نظریاتِ حیات کی کشمکش ہے۔ اقوامِ سابقہ کی داستانیں (جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں)، اس کے اسی دعویٰ کی شہادت ہیں۔ فرمایا:

۱۵/۴ وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴﴾

اور (ان سے پہلے بھی) ہم نے کسی قوم کو، ان کی مہلت کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے تباہ نہیں کیا۔

یہ وقفہ، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں (۱۳/۳۸)

مُہلت کا وقفہ، قوموں کے اعمال، یعنی اُن کی زندہ رہنے کی صلاحیت کی نسبت سے متعین ہوتا ہے لیکن وہ (دیگر قوانینِ خداوندی کی طرح)، ہوتا ایسا اٹل ہے کہ اس میں ذرا کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ سُورۃ الاعراف ... کی آیت (۷:۳۴) اور سُورۃ الرّعد کی آیت (۱۳:۳۸) میں اس نکتہ کی وضاحت کی جا چکی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ:

۱۵/۵ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ﴿۵﴾

ہمارا یہ قانونِ مہلت اس قدر اٹل ہے کہ نہ کوئی قوم اس وقفہ سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد زندہ رہ سکتی ہے۔ (غلط روش کے نتائج ٹھیک اپنے وقت پر ظہور میں آتے ہیں)

لیکن مُہلت کے وقفہ میں یہ بات کسی قوم کی سمجھ میں بمشکل آ سکتی ہے کہ اس کی روش اور نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ جب ایک قوم، قوّت و شوکت اور دولت و حشمت کے اوجِ کمال پر ہو، اس سے کہنا کہ وہ تباہ ہو جائے گی، اس کے لیے ناقابلِ فہم ہوگا۔ ایسا کہنے والے کے متعلق وہ اس کے سوا اور کیا کہے گی کہ وہ پاگل ہے۔ سابقہ اقوام میں سے ہر قوم نے ایسا ہی کیا۔ یہی کچھ حضور نبی اکرمؐ کے ساتھ ہوا۔ آپؐ نے جب اپنی قومِ مخاطب سے کہا کہ ——— تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ ——— تو:

۱۵/۶ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶

(اس وقت یہ لوگ خوابِ غفلت میں پڑے ہیں اور اُن کے نشۂ قوت کی بدمستی کا یہ عالم ہے کہ)
یہ کہتے ہیں کہ "اے وہ، جس پر یہ قرآن نازل ہو رہا ہے، تو پاگل ہے۔"

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، ہر رسُول کے متعلق یہی کہا گیا۔ (دیکھیے: ۲۶/۲۷ ؛ ۳۷/۳۶ ؛ ۴۴/۱۴ ؛ ۵۱/۳۹ ؛ ۶۴/۵۱)۔ سورۃ (۵۱/۵۲) میں جامع طور پر بتایا گیا کہ ہر رسُول کے ساتھ یہی ماجرا گزرا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں خود خدا نے اس الزام کی تردید کر دی۔ (۵۲/۲۹ ؛ ۶۸/۲-۵۱ ؛ ۸۱/۲۲)

اور پھر وہی مُطالبہ کہ اگر تم خدا کے رسُول ہو تو معجزہ دکھاؤ۔

۱۵/۷ لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷

"اور اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئے۔"

معجزہ کے مطالبہ کے سلسلہ میں، انڈکس میں "معجزات" کا عنوان دیکھیے۔ جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے، مطالبُ الفرقان۔ جلد دوم (صفحہ ۶۶) پر بتایا جا چکا ہے کہ ان سے مراد وہ قوتیں ہیں جو مُدبّراتِ امُورِ الٰہیہ اور مؤثراتِ قوانینِ خداوندی ہیں۔ ہم اُن کی کنہ و حقیقت کے متعلق تو کچھ نہیں جان سکتے البتہ قرآنِ حکیم نے ان کے مناصب اور فرائض کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح تدبیرِ امُور کرتے اور قوانینِ خداوندی کو مؤثر بناتے ہیں۔ اس مقام پر سلسلۂ کلام یُوں چلا آ رہا ہے کہ اس (قومِ مخالف) کی غلط روشِ زندگی کا نتیجہ ان کی تباہی ہو گی جو مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد وارد ہو گی۔ اس تباہی کے وارد ہونے کو ملائکہ کی طرف منسُوب کیا گیا۔

۱۵/۸ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸

(اے کاش! ان کی سمجھ میں یہ بات آ سکتی کہ) ہم ملائکہ کو یونہی نازل نہیں کیا کرتے۔ وہ اُس وقت نازل ہُوا کرتے ہیں جب نتائج کے حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آنے کا وقت آ جائے۔ (وہی حق و باطل کی کشمکش کا آخری مرحلہ ہوتا ہے) اس کے بعد پھر کسی کو مہلت نہیں مِلا کرتی۔

اس موضوع کا تسلسل تو آگے بھی برقرار رہے گا لیکن درمیان میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کا بڑا گہرا تعلق قرآن کے ہر دعویٰ کے ساتھ ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہر قوم کے نظامِ حیات کا انجام ان قوانین کے

مطابق ہوتا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ چونکہ قرآن ایک مستقل ابدی ضابطۂ حیات ہے اس لیے اس کے متعلق یہ وضاحت ضروری تھی کہ یہ مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس میں نہ کسی حک و اضافہ کی ضرورت ہوگی، نہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس حقیقت کو (۶/۱۱۶) میں واضح کر دیا۔ ایک ابدی ضابطۂ حیات کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔ اس کا اعلان اگلی آیت میں کر دیا:

۱۵/۹ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹

اس قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے (اس لیے اس کا ہر وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔ اور چونکہ اسے تمام نوعِ انسان کے لیے، ہمیشہ کے لیے، ضابطۂ ہدایت بن کر رہنا ہے، اس لیے ہر طرح سے اسے مکمل کر دیا گیا ہے۔ اس میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ۶/۱۱۶) اس لیے ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکے گی۔

یہ تینوں خصوصیات (مکمل، غیر متبدل اور محفوظ) قرآن کے ساتھ مختص ہیں۔ مذاہبِ عالم میں سے کسی مذہب کی مبینہ آسمانی کتاب میں اس کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی مذہب کا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ جس کتاب کو وہ (اپنی) الہامی کتاب کہتے ہیں وہ وہی ہے جو ان کے بانیٔ مذہب نے انہیں دی تھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب — مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی — میں ملے گی)۔ ان کے برعکس قرآن کے اس دعویٰ کو کہ وہ غیر محرف اور محفوظ ہے، غیر مسلموں تک تسلیم کرتے ہیں۔ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے نبیِ اکرمؐ نے یہ کہہ کر اُمت (بلکہ عالمِ انسانیت) کو دیا کہ یہ ان پر بذریعہ وحی (خدا کی طرف سے) نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن کی منفرد خصوصیت ہے اور ختمِ نبوت کی ایک محکم دلیل یہ بھی ہے۔ جب ایک منزل من اللہ کتاب اپنی مکمل اور غیر محرف شکل میں موجود ہو، اور اس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہو، نہ تبدیلی کی، تو کسی رسول کے آنے کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی مطالبُ الفرقان کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔)

اس کے بعد پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

۱۵/۱۰-۱۱ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِىۡ شِيَعِ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝۱۰ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۱۱

(اور تم کوئی نئے رسول نہیں ہو، ہم نے، تم سے پہلے بھی، مختلف گروہوں کی طرف رسول بھیجے

تھے۔ لیکن جو رسول بھی آیا، لوگوں نے اس سے (اسی طرح) مذاق کیا (جس طرح یہ تم سے مذاق کرتے ہیں۔ لہٰذا تمہارے لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں)

آیت (۱۵/۶) میں کہا تھا کہ انبیاء کو مجنون کہا گیا۔ یہاں کہا ہے کہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اُڑایا گیا (مثلاً ۴۳/۷؛ ۳۶/۳۰) مخالفت میں یہ حرکت انتہائی ذلیل اور کمینہ ہوتی ہے لیکن قوت کا نشہ ہر جوہرِ انسانیت اور ہر رمقِ شرافت کو سلب کر لیتا ہے۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ یہ کسی خاص مجرم یا مجرم قوم کے ساتھ مختص نہیں ہیں۔ یہ تمام مجرمین کی مشترکہ نفسیاتی کیفیت ہے۔

۱۵/۱۲ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾

یہ سب مجرمین کی مشترکہ نفسیاتی کیفیت ہے (کہ وہ اپنی قوت کے نشہ میں، دلائل و براہین کا جواب استہزاء اور استخفاف سے دیتے ہیں)۔

اس نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ نہ اقوامِ سابقہ کے مجرمین پیغاماتِ خداوندی پر ایمان لاتے تھے اور نہ ہی نبی اکرمؐ کی قومِ مخالف، قرآن پر ایمان لائے گی۔ ایمان کے لیے مقدم شرط نفسیاتی تبدیلی ہوتی ہے۔

۱۵/۱۳ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

یہی کیفیت تمہاری قوم کی ہے۔ یہ بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے (اور جو کچھ پہلے لوگ کرتے رہے وہی کچھ یہ بھی کریں گے۔)

باقی رہا ان کا معجزات کا مطالبہ، سو واقعہ یہ ہے کہ جس ذہنیت کے یہ حامل ہیں اُس کی رُو سے یہ کوئی خارقِ عادت واقعہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۵/۱۴-۱۵ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

(یہ کہتے ہیں کہ اگر تو اپنے دعویٰ رسالت میں سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتے لے آ۔ یہ ان کی محض کٹ حجتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ) اگر ہم ان کے سامنے، آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اُس میں چڑھنے بھی لگ جائیں (تو بھی یہ ایمان نہ لائیں)۔ اُس وقت یہ کہنے لگ جائیں کہ ہماری نگاہ

بند کر دی گئی ہے یا ہم پر جادُو کر دیا گیا ہے۔ (ایمان لانے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن پر غور و فکر کیا جائے، نہ یہ کہ اس قسم کی خارقِ عادات باتوں کا تقاضا کیا جائے)۔

(انڈکس میں معجزات کا عنوان دیکھیے)

———— (۰) ————

شعُورِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں مظاہرِ فطرت کی کُنہ و حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ وہ اُن کے جلال سے اس قدر مرعوب اور اُن کے جمال سے ایسا مسحُور ہُوا کہ انہیں اپنا معبُود بنا لیا اور ان کی پرستش شرُوع کر دی۔ اس کی ان تمام توہّم پرستیوں میں سب سے زیادہ تباہ کُن عقیدہ یہ تھا کہ ہر ایک انسان کا ایک ستارہ ہے جس کے ساتھ اس کی قسمت وابستہ ہے۔ یہ عقیدہ اس لیے تباہ کُن تھا کہ اس سے انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی بجائے مجبور و مقہور ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی تقدیر کسی موہُوم قوّت (ستارہ) کے تابع ہو، اس سے زیادہ مجبور اور کون ہو گا؛ پجاریوں کی موج تھی۔ ہر معبد (پرستش گاہ) میں نجومی براجمان رہتے تھے جن کے گرد قسمت کا حال پوچھنے والوں (بالخصوص پوچھنے والیوں) کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ یہ کہہ کر کہ وہ عالمِ افلاک میں جا کر بزمِ ستارگان کی تمام کیفیت معلوُم کر کے آتے ہیں، ان توہّمات کی گرہیں مضبُوط کرتے رہتے تھے۔ قرآن آیا اور اس نے ہر قسم کی توہّم پرستی کی تاریکی کو علم و بصیرت کی روشنی میں بدل دیا۔ اُس نے مظاہرِ فطرت اور اجرامِ فلکی کی اصل و حقیقت کو بے نقاب کر کے کاہنوں اور منجّموں کی دسیسہ کاریوں کے پردے چاک کر دیئے (انڈکس میں فطرت کا عنوان دیکھیے)۔ اس نے ستاروں کے متعلق کہا:

(۱۵/۱۶—۱۷) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

(باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ اس قسم کی باتیں جو قرآن میں بیان ہوتی ہیں، ان کو کاہن اور نجومی علمُ النجوم — ستاروں کے علم — کی رُو سے بھی بتا سکتے ہیں تو ستاروں کی کیفیت یہ ہے کہ) ہم نے فضا کی بلندیوں میں اُبھرے ہوئے کُرّے پھیلا رکھے ہیں اور اُن سے روشنی منعکس ہوتی ہے تو دیکھنے والوں کو بڑے خوشنما نظر آتے ہیں۔ اور انہیں ہم نے ہر قسم کی تخریبی قوتوں سے محفوظ رکھا ہے (اسی لیے تو یہ عظیم کارگہِ کائنات، اس نظم و ضبط اور حُسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ ہے ستاروں

کی حقیقت جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کی گردش سے انسانی مقدرات اور واقعات کے متعلق پیش گوئیاں کی جا سکتی ہیں۔)

اور کاہنوں اور منجّموں کے متعلق کہا کہ ان کے یہ فریب' دورِ جہالت میں تو چل جاتے تھے۔ اب (نزولِ قرآن سے) علم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اب ان کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ اُس نے اپنے مخصوص تشبیہی انداز میں کہا:

15/18 اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۸﴾

(ان پیش گوئیوں کی بھی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں کہ یہ) محض ان کی قیاس آرائیاں ہیں۔ (یہ قیاس آرائیاں اُس زمانے میں تو چل سکتی تھیں جب علم کی روشنی اس قدر عام نہ تھی۔ اب قرآن کے بعد، ان کا دور ختم ہو گیا) اب ہر قیاس و تخمین کے پیچھے علم و یقین کا ایک چمکتا ہُوا شعلہ موجود ہے جو اُس کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

($\frac{۲۹}{۲۱۰-۲۱۲}$; $\frac{۳۷}{۸-۹}$; $\frac{۵۲}{۳۸}$; $\frac{۷۶}{۵}$; $\frac{۷۲}{۸-۹}$)

قرآنِ کریم کی اس نظری تعلیم کی عملی تشریح حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ نے کر دی۔ یہ عقیدہ عام تھا کہ جب کسی عظیم انسان (سردارِ قوم) کی وفات ہوتی ہے تو چاند اور سُورج کو گہن لگتا ہے۔ حضورؐ کے ایک صاحبزادے کی وفات صِغرسنی میں ہوئی تو اتفاق سے اس دن سُورج کو گرہن لگ گیا۔ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ ایسا آپؐ کے بیٹے کی وفات کی وجہ سے ہُوا ہے۔ آپ کو معلوم ہُوا تو فرمایا کہ چاند یا سورج کو گہن قوانینِ خداوندی کے مُطابق لگتا ہے۔ اس کا کسی کی موت یا حیات سے کوئی تعلق نہیں (بخاری۔ کتابُ الکسوف) یوں حضورؐ نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ دی۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ایک ثانیہ کے لیے رُکیے اور سوچیے کہ قرآن نے ان توہمات کے بُتوں کو کس طرح توڑا تھا اور ہم (مسلمانوں) نے ـــــ ان بتوں کے پاشیدہ ٹکڑوں کو اپنی مشرکانہ عقیدت سے اُٹھا کر کیسے جوڑا اور اپنے "اسلامی عقاید" کے محرابوں میں سجایا۔ اس نے نجوم (ستاروں کے ساتھ انسانی قسمت کی وابستگی) کو توہم پرستی اور منجّموں کو باطل پرست قرار دیا تھا۔ ہم نے اسی نجوم کو حقیقی علم اور اس کی بنا پر پیش گوئیوں اور تقدیر کو اپنا عقیدہ بنا لیا جس سے انسان مجبورِ محض بن کر رہ گیا (انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھیے) ہمارے دور میں علامہ اقبالؒ نے تقدیر (جبر) کے باطل عقیدوں کی تردید میں بڑی کثرت سے لکھا ہے اور ہر اُس عقیدہ یا

نظریہ کو جس سے اِنسان کے صاحبِ اختیار ہونے پر کسی نوع سے بھی حرف آتا ہو، باعثِ تذلیلِ انسانیت قرار دیاہے۔ اس نے کہاہے کہ انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ حیوان، اپنی جبلّت کی رُو سے مجبور ہوتا ہے اِنسان صاحبِ اختیار ہوتا ہے ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات		اِنسان فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

وہ احکامِ الٰہی کی پابندی اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔ اس نے انسان سے کہا کہ تمھیں خالقِ فطرت نے آزادی عطا کی ہے کہ اپنی تقدیر آپ مرتب کرو۔

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ		خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اُس نے نجوم کی رُو سے قسمت دریافت کرنے والوں کے متعلق کہا ؎

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دیگا		وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اور منجموں کے متعلق کہا:

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے		کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

لیکن قرآن کچھ کہے اور اقبالؒ بیچارہ کتنا ہی چلائے، اس ملوکیت زدہ اُمت کو عقیدۂ جبر ہی راس آتا ہے "جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ کی طرف سے ہے، ہم اسے بدل ہی نہیں سکتے۔"

نہ آسماں بگردش و ما درمیانہ ایم		غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رَوَد

قرآن انسان کو جن بلندیوں پر پہنچاتا ہے اُس کے متعلق تو پوچھنا ہی کیا، جو دانشور اپنی بصیرت کی رُو سے مقامِ انسانیت کا کچھ اندازہ کر لیتے ہیں، انھیں بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ "مقدرات کے ستاروں" کی حقیقت کیا ہے۔ نیٹشے ایک جگہ کہتا ہے:

میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں سے میں اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر دیکھتا ہوں۔

اور ایک مردِ مومن پکار اُٹھتا ہے کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است		اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

وہ تھی قرآن کی تعلیم کا ماحصل — شرف و تکریمِ انسانیت — اور یہ ہے ہمارا مسلک!

آیت (۱۵/۱۸) میں اس نے ستاروں اور ستارہ شناسوں کی حقیقت کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دھرتی (زمین) کو ماتا (دیوی) اور پہاڑوں کو دیوتا ماننے والوں سے کہا کہ جنھیں تم اپنا معبود سمجھ رہے ہو، اُن کی اصل و حقیقت یہ ہے کہ:

۱۵/۱۹ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾

(حقیقت یہ ہے کہ یہ فضا اور اس میں تیرنے والے کُرّے، سب ہمارے نظامِ ربوبیت کے کَل پُرزے ہیں۔ بلندیوں کی طرف وہ کُرّے اور پستی کی طرف) زمین کا کُرّہ، جسے (گول ہونے کے باوجود) ہم نے پھیلا رکھا ہے اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ بنا دیے ہیں (جن سے دیگر فوائد کے علاوہ، زمین کی آب پاشی کے لیے واٹر ورکس کا کام لیا جاتا ہے۔ اس پانی کے ذریعے) ہم نے، زمین میں نہایت عمدہ توازن اور تناسب سے، تمام چیزیں اُگائیں۔

جیسا کہ ہم (مسلسل) واضح طور پر کہتے چلے آرہے ہیں، کہ قرآن نہ تاریخ کی کتاب ہے (جس وجہ سے وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتا ہے)، نہ علومِ سائنس کی کتاب (جس کے لیے وہ تخلیقِ کائنات، تخلیقِ انسان، علومِ فطرت، علمُ الافلاک، علمُ الارض، نباتات، جمادات وغیرہ سے متعلق علوم و فنون کا اس شرح و بسط سے ذکر کرتا ہے)، اُس کے سامنے ایک بنیادی مقصد ہے اور یہ تمام علوم، انسان کو اس مقصد کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ اس لیے ان کا ذکر کرتا ہے۔ آیاتِ زیرِ نظر میں اس نے اجرامِ فلکی، زمین، پہاڑ، نباتاتِ رُخیّۃ کا ذکر کرنے کے بعد کہا:

۱۵/۲۰ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور زمین کی اس پیداوار کو، تمہارے لیے وجہِ معاش (روزی کا سامان) بنایا۔ تمہارے لیے بھی اور اُس مخلوق کے لیے بھی جن کے لیے تم رزق مہیا نہیں کرتے۔

غور کیجیے۔ قرآنِ کریم نے نظامِ ربوبیت کی وسعتوں کو کس طرح چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ زمین (اور اُس کے مزروعات) مخلوق کے لیے ذرائعِ رزق ہیں۔ اس لیے کسی کو حق حاصل نہیں کہ اسے اپنی جائیداد

بنا کر بیٹھ جائے (انڈکس میں عنوان زمین دیکھیے) پھر کہا۔ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ ضمیر کُمْ میں تمام انسان آجاتے ہیں۔ لہٰذا، ان ذرائع رزق کا نظم و نسق اس انداز سے ہونا چاہیے کہ تمام انسانوں (لَكُمْ) کے لیے اس سے رزق مہیا ہو۔ اگر کسی انتظام میں کوئی ایک انسان بھی سامانِ زیست (رزق۔ معاش) سے محروم رہ جائے تو یہ منشائے خداوندی کے خلاف ہوگا۔ (انڈکس میں دیکھیے "قرآن کا معاشی نظام")

پھر یہ سامانِ زیست اِنسانوں تک محدود نہیں، اس میں تمام ذی حیات آجاتے ہیں (وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرٰزِقِيْنَ)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذرائع رزق کی وسعتیں محدود ہیں اور مخلوق بکثرت۔ پھر یہ مخلوق پھیلتی ہی جاتی ہے تو اس صورت میں یہ ذرائع اس مقصد کو کس طرح پورا کر سکیں گے؟ کہا کہ:

۱۵/۲۱ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

ہمارے پاس (کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں) ان چیزوں کے بے بہا ذخیرے ہیں (جو تمہارے لیے سامانِ زیست بنتی ہیں)، لیکن ہم انھیں ایک معیّنہ اندازے کے مطابق باہر لاتے ہیں (اس معیّنہ اندازے کا دوسرا نام قانونِ فطرت ہے)۔

خالقِ فطرت کے اس انتظام پر غور کیجیے۔ خشک زمین، کُرہ ارض کا قریباً پانچواں حصہ ہے۔ جب سے اس پر ذی حیات کی نمود ہوتی ہے، یہ ان سب کو رزق بہم پہنچاتی جاتی ہے۔ اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت (لامحدود نہیں تو) بے کنار ہے۔ اس میں سے رزق کی پیداوار قوانینِ فطرت کے مُطابق ایک خاص اندازے کے مُطابق ہوتی ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ یہ اپنے خزانے ایک ہی بار اُگل دیتا تو آنے والی نسلیں بھوکی مر جاتیں۔ علاوہ ازیں استحصالی قوتیں زمین پر قابض ہو کر اس میں سے رزق نکالنے لگتیں اور یہ سارے کا سارا رزق ان کے حوالے کر دیتی تو بقایا مخلوقِ خدا کا جو حشر ہوتا، ظاہر ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ انھیں بھی رزق حاصل کرنے کے لیے ہر بار جدّوجُہد کرنا پڑتی ہے۔

"بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" میں بھی ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ زراعت کے لیے بھی قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین کا علم جس قدر بڑھتا جائے گا (وہ بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ہوتا جائے گا) اس نسبت سے ارضی خزائن کی زیادہ نمود ہوتی جائے گی۔ سو سال پہلے اور موجودہ دور کی ارضی پیداوار میں کس قدر فرق ہے وہ انہی قوانین کے "معلوم"

ہونے (اور ان پر عمل کرنے) کا نتیجہ ہے۔ جو قومیں اس علم کو زیادہ سے زیادہ جس قدر حاصل کریں گی اور ان کے مطابق زراعت کریں گی، ان کے ہاں اسی قدر رزق کی ارزانی ہوگی۔

ذرائع رزق تنہا زمین تک محدود نہیں۔ اس کے ساتھ دیگر عناصر بھی تعاون کرتے ہیں جن کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

15/22 وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ﴿٢٢﴾

اس مقصد کے لیے، ہم ہوائیں چلاتے ہیں جو پانی کے بخارات سے لدی ہوتی ہیں (برعکس آندھیوں کے۔ 4/54) پھر ہم انہی بادلوں سے مینہ برساتے ہیں اور اس کا پانی تمہارے پینے کے کام آتا ہے۔

(یہ ذخائر ہمارے پاس رہتے ہیں، تمہارے پاس نہیں رہتے۔

اس کے بعد پھر ان نکات کی اہمیت واضح کر دی جن کے لیے ان تصریحات کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ افراد کی موت وحیات اور اقوام کا عروج وزوال ان ہی ذرائع کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسرے یہ کہ ان کے خالق بھی ہم ہیں اور مالک بھی ہم۔ حقیقی مالک، خالق ہی ہوسکتا ہے۔ فرمایا:

15/23 وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿٢٣﴾

اور (ہر شے کو ہمارے قانون کے مطابق) زندگی ملتی ہے اور اسی کے مطابق موت طاری ہوتی ہے۔

(ان تصریحات سے واضح ہے کہ کائنات میں جس قدر سامانِ زیست ہے، اُس کے) مالک ہم ہیں۔

(تم مالک نہیں ہو کہ اسے سمیٹ کر بیٹھ جاؤ (56/63-74)

سورۃ قٓ میں بھی ایک آیت انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ (50/43)

ہم تو اِس قسم کی آیات سے یونہی سرسری طور پر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن جن اہلِ علم حضرات کی نگاہیں گہرائیوں تک پہنچتی ہیں، وہ ان کے اسلوبِ بیان کو بھی قرآن کا معجزہ سمجھتے ہیں۔ (H.A.R. GIBB) عربی زبان کا سکالر اور ممتاز مستشرق ہے۔ اس نے ایک، بقامت کہتر لیکن بقیمت بہتر کتاب لکھی ہے (MODERN TREND IN ISLAM) اس میں اُس نے اس نکتہ پر بحث کی ہے کہ قرآن کریم کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ

نہیں ہو سکتا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو نہیں سکتا ۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے ...... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کی بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو۔ لیکن، بایں ہمہ، جو مدّ و جذر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش۔ اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ۵۰/۴۳

اور انگریزی ہی نہیں، دُنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھائیے۔ اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ مرتبہ "ہم" (WE) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟ (صفحہ ۴ ترجمہ رواں)

یہ ہے قرآن مجید کی پانچ پانچ، چھ چھ الفاظ پر مشتمل آیات کا اعجاز بیان۔ (میں نے اسی لیے قرآنِ کریم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم مرتب کیا ہے)۔ یہ حقیقت ہے کہ ترجمہ (خواہ کسی زبان میں ہو) قرآن کا مفہوم ادا کر ہی نہیں سکتا۔ کوئی اور زبان تو ایک طرف، خود عربی زبان کے مرادف الفاظ بھی قرآنی الفاظ کا مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں ایک مشہور تفسیر ہے ۔ جلالین ۔ اس میں قرآنی الفاظ کے مرادف الفاظ ساتھ کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ آپ کسی آیت کے قرآنی الفاظ کو دیکھیے اور اس کے بعد اُس کے مُرادف الفاظ کی رُو سے اس آیت کے "اصلی اور نقلی" کا فرق نکھر کر سامنے آجائے گا۔ میں نے اس موضوع پر، مفہوم القرآن. جلد اوّل کے شروع میں "تعارف" کے تحت تفصیلی بحث کی ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد آگے بڑھیے۔ یہ کہنے کے بعد کہ سامانِ زیست، جس کے ساتھ افراد اور اقوام کی موت و حیات وابستہ ہے، قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا:

۱۵/۲۴ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کون (اپنی ہنرمندیوں اور چابک دستیوں کی بنا پر) آگے بڑھ جانے

والے (اور اس طرح سامانِ معیشت اپنے قبضے میں لے لینے والے) ہیں اور کون پیچھے رہ جانے والے ہیں۔
رزق سے متعلق جو موضوع پیچھے سے چلا آرہا ہے ہم نے مفہوم اس کی رعایت سے متعیّن کیا ہے۔ لیکن اس آیت میں ایک عظیم اصُول بیان کیا گیا ہے جو حصُولِ رزق تک محدُود نہیں۔ وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا نے انسان کو غلط اور صحیح راستے دکھا دیے۔ اُسے یہ صلاحیّت عطا کر دی کہ وہ جونسا راستہ چاہے اختیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کی استعداد بھی مرحمت فرما دی کہ وہ اس (شاہراہِ حیات) پر جس رفتار سے جی چاہے چلے، جس قدر عمل کوشش ہونا چاہے ہو۔ شاہراہِ حیات افراد اور اقوام کے لیے دوڑ (RACE) کا میدان ہے۔ جو آگے نکلنا چاہے آگے نکل جائے جو پیچھے رہنا چاہے پیچھے رہ جائے۔ جو جس قدر کوشش کریگا اس کے مُطابق اُس کا مقام معیّن ہوگا۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا - (۱۷/۲۰) ہم نہ کسی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کریں گے نہ بند لگائیں گے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جو آگے بڑھ جائے، آگے بڑھ جائے۔ جو پیچھے رہنا چاہے، پیچھے رہ جائے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَؕ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۷-۳۸) اس کی رفتار کی تیزی اور سُستی اُس کے عمل کی رُو سے متعیّن ہوگی۔ اس کی پابندی اور آزادی کے حلقے اس کی حرکت کے مُطابق وضع ہوں گے۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳/۲۶) مسابقت اور منافست کی یہ آماجگاہ سب کے لیے ممکن ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۵۶/۱۰-۱۱)۔ جو جتنا آگے بڑھ جائے گا، اُتنا ہی (یوں سمجھو کہ) "خدا کے قریب" ہوتا جائے گا۔
دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ خدا اس جذبہ کو افسردہ نہیں کرتا، اسے اُبھارتا ہے۔ اس کی تحقیر نہیں کرتا، تحسین کرتا ہے۔ آگے بڑھنے والوں کو شاباش دیتا ہے، ان میں انعامات تقسیم کرتا ہے لیکن وہ آگے بڑھنے کے میدان میں تفریق اور تمیز کرتا ہے اور یہ تفریق و تمیز، نظریۂ حیات کی رُو سے متعیّن ہوتی ہے۔
ایک نظریۂ حیات یہ ہے کہ زندگی بس اس دُنیا کی زندگی ہے اور مقصودِ حیات اس دنیا کی آسائشوں اور ستائشوں کو حاصل کرنا ہے خواہ وہ کسی طرح سے حاصل ہو جائیں۔ اس سے کوئی بلند مقصد ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ اسے مادی نظریۂ حیات یا سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن اسے کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک دوسرے

سے آگے بڑھنے کا جذبہ اس میدان میں بھی، اس حد تک شدید کہ اس دوڑ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اسے تکاثر سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ، انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل کر دیتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱۰۲/۱)

اس کا جذبۂ محرکہ ہوس ہوتی ہے۔ انسانی ضروریات کی تو ایک حد ہوتی ہے، لیکن ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اسے تو جس قدر پورا کیا جائے، اتنی ہی یہ اور بڑھ جاتی ہے۔ اس میدان میں انسان ساری عمر دوڑتا رہتا ہے — ہانپتا، کانپتا — تاآنکہ وہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲)

ایک یہ میدان ہے۔ اس کے مقابل دوسرا میدان ہے جس کے متعلق کہا کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۵/۴۸) آگے بڑھنا ہے تو نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ (قرآن کریم میں متعدد مقامات میں عملِ خیرات میں آگے بڑھنے کی ترغیب و تلقین آئی ہے۔ (مثلاً ۲/۱۴۸؛ ۳/۱۱۳؛ ۲۳/۶۱؛ ۳۵/۳۲)

اِن مقامات سے زیرِ نظر آیت (۱۵/۲۴) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ○

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اس پر زور دیتا ہے کہ قرآنِ کریم کی صحیح تفسیر احادیث کی رُو سے ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تفسیر خود رسول اللہ کی بیان فرمودہ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کی جو تفسیر خود رسول اللہ نے بیان فرمائی ہو اس سے بہتر تفسیر اور کون سی ہو سکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جن تفسیری روایات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اُن میں بیشتر ایسی ہیں جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتی ہیں کہ ان کی نسبت رسول اللہ کی طرف صحیح نہیں، وہ وضعی ہیں۔ اسی آیت (۱۵/۲۴) کی قرآن کی رُو سے تفسیر آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب دیکھئے کہ حدیث اس کی تفسیر کیا بیان کرتی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ:

> ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اُسے نہ دیکھ سکیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اُسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

یہ تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں بجز اس کے کہ جن لوگوں نے اس قسم کی روایات وضع کی تھیں، اُن پر تو کیا افسوس ہو سکتا ہے، افسوس آتا ہے ہمارے عُلماء کرام پر جو بضد ہیں کہ اسے صحیح روایت مانو اور جو اسے یہ

کہہ کر صحیح ماننے سے انکار کر دے کہ اس کا جذبۂ ایمان اس قسم کی روایات کو رسولؐ اللہ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تو اسے منکرِ حدیث قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیتے ہیں!

اس سے اگلی آیت میں ہے:

۱۵/۲۵ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾

(لیکن ہمارا نظامِ ربوبیت اس قسم کی تفریق و تقسیم کی اجازت نہیں دے سکتا)۔ ہم ان سب کو یکجا اکٹھا کر دیں گے اور یہ ہمارے اس قانون کی رُو سے ہوگا جو سرتا سر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اگر آیت (۱۵/۲۳) میں موت اور حیات، طبعی زندگی سے متعلق سمجھیں تو اگلی آیت (۱۵/۲۴) کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو لوگ دُنیا سے پہلے جا چکے ہیں وہ بھی خدا کے علم میں ہیں اور جو ہنوز پیچھے ہیں اُنھیں بھی خدا جانتا ہے۔ اس اعتبار سے آیت ۱۵/۲۵ میں يَحْشُرُهُمْ کا تعلق اُخروی زندگی سے ہوگا۔ لیکن اگر ان آیات کا تعلق رزق میں مسابقت سے ہوگا تو زیرِ نظر آیت (۱۵/۲۵) کا مفہوم یہ ہوگا کہ مُستقدمین اور مُستاخرین سے جو طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی ہے، جب نظامِ ربوبیت قائم ہوگا تو یہ باقی نہیں رہے گا۔ تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد توجہ کا رُخ قصۂ ابلیس و آدم کی طرف منعطف کرایا۔ جو اس کشمکش کی داستان ہے۔ لیکن اس سے پہلے دو ایک آیات میں تخلیقِ انسانی کا ذکر اشارۃً کر دیا جس سے (ضمناً) ان اسرائیلی افسانوں کی (بارِ دگر) تردید مقصود ہے جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ آدمؑ ایک مٹی کا پُتلا تھا۔ اس سے انسانوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہُوا۔ فرمایا:

۱۵/۲۶ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾

یہی وہ حقیقت ہے جسے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں، پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے اور جسے اب پھر دُہرایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا سیاہ کیچڑ سے ہوئی جو سُوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے۔ (یعنی وہ طینِ لازب جس سے زندگی کا اوّلین جرثومہ وجود میں آیا۔ ۳۷/۱۱)

تخلیقِ انسانی کے متعلق مطالبُ الفرقان۔ جلد اوّل (صفحہ ۲۹) اور (زیادہ تفصیل کے ساتھ) جلد دوم (ص ۳ تا آخر) لکھا جا چکا ہے۔ (مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ حوالہ کے طور پر ذیل کی آیات میں اس کا اجمالی او تفصیلی ذکر آیا ہے۔

۶/۲ ؛ ۱۵/۲۸ ؛ ۱۵/۳۱ ؛ ۱۶/۴ ؛ ۱۸/۳۷ ؛ ۱۹/۶۷ ؛ ۲۲/۵ ؛ ۲۳/۱۲ ؛ ۲۵/۵۹ ؛ ۳۲/۷ ؛ ۳۶/۷۷ ؛ ۳۷/۱۱ ؛ ۳۸/۷۱ ؛ ۴۰/۶۷
۷۶/۱-۲ ؛ ۷۷/۳۰ ؛ ۸۶/۵ ؛ ۹۶/۲

اِن آیات کے مطالعہ سے یہ پوری سرگزشت بیک نگاہ سامنے آجائے گی۔ اس کے ساتھ اگر انڈکس میں ارتقاء کا عنوان بھی دیکھ لیا جائے تو زندگی جن مراحل سے گزر کر پیکرِ انسانی تک پہنچی ہے وہ بھی واشگاف ہو جائیں گے۔ اور "نفس" کے عنوان کے تحت وہ امتیازی خصوصیت جس نے انسان کو دیگر مخلوق سے ممتاز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان سے پہلی مخلوق کا اجمالی سا ذکر ہے جسے جِنّ کہہ کر پکارا گیا۔

۱۵/۲۷ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

واضح رہے کہ انسانی تخلیق سے پہلے کرۂ ارض میں بے پناہ حرارت تھی۔ اس لیے ابتداءً یہاں ایسی مخلوق کی نمود ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔

اس کی تشریح مطالب الفرقان، جلد دوم (صفحہ ۶۵ پر) آچکی ہے۔

اس کے بعد آیات ۲۸ تا ۴۲ میں قصۂ ابلیس و آدم کو دہرایا گیا ہے۔ تخلیقِ آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ کشمکش ابلیس و آدم۔ یہ تمام موضوعات شرح و بسط کے ساتھ مطالب الفرقان، جلد دوم کے ابتدائی ابواب میں آچکے ہیں۔ اور زیرِ نظر آیات بھی جستہ جستہ وہاں مذکور ہیں۔ اس لیے یہاں ان آیات کا صرف مفہوم بیان کیا جانے کا بجز کسی ایسے نکتہ کے جو پہلے نہ آچکا ہو۔ اگر آپ جلد دوم کے پہلے دو ابواب کا ایک بار پھر مطالعہ فرمالیں تو زیرِ نظر آیات خود بخود سمجھ میں آتی جائیں گی۔ سورۃ الاعراف کی آیات (۷/۱۱-۱۸) میں بھی یہی موضوع بیان ہوا ہے مطالب الفرقان جلد پنجم، صفحہ ۱۷۰-۱۷۲ میں ان کی تشریح کے لیے یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

۱۵/۲۸ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب تیرے نشوونما دینے والے نے کائناتی قوتوں سے کہا کہ میں سیاہ کیچڑ کی کھنکھنی مٹی سے انسان کی تخلیق کی ابتداء کرنے والا ہوں۔

آدم کا اختصاص۔

۱۵/۲۹ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو جب ایسا ہو کہ وہ زندگی کی مختلف ارتقائی منازل طے کرکے، اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب اور توازن قائم ہو جائے، اور میں، اس میں، اپنی توانائی کا ایک شمّہ ڈال دوں اور یوں وہ صاحبِ اختیار و ارادہ، انسانی ذات کا حامل بشر بن جائے، تو تم اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

نفخِ روح "، اہم موضوع ہے جس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (ص۱۴۱) پر آ چکی ہے۔

۱۵/۳۰—۳۱ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

چنانچہ اس پروگرام کے مطابق، تمام کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھک گئیں۔ (یعنی انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکے)، لیکن اس کے اپنے سرکش جذبات اس کے سامنے نہ جھکے۔ اُنھوں نے اس سے انکار کر دیا اور سرکشی اختیار کر لی۔ (۲/۳۴)

ابلیس سے پوچھا گیا کہ اُس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔

۱۵/۳۲ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

خدا نے ابلیس (انسان کے سرکش جذبات) سے پوچھا کہ تم اس کے سامنے جھکنے والوں میں سے کیوں نہیں ہوئے؟ تم نے سرکشی کیوں اختیار کی؟

اُس نے جواب دیا:

۱۵/۳۳ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

اُس نے کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ایسی مخلوق کے سامنے جھک جاؤں جسے سیاہ کیچڑ کی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (یعنی انسان کی مادی تخلیق ایسی ہے کہ اس کے سرکش جذبات اس پر

غالب رہتے ہیں لیکن اسے جو "خدائی توانائی کی جھلک — انسانی ذات — دے دی گئی ہے اس سے یہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کے جذبات اس پر غالب نہ آئیں)۔

یہاں تو اتنا ہی کہا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۖ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○ (۷/۱۲)

ہم نے اُس سے پوچھا کہ جب ہم نے تجھے، آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس حکم کی تعمیل سے باز رکھا؟

اُس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ (آب و گل کے پیکر انسان پر اُس کے تند و تیز جذبات غالب رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے اندر وحی کے اتباع سے شرفِ انسانیت کو بیدار کر لیتا ہے، تو پھر وہ ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ (۱۵ / ۴۰-۴۲)

یہ جواب منطقی ہے۔ لیکن اُس نے عقلی دلیل کی رُو سے جواب دیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ وہ دلیل باطل تھی۔ لیکن جواب بہر حال منطق پر مبنی تھا)۔ اہلِ فقہ کے ہاں قیاس (منطقی طریق) بھی قانونی مآخذ میں سے ہے۔ (فقہ میں قانونی مآخذ چار ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع)۔ اہلِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ شریعت میں عقل کو دخل نہیں۔ اس لیے وہ عقلی طریق (قیاس) کو ماخذِ قانون نہیں مانتے۔ وہ اس کے سخت خلاف ہیں۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ "اول من قاس ابلیس" سب سے پہلے جس نے قیاس (عقلی دلیل) سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا اور اس کی سند یہی آیت ہے۔ جو لوگ قرآن پر مبنی دین کے متعلق یہ کہیں کہ اس میں عقل کو دخل نہیں (حالانکہ سارا قرآن عقل و بصیرت کی تاکید سے بھرا پڑا ہے) ان کے متعلق کیا کہا جائے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (۲/۲۶) اکثر لوگ اپنی گمراہی کی سند بھی قرآن سے دیتے ہیں!

اس کے اس مسلک کا نتیجہ یہ ہے کہ:

(۱۵ / ۳۴-۳۵) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۳۴ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۳۵

خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ہر قسم کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ (اگر انسان اپنے جذبات سے

مغلوب ہو جائے، اور انھیں قوانینِ خداوندی کے تابع نہ رکھے، تو وہ، زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے) — اور یہ محرومی انسان کے ساتھ مسلسل لگی رہتی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

اُس نے کہا:

(۱۵ / ۳۶—۳۸) قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٣٧﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٣٨﴾

اس نے کہا کہ مجھے انسان کی نشأۃِ ثانیہ تک مہلت دے دی جائے۔ اُس دَور تک کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جس قدر موانع ہیں، یہ انھیں دُور کر کے، صحیح انسانی آزادی حاصل کرے۔ جب انسان ان تمام موانع کو دُور کر کے، وحیِ الٰہی کے مطابق، صحیح آزادی حاصل کرے گا تو اُس وقت اس پر، اس کے تخریبی جذبات غالب نہیں آسکیں گے۔ (۱۵-۱۴ / ۶)

خدا نے کہا ہاں! تجھے اس وقت تک مہلت دی جاتی ہے۔ یعنی ایک وقتِ معلوم تک کے لیے ("وقتِ معلوم" اس لیے کہ انسان کی صحیح آزادی کا دور، جس میں وہ اپنے پست جذبات پر غلبہ حاصل کرلے، ایسا نہیں جس کا کسی کو علم ہی نہ ہوسکے۔ یہ کوئی رازِ درُون پردہ نہیں — اس کا ہر ایک کو علم ہوگا — اور ہوتا ہے)

اُس نے کہا:

(۱۵ / ۳۹) قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٩﴾

اس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تُو نے مجھے جو، اس طرح، زندگی کی سعادتوں سے محرُوم کر دیا اور مجھ پر خوشگواریوں کی راہ مسدُود کر دی ہے تو میں بھی اب ایسا کروں گا کہ انسانوں کو ان کی طبیعی زندگی کے مفاد و اسباب اس طرح خوشنما بنا کر دکھاؤں کہ وہ انہی میں اُلجھ کر رہ جائیں اور انسانی زندگی کے بلند مقاصد کو یکسر نظر انداز کر دیں؛ اور یوں میری طرح، یہ بھی زندگی کی حقیقی سعادتوں سے محرُوم رہ جائیں۔

یہ وہ آیت ہے جس میں انسانی زندگی اور دین کے اہم بنیادی حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس کے لیے مطالبُ الفرقان

جلد دوم، صفحہ ۱۰۱۱ کو بار دِگر ضرور دیکھ لیجیے۔ اسے تو بار بار دیکھنا چاہیئے۔ آپ اس اصُول پر غور کیجیے کہ جو شخص اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنی ذمہ داری کو دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ دُنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہوتے ہیں (وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) اُن کی بُنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ غلط کوش یا غلط کار اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا، اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا، اُسے دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے قبول نہیں کرتا، جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور اس کے جو نتائج برپا ہوتے ہیں، ظاہر ہیں۔ اگر انسان اپنی غلطی کو تسلیم اور اپنی ذمہ داری کو قبول کر لے تو اس قسم کے جھگڑے ہی پیدا نہ ہوں اور انسان کی اصلاح بھی بآسانی ہو جائے۔ تقدیر کا عقیدۂ جبر اسی قسم کی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ذمہ دار نہیں۔ "میں تو مجبورِ محض ہوں"۔ اس ذہنیت کی وجہ سے انسان دین اور دُنیا دونوں میں تباہ ہوتا ہے۔ (انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھئے)۔

ابلیس نے جب یہ کہا کہ: وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ میں ان سب (تمام لوگوں) کو گمراہ کروں گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ:

۱۵/۴۰ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۰﴾

ہاں! جو تیرے مخلص بندے ہوں گے، ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ (وہ اپنے آپ کو وحی کے تابع رکھیں گے اس لیے سرکش جذبات ان پر غالب نہیں آسکیں گے)۔

دوسرے مقام پر (۳۸/۸۳) بھی یہی آیا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس سے انسان ہر قسم کے شر کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی استثناء سے، ان تمام باطل عقاید اور مسالک کی تردید ہو جاتی ہے جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کے داغ دھو ہی نہیں سکتا (تفصیل کے لیے مطالب الفرقان، جلد دوم، عنوان ابلیس ص ۴۳ تا ۵۰) یہی حق پر مبنی مسلک ہے۔

۱۵/۴۱ قَالَ هَٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۱﴾

خدا نے کہا۔ جس راہ پر مخلص بندے چلیں گے، وہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو انہیں سیدھی، زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔ یہی راہ میری طرف لانے والی ہے۔ (۱۶/۹)

پہلے ابلیس نے خُدا سے کہا تھا کہ تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اس کے بعد خود

خدا نے اس کی یہ کہہ کر توثیق کر دی کہ :

۱۵/۴۲ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۴۲﴾

میرے ان بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ تیرا غلبہ انہی پر ہو سکے گا جو اس متوازن راہ کو چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔ ان کا انجام تباہی ہوگا۔

۱۵/۴۳ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۳﴾

یقیناً ان سب کے لیے تباہی و بربادی کا جہنم ہے اور یہ وہاں پہنچ کر رہیں گے۔

وہ جہنم :

۱۵/۴۴ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴿۴۴﴾

تباہی تو سب کے لیے ایک جیسی ہوگی لیکن اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوں گے۔ ان میں سے ہر گروہ کا الگ راستہ ہوگا جہاں سے تباہی کے جہنم میں داخل ہوگا۔ (یعنی صراطِ مستقیم جو جنّت تک لے جاتی ہے ایک ہی ہے۔ لیکن جب اُسے چھوڑ دیا جائے تو غلط راستے بے شمار ہوتے ہیں اور مختلف لوگ مختلف راستوں سے تباہی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک نشانے کا مقام ایک ہی ہوتا ہے، غلط نشانے کے مقامات لاتعداد ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ غلط جوابات کا شمار نہیں ہو سکتا۔ خدا کا دین ایک ہی ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب بے شمار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں فرقے نہیں ہو سکتے۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

ان کے برعکس :

۱۵/۴۵-۴۶ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۴۵﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ﴿۴۶﴾

ان کے برعکس متقین (زندگی کی تباہیوں سے بچ کر قوانینِ خداوندی کے مطابق چلنے والوں) کی منزل

سرسبز و شاداب باغات اور جاری چشمے ہوں گے۔ اس جنتی معاشرہ میں (جو اس زندگی سے اُخروی زندگی تک مسلسل چلا جائے گا) وہ ہر تباہی سے مامون ہوں گے اور ان کی تمام صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے گی۔

اس معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوگی کہ:

۱۵/۴۷ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿۴۷﴾

اس معاشرہ کے افراد کے دلوں میں (ایک دوسرے کی طرف سے جس قدر) گرہیں ہوں گی سب صاف ہو جائیں گی — بغض، کینہ، عداوت، فریب کی کوئی بات نہیں رہے گی۔ حتیٰ کہ کوئی راز ایسا نہیں ہوگا، جسے وہ ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھیں (۳۳ ؍ ۷)۔ وہ بھائیوں کی طرح دل کھول کر، ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔

غِلٍّ کی تشریح مطالب الفرقان، جلد پنجم (صـ۱۹۷) پر دی گئی ہے۔ اسے دیکھ لیجئے۔ کیونکہ یہ جنتی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

۱۵/۴۸ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۴۸﴾

وہاں اُنھیں، مشقت، تھکان یا واماندگی چھو تک نہیں سکے گی۔ وہ ہر وقت تر و تازہ اور ہشاش بشاش رہیں گے۔ نہ ہی وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد کہا:

۱۵/۴۹-۵۰ نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

(اے رسول!) میرے بندوں کو یہ خبر سُنا دو کہ میرے ہاں ان کے لیے ہر قسم کی حفاظت اور نشوونما کا سامان ہے۔ لیکن جو لوگ میرے قوانین کی خلاف ورزی کرکے، اپنے لیے سامانِ ہلاکت خرید لیں گے، ان کے لیے بڑی ہی الم انگیز تباہیاں ہوں گی۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہ عذاب قومِ لُوطؑ پر کس طرح آیا۔ اس سے (ضمناً) یہ بھی واضح ہے کہ (اُخروی عذاب تو اپنے مقام پر رہا) یہ عذاب اس دُنیا میں وارد ہوجاتا ہے (انڈکس میں قوم یا اقوام کا عنوان دیکھیے۔ متعلقہ مقامات سے واضح ہوجائے گا کہ قوموں کا عرُوج وزوال اور ان کا استخلاف واستبدال اِنہی قوانینِ مکافاتِ عمل سے وابستہ ہے)

قومِ لُوطؑ کا تعارف مطالبُ الفرقان۔ جلد پنجم۔ (صفحہ ۲۹۰ پر) کرایا گیا ہے۔ اور اس کی داستان (۱۱: ۷۷—۸۳) ص ۲۹۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں، سُورہ ہُودؑ کی آیات (۱۱: ۷۷—۸۳) میں بھی یہ داستان مذکور ہے (جس کے لیے مطالبُ الفرقان۔ جلد ششم دیکھیے)۔

اس داستان کا آغاز ضیفِ ابراہیمؑ (حضرت ابراہیمؑ کے ہاں آنے والے مہمانوں) سے ہوتا ہے۔ مطالب جلد پنجم ص ۲۹۵—۳۰۶ پر تو اس کا ذکر اجمالی سا ہے۔ تفصیلی تذکرہ سُورۂ ہُود میں آیا ہے۔ چونکہ سابقہ جلدوں (پنجم اور ششم) میں یہ واقعات تفصیل سے بیان ہوچکے ہیں، اس لیے زیرِ نظر اوراق میں (حسبِ سابق) متعلقہ آیات اور ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا، بجز کسی ایک نکتے کی تشریح کے جو پہلے نہ آیا ہو۔ زیرِ نظر سورۃ میں آغازِ داستان یُوں ہوتا ہے۔

۱۵/۵۱ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾

الم انگیز تباہی کا یہ عذاب کس طرح آیا کرتا ہے، اس کے لیے انہیں (مثلاً، قومِ لُوطؑ کی تباہی کا قصہ سناؤ جس کی ابتداء ابراہیمؑ کے ہاں آنے والے مہانوں سے ہوتی ہے۔ (۱۱: ۶۹)

اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں بیٹے کی بشارت کا تذکرہ ہے۔

۱۵/۵۲—۵۶ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾
قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي
عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ
بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ

مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۤلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

وہ جب ابراہیمؑ کے ہاں آئے تو اُنھوں نے کہا کہ ہم تمہاری سلامتی کے خواہاں ہیں۔ اس نے کہا کہ تم اجنبی لوگ ہو اس لیے) مجھے تم سے کچھ اندیشہ سا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اندیشہ اور خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ ہم تمھیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو صاحبِ علم ہوگا۔ اس نے کہا کہ تم مجھے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہو حالانکہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ تم مجھے اولاد کی خوشخبری دیتے ہو تو کن قرائن کی رُو سے؟ اب میرے ہاں اولاد کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ ہم تمھیں بالکل سچی خوشخبری دیتے ہیں۔ تم نااُمید مت ہو۔ ابراہیمؑ نے کہا، نہیں! میں خدا کی رحمت سے نااُمید نہیں ہوں۔ اُس سے تو وہی نااُمید ہوتے ہیں جو اُس کا راستہ چھوڑ کر غلط راستوں پر چل نکلیں یا جنھیں صحیح راستہ نہ مل سکے۔ جو اُس کی راہ پر چلیں، ان کے سامنے اُس کی رحمت کے عالمگیر نقشے ہوتے ہیں۔ لہٰذا، میں اُس کی رحمت سے کیسے نااُمید ہو سکتا ہوں؟ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ عام قرائن کے لحاظ سے میرے ہاں اب اولاد کی اُمید نہیں ہو سکتی۔

اس خوشخبری کا ذکر سورہ ھُود کی آیات (۱۱/۷۰–۷۳) میں آچکا ہے۔ نیز مطالبُ الفرقان جلد پنجم (ص۳۰۲) پر۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اُن سے پُوچھا کہ وہ کس مشن کے لیے آئے ہیں۔

۱۵ / ۵۷–۶۰ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

پھر اُس نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم جو بھیجے ہوئے آئے ہو، تو وہ کون سی مہم ہے جس کے لیے تم مامور ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں یعنی قومِ لُوطؑ کی طرف۔ وہ ساری قوم تباہ ہو جائے گی، بجز لُوطؑ کی اپنی جماعت کے لوگوں کے۔ اُنھیں بچا لیا جائے گا حتیٰ کہ لُوطؑ کے اپنے گھرانے کے لوگوں میں سے، اس کی بیوی بھی تباہ ہو جائے گی۔ اُس کے متعلق ہمارا اندازہ ہے کہ وہ لُوطؑ کے ساتھ نہیں جائے گی، قومِ مخالف کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی۔

اس کا ذکر مطالب الفرقان۔ جلد پنجم (صفحہ ۲۹۵) پر آ چکا ہے۔ نیز سورۃ ہود کی آیات (۱۱/۷۴-۷۶) میں۔ ازاں بعد قوم لوطؑ کی داستان بیان ہوئی ہے جو مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۹۶ سے آخر تک) اور سورہ ہود کی آیات (۱۱/۷۷-۸۳) میں۔ زیر نظر سورۃ میں یہ واقعات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

(۱۵/۶۱—۶۴) فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ ۣالۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡكَرُوۡنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوۡا بَلۡ جِئۡنٰكَ بِمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۶۴﴾

پھر جب وہ پیغامبر، قوم لوطؑ کے پاس آئے تو لوطؑ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ یہاں کے رہنے والے نہیں اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں کے رہنے والے نہیں لیکن ہم وہ بات لے کر آئے ہیں جس کی بابت یہ لوگ تم سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ (یعنی وہ تباہی جس سے تم انہیں آگاہ کرتے ہو، اور یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو اُسے لا کر دکھاؤ) ہم اس تباہی کو ایک ٹھوس حقیقت بنا کر ان کے سامنے لانے کے لیے آئے ہیں۔ ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ ایسا ہو کر رہے گا۔

اس کے ساتھ ہی وہاں سے ہجرت کر جانے کی بھی تلقین کر دی۔

(۱۵/۶۵—۶۶) فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَهُمۡ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ وَّامۡضُوۡا حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۤءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿۶۶﴾

سو تم اپنی جماعت کو لے کر، کچھ رات گئے یہاں سے نکل جاؤ۔ آگے آگے انہیں جانے دو اور ان کے پیچھے پیچھے خود چلو (کہ خطرہ کے وقت، امام۔ لیڈر کو سب کے بعد جانا چاہیے) اور یہاں سے یوں دامن فشاں اُٹھو کہ پھر اس طرف مڑ کر بھی نہ دیکھو (۱۱/۸۱) اور جس مقام کا تمہیں (خدا کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ اور ہم نے لوطؑ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ صبح ہوتے ہی اس قوم کی جڑیں کٹ جائیں گی

بستی کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو :

(۱۵ — ۶۷ — ۱۰) وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ
ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾
قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِىْٓ
اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر جب بستی کے لوگوں کو اِن نوواردوں کی اطلاع ملی تو وہ خوشیاں مناتے ہوئے آپہنچے۔ لوطؑ نے ان سے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں۔ تم اِن سے کوئی نازیبا حرکت کرکے مجھے رسوا نہ کرو۔ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری تذلیل کا باعث نہ بنو۔ اُنہوں نے لوطؑ سے کہا کہ کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنے ہاں نہ ٹھہرایا کرو؟ (اب اگر تم وہی کچھ کرو جس سے ہم نے تمہیں روکا تھا تو اس کا خمیازہ بھگتو) اس پر لوطؑ نے ان سے کہا کہ (اگر کوئی اجنبی مرد ادھر آنکلے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ تم اس پر پِل پڑو!) یہ تمہاری عورتیں جو میرے لیے بمنزلہ میری اپنی بیٹیوں کے ہیں، موجود ہیں۔ (اپنی نفسانی خواہش کو ان سے پورا کرو)۔

اس کی تشریح مطالبُ الفرقان۔ جلد پنجم (صفحہ ۳۰) میں اور سورۃ ھُود آیات (۱۱ — ۷۸، ۷۹) میں کی جا چکی ہے۔ اگلی آیت کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ آیت ہے۔

(۱۵ — ۷۲) لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِىْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

ترجمہ اس کا ہے — تیری جان کی قسم! وہ لوگ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے۔

اگر اسے انہی مہمانوں کا قول سمجھا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ حضرت لوطؑ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کن لوگوں سے بے فائدہ مغز ماری کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جنسی جذبات کی شدّت سے اندھے ہو رہے ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ آپؑ ان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ جو شخص نشہ سے بدمست ہو رہا ہو اُس پر پند و نصائح کیا اثر کر سکتے ہیں

اور اگر اسے جملہ معترضہ لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ داستان بیان کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے رسُولؐ اللہ سے کہا کہ "تیری جانِ عزیز[1] کی قسم! وہ لوگ اپنے جذبات کی شدّت سے اندھے ہو رہے تھے اس لیے وہ (حضرت) لوطؑ

---

[1] "تیرے دین کی قسم!" عمر کے معنی دین بھی ہوتے ہیں۔

کی بات کیا سُنتے ؟" اس کے بعد پھر داستان کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا۔

(۱۵/۷۳) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾

قصہ مختصر، ان لوگوں کو، سورج نکلتے ہی ایک ہولناک زلزلے نے آپکڑا اور آتش فشاں پہاڑ سے، ان پر مٹی کے پتھروں کی ایسی بارش ہوئی کہ ساری بستی تہ و بالا ہو گئی۔

پھر مقطع کی آیت کے طور پر اس حقیقت کو دُہرا دیا کہ یہ قصہ تو محض تاریخی واقعہ کے طور پر بیان کر دیا گیا۔

(۱۵/۷۵) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾

یقیناً اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے عبرت کی بڑی نشانیاں ہیں جو فہم و فراست سے کام لے کر حقیقت تک پہنچنا چاہیں۔

اور قوم مخاطب (عربوں) سے کہا کہ تمہیں اس قوم کے انجام کے متعلق بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ :

(۱۵/۷۶) وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾

(قوم لُوطؑ کی بستی غیر معروف مقام پر نہیں تھی۔) وہ اس راستے پر واقع تھی جہاں آمد و رفت کا سلسلہ اب تک قائم ہے (اس لیے یہ لوگ آتے جاتے اُس کے کھنڈرات دیکھ سکتے ہیں۔)

اور زمانۂ نزولِ قرآن کے عربوں کے لیے ہی نہیں، قیامت تک قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے۔

(۱۵/۷۷) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾

یقیناً ان کھنڈرات میں ان لوگوں کے لیے حقیقت شناسی کی نشانیاں ہیں، جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں۔

(۰)

اس کے ساتھ (ضمناً) دو اور قوموں کے اس قسم کے انجام کا ضمنی تذکرہ کر دیا۔ ایک قوم مدین جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اسے اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ بھی کہا گیا ہے۔ یعنی گھنے جنگلوں میں رہنے

والی قوم اور دوسری اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ یعنی قومِ ثمود جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ قومِ مدین کا تفصیلی تذکرہ، مطالب الفرقان جلد پنجم (ص ۳۰۹) میں آچکا ہے اور قومِ ثمود کا اس جلد کے ص ۲۶۶ پر سورۃ ہود میں بھی ان دونوں کا ذکر آیا ہے۔ (انڈکس دیکھئے)۔ یہاں کہا:

۱۵ (۷۸—۷۹) وَاِنۡ كَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ لَظٰلِمِيۡنَ ۝۷۸ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ ‌ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ۝۷۹

اور اسی طرح، اصحاب الایکہ (گھنے جنگلوں کے رہنے والے۔ یعنی قبیلہ مدین کے لوگ) بھی بڑے سرکش تھے۔ سو ہم نے انہیں بھی، ان کی سرکشی کی سزا دی — اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قومِ لوطؑ اور قومِ مدین کے شہر عام شاہراہ پر واقع ہیں۔

اور قومِ ثمود کے متعلق:

۱۵ (۸۰—۸۴) وَلَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝۸۰ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ اٰيٰتِنَا فَكَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۝۸۱ وَكَانُوۡا يَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا اٰمِنِيۡنَ ۝۸۲ فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُصۡبِحِيۡنَ ۝۸۳ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝۸۴

اور اصحابُ الحجر، یعنی قومِ ثمودؑ نے بھی اپنے رسولوں کے پیغام کی تکذیب کی۔ انہیں ہم نے واضح قوانین دیئے تھے لیکن وہ ان سے رُوگرداں رہے (وہ بڑی طاقتور قوم تھی) وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر اپنے مکان بناتے تھے تاکہ (ان قلعہ نما گھروں میں) محفوظ رہیں۔ (۲۶/۱۴۹) لیکن ان کے یہ محفوظ قلعے بھی، انہیں خدا کے عذاب سے نہ بچاسکے، صبح ہوتے ہی انہیں سخت ہولناک آواز کے ساتھ، عذاب نے آدبوچا۔ اور جو کچھ اُنہوں نے اپنی کوششوں سے اپنے لیے بنا رکھا تھا، وہ اُن کے کسی کام نہ آسکا۔

اقوامِ سابقہ کی یہ داستانیں اس لیے دُہرائی گئی ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ اور جماعتِ صحابہؓ کو بتایا جائے کہ

حق و باطل کی وہ کشمکش جس کا سامنا وہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں بشروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آخر الامر کامیابی حق کی ہوتی ہے۔

یہ کشمکش اب آخری مراحل میں آپہنچی تھی۔ اس لیے اس جماعتِ مومنین کو واضح طور پر بتا دیا کہ انقلاب کی گھڑی اب بالکل سر پر کھڑی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے اور وہ یہ کہ یہ سلسلۂ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں (۲۲/۴۵)۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد دوم (صـ۹۳) نیز (۵۳/۳۱ ؛ ۱۶/۵۴) دیکھئے۔

انقلاب کے لیے قرآنِ حکیم میں ساعۃ کا لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد پنجم (صـ۲۷ـ۲۰) نیز سورۃ الاعراف، آیت (۷/۱۸۷)، مطالب الفرقان جلد ششم۔

اس کشمکش میں پروگرام یہ ہوتا تھا کہ خدا کا رسول اپنی مخاطب قوم تک خدا کا پیغام پہنچاتا تھا۔ ان میں سے جو سعادت مند افراد اس پیغام کو قبول کر لیتے وہ اس کی جماعت میں شامل ہو جاتے۔ آخر الامر ایسا مقام آجاتا جس میں نظر آجاتا کہ باقیماندہ افراد اس پیغام کو قبول نہیں کریں گے بلکہ اس کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ جائیں گے۔ اس مقام پر رسول اپنی جماعت کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر کے ایسے مقام کی طرف چلا جاتا جو اس کے مشن کے لیے زیادہ سازگار ہوتا۔ (انڈکس میں، ہجرت کا عنوان دیکھئے)۔ یہ اس قوم سے قطعِ علائق کی علامت بھی ہوتی تھی۔ اس قطعِ علائق کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی طبیب مریض کی بالیں سے یہ کہہ کر اُٹھ کر چلا جائے کہ: ؎

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں!

لیکن پیغمبرانہ اندازِ زیست یہ ہوتا تھا کہ کسی کے ساتھ رہنا تو ایک طرف، اس سے الگ ہونا پڑے تو بھی حُسنِ کارانہ انداز سے الگ ہُوا جائے۔ (۷۳/۱۰)

یہ تمام نکات اگلی ایک آیت میں سمٹا دیے گئے ہیں: فرمایا:

۱۵/۸۵—۸۶ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

(اے رسول! تم نے دیکھ لیا کہ اقوامِ سابقہ کو اُن کے غلط اعمال نے کس طرح تباہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلۂ کائنات (ارض و سما) پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے۔ تخریبی قوتیں، کائنات کے پروگرام میں فٹ نہیں بیٹھ سکتیں، اس لیے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا، جو کچھ اُن اقوام کے ساتھ ہوا، وہی کچھ تمہاری مخاطب قوم کے ساتھ بھی ہوگا۔) وہ فیصلہ کُن انقلاب جس سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے، آکر رہے گا۔ لہٰذا، تم ان سے اُلجھو نہیں۔ (جس قدر تبلیغِ حق کا ضروری کام تھا، وہ ہو چکا) تم ان سے، نہایت خوش آیند طریق سے الگ ہوکر، اپنے پروگرام کی تکمیل میں مصروف رہو۔ (۱۵/۸۵) یہ سب کچھ تیرے اُس پروردگار کی طرف سے کہا جا رہا ہے جس نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس قسم کی سعی و عمل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے!

قرآنِ حکیم نے تاریخ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کے لیے انڈکس میں عنوان تاریخ دیکھئے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے" اسے اگلی آیت میں بیان کر دیا۔ اس کی تشریح مطالبُ الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۵۱ پر آچکی ہے اس لیے یہاں اس کے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۵/۸۷ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

ہم نے تمہیں اس تاریخ کے متعدد واقعات کا علم دیا ہے، جو اپنے آپ کو دہراتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ قرآنِ عظیم عطا کیا ہے (جو ان اصولوں کو اپنے اندر رکھتا ہے جن کے مُطابق اقوام کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں)۔ (۳۹/۲۳)

کشمکش کے اس آخری مرحلہ میں، جب تصادم اپنی شدّت کو پہنچ رہا تھا، جماعتِ مومنین کے دل میں یہ خیال اُبھرتا ہوگا کہ مخالفین مادی وسائل و ذرائع میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں اس لیے ان سے مقابلہ میں بڑی دِقّت پیش آئے گی۔ اس خیال کا ازالہ یہ کہہ کر کر دیا کہ تمہارے پاس جو (ایمان کی) قوّت ہے اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا۔ اس لیے تم (اپنی قلتِ اسباب کے خیال سے) گھبراؤ نہیں

اس کے ساتھ ہی سیرتِ رسولِ پاک کا ایک نہایت درخشندہ گوشہ بھی باعثِ فروغِ دیدہ بن رہا ہے۔ مخالفین کی جماعت تمام عمر مخالفت کرتی رہی اور اس میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حضورؐ تمام عمر ایک طبیبِ مُشفق کی طرح انہیں سمجھاتے رہے کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آجائیں ورنہ تباہ ہو جائیں گے۔ حضورؐ کی یہ دردمندی اور غمگساری اس حد تک تھی کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا

مُؤْمِنِیْنَ (۲۶/۳) ” ایسا نظر آرہا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنی جان گھلا لیگا“
یہاں کہا۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (۱۵/۸۸) ” تو ان کی تباہی کے تصور سے غم نہ کھا۔“ کسی کی ہمدردی، خودکشی
کرنے والے کی جان نہیں بچا سکتی اور اس کے بعد کہا کہ تم اپنی جماعت کی تنظیم و تربیت میں اور بھی شدت سے
مصروف ہو جاؤ۔ یہ صحابہؓ کی جماعت تھی جن کے بلند و بالا مقام اور حسنِ سیرت و کردار کے متعلق قرآن میں بڑی
تفصیل سے آیا ہے (انڈکس میں عنوان صحابہؓ دیکھئے) یہ تمام نکات ذیل کی آیت میں آگئے ہیں :۔

۱۵/۸۸ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾

(تاریخ کی ان سرگزشتوں اور قرآن کے ان بنیادی حقائق کے بعد) تم طبیعی زندگی کے اُس ساز و سامان کی
طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے، ان میں سے مختلف طبقات کے لوگوں کو دے رکھا ہے۔ (اقوامِ
سابقہ کو ان سے کہیں زیادہ ساز و سامانِ زیست حاصل تھا)۔ نہ ہی تم اپنے آپ کو اس غم میں گھلاتے
رہو کہ یہ لوگ صحیح راستے کی طرف آکر، زندگی کی تباہیوں سے کیوں نہیں بچ جاتے۔ (نہ اقوامِ سابقہ نے
اپنے پیغمبروں کی بات پر کان دھرا تھا، نہ یہ تمہاری بات سنیں گے)۔ تم اب (ان مخالفین کا خیال چھوڑ کر)
ان لوگوں کو، جو اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں، اپنے بازوؤں کے نیچے سمیٹتے جاؤ (اور اس
طرح مناسب تعلیم و تربیت سے، اپنی جماعتی تنظیم میں پختگی اور مرکزیت پیدا کرتے جاؤ۔ (۱۵/۹۴)
اور اس آخری مرحلہ میں بھی ان مخالفین کو ان کی غلط روش کے انجام سے آگاہ کرتے رہو۔

۱۵/۸۹ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾

اور فریقِ مخالف سے کہتے رہو کہ میں تمہیں، تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کھلے طور پر
آگاہ کر رہا ہوں۔

ان مخالفین میں وہ مخالف بھی ہیں جو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (دیکھئے
عنوان منافق)۔ ان لوگوں کی روش اور مسلک کو قرآن نے ایک لفظ ” عِضِيْنَ “ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ یہ بڑا
جامع المعانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں :۔

۱۔ کسی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ ان کا انداز یہ ہے کہ قرآن کی جو بات اپنے مفید مطلب ہو اُسے اختیار کر لیتے ہیں، جو ان کے خلاف جائے اُسے چھپا دیتے ہیں۔ اس روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اُسے قرآن نے آیت (۲/۸۵) میں واضح کر دیا ہے۔ اس دُنیا میں ذلّت اور خواری اور آخرت میں عذاب شدید۔

۲۔ اس کے معنی جھوٹ۔ فریب اور دھوکا کے بھی ہوتے ہیں۔

۳۔ نیز جنتر منتر، تعویذ تاگے اور وظائف۔ جادو۔ ٹونے ٹوٹکے۔

قرآنِ کریم نے ان لوگوں کی جو روش بیان کی ہے، آپ غور کیجیے، کیا ہماری بعینہٖ یہی حالت نہیں ہے؟ کیا ہم نے بھی قرآن کا یہی مصرف نہیں بنا رکھا۔

جن آیات کی یہ تشریح ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱۵ / ۹۰—۹۱) كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾

جن تباہیوں سے تو انہیں آگاہ کرتا ہے ان کا کچھ اندازہ ان لوگوں کو ہو بھی چکا ہے۔ یہ لوگ آپس میں قسمیں کھا کھا کر تیری مخالفت کرتے اور پھر جھوٹی قسموں سے تمہیں اپنی رفاقت کا یقین دلاتے تھے (۵/۵۳؛ ۹/۱۰۷؛ ۱۶/۹۲؛ ۱۶/۹۴؛ ۱۰/۶۸) اور اپنا سارا زور یہ مشہور کرنے میں صرف کر دیتے تھے کہ قرآن، جھوٹ، افترا، سحر اور کہانت کے سوا کچھ نہیں۔ سو ہم نے انھیں طرح طرح کے مصائب و نوازل میں مبتلا کیا (اور یہ تو ابھی ہلکے ہلکے جھٹکے تھے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا)۔

خُدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اُن کی اس غلط روش کے نتائج نکھر کر ان کے سامنے آجائیں گے۔

(۱۵ / ۹۲—۹۳) فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

تیرے رب کا قانونِ مکافات اس پر شاہد ہے کہ ان سب سے، ان کے اعمال کی بازپرس ہوگی (اس قسم کی روش کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا)۔

ان کی مخالفت کا علاج یہ ہے کہ:

(۱۵ / ۹۴) فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

لہٰذا، اے رسول! تم ان کا خیال مت کرو، بلکہ (جیسا کہ تم سے کہا گیا ہے (۱۵/۹۴) ان سے الگ ہٹ کر اپنی خدا کا تنظیم کرو اور ان لوگوں سے اعراض برتو جو خدا کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔

جس انداز سے نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کو اطمینان دلایا جا رہا ہے، ان کی تسلی کرائی جا رہی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مرحلہ کس قدر جانگسل، ہمت شکن اور صبر آزما تھا۔

(۱۵/۹۵—۹۶) اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

یہ لوگ، جو خدا کے اقتدار کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہیں، تمہاری ہنسی اُڑا کر (بہت خوش ہوتے ہیں کہ بڑا کارنمایاں سرانجام دے رہے ہیں) ہم تیری طرف سے ان کے لیے کافی ہیں (ہمارا قانونِ مکافات ان سے نپٹ لے گا اور) انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کے اس استہزاء کا انجام کیا ہے۔

یہاں استہزاء کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فولادی تیغ و سناں کے زخموں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن طنز و طعن کے گھاؤ ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس لیے کہ طعن و تشنیع میں جس ذہنیت اور پستی کی سطح پر اُترنا پڑتا ہے، بلند سیرت و کردار کا حامل اس سطح پر اُتر نہیں سکتا۔ اور اپنے مقصد کی بلندی اور مشن کی پاکیزگی کا احساس ہی اس میں قوتِ برداشت پیدا کرتا ہے۔ اس لیے مُسْتَهْزِءِيْنَ کے مقابلے کے لیے اِنَّا كَفَيْنٰكَ کہا۔ اور فرمایا:

(۱۵/۹۷) وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کا تمہارے قلبِ حساس پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس سے تم کبیدہ خاطر ہو جاتے ہو۔

غور فرمایئے۔ کہا یہ ہے کہ حریف کی طعن آمیز باتوں (بِمَا يَقُوْلُوْنَ) سے جو کچھ تیرے دل پر گزر رہی ہے اس کا ہمیں پورا پورا علم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مَا يَقُوْلُوْنَ کو برداشت کرنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں بیشتر جھگڑوں اور فسادات کی بنیاد مَا يَقُوْلُوْنَ ہی ہوتی ہے۔ اگر باتوں کو برداشت کر لیا جائے تو جھگڑا بڑھتا ہی نہیں۔ یہ مقابلہ تو ٹینس کا کھیل ہوتا ہے۔ فریقِ مخالف جس شدت اور قوت سے گیند پھینکتا ہے اگر آپ اسے نرمی اور لطافت سے واپس کر دیں تو کھیل آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اگر ہم قرآن کی اتنی سی تلقین اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کے اتنے سے گوشہ پر عمل پیرا ہو جائیں تو کتنے جھگڑے اور فساد یونہی ختم ہو جائیں۔

لیکن حریف کے حملوں کو برداشت کرنا تو منفی عمل ہے' اس کے ساتھ مثبت پروگرام کی بھی ضرورت ہے اور وہ پروگرام یہ ہے کہ:

۱۵/۹۸ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

(لیکن تم ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ یہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمھیں ان باتوں میں اُلجھا کر تمہاری توتوں کو منفیانہ طور پر ضائع کر دیں)۔ تم اپنے پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہو تاکہ خدا کا نظامِ ربوبیت اس انداز سے متشکل ہو کر سامنے آجائے کہ وہ خدا کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر بن جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرتے جاؤ۔ تم خود بھی ایسا کرو اور تمھاری جماعت بھی ایسا ہی کرے۔

لیکن یہ پروگرام وقتی اور ہنگامی نہیں۔ اسے آخری کامیابی تک مسلسل جاری رکھنا ہوگا۔

۱۵/۹۹ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور اس طرح اپنے نشوونما دینے والے کی محکومیت پورے طور پر اختیار کر لو تا آنکہ تمھارا یہ دعویٰ (کہ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ نہایت خوشگوار نتائج کا حامل ہوگا اور غلط نظام پر چلنے والوں کا انجام تباہی و بربادی ہوگا) پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے اور ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں دنیا کے سامنے آجائے۔

قرآن کی حامل اُمت کے لیے یہ پروگرام کسی خاص خطۂ زمین اور خاص زمانے تک محدود نہیں۔ اس کا منتہیٰ یہ ہے کہ:

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)

تمام کرۂ ارض خدا کے نظامِ ربوبیت کے نور سے جگمگا اُٹھے۔

اور اس طرح جگمگا اُٹھے کہ پھر کوئی اس قندیلِ آسمانی کو بجھا نہ سکے۔ یہی اس کرۂ ارض پر انسانیت کی آخری منزل ہے۔ (۵۳/۴۲؛ ۴۴/۹)